رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۰۴

اس پرچہ کی قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول ہے

قواعد رسالہ "نگار"

۱۔ رسالہ ہر مہینے کی پندرہ تاریخ سے پہلے شایع ہوتا ہے۔
۲۔ رسالہ نہ پہونچنے کی صورت میں بیس تاریخ تک دفتر کو اطلاع ہونی چاہیئے ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ کیا جائیگا
۳۔ خط کتابت کیوقت اپنا نمبر خریداری ضرور لکھیے جسپر نمبر خریداری نہیں ہوتا ایسے خطوط ضایع کردیئے جاتے ہیں
۴۔ جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ آنا ضروری ہے۔
۵۔ مضامین صاف اور خوشخط آنے چاہییں۔
۶۔ سالانہ قیمت پانچ روپیہ ششماہی تین روپیہ بیرون ہند سات روپیہ سالانہ پیشگی مقرر ہے۔

نرخنامہ اجرت اشتہارات

تعداد صفحہ	ایک صفحہ	نصف صفحہ	پاؤ صفحہ
بارہ مرتبہ	۱۰۰ روپیہ	۶۰ روپیہ	۴۰ روپیہ
چھ مرتبہ	۶۰ روپیہ	۳۵ روپیہ	۲۵ روپیہ

(۱) اجرت ہر حال میں پیشگی آنا ضروری ہے (۲) جو صاحبان تین ماہ سے زائد اشتہار دینگے ان کو بیس فیصدی کمیشن دیا جائیگا میعاد اشتہار کے اندر دو مہینے قبل اطلاع دیتے پر مضمون بدل سکتا ہے۔

تعداد صفحہ	ایک صفحہ	نصف صفحہ	پاؤ صفحہ
تین مرتبہ	۳۵ روپیہ	۲۲ روپیہ	۱۴ روپیہ
ایک مرتبہ	۱۲ روپیہ	۹ روپیہ	۶ روپیہ

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

مولانا نذیر احمد
نبات النعش ۹/
مراۃ العروس ۱۰/
توبۃ النصوح ۱۲/
موعظہ حسنہ ۸/
رویائے صادقہ ۸/
ایامیٰ ۸/
فسانۂ مبتلا ۸/
ابن الوقت ۸/
مصائب غدر ۱۲/

مولانا شبلی
سیرۃ النبی جلد اول ۸
〃 دوم ۸
〃 سوم ۸
الفاروق ۶/
سیرۃ النعمان ۸
الغزالی ۸
المامون ۸
سوانح مولانا روم ۶
سفرنامہ مصر و شام ۶/
علم الکلام ۶/
الکلام ۶/
رسائل شبلی ۸
مقالات شبلی عہ/
شعر العجم جلد اول ۶/
〃 دوم ۸
〃 سوم ۸
〃 چہارم ۶/
〃 پنجم ۶/
موازنہ انیس و دبیر ۶/
مضامین عالمگیر ۸/
آغاز اسلام ۸/
کلیات فارسی ۶/
کلام شبلی اردو ۸/

امیر مینائی
صنم خانۂ عشق ۶/
مراۃ الغیب ۸
محامد خاتم النبیین ۸/
ضیائے سخن عہ/
مکاتیب امیر مینائی ۸

رتن ناتھ سرشار
سیر کہسار ۸
خدائی فوجدار ۸
جام سرشار ۶/
الف لیلہ بطرز ناول عہ/
کامنی ۸
سوانح عمرو عیار ۸

منشی سجاد حسین مرحوم
احمق الذی ۸/
حاجی بغلول ۸/
پیاری دنیا ۸/
کایا پلٹ ۸/
میٹھی چھری ۶/
طرحدار لونڈی عہ/
طلسمی فانوس ۸

جوالا پرشاد برق
مرنا لنی ۱۲/
مارا آستین ۱۲/
بنگالی دلہن ۱۲/
معشوقۂ فرنگ ۱۲/

جلد ۱۵- شمار ۲

نگار

فہرست مضامین فروری ۱۹۲۹ء

نگار

ایڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۱۵	فروری سنہ ۱۹۲۹ء	شمار ۲

ملاحظات

گذشتہ ماہ (جنوری) کے رسالہ سے نگار نے اپنی عمر کے آٹھویں سال میں قدم رکھا ہے، جو عورتوں کی اصطلاح میں "میٹھا سال" کہلاتا ہے اور بہت "اللہ آمین" کے ساتھ بسر ہوتا ہے لیکن چونکہ ہندوستان کی محدود حوصلہ اور ناپایدار عمر رکھنے والی علمی دنیا میں کسی رسالہ یا اخبار کیلئے اس عمر تک پہونچ جانا بھی گویا "ہفت خواں" کا طے کر لینا ہے، اس لئے میں تو یہی کہونگا کہ نگار نہ صرف اپنے شباب بلکہ سن وقوف کو پہونچ گیا ہے اور وہ اعتماد و وقار جو ملک کے اندر اسنے حاصل کر لیا ہے، بڑی حد تک اس کی حیات طویل کا ضامن ہے اگر بدقسمتی سے کوئی حادثہ سنگین داعی نہ ہوا۔

اس میں شک نہیں کہ نگار اس وقت یوپی کے تمام اردو رسائل و جرائد سے زیادہ اشاعت رکھنے کا مدعی ہے، لیکن یہ کثرت صرف تقابلی و امتیازی ہے، حقیقی نہیں۔ یعنی یہ تو کہا جاسکتا ہے کہ اس وقت اسکی اشاعت مقابلتہً دوسرے رسائل سے زیادہ ہے، لیکن جسوقت یہ دیکھا جاتا ہے کہ حقیقتاً اسکی اشاعت کتنی ہونا چاہئے، تو ہم یہ کہنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ ؎

وہ جو ہم رکھتے تھے اک حسرت تعمیر سو ہے

یہ صحیح ہے کہ رسالہ نگار نہ صرف اپنے مصارف پورے کرتا ہے بلکہ وہ میرے اسباب معیشت و معاشرت کا بھی بڑی حد تک کفیل ہے اور ایک مشین پریس مع تمام ضروری سامان کے اپنی ملکیت میں رکھتا ہے، لیکن کیا میری سات سال کی کاوش دماغ کا صرف یہی صلہ ہونا چاہئے

ممکن ہے کہ ہندوستان میں جہاں اب سرمایۂ زر وسیم کے مقابلہ میں سرمایۂ دماغ کی کوئی اہمیت نہیں، اسکو کافی سمجھا جائے، لیکن ہند ہی کی سرزمین میں ایک زمانہ ایسا بھی گزرا ہے جب علم و ہنر کی قدردانی کا مفہوم مادی نقطۂ نظر سے استعارۃً نہیں بلکہ حقیقتاً زر وسیم کے برابر تولا جانا اور جواہرات سے منہ بھر دینا ہوا کرتا تھا۔ ہر چند میں ان لوگوں میں نہیں کہ کسی وقت اس احترام کا مطالبہ کر سکوں لیکن خدمت کے لحاظ سے اجرت طلب کرنا یقیناً میرا فطری حق ہے اور اگر اہلِ ملک کمی کرے تو کوئی وجہ نہیں کہ میں اس کا تقاضہ نہ کروں۔

نگار نے گذشتہ سال کے اندر جو خدمت زبان و علم کی انجام دی ہے یا جو ذہنی انقلاب اس نے پیدا کر دیا ہے وہ صحافت کی دنیا کا ایسا معمولی واقعہ نہیں ہے جس کو نظر انداز کر دیا جائے۔ احباب نکتہ سنج نے اپنے اعتراف سے اور ارباب حسود نے اپنے اضطراب سے بارہا اسکو تسلیم کیا اور کرتے رہیں گے لیکن افسوس ہے کہ اس وقت تک نگار اپنے پیغام کی نشر و اشاعت ضروری حد تک بھی نہیں کر سکا اور یہ فرض ابتک ناتمام حالت میں پڑا ہوا ہے جس کا بڑا ذمہ دار ملک ہے۔ اگر آج نگار کے تمام موجودہ خریدار صرف ایک شخص اپنا ہم خیال و ہمنوا پیدا کر کے نگار کی اعانت پر آمادہ کر دیں، (جو ایسا دشوار امر نہیں ہے) تو ایک ہی سال کے اندر ایسا صوری و معنوی انقلاب نگار کی حالت میں پیدا ہو سکتا ہے کہ اس وقت آپ اسکا اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔

بہرحال میرا فرض اس اظہار خیال پر ختم ہو جاتا ہے اور اب مجھے دیکھنا ہے کہ ناظرین نگار کس حد تک میری اعانت کرتے ہیں۔

میں بے انتہا ممنون ہوں ان احباب کا جو وقتاً فوقتاً نگار کی توسیع اشاعت میں حصہ لیتے رہتے ہیں اور خصوصیت کے ساتھ مولوی غلام ربانی عزیز (کمبل پور) کا جنہوں نے ایک ایک وقت میں پچیس پچیس خریدار فراہم کئے۔

گذشتہ ماہ نگار چونکہ سال کا پہلا پرچہ تھا اور زیادہ ضخیم نکالنا تھا اس لئے اس مرتبہ ۳۲ء کے خاص خاص مضامین کا انتخاب اس میں درج کیا گیا۔ اس سے ایک طرف یہ مقصود تھا کہ لوگوں کے پاس ۳۲ء کا ایک منتخب مجموعۂ مضامین پہونچ جائے، اور دوسری طرف یہ ظاہر کرنا تھا کہ ابتدا میں جب نگار جاری ہوا ہے تو ادارت پر اس کی ترتیب کا کتنا بار تھا۔ چونکہ موجودہ خریداروں میں بہت کم تعداد ان لوگوں کی ہے جو شروع سے خریدار ہوئے ہیں اس لئے یہ مجموعۂ مضامین بہت زیادہ پسند کیا گیا۔ بعض حضرات نے جنکے پاس ۳۲ء کا مکمل فایل تھا ان کو شکایت بھی ہوئی، لیکن انکی خدمت میں عذر پیش کر دیا گیا۔

یہ امر اس سے قبل بھی ظاہر کیا جا چکا ہے اور اب پھر اس کا اعادہ کرتا ہوں کہ نگار کا نہ کوئی خاص نمبر نکلتا ہے اور نہ اسکا کوئی سالنامہ شائع ہوتا ہے، البتہ کبھی کبھی بغیر کسی التزام و تعیین کے ضخامت زیادہ کر دی جاتی ہے اور اس زیادتی حجم سے یہ فایدہ اٹھایا جاتا ہے کہ رسالہ کا اسلوب ترتیب ایک ماہ کے لئے بدل کر کچھ تنوع پیدا کر دیا جاتا ہے اس لئے اگر کوئی صاحب نگار کی کسی ایسی مخصوص اشاعت کو سالنامہ وغیرہ کے لفظ سے یاد کرتے ہیں تو اسکی ذمہ داری انہیں پر ہے۔

میں اس کا معترف ہوں کہ پنجاب کے رسایل کی طرح نہ نگار میں تصاویر ہوتی ہیں اور نہ کوئی ظاہری صنعت و نمایش اس میں پائی جاتی ہے، لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ جو طبیعتیں نگار کے مضامین کی عادی ہو گئی ہیں۔ وہ تصاویر اور نقش و نگار سے زیادہ کسی اور چیز کی جستجو میں رہتی ہیں اور غالباً اسکا فقدان نگار میں کبھی نہیں ہوا۔

اس میں کلام نہیں کہ رسایل میں موزوں و مناسب تصاویر کی اشاعت کے ساتھ ساتھ معقول و سنجیدہ ترتیب کا بھی لحاظ رہے، تو بہت زیادہ قابل تعریف امر ہے، لیکن عام طور پر تصاویر شایع کرنیوالے رسایل اس کا لحاظ نہیں کرتے اور صرف ظاہری صورت کا سودا کرنا چاہتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ انہیں کامیابی نہیں ہوتی، ہوتی ہے اور بہت زیادہ ہوتی ہے کیونکہ دنیا معنی سے زیادہ صورت کو کیفیت سے زیادہ کمیت کو دیکھتی ہے، لیکن یہ کامیابی تجارت کی ہے، رسالہ کی نہیں۔۔۔۔۔۔ تصاویر کی اشاعت کا مسئلہ عرصہ سے نگار کے سامنے ہے، لیکن افسوس ہے کہ اسوقت تک نگار کی مالی حالت اس قابل نہیں ہوئی کہ وہ اسی معیار کی تصاویر شایع کر سکے جو اس کے مضامین کا ہے۔

پنجاب میں اس وقت متعدد رسایل ایسے نکل رہے ہیں جن میں تصاویر کا التزام ہوتا ہے اور میں انکے مساعی کو نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں، لیکن جس وقت یہ غور کرتا ہوں کہ تصاویر نکال دینے کے بعد کونسا رسالہ دیکھے جانے کے قابل ہے تو صرف دو یا تین رسالے اس قابل نظر آتے ہیں۔

رسالہ ہمایوں اور نگار کی ابتدا ساتھ ساتھ ہوئی جس طرح نگار نے ایک روش قایم کرنے کے بعد اسکو ترک نہیں کیا، اسی طرح ہمایوں نے بھی اپنا سمت مقصود نہیں بدلا۔ بلکہ اس کو یہ امتیاز اور زیادہ حاصل ہے کہ وہ تصاویر بھی شائع کرتا رہتا ہے جن میں سے اکثر اچھے ذوق کا پتہ دیتی ہیں۔

نیرنگ خیال، ہمایوں کے بعد جاری ہوا، لیکن تصاویر کی ابتدا اسی نے کی اور غالباً اظہار حقیقت ہوگا اگر یہ نہ کہا جائے کہ دیگر رسایل کے مصور شائع ہونے کا سبب نیرنگ خیال ہی ہوا۔ اسی نے خصوصیت کے ساتھ مخصوص نمبروں اور سالناموں پر زیادہ توجہ کی اور آج غالباً اس سے زیادہ کامیاب رسالہ اس باب میں کوئی نہیں اور جن اصول کے ماتحت اسکو جاری کیا گیا تھا اس میں اسکو قابل رشک کامیابی حاصل ہوئی۔ رسالہ مخزن کا نشاۃ الثالثہ نیرنگ خیال کے بعد ہوا اور جناب حفیظ جالندھری کی سعی و کوشش سے اس نے بھی کافی ترقی کی، تصاویر بھی اچھی اچھی شائع ہوئیں اور ترتیب و تہذیب میں بھی دلکشی پیدا کیگئی، لیکن ایک عجیب و غریب بات جو پنجاب کے رسایل و جرائد میں پائی جاتی ہے اور جس سے ہمایوں بھی باوجود اپنی انتہائی متانت و سنجیدگی کے نہ بچ سکا، وہ باہمی تضحیک و توہین اور سب و شتم ہے۔ خیر اگر پنجاب کے رسالے یوپی کے رسایل کے مخالف ہوں تو اسکی تاویل بھی ہوسکتی ہے، لیکن خود اُن کا آپس میں افتراق و انشقاق عجیب بات ہے۔

اسی سلسلہ میں مجھے وہاں کے ایک اور نوزائیدہ رسالہ کا ذکر ناضرور ہے جو شبستان کے نام سے دیوان آتم آنند شرر بی اے کی ادارت میں جنوری ۲۹ء سے جاری ہوا ہے۔ یہ رسالہ سینما کی دنیا سے متعلق ہے اور اس میں صرف وہی مضامین درج ہونگے جو بالواسطہ یا بلاواسطہ سینما سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس رسالے میں دنیا کے بعض مشہور ایکٹروں کی تصاویر بھی ہیں اور طباعت، کتابت اور کاغذ نہایت ہی عمدہ و پاکیزہ ہے جناب پطرس کا مضمون "فلم کی شام" دیکھنے کے قابل ہے۔

سیاسیات ہند کا سب سے زیادہ مہتم بالشان مطلب جسے گذشتہ کانگرس کی تمام کارروائیوں کا ماحصل کہنا چاہئے ہندوستان کیلئے ڈومینین ہوم رول کا مطالبہ تھا جسکی سفارش نہرو کمیٹی رپورٹ میں کی گئی تھی اور جس سے انڈپنڈنٹ پارٹی کو سخت اختلاف تھا۔

میں اس جگہ کانگرس کی کارروائیوں کو بیان کرنا ضروری نہیں سمجھتا، کیونکہ اسکا علم ہر اخبار بین شخص کو ہے، لیکن مختصراً یہ ظاہر کرنا ضروری ہے

کہ گذشتہ کانگرس کے بعد سیاسیات ہند کا رخ کیا ہو گیا اور مسلمانوں نے اس سے کس حد تک فایدہ اٹھایا۔

مہاتما گاندھی کا چند سال سے پانوں توڑ کر زاویہ نشین ہو جانا اور پھر دفعتہً کانگرس میں شریک ہو کر تجدید عمل کی نمایش کرنا اور وہ بھی اس شان کے ساتھ کہ کانگرس میں ہر جگہ وہ پنڈت موتی لال نہرو ہی کے حلقوم سے گفتگو کر رہے ہوں اور آزادی کامل کے مطالبہ سے ترک کر دو مینین ہوم رول تک آ جائیں، کوئی معمولی بات نہیں ہو سکتی،

میں دیکھتا ہوں کہ یہ ڈرامہ جو کانگرس کے اجلاس پر کھیلا گیا، اسکی طیاری مخفی طور پر الہ آباد اور احمد آباد میں بہت عرصہ سے ہو رہی تھی یہاں تک کہ مجھے تو یہ شبہ ہے کہ انڈپنڈنٹ جماعت کی وہ شدید مخالفت جو کانگرس میں ظاہر ہوئی، کہیں وہ بھی اسی کھیل کا کوئی طے شدہ اور مقررہ حصہ نہ ہو۔

بہر حال حقیقت جو کچھ بھی رہی ہو اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ جو کچھ ہوا وہ کس حد تک صحیح ہے اور اس سے کن نتائج کی توقع کی جاتی ہے۔ گذشتہ کانگرس کی اس متفق علیہ آواز کو کہ "اگر ہوم رول ایک سال کے اندر نہ ملگیا تو عدم تعاون، ستیاگرہ وغیرہ کے وہی حربے اختیار کئے جائیں گے جن کی اس قبل آزمایش ہو چکی ہے" بلا اختلاف تمام جماعتوں نے پسند کیا اور کم از کم ایک سال کے لئے ہندوستان کے سیاسیات کا ایک متفقہ محاذ قایم ہو گیا۔

یہ تجویز حقیقتاً ایک کھلا ہوا پیام جنگ ہے جو حکومت برطانیہ کو دیا گیا ہے اور اگر اس چیلنج کے الفاظ کو واقعۃً عمل سے بھی ثابت کر دیا گیا تو پھر ہندوستان کا کم از کم اس منزل سے گزر جانا تو یقینی ہے، جسے سکون جمود کہتے ہیں۔ رہا نتیجہ، سو اس کی جستجو بیکار ہے، کیونکہ جب انسان طوفان میں گھر کر ہاتھ پاؤں مارنے پر مجبور ہو جاتا ہے تو کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ساحل ملگیا، اور اس امید پر تو اس سے زیادہ قربانی کی جا سکتی ہے۔

مسلمانوں میں باہم جو اختلاف اس مسئلہ میں پیدا ہو گیا ہے، وہ البتہ بدستور قایم ہے اور اگر ۲۹ء کے اخیر تک حکومت برطانیہ کے کسی فیصلہ نے ملک کے اندر کوئی عام اضطراب نہ پیدا کر دیا، تو اس خلیج کا وسیع ہو جانا بالکل یقینی ہے، اور کمزور جماعت ہونے کے لحاظ سے خسارہ میں رہنا لازمی۔

مسلم لیگ کے جو جلسے کلکتہ میں ہوئے ان کو کانگرس ہی کا پرتو سمجھنا چاہئے، کیونکہ ہمیں حصہ لینے والے مسلمان تقریباً سب وہی تھے جو شروع سے نہرو کمیٹی رپورٹ کے موافق ہیں۔ مخالفین کی شرکت وہاں کی فضا میں کوئی تغیر پیدا نہ کر سکی بلکہ انکار ہا سہا اقتدار بھی ختم ہو گیا۔ اس کے جواب میں دہلی کی آل مسلم پارٹیز کانفرنس کا انعقاد جو اہمیت رکھ سکتا تھا اس کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ پذیرائی کرنے والے کون تھے اور جن کی پذیرائی کی گئی وہ کیا ہیں۔ اس کانفرنس نے کوئی قابل ذکر اہمیت پیدا نہیں کی اور نہ جمہور مسلمانان ہند میں اس سے کوئی تغیر پیدا ہوا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ وقت بہت دلچسپ ہوگا جب اس اختلاف کے بانی (خواہ وہ اختلاف کتنے لوص پر کیوں نہ قایم ہو) مجبور ہو کر ترک اختلاف کا عہد و پیمان کریں گے اور ہندو سبھا کے حکم کو، برطانیہ کے حکم پر ترجیح دینا فلاح سمجھیں گے۔

کانگرس میں مہاتما گاندھی کے اس الٹی میٹم کے شایع ہوتے ہی ملک و بیرون ملک کے معزز ارکان صحافت نے جن جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ امید افزا تھا اور ہم کو ماننا پڑے گا کہ لارڈ ارونگ کی تقریر افتتاح کونسل کے وقت بڑی حد تک انہیں خیالات و آرا سے متاثر

ملاحظات

نے کے بعد تب کی گئی تھی۔ گاندھی کے چیلنج کا جواب جس سکون و نرمی کے ساتھ حکومت ہند نے دیا ہے وہ برطانوی ڈپلومیسی کا کوئی جدید مظاہرہ نہیں ہے۔ کیونکہ "مہا تا سپر باید انداختن" کے اصول سے کام لینے کو جیسا یہ قوم جانتی ہے کسی اور قوم کو نہیں معلوم، لیکن اسی کے ساتھ نتیجہ کے لحاظ سے جو مایوسی پیدا کر دی ہے، وہ لندن کے قلمدان وزارت کا کوئی نیا کارنامہ نہیں جس کے نقوش پر وائسرائے ہند کے آواز کی رکارڈنگ ہوتی ہے۔

بہرحال یہ امر یقینی ہے کہ سنہ ۲۹ء کے اخیر تک حکومت کی طرف سے علاوہ سائمن کمیشن کے کسی اور کمیشن کا وجود عمل میں آئے گا جس کو اہل ہند بائیکاٹ نہ کر سکیں گے اور اگر سائمن کمیشن اور اس دوسرے کمیشن کے فیصلہ میں اختلاف ہوا جو بالکل یقینی ہے تو پھر کسی تیسرے کمیشن کو پیدا کیا جائے گا جو زیادہ تر راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کی حیثیت رکھیگی اور اس طرح کم از کم آٹھ دس سال کا زمانہ گزر جائے گا اور گاندھی جی مذبذب حالت میں بیٹھے ہوئے یہی سوچتے رہیں گے کہ انہیں اپنے ترکش کا کوئی تیر استعمال کرنا مناسب ہے یا نہیں؟

اس لئے میری رائے میں یہ زمانہ صرف انتظار میں بسر کر دینا کہ حکومت کیا فیصلہ کرتی ہے اور سنہ ۳۰ء میں ہمیں کیا کرنا ہے، تضیع اوقات ہے۔ اس دوران میں سب سے پہلے یہاں کی اقتصادیات و معاشیات پر قابو حاصل کرنے کیلئے ایک نہایت زبردست مرکزیت پیدا کرنا چاہیئے اور کوشش کر کے ملک کو بتا دینا چاہیئے کہ انکی فلاح کا انحصار صرف اقتصادی اصلاح پر ہے جس کی اولین منزل کھدر کا استعمال ہے۔ ملک کی آزادی کا سوال سامنے رکھکر کھدر کے استعمال کی ترغیب کبھی مفید نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ ابھی تک عوام ملک کی آزادی کی اہمیت کو نہیں سمجھتے، بلکہ لوگوں کو دلایل سے، اعداد و شمار سے یہ بتانا چاہیئے کہ کھدر کا استعمال کتنوں کے قرضے ادا کر سکتا ہے، کتنی جائدادوں کا فک رہن اس کے ذریعہ سے ہو سکتا ہے، کتنے خاندان فاقوں سے بچ سکتے ہیں اور کتنے بچے تعلیم پا سکتے ہیں۔ کھدر پرچار میں ادنیٰ سے ادنیٰ شائبہ بھی سیاسیات کا نہ آنا چاہیئے، بلکہ اس کو صرف اقتصادی مسئلہ کی حیثیت سے رائج کرنا چاہیئے، جس کے لئے اگر نیشنل کانگرس اپنی کوئی علیحدہ شاخ قائم نہیں کر سکتی تو ایک اقتصادی کانگرس بالکل جداگانہ قائم کرنا چاہیئے اور تمام اکابر قوم کو کم از کم دو تین سال کے لئے اپنی ساری توجہ اسی طرف مبذول کر دینا چاہیئے۔

مہاتما گاندھی نے اب پھر ایک جدید اسکیم اس مسئلہ کی شائع کی ہے، لیکن صرف اسکیموں کی اشاعت سے کچھ نہیں ہو سکتا جب تک کچھ عرصہ کے لئے تمام اور تحریکوں سے قطع نظر کر کے تمام اکابر ملک کی توجہ اس طرف مبذول نہ ہو۔ کیونکہ یہ تحریک اسوقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک ایک ایک گانوں پھر کر اس کا پروپگنڈا نہ کیا جائے اور نہایت وسیع پیمانہ پر تجارت اور کاروبار کی صورت سے اسکی اشاعت نہو۔

بیرون ہند کے معاملات میں سب سے زیادہ اہم واقعہ انقلاب افغانستان کا ہے کہ ایک بغاوت نے جو پہلے بہت معمولی معلوم ہوتی تھی یہاں تک اہمیت اختیار کر لی کہ امیر امان اللہ خان کو سلطنت چھوڑ کر کابل سے قندھار آنا پڑا اور سردار عنایت اللہ خاں بھی کامیاب باغیوں کی وجہ سے کابل میں نہ رہ سکے۔ اس انقلاب کے تمام واقعات و جزئیات سے ہر شخص واقف ہے اور شاید ہی کوئی ایسا شخص ہو جس نے شروع سے اس وقت تک اس تغیر کے مختلف مدارج و منازل کا مطالعہ اخباروں کے ذریعہ سے نہ کیا ہو۔ لیکن سب سے زیادہ حیرتناک امر یہ ہے کہ باوجود افغانستان کے اس قدر قریب ہونے کے آجتک کوئی خبر ایسی موصول نہیں ہوئی جس پر ایکدن کیلئے بھی وثوق ہو سکے اور دوسرے دن اسکی تردید کی توقع نہ ہوتی ہو۔

یہ انقلاب وہاں کیوں رونما ہوا، اور اس نے اسقدر شدت کیوں اختیار کی، کوئی ایسا راز نہیں ہے جس کی حقیقت معلوم کرنے کیلئے زیادہ انتظار کیا جائے۔ اس انقلاب کے اسباب متعدد بیان کئے جاتے ہیں جنمیں سب سے زیادہ اہم ایک سبب یہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ امان اللہ خاں کی مغربی اصلاح وہاں کے تاریک خیال لوگوں کو ناگوار گزری، دوسرا سبب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ حکومت برطانیہ نے اس بغاوت کو پیدا کیا تاکہ امان اللہ خاں جو روسیوں کے زیادہ طرفدار تھے علحدہ ہو جائیں۔ ان میں سے دوسرا سبب تو یقیناً قابل اعتماد نہیں ہو سکتا، کیونکہ نہ امیر امان اللہ خاں روس کے طرفدار تھے اور نہ وہ ہو سکتے تھے جبکہ روس کی موجودہ حالت ہرگز ایسی نہیں کہ اسکی موافقت میں کوئی سلطنت، دوسرے ملک کی مخالفت مول لیکر روس سے امداد کی توقع رکھے۔ اگر آج روس اس قابل ہوتا تو موجودہ انقلاب افغانستان سے وہی سب سے زیادہ ناجائز فایدہ اٹھاتا۔ علاوہ اس کے سرحدی سیاست کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ بھی ماننا پڑتا ہے کہ حکومت ہند کا فایدہ اسمیں ہے کہ افغانستان کے اندر کوئی مرکزی حکومت قایم رہے اور تفریق و انشقاق نہ پیدا ہو، کیونکہ اس صورت میں اسکی خارجی پیچیدگیاں اور بڑھ جائیں گی۔ بہرحال یہ خیال لوگوں کا بربنائے غلط فہمی ہے۔

سبب اول کی کچھ حقیقت ضرور ہے، لیکن نہ اسقدر کہ اسی کو اصل وجہ قرار دیا جائے۔ میں نے جہانتک غور کیا ہے اسکا سب سے بڑا سبب افغانستان کی عام اقتصادی حالت کا کمزور ہو جانا ہے، اور اس کے بعد دوسرا سبب وہاں کے عمال کا ناقابل ہونا۔ امان اللہ خاں جس عجلت و شتابی جس مستعدی اور برق وشی کے ساتھ اصلاحات کو نافذ کر رہے تھے اسکا اقتضاء یہ بھی تھا کہ رعایا پر ٹیکس بڑھا دیا جائے اور اسے وصول بھی کیا جائے، پھر چونکہ افغانستان کی رعایا جو پہلے محاصل زمین بھی صرف غلہ کی صورت میں ادا کیا کرتی تھی اور جو حقیقتاً مفلس و نادار ہے، حکومت کے جدید ٹیکسوں سے گھبرا گئی اور یہ دیکھکر کہ ابھی تو ابتدا ہے آیندہ خدا جانے اور کیا کیا دینا پڑے ان میں بددلی پیدا ہو چلی تھی، پھر چونکہ یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ وہاں کے عمال اچھے نہیں ہیں (اور نہ اسقدر جلد تمام ملک کے اہلکاروں کی اصلاح ہو سکتی ہے) اس لئے وہ پبلک کی بدظنی کم کرنے کے بجائے اور زیادتی کا باعث ہوئے اور رفتہ رفتہ یہ آگ تمام اکناف ملک میں مشتعل ہو گئی، اور وہ تمام لوگ جو کچھ ان اسباب کی بناء پر اور کچھ دیگر قبائلی و نسلی تفریق و عناد کی بناء پر پہلے ہی سے خوش نہ تھے ملکر اس ہنگامہ کا باعث ہو گئے۔

پردہ کا مسئلہ، عورتوں کی تعلیم، لباس کی تبدیلی، ان میں سے کوئی بات ایسی نہ تھی جو بغاوت کو اس حد تک پہونچا دیتی، اگر اسوقت کابل کا خزانہ ملک کی اقتصادی حالت کو درست کرنیکا اہل ہوتا، محض جبریہ فوجی بھرتی کی مخالفت افغانستان میں کبھی نہیں ہو سکتی (کیونکہ جنگ انکی فطرت ہے) لیکن اگر فوج کو تنخواہ وقت پر نہ ملے تو بیشک اسکو بددل ہونا چاہئے اور یقیناً یہ بھی ایک سبب باغیوں کی کامیابی کا ہوا اور شاہی فوج پوری قوت کے ساتھ مقابل نہیں آئی۔ ممکن ہے کہ وہاں کے وزراء کا باہم شکررنجی نے بھی اس شورش کی اعانت کی ہو۔ بہرحال اسوقت وہاں کی حالت یہ ہے کہ مختلف حصوں پر مختلف شخصوں نے حسب موقعہ قبضہ جما رکھا ہے اور امان اللہ خاں نے پھر اپنی ملوکیت کا اعلان کر کے بچہ سقہ کے خلاف جو کابل پر قابض ہو گیا ہے، تاخت کی تدبیریں شروع کر دی ہیں۔ آیندہ کیا ہوگا۔ اس کے متعلق بھی آسانی سے پیشین گوئی کی جا سکتی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ افغانستان ان ملکوں میں سے ہے جہاں نہایت آسانی سے ملوک الطوائف پیدا ہو سکتے ہیں، لیکن یہ بھی ایک حقیقت واضح ہے کہ اسوقت سوائے امان اللہ خاں کے اور کوئی شخص سارے ملک میں ایسا نہیں ہے جسکی حکومت پر تمام قبایل کسی وقت متفق ہو سکیں۔

امان اللہ خاں کا شاہی خاندان سے ہونا، اپنی خصوصیات ذاتی کی بنا پر صاحب اثر و اقتدار ہونا اور گذشتہ طرز عمل سے انکا سچا خادم ملک ثابت ہوجانا، یہ تمام وہ باتیں ہیں جنکا اثر ابتک قایم ہے اور رہے گا، اسلئے کوئی وجہ نہیں کہ ملک دوبارہ انکی حکومت و سیادت کو تسلیم نہ کرے، لیکن ضرورت یہ ہے کہ پہلے اس ہنگامی اشتعال کو فرو کر دیا جائے۔ اسوقت تک امان اللہ خاں کا قندھار میں خاموش بیٹھا رہنا اس لئے نہیں ہے کہ وہ آیندہ کیلئے مایوس ہوچکے ہیں یا انہیں افغانستان کی موجودہ تشتت و انتشار سے کوئی تکلیف نہیں پہونچ رہی ہے، بلکہ اسکا سبب صرف موسم کی خرابی ہے۔ جسوقت برفباری موقوف ہوکر راستے صاف ہوگئے تو آپ دیکھیں گے کہ امان اللہ خاں نے کیا کیا۔ اور ہوا کا رخ کس طرف کو پھر گیا۔ سقہ بچہ کی ذاتی حیثیت ہرگز اس قابل نہیں ہے کہ وہ برفباری کے موسم سے زیادہ کابل کو اپنے پاس رکھ سکے۔ جسوقت یہ شدت سردی کی ختم ہوئی اور امان اللہ خاں کا آفتاب اقبال قندھار سے طلوع ہوا تو یہ تمام اپنی اپنی جگہ پر بادشاہ بن بیٹھنے والی ہستیاں شبنم کی طرح اڑجائیں گی اور پھر وہ امن و سکون، عروج و ترقی کا زمانہ آئے گا جس کی تکمیل امان اللہ خاں کے ہاتھ پر قدرت نے لکھدی ہے۔

اس زمانہ میں برطانیہ کی نیوٹرل پالیسی کو عام طور پر بہت پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ اور غالباً یہ بڑی مدد تھی جو حکومت ہند کی طرف سے پیش کیگئی لیکن یہ سوال ہے کہ جب امان اللہ خاں نے اپنی ملوکیت کا اعلان کیا تو اسکو برطانیہ نے کیوں تسلیم نہیں کیا اور ابتک سرکاری پیغامات میں انکا ذکر ایک معزول بادشاہ کی حیثیت سے کیوں کیا جاتا ہے اور کیوں نہیں اُن سے وہی تعلقات قندھار میں پیدا کئے جاتے جو اس سے قبل کابل میں تھے۔ کیا امان اللہ خاں نے باقاعدہ اسکی اطلاع حکومت ہند کو نہیں دی؟ یہ راز شاید ابھی ظاہر نہیں ہوسکتا اور نہ اسپر رائے زنی مناسب ہے۔

سب سے زیادہ باعث مسرت امر اس سلسلہ میں یہ ہے کہ ہندوستان کی غیر مسلم صحافت نے جسمیں اینگلو انڈین اور ہندو دونوں شامل ہیں، اپنا انداز تنقید نہایت سنجیدہ اور قابل تعریف رکھا۔ شاید ہی کوئی ایسا اخبار ہو جسنے امان اللہ خاں کیساتھ ہمدردی کا اظہار نہ کیا ہو اور اس انقلاب کو وہاں کی پبلک کی غیر دانشمندانہ پالیسی پر محمول نہ کیا ہو۔ اور یہ اتنا بڑا ثبوت امان اللہ خاں کی دلعزیزی کا ہے کہ شاید ہی اب اسمیں کسی اور اضافہ کی گنجایش ہوسکتی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ جدید اصلاحات کے نافذ کرنے میں امان اللہ خاں نے اپنی فطرت کے لحاظ سے ذرا عجلت سے کام لیا اور صرف اپنے خلوص اور خدمت قومی کے جذبے سے متاثر ہوکر اپنی قوم کی ذہنیت کو نظر انداز کر دیا۔ اگر وہ انہیں اصلاحات کے نفاذ کیلئے ذرا نرم پالیسی سے کام لیتے اور دفعتہً تمام نظام میں تبدیلی پیدا کرنیکے خیال سے اپنے آپ کو اور ملک کو اقتصادی مشکلات میں مبتلا نہ کرلیتے تو شاید یہ انقلاب رونما نہ ہوتا۔ امید ہے کہ جب دوبارہ عنان حکومت میں لیں گے تو وہ زیادہ مصلحت اندیشی سے کام لینگے۔ مغرب سے جہاں وہ اور اصلاحات کا درس لیکر آئے ہیں، اگر انہیں کے ساتھ وہ اس ڈپلومیسی کا بھی سبق لیتے جو انسان کی زبان و قلب کو بالکل علحدہ علحدہ کر دیتی ہے تو افغانستان کی کم از کم سیاست خارجہ کا اقتدار اسقدر جلد زایل نہ ہوتا۔

"تذکرۂ خندۂ گل" کی تکمیل میں جتنی تعویق ہوتی جاتی ہے، اتنی ہی میری شرمندگی میں اضافہ ہوتا جاتا ہے، لیکن پہلے یہ خیال نہ تھا کہ کتاب اسقدر ضخیم ہوجائیگی۔ بہرحال امید کیا بلکہ یقین ہے کہ زیادہ سے زیادہ وسط مارچ تک کتاب مکمل ہوجائے گی اور اخیر مارچ تک تمام ان حضرات کی خدمت میں بھیجدی جائیگی جنکا روپیہ وصول ہوچکا ہے۔

نیاز

فلسفۂ مذہب

مذہب اور اخلاق انسان کی عام عادات و اطوار پر بحث کرنا علم اخلاق کی اجمالی تعریف ہے، مگر ایسی صورت میں اخلاق کے وسیع دائرہ میں ایسے مضامین بھی آجائیں گے جنکا تعلق زیادہ تر علم تاریخ علم انسان یا علم انساب سے ہے یعنی مختلف ادوار و زمانہ میں انسان کے گوناگوں معاشرت و تمدن پر تاریخی نقطۂ نگاہ سے نظر ڈالنا ضروری ہو جائیگا۔ اس لئے عام طور سے اخلاقی بحث صرف ان مسائل پر محدود سمجھی جاتی ہے کہ انسان کے اطوار و عادات کن اخلاقی اصول کے تابع ہیں لیکن اگر ہم اخلاق کو صرف اطوار انسانی کا ایک علم سمجھیں تو وہ دو حیثیت سے غلط ہوگا اول تو یہ کہ علم یا تو نظری ہوگا یا عملی۔ نظری حیثیت سے انسانی اعمال کی ایسی تشریح کرنا کہ زمانۂ گذشتہ یا موجودہ میں ان پر نیک و ملاق کیوں کر ہوا ممکن نہیں عملی حیثیت سے بھی یہ کوئی مفید مقصد پیدا نہیں کرتا کیونکہ ایسی صورت میں ہمارے ضمیر یا ادراک اخلاقی ے ہی وقت میں مجرب اور مجترب بنانا پڑیگا، دوسرے یہ کہ اخلاق ایک فلسفہ ہے نہ کہ علم اور فلسفہ کے معنی یہ ہیں کہ جو مسلمات ہمارے خیالات سے پیدا ہوتے ہیں انکی کنہ و فیہ پر بحث کی جائے اخلاق پر بحث کرتے وقت ہمارے سامنے یہ مسلمات مثلاً حقوق، فرائض، ارادۂ انسانی، خیر و شر، خطا و کرب پہلے سے موجود ہوتے ہیں، اور فلسفۂ اخلاق سوائے اس کے کہ ان مسلمات کو اپنی بحث میں ضبط کرے۔ ایک حد تک اس کی تشریح نہیں کرتا۔

یہ سوال کہ ضمیر انسانی میں کس وقت اور کس دور میں نیک و بد کے تمیز کرنے کی قابلیت پیدا ہوئی۔ وہ بھی اس کے فلسفیانہ بحث سے خارج ہے، اخلاق صرف ایسے مسائل سے بحث کرتا ہے جیسے انسان جب ایک کام کا ارادہ کرتا ہے تو اسکے دل پر خود بخود ایسے سوالات کیوں پیدا ہوتے ہیں، فلاں حالت میں ہمارا فعل عدل و انصاف کے متقاضی ہے یا نہیں یا فلاں شخص کی ناواقفیت سے فلاں کام کرنیکی ذمہ داری ما پر کہاں تک عائد ہوتی ہے، وغیرہ، یا ہم ان اشکال کو پورے طور سے سمجھنے کی کوشش کرنا جس کے بموجب ارادہ کو عمل کی صورت میں لایا جاتا ہے یا ایسے لوگوں کی شخصیت پر کلام کرنا جو عام طور سے اس کے معمول یا موثر ہوتے ہیں یا ان نتائج پر غور کرنا جو ان اعمال سے پیدا ہوں۔

فلاسفۂ متقدمین نے اخلاق کی بحث انسانی علم سے شروع کی ہے۔ اور متاخرین نے "قانون فطرت" سے۔ بقول گروٹیس ([illegible]) "قانون فطرت" الہامی یا خدائی قانون کا ایک حصہ ہے جسکا کام انسان کے جذبات فطری کی ترجمانی کرنا ہے اور فطرت انسانی کا یہ خاصہ ہے (جسکی وجہ سے اس کو دوسرے حیوانات سے امتیاز حاصل ہے) کہ وہ اپنے ہم جنس کے ساتھ سلامت روی سے رہنے کا خواہشمند ہو اور اس وجہ سے اسکا چند اصول پر کاربند ہونا ضروری ہے، چنانچہ قانون فطرت ایسا ناقابل تبدیل قانون فطرت ہے کہ خدا کی بھی طاقت اس کے تبدیل کرنیکی نہیں ہے (اسکا مقابلہ قرآنی آیت "فلن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا" سے کرو) اور اس کے اصول ویسے ہی

مستحکم ہیں جیسے ریاضی کے اصول۔ گوکہ بعض عواقب ونتائج کو مدنظر رکھتے ہوتے کسی خاص وقت وزمانہ میں اس کے بعض اصول منسوخ
کردئے جائیں مگر یہ احکام ناسخ بھی خدا ہی کے ہوسکتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ قانون ابدی وازلی خدا کی ذات کی طرح ہیں۔ اگرچہ بظاہر
طبیعت انسانی کے غیرمقبول ومعمول ہونے پر وحادث ہی "سمجھے جائیں" یہ خیال زیادہ تر متاخرین رومی قانون دانوں کے خیالات کا
پرتو ہیں۔ جنکے نزدیک قانون فطرت کے یہ معنی تھے کہ وہ دنیاوی قوانین کے اصل مبادی وبنیاد ہیں۔ اور دنیاوی قوانین کے ذریعہ سے انکا
پتہ لگ سکتا ہے جو شاید ایک وقت میں دنیاوی قوانین کی تفسیر سے مستغنی ہوجائیں۔ اور جب تک یہ صورت پیدا نہیں ہوتی وہ ایک ایسا
نمونہ ہیں جو دنیاوی شریعت کی رہبری کرتی ہیں۔ انسانی تاریخ کا ایک زمانہ ایسا بھی سمجھا جاتا ہے جب انسان صرف اس قانون فطرت
کا پابند تھا اور وہ زمانہ انسان کی تربیت کے پہلے کا ہے۔ شاید یہ وہی زمانہ ہو جسکو ہنود ست جگ کہتے ہیں اور پاسوڈئیس
(Posodeus) یونانی نے "زمانہ زرین" کے نام سے یاد کیا ہے یا بائبل نے اسکو آدم وباغ عدن سے تعبیر کیا ہے یعنی وہ زمانہ جب
انسان حالت طبعی میں علٰحدہ علٰحدہ اپنے بال بچوں کے ساتھ زندگی بسر کرتا تھا اور اسکی پابندیوں میں صرف اسقدر تھا کہ وہ ایک دوسرے کو گزند
نہ پہونچائیں۔ اور دنیا کی نعمتوں کے حاصل کرنے میں خلل انداز نہوں۔ یا اپنے والدین کا کہنا مانیں یا اپنے بیویوں سے حسن سلوک سے پیش آئیں
یہ ہے قانون فطرت کی تعریف جو گروٹیس نے کی ہے اور اسکی مدد سے ایک حد تک بین الاقوامی حقوق وفرائض کے معین کرنے میں کام لیا گیا
ہے کیونکہ اجتماعی حالت میں اقوام کے باہمی تعلقات قریب قریب وہی ہوتے ہیں جو دو خاندانوں یا دو انسانوں میں ہوتے ہیں۔ البتہ یہ فرض
نہیں کیا گیا کہ ان قوانین کے عمل پر انسان مجبور بھی تھا۔ کیونکہ حقوق انسانی کے پامالی پر جد وجہد وجنگ کا قائم ہونا بھی فطرتی تصور کیا گیا ہے
قانون فطرت کا یہ تصور کہ وہ صحیح الدماغی کا ایسا حتمی فیصلہ ہے جو ہے انسان کی طبائع عقلیہ اور مدنیہ پر حادی ہو۔ اس بنا پر یہ فرض کیا گیا ہے
کہ پابندی معاہدہ بھی اگر فطرت انسانی کا خاصہ نہیں ہے تو اسیر ابتدا سے اسکا معمول رہا ہے اور ان معاہدات کی پابندی کا نتیجہ یہ ہوا کہ
اشیائے عالم پر انسان کی ملکیت تسلیم کی جانے لگی۔ جو پہلی صورت یعنی جلب منفعت میں ایک دوسرے کی مخالفت نہ کرنے کا ایک ارتقائی
درجہ ہے اور یہ ہی ابتدائی معاہدہ سلطنت وحکمرانی کی بنیاد ہیں۔

گروٹیس کے ان نظریات پر لازمی طور سے یہ سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ کن وجوہات سے انسان قانون فطرت کی پابندی پر مجبور ہوا۔
انسان کہاں تک اور کس حیثیت سے مدنی الطبع کہلایا جاسکتا ہے۔ اور انسان کے طبائع عقلیہ ومدنیہ میں پابندی معاہدہ کے اوصاف کہاں
پیدا ہوتے ہیں۔

انسان کے جذبات فطری کا مدعا حفظ نفس ہے یا حظ نفس۔ عدم حفظ نفس یا عدم حظ نفس جو انسان اپنے لئے بلا ومصیبت وبدی
خیال کرتا ہے۔ اسیر جہاں تک اوسکی ذات کا تعلق ہے جان بوجھ کر انسان کبھی عامل نہیں ہوسکتا تاوقتیکہ ان بدیوں اور برائیوں کے اندر وہ
دنیا یا عاقبت میں اپنے حظ نفس یا حفظ نفس کے لئے انجام نیک نہ جانتا ہو۔ مطلب یہ ہوا کہ انسان پر جو برائیاں اور مصیبتیں آتی ہیں وہ اسکے
خیالات کا نتیجہ ہیں گویا علم ونیکی لازم وملزوم ہیں۔ انسان جتنا علم میں ترقی کرتا جائے گا اتنا ہی وہ نیکی سے قریب تر ہوجائے گا۔ بادی النظر
میں یہ کلیہ عجیب وغریب وخلاف واقعہ معلوم ہوگا، لیکن جب ہابس ([illegible]) کے نفسیات کے اصول سے اسکی تشریح کی جائیگی

تو یہ عقیدہ آسانی سے حل ہو جائے گا۔ ہابس کا قول ہے کہ انسان دوسرے انسان پر جو کچھ رحم و انصاف یا ہمدردی یا حسن سلوک سے پیش آتا ہے وہ درحقیقت صرف ایک دھوکا ہے خود اسکے حفظ نفس و حظ نفس کا جب تک انسان اپنا کوئی فائدہ مدنظر نہیں رکھتا، وہ دوسرے انسان کے ساتھ فطرتاً نیکی سے پیش نہیں آتا۔ رحم کیا ہے؟ بقول ہابس کے وہ دوسروں کی مصیبت و تکالیف کا رنج ہے جسکا محرک صرف وہی خیال ہے کہ کہیں ہمکو بھی اسی رنج و مصیبت سے دوچار ہونا نہ پڑے۔ ہم دوسروں کے ساتھ نیکی اور انصاف اسی امید پر کرتے ہیں کہ وہ ہمارے ساتھ نیکی و انصاف سے پیش آئے گا اس لئے اگر ہم یہ سوال کریں کہ دوسروں سے نیک برتاؤ کی ضرورت کیا ہے تو اسکا جواب یہ ہے کہ درحقیقت وہ ہمارے خود حفظ نفس و حظ نفس کا ایک قرض حسنہ ہے جو ہم دوسروں کو دے رہے ہیں۔ مگر یہ تخیل انسان میں فطرتاً پیدا نہیں ہوتا اور فوری جلب منفعت کا خیال اس پر اس درجہ غالب آجاتا ہے کہ ایک شخص دوسرے انسان سے برائی کرنے میں فوراً آمادہ ہو جاتا ہے۔ گو معمولی اصول اخلاق انسان کے عمل پر منحصر ہوئے نہ کہ اسکی طبیعت پر۔

ہابس نے الحاد و مادہ پرستی میں اخلاق انسانی کو جانچا ہے۔ اور اس لئے جب انسانی جذبات کی بے اعتدالی کے اندر اپنے اس کلیہ کو وہ پوری طرح حل نہ کر سکا تو اس نے آخر کار حکومت و سیاست کو ایک ازلی ذریعہ مانا ہے۔ جو انسان کو نیک عمل پر مجبور کر سکتا ہے۔ مثلاً ایک انسان اپنے کو مجبور نہیں پاتا کہ وہ خواہ مخواہ اپنی ذات سے اتمہد کی تکمیل کرے تاوقتیکہ اسکو یہ اطمینان نہ دلایا جائے کہ فریق ثانی بھی اپنے حصے کی تعمیل کرتا ہے۔ اور یہ اطمینان اسوقت تک میسر نہیں آسکتا ہے جب تک سوسائٹی ایسا نہ کرنے والوں کو اسباب دنیاوی سے مجبور نہ کر سکے پس ایک ایسی علم و قوت کی ضرورت ہوئی جو جماعت کی قوت و ذرائع کو ان احکام کی فرمانبرداری پر مجبور کرائے جو امن و امان کے لئے ضروری ہے اور یہ مبادیات حکومت و سلطنت ہیں مگر حکومت کی تشکیل سے پہلے اخلاق کو انسان نے کس طرح برتا یا دوسرے معنوں میں جب حکومت نہ تھی تو ان احکام پر انسان نے کیسے عمل کیا۔ مجھے ہابس کے قول سے یہاں تک تو اتفاق ہے کہ مذہب نے بھی عقاب و ثواب کی صورت دیکر جب تک انسان کو عاقبت میں اپنے حظ نفس یا حفظ نفس کا اطمینان نہیں دلایا۔ اس نے انسان کو یہ تعلیم نہیں دی کہ فلاں کام کیوں نہ کرو اور فلاں کام کیوں کرو گویا کہ جب تک انسان کو اپنا فائدہ نظر نہیں آتا خواہ دنیاوی ہو خواہ اُخروی وہ نیکی کیطرف رجوع نہیں ہوتا۔ مگر اس کے ساتھ یہ بھی کہونگا کہ تمام اعمال نیک کی محرک انسانی خود غرضی کو کہنا انسان کی ایک قسم کی توہین ہے فلاسفر لاک ([illegible]) نے بھی اگرچہ ہابس کے اس قول کی تائید کی ہے کہ انسان کے عاقلانہ برتاؤ کی بنیاد خود غرضی ہے اور نیکی و بدی دراصل خود اس کے اپنے نفس کے کرب کے مرادف ہیں وہ ہابس کے مخالفین کا ہم نوا بھی ہے کہ احکام اخلاقی کی بجا آوری پر تمیز انسانی جماعت سیاسی کے باہر بھی مجبور ہے اور ادراک انسانی خود بخود اصول اخلاق کو اپنے عقل کی مدد سے مستنبط کر سکتی ہے گو کہ ہم اس تمیز کو فطری نہ کہیں، لاک کے نزدیک انکی وہ احکام خداوندی ہیں جو عام قوانین معاملات و معاشرت سے فائق و برتر ہیں، اور ایک ایسا معیار ہیں جس کی وجہ سے ایک شخص پر مستوجب سزا و جزا ہونیکا حکم لگا سکتے ہیں، اور از بسکہ یہ احکام خداوندی ں میں سزا و جزا کی پوری تشریح ہے۔ لاک کا یہ مطلب نہیں ہے کہ احکام خداوندی کسی ترتیب یا عالمانہ پیرائے میں کسی کتاب کے اندر درج ہیں۔ جو کچھ وہ کہتا ہے وہ یہ ہے کہ انکا وجود ضرور ہے اور اس کا نہایت شد و مد سے قائل ہے۔ اسکا قول ہے کہ یہ خیال کہ ایک برتر ذات جس میں عقل و خیر و اختیار کی انتہائی صفات ہیں اور جسکے ہم قائل

ہیں اور جسپر ہم بھروسہ رکھتے ہیں صحیح ہے، تو ہمارے فرائض و اعمال کی ایسی بنیاد پیدا ہو جاتی ہے جو علم اخلاق کو قابل بحث و تمحیص کر دیتے ہیں علاوہ اخلاق کی نیکی و بدی کے معیار کے لئے ویسی ہی قابل یقین مسلمات و مفروضات پیدا ہو سکتے ہیں جیسے ریاضی میں، لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ لاک کی مراد خدا کی نیکیوں سے کیا ہے، اگر اس کے معنی سوائے اس کے کچھ نہیں ہے کہ وہ ایسی ذات ہے جس سے لوگوں کو فائدہ یا حظ حاصل ہوتا ہے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ نیک عمل کا آخری معیار وہی سمجھا جائے گا کہ اخلاق کے معنی ان اعمال کے ہیں جنسے لوگوں کو خوشی و فائدہ حاصل ہو۔ مگر لاک نے نیکی کا یہ معیار نہیں مانا ہے اور نہ اسنے نیکی کی کوئی مثال دی ہے۔ اس نے جو چند اخلاقی حقائق و مسلمات بیان کئے ہیں وہ مبہم سے ہیں یا اس قسم کے معمولی موضوعات ہیں کہ مثلاً کوئی سلطنت انسان کو پوری آزادی نہیں دیسکتی، یا ظلم و ناانصافی کا سوال اسوقت پیدا ہوگا جب ملکیت تسلیم کیجائیگی۔

کلارک (Clarke) اصول اخلاق کو خدا یا انسان کے مستبدانہ احکام کے ماتحت نہیں خیال کرتا لیکن لاک کی طرح وہ بھی معترف ہے کہ اخلاق کے اصول بھی ریاضی کے اصول کی طرح چند بدیہات و مسلمات پر مبنی ہیں۔ تقویٰ (Piety) رحم و انصاف (Righteousness) وطہارت (Soberness) اخلاق کے تین صفات اساسی ہیں، تقویٰ خدا کے لئے، انصاف و رحم مخلوقات کے لئے، طہارت اپنے حفظ نفس کے لئے۔ پہلی صفت انسان میں اسوقت پیدا ہوتی ہے جب بقول لاک بندہ اپنی ذات کو اس ذات برتر سے جو انتہائے خیر و عقل ہے اور جسپر اوسکا بھروسہ ہے مقابلہ میں لاتا ہے۔ دوسری صفت انسان کی اس خواہش سے پیدا ہوتی ہے کہ جس طرح ہم انسان ہیں اوسی طرح دوسرے انسان بھی ہیں اور جس طرح ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے ساتھ انصاف کیا جائے دوسرے بھی ویسا ہی چاہتے ہیں، یا رحم کے متعلق یہ اصول کہ جسقدر نیکیاں دوسروں کے ساتھ کی جائیں اتنی ہی وہ بھی ہمارے ساتھ بھلائی کریگا۔ ایک ایسی صریحی و بدیہی بات ہے جو معمولی عقل کا انسان بھی سمجھ سکتا ہے۔ اور تیسری صفت تو اس اصول کے ماتحت ہے کہ کوئی شخص جس کے دماغ ہے اور دماغ کے اندر عقل ہے وہ اپنے نفس کے ساتھ کبھی برائی روا نہیں رکھ سکتا ہے۔ مگر کلارک کا یہ منشا نہیں ہے کہ جو چیز نیک ہے اسپر ہم عمل کرنے کیلئے مجبور ہیں خواہ اس عمل سے ہمارا مقصود حظ نفس یا حفظ نفس ہو یا نہ ہو کیونکہ اسکا یہ بھی قول ہے کہ انسان بسا اوقات اپنی بے عقلی سے جذبات کی بے اعتدالی سے مغلوب ہو جاتا ہے، اگر کلارک کا یہ قول صحیح مانا جائے کہ انسانی فطرت کا خاصہ نیکی پر معمول ہونے کے لئے حفظ نفس و حظ نفس کے مقصد سے مستغنی ہو۔ تو یہ سکہ اسوقت بالکل بدل جاتا ہے جبکہ ایک بدکار اپنی بدکاریوں سے وقتی حظ و فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ اور ایک نیک انسان باوجود عمل خیر کے مصیبت و پریشانی میں رہتا ہے اور یہ بات قابل قبول نہیں کہ ایک شخص باوجود اپنی جان کے خطروں میں پڑنے اور بظاہر اپنی نیکیوں سے کوئی فائدہ نہ اٹھانے کے نیکیوں پر عمل پیرا ہو، غرض کہ اخلاق کو مذہب سے علیحدہ رکھکر محض فلسفہ کی مدد سے سمجھنا ایسا ہی مشکل ہے جیسا الٰہیات، و تکوین و معاد و تقدیر۔

مل (Mill) نے کہا ہے کہ اگر کسی الہامی مذہب کی تعلیم اخلاقی بری اور راستہ سے دور ہے تو خواہ کسی کی طرف سے ہو ہم پر اسکا ترک کر دینا فرض ہے۔ کیونکہ ایسی تعلیم کسی حکیم و خبیر ہستی کی طرف سے نہیں ہو سکتی۔ لیکن اخلاق کی عمدگی ہم کو مستحق نہیں کرتی کہ خواہ مخواہ اسے کسی فوق العادۃ سرچشمہ کی طرف منسوب کریں، کیونکہ اس امر کی کوئی دلیل قوی موجود نہیں کہ جس خوبی کے سمجھنے کی

قابلیت انسان میں موجود ہے اس خوبی کو دریافت کرنے کی قابلیت اس میں موجود ہو۔ مل کے اس قول سے دو تنقیح طلب مسئلے پیدا ہوتے ہیں۔ اول یہ کہ آیا مذہب کے لئے ضروری ہے کہ اس میں اخلاقی تعلیم ہو، دوم یہ کہ آیا اخلاقی تعلیم مذہب کے باہر بھی ممکن ہے۔ ان مسائل پر غور کرنے سے پہلے ہم کو موجودہ مذاہب الہامی میں اخلاق کی تعلیم دریافت کرنا چاہیئے۔ اور اس کے بعد اسکا خود اپنی ادراک اخلاقی سے موازنہ کرنا ہوگا۔ بعد میں ہم یہ حکم لگا سکتے ہیں کہ آیا اس قسم کی اخلاقی تعلیم الہام سے باہر بھی دیجا سکتی ہے۔

ہم یہاں پر ان کتب الہامیہ کی طرف اپنی توجہ منعطف کرینگے جن کو عام طور سے ہم مسلمان مانتے ہیں۔ یعنی یہود و نصاریٰ و اسلام کی کتب سماوی۔ ہنود، بودھ، و مجوسی کے متعلق ہم کو شبہ ہے کہ آیا ان کی تعلیم الہامی کہی جاسکتی ہے یا نہیں۔ کیونکہ مذہب کا اساس الٰہیات و حشر و نشر ہے اور وہ ان تینوں مذاہب میں تقریباً مفقود و معدوم ہے۔ اور مذہب کے اندر الٰہیات تسبیح کے ڈورے کی طرح ہے۔ جس کے نہ ہونے پر تمام دوسری باتیں منتشر ہوکر اور بکھر کر اوہام میں الجھ جاتی ہیں۔ ہمارا یہ مقصود نہیں کہ ان مذاہب میں کوئی بات الہامی موجود ہی نہیں۔ مگر وہ اوہام کی تاریکی میں اسقدر جذب ہیں کہ انکی تفتیش سعی لاحاصل سے کم نہیں یا بھُس کے ڈھیر میں دانہ گندم کا فراہم کرنا اور اس کے لئے نہ ہمارے پاس وقت ہے اور نہ ہم نے اس کی مداومت کی ہے۔ بائبل بھی ایک حد تک اوہام میں ڈوبی ہوئی ہے مگر نہ اسقدر جیسی کہ دوسری کتابیں۔

توریت کے اخلاقی احکام اول تو وہ احکام عشرہ ہیں جو جناب باری نے حضرت موسےٰ علیہ السلام کو کوہ سینا پر تعلیم کئے تھے گو کہ وہ عام طور سے اسقدر مشہور ہیں۔ کہ انکے لئے محض احکام عشرہ کا نام لے دینا کافی ہوگا مگر تاہم ہم اسکا ضروری حصہ جس کا تعلق اخلاق سے ہے یہاں نقل کرتے ہیں۔ (دیکھو کتاب خروج باب بستم)

۱۔ اپنے والدین کی عزت کر تاکہ دنیا میں تیری عمر دراز ہو۔
۲۔ قتل نہ کر
۳۔ زنا نہ کر۔
۴۔ چوری نہ کر۔
۵۔ دوسروں پر جھوٹی شہادت نہ دے۔
۶۔ اپنے ہمسایہ کی عورت و مال کا لالچ نہ کر۔

انجیل کی اخلاقی تعلیم وہ ہے جو جناب مسیح علیہ السلام نے اپنے "وعظ کوہ میں دی تھی" اور جسکا خلاصہ حسب ذیل ہے (دیکھو انجیل متی کا باب ۵ و ۶)

"پچھلوں نے کہا ہے کہ تو قتل نہ کر اور جو قتل کریگا مستوجب سزا ہوگا۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ جو شخص اپنے بھائی سے بیجا غصہ کریگا وہ مستوجب سزا ہوگا۔ اور جو اپنے بھائی کو برا کہے گا وہ سپرد جماعت محاکمہ کریگی۔ اور جو اپنے بھائی کو احمق کہے گا وہ مستوجب نار جہنم ہوگا اور اگر تو اسوقت قربان گاہ پر کوئی قربانی چڑھا رہا ہو اور تجھے معلوم ہو کہ تیرا ایک بھائی تجھ سے ناراض ہے تو اپنی قربانی کو وہیں چھوڑ اور پہلے جاکر اپنے بھائی کو منا اور پھر آکر اپنی قربانی چڑھا۔ اپنے دشمن سے جلد صلح کرلے ایسا نہ ہو کہ دشمن تجھے قاضی کے سپرد کردے اور قاضی تجھے سپاہی اور سپاہی

تجھے محبس میں ڈالدے، اور دہاں سے تو اسوقت تک نہ نکلے جب تک تو آخری پائی ادا نہ کر چکے

پچھلوں سے سنا ہوگا کہ زنا مت کر۔ اور میں کہتا ہوں کہ تو عورت کی طرف شہوت کی نگاہ سے بھی دیکھے گا تو تو اپنے دل میں اس کے ساتھ زنا کر چکا۔ اور اگر تیری داہنی آنکھ تجھے برائی کی طرف بجائے تو اسکو نکالکر پھینک دے۔ بہتر ہے کہ تو کانا رہے اس سے کہ تیرا سارا جسم اس کی وجہ سے جہنم میں جائے، اور اگر تیرا داہنا ہاتھ برائی کرے تو اسکو کاٹ ڈال۔ یہ بہتر ہے کہ تو ایک ہاتھ کا رہے بہ نسبت اس کے کہ تیرا سارا بدن جہنم میں ڈالا جائے۔ کیا کہا ہے کہ جو شخص اپنی عورت کو طلاق دے وہ اسکو طلاقنامہ لکھ کر دیدے۔ اور میں کہتا ہوں کہ جو شخص سوائے زنا کی علت کے اپنی عورت کو طلاق دیتا ہے اور دوسری عورت سے نکاح کرتا ہے، وہ زنا کرتا ہے اور جو مطلقہ عورت سے نکاح کرتا ہے وہ زنا کرتا ہے۔

پچھلوں نے کہا کہ سوائے خدا کے کسی کی قسم نہ کھا۔ اور میں کہتا ہوں کہ تو قسم ہی نہ کھا۔ نہ آسمان کی نہ عرش کی نہ کرسی اور نہ زمین کی اور نہ اور شلیم کی اور نہ اپنے سر کی۔ پس تیرا کلام ہاں ہاں نہیں نہیں ہو۔

تم سنا ہوگا کہ آنکھ کے بدلے آنکھ، کان کے بدلے کان، دانت کے بدلے دانت۔ مگر میں تجھ سے کہتا ہوں کہ بدی کا کوئی جواب نہ دو اگر تیرے داہنے گال پر کوئی طپانچہ مارے تو بایاں گال بھی اس کی طرف پھیر دے اور جو شخص تیرا لبادہ چھینے تو اسکو چادر بھی دیدے اور جو تجھ سے ایک میل کے چلنے کو کہے تو اس کے ساتھ دو میل جا۔

تم نے سنا ہوگا کہ اپنے ہمسایہ سے محبت کر اور اپنے دشمن سے نفرت، اور میں کہتا ہوں کہ اپنے دشمن کو دوست رکھ اور جو تیرے ساتھ برتر کہ جبر برائی کرے اوس کے ساتھ نیکی کر۔ اگر تم نے انہیں لوگوں سے محبت کی جو تجھ سے محبت رکھتے ہیں تو کیا کمال کیا، یہ تو محصول لینے والے بھی جاہتے کرتے ہیں۔"

صریحی قرآن کے احکام اخلاقی جو آنحضرت کو شب معراج میں تعلیم دئے گئے تھے وہ سورۂ معراج میں بھی صراحت کے ساتھ ایک جگہ دئے گئے دلملغ۔ ہیں اس کے علاوہ بعض دوسرے اخلاقی و معاشرتی احکام اور دوسرے سورہ میں پائے جاتے ہیں۔ سورۂ معراج یا اسریٰ کے احکام اخلاقی کا اسیر ہم ترجمہ حسب ذیل ہے:۔

اپنی بے "اور تمہارے پروردگار نے تم کو حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا اور اپنے والدین کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنا اور اگر ہونے۔ والدین میں کا ایک یا دونوں تیرے سامنے بڑھاپے کو پہونچیں تو انکے آگے ہوں بھی نہ کرنا۔ اور نہ انکو جھڑکنا اور انسے کچھ کہنا تو ادب کے ساتھ کہنا اور اٹھا۔ کہ محبت سے خاکساری کا پہلو انکے آگے جھکاتے رہنا اور ان کے حق میں دعا کرتے رہنا کہ اے میرے پروردگار جس طرح انہوں نے مجھے بچپن سے اپنی۔ پالا ہے اور میرے اوپر رحم کیا ہے اوسی طرح تو بھی ان پر اپنا رحم کیجئو، اور رشتہ دار اور غریب اور مسافر ہر ایک کو اسکا حق پہونچاتے رہو اور دولت کو ارکھکر بیجا مت اڑاؤ کیونکہ بیجا اڑانے والے شیطانوں کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے پروردگار کا بڑا ناشکر ہے، اور اگر تم کو اپنے پروردگار کے فضل کے انتظار میں جس کی تم کو توقع ہو، بہ مجبوری ان غربا سے منھ پھیرنا پڑے تو نرمی سے انکو سمجھادو۔ اور اپنا ہاتھ نہ تو اتنا سکیڑو کہ گویا گردن میں بندھا ہوا ہے، اور نہ بالکل اسکو پھیلا ہی دو ایسا کروگے تو تم ایسا ہی بیٹھے رہ جاؤ گے کہ لوگ تمہیں ملامت بھی کریں گے اور تم تہی دست بھی ہوگے، اور کہ خواہ

افلاس کے ڈر سے اپنی اولاد کو قتل نہ کرنا۔ ان کو اور تم کو ہم ہی روزی دیتے ہیں۔ اولاد کا جان سے مارنا بڑا بھاری گناہ ہے، اور زنا سے دور رہنا کیونکہ وہ بے حیائی ہے اور برا چلن ہے۔ اور کسی جان کو جسکا مارنا اللہ نے حرام کر دیا ہے ناحق قتل نہ کرنا اور جو شخص ظلم سے مارا جائے تو ہم نے اس کے ولی کو قصاص کا اختیار دیا ہے، تو اسکو چاہیئے کہ خون کے بدلہ لینے میں زیادتی نہ کرے، کیونکہ واجبی بدلہ لینے میں اس کی جیت ہے، اور جب تک یتیم اپنی جوانی کو نہ پہونچ لیں انکے مال کے پاس بھی نہ جانا، اور عہد کو پورا کیا کرو کیونکہ قیامت میں عہد کی باز پرس ہوگی اور جب ناپ کر دو تو پیمانہ کو پورا بھر دیا کرو، اور تول کر دینا ہو تو ڈنڈی سیدھی رکھ کر تولا کرو، یہ بہتر طریقہ ہے اور اسکا انجام بھی اچھا ہے، اور جس بات کا تجھے علم نہیں اس کے پیچھے نہ ہو لیا کر، اور زمین پر اکڑ کر مت چل کیونکہ تو زمین کو نہ تو پھاڑ سکے گا اور نہ پہاڑوں کی لمبائی کو پہونچ سکے گا۔"

یہ ہے مختصر نمونہ اس تعلیم اخلاق کا جو اسلام نے دی ہے، اس نمونہ کو سامنے رکھ کر اگر ہم خیر و شر کا تجزیہ کریں تو ہم کو کوئی بڑی دقت واقع نہ ہوگی۔ سب سے پہلے ہم جذبات انسانی کو تین شاخوں میں تقسیم کریں گے۔ اول غضب، دوم شہوت، سوم ارادہ، پھر ان تین جذبات کے اندر انسانی اخلاق کی تشریح کا جہاں تک ہو سکے گا، اور جہاں تک مذہب کی مدد سے ہم خیر و شر کی تمیز کر سکتے ہیں ایک نقشہ حسب ذیل مرتب کر سکتے ہیں۔ ہم نے اس ترتیب میں قرآنی اخلاق کو اپنا نمونہ قرار دیا ہے، جو تھوڑے اختلاف کے ساتھ تقریباً تمام الہامی اخلاق کی طرح ہے۔ جہاں پر دوسرے مذاہب نے بعض رذائل کو فضائل یا فضائل کو رذائل کا درجہ دیا ہے۔ اسپر میں نے نشان بنا دیا ہے۔

غضب (حفظ نفس)

رذائل	فضائل
۱۔ فتنہ و قتل۔	۱۔ مقاومت و جہاد و سیاست۔ ※
۲۔ کبر و نخوت	۲۔ فروتنی و عاجزی۔
۳۔ غیبت، و بد کلامی۔	۳۔ صبر و خاموشی۔
۴۔ انتقام، و تعصب۔	۴۔ عفو و انصاف۔
۵۔ ظلم و ایذا رسانی	۵۔ راحت رسانی و مروّت۔
۶۔ غدر و بغاوت۔	۶۔ اطاعت (حاکم و والدین)
۷۔ بزدلی ※	۷۔ شجاعت۔ ※

شہوت (حفظ نفس)

رذائل	فضائل
۱۔ زنا و رہبانیت۔ ※	۱۔ نکاح و حسن معاشرت۔

رذائل	فضائل
۲۔ غبن وچوری	۲۔ جود وسخا۔
۳۔ سود و قماربازی۔ ٭	۳۔ کسب وتجارت۔
۴۔ شراب خواری وحرام خوری)۔ ٭	۴۔ قناعت۔
۵۔ پلیدی نفس کشی۔ ٭	۵۔ طہارت وتن آسانی ٭
۶۔ ریاکاری	۶۔ اظہار حق۔
۷۔ بےحیائی	۷۔ حیا وشرم

ارادہ یا ادراک

رذائل	فضائل
۱۔ جھوٹ۔	۱۔ سچ۔
۲۔ بغض	۲۔ ہمدردی ورحم۔
۳۔ حسد	۳۔ رشک
۴۔ نفرت	۴۔ محبت
۵۔ کفر	۵۔ ایمان
۶۔ جہل	۶۔ علم
۷۔ تملق	۷۔ توکل

مگر ایک کام کو نیک اور ایک کو برا کہنے کا معیار الہام نے کیا مقرر کیا ہے۔

اگر برائی کا معیار یہ ہے کہ وہ ایک ایسا فعل ہے جو اپنے ایک ہم جنس کو تکلیف پہونچائے یا معدوم کردے تو بعض اعمال جو یقیناً برے ہیں ان میں بظاہر یہ معیار قایم نہیں رہ سکتا۔ مثلاً زناکاری۔ اگرچہ آگے چلکر ان کے عواقب میں یہ بات پیدا ہوجائے۔

ہم نے پہلے باب میں اسکا اشارہ کیا تھا کہ جذبات فطری جو خدا نے انسان میں ودیعت کئے ہیں۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ انسان آپس میں لڑکر تباہ نہ ہوجائیں اور اس کارخانہ قدرت کو ستیاناس نہ کردیں۔ گویا برائیاں دراصل ایک ایسا فعل ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ مخلوقات معدوم ہوجائیں۔

پروفیسر محمود علی نے اپنی کتاب دین ودانش میں وحدت شہود والوں کی طرف سے ان خیالات کو اس طرح پیش کیا ہے (دیکھو کتاب دین ودانش، ہر صفحہ ۲۸۶)

"بدی موجود ہونے کا سبب تلاش کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس بدی کو جس کا ہونا معیوب خیال کیا جاتا ہے۔ ان کے

نیچر کو دیکھا جائے۔ چنانچہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک بدی کے نیچر میں داخل ہے کہ وہ کسی چیز کو عدم کی طرف لے جانے کی کوشش کرتی ہے اگر زہر انسان کو مارتا ہے یا ایک انسان دوسرے انسان کو قتل کرتا ہے تو ظاہر ہے کہ وہ اپنی طاقت کے موافق اس کو عدم کی طرف لے جاتا ہے اور اگر کوئی شخص کسی کی عزت پر حملہ کرتا ہے یا دوسرے کے مال کو غبن کرتا ہے تو اگرچہ ظاہر میں وہ کسی چیز کو عدم کی طرف نہیں لیجاتا مگر ان چیزوں کو انکی مناسب جگہ سے ضرور معدوم کرتا ہے اور نیز اکثر حالات میں عزت کو دور کرنا یا مال چرانا انسان کو عدم کیطرف لیجانے کا باعث ہوتا ہے اور اسکے علاوہ جسقدر روحانی یا جسمانی برائیاں انسان میں موجود ہیں ان سب میں کم و بیش کسی چیز یا کسی حالت کو معدوم کرنا پایا جاتا ہے۔ اگر اپنے اگر اپنے جرم کو چھپانے کے لئے مکر و فریب کیا جاتا ہے تب بھی اس نتیجہ کو معدوم کرنا مقصود ہوتا ہے اور علی ہذا اگر جسم میں کوئی برائی یا عیب یا مرض موجود ہے تو بھی کسی ایسے عضو یا ایسے وصف کا معدوم ہونا ہے جو جسم کے لئے ضروری یا کم از کم شان پیدا کرنے کا باعث ہے اور یہی حال تمام ان برائیوں کا ہے جو حیوانات میں پائی جاتی ہیں کہ سب انکو عدم کی طرف لے جاتی ہیں۔ اور انسان میں تو پھر بھی بعض برائیاں ظاہر میں کسی چیز کو عدم کی طرف لے جاتی ہوئی نظر نہیں آتیں۔ مگر حیوانوں میں اتنا پردہ بھی نہیں اور وہ سب براہ راست دوسرے کو معدوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور مل کے یہ الفاظ بالکل درست ہیں کہ حیوانات کا بہت بڑا حصہ دوسرے حیوانات کو پھاڑنے اور نگلنے پر زندگی بسر کرتا ہے اور یہ بڑا حصہ بھی بڑے حیوانات میں پایا جاتا ہے جو دوسرے حیوانات سے ترقی یافتہ ہیں اور جن میں سے اکثر انسان سے مانوس ہو سکتے ہیں ورنہ چھوٹے درجہ کے حیوانات یا نگلنے والے یا نگل جانے والے" اور نیز وہ ان ہزار ہا برائیوں کا شکار ہیں جنکے سبب سے وہ اپنی حفاظت کے اسباب سے محروم ہو جاتے ہیں"

غرض یہ ہیں وہ برائیاں جن کے سبب کی تلاش ہے اور یہ ہے انکی نیچر کہ وہ سب عدم کیطرف لیجانے کی کوشش کرتے ہیں، مگر ابھی نیچر کی برائیاں شمار کرنے میں کوتاہی ہوئی ہے کیونکہ حیوانات کے نیچے کے درجوں میں بھی بہت سے عیوب موجود ہیں، مثلاً حیوانات کے نیچے نباتات ہیں اب اگر صرف نباتات ہی مدار زندگی ہوتے تو پیدا کرنے والا صرف چند ابتدائی کیڑوں پتنگوں ہی کو پیدا کرتا جو نباتات پر بسر کر سکتے ہیں اور یہ جانوروں کا لاتعداد سلسلہ جن میں ایک کی زندگی بہت کچھ دوسرے جانوروں پر منحصر ہے ہرگز وجود میں نہ آتا اور اگرچہ ظاہر میں بہت سے بڑے حیوانات بھی صرف نباتات پر گزر کرتے ہیں مگر علمی تحقیقات ثابت کرتی ہے کہ تنفس اور بدنی مسامات کے ذریعہ سے بلکہ پانی کے ہر گھونٹ میں یہ جانور بے شمار مخلوق کو ہضم کرتے ہیں۔ اس لئے نباتات میں جو دولت ہے اسی کو موجود مانکر سوا چند پتنگوں کے اور سب جاندار شروع ہیں۔ یہ تو نباتات کا وہ بڑا نقص ہے کہ وہ اپنے نیچر سے تمام جانداروں کو معدوم رکھنا چاہتی ہے۔ اور اس کے علاوہ بہت سے زہریلے مادہ بھی ان میں ایسے ہیں کہ جانداروں کو بہت کچھ نقصان پہونچاتے ہیں اور بعض وقت ان کی سمیت سے بڑی بڑی تباہیاں وجود میں آتی ہیں۔ اور ان سے اتر کر معدنیات اور گیس وغیرہ عناصر کا درجہ ہے اور اگر صرف انہیں پر مدار ہوتا تو کیڑوں پتنگوں سمیت تمام جاندار مخلوق کا خاتمہ تھا اور صرف معدنیات کی وساطت سے دنیا محض نباتات کا جنگل ہوتا اور جو زندگی کی برکت اب ہے وہ تختۂ زمین پر نظر نہ آتی اور جس قدر گیس وغیرہ کے پھٹنے اور معدنیات کی سمیت کے جوش مارنے سے جانداروں کا اور نباتات کا نقصان ہوتا ہے وہ اس کے علاوہ ہے۔ اس سے اتر کر زمین اور اس سے اتر کر آفتاب کا درجہ ہے اور ظاہر ہے کہ اگر زیست کا انحصار صرف انہی پر ہوتا

تو مادہ نہایت ہی ابتدائی اور سادہ شکل میں رہتا اور یہ انواع و اقسام کی شکلیں اور طرح طرح کی زیب و زینت عالم میں نظر آتی اور
اس نقص کے علاوہ ان کے دیگر نقصانوں کا یہ عالم ہے کہ آفتاب کا ادنیٰ طوفان اور زمین کا ایک آتش فشاں پہاڑ تھوڑی دیر میں وہ بدی
ظاہر کرتا ہے جو کوئی انسان یا حیوان ہزار برس میں بھی نہیں کر سکتا۔ آفتاب سے پرے ہمارا تجربہ چل نہیں سکتا لیکن اتنا قیاس ضرور ہو سکتا ہے
کہ جو درجات اس سے پہلے ہوں گے اگر صرف انہیں پر مدار ہوتا تو مادہ اور بھی سادہ اور ابتدائی شکل میں رہتا اور دنیا میں جو کچھ ہوتا وہ ہونے
کے برابر ہوتا اور علی ہذا ان درجات کے طوفان بھی اور ہوں گے وہ آفتاب اور زمین کے طوفانوں سے زیادہ تباہی بخش ہوں گے۔ یہ ہی مجموعہ
ان برائیوں کا جو نیچر میں موجود ہیں اور شمار کرنے والوں نے محض ان ہی برائیوں کو گنا ہے جن میں ایک جاندار دوسرے جاندار کو مار دیتا ہے
حالانکہ جیسا جاندار کو مارنا اوسکی زندگی معدوم کرنا ہے اسی طرح نباتات کو کھانا اور جلانا بھی انکی اپنی ہستی کو معدوم کرنا ہے اور اس لئے
دونوں برے ہوئے۔ اور اسی طرح کسی کو معدوم رکھنا اور ہستی کی نعمت سے بہرہ یاب ہونے دینا بھی اس سے زیادہ برا ہے اور اس سے کسی کو
انکار نہیں ہو سکتا البتہ بولنے میں اصطلاح کا فرق ہے۔ زندگی معدوم کرنے کے وقت کہا جاتا ہے کہ اس نے برا کیا اور زندگی سے محروم رکھنے
کا خیال کرنے پر کہا جاتا ہے کہ اس کا نقص ہے اور دونوں حالتوں میں مشترک طور پر کہہ سکتے ہیں کہ جاندار کو مار کر زندگی بسر کرنا بھی عیب ہے
اور جانداروں کو پیدا کرنے کی قابلیت نہ رکھنا بھی عیب ہے۔ غرض نیچر دونوں کی ایک ہے اور اس لئے اعتراض کرنے والا کہہ سکتا ہے کہ دنیا
اول سے آخر تک برائیوں اور عیبوں کا مجموعہ ہے۔

مگر اس کے ساتھ اتنا اور بھی کہنا چاہئے کہ مادہ کی تمام شکلوں کو دیکھتے ہوئے جسقدر ابتدا کی طرف چلے جاؤ برائی اور عیوب زیادہ ہوتے
جاتے ہیں اور جس قدر انجام کی طرف آؤ بدی کے درجہ میں کمی آتی جائے گی اور نیکی یا فائدہ بڑھتا جائے گا۔ آفتاب اگر اکیلا ہوتا تو مادہ
نہایت ہی سادہ شکل میں رہتا اور جاندار اور دیگر مخلوق پیدا نہ ہوتی۔ مادہ کو کسی نہ کسی شکل میں موجود رکھنا اسکا فائدہ ہے اور دیگر اعلیٰ اشکال
کو پیدا نہ ہونے دینا نقص۔ مگر زمین پیدا ہونے پر نقص کم ہو گیا اور فائدہ بڑھ گیا، کیونکہ اب مادہ کو اور بھی چند پہلے سے مکمل تر شکلوں میں
آنے کا موقع ملا۔ علی ہذا جمادات، حیوانات اور نباتات کے پیدا ہونے پر نقص کی کمی اور فائدہ کی زیادتی درجہ بدرجہ اور نمایاں ہوتی گئی کہ
دنیا آبادی کے قریب ہوتی گئی اور پہلا سا لق و دق میدان نہ رہا، ان کے بعد بڑے حیوانات کے پیدا ہونے سے نقص میں اور بھی کمی ہو گئی
کہ ان میں سے بعض مانوس ہو کر دوسری مخلوق کو خوراک کے علاوہ اور فائدہ بھی پہنچا سکے اور انہی کی وساطت سے مادہ نے آگے ترقی کی
اور زیادہ لطیف شکلیں وجود میں آئیں۔ ان کے بعد انسان پیدا ہوا تو وہ اگر کسی قدر جانداروں کو مارتا ہے تو کچھ جانداروں کی پرورش بھی
کرتا ہے اور نیز مانوس حیوان اگر مجبور ہو کر کام دیتے ہیں تو یہ اپنی خوشی سے بھی اپنے ہم جنسوں اور دیگر مخلوقات کے کام کرنے لگا اور نیز
حیوان براہ راست معدوم کرنے کی کوشش کرتے تھے اور انسان کچھ کوشش براہ راست معدوم کرنے کی کرتا ہے تو بعض کوششوں
میں صرف عزت یا مال چھیننے ہی پر قناعت کرتا ہے اور اس طرح بالکل معدوم کرنے سے اپنے تئیں کسی قدر دور رکھتا ہے اور پھر اس نے
تہذیب میں ترقی کی تو جو برائیاں وحشی انسان کرتے تھے ان میں سے اکثر کو چھوڑتا گیا اور ہمدردی اور فائدہ رسانی میں بڑھتا گیا اور مہذب
انسانوں سے بڑھکر وہ انسان ہے جو تہذیب کے ساتھ ایمان بھی رکھتے ہیں۔ کیونکہ مہذب انسان جب تک بانداز ہو صرف انہیں برائیوں سے

گریز کرتا ہے جو اس زندگی میں نقصان پہونچائیں اور وہی ہمدردی کرتا ہے جو اس دنیا میں مفید ہو۔ لیکن ایماندار انسان لوگوں کو ان برائیوں سے بھی بچاتا ہے جو آیندہ زیست میں اثر کریں اور اس ہمدردی کو بھی اپنا فرض سمجھتا ہے جو اگلے جہان میں بھی فائدہ دے چنانچہ وہ مالی اور جسمانی نقصان سے بچانے کے علاوہ دوسرے کو گناہ اور کفر کی ترغیب دینے سے بھی گریز کرتا ہے اور حتی الوسع اخروی ترقی کی طرف متوجہ کرنیکی کوشش کرتا ہے مگر چونکہ سب انسان ہیں اس لئے اختیار یا بے اختیاری سے جانداروں پر بسر کرنے یا نباتات کو کھانے کے نقص سے بالکل پاک کوئی بھی نہیں۔

غرض یہ ہے نقشہ اس نقص اور کمال یا بدی اور نیکی کا جو موجودات عالم میں پائی جاتی ہے۔ اب دیکھنا چاہئے کہ نیست سے ہست کرنے کی تصویری پر عقل کے نزدیک دنیا میں نیکی اور بدی کی یہی شکل ہونی چاہئے یا کچھ اور، اور چونکہ عدم و وجود باہم متباین ہیں اس لئے معدوم کے موجود ہونے کے واسطے وہی شکل قرین قیاس ہوئی جو دنیا کے اور ضدین کے انقلاب میں ہوتی ہو۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ لوہے کو جسکا اصلی رنگ سیاہ ہے صیقل کرنے سے ایسا روشن کرسکتے ہیں کہ آئینہ کی طرح اس میں سے چہرہ نظر آئے اور بالکل سفید ہوجائے مگر اسکی شکل یہی ہوتی ہے کہ ایک زنگ آلود لوہے کو جب صیقل کرنے لگیں تو پہلے اسکا زنگ دور ہوتا ہے اور سطح کسی قدر صاف ہوجاتی ہے اس حالت میں اگر نور آمیں پیدا بھی ہوا ہے تو ایسا ناقص کہ سیاہی کچھ بھی دور نہیں ہوئی اور اگر کالا رنگ نور کے مقابل میں برا ہے تو لوہے کی اس حالت میں یہ برائی بڑی حد تک موجود ہے اس کے بعد اور رگڑا جائے تو سیاہی دور ہونا شروع ہوتی ہے مگر اس عمل کے ہر ایک درجہ میں نور بڑھتا جاتا ہے۔ لیکن سیاہی بھی کم سے کم تر ہوتی ہوئی ہر وقت موجود رہتی ہے حتی کہ وہ آئینہ جیسا چمک اٹھتا ہے۔ اسوقت اگرچہ نور جہاں تک لوہے میں آسکتا تھا آگیا۔ اور اگر اس کو آفتاب کے سامنے رکھا جائے تو آفتاب کی جھلک اس میں نظر آجائے گی مگر پھر بھی لوہا لوہا ہی ہے اور آفتاب کے برابر نورانی نہیں ہوسکا اور نیز جسقدر نور موجود ہے وہ ایسا کمزور ہے کہ آئندہ ذرا سی بے احتیاطی کے ساتھ دور ہوسکتا ہے اور لوہا سیاہ ہوتا ہوا پھر زنگ آلود حالت کو پہونچ سکتا ہے۔ اسوقت ایک بات اور بھی یاد رکھنی چاہئے کہ لوہے میں نور کا ایسی آہستگی سے در آنا اور کامل شکل میں پھر بھی موجود ہونا اور بے احتیاطی سے فوراً دور ہونے لگنا نور آفتاب کے حضور سے نہیں بلکہ بوجہ اسکے چونکہ نور آفتاب کی بالکل ضد ہے اس لئے اسکی نیچر ایسی ہی ہے کہ نور کو محض اسی شکل سے حاصل کرسکتا ہے اور نور کی رفتار اسکی طرف صرف دیر آمدن و شتاب رفتن کے اصول پر ہوسکتی ہے۔

اس نظیر کو دیکھنے کے بعد مضمون کی عظمت کے لحاظ سے ایک اور نظیر کا پیش کرنا بھی ناموزوں نہ ہوگا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جب کوئی جاہل علم حاصل کرنے لگتا ہے تو پہلے علم کے بے انتہا ذخیرہ میں سے بہت تھوڑا سا حصہ اخذ کرسکتا ہے اور اسمیں سے بھی کچھ یاد رکھتا ہے اور کچھ بھول جاتا ہے اس حالت میں جہالت اگر برائی ہے تو وہ علم کے آغاز پر نہایت کثرت سے موجود ہوتی ہے پھر رفتہ رفتہ علم کا سرمایہ بڑھنا شروع ہوتا ہے اور جہالت کا عیب کم ہوتا جاتا ہے۔ مگر ترقی کے ہر درجہ میں جہالت کا بقیہ حصہ کچھ نہ کچھ موجود رہتا ہے حتی کہ انسان کسی علم یا اس کی شاخ میں ماہر اور صاحب الرائے ہونیکا فخر حاصل کرتا ہے مگر اسوقت بھی یہ عالم ہوتا ہے کہ اگر اس علم کے متعلق اس کی دس رائیں صحیح ہوتی ہیں تو ایک رائے ضرور غلط ہوتی ہے اور ایسا کمال کسی کو حاصل نہیں ہوسکتا کہ اسکا کوئی قیاس بھی غلط نہ نکلے بلکہ یہ بھی ہوتا ہے کہ کبھی اس نے کسی مسئلہ میں صحیح رائے قایم کی ہے تو دوسرے وقت پر دماغ ایسا چکرایا ہے کہ اسی مسئلہ میں غلط خیال کا حامی بنگیا ہے اور علی ہذا جس قدر کمال حاصل کرتا ہے

اگر اسکی بحث و تکرار نہ رکھے تو وہ کمال رفتہ رفتہ زوال پانے لگتا ہے حتیٰ کہ عالم ایک وقت میں بالکل کندۂ ناتراش ہو سکتا ہے اور یہاں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ یہ نور علم کا نقص نہیں ہے۔ کیونکہ جس مسئلہ میں ہم کسی وجہ سے غلطی دیکھتے ہیں۔ اسی مسئلہ میں وہی نور علم جو کسی اور عالم میں جلوہ گر ہے اس مسئلہ کو نہایت صحت کے ساتھ دریافت کر لیتا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ نور علم میں بیشک مسائل کی اس حقیقت دریافت کرنے کی قابلیت ہے اور جو کچھ نقص نظر آتا ہے وہ اس لئے ہے کہ جہالت کی فطرت ہی علم سے اس قدر تناقض رکھتی ہے کہ وہ جسقدر دور ہو سکتی ہے بتدریج ہوتی ہے اور پھر بھی کسی نہ کسی شکل میں اس کا بقیہ موجود رہتا ہے اور وہی جہالت ہے جو ابتدائی درجات میں پورے طور پر نمایاں ہے اور وہی جہالت ہے جو مہارت کے وقت بھی مختلف شکلوں میں اپنی بقا کو ظاہر کرتی ہے اور علم کی برکت پر پردہ ڈالدیتی ہے۔

انکے علاوہ اور دیگر واقعات عالم میں جس قدر غور کیا جائے معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک ضد کا دوسری ضد کی طرف جانا اسی ترتیب اور اسی نقص کے ساتھ ہوتا ہے۔ پس یہی کیفیت آفتاب وجود کی ظلمت عدم پر عکس ڈالنے کی ہونی چاہئے تھی اور یہی ہوئی کہ اس کی پہلی شعاع سے زنگ عدم دور ہوا اور مادہ کی ابتدائی شکل وجود میں آئی۔ اور اس کے بعد جس جس حد تک عکس پڑتا گیا اُس حد تک عدم کی ظلمتیں یعنی نقص اور عیب دور ہوتے گئے۔ اور وجود کی کامل سے کامل شکلیں بنتی گئیں حتیٰ کہ انسان اور کامل انسان میں آکر اس نابود نے وہ بود حاصل کی کہ آفتاب وجود کی شعاعیں اس کے اندر چمکنے لگیں۔ اور عقل و معرفت کے نور سے جسمانی اور روحانی جلوے ایسے ظاہر ہوئے کہ بعض حالات میں اس پر خود آفتاب وجود ہونے کا دھوکا ہوا۔ جس طرح مجلا تلوار کو سورج کے سامنے رکھنے سے اس کے اندر آفتاب معلوم ہوتا ہے، چنانچہ بعض کوتاہ بینوں نے اسی کو خود ذات خدا کا ظہور سمجھ لیا ہے۔ حالانکہ وہ حقیقت میں خود ذات خدا کا ظہور نہیں البتہ ایک طرح سے نور خدا کا مظہر ضرور ہے جس طرح لوہا خود آفتاب کا ظہور نہیں بلکہ اس کا مظہر ہے۔ اور یہ اس لئے ثابت ہوتا ہے کہ ادھر لوہا پہلے ایسا نورانی نہ تھا اور بعد میں بے احتیاطی سے پھر تاریک ہو جاتا ہے اور ادھر انسان پہلے ایسا عارف نہ تھا اور بعد میں ذرا سی لغزش سے پھر کور باطن ہو سکتا ہے

پس یہاں بھی ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس معدوم کی ایسی دھیمی رفتار اور اس کے اندر نقصوں کا اس قدر ہجوم اس آفتاب وحدت کا نقص نہیں بلکہ یہ عدم ہے اس لئے کہ اس کی نیچر ہی مقتضی ہو کہ ایسی صورت سے ترقی کرے اور اس لئے ذات خداوندی کو بدی کا منبع قرار دینے کے بجائے ثابت ہوتا ہے کہ وہ محض خیر کا سرچشمہ ہے چنانچہ اس نے سب موجودات کو اس عیب سے بری کیا جو سب سے بڑھ کر تھا یعنی عدم اور بری بھی اس خوبی سے کیا کہ اب چاہے بدی کرنے والے کیسی ہی بدی کریں وہ موجودات کو موجود سے معدوم نہیں کر سکتے اور زیادہ سے زیادہ جو انکا زور چل سکتا ہے وہ ایک چیز کی محض شکل کو بدل دیتا ہے۔

اور محض وجود یا مادہ کو صرف سادہ شکل عطا کرنے پر اکتفا نہیں کی گئی بلکہ ترقی کا ایسا سلسلہ معدوم کر دیا گیا ہے کہ جس چیز میں جس حد تک اس بڑی بدی یعنے عدم سے بعد ہوتا گیا اُسی حد تک اس میں سے عدم کا میلان کم ہوتا گیا اور اسی حد تک وجود کی مکمل تر اشکال پیدا کرنے کی طاقت بڑھتی گئی حتیٰ کہ میلان عدم کم ہونے اور وجود کی طاقت بڑھنے کا سلسلہ کامل انسان میں اس حد تک پہونچ گیا کہ وہ اپنی طاقت کے موافق کسی شخص اور کسی فرد کو نقصان پہونچانے کا ذمہ دار نہیں اور تمام عالم کو اپنے وجود سے فائدہ پہونچانے کی اور ہر چیز کی

اصل حقیقت کو اس کے مناسب حال سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن چونکہ اصلیت عدم ہے اس لئے عیب سے بالکل پاک ہو
نہیں کر سکتا تھا، چنانچہ وہ بھی عدم کا بقیہ تھا جس کے سبب نباتات وغیرہ ابتدائی مخلوقات وجود کے بہت سے کمالات سے محروم تھ
بھی عدم کا بقیہ ہے جس کے سبب انسان جیسی اعلیٰ مخلوق کبھی امراض وغیرہ کی شکل میں اپنے اندر عدم کو ظاہر کرتی ہے اور کبھی
وغیرہ کی شکل میں دوسروں کو معدوم کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ جس طرح وہ بھی جہالت کا بقیہ تھا جو علم کے ابتدائی درجہ میں بہت
کو مخفی رکھتا تھا اور وہ بھی جہالت کا بقیہ ہے جو ایک عالم میں کبھی کبھی غلط رائے قائم کرنے کا سبب ہوتا ہے فرق صرف اس قدر ہے کہ عد
نباتات وغیرہ میں اور جہالت کا ظہور علم کے آغاز میں بے ارادہ ہے اس لئے کہ ابھی ارادہ کی قابلیت بھی پیدا نہیں ہوئی۔ اور ج
کا ظہور عالم کی غلط رائے میں اور عدم کا ظہور انسانی افعال میں ارادہ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ اس لئے کہ اسوقت ارادہ کی قابلیت
ہے مگر جب ماہر کی غلطی کو یقیناً جہالت کا نقص کہہ سکتے ہیں نہ نور علم کا قصور تو انسان کی بدی کو بھی عدم کا نقص سمجھنا چاہیئے نہ کہ آ
وجود کا قصور۔

اب میں ان دو تنقیح طلب مسئلوں کی طرف آتا ہوں جو مل کے قول سے پیدا ہوتے ہیں یعنی آیا مذہب کے لئے ضروری ہے کہ آمیز
تعلیم ہو۔ دوسرے کہ آیا اخلاقی تعلیم مذہب کے باہر بھی ممکن ہے۔

ہم نے تین مذاہب الہامی کے اخلاقی تعلیم کا مختصر نمونہ دیا ہے۔ جس سے یہ صریح نتیجہ ظاہر ہو سکتا ہے کہ معمولی اختلاف و افراط
کے ساتھ ان سب مذاہب میں اخلاق کا صرف ایک ہی معیار ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ ایک مذہب مثلاً زنا کو اچھا کام سمجھتا ہو اور د
برا۔ تو اس حیثیت سے نیکی و بدی کی تعریف متقابل نہیں ہوتی بلکہ نیکی نیکی ہے اور بدی بدی۔ اور یہ دونوں معیار اخلاق کے ایسے
ہیں جنکی تشریح فلسفہ سے نہیں ہو سکی۔ ہم نے شروع ہی میں اخلاق کی تعریف میں علم تاریخ انسان کو علیحدہ رکھ دیا تھا، ممکن ہے کہ ہم کچ
کے لئے اس کو باور کر لیں کہ انسان نے اخلاق کو اپنے متواتر تجربات سے حاصل کیا۔ اور جب جب اس کو کسی فعل سے نقصا
تکلیف ہوئی اس کو اس نے بدی جان کر ترک کر دیا اور اپنی اولاد کو اس سے بچنے کی تعلیم دی۔ یا ہم تاریخ کی مدد سے یہ بھی ثابت کر سک
حکومت نے اجتماع اقوام کی غیر مساویانہ برتاؤ سے انصاف کرنا سکھا اور اس پر اخلاق کی بنیاد پڑی، مگر اخلاق پر انسانی بقا و نظام فط
اسقدر ذمہ داریاں ہیں کہ یہ مشکل نظر آتا ہے کہ مذہب نے انسان کی اپنی فطرت پر چھوڑ دیا ہو، اور اس کو تعلیم الہام کے ذریعہ
نہ دی ہو۔ مذہب انسان کے موت کی وجہ سے شروع ہوا نفس نے انسان کی موت کو آخری درجہ زیست کا نہ سمجھا۔ مذہب
آئندہ زندگی کی امید دلائی۔ اور اس کے ساتھ سزا و جزا کا سوال پیدا ہونا ضروری ہوا۔ اور جب سزا و جزا کا سوال پیدا ہوا تو اخ
اس کا اصل سبب ہوا۔

یہ بہت ممکن ہے کہ مذہب سے باہر اخلاق کی تعلیم ہو سکے۔ مگر وہ اس حد پر جا کر ٹھہر جائے گی جہاں تک انسانی خود غرضی
محرک ہوگی۔ اور مذہب اخلاق کو خود مقصود بالذات ہونے کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔ قانون دنیاوی نے سیاست کے ماتحت بہت
برائیوں سے انسان کو محفوظ رکھا ہے۔ مگر اعمال انسانی پر سوائے مذہب کے کوئی دوسری شے پوری طرح مسلط نہیں ہو سکتی اور اس

یہ بھی ممکن نہیں کہ مذہب کے باہر اخلاق کی کماینبغی تعلیم دی جا سکے آخر میں ہم کو یہ بھی بتا دینا چاہئے کہ مذہب کی خوبیوں کا معیار اس بات پر نہیں ہے کہ اس کی اخلاقی تعلیم کو نہایت آئیڈیل حیثیت اور ناقابل عمل صورت سے پیش کیا جائے جس مذہب نے انسانی جذبات کا خیال کئے بغیر اس آئیڈیل تعلیم کا وعظ دیا ہے۔ وہ کاغذ کے لئے بہت اچھے الفاظ ہیں مگر عمل میں صفر۔ ہم اسلام کو اسی لئے کامل اور نمونہ قرار دیتے ہیں کہ اخلاق کی جو اس میں تعلیم ہے وہ ایک ایسا اعتدال کا درجہ لئے ہوئے ہے جو بالکل فطری ہے اور جو دیگر مذہب میں یا تو سرے سے مفقود ہے یا بالکل اس کے خلاف پایا جاتا ہے۔ اور جو بات اسلام میں سب سے زیادہ ممتاز ہے وہ یہ ہے کہ انسانی حقوق میں اپنے نفس کے ساتھ بھی وہی فرائض ادا کرنے کا حکم ہے جو دوسروں کے ساتھ، یعنی ایسے کام جس سے خود اپنے حفظ نفس و حفظ نفس ہی مقصود محض ہوں، وہ بھی اخلاق کے فضائل میں سے ہے۔ مثلاً رہبانیت، خودکشی، اور شہید و مظلوم بننے کا شوق ان سب باتوں کی اسلام میں سختی سے ممانعت ہے۔ جو ہنود و مسیحیت کے اخلاقی فضائل مانے جاتے ہیں۔

سیّد مقبول احمد

لاٹری کا روپیہ

بابو گنیش بہاری کو ڈربی والی لاٹری میں پچاس ہزار روپیہ ملجانا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ بیچارے میرٹھ کی میونسپلٹی میں پچیس روپیہ ماہوار کے کلرک تھے۔ بالائی آمدنی کے نام کبھی ایک پھوٹی کوڑی انہیں نصیب نہ ہوئی بڑی دقت اور عسرت سے بسر کرتے۔ اخیر مہینہ میں دو چار روپیہ ادھر ادھر سے قرض لیتے جب جا کے کام چلتا انکے خواب وخیال میں بھی نہ تھا کہ مجھے گھر بیٹھے اتنی دولت ملجائیگی، چار مہینہ پہلے رمضان چپراسی نے زبردستی سر ہو کر ایک چونی کا ٹکٹ خرید وا دیا تھا۔ اس چونی کا غم ایک دو روز رہا پھر بھول گئے۔ گنیش بہاری بخیل نہ تھے بخیل کیا ہوتے بخل اور خست اصل میں دولت کی ساتھی ہے جسکی آمدنی روزانہ اخراجات کے لئے بھی کفایت نہ کرے روپیہ کے معاملہ میں اسکی کشادہ دلی یا تنگ حوصلگی کا اندازہ کیونکر ہو سکتا ہے۔ اتنا ضرور ہے کہ کسی تقریب میں جاتے اور وہاں صاحب ثروت لوگوں کو دیکھنے یا کسی دولت مند سے ملنے کا اتفاق ہوتا۔ تو یہ دولت کے متعلق خواب دیکھنے لگتے اور سوچتے اگر پرماتما مجھے روپیہ دیدے تو میں اپنی دولت کا تماشہ نہ بناؤں نہ میں اوسے چھپا چھپا کر رکھوں۔ امارت و ثروت زندگی کا مقصد نہ ہونا چاہئے بلکہ اسے باطریقہ زندگی بسر کرنیکا ایک ذریعہ سمجھنا چاہئے، دولت میرے نزدیک انسان کو سلیم الطبع اور صحیح الحواس بنانے میں مدد دے سکتی ہے۔ میں اس خیال سے متفق نہیں ہوں کہ دولت فسق و فجور اور لہو و لعب کی طرف مائل کر دیتی ہے۔ یہ ایک ایسا دعویٰ ہے جس کی معقول دلیل پیش نہیں کی جاسکتی اگر اس کو صحیح مان لیا جائے تو اس کے یہ معنی ہونگے کہ مفلس اور تنگ دست لوگ فاسق اور فاجر نہیں ہوتے حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے فلاکت یا امارت پر گناہ اور بدکاری کو منحصر کرنا فطرت انسانی سے ناواقفیت کا ثبوت دینا ہے۔ میں ضرورت سے زیادہ روپیہ کا طلب گار نہیں ہوں مجھے خزانہ جمع کرنے کی ہوس نہیں ہے۔ میں دولتمند مرنے سے دولتمند رہ کر جینا زیادہ پسند کرتا ہوں

یہ تھے بابو گنیش بہاری کے خیالات دولت ملنے سے پہلے لیکن آج پچاس ہزار کی ملنے کے بعد ان کے جذبات عجیب طرح سے متاثر ہوئے حقیقت یہ ہے کہ جیب کو جس قدر وسعت اور کشادگی نصیب ہوتی ہے اسی قدر دل تنگ ہو جاتا ہے، دولت غلامی کی زنجیر ہے، جو دولت آسائش کا ذریعہ نہیں بنتی وہ اپنے محافظ پر حکومت کرتی ہے، یہ ایسی چیز ہے کہ اسکی زیادتی اس کی مزید افزائش کی خواہش پیدا کرتی ہے، انہوں نے سوچا جہاں تک ہو سکے اسمیں سے ایک پیسہ بھی صرف نہ کرنا چاہئے۔ چھوٹی سی رقم ہے اصلی حقیقت ہی کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ دولت بے پر کے اوڑتی ہے۔

بابو گنیش بہاری کا وطن ہاپوڑ میں تھا بہت غور و فکر کے بعد انہوں نے فیصلہ کیا کہ ایک مہینہ کی چھٹی لیکر اپنے وطن چلے جائیں اور وہاں جا کر کچھ کاروبار کریں کھیتوں کی خرید و فروخت میں لوگ لکھ پتی ہوگئے یہ بہت نفع کا کام ہے گو بھاؤ گر جانے کا ڈر بھی کچھ کم نہیں۔ اگر ایسا ہوا تو کیا ہوگا اس خیال سے دل میں دھڑکن پیدا ہوگئی ایسا نہ ہو کہ بیٹھے بٹھائے ساری رقم سے ہاتھ دھونا پڑیں۔ ایسا کاروبار کوئی نہیں جس میں نقصان کا اندیشہ نہ ہو۔ اب انکا خیال لین دین کی طرف رجوع ہوا مگر اسمیں بھی اکثر لوگ نادہند نکل جاتے ہیں۔ رقعہ پرچہ، تمسک کچھ کام نہیں آتا۔ پھر کیا ہو اس دولت نے

انہیں بہت تشویش میں ڈالدیا۔امارت اپنے مخصوص تفکرات ساتھ لاتی ہے۔ یہ بھی اس درخت کے مانند ہے جس کی ڈالیاں اپنے پھلوں کی کثرت کا بار نہیں سنبھال سکتیں اور ان کے وزن سے ٹوٹ جاتی ہیں۔

آخر گیہوں کی تجارت کا فیصلہ کرکے بابو گنیش بہاری ہاپوڑ کو روانہ ہوئے اسٹیشن پر آئے تو گاڑی تیار تھی انکے سامنے ہی ریل کا جو درجہ تھا اس میں دو آدمی بیٹھے تھے۔ اس درجہ میں بیٹھنے ہی کو تھے کہ انہیں کچھ خیال آیا فوراً وہاں سے ہٹ گئے اور اس آگے والے درجہ میں جا بیٹھے جو بالکل خالی تھا گاڑی چھوٹ گئی سوچنے لگے خیر ہوئی میں اس درجہ میں نہ بیٹھا دو آدمی تھے جو دونوں ساتھی معلوم ہوتے تھے بہت التفات کے ساتھ آپس میں باتیں کر رہے تھے، دل میں بے ایمانی آتے کیا دیر لگتی ہے مجھے روپیہ ملنے کا حال کم سے کم میرٹھ میں سب کو معلوم ہی ہے۔ انہیں بھی ضرور معلوم ہوگا اور یہ لوگ اس سے بھی بےخبر نہ ہونگے کہ میں سارا روپیہ اپنے ہمراہ لیکر کاروبار کے ارادہ سے ہاپوڑ جا رہا ہوں ورنہ لیک[illegible] کی چھٹی کیوں لیتا۔ اب انہیں یاد آیا کہ گذشتہ شب کو اسی ریل میں ایک شخص قتل کر دیا گیا تھا اور ڈاکو اسکا اسباب لیگئے تھے۔ اس خیال کا آنا تھا کہ انہیں اختلاج شروع ہوگیا پسینے میں شرابور ہوگئے، سوچنے لگے میں بھی کس قدر احمق ہوں۔ گھبراہٹ میں بے سوچے سمجھے سیدھا اسٹیشن پر چلا آیا، موٹر میں چلا جاتا اگر یہ تھوڑا سا زیادہ سہی مگر کچھ خطرہ تو نہ تھا، ممکن ہے وہ شخص اسی درجہ میں قتل ہوا ہو، اس خیال نے اوسان خطا کر دیئے۔ ممکن ہے وہ یہیں بیٹھا ہو ایسی جگہ جہاں میں بیٹھا ہوں، سنا ہے وہ بھی سارے درجہ میں تنہا تھا اور ڈاکو کھرکودے کے اسٹیشن سے سوار ہوا تھا، اسوقت بابو گنیش بہاری سخت بے چین اور مضطرب تھے انکی حالت ایسی تھی جیسے کوئی مسافر جنگل بیابان میں بھٹک کر کسی ایسے راستہ پر آ لگا ہو جو رہزنوں اور لٹیروں کا تختۂ مشق بنا ہوا ہو، ریل تیزی کے ساتھ جا رہی تھی اور انہیں بار بار شبہ ہوتا تھا کہ کوئی ڈاکو چلتی گاڑی میں کھڑکی کھول رہا ہے انکی حالت قابل رحم تھی سچ یہ ہے اس مصیبت کا برداشت کرنا سب سے زیادہ مشکل ہے جو کبھی رونما نہیں ہوتی، ہم اکثر بے بنیاد خطرات کے خیال سے لرز جاتے ہیں خطرات بے بنیاد سہی لیکن انکے خیال سے جو تکلیف پہونچتی ہے وہ بے بنیاد نہیں ہوتی۔ کسی مصیبت کے خیال سے ہم قبل از وقت جس قدر مضطرب ہوتے ہیں اگر واقعی وہ مصیبت پیش آ جائے تو ہم ہرگز اتنے مضطرب نہ ہوں۔

اب ریل کھرکودے کے اسٹیشن پر پہونچ گئی، گنیش بہاری کے جذبات کا ہیجان اسی حالت پر تھا کچھ خفیف سا خیال آیا کہ کسی دوسرے درجہ میں چل کر بیٹھ جانا چاہیئے لیکن خدا جانے وہاں کیا پیش آئے کڑھائی سے نکلکر آگ میں گرنا کہاں کی عقلمندی ہے پھر سوچا کہ جس درجہ میں آدمی زیادہ ہوں، وہاں خطرہ کم ہے ابھی اسی تذبذب میں تھے کہ گارڈ نے سیٹی دے دی جوں ہی ریل نے حرکت کی ایک نہایت جسیم شہیم انسان پھرتی کے ساتھ دروازہ کھولکر انکے درجہ میں گھس آیا اور دوسرے کنارے پر کھڑکی کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ اس کے پاس ایک چمڑے کے بیگ کے سوا اور کچھ نہ تھا صورت سے کوئی جاٹ یا گوجر معلوم ہوتا تھا بڑی بڑی سرخ خطرناک آنکھوں سے آگ برس رہی تھی مونچھیں لبوں سے گزر کر رخساروں کو پار کرتی ہوئی کانوں کے قریب تک پہونچ گئی تھیں اسنے بیٹھتے ہی چمڑے کے بکس میں سے نکالکر جرابیں پہنیں اور خاموش بیٹھ گیا۔

گنیش بہاری کا برا حال تھا، اب انہیں پختہ یقین ہوگیا کہ آج میری جان کی خیر نہیں یہ شخص ضرور کوئی ڈاکو ہے۔ گذشتہ شب بھی

اسی نے قتل کیا ہوگا وہی لالچ اسے آج پھر لائی ہے وہی وقت ہے وہی درجہ ہے انکا دل بانسوں اچھل رہا تھا بہتیرا سوچتے تھے کہ کوئی تدبیر جانبری کی نکل آئے مگر کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا، سوچنے لگے کہ پولیس بھی کسقدر غافل ہے دنیا بھر میں توغل برپا کر رکھا ہے کہ قاتل فرار ہوگیا یہ خبر نہیں وہ کمبخت آج پھر اسی درجہ میں موجود ہے اب وہ شخص ذرا توجہ کے ساتھ گنیش بہاری کو دیکھنے لگا، اسوقت ان کا سارا بدن لرز رہا تھا، آنکھیں ابل آئی تھیں منہ خشک ہوکر کھل گیا تھا، ایسی عجب ہئیت کس کی نظر اپنی طرف نہ کھینچ لیتی اب گاڑی بانچی سے گذر چکی تھی اور گذشتہ شب قتل کا واقعہ بانچی اور ہاپوڑ کے درمیان ہی ہوا تھا درجہ کا دوسرا مسافر ذرا سنبھل کر بیٹھا بیگ کھولکر اس میں جھانکا پھر بیگ بند کر دیا، داہنا ہاتھ کوٹ کی جیب میں ڈال لیا۔ اسوقت گنیش بہاری کے حواس قطعاً معطل ہوچکے تھے انہیں چند منٹ سے زیادہ اپنی زندگی کی امید نہ تھی وہ ہر لحہ اس انتظار میں تھے کہ اب کوٹ کی جیب سے ہاتھ نکالا میری روح کو تن سے جدا کیا جائے گا اور بے تحاشا کہنے ہی والے تھے کہ اگر تم میری جان نہ لو تو میں لاٹری کی رقم میں سے تمہیں نصف روپیہ دینے کے لئے تیار ہوں کہ وہ شخص اپنی جگہ سے اٹھ کر انکے سامنے آبیٹھا گنیش بہاری ایک دم چیخ اٹھے "ڈشٹ کہیں کے تو کون ہے؟" اسنے جواب دیا کہ "بابو صاحب میں لکشمی بیمہ کمپنی کا ایجنٹ ہوں" اس جواب کے آخری لفظ اس کے لبوں پر تھے کہ ہاپوڑ کا اسٹیشن آگیا۔

حامد اللہ افسر

چند باتوں کا خیال رکھئے

(۱) نگار کی تاریخ اشاعت ہرچند ہر ماہ کی پندرہ تاریخ ہے، لیکن عموماً وہ پہلے ہی ہفتہ میں شایع ہوجاتا ہے، اس لئے اگر ۲۰ تک پرچہ نہ پہونچے تو فوراً اطلاع دیجئے۔ ورنہ پھر دوسری کاپی مفت نہ ملسکے گی۔

بعض حضرات دوسرے مہینہ کا پرچہ ملنے پر پہلے مہینہ کا پرچہ نہ پہونچنے کی شکایت کرتے ہیں، افسوس ہے کہ ان شکایات کا ہمارے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔

(۲) نمبر خریداری خط وکتابت میں درج کرنا ضروری ہے، بعض حضرات ڈاکخانہ کے رجسٹرڈ نمبر ایل ۱۱۰۴ کو اپنا نمبر خریداری سمجھتے ہیں، نمبر خریداری فیدک کے اوپر داہنے جانب بلیو بلیک سیاہی سے درج ہوتا ہے اسکو ایک بار دیکھ کر کہیں نوٹ فرمالیجئے۔

(۳) طلبہ کے لئے زیادہ مناسب یہ ہے کہ وہ اپنے گھر یا کسی اور پتہ سے رسالہ طلب کریں۔ اسکول کے پتہ سے رسالہ طلب کرنا محفوظ طریقہ نہیں ہے۔

(۴) جن طلبہ یا لائبریریوں وغیرہ سے رعایتی چندہ لیا جاتا ہے وہ اگر میعاد خریداری ختم ہونے پر منی آرڈر نہ روانہ کریں گے تو وی پی پوری رقم کا کیا جائے گا۔

(۵) حیدرآباد کے ان خریداروں سے جہاں انگریزی ڈاک خانہ نہیں ہے، یہ استدعا کیجاتی ہے کہ حتی الامکان رسالہ رجسٹرڈ طلب کریں اور پھر سالانہ اس صرف کو بھی برداشت کریں کیوں کہ سوائے اس کے کوئی صورت وہاں حفاظت سے رسالہ پہونچنے کی نہیں ہے۔

"مینیجر نگار لکھنؤ"

انعام اللہ خاں یقین دہلوی

نام و نسب و شخصیت انعام اللہ خان نام یقین تخلص نواب اظہر الدین خان بہادر مبارک جنگ دہلوی کے بیٹے نواب حمید الدین خان بہادر کے نواسے اور حضرت شیخ عبد الاحد فاروقی سرہندی کے پرپوتے تھے شجرۂ نسب انکا حضرت شیخ مجدد الف ثانی سرہندی کی وساطت سے خلیفہ دوم تک پہونچتا ہے۔ دلی میں پیدا ہوئے اور نقاش اول زبان ریختہ حضرت مرزا جان جاناں مظہر کے دامن تربیت میں پرورش پائی۔ مولوی قدرت اللہ شوق صدیقی اپنے تذکرہ طبقات الشعراء میں ان کے متعلق لکھتے ہیں۔

”جوانے بود خوش رو و خوش گو خوش خلق و قابل منظور نظر و تربیت کردۂ مرزا مظہر“

مولوی قدرت اللہ شوق ایک جید عالم تھے لہٰذا انکا یقین کی قابلیت کو تسلیم کرنا دلیل ہے اس بات کی کہ یقین فارسی و عربی کے فارغ التحصیل ضرور تھے مگر افسوس ہے کہ میر صاحب نے نکات الشعراء میں ان کے فضل و کمال کے مٹانے میں پوری کوشش صرف کردی ہے، ارشاد ہوتا ہے۔

”القصہ پرد پوچ چند کہ بافتہ است کہ او شما نیز توانیم بافت اینقدر بر خود چیدہ ہست کہ رعونت فرعون پشت دست بر زمین میگذارد بعد ملاقات اینقدر معلوم شد کہ ذائقہ سخن فہمی مطلق ندارد“

یقین ہی پر موقوف نہیں ہے میر صاحب کی ”مشق ناز“ نے ”خون دو عالم“ اپنی گردن پر لے رکھا ہے چنانچہ شاہ قدرت اللہ قدرت ایسے قادر الکلام کے بارے میں فرماتے ہیں ”او عاجز سخن است لیکن برائے خاطر عارف کہ از یاران درست فقیر است نوشتہ شد“ مگر بخلاف میر صاحب کے میر حسن اسی ”عاجز سخن“ کو ان الفاظ میں سراہتے ہیں۔

”مرد یست از متوسلان میر شمس الدین فقیر درویش وضیع خلیق طبع رتبہ قدرش رفیع و شیوۂ معانیش بدیع سمند نظمش در میدان فارسی و ہندی چالاک و چست و تصویر بے نظیر معانیش در استخوان بندی الفاظ درست بندہ وے را یکبار در مشاعرہ لکھنؤ دیدہ ام“

اور تو اور استاد الاستاد شاہ حاتم بھی میر صاحب کی تنقید ”خنجر بکف“ سے ذبح ہوئے بغیر نہ بچے ان کے حال میں میر صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

”مرد یست جاہل و متمکن و مقلع وضع و دیرآشنا غنا ندارد و دریافتہ نمی شود کہ رگ کہن بسبب شاعری است کہ ہجو من دیگرے نیست باوضع او ہمین است“

شاہ صاحب موصوف مرزا سودا ایسے شخص کے استاد تھے پھر بھلا وہ میر صاحب کو کیا خاطر میں لاتے یہی وجہ ہے کہ میر صاحب ایسے ناراض ہیں قدرت کو ”عاجز سخن“ کہنا بھی کسی ایسے ذاتی مناقشے سے تعلق رکھتا ہے، اب رہے یقین تو انکی بابت اتنا سمجھ لیجئے کہ ایک نامی گرامی نواب زادہ جو ایوان شباب کی منزلوں سے گزر رہا ہو اور اس کے ساتھ ہی فضل و کمال بھی رکھتا ہو اسکی خودداری نفس کس مرتبہ

کی ہوئی میر صاحب کی نازک مزاجی کو یقین کا یہ طرز عمل بیشک کھٹکتا ہوگا اندریں حالات نکات الشعرا میں انہوں نے جو کچھ یقین کے بارے میں لکھا ہے اسکو ان کے جذبۂ انتقام یا رشک و حسد کا ایک کرشمہ سمجھنا چاہیے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ یقین کی زندگی ہی میں انکی سخنوری کے ڈنکے بج چکے تھے چنانچہ فتح علی گردیزی جو میر کی طرح یقین کا شناسا ہے اپنے تذکرہ میں لکھتا ہے۔

''صاحب تلاش معانی رنگین انعام اللہ خاں یقین پسر اظہر الدین خاں بہادر مبارک جنگ نبیرۂ حضرت شیخ مجدد الف ثانی است و نواسہ نواب جملہ الدین خاں مرحوم شہباز خیالش بصید معنی بلند پرواز است و ہمائے اندیشہ بر قلۂ سخن بپر افشانی ممتاز بے اغراق ریختہ گوئی را بر طاق بلند گزاشتہ و تخم معنی در زمین سخن کاشتہ دانچہ از طبعش سر زدہ از فرط شیوع و حسن قبول در تمام ہندوستان بر افواہ و السنہ جاری است''

عبارت مندرجہ بالا اسقدر رفیع ہے کہ اسکے آگے میر صاحب کے خرافات کی پرکاہ کے برابر بھی وقعت نہیں رہتی، یہی نہیں بلکہ اس مشہور الزام کی بھی دھجیاں اڑجاتی ہیں جو یقین کے بعض معاصرین کی طرف سے ان پر عائد کیا جاتا ہے۔ اس الزام کی تشریح میر صاحب کی زبانی سنئے۔

''مرداں می گفتند کہ مرزا مظہر او را شعر گفتہ می دہند و وارث شعر ہائے ریختہ خود گردانیدہ از قبول کردن ایں معنیش بندہ را خندہ می آید کہ ہمہ چیز بوارث میرسد الا شعر مثلاً کسے کہ بر شعر پدر خود یا مضمون او متصرف شود از او دخواہند گفت تا بہ شعر استادیہ رسد''

فتح علی کے خیالات سن چکے مگر وہ پھر غیر معروف شخص ہے لہذا تھوڑی دیر کے لئے خالی الذہن ہو کر میر صاحب کے بہنوئی میر محمد حسین کلیم دہلوی سے رجوع کیجئے دیکھئے وہ کیا کہتے ہیں انکا شعر ہے ؎

یقین کے شعروں پر ہیں بدگماں بعضے کہ اس کے نہیں
غلط ہے ہمنے بوجھا ہے کلام مرزا جان جاناں کو

یہ بھی واضح رہے کہ میر محمد حسین کلیم کوئی معمولی آدمی نہیں شیخ محی الدین ابن عربی کی مشہور و معروف کتاب ''فصوص الحکم'' کے مترجم ہونیکی حیثیت سے ان کا پایۂ علمی بہت بلند ہے اس کے علاوہ میر صاحب نے انکو نکات الشعرا میں ''کلیم ریختہ'' اور میر حسن نے اپنے تذکرہ میں ''استاد سخن'' لکھا ہے، پس ایسے جامع کمالات شخص کی شہادت جسقدر وزنی ہوسکتی ہے محتاج بیان نہیں

فتح علی اور میر کلیم کے ماسوا مصحفی کے بیان سے بھی اس الزام رکیک کی پوری پوری تردید ہوتی ہے، استاذ الاساتذہ شیخ مصحفی فرماتے ہیں۔

''در دورۂ ایہام گویاں اول کسے کہ ریختہ را شستہ و رفتہ گفتہ ایں جوان بود و بعد ازاں تتبعش بدیگراں رسیدہ''

آخری فقرہ کی تصدیق تذکرۂ فتح علی گردیزی سے بھی ہوتی ہے۔ فتح علی ظہور کے ذکر میں لکھتا ہے۔

''بخوش بیانی و نیکو بیانی مشہور است در ریختہ تتبع دیوان انعام اللہ خاں یقین میکند''

عمدہ کے ذکر میں لکھتا ہے۔

''در ریختہ تتبع دیوان انعام اللہ خاں یقین می نماید شعر را بہ شستگی و رفتگی می گوید''

خود یقین کو بھی اسکا دعویٰ ہے چنانچہ کہتے ہیں ؎

حق کو یقین کے یارو بر باد مت دو آخر
طرزیں سخن کی اس کی تم نے اڑائیاں ہیں

یقین کا ہنگامۂ فخر یہیں پر ختم نہیں ہوتا ایک دوسری جگہ کہتے ہیں ؎

یقیں تائید حق سے شعر کے میداں کا رستم ہے — مقابل آج اس کے کوئی آسکتا ہے کیا قدرت

آگے چلکر اپنے سحر بیان اور اثر مقال کے متعلق فرماتے ہیں ؎

سخن کے سحر سے نزدیک ہے یقیں کہ کرے — مرے زمین غزل دیکھ کر یہ گردوں رقص

اس کے باوجود یقین کا خیال ہے کہ انہوں نے ریختہ کی طرف کما حقہ توجہ نہیں کی اگر کرتے تو غزل کی زمین آسمان بنجاتی چنانچہ فرماتے ہیں ؎

نہ آیا سر فرو ادھر یقیں کی فکر عالی کا! — زمینوں کو وگرنہ ریختے کی آسماں کرتا!

اس بلندی پر پہونچنے کے بعد یقین کا یہ خیال ہو جاتا ہے کہ ان کے "لطف گفتگو" کو ان کے استاد کے سوا دوسرا شخص سمجھ ہی نہیں سکتا ؎

یقیں کی گفتگو کے لطف کو باللہ کب کوئی — بجز از حضرت استاد مرزا جان جاں سمجھے

انداز کلام بتاتا ہے کہ مرزا صاحب بھی لائق شاگرد کے لطف سخن کے معترف تھے لیکن یقین کی سعادت مندی دیکھئے وہ اگر ایک طرف اس اعتراف پر فخر کرتے ہیں تو دوسری جانب اپنی عجز طبع کے اقرار کو بھی ضروری جانتے ہیں حالانکہ ان کا ایسا کرنا صاف و صریح کسر نفسی کی مثال ہے ؎

شعر خاطر خواہ مجھ سے ہو نہیں سکتا یقیں — ہو جب استعداد ناقص پیر کامل کیا کرے

جس طرح یقین اس بات کے مدعی ہیں کہ میری "لطف گفتگو" کو مظہر کے سوا دوسرا نہیں سمجھ سکتا اسیطرح انکا بھی دعویٰ ہے کہ میں اور صرف میں ہی مظہر کا صحیح قدر شناس ہوں شاگردانہ عجز و منت پذیری کے رنگ میں اس مضمون کو ادا کرتے ہیں ؎

مجھ سے پتھر کو کیا ہے جیوں یقیں حرف آشنا — کون پہچانے یقین بن حضرت مظہر کی قدر

آگے چلکر اپنی افتادگی و فروتنی اور بے پایاں عقیدت و محبت کا اسطرح اظہار فرماتے ہیں ؎

سایہ بے شخص ٹھہرتا نہیں کہتا ہے یقیں — آپ سے مجھ کو جدا حضرت مظہر نہ کرد

اس پر بھی صبر نہیں آتا تو جوش ارادت کو اس طرح ظاہر کرتے ہیں ؎

جوں نماز اپنے پہ شام و صبح لازم کر یقیں — حضرت استاد یعنی شاہ مظہر کی ثنا

یقین ایک اعلیٰ درجہ کے نباض سخن ہیں مگر یہ مرتبہ انکو شاگردانہ نیازمندیوں کی بدولت حاصل ہوا ہے اس خیال کو کلیہ کے رنگ میں بیان فرماتے ہیں ؎

طبیعت شعر کی اصلاح بن فاسد ہی رہی ہے — وہی سمجھے یقیں یہ بات جو فہم سخن جانے

دیوان یقین

یقین، صاحب دیوان شاعر ہیں انکی زندگی ہی میں انکا دیوان اس حد تک مقبول ہو چکا تھا کہ بقول مصحفی دوسرے شعرا انکی تتبع پر مجبور ہو گئے تھے لیکن افسوس ہے کہ آجکل نایاب ہے بظاہر صرف ایک نسخہ کتب خانہ لندن میں محفوظ ہے جسے دیکھکر سید محی الدین صاحب قادری نے ایک مضمون بعنوان "دیوان یقین" جون ۲۳ء کے "نگار" میں سپرد قلم فرمایا ہے۔ یہ مضمون نہایت سرسری طور پر لکھا گیا ہے چنانچہ میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے اسمیں مرزا سودا کے یہ دو شعر یقین سے منسوب پائے ؎

بدلا ترے ستم کا کوئی تجھ سے کیا کرے — اپنا ہی تو فریفتہ ہووے خدا کرے

گر ہو شراب و خلوت و محبوب خوبرو — زاہد تجھے قسم ہے جو تو ہو تو کیا کرے

مضمون مذکور الصدر میں دوسرے شعر کا پہلا مصرعہ کسی قدر بدلا ہوا بھی ہے جس سے شعر بالکل مہمل ہو کر رہ گیا ہے ملاحظہ ہو۔

خلوت ہو اور شراب ہو معشوق خوبرو — زاہد تجھے قسم ہے جو تو ہو تو کیا کرے

ان فروگذاشتوں کے دیکھتے ہوئے قدرتاً یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ یا تو قادری صاحب کی نظر سے "دیوان یقین" نہیں گزرا یا پھر انڈیا آفس میں جو نسخہ "دیوان یقین" کا موجود ہے وہ صد درجہ ساقط عن الاعتبار ہے۔

دیوان پیش نظر ہوتا تو یقین کی شاعری کے متعلق بہت کچھ معلومات میں اضافہ ہو سکتا تھا تاہم اگر قادری صاحب کی تحقیق پر اعتماد کیا جائے تو یقین کی شاعری صرف غزلوں تک محدود ہے اور ہر غزل پانچ پانچ شعر پر مشتمل ہے یہ دونوں باتیں شاید نئی ہیں جو قادری صاحب کے مضمون شائع ہونے سے پہلے پردۂ خفا میں تھیں دوسری شق سے یہ بات بھی مترشح ہوتی ہے کہ غالباً یقین نے اپنے کلام کا انتخاب شائع کیا ہے، مجھے اتفاق سے ایک[1] پرانی کتاب مسمی بہ "چمن بے نظیر" میں یقین کی چار غزلیں دستیاب ہوئی ہیں جن میں سے تین غزلیں قادری صاحب کے بیان کردہ خصوصیت پر پوری اترتی ہیں لیکن چوتھی غزل میں بجائے پانچ شعر کے چار شعر ہیں ممکن ہے کہ ایک شعر چھوٹ گیا ہو اس خیال کو اور بھی تقویت ہوتی ہے جب "چمن بے نظیر" کی اور فروگذاشتوں پر نظر جاتی ہے اب رہی یہ بات کہ ان غزلوں کو انعام اللہ خاں یقین کا کلام سمجھنے کی کیا ضمانت ہے تو اس کے جواب میں غزلہائے مذکورہ میں سے پہلی غزل کا مقطع پیش کیا جا سکتا ہے ۔

جوں نماز اپنے پہ شام و صبح لازم کر یقین — حضرت استاد یعنی شاہ مظہر کی ثنا

یہ شعر بالتخصیص یقین ہی کا ہے جیسا کہ فتح علی گردیزی کی عبارت ذیل سے ظاہر ہوتا ہے۔

"استفادۂ سخن از افادۂ مرزا مظہر گرفتہ چنانچہ گوید":-

جوں نماز اپنے پہ شام و صبح لازم کر یقین — حضرت استاد یعنی شاہ مظہر کی ثنا

البتہ دوسری تیسری اور چوتھی غزل کے متعلق کوئی ایسا روشن ثبوت پیش نہیں کیا جا سکتا تاہم رنگ کلام صاف بتاتا ہے کہ یہ وہی "جوان میرزا" ہے جس کو خدائے سخن میر تقی میر کے محسود ہونے کا شرف حاصل ہے۔

"یقین کی شاعری" یقین کی شاعری خالص جذباتی شاعری ہے قریب قریب ہر شعر میں سادگی اور جوش اپنی پوری قوت کے ساتھ کارفرما ہے، اسپر حسن ادا اور صفائی زبان کی دلآویزیاں مستزاد چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

انجام محبت سے پشیمان ہونا عام موضوع سخن ہے یقین بھی اس سنت دیرینہ کو تازہ کرتے ہیں مگر کب جب بتوں کی ناہربانیاں نشۂ غفلت سے ہشیار کر کے خدا کے وجود کا قائل کر دیتی ہیں اس پر بھی معیار طبیعت چونکہ بلند ہے لہذا اجتناب و گریز کا خیال پیدا نہیں ہوتا۔

جو کچھ کہیں یہ تجھ کو یقیں ہے سزا تری — بندہ جو تو بتوں کا ہوا کیا خدا نہ تھا

---

[1] یہ کتاب مختلف شعرائے فارسی و اردو کے کلام کا مجموعہ ہے۔

واعظ کی پگڑی اچھالنا رندان میکدہ کا پرانا دستور ہے یقین بھی اس خوش فعلی کے مرتکب ہوتے ہیں مگر دیکھئے کس خوبی کے ساتھ کیفیت مستی کی آڑ میں پناہ لیکر اپنی معصومیت ثابت کرتے ہیں، ان دونوں شعروں میں استفہام کا لطف وجدانی ہے

خفیف مجھ سے الجھکر عبث ہوا واعظ ۔۔۔ کہ میں تو مست تھا اسکو بھی کیا شعور نہ تھا

درد محبت کا ہر لمحہ ایک مستقل گرانجانی ہے لیکن مے مرد افگن عشق کا پامرد حریف مزے لے لیکر زہر آب غم کے یہ تلخ گھونٹ پیتا ہے اور باوصف امکان وہ نہیں کرتا جس سے تمام مشکلات کا دفعتاً خاتمہ ہو جائے کیا اس سے بڑھکر ایثار عاشق کا کوئی اور درجہ خیال میں آسکتا ہے ؎

تری الفت سے مرنا خوش نہیں آتا مجھے ورنہ ۔۔۔ یہ ایسا کار آساں اس قدر دشوار کیوں ہوتا

ہنگامۂ بہار آخر ہوا اور بخیۂ چاک گریباں کا ہنگام آپہونچا مگر یقین کا نشۂ دیوانگی خمار ہوش سے تبدیل ہونیکا ننگ قبول نہیں کرتا ؎

بہار آخر ہوئی ہے اب تو سینے دے گریباں کو ۔۔۔ یقیں کرتا ہے کوئی اسقدر دیوانہ پن بس کر

اسقدر سنگلاخ زمین میں ایسا شگفتہ شعر کہہ لینا یقین کی قادر الکلامی کا بین ثبوت ہے۔

"داغ درون سینہ" کو ہمیشہ چشم و چراغ عشاق کا درجہ حاصل رہا ہے یقین بھی اس "شعلۂ خرمن نور" کی شادابیوں کے رہین منت ہیں ؎

یہ سینہ عشق سے محروم درد و داغ نہیں ۔۔۔ ہزار شکر کہ یہ ملک بے چراغ نہیں

محبت کی دیوی پر عشاق کا بھینٹ چڑھ جانا متواترات شاعری میں داخل ہے لیکن یقین نے جس طرح یہ خیال نظم کیا ہے جواب نہیں ہوسکتا کیا بلحاظ شاعری اور کیا بلحاظ واقعیت۔ راقم الحروف کی رائے میں "گل سرسبد" دیوان یقین یہی شعر ہے ؎

یقیں مارا گیا جرم محبت پر زہے طالع ۔۔۔ شہادت اسکو کہتے ہیں سعادت اسکو کہتے ہیں

عاشق کی روداد محبت ایک مشہد تمنا ہے ایک محشر عبرت ہے اسکو سنکر دل قابو میں میں رکھنا از قبیل محالات ہے اس پوری داستان کو صرف ایک لفظ "افسوں" میں اس طرح کھپا دیا ہے کہ تعریف نہیں ہوسکتی ؎

روداد محبت کی مت پوچھ یقیں مجھ سے ۔۔۔ کچھ خوب نہیں سننا افسوں ہے یہ افسانہ

عام طور پر شعرا "عشق بلا سنج" کی تصویر کا ایک ہی رخ دکھاتے ہیں مگر یقین کی نظر اس سے بالاتر ہے وہ ناکام محبت ہوسکنے کے باوجود بھی اس "مائدۂ نعمت" سے اپنے کام و دہن کو ایک حد تک لذت یاب پاتے ہیں ؎

اگرچہ عشق میں آفت ہے اور بلا بھی ہے ۔۔۔ نرا برا نہیں یہ شغل کچھ بھلا بھی ہے

عاشق کی مہر و وفا کا اثر معکوس ایک پامال مضمون ہے لیکن یقین اسی پامال مضمون کو حسن ادا سے معجزہ بنا دیتے ہیں ؎

جور و جفا میں یار بہت ہو گیا دلیر ۔۔۔ کرنے کو کی یہ راس نہ آئی وفا مجھے

فرمایہ عشاق کے داعیات محبت کا سدرۃ المنتہیٰ وصل معشوق ہے اور بس، لیکن ایک حقیقی عاشق کا مقام اس سے ورا الورا ہے وہ صرف رضائے معشوق چاہتا ہے خواہ بصورت وصل حاصل ہو خواہ بشکل ہجر شعر کی جسقدر تحسین کی جائے کم ہے ؎

گزر جا وصل سے گر ہجر میں دیکھے رضا انکی ۔۔۔ محبت میں یقیں لیتا ہے نام مدعا کوئی

فلسفۂ ہمہ اوست کی رو سے حسن صنم جلوۂ صمد کا آئینہ دار ہے پس جو لوگ اس "اتحاد و مجاز و حقیقت" کے رازداں ہیں وہ "باطل" کو "حق" سمجھتے ہیں اور اس "حق" سے روگردانی کرنے والے کو باطل آشنا جانتے ہیں ؎

حق مجھے باطل آشنا نہ کرے		میں بتوں سے پھروں خدا نہ کرے

لاجواب مطلع ہے۔

دیوانۂ عشق فصل بہار آنے سے قبل ہی احتیاطاً پابہ زنجیر کر دیا جاتا ہے لیکن تبسم گل کی اثر آفرینیوں کا یہ شیدائی اس قید بیجا سے مطلق نہیں گھبراتا وہ اپنی قوت ارادی کے بھروسہ پر محافظان زنداں کو متنبہ کرتا ہے کہ تم نے مجھے قید تو کر دیا ہے مگر تمہارا یہ حصول استبداد میرے ولولوں کو دبا نہیں سکتا ؎

اگر زنجیر میرے پاؤں میں ڈالی تو کیا ہوگا		بہار آنے دو میرا ہاتھ ہے اور یہ گریباں ہے

بادصبا کے انفاس جانفزا سے کلیوں کا غنچۂ خاطر کھل جاتا ہے اور وہ کلی سے پھول بن جاتی ہیں اتنا سا مضمون ہے لیکن یقین جو ایک عاشق ستم زدہ ہیں اُن کو بادصبا کے خرام ناز میں جلوۂ قیامت نظر آتا ہے اور غنچوں کی شگفتگی میں چاک گریباں کا عالم یہ شعر حسن التعلیل کی بہترین مثال ہے ؎

نظر آتا نہیں ثابت گریباں ایک غنچہ کا		چمن پر یہ ستم کرتا ہے اے بادصبا کوئی

ناصح مشفق کا دیوانگان عشق کو پند و نصیحت فرمانا ایک دقیانوسی مضمون ہے مگر یقین نے حسن ادا سے اس میں وہ تازگی پیدا کی ہے کہ باید و شاید ؎

گریباں چاک کرنے سے کسی کے کیا تجھے ناصح		ہمارے ہاتھ جانیں اور ہمارا پیراہن جانے

دوسرے مصرعہ کے تیور اس قیامت کے ہیں کہ جواب نہیں ہو سکتا۔

محبت ایک مرض جانستاں ہے اس معمولی سی بات کو کس جوش و خروش کے ساتھ بیان فرماتے ہیں ؎

مفت کب آزاد کرتی ہے گرفتاری مجھے		جی ہی لیکر چھوڑے گی آخر یہ بیماری مجھے

بتان سنگدل اپنے پرستاروں کے ساتھ ہمیشہ سے بدسلوکیاں کرتے چلے آئے ہیں لیکن یقین ایک خوددار عاشق ہیں وہ اپنی مہر و وفا کو بخون غلتیدہ دیکھکر کم حوصلگی سے نہیں بلکہ فرط غیرت سے چیخ اٹھتے ہیں ؎

اپنے بندوں کو جلا کر داغ کرتے ہیں یقیں		ان بتوں کی ضد سے ہو جاؤں مسلماں تو سہی

صرف انہیں شعروں پر موقوف نہیں ہے یقین کا قریب قریب سارا کلام یکساں شستگی و رفتگی رکھتا ہے چنانچہ مصحفی لکھتے ہیں۔

"در تمام دیوانش فصاحت و بلاغت زبان استاد جلوہ ظہور می دہد"

یہیں سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ یقین کی سخن گوئی کا انکار جو انکے بعض معاصرین کی طرف سے کیا گیا اسکی تہہ میں دراصل یقین و مظہر کی "ہمزبانی" کا راز پوشیدہ ہے اور یہ بات ہر شاگرد کے لئے موجب فخر ہو سکتی ہے کہ اس کے کلام کو غیر متوقع طور پر بلند دیکھکر اس کے

استاد سے منسوب کیا جائے اس مسئلہ پر پوری وضاحت کے ساتھ روشنی ڈالی جا چکی ہے "اعادہ و تکرار بیکار ہے لیکن پھر بھی اتنا اور سن لیجئے کہ ملک الشعراء مرزا رفیع سودا ایسے شخص نے یقین کے ایک مصرعہ کی تضمین کی ہے جو انکے کلیات میں موجود ہے تضمین کردہ کا صرف مقطع پیش کرتا ہوں۔

مصرعہ کو یقیں تیرے سودا نے سنا تھا کل — روتا ہے وہ تب سے یوں برسے ہے گویا بادل
ہے رعد نمط نالاں بجلی کی طرح بے کل — پھر پھر کے وہ پڑھتا ہے ہاتھوں کے تئیں مل مل
"کیا کام کیا دل نے دیوانے کو کیا کہئے"

اس تضمین سے ایک طرف تو یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ بقول فتح علی گردیزی یقین کا سارا کلام انکی زندگی ہی میں فرط شیوع و عام حسن قبول سے زبان زد خاص و عام ہو گیا تھا اور دوسری جانب یہ امر پایہ ثبوت کو پہونچتا ہے کہ مرزا سودا یقین کے علو منزلت کو تسلیم کرتے تھے ورنہ ایک "وزدِ سخن" کے کلام کو ہرگز قابل اعتنا نہ سمجھتے۔

مضمون کی طوالت کے خوف سے ہر شعر پر علحدہ علحدہ تبصرہ کرنیکے بجائے یقین کا جس قدر کلام مجھے بہم پہونچ سکا ہے وہ سب یکجا کئے دیتا ہوں قارئین کرام خود فیصلہ فرمالیں۔ پہلے پوری غزلیں لکھتا ہوں۔

کون کرسکتا ہے اس خلاق اکبر کی ثنا — نارسا ہے شان میں جس کی پیمبر کی ثنا
سربراہ اس منہ سے ہوسکتی ہے کب نعتِ رسولؐ — یا ابوبکرؓ و عمرؓ عثمانؓ و حیدرؓ کی ثنا
یہ زباں قابل ہے کب اس بات کے جو کیجئے — حضرتِ زہراؓ کی اور شبیرؓ و شبرؓ کی ثنا
نام احمدؐ کا مجھے انصاف سے لینا نہیں — کی ہے ساری عمر ترکانِ ستمگر کی ثنا
جوں نماز اپنے پہ شام و صبح لازم کر یقیں — حضرت استاد یعنی شاہ مظہر کی ثنا

خوش نہیں آتا ہے بن مجنوں ہمیں صحرا ہنوز — ان غزالوں سے ہمارا جی نہیں لگتا ہنوز
اتبلک کرتا ہے تیشہ کام میں پتھر کے دخل — مانتا ہے کوہکن کے نقش کو خارا ہنوز
مونکالے پر بھی مستی حسن کی اتری نہیں! — بھر رہا ہے مے سے یہ معشوق کی مینا ہنوز
باوجود اسکے کہ ہے زخموں کے مارے خوں میں غرق — آب خنجر کو ترستا ہے جگر میرا ہنوز
ہے یقیں کا عشق میں ہر موز بان احتیاج — اس پہ کم ہوتی نہیں اس کی یہ استغنا ہنوز

رات دن خوباں کو ہے دلہائے مفتوں کا تلاش — روز و شب لیلیٰ کو تھا در پیش مجنوں کا تلاش
اشکِ رنگیں سے گلی کو اس نے مشہد کر دیا[1] — مرگئے ہیں دیکھکر اس چشم پر خوں کا تلاش

---

[1] چمن بے نظیر میں یہ مصرعہ اس طرح تھا "اشک رنگیں سے گلی کو تو نے مشہد کر دیا" مگر "تو نے" یقیناً سہو کاتب ہے "اس نے" ہونا چاہئے۔

جس طرح سے ڈھونڈتے ہیں لوگ خاطر ہائے شاد
اس طرح رہتا ہے مجھکو جان محزوں کا تلاش

جی سے میرے لگ رہی ہے سازوں کی جستجو
جس طرح رہتا ہے افیونی کو افیوں کا تلاش

شاعری ہے لفظ و معنی سے پرے لیکن یقیں
کون سمجھے یاں تو ہے الہام مضموں کا تلاش
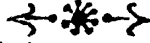
کب سے زنجیر مجھ مجروح دیوانے کی عرض
ہو بختی تھی کان تک اس زلف کاشانے کی عرض

گرمی اہل بزم سے مست کر کے میں ہوتا ہوں داغ
شمع کی خدمت میں ہو اپنے ہی پروانے کی عرض

ہر گھڑی صحرا نشینی پہ نہ کر جرأت یقین
آ گئی تھی راس مجنوں کو بیاباں کی ہوا

آشنا کوئی جہاں میں کبھو بے وفا نہ تھا
ملتے ہی تیرے مجھ سے یہ دل آشنا نہ تھا

سر پر سلطنت سے آستان یار بہتر تھا
ہمیں ظل ہما سے سایہ دیوار بہتر تھا

مرا دل مر گیا جس دن سے نظارے سے باز آیا
یقیں پرہیز اگر کرتا نہ یہ بیمار بہتر تھا

شکوہ حسن سے آنسو ہمارے سوکھ جاتے ہیں
یقیں سورج کے آگے کب اثر رہتا ہے شبنم کا

اس قدر غرق لہو میں یہ دل زار نہ تھا
جب حنا کو ترے پاؤں سے سروکار نہ تھا

دل میں زاہد کے جو جنت کی ہوا کی ہے ہوس
کوچۂ یار میں کیسا سایۂ دیوار نہ تھا

آنکھ سے نکلے یہ آنسو کا خدا حافظ یقیں
گھر سے جو باہر گیا لڑکا سو ابتر ہو گیا

کہوں میں کیونکہ نہ صبح بہار تجھکو کہ آج
جو تو چمن میں نہ تھا گل کے منہ پہ نور نہ تھا

تری جدائی میں کیا کیا جفا اٹھائی ہے
مرے جو پاس تو آتا وفا سے دور نہ تھا

مرا جو کام وفا تھا سو ہو سکا نہ یقیں
دگرنہ اس کی جفا میں تو کچھ قصور نہ تھا

بتاں خون کر کے میر اب لگے آپس یوں کہنے یہ کافر جیتا رہتا تو بت خانے کے کام آتا

نہیں معلوم ابکی سال پیمانے پہ کیا گذرا ہمارے توبہ کرنے سیتے میخانے پہ کیا گذرا

بلو کو اپنے یقیںؔ کی چشم گریاں پہ نہ رکھ مت کر اے گل آبجو میں دامن رنگیں خراب

تری آنکھوں کی کیفیت کو میخانے سے کیا نسبت نگہ کی گردشوں کو دور پیمانے سے کیا نسبت

فصل گل بھی آن پہونچی دیکھئے کیا ہو یقیںؔ ابکی چلتا ہے جنوں پر جی ہمارا بے طرح

سچ کہو اے بلبلو کس باغ سے آتی ہو تم ؟ ہے ہمارے بھی تمہیں کچھ آشیانے کی خبر

تو نہ تھا حیف یقیںؔ ورنہ دوا نہ ہوتا آج اس طرح کا دیکھا ہے پریزاد کہ بس

ناصح سے مجھسکو غم نے کیا شرمسار حیف سو بار پھٹ چکا یہ گریباں ہزار حیف

کوئی دن اور کرنے دو جنوں مجکو بہاراں میں عبث سیتے ہو اسکو کیا رہا ہے اب گریباں میں

شکوہ جفائے یار سے کرنا روا نہیں بندوں کو اعتراض خدا پر روا نہیں
سو سو ہے التفات تغافل میں یار کے بیگانگی سے اس کی کوئی آشنا نہیں
کعبے میں ہم گئے نہ گیا پر بتوں کا عشق اس درد کی خدا کے بھی گھر میں دوا نہیں

فکر مرہم کی مرے واسطے مت کر ناصح خوب ہوتا نہیں اس عشق کا ناسور کبھو

عشق میں ملتی نہیں راحت مگر جوں کوہکن جان شیریں دیجئے تب خواب شیریں کیجئے

یقیں کے واقعے کی سن خبر وہ بدگماں بولا یہ دیوانہ تو ایسا کچھ نہ تھا بیمار کیا کیئے

شب ہجراں کی وحشت کو تو اے ہمدرد کیا جانے جو دن ہٹتے ہیں راتوں کو مجھے تیری بلا جانے

خطا ہے مفت مر کر بار کیوں دیجے رقیبوں کو ہماری ہم سے پوچھو کو ہکن کی کوہکن جانے

یقیں جاتا رہا گر بلبلوں کے ساتھ جانے دو کوئی اس بے مروت دلکو اپنے پاس کیا رکھے

پڑیں پتھر الٰہی اس محبت پر کہ ہو بیکس مرے فرہاد اور پرویز شیریں کو اٹھا لائے

یقیں ہوا مجھے قطرے سے اشک کے معلوم نہ اٹھ سکے جو کوئی آنکھ سے گرا ہووے

جسکو منظور ہو مرنا اسے جینا ہے عذاب ہے دم پاک مسیحا دم شمشیر مجھے

نہ نکلا کام کچھ اس صبر سے اب نالہ کرتا ہوں مری فریاد ہی شاید مری فریاد کو پہونچے

پریشاں خاک سے اٹھتا ہے سنبل اس سے ظاہر ہے کھلے ہیں موے لیلیٰ اب تلک ماتم میں مجنوں کے

دعا مستوں کی کہتے ہیں یقیں تاثیر رکھتی ہے الٰہی سبز جتنا ہے جہاں میں تاک ہو جاتے

کیا دل ہے اگر جلوہ گہ یار نہ ہووے ہے طور سے کیا کام جو دیدار نہ ہووے

ناصحو! یہ بھی کچھ نصیحت ہے کہ یقیں یار سے وفا نہ کرے

جوان مرگی | افسوس ہے کہ عین عنفوان شباب یعنی پچیس ۲۵ سال کی عمر میں یقین کو چرخ کج مدار کی نظر کھا گئی ورنہ بقول حسن صنا گل رعنا

اگر جیتے رہتے تو میر ہوں یا مرزا کسی کا چراغ ان کے سامنے نہیں جل سکتا تھا۔

تمام تذکرے متفق ہیں کہ یقین اپنے باپ کے ہاتھ سے مارے گئے مگر کیوں مارے گئے، اسکو مرزا علی لطف صاحب تذکرہ گلشن ہند کی زبانی سنئے، مارے جانے کو اس کے بعضے تو یوں نقل کرتے ہیں کہ احمد شاہ بادشاہ کے "عہد سلطنت میں بہ سبب کسی حرکت نامعقول کے کہ وہ صادر ہوئی تھی یقین سے، باپ نے اس کے اسکو قتل کیا اور نعش کو اسکی دریا میں بہادیا، اور بعضے کہتے ہیں کہ ارتکاب اس عمل شنیع کا گذرا تھا اسکے باپ کے دھیان میں کہ وہ ممنوع ہے جمیع ادیان میں، یقین نے اس باب میں اکثر متنبہ کیا، ایکدن اس نے خفا ہوکر اس بیچارے کا جی ہی لیا"

تذکرہ گلشن ہند ترجمہ ہے علی ابراہیم خاں خلیل کے تذکرہ گلزار ابراہیمی کا لیکن اکثر ناقص ہے چنانچہ خط کشیدہ فقرے کو بار بار پڑھ جایئے صحیح مطلب سمجھ میں نہ آئے گا تاوقتیکہ علی ابراہیم خاں خلیل کی عبارت پیش نظر نہ رکھی جائے، علی ابراہیم خان لکھتے ہیں۔

"گویند بعہد احمد شاہ بادشاہ بنابر امر ناملائمے کہ از یقین صادر نمی شد او را پدرش کشت و بدریا انداخت و بعضے گویند پدرش ارتکاب امرے داشت کہ ممنوع جمیع ادیان بود او منع می نمود پدرش برآشفت و خونش بریخت"

مگر مولوی قدرت اللہ شوق نے شق دیگر کا ذکر نہیں کیا ہے انکے الفاظ یہ ہیں "در عین عنفوان جوانی پدرش نسبت بقصورے کہ از یقیں بوقوع آمدہ باشد کشت یقین است کہ مغفور شدہ باشد" یہ دونوں متباین بیانات اسقدر مبہم ہیں کہ انکو پڑھکر کسی قطعی نتیجے پر پہونچنا دشوار ہے، البتہ مولوی عبدالغفور نساخ نے سخن شعرا میں حقیقت کے چہرے سے نقاب اٹھا دیا ہے وہ لکھتے ہیں۔

"احمد شاہ بادشاہ کے عہد میں پچیس (۲۵) برس کی عمر میں تہمت زنا پر اپنے والد ماجد کے ہاتھ سے بے گناہ شہید ہوئے" نساخ کا تذکرہ اگرچہ بہت بعد کو لکھا گیا ہے مگر یقیناً انہوں نے یہ روایت کسی مستند ماخذ لی ہوگی اب ان تمام واقعات پر ایک تنقیدی نظر ڈالئے تو معلوم ہوتا ہے کہ یقیناً عشق خونریز کا سفاک ہاتھ یقین کی ہلاکت کا باعث ہوا خود یقین نے اپنی قبل از وقت موت کی پیشینگوئی ایک شعر میں عمداً یا اضطراراً اس طرح کی ہے ؎

یقیں مارا گیا جرم محبت پر زہے طالع
شہادت اس کو کہتے ہیں سعادت اسکو کہتے ہیں

اس شعر کے مفہوم سے بھی یہی مستنبط ہوتا ہے کہ یقین کسی "ترک جنگجو" کے گھایل ضرور تھے اس کے علاوہ عام رنگ کلام بھی یہی بتاتا ہے واقعہ بہر حال کچھ ہو یہ مسلم ہے کہ یقین کی جواں مرگی اور بے گور و کفن لاش ایک عظیم خزینہ ادبیہ سے تعبیر کرنیکے لایق ضرور ہے۔

اولاد | یقین کے سلسلۂ ذکر میں کسی صاحب تذکرہ نے انکی اولاد کے متعلق ایک حرف نہیں لکھا اور حقیقت یہ ہے کہ ان بزرگوں کے زمانے تک تذکرہ نویسی کا معیار ہی اس قدر بلند نہ تھا جو ان خفیف خفیف باتوں کی طرف توجہ کرتے، لیکن مجھے ورق گردانی کی کافی محنت اٹھانیکے بعد سخن شعرا سے ان کے تین بیٹوں کا حال معلوم ہوا۔ (۱) صمصام الدین خاں احمد، (۲) مرید حسین خاں مرید (۳) مقبول نبی خاں مقبول

ان تینوں کی بابت نساخ نے جو کچھ لکھا ہے وہ انہیں کے الفاظ میں پیش کرتا ہوں۔

(۱) "احمد تخلص صمصام الدین خلف انعام اللہ خاں یقین مقیم دہلی سپاہی پیشہ تھے" اسکے بعد یہ دو شعر انکے نقل کئے ہیں ؎

تن کو جلائے یا کہ تو آنسو بہائے شمع
بنتی نہیں یہاں تجھے بن سر کٹائے شمع

فراق گلرخاں میں کھا کے داغ آہستہ آہستہ کیا سینہ کو میں نے اپنے باغ آہستہ آہستہ

۲۔ مرید تخلص مرید حسین خاں دہلوی خلف انعام اللہ خاں یقین "

درد اور غم میں مبتلا ہیں ہم ! دردمندوں کے پیشوا ہیں ہم
مثل سیماب کیوں نہ دل تڑپے آئینہ رو سے اب جدا ہیں ہم
تھا وعدہ سر شام کا پھر اب ہے سحر کا ڈرتا ہوں کہیں صبح کی پھر شام نہووے

۳۔ مقبول تخلص مقبول نبی خاں خلف انعام اللہ خاں یقین شاگرد نثار اللہ خاں فراق

دسترس رکھتا ہے جو پائے حنائی تک رقیب یا الٰہی ہاتھ اوس کا ہووے شانے سے جدا
نہ لگا تو گلے سے یار افسوس !! آہ افسوس صد ہزار افسوس !!
ہر بات میں رکاوٹ طرز ادا تو دیکھو ہر آن میں بگڑنا مہر و وفا تو دیکھو

یوں تو یہ سب شعر اپنی اپنی جگہ صفائی اور برجستگی کا ایک اچھا نمونہ ہیں لیکن مرید حسین خاں مرید کا یہ شعر طرز یکتائی دارد ؎

تھا وعدہ سر شام کا پھر اب ہے سحر کا ڈرتا ہوں کہیں صبح کی پھر شام نہووے

تلامذہ گلستان سخن، آثار الشعرائے ہنود، اور سخن شعرا میں لالہ شیو سنگھ ظہور دہلوی اور لالہ اختیار رام عمدہ کشمیری (برادر راجہ دیا رام پنڈت کشمیری مقیم دہلی) کو یقین کا شاگرد لکھا ہے لیکن تذکرہ فتح علی گردیزی سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ لوگ یقین کے متبع تھے نہ کہ شاگرد۔ ممکن ہے فتح علی کا بیان صحیح ہو اور بعد کے تذکرہ نویسوں نے اس اتباع کو شاگردوں کا مرادف سمجھا ہو، معنوی حیثیت سے دیکھا جائے تو اتباع بھی ایک قسم کی شاگردی ہے پس کوئی وجہ نہیں ہے کہ ظہور و عمدہ کو یقین کا شاگرد نہ کہا جائے۔ اسکے ساتھ ہی اگر انکے "طرز سخن" کا اتباع دوسرے شعراء نے بھی کیا ہے جیسا کہ مصحفی کے بیان اور خود انکے ایک شعر سے ظاہر ہوتا تو بلاشبہ ان سب کو بھی یقین کا خوشہ چین ماننا پڑیگا اور یہی وہ بات ہے جو میر و مرزا کی کمالات کو بھی "نقش ثانی" کا درجہ دینے کی سفارش کرتی ہے، اس سلسلے میں یہ روایت بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ میر مظفر حسین ضمیر استاد مرزا دبیر نے جب مرثیے کے میدان میں علم جدت و اجتہاد بلند کیا تو صاف صاف کہدیا ؎

دس میں کہوں سو میں کہوں یہ درد ہے میرا اس طرز میں جو کہدے وہ شاگرد ہے میرا

ظہور و عمدہ کے کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے۔

ظہور

بہا اس بے بہا کا کیا بھلا ہو سر قاتل پہ جس کا خوں بہا ہو
چشم گریاں حسن سے معمور ہے چاندنی برسات کی مشہور ہے

عمدہ

خراب مجھکو نہ کر جان آشنا اسکر برا کرے ہے کسو سے کوئی بھلا کہہ کر
مرے تابوت پر حاجت نہیں پھولوں کی چادر کی کہ میری نعش پر وہ سرگل اندام ہو نچے گا

فتح علی گردیزی ظہور کو مشہور "خوش بیان و نیکو بیان" بتاتا ہے اور عمدہ کے حال میں لکھتا ہے کہ اسکے شعر "شستہ و رفتہ" ہوتے ہیں۔

حالات عُرفی پر ایک نظر

اور

عبدالمالک صاحب سے تاریخی اختلاف

مجھے عبدالمالک صاحب آروی کے مضمون "خواجہ محمد شیرازی متخلص بہ عُرفی" مطبوعہ نگار بابت ماہ دسمبر ۱۹۲۸ء سے عُرفی کے بعض حالات زندگی کے متعلق اختلاف ہے مجھے اس میں کئی غلطیاں محسوس ہو رہی ہیں، اپنی تحقیقات کی بنا پر اونہوں نے درست تحریر فرمایا لیکن میں ایسی کتاب کی مدد سے انکے دعاوی کو باطل ٹھہرا رہا ہوں جو ۱۰۲۹ھ ہجری میں پایۂ تکمیل کو پہونچی ہے اسکا مؤلف ایک محتاط شخص تھا اور جہاں تک ممکن تھا اس نے پوری تحقیق سے کام لیا۔ جن اشخاص کا ذکر اس نے اپنی کتاب میں کیا ہے اگر وہ ان سے خود ملا جس سے نہ مل سکا انکے قریبی رشتہ داروں سے حالات پوچھ کر اپنی کتاب میں درج کئے ہیں۔ عُرفی کے ذیل میں لکھتا ہے کہ اس کے خالو شمس الانام شیرازی سے حالات دریافت کرکے لکھے گئے ہیں۔ اس کتاب کا نام میخانہ ہے مؤلف کا نام ملا عبدالنبی فخر الزمانی قزدنی ہے، یہ نایاب مگر گراں قدر صحیفہ قریباً ناپید ہو چکا تھا خدا بخشے مولینا شبلیؒ نعمانی مرحوم کو، انہوں نے پہلے پہل اس کتاب کا ذکر اپنی مشہور عالم تصنیف شعر العجم کے ماخذ بیان کرتے ہوئے کیا، اسکے بعد مسیرز عطر چند کپور اینڈ سنز انارکلی لاہور نے بہ تحشی و تصحیح ایم محمد شفیع صاحب ایم۔ اے معلم عربی ۱۹۲۶ء میں شایع کی۔ اب یہ کتاب پنجاب یونیورسٹی لاہور کے امتحانات السنۂ شرقیہ کے درجۂ منشی فاضل میں شامل ہے۔ میری تحقیق کا دار و مدار اسی پر ہے۔

نام و نسب مؤلف میخانہ فرماتے ہیں "حقیقتِ حال آں عندلیب گلستانِ نکتہ پردازی از خالو او شمس الانام نام شیرازی استماع نمودہ دریں اوراق پریشاں تحریر نمود" اس سے ظاہر ہے کہ عُرفی کے حالاتِ زندگی کے متعلق کسی مصنف کے قول کو شمس الانام کے قول پر تفوق و ترجیح نہیں۔ مؤلف میخانہ فرماتے ہیں۔ "کہ چوں ایں ضعیف مآلِ حالِ آں طوطیٔ شکر مقال از و استفسار نمود گفت :- نام پدر عُرفی خواجہ بلوی شیرازی است و ایں خواجہ بلوی در شہر مذکور، در دفتر خانہ ئے شاہی بشغلی، از اشغال حکام آنجا اشتغال داشت و نام پسرش محمد حسین بود در صغرِ سن درمیانِ مردم بمولانا صیدی ملقب گردید یارانِ شیراز باد عُرفی تخلص دادند"۔ اس سے معلوم ہوا کہ عُرفی کا نام جمال الدین نہیں جیسا کہ عام تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے اور نہ خواجہ سید محمد ہے جیسا کہ عبدالمالک صاحب نے تحریر فرمایا۔ عُرفی کے والد کا نام خواجہ بلوی ہے۔ نہ کہ زین الدین علی ملوی۔

اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ عُرفی پہلے صیدی تخلص میں کرتا تھا عُرفی تخلص دوستوں نے تفویض کیا نہ کہ والد کے عہدے کی نسبت سے۔

ولادت و وفات عُرفی ۹۶۶ھ ہجری میں بمقام شیراز پیدا ہوا۔ اور ۱۰۰۲ھ ہجری میں بمقام لاہور وفات پائی" ملا عبدالنبی" لکھتے ہیں ہنوز سنش بچہل نرسیدہ بود کہ در لاہور در سن اثنی والف عالم فانی را وداع کرد روزے اندوزہا تقریب تعزیت پناہ عزت

ومعانی دستگاہ میرزا نظام قزوینی کہ بخشی و دیوان دار العیش کشمیر بود شنیدم کہ گفت در وقتے کہ خبر بیماری عرفی بسمع مبارک جہاں انجم سپاہ جلال الدین
محمد اکبر بادشاہ رسید بمن حکم فرمود تا من ببالین او رفتہ بر مآل احوالش اطلاع یابم و حقیقت مردن و زیستن او را بعد از ملاحظہ بعرض رسانم چوں
نزدیک او شدم دیدم کہ کار برا و دشوار شدہ و نفسش بہ شمار افتادہ پرسیدم چہ حال داری جواب داد کہ "دو دستش دستش پنج" (اس سے
بستر مرگ کی رباعی کی تصدیق نہیں ہوتی) "ہر چہ از وے پرسیدم ہمیں گفت۔ برگشتہ حقیقت حال آں شکستہ پر و بال را بعرض ایستادگان بارگاہ
جلال رسانیدم۔ بادشاہ و اعیان دولت قاہرہ از استماع ایں مقدمہ تعجب بسیار نمودند" تقی کاشی نے بھی یہی تاریخ وفات دی ہے۔

ورود و قیام ہند

چودہ پندرہ سال کی عمر میں ہو کہ عرفی خوبصورتی میں بدر البدر تھا اسکا حسن ضرب المثل لیکن بیس سال کی عمر میں
چیچک نکل آئی جس سے کریہ منظر اور بدگل ہوگیا۔ یہاں تک کہ لوگ اس سے نفرت کرنے لگے عرفی شکستہ دل و آزردہ
خاطر ہوکر ہندوستان چلا آیا جیسا کہ اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے:۔ "در سن چہاردہ و پانزدہ حسن او قبول تمام عیاری بہم رسانیدہ بود و آبلہ
نکشیدہ چوں سال عمرش بہ بست رسید آبلہ سرشاری بر آورد و بعد از انقضائے اشتداد و استخلاص ازاں مرض تغیرے در چہرہ او بہم رسید چنانکہ
ہر کس کہ او را مید ید تنفر میکرد و مولوی ازیں مقدمہ بغایت آزردہ و درہم بود .... بنابراں از وطن خروج کردہ بہ ہندوستاں کہ خانۂ
نشوونمائے نکتہ سنجاں و دار العیار خردمنداں است آمد"

عبدالمالک صاحب کی تحقیق کے مطابق مولینا عرفی ۳۵ برس کی عمر میں ہندوستان آئے اور ایک سال ہند میں رہے لیکن مؤلف میخانہ کے
قول سے اس کی تردید ہوتی ہے بلکہ بموجب روایت خالوی عرفی شمس الانام شیرازی' بیس یا اکیس سال کی عمر میں ہندوستان آنا ظاہر
ہوتا ہے۔ اس حساب سے عرفی کا قیام ہندوستان پندرہ سولہ سال ثابت ہوتا ہے نہ کہ ایک سال۔

تقی کاشی (سیر نگ صفحہ ۳۷) نے لکھا ہے کہ عرفی ۹۹۲ھ ہجری میں براہ دریا ہندوستان آیا۔ پہلے احمد نگر ٹھہرا ہفت اقلیم میں (ذیل عرفی)
ہے "و او از ابتدا از بندر جرون بدکن وارد شد دراں ولایت او را چنانکہ باید دست نداد لاجرم متوجہ ہند شد"۔ ان تمام واقعات کو ہم اس طرح
تطبیق دے سکتے ہیں۔ کہ عرفی بیس اکیس سال کی عمر میں دکن آیا ہو سات آٹھ سال وہاں رہ کر شمالی ہند کی طرف متوجہ ہوا ہو بنا بریں
مورخین کو عرفی کے قیام و ورود ہند کے متعلق غلط فہمی ہوئی ہو لیکن یہ محض قیاس ہی قیاس ہے، قیام دکن پر ہم کوئی روشنی نہیں ڈال سکتے۔
دکن میں وارد ہوا ہو یا نہ ہو یہ تو قطعی طور پر درست ہے کہ وہ ۹۸۶ یا ۹۸۷ ہجری میں شمالی ہندوستان میں وارد ہوا۔

استخوان عرفی کا نجف اشرف پہونچنا

مؤلف میخانہ لکھتا ہے "ملک الشعرائے خراساں میرزا فصیحی در سنہ ہزار و بیست و ہفت شخصے از ہرات بلاہور
فرستادہ بود کہ استخوان مولوی مغفور را بہ مشہد مقدس برند۔ دہ روز قبل از انکہ کس میرزا فصیحی بلاہور
رسد میر صابر[۵] صفاہانی کہ یکے از یاران ایں مجستہ فرجام است استخوان عرفی را بہ نجف اشرف روانہ ساختہ بود، سبحان اللہ نتیجہ ایں بیت او

---

۵ یہ شخص جہانگیر اور شاہجہاں کے عہد میں پہلے صوبہ گجرات کا واقعہ نویس و دیوانی تھا۔ پھر کل دکن کا واقعہ نویس مقرر ہوا۔ امیر نے تمام عمر تاہل اختیار نہ کیا اور تجرد میں
نیک نامی سے زندگی بسر کی ۱۰۴۶ھ ہجری تک وہ واقعہ نویس دکن تھا، نہیں معلوم اس کے بعد کب تک جیا۔

بطور پیوست ؎

بکاوش مژہ از گور تا نجف بروم
اگر بہند بمیرم اگر بہ تتار

عبدالمالک صاحب تحریر فرماتے ہیں: "میر صابر اصفہانی جو غیاث بیگ طہرانی مخاطب بہ اعتماد الدولہ وزیر ہند کی خدمت میں تھے وزیر موصوف سے اجازت حاصل کر کے عرفی کی لاش لاہور سے نکالکر خراسان کی راہ مشہد لے گئے اس حصول سعادت کے دو ماہ بعد نجف اشرف میں پہونچایا۔ اور وفات کے تیس سال بعد عرفی کے ریزہ ہائے استخواں کو حصار نجف اشرف کے باہر جو جگہ "حصار" اور "مقام صاحب الامر" کے درمیان واقع ہے اور جس کو بحیرہ کہتے ہیں۔ دفن کر دیا۔ ملا رونقی ہمدانی نے اس کی تاریخ کہی ؎

بکاوش مژہ از ہند تا نجف آمد　　　رقم زد از پئے تاریخ رونقی کلکم

عبدالمالک صاحب کی تحقیق کے مطابق میر صابر صفاہانی خود استخوان عرفی کو نجف اشرف لے گئے۔ لیکن مؤلف میخانہ لکھتا ہے اس کام کو میر صابر کے ایک آدمی نے سر انجام دیا۔ نیز عبدالمالک صاحب وفات کے تیس سال بعد استخواں کا نجف اشرف پہونچنا لکھتے ہیں۔ لیکن ملّا عبدالنبی فخرالزمانی قزوینی ۱۰۲۶ھ ہجری وفات کے چھبیس سال بعد لاش کا نجف اشرف پہونچنا لکھتے ہیں ملا رونقی کی جس تاریخ کو عبدالمالک صاحب نے بطور سند پیش کیا ہے ہم اسی کو ان کے دعوی کے بطلان میں پیش کرتے ہیں، یہ تاریخ بقول عبدالمالک صاحب عرفی کے ریزہ ہائے استخواں کے نجف اشرف پہونچنے کی ہے جو بقول انکے اس کی وفات کے تیس سال بعد کا واقعہ ہے۔ عبدالمالک صاحب نے عرفی کی وفات ۹۹۹ھ میں واقع ہونا لکھی ہے۔ رونقی کی تاریخ سے ۱۰۳۲ نکلتے ہیں۔ اگر اس سے تیس نکال دئے جائیں، تو ۱۰۰۲ رہجاتے ہیں۔ اور یہی تاریخ وفات عرفی ہے۔ گویا عبدالمالک صاحب نے مؤلف میخانہ کی تائید کرکے اپنے دعوی (وفات عرفی ۹۹۹ھ ہجری) کی تردید کردی۔

فضل حسین تبسم

خزینۂ حسن و عشق

کہا جاتا ہے کہ عشق کا تعلق دل سے ہے اور چونکہ دل میں صرف خون بھرا ہے، اس لئے عشق ایک خونی داستان ہے۔ آئیے خون کی سیر خوردبین میں کریں عاشق کا خون تو غالباً مانا ہی گیا ہے دیکھیں کہ اس کے خونِ دل کے ایک قطرہ میں کیا کیا رازِ حسن و عشق پنہاں ہیں.......:............ واہ کیا دلکش نظارہ ہے.....................!

اس ناچیز قطرۂ خوں میں تو قارون کا خزانہ دفن ہے۔ لاکھوں گول گول ٹکیاں جابجا نظر آتی ہیں گویا کہ دینار سرخ ہیں کہ ادھر ادھر بکھرے پڑے ہیں۔ ان کو اگر متاعِ عشق تصور کیا جائے تو حضرتِ عاشق کا دل دولتِ عشق سے مالامال ہے۔

انہی سرخ ٹکیوں کے درمیان چند سفید اور تاروں کی طرح جگمگاتے ہوئے ذرات بھی نظر آتے ہیں۔ اگر کہا جائے کہ یہ کسی مہروش کے حسنِ دلنشین کی تابش ہے جو عاشق کے خونِ دل کے ذرّوں میں سرایت کر گئی ہے تو بیجا نہ ہوگا۔ غرض یہ کہ دولتِ عشق اور کسی کے حسن کی چمک دمک نے اس قطرۂ خوں میں کچھ ایسی دل آویزیاں پیدا کر دی ہیں کہ:۔

خون کا نظارہ خوردبین میں۔

اجزائے خوں کی سیر حسیں گر کیا کریں
ہر خوردبیں کے نیچے ہمارا لہو رہے

یہ تو خون کا نظارہ ایک شاعر کے نقطۂ نظر سے تھا دیکھیں کہ سائنس دان اس کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں۔ انکے نزدیک یہ گول گول سکہ ہائے عشق صرف ایک قسم کے سرخ رنگ سے بھری ہوئی ٹکیاں ہیں جنکا کام یہ ہے کہ تازہ ہوا یعنی آکسیجن (oxygen) کو ہمارے بدن کے ہر گوشہ میں پہونچائیں اور نیز ملی ہوا یعنی کاربونک ایسڈ گیس (Carbonic acid gas) کو ان گوشوں سے نکالکر جسم کے باہر لیجائیں۔ سائنس کے اس خیال کے مطابق عاشقوں کا آہ سرد بھرنا اور ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں لینا نہایت مفید ہے۔ کیونکہ جتنی لمبی اور گہری سانس کھینچی جائے گی اتنی ہی زیادہ تازہ ہوا خون میں شامل ہوگی اور خراب ہوا جسم سے باہر نکل جائیگی اس لئے عاشقوں کو طولِ شبِ فراق اور آہوں کی اذیت کا گلا فضول ہے، یہ تو ان کے حق میں نعمت غیر مترقبہ ہیں۔ ہاں لحاف یا چادر

میں منہ لپیٹ کر آہیں بھرنا بیشک بہت نقصان دہ ہے کیونکہ خراب ہوا بار بار پھیپھڑوں میں داخل ہو کر خون کو خراب کر دیگی۔ ڈاکٹر رائے دیتے ہیں کہ علی الصباح کھلے میدانوں میں لمبی اور گہری سانسیں لینے سے تندرستی پر بہت اچھا اثر پڑتا ہے۔ عاشقوں کیلئے صرف اتنی نصیحت کافی ہے کہ جب کھلے میدانوں اور باغوں وغیرہ میں تشریف لیجائیں تو کسی کی جفاؤں اور بیدردیوں کا خیال کر لیا کریں، بس یہی انکی جسمانی تندرستی کے لئے بہترین علاج ہے۔

معمولی انسان کو تو مصنوعی سانسیں لینے کی ضرورت ہے، لیکن عاشق کی ہر آہ فطری اور حقیقی معنوں میں گہری ہوا کرتی ہے۔ خون کے سفید ذرات سائنس دانوں کے نزدیک ہمارے جسم کے سپاہی ہیں جو ہر مرض کے جراثیم پر نہایت سختی سے حملہ آور ہوتے ہیں اور اکثر انہیں پسپا کر دیتے ہیں۔ سائنٹیفک معلومات کی ترقی کے ساتھ ساتھ ہر مرض کے جراثیم برابر دریافت ہو رہے ہیں۔ عشق بھی ایک مرض ہے ممکن ہے کہ کسی زمانہ میں اس کے جراثیم کا بھی پتہ لگ جائے اور اس مرض لادوا کی دوا بھی دستیاب ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ سفید ذرات کی جتنی زیادہ تعداد خون میں ہوگی اسی قدر کم انسان کسی مرض میں مبتلا ہوگا، اور برخلاف اس کے ان کی تعداد جتنی کم ہوگی اتنی ہی جلد انسان امراض کا شکار ہو جائے گا۔ اس سے ثابت ہوا کہ عاشق خون کے سفید ذروں کی کمی کی وجہ سے بہت جلد مرض عشق میں مبتلا ہو جاتا ہے اور معشوق ان ذروں کی زیادتی کی وجہ سے عرصہ تک اس کے اثرات سے محفوظ رہتا ہے۔ اس کا پتہ تو جب ہی چل سکتا ہے کہ عاشق و معشوق کے خون کا مقابلہ خوردبین میں کیا جائے۔ لیکن کس عاشق کو اتنی تاب ہے کہ وہ کسی کے خون کا تصور بھی کر سکے، چہ جائیکہ اس کا تماشہ خوردبین میں دیکھے۔

احتشام علی۔ ایم۔ ایس سی

تذکرۂ خندۂ گل

یعنی

ظریف شاعروں کا تذکرہ

نہایت تیزی کے ساتھ چھپ رہا ہے اور یقین ہے کہ فروری کے اخیر تک مکمل ہو جائے گا۔ جن حضرات نے دو روپیہ پیشگی بھیجدئے ہیں۔ ان کی خدمت میں طباعت کے بعد بذریعہ رجسٹری فوراً روانہ کر دیا جائے گا۔

اب بھی موقعہ ہے کہ آپ دو روپیہ بھیجکر نصف قیمت میں اسے حاصل کریں۔ ورنہ طباعت ختم ہونے پر چار روپیہ سے کم اسکی قیمت نہ ہوگی اور محصول علاوہ اسکے ہوگا۔ کیونکہ اسکا حجم ۵۰۰ صفحات سے زیادہ ہوگا۔

اردو زبان میں یہ پہلا تذکرہ ہے جسمیں تمام قدیم و جدید ظریف شاعروں کے حالات، ان کے لطایف اور انتخاب کلام کو یکجا کر دیا گیا ہے۔

"مینیجر نگار، لکھنؤ"

شیخ الشیوخ حضرت نصیر الدین محمود گنج معانی رحمۃ اللہ علیہ

محمود نام، نصیر الدین کنیت، چراغ دہلی اور گنج معانی لقب اور عرف ہے۔ والد کا نام شیخ یحییٰ تھا، وہ عبد اللطیف یزدی کے بیٹے تھے۔ اصلاً خراسانی ہیں۔ نسب کے متعلق اختلاف ہے، بعض نے سید لکھا ہے، بعض فاروقی کہتے ہیں اور بعض کے نزدیک خالدی ہیں لیکن ان سب میں قابل ترجیح نسبت فاروقی ہے۔ سیادت و خالدیت محض دعویٰ ہے، کوئی ثبوت نہیں، اور نسبت فاروقی حضرت فاروق اعظم تک منتہی ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں اس روایت کے حامل بھی کئی تذکرے ہیں، اور سب میں قریب قریب ایک ہی سلسلہ نسب مرقوم ہے، مثلاً سیرت المحمود۔ روضۃ الاخیار۔ احوال الاتقیا، تذکرۃ الاولیا، سیر السالکین۔ اقتباس الانوار اس وقت پیش نظر نہیں[۵۱]

شیخ عبد اللطیف کے اسلاف قدیم الایام سے خراسان میں رہتے تھے اور یہ خاندان تقریباً ایک صدی سے اپنی نجابت و شرافت، تقویٰ وطہارت، اور علم و دولت کی وجہ سے بہت مشہور و ممتاز تھا۔ لیکن بدقسمتی سے عبد اللطیف کو وہ زمانہ ملا جب دولت مٹ چلی تھی، اور سارے ساز و سامان رخصت ہو کر صرف ایک علم باقی رہ گیا تھا، جو اس فلاکت و بیچارگی کے زمانہ میں رفیق و ہمدم تھا۔ مصیبت کے مارے وطن سے نکلے، گھر سے نکلتے ہی بلاؤں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ جو کبھی دو قدم پیدل نہ چلے تھے، اب انھیں کوسوں اور منزلوں چلنا پڑا، جن عورتوں نے کبھی گھر کے باہر قدم نہ رکھا تھا، انھیں صحرا نوردی کرنی پڑی، اور یہ مصیبت زدہ خاندان معیشت کی تلاش میں برسوں آوارہ و سرگرداں رہا۔ مگر وہ جو کہتے ہیں کہ قسمت کے لکھے کو کوئی مٹا نہیں سکتا، ان مصیبت زدوں کی قسمت کا لکھا بھی کسی طرح نہ مٹا، جہاں گئے بدقسمتی ساتھ گئی۔ اور بخت کی نارسائیوں نے ہر جگہ ناکامی کا منھ دکھایا۔ ان پیہم ناکامیوں سے اکثر کی ہمتیں ٹوٹ گئیں، اور وہ تارک الدنیا ہو گئے۔ لیکن جو شیر دل اور قوی بازو تھے وہ اپنی طلب میں سرگرم رہے، اور بالآخر کامیابی سے ہم آغوش ہوئے۔

انھیں خوش نصیب جواں ہمتوں میں شیخ عبد اللطیف بھی تھے۔ جو آٹھ نو برس تک در در کی ٹھوکریں کھاتے رہے مگر کسی ناکامی سے دل تنگ نہ ہوئے، اسی سعی و تلاش میں انھوں نے ہندوستان کا رخ کیا، اور لاہور پہونچکر قسمت آزمائی میں کامیاب ہو گئے یہاں زمانے نے پوری مساعدت کی، بُرے دن پلٹ گئے، قسمت جاگی اور تین چار مہینہ میں عبد اللطیف کا طالع چمک اٹھا[۵۲]

اس کی تقریب اسطرح ہوئی کہ ایک جاگیردار کو اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لئے ایک نیک ذات ادیب اور فارغ التحصیل عالم کی ضرورت تھی۔ یزدی حسن اخلاق اور علم و فضل کی دولت سے مالا مال تھے جو کچھ پڑھا تھا سب ازبر تھا، معقول و منقول میں یکساں فرمانروائی تھی اس پر مستزاد یہ کہ زبان و قلم کے بھی مالک تھے، جہاں بیٹھ جاتے اپنا رنگ جما دیتے۔ جاگیردار سے ملاقات ہوئی تو وہ ایک ہی صحبت میں دلدادہ ہو گئے، دل کھول کر اس جوہر کامل کی قدر کی سارے گھر بار کا مالک بنا دیا، اور اپنی بیٹی عقد میں دیکر پندرہ ہزار کی جاگیر داماد کے نام لکھدی

---

۵۱ روضۃ الاخیار ۱۲ ۵۲ سیر السالکین ۱۲

مگر یزدی بلند فطرت تھا، اس نے اپنی نظر ہمیشہ اونچی رکھی، وہ جاگیرداری کے عیش و آرام میں بھی سپاہی بنا رہا[1]۔

خدا نے اس رشتہ کو بہت کامیاب کیا، اور یحییٰ نامی ایک بچہ پیدا ہوا جو صورت و سیرت کے لحاظ سے عجیب چیز تھا۔ یزدی کو یحییٰ سے بہت محبت تھی، ذرا بھی ماتھا گرم ہو جاتا تو وہ تلملا جاتے، نہ کھانے کا ہوش رہتا نہ پینے کا، وہ معمولی معمولی بیماریوں میں کئی کئی راتیں آنکھوں میں کاٹ دیتے تھے[2]۔ لیکن اس دیوانی محبت کے ساتھ یہ تیور بھی دیکھو کہ تعلیم کی طرف سے ایک دم کو غافل نہ ہوئے، اور پیار ایسا نہ کیا کہ بیٹا مرزا پھویا بن جائے[3]۔ انھیں اپنی مصیبت کے دن یاد تھے، وہ چاہتے تھے کہ یحییٰ کو خراب عادتوں سے بچائے رکھیں، قلم و تلوار کا دھنی بنائیں، رزم و بزم، عیش و مصیبت، تنگی و فارغ البالی سب کے مزے چکھا دیں[4]۔ لیکن خدا کو ان کی یہ آرزو آرزو ہی رکھنی منظور تھی، وہ یحییٰ کی تربیت مکمل کرنے سے پہلے چل بسے، اسوقت یحییٰ کی عمر کل بارہ برس کی تھی[5]۔

مگر یحییٰ کی ماں امام بیبیہ کی ماں تھی۔ شوہر کے مرتے ہی وہ مرد بن گئی، اور بیٹے کی تعلیم و تربیت کا انتظام ایسے سلیقہ سے اپنے ہاتھ میں لیا کہ لوگ حیران رہ گئے۔ دور دور سے استاد بلوائے، جہاں ضرورت ہوئی ساتھ لے گئی، امتحانوں میں خود جا کر دیکھا، دن کا پڑھا ہوا سبق رات کو اپنے سامنے بٹھا کر یاد کرایا۔ اس کے علاوہ شہ سواری، نیزہ بازی، تیر اندازی، تحریر و تقریر سب چیزیں سکھائیں، اور پچیس برس کی عمر میں یتیم یحییٰ کو قابل رشک نوجوان بنا دیا۔ سیرت المحمود میں یحییٰ کی زبانی لکھا ہے کہ ان کی والدہ نے ان کی تعلیم پر ساٹھ ہزار روپیہ سے زیادہ خرچ کیا تھا۔ کبھی کبھی استاد رات دن گھر پر رہتے تھے، اور فنون سپہ گری کے ماہروں کی خدمات اسطرح حاصل کی گئی تھیں کہ ان کے کل مصارف برداشت کئے جاتے تھے۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد یحییٰ ماموں کی دعوت پر نیض آباد آ گئے۔ ماموں کا کاروبار دیکھ کر آنکھیں کھل گئیں۔ وہ ایک معزز عہدہ دار اور بہت بڑے زمیندار تھے۔ والدہ نے ان کی لڑکی سے ان کا پیام دیا، شادی ہو گئی، اور اس سنگم سے امرت کی وہ چوہ سلسبیل نکلی جس نے اپنے خاندان کو ہمیشہ کے لئے زندہ کر دیا۔ والدین نے اس کا نام محمود رکھا تھا، لیکن وہ نصیر ملت و دین تھا۔ فرشتوں نے آسمانوں میں اور انسانوں نے زمین پر اسے چراغ دہلی اور گنج معانی کے نام سے پکارا۔

کہتے ہیں فولاد جب کسی اچھی دھات سے مل جاتا ہے تو اسکی خوبیاں کئی گنا بڑھ جاتی ہیں۔ شیخ محمود ماں کی طرف سے سید اور باپ کی طرف سے فاروقی تھے۔ سیادت و فاروقیت جب ملی تو سنگ پارہ لعل شب تاب بن گیا۔ محمود کو اپنے نسب پر بہت ناز تھا، کہتے تھے یہ اللہ کی ایسی رحمت ہے کہ شکر ادا نہیں کر سکتا، اور نہیں چاہتا کہ اس نشہ سے ایک دم کو بھی میرا دماغ خالی ہو۔ جسطرح ددھیال نجابت و شرافت میں مشہور و ممتاز تھی، اسی طرح ننھیال بھی اپنی عالی نسبی میں ضرب المثل تھی۔ یہ لوگ صرف نام کے سید نہ تھے، بلکہ حقیقی اور عملی سید تھے، تیغ و قلم کے ساتھ صداقت، پاکبازی، زہد، تقویٰ اور حیرت پسندی ان کی شہادت کا اصلی رنگ روپ تھا۔

تذکرہ نویسوں نے بچپن کے جو حالات لکھے ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ستارۂ بلندی اسی زمانہ سے چمکنے لگا تھا۔ پاکی اور

---

[1] سیرت المحمود و اخبار الاولیا ۱۲ [2] اخبار الاولیا ۱۲ [3] حکایات الصالحین ۱۲ [4] سیرت المحمود ۱۲ [5] حکایات الصالحین ۱۲ [6] سیرت المحمود ۱۲

نفاست کا بہت خیال تھا، عبادت کے بیحد شائق تھے، کھیل کود سے بھاگتے، اور پڑھنے لکھنے کی طرف دوڑتے تھے۔ اسپر ذکاوت حاضر جوابی، فراست اور حافظہ وگویائی نے اس مجموعۂ خوبی کو اور قیامت بنا دیا تھا۔ جس استاد سے پڑھتے وہ عاشق ہوجاتا۔ مولانا عبدالکریم شیروانی کہتے ہیں۔ میری ساری عمر پڑھنے پڑھانے میں گزری، لیکن ایسا ہونہار بچہ میں نے کوئی نہیں دیکھا۔ نصیر الدین نے پڑھانے کا مزہ کھو دیا، اب ایسا عالم نہیں ملیگا۔ آپ یہ باتیں سنتے تو خدا کا شکر ادا کرتے، اور کہتے کہ اس کا مستحق میں نہیں ہوں بلکہ وہ ہے جس نے مجھے یہ دولت عطا کی ہے۔ اسکی عنایت شامل حال نہ ہوتی تو میں کیا کرسکتا تھا۔[۱]

اخبار الاولیا میں لکھا ہے کہ شیخ محمود نے صرف تین مہینے میں سارا قرآن حفظ کر لیا تھا، اور حافظہ اتنا قوی تھا کہ اپنا سبق یاد کرکے اوروں کے سبق بھی یاد کرلیتے تھے۔

مولانا فخر الدین زرادی سے شیخ یحیی کے بہت گہرے مراسم تھے، ان کے بلانے پر محمود دہلی بھیجدیئے گئے، یہاں انھوں نے سات آٹھ برس رہکر مختلف علوم کی تحصیل وتکمیل کی اور نہایت محنت وجانفشانی سے درجۂ تبحر حاصل کیا۔ اس سلسلہ میں جن شیوخ علم سے استفادہ کیا، ان میں مولانا فخر الدین زرادی، مولانا علاء الدین نیلی، مولانا فخر الدین گیلانی، مولانا رکن الدین خجندی، مولانا وجیہ الدین پائلی، مولانا نجیب الدین بھکری، مولانا جلال الدین اودہی، مولانا صدر الدین نادی اور مولانا شمس الدین یحیی کے نام بہت نمایاں ہیں۔ آپ نے مولانا یحیی کی تعریف میں عربی میں ایک قصیدہ بھی لکھا تھا، اس کا ایک شعر یہ ہے[۲]

سالت العلم من احیاک حقاً   فقال العلم شمس الدین یحیی

ایک دفعہ مولانا شمس الدین یحیی کے ساتھ حضرت محبوب الٰہی سے ملنے گئے، انھوں نے پوچھا کچھ پڑھتے ہو بولے ہاں فی الحال مولانا سے ابن سینا کی اشارات پڑھ رہا ہوں۔ انھوں نے بعض مشکل مقامات پوچھے، آپ نے کہا اگرچہ مولانا پوری طرح سمجھا چکے ہیں، اور مجھے کوئی اعتراض بھی نہیں ہے، لیکن ہنوز قلب مضطرب ہے، شیخ نے ایک مختصر سی تقریر میں پہلے ابن سینا کا نظام فلسفہ سمجھایا، پھر ان مقامات کی ایسی واضح تشریح کی کہ آپ مطمئن ہوگئے۔ اس ملاقات کے بعد سے آپ اکثر ان کی خدمت میں جایا کرتے تھے۔[۳]

اخبار الاولیا میں یہ آمد ورفت نسبت بیعت کی وجہ سے لکھی ہے، لیکن یہ غلط ہے۔ اس سفر اور اس ملاقات کو بیعت سے کوئی واسطہ نہیں۔ اس زمانہ میں آپ لیلائے علم کے سودائی تھے۔ اور رات دن اسی کے لئے سرگرداں رہتے تھے۔ البتہ اس ملاقات سے آپ حضرت محبوب الٰہی کے علم وفضل کے معتقد ہوگئے تھے۔ تذکرۃ الفضلا میں لکھا ہے:۔

"اثبات را اعتقاد در حق او راسخ شد، بعد از مدتے مرید شد وبمرتبۂ کمال رسید"

باوجودیکہ آپ کا زیادہ وقت لکھنے پڑھنے میں گزرتا تھا، تاہم آپ کے دوست بکثرت تھے۔ آپ جب دہلی آئے تو یہ دنیا بالکل اجنبی تھی، لیکن چند روز میں یہ اجنبی دنیا وطن بن گئی اور بیگانے یگانے ہوگئے۔ کوئی مشہور وممتاز مدرسہ ایسا نہ تھا جس کے طالب علم

---

[۱] روضۃ الاخبار، سیرت المحمود، حکایات الصالحین [۲] سیرت المحمود [۳]

اسیر محبت نہ ہوں۔ جوہر قابل کو دیکھکر استاد بھی دوستوں کی طرح ملتے تھے[۱]، اور دہلی کے تمام علمی حلقوں میں آمد رفت شروع ہوگئی تھی۔
سیرت المحمود میں لکھا ہے کہ دہلی کے جن جن مدرسوں میں پڑھا تھا، ہر جگہ تمام شاگردوں کے لئے استاد کے جانشین رہے۔

اُسی زمانہ میں وعظ و غلبہ کا سلسلہ بھی شروع کر دیا تھا اور رسائل و مقالات بھی لکھتے رہتے تھے۔ یہ رسائل اتنے مقبول ہوگئے تھے[۲] کہ اکثر مدرسوں میں داخل درس ہوگئے تھے۔ لیکن جب زندگی میں انقلاب پیدا ہوا تو دنیا بدل گئی اور تمام رسائل جمع کر کے آگ کے نذر کر دئے[۳] کہ

این جملہ قیل و قال پامال شود!

عہد طالب علمی کی ان عالمانہ شہرتوں نے آپ کو دربار شاہی تک پہونچا دیا تھا۔ خصوصاً شہزادہ محمد تغلق سے دوستانہ مراسم ہوگئے تھے۔ یہ اسکی طالب علمی کا زمانہ تھا، بے تکلف ہوکر ملتا اور نیاز مندی سے پیش آتا تھا۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے آپ سے کچھ استفادہ بھی کیا تھا۔ جب آپ دہلی سے رخصت ہوئے تو مشایعت میں وہ بھی شریک تھا اور بہت سے تحفے تحائف ساتھ کئے تھے[۴]

اس علم و فضل اور شہرت و عزت کے ساتھ جب آپ وطن پہونچے، تو دور و نزدیک دھوم مچ گئی، اور سارا فیض آباد ایک رات کے لئے شہر چراغاں بن گیا۔

دو تین برس وطن میں رہکر مزید تحصیل علم کے لئے بیرون ہند کا سفر کیا، کئی برس مصر اور عراق و حجاز میں پھرتے رہے۔ مختلف شیوخ سے حدیث کی سماعت کی۔ حجاز و یمن اور نجد کے ادیبوں سے علم ادب حاصل کیا۔ شافعی، حنبلی، مالکی طریقوں کے فقہا سے بزنگ محدثانہ فقہ کا درس لیا۔ پھر ایران، کاشغر، سمرقند، بخارا، فرغانہ وغیرہ کا سفر کرتے ہوئے براہ افغانستان ہندوستان میں آئے۔ یہاں اس زمانہ میں سلطان محمد تغلق سریر آرائے ملک و دولت تھا، اس نے سنا تو آپ کو دہلی ہوتے ہوئے جانے کی دعوت دی اور وزارت دینی کا عہدہ پیش کیا۔ آپ تیار ہوگئے اور یہ ٹھیرا کہ وطن سے واپس ہوکر جائزہ لے لیں گے۔ مگر خدا کو یہ منظور نہ تھا، اور اس سے زیادہ معزز بنانا چاہتا تھا۔ جس کے آگے یہ سربلندی ادنیٰ ترین پستی تھی، مشیت کی چارہ گری سے وطن آکر پے در پے ایسے صدمات و حوادث میں مبتلا ہوئے کہ پریشان ہوگئے، یکایک والدہ کا انتقال ہوگیا نو برس کا ایک بچہ مرا، والد پر فالج گرا، بیوی بیمار ہوگئیں[۵] اور اندر باہر کے تمام کاروبار درہم و برہم ہوگئے۔ ان وجوہ سے مجبوراً جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ اعلیٰ عہدے کیلئے انتخاب ہی بڑی چیز ہوتا ہے، گو قلمدان وزارت ہاتھ میں نہ آیا، مگر یہ بات ساری مملکت میں پھیل گئی، ہزاروں نظروں کا مرکز بن گئے، دیوان خانہ دربار عام بنا رہتا، لوگ خدمت میں حاضر ہونا فخر سمجھنے لگے۔ علما کی گردنیں بھی دست بوسی کے لئے جھکنے لگیں اور اک دنیا اس شمع پر پروانہ وار ٹوٹ پڑی۔ تذکرۃ الفضلا میں لکھا ہے:۔

"ہر جا کہ رفتے مخلوق جوق جوق بخدمت شریفش حاضر گشتے، بیشتر مردم تلمذ بوے انتخاب می کردند، و علما بدست بوسی کردلا مفتخر و مبتہج می بودند"

جاگیر کا انتظام ایسی خوش اسلوبی سے کیا کہ سال بسال آمدنی میں اضافہ ہونے لگا، ہر چھٹے مہینے سارے علاقہ کا دورہ کرتے،

---

[۱] حکایات الصالحین و تذکرۃ الفضلا ۱۲ [۲] سیرت المحمود ۱۲ [۳] سیرت المحمود و تذکرۃ الاتقیا ۱۲ [۴] سیرت المحمود ۱۲

آمد خرچ کا حساب کتاب لین دین کے معاملات اپنی نگرانی میں رکھے، مقدمات کے فیصلے خود کرتے تھے[۱]۔ قابل تعریف بات یہ تھی کہ باوجودیکہ زندگی بھر ان باتوں سے علیحدہ رہے، تاہم اسطرح کام کیا جیسے کوئی بہت ہی آزمودہ کار کرتا ہے۔ بعض خوش عقیدہ تذکرہ نویسوں نے اس حسن انتظام کو بھی خرق عادت لکھا ہے، ان کے خیال میں آپ ولی مادرزاد تھے[۲]۔

لیکن علم کا نداق ان مصروفیتوں میں بھی خدمت علم سے نہیں رہا، اس کا جوش ان کاروبار میں بھی شباب پر رہا، اور نشر علوم و معارف، انہدام بدعت و قیام شریعت کے فرائض اسی طرح انجام پاتے رہے جس طرح عہد فراغ میں انجام پاتے تھے، سیرت المحمود میں لکھا ہے:۔

"غالب وقت در افادہ علم گزشت، وکار حفظ شریعت نیز انجام پذیرفت"۔

مولوی احمد علی نامی ایک صاحب آپ کے سخت مخالف تھے، اس مخالفت میں بدنام کرنے کی کوئی تدبیر ایسی نہ تھی جو انھوں نے نہ کی ہو۔ اخلاق و ایمان کے ذلیل سے ذلیل الزام لگائے، اور بری سی بری صورت میں پیش کیا، لوگوں میں طرح طرح کی افواہیں اڑائیں۔ لیکن۔ انھوں نے جتنی برائیاں کیں سب انھیں کے خبث نفس کا ثبوت بن گئیں۔ ہر ایک کی نظروں میں ذلیل و خوار ہوگئے۔ مگر اس جلن میں بری فطرت بد سے بدتر ہوگئی۔ گالیاں دیتے تھے۔ جان کے درپے ہوگئے۔ شیخ محمود فضائل اخلاق کا پتلا تھا، وہ یہ باتیں سنتا تو افسوس کرتا۔

ایک روز اتفاق سے مولوی صاحب ایک جگہ مل گئے، اور حسب عادت نہایت ترشروئی سے پیش آئے، لیکن گرم لوہے کو ٹھنڈا لوہا کاٹ دیتا ہے، یہ ترشروئی بھی خندہ پیشانی سے کٹ گئی۔ جسکی قدر اندازیاں ساری دہلی کو نخچیر بنا چکی ہوں، اس کے لئے ایک دل کو اپنے فتراک میں باندھ لینا کیا مشکل تھا۔ دیکھتے ہی ان کی طرف بڑھے اور لطف و محبت کے انداز سے چند باتوں میں وہ جادو کیا کہ مولوی صاحب قدموں پر گر پڑے، بولے: "مولانا! میں بہت شرمندہ ہوں، خدا کے واسطے مجھے معاف کر دیجئے"۔ آپ نے انھیں گلے سے لگا لیا، اور کہا "میرے عزیز! اس کا غم نہ کرو، میرا دل صاف ہے"[۳]

غرض امیرانہ شان و شوکت اور عالمانہ جلال و جبروت کی یہی انجام سے بے خبر زندگی تھی جس کی آغوش میں آپ سودہ راحت تھے، اور کوئی نہ جانتا تھا کہ مستقبل قریب میں کیا ہونے والا ہے۔ ہر غرض مند، ہر وارستہ دامن، ہر ذلہ ربائے خوان کرم کی یہی دعا تھی کہ خدا اس در کو ہمیشہ قائم رکھے۔ مگر قسمت کا لکھا ان مٹ ہوتا ہے، اس کے آگے شاہ و گدا بے بس ہیں، نہ کسی کا زور اسکو بدل سکتا ہے۔ نہ کسی کی عاجزانہ دعائیں۔ جب وقت آیا تو تقدیر پوری ہوئی، اس پیدا و پنہاں معشوق نے ماسوا کی محبت دل سے نکال کر اپنی لگن لگا دی، آنکھوں کو اپنا جلوۂ عریاں دکھا کر تڑپا دیا۔

بظاہر اس انقلاب کی ابتدا جس واقعہ سے ہوئی وہ بہت معمولی ہے۔ ایک دفعہ شیخ محمود کہیں جا رہے تھے، دابستگان دامن دولت کا ہجوم ساتھ تھا، ناگاہ ایک مجذوب سے ملاقات ہوگئی، اس نے کہا "مولانا! کہاں جاتے ہو؟" لیکن محمود نے سنی ان سنی کر دی، انھوں نے پھر پوچھا: "مولانا کہاں جاتے ہو؟ لیکن محمود نے اب بھی کچھ جواب نہ دیا، اور منھ موڑے آگے بڑھ گئے۔ یہ دیکھکر مجذوب غیظ و غضب سے بھر گیا، آنکھیں انگارے کی طرح سرخ ہوگئیں، چہرہ تمتما اٹھا، رونگٹے کھڑے ہوگئے، جسم سے آگ کے شرارے نکلنے لگے، اور وہ ایک رعد آسا آواز کے ساتھ

---

[۱] سیرت المحمود و اخبار الاولیا ۱۲ [۲] حکایات الصالحین ۱۲ [۳] سیرت المحمود، حکایات الصالحین و اخبار الاولیا ۱۲

محمود کا ہاتھ پکڑ کر بولا: "او مردود نابکار! بتا تیرے پاس وہ کون سی چیز ہے جس پر تو اتنا مغرور ہو گیا ہے؟ کیا یہ جھوٹی عزت؟ یہ مصنوعی شہرت؟ یہ فانی دولت؟ یہ علم جس پر جہل بھی ہنستا ہے؟ مگر او کم ظرف! یہ ایسی کون سی چیزیں ہیں جن پر تو گھمنڈ کرتا ہے؟ ہاں تو بد گہر تھا، تیری فطرت ذلیل تھی، تیرے ظرف میں علم و دولت کے لئے سمائی نہ تھی، تو ذرا سی پونجی لیکر اچھل پڑا، لیکن او مغرور! یہ تیری دیوانگی ہے، اسوقت سے ڈر جب خدا کی فطرت تجھے پکڑے گی، اور تیرے پاس اس فرعونیت کا کوئی جواب نہ ہوگا۔ تو اجلی اجلی، خوش وضع، قیمتی پوشاکیں پہنکر اکڑتا ہے، لیکن کہیں تو نے کبھی اپنے باطن کو بھی دیکھا کہ وہ کتنا غلیظ اور سیاہ ہے، آج تو زمین پر اتراتا ہے، مگر یاد رکھ کہ کل تجھے آسمانوں میں ذلیل ہونا پڑے گا۔"[۵۱]

آپ نے اسوقت تو یہ باتیں جبراً و قہراً سن لیں، اور اُن سے پیچھا چھٹا کر خوب مذاق اڑایا، لیکن یہ تیر خالی جانے والے نہ تھے، آہستہ آہستہ دل میں اُتر گئے۔ یہ جاڑے کی چوٹ تھی جو اسوقت تو کچھ نہ معلوم ہوئی مگر ہڈی ہڈی میں بیٹھ گئی۔ فطرت صالحہ کو ایک اشارہ کافی تھا، وہ یہ مہمیز پاتے ہی اپنی راہ لگ گئی۔ اب شب و روز یہی فکر تھی کہ کسی طرح ان کار و بار سے جھٹکارا پائیں اور کسی گوشہ میں بیٹھکر یاد دلدار سے جی بہلائیں۔ مگر وہ دلدار کہاں تھا؟ دل میں ہر وقت اسی نامعلوم کو ڈھونڈھنے کا جذبہ بیقرار رکھتا تھا۔ عزیز و اقارب اس جذب وحشت سے بہت متفکر تھے، انھوں نے تفریح کے لاکھوں سامان پیدا کئے، دوستوں نے ہر طرح جی بہلانے کی کوشش کی، لیکن یہ درد ایسا نہ تھا جو کسی رمال سے جلا جائے۔ عشق کی آگ میں جل جل کر تڑپنا مقسوم تھا، تڑپتے رہے، گریبان کا چاک دامن کے چاک سے آملا، گھر کو چھوڑ دیا، مال و دولت پر لات ماردی، اور دشت و صحرا میں آبلہ پا سر ٹکراتے پھرے۔ لیکن اس سے کیا ہو سکتا تھا، دل کی وحشت زدگی کے لئے شہر و ویرانہ دونوں ایک ہیں، دل کی ویرانیاں جنگل کی سنسانیوں سے آباد نہیں ہو سکتیں۔

اسی وحشت کے عالم میں پھرتے پھراتے روہیل کھنڈ کی طرف نکل آئے، یہاں ایک دوست مل گئے، وہ آپ کو ایک زمانہ میں بڑی شان و شوکت سے دیکھ چکے تھے، اب اس حال میں دیکھا تو رو پڑے۔ پوچھا "نصیرالدین! خیر تو ہے؟ یہ تم کس حال میں ہو؟ بولے ہاں اچھا ہوں، جس حال میں ہوں خوش ہوں، دعا کرو کہ خدا میرے مقصد میں مجھے کامیاب کرے۔" انھوں نے کہا: میرے ساتھ دہلی چلو، وہاں شاید کوئی صورت نکلے، آپ نے کہا، مجھے یہیں رہنے دو، وہاں جاکر کیا کروں گا، میرا جی انھیں بیابانوں میں بہلتا ہے[۵۲]

لیکن وہ مجبور کرکے اپنے ساتھ دہلی لائے، یہاں جس نے دیکھا افسوس کیا، اور اپنے اپنے خیال کے موافق ہمدردی کی کہ ان کا منشاء نظر صرف ظاہری کامیابی نہیں، مگر اہل نظر میں جس نے دیکھا خوش ہوا۔ قاضی محی الدین کاشانی مل کر بولے۔ نصیرالدین یہ کیفیت مبارک ہو۔ لہذا اپنا مہمان بنا کر تربیت دی[۵۳]

حسن اتفاق سے قاضی اسی زمانہ میں بیمار ہوگئے اور یکایک مرض اتنا بڑھ گیا کہ زیست کی امید نہ رہی۔ حضرت محبوب الٰہی عیادت کو تشریف لائے۔ قاضی اسوقت بیہوش تھے، شیخ نے اپنا ہاتھ ان کے منھ پر پھیرا، وہ فوراً ہوش میں آگئے، اور طبیعت ایسی بحال ہوگئی کہ جیسے بیمار ہی نہ ہوئے تھے۔

---

[۵۱] سیرۃ المحمود، اخبار الاولیا، روضۃ الاخبار ۱۲ [۵۲] حکایات الصالحین ۱۲ [۵۳] سیرۃ المحمود ۱۲

آپ یہ دیکھکر ششدر رہ گئے، اور یہ سمجھ کر کہ میرے درد کی دوا یہی کریگا، اک عجیب انداز سے اٹھے اور روتے ہوئے شیخ کے قدموں پر گر پڑے۔ انھوں انھوں نے شفقت سے آپ کا سر اٹھا کر سینہ سے لگا لیا، اور دیر تک سینہ سے لگائے تسکین دیتے رہے۔ کہتے ہیں شیخ کا ہاتھ لگتے ہی اک ٹھنڈک سی میرے سارے جسم میں دوڑ گئی، سارا رنج و غم سکون و مسرت سے اور تمام درد و تپش کشف و مشاہدہ سے بدل گئی، اور میں ایسا محسوس کرنے لگا کہ میں دنیاوی زندگی ختم کر کے نئے جنم میں آگیا ہوں۔ چلتے وقت میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لئے مجھے اپنے ہاں لے گئے اور میری مشکل آسان کردی"۔ ۱ف

بیعت ہونے کے بعد رات دن سلسلہ کے اشغال و اذکار کے سوا کسی سے سروکار نہ تھا۔ بیشتر اوقات تنگ و تاریک گوشوں میں بیٹھکر اپنا کام کرتے۔ رات کا سونا بالکل چھوڑ دیا تھا، ابتداء سلوک میں معمولی روزے رکھتے تھے، لیکن بعد کو ایک ایک ہفتہ کا روزہ رکھنے لگے، ۲ف اس پر جوش و پر خلوص محنت و ریاضت سے آپ ساری بزم میں ضرب المثل ہوگئے۔ اور ان لوگوں سے بھی آگے بڑھ گئے جو آپ سے پہلے اس راہ میں قدم رکھ چکے تھے۔ حضرت محبوب الٰہی ان باتوں کی وجہ سے آپ پر بہت عنایت فرماتے، اور ہمیشہ اپنے پہلو میں جگہ دیتے تھے۔ عام مرید اور عقیدت مند شیخ کے مزاج میں آپ کا یہ درخور دیکھ کر بہت قدر و منزلت کرنے لگے، اور آپ کا حجرہ بھی ایک چھوٹا سا دربار بن گیا ۳ف لیکن اب آپ کا رنگ دوسرا تھا، ان باتوں سے دل سیر ہو چکا تھا، ہنگامہ آرا بزم افروزیاں اسی وقت تک اچھی معلوم ہوتی تھیں جب تک حقیقت سے دور تھے۔ اب جو حقیقت کا رخ زیبا دیکھ لیا تو سب سے بیزار ہوگئے، اور مدام اسی میں مشغول و مستغرق رہنے لگے، تھوڑی دیر کی مشغولیت دنیا بھی بیحد گراں گزرتی تھی۔ لوگوں کے ہجوم و ہنگامہ میں دن بدن زیادتی دیکھکر حضرت امیر خسرو کے ذریعہ شیخ سے کہلوایا کہ یہاں رہنے سے مشغولی میں فرق آتا ہے، حکم ہو تو کسی اور سنسان مقام پر چلا جاؤں اور فراغ خاطر سے عبادت کروں" حسب معمول حضرت امیر خسرو نے آپ کا پیغام عرض کردیا شیخ نے کہا۔ نصیر الدین سے کہو کہ تمہیں اسی مزاحمت میں رہکر اپنا کام کرنا چاہیئے، وہ سلوک ناقص ہے جو جنگلوں میں تکمیل پاتا ہے چنانچہ آپ بدستور وہیں رہے اور "دل بہ یار و دست بکار" کے اصول پر کاربند ہوگئے ۴ف

بیعت کے پانچویں چھٹے برس حضرت محبوب الٰہی نے مدینہ منورہ جانے کا حکم دیا۔ آپ ایک خادم کو لیکر فیض آباد ہوتے ہوئے روانہ ہوگئے درقریب قریب دو سال مقیم رہے ۵ف۔ خلوص، محبت اور سچی طلب کے یہ دو سال آپ کی سالکانہ زندگی کے لئے دو صدیوں سے بھی زیادہ تھے جن ہیں مقامات کی سیر کی، جو جو کیفیتیں طاری ہوئیں بیان سے باہر ہیں۔ ناسوت سے جبروت و لاہوت و ہاہوت کا کوئی گوشہ ایسا نہ تھا جو نہ دیکھ ڈالا ہو اور جسکی ہر منزل سے پوری طرح نہ گزر گئے ہوں۔ ایک مراقبہ کی کیفیت ہے: میں نے اپنے جسم کو دیکھا کہ نور ہو کر عرش کو محیط ہو گیا ہے، وراس نور کے اثرات آسمان و زمین کے سارے عالموں میں پہونچ رہے ہیں۔ پھر میں نے دیکھا کہ میرا دل رواں ایک صورت ہو گیا ہے، اور ہر صورت بالکل میری سی ہے۔ اس کے بعد میں نے دیکھا کہ تمام زمینیں اور تمام آسمان، تمام انفس اور تمام آفاق اپنے اصلی رنگ میں میرے سامنے کھڑے ہیں، اور کل افعال و اسماء، آثار و صفات پر میری دسترس ہوگئی ہے۔ اسی کے ساتھ میرے کانوں میں اک ایسے نغمہ کی آوازیں آنی شروع

۱ف حکایات الصالحین و سیرت ۲ف روضۃ الاخیار ۳ف اخبار الاولیا ۴ف سیر الاولیا و اخبار الاخیار ۵ف سیر السالکین ۱۰

ہوئیں کہ محو بر محو آمیز بیخودی طاری ہو گئی ۔ اسی میں عین ذات کے بے نقاب نظارہ سے مشرف ہوا ۔ اسی زمانہ میں حضور سرور کونین صلی اللہ وسلم کی زیارت سے بھی کئی بار شرف اندوز ہوئے ۔ تمام صحابہ اور انبیا سے ملاقاتیں کیں، اور یہ کیفیت اتنی بڑھ گئی کہ چشم باطن کے کشف و ذوق ہی سے نہیں بلکہ چشم ظاہر سے بھی ان کو دیکھتے، اور اُن سے گفتگوئیں کرنے لگے ۔ اور یہ واقعہ تو بہت مشہور ہے کہ آپ نے محی الدین ابن عربی، امام غزالی، جلال الدین رومی، عثمان ہارونی، مودود چشتی، ابو اسحاق شامی، شیخ جیلانی، امام بخاری اور عین القضاۃ ہمدانی سے ان کے خاص خاص مسائل کے متعلق بالمشافہ گفتگوئیں کی ہیں ۔ فرماتے تھے : یہ بات مجھے مدینہ طیبہ جانے اور وہاں رہنے ہی سے حاصل ہوئی ۔ میں پہلے محض زیارت کیلئے مدینہ جانے کا قائل نہ تھا، لیکن اب معلوم ہوا کہ قرب زمان کی طرح قرب مکان بھی بے اندازہ رحمت و برکت کا باعث ہوتا ہے اور اپنے پچھلے اعتقاد پر توبہ کرتا ہوں[1] ۔

یہاں کے قیام میں وہ شہرت حاصل ہوئی کہ اس صدی میں شائد ہی کسی کو حاصل ہوئی ہو ۔ اخبار الاولیا میں لکھا ہے کہ : ایک جہان نے شرف وابستگی حاصل کیا، اور دنیائے اسلام سے دیار نبی میں آنے والے علماء و مشائخ نے اعتراف کیا کہ : ایں آفتابے ست کہ مثل ماہزاراں ستارہ ہا در سایۂ او گم اند" سیرت المحمود میں لکھا ہے :-

علماء از دور و نزدیک بخدمت رسیدند، و امراء ازترک و تاجیک بشرف حضور بہرہ ور گردیدند، مشائخ عہد ارادت آوردند، اکابر زمانہ بتواضع برخاستند"

تذکرۃ الفضلا میں ایک قادری بزرگ کے الفاظ مرقوم ہیں کہ :-

ذات بابرکات ایشاں آیتے بود از آیات الٰہی، و نعمتے بود از نعمائے ربانی "

اور یہی نہیں کہ صرف انھوں ہی نے اعتراف کیا ہو، صرف دوستوں نے ہی نے تربیت کی ہو، صرف متعلقین و متاخرین ہی نے نیازمندی کا اظہار کیا ہو ۔ بلکہ آپ کے حسن کا اصلی کمال یہ تھا کہ دشمنوں نے بھی کمال علم و طریقت کا اعتراف کیا[2]، بزرگوں اور استادوں نے بھی گردنیں جھکائیں اور قاضی محی الدین کاشانی نے جو آپ کے استاد بھی تھے اور راہ سلوک کے اولین رہنما بھی، ایک جماعت کے سوال پر کہا : بدولت ایشاں صبح طلاشد و ذرہ ہا آفتاب"[3] (باقی)

[1] سیرت المحمود اخبار الاولیا و حکایات الصالحین [2] حکایات الصالحین [3] سیرت المحمود

تاریخ عرب کی ایک روایت جمیل

پہلی صدی ہجری کا ایک واقعۂ حسن و عشق

اور معاویہ و حسین کے کردار کا فرق

وہ روایت جو اس مختصر مضمون کی بنیاد ہے، کوئی فرضی واقعہ نہیں بلکہ ایک تاریخی حقیقت ہے جسے مسعودی صاحب اغانی ابن قتیبہ، حموی، اور ابن بدرون وغیرہ نے بیان کیا ہے۔

اس واقعہ سے نہ صرف تاریخ عرب کا اگر ایک یہ باب سامنے آتا ہے کہ خلفاء راشدین کے بعد امویین کی حکومت کیا اسلوب اختیار کر رہی تھی، اور انکی حیات اجتماعی میں کن اخلاق کا نشو و نما ہو رہا تھا، تو دوسری طرف معاویہ کے بالکل برعکس حسین کی سیرت کا وہ نمونہ بھی سامنے آتا ہے، جو بعد کو "ذبح عظیم" کی صورت میں حکومت بنی امیہ پر ایک ایسی بے لاگ تنقید کر گیا جس کی نظیر دنیائے حق و صداقت میں مشکل سے دوسری مل سکتی ہے۔

اسی کے ساتھ یہ بھی معلوم ہوگا کہ اس زمانہ میں اہل عرب کی "طرح ادب" کس ذوق سے وابستہ تھی اور انکے ہاں ایک "عورت" کی تکمیل نسائیت کا صحیح معیار کیا تھا۔

نیاز

افراد:-

حسین	=	ابن علی مرتضےٰ
معاویہ	=	ابن ابی سفیان (امیر وقت)
یزید	=	معاویہ کا بیٹا اور ولی عہد
رقیق	=	معاویہ کا معتمد علیہ نوجوان غلام
عبداللہ بن سلام	=	والیِ عراق
ارینب	=	عبداللہ بن سلام کی بیوی اور اپنے عہد کی بے مثل جمیل عورت
ابوہریرہ	=	صحابی رسولؐ

ابوالدرداء = صحابی رسول

معاویہ کی ایک جوان لڑکی

(رات کا وقت - یزید اپنے کمرہ میں مسند زرکار پر مغموم سا بیٹھا ہوا ہے، عود وعنبر کا دھواں فضا کو معطر کئے ہوئے ہے، سامنے
اسباب بادہ خواری مہیا ہے، اور رفیق (معاویہ کا غلام) سامنے خاموش حکم کا منتظر ہے)

یزید (جام شراب ہاتھ میں لیکر) "اے رفیق، میں نے تجھے اس لئے یاد کیا کہ آج ترکِ نشاط کا عہد کرنے والا ہوں اور شاید تجھ سے بہتر شاہد اس کا
اور کوئی نہ ہو سکتا (جام رفیق کی طرف بڑھا کر) لے، اس کو باہر جا کر کہیں دور پھینک آ اور یہ سارا سامان چور چور کر ڈال۔ رفیق، جا، جلدی کر، یہ خون کے
گھونٹ کب تک پیونگا، اور دل کی آگ کو کہاں تک اس طرح اور بھڑکاتا رہوں گا۔"

رفیق (دوزانو ہو کر یزید کے ہاتھ سے جام لیتے ہوئے) "اے خاندان امیہ کے چشم وچراغ، تعمیل حکم مجھ پر فرض ہے، لیکن اگر کبھی کبھی غلام کی گستاخیاں
معاف کی جا سکتی ہیں، تو مجھے پوچھنے دیجئے کہ اس وقت سرزمین عرب کی وہ کونسی دولت ولذت ہے جو آپ کے قدموں تک پہونچنے کی آرزومند
نہیں اور وہ کیا آزار ہو سکتا ہے جو عرب کے ایسے حسین وجمیل شاہزادہ کو اسدرجہ ملول بنا دے؟

یزید۔ (منہ پھیر کر) "رفیق، جا، اصرار نہ کر، دل کا چھالا پھوٹتا ہے، تو زہراب بنجاتا ہے، بہتر یہی ہے کہ میرا آزار، راز ہی رہے، ورنہ ممکن ہے کہ اسکا
اظہار خود میرے لئے اور زیادہ باعث زحمت ہوجائے۔"

رفیق۔ (کمر سے پیش قبض نکالکر یزید کے سامنے رکھتے ہوئے سر جھکا کر) لاعلمی کی حالت میں اصرار کئے جانا اور ہلاک ہوجانا اس سے بہتر ہے کہ زندہ رہوں
اور اس علم کے ساتھ کہ آپ نے مجھے رازداری کا اہل نہ سمجھا۔ اگر آپ کو اخفاء پر اصرار ہے تو مجھے اس بے اعتباری کی زندگی بسر کرنے سے انکار۔ رفیق
اب اپنا سر لے کر یہاں سے واپس نہیں جا سکتا۔ اس لئے میں ادھر جام پھینکتا ہوں اور ادھر آپ اس پیش قبض کو میری گردن پر پھیر دیجئے

یزید۔ (پیش قبض کو لیکر دور فرش پر پھینکتے ہوئے) رفیق کیوں مجھے مجبور کرتا ہے کہ اپنے غم میں تجھے بھی شریک کروں جبکہ اسکا مداوا دنیا میں کوئی نہیں
امیر المومنین (امیر معاویہ) کی پدرانہ شفقت، امیرانہ حرمت کونسی ایسی ہے جو مجھے حاصل نہیں، لیکن یہ میری بدقسمتی کی انتہا ہے کہ باوجود ان تمام
الطاف خسروانہ کے میری بے نوائی کا وہی عالم ہے اور میری مجبوریاں علی حالہا قایم۔

اگر زندگی کی حقیقی راحت ومسرت، اگر حیات کی سچی لذت وعذوبت کا تعلق کبھی قلب وروح سے بھی ہو سکتا ہے تو مجھ سے زیادہ ماتم گسار
اور کون ہو سکتا ہے کہ ٹھیک اسی وقت جبکہ میرا جسم ملبوس زرکار سے آراستہ نظر آتا ہے، میری روح ایک گدا کی طرح محتاج ہے اور
جس وقت دنیا حشم وخدم کے ساتھ مجھے دیکھتی ہے، میرا قلب ایک ویرانہ کی طرح سنسان ہوتا ہے۔

میری یہ امیرانہ زندگی، یہ شاہانہ سطوت، یہ ملوکانہ اقتدار، یہ خسروانہ جاہ وجلال، حقیقتاً یہ سب ایسے پردہ کے نقش ونگار ہیں جس کے اٹھ جانے
کے بعد سوائے سوگ اور ماتم کے کچھ نظر نہیں آسکتا۔

جسم سے نہیں میرے قلب سے پوچھ کہ اس نرم مسند سے زیادہ سنگ خارا کوئی اور ہو سکتا ہے، کام ودہن نہیں روح سے دریافت کر
کہ ان نعائم ولذائذ سے زیادہ گرسنگی کوئی اور ہو سکتی ہے۔ دنیا جس وقت مجھے نشۂ شراب میں بدمست دیکھتی ہے۔ اس وقت مجھ پر خود اپنا ہی

خون پینے کا جنون ہوتا ہے، اور زمانہ جب مجکو نغمہ و موسیقی دکھتا ہے، تو اسوقت میری ہستی یکسر فریاد و آہ ہوتی ہے، لیکن کس سے کہوں کہ کوئی رازداں نہیں، اور کیوں کہوں جب میرے درد کا کوئی درماں نہیں۔"

رقیق "سچ ہے، مجھ میں نہ رازداں بننے کی اہلیت اور نہ تلاش درماں کا سلیقہ، لیکن یہ تو آپ بھی جانتے ہوں گے کہ آپ کے ساتھ اپنا دل کھانے اور آپ کے قدموں پر اپنی جان دیدینے کی تمیز مجھ میں ضرور ہے، اس لئے مجھے اسکا موقعہ دیجئے، اسکی اجازت دیجئے، حیران ہوں کہ معاویہ کا مٹا، سفیان کا پوتا جس کا مردانہ عزم سنگین سے سنگین قلعہ فتح کرسکتا ہے، وہ ایک عورت کے نرم و نازک دل کی طرف سے اس درجہ خائف ہو، دنیا میں بھی تو سنوں کہ حرم کی کنیزوں، امراکی بیٹیوں میں وہ کون ایسی بدنصیب ہے جو آپ کی پرجوش محبت کی قدر کرنا نہیں جانتی۔ حسن وشباب نہایت بیش بہا دولت ہے، لیکن مجھے معلوم ہے کہ اس سے زیادہ ارزاں سودا بھی کسی اور چیز کا نہیں ہوتا۔ کچھ کہئے تو سہی کیا یہ عتاب حبابہ و عطرار رباب وسلمہ پر ہے، یا کوئی اور سرزمین نجد کی لڑکی ہے جسنے آپ کو اسقدر دیوانۂ محبت بنا رکھا ہے۔"

یزید۔ (ایک آہ سرد کے ساتھ) "نہ وہ میری کنیزان حرم میں سے حبابہ و عطرا ہے نہ نجد کی کوئی لیلیٰ۔ بلکہ وہ عراق کی تاتاری کی شراب ہے، بابل کے باغ کی بہار ہے، وہ ارنیب ہے اور خوش نصیب عبداللہ بن سلام، والی عراق کی بیوی، جس کے حصول کے لئے میں صرف وہ ایک لمحہ چھوڑ کر جس میں اس کے لب میرے لب سے متصل ہوں، اپنی ساری زندگی دیدینے کے لئے آمادہ ہوں۔ اے رقیق تونے اُسے نہیں دیکھا اس لئے شاید مجھ پر ہنسے لیکن باور کرکہ صحرائے عرب آج تک کوئی ایسا غزال رعنا پیدا نہیں کرسکا، اور نہ سرزمین شام نے ایسی سیہ چشم نازنین آج تک کبھی دیکھی، اسکی رعنائی ایک ایسا تیر ہے جو ایک بار دل میں پیوست ہو جانے کے بعد نکالا نہیں جاسکتا، اس کی چشم شہلا کی ہر نگاہ غلط انداز ایک ایسا کرشمہ ہے جس میں بیک وقت سحر بھی ہے اور شراب بھی جو مسحور بھی کر دیتا ہے اور مخمور بھی۔ اس کی لانبی سیاہ پلکیں جنکی ہر جنبش بہ حالت التفات رگ جاں ہے اور بہ صورت عتاب نوک سناں، ...... اس حریر سے بنائی گئی ہیں جسے نازنینان رومائی نرم و چلبلی انگلیاں طیار کرتی ہیں۔ وہ اس کے نازک لب جن کے دیکھنے کے بعد ہی گلاب کی ملفوف پنکھڑی کا مفہوم ذہن میں آسکتا ہے، ایک ایسا سرچشمہ حیات ہیں جس سے سیراب ہونے کے لئے جان کی قربانی صد درجہ ناقص تعبیر شوق ہے۔ وہ اس کا صبیح رنگ، جس سے آفتاب طلوع صباح کا استعارہ کرتا ہے، وہ اس کے سیاہ بال، جن سے برسات اپنی بھیگی ہوئی خنک رات طلب کرتی ہے، وہ خوبصورت دانت جس سے الماس اپنے سرمایۂ ضیا کا آرزومند ہے، وہ رخسار جن سے شمع محفل کسب نور کرتی ہے، اور اسی طرح اس کے جسم کا ہر ہر حصہ، اس کی خوش ادائیوں کا ایک ایک کرشمہ، اس کی عشوہ طرازیوں کا ایک ایک رمز الگ مستقل دنیائے لذت ونشاط ہے، جس کے اظہار کے لئے عالم نقش و شعر میں اس وقت تک کوئی نقاش وشاعر پیدا ہی نہیں ہوا .... میں بتاؤں کہ میں نے کب اور کس عالم میں اول اول اسے دیکھا تھا۔ آہ، کلیجہ شق ہو جانا چاہتا ہے.... وہ ابھی دوشیزہ تھی، اس کی شراب حسن ناچشیدہ تھی اور کیف و مستی رمیدہ، ایک رات، وہ ایک ظالم رات جب میں نے اسے دیکھا، تو اپنے تمام ملکوتی جمال کے ساتھ، وہ زینت و آرایش کا بھی مجسمہ تھی اور ایک تقریب میں اپنی بہت سی ہمسن لڑکیوں کے ساتھ مصروف نشاط تھی، میں نے پوشیدہ طور پر ساری رات اسکو محو لہو ولعب دیکھا اور نہیں کہہ سکتا کہ کھیلتے ہی کھیلتے اس نے کتنی بار اور کس کس طرح، میری روح، اور میری حیات کا سودا کر لیا اس عمر میں خدا معلوم کتنی حسین لڑکیاں میری نگاہ سے گذر چکی ہیں جنکے حسن و جمال جن کے شاعرانہ ذوق اور نغمہ و موسیقی نے مجھے مانوف کیا اور میں ان کی قدر کرنے پر

مجبور ہوگیا، لیکن میرا ذروں کے سامنے جھک جانا اس وقت تک تھا جب تک آفتاب زینب کے آفتاب حسن نے میرے سامنے طلوع نہ کیا تھا۔ لیکن جس وقت اس نے طلوع کیا تو میں اس کے سامنے جھک گیا، اس کو پوجنے لگا اور عہد کر لیا کہ ساری عمر اس کی پرستش میں صرف کر دوں گا۔

اس رات اس نے جن کمالات نسائی کو پیش کیا ان کا اظہار بالکل محال ہے، وہ اس کا بلند ذوق شعری، وہ برجستہ و برمحل فصیح و بلیغ فقروں کا استعمال، وہ اس کا جاں نواز لحن، وہ اس کا رعشہ براندام کرنے والا رقص، الغرض اس کی وہ تمام دلربائیاں جنہیں مشکل سے ایک تصور انسانی ایک جگہ فراہم کر سکتا ہے حقیقی صورت میں میرے سامنے تھیں اور میں زندہ تھا!

رفیق، تو یقین کر کہ اس واقعہ کے بعد ایک ہفتہ تک مجھ پر مدہوشی کی سی کیفیت طاری رہی اور اس کے بعد جب میں نے دریافت حال کیا تو معلوم ہوا کہ اس درمیان میں عبداللہ بن سلام سے اس کا عقد ہو چکا ہے۔ تو اندازہ کر سکتا ہے کہ یہ خبر سنکر مجھ پر کیا گذری ہوگی اور اب میں کیونکر دنیا میں بسر و رزندگی بسر کر سکتا ہوں۔ اے رفیق اگر تیری کوئی تدبیر اس باب میں کامیاب ہوگئی تو میرے اور تیرے درمیان خدا ہے کہ مجھ سے زیادہ انعامات کی بارش کرنے والا تجھے کوئی نہ ملیگا۔

رفیق "آپ پر میری جان فدا ہو۔ کیا مجھے اس سے زیادہ کسی انعام کی خواہش ہو سکتی ہے کہ آپ نے مجھے اپنا راز دار بنایا اور کیا میں حصول تمنا کے لئے کوئی دقیقہ کوشش کا اٹھا رکھوں گا۔"

(یزید سر پکڑ کر رہجاتا ہے اور رفیق پردہ کھول کر باہر نکل جاتا ہے)

(۲)

(صبح کا وقت معاویہ کی خلوت گاہ، معاویہ ٹہل رہے ہیں اور رفیق انسے باتیں کر رہا ہے)

معاویہ - "یقیناً میں نے یزید کو اپنا جانشین نامزد کرنے میں غلطی کی، اور جو دن گزرتا ہے مجھے اپنی اس غلطی کا احساس زیادہ ہوتا جاتا ہے۔ غضب خدا کا شب و روز میخواری، رات دن فسق و فجور اور ہر لحظہ ایک نئی معصیت کی جستجو، میں نہیں سمجھتا کہ اگر یہ میرے بعد خلیفہ ہو بھی گیا تو کون اس کی عزت کرے گا اور عباس و علی کا خاندان کب اسکو حکومت کی مہلت دیگا۔"

رفیق - "امیر المومنین کا ارشاد بجا و درست ہے، لیکن غلام کا خیال یہی ہے کہ یزید کی موجودہ زندگی کی ذمہ داری بڑی حد تک ان لوگوں پر بھی ہے جو اپنے آپ کو اسکا بزرگ سمجھتے ہیں۔"

معاویہ - "(غصہ کی حالت میں کھڑے ہو کر) رفیق یہ تو نے کیا کہا، کیا تیرا مطلب یہ ہے کہ میں نے اس کو معصیت میں مبتلا کیا، مینے اس کو شراب کا عادی بنا دیا، میں نے اس کے بیوقوف دماغ میں گناہ کا خیال پیدا کیا؟"

رفیق (ہات جوڑ کر) نہیں، اے امیر المومنین نہیں۔ یہ کون کہہ سکتا ہے، اس خلاف حقیقت بات کو کون مان سکتا ہے، لیکن میرا مطلب یہ ہے کہ بعض اوقات انسان حالات سے مجبور ہونے کے بعد بھی بعض گناہوں میں مبتلا ہو جاتا ہے یہاں تک کہ اگر وہ اسباب نہ پیدا ہوتے تو شاید وہ گمراہ نہ ہوتا۔ اور مجھے یقین ہے کہ یزید کی میخواری اس کی فطرت نہیں بلکہ مجبوری ہے۔

معاویہ۔ "مجبوری! مجبوری کیا ہوسکتی ہے۔ میں کبھی اس کے ماننے کے لئے طیار نہیں"

رفیق۔ "امیرالمومنین، جب انسان پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑتا ہے تو وہ اپنی جانبری کی ہر ممکن تدبیر کرتا ہے۔ اگر یزید ارنیب کی طرف سے مایوس ہوکر ان مشاغل تفریح سے اپنے نفس کو دھوکا نہ دیتا تو وہ غریب کب کا ہلاک ہوگیا ہوتا۔ اور اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اگر آج ارنیب حاصل ہوجائے تو کل یزید سے زیادہ متقی، کوئی ہو نہیں سکتا"

(معاویہ خاموش، سر جھکا کر رہ جاتے ہیں اور دیر تک یہی عالم رہتا ہے۔ رفیق باہر جانا چاہتا ہے، معاویہ اس کو روک لیتے ہیں)۔

معاویہ۔ "رفیق، تجھ کو یقین ہے کہ یزید کی زندگی میں انقلاب ہوجائے گا اگر ارنیب مل گئی"

رفیق۔ "اے امیرالمومنین، ایسا ہی یقین ہے، جیسے اس وقت طلوع آفتاب کا"

معاویہ۔ "اچھا، کاتب کو بلالا"

(کاتب آتا ہے)

معاویہ۔ "عبداللہ بن سلام والی عراق کے نام میری طرف سے ایک خط لکھو کہ جسقدر جلد آسکتے ہو میرے پاس آجاؤ، کیونکہ ایک مہتمالے ہی فلاح وبہبود کا سامنے ہے"

(۳)

(عبداللہ بن سلام، معاویہ کا مہمان ہے اور نہایت عزت واکرام کے ساتھ ایک جگہ ٹھہرا دیا گیا ہے۔ معاویہ، ابوہریرہ اور ابوالدرداء کے ساتھ اپنے مکان میں بیٹھے ہوئے گفتگو کر رہے ہیں)

معاویہ۔ "(ابوہریرہ اور ابوالدرداء سے) آپ لوگوں کو معلوم ہے کہ میری بیٹی جوان ہوگئی ہے اور میں اس کی شادی کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے عبداللہ بن سلام کو پسند کیا ہے۔ آپ لوگوں کی کیا رائے ہے"

دونوں۔ "انتخاب اچھا ہے اور آپ کی رائے بہت مناسب معلوم ہوتی ہے"

معاویہ۔ "تو پھر آپ جاکر عبداللہ بن سلام کو میری طرف سے یہ پیغام دیجئے، یقین تو ہے کہ وہ منظور کرلے گا"

(وہ دونوں جاتے ہیں۔ امیر معاویہ، کنیز کے ذریعہ سے اپنی لڑکی کو طلب کرتے ہیں۔ لڑکی اندر داخل ہوتی ہے۔)

معاویہ۔ "جس وقت ابوہریرہ اور ابوالدرداء تیرے پاس آکر عبداللہ بن سلام کے ساتھ شادی کرنے کا پیغام تجھ کو دیں تو اس پیغام کو مسرت سے سننا اور جواب دینا کہ مجھے کوئی عذر نہیں، سوائے اس کے کہ فی الحال ارنیب اس کے پاس موجود ہے اور ایسی صورت میں میری غیرت شادی کی اجازت نہیں دیتی، اگر وہ اس کو طلاق دیدے تو بیشک میں راضی ہوں"

(۴)

(عبداللہ بن سلام اپنے خیمہ میں منتظر بیٹھا ہوا ہے اور ابوالدرداء اور ابوہریرہ پردہ کھولکر اندر داخل ہوتے ہیں۔)

ابوہریرہ۔ "معاویہ بہت مسرور ہے کہ تم نے اس تعلق کو خوشی کے ساتھ قبول کیا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ معاویہ نہ صرف امیر وقت ہی، بلکہ صحابی رسول

اور کاتب رسول ہونے کا بھی فخر اُسے حاصل ہے۔ پھر یوں بھی شرافت و سیادت، نجابت و امارت ہمیشہ سے اس خاندان میں چلی آرہی ہے، اس لئے یقیناً تم کو خوش ہونا چاہئے کہ اس نے اپنے خاندان میں تم کو شامل کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ لیکن اس کی لڑکی کو اس امر میں اعتراض ہے کہ ارزینب کے ہوتے ہوئے وہ تمہارے ساتھ مسرت کے ساتھ زندگی بسر کر سکے۔ اس لئے اب صورت صرف یہ رہجاتی ہے کہ تم ارزینب کو طلاق دو، یا اس رشتہ سے ہاتھ دھو"

(عبداللہ یہ سن کر گھبرا جاتا ہے اور افسردگی اس کے چہرہ پر چھا جاتی ہے۔)

ابوالدرداء۔ "یقیناً تمکو ارزینب کا چھوڑ دینا بہت شاق ہوگا، کیونکہ علاوہ حسن و جمال، تہذیب و شائستگی کے محبت دیرینہ کا خیال بھی اس کے منافی ہے، لیکن اگر تم سمجھتے ہو کہ معاویہ کے خاندان میں شامل ہونا تمہارے لئے باعث فلاح ہوسکتا ہے تو تمکو چار و ناچار ارزینب کو طلاق دینا پڑے گی"

عبداللہ۔ "یہ صحیح ہے کہ ارزینب ایسی بیوی کا ملجانا میرے لئے انتہائی خوش قسمتی ہے، لیکن ارزینب کے لئے یہ امر باعث فخر نہیں ہوسکتا کہ میں اس کا شوہر ہوں۔ اس لئے میرا اسکو چھوڑ دینا اس کے لئے باعث تکلیف نہیں ہوسکتا جو تکلیف ہو گی مجھی کو ہو گی اس لئے اب جبکہ میں اتنا سفر کر کے یہاں آیا ہوں، امیر معاویہ کی خود یہ خواہش ہے اور میں اسپر راضی بھی ہوں، تو اب میرا انکار کر دینا صرف جذبات محبت کی بنا پر غالباً سیاست کے خلاف ہے اس لئے میں اسوقت آپ دونوں کو شاہد بنا کر ارزینب کو طلاق دیتا ہوں، آپ جائیے اور امیر معاویہ اور ان کی صاحبزادی کو اطلاع دیجئے کہ میں نے انکی یہ خواہش بھی پوری کر دی ہے"

(عبداللہ بن سلام باقاعدہ طور پر ارزینب کو طلاق شرعی دیتا ہے۔ اور ابوالدرداء، ابوہریرہ طلاق کے شاہد ہو کر باہر چلے جاتے ہیں۔)

(۵)

(عراق میں عبداللہ بن سلام کا مکان۔ امام حسینؑ ارزینب کے مہمان فرش پر بیٹھے ہوئے ہیں اور ارزینب اندر حجرہ میں بیٹھی ہوئی ہے ابوالدرداء داخل ہوتے ہیں)۔

ابوالدرداء۔ "السلام علیکم"

حسین۔ "وعلیکم السلام اے صحابی رسول"

ابوالدرداء۔ (آنکھوں میں آنسو لاکر) اے حسین تمہیں دیکھکر میرے سامنے عہد نبوی آگیا، آہ! وہ بھی کیا مسعود و متبرک زمانہ تھا کہ ہمارا جو قدم اٹھتا تھا خدا کی راہ میں اٹھتا تھا اور آج میں دیکھتا ہوں کہ میری ہر سانس نا راستی کی فضا میں نکلتی ہے۔ خیر، خدا کی مرضی یہی ہے میں یہاں ارزینب کو معاویہ کی طرف سے یزید کا پیغام نکاح دینے آیا ہوں۔ لیکن اے جگر گوشۂ رسول آپ یہاں کیسے تشریف لائے؟

حسین۔ "میں بھی اسی غرض سے آیا ہوں کہ ارزینب کو اپنا پیام دوں"

ابوالدرداء۔ "افسوس ہے مجھے وہ خدمت انجام دینا پڑ رہی ہے جس کو میرا دل نہیں چاہتا، عبداللہ بن سلام ارزینب کو طلاق دینے کے بعد معاویہ کی بیٹی کو بھی حاصل نہ کر سکا کیونکہ اس نے انکار کر دیا۔ غالباً آپ نے سنا ہوگا اور چونکہ عبداللہ بن سلام کو یہ یقین ہوگیا کہ یہ سب کچھ فریب تھا

صرف اس لئے کہ کسی طرح ارنیب کو طلاق دلوا کر یزید سے اس کی شادی کرادی جائے اور ہر جگہ اس کا چرچا ہوگیا، اس لئے معاویہ نے برہم ہوکر اسے معزول بھی کر دیا اور اب وہ غریب کسی طرف کا نہ رہا۔"

حسین۔ "میاں، یہ ساری خبریں ہو پہنچ چکی ہیں اور چونکہ آپ بھی اس غرض کو لیکر آئے ہیں اس لئے اب مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ ارنیب سے دریافت کر لیجئے وہ مجھ میں اور یزید میں کس کو پسند کرتی ہے۔"

(ابوالدرداء حجرہ کے پاس جاکر ارنیب کو مخاطب کرتے ہیں)۔

ابوالدرداء۔ "اے ارنیب، مجھ کو تیرے حال سے بہت ہمدردی ہے، لیکن اب جبکہ عبداللہ بن سلام تجھے طلاق دے چکا ہے اس لئے کوئی چارہ نہیں سوائے اس کے کہ تو کسی اور سے نکاح کرے۔ اسوقت دو شخص تیرے خواہشمند ہیں، ایک یزید معاویہ کا بیٹا، اور اسکا ولی عہد اور دوسرا حسین ابن علی۔ ان میں سے تو جس کو مناسب سمجھے اپنے لئے اختیار کرے۔"

ارنیب۔ (دیر تک سکوت کرنے کے بعد) "اے ابوالدرداء، اگر آپ اس وقت یہاں نہ ہوتے اور یہ مسئلہ میرے سامنے آتا تو میں اسوقت بھی آپ ہی پر اس کا انحصار کرتی، اس لئے میں آپ سے دریافت کرتی ہوں کہ مجھے اس صورت میں کیا کرنا چاہئے اور میرے لئے فلاح کس کے انتخاب میں ہے۔"

ابوالدرداء۔ "میرا اس باب میں کوئی مشورہ دینا مناسب نہیں ہے۔ بہتر یہی ہے کہ تم خود فیصلہ کرو۔"

ارنیب۔ "ابوالدرداء، میں تمہارے بھائی کی بیٹی بھی ہوں، اس لئے یوں بھی تمہیں مشورہ دینا چاہئے تعجب ہے کہ تم صحابی رسول ہوکر یوں امر حق کے ظاہر کرنے سے احتراز کرتے ہو۔"

ابوالدرداء۔ "اگر تجھے اصرار ہے تو میں یہ کہنے سے باز نہیں رہ سکتا کہ حسین ابن علی میرے نزدیک زیادہ قابل ترجیح ہیں، کیونکہ میں نے رسول اللہ کو حسین کے لب چومتے ہوئے دیکھا ہے۔"

ارنیب۔ "تو بہتر ہے میں حسین کو پسند کرتی ہوں۔"

(اسی جگہ اور اسی وقت حسین کا عقد ارنیب سے ہو جاتا ہے اور ابوالدرداء چلے جاتے ہیں)۔

(۶)

(کچھ زمانہ کے بعد امام حسین اپنے مکان میں بیٹھے ہیں اور عبداللہ بن سلام داخل ہوتا ہے۔ اس حال میں کہ اس کا چہرہ بہت مغموم ہے اور غربت و افلاس اس کے کپڑوں سے ظاہر ہے)۔

حسین۔ "عبداللہ بن سلام، آؤ، مبارک ہو تمہارا یہاں آنا، کہو، معاویہ کو تم نے کیسا پایا۔"

عبداللہ بن سلام۔ (آہ سرد بھرکر)۔ "معاویہ وہ ہے جس نے دھوکا دیکر میری زندگی کی بہترین لذت و نعمت مجھ سے چھین لی، میری امارت و ہمدردی کو غربت و افلاس سے بدل دیا اور میرا یہ حال ہے کہ دنیا میں کوئی ہستی ایسی نظر نہیں آتی جو میرے حال پر رحم کرے اور اپنی محبت سے میرے مصائب کو قابل برداشت بنا دے۔"

حسین۔ "اے عبداللہ بن سلام، اللہ تجھ پر رحم کرے اور تیری تکلیفوں کو دور کرے۔ اگر میرے لایق کوئی خدمت ہو تو بلا پس و پیش بتاؤ، مَیں اس کے انجام دینے کے لئے ہر وقت آمادہ ہوں"

عبداللہ بن سلام۔ "ہاں، میں اسی لئے آیا ہوں کہ آپ کے ذریعہ سے ارنیب سے اپنی ایک امانت طلب کروں جو مَیں نے اسکو دی تھی، اور ہمیشہ کے لئے اس سے رخصت ہولوں"

حسینؑ۔ (اوٹ کے اندر ارنیب سے) "عبداللہ بن سلام اپنی امانت تم سے طلب کرنے آئے ہیں۔ وہ کیا چیز ہے؟"

ارنیب۔ "مجھے نہیں معلوم کہ وہ کیا چیز ہے کیونکہ وہ تھیلی میں سربہ مُہر ہے اور مَیں نے اسے کھولا نہیں"

حسینؑ۔ "تو بہتر یہی ہے کہ جس شخص نے امانت رکھی ہے خود اس کو اپنے ہاتھ سے واپس کردو"

(حسینؑ باہر چلے جاتے ہیں اور ارنیب پردہ سے باہر آکر عبداللہ بن سلام کے سامنے آجاتی ہے۔ عبداللہ متحیرانہ اس کو دیکھنے لگتا ہے اور پھر دونوں رونے لگتے ہیں۔ کچھ دیر بعد)۔

عبداللہ بن سلام۔ (آنسو پونچھتے ہوئے) "اے ارنیب، مجھے تیری جدائی کا اتنا ڈر نہیں ہے، جتنا اس امر کا کہ میں اپنے آپکو تیرے قابل نہ ثابت کرسکا، میں نے جس طمع سے تجھے طلاق دی اس کی سزا اگر کوئی ہو سکتی ہے تو صرف یہ احساس کہ میں نے تجھ سے بیوفائی کی اور اس احساس کے ساتھ تمام عمر بے چین رہنا۔ اے ارنیب مجھے شرم آتی ہے کہ مَیں تجھسے ہمکلام ہوں، اور غالباً میں کبھی نہ آتا اگر میری موجودہ سقیم حالت امانت واپس لینے پر مجبور نہ کرتی، کیونکہ اس تھیلی میں ایک قیمتی موتی ہے اور مَیں چاہتا ہوں کہ اس کو فروخت کرکے کسی جگہ گوشۂ گمنامی میں اپنی زندگی بسر کروں"

ارنیب۔ (دامن سے آنسو خشک کرتے ہوئے) "یہ آپ کی امانت حاضر ہے، اور اگر کوئی اور چیز ایسی ہے جو میں پیش کرسکتی ہوں تو اسے بھی بتا دیجئے آپ نے جس محبت وعزت کے ساتھ میرے حقوق ادا کئے ہیں، وہ مجھ سے بہت زیادہ قربانی طلب کرسکتے، چہ جائے کہ مال وزر جو نہایت حقیر چیز ہے"

عبداللہ بن سلام۔ "میں نے تجھے دیا ہی کیا ہے جو طلب کروں، البتہ اگر مجھے یہ معلوم ہوجاتا کہ تو نے میرے اس قصور کو معاف کردیا ہے تو غالباً میں ایک حد تک سکون کے ساتھ زندگی بسر کرسکتا"

ارنیب۔ "اللہ اور اس کا رسول شاہد ہے کہ میں آپ کی ہر غلطی کو سچے دل سے معاف کرتی ہوں اور آپ سے بھی یہی استدعا ہے کہ میری طرف سے اگر کوئی فروگذاشت ہوئی ہو جس کا مجھے علم نہیں ہے تو آپ بھی درگذر کیجئے"

(عبداللہ بن سلام کا دل یہ سنکر بھر آتا ہے اور اٹھکر روتا ہوا باہر جانا چاہتا ہے۔ حسینؑ اندر داخل ہوتے ہیں)۔

حسین۔ "اے عبداللہ، تم کو اپنی امانت واپس ملگئی"

عبداللہ۔ "ہاں، ملگئی، اور اب میں جاتا ہوں، آپ کی اس عنایت کا شکریہ"

حسینؑ۔ "لیکن ابھی ایک امانت اور ہے جو تم کو ملنا چاہئے"

عبداللہ۔ "وہ کیا، میں نے تو اور کوئی چیز ارنیب کے پاس امانت نہیں رکھوائی تھی۔

حسین۔ "لیکن میرے پاس تو ہے"

عبداللہ۔ "وہ کیا، اے میرے سردار"

حسین۔ "وہ ارنیب بنت اسحاق ہے، جس سے میں نے صرف اس لئے شادی کی تھی کہ طلاق دیکر پھر تمہارے ساتھ شادی کردوں ظاہر ہے کہ اُس شدید طلاق کے بعد جو تم نے دی تھی ارنیب تمہاری نہیں ہوسکتی تھی تاوقتیکہ کوئی دوسرا شخص اس سے عقد کرکے طلاق نہ دے، اور میں نے مناسب سمجھا کہ یہ خدمت میں ہی انجام دوں"

(حسین یہ کہہ کر باہر چلے جاتے ہیں اور عبداللہ بن سلام اور ارنیب دونوں ایک ایسی حالت کے ساتھ جسمیں مسرت کا غیر معمولی جذبہ انسان کو گنگ بنادیتا ہے، ایک دوسرے کو دیکھنے لگتے ہیں)۔

نیاز

عالم فطرت، ماورائے علم و ادراک

دماغ انسانی کی خارق عادات اعجوبہ نمائیاں
اخبار عن الغیب کے محیر العقول واقعات

انسان جسکی زندگی کے تمام تجربات بظاہر صرف اس کے حواس متعینہ پر منحصر ہوتے ہیں اگر ایک طرف اپنی سادگی فطرت کے لحاظ سے ایک ایسی بے بس و بیچارہ مخلوق ہے کہ اگر اس کی آنکھ کے سامنے ایک ہلکا سا کاغذ بھی رکھدیا جائے تو وہ آفتاب ایسی عظیم الشان چیز کو بھی نہیں دیکھ سکتا، تو دوسری طرف وہ ایک ایسا لاینحل معمہ ہے کہ اس وقت تک یہی نہیں معلوم ہوسکا کہ اسکی ترقی کی آخری حد کیا ہے، یہاں تک کہ اب گفتگو اس میں ہے کہ کہیں خدا یہی تو نہیں ہے۔

انسان جس چیز سے عبارت ہے وہ نہ اس کے ہاتھ پاؤں ہیں، نہ آنکھ کان اور نہ کوئی اور عضو جسمانی، بلکہ علم و حکمت والے کہتے ہیں کہ انسان نام اس حقیقت کا ہے جسے عقل سلیم کہتے ہیں اور جس کے مظاہر بدو کائنات سے لیکر اسوقت تک تمام عالم میں ہر جگہ منتشر نظر آتے ہیں۔ لیکن ایک جماعت اور ہے جو علم و حکمت کی حامل تو نہیں ہے لیکن اس کے معلومات کا ذریعہ علم و حکمت سے زیادہ کوئی بلند چیز ہے، اس کا خیال ہے کہ انسان نام عقل سلیم کا بھی نہیں، فضل و کمال کا بھی نہیں، بلکہ صحیح معنے میں انسان وہ ہے جو انسان پیدا ہوا ہے اور بلا کسی سبب کے انسان ہے کیونکہ اگر انسان نام صرف اس ذہنی اکتساب، علمی ترقی، اور تربیت دماغ کا ہے جسمیں ہر شخص برابر کا شریک ہوسکتا ہے تو پھر اس کو کیا کہیں گے جس کو اس نوع کی سعی و کوشش کا کوئی موقعہ میسّر نہیں آیا، لیکن اس سے ظہور ہوتا ہے ایسی باتوں کا جس کو دنیا کا بڑے سے بڑا حکیم و فیلسوف بھی سمجھنے سے عاری ہے۔

عالم فطرت کے تمام غوامض و نوامیس میں سب سے زیادہ حیرت انگیز چیز اگر کوئی ہوسکتی ہے تو وہ انسان ہے جس کے بالشت بھر دماغ کی حقیقت کا بھی اسوقت تک انکشاف نہیں ہوسکا، اور بعض صورتوں میں بڑے بڑے عقل والوں کو اپنی کم فہمی اور جہل کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔

انبیاء اور رسل کی نسبت بعض علماء ظاہر کا خیال ہے کہ ان میں کوئی فطری خصوصیت موجود نہیں ہوتی۔ ہر شخص کوشش سے نبی ہوسکتا ہے، لیکن جسوقت ان سے کہا جاتا ہے کہ وہ سعی و کوشش سے صرف ہوڈینی ہی کے درجہ تک پہونچ جائیں، جو ٹھوس دیوار کے اندر سے گذر جاتا تھا یا ہندوستان کے ایک جاہل سادھو کی طرح صرف چند گھنٹہ ہی زمین میں دفن ہوکر زندہ رہیں، تو انکے پاس اسکا کوئی جواب نہیں ہوتا اور انکو سوائے سکوت کے اور کوئی چارہ نہیں رہتا۔

حقیقت یہ ہے کہ جس طرح نہ میں فورڈ و ماڈیسن ہو سکتا ہوں اور نہ فورڈ و ماڈیسن، تان سین اور بیجو باورے بن سکتے ہیں، اسی طرح نہ کوئی فیلسوف ہر واقعہ کا سبب دریافت کر سکتا ہے اور نہ کوشش کر کے ان حدود سے متجاوز ہو سکتا ہے جن کے اندر اس کے دماغ کی ساخت ہوئی ہے۔ اس لئے کہا جاتا ہے کہ شاعر، نقاش، مغنی، صناع اور نبی سب پیدا ہوتے ہیں اور بننے سے نہیں بن سکتے۔ روئے زمین پر ہمیشہ متعدد ایسی غیر معمولی ہستیاں پائی گئی ہیں اور ہمیشہ انکے صدق و کذب پر بحث کی گئی ہے۔ پھر چونکہ اس سلسلہ میں روح و بقاء روح کا سوال بھی پیش آجاتا ہے اس لئے مذہب اور مابعد الطبیعیات دونوں کے نزدیک اس بحث کی اہمیت بڑھ جاتی ہے، اور انسان جو فطرتاً بہت جستجو پسند واقع ہوا ہے نہایت دلچسپی کے ساتھ نہ صرف ان مظاہر کا مطالعہ کرتا ہے بلکہ انکی علمی توجیہ بھی کرنا چاہتا ہے۔

اس وقت اس قسم کے مظاہر پیش کرنے والے دو قسم کے لوگ ہیں۔ ایک وہ جو ذریعۂ مسمریزم یا ہپناٹیزم (تنویم مقناطیسی) براہ راست خود یا کسی وسیط یا معمول (medium) کے ذریعہ سے مختلف قسم کے حالات بتاتے ہیں، روحوں کے طلب کرنے کے مدعی ہیں اور بعض اوقات روحوں کی تصاویر بھی دکھا دیتے ہیں، اور دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جو بغیر واسطۂ مسمریزم لوگوں کے دل کا حال معلوم کر لیتے ہیں، خط کے اندر کی عبارت پڑھ لیتے ہیں، زمین کے اندر دفن ہو کر گھنٹوں زندہ رہتے ہیں موٹی موٹی زنجیر توڑ ڈالتے ہیں، موٹر کو روک لیتے ہیں، جامد اجسام سے عبور کر جاتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

پہلے قسم کے لوگوں کا یہ دعویٰ کہ وہ روحوں کو طلب کر لیتے ہیں یا ان کی تصاویر دکھا دیتے ہیں، کسی طرح قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس کے تسلیم کرنے میں بہت سے علمی محالات کو ماننا پڑے گا۔ روح اگر جسم سے جدا ہونے کے بعد باقی رہنے والی چیز ہے تو ظاہر ہے کہ اسکا وجود بغیر کسی وساطت کے نہیں پایا جا سکتا اور اگر اس کو وجود محض مانیں تو دوسرے الفاظ میں گویا اسکو خدا ماننا پڑے گا۔ پھر بلانے سے اسکا آجانا اور تھوڑی دیر کے بعد واپس چلا جانا کوئی معنی نہیں رکھتا کیونکہ اس طرح حیز زمانی و مکانی دونوں کا وجود اس کے لئے ضروری ہوگا اور یہ بالکل خلاف عقل ہے۔ روحوں کی جو تصویریں دکھائی جاتی ہیں، وہ خود اس کا ثبوت ہیں کہ یہ سارا تماشہ محض شعبدہ ہے۔ کیونکہ یہ تصویریں بالکل انسانی جسم کی تصویریں ہوتی ہیں۔ وہی تمام اعضاء وہی وضع و ملبوسات، وہی خط و خال۔ اول تو روح محض جو غیر مرئی چیز ہے فوٹو کے شیشہ پر نمایاں ہو ہی نہیں سکتی اور اگر اس سے قطع نظر کر لیں تو بھی اس کا جسم انسانی اور اس کی تمام خصوصیات اور دنیاوی وضع و لباس کے ساتھ رونما ہونا کوئی معنے نہیں رکھتا۔ امریکہ کے مشہور علمی پرچہ سائنٹفک امریکن نے زر کثیر صرف کر کے ایک جماعت اسکی تحقیق کیلئے متعین کی تھی، اور اس نے جو رپورٹ پیش کی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نہ صرف روحوں کی تصویریں بلکہ اکثر بیشتر میڈیمز کے ذریعہ سے یا وسیط و معمول کی وساطت سے روحوں کا طلب کرنا بھی محض مکر و فریب ہے۔ لیکن بعض صورتوں میں یہ ضرور ماننا پڑیگا کہ مسمریزم یا ہپناٹزم ضرور ایک ایسی دماغی قوت ہے جو دوسروں کو متاثر کر کے بعض غیر معمولی باتوں کو دائرہ علم میں لے آتی ہے، لیکن یہ صرف عامل کی قوت ارادی اور دماغی برتری کا نتیجہ ہے۔ اسکو کسی روح کی آمد و رفت سے کوئی علاقہ نہیں۔

دوسری جماعت سے جو خارق عادات واقعات ظہور میں آتے ہیں، ان میں بعض کا سبب مشق و تربیت ہے، مثلاً زنجیروں کا توڑنا موٹر کا روک لینا وغیرہ کہ اعصاب انسانی میں فطرت کی طرف سے ایک غیر معمولی اہلیت ودیعت ہوئی ہے کہ اگر انکی پرورش کی جائے تو

اس نوع کے بہت سے مافوق الفطرت واقعات اس سے ظہور میں آسکتے ہیں۔ لیکن بعض باتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو اکتساب ومشق، تعلیم وتربیت سے متعلق نہیں ہیں۔ بلکہ خود فطرت ذہن وعقل، روح ودماغ کو غیر معمولی پیدا کرتی ہے اور بند تحریروں کو پڑھ لینا، پوشیدہ سوالوں کا جواب دیدینا، مستقبل کے متعلق صحیح پیشین گوئیاں کردینا اکثر وبیشتر ایسے ہی دماغ والوں کی طرف سے ظاہر ہوتا ہے۔

حال ہی میں یورپ کا ایک شخص ہوڈینی جو ساحر کے لقب سے مشہور ہوگیا تھا، انہیں لوگوں میں سے تھا اور اس سے ظاہر ہونیوالے واقعات کسی لاگ یا شعبدہ کا نتیجہ نہ ہوتے تھے بلکہ فطرتاً اسکی قوت ارادی اتنی بڑی زبردست تھی کہ جس بات کا وہ ارادہ کرتا تھا پوری ہوجاتی تھی، یورپ میں مختلف مقامات پر بڑے بڑے جلسوں میں اسکا امتحان لیا گیا اور آخر کار ہر شخص کو اعتراف کرنا پڑا کہ جو کچھ اس سے ظاہر ہوتا ہے وہ باوجود غیر فطری ہونے کے بالکل فطری ہے۔ مثلاً ایک ادنیٰ سی بات یہ تھی کہ کوٹھری کے اندر بند کردینے کے بعد وہ دیوار کے اندر سے نکل آتا تھا، بظاہر یہ کس قدر ناممکن سی بات ہے، لیکن ایسا ہوتا تھا اور لوگ دیکھتے تھے۔ یا یہ کہ اسکو کتنی ہی موٹی زنجیروں سے باندھ دیجئے، لیکن بغیر زنجیر توڑے ہوئے وہ اپنے آپ کو آزاد کرلیتا تھا۔ بہر حال اسکی زندگی کے بہت سے واقعات ہیں جن سے یورپ کا ہر شخص واقف ہے۔

اس سے قبل ایک نہایت مشہور شخص جو لوگوں کے دل کا بات معلوم کرلیتا تھا اور جس سے کسی راز کا چھپنا دشوار نہ تھا، کمبر لینڈ تھا، جس کو اپنی اس قوت کا حال اتفاق سے معلوم ہوگیا۔ ایک مرتبہ وہ اپنے دوست کے مکان پر بیٹھا ہوا تھا کہ مسمریزم پر گفتگو شروع ہوئی، کمبر لینڈ نے کہا کہ دوسرے کے دل کی بات معلوم کرلینا دشوار نہیں ہے، اور یہ کہکر اس نے غور کیا تو اپنے دوست کے دل کی بعض باتیں اسپر منکشف ہونے لگیں، اتفاق سے اس وقت اس کے دوست نے کمبر لینڈ سے دریافت کیا کہ اگر یہ ممکن ہے تو بتاؤ میرے دل میں کیا ہے اور جس وقت کمبر لینڈ نے بتادیا تو اس کو سخت حیرت ہوئی۔ اس واقعہ کے بعد کمبر لینڈ نے جو غور کرنا شروع کیا تو اسے اپنی اس قوت کا حال زیادہ وضاحت کیساتھ معلوم ہونے لگا۔

کمبر لینڈ نے اس کے بعد کے جو تجربات اپنے قلمبند کئے ہیں وہ نہایت عجیب وغریب و پر لطف ہیں۔ وہ لکھتا ہے پہلے مجھے یہ یقین نہ تھا کہ گھر کے اندر کی کسی پوشیدہ چیز کا ٹھکانا مجھے معلوم ہوسکتا ہے، لیکن ایک بار میں مارکوئیس لورن کے ساتھ کھانا کھا رہا تھا کہ اسنے کہا میں اپنے دل میں کسی چیز کا خیال کرتا ہوں، بتاؤ وہ کیا ہے۔ میں نے اپنی آنکھ پر پٹی باندھ لی اور مارکوئیس کا ہاتھ پکڑ کے باہر چلا میرے قدم خود بخود اٹھتے جاتے تھے یہانتک کہ میں گھر سے باہر نکلکر اصطبل تک گیا اور وہاں میں نے ایک جاندار چیز پر ہاتھ رکھکر کہا کہ آپ نے اس چیز کا تصور کیا تھا جس کی اسنے تصدیق کی۔ میں نے آنکھ سے پٹی کھولی تو معلوم ہوا کہ وہ ایک ہرنی تھی۔

اسی طرح ایک مرتبہ آسٹریا کے ولی عہد نے ایک ایسے سیاہ کتے کا تصور کیا جس کا علم خود اس کو بھی نہ تھا، لیکن کمبر لینڈ اس کا ہاتھ پکڑ کرلے چلا یہانتک کہ ایک بازار میں اس طرح کا کتا نظر آگیا جسے ولیعہد نے خرید لیا۔ ایک مرتبہ امتحاناً چند لوگوں نے ایک سوئی کہیں چھپادی لیکن کمبر لینڈ نے اسے بھی ڈھونڈھ نکالا۔

ایک مرتبہ ایک انگلستانی سفیر امریکہ کو دیا گیا کہ جہاں چاہے اسے چھپادے چنانچہ اس نے چھپادیا۔ اس مرتبہ یہ کیا گیا کہ ایک باریک

زنجیر کا ایک سرا کمبرلینڈ کے داہنے ہاتھ میں باندھ دیا گیا اور دوسرا سفیر امریکہ کے بائیں ہاتھ میں۔ کمبرلینڈ آگے اور سفیر اس کے پیچھے پیچھے تھا، آخرکار یہ اصطبل میں پہونچا اور وہاں ایک صندوق کے پاس ٹھہر گیا جو مقفل تھا، کمبرلینڈ نے سفیر کی جیب سے کنجی نکال کر اس کو کھولا اور انڈا نکال لیا۔

ایک مرتبہ کئی آدمیوں نے ملکر کمبرلینڈ کو دھوکا دینا چاہا یعنی انہوں نے یہ ترکیب کی کہ اس کو باہر کرکے اندر دو قزاقوں اور ایک مسافر کی نقل کی اس طرح کہ دو نے قزاق بنکر تیسرے شخص کو جو مسافر بنا تھا گرفتار کیا، اسکا مال چھینا، خنجر سے اسے ذبح کیا اور یہ خنجر کو صاف کرکے رکھ لیا۔ کمبرلینڈ جب اندر آیا تو اس نے اسی طرح تمام نقل کرکے دکھا دی یہانتک کہ خنجر تک اس نے بالکل اسی طرح صاف کیا جس طرح ان لوگوں نے کیا تھا۔

ایک مرتبہ انگلستان کے مشہور وزیر گلیڈسٹون نے ایک عدد تین ہندسوں کا اپنے جی میں لیا اور اس کے دو ہندسے ۳ اور ۶ بتاکر کہا کہ تیسرا ہندسہ بتاؤ۔ کمبرلینڈ نے گلیڈسٹون سے کہا کہ اس عدد پر کامل غور کیجئے، اس کے بعد کمبرلینڈ نے بتا دیا کہ وہ عدد ۳۶۴ ہے، لیکن اس کے ساتھ گلیڈسٹون سے یہ بھی دریافت کیا کہ آپ تیسرے ہندسے کے لئے ۵ اور ۶ کے درمیان کیوں تذبذب کر رہے تھے گلیڈسٹون نے اسکا اقرار کیا اور کہا کہ بیشک میں یہ تردد کر رہا تھا۔

الغرض اس قسم کے متعدد واقعات کمبرلینڈ نے قلمبند کئے ہیں اور اس کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قوت اس میں بالکل فطری ہے جس میں اکتساب کو بہت کم دخل ہے۔ خود یہاں ہندوستان میں ایک بار میں نے ایک گمنام ہندو شخص کو دیکھا تھا جو بند خط کی عبارت کی عبارت پڑھ دیتا تھا۔ میں نے اس سے گفتگو کی تو معلوم ہوا کہ اس میں بھی یہ قوت بالکل عطیۂ فطرت تھی۔
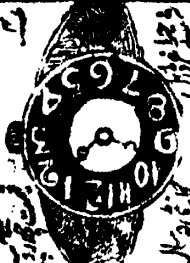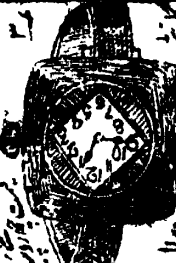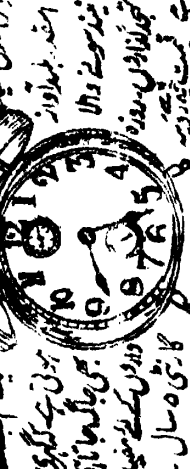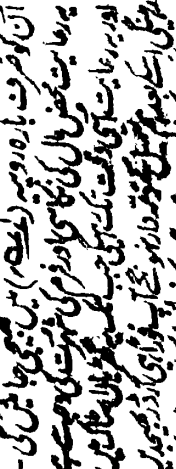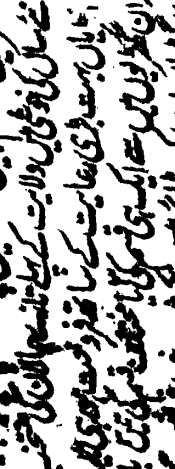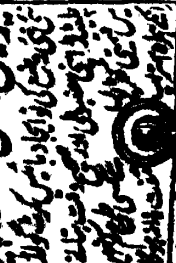
اب ایک محقق کے سامنے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کیوں ہے اور دماغ کی وہ کونسی ساخت ہے جو ایک شخص میں یہ غیر معمولی ملکہ پیدا کر دیتی ہے، لیکن اسوقت تک اس میں کوئی کامیابی نہیں ہوئی اور کسی قسم کی تسکین بخش علمی توجیہ اس کی نہیں ہو سکی۔ ممکن ہے کہ آئندہ اس میں کامیابی حاصل ہو لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ اس وقت تک اور جدید غوامض فطرت رونما ہوکر انسان کو پھر اسی احساس بیچارگی کے سوگ میں مبتلا نہ کر دیں گے۔

انسان کو فطرت نے کبھی اس پر مجبور نہیں کیا کہ وہ ہر نامعلوم شئے کو معلوم کرے بلکہ اس کا اقتضاء یہ ہے کہ جو معلوم ہو اس سے کام لیا جائے۔ اگر اس طرح کے دماغ دنیا میں موجود ہیں جن سے ایسے غیر معمولی افعال کا ارتکاب ہوتا ہے تو وہ زیادہ قابل اعتنا نہیں بلکہ قابل لحاظ وہ معمولی دماغ ہیں جن کی کاوشیں ہماری روز کی زندگی اور تمدن کی ضروریات کو پورا کرتی ہیں۔

آج تک کبھی کوئی قوم کمبرلینڈ، ہوڈینی، یا کسی صاحب کرامات ولی کے خوارق عادات سے ترقی نہیں کر سکی، اگر ترقی ہوئی ہے تو صرف اس معمولی اصول کی بنا پر کہ زمین میں ہل کیسے چلایا جاتا ہے، پتھر ہتوڑے سے کیونکر توڑا جاتا ہے، روئی کا تاگا اور تاگے کا کپڑا کس طرح بنایا جاتا ہے، اس لئے میری رائے ہے کہ اگر کوئی اگر کوئی ایسا آدمی نظر آجائے جو اس طرح کی باتیں بتا سکتا ہے یا اس سے ایسی غیر معمولی عجیب باتیں ظاہر ہوتی ہوں تو اس کی طرف توجہ نہ کرو کیونکہ وہ ایک تعجب انگیز منظر قدرت تو ضرور ہے لیکن ہماری

دنیاوی زندگی کے لئے اسکا وجود بالکل بیکار ہے۔ انبیاؑ و رسلؐ نے بھی دنیا میں کوئی کامیابی معجزوں کے ذریعہ سے حاصل نہیں کی اور نہ معجزہ و کرامات ہمارے لئے مفید ہیں۔ بلکہ کامیابی کا اصل راز قوت عمل اور عزم راسخ ہے، سو اس کا استعمال آسمان سے ستارے توڑکر لانے کے لئے نہ ہونا چاہئے بلکہ صرف اپنے کو اصلح بنانے کے لئے ہونا چاہئے۔ غیب کی باتوں کا معلوم ہونا ضروری نہیں ہے بلکہ واردات حال کو سمجھنا لازم ہے، کیونکہ زمانۂ مستقبل کی ہر چیز کو ایک نہ ایک دن حالی ہوجانا ہے اور حال کا ماضی ہوجانا بالکل یقینی جس پر انسان کا کوئی قابو نہیں۔

نیاز

لفظ حسین کے ساتھ امامت کی نسبت احترام وغیرہ کا غلط معیار ہے

نگار کی کسی گذشتہ اشاعت میں بہ سلسلہ "باب الاستفسار" میں نے جناب سکینہ بنت حسین کے مسئلۂ ازدواج اور انکی بعض خصوصیات فطرت کے متعلق کچھ لکھا تھا جس کو ہمارے شیعہ احباب نے اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا اور بعض نے مجھے متنبہ کرتے ہوئے اسقدر عجیب و غریب ذہنیت کا اظہار کیا کہ میں یہ چند سطریں لکھنے پر مجبور ہو گیا، انکی اصلاح کے لئے نہیں بلکہ صرف اپنا مقصود ظاہر کرنے کے لئے۔

اعتراض کرنے والوں میں صرف ایک صاحب میرٹھ کے ایسے تھے جنہوں نے یہ لکھا کہ جناب سکینہ کے جو حالات میں نے قلمبند کئے ہیں وہ تاریخی نقطۂ نظر سے بالکل غلط ہیں، (حالانکہ انہوں نے بھی تاریخ سے مدد لیکر میرے تحریر کردہ حالات کی تردید نہیں کی اور نہ خود صحیح حالات تحریر فرمائے)، باقی جتنے حضرات تھے انہوں نے اپنی برہمی کا اظہار جس انداز سے کیا وہ نہایت ہی پر لطف ہے۔ مثلاً ایک صاحب نے جو اودھ کے ضلع کے معزز وکیل ہیں تحریر فرمایا کہ "چونکہ نگار میں تنزر کی تصنیف سکینہ بنت حسین کا اشتہار درج ہوتا ہے اس لئے آئندہ سے نگار کی خریداری منظور نہیں ہے"۔ ایک اور بزرگ نے مطالبہ کیا کہ "لفظ حسین کے بعد چونکہ آپ علیہ السلام نہیں لکھتے اس لئے نگار نہ بھیجا جائے"۔ الغرض اسی طرح کے مطالبات تھے اور اسی انداز کی برہمی تھی جو شیعہ حضرات کی طرف سے ظاہر کی گئی چونکہ میرا مسلک تفریق و تعیین مذاہب سے بہت بلند ہے اور میں ایک شیعہ کیا معنی، ایک بت پرست کو بھی برا نہیں کہتا اور نہ اسکی طرف سے مذہبی عناد رکھتا ہوں، جیسا کہ نگار کے مطالعہ کرنے والوں پر واضح ہے، اس لئے میں نے ضروری سمجھا کہ اپنے برہم ہو جانے والے شیعہ دوستوں سے اس باب میں تھوڑی سی گفتگو کر لوں۔

جناب سکینہ کے متعلق جو کچھ میں نے لکھا ہے وہ اپنی نزدیک انتہائی وثوق کے ساتھ لکھا ہے اور اگر کوئی صاحب تاریخ سے اسکی تردید کر دیں گے تو میں بلا تامل تسلیم کر لوں گا۔ علاوہ اس کے میں نے جو کچھ تحریر کیا ہے اس میں ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ہے اور نہ ہو سکتا ہے جسے جناب سکینہ کی شان کے منافی سمجھا جائے۔ شاعری یا موسیقی کا ذوق، وضع و ملبوس کے باب میں اظہار خوش سلیقگی میرے نزدیک ایک عورت کی بہترین صفت ہے اگر اسکا استعمال اچھا کیا جائے اور یقیناً جناب سکینہ کے لئے یہ امر کم باعث امتیاز نہیں کہ آپ کی زندگی میں ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ملتا جو انسان کی بلند ترین فطرت کے معیار سے گرا ہوا ہو۔ پھر اگر اس اعتراف کیساتھ ساتھ میں نے یہ بھی ظاہر کر دیا کہ آپ کا ادبی ذوق نہایت پاکیزہ تھا یا موسیقی سے آپکو خاص مناسبت تھی یا یہ کہ آپ نہایت خوش سلیقہ تھیں، تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس سے جناب سکینہ کی کیا توہین ہوتی ہے۔ اگر اس سارے الزام کے جواب میں یہ عرض کر دوں کہ جو کچھ میں نے لکھا ہے وہ اس سے بہت کم ہے جو خود ایک شیعی مورخ (صاحب اغانی) نے تحریر کیا ہے، تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ حضرات شیعہ اس کتاب کو بھی اسی سلوک کا مستحق سمجھیں گے جو نگار کے لئے روا رکھا گیا یا نہیں؟

بہرحال جہانتک روایات تاریخی تعلق ہے میں نے ہر اس عزت و احترام کا لحاظ رکھتے ہوئے اقتباس کیا ہے جسکی جناب سکینہ مستحق ہیں" اور اگر مجھسے اسمیں کچھ غلطی ہوئی ہے تو ہر وقت اسکے اعتراف پر آمادہ ہوں لیکن یہ قیامت تک ماننے کیلئے تیار نہیں کہ اس کی تہ میں میری عصبیت کام کر رہی تھی یا قصداً میں نے دل آزاری کی

اب رہا سوال لفظ حسین کے بعد علیہ السلام یا اس سے قبل لفظ امام کا اضافہ۔ اسمیں البتہ میرا مسلک ذرا عام روش سے علیحدہ ہے میں یہ سمجھتا ہوں کہ انسان جسقدر زیادہ بلند و ممتاز ہوتا جاتا ہے اسی قدر کمی ان القاب و خطابات میں بھی ہوتی جاتی ہے جو محض تخصیص و تعیین کیلئے وضع کئے جاتے ہیں۔ اور اگر انکو قایم رکھا جائے تو گویا حقیقی عزت میں کمی کرنا ہے حسین کی امامت مسلم ہے اور یہ بھی یقین ہے کہ وہ سلام و صلواۃ کے مستحق ہیں، لیکن اگر گمان یہ ہو کہ جبتک انکے نام کیساتھ اسکا اظہار نہ کیا جائیگا لوگ نہیں سمجھ سکیں گے تو میرے خیال میں یہ حسین کی اہمیت کو کم کرنا ہے کیونکہ بڑھانا۔ حسین ایسی ان تمام خصوصیات کیساتھ جسمیں امامت، سیادت وغیرہ شامل ہیں دنیا میں صرف ایک ہی ہوا ہے اور جو چیز دنیا میں صرف ایک ہو اور اسکا کوئی مثیل و نظیر نہو اسکے نام کے ساتھ الفاظ تخصیص کا اضافہ فعل عبث ہے۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ صرف حسین کہکر ہم جس قوت کے ساتھ انکی بزرگی کو ثابت کر سکتے ہیں، وہ نہ لفظ امام کے بڑھانے سے پیدا ہوتی ہے نہ کسی اور لقب کے اضافہ سے۔ اگر ایسا ہوتا تو آج لفظ خدا سے زیادہ کسی اور لفظ کے ساتھ طومار ضمیموں کا نہ ہوتا۔ اگر یہ کہا جائے کہ خدا کی ذات بے نیاز ہے اور اس کو کسی چیز کی ضرورت نہیں، تو میں پوچھتا ہوں کہ حسین ہی کو کب ضرورت ہے کہ آپ انہیں امام کہیں اور علیہ الصلواۃ والسلام کے دعاؤں کا محتاج سمجھیں۔ نہ وہ کسی کے کہنے سے امام ہو سکتے ہیں، اور نہ آپ کا سلامتی کی دعا ان کے لئے مفید ہو سکتی ہے۔

البتہ اگر اس کے جواب میں کسی نے یہ کہدیا کہ اس سے مقصود خود برکت و ثواب حاصل کرنا ہے تو بیشک میرے پاس اسکا کوئی توڑ نہوگا اور مجکو پھر سپر ڈالدینی پڑیگی، کیونکہ گفتگو اعتقاد کی اس تاریک دنیا کی چھڑ جائے گی، جہاں ہر جہل کا نام علم ہے اور مجھے اسکا علم ہے کہ بحمد اللہ میں اسقدر جاہل نہیں۔

بہرحال اگر کوئی شخص حسین کے نام کے ساتھ انکے تمام صفات کا اظہار بربنائے غلوئے شوق ضروری سمجھتا ہے تو مجھے اعتراض کی ضرورت نہیں کیونکہ اس کے ضمیر کو تسکین ہوتی ہے۔ اسی طرح اگر میں یہ سمجھتا ہوں کہ صرف لفظ حسین کا کہدینا زیادہ پرعظمت طریق اظہار ہے تو دوسرے کو برا ماننے کی ضرورت نہیں علی الخصوص اس وقت، جب کہ میں عیسی، موسی، محمد، ابوبکر، عمر، عثمان وغیرہ کے ساتھ بھی کسی اور لفظ کا اضافہ نہیں کرتا

اب رہا معاملہ شرر کی کتاب سکینہ بنت حسین کا، سو چونکہ اس کا تعلق صرف تجارت سے ہے اور محض تجارتی نفع کے خیال سے میں کسی کا دل دکھانا پسند نہیں کرتا اس لئے میں نے مینجر کو ہدایت کر دی ہے کہ آیندہ سے اسکا اشتہار بند کر دیا جائے، لیکن جناب سکینہ کے متعلق اپنے لکھے ہوئے واقعات کو میں اس وقت تک غلط نہیں سمجھ سکتا، جب تک اس کی غلطی مجھ پر ثابت نہ کر دی جائے۔

نیاز

نشاطِ بہار

فریب رنگ و بو کہیں ہوائے جستجو کہیں
فضائے آرزو کہیں خدائے ما و تو کہیں
نزول آب جو کہیں گلوں میں ہے نمو کہیں
نماز بے وضو کہیں ہے خم کہیں سبو کہیں
سرور ہے خمار ہے
بہار ہی بہار ہے

ارم فریب ہے زمیں مہک رہی ہے یاسمیں
لہک لہک کے پتیاں ہوئی ہیں کیف آفریں
چہک رہی ہیں بلبلیں گلاب کے قریں قریں
کنارے پنگھٹو کے ہیں حسین و شوخ نازنیں
نشاط ہے ترنگ ہے
امنگ سی امنگ ہے!

بہار سبزہ زار ہے کہ حسن کیف بار ہے
فضائے کیف زا ہے یہ کہ لطف بادہ خوار ہے
صبا میں ہیں زمزمے کہ نغمہ بے قرار ہے
یہ سرخ سرخ پھول ہیں کہ حسن اشکبار ہے
جو ہے وہ لاجواب ہے
شباب کا شباب ہے

خروش سیل گنگ ہے طلسم آب و رنگ ہے
صدائے قہقہہ ہے اب گلوئے حسن تنگ ہے
ہر ایک مطربہ لئے! رباب اور چنگ ہے
غنائے دلپذیر ہے فضا میں خاص رنگ ہے!
جمال تابدار ہے!
کہ حسن لمعہ بار ہے!

نمائش شباب ہے ہجوم اضطراب ہے
کھلی ہوئی ہے یاسمن عروس "بے نقاب" ہے
اسے خبر ہی یہ کہاں کسی کو پیچ و تاب ہے
نگاہ شوق دید سے مگر وہی حجاب ہے
گناہ پر عذاب ہے
عذاب بھی ثواب ہے

نیاز، سرفروش ہے تو ناز، لطف کوش ہے
پیام شوق میں نہاں لطافت خموش ہے
نگاہِ کیف آفریں حریف بادہ نوش ہے
ردائے جوش میں چھپی ادائے گل فروش ہے
نمود میں نمود ہے!!
شہود میں شہود ہے!!

لگاوٹیں شباب کی عداوتیں حجاب کی
جھلک کے قہر ڈھا گئیں یہ سرخیاں گلاب کی
رلائیں گی مجھے لہو! یہ شوخیاں نقاب کی
ہنوز لن ترانیاں سوال پر جواب کی
کلیم ناصبور ہے
خموش کوہ طور ہے!!

حلاوتِ بہار ہے کہ لطف آبشار ہے
وہ آئینہ ہوں دہر میں کہ روئے پُرغبار ہے
رفوئے زخم دل کہاں کہ جیب تار تار ہے
ہے "پیکرِ خموش" یہ کہ حافظِ نزار ہے
متین بے خروش ہے!
مگر بہار دوش ہے!

حافظ غازی پوری

خدائے محبت سے

اے خالقِ اربابِ وفا چھوڑ نہ مجھکو
اے عشق و محبت کے خدا! چھوڑ نہ مجھکو

اے وہ! کہ شہنشاہ بھی محتاج ہیں تیرے
میں بھی ہوں ترے در کا گدا چھوڑ نہ مجھکو

کمزور ہوئی روح مری۔ دور ہے منزل
ہے کشمکشِ لغزشِ پا چھوڑ نہ مجھکو

ہر ذرّہ گنہگار ہے تعمیر کا میری
لیکن مرے "معصوم خدا" چھوڑ نہ مجھکو

میرے لئے ہے تیرہ و تاریک زمانہ
اے چشمۂ انوار و ضیا! چھوڑ نہ مجھکو

ہوں کب سے تیری راہ میں افتادۂ ذلت
الفت سے مرے سر کو اٹھا چھوڑ نہ مجھکو

یہ ہاتھ تو وابستۂ زنجیرِ وفا ہیں
آقا! مرے دامن نہ چھڑا۔ چھوڑ نہ مجھکو

قطرہ کو بھی دریا سے ہی اک نسبتِ جاوید
ہوں گا نہ کبھی تجھ سے جدا چھوڑ نہ مجھکو

تو میرا خدا ہے تو میں تیرا ہی روشن ہوں
اس طرح نہ جو مجھسے خفا۔ چھوڑ نہ مجھ کو

(روشن صدیقی)

گونڈہ کی یاد دکن میں

تیرے اندر "رودِ موسیٰ"[1] ہے نہ "باغِ عام"[2] ہے　　کوئی واقف تک نہیں، تو اس قدر گمنام ہے
اونچے اونچے بام و در والے مکاں تجھ میں نہیں　　لکھنؤ کی نوبنو رنگینیاں تجھ میں نہیں
چشمِ ظاہر کے لئے ہر چند تو ویران ہے　　پھر بھی تیری سادگی میں بانکپن کی آن ہے
دیکھنے میں یوں تو بے رونق ہے تیری سرزمیں　　شہر کہلاتا ہے، لیکن شہریت بالکل نہیں

تیری گلیاں تنگ و ناہموار، سڑکیں خام ہیں
تیرے کچے گھر مسرت کا مگر پیغام ہیں

میری نظروں میں ہیں "رادھاکنڈ"[3] کی وہ سیڑھیاں　　چاندنی راتوں میں گھنٹوں میں ٹہلتا تھا جہاں
ہلکی ہلکی چاندنی میں وہ ہوائے مشکبار　　وہ کنول کے سرخ پھولوں پر قیامت کا نکھار
کوکتی تھیں کوئلیں جب دکھ بھری آواز سے　　دل تڑپ اٹھتا تھا سینہ میں عجب انداز سے
دور آموں کے درختوں پر پپیہا بول اٹھا　　یا لبِ صحرا کوئی دہقان اگر گانے لگا!

درد بن جاتی تھیں آوازیں دلِ مہجور میں!
تیرنے لگتی تھی میری روح موجِ نور میں!!

آم کی فصلوں میں وہ گنجان باغوں کی بہار　　وہ سڑک پر دونوں جانب سبز نیموں کی قطار
ہم جلیسوں میں وہ بے معنی خوشی کے چہچہے!　　عہدِ طفلی کا تبسم، نرم و شیریں قہقہے!
ہائے وہ "ساگر"[4] کی موجیں، "انجمن"[5] کا سبزہ زار　　شام کی تازہ ہواؤں میں وہ ٹینس کی بہار

حضرت اصغر کی وہ رنگیں نوائی کے مزے!
بیخودی میں وہ جگر کی خوش ادائی کے مزے!

ہائے اب تک کمسنی کی رنگ رلیاں یاد ہیں　　وہ محلے یاد ہیں، وہ تنگ گلیاں یاد ہیں
کوئی موسم ہو، کوئی رت ہو، سحر ہو شام ہو　　منزلِ آوارگی ہو، گوشۂ آرام ہو!!!
یہ مناظر دل سے اپنے میں بھلا سکتا نہیں　　مجھ کو کیوں ان سے محبت ہے، بتا سکتا نہیں

ذرہ ذرہ اس زمیں کا جلوہ گاہِ ناز ہے
میری اس وابستگی میں ایک گہرا راز ہے

ذوقی

[1] حیدرآباد کی ندی [2] حیدرآباد کا ایک خوبصورت باغ [3] گونڈے کا ایک تالاب [4] ایک دوسرا تالاب [5] کلب کا نام

ترانۂ دل

جب راز ہوں سرتا پا جب ایک معمّا ہوں
پھر بحث ہے لاحاصل محمل ہوں کہ لیلےٰ ہوں
یہ دیکھ کہ دانا ہوں! یہ دیکھ کہ بینا ہوں
یہ دیکھ کہ ہوں سب کچھ مت پوچھ کہ میں کیا ہوں؟

میں رونقِ محفل ہوں
دل ہوں میں ترا دل ہوں

امکاں مری وسعت کا! نادیدہ و نشنیدہ
یعنی ہوں ابھی تک میں اک فتنۂ خوابیدہ
صد نغمۂ نشنیدہ صد جلوۂ نادیدہ
جبریلؑ مرا خادم خالق مرا گرویدہ

میں جوہرِ قابل ہوں
دل ہوں میں ترا دل ہوں

آمین حزیں

عورت

حسن کے اور عشق کے جذبات کا
قلزمِ زخار لہراتا ہوا

قاصدِ عشق اور شاہنشاہِ حسن
نامۂ عصمت کی توقیعِ حیا

نیش ہے لیکن بمثالِ نوش ہے
بُرّش ہے سم۔ برنگِ مومیا

یا شرابِ عشرت و عیش و نشاط
یعنی آدم کا نخستیں مدعا

یا کہ ہے غارت گرِ ہوش و حواس
بادۂ کیف آور و ایماں رُبا

یا کہ ہے گوسالۂ مسلم فریب
سامری کا سحر ہے چلتا ہوا

یا پری جو کسوتِ آدم میں ہے
نور کے سانچے میں ہے یا بت ڈھلا

یا گلِ رنگینِ فردوسِ نظر
یا ترنمِ حضرتِ داؤدؑ کا

یا حدیثِ غالبِ جادو طراز
یا کہ شعرِ حافظِ معجز نما

یا اچھوتا سا تخیل جو کہ ہو
سرحدِ افکارِ شاعر سے وریٰ

یا کہ یہ قدرت کا گہرا راز ہے
پردۂ حسن و جوانی میں چھپا!

کیا جنونی کہئے مشتِ خاک کو
فتنۂ محشر کہ طوفانِ بلا

فضل حسین تبسم

غزلیات

اثر رامپوری

گھر سے باہر جاتا ہوں جب دلکو وحشت ہوتی ہے
میرے حال ابتر سے دنیا کو عبرت ہوتی ہے

دل کو راغب کرنیوالی اچھی صورت ہوتی ہے
جو دلمیں گھر کرتی ہے وہ اچھی سیرت ہوتی ہے

عرض حسرت کو یہ سمجھے میری شکایت ہوتی ہے
کہتے ہیں وہ ان باتوں سے ہمکو اذیت ہوتی ہے

دردِ الفت کے میں صدقے دردِ الفت کے قرباں
بڑھتا ہے یہ جتنا دل میں اتنی راحت ہوتی ہے

اے دل رنجِ فرقت میں گھبرانے سے کیا حاصل ہے
راحت بھی ملتی ہے اسکو جسکو مصیبت ہوتی ہے

اُن سے نظر کا ملنا بس اور سمجھ میں آنا تھا
جو دل کو بس میں کرتی ہے کونسی طاقت ہوتی ہے

مشکل راحت کیونکر دیکھے کوئی عشق دلبر میں
جب دل بس میں ہوتا ہے راحت کی صورت ہوتی ہے

دیکھ لیا کرتے ہیں اثرؔ ہم سوئے گردوں ایک نظر
رونے دھونے سے فرقت میں جسدم فرصت ہوتی ہے

شوق مرادآبادی

ہوں خاکِ نامراد۔ تری رہگذار میں
جو ذرہ اُڑ گیا ہو۔ ہوا سے غبار میں

ہمت ہے آج دیکھئے! کس جاں نثار میں؟
ایک اک ادا۔ پکار رہی ہے ہزار میں

یہ تنگنائے دہر کا ہے نقشۂ حیات
گویا پڑا ہوا ہوں کسی انتظار میں

ہے ہر ہوا کے ساتھ جو رقصاں۔ بگولہ وار
مٹ کر بھی۔ یہ جنون ہے میرے غبار میں

ہے عاشقوں میں دھوم رکوع و سجود کی
جوہر تڑپ رہے ہیں جو شمشیر یار میں

واللہ۔ ایک ہی ہے نویدِ وصال و مرگ
اُف بے بسی۔ کہ وہ بھی نہیں اختیار میں

پیغامِ وصل۔ شوقؔ بس اک حدِ عمر ہے
ابتک گذر رہی تھی کسی انتظار میں

اختر شیرانی

کبھی، کاش، رحم کا بھی اثر ملے چشم فتنہ نگاہ میں!
کہ کوئی گدا ہے پڑا ہوا ترے درد عشق کی راہ میں!

نہیں یاد عیش و ملالِ عمرِ گذشتہ کی کوئی داستاں
مگر آہ، چند وہ ساعتیں، جو بسر ہوئی ہیں گناہ میں!

گلۂ ستم کی مجال تو ہے پر آہ، اس کو میں کیا کروں
یہ جو ایک بجلی سی بیقرار ہے ان کی نیچی نگاہ میں!

جو نظامِ دل نہ بدل سکا، تو مذاقِ دہر کا کیا گلہ؟
وہی تلخیاں ہیں ثواب میں! وہی لذتیں ہیں گناہ میں!

نہیں عذر، زاہدا! لاکھ مرتبہ جائیں طوفِ حرم کو ہم
مگر ایک شرط ہے میکدہ، نہ ملا کرے ہمیں راہ میں!

بخدا کہ دونوں جہان میں کوئی بھی اس سے بڑھ کے مزہ نہ تھا
اگر ایک تلخیٔ انفعال کی حس نہ ہوتی گناہ میں!

دل شاہجہانپوری

کر چکا برباد جب عشق قیامت زا مجھے — دل کے سدن میں نظر آئی نئی دنیا مجھے
جب ازل سے حسن کی فطرت ہے خلوت آشنا — تم نے کوئے عشق میں پھر کیوں کیا رسوا مجھے
وہ تغافل کیش۔ میں صبر آزما۔ دل بادنا — دے شبِ وعدہ نہ تو اے زندگی دھوکا مجھے
آپ پر گذری ہوئی ہے خود سمجھ لیں اے کلیم — کیا کہوں اس جلوہ گہ میں کیا نظر آیا مجھے
آمد دے دید۔ شوقِ وصل سب خواب و خیال — ہستیٔ موہوم نے دھوکے دیئے کیا کیا مجھے
شدتِ تنویر آخر بن گئی وجہ حجاب! — پردہ اٹھنے پر بھی اک پردہ نظر آیا مجھے

حشر میں عذر وفا کا اب نہیں کوئی محل
یاد ہے اے دل کسی کا وعدۂ فردا مجھے

فرخ بنارسی

طریقِ عشق میں لذّت کشِ فنا ہوں میں
مٹا ہوا سا سرِ راہ نقشِ پا ہوں میں

جہانِ عشق میں اک راز ہے مری ہستی
بیاں ہو نہ سکے جو وہ مدعا ہوں میں

مذاقِ درد ملا درد آشنا نہ ملا!!
محیطِ دہر میں لب تشنۂ وفا ہوں میں

ہر ایک ذرّۂ فطرت ہے گوش بر آواز
سمجھنے والے سمجھتے ہیں وہ صدا ہوں میں

مآلِ ہستی موہوم اک معمہ ہے
خبر نہیں کوئی جس کی وہ مبتدا ہوں میں

ازل سے جو نہیں منّت پذیرِ چارہ گری
وہ خوگرِ خلشِ دردِ لا دوا ہوں میں

جفائے عشق کی مجبوریاں معاذ اللہ
نہ دیکھ سکتا تھا جو کچھ وہ دیکھتا ہوں میں

نہیں ہے اپنی خبر ہوش ماسوا کیسا
تلاشِ یار میں کچھ ایسا گم ہوا ہوں میں

بڑھی ہے کیفِ محبت سے بیخودی ایسی
کہ اپنا حال اب ایک اک سے پوچھتا ہوں میں

سرابِ وہم بہارِ نمودِ ہستی ہے
یہ سب فریبِ نظر ہے جو دیکھتا ہوں میں

زمانہ چاہیے تکمیلِ ذوقِ عرفاں کو
ابھی تو اپنی پرستش میں مبتلا ہوں میں

مری حقیقتِ ہستی ہے راز اے فرخ
کوئی سمجھ نہیں سکتا مجھے کہ کیا ہوں میں

راز رامپوری

سرِ نیاز کو کس کس کا آستاں نہ ملا
مگر جہان میں دیِ زینتِ جہاں نہ ملا

ذرا سمجھ کے مری حسرتوں کی داد مجھے
نمک ملا جو کبھی تو نمک فشاں نہ ملا

مرے فرائضِ ہستی میں خامشی تو نہ تھی
بقدرِ وسعتِ غم کوئی رازداں نہ ملا

قفس میں کتنی گذاری خبر نہیں لیکن
چمن میں آ کے جو ڈھونڈھا تو آشیاں نہ ملا

حسابِ حسرتِ سجدہ بتائے دیتا ہوں
یہی کہ مجھکو کبھی تیرا آستاں نہ ملا

قفس میں فکرِ خور و نوش اور میرے لئے
ہوں جسکی قید میں وہ بھی مزاجداں نہ ملا

عبث ہے شکوۂ فقدانِ آشنائے راز
جہاں میں جب کوئی تجکو عدوئے جاں نہ ملا

باب الاستفسار

شطرنج۔ خواب

(جناب مشتاق حسین صاحب۔ وکیل۔ لشکر)

(۱) اس سے پیشتر میں نے شطرنج کے بارے میں آپ سے دریافت کیا تھا کہ یہ کس شخص کی ایجاد ہے اور کب اور کہاں ایجاد ہوئی آپ نے جو مختصر سا جواب (پرائیوٹ) عنایت فرمایا تھا اس سے تسلی نہیں ہوئی۔ امید کہ ذریعۂ نگار مفصل جواب مرحمت فرمائیے۔

(۲) خواب کی بنیاد کیا ہے۔ نیند کی حالت میں اکثر عجیب قسم کے خواب نظر آتے ہیں جنکا وہم وخیال بھی نہیں۔ اسکے متعلق علماء واطبا نے کن خیالات کا اظہار کیا ہے اور خواب کی جو تعبیریں بیان کیجاتی ہیں وہ کہاں تک قابل تسلیم ہیں۔

(نگار) مجھے یاد نہیں کہ شطرنج کی بابت میں آپ نے کب دریافت فرمایا اور میں نے کیا جواب دیا تھا۔ آپ اس مسئلہ میں کیا تفصیل چاہتے ہیں جب کہ یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

عام طور پر یہی مشہور ہے کہ مسلمانوں نے یہ کھیل ہندوؤں سے سیکھا اور ہندو ہی اس کے موجد ہیں، لیکن اس کے ساتھ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ یہ کھیل یونان کے عہد قدیم میں بھی رائج تھا اور اہل یونان فلامیدوس یونانی (Palamedes) کو اسکا موجد کہتے ہیں۔

مشرق کے عہد وسطے میں نرد اور شطرنج دونوں کا رواج تھا اور نہ صرف ہندوستان بلکہ مشرق کے تمام ممالک میں یہ دونوں کھیل کافی رائج ہوچکے تھے، اس لئے گمان غالب یہی ہے کہ مسلمانوں نے اس کو ایران سے حاصل کیا مگر یہ ہوسکتا ہے کہ ایران میں اسکا رواج ہندوستان سے آیا ہو۔

لفظ شطرنج کی تحقیق میں بعض نے لکھا ہے کہ اس کی اصلیت سنسکرت ہے، لیکن میرے نزدیک یہ لفظ بگڑی ہوئی صورت ہے فارسی کی "شصت رنگ" کی۔ ممکن ہے کہ وہاں اس زمانہ میں ساٹھ گھروں کی بساط ہوتی ہو اور اسی لئے اس کو "شصت رنگ" کہتے ہوں۔ یا پھر یہ نام اس لئے وضع کیا گیا ہو کہ اس کھیل میں ہمیشہ مختلف رنگ کے نقشے بنتے ہیں

مسعودی کا بیان ہے کہ ہندوستان کے راجاؤں میں علوم وفنون کا بہت ذوق تھا اور ان کے عہد میں بہت سی باتیں ایجاد ہوئیں چنانچہ راجہ باہ بود کے عہد میں نرد کا کھیل ایجاد ہوا اور بلہیت کے زمانہ میں شطرنج ایجاد ہوئی، اور اس فن پر ایک کتاب بھی لکھی گئی جس کا نام ترک جنکا تھا مہرے آدمیوں اور جانوروں کی شکل کے بنائے جاتے تھے۔ مسعودی کے زمانہ میں یہ کھیل بارہ مہروں سے ہونے لگا تھا، لیکن اس سے قبل

اس کی مختلف صورتیں تھیں ۔

البیرونی نے لکھا ہے کہ یہ کھیل ہندوستان میں مختلف طریقوں سے رائج تھا، لیکن سب سے زیادہ عام طریقہ پانسہ کے ذریعہ سے کھیلنے کا تھا مثلاً اگر پانسہ میں ایک اور پانچ آتے تھے تو بادشاہ یا فیل کو چلنا پڑتا تھا، دو میں رخ کو تین میں گھوڑے کو چلنا پڑتا تھا۔ مہروں کی مقررہ قیمت ہوتی تھی جن کا اخیر میں شمار ہوتا تھا اور زیادہ قیمت کا مہرے رکھنے والا کامیاب سمجھا جاتا تھا۔

فردوسی نے بھی شطرنج کا ذکر کیا ہے اور وہ بالکل موجودہ شطرنج کے مطابق ہے یعنی وہی ۶۴ خانوں کی بساط اور وہی درمیان میں شاہ و وزیر اور اس کے داہنے بائیں فیل، گھوڑا، اور رخ کا قائم کیا جانا۔

شطرنج کے واضع کے متعلق ایک قصہ مشہور ہے کہ اس نے اس کے صلہ میں بادشاہ سے صرف گیہوں یا چاول کی اتنی مقدار طلب کی تھی جو ۶۴ خانوں میں پہلے خانے سے دوچند کے حساب سے آجائے۔ لیکن بعد کو حساب کرنے سے معلوم ہوا کہ ۲۰ خانوں تک اس کی مقدار اتنی ہو جاتی ہے کہ شاہی خزانہ بھی اس کے لئے کافی نہیں ہو سکتا۔ اس کا ذکر صفدی نے کیا ہے اور البیرونی نے بھی اس پر گفتگو کی ہے۔

بہرحال یہ کھیل عہد وسطےٰ میں مشرق، مغرب ہر جگہ رائج تھا اور حروب صلیبیہ کے زمانہ میں میدان جنگ کے اندر خیموں میں دونوں فریق اس کو کھیلتے تھے۔ ہارون الرشید کا شارلمین کو تحفہ میں شطرنج کا بھیجنا مشہور تاریخی واقعہ ہے۔

ن ۔ ف

(۲) خواب کے متعلق بحث کے دو طریقے اختیار کئے جا سکتے ہیں ایک وہ جس کا تعلق صرف فزیالوجی (عضویات) اور سائکالوجی (نفسیات) سے ہے اور دوسرا مذہبیات سے۔ اول الذکر علوم میں جو مباحث پیش کئے گئے ہیں وہ بہت بسیط و طویل ہیں، لیکن ان کو مختصر الفاظ میں اگر ظاہر کیا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان علوم میں خواب کا تعلق بالکل دماغ سے رکھا گیا ہے اور اس کی مختلف صورتیں گویا ان نقوش کی مختلف صورتیں ہیں جو دماغ میں پیدا اور محو ہوتے رہتے ہیں۔

اگر آپ نے عضویات کا مطالعہ کیا ہوگا تو معلوم ہوگا کہ انسان کا سر یا جمجمہ چند ہڈیوں سے مرکب ہے۔ جمجمہ کے اندر دماغ انسانی ہے جو بیشمار باریک رگوں اور ریشوں کا مجموعہ ہے، یہیں سے ایک شاخ ریڑھ کی ہڈی میں چلی گئی ہے اور یہیں سے تمام اعضائے انسانی کے اعصاب وعروق منشعب ہو کر پھیلتے ہیں۔ اس لئے دماغ کو مرکز اعصاب کہتے ہیں، اور اسی بناء پر ادراک و حس کا مخزن دماغ کو بتایا جاتا ہے۔

جب تک انسان جاگتا رہتا ہے، دماغ مع اپنے تمام نظام عصبی کے متاثر ہوتا رہتا ہے اور اس تاثر کے نقوش اس کے اندر محفوظ ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہ نقوش امتداد زمانہ کے ساتھ دھندلے بھی ہو جاتے ہیں اور مٹتے بھی رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگر ہم ایک شخص کو بہت دنوں کے بعد دیکھیں تو کبھی زیادہ غور کرنے کے بعد اس کی صورت یاد آتی ہے اور کبھی بالکل نہیں۔

انسان جب سو جاتا ہے تو دماغ کے بعض حصے معطل ہو جاتے ہیں اور بعض حصے کام کرتے رہتے ہیں۔ اور انہیں کام کرنیوالے حصوں کی یہ تمام اعجوبہ نمائیاں ہیں جنہیں خواب یا رؤیا سے تعبیر کرتے ہیں۔ ابھی یہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ انسان جو کچھ دیکھتا یا سنتا ہے اسکے

نقوش دماغ میں محفوظ رہجاتے ہیں۔ اس لئے سوجانے کے بعد دماغ کے جوحصے کام کرتے رہتے ہیں انکا مشغلہ یہی ہوتا ہے کہ ان نقوش پر نظر ثانی کرتے رہیں، یا ان میں مختلف قسم کی تبدیلیاں کرکے تماشہ دیکھتے رہیں۔ مثلاً اگر ہم نے دن کو بکری کو درخت پر چڑھتے دیکھا ہے، تو بالکل ممکن ہے کہ دماغ بہ حالت نوم اس منظر کو بالکل الٹ کر یوں دکھادے کہ درخت بکری کی پیٹھ پر اُگا ہوا ہے، یا اگر دن کو ہم نے ایک پٹاخہ کی آواز سُنی ہے تو رات کو یہ آواز توپوں کی گرج میں تبدیل ہوجائے، یا اگر ہم نے نل سے پانی کو قطرہ قطرہ کرکے ٹپکتے دیکھا ہے تو رات کو دماغ اسے سیلاب اور طوفان کی صورت میں دکھادے۔ پھر دماغ یہی نہیں کرتا کہ حال ہی کے نقوش میں تغیر و تبدل کرکے پیش کرے بلکہ وہ نئے پرانے تمام نقوش کو ملاکر بھی کبھی پیش کرتا ہے اور انسان حیرت کرتا ہے کہ جن باتوں کا وہم و گمان بھی نہ تھا وہ خواب میں نظر آئیں۔ حالانکہ اکثر و بیشتر یہ قدیم نقوش دماغی کی نظر ثانی ہوتی ہے اور انہیں کے تغیر و تبدل اور گڈمڈ ہوجانے سے مختلف صورتیں خواب کی پیدا ہوتی ہیں۔ شیخ بوعلی سینا اور امام رازی ان کے شارح نے بھی خواب کی حقیقت یہی بیان کی ہے اور جدید تحقیقات بھی یہی ہے۔ اور اس میں کلام نہیں کہ خواب کا تعلق بالکل انسان کے دماغ سے ہے۔ لیکن مذہبی دنیا میں خواب کی مختلف قسمیں قرار دیکر ایک قسم کا نام بشارت خدا اور فیضان الٰہی رکھا ہے، جو انبیا، اولیا، صلحا، وغیرہ کو حاصل ہوتا ہے اور جو وحی، الہام، القاء کی ایک صورت سمجھا جاتا ہے۔

قبل اس کے کہ ہم اس پر بحث کریں، اس کی تعیین ضروری ہے کہ خواب یا رؤیا کے اقسام میں واقعی کوئی قسم ایسی بلند ہے یا نہیں جسکی کوئی علمی تاویل بظاہر نہیں ہوسکتی ہے اور جس کو فیضان الٰہی کہا جاسکتا ہے۔ اس کے متعلق لوگوں کے تجربات مختلف ہیں۔ بعض اس کے قایل نہیں ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ رویائے صادقہ کا وجود پایا جاتا ہے۔ اور حقیقت میں رؤیاء صادقہ سے انکار نہیں ہوسکتا اور بہت سی مثالیں ایسی ملتی ہیں، جن میں خواب کے ذریعہ سے آیندہ ہونے والے یا کسی اور جگہ وقوع میں آنے والے حالات کا علم ہوگیا، چونکہ بظاہر اس قسم کے خواب قدیم نقوش دماغی کا نتیجہ نہیں ہوتے اس لئے ان کو انتباہ غیبی کا کہا جاتا ہے اور ملاء اعلیٰ کے عالم ارواح سے اس کو متعلق سمجھا جاتا ہے۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ اس قسم کے رؤیا کا جو نام جی چاہے رکھ لیا جائے، لیکن ہیں وہ ایک ہی علمی اصول کے ماتحت اور نفسیات انسانی کے مسلمات سے انکو علحدہ نہیں کرسکتے۔ کہا جاتا ہے کہ اکثر نفوس مقدسہ اور بزرگان دین کے خواب سچے ہوتے ہیں اور کوئی نہ کوئی مدعا ضرور ان میں پوشیدہ ہوتا ہے۔ لیکن رویاء صادقہ کے لئے ہمارے نزدیک بزرگ یا غیر بزرگ کی کوئی قید نہیں لگائی جاسکتی اگر ایک شخص بغیر ولی یا بزرگ ہوئے حالت بیداری میں کوئی پیشین گوئی کرسکتا ہے، کسی کے دل کی چھپی ہوئی بات معلوم کرسکتا ہے، بند خطوط کے اندر کی عبارت پڑھ لیتا ہے (ملاحظہ ہو اس ماہ کے رسالہ میں مضمون "عالم فطرت، ماوراء علم و ادراک")، تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ سونے کے بعد اس قسم کے خواب نہ دیکھ سکے، اس لئے میری رائے یہ ہے کہ رویاء صادقہ کا وجود تو یقینی ہے لیکن اس کے لئے خاص دماغ پیدا ہوتے ہیں اور اکتساب وسعی کو اس میں مطلق دخل نہیں ہے۔ یہ ممکن ہے کہ ایک شخص کی دماغی ساخت ایسی مکمل تو نہ ہو کہ وہ بہ حالت بیداری اس قسم کی صاف صاف طور پر خبریں دے سکے لیکن سونے کے بعد اشارات یا استعارات کی صورت میں اس کے دماغ کو کچھ علم ہوجاتا ہو اور یہی صورت ایک ایسی ہے جس کا تعلق

تعبیر عن الرؤیا رسے ہے۔

شیخ بو علی سینا لکھتا ہے کہ جن لوگوں کے نفس کامل ہیں ان کو خواب میں ملاء اعلیٰ سے فیضان ہوتا ہے اور وہ فیضان انکے صور خیالیہ میں سے کسی صورت میں منتقل ہو کر خواب میں نظر آتا ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب کا بیان ہے کہ صرف اس قسم کے خواب قابل تعبیر ہوتے ہیں۔ باقی سب لغو و مہمل ہیں۔

بو علی سینا اور محدث دہلوی کا یہ ارشاد میری رائے سے مختلف نہیں ہے بلکہ ایک ہی ہے صرف بیان اور تعبیر کا فرق ہو تو ہو۔ اس امر کا ثبوت کہ بعض دماغوں کو اشارات کے ذریعہ سے آیندہ کے حالات سے خبردار کیا جاتا ہے۔ سورۂ یوسف سے بھی ہوتا ہے۔ کیونکہ یوسفؑ کے جس خواب کا ذکر کلام مجید میں ہے وہ اس قسم کا اشاری و کنائی ہے اور غالباً تمام پیغمبروں میں یوسفؑ ہی ایک ایسے پیغمبر تھے جن کا دماغ نہ صرف اس قسم کے خوابوں کے دیکھنے کا اہل تھا بلکہ اس قسم کے خواب سنکر ان کے مفہوم تک پہونچ جانے کی بھی قابلیت ان میں اچھی پائی جاتی تھی۔

پھر چونکہ اس طرح کے دماغ کم پیدا ہوتے ہیں، اس لئے ہر شخص کو اپنے خواب کی تعبیر تلاش کرنا لغو سی بات ہے۔ کیونکہ اکثر و بیشتر خوابونکی حقیقت امتلاء معدہ، سوء ہضم، تاثرات دماغی، مشاہدات روزانہ، فکر و خیال، واہمہ و تصور سے زیادہ نہیں ہوتی اور ان کے لئے تعبیر نامہ کو لیکر بیٹھ جانا مہمل سی بات ہے۔ جب کہ نہ یہ کوئی علم و فن ہے اور نہ صحت کے ساتھ کوئی اصول تعبیر خواب کے منضبط ہو سکتے ہیں۔

آپ کو اگر رؤیا رسے بہت دلچسپی ہے اور اس کے متعلق آپ زیادہ بسیط معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں تو پہلے عضویات و نفسیات کی کتابوں کا مطالعہ کیجئے اور انکو پڑھ کر خود غور فرمائیے کہ انکے تسلیم کرنے میں کیا قباحتیں اور ہر خواب کو قابل تعبیر سمجھنے یا عالم رؤیا کو کسی اور دنیا سے متعلق سمجھنے میں کیا فواید ہیں۔

عربی میں بعض اچھے رسالے اس موضوع پر شایع ہوتے ہیں، انگریزی میں تو خیر بہت کافی مواد موجود ہے۔ ان دونوں زبانوں کی کتابوں سے آپ مدد لے سکتے ہیں، کئی سال ہوئے اردو میں دارالاشاعت صوفی پنڈی بہاء الدین نے ایک رسالہ میرے ایک دوست کا لکھا ہوا شائع کیا تھا جسمیں عربی معلومات سے مدد لیگئی تھی اسکو طلب کر کے ملاحظہ فرمائیے اسوقت وہ رسالہ میرے پاس نہیں ہے ورنہ میں اسکا نام بھی لکھدیتا۔

تعبیر کی کتابیں جو عام طور سے بازار میں نظر آتی ہیں بالکل لغو و مہمل ہیں اور انپر اعتماد کرنیکے نقصانات کا مجھے پورا علم ہے، کیونکہ میرے بعض احباب ہمیشہ اپنے خوابونکو رؤیا رصادقہ سمجھ کر انہیں تعبیر ناموں سے مدد لیا کرتے تھے، اور ہمیشہ امداد غیبی کے منتظر رہتے تھے، جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ غیب نے انکی مدد کی اور نہ زمانہ نے اتنا قیام کیا کہ ان کے کام کرنیکی عمر باقی رہتی، الغرض اس دہم نے انہیں تباہ کر دیا اور وہ اب بالکل بیکار ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ اگر کسی شخص میں رؤیا رصادقہ دیکھنے کی اہلیت موجود ہو تو بھی، تو بھی اسکو قابل لحاظ نہ جاننا چاہئے کیونکہ اسکے خواب دنیا میں ہماری کوئی مدد کر سکتے ہیں اور نہ کسی مصیبت سے بچا سکتے ہیں، چہ جائیکہ ہر شخص کا اس خبط میں مبتلا رہنا۔ اگر آپکا انہماک اسطرف زیادہ ہے تو میں آپکو مشورہ دونگا کہ کوشش کر کے اپنے دماغ کو دوسری طرف متوجہ کیجئے اور کبھی اسباب کے علم کی کوشش نہ کیجئے جسکا علم آپکو کوئی فائدہ نہیں پہونچا سکتا۔

نیاز

اقتباسات علمیہ

صحافت اور عجائب تلغراف

اخبار مانچسٹر گارڈین کے دفتر میں ایک بالکل جدید قسم کا آلہ تلغراف نصب ہے جو یوروپ و امریکہ کے کسی اخبار کے دفتر میں نہیں پایا جاتا۔ چونکہ اس اخبار کا ایک دفتر لندن میں بھی ہے اس لئے لندن کے دفتر سے مانچسٹر کے دفتر تک ایک خاص تار لگایا گیا ہے جس کے ذریعہ سے آن واحد میں متعدد پیغامات ادھر ادھر آجا سکتے ہیں۔ اس آلہ کے پاس پانچ ٹائپ کی مشینیں رکھی ہوئی ہیں جو لندن سے آنے والی خبروں کو از خود ٹائپ کرتی رہتی ہیں۔ اسکی تفصیل یہ ہے کہ لندن کے دفتر میں بھی پانچ ٹائپ کی مشینیں ہیں جن پر کلرک مختلف خبروں کو ٹائپ کرتے ہیں اور انکو دفعۃً اسی ایک تار کے ذریعہ سے مانچسٹر روانہ کرتے ہیں۔ مانچسٹر میں یہ مختلف پیغامات ایک آلہ کے ذریعہ سے علیحدہ ہوجاتے ہیں اور مختلف مشینوں پر پہونچکر ٹائپ ہوجاتے ہیں۔ سب سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ ایک وقت میں ایک ہی پیغام جاسکتا ہے، لیکن اس تار کی خصوصیت یہ ہے کہ وقت واحد میں متعدد پیغامات بھیجے جاسکتے ہیں۔

روشنی اور سانپ کا زہر

مشہور ہے کہ صحرا کے رہنے والے سانپوں میں زیادہ مہلک زہر ہوتا ہے۔ اس شہرت کی بنا پر فرانس کی اکاڈمی کے دو عالموں کا خیال اس طرف منتقل ہوا کہ ممکن ہے اسکا تعلق آفتاب کی سے ہو، چنانچہ انہوں نے اس کے تجربات شروع کئے اور تحقیق کے بعد دریافت ہوا کہ مافوق البنفسجی شعاعوں کا اثر سانپ کے زہر کو زیادہ سریع الاثر اور مہلک بنا دیتا ہے۔ ایک ہی سانپ کا زہر دو جگہ تقسیم کرکے ایک پر یہ شعاعیں ڈالی گئیں اور دوسرے کو اس کے حال پر چھوڑ دیا گیا، اور پھر ان دونوں زہر کو دو جانوروں کے جسم میں پہونچایا گیا تو اس زہر کا فعل بہت شدید ثابت ہوا جس پر شعاعیں ڈالی گئی تھیں۔

یہ بھی قدرت خداوندی ہے کہ وہی مافوق البنفسجی شعاعیں، جو نشو و نما اور ازالہ مرض کے لئے اسقدر ضروری ہیں، وہی سمیت بھی پیدا کرتی ہیں، یعنی اگر ایکطرف وہ تریاق ہیں تو دوسری طرف سم قاتل بھی ہیں۔

مستقبل کا تمدن

جرمنی کی ایک فلم کمپنی نے فلم طیار کیا ہے جس کے ذریعہ سے یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ آئندہ دنیا کی آبادی اور اسکے شہروں کی کیا حالت ہوگی۔ اس فلم کا نام "متروپولس" ہے اس میں دکھایا گیا ہے کہ اس قرن کے اخیر تک مکان اتنے بلند بننے لگیں گے کہ حال کی بلند عمارتیں ان کے سامنے کوئی حقیقت نہ رکھیں گی۔ ان مکانوں کے درمیان سلسلۂ آمد و رفت چھوٹے چھوٹے ہوائی جہازوں کے ذریعہ سے ہوا کریگا، اور ان کی کثرت اس قدر ہوجائے گی جیسے اب سڑکوں پر موٹریں نظر آتی ہیں۔ سڑکیں پلوں کیطرح بالکل معلق بنیں گی۔ صنعت و حرفت کے کارخانے صرف ایک شخص کی ملکیت میں ہوا کریں گے، اور تمام کام صرف بجلی کا بٹن دبانے سے چلایا کریں گے۔ تفریح کے لئے باغ اور پارک بھی معلق ہونگے۔ الغرض شہر کا شہر بالکل میکانکی اور مشین کا بنا ہوا ہوگا جس میں تمام کام بجلی اور مشین سے اس طرح ہوا کریں گے جیسے نظام عالم کے موسموں کا ظہور، آفتاب کا طلوع و غروب اور تمام حوادث طبیعی سب ایک وقت

مقررہ پر اپنے آپ ہوتے رہتے ہیں اور کوئی ہاتھ اس نظام کو عمل میں لانے والا نظر نہیں آتا۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس فلم بنانے کا خیال سر فلپ گبس کی کتاب کو دیکھ کر پیدا ہوا جس میں علمی طریقہ سے بتایا ہے کہ دنیا کا عہد مستقبل کسقدر عجیب و غریب آنے والا ہے، ممکن ہے کہ اس وقت یہ پیشین گوئیاں صرف لطائف سمجھی جائیں، لیکن اگر میکانکی ترقی کا یہی عالم ہے تو ہکو حیرت نکرنا چاہیے، کیونکہ اسوقت جو کچھ نظر آرہا ہے، اگر پچاس سال قبل اسی کی پیشین گوئی کی جاتی تو لوگ اسپر بھی ہنستے، حالانکہ اب وہ سب حقیقتیں ہیں۔

فن پرواز کیلئے ایک جدید اختراع

ڈیٹرائٹ امریکہ کا وہ مقام ہے جہاں فورڈ کا کارخانہ ہے اور جس میں اب موٹروں کے علاوہ ہوائی جہاز بھی طیار ہوتے ہیں۔ یہاں ہوائی جہاز کے لئے ایک ایسی جدید اختراع ہوئی ہے جس سے فن طیران میں بہت کچھ انقلاب و تغیر کی توقع کی جاتی ہے۔ یہ اختراع متعلق ہے جہاز کے محرک (موٹر) سے جو بجائے بنزین کے کہربائی مقناطیسی قوت سے چلیگا اور اس کی حرکت زمین کی طرح ہوگی۔

ماہرین فن نے اس اختراع کا امتحان کرنے کے بعد فیصلہ کیا ہے کہ یہ آلہ ایک منٹ میں ۱۸۰۰ مرتبہ گردش کرتا ہے اور دو ہزار گھنٹے تک برابر بغیر دوبارہ قوت پہونچائے ہوئے یہ آلہ گردش کرسکتا ہے۔

ایک جماعت ماہرین فن کی طلب کی گئی ہے تاکہ اس کی کامل تحقیق کرکے رپورٹ پیش کرے۔ اور دنیا نہایت بیتابی سے نتیجہ کی منتظر ہے۔

مطبوعات جدیدہ

تاریخ اسلام

صدیق بکڈپو لکھنؤ نے حال ہی میں یہ کتاب ۵ جلدوں میں شایع کی ہے۔ کتاب کا موضوع اس کے نام سے ظاہر ہے۔ یہ ترجمہ ہے مصری مورخ علامہ محی الدین کی کتاب کا اور اسمیں شک نہیں کہ ترجمہ اچھا کیا گیا ہے۔ اس وقت عربی زبان میں یہ تاریخ خاص اہمیت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے اور اکثر جگہ نصاب میں داخل ہے۔ یورپین ممالک کے اخبار و رسایل نے بھی اس تالیف کی بہت تعریف کی ہے اس میں شک نہیں کہ جمع واقعات اور اسلوب بیان کے لحاظ سے یہ کتاب ہر تعریف کی مستحق ہے۔ پہلے حصہ میں فن تاریخ کی اہمیت بیان کرکے عہد نبوی سے بحث کی گئی ہے۔ دوسرے حصہ میں خلفائے راشدین کے حالات ہیں، تیسرے حصہ میں خلافت بنی امیہ کی تاریخ ہے، چوتھے حصہ میں خلافت عباسیہ کے حالات قلمبند کئے ہیں اور پانچویں میں اسپین اور دوسری اسلامی حکومتوں سے بحث کی ہے۔ کتابت و طباعت پسندیدہ ہے، پانچوں حصوں کی قیمت پانچ روپیہ ہے اور منیجر نگار سے مل سکتی ہے۔

سیر المصنفین جلد دوم

مولوی محمد یحییٰ صاحب تنہا بی۔ اے نے سیر المصنفین کی پہلی جلد لکھکر اسقدر شہرت حاصل کرلی تھی کہ اگر وہ سیر المصنفین کی دوسری جلد نہ مرتب کرتے تو بعض حضرات کے نزدیک ان پر ناشکر گزاری کا الزام عاید ہو سکتا۔ لیکن اگر تنقید صحیح کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے

تو میں یہ کہونگا کہ جس طرح پہلی جلد انکا کوئی قابل فخر کارنامہ نہیں تھا، اسی طرح افسوس ہے کہ دوسری جلد بھی ایک ناکامیاب سعی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ پہلی جلد میں انہوں نے دو دوروں سے بحث کی تھی، پہلا وہ جسے انھوں نے میر محمد عطا حسین خاں صاحب تحسین سے شروع کرکے محمد خلیل اللہ خاں اشک پر ختم کیا تھا اور اس سلسلہ میں میر امن، لطف، میر بہادر علی حسینی، میر امن دہلوی، میر شیر علی افسوس، سید انشاء اللہ خاں انشاء، مولوی شاہ رفیع الدین دہلوی، مولوی شاہ عبد القادر دہلوی، مولوی اسمٰعیل شہید، منشی نہال چند لاہوری وغیرہ کے حالات اور لٹریچر سے بحث کی تھی، دوسرا دور کو فقیر محمد خاں گویا سے شروع کرکے منشی امیر احمد مینائی پر ختم کیا تھا اور اس سلسلہ میں مرزا رجب علی بیگ سرور، اسد اللہ خاں غالب، غلام امام شہید، غلام غوث بیخبر وغیرہ کے تذکرہ سے اعتنا کیا گیا تھا۔ اب یہ دوسری جلد تیسرے دور سے متعلق ہے جس میں سرسید، مولوی چراغ علی، محمد حسین آزاد، ذکاء اللہ، سید علی بلگرامی، ڈپٹی نذیر احمد، الطاف حسین حالی، شبلی نعمانی، رتن ناتھ سرشار اور شرر شامل ہیں۔

شکر ہے کہ چوتھا دور "شایان دست و بازوئے قاتل" نہیں سمجھا گیا ورنہ وہ بھی اسی تنقید عالیہ اور صحت ذوق کا شکار ہوتا جو انہوں نے گذشتہ تین ادوار کے حالات قلمبند کرنے میں صرف فرمائی ہے۔ تنہا صاحب نے یقیناً اپنے آپ کو سمجھنے میں بہت بڑی غلطی کی ورنہ وہ ہرگز سیر المصنفین ایسی اہم کتاب کی تالیف کی جرأت نہ کرتے۔ اگر سیر المصنفین سے انکا مقصود یہ تھا کہ بعض مصنفین کے حالات نہایت سرسری طور پر لکھ کر انکی تصانیف پر ایک غیر ماہرانہ رائے کا اظہار کر دیا جائے تو بیشک تنہا صاحب کو کامیاب مؤلفین کی صف میں جگہ دیجا سکتی ہے، لیکن اگر سیر المصنفین کے ذریعہ سے کوئی ایسی تالیف پیش کرنا مقصود تھا جو تذکرہ نویسی، سیرت نگاری، مورخانہ کاوش و تحقیق، تنقید صحیح، فلسفیانہ استنتاج تاریخ کی معیاری چیز ہو، تو ہر شخص ادنیٰ تامل کے بعد کہدیگا کہ تنہا صاحب اس میدان کے مرد نہ تھے اور اگر وہ اتنا وقت اپنے پیشۂ وکالت ہی کی ترقی میں صرف کرتے تو ذریعہ موزوں تھا۔

جمع واقعات و حالات میں انہوں نے سوائے چند رسائل یا مشہور کتب تذکرہ و تاریخ کے اور کوئی دوسری صورت استفادہ کی اختیار ہی نہیں کی اور تنقید کی حقیقت اس سے ظاہر ہے کہ شرر کے ناولوں میں وہ فردوس بریں کو سب سے بہتر ناول خیال کرتے ہیں (جو حقیقتاً سب سے بدتر ہے) اور محمد حسین آزاد کی زبان کو ٹکسالی کہتے ہیں، جو اغلاط سے پر ہے۔ فاضل مولف نے اقتباسات کی کثرت سے اس جلد کو بھی بہت ضخیم بنانے کی کوشش کی ہے، لیکن افسوس ہو کہ اقتباسات بھی سب ادنیٰ قسم کے ہیں اور کوئی ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ تنہا صاحب کا دماغ کبھی بھول کر بھی حقیقت کی طرف مائل ہو سکتا ہے۔

میں نہیں سمجھ سکتا کہ جامعہ ملیہ دہلی نے اس کتاب کو شایع کرکے کوئی خاص خدمت اردو زبان یا فن تذکرہ نویسی کی انجام دی ہے۔

اس کتاب کی قیمت تین روپیہ ہے جو حسن طباعت و کتابت اور ضخامت کے لحاظ سے زیادہ نہیں ہے۔

قرآن اور پردہ مرزا عظیم بیگ چغتائی بی۔ اے (علیگ) نے اس رسالہ میں روایت و درایت دونوں طرح عورتوں کے موجودہ پردہ کو ناجایز و غیر ضروری ثابت کرنے میں اس اجتہاد اور سعی و کاوش سے کام لیا ہے جسکا جدید تعلیمیافتہ حضرات میں فقدان ہے۔ انکی اس تالیف سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب چغتائی ایک اچھے مولف و مصنف ہونیکی اہلیت اپنے اندر رکھتے ہیں اور میرے نزدیک یہ فال نیک ہے کہ انکی یہ اہلیت حسن نسائی کے ساتھ ساتھ ذی نقاب ہوئی۔ ہر چند اس لحاظ سے کہ عورتوں کے پردہ کا مسئلہ اس وقت مردوں کے لئے قابل توجہ ہوتا ہے، جب خود عورتوں نے اسکی کراہت کو محسوس کرکے اسکا اعلان کر دیا ہو، اس نوع کی سعی و کوشش کوئی خاص امتیاز نہیں رکھتی، لیکن یہ ضرور ہے کہ اگر کسی وقت عورتوں کو خود علمی مقابلہ مستبد قسم کے مردوں سے کرنا پڑا تو ایسی تصانیف ان کیلئے اچھا آلۂ حرب و دفاع ثابت ہونگی۔

شروع میں آنریبل ڈاکٹر جسٹس شاہ محمد سلیمان چیف جسٹس الہ آباد کا مختصر لیکن نہایت مدلل مقدمہ کیا بلکہ فیصلۂ آخری بھی شامل ہے، جو نہ صرف

اس [illegible] کر دو یو پی کی سب سے بڑی عدالت گاہ کے سب سے بڑے عادل حاکم کا فیصلہ ہے بلکہ اس حیثیت سے بھی کہ وہ قوم کا بہترین [illegible]
کتاب [illegible] چھاپی گئی ہے [illegible] میں محصولڈاک سکریٹری انجمن اصلاح بیدہ علیگڑھ سے ملسکتی ہے۔

صراط الحمید

سفرنامہ ہے محمد الیاس برنی ایم۔ اے پروفیسر معاشیات جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کا جو (مقامات مقدسہ)، شام، فلسطین، حجاز [illegible]
میں مرتب کیا گیا ہے۔

جناب برنی نے جس ولولہ و شوق، اور جس جذبۂ خلوص و عقیدت سے یہ سفر کیا ہے وہ کتاب کے ہر ہر لفظ سے ظاہر ہے۔ اور غالباً اسی کیفیت کا اثر ہے [illegible]
اس کے مطالعہ سے کافی لطف اندوز ہوتا ہے۔ مقامات مقدسہ کی زیارت کرنے والوں کیلئے یہ سفرنامہ بہترین مشیر و ہمدرد کی خدمات انجام دے سکتا ہے [illegible]
رحلت، خصوصیات اماکن وغیرہ کے متعلق کوئی ایسی بات نہیں ہے جو اس میں درج نہو۔ اگر وہ معاشیات و اقتصادیات کے ماتحت بھی ان مقامات پر [illegible]
غالباً بے محل نہوتا، لیکن برنی صاحب کا یہ سفر ایک عاشق سا سفر تھا، نہ کہ پروفیسر کا۔ کتاب کی طباعت و کتابت کی نفاست پر لکھنا بیکار ہے [illegible]
مسلم یونیورسٹی پریس میں چھپی ہے اور غالباً وہیں سے عہ میں ملسکتی ہے۔

مطلع الانوار

سلسلۂ کلیات خسرو کی یہ ساتویں کتاب ہے جو مولوی محمد مقتدا خاں صاحب شروانی کی تنقید و نگرانی میں مسلم یونیورسٹی پریس سے شائع ہوتا [illegible]
ہے اس سے قبل جو حضرات اس سلسلہ کی اور کتابوں (مجنوں لیلیٰ، آئینہ سکندری، لالی عماں، دول رانی خضر خاں، قران السعدین [illegible]
ہشت بہشت) کو دیکھ چکے ہیں، وہ سمجھ سکتے ہیں کہ اس مثنوی کو بھی کیسا ہونا چاہئے۔ صحت و حسن کتابت اور تصحیح و تنقید کے لحاظ سے یہ مثنوی بھی خاص اہتمام [illegible]
شائع ہوئی ہے اور نواب محمد اسحاق خاں مرحوم جو اور برکات اپنے بعد چھوڑ گئے ہیں، انہیں میں سے ایک علمی برکت یہ بھی ہے۔
اس سے قبل جو مثنویاں شائع ہوئی ہیں ان میں مولوی مقتدا خاں صاحب کی کوششیں محض حسن طباعت تک محدود تھیں، لیکن اسمیں انکا حسن ترتیب و
جمال تنقید بھی شامل ہے، اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ یہ مثنوی قابل قدر نہو۔ رہا کلام خسرو سو اسکے متعلق لکھنا بیکار ہے کہ ہر شخص اس کی حلاوت سے واقف ہے قیمت [illegible]

الایمان

یہ ایک رسالہ ہے ۵۲ صفحات کا جسے مولوی محمد مقتدا خاں شروانی نے مسلمان بچوں کی تعلیم عقاید کی غرض سے لکھا ہے۔ زبان نہایت صاف و
سلیس ہے اور ترتیب معقول۔ ۲ر آنہ میں مسلم یونیورسٹی پریس سے ملسکتی ہے۔

سفرنامہ شاہ امان اللہ خاں حصہ اوّل

مولوی زاہد القادر صاحب نے ان تمام واقعات کو جو شاہ افغانستان کی سیاحت یورپ کے متعلق اخباروں میں
شائع ہو چکے ہیں ایک جگہ جمع کرکے اس نام سے شائع کیا ہے۔ چونکہ یہ حالات کوئی جدید چیز نہیں ہیں [illegible]
متعلق رائے زنی بیکار ہے، البتہ اسقدر جدت ضرور کیگئی ہے کہ جابجا تصاویر دیکر اسکو زیادہ دلچسپ بنایا گیا ہے، اور شروع میں شاہ امان اللہ خاں کے مختصر حالات بھی
دیدیئے گئے ہیں۔ اس حصہ میں سیاحت روس تک کے حالات درج ہیں، باقی حالات دوسرے حصہ میں ہونگے، اسکی قیمت قسم کے لحاظ سے دو روپیہ اور ایک روپیہ رکھی گئی ہے۔
ملنے کا پتہ قریشی بکڈپو کوچہ چیلاں دہلی ہے۔

ابن سعود

یہ ایک ناول ہے جسمیں جناب حسرت لکھنوی نے ابن سعود (سلطان نجد) کے حالات افسانہ کے پیرایہ میں [illegible]
بے تعلق کئے گئے ہیں جنکا علم عوام کو نہیں ہے۔ یہ کتاب گویا اس لٹریچر پر مشتمل ہے جو ہندوستان کے اندر [illegible]
پیدا ہو گیا ہے۔ اسکی قیمت ۱۲ر روپیہ رکھی گئی ہے جو ۲۰۹ صفحہ کی کتاب کے لئے زائد ہے۔ ملنے کا پتہ قریشی بکڈپو کوچہ چیلاں دہلی ہے۔

رسالہ تجلی نعمانی دہلی کا عظیم الشان اشاعتی اعلان

مترجمہ و ... خوشنما قرآن شریف

کلکتہ واچ کمپنی چاندنی

رجسٹرڈ نمبر ایل ۱۰۲۴ — جلد ۱۵ - شمارہ ۳

فہرست مضامین مارچ ۱۹۲۹ء

اڈیٹر:۔ نیاز فتحپوری

جلد ۱۵ | مارچ ۱۹۲۹ء | شمار ۳

ملاحظات

اگر غور کیا جائے تو یہ بات آسانی سے معلوم ہوسکتی ہے کہ حکومت زیادہ سے زیادہ چار قسموں کی ہوسکتی ہے: ۱۔ ایک شخصی واستبدادی ملوکیت جسمیں قوم کی رائے اور اسکی آواز کو کوئی دخل نہیں ہے اور شاہِ وقت ملک کے سیاہ و سفید کا مختارِ کُل ہوتا ہے اس قسم کی حکومتیں انیسویں صدی سے قبل اکثر جگہ پائی جاتی تھیں اور کچھ زمانہ پیشتر روس ترکی اور ایران میں بھی یہی "سلطنۃ مطلقہ" پائی جاتی تھی، لیکن اب سوائے سیام اور بعض ہندوستانی ریاستوں کے، یہ طریق حکومت تمام دنیا سے معدوم ہوگیا ہے اور اس کے حیلہ کی اب کوئی امید بھی نہیں۔

دوسری قسم حکومت کی حکومت جمہوری و ڈیموکریٹک ہے جو قوم اور نمایندگان قوم کے زیر اثر ہوتی ہے اور کسی ایک شخص کو اختیار کامل نہیں دیا جاتا جس کی ایک مثال فرانس کی حکومت ہے۔ تیسری قسم کی حکومت وہ ہے جسے حکومت اتحادی کہتے ہیں جمہوری اور اتحادی حکومت میں یہ فرق ہے کہ اول الذکر میں صرف ایک مخصوص قوم و جماعت تمام اہل ملک کے لئے وضع قانون کا اختیار رکھتی ہے (مثلاً ملک فرانس کہ وہاں کا ہر شخص خواہ وہ کسی جگہ کا رہنے والا ہو پیرس کی پارلیمنٹ کے وضع کردہ قوانین کے آگے سر جھکا دیگا) اور موخر الذکر طریق حکومت میں ایک ملک کے مختلف حصے اپنے اپنے مفاد کے لحاظ سے مختلف قوانین وضع کرتے ہیں

اور انکا تعلق ایک مرکزی حصہ سے ہوتا ہے جس کو یہ مختلف حصے کچھ زاید حقوق دیدیتے ہیں۔ اسکی مثال میں امریکہ، سوئٹزرلینڈ اور جرمنی کو پیش کیا جاسکتا ہے۔

چوتھی قسم حکومت کی سوویٹ ہے یعنی وہ جو اب روس میں پائی جاتی ہے اور مجالس عمّال پر قایم ہے۔ یہ تو صرف وہ تقسیم ہے جسے عقل بھی تسلیم کرتی ہے اور جو عملاً بھی اس وقت دنیا میں پائی جاتی ہے، لیکن ایک پانچویں قسم حکومت کی اور ہے، جو اپنے وجود کی اہمیت اور عمل کی وسعت کے لحاظ سے ساری دنیا پر چھائی ہوئی ہے، لیکن عقل حیران ہے کہ اس کو کیا سمجھے، آپنے اگر کبھی غور کیا ہوگا تو آپ بھی شاید حیران ہوئے ہونگے کہ حکومت برطانیہ کو کس نوع کی حکومت میں شامل کرنا چاہئے اور اسکے متضاد عناصر کو دیکھتے ہوئے اسکا کیا نام رکھنا چاہئے۔ وہاں ملوکیت بھی ہے لیکن ناقص و نامکمل، وہاں دستوریت بھی ہے لیکن محدود و مقید، وہاں دیمقراطیت (Democracy) بھی ہے مگر لا یعنی و بیکار، اور وہاں ارستقراطیت (Aristocracy) بھی ہے لیکن لغو و بے معنی۔ پھر اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہندوستان، جسکی نجات و ہلاکت کا تنہا ذمہ دار اب گاندھی اور نہرو نے بھی حکومت برطانیہ کو تسلیم کرلیا ہے، اس سے کس نوع کی حکومت کا مطالبہ کرسکتا ہے، اور ایسا نظام حکومت اسے کیا عطا کرسکتا ہے مطالبہ کی صورت ہمارے سامنے نہرو رپورٹ کی شکل میں موجود ہے جو عطا ہونیوالا ہے۔ اسکا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ جناب سائمن ہمارے حال کی تفتیش کے لئے مامور ہوئے ہیں جن کو نسل و ملک کے لحاظ سے بعید ترین تعلق بھی ہندوستان سے نہیں ہے۔

ڈومی نین ہوم رول، کوئی الہامی فقرہ نہیں، جس کے دنیا میں صرف ایک ہی معنی لئے جاسکیں، اس لئے یہ ضروری نہیں کہ ہندوستان کے ڈومی نین ہوم رول کے بھی وہی معنے ہوں جو کناڈا یا آئرلینڈ کے ہوم رول کے ہیں اور اگر وہی ہوں، تو بھی یہ لازم نہیں کہ برطانیہ اسی اصول پر ہمارا خط سرشت تحریر کردے، جبکہ وہ خود نوعیت حکومت کے لحاظ سے ایک نہایت ہی عجیب و غریب مجموعہ اضداد و مناقضات کا ہے۔

نہرو رپورٹ میں جس نوع کی حکومت ہندوستان کے لئے طلب کیگئی ہے وہ یقیناً کسی خوددار قوم کے لئے باعث فخر و ناز نہیں ہوسکتی اور نہ اس سے کسی قوم کی عالی حوصلگی کا پتہ چلتا ہے، لیکن ادھر برطانیہ کی پیچیدہ پالیسی اور عجیب طرز حکومت کو دیکھتے ہوئے اور ادھر خود سرزمین ہند میں بسنے والی دیوانۂ مذہب قوموں کے اختلاف آرا پر نگاہ ڈالتے ہوئے، جو کچھ طلب کیا گیا وہ بڑی حد تک سب کو ایک مرکز پر لانے کا امکان اپنے اندر رکھتا تھا، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ برطانیہ کا اقبال یہاں بھی کام کر گیا اور مسلمانوں کی ایک جماعت نے، جسکی نیت سے بحث کرنیکی ضرورت نہیں، نہرو رپورٹ سے اختلاف کرکے ایک ایسا عذر لنگ نہیں بلکہ صحیح آلہ کار اس کے ہاتھ میں دیدیا کہ اگر دسمبر ۲۹ء کیا معنے دسمبر ۳۹ء تک بھی حکومت آرام سے سوتی رہے تو گاندھی کو اپنے الٹی میٹم کے مطابق عمل کرنیکی کوئی عقلی دلیل میسر نہیں آسکتی۔ اس لئے مستقبل میرے سامنے ہے اور میں دیکھ رہا ہوں کہ وہ وقت آئے گا جب نہرو رپورٹ اساطیر الاولین میں داخل ہوجائے گی اور کوئی اور خدا کا بندہ دوسری رپورٹ طیار کریگا اور اسوقت بھی یہی سوال پیدا ہوگا کہ ہم برطانیہ سے کیا طلب کریں اور وہ ہمیں کیا دے سکتا ہے جبکہ نہ اسکے پاس کچھ دینے کو ہے اور نہ ہم لینے کے اہل۔

یقیناً ایک قوم کی یہ بڑی بے مائگی ہے کہ اسیر غیروں کی حکومت ہو، لیکن ایک درجہ اس سے بھی فروتر ہے اور وہ یہ کہ وہ غیروں کی حکومت کی محتاج ہو، اور اس سے نظم و عدل کی اہلیت سلب کر لی گئی ہو۔ پھر جس وقت تک ہم اس منزل میں ہیں نہ نہرو رپورٹ سے کچھ کام نکل سکتا ہے، نہ عدم تعاون کے الٹی میٹم سے اور نہ مسٹر پٹیل کے ہاں اجتماع آروِن و گاندھی سے۔

جس وقت تک مسلمان (نزاع کفر و ایمان کے نقطۂ نظر سے) مسلمان، اور ہندو (اپنی گوسالہ پرستی اور چھوت چھات کے اعتبار سے) ہندو ہے، ہندوستان کبھی غلامی کی لعنت سے نہیں نکل سکتا اور نہ اس کو نکلنا چاہئے۔ اس قعر میں جس طرح مسلمان مبتلا ہیں بالکل اسی طرح ہندو بھی گرفتار ہیں، نہ اُنکی نگاہ وسیع، نہ انکا سینہ فراخ، اور جبتک دونوں میں سے ہر ایک اپنی اپنی جگہ صرف اپنے ہی کو نجات اخروی اور ملکی کا اہل سمجھتا ہے اس وقت تک کوئی امید فلاح کی نہیں ہے۔

اس لئے جس وقت میں یہ دیکھتا ہوں کہ بعض اکابر قوم بجائے اس کے کہ ان کے ذہن میں وسعت اور دماغ میں اخوت عامہ قائم کرنیکا خیال پیدا ہو روز بروز تنگ نظر اور رسم و رواج کے پابند ہوتے جاتے ہیں تو میری یاس کی کوئی انتہا نہیں رہتی اور مجھ کو خود اپنی ذات سے نفرت ہونے لگتی ہے کہ میں کیوں نہ بجائے مسلمان ہونے کے انسان پیدا ہوا۔ پس اگر ہندو مسلمان چاہتے ہیں کہ صحیح معنے میں باہم اتحاد پیدا ہو تو انکا اولین فرض یہ ہے کہ وہ تمام ان نقوش کو قلب سے محو کر دیں جنسے بوئے عصبیت آتی ہے ورنہ جب تک ہندو یونیورسٹی کا نام ہندو یونیورسٹی، مسلم یونیورسٹی کا نام مسلم یونیورسٹی ہے جب تک ہندو چوٹی میں گرفتار ہے اور مسلمان اپنی ریش دراز میں، اور جبوقت تک مذہب کا مفہوم اخوت عامہ اور انسانیت پرستی نہیں ہو جاتا، نہ ہندوستان کبھی آزاد ہو سکتا ہے اور نہ حُریت کی صحیح رُوح پیدا ہو سکتی ہے۔

آزادی نام ایک کیفیت کا ہے جو پہلے قلب انسانی میں خود اس کے آزادی ضمیر کے ساتھ پیدا ہوتی ہے اور وہ علائق مذہب و ملت سے بہت بلند ہے۔ اگر آج ہندوستان موجودہ ذہنیت کے ساتھ آزاد و خود مختار ہو جائے تو بھی ہمارے لئے باعث مسرت نہیں، کیونکہ وہ امن و سکون جو آزادی کے بعد حاصل ہوتا ہے اس وقت تک میسر نہیں آ سکتا جب تک ہماری روحیں آزاد نہ ہوں، ہمارے خیالات وسیع نہ ہوں اور تفریق ملت، امتیاز کفر و اسلام کا پردہ درمیان سے نہ اٹھ جائے اور یہ آسان نہیں جب تک مذہب مفقود نہ ہو جائے، یا لوگ مذہب کے صحیح مفہوم سے آشنا نہ ہوں اور اسکو انفرادی عقیدہ کی چیز جانکر اجتماعیات سے علیحدہ نہ رکھیں۔

ہندو مسلمانوں کے جتنے اکابر آج آزادی کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں وہ سب بلا استثنا ء یہ اہلیت اپنے اندر نہیں رکھتے اور جس وقت کورانہ تقلید اور قدامت پرستی کا سوال آتا ہے تو گاندھی ایسا انسان بھی گاؤ پرستی کے احمقانہ جذبہ سے متاثر ہو کر ملک کے تمام مصالح قربان کرنے کیلئے آمادہ ہو جاتا ہے اور بڑے سے بڑے ذی ہوش مسلمان لیڈر کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ سرے سے قربانی کرنا کونسا محمود فعل ہے کہ گائے اور بکری میں انتخاب کا سوال پیدا ہو۔

افغانستان کا مسئلہ بدستور الجھا ہوا پڑا ہے اور اسوقت تک واقعات نے کوئی خاص رُخ ایسا اختیار نہیں کیا، جنکی بنا پر
صحیح رائے قایم ہوسکے، امیر امان اللہ خاں بدستور قندھار میں ہیں۔ بچہ سقہ اسی طرح کابل میں موجود ہے۔ سردار علی احمد جان
ز کابل جو اس درمیان میں خود دعویدار سلطنت ہوکر اُٹھے تھے، پھر امیر امان اللہ خاں کے طرفدار ہوگئے ہیں اور جنرل نادر خاں
آمد کا تخت انتظار تھا آگئے ہیں، اور نہیں کہا جاسکتا کہ وہ کیا کرنا چاہتے ہیں اور کیا کر سکیں گے۔

جنرل نادر خاں کا افغانستان میں بہت اثر ہے، اس کو وہ خود بھی جانتے ہیں اس لئے قدرتاً انکو اسکا خیال کرنا چاہئے
ہیں کوئی امر انکی اس اثر کو کم کرنیوالا نہ پیدا ہوجائے اور یہی سبب ہے کہ اسوقت تک وہ کوئی رائے قایم نہیں کرسکے کہ
رینگے، تاہم اسقدر ضرور معلوم ہوا ہے کہ وہ پہلے جلال آباد جاکر وہاں کے قبایل کو جمع کرکے معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ ان کا
یال ہے اور پھر اتفاق آرا سے کسی بادشاہ کا انتخاب کرینگے۔ گویا وہ اس وقت نہ امیر امان اللہ خاں کے طرفدار ہیں اور نہ مخالف
ن سوال یہ ہے کہ آیا جنرل نادر خاں کا موجودہ طرزِ عمل وہاں کے حالات کے لحاظ سے مناسب ہے یا نہیں اور اگر انتخاب حکمراں کا
ا قبایل نے امیر امان اللہ خاں کے خلاف کیا تو جنرل نادر خاں اُن قبایل کے ہم آہنگ ہوکر کامیاب ہوسکیں گے یا نہیں۔

یہ بالکل کھلی ہوئی بات ہے کہ افغانستان میں ابھی دستوری یا جمہوری حکومت قایم نہیں ہوسکتی وہ اس منزل سے
ا پیچھے ہے۔ اس لئے وہاں کسی نہ کسی خود مختار حکمراں کا ہونا ضروری ہے، لیکن ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ امیر امان اللہ خاں کے
تے ہوئے یعنی اک جائز و اہل حکمراں کی موجودگی میں انتخاب حکمراں کے سوال کا پیدا ہونا کیا معنے رکھتا ہے۔ نادر خاں کا اپنی قطعی
ظاہر کرنیسے انکار، کسی نتیجہ پر پہونچنے میں پس و پیش اور اگر خبریں صحیح وصول ہوتی ہیں تو انکا قندھار جانیسے باوجود طلب کرنے کے
رکرنا، پوری طرح اس خیال کی تصدیق کرتا ہے کہ وہ امیر امان اللہ خاں کے طرفدار ہوکر نہیں آئے اور افغانستان کی موجودہ
دگیوں کو وہ امیر امان اللہ خاں کے نقطۂ نظر سے دور کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ افغانی قوم نہایت کینہ پرور
ہے۔ لیکن تعلیمیافتہ طبقہ میں تو اس قومی خصوصیت کو بہت ضعیف ہوجانا چاہئے، اگر جنرل نادر خاں نے بیماری کی حالت
یورپ سے افغانستان کا سفر برداشت کرنے کی زحمت کسی انتقام طلبی یا کینہ پروری کی بنا پر اختیار نہیں کی ہے (جسکا
ن ہے) تو پھر اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ جنرل نادر خاں صرف ایک پتلی ہیں جسکا رشتہ کسی غیر ملکی ہاتھ میں ہے اور
ا کی جنبش پر ان کی نقل و حرکت کا انحصار ہے۔ بہرحال اسوقت تک تمام معاملات پر نگاہ ڈالنے سے یہ امر تو یقینی
رپر محقق ہوچکا ہے اور وہ یہ کہ بچہ سقہ افغانستان کا فرمانروا نہیں رہ سکتا، اس لئے اب صرف یہ دیکھنا ہے کہ آیندہ امیر
ن اللہ خاں کے سر پر تاج شاہی رکھا جاتا ہے یا کسی اور کے، جنرل نادر خاں اور ان کے بھائی اس کا اعلان کرچکے
ا کہ وہ تخت و تاج کی تمنا نہیں رکھتے، سردار علی احمد جان کے سر سے بھی یہ سودا نکل چکا ہے، اس لئے بظاہر منطقی نتیجہ
ن نکلتا ہے کہ سوائے امیر امان اللہ خاں کے اور کوئی افغانستان کی عنان حکومت اپنے ہاتھ میں نہیں لے سکتا لیکن اندرونی
بیدگیاں اور بیرونی سیاسی ریشہ دوانیاں اسقدر گہری نظر آتی ہیں کہ یہ سب کچھ آسانی سے حاصل ہوتا ہوا نظر نہیں آتا۔

اگر امیر امان اللہ خاں کی اس تقریر پر نگاہ ڈالی جائے جو انہوں نے پشاور میں ایک جماعت کے سامنے کی تھی، تو اس سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ اس انقلاب میں بعض وزراء کابل کی غداری بھی اپنا کام کر رہی تھی (جیسا کہ اس سے قبل ہی ہم نگار میں ظاہر کر چکے ہیں) اور اس لئے آگ لگانے والے نے یہ آگ باہر سے نہیں لگائی تھی، بلکہ اندر سے بھی اس پر تیل چھڑکنے کا کافی انتظام کر لیا تھا۔

ایک قزاق کا اس قدر قوت حاصل کر لینا کہ وہ مستقل حکومت کی بنیاد کو ہلا ڈالے، ایک ایسی کھلی ہوئی داستان مکر و سازش اپنے اندر پنہاں رکھتی ہے جس کے سمجھنے کیلئے زیادہ غور و تامل کی ضرورت نہیں اور اس کا جواب اگر کوئی ہو سکتا ہے تو صرف یہ کہ امیر امان اللہ خاں بغیر وساطت نادر خاں کے اپنی ضرورت ملک سے تسلیم کرا لیں اور اگر جنرل نادر خاں کے فیصلہ ہی پر انحصار ہونے والا ہو تو اس کے ماننے سے انکار کر دیں اور بجائے بادشاہ ہونے کے آزاد انسان کی زندگی کو ترجیح دیں۔

بہرحال امید کی جاتی ہے کہ اپریل تک ادھر یا ادھر کوئی فیصلہ ہو جائے گا اور اگر یہ چنگاری گذشتہ جنگ عظیم کی سرویا کی سی چنگاری ثابت نہ ہوئی تو نہ برطانیہ کو اپنی غیر جانبداری توڑنے کی ضرورت ہوگی اور نہ روس کو فوجی نقل و حرکت کی۔

اس وقت جمہوریہ ترکی کی توجہ کا مرکز ملک کی تعلیم عام ہے۔ اب سے چار سال قبل اس باب میں سب سے پہلا دانشمندانہ قدم یہ اٹھایا گیا تھا کہ قدیم مذہبی مدارس کو فنا کر دیا گیا، کیونکہ غازی مصطفےٰ کمال اس امر کو اچھی طرح جان گئے تھے کہ ملک کی ترقی کا سب سے بڑا مانع علماء کا وہ گروہ ہے جو اس وقت ہاتھ کی چھٹی انگلی کی طرح بیکار ہونے کے ساتھ ہی بدنما بھی ہے اور ملک میں اس نوع کی پیداوار کو جاری رکھنا گویا خود بیماری کے جراثیم منتشر کرنا تھا، اس لئے انہوں نے ان مدارس ہی کو بند کر دیا جس سے یہ موذی جماعت بڑھتی جا رہی تھی اور ملک کو انحطاط کی طرف ڈھکیل رہی تھی، لیکن اس کے بعد ملک کی دیگر ضروریات کی وجہ سے کوئی دوسرا قدم اصلاحات کی طرف نہیں اٹھایا جا سکا تھا۔

اس وقت وہاں کا نظام تعلیم یہ تھا کہ ہر صوبہ میں علیحدہ تعلیم کا بجٹ مقرر کیا جاتا تھا اور اس کی ساری ذمہ داری صوبہ کی حکومت پر ہوتی تھی، لیکن اب اس دستور کو مٹا کر صرف ایک مرکزی بجٹ سارے ملک کے لئے مقرر کر کے انگورہ سے متعلق رکھا گیا تا کہ تعلیم کا انتظام قلب حکومت سے وابستہ رہے اور اس پر زیادہ توجہ صرف کی جا سکے

اس وقت وہاں ۶۰۰۰ ابتدائی مدارس ہیں جن میں ۴۳۰۰۰ طلبہ تعلیم پاتے ہیں۔ ۱۹ ثانوی مدارس ہیں جہاں ۷۴۰۰ طلبہ پڑھتے ہیں، ۲۲ مدارس مدرسوں کے لئے ہیں جہاں خاص طور پر زراعت و تجارت وغیرہ کی بھی تعلیم ہوتی ہے۔ انمیں ۵۲۰۰ طلبہ پائے جاتے ہیں۔ یونیورسٹی صرف ایک ہے۔ غیر ملکی مدارس کی تعداد ۲۰۰ جہاں ۳۶۰۰ طلبہ پڑھتے ہیں، ان اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں ابھی بہت زیادہ مدارس قائم کرنے کی ضرورت ہے اور اسی لئے اس شعبہ کو مرکزی حکومت نے اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے اور امسال وہاں صرف قسطنطنیہ میں ۴۶ جدید ابتدائی مدارس تعمیر کئے جا رہے ہیں تا کہ ملک کے بڑھتے ہوئے شوق تعلیم کو پورا کیا جا سکے۔

جب سے وہاں لاطینی خط کا رواج ہوا ہے، سارے ملک میں تعلیم کی طرف سے عجیب و غریب شوق پیدا ہو گیا ہے
[اس] آسانی کو دیکھتے ہوئے جو اس جدید خط کی وجہ سے پڑھنے میں پیدا ہو گئی ہے، طلبہ اسقدر کثرت سے آنے لگے ہیں کہ موجودہ
[اس] کے لئے بالکل ناکافی نظر آتے ہیں۔ بہر حال اس وقت ترکی جس خوبی کے ساتھ ترقی کی طرف مائل ہے، اسکا اعتراف
[فد]ائے قدیم رنگ کے مولویوں کے سبھوں نے کیا ہے اور اگر ایک ربع صدی تک انکی یہی حالت رہی تو ممکن ہے کہ ملک
[اس] عنصر ہی سے پاک ہو جائے جس کی طرف سے اندیشہ مخالفت کا کیا جاتا ہے۔

کانگرس کے پروگرام میں بدیسی کپڑوں کے مقاطعہ کی طرف عملی قدم اٹھایا گیا ہے، جس کی بہت مبارک ابتدا گاندھی
[جی] کی گرفتاری سے ہوئی۔ ہر چند یہ گرفتاری صرف اس بنا پر ہوئی تھی کہ کلکتہ کے مقامی قانون کی رو سے آبادی کے
[اند]ر کسی ڈھیر میں آگ لگانا ممنوع ہے اور بدیسی کپڑوں کے اندر جہاں آگ لگائی گئی تھی وہ آبادی ہی کے اندر تھا، لیکن
چونکہ تصادم ہمیشہ جذبات میں اشتعال پیدا کرتا ہے، اس لئے جو کچھ ہوا بجا نہ ہوا اب دیکھنا یہ ہے کہ برما سے واپسی کے بعد
گاندھی جی اس مقدمہ کی جوابدہی کرتے ہیں یا نہیں اور ان کو اس جرم کی سزا بھی ملتی ہے یا نہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ گورنمنٹ
اس مقدمہ کو اٹھالیگی اور چلانا مناسب نہ سمجھے گی، لیکن اگر ایسا نہ کیا گیا تو قدرتاً اس تحریک کو مدد ملنا چاہئے اور زیادہ قوت
کے ساتھ اس تحریک کو قائم رہنا چاہئے۔ مگر اسی کے ساتھ یہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ اگر مقامی حکومتیں زیادہ صبر و ضبط
سے کام نہیں لے سکتیں تو ہم کو دامن اعتدال ہاتھ سے نہ دینا چاہئے اور جو کچھ کریں اس کو انتہائی امن و سکون کے ساتھ
کرنا چاہئے، قانون شکنی کی صرف یہی ایک صورت نہیں ہوتی کہ اس کی مخالفت کی جائے، بلکہ اسکی بہترین صورت یہ ہوتی
ہے کہ اس کے استعمال کا موقعہ ہی نہ دیا جائے، قانون جرم کرنے سے بیکار نہیں ہوتا بلکہ ترک جرم سے۔

مسلم لیگ کی دونوں مخالف جماعتوں کا اجلاس جو حال ہی میں ہوا ہے اور جسمیں باہم مفاہمت و مشارکت کی سعی کی گئی
ہے، نہایت مبارک خیال ہے۔ جو راہ عمل اب اختیار کی گئی ہے، اس کو اس سے قبل ہی اختیار کرنا چاہئے تھا، لیکن "بعد از خرابی بسیار"
کسی صحیح راستہ کو اختیار کرنا ہمارے اکابر ملت کی خصوصیت ہے۔

اس اجلاس میں مولانا محمد علی نے جو طریق عمل و انداز گفتگو اختیار کیا، وہ انسانی نفسیات کا کوئی اہم راز نہیں ہے۔ اس
دوران میں نہرو رپورٹ کی مخالفت اور اجلاس کلکتہ میں ان کی غیر مدبرانہ تقریر نے (جیسا کہ ہمیشہ ہوا ہے) انکی سیادت و قیادت
کو ایسا سخت صدمہ پہونچایا کہ اس وقت تک باوجود کوشش کے اس کی تلافی نہ ہو سکی۔ اس کے بعد افغانستان کے معاملہ
میں انکے خیالات و آرا نے جس غیر دانشمندانہ ذہنیت کا ثبوت دیا اس نے اور بھی رہے سہے وقار کو کھو دیا، اس لئے ان کو قدرتاً
بے چین ہو جانا چاہئے تھا اور یہ دیکھ کر کہ علحدہ وہ کوئی جماعت اپنی پیدا نہیں کر سکتے، ان میں فطری طور سے یہ خواہش پیدا ہوا تھا

چاہیئے تھی کہ کسی طرح پھر اس جماعت میں داخل ہو جائیں جس سے وہ علیحدہ ہو گئے تھے۔ چنانچہ یہی وہ جذبہ تھا جس کے ماتحت انہوں نے محمد علی جناح کے ہم آہنگ ہو کر کہدیا کہ اگر مسلمانوں کا مفاد محفوظ رہے تو وہ مخلوط انتخاب کے موافق ہیں حالانکہ اب سے قبل یہیں دہلی کے کانفرنس میں جس کی صدارت سر آغا خاں نے کی تھی، یہ امر مولانا محمد علی کی کوشش ہی سے طے پایا تھا کہ انتخاب جداگانہ لازم ہے۔

بہرحال ہم خوش ہیں کہ انہوں نے اپنی غلطی کا اعتراف صراحۃً نہیں تو کنایۃً کر لیا، لیکن آیندہ کے لئے بھی انکو اچھی طرح جان لینا چاہیئے کہ ہر چیز کی ایک عمر ہوا کرتی ہے اور غالباً انکی سیادت بھی اب عالم شیب ہی کی گھڑیاں بسر کر رہی ہے اور دنیا کو اسکی زیادہ پرواہ نہیں ہے۔

اس ماہ کا رسالہ چار پانچ دن کی تعویق سے شایع ہو رہا ہے، جس کا ایک ضعیف سبب تو فروری کے مہینہ کا اختصار تھا اور دوسرا قوی سبب یہ کہ نگار کے جدید کاتب جو ضرورت سے زیادہ متقی واقع ہوئے ہیں، ماہ رمضان کیوجہ سے کافی وقت نہ دے سکے اور اس طرح اس ماہ کے نگار کو اپنی پابندی بطور خراج ان کے زہد و ورع کے حضور میں پیش کرنی پڑی، اور چونکہ میں پابند صیام نہیں ہوں اس لئے میں نے بھی یہ کفارہ دینا آسانی سے گوارا کر لیا۔

حامد رضا خاں تبسم نظامی جو نمایندۂ نگار کی حیثیت سے کام کر رہے تھے بعض اسباب کی بنا پر جنکے اظہار کی فی الحال ضرورت نہیں، اپنی خدمت سے معزول کر دیئے گئے ہیں اور اب دفتر نگار سے انکا کوئی تعلق قایم نہیں رہا، اس لئے اگر کسی صاحب نے انکو کوئی رقم نگار کے متعلق مرحمت فرمائی تو اس ذمہ دار دفتر نگار نہ ہوگا۔

اس درمیان میں بعض چیزیں علاوہ کتابوں کے اور بھی ریویو کیلئے آئی ہیں جنمیں خصوصیت کیساتھ ایک کا ذکر یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے۔ یہ ایک تیل ہے جسکے متعلق مخترع کا دعویٰ ہے کہ خواہ کسی سبب سے سر کے بال گر جائیں، اسکے استعمال سے پھر پیدا ہو جاتے ہیں، میں نے خود اپنے ایک عزیز دوست کو یہ شیشی استعمال کیلئے دی اور میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ انکا وہی سر جو بالکل ہتیلی کیطرح صاف تھا ایک ہی شیشی کے استعمال کے بعد خوشنما گھنے بالوں سے بالکل ڈھک گیا۔ تقویت دماغ اور تقویت بصارت کی بھی انہوں نے تصدیق کی۔

اگر کسی صاحب کو مزید حالات معلوم کرنا ہوں تو ذیل کے پتہ سے خط و کتابت کریں۔

سخاوت حسین۔ ذریعہ سید احمد حسین صاحب پیپرمل۔ لکھنؤ

نیاز فتحپوری

ورنگل کے آثار قدیمہ

ہر قوم کے آثار گویا مراۃ تاریخ ہوتے ہیں۔ کیونکہ اس سے ان کے کردار کا جس قدر تعلق رہا ہے، اور اس کے ذریعہ سے انکے سمجھنے میں جسقدر سہولت و آسانی ہوتی ہے۔ وہ اصل میں انہی کے اس جستہ جستہ آثار پر مبنی ہے۔ حقیقت واقعہ یہ ہے کہ ان فرقوں کی ابتدائی تاریخ ابھی نامکمل ہے۔ کیونکہ آئے دن کی جدید تحقیقات سے ان کے اتنی کارناموں پر جو روشنی پڑ رہی ہے۔ اور ان سے جو بیش قیمت معلومات اخذ ہو رہی ہیں وہ ان کے نام اور کام دونوں کی مجسّم تاریخیں ہیں۔

ان قوموں کے آثار جو کئی اصناف اور مختلف ازمنہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور جن سے انکا تمدن قدیم برقرار ہے، ہندوستان کے ہر حصہ میں کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ زمانہ نے ان کو جس بیدردی اور اپنے تباہ کن ہاتھوں سے برباد کیا ہے اور اس سے انکی عظمت پر جو گمنامی کا پردہ پڑ گیا ہے حقیقت میں وہ تمدن موجودہ کے لئے ناقابل تلافی ہے۔ ان کے تمدن قدیم سے تعلق رکھنے والی جس قدر چیزیں باقی ہیں وہ سب ان کے اساس مذہبی، مراسم معاشرتی اور اصول زندگی کی یادگار ہیں۔

ہندوستان کے عہد قدیم کی ہندو عمارت کا سلسلہ جناب مسیحؑ سے تقریباً دو سو پچاس سال پہلے سے شروع ہوتا ہے، اس کی ابتداء غار ہائے معابد سے ہوتی ہے کیونکہ تمدن قدیم نے ہندوستان میں اسی زمانہ سے نشوونما حاصل کی تھی، اور اسی زمانہ سے ان کے کارنامے عالم وجود میں آنے لگے تھے، اصل میں انکے زرین کارناموں سے یہی چیزیں مراد ہیں۔ ان سے انکی تہذیب کا تعلق جسقدر ہے، انہوں نے اسکے فروغ دینے میں جسقدر کوششیں کی ہیں، وہ انکے نام کے ساتھ ہمیشہ یادگار رہے گی۔

اس فن کی نشوونما اور ابتداء کا زمانہ سنہ ۲۵۰ قبل عیسیٰؑ تھا۔ اس زمانہ کو فن تعمیر کا پہلا دور قرار دینا چاہئے۔ کیونکہ سنہ ۱۵۰ قبل مسیحؑ کے بعد سے اس فن میں بہت سی تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں چنانچہ دور اول کے طرز تعمیر کا یہ حال تھا کہ انکی عمارات بھیانک اور تاریک ہوا کرتی تھیں ان میں آسایش و زیبایش کے سامان بہت کم مہیا ہوتے تھے۔ لیکن سنہ ۱۵۰ قبل مسیح سے ان میں ایک طرح کی شائستگی اور راحت و آرام کی تدبیریں عمل میں آنے لگیں اور اس زمانہ کی متعلقہ عمارات نہایت کھلی اور ہوادار ہوتی تھیں۔ یہ زمانہ فن سنگتراشی کا دوسرا دور ہے، اس کی زندگی ساتویں صدی عیسوی تک رہتی ہے۔ اسی زمانہ کی یادگاروں میں سے ایلورا اور اجنٹا کے مشہور غار ہیں۔

اس کے بعد اس میں تدریجی ترقی ہونی شروع ہوئی۔ اور اس میں نئے نئے انداز تعمیر استعمال کئے جانے لگے۔ اور اس فن نے تھوڑے ہی عرصہ میں اس قدر ہر دلعزیزی حاصل کر لی کہ آٹھویں اور بارھویں صدی عیسوی کا وسطی زمانہ اس کے عروج کا انتہائی زمانہ تھا کیونکہ اس زمانہ میں یہ قدیم طرز تعمیر کو چھوڑ کر کشادہ اور ہوادار تعمیرات کی طرف زیادہ مایل ہونے لگے تھے۔ انکا یہ طریقہ تعمیر مسلمانوں کے دکن پہونچنے تک برابر ایک حالت میں جاری رہا۔ لیکن مسلمانوں کے قبضہ کے بعد اس کا خاتمہ نظر آتا ہے۔

ـــــ فرانس کے مشہور مورخ ڈاکٹر گستاولی بان کا خیال ہے کہ، دکن کے طرز تعمیر کی ابتدا بھی اوسی طرح نامعلوم اور غیر محقق ہے جس طرح شمالی ہند کی، انکے اس قیاس سے اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ چھٹی صدی عیسوی میں غاری منادر نے اپنے طرز تعمیر میں غیر معمولی ترقی کی تھی لیکن پھر اس بیان کے بعد ان کا خیال زمانے کے تعین کرنے سے قاصر رہتا ہے اور بقول انکے جنوب میں مدورا اور اس کے نواح جو دکن کے قدیم دارالحکومتوں سے ہیں۔ عجب نہیں کہ اسمیں انہوں نے یونان اور روم کے محققین کے بیان کے مطابق اپنی اثری یادگاریں تعمیر کی ہوں گی لیکن انکو زمانہ کی دست برد آپس کی خانہ جنگیوں اور بیرونی چڑھائیوں نے باقی نہیں رہنے دیا۔ اس زمانہ کو جس سے تاریخ آشنا ہو زمانہ حجری سے تعبیر کرتے ہیں۔ ہمیں چھٹی صدی عیسوی تک ایک ایسا وقفہ ہوگیا ہے جس کے متعلق ہمیں کچھ معلوم نہیں۔

دراصل دکن کے آثار میں چھٹی صدی عیسوی کے زمانہ سے پہلے کی عمارات بہت کم پائی جاتی ہیں جنکا ہم کوئی حقیقی زمانہ متعین نہیں کرسکتے۔ البتہ سنگی کتبہ یا قدیم تحریریں جو ان پر ثبت ہیں۔ ان سے ایک حد تک زمانہ کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ اس کے علاوہ جن اصول کے ماتحت ان آثار کو زمانہ حجری قرار دینا پڑتا ہے۔ وہ ان کے طرز تعمیر پر موقوف ہے کیونکہ قدیم تمدن میں جن چیزوں کا رواج تھا۔ وسطی زمانہ میں وہ زیادہ قابل قبول نہیں ہوئی۔

جنوبی ہند میں دکن کا علاقہ قدیم ہندو آثار اور مختلف ازمنہ کی غیر معمولی یادگاروں کا ایک زرخیز خطہ سمجھا جاتا ہے۔ ہمیں راجگان قدیم کی جو یادگاریں محفوظ ہیں۔ انکا جواب سارا ہندستان پیدا نہیں کرسکتا!

سمت تلنگانہ میں ہندوؤں نے بہ نسبت دکن کے اور مقامات کے اپنی اثری یادگاریں زیادہ چھوڑی ہیں، کیونکہ تلنگانہ کے ہندو راجہ مسلمانوں کی فتوحات کے ایک عرصہ بعد تک دکن میں حکمران تھے۔ ان کی تعمیرات زیادہ تر وسطی زمانہ سے تعلق رکھتی ہیں حقیقت میں اس سرزمین کو قدیم ہندو دھرم کے اعتبار سے جو اہمیت حاصل ہے، وہ دکن کے کسی حصہ کو نصیب نہیں۔ خاص کر اس خطہ میں ہندوؤں کے جس قدر آثار ہیں وہ سب طریقۂ تعمیر کے اعتبار سے خاص اہمیت اور وقعت رکھتے ہیں۔ ان آثار کا دکن کے آثار میں وہی درجہ ہے جو شمالی دکن میں ایلورہ اور اجنٹہ کا ہے

تلنگانہ کی یادگاریں مختلف ازمنہ پر مشتمل ہیں۔ اور یہ کئی راجاؤں کی متحدہ اور اجتماعی کوششوں کا نتیجہ ہیں۔ ان عمارات کو دکن میں جو شہرت حاصل ہے، یا جس کے باعث یہ اسقدر شہرت رکھتے ہیں وہ محض انکا طرز تعمیر ہے۔ اس طرز کی خصوصیت یہ ہے کہ انکی عمارات کے ستون نہایت زبردست اور اونچے ہوتے تھے اور انکی ہر چیز میں اسقدر اعتدال برتا جاتا تھا کہ یہ سب اپنی اپنی جگہ بڑی موزونیت رکھتی تھیں۔ ان سب میں قابل لحاظ جو چیز تھی وہ ہوا، اور روشنی کا باضابطہ انتظام تھا۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان یا دکن میں جسقدر دیولیں یا خانقاہیں ہیں ان میں ہوا اور روشنی کے نفوذ کا بہت کم لحاظ رکھا گیا ہے۔ اصل میں دیول کی موزونیت اور خوبصورتی کا دارومدار صرف ہوا اور روشنی کے اعتدال پر ہے لیکن عام دیولوں میں اس التزام بالکل نہیں ہے۔ خاصکر مورتوں کے تناسب میں بھی اسی قسم کی بہت سی لغزشیں واقع ہوئی ہیں جس کے باعث دیول یا عمارت کا حقیقی حُسن باقی نہیں رہتا۔ برخلاف اس کے تلنگانہ کی تمام عمارتیں ہر لحاظ سے قابل اہمیت ہیں۔ کیونکہ ان میں یہ سارے تعمیری تناسب اسقدر اہتمام اور موزونیت کے ساتھ جمع کئے گئے ہیں کہ انکی کوئی عمارت کبھی خلاف

اصول نظر نہیں آئے گی۔ اصل میں یہی ایک ایسی چیز ہے جس سے عمارت کی وقعت اور عزت بڑھجاتی ہے۔ بقول ماہرین علم آثار کے اسی سے انکی صنعت اور غیر معمولی محنت کا اندازہ ہوتا ہے۔

ہم اس تمہید کے بعد اس سلسلہ کو ختم کر کے تلنگانہ کی ان مشہور عمارات کا حال لکھتے ہیں جو بلحاظ فن کے دکن کیا بلکہ سارے ہندوستان میں یکساں شہرت رکھتی ہیں۔

ہزار ستونی دیول تلنگانہ کی مشہور عمارات میں تاریخی اعتبار سے اس دیول کو فوقیت حاصل ہے کیونکہ اس میں جو کتبہ کندہ ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دیول ۱۱۶۲ء و ۱۱۶۳ء کے درمیان تعمیر ہوئی ہے۔ اسکا بانی رودرا دیوا را ادل (۱۱۶۳ء ۔ ۱۱۹۵ء) تھا جو کاکیٹیا خاندان کا مشہور و معروف راجہ ہے۔

اس دیول کا ذکر قدیم تاریخوں میں نہایت وضاحت کے ساتھ آیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دیول رایان تلنگانہ سے متعلق ہے۔ ان تواریخ کے علاوہ تلنگی زبان میں ایک کتاب پرتاپ چرتر اکے نام سے لکھی گئی ہے۔ جس میں راجگان تلنگانہ کا مفصل و بسوط تذکرہ ہے۔

اس کتاب کے مصنف نے اس دیول کے تعمیر کئے جانے کی نسبت ایک عجیب وغریب وجہ بیان کی ہے۔ جس کو ہم ذیل میں بطور اقتباس نقل کرتے ہیں:۔

> تلنگانہ کے مشہور راجہ کایت پول (پردلا) کے گھر ایک لڑکا پیدا ہوا جس کی نسبت منجموں نے راجہ سے یہ پیشین گوئی کی تھی کہ یہ لڑکا بڑا ہو کر تمہارے قتل کا باعث ہوگا۔ چنانچہ راجہ نے اس واقعہ کے بعد اس کو پارس لنگم کے مندر کے ایک پوجاری کو دیدیا اور ساتھ ہی ساتھ لڑکے کو ہمیشہ اپنے پاس رکھنے کی تاکید بھی کی۔ اس نے راجہ کے حکم کے موافق لڑکے کو لیجا کر اپنے گھر رکھ لیا۔ باضابطہ تعلیم دلوائی یہانتک کہ ایک فاضل و کامل بنادیا۔ جب راجہ کو اپنے لڑکے کے اس فضل و کمال کی اطلاع ملی تو بڑا خوش ہوا۔ اور اس پوجاری کو اس خدمت کے معاوضہ میں دو ہزار کی جمعیت سے سرفراز کر کے مہادیو کے مندر کی نگرانی کے لئے روانہ کیا اور حکم دیا کہ بلا میری اجازت کے اس کو باہر جانے نہ دینا۔
>
> اتفاق سے انہیں دنوں میں راجہ خود اسی مندر میں پوجا کی غرض سے چلا گیا، اس کا لڑکا دروازہ پر سو رہا تھا، جب اوسکو کسی آدمی کے گذرنے کی آہٹ محسوس ہوئی تو فوراً جاگ اٹھا، اور برچھالے کر راجہ کو اسقدر زخمی کر دیا کہ سوائے موت کے اوسکا اور کوئی علاج نہ تھا۔ مرتے وقت راجہ نے اس سے یہ وصیت کی کہ میرے اس قتل کے کفارہ میں تو کاشی اور رنگم کے دیولوں کو جا اور ہر ایک دیول کی اپنے بساط کے موافق خدمت کر۔ اور وہاں سے آکر ایک دیول بنا جس کے ہزار کھم ہوں
>
> چنانچہ اس نے راجہ کے حسب وصیت یہ مندر تعمیر کیا۔

اس دیول کا تین تیرتھی دالان نہایت قدیم ہے۔ نندی منڈپ اور اس کے ایوان کی توسیع بعد میں کیگئی ہے جس میں باہر کا

بڑا دالان بھی شامل ہے۔ دیول جس مقام پر تعمیر کیگئی ہے۔ اس کی بلندی سطح زمین سے تقریباً ۴ فٹ ۴ انچ ہے۔ یہ دیول بقول ماہرین علم آثار کے سیوا، سوریا، اور وشنو کے ناموں سے منسوب ہے۔ کیونکہ اس میں تین قطعے ہیں جو ایک دوسرے سے بالکل علحدہ ہیں اور ہر ایک قطعہ اس کا تیرتھ کہلاتا ہے اور یہ تینوں تین مختلف نام سے (سیوا، سوریا اور وشنو) مشہور ہیں اور ہر ایک تیرتھ پر ہر ایک دیوتا کی مورت نہایت صفائی کیساتھ کندہ ہے۔ جس سے ان مخصوص مقامات کے سمجھنے میں بڑی سہولت ہوتی ہے۔ اس کے بعض شواہد اس بات کے موید ہیں کہ یہ دیول جب راجگان کاکیٹیا (گنپتی) کے قبضہ سے نکل گئی تو اسپر لنگائتوں کا قبضہ ہوگیا جنہوں نے اسکے سارے اوتاروں کی مورتیں اصلی جگہ سے علحدہ کردیں اور اسکی جگہ اپنے اوتار سلنگاس کو بٹھادیا جو ابھی تک موجود ہے اور اس جگہ سے ان مورتوں کے علحدہ کرنے کے موہوم سے نشانات ابھی پائے جاتے ہیں۔

اس دیول کی تعمیری خصوصیات میں سب سے بڑی خصوصیت اس کی صناعی ہے۔ جو نہایت اعلیٰ درجہ کے سنگ تراشوں کی برسوں کی محنت کا نتیجہ ہیں چنانچہ اس میں دوار پالک ایک ایسا مقام ہے۔ جہاں ہر قسم کے نقش و نگار بیل، بوٹے، پھول، پتے ایک ہی انداز میں نظر آتے ہیں۔ اس مقام پر جو صناعی کی گئی ہے وہ اس قدر بہتر اور خوبصورت ہے کہ اس کا جواب ساری دیول پیدا نہیں کرسکتی۔

اس حصہ سے ملا ہوا ایک دالان ہے۔ جو بالکل سادہ ہے۔ اس کے بیچ کا کمرہ دیوی کی نشست گاہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے دو حصے ہیں۔ اس میں بھی کسی قسم کی کوئی مورت نہیں ہے البتہ اندرونی حصہ کی چوکھٹ میں گلکاری کا بہت کام ہے۔ اور اس کے ہر دو جانب بہت سی مورتیں کندہ ہیں جو حالت رقص میں دکھائی دیتی ہیں۔

اس دیول میں متعدد کتبے ہیں جو نہایت قدیم اور مختلف زبانوں میں کندہ ہیں۔ اور یہ اکثر جگہ سے ٹوٹ گئے ہیں جس کی وجہ سے ان کے پڑھنے اور سمجھنے میں دقت ہوتی ہے۔ اس میں کے اکثر کتبے ایسے بھی ہیں جو تاریخ سے تعلق رکھتے ہیں، ان سے اس کے بانیوں کے سلسلہ پر جو روشنی پڑتی ہے وہ تاریخ کے لئے بالکل نئی چیز ہے۔

اس دیول میں سب سے قدیم کتبہ وہی ہے جو اس کے تعمیر کے زمانہ میں نصب کیا گیا تھا۔ یہ کتبہ نہایت طویل اور عریض پتھر پر قدیم سنسکرت زبان میں کندہ ہے۔ یورپ کے اکثر محققین نے اسپر بہترین مقالے لکھے ہیں، اور یہ متعدد بار مختلف رسائل میں چھپ چکا ہے اور محققین نے اس کی تحقیق پر اپنی اپنی بساط کے موافق روشنی ڈالی ہے۔

سب سے پہلے اس کتبہ کی قدامت پر بنگال رایل ایشیاٹک سوسائٹی کے رسالے نے ایک مضمون شایع کیا تھا جس میں اسکے فاضل نامہ نگار نے اس کی صحیح تاریخ تحریر ۱۰۵۴ سنہ ساکا (شک) قرار دی تھی۔ اس کے بعد اسی عنوان پر بمبئی رایل ایشیاٹک کے جرنل میں بھی مسٹر باڈوجی کا ایک مضمون چھپا تھا جو نہایت طویل ہے۔ اس میں انہوں نے اسکی تاریخ کندگی ۱۰۶۴ سنہ ساکا (شک) بیان کی ہے۔ اس کے علاوہ موصوف نے کتبہ کے تحت اس کے بانی کے حالات بھی لکھے ہیں۔

لیکن ان مضامین کے تھوڑے ہی دنوں بعد مسٹر رائس نے اس کتبہ پر تحقیقی نظر ڈالی ہے۔ اور اس پر اپنے جدید معلومات مہیا کر کے اسکی صحت تاریخ پر ایک خاص مضمون لکھا ہے۔ جس میں انہوں نے اسکی ابتدائی تحقیقات سے گریز کرتے ہوئے اس کی صحیح تاریخ تحریر نویں صدی عیسوی کی قرار دی ہے۔ اور ان کے خیال میں اس میں تیلاے اول اور بھیاے دوم جو مغربی چلوکیا خاندان کے مشہور

راجہ ہیں، ان کے قسمت کے نوشتوں کا حال ہے۔

ان تحقیقی مضامین کے شائع ہونے کے بعد مسٹر فلٹ نے بھی اس کی تحقیق بہ قول اپنے شروع کی اور ایک مضمون قدیم سنسکرت کتبہ کے متعلق لکھا جو انڈین انٹی کویری کی گیارھویں جلد میں شائع ہوا ہے، اسمیں موصوف نے ان سارے محققین کی تحقیق سے بالکل علٰحدگی اختیار کی ہے اور نہایت ہی زبردست وجوہ کے ساتھ ان سب سے اختلاف کیا ہے۔ اور اس کی صحیح تاریخ تحریر ۱۱۶۲ء و ۱۱۶۳ء کے وسطی زمانہ کی قرار دی ہے۔

یہ آخری نظریہ ہمیں بھی نہایت صحیح معلوم ہوتا ہے کیونکہ ان کے بعد کے مورخین نے بھی اسی کا اتباع کیا ہے۔ اسی مضمون پر میجر ہیگ اور مسٹر یزدانی کے مقالوں کی بنیاد ہے

یہ کتبہ بڑی اہمیت رکھنے والی چیز ہے کیونکہ اس میں ورنگل کے متعلق اس قدر صحیح معلومات ہیں۔ کہ اس سے بہتر معلومات سرزمین دکن کی کسی تاریخ میں یکجا جمع نہیں دکھائی دیتیں

اس کتبہ کے ایک بیان کے متعلق میجر ہیگ نے اپنے مقالہ ورنگل میں ایک نظریہ قایم کیا ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ :-

> ورنگل کے کاکیتیا خاندان نے کبھی خود مختاری کا اعلان نہیں کیا تھا۔ کیونکہ رودرادیو اول نے اپنے آپ کو "مہا منڈلیس" کے لقب سے ہمیشہ یاد کیا ہے جس کے معنے ایک بہت بڑے امیر کے ہیں۔ اس سے خود ظاہر ہے کہ رودرادیو اول ایک باجگذار راجہ تھا۔ کیونکہ یہ لقب صرف باجگذار راجہ ہی اپنے نام کے ساتھ استعمال کرتے تھے۔

مولوی غلام یزدانی صاحب ناظم آثار قدیمہ سرکار عالی نے اس بیان کی تردید کی ہے اور لکھا ہے کہ :-

> اس کتبہ سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ رودرادیو اول کس راجہ کا باجگذار تھا کولھاپور کے راجہ نے بھی اپنے آپ کو سپلاہا مہا منڈلیس ور کے لقب سے ہمیشہ منسوب کیا ہے، حالانکہ وہ ایک خود مختار اور ذی اقتدار راجہ تھا۔

اس سے خود ظاہر ہے کہ یہ القاب صرف رواجی ہیں ان کو اصلیت سے کوئی تعلق نہیں ہے، اور اس رودرادیو اول نے بھی بطور رواج عام کے اختیار کیا تھا۔

میجر ہیگ نے اس کتبہ کے علاوہ ایک اور تلنگی زبان کے کتبہ کا ذکر کیا ہے۔ جس کی ترشوائی کتبۂ اول الذکر کے بہت بعد کی ہے۔ یہ کتبہ شتاب خاں کی تعریف میں ہے جو پندرھویں صدی عیسوی کے اخیر زمانہ میں ورنگل کا صوبہ دار تھا۔ اس نے اپنے زمانہ صوبہ داری میں ہندوؤں سے خوب راہ و رسم پیدا کی تھی جس کی وجہ سے کچھ دنوں کے لئے یہ تلنگانہ اور کھم میٹ کا خود مختار بادشاہ بھی بن گیا تھا۔ اس کو بہ قول میجر ہیگ کے مسٹر برگس نے ہند دیمھا اور سیتا پتی کے نام سے یاد کیا ہے۔

قلعۂ ورنگل اس کے بعد تاریخی حیثیت سے ورنگل کا مشہور قلعہ ہے۔ جس کی بنیاد گنپتی دیوار (۱۲۳۱ء سے ۵۷ یا ۱۲۶۱ء) نے رکھی تھی اس کا زمانہ تعمیر ۱۲۳۱ء سے ۱۲۹۴ء کا درمیانی زمانہ ہے۔ کیونکہ اسکی تکمیل رودرما دیوی (۵۶ یا ۱۲۶۱ء سے ۱۲۹۴ء) کے زمانہ حکومت میں ہوئی تھی۔

یہ قلعہ مضبوطی و استحکام کے اعتبار سے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اور یہ دکن کے قلعوں میں ایسا ہی ممتاز ہے۔ جیسے گولکنڈہ اور بیجاپور کے قلعے مشہور ہیں۔ جس پہاڑ پر یہ تعمیر کیا گیا ہے، اس کی شکل کسی قدر بیضوی ہے۔ جس مقام پر اسکا انتہائی ارتفاع ہے اس کی بلندی سطح زمین سے تقریباً ۴۰۰ فٹ ہے۔

اس قلعہ میں دو فصیلیں ہیں، پہلی مٹی کی ہے، دوسری پتھر سے باندھی گئی ہے، اس کے اطراف میں ایک نہایت عمیق خندق ہے۔ جس کا عرض تقریباً ۱۲۷ فٹ اور عمق ۵۶ فٹ کے قریب ہے۔ یوں تو قلعہ کے تین حصار ہیں، لیکن پہلا حصار زمانہ کی دست درازیوں کے باعث باقی نہیں رہا۔ اس کے موہوم سے نقوش اگلی یادگار کے شاہد ہیں۔ اس کے متعلق مسٹر کازنس کا خیال ہے کہ یہ حصار تقریباً ۳۰ میل کے احاطہ پر مشتمل تھا۔ کیونکہ بقول ان کے ہنمکنڈے کے جانب جنوب ایک سنگین دہلیز ملی ہے جس کا طول ۲۰ فٹ ہے۔ اس سے اندازہ کیا جاتا ہے کہ یہ دہلیز اسی فصیل سے تعلق رکھتی ہے۔

ہمارے خیال میں یہ فصیل قلعہ کی فصیل میں شمار نہیں کی جاسکتی بلکہ اسکو شہر پناہ کی فصیل کہنا چاہئے اس لئے کہ سارے ہندوستان میں اتنا بڑا حصار کسی قلعہ میں نہیں پایا گیا ہے۔

قلعہ کی اندرونی فصیل جو پتھر کی ہے، اس میں چار دروازہ ہیں، شمال اور جنوب کے دروازے ہمیشہ بند رہتے ہیں، ان دروازوں کا طرز تعمیر بالکل عجیب واقع ہوا ہے۔ اس کے ہر دروازے کے اوپر شیر ببر کی مورت کندہ ہے۔ یہ ببر بھی بالکل نئی طرح کے ہیں۔ انکی نسبت ڈاکٹر ہنٹ ماہر آثار قدیمہ کا خیال ہے کہ یہ ببر اشوریا اور بابل کے ببروں سے قریب قریب بہت مشابہت رکھتے ہیں۔

ان دروازوں کی دہلیز کے اندرونی سنگی ستونوں پر نہایت قدیم کتبہ کندہ ہیں جو امتداد زمانہ کے باعث محو ہونے کے قریب ہوگئے ہیں۔

قلعہ کے حصار مختلف ناموں سے مشہور ہیں۔ بیرونی حصار بھومی کوٹ کہلاتا ہے۔ اندرونی پیداکوٹ کے نام سے منسوب ہے، ان دونوں حصاروں کا درمیانی رقبہ تقریباً ۴ میل کے مساوی ہے۔ گمان غالب ہے کہ اس حصہ میں پہلے زراعت ہوتی ہوگی کیونکہ اب بھی اس کے اکثر زرخیز مقامات اس امر کے شاہد ہیں۔

قلعہ کے بیرونی فصیل کے اطراف میں خندق حایل ہے اس لئے یہ غیر معمولی بلند دکھائی دیتی ہے۔ دراصل اسکی حقیقی بلندی سطح زمین سے تقریباً ۳۰ یا ۴۰ فٹ ہے۔ اس میں تھوڑے تھوڑے فاصلہ سے نہایت نفیس برج ہیں انکا اندرونی اور بالائی حصہ زیادہ کشادہ ہے۔

یہ قلعہ جب مسلمان فاتحین کے ہاتھ آیا تو انھوں نے اس میں غیر معمولی توسیع کی۔ اسکے علاوہ اس میں کئی ایک نئی چیزوں کا اضافہ کیا۔ بقول مولانا یزدانی کے اسمیں کی قدیم عمارتیں جو زمانہ ہنود میں تعمیر ہوئی تھیں۔ وہ مسلمانوں کی معرکہ آرائیوں سے تباہ ہوگئیں انکے منہدمہ پتھر نہایت نفیس اور نقشی تھے، مسلمانوں کی جدید عمارات میں استعمال کئے گئے ہیں۔ جس کی وجہ سے اس کی قدیم فن تعمیر کے آثار مفقود ہو چلے ہیں۔

اس قلعہ کی قابل ذکر خصوصیات میں ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کے اوپر جانے والی ساری سیڑھیاں بالکل مستطیل واقع

ہوئی ہیں جو طول میں تقریباً ۲۰۰ فٹ کے قریب ہیں۔ شاید اس کے تعمیر کرنے سے انکا یہ منشا تھا کہ بیرونی حملوں سے ان کے ملکی اثرات پر جو اثر پڑتا تھا اور جس کے باعث ان کو جانی اور مالی نقصانات برداشت کرنے پڑتے تھے اس کا اندیشہ جاتا رہے مگر اس پر اس قدر صدیاں گذرنے کے بعد بھی اس کی اصلی صورت میں کسی قسم کا فرق نہیں آیا۔ اب بھی نہایت اچھی حالت ہے۔

ابتدا میں یہ قلعہ راجگان کاکتیا کے زیر اثر تھا ان سے محمد تغلق (سمہ سمہ) نے ۱۳۲۱ء میں فتح کیا۔ مگر ان سے صلح ہوجانے پر پھر اس کو بطور خراج مسترد کر دیا۔ ۱۴۲۲ء میں یہ قلعہ بیدر کے شاہان بہمنیہ کے قبضہ میں تھا۔ ان سے سلاطین قطبشاہیہ کی عملداری میں آیا۔ ان کے بعد اسپر اورنگ زیب عالمگیر کا قبضہ ہوا۔ اب یہ حیدرآباد کے آصفیہ خاندان کی عملداری میں ہے۔

قلعہ کی دیول

قلعہ کی اندرونی یادگاروں سے ایک قدیم دیول ہے۔ جس کو ہم سلسلہ کے لحاظ سے تیسرے دور میں شامل کرتے ہیں۔ یہ دیول گنپتی دیو (۱۲۳۱ء تا ۱۲۶۱ء) نے تعمیر کی تھی۔ لیکن یہ ایسی عظیم الشان عمارت ہے کہ اوسکا ایک راجہ کے عہد حکومت میں تعمیر ہوجانا بالکل ناممکن تھا۔ اس لئے یہ نامکمل حالت میں رہ گئی۔ اسکی خراب و خستہ حالت تباہ و بوسیدہ چھت منہدمہ ستون جواب یادگار زمانہ ہیں اون کے دیکھنے سے اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ یہ مندر طرز تعمیر کے اعتبار سے فن سنگ تراشی کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ اگر یہ اپنی پہلی حالت میں موجود رہتا تو اسکا شمار تعمیری نقطۂ نظر سے تلنگانہ کا کیا بلکہ سارے دکن کی ہندو عمارات سے غیر معمولی درجہ رکھتا۔

اس دیول کے منہدمہ دروازوں کی نسبت مسٹر فرگوسن لکھتے ہیں کہ یہ دروازے سانچی کے دروازوں سے بالکل مشابہت رکھتے ہیں، جن کو پٹنہ کے ساتا واہانا خاندان نے پہلی صدی عیسوی میں تعمیر کیا تھا۔ ان دروازوں کا طرز تعمیر بالکل بدھی پایا جاتا ہے، لیکن اس طرز کا استعمال دکن ہی سے شروع ہوا۔ اس نے یہیں نشو و نما پائی اور بدھ مت کے ختم ہوجانے کے بعد بھی ایک زمانہ تک اس کا دکن میں عام رواج تھا۔ اس قسم کے دروازے کلپاک کے نواح میں اکثر پائے جاتے ہیں۔

ورنگل کے دروازے حالانکہ سانچی کے دروازوں سے زیادہ مختلف الوضع نہیں ہیں۔ تاہم مشابہت ضرور رکھتے ہیں ہرچند قلعہ ورنگل کے دروازے سانچی کے دروازوں سے ایک ہزار سال بعد بنائے گئے ہیں لیکن ان کو غور سے دیکھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ یہ دروازے لکڑی کے سانچے کا نمونہ ہیں۔ اس قسم کے ستونوں کا رواج دکن میں آجتک موجود ہے۔ چنانچہ اس نوعیت کی ایک حاضر مثال راجہ صاحب اناگونڈی کا مکان ہے۔

ان دروازوں کے شمالی اور جنوبی حصہ کا درمیانی فصل ۴۸۷ فٹ ہے۔ اس کے مغربی اور مشرقی حصہ کو ۴۳۰ فٹ کی مسافت جدا کرتی ہے۔ اس طویل اور عریض مربع سے اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ یہ دیول کس قدر وسیع ہوگی!

جس حصہ میں اسکا سنگ بنیاد رکھا گیا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ مندر جب تباہ ہوگیا تو اس وقت اس کے بہت سے اساس مذہبی تہ خاک پیوند ہوگئے۔ اور بہت سارے کتبے جنسے ان کی گذشتہ تاریخ کی ترتیب میں مدد ملتی تھی وہ سب اس حصہ میں محفوظ ہیں اگر

اس حصہ کو کھدوا یا جائے تو عجب نہیں کہ اسمیں سے نہایت قدیم قدیم کتبے نکلیں گے۔ جس سے ان کے خاندان کی عظمت و امتیاز پر غیر معمولی روشنی پڑے گی۔ اور ان کے سلسلۂ نسب کا بھی حقیقی پتہ لگ جائے گا۔ اس کے علاوہ اور بہت سی ایسی چیزیں عالم وجود میں آئیں گی جس سے دنیا ابھی تک ناواقف ہے۔

قلعے کے بعض قدیم منادر اس مندر کے سوا قلعہ میں اور بہت سی قدیم اور جدید دیولیں ہیں۔ ان میں کی بعض دیولیں تو نہایت قدیم ہیں۔ ان کا سنہ تعمیر یقیناً بڑی دیول سے بہت پہلے کا ہے۔ لیکن یہ فن تعمیر کی ابتدائی کڑی ہونے کے لحاظ سے نہایت مبتذل واقع ہوئی ہیں۔ اور فنی اعتبار سے ان کا کوئی خاص درجہ نہیں ہے۔ البتہ قدیم کتبات جو ان پر کندہ ہیں۔ ان سے انکی شان ایک حد تک ارفع و بلند ہوجاتی ہے۔

سمبھوگدی "مندر" ان مندروں کے سامنے ایک مندر واقع ہے جس کو سمبھوگدی کا مندر کہتے ہیں۔ اس کے صحن میں پتھر کے تین ہاتھی ہیں ان میں کا ایک ہاتھی کسی قدر مجروح ہوگیا ہے۔ ان کی نسبت ہمارا خیال ہے کہ یہ ہاتھی عجب نہیں کہ بڑے مندر کے لئے بنائے گئے، لیکن جب یہ مندر برباد ہونے کے قریب ہوگیا تو ان کو اس کی اصلی جگہ سے علحدہ کر کے یہاں رکھدیا گیا ہے۔

ونکاٹیساگدی "مندر" اسی قبیل سے ایک اور مندر ہے جس کو ونکاٹیساگدی کہتے ہیں۔ اس میں نہایت نفیس صناعی کی گئی ہے۔ اور یہ طریقۂ کندیدگی کے اعتبار سے بڑا درجہ رکھتا ہے۔ کیونکہ اس کے اندرونی استادہ ستون اس نزاکت سے تراش کر نصب کئے گئے ہیں کہ انہیں جس پہلو سے دیکھا جائے، ایک ہی سیدھ میں دکھائی دیتے ہیں۔

شتاب خاں کا دربار ہال اس مندر کے دروازے سے بالکل قریب میں ایک پٹھان طرز کی عمارت ہے۔ جو شتاب خاں کے دربار ہال کے نام سے مشہور ہے۔ یہ عمارت بھی نامکمل حالت میں ہے۔

چمپتی مندر اس کے بالکل سامنے ایک دیول ہے جو کئی ستونوں پر قائم ہے۔ اس دیول کی ایک خاص خصوصیت یہ ہے کہ اسکے سارے ستون خطوط عمودی کی شکل میں ہیں۔ یہ ستون اس دیدہ ریزی اور کاریگری سے اپنی اپنی جگہ نصب کئے گئے ہیں کہ باوجود اس برسات سو سال کے طویل عرصہ کے گذرنے کے بعد بھی انکی استقامت میں کسی قسم کا کوئی فرق نہیں آیا۔ اس کے ایک ستون پر ایک کتبہ کندہ ہے۔ جس سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ یہ دیول ۱۱۳۵ء میں رودرا چمپوتی نے اس یادگار میں تعمیر کی تھی جو اسکو راجہ لنگائی کے مقابلہ میں فتح حاصل ہوئی تھی۔

ان آثار قدیمہ کے علاوہ اس میں اور بہت سی یادگاریں محفوظ ہیں جو جدید ہونے کی وجہ سے نظر انداز کی گئی ہیں۔ ان میں سے بعض ایسی بھی ہیں جو قدیم ہیں مگر انکی کوئی تحقیق نہ ہوسکی۔

مسجد ان منادر کے جنوب میں ایک مسجد بھی واقع ہے۔ جس کو مسلمانوں نے قلعہ فتح کرنے کے بعد تعمیر کیا تھا۔

انبار خانہ اور رسد خانہ قلعہ کے شمال میں بہت سے بوسیدہ مکانات ہیں جنکی نسبت ماہرین آثار کا خیال ہے کہ یہ راجگان ورنگل کے

انبار خانے اور رسد خانے کے کمرے تھے۔

ان مختصر آثار کے علاوہ تلنگانہ کے آثار قدیمہ میں اور کوئی قابل ذکر چیز نہیں ہے۔

کتبہ

جو ہنمکنڈے کے مشہور ہزار ستونی دیول پر (۱۱۶۲ء و ۱۱۶۳ء کا) سنسکرت زبان میں کندہ ہے[1]۔

خدا ہمارے ملک کو فتح و کامرانی سرسبزی و شادابی عطا کرے، رودر دیوا مہامنڈلیس ور اجیسے ذی اقتدار راجہ کا زمانہ حکومت شوکت، دبدبہ اور فتحمندیوں سے لبریز تھا اور وہ ہنمکنڈہ جیسے بہترین شہر پر نہایت جاہ و جلال کے ساتھ حکمران تھا۔ مہالیس ورا کا بڑا پرستار تھا۔ اوس کے سارے افعال مالک کی خاطر تھے اور وہ شرم و مروت کا مجسم پتلا تھا۔ طرز جہانبانی کو اسکی شیریں بیانی نے چار چاند لگا دئے تھے

"دوارہ نے ۱۳ ماہ سکھ سال سک میں لیسوبہ سری وشنو دیوا اور سری دیوا کے ناموں پر اپنے نام کا سکہ بٹھایا[2]۔

میں ہری کی تعریف میں رطب اللسان ہوں جب اس نے کرہ زمین کو اوپر کی طرف اوٹھایا تو سات سمندر کی موجیں آٹھ آٹھ کر اوس پر یورش کرنے لگیں جو بمشکل تمام اس کے پاؤں کے انگوٹھوں کے ناخن تک پہونچ سکے۔ اور تینوں عالم پانی کے ایک قطرہ کی طرح اسکی جھونپڑی میں سماگئے۔ یہ جھونپڑی اوس کے دانت کا صرف ایک گوشہ تھی۔ اے سری ہر پیا مرے حال پر لطف و کرم کی نظر کر، تو ان شہد کی مکھیوں کا نشیمن ہے۔ جو تیرے پائیں کے عطر بیز نغموں کی کشش سے کھنچی ہوئی پاس چلی آتی ہیں۔ خدا کرے سرسوتی علم کی دیوی مرے دل میں آبسے، جس کو میں اپنی ماں کے برابر سمجھتا ہوں۔ وہ دودھ کی دھلی ہوئی سے بھی بلند مدارج پر پہونچائی گئی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سرچشمۂ علم سرسوتی چاند کے نور سے گوندھی ہوئی ہے یا ہلکے ہلکے صندلی رنگ کا ایک مجسمہ ہے۔ میں یعنے اچتندرا، سری رامیس ورداکشٹیا کا بیٹا ہوں جو ہرت راجہ کے خاندانے کی عزت کا بڑھانے والا تھا۔ اور سرد تا کے رسوم کو نہایت توقیر کے ساتھ ادا کیا کرتا تھا۔ وہ دنیا کا بہترین آدمی تھا۔

تہری ہوا نا ملا کا کیتیا نسل کا ایک فتحمند راجہ تھا۔ جس سے ذی جبروت دشمنوں کی بیویوں کا سہاگ جاتا رہتا تھا۔ اسکے نام سے بڑے بڑے سرکشوں کے دل ہل جایا کرتے تھے۔ مستحق لوگ اس کے فیض و کرم سے مستفید ہوتے تھے۔ خوش گلو اور

---

[1] اس کتبہ کا ہم نے انڈین انٹی کویری جلد ۱۱ صفحہ ۱۹ سے خلاصہ کیا ہے۔

[2] یہ عبارت بطور جملہ معترضہ کے آئی ہے۔

حسین نازک اندام نازنین اسکی دل وجان سے گرویدہ ہوئی تھیں۔

اس کے بیٹے پرودے نے بڑی ناموری حاصل کی تھی اور ایک لمحہ میں اس نے تیلاپادا جیسے سپاہی منش راجہ کو جو چلوکیا خاندان کی ناک تھا ایک معرکہ میں قید کر لیا، اس نے گوندراجہ پر بھی چڑھائی کی اور اسے دم بھر میں اسیر کر لیا۔ اور پھر اس کو اپنی شاہانہ فیاضی سے رہا کر دیا۔ اسکی سلطنت آدیوار راجہ کو دے دی۔ بیشرم (یا جگدار) گوند اسکے ہاتھوں شکست کھاکر اپنے شہر کی طرف فرار ہو گیا جس کے بعد پرودے نے پھر اس جنگ کے لئے مقابلہ کو طلب کیا۔ جگدیوار جیسے ذی اقتدار راجہ کی شخصیت کو اس نے معرض زوال میں ڈال دیا۔ اور اسکی ساری قوتیں سلب کر لیں۔ اس کے بعد پاراانی اس کی بیوی بنی۔ جس کے دلفریب حسن کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ اس کے بطن سے دنیا کا سکھ یعنے سری رودرادیوار پیدا ہوا جس کا تعلق سری کرشنا سے وابستہ ہے۔

اس نے آن کی آن میں دوٌنا کا سارا زور توڑ ڈالا، جو بڑا وفادار صاحب قوت اور شہسوار تھا۔ اس کے بعد ایدرودرا نے کئی بہتر سے بہتر شہر اپنی راجدھانی میں شامل کئے۔

شہر بھر میں سری رودرا کی تعریف کرتا ہونگا جو میدا اس کی شرارتوں کو کچل سکتا ہے۔ اور جو بلند اور اولوالعزم ارادوں کا اور مشوروں کا علمبردار ہے۔ جس کی تاب اوس کے دشمن نہیں لا سکتے۔ اس نے ظفر مند میلی گیدوا جیسے موذ شخص کی شان و آبرو کو خاک میں ملایا۔ سری بلوا سا جیسے زبردست راجہ کی ساری دولت سمیٹ لی۔ گوکرانا یہ ایک کم اصل انسان تھا۔ لیکن وہ تمام دنیا کا ہیرو بن بیٹھا تھا۔ اس کو بیما جیسی خوفناک ہستی نے موت کے گھاٹ اتارا۔ اور پھر وہ چہکتے ہوئے بلبل کی طرح دنیا سے سدھارا۔ انہی دنوں میں راجہ چیدَوَدیا نے بھی عالم دیوانگی میں راہ لی۔ اور تیلپا بھی سری رودرادیوار کے رعب و دہشت سے چل بسا۔ بیما جیسے بدبخت نے اس کی جگہ سنبھالی۔ یہ اپنی حکومت کے نشہ میں چور تھا، اور سری رودرا جیسے بہادر کے مقابلہ میں خم ٹھوکنے کی جرأت کر بیٹھا۔ رودرا نے بیما کی شیخیاں سنیں تو اس کا خون معرکہ آرائی اور فتحمندی کے جوش میں ابلنے لگا۔ چنانچہ ایک لشکر جرار کیساتھ روانہ ہوا۔

اس کی ان شاندار تیاریوں کو دیکھ کر بڑے بڑے مخالف راجہ کانپنے لگے۔ سب سے پہلے راجہ نے شہر دھمن نگری کو اپنے قہر و غضب کا نشانہ بنایا۔ بیما نے راجہ کی اس شان جلالی کو دیکھا تو ہوش جاتے رہے اور سب چھوڑ چھاڑ کر بڑی بے حیائی کے ساتھ اپنے بھائی، ماں، بہن اور بیوی، کو لیکر جنگل کی راہ لی، راجہ نے بھی اس کا تعاقب کیا اور چیدَوَدیا کے شہر کو آگ لگا دی، اور تیر بنیچ جنگلوں کا صفایا کر ڈالا، جو اس کی راہ میں حایل ہوئے تھے پھر اس نے ایک عظیم الشان اور عجیب و غریب تالاب شہر کے بیچوں بیچ بنایا۔

بیما اور دوسرے راجہ جو کانچی اور وندھیا کے درمیان رہتے تھے۔ جو سلطنت کے غرور میں اپنی اپنی جگہ خدا

بنے بیٹھے تھے۔ لیکن جب ان کے مزاج درست ہو گئے اور ہوش ٹھکانے لگے تو وررا کے دامن میں پناہ گزین ہوئے۔

اس کا دار الحکومت (ماکنڈہ) شہر کندریا کی طرح راحت و آرام معمور تھا۔ اور اس کا ہر گوشہ کھنڈری کی طرح جشنو اور دشنو کی دیولوں سے آراستہ و پیراستہ ہے۔

یہاں پر نازک اندام اور پری پیکر جادو بھری نینوں والی عورتوں کا ایک میلا لگا رہتا ہے۔ جو نہایت انداز کیساتھ مسکراتی ہوئی اپنی بھری بھری چھاتیوں کو سنبھال سنبھال کر چلتی ہیں۔ برہمنوں کے مکانوں میں نوجوان طالبعلموں کے ساتھ سیانے طوطے بھی ہیں۔ جو اُن کے ہم آہنگ ہو کر دیدن کی رٹ لگاتے ہیں۔

سری رورا کے گھوڑے آسمان پر دھاوے نہیں کرتے۔ کیونکہ یہ وہ مقام ہے جہاں وشنو کے قدم پڑے تھے۔ نہ وہ اپنی ٹاپوں سے زمین کو پامال کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ ان کے نزدیک ایک مقدس گائے کا رتبہ رکھتے ہیں۔ لیکن گھوڑوں کی یہ فوج غنیم کے حق میں ایک بلائے ناگہانی ہے۔ اس کے گھوڑے مشہور و معروف خصائل سے متصف ہیں۔ بڑے چھیلے برق رفتار اور انتہا کے باربردار ہیں انکی عمر بھی خاصی بڑی ہوتی ہے۔ رفتار کی پانچوں قسموں میں خوب طاق ہیں۔

اس کی قلمرو مشرق میں دریائے شور تک پھیلی ہوئی ہے۔ اس کی قوت اقتدار کا سکہ تمام جنوبی حصہ میں یعنے سری لنکا تک رواں ہے۔ اس کے حدود کے ایک جانب کٹک ہے۔ دوسری جانب تمام مغربی ممالک جانب شمال ملیادنتا کے پہاڑ جو اپنی ناہموار بلندیوں کی دلفریبی میں مشہور ہیں۔

راجہ رورا "دتے" جس کی سب عزت و تکریم کرتے ہیں سری مہیسارادی اور سوری جیسے دیوتاؤں کی پرستش کیلئے ایک عظیم الشان قبضہ متی جورودلہ مستقل طور پہ وقف کر دیا۔

ماخذ

(۱) انڈین انٹی کویری (جنرل) . . . . جلد (۱۰) و (۱۱)

(۲) جنرل دکن ارکیولوجیکل سوسائٹی آف حیدرآباد۔ بابتہ ۱۹۱۶ء

(۳) لینڈ مارک آف دکن . . . . معنفہ لفٹنٹ میجر ہیگ مطبوعہ ۱۹۱۷ء

(۴) ہسٹاریکل ڈسکرپٹیو اسکیچ آف دی نظام ڈومینس . . . . . . مولفہ عماد الملک بہادر طبع قدیم۔

(۵) تاریخ نادری . . . . معنفہ منشی قادر خاں بیدری سنہ تصنیف ۱۲۴۹ قلمی

(۶) تاریخ قلمروئے نظام . . . . مترجمہ مولوی شمس الدین صاحب نجم

(۷) گزیٹر ممالک محروسہ سرکار عالی مرتبہ مہدی خاں صاحب　　مطبوعہ ۱۹۰۸ء

(۸) امپیریل گزیٹیر آف انڈیا .... جلد ۴

(۹) واقعات بیجاپور حصہ سوم .... مصنفہ مولوی بشیر احمد صاحب مطبوعہ ۱۹۱۵ء

(۱۰) ہندوستان کا فن تعمیر .... از فرگوسن　　جلد (۱)

(۱۱) جنرل بنگال رائل ایشیاٹک سوسائٹی .... جلد (۷) صفحہ (۹۰۱)

(۱۲) جنرل بمبئی رائل ایشیاٹک سوسائٹی .... جلد (۱۰) صفحہ (۴۶)

(۱۳) رپورٹ مغربی تعمیرات ہندوستان .... از مسٹر کاؤزنس بابتہ ۹۵-۱۸۹۴ء

(۱۴) تمدن ہند .... مترجمہ ڈاکٹر سید علی بلگرامی مطبوعہ ۱۹۱۳ء

(۱۵) پرتاپ چرترا (تلنگی) .... قلمی

(۱۶) رپورٹ آثار قدیمہ سرکار عالی .... مرتبہ مولوی غلام یزدانی صاحب

ان کتابوں کے سوا ذیل کے رسایل اور کتابوں سے بھی ہمنے استفادہ کیا ہے۔

"رسالہ نمائش حیدر آباد بابتہ اگست ۱۹۲۶ء اخبار ریاست دہلی جلد ۵ نمبر ۶ بابتہ ستمبر و ہسٹری آف میڈ ورٹیلیہ صفحہ ۵۴

تاریخ پیانگر مولفہ سورج نراین صاحب صفحہ ۵۶"

سید احمد اللہ قادری۔ ایم۔ آر۔ اے۔ ایس (لندن)

علم فراست الید

پرناچندر پڑھنے کو یوں تو بی۔اے میں پڑھتے تھے لیکن انگریزی تعلیم اور ایک انگریزی تعلیم پر کیا منحصر تھا نئی روشنی اور مغربی تمدن کی کل چیزوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ یہ صرف خاندان اور سب سے بڑھکر انکی ماں کا شدید اصرار تھا کہ وہ اپنے مزاج اور طبیعت کے خلاف کالج میں پڑھ رہے تھے۔ ورنہ واقعات تو یہی بتاتے ہیں کہ وہ سینٹ زیویر کالج کلکتہ کی شاندار عمارت میں پڑھنے کے بجائے کسی پنڈت کے ٹوٹے ہوئے جھونپڑے میں، زمین پر بیٹھ کر مذہبی کتب کا درس لیتے رہتے۔ وہ سنسکرت زبان کے عاشق تھے۔ اور ہر چند کالج کے مشاغل سے بہت ہی کم فرصت ملتی تاہم کوئی نہ کوئی سنسکرت کی کتاب برابر ان کے زیر مطالعہ رہا کرتی۔ پوجا پاٹ اور اپنے مذہب کے احکام کی تعمیل وہ بہت ہی خلوص اور انہاک سے انجام دیا کرتے۔ ان کے دوستوں کا بیان ہے کہ وہ بعض وقت جاڑے کے ایام میں دو دو بجے شب کے وقت گنگا جی میں اشنان کر لئے گئے ہیں۔ انکی وضع بالکل قدیمانہ تھی۔ موٹا کھاتے موٹا پہنتے اور نہایت ہی سادہ بے تکلف زندگی بسر کیا کرتے۔ وہ نئی روشنی کے دشمن تھے اور ان کے خیال میں ملک کی تباہی و بربادی کا اصل راز انگریزی تعلیم کے اندر مضمر تھا۔ وہ جس وقت راجہ رامچندر جی اور سری کرشن جی مہاراج کا زمانہ یاد کرتے تو انکی چھاتی پر ایک سانپ سا لوٹ جاتا۔ دل میں کہتے۔ وہ زمانہ تو خیر آنا مشکل ہے۔ نہ ویسے لوگ پیدا ہونگے۔ نہ انکی تعلیم پر کوئی چلنے والا ہوگا۔ آج سے سو دو سو سال قبل ہی کی حالت کا مطالعہ کیجئے اور دیکھئے کہ ہماری ذہنیت میں کتنی تبدیلی پیدا ہو چکی ہے۔ انکا خیال تھا کہ ہماری مذہبی روح اور ہماری روحانی قوت محض انگریزی تعلیم اور مغربی تمدن کی بدولت دن بدن فنا ہوتی جا رہی ہے۔

پرناچندر اکثر کہتے کہ ہندوستان کی بھلائی نہ ترک موالات سے ہو سکتی ہے اور نہ شدھی و سنگھٹن سے۔ نہ کانگریس اور کانفرنس سے کوئی مفید نتیجہ نکالا جا سکتا ہے اور نہ ہندو سبھا کی کوشش سے تاوقتیکہ نئی روشنی اور جدید تہذیب کا قطعی طور پر قلع قمع نہ کر دیا جائے۔ جبتک ہماری ذہنیت میں تبدیلی پیدا نہ ہوگی۔ جبتک ہم انکی تعلیم پر عمل پیرا نہ ہونگے جب تک ہم میں وہی قدیمی روح پیدا نہ ہوگی، ان تحریکوں سے سوائے ذلت و پریشانی اور آپس میں نفرت و عناد کا جذبہ پیدا ہونے کے، کوئی مفید اور عملی نتیجہ ظاہر نہیں ہو سکتا

بھارت کی سادہ زندگی انہیں بہت مرغوب تھی۔ جب کبھی وہ مکان آتے اور سیدھے سادے بھولے بھالے کاشتکاروں کے جھرمٹ میں بیٹھکر ہمکلام ہوتے تو انہیں ایک روحانی مسرت حاصل ہوتی جس کا بیان مشکل ہے۔ کلکتہ کی چہل پہل اور گہما گہمی سے کون ناواقف ہے؟ ڈلہوزی اور چورنگی کے دلچسپ مناظر کس کو محو حیرت نہیں بناتے! لیکن پرناچندر کی آنکھوں میں ان چیزوں کی کوئی وقعت نہ تھی۔ وہ ہوسٹل کی چار دیواری سے شاذ و نادر ہی باہر آتے۔ انہیں سوائے کالج جانے، ہوسٹل میں رہنے، اور مذہبی کتب کا مطالعہ کرنے کے کوئی دوسرا مشغلہ ہی نہ تھا۔ اس لئے نہیں کہ انہیں آبادی سے نفرت تھی یا وہ اپنے ابنائے جنس سے ملنا ناپسند کرتے تھے بلکہ اس لئے کہ انہیں ان تمام باتوں میں تکلف اور تصنع کا رنگ نظر آتا تھا۔ یا دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ مذہبی تعلیم ان باتوں کے سراسر منافی تھی۔

یونتو زمانہ کی زبان کون پکڑ سکتا ہے۔ ہر شخص اپنے اپنے حوصلہ کے بوجب پرناچند کی نسبت جو چاہتا تھا کہتا تھا۔ لیکن اسمیں شک نہیں کہ وہ اپنے اصول کے بہت پکے، مذہب کے بہت پابند اور انسانی اوصاف کے لحاظ سے بہت ہی سچے اور راست باز انسان تھے

(۲)

درگا پوجا کی تعطیل تھی۔ کالج ایک ماہ کے لئے بند تھا کالج کے طلبہ سیر و تفریح کی غرض سے مختلف مقامات میں جانیکی تیاریاں کر رہے تھے۔ لیکن پرناچندر نے ابھی تک کہیں جانیکا ارادہ نہیں کیا تھا۔ وہ ہوسٹل ہی میں رہے اور نصف سے زیادہ تعطیل تن تنہا ہوسٹل ہی میں گذار دی۔ ان کے وقت کا زیادہ حصہ مذہبی و دینی کتب کے مطالعہ میں بسر ہوتا تھا اور وہ ہمیشہ اس سوچ میں رہتے تھے کہ ہم کیا تھے اور اب ہماری کیا حالت ہو گئی ہے۔ جب اختتام تعطیل کو بہت کم دن باقی رہ گئے تو انہوں نے مکان جانے کا ارادہ کیا اور شام کی ایکسپرس سے سوار ہو کر دوسرے دن اپنی بستی گونڈہ میں پہونچ گئے۔

(۳)

صبح کا وقت تھا۔ پرناچندر پوجا پاٹ سے فارغ ہو کر کئی ہفتہ قبل کا ایک اخبار اٹھا کر دیکھ رہے تھے۔ ان کی ماں مسکراتی ہوئی کمرہ میں داخل ہوئیں۔ وہ ایک بیوہ عورت تھیں۔ پرناچندر کے پتا عرصہ ہوا مر چکے تھے۔ انہوں نے کمرہ میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ "پرنا! میں تم سے ایک بہت ضروری بات کہنے آئی ہوں۔ جہاں تک ممکن ہو جلد جواب دینا۔ تم ساری تعطیل ختم کر کے تو یہاں آئے ہو"

پرناچندر دونوں ہاتھوں کو جوڑ کر مودبانہ کھڑے ہو گئے۔ وہ اپنی ماں کی بڑی عزت کرتے تھے۔ سر جھکائے ہوئے بولے۔ "جی ہاں۔ کیا بتاؤں۔ کالج کے مشاغل سے بہت کم فرصت ملتی ہے۔ کیا کوئی بہت ضروری کام ہے"

"ہاں بہت ضروری" ماں نے چوکی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "اتنا ضروری کہ تمہیں آج ہی بلکہ اسی وقت جواب دینا ہوگا"

ماں کو ہنسی آگئی۔ پرناچندر بھی مسکراتے ہوئے کرسی پر بیٹھ گئے

تھوڑی دیر کے بعد ماں بولیں "پرنا! میری خواہش ہے اور دلی خواہش ہے کہ اب میں تمہاری دلھن بیاہ کر لاؤں۔ دنیا ہنستی ہے کہ ابھی تک لڑکے کا بیاہ نہ کیا۔ میں، سچ پوچھو، تو شرم سے گڑی جاتی ہوں۔ بات بھی سچ ہے۔ جوالا تم سے چھوٹا ہے۔ ڈیڑھ دو سال چھوٹا ہوگا۔ جیت میں پیدا ہوا تھا۔ ابھی اٹھوارھواں لگے گا۔ ایشور کی دیا سے اس کی شادی بھی ہو گئی۔ ایک بچہ بھی پیدا ہوا۔ اور تم ہو کہ شادی کے نام سے کوسوں بھاگتے ہو۔ آخر میں کب تک جیتی رہونگی۔ میری زندگی میں تمہارا بیاہ نہ ہوا تو آخر کب ہوگا؟ اب تو میں تمہاری ایک نہ سنوں گی۔ اسی کرسمس کی تعطیل میں میں بیاہ کا انتظام کرتی ہوں۔ جدو بابو وکیل کو تو تم جانتے ہی ہو۔ ان کی بیوی کل آئی تھیں۔ راجکماری کی بابت ذکر آیا۔ مجھے بھی بے حد پسند ہے۔ ایسی اچھی لڑکی، میرے خیال میں، ملنا بہت مشکل ہے۔ دیکھو اگر تم نے اس مرتبہ میری بات نہ مانی تو مجھے بہت صدمہ ہوگا۔

پرناچندر شادی کے مخالف تھے۔ کئی پیغام اب تک مسترد کر چکے تھے۔ انکا شادی کرنے کا ارادہ نہ تھا۔ اور وہ کچھ عجیب و غریب قسم کی دلیل اس کے متعلق رکھتے تھے۔ عموماً لوگ طالب علمی کے زمانہ میں شادی کرنا ناپسند کرتے ہیں۔ چونکہ تجربہ نے ابتک یہی بات

بتائی ہے کہ شادی کے بعد تعلیم جاری رکھنا بہت دشوار طلب امر ہے۔ لیکن پرناچندر کے پاس یہ بھی دلیل نہ تھی۔ وہ اس لئے شادی کے مخالف نہ تھے کہ وہ طالبعلم تھے اور شادی کے بعد تعلیم پر اسکا ناخوشگوار اثر پڑتا ہے۔ وہ اس لئے بھی شادی کے مخالف نہ تھے کہ جب تک وہ چار پیسے اپنی قوت بازو سے حاصل کرنے کے لائق نہ ہوجائیں وہ ازدواجی زندگی میں نہیں آسکتے۔ کچھ یہ بات بھی نہ تھی کہ شادی کے بعد فکر معیشت کے ترددات کا انہیں سامنا کرنا پڑتا۔ وجہ اگر کوئی تھی تو یہ اور جیسا کہ انہوں نے اپنے بعض بے تکلف دوستوں سے بیان بھی کیا کہ موجودہ زمانہ میں جیسی بیوی ملنی چاہئے ویسی ملنی مشکل ہے۔ انہوں نے مذہبی کتب میں دیکھا تھا کہ اگلے زمانہ کی بیویاں کس درجہ اطاعت شعار کتنی مطیع اور کیسی فرمانبردار ہوتی تھیں۔ برخلاف اس کے آجکل کے مشاہدات انہیں بتاتے تھے کہ بیوی شوہر کے لئے نہیں بلکہ شوہر دراصل بیوی کے لئے ہوتا ہے۔ شوہر اگر بیوی کی اطاعت شعاری اور فرمانبرداری نہ کرے تو ہر جگہ اور ہر سوسائٹی میں بدنام و مطعون ہوتا ہے۔ وہ کہتے کہ آجکل کی بیویاں عموماً پڑھی لکھی ہوتی ہیں۔ اور اسکا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کھانا پکانا، کونا پیسنا تو ایک علیحدہ چیز رہی، انہیں اپنے شوہر کو ایک گلاس پانی کا بھی دینا گراں گذرتا ہے۔ وہ اخبارات پڑھتی ہیں۔ انہیں عشقیہ ناولوں سے دلچسپی ہوتی ہے۔ وہ بناؤ سنگار میں اپنے وقت کا زیادہ حصہ صرف کرتی ہیں۔ اور ان کے دل میں شوہر کی عزت ایک ستم زدہ عاشق سے زیادہ نہیں ہوا کرتی۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ مساوات برتنا چاہتی ہیں۔ اور اگر انکے احکام کی تعمیل میں ذرہ برابر بھی بے عنوانی ہو تو پھر مرد کا انکے سامنے "سراسر تقصیر" ہوکر رہ جانا ناگزیر ہے۔

یہی خیالات تھے جنکی بنا پر پرناچندر نے عرصہ ہوا یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ صنف نازک میں سے کسی فرد کو بھی اپنی زندگی کا شریک نہ بنائیں گے۔ لیکن بالآخر لوگوں کا اتنا شدید اور پیہم اصرار ہوا کہ انہیں اپنے فیصلہ میں کچھ ترمیم کرنی پڑی۔ انہوں نے سوچ لیا تھا اور یہ فیصلہ انکا اب بالکل قطعی تھا کہ اگر آئندہ شادی کے لئے انہیں مجبور کیا گیا تو وہ اپنی رضامندی ظاہر تو کردیں گے۔ لیکن "عورت" کا انتخاب خود انکے ذمہ ہوگا۔

اتفاق یہ کہ پوجا کی تعطیل کے دو چار ہی دن قبل انہوں نے ہوسٹل کے بعض لڑکوں سے بھی اپنے خیالات کا اظہار کردیا تھا کہ اول تو حتی الامکان وہ شادی ہی نہ کریں گے۔ اور اگر اسکا کبھی موقع آیا بھی تو ان کی نظر انتخاب اس عورت کی طرف جائیگی جو ظاہری و جسمانی ساخت کے لحاظ سے انتہائی بدقسمت عورت کہی جاسکے۔ یہ بات انکے خیال میں اچھی طرح جم گئی تھی کہ حسن ہی ایک وہ شئے ہے جس پر عورت کے سارے طلسم کا دار و مدار ہے۔

پرناچندر کی اس عجیب و غریب ذہنیت کو سن کر بعض لڑکوں نے انکا مذاق بھی اڑایا اور بعضوں نے کہا کہ صاحب کہنے اور کرنے میں بڑا فرق ہے۔ اس وقت کہہ لیجئے لیکن جب موقع آئے گا تو یہ ساری باتیں بھول جائے گا۔ پرناچندر نے اسکا اور کچھ تو نہ دیا صرف اتنا کہکر خاموش ہوگئے کہ آپ مانیں چاہے نہ مانیں لیکن کم از کم میں تو اپنے آپ کو اپنے ارادہ میں راسخ، اور اپنے "عہد" میں پختہ سمجھتا ہوں۔

الغرض یہ تھے وہ خیالات جو پرناچندر اپنی آئندہ زندگی کی نسبت رکھتے تھے۔ آجتک تو ان کی ماں نے دوست احباب کے ذریعہ سے انہیں سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن اس مرتبہ جب انہوں نے خود اپنی زبان سے اتنی آزادی و بیباکی کے ساتھ گفتگو کی تو پرناچندر سوائے "ہاں" کے نہیں کہنے کی جرأت نہ کرسکے۔ انہوں نے کہا۔ "میں آپ کے حکم کی تعمیل کے لئے ہر وقت مستعد ہوں لیکن نہیں معلوم جس لڑکی کا آپ

ذکر کر رہی ہیں اُسے کبھی آپ نے دیکھا بھی ہے یا نہیں؟" ماں کے لئے پرناچندر کی رضامندی بالکل غیر متوقع اور خلاف امید تھی۔ انہوں نے خوشی کے لہجہ میں جواب دیا "نہیں میں نے بذات خود تو نہیں دیکھا لیکن سنتی ہوں بہت خوبصورت لڑکی ہے۔ ۱۳، ۱۴ سال کا سن ہے، پڑھی لکھی، سلیقہ مند، شگفتہ صورت، جب دیکھو یہی معلوم ہوتا ہے مسکرا رہی ہے۔"

"کم سن! خوبصورت!! پڑھی لکھی!!! شگفتہ صورت!!!!" پرناچندر کانپ اٹھے۔ ہر چند وہ اپنی ماں کی بڑی عزت کرتے تھے۔ لیکن اس وقت انہوں نے آزادی سے کہدیا کہ میں تو ایک ایسی لڑکی چاہتا ہوں جو ان اوصاف کے بالکل برعکس ہو۔ میں جدو بابو کے ہاں شادی نہیں کر سکتا۔ آپ انکی بیوی سے کہدیجئے۔

"تو کیا تمہارا یہ مطلب ہے کہ تم ایک بدصورت اور جاہل لڑکی چاہتے ہو؟" ان کی ماں نے حیرت و استعجاب کے لہجہ میں پوچھا۔

"ہاں" انہوں نے سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا "میں ایک حسین اور خوبصورت لڑکی سے شادی کرنے کے بالکل مخالف ہوں اور مجھے امید ہے کہ آپ بھی میری رائے کے موافق ہونگی۔"

"میں؟ میں کیوں ہونے لگی" ان کی ماں نے حالت اضطراب میں کہا "آخر تمہارا کیا مطلب ہے۔ تم صاف صاف کیوں نہیں کہتے" پرناچندر نے اختصار کے ساتھ اپنی دلیل پیش کی۔ ماں نے خیال کیا اس وقت گفتگو کا ملتوی رکھنا مناسب ہے۔ اور یہ کہتی ہوئی باہر چلی گئیں کہ "اچھا کم از کم تم شادی کے لئے تو راضی ہوگئے۔ جدو بابو کے یہاں نہ سہی، کہیں اور سہی"

(۴)

بابو جدو نندن سہائے کنگ پور ضلع بردوان کے ایک مشہور و معروف وکیل تھے۔ کلکتہ ہائی کورٹ میں پریکٹس کرتے تھے۔ انکی آمدنی تین چار ہزار روپے ماہانہ سے کم نہ تھی۔ خاندانی آدمی تھے۔ موروثی جائداد بھی اچھی تھی۔ ان کے صرف ایک اولاد راجکماری تھی جو ماں باپ کی آنکھوں کا تارا تھی۔ راجکماری کا تیرھواں سال تھا۔ متعدد جگہوں سے شادی کے پیغامات آرہے تھے۔ لیکن جدو بابو کی نظر میں سوائے پرناچندر کے دوسرا نہ جچتا تھا۔ پرناچندر کے والد اور جدو بابو ہم جماعت تھے۔ اور خاندانی مراسم ایک زمانہ دراز سے چلے آتے تھے۔ پرناچندر کے والد کے مرنے کے بعد بھی جدو بابو نے اپنی وضع کو اسی طرح نبھایا اور اپنے اوضاع و اطوار میں کسی قسم کا بھی فرق نہ آنے دیا۔ پرناچندر کو وہ بہت عزیز رکھتے تھے اور ہمیشہ سے انکی پسندیدہ اطوار کے ثناخواں تھے۔ انکی سادگی اور مذہبیات سے دلچسپی انہیں اتنی پسند تھی کہ انکا خیال تھا کہ راجکماری کے لئے اگر کوئی بہترین رفیق زندگی ملسکتا ہے تو وہ پرناچندر ہیں۔

پرناچندر نے جب اپنی ماں سے صاف صاف انکار کر دیا کہ وہ جدو نندن بابو کے ہاں محض اس لئے شادی کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ وہ ایک بدشکل اور بدصورت لڑکی چاہتے ہیں تو انکی ماں کو سخت پریشانی لاحق ہوئی۔ پرناچندر کا کالج کھل گیا تھا۔ وہ تو کلکتہ چلے گئے، لیکن غریب ماں کو بیحد تشویش تھی کہ آخر وہ جدو نندن بابو کی بیوی کو کیا جواب دیں گی۔ چونکہ وہ ان سے یہ کہنا نہیں چاہتی تھیں کہ پرناچندر کچھ ایسی عجیب و غریب خواہش رکھتا ہے۔ اسی طرح آٹھ دن گذر گئے کہ یکایک جدو بابو کی بیوی پھر آموجود ہوئیں۔ تھوڑی دیر تک تو ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ اس کے بعد انہوں نے پھر وہی گفتگو شروع کی اور پوچھا کہ پرناچندر سے انہوں نے اس کا ذکر کیا یا نہیں؟ پرناچندر کی ماں اول تو

کچھ سراسیمہ ہوئیں لیکن آخر انہوں نے مناسب سمجھا کہ واقعہ کی اصل حالت سے انہیں من وعن آگاہ کر دیا جائے۔ تاکہ آیندہ وہ غلط فہمی میں مبتلا نہ رہیں۔ انہوں نے کہا۔ "بہن بات یہ ہے کہ تم پرنا کے مزاج سے تو واقف ہی ہو۔ مذہبی کتابوں کو پڑھتے پڑھتے وہ بالکل سادھو ہو گیا ہے۔ پہلے تو وہ شادی کے لئے راضی ہی نہ تھا۔ لیکن میں نے بہت مجبور کیا تو یہ کہتے ہیں کہ وہ ایسی لڑکی سے شادی کریں گے جو حسین و شکیل ہونیکے بجائے بدصورت و بدشکل ہو۔ انہوں نے اس کے متعلق دلیل بھی پیش کی۔ میں کیا کہوں میری تو دلی خواہش تھی کہ میں اس نئے رشتہ کو جہانتک جلد ممکن ہو انجام دوں۔ لیکن اس صورت میں تم خود سمجھ سکتی ہو میں کیا کر سکتی ہوں۔ میں نے تو حتی الامکان انہیں بہت سمجھایا لیکن وہ کسی صورت سے راضی ہی ہوتے نظر نہیں آتے۔ مجھے سخت افسوس ہے کہ میں اس حالت میں محض بے بس ہوں۔"

جدو بابو کی بیوی کو پرنا چندر کی اس دنیا سے نرالی خواہش کو سنکر حیرت تو ضرور ہوئی لیکن وہ خاموشی کے ساتھ ان کی ماں کی باتوں کو سنتی رہیں۔ پھر بولیں۔ "پرنا کی یہی خواہش ہے تو کیا مضائقہ ہے۔ اس کا سب سے سہل طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنی آنکھ سے لڑکی کو دیکھ لیں۔ اگر انہیں پسند ہو تو شادی کر سکتے ہیں۔ اگر ناپسند ہو تو انہیں کوئی دباؤ دیئے تو نہ جائے گا۔ اس میں جہانتک میں سمجھتی ہوں انہیں عذر نہ ہوگا۔"

"ہاں۔ اس میں تو انہیں کوئی عذر نہ ہونا چاہئے" پرنا چندر کی ماں نے مایوسی کا سانس لیکر کہا۔ "تو پھر آج ہی انہیں ایک خط لکھدو کہ وہ آیندہ اتوار کو کنگ پور براہ راست چلے آئیں اور لڑکی کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھکر کسی آخری نتیجہ پر پہونچیں۔"

(۵)

اتوار کا دن تھا۔ جدو بابو کے یہاں پرنا چندر کا بےچینی کے ساتھ انتظار ہو رہا تھا۔ صبح کی گاڑی سے آنے کی وجہ سے سب کو پریشانی تھی کہ آخر باوجود تار دینے کے پرنا چندر ابھی تک کیوں نہ آے۔ کوئی کہتا، گاڑی چھوٹ گئی ہو گی۔ کوئی کہتا ممکن ہے کچھ سوچ کر ارادہ فسخ کر دیا ہو۔ کوئی کچھ کہتا کوئی کچھ کہتا۔ اسی طرح سارا دن گذر گیا۔ شام ہو گئی۔ لیکن پرنا چندر نہ آئے۔ الغرض سب کو مایوسی ہو گئی تھی کہ یکایک شام کی گاڑی سے پرنا چندر تشریف لے آئے۔ ان کے آنے سے گھر میں پھر چہل پہل ہو گئی نوکرنیاں اشارے کرنے لگیں۔ چھوٹے اور کمسن بچے نئے مہمان کو دیکھنے کی غرض سے باہر نکل آئے۔ جدو بابو کی بیوی کھانے پینے کے انتظام میں مصروف ہو گئیں۔

صبح کے وقت پرنا چندر اندر بلائے گئے۔ ایک وسیع کمرہ میں جہاں آرام و آسایش سے زیادہ عیش کا سامان موجود تھا انہیں بٹھایا گیا۔ یہ تکلفات پرنا چندر کی فطرت کے بالکل خلاف تھے۔ لیکن مجبوری یہ تھی کہ ان کی حیثیت ایک مہمان کی تھی۔ کچھ بول نہ سکتے تھے۔ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہے تھے۔ اور نئی تہذیب اور مغربی تمدن کو کوس رہے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک لڑکی جو سر سے پاؤں تک سونے کے زیور میں لدی ہوئی تھی کمرہ میں داخل ہوئی۔ وہ ایک نہایت بیش قیمت سرخ ریشمی ساری پہنے تھی۔ اس کے ہاتھوں میں ایک چاندی کا طشت تھا جس میں کچھ رنگترے، انگور اور انار کے دانے رکھے ہوئے تھے۔ لڑکی نے اس طشت کو پرنا چندر کے سامنے لاکر رکھدیا اور خود ذرا ہٹ کر علٰحدہ ہو گئی۔ معلوم ہوا کہ یہی وہ لڑکی ہے جو پرنا چندر سے منسوب ہے۔ چونکہ لڑکی گھونگھٹ میں تھی اس لئے پرنا چندر تو نہ دیکھ سکے لیکن ہاتھ پیر کا اگلا حصہ جسے انہوں نے آتے وقت اتفاقیہ دیکھ لیا تھا اس سے انہیں اتنی بات معلوم ہو گئی تھی کہ لڑکی گوری یا سانولی نہیں بلکہ سیاہ فام ہے۔ یہ دیکھکر انہیں یک گونہ تسلی ہوئی۔ لیکن جب تک وہ چہرہ نہ دیکھ لیتے انہیں اطمینان ہونا مشکل تھا نوکرنیاں

جوان معاملات میں بہت زیادہ قیافہ شناس واقع ہوئی ہیں انہوں نے فوراً ان کے چہرہ سے دل کی بات دریافت کر لی اور لڑکی کے چہرہ سے گھونگھٹ کو ہٹا دیا۔ پرناچندر نے اسے دیکھا اور تھوڑی دیر کے لئے بالکل محوِ حیرت ہوگئے۔ لڑکی قیاس سے باہر بدشکل تھی۔ اس کے سر کے بال کنگھی نہ کرنے کی وجہ سے الجھ الجھ کر سادھو کی جٹ کی طرح ہوگئے تھے۔ مدت کے بعد جو سر میں تیل پڑا تھا تو وہ پیوست ہونے کے بجائے پیشانی پر بہہ رہا تھا۔ اسکی آنکھیں بڑی تھیں لیکن اتنی بڑی کہ دیکھنے سے بھیانک معلوم ہوتی تھیں۔ سیاہ چہرہ پر بڑے بڑے چیچک کے داغ اور اسپر بڑی بڑی سرخ آنکھیں، پرناچندر کی آنکھوں نے آجتک ایسا منظر نہ دیکھا تھا۔ ہونٹ اس قدر باریک کہ بند ہونے کی حالت میں ناک کی نوک سے تھوڑی تک بالکل ایک سطح نظر آتی تھی، اور کوئی خط، کوئی نشیب و فراز درمیان میں ایسا نہ معلوم ہوتا تھا جس سے دہن کا وجود متعین کیا جا سکے۔ قد چھوٹا۔ قامت ناموزوں۔ بدن فربہ۔ ہاتھ پاؤں بدنما۔ الغرض وہ ایک ایسی ہستی تھی کہ اسے دیکھتے ہوے قدرت پر ناانصافی کا الزام لگانا ہرگز ناروا نہ ہو سکتا تھا۔ یہ صرف بشریت کا تقاضہ تھا کہ پرناچندر بھی تھوڑی دیر کے لئے حیرت و استعجاب میں آگئے تھے۔ ورنہ انکی خواہش کے مطابق لڑکی میں کل اوصاف بدرجۂ اتم موجود تھے۔ انہوں نے دل میں کہا۔ "بیشک میں اس لڑکی شریک رنج وراحت بنانے کی بنانے کی جرائت کر سکتا ہوں اس میں وہ کل اوصاف موجود ہیں، جسے پرناچندر کی آنکھیں مدت سے ڈھونڈھ رہی تھیں۔ یقیناً میں ایسی ہی لڑکی چاہتا ہوں۔ زبیر، شیونندن، رام سیوک، میرا مذاق اڑاتے تھے لیکن اب انہیں معلوم ہو جائے گا کہ دنیا میں اب بھی ایسے لوگ موجود ہیں، جو کہہ کے نہیں بلکہ کر کے دکھاتے ہیں۔ میں غلط کیوں کہتا۔ اب مجھے اس کیا فائدہ تھا۔ لیکن وہ لوگ کیوں یقین کرتے۔ اب انہیں یقین کرنا پڑیگا۔ مجبوراً ماننا پڑیگا"

تھوڑی دیر کے بعد انہوں نے اپنے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے لڑکی سے پوچھا "تمہارا کیا نام ہے؟"

لڑکی نے اپنی گردن اونچی کی اور کچھ اس طور سے پرناچندر کو گھور کر دیکھا کہ انکی آنکھیں خودبخود نیچی ہوگئیں۔ پھر بولی۔ اسکی آواز اتنی گرجدار تھی کہ سارا کمرہ گونج رہا تھا۔ "کیا کہتے ہیں؟"

"تمہارا کیا نام ہے؟" پرناچندر نے سانس کو روکتے ہوئے دہرایا۔

"نام؟........کس کا نام؟............میرا؟............رجکاری...نا...نا.....نا.....نا...... جگدمبا"

"راجکماری۔ جگدمبا" دو نام۔ پرناچندر سوچنے لگے۔

عورتوں نے بتایا کہ پنڈتوں نے انکا نام جگدمبا رکھا تھا۔ لیکن گھر والے انہیں راجکماری کے نام سے پکارتے ہیں۔

پرناچندر نے دل میں کہا "راجکماری یہ نام نامناسب ہے۔ اگر شادی ہوئی تو میں اسی اصلی نام کو رواج دونگا جو مقدس پنڈتوں نے تجویز کیا ہے۔ یہ مذہبی نام ہے اور اگلے وقتوں میں عورتوں کے ایسے ہی نام ہوتے تھے۔ جگدمبا کیسا پیارا اور کیسا بھلا نام ہے"

لڑکی اندر بلالی گئی۔ پرناچندر سے دریافت کیا گیا کہ وہ اس نسبت کو پسند کرتے ہیں یا نہیں؟ انہیں کیا عذر ہو سکتا تھا۔ انہوں نے اثبات میں جواب دے دیا۔

(۶)

اسی دن شام کو پرناچندر رخصت ہوئے۔ تانگہ تیزی کے ساتھ گذر رہا تھا۔ پرناچندر اپنے خیالات میں مستغرق تھے۔ خیالات کا طوفان تھا

جو اندا چلا آرہا تھا۔ وہ اپنی فتح پر خوش تھے لیکن ساتھ ہی انکے قلب کی کچھ عجیب حالت تھی۔ دل اندر ہی اندر بیٹھا جارہا تھا۔ اور رہ رہ کر جگد مبا کی خوفناک صورت ان کی آنکھوں میں گھوم رہی تھی۔ انہوں نے آج اپنی عادت بلکہ فطرت کے خلاف ان عورتوں کو غور سے دیکھا جو انہیں راستہ میں گذرتی ہوئی ملیں۔ ان کی آنکھیں بے اختیارانہ نامحرم عورتوں کے چہرہ پر پڑ رہی تھیں۔ اور وہ یہ سوچ رہے تھے کہ ان میں کیا کوئی ایک عورت بھی جگد مبا کی شکل و صورت کے مشابہ ہے۔ لیکن باوجود تلاش و کوشش کے بھی انہیں کوئی عورت جگد مبا کی شکل و شباہت کی نظر نہ آئی تھی۔

ماں سے ملکر اور اتنا کہنے کے بعد کہ انہوں نے شادی کے لئے اپنی رضامندی ظاہر کر دی ہے، وہ کلکتہ چلے آئے۔ ہوسٹل میں آتے ہی لڑکے ان کے ارد گرد جمع ہو گئے۔ چونکہ کنگ پور جاتے وقت پرناچندر نے لڑکوں سے واقعہ کی اطلاع دیدی تھی۔ کسی نے پوچھا "کہئے پرنا بابو کیا خبر ہے؟" پرناچندر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "میاں زبیر سے پوچھئے۔ انہیں کسی طرح یقین نہ آتا تھا" ایک نے پوچھا۔ "لڑکی آپ کو پسند ہے؟" کسی نے دریافت کیا "سن کیا ہوگا؟" غرض چاروں طرف سے سیکڑوں سوالات ہونے لگے۔ پرناچندر وقار و تمکین کے ساتھ سب کا جواب دیتے جاتے تھے اور اپنی فتح پر بیحد مسرور نظر آتے تھے۔ اتفاقاً کسی نے پوچھا "اور لڑکی کا نام کیا ہے؟" پرناچندر نے سنجیدگی کے ساتھ کہا "جگد مبا"

یہ نام سنکر ہنسی تو سبھی کو آگئی لیکن شیونندن کھل کھلا کر ہنس پڑا۔ "واقعی پرنا بابو بہت اچھا نام ہے۔ واقعی بہت اچھا ہے۔"

نگندر بابو نے بناوٹی غصہ سے شیونندن کو ڈانٹا "نہایت بیہودہ ہو۔ تمہیں کبھی تمیز نہ آئے گی۔"

شیونندن نے ہنسی کو ضبط کرتے ہوئے کہا:-

"نہیں میں کیوں ہنسنے لگا۔ تم خواہ مخواہ الزام لگاتے ہو" لیکن یہ کہتے کہتے آخر اس سے ہنسی برداشت نہ ہوئی اور بستر پر مارے ہنسی کے لوٹ گیا۔

جوگندر بابو نے کہا "آخر آپ لوگوں کو یہ نام کیوں نیا معلوم ہوتا ہے۔ شریف گھرانوں میں عورتوں کے ایسے ہی نام رکھے جاتے ہیں۔ اس میں اچنبھے کی کونسی بات ہے۔ آپ لوگ تو تھیٹر کے ناموں کو پسند کرتے ہیں۔ یہ کون؟ فیروزی۔ یہ کون؟ بسنت دیوی یہ کون؟ سری متی منجری۔ واہ واہ، کتنے اچھے نام ہیں۔ آپ لوگوں کو شرم نہیں آتی۔"

(۷)

یہ تو خیر اسی وقت کا واقعہ ہے جب پرناچندر کے ہوسٹل میں داخل ہوتے ہی لڑکے ان کے چاروں طرف جمع ہو گئے تھے۔ لڑکوں کے جانے کے بعد جب ذرا تنہائی ہوئی تو پرناچندر پھر اپنے خیالات کی سیر کرنے لگے۔ جگد مبا کی شکل ان کی آنکھوں میں پھرنے لگی اور وہ سوچنے لگے کہ کیا قدرت بھی ایسی مہیب صورت انسانی شکل میں پیدا کر سکتی ہے۔

دوسرے دن ان کی ماں کا خط آیا کہ شادی کی تاریخ اسی مہینہ میں رکھی گئی ہے۔ اور شادی سے دو دن قبل انہیں مکان چلے آنا ہوگا۔

اگرچہ انہوں نے خود ہی اپنی رضامندی شادی کے لئے ظاہر کی تھی اور انہیں معلوم تھا کہ شادی بھی عنقریب ہو گی لیکن اس خط کو دیکھتے ہی ان کا دل بیٹھنے لگا اور کچھ ایسی حالت طاری ہوئی جسکا بیان مشکل ہے

دو چار دن تک تو یہ کالج گئے بھی لیکن رفتہ رفتہ ان کے معمولات میں فرق آنے لگا۔ یہاں تک کہ صبح کا اشنان اور پوجا پاٹ بھی تین تین چار چار دن تک ناغہ ہونے لگا۔ انکی نیند اڑ گئی تھی۔ کھانے پینے کی مطلق خواہش نہ رہتی تھی۔ وہ ہمیشہ بستر پر پڑے رہتے تھے اور خدا معلوم کن کن خیالات کی سیر کرتے تھے۔ وہی ایک خیال، ایک تصور، ان کے دماغ کی آزادی کو معطل کر رہا تھا، اور وہ لاکھ خیالات کو تبدیل کرنا چاہتے تھے لیکن یہ نہ ہوتا تھا۔ جگدمبا کی شکل ہر وقت، ہر لحظہ انکے سامنے تھی اور انہیں کسی طرح بھی اس سے نجات نہ ملتی تھی۔

(۸)

شادی کی مقررہ تاریخ کو صرف پانچ دن باقی رہ گئے تھے۔ رات کا وقت تھا۔ کائنات پر ایک سکون مطلق طاری تھا۔ دنیا بے خبر سوتی تھی لیکن ایک ہستی صرف پرناچند کی تھی جس کی آنکھوں میں نیند نہ تھی۔ وہ بستر پر کروٹیں بدل رہے تھے۔ کبھی اٹھتے کبھی بیٹھتے، کبھی ٹہلتے، کبھی کراہتے لیکن کسی طرح طبیعت کو کل حاصل نہ ہوتا۔ وہ پریشان تھے۔ خود اپنے اوپر حیران تھے "یا پرمیشور میری یہ کیا حالت ہے؟ میرا دل کیوں بیٹھا جاتا ہے؟ میں ایسا کیوں پاگل ہو گیا ہوں؟ یا پرمیشر، یا بھگوان تو میری مدد کر۔ میرے قلب کو اطمینان دے۔ میری طبیعت کو سکون عنایت کر۔ مجھے موت دے اگر تو میری امداد نہیں کر سکتا۔ میری زندگی کو ختم کر دے، اگر تو مجھ سے ناخوش ہے۔ میری جان لیلے اگر میرے گناہ معاف نہیں ہو سکتے"

صبح کاذب کا وقت تھا کہ تھوڑی دیر کے لئے انکی آنکھ لگ گئی۔ اب اسے خیالات کا اثر کہو یا دماغی انتشار کا نتیجہ سمجھو انہوں نے خواب دیکھا کہ ایک وسیع میدان میں تنہا کھڑے ہیں۔ صحرا پر خار ہے اور راستہ نامعلوم۔ کہاں جائیں؟ کدھر جائیں؟ وہ یہ سوچ رہے تھے۔ ناگاہ ایک خوفناک درندہ ان پر حملہ آور ہوا۔ انہوں نے بھاگنا چاہا، لیکن یہ جانور قریب آگیا اور انہوں نے دیکھا کہ اسکا چہرہ بالکل جگدمبا کے مشابہ ہے۔ قریب تھا کہ جانور انہیں اپنی سینگوں سے اٹھا کر پھینکدے کہ انہوں نے ایک چیخ ماری اور ساتھ ہی آنکھ کھل گئی۔ روشنی گل ہو گئی تھی۔ تمام اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ دس منٹ تک تو وہ بے حس و حرکت بستر پر پڑے رہے۔ پھر تکیہ کے نیچے سے دیا سلائی نکال کر لالٹین روشن کی اور دیر تک خواب کی تعبیر کو سوچتے رہے۔

دن رات کے چوبیس گھنٹے تیزی سے گذر رہے تھے۔ یہانتک کہ اب صرف دو دن پرناچند کی روانگی کو باقی رہ گئے۔ دن کا وقت تھا لیکن مسلسل کئی راتوں کی شب بیداری کے باعث فطرت نے انہیں پھر تھوڑی کے لئے دنیا سے بے خبر کر دیا تھا۔ غنودگی کا طاری ہونا تھا کہ انہوں نے پھر ایک خواب دیکھا جو اگلے خواب سے زیادہ دہشت ناک اور ہولناک تھا انہوں نے دیکھا کہ ایک تنگ و تاریک کرہ میں جسکی دیواریں بجائے سفیدی کے خون سے رنگی ہیں، وہ مقید ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد "کالی دیبی" ایک ہاتھ میں چھرا اور دوسرے ہاتھ میں ایک کٹا ہوا سر جس سے تازہ خون ٹپک رہا تھا، انہیں اپنی طرف آتی ہوئی دکھائی دی۔ انہوں نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ "کالی دیبی" کی موجودہ شکل بالکل جگدمبا کے مشابہ ہے اور وہ کٹا ہوا سر جسے وہ اپنے ہاتھوں میں لئے ہے خود انکی صورت سے مماثلت رکھتا ہے۔

وحشت کے عالم میں ان کی آنکھ کھل گئی۔ لیکن دیر تک سینہ بلیوں اچھلتا رہا۔

انہوں نے سوچا۔ ماں کو لکھ دوں۔ شادی منقطع کر دیجئے مجھے پسند نہیں۔ اس خیال کا آنا تھا کہ انہوں نے دوات قلم نکال کر خط لکھنا شروع کیا۔ متعدد مسودے بنائے اور چاک کئے۔ لیکن ایک سطر بھی نہ لکھی گئی۔ یہ بات نامناسب ہے۔ شادی کے کل انتظامات ہو گئے ہونگے ماں خوشی خوشی چیزوں کی فراہمی کر رہی ہونگی۔ انہیں کیا معلوم کہ یہاں پرناچندر پر کیا بیت رہی۔ لیکن بہرحال امتناعی خط لکھنا مناسب نہیں ہے۔ ماتا کو تو صدمہ ہو ہی گا۔ مجھے بھی لوگ کینہ اور مجھے مجبور متصور کریں گے۔ نہیں ایسا نہ ہوگا۔ اور میں ایسا خط نہ لکھونگا۔

خیالات کا طوفان تھا جو امڈا چلا آ رہا تھا۔ جب اس صورت بھی ناامیدی ہوئی تو انہوں نے فیصلہ کیا کہ کلکتہ چھوڑ کر کسی دوسرے شہر میں جانا زیادہ مناسب ہے لوگ سمجھیں گے، گنگاجی اشنان کے لئے گئے ہوں گے۔ پیر پھسل گیا ہوگا ڈوب گئے ہونگے۔ مگر خبر ملیگی، لوگ رو پیٹ کر خاموش ہو جائیں گے۔ مجھے تو کم از کم دماغی تکلیف و روحانی اذیت سے نجات حاصل ہو جائے گی۔ یہ خیال اتنا مستحکم اور یہ تدبیر اتنی مناسب تھی کہ انہوں نے فوراً سامنے کی میز سے ٹائم ٹیبل اٹھایا اور بمبئی جانیکا وقت دیکھنے لگے۔ بمبئی کلکتہ سے بہت دور ہے۔ وہاں پرناچندر کو کون پہچانتا ہے۔ رزق کے مالک بھگوان ہیں۔ اس کا کیا تردد ہے۔ وہاں اطمینان سے زندگی بسر ہوگی۔ رہی ایک ماں کی خیریت سو کسی طرح معلوم کر لی جائے گی۔

دماغ آخری نتیجہ پر پہونچ گیا۔ کمرہ بند کر کے یہ اپنا بستر باندھنے لگے۔ زیادہ چیزوں کا لے جانا مناسب نہیں ہے۔ اس سے تو بات معلوم ہی ہو جائے گی۔ لوگ تلاش میں نکلینگے۔ خدا معلوم کہاں کہاں ڈھونڈیں گے۔ اخبارات میں اشتہارات شائع کریں گے۔ اس سے اور بدنامی و رسوائی ہوگی۔ نہیں نہیں میں تنہا جاؤنگا۔ اکیلا جاؤنگا۔ سب چیزوں کو یہیں چھوڑوں گا۔ اس خیال کا آنا تھا کہ انہوں نے بستر وغیرہ کھول ڈالا۔ ابھی صرف آٹھ بجے ہیں۔ گاڑی دو بجے چھوٹتی ہے۔ بہت وقت ہے۔ گیارہ ساڑھے گیارہ بجے چپ چاپ نکل جاؤں گا کسی کو خبر بھی نہ ہوگی۔

گیارہ بجگئے۔ ان کا دل دھڑکنے لگا۔ کیا میں بمبئی چلا جاؤں؟ زندہ ہو کر مردہ بنجاؤں؟ غریب ماں رو رو کر مرجائے گی۔ اسکا پاپ کس کے سر پڑیگا۔ میرے ہی سر پڑنا؟ میں کتنا پاپی ہوں۔ کیا سوچتا ہوں۔ نہیں نہیں۔ یہ بات نہ ہوگی۔ ہرگز نہ ہوگی۔ میں ایسا نہ کروں گا۔ کبھی نہ کروں گا۔

شادی کے معنے خوشی و شادمانی کے ہیں لیکن پرناچندر کی شادی درحقیقت سو مصیبتوں کی ایک مصیبت تھی۔ انکا دماغ جواب دے رہا تھا۔ ان کے قلب کی حالت بگڑی جاتی تھی۔ اور انہیں اس مصیبت سے نجات دلانے والا کوئی بھی نظر نہ آتا تھا۔

آخرکار پرناچندر کے یہ کل خیالات عارضی ثابت ہوے۔ اور انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ جو کچھ بھی ہو وہ اب تو زبان ہار چکے ہیں اور انہیں اب ہر نتیجہ کو برداشت کرنا ہی ہے۔

(۹)

وقت مقررہ پر پرناچندر اپنے مکان پہونچ گئے۔ بارات نہایت ہی تزک و احتشام کے ساتھ کنگ پور کی طرف روانہ ہوئی۔ اسوقت

پرناچندر کے دل میں نہ خوشی کے جذبات تھے اور نہ غم کے۔ خوف وہراس کا بھی تسلط دل سے اٹھ گیا تھا میدان جنگ میں قاعدہ ہے کہ بزدل سے بزدل سپاہی بھی اپنی موت کو بھول جاتا ہے۔

رسم کے مطابق دولہا دولھن ایک جا بٹھائے گئے اور رونمائی کے لئے ایک بڑا آئینہ لایا گیا۔ پرناچندر کو دولھن کی صورت دکھائی گئی۔ لیکن ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب انہوں نے دیکھا کہ بجائے کرپہ صورت جگدمبا کے ایک کمسن دبلی پتلی اور پری جمال لڑکی ان کے پہلو میں بیٹھی ہے۔

بعد میں خود راجکماری ہی کی زبانی معلوم ہوا کہ وہ لڑکی (یعنی جگدمبا) دراصل محلہ کے ایک تیلی کی تھی جو قصداً اس لئے دکھائی گئی تھی کہ کسی طرح اُن کی یہ عجیب وغریب ذہنیت بدل جائے۔

اب تو یہ حالت ہے کہ پرناچندر کی آنکھیں ہوسٹل کے دروازہ پر لگی رہتی ہیں "ابھی تک ڈاکیہ نہیں آیا۔ خدا معلوم کہاں ہے۔ بہت دیر ہوگئی" ایک دن بھی خط نہیں آتا تو پرناچندر بےچین ہو جاتے ہیں۔

ظہیر الدین حیدر (آروی)

چند باتوں کا خیال رکھئے

(۱) نگار کی تاریخ اشاعت ہر ماہ کی پندرہ تاریخ ہے، لیکن عموماً وہ پہلے ہی ہفتہ میں شائع ہو جاتا ہے اس لئے اگر ۲۰ تاریخ تک پرچہ نہ پہونچے تو فوراً اطلاع دیجئے۔ ورنہ پھر دوسری کاپی مفت نہ مل سکے گی۔

بعض حضرات دوسرے مہینہ کا پرچہ ملنے پر پہلے مہینہ کا پرچہ نہ پہونچنے کی شکایت کرتے ہیں، افسوس ہے کہ ان شکایات کا ہمارے پاس کوئی جواب نہیں

(۲) نمبر خریداری کتابت میں درج کرنا ضروری ہے، بعض حضرات ڈاکخانہ کے نمبر مثلاً ۱۱۰ کو اپنا خریداری نمبر سمجھتے ہیں، نمبر خریداری چٹ کے اوپر داہنی جانب بلو بلیک روشنائی سے درج ہوتا ہے اس کو ایک بار دیکھ کر کہیں نوٹ فرمالیجئے۔

(۳) طلبہ کے لئے زیادہ مناسب یہ ہے کہ وہ اپنے گھر یا کسی اور پتہ سے رسالہ طلب کریں۔ اسکول کے پتہ سے رسالہ طلب کرنا محفوظ طریقہ نہیں ہے۔

(۴) جن طلبہ یا لائبریریوں وغیرہ سے رعایتی چندہ لیا جاتا ہے وہ اگر میعاد خریداری ختم ہونے پر منی آرڈر روانہ کریں گے تو وی۔ پی پوری رقم کا کیا جائے گا۔

(۵) حیدرآباد کے ان خریداروں سے جہاں انگریزی ڈاکخانہ نہیں ہے، یہ استدعا کی جاتی ہے کہ حتی الامکان رسالہ رجسٹرڈ طلب کریں، اور ۱۲؎ سالانہ اس صرف کو بھی برداشت کریں کیوں کہ سوائے اس کے کوئی صورت وہاں رسالہ پہونچنے کی نہیں ہے۔

منیجر "نگار" لکھنؤ

فلسفہ مذہب

مذہب اور عبادات

معمولات مذہب کا تعلق مذہب سے ویسا ہی ہے جیسا انسان کا تعلق اسکی اپنی عادات سے جس طرح عادات کا یہ خاص عمل ہے کہ وہ انسانی جسم و قوا میں ایک قسم کا قرار و سکون ڈالدیں تاکہ ان میں دماغ کے معمول بننے کی صلاحیت پیدا ہو۔ اسی طرح معمولات مذہب کا یہ مدعا ہے کہ مذہب کو آئین معاشرت میں مقیم و متعین کرنے کے لئے اعمال انسانی کا ایک ایسا نظام یا ترتیب مقرر کرے جس سے علاوہ اس کے کہ ایک جماعت میں تشکیل یا تنظیم پیدا ہو سکے وہ انسان کی خواہش اور ارادے کو روحانیت کی طرف منتقل کر دیں۔ بغیر معمولات مذہبی کے انسان کے اندر عملی مذہب کی صورت پیدا کرنا ممکن نہیں اور بقول علمائے نفسیات مذہب کی فطرت کا ایک نظام عمل اور دستور کے ماتحت ہونا لازم ہے اور تاکہ ایک مذہب کے ماننے والوں کے اندر باہمی تعلقات و روابط قائم و وابستہ رہیں یہ ضروری ہے کہ مذہب میں کچھ نہ کچھ ظاہری معمولات ہوں۔ معمولات مذہبی کی ایک صورت مراسم مذہبی ہے اور وہ تاریخی حیثیت سے اس سے زیادہ عمیق نتیجہ پیدا کرتی ہیں جتنا معمولات مذہب۔

تقریباً دنیا کے جتنے مذاہب ہیں وہ عموماً مراسم مذہب کو بجائے خود ایک ایسا زود اثر نسخہ مانتے ہیں جس سے انکی دلی منتیں اور آرزوئیں پوری ہو جاتی ہیں جو رکاوٹیں پیدا ہونے والی ہوں وہ اس سے دور ہو جائیں۔ قبل اس کے کہ ہم ان مراسم کی ابتدا پر غور کریں یہ بہتر ہوگا کہ بعض اعلیٰ مذاہب میں ان خیالات کی تشریح کر دیں جو ان رسمیات کے متعلق ہیں۔ عموماً ان خیالات کے اندر دو مقصد پنہاں ہوتے ہیں۔ اول تو یہ مراسم کا ادا کرنے والا اس بات کو باور کرتا ہے کہ اسکی جو کچھ دلی آرزوئیں اور منتیں ہوں اور جس کی خواستگاری میں اسکو معمولی درخواست پر شبہ ہوتا ہے کہ اس کو ملے یا نہ ملے وہ ان مراسم کے انجام دینے کے بعد زیادہ تیقن سے بدل جائے۔ دوسرا مقصد ان مراسم کی ادائیگی سے یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسا ذریعہ سمجھے جاتے ہیں جس سے عابد و معبود میں یگانگت پیدا ہو سکے۔

اگر مذاہب عالم کے عام معمولات و رسمیات پر غور کیا جائے تو انکی فہرست حسب ذیل اعمال کے اندر آجاتی ہے۔

۱۔ طہارت ۲۔ قربانی چڑھانا ۳۔ بخور جلانا یا ہون کرنا ۴۔ نماز ۵۔ روزہ ۶۔ زکوۃ ۷۔ اجتماع ہم مذہب افراد مختصراً ہم ان اعمال کے کنہ و فیہ پر ایک مبصرانہ نظر ڈالیں گے۔

طہارت طہارت مذہبی کا مقصد یہ ہے کہ بعض عمل ظاہری سے ایسی گندگی اور پلیدی کو دور کیا جائے جو ایک جماعت یا ایک انسان میں یا ایک مقام پر پیدا ہو جاتی ہے اور جسکا لازمی نتیجہ بیماریاں۔ تکالیف اور موت ہیں مذہب کی ارتقائی حالت میں یہ خیال صفائی قلب و باطن اور گناہوں سے محفوظ رہنے کی صورت میں بدلتا گیا اور جو فرق ظاہری و باطنی صفائی کا ان دونوں خیالات

کے دوران ارتقا میں پیدا ہوا دہ ایسے مذاہب مثلاً یہود، نصاریٰ یا ہنود و مجوس یا اہل یونان و روما میں بالکل نہیں پایا جاتا، اور گناہوں کو دھونے کے لئے جو ظاہری اور جسمانی طہارت کی ان مذاہب میں ہدایت ہے اور جس کے لئے اصطباغ، گنگا اشنان وغیرہ کا استعمال ناگزیر سمجھے جاتے ہیں وہ صفائی قلب اور گناہوں کے محو کرنے میں ویسی ہی کارآمد ہیں جیسا توبہ و استغفار اسلام نے یا موجودہ زمانے کے بعض ترقی یافتہ مذہبی سوسائٹیوں نے صفائی قلب کے لئے ظاہری طہارت کو صرف ایک ذریعہ سمجھ کر محض اعمال انسانی کو کافی سمجھا ہے۔ اور ان مذاہب میں طہارت کوئی خاص مقصود و بالذات عبادت بھی نہیں جاتی۔ بلکہ عبادت کے لئے طبیعت کو مطمئن ساکن کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ ناپاکی سے عموماً طبیعت پراگندہ اور مشوش رہتی ہے اور غسل بدن سے اور جگہ کی صفائی اور لطافت سے آدمی مطمئن و بشاش ہو کر خدا کی عبادت زیادہ رجوع قلب کے کرتا ہے۔ مسلمانوں میں اسی واسطے طہارت کی ضرورت اسوقت تک فریضہ مذہبی نہیں سمجھا جاتی جبتک کہ اس کے بعد خدا کی عبادت نہ کی جائے۔

ابتدائی خیالات انسانی نے مذہبی ناپاکی کے خاص ذرائع۔ موت مباشرت۔ بیماریاں ہر قسم کے خون (خصوصاً حیض و نفاس کے خون) کے نکلنے کو جانا ہے اور ایک پاک انسان کا اس قسم کی ناپاکیوں سے ملوث ہوجانے کے بعد اس کے لئے ضروری ہوتا تھا کہ وہ مذہبی طہارت کو عمل میں لائے۔ یہ مذہبی طہارت اکثر تو اس خیال پر مبنی ہوتی تھیں کہ پلیدی ارواح خبیثہ کے مساس سے پیدا ہوتی ہیں اور اس لئے ان ارواح کو نکالنے یا انکے اثر کو دور کرنے کے لئے کچھ خاص قسم کے منتروں کا جپنا بھی ضروری ہوتا تھا جس سے پاک روح خوش ہو کر ناپاک روح کو نکالنے پر اور آمادہ ہوجائے جو ناپاک مقام پر آکر اپنا ڈیرہ جما لیتی ہیں کیونکہ ابتدائی عقول انسانی کا ہر جگہ یہ خیال رہا ہے کہ بیماریاں اور خصوصاً دماغی بیماریاں ناپاک ارواح کے حلول اور اثر سے پیدا ہوتی ہیں انسانی عقل نے جب زیادہ ترقی کی تو ان بیماریوں کو دور کرنے کے لئے اس نے دواؤں کا استعمال بھی شروع کیا۔ مگر ایک زمانہ تک اسکا خیال رہا کہ دوائیاں کوئی اپنی ذاتی خاصیت رکھنے کی وجہ سے اثر نہیں کرتیں بلکہ وہ ایک قسم کے طلسمی جوہر ہیں جو پیٹ میں جاکر اپنے طلسمی قوت کے کرشمے دکھلاتی ہیں۔

طہارت مذہبی کی بعض صورتیں جو مختلف اقوام میں پائی جاتی ہیں ان کی یہاں پر ایک فہرست دینا نامناسب نہوگی گو کہ یہ فہرست حاوی نہیں۔

۱۔ پانی سے عضو جسمانی کو غسل دینا جو پانی پہلے سے بابرکت کر لیا گیا ہو۔ کسی چیز کے ڈالنے سے یا اس پر کچھ دعا پڑھنے سے۔ مثلاً عیسائیوں میں اصطباغ ہندوؤں میں گنگا اشنان۔

۲۔ گائے کے پیشاب سے عضو جسمانی کو دھوتا (ہندوؤں اور پارسیوں کا طریقہ)

۳۔ قربانی کا خون چھڑکنا۔

۴۔ جھولبان کی دھونیاں دینا۔

۵۔ بعض چیزیں مثل گندھک اور سیندور یا زیتوں کے تیل کو سر یا پیشانی پر ملنا۔

۶- آگ سے جلانا۔

۷- بعض منتروں کا جپنا جس کی وجہ سے پلید روح نکل جاوے۔

۸- کسی ایسی چیز پر نگاہ ڈالنا جس سے ناپاکی خود بخود دور ہو جائے (جیسے پارسیوں میں کتوں کو دیکھنا)

۹- مکانوں میں پھونکی ہوئی کیل گاڑنا۔

۱۰- بعض اشیاء مثلاً نمک، شراب، سرکہ وغیرہ کا اندرونی استعمال۔

۱۱- عورتوں کی مقاربت سے پرہیز کرنا۔

۱۲- آگ کے اندر سے گزرنا۔

۱۳- اپنے بدن کو ریت یا مٹی سے ملنا۔ بدن کو داغنا یا اس پر نشان بنانا۔ موٹے جھوٹے کپڑے میں اپنے کو لپیٹنا

۱۴- عقیقہ کرنا۔

۱۵- ختنہ کرانا۔

۱۶- بعض اشیائے ماکولات سے پرہیز کرنا

دنیا کے اکثر موجودہ مذاہب میں بعض یہ صورتیں طہارت مذہبی کی پائی جاتی ہیں مگر غالباً اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس نے طہارت مذہبی کی ضرورت کو ایک حد تک تسلیم کرتے ہوئے اسکو جسمانی صفائی کا ذریعہ جان کر عبادات کا پیش خیمہ بنایا ہو۔ اور اس کا مدعا ایسی طہارت سے سوائے موجودہ طبی اصول صفائی و حفظان صحت کے کچھ نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں میں ختنہ۔ عقیقہ اور حج کے مراسم میں بعض ایسی طہارت مذہبی کا رواج پایا جاتا ہے جس کی ابتدا ان اوہامی خیالات سے ہوئی ہے جو اور مشرک اور وحشی اقوام میں پائے جاتے ہیں۔ مگر یہ سب عرب کے قومی اور قدیم مراسم ہیں انکا ذمہ دار دین اسلام نہیں جو قرآن میں ہے ان مراسم کا مٹانا قرآن کا کوئی مشن نہ تھا۔ اور نہ قرآن کا یہ منشا رہے کہ عربوں کی قومی عادات ورسمیں اسلام کے ساتھ دوسری قومیں بھی اختیار کریں۔ قرآن نے صرف اس عقیدے کو مٹا دیا ہے کہ اس قسم کی جسمانی طہارت سے بجز اس کے کہ عبادات میں ایک قسم کی یکسوئی و اطمینان و انبساط قلب حاصل ہو وہ گناہ دھونے کے لئے کوئی مقصود بالذات شئے نہیں[1]۔ اور اسلام میں ناپاکی کی تعریف وہی ہے جو حضرت مسیحؑ

---

[1] غسل جنابت کی فرضیت اور بغیر اس کے نماز کا قبول نہونا۔ ایک عرصہ تک مجھے بھی اسکی علت سمجھ میں نہ آئی اور میں یہ سمجھا کرتا تھا کہ کہیں قرآن کا یہ منشا تو نہیں کہ آدمی پر یہ ناپاکی اور روح خبیثہ کے مساس سے پیدا ہوتی ہے لیکن ایک روز ایک انگریزی ڈاکٹر کا ایک مقالہ مباشرت پر پڑھ رہا تھا۔ اسکا قول ہے کہ مباشرت کے بعد بدن کو سکون و راحت دینا نہایت ضروری ہے ورنہ خوف ہے کہ انسان ایسا نہ کرنے پر جلد یا بدیر نامرد ہو جائے یا اسکو دماغی اور اعصابی امراض پیدا ہو جائینگے اور اسنے یہ مشورہ دیا ہے کہ یا تو مباشرت کے بعد سو جانا چاہئے یا ٹھنڈے پانی سے غسل کر ڈالنا چاہئے کہ اعصاب میں جو ہیجان پیدا ہوتا ہے۔ وہ رفع ہو جائے۔ اس وقت مجھے غسل جنابت کی مصلحت سمجھ میں آئی۔ (س۔م۔ا۔)

کی طرف سے انجیل میں منقول ہے۔ یعنی ہر وہ چیز جو انسانی اعضاء سے خارج ہوکر نکلے وہ ناپاک ہے اور اس میں بول و براز۔ خون۔ پیپ حیض و نفاس۔ کھنکھار (اور ایک حد تک تھوک اور پان کی پیک) سب شامل ہیں۔ ناپاکی کا یہ معیار بہت ہی اچھا ہے۔ ورنہ طبیعتوں کے اختلاف سے یہ مشکل امر تھا کہ بدی و نیکی کی طرح ناپاکی کا بھی کوئی معیار مقرر کیا جائے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ نفاست طبیعت، صفائی اور حفظان صحت کا تقاضا ہے کہ اس پلیدی کو پہلے کپڑے یا جسم سے دور کیا جائے اور پھر خدا کی عبادت میں مصروف ہوا جائے۔ ورنہ اس کے بغیر عبادت نامقبول۔ اس سے زیادہ قرآنی طہارت کا اور کوئی مدعا نہیں۔

طہارت کے ضمن میں بعض قسم کے ماکولات (خصوصاً جانوروں کے گوشت) بھی شامل ہیں۔ وہ بھی مذہبی نقطۂ نظر سے دیکھے گئے ہیں۔ جہانتک قرآن کا تعلق کھانوں میں ناپاک چیزیں وہی ہیں جو انسانی صحت کو نقصان پہونچانے والی ہیں۔ اور انمیں ہر قسم کی نشہ آور چیزیں۔ خون و مردار ہیں جنکے استعمال سے بدن میں مفسد مادہ پیدا ہونا یا اسکا اندیشہ ہونا اصول طب کے مسلمات میں سے ہے۔ اگرچہ قرآن نے سٹری گلی اور بدبودار چیزوں کو حرام نہیں کیا۔ لیکن مذہبی اصول کا کوئی مطلب و مدعا ہے تو ان چیزوں کا حرام ہونا ویسا ہی ضروری تھا جیسے سور کا گوشت۔ مگر قرآن نے دم اور میتہ اور لحم الخنزیر کو مذہباً حرام قرار دیا ہے۔ مگر سٹرے گلے پھلوں کو جس کو مومنین بوجہ افلاس کے زیادہ کھاکر ہیضہ کا شکار ہوجایا کرتے ہیں اسکو مذہباً حرام قرار نہیں دیا۔ حالانکہ سور کا گوشت عام طور سے ایسا مضر صحت نہیں جیسا یہ چیزیں ہیں۔ عرب کی آب و ہوا میں مضر ہو تو ہو ورنہ اہل یورپ اسکا متواتر استعمال کرتے ہیں اور انکی صحت و اخلاق پر اسکا کوئی مضر اثر نہیں پڑتا۔ اور نہ دیکھا گیا۔ بس معلوم ہوا کہ مذہب کا مدعا نہ صرف حفظان صحت ہے بلکہ اس سے زیادہ کچھ اور ہے۔ یورپ کے لال بوجھکڑوں نے تو یہودیوں کی فہرست حلال و حرام ماکولات کو جو کتاب تیشہ میں ہے (اور جسے بدقسمتی سے ہمارے فقہانے قرآن کے باوجود جیسا اس آیت سے ہویدا ہے۔ اپنا شعار مذہبی بنالیا ہے۔

"قل لا اجد فی ما اوحی الی محرما علی طاعم یطعمه الا ان یکون میتة او دما مسفوحا او لحم خنزیر فانه رجس او فسقا اهل لغیر الله به ۚ فمن اضطر غیر باغ ولا عاد فان ربك غفور رحیم ○
وعلی الذین هادوا حرمنا کل ذی ظفر ۚ ومن البقر والغنم حرمنا علیهم شحومهما الا ما حملت ظهورهما او الحوایا او ما اختلط بعظم ۚ ذلك جزینٰهم ببغیهم وانا لصٰدقون" (سورہ انعام رکوع ۱۷)

مسلمانوں کو اس آیت کو پڑھکر اپنی گریبان میں منہ ڈالنا چاہئے۔ کہ آج ان پر یہ جملہ صادق آتا ہے (وعلی الذین هادوا حرمنا کل ذی ظفر ۚ")

اس کی وجہ وہی قرار دی ہے جو وحشیان جزائر اوقیانوس کی ٹابو (Taboo) کی ہے۔ یعنی اقوام اولین وحشیہ کا یہ خیال تھا کہ ان کے آباؤ اجداد مختلف قسم کے جانوروں سے پیدا ہوئے ہیں اور انکی روح مرنے کے بعد انہیں جانوروں کی روح میں حلول ہوجاتی ہے۔ یہ اوہام جسکو یوروپ کی اصطلاح میں "طوطم" (Totem) کہتے ہیں انکو مجبور کرتا تھا کہ وہ ان جانوروں کے گوشت سے پرہیز کریں جو خود ان کے مورث اعلی رہے ہیں۔ مثلاً بھیڑیوں والا قبیلہ بھیڑ کو نہ کھائے یا کتے والا قبیلہ کتے کے گوشت سے

پرہیز کرے۔ چنانچہ تقریباً انہیں خیالات کی وجہ سے ہندو گوشت سے پرہیز کرتے ہیں کہ کہیں انکے آباؤ اجداد کی روح ان جانوروں میں ہو۔ متوفی مہاراجہ کشمیر نے اپنے زمانے میں یہ حکم جاری کردیا تھا کہ کشمیر کے اندر کوئی مچھلی کا شکار نہ کرے۔ اس لئے کہ ایک پنڈت کی زبانی مہاراجہ کو معلوم ہوا تھا کہ ان کی والدہ کا جنم مچھلی میں ہوا ہے۔ لیکن جہاں تک میں نے غور کیا۔ سوائے سور کے گوشت کے قرآن نے کہیں حلال وحرام گوشت کی فہرست نہیں بنائی ہے۔ قرآن میں درحقیقت بعض کھانے کی چیزوں کی ممانعت محض حفظان صحت کے خیال سے ہے۔ اور اگر یہ مقصد فوت نہ ہو تو ہمارے معدہ پر ہمارے ایمان کا موقوف ہونا یہودیوں اور ہندوؤں کا خیال ہو تو ہو۔ اسلام قرآن کا خیال ہرگز نہیں۔ لفظ میتہ (مردار) میرے خیال میں ان تمام چیزوں پر حاوی ہے جو سڑ گئے ہوں۔ یا بدبودار ہو گئے ہوں یا کیڑے پڑ گئے ہوں۔ اور اگر قرآن نے اس کی تخصیص ممانعت ماکولات میں نہیں کی ہے تو اس کی غالباً یہی وجہ ہے کہ ان سے کراہت کرنا خود انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ ظاہر ہے کہ فطرتاً کوئی انسان بول وبراز کے استعمال پر مائل نہ ہوگا۔ اس لئے اس کی ممانعت ایک فضول امر ہوتا۔ اسی طرح بعض طبیعتیں سانپ۔ بچھو۔ کتے۔ بلی کا گوشت دیکھ کر فطرتاً نفرت کرتی ہیں۔ لیکن اگر بعض بلند طبیعتیں اس کے استعمال کرسکتی ہیں تو فبہا۔ انکی ایمانداری اور اسلام ان کے کھانے پر موقوف نہیں۔ البتہ قرآن نے سور کے گوشت کے ممانعت کی تخصیص کیوں کی۔ یہ ضرور ہے کہ قرآن نے ماکولات ممنوعات کے لئے یہ شرط بھی کردی ہے کہ اگر اس کے بغیر کھائے کوئی چارہ نہ ہو تو کھایا جاسکتا ہے۔ مگر پھر حرام قطعی کرنے کے کیا معنے۔ گویا اگر مسلمان اسکو بلا عذر کھائے تو وہ احکام قرآنی سے صریحی انحراف کر رہا ہے اور نجات کو خطرہ میں ڈال رہا ہے۔

حالانکہ ہم قرآن کے احکام اخلاق اور شرعی کے اوامر و مناہی میں کچھ نہ کچھ فوائد اور علت ضرور پاتے ہیں۔ میرا اپنا خیال ہے (ممکن ہے کہ غلط ہو) کہ سامی اقوام[1] سوروں کی ریوڑوں کو پلیدی اور ناپاکی کا منبع سمجھتے تھے۔ چنانچہ انجیل میں ایک واقعہ کا ذکر ہے کہ جب مسیح نے پلید ارواح کو نکالا تو انہوں نے استدعا کی کہ انکو سوروں کے ریوڑوں میں رہنے کے لئے بھیجدیا جائے۔ اور ایسا دیکھا بھی گیا ہے کہ جہاں سور کے ریوڑ رکھے جاتے ہیں وہ جگہ نہایت غلیظ و گندی ہوتی ہے۔ گویا سور ہی ایک ایسا جانور ہے، جو بول وبراز اور گندگی میں پرورش پاتا ہے۔ اور اگر عرب لوگ آبادیوں میں پالنے کے لئے ان کو رکھتے تو یقیناً ایسے زمانہ میں جب کہ عرب کو حفظان صحت کی تدابیر پوری طرح معلوم نہ تھیں۔ وہ بہت قسم کی وبا اور بیماری اور ہلاکت کا سبب ہوتیں۔ پس اگر انکے کھانے کی اجازت نہ دی جائے گی تو کوئی انکو پلنے پر بھی آمادہ نہ ہوگا اور اس طرح ایک لازمی آفت سے شہر و دیہات کو بچانا مقصود تھا۔ اور اگر یہ وجہ نہیں ہے تو غالباً اقوام سامیہ جس میں۔ یہود۔ عرب و اہل بابل۔ حبش و مصر شامل تھے، ان کا یہ قدیم مسلک تھا جس کی کوئی خاص وجہ نہ تھی یاد ہی ہو جیسا ہندوؤں میں گائے کے گوشت کی ہے۔ اور قرآن نے عربوں کی اس قومی عادت کی تائید کردی اس لئے کہ اسلام کو یہود کے آگے بھی پیش کرنا تھا۔ اور اگر عربوں کو ایسی باتوں سے منع نہ کردیا جاتا۔

---

[1] دیکھو اسلامک ریویو ماہ اکتوبر ۱۹۲۶ء ووکنگ مضمون ڈاکٹر محمد جعفر۔ جس میں فاضل ڈاکٹر نے میرے خیال کی تائید کی ہے۔

توہیود بعض قومی کے وجہ سے، ان پر ناپاک ہولے کا طعنہ بھی دیتے اور اسلام کی طرف مشکل سے مائل ہوتے۔ ایسی صورت میں فمن اضطر غیر باغ ولا عاد کے معنی کو اور وسیع کرنا پڑے گا اور سامی قوموں کے علاوہ دوسری اقوام میں اس کے کھانے اور نہ کھانے پر چنداں زور نہ دیا جائیگا لیکن اب تو ہماری ذہنیت کا یہ حال ہے کہ جب میں عراق میں ترجمان جیوش تھا اور میرا کھانا سارجنٹ کے مس (Mess) میں ہوتا تھا میں نے کبھی سور کا گوشت چھوا تک نہیں البتہ میز پر ضرور آتا تھا۔ اور انگریز اس کو کھاتے تھے، مگر اتنے قصور پہ تمام پنجابی مسلمان سپاہیوں نے میرا بائیکاٹ کر دیا تھا۔ حالانکہ پنجابی اصحاب میں زیادہ تر وہ لوگ تھے جو خوب شرابیں پیتے تھے۔ اور بعض اوقات ایسے نالائق حرکات کرتے تھے، جو ذکر نہیں کئے جا سکتے۔ اس سلسلہ میں ایک بات ذبیحہ کے متعلق رہی جاتی ہے اور جس کے متعلق عام طور سے مسلمانوں کا خیال ہے کہ جانور جو ایک خاص طریقہ سے ذبح نہ کئے جائیں، اور ذبح کرتے وقت بسم اللہ اللہ اکبر نہ پڑھا جائے تو ایسے جانور کا پیٹ میں اترنا اور ایمان کا سلب ہونا لازم و ملزوم ہے۔ مگر یہ ساری غلط فہمی اس بات سے پیدا ہوئی کہ قرآن شریف میں مسلمانوں کو بتوں کی قربانی کے گوشت کی ممانعت ہے یعنی ایسے تمام جانوروں کے گوشت سے جو خدا کے نام پر ذبح نہ کئے جائیں، اس کے یہ معنی نہیں کہ مسلمان نے جہاں بغیر ذبح کئے ہوئے کو کھایا اور اسکا ایمان بگڑا، ورنہ ظاہر ہے کہ اہل کتاب کا کھانا ہر طرح حلال ہے اور اہل کتاب کے ذبح کا طریقہ ہمارا سا نہیں اور نہ وہ خدا کا نام لیتے ہیں اور اس لئے بھی کہ اگر کتا شکار کو پکڑ کر مار ڈالے تو اس کے کھانے میں بھی کوئی حرج نہیں۔ مگر اس قول پر ایک اعتراض یہ ہو سکتا ہے کہ قرآن نے جب یہ کہا کہ تم مسلمانوں کو اہل کتاب کا کھانا حلال ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ جو مسلمان یا اہل کتاب نہ ہوں ان کا کھانا مسلمانوں کے لئے مباح نہیں اور اسمیں ہندوؤں کے چھوت چھات کی بو آتی ہے۔ اور ہمارا قول یہ ہے کہ احکام قرآنی کا مقصد محض خود اپنے اور اپنے تمام ابنائے جنس کی حفاظت نفس ہے۔ اور یہ ایک لایعنی سی بات ہے کہ ہم دوزخ میں اس لئے ڈالے جائیں کہ ہم ایک خاص طریقہ سے کھانا نہ کھائیں۔ یا ایک شخص کے ہاتھ سے یا اس گھر سے جو مسلمان یا اہل کتاب نہو، میرا اپنا قیاس یہ ہے (اور خدا کیلئے میرے قیاس کو قیاس ہی سمجھو اور اگر اس سے بہتر باتیں تم جانتے ہو اور اسکی تائید میں قرآن ہو تو میرے قیاس کو نہ مانو) کہ طعام سے مراد ہر قسم کی مواصلت و سوسائٹی ہے۔ مشرکین کے ساتھ اس زمانہ میں جب کہ انکے اور مسلمانوں کے درمیان حالت جنگ قایم تھی۔ اسکی ممانعت ہو گی۔ مگر اہل کتاب کے ساتھ حالت جنگ قایم نہ رہی ہوگی، اس لئے ان کے ساتھ مواکلت و مشاربت پھر بحال خود کر دی گئی۔ اور مشرکین سے حالت جنگ ختم ہونے کے بعد کسی امر کی ضرورت اس لئے باقی نہ رہی کہ کوئی مشرک باقی نہ رہگیا تھا۔ خلاصہ یہ ہے کہ ذبیحہ مثل دوسرے احکام معاشرت کے مذہب سے علیحدہ شے ہے۔ اور اگر ایسا نہیں ہے تو ہمکو در حقیقت ہندوؤں کی ظاہر پرستی اور چھوت چھات پر اعتراض کا کوئی حق ہو ہی نہیں سکتا۔

قربانی

قربانی کا مقصد جیسا میں نے اس کتاب کے پہلے باب میں دکھلایا ہے اور جیسا ڈاکٹر ٹائلر ([illegible]) کا خیال ہے سوائے اس کے کچھ نہ تھا کہ اقوام وحشیہ نے موت و بیماریوں کا سبب ایک قسم کا خونخوار دیوتا خیال کیا تھا اور ان کی پرستش کے ساتھ ان کو خوش کرنے یا ان کی بھوک کو رفع کرنے کیلئے اپنی جان کا بدل جانوروں کے ذبح کرنے اور ان کی نذر گزراننے کا (تاکہ انکی خونخواریت بھوک سے مجبور ہو کر خود انکی جان نہ لے) عام طریقہ اختیار کیا۔ یہ تو اس قربانی کا اصل

منشاء تھا جس کا مترادف انگریزی میں سیکریفائس (Sacrifice) اور ہندوؤں میں بلیدان اور پرشاد ہے، مگر خود قربانی کا لفظ اقوام سامیہ کی ایک ایسی اصطلاح ہے جس کے معنی سے یہ خیال پیدا نہیں ہوتا، قربانی کے معنے نزدیکی کے ہیں۔ اور یہی معنے عربی زبان میں بھی ہیں۔ چنانچہ قرآن میں آیا ہے "واتل علیھم نبأ ابنی آدم اذ قربا قربانا فتقبل من احدھما ولم یتقبل من الآخر" (المائدہ رکوع ۵) اسی واسطے رابرٹسن اسمتھ (Robertson Smith) مصنف "مذاہب سامیہ" کا خیال ہے کہ قربانی کی رسم کا مدعا اور اصل یہ تھا کہ دیوتاؤں اور پجاریوں کے درمیان ایک سفرہ ضیافت بچھایا جائے اور اس ذریعہ سے دونوں میں ایک قسم کی قربت و موانست یا یگانگت پیدا کی جائے۔ ڈاکٹر فریزر (Dr. Frazer) کا خیال ہے کہ دیوتاؤں کی زندگی کو تازہ کرنے اور ان کو بوڑھا نہ ہونے دینے کے لئے ہر سال جانوروں کو مار کر اس کے خون و روح سے انکی زندگی کو تازگی و تقویت پہونچائی جاتی ہے۔ جیسا پرانے زمانے کے بعض سلاطین مشرقیہ اپنی زندگی کے بڑھانے کے لئے دوسرے انسانوں کی جان لینے میں دریغ نہ کرتے تھے۔ ماریلیر (Marillier) فرانسیسی کا قول ہے کہ قربانی کا خیال سحر کے خیال پر مبنی ہے کہ ابتدائی قوموں کا خیال تھا کہ خون کے گرنے سے سحر کا اثر جو انسان اپنے اوپر وہم کرتا ہے جاتا رہے۔

جن لوگوں نے یہود و ہنود و پارسیوں کے کتب مذہبی کا مطالعہ کیا ہے وہ غالباً اس بات کو حیرت سے دیکھیں گے کہ یہ مذاہب جو الہامی ہونے کے مدعی ہیں رسم قربانی میں عام وحشیوں کے ہم نوا ہیں۔ گویا قربانی کا ان مذاہب میں ایک رسم مذہبی اور عبادت قرار پانا صرف اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ وہ مذاہب بھی اپنے اندر بہت سے ایام وحشت و جہالت کی یادگار رکھتے ہیں۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ اگر ہم کسی مذہب کے الہامی اور غیر الہامی ہونے کا کوئی معیار مقرر کر سکتے ہیں تو ہمارے لئے اسقدر کافی ہے کہ یہ جانچ کر لیں کہ اس مذہب میں قربانی کرنا ایک مذہبی فریضہ ہے یا نہیں۔ اور اگر اس کے مذہب میں قربانی مناسک مذہب میں سے قرار پائی ہے تو ہم یقیناً یہی نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ وہ مذہب خدا شناسی سے قاصر ہے اور اس نے انسانی ہراس موت کی تشفی کے لئے قربانی کا طریقہ ایجاد کیا، کیونکہ ظاہر ہے کہ یہ فعل اسی اسی خیال پر مبنی ہوگا کہ دیوتاؤں کی خونخواری کے لئے تازہ خون بہم پہونچایا جائے ورنہ اگر ان کو بھوک نے ستایا تو وہ ہماری جان کو لیکر رہیں گے۔ اور یہ اعتقاد ہرگز الہامی اعتقاد نہیں ہو سکتا۔

عرب میں اسلام کی تجدید سے قبل تمام دنیا کا یہی مسلک رہا ہے۔ اور اگر قربانی کا طریقہ الہامی مذاہب میں پایا جاتا ہے تو اسکی صرف دو ہی توجیہ ہو سکتی ہیں، یا تو یہ طریقہ بعد کو اوہامی خیالات کے فروغ سے الحاق ہو گیا یا پھر قربانی کا مقصد یہ تھا کہ انسان اس خالق و رزاق کے سامنے چند ہدایا گزران کر اپنی عبدیت اور ممنونیت کا اظہار کرے۔ غالباً اسی وجہ سے مسلمانوں میں قربانی کا گوشت فقراء و مساکین میں تقسیم کر دیا جاتا ہے جو ایک قسم کی خیرات ہے اور یہودیوں کی طرح وہ قربان گاہ پہ جلا کر چرا ہند پیدا نہیں کرتے شاید اسی قسم کی نذر و ہدیہ کا حوالہ قرآن کی اس آیت میں ہے جو میں نے ابھی نقل کی ہے۔

لیکن اس تاویل میں دقت یہ آپڑتی ہے کہ جانور کا ذبح کیا جانا کیوں شرط قربانی ہے حالانکہ اگر بلا ضرورت جانور کو ذبح کیا جائے تو یہ ایک قسم کی سنگدلی اور شقاوت ہے اور اس سے خونخوار دیوتا خوش ہو تو ہو۔ خدائے اسلام کو کوئی دلی حظ یا مسرت نہیں حاصل ہو سکتی خود

قرآن شریف میں ہے "لن ینال اللہ لحومہا ولا دماؤہا ولکن ینالہ التقویٰ" اور یہ کہ کسی جانور کو بلا وجہ ایک وہم پر ذبح کر دیا جائے ایک عبث و برا فعل ہے وہ اس مشہور حدیث سے ثابت ہے۔ کہ آنحضرت کے زمانے میں کسی عورت کے پاس ایک اونٹ تھا، اس اونٹ نے اسکو ایک خطرہ سے اور جنگ میں گھر جانے کے وقت بچا لیا تھا اس شکر گذاری میں اس عورت نے چاہا کہ وہ اس اونٹ کو کعبہ میں قربانی دے۔ آنحضرت نے جب اس کے اس ارادہ کو سنا تو فرمایا۔ سبحان اللہ اونٹ کی خدمت کی جزا کیا اچھی دی گئی اور آپ نے فوراً اس اونٹ کو اس سے لے لیا۔ اسلئے اگر یہودیوں کا مذہب الہامی سمجھا جائے تو اسکی تاویل یہی ہو سکتی ہے کہ یہودیوں نے امتداد زمانہ اور مشرکین کنعاں کی صحبت بد سے یہ رسم اختیار کر لی۔ اور یہ ثابت ہے کہ یہودیوں نے حضرت موسیٰ اور انبیا کے زمانہ میں بت پرستی اختیار کر لی تھی کم سے کم انکا بعل دیوتا کو پوجنا ایک تاریخی واقعہ ہے۔ باقی رہا اسلام۔ اس کے متعلق میں آزادی سے محاکمہ کر سکتا ہوں۔ سب سے پہلے ہمکو یہ دیکھنا ہے کہ عید الضحےٰ یا ایام حج میں خصوصاً منا کے روز جو جانور ذبح کئے جاتے ہیں وہ کس اعتقاد پر مبنی ہیں۔ ہمارے علما تو جھٹ یہ فرما دیں گے کہ جناب یہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ کی سنت دینیہ ہے۔ جب وہ حضرت اسمٰعیلؑ کی قربانی دینے چلے تھے تو خدا نے انکے ایمان کی آزمائش میں انکو پورا پاکر بہشت سے ایک موٹا تازہ دنبہ بھجوا دیا، اور حضرت ابراہیم نے اس کو پکڑ کر اپنے بیٹے کی جگہ اسکی قربانی کر دی۔ حضرت ابراہیم کا اپنے بیٹے کی قربانی کرنا یا اسکی جگہ کسی دنبہ کی قربانی کرنا، کوئی خلاف واقعہ بات نہیں۔ حضرت ابراہیم خود عرصے تک اور انکے آبا و اجداد بابل کے قدیم مذہب کے پابند تھے جس میں قربانی کی رسم تھی، حضرت ابراہیم نے جب اپنے آبائی مذہب اور وطن کو ترک کیا اور نبوت و رسالت کو پہونچے تو شیطان نے انکو پرانی مذہبی رسم یاد دلاکر دھوکا دیا کہ یہ رسم تمکو اب بھی کرنا چاہیئے۔ وہ اس دھوکے میں تھے کہ خدا کے فرشتے نے انکو وقت پر آگاہ کر دیا۔ چونکہ حضرت ابراہیم ایک بہت بڑی غلطی سے بچا لیے گئے تھے۔ ممکن ہے انہوں نے اسکی یادگار میں ایک دنبہ اسوقت ذبح کر دیا ہو۔ یا ہر سال ایک دنبہ ذبح کر دیا کرتے تھے۔ جو اس یاد کو تازہ کرنے کے ساتھ انکی خوراک کے کام آتا تھا۔ اور یہ یادگار مکہ میں قایم رہ گئی شاید و فدیناہ بذبحٍ عظیم میں اسکا حوالہ ہو۔ اب رہا ارکان حج میں سے قربانی کا ضروری ہونا تو ارکان واجبات حج کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

ارکان:۔ احرام[1]۔ طواف[2]۔ سعی[3]۔ وقوف عرفات[4]

واجبات:۔ رمی جمار[1]۔ قیام مزدلفہ[2]۔ قیام منا[3]۔ طواف وداع[4]

فقہا نے واجبات کے ترک پر قربانی کا کرنے کا حکم دیا ہے۔ مگر یہ واجبات بذات خود اختیاری ہیں اور اس کے کفارہ میں قربانی کا حکم فقہا کا محض قیاس ہے۔

مناہیات حج۔ مردوں کو سلا ہوا کپڑا[1] پہننا۔ عورتوں کو منہ[2] ڈھانکنا۔ خوشبوؤں[3] کا استعمال کرنا۔ عورتوں سے ہم بستر ہونا یا مقدمات جماع میں کوئی بات کرنا۔ شکار کرنا۔ انمیں سے کسی کام کے خلاف کرنے پر فقہا نے قربانی کا حکم دیا ہے۔ مگر یہ بھی محض انکا قیاس ہے۔ قرآن تو علیحدہ رہا حدیث بھی اس سے خاموش ہے۔ فقہا نے ان صورتوں کے علاوہ اور بہت سی صورتوں میں محرم کو قربانی کی ہدایت کی ہے مگر ہمکو کوئی ایسی مرفوع اور متصل الاسناد حدیث نہیں ملی جس سے ثابت ہو کہ فقہا کی تجویز کی ہوئی صورتوں میں قربانی کرنا ضروری ہے۔ ممکن ہے کہ فقہا نے صور مذکورہ کو قتل صید وغیرہ پر قیاس کرکے ان میں بھی فدیہ تجویز کیا ہو ورنہ کوئی نص صریح و صحیح تو ان پر قایم ہی نہیں۔

قرآن مجید میں صرف چار صورتوں میں فدیہ دینے کا حکم ہے۔ تین صورتیں تو آیۂ وأتموا الحج والعمرة لله میں مذکور ہیں جو عنوان حج کی پہلی آیت ہے اور ایک ساتویں پارے کے دوسرے رکوع میں یعنی قتل صید میں۔ واجبات کی تاکید اگر آنحضرتؐ نے کی ہے اور مناہیات سے منع کرنے کا اگر کہیں حکم ہے تو قربانی کے ذریعہ سے فدیہ دینے کا حکم کم سے کم میری نظر سے نہیں گذرا بلکہ اگر اس حدیث[1] کو صحیح مانا جائے تو اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص حالت احرام میں خوشبو سے لتھڑا ہوا کپڑا پہن لے تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ کپڑے کو تین دفعہ دھو ڈالے، اور اسی پر اور صور ممنوعہ کو قیاس کر لینا چاہیئے۔ الغرض اس حدیث سے بھی کہیں اس بات کا پتہ نہیں چلتا کہ آنحضرت نے ان صورتوں میں فدیہ کا حکم فرمایا ہو، اور جب یہ ہے تو ہمارے انہیں خون پر اکتفا کر لینا چاہیئے جو قرآن و حدیث میں آئے ہیں۔ پھر جو لوگ یوم النحر میں کثرت سے قربانیاں کرتے ہیں یہاں تک کہ ایک شخص سو سو دو دو سو جانور ذبح کر ڈالتا ہے وہ محض بے سود اور نہ محض بے سود بلکہ اسراف میں داخل ہے۔ سنا جاتا ہے کہ یوم النحر کو منا میں اسقدر قربانیاں ہوتی ہیں کہ گوشت کثرت کی وجہ سے کھتوں میں دبا دیا جاتا ہے اور اسکا کوئی کھانے والا نہیں ملتا۔ خیریت یہ ہے کہ عرب کی آب و ہوا خشک ہے، ورنہ مکہ اور اسکے جوار میں ایسی ہولناک بیماریاں پیدا ہو جاتیں کہ مذہب اسلام کی قوام پر ایک لعنت ظاہر کرنے کے لئے دشمنان دین کو اچھا موقع ہاتھ لگ جاتا۔

قرآن میں ایک جگہ ہے فصل لربك وانحر اور النحر کے معنے قربانی کرنے کے عام طور سے سمجھے جاتے ہیں مگر میرا خیال ہے کہ یہاں پر النحر کے معنی وہ نہیں ہیں جو عام طور سے سمجھے جاتے ہیں۔ اور نہ سیاق عبارت سے یہاں یہ اسکی مراد لی جا سکتی ہے۔ النحر کے عربی کئی معنے ہوتے ہیں اور ایک معنی دل کی توجہ کے ہیں جو یہاں پر زیادہ موزوں معلوم دیتا ہے۔

غرضکہ جہاں تک میں نے غور کیا ایام حج کو جانور ذبح کئے جانے کا کوئی مذہبی فریضہ اسلام میں معلوم نہیں ہوتا۔ البتہ اس کے عربی قومی رسم ہونے میں کوئی کلام نہیں اور اگر یہ عبادت اسلام عرب میں باقی رکھی گئی ہے یا رکھی جائے تو اسکا مقصد جاہلیت میں خواہ کچھ ہو اب صرف اسی قدر ہو سکتا ہے کہ ان ایام عید و جشن و اجتماع میں ضیافتیں و دعوتیں ہوں۔ اور لوگ سیر ہو کر کھائیں اور اس کے لئے جانور ذبح کئے جائیں۔ خصوصاً ایسے زمانہ میں جبکہ ایام حج میں دس روز تک ہر قسم کے شکار کی ممانعت کر دی جاتی ہے۔ لیکن یہ کسقدر شرم اور افسوس کی بات ہے کہ باوجودیکہ قرآن ہی دنیا کی ایک ایسی مذہبی کتاب ہے جس نے سب سے پہلے اس تصریح کو ضروری سمجھا ہے کہ جانور کا خون و گوشت خدا کو نہیں پہونچتا جیسا کفار جاہلیہ و وحشیہ کا خیال تھا۔ اب تو مسلمان قربانی کو تقریباً اسی اعتقاد پر کرتے ہیں جو ایک ہندو کالی مائی پر بکرے کے بھینٹ سے کرتا ہے۔ اور ہر مسلمان جو قربانی کرتا ہے اسکو یہ بتایا جاتا ہے کہ قیامت کے روز وہ تمام جانور اسکی سواریوں کے کام آویں گے اور فقہا نے تو یہودیوں کی طرح نقل کی ہے کہ اگر جانور عیب دار ہو یا اس کے کان کٹے ہوں یا کوئی سا پنج عیب شرعی

---

[1] عن یعلی بن امیہ قال کنا عند النبی صلی اللہ علیہ وسلم بالعمرۃ اذ جاءہ رجل اعرابی علیہ جبۃ وھو متضمخ بالخلوق۔ فقال یا رسول اللہ انی احرمت بالعمرۃ وھذا علیّ۔ فقال۔ اما الطیب الذی بک فاغسلہ ثلث مرات واما الجبۃ فانزعھا ثم اصنع عمرتک کما تصنع فی حجک (صحیحین)

اس میں ہو تو اللہ میاں کو ایسا بکرا پسند نہ آئے گا اور اس کی قربانی بے سود ہوگی (ونعوذ باللہ من تلبیس الابالیس والھفوات العوام)
اگر جانوروں کو بلا ضرورت ذبح کرنے کا یہی مقصد ہے، کہ اس سے خدا خوش ہوتا ہے تو ایسے مذہب کو اور ایسے خدا کو دور سے سلام ہے۔
خدا کی شان نظر آتی ہے کہ جن مذاہب میں ان خیالات کی بنا پر قربانی ایک فریضۂ مذہبی ہے مثلاً یہود، ہنود و مجوس انہوں نے تو آکر اس دور تمدن میں اس مذموم حرکت کو ترک کر دیا ہے اور مسلمان جن کے قرآن نے اس رسم کے خلاف سب سے پہلی آواز اٹھائی تھی وہ جنون و جہالت مذہبی اور فقہاء یہود پرست کے احکام سے متاثر ہو کر اس کو ایک فریضہ جانکر اسلام کو بدنام کر رہے ہیں اور مذہب اسلام کو ایک خونی مذہب دکھلا رہے ہیں۔ اور ہندوستان میں تو وہ بکروں اور گایوں کے ساتھ اکثر اوقات اپنی ہمسایہ قوموں کے ہاتھوں سے خود بھی قربان ہو گئے ہیں۔ اور یہ کتنی بڑی لطف کی بات ہے کہ مسلمان کا گھر سال بھر میں ایک بار بوچڑ خانہ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ یہ ہی خیریت ہے کہ مسلمان ابھی انہیں ممالک میں پھیلے ہیں جہاں تمدن ادنیٰ درجہ پر ہے۔ اور جہاں کی میونسپلٹیوں کو اپنے اپنے احکام حفظان صحت کو پورے رواج دینے کا خیال نہیں آیا۔ لیکن اکثر اوقات میں سوچتا ہوں کہ اگر ہمارے مولوی یورپ یا امریکہ کے کسی ملک میں بھیجدیئے جائیں تو بیچارے اس فریضۂ مذہبی کو اپنے گھر کے اندر کیسے بجا لائیں گے۔ مگر چونکہ اب تقریباً اسلام ایک قسم کا قومی مذہب ہو گیا ہے جو صرف گرم ملکوں کے غیر ترقی یافتہ قوموں کے اندر محدود ہے۔ یورپ و امریکہ کا اندیشہ لایعنی سی بات ہے میں نے یہ جملہ اس لئے کہدیا تھا کہ میرے سامنے قرآن کا اسلام وہ ہی جو تمام دنیا میں پھیلایا جا سکتا ہے۔ اور جو ہمارے موجودہ اسلام سے بیّن فرق رکھتا ہے۔

بخور جلانا یا ہون کرنا

عبادت مذہبی کی دوسری صورت یعنی بخور و خوشبوئیں جلانا گویا قربانی کی ایک ارتقائی صورت ہے۔ پہلی صورت کا مقصد یہ تھا کہ دیوتاؤں کی بھوک کی غضبناکی انکو خوراک دیکر دور کی جائے اور بخور جلانے کا یہ مقصد یہ ہے کہ دیوتاؤں کا غصہ و قہر خوشبوؤں کے پھیلانے سے ٹھنڈا کیا جائے۔ بائبل کے عہد نامۂ قدیم کے صفحات اس بات کا پورا ثبوت دے رہے ہیں کہ ابتدائی عقول انسانی کیونکر رفتہ رفتہ جانوروں کی قربانی سے ترقی کرتے کرتے بخور جلانے والی عبادت پر پہونچے ہیں۔ کیونکہ بخور جلانے کا ذکر شریعت موسوی کے قبل کہیں نہیں ہے لیکن مصر کے آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ مصریوں میں یہ معمولات بہت زمانہ دراز سے گئے ہیں۔ مصر میں جس قدر پرانے معابد کے آثار باقی رہ گئے ہیں ان کے نقش و نگار سے ظاہر ہوتا ہے کہ ملوک و فراعنۂ مصر اپنے دیوتاؤں کے آگے بخور جلانے والے برتن لئے ہوئے کھڑے ہیں۔ ان کے ایک ہاتھ میں بخور جلانے والا برتن ہے اور دوسرے ہاتھ سے وہ بخور لے کر اس میں جلانے کے لئے ڈال رہے ہیں۔ بعض اوقات ایک ہاتھ میں بخور جلانے کا برتن ہوتا ہے، اور دوسرے ہاتھ میں کوئی سرکہ یا کسی قسم کی شراب یا شربت وغیرہ دیوتاؤں کے نذر کرنے کے لئے زمین پر ڈال رہے ہیں۔ سب سے صاف نقش و نگار اس قسم کی عبادات کا اہرام مصری جیزہ میں ہے جس میں فرعون تماسس (   ) آفتاب کے دیوتا "را" (Ra) کے سامنے ایک ہاتھ سے شراب کی نذر دے رہا ہے اور دوسرے ہاتھ سے بخور جلانے کا برتن لئے دھونیاں دے رہا ہے مصریوں (بلکہ عموماً تمام غیر آریہ

قوموں) کا عام دستور یہ تھا کہ وہ اپنے دیوتاؤں کی تین وقت پرستش کیا کرتے تھے۔ صبح عصر و شام۔ صبح کے وقت وہ بخور کے لئے لبان استعمال کیا کرتے تھے۔ عصر کے وقت مُر اور شام کے وقت ایک قسم کا مخلوط مسالہ۔ پلوتارک (Plutarch) نے لکھا ہے کہ بخورات میں علاوہ اس تاثیر کے جو دیوتاؤں کی غضبناکی کے فرو کرنے کا کام دیتا تھا۔ اس سے ایک دوسرا فائدہ یہ بھی ہوتا تھا کہ اسکی خوشبوؤں سے پجاریوں پر ایک خاص قسم کا اعصابی اثر پڑتا تھا۔

یہودیوں کی کتاب مقدس میں بخورات کے لئے لفظ کتورہ استعمال کیا گیا ہے جو فعل "کتر" سے بنا ہے اور جس کے معنی یہ ہیں کہ ایسی خوشبوئیں جو تسلی دینے والی ہوں اور اس میں قربانی کے گوشت کی چربی اور اہند سے لیکر ہر قسم کی ادویات جس کے جلانے سے خوشبودار دھواں پیدا ہو سب شامل تھے۔ ارمیاہ اور یشعیاہ کے نوشتوں سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے زمانے میں بخورات کے لئے لوبان جلانے کا عام دستور تھا، قربان گاہ پر یہودیوں کے اخبار صبح کے وقت جبکہ عبادت گاہ کے چراغ میں بتی الکسائی جاتی تھی اور ہر شام کے وقت جبکہ عبادت گاہ کے چراغ روشن کئے جاتے تھے اور اہل میں ایک بار ہیکل کے سب سے زیادہ مقدس مقام پر آگ کے ان شعلوں سے جو قربان گاہ سے لئے جاتے تھے یہ خوشبوئیں جلائی جاتی تھیں۔ اور پھر سبت کو بخور اور قربانی کا گوشت اور فطیری روٹی قربان گاہ پر چڑھائی جاتی تھی۔ اس بخور جلانے کا جو مقصد ہوتا تھا اسکی پوری توجیہہ کتاب استثنا کے باب ۱۶ کے ۱۲ اور ۱۷ آیتوں میں مسطور ہے۔ توریت سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ مُردوں کے پاس اور اکثر اوقات گھروں میں بھی اسکا استعمال کیا جاتا تھا۔

نینوا (Nineveh) کی عمارتوں کے نقوش و نگار سے پتہ چلتا ہے کہ اہل اسور و کلدان بھی اپنی دیوی اور دیوتاؤں کے سامنے بخور جلایا کرتے تھے۔ شاہان اسور اور مذہب کے پیروشتوں نو بخور جلانے اور شہر زندگی پر شراب ڈالنے کی تمثالیں اکثر عمارتوں پر پائی گئی ہیں۔ بقول ہیروڈوٹس تقریباً ایک ہزار مروجہ کی خوشبوئیں بعل دیوتا کے میلے میں بابل کی سب سے بڑی قربانگاہ پر جلائی جاتی تھیں۔

پرسیپولس (Persepolis) یا اصطخر قدیم پایہ تخت فارس کے آثار اور شاہان ساسان کے قدیم سکوں سے پتہ چلتا ہے کہ خوشبو کا جلانا ایران قدیم کی بھی ویسی ہی ایک مذہبی عبادت تھی۔ جیسا کہ مصر و بابل اور یہودوں میں تھی۔ سامی قوموں میں عبادت کے معینہ تین تھے یعنی صبح۔ عصر و شام۔ مگر مجوسیوں میں اوقات عبادات پانچ ہوتے تھے دو زائد وقت دوپہر اور مغرب کے تھے۔ ان پانچ اوقات میں موبدان مجوس خوشبوؤں کو اپنی مقدس آگ کی قربانگاہ پر جلاتے تھے۔ اوستا میں خوشبوئیں جو عبادات میں مستعمل ہوتی تھیں، انکا نام "روہوگاؤنا" لکھا ہے۔ ہیروڈوٹس کا بیان ہے کہ دارا کے وقت میں عربوں سے تقریباً ہزاروں مروجہ کے قریب خوشبوئیات کا خراج لیا جاتا تھا۔ اب بھی ہندوستان کے پارسیوں میں یہ قدیم مذہبی رسم اس طرح جاری ہے جیسا پرانے زمانوں میں تھی۔

راماین اور مہابھارت میں ہندوؤں کا زمانۂ قدیم سے اپنے دیوتاؤں کے آگے خوشبوئیں جلانے کے دستور کا پتہ چلتا ہے۔ بودھ کے زمانہ میں بھی ہندوؤں میں خوشبو جلانے کا عام دستور تھا، اور اب بھی جہاں جہاں بدھ مذہب پایا جاتا ہے وہاں خوشبو جلانیکی عام رسم مذہبی پائی جاتی ہے۔ موجودہ ہندو مذاہب میں ہون کرنا خاص فریضۂ مذہبی ہے۔ ہون میں اور خوشبوؤں کے علاوہ گھی کا جلانا بھی ضروری سمجھا جاتا ہے۔

قدیم یونانیوں میں ہومر کے بعض جملوں سے لوگوں کو شک ہوگیا ہے کہ آیا بخور کا جلانا قدیم یونانیوں کا مذہبی فریضہ تھا یا نہیں اور آیا کہ وہ لوگ قربانی کے ساتھ اسکا استعمال کرتے تھے۔ لیکن عود کا گھروں میں جلانا تو یقینی طور سے کہا جا سکتا ہے۔ مگر چونکہ یہ خوشبو ہندوستان میں پیدا نہیں ہوتی تھیں اور ان کی تجارت یونان میں آٹھ صدی قبل مسیح تک وسیع نہیں ہوئی تھی۔ اسواسطے قیاس یہ ہے کہ یونانی بھی اپنے دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لئے کسی نہ کسی قسم کی خوشبو کرتے تھے۔ گو کہ وہ بخور نہ ہوتے تھے۔ چنانچہ مناجاتیں جو "ارنک" کے نام سے موسوم ہیں اس میں اس بات کی پوری صراحت ہے کہ کون کون سے دیوتا کن کن خوشبوؤں سے محظوظ ہوتے تھے۔ ان ادویات میں بعض ایسی چیزیں بھی ہیں جو بلحاظ خوشبو کے کوئی خاص وقعت نہ رکھتی تھیں مگر شاید ان میں کوئی اور خاص خصوصیت پائی جاتی ہوگی۔

قدیم رومیوں میں بخور کا جلانا مذہبی فریضہ کے طور پر اس سے بہت قبل رائج تھا جبکہ ہندوستان کے خوشبودار مصالحوں سے وہ لوگ واقف ہوئے تھے اور اس کے بعد تو بخور ایک مخصوص شغل مذہبی ہوگیا تھا۔ اور نہ صرف عبادتگاہوں میں استعمال کیا جاتا تھا بلکہ بعض ایسی تقریبات میں جبکہ ایک فاتح فتحمندانہ طریقے سے شہر میں داخل ہوتا تھا۔ خانگی زندگی میں بھی خوشبوؤں کا استعمال اکثر وقتوں پر کیا گیا ہے۔ رومی اپنے خاندانی دیوتا لار فیملیر یائس (Lares Familiares) کے آگے اسکو روزانہ وقت معینہ پر جلایا کرتے تھے اور قربانیوں میں جانوروں کے سر و پیر میں یہ خوشبو میں لگاکر ذبح کئے جاتے تھے اور اسکے بعد وہ قربانی کے خون میں ملاکر دیوتاؤں کو چڑھایا جاتا تھا اور اکثر اوقات اس آگ میں بھی ڈالا جاتا تھا جس پر قربانی جلائی جاتی تھی۔

مسیحیوں میں بھی بخور کا استعمال مذہبی فریضہ کے طور سے کیا گیا ہے اور اب بھی بعض کلیسا میں کیا جاتا ہے قبل اس کے عقائد منبقیہ کے یقین سے قسطنطین نے مسیحیت کو قدیم رومیوں کے مذہب کی صورت میں مسخ کر دیا علمائے مسیحیت نے بخور کا استعمال مشرکانہ اور بت پرستانہ رسم قرار دیکر محض خانگی ضرورتوں میں اس کے استعمال کی اجازت دی تھی اور ٹرٹیلین نے اس کا جواز صرف اس واسطے تسلیم کیا تھا کہ یہ چیزیں محض ناپاکی اور بدبو دور کرنے کا ذریعہ ہیں۔ لیکن ابتدائی زمانہ مسیحیت میں حواریان مسیح کی بعض تحریروں سے ثابت ہوتا ہے کہ خوشبوؤں کا استعمال یوکارسٹ کے رسوم میں کیا گیا ہے۔ اور "ادیگیریس" ([illegible]) نے اپنی کتاب میں ذکر کیا ہے حسروان عجم خوشبوؤں کا ایک بڑا ذخیرہ یروشلیم کی ہیکل میں جلانے کے لئے بھیجا کرتے تھے۔ پوپ گریگوری (Gregory) کے زمانہ سے پہلے اس کا استعمال مذہبی جلوس اور عبادات میں کثرت سے کیا گیا ہے۔ غالباً ابتدائی زمانے میں مسیحیت میں بھی ان مراسم کے ادا کرنے کا یہی منشار تھا جو بت پرست مشرکین اور یہود کی قوموں کا تھا گو کہ بعد کو علمائے مسیحیت نے اسکی توجیہہ یوں کر لی کہ خوشبو کا استعمال محض گندگی اور بدبو کو دور کرنے کے لئے ہوتا تھا۔ چنانچہ ایک مورخ نے شارلمین (Charleman) کے زمانہ میں خوشبو پر برکات دینے کا یہ منشار لکھا ہے کہ "خدائے قدوس ان خوشبوؤں کو برکت دے تاکہ اس سے بری بدبوئیں دور ہوں اور تاکہ اچھی خوشبوئیں پھیلیں"۔ مگر اولین و متقدمین علمائے مسیحیت کا بخور جلانے کی رسم سے انکار اور انکا احتجاج اس بات پر ضرور دلالت کرتا ہے کہ ابتدائی مسیحیت میں قربانی اور

خون کی جڑا ہنڈ کے ساتھ بخور کا استعمال انہیں عقائد سے ہوا کرتا تھا جو عام مشرکین اور یہود کا خیال تھا۔
مسلمانوں میں بخور کے متعلق کوئی مذہبی احکام نہیں پایا جاتا۔ اگرچہ صوفیہ میں مزارات اولیا پر بخور جلانے کی رسم ہے۔ مگر مزارات و بخور دونوں باتیں اسلام سے باہر ہیں۔ اور جو لوگ اسکو کرتے ہیں وہ اسکو مذہبی فریضہ نہیں جانتے۔ بلکہ یا تو بد اعتقادی اور بدبختی سے یہ باتیں کرتے ہیں یا اپنے معاش کا ایک ذریعہ جان کر قبروں کو بتکدہ بناتے ہیں۔ اسلام انکے فعل کا ذمہ دار نہیں۔

(باقی آئندہ)

سید مقبول احمد

قبیلہ بنی عذرہ کی داستان حسن و عشق

اور

معاویہ کی امارت و سیادت کے مقابلہ میں ایک بدوی جمال کا شاہانہ استغنا

تاریخ عرب میں قبیلہ بنی عذرہ کو اپنے شرف حسن و جمال اور امتیاز عشق و محبت کی وجہ سے جو خصوصیت حاصل ہے وہ اہل علم سے پوشیدہ نہیں۔ سرزمین نجد کے اس قبیلہ کی کسی لڑکی کا نام لے دینا، اب بھی گویا "جمال بارع" اور "محبت عفیفت" کے کسی مجسمہ کا ذکر کر دینا ہے، یہاں تک کہ عربی زبان میں "الھوی العذری" (یعنی بنی عذرہ کی سی محبت) ضرب المثل کی صورت اختیار کر چکی ہے۔

ذیل کا واقعہ اسی قبیلہ کے "افسانہ عشق و حسن" کا ایک ورق ہے جس کا ذکر ابن جوزی، نویری وغیرہ نے کیا ہے اور اس کو راویوں کے سلسلہ سے ہشام بن عروہ تک پہونچایا ہے جو قرن اول کے مشہور محدث تھے۔

نیاز

(۱)

امیر معاویہ میں دیگر امیرانہ خصوصیات کے ساتھ ایک خصوصیت ان کی معیشت و معاشرت کی نفاست و پاکیزگی بھی تھی۔ اسلام کی وہ سادگی جو عہد سعادت یا زمانۂ خلافت اربعہ میں پائی جاتی تھی، اس کا نہ معاویہ کی زندگی میں کہیں پتہ تھا نہ ان کے اعمال و افعال میں۔ وہ ایک امیر تھے، رئیس تھے بلکہ ایک خود مختار بادشاہ تھے اور انکی امارت و سیادت میں ان اکاسرۂ عجم کی سی شان و شوکت پائی جاتی تھی جنکو اسلام نے فتح کیا اور مسلمان خود اس سے مفتوح ہوگئے۔ عرب نے عجم کی زمین پر قبضہ کیا اور عجم نے عرب کے اخلاق پر جس کی سب سے پہلی روشن مثال امیر معاویہ کی ملوکیت تھی۔ وہاں حاجب و دربان بھی تھے، اور نقیب و چاؤش بھی، عجم کی درباریاں بھی تھیں اور انعام و اکرام کی بارشیں بھی، زریں کمر غلام بھی تھے اور نازک کمر کنیزیں بھی۔ وہی ریگزار عرب جس کے عیش و نشاط کی ساری کائنات بقول فردوسی "شیر شتر خوردن و سوسمار" سے زیادہ نہ تھی، وہیں نصف صدی کے اندر اندر، ایک ایک امیر عرب کا گھر فردوس بنا ہوا نظر آتا تھا اور دنیا کی تمام وہ عشرتیں جو دولت و حکومت سے حاصل کی جا سکتی ہیں، اُن کی مملوک تھیں۔ چنانچہ امیر معاویہ کے دسترخوان کی وسعت، مختلف قسم کے لذیذ کھانوں کی اختراع اور کھانے کے وقت نغمہ و موسیقی، لطایف و ظرایف کی صحبتیں تاریخ عرب کے کھلے واقعات ہیں[1]۔

[1] امیر معاویہ کے بہت سے "لطایف مایدہ" تاریخ میں محفوظ ہیں۔ انہیں میں سے ایک وہ بھی نہایت لطیف واقعہ ہے جو جناب حسینؓ کے ساتھ ہوا۔ ایک بار جناب حسینؓ بھی مدعو تھے اور دسترخوان پر مختلف قسم کے کھانے چنے ہوئے تھے۔ جناب حسینؓ نے مرغ مسلم لیکر اسکا گوشت جدا کرنا چاہا۔ امیر معاویہ نے مزاحاً کہا "ھل بینک و بینھا عداوۃ" (کیا آپکے اور اس مرغی کے درمیان کچھ عداوت ہی؟) جناب حسینؓ نے برجستہ فرمایا (ھل بینک و بین ابنھا قرابۃ) کیا تمہارے اور اس کے بیٹے کے درمیان کچھ قرابت ہے۔

ایک دن کا واقعہ ہے کہ معاویہ کا دسترخوان پوری وسعت کے ساتھ بچھا ہوا ہے اور ہر شخص کو شرکت کی اجازت ہے۔ ہجوم آہستہ آہستہ بڑھتا جاتا ہے اور کھانا شروع کرنے کی اجازت ہونے ہی والی ہے کہ قبیلۂ بنی عذرہ کا ایک خوشرو نوجوان جس کے چہرہ سے شرافت، غمگینی و جذبات حزیں ظاہر ہو رہے تھے اٹھا اور اس نے معاویہ کو مخاطب کرکے کہا:۔

معاوی، یاذا الفضل والحلم والعقل	وذا البر والاحسان والجود والبذل
اتیتک لما ضاق فی الارض مسلکی	وانکرت مما قد اصبت بہ عقلی
ففرج۔ کلاک اللہ۔ عنی فاننی	لقیت الذی لم یلقہ احد قبلی
وخذ لی۔ ھداک اللہ حقی من الذی	رمانی بسھم کان اھونہ قتلی
وکنت ارجو عدلہ ان اتیتہ	فاکثر تردادی مع الحبس والکبل
سبانی "سعدی" وانبری لخصومتی	وجار ولم یعدل وغاضبنی اھلی
فطلقتھا من جھد ما قد اصابنی	فھذا امیر المومنین من العدل؟

اس کا خلاصہ مفہوم یہ ہوا کہ "اے صاحب فضل وکرم معاویہ، میں آپکے پاس اسوقت آیا ہوں جبکہ خدا کی زمین مجھ پر بالکل تنگ ہوگئی، اس لئے میری فریاد کو پہونچئے اور میرا حق اس سے دلوائیے جس نے مجھے ان تیروں سے زخمی کیا ہے جن سے زیادہ آسان میرے لئے قتل کیا جانا تھا۔ میں اس سے عدل وانصاف کی توقع رکھتا تھا، لیکن اس نے مجھ پر قید وبند کی مصیبت ڈالدی اور میری محبوبہ سعدیٰ کو مجھسے چھین لیا۔ پھر اے امیر المومنین آپ ہی بتائیے یہ کہاں کا عدل وانصاف ہے؟

امیر معاویہ نے اس نوجوان کی یہ دردناک اشعار سنے اور خواہش کی کہ وہ اپنی سرگذشت زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کرے۔

اس نے جواب میں کہا کہ:۔

"اے امیر المومنین آپ کی عمر دراز ہو۔ میں قبیلۂ بنی عذرہ کا ایک حقیر فرد ہوں اور میری داستان بہت دردناک ہے۔ کچھ زمانہ ہوا جب میری شادی میری بنت عم (چچا کی لڑکی) سے ہوئی اور میں نے اسکی محبت میں، جو کچھ میرے پاس تھا اپنے چچا کی نذر کر دیا۔ جب میرے چچا نے دیکھا کہ میرے پاس سوائے محبت کے اور کچھ نہیں رہا تو اس نے بے التفاتی شروع کی اور اپنی بیٹی سعدیٰ کو مجبور کیا کہ مجھ سے علحدہ ہو جائے۔ ہر چند یہ امر اس کے لئے نہایت شاق تھا لیکن اس غیرت وحیا کی وجہ سے جو قبیلۂ بنی عذرہ کی خصوصیت ہے، وہ اپنے باپ کے فرمان کی مخالفت نہ کرسکی اور مجھ سے زیادہ دردمند دل لئے ہوئے وہ اپنے باپ کے گھر چلی گئی۔

میں نے پہلے تو کوشش کی کہ کسی طرح اس غم کے بار کو برداشت کروں، لیکن جب کام صبر وضبط سے باہر ہوگیا تو میں آپ کے عامل مروان بن الحکم کے پاس گیا اور اس کو اپنی داستان دردناک سنا کر مداوا چاہا۔ میں سمجھتا تھا کہ وہ اس ظلم کی تلافی کردے گا جو مجھ پر سعدیٰ کے باپ کی طرف سے توڑا گیا تھا، لیکن میرا یہ خیال بالکل غلط نکلا۔ کیونکہ جب اس نے میرے چچا اور میری بیوی کو بلاکر دریافت حال کیا تو وہ خود اس کے حسن کا مبتلا ہوگیا اور دس ہزار درہم میرے چچا کو دیکر سعدیٰ کے نکاح کا پیام دے دیا

میرا چچا جو بہت زیادہ طماع ہے راضی ہوگیا اور مروان بن الحکم نے مجھے بلاکر زندان میں ڈالدیا اور مجبور کیا کہ میں سعدیٰ کو طلاق دیدوں میں نے اول اول تو انکار کیا، لیکن جب میں نے دیکھا کہ اگر میں طلاق نہیں دونگا تو وہ کسی نہ کسی طرح اسپر قابض ہوجائے گا اور اُدھر قید کی سختیاں بھی ناقابل برداشت حد تک پہونچ گئیں تو میں نے حد درجہ مجبور ہوکر اس کو طلاق دیدی اور اب ملے امیر المومنین آپ کے دربار میں آیا ہوں کہ میرے اس درد کا مداوا کیجئے۔

یہ کہہ کر وہ نوجوان بے اختیارانہ طور پر رونے لگا اور اسی حالت میں اس نے یہ شعر برجستہ پڑھے :-

فی القلب منی نار والنار فیہا استعار
والعین تبدی بشجو فدمعہا مدرار
والحب داء عسیر فیہ الطبیب یحار
حملت منہ عظیما فما علیہ اصطبار
فلیس لیلی لیل ولا نہاری نہار

یعنی میرے دل میں وہ آگ بھڑک رہی ہے جس کا کوئی آگ مقابلہ نہیں کرسکتی اور میری آنکھیں جو طوفان اشک لارہی ہیں اسکا کوئی طوفان مقابلہ نہیں کرسکتا۔ سچ ہے کہ محبت ایسی سخت بیماری ہے جس کا علاج کسی طبیب کے بس کی بات نہیں۔ اور اب میرا حال صبر و ضبط کی حد سے اسطرح گذر گیا ہے کہ اب میری زندگی میں نہ دن کا کوئی مفہوم رہگیا ہے نہ رات کا۔

یہ سن کر امیر معاویہ بہت متاثر ہوئے اور اسی وقت ابن الحکم کے نام ایک خط تحریر کرایا جس میں یہ اشعار بھی تھے۔

رکبت امرا عظیما لست اعرفہ استغفر اللہ من جور امرء زانی
قد کنت تشبہ صوفیا لہ کتب من الفرائض او آیات فرقان
حتی اتانا الفتی العذری منتحبا یشکو الیّ بحق غیر بہتان
ان انت راجعتنی فیما کتبت بہ لاجعلنک لحما بین عقبان

(مدعا یہ کہ تم نے نہایت سخت جرم کا ارتکاب کیا جس کا علم مجھے ایک نوجوان بنی عذرہ کی فریاد سے ہوا، بہرحال اگر تم نے حکم کی تعمیل نہ کی تو سخت سزا دی جائے گی)

امیر معاویہ نے کمیت اور نصر بن ذبیان کو تعین کیا کہ ابن الحکم کے پاس یہ فرمان لے جاویں اور جلد سے جلد پہونچنے کی ہدایت کی جس وقت یہ فرمان ابن الحکم کے پاس پہونچا تو اس نے پڑھکر ایک ٹھنڈی سانس لی اور کہا "کاش امیر المومنین ایک سال تک مجھے اور سعدیٰ کو اسی حال میں چھوڑ دیتے اور اس کے بعد اگر تلوار سے وہ میری گردن بھی مار دیتے تو مجھے عذر نہ ہوتا"

الغرض نہایت جبر و اکراہ کے ساتھ اس نے سعدیٰ کو طلاق دیدی اور پیغامبروں کے ساتھ اسے کردیا۔ جس وقت ان لوگوں

اسکی صورت دیکھی تو مبہوت ہوگئے کیونکہ انہوں نے بھی آجتک ایسا حسن ساحرنہ دیکھا تھا۔ ابن الحکم نے فرمان معاویہ کے جواب میں جو شعر لکھے وہ یہ تھے۔

اعذر فانک لو ابصرتہا ۔۔۔ منک الامانی علی تمثال انسان

وسوف تاتیک شمس لیس یعدلہا ۔۔۔ عند البریۃ من انس ومن جان

حوراء یقصر عنہا الوصف ان وصفت ۔۔۔ اقول ذلک فی سر و اعلان

(یعنی میں نے اگر یہ حرکت کی تو معذور تھا کیونکہ اگر آپ اسے دیکھتے تو آپ کا بھی وہی حال ہوتا۔ بہرحال وہ آفتاب حسن عنقریب آپ کے پاس پہونچنے والا ہے جس کا نظیر روئے زمین پر نہیں مل سکتا بلکہ میں تو یہ کہونگا کہ اگر اسکو حور سے تشبیہ دی جائے تو بھی حقیقتاً اسکی توہین ہے۔)

امیر معاویہ نے ابن الحکم کی تحریر پڑھ کر کہا کہ میں اس کی تعمیل حکم سے خوش ہوا لیکن سعدی کی تعریف میں اس نے معلوم ہوتا ہے زیادہ مبالغہ سے کام لیا ہے۔ معلوم نہیں نغمہ و موسیقی اور شعر و ادب کا بھی کچھ ذوق رکھتی ہے یا نہیں۔ یہ کہکر امیر معاویہ نے اس کے بلانیکا حکم دیا اور جس وقت وہ سامنے آئی تو سارے بدن میں اک لرزش سی پیدا ہوگئی اور اسی وقت انہوں نے طے کر لیا کہ اس نوجوان کو دولت اور کنیزیں وغیرہ دیکر راضی کر لینا چاہیے، اور سعدی کو اپنے لئے مخصوص۔

یہ سوچ کر امیر معاویہ نے اس نوجوان کو طلب کیا اور پوچھا کہ "اے نوجوان، کیا کوئی ایسی صورت ہو سکتی ہے کہ تو سعدی کیطرف سے غافل ہوجائے"

نوجوان۔ "ہاں، اک صورت ہے"

امیر معاویہ۔ "کیا؟"

نوجوان۔ "یہ کہ میرا سر میرے تن سے جدا کر دیا جائے"

امیر معاویہ۔ "میں سعدی کے عوض تجھے تین نہایت حسین دوشیزہ لونڈیاں دیتا ہوں اس حال میں کہ ہر لونڈی ہزار ہزار دینار رکھتی ہوگی علاوہ اس کے بیت المال سے تیرے لئے اتنی رقم مقرر کر دوں گا کہ تو نہایت امن و سکون سے ان کنیزوں کے ساتھ زندگی بسر کر سکے"

امیر معاویہ ابھی اپنے انعام و اکرام کی فہرست پوری طرح پڑھنے بھی نہ پائے تھے کہ نوجوان چیخ مار کر فرش پر گرا اور ہر شخص نے گمان کیا کہ شاید وہ مرگیا ہے۔ جب وہ کچھ ہوش میں آیا تو امیر معاویہ نے دریافت کیا

"اے اعرابی کیا حال ہے"

نوجوان۔ "اس شخص کا حال آپ کیا پوچھتے ہیں جسکی مایوسی اس حد تک پہونچ چکی ہو، میں سمجھا تھا کہ ابن الحکم کے ظلم کی چارہ جوئی آپ سے کروں گا، لیکن جب آپ بھی اس رنگ کے نکلیں تو پھر اب کہاں جاؤں، زمین سخت ہے آسمان دور ہے

لا تجعلنی والامثال تضرب بی ۔۔۔ کالمستغیث من الرمضاء بالنار

اردد سعاد علی حیران مکتئب | یمسی ویصبح فی ھم وتذکار
قد شفہ قلق ما مثلہ قلق | واسعر القلب منہ ای اسعار
کیف السلو وقد ھام الفواد بھا | واصبح القلب عنھا غیر صبار

یعنی اے امیر المومنین اپنے طرز عمل سے میرا حال اس شخص کا سا نہ کیجئے جو گرمی سے بھاگ کر آگ کی پناہ ڈھونڈھنے نکلے۔ میری محبوبہ سعاد کو مجھ حیران و مغموم کے سپرد کر دیجئے کیونکہ اسکے درد مفارقت نے مجھ کو زار و نزار بنا دیا ہے اور اب قلب میں صبر کی طاقت باقی نہیں رہی۔"

یہ سن کر امیر معاویہ کو غصہ آیا اور بولے کہ اے اعرابی تو اقرار کرتا ہے کہ تو نے سعاد کو طلاق دیدی۔ مروان بھی اس کا مقر ہے اسلئے وہ تیرے سپرد کیونکر کیجا سکتی ہے جب تک کہ پھر تیرے ساتھ نکاح نہ ہو، اس لئے اس سے دریافت کرنا ضروری ہے کہ وہ تیرے ساتھ نکاح پر راضی ہے یا کسی اور شخص کے ساتھ" یہ کہکر امیر معاویہ نے ایک مخفی اشارہ سعدی کیطرف کیا جس سے مقصود اپنے آپ کو پیش کرنا تھا اور دریافت کیا کہ "اے سعدی، تو کس کو پسند کرتی ہے، امیر المومنین کو جو صاحب عزّ و شرف ہے، یا ایک اعرابی کو جو مفلس و محتاج ہے"

سعدی نے جواب میں اعرابی کی طرف اشارہ کرکے کہا:-

ھذا، وان کان فی فقر و اضرار | وکان فی نقص من الیسار
اکثر عندی من ابی دجاری | وصاحب الدرھم والدینار

یعنی مجھے تو یہ اعرابی چاہئے جس کا فقر و افلاس مجھے ساری دنیا کی دولت سے زیادہ عزیز ہے"

شیخ الشیوخ حضرت نصیر الدین محمود گنج معانی رحمۃ اللہ علیہ

(بہ سلسلۂ گزشتہ)

مناقب وفضائل کا یہ سلسلہ بہت طویل ہے، مگر ہم اس کو یہیں قلم انداز کرتے ہیں۔

درس وتدریس کا سلسلہ مدینہ منورہ ہی سے شروع ہو گیا تھا، اور سیکڑوں لوگ آپ کے علم وفضل اور سلوک وطریقت کی تاجداری کے باج گزار ہو چکے تھے۔ چنانچہ جب ہندوستان واپس آئے تو اسی عقیدت مند ساتھ تھے، جن میں بعض شیوخ وعلماء بھی تھے[۱]

دہلی میں بہت پرجوش استقبال کیا گیا، خود حضرت محبوب الٰہی بھی اسمیں شریک تھے، خانقاہ پہونچ کر اعلان کیا کہ: نصیر الدین میرے روحانی فرزند، اور میرے جانشین ہیں۔ یہ سنتے ہی کھل بلی مچ گئی، بڑے بڑے مریدوں کی امیدیں خون ہو گئیں، ساری محفل سراپا رشک وتعجب ہو گئی[۲]۔ یہ اعلان معمولی اعلان نہ تھا۔ ہمیں اس کو اسی رشک وتعجب کی روشنی میں دیکھنا چاہئے۔ اس سے ہم شیخ محمود کے جوہر فضل کا صحیح اندازہ کر سکینگے۔

حضرت محبوب الٰہی کی بزم سلوک جن لوگوں سے آراستہ ہوتی تھی۔ اس میں ہر شخص علم وفضل کا رازی وغزالی، اتباع سنت ودستیر کا ابن تیمیہ وابن حنبل، شعر وادب کا ابو تمام وابن رشیق، اور سلوک وطریقت کا جنید وشبلی تھا۔ مثلاً کمال الدین زاہد، رضی الدین عراقی۔ شرف الدین کرمانی، ضیاء الدین رومی، ابوبکر عدسی، شیخ نور ترک، مخلص الدین، امیر خسرو، حسن طلائی، شیخ تقی الدین، برہان الدین نسفی، شیخ شہاب الدین قاضی منہاج، شیخ احمد، قطب الدین منور، حسام الدین ملتانی، فخر الدین زرادی، شمس الدین یحییٰ، وجیہہ الدین یوسف، محی الدین کاشانی، فخر الدین مروزی، علاء الدین نیلی، وجیہہ الدین پائلی، رکن الدین اصولی، صدر الدین نادی، ظہیر الدین بھکری، حسن افغان وغیرہ۔ تاہم باوجودیکہ آپ سب کے بعد آئے مگر سب سے آگے بڑھ گئے۔ حضرت محبوب الٰہی نے اپنی زندگی ہی میں سجادۂ ارشاد وہدایت سونپ دیا، اور اپنے پرانے پرانے لوگوں میں کوئی بھی اس قابل نہ سمجھا گیا کہ اُسے مسند محبوبیت پر سرفراز کیا جائے۔

تم جانتے ہو کہ اس سرفرازی کی کیا وجہ تھی؟ اگر کامیابیوں کا انحصار محض اللہ کے فضل وکرم پر ہے، تو یہ کیسا فضل وکرم تھا کہ ایک نیا شخص تو قبول کر لیا گیا، اور پرانے شعلہ آشام رد کر دیئے گئے؟ اور اگر انسان کے علم وعمل اور استحقاق کو بھی کچھ دخل ہے، تو ان لوگوں میں بڑے بڑے عالم اور بڑے بڑے زاہد ومرتاض جو سب کے سب مستحقین بھی تھے، ان کی تمناؤں پر نامرادیوں کا قلم کیوں پھیر دیا گیا؟

لیکن یہی رد وقبول ہے جس نے وہ عظیم الشان مگر غیر محسوس فرق نمایاں کر دیا ہے۔ ان سلاطین علم وتقویٰ میں ایک شخص بھی ایسا نہ تھا جو علم وفضل، زہد وتقویٰ اور جاہ ودولت کے ساتھ عشق ومحبت، محنت وجفاکشی، اعتقاد واخلاص، صدق ودیانت، انقیاد وتسادگی،

---

[۱] سیرت المحمود ۱۲ [۲] سیرت المحمود ۱۲

ایثار وقربانی، بے نیازی وسیرچشمی، اور صبر واستقامت کے خزانوں کا ایک سکہ بھی اپنے پاس رکھتا ہو۔ مگر شیخ محمود مصر سلوک کے وہ تنہا یوسف تھے، جو اس دولت حسن کے عظیم الشان سرمایہ دار تھے۔ اور یہی وہ خوبی وزیبائی تھی جس نے آپ کو سب سے آگے بڑھا دیا، اور ہفت اقلیم کی شہنشاہی کا تاج آپ کے سر پر رکھ دیا۔

ایک روز حضرت محبوب الٰہی پر ایک خاص کیفیت طاری تھی فرمایا: اجابت کے دروازے کھلے ہیں، جسکی جو خواہش ہو کہے" ہر شخص نے اپنے اپنے مطالبات پیش کئے۔ کسی نے دنیا چاہی، کسی نے عقبیٰ اور کسی نے دونوں۔ مگر آپ کا مقصد دنیا و عقبیٰ سے بلند تر تھا، کچھ نہ بولے۔ شیخ نے کہا تم بھی تو کچھ کہو، کیا چاہتے ہو؟ بولے: بندہ را خواستی نہ باشد، خواست خواست مولیٰ باشد" حضرت محبوب الٰہی نے یہ سنکر منھ چوم لیا، اور کہا: واللہ یہی چیز ہے کہ جس نے تم کو سب سے بڑھا دیا ہے۔ (حکایات الصالحین)

عزت او قبول عام کی یہ کیفیت تھی کہ امراء، علماء، اور مشائخ خدمت شریف میں حاضر رہتے، اور نہایت خلوص واعتقاد سے زمین پا کو بوسہ دیتے تھے۔

لیکن آپ کے اخلاق وعادات میں ذرہ برابر فرق نہ آیا، وہی انکسار جو پہلے تھا اب بھی قائم رہا۔

خادم جو رات دن خدمت اقدس میں حاضر رہتے تھے، کہتے ہیں: آپ ہی نے ہمارے زیادہ کام کردئے ہوں گے، ہم نے آپ کے اتنے کام نہیں کئے۔ محلے والوں کے کام کاج ان کے گھروں پر جاجا کر اور پوچھ پوچھ کر کردیتے تھے (روضۃ الاخیار)

والد سے ترکہ میں کئی ہزار ایکڑ زمین، باغ اور مکانات ملے تھے، جن کی سالانہ آمدنی کئی ہزار اشرفی تھی۔ لیکن آپ اس سے ایک پیسہ بھی نہیں لیتے تھے۔ نقد وجنس کا اندازہ دو ڈھائی لاکھ تھا، مگر وہ سب راہ خدا میں صرف کردیا۔ سیرت المحمود میں لکھا ہے:-

حضرت شیخ را دو باغ وہشت ہزار ایکڑ زمین وسی وپنج مکانات بود، اما آنحضرت یک فلوس نہ گرفتے۔ نقد وجنس کہ اندازہ آں زاید از دو لکھ بود بخلق اللہ انفاق نمود"

تذکرۃ الفضلا کی شہادت:-

"باین ہمہ کہ او دولت فراواں داشتے، اما بر وجود خود یک حبہ صرف نہ کردے، وبخلق بخشش ہائے بے اندازہ کردے"

یہ سب دے دلا کر اپنی معاش کے لئے، خود اپنے قوت بازو سے کما کر تلوکھڑی میں تھوڑی سی زمین خریدی تھی اس میں کچھ ساگ پات اور اناج بولیتے تھے۔ لیکن اکثر ایسا ہوتا تھا کہ غربا ومساکین کی تواضع کردیتے تھے۔ اور خود بجائے غذا کے پانی کے گھونٹ پر اکتفا کرتے۔ حکایات الصالحین میں لکھا ہے:-

"برائے معاش خود در تلوکھڑی یک دو طناب زمین خریدہ بدست مبارک می کاوید وتخم می ریخت وقوت لایموت ازاں می ساخت"

اپنے کسی کام کے لئے کسی کو تکلیف نہیں دیتے تھے۔ کھانا پکانا۔ کپڑے دھونا، اور سینا پرونا سب کام خود ہی کرلیتے تھے کھانے میں ابلا ہوا بغیر نمک مرچ کا ساگ، اور جو کی روٹی ہوتی تھی (حکایات الصالحین)

ہمدردی و غمخواری کا ایسا جذبہ تھا کہ کسی کو مبتلائے مصیبت نہ دیکھ سکتے تھے۔ انسان تو انسان جانوروں کی تکلیف و مصیبت سے بھی متاثر ہو جاتے۔ ایک دفعہ ایک شخص گھوڑے پر سوار جا رہا تھا، اس نے گھوڑے کو اس زور سے چابک مارا کہ اس کی گردن پر بدھی پڑ گئی۔ آپ یہ دیکھ کر تلملا اٹھے اور اسے گھوڑے سے اتار لیا (سیرت المحمود)

فقر و فاقہ اور توکل و قناعت کا یہ عالم تھا کہ نہ عزیز و اقارب کی محبت کی پرواہ کرتے تھے نہ جاہ و عزت کی، یہ دونوں جادو آپ پر بالکل بے اثر تھے۔ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ دنیا کی عزتیں اور نعمتیں پری پیکر عروس بنکر سامنے آئیں، مگر ایک غلط انداز نظر بھی نہ پا سکیں۔ محمد تغلق کے دوستوں نے اپنے جال میں پھنسانا چاہا، اور عزیزوں نے بھی بہت کوشش کی، مگر یہ عنقا کسی دام میں نہ آیا۔ انھوں نے زیادہ اصرار کیا تو صاف کہدیا کہ: جانتے ہو اس کا کیا نتیجہ ہوگا؟ تم میرے ایمان سے اپنی قرابت کو ٹکرانے کی کوشش نہ کرو، جو دل خدا کا ہو چکا ہے وہ اب بندوں کا نہیں ہو سکتا۔ یہ چھوٹی اور ذلیل عزتیں تمھارے نزدیک کچھ ہوں، لیکن مجھے اپنی طرف مائل نہیں کر سکتیں (سیرت المحمود)

حضرت محبوب الٰہی سے ایسا خلوص تھا کہ جب یہ سنا کہ سلطان تغلق ان سے پرخاش رکھتا ہے، تو خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے ایک بڑے ابتلا سے بچا لیا (روضۃ الاخیار)

دوست احباب اور ملنے جلنے والوں سے نہایت سادگی و بے تکلفی سے ملتے تھے۔ نہ کسی سے یہ خواہش کی کہ وہ جھک جھک کر سلام سلام کرے، اور نہ یہ چاہا کہ جب آئے ہاتھ پیر چومے۔ بلکہ جو لوگ ایسا کرتے انھیں منع کر دیتے کہ یہ باتیں خلاف شریعت ہیں (روضۃ الاخیار)

شاگردوں اور عقیدتمندوں کے ساتھ برادرانہ سلوک کرتے تھے، اور کسی سے ناجائز احترام و عقیدت کے روادار نہ تھے۔ ان میں جو بیمار ہوتا روز اس کی عیادت کو تشریف لیجاتے، اور بعض اوقات ایسا ہوتا تھا کہ تیمار داری بھی کرتے اور اپنے ہاتھ سے دوائیں پیس پیس کر پلاتے تھے۔ نیرفقیر کی بیماری میں ایک مہینہ تک نوکروں کی طرح ان کی خدمت کی، اور شیخ صدر الدین کی عیادت کو روزانہ کئی میل چل کے جاتے تھے۔ سیرت المحمود میں اس قسم کے اور بہت واقعات لکھے ہیں۔

حضرت محبوب الٰہی کے مریدوں سے بہت تپاک سے ملتے تھے (حکایات الصالحین) حمید قلندر ان کے مرید اور آپ کے شاگرد تھے۔ لیکن آپ کو یہ بات معلوم نہ تھی۔ ایک روز کسی نے اس نسبت سے قلندر کا ذکر کیا، وہ آئے تو فرمایا: "تو مرید شیخی؟ من نمی دانستم، بیا کنار گیرم" (اخبار الاخیار)

محنت و ریاضت کی اتنی شدت تھی کہ ہمیشہ روزہ رکھنے کے ساتھ دو کلام اللہ روزانہ ختم کرتے، اور دوسرے اوراد و وظائف کے علاوہ تین لاکھ مرتبہ درود پڑھتے تھے۔ اشغال و مراقبے اس سے علاوہ رہے۔ سید محمد کہتے ہیں: میں برسوں خدمت عالی میں حاضر رہا ہوں لیکن کبھی ایک گھنٹہ سے زیادہ رات کو سوتے نہیں دیکھا (سیر الاولیا)

شریعت کی پابندی کا بیحد خیال تھا، ہمیشہ اس بات کے کوشاں رہتے کہ مریدوں اور دوستوں میں کوئی شخص اعتصام سنت اور تخلق باخلاق الانبیا میں کمزور نہ ہو اسی غرض سے ارشاد و ہدایت اور تعلیم و تدریس کا سلسلہ شروع کیا، امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے مقدس فرائض انجام دینے کے لیے شیوا زبان اور بلند آہنگ داعی طیار کئے، اور ایک ایسی صادق العمل پرجوش جماعت پیدا کر دی کہ خانقاہیں ایک بار

پھر کلمۃ الحق کی پکاروں سے گونج اٹھیں، اور چشتی دعوت طریقت کو حیات تازہ مل گئی (سیرت المحمود و حکایات الصالحین) اس بارے میں آپ کی مساعی جمیلہ ہندوستان کے اور ارباب طریقت سے بہت زیادہ میں، سلوک چشتیہ ہمیشہ آپ کے احسانات کو یاد رکھے گا۔

سماع چشتیہ سلوک میں روحانی نماز سمجھا جاتا ہے، خصوصًا اس زمانہ میں تو یہ نماز اتحاد وجہ فرض ہو گئی تھی۔ لیکن آپ ایک دفعہ بھی اس روحانی نماز میں شریک نہ ہوئے، اور سختی سے اس نماز کے شیوخ کی مخالفت و ممانعت کی۔ گو بعض سماع پرست تذکرہ نویسوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ آپ بھی سماع کے دلدادہ تھے لیکن یہ سراسر اتہام ہے۔ اس بارے میں آپ کا مسلک سب سے علیحدہ تھا۔ دارا شکوہ نے لکھا ہے:۔

"با وجود آنکہ دریں سلسلہ سرود و سماع می کردند، اما شیخ نصیر الدین سماع نمی فرمودند، و می گفتند کہ خلاف سنت است"

(سفینۃ الاولیا مطبوعہ لاہور صفحہ ۱۷۱)

ایک روز حضرت محبوب الٰہی کے حضور سماع ہو رہا تھا، آپ تشریف لائے، اور سماع کی آواز سنتے ہی الٹے پیروں واپس چلے گئے۔ (روضتہ الاخیار)

ایک دفعہ حضرت محبوب الٰہی کے یاران بزم کی ایک صحبت میں آپ بھی رونق افروز تھے۔ وہاں سماع شروع ہو گیا، آپ اسی وقت اُٹھ گئے سب نے بہت روکا، مگر آپ نہ مانے۔ فرمایا: خلاف سنت ہے۔ انھوں نے کہا: کیا سماع سے منکر ہو کر اپنے پیر کے مشرب سے علیحدہ ہو گئے؟ فرمایا حجت نہیں ہے، دلیل کتاب و سنت سے ہونی چاہئے۔ یہ واقعہ خیر المجالس میں لکھا ہے اس کے اصل الفاظ یہ ہیں:۔

"روزے بعضے از مریدان شیخ نظام الدین اولیا مجلسے داشتند۔ وازدف زناں سرودے می شنیدند۔ شیخ نصیر الدین در مجلس بود برخاست تا برآید۔ یاراں تکلیف نشستن کردند گفت خلاف سنت است۔ گفتند از سماع۔ سماع منکر شدی؟ و از مشرب پیر برگشتی؟ گفت حجت نمی شود، دلیل از کتاب و سنت می باید"

دوست دشمن سب کے ساتھ آپ کی مراعات یکساں تھیں۔ مولانا معین الدین عمرانی اپنے وقت کے ایک جید عالم تھے اور جیسا کہ اکثر ظاہری علما، اہل اللہ سے پرخاش رکھتے ہیں، یہ بھی حضرت محمود سے پرخاش رکھتے تھے، اور بلا وجہ بدگوئیاں کرتے تھے۔ مولانا خواجگی کو دونوں بزرگوں سے علاقہ تھا، وہ آپ کے مرید اور اُن کے شاگرد تھے۔ لیکن مولانا کو یہ نسبت بہت ناگوار تھی، جب موقع ملتا جی بھر کے گالیاں دیتے تھے خواجگی نے چاہا کہ مولانا سے نسبت منقطع کر لیں مگر شیخ نے منع کر دیا۔ قضا را ایکدفعہ مولانا نہایت شدید سفرا میں مبتلا ہوئے، اور کئی مہینے بیمار رہنے کے بعد بھی تندرستی کی نوبت نہ آئی۔ علاج سے عاجز آ گئے تھے، اور مرض دن بدن بڑھتا جاتا تھا، خواجگی نے کہا: اگر مخدوم شیخ کی ملاقات کو تشریف لے چلیں تو مضائقہ نہیں ہے۔ شاید شفا کی کوئی صورت نکلے۔ مولانا پہلے تو بہت چیں بجبیں ہوئے، لیکن پھر تکلیف کی وجہ سے تیار ہو گئے شیخ نہایت لطف و محبت سے ملے، بغل گیر کیا، اور اسی وقت خادم کو حکم دیا کہ چاول اور جغرات تیار کرے۔ دسترخوان چنا گیا تو مولانا کے آگے چاول اور جغرات کی قاب رکھی گئی۔ مولانا نے شیخ کے اصرار سے مجبور ہو کر چند لقمے کھائے۔ لیکن یہ کھانا تھا کہ صفراوی مادہ میں ہیجان آ گیا، اور پیہم استفراغوں سے اتنی بری حالت ہو گئی کہ مولانا کے ہوش و حواس اڑ گئے۔ اور انھوں نے سمجھ لیا کہ بس آج زندگی کا خاتمہ ہے مگر یہ زہر دراصل تریاق تھا۔ تھوڑی دیر بعد ایک عرق پلایا، اور اس کے پیتے ہی مولانا بالکل صحیح و تندرست ہو گئے۔ اس واقعہ نے اُن کے

دل سے زنگ کدورت دھو دیا، حسد کی آگ بجھ گئی، اور وہ خلوص و اعتقاد کے ساتھ بیعت ہو کر شیخ کی خدمت میں رہنے لگے (سیرت المحمود)

درس و تدریس کا سلسلہ اخیر عمر تک جاری رہا، عہد سلوک کے تلامذہ کی تعداد تو حد شمار سے باہر ہے لیکن بعد کے طلبہ بھی سینکڑوں سے متجاوز ہیں چند نام یہ ہیں: برہان الدین - شیخ عثمان، شاہ علی، عزیز الدین، سید محمد کرمانی، خواجہ شمس الدین، حمید قلندر، ضیاء برنی، نظام الدین شیرازی، میر جعفر، موید الدین، شمس الدین دہاری، عثمان سیاح، شیخ ابو بکر، مولانا مظہر، شیخ شہاب الدین، سید محمد گیسو دراز، شیخ احمد، مولانا خواجگی، سید جلال الدین، شیخ صدر الدین حکیم، سید ابو یوسف، قاضی عبد المقتدر، شیخ زین الدین - مخدوم جہانیاں - کمال الدین علامہ شیخ اخی سراج پروانہ - یہ لوگ علم و فضل میں شہرہ آفاق اور اقلیم فقر و فنا کے تاجدار تھے، اور حضرت محمود نے ہندوستان کے مختلف حصوں کی عنان نظم ان کو تفویض کی تھی (سیرت المحمود وغیرہ)

آفتاب کی روشنی ایک ہوتی ہے - لیکن ہر جگہ اس کے اثرات ایک نہیں ہوتے - اس آفتاب علم و طریقت کے جلوے بھی رنگ برنگ ہیں ہر جگہ ایک نئی اور مکمل شان ہے - صفحات میں گنجائش نہیں کہ مفصل طور پر اس کا بیان ہو سکے - لیکن یہ کہنا ایک اہم ترین فرض ادا کرنا ہے کہ آپ کی ہی وہ ادائیں تھیں جن کی وجہ سے ایک دنیا نے نیازمندانہ سر جھکا دیئے تھے، ہندوستان سے روم و شام اور مصر و قیروان تک گنج معانی، چراغ دہلی، اور شیخ الاسلام کا ڈنکا بج گیا تھا - خود حضرت محبوب الٰہی بھی آپ کو انھیں ناموں سے پکارتے تھے مراۃ الاسرار میں لکھا ہے :-

"از کثرت فضل و دانش و قیام امر بالمعروف و نہی عن المنکر شیخ المشائخ اورا گنج معانی و شیخ الاسلام می گفتند"

مخدوم جہانیاں کہتے ہیں: میں جس زمانہ میں مکۂ معظمہ میں مقیم تھا، ایک روز شیخ عبد اللہ یافعی سے ملاقات ہوئی - انہوں نے کہا دہلی اب صرف ایک چراغ رکھتی ہے - میں نے پوچھا وہ کون ہے: بولے: شیخ نصیر الدین (سیرت المحمود)

تاریخ فرشتہ میں بھی اس کے متعلق ایک روایت لکھی ہے - ایک روز حضرت محبوب الٰہی کے پاس دور دور کے مشائخ کا مجمع تھا، آپ آئے اور اُن کو چاروں طرف بیٹھا دیکھ کر کھڑے رہ گئے - شیخ نے فرمایا بیٹھو؟ بولے: درویشوں کی طرف پشت ہوتی ہے - شیخ نے کہا: چراغ را پشت و روئے نیست" اس روز سے چراغ دہلی مشہور ہو گئے - شیخ صدر الدین، حمید قلندر، میر جعفر مولانا مظہر، عثمان سیاح، قاضی عبد المقتدر - جہاں گشت کہتے ہیں ہم جہاں جاتے تھے حضرت محمود کا ذکر سنتے تھے، اور ہر جگہ کے علماء و مشائخ بہت تعظیم و تکریم سے نام لیتے تھے (فرشتہ جلد دوم صفحہ ۴۰۱ مطبوعہ لکھنؤ)

ہر صدی کا ایک مجدد اور فائق ہوتا ہے، اس صدی کے مجدد اور فائق آپ تھے کیونکہ آپ نے صرف حجرہ و خانقاہ ہی کے کام نہیں کئے بلکہ مدرسہ و منبر کے بھی کام کئے اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی عملی کوششوں میں سب کو مات کر دیا - اور تجدید و تاسیس کے مدارج آپ نے صد درجہ حسن کے ساتھ طے کئے -

کہنے والوں نے یہ بالکل سچ کہا ہے کہ شیخ نصیر الدین ہمارے زمانہ کے لئے رحمت و برکت ہیں - ان کا وجود اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم کا ایک نشان ہے - ان کی جامعیت نے سلوک و شریعت کو الگ ہونے اور ٹکرانے سے روک لیا ہے - وہ بظاہر ایک متشرع عالم ہیں - لیکن بہ باطن اپنے وقت کے

شبلی و جنید ہیں۔ اِن کی ذات ہمارے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔ وہ ایک ہی وقت میں امام ابن تیمیہ بھی ہیں اور شیخ عبدالقادر جیلانی بھی وہ اس دور کے مجدد' اس عصر کی روح' اور اس صدی کے زندہ کرنیوالے ہیں۔ ہم نے ان کا نظیر نہ دیکھا نہ سنا۔ حسن بصری و بایزید بسطامی کے حالات کتابوں میں پڑھتے ہیں' لیکن شیخ محمود کو رات دن اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ (یہ مختلف بزرگوں کے اقوال ہیں جو سیرت المحمود وغیرہ میں نام بنام لکھے ہیں۔) مگر میں سوائے اس کے اور کیا کہوں۔ کہ ع

اے تو مجموعۂ خوبی بچہ نامت خوانم!

اس زمانہ کے اکثر شعرائنے آپ کی مدح میں قصائد بھی لکھے ہیں۔ یہ تمام قصائد احمد الدین نامی ایک مریدنے ایک کتاب کی صورت میں جمع کئے ہیں' کل (۱۰۵) قصیدے ہیں' ۳۸۔ عربی میں ہیں اور باقی فارسی میں۔

لیکن مشیت کی عجب نیرنگیاں ہیں' ایک طرف تو آپ کی درباریاں عالمگیر ہو رہی تھیں' ہندوستان سے گزر کر تمام عالم اسلامی میں آپ کا سکہ چل رہا تھا۔ دوسری طرف مصیبتیں گھر گھر آ رہی تھیں۔ محمد تغلق کی دوستیاں دشمنی سے بدل رہی تھیں۔ اور ابتلاء و آزمایش کا نہایت سخت زمانہ آ رہا تھا۔ مگر یہ بھی بلندی فطرت کا ایک پیمانہ تھا مصیبت کی اس آگ نے اس طلاء احمر کی پوشیدہ حقیقتیں عالم آشکارا کر دیں۔

ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں میں سلطان محمد تغلق اپنے علم و فضل' دانش مندی و نیک نفسی' علو خیال اور عزم وارادہ کی وجہ سے ایک خاص امتیاز رکھتا ہے۔ لیکن یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ وہ نہایت فخر پسند مغرور اور طالب جاہ بھی تھا۔

ممکن ہے سلاطین اسلام میں اور بادشاہ بھی اس خو بو کے گزرے ہوں' لیکن عام اخلاق میں جو حیرت انگیز تشابہ صلاح الدین' منصور اور محمد تغلق میں ہے' دوسرے بادشاہوں میں نہ ہوگا۔ صلاح الدین نے شیخ الاشراق کو بڑھایا' منصور نے ابن رشد کی دماغی پرورش کی' تغلق نے شیخ محمود کی قدر دانی کر کے علماء ہند کا محسود بنا دیا۔ لیکن پھر کیا ہوا خندۂ لب چین جبیں سے بدل گیا۔ جنھوں نے رفعت و سربلندی کی قبائیں پہنائی تھیں' پھر انھیں نے تباہی و بربادی کی زنجیریں بھی ڈالیں۔ صلاح الدین نے شیخ الاشراق کو قتل کیا' منصور نے ابن رشد کو تباہ کیا' محمد تغلق نے شیخ محمود کو تکلیفیں دیں' اور جب تک زندہ رہا دشمنی سے باز نہ آیا۔

چونکہ محمد تغلق زمانۂ شہزادگی سے آپ کا بیحد دوست تھا اور دوستی کے بعد ایسی شدید دشمنی ایک حیرت انگیز واقعہ ہے اس لئے تذکرہ نویسوں نے اس کے اسباب کی تحقیق میں بہت جد و جہد کی ہے' اور ہر ایک نے مختلف اسباب بتلائے ہیں' ہم یہاں سب کا خلاصہ درج کرتے ہیں۔

تغلق کو ابتداء سے نہایت فخر پسند اور مغرور تھا' لیکن شہزادگی میں یہ باتیں دبی رہیں' مگر جب وہ سلطان ہوا تو یہ باتیں بھی سلطان ہو گئیں۔ شیخ محمود پہلے تو اسکی (ایک حد تک) من مانی عزت کرتے تھے' لیکن بے نیازی کا دور آنے کے ساتھ ہی بیجا عزت و حرمت چھوڑ دی اب وہ اسکو دوستانہ اور عزیزانہ غیر شاہانہ الفاظ سے مخاطب کرتے تھے' جو اسکو بہت ناگوار گزرتا تھا (سیرت المحمود)

جب اس نے دیوگیر کو مرکز سلطنت بنانا چاہا' تو آپ سے بھی درخواست کی کہ مع اپنے تلامذہ و مریدین کے تشریف لے جائیں لیکن آپ نے انکار کر دیا (سیرت المحمود)

اسی طرح جب وہ چنگیزیوں کے مقابلہ میں خراسان و ترکستان پر یلغار کرنا چاہتا تھا' اور عام مسلمانوں کو ابھارنے کی غرض سے تمام

علما و مشائخ کو دعوت دی، تو خاص طور پر آپ سے کہا کہ: ما می خواہیم کہ آن چنگیز ملعون را برانداز یم، حضرت شیخ با ما دریں کار موافقت خواہید فرمود" آپ نے کہا میں تیار ہوں لیکن پہلے گھر کا تو انتظام کرلو، ملک قحط کی مصیبت سے تباہ ہوا جا رہا ہے (سیرت المحمود)

ایک دفعہ آپ مہرولی جا رہے تھے، راستہ میں تغلق کی سواری مل گئی، آپ اس کو دیکھکر دوسری طرف ہو گئے، اتفاق سے زین الدین۔ مخلص الملک کی نگاہ پڑ گئی، اس کو آپ سے خصومت تھی، سلطان سے بولا: شیخ نصیر الدین ابھی اس راہ سے جا رہے تھے، لیکن کوکبۂ سلطانی کو دیکھ کر پھر گئے (اخبار الاولیا)

ایک روایت یہ بھی ہے کہ تغلق نے ایک دفعہ حریر و اطلس کے چند تھان، اور کئی ہزار اشرفیوں کی تھیلی آپ کے پاس بھیجی۔ آپ نے حسب عادت لینے سے انکار کر دیا (سیر الاولیا)

ان سب پر مستزاد اس کا حضرت محبوب الٰہی سے عناد رکھنا، اور اس عہد کے صوفیاء و مشائخ پر ظلم و ستم تھا۔ جس سے آپ اسکو ہمیشہ روکتے تھے، اور کئی دفعہ صاف لفظوں میں کہہ چکے تھے کہ: بادشاہوں کے لئے جو اخلاق ضروری ہیں، افسوس ہے کہ تم ان سے دور ہوتے جاتے ہو۔ استقلال نام کو نہیں، کانوں کے کچے، ظلم و ستم میں شیر، درویش آزاریوں کے خوگر ہو۔ غرور و خود پسندی تمھاری سرشت اور نخوت و کینہ پروری تمھارا شیوہ ہوتی جا رہی ہے۔ میں تم کو کئی دفعہ ان بری عادتوں سے روک چکا ہوں، مگر دیکھتا ہوں کہ تمہیں اس طرف ذرا التفات نہیں۔ بری عادتوں میں روز بروز زیادتی ہے، اور تم بجائے سلطانی و فرماں روائی کے سزاوار بننے کے دن بدن ناقابل بنتے جاتے ہو۔ کاش تمھیں اب بھی ہوش آئے، اور یہ بری عادتیں تم سے چھوٹیں۔ ورنہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ ذمائم اپنا رنگ لائیں اور اس بلندی کو پستی دیکھنی پڑے (سیرت المحمود و تذکرۃ الفضلا)

بہرحال ان وجوہ سے محمد تغلق آپ کا جانی دشمن ہو گیا تھا، اسپر مخلص الملک، نوازش علی اور محمد عمر کی چغلیاں گویا جلاد کے ہاتھ میں تلوار تھیں ان کی لگائی بجھائی سے ان کی پیاس اور بڑھتی جاتی تھی، اور وہ یہ چاہتا تھا کہ کسی حیلۂ شرعی سے شیخ کا قصہ پاک کر دے۔

ایک دفعہ شیخ کو مع احباب و موالی مدعو کیا، سونے چاندی کے برتنوں میں کھانا چنا گیا کہ اگر ان برتنوں میں کھانا کھا لیا تو فعل ناشرع کی سزا دی جائے گی، اور اگر انکار کیا تو قبول دعوت سے انکار کا جرم لگایا جائیگا۔ مگر آپ نے کعبہ و بتخانہ کے بیچ سے راہ نکال لی، طشتریوں میں کھانے کے بجائے تھوڑے سے چاول ہتھیلی پر رکھ کر کھا لئے، اور سب نے اسی کا اتباع کیا۔ تغلق افسوس سے ہاتھ ملنے لگا۔ (اقتباس الانوار)

اسی طرح اور مختلف طریقے اختیار کئے، کبھی مسائل میں گفتگو کی، کبھی اعتقادات پر بحث کی، کبھی تفسیری مباحث چھیڑے، کبھی علم کلام پر مناظرہ کیا، کبھی صوفیا کرام پر اعتراضات کئے، کبھی حضرت محبوب الٰہی کی بدگوئیاں کیں۔ کبھی اپنے دربار کے دو لامذہب عالموں اسعد منطقی و علم الدین فلسفی) کو بحث کے لئے آگے کر دیا۔ مگر آپ اپنے علم و فضل اور دانش و فراست سے ہر منزل سے کامیابی کے ساتھ نکلتے رہے (سیرت المحمود)

جب وہ اپنے تمام اوچھے وار ختم کر چکا، تو اب اس نے اپنے ترکش سے آخری تیر نکالا۔ یہ تیر خدمت و چاکری کا تیر تھا اخبار الاولیا میں لکھا ہے:-

سلطان محمد تغلق، حضرت شیخ نصیر الدین را باین کمال رست کہ داشت از راہ عناد ایذا ہا کردے، و در سفر ہمراہ خود گردانیدے، وقتے اورا جامہ دار خود گردانیدہ بود"

تاریخ فرشتہ بھی کہتا ہے کہ:۔

"شیخ نصیر الدین محمود در تکلیف جامہ پوشانیدن نمود" (سیرۃ المحمود جلد دوم)

یہ سنکر مرید و شاگرد اور تمام عقیدت مند بہت برافروختہ ہوئے، اکثر غصہ میں آپے سے باہر ہو گئے، تیوریاں بدل گئیں، نیاموں سے تلواریں نکل آئیں۔ مگر جو شورش و ہنگامہ کا دشمن ہو، جو فساد و خوں ریزی سے اللہ کی زمین کو پاک کر دینا چاہتا ہو، اور جس کا مقصد نیکی و راستی، صدق و محبت اور امن و خدا پرستی کے پاک جذبات سے دنیا کو لبریز کر دینا ہو، اور جس نے اپنی ساری زندگی میں گالیاں سن سنکر، اور مصیبتیں سہہ سہہ کر انسانیت کی خدمت کی ہو، وہ ان باتوں کو کب گوارا کر سکتا تھا۔ فرمایا:۔ میرے دوستو میں نہیں چاہتا کہ میرے لئے کسی مسلمان کے خون کا ایک قطرہ بھی بہے۔ خدارا محمود پر رحم کرو، اسے روز حشر کی پرسشوں سے بچالو وہ اس روز اس ہنگامہ آرائی کا کوئی جواب نہیں دے سکیگا۔ واللہ یہ گناہ کفر سے زیادہ ہے۔ مسلمان کو فتنہ انگیزی سے بچنا چاہئے، تم اس کی طرف لپکتے ہو، مسلمان کا کام امن و عافیت پھیلانا ہے، لیکن افسوس کہ تم دعوی اسلام کے ساتھ فساد کو پھیلاتے ہو، مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان محفوظ رہیں، لیکن آہ کہ تمھاری جلد بازیاں تمھارے ہاتھ خون سے رنگنا چاہتی ہیں۔ اور تم وہ کام کرنے پر تل رہے ہو جس کے تصور سے میری روح کانپتی ہے۔ مجھے بتلاؤ تمھاری ناراضی کی وجہ کیا ہے؟ کیا میرا خدمت کرنا اسلام کے خلاف ہے کیا اس سے خدا کی وحدانیت، رسول کی رسالت اور قیامت کے برحق ہونے کا انکار لازم آتا ہے؟ اگر یہ نہیں ہے تو پھر کیا ہے جس کے لئے تمھاری چٹکیاں تیر پھینکنے پر بے تاب ہیں۔ کیا ہزاروں آدمیوں کا خون بہنے، اور مدتوں قید و بند کا سلسلہ جاری رہنے سے یہ بہتر نہیں ہے کہ میں خوشی خوشی سلطان کی خدمت کے لئے تیار ہو جاؤں؟ سوچو، سمجھو اور اپنی جان ہلاکت میں نہ ڈالو۔ میری خوشی یہی ہے کہ تم مجھے میرے حال پر چھوڑ دو، اور اطمینان و یکسوئی سے اپنے اپنے کاموں میں مشغول رہو، یاد رکھو بادشاہ کی اطاعت معصیت کے سوا ہر حال میں فرض ہے۔ خواہ اس سے کسی کو تکلیف ہو یا خوشی۔ جماعت کے مقابلہ میں اشخاص کوئی چیز نہیں ہیں۔

اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم، فان تنازعتم فی شیء فردوہ الی اللہ والرسول،

پھر تمھیں کیا منظور ہے؟ صاف صاف کہدو کہ تم میرے دوست ہو یا دشمن؟ میری روح کو تکلیف دینی چاہتے ہو یا خوشی؟ اسی فیصلہ پر میرے تمھارے تعلقات کا انحصار ہے (یہ تقریر سیرت المحمود، اخبار الاولیا اور تذکرۃ الفضلا میں بہ تفصیر الفاظ لکھی ہے۔ میں نے الفاظ کو چھوڑ کر تینوں کا مفہوم لیا ہے) سب نے گردنیں جھکالیں تلواریں اور کمانیں پھینکدیں۔ اس کے بعد آپ دربار میں تشریف لے گئے، وہاں سب آپ کے منتظر تھے، سلام مسنون کے بعد آپ نے تغلق سے کہا: میں خدمت کیلئے تیار ہوں مجھے اس سے بھی انکار نہیں ہے کہ دربار مجھ سے ذلیل سے ذلیل کام لے میں اس کے لئے بھی مستعد ہوں کہ سلطان مجھے مشرق سے مغرب تک دوڑنے کا حکم دے، مجھے اس میں بھی تامل نہیں ہے کہ فلک بوس بلندیوں سے کودنے کا حکم دیا جاسے میں اس کے لئے بھی آمادہ ہوں کہ بادشاہ

اپنے تئیں نثار کر دوں۔ لیکن اے میرے دوست! کیا تم اپنے جاں نثار کی ایک بات قبول کرو گے؟ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم اپنے اندر اخلاق حسنہ پیدا کرو۔ تغلق یہ آخری الفاظ سنکر اثر میں ڈوب گیا اور کہتے ہیں کہ کئی دن اس اثر میں ڈوبا رہا (سیرت المحمود) مگر افسوس بہت ہی کمزور تھا، نفس اس پر حاوی ہو گیا۔ مگر وہ اس پر قابو نہ پا سکا۔ اس کے دل سے راستی کا جذبہ تیر کی طرح نکل گیا، اس نے حکم دیا کہ شیخ سفر و حضر میں پابہ زنجیر اس کے ساتھ رہیں، پھر کئی برس کپڑے پہنانے کی خدمت لی، اس کے بعد دہلی سے آدھ گھنٹہ میں نکل جانے کا حکم دیا، اور عاملوں کو لکھ بھیجا کہ شیخ محمود حدود دہلی میں نہ آنے پائیں۔ چنانچہ جب تک وہ زندہ رہا آپ بن باسی رہے۔

فرشتہ نے لکھا ہے۔

"از قضا دراں مدت پادشاہ را قضایائے عجیبہ پیش آمدہ در ہماں زودی فوت شدہ بندگانِ خدا خلاصی یافتند"

(جلد دوم صفحہ ۵۵)

لیکن تغلق کی کشتی کنارے آلگی تھی اور شیخ کا دہلی سے باحال پریشان نکلنا، دراصل کامیابیوں کے ساتھ واپس آنا تھا۔ (اخبار الاولیا لبضمن تذکرہ مولانا نور ترک) نارنول پہونچتے پہونچتے تخت حکومت تغلق سے فیروز شاہ کو منتقل ہو گیا۔ فیروز شاہ آپ کا بہت معتقد تھا۔ اس نے اسی وقت قاصد بھیجکر آپ کو بلایا اور بہت خاطر تواضع کی (سیر السالکین)

بعض تذکروں میں لکھا ہے کہ آپ نے قبول خدمت سے انکار کر دیا تھا، اور انتہائی مصیبتیں بھگتنے پر بھی خدمت کے لئے تیار نہ ہوئے تھے، یہاں تک کہ فیروز شاہ کا زمانہ آیا اور اس نے رہائی دی۔ لیکن یہ واقعات غلط ہیں، اس روایت کی حامی صرف دو کتابیں ہیں ایک اخبار الاولیا، دوسری سلسلہ نظامیہ۔ فرشتہ مذبذب ہے اس نے دونوں روایتیں لکھ دی ہیں۔ اس کے مقابلہ میں واقعات مذکورہ کے ماخذ چھ سے زیادہ ہیں، اور سب یک زبان ہیں کہ "ہمہ را تحمل کرد و دم نہ کشید"

سیرت المحمود میں لکھا ہے کہ تسلیم و رضا کا جذبہ اخیر عمر میں بہت بڑھ گیا تھا جس کی سب سے بڑی نظیر واقعہ وفات ہے۔ اس زمانہ میں زیادہ وقت ذکر و شغل اور تلاوت قرآن میں صرف ہوتا تھا، ملنا جلنا، آنا جانا پڑھنا پڑھانا قطعاً بند ہو گیا تھا، عصر کے بعد سے صبح تک کسی سے نہیں ملتے تھے اور حجرہ میں دروازہ بند کر کے اپنے خاص کاموں میں مشغول رہتے تھے۔

ایک روز ایک قلندر آیا، خادموں نے اس کو کچھ دے دلا کر رخصت کرنا چاہا، مگر وہ قلندر کی صورت میں ملک الموت تھا سب کچھ لے کر بھی نہ ٹلا، اور اپنا سوال بڑھاتا رہا، آخر میں بولا: میرا سوال ایک گھوڑا ہزار دینار، دو زربفت کے تھان اور شیخ سے ملنا ہے۔ جب تک یہ سوال پورا نہ ہو گا نہیں جاؤں گا" خادموں نے شیخ سے اجازت لیکر اس کو اندر بھیجدیا، اب کیا تھا اس کو من مانی مراد مل گئی، اس نے حجرہ میں قدم رکھتے ہی دروازہ بند کر کے بغیر کچھ کہے سُنے خنجر سے ایسے زخم لگائے کہ سارا جسم لہولہان ہو گیا، رگیں کٹ گئیں۔ خون کے فوارے چھوٹ نکلے اور شیخ تڑپ تڑپ کر بیہوش ہو گئے۔ مگر اس ظالم نے اس پر بھی بس نہ کی لاتوں سے خوب روندا، داڑھی نوچ ڈالی، انگلیاں توڑ دیں، ناخن جدا کر دیئے اور پوری طرح اپنا اطمینان کر کے (کہ دم نکل گیا ہے) دروازہ کھول کر بھاگا۔ خادموں نے خون آلود کپڑے دیکھکر پکڑ لیا، شیخ کو آکر دیکھا تو حالت بہت ہی زار و نزار تھی۔ مولانا صدر الدین حکیم کو

اطلاع دی وہ شہر کے تمام طبیبوں کو لیکر اسی وقت آئے، فیروز شاہ بھی یہ ماجرا سنکر آیا، قلندر حراست میں لے لیا گیا، چوتھے دن بڑی مشکل سے ہوش آیا۔ تمام عقیدت کیش حاضر تھے، فیروز شاہ بھی موجود تھا، قلندر پیش کیا گیا، آپ اس کو پابہ زنجیر دیکھکر آبدیدہ ہوگئے، بولے اس کو چھوڑ دو، یہ بے قصور ہے" اس کے بعد اس سے فرمایا" میں بہت شرمندہ ہوں کہ میری وجہ سے تم کو اسقدر تکلیف پہونچی، امید ہے کہ تم معاف کردوگے" پھر فیروز شاہ سے کہا کہ اس کا سوال پورا کردو، مجھپر احسان ہوگا (یہ واقعہ قریب قریب تمام تذکروں میں ہے مگر یہ تفصیل صرف سیرت المحمود اور اخبار الاولیا میں ہے)

دم آخر تھا لوگوں نے قبر کی نسبت پوچھا، فرمایا "اسی حجرہ میں بنے گی، پختہ نہ کرنا" تبرکات ساتھ جائیں گے، خرقہ سینے پر، کاسہ سرہانے تسبیح ہاتھ میں اور عصا پہلو میں رکھنا (اقتباس الانوار) فرشتہ کا بیان ہے کہ سید گیسو دراز کو توقع تھی کہ یہ چیزیں انھیں انعام ہونگی، لیکن یہ وصیت سنکر بہت رنجیدہ ہوئے، اور اس رنج میں دہلی سے نکل کر دکن چلے آئے (جلد دوم صفحہ ۷۵۰)

شہر میں وفات کی پہونچتے ہی کہرام مچ گیا، نماز جنازہ میں دہلی کے چھوٹے بڑے سب شریک تھے کئی جماعتیں ہوئیں۔ کہتے ہیں کہ اس روز در و دیوار پر ماتم کی سی تاریکی چھاگئی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا دہلی بےچراغ ہوگئی ہے (سیرت المحمود) اس درد و غم میں اکثر شعرا نے نوحے اور مرثیے لکھے۔ ان صفحات میں گنجائش نہیں ہے کہ ان کے منتخب اشعار بھی لکھے جائیں، شیخ کو مولانا مظہر سے خاص انس تھا، اس لئے یہاں ان ہی کے نوحے کے چند شعر لکھے جاتے ہیں (اخبار الاخیار)

زد در محنت ایں نہ سپہر زنگاری — کدام دل کہ نہ خوں گشت از جگر خواری
کجا بہ جام طرب مجلسے بنا کردند — کہ از سپہر بباریدہ سنگ قہاری
وفا ز عالم فانی مجو کہ مشہور اند — فلک بخیرہ کشی اختران بغداری
خزینہ ایست سپہر از نفوس انسانی — دفینہ ایست زمیں از تبان فرخاری
تو اے عزیز کہ در ملک و مال مغروری — مباش ایمن اگر عاقلی و ہشیاری
چہ دانی آنکہ در اوراق کارخانۂ غیب — قضا چہ نقش برآورد ز کلک جباری
زمانہ صلح کند با دل تو با خصمے — فلک بدشمنی آید بہ پیش با یاری
چو وقت آں برسد ہیچ کس نگیرد دست — نہ ملک بے ملکی نے سپاہ سالاری
بقا بقائے خدا ایست ملک ملک خدائے — کہ نیست قائم و دائم کسے بجز باری
ز دست چرخ ندانم کجا کنم فریاد — کہ برگذشت بما جور او ز بسیاری
جہاں بماتم خواجہ نصیر دیں محمودؒ — ہزار گونہ فغاں کرد نوحہ و زاری
بقیۂ سلف و یادگار اہل کرم — کہ کرد ختم خلافت بملک دیں داری
ہہنا ملکاً منعماً خدا وندا — بحق نعمت قرآن و دولت قاری

برحمت تو کہ عام ست در جہاں باقی | بعزت تو کہ خاص ست در جہانداری
کہ اے روح اعظم آں شیخ پیشوائے کرام | کہ مقتدائے جہاں بودہ دست زاخیاری
ندیم قرب عز خود کن غریق رحمت خویش | مجاور رسل و انبیاء مختاری
بساط صحن دہ از حلہ ہائے فردوسی | غلاف خیرکن از پردہ ہائے غفاری

صفحات بالا میں آپ شیخ کے حسن سیرت کے خد و خال دیکھ چکے ہیں، اب آیئے ایک نظر صحبتوں کے حسن بیان پر ڈال لیں۔ قاضی عبد المقتدر رنے مناقب الصدیقین میں اور حمید قلندر رنے خیر المجالس میں آپ کے ملفوظات جمع کئے ہیں، سطور ذیل میں چند جواہر ریزے پیش کئے جاتے ہیں:-

چند طالب علم اجزائے سلوک پر بحث کر رہے تھے۔ کوئی علم کا طرفدار تھا کہ یہی سلوک کی انتہائی بلندیوں تک پہونچا سکتا ہے۔ کوئی عمل کا حامی تھا کہ بغیر عمل علم بے سود ہے، اور کوئی صرف نیت ہی کو لیتا تھا کہ نیت کے صدق و خلوص پر ہر کام کے فتح یاب کا انحصار ہے۔ آپ نے انکی یہ بحث سنکر فرمایا: تم سب اپنے اپنے خیال میں سچے ہو، افراط و تفریط اٹھا دو تو تمھارے خیالات ایک ہی زنجیر کی کڑیاں بن جائیں گے۔ مراتب سلوک میں پہلا درجہ علم کا ہے، دوسرا عمل کا، تیسرا نیت کا۔ علم کے بغیر عمل درست نہیں ہوتا، عمل کے بغیر نیت کا وجود نہیں، اور نیت صالح نہیں تو علم و عمل دونوں بیکار ہیں۔ سالک کے لئے یہ تینوں غذا، پانی اور ہوا کی طرح ضروری ہیں۔

فرمایا مبتدی کے لئے اولین کام دل کی نگرانی ہے، اسکو چاہئے کہ ہر وقت دل پر نظر رکھے اور خدا کی طرف متوجہ کر کے اسی میں مشغول کر دینے کی کوشش کرے۔

فرمایا: لوگ کرامت پر مرتے ہیں، حالانکہ سالک کے لئے یہ چیز موت ہے۔ ایمان کی فکر کچھ کم نہیں ہے کہ اور باتوں کی طرف توجہ ہو حیران ہوں کہ خلق بغیر مشاہدہ کیسے جیتی ہے۔

فرمایا: شریعت میں کمال حاصل کئے بغیر طریقت میں آنا بیحد خطرناک ہے۔ جو لوگ ایسا کرتے ہیں وہ زہر کا پیالہ پیتے ہیں۔ استقامت شرع کی صورت میں طریقت سے گر کر شریعت میں رہ سکتے ہیں، لیکن عدم استقامت کی صورت میں طریقت سے گر کر کہاں جائینگے جن کا ظاہر پاک نہ ہو اُن کا باطن بھی پاک نہیں ہو سکتا۔

کسی نے پوچھا درویشوں پر جو حال طاری ہوتا ہے اسکی کیا وجہ ہے؟

فرمایا: حال صحت اعمال کا نتیجہ ہے۔ اعمال کی دو قسمیں ہیں، ایک عمل جوارح دوسرا عمل قلب۔ عمل جوارح عبادات و مجاہدات ہیں، اور عمل قلب مراقبہ۔ والمراقبۃ ان تلازم قلبک العلم بان اللہ ناظر الیک۔ ان دونوں عملوں سے روح پر انوار نازل ہوتے ہیں ان کا اثر قلب پر آتا ہے، قلب سے جوارح متاثر ہوتے ہیں۔ پھر اُسی نے کہا کہ صاحب عوارف نے اہل حال کو متوسط کہا ہے، "المبتدی صاحب وقت والمتوسط صاحب حال، والمنتہی صاحب انفاس" حاضرین کو یہ سنکر بہت تشویش ہوئی، فرمایا: گھبراؤ نہیں، بات بالکل صاف ہے۔ مبتدی کا سب سے پہلا کام اوقات کی نگرانی اور ہر لمحہ کو غنیمت جان کر کام میں لگانا ہے۔ جو شخص ایسا کرتا ہے وہ صاحب وقت ہے۔ چونکہ مواہب کا سبب

نتیجہ ہوتے ہیں' اور مکاسب میں یکسانی نہیں ہوتی' ہمیشہ گھٹاؤ بڑھاؤ رہتا ہے' اس لئے عالم علوی سے روح پر جن انوار کا نزول ہوتا ہے۔ وہ دوامی نہیں ہوتے بلکہ بجلی کی طرح چمکتے اور غائب ہو جاتے ہیں۔ لہذا ایسا شخص جو اس درجہ میں ہو متوسط ہے۔ لیکن جب اس کیفیت میں قیام و دوام ہو جاتا ہے تو اضطراری احوال استمراری ہو کر انفاس سے مل جاتے ہیں' اور کوئی سانس بغیر احوال کے نہیں گزرتا۔ جو شخص اس درجہ میں پہونچ جاتا ہے وہ سلوک کی منزل اول کا منتہی ہوتا ہے۔

ایک شخص نے دریافت کیا کہ انسان مرنے کے بعد اپنی اصل کی طرف راجع ہوتا ہے یا نہیں؟

فرمایا: راجع وہی ہوتا ہے جو زندگی میں اپنے مرجع کو پہچان لیتا ہے' اور موافق و علائق کو قطع کر کے اپنے تئیں اسمیں فنا کر دیتا ہے۔ لیکن جس کا جینا ایسا نہیں ہوتا' وہ مرنے کے بعد انہیں چیزوں کی طرف رجوع ہوتا ہے جن کے اندر زندگی میں منہمک تھا۔

فرمایا: سلوک میں اصل چیز نفس کی محافظت ہے' صوفی کو مراقبہ میں نفس پر نگاہ رکھنی چاہیئے' اس کا ہر سانس دیکھا اور گنا ہوا ہو تاکہ خاطر جمع رہے۔ نفس سے توجہ ہٹتے ہی خاطر پریشان ہو جاتی ہے' بعض مشائخ نے المنتہی صاحب نفس کے یہی معنی لئے ہیں' اور ہندوؤں میں سادھو ایسا ہی کرتے ہیں۔

کسی نے پوچھا: ظاہری اور باطنی طہارت میں کیا فرق ہے؟ بولے: ظاہری طہارت وضو سے قائم ہوتی اور حدث سے ٹوٹ جاتی ہے۔ لیکن باطنی طہارت اس کی بھی متحمل نہیں ہوتی۔ محدثات میں پہلی چیز دنیا ہے' اس کا خیال گزرتے ہی سالک پر غسل طریقت فرض ہو جاتا ہے۔

فرمایا: اے عزیز میں نہ خلوت رکھتا ہوں نہ مشغولی' سارا دن لوگوں سے ملنے جلنے میں گزر جاتا ہے۔ لیکن تمھارے پاس فرصتیں ہیں' خلوتیں اور تنہائیاں ہیں' انھیں ضائع نہ کرو' جو دم بھی گذر جائے غنیمت جانو' ایسا وقت پھر نصیب نہ ہوگا۔ کوشش کرو کہ نفس پر قابو ہو جائے' اور ہر جگہ اور ہر حال میں وہ اپنے کام میں مشغول رہے۔

پوچھا گیا راہ کیا ہے اور منزل کونسی؟ فرمایا: کس راہ و منزل سے سوال کرتے ہو؟ ارباب شریعت کی راہ و منزل سے یا اصحاب طریقت کی؟ عرض کیا۔ دونوں سے۔ کہا: ارباب شریعت کی راہ و منزل نفس و مال سے اٹھ جاتا ہے: ان اللہ اشترٰی من المومنین انفسھم و اموالھم اور اصحاب طریقت کی راہ و منزل جان و دل سے اٹھ جانا اور وحدت میں رہنا ہے۔ و تبتل الیہ تبتیلا و ان الی ربک المنتہی۔ دوستو! تم مسافر ہو' مسافروں کی طرح رہو۔ مسافروں کو اقامت کی نیت درست نہیں ہوتی' پھر تم نے راستہ میں کیوں پڑاؤ کر لیا؟ اٹھو چلنے سے ایمان تازہ ہوتا ہے' بیٹھ رہنا گناہ ہے۔ تم خواہ شریعت میں ہو خواہ طریقت میں۔ ہر حال میں مسافر ہو۔ تمہارے سفر کی منزل مقصود مالک الملک کا مشاہدہ ہے۔ عرض کیا: مالک الملک کہاں ہے کہ روئے دل اسکی طرف پھیریں: فرمایا کونسی جگہ ہے جہاں وہ نہیں ہے؟ اینما تولوا فثم وجہ اللہ۔ یہ نہ خیال کرو کہ وہ تم سے دور ہے' اور ہم اس کو کہاں ڈھونڈیں۔ ذرا اپنے محجوبات و مالوفات سے نکل کر تو دیکھو ؎

تا دیدہ بود دیدہ کجا آید دوست خواہی کہ شود دیدہ برون آئی ز پوست

ازدیدہ و دید لیؒ چو تو بگذشتی دانی کہ کسے نیست بہ بینی ہمہ اوست

فرمایا: سلوک میں آستین کوتاہ کردی جاتی ہے، اور سر کے بال تراش دیئے جاتے ہیں۔ مگر جانتے ہو اس کا کیا مطلب ہے؟ دنیا سے دست کشی اور راہ حق میں سربازی سلوک کی منزل اول ہے۔ آستین چھوٹی کرنا اور بال تراشنا۔ سالک کو اسی طرف ہدایت کرتا ہے۔ مگر افسوس کہ اہل طریقت جانتے بوجھتے ان باتوں سے روگرداں ہوگئے ہیں، اور سلوک کی ان معمولی معمولی باتوں کی بھی پابندی نہیں کرتے، تابدیگراں چہ رسد

کسی نے کہا: مشائخ نماز کے بعد مصافحہ کیوں کرتے ہیں۔؟ فرمایا: مسافر باہر سے آکر مصافحہ کرتے ہیں۔ مشائخ بھی نماز سے فارغ ہوتے ہیں تو باہر سے آتے ہیں۔ ان کی نماز روحانی سفر ہوتی ہے، وہ اسوقت اپنے آپے میں نہیں ہوتے۔

فرمایا۔ طلب و جوع ہر کامیابی کے لئے ضروری ہے، وہ طلب ناقص ہے جس کے لئے قربانیاں نہ کی گئی ہوں۔ جو مقصد جتنا اعلیٰ ہوتا ہے اس کے لئے اتنی ہی زیادہ قربانیاں کرنی پڑتی ہیں۔ خدا کی محبت تکمیل انسانیت کا آخری مقصد ہے۔ سالک کو اپنے اندر صدق طلب اور حصول مقصد کے لئے جان توڑ کوشش کرنی چاہیے۔ مشائخ نے ابتدا میں روزہ اسی لئے قرار دیا ہے، تاکہ جس مقصد سے محبوبات و مالوفات کو ترک کیا گیا ہے۔ اسکی یاد ہر دم تازہ رہے، مادیت کم ہو، روح میں تازگی آئے۔ دنیا کی طرف سے دل ہٹے، اور ولولۂ طلب دمبدم بڑھتا رہے۔ جو لوگ اس حصار میں داخل ہو جاتے ہیں، نفس اور شیطان کی آمد و شد سے محفوظ ہو جاتے ہیں، اور اُن کے خطرات رحمانی ہوتے ہیں۔ میں ہر مبتدی کو جوع بے صوم کی (جو قوی ہو) اور جوع با صوم کی (جو کمزور ہو) ہدایت کرتا ہوں۔

پوچھا: جاھدوا فینا کے کیا معنی ہیں؟ فرمایا: اہل ادب کلمہ فی کی اتصالیت پر زور دیتے ہیں، اور ظرف و مظروف کی بحث چھیڑتے ہیں۔ لیکن مشائخ کے ہاں کچھ اور معنی ہیں۔ وہ کہتے ہیں مجاہد کی تین قسمیں ہیں۔ ایک دوزخ سے ڈرنے والے، دوسرے بہشت کے امیدوار تیسرے خدا کے طالب۔ جنت و دوزخ کی امید و بیم مجاہدہ مجاہدہ للشر ہے، اور طلب مولیٰ کا مجاہدہ مجاہدہ فی اللہ ہے۔ اول الذکر مجاہدے معمولی اور آسان ہوتے ہیں۔ لیکن آخر الذکر مجاہدہ نہایت سخت اور مشکل ہوتا ہے، اسی کی نسبت ہے جاھدوا فی اللہ حق جھادہ مطلوب جتنا بلند ہوتا ہے۔ اتنی ہی زیادہ اس کے لئے محنت کی جاتی ہے۔

فرمایا: اعمال کی قبولیت جذبہ پر موقوف ہے، جو کام جذبہ سے نہ ہوگا قبول نہیں کیا جائیگا۔ جذبہ کے لئے کوئی وقت معین نہیں ہے، کبھی بچپن میں پیدا ہوتا ہے، کبھی جوانی میں، کبھی بڑھاپے میں۔ لیکن اس کے مراتب ہیں، عوام کا جذبہ اعمال میں توفیق پاتا ہے، اور خواص کا جذبۂ عشق خالق میں فنا ہوجاتا ہے۔

فرمایا: محبت کی دو قسمیں ہیں، ایک محبت ذات دوسرے محبت صفات۔ محبت ذات مواہب سے ہے، اور محبت صفات مکاسب وہ ہماری دسترس سے باہر ہے، اور یہ بالکل ہمارے ہاتھ میں ہے ہمیں چاہئے کہ اس قدرت کو کام میں لائیں، اور ایک دم کے لئے بھی اپنے اس اختیار اور فرض سے غافل نہ ہوں، ہمارا کام بالکل صاف اور واضح ہے، ہمیں فانی زندگی، اور ماسویٰ کے الجھاؤ سے نکل کر عشق الٰہی سرشاری لینی ہے ہمیں اسکو لینے کی جدوجہد کرنی چاہئے۔ اس کے چار رکن ہیں: عزلت، قناعت، توبہ، قلادگی۔ جو لوگ ان کی حقیقت کو پالیتے ہیں وہ تمام خطرات و مہالک سے محفوظ ہو جاتے ہیں، ان کے آگے روحانی ترقیوں کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ اور وہ ابدی

زندگی حاصل کر لیتے ہیں۔

فرمایا: جب تک راہ نہ چلیں منزل کو نہیں پہونچ سکتے، جہد و کوشش ضروری ہے: والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا مجاہدہ بھی راہ روی ہے، اس سے روح آلائشوں سے پاک اور مادی گرفتاریوں سے آزاد ہو جاتی ہے۔ جس مقصد سے جو کام کیا جاتا ہے اور جستجو، جوش و سرگرمی سے کیا جاتا ہے وہ آخر عروس کامیابی کی صورت دیکھتا ہے۔

فرمایا: سالک کو اپنے کام میں سپاہی کی طرح مضبوط، مستعد، اور بلند ہمت ہونا چاہئے۔ زمانہ کے گرم و سرد کے طوفان اٹھیں اور گزر جائیں، راحتوں اور خوش حالیوں کی حکومتیں قائم ہوں اور چٹ ہو جائیں۔ لیکن اس کا دل اس جلوۂ سراب سے میلانہ ہو وہ اپنی جگہ سے سرمو جنبش نہ کرے، اس کا ارادہ لوح محفوظ کی طرح اٹل رہے، اس کی نظر دم بھر کو نہ چوکے۔

انسان لیسیر الحصول کامیابیوں کی قدر نہیں کرتا، اس لئے کوئی کامیابی سامنے نہیں آجاتی۔ آرام کا خوگر ہونے کے سلئے تکلیف کا مزہ چکھنا ضروری ہے۔ حضرت موسیٰ کو نبوت کی منزل تک پہونچنے کے لئے بیشمار مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ تنور میں ڈالے گئے، تابوت میں رکھے گئے۔ دشمن کے ہاتھ گرفتار ہوئے، قبطی کی موت کا واقعہ پیش آیا، چودہ برس غریب الوطنی کی مصیبت اٹھائی، اور ایک دم کو آرام نہ پایا۔ تاہم وہ دل تنگ نہ ہوئے، ہر منزل فاتحانہ اولوالعزمی سے طے کی۔ ایک رات زمین سے آسمان تک اندھیرا چھا رہا تھا، بجلی چمک چمک کر غائب ہو جاتی، اور کڑک سے ساری مخلوق کپکپا جاتی تھی، بادلوں کی گرج سے کوہ و صحرا دہلے ہوئے تھے، مینہ کہتا تھا اب برس کے پھر نہ برسوں گا، سردی ایسی شدید تھی کہ معلوم ہوتا تھا برف کٹ رہی ہے، جنگل کے وحشی جانور اپنے بھٹوں سے نکل پڑے تھے۔ اور موسیٰ اپنی بی بی کو لئے لق و دق جنگل میں بھٹک رہے تھے۔ اسی حال میں ان کو درد زہ اٹھا، اور آناً فاناً اتنا بڑھ گیا کہ وہ ضبط نہ کرسکیں۔ موسیٰ نے کونے کھدروں میں آگ ڈھونڈی، مگر اس موسلا دھار مینہ میں وہ کہاں مل سکتی تھی، چقماق کی آگ بھی سردی اور پانی سے بجھ گئی تھی۔ مجبور و مایوس ہو کر بیٹھ گئے۔ لیکن مصیبتوں کی یہ آخری منزل تھی۔ خدا نے اسی کف دست جنگل کو کامرانیوں کا باغ سدا بہار بنا دیا۔ قریب کی پہاڑی پر آگ کا شعلہ چمک کر بولا: انی انت۔ نادا، موسیٰ بے تابانہ دوڑے مگر وہاں پہونچے تو اور ہی گل کھلا آواز آئی انا ربک فاخلع نعلیک انک بالواد المقدس طویٰ۔ پس میرے دوستو! راہ مقصود میں مصیبتیں برداشت کرنے کیلئے تمہیں بھی ایسا ہی قوی دل، بلند ہمت، اور جوان عزم ہونا چاہئے۔

در رہ منزل جاناں کہ خطرہاست بسے ۔۔۔ شرط اول قدم است کہ مجنوں باشی

فرمایا: موجودات محسوس کو اصطلاح تصوف میں عالم ملک کہتے معقول کو عالم ملکوت، بالقوہ کو عالم جبروت۔ اور اس کے ماوراء کو عالم لاہوت کہتے ہیں۔ ان میں سے ہر عالم دوسرے عالم پر محیط ہے اور یہ احاطہ لطافت کی وجہ سے ہے۔ ملک کے مقابلہ میں ملکوت کے اور ملکوت کے مقابلہ میں جبروت کے لطائف بہت لطیف ہوتے ہیں۔ مگر لاہوت کے لطائف لطیف تر ہوتے ہیں اسی وجہ سے لاہوت، ملک و ملکوت اور جبروت کے ذرہ ذرہ پر محیط ہے۔ اور اسکی ساری حقیقتیں آئینہ کے مانند اس پر منعکس ہوتی ہیں جو لوگ اس مقام میں پہونچ جاتے ہیں، زمان و مکان کی قید سے آزاد ہو جاتے ہیں، ان کے لئے قرب و بعید سب یکساں ہو جاتا ہے۔

ظاہر و باطن سب پر ان کی نگاہ ہوتی ہے یہی مقام ہے جہاں وھو معکم اینما کنتم اور نحن اقرب الیہ من حبل الورید۔ راست آتا ہے۔

فرمایا عشق کا کمال یہ ہے کہ عاشق کے لئے منع و عطا، رد و قبول، رحمت و لعنت ایک ہو جائے، جب تک فرق کا احساس باقی ہے عشق ناقص ہے۔ کمال وہاں ہے جہاں فرق نہیں ہے۔ جو عشق اس درجہ کو پہونچ جاتا ہے وہ سچا عشق ہے، اس کے لئے لعنت بھی رحمت اور ہجر بھی وصال ہے

فرمایا: صفات بشریت حقائق کے منافی ہیں جب تک بشریت کے صفات باقی ہوں سالک مقام حقائق تک نہیں پہنچ سکتا۔ اسی لئے کہا ہے تخلقوا باخلاق اللہ۔

فرمایا: جس کا دل قوی، امید صادق، ہمت بلند ہو اس کا باطن اس تجلی کے ظہور سے چمک اٹھیگا جس کے ادراک سے عقول ملکی و بشری عاجز ہیں۔ سلوک اسی وقت پختہ ہوتا ہے جب کوئی آرزو باقی نہیں رہتی اور ہمت دنیا و آخرت سے گزر جاتی ہے میرے عزیزو! تم کو اتنا بے نیاز اور سیر چشم ہونا چاہیئے کہ دونوں جہان کی نعمتیں بھی تمھارے قدموں پر ڈالدی جائیں تو تمھارا دل ان کی طرف مائل نہ ہو۔ تمھارا مطمح نظر ہمیشہ یہ ہونا چاہیئے کہ ؎

دنیاست بلاخانہ و عقبی ہوس آباد ما حاصل ایں ہر دو بیک جو نستانم

فرمایا: خم خانۂ رحمت سے جو کچھ پلایا جائے، قدح قدح پیو اور بدمستی نہ کرو۔ یہاں کام صرف ہمت پر ہے، جتنی ہمت بلند ہو گی طلب اور تشنگی اتنی ہی زیادہ ہو گی۔

ہر کہ صاحب ہمت آمد مرد شد ہم چو خورشید از بلندی فرد شد

فرمایا: توحید ایک دریا ہے جسمیں علم و عقل، دانش و بینش، محسوسات و مدرکات سب غرق ہیں جو اس دریا میں ڈوب جاتے ہیں ان پر مدام حیرت طاری رہتی ہے۔

قطرہ کو غرق در دریا بود ہر دو کونش جز خدا سودا بود

اس حیرت زدگی میں کسی سے کچھ رہ جائے تو اس کے لئے وہ معذور ہے، اسکی بزرگی کی وجہ سے اس کا کوئی قول و فعل دوسروں کے واسطے حجت نہیں ہے۔

فرمایا: امام شبلی سے کسی نے پوچھا: ماصفۃ العارف؟ بولے: صم بکم عمی۔ پس ہمیں یہ شور و غوغا کیا فائدہ دے سکتا ہے انسوس ہے کہ اب ہماری زبانیں چلتی ہیں اور عمل خاموش رہتے ہیں، پہلے عمل چلتے تھے اور زبانیں خاموش رہتی تھیں۔

دوستو! منہ بند کر لینا چاہیئے، لکھنا پڑھنا پردہ کے باہر ہے، پردہ کے اندر عمل اور خاموشی ہے ؎

چوں سر ازل طعمۂ ابدال شود آں جملہ قیل و قال پامال شود
ہم مفتی شرع را جگر خوں گردد ہم خواجۂ عقل را زباں لال شود

فرمایا: ہمارے ہاں پسندیدہ روش الاستقامۃ علی الشریعۃ مع کتمان السر ہے

فرمایا: صوفی خدا کا طالب ہوتا ہے، اسے لباس کی قیود سے آزاد ہونا چاہیئے۔ خرقہ، عمامہ، پیراہن، کفنی محض عادت پرستی ہے اخلاق

اچھے نہ ہوں تو روزہ نماز کچھ فائدہ نہیں دے سکتا۔ یہ ظاہری اسلام اور باطنی بت پرستی ہے۔ صوفی کا کام اخلاق انسانی سے گزر جاتا ہے خدا ماسوں کو نہیں دیکھتا، اسکی نظر ہمیشہ اخلاق پر رہتی ہے، وہ دلوں اور نیتوں کو دیکھتا ہے۔ ان اللہ لا ینظر الی صورکم و اعمالکم ولکن ینظر الی قلوبکم و نیاتکم۔

فرمایا: سالک کو مرنج مرنجاں ہونا چاہئے۔ اس کے اقوال و افعال سے کسی کو صدمہ نہ پہونچے، دوستوں کے ساتھ لطف و محبت سے اور دشمنوں کے ساتھ خاطر مدارات سے پیش آئے۔ سچ کو کبھی ہاتھ سے نہ دے، اور خدا سے اپنا معاملہ بالکل راست رکھے۔ اسکی نظر وجودیات سے بلند رہے۔ اس کے ہلے فکر کو فضائے ربوبیت میں پرواز کرنی چاہئے۔

فرمایا: سالک کو دشمن کی طرح اپنے اعمال کا محاسبہ کرنا چاہئے۔ اس کا کام یہ ہے کہ رات دن برائیوں کی گھات میں لگا رہے، اور جلاد کی طرح ایک ایک برائی کو چن چن کر ہلاک کر دے۔ اسکو ہمیشہ ڈھونڈھنی چاہئے کہ اعضائے ظاہری و باطنی میں کون کون پاک ہے اور کون کون پلید۔ جو پلید ہو جائیں انھیں توبہ اور تجدید ایمان سے پاک کرنا چاہئے اور کوشش کرنی چاہئے کہ پھر وہ ناپاک نہ ہونے پائے۔ جب اس پر پوری طرح قدرت حاصل ہو جائے گی تو حقیقت ایمانی جلوہ گر ہوگی، اور محاسن و محامد کا ظہور ہونے لگیگا۔

فرمایا: سالک کیلئے اکل حلال پہلی اور سب سے بڑی پاک دامنی ہے، جسکی روزی حلال اور عادتیں اچھی ہوں وہ جنید وقت ہے۔ جس کو یہ سعادت نصیب ہو جائے اسکو خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے۔

حضرت محمود کی خوبیوں اور رعنائیوں کی داستان ابھی بہت طویل ہے، ان کے ملفوظات (عربی اور فارسی میں) اتنے زیادہ ہیں کہ خواجگان چشت میں اتنے کسی کے نہ ہوں گے۔

ناظر دہلوی

فضل حسین صاحب تبسم کے مضمون حالات عرفی پر ایک نظر کی تنقید

اور

ملا عبدالنبی مرحوم کے تذکرہ "میخانہ" پر ایک ضمنی تبصرہ

اسوقت جناب فضل حسین صاحب تبسم کا تنقیدی مضمون، جو "حالات عرفی پر ایک نظر" کے عنوان سے فروری ۲۹ء کے نگار میں چھپا ہے، میرے پیش نظر ہے اور چونکہ اس میں میرے مضمون "عرفی" پر تنقید کی گئی ہے اس لئے مجھے حق حاصل ہے کہ براہ راست انہیں سے مخاطب ہوکر جواب عرض کروں

میرے محترم دوست! قبل اسکے کہ میں آپکی تنقیدی تحریر پر روشنی ڈالوں یہ ضروری ہے کہ چند الفاظ میں آپکا شکریہ ادا کرلوں، کہ آپنے میری ناچیز تحریر کو کم از کم اہمیت کی نظر سے تو دیکھا، لیکن معاف فرمایئے اگر اسی کے ساتھ یہ بھی عرض کروں کہ "سخن شناس نۂ دلبرا سخن اینجاست "

جیسا کہ آپ نے خود تحریر فرمایا ہے، آپکی تنقید محض صاحب "میخانہ" کی تحقیقات پر مبنی ہے، جسکی تصنیف کا زمانہ ۱۰۲۸ھ ہے یعنے عرفی کی وفات کے ۲۹ سال بعد یہ کتاب لکھی گئی، آپ نے اسے بھی بڑی اہمیت دی ہے کہ مصنف عرفی شیرازی کے خالو سے ملا تھا، میری تحقیقات کا دارومدار اورینٹل لائبریری (پٹنہ) کی متعدد قلمی کتابیں تھیں، جنمیں ایک مآثر رحیمی مصنفہ عبدالباقی نہاوندی کا قلمی نسخہ بھی تھا، اپنی بدقسمتی کا شکوہ کروں یا آپ کی نظر عنایت کا شکریہ، کہ جو تنقید بھی (باستثنائے ایک واقعہ) آپ نے کی وہ ان واقعات سے متعلق ہے جنہیں میں نے صاحب مآثر رحیمی کے حوالہ سے لکھا تھا، کیا آپکو خبر نہیں کہ مآثر رحیمی کب لکھی گئی، اور اسکا مصنف عرفی کے زمانہ سے صاحب میخانہ کی بہ نسبت قریب تھا یا بعید؟ اگر آپ کو مآثر رحیمی کا زمانۂ تصنیف معلوم ہوتا، اور پھر یہ حقیقت بھی آپ پر واضح رہتی کہ مآثر رحیمی کی روایتیں صاحب میخانہ کی بہ نسبت زیادہ قابل وثوق اور مرجح ہیں تو غالباً آپ تکلیف کرنے کی جرأت نہ کرتے، کیا ترمذی شریف کے اندر آپنے صحیح اور ضعیف، موصول اور مقطوع، حسن اور مرفوع کے مدارج و تقسیم کے واقعات نہیں دیکھے، ؟ صاحب میخانہ کی روایات موصول ہیں یا مقطوع؟ آپنے خود ہی اعتراف کیا کہ صاحب میخانہ عرفی سے نہیں ملا، بلکہ اسکی وفات کے بعد صرف اسکے خالو سے ملا، آپنے حدیث کے اقسام، رواۃ کے طبقات، اور اصول حدیث کا مطالعہ کیا ہوگا، تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ایسے راوی کی روایت جو نہ واقعہ کے وقت موجود ہو، اور نہ خود صاحب واقعہ سے ملا ہو، علمائے تاریخ و سیر کے نزدیک کہاں تک قابل اعتنا و استناد ہے"؟

آپ نے بڑے جوش کے ساتھ یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ علامہ شبلیؒ نے ماخذ شعر العجم میں میخانہ کا تذکرہ کیا ہے، معلوم ہوتا ہے، شعر العجم کا

وہ حصہ آپ کی نظر سے نہیں گذرا، جو عرفی شیرازی کے متعلق ہے، عرفی کے متعلق علامہ مرحوم کی تحقیقات کا زیادہ حصہ مآثر رحیمی ہی پر مبنی ہے۔

یہاں تک تو آپ کی مایۂ ناز کتاب میخانہ کی حقیقت تاریخی کے متعلق تھا، اب اپنی تنقید کا بھی سلسلہ وار جواب سن لیجئے۔

نام و نسب یہ صحیح ہے کہ میں نے صاحب مآثر رحیمی کے حوالہ سے عرفی کا پورا نام خواجہ سید محمد بن زین الدین علی علوی بن جمال الدین مشہور بہ "چادر باف" لکھا تھا، آپ لکھتے ہیں کہ اسکا اصل نام محمد حسین تھا، اور اس کے والد کا نام خواجہ بلوی" ہے! اصول روایت کے مطابق تو صاحب مآثر رحیمی ہی کا قول مرجح ہونا چاہئے، لیکن درایۃً بھی یہاں آپ پر چند اعتراضات ہوتے ہیں، "محمد" تک ہم آپ متفق ہیں باقی رہا "حسین" تو ممکن ہے گھر والوں نے محمد حسین ہی نام رکھا ہو لیکن دنیا نے اسے جس نام سے خطاب کیا وہ وہی ہے جو میں نے اپنی ناچیز تحقیق میں ظاہر کیا تھا، اور اس کی دلیل یہ ہے کہ تمام تذکرہ نویسوں نے یہی نام لکھا ہے، مآثر رحیمی، صحف ابراہیم، مخزن الغرائب، مجمع النفائس، ریاض الشعراء، میں یہی نام پائے جاتے ہیں، آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ ہزاروں اکابر اس نام سے مشہور نہیں ہیں، جو ماں باپ نے رکھے تھے، اگر کوئی شخص اپنی تحقیق کی بنا پر متقدمین کے حوالہ سے یہی نام لکھے تو کیا آپ کو اسمیں تاریخی غلطی نظر آئے گی؟ یہ تو درایت کے لحاظ سے میں کہہ رہا ہوں، ورنہ روایت کے لحاظ سے تو مجھے صاف انکار کر دینا چاہیے کہ صاحب میخانہ کی تحقیق کو میں عبدالباقی نہاوندی کی تحقیق کے مقابلہ میں ماننے کیلئے تیار نہیں،

آپ نے اس کے والد کا بھی ایک نہایت ہی پر لطف نام پیش کیا ہے، آپ ہی فرمائے عقل "زین الدین علی علوی" تسلیم کرنے کیلئے تیار ہے یا خواجہ بلوی" نہ معلوم بلوی کس لغت کا لفظ ہو اگر صاحب میخانہ کی تحقیق آپ کے نزدیک زیادہ قابل اعتبار تھی، تو کم از کم آپ فارس کے جغرافیہ کا مطالعہ تو کر لیتے، یاقوت حموی کی کتاب معجم البلدان عربی میں موجود ہے، ناصر خسرو علوی کا سفر نامہ فارسی ہی میں نہیں بلکہ ایم۔ شیفر کی بدولت فرنچ میں بھی پایا جاتا ہے آپ کو جستجو کرنی تھی کہ آیا "بلو" فارس میں کوئی مقام بھی ہے یا نہیں اور اگر یہ بات آپ ثابت کر دیں تو بھی آپ پر یہ اعتراض قائم رہیگا، کہ یہ نام اضافت یہ ادنی ملابست کے رشتہ سے ہے حقیقی نام کچھ اور ہے، اگر میں امام بخاری کو محمد بن اسمعیل، اور رازی کو فخر الدین، یا محمد بن زکریا لکھوں تو آپ اسے تاریخ کی روشنی میں غلط ثابت کرنیکی کوشش کریں گے، ہم سنجیدہ دماغ صاحب میخانہ کی تحقیق "خواجہ بلوی" کو ماننے کے لئے تیار نہیں، اگر آپکو اسپر اصرار ہے، تو آپ براہ کرم لفظ "بلوی" پر مزید روشنی ڈالئے۔

آپنے وجہ تخلص پر بھی اعتراض کیا ہے، آپ نے فردوسی کی ابتدائی زندگی کا مطالعہ کیا ہوگا، تو آپکو معلوم ہوگا کہ ابتداءً "فردوسی" اس کا تخلص نہ تھا اسی طرح مرزا نوشہ دہلوی کو دیکھئے، وہ پہلے "اسد" تخلص کرتے تھے، اب کوئی صرف فردوسی اور غالب لکھے اور ان کے ابتدائی تخلص کا تذکرہ نہ کرے تو کیا آپ کو اعتراض ہوگا، اگر عرفی ابتداً صیدی تخلص کرتے تھے، تو بعد میں انہوں نے میری تحقیق کے مطابق شرعی اور عرفی (سوشل) معاملات کی مناسبت سے عرفی تخلص اختیار کیا تو کونسا استبعاد عقلی ہے، یہ بھی میں نے صاحب مآثر رحیمی کے حوالہ سے لکھا تھا، یہ تو آپ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ اسکے والد حکومت میں ایک عہدہ پر فائز تھے

اگر صاحب مآثر رحیمی کے مفصلہ ذیل قول کو صحیح مانا جائے تو اعتراض ہی کیا ہے؟ فرماتے ہیں :-

"سبب عرفی تخلص نمودن ایشان آنست کہ چون پدرش بعض اوقات در دیوان حکام فارس باھر دارہ وغیرہ دارالفاضل شیراز مشغولی می نمود مناسبت شرعی و عرفی را منظور داشتہ تخلص خود عرفی کرد"

لطف تو یہ ہے کہ صاحب میخانہ کی روایت سے یہاں تضاد بھی واقع نہیں ہوتا، اور آپ اپنے جوش تنقید میں اسے متضاد ہی خیال فرما رہے ہیں، صاحب میخانہ بھی اپنی جگہ پر صحیح اور مآثر رحیمی کی روایت بھی معتبر اگر تھوڑی دیر کے لئے تسلیم کر لیا جائے، کہ یاران شیراز ہی نے تخلص عرفی کا "انتخاب" کیا، تو میں نے یہ تو لکھا نہیں کہ عرفی نے "خود" انتخاب کیا، بلکہ صرف "اختیار کیا" لکھا تھا۔

ولادت و وفات

برادرم یہ دیکھ کر میری حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہی کہ اس بادیہ پیمائی میں آپ جتنے قدم آگے بڑھاتے گئے ہیں، اسی قدر منزل دور ہوتی گئی ہے، آپ نے ملا عبد النبی مرحوم کا تاریخی حیثیت سے یہ غیر ذمہ دارانہ جملہ تو نقل کر دیا، لیکن اس کے تحقیقی نقایص و معایب پہ غور فرمانیکی زحمت گوارا نہیں کی۔ ملا صاحب فرماتے ہیں :-

"ہنوز سنش بہ چہل نہ رسیدہ بود کہ در لاہور در سنہ اثنی و الف عالم فانی را وداع نمود" اور چند جملوں کے بعد مرزا نظام قزوینی کا یہ بیان نقل کرتے ہیں "چون نزدیک او شدم، دیدم کہ کار بہ دشوار شدہ و نفسش بہ شمار افتادہ پرسیدم چہ حال داری جواب داد "دو شش و شش پنج" اب آپ استنباط فرماتے ہیں کہ اس سے وقت مرگ کی رباعی کی تصدیق نہیں ہوتی۔

پہلے تو آپ کے ملا صاحب کے "طوفان تحقیق" ہی پر مجھے اعتراض ہے، یہ ایک مورخ کا نقص نہیں تو اور کیا ہے، کہ وہ بجائے عمر کی صحیح تعین کرنیکے، صرف یہ غیر ذمہ دارانہ جملہ "ہنوز سنش بہ چہل نہ رسیدہ بود" لکھدے صرف اسی واقعہ کو لیجئے، تو ملا صاحب کے معیار تاریخ دانی، اور ذوق کاوش پر کافی روشنی پڑتی ہے، اسکے برخلاف صاحب مآثر رحیمی کا قول دیکھئے۔

"بتاریخ شوال تسع و تسعین و تسعمائۃ ۹۹۹ در سن سی و شش سالگی در لاہور جہان فانی را وداع نمود"

ارباب تمیز بہ یک نظر جان لے سکتے ہیں، کہ صاحب میخانہ کی روایت ترجیح پہلو رکھتی ہے، یا صاحب مآثر رحیمی کی، "ابھی عمر کا چالیسواں سال بھی نہ گذرا تھا، کہ وفات پائی" قطعی فیصلہ ہے یا یہ کہ "۹۹۹ھ میں ۳۶ سال کی عمر میں دنیا سے گذر گئے" اسکول کی جب تاریخ یاد نہیں رہتی ہے، تو بچے استادوں کو ایسا ہی مغالطہ دیا کرتے ہیں، "ہنوز سنش بہ چہل نہ رسیدہ بود" نے میرے سامنے زندگی کا وہ دلچسپ واقعہ بعینہ پیش کر دیا۔

میں نے لکھا تھا کہ عرفی نے بستر مرگ پر ایک رباعی کہی تھی، اور آپ نے اسے ساقط الاعتبار تصور کیا، کیونکہ ملا عبد النبی نے یہ لکھا ہے، کہ دم نکل جانے کے کچھ وقت قبل جب میر نظام الدین قزوینی عرفی سے ملے، تو انہوں نے "دو شش و شش پنج" کہا، اس استنباط سے تو یہ چلتا ہے کہ آپ نے کبھی "اشکال بخاری" کا مطالعہ نہیں کیا، محدثین نے بخاری کی بعض روایتوں کو جو بہ ظاہر متضاد معلوم

ہوتی ہیں، تطبیق دے کر نہایت باریک بینی کا ثبوت دیا ہے، میں آپ کو مشورہ دونگا کہ بخاری کی ایسی روایات ضرور مطالعہ کریں کیونکہ آپکی صحت تنقید کیلئے فایدہ بخش ہوگا۔

مختصراً سن لیجئے، محدثین نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت کی مختلف حدیثیں روایت کی ہیں، جن میں دو یہ ہیں ۱ اخرجوا الیھود والنصاریٰ من جزیرۃ العرب دوسری حدیث (بخاری، کتاب الجنائز) میں حضرت عایشہ صدیقہؓ کی روایت سے یہ ہے، کہ آپ دم واپسین کے وقت اللھم الرفیق الاعلیٰ فرمارہے تھے، دونوں حدیثیں اصول روایت کے مطابق صحیح ہیں، اب آپ کے اصول تنقید کو پیش نظر رکھا جائے تو دونوں متضاد ثابت ہونگی، حالانکہ علمار نے انکی تطبیق دی ہے، دونوں اپنی اپنی جگہ پر صحیح ہیں اگر عرفی نے سانس نکلتے وقت "دششش وشش ش پنج" کہا تھا، تو اس سے بستر مرگ پر رباعی کہنے کی تردید کہاں سے ہوگئی، میں نے یہ تو لکھا ہی نہیں کہ "عرفی نے یہ رباعی کہی، اور انکا دم نکل گیا" بلکہ صرف بستر مرگ کا لفظ ہے، یعنی جس بیماری سے انہوں نے قضا کی، اس بیماری مرگ میں یہ رباعی کہی تھی، آپ کو غالباً "دم نزع" کی ترکیب سے غلط فہمی ہوئی، "دم نزع" سے "سانس اکھڑ جانا" مراد نہیں ہے، بلکہ "وقت آخر مراد" ہے کیونکہ جب سانس اکھڑ جاتی ہے تو ہوش کہاں رہتا ہے کہ انسان شاعری کرے۔

ورود وقیام ہند اس عنوان کے ماتحت بھی آپ نے نہایت پر لطف مباحث پیدا کئے ہیں۔ مثلاً یہ آپ نے عرفی کو معشوق ایران تصور کرکے ہندوستان میں اس کے ورود کو بھی محض "اضمحلال حسن" ہی کی وجہ سے قرار دیا، مجھے جس قدر آپسے شکوہ ہے اس سے کہیں زیادہ خود ملا عبدالنبی صاحب کی ادائے ستمگار کا گلہ ہے، معلوم ہوتا ہے، وہ نہ تو اصول سیرت نگاری سے واقف تھے اور نہ انہوں نے نفسیات کا مطالعہ کیا تھا، ملا صاحب فرماتے ہیں:۔

> "درسن چہاردہ و پانزدہ سالگی حسن او قبول تام عیاری بہم رسانده بود چوں سال عمرش بہ بست رسید آبلہ سرشاری برآورد، بعد از انقضائے اشتداد و استخلاص زاں مرض تغیرے در چہرۂ او بہم رسید، چنانکہ ہر کس کہ اداوید تنفری کرد مولوی ازاں مقدمہ بغایت آزردہ دور ہم بود و بنا براں آں از وطن خروج کردہ بہ ہندوستان کہ خانہ نشو و نمائے نکتہ سنجان و دار العیار خردمنداں است آمد"

الغرض ملا صاحب کے خیال میں عرفی یہی نہیں کہ "خواجہ حسن" دہلوی کی طرح ایک حسین شاعر تھے بلکہ انہیں حسن فروشی کا بھی خیال تھا، اور جب چیچک کی دستبرد سے یہ حسن ظاہر جاتا رہا، تو لوگ ان سے ایسے متنفر ہوئے، کہ انہوں نے مجبوراً ترک وطن کیا، گویا شیراز قدردان تھا، تو عرفی کے حسن کا، اور جب اسے "آبلہ سرشار" نے غارت کردیا تو عشاق بوالہوس نے بھی کنارہ کشی کرلی، بندہ نواز، کیا سیرت نگاری کا اس سے زیادہ کوئی بدنما پہلو دکھایا جاسکتا ہے، ؟۔

اگر ملک عرفی کے علم و فن کا قدردان تھا، تو چیچک نکلنے اور صاحب میخانہ کی تحقیقات کے مطابق، کریہ المنظر ہونے کے بعد بھی وہ اہلیت اسمیں موجود تھی، ایک اور مزہ کی بات آپ کے ملا صاحب نے یہ لکھدی ہے کہ "ہر کس کہ او را می دید تنفری کرد" مہربان من! کیا اس پر نفسیاتی نقطۂ نظر سے بھی نگاہ ڈالی، ؟ اگر ارباب وطن کا ذوق سلیم اسقدر اعلیٰ تھا کہ انہوں نے عرفی کی صورت سے نفرت کرنی شروع کی تو تعجب ہے

دربار مغلیہ کی پستی احساس ہو کہ اس نے اسے مقربین خاص میں شامل کر لیا، اور شاہی خاندان سے اسکا، ایسا تعلق ہو گیا، کہ لوگوں نے شاہزادہ سلیم کا اسے عاشق ہی مشہور کر دیا۔ ریاض الشعراء کی اس روایت سے کم از کم اتنا تو ضرور ثابت ہو جاتا ہے، کہ شاہزادہ سلیم کی صحبت میں اسے ایک خصوصیت حاصل تھی، بھلا ایسا بدصورت انسان جسے دیکھنے والوں کو نفرت آتی ہے، کیا جہانگیر جیسے حسن پرست انسان کے دربار میں باریاب ہو سکتا تھا نفسیاتی تحقیق اسکی تائید نہیں کرتی لہذا صاحب میخانہ کی روایت جو عرفی کے اسباب سفر ہند کے متعلق ہے، یک لخت ساقط الاعتبار، اور بالکل بے سر و پا افسانہ ہے، قراین یہی بتاتے ہیں، کہ عرفی کی تعلی نوازیوں سے احباب وطن اکتا گئے تھے، اس لئے انہوں نے اس سے تعلقات کشیدہ کر لئے تھے، یہی وجہ ہوئی کہ اسنے ہندوستان کا سفر کیا، براؤن کی یہی تحقیق ہے، جو لٹریری ہسٹری آف پرشیا کی تیسری جلد کے اندر عرفی شیرازی کے ذیل میں پائی جاتی ہے۔

آپ نے صاحب میخانہ کی تحقیقات کے مطابق عرفی شیرازی کے قیام ہند کی مدت پندرہ سولہ سال متعین کی ہے۔ میں نے صاحب مجمع النفائس کی روایت سے تاریخی استدلال کر کے صرف ایک سال کی مدت لکھی، اس معاملہ میں میرے نزدیک صاحب مجمع النفائس پر ملا عبدالنبی کی روایت کو تفوق حاصل ہے، لیکن میں صرف اسی ایک روایت کی بنا پر سراج الدین علی خاں آرزو جیسے نکتہ داں مصنف کی تکذیب نہیں کر سکتا، مجمع النفائس میں صاف لکھا ہوا ہے۔

"تقی اوحدی گوید در سن سی و شش سالگی از صفاہان کہ مولد من است متوجہ شیراز کہ وطن اصلی آبا و اجدا است، متوجہ شدم بہ خدمت و صحبت مولانا عرفی رسیدم، پنج سال پیش از آنکہ او متوجہ ہند شود، اکثر در ملازمت و سفرائے دیگر کہ مجمع بودند میرسیدم، و اشعار بابا فغانی کہ در ایام طرح می باشد تتبع می نمودم سن وے تقریباً سی سالہ بود"

اس سے صاف ظاہر ہے، کہ عرفی شیرازی جب تیس سال کے تھے، تقی اوحدی نے ان سے ملاقات کی اور اس واقعہ کے پانچ برس کے بعد انہوں نے ہندوستان کا سفر کیا، جب مآثر رحیمی کی روایت کے مطابق ۳۶ سال کی عمر میں عرفی کی وفات تسلیم کرتا ہوں تو نتیجہ یہی نکلتا ہے، کہ وہ صرف ایک سال ہندوستان میں قیام پذیر رہے، اب اس روایت سے صرف صاحب میخانہ نے اختلاف کیا ہے تو چنداں اہم نہیں، لیکن اگر اس کے ساتھ اور تذکرے بھی متفق ہیں، تو میں، آپکی تحقیق کو مان لوں گا۔ بشرطیکہ آپ اسپر اصول درایت کے لحاظ سے روشنی ڈالیں، اور سراج الدین علیخاں آرزو کی روایت کو درایۃً پایۂ اعتبار سے گری ہوئی ثابت کر دیں۔

استخوان عرفی کا نجف اشرف پہونچنا

آپ نے اس عنوان کے ذیل میں بھی چند دل خوش کن باتیں لکھی ہیں، اس سلسلہ میں آپکو مجھ سے تین واقعات کے متعلق اختلاف ہے، پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ نے میرے الفاظ سے یہ نتیجہ نکالا ہے، کہ خود میر صابر اصفہانی استخوان عرفی کو نجف اشرف لے گئے اور آپ نے اپنے خیال کی تائید میں میری سطور کا اقتباس بھی درج کر دیا ہے، لیکن مجھے افسوس ہے کہ آپکی یہ سعی بھی کامیاب نظر نہیں آتی، آپ "خود" کا لفظ کہاں سے لائے، میں نے لفظ "خود" نہیں لکھا، اب اپنے استنباط کی حقیقت دیکھئے، کیا یہ محاورہ نہیں ہے کہ ہم اپنے زیر اثر کوئی کام کریں اور اسے اپنی طرف منسوب کریں خواہ اس

عمل میں میرے ہاتھ پیر کو جنبش ہوا ہو، اگر میں کہوں کہ "فلاں باغ میں نے لگایا ہے" تو کیا آپ اس سے نتیجہ نکالیں گے کہ ایک مزدور کی طرح دن بھر دھوپ میں مرمر کر میں نے درخت بھی اپنے ہاتھ سے لگائے ہیں۔ ابن عباس سے ایک روایت منقول ہے جو اہل سنت اور اہل شیع کے درمیان سخت متنازعہ فیہ ہے، یہ حدیث مسلم شریف میں بھی موجود ہے، اور بخاری شریف کی کتاب المرضیٰ میں بھی پائی جاتی ہے، سرور کائنات کا آخری وقت تھا، آپ فرماتے ہیں ھلم اکتب لکم کتاباً لا تضلوا بعدہٗ حدیث میں لفظ "اکتب" واحد متکلم کا صیغہ ہے جسکا ترجمہ ہے "لکھدوں" یہ ظاہر ہے کہ سرور کائنات ایک "امی" شخص تھے اس لئے اس کے معنے یہی لئے جادیں گے کہ لکھوا دوں چونکہ آپ کی تحریک اور آپ کے زیر اثر آپ کے خیالات کی ترجمانی ہوتی، اس لئے گویا آپکا "لکھوادینا" "عین" "لکھنا" تھا، اسلئے آپکا یہ اعتراض بھی بالکل بے معنی ہے، ہیں اگر لفظ "خود" یا "بنفس نفیس" لکھا تو آپکا یہ اعتراض حق بجانب تھا۔

آپ فرماتے ہیں کہ ملا عبد النبی نے وفات کے ۲۵ سال کے بعد استخواں عرفی کا نجف اشرف میں دفن ہونا بیان کیا ہے لیکن مجھے اصرار ہے کہ مآثر رحیمی زیادہ معتبر ہے جسمیں "سی سال" موجود ہے، اور مآثر رحیمی کی تحقیق کے ساتھ اور بھی تذکرے اس خیال کی تائید کرتے ہیں، جنکا حوالہ میں اپنے مضمون میں پیش کر چکا ہوں۔

آپنے آخر میں یہ نظریہ بھی بڑی شد و مد سے پیش کیا ہے، کہ میرے ہی قول سے میرے خیال کی تردید ہوتی ہے، جب میں یہ تسلیم کرتا ہوں، کہ عرفی نے سنہ ۹۹۹ میں وفات پائی، اور تیس سال کے بعد انکے ریزہ ہائے استخواں کو لوگوں نے نجف اشرف میں دفن کیا، تو اس حساب سے نجف اشرف میں دفن ہونیکی تاریخ سنہ ۱۰۲۹ ہوتی ہے، اور میں نے ملا رونقی کا جو قطعہ پیش کیا تھا، اس سے سنہ ۱۰۳۲ نکلتا ہے لہذا میرے ہی قول سے میری تردید ہوگئی، اور صاحب میخانہ کی تحقیق کہ "عرفی نے سنہ ۱۰۰۲ میں انتقال کیا" پایۂ ثبوت کو پہونچ گئی حالانکہ آپنے اپنے خیال میں ان متضاد واقعات کے متعلق جو تنقید کی ہے، وہ ناظرین نگار کیلئے اور بھی باعث دلچسپی ہوگی، جب وہ یہ غور کریں گے کہ آپنے ملا رونقی کی جس تاریخ سے استدلال کیا ہے، وہ آپ کے نزدیک مستند بھی ہے یا نہیں؟ آپ تو ملا عبد النبی کی روایت کے مطابق ۲۵ ہی سال کے بعد عرفی کے استخواں کا نجف اشرف میں دفن ہونا تسلیم کرتے ہیں نا؟ اور اور جب یہ بھی آپ مانتے ہیں، کہ انہوں نے سنہ ۱۰۰۲ میں وفات پائی، تو اب دو ہی صورتیں باقی رہ جاتی ہیں یعنی ملا رونقی کی تاریخ آپ کے نزدیک صحیح ہوگی، یا غلط، اگر تاریخ غلط نکالی گئی ہے تو بحث ہی ختم ہے، اگر صحیح ہے، تو آپ کو ماننا پڑیگا کہ عرفی کی وفات سنہ ۱۰۰۷ میں ہوئی نہ کہ آپ کی تحقیق "میخانہ" کے مطابق سنہ ۱۰۰۲ میں کیونکہ جب سنہ ۱۰۳۲ میں سے ۲۵ نکال لینگے تو سنہ ۱۰۰۷ باقی رہجاویگا، ملا رونقی کی تاریخ جس طرح آپ کے خیال میں میرے دعوی سنہ ۹۹۹ کو ثابت کرنے کے لئے غیر مفید ہے۔ اسی طرح آپکی تحقیق کے مطابق عرفی کی وفات سنہ ۱۰۰۲ کے دعوی کو باطل ٹھیرا رہی ہے۔

عبد المالک آروی

تعزیر جرم

افسانہ

:(۱):

شب تاریک اپنی زندگی کی آخری گھڑیاں بہ سرعت تمام ختم کر رہی تھی۔ سوسن جو چند لمحوں کا مہمان سمجھا جا رہا تھا زندان کے ایک گوشہ میں مصروف الحاح و مناجات تھا۔ دفعتاً دروازہ کھلا اور سوسن نے دیکھا کہ شمع ہاتھ میں لئے شاما اس کے سامنے کھڑی تھی۔ اس کے ایک اشارۂ مبہم پر سوسن کی بیڑیاں کاٹ ڈالی گئیں۔

"تم میرے لئے مایوسی کے سیاہ بادلوں سے نور رحمت بن کر نمودار ہوئی ہو" سوسن نے کہا۔

"نور رحمت!" زیر لب کہتے ہوئے شاما نے ایک ایسا زور کا قہقہہ لگایا جیسے گرجتے ہوئے بادل دیوانہ وار برس پڑیں۔ ہراساں بھوتوں کے غول کے مانند اس کی صدائے بازگشت زندان کی دیواروں سے ٹکرا کر لوٹی۔

:(۲):

دریائے بردنا کے کنارے ناریل کے درختوں کی دھندلی قطاروں میں پو پھٹ رہی تھی۔ شاما نے کشتی میں قدم رکھتے ہوئے کہا

"آؤ پیارے زمانۂ ماضی کے مصائب و آلام بھول کر اب کہیں چلے چلیں"

دریا کی افتاں و خیزاں موجوں میں کشتی سبک سیر روانہ ہوئی۔ سوسن نے شاما کے سر کو اپنے سینہ سے لگا کر کہا۔ "ہاں! یہ تو بتاؤ کہ ابدی زنجیروں میں جکڑنے کے لئے تم نے میری آزادی کس قیمت پر خریدی؟"

شاما جو اس کے سینہ سے لپٹی تھی زیادہ زور سے لپٹ گئی اور کہا۔ "ابھی نہیں"

:(۳):

موجوں کے ساتھ ساتھ بہنے والی کشتی پر آفتاب پرتو فگن ہونے لگا۔ عورتیں اشنان کر کے بھیگے جسم اور لباسوں میں سروں پر پانی کے گاگر لئے گھروں کو واپس ہو چکی تھیں اور صبح کا بازار برخاست ہو چکا تھا۔ دورویہ بانس کے درختوں کی قطاروں والی سڑک پر سکوت مطلق طاری تھا۔ جنگل کے پھولوں کی نکہت سے معمور ہوا کے جھونکوں سے شاما کی نقاب الٹ گئی۔

سوسن نے رکتے رکتے پوچھا "کیا تم اپنے احسان سے مجھے کبھی آگاہ ہونے نہ دوگی؟ اگر میں اس بار سے سبکدوش نہ ہو سکوں تو کم از کم اس کے مایوسانہ محاسبہ سے تو پیہم لطف اندوز ہوتا رہوں گا۔ شاما نے اپنی نقاب کو درست کرتے ہوئے جواب دیا "ابھی نہیں"

(۴)

رات کے تاریک ساحل پر روشنی چلی آرہی تھی، کشتی اس ویران مندر کے قریب پہونچ گئی جو لب جو برگد کے زیر سایہ واقع تھا کسن چاند ابر کی ہلکی نقاب میں منہ چھپائے دریا کی لہروں پر اسی طرح رقصاں تھا جس طرح کسی ننھے بچہ کی کاغذی ناؤ۔

رات بتدریج تاریک ہونے لگی اور تاریکی کے ساتھ اس سوال کی ہولناکی اور اہمیت بھی بڑھتی گئی جو دن بھر شرمندۂ جواب نہ ہوسکا تھا۔

شاما نے ایک ٹھنڈا سانس بھرا اور کہا "میں نے جو کچھ تمہارے لئے کیا ہے وہ تکلیف اور قابل ملامت ضرور ہے اور پھر تم سے اس کا اعادہ اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ ہے۔ مگر میں مختصراً بیان کرتی ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ سنتے ہی تم اس کو فراموش کردو۔ نوجوان یوٹسیا نے جو میرا عاشق زار ہے تمہارے جرم کو اپنے سر محض یہ ثابت کرنے کی خاطر لے لیا ہے کہ میری خوشنودی کیلئے کسطرح اپنی جان نثار کرسکتا ہے۔

"میرے اچھے محبوب! میں نے اپنی زندگی کے اس گناہ عظیم کا ارتکاب تمہارے لئے ہاں فقط تمہارے لئے کیا ہے"

(۵)

چاند رخصت ہوچکا اور جنگل ایک سکوت تاریک میں ملفوف ہے۔ سوسن کے اس ہاتھ کی گرفت جو شاما کی کمر میں حلقہ کئے ہوئے تھا، مگر دور ہوگئی اور دونوں علحدہ ہوگئے اب انہیں ہر شئے ایک دوسرے سے متنا دور کرنے لگی، حتیٰ کہ انکی خاموشی اور درمیانی فاصلہ بھی دونوں میں حائل ہوگیا شاما فوراً جھکی اور سوسن کے قدموں پر سر رکھدیا۔ آنسو خشک تھے اور آواز بھرائی ہوئی اس نے کہا "خیر خدا مجھے سزا دیگا مگر تم ہرگز نہ دینا"

سوسن اپنے کو چھڑا کر کشتی سے کود پڑا اور رات کی بے پایاں تاریکی میں غائب ہوگیا۔

(۶)

پاؤں میں روندے جانے سے بکھرے ہوئے سوکھے پتے کھڑکھڑانے لگے۔ ہوا پھولوں میں بسی ہوئی تھی درختوں کی پرپیچ وخم شاخیں کسی خواب پریشاں کے بھوتوں کی نقالی کررہی تھیں۔ آخر کار وہ تھک کر بیٹھ گیا اور اس کو یکایک اسکی موجودگی کا احساس ہوا جو اس کا تعاقب کررہی تھی جیسا کہ خاکستر سیاہ صحرائی آگ کے شعلوں کا کیا کرتا ہے۔ "مجھے چھوڑدو" اوس نے چیخ کر کہا لیکن وہ اس سے لپٹ گئی اور لگاتار بوسوں کی بوچھار کردی۔ دم پھول رہا تھا بال پریشان تھے اور نقاب زمین پر لوٹ رہا تھی "نہیں، نہیں!! ہرگز نہیں!!!" شاما نے چلا کر کہا "تم اپنے ہاتھوں سے میرا گلا گھونٹ ڈالو تاکہ ہم دونوں کے گناہ برابر ہوجائیں" جنگل کے سائے کانپ اٹھے اور درختوں پر ہیبت طاری ہوگئی گلا گھٹنے کی ایک چیخ کے ساتھ کسی کے گرنے کی آواز سنائی دی۔

(۷)

خورشید خاوری کی سنہری کرنیں مندر کے کلس کو یوں جگمگا رہی تھیں گویا کسی دیوتا کی خشمگیں نگاہیں ہیں۔ سوسن اس جگہ

نکل کر ویران ریگستان میں بھٹکتا رہا۔ آفتاب نصف النہار نے اپنی تمازت سے اس کے خون میں بخار کی سی حرارت پیدا کر دی تھی
آفتاب غروب ہو گیا اور گرد و پیش تاریکی چھانے لگی۔

سوسن اک عالم وارفتگی میں کشتی کیطرف واپس چلا۔ کشتی میں اس کو ایک طلائی کنگن ملا جو غروب ہونے والی آفتاب کی شعاع کے مانند دمک رہا تھا۔ لپک کر اُسے لیا اور سینہ سے لگایا۔ اپنا چہرہ اس نیلی نرم شال سے ڈھانک لیا جو وہاں دھری تھی۔ وہ بے اختیار چاہتا تھا کہ اسکی گریزپا نکہت کو اپنی ہستی میں جذب کر لے اور اسکی خلش پیہم سے لذت اندوز ہوتا رہے۔

:(۸):

رات بڑھتی گئی ہلکے ابر کی چادر دں میں ماہ منیر دھندلا نظر آنے لگا۔ سوسن کشتی پر کھڑا تھا۔ صحرا کے دہشتناک سکوت کیطرف مخاطب ہو کر بے اختیار چیخ اٹھا "میری اچھی شاما! تو اب زندہ ہو جا! آ اور مجھ سے ملجا"

ایک سایہ تھا یا داہمہ جو تاریکی کے پردہ سے ریت پر نمودار ہوا اور کشتی میں قدم رکھتے ہوئے گویا ہوا "لو میں آگئی تمہارے دست کرم نے ذرا سی لغزش کی اور مجھے موت کے منھ سے بچا لیا۔ سوسن کی آنکھیں مضطربانہ اشتیاق میں اس پر جم گئیں اُسنے شاما کو سینہ سے لپٹانے کے لئے ہاتھ پھیلا دئے۔ معاً کانپ اوٹھا پیچھے ہٹا اور چلا کر کہا "پھر تو کیسے آگئی؟"

:(۹):

شاما ایک لمحہ تک مبہوت کھڑی رہی۔ بعد ازاں سر تسلیم خم کر کے اُس خواب کی طرح بے پتہ ہو گئی جو بیداری کے قریب پہونچکر پھر شب تار کی وسعتِ لامتناہی میں مفقود ہو جائے

(ترجمہ) ظہیر احمد بی اے۔ ایچ سی۔ ایس

فطرت کے حضور میں علم و حکمت کی بیچارگی

اور

کائنات میں عقول انسانی کی بے دست پائی

ایک عالم و عامی کا مکالمہ

مادیین کے مذہب میں سب سے زیادہ اہم بالشان مسئلہ مادہ (Matter) اور جوہر فرد (Atom) کا ہے کیونکہ اسی پر انحصار تمام مظاہر علمی کا ہے۔ اور اس میں کلام نہیں کہ عقول انسانی نے کوئی دقیقہ کوشش کا ان کی حقیقت کا علم حاصل کرنے کے لئے اٹھا نہیں رکھا لیکن اگر یہ سوال کیا جائے کہ کیا کوئی قابل اطمینان نتیجہ اس وقت تک پیدا ہو چکا ہے تو اس کا جواب سوائے اس سکوت و حیرانی کے اور کچھ نہیں ہو سکتا جو جہل کے اولین یوم میں پائی جاتی تھی۔

نگار کی کسی گذشتہ جلد میں ہم مادیین کے مذہب پر تفصیلی بحث کر چکے ہیں اور اس کے بعد بھی اکثر و بیشتر اس قسم کے علمی مضامین شایع ہوتے رہے ہیں، آج ہم ایک مضمون کا اقتباس پیش کرتے ہیں جس میں جوہر فرد پر مکالمہ کی صورت سے لطیف بحث کی گئی ہے۔

یہ مضمون سائنٹفک امریکن میں شایع ہوا تھا جس سے "المقتطف" نے لیا اور اس سے ہم نے۔　　نیاز

عامی ۔ "میں جوہر فرد کو دیکھنا چاہتا ہوں"

عالم ۔ "میں خود ہی تمنا عرصہ سے دل میں لئے ہوئے ہوں"

عامی ۔ "تو کیا آپ نے ابتک جوہر فرد کو نہیں دیکھا، میں تو سمجھتا تھا کہ آپ کے پاس بڑے بڑے نازک و دقیق آلات ہیں، نہایت عجیب و غریب خورد بینیں ہیں، آپ نے ضرور اسے دیکھ لیا ہوگا"

عالم ۔ "نہیں یہ تمام آلات اس کی حقیقت معلوم کرنے سے عاجز ہیں۔ جواہر فردہ (Atom) کے حجم کا تعلق ان عوامل سے ہے

جو نظر نہیں آسکتے۔ ایک قوی دوربین زیادہ سے زیادہ ایک انچ کے لاکھویں حصہ کو سامنے لے آتی ہے، لیکن جب ایک انچ کے لاکھویں حصہ میں کروروں جواہر فردہ پائے جاتے ہوں تو دوربین کیا کام دے سکتی ہے، علاوہ اس کے یوں بھی انکی حقیقت کا پتہ نہیں چلسکتا کیونکہ وہ ہمیشہ حرکت میں رہتے ہیں اور متحرک اشیاء کی حقیقت کا ادراک اور زیادہ دشوار ہے۔"

عامی۔ "پھر یہ بتائیے کہ تمام وہ حقایق جو جواہر فردہ سے مرتبط ہیں انکا علم آپ کو کیونکر ہوا؟"

عالم۔ "جو کچھ ہمیں معلوم ہوا ہے وہ نہ معلوم ہونے کے برابر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمیں اسوقت تک جواہر فردہ کا تو کچھ علم ہی نہیں حاصل ہوا۔ اگر کچھ معلوم ہوا ہے تو صرف یہ کہ اس کی مختلف کیفیات کیا ہوتی ہیں۔ مثلاً طبیعی اور کیمیاوی تجربوں میں حرارت، رطوبت، برودت، مقناطیسیت، کہربائیت وغیرہ حقیقتاً جواہر فردہ کے مختلف تاثیرات ہیں نہ کہ عین جوہر فرد، اسلئے ہمارا علم صرف اس کی تاثیرات کے علم تک محدود ہے۔ اس کو ہمنے آجتک نہیں دیکھا۔"

عامی۔ "مجھے ایک سوال کرنے کی اجازت دیجئے۔ کیا یہ دعویٰ نہیں کیا گیا کہ جوہر فرد نظام شمسی کیطرح ہے یعنی جس طرح آفتاب کے گرد اس کے ماتحت کرے گردش کرتے ہیں، اسی طرح جوہر فرد کے اندر بھی ایک چیز اصل ہے جسے اصطلاح میں (نواۃ) کہتے ہیں اور اس کے گرد بیشمار برقپارے (Electrons) گردش کر رہے ہیں؟"

عالم۔ "ہاں، ڈنمارک کے ایک عالم بوہر کی یہی رائے تھی اور ایک حد تک مفید بھی تھی"

عامی۔ "تھی؟ تو کیا اب نہیں ہے"

عالم۔ "بات یہ ہے کہ بوہر کی بتائی ہوئی حقیقت علوم جدیدہ کے تمام مطالب کے لئے مفید ثابت نہیں ہوتی اور یہ وفیسر بوہر خود بھی اس کو جانتا تھا، لیکن چونکہ اس سے بہتر کوئی نظریہ اس سے قبل قایم نہیں ہوا تھا اسلئے علماء نے عارضی طور پر کام چلانے کے لئے اسکی صحت کو تسلیم کر لیا تھا۔

عامی۔ "حیرت ہے، میں تو نہیں سمجھتا تھا کہ بوہر کے اس نظریہ میں نقایص ہیں۔ مجھے تو جرائد و رسایل سے یہی معلوم ہوا کہ وہ تمام مطالب علمی کے موافق ہے اور بڑا اکتشاف ہے"

عالم۔ "اس کے اکتشاف عظیم ہونے میں شک نہیں کیونکہ بہت سے مباحث علمی میں اس سے مدد ملی تھی اور اسلئے علماء نے اس کو تسلیم کیا لیکن بعد کو تحقیق سے معلوم ہوا کہ تمام مسایل علمیہ میں یہ نظریہ کام نہیں دے سکتا اسی لئے جوہر فردہ کے شکل کی تعین میں ہمیشہ ارتقاء بحث کے ساتھ ساتھ تغیر ہوتا رہتا ہے۔"

عامی۔ "سب سے پہلے کس نے جوہر فرد کی شکل کے تعین کی"

عالم۔ "قدماء کا گمان تھا کہ مادّہ ذرات دقیق سے مرکب ہے، لیکن انہوں نے تجربہ کی کسوٹی پر اس خیال کو کبھی نہیں آزمایا تھا۔ بعد کو جدید علمی دنیا میں سب سے پہلے نیوٹن نے اپنی کتاب "بصریات" میں ان ذرات سے بحث کی اور بتایا کہ وہ متحرک ہیں، سخت ہیں، اور انکا تجزیہ نہیں ہو سکتا۔ اس نے ظاہر کیا کہ اجسام مادّی کی نرمی و سختی کا انحصار نہیں اجزاء کی زیادتی

دکی اور تفاعل رہے۔ اس کے ۲۰۰ سال بعد لارڈ کالون نے اس کو بالکل الٹ کر یوں ظاہر کیا کہ اجسام کی سختی کا سبب نرم ذرات ہیں جو سریع حرکت کرتے رہتے ہیں۔

عامی۔ "درست ہے، مجھے یاد آگیا کہ کالون نے جوہر فرد کو 'حلقۂ دخان' سے تشبیہ دی تھی۔"

عالم۔ "ہاں اس نے بتایا تھا کہ جواہر فردہ ایتھر میں گردش کر رہے ہیں جن کے ساتھ نور شامل ہے۔"

عامی۔ "پھر کیا ہوا؟"

عالم۔ "پچاس سال تک کالون کا بتایا ہوا جوہر طبیعات میں کام دیتا رہا کیونکہ اس ذریعہ سے بعض ایسے امور کی تفسیر بیان ہو سکی جو اس سے قبل کے نظریہ کے ماتحت بیان نہیں ہو سکتے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ اس نظریہ میں بھی ایک نقص نکل آیا، اور وہ یہ کہ اس نے جوہر فرد میں جذب کو تسلیم نہیں کیا اور مادہ کی تکوین جواہر سے ممکن نہیں جب تک انہیں باہمد گر جذب وکشش کو نہ مانا جائے۔"

عامی۔ "پھر اس کمی کو کیوں کر پورا کیا گیا؟"

عالم۔ "اس کے بعد ایک زمانہ گذر گیا اور کوئی خاص رائے قائم نہ ہو سکی۔ گذشتہ قرن کے آخر میں پروفیسر رولینڈ نے دعویٰ کیا کہ جوہر فرد کی بنا، پیانو کی بنا کی طرح پیچیدہ وگرہ دار ہے۔"

عامی۔ "میرے خیال میں تو ہمر کا نظریہ رولینڈ کے نظریہ سے زیادہ بسیط تھا۔"

عالم۔ "ہاں، رولینڈ اس وقت تک زندہ نہ رہا کہ علوم طبیعیہ کے جدید ترقی کے سلسلہ میں رانتجنی شعاعوں (X – rays) اور عناصر منورہ کے انکشافات کا حال اسے معلوم ہوتا۔ کیونکہ ان جدید انکشافات سے ایک امر نہایت عجیب وغریب یہ ثابت ہو گیا کہ جوہر فرد کا کہربائی ماننا ضروری ہے۔"

عامی۔ "اسمیں شاید یہ بھی ماننا پڑیگا کہ اس میں قوت جذب وکشش پائی جاتی ہے۔"

عالم۔ "نہیں یہ اس کی لازم صفت نہیں ہے۔"

عامی۔ (حیرت سے) "کشش اس کی لازم صفت نہیں ہے! حالانکہ ابھی آپ لارڈ کالون کے نظریہ کو ناقص بتا رہے تھے جسمیں کشش کو تسلیم نہیں کیا گیا۔ اتنے عرصہ میں وہ کونسا ایسا نیا شخص پیدا ہو گیا، جس نے جوہر کے صفت کشش کو جو لازم مانی جاتی تھی غیر لازم کر دیا۔"

عالم۔ "اینشٹین"

عامی۔ "یہ کیا فرماتے ہیں"

عالم۔ "اس نے کہا کہ اجسام میں باہم کشش وجذب نہیں ہے بلکہ فضا کی شکل جسمیں اجسام حرکت کر رہے ہیں ایسی ہے کہ ایک جسم دوسرے جسم سے مل جاتا ہے۔"

عامی۔ "ان میں باہم کشش ہو یا نہ ہو لیکن یہ تو مسلّم ہو گیا کہ تو ہر نے جو صورت جوہر کی پیش کی تھی وہ زیادہ بسیط ثابت ہوئی"

عالم۔ "نہیں تو ہر کا نظریہ بھی کافی ثابت نہیں ہوا"

عامی۔ "پھر اس کے بجائے اور کیا رکھا گیا؟"

عالم۔ "شرویڈنگر کا نظریہ، جس کو قائم ہوئے صرف تین سال کا زمانہ گزرا ہے"

عامی۔ "کیا وہ نظریہ بھی کہربائی ہے؟"

عالم۔ "ہاں، ہے تو وہ بھی کہربائی لیکن تو ہر کے نظریہ سے وہ کچھ مختلف ہے تو ہر کا نظریہ تو یہ ہے کہ جوہر کے اندر ایک پروٹن ہے جسکے گرد برقپارے یا کہارب اجرام فلکی کی طرح گردش کر رہے ہیں یعنی پروٹن کی کہربائیت ایجابی ہے اور کہارب کی سلبی گویا اس طرح جوہر کے اندر کہربائیت معین نقطوں میں مرکوز ہے جنھیں پروٹن اور کہارب کہتے ہیں۔ دوسرے نظریہ کے موافق اسمیں کہربائیت ہر جگہ پھیلی ہوئی ہے، دوسرا فرق یہ ہے کہ تو ہر کے جوہر میں کہارب ہر وقت حرکت کرتے رہتے ہیں اور شرویڈنگر کے نظریہ کے مطابق وہ ساکن ہیں مگر ان کو قدرت حاصل ہے کہ اوقات معینہ اور نقاط معینہ میں اپنی کہربائیت کی مقدار بدلتے رہیں اور یہی تغیر ہے جو فضا میں امواج نور پیدا کرتا ہے۔

عامی۔ "اب آپ یہ فرمائیے کہ یہ نظریہ آپ کے تمام مطالب کیلئے کافی ہے یا نہیں؟"

عالم۔ "ہاں یہ نظریہ نہ صرف تمام ان ظواہر کی تعلیل کے لئے کافی ہے جن کے نظریۂ تو ہر کے مطابق تعلیل ممکن تھی بلکہ بعض ایسے ظواہر کی بھی تعلیل اس سے ہوتی ہے جو اس قبل ناممکن التعلیل تھے"

عامی۔ "اس وقت تو آپ یہی سمجھتے ہیں، لیکن ممکن ہے ایک دن آپ اس نظریہ کو بھی ناقص کہنے لگیں"

عالم۔ "بالکل ممکن ہے، کیونکہ انسان کا شعور ابھی مرتبۂ کمال سے بہت دور ہے، اور کون کہہ سکتا ہے کہ آیندہ کے تجربات کیا کیا اور جدید نظریہ پیدا کر کے ہمیں مجبور کرتے ہیں اور ہمکو اپنے تصور و فہم کا اعتراف کن کن طریقوں سے کرنا پڑیگا۔

فضائے بسیط اور ہم

ابھی شب کے پردہ میں سورج گیا تھا / پرند اب لیا چاہتے تھے بسیرا
شفق مل چکی تھی ابھی منھ پہ غازہ / نکھرنے ہی والا تھا مکھڑا قمر کا

بس اب گرم ہونے کو تھی بزم انجم
اونڈلنے کو تھے بادۂ نور کے خم

کہ اتنے میں حیرت نے آنکھوں میں چھا کر / جہالت کی تاریکیوں کو مٹا کر
نظر کو مری سوئے گردوں اٹھا کر / سڑک کہکشاں کی فلک پر دکھا کر

کہا دیکھنا ہے اگر کچھ تماشا
تو اس راہ سے تجھ کو چلنا پڑے گا

خیال اتنے میں مجھ کو ہیئت کا آیا / تخیل کی پریوں کو ساتھ اپنے لایا
مجھے اون کے تخت رواں پر بٹھایا / پھر اس تخت کو سوئے گردوں اڑایا

یہ اوج مقدر تو دیکھو کہ اخگر
ہوا جا کے مہمان خورشید خاور

پہونچ کر وہاں بس یہ جی میں سمائی / کہ اب کیجئے سیر باغ خدائی
فضا کی طرف جب نظر اک اٹھائی / تو دیکھا کہ دانائی کبریائی

طلسمات حیرت وہ دکھلا رہی ہے
کہ دیوانگی عقل پر چھا رہی ہے

وہ فانوس حسن ثوابت کے جلوے / وہ گردش میں پروانے سیارگاں کے
چراغ قمر نور پر جن کے صدقے / وہ تاروں بھرے جگمگاتے اوجالے

نہ دن رات ہے واں نہ شام و سحر ہے
تجلی مطلق فقط جلوہ گر ہے

ہر اک شے ہے اطراف عالم سے خالی نہ دہنے نہ بائیں نہ اونچی نہ نیچی
نہ وقت گذشتہ کے ہیں کوئی معنی نہ ہے آنے والے زمانہ کی ہستی

فقط ایک موجود گی کا نشاں ہے
یہاں میں وہاں ہے وہاں میں یہاں ہے

خدایا تری رحمتوں کے سمندر سمائیں تصور کے قطروں میں کیونکر
یہ کچھ وسعتیں چھائی ہیں وسعتوں پر کہ حیرت بھی کہتی ہے اللہ اکبر

جو دل میں خیال فلک کو میں لایا
تو اک بلبلے سے زیادہ نہ پایا

گیا پھر میں ذرّوں کی مخفی تہوں میں اُڑا میں ہواؤں میں اور بادلوں میں
جو ڈوبا سمندر کی گہرائیوں میں تو اچھلا پھر افلاک کی رفعتوں میں

نشاں اوس کے کوچہ کا لیکن نہ پایا
یہ عالم ہے سب جسکی ہستی کا سایہ

نہ پوچھو فضا جس کو کہتے ہیں کیا ہے خلا میں وہ دریا سا کچھ بہہ رہا ہے
نہ کچھ عرض اور طول کی ابتدا ہے نہ جس کے عمق کی کوئی انتہا ہے

کُرے تیرتے پھرتے ہیں مثل ماہی
چھڑکتے ہوئے نور فیض الٰہی

نہ پیمائشوں کی وہاں ہے سمائی نہ میل اور فرسنگ کی ہے رسائی
نہ کچھ علم عداد کی واں بن آئی عیاں ہندسہ کی ہے بیدست وپائی

تفکر دلائل قیاس اور توہم
پہونچکر وہاں ہوگئے سب کے سب گم

اگر باغ سے توڑ لو ایک پتا!! سمندر سے بھر لو اگر کوئی کوزہ!!
جو اُڑ جائے صحرا میں سے ایک تنکا زمیں پر سے مٹ جائے گر ایک ذرّہ

تو باغ اور صحرا زمیں اور سمندر
رہیں گے یہ سب کچھ نہ کچھ اپنا کھو کر

مگر سب نظام اور یہ سورج ہمارا اگر آن واحد میں ہو پارہ پارہ

اگر یہ فلک اور ہر ایک تارا ۔۔۔ فنا ہو کے اُڑ جائے سارے کا سارا
کمی شان ہستی میں ہو گی نہ اتنی
اَر دہر سفیدی کی مقدار جتنی
قیاس و گماں سے ہے یہ شبہ باہر ۔۔۔ کہ اک بوند میں ڈوب جائے سمندر
تعجب سے خالی ہو یہ بات کیوں کر ۔۔۔ کہ ذرہ میں چھپ جائے خورشید خاور
بہ ظاہر یہ ہے جزو کا کُل سے بڑھنا
تامل مگر ماننے میں نہ ہو گا!!
جو بکری کسی شیر کو پھاڑ ڈالے ۔۔۔ اگر مارے خرگوش تازی کے بھالے
اگر بھیڑیئے کو کوئی بھیڑ کھالے ۔۔۔ ہرن بھی کرے چیتے کے گرنوالے
یہ باتیں نہیں گو طلسمات سے کم
یقیں ان پہ لانے کو ہیں مستعد ہم
مگر حد امکان سے بالکل ہے باہر ۔۔۔ کہ قابو ہو قدرت کی پیمائشوں پر
پٹکتا ہے پیمائش ٹپکا کرے سر ۔۔۔ بنائے بنا تا ہے منہ فلسفہ گر
ذہانت بھی زور اپنا سارا لگائے
قلابے زمیں آسماں کے ملائے
مہاسنکھ صدیوں کا دور اک بناؤں ۔۔۔ مہاسنکھ پھر دور ایسے جو پاؤں
گھڑی بھر میں ان سارے دوروں کو کچھوں ۔۔۔ یہ گھڑیاں میں پھر آپ کو اس قدر دوں
کہ جن سے بنیں دن دنوں سے مہینے
بنیں پھر مہینوں سے سو سال پورے
کروں فرض اکدن اب ان سو برس کا ۔۔۔ پھر ایسے دنوں کا بناؤں مہینہ
کروں جمع ایسے مہینے جو بارہ ۔۔۔ تو اک سال بن جائے گا اُنکا پورا
کروڑوں مہاسنکھ پھر سال ایسے
مددگار ہوں میری عمرِ رواں کے
پھر اک سرعتِ برق کا اسپ آئے ۔۔۔ مجھے اپنی پشت رواں پر بٹھائے
گردوں سے گردوں تک وہ پھر اُڑ کے جائے ۔۔۔ وہ بے انتہا اس میں صدیاں لگائے

مگر سب کی سب پھر بھی ہستی قریباً
رہیگی نگاہوں سے پنہاں یقیناً

مبارک ہے لیکن یہ بے انتہائی حقائق شناسوں کی بے دست و پائی
یہ قدرت کے میداں یہ بیحد خدائی بڑے کام آئی بڑے کام آئی!!

اسی بات سے اور اسی کے بدولت
کھلا کرتی تھی نت نئی اک حقیقت

خدا ہم کو دیتا اگر عقل کامل جو ہوتا ہمیں علم ہر شے کا حاصل
نہ طے کرنی پڑتی کبھی کوئی منزل پڑے رہتے بستر پہ بن بن کے کاہل

یہ محنت کے باغوں کی باد بہاری
کسے ہوتی معلوم یوں پیاری پیاری

مجنوں اگر لطف کھانے کا چاہو تو پھر بھوک کی بھی تو سختی اٹھاؤ
کرو ہمت اے آب رحمت کے پیاسو پسینے بہا کر کنویں کھود ڈالو

ذرا بھی پڑی جس کو محنت کی عادت
سمجھ لو کہ ہے اس کے قدموں میں راحت

غرض نوع انسان کی یہ کم علمی ہے اک وجہ ہر چیز کے جاننے کی
سمجھ سوچ میں ہے خدائی ہے کیسی ہے پستی کی تہ میں چھپی کیوں بلندی

مقید نہ ہوتے جو ہم اس زمیں پر
تو اٹھتے سوالات یہ دل میں کیونکر

کہ اے چرخ کیونکر تری کل چلی ہے تجھے شکل اے چاند یہ کس نے دی ہے
ستارو قسم تم کو سورج ہی کی ہے بتاؤ تو کس کی یہ جادوگری ہے

شرابِ کماں اپنی کس نے پلا کر
تمہیں بے خودی کے دئے ہیں یہ چکر

یہ مانا کشش کی یہ کاریگری ہے! کشش تم میں لیکن یہ کس نے بھری ہے
کسی نے تو تم میں یہ عشرت دھری ہے کہ شرمندہ اڑنے میں تم سے پری ہے

یہ کیا ہے یہ قانونِ قدرت ہی کا ہے

یہ سامان صرف اپنی حیرت ہی کا ہے

کہاں ہیں وہ جو منکر ان خدا ہیں — تمہیں دیکھیں، آنکھیں اگر انکی وا ہیں
وہ اپنی ہلاکت پہ کیوں مبتلا ہیں — یہ روحانی خونخواریاں کب روا ہیں

ہے علت کوئی جس کے معلول ہو تم
شجر ہے کوئی جس کے پھل پھول ہو تم

وہی ہے کہ ہر چیز جس سے بنی ہے — اوسی کی ہر اک سمت شادی رچی ہے
ہر اک دل میں اسکی لگن لگ رہی ہے — ہر اک جان کی جان بس اک وہی ہے

عناصر زمین کے فلک کے ستارے
اسی کے تو اخگر براتی ہیں سارے

امداد حسین اخگر مرادآبادی

غزل

قفس میں آرزو جینے کی ہم صیاد کیا کرتے — بڑھا کر اور اپنی قید کی میعاد کیا کرتے
فنا ہی اور شئے تبدیل ہئیت دوسری شئے ہو — وہ میری ایک مشت خاک کو برباد کیا کرتے
ہمارا ضبط تھا پابند آئین زباں بندی — لب خاموش کو آلودہ فریاد کیا کرتے
ہمیں تھی اُنسے امید وفا اور وہ وفا دشمن — انہیں ہم بھول کیوں جاتے ہمیں وہ یاد کیا کرتے
انہیں فرصت کہاں تھی دشت وحشت کے تماشے سے — ترے دیوانے سیر عالم ایجاد کیا کرتے
ہماری خاک کا ہر ذرہ دنیائے محبت ہے — ہمیں برباد بھی کرتے تو وہ برباد کیا کرتے
سنائی گریۂ خونیں میں انکو داستاں دلکی — بیاں ہم اس سے بہتر درد کی روداد کیا کرتے
طلسم بیخودی تھے نقش دنیائے محبت کے — ستم کش امتیاز راحت و بیداد کیا کرتے
فضا گونجی ہوئی ہے نغمۂ منصور سے اب تک — ترے دیوانے جو کچھ کر گئے آزاد کیا کرتے

مری آشفتہ حالی اک سزا تھی جرم الفت کی
وہ قید غم سے اے فرخ مجھے آزاد کیا کرتے

فرخ بنارسی

"جامِ کہن ——— اور ——— بادۂ نو"

بہلاؤں تا بہ کے دلِ آشفتہ سر کو میں کب تک مٹاؤں رنج والم کے اثر کو میں
حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں شاید کچھ اس طرح میری تسکین ہو سکے
مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

حرماں نصیب دل کی تسلی کو کیا کروں کب تک میں بزمِ ناز سے نا آشنا رہوں
چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں لیکن یہ سادگی ہے کہ از راہِ امتحاں
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

بے اختیار یوں یہ نہیں کوئی اختیار اللہ رے اضطرابِ دلِ ناتوان و نزار
جانا پڑا رقیب کے در تک ہزار بار اور ایسے حال میں کہ نہیں طاقت و سکوں
اے کاش جانتا نہ ترے رہگذر کو میں

باطل کی شوخیوں سے نہ حق آشنا ڈرے اک سرفروش قتل کی دھمکی سے کیا ڈرے
ہے کیا جو کس کے باندھیے میری بلا ڈرے سمجھا ہے تم نے کیا مرے وہم و قیاس کو
کیا جانتا نہیں ہوں تمہاری کمر کو میں

اب دورِ عاشقی کا زمانہ تمام ہے کہتے ہیں جس کو عشق وہ سودائے خام ہے
لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے اللہ رے زر پرستیِ دنیائے حسن و ناز
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

پروانہ جیسے جاتا ہے شعلہ کی لو کے ساتھ تاریکیوں کا دور چلے جیسے ضو کے ساتھ
چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہرو کے ساتھ صرف اس امید پر کہ ملے کوئی غم گسار
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

کم بخت جانتے ہی نہیں عشق کا وقار اہلِ ہوس سمجھ نہ سکیں گے مرا شعار
خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار یہ کم نگاہیاں ہیں تو کہنا پڑا ابھی مجھے

کیا پوچھتا ہوں اس بت بیداد گر کو میں

اب لغزش قدم پہ نہیں کوئی اختیار　جذبات ہوشیار نہ احساس پائدار
پھر بیخودی میں بھول گیا راہ کوئے یار　اے وائے فرط شوق کی حرماں نصیبیاں
جاتا وگرنہ ایک دن اپنی خبر کو میں

ملتا نہیں کوئی مجھے مجھ جیسا مبتلا　اہل نظر کو ڈھونڈھتا پھرتا ہوں جابجا
اپنے پہ کر رہا ہوں قیاس اہل دہر کا　میرا قصور ہے کہ بہ عنوان شاعری
سمجھا ہوں دلپذیر متاع ہنر کو میں

جویا اس آستاں کا ہے اکبر سر نیاز　محمود سے جدا رہے کب تک بھلا ایاز
غالب خدا کرے کہ سوارِ سمند ناز　صمصام حیدری کو نمایاں کئے ہوئے
دیکھوں علی بہادرِ عالی گہر کو میں

اکبر حیدری

غزل

منتشر شیرازۂ ہستی تو کیا ہو جائیگا　صرف وہ برہم نہ ہوں نالہ رسا ہو جائیگا
التفات ناز کیا صرف وفا ہو جائیگا!　دو گھڑی کو آ ہی جاؤ گے تو کیا ہو جائیگا؟
ان کے دل کی بات میری آرزو بنجائیگی　وہ جو سوچیں گے مقدر کا لکھا ہو جائیگا
آپ تو بیمار غم کا حال سنکر رو دئے　یہ نہ سوچا کوئی سن لیگا تو کیا ہو جائیگا
حسن ہی خود بن گیا سرمایہ دار درد عشق　اب جفا کو بھی وفا کہنا روا ہو جائیگا
وہ تاسف کیوں کریں سنکر کسی کا حال زار　اس سے تو درد دروں شاید سوا ہو جائیگا
یک بیک طالب گھٹائیں سی خرد پر چھا گئیں
سوچتا یہ تھا کہ کوئی اور کیا ہو جائیگا؟

طالب باغپتی

"تو ایسے سمے میں آ پیاری!"

دنیا کی فضائیں سب چپ ہیں! جنگل کی ہوائیں سب چپ ہیں!
چڑیوں کی صدائیں سب چپ ہیں! آ پریت کے گیت سنا پیاری!

تو ایسے سمے میں آ پیاری!

غم کی گھٹا ہے گھر کر آئی یاس نے دل پر چھاؤنی چھائی!
میں ہوں اور میری تنہائی اس تنہائی کو مٹا پیاری!

تو ایسے سمے میں آ پیاری!

پچھلے پہر کی خاموشی ہے فطرت غرق مدہوشی ہے
اک عالم سکر فروشی ہے آ سینے میں اتنا پیاری!

تو ایسے سمے میں آ پیاری!

کلیوں پہ تتلی منڈلاتی ہے! اور پریت کے گیت سناتی ہے!
پچھلی کہانی یاد آتی ہے! آ پھر وہی رنگ دکھا پیاری!

تو ایسے سمے میں آ پیاری!

گھنگھور گھٹائیں چھاتی ہوں! سرمست ہوائیں آتی ہوں!
چڑیاں گیت سناتی ہوں! سبزے کا ہو فرش بچھا پیاری!

تو ایسے سمے میں آ پیاری!

دنیا ساری خوابیدہ ہے! اور فطرت آرامیدہ ہے!
بیدار نظر رنجیدہ ہے! سپنا بن کے سما جا پیاری!

تو ایسے سمے میں آجا پیاری!

وادی کے نظارے سامنے ہیں! دریا کے کنارے سامنے ہیں!
خوش رنگ ستارے سامنے ہیں! ایک جھلک دکھلا جا پیاری!

تو ایسے سمے میں آ پیاری!

دل میں یہ یا محشر غم ہے!
روح پہ طاری سیل الم ہے

اختر کی آنکھوں میں نم ہے!
سب کچھ دل سے بھلا جا پیاری

تو ایسے سمے میں آ جا پیاری!

اختر شیرانی

افکار انجم

چشم حیرت سے دیکھتے ہیں تجھے
ارے انساں! بری بلا ہے تو!

کرم بے مایہ تھا تو ہی کل تک
آج دیکھے کوئی کہ کیا ہے تو!

کونسی شئے سے تو نہ ڈرتا تھا؟
کونسی شئے نہ تھی تری مسجود؟

عہد طفلی میں بے خبر تھا تو
کہ تری ذات کا ہے کیا مقصود؟

آج تیرے شعور کا عالم
محو حیرت کئے ہے عالم کو؟

اب ہوا کائنات کو معلوم
کیا بلا دی گئی تھی آدم کو!

تیری وسعت کے ممکنات کا ہم
رات بھر ذکر کرتے رہتے ہیں

سچ تو یہ ہے کہ دسترس سے ترے
دل میں ہم خود بھی ڈرتے رہتے ہیں

دیو فطرت تو ہو چکا بسمل
اب زمان و مکاں کی باری ہے

جسکی زد میں ہیں آسمان و زمین
تو ہی لاریب وہ شکاری ہے

امین حزیں

حسن زار کشمیر کی ایک صبح

سحر نے چاک کیا جب کہ رات کا دامن — جہاں کا چہرۂ بے نور ہو گیا روشن
ہوا وہ پچھلا پہر شمع جھلملانے لگی — وہ دیکھو ہو گئے دھندلے کواکبِ روشن
عروسِ صبح وہ گھونگھٹ میں مسکرانے لگی — اٹھا دی بڑھ کے دھندلکے نے رات کی چلمن
وہ موجِ آب مچلتی ہوئی بڑھی آگے — دکھا رہی ہے زمانے کو بجلیوں کے چلن
وہ دیکھو بزم میں دریا کے اک تلاطم ہے — نہانے آئی ہے خورشید کی وہ پہلی کرن
حسین ہیروۂ آبی جو جگمگانے لگا — شعاعِ مہر نے خود بڑھ کے ڈال دی چلمن
سوائے نور کے اب کچھ نظر نہیں آتا — کہ بن گیا ہے ہیولائے برق کا مسکن

نقاب اٹھتے ہی خورشید کی چمک اٹھا — ہر ایک قطرۂ شبنم مثالِ درِّ عدن
بچھی ہے صحن میں سبزے کی مخملی چادر — کھڑے ہیں سب وہ قطار و نمیں نگرانِ چمن
وہ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں وہ بھینی بھینی مہک — مسامِ جاں کو معطر کئے ہے بوئے چمن!
چمک سے مہرِ درخشاں کے صحنِ گلشن میں — ہر ایک قطرۂ شبنم ہے گوہرِ روشن
نسیمِ صبح کے جھونکوں کی وہ دلآویزی — وہ سبزہ زار کی لہریں وہ رنگ و بوئے چمن
وہ گدگدایا نسیمِ سحر نے کلیوں کو — وہ کھلکھلا پڑا ہر اک چمن کا غنچہ دہن
ہر ایک طائرِ خوش رنگ چہچہا اٹھا — عجیب رنگ پہ آئی ہے آج بزمِ چمن
ہر ایک غنچہ چٹک کر ہوا ترنم خیز — وہ دیکھو چھڑ گیا اب سازِ اہلِ بزمِ چمن
ہر ایک پنکھڑی پھولوں کی مست ہونے لگی — وہ جھومنے لگے ہر سمت ہوشانِ چمن
صدا وہ آنے لگی حمد کے ترانوں کی — اٹھا وہ صحنِ گلستاں سے نغمۂ گلشن

عجیب تجلیاں پرتو نے صبح کی بھر دیں — کسی کے روکے سے رکتا نہیں ہے جوشِ چمن
ہم وہ برگِ شجر نے بھی مل کے چھیڑا ساز — ہر ایک شاخ ہوئی گل کی صورتِ معدن
صدائے بربط و چنگ و رباب آنے لگی — نوائے زمزمہ سنجی سے گونج اٹھا گلشن

ہر ایک شاخ بھی پھولی نہیں سماتی ہے
ہے کھنچ کے آیا یہاں تک بہار گلشن

کہ اڑ نہ جائے کہیں پھر یہ بزم گلشن سے
نسیم صبح ہے تھامے نسیم کا دامن

بیاں ہو کس طرح تفصیل مختصر یہ ہے
بنا ہے تختۂ فردوس تختۂ گلشن

سحر کی ادنیٰ سی محمود یہ تجلی ہے
کہ جس نے منظر عالم کو کر دیا روشن

محمود الہ آبادی

غزل

حسن مشتاق وجودِ دیدۂ بینا ہوا
عشق محو انتظار لذت فردا ہوا

آرہا ہوں بزم فطرت کا تماشا دیکھ کر
ہر نفس میرا ابھی ہے کیف میں ڈوبا ہوا

فطرتِ مجبور تعمیل ادا امر کیا کرے
ایک دل حصے میں آیا وہ بھی ہے سہما ہوا

ذرہ ذرہ بنگیا دل عشق کی تاثیر سے
کوئی دیوانہ ترا جب وارد صحرا ہوا

صبحدم اٹھے ہیں لیکر دل میں ہم داغ جنوں
چاہیئے خورشید کو نکلے ذرا ابھرا ہوا

اپنے سایہ سے بھی رم کرنے لگے اہل جنوں
اپنی ہستی پر انہیں جب غیر کا دھوکا ہوا

اللہ اللہ ابتسام حسن کا حسن کمال
ایک موج نور میں دل ہے مرا ڈوبا ہوا

وہ نگاہ جذب اٹھی جب کبھی میری طرف
عرصۂ ہستی میں پیدا ایک سناٹا ہوا

ارتقائے عشق ہے تمہید تکمیل جنوں
اس سے آگے بڑھ گیا تو قیس خود لیلیٰ ہوا

دیکھتا ہوں میں بھی حافظ حسب ارشاد جگر
منظر فطرت کو دل تھامے ہوئے سہما ہوا

حافظ غازیپوری

باب الاستفسار

عہد اسلام اور علم نجوم و فلکیات

(جناب سید محمد ارتضا صاحب ۔ مدراس)

غالباً آپ کو معلوم ہوگا کہ دکن و جوار دکن کے بعض مقامات میں جوتش اور علم نجوم کے جاننے والے بکثرت پائے جاتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے بعض اپنے فن میں کامل بھی ہیں، ماضی کے حالات بڑی حد تک صحیح بتاتے ہیں، اس لئے لوگوں کو اپنے مستقبل کے متعلق بھی ان کی پیشین گوئی پر اعتبار آجاتا ہے ۔ لیکن یہ سب غیر مُسلم ہیں، مجھے بھی یہاں عرصہ تک قیام کرنے کی وجہ سے کچھ دلچسپی اس فن سے ہوگئی ہے ۔ اور اردو کی ان مشہور کتابوں کا بھی مطالعہ کیا ہے جو بازار میں ملسکتی ہیں ۔ میں ایک کتاب مرتب کر رہا ہوں جسمیں علم نجوم اور فلکیات کی تاریخی حیثیت سے بھی بحث کرنا ضروری ہے اس لئے براہ کرم مطلع فرمائیے کہ مسلمانوں میں کب سے ان فنون کا رواج ہوا، ان کے کیا کیا خاص کارنامے ہیں، پھر یہ بھی بتائیے کہ علم نجوم کے ذریعہ سے جو احکام صادر کئے جاتے ہیں وہ کیوں اور کس حد تک قابل اعتبار ہو سکتے ہیں ۔ فلکیات اور نجوم میں باہم کیا علمی رابطہ ہو سکتا ہے ۔

(نگار) آپ کا استفسار بحث کے مختلف پہلو پیش کرتا ہے اور غالباً یہ مشکل ہے کہ باب الاستفسار کے محدود و متعین صفحات میں تمام پہلوؤں پر علیحدہ علیحدہ گفتگو کر سکوں ۔ بہر حال تعمیل ارشاد کرتا ہوں اور مختصراً جتنی روشنی ان مسایل پر ڈالی جاسکتی ہے، اسکو بیک وقت پیش کرنیکی کوشش کرونگا ۔

فضا اور کواکب و نجوم سے دو علم متعلق ہیں جنمیں سے ہر ایک کا موضوع بالکل جداگانہ ہے ۔ ایک وہ جسے علم نجوم یا علم احکام نجوم یا علم تنجیم کہتے ہیں اور دوسرا وہ جو ہیئت یا فلکیات کے نام سے موسوم ہے ۔ پہلے کا مقصود گردش کواکب کو دیکھ کر پیشین گوئی کرنا ہے اور دوسرے کا صرف اجرام فلکی کے متعلق علمی تحقیق و جستجو ۔

علم تنجیم کو ارسطو نے علوم طبیعیہ کی شاخ قرار دیا ہے لیکن فارابی اور ابن خلدون وغیرہ نے اسکو علوم ریاضیہ میں شامل کیا ہے ۔ میرے نزدیک علم التنجیم کا جس حد تک تعلق ہیئت سے ہے اُسے ریاضی کی شاخ سمجھنا چاہیئے

اور حکایات صادر کرنے کا حصہ اُن علوم طبیعیہ سے وابستہ ہے جنمیں علم الفراست (قیافہ) علم الکیمیا اور علم تعبیر الرؤیا وغیرہ داخل ہیں۔

علم تنجیم کی بنیاد اس اعتقاد پر قایم ہے کہ تمام تغیرات "عالم کون و فساد" کے اجرام فلکی کی گردش سے وابستہ ہیں اور اس سلسلہ میں جس قدر اصطلاحات مرتب ہوئی ہیں اور جن کا علم آپ کو ہونا چاہئے، ان سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے دیگر علوم و فنون کی طرح اس طرف بھی خاص توجہ کی اور ہیئت کی بہت سی اصطلاحات کی طرح، علم نجوم کے بھی تمام اصطلاحات یورپین لٹریچر میں انہیں سے لئے گئے۔ مسلم ماہرین علم نجوم نے زیادہ تر ان تین باتوں کی طرف توجہ کی۔ اول۔ روزانہ واقعات زندگی کے متعلق سوالات کا جواب دینا۔ مثلاً یہ کہ فلاں چیز ملے گی یا نہیں، فلاں شخص کہاں غایب ہوگیا ہے، فلاں چور پکڑا جائے گا یا نہیں وغیرہ وغیرہ اس کا اصطلاحی نام "مسایل" ہے۔ دوسرے کسی کام کرنے کے لئے نیک ساعت بتانا جسے اصطلاح میں "اختیارات" کہتے ہیں۔ تیسرے زائچہ طیار کرنا جس سے کسی شخص نومولود، یا قوم کے ماضی و مستقبل کے حالات معلوم ہوسکیں جسے اصطلاح میں "تحویل سن الموالید" یا "تحویل سن العالم" کہتے ہیں۔

عرب کے مسلمانوں نے اس فن کو مختلف ذرایع سے حاصل کیا، یونانی ذرایع میں سے افلاطون، ویتیس ولینس (Vettius Valens) ڈروتھیس سڈونس (Dorotheus Sidonius) تیوسر (Teucer)، انتیاکوس (Antiochus) مخصوص طور پر قابل ذکر ہیں۔ علاوہ یونانی ذرایعہ کے پہلوی اور ہندی کتابوں سے بھی انھوں نے مدد لی اور مصر و عراق اور شام میں جو زبانی روایات اس فن کے متعلق چلی آرہی تھیں ان سے بھی فایدہ اٹھایا۔ الغرض مسلمانوں کا علم تنجیم ان سب کا امتزاج تھا جو نہایت مکمل طریقہ سے ابومعشر کی تصانیف میں پایا جاتا ہے۔

فلاسفہ و فقہاء وغیرہ نے سوائے الکندری، فخر الدین رازی اور اخوان الصفا کے ہمیشہ اس علم کی مخالفت کی، لیکن عملاً یہ مخالفت بیکار ثابت ہوئی اور تمام خلفاء و امراء کے دربار میں اہل تنجیم کا باثر ہونا تاریخ سے ثابت ہے۔

اس فن میں ابومعشر کی مشہور تصانیف کے علاوہ الکندری کے رسایل جنمیں اسلام کا زائچہ طیار کیا گیا تھا، علی بن رضوان کی شرح افلاطون کی کتاب پر، احمد بن یوسف کی شرح کتاب الثمرہ پر، ابوالحسن علی بن ابی رجال کی تصانیف، سہل بن بشر ابوبکر الحسن بن الخصیب، ابوعلی یحییٰ بن الخیاط، محمد بن عمر بن الفرخان الطبری، کی کتابیں جنکے ترجمے پہلے لاطینی زبان میں اور پھر یوروپ کی دوسری زبانوں میں ہوکر مشہور ہوچکے ہیں۔ اس فن میں مسلمانوں کے مشہور علمی کارنامے یہ ہیں

علم الافلاک یا علم ہیئت میں مسلمانوں کی کاوشیں بہت زیادہ قابل قدر ہیں، یوں تو اہل عرب ظہور اسلام سے قبل ہی ہیئت کا کچھ نہ کچھ علمی علم رکھتے تھے جسے اُن کی صحرائی زندگی اور بدویانہ طرز معاشرت نے مجبور سکھا دیا تھا (کیونکہ رات کی سیاحتوں نے جنکا وہاں بہت زیادہ رواج تھا، انہیں بتا دیا تھا کہ چاند اور ستاروں کی جائے وقوع اور اوقات طلوع اور غروب سے وقت اور موسم کا حال معلوم کر لیا کریں) لیکن علمی حیثیت سے اس کا رواج دوسری صدی ہجری میں ہوا اور اس کی ابتدا سنسکرت کی ان کتابوں سے ہوئی جو ۱۵۴ھ میں دربار خلافت تک پہونچیں، یہ کتابیں برہما گپتا

کی تھیں اور انہیں کو پیش نظر رکھکر، ابراہیم حبیب الفزاری اور یعقوب بن طارق نے عربی میں اس فن کی کتابیں مرتب کیں اور ابوالحسن اہوازی نے گردش سیارگان کا نقشہ بنایا۔ ان کتابوں میں جس اصول پر نقشے دیئے گئے تھے اسکا نام انہوں نے السندہند رکھا، جو یقیناً سنسکرت لفظ سدھانتا کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔ یہ اصول تقریباً پانچویں صدی ہجری تک قایم رہا۔

اس کے بعد پہلوی کتابوں اور نقشوں سے مدد لی گئی چنانچہ عربی کا زیج شاہ یا زیج شہریار پہلوی نقشہ زیک شترو۔ ایار ہی کا مترادف ہے جو ساسانی حکومت کے زمانے میں طیار ہوا تھا۔ تیسری صدی ہجری میں مسلمان ہیئت داں اس زیج کے زیادہ مایل تھے لیکن اس کے بعد اسکا رواج ختم ہوگیا۔

ہیئت میں یونانی اثر کو مسلمانوں نے بہت بعد میں قبول کیا لیکن حد درجہ استحکام کے ساتھ سب سے پہلے (Almagest) کا ترجمہ المجسطی کے نام سے ہوا، جو زیادہ کامیاب چیز نہیں کہی جاسکتی لیکن اسکے بعد حجاج بن مطر اور حنین بن اسحاق نے زیادہ بہتر صورت میں اس خدمت کو انجام دیا۔ اس سلسلہ میں اور بعض مشہور یونانی ہیئت دانوں کی کتابوں کا ترجمہ کیا گیا۔

باقاعدہ رصدگاہوں کے استعمال کی ابتدا جندیشاپور میں (جو ایران کے جنوب و مغرب کا ایک مقام ہے) ہوئی اور احمد النہاوندی نے اپنی مشہور زیج المشتمل طیار کرنیکے زمانہ میں آلات رصدگاہ کا استعمال کیا۔

مامون الرشید عباسی کے زمانہ میں مسلمانوں کی ترقی اس فن میں اپنے عروج پر تھی۔ بغداد کی رصدگاہ میں یحیی بن ابی منصور کی نگرانی میں دربار خلافت کے ہیئت دانوں نے باقاعدہ گردش اجرام کا معاینہ کیا، المجسطی کے تمام اصول کی عملی تصدیق کی اور بہت سے مسایل ہیئت عملی طور پر حل کئے اور الزیج الممتحن طیار کیا جس کی تصدیق کوہ قاسیان کی رصدگاہ سے بھی کی گئی۔ عہد مامون الرشید میں تدمر اور الرقہ کے درمیان دایرہ نصف النہار کے ایک درجہ کی پیمایش ایک مشہور واقعہ ہے۔

عہد مامون میں محمد بن موسیٰ الخوارزمی بھی نہایت مشہور ہیئت داں ہوا جس کی زیج دو صدی تک رائج رہی۔

۸۵۰ء سے ۸۷۰ء تک موسیٰ بن شاکر کے تین بیٹوں نے خود اپنے گھر پر رصدگاہ قایم کر کے ہیئت کا مطالعہ کیا۔ اسی صدی میں شیراز، نیشاپور، سمرقند وغیرہ میں بھی رصدگاہوں سے کام لیا گیا۔ تیسری صدی ہجری میں ثابت بن قرہ البتانی، الماہانی، النائریزی وغیرہ مشہور ہیئت داں گذرے ہیں۔

سلاطین بویہ کے زمانہ میں بھی ایک رصدگاہ قایم ہوئی اور عبدالرحمان الصوفی، ابن الاعلم، ویجن بن رستم الکوہی، احمد الصاغانی اور ابوالوفا وغیرہ بڑے بڑے ہیئت داں دربار میں جمع ہوگئے۔ اسی زمانہ میں غزنہ میں البیرونی ہوا جس کے کارنامے کافی مشہور ہیں۔

مصر میں باقاعدہ مطالعۂ ہیئت فاطمی خلیفۂ العزیز کے زمانہ میں شروع ہو۔ اس خلیفہ نے قاہرہ میں ایک رصدگاہ قایم کی اور جایداد اس کے متعلق وقف کی گئی۔ اسی رصدگاہ میں ابن یونس نے اپنا مشہور "الزیج الحاکمی" طیار کیا۔ اسپین میں دسویں

صدی عیسوی کے وسط سے اس طرف توجہ ہوئی اور شاہزادگان قرطبہ، اشبیلیہ، اور طالیدہ نے بھی اس جانب اعتناء کیا یہاں جو تصانیف ہوئیں وہ پہلے اسپینی زبان میں اور پھر لاطینی میں منتقل ہوئیں۔ یہاں کے مشہور ہیئت داں مسلمۃ المجریطی، ابن السمح، جابر ابن افلح، اور الزرقالی تھے۔ شمالی افریقہ میں ہر چند کوئی باقاعدہ رصدگاہ قایم نہیں ہوئی تاہم بعض ہیئت داں وہاں ایسے پیدا ہوئے جن کا نام تاریخ میں پایا جاتا ہے اور جنمیں ابوعلی الحسن المراکشی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

شمالی ایران میں سلجوقیوں کا دربار بھی اس علم کے ماہرین سے خالی نہ تھا چنانچہ جلال الدین ملک شاہ سلجوقی کے زمانے میں بمقام نیشاپور رصدگاہ قایم ہوئی اور اسکے بعد الخزانی نے زیج سنجری طیار کی۔

ایلک خانی خاندان کی مشہور خونریز وخون آشام ہستی ہلاکو نے بھی مراغہ میں ایک بڑی رصدگاہ نصیر الدین طوسی کی نگرانی میں طیار کرائی۔

علامہ طوسی نے بارہ سال کے مطالعہ کے بعد زیج الکنعانی شایع کی۔ طوسی کا ایک شاگرد قطب الدین محمود الشیرازی بھی خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

قاہرہ میں ایک شخص ابن الشاطر بڑا ماہر فلکیات پیدا ہوا جس کے مرتب کئے ہوئے زایچے شام، مصر، اور تمام شمالی افریقہ میں رائج ہوئے۔

تیمور کے پوتے سلطان الغ بیگ نے سمرقند میں ایک بہت بڑی رصدگاہ تعمیر کرائی جسمیں جمشید الکاشی، قاضی زادہ، الرومی، اور علی القوشجی ایسے مشہور ماہرین فن مامور کئے گئے اور خود سلطان الغ بیگ نے کئی سال تک رصدگاہ کی صدارت کی مگر افسوس ہے کہ الغ بیگ کے ساتھ ہی اسلامی دنیا سے ہیئت کی اصلی شان مٹ گئی اور اسکے بعد صرف جنتریاں بنانے والے، اور اوقات نماز بتانے والے لوگ رہ گئے۔

مسلمان ہیئت دانوں نے تقریباً بطلیموس کا تتبع کیا اور زمین کو ساکن مانکر، دیگر اجرام فلکی کی گردش کو دائرہ دار تسلیم کیا۔ البتہ اسپین کے بعض فلاسفہ نے نظام بطلیموسی کی مخالفت کی۔ ان میں سب سے پہلا محمد بن یحییٰ تھا جو ابن باجہ کے نام سے مشہور ہے۔ ابن طفیل نے بطلیموس اور ابن باجہ دونوں کی مخالفت کی۔ ابن رشد نے حرکت اجرام کو لولبی ([illegible]) تسلیم کیا۔

الغرض مسلمانوں کے کارنامے علم ہیئت میں دیگر علوم ریاضیہ کی طرح کم نہیں ہیں اور یورپ کا بہت سا علمی ذخیرہ فلکیات کے متعلق مسلمانوں ہی کی کتابوں کا ترجمہ ہے۔

اب آپ کے سوال کا ایک جزو رہگیا، اور وہ یہ کہ آیا ہماری زندگی اور معاملات زندگی پر اجرام فلکی کا کوئی اثر ہوتا ہے یا نہیں، سو اس کا جہاں تک علمی تعلق ہے، انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ حوادث طبیعی کا تعلق زیادہ تر گردش سیارگان ہی سے ہے اور اب جبکہ فضا کی شعاعوں کے اثرات بداہتہً ثابت ہوتے جا رہے ہیں۔ اس سے کون انکار

کر سکتا ہے کہ اہل زمین کی صحت و بیماری، ترقی و تنزل کا تعلق فضا اور رمانی الفضا سے نہیں لیکن کسی کا یہ خیال کر لینا کہ جو کچھ کرتے ہیں اجرام فلکی کرتے ہیں ہیشک لغو و جہل ہے اور اسی خیال سے مذہب نے اہل نجوم کی پیشین گوئیوں کے خلاف احتجاج کیا۔ البتہ ان کو اگر بجائے فاعل کے دلایل و ذرائع مان لیا جائے تو کوئی حرج نہیں اور بڑی حد تک حقیقت سے بھی قریب ہے

پراسرار لوح کا انکشاف

آجکل طب یونانی کی بڑی شد و مد سے مخالفت ہو رہی ہے جو لوگ اسکے کرشمے سے ناواقف ہیں وہ ذیل کے مضمون کا مطالعہ کریں جو رسالہ الحکیم سے پبلک کے فائدہ اور اطلاع کیلئے اقتباس کیا گیا ہے۔ رنگون کے ایک صاحب ثروت سوداگر اسباب معلومہ کیوجہ سے ...... نوذی کا شکار ہو کر بالکل ...... ہوگئے تھے۔ مدت تک مشہور معروف اطبا کا علاج کرایا مگر حسب منشار فائدہ نہ ہوا۔ یہ قاعدہ ہے کہ مایوس العلاج مریض ذلیل سے ذلیل طریقہ علاج کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ انہوں نے بھی عطائیوں اور اناڑیوں سب سے ہی رجوع کیا اور آخر میں ناکامیاب رہنے پر یہ قصد کر لیا کہ ہندوستان کے تمام مشہور مقابر پر جا کر دعائیں مانگیں اور دوران سفر میں جو فقیر یا طبیب ملنے لگے ان سے بھی رجوع کریں وہ اپنے اسی دورہ پر تھے کہ اتفاقاً درگاہ حضرت محبوب الٰہی کی درگاہ میں مجھ سے شناسائی ہوئی اور یہ معلوم ہونے پر کہ میں طبیب ہوں اپنا حال مجھے سنا دیا اور ٹھنڈی سانس بھر کر چپ ہو رہے۔ مجھ پر انکے طرز بیان کا کچھ ایسا اثر ہوا کہ فوراً علاج کرنے کا وعدہ کر لیا۔ چنانچہ میں نے ان کا علاج نہایت محنت و جانفشانی سے شروع کیا لیکن کوئی فائدہ مرتب نہ ہوا۔ قریب تھا کہ وہ بددل ہو کر واپس چلے جائیں کہ حسن اتفاق سے ایک دوست کی زبانی معلوم ہوا کہ گوڑ گانوہ میں کوئی نذیر احمد صاحب ہیں جن کے پاس اس مرض کا نادر نسخہ موجود ہے لیکن نہ وہ طبیب ہیں نہ صاحب غرض بلکہ گھر کے رئیس اور کھاتے پیتے ہیں۔ نسخہ کسی کو نہیں بتلاتے۔ البتہ اگر کوئی زبردست سفارش لے کر پہونچ جائے تو دوا تیار کر دیتے ہیں۔ اس قدر تعریف سن کر میں ایک تعارفی خط لے کر سیدھا گوڑ گانوہ پہونچا وہ بہت اخلاق سے پیش آئے اور دوا مجھے دے دی۔ میں نے سیٹھ صاحب پر اسکا استعمال شروع کیا۔ سیٹھ صاحب کی قوت حیرت انگیز طور پر ترقی کر گئی اور اس قدر طاقت پیدا ہوئی کہ بیان سے باہر ہے، اور میں نے اس کو متعدد مریضوں پر مختلف حالات میں آزمایا ہر بھی ہمیشہ تیر بہدف پایا یقیناً میرے علم میں ایسا پر اثر نسخہ کسی دوسرے شخص کے پاس نہیں ہے۔ مجھے صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ یہ نسخہ بوعلی سینا کی خاص دماغی کوششوں کا نتیجہ ہے جو کسی بادشاہ کے لئے تجویز کیا گیا تھا اور ایک معدنی لوح پر کندہ ہے وہ اس نسخہ سے کوئی فائدہ نہیں اٹھاتے اس لئے میری یہ استدعا بیجا نہ ہوگی کہ ایسے صاحب کمال کے اس نسخہ کو الحکیم میں شایع کر کے تمام اطبا ہند کو شکریہ کا موقعہ دیں۔

خادم الاطبا مسعود الرحمٰن

اڈیٹر صاحب الحکیم کا نوٹ

یہ مکتوب کوئی دو تین ماہ ہوئے ہمارے پاس پہونچا تھا لیکن اشاعت سے قبل ہمنے ان واقعات کی مزید تحقیق کے لئے اپنے کرم فرما خان بہادر ملک سردار علی صاحب کو تکلیف دی جو حسن اتفاق سے آجکل گوڑ گانوہ میں قیام پذیر ہیں چنانچہ صاحب موصوف کا جو جواب ہمیں موصول ہوا ہے وہ درج ذیل ہے:۔ مکرمی جناب حکیم صاحب السلام علیکم میں کل نذیر احمد قریشی سے ملا بعقاعدہ حکیم نہیں ہیں۔ مولوی برکت علی صاحب وکیل لاہوری کے فرزند ہیں ان کے پاس قوت باہ کا واقعی ایک عجیب نسخہ ہے۔ تابعدار سردار علی سپرنٹنڈنٹ پولیس مارچ ۲۹ء

نوٹ:۔ یہ دوا پبلک کی فرمایش سے بارہا تیار ہو چکی ہے۔ چونکہ اس نسخہ کے اجزا بہت مشکل سے فراہم ہوتے ہیں اس لئے اس دفعہ بھی صرف ۱۰۰ اشخاص کے لئے دوا تیار کی جا رہی ہے۔ جس میں سے بہت سے نام رجسٹر ہو چکے ہیں۔ ضرورت مند اصحاب قیمت دوا جلد روانہ کر کے اپنا نام رجسٹر کرا لیں۔

قیمت:۔ اکسیر سینا سات روپیہ طلا رسینا تین روپیہ محصولڈاک چھ آنے (۶)

پتہ:۔ نذیر احمد قریشی صیغہ (د) برکت منزل۔ گوڑ گانوہ (پنجاب)

اقتباسات علمیہ

اجرام فلکی تک پرواز کا امکان

آپ ایک انڈا لیجئے اور اس کے سرے پر ایک سوراخ کر دیجئے، اسی طرح اس کے نیچے دو سوراخ چھوٹے چھوٹے کیجئے جن میں ایک بھرا ہوا، زردی سفیدی نکال کر نصف حصہ پانی سے بھر دیجئے۔ اور ایک سوراخ بند کر دیجئے۔ اس کے بعد ایک ٹکڑا لکڑی کا لیکر اس میں چار کیلیں گاڑ دیجئے اور انڈے کو اسپر اس طرح رکھئے کہ ایک انچہ لکڑی کی سطح سے بلند رہے، پھر اس کے نیچے ایک موم بتی روشن کرکے پانی کے حوض میں چھوڑ دیجئے، تھوڑی دیر نہ گذریگی کہ لکڑی کا ٹکڑا ایک کشتی کی طرح چلنے لگے گا۔ اسکی علمی توجیہ یہ ہے کہ پانی کا ایک حصہ گرمی کی وجہ سے بخار میں تبدیل ہوتا ہے اور چونکہ انڈے کا چھلکا او پر کی طرف سے روکتا ہے اس لئے صرف چھوٹا سوراخ نکلنے کے لئے رہجاتا ہے اور جب بھاپ، اس سے قوت کیساتھ نکلتی ہے تو لکڑی کو جہت مخالف کی طرف پھینکتی ہے۔

بالکل اسی اصول پر جرمنی کے ایک پروفیسر نے موٹر اور ہوائی جہاز کے اختراع کا دعویٰ کیا ہے جس کے اندر کی ہوائیاں یکے بعد دیگرے چھوٹتی ہوئی موٹر یا ہوائی جہاز کو آگے کی طرف پھینکتی جائیں گی اور یہ رفتار بندوق کی گولی کی طرح تیز ہوگی۔

مثلاً اگر کوئی شخص چاند پر جانا چاہے تو اسکی صرف یہی صورت ہوسکتی ہے کہ وہ توپ کے گولے کی طرح زمین سے جدا ہوکر بلند ہو اور یہ اسی طریقہ سے ممکن ہے جو جرمنی کے اس پروفیسر نے بتائی ہے۔ ہر چند اس وقت تک کوئی قابل ذکر کامیابی اس تجویز میں نہیں ہوئی لیکن اس کو ناممکن العمل نہیں بتایا۔ کیونکہ اگر ۳۰ میل کی بلندی تک کوئی ہوائی جہاز پہونچ جائے تو وہ اتنی ہی قوت کے ساتھ جو سطح بحر سے قریب اسے استعمال کرنی پڑتی ہے، ایک گھنٹہ میں ۵۰۰ میل تک جاسکتا ہے۔ ہوا کا سمندر ۱۰۰ میل کا مانا جاتا ہے۔ اس سے عبور کرنے کے بعد ہی اگر کشش زمین ختم ہوگئی تو پھر کوئی جھگڑا ہی باقی نہ رہا، لیکن اگر وہ ختم نہ ہوئی تو بھی اس کا اس حد تک کم ہوجانا یقینی ہے کہ ہوائی جہاز کی رفتار بہت کم قوت کے ساتھ اس سے بھی دوچند ہوسکتی ہے یہانتک کہ زمین کے حدود کشش ختم ہوں۔

بہرحال ماہرین فن اس مسئلہ پر غور کر رہے ہیں اور اس امر کا امکان پیدا ہوتا جاتا ہے کہ جب کسی وقت کرۂ ارضی پر تباہی تو یہاں کے باشندے قبل ہلاک ہونے کے مریخ، زہرہ، یا مشتری وغیرہ جاکر اپنی نوآبادیاں قائم کرلیں اور زمین کے غیر آباد رکرے کو تباہ و برباد ہونے کے لئے پیچھے چھوڑ جائیں۔

ایک عجیب و غریب عمل جراحی

انسان کے تمام اعضاء میں آنکھ کی ساخت جسقدر نازک و دقیق ہے اور کسی عضو کی

اسی لئے اسیر عمل جراحی کرنا بھی آسان نہیں اور خاص طور سے مہارت حاصل کرنے کے بعد ڈاکٹر اسکی جرات کرتے ہیں۔ حال ہی میں امریکہ کے ایک ڈاکٹر نے جو آنکھ اور کان کی بیماریوں کا ماہر ہے ایک عجیب و غریب عمل جراحی کیا

اس کے اسپتال میں ایک شخص آیا جس کی ایک آنکھ غایب تھی اور بجائے اس کے کانچ کی مصنوعی آنکھ لگی ہوئی تھی، دوسری آنکھ میں بھی موتیا بند ہوگیا تھا۔ موتیا بند میں آنکھ کا قرنیہ بیکار ہوجاتا ہے۔ اس ڈاکٹر نے کوشش کی کہ دوسرے کی آنکھ کا صحیح و سالم پردہ قرنیہ لیکر اس کے بیکار قرنیہ کے بجائے لگا دے۔ چنانچہ وہ اس عمل جراحی میں کامیاب ہوگیا اور اسکی بینائی عود کر آئی

مریخ کی آبادی

بعد غروب آفتاب فضائے آسمانی پر ایک بڑا ستارہ سرخ رنگ کا نظر آتا ہے۔ اسی کو مریخ کہتے ہیں جس کا مدار زمین کے مدار سے بہت زیادہ وسیع ہے۔ جس وقت زمین مریخ و آفتاب کے درمیان آجاتی ہے تو اس کو اصطلاح میں استقبال کہتے ہیں کیونکہ اس وقت ہمارے سامنے سطح مریخ کا وہ حصہ سامنے ہوتا ہے جس پر آفتاب کی روشنی پڑتی ہے۔ پھر چونکہ مریخ کا مدار آفتاب کے گرد بیضاوی دایرہ کا ہے اس لئے کبھی وہ زمین سے دور ہوجاتا ہے اور کبھی نزدیک۔ چنانچہ ۱۹۲۳ء میں مریخ زمین سے بہت زیادہ قریب آگیا تھا یعنی صرف ۳۲ ملین میل دور تھا۔ اور اس لئے علمائے ہیئت نے اس موقع کو غنیمت جانکر نہایت اہتمام کے ساتھ رصد گاہوں میں اس مطالعہ کیا اور سب بالاتفاق اس نتیجہ پر پہونچے کہ مریخ کی سطح پر حیات کے آثار پائے جاتے ہیں۔ اب رہا یہ امر کہ یہاں کی آبادی کس قسم کی ہے اور باعتبار عقل و ذہن کے کیا مرتبہ رکھتی ہے، اس میں ضرور اختلاف ہے۔ ڈاکٹر یکرنگ کا قول ہے کہ سطح مریخ پر نہ صرف عاقل آبادی کا پایا جانا بلکہ اسکا ہم سے تخاطب کرنے کی کوشش کرنا بھی ثابت ہوتا ہے۔ ڈاکٹر ایبٹ کا خیال ہے کہ مریخ میں صرف حیات نباتی پائی جاتی ہے۔ رسل، اتیکن اور فشر کا بیان ہے کہ مریخ میں صاحب عقل اور متمدن آبادی کا پایا جانا نہ خلاف عقل ہے نہ غیر ممکن لیکن اس وقت تک کوئی علمی دلیل اس امر کی بابت نہیں ملی کہ نباتات و حیوانات سے زیادہ ترقی یافتہ آبادی وہاں موجود ہے۔

اب جدید تحقیقات سے یہ امر ثابت ہوا ہے کہ مریخ کی فضا میں اور اسکی سطح پر حرارت، پانی اور آکسیجن پائے جاتے ہیں جو حیات کے لئے لازم ہیں اور دوربین کے ذریعہ جو تصویریں مریخ کی حاصل کی گئی ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ اسباب حیات جو اہل مریخ کے لئے لازم ہیں وہی ہیں جو اہل زمین کے لئے درکار ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر کوبلنٹز نے ایک نہایت ہی نازک آلہ کی مدد سے دریافت کیا ہے کہ مریخ میں دوپہر کے قریب گرمی ۶۰ درجہ کی ہوتی ہے جو ہندوستان کے موسم سرما میں دوپہر کو ہوتی ہے۔ اس سے پہلے خیال کیا جاتا تھا کہ وہاں درجۂ حرارت صفر سے اونچا نہیں ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کروڑوں میل پر واقع ہونے والے سیارے کی حرارت کا صحیح علم کیونکر ہوسکا، سو اس کے لئے ایک خاص آلہ طیار کیا گیا تھا۔ یہ شیشہ کی ایک نلکی ہے جس کے اندر کی ہوا نکال لی جاتی ہے اور اندر نہایت باریک تار پلاٹینم اور بسمتھ کے مکڑی کے جالے کی طرح داخل کئے جاتے ہیں۔ جہاں یہ تار جاکر ملتے ہیں وہ نہایت ہی باریک گول تختیاں ہیں جہاں تار آنکھ سے نظر نہیں آتے بلکہ خوردبین

محبت کے ۲ دو عمل

[illegible] عمل ... ہر مذہب والا عامل بن سکتا ہے۔
[illegible] مطلوبی صرف مسلمانوں کے لئے مخصوص ہے۔ کامل بیس سال کا تجربہ کبھی سہرو خطا نہیں کی جب تلاش تھی ہزاروں روپیہ
[illegible] میں خدا کو حاضر و ناظر سمجھ کر اور گواہ بنا کر بے کم و کاست قلیل ہدیہ پر انکا اعلان کرتا ہوں کہ امیر و غریب سب فائدہ
[illegible] جن بھائیوں کو میری گذارش پر اعتبار ہو وہ ساتھ ہی ایک حلف نامہ اس اقرار کا ارسال کریں کہ اپنی ذات کے سوا کسی کو نہ بتلائینگے طلب کریں
عمل نمبر۱ اس عمل کو پڑھنے میں پندرہ منٹ صرف ہوتے ہیں اسکا عامل ایک سال سے قابض رہتا ہے۔ دوسرے سال کیلئے دوبارہ
منٹ صرف کرکے پڑھنا ہوتا ہے۔ صرف تین منٹ میں تین مرتبہ پڑھکر مطلوب کو تابعدار بنایا جا سکتا ہے۔ ہدیہ پانچ روپیہ (صہ)
عمل نمبر۲ یہ ایک آیت قرآنی ہے جو صرف ایک سطر کی اکتالیس سیاہ مرچوں پر اکتالیس بار پڑھی جاتی ہے اور مرچیں آگ میں جلائی
[illegible] سات دن میں انشاءاللہ مطلوب مسخر ہو جائیگا۔ ہدیہ عا

عمل نمبر۳ برائے ترقی روزگار عجیب و غریب عمل ہے۔ ہفتہ میں صرف چہارشنبہ کو پڑھا جاتا ہے۔ پڑھنے میں آدھ گھنٹہ صرف ہوتا ہے۔
[illegible] برکت سے روزی و روزگار میں اسقدر ترقی ہوتی ہے کہ اللہ کی قدرت کا کرشمہ نظر آتا ہے [illegible] ہے۔ ایک روپیہ چار آنہ میں دس
پڑھنے کی اجازت لے سکتے ہیں۔ ہر سہ عملیات کے پڑھنے میں کسی قسم کا خطرہ نہ خوف نہ پرہیز نہ وقت نہ اپنے مکان سے کہیں باہر
جانا ہوتا ہے صاحب عمل ہمراہ ایک خط طلب فرمائیں گے تو ہدیہ فی عمل [illegible] روپیہ لیا جائیگا۔ اگر بذریعہ منی آرڈر روپیہ روانہ کریں
[illegible] معاف بذریعہ رجسٹری یا وی۔ پی لفافے میں عمل روانہ کئے جاتے ہیں۔

فضل شاہ عامل حبیبہ لال میاں دہلی

خاص رعایت یکم شعبان المعظم تا ۳۰ شوال المکرم ۱۳۴۷ھ

غریبوں کا قرآن

غربا میں تقسیم کرنے کیلئے بہترین ہشت سطری کلام مجید

[illegible] خوشخط، عمدہ چھپائی، نفیس کاغذ بہت کم ہدیہ، اس کلام مجید کو حسب ذیل خوبیوں کے ساتھ چھاپا گیا ہے:۔
قلم جلی روشن اور نمایاں ہے۔ کاغذ عمدہ خوشنما سفید چکنا ہے۔ ہر پارہ علیحدہ علیحدہ ہے۔ ہر پارہ کی پہلی سطر کا قلم جلی ہے اور خوشنما گل بوٹوں سے مزین ہے۔
[illegible] بھی علیحدہ ہے اور بیل بوٹوں سے مزین ہے۔ [illegible] بلکہ معظمہ مسجد اقصیٰ یعنی بیت المقدس کا نقشہ ہے جو صحت اور خوبصورتی میں بے مثل ہے۔ آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کا نسب نامہ مبارک حضرت آدم تک لکھا گیا ہے۔ مخارج حروف کا مفصل بیان درج ہے جسے بچوں کو سب سے پہلے پڑھنا چاہئے، دہلی کے
[illegible] حافظوں کی مہر ثبت ہے جنہوں نے اسکی صحت کی ہے یہ قرآن مجید کم استطاعت مسلمانوں کیلئے بڑی کوشش اور صرف کثیر للہ کا خیر سمجھ کر تیار کیا گیا ہے۔
[illegible] لڑکیوں کے پڑھانے کیلئے اور غریبوں میں تقسیم کرنے کیلئے بے نظیر ہے تقطیع ۶ ۴ انچ ہے صرف یکم شعبان المعظم سے ۳۰ شوال تک خاص رعایت رکھی گئی ہدیہ
[illegible] بجائے عا کے ۱۲ ہے۔ دس قرآن شریف منگائیں تو [illegible] مجلد یا [illegible] جاتے ہیں کے صرف عہ دس جلد منگائیں تو [illegible] کے علاوہ محصول ڈاک
[illegible] زائد یا کم منگانیوالے کو کوئی مزید رعایت نہ ہوگی۔ قریب کے اسٹیشن کا نام و پتہ صاف لکھیں۔

ملنے کا پتہ رحمانیہ بکڈپو نمبر ۳۰ دریبہ کلاں دہلی

رجسٹرڈ نمبر ا ے ۳-۱۱۰

قواعد رسالہ "نگار"

۱۔ رسالہ ہر مہینے کی پندرہ تاریخ سے پہلے شایع ہوتا ہے۔
۲۔ رسالہ نہ پہونچنے کی صورت میں بیس تاریخ تک دفتر کو اطلاع ہونی چاہیے ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ کیا جائیگا
۳۔ خط و کتابت کے وقت اپنا نمبر خریداری ضرور لکھئے جس پر نمبر خریداری نہیں ہوتا ایسے خطوط ضایع کر دیے جاتے ہیں
۴۔ جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ آنا ضروری ہے۔
۵۔ مضامین صاف اور خوشخط آنے چاہییں۔
۶۔ سالانہ قیمت پانچ روپیہ ششماہی تین روپیہ۔ بیرون ہندسات روپیہ سالانہ پیشگی مقرر ہے۔

نرخنامہ اجرت اشتہارات

(۱) اجرت ہر حال میں پیشگی آنا ضروری ہے (۲) جو صاحبان تین ماہ سے زائد اشتہار دینگے ان کو بیس فیصدی کمیشن دیا جائیگا۔ میعاد اشتہار کے اندر دو مہینے قبل اطلاع دینے پر مضمون بدل سکتا ہے۔

تعداد صفحہ	ایک صفحہ	نصف صفحہ	[illegible]
تین مرتبہ	۳۵ روپیہ	۲۲ روپیہ	[illegible]
ایک مرتبہ	۱۲ روپیہ	۹ روپیہ	[illegible]

تعداد صفحہ	ایک صفحہ	نصف صفحہ	۱/۴ صفحہ
[illegible]	۱۰۰ روپیہ	۶۰ روپیہ	۴۰ روپیہ
[illegible]	۶۰ روپیہ	۳۵ روپیہ	۲۵ روپیہ

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

مولانا نذیر احمد
بنات النعش ۹
مراۃ العروس ۱۰
توبۃ النصوح ۱۲
موعظہ حسنہ
رویائے صادقہ
ایامیٰ
فسانۂ مبتلا
ابن الوقت
مصائب غدر ۱۲

مولانا شبلی
سیرۃ النبی جلد اول
〃 دوم
〃 سوم
الفاروق
سیرۃ النعمان
الغزالی
المامون
سوانح مولانا روم
سفرنامہ مصر و شام
علم الکلام
الکلام
رسائل شبلی
مقالات شبلی
شعر العجم جلد اول
〃 دوم
〃 سوم
〃 چہارم
〃 پنجم
موازنۂ انیس و دبیر
مضامین عالمگیر
آئینۂ اسلام
کلیات فارسی
کلام شبلی اردو

امیر مینائی
صنم خانۂ عشق
مراۃ الغیب
محامد خاتم النبیین
ضیائے سخن
مکاتیب امیر مینائی

رتن ناتھ سرشار
سیر کہسار
خدائی فوجدار
جام سرشار
الف لیلہ ناول
کامنی
سوانح عمری عیاریہ

منشی سجاد حسین
احمق الذین
حاجی بغلول

پیاری دنیا
کالا پانی
میٹھی چھری
طرحدار لونڈی
طلسمی فانوس

جوالا پرشاد برق
مر نالنی ۱۲
مار آستین ۱۲
بنگالی دلہن ۱۲
معشوق فرنگ ۱۲

فہرست مضامین اپریل ١٩٢٩ء

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

شمارہ ۴	اپریل سنہ ۱۹۲۹ء	جلد ۱۵

ملاحظات

سب سے پہلا عملی قدم، جو حکومت برطانیہ و حکومت ہند نے اشتراکیت (Communism) کے خلاف اٹھایا ہے، وہ گذشتہ ماہ کی گرفتاریاں ہیں جو ہندوستان کے ہر صوبہ میں بیک وقت عمل میں آئیں۔

میں ان گرفتاریوں کے جزئیات سے بحث کرنا نہیں چاہتا کیونکہ ناظرین نگار، روزانہ اخبار کی وساطت ان کو معلوم کر چکے ہونگے بلکہ میں مختصراً یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اشتراکیت کیا چیز ہے، اسکی تاریخی قدامت کیا ہے اور یہ کہ ہندوستان یا کسی اور متمدن ملک میں اسکا رواج مناسب ہے یا نہیں۔ نگار کی اولین اشاعت میں، اس موضوع پر مینے روشنی ڈالی تھی، اور اسوقت بھی بحالات موجودہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس یاد کو تازہ کیا جائے۔

کمیونزم (Communism) جسے سوشلزم (Socialism) بھی کہتے ہیں، اور جسکا ترجمہ اشتراکیت کیا جاتا ہے، اپنے لغوی معنے کے لحاظ سے نہایت دلکش چیز معلوم ہوتی ہے کیونکہ، تمام افراد انسانی کا ہر چیز میں مشترک رہنا، فطرت کے تمام انعامات سے یکساں طور پر فایدہ اٹھانا، جو مفہوم اشتراکیت کا ہے ایک ایسا دلچسپ مطالبہ ہے کہ کوئی شخص جو انسانیت اخوت عامہ اور امن عام کی حکومت دیکھنا چاہتا ہے وہ بغیر ایک لمحہ تامل کئے ہوئے اس مطالبہ کے استحسان پر

فتوی دیدیگا۔ لیکن جہانتک عمل کا تعلق ہے یعنی جس حدتک اشتراکیت کے قابل عمل و نفاذ پذیر ہونے کا واسطہ ہے۔ یہ مطالبہ اسقدر آسان و خوشنما نہیں اور زمانۂ قدیم سے لیکر اسوقت تک جب کبھی اشتراکیت کا جذبہ دنیا میں پیدا ہوا، ہمیشہ اسکی مخالفت کیگئی اور کبھی اسکو کامیابی نہیں ہوئی۔

اشتراکیت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک "اشتراکیت محض" دوسرے "اشتراکیت تعاون" اول الذکر سے مراد یہ ہے کہ تمام افراد انسانی متاع عالم میں برابر کے شریک ہوجائیں اور دوسرے سے مقصود یہ ہے کہ افراد انسانی تقسیم عمل کے ماتحت خدمات انجام دیں اور نفع میں سب کا حصہ برابر ہو۔ الغرض اس کا نصب العین یہ ہے کہ جمہور کی مدد سے افراد انسانی کی عام حالت درست کیجائے۔

اشتراکیت دنیا کا کوئی نیا خیال نہیں ہے بلکہ حقیقتاً اس کی ابتدا اس وقت سے ہوتی ہے جب سے ملوکیت یا تسلط کی بنیاد پڑی اور ہمیشہ یہی ہوا کہ جب اصحاب دولت یا سرمایہ داروں نے غریبوں پر ظلم شروع کیا، اشتراکی خیالات دنیا میں رونما ہونے لگے۔

یونان قدیم میں فالیاس کا اشتراکیت کو رواج دینا جس کے ذریعہ سے وہ تعلیم و معاشرت میں امیر و غریب دونوں کو دوش بدوش چلانا چاہتا تھا، تاریخ کا کھلا ہوا واقعہ ہے اور افلاطون کا یونانی جمہوریت کو ترتیب دینا جس میں زمین، عورت اور غلام کو مشترک ملکیت قرار دیا گیا تھا، اہل علم پر واضح ہے۔

قبل مسیح دوسری صدی میں اسرائیلیوں کی ایک جماعت جو فرقہ اسینیہ (Essenes) کے نام سے موسوم تھی بحر مردہ (Dead Sea) کے ساحل پر آباد تھی، ان کے ہاں بھی سب لوگ مال میں شریک تھے یہانتک کہ عورت کو بھی مال ہی سمجھا جاتا تھا اور وہ بھی مشترک چیز سمجھی جاتی تھی۔ یہی حال ایک مسیحی جماعت کرد کراٹیا کا تھا جو چھٹی صدی عیسوی میں معدوم ہوئی۔ ہالینڈ میں بھی متعدد جماعتیں اشتراکی اصول پر قایم ہوئیں جنمیں سے بہت زیادہ شہرت اس جماعت کو حاصل ہوئی جسے جرار گرد مے نے ۱۳۸۴ء میں قایم کیا تھا، دوسری صدی عیسوی میں ایک گروہ ادیٹا نمودار ہوا جو راستوں پر برہنہ پھرتا تھا اور عورت پر اس کے مشترکہ حقوق قایم تھے۔

جرمنی کے عہد اصلاح میں کاشتکاروں نے زمینداروں کو مجبور کیا کہ زمین میں انہیں برابر کا حصہ دیں، جسپر سخت خونریز لڑائی ہوئی جو "جنگ مزارعین" کے نام سے مشہور ہے۔ ایسے واقعات بھی تاریخ میں ملتے ہیں کہ مسیحی جماعتوں نے اُمراء پر زور ڈالا کہ وہ اپنی دولت فقراء پر برابر تقسیم کردیں۔

الغرض ہر جگہ اور ہر زمانہ میں اشتراکی خیالات پیدا ہوئے، دولت و حکومت نے انکا مقابلہ کیا اور اس تصادم نے دنیا میں بہت کچھ اضطراب پیدا کیا۔ اشتراکی اصول پر عہد وسطےٰ میں متعدد کتابیں بھی لکھیگئیں جنمیں سب سے زیادہ مشہور کتاب سار ٹومس مور کی ہے جو ۱۵۱۶ء میں طبع ہوئی تھی۔

تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ متمدن دنیا میں اشتراکی جماعت کی تعداد ہمیشہ بڑھتی ہی گئی اور حکومت اس کو

فنا کرنے میں کامیاب نہ ہوسکی۔ فرانس میں بھی زمانۂ قدیم میں اصول اشتراکیت قایم ہوئے اور بابوف نے تو نظام حکومت الٹ دینے کا ارادہ کرلیا تھا لیکن اس کے متبعین میں اختلاف پیدا ہوگیا اور یہ تحریک خود فنا ہوگئی۔

اٹھارویں صدی میں سان سیموں فرانسیسی نے ایک نیا مذہب نکالا جسے وہ نصرانیت جدید کہتا تھا اور اپنے اصول مخترعہ کے ذریعہ سے وہ عقاید مذہب و سیادت کی اصلاح کرنا چاہتا تھا لیکن اس کی عمر نے وفا نہ کی اور اس کے تلامذہ میں باہم اختلافات پیدا ہوجانے کی وجہ سے حکومت نے اس انتشار سے فایدہ اٹھایا اور انکی قوت کو فنا کردیا۔ اس کے بعد شارل فوریہ (سنہ ۱۷۷۲ء ۔ سنہ ۱۸۸۳ء) کا ظہور ہوا۔ اسکا خیال تھا کہ ہیئت اجتماعی کی بنا دائمی ارتقاء پر ہے جس زمانہ میں فوریہ اور اس کے مقلدین ہیئت اجتماعی کی اصلاح کرنا چاہتے تھے، ایک اور شخص لوئی بلان نے اس امر پر زور دیا کہ حکومت تعین عمل اور تقسیم اجرت کو اپنے ہاتھ میں لے۔ چنانچہ حکومت کیطرف سے کارخانے قایم کئے گئے، حکومت ہی کی طرف سے اجرت پر مزدور رکھے گئے، مگر کوئی مفید نتیجہ نہ نکلا اور ملک میں صرف اک اشتراکی بغاوت پیدا ہوکر رہ گئی۔ پرودان (سنہ ۱۸۰۹ء ۔ سنہ ۱۸۶۵ء) کا دستور العمل، لوئی کے خلاف تھا، وہ کہتا تھا کہ حکومت کو وضع قوانین کا اختیار نہیں ہے، انگلستان میں رابرٹ اوین (سنہ ۱۷۷۱ ۔ ۱۸۹۵) نے اشتراکی خیالات کی اشاعت شروع کی لیکن کامیاب نہیں ہوا۔ اس کے بعد بہت سی اشتراکی جماعتیں قایم ہوئیں جنکی تعداد ۱۳۰۸ تک پہونچتی ہے انمیں سب سے زیادہ کامیاب انجمن راشڈیل تھی۔ اس نے اسباب تجارت کا ایک عام و مشترک ذخیرہ فراہم کیا تھا، چند سال کے عرصہ میں اسنے غیر معمولی ترقی کرلی اور ہر قسم کی تجارت اس کے ہاتھ میں آگئی مگر نتیجہ کے لحاظ سے یہ بھی بدقسمت ثابت ہوئی اور حکومت نے اس کو بھی فنا کرکے چھوڑا۔

اس وقت یورپ و امریکہ، اور ایشیا میں بہت سی اشتراکی انجمنیں پائی جاتی ہیں اور اکثر "اشتراکیت تعاون" کے اصول پر قایم ہیں۔ لیکن سب سے زیادہ کامیابی روس میں ہوئی اور اسی کی کامیابی نے روئے زمین میں پھر از سر نو اشتراکیت کے جراثیم پیدا کردئے ہیں اور روز بروز انمیں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ چنانچہ چین کا موجودہ انقلاب اسی کا نتیجہ سمجھا جائیگا اور ہندوستان میں ایسی جماعتوں یا انجمنوں کا قایم ہوجانا بھی اسی کا پر تو ہے۔

ہمکو اسوقت تک تفصیلی علم اسکا حاصل نہیں ہے کہ ہندوستان کی اشتراکی جماعتیں کیا نظام حکومت قایم کرنا چاہتی ہیں اور وہ کیا مطالبہ ہے جسکی بنا پر حکومت ہند یہ سمجھنے پر مجبور ہوگئی کہ وہ ہندوستان کی حکومت سے ملک معظم کو محروم کرنا چاہتے ہیں۔ جس حد تک اس قانونی دفعہ کے الفاظ کا تعلق ہے یقیناً یہ الزام نہایت مہمل و لغو ہے، کیونکہ ملک معظم کو ہندوستان کی حکومت سے محروم کرنے کا خیال اسوقت پیدا ہوسکتا تھا جب ملک معظم کو ہندوستان کی حکومت پر کوئی اختیار حاصل ہوتا، اس لئے اگر الزام کوئی عاید ہوسکتا ہے تو یہ کہ وہ حکومت ہند کے موجودہ طرز عمل کو بدلنا چاہتی ہیں اور یہ خیال وہی ہے جسے کانگرس اور دوسری سیاسی جماعتیں تقریباً نصف صدی سے ظاہر کررہی ہیں۔

اس سلسلہ میں جتنے حضرات گرفتار ہوئے ہیں وہ سب براہ راست یا بالواسطہ کسی نہ کسی ایسی انجمن سے ضرور واسطہ

رکھتے ہیں جو کاشتکار یا مزدور جماعت سے متعلق ہے اور چونکہ کاشتکاروں کے حریف زمیندار اور مزدوروں کے حریف سرمایہ دار ہیں اسلئے اس میں تو کلام نہیں ہو سکتا کہ موجودہ عہد میں جبکہ معاشرت و معیشت کی سختیاں ناقابل برداشت حد تک پہونچگئی ہیں، ایسی انجمنیں جو مزدوروں اور کاشتکاروں کی حمایت کر رہی ہیں، سرمایہ داری و زمینداری کی بنیاد کو متزلزل کرنیوالی ہیں اور اگر اس سلسلہ میں ملک معظم کا اپنی مملکت سے محروم ہو جانا کوئی لازمی منطقی نتیجہ ہے تو بیشک قانون کی گرفت میں بھی ان کو آجانا چاہئے لیکن اگر ایسی جماعتیں صرف اصلاح حال مزارعین اپنا مقصد رکھتی ہیں تو ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ حکومت کیوں دست اندازی کرے۔

میں اصول اشتراکیت کا حامی نہیں ہوں اور نہ اُسے افلاس کا مداوا سمجھتا ہوں، کیونکہ وہ میرے نزدیک اصول فطرت کے منافی ہے۔ لیکن میں یقیناً ہر اس تحریک کا طرفدار ہوں جو مزدوروں اور کاشتکاروں کے اصلاح و ترقی سے متعلق ہے، کیونکہ ایک ملک کی حقیقی ترقی اس کے طبقۂ ادنیٰ کی ترقی ہے جس سے غالباً حکومت کو بھی انکار نہیں ہو سکتا۔

اشتراکیت صحیح معنے میں اس فرق مراتب و توازن کو محو کرنیوالی چیز ہے جو خود فطرت نے ذہن و دماغ کی ساخت میں ملحوظ رکھا ہے اور اس لئے ابتک اس کو کامیابی نہیں ہوئی اور جب کبھی اسکا ظہور ہوا دوسری مخالف قوتوں نے اسے فنا کر دیا۔ روس کی آزادی بھی حقیقتاً اشتراکیت کی کامیابی نہیں ہے اور نہ صحیح معنے میں اسکا وجود وہاں پایا جاتا ہے۔ کیونکہ وہاں موجودہ حکومت کی صورت صرف مجلس عمال کا اقتدار ہے جسکو معیشت و معاشرت میں اشتراک عام پیدا کرنے سے کوئی تعلق نہیں اور نہ اسمیں کوئی کامیابی اسوقت تک ہوئی ہے۔ عوام میں بیداری بیشک پیدا ہوگئی ہے اور یہی اصل راز ملک و قوم کی ترقی کا ہے۔

اس لئے اگر کوئی جماعت ہندوستان میں بھی اس مقصد کو لیکر اٹھتی ہے تو ہر شخص کو اس کے ساتھ ہمدردی ہونا چاہئے، لیکن اگر اسکا مدعا اشتراکیت کا نام لیکر صرف اضطراب پیدا کرنا ہے تو بیشک ہمکو اس کے تعاون سے احتراز کرنا چاہئے، کیونکہ اس سے سوائے نقصان کے کسی فائدہ کی توقع نہیں۔

ہمکو نہیں معلوم کہ اس جماعت کے خلاف میرٹھ کے مجسٹریٹ کے پاس کیا شہادتیں موجود ہیں اور وہ کونسا لٹریچر ایسا دستیاب ہوا ہے جس کی بنا پر ان کو اشتراکی جماعت سے متعلق سمجھا جاتا ہے۔ لیکن جہانتک خیال کیا جاتا ہے، ہندوستان کی ان غریب انجمنوں کو قیام "اشتراکیت" کا بانی بتانا بالکل ویسا ہی اتہام ہے جیسے حکومت ہند کے متعلق ہمارے ایک دوست کا یہ کہنا کہ اس سے زیادہ باعث زحمت طریق حکمرانی اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔

افغانستان کے متعلق ابتدائے انقلاب سے اسقدر عجیب و غریب اور متضاد خبریں موصول ہو رہی ہیں کہ بہترین طریق کار یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان سب کو غلط سمجھ کر صرف نتیجہ کا انتظار کیا جائے، چنانچہ بعض سنجیدہ اخباروں نے یہ دیکھ کر کہ پشاور اور لاہور میں افغانستان کے متعلق خبریں گڑھنے کے دار الضرب قایم ہوگئے ہیں، بہت کم خبریں دینا شروع کر دی ہیں،

لیکن یہ یقینی ہے کہ ان خبروں سے لوگوں کی عام ذہنیت کا ضرور پتہ چلتا ہے اور اب نہ ماننے والوں نے بھی اسے مان لیا ہے کہ ردّ عمل امیر امان اللہ خاں کے حق میں ہوتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اور یہ کہ بچہ سقہ کی حکومت بالکل عارضی ہے اور کم از کم یہ یقینی طور پر طے پا گیا ہے کہ افغانوں کی غیور قوم بچہ سقہ کی حکومت کو کسی طرح قبول نہیں کر سکتی۔ جنرل نادر خاں کا اسکو لکھ بھیجنا کہ عنان حکومت لینے میں اُسنے سخت غلطی کی ہے اور وہ ہرگز اسکا اہل نہیں ہے گویا اس فیصلہ پر ایک مہر توثیق ثبت کر دینا ہے جس کے خلاف اب کہنے سننے کا کوئی موقعہ ہی حاصل نہیں رہا۔ رہا یہ امر کہ مختلف جرگوں کا اجتماع کیا فیصلہ کریگا اور کس کو اپنا حکمراں منتخب کریگا ہنوز مستقبل کی تاریکی میں ہے اور اسی پر افغانستان کی سیاسیات آیندہ کا بہت کچھ انحصار ہے۔

ہر چند بعض قبایل امیر امان اللہ خاں کے طرفدار ہو گئے ہیں اور ہوتے جاتے ہیں، لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ اسوقت تک اکثر قبایل ایسے ہیں جو امیر امان اللہ خاں کو کافر ہی سمجھتے ہیں اور کسی طرح راضی نہیں ہوتے کہ پھر اس مشرک و کافر کی حکومت کو قبول کریں۔ اسلئے جرگوں کے اجتماع سے کسی قابل اطمینان نتیجہ پر پہونچنا اسقدر آسان امر نہیں ہے کیونکہ اگر وہ کوئی قطعی فیصلہ کر بھی دیں تو اسکی کیا ذمہ داری ہے کہ آیندہ مخالف قبایل یا خود امیر امان اللہ خاں خاموش بیٹھے رہیں گے۔ قبایل میں اس نوع کی برہمی تاریخ افغانستان کا کوئی جدید واقعہ نہیں ہے، اس سے قبل بارہا حکومت کے خلاف شورشیں پیدا ہوئیں اور مٹتی رہیں، لیکن یہ ضرور ہے کہ اس شورش کا رنگ زیادہ تر مذہبی ہے اور اس لئے اسکو پوری طرح دبا دینا طویل زمانہ چاہتا ہے۔ امیر عبد الرحمٰن خاں مرحوم کے عہد میں بھی بالکل اسی شدت کا انقلاب رونما ہوا تھا اور وہ بھی تخت سے علیحدہ ہونے پر مجبور ہو گئے تھے، لیکن اُن کے عزم ملوکانہ نے تمام مصائب و شدائد برداشت کر کے پھر اپنی متاع از دست رفتہ کو حاصل کیا اور عرصہ تک نہایت کامیاب حکومت کی۔ اس لئے اگر قبایل کا فیصلہ امیر امان اللہ خاں کے خلاف ہو تو بھی یہ کون کہہ سکتا ہے کہ وہ اپنے دادا کی پیروی نہ کریں گے اور خاموشی کے ساتھ ہتھیار ڈالکر یوروپ کے کسی ہوٹل میں جاکر قیام کر لیں گے۔

کہا جاتا ہے کہ بصورت جنگ امیر امان اللہ خاں کو جو دشواریاں پیش آئیں گی وہ سامان حرب اور روپیہ کی کمی سے پیش آئنگی کیونکہ نہ ذخیرۂ جنگ ان کے پاس ہے نہ خزانہ، لیکن یہ کوئی ایسی زبردست دلیل نہیں جو امیر امان اللہ خاں کی کامیابی کیطرف سے مایوس کر دے، کیونکہ اول تو جنگ کی کامیابی کا انحصار فوج کی اخلاقی حالت پر ہوا کرتا ہے اور دوسرے یہ کہ ان ذرایع کی ہمکو کیا خبر ہو سکتی ہے جو انہیں حاصل ہیں۔ بہر حال اس وقت حالات امید افزا ہیں اور آیندہ ماہ تک وضاحت کے ساتھ معلوم ہو سکے گا کہ ہوا کا رخ کیا ہے۔

ہندوستان کے مسلمانوں میں جو اضطراب پیدا ہے، وہ بالکل قدرتی امر ہے اور گو امیر امان اللہ خاں اپنے ملک کے بعض قبایل کے نزدیک مردود ہیں، لیکن انہیں شکر ادا کرنا چاہیئے کہ نہ صرف ہندوستان بلکہ سارا عالم ان کے ساتھ ہمدردی رکھتا ہے اور انکی کامیابی کا دل سے آرزومند ہے۔

بعض جرمن افسروں کی زبانی جو کابل میں متعین تھے ہمارے اس خیال کی تصدیق ہوتی ہے جو سب سے پہلے ہم نے ظاہر کیا تھا

کہ امیر امان اللہ خاں کے زوال کے دیگر اسباب میں ایک قوی سبب وزراء و عمال کی نا اہلیت و غداری بھی ہے جس کا علم خود امیر کو بھی ہو چکا ہے۔ اس لئے یقین ہے کہ آیندہ وہ بہت پھونک پھونک کر قدم رکھینگے اور اس دوران میں بھی وہ ہر شخص کو اپنا دوست سمجھنے سے احتراز کریں گے۔

کابل سے جو خبریں آرہی ہیں انسے معلوم ہوتا ہے کہ بچہ سقہ کے فوج کی اخلاقی حالت بہت گری ہوئی ہے اور وہ موجودہ طریق حرب و دفاع سے بالکل ناواقف ہے۔ دولتمند تاجروں سے روپیہ وصول کرنے کیلئے سختیاں کیجا رہی ہیں اور اب ہر شخص دورِ امانی کو یاد کر رہا ہے۔ جلال آباد بدستور تباہ و برباد حالت میں پڑا ہوا ہے اور سارا ملک اسوقت عالم اضطراب میں ہے۔ یہ احساس بھی بجائے خود امیر امان اللہ خاں کے لئے بہت مفید ہے اور وہ غالباً ناواقف نہ ہونگے کہ لوگوں کے احساس سے کیونکر عملی فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

جنوری ۱۹۲۶ء کا نگار دیکھ کر ایک خاتون نے جو حکیم مومن خاں مرحوم کے نواسہ کی بیٹی ہیں، بعض غلطیوں کے اوپر ہمکو متنبہ کیا ہے ہم شکریہ کیساتھ انکی تحریر یہاں درج کرتے ہیں اور مستدعی ہیں کہ اگر انکو اور حالات مومن خاں مرحوم کے ایسے معلوم ہوں جو اسوقت تک پبلک میں نہیں آئے تو تحریر فرمائیں کیونکہ یہ بہترین ادبی خدمت ہے۔ خاتون محترم لکھتی ہیں:-

"حکیم مومن خاں صاحب قبلہ کے حالات جو سید امتیاز احمد صاحب بی اے علیگ نے لکھے ہیں میں انکی تعریف نہیں کرسکتی، مگر اسقدر عرض کئے بغیر نہیں رہسکتی کہ مومن خاں مرحوم کی جن صاحبزادی کے متعلق یہ لکھا گیا ہے کہ چار سال کی عمر میں انتقال کر گئیں، درست نہیں ہے حکیم مومن مرحوم کی یہ صاحبزادی مولوی عبدالغنی مرحوم وکیل سیتاپور کو منسوب تھیں جو مولانا محمد فصیح صاحب غازیپوری کے بھتیجے تھے۔ ان صاحبزادی سے میرے والد محمد ناصر حبیب صاحب پیدا ہوئے جو بحمد اللہ اسوقت تک زندہ ہیں۔ یہ وہی صاحبزادی تھیں جنکی تاریخ خان مبرور نے نال کٹنے کیساتھ ہاتف نے — کہی تاریخ دختر مومن

کہی تھی۔ سید وحید الدین بیخود دہلوی اور سید جلال الدین دہلوی جو چوڑی والوں میں رہتے ہیں اور سید ناصر نذیر فراق دہلوی یہ سب میرے والد کے رشتہ دار ہیں۔ اور میرے والد انہی صاحبزادی کی اولاد ہیں جو خواجہ میر درد کے خاندان سے تھیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ میر حسن تسکین شاگرد ہونے کے علاوہ حضرت مومن کے سمدھی بھی تھے۔ انکے صاحبزادہ میر عبدالرحمن آہو تھے جنکی ایک صاحبزادی میاں کالے صاحب کے گھرانے میں سیف الدین صاحب سجادہ نشین درگاہ حضرت نظام الدین صاحب اورنگ آبادی سے منسوب تھیں۔

مومن مرحوم کے صاحبزادہ خواجہ احمد نصیر صاحب، میرے والد کے حقیقی ماموں تھے جنہوں نے اپنے بعد دو لڑکے اور ایک لڑکی چھوڑی۔" (کنیز فاطمہ)

حال میں لکھنؤ سے دو ادبی رسالے "عالم شہود" میں آئے ہیں۔ ایک رسالہ جسکا نام مبصر ہے، یہاں کی مشہور انجمن مشاعرہ (معراج الادب) کا ارگن ہے اور جناب حکیم ابو العلاء الناطق لکھنوی کی اڈیٹری میں جاری ہوا ہے۔

جناب ناطق لکھنوی، ملک کے اچھے شعراء قابل ادباء اور اہل علم حضرات میں شمار کئے جاتے ہیں، اور اگر انکی چہار ترکی کلاہ

صرف "ذوق لباس" کا نتیجہ نہیں تو کہنا چاہئے کہ وہ اہل تصوف میں بھی ایک "سجادہ نشینانہ" شکل وشمایل رکھتے ہیں، لیکن ہمیں افسوس ہے کہ اسوقت تک مبصر کا ایک رسالہ بھی ایسا نہیں نکلا جسے ہم حکیم صاحب سے منسوب کرکے خوش ہوسکیں جسوقت ہماری نگاہ "العلم" پر جاتی ہے جو بہت عرصہ ہوا حکیم صاحب کی ادارت میں کانپور سے جاری ہوا تھا تو ہمیں حیرت ہوتی ہے کہ اس کے بلند علمی معیار کے سامنے مبصر کو کیا سمجھیں اور کیونکر یقین کریں کہ حکیم صاحب مبصر کی ادارت میں واقعی بالکل آزاد چھوڑ دئے گئے ہیں۔ اس وقت تو ایسے رسایل وجراید کی ضرورت ہے جو لکھنؤ وغیر لکھنؤ کی خلیج کو محو کردیں نہ کہ اس میں اور وسعت پیدا کردیں۔ حصول قابلیت کیلئے، زباندانی کیلئے، کسب علم وفضل کیلئے اور دنیا میں کچھ کام کرنے کیلئے، کرۂ ارض کو ٹکڑے ٹکڑے نہ کیجئے جو نظام شمسی کا نہایت ہی چھوٹا سیارہ ہونیکی حیثیت سے تقسیم وتفریق اور تحلیل وتجزیہ کو برداشت نہیں کرسکتا۔ لکھنؤ اور لکھنؤ سے باہر جہاں بھی فضل وکمال نظر آے اسکی قدر کرنا چاہئے اور اس بحث ونزاع میں وقت نہ ضایع کرنا چاہئے کہ حقیقتاً اہل زبان کون ہے۔ کیونکہ جس کے منہ میں زبان ہے وہی اہل زبان، ہوسکتا ہے، گو لکھنوی زبان کی لذت سے اسکا دہن آشنا نہ ہو۔ اس قسم کے مضامین ہمیشہ نہایت سطحی ذہنیت کا نتیجہ ہوا کرتے ہیں اور انکو رواج دینا ملک میں کوئی وقار نہیں پیدا کرسکتا۔ اگر حکیم صاحب مجبور ہیں اسلئے کہ یہ پیشہ ور شاعروں کی "مشاعرہ ساز" انجمن کا رسالہ ہے اور اسکے اجرا کی غایت ہی یہ ہے تو میں حکیم صاحب کو مشورہ دونگا کہ اولین فرصت میں اس سے علٰحدہ ہوجائیں، اگر وہ رسالہ کی موجودہ پالیسی کو بدلنے میں کامیاب نہیں ہوسکتے۔ ادب کی خدمت صرف نکتہ چینی سے نہیں بلکہ "نکتہ رسی" سے بھی ہوسکتی ہے۔ نمونہ منیجر مبصر وکٹوریہ اسٹریٹ سے ملسکتا ہے۔

دوسرا رسالہ "خضر راہ" ہے، جسکے نام کی "کہنگی وفرسودگی" دیکھتے ہوئے کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس کے کارکن نوجوان ہونگے۔ ہرچند "دارالعلوم ندوہ" کے موجودہ عہد کے طلبہ نے، جنکے ہاں شباب کا مفہوم "نگاہ کرلینا" سے زیادہ ہوہی نہیں سکتا، کبھی جوانی کا دعوٰی نہیں کیا، لیکن افسوس ہے کہ انہوں نے اس کلیہ کو بھی غلط ثابت کردیا کہ "جب انسان عمل کے لحاظ سے مجبور ہوتا ہے تو زبان خوب چلنے لگتی ہے"۔ بہرحال رسالہ نہایت سنجیدہ ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ علمی ذوق رکھنے والوں نے سے مرتب کیا ہے۔ اخیر میں "نظر بر دوز" ایک فسانہ بھی ہے اور تفریح کے چند لمحے کے عنوان سے "فکاہات" بھی شامل ہیں، ایک دو نظمیں اور غزلیں بھی ہیں لیکن سب اچھے معیار کی، زبانی گفتگو سے معلوم ہوا کہ آیندہ اشاعتوں میں زیادہ دلچسپ تبدیلیاں پیدا کیجائیں گی لیکن اگر یہ نہ ہو، تو بھی سوائے نام کے کہ "خرافاتی" بھی ہے اور غیر شاعرانہ بھی مجھے رسالہ کی موجودہ ترتیب وتہذیب بھی پسند ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ اہل علم طبقہ میں اسکو پسندیدگی کی نگاہ سے نہ دیکھا جائے۔ نمونہ منیجر خضر راہ محلہ نیا گانوں۔ لکھنؤ سے حاصل ہوسکتا ہے۔

امسال موسم گرما بہت خطرناک نظر آرہا ہے کیونکہ ابھی مارچ کا مہینہ ختم نہیں ہوا اور رات کو بھی گاہے گاہے پنکھے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اگر یہی رفتار ترقی بھی ہے تو اسکے شباب دیکھنے کی تاب لانا کم از کم میرے بس کی بات تو ہے نہیں، ارادہ کررہا ہوں (جو یقیناً پورا نہوگا) کہ شاید گرما کے دو مہینے کشمیر میں بسر کردوں، کہ دنیا کی کوئی مصیبت گرمی سے میرے توازن عقل ودماغ کو غارت کرنیوالی نہیں ہوتی۔ بہرحال یہ اطلاع دینا اسلئے ضروری ہے کہ ناظرین نگار میں سے بھی ہر شخص اپنی اپنی جگہ مطلع ہوجاے کہ وہ موسم آگیا ہے جب میں بجا طور پر کہہ سکتا ہوں کہ:۔

دورِ مجنوں (دیوانہ؟) گذشت ونوبت ماست

نیاز

فلسفۂ مذہب

(بہ سلسلہ ماسبق)

نماز نماز عجمی لفظ ہے اور اس کے ہم معنی و مشابہ سنسکرت کا لفظ نمستے ہے۔ عربی میں اسکو صلوٰۃ کہتے ہیں اور انگریزی میں پریئر (Prayer) جو لاطینی لفظ پریکاری (Precaris) سے ماخوذ ہے اور جسکے معنی عاجزی کرنے کے ہیں صلوٰۃ کے لفظی معنی "سرینوں کا ملانا" ہے اور شاید یہ عربوں کی اصطلاح میں عاجزی کرنے کے مترادف ہو۔ نماز کا مفہوم بھی غالباً وہی ہے جو نمستے کا ہے۔ جو ہمارے بعض برادران وطن آداب و تسلیمات کی جگہ آپس میں استعمال کرتے ہیں اور اس سے بھی انسان کی اس خاص حالت کا اظہار مقصود ہے جو خشیت و تضرع کی صورت میں پیدا ہوتا ہے۔ دنیا کے مذاہب خواہ وہ الہامی ہوں یا ادہامی سب میں کسی نہ کسی صورت سے یہ طریقہ عبادت کا پایا جاتا ہے۔ بلکہ مذاہب سامیہ میں اور خصوصاً اسلام میں تو نماز دین کا رکن عظیم ہے۔ اور ہر بالغ مومن پر اوقات معینہ میں نماز کا ادا کرنا فرض ہے۔ نماز کا اصل مقصد یہ ہے کہ اپنے معبود کے آگے اپنی خیر و عافیت کے لئے اس سے مدد مانگی جائے اور اس کے ساتھ اس کی عظمت اور بڑائی کا اقرار کیا جائے۔ اور زبان سے جو الفاظ ادا کئے جائیں اس کے ساتھ اپنے اعضاء کو ایک خاص معمول کا پابند کیا جائے۔ جو عام طور سے حسب ذیل حرکات پر مشتمل ہوتا ہے۔

۱۔ خاموشی کے ساتھ ہاتھ باندھ کر یا ہاتھ کھول کر کھڑے رہنا۔ ۲۔ گھٹنے ٹیک کر یا بغیر گھٹنے ٹیکے اپنے کو جھکانا ۳۔ سجدہ کرنا۔ ۴۔ خاموشی سے سر جھکا کر یا ایک خاص وضع سے بیٹھنا۔ ۵۔ بابرکت چیزوں یا معبود کی تمثالی صورت کو بوسہ دینا یا پیشانی رگڑنا۔ ۶۔ ایسی چیزوں کے گرد پھرنا۔ نماز کا ابتدائی مدعا تو در اصل وہی تھا جو قربانی اور بخور کا تھا۔ گویا یہ دیوتاؤں کو خوش کرنے کی تیسری ارتقائی صورت تھی۔ ہراس موت کے فطری حاسہ نے انسان کو اس چیز کے آگے جس سے وہ خوف کھاتا تھا گڑگڑانے اور عاجزی کرنے پر آمادہ کیا تاکہ وہ اس پر رحم کرکے اس کی جان نہ لے۔ اسی سلسلہ میں جب انسان بخور قربانی اور عاجزی کے بعد بھی خونخوار دیوتاؤں کو قابو میں نہ لاسکا تو بعض اوقات وہ ایسے موثر الفاظ بار بار دہرانے لگا جو اپنے ساحرانہ اثر سے ان کی خونخواری اور ایذا کو لطف و رحم سے بدل دیں۔ یہ تو ان اقوام وحشیہ کی نماز کا مقصد تھا جنھوں نے خدا اور اس کی صفات کو نہیں پہچانا۔ مگر اسلام میں نماز کا مقصد کیا ہے۔ اگر اس کا مطلب بھی وہی ہے کہ خدا ہمارے ان حرکات سے خوش ہو کر ہم پر رحم کرے تو یہ خیالات جاہلیت کے خیالات سے زیادہ فرق نہیں رکھتے۔ اس لئے دیکھنا یہ ہے کہ قرآن سے نماز کا کیا مقصد ثابت ہوتا ہے قرآن شریف میں ہے۔ "ان الصلوٰۃ تنھیٰ عن الفحشاء والمنکر" یعنی نماز کا مقصد یہ ہے کہ وہ تم کو برائی اور بدیوں سے بچائے ورنہ "انّ اللہ غنیٌ عن العالمین" خدا کو تمھاری عاجزی اور عبادت کی مطلق ضرورت نہیں۔

قابل غور بات یہ ہے کہ نماز پڑھنے سے ہم کیونکر بدکاریوں و برائیوں سے بچائے جاسکتے ہیں کیونکہ بادی النظر میں انسان

عمل و ارادے انسان کے اس فعل پر موقوف نہیں تو اس کی توجیہ یہ ہے کہ نماز کے وقت جب انسان کھڑا ہوتا ہے تو وہ اس وقت کم سے کم یہ خیال اپنے دل میں پیدا کر لیتا ہے کہ وہ ایک ایسی ہستی کے آگے دست بستہ کھڑا ہو رہا ہے جو رب العالمین و مالک یوم الدین ہے۔ دل میں کئی بار اس یاد ربانی سے یہ اصول نفسیات یہ نتیجہ ضرور نکلتا ہے کہ خدائے تعالیٰ کی عظمت اور خشیت ہر وقت ہمارے پیش نظر ہو جاتی ہے۔ اور ہم اس بات کو فراموش نہیں کر سکتے کہ ہم جو کام کر رہے ہیں اس کا دیکھنے والا ایک خدا موجود ہے جس کے سامنے وہ اپنے ہر ایک کام کا جواب دہ ہے۔ تو ہمارا مقصد دراصل اس ذہنیت کا پیدا کرنا ہے۔ اس کے برخلاف جو لوگ کسی وقت نماز نہیں پڑھتے اُن کے دل سے خدا کی ہستی کا اعتراف تقریباً محو ہو جاتا ہے اور وہ بے باکی سے ہر کام کو اس طرح کرنے لگتے ہیں گویا خدا کا کوئی وجود نہیں ہے۔ دن پھر دنیاوی زق زق بق بق میں انکا دل اس قدر سخت ہو جاتا ہے کہ آخر میں وہ عام اخلاقی اعمال سے لاپرواہ ہو جاتے ہیں۔ اور رفتہ رفتہ ایسے لوگوں کے ذہن میں خدا کا محض ایک فلسفیانہ تخیل رہ جاتا ہے اور وہ الہیات کے ماتحت جیسے اسٹوئک فلاسفہ اور ارسطو نے الہیات معاشرت سے تعبیر کیا ہے وجود معطل ہو جاتا ہے۔

اس لئے ضرور ہے کہ انسان اپنے کاموں سے تھوڑا وقت نکال کر دن و رات میں کئی بار خدا کی یاد کرے اور اسی میں اس کی فلاح ہے۔ اور چونکہ نفسیات کا یہ بھی قول ہے کہ خیال کی یکسوئی ہمیشہ کچھ نہ کچھ حرکات جسمانی سے ہوتی ہے (مثلاً جیسا میں خود جب کسی مضمون کو سوچنے لگتا ہوں تو اکثر ٹہلنے لگتا ہوں۔ یا سگریٹ پینے لگتا ہوں) اسلئے نماز میں جسم کو ایسی حرکت دینا جو ایک ہی وقت میں یکسوئی کا باعث بھی ہو اور انسان میں عجز و فروتنی پیدا کرے ——— ضروری ہے میرا ذاتی خیال ہے کہ اگر یکسوئی اور دل کی رقت پیدا کرنے کے لئے خوش الحانی کی مناجات یا موسیقی کو روا کر دیا جائے تو زیادہ مناسب ہو۔

یکسوئی کی ایک صورت قدیم مذاہب میں یہ بھی تھی کہ وہ اپنے سامنے اپنے معبود کی ایک تمثالی صورت رکھ لیتے تھے اور اس کے آگے مراقب ہوتے تھے۔ مگر از بسکہ یہ تمثالی صورتیں خود خدا کی تو ہوتی نہیں اور انسان ایسی عادت سے رفتہ رفتہ خدا کو اس تمثال کا نمونہ سمجھنے لگتا ہے۔ اسلام میں سامنے کسی تمثالی رکھنے کی سخت ممانعت ہے۔ البتہ اس کی جگہ قبلہ رخ ہونے کا مشورہ دیا گیا ہے۔ جس کا مقصد وہی ہے۔

روزہ

روزہ یا "صوم" بھی تقریباً تمام مذاہب کا معمول رہا ہے۔ اگرچہ اس کے طریقوں اور مقاصد میں اختلاف ہو۔ شاید کنفوشیس کے مذہب میں روزہ رکھنے کا حکم نہیں پایا جاتا ورنہ کیا الہامی کیا اوہامی غرض جتنے مذاہب ہیں، ان میں روزہ ایک فریضۂ مذہبی سمجھا گیا ہے حتیٰ کہ مذہب زردشت میں جس کے متعلق عام طور سے خیال ہے کہ اس میں روزے کا حکم نہیں ہے۔ اس میں بھی کم سے کم موبدان کو سال میں پانچ بار[1] روزہ رکھنے کا حکم ہے۔ مذہب میں اس کی ابتدا کیونکر ہوئی۔ اسکا

[1] مجوس میں نماز کے اوقات بھی پانچ ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ پانچ کا عدد مجوس میں کیوں اس قدر محبوب ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ مجوس عناصر اربعہ اور نیران کو مانتے تھے اور اُن کا مجموعہ پانچ اُن کے لئے بابرکت عدد سمجھا گیا ہو۔ اس اثر سے شیعیان علی نے جو مجوس کے براہ راست

پتہ چلانا مشکل ہے۔ صَوم عربی زبان میں صَم سے نکلا ہے جس کے معنی چپ رہنے کے ہیں اور مذاہب سامیہ میں ایک قسم کا روزہ چپ رہنے کا تھا جیسا قرآن میں بھی ذکر ہے۔ انگریزی کا لفظ فاسٹنگ (Fasting) قدیم جرمنی زبان فاستنجان ( ) سے نکلا ہے اور لاطینی میں اس کو ججو ناری (jejunaria) کہتے ہیں۔ روزہ عجمی زبان کا لفظ ہے مگر مجھے علم نہیں کہ اس کے لفظی معنے کیا ہیں۔ بہر حال کچھ بھی ہو۔ روزہ رکھنے کی عام تعریف یہ ہے کہ وقت مقررہ کے اندر جو اکثر صبح سے شام تک ہوتا ہے۔ کھانے پینے سب (اور اسلام میں مباشرت سے) قطعی یا ایک حدتک پرہیز کیا جائے۔ فلسفی ہربرٹ اسپنسر (Herbert Spenser) نے بعض اقوام وحشیہ کی عادات مذاہب کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ نتیجہ نکالا ہے کہ شاید روزہ کی ابتدا یوں ہوئی ہے کہ مرے ہوئے لوگوں کو غذا پہونچانے کے خیال سے اس کے پس ماندگان اپنا کھانا پینا وقت معینہ کے لئے چھوڑ دیا کرتے تھے اور اس کے بعد وہ قربانی کا لازمی نتیجہ قرار دیا گیا اور رفتہ رفتہ اصل غایت روزہ کی فراموش ہوگئی۔ لیکن اسپنسر کا نظریہ یوں معقول نہیں کہ عموماً اقوام وحشیہ میں روزہ موت اور قربانی کے بعد نہیں بلکہ اس کے پہلے رکھے جانے کا رواج ملتا ہے اور اس لئے اسپنسر کو خود اپنی اس توجیہ پر اطمینان نہیں اور آخر میں جب اس کو کوئی غایت نہ معلوم ہو سکی تو اس کو اقرار کرنا پڑا کہ روزہ کے کئی وجوہ ہو سکتے ہیں مثلاً طبی خیال سے محض صحت جسمانی کو برقرار رکھنے کے لئے یا اپنے ابنائے جنس سے ہمدردی کا احساس پیدا کرنے کے لئے کہ بھوک کی تکلیف کو عملاً معلوم کیا جائے جو ایک بھوکے اور غریب انسان پر گزرتی ہے اور اس طرح اس کی امداد کی طرف انسان مائل ہو۔ یا یہ ہو کہ بعض قومی یا ذاتی آلام و مصائب میں کھانا پینا چھوٹ گیا ہو اور اس کی یاد کو تازہ کرنے کے لئے ایک مقررہ دن روزے کا تعین ہوگیا ہو۔ اور ایک توجیہ یوں بھی ہو سکتی ہے کہ انسان کا وہی خوف یعنی ہراس موت جس نے اس کو قربانی بجور اور عاجزی پر آمادہ کیا۔ روزہ کو اس نیت سے رکھا یا ہو کہ وہ اپنے خونخوار معبودوں کو دھوکا دے سکے کہ وہ کمزور نحیف ہے اور اس کی جان لینے سے معبودوں کو کوئی اچھی غذا بہم نہ پہونچے گی۔ ای بی ٹائلر (E. B. Tylor) کا خیال ہے کہ اس کی ابتدا غالباً اس خیال سے ہوئی کہ بھوکے رہنے سے انسان کے اعصاب

متوارث میں پنجتن پاک بنالیا ہے اور بجائے یزدان اور عناصر اربعہ کے آنحضرت۔ فاطمہ۔ علی حسن و حسین کو شامل کر دیا مسلمانوں میں بھی عام طور سے نماز کے پانچ اوقات فرض کرلئے گئے ہیں جس پر میرے اور رسالۃ ایڈیٹر نگار کی ایک بحث بھی ہوچکی ہے۔ اور اڈیٹر نگار کو آخر میں تسلیم کرنا پڑا کہ نماز کے اوقات قرآن کے نص قطعی سے تین وقت کے ثابت ہیں گو وہ اس بات سے متفق نہیں کہ نماز کے پانچ اوقات مجوس کے مقابلہ میں بنائے گئے ہیں۔ خیر یہ کوئی ایسی بڑی بات نہیں۔ نماز جس قدر پڑھی جائے اتنا ہی بہتر ہو میرے پیش نظر وہ وقت تھا جب کہ اسلام قومی مذہب سے علیحدہ ہو کر عمومیت کے ساتھ یورپ اور امریکہ میں تبلیغ کیا جائیگا اور یورپ و امریکہ کے لوگوں کے مشاغل اور عادات اُن کو تین سے زائد نماز پڑھنے میں مانع رہینگے اور نہ بیکاروں کے لئے جیسے ہم لوگ ہیں پانچ کیا دس وقت کی نماز پڑھنا بہتر ہے یا جو لوگ دن بھر کچہریوں میں کام کرتے ہیں اور شام کو گھر آتے ہیں اور پھر غروب آفتاب تک باہر تفریح کی ضرورت سمجھتے ہیں انکو میں یہی صلاح دونگا کہ وہ ظہر و عصر اور مغرب و عشاء کی نماز جمع کرکے پڑھ لیا کریں جو آنحضرت کا طریق عبادت تھا۔ س۔ م۔ ا۔

ایک ایسا اثر پڑتا ہے جس سے وہ روحانیت کا مشاہدہ بہتر صورت سے کر سکتا ہے۔ یا جیسا امازولو ( ) کا خیال ہے کہ روزہ کا مقصد وہی ہے جو سعدی شیرازی نے اپنے اس لطیف شعر میں بیان کیا ہے۔

اندروں از طعام خالی دار تا درو نورِ معرفت بینی

اور جو نہایت مقبول عام خیال ہے۔ مذہباً اصل وجہ روزہ رکھنے کی خواہ کچھ ہو۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ دنیا کی قوموں نے اس کو بھی ایک طریقۂ عبادت سمجھا ہے اور اس پر عامل رہے ہیں حتیٰ کہ دنیا کے اعلیٰ مذاہب خصوصاً اسلام نے روزہ رکھنا فرض مذہبی تصور کر کے اس کی سخت تاکید کی ہے۔ برہمنوں نے چاند نکلنے اور چاند کے کامل ہونے کے گیارھویں روز ساٹھ گھنٹہ تک ہر چیز سے پرہیز رکھنے کا حکم دیا ہے۔ اور ہر سال نومبر کے مہینے میں سوموار کے سوز برت رکھنے کا حکم ہے۔ قدیم مصریوں میں بقول ہیروڈوٹس ائی سس (Isis) دیوتا کے جشن مولود میں روزہ رکھا جاتا تھا۔ یونانیوں میں بعض مذہبی نسلوں کے سلسلے میں بالخصوص عورتوں کو تین دن روزہ رکھنے کا حکم تھا۔ لیوی (Levy) قدیم مورخ روم نے بھی روزہ رکھنے کی رسم کا ذکر اپنی قوم میں کیا ہے۔ مگر اس سے یہ بات صاف معلوم نہیں ہوتی کہ عوام و خواص سب روزہ رکھتے تھے یا محض مندر کے پروہت۔ یہودیوں میں سالانہ ایک دن روز رکھنے کا حکم ہے جو ایام تشرین یعنی ساتویں مہینے کی دسویں تاریخ کو مقرر ہے شریعت یہود میں جیسا کتاب استثناء کے ابواب ۱۶ (آیات ۲۹ تا ۳۴) ۲۳ (آیات ۲۷ تا ۳۲) اور کتاب اعداد باب ۱۹ (آیات ۷ تا ۱۱) سے ظاہر ہوتا ہے مگر یہ معلوم نہیں کہ اس دن یہودیوں پر روزہ رکھنا کیوں فرض ہوا تھا۔ ابن عباس کی طرف سے ایک قول حدیثوں میں نقل ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں جب ہجرت کی تو آپ نے یہودیوں کو محرم کی دسویں تاریخ کو روزہ رکھتے ہوئے دیکھا۔ اور آپ کے استفسار پر انھوں نے بتایا کہ یہ وہ دن ہے جس دن حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کو لیکر مصر سے نکلے تھے۔ مگر یہ حدیث اس وجہ سے ناقابل اعتبار ہے کہ خود موجودہ یہود میں اس کی غایت پر اختلاف ہے۔ دوسرے یہ کہ ابن عباس کا قول مرفوع دبا سند نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ سال ہجرت میں پیدا ہوئے ہیں۔ صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ یہ روزہ یہودیوں کے سالانہ عید سے پہلے ہوا کرتا تھا تاکہ لوگ اپنے گناہوں کا کفارہ دیکر خوشیاں منائیں۔ یہود کی شریعت سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ان کے ہاں ایام سبت کو روزہ رکھنا منع تھا۔ اور کتاب اعداد کے تیئسویں باب کے ۱۴ آیت میں لکھا ہے کہ اگر عورت اپنی روح کو ایذا دے (یعنی روزہ رکھے) تو اس کے شوہر کو اختیار ہے کہ وہ اس روزے کو توڑ وا دے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ علاوہ سالانہ روزے کے یہودیوں میں اور بھی نفل روزے رکھے جاتے تھے اور خصوصاً بعض قومی میلوں یا عید کے زمانے میں اسارت بابل کے زمانے میں اور اس کے بعد تو یہودیوں میں روزے رکھنا ان ایام صعوبت کی یاد تازہ کرنے کے لئے کثرت سے ہوا کیا ہے اور انبیاء اسرائیل کے نوشتوں سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ایک روزہ دسویں۔ چوتھے پانچویں۔ اور ساتویں مہینوں میں القدس کے محاصرہ و تباہی کی یاد میں رکھے جاتے تھے۔

اگرچہ موجودہ اناجیل سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ حضرت مسیح نے روزے کا حکم خاص کر کے اپنے متبعین کو دیا ہو لیکن خود مسیح نے

روزے کی جو تاویل اپنے مشہور وعظ کوہی میں کی ہے اور شیطان کی آزمائش کے دوران میں چالیس روز کا خود روزہ رکھا ہے اور فریسوں کے اعتراض پر کہ آپ کے حواری اکثر روزے کیوں نہیں رکھتے حضرت مسیح کا یہ جواب دینا کہ روزے ایام خوشی میں جبکہ وہ خود موجود ہیں کیوں رکھے جائیں یہ سب اس بات کا پتہ دیتے ہیں کہ از بسکہ حضرت مسیح خود کسی شریعت کے موجد نہ تھے خود ان کا اور ان کے متبعین کا عمل یہود کی شریعت پر تھا جیسا کتاب اعمال الرسل کے ابواب سترہ اور تیرہ سے پتہ چلتا ہے۔ چنانچہ سوائے پروٹسٹنٹ کے مسیحیت کے دوسرے کلیساؤں میں روزہ رکھنا ایک فرض دینی سمجھا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ ازمنہ وسطیٰ میں اگر روزے کے ایام میں کوئی گوشت کھائے تو وہ کبھی قتل کر دیا جاتا اور کبھی اس کے دانت توڑ دئے جاتے تھے۔ یہودیوں میں بھی فرض روزہ نہ رکھنے کی سزا قتل تھی۔ (مسیحیت میں روزے کی زیادہ وضاحت کے لئے انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا دیکھو)

اسلام میں بھی روزہ ایک فرض مذہبی ہے اور روزے کا فرض مذہبی ہونا علاوہ دوسرے مقاصد کے اس حیثیت سے بھی ضروری تھا کہ مسلمانوں کو جفاکشی کی تعلیم دمشق کی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔ چنانچہ روزہ کا حکم قرآن کے سورۃ بقر کے رکوع ۲۲ میں بصراحت موجود ہے یعنی۔ یاایھا الذین امنوکتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم لعلکم تتقون - ایاماً معدودٰت فمن کان منکم مریضاً او علی سفر فعدۃ من ایام اخر و علی الذین یطیقونہ طعام مسکین فمن تطوع خیراً فھو خیرلہ وان تصوموا خیرلکم ان کنتم تعلمون ○ شھر رمضان الذی انزل فیہ القراٰن ھدًی للناس و بینٰت من الھدیٰ والفرقان فمن شھد منکم الشھر فلیصمہ ومن کان مریضاً او علیٰ سفر فعدۃ من ایام اخر۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ اے وہ لوگ جو ایمان لائے ہو تم پر روزہ فرض کیا گیا ہے جس طرح تمہارے پہلے لوگوں پر فرض کیا گیا تھا تاکہ تم نیک بنو گنتی کے چند روز ہیں۔ لیکن اگر تم میں سے کوئی مریض ہو یا سفر میں ہو تو دوسرے دنوں میں اس کا بدل رکھ لے اور جو لوگ تم میں سے استطاعت رکھتے ہیں وہ مساکین کو کھانا کھلادیں اور جو کچھ نیکی تم اپنی خوشی سے کروگے وہ تمہارے لئے بہتر ہے اور اگر روزہ بھی رکھو وہ تمہارے لئے اچھا ہے۔ اگر تم اس کی مصلحت کو جانتے ہوتے رمضان کے مہینے میں جن دنوں میں قرآن نازل ہوا ہے جو انسان کے لئے ہدایت اور دلیل ہے اور انسانوں میں تفریق کرنیوالا ہے۔ پس تم میں سے جس کو یہ مہینہ ملے وہ روزہ رکھے۔ اور جو تم سے مریض ہو یا سفر میں ہو تو اس کی عدت دوسرے دنوں سے پوری کرے"

یہ اس قدر صاف و صریح اور محکم ہے کہ کسی تاویل کی گنجائش نہیں۔ اور اس لئے شریعت نے روزہ کو مذہب کا دوسرا رکن قرار دیا ہے۔ البتہ اس میں چند الفاظ قابل توجہ ہیں۔ اول تو ایام معدودات دوسرے" وعلی الذین یطیقونہ" تیسرے "فمن شھد منکم الشھر" مگر قبل اس کے کہ ان الفاظ کے معانی و مطالب پر غور کیا جائے ایک اصولی بات اس آیت کے متعلق طے کر لینا چاہئے تقریباً تمام مفسرین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ قرآن میں بعض ایسی آیتیں ہیں جو بعد کی آیتوں سے منسوخ کر دی گئیں ہیں اور آیتین ناسخ ہیں اور پہلی منسوخ۔ حال کے بعض مفسرین — جن میں سے ایک تو مولینا محمد علی احمدی کا نام لیا جا سکتا ہے — قرآن میں ناسخ و منسوخ کے قائل نہیں ہیں اور حقیقت

امر بھی یہ ہے کہ مسئلہ ناسخ منسوخ بھی اور دوسرے فقہی مسائل کی طرح یہودیوں سے لیا گیا ہے مگر اس کے ساتھ اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ قرآن شریف میں ایک آیت ہے یعنی "ننسخ من آیۃ الی آخرہ" جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یا تو قرآن میں کی بعض آیتیں ناسخ و منسوخ ہیں اور یا قرآن کی اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ وہ باتیں جو کتب سابقہ میں مرقوم تھیں وہ قرآن کی آیتوں سے منسوخ ہو گئیں۔ میں خود ایک حد تک ناسخ و منسوخ کا قائل ہوں جس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ خدائے تعالیٰ نے ایک وقت میں بلا پیش بینی کے ایک آیت نازل کر دی۔ لیکن بعد کے تجربہ سے اس کو منسوخ کرنا پڑا۔ بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ قرآن میں بعض احکام ایک دم سے فرض نہ کئے جاتے تھے بلکہ رفتہ رفتہ یعنی مثلاً شراب کے لئے۔ پہلے صرف یہ حکم دیا گیا کہ شراب مضر بھی ہے اور مفید بھی۔ مگر اس کی مضرت اُس کے فائدہ سے زیادہ ہے۔ اس سے بعض لوگوں نے شراب پینا کم کر دی اور جب اس حکم کے لوگ عادی ہو چلے تو دوسرا حکم یہ دیا گیا کہ مخمور حالت میں نماز مت پڑھو۔ اس کے بعد شراب کو قطعاً حرام کر دیا گیا۔ تو اب شراب کے حرام ہونے کا حکم صرف تیسرے حکم سے باقی رہا اور پہلے دو حکم منسوخ ہو گئے یا زانیہ کے لئے پہلے یہ حکم دیا گیا کہ اُس کو گھر سے باہر نہ نکلنے دیا جائے۔ اور چونکہ شروع میں عرب کے عادات میں زنا کا زیادہ رواج تھا۔ یہ حکم ابتدائی رہا اور اس کی بات جب عربوں کی پرانی عادتوں میں اصلاح ہوئی تو زانیہ کے لئے حد قائم ہوئی۔ اور اب پہلا حکم منسوخ ہو گیا۔

آیات صیام جو ہم نے نقل کی ہے ان میں مفسرین کی رائے یہ ہے کہ "یا ایھا الذین سے تعلمون" تک آیت منسوخ ہے اور "شھر رمضان الذی" سے "من ایام اخر" تک ناسخ۔ میں اس رائے سے متفق نہیں ہوں۔ کیونکہ اول تو متن قرآن اور سیاق عبارت اور ترتیب سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ یہ دونوں آیتیں دو زمانے کی ہیں۔ اور جب وہ ایک ہی سانس اور سلسلے میں بیان کی گئی ہیں تو ناسخ و منسوخ کی تاویل لغو ہو جاتی ہے۔ دوسرے پہلی آیت میں کوئی ایسا لفظ قطعی نہیں ہے جو منسوخ سمجھا جائے اور جس کے لئے دوسری آیت کی ضرورت ہو۔ آیت کا دوسرا حصہ محض پہلے حصہ کی تشریح ہے اس تمہید کے بعد ہم کو ان الفاظ پر غور کرنا چاہئے۔

"ایام معدودات" یعنی گنتی کے چند روز نہ عربی میں اور نہ ہماری زبان میں کبھی مہینہ بھر کے لئے گنتی کے چند روز بولے جاتے ہیں گنتی کے چند روز کا مفہوم یہی ہوتا ہے کہ جو شمار میں بالکل کم ہوں۔ اور چونکہ اس زمانے کے عرب اور اب بھی اقوام وحشیہ میں دس سے زیادہ عدد گننا نہیں جانتے تھے اس لئے کہ دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کا شمار دس ہوتا ہے اور اسی کو عربی میں عقدۃ الانامل کہتے ہیں۔ اس لئے گنتی کے دن اتنے ہی دن ہوں گے جو شمار میں دس تک ہوں ورنہ اگر اس سے ۳۰ یا ۲۹ دن مراد لئے جائیں تو ایام معدودات کے بجائے شھر کہنا زیادہ صحیح ہوتا۔ تو اب سوال یہ ہے کہ اگر روزے کے دن گنتی کے چند روز ہیں تو انکی تعداد کیا ہے۔ اب آخری آیت کو پڑھو "شھر رمضان الذی نزل فیہ القرآن" رمضان کے مہینے میں جبکہ قرآن نازل ہوا تھا۔ مورخین و اہل سیر کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ۲۱ یا ۲۳ رمضان کو قرآن کی پہلی آیت نازل ہوئی تھی۔ بس اس تاریخ سے آخری مہینہ رمضان تک قرآن شریف کے رو سے روزہ فرض معلوم ہوتا ہے حدیثیں بھی جہاں تک میری نظر سے گزری ہیں اگر ان کے رطب و یابس کو بلا تنقید پڑھا جائے تو اس سے بھی صاف واضح نہیں ہوتا کہ پورا مہینہ رمضا

میں روزہ رکھا جاتا تھا۔ البتہ فقہ کے روسے سارا مہینہ رمضان روزہ رکھنا چاہئے۔ مگر میں فقہی مسائل کا اس وقت تک پابند نہیں ہوتا جب تک کہ قرآن یا متصل بالاسناد صحیح حدیث (جو بہت ہی شاذ ہے) اس کی تائید میں نہ ہو۔

بہرحال یہ بات قطعی ثابت ہے کہ ایام معدودات کا عمل سارے مہینے پر نہیں ہوتا اور مفسرین نے اس کی تاویل یہ کی ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے۔ مگر مفسرین کیا جانتے تھے کہ دنیا اُن کے بعد کتنی کروٹیں لے گی اور سوائے قرآن کے کوئی خیال و مسئلہ ایسا باقی نہ رہے گا جو غیر وقتی پُرانا اور ناموزوں نہ ہو جائے۔ چونکہ سامی مذاہب میں بھی سال میں گنتی کے چند روز کے روزے تھے۔ اور ہمیشہ کسی بڑی یادگار کے روز اور اس کے بعد تک رکھتے تھے نہ کہ اس کے قبل رکھے جاتے تھے۔ اس سے اس قیاس میں اور مدد ملتی ہے کہ ہمارے روزے اتنے سخت نہیں ہیں جتنا ہم نے خود اپنے نفس پر ظلم کر کے رکھ لیا ہے اور جو رہبانیت و نفس کشی کی حد تک پہنچ جاتے ہیں۔

"وعلی الذین یطیقونہ" اور وہ لوگ جن کو طاقت ہے۔ اس لفظ نے بہت سے مفسرین کو مشکل میں ڈالا ہے۔ اور بعض مفسرین نے تو اس مشکل کو اس طرح حل کیا ہے کہ آخر میں انھوں نے بروایت ابن عباس (جو مفسرین و محدثین کا سب سے بڑا سہارا ہیں) یہ تسلیم کیا ہے کہ آنحضرت کے زمانے میں روزہ رکھنا فرض عام نہ تھا۔ بلکہ جو لوگ چاہتے روزہ رکھتے اور جو لوگ چاہتے مساکین کو کھانا کھلا دیتے۔ اس حدیث کو میں بھی تسلیم کر لیتا اگر بعد کے جملے سارا بنا بنایا کھیل نہ بگاڑ ڈالتے۔ یعنی کہا جاتا ہے کہ اس کے بعد یہ اجازت دوسری آیت سے منسوخ ہو گئی۔

ملا جیون استاد عالمگیر نے عربی میں احکام قرآنی کی ایک تفسیر لکھی ہے جو عربی زبان میں ہے اور انھوں نے اس لفظ کی تاویل یوں کی ہے کہ اس میں "لا" محذوف ہے اصل میں "لایطیقونہ" تھا جس کا مطلب یہ ہوا کہ تم میں سے جو روزہ نہ رکھ سکیں۔ مثلاً بوڑھے لوگ۔ یہ تاویل اچھی تھی۔ کیونکہ نحو میں بھی اکثر یہ قاعدہ تسلیم کیا گیا ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ ایک شخص جو نہ روزے کی طاقت رکھتا ہے اور نہ فدیہ کی وہ کیا کرے۔ اور ہم اس سے وہی لوگ کیوں نہ مراد لیں جو روزہ رکھنے رکھنے کی استطاعت نہ رکھتے ہوں۔ کیونکہ روزے کی استطاعت کے لئے صرف صحت و حضر شرط ہے نہ کوئی اور چیز اور جب صحت نہیں تو مریض و مسافر پر سے یوں ہی روزہ ساقط ہو جاتا ہے۔ اس لئے قرآن کی آیت سے صاف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ روزہ کا بدل فدیہ و اطعام مساکین ہے اور وہ خدا کے نزدیک ویسا ہی محبوب ہے جیسے روزہ۔ ایک شخص چاہے فدیہ دے چاہے روزہ رکھے چاہے دونوں کرے۔ یہ قیاس اس سے بھی قوی ہو جاتا ہے کہ بعض گناہوں کے کفارے میں یہی حکم ہے کہ یا روزہ رکھا جائے۔ یا مساکین کو کھانا کھلایا جائے۔ یا غلام آزاد کیا جائے۔

"فمن شہد منکم الشہر" اور تم میں سے جو رمضان کے مہینے کو پاوے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ایسے لوگ بھی دنیا میں ہیں جن کو رمضان کا مہینہ ملتا ہی نہیں۔ اس کا جواب انیسویں صدی سے قبل کوئی مفسر نہیں دے سکتا تھا۔ مگر آج اس کا جواب ہم دے سکتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ یہ دکھلا سکتے ہیں کہ قرآن کسی انسان کا بنا یا ہوا ہرگز نہیں۔ وہ ایسی ہستی کا کلام ہے

جس کی نظر انسانی نظر سے کہیں بڑھی ہوئی ہے بے شک ایسے لوگ دنیا میں موجود ہیں اور وہ قطب شمالی اور جنوبی کے رہنے والے ہیں اور اس لئے جس طرح حج و زکوٰۃ کی فرضیت غیر مستطیع پر سے ساقط ہو جاتی ہے یا جہاد کی فرضیت بغیر آمر د خلیفہ کے اسیطرح روزہ کی فرضیت وہاں ساقط ہے۔

ہم فلسفۂ مذہب میں تفسیر قرآن کرنے بیٹھ گئے۔ حالانکہ میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ روزہ ایک رکن مذہبی ہے اور اسلام میں بھی چند روز کے لئے بہ یادگار نزول قرآن روزہ رکھنا فرض ہے جس میں متعدد دینی و دنیاوی مصلحتیں ہیں اور یہ کہ مریض و مسافر اور جو لوگ رمضان کا مہینہ نہیں پاتے یا جو لوگ اس کی جگہ فدیہ دے سکتے ہیں اُن کو روزہ رکھنا ضرور نہیں۔

زکوٰۃ یا صدقہ زکوٰۃ یا صدقہ دونوں عربی الفاظ ہیں۔ زکوٰۃ کے معنی پاک کرنے کے ہیں اور صدقہ کے معنی مجھے ٹھیک معلوم نہیں زکوٰۃ و صدقہ کے ہم معنی لفظ عربی میں خیرات اور انگریزی میں چیریٹی (charity) یا نیکی کرنے کے ہیں۔ صدقہ سے مراد یہ ہے کہ فقرا اور مساکین کی مالی امداد کی جائے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ فعل اخلاق و معاشرت کے ضمن میں آتا ہے۔ اور نہ اس کی ضرورت ہے کہ اس کے کنہ و فیہ پر سور خانہ حیثیت سے نظر ڈالی جائے۔ چونکہ اسلام نے زکوٰۃ کو ایک رکن دین قرار دیا ہے۔ اس واسطے ہم نے اُس کو عبادات میں شامل کر لیا ہے۔ ورنہ عام طور سے یہ ایک اخلاقی فعل ہے اور دوسری نیکیوں کے ساتھ تمام اعلیٰ مذاہب نے اس کی تائید کی ہے۔ البتہ اسلام ہی کو صرف دنیا کے تمام مذاہب میں امتیاز حاصل ہے کہ اس نے نماز کے ساتھ زکوٰۃ کی اس درجہ تاکید کی ہے کہ وہ ایک فریضہ مذہبی میں شمار ہونے لگا۔ اور اس کی تشریح بھی بعد کو دوسرے ارکان دین کی طرح کی گئی ہے۔ ہم اس میں صرف دو تین باتوں پر اکتفا کریں گے۔ زکوٰۃ کے متعلق عام طور سے فقہی مسئلہ یہ ہے کہ سال بھر میں آدمی کے پاس سے جو بچ رہے اور جو ایک معین مقدار سے کم نہ ہو اس کا چالیسواں حصہ نکال کر مستحقین کو دیدو۔ بالکل یہی طریقہ یہودیوں کے ہاں تھا۔ اور کہا جاتا ہے کہ اس کی تعیین حضرت ابوبکر نے اپنے خلافت کے زمانے میں کی تھی۔ اور اس کی سند میں ان کا مشہور خط پیش کیا جاتا ہے جو حدیثوں میں منقول ہے۔ تو اسلامی زکوٰۃ دراصل ایک قسم کا انکم ٹیکس ہے۔ اور جب مذہب کے ساتھ سیاست شامل تھی تو اسلامی زکوٰۃ کا مقصود درحقیقت وہ کبھی نہیں ہو سکتا جو خیر و خیرات و رحمدلی کا ہو سکتا ہے۔ ہم کو زکوٰۃ کے اس مفہوم کے ماننے میں کچھ تامل نہ ہوتا اگر اسلامی سلطنت دنیا میں محدود نہ ہوتی اور ایسے زمانے میں جب کہ اسلام اسلامی سلطنتوں کی حدود سے کہیں دور نکل گیا ہے۔ زکوٰۃ کی سیاسی تعیین ان قوموں میں جہاں کی سلطنت اسلامی نہیں یا تو منسوخ سمجھا جائیگا یا اس کی دوسری صورت پیدا کی جائے گی۔ کیونکہ اس قسم کی زکوٰۃ آدمی خود بخود اپنے دل کی خوشی سے نہ دیگا اور جس طرح انکم ٹیکس دینے والے بہت سے بہانے ٹیکس دینے کے نکال لیتے ہیں اور اپنی اصلی آمدنی چھپاتے ہیں۔ مسلمان بھی یہ کرنے لگیں گے کہ سال میں جب زکوٰۃ ان پر فرض ہونے لگے گی تو روپیہ اپنی بیوی کے نام منتقل کر دیں گے۔ اور وہاں تو زکوٰۃ کا نام بھی نہ لیں گے جہاں کوئی اسلامی سلطنت نہیں۔ اور اس طرح بیوی اپنے شوہر یا اپنے بچوں کے نام۔ لیکن اگر زکوٰۃ کا نام رافت و رحمدلی ہے اور اپنے ہمجنس غریب بھائیوں کی امداد

بطیب خاطر مقصود ہے تو ہم اُس کو کبھی نہ بھولیں کہ قرآن نے جس کی نظر ہر زمانے اور ہر ملک پر تھی۔ نہ زکوٰۃ کا کوئی نصاب مقرر کیا ہے اور نہ یہ بتایا ہے کہ زکوٰۃ دینے کا سال میں صرف ایک ہی وقت ہے۔ برخلاف اس کے قرآن نے جب کہیں نماز کی تاکید کی ہے تو اس کے ساتھ زکوٰۃ کو بھی تاکید کردی۔ یعنی جس طرح نماز روزانہ ہو اسیطرح زکوٰۃ بھی روزانہ ہو۔ آنحضرت سے لوگوں نے دریافت بھی کیا کہ وہ کس قدر زکوٰۃ دیں۔ اس کا قرآن نے یہ جواب دیا ہے۔

(۱) یسئلونک ماذا ینفقون۔ قل ما انفقتم من خیر فللوالدین والاقربین والیتمیٰ والمساکین وابن السبیل وما تفعلوا من خیر فان اللہ بہ علیم۔ (بقرر کوع ۲۵)

تم سے لوگ پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں کہدو کہ جو مال بھی خرچ کرو وہ تمہارے ماں باپ کا حق ہے۔ اور قریب کے رشتہ والوں کا اور یتیموں کا اور محتاجوں کا۔ اور مسافروں کا اور تم کوئی سی بھلائی کروگے تو اللہ اُس کو جانتا ہے۔

(۲) ویسئلونک ماذا ینفقون۔ قل العفو۔ کذلک یبین اللہ لکم الایت لعلکم تتفکرون۔ (البقر۔ رکوع ۲۶)

اور تم سے دریافت کرتے ہیں کہ کتنا خرچ کریں کہدو جتنا تم سے ہوسکے۔ اسی طرح اللہ اپنے احکام تم سے کھول کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ تم کو غور کرنے کا موقع ملے۔

یا تو اس صریح آیت کو مسائل فقہی کے آگے سے اُٹھا کر پس پشت ڈالدیا جائے۔ یا نعوذ باللہ یہ سمجھا جائے کہ یہ احکام مبہم ہیں اور فقہ میں اس کی صراحت زیادہ ہے۔ مگر زکوٰۃ دینے والوں اور لینے والوں سے پوچھو۔ کونسی صورت دل کو پیاری و تسکین دینے والی ہے یہ ضرور ہے کہ تعین زکوٰۃ سے ایک کام کی مقررہ عادت پڑجاتی ہے مگر خیرات کے معاملے میں تعین کیا معنی "اللہ معطی وانا قاسم" مسلمانوں کا شیوہ ہونا چاہئے۔ جب ہم کو اللہ مقدرت دے خوب دل کھول کر زکوٰۃ دیجائے اور مسلمانوں کے کاموں میں اسقدر فراخدلی سے چندہ دیا جائے جو نصاب زکوٰۃ سے ہزار گُنا ہو۔ اور فقہا کو اپنے مسائل کے ساتھ ان کو حال پر چھوڑ دیا جائے مسلمان اگر اپنا یہ طریقہ کرلیں کہ اپنے تمام اعتقاد و اعمال میں سوائے قرآن کے کسی کی مدد نہ لیں تو میں ذمہ لیتا ہوں کہ دنیا میں کوئی مذہب ان سے بالا نہیں رہ سکتا۔ اور اسیوقت قرآن کی آیت صحیح ثابت ہوگی۔

"لیظہرہ علی الدین کلہ ولو کرہ المشرکون" مگر ہمنے قرآن کے احکام کو چھوڑ دیا اور نامعتبر اور مشکوک روایات اور ظنون کو اپنا دستور العمل بنالیا۔ اور جیسا ہم نے یہ دیسا ہی ہم نے پایا۔ نہ ہم سے اپنے مذہب کی تبلیغ ہوسکتی ہے کیونکہ وہ بفضلہ عربی و فارسی کے جاننے پر موقوف ہے۔ جو دنیا میں صرف ایک محدود خطہ میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اور نہ ہمکو کبھی ہوش آتا ہے کہ ہم میں قومیت کا احساس دوسری قوموں کی طرح پیدا ہو جو ترقی کا اصل محرک ہے۔ معلوم نہیں کس احمق نے ہم کو سمجھا دیا ہے کہ سارے مسلمان ایک قوم ہیں جنکی ایک زبان ایک تمدن ایک لباس ایک معاشرت ہونا چاہئے جیسے یہودیوں۔ ہندوؤں اور پارسیوں کا حال ہے۔ ہندوستان میں اقلیت پر جو ہم لڑ مر رہے ہیں وہ قومیت کی بنا پر نہیں ہے۔ اس لئے ہم میں سے نوے فیصدی اس ملک کی آب و ہوا اور تمدن کے پروردہ ہیں بلکہ مذہب کی بنا پر ہے

اور یہ حماقت ابتک سوائے ہندوستان کے مسلمانوں کے کسی ملک سے سرزد نہیں ہوئی۔ اور اگر مجھ سے کوئی سوال کرے کہ مسلمانوں کی پستی کے اسباب بحیثیت قوم کیا ہیں تو مجھے یہ بھی کہنا پڑے گا کہ اُن کے وہ مذہبی خیالات ہیں جن کو غلطی سے وہ اسلام سمجھتے ہیں۔

اجتماع ہم مذہب افراد مسلمانوں کو غالباً یہ سنکر تعجب ہو گا کہ حج جو ایک خالص فریضۂ اسلامی سمجھا جاتا ہے اور اس کے مثل کوئی فریضہ دوسرے مذاہب میں حتیٰ کہ مذاہب یہود و نصاریٰ میں بھی نہیں ملتا وہ لفظ اصل عبرانی لفظ ہے۔ اور عبرانی میں اس کی صورت حاگا یا حاجا (Haqqa) ہے اور جس کے معنی میلے کے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک سالانہ مذہبی اجتماع کا خیال کم سے کم یہودیوں میں بھی تھا۔ اور وہ بھی سال میں ایک مذہبی اجتماع یا کانفرنس کیا کرتے تھے۔ اجتماع ہم مذہب اصولی حیثیت سے بعض مذاہب کے معمولات میں سے رہا ہے چنانچہ مسیحیوں میں یوکارسٹ یا عید فصح ایک ایک مشہور اجتماع مذہبی خیال کیا جاتا ہے جس روز عیسائی ایک سفرۂ عام پر بیٹھ کر حضرت مسیح کی یاد میں روٹی کو ان کا گوشت تصور کر کے اور شراب کو اُن کا خون جانکر کھاتے پیتے ہیں۔ یوکارسٹ کی بابت میں خود مسیحیوں میں اختلاف ہے۔ بعضوں نے اُسکو بت پرستی کی ایک رسم کے مماثل سمجھ کر یہ قرار دیا ہے کہ یہ بھی قسطنطین کی ان بدعات کے ضمن میں عیسائیوں پر ڈالے گئے ہیں جو اُسنے عقائد متفقہ کے بعد فروغ دئے تھے اور یہ رسم دراصل پرستاران متھرا اور اپالو کی رسم ہے۔ کیونکہ اُن بت پرستوں میں بھی ہوبہو یہی رسم پائی جاتی ہے۔ خواہ کچھ ہو کم سے کم اس سے پتہ چلتا ہے کہ مسیحیوں سے قبل بھی اجتماع ہم مذہب بعض مذاہب کا معمول رہا ہے اور اگر مسیحیوں نے واقعی بت پرستی کی نقل منجملہ اور دوسری باتوں کے کی ہے تو کم سے کم قرآن اس کا شاہد ہے اور ان مسیحیوں میں جو عقاید نیقیہ کے قبل تھے اسی قسم کی ایک عید منائی جاتی تھی اور وہ اس یاد میں تھی کہ حضرت مسیح نے حواریوں کے فرمائش سے روٹی اور مچھلیوں کے زیادہ ہونے اور اس سے بڑی خلقت کے شکم سیر کھانے کا معجزہ دکھلایا تھا۔ جیسا قرآن میں ذکر ہے اور انجیل میں اس کی تائید ہے۔ یہودیوں میں بھی ہر سال ہیکل میں ایک اجتماع مذہبی ہوا کرتا تھا۔ اور مسلمانوں میں تو حج تقریباً ایک فریضۂ مذہبی اور رکن دین ہے۔ اگرچہ بعض احادیث[1] سے اس کی فرضیت ثابت نہیں ہوتی اور نہ قرآن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ عام مسلمانوں پر فرض ہے حتیٰ کہ شیعوں میں اس کے فرضیت و وجوب پر اختلاف آرا بھی ہے مگر اسمیں کلام نہیں کہ اجتماع مذہب کا مقصد ایک ایسا مہتم بالشان مسئلہ ہے اور بہت سے ایسے سیاسی و ملکی و معاشرتی مصلحتوں پر مبنی ہے کہ یہ واقعی قابل افسوس بات ہوگی اگر ایک مستطیع مسلمان حج کی فرضیت سے انکار کر کے اپنی زندگی میں ایک بار اس اجتماع میں شامل ہونے سے محروم رہے یہ ظاہر ہے کہ مذہب کا ایک مقصد تشکیل و تنظیم جماعت ہے۔ اور اگر جماعت کے اجتماع کی صورت پیدا نہ ہو تو مذہب کی تمام شان و جلوہ پردۂ خفا میں رہ جائے۔ اور مذہب صرف ایک فلسفیانہ

---

[1] دیکھو کتاب الایمان بخاری۔

تخیل تک محدود ہو جائیگا ——————— اجتماع کا ایک مقصد تو یہ ہے - پھر ایسا اجتماع باہمی تبادلۂ خیالات اور ایک دوسرے کے حالات کو بہتر جاننے کا ذریعہ بھی ہو اور اس سے مذہبی ہمدردی اور خلوص میں وسعت ہوتی ہے - پھر سفر و تجارت سے جو فایدے انسان کی وسعت نظری اور تجربہ کو ہوتے ہیں وہ الگ رہے اور آخر میں سب سے بڑی بات یہ ہے کہ منبع مذہب کی وہ تمام یادگاریں تازہ ہو جاتی ہیں جو ایک طرح سے تقویت ایمان کا باعث ہوتی ہیں - اہل یورپ ہر چند کہ مسلمانوں کو طعنے دیتے ہیں کہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے توحید اسلام کے ساتھ عرب کے یہ قومی بت پرستی کی عادت قائم رکھی وہ بھی اس کے فوائد و مصلحت کے قائل ہیں - ہم صرف یورپ کے اس اعتراض پر کہ حج پرانی مشرکین عرب کی رسم ہے - جو بت پرستی پر مبنی ہے اس کا مختصر جواب دیکر عبادات کے عنوان کو ختم کر دین گے -

یہ امر مسلمہ ہے کہ مکہ میں حضرت اسمٰعیل کی اولاد کی نشو و نما ہوئی جو حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے بڑے بیٹے تھے اور یہ بات بھی ناقابل انکار ہے کہ حضرت ابراہیم نے دنیا کی سب سے پہلی مسجد کی بنیاد مکہ[1] میں ڈالی ہے - اور حضرت ابراہیم موحدین اور مسلمین کے آبا و اجداد میں سے ہیں - پس انکی یادگاروں کو تازہ رکھنے کے لئے خواہ عرب کے بت پرست حج کریں یا مسلمان کسی صورت سے ناجائز نہیں ہو سکتا - مکہ میں جو مناسک ادا کئے جاتے ہیں وہ سب ابراہیم خلیل اللہ کی یادیں ہیں - حتیٰ کہ انھیں کی طرح کا لباس بھی ان ایام میں پہنا جاتا ہے - اور طواف کعبہ ایک قسم کی عبادت ہے جو حضرت ابراہیم کے زمانے میں ہوا کرتی تھی اور جو عبادت انھوں نے خود بھی کی ہے - رہا سعی صفا و مروہ - تو اس کی تاریخی توجیہ یہ ہے کہ اس واقعہ کی یادگار ہے - جب حضرت ہاجرہ نے اپنے بچے اسمٰعیل کو پیاس سے جان بلب پایا تو وہ سراسیمگی سے پانی کی تلاش میں ادہر ادہر دوڑنے لگیں - کبھی صفا پر چڑھ جاتیں کبھی مروہ پر یہاں تک کہ اُن کو زمزم کا چشمہ نظر آگیا - رمی الجمار دراصل اصحاب فیل کی مکہ کے سامنے سے پسپائی کی یاد ہے - کیونکہ اصحاب فیل کنکریوں سے جو ابابیلیں اپنے پنجوں سے مارتی تھیں ہلاک ہوگئے تھے - لیکن یہ سب حج کے فروعات میں - اصل حج یہ ہے کہ عرفات کے تلے مسلمان جمع ہوتے ہیں اور اس وقت خطیب اُن کو وعظ کہتا ہے - عرفات وہ مقام ہے جہاں حضرت ابراہیم نے خدا کو دیکھا تھا - یا پہچانا تھا - غرضکہ حج میں کوئی ایسا امر نہیں کیا جاتا جو قبیح ہو یا جس میں ذرا بھی بت پرستی کا شائبہ ہو - الا قربانی کہ جسکے متعلق میں پہلے لکھ چکا ہوں -

معمولات مذہب کی تشریح پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ مذہب کے معمولات بھی عقائد کی طرح ایک عالم خیالات پر مبنی ہیں - اور ہر مذہب میں کچھ نہ کچھ مشابہت ضرور ہے - اب ہم آئندہ عنوان میں انشاءاللہ انجام مذاہب پر نظر ڈالیں گے - اور مذہب کے ایک خیال و فعل پر متحد ہونے کے امکان پر غور کریں گے -

سید مقبول احمد

---

[1] دیکھو راڈویل کا ترجمۂ قرآن

چین کی ملکہ

(فسانہ)

وہ مجسم کی طرح نازک اندام اور خوبصورت تھی۔ اور کسی خوشنما باغ میں ایک شاداب گلاب کی طرح اپنے ننھے سے قلعہ کی تنہا مالک
یہ ننھا سا قلعہ اس کا عشرت کدہ تھا جس کی دیواروں پر ہلکا ہلکا سبز رنگ چڑھا ہوا تھا اور فرش پر سنہری لیس والے ریشم کے نرم نرم گدے
بچھے ہوئے تھے جن پر وہ ترنم ریز قمری کی طرح پھدکتی پھرتی تھی۔

یہ درخشاں آنکھ اور گلابی رخساروں والی خوش گلو اور زندہ دل قمری کس کی ملکیت تھی؟ جب دوشیزۂ بہار باغ عالم کی سیر کو نکلتی
اور نسیم سحر پھولوں سے سرگوشیاں کرتی اور خوابیدہ کلیوں کو آنکھیں کھولنے پر مجبور کرتی تو اس قمری کے کیف اور نغموں سے کون سی
خوش قسمت ہستی لطف اندوز ہوا کرتی؟ اس الفتکدہ کی روح رواں کا نام سسٹ (Susan etta) تھا جس کا برق پاش
تبسم۔ ترنم ریز گفتار اور غم ربا موسیقی اپنے محبوب خاوند رکارڈو کے لئے وقف تھیں۔

آج سے ڈیڑھ سال قبل ان دونوں کی شادی ہوئی تھی۔ اس وقت موسم بہار شباب پر تھا اور یہ دونوں محبت کی رنگینیوں سے
بہرہ اندوز ہونے کے لئے شہر سے دور ایک پرفضا مقام پر ٹھہرے ہوئے تھے۔ جب یہ صبح و شام ہاتھ سے ہاتھ ملائے محبت سے گفتگو
کرتے ہوئے چشمہ کے کنارے ٹہلتے تو لہریں زیادہ سرعت سے ایک دوسرے کا تعاقب کرنے لگتیں اور ہوا اس کی جھاڑیوں میں اٹکھیلیاں
کرتی ہوئی تمام خوابیدہ پتوں اور پرخمار کلیوں کو جگا دیتی اور ان کے ساتھ روح پرور لے میں گنگنانے لگتی۔

چند روز کے بعد یہ دونوں پھر شہر میں واپس آگئے۔ اور اپنے باغ میں ننھے ننھے گلاب اور یاسمین کے پودوں کی نگہداشت میں مصروف
ہو گئے۔

رکارڈو صناع تھا۔ ایک صاف ستھرے چھوٹے سے کمرہ میں اس کی دوکان تھی جو مرمریں ٹکروں۔ برنجی مجسموں۔ اور مٹی کے خوبصورت
کھلونوں اور بتوں سے بھری ہوئی تھی۔ اکثر ریشمی پردوں کے پیچھے سے گانے کی آواز اور آہنی ہتھوڑی کی جھنکار سنائی دیتی جو اتنی
دلکش ہوتی تھی کہ قریب سے گزرنے والے راہگیر چلتے چلتے ٹھٹھک جاتے اور ہمہ تن گوش ہو کر سننے لگتے۔ اکثر اوقات رکارڈو
اپنی محبوبہ کی دلکش آواز سے ایسا بیخود ہو جاتا کہ اپنی ہتھوڑی روک کر خود کوئی پرانے زمانہ کے گوالوں کا گیت گانے لگتا!

بسا اوقات جب رکارڈو کام میں منہمک ہوتا تو سسٹ آہستہ آہستہ پنجوں کے بل جاتی اور پیچھے کھڑی ہو کر اس کے گلے میں باہیں
ڈال دیتی۔ رکارڈو کی الفت پاش آنکھیں پلٹتیں اور سسٹ کے لبہائے لعلیں اس کے عرق آلود رخساروں پر چپاں ہو جاتے یا کبھی
یوں بھی ہوتا کہ سسٹ اپنے مخملی صوفہ پر ہاتھ میں کتاب لئے پڑھتے پڑھتے آنکھیں بند کر لیتی اور رکارڈو کے تھرتھراتے ہوئے
ہونٹ اس کے تبسم آمیز ہونٹوں سے ملکر اس کے خواب لذید کو درہم برہم کر دیتے۔ سسٹ کی نیم باز آنکھیں محبت سے درخشاں آنکھیں

رکارڈو کی آنکھوں میں گڑھ جاتیں اور ہر ایسے موقعہ پر سسٹ کی عزیز بلبل جو قریب ہی پنجرے میں ٹنگی ہوتی اپنے مسرت بار قہقہوں سے کمرہ کی فضا کو معمور کر دیتی۔ سسٹ دوڑ کر پنجرہ کے دروازہ کو کھول دیتی اور بلبل سیٹی بجاتی ہوئی سارے کمرہ میں رقص کرتی پھرتی۔ کبھی رکارڈو کے بنائے ہوئے اپالو کے مجسمہ پر بیٹھ کر ان دونوں کی طرف دیکھتی اور کبھی وینس کے گل رخسار کا بوسہ لیکر گویا اپنی مالکہ پر طعنہ کستی۔ سسٹ دوڑ کر اسے پکڑ لیتی اور اس کی منقار کو منھ میں دبا کر آہستہ سے کہتی "تو خوبصورت ضرور ہے۔ مگر بلا کی شریر ہے!"
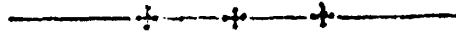
جب یہ دونوں فرصت کے وقت یکجا ہوتے تو ایک دوسرے کی زلفیں سنوارتے۔ "میری لیلیٰ کوئی گانا نہ سناؤ گی؟" رکارڈو کہتا۔ اور آہستہ آہستہ فضا میں ایک دلکش نغمہ ملبند ہوتا اور رفتہ رفتہ اس کی لہریں ساری فضا میں محیط ہو جاتیں۔ دونوں کے دل محبت کے پاک جذبہ سے معمور تھے۔ اور یہ ایک دوسرے پر فریفتہ۔ یہ اس کے لئے انسا اور وینس تھی اور وہ اس کے لئے جوپیٹر اور لوہنگن۔ آہ فریفتگان محبت! جب عشق تمہارے دلوں میں جلوہ فگن ہوتا ہے تو دلوں کی کیا کیا کیفیتیں ہوتی ہیں کتنے جذبات خفتہ اُٹھتے ہیں۔ کیسے کیسے جسارت انگیز دلولے اُبھرتے ہیں۔ شباب وارفتگانِ الفت کے سامنے ایک ہلکا سنہری پردہ آویزاں کر دیتا ہے جس پر لامحدود خوشیوں کی تصویریں رقص کرتی نظر آتی ہیں!۔ آہ کیا اندازہ ہو سکتا ہے کہ ان دونوں کو ایک دوسرے سے کیسی شدید الفت تھی۔ ملکہ شب سے زیادہ۔ آفتاب درخشاں سے فزوں تر رکارڈو اپنی محبوبہ کو چاہتا اور ان نورانی ہستیوں سے کہیں زیادہ گرم جوشی سے اس کی پرستش کرتا تھا۔ کبھی اس کی محبت کے دریا میں چشمۂ خوابیدہ کا سکون نظر آتا کبھی تلاطم خیز سمندر کی جنوں سامانی اور کبھی یہی جذبہ مذہبی عقیدت کا رنگ اختیار کر لیتا۔ بعض اوقات رکارڈو اپنے تخیل میں صوفیوں کی ملبند پروازوں سے بھی آگے بڑھ جاتا اور اُسے اپنی محبوبہ کی ہستی میں انسانی دنیا سے ملبند تر اوصاف نظر آنے لگتے۔ اور وہ خیال کرنے لگتا کہ سسٹ آسمانی دنیا کی کوئی بہترین جنس ہے۔ وہ خوشبودار پھول کی طرح اس کی مشام روح کو معطر رکھتی ہے اور جب وہ اُس کے نرم نرم قابل پرستش سر کو ہاتھوں میں لیکر جوشِ محبت سے سینہ سے لگاتا تو اس کے لبوں پر فاتحانہ تبسم رقص کرنے لگتا اور وہ اپنی قابل رشک کامیابی کو کسی فاتح اعظم کی فیروزمندی سے اعلیٰ تصور کرتا۔

رکارڈو کو اپنی صنعت سے الفت تھی۔ وہ مجسموں کی تراش خراش میں نہایت جوش و کاوش سے کام لیتا۔ مرمریں ٹکڑوں سے یونانی رقاصہ کا جسم دو چار ضربوں میں نکال لینا اس کا ادنیٰ کرشمہ تھا۔ سفید آنکھ اور بغیر پتلیوں والی عریاں دیویوں کے مجسمے آن کی آن میں تراش لیتا۔ ان خاموش مجسموں سے اس کی چھوٹی سی دوکان کی پوری دنیا آباد تھی۔ علاوہ ازیں اسے جاپان اور چین کی نوادرات جمع کرنے کی دھن تھی اور وہ اس فن کا ماہر تھا۔ البتہ یہ اس کی بدقسمتی تھی کہ وہ ان ممالک کی زبانوں سے بے بہرہ تھا۔ اس نے غیر ممالک کی کتابوں کا خوب مطالعہ کیا تھا۔ لوٹی۔ جوڈیتھ اور کارٹر کو وہ پرستش کی نگاہوں سے دیکھتا۔ اور بگاسکی۔ کیوٹو۔ نیکن اور پیکن وغیرہ کی شہرۂ آفاق صنعت کے بہترین نمونے حاصل کرنے کے لئے اُس نے کافی قربانیاں کی تھیں۔

سسٹ نے ایک روز اس سے کہا "میں تمھاری دوکان کو اس طلسمی کمرہ کو حقارت کی نظروں سے دیکھتی ہوں جس کی وجہ سے مجبوراً مجھے تم سے علٰحدہ رہنا پڑتا ہے۔ رکارڈو فی الفور اپنے نگارخانہ سے مسکراکر اٹھ کھڑا ہوا اور سسٹ کے گلے میں ہاتھ ڈالے ہوئے آسمانی رنگ کے کمرہ میں اپنی محبوبہ کی محبت آمیز جھڑکیاں سننے اور اُنکی شریر بلبل کی چھیڑ چھاڑ کا تماشہ دیکھنے کے لئے جا پہنچا۔

ایک روز صبح جب رکارڈو کمرہ میں داخل ہوا تو سسٹ کی آنکھیں خمار خواب میں ڈوبی ہوئی تھیں اور وہ ایک تپائی کے قریب جس پر پھولوں سے بھرا ہوا گلدان رکھا تھا۔ محوِ خواب تھی۔ کیا سسٹ صحرائے خفتہ کی کوئی حسین دیوی تھی؟ وہ نیم خوابیدہ مخملی صوفہ پر پڑی تھی اور اس کا حسن ضیا پاش اُس کے لباس سے چھن چھن کر سارے کمرہ کو منور کر رہا تھا۔ اُس کے سنہرے نور افشاں گیسوؤں پر بکھرے ہوئے تھے جن کی خوشبو سے سارا کمرہ مہک رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ سسٹ اگلے زمانہ کے ان پُر رومان قصوں کی شہزادی تھی جن کی ابتدا اکثر اس دلکش جملہ سے ہوا کرتی تھی کہ ——— "کسی زمانہ میں ایک بادشاہ تھا! ———"

رکارڈو نے اسے اس خواب ناز سے جگا دیا۔

"سسٹ۔ میری خوبصورت سسٹ!"

اُس نے اپنا رُخ انور انگڑائی لیتے ہوئے اٹھایا۔ رکارڈو کی آنکھیں فرطِ محبت سے چمکنے لگیں اس کے ہاتھ میں ایک خط تھا۔

"پیاری سسٹ۔ یہ خط رابرٹ کا ہے۔ اسپر چین کی مہر ہے۔ ہانگ کانگ جنوری ۱۸ ———"

سسٹ اُٹھ کر بیٹھ گئی اور خط کو لیکر عجیب انداز سے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔

"رابرٹ کا سا دوسرا شخص دیکھنے میں نہ آیا" رکارڈو نے کہا ——— "اسے ارض پیمائی کا خبط سوار ہے ہمارے گھر میں اُسکی بڑی عزت ہے اور وہ اس خاندان کا بھی ایک فرد شمار کیا جاتا ہے۔ دو سال قبل وہ سان فرنسسکو کے لئے روانہ ہوا تھا اور اب چین میں موجود ہے ———" اس نے خط لیکر پڑھنا شروع کیا۔

"ہانگ کانگ جنوری ۱۸ ۱۸۳۰ء

عزیز رکارڈو

" تم سے رخصت ہونے کے بعد میں نے دل کھول کر سیاحی کی مگر ہنوز مجھے سیری نہیں ہوئی۔ تمھاری شادی کی خبر مجھے سان فرانسسکو میں ملی تھی۔ میں ہدیہ مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ میں یہاں پر کیلیفورنیا کے ایجنٹ کی حیثیت سے مقیم ہوں۔ اور اس ملک کے نوادرات وہاں بھیجنے کے کام پر مامور ہوں۔ اس خط کے بعد تمھیں اپنی شادی کا تحفہ بذریعہ پارسل ملیگا جس سے تم نہایت محظوظ ہوگے کیونکہ میں جانتا ہوں کہ تم اس ملک کی چیزوں کی کتنی قدر کرتے ہو۔ سسٹ سے میری قدمبوسی عرض کیجئے اور مجھے ہرگز ہرگز فراموش نہ کیجئے۔ کیونکہ میں وہی ہوں تمھارا رفیق دیرینہ اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔"

رابرٹ

خط کے ختم ہوتے ہی دونوں کے دونوں کھل کھلا کر ہنس پڑے۔ سسٹ کی بلبل اپنی سیٹیوں کی آواز سے طلائی قفس کی

تیلیوں کو متحرک کر دیا!

پارسل دستیاب ہوا بڑا صندوق جس پر جگہ جگہ چنگی خانوں کے نشانات اور مختلف مقامات کی مہریں ثبت تھیں۔ ایک گوشہ میں نہایت جلی قلم سے ایک جملہ لکھا ہوا تھا جس سے پتہ چلتا تھا کہ اندر کا سامان نہایت نازک اور بیش قیمت ہے۔ دونوں رابرٹ کا تحفہ دیکھنے کے لئے بیتاب تھے۔ صندوق کھولا گیا جس میں سے ایک نہایت نفیس چینی کا نسائی مجسمہ برآمد ہوا اس کا چہرہ چینی صنعت کے لحاظ سے قدرے زردی مائل تھا اور اس کے لبہائے نازک تبسم سے لرزاں نظر آتے تھے۔ مجسمہ کے نیچے مختلف زبانوں میں یہ الفاظ خوبصورتی سے کندہ تھے۔

"چین کی ملکہ" — "چین کی ملکہ"

کیا قابل رشک صناعی تھی! یہ سحر ریز مجسمہ کسی چابکدست کی صنعت کا نتیجہ تھا؟ کسی ایشیائی صناع کی؟ کیا یہ لوگ بت سازی میں اس درجہ ماہر ہوتے ہیں؟ یا ان کے پس پردہ کوئی غیبی ہاتھ ان کے مجسموں کو مکمل کرتا ہے؟

مجسمہ کی دراز زلفیں اس کے رمز آمیز چہرہ کے پیچھے خوبصورت جوڑے میں بندھی ہوئی تھیں اس کی چشم ہائے فریب کار کسی آسمانی شہزادی کی آنکھوں کی طرح درخشاں تھیں۔ وہ سفید چینی کی بنی ہوئی تھی اور ڈلکتے ہوئے ستارہ کی طرح روشن۔ ان ہمہ گیر خوبیوں کے ہوتے ہوئے اس کے طلسمی ہونے میں کسے شک ہو سکتا تھا؟

چین کی ملکہ! چین کی ملکہ!!" سمتھ نے اپنا دست نازک اس حور وش ملکہ کے چہرہ پر پھیرتے ہوئے کہا۔ "واقعی رابرٹ نے ہمارے لئے ایک نایاب تحفہ پیش کیا ہے۔ یقیناً یہ ہم لوگوں کا عزیز ترین سرمایہ ہے۔"

رکارڈو مجسمہ کو نظر افتخار سے دیکھنے لگا اور وہ مطمئن تھا کہ اس کی محبوبہ بھی اُسے پسند کرتی ہے — "میں اس کے لئے ایک خوشنما کیبنٹ (cabinet) بناؤنگا اور اسے بیل بوٹوں اور پھولوں سے سجاؤنگا۔ تاکہ معلوم ہو کہ وہ درحقیقت میرے گھر کی ملکہ ہے۔ ہاں چین کی ملکہ میرے گھر میں اسی طرح حکومت کرے گی جیسے وینس کی مورتی اپنے مندر میں کرتی ہے" —

اور رکارڈو نے اپنا قول پورا کیا۔ ایک نہایت شاندار کیبنٹ بنوایا گیا اور اس میں رابرٹ کا عزیز تحفہ نہایت تزک و احتشام کے ساتھ رکھا گیا مجسمہ کے ہر چہار طرف رنگ برنگ کے پردے لٹکائے گئے۔ جن کی تصویریں اور نقوش خود بلحاظ صنعت کے بے نظیر تھے۔ کہیں برگ‌ہوں کی ہری بھری کھیتیوں اور پودوں کے درمیان ننھی ننھی چڑیوں کا رقص بتلایا گیا تھا تو کہیں دو بلند وادیوں کے درمیان ایک قلقل ریز چشمہ سیمیں۔ اور اس منظر کی بہار لوٹنے والا ایک تنہا بگلا جو آب رواں کے ترنم سے ایسا مبہوت ہو گیا تھا کہ سطح آب پر اچھلنے والی مچھلیوں کی اُسے ذرہ بھر بھی پرواہ نہ تھی۔ کسی پردہ پر صبح کا دلکش منظر دکھلایا گیا تھا جبکہ طلائی آفتاب سمندر کی گہرائیوں سے نہا دھو کر افق پر آہستہ آہستہ بلند ہوتا ہے اور ایک غریب ملاح جو بہت پہلے کام پر نکل چکا ہے اس فکر میں ہے کہ پانی کے تھپیڑوں سے کیوں کر اپنی چھوٹی کشتی کو محفوظ رکھے۔ ان سحر افشاں پردوں کے کنارے کنارے رکارڈو نے اپنی کل چینی اور جاپانی نوادرات سلیقہ سے بکھیری تھی جو کمرہ کی خوبصورتی کو دوبالا کر رہی تھیں۔

جب رکارڈو اپنے کاموں سے فارغ ہوتا تو اس چین کی ملکہ کے روبرو اپنے فلسفیانہ انداز میں کھڑا ہوکر نہایت عزت واحترام سے اس کی طرف دیکھتا رہتا دن میں کئی مرتبہ اسیطرح وہ اس مجسمہ کی پرستش کرتا۔ علی الصباح باغ کے عمدہ سے عمدہ پھول چنکر یاکوہاما کے بنے ہوئے بڑے طشت میں رکھ اس کے سامنے پیش کرتا۔ اس مجسمہ کی دید سے اس کے دلپر ایک کیف انگیز سرور چھاجاتا اور اسے اپنے تن بدن کا ہوش نہ رہتا۔

رکارڈو! پیارے رکارڈو! میں تمھارا انتظار کررہی ہوں" سسٹ کی سریلی آواز چینی کے ظروف میں سرایت کرجاتی اور انہیں ایک قسم کی جھنکار پیدا ہوجاتی۔ مگر پھر بھی وہ محو نظارہ رہتا۔ یہانتک، کہ سسٹ اسپر آکر ٹوٹ پڑتی اور اس کے سرکو اپنی آغوش میں لیکر کہتی "مجنون۔ دیوانہ۔ وحشی!"

ایک روز صناع کے بھینٹ کئے ہوئے پھول مجسمہ کے پاس سے یکایک غائب ہوگئے!

ارے! یہاں کے پھول کون اُٹھائے گیا؟ — پریم مندر کے پجاری نے گھبراکر پوچھا۔

میں نے! — تھرتھراتی ہوئی آواز میں جواب ملا۔ اور ساتھ ہی سسٹ نے مسکراتے ہوئے پردے سے جھانک کر دیکھا لیکن اُس کی آنکھیں آج خلاف معمول آتش بار تھیں۔ اور اس کے انداز سے کسی عزم صمیم کے آثار اب تک ہویدا تھے۔ رکارڈو سہم گیا۔ وہ چند روز سے اپنی محبوبہ کے طرز عمل میں ایک تبدیلی محسوس کررہا تھا۔ لیکن کوئی قابل تشفی توجیہ اس کے سمجھ میں نہ آئی تھی۔ وہ سوچنے لگا "آخر ماجرا کیا ہے۔ میری پیاری سسٹ کو کیا ہوگیا۔ اس نے کھانا پینا کیوں ترک کردیا۔ کتب خانہ کی خوبصورت کتابیں کتنے دنوں سے اُسکے دست نازک کے لمس کو ترس رہی ہیں، اس کی گود میں کھیلنے کے لئے بیتاب ہیں۔ لیکن وہ ہے کہ اُن کی طرف ملتفت ہی نہیں ہوتی۔ یکلخت وہ اس قدر افسردہ کیوں ہوگئی۔ کونسا اندرونی صدمہ اس کو نڈھال کیئے ہوئے ہے؟۔"

کبھی کبھی رکارڈو دزدیدہ نگاہوں سے اس کی خوبصورت آنکھوں کی طرف دیکھتا اور اس کے دل میں ایک چوٹ سی لگتی جب وہ دیکھتا کہ وہ آنکھیں جو چند روز قبل وفور محبت و فرط انبساط سے چمکا کرتی تھیں آج آنسوؤں سے لبریز ہیں۔ وہ اس کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھتا "پیاری سسٹ تم کیوں اداس ہو۔ آخر تمھیں کس چیز کی ضرورت ہے؟" — اُسے طفلانہ جواب ملتا۔ "نہیں کچھ نہیں" اس کی آواز درد میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اور کبھی یہ مختصر و تشنہ الفاظ بھی آنسوؤں میں جذب ہوجاتے یا ہچکیوں کی آواز میں فنا ہوجاتے۔

ایک دن رکارڈو سے نہ رہا گیا اور شام کو جب وہ دونوں ناشتہ کرتے بیٹھے تو اُس نے کافی کی پیالی سے اُٹھتے ہوئے ابخرات کے دائرہ پر نظر گاڑتے ہوئے کہا "سسٹ! یقیناً تم مجھ پر ظلم کررہی ہو۔ تمھارا مغموم ہونا اور اُس کے سبب کو مجھ سے پوشیدہ رکھنا انصاف سے بعید ہے تم جانتی ہو کہ مجھے تم سے کس قدر الفت ہے۔ کیا تم میری آنکھوں سے میری دلی کیفیات کا اندازہ نہیں کرسکتیں؟"

سسٹ زار و قطار رونے لگی "آہ تم مجھے کس قدر پیار کرتے تھے۔ لیکن اب وہ باتیں خواب وخیال ہوگئیں خوشی کی منور گھڑیاں

چشم زدن میں ختم ہوگئیں بوس وکنار کے پرلطف ایام جاڑے کی بارش کی طرح آئے اور نکل گئے اور اب وہ وقت ہے کہ میں مفتوں تمھاری نظر التفات کو ترستی رہتی ہوں اور تم نے مجھکو۔ ہاں اس کی آنکھیں کبھی تمھیں صبح کے ستارے سے زیادہ منور اور چشم نرگس سے حسین تر معلوم ہوتی تھیں۔ جسکے خانۂ دل میں تمھاری تصویر ابتک محفوظ ہے۔ جس کی عیش ومسرت کا انحصار صرف تمھاری ذات سے وابستہ تھا اپنے دل سے علٰحدہ کردیا۔ اور اس دلبر جسے میری ملکیت ہونی چاہئے تھا۔ آج ایک غیر حکومت کررہی ہے!"

"کوئی غیر کوئی غیر!!" رکارڈو دیوانوں کی طرح کرسی سے اچھل پڑا۔ سسٹ کوئی غیر؟۔ تم کیا کہہ رہی ہو۔ لیکن تمھارے دل میں الوچیا کا خیال ابھی تک باقی تو نہیں جس کی شان میں میں نے کسی زمانہ میں چند اشعار لکھے تھے؟۔ مگر سسٹ وہ تمھاری ملاقات سے بیشتر کی بات تھی۔

سسٹ نے سر ہلاکر آہستہ سے کہا "نہیں میں اس کا ذکر نہیں کررہی"

"تو کیا تم متمول جبریا، کا خیال کررہی ہو۔ وہ جس کی سیاہ زلفیں تا بہ کمر پہنچتیں تھیں جسکا مجسمہ میں نے طیار کیا تھا؟"

"..........................."

پھر کیا رقاصہ لوسا کا خیال تمھارے لئے جانکاہ ثابت ہورہا ہے۔ وہ جس کی فسوں ساز آنکھیں ایک زمانہ کو اپنا ہدف بنا چکی ہیں

"نہیں .... ان میں سے ایک بھی نہیں"

حیرت ہے تعجب ہے" رکارڈو نے کرسی پر دراز ہوتے ہوئے کہا ——— پیاری سسٹ مجھے نہ کڑھاؤ۔ مجھپر اصلی حقیقت ظاہر کردو" اس نے نہایت سنجیدگی سے کہا "آخر تم کس کمبخت کا ذکر کررہی ہو۔ بولو۔ جلد بولو۔ تم جانتی ہو کہ میں کس رخ انور کا پروانہ ہوں۔ میرے دل میں کسی اور کا خیال جاگزین ہونا۔ ناممکن بعید از قیاس"

"کیا تم واقعی اب بھی مجھ سے محبت کرتے ہو؟"

"ہاں۔ اور تم اس امر سے بخوبی واقف ہو!"

رکارڈو کی آنکھیں محبت کے نور سے چمکنے لگیں ان چند جملوں کو اس نے اس پیرایہ میں ادا کیا کہ سسٹ کا دل بھر آیا اور وہ آنسو پونچھتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اچھا تو میں اپنے رقیب سے بدلہ لونگی۔ اس مکان میں یا وہ رہیگی یا میں۔ تمھیں اختیار ہے۔ تم منتخب کرلو۔ کیا یہ حقیقت ہے کہ تم میری پرستش کرتے ہو۔ کیا تم اس کا خیال اپنے دل سے نکالنے پر آمادہ ہو۔ جو میری اقلیم محبت کو تاراج اور عشرت کدہ کو منغص کررہی ہے؟ کیا میں تمھاری محبت پر اعتماد کروں اور امید کروں کہ تمھارے دل میں اب بھی میری وہی قدر ومنزلت ہے جو پہلے کبھی تھی؟"

"ہاں۔ یقیناً۔ ضرور" ——— اس نے پھر اپنی کافی کی پیالی اٹھالی۔

اس نے مشکل سے دو ایک گھونٹ پئے ہونگے کہ پاس کے کمرہ میں زور کا دھماکا ہوا۔ اور کسی چیز کے ٹوٹنے کی آواز آئی۔ وہ اس طرف

لپکا۔ اور اس کی آنکھیں ایک عجیب منظر سے دوچار ہوئیں۔ چین کی ملکہ کا اسباب آرائش اس کے سنہری لیس اور خوشنما پردے زمین پر بکھرے ہوئے تھے اور وہ خود سسٹ کے قدموں تلے منتشر ٹکڑوں کی صورت میں پڑی ہوئی نظر آرہی تھی۔
سسٹ کے بال بکھرے ہوئے تھے اور وہ ایک طرف ہانپتی ہوئی کھڑی تھی۔ رکارڈو کو دیکھتے ہی اُس نے دوڑ کر اُس نے گلے میں باہیں ڈالدیں اور نہایت جوش کے ساتھ بولی۔ پیارے رکارڈو۔ میں نے اپنے رقیب سے انتقام لے لیا۔ دیکھو دیکھو۔ میں نے آج اس غاصبۂ محبت۔ چین کی ملکہ کا خون کرڈالا!" ــــــــ اس کے نقرئی قہقہوں سے سارا کمرہ گونج اُٹھا۔
اور جب ہفتوں کی کشیدگی کے بعد آسمانی رنگ کے سلوں میں دو ہستیاں بوسۂ محبت سے پیمان الفت کی تجدید کررہی تھیں سسٹ کی عزیز بلبل ہنستے ہنستے بیخود ہوگئی!

ممتاز اشرف قادری

(اسپینی لٹریچر)

کلیات و دواوین (اردو)

دیوان میر حسن دہلوی نہایت دردانگیز کلام ہے۔ ہر شعر سے اُستادی اور قادر الکلامی ٹپکتی ہے ۶ر

دیوان مردان صفی تصوف کا رنگ کوٹ کوٹ کر بھر دیا گیا ہے ۱۵ر

کلیات مومن۔ مومن کے کلام کی شوخی مشہور عام ہے اس میں اُن کی مثنویات بھی شامل ہیں عہ ر

کلیات ظفر ہر چہار جلد کامل دو جلد۔ سنگلاخ سے سنگلاخ زمینوں میں نہایت روانی کے ساتھ غزلیں لکھی ہیں از ابوظفر سراج الدین بادشاہ آخری دہلی ع۱۲ر

دیوان ناسخ۔ استعارات اور تشبیہ میں اُن کا کلام اپنی آپ نظیر ہے از شیخ امام بخش ناسخ لکھنوی عہ

کلیات میر تقی میر۔ تعریف فضول ہے کل شعرائے ماضی وحال کے پیشوا مانے جاتے ہیں اور زمانہ اُن کی تعریف میں رطب اللسان نظر آتا ہے اس کلیات میں ان کا تمام کلام مثنوی رباعی قطعات وغیرہ کے اقسام سے موجود ہے عہ ر

کلیات سودا۔ ہجوگوئی کے بادشاہ اور قصیدہ کے اُستاد ہیں میر تقی میر نے بھی ان کو شاعر مانا ہے ہر قسم کا کلام اسمیں موجود ہے عہ ر

کلیات نظیر اکبرآبادی۔ ہر رنگ میں فرد تھے جملہ اقسام کا کلام ان کی کلیات میں موجود ہے عہ ر

گلزار داغ۔ زبان اور محاورات دہلی کا معدن ہے عہ ر

دیوان رند از سید محمد خاں صاحب رند نہایت پختہ اور متین کلام ہے ۹ر

دیوان غالب۔ مشہور ومقبول ہے از تصنیف شاعر کامل مرزا اسد اللہ خاں غالب اس کتاب کو نہایت صحیح کرکے ۲۰×۳۰ تقطیع پر چھاپا گیا ہے اسمیں مشکل الفاظ کے معنی واقعہ طلب اشعار کے واقعات کا اضافہ کیا ہے۔ ایک چھوٹا سا مقدمہ جس میں مصنف کی سوانح عمری درج ہے اول میں لگا دیا گیا ہے اور اس کلام کا اضافہ کیا گیا ہے جو جدید دستیاب ہوا ہے غرضکہ دیوان نہایت عمدہ حیثیت میں آگیا ہے ٹائٹل سبز رنگین گندہ ۴۰ر

دیوان ذوق۔ اسمیں جدید کلام کا بھی اضافہ کیا گیا ہے ۔ ۱۲ر

صنم خانہ عشق یعنی منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی کا دیوان مطبوعہ غیر ع۲ر

(مینجر نگار)

دُنیا کی مشہور الہامی کتابوں پر تاریخی نظر

قرآن کا فلسفہ تعلیم

اے روح بہر جستجو سر سازہمچون آب جو
زمے عقل بہر آن بقا، دائم بہ در راہ فنا
(شمس تبریز)

مراتب ذوق، اور مدارج کاوش کے لحاظ سے، ہر انسانی زندگی میں، ایک ایسی ساعت بھی ہوا کرتی ہے، جب تعلقات و مخلوق کے رازہائے سربستہ کی عقدہ کشائی کا مسئلہ اس کے سامنے ہوتا ہے۔ جب انسان اپنے ارتقائے ذہنی کے گہوارہ میں تھا، اس وقت بھی یہ خیال اس کے دماغ میں پیدا ہوا، اور جب اس نے تہذیب و تمدن کا ایک کافی زمانہ گذار دیا اس وقت بھی اسکا دماغ اس شاہد خیال کی عشوہ طراز نگاہوں سے معمور رہا انسان نے اپنے ناخن فکر سے اس عقدہ لاینحل کو کھولنا چاہا، قوموں کے ضمیات (میتھالوجی) ملتوں کے عجیب و غریب روایات فلسفہ کے مختلف مسالک، اور صوفیا کے مختلف طبقات اسی کاوش ذہنی کی پیداوار ہیں، ہاں اس صحرائے ناپیدا کنار میں، نوع انسان کی رہنمائی، اور طریق رشد کے لئے خود اس مطلوب کائنات کی طرف سے "الہام" کی شکل میں ایک تدبیر سامنے رہی، لیکن ذہن انسانی کی عجائب نوازیوں، اور اس کے انکار کی پر پیچ رہ توردیوں نے "الہام" کی سادگی، اور ملہم کے صحیح خط و خال کے درمیان ندرت آفرینیوں کے سینکڑوں حجابات پیدا کر دئے۔ یہاں تک کہ آج اس کرۂ ارضی کے ایک کنارہ پر جب ایک جویائے حق کھڑا ہوتا ہے تو اُسے مذہبی فرقہ بندیوں کا ایک سلسلہ نظر آتا ہے، اس سلسلہ کا ہر رکن اپنی حقانیت کا مدعی ہے اور بقیہ ارکان کا سخت مخالف۔ پھر قدرتاً ایک محقق کے سامنے حق و باطل کے امتیاز کا مسئلہ درپیش ہوتا ہے اگر مذہبی تعلیم کے خصائص کا مطالعہ کیا جائے، تو سب سے پہلے ایک انسان کے سامنے دنیا کی بے شمار زبانوں کی تحصیل کا اہم مسئلہ سامنے آتا ہے۔ حیات انسانی کی مختصر مدت اس تلاطم میں پڑ کر گم ہونے کی اجازت نہیں دیتی اور اس کے سوا چارہ بھی نہیں؛ پھر چونکہ مذاہب کا تعلیمی موازنہ کرنے میں، کسی مذہب کی اصلی زبان کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، اور استقصاء، تسکین قلب کا سامان نہیں پیدا کر سکتے، لہذا ایک دوسری صورت اختیار کرنی پڑتی ہے اور وہ یہ کہ آیا مدعیان مذہب کے الہامی صحیفے تاریخی دنیا میں، سندر اعتبار کی حیثیت رکھتے بھی ہیں یا نہیں، اگر دنیا کی تاریخی شہادتیں ثقہ روایات اور صحیح نظریات بتائیں کہ دنیا کے الہامی صحیفوں کو اپنی زندگی میں فلاں فلاں پر صعب مراحل سے گذرنا پڑا ہے تو تنقید صحیح کے بعد ایک محقق کسی مسلک پر گامزنی کی جرأت کر سکتا ہے؛

آئندہ اوراق میں تاریخ کے اسی حصہ پر روشنی ڈالی گئی ہے، اور روایات کی غیر جانبدارانہ شہادتوں کی بنا پر ثابت

کیا گیا ہے کہ دنیا کے تمام صحف الہامیہ کے اصلی نسخے گم ہو گئے، صرف قرآن مجید اس تضییع سے محفوظ رہا، اور اسے عقلی اور نقلی براہین سے ثابت کیا گیا ہے، وید ہزاروں برس زبانی رہے، ژند وستا پر یونانی جبر و استبداد کا اثر پڑا، بنی اسرائیل کے مقدس صحیفے مصر و بابل کی شورش میں ضائع ہو گئے، جین مذہب کے صحیفے اول تو ایک مدت مدید کے بعد پارسوا اور مہاویر کے زمانہ میں مدون ہوئے انھیں بھی حوادث روزگار کے امواج نے ضائع کر دیا، بدھ اور لاؤزی کے مذہبی صحیفوں کو لوگوں نے ان کی وفات کے سینکڑوں برس کے بعد مرتب کیا، جسکے باعث ان کی صحت، بہت مشکوک، اور ناقابل اعتبار ہے، قرآن کی صحت پر بھی اس ضمن میں بعض مغربی علماء نے تنقید کی ہے، لیکن عقلی اور نقلی دلائل سے اُن کی تنقید پر تنقیحی روشنی ڈالی گئی ہے۔

قرآن مجید نے جماعات انسانی کے مختلف الہامی صحیفوں کی حقانیت تسلیم کی، لیکن یہ بات اکثر افراد کو کھٹکتی ہو گی، کہ اس نظریہ میں تنظیم جماعات اور تالیف قلوب کے سوا، اور کوئی بات نظر نہیں آتی، قرآن مجید کہتا ہے،

"قل امنا باالله وما انزل الینا وما انزل الیٰ ابراهیم واسمعیل واسحق ویعقوب والاسباط وما اوتی موسیٰ وعیسیٰ وما اوتی النبیون من ربهم لا نفرق بین احد منهم"

(اے نبی صلعم) فرمادیجئے، ہم اللہ پر، اور جو ہم پر اتری، اور جو ابراہیم، اسمٰعیل، اسحٰق، یعقوب اور ان کی اولاد پر اتری اور جو کچھ موسیٰ اور عیسیٰ، اور جو کچھ نبیوں کو ان کے رب کی طرف سے دیا گیا، ایمان لائے، ان میں ایک سے بھی ہم اختلاف نہیں کرتے،

ہم اُن کی تصدیق بھی کریں، ان کی الہامی خصوصیت کو بھی مان لیں، پھر بھی ہم میں اور ان میں مذہبی اشتراک عمل مفقود، اس کا سبب؟ یہ مضمون قرآن مجید کے اسی نظریہ کی تفسیر ہے، یعنی جماعات انسانی کے اکثر مذہبی صحیفے من جانب اللہ تو ضرور ہیں لیکن وہ اپنی اصلی شکل میں نہیں۔

ماخذ اور چند اہم کتابوں کی تلخیص میں نے اس مضمون کے تاریخی حالات مفصلہ ذیل کتب سے لئے ہیں۔

نام کتاب	مصنف	کیفیت
منتشر معارات متعلق مذہبیات	میجر جنرل جے جی آر فارلنگ	—— یہ کتاب ایک ضخیم جلد میں ہے اور گیارہ ابواب پر منقسم ہے، پہلے باب میں ہندوستان کی قدیم تاریخ، اقوام ہند کے عروج اور انکے استقرار کے متعلق ہے، اس میں ثابت کیا گیا ہے، کہ ہندوستان کی تہذیب پر صرف آریہ قوم ہی کا اثر نہیں پڑا ہے بلکہ ڈریوڈ قوم کی ذہنیت کا بھی دخل ہے، دوسرے باب میں جین اور بدھ مذہب پر ایک تاریخی اور فلسفیانہ بحث کی گئی ہے، تیسرے باب میں فارس کے مشہور مدعی نبوت زردشت اور اس کی کتاب ژندوستا کے متعلق مبسوط تحقیقات

		پیش کی گئی ہے، چوتھے پانچویں، اور چھٹے ابواب میں، ہندو مذہب ویدانت، اور چین کے مشہور روحانی رہنما "لاؤزی" اور کانفیوشیس کے حالات زندگی اور ان کے طریق رشد و ہدایت پر ایک موضوع تبصرہ ہے۔ ساتویں، آٹھویں اور نویں ابواب میں، انبیائے بنی اسرائیل ان کے حالات زندگی اور اُن کے صحف الہامی سے متعلق تحقیق اور دقت نظر سے مواد جمع کئے گئے ہیں، خصوصیت کے ساتھ نواں باب نہایت دلچسپ ہے جس میں بنی اسرائیل کے کتب سماوی کے ضائع ہوجانے اور اصل سے موجودہ نسخوں کے مختلف ہونے پر تاریخی واقعات سے استشہاد کیا گیا ہے، دسویں باب میں آنحضرت صلعم کی زندگی ہے، قرآن مجید پر نقد و بصر کیا گیا ہے، اور مکہ کی تاریخ لکھی گئی ہے، گیارہویں باب میں مذاہب کی تعلیم کے منتخب نظم میں درج ہیں
یہودی فلسفۂ اسکندریہ	ڈرامنڈ ——	یہ کتاب دو جلدوں میں ہے "فیلو" یہودی مذہب میں اسی پایہ کا عالم گذرا ہے، جس پایہ کے اسلام میں علمائے معتزلہ تھے، ایک حد تک اسے امام رازی سے مشابہت دیجاسکتی ہے، کیونکہ فیلو یہودیوں میں ایک زبردست متکلم تھا، پہلی صدی قبل مسیح میں گذرا ہے۔ اس کتاب کے اندر فیلو کے وہ نظریات ہیں جو اُس نے یہودیت کی تشریح میں اصول فلسفہ و منطق، یا بہ الفاظ دیگر علوم یونانیہ کو ملحوظ رکھکر پیش کیا ہے،
ڈکشنری آف دی بائبل	جیمس ہیسٹنگس ——	یہ کتاب چھوٹے ٹائپ کے اندر ایک ضخیم جلد میں ہے، لفظ "بائبل" کے ماتحت مصنف نے قابل قدر مباحث لکھے ہیں، میں نے اسی کا خلاصہ ترجمہ کیا ہے، اور ان واقعات کو نظر انداز کردیا، جو اُس نے بنی اسرائیل کے مذہبی کتب کے مختلف حصوں اور ان کے موضوع بحث کے متعلق لکھا ہے۔ اُس نے مصطلحات اولڈ ٹسٹمنٹ، اور "نیو ٹسٹمنٹ" کی وجہ تسمیہ بتائی ہے اور اُن کی تاریخ لکھی ہے، اس کے بعد ان کتابوں کے نام گنائے ہیں جو اُن میں شامل ہیں یہ بھی لکھا ہے، کہ

یہودی ان میں کتنی کتابیں تسلیم کرتے ہیں اور نصاریٰ سے انھیں کن کتابوں کے متعلق اختلاف ہے،

مقدس صحف مشرقیہ میکس مولر ـــــ یہ کتاب مشرق کے مذہبی صحیفوں کی چوتھی جلد ہے، اور اس میں "وندیدات" کا پہلوی نسخہ ہے جو ژند وستا کا ایک حصہ ہے، اس کا مقدمہ ڈارمستیٹر کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔

تصوف کے متعلق فارسی اور عربی میں کتابیں بکثرت ہیں، لیکن مینے قرآن مجید کے صوفیانہ و نفسیاتی اصول کو زیادہ تر انگریزی تصنیفات کا مطالعہ کرنے کے بعد لکھا ہے، اس سلسلہ میں میکڈ نلڈ کی "دی مجس ایٹیچیوڈ اینڈ لائف ان اسلام" (اسلام میں مذہبی طور اور زندگی) اور نکلس کی بہترین تالیفات "صوفیائے اسلام" اور مقدمہ دیوان شمس تبریز مطبوعہ کیمبرج" سے کافی مواد حاصل کئے گئے، میکڈ نلڈ عربی علوم کا ایک مایہ ناز مستشرق گذارہے، اسلامی فقہ وحدیث وغیرہ کے متعلق بھی ایک مشہور تصنیف مشہور تصنیف ہے۔ جو اُس نے متذکرہ بالا تصنیف کے قبل لکھی تھی "اسلام میں مذہبی طور اور دینی زندگی" کے اندر اس نے زیادہ تر علامہ ابن خلدون کے مقدمہ تاریخ، اور امام غزالی کی احیاء العلوم الدینیہ سے صفحات کے صفحات ترجمے نقل کئے ہیں، یہ تراجم عموماً خود اس کی ہمت طالبعلمانہ کا نتیجہ ہیں بعض مقامات میں اس نے ڈی سلین کے انگریزی ترجمہ سے بھی مدد لی ہے، ڈی سلین کے شغف علمی اور عربیت کا یہ عالم تھا کہ اس نے ابن خلکان کے وفیاۃ الاعیان کی ضخیم جلدوں کا انگریزی میں ترجمہ کر ڈالا، یہ ترجمہ متعدد ضخیم جلدوں میں ہے، پٹنہ کی اورینٹل لائبریری میں یہ انگریزی نسخے موجود ہیں، ایک جلد میری نظر سے بھی گذری ہے جس میں بوعلی سینا اور منصور وغیرہ کا تذکرہ ہے، ڈی سلین نے دوسری علمی خدمت یہ کی، کہ اس نے تاریخ ابن خلدون کی ضخیم جلدوں کی کاپی انگریزی میں ترجمہ کر ڈالا، میکڈ نلڈ نے اپنی اس کتاب میں اسلامی جماعت کے ان افکار و احساسات کا تذکرہ کیا ہے، جو اسلام کے اصول مذہب میں نہیں، یا موجودہ صورت میں نہیں پائے جاتے، اس نے وحی اور الہام کے حقائق سحر و طلسم کے اسرار کشف و کرامات کے عجائب، خواب اور عالم غیب کے معمے اسلامی اصول کے مطابق نہایت وصاحت سے دکھائے ہیں، اس کی کتاب کا نصف آخری حصہ تصوف کے متعلق ہے جس میں اُس نے تصوف کے مختلف پہلوؤں پر عالمانہ اور محققانہ روشنی ڈالی ہے، نکلس کا ذوق فارسی و عربی مزید تعارف کا محتاج نہیں، موجودہ دور میں وہ ایک قابل قدر ہستی ہے، اس کی تصنیفات کا زیادہ حصہ صوفی ادبیات کے تراجم اور تشریحات کے متعلق ہے، نگار کی کسی اشاعت میں اس کی زندگی، اس کے کمالات علمی اور اس کی تصنیفات پر جامع بحث کیجائیگی، جس کا ایک حصہ خود اُس کے ملفوظات میں ہوگا "صوفیانہ افکار" کی توضیح میں مینے انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا" اور "انسائیکلوپیڈیا آف رلجن اینڈ اتھکس" (دائرہ معارف مذہب و اخلاق) سے بھی مدد لی ہے،

نفسیاتی افکار کی تصریحات میں خاکسار کا بہترین مطمح نظر "میک ڈوگل" اور "ولیم جیمس" ہیں، جن کی تصنیفات "نفسیات اجتماع اور "مبادی نفسیات" کا مطالعہ فلسفہ نفس کے ایک طالب علم کے لئے ناگزیر ہے "نفسیات کے متعلق تصریح نفسیات (Psychology

analysis) کی بھی ورق گردانی کی گئی، ان کتابوں کے علاوہ اور بھی بہتری کتابیں زیر مطالعہ آئیں، جن کے اقتباسات مضمون کے اندر ملیں گے،

فارلنگ نے اپنی کتاب میں جین مذہب کو سب سے قدیم تسلیم کیا ہے، اس لئے مذاہب عالم کی مختصر تاریخ میں وہی ترتیب یہاں بھی ملحوظ رکھی گئی ہے۔

جین مذہب

جین مذہب کے پیرو اپنے مذہب کے چوبیس مذہبی رہنماؤں کے نام بتاتے ہیں، جو وقتاً فوقتاً دنیا میں ظاہر ہوئے، ان کے نام ہیں، رشابھا، اجیتا، سمبھارا، ابھینندانہ، سوماتی، پدما پربھا، سوپرسوا، (سیارس) چندر ابربھ پشپا دندتہ، یاسو بدھی، ستیالہ، سری ینسہ، دسو پوجیا، دیمالہ، اننا، دھرما، سانتی، کنتھو، ارا، ملی، سورتا منی، نم (یا نیمی) نیمی (یا)، ارشتہ نیمی، پرسوا، وردھمنا، ویرا، (یا مہا ویر یا) سرامنہ اعظم، ڈاکٹر اسٹونسن، پرسوا کا زمانہ ۸۷۰ قبل مسیح بتاتا ہے، فارلنگ کہتا ہے، بائیسویں پیشوائے جین، یعنی "نیمی" کے اوپر کسی محقق نے تاریخی تعین کرنے کی جرأت نہیں کی ہے، پھر بھی پہلا اور آخری تینوں پیشوایان مذہب حقیقی افراد تھے، اور آخری دونوں پارسوا اور مہا ویر تو تاریخی شخصیتیں ہیں۔ ان پیشوایان مذہب نے اپنی خاص خاص علامتیں مقرر کرلی تھیں، رشابھا نے سانڈ کی علامت مقرر کی تھی پرسوا نے سانپ کی اور مہاویر نے شیر کی علامتیں اپنے اپنے لئے تجویز کی تھیں،

ان تمام ارباب رشد و ہدایت کا زمانہ چار ہزار برس قبل مسیح سے لیکر پانچ ہزار برس ق م ہے فارلنگ نے اس ضمن میں نہایت افسوس کا اظہار کیا ہے کہ ہندوستان میں خزرا کی طرح کوئی ایسا نہ ہوا، جو ان واقعات کے منتشر عناصر کو تاریخی صورت میں مرتب کرتا، اس لئے مذہبی رسائل جو ان واقعات کا ماخذ ہیں وہ کم و بیش مشکوک ہیں اور ان کا اسلوب بیاں بھی غیر ذمہ دارانہ ہے

پرسوا اور مہا ویر دونوں ممتاز علمی رہنما ہیں انھوں نے غیر ملکو صحف الہامیہ پر نظر ثانی کی، جنھیں پُروا، یا قدیم کہا جاتا ہے اور جو یقیناً تمام شاستر، اپنشد اور شاید وید سے بھی قدیم تھے، "مقدس صحف شرقیہ" کی بائیسویں جلد میں جاکوبی لکھتا ہے، کہ وہ بتدریج ضائع ہوگئے، چونکہ جنگ و فساد کے زمانہ میں حافظے معطل ہو جاتے ہیں اور مبلغین کا جوش تبلیغ بھی افسردہ ہو جاتا ہے اس کے بعد تین سو اٹھ برس قبل مسیح میں مرتب کئے گئے،

مہاویر اور گوتم بدھ کی مماثلت

مہاویر کے زمانہ کے متعلق چنداں متعارض روایات نہیں پائی جاتیں، مغربی علمانے مغربی ہند کے سوتمبرا، فرقہ کی روایت پر اعتبار کرکے بیان کیا ہے کہ مہاویر نے ۵۲۶ ق م میں ۷۱ برس کی عمر میں انتقال کیا، اور اس لئے ظاہر ہے کہ ۵۹۸ ق م میں اُن کی ولادت ہوئی، اس صورت میں گوتم بدھ، مہاویر سے ۳۱ برس چھوٹے تھے، چونکہ ان کی ولادت ۵۵۷ ق م میں ہوئی تھی،

دونوں کو ۲۴ بدھ کہا جاتا ہے، گو بعض روایات سے پتہ چلتا ہے، کہ گوتم کو ۲۵ بدھ کہتے تھے، اس صورت میں گوتم بدھ، مہاویر کے جانشین مقرر ہو جاتے ہیں، حالانکہ یہ گوتم بدھ کے ایک پیرو، اننداکے بیان کے مخالف ہو جاتا ہے۔ چونکہ وہ گوتم کو ۲۴ بدھ سے

مخاطب کرتا ہے، "مقدس صحف مشرقیہ" کیلہ ستر امرتبہ اسٹونسن، اور "ابتدائی اشوک" مصنفہ ٹامسن میں اس کی تفسیر موجود ہے، گوتم نے خود بھی اپنے کو اپنے زمانہ کا ۲۴ بدھ کہا ہے، جین مذہب کے پیرو بھی گوتم بدھ کو مہاویر کا جانشین یا خلیفہ نہیں تصور کرتے، اس صورت میں جاکوبی نے مقدس صحف مشرقیہ میں گوتم بدھ اور مہاویر کو ایک ہی ذات ثابت کرنے کی لاطائل کوشش کی ہے، گوتم بدھ مہاویر کے عقاید و افکار کے سخت مخالف تھے، ان کے نزدیک عریان جسم، عزلت نشین زندگی، اور ترک دنیا جائز نہیں، جن پر مہاویر سختی کے ساتھ عمل پیرا تھے، فارلنگ نے جاکوبی کی رائے پر جو ناقدانہ روشنی ڈالی ہے، وہ کتنی ہی صائب کیوں نہ ہو، لیکن بعض بانیان مذہب کی تاریخی زندگی بھی، مذاہب کے صحف الہامیہ کی طرح دور از کار خیالات، پارینہ اساطیر اور والہانہ جوش عقیدت سے مملو ہے، اس وقت دنیا میں بہ استثنائے نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کسی پیغمبر کے حالات تاریخی اصول اور روایات کے تنقیدی معیار پر صحیح نہیں اتر سکتے، کئی سال ہوئے "انجمن ترقی اردو پٹنہ سٹی" کے اعلان پر میں نے سرور کائنات کی ایک مختصر زندگی لکھی تھی، اس میں یہ بحث ضمناً آگئی تھی جسے یہاں نقل کر دیا جاتا ہے:-

دنیا کے بڑے بڑے مذاہب میں، ہندو، مجوسی، بدھ، جینی، یہودی، مسیحی اور اسلامی مذاہب تاریخی لحاظ سے زیادہ قابل ذکر ہیں، غیر جانبدارانہ نظر ڈالنا ہے، تو مغربی علما کی تصانیف پڑھیے، ہنود میں تو سرے سے وید کے ملہم کا پتہ نہیں اور حق تو یہ ہے کہ وید اپنے ملہم کا مدعی بھی نہیں، مجوسیوں کے پیشوا، زردشت کے متعلق مستشرقین عجیب عجیب باتیں لکھتے ہیں، ایک انگریز مستشرق مولٹن اپنی تصنیف "ابتدائی مذہب زردشت" میں، زردشت کی تاریخ زندگی کے متعلق بھی دو قول بیان کرتا ہے، ایک قول یہ ہے کہ اس کا زمانہ چھ سو برس قبل مسیح ہے، پروفیسر جیکسن لکھتا ہے، کہ زردشت دو ہزار برس قبل مسیح میں گذرا ہے، میکس مولر کے مرتبہ مقدس صحف مشرقیہ کی چوتھی جلد کے مقدمہ میں ڈارمسٹیٹر نے جونس کے وہ مباحث لکھے ہیں جنہیں اُسنے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ژند وستا کا موجودہ نسخہ زردشت کی نہ الہامی کتاب نہیں، (اس کی بحث اسی مضمون میں شرحاً آئندہ اوراق میں ملیلی) اسی طرح جین مذہب کے پیشواؤں کی زندگی بھی تاریکی میں ہے- جینیوں کے روحانی قائدین ۲۴ کی تعداد میں ہیں ان میں تین آخری حضرات کے نام تاریخی روشنی میں ہیں، اور بقیہ سب مذہبی روایات اور قدامت کی عجوبہ پسندی پر مبنی ہیں، ایک جینی یہ ثابت کرنے سے عاجز ہے کہ اس کے دین کا پہلا مبلغ کس زمانہ میں تھا، اور اس کے صحیح حالات زندگی کیا ہیں، فارلنگ لکھتا ہے، بدھ کے قبل بھی ہندوستانی فضا میں روحانی اور مذہبی مبلغین کا ایک سلسلہ تھا جنھیں "بودھا" کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے نہیں کہا جا سکتا، جو باتیں گوتم بدھ کی طرف منسوب کی جاتی ہیں، انھیں واقعتہً گوتم بدھ ہی سے نسبت ہے - یا ان سابقون الاولون، یعنی "بودھا" سے، اس کے برخلاف ارباب حدیث کی نکتہ آرائی، اور ان کے شوق طلب کی وسعت نے روحانیت کے اس قاید اعظم (نبی آخر الزمان صلعم) کی زندگی اس تفصیل سے لکھی کہ دنیا میں نہ تو پہلے کسی انفرادی زندگی پر ایسی مشرح اور مبسوط بحث ہوئی تھی، اور نہ اس کے بعد آج تک ہوئی، اس تقدیس کے مجسمہ اور عظمت و جلال کے

کے پیکر کے واقعات زندگی تاریخی اہمیت کے لحاظ سے نہیں لکھے گئے بلکہ اس کی معمولی معمولی باتیں اس کے چاہنے والوں کی آنکھوں میں ایسی کھب گئی تھیں، کہ ان کی دلفریبیاں اور لذت آفرینیاں ان کی یاد کا جزو لاینفک بن گئیں، اور صدیوں تک زمانہ کے ہزاروں انقلاب، اور روزگار کی بے شمار دست برد کے باوجود لاکھوں انسانوں کے قلوب میں جلوہ فگن رہیں، قلوب سے گزر کر یہ واقعات اب قرطاس کے صفحات پر موجود ہیں، جنھیں ہم "احادیث" سے تعبیر کرتے ہیں حفاظ حدیث کی تاریخ دنیا میں اسلام کا عدیم النظیر اور حیرت انگیز کارنامہ ہے۔

وید اور ویدانت

فارلنگ، بارتھ کی کتاب "مذاہب ہند" کے حوالہ سے لکھتا ہے، کہ ویدوں کی زبان، مضامین اور اوزان (عروضیہ) بتاتے ہیں کہ یہ مختلف زبانوں میں لکھے گئے، اور مختلف دماغوں کی جودت کا نتیجہ ہیں، ہر گو وید کے ہر ایک مضمون کی ابتدا میں ایک رشی یا دیوتا کا نام ہے، جو اس مضمون کا مصنف قیاس کیا جاتا ہے وو وید قدیم زمانہ سے لکھے ہوئے نہ تھے، بلکہ ہزاروں برس سینہ بہ سینہ رہے، کیونکہ مشہور نحوی "پانینی" کے زمانہ تک جو ۴۰۰ء سے ۳۵۰ء تک قبل مسیح گذرا، ہم لوگوں کو ہندوستان طریق کتابت کا قطعی ثبوت نہیں ملتا۔

کانفیوشیس اور لاؤزی

جس وقت ہند میں گوتم بدھ، اور مہاویر کا زمانہ تھا، اس وقت کسی قدر تقدم اور تاخر کیساتھ چین میں لاؤزی اور کانفیوشیس اپنے روحانی عقاید اور مذہبی فکر و احساس کی تبلیغ کر رہے تھے، لاؤزی کی الہامی کتاب "طاؤ" کے متعلق چوانگز، اور نسیس کے زمانہ تک کوئی خبر نہیں، گویہ کتاب لکھی ہوئی تھی، لیکن اس کا نشر و ابلاغ لاؤزی کی وفات کے بعد ہوا۔ یعنی اس کتاب کے زمانہ وجود کے تین سو برس کے بعد عوام میں اس کا رواج ہوا، یہی واقعہ بدھ مذہب کی کتاب "ترپیتکا" کے ساتھ بھی ہوا، یہ کتاب بھی بدھا کی وفات کے دو سو برس کے بعد عوام میں رائج ہوئی۔

کانفیوشس ۵۵۱ء قبل مسیح میں پیدا ہوا، اور ۷۳ برس کی عمر میں وفات پائی، فارلنگ نے اس کی کسی الہامی کتاب کا تذکرہ نہیں کیا ہے۔ لیکن اس کے واقعات زندگی کے مطالعہ سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اس کی تعلیم الہامی نہ تھی بلکہ فکری جودت، اور سیاسی نکتہ رسی کی پیداوار تھی، کیونکہ حکومت چین کی طرف سے وہ افسر اعلیٰ (مجسٹریٹ) کی حیثیت سے عرصہ تک اپنے فرائض انجام دیتا رہا، ۴۸۳ء قبل مسیح میں اس کا ایک شاگرد مر گیا تو اس نے تبلیغ اور اصلاح کا کام بھی ترک کر دیا اور مدتوں عزلت نشینی اختیار کی، یہی حالت اس وقت بھی ہوئی جب اس کے بیٹے نے انتقال کیا، اسلئے کہا جا سکتا ہے کہ وہ نوامیس ملکوتیہ کا حامل نہ تھا، بلکہ ماہر سیاست اور مدبر مملکت کی حیثیت سے اسے عوام کی اخلاقی اصلاح کا خیال پیدا ہوا جسے الہام تعبیر نہیں کر سکتے

زند وستا کی تدوین اور اسکے تاریخی حالات

کتب سماوی کے تاریخی حالات کا مطالعہ کرنے میں ژند وستا، بنی اسرائیل کے صحف مذہبی اور قرآن مجید کے جمع و ترتیب کے حالات چونکہ زیادہ دلچسپ معلوم ہوئے اس لئے انہیں کسی قدر تفصیل سے لکھا جاتا ہے۔

فارلنگ لکھتا ہے کہ اب میں بتانا چاہتا ہوں کہ ژند وستا اعلیٰ تعلیم سے کتنا ہی مالا مال کیوں نہ ہو لیکن کیا تاریخی حیثیت سے

اس کا موجودہ نسخہ قابل اعتبار بھی ہے یا نہیں؟ دستا کے ماننے والے تو مدعی ہیں، کہ باوجودیکہ زمانہ کے انقلاب نے ژندودستا پر آتش باری کی، اسیر غارتگری اور سرقہ کا بھی دسترس ہوا، لیکن پھر بھی اصلی نسخہ زمانہ کے دست برد سے محفوظ رہا، یہاں تک کہ اسکندر اعظم کے حملہ آوروں نے بھی فخریہ کہا ہے، کہ انھوں نے جب فارس پر چڑھائی کی، تو اپنے ساتھ علما کی ایک منتخب جماعت رکھ لی تھی، جن کا کام تھا کہ وہ اس قسم کی مکتوبات جمع کریں اور ضائع ہونے سے بچالیں، چونکہ یہ اقوام کا مشترکہ خزانہ ہے یہ جماعت ایک کامل نسخہ کی دستیابی میں کامیاب ہوئی" (فارلنگ کے قول کے مطابق یہ نسخہ پہلوی زبان کی مکتوبات سے مرتب ہوا تھا، حالانکہ ژند وستا کی اصلی زبان پہلوی نہ تھی بلکہ ژنجین تھی) اس سے ارمنی اور یونانی زبانوں میں چند نسخے مرتب کئے گئے، پیروان زردشت کا دعویٰ ہے کہ ان کی کتاب کبھی بالکل ضایع نہیں ہوئی، یہانتک کہ ۳۳۰ء قبل مسیح میں جب اسکندر اعظم نے فارس کے پایۂ تخت کو غارت کر دیا، جب بھی دستا محفوظ رہا، جس طرح یہودیوں کا دعویٰ ہے کہ ان کے صحیفے اہل بابل کے حملوں میں غارتگری سے محفوظ رہے، ان کا دعویٰ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عزرا کی وساطت سے صحف بنی اسرائیل کو نشاۃ جدیدہ عطا کی،

تمام روایات کا اتفاق ہے کہ ژندوستا کا اصلی نسخہ سترہوین صدی قبل مسیح میں خود زردشت نے گشتاسپ کے دربار میں پڑھا اور یہ ایران کا پہلا شہنشاہ تھا جسنے مجوسی مذہب اختیار کیا اور اس لئے اپنے پیغمبر کی طرح مشکلات کا سامنا کرنا پڑا گشتاسپ نے اصل نسخہ سے متعدد نقلین مرتب کرائیں، اور خزانۂ شایگاں میں بھیجدین اور حکم دیا کہ نقل کتابت ہوتی رہے، اور عوام میں تقسیم ہوا کرے۔ ایک مشہور نسخہ قلعہ کے اندر "مکتوبات نادرہ" کے ساتھ محفوظ کر لیا گیا، مجوسی روایات سے پتہ چلتا ہے، کہ یہی نسخہ جلایا گیا تھا، خزانہ شایگان کا ابتدائی نسخہ جو پہلوی زبان میں تھا، یونانی حملہ آوروں کے ہاتھ لگ گیا، اور انھوں نے یونانی زبان میں اس کا ترجمہ کیا، ڈارمسٹیٹر لکھتا ہے کہ حکومت یونانی کے زمانہ میں فلسفیانہ "نسک" کے تو سو پانچ ابواب میں سے صرف ایک سو اسی غائب ہوئے۔

اسکندر اعظم کا زمانہ ۳۳۰ء ق م اور ژندوستا کی بربادی	"نسک" کے ۲۱ ضخیم جلدوں میں سے بہتری جلدین اسکندر اعظم کے ہنگامہ قتل وغارت میں ضائع ہو گئیں لیکن مذہبی پیشواؤں نے بڑی تیزی اور انہاک سے جمع وترتیب کا کام شروع کر دیا اور اُنھوں نے ایک حد تک اس تضیع کی تلافی بھی کی، اور انھوں نے حفاظ ژندودستا سے سن سنکر ذخیرہ جمع کر لیا

ان لوگوں کو قدیم برہمنوں کی طرح ژندودستا زبانی یاد تھا، اس وقت ژندوستا کے پندرہ "نسک" جمع ہو گئے۔ انہیں سب سے اہم وندیدات کا پہلوی نسخہ تھا، جو ہمیشہ مکمل رہا اور ضائع ہونے سے بچ گیا، اسی کو ڈارمسٹیٹر اور دسٹ نے انگریزی میں ترجمہ کیا، ساتھ ہی تاریخ سے یہ بھی ثابت ہے کہ یونانیوں نے ژندودستا کا مکمل ابتدائی نسخہ پالینے کا دعویٰ کیا، اور یہ ۲۱ نسک تھے جنھیں یونانیوں نے اپنی زبان میں ترجمہ کر ڈالا،

اقتدار سلیوقس ۳۱۲ء ق م	دستا کی زندگی کا یہ نہایت اہم دور تھا، چونکہ بلاشبہ یہ یونانی سلطنت دستا کا وہ مسروقہ اصلی نسخہ رکھتی تھی، روایت کیا جاتا ہے کہ اس خاندان کے فرمانرواؤں نے بڑی مستعدی سے مکتوبات

کے جمع کرنے کا حکم دیا، اور انھیں مغربی زبانوں میں ترجمہ کرایا۔

اقتدار دولت پارتھی اس خاندان کے فرمانروا بھی پرجوش پیروان زردشت تھے، اور انھوں نے اپنے ممالک محروسہ اور اس سے باہر تمام مقامات سے اپنی الہامی کتاب جمع کرنی شروع کی، لیکن انھوں نے اسے اپنے پارتھی زبان میں ترجمہ کرایا۔

خاندان بطالسہ سنہ ۲۵۰ سے سنہ ۲۲۰ ق م تمام عالم میں مذہبی صحیفوں کے جمع و ترتیب کا زمانہ تھا، چنانچہ اسوک اعظم "جسے قسطنطین مذہب بدھ" کہا جاتا تھا۔ بدھ مذہب کے صحیفے جمع کر رہا تھا، اور خاندان بطالسہ کا ایک فرمانروا، بیلیانل بطلیموسی سکران مصر، ایشیا کی تمام ادبیات جمع کر رہا تھا اور انھیں ترجمہ کرا رہا تھا۔

خاندان ارسکی اور ساسانی خاندان (سنہ ۲۴۰ء تا سنہ ۲۵۰ء) سنہ ۶ء میں خاندان ارسکی کے ایک فرمانروا "والخش" نے وستا کے مکتوبات پھر جمع کرنا شروع کئے، سنہ ۲۴۰ء سے سنہ ۲۵۰ء تک ساسانی خاندان کے بانی آردشیر بابگاں نے مجوسیت کی ترویج اور استحکام میں نہایت سعی کی، اس نے تانسر نامی ایک مذہبی عالم کو اس کام کے لئے مستعد کیا۔ اس بادشاہ کے عہد میں وستا کی ضخیم جلدوں سے ایک سرکاری خلاصہ مرتب کیا گیا شاپور ثانی کے عہد میں وستا کے احکامات کا ایک جدید خلاصہ ترتیب دیا گیا، اور اعلان کیا گیا کہ مجوسی صحف الہامیہ کے اصلی نسخوں کے تراجم موجود ہیں، نوشیرواں عادل کے زمانہ سنہ ۵۳۱ء سنہ ۵۷۹ء تک یہی خیال متداول رہا۔

زندوستا کا سب سے پہلا یورپی ترجمہ اور علمائے مغرب کے مناظرے سنہ ۱۷۵۴ء میں پیرس کے "مجمع السنہ مشرقیہ" کے ایک نوجوان رکن، انکوٹل نامی نے جس کی عمر اس وقت بیس برس کی تھی، اکسفورڈ کے "وندیدات" کے چار اوراق کا [illegible] دیکھا، اس نے ارادہ کیا کہ وہ بھی فرانس کے لئے زردشت کی الہامی کتابیں بہم پہونچائے، اور ن کا سب سے پہلا مغربی ترجمہ شائع کرے حکومت نے بھی اس کی مدد کا وعدہ کیا، لیکن وہ نہایت بیقرار تھا، آخر کار اس نے فرنچ ایسٹ انڈیا بینی میں ایک پرائیوٹ سپاہی کی حیثیت سے اپنا نام درج کرا لیا، اور سنہ ۱۷۵۵ء میں ۲۲ فروری کو "لورینٹ" سے روانہ ہوا، تین برس کی معوبت بلاکشی کے بعد خطرات سے بچتے ہوئے (چونکہ اسوقت فرانسیسیوں اور انگریزوں میں لڑائی ہو رہی تھی) وہ سورت میں آیا ہاں تین برس تک پارسیوں کے ساتھ مقیم رہا۔ فریزر کی طرح اسے بھی بے اعتمادی اور ناخوشگواری کا سخت مقابلہ کرنا پڑا، جس سے ریزر برداشتہ خاطر ہو گیا تھا۔ لیکن اینکوٹل کو اس میں کامیابی ہو گئی۔ اور آخر کار پارسیوں نے اپنے کتاب بھی دی اور اپنا نی علم بھی سکھایا، ۱۴ مارچ سنہ ۱۷۶۴ء میں وہ پیرس واپس آیا، اور اس نے اسی دن شاہی کتب خانہ میں ژندوستا کامل، اور سری مذہبی کتابیں (متعلقہ اخبار و احادیث) داخل کیں، اس نے دس سال تک اس مجموعہ مواد کا مطالعہ کیا، اور سنہ ۱۷۷۱ء میں ندوستا کا مغربی زبان میں سب سے پہلا ترجمہ شائع کیا، اس اشاعت کے ساتھ ایک پرشور بحث وجدل شروع ہوا، چونکہ علمی دنیا کا سف حصہ وستا کی صحت کا منکر تھا، اور اسے وہ جعلی تصور کرتا تھا، ان شورش پسند مجادلوں میں ولیم جونس تھا جو آگے چل کر

"رائل ایشیاٹک سوسائٹی" کا بانی ہوا، وہ آئینکوٹل کے محقرانہ لہجہ سے متاثر ہوا تھا جو اس نے ہائیڈ اور دوسرے انگریز علما کے متعلق اختیار کیا تھا، اس نے فرنچ میں ایک رسالہ شائع کیا، اور اس میں دکھایا، کہ جس کتاب میں ایسی سفیہانہ حکایتیں ایسے احمقانہ قوانین، وضوابط، اور جس میں دیوتاؤں اور شیاطین کے ایسے دوراز کار مباحث ہوں وہ زردشت کی الہامی کتاب متصور نہیں ہوسکتی اور نہ وہ اس مذہب کا آئین عمل ہوسکتی ہے، جو اپنی سادگی، عقل، اور صفائی کے لحاظ سے ایسا معروف تھا، اسنے نتیجہ نکالا کہ وستا کا یہ نسخہ کسی جدید تخیل کا نتیجہ ہے، جونس کی آواز پر انگلستان میں جارڈین اور رچارڈسن کی ہمنوائیوں نے صدائے بازگشت کا کام کیا، جرمنی میں بھی ایک شخص "بینیرس" نے جونس کے نظریہ کی تائید کی رچارڈسن نے علم السنہ کے اصول پر دکھایا کہ وستا عصر جدید کی ذہنی پیداوار ہے، اُسنے دکھایا کہ عربی الفاظ کی ایک خاصی تعداد ژند اور پہلوی زبانوں میں پائی جاتی ہے، اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ چونکہ فارسی زبان کے محاوروں میں عربی عناصر کا داخلہ ساتویں صدی کے قبل نہ تھا، اور پھر لغت و قواید کے اعتبار سے ژند اور فارسی کے بنیادی امتیازات دکھائے، جرمنی کے بنیرس نے یہ بحث پیدا کی، کہ وستا کے موجودہ نسخوں میں ایسے بے شمار اشجار، حیوانات اور انس وجن کے اسماء پائے جاتے ہیں جو قدیم اہل فارس کو معلوم نہ تھے۔ اور پھر ان حیوانات اور اشیاء کے نام گنائے جو وستا میں موجود ہیں اور دکھایا کہ پہلے اہل فارس کو یہ معلوم نہ تھے، کیونکہ کسی قدیم عالم تحریر میں ان کا پتہ نہیں ملتا یا کم از کم اہل فارس ان کی پرستش نہ کرتے تھے۔

کلیوکر نامی ریگا یونیورسٹی کے ایک پروفیسر نے، اینکوٹل کے نظریہ اور وستا کے فرنچ ترجمہ کی تائید کی، اسنے فرنچ ترجمہ سے وستا کا ایک جرمنی ترجمہ مرتب کیا، اور اینکوٹل کے تاریخی مباحث کا بھی ترجمہ کیا، اس کے بعد اپنے سلسلہ مباحث میں اسنے دکھایا کہ ژند وستا کا یہ صحیح نسخہ ہے، اس کے بعد علم السنہ کے اصول پر دکھایا کہ وستا میں عربی لغت کے عناصر موجود نہیں، صرف یہی نہیں بلکہ اسمیں صرف سامی لغت کے ارمنی زبان کے عناصر پائے جاتے ہیں، جس کی وجہ یہ ہے کہ ساسانیوں کے زمانہ میں ارمنی خطہ سے مملکت فارس کا نزدیکی تعلق ہوگیا تھا۔ اس کے بعد اس نے دکھایا کہ عربی لغت صرف ان کتابوں میں پائے جاتے ہیں، جنکے متعلق پارسی روایات خود دال ہیں کہ یہ جدید ہیں۔

ایک اور مغربی عالم نے ویدکو ژند وستا کا ماخذ قرار دیا ہے، ایک نے اس کی تردید کی ہے، اور کہتا ہے کہ اس میں پراکرت اور بابلی لغات پائے جاتے ہیں، (تفصیل کے لئے مقدس صحف مشرقیہ جلد چہارم دیکھئے)

بنی اسرائیل کے الہامی صحیفے اور ان کی تنقیح و تدوین۔

فارنگ لکھتا ہے، بطلیانوس فلیڈیلفس، حکمران مصر کو بنی اسرائیل کے الہامی صحیفے مل گئے جنھیں اُسنے یونانی میں ترجمہ کرایا اور یہی مسیحیوں کا قدیم بائبل ہے، بطلیموس کے اس نسخہ کے سوا، بائبل کے تمام اصلی نسخے گم ہوگئے، جو نیم دباغت شدہ کھال کے ٹکڑوں پر لکھے ہوئے تھے۔ دور وسطی میں اسی یونانی نسخہ سے علمائے یورپ نے دوسری زبانوں میں ترجمہ کیا، اصلی نسخہ ۴۷ھ ق م میں بطلیموس کے کتب خانہ کے جلتے وقت جو "برکشیم" میں تھا، ہمیشہ کے لئے ناپید ہوگیا۔ اور کوئی نطق خداوندی نہیں رہا، جو

تیسری صدی سے پہلی صدی قبل مسیح تک موجود تھا اور جن سے یہ ترجمہ مرتب کیا گیا، یہ امر صرف علما کو معلوم ہے، اور علما بھی اسکے اعلان سے احتراز کرتے ہیں، با دریوں کا کیا کہنا؛

ڈرامنڈ "یہودی فلسفہ اسکندریہ" جلد اول میں لکھتا ہے، اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ (توریت وغیرہ) اسکندریہ کی ذہنی پیداوار ہے شاید ہم لوگ صحیح معنی میں اسے سلسلہ تصنیفات کہہ سکتے ہیں چونکہ یہ مختلف ہاتھوں کی وساطت سے ہم لوگوں تک آیا ہے اور مختلف زبانوں میں اس کے ترتیب وار حصونکا ترجمہ ہوا توریت وغیرہ کا یونانی نسخہ، جیسا کہ اچھی طرح معلوم ہے، عبرانی نسخہ کی حقیقی نیابت نہیں کرتا، چند مقامات میں اس قسم کی تحریفیں ہوئی ہیں، کہ جنھیں صرف یہی کہا جا سکتا ہے، کہ مترجمین نے عمداً قدیم الہامی صحیفوں کو موجودہ فلسفہ یونان کے مطابق بنانے کی کوشش کی ہے، اور [illegible] نے ان تمام محرفہ مقامات اور فلسفیانہ تاویلات کو ثابت کیا ہے کہ یہ محض علمائے اسکندریہ کی ذہنی اور فکری جودت کا نتیجہ ہیں، اس کے بعد (Lanne [illegible]) نے ان محرفہ مقامات کی مثالیں پیش کی ہیں، ڈرامنڈ [illegible] اور Zeller کے استدلالی نظریات اور استنباط نتائج کے بعد لکھتا ہے، کہ واقعہ یوں ہے کہ ترجمہ میں یونانی فلسفہ کے نظریات کا لحاظ نہیں رکھا گیا ہے، بلکہ اس دور میں یہودیونکا ذہنی رجحان ہی تھا، کہ وہ کتب سماوی کو نئی روشنی کے مطابق بنانے کی سعی کرتے تھے، چونکہ مترجمین اس زمانہ میں تھے، جبکہ فلسفہ یونان کا رواج تھا، اس لئے توریت وغیرہ کے اس ترجمہ میں ہم لوگ یونان کے فلسفیانہ تخیلات اور مصطلحات کی صدائے باز گشت سنتے ہیں، ساتھ ہی ہم لوگ یہ بھی مطالعہ کرتے ہیں کہ اس وقت الوہیت کے متعلق ایک ملبند تر ماورالطبعی تخیل، متداول تھا خصائص ترجمہ پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے، یا تو اتفاقی یا ارادی طور پر چند مسائل ایسے شامل ہو گئے ہیں جنھیں ہم لوگ فیلو کے نظریات میں پاتے ہیں؛

جیمس ہیسٹنگس اپنی کتاب "ڈکشنری آف دی بائبل" میں رقمطراز ہے کہ بنی اسرائیل کی قدیم الہامی کتابوں کا بڑا حصہ عبرانی زبان میں تھا، عبرانی کنعانی زبان کا ایک مکالمہ ہے اور بہت اتصالی طریقہ سے سریانی (Aramaic) سے ملتا جلتا ہے او لڈ ٹیسٹمنٹ کے بعض حصے سریانی زبان میں بھی تھے، جو شام کی زبان تھی، اور ایک وسیع طریقہ پر بابل، مصر اور عرب میں مروج تھی، بنی اسرائیل کی جلاوطنی کے بعد عبرانی زبان سے ایک اعزازانہ غفلت برتی گئی، اور وہ ادبیات اور قوانین کے لئے مخصوص رہی اور روزانہ زندگی میں سریانی نے رواج پکڑا، غالباً انجیل کی ابتدائی تحریریں اسی زبان میں تھیں، جب پیپی کہتا ہے کہ "متھو" نے حضرت مسیح کے ملفات کو عبرانی میں لکھا تو اس سے اس کا مطلب سریانی زبان ہے، چونکہ حضرت مسیح سریانی زبان میں تعلیم و تلقین کرتے تھے، یہ معقول نہیں معلوم ہوتا کہ ان کی تعلیم کو قدیم زبان (عبرانی) میں ترجمہ کیا جاتا تھا اغلب یہی ہے کہ یہ تحریریں سریانی زبان میں تھیں، اسی طرح یہ بھی شبہہ کیا جاتا ہے، جیسا کہ یہودیوں کا خیال ہے کہ MARTHEW بھی سریانی زبان میں تھا، انجیل کا کامل حصہ یونانی زبان میں ترجمہ ہوا، اسکا اعتراف کئے بغیر چارہ نہیں، کہ انجیل کے لب و لہجہ میں (یہودی یا عبرانی) اثر پایا جاتا ہے، یہ اثر متھو (Mathew) اور لوقا کے ابتدائی حصوں اور [illegible] (APOCALYPSE)

میں نمایاں ہے، لوقا کا دیباچہ قدیم یونانی زبان سے بہت نزدیک پایا جاتا ہے" اولاً ٹسٹیمنٹ کا بطلیموس ثانی کے زمانہ ۲۸۵ء ۲۴۷ء ق م میں ترجمہ ہوا، ۱۵۰ء ق م میں اکوٹیلا نامی نے یونانی زبان میں دوسرا لفظ بہ لفظ ترجمہ کیا، تیسری مرتبہ (عبرانی زبان سے) سیمیقوس (Symmachus) نے دوسری صدی بعد مسیح میں ترجمہ کیا، اور اس مرتبہ یہ لحاظ رکھا گیا کہ یہ یونانی زبان کے عام محاورہ اور مکالمہ میں ہو، اس لئے یہ بجائے ترجمہ ہونے کے بعض مقامات میں اصل عبارت کا خلاصہ ہو کر رہ گیا، انجیل کا سب سے پہلا ترجمہ دوسری صدی میں شامی اور لاطینی زبانوں میں ہوا، سابق الذکر کے متعلق یہ نہیں بتایا جا سکتا کہ یہ ابتدائی نسخہ ہے، پہلا ترجمہ (Peshitta) یا "سلیس ترجمہ" ہے اور شام کے عیسائی مذہب کا یہی معتبر اور مستند نسخہ تھا، ۳۸۲ء میں دمشق کے بشپ نے، شمالی افریقہ میں نسخوں کی گڑبڑی کے باعث ایک لاطینی نسخہ کی ترتیب کا حکم دیا، جو ایک ہزار برس تک کیتھلک چرچ کا معتبر اور صحیح نسخہ تھا، چوتھی صدی مسیحی میں قبطی زبان کے تین قسم کے مکالمات میں انجیل کا ترجمہ ہوا، معتنگس کے خیال میں مختلف ہاتھوں کی وساطت سے توریت اور انجیل کی تدوین ہوئی، ان میں لوقا کے سوا، تمام کتابوں کے مصنف یہودی تھے۔

مصحف مجید کے جمع و ترتیب پر فالنگ کی تنقید

"مختصر معلومات مذہبیات" میں فالنگ لکھتا ہے، کہ ۶۱۱ء سے قرآن مجید نازل ہونا شروع ہوا، ۶۳۲ء تک زبانی تھا، چونکہ آنحضرت کی وفات تک قرآن مجید کے جمع و ترتیب کا کام انجام نہیں دیا گیا تھا، اس لئے یہودیوں اور مسیحیوں کو کافی موقع تھا (جیسا کہ شبہ کیا جاتا ہے) کہ وہ قرآن مجید میں اپنے مذہب و فرقہ کے مطابق تخلیط کر دیں، حضرت ابوبکر نے زید بن حارثہ کو قرآن مجید کے جمع و ترتیب کا کام سپرد کیا تھا، آنحضرت ہی کے زمانہ میں حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکر صدیق رضؓ سے درخواست کی تھی، کہ قرآن مجید جمع کیا جائے زید بن حارثہ نے نزدیک اور دور کے تمام آدمیوں سے قرآن مجید جا کر سنے، اور حفاظ کا موازنہ کرنے کی بجائے (کہا جاتا ہے) صرف ایک آدمی سے ۷ سورتیں زبانی سنکر قرآن مجید میں داخل کر لیں، انھوں نے قرآن مجید کو کھجور کی پتیوں، چمڑہ کے ٹکڑوں ہڈی پتھر اور قلوب انسان میں لکھا ہوا پایا۔ اس آخری کتاب الٰہی کی تدوین بھی دوسرے کتب سماوی کی طرح مشکوک ہے اور کہا جاتا ہے کہ اصلی نسخہ نہیں، ۶۱۱ء سے ۶۵۰ء تک قرآن مجید کا مشکوک تاریخی زمانہ ہے، حضرت ابوبکرؓ کا مرتب کیا ہوا قرآن مجید عرب، شام، اور فارس میں شائع کیا گیا، سر ولیم میور کا خیال ہے کہ اس اشاعت کے بعد بہت سی مکتوبات ملی ہونگی، اس لئے دوبارہ جمع و ترتیب کا کام شروع ہوا، یہودیوں، نصرانیوں، اور صابیوں نے قرآن مجید میں اضافے کر دئے، جمع و ترتیب کے سردار قریشی تھے، ان کا خیال تھا کہ ان کی زبان کا رواج ہو جو آنحضرت کی زبان تھی، شبہ ہے کہ حضرت عثمانؓ نے قرآن مجید کا کچھ حصہ زیادہ پایا، جو زید کی ترتیب اول کے وقت نہ ملا تھا، یہ طے شدہ امر ہے کہ ۶۱۵ء سے خود آنحضرت صلعم پر یہودیوں اور نصرانیوں کا اثر پڑا، سر ولیم میور کے الکندی کا یہ قول لکھتا ہے، کہ قرآن مجید کی بعض آیتیں جو یہودیت اور نصرانیت کی حمایت میں ہیں وہ اس سبب سے ہیں کہ آنحضرت صلعم کو ایک نسطوری عیسائی "سرجلس" اور دو یہودیوں سے جو

منافقانہ اسلام لائے تھے، دوستی تھی آنحضرت صلعم کی وفات کے بعد وہ حضرت علیؓ کے بھی دوست رہے، انھیں کافی وقت اور موقعہ ملا، کہ قرآن مجید میں تخلیط کردیں، اور اسی نسخہ کو زید نے ترتیب دیا تھا"

یورپ کے شکوک کا جواب اور فارلنگ کی تنقید پر محاکمہ،

یہ اعتراضات صرف فارلنگ کے فشار دماغ کا نتیجہ نہیں، بلکہ عصبیت کا یہ عنصر علمائے یورپ کی اکثر تصنیفات میں پایا جاتا ہے، ان کی کوششیں ہمیشہ اس طرف مبذول رہیں، کہ مذہبیات کے اس آخری رونق کو بھی مذاہب عالم کے محرف الہامات، اور مخلوط اجزائے وحی کی طرح سند داعتبار کی سطح سے فروتر ثابت کردیں لیکن یہ حکمت عملی اور یہ سیاسی دنائت حقیقت شناس دماغوں اور نکتہ رس نگاہوں کی حد امتیاز سے محجوب نہیں ہوسکتی، علمائے مغرب کا طوفان تحقیق اور ان کے ذوق طلب کی تشنہ کامیاں، آج علمی دنیا سے مزید تعارف کی محتاج نہیں، لیکن ساتھ ہی یہ ستم ظریفی بھی نظر انداز نہیں کی جاسکتی، کہ عصبیت کے ذاموش کارانہ سیہ شوریوں اور سیاست مدن کی والہانہ محویتوں میں وہ بعض اوقات اس کی پروا نہیں کرتے کہ جب دنیائے تحقیق واستقرا میں اُن کے نظریات کا مطالعہ کیا جادیگا تو کیا صوبہ بہار کا ایک گوشہ نشین" انسان ان کے شغف علمی کے اس نادرانہ طریق تعبیر پر حافظ کا یہ شعر نہیں پڑھیگا ؎

صلاح کار کجا و من خراب کجا   ببین تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

فارلنگ کی تنقیدی تحریر کا جواب حسب ذیل ہے

کیا انھیں خبر نہیں کہ قرآن مجید کی حفاظت کا مسئلہ اس کے زمانہ نزول ہی سے اس کے ملہم کے پیش نظر تھا، میں سمجھتا ہوں میکڈنلڈ گولڈزیہر اور ولیم میور، کی طرح فارلنگ عربی زبان سے واقف نہیں، لیکن یہ کیا غضب ہے کہ انسان کسی مسئلہ پر مخالفانہ پہلو سے تو نظر ڈالے لیکن پھر منصفانہ یا غیر جانبدارانہ نگاہ سے دریغ کرے، اس سے بڑھکر ایک محقق کے لئے اور کوئی عیب نہیں ہوسکتا فارلنگ کو چاہئے تھا کہ صرف ولیم میور جیسے معاند اسلام کی تحقیقات پر اعتماد نہ کرلیتے، بلکہ میکڈنلڈ، گلام، اور لوٹری وغیرہ کی ان تصنیفات کا مطالعہ بھی کرتے، جو انھوں نے اسلام کی مذہبی تاریخ اسلامی فقہ و تاریخ اور معارف قرآن کے سلسلہ میں انگریزی اور یورپ کی دوسری زبانوں میں پیش کی ہیں۔

قرآن مجید کے اسلوب بیان سے ایک محقق خود بخود یہ نتیجہ نکال سکتا ہے، کہ اس کی حفاظت اور اس پر عمل کرنے کا ذوق اسکے نزول کی ساعت افتتاحیہ سے متلازم رہا ملاحظہ ہو، قرآن مجید کے اندر سورۃ قیامہ میں ہے:-

"لا تحرک بہ لسانک لتعجل بہ ط ان علینا جمعہ وقرانہ ۵ فاذا قرانہ فاتبع قرانہ ثم ان علینا بیانہ"

امام بخاری (فضائل القرآن کے اندر) اس کی تفسیر میں حضرت ابن عباسؓ کی مفصلہ ذیل روایت نقل کرتے ہیں،

"کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا نزل جبریل بالوحی وکان مما یحرک بہ لسانہ وشفتیہ فتیشتد علیہ وکان یعرف منہ فانزل الآیۃ التی فی لا اقسم بیوم القیامۃ لا تحرک بہ لسانک لتعجل بہ الی اخران علینا بیانہ قال ان علینا ان نبینہ بلسانک قال وکان

اتاہ جبریل اطرق فاذا ذھب قرأہ کما وعدہ اللہ -

(ترجمہ) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی اترتے وقت بہت سختی ہوتی، جب جبرئیلؑ وحی لاتے تو آپ زبان اور ہونٹ ہلاتے رہتے، یہ سختی دیکھنے میں لوگوں کو معلوم ہو جاتی، اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری جو سورہ لا اقسم بیوم القیامہ میں ہے لاتحرک بہ لسانک لتعجل بہ تا ان علینا بیانہ تک یعنی تیرے دل میں جما دینا اور پڑھا دینا ہمارا کام ہے، جب ہم اس کو پڑھ چکیں اس وقت ہمنے پڑھا تو بھی پڑھ، یعنی وحی اترتے وقت سنتا رہ، پھر اس کا بیان کر دینا ہمارا ذمہ ہے، یعنی تیری زبان میں اس کا سمجھا دینا، ابن عباس نے کہا ان آیتوں کے اترنے کے بعد جب حضرت جبرئیل آپ کے پاس وحی لیکر تشریف لاتے، تو آپ سر جھکا لیتے، جب جبرئیل چلے جاتے، تو اللہ نے جیسا وعدہ کیا تھا، (تیرے دل میں جما دینا اس کا پڑھا دینا میرا کام ہے) آپ اسی موافق پڑھ دیتے -

حفاظت قرآن مجید کے متعلق جس شخص کے فکر و احساس کی یہ حالت ہو (کہ نزول کے وقت ہی سختی اٹھا کر اُسے دہراتے جاتے) کیا اس سے اندازہ نہیں لگایا جا سکتا کہ قرآن مجید کی صحت اور حفاظت کے لئے اُس نے کونسی تدبیر اٹھا رکھی ہوگی، اسلامی تاریخ تو حفاظت قرآن کے ان مباحث سے پُر ہے، صرف قرآن کے بیان کردہ واقعات کو لے لیا جائے، تو بھی علمائے مغرب کے رفع شکوک کا کافی سامان موجود ہے، لیکن تعصب اور عناد کا دفعیہ ناممکن ہے ولن ترضی عنک الیھود والنصاری حتی تتبع ملتھم

علمائے مغرب کا یہ محض افترا ہے کہ ۶۱۰ء سے ۶۳۲ء تک قرآن مجید بالکل زبانی تھا، بلکہ جسوقت وحی اترتی تھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے کاتبوں کو بلا کر لکھا دیتے، خلفائے اربعہ اور زید ابن ثابت وغیرہ وحی کی کتابت کرتے تھے، اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بڑی احتیاط سے زبانی بھی یاد کراتے تھے۔ فارلنگ نے بھی اقرار کیا ہے، کہ زید نے چمڑے اور ہڈی کے ٹکڑوں، کھجور کی پتیوں اور صدور انسانی سے نقل کر کے قرآن مجید کی ترتیب دی، یہ گویا امام بخاری کے الفاظ میں زید ابن ثابت رضؓ کے بیان کا ترجمہ ہے،

فتتبعت القرآن اجمعہ من العسب واللخاف وصدور الرجال

میں نے قرآن کی تلاش شروع کی اور اسے کھجور کی چھڑیوں، باریک سپتلے پتھروں پر لکھا پایا، اور کچھ لوگوں کو زبانی یاد تھا؛

فارلنگ نے یہ تاریخی غلطی کی ہے کہ انھوں نے زید ابن ثابت رضؓ کی بجائے زید ابن حارثہ کو جامع قرآن تصور کیا، قرآن مجید کے جمع و ترتیب کے متعلق عہد رسالت میں کوئی بحث نہیں ہوئی تھی، بلکہ جنگ یمامہ کے بعد جس میں مسیلمہ کذاب مارا گیا اور بہت سے حفاظ قرآن شہید ہوئے، حضرت عمر رضؓ کو جمع و ترتیب قرآن کا خیال پیدا ہوا، بخاری شریف میں یہ مطول حدیث مذکور ہے، حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نے جمع و ترتیب کے متعلق پہلے تو پس و پیش کیا، لیکن بعد میں حضرت عمر رضؓ کی رائے صائب سے اتفاق کر کے زید ابن ثابت رضؓ کو اس اہم کام کے لئے حکم دیا، آنحضرت صلعم کو ۶۰۹ء میں نبوت ملی، اس کے بعد آپ دس سال مکہ میں رہے اور تیرہ سال مدینہ میں، ۶۳۲ء میں آپ نے انتقال فرمایا، جنگ یمامہ حضرت ابوبکر رضؓ کے زمانہ خلافت میں ہوئی حضرت ابوبکر رضؓ کی سالہ

وفات ۳۴ھ کو اگر انجام ترتیب کا نقطہ تصور کریں تو ایک محقق کے سامنے صرف یہی مسئلہ رہ جاتا ہے کہ آیا پچیس سال کے اندر قرآن مجید کے متعلق (نعوذ باللہ) خلط و تحریف، تغییر و تضییع کے شکوک کہاں تک صحیح ہو سکتے ہیں؟-

اوراق احادیث اور تاریخ حفاظ سے پتہ چلتا ہے، کہ آنحضرت صلعم کے زمانہ ہی میں قرآن مجید کے کثیر حفاظ موجود تھے، جنھیں صرف یہی نہیں کہ کامل قرآن مجید زبانی یاد تھا، بلکہ وہ اس کے نزول کے مواقع، اسباب، اور مقامات سے بھی واقف تھے، اس کے معانی و مطالب پر اُنھیں تبحر وافی، اور عبور کامل تھا، کیونکہ حامل وحی (صلعم) کی زبانی سن چکے تھے امام بخاریؒ حضرت عبداللہ ابن مسعود رضؓ کی مفصلہ ذیل روایت نقل کرتے ہیں۔

واللہ الذی لا الہ غیرہ ما انزلت سورۃ من کتاب اللہ الا انا اعلم این انزلت ولا انزلت آیۃ من کتاب اللہ الا انا اعلم فیم انزلت ولو اعلم احدا اعلم منی بکتاب اللہ تبلغہ الابل لرکبت الیہ

(ترجمہ) قسم پروردگار کی جس کے سوا کوئی سچا معبود نہیں، قرآن کی کوئی سورت ایسی نہیں اتری جس کے متعلق میں یہ نہیں جانتا ہوں کہ وہ کہاں اتری اور قرآن کی کوئی آیت ایسی نہیں اتری جس کی نسبت میں یہ نہ جانتا ہوں کہ وہ کس باب میں کس شخص کے حق میں اتری اور اگر مجھکو یہ معلوم ہو جائے کہ کوئی اللہ کی کتاب کو مجھ سے زیادہ جاننے والا ہے اور اونٹ وہاں تک جا سکتے ہوں تو میں اس کے پاس جاؤں۔

آنحضرت صلعم کے زمانہ میں عبداللہ ابن مسعود رضؓ کے سوا، اکابر صحابہ رضؓ میں اور بھی معروف حفاظ قرآن مجید موجود تھے جنہیں زید ابن ثابت رضؓ ابی ابن کعب رضؓ، سالم ابن معقل رضؓ، ابو درداء رضؓ، معاذ ابن جبل رضؓ، ابو زید انصاری رضؓ اور انس ابن مالک رضؓ ہیں، امام بخاری نے حفاظ قرآن مجید کے سلسلہ میں حضرت انس رضؓ کی مفصلہ ذیل روایت نقل کی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ مفصلہ بالا حفاظ میں اکثر آنحضرت کی وفات کے بعد بھی، زندہ رہے۔

عن انس قال مات النبی صلی اللہ علیہ وسلم ولم یجمع القرآن غیر اربعۃ ابو الدرداء ومعاذ ابن جبل وزید ابن ثابت وابو زید ونحن ورثناہ،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات پائی، اور کامل قرآن مجید کے حافظ چار شخص تھے، ابو درداء رضؓ معاذ ابن جبل رضؓ زید ابن ثابت رضؓ اور ابو زید انصاری رضؓ (انس رضؓ نے کہا) ابو زید کے ہم وارث ہوئے۔

عبداللہ ابن مسعود رضؓ، انس ابن مالک رضؓ اور زید ابن ثابت رضؓ ہی نہیں کہ خلیفہ اول کے عہد میں قرآن مجید کے جمع و ترتیب کے وقت موجود تھے، بلکہ دوبارہ حضرت عثمان کی خلافت کے زمانہ میں جب صرف نقل کتابت کا کام ہو رہا تھا، تو یہ تینوں حضرات زندہ تھے، اور زید ابن ثابت رضؓ پہلے تو "جمعیۃ ترتیب" کے صدر رہ چکے تھے، اور دوسری مرتبہ حضرت عثمان رضؓ نے نقل کتابت کرا کے، اسلامی ممالک محروسہ میں مصاحف روانہ کئے، تو نقل کرنے والوں کی جماعت میں حضرت عبداللہ ابن زبیر رضؓ ،

سعید بن عاص رضہ اور عبدالرحمٰن بن حارث بن ہشام کے ساتھ زید ابن ثابت رضہ ہی صدر رہے، فارلنگ نے یہاں یہ بھی غلطی کی ہے کہ اس نے حضرت عثمان رضہ کے زمانہ کے "نقل و کتابت" کی جماعت کو "جمع و ترتیب قرآن" کی جمعیتہ تصور کر لی اور یہ تو محض غلط ہے کہ جامعین قرآن کے سردار قریشی تھے، حالانکہ یہ مسلم نظریہ ہے جسکو "نگفانہ" نے "شامی ترجمہ قرآن" کے اندر اور جارج سیل نے انگریزی ترجمہ قرآن مجید کے مقدمہ میں تسلیم کر لیا ہے کہ "جمعیت ترتیب" کا سردار قریشی نہ تھا، بلکہ ایک انصاری زید ابن ثابت رضہ تھے، جو جمعیت نقل و کتابت" کے بھی صدر رہے، کجا قریشیوں کی سرداری، اور کجا اُن کا عنصر انانیت اور پھر اپنی زبان کی ترویج میں سعی مذموم، ہاں یہ ضرور ہے کہ قرآن مجید آنحضرت صلعم پر نازل ہوا تھا جو قریشی تھے، اور یہ بھی صحیح ہے کہ حضرت عثمان رضہ نے عبداللہ بن زبیر رضہ سعید بن عاص رضہ اور عبدالرحمٰن ابن حارث کو اجازت دیدی تھی کہ جب حضرت زید ابن ثابت رضہ سے نقل کتابت میں قرأت کے متعلق اختلاف ہو، تو تم قریشی محاورہ کو ترجیح دینا، کیونکہ اسی مکالمہ میں قرآن مجید نازل ہوا ہے، لیکن ایسی روایت کا پتہ نہیں چلتا جس سے ثابت ہو کہ جامعین میں محاورہ کے متعلق اختلاف ہوا بھی ہو، اور یہ تو محض بعید از قیاس ہے کہ حضرت عثمان کے اس حکم سے قریشیوں کو اپنی زبان کی ترویج کا موقعہ ملا، اگر کوئی ثبوت ہو تو مدعی الفیس اسلام پیش کریں،

دوسری مرتبہ حضرت عثمان رضہ کے زمانہ میں صرف نقل کتابت ہوئی تھی کامل قرآن مجید مصحف کی شکل میں تو آنحضرت کی وفات کے دوسری ہی برس مرتب ہو چکا تھا، اور اگلے سطور میں یہ لکھا جا چکا، کہ اس وقت قرآن مجید کے کیسے کیسے علمائے متبحر اور حفاظ جید موجود تھے، جنمیں عبداللہ ابن مسعود، انس ابن مالک، اور خود حضرت علی کے اسمائے گرامی بتائے جاتے ہیں ایسی حالت میں کیا یہ شبہ کیا جا سکتا ہے کہ عیسائیوں اور یہودیوں کو اپنے فکر و عقیدہ کے مطابق قرآن مجید میں آمیزش کا موقعہ مل گیا، اور ان اکابر صحابہ رضہ نے خموشی کے ساتھ تسلیم بھی کر لیا، اگر صرف اس موقعہ پر کہ قرآن مجید حامل وحی کی وفات کے دو برس کے بعد پتھر کے ٹکڑوں چمڑہ کے پارچوں، اور ہڈیوں سے جو قلوب انسانی پر بھی مرکوز تھے، جمع ہو کر مصحف کی شکل میں آیا، اور اسلئے اس میں خلط و تحریف تضیع و تغییر کا شبہ ہے، تو پھر شک و شبہ کی وسعتیں اشیائے عالم کے ہر ذرہ پر محیط ہو جاوینگی اور تمام کائنات کی حقیقت اصطلاح تصوف میں "فریب عرفان" اور "التباس شہود" سے زیادہ نہ رہیگی۔ اگر فارلنگ نے تصوف کے اسی خاص رنگ میں قرآن مجید کے متعلق نکتہ چینی کی ہے تو مجھے کوئی بحث نہیں، میں اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح لبید کے اس مصرعہ کی تصدیق کرتا ہوں ؎

الا کل شیءٍ ما خلا اللہ باطلٌ

یہاں یہ بھی بتا دینا ضروری ہے، کہ حضرت عثمان رضہ جامع قرآن تھے یا ناشر قرآن؟ قرآن مجید کے جامع دراصل حضرت ابوبکر صدیق رضہ تھے، حضرت عثمان رضہ نے نقل کتابت کا کام اس لئے شروع کیا تھا، کہ حضرت ابوبکر رضہ نے مصحف مجید کی صرف چند جلدیں اسلامی ممالک میں روانہ کیں، اس وقت مطابع تو تھے نہیں، مقامی مسلمانوں نے سنکر یاد کیا، اور سنا بھی عوام سے، اس لئے

قرأۃ میں اختلاف ہوا، حضرت حذیفہ رضؓ عراق میں آرمینیہ اور آزربیجان کی فتح کے لئے لڑ رہے تھے، تو انھوں نے ان اختلافات کا مطالعہ کیا، اور جب مدینہ میں آئے تو حضرت عثمان رضؓ کو اس طرف توجہ دلائی، انھوں نے حضرت ابوبکر رضؓ کے مرتبہ مصحف سے نقل کرا کے تمام مقامات میں روانہ کئے، اور بقیہ تمام کاغذات اور ٹکڑوں پارچوں کو جلوا دیا، فارلنگ اسے حضرت عثمان رضؓ کی غلطی بتاتا ہے، ہاں صاحب کیوں نہیں، یہی تو ایک موقعہ تھا، وہ بھی ہاتھ سے جاتا رہا، آج برلن سے آثار قدیمہ کا ایک عالم کھڑا ہوتا، اور وہ کسی یہودی یا نصرانی کی تحریف کردہ تحریر کو کہتا کہ اصل قرآن کی عبارت یوں ہے تمہارے مصحف میں غلط لکھا ہوا ہے، کل پیرس کا ایک محقق بتاتا مجھے مصر اور شام کے کھنڈروں سے کتبات ملے ہیں جنمیں قرآن مجید کی فلاں فلاں آیتیں اس طرح لکھی ہوئی ہیں، جو قرآن مجید کے موجودہ مصحف کے اندر محرف صورت میں یوں ہیں، اور یورپ کے ایک لطیف الخیال اور نکتہ رس عالم نے تو قرآن مجید کے ایسے اجزا دریافت کرہی لئے جو مصحف کے اندر نہیں پائے جاتے اور شامی زبان کی پرانی تحریر میں موجود ہیں اللہ رے آپ کے کرشمہ تصور کی شہر آشوب بیان'!

باقی ——— باقی

عبدالمالک آروی

مسٹر رینالڈز کے انگریزی ناولوں کے اردو ترجمے

فسانۂ الہ دین و لیلیٰ - مشہور ناول اسٹار آف منگریلیا کا ترجمہ رنگین داستانوں کے ضمن میں بہشت و دوزخ کی سیر کرائی ہے پڑھکر دل دھڑک جاتا ہے مترجمہ منشی امیر حسین صاحب تحصیلدار کاکوردی عہ ۱۲/

فریب حسن - ناول فاسٹ کا اردو ترجمہ جس میں قصہ کے پیرایہ میں بدکرداریوں کے زبون نتائج دکھائے گئے ہیں - عہ ۱۲/

فسانۂ سوزن عشق ناول سٹبرس کا ترجمہ جس میں دنیا کی خود غرضی اور سیاہ کاری کی ایک عجیب و غریب قصہ کے پیرایہ میں دلکش تصویر ہے عہ ۱۲/

فسانۂ لارنس ورڈتھ ایک عفیفہ لڑکی کی داستان فوجی افسروں کی بیباکی چارلس گزشتہ شاہ انگلستان کی بے اعتدالی - زنان درباری کی بدکرداری وغیرہ کا خاکہ - ترجمہ رائے ہوس پلاٹ مترجمہ سید امیر حسین صاحب عہ ۱۲/

ناول اسرار - نیکر دمنیسر کا بامحاورہ اور سلیس ترجمہ جیحہ باعصمت اور حسین نیز مانہ لیڈیز کے دلی جذبات کا خاکہ زمانہ کی حیرت انگیز نیرنگیوں اور انقلاب کی حیرت انگیز تصویر عا/

مسٹر رینالڈز کے انگریزی ناولوں کے ترجمے

روز الیمبرٹ - ایک لڑکی لیمبرٹ کی حسرت اور درد بھری سوانح عمری راہ نیک سے انحراف اور چوری جوے دغابازی شرابخواری وغیرہ کے برے انجام زبان سلیس اور صاف دو حصہ کامل للعہ - ایضاً حصہ اول عہ/ حصہ دوم عا/

شام جوانی حصہ اوّل - مسٹر رینالڈز کے ناولوں میں یہ مشہور ناول ہے جس میں مصنف نے اپنا زور قلم دکھایا ہے مگر مترجم نے بھی اردو کے سانچے میں ڈھالکر اسے اردو کا بہترین ناول ثابت کر دیا ہے قصہ کی دلچسپی کے ساتھ عبارت کی روانی وغیرہ قابل دید و داد ہے - مترجمہ منشی نوبت رائے صاحب نظر مرحوم عہ حصہ دوم ۹/

دھوکا یا طلسمی فانوس اس میں بھی قصہ کو نہایت عبرت انگیز پیرایہ میں بیان کیا ہے اور دکھایا گیا ہے کہ اگر انسان کو تمام دنیا کے راز معلوم ہو جائیں تو اس کا کیا نتیجہ ہے اور وہ کیا کر سکتا ہے اور کیسی لا یطاق تکلیف میں پھنس جاتا ہے، پھر جو اسکے مترجم منشی سجاد حسین صاحب اڈیٹر اودھ پنچ نے ظرافت کی چاشنی دی ہے اس سے اسکی عبارت میں اور بھی گلکاری پیدا ہو گئی ہے - عہ ۲/

(منیجر نگار)

زلزلۂ عشق

(ڈراما)

افراد:-

ریاض ۔ ایک نوجوان خوشحال زمیندار۔
رابعہ ۔ ریاض کی نئی بیاہی ہوئی بیوی جو اپنے شوہر سے ملتفت نہیں ہے۔
حمیدہ ۔ خادمہ۔
محبوب ۔ ریاض کا سالا۔
عزیز ۔ ریاض کا دوست۔
نصیرہ ۔ عزیز کی بیوی۔

(کوٹھے کے اوپر شہ نشین میں رابعہ کھڑی ہوئی سیاہ بادلوں کے گھر گھر کر آنے کا تماشہ دیکھ رہی ہے، سامنے مینا کا پنجرہ لٹک رہا ہے دیر تک اس منظر سے لطف اٹھانے کے بعد رابعہ نیچے واپس جانا چاہتی ہے کہ مینا پنجرہ کے اندر سے "رابعہ ۔ رابعہ" کہکر پکارتی ہے اور رابعہ کچھ برہمی کے ساتھ مڑکر اس کو دیکھتی ہے)

رابعہ ۔ "جب دیکھو، رابعہ، رابعہ ۔ چیخا کرتی ہے ۔ اس کو موت بھی تو نہیں آتی (زور سے) حمیدہ ۔ حمیدہ!

(حمیدہ آتی ہے)

—— (حمیدہ سے) تو بھی نہیں سنتی ۔ دیکھ اس پنجرے کو اٹھاکر کہیں پھینکدے، جب دیکھو یہ کمبخت میرا ہی نام لیا کرتی ہے، آخر میں کون ہوں جو........"

حمیدہ ۔ (بات کاٹ کر) "آپ گھر کی ملکہ ہیں، ہماری اور مینا سب کی مالک ہیں، آپ کا نام نہ لے تو کس کا لے"۔

رابعہ ۔ "جی ہاں، گھر کی ملکہ نہیں خدا جانے کیا ہوں ۔ خیر، تو اس کو اڑادے اگر یہ میرا نام لینے سے باز نہیں آسکتی"۔

حمیدہ ۔ "نا بیوی، یہ ممکن نہیں ۔ میاں یہی آواز سننے کے لئے تو اس کو اتنا چاہتے ہیں، میں بھلا کیسے اڑا سکتی ہوں"

رابعہ ۔ (غصہ سے) تو میرا کہنا نہیں مانتی ۔ (بگڑ کر جاتے ہوئے) اچھا اگر یہ مینا گھر میں ہے تو میں نہیں رہونگی، جب آئیں تو اپنے اور مینا کے میاں سے کہدینا —— (ریاض داخل ہوتا ہے اور حمیدہ چلی جاتی)

ریاض (ہنکر) کیا واقعی مینا کا رہنا گوارا نہیں؟"

رابعہ (منہ پھیر کر) ہاں، مجھے رات دن اس کا چیخنا اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ اگر آپ اسے رکھنا چاہتے ہیں تو مہربانی فرما کر مجھے رخصت کر دیجئے۔"

ریاض۔" اس میں شک نہیں کہ یہ مینا مجھے بہت عزیز ہے کیونکہ یہ بلند آواز سے نام لیکر اس کی پوجا کیا کرتی ہے جس کی پرستش میں خاموشی سے کرنے پر مجبور رہوں۔ تاہم تم سے زیادہ تو عزیز کو نہیں ہو سکتا۔ اگر تمھاری یہی مرضی ہے تو میں اسیوقت اس کو رخصت کئے دیتا ہوں

(ریاض پنجرہ اتار کر کھڑکی کھول دیتا ہے اور مینا باہر نکل کر ریاض کے ہاتھ پر آبیٹھتی ہے۔)

ریاض (اس کے پروں پر ہات پھیرتے ہوئے) مجھ سے اتنی محبت نہ کر کیونکہ میں تجھ کو اپنے سے جدا کرنے پر مجبور ہوں اور تیری اس الفت کا جواب دینے کے لئے طیار نہیں ۔ (ریاض یہ کہکر مینا کو زبردستی دریچہ کے باہر پھینک کر دروازہ بند کر لیتا ہے)

رابعہ۔ (کچھ سہم کر) آپ نے اُسے اڑا دیا؟"

ریاض۔" ہاں، اڑا دیا۔

رابعہ۔ "مگر آپ تو اس کو بہت چاہتے تھے۔"

ریاض۔" بیشک چاہتا تھا"

رابعہ۔ "مگر پھر بھی اڑا دیا"

ریاض۔" ہاں زیادہ فائدہ کی طمع میں انسان نقصان بھی برداشت کر لیتا ہے۔ راستہ طیار کرنے کے لئے اینٹ پتھر توڑنے کی تکلیف برداشت کرنا ضروری ہے۔"

رابعہ۔ یہ آپ کی آنکھ میں خوفناک چمک کیسی ہے۔

ریاض۔ جب دل میں آگ ہوتی ہے تو کہیں نہ کہیں سے اس کی روشنی ظاہر ہو ہی جاتی ہے۔

رابعہ۔" مجھے تو دیکھ دیکھ کر ڈر معلوم ہوتا ہے۔"

ریاض۔" ڈر کی کیا بات ہے جب کہ اس سے قبل اسی طرح کی بہت سی آگیں آنسو سے بجھا چکا ہوں۔"

رابعہ۔" یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں، مجھے تو اب آپ سے بہت خوف معلوم ہونے لگا ہے۔ خدا کے لئے مینا کی طرح مجھے بھی چند روز کے لئے آزاد کر دیجئے۔"

ریاض۔" اگر تمھاری خواہش یہی ہے تو چند روز کے لئے نہیں بلکہ ہمیشہ کے لئے میں آزاد کر سکتا ہوں۔ کل ہی تمھارے بھائی کو تار بھیجتا ہوں کہ وہ تمھیں آکر لیجائیں۔"

(۲)

(باہر کمرہ میں ریاض اپنے سالے محبوب کو تار دیکر خاموش بیٹھا ہوا ہے کہ اسکا دوست عزیز آجاتا ہے)

ریاض۔"بیٹھو عزیز۔"

عزیز۔ "کیوں اس قدر مغموم کیوں ہو؟"
ریاض۔ (ٹھنڈی سانس لیکر) کیا دنیا میں غم کے سوا کچھ اور بھی ہے۔
عزیز۔ "معلوم ہوتا ہے پھر کوئی نیا جھگڑا اُٹھ کھڑا ہوا؟"
ریاض۔ نہیں کوئی نئی بات نہیں ہے۔ سوائے اس کے کہ جی بہت گھبراتا ہے اور ارادہ ہے کہ کل کہیں سیاحت کے لئے نکل جاؤں
عزیز۔ (حیرت سے) کل! سیاحت کے لئے!!

(رابعہ چھپکر پردہ کے پاس آکر کھڑی ہو جاتی ہے)

ریاض۔ "ہاں، ابھی تو بنارس، الہ آباد، دلی وغیرہ جانے کا قصد ہے اور وہاں سے اور آگے"
عزیز۔ واپس کب تک آؤگے"
ریاض۔ "کچھ ٹھیک نہیں"
عزیز۔ "اور رابعہ!"
ریاض۔ "وہ کل اپنے باپ کے گھر جا رہی ہیں"
عزیز۔ "مگر تمھارا جانا خوشی کا جانا نہیں معلوم ہوتا"
ریاض۔ "شوق یا ضرورت کا سوال کیا؟ اگر میری طبیعت گھر سے نکلکر باہر کہیں لگے تو گھر سے اچھا پردیس ہے"
عزیز۔ "ریاض خدا کے لئے اس ارادہ کو ملتوی کرو، میرا جی دکھتا ہے"
ریاض۔ "تم جانتے ہو کہ خدا کی سب سے بڑی نعمت انسان کا دل ہے اور اس کا نقصان کسی نفع کی امید پر گوارا نہیں کیا جاسکتا محبت میں دل کا امتحان پر لطف مشغلہ ہے، لیکن اسی وقت تک کہ امتحان دینے والا باقی رہے، اگر اس کو آرام کا موقع نہ دیا جائےگا تو نتیجہ کیا ہوگا۔ مومن کا شعر تم نے نہیں سُنا ؎

دن رات فکر وجور میں یوں رنج اٹھانا کبتلک میں بھی ذرا آرام لوں تم بھی ذرا آرام لو

عزیز۔ "اگر تمھاری دردمندیاں اس حد تک بڑھ گئی ہیں تو جانا ہی مناسب ہے۔ لیکن میری رائے میں اس قدر جلدی مناسب نہیں چند دن اور دیکھ لو"
ریاض۔ "نہیں اب تو جانے ہی دو۔ کل وہ اپنے گھر جائیں گی اور میں گھر سے باہر"

(۳)

(شام کا وقت ہے عزیز کی بیوی نصیرہ، رابعہ کو دیکھنے آئی ہے)

نصیرہ۔ "کیا کل تم کلکتہ جا رہی ہو بہن"
رابعہ۔ "ہاں"

نصیرہ: "یوں دفعتہً"؟

رابعہ: "ہاں، بے اختیار ماں باپ سے ملنے کو جی چاہ رہا ہے"۔

نصیرہ: "ابھی تو تم وہاں سے آئی ہو۔ اس قدر جلد جلد جانے سے خود تمھارے گھر میں جو بدانتظامی پیدا ہوجائے گی اُسکا کچھ خیال نہیں کرتی ہو؟"

رابعہ: "میرا گھر!، میرا گھر تو وہی جہاں ماں باپ بھائی موجود ہوں"۔

نصیرہ: "بیشک پہلا گھر وہی ہے، لیکن شادی ہوجانے کے بعد عورت کا گھر وہ ہے جہاں اس کا شوہر موجود ہو"۔

رابعہ: (بات ٹالنے کے لئے) "یہ تمھاری آنکھیں کیوں سُرخ ہورہی ہیں؟"

نصیرہ: "کل رات میں سوئی نہیں۔ کلکتہ سے اُنھوں نے میرے لئے ایک ہار بنوا کر منگوایا تھا اور اس کی خوشی میں نہ میں سوئی نہ اُن کو سونے دیا"۔

رابعہ: (ہنسکر) "ہار کی خوشی میں رات بھر سوئی نہیں؟ تعجب ہے میرے لئے تو نہ جانے کتنے ہار آئے لیکن میں ایک گھنٹہ بھی نہیں جاگی"۔

نصیرہ: (ٹھنڈی سانس لیکر) "ہاں، تمھیں نہیں معلوم کہ عورت کی خوشی کیا ہے اور اس کا ساری ساری رات خوشی میں جاگتے رہنا زندگی کا کس قدر دلچسپ حصہ ہے"۔

رابعہ: "بہن، بعض دفعہ تم بھی عجیب طرح کی خیالی باتیں کرنے لگتی ہو، میری سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ تم کیا کہہ رہی ہو"۔

نصیرہ: "خدا کرے وہ دن جلد آئے کہ تم سمجھنے لگو"۔

رابعہ: (ہنسکر) "وہ دن کیسے آئے گا؟"

نصیرہ: "گھبراؤ نہیں، جب وہ دن آئے گا تو اچانک آئے گا۔ زلزلہ آنے سے قبل کسی کو اطلاع نہیں ہوتی، لیکن جب وہ دفعتہً آتا ہے پل بھر میں خشکی کو پانی اور پانی کو خشک کرکے میدان بنادیتا ہے۔ اس لئے گھبراؤ نہیں، جب تمھارا وہ دن زلزلہ کی طرح آئے گا تو یہ روز روز کلکتہ کا جانا بھول جاؤگی اور بہانے ڈھونڈھوگی کہ کوئی شخص جس سے اب تم بیزار ہو، ہر وقت تمھارے سامنے رہے۔ اچھا بہن میں اب جاتی ہوں دیر ہورہی ہے۔ اُن کے کھانے کا وقت آگیا ہے"۔

رابعہ: "اوہو، کھانے کے وقت تم نہ ہوگی تو کیا ہوگا، آج نوکر ہی کھانا کھلادیگا تو کیا گناہ ہوجائے گا"۔

نصیرہ: "واہ نوکر کو کیا ہمدردی ہوسکتی ہے معلوم اچھا بُرا کیا سامنے رکھدے اور پھر یہ کہ میرا جی بھی مانے۔ میں خود اس کو کیسے گوارا کرسکتی ہوں"۔

(۴)

(رات کے دس بج چکے ہیں، تاریکی چھائی ہوئی ہے۔ مینہ رم جھم برس رہا ہے، بجلی چمک رہی ہے، ریاض باہر سے اندر نہیں آیا، رابعہ پریشان حالت میں اندر اپنے کمرہ کے بیٹھی ہوئی سوچ رہی ہے)

—— " نصیرہ کو اپنے شوہر سے بڑی محبت ہے، وہ یہ بھی گوارا نہ کرسکی کہ ایک وقت ان کو تنہا کھانا کھا لینے دے ——
—— ابھی تک اندر نہیں آئے۔ بہت خفا ہیں۔ مینا کے جانے کا رنج ہوگا۔ یا سفر کی طیاریاں کر رہے ہوں گے۔ خدا جانے کہاں کہاں جائیں اور کب تک واپس آئیں۔ میں اگر کلکتہ نہ جاؤں، تو شاید وہ بھی ارادہ باہر جانے کا ترک کردیں —— ضرور مجھ سے خفا بھی ہوں گے اور ہونا چاہئے۔ ان کی مینا ہاتھ سے گئی اور میری وجہ سے۔ پھر میں بھی ان کی مرضی کے خلاف جا رہی ہوں۔ لیکن اگر وہ کہدیتے کہ نہ جاؤ۔ تو میں کیوں جاتی۔ وہ سمجھے ہوں گے کہ اگر نہ جانے دیا تو میں خفا ہو جاؤنگی۔ بیشک انھیں میری خفگی کا بڑا خیال رہتا ہے۔ اب بھی وہ آکر مجھے نہ جانے دیں تو اچھا ہے —— مجھے ان کے سفر کرنے کے خیال سے تکلیف ہوتی ہے۔ دوسری جگہ جاکر ممکن ہے طبیعت خراب ہو جائے۔ یونہی ان کی صحت اچھی نہیں رہتی ہر وقت مغموم سے رہتے ہیں —
(بجلی چمکتی ہے) – اف کیسی خوفناک چمک ہے۔ کیا آج وہ نہیں آئیں گے —

(دفعتہً باہر سے بندوق کی آواز آتی ہے۔ رابعہ گھبرا کر باہر کمرہ میں جاتی ہے۔ ریاض بندوق لئے روزن کے پاس کھڑا ہے اور دھواں چاروں طرف پھیلا ہوا ہے۔ رابعہ گھبرا کر آگے بڑھتی ہے اور بندوق کی نال تھام لیتی ہے)

ریاض۔ (آہستہ سے) چھوڑ دو، چھوڑ دو، بندوق بھری ہوئی ہے، چھوٹ جائے گی "

رابعہ " چھوٹ جانے دو۔ میں نہیں چھوڑونگی۔ یہ آواز کیسے آئی، تم نے کس کو مارا "

(ریاض کانپتی ہوئی رابعہ کو آغوش میں لیکر قریب کی مسہری پر چلا جاتا ہے۔)

ریاض " کیوں تم کانپ کیوں رہی ہو "

رابعہ " سچ بتاؤ تم نے کس کو مارا "

ریاض " اسی چڑیا کو "

رابعہ " کون چڑیا؟ "

ریاض۔ وہی مینا، جسے صبح باہر نکال دیا تھا۔ اس وقت بھی وہ کھڑکی کے آس پاس اڑ رہی تھی "

رابعہ " تم بڑے بیرحم ہو، میں تو دن بھر مینا کے لئے روتی رہی اور تم نے اسے مار ڈالا "

(رابعہ منھ ڈھانپ کر ریاض کے شانہ پر سر رکھ کر رونے لگتی ہے)

ریاض " (بے اختیارانہ) رابعہ، رابعہ، خدا کے لئے یہ نہ کرو، میں تباہ ہو جاؤنگا، میں تمھیں روتا ہوا نہیں دیکھ سکتا "

رابعہ " نہیں، مجھے رونے دو۔ نصیرہ نے آج زلزلہ کا ذکر کیا تھا۔ کہ وہ کس طرح دفعتہً پہاڑ کو ہلا کر پانی کے چشمے جاری کر دیتا ہے۔ یہ میری زندگی کا زلزلہ ہے اور میں خوش ہوں کہ آج تمھارے قدموں پر مجھے رو رو کر اپنے قصور کی معافی چاہنے کی توفیق عطا کرتا ہے "

(۵)

(محبوب ریاض کے ساتھ اندر داخل ہوتا ہے)

محبوب " (رابعہ سے) کل تار پہونچنے سے ہم لوگ بہت فکر مند ہو گئے تھے، کہو اچھی تو ہو "

(ریاض چلا جاتا ہے)

رابعہ " (ہنسکر) اچھی ہوں "

محبوب " پھر تار کیوں دیا "

رابعہ - تمھارے دیکھنے کو بہت جی چاہتا تھا "

محبوب " (ہنسکر) خوب - میں تو سمجھا تھا کہ شاید پھر ریاض سے لڑ بیٹھی ہو گی - اچھا تو کس وقت چلوگی

رابعہ " (کچھ سوچکر) نہیں اس دفعہ جانے کا موقعہ نہیں ہے "

(دوسرے کمرہ سے سیٹی کی آواز آتی ہے)

محبوب " یہ سیٹی کون بجاتا ہے "

رابعہ " معلوم نہیں کوئی ہو گا - اچھا تو میں جاتی ہوں - انتظام کرتی ہوں - اور تم شام کو گھر واپس جاؤ، سب فکر مند ہوں گے -

(یہ سمجھکر کہ یہ سیٹی نصیرہ نے بجائی تھی، ٹالتے ہوئے -)

(رابعہ اندر داخل ہوتی ہے اور نصیرہ ہنستی ہوئی پھر سیٹی بجاتی ہے -)

رابعہ " تم بڑی شریر ہو، سیٹی بجانے کا کیا موقعہ تھا "

نصیرہ " شریر میں ہوں یا تم کہ بھائی کو حیلہ حوالہ کر کے ۲۴ گھنٹہ کے اندر ہی رخصت کر دیا "

واثق حسین

خبطیون کے قصے

(۱)

سوءتفہیم یا غلط خیالی سے ایک شخص "خبطی" نہیں کہلائے گا۔ اگر وہ دہری نگاہ رکھتا ہو اور ایک انگلی کو دو بتلاتا ہو اسے خبطیوں میں شمار نہیں کر سکتے، اور اگر ایک آدمی یہ کہے کہ مجھے تصویریں اور بت نظر آتے ہیں اور وہ یہ بھی یقین رکھتا ہو کہ دراصل فضا میں کچھ موجود نہیں ہے تو کیا آپ اُسے سودائی کہیں گے؟ بعض لوگ اپنی تمناؤں کو مجسم دیکھتے ہیں حالانکہ وہ اُن کی تجسیم ناممکن سمجھتے ہیں تو ایسے لوگ بھی خبطیوں میں شمار نہیں ہو سکتے، کیونکہ فریب نظر کا شکار خبطی نہیں کہلاتا۔ بعض لوگ خلائے بسیط میں جاندار اشیا، درندے اور دوسرے جانور دیکھتے ہیں اور یہ بھی سمجھتے ہیں کہ یہ محض ہمارے دل و دماغ کی کمزوری کا نتیجہ ہے۔

تو کیا آپ ایسے آدمی کو "سودائی" کہیں گے؟ ہرگز نہیں۔ ہم اس تفصیل کے ثبوت میں برلن کے ایک کتب فروش "نکولائی" کا قصہ پیش کر سکتے ہیں۔ اُسے کئی موقع پر خلائے بسیط میں جاندار اشیاء کے جھنڈ نظر آتے تھے۔ لیکن وہ یہ کہتا تھا کہ یہ سب میری خرابیٔ صحت کے کرشمے ہیں، جب اس کا دماغی توازن برقرار ہو گیا تو پھر اُسے کبھی ریگستان موجیں مارتا ہوا سمندر نہ دکھائی دیا۔ بہرحال نہ ایک کی دو انگلیوں کو دیکھنے والا خبطی و سودائی کہلائے گا اور نہ خلائے بسیط میں جانداروں کے گلہ کو دیکھنے والا۔ بروٹس اور ساکریٹس کے قصوں کو آپ جانتے ہوں گے؟ کہتے ہیں کہ بروٹس نے زار کو اپنے سامنے کھڑا دیکھا اور ساکریٹس کو ایک واقف شخص کی روح نظر آئی۔ اگر وہ اپنے زمانہ کے عام اعتقاد کے مطابق سچ سمجھ لیتے تو بھی ہمیں انھیں خبطی اور سودائی کہنے کا حق نہ تھا البتہ وہ یہ مانتے ہوئے بھی کہ فریب نظر بھی ایک چیز ہے یقین کرتے کہ ہم نے جو کچھ دیکھا وہ صحیح تھا تو ہم انھیں خبطی سودائی یا جنونی کا خطاب دے سکتے تھے۔ آپ اگر مخبوط الحواسی کے واقعات پر غور کریں گے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ سو فیصدی واقعات میں تیقن موجود ہے۔ خبطی کچھ اس بُری طرح سے ایک بے حقیقت چیز کی موجودگی کا یقین کرتا ہے کہ عوام اسے یکلخت پاگل کا خطاب دیدیتے ہیں۔ ایک قصائی کا قصہ ہے کہ وہ یقین کے ساتھ کہتا تھا کہ میں نے بکرے کی ران کو اپنی ناک سے بندھی اور لٹکتی ہوئی دیکھا وہ واقعی مخبوط الحواس تھا۔ ایک نانبائی کے متعلق مشہور ہے کہ وہ اپنے کو مکھن کا سمجھتا تھا اور اس خیال سے کہ کہیں پگھل نہ جاؤں۔ دھوپ میں جانے سے سخت پرہیز کرتا تھا۔ ایک پنسر صاحب کو یہ یقین ہو گیا تھا کہ میرا جسم ٹین (   ) میں تبدیل ہو گیا ہے اور اسلئے بلا دباؤ کے وہ چلنا پھرنا اپنے لئے سخت خطرہ کا باعث سمجھتے تھے۔ بعض نے خود بلور کا سمجھ لیا تھا اور بیٹھتے اٹھتے ڈرتے تھے کہ کہیں تڑخ نہ پڑ جائے۔ لوتھر کے علم و کمال سے کون انکار کر سکتا ہے لیکن بعض صورتوں میں وہ اچھا خاصا خبطی تھا۔ وہ کہتا تھا کہ مجھ پر ایک بھوت سوار رہتا ہے۔ اس نے اپنی کتابوں میں کئی جگہ لکھا ہے کہ مجھے کس طرح بھوت نظر آتا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ میں اسے ہجو اور طعنہ زنی سے بھگانے کی کوشش کیا کرتا ہوں اس کا خیال تھا کہ بُرا بھلا کہنے سے بھوت و شیطان کو بھگایا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر فریڈلے کے

زیر علاج لوتھر کا بھی خیال ایک مریض تھا وہ کہتا تھا کہ میں غلطی سے بھوت نگل گیا ہوں، بعض کو یہ وہم ہوجاتا ہے کہ ہمارے پیٹ میں سانپ اور مینڈک پیدا ہوگئے ہیں۔ ایک عورت کو تو یہ وہم ہوگیا تھا کہ ایک پوری پلٹن میرے شکم میں موجود ہے۔ ایک عورت نے اپنے آپکو اس قدر فربہ اندام سمجھ لیا تھا کہ دروازے سے گذرہی نہیں سکتی جب اسے زبردستی دروازے سے ڈھکیل کر پار کیا گیا تو وہ زور سے چیخی گویا دروازے نے اس کے جسم کے ڈھانچے ہی کو خراب کردیا ہے اور لطف یہ کہ وہ اسیوقت مر بھی گئی۔ توہم پرستی اور مخبوط الحواسی کی بھی کوئی حد ہے؟ ایک عورت کو یہ وہم گیا تھا کہ میں مردہوں، میں دنیا میں بغیر دل کے بھیجی گئی ہوں، اور مخلوقات خداوندی سے میں بالکل نرالی ہوں؟ (Friends Retreat) نیویارک میں ایک خط محفوظ ہے جس میں لکھا ہے "میں بے روح ہوں میرے پاس دل جگر اور پھیپھڑا نہیں ہے اور نہ میری رگوں میں ایک خون کا ایک قطرہ ہے۔ میری ہڈیاں جل چکی ہیں میرا سر کبھی لوہے کے مانند سخت ہوجاتا ہے اور کبھی انڈے کی زردی کی طرح نرم۔ فرانسیسی انقلاب کے وقت جب ایک سرے سے دوسرے تک طوائف الملوکی برپا تھی ایک شخص کو یہ وہم ہوگیا کہ میرا سر بدل گیا ہے اور اصل سر کا مالک بھوت بنکر مجھے ستایا کرتا ہے۔ بشپ وار برٹن نے اپنی تصنیفات میں ایک جگہ چند مخبوط الحواسوں کا تذکرہ کیا ہے ایک شخص کی نسبت لکھا ہے کہ وہ خود کو ہنس سمجھتا ہے۔ اکسفورڈ یونیورسٹی کے ایک آدمی نے اپنے آپ کو مردہ تصور کرلیا اور چارپائی پر لیٹ کر گرجا کے گھنٹوں کے بجنے کا انتظار کرنے لگا۔ (کیونکہ جب کوئی مرجاتا ہے تو عیسائی گرجا کے گھنٹے بجاتے ہیں) جب متوقع وقت پر گھنٹے نہ بجے تو بڑے غصہ میں بھرا اٹھا اور دوڑا دوڑا جاکر گھنٹے بجادیا اور ساتھ ہی اعلان کردیا کہ آج مردے نے خود گھنٹے بجادئے ہیں۔ سائمن براؤن نے جو وزارت کے عہدۂ جلیلہ پر ممتاز رہ چکے تھے ( ) ٹنڈل کی کتاب (Christianity as old as creation) کے جواب میں ایک کتاب لکھی ہے جسکے پڑھنے کے بعد ناممکن ہے کہ کوئی اس کی قوت استدلال کا لوہا نہ مان لے۔ لیکن آپ کی نظر اگر اسی کتاب کے ڈیڈیکیشن پر پڑجائے جو اُس نے ملکہ کو مخاطب کرکے لکھا ہے تو آپ اس شخص کو فوراً جھکی اور خبطی کا خطاب دیدیں گے۔ اُس نے اس خطبہ میں لکھا ہے کہ بحکم خداوندی میری شائستہ روح پرواز کرگئی ہے اور اسوقت مجھ میں ایک بدتمیز روح موجود ہے۔ اس کے بعد کتاب کے اس حصہ کو حرف غلط کی طرح مٹا دیا گیا۔ سوئیڈنبرگ کے نواب کو جو بڑا تعلیم یافتہ اور قابل آدمی تھا یہ خیال ہوگیا تھا کہ خدا سے تیس برس خط و کتابت کرنے کے بعد مجھے قدرت کے اسرار و عوامض پر عبور حاصل ہوا ہے۔ کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ بغیر کسی جھجک کے ایک مہذب تعلیم یافتہ شخص اس قسم کا دعویٰ کرسکتا ہے؟

اسی قسم کا ایک واقعہ پیسکل (Pascal) سے متعلق مشہور ہے کہتے ہیں کہ ایکبار جبکہ وہ ریاضی کے کسی مشکل مسئلہ کو حل کرنے میں مشغول تھا، خود کو کرسی سے بندھوالیا اور سامنے ہی زمین پر اوندھا ہوگیا، اسے یہ وہم ہوگیا تھا کہ میرے سامنے نہر بہ رہی ہے اور میں اس میں غوطے لگا رہا ہوں۔

(۲)

دہشت سودائیت اور خبط میں پورا دماغ مختل نہیں ہوتا، ہاں کسی ایک نکتہ پر ناقابل تزلزل تعین و ایمان ضرور پایا جاتا ہے

یعنے مریض دوسرے مباحث پر عالمانہ گفتگو کرے گا، خبطی کتاب پڑھیگا اور سمجھیگا۔ رنگائی کا کام کرے گا مکانیکل امور میں اپنی ذہانت کا ثبوت دیگا اور اپنے خبط کو پورا کرنے میں بھی اس قدر اپنی انتہائی فراست کو صرف کردیگا کہ آپ حیران ہوکر اسے پاگل کا تمغہ دیدیں گے اس قسم کا ایک خبطی لارڈ مینس فیلڈ کی عدالت میں پیش ہوا تھا اس نے دن بھر اپنے گول مول جوابات سے عدالت کو پریشان کردیا اور لوگوں کو پوری طرح آگاہ کرادیا کہ میں سودائی ہوں، ڈاکٹر بٹی بھی وہاں موجود تھے یہ سمجھ گئے کہ کس خاص امر پر گواہ کو وحشت ہوتی ہے، چنانچہ انھوں نے سوال کیا "ہاں بھئی! اس شہزادی کا کیا حال ہوا جسکے ساتھ آپ شاہ دانہ کے عرق سے خطوط لکھکر اظہار تعشق فرمایا کرتے تھے" گواہ یکایک اپنی تمام فراست کھو بیٹھا اور کہنے لگا "جناب آپ سچ فرماتے ہیں میں قلعہ میں بند تھا وہاں دوات قلم نہ تھی میں نے شاہ دانے کے پانی سے خطوط لکھکر نہر میں چھوڑے اور وہ کشتی کے ذریعہ شاہزادی کو مل جاتے تھے"۔ معاملہ یہیں ختم نہیں ہوجاتا بلکہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ خبطی ان خاص نکات پر جس کا خبط ان پر سوار رہتا ہے اپنی ذہانت کو حیرت انگیز حد تک بڑھا لیتے ہیں۔ ڈاکٹر رشس کہتے ہیں کہ ایک خبطی عورت میرے زیر علاج تھی۔ یہ عزیزین خود نظم کرتی اور گاتی تھی حالانکہ اس سے پہلے کبھی اسے مشق کرنیکا موقع نہ ملا تھا۔ واقعہ یہ تھا کہ اسکا حس شعری المضاعف ہوگیا تھا اور اس کی دیگر دماغی حالت میں ابتری برپا تھی ڈاکٹر مذکور خبط کے دو واقعے اور جانتے ہیں جن میں نقشہ کشی پر ذہانت کے ثبوت پائے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر دلس کو ایک ایسے مریض سے سابقہ پڑا تھا جو خبط سوار ہوتے ہی مشہور لاطینی کتب کے اقتباسات مزے لیکر پڑھا کرتا تھا۔ اور دوسرے اوقات پر وہ کچھ نہیں پڑھ سکتا تھا۔ ڈاکٹر کاکس کا بیان ہے کہ میری نگرانی میں ایک گویا مریض تھا جو معمولی مسائل پر بھی مجنونانہ گفتگو کرتا تھا لیکن ساز سے اس قدر عمدگی کیساتھ گانا گاتا تھا کہ لوگ عش عش کرتے تھے ڈاکٹر رشس لکھتے ہیں کہ میرے مطب میں ایک مریض تھا جو میرے اسٹاف (عملہ) اور مریضوں کو اپنی فصاحت اور خوش کلامی سے دوران تغزل میں خوب ہنسایا کرتا تھا۔ ڈاکٹر پنیل مشہور فرانسیسی ڈاکٹر کا بیان ہے کہ میں ایک ایسے مریض کو جانتا ہوں جو روزمرہ کی گفتگو میں بھی اپنے گنوارپن کا ثبوت دیا کرتا تھا لیکن جب اس پر ایک خاص حالت طاری ہوتی تھی تو نہایت پرشکوہ انداز سے انقلاب فرانس پر فصیح و بلیغ تقریر کیا کرتا تھا۔

بخار کی حالت میں بھی اس قسم کی مثالیں دیکھی گئی ہیں۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ وہ شخص جو بخار سے پہلے معمولی طور سے گاتا تھا حرارت سے متاثر ہونے کے بعد نہایت عمدگی سے گاتا ہے ایک شخص معمولی گفتگو بھی بلا جھجک کے نہیں کرسکتا لیکن بخار کی حالت میں کسی موضوع پر ایک لمبی تقریر کرنے پر قادر ہوجاتا ہے لیکن یہ حالت عارضی اور کم دیرپا ہوتی ہے۔

اب تک جو کچھ لکھا گیا اس میں قوائے دماغی پر بحث تھی اب ہم احساسات و رجحانات سے بحث کریں گے جو خبط کی حالت بالکل بجا نہیں رہتے۔ بعض کو آپ مذہب کا سودائی پائیں گے کسی کو اور کوئی قابل قدر جنون ہوگا بعض ناپاک خیالات کے مرکز ہوں گے کسی کی طبیعت میں شرارت جاگزیں ہوگئی ہوگی کسی کو چوری کی لت ہوجاتی ہے کوئی ہمیشہ غضبناک پایا جاتا ہے۔ کوئی ہمیشہ خوش۔ ہم کہاں تک ان کی تشریح کریں۔ "ہر شخص بخیال خویش خبطے دارد" لکھدینا کافی معلوم ہوتا ہے۔ بعض تو بہت ہی خطرناک خبط رکھتے ہیں اور اپنا ہی قصہ پاک کرنے کی فکر میں رہتے ہیں یا دوسروں کو قتل کرنے سے خوش ہوتے ہیں۔

میری طالب علمی کے وقت کیمبرج یونیورسٹی میں ایک آدمی تھا جو تین بار کالج کو نذر آتش کرنے کی کوشش میں پکڑا گیا اور اسی شخص کی نسبت کہا جاتا تھا کہ یہ جب کمسن تھا ایک بچے کو پانی میں ڈوبا کر مارنا چاہتا تھا۔ تاہم اسے کسی نے یونیورسٹی میں پاگل نہیں متصور کیا۔
مسٹر بونز اور ان کی بیگم کے قاتل کو آپ جانتے ہوں گے جو انھیں کا وفادار ملازم تھا ایک رات وہ اٹھا اور ہاتھ میں کرچھا لیکر ان کی خوابگاہ میں پہونچا اور دونوں کو بلاخوف موت کے گھاٹ اتار دیا۔ عدالت نے وجہ پوچھی تو وہ کچھ نہ بتلا سکا اس نے کہا "یہ میرے ساتھ نہایت مہربانی سے پیش آتے تھے لیکن اس کو رات میں یکایک قتل کرنے کی تحریک ہوئی۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ سب شیطان کی رہنمائی کا نتیجہ تھا۔ چونکہ اس کے اور کسی کام میں جنون کا شائبہ نہ پایا جاتا تھا عدالت نے اُسے پھانسی کا حکم دیدیا۔
ڈاکٹر گال ویانا کے ایک شخص کا واقعہ بیان کرتے ہیں جو ایک خونی مقدمہ میں گواہ تھا اور شوق قتل کے اظہار میں خود پھانسی کے تختہ پر چڑھ گیا۔ لیکن اسی وقت اسے موقع کی اہمیت کا خیال بھی ہوگیا تھا اس نے عدالت ہی میں ایسے فعل اور جرم پر نفرت کا بھی اظہار کیا اور بہت چیخا چلایا لیکن عدالت پر اس کا کچھ اثر نہ ہوا اور فیصلہ بحال رہا۔
پنیل کہتا ہے کہ میں ایک شخص کو جانتا ہوں جسے قتل کا جنون ہو گیا تھا۔ پہلے اس نے اپنی بیوی کو متنبہ کیا کہ وہ کہیں چلی جائے جب وہ اس کی دسترس سے باہر ہوگئی تو وہ اپنی ہی جان کے پیچھے پڑ گیا اور کئی بار خودکشی کی کوشش کی اسے ایک کمرہ میں بند کر دیا گیا تھا۔

مسٹر ہل کی کتاب میں ایک شخص کا واقعہ جو ۱۸۰۵ء میں عدالت ناروک پیش ہوا تھا یوں بیان کیا گیا ہے کہ اس نے اپنی بیوی کو زخمی اور بچے کا گلا گھونٹ دیا تھا اسی شخص کی نسبت مشہور تھا کہ اُس نے خود کو ایک ہفتہ تک رسی سے باندھ رکھا تھا کہ اپنے خطرناک جذبۂ خونریزی سے متاثر ہو کر کسی کو قتل نہ کر دے۔ لندن کے ایک خاندان کے فرد پر یہ جملے ہوا کرتے تھے "خدا کے لئے مجھے پابند سلاسل رہنے دو۔ مجھے ذرا آزادی ملی کہ میں نے اپنی اور اپنی بیوی کی زندگی کا خاتمہ کیا۔ میں اس وقت تک خوب یاد رکھو کہ اس کام کو ضرور کروں گا جب تک مجھ میں تھوڑا سا بھی قتل کا جذبہ پایا جائیگا۔
دیکھو! مجھے ہرگز نہ چھوڑنا غیب سے یہ آواز آرہی ہے کہ میں ایسا ضرور کروں گا اور میں کروں گا"۔ ڈاکٹر گال فری برگ کے ایک قیدی کا حال لکھتے ہیں جس نے متواتر چار بار اپنے گھر کو آگ لگائی تھی اور جو آگ لگانے کے بعد بجھانے کی کوشش کرتا تھا۔ بعض اچھے لوگوں کو چوری کی لت پڑجاتی ہے جو بظاہر صحیح الدماغ معلوم ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر گال کہتے ہیں کہ اسپین کے پہلے بادشاہ کو معمولی چیزیں چرانے کا شوق تھا ایک جرمن بھی محض اسی جذبہ کا شکار پایا گیا ہے وہ معمولی سے معمولی چیز چرا کر بہت محظوظ ہوتا تھا۔ ایک اور آدمی کو بھی شوق ہوگیا تھا، وہ بیچارہ فوج میں بھرتی ہوگیا کہ شاید فوجی پابندیاں اسے اس شوق کو پورا کرنے کا موقع نہ دیں گی لیکن اس کا جذبہ وہاں بھی کارفرما رہا۔ آخرکار اسے پھانسی کے تختہ پر چڑھنے کا موقع دیا گیا۔ لیکن کسی وجہ سے چھوڑ دیا گیا پھر اس نے فقیری اختیار کی کہ شاید اس طرح چوری کی لت باقی نہ رہے اور پھر بھی کامیاب نہ ہوا۔ ڈاکٹر گال ویانا کے ایک اور شخص کا واقعہ لکھتے ہیں جسے یہی لت تھی اور چوری کے مال کو رکھنے کے لئے ایک گھر کرایہ پر لے رکھا تھا۔ یہ اشیاء خانہ داری کو چرایا کرتا تھا اور

گودام میں زیادہ مال ہوجاتا تھا فروخت کردیتا تھا۔لیڈن کے ایک ڈاکٹر کی بیوی کے متعلق بیان کیاجاتا ہے کہ وہ بغیر کسی چیز کے چرائے کسی دوکان سے سودا نہ لیتی تھی۔کاؤنٹس آف فرانک فورٹ کو بھی یہی لت تھی۔تم نے اس حکیم کا قصہ سنا ہوگا جس کی بیوی کو ڈاکٹر صاحب کے زیر علاج مریضوں کے جیبوں کو ٹٹولنے کا مرض تھا وہ ان میں جو کچھ باقی تھی نکال لیتی تھی کچھ نہیں تو اس کے شوہر کی فیس توضرور اسے ضرور مل جاتی تھی۔

میرزنے اسی قسم کے ایک عادی مجرم کا حال لکھا ہے جس نے دوران مقدمہ میں بھی ایک ناس کی ڈبیہ چرانے کی کوشش کی تھی پادشاہ بیوریا کے ڈاکٹر برنر بیان کرتے ہیں کہ میں ایک نوجوان کو جانتا ہوں جو ہر طرح فارغ البال اور تعلیم یافتہ تھا اور پھر بھی وہ چوری کرتا تھا اس کے باپ نے فوج میں بھرتی کردیا لیکن وہاں بھی اس نے اپنا کام جاری رکھا اور ایک روز پھانسی دیدیا گیا۔ ایک خاندانی لڑکے میں یہ لت پائی جاتی تھی حالانکہ وہ بڑا قابل اور ہرفن مولا تھا۔ لیکن باوجود کوشش اس خراب عادات سے پیچھا نہ چھوڑا سکا۔میں اسی قسم کے بہتیرے خبط کے قصے بیان کرسکتا ہوں جن پر غور کرنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ فاعل عادی مجرم نہیں ہیں بلکہ ان میں چوری ڈکیتی قتل وغیرہ کرنے کا ایسا جذبہ شوق اور رغبت ہوجاتی ہے جس کے لئے بغیر اُن کو چین نہیں پڑتی

(۳)

اگر اس ملک میں (یوروپ میں) کوئی عورت اپنے مردہ شوہر کے ساتھ جلنے مرنے کو تیار ہوجائے تو ہم اسے پاگل کہیں گے۔ لیکن ہندوستان جہاں ایسی تعلیم ہی دی گئی ہے اُسے پاگل نہیں کہا جاتا ۱۸۲۱ء میں مسٹر بکسٹن نے پارلیمنٹ میں بیان کیا تھا صرف فورٹ ولیم پریسیڈنسی میں چار برس کے اندر ۲۳۶۶ بیواؤں نے اپنے آپ کو ستی کردیا تھا۔ان میں سے چند کی عمریں بارہ تیرہ برس کی تھیں ایک صرف آٹھ سالہ تھی اور ایک گیارہ سالہ تھی۔اس بیوہ کو جب ستی ہونے سے روک دیا گیا تو اپنی قربانی کرنے کو تیار ہوگئی لیکن حکام نے بلدان بھی نہ ہونے دیا وہ چار پانچ روز متواتر پیاسی رہی یعنی روزہ رکھا اور عہد کرلیا کہ جب مجھے موقع ملیگا میں ستی ہوجاؤں گی اور اس غرض کے لئے اس نے اپنے مردہ شوہر کی کچھ ہڈیاں اپنے پاس رکھ لی تھی۔ایسا کام ہمارے ملک میں شاید بغیر دماغی اختلال کے ظہور پذیر نہ ہوگا۔جہلا فلاسفروں کو ہمیشہ پاگل کہتے آئے ہیں۔

کو عوام نے صرف اس وجہ سے کہ اس نے ایک انسانی نعش کو اختلال دماغ کی تحقیقات کے لئے استعمال کیا تھا پاگل مشہور کردیا تھا اور لوگوں کو کہا تو نہیں بلکہ تم لوگ واقعی پاگل ہو۔ایک پاگل کہتا تھا کہ میرا دماغ باقی دوسرے لوگوں کی طرح بالکل صحیح ہے لیکن چونکہ بکثرت لوگوں کو اس سے اختلاف تھا اسے پاگل خانہ میں ڈال دیا گیا۔مسٹر بریسول کا قاتل بلیگھم کمزور دماغ کا آدمی تھا۔اس کے دماغی معائنہ سے معلوم ہوا کہ اس کے دماغ کا اگلا حصہ مختل اور خراب ہوچکا ہے۔اور پچھلا اپنی فطری حالت پر قائم ہے۔یہ شخص عدالت میں پیش ہوا اور قابل دار قرار دیا گیا۔اور بظاہر اس میں جنوں کے کوئی آثار پائے بھی نہ جاتے تھے۔لیکن جو کوئی بھی اس کی دماغی حالت سے آگاہ ہوگا وہ اگر اسے خطرناک سمجھکر یکلخت رہا نہ کردے گا تو اس کی جان لینا بھی گوارا نہ کرے گا۔

ایک آدمی خودکشی کرتا ہے اور ہم بلا دلیل اسے خبطی اور وحشی کہدیتے ہیں۔ میں بلا خوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ ہزاروں مجرم جنھوں نے خلل دماغ کیوجہ سے ارتکاب جرم کیا تھا مستوجب سزا قرار دئے جاتے ہیں اور ہزاروں مستوجب سزا رہا ہوجاتے ہیں۔ بعض وقت عین موقع پر یہ سمجھ لینا کہ جنونی ہے ناممکن ہوجاتا ہے۔ "مجھے خوب یاد ہے" لارڈ اریسکن کہتے ہیں کہ مجھے ایک ایسے ہی بدنصیب جنٹلمین سے واسطہ پڑا تھا جسنے اپنے چہیتے بھائی اور ملازم کو قتل کردیا تھا۔ میں دن بھر اس سے جرح کرتا رہا اور کوئی رائے قائم نہ کرسکا آخرش جب مجھے معلوم ہوا کہ میرا مخاطب مجنون ہے تو مجھے شرمندگی سے گردن جھکا لینا پڑی یہ شخص اپنے آپ کو مسیح زماں اور دنیا کا نجات دہندہ بتلاتا تھا۔

جنونی عموماً بہرے ہوتے ہیں۔ اکثروں کی قوت شامہ بھی خراب ہوتی ہے ان کو ہر فضا بو باس سے بھری ہوئی محسوس ہوتی ہے آپ نے دیکھا ہوگا کہ اکثر ناک پر رومال رکھکر گفتگو کرتے ہیں۔ میرا یقین ہے کہ بکثرت پاگل ناس کے شائق ہوتے ہیں۔ بعض وقت یہ شدت سے پیاسے پائے جاتے ہیں اور کبھی ان کو خوب بھوک معلوم ہوتی ہے اور یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ کبھی گھنٹوں ان کو بھوک پیاس نہیں معلوم ہوتی کبھی یہ نشہ زور ہوجاتے ہیں اور اپنی صحت سے زیادہ قوت کا مظاہر کرتے ہیں۔ پاگل کئی دن بلکہ ہفتوں مطلق نہیں سوتے۔ مذکورہ بالا غیر معمولی عادتوں کو اختیار کرلینے سے اکثر پاگلوں کی زندگی بہت جلد ختم ہوجاتی ہے۔ بعض پاگلوں میں انتہائی شائستگی پائی جاتی ہے وہ اسقدر اخلاق سے پیش آتے ہیں کہ آپ مصیبت میں خود کو گھرا ہوا محسوس کرنے لگتے ہیں۔ آپ شکم سیر ہیں اور اس لئے معذرت خواہ لیکن وہ ضرور کھانا کھلائیں گے۔ بعض وقت آپ کسی وقت جائیں لیکن وہ مصر ہوجائیں گے کہ شام کا کھانا ہمارے ساتھ کھا کر جائے۔ ایسے کئی خوش قسمتوں کو میں جانتا ہوں جو زبردستی روک لئے گئے ہیں اور پھر معلوم ہوا ہے کہ یہ ایک دیوانے کے مہمان تھے۔

آغاز دور جدید سے قبل دیوانگی کا علاج بیرحمانہ سلوک میں مضمر سمجھا جاتا تھا لیکن یہ نہ معلوم ہوسکا کہ کبھی مادی ایذا رسانی سے دیوانوں کا علاج کرکے اپنی دیوانگی کا ثبوت بھی دیا گیا یا نہیں؟ عرب کے حکیم (Rhazes) کا قول ہے کہ ان بوالہوسوں کا علاج جو حسن پرستی شعار کرتے ہیں، ہاتھ پیر باندھ کر گھونسہ بازی سے کرنا چاہئے۔ ایک دوسرے مصنف کا قول ہے کہ جوانی کے دیوانوں یا محبت کے دیوانوں کو خوب اچھی طرح باندھ کر تازیانے رسید کرنا چاہئے اگر اس عمل سے اس کی دیوانگی دور نہ ہو تو اسے ایک تاریک گوشہ میں بند کردینا چاہئے۔ تاکہ وہ خود رہائی کی درخواست کرے

ایک نوجوان افکار و آلام کے ہجوم سے دیوانہ ہوگیا جب اس کی دیوانگی کچھ کم ہوئی تو اس نے مجھ سے التجا کی کہ مجھے اپنی بیوی سے ملا دیجئے، چونکہ وہ دیر تک اسے اُسکے اپنے مطالبہ سے باز نہ رکھا جاسکتا تھا۔ میں اسکے ساتھ صرف تین گھنٹہ رہا اور مجھے اطمینان ہوگیا کہ اسے اس کی بیوی سے ملا دینا مفید ثابت ہوگا۔ پہلے اس نے کہا مجھے اس خوابگاہ سے جانے دو میں گھر کے دوسرے کمرے دیکھنا چاہتا ہوں میں اسے لیگیا اور ایک ایک کمرہ بتلاتا پھرا میں نے دیکھا کہ اس طرح اسکی وحشت میں اور کمی ہوئی۔ اُس نے کئی عجیب عجیب خواہشوں کا اظہار کیا اور میں نے اُن کو پورا کیا۔ ایک بار اس نے سڑک پر ایک مرغے کو دیکھکر کہا اس مرغے کو میں مارونگا اس کا رنگ مجھے بہت ناگوار معلوم ہوتا ہے جب تک میں اسے مار نہ دوں مجھے چین نصیب نہ ہوگا۔ میں نے اسکی یہ بھی خواہش پوری کی اور وہ بہت خوش ہوا۔ بعد ازاں اسے اسکی بیوی سے ملا دیا گیا اور اس کا اس قدر اچھا اثر پڑا کہ اسکی تمام دیوانگی جاتی رہی۔

(ڈاکٹر الائٹ سن)　　(مترجم، فاروقی)

کلوخ انداز را پاداش سنگ ست

(فسانہ)

اتابک سعد زنگی شیراز میں ایک رحمدل وخدا ترس بادشاہ گزرا ہے۔ صرف اس میں یہ خرابی تھی کہ شیراز کو بالکل غیر محفوظ چھوڑکر ملک گیری کی ہوس میں اولوالعزمانہ دیگر ممالک پر چڑھ دوڑتا تھا۔ ادہر تاتاری پایۂ تخت کو خالی پاکر تاخت وتاراج کردیا کرتے تھے ان آئے دن کی مصیبتوں نے ہی تو شیخ سعدی سے پیارا وطن چھڑا دیا تھا۔

اصول سیاست کیخلاف ایک بات سعد نے یہ کی کہ ابتداہی سے رعایا کے لئے کسی قسم کا قانون ترتیب نہیں دیا۔ جس ملک میں کوئی قانون یا ضابطہ نہیں ہوتا اُس کے باشندے قوم بنی اسرائیل کی طرح غیر متمدن وآوارہ ہوجاتے ہیں۔ صرف ایک بار یہ حکم جاری کیا گیا تھا کہ اگر کسی عورت پر کوئی مرد ناجائز طور پر قبضہ کرنے کی کوشش کرے تو اس کا سر قلم کردیا جائے مگر اس کی لاابالی طبیعت نے اس حکم کا نفاذ بھی سختی کے ساتھ نہ ہونے دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ علاوہ اور بہت سے جرائم کے حسینان شیراز پر علانیہ ڈاکے پڑنے شروع ہوگئے اور شرفا کی عزت وناموس کو بُری طرح برباد کیا جانے لگا۔

رعایا کی مجرمانہ حرکات کا احساس اب سعد کو بھی ہوا۔ مگر اس کے معاملہ فہم دماغ نے یہ مشورہ دیا کہ اصلاح کی جانب بتدریج مائل ہونا مناسب ہے ورنہ فوری تغیر وسخت گیری سے خطرہ تھا کہ لوگ کہیں ایکدم نہ بھڑک اُٹھیں۔ ہر مصلح عوام کی ذہنیت کو مدنظر رکھ کر مائل باصلاح ہوتا ہے۔ چنانچہ اس نے یہ طے کیا کہ ہر قسم کی قانونی سختی برتنے اور عورتوں کے اغوا کی انسداد کے لئے اپنا ایک نائب مقرر کرکے خود روپوش ہوجائے۔ اس نائب کو اختیار کلی تفویض کردئے جائیں کہ اگر دلفروش نوجوان پھر کسی حسینہ پر دوڑے ڈالنے کی جسارت کریں تو ان کو بیدریغ سزا دیجائے۔

مہابت نامی ایک رکن سلطنت کو جو نہ صرف بلحاظ تقدس اہالیان شہر میں مشہور تھا بلکہ تعزیر میں سخت اور عدل وانصاف میں بھی شہرۂ آفاق تھا سعد نے اپنی نوجوان رعایا کی اخلاقی خرابیوں کی اصلاح کے لئے مختار کامل بناکر شہر میں اعلان کرادیا کہ بادشاہ بغرض حج خانہ کعبہ جارہا ہے۔ یہ زمانہ اسلامی آزادی کا تھا۔ بادشاہ سے لیکر عام لوگ تک ایک حالت میں حج کے لئے روانہ ہونا اظہار عقیدتمندی سمجھتے تھے۔ سعد بھی تنہا بے سروسامانی سے روانہ ہوا مگر فی الحقیقت وہ عازم حج نہ تھا۔ بلکہ دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ نیا راعی کس حکمت عملی سے اس دشوار امر کو انجام دیتا ہے جسکی تمام مشکلات کا بانی وہ خود تھا۔ رات گوگڈریہ کا بھیس بدل کر شہر میں آگیا اور رعایا پر سخت گیری کرنے کا انجام دیکھنے کے لئے آمادہ ہوگیا جو اس کی سیاسی کمزوریوں سے خود سر سہل انکار اور بے اعتدال بنی ہوئی تھی۔

حکومت کی اس تبدیلی کے کچھ عرصہ بعد ہی ایک شریف زادہ جو مدت سے ایک حسینہ کی سوز محبت میں جل رہا تھا اپنی داعیات قلب کی اخیر آزمائش کے لئے اس کی خدمت ناز میں گیا اور الحاح مجسم وسراپا عجز ہوکر بولا "شمیمہ! تمھاری پرلطف سرد مہریاں

اب مجھے فریب نہیں دے سکتیں کہ تم کو مجھ سے محبت نہیں ہے میرے ذہن میں تمھاری مفارقت سے نجات پانے کی ایک تدبیر آئی ہے بشرطیکہ تم بھی میری خستہ حالی پر رحم کرکے اُس کو قبول کرلو۔ شمیمہ کو جلال رزمی سے (اس نوجوان کا نام تھا) محبت تھی۔ اس کی تدبیر سننے کو استفسارانہ اس کی جانب دیکھا۔ جلال نے جرأت سے کہدیا کہ ہم یہاں سے فرار ہوکر کسی دوسرے شہر میں پہنچ جائیں اور وہاں محبت کی مطمئن زندگی گزاریں۔ شمیمہ نے تذبذب کے ساتھ اس پرخطر تدبیر کو سنا۔ وہ کچھ سوچ رہی تھی۔ اس کو ایک خیال آیا تھا۔ اس کے پاس یہ یقین کرنے کے لئے کوئی وجہ نہ تھی کہ یہ محبت نئے قانون کی بندشوں کو بھی خاطر میں نہ لاکر جلال کو ہمیشہ اس کا پرستار بنائے رکھنے میں کامیاب ہوسکے گی۔ آخر میں تھوڑی سی کشمکش کے بعد آمادہ ہوگئی اور یہ دونوں خدا کے مقبول و قانون شیراز کے "بورلوگ" نکل بھاگے۔ مگر بدنصیب جلال گرفتار کرلیا گیا۔ بجیس جہابت محبت کی قوت استمالت اور عجز وانکسار سے متاثر ہونا قطعی نہ جانتا تھا اس نے فوراً جلال کا سر قلم کرنے کا حکم دیدیا۔

شہر کے چند معزز لوگوں کی جان بخشی کے لئے جہابت کے پاس سفارشیں آئیں — عمائد سلطنت میں سے فرید نامی ایک نیک شخص نے پرزور الفاظ میں اس کی سفارش کی مگر جہابت نے روکھے پن سے کہدیا "جناب! قانون کو جانوروں کے ڈرانے کا پتلا نہیں بنا دینا چاہیے۔ جیسا کسان اپنی زراعت کی حفاظت کے لئے بناکر کھڑا کردیا کرتے ہیں۔ جلال کی جان بخشی ناممکن ہے۔" فرید مایوس ہوکر جلال کے پاس قیدخانہ میں پہنچا اور اس کی تسکین کرنی چاہی، مگر جو عشق کی بلاؤں سے نہیں ڈرتے ان کو موت کا کیا خوف؟ لیکن پھر کوئی تمنا تھی۔ کوئی مٹی مٹی سی آرزو تھی جو اس کو مرنے سے باز رکھنا چاہتی تھی۔ پژمردہ آواز میں بولا "میری بہن کو اس جانکاہ واقعہ کا علم نہیں ہے۔ اس عفیفہ کو جاکر مطلع کردو، اس کے بدنصیب بھائی کی گردن ماری جانے والی ہے۔ اگر اس کی جادوبیانی جہابت کی قانونی جہابت کو کم کرسکتی ہو تو اس سے کہنا کہ جاکر میری سفارش کرے۔"

جلال عالی نسب سادات میں سے تھا اس کے باپ کا انتقال ہوچکا تھا صرف ایک چھوٹی بہن رہ گئی تھی۔ اس عفیفہ کا عنفوان شباب کا عالم تھا مگر وہ سادات خواتین کی مقدس زندگی اور عصمت کا قابل صد ستائش نمونہ تھی۔ فرید نے جاکر تمام کیفیت اس سے بیان کی اپنے بھائی کی اس بے عنوانی پر وہ ناخوش نہیں ہوئی ایک پُر درد آہ کو ضبط کرتے ہوئے اس کی سزائے موت کی خبر کو سنا۔ حلق میں ایکدم امنڈ آنے والے دلی صدمہ سے پھندا لگ گیا جب تک گرم گرم آنسوؤں نے عارض گلگوں پر بہکر رومال کو اچھی طرح تر نہ کردیا دل کا بخار کم نہ ہوا۔ آخر پریشانی کو ضبط کرکے بولی "اچھے چچا! اب تم ہی بتاؤ میں کیا کروں؟ آہ کس طرح سنگدل جہابت سے اپنے بھائی کو بچاؤں؟"

فرید: "بیٹی میرا اعتقاد ہے کہ تضرع والحاح ایک عام صورت میں ہمیشہ کامیاب نہیں ہوا۔ انکسار بھی ایک مستقل ایکٹ (فن) کے شعبے میں آجاتا ہے۔ اس کے لوازمات پُر درد لہجہ، موثر الفاظ دردانگیز بیان اور مستحکم ادائیں ہیں۔"

طاہرہ: "افسوس مجھے ان تمام قوتوں کی آزمائش کا اب تک موقع ملا ہی نہیں پھر کیسے یقین کرلوں کہ جہابت جیسے مستقل مزاج اور سخت دل شخص کو ملائم کرسکوں گی؟"

فرید - تمہارے یہ شکوک جلال کے ساتھ ظلم کر رہے ہیں - یہ خیالات خواہ مخواہ تمہاری ان قوتوں کو نقصان پہنچا رہے ہیں - تم ایک بار کوشش تو کرو وہ بھی آخر انسان ہے تمہارے قبضہ میں ایک اور آلہ تسخیر ہے .... جس سے مہابت انسان ہونے کی حیثیت سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا" باحیا طاہرہ اپنے حسن کی ستائش میں ان الفاظ کو سنکر کچھ شرما گئی مگر پھر مستقل لہجہ میں بولی "اچھا محترم بزرگ! میں اپنی تمام قوتوں کے ساتھ مہابت سے مقابلہ کروں گی"

شام کو وہ مہابت کی خدمت میں حاضر ہوئی اور نہائی تضرع و لجاجت سے بولی "شاہ شیراز! میں تیری خدمت میں بھیک مانگنے آئی ہوں - امید ہے تو مجھ دکھیا کی درد بھری کہانی ضرور سنے گا"

مہابت (اپنے قدرتی کرخت لہجہ کو ذرا دھیما کرکے) کیا چاہتی ہو؟

اسوقت کی سخت آواز میں قدرے ملائمت محسوس کرکے طاہرہ نے اپنے بھائی کی جان بخشی کے لئے اس قوت بیان کو صرف کرنا شروع کر دیا جس کی آزمائش کا موقع اس کو پیشتر حاصل نہ ہوا تھا مگر اس کی سحر کاری سے توقع ضرور تھی کہ ناکامی کی ذلت سے محفوظ رہیگی - سنجیدہ مزاج مہابت عدالت کی غیر جانبدارانہ شان سے اس کی موثر اپیل کو سنتا رہا - آخر دھیمی آواز میں بولا "خاتون! اب کوئی مداوا نہیں - تمہارا بھائی قانون کی رو سے مستحق سزائے موت ہے"

طاہرہ - (مایوس ہوکر) "آہ خوفناک قانون!" وفور غم و مایوسی سے کوئی تدبیر نہ بن پڑی - باہر نکل آئی - مگر فرید جو یہاں پیشتر سے موجود تھا حوصلہ افزا لہجہ میں بولا "اتنی جلد مایوس نہ ہو - پھر جاؤ - اس کا دامن تھام کر کھڑی ہو جانا - ابھی تم یقین نہیں کر سکتیں کہ تمہاری درخواست سختی کے ساتھ بالکل مسترد کر دیجائیگی" طاہرہ تازہ دم ہوکر پھر اندر داخل ہوئی اور زیادہ کامیابی سے حرف مطلب کا اعادہ کیا -

مہابت - (ذرا تلون مزاجی سے) میں کہہ چکا اب کچھ نہیں ہو سکتا"

طاہرہ (استقلال سے) کیوں نہیں ہو سکتا؟ جس تیرے ارشاد میں نفاذ قانون کی قدرت ہے کیا وہی حکم امتناعی نہیں بن سکتا؟"

مہابت "جاؤ جاؤ تم کچھ نہیں سمجھتیں" مگر اس بار طاہرہ نے زمین نہ چھوڑی - پھر اسی جرأت سے بولی "سلطان! اگر میرے بھائی کی جگہ تو ہوتا اور تیری جگہ میرا بھائی تو تو بھی اُس لغزش سے محفوظ نہیں رہ سکتا تھا جو اس سے سرزد ہوئی اور وہ بھی تیری طرح اس قدر سنگدل بےحس و جابر نہ بنا رہتا - کاش مجھے وہ اختیارات و مراتب حاصل ہوتے جن پر تو فائز ہے اور تو طاہرہ ہوتا تو معلوم کر سکتا تھا کہ ایک بھائی کی جان بچانے کے لئے کس قدر بیقرار ہو سکتی ہے" مہابت جری حسینہ! تو قانون کی اہمیت سے ناواقف ہے - میں کچھ نہیں کر سکتا تیرے بھائی کو سزائے موت قانون دے رہا ہے اگر وہ میرا بیٹا ہوتا تب بھی ناآشنا مراعات قانون اس کو وہی سزا دیتا - کل اس کی ضرور گردن مار دی جائے گی"

طاہرہ - (متوحش ہوکر) "آہ کل؟ اف! اس قدر جلد؟ خدا کیواسطے اس کی جان بخشدے - اس کی مرگ جوانی پر موت بھی روئے گی ایک حقیر سے ذی روح کو مارنے میں انسان اپنے دل میں ایک قسم کا درد سا محسوس کرتا ہے - پھر وہ تو انسان ہے - کیا خدا کی اشرف

خلوق عام ذی حیات کے مقابلہ میں قابل احترام نہیں ؟ ذرا سوچو تو سہی اس جرم کی پاداش میں پیشتر بھی کوئی قتل کیا گیا ہے ! پھر میرے بھائی کو کیوں سزائے موت دیجا رہی ہے۔ وہ شیر از کے اندر اس جرم کی پاداش میں پہلا مقتول ہوگا اور تو پہلا قاتل ——"

مہابت دلچسپی کے ساتھ اس حسینہ کے دلفریب چہرے کے اتار چڑھاؤ کو دیکھ رہا تھا۔ وہ پھر بولی۔ ذرا اپنے سینے کا تو جائزہ لے۔ دل کی گہرائیوں میں جھانک اور ضمیر سے دریافت کر۔ اگر وہ بھی میرے بھائی کے سے مجرمانہ احساسات اور اسی قسم کے قانونی مواخات کی لہر قدرتاً اپنے اندر محسوس کرنے کا اعتراف کرتا ہے تو تجھکو نادم ہونا چاہئے کہ اس جرم میں فقط تم دو شخص ہی شریک نہیں ہو بلکہ ہر نوجوان حسینہ کو دیکھکر ہر مرد اس جرم خفی میں مبتلا ہو سکتا ہے۔" اس کے پرسحر کلمات نے مہابت کو متوحش سا کر دیا۔ ان الفاظ کو سنکر وہ چونک پڑا کیونکہ طاہرہ کے حسن کے جادو نے اس کے تپیس دل کے اندر ایک مجرمانہ خلش پیدا کر دی تھی۔ اس کے دماغ میں ناپاک خیالات وارد ہونا شروع ہو گئے تھے۔

ذہنی کشمکش سے عاجز آکر وہ اس حسین ساحرہ کے پاس چلے جانے کا قصد کرنے لگا۔ مگر طاہرہ کے مخاطبانہ الفاظ سے پھر رک گیا "شاہ میری جانب مخاطب ہو۔ میں تجھکو ایک معقول رشوت دینا چاہتی ہوں"۔

مہابت "رشوت ؟ مجھکو ؟ اس قدر جرأت ؟"

طاہرہ "وہ رشوت ایسا مقدس تحفہ ہے جس پر قدرت خود برکتیں نازل کرتی ہے اس کے مقابلہ میں زر و جواہر جن کو ہمارے حریص خیالات اور بیکار ضروریات نے اس قدر قیمت دے رکھی ہے کچھ حقیقت نہیں رکھتے۔ وہ تحفہ ایک بیکس عورت کی زبان سے بصد تضرع نکلی ہوئی دعا ہے"

مہابت۔ (مغلوبانہ بدمزگی سے)" اچھا اچھا ——— کل آؤ میں تمھاری درخواست پر غور کرنے کی کوشش کرونگا۔ اپنے بھائی کی موت کے اس قلیل التوا سے وہ خوش خوش روانہ ہوئی۔ اس کو مسرت تھی کہ متلون مزاج مہابت کی مستقل و سنجیدہ طبیعت کا مقابلہ اس نے آج خوب کامیابی سے کیا۔

طاہرہ۔ (روانہ ہوتے وقت)" خدا تیرے اقتدار و سطوت کو ترقی دے۔ اور تمام خطرات سے تجھکو محفوظ رکھے"

مہابت۔ (بآہستگی)" آمین ! خدا مجھکو تجھ سے بچائے اور تیرے نسوانی اوصاف سے امان میں رکھے۔ یہ مجھکو فتح کئے بغیر نہ چھوڑیں گے" اپنی تلبی دار دگیر کا راز بہت دیر تک اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ چند منٹ بعد آہستہ آہستہ بڑبڑانے لگا "یہ مجھکو کیا ہوا جا رہا ہے۔ اس پرفتن حسینہ کی آواز سننے کے لئے میری روح کیوں بیقرار ہوئی جا رہی ہے۔ وہ مستغیث بنکر میرے پاس آئی تھی یہ کیا ظلم کر گئی ——— کل عجیب لطف ہوگا وہ مجھ سے درخواست کر رہی ہوگی اور میں اس کے قدموں میں جھکا ہوا ملتجی رحم و کرم ہونگا کیا میں اس نازک سی عورت سے عہدہ برا نہیں ہو سکتا ؟ کیا یہ پاکدامن چھوکری میرے ناآشنا محبت دل میں گھر کئے بغیر نہ رہیگی ؟ اف ! کاش میں اپنی ان تمام پیچیدگیوں کا خود علاج کر سکتا ———"

اپنی فطرت کی اس فوری پستی یا تغیر پر وہ بہت دیر تک متعجب رہا۔ اس کی بیخوابی شب اُس بدنصیب قیدی کی المناک التوائے

سخت تر تھی۔ اسی رات کو نیکدل سعد نے (جو گذار یہ بنا ہوا تھا) زنداں میں جاکر جلال سے بہت سے کلمات تسکین کہے اور اس کی ڈھارس بندھائی۔ ادھر جہابت سخت کرب و اضطراب میں مبتلا رہا۔ اس کے دل میں خطا کاری کی ایک ہوک سی اٹھ رہی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ معصوم طاہرہ کو اپنی ہوس رانی کا شکار بنا دے۔ اُس پر قدرتی مغلوبیت سی طاری تھی ضمیر کچھ نیک مشورہ دینا چاہتا تھا۔ مگر کسی دفعۃً بھڑک اٹھنے والے جذبہ سے وہ اس قدر مغلوب تھا کہ بجز طاہرہ کی عصمت دری کی تحریص کے اور کسی خیال کی تائید کرنی نہیں چاہتا تھا۔ آخر یہ فیصلہ کیا کہ وہ اس عفیفہ سے اس کے بھائی کی جاں بخشی کے عوض وہ شے طلب کرے گا جس کو عورت عصمت کہتی ہے اور اُس پر سے ہر عزیز شے کو قربان کر دینے کی مدعی ہے۔

جب صبح طاہرہ پھر آئی تو اس کو جہابت نے فوراً اپنے کمرہ میں طلب کیا اور بیساختہ کہنے لگا "اگر طاہرہ تم اپنے دوشیزگی کو میری خواہشات کے مطیع کرنے کے لئے تیار ہو تو تمھارے بھائی کی جاں بخشی کی جا سکتی ہے۔ ظالم طاہرہ! میں تجھ پر مرمٹا" عورت مرد کا راز دل پڑھ لینے میں کمال رکھتی ہے اس کو جہابت کے خیالات پیشتر ہی معلوم ہو چکے تھے۔ پُرسکون بشرے سے بولی "شاہ! میرا بھائی بھی تو مجرم محبت ہے پھر اُس کو سزا موت کیوں دیجا رہی ہے؟"

جہابت۔ یہ جرح قدح رہنے دو۔ اگر رات کو تم میرے ساتھ چپکے سے شعب بوان (ایران کی ایک مشہور نزہت گاہ) میں چلنے کو تیار ہو تو تمھارے بھائی کی جان بچ سکتی ہے" طاہرہ اس با اختیار شخص کو اس مجرمانہ حرکت پر آمادہ دیکھکر سخت متعجب ہوئی، آخر درشت لہجہ لہجہ میں بولی "میں اپنے بھائی کی خاطر ہر قسم کی مصیبت و عذاب کے لئے تیار ہوں۔ اگر اس کے بالعوض میرے لئے سزا تازیانہ تجویز کیجاتی تو میں بیرحم کوڑوں کی ضرب کے نشانات زیور کی مانند باعث زینت و فخر تصور کرتی۔ اگر مجھکو زندہ جلایا جانا تجویز کیا جاتا تو میں اس کے لئے بھی صبر و استقلال سے تیار تھی مگر اس قسم کی شرمناک و سفیہانہ خواہشات کا خیر مقدم کرنے کے لئے ہر گز تیار نہیں۔ آہ ——— لیکن۔ شاہ! تو کہیں مجھے آزما تو نہیں رہا ہے؟" مگر جہابت نے ایک والہانہ مفتونیت سے اس کے حسین چہرہ پر نظریں جماکر کہا "نہیں طاہرہ میں تم پر فریفتہ ہوں اور یہ میری دلی خواہش ہے جس کو میں نے ابھی ظاہر کیا ہے"

طاہرہ۔ (تمکنت سے) "سلطان! تجھے اپنے اعزاز و مراتب کا بھی خیال نہ رہا۔ اپنی نفسانی خواہشات کا غلام بنا جا رہا ہے میں ابھی تیری اس شیطنت کی باہر جاکر تشہیر کرتی ہوں۔ میرے بھائی کی جاں بخشی کا پروانہ لکھ ورنہ میں عوام میں تیری حقیقت کھول دونگی"

جہابت۔ دیوانی تیری اس ہرزہ سرائی کا میری متین و سنجیدہ طبیعت کا خیال کرتے ہوئے یقین کون کریگا۔ تیرے اتہام کا تار و پود دکھیرنے کو میری مشہور خلائق بجیسی دتلون مزاجی کافی ہے۔ اگر اپنے بھائی کی خیریت چاہتی ہے تو ضد سے باز آ ورنہ اس کا سر قلم کرا دونگا۔ جا کل سوچکر جواب دینا" طاہرہ غصہ میں بھری ہوئی باہر چلی آئی اور اپنے بھائی کے پاس پہنچی جو سعد سے باتیں کر رہا تھا۔

طاہرہ "بھائی میں تم سے کچھ کہنا چاہتی ہوں" سعد وہاں سے علحدہ ہوگیا مگر باہر جاکر ایسے مقام پر کھڑا ہو گیا جہاں سے ان کی گفتگو سن سکتا تھا"

جلال: "کیوں عزیزہ! میرے بچنے کی کوئی صورت پیدا ہوئی؟"

طاہرہ: "بھائی موت سے نہ ڈر، مردانہ وار جان دیدو"

جلال (اندوہگیں لہجہ میں) "کیا کوئی تدبیر نہیں ہوسکتی ہے؟"

طاہرہ: "ایک ہوسکتی ہے مگر اس پر عمل کرکے تم اپنے خاندانی اعزاز سے قطعی عاری ہوجاؤگے اور اس کے بعد ہماری زندگی سخت بیحیائی کی زندگی ہوگی"

جلال: "آخر کہو تو کیا بات ہے"

طاہرہ - مجھے اس کو ظاہر کرتے ہوئے خطرہ ہے کہ کہیں تم اپنی جان کے مقابلہ میں میری اس —— قربانی کو حقیر سمجھ کر زندہ رہنے کے لئے آمادہ نہ ہوجاؤ۔ جان ہر شخص کو عزیز ہے۔ موت کی سختی ایک ننھے سے کیڑے سے دیو تک کے لئے برابر ہے۔ مگر جہاں حمیت و ناموس کا سوال آجاتا ہے وہاں موت کی صعوبتیں اور تکلیفیں آسان ہوجاتی ہیں اور انسان تحفظ عزت کے لئے جان دینے کو آمادہ ہوجاتا ہے"

جلال - طاہرہ یہ لکچر تم مجھے کیوں دے رہی ہو؟ کیا تم میری حمیت کو بالکل مردہ تصور کرتی ہو۔ اگر میری موت آہی چکی ہے تو میں تاریکی لحد سے ہمکنار ہونے کو بالکل تیار ہوں"

طاہرہ (خوش ہوکر) ہاں یہ میرے باحمیت بھائی کے الفاظ ہیں۔ یہ میرے نامور باپ کی نسلی خوبیاں بول رہی ہیں۔ بیشک تم کو مرجانا چاہئے۔ عزیز بھائی اُس جو نما گندم فروش نہایت کی منصف مزاجی اور تقدس کی اصلیت بھی مجھ سے سنو وہ میری دوشیزگی کی حرمت کو تباہ کرکے تمہاری جان بچانے کا وعدہ کرتا ہے۔ اگر مجھ سے تمہاری جان کے عوض وہ میری جان طلب کرتا تو میں بصد فخر خنجر جلاد کے سامنے سر جھکادیتی"

جلال: "خدا تیری عمر دراز کرے طاہرہ"

طاہرہ - (گلوگیر آواز میں) آہ بھائی کل تمہارا سر قلم کردیا جائیگا"

جلال - طاہرہ موت کا نام بہت خوفناک ہے"

طاہرہ: "ہاں مگر بیحیائی کی زندگی قابل نفرت و شرمناک ہے" اب موت کے بھیانک خیالات نے جلال کی خودداری وغیرت کو سرد کرنا شروع کردیا تھا جسطرح پھانسی کا حکم سنکر مجرم ہر جائز و ناجائز طریقہ سے اپنی جان بچانے کی اُمیدیں شروع کردیتا ہے اسیطرح جلال کو موت کے ہیبتناک تصور نے جادۂ استقامت سے ڈگمگانا شروع کردیا ایکدم کھڑا ہوگیا اور انتہائی عجز سے بولا" پیاری طاہرہ —— مجھے بچالے —— میری جان بچانے میں جو گناہ تجھ سے سرزد ہوگا خدا اسکو ایک انسان کی جان کے صلہ میں عمل حسنہ سے تبدیل کردیگا"

طاہرہ (غصہ سے) بزدل انسان! کیا تم اپنی بہن کی عصمت دری پر اپنی پُرشرم زندگی کو ترجیح دیتے ہو؟ نفرین! صد نفرین! میرا خیال تھا کہ میرے بھائی کے سینے میں مردانہ وغیور دل ہے جو میری بے حرمتی کے مقابلہ میں سو بار سر قلم کرا دینے کے لئے اس کو آمادہ کرسکتا ہے"

جلال (شرم و افسوس کی درمیانی حالت میں) "طاہرہ ذرا سن تو سہی ------" مگر اپنی کمزوری و انفعال کی تائید میں جو بات کہنے والا تھا نہ کہہ سکا۔ سعد ایکدم اندر آگیا اور موثر الفاظ میں بولا "جلال! میں تمہاری تمام باتیں سن چکا ہوں تمہارے بچنے کی کوئی توقع نہیں ہوسکتی چنانچہ تم اپنی اس کمزوری اور ترغیب معصیت پر جس نے طاہرہ کے پندار میں ہیجان بپا کردیا تھا تہ دل سے تائب ہو تاکہ خدا تم کو شہدائے عشق کے زمرے میں جگہ دے"

جلال (نادم ہوکر طاہرہ سے) "طاہرہ! جب خدا توبہ سے میری کمزوریوں کو درگذر کرسکتا ہے تو کیا تم مجھے معاف نہیں کروگی؟"

طاہرہ نے اپنے بھائی کو معاف کردیا اور باہر آگئی۔ اس کے پیچھے سعد بھی آگیا طاہرہ کی تعریف کرتے ہوئے بولا "خاتون! جس صناع نے تیری ایسی بے عیب صورت بنائی ہے اس نے تجھے سیرت بھی ایسی بخشی ہے"

طاہرہ۔ "بڑے میاں یہ تو بتاؤ کہ ہمارا بادشاہ سعد کب تک لوٹ آئیگا؟ میں اس کے آتے ہی اپنی بیکسی کی داد طلب ہونگی اس کے نائب نے میری سخت توہین کی ہے"

سعد۔ "خدا مہابت کو خود سزا دیگا۔ اسپر بھروسہ رکھ اب میں تجھے ایک مخلصانہ مشورہ دیتا ہوں جس سے اُمید ہے تیرے بھائی کی جان بچ جائیگی۔ تو بظاہر مہابت کی ناپاک آرزو کے خیر مقدم کے لئے تیار ہوجا مگر دوسری عورت کو اس کی بہیمیت کا شکار بنادے ---- نہیں تو ابھی نہیں سمجھی۔ مہابت کی بیوی جس کو وہ سنگدل جفا ہوکر دمشق چھوڑ آیا تھا پھر یہاں آگئی ہے۔ دو سال تک جانگسل مصیبتوں کا سامنا کرکے بھی اس بندی نے اس ظالم کا اپنے دل سے خیال نہ نکالا۔ ہر وقت اس سے خواستگار عفو تقصیر ہے۔ مگر بیوفا مہابت سے ملنے کی جرأت نہیں ہوتی۔ رات دن اسی فکر میں مبتلا رہتی ہے کہ کسطرح اس کے حضور میں پہنچکر اپنی اگلی مہر و وفا کا واسطہ دے اب خدا نے اس کی یہ تمنا بار آور ہونے کا موقع پیدا کردیا ہے۔ تو جاکر مہابت سے وعدہ کرآ کہ آج ہی رات کو اصطبل کے قریب اپنے بھائی کی جان بچانے کے لئے اس کی پُرمعصیت تمنا کا خیر مقدم کرنے کو تیار رہیگی۔ مگر اپنے بجائے سلمیٰ (مہابت کی بیوی) کو پہنچا دینا۔ میں اس کو جاکر ابھی آمادہ کرتا ہوں وہ خدا سے چاہتی ہے کہ کسطرح اس کو دیکھ ہی لے" طاہرہ نے اس تدبیر کو پسند کیا اور مہابت سے اس عظیم الشان و متبرک قربانی کا وعدہ کرآئی جس کی مسرت میں وہ بہت سی اندوہگین راتیں تڑپ تڑپ کر گذار رہا تھا۔ ادہر سعد نے جاکر سلمیٰ سے بزرگانہ نصیحت کے بعد وعدہ کیا کہ وہ اسکو آج مہابت سے ملادیگا۔ چنانچہ وہ مصیبت کی ماری بھی اس خوشگوار مہم کے لئے تیار ہوگئی طاہرہ آکر پھر سعد سے ملی اس کی اسنے سلمیٰ سے بھی تقریب کرادی۔

سعد "اچھا تم کیا کر آئیں؟"

طاہرہ "میں نے مہابت سے کہدیا کہ شبستان یا اس کے محل میں جانے سے تو میری بدنامی کا خوف ہے۔ اصطبل محفوظ مقام ہے اس نے بھی منظور کرلیا"

سعد "شاباش تم نے تمام باتیں انجام دیدیں (مہابت کی بیوی سے) تم مہابت سے کوئی بات چیت نکرنا تاریکی میں وہ تم کو پہچان بھی نہ سکے گا مگر سعد کو ابھی یقین نہ تھا کہ سنگدل مہابت مطلب حل ہوجانے کے بعد بھی غریب جلال کو زندہ چھوڑے گا۔ چنانچہ وہ

پکا ہوا پھر زنداں میں آیا۔ ایک گھنٹہ بعد ہی بیرحم مہابت کا حکم لیکر پیادہ آپہنچا کہ صبح پانچ بجے جلال کا سر دربار میں پہنچایا جائیگا۔ اُس کو مرنے کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ سعد پہلے تو سخت گھبرایا مگر فوراً داروغہ کے پاس دوڑا ہوا پہنچا اور اس کو اپنی زمرد کی انگشتری دیکر آمادہ کیا کہ ایک دوسرے قیدی کا سر جو صبح مرگیا تھا مسخ کرکے مہابت کے دربار میں پہنچا دے اس کے بعد ایک مراسلہ اُسنے اپنے نام سے مہابت کے پاس روانہ کیا جسمیں تحریر کیا کہ موسم کی خرابی کے باعث عزم حج ملتوی کرکے آرہا ہوں۔ تم مع امرا کے استقبال کے لئے شہر پناہ کے دروازہ کے پاس ملو اور وہیں اپنے اختیارات واپس کردو شہر میں یہ اعلان بھی کردیا جائے کہ جو لوگ اپنے بادشاہ سے کچھ عرض و معروض کرنا چاہیں تحریر میں کریں۔ ان کی تمام درخواستیں وہیں سنی جائیں گی۔

علی الصباح طاہرہ اپنے بھائی کی خیریت معلوم کرنے زنداں میں آئی۔ سعد بھی یہاں موجود تھا۔ اس نے بلحاظ مصلحت غریب طاہرہ کے نازک دل پر اس کے بھائی کے قتل کی خبر سنا کر غم کا پہاڑ توڑ دیا۔ زار و قطار رونے لگی جب دل کا بخار ذرا کم ہوا تو سعد نے ڈھارس بندھاتے ہوئے کہا "آج ہمارا بادشاہ آنے والا ہے تم ظالم مہابت کی وعدہ شکنی اور تمام بیہودہ حرکات کی فریاد اس کے سامنے لیجانا قدرے سکون پذیر ہوکر شکستہ دل طاہرہ بدعہد مہابت سے انتقام لینے کے لئے آمادہ ہوگئی۔ اس کے پاس رخصت ہوکر سعد نے مہابت کی بیوی سے چند ہدایتیں کیں اور مناسب کارروائی اس کے ذہن نشین کرادی۔

ذرا دن چڑھنے پر شاہ اپنی شاہانہ تمکنت سے شہر میں داخل ہوا۔ اور جان نثار رعایا کے سلام و آداب کا پُر محبت قبولیت سے جواب دیتا ہوا مہابت سے ملا جو بے ریا شانِ استغنا سے شاہی اختیارات اپنے آقا کے سپرد کرکے دیگر ارکین کی صف میں جا کھڑا ہوا۔ دفعتہً دعاگو رعایا کے مجمع کے اندر ایک ہلچل سی مچی اور تمام لوگ ایک سرو قد برقع پوش عورت کی جانب متوجہ ہوگئے جو تیزی سے ہجوم کو چیرتی پھاڑتی شاہ کے حضور میں زبانی فریاد لیکر جا کھڑی ہوئی۔ اس کی موسیقی آواز جوش کے عالم میں نکلنے سے اور موثر ہوگئی بے اختیار بولی "فریاد رس اے سلطان! میں جلال زرمی کی بہن ہوں جو ایک خاتون کے اغوا کی پاداش میں مہابت کے بے رحم قانون سزائے موت کا شکار ہوگیا۔ میں نے اپنے عزیز بھائی کی جان بخشی کے لئے وہ تمام مسترحم درخواستیں اور عاجزانہ کوششیں صرف کردیں جن کی توقع ایک بہن سے ہی ہوسکتی ہے مگر کوئی نتیجہ نہ ہوا .... اب میں مہابت کی ایک حیا سوز شرمناک حرکت ظاہر کرتی ہوں۔ ہر عیش پسند و بیرحم شخص کی عادت ہوتی ہے کہ وہ متواتر التجا و عاجزی سے اور بھی بدمزاج و سخت دل ہوجاتا ہے۔ اس کو صرف نفسانی خواہشات ایسے موقع پر مغلوب کرسکتے ہیں۔ ایک وہی کیا اس شیطانی قوت سے ہر شخص مغلوب ہوجاتا ہے چنانچہ یہ تیرا نائب جو عدل و انصاف اور زہد و اتقا میں مشہور ہے مجھ سے مُصر ہوا کہ میں اس کی ناپاک خواہشوں کی شکار بن جاؤں اور اس کے عوض اپنے بھائی کی جان بچاؤں خون کا تعلق میرے عزت نسوانی پر غالب آگیا اور میں ——— مگر صبح اس نے بدعہدی کی اور میرے بھائی کا سر قلم کرادیا ——" سعد نے اس کی دردبھری داستان پر بظاہر یقین نہ کرتے ہوئے مہابت کی جانب دیکھا جو سر نیاز جھکا کر بولا۔ اس غریب کا دماغ جلال کے صدمۂ مرگ نے مختل کردیا ہے کوئی بھی اس کی بات ٹھکانہ کی ہے؟ وہ ابھی اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ مہابت کی بیوی سلمیٰ آگے بڑھی اور شاہ کے حضور میں لب کشائی کی "عالی وقار بادشاہ! طاہرہ کا بیان سراسر غلط ہے

میں مہابت کی بیوی ہوں اور شب کو اُس کی ملاقات کے لئے اصطبل میں بھی میں ہی گئی تھی وہ ہرگز نہیں گئی تھی اگر میرا بیان ذرا بھی غلط ہو تو مجھے سنگسار کر دیا جائے۔"

طاہرہ اپنے بیان کی صداقت کے ثبوت میں اس بزرگ صورت گڈریہ کو پیش کرنا چاہتی تھی (طاہرہ کا بیان بالکل سعد کی ہدایت کے موافق تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کی بیگناہی عوام میں صاف طور پر ثابت ہو جائے) مہابت ان دونوں عورتوں کے اختلاف بیان کے راز سے ناواقف تھا۔ چنانچہ اس نے فائدہ اٹھانے کی غرض سے ایک معصومانہ ناراضگی کے ساتھ بولا: "اب تک ان عورتوں کی ہرزہ سرائی کو میں قابل التفات نہ سمجھتا تھا۔ مگر جبکہ میرا وقار مجروح کیا جانے لگا تو مجھے بھی بولنے کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ عورتیں کسی اور مفسد کی آلۂ کار بنی ہوئی ہیں۔"

سعد۔ "گڈریہ کیا بک رہی ہیں مجھے سمجھاؤ تو سہی تاکہ میں ان کو تمہاری تجویز کردہ سزا دے سکوں (اپنے وزیر سے) آپ بھی اس معاملہ میں مہابت کی مدد کیجئے میں غسل وغیرہ سے فارغ ہو کر ابھی آتا ہوں۔ طاہرہ کا گواہ طلب کیا گیا ہے آتا ہی ہوگا۔" مہابت کو اطمینان ہوا کہ اس کو خود کو اپنے مقدمہ کا حکم بنا دیا گیا۔ شاہ چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد پھر گڈریہ کے بوسیدہ لباس میں عدالت کے اندر آگیا وزیر اعظم نے اس کی جانب نگاہِ عتاب دیکھکر دریافت کیا: "کیا تم نے ان دونوں عورتوں کو ورغلا کر نائب السلطنت مہابت کے خلاف ان سے کوئی استغاثہ دائر کرایا ہے؟"

سعد۔ "ہمارا بادشاہ کہاں ہے؟ میں صرف اس سے بات کرنی چاہتا ہوں۔"

وزیر۔ "وہ بھی یہیں رونق افروز ہونے والے ہیں تم اپنا بیان تو قلمبند کراؤ۔"

سعد: "بہت مبارک۔" اس کے بعد سعد نے بادشاہ کی شان میں بہت سے گستاخانہ کلمات کہے کہ وہ معصوم طاہرہ کی مرافعت میں خود کیوں نہ موجود رہا۔ اُسی شخص کے ہاتھ میں فیصلہ کیوں دیا گیا جو ملزم ہے۔ پھر مہابت کی بہت سی بے اعتدالیاں کیں وزیر اعظم اس کے گستاخانہ بیان سے سخت غصہ ہوا اور اس کو جیل میں لیجانے کا حکم دیا۔ سپاہی گڈریہ کی طرف لپکے مگر وہ کمال بے پرواہی کھڑا رہا۔ نہایت اطمینان سے اپنے بوسیدہ جبے کو اتار کر ایک طرف ڈالدیا۔ محو حیرت حاضرین بالخصوص مہابت کے استعجاب خوف کے اضافہ کرنے کو شاہانہ لباس میں خود ان کا بادشاہ موجود تھا۔

سعد۔ (خسروانہ التفات سے) "طاہرہ! ادھر آؤ وہ تمہارا اصلی کارگذار یہ تمھارے سامنے موجود ہے۔ تم متعجب کیوں ہو میں اس وقت بھی راعی تھا اور اب بھی ہوں۔ مایوس نہ ہو اب بھی تمھارے کام آنے کو تیار ہوں۔"

طاہرہ۔ (لصبہ معذرت) "سکندر سطوت بادشاہ معاف کر! آہ مجھ جیسی تیری ادنی کنیز نے اپنے آقا کو اس قدر زحمت دی اور اس کے ساتھ مودبانہ طرز عمل رکھنے میں قاصر رہی" سعد مسکرا رہا تھا۔ وہ حسین طاہرہ کے پاک ضمیر کو تھوڑا سا اور آزمانا چاہتا تھا اس لئے بھی ظاہر نہیں کیا کہ جلال زندہ ہے۔ مہابت پر ایک ناگفتہ بہ عالم طاری تھا۔ یہ خیال آتے ہی کہ اُس کے تمام جرائم پر سعد کی نظر رہی ہے کانپ اُٹھا اور شکستہ آواز میں بولا "اف صاحب اقتدار سلطان! میری تمام بداعمالیوں پر تو نے خدائی فرشتہ کی طرح نظر

رکھی ہے۔ میں فرط ندامت سے تجھ سے آنکھ نہیں ملا سکتا۔ اب خدا کے واسطے میری موت کا جلد حکم فرما یہ آرزو ــــــ"

سعد۔ (تیز آواز میں) مہابت! تو موت سے بھی سخت تر سزا کا مستحق ہے اچھا اس کو یہاں سے ہٹاؤ اور اسی خون آشام تبر سے اسکا سرتن سے جدا کر دو جس سے اس نے بیکس جلال کو قتل کرایا ہے۔ اور اس کی بیوہ سلمیٰ کو اس کی تمام دولت وجائداد بخشدی جائے۔"

سلمیٰ۔ (شاہ کے آگے دامن پھیلا کر) رحم آقا! میں مجھ سے کوئی دولت طلب نہیں کرتی صرف میرے شوہر کی جان بخشدے"۔ اس کے بعد جسطرح طاہرہ نے اپنے بھائی کی جان بخشی کے لئے مہابت سے درخواست کی تھی اسیطرح سلمیٰ ایک ناسپاس شوہر اور چند گھنٹے پیشتر کے صاحب اقتدار فرمانروا کی جان بخشی کے لئے سعد کے سامنے زار وقطار رو رہی تھی۔ عورت کو بھائی کی محبت زیادہ ہوتی ہے یا شوہر کی؟ اس کا اندازہ لگانا مشکل تھا کیونکہ دو مختلف شخصوں سے اس موضوع پر اپیل کی گئی تھی۔

سلمیٰ (عاجزی سے) "رحم کر اے رعایا کے محافظ! خدا کیواسطے رحم کر! ــــــ (طاہرہ سے) پیاری طاہرہ تم بھی میری وکالت کرو۔ میری تضرع کی شریک ہو۔ میری بقیہ زندگی کی غمگین ساعتیں اگر تم اس سفارش کے صلہ میں طلب کروگی تو میں دینے میں دریغ نہ کرونگی خدا کے لئے کسی طرح میرے شوہر کو بچالو"۔

سعد" نہیں سلمیٰ! طاہرہ کو اپنی آہ وزاری کی شریک بننے کی ترغیب نہ دو۔ اس کے بھائی کی روح اپنے بعد اب کسی کے لئے اس کی آہ وزاری کی ضرورت نہیں سمجھتی" مگر سلمیٰ پھر ممنت طاہرہ سے مخاطب ہوئی "اچھی طاہرہ! تم سفارش میں خواہ لب کشائی نکرو لیکن میرے ساتھ شاہ کے قدموں میں تم بھی گر جاؤ۔ میں سب کچھ کہونگی تم چپ چاپ رہنا۔

سعد۔ نہیں سلمیٰ اس کو مجبور نہ کرو"۔

سلمیٰ۔ سلطان! مہابت آخر انسان ہی تو ہے۔ فطرت کی غیر ارادی پستی بعض وقت انسان سے بہت سی سفیہانہ حرکات سرزد کرادیتی ہے میں اچھی طرح آگاہ ہوں کہ مہابت کی فطرت اس قدر پست نہیں ہے جس قدر ایک غیر متوقع عروج نے اسکو کردیا تھا جب وہ اپنے اصلی مدارج پر فائز ہو جائیگا تو پھر وہی محبت پرست شوہر اور وفا شعار وخیر خواہ رکن سلطنت ثابت ہوگا ــــــ"

سعد۔ سلمیٰ تیرا فلسفہ نرالا ہے۔ تیرے خیال میں یہ میرے بخشے ہوئے اختیارات تھے جنھوں نے اس کی فطرت کو پست کر ڈالا۔ میں اور کچھ نہیں جانتا اسکو بہرصورت جلال زمی کی بدنصیبی کا شریک ہونا پڑے گا۔ لیکن اسکی طاہرہ ــــــ ہاں طاہرہ سعد کے پاک دل پر قابض ہو چکی تھی آگے بڑھی اور گرمجوشی کے ساتھ کہنے لگی میرے آقا یہ خیال فرمائے کہ مہابت جلال زمی ہے اور طاہرہ اس کی جان بخشی کی استدعا لیکر تیرے حضور میں گڑگڑا رہی ہے۔ چونکہ تو میری پُر درد درخواست سے اس کی جان بخشی کر سکتا تھا خدا جانے اس کو یہ یقین کیوں ہوگیا تھا اس لئے مہابت کی جان بھی بخشدی۔ میرے بھائی کا جرم مہابت کے قانون کی رو سے فی الحقیقت سزا موت کے قابل تھا۔ مگر مہابت کا جرم بھول" تیرے آئین محمدی میں قابل عفو ہونا چاہیے"۔ سعد نے چپکے سے جلال کو بھی بلا بھیجا تھا۔ اپنے بھائی کو زندہ سلامت دیکھکر طاہرہ فرط مسرت سے اس سے لپٹ گئی۔

سعد نے طاہرہ سے محبت بھرے الفاظ میں کہا "پیاری طاہرہ! میں تیری نازآفرینی کی خاطر مہابت کی خطا معاف کرتا ہوں عصمت آمانا زنین تو میرے دل کی ملکہ ہے (مہابت سے) تم کو اپنی وفاپرست بیوی کے قربان جانا چاہئے جس کی محبت کی سفارش نے تمھاری جان بچادی"۔

اس کے بعد شمیمہ کی شادی جلال سے ہوگئی اور طاہرہ جیسی عفیفہ دوشیزہ سے سعد نے عقد کیا۔ پھر شیراز کا ہر شخص قانون کی قدرت محبت کی اپیل اور بادشاہ کے عدل وانصاف کے حقیقی معنے سے واقف ہوگیا۔

(قیسی رامپوری)

(شکر ،

شمالی ہند اور دکن

عہد شاہجہاں

ہم پہلے یہ دکھا چکے ہیں کہ وہ کیا اسباب تھے جن کی بنا پر فتوحات جہانگیری کو آخری زمانہ میں بڑا نقصان پہونچا اور دکن کا وہ حصہ جو برسوں کی جد وجہد اور جان و مال کے بے انتہا نقصان کے بعد حاصل ہوا تھا وہ قبضہ سے نکل چکا تھا۔ بلا شبہ ہم کو یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ نورجہان کی خود غرضی اور شہریار کو تخت نشین کرانے کی جد وجہد نے مغلیہ اغراض کو دکن کے معاملات میں بیحد نقصان پہونچایا، شاہجہان کی بغاوت کے زمانہ میں ملک عنبر جسکو شاہ بلند اقبال نے ۱۶۲۲ء میں بیحد تنگ کر کے صلح کرنے اور قدیم مقبوضات کے واپس کرنے پر مجبور کیا تھا دوبارہ قوی ہوگیا خاندان شاہی کے دو فریقین کے درمیاں نزاع پیدا ہو جانیکی وجہسے اسکو اپنے ذاتی مفاد کے حصول سلطنت کی توسیع اور گئے ہوئے علاقہ کے حاصل کرنے میں بڑی مدد ملی، وہ ایسا شخص تھا جسنے اس زریں موقعہ سے فائدہ اٹھانے میں ذرا بھی کوتاہی نہیں کی، اس نے اپنے پرانے رقیب اور قوی دشمن یعنی شاہجہان کی رفاقت قبول کی، اور اس کو اپنا ہمخیال بنا کر مغلیہ سلطنت کے خلاف جنگی کارروائی شروع کر دی، قلعہ شولاپور فتح کر لینے کے بعد اس نے شاہجہاں کی امداد سے برہان پور (مغلیہ پایہ تخت دکن) کا محاصرہ کر لیا، گویا کہ ۱۶۲۶ء کے اختتام تک ملک عنبر دوبارہ شاہی مقبوضات کے بڑے حصہ پر قابض ہوگیا، لیکن ملک عنبر کی وفات کے بعد نظام شاہی مملکت میں کوئی ایسا شخص نہ تھا جو اُس کی اہم تجاویز کو کامیاب بنا سکے اور اس کے عظیم الشان کام کو انجام دے سکے، اگرچہ ملک عنبر کے لڑکے فتح خان نے باپ کی جگہ لی، تاہم وہ اپنی نااہلی کی وجہ سے برہان نظام شاہ کو جو عرصہ سے مقید تھا اپنے قبضہ میں نہ رکھ سکا، یاقوت خان سپہ سالار فتح خان کا مخالف تھا یاقوت خاں اور فتح خاں معاملہ کی یکسوئی کے لئے سلطنت مغلیہ کی پناہ میں آنیوالے ہی تھے کہ اسی عرصہ میں حمید خاں کو برہان نظام شاہ نے سپہ سالار مقرر کیا، اور اس نے برہان نظام شاہ کے کان فتح خاں کے خلاف خوب بھرے اور اس کو ایک قلعہ میں قید کر دیا، جس کی وجہ سے عنبری سرداروں کو خطرہ پیدا ہوا، اور جب انھوں نے مملکت کی حالت اس قدر نازک دیکھی تو بھاگ کر مغلوں کی پناہ میں جانے کا ارادہ کر لیا۔ چنانچہ جنگیز خان، جمشید خان اور آتش خاں جیسے بہادر عنبری سرداروں نے مغلیہ حکومت کی ملازمت قبول کر لی، لیکن باوجود اس کے حمید خان سپہ سالار افواج نظام شاہیہ نے نہایت جرأت سے کام لیا اور سلطنت مغلیہ سے اعلان جنگ کر دیا، اور مہابت خان و نورجہاں کی مخالفت سے فائدہ اٹھا کر ملک خاندیس و برار کی تاخت کے لئے ایک عظیم الشان فوج کے ساتھ روانہ ہوا۔ خانجہاں لودھی بھی مغلیہ فوج کے ساتھ ان کا مقابل ہوا، مگر حمید خان کی بیوی نے ایسا کھیل کھیلا اور ایسی داد شجاعت دی کہ "بازار رزم و فوجکشی بہ بزم دلجمعی تبدیل یافت"۔ اور خانجہان نے بالاگھاٹ کا تمام علاقہ پانچ لاکھ ہون کے عوض نظام شاہیوں کے ہاتھ فروخت کر ڈالا، اس وقت سوائے قلعہ احمدنگر کے بقیہ تمام ملک مغلوں کے قبضہ سے نکل گیا تھا۔

---

[51] رسالہ "نگار" بابت فروری ۱۹۲۶ء [52] بساتین السلاطین صفحہ ۲۸۷ [53] منتخب اللباب جلد اول صفحہ ۳۸۴

الغرض دکن کی یہ حالت تھی جب کہ شاہجہان صاحبقران ثانی تخت نشین ہوا، شاہجہان دکنی معاملات سے بخوبی واقف تھا، اپنی ولیعہدی کے زمانہ میں دو مرتبہ دکن پر فوجکشی کر چکا تھا، وہ اپنے زمانہ کا بہترین سپہ سالار اور جنگجو سپاہی تھا، علاوہ بریں تخت نشینی کے بعد اس نے سلطنت کے اندرونی انتظام کی طرف توجہ کی اور جب ان امور سے فارغ ہو گیا، جب سلطنت مغلیہ میں چاروں طرف امن وامان قائم ہوا اور سلطنت بہار کے پرجوش اور سرور انگیز منزل کو پہونچگئی تو اس نے اسی قدیم طرز عمل کا اعادہ کیا یعنی دکن کی طرف توجہ کی، اور دکن میں سخت گیر (vigorous) طرز عمل کا آغاز کیا، نظام شاہ اور شاہجہاں کے تعلقات بالا گھاٹ کے علاقہ کی وجہ سے نازک ہو گئے تھے، شاہجہاں نے نظام شاہ کے نام فرمان بھیجا، چنانچہ نظام شاہ نے بالا گھاٹ کا علاقہ سنہ ج میں واپس کر دیا، لیکن ساتھ ہی روپیہ اور فوج سے ساہو کی مدد کی تاکہ وہ " درزمین خاندیس شورش برانگیختہ سپاہ ...... راندبذب الحال دمتردو الحال گرداند"[۱] علاوہ ازیں اسی زمانہ میں خانجہاں لودھی نے علم بغاوت بلند کیا اور نظام شاہ کے پاس جاکر پناہ لی نظام شاہ نے " برائے مقابلہ فوج بادشاہی" ایک زبردست فوج بھیجی، ایک باغی کو، راندۂ درگاہ شاہجہانی کو پناہ دینا ایسا جرم تھا کہ شاہجہان اس کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا، چنانچہ شاہجہان بذات خود دکن کی طرف روانہ ہوا اور اعلان جنگ کرکے تین طرف فوجیں روانہ کیں،

خانجہان لودھی اور نظام شاہ کا اتحاد مصلحت سے خالی نہ تھا، برہان نظام شاہ کا مقصد یہ تھا کہ خانجہان کی امداد کرکے نہ صرف اپنے مقبوضات حاصل کرے بلکہ اس منحوس دن کی نوبت ہی نہ آنے دے جس کا خطرہ اس کو لگا ہوا تھا اور جس کی ابتدا اکبر اعظم کے زمانہ سے ہوئی تھی، لیکن جب خانجہان کو برہان نظام شاہ کی اس "غرض آلود دوستی" کا پتہ چلا تو وہ شمال کی طرف روانہ ہو گیا، اور شاہنشاہی افواج نے پوری قوت کے ساتھ علاقہ نظام شاہی پر حملہ شروع کر دیا، اور سب سے پہلے قلعہ دھارور کا محاصرہ کیا،

قبل اس کے کہ مزید حالات بیان کئے جائیں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دکھنی سلطنتوں کی حالت اور ان کے طرز عمل کا تذکرہ کر دیا جائے اس لئے کہ اب مغلیہ سلطنت کو نظام شاہی سلطنت کے علاوہ بیجاپوری اور گولکنڈہ کی سلطنت سے بھی سابقہ پڑنے والا تھا،

جب سے شمال کی طرف مغلوں کے حملوں کا خوف لاحق ہوا اس وقت سے حکومت بیجاپور نے اپنا یہ اصول ہی بنا لیا تھا کہ اپنے ہمسایہ سلطنت کی اعانت کرے اگرچہ نظام شاہیوں کی ناشکر جماعت نے نیکی کا بدلہ بدی ہی دیا اور جب دیکھو سلطنت عادل شاہی پر چڑھ آتے تھے، لیکن باین ہمہ سلطان ابراہیم عادل شاہ کے دل میں ذرا ہراس نہ آیا، وہ بڑا مدبر اور دور اندیش تھا اس نے مصلحت اور معاد رسی میں دیکھا کہ احمد نگر جو مملکت حاجب (Buffer State) ہے اس کی دولت وثروت قائم رہے اس کو اس بات کا احساس تھا کہ وہ اکیلا مغلیہ طاقت کا مقابلہ نہیں کر سکتا، پس اس کی ضرورت تھی کہ شاہجہاں کو نظام شاہ کے ساتھ ہی برسرپیکار رہنے دیا جائے، سلطان ابراہیم بخوبی جانتا تھا کہ نظام شاہی ملک کی تسخیر کے بعد مغلیہ افواج اس کے ملک کی طرف پیشقدمی کریں گی، اور اس کا وجود معرض خطرہ میں پڑ جائیگا، چنانچہ اس کی پالیسی یہ تھی کہ نظام شاہی سلطنت کی امداد کی جائے، سلطنت گولکنڈہ مقابلتہً کمزور تھی، اور مزید براں بیجاپور اور گولکنڈہ کے درمیان جنوبی سرحد کے جھگڑوں اور پیچیدگیوں کی وجہ سے ناموافقت تھی، جس کا

[۱] بادشاہ نامہ جلد اول صفحہ ۲۵۱

نتیجہ یہ نکلا کہ گولکنڈہ کی سلطنت نے ادنیٰ سے دباؤ پر مغلوں کی اطاعت قبول کرلی، یہ وقت تو ایسا تھا کہ دکن کی یہ تینوں سلطنتیں متحد ہو کر مشترک دشمن کا مقابلہ کرتیں اس لئے کہ احمد نگر کا وجود ان کو خطرۂ عظیم سے محفوظ رکھتا تھا۔ اس نکتہ کو سلطان ابراہیم نے بخوبی سمجھ لیا تھا چنانچہ نظام شاہیوں کی احسان فراموشی کے باوجود احمد نگر کی امداد کی طرف سے غافل نہیں رہا۔ بعد کی تاریخ اس امر کی تصدیق کرتی ہے کہ جب احمد نگر کی سلطنت پارہ پارہ ہوگئی اور اس کا بڑا حصہ مغلیہ سلطنت میں داخل ہوا اسی وقت دکن کی دیگر سلطنتوں کو مغلیہ سلطنت سے براہ راست مقابلہ کرنا پڑا۔ بالآخر شہنشاہ اورنگ زیب کے زمانہ میں گولکنڈہ اور بیجاپور کی سلطنتیں مغلیہ عملداری میں داخل ہوگئیں

ملک عنبر نے باوجود سلطان ابراہیم کی رفاقت کی اس کے خلاف خودکشی کی، اور ۱۰۳۳؁ھ ہجری میں بیجاپوری لشکر کو بمقام بھتوری شکست دیکر بیجاپوری علاقہ کو لوٹ مار کر کے ویران کردیا۔ اور ۱۰۳۴؁ھ ہجری میں شہر نورسپور کی جسے سلطان نے نہایت درجہ شوق اور دلچسپی سے بنایا تھا اینٹ سے اینٹ بجادی[۵۱]۔ بیجاپور میں امراء کے دو فریق تھے ایک مغلوں کا ساتھ دیکر نظام شاہیوں کی بیخکنی کرنا چاہتا تھا، اور دوسرا نظام شاہی سلطنت کو بطور مملکت حاجب کے برقرار رکھنا چاہتا تھا، کہ مغل اسی سلطنت سے مصروف جنگ و پیکار رہیں اور بیجاپوری حکومت در پردہ اس کی اعانت کر کے مغلوں کی طرف سے محفوظ رہے مصطفیٰ خاں دربار بیجاپور کا ایک جلیل القدر رکن چاہتا تھا کہ نظام شاہیوں کو تباہ و برباد کردیا جائے، اور نورسپور جیسے بنے بنائے شہر کو برباد کرنے کا بدلہ لے اس کی یہ دلی خواہش تھی کہ مغلوں کا ساتھ دیکر نظام شاہیوں کی بیخکنی کی جائے، شاہجہاں نے ۱۰۳۸؁ھ ہجری میں شیخ معین الدین کو بیجاپور اور شیخ محی الدین کو گولکنڈہ برہان پور سے روانہ کیا، شیخ معین الدین تہنیت نامہ جلوس لیکر پہونچا، اس کو نہ صرف بطور ایلچی مبارکباد کے لئے بھیجا گیا تھا بلکہ اجازت دی گئی تھی کہ وہ عادل شاہی حکومت سے نظام شاہ کے خلاف معاہدہ کرے، اور اس بات کا عہد کرے کہ نظام شاہیوں کا قلع قمع کرنے کے بعد آدھا ملک عادل شاہیوں کو دیدیا جائے گا۔ جب یہ سوال سلطان محمد عادل شاہ کے ارکین دولت کے روبرو پیش ہوا تو ان کے دو فریق نے اس مسئلہ پر دو طرح پر روشنی ڈالی، مصطفیٰ خاں نے اس موقعہ کو غنیمت جانا، اس نے یہی بہتر خیال کیا کہ شاہجہاں سے ملکر نظام شاہی علاقہ کو نیست و نابود کر ڈالا جائے اور نصف ملک حاصل کیا جائے۔ فریق ثانی کا سربرآوردہ سردار خواص خان تھا جو یہ کہتا تھا کہ شاہجہاں زبردست بادشاہ ہے، نظام شاہی حکومت، ہماری اور اس کی حکومت کے درمیان واقع ہے، لہذا ہمکو اپنے مصالح ملکی کے لحاظ سے اس خاندان کی پرداخت اور تقویت کی کوشش کرنا چاہئے، اگر یہ علاقہ جو حد فاصل ہے نہ رہا تو براہ راست مغلوں سے سابقہ پڑے گا، اور اس وقت مخالفت کا تدارک سخت دشوار ہوگا[۵۲]، بالآخر مصطفیٰ خاں نے کوشش کر کے خواص خان کو اپنا طرفدار بنایا، اور یہ طے پایا کہ رندولہ خان (سپہ سالار افواج عادل شاہی) کی سرکردگی میں ایک بڑی فوج مغلوں کی امداد کے لئے بھیجی جائے، مختصر یہ کہ نظام شاہی سلطنت کی نصفا نصف تقسیم کے متعلق عادل شاہیوں کو مغلوں کے درمیان عہد و پیمان واثق و مکمل ہوا، اور سلطان محمد نے ایلچی کو خلعت وغیرہ دیکر رخصت کیا، لیکن ایلچی کے

---

[۵۱] بساتین السلاطین صفحہ ۲۹۰ و ۲۹۱، [۵۲] بساتین السلاطین صفحہ ۲۹۲

روانہ ہونے کے چند ہی دن بعد یہ خبر ملی کہ مغلوں نے عہد شکنی کی ہے، اور ان کی فوج چڑھتی چلی آرہی ہے تو سلطان محمد عادل شاہ نے فوراً شیخ معین الدین کو راستہ سے پکڑوا منگاکر قید کر دیا۔

مغلیہ فوج دکن میں نظام شاہی تسخیر کے لئے مقیم تھی اور شاہجہان خود برہان پور میں ٹھیرا ہوا تھا، نظام شاہ کے خلاف ایسی جارحانہ کارروائیوں کا آغاز ہوا کہ رفتہ رفتہ اس جنگ نے مہلک صورت اختیار کی اور بالآخر ایک قدیم اسلامی سلطنت مغلوں کے زبردست حملوں کی تاب نہ لاکر تباہ و برباد ہوگئی، اب ان حملوں کی نوعیت اور جنگی کارروائیوں کے سمجھنے کے لئے اس کی ضرورت ہے کہ علاقہ احمد نگر کی جغرافی حالت پر غور کیا جائے جس سے فوجی نقل و حرکت اور اس علاقہ کے قلعہ جات کے اثرات کا بخوبی اندازہ ہو سکے،

یہ حصہ دکن زیادہ تر پہاڑیوں پر مشتمل ہے جنکی بلند اور دشوار گذار چوٹیوں پر قلعے بنے ہوئے ہیں، ان قلعوں پر مختلف محال اور پرگنوں کا انحصار ہے اور فوجی نقطۂ نظر سے ان کی اہمیت بہت زیادہ ہے، کل سلطنت احمد نگر کی حفاظت انھیں قلعوں کے ذریعہ ہوتی ہے، ان میں سے نہایت اہم قلعہ دولت آباد، قلعہ قندھار، قلعہ دھارور اور قلعہ پرینڈہ ہیں، یہ قلعہ نہ صرف دشمن کے محاصرہ کرنے کے وقت جائے پناہ کا کام دیتے ہیں بلکہ تمام علاقہ کی حفاظت کرتے ہیں، نہیں سے تازہ دم امداد وقت ضرورت نہایت آسانی کے ساتھ روانہ کیجاتی ہے، ان قلعوں کا فتح ہونا گویا تمام سلطنت پر قبضہ کا حاصل ہونا ہے۔

رندولہ خان اگرچہ مصطفےٰ خاں کے حکم سے بھیجا گیا تھا، تاکہ مغلیہ فوج کی امداد کرے مگر اس نے خواص خان اور دیگر امراء کے اشارہ سے مغلوں کی کوئی مدد نہ کی، جب اعظم خان نے قلعہ دہارور فتح کر لیا تو رندولہ خان نے اس کے ہاں پیام بھیجا کہ سلطان محمد عادل شاہ، شاہجہاں کا سچا بہی خواہ ہے اور اُس نے مجھے بھیجا ہے کہ آپ سے ملکر نظام شاہ کی گوشمالی کروں، لہذا حسب صلحنامہ فتح شدہ قلعہ دھارور ہمارے حوالہ کر دیا جائے، لیکن اعظم خان بخوبی جانتا تھا کہ "اوباب نظام در مقام موافقت است" اور انکی اس پالسی کو بھی خوب سمجھتا تھا کہ "عادل شاہیہ در باطن نمی خواستند کہ استیصال نظام الملک باکل شود"، لیکن مصلحت وقت دیکھکر جواب دیا کہ "بادشاہ کا یہ حکم ہوا تھا کہ عادل شاہ خود سعی و تردد کر کے قلعہ جات مذکورہ پر متصرف ہو جائے اور نظام شاہی ملک کی تہذیب اور تفریق جمعیت میں لشکر شاہی کی مدد کرے لیکن تم نے اس وقت مدد نہ کی اور اب قلعہ دہارور کی خواہش کرتے ہو جو بالکل بیجا ہے، اگر اب بھی تم ہمارا ساتھ دیتے ہوئے قلعہ قندھار کی تسخیر میں مدد دیکر تلافی گذشتہ کرو اور جاکر گھاٹ کا راستہ روکو تو پھر شاہجہاں کے پاس سفارش کریں گے" اعظم خاں خود نصیری خان کی مدد کے لئے روانہ ہوا جو قلعہ قندھار کا محاصرہ کئے پڑا تھا، لیکن بعد کو افواج نظام شاہی کا تعاقب شروع کیا، نظام شاہ کی حالت پرخطر تھی، قلعہ دہارور معہ مضافات مغلوں کے قبضہ میں تھا، قلعہ قندھار کے توابع نصیری خان کے تحت تھے، اور وہ محاصرہ کئے پڑا تھا، کوکش میں ناسک پر خواجہ ابوالحسن سردار مغلیہ قابض تھا، بیضاپور، چیسر اور اس کے نواح ساہو کو بطور جاگیر عطا کر دئے گئے تھے جو اب نظام شاہ کا مخالف تھا، نظام شاہ کے قبضہ میں قلعہ دولت آباد اور چند محال تھے

لہ بساتین السلاطین صفحہ ۲۹۳، لہ بادشاہنامہ جلد اول حصہ اول صفحہ ۳۲۲ لہ منتخب اللباب جلد اول صفحہ ۴۰۱ لہ منتخب اللباب جلد اول صفحہ ۴۱۷ اور بادشاہ نامہ جلد اول صفحہ ۳۵۲

اب افواج نظام شاہی کے لئے صرف ایک راستہ تھا یعنی طرف رندولہ خان متعین کیا گیا تھا، لہذا مقرب خان اور بہلول خاں رندولہ خاں کی طرف رجوع ہوئے اور اس کو موقع کی نزاکت جتا کر اتحاد و موافقت کی درخواست کی اور شولاپور جس کی نسبت "نزاع موروثی" تھی معہ توابع رندولہ خاں کے حوالہ کرکے مصالحت کرلی، جب اعظم خان کو پے در پے اس قسم کی خبریں ملیں تو اُس نے شاہجہان سے کمک کی درخواست کی اور مجبوراً خود پرینڈہ کے محاصرہ کے لئے روانہ ہوا، جب عادل شاہ اور نظام شاہ متحد ہوگئے تو ان کے اتحاد کا یہ نتیجہ ہوا کہ مغلوں کو سخت دقتوں کا سامنا کرنا پڑا، اعظم خان نے قلعہ قندہار کی نازک حالت سنکر نصیری خاں کا امداد کے لئے پرینڈہ کا محاصرہ چھوڑکر کوچ پر کوچ کرتے ہوئے دھارور میں جاکر دم لیا، اسی دوران میں دکن میں عظیم الشان قحط پڑا جسکی وجہ سے رسد، چارہ، اور گھاس کی دستیابی محال ہوگئی،

یہ بیان کیا جاچکا ہے کہ نصیری خان قلعہ قندھار کا محاصرہ کئے پڑا تھا مقرب خان سپہ سالار افواج نظام شاہی اور رندولہ خان نے نصیری خان پر حملہ کیا، لیکن اعظم خان موقعہ پر مدد کو پہونچا، اور ان کو شکست ہوئی اور قلعہ مذکور مفتوح ہوگیا، جس کا فوری اثر دربار نظام شاہی میں انقلاب کی صورت میں ظاہر ہوا، فتح خان کو پھر عروج ہوا، اس نے بعض مورخین کے بیان کے مطابق مغلوں کے اشارہ پر برہان نظام شاہ کو مروا ڈالا، اور حسین نظام شاہ کو تخت پر بٹھایا اور آصف خان کے ذریعہ مغلوں کی اطاعت قبول کرلی، شاہجہان نے فتح خاں کو نظام شاہی سلطنت پر بطور نمائندہ کے مقرر کیا، عبدالحمید لاہوری مصنف بادشاہ نامہ لکھتا ہے کہ شاہجہاں نے حکم دیا، کہ فتح خاں، برہان نظام الملک کا خاتمہ کردے جس کی تعمیل کی گئی، لیکن خافی خان اس سے اختلاف کرتا ہوا بیان کرتا ہے کہ اس نے عرضداشت روانہ کرنے کے قبل برہان نظام شاہ اور مخالف جماعت کے بہت سے اراکین مثلاً خواص خان اور شمشیر خاں کا خاتمہ کردیا، اور اکثر کو قید کردیا اور حسین نظام شاہ کو جس کی عمر دس سال کی تھی اس کا جانشین مقرر کیا، بہرحال شاہجہاں نے حسین نظام شاہ کی "یتیمی و مظلومی" کا خیال کرتے ہوئے تمام ملک نظام شاہیہ بحال کردیا، ادھر سلطان محمد عادل شاہ اکیلا رہ گیا تو شاہجہاں نے اُس کے خلاف آصف خان کو نامزد کرکے روانہ کیا اور حکم دیا کہ اگر سلطان محمد عادل شاہ اپنے والد کی طرح لوازم اطاعت و مراسم انقیاد بجا لائے اور پیشکش بھیجے تو اسکو اپنی حالت پر چھوڑ دیا جائے اور اگر شاہراہ مطاوعت سے تجاوز کرے تو اس کا اچھا ملک و مال ضبط کرلیا جائے اور باقی کو خراب کر ڈالا جائے۔

چنانچہ آصف خان فوج عظیم کے ساتھ روانہ ہوا، جو قلعے اس کی راہ میں پڑے فتح کرتا ہوا عادل شاہی عملداری کے قصبہ کلانور پہونچا یہاں سے ہوتا ہوا حوالی بیجاپور میں پہونچکر نورسپور اور شاہ پور کے درمیان ڈیرہ ڈالے، اور قلعہ بیجاپور کا محاصرہ کیا، لیکن بیجاپوری بھی غافل نہ تھے، جس وقت کہ دھارور کے نہ دینے پر مغلوں سے بیجاپوریوں نے مخالفت کا اظہار کیا تھا اسیوقت سے انھوں نے تیاری شروع کردی تھی اور بیجاپور کا معقول انتظام کرلیا تھا، جس قدر سامان رسد اور سلاح جنگ میسر ہوسکا اس قدر جمع کرلیا، اور بیجاپور سے بیس تیس میل تک گھاس اور چارہ کا نام و نشان نہ چھوڑا، جو کچھ اپنے واسطے مطلوب تھا اسے تو قلعوں میں رکھوا لیا، اور باقی

لہ منتخب اللباب جلد اول صفحہ ۴۵۲ ۔ ۲ہ بادشاہ نامہ جلد اول حصہ اول صفحہ ۴۰۴، اور منتخب اللباب جلد اول صفحہ ۴۶۲

سب کو آگ لگا کر جلا ڈالا[۵۱] آصف خان کے پہونچنے کے بعد ہر روز آصف خان کی اور عادل شاہی فوج سے کھیتوں میں لڑائی ہوتی، آصف خان کی فوج کی فتح ہوتی لیکن یہ ایسی لڑائی نہ تھی جس سے عادل شاہیوں کو نقصان اور مغلوں کو فائدہ پہونچتا، اس لڑائی کے دوران میں آصف خان سے صلح کی گفتگو بھی ہوتی رہی لیکن عہد نامہ مرتب نہ ہوسکا۔ مصطفٰے خان، شاہجہاں سے صلح کرانا چاہتا تھا[۵۲]، لیکن خواص خان کی رائے اُس کے خلاف تھی، اگرچہ مصطفٰے خان کی رائے بہت اچھی تھی اور ملک و رعایا کے لئے مفید تھی مگر عادل شاہی امرا کے دل میں یہ بات جمی ہوئی تھی کہ مغلوں کی اطاعت سے اُن کی حکومت میں خلل پڑ جائیگا، اس لئے تمام عادل شاہی امرا خواص کے طرفدار تھے۔ اسی بنا پر مغلیہ فوج کے مقابلہ کے لئے تلے ہوئے تھے، چنانچہ مصطفٰے خان اور خواص خان دونوں سلطنت کے خیر خواہ تھے۔ اسواسطے ایک صلح سے اور دوسرا لڑائی سے حکومت کو فائدہ پہونچانا چاہتا تھا۔ دراصل یہی اختلاف رائے بڑا سبب تھا جس کی وجہ سے صلحنامہ مرتب نہ ہوسکا، لڑائی برابر جاری رہی، دکھنوں نے لشکر شاہی کو بحد پریشان کیا، اور رسد کی کمی سے مجبور ہو کر آخر کار آصف خان نے محاصرہ اُٹھا لیا، اور شولاپور کی طرف کوچ کیا، آصف خان کے تعاقب میں بیجاپوری فوج بھی لوٹتی مارتی شولاپور تک برابر پیچھا کرکے واپس آئی[۵۳]، اسی دوران میں سلطان محمد عادل شاہ کو ایک موقعہ اور ہاتھ آیا، ساہو جو نظام شاہی حکومت کا جاگیردار تھا، اور فتح خان نے جس کی جاگیریں چھین لی تھیں، بیجاپور آکر مراری پنڈت اور رندولہ خان کو یہ باور کرایا کہ اگر اس کی امداد کی گئی تو وہ قلعہ دولت آباد فتح کرکے عادل شاہوں کے حوالہ کر دیگا[۵۴]، مشترکہ مقصد کی وجہ سے عادل شاہی اور ساہو جی کی فوج متحد ہو کر سنہ ۱۰۴۲ ہجری میں قلعہ دولت آباد پر حملہ آور ہوئی، اس خبر کے سننے کے بعد خان زماں خان بھی سیحر دولت آباد کے لئے روانہ ہوا، فتح خاں کی اطاعت کیوجہ سے امرائے نظام شاہی کی ایک جماعت اس کے مخالف ہوگئی تھی جب عادل شاہ اور ساہو کی متفقہ فوج نے دولت آباد پر حملہ کیا تو اس نے مہابت خاں سے مدد طلب کی، اسی عرصہ میں اندولہ خان نے فتح خاں سے گفت و شنید کا سلسلہ جاری کیا، اور یہ پیغام بھیجا کہ "افواج مغلیہ کا مقصد یہ ہے کہ دولت نظام الملک کا بالکل استیصال کر دے، دولت آباد کے قلعہ کو فتح کرنے کے بعد بیجاپوری سلطنت پر حملہ کرے، اور چونکہ ان دونوں سلطنتوں کی قسمت ایک دوسرے سے وابستہ ہے لہذا ہمارا یہ مقصد ہے کہ خاندان نظام شاہی کو تباہی سے بچائیں" الغرض صلح ہوگئی[۵۵] معرکہ کارزار گرم ہوا تو مزید فوج مراری کی سرکردگی میں سلطان محمد نے بھیجی، لیکن مراری کی ناعاقبت اندیشی سے دکھنیوں کو شکست ہوئی اور دولت آباد مغلوں کے قبضہ میں چلا گیا[۵۶]۔ اس واقعہ کے بعد سلطان محمد اور شاہجہاں کے درمیان ناچاقی اور بڑھ گئی، بیجاپوری ہزیمت خوردہ براہ ناسک و تریبنک فرار ہوئے رساہو نے محبوس نظام شاہ کو آزاد کرکے برائے نام بادشاہ بنا لیا اور نواح دولت آباد میں تاخت و تاراج شروع کر دی[۵۷]

قلعہ دولت آباد کی تسخیر کا یہ اثر ہوا کہ دکن کی لڑائی کا آغاز سنہ ۱۰۳۹ ہجری ہوا تھا، سات سال کے عرصہ میں یعنی سنہ ۱۰۴۶ ہجری میں

---

۵۱ بادشاہ نامہ جلد اول حصہ اول ص ۴۱۲ و ص ۴۱۵ ۵۲ بادشاہ نامہ جلد اول حصہ اول ص ۴۱۶ و ص ۴۱۷ ۵۳ منتخب اللباب جلد اول ص ۴۷۶ ۵۴ بادشاہ نامہ جلد اول حصہ اول ص ۴۹۹، ۵۵ منتخب اللباب جلد اول ص ۴۸۷ ۵۶ منتخب اللباب جلد اول ص ۴۹۲

مرتضیٰ نظام ثانی کی گرفتاری پر اس کا خاتمہ ہوا اور دکن کی ایک قدیم اسلامی سلطنت جو ۸۹۱ ہجری میں قائم ہوئی تھی پارہ پارہ ہوگئی ملک میں ایک ادھم مچ گیا، ضلعدار، قلعدار اور امراے نظام شاہی سے جو جہاں تھا جتنا قابو چل سکا اسیقدر ملک دبا بیٹھا اور نظام شاہی سلطنت میں طوائف الملوکی اور بدامنی پھیل گئی، جب قلعہ دولت آباد کے فتح کی خبر شاہجہاں کو ملی تو اس نے مہابت خاں کو بہت سرفراز کیا اور حسین نظام نے شاہ کو قلعہ گوالیار میں قید کرادیا اور فتح خان کا قصور معاف کرکے خلعت دیا اور دو لاکھ روپیہ سالانہ وظیفہ مقرر کیا[۱]،

بلاشبہ قلعہ دولت آباد کا مغلوں کے ہاتھ میں چلا جانا ان کے لئے بڑی کامیابی تھی، فوجی نقل وحرکت کے لئے یہ قلعہ بہت مفید ثابت ہوا، جسطرح ہم نے بیان کیا ہے، انھیں قلعوں کے ذریعہ علاقہ احمد نگر کی حفاظت ہوتی تھی، اور ان سب قلعوں میں خصوصاً دولت آباد کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل تھی یہ قلعہ استحکام اور مضبوطی میں شہرۂ آفاق تھا، چنانچہ بادشاہ نامہ میں لکھا ہے کہ "در حصانت ومتانت میان قلاع ہندوستان طاق بود[۲]"۔ قلعہ دولت آباد کی فتح تاریخ دکن میں نمایاں حیثیت رکھتی ہے، یہ قلعہ نہایت ہی سنگین اور مستحکم تھا جس کا فتح کرنا آسان کام نہ تھا اور اس مرتبہ صرف قلعہ نشینوں کے رسد سے محروم رہنے، آذوقہ کے تمام ہوجانے وبا کے پھیلنے، اور عین وقت پر مراری کی امداد نہ کرنے کی وجہ سے یہ قلعہ مغلوں کے ہاتھ میں چلا گیا، ورنہ اس کا فتح ہونا بہت مشکل تھا، تاہم اسباب کچھ ہی کیوں نہوں مغلوں کے ہاتھ میں کلید دکن چلی گئی، اب تک دکن میں امن وامان انتظام و اقتدار قائم رکھنے کے لئے مغلوں کے قبضہ میں کوئی ایسا مضبوط قلعہ نہ تھا، جو وقت ضرورت فوجی امداد کے لئے مرکز کا کام دیتا، تاریخ اس بات کا ثبوت دیتی ہے کہ اس قلعہ پر قابض ہونے کے بعد مغلیہ فوج کو آئندہ حملوں میں یہ محفوظ مقام ہمیشہ ان کے لئے مرکز کا کام دیتا رہا اور اسی مقام سے ایک سال کے بعد ہی شاہجہاں نے عادل شاہ قطب شاہ کے خلاف فوجیں روانہ کیں۔ اب تک مغلوں کے لئے برہان پور مرکز کا کام دیتا تھا جو میدان جنگ سے دور تھا، اور اس زمانہ میں رسل ورسائل کے طریقہ اچھے نہ تھے۔ مرکز کا فاصلہ پر ہونا فوجی نقل وحرکت کے لئے فائدہ مند نہ تھا لیکن دولت آباد کے فتح ہونے پر مغلوں کا عقب محفوظ ہوگیا، اور فوجی امداد کے لئے نہایت آسانی ہوگئی، اور اب ان کے لئے آگے بڑھنے، عادل شاہی اور قطب شاہی حکومت پر حملہ کرنے کے لئے کوئی رکاوٹ باقی نہ رہی، اس قلعہ کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ آئندہ کے لئے نہ صرف شاہجہان کے زمانہ میں بلکہ اورنگ زیب کے عہد میں بھی یہی قلعہ مرکز رہا۔ علاوہ بریں ۱۰۴۴ ہجری میں شاہجہان نے دکن میں جو انتظامی تبدیلیاں کیں اسیر غور کرنے سے اس کی اہمیت کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ الغرض موقعہ خالی پاکر جب ساہو نے محال شاہی پر دست درازی شروع کی تو مہابت خاں نے درخواست کی کہ اگر سامان حرب بھیجا گیا اور شہزادہ متعین ہوگیا تو امید ہے کہ بیجاپور بھی فتح ہوجائیگا، اور ساہو کی گوشمالی بھی ہوگی۔ شاہجہان نے شاہزادہ محمد شجاع کو فوج عظیم کے ساتھ روانہ کیا[۳]،

---

[۱] منتخب اللباب جلد اول صفحہ ۴۹۱، میکن تاریخ مرہٹہ مصنفہ کنکیڈ اور پارسینس صفحہ ۱۱۹ پر درج ہے کہ بیس ہزار روپیہ سالانہ وظیفہ مقرر کیا گیا، [۲] بادشاہ نامہ جلد اول حصہ اول صفحہ ۵۰۴ [۳] منتخب اللباب جلد اول صفحہ ۴۹۱

خانخاناں مہابت خان، خانزماں، اور خان دوران (نصیری خان) قلعہ پرینڈہ کی طرف رجوع ہوئے، سلطان محمد عادل شاہ نے تین لاکھ ہون دیکر اس قلعہ کو نظام الملکی قلعہ دار سے حاصل کر لیا تھا[۱]، قلعہ مذکور کا محاصرہ کیا گیا، لیکن نہ صرف سپاہی خانخانان کے سلوک سے ناراض تھے بلکہ بقول خافی خاں "میاں خانخاناں (مہابت خان) و خان دوراں (نصیری خان) کہ ہر دو صاحب داعیہ بودند نفاق بمیاں آمدہ بود"[۲] اس لئے ناکامی کی صورت دیکھنا پڑا، شاہجہاں نے اس کی اطلاع ملنے پر شہزادۂ شجاع کو واپس[۳] بلا لیا،

شاہجہاں نے دکنی مقبوضات کی از سر نو تقسیم کی، اور انتظام دسہولت کے خاطر دریائے نربدا کو صوبہ مالوہ کی سرحد قرار دی، حالانکہ اس سے پیشتر صوبہ مالوہ کی کچھ سرکار دریائے نربدا کے اس پار بھی تھے، اور شاہجہاں نے بقیہ تمام مقبوضات کے دو حصے کئے۔ (۱) پائین گھاٹ، جس میں تمام ملک خاندیس اور برار شامل کیا گیا، خان دوران صوبہ دار مقرر کیا گیا، (۲) بالا گھاٹ جس میں سرکار دولت آباد، احمد نگر، پٹن، جنیر، سنگمیر، اور تمام علاقۂ تلنگانہ شامل کیا گیا۔ اور خان زماں صوبہ دار مقرر کیا گیا، چونکہ قواعد ملکداری کی رو سے ضروری تھا کہ بادشاہ اپنے ممالک مفتوحہ جدیدہ کا بذات خود معائنہ کرے اس لئے شاہجہاں ممالک مفتوحہ کے انتظام، فتنہ پردازوں کی تنبیہ اور نظام الملک کے بقیہ قلعوں کی تسخیر کے لئے ۱۰۴۵ھ ہجری میں دکن کی طرف روانہ ہوا[۴]، اور دار الحکومت جھجار سنگھ پہونچا،

اس دوران میں بیجاپور میں کچھ عجیب حالات رونما ہوئے۔ خواص خان اور مصطفٰے خان کے درمیان مخالفت پیدا ہوئی اور امرا نے مصطفٰے خان کا ساتھ دیا، اور دو جماعتوں کے درمیان جنگ وجدال کا سلسلہ جاری ہوا، سلطان محمد نے اس تضیہ ناضیہ کا تصفیہ اس طرح کیا کہ سدی ریحان کے ذریعہ خواص خان کو مروا ڈالا[۵]، ہم نے بیان کیا ہے کہ مصطفٰے خاں ابتدا ہی سے مغلوں سے صلح کرنے کا خواہشمند تھا، اب جبکہ بیجاپور میں اس کو اختیار کل حاصل تھا، اور شاہجہان خود دکن میں موجود تھا اس سلسلہ عہد وپیمان کو جاری کرنے کا بہترین موقع ہاتھ آیا،

شاہجہاں نے تنڈیہ سے عادل شاہ اور قطب الملک کے نام فرمان جاری کئے، مکرمت خان دیوان بیوتات کو فرمان اور دکھنی تلوار بطور ہدیہ دیکر سلطان محمد کے پاس روانہ کیا، اور مکرمت خان کو حکم دیا کہ عادل شاہ سے جاکر بالمشافہ کہدے کہ اگر بادشاہ کی خدمت گذاری سے انحراف کریگا، اور پیشکش ادا نہ کرے گا اور نظام الملک کے جن محال پر متصرف ہوا ہے نہیں چھوڑے گا، اور ساہو دیگر نظام ملکی اوباشوں کو جن کو اپنے ملک میں جگہ دی ہے، نوکر رکھ چھوڑا ہے ان کے نکالنے میں تساہل کرے گا تو پھر ہم لشکر بھیجیں گے جو اس ملک ومال کو تلف کرے گا۔ اور اس مفسد گروہ کو ان کے اعمال کی سزا دیگا، اور اگر ہمارے ارشاد کے مطابق عمل کرے گا تو پھر از راہ ترحم قلعہ شولاپور کو جو نظام الملک اور اس کے درمیان مادۂ نزاع رہا ہے اور ملک کوکن سے تبد رجیوں اور نظام الملکی دیگر تعلقے جن کا محصول نو لاکھ ہون ہے اس کو بخشدیں[۶] گے"، قطب الملک کے فرمان میں شاہجہان نے اپنے اقتدار اعلیٰ کا اعادہ کرنے کے بعد یہ امر جتلایا کہ ہر جا حکم اشرف اقدس ما جاری باشد احکام شریعت غرا و ضوابط ملت بیضا جاری سازیم" اور چونکہ صحابہ کبار کو علی رؤس الاشہاد

[۱] منتخب اللباب جلد اول صفحہ ۴۹۵، [۲] منتخب اللباب جلد اول صفحہ ۵۰۰، [۳] منتخب اللباب جلد اول صفحہ ۵۰۱، [۴] بادشاہ نامہ جلد اول حصہ دوم صفحہ ۱۰۴، [۵] بساتین السلاطین صفحہ ۳۶۲، [۶] عبد الحمید لاہوری نے آخری شرط یعنی نو لاکھ ہون کے محاصل عطا کرنے کا ذکر نہیں کیا ہے خافی خاں نے اسکو لکھا ہے منتخب اللباب جلد اول صفحہ ۵۰۰

بڑا کہا جاتا ہے لہذا اس فعل قبیح کا تدارک کیا جائے، علاوہ ازیں باوجود "دعوی مریدی نامی نمودہ باشد" مگر شاہ ایران کا نام خطبہ میں لیا جاتا ہے، بس لازمی ہے کہ بجائے شاہ ایران کے ہمارا نام خطبہ میں لیا جائے، علاوہ پیشکش سابقہ مطابق فرد مسلکہ روانہ کیا جائے"، اس موقعہ پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ شاہجہان کو یہ حق نہ تھا کہ وہ قطب الملک کے مذہبی عقاید پر قیود عاید کرے، اور مذہبی آزادی میں مخل ہو جو کہ اس کی تنگ نظری اور مذہبی تعصب پر دلالت کرتا ہے، لیکن غور کرنے سے یہ اعتراض بیجا نظر آتا ہے سب سے پہلے فرمان کے وہ الفاظ قابل لحاظ ہیں جن میں وہ عبداللہ قطب شاہ کو مخاطب کرتا ہے، فرمان میں شاہ گولکنڈہ کو "قطب الملک" کے خطاب سے مخاطب کیا گیا ہے۔ نہ شاہ اور نہ سلطان کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ علاوہ اسکے شاہجہاں کا یہ مطالبہ کہ خطبہ میں ہمارا نام لیا جائے اور پیشکش روانہ کیا جائے، بصراحت اس امر کو ظاہر کرتا ہے کہ شاہجہاں اور شاہ گولکنڈہ کے تعلقات مساوی نہ تھے بلکہ اقتدار اعلیٰ شاہجہاں کو حاصل تھا ان حالات میں مملکت مقتدر اعلیٰ کے مذہبی اعتقاد کو کھلم کھلا بُرا کہنا کوئی منضبط حکومت گوارا نہیں کرسکتی تھی، یہ اصول جس طرح موجودہ زمانہ میں صحیح مانا جاتا ہے بعینہ اسیطرح اس زمانہ میں بھی صحیح و درست تھا۔

شاہجہاں نے دولت آباد پہونچنے کے بعد چاروں طرف فوجیں متعین کر دیں، خاندوران کو قندھار و ناندیڑ کی طرف روانہ کیا جہاں بیجاپور اور گولکنڈہ کی سرحد ملتی تھی، اور حکم دیا کہ وہ قلعہ اودگیر و اوسہ کو تسخیر کرے اور اگر عادل شاہ اعلان جنگ قبول کرے تو فوراً ملک بیجاپور میں داخل ہو کر تاخت و تاراج شروع کر دے، ساہو کی تنبیہ کے لئے خان زماں روانہ کیا گیا، تاکہ وہ پہلے ساہو کے وطن کو پامال کرے اور بعد ازاں کوکن کی طرف رجوع ہو جسکو غصب کر لیا تھا۔ تیسری فوج جنیر و ناسک کو فتح کرنے کے لئے شائستہ خان کے تحت روانہ کی گئی، شائستہ خان نے ساہو کا قافیہ تنگ کر دیا، جنیر و سنگمیر فتح کر لیا، رعایا کی خاطرداری کی، کاشتکار اور کسانوں کو جو پراگندہ ہو گئے تھے ان کو جمع کر کے زراعت کی طرف راغب کیا، خان زماں نے دوسری طرف سے اس کو کہیں پناہ لینے نہ دی جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ ساہو ولایت عادل شاہی میں بھاگ گیا، چونکہ حکم شاہی یہ تھا کہ اگر وہ عادل شاہ کی ولایت میں چلا جائے تو تعاقب نہ کیا جائے اس لئے صورت حال کی اطلاع دیکر مزید احکام کا انتظام کرنے لگا۔

اسی دوران میں سلطان محمد عادل شاہ کا رویہ قابل اطمینان نہیں رہا، جب مکرمت خان فرماں لیکر پہونچا تو بظاہر بیحد خاطر و مدارات کی مگر باطن میں اعانت نہ کی، خفیہ طور پر قلعہ دار اودگیر و اوسہ را نہانے فرستاد...... و ساہو سیہ روسے حال ساختہ رندولہ خان گاہا جمع بمعاونت او معین گردانید" مکرمت خان نے شاہجہان کو اسکی اطلاع دی، شاہجہان نے یہ خبر پاکر سید خانجہاں کو دس ہزار سوار کے ساتھ روانہ کیا اور تین طرف سے حملہ کرنے کا حکم دیا، خاندوران مغربی سمت سے، خان زمان اندا پور کی طرف سے اور خانجہان شولاپور کی جانب سے حملہ آور ہوئے تاکہ رندولہ خان کو شکست دیکر بیجاپور کو پے در پے تاخت و تاراج سے ویران کر ڈالیں، لیکن خفیہ طور پر شاہجہان نے یہ بھی کہدیا تھا کہ اگر عادل شاہ اس دوران میں کچھ ہوش میں آجائے اور اطاعت کرے تو اس کے ملک کو ضرر نہ پہونچائیں۔

---

۱ بادشاہ نامہ جلد اول حصہ دوم صفحہ ۱۳۲، ۲ منتخب اللباب جلد اول صفحہ ۵۲۳، ۳ بادشاہ نامہ جلد اول حصہ دوم صفحہ ۱۳۰، ۴ بادشاہ نامہ جلد اول حصہ دوم صفحہ ۱۵۱، ۵ بادشاہ نامہ جلد اول حصہ دوم صفحہ ۱۴۱ اور منتخب اللباب جلد اول صفحہ ۵۲۲

تینوں متعین کردہ سپہ سالار ولایت بیجاپور میں داخل ہوئے، ادھر سے بہلول خان رندولہ خاں اور عنبر خاں ان تینوں کی مدافعت کے لئے روانہ ہوئے، عساکر عادل شاہی کو قدم قدم پر دقتیں پیش آنے لگیں تو ناچار صلح پر آمادہ ہوئے گو شاہجہاں نے لڑائی چھیڑ دی تھی، لیکن ان مصائب وتکالیف کا لحاظ کرتے ہوئے دل سے یہی چاہتا تھا کہ کسی طرح صلح ہو جائے تو اچھا ہے تاکہ یہ جھگڑا مٹے، ادھر بیجاپور میں مصطفےٰ خاں برسر اقتدار تھا وہ ہمیشہ سے شاہجہان کے ساتھ مصالحت کرنے کا طرفدار تھا۔ اب اس وقت بھی مختار کل تھا اگرچہ رندولہ خاں وغیرہ لڑائی چاہتے تھے اور اسی واسطے انھوں نے صلح میں اب تک تساہل کیا تھا۔ مگر جب این خو ہشمندان جنگ کو شاہجہانی فوج نے آگھیرا تو ایسی بری آبنی کہ چاروں طرف ملک میں لوٹ مار مچی اور وہ بھی صلح کے لئے بدرجہ اولی تیار ہوئے، آخر کار ۱۰۴۵ھ ہجری مصطفےٰ خاں نے میر ابوالحسن اور خانی ابوسعید کو ایلچی بنا کر مصالحت کے لئے روانہ کیا، اور آصف خان کی وساطت سے شاہجہان کے سامنے پیش ہونے کے لئے کہا، چنانچہ آصف خان کی معرفت سے پیش ہوئے شاہجہاں نے تینوں سرداروں کو اس دی اور تینوں سمت سے فوج[۱] ہٹالی گئی،

برخلاف عادل شاہ کے قطب الملک نے عبداللطیف سفیر شاہجہاں کی نہایت خاطر کی، فرمان کے تمام شرائط کو پورا کیا، خطبہ میں شاہجہاں کا نام ایزاد کیا، سکہ پر بھی شاہجہاں کا نام مسکوک کرایا، اور پیشکش بھی روانہ کیا،

غرض ۱۰۴۵ھ ہجری میں شاہ بیجاپور اور شاہ گولکنڈہ سے صلح ہوگئی، شاہجہاں نے عادل شاہ کے نام فرمان بھیجا، اور اس امر پر خوشی ظاہر کی کہ تم نے طریق بندگی و اطاعت اختیار کی اور در ہر باب آنچہ حکم فرمودیم قبول کردہ مانیز از نظام الملک ہم محال و نکو قلعہائے کہ در آن محال واقع است وقلعہ شولاپور و محال متعلقہ آن وقلعہ پرینڈہ و پرگنہ بھالکی، پرگنہ جیت و پرگنہ جاکند را کہ مجموعہ بیجاہ پرگنہ میشود و قریب بست لاکھ ہون حاصل دارد بجان شوکت انتباہ مرحمت فرمودیم" اور حسب ذیل شرائط طے ہوئے۔

(۱) سررشتہ مریدی و اخلاص کو ہاتھ سے جانے نہ دے۔ (۲) کسی نظام الملکی کو ملازم نہ رکھا جائے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ عادل شاہی ہو جائے (۳) چونکہ قطب الملک کے ساتھ عہد نامہ ہوا ہے اور وہ جار اصلیت ہے لہذا اس کو کوئی ضرر نہ ہونچایا جائے (۴) اگر کوئی مغلیہ سلطنت سے بھاگ کر عادل شاہ کا ملازم ہونا چاہے تو اُس کو نوکر نہ رکھا جائے (۵) ساہو اور ریحان شولاپوری کو بلایا نہ جائے اور نہ کسی قسم کی زبان دیجائے۔ ساہو اگر ملازمت اختیار کرنا چاہے تو یہ شرط لگائی جائے کہ قلعہ ترنبک وجنیر وغیرہ حوالہ شاہی کر دیا جائے اور معہ اہل وعیال کے جہاں چاہے چلا جائے۔ اور اگر رجوع نہ ہو تو اس کو ملک میں نہ آنے دیا جائے اور اگر آجائے تو نکال دیا جائے تاکہ زیر کیا جا سکے، اور قلعہ اودگیر واوسہ کی تسخیر میں[۲] مدد کیجائے"

(باقی)

سعیدی بی اے (علیگ)

[۱] منتخب اللباب جلد اول ص ۵۲ ، [۲] بادشاہ نامہ جلد اول حصہ دوم ص ۱۴۰ تا ص ۱۴۷

دورِ انسانیت کا ایک نیا عہد

اور

ارتقاءِ ذہنی کا محیر العقول مستقبل

انسان پر اس سے قبل جتنے دور گزر چکے ہیں اگر ان سب کا استقصا نہیں ہو سکتا، تو کم از کم یہ تو یقینی طور پر معلوم ہے کہ قدیم الایام میں جب انسان بنے ہوئے اسے زیادہ زمانہ نہ گزرا تھا اس پر دَور نباتی آیا جب وہ حیوانوں کی طرح درختوں پر رہتا تھا اور صرف نباتات پر زندگی بسر کرتا تھا۔ اس کے بعد اس نے ترقی کر کے دورِ حجری میں قدم رکھا اور پتھر کے اوزار بنا کر سامانِ خورد و نوش و اسبابِ عافیت مہیا کئے، تیسرا عہد، عہدِ فلزی تھا جب دھات کی چیزیں اس نے طیار کیں اور یہ عہد اس قدر ترقی کا اہل ثابت ہوا کہ آج آلات و مشینری کی موجودہ دنیا اسی کی ممنون ہے اور انسان کا آج ہوا پر اڑتے پھرنا کہربا کی مدد سے زمین کی طنابیں کھینچ کر زمان و مکان و وقت و فاصلہ کا مفہوم بدل دینا اور عیش و نشاط کے اس حقیقی عالم میں زندگی بسر کرنا جو اس سے قبل صرف کہانیوں اور افسانوں ہی میں پایا جاتا تھا، سب اسی کا صدقہ ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ زمانہ دورِ انسانیت کا آخری عہد ہے، کیا اس کے بعد ترقی کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں اور کیا اسی عہد میں اس کو ہمیشہ کے لئے ختم ہو جانا ہے۔ اگر یہ سوال اب سے کچھ زمانہ قبل کیا جاتا تو اس کا جواب متفقہ طور پر اثبات ہی میں دیا جاتا لیکن اب اس کا جواب نفی میں دیا جائیگا کیونکہ ذہنِ انسانی نے اب جس عہد کی ابتدا کی ہے وہ بالکل جدید عہد ہے اور یقیناً گزشتہ تمام ادوار سے مختلف اور بہت زیادہ عظیم الشان ہے یہ عہد نور اور اسکے شعاعوں کا ہے اور اگر ہم چاہیں تو اس کا نام عہدِ شعاعی رکھ سکتے ہیں۔ کیونکہ اب روزانہ نئی نئی شعاعوں کا اکتشاف اور ان کی قوتوں کا علم بتا رہا ہے کہ آئندہ زمانہ میں ہماری تہذیب و مدنیت اور صلح و جنگ کا انحصار انھیں پر ہوگا۔ آج بھی ایسی شعاعیں دریافت ہو چکی ہیں جو ہمارے لئے سامانِ تفریح مہیا کرتی ہیں، ہماری بیماریوں کو دور کرتی ہیں اور ہمیں مار بھی ڈالتی ہیں۔

سب سے پہلے آپ ان معمولی شعاعوں کو دیکھئے جو روزانہ آفتاب سے حاصل ہوتی ہیں اور جو سرچشمۂ حیات ہیں یقیناً ان کے فوائد و نتائج ایسے نہیں جن کے بتانے کی ضرورت ہو کیونکہ زندگی کا مدار انھیں شعاعوں کو بتایا جاتا ہے، لیکن ڈاکٹر ملیکن جس نے کازمک شعاع (Cosmic Ray) دریافت کی ہے کہتا ہے کہ جس وقت آفتاب فنا ہوگا اور یقیناً ایک دن ایسا آئیگا تو مستقبل کا انسان آفتاب کے بجھ جانے سے مطلقاً متاثر نہ ہوگا۔ اور وہ اپنے لئے ایک نیا آفتاب پیدا کر لیگا۔ یعنی انسان اپنی زندگی کے لئے خود مصنوعی شعاع پیدا کر سکیگا اور اس کے جیب میں سیروں شعاع (شعاع کا وزن فی سنٹی میٹر پونڈ کے حساب سے اب بھی ہونے لگا ہے) بھری رہیگی تاکہ ضرورت کے وقت اس سے کام لے سکے اور گھر، دفتر، باغ، کھیتیاں وغیرہ سب انھیں خود

خود ساختہ شعاعوں کی بدولت آباد ہونگی۔ اسی معمولی شعاع سے ایک اور شعاع ماورائے بنفشی (Ultra-violet) دریافت ہوچکی
ہے جس سے ولایت میں ہر جگہ بچوں کی صحت قائم رکھنے میں کام لیا جاتا ہے، لیکن یہ بھی قدرت کا عجیب و غریب فیصلہ ہے کہ یہ شعاع جسقدر
مفید ہے اسی قدر مضرت رساں بھی ہے یہاں تک کہ اگر زمین کی مرطوب فضا اس کے نقصان کا مقابلہ نہ کرے تو یہ شعاع دنیا
کی تمام چیزوں کو جو دھات سے طیار ہوتی ہیں فنا کردے اور ہمارے جہازوں ریل گاڑیوں اور مشینوں وغیرہ کو تباہ کرکے رکھدے
اسی لئے پیشین گوئی کیجارہی ہے کہ زمانہ مستقبل کی جنگ میں زیادہ تر اسی شعاع سے کام لیا جائیگا۔ یقیناً وہ وقت بھی عجیب و غریب ہوگا
جب جنگ، کا مفہوم صرف وہ سکون ہوگا جب رات کے وقت یہ شعاع، برقیہ (Search light) کی طرح فضا میں ادہر ادہر
دوڑتی پھرتی ہوگی اور جہازوں کو سمندر کی سطح پر ریزہ ریزہ کرکے تہ نشین کرتی جاتی ہوگی۔ حال ہی میں ایک اور شعاع دریافت ہوئی
ہے جس کا نام تحت الاحمری (   ) ہے جس کے ذریعہ سے انسان تاریکی میں دیکھ سکتا ہے، تصویر لے سکتا ہے
بغیر اس کے کہ کوئی اُسے دیکھے اگر اُس کو بھی بحری جنگ کا آلۂ کار بنایا گیا تو اس کی تباہ کاریاں کم نہ ہونگی اور فضا کی یہ خاموش
وغیر مرئی شعاع دیگر آلات حرب سے بے نیاز کردیگی۔ کازمک شعاع (Cosmic Ray) جسکا ذکر کیا گیا، بالکل حال کی دریافت شدہ
شعاع ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس سے زیادہ قوی الاثر شعاع اس وقت تک دریافت نہیں ہوئی۔ یہ شعاع کرۂ زمین پر کہاں سے
آتی ہے اور کیونکر پیدا ہوتی ہے۔ ہنوز اسکی تحقیق نہیں ہوسکی، لیکن اسکی قوت کا اندازہ اس سے کیا جاتا ہے کہ ۱۹۰ فٹ تک پانی کے اندر
نفوذ کر جاتی ہے اس شعاع کے ساتھ بڑے بڑے امکانات و توقعات وابستہ ہیں یعنی یقین کیا جاتا ہے کہ ہم اس شعاع کی مدد سے کرۂ
زمین کی دوسری سمت مخالف کو بھی دیکھ سکیں گے۔ یعنی اس میں قوت نافذہ اس قدر زبردست ہے کہ وہ کرۂ زمین کے قطر کو پار کرکے دوسری
جانب عبور کر جائیگی اور وہاں کی چیزوں کو اسیطرح پیش نظر کردیگی جس طرح دوربین کے ذریعہ سے ہم کو ۱۴۰ ملین نوری سال کے فاصلہ پر واقع
ہونے والے ستارے نظر آجاتے ہیں۔ لاسلکی خبر رسانی میں بھی اس سے حیرتناک انقلاب پیدا ہونیکی توقع ہے کیونکہ یہ شعاع اس قدر قوی
ہے کہ ایک معمولی آلۂ نقل (Transmitter) جو دیا سلائی کے بکس کے اندر آسکے ہم کو اس قابل بنا دیگا کہ وہ کرۂ زمین کے دوسری
سمت کے لوگوں سے باتیں کرسکیں۔ بعض سائنس والوں کا خیال ہے کہ یہ شعاع جوہر فرد (Atom) کے پھٹنے سے پیدا ہوتی ہے
پھر چونکہ ایک چٹکی نمک میں بھی اتنی جوہری قوت (Atomic Energy) پائی جاتی ہے کہ ہزاروں ٹن کوئلہ کی مدد سے بھی نہیں حاصل
ہوسکتی، اس لئے ظاہر ہے کہ اس نظریہ کی بنا پر کیسے محشر خیز انقلابات دنیا میں پیدا کئے جاتے ہیں۔ اسوقت دنیا کی نگاہیں لاسلکی شعاع
پر لگی ہوئی ہیں اور ایک ہزار سال گزرنے سے قبل ہی بجلی کی قوت پیدا کرنا، مشینیں چلانا، ہوائی جہازوں کا اڑانا، موٹر کا چلنا، گہوارہ
ہلانا، مکان کو صاف کرنا، کھانا پکانا۔ الغرض زندگی کے تمام کام اسی شعاع کے ذریعہ سے انجام پائیں گے۔ تجربات جاری ہیں اور امریکہ کے
ایک سائنس داں نے جسکا نام نکولا ٹسلا ہے بڑی حد تک کامیابی حاصل کی ہے، تازہ ترین خیال یہ ہے کہ لاسلکی کے مختصر تموجات کو ایک
شعاع میں تبدیل کیا جائے اور پھر اس شعاع کی مدد سے برقی ذرہ امین پیدا کیا جائے۔ یہ فضا میں بالا بالا جائیں گی ان کی قوت کو تقسیم
کرکے زمین کی طرف لایا جائیگا اور تمام کام چلائے جائینگے۔ اور اسی اصول کی بنا پر پیشین گوئی کیجاتی ہے کہ مستقبل جنگ میں گزشتہ جنگوں کی طرح
نہ بندوقوں کی آواز ہوگی نہ توپوں کی گرج بلکہ وہ ہلاکت بار سکون مطلق ہوگا جو بغیر کسی ہنگامہ کے دنیا کو موت کی نیند سلا دیگا۔

تاریخِ طبیعی کا ایک دلچسپ ورق

اور

عالمِ حشرات میں عقل و ذہن کی کارفرمائیاں

علوم حکمیہ اور طبیعیات میں تاریخ طبیعی اس قدر دلچسپ اور وسیع علم ہے کہ ایک بار اس کا ذوق پیدا ہونے کے بعد نہ کوئی اسے ترک کر سکتا ہے اور نہ ختم۔ چنانچہ بعض علما نے اپنی ساری عمریں ایک حقیر کیڑے کے مطالعہ میں صرف کر دیں اور وہ مطمئن نہ ہو سکے، دو سال ہوئے امریکہ کے ایک پروفیسر نے کامل چالیس سال کے مطالعہ کے بعد چیونٹی کے حالات پر کئی جلدیں مرتب کر کے شائع کیں اور اس کے بعد بھی اس کو اپنی تحقیق پر کامل اعتماد نہ ہوا۔ اسی طرح کے اور بہت سے حقیر حشرات الارض ہیں جن کے حالات کا علم انسان کو بہت کم حاصل ہوا ہے، لیکن جسقدر معلوم ہو گیا ہے وہ بھی حقیقتاً ایک مکمل داستانِ حیرت و استعجاب ہے۔

آپ کو جن کیڑوں سے روز اور اکثر واسطہ پڑتا ہے انھیں میں سے ایک مکڑی بھی ہے، لیکن آپ غالباً اس سے واقف نہ ہوں گے کہ اس کی ضعیف و کمزور ساخت ایک دنیائے عجائب اپنے اندر رکھتی ہے، اور اس کا جالا جو کمزوری میں ضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہے ایک ایسی مضبوط چیز ہے کہ اس کی مثل انسان کوئی مستحکم چیز اس وقت تک طیار نہیں کر سکا۔

اگر آپ کسی سے کہیں کہ مکڑی اپنی ہوشیاری، خونخواری، قوت ابداع و اختراع اور جرأت و ہمت میں انسان سے بڑھی ہوئی ہے تو وہ ہنسنے لگیگا، لیکن جسوقت آپ اُس کو واقعات بتائیں گے تو اسے بھی آپ کا دعوےٰ تسلیم کرنا پڑے گا۔

یورپ کے مشہور مصنف (H. G. Wells) کا مقولہ ہے کہ اگر کبھی انسان کی سیادت کرۂ ارض سے اُٹھ گئی تو اس کے بعد جس "قوم" کی حکومت ہو گی وہ قوم مکڑی کی ہو گی۔

مسٹر ویلز کوئی سائنس داں شخص نہیں لیکن ایک ماہر جسنے مکڑی کا پورا مطالعہ کیا ہے وہ کہہ گیا ہے کہ ویلز اگر سائنس داں نہیں تو پیغمبر ضرور ہے جسنے ایسی صحیح پیشین گوئی کی ہے۔

مختلف قسم کی مکڑیوں کے حالات کا جو مشاہدہ کیا گیا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ بلا کی ذہین چیز ہے اور انسانی دماغ مشکل سے اس کی قوت ایجاد و اختراع اور انجنیری کا مقابلہ کر سکتا ہے۔

جن ماہرین فن نے اُس کے جالے کا مطالعہ کیا ہے ان کا بیان ہے کہ بعض مکڑیاں اس قدر باریک جالا طیار کرتی ہیں کہ اگر خوردبین کے ذریعہ سے دو ہزار گنا بڑا کر کے اس کو دکھایا جائے تو وہ گھوڑے کے معمولی بال سے زیادہ موٹا نظر نہیں آسکتا،

حالانکہ اگر انسانی بال کو اسی نسبت سے بڑا کرکے دیکھا جائے تو وہ ۶ ½ انچ موٹا نظر آئے گا۔ پھر نازک و باریک جالے کی (جسکا قطر $\frac{1}{32......}$ انچ ہوتا ہے) مضبوطی کا یہ عالم ہے کہ انساں کی بنائی ہوئی رسی اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ ایک پروفیسر کا بیان ہے کہ خود اس نے اسی جالے کے ذریعہ سے مرغے چھوٹے مینڈکوں، سانپوں چھپکلیوں اور چمگادڑوں کا شکار کرتے ہوئے مکڑی کو دیکھا ہے جس وقت کوئی بڑی مکڑی بھوکی ہوکر کسی تالاب یا حوض کی طرف شکار کو جاتی ہے تو بعض اوقات چھوٹی چھوٹی مچھلیاں بھی خوف زدہ ہوکر بھاگ جاتی ہیں۔

بیٹویا میں ایک سانپ ہوتا ہے جس کی لمبائی تقریباً ایک فٹ ہوتی ہے، ایک مرتبہ دیکھا گیا کہ ایک مکڑی نے جس کا جسم مٹر سے کچھ بڑا تھا اُس کو اس بُری طرح جالے میں لپیٹ لیا کہ وہ بھاگ نہ سکا۔ مکڑی نے اس کی دم کو بھی جالے میں لپیٹ کر مرکزی رشتہ سے باندھ دیا تھا اور منہ میں بھی بہت سا جالا بھر دیا تھا تاکہ وہ بالکل بے قابو جائے۔

ایک بار چوہے کو جالے کے اندر تڑپتے ہوئے دیکھا گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے سونے کی حالت میں اس کی دُم کو جالے کے اندر لپیٹا گیا اور پھر جالے کے پھندے کے ذریعہ سے جو اس کے گلے میں ڈالا گیا تھا اوپر کی طرف کھینچ لیا گیا جہاں وہ میز کے نیچے جالے کے اندر بے قابو ہوکر لٹک گیا اور آخرکار مکڑی کی خوراک ہوگیا۔

جالے کی مضبوطی کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اس سے مچھلی کا جال طیار ہوسکتا ہے، چنانچہ نیوگائنا کے باشندے مکڑی کے جالے ہی سے مچھلی پکڑنے کا کام لیتے ہیں۔ یہاں بڑی قسم کی ایک مکڑی پائی جاتی ہے جو ۶ - ۷ فٹ قطر کا جالا بنتی ہے اور چڑیوں کے پکڑنے کے لئے بڑے بڑے پھندے طیار کرتی ہے۔ یہاں کے وحشی ایک بانس لیکر جنگل میں گاڑ آتے ہیں اور اس کے سرے پر ایک آنکڑا سا لگا دیتے ہیں۔ یہ آنکڑا گویا بڑے پھندے کا کام دیتا ہے اور مکڑی اگر اس پھندے سے اپنا جالا بننا شروع کردیتی ہے۔ جب جالا طیار ہوجاتا ہے تو الگ بانس دکھاڑ کرلے جاتے ہیں اور اس سے مچھلیاں پکڑتے ہیں۔ اس جال میں ایک اور خصوصیت یہ بھی ہوتی ہے کہ پانی اسپر اثر نہیں کرتا۔

مکڑی ہوا باز بھی ہے اور گرما میں اس کی بہترین تفریح یہی ہوتی ہے کہ وہ فضا میں جھولا جھولے۔ اس کی تدبیر یہ ہوتی ہے کہ کسی بلند جلد پر جاکر تین چار تاگے جالے کے نیچے کی طرف ڈھیلے لٹکا دیتی ہے اور خود ان پر لٹک جاتی ہے۔ ہوا سے یہ تاگے اِدھر اُدھر اڑتے ہیں اور وہ بھی ان کے ساتھ جھولا جھولتی رہتی ہے۔

مکڑی کی زندگی کا عجیب و غریب کارنامہ اس کا واقعۂ عشق و محبت ہوا کرتا ہے۔ سب سے پہلے یہ معلوم کرلینا چاہئے کہ جالا بننا، شکار کرنا اور تمام ایجاد و اختراع یہ سب مکڑی (مادہ) کا کام ہوتا ہے، نر بہت حقیر، کاہل اور ذلیل ہوتا ہے۔ اسلئے محبت کے معاملہ میں بھی مادہ مکڑی ہی پیش پیش ہوتی ہے اور اسی کی مرضی پر سب کچھ منحصر ہوتا ہے۔

مکڑی کا عشق ہمیشہ چاندنی رات میں شروع ہوتا ہے جس کی ابتدا اس کے مخصوص حرکات سے ہوتی ہے اور جسے "رقص محبت" کہہ سکتے ہیں۔ جب مکڑی (نر یا مادہ) رقص محبت کرتی ہوئی بڑھتی ہے تو دوسری مکڑیوں سے اس کا جسم مس کرتا ہے

اگر یہ دونوں نر ہوتے ہیں تو ایک دوسرے کو مارتے ہوئے گزر جاتے ہیں لیکن جب نر اور مادہ کے ملنے کا اتفاق ہوتا ہے تو تھوڑی دیر تک ایک دوسرے کو چھونے کے بعد اگر رشتۂ محبت منظور نہیں ہوتا تو دونوں علیحدہ ہوجاتے ہیں اور اگر منظور ہوتا ہے تو پھر یہ رقص محبت دونوں کا ساتھ ساتھ شروع ہوتا ہے اور اس کو شادی سے پہلے نسبت یا کورٹ شپ کی رسم سمجھنا چاہئے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ یہ عہد نسبت طویل ہوتا ہے اور کبھی مختصر۔ کبھی اس نسبت کا نتیجہ شادی ہوا کرتا ہے اور کبھی افتراق۔ اس عہد الفت میں ان دونوں کا باہم ملکر گھومنا بہت پرلطف ہوتا ہے، کبھی دونوں گھنٹوں کے لئے خاموش کھڑے ہو جاتے ہیں، کبھی ایک دوسرے سے علیحدہ ہوکر پھر مل جاتے ہیں اور ٹہلنے لگتے ہیں۔ ان میں باہم جنگ بھی ہوتی ہے اور صلح بھی اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ازدواج تک پہونچنے کے لئے وہ ایک دوسرے کا مطالعہ گہرائی کے ساتھ کر رہے ہیں۔ بعض مکڑے بھی مردوں کی طرح صرف عیاش و اوباش ہوتے ہیں اور ان کا میلان مادہ کی طرف کبھی سنجیدگی کے ساتھ نہیں ہوتا اور نہ شادی کرنا ان کا مقصود ہوتا ہے بظاہر اس قسم کے مکڑے بہت متواضع نہایت عمدہ رقص کرنے والے ہوتے ہیں اور اول اول ہر مکڑی ان کی طرف مائل ہوجاتی ہے لیکن بعد کو جب حقیقت کا علم ہوجاتا ہے تو اس سے احتراز ہونے لگتا ہے اور اُن کو ڈورے ڈالنے کیلئے کسی اور مکڑی کی جستجو ہوتی ہے۔

لیکن مکڑی کے عشق و محبت کی داستان کا انجام اس سے بھی زیادہ عجیب و غریب ہے، یعنی جس وقت وہ کسی مکڑے (نر) کا انتخاب کر لیتی ہے اور وہ غریب، اپنے انجام سے بے خبر مواصلت کو گوارا کر لیتا ہے تو مکڑی کی دعوت ولیمہ کا سارا سامان مکڑے ہی کی جان ناتوان فراہم کرتی ہے۔ یعنی مواصلت ازدواج کے بعد ہی مکڑی اس پر حملہ کرتی اور کھا جاتی ہے۔ بعض مرتبہ نر بھاگتا ہے اور پوری کوشش جانبری کے لئے کرتا ہے، لیکن وہ اس میں کامیاب نہیں ہوتا اور لذت مواصلت کے عوض اسکو اپنی جان کی قربانی بہر نوع پیش کرنا ہی پڑتی ہے

خوابِ نشاط

یہ "بارِ نغمہ" اٹھایا نہ جائے گا مجھ سے
"خوشی کا گیت" ابھی گایا نہ جائیگا مجھ سے
"پیارے"! تجکو جگایا نہ جائے گا مجھ سے

میں دور پھینک رہا ہوں رباب، سوئے جا
ترے نثار — ! مرے مستِ خواب، سوئے جا

ابھی تو گیسوئے لیلائے شب ہیں آوارہ
ستارے ہیں ابھی گردوں پہ انجمن آرا،
ابھی تو رقص میں ہے چاندنی کا — فوارہ

ابھی کہاں سحر آفتاب؟ سوئے جا!
ترے نثار — ! مرے مست خواب سوئے جا

ادائے زلفِ پریشاں یونہی رہے اے کاش!
کھلا ہوا — یہ گریباں، یونہی رہے اے کاش!
یہ آفتاب — زرافشاں یونہی رہے اے کاش!

تمام رات یوں ہی بے حجاب؟ سوئے جا
ترے نثار مرے مست خواب، سوئے جا

تجھے حبیب ہیں جو وہ ادائیں — مانگونگا!
جو کام آئیں ترے وہ وفائیں — مانگونگا!
تمام رات خدا سے دعائیں — مانگونگا!

کھلے ہیں رحمت باری کے باب، سوئے جا!
ترے نثار مرے مست خواب سوئے جا!

(۲)

خوشا! کہ رہرو راہ وفا ہیں — ہم دونوں!
زہے نصیب! کہ حق آشنا ہیں — ہم دونوں
ہزار شکر! قریب خدا ہیں — ہم دونوں

حریم قدس میں ہیں باریاب، سوئے جا
ترے نثار مرے مست خواب، سوئے جا

نیاز و ناز کی عصمت کو آج دیکھیں گے!
ہم اپنے "قلب" کی عظمت کو آج دیکھیں گے!
خدائے "عشق و محبت" کو آج دیکھیں گے!

اٹھائے جائیں گے، لاکھوں حجاب، سوئے جا
ترے نثار مرے مست خواب، سوئے جا

روش صدیقی

"نیند اڑانے والے!"

آ، بس خواب ہی آ! نیند اڑانے والے
سو گیا کیوں مری قسمت کے جگانے والے

آنکھ کو اشک نہ دے قلب کی حرکت نہ بڑھا
روح کو چھیڑ تصور میں ستانے والے

چاند بھی ڈوب چلا، اب تو خدارا آ جا!
روشنی بن کے نگاہوں میں سمانے والے

شکوۂ جور کا یہ ناز سے ملتا ہے جواب
"جاؤ بھی، آئے بڑے بات بنانے والے"

کوئی نومشق نہ کہدے غلط اندازی پر
یوں نگاہیں نہ چرا تیر چلانے والے

طالبؔ ضبط نہیں دل تو پھر ایسا کر دے
صبر دیدے مجھے مجبور بنانے والے

طالب باغپتی

میلادِ خیال

امتیازِ من و تو مطلعِ دیوانِ حیات — حفظِ ناموسِ خودی مایۂ وجدانِ حیات
ہر دو عالم بہ نگہ دیدۂ ارمانِ حیات — برتر از وہم و گماں منزلتِ شانِ حیات

زندگی جوہرِ بیتاب کی خود رائی ہے
زندگی اپنی نمائش ہی کی سودائی ہے

حال کیا جانے کوئی اس کے نہاں خانوں کا؟ — زندگی نام ہے جذبات کے طوفانوں کا
سلسلہ ہے یہ تمناؤں کا ارمانوں کا! — کیا حقیقت ہے جو مجموعہ ہے افسانوں کا

زندگی ذوقِ طلب لے کے جو بیدار ہوئی
نشۂ بادۂ کردار سے سرشار ہوئی

جوششِ کردار کہیں موجبِ رفتار ہوا — کہیں احساس فقط اور کہیں پندار ہوا
پر پرواز بنا اور کہیں گفتار ہوا! — آخر شِ دل ہوا اور حاملِ اسرار ہوا

عشق نے دیکھتے ہی دل کی پذیرائی کی
عجز سے جھک کے ملائک نے جبیں سائی کی

عشق کے فیض سے جب حسن کا ادراک ہوا — پردۂ دیدۂ دل مثلِ سحر چاک ہوا
پرتوِ نور ہر اک ذرہ کی پوشاک ہوا — اک نئی چیز جہانِ خس و خاشاک ہوا

وہی ماحول جو ظلمات نظر آتا تھا
اب نگاہوں کو طلسمات نظر آتا تھا

جوہر آئینۂ دل کو یہ حیرانی تھی — حسن مستور تھا جلووں کی فراوانی تھی
مئے پندار میں کیفیت وجدانی تھی — ایک بیتابی تھی۔ الجھن تھی پریشانی تھی!!

شوق کی اس خلش نو نے نکالیں راہیں
بن گئیں صورت زیبائے تخیل آہیں

کیا کہوں اہلِ زمیں دل کے یہ کیا ہاتھ لگا! — مرکزِ دائرہ ارض و سما ہاتھ لگا!!
چشمہ کیا؟ قلزمِ مواجِ بقا ہاتھ لگا! — اسمِ اعظم جسے کہتے ہیں خدا ہاتھ لگا!

کن کی تاثیر تخیل میں نہاں ہے واللہ

ہر دو عالم میں یہی روح رواں ہے واللہ

نہ تو پابند رماں ہے نہ گرفتار مکاں! منتظر اس کی نگاہوں کے ہیں اسرار نہاں

اسکی توصیف سے قاصر ہے امیںؔ میری زباں می تواں گفت دریں باب عیاں لیچہ بیاں

"بست ایں میکدہ و دعوت عام است اینجا" (اقبال)

"قسمت بادہ بہ اندازۂ جام است اینجا"

امین حزیں

بسنت کی آمد

بہارِ صبح دلکشا بسنت بن کے آگئی نمودِ حسن کی گھٹا سرور بن کے چھا گئی

نصیب صحنِ باغ کا جو سو رہا تھا سو چکا خزاں کا دور ہو چکا خزاں کا دور ہو چکا

اب اپنے حسن پر فدا شجر بھی ہے حجر بھی ہے کمال شانِ دلبری ادھر بھی ہے ادھر بھی ہے

نگاہِ شوق آج پھر دل پہ آرزو ہوئی زمین سیرِ گل ہوئی فضا رنگ و بو ہوئی

پھر آج رنگ نسترن نظر نواز ہو گیا پھر آج برگ یاسمن حریم ناز ہو گیا

غبارِ خستہ خاطری ہر ایک رخ سے دھل گیا دعا قبول ہو گئی درِ کریم کھل گیا

چمن کی شاخ شاخ پر طیور نغمہ زن ہوئے یہ نغمے حسن بن گئے فروغ انجمن ہوئے

ہر ایک شے میں زندگی ادائے ناز ہو گئی شگفتگی میں تازگی کرشمہ ساز ہو گئی

چمن میں آکے رک گئیں جنون کی ہرزہ گردیاں ہوا میں اعتدال ہے نہ گرمیاں نہ سردیاں

یہ ڈر تھا اندر باغ میں کریں نہ کچھ خرابیاں گلاب لیکے آگیا بھری ہوئی گلابیاں

صنم کدہ سے برہمن جو ہو کے بیقرار اٹھا بہارِ سبزہ دیکھ کر ہری ہری پکار اٹھا

صبا نے زر اڑا لیا قدم اٹھائے تول کے خطرہ یہ ہے نہ دیکھ لے شگوفہ آنکھ کھول کے

نظر کا ذوقِ جستجو چمن میں خندہ زن ہوا یہ خندہ رنگ بن گیا گلوں کا پیرہن ہوا

ہری ہری یہ کیاریاں یہ پھول کو کنار کے فرنگیوں نے لے لئے علاقے زنگبار میں!

ہر ایک پھول ہے باغ میں عروجِ شانِ ارتقا زمین گلستان ہے یہ کہ آسمان ارتقا

حیات تازہ مل گئی تمام کائنات کو طیور کو ہوام کو جماد کو نبات کو

[illegible]

غزلیت - ۱

ثاقب جالندھری

جیتے جی مرمٹے ترے جانباز
اک تماشہ ہے عشق کا اعجاز

اے تمنائے دل خدا حافظ
اب تو ناکامیوں کا ہے آغاز

چشم انجم سے بھی جو پنہاں ہے
دیکھتی ہے وہ چشم جلوہ طراز

طول کھینچا ہے وہ اسیری نے
مٹ گئی دل سے حسرت پرواز

نشہ کیف تا ابد رہتا
کاش کھلتا نہ ہمپر اپنا راز

ہے وہ منزل ہماری نظروں میں
جسکو سمجھے ہوئے تھے دور دراز

صورتیں ہیں نظام عالم کی
آپ کا ناز میری شان نیاز

برق تڑپے نہ آشیاں کے لئے
بلبلوں میں نہ ہو جو سوز و گداز

کیا کروں دل کی جستجو ثاقب
ان کی زلفوں کا سلسلہ ہے دراز

حبیب رامپوری

دل ہو وارفتہ محبت میں تو پروا کیا ہے
فرط غم کشمکش ذوق تمنا کیا ہے

اُدس سے میں مجھسے ہو بیزار مری عمر رواں
خود میں حیران ہوں آخر یہ تماشا کیا ہے

مجھسے کیا چاہتے ہو حسرت دل کی تشریح
مجھسے کیا پوچھتے ہو میری تمنا کیا ہے

ہو کے مجبور مسیحا نے مجھی سے پوچھا
اچھا اب تو ہی بتا تیرا مداوا کیا ہے

فخر اسکا ہے کہ دشنام طلب ہوں سر بزم
مری توہین مرے واسطے بیجا کیا ہے

کشتۂ ناز جو ہیں حسرت کافر کے حبیب
وہ یہ کیا جانیں کہ اعجاز مسیحا کیا ہے

صفی اورنگ آبادی

دنیا کی حرص، دین کی پروا کہاں مجھے
تم مل گئے تو مل گئے دونوں جہاں مجھے

مر جانے کے یقین پر ایسی خوشی ہوئی
گویا ملی ہے زندگی جاوداں مجھے

یہ کیوں ہے واقعاتِ گذشتہ کا تذکرہ
تم کیوں سنا رہے ہو مری داستاں مجھے

لوگوں کی بات بات کے سو سو جواب ہیں
تم نے بنا دیا ہے مگر بے زباں مجھے

اقرار کیا کیا ہے کہ اک چپ سی لگ گئی
گویا وہ گونگے بن گئے دیکر زباں مجھے

غیروں سے التجا کی ضرورت نہیں صفی
گھر بیٹھے بھیج دیتے ہیں اللہ میاں مجھے

ضیا بدایونی

غمزۂ بے پناہ نے مارا
تیر بے نگاہ نے مارا

لے چلا پھر صنم کدے کی طرف
دل گم کردہ راہ نے مارا

دیکھتا ہوں بہار میں بھی خزاں
چشم عبرت نگاہ نے مارا

ہو ہی جاتے ستم کے خوگر ہم
کرم گاہ گاہ نے مارا

انفعال ستم معاذ اللہ
نگہ عذر خواہ نے مارا

شکر بیداد بھی گلہ ٹھیرا
عشق کی رسم و راہ نے مارا

کیا کروں برق حسن کا شکوہ
مجھے ذوق نگاہ نے مارا

تو اگر لطف دو عالم نہیں ارماں میرا
مجکو لے جائے کہاں دیکھئے امکاں میرا

دل کی ایذا طلبی بن گئی درماں میرا
کام آیا شبِ غم دردِ فراواں میرا

پرتوِ حسنِ تخیل ہیں نقوشِ ہستی
ہر گھڑی رنگ بدلتا ہے گلستاں میرا

کارواں ہے نہیں خود ہوں نغ جرس کی آواز
منزلِ عشق میں دیکھے کوئی ساماں میرا

دھو دیے داغ گنہ ہائے تری رحمت کے نثار!
بن گیا ابرِ کرم دامنِ عصیاں میرا

مہدی اجنالوی

فغاں تو لب پہ ہے لیکن اثر فغاں میں نہیں
سمجھ لیا ہے یہ دل نے کہ ہم جہاں میں نہیں

گلوں کا خون، عنادل کی موت۔ شورِ جنوں
بہار میں جو بلائیں ہیں وہ خزاں میں نہیں

جنونِ عشق کی یہ بےخودی معاذ اللہ
اب امتیازِ رقیب اور رازداں میں نہیں

مجھی کو دیکھ یہ کافی ہے پوچھنے والے
کہ مجھ سے بڑھ کے اثر میری داستاں میں نہیں

نظیر لودھیانوی

عاشق نامراد اٹھ نیند حرام ہو چکی
دورِ نشاط جا چکا گردشِ جام ہو چکی

سرد قلوب ہو چکے جمگھٹے خوب ہو چکے
تارے غروب ہو چکے رات تمام ہو چکی

گیسوئے شب بکھر چکا نشۂ مے اتر چکا
عہدِ طرب گزر چکا رونقِ بام ہو چکی

کھل گئی صبح کی جبیں خواب سے جاگ اٹھی حسیں
جلوۂ مہر سے زمیں آئینہ فام ہو چکی

سینے میں رنگِ سومنات دل میں غمِ منات و لات
میری تمام کائنات ان کی غلام ہو چکی

کشتے پڑے ہیں پیش و پس پھر بھی ہے ظلم کی ہوس
کوئی انہیں کہے کہ بس مشقِ خرام ہو چکی

مرغِ حرم کو ہر شریر کرتا ہے ذبح یا اسیر
تیغِ جہاد اے نظیر وقفِ نیام ہو چکی

باب الاستفسار

جوہر فرد۔ ذرہ۔ یا دقیقہ

(جناب کرم الدین صاحب۔ ہاوڑہ)

گذشتہ ماہ کے رسالہ میں "ایک عالم و عامی کا مکالمہ" میری رائے میں کوئی اچھی روشنی جوہر فرد پر نہیں ڈالتا اور نہ اس سے مسلسل یہ معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے کس نے یہ خیال پیدا کیا اور رفتہ رفتہ اسمیں کیا تبدیلی پیدا ہوئی اگر زحمت نہو تو مختصر بحث استفسار کے سلسلہ میں اس امر پر بھی درج کیجئے۔

(نگار) تحقیق کے ساتھ یہ بتانا کہ جوہر فرد (Atom) کا خیال سب سے پہلے کس کے ذہن میں آیا بہت دشوار ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ یونانیوں نے اسکو فلاسفۂ ہند سے حاصل کیا تھا، اور بہت ممکن ہے کہ یہ رائے درست ہو لیکن اسکا کوئی تاریخی سراغ لگانا مشکل ہے۔ بہرحال اسوقت تو عام طور پر یہی تسلیم کیا گیا ہے کہ سب سے پہلے یونانی فیلسوف دیمقراطیس نے جو ۴۰۰ سال قبل مسیح پایا جاتا تھا اس اعتقاد کو رواج دیا کہ مادہ مرکب ہے ایسے ذرات یا دقایق سے جو ہر وقت متحرک رہتے ہیں اور جو اسقدر چھوٹے ہیں کہ نہ نظر آسکتے ہیں اور نہ ان کے اجزاء ہو سکتے ہیں۔ دیمقراطیس کا خیال تھا کہ ظواہر طبیعی کی تفسیر یہ صورت فرض کرنے سے بآسانی ہو سکتی ہے۔ مثلاً پانی کے متعلق کہتا تھا کہ وہ مرکب ہے نرم ذرات سے جو کرہ دی شکل کے ہیں اور باہم ایک دوسرے پر آسانی سے پھسلتے رہتے ہیں۔ برخلاف لوہے کے ذرات کے کہ وہ سخت ہیں جسم انسانی کو بھی وہ اسی طرح ذرات سے مرکب بتاتا تھا، سانس لینے کو بھی وہ یہی کہتا تھا کہ پرانے ذرات نکل کر نئے ذرات اندر داخل ہوتے ہیں، بلکہ وہ مادہ سے گذر کر روح کی حقیقت بھی یہی بیان کرتا تھا کہ وہ مرکب ہے نرم، لطیف، مستدیر سریع الحرکت ذرات سے جو تمام اجزاء جسم میں حد درجہ سرعت کے ساتھ حرکت کرتے رہتے ہیں۔

لیکن دیمقراطیس کا یہ قول، دوسرے فلاسفۂ یونان کی طرح صرف قول ہی قول تھا اور کوئی عملی تجربہ اس کا نہیں ہوا تھا۔ اس خیال کو ایک زمانہ گذر گیا اور کوئی ترقی اس کو نہیں ہوئی، یہانتک کہ انگریزی فیلسوف ڈالٹن (۱۷۶۶ء-۱۸۴۴ء) پیدا ہوا اور اس نے عملی تجربوں اور مشاہدوں سے دیمقراطیس کے نظریہ کو جانچا، چنانچہ اس نے یہ ظاہر کیا کہ ہر کیمیاوی عنصر مرکب ہے ایسے ذرات سے جو وزن میں برابر، نوع میں متشابہ ہوتے ہیں۔ اور دوسرے عنصر کے ذرات سے وزن و نوع میں مختلف ہوتے ہیں لیکن جسوقت دو یا زاید عنصر کو ملایا جاتا ہے تو ان کے ذرات ملکر ایک دقیقۂ مرکب بناتے ہیں اور ان مرکب دقائق یا ذرات

کا مجموعہ اتحاد کیمیادی کہلاتا ہے۔

اس کے ایک زمانہ بعد علماء نے بعض جدید نوامیس دریافت کئے جنکی بنا پر ڈالٹن کی رائے میں کچھ اضافہ کرنا پڑا اور بعض اور نظریے پیدا ہوئے، جن میں سے بہت مشہور نظریہ یہ تھا کہ مختلف گیس یا بخار کے حجوم متسادی • متشابہ حالات میں برابر کے دقائق منفصلہ رکھتے ہیں۔

اس کے بعد ذرات عناصر کا وزن ذرۂ آکسیجن کی نسبت سے مقرر کیا گیا، چنانچہ آکسیجن کا وزن ۱۶ مانکر کاربن کا وزن ۱۲، نائٹروجن کا ۱۴ مانا گیا۔ سب سے ہلکا وزن ہیڈروجن کا (یعنی ۱۰۰۷۷) اور سب سے وزنی یورانیوم کا (۲۳۸۰۲) مقرر ہوا۔ اوزان کی تعیین سے گویا علم کیمیا کی ریاضی بنگئی اور بہت سے مسلمات کیمیادی حساب کے مرتب ہوگئے جنکے بغیر اس علم کا سمجھنا دشوار ہے

الغرض ۱۹۰۳ء تک دنیا کا اعتقاد یہی رہا کہ عناصر کے ذرات بالکل فرضی اور ناقابل تجزیہ ہیں، ان کے ابعاد و اوزان کی معرفت ممکن نہیں اور جس وقت مادہ تحلیل کیا جاتا ہے تو اس میں ۹ مختلف قسم کے دقایق پائے جاتے ہیں جو مختلف عناصر کے ذرات ہیں۔ لیکن گذشتہ ۲۵ سال کے اندر اس نظریہ میں بہت تغیر پیدا ہوگیا ہے۔ مثلاً یہ کہ ذرات عناصر فرضی نہیں بلکہ حقیقتاً موجود ہیں اور یہ کہ ذرہ یا عنصر ڈالٹن کی رائے کے مطابق خاموش یا ساکن چیز نہیں ہے بلکہ اسکا نظام بالکل نظام شمسی کیطرح ہے جس طرح کہ آفتاب کے گرد اس کے تابع سیارے گردش کرتے رہتے ہیں، اسی طرح ذرہ کے اندر بھی ایک مرکزی چیز آفتاب کی طرح قائم ہے جسکے گرد اور اجزا گردش کر رہے ہیں۔ اس جدید نظریہ نے گویا یہ ثابت کیا کہ تمام عناصر کی اصل ایک ہے اور ایک عنصر کا دوسرے عنصر میں تبدیل ہوجانا ممکن ہے۔ ذرات باوجود ناقابل تجزیہ ہونے کے حقیقتاً موجود ہیں جن سے عناصر ترکیب پاتے ہیں اور جن کو علماء نے شمار کرلیا ہے، وزن کرلیا ہے، ان کی سرعت متعین کرلی ہے اور اس کی تصویر لیلی ہے اس سے یہ مراد نہیں کہ بصارت انسانی نے یہ سب کچھ دیکھ لیا ہے بلکہ مقصود یہ ہے کہ عقل انسانی نے یہ سب کچھ استنباط کرلیا ہے۔ سر ولیم کروکس نے حال ہی ایک آلہ ایجاد کیا ہے جس کا نام "Spinthariscope" (منظار انتشار) ہے اس کے ذریعہ سے معلوم ہوا ہے کہ جب ریڈیم کسی ایسی تختی سے مس کرتا ہے جس پر Zinc sulphide "(کبریت توتیا) کی تہ جمی ہو تو اس سے چھوٹے چھوٹے دقایق پیدا ہوتے ہیں (جنہیں ذرات ہلیوم کہتے ہیں) اور محدب شیشے سے ان چنگاریوں کو دیکھا جا سکتا ہے۔ علماء نے اندازہ کیا ہے کہ ان ذرات کی سرعت ۱۰ ہزار میل فی ثانیہ سے زیادہ ہے۔ اور اس کے ساتھ یہ بھی معلوم کرلیا ہے کہ اس مادۂ مشتعل کے متعین وزن میں کتنے ذرات ہلیوم ہیں اور کتنی چنگاریاں فی سکنڈ پیدا ہوتی ہیں

ڈاکٹر ولسن ذرۂ ہلیوم کے حرکت کی تصویر لینے میں بھی کامیاب ہوگیا تھا اور وہ اس طرح کہ جب ذرۂ ہلیوم تر ہوا کے اندر سے گزرتا ہے تو پانی کا بخار متکاثف ہوکر نہایت باریک نقطوں کی صورت میں تبدیل ہوجاتا ہے جسکی تصویر لی جاسکتی ہے۔

ڈاکٹر آسٹن کا بیان ہے کہ اگر ایک مکعب ڈسیمیٹر (Decimeter) لیکر اس کے آٹھ برابر کے مکعب

بنائے جائیں اور پھر ان میں سے ہر ایک کے برابر برابر مکعب بنائے جائیں اور یہ عمل ۴۰ بار کیا جائے تو اخیر میں ہکوسیسے کا ایک ذرۂ اصلی دریافت ہو جائے گا۔ جو اس قدر باریک ہو گا کہ اگر ایک مکعب ڈیسیمٹر سیسے کے ان ذرات کو برابر رکھا جائے تو لاکھوں بلکہ کروڑوں میل تک پہونچ جائیں۔

ذرۂ مادی خود ایک مجموعہ ہے اجسام سالبہ کا جنھیں کہارب (Electrons) اور اجسام موجبہ کا جنھیں پروٹن (Protons) کہتے ہیں، یعنی پروٹن کے گرد کہارب گردش کرتے رہتے ہیں اور یہ نظام ایک ذرہ مادی بناتا ہے۔ پروٹن اور کہارب کے حجم کا ذکر فضول ہے کیونکہ اگر ایک ذرہ کو بڑا کر کے گنبد کی طرح بنا دیا جائے تو بھی کہارب آلپین کے سرے کے برابر نظر آئیں گے۔ اور پروٹن اسوقت بھی نہ نظر آئے گا۔ الغرض ذرہ کا وجود بھی بالکل نظام شمسی کے طرح مانا گیا ہے البتہ فرق یہ ہے کہ مختلف عناصر کے ذرات میں مختلف کہارب یا برقپارے ہوتے ہیں۔

اسی کے ساتھ یہ بیان بھی دلچسپی سے خالی نہ ہو گا کہ بعض مرتبہ ذرہ پھٹ کر بے شمار حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے اور اسکی ہر تقسیم ایک مستقل نظام گردش ہوتی ہے اور اسی طرح ایک عنصر دوسرے عنصر میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ مثلاً ذرہ یورانیوم میں ۹۲ برقپارے ہوتے ہیں، اگر اس نظام میں تبدیلی ہو کر صرف ۸۸ کہارب رہجائیں تو وہ ذرۂ ریڈیم میں تبدیل ہو جائیگا یا صرف ۸۲ رہجائیں تو وہ سیسہ بنجائیگا۔ یا صرف ... رہجائیں تو پارہ اور ۷۹ رہجائیں تو سونا بنجائیگا۔ چنانچہ اسی اصول بنا پر جرمنی کے کسی کیمیادان نے حال ہی میں پارہ کو سونے میں تبدیل کر دیا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ بعض علماء ذرہ کی اس حقیقت کے مخالف ہیں اور خصوصیت کے ساتھ اینشٹین کے نظریے کے مطابق جس نے نہ ایتھر کے وجود کو مانا ہے نہ قانون جذب کشش کو گذشتہ تحقیق ذرہ کے متعلق بعض کے نزدیک درست نہیں لیکن ابھی تک دنیا اسی پہ کاربند ہے اور تا حال کوئی اور ایسا زبردست یقینی نظریہ پیدا نہ ہو سکا جو اول نظریہ کو غلط ثابت کر دے۔

سکہ کا رواج اسلام میں

(جناب صدرالدین صاحب۔ بھاولپور)

سکہ کا رواج اسلام میں کب سے ہوا اور قبل اسلام لین دین کی کیا صورت تھی۔

(نگار) عرب کے ایام جاہلیت میں کسی خاص سکہ کا رواج نہ تھا۔ خرید و فروخت میں قریب کے ملکوں کے سکے استعمال کرتے تھے چنانچہ اس وقت انکے یہاں دینار رومی جسے وہ رومیہ کہتے تھے اور ایران کے سکے جنھیں وہ دراہم کسروی کہتے تھے زیادہ رائج تھے،

حدود یمن کے قریب حمیری سکے بھی چلتے تھے۔

ظہور اسلام کے بعد بھی اس طرف کوئی توجہ نہیں کی گئی اور بعض احادیث سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ اوزان و اعداد نا:
تول اور خرید و فروخت میں سکہ وغیرہ وہی رائج تھے جو ظہور اسلام سے پہلے پائے جاتے تھے۔ خلیفہ اول ابو بکر صدیق کے زمانہ میں
بھی اس طرف اعتنا نہیں کیا گیا۔ خلیفہ دوم کے زمانہ میں فتح عراق کے بعد جب دولت ساسانی پر اقتدار قایم ہوا تو اس وقت
وہاں تین مختلف وزن کے درہم رائج تھے (۱۰، ۱۲، اور ۲۰ قیراط کے)۔ خلیفہ دوم نے یہ دیکھ کر کہ اس اختلاف وزن کیوجہ
سے ادائے زکواۃ میں دقت پیدا ہوگی، صرف ایک سکہ ۱۴ قیراط کا رائج کیا جسے درہم عمری کہتے ہیں اور یہ پہلا سکہ ہے جو
عہد اسلام میں رائج ہوا، اور ان دس سکوں کو سات مثقال کے برابر قرار دیا گیا تھا۔ سکہ کی صورت وہی رکھی گئی جو پہلے تھی
یعنی ہلال اور ستارہ جو قدیم اہل فارس کا نشان تھا وہ بدستور اسیر قایم رکھا گیا البتہ دائرہ میں بسم اللہ، بسم اللہ ربی یا الحمد للہ
اور سنہ ہجری کندہ کیا گیا۔ اس کے بعد خلیفہ چہارم (علی ابن ابی طالب) کے وقت تک یہی سکہ قایم رہا اور اس میں کوئی
تغیر نہیں ہوا۔ جب ۴۱ھ میں دولت اموی شام میں قایم ہوئی تو معاویہ نے بھی کئی سال تک وہی سکہ مسکوک کرایا جو پہلے
سے رائج تھا، لیکن ۵۱ھ میں صوبوں کے امرا نے امیر کو لکھا کہ اگر سکہ پر امرا مسلمین کے نام درج کئے جائیں تو کیا حرج ہے۔ امیر
نے اسکی اجازت دیدی اور اب امرا کے نام بھی (پہلوی خط میں اور بعد کو کوفی خط میں) سکہ پر کندہ ہونے لگے۔

جب بنی امیہ کے پانچویں تاجدار (عبد الملک بن مروان) کا زمانہ آیا تو اس نے حکم دیا کہ اسکا نام سکہ پر درج کیا جائے اور
اسیر "عبد الملک امیر المومنین" بھی بسم اللہ ربی کے ساتھ ساتھ منقوش کیا گیا۔ حجاج نے جو سکے عراق میں مسکوک کرائے
ان کے متعلق مورخین کا اختلاف ہے بعض کا بیان ہے کہ اسنے "احمد اللہ الصمد" یا "بسم اللہ" کے ساتھ اپنا نام بھی بڑھویا
تھا، اور اہل عراق اس سکہ کو نقلی کہتے تھے۔ لیکن اس خیال کی تصدیق پر کوئی علمی دلیل موجود نہیں ہے۔

ابن خلدون اور مقریزی کا بیان ہے کہ سب سے پہلے عبد اللہ ابن زبیر نے گول سکے کا رواج دیا۔ یعنی جب مکہ میں ان کا
مستقل قیام ہو گیا تو انہوں نے ایرانی سکہ کی صورت بدلکر اس کو گول کر دیا اور اس کے ایک جانب "محمد رسول اللہ" اور
دوسری طرف "امر اللہ بالوفا و العدل" تحریر کرایا۔ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ جب انکے بھائی مصعب کا زمانہ آیا تو انہوں
نے ایک جانب لفظ اللہ اور دوسری طرف لفظ برکت نقش کرایا، لیکن علماء متاخرین کی روایات سے یہ ثابت نہیں ہوتا
کہ ابن زبیر نے نئی طرح کا سکہ جاری کیا، سوائے اس کے کہ علماء آثار نے ایک سکہ ضرور ایسا پایا ہے جسکے ایک طرف پہلوی
خط میں "عبد اللہ امیر المومنین" اور دوسری طرف "بسم اللہ ربی" منقوش ہے اور اس کا سنہ ضرب ۶۲ ہے۔ مصعب
ابن زبیر کے زمانہ کا جو سکہ ملا ہے اسمیں صرف لفظ بسم اللہ پایا جاتا ہے لفظ برکت نہیں ہے اور نہ یہ سکے فارسی سکوں سے
صورت میں مختلف ہیں۔

طلائی سکوں میں سوائے دینار رومانی کے جسے وہ ہرقلیہ کہتے تھے، اول اول وہ کسی اور سکہ سے واقف نہ تھے،

جب خلیفہ ثانی کے زمانہ میں سوریہ فتح ہوا تو انہوں نے اسی کو قایم رکھا البتہ اسپر کوئی عربی کلمہ اور سنہ ہجری میں بڑھا دیا۔ لیکن اس قسم کے سکے تلاش سے صرف دو چار دستیاب ہو سکے ہیں جس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ عبدالملک نے طلائی سکے جمع کر کے گلوا دیتے تھے اور پھر ان کو جدید طریقہ پہ ڈھالا تھا۔

تانبہ کا سکہ بھی (جسے عرب "فلس" کہتے تھے) رومانی تھا اور مسلمانوں نے فتح شام کے بعد اس کو بھی ادنی تغیر کے ساتھ اسی حال پر قایم رکھا۔

الغرض ابتدا عہد میں مسلمانوں نے مشترک سکے مسکوک کرائے اور کوئی خاص طرز انکی قایم نہیں کی۔ سب سے پہلے مشترک درہم دمشق میں مسکوک ہوا جسپر شاہ ہرقلیوس کی کھڑی تصویر بنی ہوئی ہے اور درمیان میں صرف M اور دونوں طرف تاریخ ضرب XVII - a n n o (یعنی سنہ ۱۷) درج ہے۔ اس سکہ پر کوئی عربی لفظ نہیں پایا جاتا۔ اس طرح مشترک تانبہ کا سکہ سنہ ۱۷ء میں بمقام حمص ڈھالا گیا۔ اس میں کلمۂ طیب بھی عربی میں منقوش ہے۔

آستانہ کے خزانہ میں مشترک نقود اسلامی میں سے ایک درہم سنہ ۲۰ھ کا پایا جاتا ہے جو ہرات میں ڈھالا گیا تھا۔ اس کے وسط میں کسریٰ ثانی کا چہرہ ہے اور نیچے چاند تارہ، بائیں طرف دو لفظ "ام افزود" اور حلکہ ہوسروی (یعنی کسریٰ) پہلوی خط میں منقوش ہیں اور دائرہ میں بسم اللہ بخط کوفی درج ہے۔

اسی طرح عہد عثمانی کا ایک سکہ جو سنہ ۲۸ھ میں مسکوک ہوا اور عہد حضرت علی کا ایک درہم جو سنہ ۳۷ھ میں مسکوک ہوا، اور معاویہ و زیاد ابی سفیان وغیرہ کے عہد کے سکے دریافت ہوئے ہیں اور ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائے اسلامی سکے رومانی اور فارسی سکوں کے ساتھ مشترک تھے یعنی انہیں میں تھوڑی تبدیلی کر کے قایم رکھا تھا۔

؎ ایک سکہ فرانس کے عجائب خانہ میں ہے، ایک کرنل کو تری کے پاس ہے اور تیسرا آستانہ کے عجائب خانہ میں۔

تذکرہ خندۂ گل

ترکی میں اصلاحات جدیدہ کا طوفان

بظاہر یہ امر نہایت معمولی معلوم ہوتا ہے کہ حکومت ترکی نے عربی حروف بدلکر لاطینی حروف اختیار کر لئے، لیکن مصطفیٰ کمال پاشا نے اس تدبیر سے ایسی غیر معمولی تبدیلی ساری قوم کی ذہنیت میں پیدا کر دی ہے کہ مشکل سے کوئی اور تدبیر اسقدر مفید ثابت ہو سکتی۔ زبان پر اس تغیر کا جتنا اثر پڑنا چاہئے وہ ظاہر ہے کیونکہ اس سے قبل کی جتنی کتابیں عربی حروف کی تھیں وہ سب منسوخ کر دی گئی ہیں، اور اسوقت ساری قوم بغیر لٹریچر کے رہگئی ہے۔ لوگوں نے عربی خط کی مطبوعات کو خریدنا چھوڑ دیا ہے اور کتب فروشوں کو جرأت نہیں کہ انہیں بازار میں لائیں، ہر چند قانوناً اسکی ممانعت نہیں ہے۔ صرف قسطنطنیہ میں ۲۰ لاکھ کتابیں ضایع کی گئیں، اور پبلشروں و کتب فروشوں نے حکومت سے معاوضہ کی درخواستیں پیش کی ہیں۔ جنوری آیندہ سے کوئی کتاب عربی حروف میں طبع نہیں ہو سکتی۔

جدید حروف میں اس وقت ایک کتاب شایع ہوئی ہے جو بازار میں فروخت ہو رہی ہے۔ یہ ایک ممبر پارلیمنٹ کی لکھی ہوئی ہے اور "شعر منثور" کا مجموعہ ہے۔ اسکا نام دلمہ دلمہ (قطرہ قطرہ) ہے اور جو طلبہ کو بصورت انعام دیجائیگی۔

حکومت کے مطابع اسوقت اسکول کی کتابوں سے بھرے پڑے ہیں۔ بچوں کے لئے پرائمری، ریڈریں، معہ رنگین تصاویر اور نقشوں وغیرہ کے جدید حروف میں چھاپی جا رہی ہیں، انکی مانگ ملک میں بہت ہے۔ لاطینی حروف کے رواج نے زبان پر بڑا اثر کیا ہے اور اسکی سادگی بڑھتی جاتی ہے بہت سے قدیم وہ الفاظ جو جدید حروف میں آسانی سے نہیں لکھے جا سکتے ترک ہوتے جاتے ہیں، اور عربی فارسی کے تمام الفاظ زبان سے علیحدہ کئے جا رہے ہیں۔

مختلف صوبوں میں کمیشن مامور کئے گئے ہیں تاکہ ان مفید الفاظ اور فقروں کی تحقیق کریں جو نئی زبان میں رائج ہو سکتے ہیں، زبان کی یہ کمیشن، ایک قسم کی ترکی اکاڈیمی کی صورت اختیار کر رہی ہے جسکا فرض ہوگا کہ وہ مصنفین و مؤلفین کو زبان کی مناسب حدود سے آگے نہ بڑھنے دے۔

ناول نویسوں کی تعداد وہاں بڑھ رہی ہے اور وہ لوگ جو پرانی طرز تحریر کے عادی تھے وہ جدید حروف میں لکھنا اور جدید اسلوب بیان میں تصنیف کرنا سیکھ رہے ہیں۔

حروف آشنا اور پڑھا لکھا ہونا اب وہاں فیشن ہے اور ہر آغا (ان پڑھ) اب آفندی (پڑھا لکھا) بننے میں مصروف نظر آتا ہے۔

مصطفےٰ کمال پاشا نے فنون لطیفہ کی ترقی کی طرف بھی توجہ کی ہے، تصویر سازی اور مجسمہ سازی کے خلاف مذہبی ممانعت
سوخ کر دیا ہے۔ انھوں نے اپنی ایک تقریر کے دوران میں ظاہر کیا کہ کوئی مہذب قوم بغیر فنون لطیفہ کی ترقی کے رہ نہیں سکتی اور حسن
کا اظہار مختلف ذرایع سے کبھی مخرب اخلاق نہیں ہو سکتا۔

غازی مصطفےٰ کمال کے پورے اور نصف مجسمے تمام بڑے بڑے شہروں میں قایم کئے گئے ہیں۔ انگورہ میں ایک بڑا
رہ دعات کا نصب کیا گیا ہے، جسمیں وہ وردی پہنے ہوئے گھوڑے پر سوار ہیں اور اپنے نئے دارالسلطنت کی طرف دیکھ رہے ہیں
کے گرد چار سپاہی ہیں جو سنگینوں کو اسطرح تانے ہوئے ہیں جیسے مدافعت کے وقت تانی جاتی ہیں۔

عریاں نقاشی و مجسّمہ سازی بھی مدارس فنون میں سکھائی جاتی ہے۔

اسمیں شک نہیں کہ لاطینی حروف کے اجرا نے بعض حلقوں میں بےچینی پیدا کر دی تھی اور بر دحصہ میں علانیہ مخالفت بھی کی گئی
ن یہ لوگ فوراً گرفتار کئے گئے اور ایسی تحریکوں کو سختی سے دبا دیا گیا۔ اور دور کے اضلاع میں جہاں قدامت پرستی باقی ہے
ید اصلاحات کو اسلام کے منافی سمجھا جاتا ہے، لیکن کھلی ہوئی مخالفت کرنے کی تاب کسی میں نہیں ہے۔ غیرملکی لوگوں کی سخت
انی ہوتی ہے، اور جب ان میں سے کوئی اِدھر اُدھر جاتا ہے تو اسکی نگرانی کا کاغذ ساتھ ساتھ جاتا ہے، لیکن کوئی خیال منافر
مداوت اسمیں شامل نہیں ہوتا۔

ترک قوم اجنبی تنقید کا بڑا خیال رکھتی ہے اور اسی لئے یورپ کے تمام اخبار وہاں نہایت شوق اور دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں
غور کیا جاتا ہے کہ انکی اصلاحات جدید کے متعلق دنیا کیا خیال ظاہر کر رہی ہے۔

غازی مصطفےٰ کمال پاشا، ان لوگوں میں سے ہیں جنھیں اپنے اوپر اعتماد ہوتا ہے اور سیرت کی اس مضبوطی کے ساتھ ہر
رمیں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اس لئے ترکی کا موجودہ انقلاب ہر چند ایک شخص کی کوششوں کا نتیجہ ہے لیکن چونکہ اب
ارا ملک سمجھ گیا ہے کہ ترقی کا راز کیا ہے اور انکا ملک کیونکر ترقی یافتہ ممالک کے دوش بدوش چل سکتا ہے اس لئے وہاں اب
عمل (Reaction) ممکن نہیں اور افغانستان کا سا حشر اسکا کبھی نہیں ہو سکتا۔

زمانہ حال کے قارونوں کا محلہ

اسوقت تمام دنیا میں نیویارک سے زیادہ دولتمند شہر کوئی نہیں لیکن شاید کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ نیویارک کی یہ شہرت صرف اس ایک محلہ یا سڑک سے قایم ہے جو پارک ایونیو
(Park Avenue) کے نام سے معروف ہے اور جہاں کے خاندانوں کی دولت و ثروت بالکل اسی طرح میراثی چلی آرہی
ہے، جس طرح جسم انسانی کے وظایف الاعضا۔ معدنیات کے بادشاہ، کہربا کے مالک، فلم سازی کے قابض، بنکوں کے قطب، صنعت
رفت کے خدا، الغرض ان تمام مشینریوں کے انجن جنسے دنیا کی دولت و ثروت پر قبضہ کیا جا سکتا ہے، اسی محلہ میں قایم ہیں اور نہیں
اشارے پر عالم کی تجارت کا مدوجزر منحصر ہے۔

برطانیہ عظمیٰ جسکی مملکت میں کبھی آفتاب غروب نہیں ہوتا ۲۶۷ ۵ لکھ پتی رکھتا ہے، لیکن پارک ایونیو کی ۳ میل جگہ میں ...۵ خاندانوں

اور ۲۰۰ ہزار کی آبادی کے اندر دو ہزار سے زیادہ لکھ پتی پائے جاتے ہیں۔

یہ لوگ اپنے محلوں میں رہتے ہیں یا ایسے کمروں میں جن کا کرایہ ۱۰۰ ڈالر ماہوار سے ۵۰۰۰ ڈالر سالانہ تک ہے۔ یہاں کے امراء کی ایسوسی ایشن کا بیان ہے کہ اس کے ممبروں کی ثروت کا اوسط ۵ ارب ڈالر ہے۔ ۱۹۲۷ء میں ان خاندانوں نے ۱۰ کروڑ ڈالر اسباب تعیش کی فراہمی میں صرف کئے۔ پھر چونکہ یہاں کی دولت، یہاں کا صرف، اور یہاں کی آبادی ۵ ۲ فی صدی کے حساب سے بڑھ گئی ہے، اس لئے ۱۹۲۹ء کے لئے ۴۲ کروڑ ڈالر صرف کا اندازہ کیا گیا ہے۔ یعنی فی خاندان ۴۸ ہزار ڈالر۔ نیویارک کی کل آبادی کے لحاظ سے اس محلہ کی آبادی ایک فی صدی کی ۱/۳ ہے لیکن اس کا صرف ۳ ۲/۳ گنا زائد ہے اس رقم سے جو سارے شہر کی تعلیم کے لئے ۱۹۲۸ء میں درج بجٹ کی گئی تھی۔ آبادی کے لحاظ سے ان لوگوں کی اہمیت کچھ نہیں ہے، لیکن ۲۵-۱۹۲۶ء میں جو رقم تمام ملک کے ابتدائی و ثانوی تعلیم کے لئے منظور کی گئی تھی اس کے ۱/۴ حصہ کے برابر انہوں نے تاجروں کو دی۔

اوسطاً سالانہ خرچ یہاں کے ہر خاندان کا ۱۹۲۹ء کے لئے، ۳ ہزار ڈالر اندازہ کیا گیا ہے، یعنی یہ سارا محلہ ۱۹۲۹ء میں ایک کروڑ ۵۰ لاکھ ڈالر غذا اور لباس پر صرف کریگا جو ایک لاکھ کلرکوں کی سالانہ تنخواہ ہے۔

تفریح اور سیر و سیاحت پر ۱۸ ہزار ڈالر فی خاندان یا ۹ کروڑ ڈالر تمام خاندانوں پر صرف ہوگا۔ علاوہ اس کے ۱۴ کروڑ ۵۰ لاکھ کروڑ ڈالر پھول، عطر، خیرات وغیرہ پر صرف ہوں گے۔ شراب کے مصارف کا اندازہ ایک کروڑ ۵۰ لاکھ ڈالر ہے۔

چینی انسائیکلوپیڈیا

چینی انسائیکلوپیڈیا کا نام "چن تن کوچن تو شو چی چنگ" ہے اسکی پچاس ہزار جلدیں ہیں جن کا وزن ایک ٹن پندرہ ہنڈرویٹ ۸۰ پونڈ ہے۔ حال ہی میں اسکا ایک سٹ مکگال یونیورسٹی کی گسٹ چینی لائبریری نے مول لیا ہے۔ یہ گویا دوسرا سٹ ہے جو چین سے باہر مول لیا گیا ہے، پہلا لندن کی برٹش میوزیم نے لیا تھا۔ یہ انسائیکلوپیڈیا ۱۷۲۶ء اور ۱۷۷۱ء کے درمیان مرتب کی گئی تھی اور انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا سے چار چند مواد اسمیں موجود ہے۔ اور کثرت سے تصاویر دی گئی ہیں۔

دس روپیے سے بھی ایک بڑی تجارت ہو سکتی ہے

دس ہزار آدمی اگر دس دس روپیہ دیدیں تو ایک لاکھ روپیہ کا سرمایہ جمع ہو سکتا ہے۔ اور اس مشترکہ سرمایہ سے بڑے پیمانہ پر کوئی مفید تجارت کی جا سکتی ہے لیکن ایسی مشترکہ تجارتوں کیلئے گورنمنٹ نے ایک خاص قانون بنا رکھا ہے جس کا نام **کمپنیوں کا قانون** ہے۔ اس قانون کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اس قسم کی مشترکہ تجارتوں میں شریک ہوں ان کے حقوق کی نگرانی کی جائے اور ان منتظمین پر ایسی پابندیاں عائد کر دی جائیں کہ انکے لئے بے ایمانی اور دغا بازی بہت مشکل ہو جائے۔ اسکے علاوہ کمپنیوں کے قانون نے مشترکہ کاروبار کے **لمیٹڈ** کر دینے کا بھی ایک نہایت مفید طریقہ جاری کیا ہے۔ جس کا یہ مقصد ہے کہ جو لوگ کسی لمیٹڈ مشترکہ کاروبار میں شریک ہوں انکو اس کاروبار کی وجہ سے کبھی اتنا نقصان نہ برداشت کرنا پڑے جسکے برداشت کرنے کے لئے وہ خود تیار نہ ہوں۔

مشترکہ کاروبار میں **محدود ذمہ داری نقصان** کا یہ مفید اصول جاری ہونے سے دنیا کو عظیم الشان مالی تمدنی اور اقتصادی فوائد حاصل ہوئے ہیں۔ اور متمدن قومیں مشترکہ سرمایہ کی **لمیٹڈ** کمپنیاں قائم کر کے اپنے تمول اور سیاسی اقتدار میں روز افزوں اضافہ کر رہی ہیں۔ ہم بھی ان تمام فوائد کو حاصل کر سکتے ہیں بشرطیکہ ہم **لمیٹڈ** کمپنیوں کے معاملات سے واقفیت اور دلچسپی پیدا کریں اور محدود ذمہ داری کی مشترکہ تجارتوں کے فروغ دینے میں تنگ نظری اور پست ہمتی سے کام نہ لیں۔

دہلی میں ۲۷ دسمبر ۲۸ء کو مشترکہ سرمایہ کی ایک **لمیٹڈ** تجارتی کمپنی اشاعت و طباعت کتب وغیرہ کا کاروبار کرنے کیلئے "**دی حسن نظامی ایسٹرن لٹریچر کمپنی لمیٹڈ**" کے نام سے قائم ہوئی ہے آپ اس کمپنی کا پراسپکٹس یعنی ترغیب شراکت فارم منگا کر پڑھیں تاکہ اس **لمیٹڈ** کمپنی کے حالات و معاملات سے آپکو پوری واقفیت ہو جائے اور اگر آپ پراسپکٹس پڑھنے کے بعد مناسب سمجھیں تو حسب مقدرت اس مشترکہ تجارت میں تھوڑا بہت سرمایہ لگا کر شریک ہو جائیں ابھی ایک کارڈ پراسپکٹس کیلئے ذیل کے پتہ پر لکھیے

پتہ

مینجنگ ڈائرکٹر دی حسن نظامی ایسٹرن لٹریچر کمپنی لمیٹڈ دہلی

تصانیف مولٰنا نیاز فتحپوری
صحابیات
جس میں عہد سعادت کے ۸۵ خواتین کے
مستند حالات درج ہیں۔ اس کا مقدمہ مولانا کی
خاص زبان و انشا میں ہے جو دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے
قیمت فی جلد ۶؍
نگارستان
مولانا نیاز کے معجزات ادب و انشا کا انتخاب
جس میں بعض وہ فسانے و مضامین بھی درج
ہیں جو لٹریچر میں غیر فانی درجہ رکھتے ہیں۔
قیمت فی جلد ۶؍
شاعر کا انجام
مولانا نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا ایک فسانہ
جس کی ایک ایک لفظ قوت خیال اور زور قلم
کا بے مثل نمونہ ہے۔
قیمت فی جلد ۱۰؍
شہاب کی سرگزشت
اردو میں پہلا فسانہ ہے جس میں نفسیاتی تحلیل
کے لحاظ سے سیرت نگاری کی گئی ہے۔ یہ امر
مسلم ہو چکا ہے کہ اردو میں اس سے بہتر تخییل
اور بلند انشا کا فسانہ کوئی شائع نہیں ہوا
قیمت فی جلد ۱۲؍
جذبات بھاشا
ہندی شاعری میں جو لوچ اور کیفیت ہے اس کا
علم انھیں کو ہو سکتا ہے جنھوں نے اس زبان
کی شاعری کا مطالعہ کیا ہے۔ اس کتاب کو دیکھئے
اور جذبات و خیال کی پاکیزگی کی داد دیجئے
قیمت فی جلد ۱۲؍
تاریخ الدولتین
جرجی زیدان مصری مشہور مورخ اسلام کی
تاریخ تمدن اسلامی کے ایک حصہ کا ترجمہ
جس میں عہد بنی امیہ و بنی عباس کی سیاسی
تاریخ پر بے مثل تبصرہ کیا گیا ہے۔
قیمت فی جلد ۸؍
علم فراست الید
یعنی ہاتھ کی لکیروں کو دیکھکر ایک شخص کی سیرت اور اس کے ماضی
و مستقبل کے حالات معلوم کرنے کا علم۔ اس فن پر ایک سلسلہ
مضامین نگار میں شائع ہوا تھا۔ اب اسے خوبصورت جیبی سائز میں
مرتب کیا جا رہا ہے اور آخیر دسمبر ۱۹۳۳ء تک شائع ہو جائیگا۔ اس
کتاب میں اس فن کے تمام مشکلات سلجھا کر آسان زبان میں حل کئے
گئے ہیں کہ ہر شخص مطالعہ کرنے کے بعد نہایت معمولی مشق سے ہاتھ دیکھکر
صحیح احکام صادر کر سکتا ہے قیمت فی جلد ۱۲؍
ظریف شاعروں کا تذکرہ
یا
تذکرۂ خندۂ گل
اردو و فارسی کے جتنے ظریف شاعر گزر چکے ہیں یا اب موجود ہیں ان سب کے حالات
مع ان کے لطائف و ظرائف اور نمونۂ کلام کے یکجا کر دیئے گئے ہیں۔ یہ کتاب
چھپ رہی ہے جو حضرات ابھی سے درخواست بھیجکر اپنا نام درج کرا لیں گے ان سے
قیمت نہ لی جائیگی۔ اشاعت کے بعد اسکی قیمت کا اندازہ
للعہ کیا گیا ہے۔
خاک پروانہ
مشہور فسانہ نگار منشی پریم چند کے افسانوں کا مجموعہ، جن کی شہرت و قبول کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ چینی زبان میں بھی اسکے ترجمے ہوئے ہیں
قیمت علاوہ محصول ۱۲؍
منیجر "نگار" نظیر آباد لکھنؤ

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۰۴

"نگارستان نظیر"

رجسٹرڈ نمبر ۱۱۰۴

جلد ۱۵ ۔ شمارہ ۵

فہرست مضامین مئی ۱۹۲۹ء

اڈیٹر:۔ نیاز فتحپوری

جلد ۱۵	مئی ۱۹۲۹ء	شمارہ ۵

ملاحظات

دنیا میں کوئی ملک ایسا نہیں۔ جسنے کسی انقلاب کو بغیر مقابلۂ صدمات و خطرات قبول کر لیا ہو۔ انقلاب خواہ انفرادی ہو یا اجتماعی، ذہنی ہو یا جسمانی، مذہبی ہو یا سیاسی نام ہے اُن نقوش و آثار، ان امیال و عواطف اور ان عوامل و موثرات کے محو کر دینے کا جو زمانۂ مدید تک ہمارے حواس و اذہان کو متاثر کر چکے ہیں اور جن کے خلاف جنگ کرنا گویا ایک "بنیان مرصوص" ایک "کوہ راسخ" کو ریزہ ریزہ کر دینا ہے پھر یہ تو شدنی ہے کہ اس کوشش میں ہم مجروح بھی ہونگے اور ہلاک بھی، لیکن اسکو آپ کیا کہیں گے، اگر اسی دوران جنگ و مقابلہ میں افتراق و تشتت پیدا ہو جائے اور قوت مرکزی ضعیف، یقیناً یہ وقت ایک قوم کی تاریخ انقلاب میں نہایت نازک وقت سمجھا جاتا ہے اور بیجا ہو گا اگر کہا جائے کہ اسوقت ہندوستان اسی "نازک وقت" سے گذر رہا ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جس ملک میں ہندو مسلمان ایسے دو متضاد عنصر موجود ہوں گے، وہاں کبھی اتحاد پیدا نہیں ہو سکتا اور نہ وہاں "آزادی" کی امن پسند دیوی کبھی اپنا نشیمن بنا سکتی ہے۔ مجھے اس کے ماننے میں کچھ تامل ہے، کیونکہ بعض ملک (مثلاً سوئٹزرلینڈ) اسوقت یورپ میں ایسے موجود ہیں جہاں ایسے ہی متضاد عناصر پائے جاتے ہیں اور وہاں وہی امن و سکون، وہی حریت و آزادی ہے جسکا قیام بغیر اتفاق کامل کے ناممکن ہے۔ اس لئے قبل اسکے کہ ہم مایوس ہو کر بیٹھ جائیں یہ کر غور کر لینا چاہیئے کہ ہمارا باہمی "تضاد" واقعی اس قسم کا ہے کہ

کبھی آپس میں ملنے نہیں دیسکتا، یا ہم نے غلطی سے اسکو ایسا سمجھ لیا ہے۔ میری رائے اس باب میں شق ثانی کی طرف ہے اور یہ میرا اعتقاد ہے کہ ہندو مسلم نااتفاقی نتیجہ ہے صرف غلط فہمی کا اور یہ غلط فہمی وہ ہے جس کے پیدا کرنے کے ذمہ دار صرف مذہبی علماء ہیں خواہ وہ مسلمانوں کے ہوں یا ہندوؤں کے۔

ہندوستانی آبادی میں مذہبی قایدین کی جماعت ہرچند کمیت کے لحاظ سے زیادہ نہیں ہے، لیکن کیفیت و اثر کے لحاظ سے وہ بہت زیادہ ہے اور جس وقت ہم ان کے کارناموں پر نظر ڈالتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے کہ فطرت نے اسوقت تک کیونکر گوارا کر لیا کہ یہ جماعت جو "جبین انسانیت" کا بدترین داغ ہے، اتنے عرصہ تک قایم رہے۔

مذہب کے صحیح مفہوم کو بگاڑ کر عوام کو گمراہ کرنے والی، اخلاق کی صورت کو مسخ کر کے پبلک کو تنگ نظر بنانیوالی، اوہام و اکاذیب کو ذریعۂ نجات قرار دینے والی اور فطرت کی تمام صداقتوں پر پردہ ڈالکر صرف مکر و فریب کی پرستش کرانے والی جماعت اگر کوئی ہے تو وہ صرف مذہبی علماء کی ہے اور تاوقتیکہ ان کے پھیلائے ہوئے جال سے ہم اپنے آپ کو آزاد نہ کریں گے اسوقت کسی فلاح کی امید رکھنا بالکل بے سود ہے۔ انکی تعلیمات یکسر کاذب، انکی ہدایات سر اسر گمراہ کن، انکا درس مذہب و اخلاق بالکل خدع و فریب، اور انکا وجود از سر تا پا لعنت ہے۔ اس جماعت کی داستان مکر و زور بہت طویل ہے، اور تاریخ بشریت کی ابتدا سے لیکر تا ایندم انکی دراز دستیاں اور فتنہ سامانیاں یکساں طور پر ہادم اخلاق و انسانیت نظر آتی ہیں۔ ترکی کی تباہیاں، ایران کی ویرانیاں، افغانستان کی بربادیاں، ہندوستان کی غلامیاں، سب انہیں بابرکت ہستیوں کی کارفرمائی ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ آیندہ کب تک دنیا انکی وجہ سے سوگوار بنی رہیگی۔

میں ہندوؤں سے دریافت کرتا ہوں کہ کیا انکی چھوت چھات، کیا انکا ایک خاص جذبۂ تفوق کے ماتحت دوسری قوموں کو ذلیل و ناپاک سمجھنا، کیا گائے کا یہ لایعنی احترام کہ اسکے لئے انسان کا خون بہانا بھی جایز قرار دیا جائے، کیا دوسرے مذاہب کے اکابر کو برا کہنا واقعی ہندو مذہب کی تعلیم ہے اور کیا یہ تمام تنگ نظریاں انکے یہاں کے مذہبی علماء کی تعلیم کا نتیجہ نہیں ہیں۔ کیا ہندو مذہب نام صرف چوٹی اور زنار کا ہے، کیا ہندو مذہب عبارت ہے صرف مندر و ناقوس سے، کیا انکے ہادی و پیغمبر نے یہ تعلیم نہیں دی کہ تمام بنی نوع انسان ایک حیثیت رکھتے ہیں اور دوسروں کے لئے ایثار و رواداری عین فرض انسانیت ہے۔ ہمکو معلوم ہے کہ دوسرے مذاہب حقہ کی طرح انکو بھی یہی درس دیا گیا تھا اور ایک زمانہ تک اسپر عامل نہ رہنے کے بعد جب علماء زور کا زمانہ شروع ہوا تو مذہب کے صحیح خط و خال محو ہو گئے اور آج انکے مذہب کا مفہوم صرف یہ رہ گیا ہے کہ وہ دوسرے مذاہب والوں کو نجس و ناپاک سمجھیں، انکے اکابر کو گالیاں دیں اور ایک معمولی جانور کے مقابلہ میں انسان کو ذبح کر دینا روا رکھیں۔ کیا وہ کہہ سکتے ہیں کہ انکا مذہب وہی ہے جسکا اسوہ رام اور کرشن نے پیش کیا تھا، انکا مسلک وہی ہے جو اس بیشتر آریہ ورت کے سورماؤں کا تھا؟ ہندوؤں کا مذہب جو اپنے فلسفہ پر ہمیشہ فخر و ناز کر سکتا ہے حقیقتاً ایک ایسا وسیع و جامع مذہب تھا جس میں تفریق نوع انسانی ہمیشہ گناہ سمجھی جاتی تھی۔ لیکن آج اس مذہب کا انتہائی ارتقاء نے فلسفہ کے لحاظ سے صرف پتھروں کو خدا سمجھنا اور عمل کے لحاظ سے صرف تیکھرام، اور راجپال پیدا کرنا رہ گیا ہے۔ یہ کیوں؟ اس لئے کہ وہ اپنے مذہب سے بیگانہ ہیں اور جس چیز کو انہوں اپنا مذہب بنا لیا ہے، وہ مجموعہ ہے صرف مزخرفات و اوہام کا جنھیں ہوا پرست مذہبی علماء نے اپنا احترام و اقتدار

قایم کرنے کے لئے رواج دیا اور جاہل پبلک نے اُسے خدائی تعلیم سمجھ کر قبول کر لیا۔

بالکل یہی حال مسلمانوں کا ہے کہ آج ان کے تمام عبادات وشعایر بے روح ہیں اور انکے اعتقادات مذہبی یکسر مردہ و بے جان نہ انکی نماز میں یہ صلاحیت باقی رہی ہے کہ منکرات ومعاصی سے باز رکھ سکے اور نہ انکے روزہ میں یہ اہلیت پائی جاتی ہے کہ دوسروں کیساتھ ہمدردی کرنا سکھائے۔ انکا مذہب نام ہے صرف چند متعین حرکات کا، مخصوص وضع ومعاشرت کا، انکا اعتقاد ہے کہ اگر مسلمان گائے کی قربانی چھوڑ دیں تو مسلمان نہیں رہ سکتے، اگر اذان ونماز کے وقت، ناقوس کی آواز سنکر لاحول پڑھتے ہوئے کان نہ بند کر لیں تو کفر کی حمایت کرنے والے کہلائیں۔ الغرض صحت اخلاق، تصفیۂ نفس، تزکیۂ روح اور اخوت عامہ جو اسلام کا صحیح مفہوم تھا وہ رسم ورواج پر قربان ہو چکا ہے اور وہ ایک لمحہ کے لئے بھی اس ایثار ورواداری سے کام لینے کے لئے آمادہ نہیں جو "رحمۃ للعالمین" کے مبعوث ہونے کا مقصود تھا۔ یہاں بھی سبب وہی ہے کہ مذہبی علماء نے اپنی اغراض کے ماتحت عوام کو مذہب کی صحیح تعلیم نہیں دی اور اسلام کو ایسی بدترین شکل میں پیش کیا کہ آج کوئی صحیح الدماغ انسان انکی تعلیمات کو صحیح سمجھکر اس مذہب کے حق ہونیپر حکم نہیں لگا سکتا۔

الغرض مذہب کی بنا پر جہاں کہیں دنیا میں فساد پیدا ہوا یا ہو رہا ہے وہ نتیجہ ہے انہیں علماء سوء کی گمراہ کن "ہدایت" کا، ورنہ ظاہر ہے کہ مذہب نام ہے صرف حقیقت وصداقت کا اور دنیا میں کبھی سچائی یا حق پر باہم اختلاف ہو ہی نہیں سکتا۔ اس لئے اگر کوئی صورت ہندو مسلم اتفاق کی ہو سکتی ہے تو صرف یہ کہ دونوں اپنی اپنی جماعت سے اس مہلک عنصر کو علیحدہ کریں اور انکے بتوں کو مسمار کر کے صرف

کفر واسلام در رہش پویاں

کو معیار مذہب کا قرار دیں۔

ہندو مسلمانوں کی تفریق کے علاوہ ایک اور زیادہ مہلک افتراق خود اپنے ہی اندر کی جماعتوں کا ہے اور اس اختلاف نے اسقدر شدید منافرت باہم پیدا کر دی ہے کہ آج کفر واسلام سے زیادہ "دست خویشتن" کا جھگڑا تباہ کن ثابت ہو رہا ہے۔ یہ منظر بھی پیدا کیا ہوا انہیں متبرک ہستیوں کی چیرہ دستیوں کا ہے۔ اور اس کے دور کرنے کی بھی وہی تدبیر ہے جو ابھی عرض کی گئی۔

زمانہ اسقدر ترقی کر گیا ہے کہ ہر شخص نیک وبد میں آسانی سے تمیز کر سکتا ہے اس لئے دنیا کو اب ان قطب نما مولویوں، پنڈتوں، اور مجتہدوں کی ضرورت نہیں، بلکہ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہر شخص خود اپنے آپ کو اپنا رہنما قرار دے کہ عقل سلیم سے زیادہ کوئی ہادی ومصلح نہیں۔

راجپال کے واقعۂ قتل کو کسی اجتماعی تحریک کا نتیجہ قرار دینا ایسا ہی لغو ولایعنی ہے جس طرح اسمبلی کے حادثۂ بم کو کسی اشتراکی جماعت سے منسوب کرنا۔ ہر مذہب وجماعت میں بعض افراد ایسے ہوا کرتے ہیں جو خود اپنے مسلک وطریقت کو متعین کیا کرتے ہیں اور انکے افعال کی ذمہ داری خود انہیں پر ہوا کرتی ہے۔ اس لئے یہ ایک نقاد کی غلطی ہے کہ بعض غیر حقیقی دلایل کی بنا پر ان کو کسی جماعت سے منسوب کرے۔

اسلام نے ہمیشہ اس قسم کی بزدلانہ حرکات پر ملامت کی ہے اور یقیناً اس طرح کسی شخص کو جاکر قتل کردینا، خواہ وہ کتنا ہی واجب القتل ہو کیوں نہ ہو کسی مذہب و ملت میں جایز نہیں ہوسکتا۔ بعض ہندو اخباروں کا یہ شور و واویلا کہ آریہ جماعت کے خلاف اک مستقل جماعت مسلمانوں کی ایسی قایم ہوگئی ہے جو انکے یہاں کے سربرآوردہ لوگوں کو قتل کرے نہایت ہی سطحی ذہنیت کا ثبوت دینا ہے۔

ہر چند راجپال نے رنگیلا رسول لکھ کر یہ ثابت کردیا تھا کہ وہ کوئی ایسا دماغ لیکر نہیں آئے جسکے فقدان پر کسی قوم کو ماتم کرنے کی ضرورت ہو، بلکہ وہ دماغ بھی وہی ذہنیت رکھتا تھا جو ان کے قاتل کی تھی، لیکن اسکی شکایت ہم ہندوؤں سے نہیں کرسکتے کیونکہ مسلمانوں میں بھی متعدد راجپال پائے جاتے ہیں اور آج پنجاب کے ہندو مسلمان اخباروں کی روش کا اقتضا تو یہی ہے کہ وہاں روز ایسی ہستیاں پیدا ہوں۔

اس نوع کی تبلیغی جماعتیں خواہ وہ کسی ملک و ملت کی ہوں انسانیت کے لئے باعث شرم ہیں اور ممکن ہے آریہ سماجی جماعتیں شردھانند اور راجپال کی ہلاکت پر خون کے آنسو بہائیں، لیکن انسانیت و شرافت یقیناً مسرور ہے کہ دنیا سے ایسی فساد انگیز ہستیوں کا خاتمہ ہوگیا۔

اسی طرح مسلمانوں میں بھی جو لوگ اس ذہنیت کے ہیں، انکا دنیا سے اٹھ جانا باعث صد خیر و برکت ہے۔ لیکن جب ملک کے اکابر کا یہ حال ہے کہ اس فقدان پر بجائے مسرور ہونے کے مستقل فنڈ قایم کریں اور اس تحریک نفاق و اختلاف کو ہمیشہ زندہ رکھنے کی کوشش کریں وہاں امن و سکون کی جستجو بیکار ہے۔ غالباً گاندھی جی بھی اپنے نفس مطلئنہ کے سامنے کامیابی کے ساتھ اس الزام کا جواب نہیں دے سکتے اور وہ باوجود اس درجہ بلند اخلاق ہونے کے بھی اس مرتبہ پر نہیں پہونچے جہاں ہندو مسلم سوال اٹھ کر صرف انسانیت کا سوال قابل توجہ رہجاتا ہے۔

افغانستان کی خبریں اس وقت تک اسی طرح الجھی ہوئی آرہی ہیں اور بہ مشکل ان سے کوئی صحیح نتیجہ نکالا جاسکتا ہے۔ تاہم دو باتیں بالکل یقینی ہیں، ایک یہ کہ بچہ سقہ کے خلاف امیر امان اللہ خاں نے جارحانہ کارروائی شروع کردی ہے اور بعض وہ قبائل جو پہلے بچہ سقہ کے طرفدار تھے اب امیر امان اللہ خاں کی اعانت پر آمادہ ہیں۔

جنرل نادر خاں کا طرز عمل بالکل صاف ہوگیا ہے اور اس میں کسی شبہ کی گنجایش باقی نہیں کہ وہ امیر امان اللہ خاں کے طرفدار ہیں اور بچہ سقہ کو اس کے زوال کی خبر دے چکے ہیں۔

غزنی پر امیر امان اللہ خاں کے قبضہ کی اسوقت تک تصدیق طلب ہے، اور نہیں کہا جاسکتا کہ امیر امان اللہ خاں کے حملہ کابل کا نقشہ قبضۂ غزنی کو ضروری قرار دیتا ہے یا نہیں۔ بہر حال اس موسم میں یہ مرحلہ بھی طے ہوجانا ہے اور دیکھنا ہے کہ افغانستان کور باطن ملاؤں کا اثر کامیاب ہوتا ہے یا ایک روشن دماغ مصلح فرمانروا۔ اگر اس جنگ میں امان اللہ خاں کو کامیابی نہ ہوئی تو یہ تاریخ کا کوئی نیا واقعہ نہ ہوگا کیونکہ بارہا تاریکی کو نور پر چھا جاتے ہوئے دیکھا گیا ہے، لیکن یہ یقینی ہے کہ افغانستان کی یہ "ملا گردی"

بھی باقی نہ رہیگی اور امان اللہ خاں نہیں تو خدا کا کوئی دوسرا بندہ جلد یا بدیر پیدا ہوگا جو ان خبیثوں سے ملک کو پاک کرے۔

بچہ سقہ کے جو اعلانات امان اللہ خاں کے خلاف شایع ہوئے ہیں اور ان میں جو جو الزامات امان اللہ خاں پر قایم کئے گئے ہیں وہ اس قدر مضحک ہیں کہ انکو دیکھنے کے بعد کوئی صحیح الدماغ انسان بچہ سقہ کے دور قزاقی کے قیام کو پسند نہیں کر سکتا۔ لیکن یہ بھی خدا کا ایک عذاب ہے جو وہاں کی جاہل و نامعقول قوم پر نازل ہوا ہے اور یہی ذرایع قدرت کی طرف سے تنبیہ کے ہوا کرتے ہیں۔ پھر ایک وقت آئے گا کہ وہ حقیقت کو سمجھیں گے اور ان دیوانوں کی گرفت سے آزاد ہونے کی خود کوشش کرینگے۔ لیکن ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ امان اللہ خاں صرف اپنے اخلاق اور مصلحانہ جذبہ کو حکمرانی کی اہلیت کے ثبوت میں پیش کر سکیں۔ اس لئے انکو خونریزی بھی کرنا پڑے گی اور جہل کا جواب جہل سے دینا ضروری ہوگا۔ سو اس کیلئے بھی امان اللہ خاں کی طیاریاں ایک حد تک اطمینان بخش نظر آتی ہیں۔ بہرحال فضا میں تبدیلی پیدا ہوئی ہے۔ اور آہستہ آہستہ پھر امان اللہ خاں کی مرکزیت اپنی اصلی جگہ پر آرہی ہے۔ پنجاب کے بعض علماء کا طرز عمل اس باب میں بہت زیادہ قابل تعریف ہے اور قابل صد مبارکباد ہیں انکی یہ جرأت کہ باوجود حکومت کی ممانعت کے انہوں نے ملایان افغانستان سے بحث کرنے کے لئے کوچ کر دیا۔ اگر اس سے زیادہ وہ کامیاب نہوں، تو بھی اس قدر ہمت کم کامیابی نہیں ہے جسکا نتیجہ آج نہیں تو کل ضرور نکلے گا۔

مسٹر پٹیل صدر اسمبلی دہلی کی جرأت کا افسانہ لوگوں کو معلوم ہو چکا ہے کہ کس طرح انہوں نے پبلک سیفٹی بل کو مسترد کر دیا، اور یہ بھی معلوم ہے کہ وایسرائے نے اسکو اپنی ذاتی رائے و اختیار سے آرڈنینس کے ماتحت نافذ کر کے یہ بھی بتا دیا کہ اسمبلی اور اسمبلی کا صدر دونوں کسقدر لایعنی چیزیں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک اسمبلی ہال میں وہ صدا گونجتی رہے گی جو "استاد ازل" نے بتا دی ہے تو اسمبلی کا بھی وجود ہے اور اس کے صدر کا بھی ورنہ حکومت کی قدر اندازیاں وہی ہیں اور "بربادی آشیاں" اک امر معلوم ہے۔ ہرچند یہ کوئی نیا عبرتناک منظر اہل ہند کی خودداری اور وطن پرستی کے سامنے نہیں آیا۔ اس قبل بارہا ڈایر و اڈوائر مختلف صورتوں سے جلوہ گر ہوئے اور ہوتے رہیں گے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ قدرت کب تک ہمیں جگاتی رہے گی اور ہمارے خواب کی سرمستیاں کس وقت زایل ہونگی۔ اُسے اپنے اصول بدلنا نہیں، ہمیں اپنیر کار بند ہونا نہیں، پھر یہ تنقید و بیزاری کیوں۔ حکومت ہند میں وہ کونسی برائی ہے جو سوراج ملنے کے بعد دور ہو جائے گی۔ جب تک ہمکو اذان و ناقوس پر نزاع کرنے کی توفیق حاصل ہے ہمو قت کسی اور برکت کے حاصل کرنیکی تمنا کیسی؟ ایک طرف حکومت برطانیہ ہے جسکی تنہا خصوصیت اس کے افراد کی مرکزیت ہے، دوسری طرف ہندوستان کے وہ افراد ہیں جو ابھی تک اپنے ہی اعضا کو نہیں پہچان سکے۔ اور تمنا یہ ہے کہ ہم آزاد ہو جائیں، سوراج حاصل کر لیں۔

پہاڑ کی چوٹیاں جو برق خاطف چاہتی ہیں، انکے سامنے صرف ابر آلود فضا پیش کیجاتی ہے۔ افسوس ہے کہ اس سادگی پر "مرجانے والے" اب پیدا نہیں ہوتے، ورنہ شاید آبگینہ کی یہ "عرض گرانجانی" شکستگی کے

علاوہ کچھ اور نتیجہ پیدا کرتی

گذشتہ ماہ کے رسالہ میں کنیز فاطمہ صاحبہ کی ایک تحریر حکیم مومن خاں کے حالات کے متعلق امتیاز احمد صاحب صابی۔ اسے کے ایک حصہ مضمون کے اختلاف میں شایع ہوئی تھی۔ جناب امتیاز احمد صاحب نے اسکا جواب ان الفاظ میں بغرض اشاعت روانہ کیا ہے :-

محترمہ جناب کنیز فاطمہ کی تحریر میری نظر سے گذری میں ممنون ہوں کہ محترمہ نے مجھے میری فروگذاشتوں سے مطلع فرمایا۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ حکیم مومن خان مومن کی ایک صاحبزادی مولوی عبدالغنی صاحب مرحوم وکیل سیتاپور کو منسوب تھیں مضمون کی اشاعت کے بعد مجھے حضرت ریاض خیرآبادی نے یہ اطلاع دی تھی لیکن مضمون شایع ہو چکا تھا۔ البتہ موصوفہ کا یہ کہنا کہ حکیم مومن خاں مرحوم کی وہ صاحبزادی جنکی تاریخ وفات اس شعر سے نکلتی ہے۔

نال کٹنے کے ساتھ ہاتف نے   کہی تاریخ دختر مومن (۱۳۴۰ - ۸۱ = ۱۲۵۹)

مولوی عبدالغنی مرحوم کو منسوب تھیں مجھے صحیح نہیں معلوم ہوتا۔

اپنی ایک دختر کی تاریخ وفات مومن مرحوم نے اس شعر سے پیدا کی ہے :-

خاک بر فرق دولت دنیا   من فشاندم خزانہ بر سر خاک (۶۶۳ – ۶۰۰)

کلیات مومن میں یہ تاریخ موجود ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ مومن خاں کی کسی ایک صاحبزادی کا ۱۲۶۳ھ میں انتقال ہوا۔

آبحیات میں لکھا ہے کہ "اپنی صغیر سن بیٹی کی تاریخ وفات کہی"

خاک بر فرق دولت دنیا   من فشاندم خزانہ بر سر خاک

"صغیر سن" کی صفت اس واقعہ کو ظاہر کرتی ہے کہ غالباً اسی لڑکی کا ۱۲۶۳ھ میں انتقال ہوا جو ۱۲۵۹ھ میں پیدا ہوئی تھی۔ اور یہی وجہ ہے کہ شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد نے صغیر سن لکھا۔ گمان غالب ہے کہ مولوی عبدالغنی مرحوم کو جو صاحبزادی حکیم مومن خاں کی منسوب تھیں انکی تاریخ پیدائش میں یہ شعر نہیں لکھا گیا ہے۔

نال کٹنے کے ساتھ ہاتف نے   کہی تاریخ دختر مومن

محترمہ نے دوسری بات یہ لکھی کہ "میر حسین تسکین شاگرد ہونے کے علاوہ حضرت مومن کے سمدھی بھی تھے"۔

میں نے اپنے مضمون میں جہاں ایک چہار سالہ صاحبزادی کے انتقال کا حال لکھا ہے اسی صفحہ میں یہ بھی لکھدیا ہے کہ "پسر میر عبدالرحمن" آہی"، خلف میر محمد تسکین (خانصاحب کے فرزند نسبتی) نے (اُردو کلیات) از سر نو مرتب کیا" سچ تو یہ ہے کہ اب یہ کام ایک عورت ہی کا رہ گیا تھا کہ وہ رشتہ کو "موسوم" کردے۔

کیا خاتون محترم اب بھی اس باب میں کچھ لکھنا پسند فرمائیں گی

اس مہینہ کے مضامین میں، ملاحظات کے بعد جناب ذوقی بی اے (علیگ) کا فسانہ "خیرات" کے عنوان سے درج کیا گیا ہے۔ جناب ذوقی کی افسانہ نگاری حسن و عشق کی فسانہ نگاری نہیں ہے بلکہ روسی افسانہ نویسوں کی طرح وہ ہے جسے عوام کی زبان میں بال کی کھال نکالنا کہتے ہیں کسی شخص کی خصوصیات سیرت، کسی واقعات کے تمام جزئیات کو پیش نظر رکھکر فسانہ کے طور پر انہیں ظاہر کر دینا اس فن کا ایک خاص شعبہ ہے جسکی طرف جناب ذوقی کو بہت التفات ہے۔ مولوی عبدالمالک صاحب آروی کا مضمون "قرآن کے فلسفۂ تعلیم" پر مسلسل چل رہا ہے۔ مجھے صاحب موصوف کی کاوش تحقیق سے انکار نہیں اور نہ مضمون کے کارآمد ہونے میں کسی شک کی گنجایش ہے لیکن اگر وہ انہیں مطالب کو کم الفاظ اور ذرا سہل و شگفتہ عبارت میں ادا کریں تو زیادہ مناسب ہے۔ مضمون کے ختم ہونے پر مجھے جہاں جہاں اختلاف ہے بالتفصیل عرض کرونگا۔

"انقلاب" جناب اعظم کریوی کا فسانہ ہے اور اسکی بنیاد اسی زمین پر قایم کی گئی ہے جو انہیں بہت محبوب ہے اور ہونا چاہئے۔ اس فسانہ میں جو درس ہمارے لئے نہاں ہے وہ بڑی حد تک "سودیشی" کیفیات اپنے اندر رکھتا ہے۔

"فلسفۂ مذہب" آیندہ ماہ میں ختم ہو جائیگا جسکے اخیر میں میرا مختصر الوداعی نوٹ بھی ہوگا۔ جناب ضیاء احمد صاحب ایم۔ اے کا فسانہ "غرور حسن" انشا کے لحاظ سے اچھا ہے، گو پلاٹ یا فسانہ نگاری کی دیگر خصوصیات کے لحاظ سے زیادہ اہم نہیں۔ عبدالمنعم صاحب کا "شمالی ہند تاریخی" مضمون ہے اور گو دلچسپ نہیں لیکن مفید ضرور ہے۔ "دو ستارے" فرانسیسی خیال ہے اور بہت لطیف۔ جناب نیاز حسین بی اے نے بہت خوبی کیساتھ اسے اردو میں منتقل کیا ہے۔ تنقید "پیام روح" چونکہ شاعرانہ نقطۂ نظر سے نہیں کیگئی اسلئے اسمیں مبالغہ نہ ڈھونڈھا جائے۔ "رشی مقدس" پر اپنا خیال مضمون کے اخیر میں مینے وضاحت کے ساتھ ظاہر کر دیا ہے۔

منظومات میں جناب محمود اسرائیلی کی نظم مجھے بہت پسند ہے۔ اسرائیلی صاحب لکھتے ہیں اور انکی نظم کو پڑھکر انسان محسوس کرتا ہے کہ کوئی درس اسکو ملا مطبوعات موصولہ کیوجہ سے بعض اہم مضامین کو ملتوی کرنا پڑا، لیکن چونکہ ایک زمانہ سے کتابیں پڑی ہوئی تھیں اسلئے مینے اس فرض کا عہدہ برآ ہونا ضروری خیال کیا۔ باب الاستفسار کی طوالت سے معلومات کا حصہ بالکل "خرد مینی" ہو کر رہگیا۔ امتحان بصیرت کے ساتھ امتحان بصارت بھی لگا ہے ہو جانا چاہئے۔

ماہ آیندہ کے رسالہ میں بعض نہایت اہم اور دلچسپ مضامین شایع ہونگے جنمیں سے ایک میں "غالب کے مذہب" پر پوری تحقیق کیساتھ بحث کیگئی ہے۔ ایک اور مضمون ہے جسمیں "فسانۂ عجائب" کے اجزاء ترکیبی سے بحث کر کے بتایا گیا ہے کہ رجب علی بیگ سرور کا یہ کارنامہ حقیقتاً کس نگاہ سے دیکھے جانے کے قابل ہے۔ ایک فسانہ میرا بھی (یعنے میرا لکھا ہوا) شایع ہونا شروع ہوگا اور عبداللہ خاں علوی کے بالکل نایاب کلام کے بعض اجزا پیش کئے جائیں گے۔

آج کی تاریخ تک تذکرۂ خندۂ گل کے ۳۸۵ صفحات طبع ہو چکے ہیں اب صرف تقریباً ۱۰۰ صفحات اور رہ گئے ہیں جو غالباً نہیں بلکہ یقیناً مئی میں ختم ہو جائینگے اور کتاب کی روانگی شروع ہو جائیگی۔

امسال موسم کی خرابی کا یہ عالم ہے کہ شاید ہی کوئی گھر عوارض حملہ سے بچا ہو۔ چنانچہ میرا سارا گھر بیمار پڑا ہوا ہے اور چونکہ میری دنیا صرف میرا گھر ہے اسلئے کہہ سکتا ہوں کہ اسوقت

سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

ہر چند ابھی تک کوئی سانحہ ایسا رونما نہیں ہوا کہ مجھے مسلوب الحواس کر دے، لیکن کسے خبر ہے کہ کل کیا ہونیوالا ہے۔ بہرحال اسکا اظہار اسلئے ضروری تھا کہ اگر بعض احباب کے خطوط کا جواب میں بروقت نہیں دے سکا تو اسکا سبب تساہل یا تغافل نہ تھا بلکہ "مقابلۂ فطرت" تھا۔

نیاز

(فسانہ)

(۱)

محمود نے گفتگو کرتے ہوئے جوش میں آکر اس زور سے چائے کی میز پر مکا مارا کہ کئی پیچے اپنی جگہ سے اکدم اچھل کر دور جا پڑے۔ دو تین تشتریاں آپس میں ٹکرا کر ٹوٹتے ٹوٹتے رہ گئیں اور میں احمقوں کی طرح منہ کھول کر تعجب سے اس کو دیکھنے لگا۔

"اور میں دکھادوں گا کہ کام کرنے کا کیا طریقہ ہے۔ محض باتیں بنانے اور چیخنے چلانے سے کچھ نہیں ہوتا، اصل چیز خلوص ہے خلوص۔ محال ہے کہ سرگرمی سے کوئی کام شروع کیا جائے اور اس میں کامیابی نہو! ——— تو بہتی سمجھے سعید! بس اب دیر نہ کرنی چاہئے۔ ایک ایک لمحہ قیمتی سمجھو۔ آج ہی سے کام شروع کردیا جائے۔"

محمود ایک ہاتھ کی مٹھی کو زور سے بھینچے ہوئے تھا۔ دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں آدھے سے زیادہ جلا ہوا سگرٹ اٹکا تھا جسکی راکھ اس کی شیروانی پر گر کر بکھر گئی تھی۔ وہ بغیر سانس لئے ٹائپ رائٹر کی سی تیزی کے ساتھ جلدی جلدی باتیں کئے چلا جاتا تھا۔ باتیں کرتے وقت اس کے گُتے ہوئے سانولے چہرے پر چھوٹے بچوں کا سا بھولاپن پیدا ہوگیا تھا۔

تم مجھپر جلدبازی کا الزام رکھتے ہو۔ میں کہتا ہوں کامل آٹھ سال سے جو شخص اسی ایک مسئلہ پر غور کررہا ہو تم اسے جلدباز کیسے کہہ سکتے ہو؟ سوتے جاگتے مجھپر یہی دھن سوار ہے' ان لوگوں کو تو جھونکو چولھے میں جو اس مسئلہ کو اہم نہیں سمجھتے۔ لیکن میں ——— میں اب چین سے نہیں بیٹھ سکتا۔ آخر صبر کی بھی کوئی حد ہوتی ہے؟ غضب خدا کا! ہر سال فقیروں کی آبادی مچھروں اور بھنگوں کی طرح بڑھتی جاتی ہے اور یہ کمبخت جو قوم کے لیڈر بنے اصلاح اصلاح کی چیخ پکار سے اپنا گلا اور دوسروں کے کان پھاڑے ڈالتے ہیں ان کے جسم میں پھریری تک نہیں اٹھتی۔ جیسے ان بزرگوں کو اس مسئلے سے کوئی تعلق نہیں ہے ——— رہنے دیجئے جناب! آپ چاہے مجھے جلدباز کہیں چاہے ناتجربہ کار بنائیں' میں نے تو دل میں ٹھان لی ہے کہ جو ہو سو ہو اس تحریک کو کامیاب بنا کر چھوڑوں گا ——— اور میں پوچھتا ہوں آخر وجہ کیا؟ کہ ایمانداری کے ساتھ کوئی اصلاحی تحریک اٹھائی جائے اور خلوص کے ساتھ اس کے لئے کام کیا جائے اور اُسے کامیابی نہ نصیب ہو۔"

محمود اس بُری طرح باتوں میں لگا ہوا تھا کہ اس کا سگرٹ بغیر پئے ہوئے بالکل جل گیا۔ اُس نے جلتے ہوئے ٹکڑے کو خاکستردان میں رکھنے کے بجائے ایک بے پروا ڈھیلے جھٹکے کے ساتھ قالین پر پھینک مارا اور اس کی زبان کی قینچی بدستور چلنے لگی۔ اگر میں فوراً اُٹھ کر اُسے جوتے سے دبانہ دیتا تو میرے نئے ایرانی قالین میں یہ آدھ انچ کا چھوٹا سا ٹکڑا یقیناً کئی انچ کا سوراخ بنا دیتا۔

"اب رہا یہ سوال کہ مجھے اس راستہ میں سیکڑوں دشواریاں پیش آئینگی۔ تو بھائی اس کے لئے میں پہلے سے پوری طرح تیار ہوں

میں خوب جانتا ہوں کہ ایسے تمام کام صرف دیکھنے ہی میں آسان معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن جب واقعی انھیں عملاً کر کے دیکھو تو ایسی دشواریاں پیدا ہوتی چلی جاتی ہیں جنکا وہم و گمان بھی نہیں ہو سکتا ــــــ میں کوئی بیوقوف تو ہوں نہیں آخر تمام بڑے بڑے شہر چھوڑ کر میں نے حیدرآباد کو اسی کام کے لئے کیوں پسند کیا؟ صرف اسی لئے کہ یہاں مجھے بہت جلد کامیابی ہوگی۔ اُمید سے بھی زیادہ جلد۔ پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہاں سے زیادہ موٹے مُسٹنڈے حرام خور بھکاری ہندوستان کے کسی شہر میں نظر نہیں آتے سب سے پہلے تو مجھے ان پاجی گداگروں کا قلع قمع کرنا ہے جو لنگڑے لولوں اور اپاہجوں کا حق بیچ سے صاف اچک لیجاتے ہیں اور مفت کی روٹی کھا کھا کر سانڈوں کی طرح شہر کے ہر حصے میں اینڈتے پھرتے ہیں خیرات خانہ تو قائم ہوتا ہے گا بعد کو۔ پہلے ان احمقوں کو سمجھانا چاہئے جن کی امداد نے ان مفت خوروں کے حوصلے بڑھا رکھے ہیں۔"

"بہر حال ابھی جلدی کاہے کی ہے۔ کام ہی کرنا ہے تو اطمینان سے شروع کرنا۔ تم تو ایسی جستی دکھا رہے جیسے ایک ہی رات میں خیرات خانہ کی عمارت بنا کر کھڑی کردوگے۔"

سعید اب میں ایک منٹ بھی ضائع کرنا نہیں چاہتا۔ میں لوگوں کو اس گہری نیند سے چونکا دینا چاہتا ہوں جس میں وہ پڑے خراٹے لے رہے ہیں۔ باتیں کرنے کا زمانہ گزر گیا۔ اب عمل کی ضرورت ہے، ٹاؤن ہال میں اس مقصد کے لئے تقریر کرنے کی اجازت میں نے یہاں آنے سے پیشتر ہی حاصل کرلی ہے۔ کل جمعے کو سہ پہر کے تین بجے میرا لکچر ہے۔ لیکن میں لکچر سے پہلے یہاں کے ...."

"کیا کہا؟ کل جمعہ کو سہ پہر کے تین بجے لکچر ہے؟" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے بے انتہا متعجب ہو کر پوچھا۔

"ہاں۔ ہاں۔ کل جمعہ کو سہ پہر کے تین بجے ــــــ لیکن میں لکچر سے پہلے یہاں کے با اثر اور مقتدر عہدہ داروں سے مل کر بھی اس مسئلہ پر زبانی گفتگو کر لینا چاہتا ہوں بعض لوگوں سے تو پہلے ہی خط و کتابت ہو چکی ہے مثلاً شیروانی صاحب سے اور فخر یار جنگ سے اور میر مجلس صاحب سے۔ لیکن تم جانتے ہو یہ بڑے بڑے لوگ زبانی وعدوں ہی کے حاتم ہوتے ہیں ویسے تو خطوں کے ذریعہ ان لوگوں نے میری بڑی ہمت افزائی کی ہے اب دیکھو کچھ عملی مدد بھی کرتے ہیں کہ نہیں۔ میرے دوست تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ اس تحریک میں میں نے کیسی محنت اور جانفروشی سے کام کرنے کا تہیہ کر لیا ہے۔ دن رات ایک نہ کردوں تب کہنا۔"

"محمود تمھارے بے تکے پن کی بھی کوئی حد ہے" میں نے ملامت آمیز لہجے میں جس میں خلوص کا عنصر خفگی سے زیادہ تھا اُسے ڈانٹا "نہ خط نہ تار۔ نہ کوئی باقاعدہ اطلاع۔ آخر اس طرح یکایک آ دھمکنے میں کیا مصلحت تھی خصوصاً جب تمھارے پیش نظر اتنا عظیم الشان مقصد ہو۔ پھر مزہ یہ ہے کہ چپکے ہی چپکے لوگوں سے مراسلت بھی کرلی۔ لکچر کی تاریخ بھی مقرر کرالی۔ یہ بھی کر لیا۔ وہ بھی کرلیا۔ میں پوچھتا ہوں آخر مجھ غریب کو کس قصور کی پاداش میں حضور نے ان تمام باتوں سے بے خبر رکھا کیا تم مجھے دو سطروں کا ایک اطلاعی کارڈ نہیں بھیج سکتے تھے؟"

محمود نے شرارت آمیز ہنسی کے ساتھ جواب دیا

"میں تمھیں یکایک اچنبھے میں ڈال دینا چاہتا تھا۔ میں راستہ بھر اس خیال سے لطف اٹھاتا ہوا آیا ہوں کہ تم مجھے ایک دم

حیدر آباد میں دیکھ کر کیسا کیسا تعجب کروگے۔ اور میرا خیال غلط نہیں نکلا۔ مجھے تانگہ پر سے اترتا ہوا دیکھ کر تم اس طرح بھوچکا ہو ہو کر اور آنکھیں مل مل کر مجھے دیکھ رہے تھے گویا تمھیں میری صورت پہچاننے میں ایڑی چوٹی کا زور لگانا پڑ رہا ہے۔ گویا تم اپنے پُرانے دوست محمود سے نہیں، بلکہ یک لخت اس کی روح سے دوچار ہوگئے ہو۔ کیسا مزے دار اور انوکھا منظر تھا۔ تمھاری شکل بالکل احمقوں کی سی ہوگئی تھی۔"

"اچھا اور یہ لکچر تم کس موضوع پر دوگے؟"

"تم تو سوتے رہتے ہو تمھیں بھلا شعر و شاعری سے کب فرصت ملتی ہے جو یہ معلوم کرو کہ شہر میں کیا ہو رہا ہے۔ بھلے مانس آخر تم کبھی اخبار بھی پڑھتے ہو؟"

یہ کہتے ہوے اس نے اٹھ کر اپنے ہینڈ بیگ میں سے ایک شکن آلود تہ کیا ہوا اخبار نکالا۔ یہ ۲۸ فروری کا "صحیفہ" تھا۔ اس نے اخبار کھول کر ایک جگہ اپنی انگلی رکھ دی۔ میں نے یہ خبر پڑھی:۔

"کلیہ جامعہ عثمانیہ کی بزم اتحاد کے زیر انتظام ۸ مارچ کو بوقت تین بجے سہ پہر جھانسی کالج کے سابق پروفیسر تاریخ، جناب محمود انصاری صاحب ایم۔ اے قومی کیرکٹر پر گداگروں کی کثرت کا اثر" کے عنوان سے ایک دلچسپ لکچر میں ملک کی اخلاقی حالت کی اصلاح کے لئے چند مفید تجاویز پیش کریں گے۔"

خیریت گذری کہ میں پچھلے دو ہفتوں سے حیدر آباد سے غائب تھا۔ ورنہ اخبار نہ پڑھنے کا طعنہ مجھے شرم سے پانی پانی کر دیتا۔ میں آج ہی صبح کی گاڑی میں اورنگ آباد سے واپس آیا تھا۔ شام کو سات بجے والی ٹرین سے محمود پہنچ گیا اور انصاف کی بات تو یہ ہے کہ محمود کو دیکھ کر میں واقعی ششدر رہ گیا تھا۔ میرے پُرانے جگری دوستوں میں شاید وہ آخری شخص تھا جس سے اس قدر ناگہانی ملاقات کی مجھے توقع ہو سکتی تھی۔

محمود نے ایک دوسرا سگرٹ سلگا کر اس کا ایک لمبا گہرا کش لیتے ہوئے کہا۔

"قومی کیرکٹر پر گداگروں کی کثرت کا اثر ——— سعید لکچر کے لئے اچھا موضوع ہے نا؟ دیکھنا کل میں کیسی دھواں دھار تقریر کرتا ہوں۔ مزاج نہ درست کردوں تب کہنا۔ میں کہتا ہوں جب تک ان سوتے ہوے لوگوں کو شانہ ہلا ہلا کر نہیں جھنجھوڑا جائے گا تب تک کام نہیں چل سکتا۔ اگر سچ پوچھو تو سارا فساد، ساری خطا دراصل انھیں بیوقوف فیاضوں کی ہے جو آنکھ بند کر کے اپنا پیسہ لٹاتے ہیں اور پیشہ در بھک منگوں کی مدد کرتے ہیں۔ اب کام کا طریقہ یہ ہونا چاہئے کہ پہلے تو شہر میں ایک مرکزی انجمن قائم کیجائے پھر اس کے تحت تمام اضلاع پر اور خود بلدہ کے دوسرے بڑے بڑے ضلعوں میں اسی کی شاخیں کھولی جائیں۔ بلا تفریق مذہب ہر شخص اسی انجمن کا رکن بن سکتا ہے، اراکین کے ذمہ دو بڑے مقاصد کی تکمیل ہوگی۔ اول تو یہ کہ وہ رضا کاروں کی حیثیت سے اس خیرات کا سدباب کریں جو ہٹے کٹے تندرست ہاتھ پیر والوں کو اندھے دولت مندوں کے ہاتھوں روزانہ کثیر مقدار میں بانٹی جاتی ہے تحریر سے، تقریر سے، زبانی گفتگو سے، مباحثوں سے، پمفلٹوں کے ذریعہ سے، غرض جس طرح بھی ہو سکے وہ لوگوں کو برابر اسی

حماقت سے باز رکھنے کی کوشش میں لگے رہیں۔ بلکہ میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ اگر کسی شخص کو اس طرح کی خیرات کرتے ہوئے دیکھیں تو بڑھ کر فوراً اس کا ہاتھ پکڑ لیں۔ ان کا دوسرا فرض یہ ہے کہ جو روپیہ پیسہ پہلے نااہلوں کی دوزخ کو بھرنے کے لئے محض کیچڑ میں پھینک دیا جاتا ہے اُسے گھر گھر پھر کر جمع کریں اور یہ مرکزی انجمن میں محفوظ کراتے رہیں تاکہ جب وقت اور موقع اجازت دے تو اس روپیہ کو خیرات خانہ کی عمارت میں لگا دیا جائے ———— کل کے لکچر میں پوری طرح اس بات کی اہمیت ذہن نشین کرانا چاہتا ہوں کہ جو شخص جان بوجھ کر غیر مستحق گداگروں کی مدد کرتا ہے وہ ملک اور قوم کا بہت بڑا مجرم ہے۔ قوم کو پورا پورا حق ہے کہ ایسے لوگوں کی علاً گرفت کرے اور اُنھیں اس حرکت پر اچھی طرح نادم کرے اور بُرا بھلا کہے"۔

محمود بلا سانس لئے، بغیر درمیان میں رُکے بے تحاشا گفتگو کے چلا جاتا تھا اور میں دل ہی دل میں حیران ہو رہا تھا کہ یا الٰہی یہ دو ہی سال میں محمود بالکل بدل کیسے گیا؟! کہاں محمود کہاں قومی اصلاح کے عافیت تنگ کر دینے والے جھگڑے جھمیلے! میں محمود کو بچپن سے جانتا تھا۔ اس کی سیرت کے ہر رُخ سے اچھی طرح واقف تھا۔ وہ بے انتہا تخیلی آدمی تھا، بتکلیف وہ حد تک تخیلی۔ وہ بڑی سے بڑی اسکیمیں، بہتر سے بہتر پروگرام بنا سکتا تھا۔ نہایت عمدہ سوجھ بوجھ کا انسان تھا لیکن عملی حیثیت سے اپاہجوں کی طرح نکما۔ تخیل کی شدت نے اس کی عملی استعداد کا گلا بالکل گھونٹ دیا تھا۔ باتیں بنانے اور ہر مسئلہ کے متعلق جوش و خروش اور جذبات سے بھری ہوئی ٹھیٹ اصولی بحث کرنے میں اسے کمال حاصل تھا۔ لیکن تمام تخیلی اور جذباتی آدمیوں کی طرح اس میں ارادے کا استقلال بالکل غائب تھا۔ وہ اس وقت جسطرح چیخ چیخ کے گفتگو کر رہا تھا اور اپنی سرگرمی کا یقین دلا رہا تھا وہ میرے لئے کوئی غیر معمولی منظر نہ تھا۔ میں اس سے پیشتر ایک دو نہیں بیسیوں مرتبہ اسے اس سے بھی زیادہ جوشیلی گفتگو کرتے ہوئے دیکھ چکا ہوں۔ لیکن اُس کی گفتگو کی حیثیت بالکل ایسی ہوتی تھی جیسے سوڈے کی بوتل کا جھاگ۔ البتہ مجھے جس بات پر حیرت ہو رہی تھی وہ محمود کا لمبا چوڑا سفر تھا کوئی اور موقعہ ہوتا تو میں اس کے ان جوشیلے دعووں اور ہوائی اسکیموں کی ہنسی اڑانے لگتا۔ لیکن یہ موقعہ ہنسی کا نہ تھا اس وقت میں اسکی باتوں کو ڈھول کی طرح اندر سے کھوکھلا ثابت کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لئے کہ جو شخص شمالی ہند چھوڑ کر دکن تک کا دور دراز فاصلہ طے کرے، جو اپنا وقت اپنا روپیہ اپنا آرام سب کچھ صرف کر کے محض ملک کی بہتری کے لئے ایک مفید اصلاح کا جھنڈا بلند کرلے، ترک وطن پر آمادہ ہو جائے اس کے ارادوں کے خلوص اور صداقت سے بہ آسانی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ایمان کی بات تو یہ ہے کہ میں اس وقت عجب شش و پنج میں تھا۔ ایک طرف میرے سامنے اس کی زندگی کے ایک دو سال نہیں پورے بارہ سال کا زمانہ تھا جس میں بے بنیاد دعوے، پرجوش تقریریں، بے نتیجہ طول طویل بحثیں، اسکیمیں، پروگرام خاک بلا اور خدا جانے کیا کیا تھا لیکن زندگی کا عملی پہلو دیکھئے تو بالکل کورا۔ دوسری طرف وہی شخص جسے میں ہمیشہ باتونی اور ناکارہ سمجھتا رہا آج میری آنکھوں کے آگے بیٹھا ہوا انسانی زندگی کی جس انوکھی کایا پلٹ کا ثبوت دے رہا ہے اس پر مجھے اتنا ہی تعجب تھا جیسے کوئی شخص قسمیں کھا کھا کر مجھے اس بات کا یقین دلائے کہ مہاتما گاندھی قومی رہنمائی ترک کر کے انگریزوں سے مل گئے ہیں اور صوبۂ بمبئی کی گورنری قبول کرلی۔ یا خواجہ حسن نظامی نے پیری مریدی کا شغل چھوڑ دیا۔ میں اس تبدیلی کی وجہ سوچنے لگا۔ بہت دیر تک سوچتا رہا۔ میں نے

لک محمود کی گفتگو کا ایک لفظ بھی نہیں سنا بالآخر میرے ذہن میں محمود کی فطرت کے اس عجیب و غریب انقلاب کی وجہ آگئی
ہوچا پچھلے ڈیڑھ سال میں محمود کی زندگی یقیناً ایک زبردست پلٹا کھایا ہے اور اس تغیر کی ساری وجہ اس کی چہیتی بیوی کی
ہے، اس کی بیوی کی صحت بچپن ہی سے کمزور تھی۔ شاخ گل کی طرح لچکیلی، نازک جسم کی ایک چھریری کامنی لڑکی۔ محمود اُسے
کی طرح چاہتا تھا۔ اگر وہ ذرا ایک ہفتہ کے لئے بھی اپنے میکے چلی جاتی تو محمود اس طرح گم صم ہو جاتا جیسے یکایک اس کی تمام
ٹ گئی ہو۔

شادی کے دو سال بعد ہی سے اس کی بیوی کی تندرستی نمایاں طور پر خراب ہونا شروع ہوگئی۔ عام طور پر ڈاکٹروں کی تجویز تھی
ق ہوگئی ہے۔ وہ روز بروز ایک گھن کھائے ہوئے لکڑی کے ستون کی طرح اندر ہی اندر گھلتی جاتی۔ اپنی زندگی کے آخری چھ
اہ تو اس نے بالکل اس طرح گذارے جیسے کسی شخص کو موت کی سزا ملنے کے بعد پھانسی کی تاریخ سے کچھ دنوں پیشتر حوالات
رکھا جائے۔ اس مدت میں محمود نے دنیا کی تمام دلچسپیوں کا دروازہ اپنے اوپر بند کر لیا۔ وہ ایک وفا شعار پجاری کی طرح
وز اپنی بیوی کے پلنگ سے لگا بیٹھا رہتا۔ اس پجاری کی طرح جس نے تارک الدنیا ہو کر جہاں بھر کے تمام علاقوں کو اکدم
ہے۔ اسی زمانہ میں اس نے اپنی ملازمت سے استعفا دیدیا۔ یہ آخری چھ ماہ اس کے لئے کیسے دلخراش اور روح فرسا تھے
آنکھوں سے اپنی بیوی کو آہستہ آہستہ قبر کے تاریک گڑھے میں اترتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ اس کو ایسا نظر آتا تھا جیسے اس کی بیوی
ایک ہولناک بلا کی طرح سیاہ پر پھیلائے اس کے مکان پر دن رات منڈلا رہی ہے بالآخر ایک دن وہ لمحہ بھی آ ہی گیا جسکے
زندگی کا سب سے زیادہ قیامت خیز سانحہ چھپا ہوا تھا۔ کتنا بڑا غم! کیسی جان لیوا مصیبت! ——— اور وہی
میرے پاس بیٹھا ہوا، اُداس دل میں اس دائمی رنج کا تازہ داغ چھپائے، ایسی سادگی، ایسی بے پروائی سے اپنی آنکھیں
رہا تھا جیسے ساری عمر کبھی انسانی زندگی کے آلام و مصائب سے اُسے سابقہ ہی نہیں پڑا۔

لیکن جو لوگ محمود کو عرصے سے جانتے تھے، جن کے کان آج سے چار برس پیشتر اس کے بے معنی غیر ذمہ دارانہ قہقہوں کی گونج
ارہ چکے تھے وہ ایک ہی نظر میں اس کے چہرے سے پڑھ سکتے تھے کہ اس ڈیڑھ سال کی قلیل مدت نے اس کو اپنی عمر سے
دس سال آگے ڈھکیل کر اسے قبل از وقت بڑھاپے کے چنگل میں گرفتار کر دیا تھا۔ میری نگاہیں غیر محسوس طریقہ پر اس کے
جم گئیں میں نے دیکھا کہ اس کی دونوں گھنی بھویں پہلے سے زیادہ قریب ہوگئی ہیں۔ مونچھوں کی سیاہی میں کہیں کہیں سفیدی
ا پیدا ہوگئی ہے اور آنکھوں میں طفلانہ بے پروائی اور شگفتہ تبسم کے بجائے کسی گہری پریشان کن سوچ کی مدھم چمک نمایاں ہے
یرا دل یک بیک اس غمزدہ قوم پرست کے لئے جس نے جھانسی سے حیدر آباد تک کا سفر صرف اسی لئے طے کیا تھا کہ یہاں
ے پبلک خیرات خانہ کی تحریک کو کامیاب بنائے اندر سے پگھلنے لگا۔ مجھے اس کے ارادوں کے ضرب المثل بودے
باوجود اس کے خلوص کا یقین ہونے لگا۔ یہ بات خود بخود میری سمجھ میں آگئی کہ وہ محمود جو صرف خیالی گپوں کا مرد میدان تھا
حیرت انگیز سرگرمی، اس شدید جوش و خروش کے ساتھ کمر ہمت کس کر میدان عمل میں کیسے کود پڑا ہے۔ بیشک یہ سب

اس کی چہیتی بیوی کے ابدی غم کا نتیجہ ہے، اس کی موت نے ایک ایسی ضرب سے یکایک اس کے دماغ کے سمٹے ہوئے پردوں کو کھول دیا اسے انسانی زندگی کی اصلی شاہراہ سے دوچار کر کے بتا دیا کہ حیات کا حقیقی منشا صرف خوبصورت بے نتیجہ باتیں بنانا، دلچسپ غیر مفید بحثیں کرنا، اور ڈرائنگ روم کے نرم صوفوں پر بیٹھ کر سائمن کمیشن یا شاہ امان اللہ خاں کی قبل از وقت اصلاحوں کی ہنسی اڑانا ہی نہیں ہے، زندگی اس سے کہیں زیادہ سنجیدہ اور اہم مشاغل مفید اور عملی کاموں کا ہم سے مطالبہ ہی نہیں کرتی بلکہ وہ کسی نہ کسی طرح ہم سے اپنا حق وصول کر کے رہتی ہے —— یہ سوچتے سوچتے میرے قلب میں میٹھا میٹھا درد ہونے لگا اور اقبال کے "فلسفۂ غم" کا یہ شعر بے اختیار یاد آ گیا ؎

غم جوانی کو جگا دیتا ہے لطف خواب سے سازیہ بیدار ہوتا ہے اسی مضراب سے

(۲)

۸ مارچ بروز جمعہ - ۳ بجے سہ پہر -

ٹاون ہال پر جوش تالیوں کی آوازوں سے گونج رہا تھا۔ محمود ابھی ابھی اس پلیٹ فارم پر سے تقریر کر کے اترا تھا۔ جہاں کوئی ڈھائی ماہ پیشتر، مسلسل تین دن تک روزانہ ڈاکٹر اقبال نے مذہب اور عبادت کے مفہوم پر وہ حکیمانہ اور معرکتہ الآرا لکچر پڑھے تھے، جن کی تصنیف کے بعد سے اُن کی پبلک زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے، محمود کا لکچر اس کی اور میری دونوں کی اُمید سے زیادہ کامیاب رہا تھا - اس کامیابی کے حصول میں میری ذرہ برابر مدد بھی شامل نہیں تھی لیکن اس وقت مجھے کچھ ایسی بچوں کی سی خوشی محسوس ہو رہی تھی گویا اس کامرانی کا تمام سہرا میرے ہی سر ہے -

ہال میں گڑبڑ پیدا ہو چکی تھی - حاضرین اپنی اپنی جگہ چھوڑ کر دروازوں کی طرف بڑھ رہے تھے - بعض متجسس لوگ محمود کو زیادہ قریب سے دیکھنے کے لئے اس کے گرد جمع ہو گئے تھے - کرسیوں کی کھڑ بڑ، لباسوں کی سرسراہٹ اور پختہ فرش پر ہزار ہا جوتوں کی رگڑ کی آوازوں کے ساتھ ساتھ مجمع کی بھنبھناہٹ کے ملے جلے شور سے کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی تھی محمود اُتر کر نیچے کھڑا ہو گیا تھا - ڈاکٹر نعیم الحق نے آگے بڑھ کر اس سے کچھ کہا جسے شور و غل کی وجہ سے میں اچھی طرح نہ سکا - شاید گھر واپس چلنے کے لئے اپنی موٹر پیش کی ہو اس لئے کہ جواب میں میں نے محمود کو "جی نہیں بہت بہت شکریہ - اس وقت تو میں ٹہلنا زیادہ پسند کروں گا:" کہتے سُنا - محمود کا چہرہ اسوقت اطمینان اور مسرت کی وجہ سے تمتما رہا تھا اور آنکھوں میں پہلے سے بھی زیادہ خلوص کی جھلک پیدا ہو گئی تھی -

ہم لوگ بمشکل مجمع کو چیرتے پھاڑتے باہر نکلے - تمام مجمع کی آنکھیں ہم پر لگی ہوئی تھیں - میں یہ محسوس کر کے دل ہی دل میں بے انتہا مسرور ہو رہا تھا کہ ہر شخص محمود کو سر سے پیر تک دیکھنے کے بعد مجھ پر اپنی نگاہیں جما دیتا تھا - اس وقت مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ میں یکایک تمام حیدرآباد میں مشہور ہو گیا ہوں - گویا محمود کے اس لکچر نے مجھے گمنامی کی زندگی سے نکال کر اکدم شہرت اور نام آوری کی زرین روشنی میں لا کر کھڑا کر دیا ہے -

محمود کو دیکھنے کے لئے ——— بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ ہم لوگوں کو دیکھنے کے لئے برآمدے کی سیڑھیوں پر بہت سے لوگ اکٹھا ہوگئے تھے۔ لیکن سڑک پر قطار در قطار کھڑے ہوئے بیش قیمت موٹروں میں سے کسی ایک موٹر پر بیٹھنے کے بجائے جب انھوں نے ہم لوگوں کو بائیں ہاتھ کی روشس پر پیدل مڑجاتے ہوئے دیکھا تو اُن سے بہتوں کے چہرے پر مایوسی کی جھلک نمایاں ہوگئی اور میرا خیال ہے اس ایک لمحے کے لئے یقیناً اُن کے دلوں میں ہم لوگوں کی وقعت کم ہوگئی ہوگی۔

ہم لوگ گنجان درختوں کی دو رویہ صفوں میں ٹہلتے ہوئے گذرنے لگے۔ ہلکی، نرم ہوا آہستہ آہستہ بہہ رہی تھی۔ میں "بہہ رہی تھی" اس لئے کہتا ہوں کہ اس وقت ہوا اس لطافت، اس نرمی سے چل رہی تھی جیسے کسی چشمے کا صاف وشفاف پانی دھیمی دھیمی چال سے سبزہ کے فرش پر بہہ رہا ہو۔ باغ کے سرسبز اور شاداب درختوں سے ہری ہری کونپلوں اور نم آلود شاخوں کی بھینی بھینی خوشبو آرہی تھی شام کی بوجھل، دل میں درد پیدا کرکے دیوانی نشہ آور ہوا کے جھونکوں سے تالاب میں کنول کے سبز پتے اس طرح لچک رہے تھے جیسے کنویں سے پانی بھرتے وقت کسی دہقانی دوشیزہ کی پتلی کمر گھڑے کے بوجھ سے بار بار بل کھا کر رہ جاتی ہے۔ کہیں دور سے کوئل کی دکھ بھری آواز تھوڑی، تھوڑی دیر کے بعد باغ کی خاموش فضا کو چیرتی پھاڑتی سینے میں گھس جاتی ہے۔

ان روح پرور نظاروں سے میرے دل میں سرور پیدا ہونے لگا۔ میں چاہتا تھا اس وقت خاموشی اور سکون کے ساتھ اس لطیف ماحول کا لطف اٹھاؤں، لیکن محمود میرے ساتھ اس وقت کسی قسم کی رعایت کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ وہ آج کی کامیابی پر اس قدر خوش تھا، نازاں تھا کہ پھر پھر اکر اسی ایک موضوع پر بے تکان باتیں کئے چلا جاتا تھا۔ میں نے راستہ میں ایک خوبصورت چیتل کی طرف اس کی توجہ مبذول کرانے کی کوشش کی جو کلیلیں کرتے کرتے بھاگ کر کٹھرے کے بالکل قریب آکر کھڑا ہوگیا تھا۔ لیکن محمود نے ایک لمحہ کے لئے بھی اپنی گفتگو کا سلسلہ نہیں بند کیا۔ گویا اس نے میری بات سنی ہی نہیں۔

"......... تمھیں اندازہ ہوگیا ہوگا کہ میں خیرات خانہ قائم کرنے سے بھی زیادہ ضروری اُسے سمجھتا ہوں کہ بھلے چنگے نقیروں کو جو اندھا دھند خیرات دیجاتی ہے اس کی نہایت سختی سے روک تھام کی جائے۔" میرے بس میں ہوتا تو میں اپنے دونوں کانوں میں انگلیاں دے لیتا۔ مجھے اس وقت محمود کی اس خشک بے نمک گفتگو میں کچھ بھی مزہ نہیں آرہا تھا۔ میں اُس کی لکچر بازی سے بوکھلا گیا تھا۔

"ان کمبختوں نے تو بھیک مانگنے کو ایک نفع بخش پیشہ بنالیا ہے۔" اُس نے پھر کہنا شروع کیا حالانکہ اس وقت میں ہمہ تن اس خوبصورت برف سے زیادہ سفید ہنس کے جوڑے کو دیکھنے میں مصروف تھا جو پانی میں تیرتے وقت تالاب کی سبز کائی میں دور تک ایک پتلا سا راستہ بنا رہا تھا ——— "اور بعض پیشہ ور نقیر تو ایسے ہیں جو ہندوستان بھر میں تمام شہروں کا چکر لگا لگا کر بھیک مانگتے ہیں اور سال بھر بعد روپے کی بڑی بڑی رقمیں لے کر اپنے گھر بھیجتے ہیں۔ بھلا غور تو کرو قوم کا کتنا روپیہ اس طرح مفت برباد ہو رہا ہے۔ کتنے مستحق اور حاجتمند لوگوں کا حق مارا جاتا ہے جو فاقہ کر کر کے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر دن رات موت کا نوالہ بن رہے ہیں۔ میں کہتا ہوں سعید۔ ان پاجیوں کو ایک پیسہ بھی خیرات کرنا دنیا کا سب سے بڑا اخلاقی جرم ہے سوسائٹی

ان مجرموں کو سخت سے سخت سزا دینے میں حق بجانب ہے۔ ہٹے کٹے فقیروں کی اعانت کرنا گویا جان بوجھ کر ملک کے افلاس کو قوت پہنچانا اور ناداری کی وبا کو ترقی دینا ہے۔"

ہم لوگ باغ عام کے مشرقی پھاٹک سے نکل کر سڑک پر ہو لئے یہاں آمدورفت کی کثرت تھی۔ تھوڑی دیر کے لئے محمود کی تقریر کا سلسلہ رک گیا۔ ہم لوگ دیکاجی ہوٹل تک بغیر آپس میں باتیں کئے راستہ کی بیشمار موٹروں، سائیکلوں اور گاڑیوں کا تماشا دیکھتے ہوئے چلے آئے۔ شام کا دھندھلکا پھیلتا جاتا تھا۔ دن بھر کے بھوکے پیاسے روزہ دار تیزی کے ساتھ ہر طرف لپکتے نظر آرہے تھے تاکہ افطار کے وقت تک اپنے اپنے ٹھکانوں پر پہنچ جائیں۔

"اگر میرا بس چلتا" محمود کا گرانوں پھر بجنے لگا۔ "تو میں کونسل میں ایک تجویز پیش کرتا، پیش کرنا کیا معنی کامیاب کرا کے چھوڑتا کہ غیر مستحق فقیروں کو خیرات دینا قانون کی طرف سے جرم قرار دیا جائے۔ پھر دیکھتا کیسے یہ دولت مند آنکھوں کے اندھے ...."

"السلام علیکم" — ایک کرخت اور انتہائی ناخوشگوار آواز ہم لوگوں کے کان چھیلتی ہوئی کنپٹی کے پاس سے گذر گئی۔

"حضور میں مصیبت زدہ ہوں۔ مجھ پر بڑا وقت آپڑا ہے۔ للہ میرے حال پر رحم کر کے میری کچھ مدد کیجئے"———

ایک ادھیڑ عمر کا پستہ قد آدمی جس کی آنکھیں چھوٹی چھوٹی تھیں اور جسکے کپڑوں میں سے حقہ کے جلے ہوئے تمباکو کی بو چلی آرہی تھی ہم لوگوں کا راستہ روک کر بیچ میں کھڑا ہو گیا۔

"اللہ آپ کو نیکی کا اجر دے گا۔ ایک محتاج مسافر کے حال پر ترس کھائیے۔ میں مفلس ہوں۔ غریب الوطن ہوں اس شہر حیدرآباد میں کسی کو نہیں جانتا۔ خدا کے لئے مجھ پر مہربانی کیجئے۔"

میں نے سر سے پیر تک ایک نگاہ میں اس شخص کا جائزہ لیا۔ اس کے سر پر پرانی بے ھبندنے کی ٹوپی تھی جسکے کناروں پر ایک ایک انگل چکنائی کی میل جمی ہوئی تھی۔ ٹخنوں سے اوپر تک کا ایک ڈھیلا ڈھالا پائجامہ۔ جسم پر خوب گہرے رنگ کی ایک تنگ شیروانی جسکے نصف سے زائد بٹن ٹوٹ چکے تھے۔ پیروں میں کھردرے چمڑے کا دیہاتی جوتا جس کا تلا گھس گیا تھا اور جسکے اندر سے اس کے گرد آلود انگوٹھے جھانک رہے تھے۔ اس کی پیٹھ پر میلی دری کا ایک تہ کیا ہوا چھوٹا سا بلندہ تھا جسے اس نے سُتلی سے باندھ رکھا تھا۔ اسی بلندے کی سُتلی سے اٹکا ہوا ایک زنگ آلود ٹین کا لوٹا بھی تھا جس کی گردن میں ایک پتلی سی ڈوری کے کئی بل چپٹے ہوئے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کے چہرے پر تندرستی اور اطمینان کے آثار میں لہجے کی مسکینیت کے باوجود دراز میں ایسی توانائی تھی جو صرف پیٹ بھرے لوگوں کو ہی میسر ہو سکتی ہے۔

میں ایک سرسری نگاہ سے اس شخص کو دیکھتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ محمود نے بھی بظاہر اس کی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ لیکن یہ شخص سایہ کی طرح ہم لوگوں کے ساتھ ہو لیا اور مجھ سے اس قدر بھڑ کر ساتھ ساتھ چلنے لگا کہ اس کے کپڑوں سے چمٹی ہوئی تمباکو کی بو سے میرا دماغ پراگندہ ہو گیا۔ میں نے اس سے ٹالنے کے طور پر ڈانٹ کر کہا:

لیکن تم تو بالکل ہٹے کٹے ہو محنت مزدوری کر کے اپنا پیٹ پال سکتے ہو۔ بھیک مانگتے ہوئے تمھیں شرم نہیں آتی بھیک مانگنے سے تو ڈوب مرنا بہتر ہے!"

"میں نے آج سے پہلے کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا اب مجھ پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے میں لکھنؤ کا رہنے والا ہوں۔ وہاں چکن کاڑھنے کا کام کرتا تھا۔ اب کی سال خیال آیا آدمی کی زندگی کا کوئی اعتبار نہیں چلو حج کے فرض سے بھی فراغت کرلوں۔ کچھ روپیہ پہلے سے موجود تھا۔ کچھ گھر کی چیزوں کو اونے پونے بیچ کر اکٹھا کیا ایک پڑوسی بھی ساتھ ہولیا۔ رحیم خاں کمبخت کا نام ہے کہنے لگا میں بھی بمبئی تک چلوں گا۔ میں نے دل میں سوچا یہ آدمی ایماندار معلوم ہوتا ہے۔ پھر مجھ سے زیادہ چوکس بھی رہتا ہے حفاظت کے خیال سے ساری رقم اس کے پاس رکھوا دی کہ بمبئی کے اسٹیشن پر پہنچ کر لے لوں گا۔ اب جناب بھوپال کے اسٹیشن پر جو آنکھ کھلتی ہے تو دیکھتا کیا ہوں کہ رحیم خاں میرا تمام سامان اور روپئے لیکر کہیں غائب ہو گیا۔ میرے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ لاکھ ڈھونڈھا تار دلوائے۔ ایک ایک کی خوشامد کی کہیں پتہ نہ چلا۔ بس یہ کپڑے جو بدن پر آپ دیکھتے ہیں اور اس بستر اور لوٹے کے سوا ظالم نے کوئی چیز نہ چھوڑی میرے پاس بمبئی تک کا ٹکٹ تھا۔ لیکن اب بمبئی جاکر کیا کرتا۔ دس بارہ سال ہوئے روزگار کی تلاش میں میرا ایک چچا حیدرآباد چلا آیا تھا۔ مجھے اس ناگہانی مصیبت کے وقت اس کا خیال آیا۔ میں نے سوچا اب اتنے دم تو ہیں نہیں کہ واپس جاؤں منماڑ کے اسٹیشن سے حیدرآباد کا رُخ کیا۔ یہاں آکر ڈھونڈھتا ڈھانڈھتا چچا کے مکان پر پہنچا تو معلوم ہوا وہ پار سال طاعون میں دو چھوٹے چھوٹے بچے اور ایک بیوی چھوڑ کر مر گیا ——— حضور اب کل سے مارا مارا پھر رہا ہوں اللہ کے واسطے میری مدد کیجئے۔ میں بھوکوں مر رہا ہوں"

اور یہ کہتے کہتے اس کی آواز بھرا گئی اور آنسوؤں کے تین چار قطرے چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے بہہ کر چڑیا کے گھونسلے کی طرح گرد آلود بالوں کی مختصر سی داڑھی میں اٹک گئے۔

اس شخص کے آنسوؤں کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ نہ اس کی آواز کی تھرتھراہٹ نے میرے دل میں رحم پیدا کیا۔ محمود کی لمبی چوڑی نصیحتوں اور اس کے دل ہلا دینے والے لکچر نے میرے ذہن کو اس طرح متاثر کر رکھا تھا کہ مجھ پر اس غریب الوطنی کی دلخراش داستان کا جادو کارگر نہیں ہوا۔

"اُنھ ...... رہنے بھی دو۔ یہ سب بنائی ہوئی باتیں ہیں۔ خدا نے تم کو ہاتھ پاؤں دئے ہیں۔ اس طرح بھیک مانگنا بڑے شرم کی بات ہے.......... لیکن ٹھہرو۔ مجھے خیال پڑتا ہے اس سے پہلے میں نے تمھیں کہیں دیکھا ہے۔ ضرور بالضرور دیکھا ہے مجھے ہرگز ہرگز دھوکا نہیں ہوسکتا"

معاً میرے حافظہ میں ایک بھولی بسری شکل کے مٹے مٹائے نقوش ابھرنے لگے۔ میں نے چلا کر کہا۔

"ٹھیک۔ بالکل ٹھیک۔ اب مجھے یاد آگیا۔ کوئی دس روز ہوئے میں نے تمھیں اورنگ آباد کے بیرسٹر ممتاز حید صاحب کے یہاں بھیک مانگتے ہوئے دیکھا تھا۔ بلاشک تم وہی ہو۔ بالکل وہی۔ صرف فرق اتنا ہے کہ اس روز تم زرد رومال

کا صافہ باندھے ہوئے تھے آج ترکی ٹوپی پہنے ہو"

اس شخص کا رنگ یکایک اڑ گیا۔ وہ کدم اس طرح سہم گیا جیسے بچہ کسی ڈراؤنی چیز کو دیکھ کر سہم جاتا ہے۔ لیکن ایک ہی لمحہ میں اس نے اپنے کو سنبھال کر اطمینان دلانے والی آواز میں کہا

"جی نہیں حضور! وہ کوئی اور ہوگا۔ میں نے تو آج تک اورنگ آباد کی صورت تک نہیں دیکھی۔ بھلا کہاں میں کہاں اورنگ آباد۔ حضور میں روزے میں جھوٹ نہ بولوں گا۔ آج سے پہلے میں نے کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا"

"تم سراسر جھوٹ بول رہے ہو۔ بالکل غلط کہہ رہے ہو۔ مجھے اب اچھی طرح یاد آگیا۔ میں اورنگ آباد میں بیرسٹر صاحب کے یہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ تم میرے سامنے وہاں آئے تھے۔ لیکن وہاں تم نے اپنی مصیبت کا جو قصہ بیان کیا تھا۔ وہ بالکل دوسرا تھا تم نے اپنے کو آگرے کا رہنے والا بتایا تھا۔ اور کہا تھا کہ بمبئی میں میری قالینوں کی دوکان تھی حال میں پٹھانوں اور ہندوؤں میں فساد ہوا، بلوائیوں نے دوکان میں آگ لگا دی اور گھر کا سب سامان جل گیا۔ مجھے تمھاری من گھڑت کہانی کا ایک ایک لفظ یاد ہے۔ تم وہاں بھی دھوکا دے کر مجھ سے ایک اٹھنی وصول کرکے گئے تھے۔ اب آج یہاں پھر الو بنانا چاہتے ہو۔ میں تمھاری کچھ مدد نہیں کرونگا، تم جھوٹے اور فریبی ہو، دغاباز کہیں کے! چلے جاؤ یہاں سے!"

محمود جو اب تک بالکل خاموش تھا چلتے چلتے اکدم ٹھہر گیا۔ اس کے ماتھے پر کونت اور جھنجھلاہٹ کے موٹے موٹے بل پڑے ہوئے تھے۔ اس مکار فقیر کی جھوٹی باتیں سنتے سنتے اسکا پیمانۂ صبر لبریز ہو چکا تھا غصہ کی وجہ سے خود میری بری حالت تھی تو بھلا محمود جو اس کے فقیروں کا جانی دشمن تھا کب ان باتوں کو برداشت کر سکتا تھا ——

میں نے اس کے داہنے ہاتھ کو حرکت کرتے ہوئے دیکھا اور مجھے یقین ہوگیا کہ محمود نے جھنجھلا کر اور غصے میں آکر اس حرام خور فقیر کو مارنے کے لئے اپنا ہاتھ اٹھایا ہے لیکن حیرت کی وجہ سے میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی اور منہ کھلا کا کھلا رہ گیا جب میں نے دیکھا کہ محمود نے چپکے سے نیسرواتی کی جیب میں ایک روپیہ نکال کر اس شخص کے ہاتھ میں رکھدیا اور جلدی جلدی قدم بڑھاتا ہوا آکر مجھ سے مل گیا۔

"بیچارہ روزے دار ہے" محمود نے آہستہ سے عذر خواہی کے لہجے میں کہا اور اس کے لہجے میں ہمدردی اور رحمدلی کی نرمی تھی"۔

مجھے محمود کی اس غیر متوقع حرکت پر بے حد غصہ آیا۔ ایک تو فقیر کی باتوں ہی سے میرے مزاج کا پارہ چڑھا ہوا تھا پھر محمود کی خیرات نے میرے جسم میں آگ لگا دی۔ میرا خون اندر سے کھولنے لگا۔ رگوں میں چنگاریاں دوڑنے لگیں۔ اس دو روز کے عرصے میں محمود کے متعلق میں نے جو حسن ظن قائم کر لیا تھا اس کی پوری عمارت یک لخت بلندی پر سے زمین پر آرہی۔ میں گلا پھاڑ کر اور خوب چلا کر محمود کو ڈانٹنے ہی والا تھا کہ میں نے یکایک غیر اختیاری طور پر پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ہمارا دو روز کا فاقہ کش روزہ دار مسافر سڑک کے کنارے ایک پھلوں کی دوکان پر کھڑا ہوا سنتروں اور انگوروں کی قیمت طے کر رہا تھا اور اپنے مزید اطمینان کے لئے انھیں چکھنا بھی چاہتا تھا۔ غالباً میرے ساتھ ہی محمود کی گردن بھی مڑ گئی تھی۔ وہ بھی ہونے والے حاجی صاحب کی اس حرکت کو دیکھ رہا تھا میں نے طعن آمیز نظروں سے محمود کے چہرے پر نظر ڈالی۔ اس کا چہرہ خفت، شرمندگی اور جھینپ کی وجہ سے اس قدر مضحکہ خیز بنا ہوا تھا کہ انتہائی غصہ کے باوجود ۴۴

۴۴۔ میں بے اختیار ہنس دیا۔ میرے کانوں میں اکدم یہ فقرہ گونجنے لگا میں کہتا ہوں سعید اگر سچ پوچھو تو ان پاجیوں کو ایک پیسہ بھی خیرات کرنا دنیا کا سب سے بڑا جرم ہے اور قول و فعل کے اس حیرت انگیز اور [illegible]

دُنیا کی مشہور الہامی کتابوں پر تاریخی نظر

قرآن کا فلسفۂ تعلیم

(مسلسل)

فلسفہ کی تعریف

قرآن مجید کے فلسفیانہ معاشرتی اور صوفیانہ مواعظ وحکم کی شرح وبسط کرنے سے قبل یہ ضروری ہے کہ ان علوم کی تعریفی اور تاریخی پہلوؤں کو پیش نظر رکھا جائے، اس لئے قبل اس کے کہ قرآن مجید کے فلسفیانہ خیالات پر روشنی ڈالی جائے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے، کہ پہلے یہ بتا دیا جائے کہ خود فلسفہ ہے کیا؟ اور اس وادی عرفان میں بعض علمائے یونان اور مصر نے کہاں کہاں اپنا نقش قدم چھوڑا ہے، ڈرامنڈ اپنی کتاب "جیوش الکسنڈرین فلاسفی" جلد اول میں فلسفہ کی تعریف مفصلۂ ذیل الفاظ میں پیش کرتا ہے۔

فلسفہ کیا ہے؟ حقیقی خوبیوں کا سرچشمہ، اور اس کا ماخذ ہے صحیفۂ فطرت کا مطالعہ، انسانی نظریں، دیدہ اٹھیں، تو انہیں ایتھر میں شمس وقمر، ثوابت وسیارے نظر آئے، ان کے طلوع وغروب کے اسرار اور تعین اوقات کے رازہائے سربستہ نے فکر انسانی میں اشتعال دیا، قمر کی مختلف شکلیں، آفتاب کی سالانہ حرکات، اور خشکی وتری کے بے شمار عجائب وغرائب انسانی خیال کا مطمح نظر بن گئے، قدرت کی اس شاندار تماشہ گاہ میں بیٹھکر عقل نے جستجو شروع کی کیا کائنات کے اندر ان تمام مناظر میں ایک ہی عنصر کارفرما ہے، یا مختلف اشیا میں مختلف عناصر کی حکومت ہے کیا دنیا غیر مخلوق اور ازلی ہے، یا اس کی کوئی ابتدا بھی ہے؟ ظاہری حرکت کس اصول کے ماتحت ہے؟ وہ کون سے اسباب ہیں جن سے چند اجسام کی تنظیم وتنسیق ہے اور ان اسباب کے پیدا ہونے کی کون کون علتیں ہیں؟ وہ کونسی طاقتیں ہیں جو انہیں منظم شکل میں رکھتی ہیں اور پھر یہ مادی ہیں یا غیر مادی؟ اس کے بعد اور بھی اعلیٰ سوالات پیدا ہوتے ہیں کیا کرشمۂ خلقت فانی ہے کیا تخلیق وحدوث خود بخود ہے، اور کسی غیر عقلی اثر کے ماتحت ہے، یا اس پر کسی خالق کل اور مختار ابدی کی کارفرمائیاں ہیں یہی ان سربستہ مسائل کی مثالیں ہیں جو مطالعۂ فطرت کے بعد دماغ انسانی میں پیدا ہوتی ہیں اور انکی تفتیش اور استقرا، فلسفہ کا موضوع ہے

ایک مصری فلسفی کا نظریہ

فلسفہ کے اس طریق جستجو کو یہودی فلسفہ کا مدون یعنی فیلو جوڈیس غیر مستحسن خیال کرتا ہے، اس کے نزدیک فطرت کا مطالعہ ایسے ایسے مسائل پیش کرتا ہے، جن کی عقدہ کشائی ناممکن ہے، اس لئے اس کے نزدیک مطالعۂ باطن کے تجربات، اور حیات شاعرہ کی فعلیت وانفعالیت، اس کا اثر وتاثر اور ان پر غور وخوض، ترجیحی پہلو رکھتے ہیں، وہ کہتا ہے، ہمارے جسم ودماغ کی ساخت ہی ایسے ایسے سوالات پیش کرتی ہے جن کا جواب دینا فلسفہ پر لازم ہے وہ کہتا ہے یہ دریافت کرنا چاہیے کہ بصر وسمع، ذوق وشم، لمس ودیگر حیات کی ماہیت، اور ان کے ضوابط کیا ہیں، اور دوسرے اعضاء سے ان کا کیا تعلق ہے، جن کے ماتحت ہم لوگ عالم خارج کا علم ووقوف حاصل کرتے ہیں، ہم لوگوں کو خود ہی اپنے اندر

حاکمانہ اور محکومانہ اصول، ذی روح، اور غیر ذی روح، عقلی اور غیر عقلی، فانی اور ازلی بہتر اور بدتر کی گرہ کشائی کرنا چاہیے، ان مسائل پر توجہ کرنے سے انسان کو خدا، اور اس کی صنعتوں کا علم حاصل ہوتا ہے، کیونکہ ہم لوگ خود اپنے اندر کائنات کی ایک حقیقی مشابہت پاتے ہیں، اور اپنے ہی دماغی تصورات کی وساطت سے اس قطعی نتیجہ پر پہونچتے ہیں، کہ کوئی کلی اور ارفع دماغ ہے، جو مخلوقات کو قانون اور حق کے ماتحت چلا رہا ہے" قرآن مجید نے بھی اس طرف اشارہ کیا ہے

انغزاغورس قلیزومینی اور اسکا فلسفہ،

یہ شخص یونان میں حضرت مسیح سے پانچسو برس قبل گذرا ہے، اس نے بھی اپنے معاصرین امفدقلس اور لیوقیفوس کی طرح مادہ کی قدیمی اور غیر متغیر شکلیں تجویز کیں، لیکن ان کے خلاف اس کا خیال تھا کہ خاصیت اور عدد دونوں اعتبار سے مادہ غیر محدود ہے، مادہ کی یہ ازلیت اس عقیدہ کی بنا پر تسلیم کی گئی تھی، کہ نہ تو کوئی شے حادث ہوسکتی ہے، نہ معدوم وہ صورتیں جو تخلیق دنیا کے خیالات پیدا کر رہی ہیں، حقیقتاً خرق والتیام کا فریب شہود ہیں، انغزاغورس کے قبل ازلیت مادہ کے فکر وعقیدہ سے یہ بات سمجھی جاتی تھی، کہ ہستی کی مجموعیت قلت واضافہ کی متحمل نہیں، لیکن یہ ایک عقدہ لاینحل تھا کہ یہ مادے ابتداً کیونکر متحرک ہوئے، اور خود کو ایک منظم دنیا میں کس طرح صف آرا کیا، انغزاغورس نے اس کو اپنے "مسئلہ دماغ" سے حل کر دیا گو اس کے بیان سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ یہ "دماغ" بالکل غیر مادی ہے، یا صرف مادہ ہی کی لطیف ترین صورت، لیکن دوسرے جوہر ذات سے ایک وسیع طریقہ پر ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔

سقراط کے فلسفیانہ خیالات

سقراط ایک سنگ تراش کا لڑکا تھا ۴۶۸ء ق م میں اتھنز کے قریب وجوار میں پیدا ہوا اور باپ کی طرح اس نے بھی کچھ دنوں یہی پیشہ کیا، تاریخ بتاتی ہے کہ یونان کے چار مشہور مذاہب فلسفہ، بالواسطہ، یا بلاواسطہ اسی کی تعلیم کی پیداوار ہیں، فلسفہ افلاطون، (Academicians) فلسفہ مشائیں، فرقہ لذتیہ، اور اشراقین سبھوں نے سقراط ہی کے چشمۂ فیض سے سیرابی حاصل کی ہے، ڈرامنڈ لکھتا ہے سقراط کے فلسفہ میں (Logos) کے متعلق کوئی مسئلہ نہیں پایا جاتا۔ سقراط پہلا شخص ہے، جس نے (Teleology) کا تخیل خیالی فلسفہ میں شامل کیا، اس نے بار خلق میں غرض خداوندی اور خدا وانسان کے ذاتی تعلقات کے متعلق وضاحت کے ساتھ روشنی ڈالی، لیکن جب حقیقت باریتعالی اور ماہیت روح کے متعلق تحقیق کی جاتی ہے، تو اس کے نظریات واضح نہیں معلوم ہوتے، دیوتاؤں کے ساتھ جذبۂ احترام، ان سے خوف ورجا، ان کی عظمت واقتدار کے متعلق اس کے نشر وابلاغ سے پتہ چلتا ہے، کہ وہ مشرک اور بت پرست تھا، لیکن ساتھ ہی وہ تمام دیوتاؤں سے ایک ممتاز ہستی کو تسلیم کرتا ہے جس کے قبضہ واقتدار میں تمام کائنات ہے اور وہ اس ذات کو مبدء حسن وخوبی بتاتا ہے،

افلاطون اور اسکا مسئلہ خیال

افلاطون ۴۲۹ء قبل مسیح میں اتھنز کے اندر پیدا ہوا، پہلے اس کی طبیعت شعر وسخن کی طرف مائل ہوئی لیکن تھوڑے ہی عرصہ کے بعد سقراط کے مواعظ وحکم نے اس کو فلسفہ کی طرف متوجہ کر دیا، بیس برس کی عمر میں وہ سقراط کا شاگرد ہوا، سقراط کو جب زہر دیا گیا تو افلاطون نے مصر وصقلیہ وغیرہ کا سفر کیا بارہ برس

کے بعد پھر اتھنز میں واپس آیا اور تعلیم و تلقین شروع کی، لیکن اس کی فلسفیانہ پند و موعظت کا دائرہ بہت محدود تھا، اس کا مدرسہ خود گھر ہی میں واقع تھا، جس کے دروازہ پر اس نے جلی حروف سے لکھدیا تھا، جو شخص "جبر و مقابلہ" (علم) سے ناواقف ہو وہ اس میں داخل نہ ہووے" مرنے لگا تو اپنا باغ مدرسہ میں وقف کر گیا۔ اس کا "مسئلہ خیال" تاریخ فلسفہ کا اہم ترین موضوع ہے، اس نے اپنے استاد سقراط کی طرح (Ideas) کے متعلق بحث نہ کی لیکن بزم کائنات میں "خیال" کی کرشمہ آرائیوں کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا اُس نے خیال کے مختلف اجزا قرار دے اور انہیں میں سے ایک لطیف جزو کو خدا سے تعبیر کیا۔ سقراط کی طرح وہ بھی موحد نہ تھا بلکہ توحید کے متعلق اس کی فکری حالت استاد سے زیادہ پست معلوم ہوتی ہے اُس نے سبب کی دو صورتیں تجویز کین ایک لابدی دوسرے لاہوتی، جن سابق الذکر کو آخر الذکر کے زیر نگین قرار دیا، لیکن ساتھ ہی لابدی کے ساتھ اختیارات کی ایسی وسعت تعین کی کہ اُسے خود ہی کافی قوت حاصل ہے کہ وہ عمل لاہوتی کی تحدید کرے اور اس کے بغیر خالق کے لئے ناممکن ہے، کہ وہ کوئی مکمل کام کر سکے۔

ترتیب خلق کے متعلق افلاطون نے اپنے نظریات کسی قدر شرح و بسط سے بیان کئے ہیں، وہ کہتا ہے کہ کائنات کرہ کی شکل میں تھا، وسط محور کے چاروں طرف کرہ ارض لپٹا ہوا تھا، اور اس کی شکل بھی کروی تھی، اُس کے بعد سبعہ سیارہ کے وسیع دائرہ ہائے گردش تھے، جو ایک نظام کے مطابق کسی قدر باہمی فصل پر واقع تھے، انکی ترتیب مفصلہ ذیل شکل میں تھی پہلے قمر کا دائرہ گردش تھا اس کے بعد شمس، زہرہ، عطارد، مریخ، مشتری، زحل وغیرہ کا نزدیک ہی حد کائنات کے باہر ثوابت (متعین ستارے) کا کرہ تھا، کرہ ارض غیر متحرک طور پر اپنے مقام وسط میں قائم تھا لیکن دوسرے اجرام سماوی میں نقل و حرکت تھی، ثوابت کا کرہ ایک غیر متبدل یومیہ گردش کے ساتھ خط استوا سے مشرق و مغرب کی طرف حرکت کر رہا ہے۔ یہ اپنی حرکت کے ساتھ سیاروں کے دائرہ ہائے گردش کو بھی حرکت دے رہا تھا، ان میں خود بھی منطقۃ البروج کے مشرقی اور مغربی جہات میں حرکت کرنے کی صلاحیت تھی، اجرام سماوی اور ان کی گردشوں کی بدولت "وقت و زمان" کی تخلیق ہوئی جس کا غیر متغیر حال تواتر عددی سے منقطع نہیں ہو سکتا، اور جو ماضی اور مستقبل سے ناآشنا ہے، کامل "سال" وہ ہے جب سیارے اور کرہ ثوابت اپنے مرکز رفتار پر عود کرتے ہیں اور اسی کو "کامل عدد" یعنی دس ہزار برس کہا جاتا ہے، اس کے بعد افلاطون ایک خیالی پرواز کے ساتھ کہتا ہے کہ ان اجرام سماویہ میں حرکت کرنے کا ذاتی ادراک موجود ہے، اور وہ ذہین اور ذی روح ہستیاں ہیں اور انسانی ذات سے ان کا مرتبہ اعلیٰ اور ارفع ہے۔

ارسطو اور فلسفہ مشائین

ارسطو ۳۸۴ ق۔م میں استاغیرہ نامی ایک قصبہ میں پیدا ہوا تھا، جو لب ساحل واقع تھا تیرہ برس کی عمر میں والدین کا سایہ عاطفت سر سے جاتا رہا، اس وقت وہ اتھنز میں آیا اور افلاطون کے مخصوص سلسلہ تلامیذ میں داخل ہو گیا، افلاطون اسے اپنے "مدرسہ کا ذہن" کہا کرتا تھا، ارسطو بیس سال تک اتھنز میں مقیم اور اس دور اقامت کے آخری دس سال کے اندر اپنے ایک جدید مذہب فلسفہ کی بنیاد قایم کی ۳۲۲ میں

مقدونیہ کے حکمران فیلقوس نے اسے اپنے بیٹے اسکندر کی تعلیم و تربیت کے لئے مدعو کیا، ارسطو نے قبول کر لیا، جب اسکندر اعظم تخت نشین ہوا تو اُس نے مقدونیہ سے مراجعت کی اور پھر وہاں کبھی نہیں گیا، اہل اتھنز نے اس کے مدرسہ کے لئے (Lyceum) نامی ایک جگہ دیدی جہاں سایہ میں ٹہل ٹہل کر وہ اپنے شاگردوں کو فلسفہ کی تعلیم دیتا تھا اسی وجہ سے اس کا مذہب فلسفہ مشائیں (Peripatetics) کے نام سے مشہور رہا، "یہودی فلسفہ اسکندریہ" میں اس کے فلسفیانہ تخیلات پر تبصرہ کیا گیا ہے، جسکا ترجمہ حسب ذیل ہے -

ارسطو کے فلسفہ میں اعتقاد باریتعالی کا وجود پایا جاتا ہے، لیکن اس میں وحدانیت نہیں بلکہ ثنویت کی تعلیم ہے اسمین شک نہیں کہ ارسطو نے وجود واجب کو فلسفیانہ نکتہ سنجیوں سے ثابت کیا، ہر چند اس کے فلسفہ سے ثابت ہوتا ہے کہ کائنات کے اوپر کے ایک لطیف خدا موجود ہے، اس اثبات اور انکشاف میں ارسطو نے کتنی ہی فطانت فطری اور ذہانت جبلی سے کام کیوں نہ لیا ہو، لیکن اس کا اصول، مذہب کی حیات شاعرہ کی ترویج، اور کائنات کے خدا کے زیر نگیں ہونے کی توضیح سے عاری ہے، ارسطو نے ایک "کامل ترین ہستی" کی اور ما بعد الطبعی تحقیقات میں خدا کو ایک تصور ذات بنا کر رکھدیا ہے اور اگر ہم لوگ اس نظریہ پر مستقل بحث و تمحیص شروع کریں، تو یہ مستنبط ہو گا کہ صرف یہی نہیں بلکہ ارسطو کے اصول سے خدا کی صفت تخلیقی کا انکار ثابت ہوتا ہے، بلکہ خدا خارجی تاثرات کی اثر پذیری سے معرا معلوم ہوتا ہے، اس سے ثابت ہو گا کہ اپنے خارج عن الذات کا خیال نہیں رکھ سکتا، اور اس لئے روح انسانی سے اس کا علاقہ بھی ناممکن ہے، ارسطو کا نظریہ ہے کہ خدا بذاتہ عالم مادی سے کوئی عملی سروکار نہیں رکھتا، لیکن اس عالم مادی کا منتہا اور علت غائی وہی ہے، اور کائنات اسی انتہائی نقطہ پر پہونچنے کا مقتضی ہے، یہ "اقتضاء" "ارتقاے ترتیبی" کی شاعرانہ فصاحت کے اعتبار سے کتنی ہی پر لطف کیوں نہ ہو، لیکن اس "ذات کل" یا "ہستی مطلق" اور "عالم حادث" کے تعلقات کے متعلق کوئی فلسفیانہ تشریح نہیں کرتی چونکہ خود ارسطو کے نظریہ کے مطابق "انتہا" صرف ایک مجازی اصطلاح ہے، اس سے غیر از ذات پر خدا کی صفت عملیہ کے انکار کے ساتھ، خدا کے مسبب ہونے کی صفت کا بھی انکار ثابت ہوتا ہے،

ارسطو کی ان فلسفیانہ دقیقہ سنجیوں کا ملحض یہ ہے کہ خدا ایک ذاتی مرکز شعور ہے، اور عالم انسان اس مرکز پر پہونچنے کی سعی کر رہا ہے، لیکن اس مرکز شعور کی طرف سے ان طالبان وصل، اور رہروان طریق عشق کی نہ تو کوئی امداد ہوتی ہے اور نہ ان کے ساتھ ہمدردی کیجاتی ہے، عرفی کی فلسفیانہ شاعری میں بھی یہی تعلیم ہے ؎

نظر بہ حال دل آن پر غرور نگشاید　　کہ سیر دیدہ نہ بیند متاع یغمارا

یہاں مذہبی فلسفہ کو ایک نہایت وقت طلب راہ سے گذرنا پڑتا ہے، مذہبیات کے اسی تعلق (خالق و مخلوق) کی احیاء، اور فلسفہ کے علاقہ ازلی اور حادث کی عقدہ کشائیوں کا مسئلہ تھا، جو علمائے اسکندریہ کے پیش نظر تھا اور اسی مسئلہ کو انھوں نے اپنے نظریہ (Logos) سے واضح کرنے کی کوشش کی

زینو یا فلاسفہ صُفّہ

زینو جزیرہ قبرص کے ایک شہر قطیم کا باشندہ تھا، ۲۹۹ ق-م میں ایتھنز کے اندر آباد ہوا۔ اس کے پیرو (Stoics) کہے جاتے ہیں، مورخین نے اس کی وجہ تسمیہ یہ بتائی ہے کہ اس نے ایک سائبان میں تعلیم و تلقین کا سلسلہ جاری رکھا تھا، اس لئے متعلمین "ارباب صفہ" یا (Stoics) سے مشہور ہوئے۔ ڈرامنڈ نے "یہودی فلسفہ اسکندریہ" میں زینو کے فلسفہ پر بھی موضحانہ بحثیں کی ہیں جس کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

یہ ایک تعجب انگیز امر معلوم ہوگا کہ ایک فلسفہ، مادیت، اور وحدت فی الکثرت کے بنیادی معتقدات کا حامل ہونے کے باوجود اس گہرے طور سے یہودی اور مسیحی خیالات سے جدا رہا، حالانکہ اس فلسفہ میں یہ استعداد موجود تھی، کہ اسے مسئلہ وجود واجب کے اثبات میں پیش کیا جاتا، فلسفہ زینو، کے ان معتقدات سے مسئلہ (Logos) کے متعلق بعض اہم تنوعات کا اضافہ ہوا، زینو کی ان فلسفیانہ دقائق بیزیوں کے مطابق، (Logos) ہی کا نام "خدا ہے" ایک ابدی ادراک "ہے جو مختلف مظاہر حسن میں بے نقاب نظر آتا ہے، یہ ادراک، اک نفس حیاتیہ "کی طرح کائنات کے ہر ذرہ پر وسیع تھا، اور ترقی کرتے کرتے خود کو قبل سے متعین کئے ہوئے ایک نقطۂ انتہا پر پہونچایا، تمام اشیاء میں پھیل کر وہ رازق مطلق یا کردگار بنا، کائنات کا حل و عقد، نظم و نسق، تشکیل و تعمیر اپنے قدرت تصرف میں لیا، صلحا اور ازکیا کو الہام کیا، ذات الٰہی کا ایک حصہ ہر انسانی ہستی میں موجود ہوا۔

اپیکورس اور لذتیین

ڈرامنڈ نے اپیکورس کے فلسفہ پر کوئی بحث نہیں کی، لیکن "فرقہ لذتیہ" فلسفہ کی تاریخ کا ناقابل فرد گزاشت عنصر ہے اپیکورس ۳۴۱ ق-م میں بمقام سیموس پیدا ہوا ۳۵ برس کی عمر میں ایتھنز میں آباد ہوا اور یہاں ایک مدرسہ کی بنیاد قائم کی، اس کے فلسفیانہ نظریات کا بنیادی اصول یہ تھا کہ حصول لذت دنیا میں بہترین چیز ہے، اس لذت سے اس کا مقصد محویت تماشا اور شاہدان عشوہ طراز کی طرب انگیز صحبتوں سے نہ تھا، بلکہ نفس و روح کا نشاط، اور باطن کا کیف مقصود تھا، لوگوں نے اس کی تعلیم کا غلط مفہوم لیا، اس نے روح کی ازلیت اور امور انسانی میں دیوتاؤں کی مداخلت سے انکار کیا۔

مولانا روم کی فلسفیانہ شاعری

صوفیائے کرام کے شاعرانہ خیالات ان کے متبرک مکتوبات اور ملفوظات سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے بہت سے صوفیانہ فکر و عقاید کی بنیاد یونانی فلسفہ پر رکھی، چنانچہ وحدت فی الکثرت کا مسئلہ زینو کے فلسفہ سے لیا گیا ہے اس کے قبل کسی نے ذات باری تعالیٰ کی ایسی توضیح نہ کی تھی۔ مولانا روم کی شاعری میں بعض خیالات ایسے ہیں جو ارسطو اور زینو کے خیالات کی ترجمانی کرتے ہیں ان میں ایک "تناسخ" کا عقیدہ بھی ہے جو یونانی فلسفہ میں بھی پایا جاتا ہے اور ہندی فلسفہ میں فرق صرف یہی ہے کہ فلاسفہ ہند نے تناسخ کی ذرا الجھی ہوئی شکل پیش کی ہے ان کے نزدیک ارتقاء و انحطاط اور علو و حضیض کے لئے ترتیب نہیں بلکہ ان کے عقیدہ میں عروج کے بعد ہبوط، اور پستی کے بعد بلندی ہوتی رہتی ہے یونانی فلسفہ سے یہ ثابت نہیں ہوتا، ارسطو کا خیال تھا کہ خدا تعبیر ہے عالم مادی کی علت غائی اور نقطۂ منتہا سے، اور کائنات اسی انتہائی نقطہ پر پہونچنے کا مقتضی ہے، ارسطو کے نزدیک عروج کے بعد زوال نہیں مولانا نے اپنی مثنوی میں ڈارون کے فلسفہ کی بنیاد پہلے رکھدی تھی

فرماتے ہیں :۔

از جمادی مردم و نامی شدم	وز نما مردم بہ حیواں سرزدم
مردم از حیوانی و آدم شدم	پس چہ ترسم کے ز مردن کم شدم
حملہ دیگر بمیرم از بشر	تا برارم از ملائک بال و پر
وز ملک ہم بایدم جستن ز جو	کل شیئٍ ھالکٌ الا وجہہ
بار دیگر از ملک قربان شوم	آنچہ اندر وہم ناید آن شوم
پس عدم گردم عدم چوں ارغنوں	گویدم کانا الیہ راجعون

ان اشعار میں مولانا نے تناسخ کا نکر دعقیدہ وضاحت کیساتھ پیش کیا ہے، البتہ "پس چہ ترسم کے ز مردن کم شدم" کہکر حضرت علی کے فلسفہ سے اپنے تخیل کو ممتاز کر لیا ہے، جو ارسطو سے ملتا ہوا، اور ڈارون کے بالکل مطابق ہے، مولانا روم کے مفصلہ بالا اشعار سے مسئلہ تناسخ کے نظریہ پر مختلف علمائے سلف اور ادبائے مصر نے استدلال کیا ہے، چنانچہ وہنفیلڈ نے ملخص ترجمہ مثنوی" میں ڈاکٹر نکلسن نے منتخبات دیوان شمس تبریز" اور "صوفیائے اسلام" میں اور لارڈ امیر علی (بروالله مضجعہ) نے روح اسلام (دی اسپرٹ آف اسلام) میں ان اشعار کو ترسیم کیا ہے، اور تناسخ و ارتقا کے متعلق فکر واحساس کی شرح وبسط کی ہے۔

اسیطرح اس ارتقائے انسانی کو مولانا اپنی ایک غزل میں فرماتے ہیں ،۔

مرا بگور سپاری مگو وداع وداع	کہ گور پردۂ جمعیت جنان باشد
فرو شدن چو بدیدی بر آمدن بنگر	غروب شمس وقمر را چرا زیاں باشد
ترا غروب نماید ولے شروق بود	لحد چو حبس نماید خلاص جان باشد
کدام دانہ فرو ریخت در زمیں کہ نہ رست	چرا بہ دانۂ انسانت ایں گماں باشد
کدام دانہ فرو شد کہ بر بروں نامد	زچاہ یوسف جاں را چرا فغاں باشد

مفصلہ بالا غزل سے صاف ظاہر ہے کہ مولانا نے مسئلہ ارتقا کی طرف اشارہ کیا ہے، کہا جا سکتا ہے، ڈارون کا فلسفہ کیسا ؟ مولانا نے تو حیات بعد الممات اور مسئلہ نشر کی تفسیر کی ہے ؛

لیکن مشکل یہ ہے کہ مولانا نے فرو شدن کے بعد "بر آمدن" کا جو نظریہ پیش کیا ہے، اُس کے لئے شمس وقمر کے طلوع وغروب سے استدلال کیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا سلسلہ حیات وممات کا عقیدہ رکھتے تھے، چونکہ آفتاب کا طلوع وغروب مسلسل ہے وقتی نہیں" کدام دانہ فرو ریخت در زمیں کہ نہ رست" سے یہ خیال اور بھی محکم ہو جاتا ہے، انسان کے لئے موت ناگزیر ہے، اور جب مولانا کے خیال کے مطابق "چرا بہ دانۂ انسانت ایں گماں باشد"

غور کرکے پھر اس کے خروج کا تصور کیا جائے تو مسلسل حیات و ممات کا تصور پیش نظر ہو جاتا ہے یہاں ایک اور جرح ہو سکتی ہے کہ تعدد حیات و موت کے لئے شمس و قمر کے طلوع و غروب سے استدلال فائدہ بخش نہیں کیونکہ مثال کے لئے ضروری نہیں کہ تمام صور و اشکال کی مماثلت ہو، بلکہ دو ایک صورت کی مماثلت کے لئے بھی مثال یاد کرتے ہیں، ان مثل عیسیٰ کمثل آدم لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ مولانا کی مثنوی کے مفصلۂ بالا اقتباس کو پیش نظر رکھکر ان کے اس غزل کی تشریح کیگئی ہے، وحدت فی الکثرت جو زینو کے اجتہاد کا نتیجہ ہے، مولانا کے اس شعر میں پایا جاتا ہے،

چہ جائے صورت اگر خود نمد شود صدتو شعاع آئینہ جاں عالم آورد بظہور

عرفی نے بھی فلسفہ کے اس خاص مسئلہ کی طرف اشارہ کیا ہے، جسمیں حقیقت انسانی اور اس کے ارتقا سے بحث کی جاتی ہے اور جو ارسطو کے الفاظ میں یہ ہے کہ کائنات کے ہر مظہر کو اس مبدء فیض میں مگر غائب ہو جانے کی جستجو ہے،

از وصل نہان ما کہ عمار زنیافت انجام کسے ندیدہ آغاز نیافت
در دوست شدم محو چنانکہ مرا ہم دوست طلب کرد نشان باز نیافت

قرآن مجید کا فلسفہ، اور کسب فلسفہ کی تعلیم

قرآن مجید نے انسانی فکر کو ایسی حریت دیدی ہے اور وجدان سلیم میں جستجوئے حقائق کی ایسی ولولہ انگیز تعلیمی تحریک پیدا کردی ہے کہ مشکل سے فلاسفہ کے خیال میں موضوع فلسفہ کا کوئی ایسا مسئلہ ہوگا جسے قرآن مجید نے نہ بیان کیا ہو۔ ڈرامنڈ نے "یہودی فلسفہ اسکندریہ" میں فلسفہ کی جو تعریف کی ہے، اسے پیش نظر رکھا جائے، تو قرآن مجید کے مفصلہ ذیل آیات کی اہمیت صحیح طریقہ پر ذہن نشین ہو سکتی ہے،

ان فی خلق السمٰوات والارض واختلاف اللیل والنہار لآیت لاولی الالباب ٥
الذین یذکرون اللہ قیاما وقعوداً وعلیٰ جنوبھم ویتفکرون فی خلق السموات والارض،
ربنا ما خلقت ھذا باطلا سبحانک فقنا عذاب النار (آل عمران)

(ترجمہ) بیشک زمین و آسمان کی خلقت، اور لیل و نہار کے الٹ پھیر میں عقلمندوں کے لئے نشانیاں ہیں، وہ لوگ کھڑے بیٹھے اور اپنے پہلوں پر (لیٹے) خدا کو یاد کرتے ہیں، اور زمین و آسمان کی خلقت میں فکر کرتے ہیں، اے ہمارے رب! تو نے ان کو ناحق نہیں پیدا کیا، تعریف تیرے لئے ہے، ہم کو تو دوزخ کی آگ سے بچا،

ان فی خلق السموات والارض واختلاف اللیل والنہار والفلک التی تجری فی البحر بما ینفع الناس وما انزل اللہ من السماء من ماءٍ فاحیا بہ الارض بعد موتہا و بث فیہا من کل دابۃ وتصریف الریح والسحاب المسخر بین السماء والارض لآیت لقوم یعقلون (بقرہ)

(ترجمہ) بیشک زمین و آسمان کی خلقت، اور رات دن کے الٹ پھیر اور دریا میں کشتی کی روانی جس سے انسان کو فائدہ ہوتا ہے،

اور جو کچھ اتارا آسمان سے پانی میں سے اور اس سے زمین کو اس کی موت (خرابی یا بنجر ہونے) کے بعد زندگی عطا کی، اور اس میں بہترے جانور آباد کئے، اور ہوا کے چلنے، اور آسمان و زمین کے درمیان میں بدلی کی تسخیر میں عقل رکھنے والی قوم کے لئے نشانیاں ہیں

فلینظر الانسان الی طعامه انا صببنا الماء صبا ثم شققنا الارض شقا فانبتنا فیها حبا و عنبا و قضبا و زیتونا و حدائق غلبا و فاکهة و ابا متاعا لکم ولانعامکم (عبس)

(ترجمہ) پس انسان اپنی غذا کی طرف غور کرے، ہم جھاجھم پانی برساتے ہیں، پھر ہم زمین کو چاک کرتے ہیں، اور ہم اگاتے ہیں اس میں غلہ، انگور، قضب، زیتون، کھجور، اور باغ جس میں گھنے درخت ہوتے ہیں، میوہ جات، اور گھانس، تمھارے اور تمھارے جانوروں کے استعمال کے لئے؛

اس کے بعد دیکھئے، انسان کے اکثر اعضا، ان کی صورت آفرینش، اور ان کے لئے جو مادی اسباب مہیا کر دئے ہیں ان پر غور و تفکر کا حکم ہوتا ہے؛

قتل الانسان ما اکفره ٥ من ای شیء خلقه ٥ من نطفه خلقه فقدره ثم السبیل یسره ٥ ثم اماته فاقبره ٥ ثم اذا شاء انشره (عبس)

لعنت ہو انسان پر، کس چیز نے اسے کفر کی رغبت دلائی، خدا نے اسے کس چیز سے پیدا کیا؟ اسے ایک قطرہ منی سے پیدا کیا اور اس نے اس کا اندازہ لگایا پھر (رحم سے نکلنے میں) اس کے ورود میں سہولت پیدا کر دی، اس کے بعد وہ اسے موت دیتا ہے، اور قبر میں سپرد کرتا ہے، اس کے بعد جب وہ چاہیگا، اسے دوبارہ زندگی دیگا۔

فلینظر الانسان مما خلق ٥ خلق من ماء دافق ٥ یخرج من بین الصلب والترائب انه علی رجعه لقادر ٥ (طارق)

الم نجعل له عینین ٥ ولسانا و شفتین (ترجمہ) کیا میں نے اُسے آنکھیں، زبان، اور جبڑے نہیں عطا کئے؟

فلاسفہ یونان کی تمام دقیقہ سنجیاں، قلوب انسانی کی تسکین کا سامان نہ پیدا کر سکیں، انغزاغورس موحد تھا لیکن اس نے مادہ کی ازلیت تسلیم کر کے رنگ وحدت کھو دیا، سقراط نے دیوتاؤں کی عظمت، اور ان کے ساتھ خوف و رجا کے تعلقات قایم کرنے میں، خدا کو بھلا دیا، اس کا خاص پیام عرفی کے رنگ تغزل میں یہ تھا،

عنایت صمدی رو کفر ما نہ کند اگر کمال پذیرد صنم پرستی ما،

اسی طرح افلاطون کا "مسئلہ خیال" اس قدر لطیف مباحث، اور نازکخیالیاں رکھتا ہے، کہ ایک "جویائے حق" کا ناخن فکر اس بزم کائنات کے رولق ازلی کی عقدہ کشائی نہیں کر سکتا، ارسطو نے ثنویت کے طلسم میں حقیقت کا جلوہ ہی نہیں دیکھا اور زینو نے تو پھر یہ افراط پیدا کر دی کہ ہر شے میں ذات باری تعالے کے عناصر موجود ہیں، آخر قلب انسانی کے اطمینان، اور

شہود حقیقت کی کیا صورت ہوسکتی تھی، قرآن مجید نے ماہیت روح اور حقیقت باری تعالیٰ کے مباحث میں فلسفۂ یونان کی طرح الجھ کر، انسانی قلب کے اضطرابات میں اور اضافے کرنے کی بجائے اپنے ایک جدید فلسفہ کی بنیاد قائم کی اس نے انسانی دماغ کو مظاہر فطرت، اور کائنات کے اسباب آرائیش پر غور و فکر کی تعلیم دینے کے بعد بتایا کہ اُس کا خالق ایک ہے، وہ ازل سے ہے اور ابد تک رہیگا، وہ ایسا لطیف ہے، کہ انسانی بصارتیں اس کے احساس سے قاصر ہیں لا تدرکہ الابصار وھو یدرک الابصار ارسطو کے خدا کی طرح شیدائیاں وصل اور طالبان تجلی کے لئے یہاں ایک افسردہ بے نیازی، ایک غیر ملتفت، خموشی اور فقدان اثر پذیری نہیں پایا جاتا، بلکہ اس کا عالمگیر پیام ہے واذا سالک عبادی عنی فانی قریب اجیب دعوۃ الداع اذا دعان فلیستجیبوا لی (بقرہ) قرآن مجید نے خدا کو، افلاطون کی طرح ایک لطیف ترقی یافتہ خیال بنا کر نہیں رکھدیا، اور نہ ارسطو کی طرح یہ بتایا کہ خدا تعبیر ہے، مادیت ہی کی ایک انتہائی نقطہ پر پہونچی ہوئی ذات سے بلکہ یہ بتایا کہ لیس کمثلہ شئی

قرآن مجید کے صوفیانہ اصول

قرآن مجید کے صوفیانہ اوراد و وظائف پر بحث و تمحیص کرنے کے قبل یہ نہایت ہی اہم امر ہے، کہ نفس تصوف پر ایک نظر ڈال لی جائے۔ ساتھ ہی تصوف کی داخلی صورت پیش کرنی اسوقت تک مفید نہیں ہوسکتی جب تک یہ نہ بتایا جائے کہ تصوف کی تاریخ کیا ہے، اور مراحل ارتقار کی کتنی منزلیں طے کر لینے کے بعد آج ہم اسے موجودہ صورت میں دیکھتے ہیں، پھر یہ بتانا ضروری ہے کہ تصوف کی تعریف کیا ہے، اور اس ابتدائی عرصہ کے طے کر لینے کے بعد ان امور پر روشنی ڈالی جائے، کہ صوفیائے کرام نے ذکر و شغل کے کیا کیا طریقے بتائے ہیں، اور اُن کے خصائص کیا ہیں؟ تجلی و معرفت کیا ہے، بیخودی و شہود کسے کہتے ہیں، کثرت میں وحدت کی جلوہ گری کیونکر نظر آتی ہے کشف و الہام کی کیا حقیقت ہے، اور ان میں اور وحی میں ما بہ الامتیاز کیا ہے؟ مراقبہ ذات کیا ہے "نفس" و "قلب" کے لغوی معنی کیا ہیں اور اصطلاحات صوفیانہ میں ان کے اسرار و نکات کے متعلق کس قدر لطیف مباحث پنہاں ہیں؟ یہ تمام لطیف جواہر ہیں مشرق کے مقدس دفینوں سے نہیں لوں گا، کیونکہ مشرق کی فلسفیانہ اور تخیلی کاوشین موجودہ دور میں روشن خیال طبیعتوں کا مرکز توجہ نہیں، بلکہ فرزندان مشرق کے جس پہلو کو چاہیے لیجئے، اب اس میں مغربیت کا عنصر غالب، اور ذوق فرنگ متسلط پائیں گے، اس لئے کسی داعی کے لئے اگر کوئی صورت ہے تو وہ یہی کہ انہین کے انداز ذوق، اور افتاد طبیعت کے رنگ میں، مشرق کی روحانیت اور اس کی قیادت کے عبرت آموز فسانے سنائے، لہذا اپنی طلب و تحقیق کی بنا پر میں نے اس مقصد کے لئے نکلسن، اور میکڈ ونلڈ کے حلاوت انگیز و سنجیدہ زور بیان، اور نکتہ سنج اداہائے خطابت کا انتخاب کیا، یوں تو مشرق کے تمام دفینے آج مغرب کے زیر اثر ہیں، لیکن تصوف کے ساحرانہ جذب و کشش نے ایک خاص صورت اختیار کرلی ہے، اس کی بڑی وجہ یہ ہے، کہ تصوف کو فارسی لٹریچر سے ایک بالکل علت و معلول کا سا تعلق ہے، مغرب نے جب شعرائے فارس کی شاعرانہ تخیلات کا مطالعہ کیا، تو ان کے سامنے صوفیانہ فکر و احساس کا ایک بادیۂ ناپیدا کنار نظر آیا، وھنفیلڈ نے جب مثنوی مولانا روم کا خلاصہ ترجمہ کیا، تو اس کے لئے ناگزیر تھا، کہ اس کے ساتھ ایک فاضلانہ مقدمہ بھی لکھا۔ جو تصوف کی داخلی اور خارجی معلومات کے لئے ضروری ہیں، اور جن کے بغیر مولانا روم کی مثنوی اور اُسکے

لطائف و دقایق کا سمجھنا محال نہیں تو دقت طلب ضرور ہے، اسی طرح گارسن ڈی ٹاسی نے جب حضرت فرید الدین عطار کی منطق الطیر کا شرح ترجمہ کیا، تو اسے بھی صوفیانہ افکار کی توضیح کرنی پڑی، صوفیانہ ادبیات کے نشر و شیوع، تراجم و تلخیص، تشریح و تصحیح کی تاریخ کے اندر، ڈاکٹر نکلسن کی خدمات ناقابل محو حقیقتیں ہیں، جنھیں یورپ کی موجودہ ادبی تاریخ نہیں بھلا سکتی، اس کے علاوہ یورپ کے سربرآوردہ مستشرقین نے خمسہ نظامی (گنجوی) اور مصنفات جامی (نفحات الانس، یوسف زلیخا وغیرہ) کے یوروپی نسخے شائع کئے، توضمناً انھوں نے تصوف پر بھی فاضلانہ مباحث کئے جرمنی کا ایک فاضل مستشرق لاک کی کتاب "ریحس ایجوڈ اینڈ لائف ان اسلام" اور نکلسن کے "صوفیائے اسلام" میں پلائے جاتے ہیں، لہذا وطن کی ذوق پسند طبیعتوں کے سامنے وہی خیالات پیش کئے جاتے ہیں، جوان کے مشرقی "خوان یغما" سے لوٹ کر آج مغرب نے ایک جدید ادا سے ان کے سامنے پیش کئے ہیں، مغرب کی اس دعوت پر ارباب مشرق نازاں ہیں، اور وہ اسے اعجوبیت اور اسرار کا جامہ پہناتے ہیں، حالانکہ یہ انھیں کے گلستان پر بہار کی گلگشت کا نتیجہ ہے

مقدمہ دیوان شمس تبریز از نکلسن کی تاریخ تصوف،

فارس کے اکابر شعراءمیں شاذ و نادر ہی کوئی ایسا ہوگا، جس نے اپنی شاعرانہ تخیل میں صوفیانہ اصطلاحات اور افکار سے استفادہ نہ کیا ہو، پھر ان شعرا کے دو طبقے ہیں، بعض تو حافظ شیرازی کی طرح مطالعہ کرنے والوں کو مادہ اور روح کی کشمکش میں حیران رکھتے ہیں اور ذو معنی افکار کی ان آشفتہ بیانیوں سے ان کے ذہن میں ہیجان پیدا کرکے اُن کی لذت نشاط کو دوبالا کر دیتے ہیں، حافظ شیرازی کا تقریباً ہر شعر عقل و ذہن کی رزمگاہ ہے، عشق شراب اور حسن کی پرجوش نقش طرازیوں کو حافظ نے اس طرح ادا کیا ہے، کہ وہی ایک شعر ایک فاسق کے اندر ہوس پرستی کی تحریک پیدا کر دیتا ہے، اور ایک اولیا اللہ کو نشاط روحانی اور لذت باطنی میں بیخود بنا دیتا ہے، شعرا کا بڑا گروہ یا تو علمی حیثیت سے مشرب تصوف سے تعلق رکھتا ہے، یا اعتقادی حیثیت سے، ان کی شاعری کی بنیاد فلسفہ اخلاق کے اعلیٰ نظام یعنی صفائے قلب، ترک لذائذ، اور فرسودگی شہوات پر قایم ہے، جو ابدی سرور و انبساط کے لئے لازمی ہیں، اس میں ہم لوگ وحدت فی الکثرت کے اصول کے مطابق یہ خیالات متداول پاتے ہیں کہ ہر شے ذات باریتعالی سے نکلی ہے، اور پھر اسی میں ملکر غائب ہو جاوئیگی، ہر چند اس سطح پر اسلام کے اوپر کوئی بلاواسطہ حملہ نہیں ہوتا، لیکن اس میں بالواسطہ حملے پائے جاتے ہیں، اور پھر یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ تمام مذاہب اور ملہمات صرف ایک الہٰی شمس کی نور افشانیاں ہیں، اور یہ کہ تمام انبیائے مختلف زبانوں میں فلاح ابدی اور صداقت ازلی کے انہیں مبادی کا نشر و ابلاغ کیا ہے، جو عالم کی روح الوہیت کے سرچشمہ سے نکلے ہیں صوفی شعرا کے اس معقول طبقہ میں جلال الدین رومی کا کوئی حریف مقابل نہیں ہے۔

ہر چند یہاں تاریخ تصوف (یا تصوف کے وجود میں آنے) کے وقت طلب مسئلہ پر بحث و تحیص نہیں کیجا سکتی، لیکن اس کی ارتقاء تاریخی اور ان عناصر کے متعلق جن سے یہ مجموعہ تیار ہوا ہے، چند خیالات کا اظہار اس طالب العلم کے لئے موید ہوگا،

جو دھنفیلڈ کی مرتبہ مثنوی مولانا روم اور گلشن راز محمود شبستانی میں مشرب تصوف کے افکار و عقاید کی قابل قدر تلخیص کا مطالعہ کرنا چاہیے

صوفیائے متقدمین میں (جو اس وقت "صوفی" کے لقب سے مشہور نہ تھے) زہد (Asceticism) کی طرف ایک زبردست میلان پیدا ہوا، غالباً یہ یہودی اور مسیحی اثر آفرینی کا نتیجہ تھا، اپنی ذات پر تصرف، اپنے خواہشات کی قربانی ذوق صبر، و فور توکل جو برنارڈ اور ٹامس اے کمپس کے اوصاف میں ہیں صوفیہ کے پر جوش اور عابدانہ (اگرچہ ایک حد تک محتاط، اور عملی) ولولہ میں اشتعال دیدیتے ہیں، صوفیا کا یہ طبقہ اسلام کا مخالف نہ تھا، بلکہ مسلمانوں کی راسخ الاعتقاد جماعت کا ایک مضبوط بازو تھا۔

مشرب تصوف کی وہ ترقی یافتہ صورت جس میں وحدت فی الکثرت کے خیالات کا دَور دیا جاتا ہے، ان ابتدائی زہاد کے لئے ایک بالکل اجنبی چیز تھی یا ایک ایسی چیز تھی جن سے وہ مالوف نہ تھے حضرت رابعہ بصری کے دور سے جنھوں نے ۱۳۵ھ بمقام بیت المقدس انتقال کیا، سرشارانہ مذہبی عقیدہ مندی کے ساتھ، عشق و محبت کی صوفیانہ طرب انگیزی بھی شامل ہوگئی، سب سے پہلے شخص جس نے صوفی کا لقب اختیار کیا ابو ہاشم (متوفی ۱۵۰ھ) تھے اور ان کی زندگی ہی میں یا وفات کی قلیل مدت گذرنے کے بعد صوفیہ کا سب سے پہلا خانقاہ بمقام رملہ واقع فلسطین ایک مسیحی امیر کے زیر اثر بنایا گیا۔

طریق تصوف کا یہ ابتدائی مرحلہ یعنی زاہدانہ زندگی عرب قوم کی پیداوار ہے، عہد عباسیہ میں فکر و احساس کا ایک جدید طوفان بپا ہوا، تخئیل نے ایک وسیع صورت اختیار کی، خالق اور مخلوق کے درمیان میں رشتۂ موالفت، اور فانی اور ابدی کے درمیان ایک علاقہ قایم کیا گیا، حضرت ذوالنون مصری متوفی ۲۴۵ھ نے طریق تصوف کے "احوال" (Ecstacies) اور مقامات (mystical Stages) کا رواج دیا، حضرت سری سقطیؒ متوفی ۲۵۳ھ نے "توحید" (Unification) کا تعارف کرایا، مولانا جامیؒ نفحات الانس میں فرماتے ہیں طریقت کے قائد اعظم حضرت ذوالنون مصریؒ تھے، ہرچند آپ کے قبل اکابر جانشین گزر چکے تھے لیکن یہ پہلے شخص تھے جنھوں نے اشارت کو عبارت میں پیش کیا، اور تصوف پر گفتگو کی، حضرت جنید بغدادیؒ (متوفی ۲۹۷ھ) نے اس علم کو ترقی دی اور اس پر کتابیں لکھیں، حضرت شبلیؒ متوفی ۳۳۴ھ نے اسے منبر پر بیان کیا، اور کھلم کھلا اس کا اعلان کیا، ۳۰۹ھ میں لوگوں نے منصور حلاج کو اس جرم میں قتل کرڈالا کہ وہ اپنی ذات کو، ذات باریتعالی کا تشابہ قرار دیتے تھے، اور اس کا اظہار بھی کر دیا، اس کے بعد سے تصوف میں کھلم کھلا وحدۃ فی الکثرت کے عقاید شامل ہوگئے، اب اصطلاحات "زہد"

ملہ علامہ جامی کے اس نظریہ کے مقابلہ میں نکلسن نے علامہ قزوینی کی رائے نقل کی ہے جو انھوں نے حضرت ابو سعید ابن ابی الخیر کے متعلق لکھی ہے، علامہ موصوف "خاوران" کے ذیل حضرت ابوسعید کے متعلق لکھتے ہیں"

"حضرت ابوسعیدؒ ۴۴۰ھ میں گزرے ہیں،

ملہ عرفی شیرازی فرماتے ہیں۔ نو اے نغمہ منصور عرفی نفزمی بینی + وے تن زن کہ خاموشند ارباب شہود اینجا +

اور "تصوف" میں کوئی امتیاز باقی نہ رہا، عابد کی جگہ عارف نے لی، ہر چند اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ارباب تمدن کی حیثیت سے وہ ملک کے لئے ایک تہمت ہیں، ان کا وجود تعبیر ہے بطالان سے، وہ قومی ترقی کو زائل کرنے والے، اور قومی عادات کو خراب وخستہ کرنے والے ہیں، لیکن اگر کسی ملک کی ادبیات اس کا کارنامۂ فخر ہے، تو کہا جاسکتا ہے، صوفیہ نے نقصانات سے زیادہ تلافی کردی ہے۔

ہم لوگوں نے دیکھا کسطرح تیسری صدی میں تصوف نے ایک وسیع صورت اختیار کرلی، سلطنت اسلامیہ کی فوری توسیع کے ساتھ، علم وتربیت نے بھی وسعت حاصل کی، فلسفہ یونانی کا داخلہ ہوا، ارسطو کی تصنیفات علمائے اسکندریہ کے شرح اور حواشی کے ساتھ ظاہر ہوئیں، اس کے علاوہ طریق تصوف میں فقرا کی ایک منتظم جماعت تھی۔ یہ لوگ مشرقی دنیا کے ہر حصہ میں سفر کر رہے تھے، ان فقرا میں اکثر ایسے اشخاص تھے، جو عملی جوش سے سرشار اور دماغی استعداد کے اعتبار سے اعلیٰ تھے انھوں نے صدقات کے علاوہ بہت سی چیزیں جمع کیں، اس صورت سے مجوسیت (مذہب زردشت) بدھ مذہب اور مسیحیت کے عناصر شامل ہوگئے۔

ہمارے پاس اسوقت اس قدر کافی مواد موجود نہیں، جسکی بنا پر ہم یقین کیساتھ صوفیانہ فکر و احساس کے اشتقاق پر روشنی ڈال سکیں، اس قسم کی جد وجہد کرنے میں بہت سی ایسی تکلیفات کا سامنا کرنا پڑیگا، جن پر تصرف نہیں حاصل ہوسکتا، دو جماعات کے متشابہ افکار وعقاید کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ رائے نہیں دی جاسکتی، کہ ان میں ایک جماعت دوسری جماعت کی پیداوار ہے، ہوسکتا ہے، دونوں ایک ہی اسباب کا کرشمۂ ہستی ہوں، حتیٰ کہ جہاں تعلق کے ڈانڈے بھی نظر آئیں وہاں بھی یہ جستجو کرنی مشکل ہے، کہ ان میں فوقیت زمانی کس کو حاصل ہے، ساتھ ہی روح صوفیانہ کے تمام مظاہر چونکہ بنیادی حیثیت سے ایک ہیں کیونکہ جس ماحول میں ان کی نشو ونما ہوتی ہے اور جس مذہب سے صوفیہ اپنے افکار کی نسبت دیتے ہیں، وہ ان کے وجود کا سبب نہیں، ہم لوگ یہ دیکھکر تعجب نہیں کریں گے، کہ دور دراز مقامات اور مختلف ازمنہ میں ایک ہی طرح کے مبادی (تصوف) متحد نظر آتے ہیں، میں جلال الدین رومی اور فلاطینوس کے خاص خاص عقاید سے اس رشتہ رفق واتحاد کی تشریح کرنی چاہتا ہوں، ہر چند مشرق میں فلاطینوس کا نام غیر معروف تھا (بحوالہ "ابن رشد اور اس کا فلسفہ" مصنفہ رینان) لیکن اس کے قریبی جانشینوں کی بدولت، جس کا پرتو تصانیف ارسطو کے شرح میں موجود ہے، شہرت پائی، اور مشرقی نظام (فلسفہ) پر اس کا بے انتہا اثر پڑا، (Emanation) یا اس کی خاص شکل کا عقیدہ جو تصوف اسلام میں پایا جاتا ہے۔ اگر ہم غلطی نہیں کر رہے ہیں تو کہا جاسکتا ہے کہ فلسفہ اشراقی سے لیا گیا ہے، جس فلسفیانہ فکر وعقیدہ کو فلاطینوس اجمال کے ساتھ پیش کرتا ہے، مولانا روم تمثیل میں بیان کرتے ہیں۔ مولانا روم اپنے موضوع بحث کو اخلاقی حیثیت سے واضح کرتے ہیں، اور ہر چند وہ منطقیانہ استدلالات کے مدعی نہیں، لیکن اپنے مختصر ماورا طبعی اظہار خیال میں اس قدر اعلیٰ تخیلی پہلو رکھتے ہیں کہ یونانی اور عربی فلسفہ کے متعلق ان کا معیار استعداد مشکل سے متعین کیا جاسکتا ہے۔

اگر ہم لوگ فلسفۂ اشراقی کے مفصلہ ذیل فکر و احساس پر موضحانہ بحث کریں تو معلوم ہوگا، کہ ان میں کوئی ایسی بات نہیں جسے مولانا نے اپنے خاص انداز بیان میں اپنی مثنوی اور دیوان کے ارباب مطالعہ کے سامنے نہ پیش کیا ہو،

مولانا روم اور فلاطینوس کا موازنہ

فلاطینوس کی تخیل اس غرض و مقصد پر مبنی ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ سے وصل کامل حاصل ہو جائے، اُس نے عالم مادی کے اوپر حقایق مابعد الطبیعہ کا اعتراف کرتے ہوئے دو باتیں پیش کی ہیں، (الف) دونوں کے درمیان میں کیا رشتہ ہے (۲) وہ کونسے ذرائع ہیں جن کی وساطت سے انسان مادہ کی کشمکش سے نکلکر لطافت روحانیہ سے بہرہ اندوز ہو سکتا ہے؛

پہلے نظریہ کے متعلق فلاطینوس نے مفصلہ ذیل افکار پیش کئے ہیں،

(۱) وحدت کاملہ (Absolute Unity) یا جسے تمام موجودات کا مبدء کہیں ایک ارفع خیال سے تعبیر کریں سب سے بڑی خوبی سمجھیں، یا حسن بدیع کا ایک مرقع مانیں، نہیں نہیں یہ ان تمام تعبیرات سے اعلیٰ ہے چونکہ یہ ہماری سمجھ سے بالاتر ہے، اس لئے اسے مقال میں ادا نہیں کر سکتے، صوفیانہ اصطلاح میں "وحدت کاملہ" کے لئے " قدم " کا لفظ آتا ہے مولانا روم اپنی تعبیرات مجازیہ میں اس کے لئے بحر و نور، عشق و مے، اور حسن وصدق کے الفاظ لاتے ہیں۔

(۲) عقل کل (Universal mind) ذات واحد کا سب سے بڑا نتیجہ اور جو ذات واحد سے کمتر ہے، یہ "اعیان علمیہ" (Ideas) کا مسکن ہے، اور عالم فانی کا حقیقی مستقر، صوفیہ ان خیالات کو جن کا تعلق عالم فانی سے ہے، " اعیان ثابتہ " کہتے ہیں؛

(۳) روح کل، یا نفس کل (Universal Soul) عالم لاہوت کی پیداوار ہے اور عالم ناسوت پر جاری اور ساری ہے، عالم ناسوت (Region below) عالم مادی کو کہتے ہیں، مادہ نام ہے صورت و عدم کا اس میں بذات خود کچھ نہیں لیکن یہ تمام اشیا کا آئینہ ہے، یہ "سراپا شر" ہے جس میں خیر کا وجود نہیں، شر کے متعلق مولانا روم کے خیالات حیرت انگیز طور پر فلاطینوس سے ملجاتے ہیں،

(ب) نفس (روح) عالم ارواح سے متعلق ہے، یہ اس سرچشمہ سے نکلکر پیکر مادی میں داخل ہوا[1]، اس کا یہ داخلہ اس کے ارادہ کے ماتحت نہ تھا، بلکہ شعور فطریہ کی ضرورت نے اسے اس امر پر مستعد کیا جسم و جسمانیات کے اعتبار سے یہ فطرت کا ایک حصہ ہے لیکن روحانیات کی حیثیت سے پھر بھی مضبوطی کے ساتھ یہ عالم تخیل میں اپنا قدم جما دیتا ہے، ہر چند یہ انحطاط پذیر ہے، لیکن وہ قدم نشین اس کے سامنے کشادہ ہے، اس نشیمن کی طرف لوٹنا انسان کا سب سے بڑا فریضہ ہے،

چونکہ نفس و روح کا فقدان تکمیل محض جسم و جسمانیات کے حجابات پر مبنی ہے، اسلئے اسکا مطلب یہ ہے کہ جب یہ تعلق جسمی

---

[1] مولانا رومی فرماتے ہیں؛ ؎ دلا دیدم ز سرتا سر ندیدم　درتو جز دلبر ؎ مخوان اے دل مرا کافر اگر گویم تو خود اوئی

منقطع ہوجاتا ہے، تو پھر اسے وہی درجۂ کمال میسر ہوجاتا ہے، اسے دنیوی تصورات اور نفسانی لہو ولعب یا ان امور سے جو عنصر لاہوتیہ کے منافی ہیں پاک رکھا جائے، تو پھر اسے وہ آشیانہ خلد حاصل ہوجاتا ہے، جسے موجودہ حالت میں اسنے کھو دیا ہے، حتیٰ کہ عالم محسوسات میں رہکر بھی انسان عالم روحانی کی لذتیں حاصل کرسکتا ہے اور خود حمالیات دنیوی سے انسان میں ایک شعلہ قدس، اور التہاب صفا پیدا ہوجاتا ہے، کیونکہ عشق سے تعبیر ہے حسن وخوبی کے ذوقِ تی، روح ایک ترقی پذیر سلسلہ مقامات کو طے کرتی ہوئی اپنے آشیانہ کی طرف روانہ ہوتی ہے، جستجوئے آشیانہ کی آخری منزل میں روح ایک ایسے عالم میں پہنچ جاتی ہے جہاں علم وعقل کا گذر نہیں، اور یہاں وہ ایک ایسے غیر شعوری حال سے لذت اندوز ہوتی ہے جہاں شاہد اور مشہود وطالب ومطلوب اور عاشق ومعشوق کے امتیازات اعتباری مٹ جاتے ہیں اور انسانیت اپنے پیکر مادی سے نکلکر اس سرچشمہ لاہوت میں لکر غائب ہوجاتی ہے۔

---

۵۱ وہنفیلڈ نے "خلاصہ ترجمہ مثنوی" میں عشق کو لفظ (αγαπη) کا جو انجیل میں موجود ہے، مترادف قرار دیا ہے، جب ہم یہ جانتے ہیں کہ مقام کے مسیحی آپس میں عشق ومحبت رکھتے تھے، اور ساتھ ہی یہ بھی واقعہ ہے کہ حضرت رابعہ بصریہؒ نے بیت المقدس میں زندگی بسر کی، تو وہنفیلڈ کے اس قیاس کی تائید ہوتی ہے، لیکن یہ قابل غور امر ہے کہ ایک احساس جو اس قدر کلی متداول ہے، لوگ نقل کرسکتے ہیں یا خود بخود دل میں پیدا ہوسکتا ہے؟

۵۲ فلاطینوس کا یہ خیال مولانا کے اس شعر میں پایا جاتا ہے ؎

چندان بہی کن یاد حق کز خود فراموشت شود   تا محو در مدعو شوی بے زحمت داعی و دعا

۵۳ فنا تعبیر ہے خالق سبحانہ میں جذب ہوجانے اور تصور حقیقت کی، (بحوالہ کتاب التعریفات) اس کے بعد ڈاکٹر نکلسن نے وہنفیلڈ کی تلخیص مثنوی اور اس کے مرتبہ گلشن راز کا حوالہ دیا ہے، وہنفیلڈ کے ترجمہ مثنوی (بحوالہ نے نامہ مترجمہ ومشرحہ ڈی ساسی) اور شرح گلشن راز مصنفہ لاہیجانی میں فنا کے متعلق بحثیں پائی جاتی ہیں، قرآن مجید میں بھی ہے، فتمنوا الموت ان کنتم صادقین (ڈاکٹر نکلسن کے اس استدلال قرآنیہ سے مجھے اختلاف ہے، سیاق وسباق قرآن مجید سے اس کا دوسرا ہی مفہوم پیدا ہوتا ہے، یہ تو خطاب ہے ان لوگوں سے جن کے متعلق اس کے بعد ہی ہے، ولن یتمنوہ ابدا بما قدمت ایدیھم پھر بھی تاویل کی بنا پر اس سے استدلال ہوسکتا ہے) ڈاکٹر نکلسن نے حدیث کا بھی حوالہ دیا ہے، موتوا قبل ان تموتوا

(فسانہ)

جوکھو نے چلم کا دم لگاتے ہوئے مہابیر حلوائی سے کہا "اب ہمارے گاؤں میں بھی لچھمی دیوی کی کرپا ہونے والی ہے" مہابیر نے اپنے بوسیدہ خوانچہ پر سے مکھیاں اڑاتے ہوئے پوچھا "سو کیسے"؟

جوکھو "ارے کیا تم کو خبر نہیں ہے کہ ہمارے گاؤں میں ہوائی جہاز کا کارخانہ کھلنے والا ہے اب تمھاری تو خوب موج رہیگی" مہابیر نے اپنی پرانی گڑ کی جلیبی پر حسرت سے نظر ڈالی گذشتہ اتوار کو سیر بھر بازار سے خرید لایا تھا لیکن اب تک بکنے کی نوبت نہ آئی تھی۔ خوش ہو کر دریافت کیا "میری موج کیسے رہیگی"؟

جوکھو۔ واہ تم اتنا بھی نہیں سمجھ سکتے آج کل تم بڑی مشکل سے دن بھر میں دو پیسے کی ریوڑی یا جلیبی بیچتے ہوگے گاؤں والے ان کی کیا قدر جانیں مگر جب کارخانہ بن جائے گا تو تمھاری اتنی مٹھائی بکیگی کہ بہت جلد سیٹھ بن جاؤ گے۔ مہابیر نے اپنی خوشی کو دباتے ہوئے کہا۔ سو بھیا تم بڑے مزے میں رہوگے۔ تاڑی کی قیمت چوگنی ہوجائیگی۔ جوکھو کلوار نے ہاتھ سے چلم رکھدی اور بولا۔ میں تو اب شراب کا بھی ٹھیکہ لینے والا ہوں کل میں شہر گیا تھا وہاں داروغہ جی اور تحصیلدار صاحب نے خود مجھ سے کہا ہے کہ سیٹھ ہوائی جہاز کا کارخانہ تمھارے گاؤں میں کھلنے والا ہے ہم سوائے تمھارے اور کسی کو شراب کا ٹھیکہ نہ دیں گے۔ یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ وہاں پر مہاراج گنیشی اور شبراتی میاں آگئے۔ اُمریا کے یہ دونوں زمیندار تھے۔

مہابیر اور جوکھو نے اٹھکر مہاراج کو پالاگن کی، اشیرباد دے کر مہاراج بولے۔ یارو کیا بات کر رہے ہو

جوکھو۔ مہاراج اِدھی کارخانہ کی بات چیت کر رہے تھے۔

مہاراج۔ معلوم نہیں کس کی زمین میں کارخانہ بنے گا۔

جوکھو۔ سو یہ تو مجھے معلوم ہے کہ کارخانہ مشترکہ زمین میں بنے گا۔ مدا یہ سنا ہے کہ زیادہ تر میں آپ کی چودھری گھسیٹے اور شبراتی میاں کی ہے، کچھ زمین ہرنجا بنیا کی بھی ہے۔

مہاراج۔ کہیں سرکار زبردستی زمین پر نہ قبضہ کرلے۔

مہابیر بولا۔ سرکار ایسا جلم (ظلم) کبھی نہ کرے گی۔

جوکھو۔ تحصیلدار صاحب تو معاوضہ دینے کو کہتے تھے کل وہ خود گاؤں میں اسی کا فیصلہ کرنے آئینگے۔

مہاراج۔ مجبکو بھی دشواس ہے کہ معاوضہ ملے گا چلو ذرا چودھری گھسیٹے اور بکریدی میاں سے بھی اس کا ذکر کریں۔
جوکھو۔ بکریدی میاں سے کیا ذکر کرو گے جب ان کا لڑکا شبراتی میاں آپ کے ساتھ ہے تو جو کچھ پوچھنا ہے پوچھ لو
مہاراج۔ نہیں بھائی جب تک بکریدی میاں زندہ ہیں ہم لوگ ان کے سامنے شبراتی میاں سے کچھ نہ پوچھیں گے۔ کیوں شبراتی میاں ٹھیک ہے نا؟

شبراتی میاں کو دل میں تو یہ مہاراج کی بات اچھی نہ معلوم ہوئی مگر بظاہر ہاں میں ہاں ملا دی۔ بکریدی میاں کے یہ اکلوتے لڑکے تھے حال ہی میں ان کی شادی ہوئی تھی بکریدی میاں نے اپنی تمام جایداد شبراتی میاں ہی کے نام لکھدی تھی لیکن پھر بھی وہی سب کام کرتے تھے۔ شبراتی میاں کو زمینداری یا کاشتکاری سے کوئی سروکار نہ تھا۔

(۲)

امریا ضلع ہوشنگ آباد میں ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ چودھری گھسیٹے۔ مہاراج گنیشی، بکریدی میاں اور ہر بجنا بنیا کی یہاں زمینداری تھی ان لوگوں کو زمینداری سے تو کچھ زیادہ فائدہ نہ تھا ہاں کاشتکاری سے بخوبی بسر اوقات ہو جاتی تھی جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ وہاں پر سرکاری ہوائی جہاز کا کارخانہ بنانے والی ہے تو ہلچل مچ گئی اور سب لوگ بکریدی میاں کے دروازے پر پنچایت کرنے کے لئے جمع ہوگئے جوکھو کلوار تحصیلدار سے پہلے ہی مل آیا تھا تحصیلدار صاحب نے اس سے وعدہ کر لیا تھا کہ جب کارخانہ بنجائے گا تو وہ جوکھو کو شراب کا ٹھیکہ دلا دیں گے چنانچہ اسی لالچ میں وہ گاؤں بھر کو ورغلا رہا تھا جب بکریدی میاں کے دروازے پر بہت لوگ جمع ہوگئے تو سب سے پہلے اسی نے اٹھکر کہا۔ بھائیو بڑی خوشی کی بات ہے کہ سرکار ہمارے گاؤں میں ہوائی جہاز کا کارخانہ بنانے والی ہے کارخانہ بن جانے سے ہم غریبوں کا بھی بڑا فائدہ ہوگا جن لوگوں کو دو آنہ مزدوری بھی مشکل سے ملتی ہے اب اُن کو روپئے روز مل سکیں گے۔ دھوبی۔ لہار۔ حلال خور، چمار، بنیا۔ اہیر سب ہی کا فائدہ ہوگا

مہاراج گنیشی کو اپنی پڑی تھی جھٹ سے بول اُٹھے۔ اور میرا کیا فائدہ ہوگا۔

جوکھو۔ آپ چودھری بکریدی میاں اور ہر بجنا بنیا کی زمین ہی پر تو کارخانہ بنے گا معاوضہ میں سرکار روپیہ دیگی۔ ایک بات اور ہے ابھی تو گاؤں میں دو چار سو آدمی ہوں گے کارخانہ بن جانے سے ہزار بارہ سو آدمی ہو جائیں گے چندہ سے ایک چھوٹا سا مندر بنجائگا اور بس آپ وہاں پر بیٹھے ہوئے ست نرائن کی کتھا کہئیگا بڑی آمدنی ہوگی۔ اعتراض کی گنجائش نہ تھی مستقبل کی خوشی نے مہاراج کو مال کی فکر سے آزاد کر دیا۔ لالچ نے کچھ سوچنے کا موقع ہی نہ دیا خوش ہو کر بولے۔ بھائیو جوکھو ہے تو ان پڑھ پرنت (لیکن) بات پتے کی کہتا ہے۔ کیوں چودھری تمھاری کیا رائے ہے؟

مہاراج کا گاؤں میں بڑا اثر تھا۔ چودھری نے بھی ان کی ہاں میں ہاں ملا دی۔ مہابیر حلوائی ایک طرف بیٹھا ہوا خیالی قلعہ بنا رہا تھا میں خوب بڑی دوکان کھولوں گا۔ لکھنا کی اماں بہت دنوں سے 'گڑوا' بنوانے کو کہہ رہی ہے میں اب اُس کو ضرور زیور بنوا دوں گا ہر بجنا بنیا کی طرف دیکھکر بولا کیوں سیٹھ تمہاری کیا رائے ہے۔ گرمہ ستو۔ اور جیسا ہی پر ہر بجنا کی دوکان کا دارومدار تھا زمینداری

بہت تھوڑی تھی۔ زمین پرتی پڑی تھی اس سے کچھ آمدنی کا سہارا نہ تھا اُس نے بھی سوچا کہ کارخانہ سے میری دوکان بھی چمک جائیگی اس نے بھی رضامندی ظاہر کردی۔ اب سب لوگ بکریدی میاں کی رائے معلوم کرنے کے لئے ان کی طرف دیکھنے لگے۔ شبراتی میاں کو نوجوان سمجھکر کسی نے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہ سمجھی اس شبراتی میاں کو بہت بُرا معلوم ہوا اور وہ وہاں سے کھسک گئے۔

بکریدی میاں پُرانے زمانہ کے آدمی تھے۔ بیوی عرصہ ہوا مرچکی تھی اس کی یادگار شبراتی میاں تھے اکلوتا لڑکا سب کا لاڈلا ہوتا ہے چنانچہ انھوں نے بڑے ناز و نعم سے شبراتی میاں کی پرورش کی پڑھانے لکھانے کی انھوں نے کچھ ضرورت نہ سمجھی کیونکہ ان کا خیال تھا کہ تھوڑی بہت زمینداری اور موروثی کاشتکاری بہت کافی ہے۔ شبراتی میاں جب سولہ برس کے ہوئے تو بکریدی میاں نے اُن کی بڑی دہوم دھام سے شادی کردی۔ بیوی کے مرنے کے بعد بہونے گھر کا تمام کام سنبھال لیا۔ بکریدی میاں کے گاؤں والے بڑی عزت کرتے تھے جب ان کی رائے دریافت کی گئی تو وہ کھنکار کر بولے میرے خیال میں تو کارخانہ بن جانے سے ہمارا گاؤں تباہ ہوجائیگا؟

مہاراج نے جوکھو کی طرف دیکھکر کہا۔ اب بولو۔

جوکھو نے بکریدی میاں کی طرف دیکھکر کہا۔ واہ بابا آپ بھی خوب کہتے ہیں وجہ تو بتائی نہیں اور کہدیا کہ کارخانہ سے گاؤں تباہ ہوجائیگا۔ کارخانہ تو پڑتی میں بنے گا۔ پڑتی تو فضول پڑی ہے اس سے گاؤں والوں کو کوئی فائدہ نہیں ہے کارخانہ بن جانے سے وہاں پر بہار آجائیگی۔

مہاراج نے بکریدی میاں سے ہنسکر کہا۔ بابا تم جوکھو کو ایسا ویسا نہ سمجھو بڑی معقول بات کہتا ہے آپ نے اس کو لکھا اور پڑھتے سنا ہی ہوگا۔ رام دے اس جوار میں تو اس کا کوئی مقابلہ نہیں کرسکتا۔ سچ تو کہتا ہے کہ پڑتی سے ہمارا کیا فائدہ ہے۔

بکریدی میاں۔ ابھی تو پڑتی ہی کا نام ہے لیکن تم سب لوگ دیکھ لوگے کہ آہستہ آہستہ آس پاس کی اچھی زمین پر بھی سرکار قبضہ کرے گی جہاں آج لہلہاتے کھیت ہیں وہاں کل چٹیل میدان ہوگا یہی نہیں بلکہ وہ زمانہ بھی آجائے گا جب ہم اپنے مکانوں سے نکال دئے جائیں گے، ہمارے کچے مکانوں کو گراکر پکی عمارتیں بنائی جائینگی لیکن اسپر دوسرے لوگ قابض ہوں گے۔ ابھی کہتے ہو کہ صرف کارخانہ بنے گا لیکن یہ تمھاری بھول ہے کارخانہ بنے گا تو اس کے ملازموں کے لئے بھی بارکیں بنائی جائیں گی اور ان کے لئے بھی زمین درکار ہوگی، افسروں کے لئے بنگلے بنیں گے اور ہماری ہی زمین پر قبضہ کیا جائیگا۔ ہماری بہو بیٹیاں جو آج بڑی آزادی سے کھلے منہ باہر آتی جاتی رہتی ہیں اور ان کی طرف کوئی بُری نظر سے دیکھنے کی جرارت نہیں کرسکتا، پردیسی ان کا مذاق اڑائیں گے گھر سے باہر نکلنا دشوار ہوجائے گا۔ تم کہتے ہو پرتی سے ہمیں کیا فائدہ ہے اس کا جواب یہ ہے کہ وہاں ہری ہری گھاس اگتی ہے ڈھور ڈنگر چرتے ہیں جب چراگاہ ہی نہ ہوگی تو مویشی کیا چارہ کھائیں گے۔

ایک اہیر بیٹھا اونگھ رہا تھا بکریدی میاں کے آخری الفاظ سنکر چونک اُٹھا اور بولا۔ تو یہ کہو کہ کارخانہ کیا بنے گا ہمارے لئے مصیبت آجائے گی۔

جوکھو نے دیکھا کہ معاملہ بگڑا جاتا ہے جھٹ بول اُٹھا۔ ہمارے گاؤں کے چاروں طرف جنگل ہی جنگل ہے کیا پرتی ہی کی گھاس سے کام چلتا ہے بابا بُرا نہ مانو تو ایک بات کہوں سرکار نے ہی ہم کو زمین دی ہے اس کا جب جی چاہے ہم سے چھین لے ہمارا کچھ بس نہیں چل سکتا فریاد کرنے سے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔

بکریدی میاں نے اداس ہو کر کہا۔ جب یہی بات ہے تو پھر مجھ سے پوچھنے کی کیا ضرورت تھی جو تمھارے جی میں آئے کرو لیکن میں اپنی زمین سرکار کو خوشی سے نہ دونگا۔

جوکھو نے کہا۔ لیکن تمھارا کچھ بس نہ چلے گا سرکار تم سے زمین ضرور لے گی خوشی سے دوگے تو خیر ورنہ زبردستی چھین لیگی اور مفت میں گاؤں کی بدنامی ہوگی۔

چودھری گھسیٹے گاؤں کے مکھیا تھے انھوں نے سوچا کہ کہیں مفت میں نہ پس جاؤں تحصیلدار صاحب کو خبر ہو جائیگی کہ اس نے لوگوں کو بہکایا ہے تو میرے حق میں بہت بُرا ہوگا کہنے لگے۔ ہاں بھائیو جو کام کرو سوچ سمجھ کر کرو "دریا میں رہنا مگر سے بیر" کوئی اچھی بات نہ ہوگی۔ ہم سرکار ہی کا تو کھاتے ہیں۔ میرے خیال میں کارخانہ بننے سے ہمارا کوئی نقصان نہ ہوگا بلکہ ہر طرح سے فائدہ ہی ہوگا کارخانہ کھلنے سے بازار بھی لگنے لگے گا سودا سلف خریدنے اور بیچنے میں ہر طرح کی آسانی ہوگی۔ ابھی تو ہفتہ میں دو دن ہمارے گاؤں میں ڈاک آتی ہے کارخانہ بنتے ہی یہاں پیر ڈاکخانہ بھی بنجائے گا۔ مدرسہ کھلے گا اس میں ہمارے بچے پڑھینگے۔

بکریدی میاں نے کہا۔ یہ سب کچھ صحیح ہے مگر جو خوشحالی اب ہمارے گاؤں میں ہے اُس وقت نہ رہیگی۔

چودھری بولے۔ رہیگی کیوں نہیں۔ تم اب سٹھیا گئے ہو تمھاری باتیں بھی الٹی ہوتی ہیں'

بکریدی میاں۔ میری باتوں کی سچائی تم لوگوں کو ابھی نہیں کارخانہ کھلنے پر معلوم ہوگی۔

جوکھو نے مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے کہا۔ دیکھا جائیگا۔

(۳)

دھرپا میں تحصیلدار صاحب مع اپنے عملہ کے تشریف لائے اور چودھری گھسیٹے کے دالان میں اپنا ڈیرہ جمایا چودھری گھسیٹے مارے مارے پھرنے لگے کڑاھیاں چڑھ گئیں پوری اور خستہ کچوری تلی جانے لگیں دودھ کے گھڑے آ گئے بیگاروں نے تحصیلدار صاحب کے گھوڑے کے سامنے ہری ہری دوب لا کر ڈال دی۔ جوکھو کو تحصیلدار صاحب نے اپنی اردلی میں رکھا اور وہ چلم بھر بھر کر حقہ پلانے لگا جب تحصیلدار صاحب اور ان کا عملہ کھا پی کر کچھ دیر آرام کر چکا تو کام کی باتیں شروع ہوئیں جس زمین پر ہوائی جہاز کا کارخانہ بننے والا تھا اس کا نقشہ تحصیلدار صاحب نے کھولا۔ پٹواری نے مالکان کی فہرست پیش کی۔ مہاراج گنیشی۔ چودھری گھسیٹے۔ بکریدی میاں اور ہر بجنا بنیا کا دل دھڑکنے لگا تحصیلدار صاحب نے جوکھو سے کچھ آہستہ آہستہ باتیں کیں اور وہ ان کے پاس سے اُٹھکر چودھری کے پاس آکر بیٹھ گیا اور کہا۔ پرتی زمین کے علاوہ سرکار اور بھی زمین لے گی۔

مزروعہ زمین پر بھی قبضہ کیا جائے گا۔ یہ سنتے ہی سب کے ہوش اڑ گئے مہاراج نے گھبرا کر کہا۔ اب کیا ہوگا۔

جوکھو بولا۔ ہوگا کیا گھبرانے کی کچھ ضرورت نہیں ہے سرکار کیا معاوضہ نہ دیگی تحصیلدار صاحب تو اسی کام کے لئے آئے ہیں لیکن میری بات مانو تو ایک کام کرو تحصیلدار صاحب کی بھینٹ کا کچھ انتظام کردو بس سب کام بن جائے گا۔

بکریدی میاں ایک طرف چپ چاپ سر جھکائے بیٹھے تھے بگڑ کر بولے۔ مجھ سے یہ کام تو ہرگز نہ ہوگا ایک تو زمین جائے اس پر رشوت بھی دوں کہیں ایسا بھی کسی نے اندھیر کھاتہ دیکھا ہے۔

جوکھو۔ تم جانو۔ میں نے تو اچھی ترکیب بتائی ہے تحصیلدار صاحب کی کچھ خدمت کردوگے تو اس کے بدلے میں وہ سرکار سے زیادہ معاوضہ دلا دیں گے آگے آپ لوگوں کی مرضی۔ یہ کہکر جوکھو نے ہربجنا بنیا سے پوچھا "کہو مہتوا! تمھاری کیا رائے ہے جواب خوب سوچ سمجھکر دینا کیوں کہ سرکاری معاملہ ہے فریاد سے کچھ بھی فائدہ نہ ہوگا۔ سرکار کو زمین کی ضرورت ہے وہ لیکر ہی رہیگی"

ہربجنا بولا۔ جو مہاراج۔ چودھری اور بکریدی میاں کی رائے ہوگی سو میری۔

چودھری۔ گھسیٹے اور مہاراج نے جوکھو کی رائے مان لی۔ ہربجنا بنیا نے بھی اُن کی تقلید کی لیکن بکریدی میاں نے صاف انکار کر دیا جوکھو نے تحصیلدار صاحب سے جاکر سارا حال کہدیا اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ مہاراج۔ چودھری اور ہربجنا کی پرتی کو مزروعہ دکھایا گیا لیکن بکریدی میاں کی مزروعہ زمین کو بھی تحصیلدار صاحب نے اپنی رپورٹ میں پرتی ظاہر کیا چنانچہ بکریدی میاں کے سوا سب کے حسب منشا معاوضہ کے لئے تحصیلدار صاحب نے سفارش کردی۔

بکریدی میاں کب خاموش رہنے والے تھے بولے۔ حضور انصاف کا خون نہ کیجئے غریبوں کو ستا کر کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

تحصیلدار صاحب نے ڈانٹ کر کہا۔ خاموش رہو میں کچھ سننا نہیں چاہتا جو کچھ سرکار نے حکم دیا ہے میں وہی کرتا ہوں اس میں میرا کیا قصور ہے۔

بکریدی میاں پھر بولے۔ لیکن حضور ہماری سرکار کا یہ منشا نہیں ہے کہ آپ غریبوں کا گلا دبائیں۔

جوکھو نے کہا۔ بکریدی میاں چپ بھی رہو حاکم سے زبان نہیں لڑایا کرتے۔

مہاراج اپنی وفاداری کیوں نہ ثابت کرتے کہنے لگے۔ ہمارے شاستر میں بھی لکھا ہے راجہ حاکم ایشور کا روپ ہوتا ہے یہ ایشوری نیائے ہے کچھ کہنا سننا فضول ہے۔

چودھری گھسیٹے تو گاؤں کے مکھیا تھے انھوں نے دیکھا کہ تحصیلدار صاحب کے خوش کرنے کا یہی موقع ہے کہنے لگے۔ "ہاں بکریدی میاں تمھاری یہ بڑی عادت ہے کہ اپنے آگے کسی کی نہیں سنتے۔

بکریدی میاں بولے۔ یار و کیا کہتے ہو ظلم ہو تو فریاد بھی نہ کروں۔

پٹواری نے اپنی کارگذاری جتاتے ہوئے تحصیلدار صاحب سے کہا۔ گذشتہ جیٹھ میں تو بکریدی میاں نے اپنی تمام زمینداری اپنے لڑکے شبراتی میاں کے نام لکھدی تھی لڑکا بالغ ہے اور وہی اب جائداد کا مالک ہے بکریدی میاں تو کچھ بول بھی نہیں سکتے۔

بکریدی میاں۔ تو کیا شبراتی اور میں کوئی غیر ہوں آخر وہ میرا ہی تو لڑکا ہے۔

تحصیلدار صاحب بولے۔ شبراتی میاں کو بلائیں بکریدی میاں سے کچھ بات نہیں کرنا چاہتا۔
جوکھو نے کہا حضور میں ابھی بلائے لاتا ہوں۔
تحصیلدار صاحب نے بکریدی میاں سے کہا۔ تم یہاں سے چلے جاؤ شاید تمہاری موجودگی میں شبراتی میاں مجھ سے کھل کر نہ بات کریں یہ سرکاری معاملہ ہے اس میں کسی غیر کی مداخلت میں کسی طرح پسند نہیں کرسکتا۔
بکریدی میاں کی آنکھیں کھل گئیں آج ان کو تحصیلدار صاحب کی بات سے اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ اس کا تجربہ ہوا کہ باپ بیٹے کا ملاپ بھی سرکار کو پسند نہیں ہے گھبرا کر دالان کی طرف اشارہ کرکے بولے حضور میں اس کے اندر بیٹھے جاتا ہوں آپ کو تو کچھ ہرج نہ ہوگا تحصیلدار صاحب نے مسکرا کر اجازت دیدی اور بکریدی میاں اُٹھکر اندر جا بیٹھے وہاں سے وہ باہر کی سب باتوں کو بخوبی سن سکتے تھے
شبراتی میاں گاؤں میں کہیں پر بیٹھے ہوئے اپنے لنگوٹیا یاروں کے ساتھ تاش کھیل رہے تھے دنیا میں کیا ہورہا ہے اس کی اُنہیں کچھ فکر نہ تھی صبح اُٹھتے ہی اپنی بچھائیں گائے کا سیر بھر دودھ پیتے اور پھر گپ شپ اڑانے کے لئے گھر سے باہر نکل جاتے جب جوکھو نے ان سے جاکر کہا "چلو بھیا تم کو تحصیلدار صاحب بلاتے ہیں" تو وہ وہاں سے فوراً چودہری کے دروازے پر آئے راستہ میں جوکھو نے خوب اچھی طرح ورغلایا۔ تحصیلدار صاحب نے شبراتی میاں کو دیکھکر کہا۔ آؤ خانصاحب میرے پاس بیٹھو۔ شبراتی میاں کا سر اونچا ہوگیا۔ تحصیلدار صاحب بڑے اچھے آدمی ہیں وہ میری اتنی قدر کریں گے اس کا تو مجھے خیال بھی نہ تھا"

بکریدی میاں نے بھی سب کچھ سنا اور دیکھا انھوں نے سوچا "تحصیلدار صاحب میرے لڑکے کو بہکا رہے ہیں۔ ہائے اگر اُس نے معاوضہ قبول کرلیا تو میری کتنی بھد ہوگی۔ گاؤں والوں کی نظروں میں ذلیل ہوجاؤنگا۔ نہیں نہیں شبراتی بغیر میرے پوچھے ہرگز کوئی جواب نہ دیگا"

تحصیلدار صاحب نے شبراتی میاں سے کہا "دیکھو خاں صاحب یہاں پر سرکار ہوائی جہاز کا کارخانہ بنوانے والی ہے اس میں تمہاری بھی زمین ہے سرکار کو اس کی ضرورت ہے آپ کو کوئی عذر تو نہیں ہے؟ شبراتی میاں سے جب مہاراج نے کہا تھا کہ تمہاری رائے کی کوئی ضرورت نہیں ہے اسی دن سے وہ جلے ہوئے تھے آج تحصیلدار صاحب نے ان کی رائے طلب کی تو وہ خوش ہوگئے ادھر جوکھو اور ان کے دوستوں نے بھی ان کو خوب بہکایا تھا۔ ہوائی جہاز کا کارخانہ کھلے گا تو خوب مزہ آئے گا قسم قسم کی دوکانیں کھلیں گی بازار لگے گا۔ ہوائی جہاز دیکھیں گے۔ شہر کا لطف گاؤں ہی میں آجائے گا۔ شبراتی میاں مستقبل کی خوشی میں مگن تھے باپ سے پوچھنے کا انہیں کچھ خیال نہ رہا جھٹ سے بول اُٹھے "جو سرکار کی مرضی مجھے کوئی عذر نہیں ہے"
شبراتی کی بات سنکر بکریدی میاں دنگ رہ گئے۔ شبراتی کی سعادتمندی پر اُن کو بڑا ناز تھا وہ ناخلف نکل جائے گا۔ اس کا انھیں سان گمان بھی نہ تھا اگر اس سے پہلے کوئی ان سے کہتا کہ شبراتی خودمختار ہوگیا ہے تو وہ ہرگز یقین نہ کرتے لیکن آج ان کو معلوم ہوگیا کہ شبراتی پر اب اُن کا کوئی اختیار نہیں رنج وغم سے بکریدی میاں کا کلیجہ پھٹنے لگا ہواس باختہ دالان سے باہر نکل آئے تحصیلدار صاحب نے چٹکی لی۔ کہو بکریدی میاں اب کیا کہتے ہو شبراتی میاں تو راضی ہوگئے۔ اب تم ان کو بہکا بھی نہیں سکتے" سب لوگ ہنسنے لگے بکریدی

میاں کا سر نیچا ہوگیا۔ ان کو ایسا معلوم ہونے لگا گویا تمام دنیا ان کا مذاق اڑا رہی ہے، وہ اپنی نظروں میں خود حقیر معلوم ہونے لگے اور یہ سب کچھ شبراتی میاں کی وجہ سے ہوا۔ زمین تو سرکار نے ہی بیچی کم سے کم شبراتی میاں ان کی رائے تو لے لیتے اس سے انکی بات بنجاتی لیکن ایسا نہیں ہوا، شبراتی میاں نے ان سے کچھ پوچھنے کی ضرورت ہی نہ سمجھی اسی کا بکریدی میاں کو بہت صدمہ تھا پانی میں ڈوبتا ہوا انسان بچنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارتا ہے۔ دل کے پھپھولے کو چھیڑ دیجئے وہ پھوٹ جائیں گے۔ بکریدی میاں کب تک صبر کرتے تحصیلدار صاحب نے جو طعنہ مارا تو دل کی بھڑاس یہ کہکر نکال ہی دی۔ تحصیلدار صاحب آپ نے تو میرے لڑکے کو بہکا ہی لیا اب میں کس منھ سے اس سے کچھ کہہ سکتا ہوں اس نے تو کچھ کہنے کا موقع ہی نہ دیا۔ آپ کا تو منشا پورا ہوگیا لیکن مجھے کیا میں تو بکا آم ہوں، آج نہ مرا کل مرگیا، لیکن آپ بھی دیکھ لیجئے گا کہ آج سے امریا پر تباہی آگئی، جو لوگ میرا مذاق اڑا رہے ہیں اور کارخانہ قائم ہونے کے لئے اپنی خوشی کا اظہار کر رہے ہیں وہ بہت جلد روئیں گے۔ ابھی کارخانہ قائم بھی نہیں ہوا لیکن آج ہی سے اس گاؤں میں پھوٹ پڑگئی بیٹا باپ سے جدا ہوگیا ابھی کیا ہے تو سہی اگر کارخانہ اس گاؤں کا نشان بھی نہ مٹا دے مہاراج بولے۔ بکریدی میاں بس بہت ہو چکا چپ بھی رہئے کوسنا اچھا نہیں ہوتا جاؤ شبراتی بابا کو گھر لے جاؤ"

شبراتی میاں بولے۔ بابا جانے دو ایسی باتیں نہیں کیا کرتے چلو گھر چلو"

ھنگو اچمار بولا میاں کا اپنے لڑکا پر تو بس نہیں چلت (چلتا) اٹا ہم لوگن (لوگ) پر رسیات (غصہ) ہیں۔

بکریدی میاں کو ہر ایک کی بات زہر میں بجھی ہوئی معلوم ہوئی۔ وہ وہاں سے کھسکے اُن کو جاتے دیکھکر سب لوگوں نے کہا بابا سٹھائے گئے ہیں" تحصیلدار صاحب ٹھٹھا مار کر ہنسنے لگے شبراتی میاں نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ بکریدی میاں جب گھر پہنچے تو اپنی بہو سے بولے "بیٹی میں اب اس گاؤں میں نہ رہونگا حج کرنے جاؤنگا"

بہو خوش ہوگئی اس نے دل میں سوچا "اچھا ہوگا راہ سے کانٹا نکل جائے گا پھر تو میں ہی گھر کی مالکن بن جاؤنگی اپنا ہی راج ہوگا اسی بڈھے کی وجہ سے تو میری کچھ نہیں چلتی خوش ہوکر بولی۔ ہاں بابا حج تو ضرور کرنا چاہئے مجھے مکہ شریف سے زمزم کا پانی ضرور لائے گا۔ بکریدی میاں نے کوئی جواب نہ دیا سفر کی تیاری میں لگ گئے۔ رات کو شبراتی میاں کی بیوی سے شبراتی سے کہا "اور سنا بابا حج کرنے جا رہے ہیں"

شبراتی نے جواب دیا "جانے دو اُن کے بغیر یہاں کونسا کام رکا پڑا ہے خود تو کبھی مجھ سے کچھ پوچھتے نہیں اور اگر میں کسی سے کچھ کہتا سنتا ہوں تو جل جاتے ہیں۔ ان کی ہمیشہ سے یہی عادت رہی ہے میرا تو ناک میں دم آگیا ہے"

دو چار دن کے بعد بکریدی میاں حج کرنے چلے گئے۔ رخصتی کے وقت وہ شبراتی میاں کو اپنی چھاتی سے لگاکر خوب روئے باپ بیٹے کا یہ آخری ملاپ تھا کیونکہ بکریدی میاں پھر جیتے جی کبھی گھر واپس نہ آئے

(۴)

امریا میں کارخانہ بننے لگا لہلہاتے کھیتوں کی جگہ میدان اور عمارتیں نظر آنے لگیں مزدوروں کی بن آئی لیکن زمینداروں اور

اور کاشتکاروں کی مصیبت آگئی آٹھ آنے مزدوری پر بھی کوئی مزدور کام کرنے کے لئے تیار نہ ہوتا تھا ایک روپیہ کارخانہ والے دیتے تھے ایسی حالت میں کوئی مزدور زمیندار یا کاشتکار کی کیوں پروا کرتا۔ مہاراج گنیشی نے دو چار مرتبہ اپنے اسامیوں کو کارخانہ میں کام کرنے سے روکنا چاہا اس پر کارخانہ کے صاحب نے پولیس میں رپورٹ کردی کہ امریا کے زمیندار سرکاری کام میں مداخلت کرتے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گنیشی مہاراج کے علاوہ چودھری گھسیٹے اور بکریدی میاں پر بھی داروغہ جی کی ڈانٹ پڑی پھر تو مزدور کھل کھیلے دبا ہوا مادہ پھوٹ نکلا زمینداروں کا رعب مزدوروں پر سے بالکل اُٹھ گیا۔ کھیت کی نرائی تو درکنار اس کے کاٹنے والے بھی نہ ملے ایک دانہ اناج بھی گھر میں نہ آیا سب کھیت میں خراب ہو کر رہ گیا۔ جن بکھاریوں میں اناج رکھنے کو جگہ نہ ملتی تھی وہ اب خالی پڑی رہنے لگیں۔

شروع میں کارخانہ میں کام کرنے والوں کے رہنے کے لئے کوئی بارک وغیرہ نہیں بنی تھی۔ ٹھیکیدار کے آدمی۔ بابو۔ منشی۔ خلاصی وغیرہ امریا ہی میں کرایہ پر مکان لیکر رہنے لگے اس سے مہاراج گنیشی چودھری گھسیٹے اور ایسے ہی دو چار آدمیوں کو جنکے پاس بڑے بڑے مکانات تھے کچھ فائدہ ہوا خود تکلیف میں رہنے لگے۔ لیکن روپیہ کے لالچ میں اپنے مکانوں میں کرایہ داروں کو ٹھہرا لیا۔ مگر برسات جو آئی تو مکانوں کی مرمت کے لئے مزدور نہ ملے مکانات کچے تھے دھڑا دھڑ گرنے لگے اس سے زمینداران کا بڑا نقصان ہوا۔ مزدوروں کے بھی مکانات گرے لیکن انھوں نے کوئی پروا نہ کی کیونکہ اس عرصہ میں کارخانہ افسر نے ان کے لئے پکی بارکیں بنوادی تھیں وہ اپنی جھونپڑیوں کو چھوڑ کر بارکوں میں منتقل ہو گئے خالی زمینوں کو ساہوکاروں نے خرید کر ان پر پکے عالیشان مکانات بنوا دیے اس آپا دھاپی میں کاشتکاروں اور زمینداروں کا دیوالہ نکل گیا۔ سرمایہ داروں نے شروع میں تو ان کو قرض دیا اور پھر سود در سود کے جال میں پھنسا کر مکانات اور جائداد نیلام کرادی اور خود ہی خرید کر مالک بن بیٹھے۔ جو کھو کلوار کو خیال تھا کہ اس کو شراب کا ٹھیکہ ضرور مل جائے گا لیکن اس کے بجائے ایک مالدار کو مل گیا اور جوکھو اسی کے یہاں ملازم ہو گیا مگر نیت خراب تھی چوری اور غبن کے الزام میں سزا پاگیا۔ مہابیر حلوائی اور ہربجنا بنیا کا ہوائی قلعہ بھی مسمار ہو گیا باہر والوں کی آراستہ پیراستہ دوکانوں کے سامنے ان کو کوئی فروغ نہ ہوا۔ کارخانہ کے ملازموں کو سودا سلف خریدنے کے لئے بہت دور جانا پڑتا تھا سرکار نے ان کے آرام کے لئے امریا ہی میں بازار بنوا دیا اور اس سے بھی پردیسی سرمایہ داروں ہی کا فائدہ ہوا گاؤں والوں کو تو ہر طرح سے نقصان ہی ہوا۔ بازار کھلنے سے بڑی رونق ہوئی جس گاؤں میں کبھی خاموشی اور سکون کا عالم رہتا تھا اب شراب تاڑی گانجہ اور چرس وغیرہ کی دوکانیں کھلنے سے رات رات بھر راگ و رنگ کی محفلیں جمنے لگیں۔ دو چار دید اور حکیم بھی باہر سے آدھمکے مریضوں کی بھرمار ہو گئی جو دیہاتی کبھی نیم کی سینکوں تلسی کی پتیوں اور کالی مرچ ہی سے بخار کھانسی میں اچھے ہو جاتے تھے اب حکیموں اور ویدوں کی دواؤں میں اپنا روپیہ برباد کرنے لگے۔ گاؤں کا دھوبی پہلے سال بھر کپڑا دھوتا تھا اور اس کے بدلے میں دس پندرہ سیر اناج پاتا تھا اب دو پیسہ اور ایک آنہ کپڑے کی دھلائی لینے لگا۔ ساہوکاروں کی پکی اور بلند عمارتیں جو تیار ہوتیں تو وہاں دو چار ڈیرہ دار طوائفیں اور بیڑنیاں بھی آگئیں۔ پھر تو وہ عالم ہوا کہ خدا کی پناہ پہلے گاؤں کی بہو بیٹیاں بےفکری سے کھیت کھلیان میں گھوم پھر سکتی تھیں۔ لیکن اب ان کا گھر سے نکلنا دشوار ہو گیا ایک دن چودھری گھسیٹے کی بہو مہاراجن کے ساتھ

اپنے کسی پڑوسن کے یہاں جارہی تھی ادہر سے کارخانہ کے کچھ اوباش خلاصی شراب میں مست جھومتے جھامتے چلے آرہے تھے اُنھوں نے الاپنا شروع کردیا۔

کہاں چلین جنیاں نیناں لڑائے کے ——————

بہو اور مہاراجن شرم کے مارے کٹ کٹ گئیں اور بھاگ کر اپنے گھروں میں گھس گئیں خلاصی آگے بڑھے تو شبراتی میاں کی بیوی کو دیکھا کہ اپنے دروازہ پر کھڑی ہے خلاصیوں کو شور وغل مچاتے دیکھکر اس نے جھٹ سے دروازہ بند کرلیا خلاصیوں نے پھر اپنی بے سری اڑائی

تیرے دکھن کو راجہ ہم کب سے کھڑے

دن نہیں چینا رات نہیں نیندیا جب سے سرکوا پہ نینا لڑے

تیرے دکھین کو پیاری ہم کب سے کھڑے

شبراتی میاں ٹھیک اسیوقت اپنے گھر کی طرف کہیں سے آرہے تھے خلاصیوں کی بدتہذیبی پر اُن کو بڑا غصہ آیا اور آو دیکھا نہ تاؤ خلاصیوں سے اُلجھ پڑے ادھر وہ اس کے لئے پہلے ہی سے تیار تھے ایک خلاصی نے ان کی ٹانگ پکڑی دوسرے نے ان کی پگڑی اچھالی تیسرے نے سر پر دہول جمائی اور چوتھے نے اُٹھا کر دے مارا شبراتی میاں کی ساری شیخی کرکری ہوگئی مہاراج اور گھسیٹے میاں بھی موقع پر آگئے لیکن سب کھڑے تماشہ ہی دیکھتے رہے اور خلاصی چلتے بنے پہلے کی طرح اتفاق ہوتا تو خلاصیوں کی جان کے لالے پڑ جاتے لیکن اب تو نفسی نفسی پڑی تھی۔ غریبی اور افلاس نے ان کے جوش کو سرد اور ہمتوں کو پست کردیا تھا۔ شبراتی میاں نے شور وغل بہت مچایا لیکن "کون سنتاہے فغان درویش" سرمایہ داروں نے خلاصیوں کا ساتھ دیا اور شبراتی میاں کا کچھ بھی بس نہ چلا اس دن سے شریفوں کی اور بھی مٹی پلید ہوگئی لیکن رذیلوں کی ڈہاک بندھ گئی پھر تو وہ زمانہ بھی آگیا کہ امیر غریب اور غریب امیر بن گئے چار پانچ سال کے اندر ہی امریا کی بالکل کایا پلٹ گئی جو کبھی گاؤں تھا وہ اب اچھا خاصہ شہر ہوگیا۔ کارخانہ میں ختم ہوتے ہی امریا کے مزدوروں کو بھی سرکار نے برطرف کردیا سیکڑوں آدمی بھوکے دربدر پھرنے لگے جس کا جسطرف منھ سمایا بھاگ نکلا۔ انقلاب زمانہ سے چودہری گھسیٹے مہاراج اور شبراتی میاں جو کبھی زمیندار تھے اب غلام بن گئے چودھری گھسیٹے کسی بنئے کے یہاں ملازم ہوگئے۔ مہاراج کا کام میردکی خوشامد اور ان کی خیرات پر چلنے لگا شبراتی میاں کو ایک انگریز کے یہاں دس روپیہ ماہوار پر خدمتگاری کی جگہ مل گئی۔ ایک دن چودہری گھسیٹے مہاراج اور شبراتی میاں بیٹھے ہوئے اپنا برا زمانہ یاد کررہے تھے مہاراج گنیشی نے شبراتی میاں سے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا "تم کو بکریدی بابا کی باتیں یاد ہیں؟" شبراتی نے کوئی جواب نہ دیا اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

اعظم کریوی

فلسفۂ مذہب

(بسلسلۂ ماسبق)

انجام مذاہب جس طرح انسان کے خیالات، زبان، تمدن کا دورِ حیات ہوا کرتا ہے۔ اسی طرح مذہب کا بھی ہوتا ہے اور جس طرح مختلف زمانہ میں انسان کے خیالات زبان و معاشرت میں درجہ بدرجہ تبدیلی ہوا کرتی ہے یہاں تک کہ ایک معین زمانہ کے بعد وہ ساری باتیں اپنا دورِ حیات ختم کرکے نیست و نابود ہوجاتی ہیں اسی طرح سے وہ مذاہب جن کو خود انسانی خیالات واوہام نے پیدا کیا ہے بدلتے رہتے ہیں۔ اور ایک وقت آتا ہے کہ تمام پرانے مذہبی خیالات نسیاً منسیاً ہوجاتے ہیں اور ان کی جگہ نئے خیالات لے لیتے ہیں۔ گویا دنیا کی ہر چیز قانون ارتقاء کے ماتحت ہے۔ اور اس لئے یہ نہیں کیا جا سکتا کہ ہمارے آئندہ زمانے میں ان مذاہب کی ارتقائی صورت کیا ہوگی۔

دنیا کے مذہبی خیالات دو حصوں میں تقسیم ہو سکتے ہیں۔ ایک حصہ مذاہب نسل سام کا اور دوسرا وہ جو نسل آرج یا انکے زیر اثر نسلوں نے اختیار کیا۔
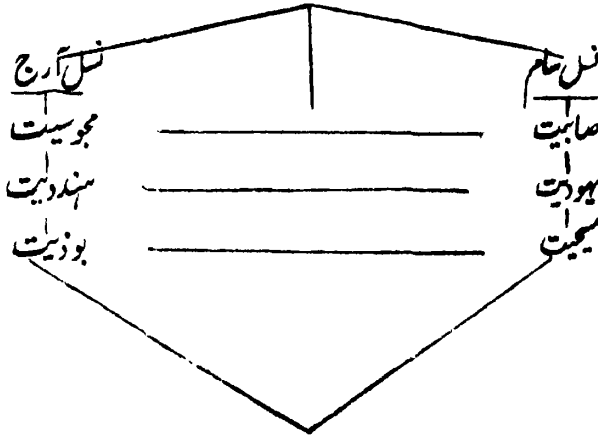
اسلام آخریں

پس خواہ ہم نسل سام کے مذہبی خیالات کو لیکر غور کریں یا نسل آرج کے مذاہب کو نتیجہ صحیح یہی نکلتا ہے کہ مذاہب کے تین دورِ حیات ہیں۔ مذہب کا پہلا دور جو صابیت و مجوسیت کا ہے اور جو نسل سام و آرج کے گہوارے یعنی بابل اور ایران سے نکلے ہیں ان دونوں میں انسانی خیالات کے وہ تمام جراثیم موجود ہیں جن کو ہم مبادیات مذہب میں دکھلا چکے ہیں۔ اس کے بعد دوسرا دور یہودیت

اور ہنادویت کا آتا ہے (ہنود یا براہمہ دراصل نسل آرج کی یہودیت ہے) وہ صابیت و مجوسیت کی ارتقائی صورت ہے۔ یعنی انسان نے اس دور میں اپنے متعدد معبودوں کو ایک دوسرے پر فضیلت دی اور آخر میں ایک مجسم دیوتا کو اپنی قوم کا ایک قہار و جبار بادشاہ تصور کر کے تھیوکریسی (Theocracy) کی بنیاد ڈالی جس کا سب سے بڑا طرۂ امتیاز یہ تھا کہ ایک قوم نے دنیاوی سلطنت کو مذہب کی صورت دے کر اپنی قوم کے سوا دوسری قوموں سے نفرت و حقارت کرنا سیکھا۔ اور مراسم مذہبی کا عادات انسانی میں وہ اہم درجہ قرار دیا کہ اخلاقی خوبیاں اور مذہبیت محض اس کے کرنے یا نہ کرنے پر منحصر ہے۔ گویا وہ قوم کا اٹل قانون ہے۔ جس کے خلاف کرنے پر افراد ویسی ہی جزا و سزا قائم ہوتی ہے جیسا ایک مطلق العنان بادشاہ اپنے حکم جا و بیجا کے منوانے پر دنیاوی سزا دیا کرتا ہے۔ چنانچہ معمولی پاکی ناپاکی و حلال و حرام پر اس درجہ تشدد ہے کہ اکثر اوقات اخلاقی جرائم کے برابر یا اس سے بڑھ کر تصور کئے گئے ہیں۔ اس دور نے مذہب کو سلطنت کی شکل دے کر مذہب کو صرف چند حرکات جسمانی پر محدود کر دیا۔ اور مذہب کی اصل روح یعنی اخوت و روحانیت سے کوئی اعتنا نہیں کیا۔ اس کے بعد تیسرا دور مسیحیت و بوذیت کا شروع ہوا جو تھیوکریسی اور پریسٹ کرافٹ (Priest craft) یا پروہیت اور لفظ پرستی کا احتجاج ہے ان مذاہب نے اگر ایک طرف یہود و ہنود کی لیگلزم (Legalism) فارملزم (Formalism) اور نیشنلزم (Nationalism) سے انکار کیا تو دوسری طرف خدا اور انسان کے تعلقات پر ایک ایسا نظریہ قائم کیا جو ہر چند کہ یہود و ہنود کے تصورات سے بہت ارفع و اعلیٰ تھا۔ مگر وہ بھی حوادث عالم سے نہ بچ سکا اور وہ فلسفہ میں ایسا الجھایا گیا کہ آخر میں خود مسیح و بودھ کو الوہیت کی کرسی پر بٹھا دیا۔

مسیحیت و بوذیت کی باہم مماثلت اس درجہ ہے کہ بعضوں کو یہ گمان ہو گیا کہ آیا مسیحیت دراصل شام کی بوذیت تو نہیں اور محض ناموں کا اشتباہ ہے۔ کیونکہ واقعہ یہ ہے کہ شام و فلسطین میں قبل شیوع مسیحیت بوذیت شائع ہو چکی تھی اور یہ وہی زمانہ تھا جبکہ سکندر مقدونی کے جانشینوں نے باختر۔ شمالی ہند۔ شام میں اپنی سلطنت قائم کی۔ اور ان کے سیاسی و معاشرتی تعلقات آپس میں قایم ہوئے۔ اہل یورپ نے اس مضمون پر متعدد کتابیں لکھی ہیں (دیکھو ڈون (Doane) کی بائبل متھ (Bible myths) جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں مذاہب میں شروع سے لیکر اخیر تک ایسے واقعات دوسرے سے ملتے جلتے نظر آتے ہیں کہ سوائے اس کے اور کوئی نتیجہ نہیں نکلتا کہ یہ دونوں ایک ہی چیز ہیں۔ اس کو ہمارے قابل دوست خواجہ کمال الدین صاحب نے تفصیل وار اپنی کتاب (Sources of christianity) کے صفحات ۱۰۸ تا ۱۱۸ میں دکھلائے ہیں) اس کے ساتھ اس واقعہ کو بھی فراموش نہ کرنا چاہئے کہ موجودہ مسیحیت کی اتنی ہی بلکہ اس سے زیادہ مماثلت متھرا۔ اپالو اور بعل کی مذہبی جماعتوں کے خیالات سے ہے اس لئے یا تو متھرا، اپالو، بعل یعنی ایران۔ روما اور بابل کے مذہبی خیالات جو پرانی مذہبی خیالات کی ارتقائی صورتیں ہیں وہ سب بوذیت کی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں یا پھر یہ کہ اس دور میں خیالات انسانی نے ہر جگہ ایک ہی قسم کا نظریہ قائم کیا۔

اس سے اس مسئلے پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ مسیح جن کی موت ایک راز ہے ان کا آخری زمانہ جبکہ وہ یہودیوں کے مکر و عناد سے چھوٹ کر

روپوش ہوگئے تھے۔ کہاں گذرا۔ بعضوں کا خیال ہے کہ وہ کوہستان کشمیر و افغانستان میں جہاں بقول اُن کے بنی اسرائیل کا ایک گم شدہ قبیلہ جو بابل سے فرار ہو کر یہاں مقیم ہوا تھا اور جن کی اولاد میں کشمیری و افغان ہیں وہ ان قوموں میں اپنے مذاہب کی تبلیغ کے بعد یہیں مرے۔ اور مرزا غلام احمد قادیانی اور ان کے متبعین اس بات کا یقین کرتے ہیں کہ انکی قبر ابتک سری نگر میں موجود ہے۔

بہرحال انسانی مذاہب کا دور حیات کچھ اس طرح کا ہے کہ ابھی ایک مذہبی خیال پوری طرح ختم نہیں ہونے پاتا کہ دوسرا خیال پیدا ہوجاتا ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہمارے زمانہ میں اس سے پہلے بھی دنیا کے اندر مختلف قسم کے مذہبی خیالات کے نمونے ایک ہی وقت میں مل جاتے ہیں، جس کا سبب شاید یہ ہو کہ انسانی طبائع و تربیت میں اختلاف ہونے کی وجہ سے قانون ارتقا ایک ہی وقت میں دنیا میں عمل نہیں کررہا ہے۔ یا یہ ہو کہ وہ انسان کی فراست و تمدن و عقل پر موقوف نہیں، کیونکہ اگر اس کے برخلاف وہ حالت ہوتی تو یورپ و جاپان باوجود اعلیٰ فراست و معاشرت کے مذہب کی حیثیت سے اسی جگہ پڑے ہوئے نہ ہوتے جہاں ایک وحشی و جاہل قوم کو ہونا چاہئے۔ اس لئے اگر ہم مذہب کی ارتقائی صورت نہ مانیں تو پھر ہم کو یہ ماننا پڑے گا کہ ابتدائے انسانوں کے اندر ایک قسم کا مذہبی خمیر موجود تھا۔ اور وہ خیالات جب اوہام انسانی سے ملتے تھے تو وہ مذہبی خیالات کی صورتیں بدلتے رہتے تھے۔ یہ خیال ہمارے اس قیاس کی تائید کرتا ہے کہ خیالات اسلامی جو دنیا میں مختلف زمانے و قوم میں برابر خدا کی طرف سے بذریعہ نبوت پیدا کئے جاتے تھے۔ وہ بھی ایک مذہبی خمیر تھا۔ اور وقتاً فوقتاً ان خیالات کی دنیا میں ترویج ہوتی رہی۔ چنانچہ ابھی بوذیت مسیحیت۔ یہودیت اور ہندویت کے خیالات کا دنیا میں دور دورہ تھا کہ اسلامی خیالات عرب سے پھر پیدا ہوئے وہ اسلامی اسلامی خیالات کیا تھے۔ ہم اُن کو پچھلے ابواب میں بیان کرآئے ہیں کہ وہ سب عین فطرت انسانی کے موافق ہیں۔ اور جو بندے اور خدا کے تعلقات اور انسان کے حقوق و فرائض کی یاد تازہ کرکے خدائے وحدہٗ لاشریک کو پھر اسی عظیم کرسی پر قائم کردیتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ خدا نہ ہم انسانوں کی اس طرح مشابہت رکھتا ہے کہ بات بات پر آپے سے باہر ہوجائے اور غصہ میں کبھی اپنے قوم کی حمایت میں دوسری قوم کو عقوبت دے۔ اور نہ وہ بالکل غیر مشخص ہوائی خیال ہے اور یہ کہ انسان کی پیدائش خود اُسکا کوئی مجرمانہ فعل نہیں ہے کہ جب تک وہ چند قسم کی حرکات جسمانی یا بعض عجیب و غریب خیالات کو اپنے دماغ میں جگہ نہ دے وہ قابل دوزخ ہے۔ بلکہ اس کا قول ہے کہ انسان دنیا کی بہترین مخلوقات میں سے ہے اور خود خدا کا خلیفۃ الارض ہے اور یہ بالکل اس کے اختیار میں ہے کہ وہ اپنی تربیت اور ذہنیت کو فرشتوں سے بڑھا کرکے اعلیٰ علیئین تک لیجائے یا اس کو اس درجہ پست کردے کہ شیطان اور اسفل السافلین کے درجے میں پہونچ جائے۔ اور یہ اس کی فطرت کی توہین ہے کہ وہ اپنے سے کمتر یا اپنے برابر میں سے کسی کا معبود ہو۔ وہ ایک طرف معاشرت کے ان مسلمہ اصول کو تسلیم کرتے ہوئے جن کا اثر اخلاق پر پڑتا ہے اسکو نیک بننے کی بہترین تعلیم دیتا ہے۔ دوسری طرف وہ اس کو اس شریعت سے بچاتا ہے جو روحانیت سے عاری ہوکر صرف ظاہر پرستی اور ربوبیت پرستی کا نام ہے۔ وہ اس کو تمام عالم کے لئے کافی جانتا ہے اور اس لئے قوموں کے طریقہ عبادات و معاشرت

کوئی زیادہ اعتناء نہیں کرتا۔

اگر یہ خیالات اسلامی دنیا پر قانون ارتقاء کے ماتحت ظاہر ہوئے ہیں تو وہ خود بھی ایک زمانے کے بعد کوئی اور دوسری ارتقائی صورت اختیار کریں گے۔ اور چونکہ یہ خیالات رفیع دنیا پر شروع سے ظاہر نہ ہوئے تھے اس لئے خدا کی مصلحت سے یہ بعید معلوم ہوتا ہے کہ اس رازِ پنہاں کو جس کی جستجو میں انسانی فطرت سرگرداں تھی صرف قرب قیامت میں دنیا پر ظاہر کرے اور اس کے پہلے قوموں کو گمراہی سے ہدایت کی روشنی میں نہ لیجائے۔ حالانکہ ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ اسلام ابتدا سے ہے اور انتہا تک رہیگا۔ اور دنیا کے جتنے مذاہب ہیں در اصل اسلام سے شروع ہوتے ہیں اور بعد کو جب دورِ جہالت ان پر غالب آیا تو انھوں نے اسلامی اصول کو مسخ یا فراموش کر دیا۔ اور اس کی مثال بالکل اس بچے کی طرح ہے جو فطرت سے معصوم پیدا ہوتا ہے اور بعد کو نیکی و بدی کے دو راستوں میں سے ایک اختیار کر لیتا ہے۔ اس لئے ہم اسلام کو قانون ارتقاء و حوادث عالم سے بالاتر رکھیں گے اور اس کے متعلق ہم یہی نظریہ قائم رکھیں گے کہ وہ ایک خدائی دویعت یا فطرت ہے۔ جو ازل سے ابد تک دنیا کے انسانوں کو عطا کی گئی۔ اور جس کو یاد دلانے کے لئے متعدد نبیوں کی ضرورت پڑی۔ اگر ایک قوم نے اسلام کو جاننے کے بعد مذہب کو مسخ کیا تو وہ قوم دورِ ارتقاء کے گرداب میں ہے۔ ایک زمانہ وہ بھی آئے گا۔ اور شاید آگیا ہے جبکہ قوموں میں یہ عام صلاحیت ہو جائے گی کہ وہ اسلام کو بغیر مسخ کئے ہوئے اختیار کر سکیں گے

میرا اس کہنے سے یہ مطلب نہیں کہ میں از راہ تعصب ایسا کہہ رہا ہوں کہ میں مسلمان ہوں یا میں دوسرے مذاہب کی کسی قسم کی توہین کر رہا ہوں۔ میرا مطلب صرف اس قدر ہے کہ وہ مذاہب بھی اسلام کی اتنی ہی مسخ شدہ صورت ہیں جتنے ہمارے فقہا و صوفیہ کا اسلام یا دوسرے معنوں میں وہ اسلام جو عوام کا مذہب ہے اور جس کی ترویج فقہا اور صوفیہ نے اسلام کے دورِ انحطاط میں کی ہے۔ حتیٰ کہ اس اسلام میں اور یہودیت میں مجھے ذرہ برابر فرق نظر نہیں آتا اور اگر کچھ فرق ہے تو اس میں کہ ہم مسلمانوں سے یہودی کم تر ہیں۔ یعنی یہود قبر کی پرستش نہیں کرتے۔ اور مزارات اولیا پر ناک نہیں رگڑتے جو ہم مسلمان کرتے ہیں۔ الغرض میرا مطلب یہ ہے کہ یہودیت ویسی ہی مسخ شدہ اسلام کی صورت ہے جسقدر ہندویت۔ مسیحیت اور صوفیت دقیقیت ہے۔ تاکہ لوگ میرے اس قول سے بھڑک نہ اٹھیں۔ میں اپنے مدعا کی پھر صراحت کرنا ضروری سمجھتا ہوں جو ایک حد تک میرے مضمون مذہب اور قومیت کا اعادہ ہوگا۔ اسلام کو اگر درحقیقت سیاست و معاملات انسانی پر حاوی کیا جاوے تو پھر ضرورت اس بات کی ہے کہ مذہب کے لئے انسان کو ایک وافر دفتر قانون کا چاہئے۔ جسطرح دنیاوی قوانین کی ضرورت ہے اور ہر بات کے جواز و عدم جواز و حلال و حرام کے لئے ویسی ہی دفعات یا مسائل بنائے جائیں۔ جیسے ہمارے ملک کے ضابطہ دیوانی و فوجداری و تعزیرات ہندو غیرہ ہیں۔ اور اس کے لئے مذہبی قیل و قال کا وہ عظیم الشان دروازہ کھل جاتا ہے۔ جو ایک عامی کو مخبوط الحواس بنانے کے لئے کافی ہے۔ اور جس میں خود قانون والوں کو مختلف قسم کے اسناد وضع کرنے کی ضرورت پڑے گی۔ تاکہ وہ اپنے جواز و عدم جواز کی احکام کی بنیاد رکھ سکیں۔ یہ بدبختی اس اسلام پر بھی آئی جو خلافت کے ساتھ دنیا میں شائع ہوئی۔ اور ابتدائے خلافت سے اسلام میں مذہب اور سیاست و معاملات ایکدوسرے سے اس طرح گڈ مڈ کر دئے گئے کہ مذہب اسلام نے درحقیقت یہودیت

دہندیت کی صورت اختیار کرلی ورنہ مذہب سے سیاست و تمدن کو حذف کردو تو اس کے اصول و عقاید اس درجہ عام فہم وسلیس و مختصر رہ جاتے ہیں کہ سوائے ایک قرآن کے کسی مذہبی لٹریچر کی ضرورت باقی نہیں رہتی جس میں نہ کسی اجتہاد کی ضرورت باقی رہتی ہے نہ کسی قیاس کی اور نہ کسی حدیث کی ورنہ پھر مذہب ایک ایسا پریشان کن علم ہوجاتا ہے جو محنت شاقہ کے ساتھ تحصیل واکتساب کئے بغیر ممکن نہیں - اور جب مذہب کی یہ صورت ہوجاتی ہے تو پھر وہ ایک قومی مذہب کی صورت اختیار کرلیتا ہے۔ اور ایک قوم سے باہر اس کا تبلیغ کرنا ناممکن ہوجاتا ہے تاوقتیکہ اس قوم کی تمام خصوصیتیں اس درجہ نہ بدل دیجائیں کہ وہ قوم دراصل اس قوم کے مانند نہ ہوجائے جس میں اسلام پہلے سے تھا۔ مسلمان بارہ صدی تک صرف ان فروعی مسائل دنیاوی وسیاست ومعاملات پر لڑتے رہے جن کا مفاد سوائے مراسم وخصوصیت قومی کے کچھ نہ تھا - اور بعض کے کہنے یا نہ کرنے پر نجات کا کوئی دارومدار نہیں ورنہ خدا کو ایک سمجھنا اور اس کی عبادت کو اس طرح کرنا جس سے اس کا وجود ہمارے دل پر قائم ہوجائے - ایسی باتیں نہ تھیں جن میں کسی قیاس وتاویل کی گنجائش ہو - مذہب کا سب سے بڑا مدعا یہ ہے کہ انسان اپنے اندرونی احساسات وجذبات کو جن کو خدائے واحد نے اس کے حفظ نفس کے لئے ودیعت کیا ہے بہترین طریقے سے استعمال کرے تاکہ نہ اس کو نقصان ومضرت پہونچے نہ اس کے ابنائے جنس کو اور اس کے اعتدال کا محرک اس کا یہ عقیدہ ہے کہ خدائے تعالی اس کی ہستی کا مالک ہے اور وہ اس کے سامنے دنیا میں اور اس کے بعد جواب دہ ہے - اس اصول کو ذہن نشین کرتے ہوئے ہم جو کام بھی اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے کریں خواہ وہ دنیاوی قوانین کے مختلف صورتوں کے ذریعے سے پورا کیا جاوے یا اخلاقی تعلیم وتربیت سے وہ سب مذہب کے اجزا ہیں - اس لئے سیاست کا تعلق مذہب سے اس قدر ہے کہ مذہب نے مثلاً بتایا کہ تم کسی کے مال کا لالچ نہ کرو - قانون وشریعت نے ایسی عملی تدابیر کو فروغ دیا جس سے انسانی کے جذبات جلب منفعت کی بے اعتدالی رک جائے یا مثلاً مذہب کا حکم ہے کہ تم زنا نہ کرو - شریعت وقانون نے مختلف صورت سے اُس کو روکا جیسے نکاح - خلع - طلاق - تعداد ازدواج، حجاب وغیرہ کی تعیین سے یا مذہب کا حکم ہے - تم قتل مت کرو - پس ہر وہ تدبیر انسانی جو انسان کو اس حکم کے انحراف سے بچائے وہ سب مذہب کے بائی لاز (Bye - Laws) ہیں خواہ اس کی سند میں اجماع ہو یا سنت یا مکائے کا دماغ یا کسی پارلیمنٹ کا ایکٹ - لیکن اگر ان اصول مذہب کے ساتھ تمام فروعی باتوں کو ملا جلا کر ایک اٹل قانون یا شریعت بنائی جائے اور اسی کا نام اسلام ہو جو ہر قوم کی معاشرت وتمدن پر منطبق کیا جائے تو اسی صورت پیدا کرنا محال ہے یہ فروعی باتیں ایسی ہیں جن کے متعلق اختلاف ہونا فطری امر ہے - اور جو انسان خود اپنے فہم وقیاس یا اجماع سے بنا سکتا ہے - اور ہر قوم کو حق ہے جسطرح چاہے وضع کرے، اس لئے جب تک مسلمانوں خصوصاً مسلمانان ہند کے دل سے یہ خیال نہ نکلیگا کہ وہ ایک قوم ہیں نہ کہ ایک مذہبی جماعت - وہ یقیناً قرآن کے منشا ومفاد اور اس کی عمومیت سے سخت دشمنی کر رہے ہیں - بلکہ خود اپنی دنیاوی ترقی کے ساتھ وہ غفلت برت رہے ہیں جو ان کو کہیں کا نہ رکھیگی - ہماری سمجھ میں یہ کبھی نہ آیا کہ ایک مرہٹہ یا بنگالی یا مدراسی اگر مسلمان ہو تو کیا اس کے لئے اولین شرط یہ ہوگی کہ وہ اپنی زبان کو بھلا بیٹھے - اپنی صورت ولباس کو بدل دے اور اردو

زبان حاصل کرے جو "قوم" اسلام کی خصوصیت ہے مگر ابھی حال کا واقعہ ہے کہ جب ہندوستان نے نہرو رپورٹ سے ہندوستان کی آئندہ سلطنت کا خاکہ کھینچا - تو ایک بڑے ادیب فلسفی بزرگ جو آج کل بہ سلسلہ شغل بیکاری صوفی و فقیہ ہونے کی سخت جدوجہد کر رہے ہیں چلا پڑے کہ اگر زانیہ کا رجم اور قاتل کا قصاص اسلامی طریقے سے نہ کیا گیا تو اسلام کی مٹی پلید ہو گی - میں اُن کو یہی مشورہ دوں گا کہ اس کی دو صورتیں ہیں یا تو آپ اپنی قوم کو لیکر ہندوستان سے نکل جائیں جسطرح بنی اسرائیل مصر سے نکلے تھے اور یا پھر اُٹھئے اور ہندوستان میں اسلامی سلطنت قائم کیجئے کیونکہ یہ عبث خیال ہے کہ "قوم" مسلمان اسلامی سلطنت سے باہر بھی پھیل سکتی ہے ہر چند بد قسمتی سے چین و ملایا و افریقہ اور اب یوروپ میں باوجود ہماری مخالفت کے مسلمان موجود ہیں اور ہوتے جاتے ہیں - کیا مولانا کو معلوم نہیں کہ دار الحرب میں مسلمانوں کا رہنا حرام ہے - پھر وہاں تبلیغ کیا معنی رکھتی ہے -

(باقی)

سید مقبول احمد

(باقی آئندہ)

کلیات و دواوین (اُردو)

دیوان میر حسن دہلوی نہایت درد انگیز کلام ہے ۶ر

دیوان مردان صفی تصوف کا رنگ کوٹ کوٹ کر بھر دیا گیا ہے ۵ر

کلیات مومن مع قصاید و مثنویات عہ ر

کلیات ظفر ہر چہار جلد کامل دو جلد ۱۲ر

دیوان ناسخ استعارات و تشبیہ میں انکا کلام اپنی آپ نظیر ہے ۱۲ر

کلیات میر تقی میر تعریف فضول ہے کل شعرائے ماضی و حال کے پیشوا مانے جاتے ہیں ۱۲ر

کلیات سودا ہجو گوئی کے بادشاہ اور قصیدہ کے استاد ۱۲ر

کلیات نظیر اکبر آبادی ہر رنگ میں فرد تھے - عہ ر

گلزار داغ زبان اور محاورات دہلی کا معدن ہے ۱۲ر

دیوان ندا از سید محمد خانصاحب ندا نہایت پختہ اور متعین کلام ہے ۹ر

دیوان غالب - مع نایاب کلام ۱۲ر

دیوان ذوق اسمیں جدید کلام کا بھی اضافہ کیا گیا ہے ۱۲ر

صنمخانہ عشق یعنی منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی کا دیوان مطبوعہ غیر ۱۲ر

مسٹر رینالڈز کے انگریزی ناولونکے ترجمے

فسانہ الہ دین و لیلیٰ مشہور ناول اسٹار آف منگریلیا کا ترجمہ رنگین داستانوں کے ضمن میں بہشت و دوزخ کی سیر کرائی ہے پڑھکر دل دھڑک جاتا ہے ترجمہ منشی امیر حسین صاحب تحصیلدار کاکوروی ۱۲ر

فریب حسن ناول فاسٹ کا اردو ترجمہ جسمیں قصہ کے پیرایہ میں بدکرداریوں کے زبوں نتائج دکھائے گئے ہیں ۱۲ر

روز الیمبرٹ ایک لڑکی یمبرٹ کی حسرت اور درد بھری سوانحعمری راہ نسک سے انحراف اور چوری جوئے دغابازی شراب خواری وغیرہ کے برے انجام زبان سلیس اور صاف دو حصہ کامل ۱۲ر - ایضاً حصہ اول ۱۲ر حصہ دوم ۱۲ر

فسانہ لارنس و روتھ ایک عفیفہ لڑکی کی داستان فوجی افسروں کی بیباکی چارلس گذشتہ شاہ انگلستان کی بے اعتدالی - زنان دربار کی بدکرداری وغیرہ کا خاکہ ترجمہ رائے ہوس پلاٹ ترجمہ سید امیر حسین صاحب ۱۲ر

ناول اسرار لنکرومنیسر کا بامحاورہ اور سلیس ترجمہ جیسا عصمت و ر حسین زمانہ لیڈیوں کے دلی جذبات کا خاکہ زمانہ کی حیرت انگیز نیرنگیوں اور انقلاب کی حیرت انگیز تصویر ۱۲ر

(منیجر نگار)

غرورِ حسن کی شکست

(۱)

فرامرزجی کا شمار بمبئی کے معزز و متمول تاجروں میں تھا۔ وہ جنرل مرچنٹ تھا اور اسکا کارخانہ متعدد اداروں اور مختلف ہلکاروں پر مشتمل تھا۔ دیانت، مستعدی، خوش معاملگی، غرض جتنے اوصاف ایک تعلیم یافتہ اور کاروباری پارسی میں ہونا چاہیے سب اسکی ذات میں موجود تھے۔ اسمیں شک نہیں کہ دولت کی وجہ سے اوسمیں یک گونہ تنگ دلی اور سرد مہری پیدا ہوگئی تھی مگر اسکی تلافی اسکی دیانتداری اور معقول پسندی نے کردی تھی۔ اس تمام دولت و وجاہت کے باوجود فرامرزجی کی زندگی تمامتر خشک و بے روح ضوابط کا مجموعہ تھی اسکو قدرتاً ہر ایک سے بے اعتمادی تھی۔ اس لئے دوسرے بھی اس سے محبت نہ کرتے تھے۔ تمام دنیا میں فرامرزجی کو اگر کسی سے الفت تھی تو، نوشابہ سے۔ اور یہ امر واقعہ ہے کہ کبھی اوسکی حیات کے پرجمود سمندر میں نشاط کی کوئی لہر اوٹھتی تھی تو نوشابہ کے متبسم اور شگفتہ چہرے کو دیکھکر، نوشابہ اسکی رفیق حیات تہمینہ کی یادگار تھی۔ تہمینہ کے بعد اس نے دوبارہ سلسلۂ علایق میں گرفتار ہونا پسند نہ کیا اور اپنے تمام جذبات محبت کا مرکز اپنی لخت جگر نوشابہ کو بنادیا، نوشابہ کو بھی اپنے باپ سے انتہا سے زیادہ شغف تھا اور وہ ہمیشہ اسکی رضاجوئی کو اپنا اولین فرض سمجھتی تھی۔

(۲)

نوشابہ کیا تھی؟ ایک حسن مجسم، ایک ناز مصوّر، ایک دنیائے شعر و جمال، ایک جہان کیف و سرشاری۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ معبدِ زہرہ میں کسی یونانی صنّاع کے دست و بازو کے تراشے ہوئے مجسمہ میں جان پڑ گئی ہے یا ایرانی شعرا کے خیالات کی لطافت شکل بشری میں نمودار ہوگئی ہے مختصر لفظوں میں یوں سمجھئے کہ "رنگینیاں سمٹ کر انسان ہوگئی تھیں"

اوس کے متناسب اعضا اور محشر خرام قد، اوس کے زاہد فریب عارض اور صاعقہ پاش نگاہیں، ان سب چیزوں نے ملکر اس کے کافر حسن کو اسقدر فتنہ ساماں بنادیا تھا کہ وہ مشکل سے اس کرۂ ارضی کی مخلوق معلوم ہوتی تھی۔ نوشابہ کی تعلیم و تربیت نہایت اعلیٰ پیمانہ پر ہوئی تھی، اور حسن صورت کے ساتھ قدرت نے اسکو حسن سیرت بھی فیاضی سے عطا کیا تھا۔ ان تمام باتوں کے باوجود اوس کے رنگین شباب میں عشق کی رنگینیوں کے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔ وہ صرف محبت کئے جانے کے لئے پیدا ہوئی تھی، محبت کرنے یا محبت کا جواب دینے کے لئے نہیں۔ بہت سے اہل نظر کا خیال تھا کہ فطرت نے مرمریں جسم کے ساتھ اسکے پہلو میں بھی کوئی سنگ مرمر کا ٹکڑا رکھ دیا ہے جو احساسات و جذبات سے مطلق ناآشنا ہے۔ بارہا ایسا ہوا کہ اس کی آنکھوں نے آہوں کے دھوئیں اور نالوں کے شرارے اٹھتے دیکھے، مگر کمال بے نیازی سے ایک غلط انداز نظر یا ایک ہمت شکن تبسم سے سب کا جواب دے دیا اور بس۔ نوشابہ اسوقت تک زندگی کی اٹھارہ بہاریں دیکھ چکی تھی اور یہ وہ زمانہ تھا کہ کیف شباب نے اس کے جمال کی

شراب کو دو آتشہ بنا دیا تھا۔ لیکن ابتک اس کے لمحات حیات ایک رفیق زندگی کی معیت سے محروم (یا یہ کہیے کہ محفوظ) تھے،
اس بارے میں اسکا اصول دنیا سے نرالا اور اسکا فلسفہ دنیا سے انوکھا تھا۔ اسکو اپنے گنجینۂ حسن کی گرانمایگی کا احساس تھا
یہ سب درست! اسکو اپنے عہد شباب کی فتنہ زائیوں پر ناز تھا یہ بالکل بجا۔ لیکن یہ کہاں کی دانائی تھی کہ وہ تعلقات اہلی سے ہمیشہ
مجتنب رہنے کے متعلق دیدہ و دانستہ ایک قطعی فیصلہ کر چکی تھی۔ اسکا خیال تھا کہ محبت کے نام سے دنیا نے ہزاروں سادہ دلوں کو
فریب دیکر مبتلائے مصیبت کیا ہے اور اس لئے اس نے طے کر لیا تھا کہ وہ ان "فریب خوردگان" میں شامل ہو کر نادانوں کی
فہرست میں اضافہ نہ کریگی۔ اسکا یقین تھا کہ عشق خود غرضی کا شاعرانہ نام ہے اور اگر بالفرض عشق کوئی صادق اور مقدس جذبہ ہے
تو رشتۂ ازدواج اسکی سب سے بڑی توہین ہے جو اس جذبہ کی روحانیت کو مادیت سے۔ اسکی تقدس کو دنائت سے اور اسکی شعریت
کو بدذوقی سے بدل دیتا ہے۔ اسکا عقیدہ تھا کہ مرد اور ایثار کا ایک جگہ پایا جانا اجتماع ضدین سے عبارت ہے اور مرد صرف اسلئے خلق
ہوا ہے کہ جنس نازک کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھائے اور اسکو اپنی ہوس رانیوں کی قربانگاہ پر بھینٹ چڑھائے۔ جسقدر عمر کے ساتھ ساتھ
یہ خیالات اسکی طبیعت میں راسخ ہوتے گئے اسی قدر جنس قوی سے اسکو نفرت ہوتی گئی۔ فرامرزجی کو نوشابہ کی دلشکنی کسی طرح گوارا نہ تھی،
اسواسطے وہ بھی اسکے فیصلہ میں مداخلت پسند نہ کرتا تھا۔

(۳)

کئی روز کی شدید بارش اور غلیظ ابر کے تسلط کے بعد آج سردی میں کمی ہوئی ہے اور آفتاب عالمتاب پوری شان کیساتھ
بمبئی کے افق پر جلوہ گر ہے۔ شام کے ۴ بجے ہیں۔ سورج کی سنہری کرنیں منتشر بادل کے ٹکڑوں پر گنگا جمنی بہار دکھا رہی ہیں چوپاٹی
کا دلکشا منظر آج کئی دن کے بعد پھر اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ جنت نگاہ بنا ہوا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عروس البلاد (بمبئی)
کی تمام بہار آج ہی ابل پڑی ہے۔ کافر ماجرا حسینوں اور موزوں ادا نوجوانوں کی ٹولیاں ادھر ادھر گلگشت میں مصروف ہیں۔ نوشابہ
اپنی سہیلی اور ہم جماعت شاما کے ہمراہ بے پرواخرامی کی شان کے ساتھ پھولوں کے تختے میں سے گذر رہی ہے اور موسم کے فوری
تغیرات پر گفتگو کر رہی ہے۔ اتنے میں دفعتہً جمیل جو سیر و سیاحت کی غرض سے وہاں نووارد تھا، دوسری طرف سے گذرنے کے لئے
بڑھا۔ جمیل ایک شریف نوجوان اور اودھ کے ایک معزز خاندان کا رکن تھا۔ جو حال میں ولایت سے صنعت و حرفت کی اعلیٰ
ڈگری لیکر آیا تھا اور اب بمبئی میں چند روز حرفتی زندگی کا مطالعہ کرکے اور مختلف کارخانوں سے گفت و شنید کرکے اپنے فن کی تکمیل
کرنا چاہتا تھا۔ وہ مردانہ حسن کا کامل ترین نمونہ تھا اور خندہ پیشانی اور شگفتہ روئی کی دلاویز تصویر۔ جمیل اس ہوشربا منظر کو دیکھکر
ہکا بکا سا رہ گیا۔ نوشابہ کی کافر شبابیوں نے اس کے دل پر کیا اثر کیا یہ تو وہ جانے یا خدا جانے البتہ اتنا سب نے دیکھا کہ اگر وہ
قریب کی بنچ کا سہارا نہ لیتا تو یقیناً اسکا سر نوشابہ کے قدموں پر ہوتا۔ نوشابہ ناسمجھ نہ تھی کہ اپنے جادو کی تاثیر سے ناواقف
ہوتی مگر اس کے تغافل شعار دل نے کرم یا ستم کا سبق ہی نہ پڑھا تھا۔ اس نے اس تمام ہنگامہ کو ایک نگاہ غلط انداز
سے دیکھا اور آگے بڑھ گئی۔ راستہ بھر شاما اس سانحہ کا تذکرہ کرتی اور جی کھولکر غریب کو بناتی رہی۔ جمیل پر اس کے بعد کیا گذری

معلوم نہیں۔ ظاہر ہے کہ کیوپڈ کے تیر خالی جانے کے لئے کمان سے نہیں نکلا کرتے۔

(۴)

بمبئی میں سرمایہ داروں اور مزدوروں کی کشمکش چند روز سے جاری ہے۔ سرمایہ دار چاہتے ہیں کہ اپنی پوری حریصانہ سرگرمیوں کے ساتھ مزدور کا خون چوستے رہیں۔ مزدوروں کا عزم ہے کہ حقوق طلبی کی دوڑ میں کسی طرح ایک قدم پیچھے نہ رہیں۔ آخر تعلقات ناگوار اور تلخ صورت اختیار کر لیتے ہیں اور ہڑتال شروع ہو جاتی ہے۔ مالکان کارخانہ کو اپنے تحفظ کی غرض سے پٹھانوں کی خدمات مستعار لینی پڑتی ہے اور اس منافست کی بنا پر مزدوروں کو پٹھانوں سے کدورت پیدا ہوتی ہے اور کئی بے گناہ پٹھان انکے بڑھتے ہوئے غیظ و غضب کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اسی اثنا میں یہ بے بنیاد خبر شہر میں مشہور ہوتی ہے کہ پٹھان ہندوؤں کے بچے پکڑ کر لیجاتے اور کسی دیوی پر بھینٹ چڑھا دیتے ہیں۔ اس افواہ کے شہرت پاتے ہی پٹھانوں پر جا بجا حملے شروع ہو جاتے ہیں، اور ان میں سے کئی موت کے گھاٹ اتار دیے جاتے ہیں۔ آخر پٹھان بھی اپنے کو مدافعت پر مجبور پاتے ہیں اور رفتہ رفتہ یہ آویزش ہندو مسلمانوں کی وسیع جنگ کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ تقریباً ایکہفتہ تک بمبئی میں کشت و خون کا بازار گرم رہتا ہے اور انسانوں کا لہو پانی کی طرح بہایا جاتا ہے۔ اس قسم کے واقعات غلام آباد ہند میں نادر نہیں۔ اسی ہنگامہ کی ابتدا میں نوشابہ اور شاما اپنے کالج کو جاتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ انکو پورے طور پر معاملہ کی نزاکت کا احساس نہ تھا اس لئے غیر معمولی احتیاط و حفاظت کی ضرورت نہ سمجھی۔ کالبا دیوی روڈ پر پہونچتے ہی اونکو سامنے سے پٹھانوں کا ایک مشتعل مجمع آتا ہوا نظر آیا۔ اسی روز یہ افواہ مشہور ہوئی تھی کہ ہندوؤں نے ایک مسلمان مقتول کے جنازہ پر حملہ کیا اور کئی مسلمانوں کو ہلاک کر دیا۔ اس وجہ سے مجمع بے قابو معلوم ہوتا تھا۔ بھیڑ کو آتے دیکھکر دونوں لڑکیاں دہشت زدہ ہو کر کنارے ہٹ گئیں۔ مگر جب ان لوگوں کے تیور بگڑے دیکھے تو پیچھے بھاگنے پر ہوئیں۔ مجمع میں سے چند گم کردہ راہ افراد ان بے بس لڑکیوں کی طرف جھپٹے اور دوڑ کر پکڑ لیا۔ نوشابہ اور شاما نے ناموس و جان کو خطرہ میں پاکر اپنا زیور اتار کر پیش کیا کہ انکو بخیریت گذر جانے دیا جائے۔ مگر حملہ آور جوش انتقام میں اندھے ہو رہے تھے اسوقت دونوں نے کمال بیکسی کے ساتھ ادھر ادھر دیکھا مگر ناخدا ترسوں میں کوئی ایسا نظر نہ آیا جو انکی مدد کرتا۔ حسن جب مجبور اور بے بس ہو تو اور بھی زیادہ قابل احترام ہو جاتا ہے مگر وہ بے بصیرت اس نکتہ کو کیا خاک سمجھتے۔

(۵)

خدا کا کرنا عین موقع پر ایک منچلا نوجوان آنکلا۔ اس نے یہ الم آفریں منظر دیکھکر تہیہ کر لیا کہ ان بیکس لڑکیوں کو بزدل بلوائیوں کی گرفت سے بچائے اور بلا امتیاز قوم و مذہب انسانیت کے نام پر ان مظلوموں کی حمایت کرے۔ یہ نوجوان **جمیل تھا**۔ اس نے ان غول الارض عنا کو حملہ آور درندوں سے چھڑا کر الگ کر دیا اور خود سینہ سپر ہو گیا۔ اس کشمکش میں جونہی اس نے دیکھا کہ امیں ایک اس کے دل کی مالک نوشابہ بھی ہے تو اسکی جرأت دہ چند ہو گئی۔ ابتک وہ انسانیت کبریٰ کی پاسداری کے لئے اپنے آپکو خطرہ میں ڈال رہا تھا۔ مگر اب محبت اس سے کہیں زیادہ قربانی کی متقاضی تھی۔ نوشابہ اور شاما کے دل اس فرشتہ غیب کی امداد پر جذبہ تشکر سے لبریز تھے، جسکی ترجمانی انکی محبت بھری

نگاہوں سے ہو رہی تھی۔ ادھر جمیل اپنے قلب میں وہی مسرت محسوس کر رہا تھا جو کسی بڑے فاتح ہی کو نصیب ہو سکتی ہے۔ اس کے لئے یہ خوشی ہفت اقلیم کی حکومت سے کم نہ تھی کہ نوشابہ اسکی جانبازی کو نگاہ وقعت سے دیکھ رہی ہے۔ بلکہ اسی کی دلیری کی بدولت ان سفاکوں کے پنجۂ ستم سے رہا ہوئی ہے۔ نوشابہ اور اسکی سہیلی نے ایک متجسسانہ انداز سے جمیل کیطرف دیکھا جسکا مطلب یہ تھا کہ وہ اپنے محسن کا نام و نشان پوچھنا چاہتی تھیں۔ مگر یہ پرسش جسکی نسبت غالب نے کیا خوب کہا ہے "پرسش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں" دل سے زبان تک نہ آنے پائی تھی اور جمیل نے ابھی جواب کے لئے لب نہ کھولے تھے کہ ایک حملہ آور نے بھوکے شیر کیطرح جس سے شکار چھین لیا گیا ہو جھنجلا کر بیچارے کے سر پر لاٹھی کا وار کیا۔ خوش قسمتی سے اسکا سر بچ گیا اور اس مرتبہ اس نے اپنی چھڑی گھما کر جو ماری تو حریف چکر کھا کر گر پڑا۔ اتنے میں اس کے دوسرے ساتھی ٹوٹ پڑے اور چند منٹ میں جمیل کو لاٹھیوں سے بیدم کر دیا۔ دونوں آفت رسیدہ لڑکیاں خدا سے اپنے محسن کی سلامتی کے لئے دست بدعا تھیں مگر جب جمیل زخموں سے چور ہو کر گرا تو انکی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا اور انکو دوبارہ اپنی جان و عزت خطرہ میں نظر آئی۔ اس دفعہ پھر ان لوگوں نے ان مظلوموں پر حملہ کرنے کا قصد کیا کہ عین اوس وقت پولیس کی امداد موقعہ پر پہونچ گئی۔ مجمع کو آمادہ فساد دیکھ کر پولیس کو قوت استعمال کرنا پڑی اور چند منٹ میں مطلع بالکل صاف تھا!

(۶)

جمیل نے جب ہاسپٹل میں دو روز کی مسلسل بیہوشی کے بعد جب آنکھ کھولی تو نوشابہ کو اپنے بالیں پر تیمارداری میں مشغول پایا۔ زخموں کی کثرت اور نقاہت کی شدت سے بولنے کی طاقت نہ تھی ورنہ شاید وہ "شاعر" کی زبان میں بے ساختہ اپنے "اقبال زنجوری" کی مدح سرائی شروع کر دیتا۔ مگر جو کچھ زبان نہ کہہ سکے آنکھوں نے کہدیا۔ اوس نے بولنے کی کوشش بھی کی مگر نوشابہ نے اشارہ سے منع کر دیا۔ واقعہ یہ ہوا کہ پولیس جمیل کو مردہ سمجھکر بیہوشی کی حالت میں کارونر کے معائنہ کے لئے لے گئی۔ وہاں جاکر معلوم ہوا کہ ابھی زندگی کی رمق باقی ہے۔ چنانچہ اسکو بہترین طبی نگرانی کی غرض سے ہسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ اس تمام وقت میں نوشابہ نے اسکو تنہا چھوڑنا گوارا نہ کیا اور پولیس اور ڈاکٹر کی اجازت سے خود بھی نرس کے ساتھ اسکی پرداخت کے لئے وہیں ٹھیری رہی۔ اس اثنا میں شاما نے سارا قصہ فرامرزجی سے جاکر کہا وہ فوراً ہسپتال دوڑا ہوا آیا اور اپنی نورِ نظر کو بخیر و عافیت پاکر خدا کا شکریہ ادا کیا۔ نوشابہ نے اسکو سمجھا دیا کہ اسکی سلامتی اس زخمی نوجوان کی سرفروشی کا نتیجہ ہے۔ چنانچہ اُسنے نوشابہ کو وہاں رہنے اور جمیل کی دیکھ بھال کرنے کی اجازت دیدی۔ خود وہ اور شاما دن میں کئی بار آکر دونوں کو دیکھ جاتے تھے۔

(۷)

دسویں روز جمیل اس قابل ہوا کہ بات کر سکے یا تکیہ کے سہارے بیٹھ سکے۔ اگرچہ اسوقت تک اسکی زندگی صحت و عدم صحت کے احتمالات کی کشاکش میں پھنسی ہوئی تھی۔ وہ اپنے زخموں کی اذیت اور ضعف کا اثر سب بھولے ہوئے تھا۔ اگر یاد تھا تو صرف یہ کہ اسکی یہ قربانی اوسکے کشورِ روح کی فرمانروا نوشابہ کی کشش کا ذریعہ ہوئی۔ اس اعتبار سے وہ اپنے زخمی ہونیکو فال نیک

تصور کرتا تھا اور قسمت پر نازاں تھا۔ جب وہ اپنی زندگی کی گذشتہ ساعات پر نظر ڈالتا تھا تو معاً اسکا دل اس نتیجہ پر پہونچتا تھا کہ حیات کے ان بیش بہا اور عزیز لمحات کو چھوڑ کر جب اس نے نوشابہ کو اپنے بالیں پر مصروف پرستاری پایا (اگر ایک ملکۂ حسن کے لئے پرستار کا لفظ استعمال کرنا محبت کے آئین میں جائز ہے) وہ اپنی تمام متاعِ عمر رائگاں کر دینے کو آمادہ ہے۔ غرض ایک محشر خیال تھا جو اس کے دماغ کو جولانگاہ بنائے ہوئے تھا۔ دوسری طرف نوشابہ۔ وہی نوشابہ جو عشق کو جنون اور محبت کو ہوس کہا کرتی تھی اپنے قلب کے ہر ہر گوشہ میں جمیل کی محبت پاتی تھی۔ وہ اس کے مردانہ حسن سے زیادہ اس کے جوانمردانہ ایثار کی گرویدہ ہوگئی تھی۔ اب اسکا وہ قدیم عقیدہ کہ "تمام مردوں کی قوم بے وفا اور مطلب پرست ہوتی ہے" شریعت منسوخ بن چکا تھا۔ لطف یہ کہ ان تمام باتوں کے باوجود ایک دوسرے کے حالات مطلق ناآشنا تھے۔ آج جمیل ذرا اٹھ کر بیٹھا اور تہیّہ کیا کہ اس راز سے پردہ اٹھادے۔ نوشابہ قریب ہی آرام کرسی پر بیٹھی ہوئی کوئی کتاب دیکھ رہی تھی مگر خدا ہی علیم ہے کہ اتنی دیر میں اس نے کتاب پر زیادہ نگاہیں ڈالیں یا جمیل کے چہرے پر۔ آخر جمیل نے ہمت کر کے اسکی اجازت سے سلسلہ کلام آغاز کیا۔ ایک نے دوسرے کے دل کی کتاب پڑھی اور نام و نشان سے آگاہی حاصل کی۔ اسی دوران میں گذشتہ بلوے کا ذکر کرتے ہوئے نوشابہ نے جمیل کے زخمی ہو کر گرنے۔ بروقت پولیس کی امداد پہونچ جانے اور شفاخانہ میں داخل ہونے کی روداد سنائی اور روداد سنانے میں بے اختیار اس کے عارضِ گلرنگ پر شبنم کی طرح آنسو بہنے لگے۔ جمیل جری اور دلیر تھا اور شاید بڑے سے بڑے زہرہ گداز منظر کے دیکھنے کی تاب لاسکتا تھا۔ مگر یہ بے پناہ نظارہ اس کے بس کا نہ تھا۔ وہ یہ کہتا ہوا کہ "نوشابہ! یہ آنکھیں بجلیاں گرانے کے لئے بنی ہیں، مینھ برسانے کیلئے نہیں" اپنی طاقت سے زیادہ حوصلہ کرتا ہوا اٹھا، تاکہ رومال سے اس کے اشکوں کو پاک کرے۔ مگر جذبات کے جوش اور ضعف کے اشتداد سے دفعتہً غش کھا کر گر پڑا۔

(۸)

پندرہ منٹ کے بعد جب اس کو ہوش آیا تو اُسنے دیکھا کہ نوشابہ کی بانہیں اسکی گردن میں حائل ہوچکی تھیں اور یہ غرورِ حسن کی پہلی شکست تھی جو فاتح نوشابہ کو اٹھانا پڑی۔

تھوڑی دیر میں ڈاکٹر نے آکر دیکھا تو تجویز کیا کہ زخموں کے انگور ابھی بندھے نہ تھے اس لئے ان کے کھلجانے کی اذیت اور ضعف کی شدت کی وجہ سے غش آگیا ہوگا۔ اور جمیل کو حرکت سے احتیاط کی تاکید اور کمپونڈر کو ڈریسنگ کی ہدایت کر کے چلا گیا۔ زخم رفتہ رفتہ مندمل ہوتے گئے اور قوت عود کرتی گئی۔ اس واقعہ کے چند روز بعد سب نے سن لیا کہ مس نوشابہ فرامرزجی کی شادی قانون ازدواج بین الاقوامی کی رو سے مسٹر جمیل کے ساتھ ہوگئی۔ اب جب کبھی شاما مزاحاً جو پارٹی کے پر لطف واقعہ کا تذکرہ چھیڑ دیتی ہے تو مسٹر اور مسز جمیل ایک معنی خیز تبسّم کے ساتھ جھینپ کر رہ جاتے ہیں۔

ضیا احمد ایم اے

شمالی ہند اور دکن

(بہ سلسلۂ ماسبق)

الغرض سنہ ۱۰۴۵ہی میں اس جنگ عظیم کا خاتمہ ہوگیا، جو سنہ ۱۰۰۵ہی میں شروع ہوئی تھی، شاہجہاں ہی کے تدبر و جنگی قابلیت کا نتیجہ تھا کہ مغلیہ اقتدار اعلیٰ جنوبی ہند کا ریاستوں پر قایم ہوگیا، اور دوستانہ تعلقات قایم ہوگئے، حدود متعین ہوگئے اور دیرپا صلح مکمل ہوگئی، جسوقت شاہجہاں تخت نشین ہوا تھا اسوقت دکنی مقبوضات معرض خطر میں تھے، اور بیحد بدامنی پھیلی ہوئی تھی، دولت آباد نظام شاہی سلطنت کے زیر اقتدار تھا، بالاگھاٹ کا علاقہ بھی ہاتھ سے جاچکا تھا، عادل شاہی مملک جنگ آزمائی کے لئے تیار تھی، لیکن شاہجہاں نے مسلسل جنگ کو اختتام کو پہونچانے کے بعد دکن کے بڑے علاقہ پر قبضہ کرلیا، نظام الملکی سلطنت صفحۂ دنیا سے ہمیشہ کے لئے نیست و نابود ہوگئی اور حسب ذیل دکن کے صوبے زیر اقتدار ہوگئے (۱) صوبہ دولت آباد معہ علاقہ احمدنگر وغیرہ (۲) صوبہ تلنگانہ معہ بالاگھاٹ (۳) صوبہ خاندیس (۴) اور صوبہ برار، شاہ گولکنڈہ کی حیثیت ایک طرح سے محکوم کی سی ہوگئی تھی، اور شاہ بیجاپور سلطنت مغلیہ کا حلیف ہوچکا تھا، اب دکن کا مکمل اور مستقل انتظام کرنے کے بعد شاہجہاں پایۂ تخت کی طرف روانہ ہوا اور شاہزادہ اورنگ زیب کو صوبیدار مقرر کیا۔

ان چار صوبوں میں کل (۶۴) قلعے تھے اور مجموعی محاصل پانچ کروڑ روپیہ تھا جس سے اورنگ زیب کو انتظامی امور کے کل اخراجات کا انتظام کرنا تھا، تمام جاگیرداروں (Mahsaldars/?) کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ فوراً معہ اپنی سپاہ کے شہزادہ کی خدمت میں حاضر ہوں اس لئے کہ ابھی دس قلعوں کو فتح کرنا باقی تھا۔

شاہجہاں نے اپنی روانگی سے پیشتر دو سپہ سالاروں کو نامزد کرکے مہم دکن کی سرکوبی کے لئے روانہ کیا تھا، ایک کو اودگیر اور اوسا کی طرف اور دوسرے کو جنیر کی تسخیر اور شاہ جی کی گرفتاری کے لئے، خان دوراں معہ لشکر کے ۱۹ جون سنہ ۱۶۳۶ء کو اودگیر پہونچا اور گاؤں پر قبضہ کرلیا، اور قلعہ کی جانب جنوب مغرب، اور جنوب مغرب خندقیں کھودی گئیں، اور مغربی جانب سرنگ لگائی گئی جب قلعہ کی دیوار تک سرنگ پہونچ گئی تو محصورین بالکل پست ہمت ہوگئے، انکے حبشی سردار مفتاح نے صلح کی گفت و شنید کا سلسلہ جاری کیا لیکن اس نے قلعہ حاصل کرنے کے عوض کثیر رقم طلب کی، چنانچہ حصار کرنیوالوں نے مزید سختی شروع کی، اور سرنگ اڑائی گئی جس سے باہر کی دیوار کو جو شیر حاجی کہلاتی تھی اور جو ایک سو گز لمبی تھی معہ بندوقوں، سامان اور دیگر اسلحۂ جنگی کے اڑادی گئی، لیکن چونکہ فصیل کو کوئی نقصان نہ پہونچا تھا اسلئے ابھی حملہ کی نوبت نہیں آئی، بالآخر ۲۸ ستمبر کو تین ماہ سے زیادہ عرصہ کی مدافعت کے بعد قلعہ پر قبضہ ہوگیا، مفتاح نے مغلیہ ملازمت قبول کرلی اسے حبش خاں کا خطاب عطا ہوا، اور تین ہزاری کا درجہ بھی۔

اوسی دوران میں اوسا پر حملہ کیا گیا تھا، اور ایک حصۂ فوج رشید خاں کی سرکردگی میں محاصرہ کے لئے روانہ کیگئی تھی، اودگیر کی فتح بہت بڑی فوجی امداد ملی، چنانچہ حملہ کرنے والوں کو بیحد تقویت حاصل ہوئی، اور اس کے ساتھ محصورین نے بھی

زیادہ جوش اور مستعدی سے آمادگی ظاہر کی، راجپوتانہ سردار بھوجپال نے نہایت جوانمردی سے مقابلہ کو جاری رکھا، لیکن جب خندق کھودتے کھودتے کھائی کے کنارہ تک مخالفین پہونچے اور سرنگ اڑانا شروع کر دیا تو بھوجپال نے ہمت ہار دی اور قلعہ حوالہ کر دیا اسے مغلیہ ملازمت میں داخل کر لیا گیا اور ایک ہزاری منصب عطا ہوا

خان زماں کا لشکر بھی ضلع جنیر اور علاقہ کونکن میں بہت کامیاب رہا[۵۱] حسب شرائط صلحنامہ جدید بیجاپوری فوج امداد کے لئے رندولہ خاں کی سرکردگی میں روانہ کی گئی، جون کے مہینہ میں احمد نگر سے جنیر کی طرف روانہ ہوا، شہر پر تو قبضہ ہو چکا تھا لیکن ابھی قلعہ مرہٹوں کے قبضہ میں تھا، سپہ سالار دو ہزار سپاہیوں کو اسکی تسخیر کے لئے مقرر کر کے شاہ جی کے وطن پونا کی فتح کے لئے روانہ ہوا، شدید بارش کی وجہ سے اسکو دریائے گھود کے کنارہ ایک ماہ تک رکا رہنا پڑا، بالآخر جب وہ لاہ گاؤں پہونچے جو دریائے اندرایانی پر واقع ہے تو مرہٹہ سردار وہاں سے جانب جنوب کونڈھانہ اور تورنا کی پہاڑیوں کی طرف فرار ہو چکا تھا۔ مغل فوراً اس کے تعاقب میں روانہ نہو سکے اس لئے کہ انکو بڑی ندیوں کو عبور کر کے جانا پڑتا تھا، مزید برآں وہ اس بات کے منتظر تھے کہ آیا رندولہ خاں شاہ جی کو بہ آسانی قلعے حوالہ کرنے پر آمادہ کرتا ہے یا نہیں۔ شاہ جی پہلے کونکن کیطرف بھاگا وہاں سے قلعہ ماہولی کی طرف خان زماں نے اسکا تعاقب کیا، گو شاہ جی جان بچا کر بھاگ گیا، لیکن اسکی پالکی، ساز و سامان اور اسکا خود ساختہ بادشاہ نظام شاہ گرفتار ہو گیا بالآخر مجبور ہو کر شاہ جی نے ہار مان لی، دربار بیجاپور کی ملازمت قبول کر لی اور نام و نمود کے بادشاہ کو، اور دیگر چھ قلعوں کو مغلوں کے حوالہ کر دیا، اکتوبر تک اس مہم کا خاتمہ ہو گیا، خان زماں دولت آباد واپس آیا جہاں اسے شہزادہ اورنگ زیب کے مشیر خاص کی حیثیت سے کام انجام دینا تھا[۵۲] خان دوراں نے اودگیر و اوسہ کی فتح کے بعد بادشاہ گولکنڈہ سے ایک مشہور ہاتھی "گجپاتی" جسکی قیمت ایک لاکھ روپیہ تھی اور ایک لاکھ روپیہ اسکے ہودہ کی وغیرہ کے لئے حاصل کئے تاکہ شہنشاہ کی خدمت میں پیش کرنیکے قابل ہو سکے، اسکے بعد وہ علاقہ گونڈ میں جو کہ وردھا اور وین گنگا کے درمیان واقع تھا داخل ہوا، بالآخر کو کیا گونڈ راجہ امان کا طالب ہوا، $\frac{1}{2}$ لاکھ روپیہ نقد اور تمام ہاتھی بطور پیشکش دیدیے، اور سالانہ $\frac{1}{2}$ لاکھ روپیہ بطور خراج دینے کا وعدہ کیا، فتحیاب و کامیاب خان دوراں گونڈ سرداروں وغیرہ سے آٹھ لاکھ روپیہ حاصل کر کے شہنشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا، اسکی کارگذاریوں سے خوش ہو کر شاہجہاں نے "نصرت جنگ" کا خطاب عطا کر کے دیگر سپہ سالاروں میں امتیاز بخشا۔

زمانہ جنگ جسکی ابتدا ۱۶۳۵ء میں مہم بندھیلہ سے ہوئی تھی اس کا اب خاتمہ ہوا، مغلیہ خزانہ میں خراج اور مال غنیمت سے دو کروڑ روپیہ کا اضافہ ہوا، اور مغلیہ حکومت میں ایسا علاقہ شامل ہوا جسکی اگر باضابطہ کاشت کیجائے تو ایک کروڑ سالانہ محاصل ہو، اورنگزیب بھی اس زمانہ میں بالکل خاموش اور بیکار نہیں رہا، چونکہ بیجاپور اور گولکنڈہ سے جدید صلحنامہ کے مرتب ہونے سے اور علاقہ گونڈ کے فتح ہو جانے سے وہ اب جنوب اور شمال مشرق کی طرف جنگی کارروائی نہیں کر سکتا تھا اس لئے شہنشاہ نے اسے اجازت دی کہ وہ علاقہ کے شمال مغربی حصہ کو بگلانہ کی فتح سے وسیع کرے، بالآخر ۱۶۳۸ء میں یہ علاقہ فتح ہو گیا۔

---

[۵۱] بادشاہ نامہ جلد اول حصہ دوم صفحہ ۲۲۵ تا صفحہ ۲۳۰　[۵۲] بادشاہ نامہ جلد اول حصہ دوم صفحہ ۲۳۰ تا صفحہ ۲۳۲

الغرض اورنگ زیب ۱۶۳۶ء سے ۱۶۴۴ء تک دکن کا صوبہ دار رہا، صوبہ داری سے علٰحدگی کے متعلق مختلف رائیں ہیں، عبد الحمید لاہوری لکھتا ہے کہ "ناعاقبت اندیش مصاحبوں کے مشورہ نے دنیا کو ترک کر کے گوشہ نشین ہونا پسند کیا اور علاوہ ازیں بعض ایسے حرکات سرزد ہوئے جن سے شہنشاہ ناراض ہوا[۱]" خانی خاں لکھتا ہے کہ "شہزادہ نے اپنے باپ کے اعمال بد کی سزا کے خوف سے زاویہ نشینی کی حیثیت سے چند دن بسر کئے[۲]" لیکن آداب عالمگیری میں لکھا ہے کہ "میں نے اسلئے اس عہدہ سے استعفا دیا اور زاویہ نشینی اختیار کی کہ میں کسی کے دل کو رنج پہونچانے کا باعث نہ ہوں، اور اس لذت آزار سے پناہ میں رہوں"[۳]۔

۱۶۵۲ء میں اورنگ زیب دوبارہ دکن کا صوبہ دار مقرر کیا گیا، اسوقت دکن کی حالت نہایت ناگفتہ بہ تھی، یہ سچ ہے کہ تقریباً نصف صدی کی جنگ وجدال کے بعد دکن میں امن وامان قایم ہو گیا تھا، اور اسمیں بھی کوئی شک نہیں کہ امن عامہ میں سرحد کی طرف سے حملہ ہو کر کوئی خلل واقع نہوا، لیکن باوجود اس کے ملک کی سرسبزی و مرفہ الحالی میں بجائے ترقی کے تنزل ہوتا گیا، بہت سی قابل کاشت زمین بیکار پڑی رہی اور کاشتکاروں کی تعداد اور ان کے ذرایع میں بہت کمی واقع ہو چکی تھی، جسکی وجہ سے محاصل کی رقم بھی بہت گھٹ گئی، اسکی اصلی وجہ نااہل صوبہ دار اور انکا تقرر اور جلد جلد انکا تغیر و تبدل خیال کیجا سکتی ہے، ۱۶۴۴ء سے جبکہ اورنگزیب گجرات پر مامور کیا گیا تھا ۱۶۵۲ء تک چھ صوبیدار مقرر کئے گئے اور سوائے شائستہ خاں کے کسی صوبہ دار نے ایک سال سے زیادہ عرصہ تک اس عہدہ کے فرایض انجام نہیں دیئے، دکن کی زمین شمالی ہند کیطرح زرخیز نہ تھی، اور اسپر بارش کی قلت، قحط سالی، اور فصل کی خرابی نے اس مقررہ محاصل کے وصول کرنیکا موقعہ نہ دیا، چونکہ صوبہ دکن کا رقبہ وسیع تھا جنگل زیادہ تھا اور پوری طور پر باضابطہ انتظام قایم نہیں کیا گیا تھا، اور مزید برآں اسکی سرحد پر بیجاپور اور گولکنڈہ کی دو سلطنتیں موجود تھیں سواسطے ضرورت تھی کہ فوج بڑی تعداد میں رکھی جائے، چنانچہ اخراجات کی زیادتی کے باوجود آمدنی برابر کم ہوتی گئی، علاقہ دکن کے چار صوبوں سے ۳ کروڑ ۶۲ لاکھ روپئے سالانہ وصول ہونا چاہئے تھے، لیکن فی الواقع رقم کم وصول ہو رہی تھی، چنانچہ ۱۶۵۲ء میں کل ایک کروڑ روپیہ کی رقم وصول ہوئی اور اسلئے اخراجات کے پورا کرنے کیلئے گجرات اور مالوہ کے محاصل سے مدد لی جاتی تھی یا دولت آباد کی مد محفوظ سے اس کمی کو پورا کیا جاتا تھا، شاہجہاں اس قسم کی ناگفتہ بہ مالی حالت کی خبر سنکر بہت مضطرب ہوا، اور اورنگزیب کو تاکید کی وہ کاشتکاروں کی فلاح و بہبود کیطرح کوشش کرے، قابل زراعت رقبہ کو وسیع کرے اور ہر سال شہنشاہی خزانہ پر جو بار پڑ رہا ہے اس سے نجات دلائے[۴]۔

الغرض اورنگ زیب جب دکن میں آیا تو اسکو نہایت دشوار مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، ہر سال محاصل میں کمی کی وجہ سے ۲۰ لاکھ کا نقصان ہو رہا تھا، جسکی تلافی ایک حد تک دولت آباد کے مد محفوظ سے کیگئی، چنانچہ مد محفوظ دو سال کے دوران میں اسی لاکھ ساٹھ ہزار سے چالیس لاکھ پچاس ہزار رہ گیا[۵]، مد محفوظ کم ہو جانا بھی نہایت خطرناک تھا، خاصکر ایسی حالت میں جبکہ ایسے دور دراز مقام

[۱] بادشاہ نامہ جلد اول حصہ دوم صفحہ ۳۷۳ و ۳۷۶ [۲] منتخب اللباب جلد اول صفحہ ۶۰۰ و جلد دوم صفحہ ۳۹۸ [۳] آداب عالمگیری ورق ۱۷۷ الف
[۴] آداب عالمگیری ورق ۱۳۱ الف [۵] تاریخ اورنگ "جادوناتھ سرکار" صفحہ ۱۸۳

میں فوری خطرات کا آئے دن پیدا ہو جانا بعید از قیاس نہ تھا۔ آداب عالمگیری کے دیکھنے سے بخوبی اسکا اندازہ ہو سکتا ہے کہ اورنگ زیب کو کیسی کیسی سخت مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، اور صوبہ کے نظم و نسق کے درست کرنے اور اسکی مالی حالت کو قابل اطمینان کرنے میں کن کن تدابیر سے کام لینا پڑا اور کیسے کیسے ذرایع سوچنا پڑے۔

اس کشمکش سے نجات پانے کے لئے اس نے شاہجہاں سے درخواست کی کہ جاگیرداروں کی جاگیر جسکا مجموعی محاصل ۱۷ لاکھ ہو مغلیہ محکمہ مالگزاری کے ماتحت کر دیا جائے تاکہ کمی پوری ہو جائے لیکن اس سے مزید مشکلات اور پیچیدگیوں کے پیدا ہونیکا خوف تھا اس لئے اس نے اس کے بعد یہ درخواست کی کہ اسکو اور اسکے اعلیٰ عہدہ داروں کو زرخیز جاگیرات، دوسرے صوبوں میں دیجائیں اور تنخواہ کی وہ رقم جو نقد کی صورت میں دی جاتی ہے مالوہ و گجرات کے محاصل سے دیجائے، لیکن شاہجہاں نے اسکی درخواست رد کر دی اور لکھا کہ وہ دکن ہی کے زرخیز جاگیرات سے مبادلہ کرلے۔ غرض یہ کہ باپ اور بیٹے کے درمیان مالی معاملات کی نسبت برابر کشمکش جاری رہی، شاہجہاں بےچین تھا کہ دکن کی حالت بہت جلد سدھر جائے، زراعت و حرفت میں ترقی ہو، لیکن اورنگ کی یہ خواہش بھی بجا تھی کہ اسکو طویل موقعہ دیا جائے، اور جب شاہجہاں یہ دھمکی دیتا تھا کہ اگر زرعت میں ترقی نہوئی تو اسکی تنخواہ بند کر دی جائے گی تو اورنگ زیب کا یہ عذر کرنا بالکل صحیح و درست تھا کہ عرصہ دراز کی جنگ و جدال کی تباہی اور دس سال کی بدانتظامی کی اصلاح دو سال میں ہونا غیر ممکن ہے۔

اورنگ زیب نے اس بات کا وعدہ کیا کہ وہ حتی الامکان لوگوں کی خوشحالی اور زمین کی زرخیزی کیطرف کوشش کریگا۔ لیکن اس کی شرط یہی تھی کہ اسے کافی مدت دی جائے، اور ان اغراض کی تکمیل کے لئے روپیہ دیا جائے لیکن بار بار شہنشاہ کی طرف سے تنبیہ کی جاتی تھی کہ وہ کاشت اور آبادی کی طرف فوراً توجہ کرے، اور اسکا دور صوبہ داری بالکل ناکام رہا، لیکن اگر ہم ذرا غور سے مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ باوجود ان تمام مشکلات کے اس بیدار مغز اور قابل حاکم نے بہت جلد دکن کی حالت سدھار دی، اور فوراً اصلاح اور تغیر و تبدل میں مشغول ہوا، اور تین ہی سال کے اندر محاصل کی تعداد دوچند ہو گئی اور اسکی صوبہ داری کا زمانہ تاریخ زمینداری اور بند و بست کیلئے ہمیشہ یادگار رہےگیا[۲]،

اورنگ زیب نے دکن کے انتظامات کیلئے مرشد قلی خاں جیسے قابل اور ماہر فن کو منتخب کیا تاکہ وہ بند و بست کرے اور مالی حالت کو تشفی بخش بنا دے، ۱۶۵۶ء میں وہ تمام علاقہ دکن کا دیوان بنا دیا گیا۔ اس نے فوراً ٹوڈرمل کے طریقہ کو دکن میں رائج کیا، اور نہایت جانفشانی اور دیانت داری کیساتھ انتظام میں مصروف رہا اور نئے نئے طریقہ جاری کئے چنانچہ اسکا طریقہ صدیوں بعد تک مرشد قلی خاں کے نام سے یاد کیا جاتا رہا، بالاخر ۱۶۵۸ء کی حالت یہ تھی غلام حسین برہانپوری لکھتا ہے کہ "اورنگ آباد کے قریب ایک چپہ زمین بھی بیکار نہ تھی، گیہوں اور دھان ۲½ من فی روپیہ، جوار اور باجرا ۲½ من فی روپیہ اور پیلا تیل ۴ سیر فی روپیہ فروخت ہوتا تھا"،

---

[۱] تاریخ اورنگ زیب جلد اول "جادو ناتھ سرکار" صفحہ ۱۸۴ [۲] اورنگ زیب جلد اول صفحہ ۱۸۸

اورنگ زیب نے صوبیداری کا جایزہ لیتے ہی بیکار اور نااہل عہدہ داروں کو یا تو علیحدہ کر دیا، یا غیر اہم خدمات پر متعین کیا، چیدہ چیدہ اور قابل اشخاص کو منتخب کر کے ذمہ دارانہ اور اہم خدمات عطا کیں[۱]، اسی کے ساتھ ساتھ جاگیرات میں بھی تغیر و تبدل کیا، قابل عہدہ داروں کی جاگیر بحال رکھی، اور نااہلوں کو خراب حصہ دیکر ان کے اچھے حصہ حاصل کر لئے، اس طرح منصبداروں کی آمدنی میں استقلال پیدا ہو گیا، بعد ازاں اس نے نہایت کد و کاوش کے بعد شاہجہاں کو اس امر پر مجبور کیا کہ منصبداروں کی فوج سختی کے ساتھ جانچی نہ جائے، اسی کے ساتھ اسنے سپاہیوں کی تنخواہ میں اضافہ کیا، میر خلیل ایک تجربہ کار، قابل اور دیانتدار شخص کو داروغہ توپخانہ مقرر کیا، میر خلیل نے نہایت عمدہ انتظام کیا، الغرض نہایت قلیل عرصہ میں دکن کی حالت روبہ ترقی ہو گئی، تاہم ہمکو یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ ان تمام اصلاحات کے باوجود بھی دکن کی مالی حالت قابل اطمینان نہ تھی جسکی وجہ سے اورنگ زیب سخت متفکر تھا اور چاہتا تھا کہ تمام مواقع سے فایدہ اٹھایا جائے جسکے ذریعہ سے ملک کی حالت بہتر ہو اور مالی خطرہ ٹل جائے۔

لیکن اورنگ زیب کو دکن کی صوبیداری کے زمانہ میں مرکزی مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا، شاہجہاں نے ہمیشہ اورنگ زیب کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کیں جسکا سبب کچھ تو یہ تھا کہ مخالفین اورنگ زیب نے اس کے خلاف شاہجہاں کے کان بھر دیے، اور کچھ یہ بھی تھا کہ شاہجہاں کما حقہ اورنگ زیب کی پالیسی کو سمجھ نہ سکا جس کی وجہ سے اکثر اسپر عتاب شاہی نازل ہوتا رہا اور اس کو یکسوئی و دلجوئی کے ساتھ کام کرنے کا موقعہ نہ دیا، بہرحال شاہجہاں اور اورنگ زیب کے درمیان مخالفت جاری رہی جسکی چند مثالیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

دکن کی صوبیداری کے تقرر کے وقت ہی اورنگ زیب نے اسپر اعتراض کیا کہ اسکی جاگیر جو سندھ میں تھی وہیں رہے ورنہ تبدیلی جاگیر سے اسکو سترہ لاکھ روپیہ کا نقصان ہوگا، لیکن اسپر توجہ نہیں کیگئی، مزید برآں اس نے لکھا کہ اس جاگیر کے معاوضہ میں اسے کم سے کم دکن کے زرخیز حصہ زمین دیے جائیں، لیکن یہ معاملہ بھی برسوں تک خط و کتابت کا مبحث بنا رہا[۲]، اور اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ ماتحتین کے تغیر و تبدل اور ان کی ترقی کے متعلق جو سفارشیں کیگئیں انکی مخالفت کیگئی، اور دیگر معمولی امور مثلاً ہاتھیوں کا شکار، آم کی رسد اور کارکردہ نوربافوں کی فراہمی وغیرہ میں بھی باپ بیٹوں میں مخالفت ہوتی رہی، شاہجہاں نے اورنگ زیب پر یہ الزام لگایا کہ وہ کاشتکاری کو فروغ دینے میں اور امن و امان قایم کرنے میں ناکام رہا جسپر اورنگ زیب نے لکھا کہ "یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک یا دو فصل میں ایک پرگنہ کی حالت بہتر ہو سکتی ہے جبکہ وہ بیس ۲۰ سال تک غیر پیداواری رہا ہو" باوجود اس کے شاہجہاں نے ارادہ کیا کہ اورنگ زیب کو علیحدہ کر کے شجاع کو مقرر کیا جائے، لیکن بعد کو اسپر عمل نہیں کیا[۳]، اختلاف کی ایک وجہ دربار بیجاپور اور گولکنڈہ سے سیاسی تعلقات تھے، اورنگ زیب چاہتا تھا کہ ان درباروں کے ایلچی صوبیدار اپنے احکام حاصل کریں، اور شہنشاہی خط و کتابت اس کے توسط سے ہو، آخر کار صوبہ داری کے آخری ایام میں اورنگ زیب کو یہ استحقاق عطا کیا گیا[۴]، شاہجہاں نے اورنگزیب پر یہ بھی الزام لگایا کہ اس نے شاہ گولکنڈہ سے قیمتی تحایف حاصل کئے لیکن پیشکش واجب الوصول طلب میں سے وہ رقم وضع نہیں کی،

---

[۱] اورنگ زیب صفحہ ۱۹۴ [۲] اورنگ زیب صفحہ ۲۰۱ [۳] اورنگ زیب صفحہ ۲۰۲ [۴] اورنگ زیب صفحہ ۲۰۳

اورنگ زیب نے یہ عذر کیا کہ وہ تحایف بالکل کم قیمت تھے، اور وہ تمام اسکو اور اس کے پسر اکبر کو بطور ذاتی تحفہ کے دیے گئے تھے، شہنشاہ نے اورنگ زیب پر یہ بھی الزام لگایا کہ اس نے برہان پور کے اپنے خانگی کارخانہ میں تمام بہترین نوربافوں کو ملازم رکھکر سرکاری کارخانہ کو نقصان پہونچایا، اورنگ زیب نے اس الزام سے برأت ظاہر کی لیکن انکے باوجود شہنشاہ نے سوائے سرکاری کارخانہ کے باقی تمام کارخانوں کے بند کئے جانیکا حکم دیا۔[1]

لیکن باوجود ان اختلافات کے جنہوں نے باپ اور بیٹے کے تعلقات کو کشیدہ کر دیا، اورنگ زیب صوبہ داری کا جایزہ لینے کے بعد سے برابر فلاح و بہبود، ترقی و توسیع کی کوشش میں لگا رہا، شاہجہاں نے اورنگ زیب کو خاص طور پر یہ ہدایت کی تھی کہ دکن کے اخراجات دکن کے محاصل سے پورے کئے جائیں اسمیں شک نہیں کہ اورنگ زیب نے فوری انتظام کر دیا لیکن اسکو آیندہ مختلف قسم کی دقتیں پیش آئیں، ابتدا میں وہ صرف اندرونی انتظامات میں مشغول رہا لیکن اندرونی استحکام کے بعد اس نے اپنے چاروں طرف نظر ڈالی اور اسکی نظر سب سے پہلے ریاست گولکنڈہ پر پڑی، اسکا ہمکو خیال رکھنا چاہئے کہ تمام فتوحات کا اصول یہ ہے کہ فاتح، مفتوحہ ملک کی تمام ذمہ داریاں اپنے سر لیتا ہے لیکن اسکا منشا ہرگز یہ نہیں کہ باوجود ذمہ داریوں کے اخراجات بھی دوسرے صوبوں کے محاصل سے پورے کئے جائیں، اگر ملک گیری سے کوئی فائدہ نہو تو نقصان بھی نہ ہونا چاہئے، چنانچہ آجکل بھی اسی اصول پر عملدرآمد ہوتا ہے، موجودہ زمانہ میں باوجود متواتر احتجاج کے ہر صوبہ سے برابر مرکزی حکومت ہند محاصل کی ایک مقدار بطور حصہ رسدی حاصل کرتی ہے اور یہ رقم اسی حالت میں معاف کیجاتی ہے جبکہ مرکزی حکومت کی آمدنی اخراجات سے زاید ہو، غرضکہ یہ کوئی اصول نہ تھا کہ دکن کے اخراجات کو پورا کرنے کے لئے مرکزی حکومت دہلی مدد کیا کرے، اگر اورنگزیب کے اس طرز عمل کا مقابلہ ایک اور واقعہ سے کیا جائے جو تاریخ ہند میں انگریزوں کے دور میں مرقوم ہوا تو اورنگ زیب کے اس فعل کا حسن و قبح ظاہر ہوگا، وارن ہیٹنگز کو جب خود مختار سلطنتوں پر ملک گیری اور شہنشاہیت کے طرز عمل کے تحت حملہ کرنے کی ضرورت تھی اور اس کے لئے روپیہ کی ضرورت پیش آئی تو اس نے نہایت ناانصافی اور انسانیت کے تمام اصولوں کو پامال کر کے بیگمان اودھ پر ظلم کئے، ان کو فیض آباد میں ان کے محل کے اندر قید کر دیا اور راجہ بنارس چیت سنگھ کے تسلیم کردہ حقوق کو نظرانداز کر کے اس سے زبردستی روپیہ حاصل کیا، اگر وارن ہیٹنگز کے اس فعل کو جائز سمجھا جاتا ہے، اور اسکو قابل تعریف اور لائق ستایش خیال کیا جاتا ہے تو ہم کو کوئی حق نہیں کہ ہم اورنگ زیب کے طرز عمل پر انگشت نمائی کریں، خاصکر ایسی صورت جبکہ (جیسا آگے بیان ہوگا) اورنگ زیب نے تنبیہ کے بعد جائز وجوہات کی بنا پر گولکنڈہ پر حملہ کیا۔ (باقی)

سعیدی بی اے (علیگ)

---

[1] آداب عالمگیری ورق ۳۵ ب ۵۲ اورنگ زیب جلد اول ص ۲۰۸

دوستارے

میرے خادم نے جب کہ میں اپنی غزل کے پانچویں شعر میں ردوبدل کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہا "جناب، باہر دو فرشتے آپ سے ملنا چاہتے ہیں"

—— "کیا انہوں نے تم کو اپنے نام بتائے ہیں" میں نے ذرا لاپرواہی سے پوچھا۔

—— "جی ہاں، یہ لیجئے" اس نے دو چھوٹے چھوٹے سفید کارڈ دیکر کہا۔

ایک پر "ہلال" اور دوسرے پر "بلال" لکھا ہوا تھا۔ اس تحریر سے مجھے یقین ہوگیا کہ بلا شک وہ فرشتے تھے۔

"اچھا ان کو اندر بلالو"

ایسے انوکھے مہمانوں سے ملتے ہوئے مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ میں نے اپنی بیوی کو جس سے شادی ہوئے ابھی تھوڑا عرصہ ہوا تھا بلانا چاہا تاکہ وہ بھی ان متبرک اور آسمانی ہستیوں سے ملے۔ مگر میں کاغذ اور پنسل میز پر رکھکر آواز ہی دینے والا تھا، کہ وہ دونوں فرشتے اندر داخل ہوئے۔ وہ سات لمبے لمبے پردں میں لپٹے ہوئے تھے جنمیں صبح کے کہرے جیسے ملکے اور دھنک جیسے سات رنگ جھلک رہے تھے۔ جو کچھ ان کے بدن کا حصہ آنکھ کو نظر آرہا تھا وہ صاف شفاف برف کے ہلکے نیلے ٹکڑے کے مانند تھا۔ میں نے اپنی کرسی پر سے اٹھکر انکا خیر مقدم کیا اور ہاتھ کے اشارے سے ان سے بیٹھنے کی التجا کی اور خود بیٹھتے ہوئے انکی تشریف آوری کی وجہ دریافت کی۔

ہلال نے اپنے پر سکیڑ کر بیٹھتے ہوئے کہا "سولہ برس گذرے جولائی کی ایک پرلطف رات میں ہم آسمان کے زرد فرش پر چوگان کھیل رہے تھے" "معاف کیجئے" میں نے ایکدم کہا "میں خیال کرتا تھا کہ آسمان نیلا ہے" "کچھ حصوں میں بہت اونچائی پر نیلا ہے مگر کچھ حصوں میں جہاں وہ فارس کے شہروں اور گانوں پر ہے وہ زرد ہے جو آنکھ کو خوب بھاتا ہے" ہلال نے کہا

دوسرا فرشتہ اپنے خوبصورت پر سکیڑے نہایت خاموشی سے آنکھیں نیچے کئے ہوئے بیٹھا تھا۔ اسکے چہرے پر ایک طرح کا حسین غم جھلک رہا تھا اور جسکو دیکھکر مجھے تکلیف ہوئی۔

"ہماری گیندیں دو چمکتے ہوئے حسین ستارے تھے" ہلال نے اپنی طرف متوجہ کرنے کیلئے ذرا زور سے کہا۔

"اور کھیلنے کی لکڑیوں کے لئے" مینے پوچھا۔

"دمدار ستاروں کی دُمیں۔ کھیل بہت دلچسپ تھا۔ میں بازی جیتنے ہی والا تھا کہ ایک سخت چوٹ سے مینے دونوں گیندوں کو حد سے باہر پھینکدیا"

"حد سے باہر"

"جی۔ افق کی حد سے باہر بڑی مصیبت کا سامنا ہوا۔ آپ خیال کر سکتے ہیں کہ آسمان پر دو ستاروں کا گم ہو جانا معمولی بات نہیں۔ ہمکو حاکمان فلک سے حکم ملا کہ جب تک دونوں کھوئے ہوئے ستارے اپنی اپنی جگہ پر واپس نہ کر دیے جادیں گے ہمکو بہشت میں داخل ہو کر لطف اٹھانیکی اجازت نہ ملیگی۔

آپ ہماری سولہ سال کوشش کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ ہم نے زمین اور آسمان کا ایک ایک کونہ جہاں ستارے گر سکتے ہیں ڈھونڈ ڈالا مگر افسوس ہماری کوشش کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔

"ہم ہمیشہ کے لئے جلاوطنی اختیار کرنے والے تھے کہ ہمنے آپکی محبوبہ کی آنکھوں کا ذکر سنا کہ بجائے دو انسانی آنکھوں کے انکے پاس وہ کھوئے ہوئے ستارے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ وہ انکو واپس کر دیگی۔

مجھے یہ سنکر سخت حیرت ہوئی اور یہ معلوم کر کے کہ یہ دونوں معصوم فرشتے میری پیاری کی بے نظیر آنکھوں کے طلبگار ہیں تکلیف بھی ہوئی۔ لیکن انکی غمزدہ صورتیں اور انکی سولہ سال کی داستان مصیبت سنکر رحم بھی آیا اور انکی کھوئی ہوئی چیز کو جسکا ملجانا میری طاقت میں تھا واپس کر دینے کا میں نے ارادہ کر کے اپنی پیاری محبوبہ کو آواز دی

وہ بے تکلف ننگے سر اپنے لمبے لمبے بال کھولے ہوئے یہ سمجھ کر کہ میں اکیلا ہوں آگئی دو نامحرموں کو دیکھکر اسنے جلدی سے اپنی نیلے رنگ کی ساری کا پلو اپنے سر پر کر لیا اور میری برابر والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

اس کی آنکھوں کو میں نے دیکھا اور پھر اس کو اندھا تصور کیا۔ ایک تکلیف دہ کپکپی میرے بدن میں دوڑ گئی۔ میں نے چند لفظوں میں اسے کل حال بتا دیا۔

میری توقع کے برخلاف نہ اسکو تکلیف ہوئی نہ رنج۔ وہ بالکل خاموش رہی اور چند منٹ ساکت رہنے اور غور کرنے کے بعد وہ ان کی طرف متوجہ ہوئی اور ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے بعد کہا "حسین فرشتو! دیکھو کہ کیا میری آنکھیں تمہارے کھوئے ہوئے ستارے ہیں"

وہ آگے بڑھے۔ انہوں نے اس کی دونوں شفاف آنکھوں کو غور سے دیکھا کچھ دیر تک وہ آپس میں عجیب حرکتوں سے تبادلۂ خیالات کرتے رہے۔ پھر ہلال نے کہا "یہ وہ چمکدار تارے نہیں ہیں جو سولہ برس ہوئے کھوئے گئے تھے۔ ہمارے تارے حالانکہ اس رات کی چمک میں سب سے زیادہ تھے۔ مگر اتنے چمکدار نہ تھے"

اس کے بعد وہ بہت پژمردگی کے ساتھ واپس ہو گئے۔ مجھے ان کی حالت پر سخت رحم آیا حالانکہ میں خوش تھا کہ انہوں نے میری معشوقہ کی ان دونوں قیمتی آنکھوں کو چھوڑ دیا تھا۔

اور وہ؟ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی "کیا میں نے ان دونوں کو چکمہ نہیں دیا" "کیا" "یہ سچ ہے .... میری ماں نے مجھے بارہا بتایا کہ میری پیدایش کے کچھ دنوں بعد دو ستارے کھڑکی میں ہو کر ٹھیک میری آنکھوں پر گرے تھے۔ غالباً وہ وہی دیکھ رہے تھے تو میں اس وقت کا خیال کرنے لگی جب تم نے پہلی مرتبہ اپنی محبت کا اظہار کرتے ہوئے میرے

لبوں کا بوسہ لیا تھا۔ مجھے وہ دن یاد تھا اور اس کی یاد نے میری آنکھوں کو ان آسمانی ستاروں سے زیادہ چمکدار اور خوبصورت بنا دیا"۔

میں نے اسے پکڑ کے پھر اظہار محبت کرنا چاہا مگر وہ یہ کہتی ہوئی کہ میں نے ابھی غسل نہیں کیا اندر بھاگ گئی، اور میں پھر اپنے پانچویں شعر کی اصلاح میں مشغول ہو گیا۔

نیاز حسین بی۔ اے

(از فرانسیسی)

چند باتوں کا خیال رکھئے

(۱) نگار کی تاریخ اشاعت ہر چند ہر ماہ کی پندرہ تاریخ ہے، لیکن عموماً وہ پہلے ہی ہفتہ میں شایع ہو جاتا ہے، اسلئے اگر بیس تک پرچہ نہ پہونچے تو فوراً اطلاع دیجئے ورنہ پھر دوسری کاپی مفت نہ ملیگی۔

(۲) بعض حضرات دوسرے مہینہ کا پرچہ ملنے پر پہلے مہینہ کا پرچہ نہ پہونچنے کی شکایت کرتے ہیں، افسوس ہے کہ ان شکایات کا ہمارے پاس کوئی جواب نہیں۔

(۳) نمبر خریداری خط و کتابت میں درج کرنا ضروری ہے۔ بعض حضرات ڈاکخانہ کے رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۰۴ کو اپنا نمبر خریداری سمجھتے ہیں۔ نمبر خریداری ٹیگ کے اوپر داہنے جانب بلو بلیک روشنائی سے درج ہوتا ہے اسکو ایک بار دیکھکر کہیں نوٹ کر لیجئے۔

(۳) طلبہ کے لئے زیادہ مناسب یہ ہے کہ وہ اپنے گھر یا کسی اور پتہ سے رسالہ طلب کریں۔ اسکول کے پتہ سے رسالہ طلب کرنا محفوظ طریقہ نہیں ہے۔

(۴) جن طلبہ و لائبریریوں وغیرہ سے رعایتی چندہ لیا جاتا ہے وہ اگر میعاد خریداری ختم ہونے پر منی آرڈر نہ کریں گے تو وی۔ پی پوری رقم کا کیا جائیگا۔

(۵) حیدرآباد کے ان خریداروں سے جہاں انگریزی ڈاکخانہ نہیں ہے، یہ استدعا کی جاتی ہے کہ حتی الامکان رسالہ رجسٹرڈ طلب کریں اور عہ سالانہ اس صرف کو بھی برداشت کریں کیونکہ سوائے اس کے اور کوئی صورت وہاں حفاظت سے رسالہ پہونچنے کی نہیں۔

منیجر "نگار" لکھنؤ

تنقید "پیام روح" غیر شاعرانہ نقطۂ نظر سے

حامد اللہ افسر بی اے میرٹھی کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ "پیام روح" کے نام سے انڈین پریس الہ آباد نے خاص اہتمام سے شائع کیا ہے اور جا بجا نظموں سے متعلق رنگین تصاویر بھی دی ہیں ضخامت ۲۴۴ صفحات اور قیمت ۲ ہے۔

اس مجموعہ کے چار حصے ہیں۔ پہلا وہ جس میں عہد طفلی یا کمسنی کا کلام ہے۔ اسکا نام نغمات الصغر (خسرو کی تتبع میں) رکھا گیا ہے جو افسر کے رنگ شاعری کے لحاظ سے بالکل ناموزوں ہے۔ دوسرے حصہ کا نام "روح جذبات" ہے جسمیں ۱۹۱۹ء سے لے کر حال تک کی نظمیں درج ہیں۔ تیسرے حصہ کا نام "پرتو افکار" ہے۔ جسمیں بقول افسر وہ نظمیں ہیں جو بحالت بیخودی یا کسی غیر متوقع واقعہ کے ظہور پر لکھی گئیں۔ چوتھا حصہ غزلوں کا ہے۔

شروع میں آنریبل جسٹس شاہ محمد سلیمان صاحب جج ہائیکورٹ الہ آباد کی تقریب، اور میاں بشیر احمد صاحب اڈیٹر رسالہ ہمایوں کا مقدمہ بھی شامل ہے

افسر کا کلام ملک میں کافی شہرت حاصل کر چکا ہے اور اس لئے انکے مجموعہ پر لکھنا کسی مجہول و نامعلوم شے کو پیش کرنا نہیں ہے، لیکن چونکہ دور جدید کے ان شعراء میں جنکا سرمایۂ شعری صرف تغزل ہی پر منحصر نہیں ہے، افسر بھی اک خاص درجہ رکھتے ہیں اس لئے ضرورت ہے کہ ذرا تفصیل کے ساتھ انکے کلام پر نگاہ ڈالی جائے اور "کتب موصولہ" کے ماتحت سرسری تنقید سے ہٹ کر علحدہ اس پر رائے کا اظہار کیا جائے۔

شعر کی ماہیت کیا ہے، فنون لطیفہ میں اسے کیوں شامل کیا جاتا ہے، شاعر کسے کہتے ہیں، شعر کے اجزاء ترکیبی کیا ہو سکتے ہیں، بہترین شعر کے جانچنے کا کیا معیار ہے۔ یہ اور اسی قسم کے بہت سے مباحث متعلق شعر و شاعری، اس سے قبل کثرت سے ہو چکے ہیں اور ہر زبان میں کافی ذخیرہ مضامین و مستقل تصانیف کی صورت میں ان مسایل پر موجود ہے۔ اس لئے میں اپنی تنقید میں ان مباحث سے تطویل بیجا پیدا کرنا مناسب نہیں سمجھتا، بلکہ میں ایک ایسے شخص کی حیثیت سے جو شاعری سے کوئی لگاؤ نہیں رکھتا، اس مجموعہ کو دیکھنا چاہتا ہوں اور معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آیا کوئی غیر شاعر بھی اس سے لطف اٹھا سکتا ہے یا نہیں کیونکہ ایک نغمہ و شعر کی بہترین تعریف یہی ہے کہ ایک معمولی انجان شخص کے دل میں بھی اپنا اثر چھوڑ جائے۔ میں نے سب سے پہلے ایام طفلی کی لکھی ہوئی نظموں کو دیکھا اور خود یہ معلوم کرنیکی کوشش کی کہ انمیں سب سے پہلے کی نظم کونسی ہو سکتی ہے تاکہ میں اس کو بنیاد قرار دیکر یہ سمجھوں کہ آیندہ افسر کے جذبات نے کیا کیا تغیرات قبول کئے۔ لیکن میں اسمیں کامیاب نہیں ہوا (یہ میں عرض کر چکا ہوں کہ ایک شاعر کی حیثیت سے یہ تنقید نہیں کرتا اور نہ ممکن تھا فن کے لحاظ سے میں کہہ سکتا کہ

فلاں فلاں نظمیں اپنے الفاظ اور ترکیبوں کی خامی سے ابتدائی مشق کا نمونہ معلوم ہوتی ہیں کیونکہ افسر کی نظموں میں خواہ وہ "نغمات اصغر" ہوں یا "تجلیات الشباب" صرف ایک ہی کیفیت کیا ہے ایک ہی جذبہ ہے اور ایک ہی "پیام" ہے جو عمر کی ترقی کے ساتھ ساتھ خام پختہ زبان میں سنایا گیا ہے۔ وہ کیفیت کیا ہے، وہ پیام کیا ہے، اس کا جواب میں ایک لفظ میں نہیں دینا چاہتا۔

نقاشی میں ایک خاص قسم نقش کی منظریہ نقاشی (Land Scape Painting) کہلاتی ہے، جسمیں ایک نقاش کا مقصود صرف مطالعۂ فطرت و مناظر فطرت ہوا کرتا ہے اور اسی مطالعہ کے تاثرات کو وہ اپنے موقلم سے ظاہر کیا کرتا ہے۔ ابر، کوہ، آسمان، زمین، افق، شفق، کہکشاں، قوس قزح، دریا، نالا، جھیل، جنگل، اور اسی نوع کے اور بہت سے انفرادی مناظر طبیعی، ایسے نقاش کا موضوع نقش ہوا کرتے ہیں اور اول تو وہ کبھی انسے متجاوز نہیں ہوتا اور اگر ہوتا بھی ہے تو رنگ غالب اسی کا رہتا ہے۔ بالکل یہی حال افسر کی شاعری کا ہے جو شروع سے لیکر اخیر تک نظموں سے لیکر غزلوں تک اسی منظریہ رنگ کی ہے اور اگر ہم بدعت و جسارت سے کام لیں تو انکی شاعری کا نام ہی (Land Scape Poetry) یا منظریہ شاعری رکھ سکتے ہیں۔

ہندوستان کی شاعری میں یہ چیز بالکل جدید پیداوار تو نہیں ہے، کیونکہ نظیر اکبر آبادی سب سے پہلا وہ شاعر تھا جس نے فطرت نگاری کی بنیاد اردو شاعری میں ڈالی، لیکن یہ دیکھتے ہوئے کہ نظیر اکبر آبادی کے بعد پھر کوئی شاعر حالی اور اسمٰعیل میرٹھی کے عہد تک اس ذوق کا پیدا نہیں ہوا۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس نوع کی شاعری عملاً زمانۂ حال کے انقلاب ذہنیت کا نتیجہ ہے اور غالباً غلط نہ ہوگا اگر میں کہوں کہ یو۔ پی کے اردو شاعروں میں اسمٰعیل کے بعد سوائے افسر کے کوئی اور شاعر اس رنگ کا پیدا نہیں ہوا، اور یقیناً یہ امر میرٹھ کے لئے کم باعث فخر و ناز نہیں کہ اردو کے منظریہ شاعری کی وہیں ابتدا ہوئی اور وہیں اس پر شباب آیا۔

منظریہ نقاشی کی خصوصیت اس کی سادگی ہوا کرتی ہے جو اپنے اثرات کے لحاظ سے ایک دلفریب اچھوتا پن ہے، ایک دل کش معصومیت ہے ایک غیر محسوس نغمۂ سرمدی ہے اور تاثرات کی ایک ایسی دنیا ہے جہاں کا تار و پود سوائے محبت کے اور کچھ نہیں۔ بالکل یہی حال منظریہ شاعری کا ہے کہ وہ جامد سے جامد انسان کو بھی اپنی فضا میں لانے کے بعد "متحرک" بنا دیتی ہے اور وہ کچھ ایسا محسوس کرنے لگتا ہے کہ اس کی روح شاید کچھ گنگنا سی رہی ہے

افسر کی شاعری یکسر انہیں اثرات و کیفیات سے لبریز ہے اور اسکا مطالعہ کرنے کے بعد ایک شخص محسوس کرتا ہے کہ جذبات ردیہ اس کے دل سے محو ہوتے جا رہے ہیں، اور اسکو کوئی ایسا درس دیا جا رہا ہے، جو جذبۂ محبت و رافت کو آہستہ آہستہ بیدار کر رہا ہے۔ پھر اسی کے ساتھ وطن کی الفت، خالق و مخلوق کا خاص رشتۂ محبت، انسان کی عظمت تخلیق، و دنیائے عمل میں اخلاق کی اہمیت، عزم راسخ، ولولۂ عمل وغیرہ مختلف جذبات انوار اطراف (Side lights) کی طرح ساتھ ساتھ ملکر افسر کی شاعری کو بہت سنجیدہ اور بلند کر دیتے ہیں۔

افسر کا کلام دیکھنے کے بعد ہر شخص اول نگاہ میں سمجھ سکتا ہے کہ انھوں نے ٹیگور کا مطالعہ نہایت غایر نگاہ سے کیا ہے،

اور انکے کلام پر ٹیگور کے جذبات کا بہت گہرا اثر پڑا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ افسر کا کلا یکسر ٹیگور کا تتبع ہے، لیکن یہ یقینی ہے کہ ٹیگور کے کلام نے انکی طبیعت پر وہی اثر کیا جو پارۂ آتشین ایک مشتعل ہوجانے والی چیز کے ساتھ کیا کرتا ہے۔

افسر نے ٹیگور کے متعدد تصانیف کا ترجمہ بھی کیا ہے اور چونکہ یہ خود فطرتاً ایک پاکیزہ دماغ رکھتے تھے اس لئے انھوں نے نہایت تکمیل کے ساتھ ان جذبات کے اثر کو قبول کیا، اور جو عہد شباب اور سن وقوف کے ساتھ ساتھ زیادہ پختہ ہوتے گئے۔

اب ہم کہیں کہیں سے انتخاب کلام پیش کرکے ثابت کریں گے کہ ہمارا دعویٰ کہاں تک صحیح ہے

افسر فطرت کی طرف سے منظریہ شاعری کا دماغ لے کر آئے ہیں، اسکا ثبوت یہ ہے کہ انکی بالکل ابتدائی نظمیں بھی اس رنگ میں رنگی ہوئی نظر آتی ہیں۔ "گھر کے نیم کے درخت" پر ابتدائی نظم ہے، لیکن اپنے طفلانہ جذبات کے اظہار کے ساتھ ساتھ وہ منظریہ رنگ پیدا کئے بغیر نہ رہ سکے۔ یہ دو شعر ملاحظہ ہوں

وہ سحر کے وقت کی ہلکی ہوائیں اور تو — ہائے وہ برسات کی کالی گھٹائیں اور تو

ہائے وہ برسات آتے ہی سنور جانا ترا — مینھ کے پانی میں نہا دھو کر نکھر جانا ترا

اسی طرح ایک اور نظم ابتدائی زمانہ کی ہے جو یکسر منظریہ ہے۔ اسکی سرخی سکوت شام ہے۔ لکھتے ہیں

سکوت شام ہے خاموش بستی ہوتی جاتی ہے — موذن کی صدا ہلکی ہوا کے ساتھ آتی ہے

. . . .

شفق پھولی فلک پر سرخ بادل کچھ نظر آئے — یہ کیسے لال دیوالی دیواروں کے سر آئے

چمن کی سیر کرکے لوگ اپنے اپنے گھر آئے — چھتیں سونی پڑی ہیں کھیل کر بچے اتر آئے

چراغ اب رفتہ رفتہ ہو چلے روشن مکانوں میں

بسیرے کیلئے جاتی ہیں چڑیاں آشیانوں میں

افسر کا مطالعہ عالم ہمیشہ فطرت کے حدود میں شروع ہوتا ہے اور وہیں ختم ہوجانا چاہتا ہے، یہاں تک کہ اگر کبھی وہ منظریہ شاعری کے حدود سے علٰحدہ ہوکر کچھ بیان کرنا چاہتے ہیں تو اسمیں بھی وہی کیفیت پیدا کردیتے ہیں۔ مثلاً مذکورۂ بالا اشعار کو دیکھئے کہ چوتھے اور پانچویں شعر کے پہلے مصرعے انسان کی عملی دنیا سے متعلق ہیں۔ لیکن ان کے دوسرے مصرعوں نے انمیں بھی ایک منظری کیفیت پیدا کردیا ہے۔

اس مجموعہ کا دوسرا اور تیسرا حصہ جسمیں ۱۹۱۰ء کے بعد سے اسوقت تک کا کلام ہے، متعدد نظموں پر مشتمل ہے۔ اور ان میں کوئی نظم ایسی نہیں جو افسر کی خصوصیت شعری کی حامل نہو، لیکن بعض نظمیں اسقدر بلند ہیں کہ منظریہ شاعری کے ارتقا کا منتہا سامنے آجاتا ہے (مثلاً دولتمند جوگی۔ بے چین گھڑیاں۔ شب تاریک۔ مسافر) اسی سلسلہ میں جو نظمیں خاص ملی یا وطنی رنگ کی ہیں (مثلاً ترمینی۔ ہمارا وطن۔ بھارت۔ سنجوگتا) نہ صرف وہ اس بات کا ثبوت ہیں کہ افسر کا جذبۂ وطن پرستی کیسا قوی ہے

بلکہ ان سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ مذہب کے باب میں وہ کس قدر روشن خیال واقع ہوئے ہیں۔

حصۂ "پرتو افکار" میں بعض بعض نظموں کے شعر حقیقتاً انمول جواہر ہیں، نشاطِ خیال کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:-

کیا ہوتا ہے محبت میں، یہ مجھ کو معلوم نہیں — جس نے آگ لگائی ہے وہ خود آگ بجھائیگا

میں تو نام کا مالی ہوں پھولوں کا رکھوالا ہوں — جس نے بیل اُگائی ہے خود پروان چڑھائیگا

جسنے خزاں کو بھیجا ہے اسکے پاس بہار بھی ہے — جس نے باغ اجاڑا ہے وہ خود پھول کھلائیگا

اسی نظم میں ذیل کا شعر کس قدر ٹیگور کے رنگ کا ہے:-

زانو کا تکیہ ہوگا، مٹی کا بستر ہوگا — گھر گھر جسکا چرچا ہے میرے گھر بھی آئیگا

ہر چند اس نظم میں صرف خالق و مخلوق کے تعلق کو ظاہر کیا ہے، لیکن آپ دیکھیں گے کہ الفاظ کا انتخاب اسلوب بیان، ترکیب اشارہ یہ سب منظر یہ ہے۔

ایک اور نظم ہے جس کا عنوان ہے "وہ بھی زمانہ آئے گا" اس میں افسر نے مستقبل کی دنیا کے متعلق پیشین گوئی کی ہے، بعض شعر ملاحظہ ہوں:-

دولت ہے نیکی میں داخل، آج زمانہ ایسا ہے — دولت جرم میں داخل ہوگی وہ بھی زمانہ آئیگا

آج اندھیرا ہے ہر گھر میں آج زمانہ ایسا ہے — جگمگ جگمگ محفل ہوگی وہ بھی زمانہ آئیگا

پہلے شعر میں دولت کا مذموم پہلو واضح کیا گیا ہے، اور دوسرے میں علوم و فنون کے عام ترقی کیطرف اشارہ ہے۔

افسر انسان کا مطالعہ کرکے جو درس دینا چاہتے ہیں اور جس نتیجہ پر پہونچے ہیں، یہ ہے۔

ہے منزل تجھ میں خود موجود اپنا راہبر ہوجا — خود اپنی روح کی گہرائیوں سے باخبر ہوجا

ابھی تک تو نے رکھی ماسوا ہی پر نظر اپنی — تجھے کرنا ہے پیدا کچھ بھروسہ ذات پر اپنی

. . . .

کوئی دن میں یہاں روحانیت چھا جائیگی سب پہ — یہی دنیا کسی دن خلد کہلائیگی اے افسر

خیالات کی بلندی ہمیشہ اپنے ساتھ الفاظ کو بھی بلند لاتی ہے۔ اگر افسر کے الفاظ میں علوئے اثر ہے تو اسکا سبب صرف یہ ہے کہ ان کے خیالات پاکیزہ ہیں میں نظموں کا زیادہ انتخاب نہیں کرنا چاہتا اور نہ اس کی ضرورت، کیونکہ کوئی نظم ان کی خصوصیات شعری سے خالی نہیں ہے، اور ہر نظم میں دو چار شعر ایسے ملتے ہیں جو براہ راست ذہن انسانی کو مس کرکے اسمیں ایک خاص کیفیت و لذت کا احساس پیدا کرتے ہیں۔

اس مجموعہ میں غزلوں کا بھی ایک حصہ ہے اور میری رائے میں نظموں سے بھی اچھا ہے۔ ہر چند غزلوں میں بھی اکثر و بیشتر جگہ وہی پیغام سنایا گیا ہے، جو نظموں کے ذریعہ سے پیش کیا ہے۔ لیکن بعض بعض شعر جو صحیح رنگ تغزل کے انکے قلم سے

نکل گئے ہیں وہ یقیناً غیر فانی ہیں اور بے مثل نمونہ ہیں اس سادگی کا جسکی تہ میں ہزاروں طوفان تاثرات پنہاں رہتے ہیں۔ اب ہم ذیل میں انکی غزلوں سے صرف ان اشعار کا انتخاب پیش کرتے ہیں، جو ہمارے نزدیک تغزل کی جان ہیں اور جو ایک شاعر کے لئے سرمایۂ حیات ابدی ہوا کرتے ہیں۔

تم جب دل کو دکھاتے ہو آنکھو نیر بس کسکا ہے   تم طوفان اٹھاتے ہو یا میں طوفان اٹھاتا ہوں
تجھ سے چھوٹے ظاہر میں تو یہ مانا مدت گذری   اب بھی پہروں یاد سے تیری جی بہلاتا ہوں

کچھ دن ضرور ایسے آتے ہیں ہر برس میں   دل تھام تھام کر ہم رہ جاتے ہیں قفس میں
جتنا انہیں بھلاؤں یاد اور آتے ہیں وہ   یوں بھی نہ ہو آلہی کوئی کسی کے بس میں

ہے کس کے تجسّس میں ہے کس کا یہ دیوانہ   یہ درد، یہ بے چینی، یہ شام، یہ ویرانہ
یوں بھی نہ بہار آئے اللہ رے مجبوری   اب کون بسائے گا اجڑا ہو کاشانہ
یہ رات کی خاموشی، تاروں کی یہ محویت   اختر کوئی کہتا ہے شاید مرا افسانہ

ہزار نیرنگیوں کے مالک مجھے بتا دے یہ کیا ستم ہے   کہ تیرے کعبہ میں رہنے والا کبھی خدا ہے کبھی صنم ہے
کہیں بہلتی نہیں طبیعت، الٰہی کیا ہو گیا ہے مجھ کو   عجب ہے اسوقت دل کی حالت نہ کچھ خوشی ہے مجھے نہ غم ہے
مجھے بتانا تھا حال کچھ تو وہ پوچھتے تھے کہ حال کیا ہے   مگر میں بے اختیار اختر یہ کہہ اٹھا "آپ کا کرم ہے"

ترا جانا تھا کہ غم خانے پہ وحشت چھا گئی   میں یہ سمجھتا تھا مرے گھر سے بیاباں دور ہے
جب غرض والا کوئی آیا تو آنکھیں پھیر لیں   ایک تم پر کیا زمانے کا یہی دستور ہے
اپنے ہر آنسو کے قطرہ میں جھلک پائی تری   میں یہ سمجھا تھا کہ تو مجھ سے بہت ہی دور ہے

جہاں میں اور بھی تو قصے کچھ اور کہہ داستاں سرا تو   یہ کیا ستم ہے کہ خود مجھی کو سنا رہا ہے تو حال میرا

کہہ رہے ہیں ڈھونڈنے والے سرِ منزل کھڑے   یہ بتا دے کوئی ہم منزل سے کتنی دور ہیں
کس سے پوچھوں اس اندھیری رات میں تیرا پتہ   آسماں پر چند تارے ہیں مگر وہ دور ہیں

موت اک فرصت دل ہے جو ہو دلکو نصیب — زندگی کہتے ہیں رہ رہ کے تڑپ جانے کو

میں بار بار پوچھ رہا ہوں بہار سے — آواز کس نے دی یہ مجھے کوہسار سے
رو رو کے انتظار کی گھڑیاں گذار دیں — یہ بھی خطا ہوئی ترے امیدوار سے

صدائیں آتی ہیں دھیمے سروں میں گانے کی — اب آج پھر نہیں امید نیند آنے کی

ہائے انجام تجسس کی عجائب کاریاں — تم ملے اور ڈھونڈھنے والے تمہارے کھو گئے

جہان میں کبھی تو ہیں تیرے چاہنے والے — خدا کا نام نہ لے اے کراہنے والے
بھری ہوئی ہے خدا کی زمیں محبت سے — نباہنا ہو تو لاکھوں نباہنے والے
یہ تم نے آتے ہی کیا کر دیا خدا معلوم — بگڑ کے رہ گئے دل کیوں کراہنے والے

جب خوشی کا خیال آتا ہے! — دل مایوس کانپ جاتا ہے!
دل کسی چیز میں نہیں لگتا — کون یہ بار بار گاتا ہے!!!
کم ہے آواز خود مری دم نزع! — یا کوئی دور سے بلاتا ہے!!

آغاز ہوا ہے الفت کا اب دیکھئے کیا کیا ہونا ہے — یا ساری عمر کی راحت ہے یا ساری عمر کا رونا ہے

یہ دل نواز نغمے جنگل کی خاموشی میں — لرزہ سا آ رہا ہے تاروں کی روشنی میں
للہ یہ بتا دے اے جذبہ محبت — کیا حسن ہے خدا میں کیا عیب آدمی میں

کوئی جب حال پوچھے دل پہ کچھ قابو نہیں ہوتا — میں آنسو ضبط کر جاتا ہوں لیکن دل میں روتا ہوں

پریشانی ہے جی گھبرا رہا ہے — کوئی دھیمے سروں میں گا رہا ہے

کوئی شب کی خموشی میں ہے گریاں تصور میں کوئی سمجھا رہا ہے
جو رستہ خلد میں نکلا ہے آفسر وہ دوزخ سے گذر کر جا رہا ہے

انتخاب بالا سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ آفسر کے یہاں صحیح رنگ تغزل کے بھی کیسے کیسے پاکیزہ شعر پائے جاتے ہیں۔ واردات قلب کو سادہ الفاظ میں بیان کرجانا نہایت ہی موثر طریق اظہار ہوا کرتا ہے اور اردو کی دنیائے تغزل میں میر کی خدائی اسی خصوصیت نے قائم کردی ہے۔ آفسر بھی اس باب میں درد و میر کے متبع معلوم ہوتے ہیں لیکن مضمون آفرینی کے لحاظ سے بیشک ان کے حدود کچھ مختلف ہیں جو نتیجہ ہے مغربی تعلیم کا۔

تنقید کا دوسرا پہلو وہ ہوتا ہے جس میں ایک شاعر کے کلام کے معایب پیش کئے جاتے ہیں اور تعقید، ایطاء، شتر گربہ، شایگاں، وغیرہ وغیرہ بہت سے نام رکھ کر اُن اصول کے مطابق کسی کے کلام کو جانچا جاتا ہے، جو صرف صنعت و آرٹ کی پیداوار ہیں اور ماخوذ ہیں اسی فطری ملکۂ شعری کے نتایج سے جو ان تمام اصطلاحات سے بالکل بیخبر ہے۔ میں اس پہلو سے بحث نہیں کرونگا کیونکہ اول تو یہ تنقید ہی غیر شاعرانہ نقطۂ نظر سے کی گئی ہے اور دوسرے یہ کہ اگر آفسر کے کلام میں کہیں کہیں غلطیاں ہوں بھی تو میرے نزدیک لایق توجہ نہیں، کیونکہ وہی شاعری پرواز فن کی اس کشمکش سے بہت بلند ہوا کرتی ہے اور ٹھیک اس وقت جبکہ لکھنؤ کا شاعر عروض، قافیہ، وغیرہ کی غلطیاں ڈھونڈھنے میں الجھا رہتا ہے، وہ اپنے خیال کی روشنی سے کسی اور فضا کو معمور کرتا ہوتا ہے، جہاں نہ فن والوں کے ذہن کی رسائی ہے اور نہ وہ اس کے اہل۔

بنگالی ناولوں کے ترجمے

بنگالی دلھن ایک نئی دلھن کے حسرت و ارمان شوہر سے جدائی کی تکالیف نیک نیتی سے استقلال اور وفاداری کی تصویریں اسکی سلاست زبان اور روانی عبارت وغیرہ قابل دید و داد ہے۔ ۱۰/

پرتاب۔ ایک تاریخی ناول غدر ۱۸۵۷ء کا سنسنی خیز واقعہ نہایت پیچیدار طریقہ سے لکھا گیا ہے جسمیں درد عشق کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ طرز بیان دنیا سے نرالا ہے عشق حقیقی و مجازی کے ایسے دلکش و روشن پہلو دکھائے ہیں کہ دیکھ کر دل پر ایک گہرا اثر پڑتا ہے۔ ۱۰/

مرنالنی عورتوں کی وفاداری پر بحث۔ عبرت و نصیحت کا خزانہ ۸/

اردو مرثیہ کی کتابیں

کلیات مراثی مرزا دبیر یعنی مرزا سلامت علی صاحب دبیر۔ ہر دو جلد ۶/

کلیات مراثی میر انیس مضمون آفرینی زبان فصاحت بلاغت غرض کوئی بات ایسی نہیں جو اس باکمال کے کلام بلاغت نظام میں نہیں پائی جاتی۔ کامل ہر چہار جلد للعہ

کلیات مراثی میر ضمیر یعنی کلام بلاغت نظام میر مظفر حسین صاحب متخلص بہ ضمیر استاد جناب مرزا سلامت علی صاحب دبیر۔ عہ

مجموعہ مراثی مرزا گولگیر۔ مرزا صاحب موصوف نہایت پرگو اور مشہور مرثیہ گوؤں میں سے گذرے ہیں کامل ہر جلد سے

"منیجر نگار"

ریش مقدس

روایات قدیمہ میں مذکور ہے کہ آدم جب پیدا کئے گئے تو ان کے چہرے پر داڑھی بھی تھی اور یہ داڑھی خوب پھیلی ہوئی اور گنجان تھی۔ اس اعتقاد کا ثبوت اس امر سے بھی ملتا ہے کہ پایائے روم کے محل میں ایک سنگی تابوت پر آدم کی تصویر اسی قسم کی ترشی ہوئی رکھی ہے۔ یہود نے اس روایت کو اپنا دستور العمل بنالیا۔ اسی لئے یہودی کے چہرے پر لمبی چوڑی داڑھی ضرور ہوا کرتی تھی۔ اگرچہ قبطیوں میں داڑھی منڈانے کا رواج تھا مگر پھر بھی سیکڑوں برس کی غلامی کرنے کے باوجود یہود اپنی اپنی داڑھیوں کو بچالائے اور ان کی نقل نہ کی۔

داڑھی ایک آدمی کی راست بازی کی علامت خیال کی جاتی تھی۔ اگر کوئی شخص کسی کی داڑھی کو بدتمیزی سے چھو لیتا تھا تو یہ خیال کیا جاتا تھا کہ اس نے سخت توہین کی ہے بچے اور دوسرے رشتہ دار عزت اور نرمی کے ساتھ داڑھی کو چھو سکتے تھے۔ اگر کوئی شخص ادب اور عزت کے ساتھ داڑھی کو چھو کر پناہ میں آنا چاہتا تو اس کو پناہ دی جاتی تھی، کسی بڑے مشکل کام کا اگر کسی کو وعدہ کرنا ہوتا تو وہ اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیر کر وعدہ کرتا اور اس کے بعد اگر وہ وعدہ خلافی کرتا تو اپنے ہم چشموں میں ذلیل ہو جاتا تھا دو قوموں میں اگر لڑائی ہوتی اور ایک دوسرے کی داڑھی کو ادب سے چھو لیتا تو وہ لڑائی مٹ جایا کرتی۔ جب جوآب (Joab) اماسا (Amasa) کے پاس گیا تو اس نے اماسا کی داڑھی چھو کر بوسہ دینا چاہا اور کہا "اے بھائی تو اچھا ہے"۔ اماسا دھوکے میں آگیا اور اس نے اس خنجر کا خیال تک نہ کیا جو جوآب کے ہاتھ میں تھا اور اس طرح جوآب نے اماسا کو دھوکے میں مبتلا کرکے اپنا خنجر پانچویں پسلی کے نیچے بھونک دیا۔ مقدس توارۃ میں اس کے اذکار بہت درج ہیں کہ داڑھی اور اس کے رکھ رکھاؤ سے کیونکر خوشی، غم، تکبر اور حسرت کے آثار کا اظہار ہوا کرتا ہے۔ اگرچہ یہود قبطیوں کی غلامی پر بھی اپنی داڑھیوں کو بچالے گئے مگر یہ ضرور ہے کہ اہل مصر اور اس کے فراعنہ بھی داڑھی کے قدر شناس تھے۔ اور اس کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ بڑی عیدوں اور تیوہاروں کے دنوں میں وہ مصنوعی داڑھیاں لگایا کرتے تھے اور اپنے بھائی کے دیوتاؤں کے چہروں پر نوکیلی داڑھیاں لگایا کرتے تھے ہم نے تو بچپنے میں جناب والد مرحوم سے یہی سنا تھا کہ موسیٰ کا فرعون اپنی داڑھی میں موتی پرویا کرتا تھا اب یہ خدا جانے کہ اصلی داڑھی میں یا مصنوعی داڑھی میں۔ آج کل کے مسلمان جو اہل فرنگ کے تمدن کے زیر سایہ آگئے ہیں وہ اپنے اسلاف سے بالکل مختلف ہیں ایک زمانہ تھا جبکہ داڑھی نجات سرمدی کا ذریعہ خیال کی جاتی تھی۔ کنگھے سے اگر کوئی بال گر جاتا تھا تو بڑی احتیاط سے دفن کر دیا جاتا تھا۔

سلاطین اسلام میں سلیم اول (۱۵۱۲ - ۱۵۲۰) وہ شخص ہے جس نے داڑھی منڈانے کی بدعت شروع کی اس کو بہلا علمائے

اسلام کیونکر برداشت کر سکتے تھے ان سے رہا نہ گیا فوراً شیخ الاسلام۔ سلیم اول کی خدمت میں پہونچے اور اسپر اعتراض کیا تو سلیم نے مسخرے بن سے جواب دیا کہ "میں نے اس لئے داڑھی منڈا دی ہے تاکہ میرا وزیر اس کے ذریعہ سے جہاں اس کا جی چاہے مجھکو نہ لے جاسکے"

اسلام سے قبل تاجداران ایران اپنے ریش بوش سونے کے تاروں سے بنایا کرتے تھے اور شاہزادگان نینوا داڑھیوں کو چڑھاتے تھے۔ اور خوب تیل ڈالا کرتے تھے۔ روایات میں تو یہاں تک آیا ہے کہ تورانیوں اور چینیوں میں محض اس بات پر جنگ ہوگئی کہ ایک گروہ کہتا تھا کہ داڑھی مونڈھی جائے اور دوسرا کہتا تھا کہ مونڈی نہ جائے بلکہ اکھاڑی جائے۔

پنجاب میں بھی میرا تجربہ ہے کہ جو لوگ چہل قدمی داڑھی (یعنی وہ داڑھی جو صرف چالیس قدم سے نظر آجائے) رکھتے ہیں وہ بال اکھڑوایا کرتے ہیں اور اس میں ان کو زیادہ مزہ آتا ہے اور بعض سو بھی جاتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ آرمی اور یونانی ہر اس قوم کو جو داڑھی نہ منڈواتی تھی وحشی کہا کرتے تھے۔ جس کے لئے انگریزی کا لفظ (Barbarian) وحشی موجود ہے مگر ساتھ ہی وہ نوجوان رومی جس کو داڑھی سوبجھ کا شوق زیادہ ہوتا وہ اپنی ٹھوڑی میں تیل لگایا کرتا تاکہ بال جلد نکل آئیں۔ تاکہ اس کو (Barbatulus) کہلائے جانے کا حق حاصل ہوجائے کیونکہ پورا آدمی، (Barbatus) کہلاتا تھا۔ رسول اللہ سے ایک ہزار سال قبل صقلیہ کے حجام روما میں جاکے آباد ہوگئے اور وہاں داڑھیاں منڈنے لگیں اس کے بعد سے رومیوں نے داڑھی والی اقوام کو وحشی کہنا شروع کیا اور اپنی زبان کا وہ لفظ استعمال کرنے لگے جسکا ترجمہ انگریزی میں لفظ (Barbarous) سے ہوتا ہے۔ یہ سب کچھ تھا مگر جمہوریت کے زمانے میں مصنوعی نوک دار داڑھیاں نوجوان لگاتے تھے۔

ہومر (Homer) ورجل (Virgil) پلنی (Pliny) پلوٹارک (Plutarch) سٹرابو (Strabo) ڈیوڈورس (Deodorus) جوے نال (Juvenal) اور پرسی اس (Persius) نے داڑھیوں پر بہت کچھ لکھا ہے۔

قیصر جولیس نے داڑھی کی مذمت پر ایک کتاب لکھ ڈالی ہے جس طرح بادشاہ جیمس نے تمباکو کے خلاف۔ قیصر جولیس کی کتاب کا نام ہے (Misopogon) یا دشمن ریش " مگر اس کے بارے میں گبن (Gibbon) کہتا ہے کہ " اگرچہ وہ اپنی کتاب میں داڑھی کے خلاف لکھتا ہے مگر مندرجہ ذیل امور پر فخر و مباہات بھی کرتا ہے۔ ناخون کی درازی پر اور سپاہی کی طرح کالے ہاتھوں پر اور لکھتا ہے کہ اس کے سارے جسم پر اگرچہ بال ہیں مگر استرے کا استعمال صرف سر پر ہوتا ہے اور یونان کے فلسفیوں کی تقلید میں داڑھی سینے پر اڑا کرتی تھی۔ پرسی اس (Persius) کہتا ہے کہ ریش کے ساتھ دانائی وابستہ ہے سقراط کی داڑھی بہت بڑی تھی اس لئے اس کی بہت تعریف کی ہے۔ ازمنہ سابقہ میں داڑھی کی عزت اس قدر تھی کہ لوگ کہتے ہیں کہ کسی بادشاہ نے ایک بے ریش و بروت نوجوان کو کسی دوسرے

بادشاہ کے پاس بطور سفیر کے بھیجدیا تھا تو بادشاہ بہت خفا ہوا اور کہنے لگا کہ کیا سفارت کے لئے کوئی داڑھی والا نہ تھا۔ مگر سفیر نے بھی خوب جواب دیا کہ "میرے بادشاہ کو علم نہ تھا کہ آپ داڑھی کا اس قدر خیال رکھتے ہیں ورنہ ایک بکرا بھیجدیتا۔"
لیڈی آف دی لیک (Lady of the Lake) میں نے بھی ایک دوسرے کو ان الفاظ میں ڈانٹ بتاتا ہے "او بے ریش والے لونڈے ہٹ جانا۔" اصلی الفاظ یہ ہیں (Back beardless boy)
یونان میں بھی داڑھیوں کا رواج تھا۔ اور داڑھی منڈانے کی بدعت سکندر نے قائم کی کہ اس نے اہل مقدونیہ کے سپاہ کی داڑھیاں منڈوا دیں۔ اور اس کو یہ خوف پیدا ہوا کہ کہیں دشمن داڑھی پکڑ کر اس کی سپاہ کو بے قابو نہ کردیں۔ مقدونیہ کے سپاہ نے تعمیل تو کردی مگر مجبوراً اور رکتے ہوئے دل سے۔

موجودہ زمانے میں جرمنی میں داڑھیاں زیادہ ہیں اور ایک شخص مسمے جوہان میو (Juhan mayo) جو فن نقاشی میں استاد ہے۔ اس کی داڑھی اس قدر لانبی ہے کہ اب وہ افسانہ معلوم ہوگی۔ یعنی جب یہ حضرت کھڑے ہوتے ہیں تو بھی آپ کی داڑھی زمین پر لوٹا کرتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ زمانۂ جاہلیت کے عربوں کی ازار ہے اور آپ جب پریشان ہوجاتے ہیں تو اس کو آپ اپنی کمر میں لپیٹ لیا کرتے ہیں جرمنی والے آپ کو ریشائیل (Bearded) کہتے ہیں اور میں ایسے آدمیوں کو خداوند لقا کہا کرتا ہوں جن کا ذکر طلسم ہوشربا میں آتا ہے۔ جب پیٹر اعظم (Palax The Great) نے روسی داڑھیوں پر محصول لگانا شروع کیا تھا تو اس وقت وہ در اصل انگلستان کی نقالی کر رہا تھا بڑے اور چھوٹے آدمیوں کی داڑھیوں پر مختلف محصول قائم کئے گئے تھے جس سے روس میں ایک ہنگامہ مچ گیا تھا۔ مگر آج کل روس میں بھی داڑھیوں کی کوئی وقعت نہیں ہے۔ آج کل داڑھی والے حضرات سوسائٹی میں اچھی نظر سے نہیں دیکھے جاتے ہیں۔
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ اندلس میں مسلمانوں کی سلطنت آٹھ سو سال تک رہی ہے اسلئے وہاں داڑھی رکھنا ضروری خیال کیا جاتا تھا مگر فلپ پنجم (Phillip V) کو چونکہ قدرت کی طرف سے داڑھی عطا نہیں ہوئی تھی اسلئے اس نے حکم عام دیدیا کہ سب داڑھیاں منڈوا دیں۔ اگرچہ لوگوں نے مجبوراً داڑھیاں منڈا دیں مگر ایک آہ کے ساتھ وہ کہا کرتے تھے کہ ہماری روحیں بھی چلی گئیں۔
روز کلن کی (Ros Kolin Ki) یورپ میں ایک مسیحی فرقہ تھا جس کا عقیدہ تھا کہ داڑھی میں خدا کا نور ہے مگر اس کو معلوم نہ تھا جان صاحب لکھنؤ کے شاعر اس بارہ میں کیا فتوی دے گئے ہیں ؎

اور کیا پھبتی کہوں بن آئے ہو لنگور سے　　داڑھی منڈواؤ میں باز آئی خدا کے نور سے

چونکہ پرتگال اندلس کا پڑوسی تھا لہذا وہاں بھی داڑھی کی قدر و منزلت ہونی چاہیے۔
پرتگال امیر البحر (juande castro) نے ایک ہزار اشرفی کی رقم جب گوا (Goa) میں کسی سے قرض لی تو اپنے داڑھی کے چند بال کفالت میں دیدیے اور یہ کہکر کہ "تمام دنیا بھر کا سونا میرے ان بالوں کی برابر

نہیں کرسکتا - اگرچہ اس کفالت کو اس زمانے میں کوئی خیال میں بھی نہ لائے گا - اور نہ کوئی ایسی بات ہی منہ سے نکالے گا
ایک مرتبہ داڑھیوں پر ہاتھ صاف ہوے کے بعد فرانس میں پھر داڑھیوں کی عزت ہونے لگی فرانس اول (Francis I) کے ٹھوڑی پر ایک زخم کا نشان تھا اس کو چھپانے کے لئے اُس نے داڑھی رکھ لی بس پھر کیا تھا گو یا کل اہل فرانس کی ٹھوڑیوں پر زخم پیدا ہوگئے اور ہر ایک نے داڑھی رکھ لی کچھ دنوں یورپ میں یہ رواج رہا کہ رخسار صاف رکھے جاتے تھے اور ٹھوڑی پر داڑھی ہوتی تھی - بعض جگہ ٹھوڑی صاف ہوتی تھی اور گالوں پر بال نظر آتے تھے -

ایک مرتبہ راجرس (Rogers) نے ٹیلی رینڈ (Talley rand) سے دریافت کیا کہ کیا نپولین خود داڑھی مونڈا کرتے ہیں اس نے جواب دیا کہ " جو پیدائشی بادشاہ ہوتے ہیں اُن کے لئے حجام کی ضرورت ہوتی ہے لیکن شاہان خود رو خود مونڈا کرتے ہیں "

یونانی کلیسا کا قانون ہے کہ داڑھی رکھی جائے اور رومی کلیسا کا قانون ہے کہ نہ رکھی جائے اور بعض بعض لوگ اس خیال کے ہیں کہ داڑھی والے عیسائی نہ خیال کئے جائیں مگر حق یہ ہے کہ وہ استاد جس کی پیروی کے دونوں مدعی ہیں خود داڑھی رکھا کرتے تھے -

قدیم زمانے میں جس کی لانبی داڑھی ہوتی تھی وہ ایک ذی عزت تصور کیا جاتا تھا - نے پلز (Naples) میں پاپائے روم کی تصاویر میں کلیمنٹس سابع (Clements VII) ۱۵۳۴ - ۱۵۲۳ - سے لیکر سکندر ہشتم (۹۱ - ۱۶۸۹) تک سب کی داڑھیاں ہیں کلیمنٹس کی داڑھی لمبی اور سیاہ ہے مگر اس کے بعد داڑھیوں کا صفایا ہوگیا - تیرہویں صدی میں انگلستان میں داڑھی داخل تہذیب تھی لیکن ہنری ہشتم کے زمانہ میں لنکن ان (Lincoln Inn) میں یہ حکم دیا گیا کہ کھانے کی بڑی میز پر داڑھی والے نہ آئیں یا دوگنا محصول دیں اس کے بعد سے داڑھیوں پر محصول لگنے لگا یہ محصول داڑھی والے کی حالت کا اندازہ کرکے لگایا جاتا تھا -

۱۵۵۵ء میں ملکہ میری (Mary) نے چار آدمی ماسکو روانہ کئے جنمیں ایک کا نام جارج کلنگ ورتھ (George Killing worth) تھا آپ کی ریش مبارک پانچ فٹ دو انچہ کی تھی - جسکو دیکھکر ایوان (Ivan) بھی مسکرا دیا یہ گھنی اور چوڑی تھی اور کھانے کے بعد ایوان اس سے کھیلا کرتا تھا -

بہت سے پروٹسٹنٹ جو اپنے مذہب کی وجہ سے قتل کئے گئے داڑھی والے تھے - مگر الزبتھ نے بھی داڑھی پر تین شلنگ اور چار پنس سالانہ کا محصول لگا دیا یہ محصول بھی زیادہ تھا - اور حکم کی حماقت تو اظہر من الشمس ہے مگر یہ حکم چلا نہیں اس کے کچھ دنوں بعد انگلستان میں داڑھی منڈانے کا رواج ہوگیا - ایک صاحب نے سنہ ۱۸۶۰ء میں یہ وعظ شروع کردیا کہ داڑھی سے گلے اور سینے کی حفاظت ہوتی ہے -

شاہان انگلستان میں ایڈورڈ ہفتم اور جارج پنجم نے بھی داڑھی رکھی اور ایک انوکھی قسم کی داڑھی دنیا میں قائم کردی

تھ ساتھ ہی لارڈ کرزن نے داڑھی اور مونچھ دونوں کا صفایا کرا دیا۔

اب یہاں سے ہمکو یہ دیکھنا ہے کہ اسلام اور داڑھی کا کیا تعلق ہے، ابھی جبکہ شریعت مکمل نہیں ہوئی تھی اس وقت کا واقعہ ہم کو معلوم ہے کہ بادشاہ ایران خسرو پرویز کو جناب رسالت مآب صلعم نے ایک خط روانہ کیا جس کو پڑھ کر وہ بہت برہم ہوا۔ خط کو چاک کر ڈالا اور کہنے لگا کہ یہ شخص مرا غلام ہے اور مجھکو ایسی بے ادبی سے خط لکھتا ہے۔ پھر والی یمن باذان کے نام حکم بھیجا کہ یہ شخص جو حجاز میں دعوائے نبوت کرتا ہے اس کے پاس اپنے دو افسروں کو روانہ کردو اور حکم دو کہ اس شخص کو گرفتار کرکے میرے پاس آئیں باذان نے اس حکم کے مطابق تابوہ اور خرخسرہ اپنے دو سرداروں کو بھیجدیا۔

ان کی داڑھیاں منڈی ہوئی تھیں یہ بات عرب کے مذاق کے مطابق بالکل انوکھی تھی۔ آپ نے اُن سے سوال کیا۔ تم کو داڑھی منڈوانے کو کس نے کہا۔" اس نے جواب دیا۔ ہمارے خداوند (شاہ ایران) کا حکم ہے۔ آپ نے فرمایا۔ مگر میرے خداوند (خدا تعالےٰ) کا حکم ہے کہ داڑھی کو بڑھنے کے لئے چھوڑ دوں اور مونچھوں کو کٹوا دوں۔"

ایک داڑھی کا شوقین اس حدیث سے استدلال کر سکتا ہے کہ داڑھی فرض ہے لیکن داڑھی منڈانے کا شوقین یہ کہہ سکتا ہے کہ احادیث نبویہ کی تدوین حضرت رسول کریم صلعم سے دوسو برس بعد ہوئی۔ اس لئے یہ حدیث قابل سند نہیں پھر یوں بھی دیکھنا چاہیئے کہ داڑھی رکھنا اسلام میں اگر فرض ہوتا تو جسطرح نماز روزہ حج زکواۃ کی فرضیت قرآن کریم میں ہے۔ اُس کی فرضیت کا ذکر بھی ہوتا۔ لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ حضرت رسول کریم صلعم نے داڑھی خود رکھی اور اسی لئے دنیائے اسلام میں اس پر ضرور عمل کیا گیا اور اب بھی عامل بنائے جانے کی جائز و ناجائز کوشش کی جاتی ہے۔ نماز ترک ہوجائے اس کی پروا نہیں روزہ چھوٹ جائے بالکل معمولی بات ہے۔ کہدیا جائے گا کہ فلاں شخص میں یہ کمزوری ہے غرضکہ ہر فعل برداشت کر لیا جائیگا مگر داڑھی منڈا امرود از لی ہی رہیگا۔ مجھکو ذاتی علم ہے کہ بعض لوگ داڑھی منڈوں کے ساتھ کھانا بھی پسند نہیں کرتے۔

امر حق ہے کہ حضرت رسول کریم کے زمانے میں عرب میں داڑھی کا رواج تھا اور ہر نبی کا یہ فرض ہوتا ہے کہ جب تک اس کو خدا تعالےٰ کے یہاں سے کوئی خاص حکم نہ ملے وہ ان مراسم میں تبدیلی نہیں کرتا جو اس کی قوم اور ملک میں رائج ہوتے ہیں۔ یہی حال عورت کے مہر کا ہے (اگرچہ اس کا ذکر قرآن کریم میں بھی ہے مگر عرب میں یہ رسم جاری تھی) اس موقع پر ہم آپ کو آپ ہی کے گھر کی ایک مثال دیتے ہیں، پنجاب میں جہیز ہارے اور یوپی میں بری کا دستور ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو اس کے معنی لڑکیوں کو فروخت کرنے کے ہیں۔ لیکن چونکہ اس میں شرک کی بو نہیں اس لئے اس کی تائید ان مقامات سے بھی۔ جہاں سے۔ ہونا چاہیئے۔

صحابہ کرام لانبی داڑھیاں رکھا کرتے تھے اور مونچھیں کاٹ دیا کرتے تھے اور مونچھیں اس نفاست سے کاٹا کرتے تھے کہ جلد نظر آتی تھی۔ جب مسلمان دوسری قوموں سے ملنے لگے تو اُن میں یہ تبدیلی ہوئی (خاصکر ایرانیوں کے میل جول سے) کہ وہ داڑھیاں

گھٹوانے لگے ترکوں نے اس میں اور تغیر پیدا کیا اور سلیم نے داڑھی کو خیرباد کہا۔ ہندوستان میں اکبر و جہانگیر نے داڑھیاں منڈوائیں مگر اس کا اثر غالباً دوسرے امرا اور عام رعایا پر کم پڑا

ہندوستان میں لکھنؤ شیعیت کا گہوارہ ہے۔ اور وہاں کے سنی بھی مطیع التشیع ہیں۔ میں بچہ تھا ایک دن والد مرحوم حضرت مولوی عابد حسین صاحب قبلہ (جو خود بھی ایک نہایت شاندار داڑھی والے بزرگ تھے) سے ملنے منشی نثار حسین مرحوم مالک پیام تشریف لائے اور ان کا حلیہ یہ تھا کہ داڑھی منڈی ہوئی تھی اور سر پر نکے دار ٹوپی تھی۔ مگر اس کے چند سال بعد جب انکی ملاقات لکھنؤ میں ہوئی تو ان کے منہ پر بھی داڑھی تھی۔ وہ فرماتے تھے کہ جیپور کے ہندؤں کو دیکھکر داڑھی میں نے رکھ لی۔ وہ مہاراجہ مادھو سنگھ کے سامنے نرائن سنگھ راٹھور داڑھی منڈوا کر گئے تو انھوں نے ڈیوڑھی بند کردی اور حکم دیا کہ یہ ہمارے سامنے سے چلا جائے کیونکہ یہ انگریزوں کی تتبع میں داڑھی منڈا کر آیا ہے۔ مہاراجگان جے پور میں تقریباً کثرت سے ایسے ملیں گے جن کے چہروں پر داڑھیاں ہیں۔ یہ سب اسلام کا کرشمہ نظر آتا ہے

جے پور میں میرے ساتھ ایک لڑکا پڑھا کرتا تھا۔ ساگر کرن اس کا نام تھا۔ اس کے والد یا چچا سمندر کرن جی یا فوج کرن جی (ناموں میں شبہ ہوتا ہے) ان میں سے ایک صاحب رزیڈنسی میں تھے ان کی ٹھوڑی میں زخم آگیا۔ میں نے مشورہ دیا (ڈاکٹر محبوب عالم صاحب احمدی کی موجودگی میں) کہ اس قدر حصہ داڑھی کا منڈوا دیجئے۔ انھوں نے کہا مرجانا منظور ہے مگر یہ منظور نہیں امر حق یہ ہے کہ سنن دو قسم کی ہیں۔

(۱) سنن عبادیہ اور (۲) سنن عادیہ۔

لاریب سنن عبادیہ کی پیروی ہر مسلمان پر لازم ہے اگر وہ نکرے تو وہ مستوجب عقاب ہوگا۔ لیکن سنن عادیہ کچھ اور ہی چیز ہے۔ حضرت رسول کریم روزرات کو سرمہ لگاتے تھے۔ کیا وجہ ہے کہ اس سنت پر زور نہ دیا جائے۔ حضرت رسول کریم لوکی تناول فرماتے تھے۔ کیا وجہ ہے کہ اسپر زور نہ دیا جائے۔ حضرت رسول ترید پسند فرماتے تھے۔ کیوں نہ مسلمان عالم اس کو کھائیں۔ حضرت رسول کریم نے تمام زندگی سوائے تہمت کے پائجامہ کبھی نہ پہنا۔ مسلمان کیوں پائجامہ پہنا کرتے ہیں اور کیوں نہ اس کے ترک پر زور دیا جاتا ہے۔ حضرت رسول کریم کے گیسو دونوں شانوں پر رہا کرتے تھے۔ کیوں نہیں اُن کی تقلید اس خاص معاملے میں کی جاتی ہے۔ حضرت رسول کریم نہ صرف خود کئی مرتبہ دن میں مسواک کرتے تھے بلکہ فرمایا کرتے تھے کہ اگر میری امت پر دیر سے عشا کی نماز اور مسواک شاق نہ ہوجاتی تو میں دونوں کو فرض کردیتا۔ سچ یہ ہے کہ جناب رسول کریم نے نہایت لطیف طریقے سے مسواک کو تو فرض ہی کردیا مگر کس قدر مسلمان اسپر عامل ہیں۔ شاید ایک بھی نہیں۔ افسوس ہے کہ داڑھی منڈوانے کو تو لوگ گناہ کبیرہ فرماتے ہیں مگر ان کو یہ خبر نہیں کہ کبائر کیا ہیں اور صغائر کیا ہیں لاریب ہر صغیرہ گناہ کبیرہ ہوسکتا ہے۔ مگر ستم ظریفی یہ ہے کہ یہ گناہ ہی نہیں ہے۔ اور پھر گناہ کہا جاتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ داڑھی رکھنے کا حکم قرآن میں نہیں اس لئے فرض نہیں۔ حدیث کے متعلق میں پہلے ہی عرض کرچکا ہوں

ضکہ یہ ایک سوشل بات ہے اور اپنے ذوق پر اس کا انحصار ہے میں نے اس معاملے میں احمدیوں کو بھی وہی فرسودہ اور پرانی
باتیں پیش کرتے ہوئے دیکھا ہے ان کے حکم وعدل کا ہر قول آب زر سے لکھنے کے قابل ہے جو انھوں نے کسی کے جواب میں
فرمایا تھا کہ آپ کو داڑھیوں کی فکر ہے اور مجھکو ایمانوں کی فکر ہے۔

(ڈاکٹر) محمد عمر

(نگار) یہ مضمون ہمارے ایک عزیز دوست ڈاکٹر محمد عمر صاحب کا ہے، جو نہایت شدت کے ساتھ "ریش دراز" کی صفائی پر عامل ہیں اور مشکل ہی سے
چند گھنٹے اُن کے چہرہ کے اعصاب کو حالت سکون میں گزرتے ہوں گے کہ وہ پھر انھیں "فرک وڈلک"، حک وقلع اور "حلق وضغط" کے عذاب
میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ اس مقالہ میں انھوں نے یہ امر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ داڑھی رکھنا کوئی امر مستحسن نہیں ہے، حالانکہ
واقعات وحالات جو فراہم کئے ہیں وہ سب داڑھی رکھنے کے موید ہیں۔ اخیر میں مذہبی حیثیت سے جو بحث کی ہے وہ بھی بالکل تشنہ
و نامکمل ہے۔ اول تو مذہبی حیثیت سے بحث کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی کیونکہ مضمون کی ترتیب و نوعیت اس کے منافی تھی، لیکن اگر
اس طرف توجہ کی گئی تھی تو اسے تکمیل تک پہونچانا چاہئے تھا۔

یقیناً داڑھی رکھنے اور نہ رکھنے پر اسلام کا انحصار نہیں ہے اور یہ بھی بالکل درست ہے کہ یہ بالکل سوشل معاملہ ہے اور ارباب
مذہب کو اس طرف زیادہ توجہ کی ضرورت نہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ داڑھی نہ رکھنے کی افضلیت یا داڑھی رکھنے کا عدم استحسان
کیونکر اس مضمون سے ثابت ہے۔ اگر وہ فن طب ہی کے لحاظ سے (جس کے وہ ماہر ہیں) داڑھی کے ساتھ "عدم ۔ داداری" کو
ثابت کر دیتے تو بھی بحث کا ایک اسلوب قائم ہو جاتا

خود میرا مسلک نہ صرف داڑھی بلکہ تمام ایسے مسائل میں جن کا تعلق انفرادی معاشرت سے ہے، ہمیشہ یہ رہا ہے کہ
اپنے آرام و آسائش، اور اپنے مصالح و مفاد کو مقدم سمجھتا ہوں۔ اس سے قبل جب میں داڑھی رکھتا تھا اس وقت بھی غرض
ثواب نہ تھی اور اب منڈاتا ہوں تو اس لئے نہیں کہ داڑھی رکھنے والوں سے کوئی عناد ہے۔ اگر کوئی شخص داڑھی رکھنے کے بعد
زندگی زیادہ اطمینان وسکون کے ساتھ اور کارآمد طور پر بسر کر سکتا ہے تو اس کو داڑھی رکھنا چاہئے اور اگر کوئی داڑھی منڈائے
کے بعد یہ کیفیت حاصل کر سکتا ہے تو اُس کو منڈا دینا چاہئے۔ کیونکہ عمر کے ساتھ انسان میں ولولۂ عمل بھی ضعیف ہو جاتا ہے
اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بڑی داڑھی (اور وہ بھی خصوصیت کے ساتھ جب سفید ہونے لگے) انسان میں اپنے معمر اور ضعیف ہونے
کا احساس پیدا کر دیتی ہے اس لئے میرے نزدیک فوراً داڑھی منڈا دینا چاہئے اگر اس کے سبب سے یہ مضمحل کر دینے والی کیفیت
پیدا ہوتی ہے، لیکن اگر کسی شخص میں یہ احساس پیدا نہیں ہوتا تو اس کے لئے منڈا دینا ضروری نہیں ہے۔ جس وقت تک
میری داڑھی کے بال سیاہ تھے میں اپنے آپ کو جوان سمجھتا تھا اور زندگی میں ولولۂ عمل کے ساتھ ساتھ خاص قسم کا نشاط
بھی محسوس کرتا تھا، لیکن جب سپیدی نمودار ہوئی تو میں نے اپنے تو اہیں اضمحلال محسوس کرنا شروع کیا اور چند دن تک

غور کرنے کے بعد جب داڑھی منڈا دی، تو یہ کیفیت بھی محو ہو گئی اور میں ایک تازہ قوت اپنے اندر محسوس کرنے لگا۔ لوگ شباب میں داڑھی منڈاتے ہیں جو بالکل لایعنی سی بات ہے۔ حقیقتاً داڑھی منڈانے کا زمانہ تو اس وقت سے شروع ہوتا ہے جب سفیدی جھلکنے لگے۔ کیونکہ اگر اسکر وائلڈ کی اس نظریہ پر عمل نہیں ہو سکتا کہ "اعادۂ شباب کی بہترین تدبیر اپنے آپ کو معاصی شباب کے سپرد کر دینا ہے" تو کم از کم اس چیز کو ضرور سامنے سے ہٹا دینا چاہیے جو ہر وقت "جرس کارواں" بنی ہوئی کوچ کا اعلان کرتی رہتی ہے۔

انسان کی زندگی نام ہے صرف اس کی "جوانی" کا کیونکہ یہی وہ چیز ہے جس کے بغیر "طاعت میں کچھ مزہ ہے نہ لذت گناہ میں" اس لئے اس کی بقا و تحفظ کے لئے ہر قربانی ضروری ہے۔ بشرطیکہ یہ انفرادی مصلحت، اجتماعی مصالح کے لئے مضرت رساں نہ ثابت ہو۔

طبی نقطۂ نظر سے لوگوں میں اختلاف ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ روز روز اُسترے کا استعمال اعصاب باصرہ کو کمزور کر دیتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ اس سے کہربائیت پیدا ہو کر اعصاب کو اور تقویت پہنچتی ہے۔ میرے نزدیک اس باب میں کوئی کلیہ قائم نہیں ہو سکتا اور ممکن ہے کہ مختلف لوگوں پر اس کا مختلف اثر ہوتا ہو۔ لیکن اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ داڑھی کا رکھنا بصارت یا دماغ کے لئے مفید ہے تو بھی یہ کوئی ایسی زبردست دلیل نہیں ہو سکتی کیونکہ محض "حدت بصارت" بغیر نشاط روح کے بیکار ہے۔

اڈیٹر

ظریف شاعروں کا تذکرہ

تذکرۂ خندۂ گل

اسوقت تک مطبع سے باہر نہیں آیا۔ اسوقت تک ۵۰ صفحات چھپ چکے ہیں اور تقریباً ۵۰ صفحات اور باقی ہیں مینیجر کو باہر کے کام سے اسقدر کم فرصت ہے کہ مسلسل اس کتاب کی طباعت نہیں ہو سکتی۔ تاہم کام بڑی حد تک ختم ہو چکا ہے اور یقین ہے کہ آئندہ ماہ کے اخیر تک کتاب تیار ہو جائیگی اور جن حضرات کے روپیہ آچکے ہیں انکو رعایتی قیمت پر بذریعہ رجسٹری روانہ ہو جائیگی۔

اسی سلسلہ میں یہ ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ بعض اخباروں میں عظمت بکڈپو کیطرف سے ایک اشتہار تذکرۂ خندۂ گل کا نکل رہا ہے لیکن وہ سو ڈیڑھ سو صفحہ کی ایک مختصر سی کتاب ہے جسمیں چند مشہور ظریف شاعروں کا حال درج ہے۔ ہمارا تذکرہ بالکل علیحدہ چیز ہے جسمیں کئی سو ظریف شاعروں کے حالات اور انتخاب کلام درج کیا گیا ہے۔

"مینیجر نگار لکھنؤ"

اے سرزمینِ گجرات!

اے سرزمین گجرات! اے خلدزار الفت! پھولوں میں تیرے رقصاں، روحِ بہار الفت!
تیرا ہر ایک ذرہ، اک یادگار الفت!
اور سجدہ زار الفت! اے سرزمینِ گجرات!

حسن وجمال کا اک گہوارہ کہئے تجھکو! شعروشباب کا اک نظارہ کہئے تجھکو!
فطرت کا ایک نقش "زرکارہ" کہئے تجھ کو!
شہپارہ کہئے تجھ کو! اے سرزمینِ گجرات!

اے سرزمینِ گجرات! تو کانِ عاشقی ہے! پنجاب کے بدن میں تو جانِ عاشقی ہے!
ہاں، جانِ عاشقی ہے، ارمانِ عاشقی ہے!
ایمانِ عاشقی ہے! اے سرزمینِ گجرات!

وہ سوہنی مہینوال، وہ عشق باز تیرے! وہ روحِ عاشقی کے آوارہ راز تیرے!
سوز وگداز سے وہ لبریز ساز تیرے!
نغمہ طراز تیرے! اے سرزمینِ گجرات!

افسانۂ حزیں ہے رسوائے عام جن کا! دنیائے عاشقی میں زندہ ہے نام جن کا!
آنسو کی طرح چھلکا الفت کا جام جن کا!
دورِ مرام جن کا! اے سرزمینِ گجرات!

ماتم سرا ہے جن کے غم میں چناب اتنک! مضطر ہے جن کی خاطر ہر موج آب، اتنک!
ہاں، جن کو ڈھونڈھتے ہیں ہر سو حباب اتنک!
چشم پرآب اتنک! اے سرزمینِ گجرات!

تیری ہی خاک اُن کا گہوارہ حسیں تھی! تیری فضا ہی انکی آغوشِ نازنین تھی
تیرے ہی در پہ ان کی خاک آشنا جبیں تھی!
ہاں، سجدہ آفریں تھی! اے سرزمینِ گجرات!

آنکھوں کے سامنے ہو، رودِ چناب جس دم مصروفِ نور پاشی ہو ماہتاب جس دم!

اور دور، جھلملاتی، ہو سطحِ آب جس دم!
جوں سیم ناب جسدم! اے سرزمین گجرات!

اس دم مرے تصور، ہم رنگ خواب ہو کر! لہراتے ہیں افق پر امواجِ آب ہو کر!
دکھلاتے ہیں فروغِ صہبائے ناب ہو کر!
رقصِ شراب ہو کر! اے سرزمین گجرات!

آتی ہے سوہنی جب دریا کے پار ہونے! عاشق کی حسرتوں پر جا کر نثار ہونے!
طوفاں کی شورشوں کے بے بس، شکار ہونے!
ماتم گسار ہونے!! اے سرزمین گجرات!

دریا پہ ہیں پریشاں وہ دل گداز نغمے! وہ سوزِ عاشقی کے شعلہ طراز نغمے!
نغمے، وہ مستِ کیفِ ناز و نیاز نغمے!
پر سوز و ساز نغمے! اے سرزمین گجرات!

موجوں کی دھیمی دھیمی آواز آ رہی ہے! یا روح سوہنی کی در پردہ گا رہی ہے!
اور دردِ عاشقی کے نغمے سنا رہی ہے!
آنسو بہا رہی ہے! اے سرزمین گجرات!

دنیائے عاشقی پر، احساں ہیں تیرے اب تک حسن آفریں، بہشتی میداں ہیں تیرے اب تک
اور عشق خیز، رنگیں داماں ہیں تیرے اب تک!
ارماں ہیں تیرے اب تک! اے سرزمین گجرات!

عریاں ہے حسن، تیرے سرسبز گلشنوں میں! آوارہ عشق، تیرے شاداب دامنوں میں!
فطرت، برہنہ، تیرے نورانی ایمنوں میں!
رنگین مسکنوں میں! اے سرزمین گجرات!

اک سوہنی ہے اب بھی، دامن میں تیرے پنہاں! اک یاسمیں ہے اب بھی، گلشن میں تیرے پنہاں
ہے اک شعاع اب بھی ایمن میں تیرے پنہاں
مسکن میں تیرے پنہاں! اے سرزمین گجرات!

بے کیفیٔ جہاں کی تکلیف سے بچا لے! للہ، مجھ کو اپنے صحراؤں میں بلا لے!
اور دوسرا مہینوال اپنا مجھے بنا لے!

اس سادہ زندگی میں لذت نہیں ہے کوئی! اس ساز میں نوائے بہجت نہیں ہے کوئی!
اس پھول میں شمیم راحت نہیں ہے کوئی!
دیوانوں کی دعا لے! اے سرزمین گجرات!

آنکھوں میں بس رہی ہیں وہ پر بہار راتیں! وہ مشک بو ہوائیں، وہ مشک بار راتیں!
وہ نشہ گوں فضائیں، وہ نشہ زار راتیں!
رنگت نہیں ہے کوئی! اے سرزمین گجرات!

ماضی کے آئینہ سے ہاں پھر نقاب اٹھا دے! بھولا ہوا سماں وہ، دنیا کو پھر دکھا دے!
گجرات کی فضاؤں کو نجد پھر بنا دے!
وہ "یادگار" راتیں! اے سرزمین گجرات!

پھر آرزو کو رسوا کرنے کی آرزو ہے!! رونے کی اور آہیں بھرنے کی آرزو ہے!!
سلمیٰ کے قدموں پر سر دھرنے کی آرزو ہے!!
سلمیٰ سے پھر ملا دے! اے سرزمین گجرات!

مرنے کی آرزو ہے!!! اے سرزمین گجرات!!!

اختر شیرانی

"کیفِ مجبوری"

جو درد کا مرکز ہے، وہ ساز اذیت ہوں چھیڑو نہ مجھے لوگو، مجبور محبت ہوں
اٹھ اٹھ کے تمنائیں کرتی ہیں بپا محشر بدنام محبت ہوں، ناکام مسرت ہوں
دنیا کو مبارک ہو سرشاری و سرمستی میں قلب شکستہ ہوں، زندانی حیرت ہوں
مانا کہ طلسم زا ہستی ہے مری، لیکن اللہ کروں کیا جب غرقاب محبت ہوں
ناکامیِ پیہم ہوں، بیتابیِ فرقت ہوں
گردیدۂ غربت ہوں، محرومیِ قسمت ہوں
اے درد ذرا تھم جا، اتنا نہ ہراساں کر یعنی نہ پشیماں کر مجھ کو نہ پریشاں کر

وہ آئیں اگر آئیں دہاں کلبۂ احزاں میں　　اے ضبطِ غمِ دوری کچھ کارِ نمایاں کر
کچھ پھول ہوں ارماں کے کچھ داغ ہوں حرماں کے　　جیبِ لطف سے دامن یوں رشکِ گلستاں کر
اک عمر کی مجبوری دیتی ہے خبر مجھ کو　　دیوانۂ نظارہ اب چاک گریباں کر
میں صرفِ نظر ہو کر کب سے ہوں نظر پیما!　　رد ہی میں مری آنکھیں خاموش یہ طوفاں کر
آجا مری دنیا میں اک بار تماشا بھر　　احسان جو کرنا ہے، تو مجھ پہ یہ احساں کر

دن ختم ہوا دے کر پیغام شبِ فرقت
حافظ کو ملا ہے یہ انعام شبِ فرقت

حافظ غازی پوری

دل سے خطاب

نہ کچھ فکرِ جزا تجھکو، نہ کچھ خوفِ سزا تجھکو　　یہ آخر کیا ہوا ہے اے دلِ بے مدعا تجھکو
تجھے ہستی کی ہستی پر بھی شک ہوتا ہے رہ رہ کر　　نہ اقرارِ بقا تجھکو نہ انکارِ فنا تجھکو
تو ہر سوز و دروں کی اک نئی تفسیر کرتا ہے!　　بس اک ملتا رہے ہر دم نیا غم آشنا تجھکو
نظامِ دہر میں تیری بھی فطرت کوئی فطرت ہے　　نہ دولت کی خوشی تجھکو نہ عسرت کا گلا تجھکو
تری فیاضیاں اللہ اللہ اس توکل پر!　　کسی کو سونپ دے، عالم جو قدرت دے خدا تجھکو
تری خاطر ضمیرِ فطرتِ انسان نہ بدلے گا　　کہاں سے لا کے دے کوئی رفیقِ بے ریا تجھکو
تو کہتا ہے کہ میں خاکی نہیں ہوں بلکہ نوری ہوں　　ملی ہے کیا کوئی دنیا اس عالم کے سوا تجھکو
خدا معلوم کرتا ہے تو کس عالم کا نظارہ　　نظر آتی ہے ہر ذرہ میں تصویرِ وفا تجھکو

بدل دے اپنی فطرت کو کہ آئینِ کہن بدلا
زمیں بدلی، فلک بدلا، زمانہ کا چلن بدلا

محمود اسرائیلی

(۱)

گو ابھی طفلِ شیر خوار ہوں میں　　توسنِ دہر پر سوار ہوں میں
دم میں مہکا دیا چمن - گرچہ　　غنچۂ اولِ بہار ہوں میں

(۲)

گو ابھی برق بیقرار ہوں میں　　حسنِ مخفی کا اعتبار ہوں میں
قاصدِ تیز گامِ ہستی ہوں　　گو افق پر ابھی غبار ہوں میں

(۳)

گرچہ ہوں طفل ہوشیار ہوں میں　　ساقیِ بزمِ روزگار ہوں میں
اتنی پابندیوں میں رقصاں ہوں　　جوہرِ برقِ بیقرار ہوں میں

(۴)

گو ابھی چشمِ شاخسار ہوں میں　　بیخزاں جو ہے وہ بہار ہوں میں
آج ہوں صرف قطرۂ شبنم　　کل کا لولوئے آبدار ہوں میں

آمین حزیں

غزلیات

طاہر رامپوری

گواہِ نازِ دلِ درد آشنا ہوگا فریبِ حسن کا راز اس سے آئینا ہوگا
بصد نیاز جھکے گی ادھر جبینِ ادب نظر نواز جدھر تیرا نقشِ پا ہوگا
وہ اور عشق کی سرگرمیوں کی مدح سرا کسی نے حالِ مرا ان سے کہہ دیا ہوگا
سمجھ رہا ہوں میں عالم فریبیاں طاہرؔ
یہ دیکھنا ہے قیامت میں اور کیا ہوگا

عشق رامپوری

حشر میں قابلِ پرسش ترا مئنوش نہ تھا اتنی پی لی تھی کہ دنیا کا اُسے ہوش نہ تھا
کسی تک تو محبت کا کوئی جوش نہ تھا اسنے جب ہوش سنبھالا تو مجھے ہوش نہ تھا
طاقتِ دید کجا اور کجا شانِ جمال پر وہ اُٹھنے بھی نہ پایا کہ مجھے ہوش نہ تھا
دیکھنے والوں میں رسوا ئے محل ہوں میں ہی عالمِ ہوش میں شاید کوئی بیہوش نہ تھا
اہلِ اظہار کے لئے عشقؔ مقابل تھے بہت
کوئی دنیا میں جوابِ لبِ خاموش نہ تھا

کیفی چریاکوٹی

عقل و خرد میں ہوش کسی کا نہ کیجئے یعنی جنونِ عشق کو رسوا نہ کیجئے
دل ہے بقدرِ فرصتِ یک لمحہ خیال اس کو نگاہِ شوق سے دیکھا نہ کیجئے
ہرچند موت غم سے رہائی کا نام ہے میرے لئے اسے بھی گوارا نہ کیجئے
یہ فلسفہ ہے راحتِ ایامِ زیست کا دل بس میں ہو تو کوئی تمنا نہ کیجئے

تا چشم موجِ اشک کو آنے نہ دیجئے — یہ دل کا راز ہے اسے افشا نہ کیجئے
ہیں محتسب کی آنکھ سے آنکھیں لڑی ہوئی — یعنی نگاہ جانب صہبا نہ کیجئے
جل جل کے کہہ رہے تھے یہ پروانے شمع سے — احسان ریست ہو تو گوارا نہ کیجئے
بتلادوں آج فلسفۂ خواہشِ نمود — اس زندگی کو وقف تماشا نہ کیجئے
سرمایۂ نشاط ہے اس ایک بات میں — اچھے بڑے کی دہر میں پروا نہ کیجئے
پرزہ جنونِ عشق کا درماندگی میں ہے — اچھا ہے قصد جانبِ صحرا نہ کیجئے

بازار حسن و عشق ہے کیفیؔ نظر فریب
ہے نقد دل جو پاس تو سودا نہ کیجئے

نظیرؔ لودھیانوی

راہِ وفا میں گام اٹھا عاشق زار دیکھکر — ڈالتے ہیں قدم یہاں شاہسوار دیکھکر
حسن بھی کیا تھا سحر دم ڈھل گئی دل سے گردِ غم — ہو گئے بے خبر ہم آئنہ وار دیکھکر
دشتِ جنوں کی سیر کا قیس کو بھی تھا حوصلہ — ایک قدم نہ اٹھ سکا میرا غبار دیکھکر
آئی کلیم کو صدا یہ بھی ہے کوئی دیکھنا — لطف یہ ہے رہیں بجا صبر و قرار دیکھکر
روح میں غم سما گیا دل پہ سکوت چھا گیا — تیرا خیال آگیا جوشِ بہار دیکھکر
در سے ہمیں نہ تو اٹھا اس میں ترا زیاں ہے کیا — بیٹھ گئے ہیں بے نوا راہ گذار دیکھکر
ہے یہ وفور یاس کیوں رنج و غم و ہراس کیوں — ہو گئے تم اداس کیوں میرا مزار دیکھکر

گم تھا سرور عاشقی زیست نظیرؔ بار تھی
روح نہال ہو گئی جلوۂ یار دیکھکر

شاعر کا انجام

بالکل ختم ہو گیا تھا۔ اس لئے دوبارہ اس کی کتابت کرائی گئی جو ختم ہو چکی ہے۔ مئی میں یہ کتاب بھی تیار ہو جائے گی۔ حضرت نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ ہے اور اس میں تمام وہ زور بیان، حسن انشا اور بلندی تخیل اپنی پوری قوت کے ساتھ پائی جاتی ہے۔ جو جناب نیاز کی تحریروں کی خصوصیت خاصہ ہے۔

قیمت معہ محصول ڈاک ۱۲؍

مطبوعات موصولہ

حیات جلیل تذکرہ ہے علامہ میر عبدالجلیل بلگرامی کا جسے مولوی سید مقبول احمد صاحب صمدنی سررشتہ دار کمشنر الہ آباد نے مرتب کیا ہے۔ یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے حصۂ اول میں پہلے قصبہ بلگرام کی تاریخ درج کی گئی ہے اور پھر علامہ عبدالجلیل بلگرامی کے نسب سے بحث کرتے ہوئے مسئلہ سیادت و سیدیت پر بسیط روشنی ڈالی ہے۔ اور اس کے بعد انکی ولادت، تربیت، تعلیم، انتسابات علمیہ، عقاید و معمولات، مشاغل حیات وغیرہ تمام ان امور سے بحث کی گئی ہے جنکا ذکر ایک تذکرہ میں ضروری ہے۔

دوسرے حصہ میں انکی ازدواج، اولاد، تلامذہ، خدام، تصنیفات، شاعری وغیرہ کا ذکر ہے اور اسطرح دونوں حصے تقریباً ۵.. صفحات میں ختم ہو جاتے ہیں وہ حضرات جنکی نظر کچھ بھی وسیع ہے، علامہ میر عبدالجلیل بلگرامی کے نام سے واقف نہیں ہیں اور نہ بلگرام کے اس نیر درخشاں کے لمعات علم و فضل سے بھی آگاہ ہیں۔ اس لئے یہ تذکرہ حقیقتاً ایک ایسی ہستی کا تذکرہ ہے جس کے مفصل حالات و سوانح کو اس سے بہت قبل شایع ہو جانا چاہئے تھا اور جسکے واقعات زندگی نہ محض اکابر پرستی بلکہ علم پروری اور نکتہ سنجی کے لحاظ سے بھی بہت زیادہ قابل قدر ہیں۔

علامہ عبدالجلیل کا زمانہ گیارھویں صدی ہجری کا آخری قرن اور بارھویں صدی کا اول قرن تھا۔ یعنی اورنگ زیب (خاندان مغلیہ کا مشہور فرمانروا) کے تخت نشینی سے تین سال کے بعد انکی ولادت ہوئی اور اسکی وفات کے بعد ۱۸ سال تک زندہ رہے۔ یعنی انہوں نے عہد عالمگیری کا تزک و احتشام بھی دیکھا، جب دولت مغلیہ انتہائی عروج پر تھی اور فرخ سیر کا وہ پرآشوب عہد بھی دیکھا جس سے مغلیہ سلطنت کے زوال کی ابتدا ہوتی ہے۔

ہرچند اس عہد کے سیاسی تاریخ میں علامہ عبدالجلیل نے کوئی حصہ نہیں لیا، لیکن اپنے علم و فضل کے لحاظ سے دربار عالمگیری اور فرخ سیر کے حضور میں انکو متعدد بار باریابی کا موقعہ ملا اور منصب و جاگیر بھی عطا ہوئی۔ لیکن فاضل مؤلف نے اپنے حواشی سے اسکو حقیقتاً ایک تاریخی کتاب بنا دیا ہے اور کوئی مقام، نام، لفظ، مسئلہ، یا بحث ایسی نہیں ہے جسکا ذکر ضمناً اصل کتاب میں آگیا ہو اور پھر اس کی لغوی، تاریخی، جغرافی، اور سیاسی تحقیق حاشیہ میں درج نہ کی گئی ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ مولوی سید مقبول احمد صاحب نے اس کتاب کی ترتیب میں وہ غیر معمولی محنت و کاوش صرف کی ہے جو صرف اہل علم و فضل ہی کی تصانیف میں صرف کی جاتی ہے۔

علامہ عبدالجلیل نہ صرف تنہا عالم و فاضل شخص تھے بلکہ وہ بڑے زبردست نثار و شاعر بھی تھے۔ فارسی، عربی، ترکی، ہندی، چاروں زبانوں میں نفیس مہارت تامہ حاصل تھی اور ان سب میں انکا کلام پایا جاتا ہے۔ فاضل تذکرہ نگار نے انکی شاعرانہ خصوصیات پر نہایت پاکیزہ نظر ڈالی ہے اور یقیناً وہ چیز پیش کی ہے جو اس سے قبل کے کسی تذکرہ میں نہیں پائی جاتی۔

مولوی سید مقبول احمد صاحب کی اس کامیابی کا تمام تر راز یہ ہے کہ وہ خود بھی فاضل شخص ہیں اور نہایت ستھرا ذوق تصنیف و تالیف کا رکھتے ہیں۔ ابتدا میں خود انہوں نے جو قصیدہ حمد و نعت کا لکھا ہے وہ کافی شہادت اس امر کی ہے کہ ان سے زیادہ موزوں تذکرہ جلیل کے لئے اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:۔

یا ازلی القیام یا ابدی البقا! انت جلیل الغضب انت جمیل الرضا

عشق ترا جانفزا، شوق ترا دلربا ذکر ترا قوت روح، نام ترا غم زدا

مکتب عرفاں ترا، درس گہ انبیا شرح حقیقت تری، درس حروف ہجا

تیرے حرم کا غبار، تیرے مکاں کا سواد غازۂ روئے یقین، سرمۂ چشم صفا

پردۂ ظہور ہے تیری نقاب جمال تیرا خفا ہے عیاں، تیرا عیاں ہے خفا

ہر تو ہی اے لایزال وجہ قیام ہر دال تجھ سے عدم کو دوام تجھ سے فنا کو بقا

عام طور پر تاریخ تذکرہ کی کتابیں دلچسپی سے نہیں پڑھی جاتیں کیونکہ انکا طرز بیان خشک ہوتا ہے، لیکن میں دیکھتا ہوں کہ اس تذکرہ کو ایسے صاف پاکیزہ اور دلکش اسلوب سے مرتب کیا گیا ہے کہ ایک بار شروع کر لینے کے بعد فسانہ کا سا لطف آنے لگتا ہے اور ختم کرنا ناگزیر ہو جاتا ہے۔

مولوی سید مقبول احمد صاحب قابل صد مبارکباد ہیں کہ انہوں نے یہ بے بہا تصنیف پیش کر کے زبان کی صحیح خدمت انجام دی اور ہر وہ شخص جو تاریخ و تذکرہ سے کچھ بھی دلچسپی رکھتا ہے اسکا فرض ہے کہ اسکی ایک جلد اپنے پاس رکھے۔

یہ کتاب مجلد شایع ہوئی ہے اور بہترین طباعت و کتابت کے ساتھ۔ قیمت درج نہیں ہے۔ رام نراین لال کتب فروش الہ آباد سے مل سکتی ہے۔

دیوان شوق

یہ منشی احمد علی شوق قدوائی لکھنوی کا مجموعۂ کلام ہے جسے شیخ رضی الدین احمد صاحب بیرسٹر گونڈہ نے شایع کیا ہے۔ منشی احمد علی شوق لکھنؤ کے مشہور شاعروں میں تھے اور اپنی مثنوی نگاری کے لحاظ سے خاص شہرت رکھتے تھے۔ اس مجموعہ میں انکی صرف غزلیں ہیں یا چند رباعیات و متفرقات۔

شوق قدوائی کی غزل گوئی خاندان اسیر کی وہی خشک و بے مزہ غزلگوئی ہے، جسے منشی امیر احمد نے طبقۂ شعراء سے الگ کر دیا، اور جس لکیر کو پیٹنے والے شعراء اب بھی لکھنؤ کی ہر گلی کوچوں میں جوق در جوق نظر آتے ہیں، وہی لایعنی رعایت الفاظ، وہی بے نمک انداز بیان، وہی فرسودہ خیال آرائیاں اور وہی عشق و محبت کا ناقص و نامکمل بہروپ جو "سطح و قشر" سے زاید نہیں ہے انکے ہاں بھی پایا جاتا ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ شوق قدوائی زبان کے بڑے محقق تھے، اور محاورات پر انکو بڑا عبور حاصل تھا، اگر یہ شہرت غلط قائم نہیں ہوئی تو اس دیوان کا مقصود صرف یہ رہجاتا ہے کہ اگر کبھی محاورہ یا زبان کے باب میں کوئی بحث آکر پڑ جائے تو "استناداً" اس سے کام لیا جائے۔

شوق کی مثنویاں بیشک نہیں کہ خاص چیزیں ہیں اور خصوصیت کے ساتھ عالم خیال کے ماتحت جو نظمیں انہوں نے لکھی ہیں، وہ ادب اردو کے غیر فانی اجزاء ہیں معلوم ہوتا ہے کہ شوق کا دماغ فطرتاً وصفی و ایضاحی شاعری ([illegible]) کے لئے وضع ہوا تھا اور یہی سبب ہے کہ جب اور جس نظم میں انہیں محاکات نگاری یا تصویر جذبات کا موقعہ ملا، وہ بہت کامیاب ہوئے۔ غزلگوئی کے لئے دل میں جن درد مند جذبات کی پرورش لازم ہے، وہ ان کے ہاں مفقود تھے، اور اسی لئے رنگ تغزل انکا بالکل بے کیف ہے۔ انکے شاعر ہونے میں کلام نہیں لیکن انکی شاعری اس نقاش کی سی نقاشی تھی جو موضوع ([illegible]) کی پابند ہوتی ہے اور نقاش کیلئے کسی "عبقریت خلاق" ([illegible]) کے نشانات ہمیں نظر نہیں آتے۔

مثنویوں میں انکی ایک نظم حسن کے عنوان سے بہت عرصہ ہوا کسی رسالہ میں شایع ہوئی تھی اور اسمیں کلام نہیں کہ شوق کے بہترین ادبی کارناموں میں اسکو شمار کرنا چاہیے، اسی طرح عالم خیال کے چاروں رُخ جو انہوں نے لکھے ہیں وہ بھی یقیناً غیر فانی ہیں، اس لئے مجھے افسوس ہوتا ہے یہ دیکھکر کہ انہوں نے شاعری میں اپنے فطری ذوق کے خلاف غزلگوئی کیطرف توجہ کی اور کافی وقت اسمیں ضایع کیا۔ اگر شوق صرف مثنوی و ابیات شاعری کیطرف توجہ رکھتے تو آج ایک بےمثل و نایاب ذخیرہ ہمارے پاس ہوتا، لیکن لکھنؤ کی فضا میں شاعری کے جذبات کا پیدا ہونا ایسی معمولی بدنصیبی نہیں ہے کہ انسان آسانی سے اسکا مداوا کر سکے شوق بھی اسکا شکار ہوئے اور جس معیار کی غزلگوئی کے وہ انتخاب و التقاط سے بے نیاز ہے۔

متفرقات کے عنوان سے بعض نظمیں بھی اس مجموعہ میں نظر آتی ہیں جو واقعی اچھی ہیں، انکے بعد چند رباعیات بھی ہیں جو زیادہ تر محاورات کو نظم کرنے کی غرض سے لکھی گئی ہیں۔ کتابت و طباعت اچھی ہے اور کاغذ نفیس استعمال کیا گیا ہے قیمت درج نہیں۔

ہندوستان کے معاشرتی حالات مجموعہ ہے ان چار لکچروں کا جنہیں علامہ عبداللہ یوسف علی نے ہندوستانی اکاڈیمی یو۔ پی۔ کی خواہش پر دیا تھا۔ فاضل لکچرار کی شخصیت اور علمی حیثیت کے لحاظ سے جو رنگ ان لکچروں کا ہونا چاہیئے وہ انمیں پورے طور پر پایا جاتا ہے۔ انمیں ساتویں صدی سے لیکر چودھویں صدی تک ملکوتوں کے انقلاب کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی معاشرت میں جو جو تبدیلیاں ہوئی ہیں انہیں پوری مورخانہ کاوش سے ظاہر کیا گیا ہے اور ایسی دلچسپ اور صاف زبان میں کہ اس کتاب کا شروع کر دینا گویا ختم کر دینا ہے۔ اس کتاب کی قیمت ایک روپیہ ہے اور ہندوستانی اکاڈیمی الہ آباد سے ملسکتی ہے۔

ڈالی کا جوگ مجموعہ ہے آفسر میرٹھی کے بعض افسانوں کا جو ملک کے مختلف رسائل میں شایع ہو چکے ہیں، شروع میں ایک مقدمہ بھی ہے جس کے بعض حصوں سے مجھے اختلاف ہے۔ میرے نزدیک حکیم محمد علی، مولوی نذیر احمد، منشی سجاد حسین، مرزا رسوا کے نام فسانہ نگاروں کی فہرست میں شامل کرنا اصولی غلطی ہے۔ اسی طرح سرشار کو فن فسانہ نگاری کا موجد لکھنا درست نہیں، افسر کے فسانے ہر چند پلاٹ کے لحاظ سے زیادہ دلچسپ نہیں ہوتے، لیکن زبان اور خیال کے لحاظ سے اسقدر سادہ ہوتے ہیں کہ انکی دلنشینی سے انکار نہیں ہو سکتا۔ یہ مجموعہ بھی انڈین پریس نے شایع کیا ہے۔

نکاتِ رموزی حصہ دوم دارالاشاعت پنجاب لاہور نے جناب ملا رموزی کے بعض مضامین کا مجموعہ اس نام سے شایع کیا ہے۔ ملا رموزی اپنی "مختلف الالوان" اردو کی وجہ سے ملک میں کافی شہرت حاصل کر چکے ہیں اور یہ واقعہ ہے کہ جو مزاح (　　　) ان کے مضامین میں پایا جاتا ہے وہ حقیقی معنے میں تفریح دماغ کہلائے جانے کے قابل ہے۔ ملا صاحب کا مزاج بالکل تصنع سے پاک ہے اور چونکہ وہ فطرتاً (سیرت و صورت دونوں حیثیت سے) ہنسنے اور ہنسانے کے لئے پیدا ہوئے ہیں، اسلئے جو کچھ انکی زبان و قلم سے نکلتا ہے اسمیں بہت اصلیت (originality) ہوتی ہے۔ پھر لطف یہ کہ اسی مزاحی رنگ میں وہ سیاسی و معاشرتی مسایل پر بھی بہت خوبی سے تنقید کر جاتے ہیں، قیمت کتاب کی ایکروپیہ چار آنہ ہے۔ دارالاشاعت پنجاب لاہور سے ملسکتی ہے۔

تصحیح اللغات یہ رسالہ مولوی رفیع احمد صاحب وکیل نے مرتب کیا ہے جسمیں بتایا گیا ہے کہ بہت سے مستعملہ الفاظ عربی فارسی کے غلط استعمال کئے جاتے ہیں۔ اس رسالہ میں رسالہ میں ردیف وار انکو جمع کر کے صحت تلفظ اور معنی کے ساتھ یکجا کر دیا گیا ہے۔ مولوی صاحب موصوف کی یہ کوشش قابل استحسان ہے لیکن ضرورت تھی کہ اسکو زیادہ وسعت دیجاتی اور صرف ۹۲ صفحات کو اس کے لئے کافی نہ سمجھا جاتا۔

۸ر آنہ میں نظامی پریس بدایوں سے مل سکتی ہے۔

صلاح کار اُردو میں اسوقت تک "جنسیات" (sex) کی طرف بہت کم کیا بلکہ بالکل توجہ نہیں کی گئی جس کا بڑا سبب یہ ہے کہ اس موضوع پر گفتگو کرنے کے لئے بعض بعض جگہ عریانیوں کا آجانا ضروری ہے، اور یہ ہمارے "متکلفانہ" سنجیدگی کو کسی طرح گوارا نہیں ہو سکتا۔ خواہ وہ پس پردہ روز کتنے ہی مسایل "جنسیات" کے عملاً کیوں نہ حل کرتے ہوں۔

یہ کتاب اسی موضوع پر ہے اور ملک کے ایک انشاپرداز رئیس جناب محمد علی صاحب ردولوی اس کے مصنف ہیں۔ چونکہ موصوف طبیب بھی ہیں، اسلئے اس موضوع پر قلم اٹھانا ایک اہل شخص کا قلم اٹھانا ہے۔ یہ کتاب پانچ ابواب پر منقسم ہے۔ اور ہر باب میں فصلیں مقرر کی گئی ہیں، اس لئے یہ معلوم کرنے میں سخت زحمت ہوتی ہے کہ ایک فصل یا باب کس بحث کے لئے مختص ہے۔ فاضل مصنف اپنی انشا کے لحاظ سے ایک خاص مرتبہ رکھتے ہیں اور ہلکا سا مزاح انکی ہر تحریر کا جزو لازم ہوتا ہے چنانچہ یہ خصوصیت انکی اس تصنیف میں بھی ہے، اور مشکل سے ایک انسان اس کتاب کو شروع کرنے کے بعد چھوڑ سکتا ہے۔

مسئلہ تناسل کے متعلق جتنے وضعی وغیر وضعی مباحث ہو سکتے ہیں۔ ان سب پر اس کتاب میں بحث کیگئی ہے اور ماہرانہ انداز سے اور اسمیں شک نہیں کہ اگر غور سے مطالعہ کر کے تمام ہدایات پر عمل کیا جائے تو نہ صرف ہماری صحت بلکہ اخلاق پر بھی بہت اچھا اثر پڑ سکتا ہے۔ کتاب کی قیمت ایک روپیہ ہے اور مولف موصوف سے ردولی (بارہ بنکی) کے پتہ پر مل سکتی ہے۔

تذکرۃ الخواتین ہندوستان اور ایران کی مشہور شاعر عورتوں کا تذکرہ ہے جسے مولوی عبد الباری صاحب آسی نے مرتب کیا اور نولکشور پریس لکھنؤ نے شایع کیا ہے۔ چونکہ جناب آسی صاحب نے مختلف تذکروں کا وسیع مطالعہ کرنے کے بعد التقاط و اقتباس کیا ہے اسلئے تذکرہ بڑی حد تک تشفی بخش ہے۔ لیکن جدید اصول تذکرہ نگاری کے لحاظ سے اسمیں اضافہ کی گنجایش ہے اور فراہمی حالات، تنقید واقعات و کلام میں جو محققانہ صورت اختیار کرنا چاہیے اسکا التزام دشوار تھا کیونکہ قدیم تذکروں میں جو تنہا ذریعہ معلومات کا ہے ان اصول کی پابندی نہیں کیا ہوتی، تاہم اتنی خواتین کی شاعری کا تذکرہ ایک جلد میں مجلد کر دینا بھی ایسا کام نہیں کہ اسے خدمت ادب سے تعبیر نہ کیا جائے۔ کتاب چھوٹی تقطیع کے ۲۰۸ صفحات کو محیط ہے اور نولکشور پریس لکھنؤ سے مل سکتی ہے۔

دیوان میر درد خواجہ میر درد کا دیوان ہے جسے نولکشور پریس نے حال ہی میں شایع کیا ہے۔ یہ نسخہ بہت سے قدیم و جدید نسخوں کو دیکھنے کے بعد مرتب کیا گیا ہے اور یقیناً دوسرے رائج نسخوں سے زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ نظامی پریس بدایوں سے جو نسخہ دیوان درد کا شایع ہوا تھا اسپر نگار میں ایک تنقید بسیط شایع ہو چکی ہے اور اسکے اغلاط ظاہر کئے جا چکے ہیں۔ میں نے اس قسم کی غلطیاں اس نسخہ میں نہیں پائیں۔ جناب آسی جنہوں نے اسکی صحت کی ہے اور جنکا ایک مقدمہ بھی ابتدا میں شامل ہے، اس نسخہ کے مرتب ہیں اور اسمیں کلام نہیں کہ انہوں نے کافی محنت اسکی صحت میں کی ہے۔ کتابت و طباعت بھی بہت پسندیدہ ہے قیمت درج نہیں، اور نولکشور پریس لکھنؤ سے یہ کتاب بھی مل سکتی ہے۔

تاریخ تاج محل جناب معین الدین احمد صاحب اکبرآبادی نے جو آگرہ کی تاریخ سے بہت واقفیت رکھتے ہیں۔ اس کتاب کو مرتب کیا ہے جس میں روضہ تاج محل کی مبسوط تاریخ دی گئی ہے۔ اور اسی سلسلہ میں جتنے پہلو بحث کے ہو سکتے تھے انمیں سے کسی کو نہیں چھوڑا۔

تاج محل کے متعلق مغربی مورخین کا خیال ہے کہ اسے اٹلی کے کاریگروں نے طیار کیا تھا۔ اور یہ مسئلہ بہت کچھ زیر بحث رہ چکا ہے۔ چنانچہ مصنف نے اسپر بھی اپنی تحقیق پیش کی ہے۔ علاوہ تاج محل کے آگرہ کی اور مشہور عمارتوں کا بھی حال درج کیا گیا ہے اور ممتاز محل کے مختصر حالات بھی دیئے ہیں بہرحال یہ کتاب جناب معین الدین احمد صاحب کی محنت وسعی کا قابل قدر نتیجہ ہے۔ جسکا مطالعہ ہراس شخص کیلئے جو تاریخ سے دلچسپی رکھتا ہے فایدہ سے خالی نہیں ہوسکتا۔ قیمت دو روپیہ ہے اور مصنف سے کچہری گھاٹ آگرہ کے پتہ پر مل سکتی ہے۔

فن زراعت ملک مالوہ

یہ ایک رسالہ ہے جسے مولوی محمد ضیاء الدین حیدر صاحب سپرنٹنڈنٹ زراعت جھانسی نے اپنے دوران قیام بھوپال میں مرتب کیا ہے۔ اس رسالہ میں انھوں نے اپنے تمام ماہرانہ تجربات جو سرزمین مالوہ کی کاشت کے متعلق حاصل ہوئے تھے یکجا کردیا ہے۔

ہندوستان ہمیشہ ایک زرعی ملک کی حیثیت سے ممتاز رہا ہے لیکن افسوس ہے کہ اسوقت تک اس فن میں کوئی خاص ترقی اسکو حاصل نہیں ہوئی اور نہ کوئی لٹریچر ایسا فراہم کیا گیا جو جدید اصول زراعت کو رواج دیتا، جسکا بڑا سبب طبقہ مزارعین کا جہل ہے۔ اسلئے مولوی صاحب موصوف کی یہ سعی یقیناً قابل داد ہے کہ انھوں نے اپنی فن کی معلومات سے عوام کو واقف کرنے کی غرض سے یہ رسالہ مرتب کرکے شایع کیا۔

عمل تسخیر

یہ ایک مختصر رسالہ ہے جسے مولوی ظہور احمد صاحب ایڈیٹر تجلی نے مرتب کیا ہے اور حامد حسین قریشی خوشنویس مالک قریشی بکڈپو کوچہ چیلان نے شایع کیا ہے۔ اس کتاب کے دو حصے ہیں ایک میں اخلاق و معاشرت کے متعلق پاکیزہ ہدایات ہیں اور جنپر ہر انسان کو عمل کرنا چاہئے۔ دوسرے حصے میں عملیات ہیں جنکی رعایت سے اس کتاب کا نام "عمل تسخیر" رکھا گیا ہے اور اس حصہ میں جو سید محمد الیاس صاحب کا مرتب کیا ہوا ہے، ہر وہ لغویت موجود ہے جو اوہام پرست جہلا کو رام کرنے کی غرض سے اختیار کیجا سکتی ہے۔ میرے نزدیک اس سے زیادہ توہین قرآن کی اور نہیں ہوسکتی کہ اسکو دعا، تعویذ، اور عملیات کی کتاب سمجھکر اس کے اصل مقصد کیطرف سے لوگوں کو غافل کیا جائے۔

اس حصہ میں کچھ اعمال جفر بھی درج ہیں اور بعض جگہ بہت سی مہمل عبارتیں لکھکر ان کے اثرات و فواید بتائے گئے ہیں۔ مجھے حیرت ہے کہ جناب ظہور احمد صاحب نے کیونکر گوارا کیا کہ انکے لکھے ہوئے حصہ کے ساتھ یہ مجموعہ خرافات بھی شامل کردیا جائے۔ ۸ آنہ اس کتاب کی قیمت ہے۔

پردہ کے حدود

مولوی عبدالماجد صاحب دریابادی نے جو مضمون پردہ کے متعلق لکھا تھا اس کا جواب اس نام سے کسی حق پرست مسلمان نے دیا ہے اور بتایا ہے کہ عبدالماجد صاحب نے نقل روایات و استناد میں کسقدر تسامح اور تدلیس سے کام لیا ہے یعنی جس طرح جناب ماجد صاحب نے قرآن و حدیث کی مدد سے ثابت کیا ہے کہ عورت کے چہرہ چھپانے کا حکم نہیں ہے، اسی طرح نصوص کی مدد سے جناب "حق پرست" نے یہ بتایا ہے کہ چہرہ چھپانا ضروری ہے۔ میں اس باب میں اپنے خیال کا اظہار بارہا کرچکا ہوں اور میں اب بھی اس رائے پر قایم ہوں کہ کلام مجید میں یقیناً چہرہ چھپانیکا حکم ہے لیکن یہ حکم اسوقت کے لحاظ سے تھا، اور دیگر معاشرتی مسایل کی طرح اب اسمیں بھی تبدیلیاں ہونا ضروری ہے۔ بہرحال یہ رسالہ پورے عالمانہ انداز سے لکھا گیا ہے، اور ماجد صاحب کے مضمون کی پوری تردید کرتا ہے۔ یہ رسالہ ۲ آنہ کا ٹکٹ وصول ہونیپر اس پتہ سے مفت مل سکتا ہے۔ امۃ محمد اسحاق صاحب محلہ مردہی ٹولہ سیتاپور۔

دق و سل

یہ مرض ہندوستان میں بہت عام ہوتا جاتا ہے اور کم لوگوں کو معلوم ہے کہ اگر ابتدا سے احتیاط کی جائے اور حملۂ مرض سے قبل لحاظ رکھا جائے تو یہ ابتلاء عظیم بہت کم ہوسکتا ہے۔ ہمارے عزیز دوست ڈاکٹر محمد عمر صاحب (بجنور) جو اس مرض کا خاص تجر

رکھتے ہیں اپنے تجربات کو ایک رسالہ کی صورت میں مرتب کرلیا ہے، جو مفید اطلاعات پر مشتمل ہے ضرورت ہے کہ ہر پڑھا لکھا انسان اسکا مطالعہ کرے اور بشرط ضرورت ان ہدایات پر کاربند ہوکر اس موذی مرض سے نجات حاصل کرے۔

اسلام اور غیر مسلم مسلم بکڈپو پھلواری (ضلع پٹنہ) نے یہ رسالہ جناب محمد حفیظ اللہ صاحب بہادر دی سے لکھواکر شایع کیا ہے، اسمیں بدوِ اسلام سے لیکر عروج اسلام تک کے متعدد واقعات تاریخی ایسے درج کئے گئے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے غیر مسلموں کے ساتھ ہمیشہ رواداری سے کام لیا اور کبھی انکے جذبات مذہبی کو صدمہ نہیں پہونچایا اور نہ ان کے جایز شہری و تمدنی حقوق غصب کئے۔ اس قسم کے رسایل کی اشاعت موجودہ عہد میں جبکہ مسلم و غیر مسلم سوال نے ملک کی فضا کو تباہ کر رکھا ہے بہت مفید ہے۔ رسالہ کی قیمت ۸ر آنہ مقرر ہے۔

قوم پرست طالب علم محمد عبدالغفار صاحب مدہولوی نے جو جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں مدرس ہیں یہ ڈرامہ لکھا ہے جس سے مقصود طلبہ میں وطن پرستی و ایثار کا جذبہ پیدا کرنا ہے۔ موضوع ڈرامہ کا اچھا ہے لیکن نفس ڈرامہ کوئی خاص بات اپنے اندر نہیں رکھتا۔ اور زبان، خیال، ترتیب، پلاٹ ہر حیثیت سے نہایت معمولی ہے۔ قیمت ۴ر آنہ ہے۔

گائے بیل محمد نصیر ہمایوں بی اے نے یہ رسالہ زراعت پیشہ لوگوں اور ڈیری قایم کرنے والوں کے لئے لکھا ہے۔ اسمیں گائے کی نسل، نسل کشی، حفاظت حمل، بچہ کی پرورش، دودھ کی تجارت، بیل کی نسلوں، مویشی کی، خوراک، پرورش، بیماریوں کا علاج اور آختہ کرنیکے طریقوں سے بحث کی ہے۔ زبان بہت آسان اور طرز ادا نہایت سلیس ہے۔ جو تصاویر دی گئی ہیں وہ البتہ بہت بھدی ہیں قیمت درج نہیں ہے قومی کتب خانہ ریلوے روڈ لاہور سے ملسکتا ہے۔

ایک خاص اطلاع

اس سے قبل مارچ کے ملاحظات میں مینے ایک تیل کے متعلق اظہار رائے کیا تھا کہ سر کے بال خواہ کسی سبب سے گر جائیں اسکے استعمال سے پھر پیدا ہو جاتے ہیں اور تقویت دماغ و بصارت بھی اس سے ہوتی ہے، اور اسکا تجربہ میں نے خود اپنے عزیز دوست پر کیا

اس ریویو کے بعد بعض حضرات نے براہ راست مجھسے خط و کتابت شروع کردی کہ تیل کی کیا قیمت ہے، اور کیونکر ملسکتا ہے وغیرہ وغیرہ، سو اسکے متعلق میں بتادینا چاہتا ہوں کہ میں سوقت تک اس تیل کے نام سے بھی واقف نہیں اور نہ یہ جانتا ہوں کہ کن چیزوں سے کیونکر طیار ہوتا ہے۔ مجھے جسقدر علم ہے وہ صرف یہ کہ ایک صاحب جنکا نام افتخار حسین ہے (مینے پہلے سخاوت حسین غلط نام لکھدیا تھا) اور جو بیرل لکھنؤ کے فورمین صاحب کے بنگلہ میں رہتے ہیں اسکے مخترع ہیں اور انہیں سے براہ راست خط و کتابت ہونا چاہیئے۔ قیمت کے متعلق مجھے صرف اسقدر معلوم ہے کہ ایک شیشی تین یا چار روپیہ میں دیتے ہیں بہرحال آیندہ جو حالات معلوم کرنا ہوں انہیں سے دریافت کئے جائیں مجھے زحمت نہ دیجائے انکا پتہ ہیر ذیل میں درج کئے دیتا ہوں

سید افتخار حسین صاحب بنگلہ فورمین صاحب بیرل لکھنؤ

نیاز

باب الاستفسار

(میرا مذہب)

(جناب سید احمد حسن صاحب جبلپور)

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ آپ ملحد و بے دین ہیں۔ کیا یہ حقیقت ہے، اگر ہے تو اطلاع دیجئے کہ کیا تمام مذاہب جو اس وقت تک رائج ہوئے لغو اور بیکار تھے۔ اور کیا مذہب اسلام جو نبی آخر الزماں کا مذہب کہلاتا ہے اور جس کے متعلق ہمارا دعویٰ ہے کہ اس زیادہ مکمل مذہب کوئی نہیں ہو سکتا، وہ بھی آپ کیلئے ضروری نہیں؟ اور کیا وہ قومیں جو کسی مذہب کی پابند نہیں، صحیح اخلاقی زندگی بسر کر سکتی ہیں، اور کیا مذہب کا ظہور بغیر کسی غایت و سبب کے ہے؟ -

---

(**نگار**) آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ آجکل "الحاد و بیدینی" کے الفاظ حقیقتاً بہت کم اپنے صحیح "مفہوم" میں استعمال کئے جاتے ہیں اور زیادہ تر ان سے مقصود صرف اظہار برہمی و بیزاری ہوا کرتا ہے (بالکل اسی طرح جیسے کسی حسین و جمیل کو کافر کہہ کے اپنی انتہائی پسندیدگی کو ظاہر کیا جاتا ہے) ورنہ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح آج صحیح معنے میں کوئی مسلمان نہیں، اسی طرح دنیا سے "الحاد و بیدینی" کا بھی استیصال ہو چکا ہے اور عقول انسانی اتنی کافی ترقی کر چکی ہیں کہ وہ اس وحشیانہ و غیر عاقلانہ عقیدہ کو بغیر کسی غور و فکر کے مسترد کر سکتی ہیں۔ بہرحال اس باب میں اگر آپ میرے متعلق کوئی فتویٰ چاہتے ہیں تو وہ صرف یہ ہے کہ

من نہ آنم کز دے ایں افسانہا باور کنم

اسی سلسلہ میں ایک غلطی اور بھی لوگوں سے ہوتی ہے، وہ یہ کہ "الحاد و بیدینی" کو ساتھ ساتھ استعمال کیا جاتا ہے حالانکہ دونوں کا اجتماع ضروری نہیں اور ہو سکتا ہے کہ ایک شخص بیدین ہو مگر ملحد نہ ہو، جس طرح عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ لوگ مسلمان ہیں اور کافر بھی حالانکہ عام طور پر کفر و اسلام کو ایک دوسرے کا ضد سمجھا جاتا ہے۔

الحاد نام ہے اس بیدینی کا جو خدا کے انکار پر قایم ہو اور بیدینی کہتے ہیں مسالک و مذاہب کی پابندی سے بے نیاز ہو جانیکو، پھر یہ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص کسی مذہب کا پابند نہ ہو اور خدا کا اقرار کرتا ہو۔ جیسے ایک مسلمان باوجود خدا کا اقرار کرنے کے اعمال کفر و شرک میں مبتلا ہو کر عملاً ملحد ہو جائے۔ پھر اگر ایک مسلمان ملحد ہونے کے باوجود اپنے مسلمان ہونے پر یقین رکھتا ہے، تو کوئی وجہ نہیں کہ میں، جو ایک لمحہ کے لئے بھی خدا سے انکار کرنے کی جرأت اپنے اندر نہیں پاتا، اپنے تئیں مسلمان نہ سمجھوں، جبکہ اسلام (میرے کہنے سے نہیں بلکہ خود نص قطعی سے) نام ہے صرف مکارم اخلاق کا (ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم) اور اس کی آغوش دو گبر و ترسا "

سب کے لئے ہر وقت کھلی ہوئی ہے۔

معلوم نہیں آپ نے "کل مولود یولد علی فطرت الاسلام" کی نص پر کبھی غور کیا ہے یا نہیں، اگر ابھی تک موقعہ نہیں ملا تو اب فکر کیجئے اور سمجھئے کہ اس سے کیا مقصود ہے۔ سب سے پہلے دیکھئے کہ "کل مولود" سے کیا مراد ہے۔ ظاہر ہے کہ مولود سے ہر ملک و ملت اور ہر زمانہ کا مولود مراد ہے، یہ ممکن نہیں کہ اس سے مقصود صرف عہد نبوی یا اس کے عہد مابعد کے بچے ہوں۔ اس لئے یہ امر قابل غور ہے کہ اگر اہل اسلام سے مقصود صرف وہ مخصوص شکل و شمایل والی، وہ مخصوص اوضاع عبادت اختیار کرنے والی، اور وہ مخصوص شعایر و عقاید رکھنے والی جماعت ہے، جسکا اصطلاحی نام آجکل مسلمان ہے، تو اس کے یہ معنی ہونگے کہ بعثت رسول سے قبل جبکہ اصطلاحی مسلمان کا وجود نہ تھا، کوئی مولود فطرت اسلام پر پیدا نہیں ہوا، حالانکہ یہ صحیح نہیں اور نہ نص میں کوئی تخصیص ہے

پھر جب بعثت رسول سے قبل کے "انسان زادوں" کو فطرتاً مسلم ہونا ظاہر کیا گیا ہے، تو اسمیں شک کی کوئی گنجایش نہیں کہ خدا کی مراد اسلام سے یہ نہیں ہے کہ وہ کسی خاص مسلک و مذہب سے وابستہ ہے، کسی مخصوص ملت و جماعت ہی میں اسکا نشو و نما ہو سکتا ہے اور ایک محدود ملک و زمانہ ہی میں اسکا وجود دیا یا جانا چاہئے۔ بلکہ وہ اولین پیدایش سے شروع ہوا ہے اور جب تک انسان کی آفرینش کا سلسلہ قایم ہے جاری رہیگا۔ اسلئے ضروری ہے کہ اسلام کا کوئی مفہوم (موجودہ مروجہ و مفروضہ مفہوم سے علیحدہ ہو کر) ایسا قرار دیا جائے تاکہ اسے ہم اس انسان پر بھی منطبق کر سکیں جو رسول اللہ سے سیکڑوں، ہزاروں بلکہ لاکھوں سال قبل پیدا ہوا تھا۔

اسلام کے لغوی معنے صرف اطاعت کے ہیں اور اگر ہم اس کے لغوی معنی سے ہٹ کر اس کا کوئی اصطلاحی مفہوم قرار نہ دیں (جیسا کہ غلطی سے لوگوں نے قرار دے لیا ہے) تو یہ مسئلہ نہایت آسانی سے طے ہو سکتا ہے۔ اس معنے کے لحاظ سے اس نص کا مفہوم یہ ہوا کہ "ہر نوزائیدہ انسان فطرتاً اطاعت و انقیاد کا جذبہ لیکر آتا ہے۔ یعنی فطرت اسکو اس امر کا اہل بنا کر بھیجتی ہے کہ وہ قانون قدرت کو سمجھ کر اس پر کاربند ہو اور دنیا میں ترقی کرے" کیونکہ خدا کے سامنے گردن جھکانے، اور خدا کی اطاعت کرنیکا مفہوم و مدعا بھی صرف یہی ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ خدا ہماری عبادتوں اور جبیں سائیوں سے بے نیاز ہے۔ اور اس کی ذات اس سے بہت بلند ہے کہ کسی کا وجود و انکار اس کو ناخوش کر سکے اور طاعت و عبادت مسرور۔ پھر جب اسلام کا مفہوم اسقدر وسیع ہے اور وہ قانون فطرت کے مطابق صرف ہمارے اخلاق کو درست کرنا چاہتا ہے تو ہم بغیر کسی اندیشۂ اعتراض کے "کل مولود یولد علی فطرت الاسلام" کا اعلان کر سکتے ہیں، کیونکہ اس صورت میں اسلام کی تبلیغ کی ابتدا محمد ابن عبداللہ (روحی فداہ) کے عہد سے نہیں مانی جائیگی، بلکہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ اگر موسیٰ و عیسیٰ، سلیمان و داؤد، یعقوب و ابراہیم، رام و کرشن، بودھ و زردشت نے درستی اخلاق ہی کی تعلیم دی تھی تو ان سب نے اسلام ہی کی تبلیغ کی تھی اور اگر اخلاق درست ہیں تو ایک یہودی بھی مسلمان ہے، ایک مسیحی بھی مسلمان ہے، ایک ہندو بھی مسلمان ہے خواہ وہ کوٹ پتلون میں نظر آئے خواہ وہ چوٹی و زنار میں۔ اسلام نام ہے نہ ریش دراز کا نہ اونچے پائجامہ کا، اسلام نہ اذاں کا پابند ہے نہ روزہ و حج کا، اسلام نہ کسی خاص مسلک سے عبارت ہے اور نہ کسی مخصوص شکل و شمایل سے، بلکہ اسلام نام ہے صرف صداقت کا محض علوئے نفس و بلندی اخلاق، اور خدائے واحد کی پرستش کا، قوائے بہیمیہ سے بچنے کا،

اور یہی وہ پیغام تھا جسے دنیا کا سب سے پہلا رسول لایا اور تا روز قیامت جو ہادی و مُصلح آئے گا پھر اسی پیغام کی تکرار کریگا (لقد بعثنا فی کل امتہ رسولاً ان اعبد و اللہ و اجتنبوا لطاغوت)۔

اگر میرا نام ایسا ہے جو کسی بڑے سے بڑے مسلمان کا تھا (یعنی زیادہ سے زیادہ فرض کر لیجئے کہ میرا نام علی ہے) اگر میرا سلسلۂ نسب خاص رسول اللہ تک پہونچتا ہے، اور اگر میرا مکان مکہ میں ہے اور خاص میزاب حرم میرے مکان کی چھت پر گرتا ہے، اگر میں نے ظاہری وضع و لباس اور صورت تراشی میں کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی ان احادیث یا روایات کے خلاف نہیں کیا جو عام طور پر بیان کیجاتی ہیں، اگر میں نے مکلف ہونے کے بعد سے کسی ایک فرضی مذہبی کو بھی ترک نہیں کیا اور میری پیدائش ہی ایسے "نادر زاد اتقار" پر ہوئی ہے کہ عالم شیر خوارگی میں کبھی رمضان کے زمانہ میں دن کو دودھ نہیں پیا (جیسا کہ بعض بزرگوں کے متعلق بیان کیا جاتا ہے) تو موجودہ اصول کے مطابق یقیناً میں اس عزت و احترام کا مستحق ہوں جو غلاف کعبہ کا ہونا چاہئے، لیکن ٹھیک اسی وقت جبکہ دنیا میرے ہاتھ کو بوسہ دیتی ہے، میرے دیدار کو اپنے لئے باعث فلاح و نجات یقین کرتی ہے، میں رات کو تنہائیوں میں غور کیا کرتا ہوں کہ اپنے فلاں پڑوسی کی زمین پر کیونکر قبضہ حاصل کروں، فلاں کاشتکار کو کس طرح بیدخل کروں، برما اور رنگون کے دورہ میں سیٹھ جمال کے اوپر اقتدار قایم کرنے کیلئے کیا صورت بناؤں، بمبئی میں سلیمان بھائی داؤد بھائی کی لڑکی عذرا کو کیسے قابو میں لاؤں، نواب صاحب گلشن آباد کے ہاتھ میں جو نیلم کی انگوٹھی ہے اسے کیسے حاصل کروں، نظام حیدر آباد تک رسائی حاصل کرنے اور وہاں کے صدر اعظم کو رام کرنے کیلئے کیا تدابیر اختیار کروں، اور میری زندگی کا ایک ایک لمحہ اسی ادھیڑ بن میں صرف ہوتا ہے، پھر اگر اسلام نام صرف ظاہری وضع و صورت کا ہے، محض اس خوشنما چھلکے کا ہے جو ایک سڑے ہوئے سیب کے اوپر نظر آتا ہے تو مجھ سے زیادہ مستحق نجات کا کون ہو سکتا ہے، لیکن اگر ایسا نہیں ہے اور اسلام عبارت ہے صداقت نفس اور پاکیزگی روح سے تو کیا ایسے انسان کو آپ شیطان و طاغوت، مشرک و کافر نہ کہیں گے۔ اس کے مقابل میں ایک غیر مسلم شخص کو لیجئے، جو ہر وقت اپنے گلے میں بُت لٹکائے پھرتا ہے، جس کے سر کی چوٹی کمر تک پہونچتی ہے۔ جس نے اپنی عمر میں کبھی ایک دن کے لئے بھی داڑھی کو آزاد نہ چھوڑا، جو نماز، روزہ کے الفاظ سے بھی واقف نہیں، جسے یہ بھی خبر نہیں کہ عرب کہاں ہے، اور اسمیں کون نبی کس وقت پیدا ہوا۔ ظاہر ہے کہ اصطلاح میں اس سے زیادہ کافر اور کون ہو سکتا ہے، لیکن ٹھیک اسی وقت جبکہ مسلمان اسکی صورت دیکھ کر لاحول پڑھتے ہیں، وہ اپنا وقت یتیموں کی خدمت میں، مستحقین کی اعانت میں صرف کر رہا ہے، ابنا جنس کے لئے وہ اپنی عزیز ترین چیز بھی قربان کرنے کے لئے طیار ہے اور مذہب کا مفہوم اس کے نزدیک صرف خدمت و عمل ہے۔ پھر اگر حقیقت کوئی چیز ہے اور مذہب کی رُوح کسی "واقعیت اخلاقی" سے متعلق ہے، تو آپ جو جی میں آئے کہئے، لیکن میرے نزدیک مسلمان وہی ہے، اور اس کا فر کی دینداری پر ہر شخص کو ایمان لانا چاہئے۔

ممکن ہے ایک شخص یہ کہے کہ پابند مذہب مسلمان کبھی بداخلاق نہیں ہو سکتا اور ایک کافر سے کبھی حُسن اخلاق کی توقع نہیں ہو سکتی۔ لیکن ایسا کہنا واقعات کو جھٹلانا ہے اور بغیر کسی کاوش کے نہایت آسانی سے اسکی متعدد مثالیں مل سکتی ہیں۔

اسی سلسلہ میں ایک امر اور بھی غور طلب ہے۔ وہ یہ کہ جب رسول اللہ نے یہ درس دیا کہ تمام اقوام میں انبیا مبعوث ہوئے ہیں اور تمام قبل کے رسولوں کی بھی انہوں نے تصدیق کی، تو پھر ایک نئے مذہب کی کیا ضرورت تھی اور اسلام نے وہ کونسی نئی بات بتائی جو اس سے قبل لوگوں کو معلوم نہ تھی۔ اسکا جواب بڑی تفصیل کا محتاج ہے، مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ اسلام نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ نئی بات بتا رہا ہے، اور نہ اُسنے ادیان سابقہ کو جھٹلایا، بلکہ اس نے اسی قدیم تعلیم کو جو مردہ ہو چکی تھی زندہ کیا اور اس تفریق کو مٹانا چاہا جو مختلف مذاہب کے درمیان باہم پائی جاتی تھی۔ اسکا مقصود یہ تھا کہ تمام بنی نوع انسان ایک مرکز پر آجائے کسی ایک غرض مشترک کی پابند ہو جائے، ایک ہی منزل کی تلاش کرے ایک ہی راستہ اختیار کرے۔ کیونکہ بغیر اس کے "امن عام" (جو اب جنس نایاب ہے) اور "جامعہ بشریت" کی تشکیل ممکن نہیں۔ اس غرض کیلئے اسلام نے جس حکمت و دانائی سے کام لیا وہ تاریخ مذاہب کا ایک ہی واقعہ ہے جو آپ اپنی نظیر ہے۔ رسول اللہ نے سوچا کہ وہ لوگ جو اپنے مذاہب حقہ کے صحیح اصول سے منحرف ہو کر صرف رسم و رواج کے پابند ہو گئے ہیں اور جنہوں نے مذہب کی بنیاد صرف اوہام باطلہ کو قرار دے لیا ہے، اگر ان سے کوئی مناظرہ یا بحث کی گئی اور ان کے مراسم کے خلاف تبلیغ کی گئی تو وہ اور زیادہ مشتعل ہو جائیں گے اور بجائے التفات کے انیں احتراز کی کیفیت اور قوی ہو جائے گی، اس لئے سب سے پہلے تو ان سے یہ کہا گیا کہ تم جو اسلام کے نام سے اسقدر بیزار ہوتے ہو یہ تمہاری غلطی ہے، کیونکہ یہ کوئی نئی چیز نہیں ہے بلکہ نہایت قدیم بات ہے اور اس قدر قدیم کہ بدو آفرینش اور آغاز حیات سے چلی آرہی ہے۔ یہانتک کہ ہر انسان کا بچہ "اسلام" کی فطرت پر پیدا ہوتا ہے یہ اور بات ہے کہ بعد کو تم اسے نصرانی یا یہودی کے نام سے پکارنے لگو۔ اب رہا یہ امر کہ ہم تم سے کیا چاہتے ہیں، ہم تم کیونکر دنیا میں ملکر کام کر سکتے ہیں سو اسکی نہایت سہل تدبیر یہ ہے کہ "تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا وبینکم الا نعبد الا اللہ ولا نشرک بہ شیئاً ولا یتخذ بعضنا بعضاً ارباباً من دون اللہ" (آؤ صرف ایک بات پر ہم تم اتفاق کریں اور وہ یہ کہ سوائے خدا کے کسی کی پرستش نہ کریں، سوائے قانون قدرت کے اور کسی وہم پرستی میں مبتلا نہوں کیوں کہ ایسا کرنے سے قوائے انسانی اور خصوصیات روحانی مضمحل ہو جاتے ہیں۔ اور حریت ضمیر، آزادی خیال، اصابت رائے، سلامتی ذوق، صحت فکر مفقود ہو جاتی ہے جسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان میں غلامی کی خو پیدا ہو جاتی اور رفتہ رفتہ اسکی روح مردہ ہو جاتی ہے حالانکہ انسان آزاد پیدا ہوا ہے اور اس کو آزاد ہی رہنا چاہیئے "ولقد کرمنا بنی آدم وحملنا ھم فی البر والبحر ورزقنا ھم من الطیبات وفضلنا ھم علی کثیر من خلقنا تفضیلا" یہاں بھی بنی نوع انسان کے مجد و شرف کا ذکر کیا گیا ہے جسمیں تخصیص مسلمانوں کی نہیں ہے۔

یہ ہے سارا لب لباب اسلام کی تعلیم کا جسکی صداقت سے غالباً کسی اہل فہم کو انکار نہیں ہو سکتا، کیونکہ یہی تعلیم تمام مذاہب کی تھی جس پر عمل کیا جانا ترک ہو گیا تھا اور اسی کو زندہ کرنے کے لئے رسول عربی کا ظہور ہوا۔ یہاں تک تو اسلام کا فلسفہ تھا، اب رہا اس تعلیم پر عمل، سو اسکے متعلق چونکہ نفسیات اجتماع سے تھا اس لئے ضرور ہوا کہ لوگوں کو اس کا خوگر بنانے کے لئے، انکے ذہنوں کو ایک مرکز پر لانے کے لئے، ان میں یہ خصوصیت اخلاق پیدا کرنے کے لئے، اعمال و عبادات کی بھی ایک صورت متعین کی جائے، وضع معاشرت میں بھی کوئی تبدیلی رونما ہو، ان کے کچھ اصول زندگی منضبط کئے جائیں تاکہ انکا شیرازہ قایم رہے، ان کی اجتماعیت پراگندہ نہو اور ایک دوسرے کو دیکھ کر سمجھ سکے کہ یہ اسی ایک "کلمۃ سواء بیننا وبینکم" پر مجتمع ہو جانیوالا ہے یا نہیں

احادیث کے متعلق میں کوئی گفتگو نہیں کرنا چاہتا۔ کیونکہ ان پر ہر شخص کا اتفاق نہیں ہو سکتا، لیکن کلام مجید کی نسبت یہ ضرور عرض کردوں گا کہ اسمیں ایک جگہ بھی کوئی تعلیم ایسی نہیں دی گئی جس سے مراد "اخوت عامہ" اور بشریت کی "اجتماعیت کبریٰ" مقصود نہو، کسی ایک جگہ بھی اس نے عبادات کو اصل مذہب ظاہر نہیں کیا، بلکہ عبادات کو ذریعہ بتایا اس منزل تک پہونچنے کا جو انسانی تگ و دو کا منتہائے نظر ہو سکتا ہے۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ جہاں جہاں کلام مجید میں عبادات کا ذکر ہے وہیں انکی غایت و غرض بھی بتادی ہے، انکی اصل روح کو بھی ظاہر کردیا ہے تاکہ لوگ نماز، روزہ، حج، زکوۃ ہی کو اصل مذہب نہ جاننے لگیں اور اصل مقصود فراموش نہ کردیں۔

میں یہ نہیں کہتا کہ دیگر مذاہب کی تعلیم یہ نہ تھی اور جہانتک فلسفۂ مذہب کا تعلق ہے سب نے یہی بتایا لیکن عملی زندگی میں اسلام سے زیادہ کسی نے اسکو سچ کرکے نہیں دکھایا اور مساوات کا جو منظر اس نے پیش کیا وہ اس درجہ وسیع تھا کہ حقیقی معنے میں شاہ و گدا کے امتیاز کو بھی اسنے مٹادیا جو اصل راز نوع انسان کی تباہی کا ہے، اس نے رسم و رواج کی زنجیروں کو توڑکے، تقدم شخصی کے بت کو پامال کرکے، نسب و حسب کے تمام اعتبار لایعنی کو محو کرکے، صرف ایک معیار انسانیت کا قرار دیا، اور وہ دینی و دنیادی حیثیت سے اسقدر بلند تھا کہ دنیا کا کوئی مذہب اسکی نظیر پیش نہیں کرسکتا۔ مسیح کی تعلیم کا انتہائی مقصود صرف رہبانیت تھا، موسیٰ نے صرف دنیا کے حصول کو منتہائے نظر قرار دیا، ہندوؤں نے بھی ہمیشہ زمانہ کلجگ کہکر اس سے احتراز کرنے کی ہدایت کی، لیکن اسلام جو دین و دنیا اور جسم و روح کا ضامن تھا، اس نے انسان کی حقیقت کو "نیابت الٰہی" اور "استخلاف فی الارض" بتایا یعنے یہ کہ وہ صحیح معنی میں مظہر خداوندی ہے۔ اور اگر ایک طرف اسکو وہی قبضہ و اقتدار کائنات میں حاصل کرنا چاہئے جو ایک خدا کے نائب و خلیفہ کا ہوسکتا ہے، تو دوسری طرف روحانی حیثیت سے اسکو خدا سے ملجانا چاہئے کہ "نیابت" کا تحلیل ہونا اصل ذات میں شامل ہوجانا ہے۔

پھر آپ ہی انصاف کیجئے کہ جو مذہب اسقدر بلند و وسیع تعلیم دیتا ہو، اسکے کسی پیرو سے آپ محض "رسوم و اشکال" کو سامنے رکھکر یہ سوال کریں کہ تیرا مذہب کیا ہے اور "تو ملحد و بیدین" تو نہیں؟ کس قدر صریح ظلم ہے۔

میں تو کہتا ہوں اور علی رؤس الاشہاد کہتا ہوں کہ اگر کسی مسلمان نے اسلام کا یہ مفہوم نہیں سمجھا اور وہ اسقدر بلند نظر نہیں ہے کہ دوسرے لوگوں کے ساتھ رواداری کرسکے صرف اس لئے کہ انکا طریق عبادت و معاشرت جداگانہ ہے تو وہ مسلمان نہیں ہے اور اگر واقعی اسلام اس "وسعت نظر" کا منافی ہے تو سب سے پہلا وہ شخص جو اپنے آپکو "ترک اسلام" پر مبارکباد دیگا، میں ہونگا اور بغیر آپکے دریافت کئے ہوئے اعلان کردونگا:۔

من از بازوئے خود دارم بسے شکر　　　کہ زور مردم آزاری ندارم

میں حشر و نشر، قیامت و معاد، بہشت و دوزخ، نماز و روزہ، حج و قربانی وغیرہ کے تمام مناظر و مناسک کو وہی سمجھتا ہوں جو انکی حقیقت ہے اور اسلام کو انکا محتاج نہیں سمجھتا۔ ممکن ہے آپ اس بنا پر مجھے کافر کہدیں، لیکن میں اپنی جگہ اس خیال پر پورے رسوخ کے ساتھ قایم ہوں کہ:۔

تنگ چشمم گر نظر بر چشمۂ کوثر کنم

آپ جنت کی طمع سے، دوزخ کی ہیبت سے بے معنی عبادت کئے جائیں اور میں؟

جام مے گیرم و از اہل ریا دور شوم

یہی میرا ایمان ہے، اور یہی میرا مسلک ہے اور میں بہشت و طوبی کسی کو بھی

باخاک کوئے دوست برابر نمی کنم

نیاز

معلومات

امریکہ کو کس نے دریافت کیا؟

آپ جس شخص سے یہ سوال کریں گے وہ فوراً کولمبس کا نام لے دیگا جو ہر مارچ ۱۴۹۲ء کو وہاں کے ساحل پر اول اول لنگر انداز ہوا تھا لیکن یہ دعویٰ بالکل غلط ہے۔ امریکہ کولمبس کے پہونچنے سے بہت قبل دریافت ہو چکا تھا جسکا ثبوت یہ ہے کہ وہاں وحشی اقوام کثرت سے پائی جاتی تھیں چنانچہ پہلی تحقیق کا خیال ہے کہ امریکہ میں سب سے پہلے لوگ شمال مشرقی ایشیا سے آبنائے بہرنگ ہوتے ہوئے آئے تھے جسکا بڑا ثبوت یہ ہے کہ یہاں کے باشندوں میں ایشیا کے مذہب اور فن تعمیر و بت تراشی کی علامات پائی جاتی ہیں۔ آخری تحقیقات سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ لوگ جزیرہ جاوا، لنکا، اور کمبوڈیا سے یہاں آئے تھے اور بودھ مذہب کی تبلیغ انہوں نے امریکہ میں کی تھی چنانچہ وسط امریکہ کے ایک مقام میں بودھ کا بت بھی نکلا ہے اور بعض ایسے آثار تعمیری بھی دریافت ہوئے ہیں جو بالکل بودھ کے مندروں سے ملتے جلتے ہیں۔ ڈاکٹر ٹامس گین جو امریکہ کے آثاریات کا ماہر ہے خود لنکا وغیرہ گیا اور وہاں کے مندروں، بتوں، اور عمارتوں کا مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہونچا کہ امریکہ میں اب سے بہت قبل بودھ مذہب والے پہونچ گئے تھے اور ایک زمانہ تک انکا مذہب عروج پر رہا۔

ایک عجیب و غریب قصر صنعتی

لندن کا وہ عظیم الشان کیمیاوی صناعات کا کارخانہ جو دریائے ٹیمس کے ساحل پر نظر آتا ہے اپنی وسعت تعمیر کے لحاظ سے عجائبات عالم میں شمار کئے جانے کے قابل ہے۔ اسکی وسعت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اگر ایک شخص ہر کمرہ کو جا کر دیکھے تو اسکے لئے بھی کم از کم ایک ہفتہ درکار ہوگا۔

اس قصر میں ۷۰۰ کمرے ہیں اور کل برآمدوں کی لمبائی ڈھائی میل تک پہونچتی ہے۔ ان ۷۰۰ کمروں میں ہر کمرہ اپنی تعمیر اور زینت فرش و سقف کے لحاظ سے بالکل مختلف ہے۔

چھٹی منزل پر تین سو کمرے ہیں جہاں سے دریائے ٹیمس، اور شہر لندن کا منظر نہایت دلچسپ نظر آتا ہے۔ روشنی کا کوئی قمقمہ یہاں نظر نہیں آتا۔ جسوقت بٹن دبایا جاتا ہے اسطرح فرش سے نور ابھرتا ہے اور سارا کمرہ مصنوعی آفتاب کی روشنی سے جگمگا اٹھتا ہے۔ ان کمروں کی تعمیر ایسی ہے کہ آواز بازگشت یا گونج انمیں پیدا نہیں ہوتی۔

اس عمارت میں ۲۰۰۰ ٹیلیفون لگے ہوئے ہیں، ۴۰۰ ۵ بجلی سے چلنے والی گھڑیاں ہیں۔ ۱۲۷ لفٹ کیاں اور ۹ مصعد ([illegible]) ہیں، یہاں کوئی آتشدان بھی نہیں ہے لیکن اسی لوہے کے ذریعہ سے کمرے گرم ہوتے ہیں۔ بالائی منزل میں کھانے کے کمرے ہیں جہاں بیک وقت ۲۴۰۰ آدمی کھانا کھا سکتے ہیں۔ اس کی تعمیر میں ۱۵۰۰۰۰۰ پونڈ صرف ہوئے تھے۔

پیٹ کے اندر کی تصاویر

ڈنمارک کے کسی شخص نے ایک ایسا تصویر لینے والا آلہ ایجاد کیا ہے جو پیٹ کے اندر کی تصاویر لیتا ہے۔ اسکا تجربہ ختنگ سنگ قیدخانہ کے ایک قیدی پر کیا گیا جس کے معدہ پر عمل جراحی کیا گیا تھا۔ یہ کیمرہ گول کارتوس کی طرح ہے، یہ دو انچ لمبا ہے اور اسکا قطر صرف ۳/۴ انچ کا ہے اس کے کنارے ربڑ کی ایک باریک نلکی لگی ہوئی ہے۔ یہ کیمرہ نگل لیا جاتا ہے اور نلکی باہر نکلی رہتی ہے۔ اسکے ذریعہ سے ۱۶ تصویریں چھوٹی چھوٹی فلموں پر لیجا سکتی ہیں، کیمرہ کے اندر ایک برقی بیٹری لگی ہے جو پیٹ کے اندر جا کر روشن ہو جاتی ہے اور اسکی روشنی ۲۰۰۰ بتیوں کی روشنی کے برابر ہوتی ہے۔ یہ عمل صرف چند سکنڈ میں ختم ہو جاتا ہے اور ان تصویروں کو بڑا کرکے معدہ کے اندر کا تمام حال نہایت وضاحت کے ساتھ معلوم کیا جا سکتا ہے۔

ایک تباہ کن شہاب ثاقب

۱۹۰۸ء میں سائبیریا کی سرزمین پر ایک شہاب ثاقب اتنا زبردست آکر گرا تھا کہ اسنے گیارہ ہزار مربع میل کے اندر تمام آثار حیات کو نابود کر دیا۔ روس کا سائنس داں گذشتہ سال اپریل میں ایک جماعت کے ساتھ آمادہ ہوا کہ اس مقام کو جا کر دیکھے جہاں یہ تارا ٹوٹ کر گرا تھا۔

اس سائنس داں کا بیان ہے کہ جس حصۂ زمین میں یہ تارا گرا تھا وہاں سیکڑوں میل تک یہ عالم ہے کہ جنگل کے جنگل خاک ہو گئے ہیں اور زمین سیاہ ہو کر رہ گئی ہے۔ اسکے ساتھی سامان غذا کے کم ہو جانے اور بیماریوں میں مبتلا ہو جانے کے باعث واپس آ گئے۔ لیکن وہ اسکے بعد مہینوں تک اس حصۂ زمین کا مطالعہ کرتا رہا۔ جب اسکی واپسی میں بہت زمانہ لگ گیا تو حکومت روس نے ایک امدادی جماعت اسکی تلاش میں روانہ کی جو ایسے وقت میں اس تک جا کر ملی جب اسکا ذخیرۂ خوراک بالکل ختم ہو گیا تھا۔ اسکا بیان ہے کہ عہد تاریخ میں اتنا زبردست تارہ کبھی ٹوٹ کر نہیں گرا اور اگر یہ لندن، پیرس یا نیویارک پر گرتا تو ایک جاندار بھی وہاں کا باقی نہ رہتا۔ آئندہ موسم بہار میں وہ پھر پورے سامان کے ساتھ اس حصۂ زمین کی تحقیق مزید کیلئے جائیگا۔

انسان کی چھٹی حس

اسوقت تک انسان کے صرف پانچ حواس (حواس خمسہ) تسلیم کئے جاتے تھے، لیکن ہارورڈ کالج کے پروفیسر ڈاکٹر ریوفس جونس نے انسان کی چھٹی حس کو بھی ظاہر کیا ہے۔ چنانچہ وہ اپنے ایک مقالہ میں لکھتے ہیں کہ "ہم اپنی چھٹی حس سے بحالت بیداری ہر لمحہ کام لیتے رہتے ہیں، اگر یہ حس موجود نہ ہو تو ہم نہ چل سکیں نہ حرکت کر سکیں اس حس کا نام "حس حرکت" ہے اسکے ذریعہ سے ہمکو اپنے جسم کی مختلف اعضا کی جائے قیام معلوم ہوتی ہے اور ہم آنکھ بند کرکے اپنے ہر عضو کو چھو سکتے ہیں اور اسی کی ساخت سے وزن کا احساس ہوتا ہے، جب اس حساس میں خرابی ہو جاتی ہے تو ہسٹریا وغیرہ کی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں یہی حس ہمارے عالم جذبات میں بھی کام کرتی ہے خوف، مسرت، رنج وغیرہ کی کیفیات اسی حس کے ذریعہ سے پیدا ہوتی ہیں، بلکہ عالم خیال و تصور میں بھی یہی حس کام کرتی ہے مختصر یوں سمجھنا چاہئے کہ انسان کو اپنی ذات اپنے وجود اور اپنی ہستی کا علم اسی حس سے ہوتا ہے۔

رنگ کے ذریعہ سے تربیت

پروفیسر ہنری پاپے کا یقین ہے کہ رنگ کے ذریعہ سے انسان کی بداخلاقیوں کا علاج ہو سکتا ہے اور اسنے ایک مسلک اسکا قائم کر دیا ہے۔

مثلاً گلابی رنگ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اسکا پہننے والا قتل نہیں کیا جا سکتا، یا یہ کہ نیلا رنگ مفاصلی درد کا علاج ہے۔ پیرس میں اس مسلک کے لوگ ہزاروں موجود ہیں۔ سانویں حال ہی میں سمعفہ بازی اور پلاٹینم کی تسبیح رائج کی ہے جو انکے مسلک کی خاص پہچان ہے۔ اس جماعت کے لوگ روزانہ دو گھنٹے تک سفید کپڑے کو دیکھتے رہتے ہیں جس سے انہیں روحانی تسکین پہنچتی ہے۔ متلون مزاج لوگوں کا علاج پروفیسر موصوف نے یہ بتایا ہے کہ صبح اٹھکر انکو آئینہ کے سامنے جاکر آہستہ آہستہ یہ کہنا چاہئے کہ "ہر چیز جمیل و عظیم ہے، میں بھی ایسا ہی ہوں، مکمل ہوں بلکہ اور دوسرے بہتر ہوں اور جو چاہوں کر سکتا ہوں" اسکے بعد ایک خاص کمانہ انداز سے سیدھے کھڑے ہو کر سینہ کی ورزش کرنا چاہئے اور پھر ناشتہ تیوروں کے ساتھ کمرہ میں ادھر ادھر ٹہل کر دن کے کاروبار کے متعلق تدابیر سوچنا چاہئے۔
ایک غیر صحیح الدماغ انسان کیلئے نارنجی رنگ کا استعمال بہت مفید ہے۔ بے ایمانی کا جذبہ سفید رنگ کے دیکھنے سے زائل ہو جاتا ہے۔ کم ہمت لوگوں کے لئے سرخ رنگ کا استعمال بہترین علاج ہے۔ مزاج کی سختی اور بے رحمی گلدستوں کی طرف دیکھنے سے کم ہو جاتی ہے۔ پروفیسر مذکور کا بیان ہے کہ اس کے اصول پر عمل کرنے سے دو تین دن کے اندر تغیر محسوس ہونے لگتا ہے اور دو تین ہفتہ میں پوری صحت حاصل ہو جاتی ہے۔

مچھلی بازی

آپنے مرغ بازی، بٹیر بازی سنا ہوگا لیکن مچھلی بازی کا علم نہ ہوگا۔ اہل سیام اسکے ایسے شائق ہیں جیسے ہندوستان کے بعض شہروں میں مرغ بازی وغیرہ کے۔ بنگاک میں ایک خاص قسم کی مچھلی اسی لئے پالی جاتی ہے کہ اُسے لڑایا جائے۔ لڑنے والی دو نر مچھلیاں شیشہ کے مدور گلوب میں چھوڑ دی جاتی ہیں اور لوگ چاروں طرف کھڑے ہو کر تماشہ دیکھتے ہیں۔ یہ مچھلیاں اسقدر سخت جنگجو ہیں کہ جبتک ایک مر نہ جائے جنگ بند نہیں ہوتی۔ اس جلسہ میں ہزاروں روپیہ کی بازی لگتی ہے اور لوگوں میں بھی جوش و ہیجان کا وہی عالم ہوتا ہے جو گھوڑ دوڑ کے میدان میں نظر آتا ہے۔

جرمنی میں بھی ایک جنگجو مچھلی پائی جاتی ہے جو صرف ۳ انچ لمبی ہوتی ہے۔ اس مچھلی کا نر بلبلوں سے اپنا آشیانہ طیار کرتا ہے۔ یہ بلبلے پیدا کرکے ان پر اپنے لعاب دہن کی ایک تہ چڑھا دیتا ہے جس سے وہ مضبوط ہو جاتے ہیں پھر وہ مادہ کی تلاش میں نکل جاتا ہے اور جب اسے کوئی عروس حسب خواہش ملجاتی ہے تو یہاں لے آتا ہے جہاں وہ انہیں بلبلوں کے جھنڈ پر انڈے دیتی ہے۔ جب بچے نکلنے والے ہوتے ہیں تو وہ مادہ کو مار کر بھگا دیتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ یہ بچوں کو کھا جائے گی اور اسطرح خود اسکی غذا کم ہو جائیگی۔ ایک اور مچھلی ہے جو بہت زیادہ جنگجو اور خوفناک ہے۔ انکا جوڑا بہت مشکل سے ملتا ہے کیونکہ آپس میں لڑ لڑ کے ایک دوسرے کو مار ڈالتے ہیں۔ اس لئے جب انکا جوڑا بنایا جاتا ہے تو نر مادہ کو علیحدہ رکھا جاتا ہے اور جب کچھ دنوں کے بعد دونوں میں موانست ہو جاتی ہے تو تعلق بھی ایسا شدید ہوتا ہے اور دونوں ملکر اپنے بچوں کی حفاظت کرتے ہیں۔

آفتاب اور صحت

آفتاب کی روشنی ہماری حیات اور صحت کی کس حد تک ضامن ہے اسکا علم صحیح طور پر اگر ہو جائے اور اس سے ہم پورے طور پر فایدہ اٹھانے لگیں تو بہت سے عوارض آسانی سے دور ہو سکتے ہیں اور دواؤں کے استعمال سے بچ سکتے ہیں۔

آفتاب کی شعاعوں سے علاج کرنا نہایت قدیم طریق علاج ہے لیکن مدنیت و تہذیب نے جہاں اور باتوں کو بھلا دیا تھا، وہیں ایک یہ بھی تھا۔ اب چونکہ برق وغیرہ کی تحقیق کے سلسلہ میں آفتاب کی روشنی پر بھی غور کیا گیا ہے اس لئے بعض ماہرین فن نے پھر اس طریق علاج کو زندہ کیا اور شعاعوں سے علاج کرنے کا دستور وسیع ہوتا جاتا ہے، چنانچہ حال میں ملک معظم پر شعاعوں کے ذریعہ سے علاج کا اثر بہت قوی ثابت ہوا اور اکثر مدارس میں بچوں کو آفتاب کے سامنے لٹا کر انکی صحت کو برقرار رکھنے کا عمل جاری ہو گیا ہے۔

ایک پروفیسر کا بیان ہے کہ شہروں پر دھوئیں کے مجتمع رہنے سے چونکہ آفتاب کی روشنی پورے طور پر حاصل نہیں ہو سکتی اس لئے بچے اکثر تشنج ہو جاتے ہیں اور سل و دق کے مرض بڑھتا جاتا ہے۔ آفتاب کی روشنی سے زیادہ مفید علاج سل اور گنج کا کوئی نہیں ہے۔ اسکا خیال ہے کہ اگر شروع سے بچوں کو کھلی ہوا میں آفتاب کی روشنی سے مستفید ہونیکا موقعہ دیا جائے تو بہت سے خبیث و مہلک امراض کے جراثیم فنا ہو سکتے ہیں۔

چونکہ آفتاب کی روشنی سے جسم کے اندر وٹیامین کی کافی مقدار پیدا ہوتی ہے اسلئے تمام وہ امراض جو وٹیامین کے فقدان سے پیدا ہوتے ہیں، دور ہو جاتے ہیں۔ آفتاب شعاعوں میں ایک شعاع مافوق البنفسجی بھی شامل ہوتی ہے اور انسانی صحت کا بہت کچھ انحصار اسی شعاع پر ہے چنانچہ مغرب میں کھڑکیوں کے اندر ایک خاص قسم کی معدنی جالی ایسی لگائی جاتی ہے جس سے یہ شعاع حاصل ہوتی رہتی ہے اور مریض کو باہر دھوپ میں جلنے کی چنداں ضرورت نہیں ہوتی۔

حال ہی میں ایک بیٹری ایسی بنائی گئی ہے جسکو اگر بجلی کے تار سے وابستہ کر دیا جائے تو اسکی نلکی کے اندر یہ شعاع پیدا ہونے لگتی ہے۔ اس نلکی کو جسم ماؤف پر آہستہ آہستہ پھرانے سے بڑی حد تک مرض کا ازالہ ہو جاتا ہے اور اعصابی کمزوریاں مفاصلی درد وغیرہ آسانی سے دور ہو جاتی ہیں۔

ہندوستان میں بچوں کو بھاری اور موٹے لباس پہنانیکا دستور ہے خاصکر جاڑوں میں تو اس کو سر سے پاؤں تک لپیٹ کر بالکل پارسل بنا دیتے ہیں، یہ بھی صحت کیلئے بہت مضر ہے کیونکہ آفتاب کی روشنی جسم تک نہیں پہنچ سکتی۔ لباس کا موٹا ہونا اچھا ہے لیکن اسکو اسقدر ڈھیلا اور کھلا ہوا ہونا چاہئے کہ ہوا اور روشنی کے نفوذ میں حارج نہ ہو۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نگار

فہرست مضامین جون ۱۹۲۹ء

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۱۶ | جون ۱۹۲۹ء | شمار ۶

ملاحظات

أجرى المدامع بالدم المهراق
خطب أقام قيامة الآماق

الغرض وہ خطرہ جس کا اندیشہ تھا آ کر رہا اور جس ہولناک نتیجہ سے تمام عالم اسلامی ڈر رہا تھا سامنے آہی گیا۔ دنیا مین اس سے قبل بھی وحشت و بربریت نے جہل و علم کا مقابلہ کیا ہے، مکاید سیاست اور وسائس استعمار نے اس سے پہلے بھی انسانیت و اخلاق کو بارہا مجروح کیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ امیر امان اللہ خان کا انتہائی یاس کے ساتھ اپنے ملک کو تباہ و خون آلود حالت مین چھوڑ کر چلے جانے پر مجبور ہونا ایسا زبردست خراج ہے جو اس سے قبل شاید ہی کبھی حق و صداقت کی طرف سے کذب و بطلان کے حضور مین پیش کیا گیا ہو۔

یا راحلاً وجمیلُ الصبرِ یتبعهُ
هل من سبیلٍ الی لقیاک یتفقُ

(اے صبر و ضبط کی سِل سینہ پر رکھ کر جانے والے۔ سچ بتا کیا تجھ سے پھر ملنے کی بھی کوئی سبیل ہو سکتی ہے یا نہین)

آج ۲۷ مئی کو جب کہ مین ملاحظات لکھنے جا رہا تھا یہ دلدوز خبر آئی ہے اور مین حیران ہون کہ اپنے جذبات کا بیان کن الفاظ مین کرون اور اُس غم و غصہ کو کیونکر ظاہر کرون جو اس وقت میرے ریشہ ریشہ مین ایک التہاب کی کیفیت پیدا کئے ہوئے ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ امیر امان اللہ خان کا اپنے بدنصیب و جاہل ملک کی اصلاح سے مایوس ہوکر چلا جانا، کسی ایک ذات کی مایوسی اور کسی ایک اسلامی سلطنت کی تباہی و بربادی کا سوال نہین ہے، بلکہ وہ سوال ہے اسلام کے مستقبل کا، تمام عالم اسلامی کے انجام کا اور اس کا کہ کیا وہ وقت ابھی نہین آیا ہے جب ان علمبرداران مذہب کے خلاف جو حقیقتاً انسانی درندے ہین جہاد عظیم کیا جائے۔

مین قیامت تک یہ ماننے کے لئے تیار نہین کہ انقلاب افغانستان صرف سیاست بیرونی کے مکاید کا نتیجہ ہے، کیونکہ اگر ملک کے مذہبی قایدین جن کے اشارہ پر جاہل پٹھانون کی حرکت و جنبش موقوف ہے۔ خود ذلیل و دنی الطبع نہ ہوتے تو وہ کیون کسی خارجی اثر کو قبول کرتے (اگر واقعی کوئی ایسا اثر پیدا کیا گیا) اور یہ وحشیون کا گروہ کیون اپنے ہات سے اپنی خودکشی کے اسباب فراہم کرتا۔

حقیقت یہ ہے کہ بدنصیب ہے وہ قوم جو مذہبی علماء کے اختیار مین ہو اور حد درجہ بدبخت ہے وہ ملک جس کے تدبیر و اصلاح مین ان بندگان طاغوت کو درخور حاصل ہو۔ یہ گروہ خواہ وہ ہندوستان مین ہو یا افغانستان مین، ترکی مین ہو یا مصر و ایران مین ہر جگہ اک مستقل عذاب کی صورت اختیار کئے ہوئے ہے اور یہ بھی قدرت کا عجیب و غریب کھیل ہے کہ جس جماعت کو منصب تعمیر کے لئے متعین کیا تھا اس کے ہاتھون آج وہ تخریب کا تماشہ دیکھنا چاہتی ہے۔

افغانستان سے ایک شخص اٹھتا ہے اور تمام اُن قربانیون کے بعد جو ایک انسان پیش کرسکتا ہے ملک کو جلد سے جلد منازل ترقی طے کرنے پر آمادہ کرتا ہے، اور چند دن مین اتنی عظیم سیاسی اہمیت پیدا کرلیتا ہے کہ کرۂ ارض کے مغرور ترین حکومتین بھی اس کی آزادی اور خودمختاری تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتی ہین۔ لیکن ٹھیک اس وقت جبکہ آفتاب اقبال نصف النہار پر پہونچنے کے قریب ہوتا ہے، ملک کے بوسیدہ خانقاہون، مرکز جہل و عصیان عبادتگاہون سے مخالفت کی آواز بلند ہوتی ہے کہ امان اللہ کافر ہے کیونکہ وہ تعلیم جدید کا حامی ہے، آزادی نسوان کا طرفدار ہے، مغربی ملبوس پسند کرتا ہے اور ان اسباب و دلایل پر اس کو علحدہ کرکے ملک کے تمام آثار ترقی و حیات کو برباد اور افغانستان کو پھر ایک صدی کے لئے پیچھے ڈھکیل دیا جاتا ہے۔

وائے گر درپس امروز بود فردائے

اگر یہ حامیان مذہب و مذہبیت واقعی راستی پر ہین اور امان اللہ خان کی اصلاحات جدیدہ حقیقتاً کافرانہ جسارتین تھین اور اسلام نام ہے صرف اس جہل و تاریکی، اُس بوسیدگی و کہنگی، اُس پستی و ذلت اور اُس نکبت و بدسلیقگی کا جس کا بہترین نظارہ حامیان مذہب کے خلوتکدون، اُن کی عبادتگاہون اور اُن کی مجالس وعظ و تلقین مین کیا جا سکتا ہے، تو پھر وہ وقت دور نہین جب ہر شخص کا انسانی و فطری فرض یہ ہوگا کہ وہ مذہب اسلام ہی کو دنیا سے نیست و نابود کرنے کے لیے اٹھ کھڑا ہو اور اگر ایسا نہین ہے، بلکہ اسلام نام ہے ایک روشن حقیقت کا، اک ارتقائی اقدام کا، مادی و روحانی استعلا و ترقی کا،

بلکہ اس سے بھی زیادہ یہ ثابت کر دینے کا کہ دنیا مین جہان تہذیب و تمدن ہے، جہان حق و صداقت ہے، جہان راستی و دیانت ہے، جہان خیر و برکت ہے، جہان امن و فلاح ہے، وہ صرف اسلام ہی کا کرشمہ ہے اور اسلام نام ہے صرف مکارم اخلاق کا، نہ کسی مخصوص وضع و ملبوس، اور کسی متعین گرایش و نمایش کا، تو پھر لازمی منطقی نتیجہ صرف یہی نکلتا ہے کہ ہر وہ شخص جو دشمن ترقی ہے دشمن اسلام ہے اور مولویون کو جسقدر عداوت اس چیز سے ہے اس کا حال کسی سے مخفی نہین ہے۔

قبایل کی جنگ ایام عرب کی مشہور چیز تھی، لیکن اسلام نے ظاہر ہو کر سب سے پہلے اس کو مٹایا۔ آج غلزئیون اور درانیون دو قبیلون کی مخالفت افغانستان کو تباہ کر رہی ہے، لیکن یہ پیروان سنت نبوی اس اختلاف کو کم کرنے کے بجائے اور زیادہ شدید بنا رہے ہین، اسلام کا درس یہ تھا کہ الحکمۃ ضالۃ المومن (حکمت و دانائی مومن کی کھوئی ہوئی چیز ہے۔ جہان ملے اُسے لیلو) لیکن یہ جانشینان رسول آج یہ سمجھا رہے ہین کہ اسلام نام ہے صرف قدامت پرستی اور جہل و پسپائی کا، اسلام نے ہدایت کی تھی کہ طلب علم مین پوری جد و جہد کرو، حالات عالم پر غور و فکر کرو، صحت تدبر اور اصابت رائے سے کام لیکر دنیا مین خدا کی خلافت دنیابت قایم کرو، لیکن آج اسلام کی جماعت تنایدین کہتی ہے کہ نہین اسلام نام ہے صرف اس دایرہ مین رہنے کا جہان انسان پیدا ہوا ہے، اسلام نام ہے صرف کجروی اور اعوجاج دماغ کا اور جو شخص جتنا زیادہ جاہل، زیادہ احمق اور زیادہ بندۂ نفس ہے اتنا ہی زیادہ مسلمان ہے۔ پھر ظاہر ہے کہ جس ملک و ملت کی باگ ایسے متبرک ہاتھون مین ہو گی وہان جو نکبت و ادبار بھی ظاہر ہو کم ہے اور وہان کی سرزمین جسقدر تباہ و برباد ہو زیادہ نہین۔

مولویون کی جماعتین خواہ ہندوستان مین ہو یا اس سے باہر حقیقتاً انسانیت کی توہین ہین اور ان کا وجود کائنات مین اسی لعنت کا مستحق ہے جو کا ذبین اور کافرین کے لئے استعمال کی گئی ہے۔ انھون نے اپنی خاص صورتین بنائی ہین، انھون نے اپنا ایک ملبوس علیحدہ وضع کیا ہے، انھون نے اپنی ایک زبان جداگانہ قایم کی ہے، الغرض انھون نے اپنے آپ کو بتون کی طرح پیش کر کے اس کے سامنے لوگون کو سربسجود ہونے کا حکم دیا ہے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ ان بتون کو توڑ ڈالا جائے، ان کی صورتین بگاڑ دیجائین ان کے عبا و قبا مین آگ لگا دیجائے اور ان کے مواعظ و نصائح کو جو یکسر مجموعۂ مزخرفات ہین در یابُرد کر دیا جائے۔ ان کی لمبی داڑھیان عہد نبوی کی داڑھیان نہین ہین بلکہ قسیسین و رہبانیین کی داڑھیان ہین جو صرف شہوت پرستی و ستمرانی کے سایہ مین بڑھتی تھین، ان کے عبا و قبا، ان کا عمامہ و جریب، ان کی تسبیح و تہلیل، ان کے اوراد و وظایف، قرون اُولیٰ کی نشانیان نہین ہین بلکہ نصاریٰ و یہود و گبر و ترسا کے مذہبی قایدین کی یادگار ہین جن سے سوائے اشاعت مکر و فریب کے اور کوئی کام نہ لیا جاتا تھا۔ اس لئے ضرورت ہے کہ دنیا ان بہروپیون کے صحیح خد و خال کا مطالعہ کرے اور ان کو اسی طرح ٹھکرا دے جیسے ایک ذلیل کتے کو ٹھکرا دیا جاتا ہے۔

آج افغانستان کا یہ نابکار گروہ اپنی کامیابی پر بہت نازان ہو گا، لیکن اس کو معلوم ہونا چاہئے کہ امان اللہ خان کی ناکامی بھی اہل نظر کے نزدیک بڑی فتح ہے اور اُن کی یہ وقتی و عارضی فتح و کامیابی بدترین شکست کا حکم رکھتی ہے۔

جس وقت تاریخ افغانستان مرتب کی جائیگی تو امان اللہ خان کا نام وہان بھی زرین حروف سے لکھا جائیگا اور اُن بندگان حرص وہوا اور غلامان زر پر وہان بھی لعنت بھیجی جائیگی۔

یقیناً حکمران ہونے کے بعد کسی کا اپنے محبوب مُلک کو چھوڑنے پر مجبور ہونا انقلاب کا نہایت ہی دردناک منظر ہے، لیکن ہمکو یقین ہے کہ امان اللہ کے لئے تکلیف اگر کوئی ہے تو یہ نہین کہ تخت و تاج ان کے ہات سے چھین گیا بلکہ صرف یہ کہ ملک نے ان کے قدر و قیمت کا اندازہ نہ کیا اور ان کی قوم پھر اس مذلت و پستی کی طرف چلی گئی جس سے انھون نے اس کو نکالا تھا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ یہ خلش اس وقت تک امان اللہ خان کے دل سے نہین نکل سکتی، جب تک مُلک کو پھر اسی منزل پر گامزن نہ دیکھ لین جو خود اُنکا نصب العین تھا۔

وہ یہان کے جانے کے بعد غالباً اٹلی مین رہین گے اور اپنی شخصیت کے لحاظ سے ہر جگہ اُن کی وہی عزت کیجائیگی جو بہ حیثیت ایک روشن دماغ انسان ہونے کے کسی کی ہوسکتی ہے، لیکن وہ شخص جو یہ سمجھتا ہے کہ ایک شخص کے انفرادی عزت اس کی توہین ہے اگر اسکی قوم اس قابل نہین، ان تمام مراسم عزت و احترام سے کیا خوش ہوسکتا ہے۔

امان اللہ خان کے آخری الفاظ افغانستان سے جدا ہوتے وقت یہ تھے کہ "مین اگر حکومت کرسکتا ہون تو صرف ایک متمدن ملک و قوم پر" اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اگر اس وقت اپنا تاج و تخت واپس لے لیتے تو بھی ان کو کوئی امید افغانستان کے سنبھلنے کی نہ تھی اور شاید وہ پھر اُن اصول کو اختیار کرنے پر مجبور ہوتے جو اُن کے نزدیک ملک کیلئے غیر مفید ہین۔ بہر حال امان اللہ خان جو درانی خاندان کا سب سے زیادہ تابناک فرد تھا اب افغانستان سے دُور ہے اور بالکل ممکن ہے کہ جس طرح ایران مین قاچاری اور ٹرکی مین عثمانی خاندان کی حکومت ہمیشہ کے لئے ختم ہوگئی ہے، افغانستان مین بھی دُرّانی خاندان ہمیشہ کے لئے محروم تاج و تخت ہوجائے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اب افغانستان کا کیا حشر ہوگا اور یہ طوائف الملوکی کس نتیجہ پر جاکر ختم ہوگی۔

اس وقت میدان مین تین قابل ذکر ہستیان موجود ہین۔ ایک بچہ سقہ، دوسرا نادر خان اور تیسرا علی احمد جان جس نے قندہار مین تخت شاہی پر بیٹھکر اپنی ملوکیت کا اعلان کردیا ہے۔ ان مین باہم جنگ کا ہونا یقینی ہے اور اگر بچہ سقہ کی حکومت کو افغانستان کی قومون نے منظور نہ کیا تو پھر یہ بالنسبۃً زیادہ تر نادر خان ہی کی طرف پلٹتا ہوا معلوم ہوتا ہے کیونکہ اب امان اللہ خان کا سوال درمیان مین نہ رہنے کی وجہ سے قبایل کی ہمدردی و حمایت حاصل کرلینا ان کے لئے زیادہ دشوار نہین۔ سردار علی احمد جان کا مستقبل بچہ سقہ سے زیادہ تاریک ہے۔ بہر حال اس وقت افغانستان کی حکومت بہت زیادہ تشویشناک ہے اور نہین کہا جاسکتا کہ آیندہ یہان ملوکیت ہی قایم رہیگی یا جمہوریت کا نظام پیدا ہوگا۔

مسلمانان ہند کو جو درس اس ٹریجڈی سے حاصل کرنا ہے وہ اس سے زیادہ نہین کہ جس فضا مین وہ زندگی بسر کررہے ہین اس کی نزاکت اس سے کہین زیادہ اہم ہے اور اگر انھون نے اب بھی ہوش نہ سنبھالا اور مذہبی مجانین ہی کے فیصلہ

اپنے مستقبل کو چھوڑ دیا، تو انکا بھی وہی حشر ہونے والا ہے جو اسپین کے مسلمانون کا ہوا۔

اس اشاعت کے ساتھ پندرھوین جلد نگار کی ختم ہوتی ہے اور جی چاہتا ہے کہ اپنے مساعی پر اُسی نوع کی تنقید کرون جیسے غالب کی زبان مین "خندہ بر بے اثر یہائے نمکدان" کہتے ہین۔

اجراءِ نگار سے اس وقت تک مادی و معنوی حیثیت سے جو جو انقلاب نگار مین ہوئے، انکا علم مجھسے زیادہ کسی کو نہین، لیکن اُن کا تفصیلی بیان بہت کچھ شخصی حیثیت رکھتا ہے، اس لئے مین اس کی بے عذلی مین ناظرین نگار کے "کام و دہن" کو شرکت کی دعوت دینا مناسب نہین سمجھتا اور ماضی کے متعلق صرف اُصل اختصار پر اکتفا کرونگا جو مستقبل کی تفصیل سمجھنے کے لئے ضروری ہے۔

سنہ ۱۹۲۲ء کا آغاز ہے اور ایک مخصوص محفل احباب، جس کے افراد اب اپنے انتشار کے لحاظ سے بالکل "شذرات" کی حیثیت رکھتے ہین ایک جریدۂ ادبی کے اجراء پر غور کرتی ہے اور اس کے نظم و ادارت کا بار میرے سر ڈالکر علیحدہ ہو جاتی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے کسی کو دریا مین ڈالکر ساحل سے اس کے ڈوبنے یا کنارہ تک آجانیکا نظارہ کیا جائے۔ مین نہین کہتا کہ "نمانشا ئیان لب ساحل" خطرہ کے وقت بھی ایسے ہی غافل و غیر ہمدرد ثابت ہوتے، لیکن یقین کے ساتھ اس کے خلاف بھی نہین کہہ سکتا کیونکہ جب "رشتہ بے گرہ" نہ ہو اور "ناخن گرہ کشا" ثابت ہو، تب کچھ کہا جا سکتا ہے۔ لیکن باایہمہ نگار جب تک قایم ہے وہ اپنے مؤسسین کے احسان سے کبھی سبکدوش نہین ہوسکتا اور نہ مین "بار بھوپال" کے اُس بار کرم سے کبھی آزاد ہوسکتا ہون، جس کے سایہ عطوفت مین اطمینان سے بیٹھکر مین نے نگار کے ابتدائی سخت صعب منازل کو حد درجہ سکون و طمانینت کے ساتھ گزار دیا۔ اور جس کی اعتماد پر "کار جہان زیر دلی بے خبرانہ کردہ ایم"

اب غالباً اس حقیقت سے کسی کو انکار نہین ہوسکتا کہ نگار کی بنیاد مستحکم ہو چکی ہے اور اگر اسباب فراہم ہو جاین تو اسپر بہتر سے بہتر عمارت قایم ہو سکتی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ وہ اسباب کیونکر فراہم ہو سکتے ہین؟

اس وقت تک کہ ایک کام کسی ایک شخص کی ذات سے وابستہ ہے، کسی مخصوص ہستی پر اس کے قیام کا انحصار ہے، اُسکی بے ثباتی ظاہر ہے، اسلئے کہ ہندوستان مین مستحکم سے مستحکم شخصی کاروبار بھی ہر وقت خطرہ مین ہے اور بلاد یوروپ مین ضعیف سے ضعیف "اجتماعی" صورتِ عمل بھی درخشان مستقبل رکھتی ہے۔ ہندوستان مین ایک اخبار یا رسالہ بھی ایسا نہین جو اپنے مؤسس کے بعد قایم رہا ہو اور مغرب کی صحافت مین کثرت سے ایسی مثالین ملتی ہین کہ افراد کی موت نے اصل کام مین کوئی تغیر پیدا نہین کیا۔

ہر شخص کی یہ فطری خواہش ہوا کرتی ہے کہ اس کا کام زیادہ دیر پا ثابت ہو اور وہ اس خواہش مین اپنی ذات کے بقا و فنا کے سوال کو بھی پس پشت ڈالدیتا ہے۔ اس لئے اگر نگار کے بقا کے متعلق میرے دل مین بھی یہ تمنا پیدا ہو، تو جائے تعجب نہین اور اگر مین اپنے اس خیال کو پبلک مین لاکر اس پر تنقید چاہون تو شاید کسی جرم کا مرتکب نہ سمجھا جاؤنگا۔

مین ہر وقت اسی مسئلہ پر غور کرتا رہتا ہون کہ نگار کے موجودہ کاروبار کو کیونکر ترقی دیکر اُسے بہت زیادہ مستحکم و دیرپا بنایا جاسکتا ہے اور ہمیشہ اس نتیجہ پر پہونچتا ہون کہ اس کی تنہا صورت صرف یہ ہے کہ اس کو "اجتماعی" مفاد سے متعلق کر دیا جائے اور کسی ایک شخص کی ملکیت نہ رکھا جائے۔ اس کی تدبیر اخلاقاً و قانوناً، اقتصاداً و عقلاً صرف ایک ہی ہوسکتی ہے اور وہ یہ کہ اس کے لئے ایک سرمایہ متعین کرکے پبلک کو اس مین شرکت کی دعوت دیجائے! اور مین صرف ایک حصہ دار ہونے کی حیثیت سے اس سے تعلق رکھون۔

اگر کسی اخبار یا رسالہ کا ذاتی پریس موجود ہو تو اس کے لئے بہترین صورت کاروبار کی یہ ہے کہ کتابون کی اشاعت کا انتظام کیا جائے اور جن کو اس کا تجربہ ہے وہ جان سکتے ہین کہ اس وقت یہ کاروبار کسقدر نفع کا ہے۔ اگر کوئی ایک شخص اسکے لئے آمادہ ہوجائے کہ وہ پورا سرمایہ لگا کر نگار اور اس کے کاروبار کو ترقی دے تو مین اس صورت مین بھی سب کچھ اس کو دیدینے کیلئے آمادہ ہون، لیکن، اس طرح پھر وہی شخصی حیثیت پیدا ہوجائے گی اور مین اس حیثیت کو مٹانا چاہتا ہون۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سرمایہ کیا ہوگا۔ اس کو کتنے حصون مین تقسیم کیا جائے گا اور اس سے متعلق اور بہت سی تجارتی تفصیلات و جزئیات، سو اس کو مین کسی آیندہ موقعہ کے لئے اٹھا رکھتا ہون اور فی الحال اس مسئلہ کو اس اجمال کے ساتھ صرف یہ معلوم کرنے کے لئے پیش کرتا ہون کہ حلقۂ نگار مین یہ تحریک کس حد تک مقبول ہوسکتی ہے اور کتنے افراد اس مین عملی حصہ لینے کے لئے تیار ہوسکتے ہین۔ اگر مین نے دیکھا کہ وہ ایسا آمادہ ہین تو تمام تفصیلات اُن کے سامنے پیش کر دیجائین گی۔ ورنہ پھر مین اور تدابیر اختیار کرونگا اور کسی نہ کسی طرح اپنے اس ارادہ کو مکمل کرکے چھوڑونگا۔

مجھے امید ہے کہ ناظرین نگار اس باب مین اپنے خیالات کا اظہار آزادی سے کرین گے اور مجھے کسی نتیجہ پر پہونچنے مین مدد دین گے۔

جنوری کے الناظر مین جناب زبید احمد صاحب ام اے (جو آج کل لندن مین ڈاکٹری کی ڈگری حاصل کرنے کی غرض سے مقیم ہین) نے ایک مقالہ شایع کرایا ہے اور اپنے پندار مین گویا حکیم بنکر یہ فیصلہ کرنا چاہا ہے کہ میرے اور عبد الماجد صاحب دریابادی کے درمیان جو اختلاف ہے، اس کے ذمہ داری زیادہ تر مجھ پر عاید ہوتی ہے اور اس کے کچھ دلایل بھی ضبط فرمائے ہین لیکن اس کے ساتھ چونکہ فاضل مقالہ نگار نے یہ بھی اعتراف کیا ہے کہ نگار کے وہ تمام پرچے اُن کی نگاہ سے نہین گزرے، جن مین ماجد صاحب کے متعلق مین نے اظہار خیال کیا ہے۔ اس لئے مجھے زیادہ عرض کرنے کی ضرورت نہین۔ تاہم مختصراً یہ ظاہر کردینا ضرور ہے کہ میرے اور عبد الماجد صاحب کے درمیان قطعاً کوئی مخالفت نہین ہے مین اُنکا وہی احترام کرتا ہون جس کے وہ مستحق ہین اور مین اُن کے وجود کو ملک و ملت کے لئے بہت غنیمت سمجھتا ہون۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ مین اپنے اطمینان نفس اور آزادی ضمیر کی قربانی کرکے کسی کے معتقدات و خیالات کا پابند نہین ہوسکتا۔ سب سے پہلے جناب ماجد صاحب ہی نے الناظر مین کسی شخص کے استفسار کا

جواب دیتے ہوئے، میرے "خراباتی" ہونے پر اظہار خیال کیا۔ اور چونکہ اس مین بعض صحیح واقعات کی تغلیط بھی تھی اس لئے مینے اس کا جواب دینا ضروری سمجھا۔ اس کے بعد شاید ایک یا دو مرتبہ ان کے معتقدات سیاسی کے متعلق لکھنے کی نوبت آئی اور بس اس سے زیادہ نہ میرے اُن کے درمیان کوئی مخالفت ہے نہ مخالفت کا کوئی سبب۔

جناب عبدالماجد صاحب نے فروری کے الناظر مین، زبید احمد صاحب کے مضمون کو دیکھ کر حد درجہ انکسار و فروتنی سے کام لے کر اُن تمام مضامین کے علم سے انکار کیا ہے جو نگار مین شایع ہوئے ہین۔ مجھے بھی اس کے تردید کی ضرورت نہین لیکن اتنا علم مجھ کو ہے کہ ان مضامین کے شایع ہونے کے بعد، دارالمصنفین کے ایک رُکن کو اُنھون نے ضرور اس طرف توجہ دلائی تھی کہ نگار کے مضامین کا جواب دیا جائے۔ ممکن ہے یہ صرف "حسن اتفاق" ہو یا کوئی "ملہمانہ کیفیت" جس نے چشم سر کے بجائے صرف "دیدۂ بصیرت" سے کام لیا ہو۔ بہر حال حقیقت جو کچھ ہو مین اپنی طرف سے زبید احمد صاحب کو یقین دلانا چاہتا ہون کہ میرے دل مین کسی غیر کی طرف سے بھی کوئی جذبۂ فرومایہ پیدا نہین ہوتا چہ جائیکہ "ماجد صاحب"، جو اپنون مین بھی "خواص" کا درجہ رکھتے ہین۔

اپریل کے مُبصر مین جناب مدیر نے نگار نہین بلکہ مدیر نگار پر تبصرہ کرنے کی زحمت گوارا فرمائی ہے اور اسی سلسلہ مین میرے اعتقادات سے بحث کرتے ہوئے مسئلۂ عبادت کو بھی چھیڑ دیا ہے اور چند آیات قرآنی بھی درج کی ہین جنمین لفظ عبادت یا اس کے مشتقات مذکور ہین، اور اس طرح گویا انھون نے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ کلام مجید مین متعدد مقامات پر عبادت کرنے (یعنی نماز پڑھنے) کی ہدایت کی گئی ہے، حالانکہ عبادت کی تعریف و غایت کا کہین ذکر نہین ہے۔ افسوس ہے کہ اس ماہ کی تمام کا بیان چھپ چکی ہین اور جواب دینے کا موقعہ حاصل نہین۔ ماہ آیندہ کے رسالہ مین مُبصر کے فاضل مدیر کو بتاؤنگا کہ کلام مجید مین کسی ایک جگہ بھی اُس عبادت کا ذکر نہین ہے جسے مذہب کی اصطلاح مین نماز سے تعبیر کرتے ہین، یہانتک کہ جہان جہان رکوع و سجود کی ہدایت ہے، وہان بھی کوئی مخصوص انداز نشست و برخاست "عبادت" کا مراد نہین ہے۔ مین غالبًا ان کے اس "تبصرۂ بصارت" پر اعتنا نہ کرتا اگر واقعی یہ "بصیرت کش" خیال اس مین ظاہر نہ کیا جاتا۔

اس سلسلہ مین جناب ناطق نے میرے متعلق یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے کہ مین اپنی غلطی کو کبھی تسلیم نہین کرتا، اور مجھے اپنے علم و فضل پر اسقدر ناز ہے کہ دوسرے کی بات سنتا ہی نہین۔ جناب ناطق معاف فرمائین اگر مین یہ کہون کہ "ان ھذا الّا بھتان عظیم"۔ آپ یا کوئی اور صاحب باور کرین یا نہ کرین لیکن یہ واقعہ ہے کہ مجھ سے زیادہ جری اپنی غلطی تسلیم کرنے مین شاید ہی کوئی دوسرا ہو، اور مین نے ہمیشہ اپنی غلطیون کا اعتراف صاف و صریح الفاظ مین کیا ہے۔ رہا "علم و فضل"، سو اس پر مین کیا ناز کرونگا جب کہ اس وقت دنیا کے بڑے سے بڑے انسان کے معلومات رموز فطرت کے مقابلہ مین قطرہ و دریا کی نسبت بھی نہین رکھتے۔

میرزا غالب کا مذہب

مذہب کو شاعروں کے۔ تو کیا پوچھتا ہے شیخ
جسوقت جو خیال ہے۔ مذہب بھی ہے وہی (اکبر)

میرزا غالب دہلوی مرحوم کی پذیرائی جیسی انکے شایان شان تھی۔ اگرچہ انکی زندگی میں تو سکی مگر بالآخر ملک و قوم نے کی اور خوب کی انکی فارسی اور اردو شاعری، انکی نثاری، انکی جدت پسندی، انکی ظرافت، انکی شرافت، انکی فیاضی، اور انکی امداد بیچارگاں، غرض ان کے صفحۂ ہستی کی ہر سطر بلکہ ہر لفظ اور انکے چہرۂ زندگی کا ایک ایک خط و خال کافی وضاحت سے منظر عام پر لایا جا چکا ہے۔ اب کسی کا ان کے متعلق کچھ لکھنا غالباً تحصیل حاصل سے زیادہ نہیں۔ لیکن باوجود اس کے ان کے مذہب کا مسئلہ سخت اختلافی بنا ہوا ہے۔ اور جہاں تک میرا خیال ہے کسی نے انکے مذہب پر مختتم بحث ابتک نہیں کی۔

اگر یہ سچ ہے کہ تاریخ و سیر کا احیاء و ابقاء آئندہ نسلوں کے لئے درس عبرت اور ورقِ نصیحت ہے تو اسکو بھی ضروری ہونا چاہیئے کہ سوانح ویسے ہی ہوں جیسے صاحب سوانح میں تھے یعنی متوفی اور اس کے تذکرہ میں اصل و نقل، سیاہ و سفید، صحیح و غلط کی مناسبت ہو۔ نیز یہ کہ اگر عوام کسی دھندلے نشان کیوجہ سے صاحب سوانح کا چہرہ ہو بہو اور مو بمو نہ دیکھ سکیں یا کسی اور عارض کے باعث، لوگ کسی غلط فہمی میں پڑ جائیں تو اہل زمانہ کا فرض ہونا چاہیئے کہ جلد از جلد اسکی اصلاح کر دیں کیونکہ امتدادِ زمانہ کے باعث کبھی وہی چھوٹی غلط فہمیاں، بڑے خیالات اور غلط عقاید بنجائیں گی اور پھر وہ سوانح و تذکرہ بجائے درس عبرت ہونے کے، اکثر موجب ضلالت ہوں گے اور بیشتر باعث نفرت!!

ہند کے مشہور اہل قلم مولانا شبلی مرحوم اپنی تصنیف "اورنگ زیب پر ایک نظر" میں لکھتے ہیں "فلسفہ تاریخ کا یہ ایک راز ہے کہ جو واقعہ جس قدر زیادہ مشہور ہوگا اسی قدر زیادہ غلط اور دور از کار ہوگا" واقعی بالکل سچی رائے ہے۔ بات یہ ہے کہ طبائع مختلف ہوتے ہیں اور اقتضائے زمانہ بدلتا رہتا ہے۔ ناممکن ہے کوئی شخص مرتے دم تک ایک ہی ماحول اور ایک ہی فضا میں رہے دوسرے جو شخص جتنا زیادہ مرجع عوام ہوگا اسی نسبت سے اس کے متعلق زیادہ غلط اور دور از کار روایتیں مشہور ہونگی کچھ غلط فہمی سے کچھ خوش اعتقادی سے، اور اکثر تو لوگوں کی دروغ بیانیوں سے۔ اور اگر کہیں ان قدرتی اسباب کے ساتھ صاحب سوانح کوئی آزاد خیال۔ صلح کل اور مرنجاں مرنج شخص ہوا، جو ہر مسلک والوں سے خندہ پیشانی وسیع النظری اور رواداری سے ملا تو پھر قیامت ہی ہے۔ اس صورت میں لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ صاحب سوانح زیادہ غلط اور خلاف واقع اوصاف کیساتھ، ایک بالکل جداگانہ شکل و لباس میں روشناس عوام ہوتا ہے۔ اور غالب کو بالکل یہی صورت پیش آئی۔

آپ اس نظریہ کو زید و عمر کے یا غالب کے تذکرہ میں نہ دیکھئے بلکہ اصولاً اس پر نظر ڈالئے۔ عنقا اور دیوار قہقہہ کو بھی جانے دیجئے۔ کیا آج دنیا اس امر کو باور کریگی کہ کلکتہ کی کال کوٹھری کا واقعہ محض نام نہاد اور بے بنیاد تھا۔ یا جہانگیر شراب کے نشہ میں چور اور سلطنت کے امور سے غافل نہ تھا بلکہ وہ نہایت باخبر، ہوشیار، نکتہ رس اور عادل بادشاہ تھا۔ بادہ خواری کا واقعہ گو صحیح ہے لیکن نہ اس حد تک کہ لکھو ہ در ایام جوانی چنانکہ

افتد، دانی" کے قبیل سے تھا۔ اور آخر میں یہ کہ کیا دنیا اس کے ماننے کے لئے تیار ہے کہ عالمگیر بد نہیں تھا مگر بدنام ضرور ہو گیا مورخین نے جلد اسکی خبر نہ لی بس جھوٹ نے جڑ پکڑ لی۔ اب معدودے چند ہی لوگ ایسے ہیں جو جانتے ہیں کہ مذکورہ بالا مثالوں کے متعلق جو حالات مشہور ہیں انکے جھوٹ میں کسقدر سچ ہے۔ اب بھی اگر جلد خبر نہ لی گئی تو عجب نہیں کہ اتنا احساس بھی مفقود ہو جائے۔

اسوقت اس تحریر کا مدّعا بھی ایک شبہ کا ازالہ ہے۔ لوگ غالب علوی کو شیعہ بتاتے ہیں حتیٰ کہ بعض شیعہ اخباروں کی یہ روش بھی نظر آئی کہ مرزا صاحب کی وہ نظمیں جن سے یہ عقاید تشیع مترشح ہوتے ہیں۔ خاص نمبروں میں نہایت اہتمام سے شایع کیگئی ہیں۔ اغلب یہ ہے کہ اس سے مرزا غالب کا تشیع ثابت و ظاہر کرنا مقصود لیکن مجھے انکے تشیع میں شک ہے۔ میرے نزدیک غالب کو شیعہ ثابت کرنا اس قبیل جیسے بعض حضرات شیخ سعدیؒ کے تشیع کے قایل ہیں۔ میں تو یہ دیکھتا ہوں کہ اگر غالب کا کوئی مذہب تھا تو باوجود لوگوں کے مزعومہ دلائل تشیع کے بھی وہ سُنی تھا ورنہ حسبِ الہام اکبر مرحوم (جس وقت جو خیال ہے۔ مذہب بھی ہے وہی) اس کا کوئی مستقل مذہب نہ تھا!!!

بادی النظر میں اس مضمون کی چنداں ضرورت نہ تھی کیونکہ ایک تو یہ بحث مصلحتِ زمانہ کے مناسب، اور یہ وقت کے موافق نظر نہیں آتی اور شاید یہ جگر کاوی محض فضول سمجھی جاوے۔ دوسرے میرزا غالب کو کوئی سُنّی سمجھے یا شیعہ جانے اس سے نہ قوم کو فائدہ پہونچ سکتا ہے نہ نقصان، اور نہ خود میرزائے موصوف کی ذات میں کوئی شرف یا نقص لازم آتا ہے کہ وہ ملتوں کے رسوم اور فرقوں کے قیود سے بے نیاز تھے اور عمر خیام کے الفاظ میں (آزاد ز دوزخ است و فارغ ز بہشت) لیکن چونکہ میرے نزدیک پبلک اس باب میں سخت شبہ اور غلط فہمی میں پڑی ہوئی ہے اس لئے میں نے اسکو اپنا فرض سمجھا کہ میرزا غالب کے کلام و سوانح اور تذکرے وغیرہ کے دیکھنے سے جو کچھ میں نے نتیجہ نکالا ہے وہ مالہٗ و ماعلیہ کیساتھ بیان کر دوں اور بس میں حاشا کسی فرد یا کسی فرقہ کی دلشکنی نہیں چاہتا میری غرض صرف یہی ہے کہ اپنے نتیجۂ تحقیق کو لوگوں تک پہونچادوں تاکہ جس طرح خود مجھ کو اس بارہ میں تسکین ہو گئی ہے۔ اسی طرح اگر کوئی اور شخص بھی میرزائے مذکور کا صحیح و تحقیقی مذہب معلوم کرنا چاہتا ہو تو اسکی تسکین و تشفی بھی ہو جائے اور اس طرح اس "کوہ کندن و کاہ برآوردن" کا کچھ تو فائدہ نکلے۔

یہ میں اوپر کہہ چکا ہوں کہ میرزا غالب کی ذات تشیّع و تسنّن کے تشخصات و امتیازات سے بالاتر اور قوم و ملک کے قیود سے یکسر بے نیاز تھی۔ اور صرف غالب ہی پر کیا انحصار ہے تمام فلاسفہ، علما و فضلا، مشاہیر اسلاف، ماہرین و کاملین فن کی ذاتوں اور شخصیتوں کے لئے مذہب و ملک، قوم و خاندان، حسب و نسب کے تشخصات اگر ننگ نہیں تو مہمل ضرور ہیں۔ انکی ذاتیں، انکی صفتیں، انکے کمالات، انکے اخلاق، انکے لئے وسائل شہرت دہر و لعزیزی کیا کم تھے کہ یہ زواید درکار ہوتے۔ شیخ سعدی (بقول بعض) شافعی المذہب تھے۔ صاحب تفسیر کشاف علامہ زمخشری معتزلی تھے۔ حدیث کے مشہور خادم و مدوّن امام بخاری عجمی اور شافعی تھے اور امام ترمذی بھی۔ امام ابو حنیفہ (شاید) جاٹ تھے اور کوفہ کے باشندے تھے (وغیرہ ذالک) مگر ان سب تشخصات سے ان سب حضرات کی ذات اور شہرت پر اور اس جوش عقیدت پر جو لوگوں کو ان سے ہے کیا اثر پڑا۔ میرے نزدیک تو مذہب دراصل نام ہے "خدا و خلق کے ساتھ اپنے معاملات صاف و درست رکھنے کا۔"

اور بس اگر یہ تعریف صحیح ہے، اور امید ہے کہ اکثر حالتوں میں صحیح ہوگی۔ تو پھر ایک شخص جس نے عیسائیوں میں پیدائش و پرورش پائی ہو۔ یا وہ لوگ جنہوں نے ہندو گھرانہ میں جنم لیا ہو۔ یا وہ جنہوں نے مسلم، جین، بدھ، یہود اور پارسی خاندانوں میں آنکھ کھولی ہو بہت ممکن اور یقینی ہے کہ اپنے معاملات خدا و خلق کے ساتھ درست رکھ سکیں مگر ساتھ ہی ساتھ ان نام نہاد مذاہب و فرق (مثل تشیع، تسنن، اسلام، بت پرستی، عیسائیت، یہودیت وغیرہ) سے کسی ایک کے ساتھ موسوم و متصف ہو کر نہ پہچانے جاتے ہوں کیونکہ تعریف بالا کے مطابق تمام مذاہب کا ماحصل تو صرف ایک ہی نقطہ اور ایک ہی مرکز تک پہونچتا ہے مگر وہاں سے جو تفریق ہوتی ہے وہ صرف رسوم مذاہب اور خصائص ملل کے اختیار کرنے سے اور اکثر تو اپنے خصائص و رسوم پر تشدد اور تقشف پیدا کرنے سے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر سلیم الطبع صلح کل شخصیتیں رواداری اور اخلاق کی بنا پر نہ ایک برہمن کے ساتھ رام رام کہنے میں دریغ کرتی ہیں نہ کسی گبر کے ساتھ آتشکدہ میں ہونچکر بر سم (جھاڑ کی لکڑیاں) وغیرہ کے استعمال میں باک۔ ایسا شخص بیک وقت تمام مذاہب کا پیرو بھی سمجھا جا سکتا ہے اور پھر کسی مذہب کا بھی نہیں۔ وہ تشدد مذہبی اور تقید اعمال کو بہت لازمی نہیں سمجھتا۔ مولانا شبلی نے "المامون" صفحہ ۱۶۰ پر ایک عجیب کام کی بات لکھی ہے:۔ "بزرگان سلف میں سیکڑوں ایسے گذرے ہیں کہ اگر انکے مجموعۂ عقاید کا شیرازہ کھولدیا جائے تو سنی، شیعہ، معتزلی، قدری ہر ایک کے ہاتھ میں اسکا کچھ حصہ آئے گا"

خود میرزا ئے مذکور کا اس بارہ میں جو کچھ فیصلہ یا فلسفہ ہے وہ بھی سُن لیجئے:۔

ہم موحد ہیں۔ ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں

کہیں تشریح بالا سے یہ نہ سمجھا جائے کہ میں مذہب کی کچھ ضرورت نہیں سمجھتا۔ حاشا للہ۔ میرے نزدیک کم عقل اور کج رو طبائع کے لئے اور بالخصوص آجکل کے ہٹ دھرم اور قیدِ مذہب و اعمال سے بھاگنے والے، لوگوں کے لئے مذہب اسیطرح ضروری ہے جس طرح مدنیت و تمدن کے لئے قانونِ تعزیرات۔ فرق یہ ہے کہ اسکا تعلق تمام تر جسم و جوارح سے ہے اور اسکا یکسر روح و عقل سے!!۔ دنیا میں دو قسم کے لوگ ہیں ایک وہ جو قدرت سے سلامت روی لے کر آئے ہوں اور تشدد کی فضا اور تنگ نظری سے بچے ہوں اور دوسرے وہ جو فطرت سے بے راہ روی لیکر اترے ہوں پھر تشدد و کجرویوں کے ماحول میں انکی زندگی ہو، اول الذکر کوئی خاص مذہب رکھکر بھی خدا سے سرخرو، اور باآبرو خلق میں رہ سکتے ہیں کہ یہی ماحصل ہے تمام مذاہبِ حقہ کا اور موخرالذکر بغیر کسی تقید کے کبھی کسی سے سرخرو نہیں ہو سکتے۔

میرزا غالب نے اپنے ایک شعر میں اگرچہ ایک بالکل جداگانہ بات کہی ہے مگر آپ اسوقت اسے اسی نظر سے دیکھ لیجئے:۔

ہر زہ مشتاب و پئے جادۂ شناساں بردار اے کہ در راہ سخن چوں تو ہزار آمد و رفت

مذہب کا سچا فلسفہ تو شیخ سعدی نے بیان کیا ہے:۔

درین بحر جز مرد داعی نہ رفت گم آں شد کہ دنبالِ راعی نہ رفت

کسانیکہ زیں راہ برگشتہ اند برفتند و بسیار سرگشتہ اند!!

خیر! اب دیکھنا یہ ہے کہ میرزا غالب کہاں تک اپنے معاملات کو خدا و خلق کے ساتھ صاف و درست رکھتے تھے۔ غالب ایک

نہایت سلامت رو شخص تھے۔ اور یہ مسلم ہے کہ ایک سُنّی خاندان میں پیدا ہوئے اور پیشہ آبا سپہ گری تھا وہ اسلام کی حقیقت پر نہایت پختہ یقین رکھتے تھے اور توحید وجودی کو اسلام کا اصل اصول اور رکن رکین جانتے تھے، وہ مذہب کے اعمال کی قید سے تو ضرور آزاد تھے مگر "تمام عبادات و فرائض و واجبات میں سے انہوں نے صرف دو چیزیں لے لی تھیں ایک توحید اور دوسرے نبی اور اہل بیت نبی کی محبت، اور اسی کو وسیلہ نجات جانتے تھے" وہ ملائکہ کتب آسمانی، اور جملہ پیغمبران علیہم السلام کو مفترض الطاعت اور برحق مانتا تھا۔ پیغمبر اسلام کو دل سے پیامبر الٰہی، ہادی، آقا اور شافع جانتا تھا، پیغمبر اسلام کے تمام صحابہ کرامؓ کو بزرگ جانتا، اور ان سب کا ادب کرتا تھا۔ اس نے کبھی کسی صحابی کی برائی نہیں کی بلکہ تعریف کی ہے[1] (مفصل آگے آئیگا) وہ قیامت، جزا و سزا پر بھی ایمان رکھتا تھا۔ وہ ترک نماز و روزہ، بادہ نوشی، زنا اور بقیہ کبائر کو دل سے گناہ سمجھتا۔ اپنی بادہ نوشی پر گناہگار ہونیکا اقرار کرتا اور اکثر اللہ کے حضور میں معذرت و استغفار کیا کرتا۔ اسنے اپنا کوئی گناہ کبھی نہیں چھپایا۔ یادگار غالب صفحہ ۶۶ پر ہے "اگرچہ شاعری کی حیثیت سے انہوں نے شراب کی تعریف کی ہے مگر اعتقاداً وہ اسکو بہت برا جانتے تھے اور اپنے اس فعل پر سخت نادم تھے۔ جنہوں نے کبھی اپنے اس فعل کو چھپایا نہیں" پھر صفحہ ۸۴ پر ہے "میرزا غالب نے کہا .... اگرچہ میرے گناہ ایسے ہی ہیں کہ میرے ساتھ اس سے بھی بدتر سلوک کیا جائے لیکن اسمیں شک نہیں کہ میں موحد ہوں۔ ہمیشہ تنہائی میں یہ کلمات میری زبان پر جاری رہتے ہیں لا الہ الا اللہ، لا موجود الا اللہ، لا موثر فی الوجود الا اللہ" مثنوی ابر گہربار میں مناجات کے ذیل میں غالب لکھتے ہیں :-

"ہمانا تو دانی کہ کافر نیم — پرستار خورشید و آذر نیم
نہ کشتم کسے را با آہرمنی — نہ بردم ز کس مایہ از رہزنی
مگر مے کہ آتش بگورم ازوست — بہ ہنگامہ پرداز مورم ازدست
نہ اندوہگیں دمے اندہ رُبائے — چہ می کردمے بندہ پرور خدائے"

یعنی "اے اللہ یہ تو تو اچھی طرح جانتا ہے کہ میں کافر نہیں ہوں۔ نہ سورج یا آگ کی پرستش کرتا ہوں۔ میں نے کسی کی جان نہیں لی میں نے کسی کا مال نہیں لوٹا۔ مجھ میں بس ایک عیب ہے کہ میں شراب پیتا ہوں کہ وہی میری ہلاکت کا باعث ہے۔ میں مصیبت کا مارا اور آفت کا مارا تھا ایسی صورت میں صرف شراب ہی تھی جو غم غلط کرتی۔ عمر اے میرے اللہ اگر غم میں شراب نہ پیتا تو کیا کرتا!!" اس "دمندی اور حسرت نصیبی" سے گھگھیا کر گڑ گڑا کر کہنا، استغفار ندامت نہیں تو اور کیا!!

اسکے علاوہ رقعات میں "نجات کا طالب، غالب" وغیرہ صاف گنہگاری کے اقرار اور اللہ سے استغفار کو ظاہر کرتے ہیں۔ یہ تو تھا اسکا خدا کے ساتھ معاملہ۔ اور کسی کو حق نہیں کہ ایسے خیالات و عقاید کے شخص کو کافر اور دوزخی سمجھے[2]۔

---

[1] یہاں تک عقاید غالب کے سلسلہ میں جو کچھ لکھا گیا وہ غالباً حوالہ طلب نہیں کیونکہ بہت مشہور باتیں ہیں۔ پھر بھی میں نے کوئی بات اپنی طرف سے نہیں لکھی بلکہ یا تو حالی کے الفاظ ہیں اور یادگار غالب صفحات ۶۷-۶۹ کا خلاصہ انہیں الفاظ میں ہے یا خود غالب کے الفاظ۔

[2] یہاں پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک روایت جو مجھکو شاہ عبدالشکور صاحب سجادہ نشین درگاہ ملا محمدی شاہ الہ آبادی سے پہونچی ہے عرض کر دوں وہ فرماتے تھے کہ میں نے ایک کتاب میں پڑھا ہے کہ کسی درویش کو معاملہ کشف میں معلوم ہوا کہ غالب شاعر کی نجات ہو گئی کیونکہ اسنے موت سے دو تین دن پہلے شراب سے توبہ کر لی تھی

رہا خلق خدا کے ساتھ اس کا معاملہ تو شاید بڑے سے بڑا پابند مذہب شخص بھی اس سے زیادہ نہیں کریگا جتنا غالب مست و خراب نے کیا۔ وہ ایک صلح کل اور مرنجان مرنج شخص تھا وہ کبھی کسی سے (سوا اپنی قسمت کے) لڑا جھگڑا نہیں۔ وہ دل آزاری حرام سمجھتا۔ اس نے کبھی کسی کی ہجو نہیں کی۔ ظرافت میں بیوی پر جو جملے کسے ہیں انکو جانے دیجئے۔ وہ شناسا و غیر شناسا سب کے ساتھ سلوک کرتا۔ خندہ پیشانی سے پیش آتا۔ فرمائشیں پوری کرتا۔ لوگوں کی حاجت برابری کو اپنا فرض عین سمجھتا اور فریضۂ اولین خیال کرتا۔ وہ غرباپرور انتہا درجہ کا تھا اور انکی امداد اپنی بساط سے زیادہ کرتا۔ اسمیں مروت و ایثار بدرجۂ غایت تھا یہی وجہ تھی کہ ہمیشہ مفلس رہتا۔ وہ غربت زدہ شرفا کی مصیبت دیکھ کر کانپ اٹھتا اور اسلام اور اسلامیوں کی ہتک و اہانت سے سخت ملول و متاثر ہوتا (یادگار صفحات ۶۵ و ۸۰ و ۶۸) یہ تھے غالب مرحوم کے اعتقادات و اعمال۔

اب اگر غالب اپنی ظرافت سے مجبور ہوکر یہ کہے کہ "تمام عمر میں ایک دن شراب نہ پی ہو تو کافر اور ایک دفعہ نماز پڑھی تو گنہگار" (یادگار صفحہ ۶۸) یا یہ کہدے کہ "آدھا مسلمان ہوں شراب پیتا ہوں۔ سور نہیں کھاتا" (یادگار صفحہ ۲۶) یا اللہ سے یہ کہے کہ "ہم بھی کیا یاد کرینگے کہ خدا رکھتے تھے" یا حضرت خضر کو یوں خطاب کرے "نہ تم کہ چور بنے عمر جاوداں کیلئے" تو اس سے اسکا کفر نہ مستنبط کرنا چاہئے۔ اور نہ غالباً دنیا کفر مستنبط کرتی ہے پھر جس طرح اسکو ان کفر نما شواہد پر کافر نہیں کہہ سکتے اسی طرح بعض "تشیع ریز" شواہد پر اسکو شیعہ بھی نہ کہنا چاہئے۔

بقیہ نوٹ صفحہ (۱۲) جسکا قصہ یوں ہوا کہ جب غالب، دہلی کے مشہور صوفی سلسلہ میں مرید ہونے گئے تو مرشد کامل نے ترک معاصی و کبائر کا عہد لیا۔ مرزا بولے حضرت تمام کبائر ترک کر سکتا ہوں مگر شراب کو نہیں چھوڑ سکتا کہ وہ میری زندگی ہے اور اندوہ ربا، مرشد نے بعد تامل کے کہا "اچھا ایک تم چار شراب پی سکتے ہو" پوچھا وہ کیا؟ ارشاد ہوا جب شراب ایک روپیہ کو بیکے روپیہ پھر ملنے لگے تو چھوڑ دینا۔ یہ تو کر سکو گے" مرزا نے سوچا کہ روپیہ تو شراب کا ہے کو کبھی بکیگی اور کاہے کو مجھے چھوڑنی پڑیگی۔ علاوہ اسکے میں کہاں سے آٹھ روپیہ پاؤنگا جو روپیہ تو شراب پیونگا تب تو بقول خود (کافر نتوانی شد ناچار مسلماں شو) شراب چھوڑنی ہی پڑیگی۔" غرض یہ کچھ سوچکر مرزا نے آنسے عہد کرلیا اور گھر چلے آے اور مدت العمر شراب پیتے رہے۔ مرنے سے پیشتر نوکر کو شراب لانے بازار کو بھیجا تو معلوم ہوا کہ نرخ بہت بڑھ گیا ہے مرزا نے کہا اور روپیہ لیجا اور جلد شراب لا۔ وہ پھر خالی ہاتھ واپس آیا کیونکہ اتنی ہی دیر میں نرخ اور بڑھ گیا تھا۔ پھر اور روپیہ دیا اور نوکر کو بازار بھیجا۔ لیکن جب وہ جاچکا تو مرزا کو خیال ہوا کہ یہ فتنہ کیا ہے۔ یکایک خیال آیا کہ یہ قضیہ اتفاقیہ نہیں بلکہ اس پردہ میں کوئی بات ہے پھر مرشد کامل کا مقولہ اور انکی ہدایت اپنا عہد یاد آیا فوراً دوسرے آدمی کو دوڑایا کہ نوکر کو بلالے۔ شراب لانیکی ضرورت نہیں۔ اسی وقت توبہ کرلی اور پھر شراب نہیں پی۔" ممکن ہے کہ یہ روایت غلط ہو لیکن درایۃً اسمیں کچھ استبعاد و استحالہ نہیں۔ اول تو بعض مشایخ سے بمصالح چند اس طرح کسی امر ممنوع کی بشرط اجازت منقول ہے کہ رسالۂ بے خبر بود ز راہ و رسم منزلہا دوسرے غالب تھا بھی ایساہی وضعدار کہ اگر اسنے مرشد سے یا کسی سے عہد کیا ہو تو پھر چاہے لاکھ خواہش ہوئی ہو۔ اس نے نہ پی ہوگی۔ یادگار غالب میں صفحہ ۸۸ پر ہے کہ:۔ مرزا کو سوتے وقت کچھ پینے کی عادت تھی مگر جو مقدار مقرر کرلی تھی اس سے زیادہ نہ پیتے تھے" تیسری بات یہ ہے کہ اردوے معلی کے بعض رقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی زمانہ میں شراب مہنگی ہوگئی تھی اور غالب نے دوستوں سے پوچھا ہے کہ بمبئی و ہاں اولڈ ٹام یا فرنچ کی کیا قیمت ہے۔

پھر شاید "مہیش داس" نے انکے پاس بھجوا دی ہے جسپر انکے بڑے شکر گزار ہوے ہیں کیا عجب ہے کہ اسکے بعد نرخ بہت ہی بڑھ گیا ہو اور صورت پیش آئی ہو۔ سنتے یہ کہ مرنے سے دو تین دن پہلے سے وہ زخموں سے چور بے ہوش پڑا رہتا تھا اور اللہ اللہ کرتا تھا۔ اسوقت تو شراب یقیناً چھوڑ دی ہوگی اور اگر توبہ بھی کرلی ہو تو بعید نہیں۔

اب ہم پہلے وہ امور درج کرتے ہیں جن سے اس کا شیعہ ہونا ثابت کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد ان پر نقد و درایت کی نظر ڈالی جائیگی پھر آخر میں وجود تسنن لکھے جائیں گے۔ مرزا صاحب نے متعدد مواقع پر ایسے کلمات و اشعار کہے ہیں کہ جن سے تشیع مترشح ہے اور غالباً یہی سب سے بڑی دلیل، مرزا کو شیعہ سمجھنے والوں کے پاس ایسی ہے۔ جسنے مرزا کو خود اقراری مجرم کی طرح شیعہ بنا رکھا ہے۔ مثلاً:-

اقوال و کلمات (الف) آپ ایک شخص کو جواباً لکھتے ہیں "اے تم نہیں جانتے کہ میں ہر جملہ کے بعد کیوں ۱۲ لکھدیا کرتا ہوں بات یہ ہے کہ میں اثنا عشری ہوں اور دوازدہ امام کا غلام پھر میں اس مبارک عدد کو کیوں ترک کردوں" (اردوئے معلی یا عود ہندی میں یہ رقعہ موجود ہے)

(ب) نواب علاؤ الدین خانصاحب نے مولوی حمزہ خاں کیطرف سے لکھا "شراب حرام ہے پھر آپ بوڑھے ہوگئے لہذا شراب چھوڑ دیجئے پھر یہ شعر لکھا (چوں پیر شدی حافظ الخ)" تو آپ لکھتے ہیں۔ مشرک وہ ہیں جو نو مسلوں کو ابوالائمہ کا ہمسر مانتے ہیں..... میں موحد خالص اور مومن کامل ہوں...... انبیاء سب واجب التعظیم اور اپنے اپنے وقت میں سب مفترض الطاعت تھے۔ محمد علیہ السلام پر نبوت ختم ہوئی یہ ختم المرسلین اور رحمۃ للعالمین ہیں مقطع نبوت کا مطلع امامت اور امامت نہ اجماعی بلکہ من اللہ ہے اور امام من اللہ علی علیہ السلام ہے ثم حسن ثم حسین۔ اسی طرح تا مہدی موعود علیہ السلام (بریں زیستم ہم بریں بگزرم) ہاں اتنی بات اور ہے کہ اباحت۔ زندقہ کو مردود اور شراب کو حرام اور اپنے کو عاصی سمجھتا ہوں......"

"انتہی ملخصاً" (یادگار صفحہ ۱۶۳)

(ج) کسی کو لکھتے ہیں "دعا کرو کہ علی علی کرتا ہوا اس دنیا سے گزر جاؤں" (اردوئے معلی)

اشعار ۱- منصورِ فرقۂ اسد اللّٰہیاں منم — آوازۂ انا اسد اللہ بر افگنم
۲- . . . . — ہم اسد اللّٰہم و ہم اسد اللّٰہیم
۳- خدائش ارد انیست ہر چند گفت — علی را تو ام خداوند گفت
۴- با من میاویز اے پدر فرزند آزر را نگر — ہر کس کہ شد صاحب نظر، دین بزرگاں خوش نہ کرد
۵- غالب ندیم دوست سے آتی ہے بوئے دوست — مشغول حق ہوں بندگی بوتراب میں (پسند)
۶- . . . . — یا علی عرض کرے فطرت وسواس قریں
۷- . . . . — آرایشِ جہاں گر از سر گیرند علی

(۲) میرزا نے حضرت علی کی منقبت میں اور واقعہ فاجعہ کربلا کے ذکر میں بہت اور پر زور قصائد۔ مرثیے وغیرہ کہے مگر بجز دو تین مقام کے اور کہیں نہ صحابہ کا ذکر کیا ہے نہ خلفائے ثلاثہ کا۔

(۳) مرزا نے سنیوں پر اکثر طنزیہ کلمات کہے ہیں:-

(الف) ایک سنی مولوی، مرزا سے ملنے آئے عصر کا وقت تھا اور رمضان کا مہینہ۔ مرزا نے خدمتگار سے پانی مانگا مولوی صاحب نے

تعجب سے پوچھا کہ "کیا جناب کو روزہ نہیں" مرزا نے کہا "سُنّی مسلمان ہوں چار گھڑی دن رہے روزہ کھول لیا کرتا ہوں"
(یادگار صفحہ ۶۹)

(ب) بقول آزاد۔ مرزا سے انکے کسی شاگرد نے پوچھا "آپنے حضرت علی کی تعریف میں تو بڑے زور کے متعدد قصائد لکھے ہیں مگر خلفائے ثلاثہ یا دیگر صحابہ کی تعریف میں کوئی قصیدہ نہ کہا، مرزا بولے "اُن میں علی جیسا کوئی مجھے دکھا دیجئے تو انکی شان میں بھی کہدوں، (اسکا مفصل ذکر آگے آتا ہے)

(ج) ایک خط میں جو اوپر گذر چکا ہے۔ لکھا ہے "...... نو مسلموں کو ابو الائمہ کا ہمسر مانتے ہیں" گویا حضرت علی کو بچپن میں اسلام لانے پر ابو الائمہ کہا ہے اور انکے مقابلہ میں تمام صحابہ کو عمر کی پختگی میں اسلام لانے پر نو مسلم کہا ہے۔

(۴) محمد حسین آزاد نے آبحیات میں لکھا ہے کہ "مرزا کا سارا خاندان سُنّی ہے مگر مرزا کے اشعار، ورقعات سے ظاہر ہوتا ہے نیز اہل راز جانتے ہیں کہ ان کا مذہب شیعہ تھا اور لطف یہ کہ ظہور اسکا جوش محبت میں تھا نہ کہ تبرا و تکرار میں" انتہی ملخصاً

یہی چار قسمیں وہ اسباب و دلائل کی ہیں جنکے باعث مرزا غالب کا تشیع ثابت کیا جاتا ہے۔ یہ میں نہیں کہتا کہ میں نے تمام ایسے اقوال و اشعار جمع کر دیئے ہیں مگر یہ ضروری ہے کہ جن باتوں سے غالب پر شیعہ ہونے کا شبہ ہوتا ہے، انکی تمام اقسام مینے بیان کر دیئے ہیں اور ہر قسم کی دو دو تین تین مثالیں بھی لکھدی ہیں جو شاید سب سے اہم اور قوی تر ہونگی آئیے اک دفعہ ان شواہد میں نقد درایت کی اک نظر ڈال لیں پہلے دو تین تمہیدیں سن لیجئے:۔

۱۔ آج تصوف کے جتنے سلاسل دنیا میں ہیں۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے سوائے ایک نقشبندیہ کے۔ کہ وہ خلیفہ اوّل حضرت ابوبکرؓ سے نکلا ہے۔ باقی تمام سلاسل حضرت علی سے نکلے ہیں[1]۔ اسوجہ سے دنیائے تصوف و سلوک میں، حضرت رسولؐ کے بعد حضرت علی ہی ولی نعمت ہیں کیونکہ انکو جو کچھ دولت و سعادت لذت وچاشنی ملی ہے وہ سب حضرت علیؓ ہی کے توسط سے ملی ہے۔ پھر آپکی ذات بھی مجمع صفات تھی کہ آپ رسولؐ کے عزیز قریب تھے اور رسولؐ کے داماد۔ رسولؐ کے علم کا دروازہ تھے اور رسولؐ کے خلیفہ۔ ایک فرد تھے اس گروہ کے جنکی محبت جزو ایمان ہے۔ حلیم تھے۔ شجاع تھے۔ ماہر فنونِ حرب تھے۔ گویا اس شعر کے مصداق بن رہے تھے کہ:۔

زفرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم   کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست

[1] جسکی ایک تاریخی وجہ ہوئی وہ یہ کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ جس زمانہ میں خلیفہ ہوئے ہیں اسوقت صورت یہ تھی کہ (۱) اکثر اجلہ صحابہؓ شہادت یا وفات پا چکے تھے (۲) زمانہ نبوی کے بعد کے باعث لوگوں میں خرابیاں پھیلنے لگی تھیں (۳) بہت سی نئی قومیں اور نئے ممالک اسلام لا چکے تھے اور اب جوق جوق مدینہ شریف میں حاضر ہونے لگے تھے (۴) ابتک تبلیغ و اشاعت کیلئے دفاعی جنگوں کی ہماہمی کے باعث فرصت نہ تھی مگر اب لوگوں کو گھر بیٹھنے اور دوسرے کاموں کی طرف متوجہ ہونیکا موقعہ ملنے لگا تھا (۵) اسوقت حضرت علی ہی خلیفہ تھے اور آپ سے بڑھکر کوئی شخص اسکا اہل نہ تھا۔ ان وجوہ سے آپنے ضرورت دیکھی کہ رسم بیعت و تعلیم تصوف کی اشاعت ہو لہذا بتوسط امام حسن بصریؒ آپ سے کئی سلسلے نکلے۔

اب اگر کوئی شخص ان اوصاف کے باعث حضرت علیؑ کے ساتھ زیادہ عقیدت رکھے تو اس کا نام شیعیت نہ ہونا چاہیئے۔ ورنہ اگر جناب امیرؑ سے زیادہ محبت رکھنا، شہادت حسینؑ کا ذکر کرنا، آل رسول سے محبت کرنا اور انکا دامن پکڑنا، ان سب کا یا انمیں سے ایک یا دو باتوں کا پایا جانا ہی شیعیت کا معیار ہے تو پھر شاید سب سے پہلے شیعہ خود آنحضرت تھے اور پھر تمام صحابہ کبار۔ اور پھر شاید امام شافعیؒ بھی شیعہ تھے جنہوں نے ڈنکے کی چوٹ پر اپنے رفض کا اعلان کیا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

لوکان رفضاً حبُّ آل محمدٍ فلیشھد الثقلان انی رافض

(ترجمہ) اگر محمد کے گھرانہ کی محبت ہی کا نام رفض و شیعیت ہے تو آج سارے انس و جان اس بات کے گواہ رہیں کہ میں رافضی ہوں!!

پھر شاید حضرت غوث پاک بھی شیعہ تھے جن کی طرف یہ رباعی منسوب ہے (اور بقول بعض یہ رباعی حضرت معین الدین چشتی کی ہی)

شاہ است حسین بادشاہ است حسین دین است حسین دیں پناہ است حسین

سر داد و نداد دست در دست یزید حقا کہ بنائے لاالہ است حسین

اور پھر حضرت شیخ سعدیؒ کیوں نہ شیعہ سمجھے جائیں جو نبیؐ و آل نبیؐ اور حضرت علیؑ و بنی فاطمہؓ کا ذکر کرتے وقت آپے سے باہر ہو جاتے ہیں۔

سعدی اگر عاشقی کنی و جوانی عشق محمد بس است و آل محمد

الٰہی بحق بنی فاطمہؓ کہ بر قول ایماں کنم خاتمہ

اگر دعوتم رد کنی ور قبول من و دست و دامان آل رسول

. . . . کرم پیشۂ شاہ مرداں علیؑ است

اور اسکے بعد آپ تمام صوفیہ اور درویشوں کو بھی شیعی کہہ لیجئے۔ پھر تمام مسلمانوں کو کیونکہ تعظیم جناب امیرؑ، حب آل رسول، حب علیؑ، ذکر شہادت، اور اسپر دو آنسو بہانا ہر مسلم کا فرض ہے۔ اور پھر آخر میں یہ کہ پنڈت دیا شنکر نسیم کو بھی شیعہ کہہ لیجئے کیونکہ اسکا شعر ہے

پانچ انگلیوں میں یہ حرف زن ہے یعنی کہ مطیع پنجتن ہے

علامہ سر اقبال لاہوری بھی ایک شعر سے شیعہ ثابت ہوتے ہیں:۔

ہے اسکی طبیعت میں تشیع بھی ذرا سا تفضیل علی ہمنے سنی اس کی زبانی

اس تمہید سے یہ ثابت ہو گیا کہ صوفیہ حضرت علیؑ کا بہت زیادہ ادب اور ان سے بہت محبت کرتے ہیں۔ اب یہ مسلّم امر ہے کہ غالب صوفی تھا۔ تصوف ہی کی کتابیں اکثر اس کے مطالعہ میں رہتی تھیں کلام میں "مسائل تصوف" بیان کرتا تھا اس کے علاوہ وہ ایک مشہور صوفی خاندان میں مرید تھا۔ لہذا اسکی حب علی و حب آل نبی کی اصلی وجہ یہ ہے۔ اب یہ امر کہ تصوف کو شیعہ حضرات مانتے ہیں یا نہیں۔ اور انمیں کوئی صوفی اور مرید ہوتا ہے یا نہیں یہ ایک بالکل واضح اور کھلا ہوا مسئلہ ہے کہ وہ لوگ تصوف اور صوفیہ سے سخت متنفر ہیں۔ اسکا بیان تفصیل چاہتا ہے جو محققین کا کام ہے۔

دوسری تمہید شاعروں کا فرقہ ایک ایسا متلون مزاج اور متغیر المذہب فرقہ ہے جسکو آج اکبر مرحوم نے "جسوقت جو خیال ہے مذہب بھی ہے وہی" کہکر بیان کیا ہے حالانکہ آج سے ساڑھے تیرہ سو برس پیشتر قرآن حکیم نے زیادہ بلیغ اور جزیل الفاظ میں یوں کہا تھا "اَلَمْ تَرَ اَنَّھُمْ الخ" یعنی تم نہیں دیکھتے کہ یہ شعرا اور ان کے متبعین ہر گھاٹی اور وادی میں بھٹکتے پھرتے ہیں اور ایسی باتیں کہتے ہیں کہ جو خود کرتے نہیں" اس فرقہ کے نزدیک کسی عبید الدرہم کو "نہ کرسی فلک" سے بھی اونچا پہونچا دینا کوئی بات نہیں۔ کسی فانی کو یا صنم کو، خدا کہنے میں بھی باک نہیں (پہلے دعویٰ خدائی اس بت کافر کو تھا۔ کچھ درستی پر جو آج آیا تو انساں ہوگیا) وہی شخص جو یہ کہتا ہے:۔

پہونچا جو آپ کو تو میں پہونچا خدا کے تئیں　　معلوم اب ہوا کہ بہت میں بھی دور تھا

کبھی "ترک اسلام" کر کے دیر میں بھی بیٹھ جاتا ہے اور "قشقہ" بھی کھینچ لیتا ہے۔ ایک فرد تو کسی طفل آتش پرست کے اس ریمارک پر کہ

در طوف حرم دیدی؟ دی مغ بچۂ گفت　　کایں خانہ بدیں خوبی آتشکدہ بایستے

در پردہ تائید و تصدیق بھی کر جاتا ہے اور ایک دوسرا فرد اسی گروہ کا، تین سو ساٹھ بتوں کے پوجنے والوں کو فلسفۂ توحید یوں سمجھاتا ہے کہ:۔

کثرت میں اگر وحدت کا راز نہ سمجھے ہو　　دیکھو کہ جہاں بت تھے کعبہ نظر آتا ہے، وغیرہ

اگرچہ سلسلۂ سخن میں میں اصل مبحث سے بہت ہٹ گیا مگر یہ بھی گوارہ نہ ہوا کہ بے ساختہ جو کچھ زبان قلم پر آگیا ہو اور ہو بھی وہ حکایت لذیذ، تو پھر اس کو دراز تر کیوں نہ کیا جائے۔ میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ وہ فرقہ جو اکثر و بیشتر وحی، القا، الہام (شاعری) سے بھی ممتاز ہوتا ہے بلکہ بلا توسط ملائک، مدرسۂ حقیقت و عرفان میں استاد ازل کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کرتا ہے (کہ الشعراء تلامیذ الرحمن) باوجود اس شرف کے وہ "ہمہ مذہبا" اور "لا مذہبا" فرقہ بھی ہے۔

تیسری تمہید غالب حد درجہ کا ظریف تھا۔ مولانا حالی لکھتے ہیں کہ "اگر انکو بجائے حیوان ناطق کے "حیوان ظریف" کہا جائے تو بجا ہے"۔ ایک اور جگہ لکھتے ہیں:۔ "چونکہ طبیعت نہایت شوخ واقع ہوئی تھی لہذا جب کوئی گرم فقرہ سوجھ جاتا پھر اُنسے بغیر کہے نہیں رہا جاتا تھا۔ خواہ اسمیں انکو کوئی کافر سمجھے، یا زندمشرب کہے، یا "بدمذہب جانے" (یادگار صفحہ ۶۸) آزاد لکھتے ہیں کہ: .... میرزا کی شوخ طبع ہمیشہ انہیں اس رنگ میں شور بور رکھتی تھی...... انکے دوست ایسی باتوں کو سنکر چونکتے تھے۔ جوں جوں وہ چونکتے تھے میرزا اور بھی زیادہ چھینٹے اڑاتے تھے" انتہیٰ

چوتھی تمہید مرزا کو دو ڈھائی برس تک ایک ایرانی صحبت نصیب ہوئی تھی اسی کی تعلیم و صحبت کی برکت تھی کہ غالب ہندی نژاد فارسی زبان اور پارسیوں کے عقاید کا ایسا ماہر ہو گیا تھا کہ اپنے کو بالکل ایرانی سمجھنے لگا تھا۔ لباس بھی ویسا ہی بنا رکھا تھا، اب اسکو یہ خبط سوار ہونے لگا کہ زبان و لباس کے علاوہ عقاید بھی ایرانیوں کے سے ظاہر کرے مگر صرف برائے بیت!! چنانچہ ایک ایرانی بنکر کہتا ہے (بیا ورید گر اینجا بود زباندانے۔ غریب شہر سخنہائے گفتنی دارد) ایک جگہ کہتا ہے کہ:۔

(فرشتہ! معنیٔ من رنگ، نمی فہم۔ من بگوے کہ غالب بگو "خدائے تو کیست") ایک جگہ ژند۔ پاژند کی قسم کھائی ہے۔ ایک پوری غزل میں آتش پرست اور مجوسیوں کے عقاید بیان کر گیا ہے (ز بزمم گزارے زمزم سرائے)۔ ظاہر ہے کہ غالب "غریب شہر" تو نہ تھا اردو جانتا تھا وہ "من رنگ" کے معنے بھی یقیناً جانتا تھا۔ وہ ژند و پاژند کو ہرگز قرآن کا درجہ نہیں دیتا تھا کہ اسکی قسم درست ہوسکے۔ اس نے کبھی جھاؤ کی لکڑیوں سے آگ کی پرستش نہیں کی تھی کہ وہ ان امور سے واقف ہوتا۔ ایسی حالت میں اسنے ایرانیوں کیطرح منقبت مرثیے۔ نوحے سلام کہے۔ حب علی میں تو غلو دکھایا۔ شیعیت ظاہر کرنے لگا جو محض برائے بیت تھا۔ ورنہ اگر کلام کے ظاہر مدلول پر اور الفاظ کے بدیہی مفہوم پر مذہب کا فیصلہ کیا جاتا ہے تو براہ کرم محمد حسین آزاد کی ذیل کی تحریر پڑھکر غور فرمائیے کہ وہ مسلمان تھے یا کوئی آتش پرست:۔

سخندان فارس حصہ دوم۔ پہلا لکچر صفحہ ۱۲ پر لکھتے ہیں "ساڑھے چار سو برس کے بعد ریگستان عرب سے ایک آندھی اٹھی۔ اس کے پیچھے گرجتا بادل بجلی چمکاتا تھا خلاصہ یہ کہ ساسانی سلطنت کا اقبال شمشیر اسلام کی قربانی ہوگیا اور درفش کاویانی قادسیہ کی خاک پر سرنگوں ہوا۔ اللہ اللہ یہ وہی مبارک جھنڈا تھا...... آج وہ ایسا گرا کہ پھر نہ اٹھا اور دیندار بہادروں میں اس کے جواہرات اور موتی مٹھی مٹھی کھجوریں تھیں کہ بٹ گئیں۔ عالیشان آتش خانے ڈھائے گئے۔ انکی نورانی آگ، خاک کے نیچے دہم ہو کر رہ گئی۔ دینی اور دنیاوی کتابیں ورق ورق اڑیں اور جل کر خاک در خاک ہو گئیں۔ اسوقت میں میرے پارسی بھائی وہاں سے بھاگے اور جانوں کے ساتھ ایمان بھی بچا لائے" الخ

آزاد کی عبارت میں سحر اور نظر بندی عام ہے ذرا دسحر کر کے دیکھئے "... گرجتا بادل بجلی چمکاتا تھا" کے بعد "خلاصہ یہ کہ ساسانی ......" کا پیوند کیا بتاتا ہے، اور آزاد کی نفسانی تحریریں کس طرح اس بے ربط تحریر سے کھل جاتی ہیں۔ پہلے جملہ میں اسنے اتنا ہی کہا ہے کہ عرب سے گرجتا چمکتا بادل اٹھا اس کے بعد ہی خلاصہ یہ ہے کہ الخ خدا جانے کونسا مفصل امر بیان کیا تھا کہ جسکا خلاصہ ان زہر بجھے الفاظ میں خود دکیا کہ ساسانی سلطنت کا اقبال شمشیر اسلام کی قربانی ہوگیا۔ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ریگستان عرب کو بہت کچھ کہنا چاہتا تھا مگر اسکا اسلام ظاہری اور دنیا کا خیال اسکو روک رہا ہے۔ یا پہلے بہت کچھ لکھا ہوگا پھر اسکو کاٹ دیا ہو گا جس سے عبارت بے ربط ہو گئی۔ اگر نفس کا چور اسمیں پوری طرح نہیں تو آگے ظاہر ہوگیا، سچ ہے وہ آگ آزاد کے لئے بھی نورانی تھی جسکا ماتم ان الفاظ میں کیا گیا ہے اور اسلام کے رویہ کو بہت زور لگا کر دکھایا گیا ہے، آخر میں پارسی قوم کو اپنا بھائی بنا ہی دیا اور ان کے ایمان کو اپنا ایمان مان ہی لیا۔ غور کیجئے کس قدر دردانگیز لہجہ میں نوحہ دبکا و ماتم کیا ہے اور اگر رونا نہیں آرہا ہے تو رونے کی صورت ہی بنائی گئی ہے اسکو بھی جلنے دیجئے۔ جرمنی کے ادبا میں گوئٹے کافی شہرت رکھتا ہے۔ اُسنے ہرڈر مشہور جرمنی مصنف کی تربیت و صحبت پاکر ایک دیوان جرمن زبان میں لکھا جسمیں مشرق کے تخیل رنگین سے فائدہ اٹھایا ہے بلکہ اسکی نقل و ترجمانی کی ہے اور خواجہ حافظ و سعدی کے کلام و تخیل کو اپنے ہاں منتقل کیا ہے، اسکا نام "دیوان مغربی" رکھا جو سب سے پہلے ۱۸۱۹ء میں شایع ہوا۔ اسکی دیکھا دیکھی پھر متعدد صاحبانِ ذوق مثل پلاٹن۔ روکرٹ۔ ہائنا نے اسی کی پیروی کی تو مشرقی تخیل کی تتبع میں اپنے ملک کی زبان میں دیوان لکھ

ساقی نامہ۔ مثنی نامہ۔ قصہ محمود و ایاز سبھی کچھ لکھا۔ ہاروت و ماروت کا قصہ بھی لکھا حتیٰ کہ ایک شاعر مسمی بوڈن سٹات نے تو مرزا شفیع کا نام اختیار کر کے مشرقی تخیل پر بہت کچھ طبع آزمائی کی ہے۔ دور کیوں جایئے، رسالہ اُردو ماہ اکتوبر ۲۷ء میں ایک مضمون پروفیسر براؤن پر نکلا تھا۔ اسمیں اسکی ایک تصویر ایسی بھی تھی کہ وہ ایرانی لباس پہنے حقہ ہاتھ میں لئے بیٹھا ہے۔ اس لباس و شکل پر بھلا پروفیسر براؤن انگریزی نام کیا پھبتا لہذا "اہل طریقت" نے (اگر آزاد ہوتے تو "اہل راز" ہی لکھتے) مظہر علی نام بھی دھر دیا۔ پروفیسر یقیناً فارسی زبان جانتا تھا اور ایک مستشرق السنۂ مشرقیہ جیسا کچھ ماہر ہوتا ہے ویسا ہی وہ تھا۔ پروفیسر مذکور نے جب ظاہری وضع محض تالیف قلب کے خاطر بدل دی تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اس نے ایرانی عقاید تالیف قلوب میں چھوڑ دیئے ہونگے۔ بہر حال گو یہ تمہید طویل ہو گئی مگر میں سمجھتا ہوں کہ اب یہ بات واضح ہو گئی ہوگی کہ جب کوئی شخص جو بدقسمتی سے اپنے قومی معتقدات کا زیادہ پابند نہو۔ دوسرے کی زبان اختیار کرتا ہے تو اپنے کلام میں زور پیدا کرنے کے لئے یا اپنے کلام کو بھی ٹکسالی شخص کے کلام کیطرح ظاہر کرنے کے لئے کیا شکل و صورت کیا وضع و قطع میں کیا مذہب و عقیدہ میں کیا زبان و زبان میں غرض ہر چیز میں بالکل ویسا ہی خود بھی بنجاتا ہے۔

ان تمہیدوں کو پیش نظر رکھئے اور اسباب تشیع کے جوابات علی الترتیب سنئے :۔

۱۔ مرزا کے اقوال و اشعار جن سے تشیع مترشح ہے۔ تمہیدوں سے معلوم ہوگا کہ غالب صوفیانہ مذاق رکھتا تھا اور مثل صوفیہ وہ بھی حضرت علیؑ کو ولی نعمت جانتا تھا۔ دوسرے وہ فطری شاعر تھا اور نئے مضمون کی تلاش میں ادھر ادھر بھٹکتا پھرتا تھا۔ غرض شاعرانہ مبالغہ نے جس سے چارہ نہ تھا جب غلو بہ عقیدت علی سے ترکیب پائی تو وہ شکل سامنے آئی کہ سبھوں نے اُس کو شیعہ۔ نصیری۔ اور کیا کیا سمجھا۔

(۲ الف) رہا ۱۲ کا عدد ہر جملہ کے بعد لکھنا تو عربی کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ شروح و حواشی میں مطالب کے ختم پر اکثر ۱۲ لکھا رہتا ہے جو لفظ "حد" کے اعداد ابجدی ہیں۔ اور خود لفظ "حد" یوں نہیں لکھا جاتا کہ کہیں لوگ اسکو جز عبارت نہ سمجھ لیں۔ غرض ۱۲ کا عدد لکھنا ایک عام رسم قدیم سے چلی آتی ہے، مگر ظرافت مآب غالب کی شوخی و زبردستی ملاحظہ کیجئے کہ اسکی کیا خوب توجیہ اور کیا حسن تعلیل کی ہے۔

(ب) حضرت علی کو امام من اللہ ماننا۔ جواب میں تمہید اور ۲ دیکھئے تیسرا جواب یہ ہے کہ یہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ ایک شخص نے ان کو شراب پینے سے منع کیا تھا۔ طبع انسانی کا خاصہ ہے کہ نصیحت ناگوار گذرتی ہے نہ کہ غالب، جیسے خود پسند و خود نما کو۔ ایک دفعہ "مولانا حالی" نے مرزا سے نماز پڑھنے کیلئے کہا تو دل کھول کر انکو صلواتیں سنائیں کہ، بس منہ دھو رکھئے کہ آپکو مولانا کا خطاب مل سکیگا، وغیرہ (یادگار صفحہ ۴۸) ان بیچارہ کی شامت جو آئی اور شراب جیسی پیاری چیز سے مرزا کو روکنا چاہا بس پھر کیا تھا لگے ان کو بھی بھوگ سنانے۔ وہ بگڑ بگڑ کر جواب لکھا ہے کہ جس کا بیان نہیں۔ جہاں تمسنے اور سخت سخت جملے غصہ اتارنے اور انکو چھیڑنے کو لکھ مارے ہیں وہاں ظرافت مآب کو "یقولون بالا یفعلون" کے طور پر اسکے کہدینے میں کیا باک تھا۔

ج) مرتے وقت علی کہنے کی تمنا۔ اسکے جواب میں اگر سخن پروری اور تاویل بارد کا الزام نہ دیا جائے تو خود غالب ہی کے دو شعر پیش

کردوں کہ وہ خود اس لفظ کو کیا لکھتے ہیں اور کیا سمجھتے ہیں (مثنوی ابر گہر بار)

نیاساید اندیشہ جز با علیؑ ز اسما نیندیشم الا علی
بلندم بہ دانش نہ پستم ہمی باین نام یزداں پرستی ہمی

یعنے اللہ کا نام بھی تو علی یعنے بلند و برتر ہے اسلئے میں علی علی کہکر خدا کو یاد کر رہا ہوں گویا مشغولِ حق ہوں بندگی بوتراب میں (دونو) دوسرا مطلب کہ علیؑ کو میں خدا مانتا ہوں اسکا وہ ہرگز قائل نہیں کیونکہ اسی مثنوی میں آگے چلکر کہا ہے (خدا لیش روا نیست ہرچند گفتم الخ)

(د) اسد اللّٰہی و انا اسد اللہ: تمہید نمبر ا و ۲ و ۴ دیکھئے۔ مگر اسکا ایک جواب اور بھی ہو سکتا ہے کہ میرزا ان الفاظ کو اپنے نام سے مشابہ اور مشتق دیکھکر کبھی تو اپنے کو نصیری بتانے لگتے ہیں اور کبھی منصور حلاج کے "انا الحق" کا جواب قایم کرنے لگتے ہیں۔ وہ تو دراصل انا اسد اللہ اور اسد اللہ الغالب یا اسد اللّٰہی کہہ کہکر در پردہ خود پسندی بلکہ خود پرستی کرتے ہیں اور اپنا نام لے لے کر خوش ہوتے ہیں مشہور ہے کہ اکبر بادشاہ نے بھی اپنے دربار کا سلام "اللہ اکبر" اور جواب سلام "جلّ جلالہٗ" صرف اسلئے رکھا تھا کہ ان دونوں فقروں میں اسکا پورا نام جلال الدین اکبر آجائے اور وہ سنکر خوش ہو۔

۲۔ مرزا کا صرف حضرت علی کی شان میں قصاید کہنا۔ جواب کیلئے پہلے تو دیکھئے تمہید نمبر ا خصوصاً اور تمہید نمبر ۲۔ لیکن اس امر کے بعض وجوہ اور بھی ہیں جو درج ذیل ہیں:—

ا۔ مرزا کو دین کی کسی بات سے خصوصیت کے ساتھ واسطہ نہ تھا۔ اسنے تاریخ پڑھی تو دھر ادھر کے مدح خلفا کی تو ویسی ہی مجمل۔ اس صورت میں اگر اسنے مدح خلفا بہ تفصیل نہ کی تو کیا الزام کی بات ہے، صفحات تاریخ میں کتنے ہی لوگ آپکو اس طبیعت کے نظر آئینگے جنہوں نے کسی کا نام نہیں لیا ابو الطیب متنبّی عربی کا ایک مشہور۔ پرگو مسلم شاعر گزرا ہے اسنے ہزاروں پرزور قصائد کہے اور تمام تر سلاطین عہد اور ارباب دول کی مدح میں۔ اور غرض تھی صرف جلب منفعت اور حصولِ زر۔ اسنے کہیں پیغمبر اسلام تک کا نام نہیں لیا تو بھلا صحابہ کا کیا ذکر۔ حضرت صالح اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام کا نام صرف ایک ایک جگہ لیا ہے اور وہ بھی اس لئے کہ نعوذ باللہ اپنے کو کسی حیثیت سے انکے برابر ٹھہرانا مقصود تھا چنانچہ اس کو متنبّی کہنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔ کہتا ہے:۔

مَا مُقَامِی بِأَرْضِ نَخْلَةَ اِلَّا کَمُقَامِ الْمَسِیْحِ بَیْنَ الْیَهُود

(ترجمہ) سرزمین نخلہ میں میرا وجود ایسا ہے، جیسے یہودیوں میں حضرت عیسیٰؑ کی ذات۔

۲۔ اَنَا فِیْ اُمَّةٍ۔ تَدَارَکَهَا اللّٰهُ غَرِیْبٌ کَصَالِحٍ فِیْ ثَمُوْد

(ترجمہ) میں اس قوم میں۔ اللہ اسکی اصلاح کرے۔ ایک پردیسی ہوں جیسے قوم ثمود میں حضرت صالحؑ۔

اس صورت میں بیچارہ غالب پر کیا الزام جب اسنے حضرت علی کو تو بجد اور بقیہ صحابہ کو بھی دو چار جگہ یاد کر لیا ہے۔ (مہر نیمروز میں بعد حمد و نعت) "ہر اختر بریں آسماں نور دیدۂ آفتابست و ہر گل دریں بوستاں جگر گوشۂ بہار، ہمہ بہ ہمزبانی کلیم ارنی گوئے، و ہمہ بہ ہمدمیٔ مسیح قم باذن اللہ سرائے" (تقریظ دیوان حافظ میں بعد حمد و نعت) براستی جانشینانش را از ایزد بخشائش گردِ مدارِ معانی

دیہ درستی آئین گزینانش راہ بہشت جاوید ارزانی" بھلا ہو بیچارہ غالب کا کہ جانشینان رسول پر (بہ صیغہ جمع بلا استثنار) درود بھیجتا اور انکو مستحق بہشت تو لکھتا ہے۔ ہر صحابی کو ہمسر آفتاب اور ہر گل کو رو کش بہار تو مانتا ہے اور کہیں کسی صحابی کو برائی سے تو یاد نہیں کرتا۔

(ب) میرزا غالب مصائب زمانہ کے شکار اور تنگی و عسرت میں گرفتار تھے۔ ایسا شخص قدرتاً سوز و گداز۔ رنج و غم کا بیان زیادہ زور کے ساتھ کر سکتا ہے خود اسکی طبیعت ہی ایسے مضامین کی طرف مائل و راغب رہتی ہے اور ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر ایسے مضامین تلاش کرلاتی ہے، تاریخ اسلام میں شہادت علی اور شہادت حسینؓ ایک اہم اور مسلسل ٹریجڈی تھی ادھر حبّ اہلبیت جزو ایمان بھی ہے پھر ایک اسلامی فرقہ اس طرف ہمہ تن مصروف بھی نظر آیا۔ لہٰذا مرزا کو اپنا زورِ طبع خرچ کرنے کیلئے یہی میدان پسند آیا۔

یہاں ایک کام کی بات اور سن لیجئے:۔ ایک طالب علم نے اپنے استاد سے پوچھا کہ حضرت! انصاف سے فرمائیے کہ غالب کا "سہرا" بڑھکر ہے یا ذوق کا۔ دنیا کا تو یہ حال ہے کہ جو ذوق کے طرفدار ہیں وہ ذوق کے سہرے کو فوق دیتے ہیں اور جو غالب پرست ہیں وہ اسکے سہرے کو غالب بتاتے ہیں، اب آپ بتائیے فیصلہ کیا ہے" بیچارہ نے کتنا اچھا اور دل کو لگتا ہوا فیصلہ کیا ہے، کہنے لگے۔ "بھئی سنو۔ سہرا شادی کے وقت کہا جاتا ہے جو خوشی کا موقعہ ہوتا ہے۔ غالب بیچارہ تو ہمیشہ گردش زمانہ سے شاکی، حرماں نصیب اور دل شکستہ رہا۔ وہ خوشی کے مضامین کیا اچھے باندھ سکتا۔ ایک غمگین شخص سے کہو کہ ہنسو بھلا وہ کیا ہنسے گا منہ البتہ چڑھا دیگا۔ حق یہ کہ ذوق کا سہرا دو وجہ سے بڑھ گیا ہے ایک تو یہ کہ ذوق نے غالب کا سہرا دیکھ لیا تھا اور مقابلہ میں ترقی کرنیکا قصد کرکے لکھا تھا دوسرے یہ کہ وہ مطمئن بے فکر اور فارغ البال تھا۔

(ج) ایک بڑی وجہ یہ بھی ہوئی کہ بہادر شاہ کی ایک بیگم نواب زینت محل خود بھی شیعی المذہب تھیں اور درباری شعرا میں وہ مرزا غالب کو زیادہ مانتی تھیں (چنانچہ انہیں کے ایما سے مرزا غالب نے قبل از وقت شاہزادہ جواں بخت کی شادی میں سہرا کہکر گزرانا تھا) مرزا جیسے بے فکرے اور آزاد منش بھلا کب ایسے موقعہ کو ہاتھ سے جانے دیتے، اس بارگاہ سے کبھی کبھی فتوحات کا بھی آسرا تھا، اسلئے تشیع ظاہر کرنا اور خود بھی پانچواں سوار بنجانا کیا بڑی بات بھی۔ اصل یہ ہے کہ جہاں کسی شخص کو ایسے اسباب یا احباب مل گئے جن سے گریز نہو اور ہر وقت کی ملاقات مختلف العقائد لوگوں کے ساتھ رہے تو دوسروں کے عقاید سے اپنے کو بچانا ناممکنات سے ہوجاتا ہے۔ خود بہادر شاہ اپنے ایک مہمان کی بدولت شیعہ ہوگئے تھے۔ اسکا بادشاہ کو بہت رنج ہوا فوراً اسکی تردید میں حکیم احسن اللہ خاں صاحب سے اشتہارات و رسایل لکھوائے اور مرزا غالب سے ایک مثنوی (دمغ الباطل) لکھوائی اور شایع کرادی (یادگار صفحہ ۶۹۔۷۰)

اسی طرح خلیفہ ہارون الرشید کا بیٹا مامون الرشید، مسلّم ہے کہ سُنّی تھا۔ چنانچہ شیعہ مورخین نہایت جبر و اکراہ سے صاف صاف لکھتے ہیں کہ وہ سنی تھا اور اسکا شیعہ پن محض بناوٹی تھا۔ مگر اسکو برامکہ کی صحبت اور بچپن کی تعلیم و تربیت نے خاصہ شیعہ بنا رکھا تھا۔ بادشاہ ہونیپر فضل اور سہل (جو دونوں شیعہ تھے) اس کے دست دراز تھے۔ ایکبار اس نے شیعہ پن کے جوش میں منادی کرادی تھی کہ سب لوگ متعہ کو جایز سمجھیں"، غرض اسی قسم کے بعض مُوہم اور مبہم اقوال کی بنا پر لوگ کھینچ تان کر اسکو شیعہ ثابت کرنا چاہتے ہیں اور اکثر سُنّی مورخین نے اسکو شیعہ لکھ ہی دیا مگر محققین اسکو صاف سنی لکھتے ہیں (المامون از شبلی صفحات ۱۶۰۔۱۶۲)

۳۔ مرزا کا طنز کرنا۔ غالب کا طنز کرنا اس سے بیش کچھ نہیں ہے کہ وہ صد درجہ کا ظریف تھا اور گرم فقرہ سوجھ جانے پر وہ پھر کچھ نہیں سوچتا تھا کیا ان ستاروں پر یہ جملہ نہیں کہا تھا "جو کام بے مشورہ کیا جاتا ہے وہ ایسا ہی بے ڈول ہوتا ہے"۔ آتش کے حال میں آزاد نے لکھا ہے کہ اسنے کچھ دنوں تک برابر سنیوں جیسی نماز پڑھی اور کسی کے ٹوکنے پر کہدیا کہ مجھے کیا اب اسطرح ہاتھ کھول کر نماز پڑھ لیا کرونگا۔ مرزا دبیر کے مرثیہ کو سنکر اس نے کہدیا کہ یہ "کربلا کا بیان ہے یا لندھور بن سعدان کی داستان" کیا آپ کسی ایسے شیعہ کا تصور کرسکتے ہیں جو سنیوں اور شیعوں کی نماز کا فرق نہ جانتا ہو اور نہایت رواداری سے سنیوں جیسی نماز پڑھے یا مرثیہ جیسی مذہبی پر ایسا توہین آمیز ریمارک پاس کرے، یہ بھی طنز صریح ہے لیکن کیا تماشہ ہے کہ آزاد اسکو مزہ لے کر بیان کر گئے ہیں اور طنز کا شائبہ بھی نہیں آنے دیتے اور اسکی بنا پر آتش کو سنی نہیں کہتے۔

۴۔ آزاد کی شہادت:۔ اس کے جواب میں آزاد ہی کی پوری تحریر درج کیجاتی ہے اور اسکا فیصلہ ناظرین کے انصاف پر چھوڑا جاتا ہے کہ آزاد کی تحریر سے غالب سنی ثابت ہوتا ہے یا شیعہ (آبحیات طبع نہم صفحہ ۵۱۳) "مرزا کے تمام خاندان کا مذہب سنت و جماعت تھا مگر اہل راز و تصنیفات سے یہی ثابت ہے کہ انکا مذہب شیعہ تھا اور لطف یہ کہ ظہور اسکا جوش محبت میں تھا نہ کہ تبرا و تکرار میں۔ چنانچہ اکثر لوگ انہیں نصیری کہتے تھے، اور وہ سنکر خوش ہوتے تھے۔ ایک جگہ خود بھی کہتے ہیں منصور فرقۂ اسد اللّٰہیاں الخ تمام اقربا در حقیقی دوست سنت و جماعت تھے، لیکن انکی اپنایت میں کسی طرح کی دوئی نہ معلوم ہوتی تھی۔ مولانا فخر الدین کے خاندان میں مرید بھی تھے۔ دربار اور اہل دربار میں کبھی اس معاملہ کو نہیں کھولتے تھے اور یہ طریقہ دہلی کے اکثر خاندانوں کا تھا" انتہی خیر بعضوں (میرے خیال میں یہ صرف آزاد ہی کا اپنا خیال ہے جسکو بعضوں کر کے لکھا ہے) کا انکو نصیری کہنا اور اسپر غالب کا خوش ہونا تو برائے بیت ہے۔ مگر دیکھیے آزاد نے غالب کے متعلق اتنی باتیں لکھی ہیں:۔ (۱) غالب مولانا فخر الدین کے خاندان میں مرید تھے ہمنے تو معتبر ذریعہ سے سنا ہے کہ حضرات شیعہ میں نہ کوئی درویش و صوفی ہوتا ہے نہ کوئی کسی کا مرید۔ (۲) تمام اقربا ماں باپ، اور دوست احباب سنی تھے (۳) آزاد کے نزدیک انکا تشیع "اہل راز" سے ثابت ہے (تصنیفات یا اقوال کو جانے دیجیے کیونکہ اسکی حقیقت اس مضمون سے واضح ہو جائیگی) سچ ہے شیعیت ایک راز ہے اور صرف "اہل راز" ہی اس سے واقف ہو سکتے ہیں مگر معلوم نہیں شیعیت کے کھلم کھلا اظہار سے کون سا امر مانع تھا اگر بادشاہ کا ڈر تھا تو کیا دربار میں شیعہ درباری نہ تھے۔ اور غالب تو بادشاہ اور بادشاہت کے بعد بھی رہے ہیں آخر اسوقت کونسا امر مانع تھا۔ (۴) آزاد کے نزدیک غالب کا تشیع جوش محبت میں تھا نہ کہ تبرا و تکرار میں۔ واقعی سچ کہا ہے غالب کو حضرت علیؓ اور حسنینؓ سے محبت تھی عشق تھا بسبب صوفی المشرب ہونے کے۔ بیہودہ تبرا و تکرار میں کیوں پڑتا۔ شیعہ ہوتا تو اسمیں پڑتا۔ مگر آگے کی عبارت کچھ عجیب گو مگو سی ہے۔ "(۱) اس معاملہ کو اہل دربار پر نہ کھولتے تھے (۲) یہی حال دہلی کے اکثر خاندانوں کا تھا" الخ۔ معلوم نہیں کس معاملہ کو وہ دربار میں نہ کھولتے تھے۔ اگر شیعہ ہونیکی طرف اشارہ ہے تو خدا جانے اہل راز سے بات پھوٹ کر کیسے بادشاہ اور درباریوں کو اسکا حال معلوم ہوگیا۔ چنانچہ بادشاہ نے پوچھا تو مرزا نے رفض و شیعیت سے تبرا بھی کیا (آگے بحوالہ مولانا حالی آئے گا) اور اگر مرید ہونیکی طرف اشارہ ہے تو خدا جانے غالب نے کیوں اسکو بھی "اہل راز" ہی کے

واقف ہونیکے لئے بیچارکھا تھا مگر انکے مرید ہونیکے کو بھی ایک دنیا جانتی تھی خطوط میں لوگوں کو خود انہوں نے لکھا۔ اور نہ یہ معلوم ہوا کہ دلّی کے کن خاندانوں (شیعہ یا سُنّی یا ہنود) کا کیا حال تھا؟ اور وہ کون کون سے خاندان تھے؟ مگر اچھا کیا ان لوگوں کا حال اور نام نہ بیان کیا ورنہ گرفت ہوتی۔ ذرا آزاد کی کوشش تو دیکھئے کہ سارے خاندان و دوست داینایت کو سنی کہکر کس طرح غالب کو "اہل راز" صادق القول کی شہادت پر شیعہ ثابت کرنا چاہتے ہیں مگر چونکہ صاف صاف شیعہ ثابت ہوتے نظر نہیں آتے اس لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا کر چپ ہو رہتے ہیں، یہی آزاد کی عبارت مع مختصر نوٹ کے۔ کیا انہیں الفاظ و بیان سے (جنکی تحلیل کے بعد بجز تسنن کے اور کچھ ہاتھ نہیں آتا) میرزا غالب کو شیعہ کہدیا جا سکتا ہے

نمبر ا۔ دلائل تشیع کے جوابات تو ختم ہوئے لیکن غالب ہی کے تذکرہ میں آزاد کی دروغگوئی کی دو بین مثالیں اور بھی ہیں۔ مقام و موقع اس امر کا مقتضی ہے کہ اسکا ذکر بھی کر دیا جائے (آبحیات صفحہ ۵۲۸) "بعض شاگردوں نے مرزا سے کہا کہ آپنے حضرت علی کی مدح میں تو بہت سے اور بڑے زور کے قصائد لکھے ہیں مگر صحابہ میں کسی کی تعریف میں کچھ نہیں کہا" مرزا نے بعد تامّل فرمایا "ان میں کوئی ایسا دکھا دیجئے تو اسکی تعریف بھی کر دوں" یہاں پہونچکر آزاد نے ایک قابل غور حاشیہ بھی لکھا ہے کہ "یہ لطیفہ کئی شاعروں کی طرف منسوب ہے" اگرچہ غالب کی ظرافت سے یہ لطیفہ کچھ بعید نہیں معلوم ہوتا مگر اس روایت میں آزاد منفرد ہیں۔ مولانا حالی جو غالب کے محتم سوانح نگار ہیں اس بارہ میں بالکل ساکت ہیں حالانکہ انہوں نے نہایت ایمانداری سے غالب کے کفر و الحاد ثابت کرنیوالے لطیفے بھی درج کر دئیے ہیں اسکو بھی جانے دیجئے۔ آزاد جانتا ہے کہ مرزا نے اگرچہ بجز حضرت علی کے کسی اور صحابی کی ایسی تعریف نہیں کی مگر حیلۃً صریحۃً کبھی اسنے خلفائے ثلاثہ یا بقیہ صحابہ کی ہتک واہانت نہیں کی۔ کیونکہ اگر کوئی کسی سے دوستی نہ ظاہر کرے تو اسکے یہ معنے ہرگز نہیں ہیں کہ وہ دشمن ہی ہے ممکن ہے کہ اس کے دل میں خیال تو ہو مگر محبت کے درجہ تک نہو اور دوستی و دشمنی دونوں پہلو سے پاک ہو۔ پس آزاد خود متردد تھا کہ اتنی سخت بات آسانی سے غالب کے ساتھ کون منسوب کریگا لہذا فوراً دلی خدشہ زبان قلم سے پھوٹ بہا اور ایک دھوکے میں ڈالدینے والا جملہ قلم سے نکلا کہ اگر غالب کے بارہ میں یہ لطیفہ نہ مانا جائے تو ہم کہدینگے کہ فلاں فلاں شاعر کا ہے کیونکہ "کئی شاعروں کیطرف منسوب ہے"۔

نمبر ۲۔ اسی کے آگے آزاد نے عبارت کتاب میں ایک ریمارک کیا ہے جو "علیٰ زعم آزاد" غالب کو سنی ثابت کرتا ہے سنئے "... مرزا کی شوخی طبع ہمیشہ انہیں اس رنگ میں شور بور رکھتی تھی جس سے ناواقف لوگ انہیں الحاد کی تہمت لگائیں، اور چونکہ یہ رنگ انکی شکل و شان پر عجیب معلوم ہوتا تھا اس لئے دوست ایسی باتوں کو سنکر چونکتے تھے۔ جوں جوں وہ چونکتے تھے مرزا اور بھی زیادہ چھیڑتے اڑاتے تھے" انتہیٰ۔ لیجئے آزاد تو صاف صاف لکھتا ہے کہ غالب اپنی شوخی و ظرافت سے اس قسم کے کلمات کہدیا کرتے تھے اور زیادہ تر لوگوں کے چھیڑنے اور چھینٹے اڑانے کیلئے (اسکی کھلی ہوئی مثال آجکل کے انگریزی داں طبقہ کی باتوں سے بہ آسانی سمجھی جا سکتی ہے) واضح ہو کہ اگر کوئی شخص شیعہ ہو یا ملحد ہو اور تشیع و الحاد کے کلمات کہے تو اسکو شوخی نہیں کہتے وہ تو واقعیت ہے شوخی و ظرافت تو اسکا نام ہے کہ اپنے مذہب و عقیدہ کے خلاف اور واقعیت و اصلیت کے خلاف کوئی بات کہی جائے۔ !!! اب کیا

آپ آزاد جیسوں سے اس سے زیادہ وضاحت کی امید کرتے تھے!! آخر ادیر کے لطیفہ کے بعد ہی شوخی و ظرافت، الحاد یا شیعیت کی تہمت، پھبتیے اڑانے، وغیرہ ریمارک پاس کرنے کے اگر یہ معنی نہیں تو اور کیا معنے ہیں؟ اللہ آزاد کا بھلا کرے کہ اس نے تو مرزا کے کفریہ کلمات پر ریمارک کیا تھا مگر اس کے قلم سے یہ ریمارک نکلا تو اس لطیفے کے بعد۔ لہذا لوگوں نے اسکا صحیح مطلب اخذ کیا اور آزاد کی روح کو دعا دی۔

نمبر ۳۔ مرزا غالب نے ایک خط میر مہدی مجروح پانی پتی کو لکھا تھا جو اردوے معلیٰ میں بھی موجود ہے۔ آزاد نے آبحیات صفحہ ۵۱۲ پر اسے نقل کر کے ایک حاشیہ چڑھایا ہے "میر مہدی۔ تم میری عادت بھول گئے۔ ماہ مبارک رمضان میں کبھی مسجد جامع کی تراویح ناغہ ہوئی ہے؟ پھر میں اس مہینے میں رامپور کیونکر رہتا؟ نواب صاحب مانع رہے برسات کے آموں کا لالچ دیتے رہے مگر بھائی میں ایسے انداز سے چلا کہ چاندرات کے دن یہاں آ پہونچا۔ یکشنبہ کو غرہ ماہ مقدس ہوا۔ اسی دن سے ہر صبح کو حامد علیخاں کی مسجد میں جا کر جناب مولوی جعفر علی صاحب سے قرآن سنتا ہوں۔ شب کو مسجد جامع میں جا کر نماز تراویح پڑھتا ہوں۔ کبھی جو جی میں آتی ہے تو وقت صوم مہتاب باغ میں جا کر روزہ کھولتا ہوں اور سرد پانی پیتا ہوں۔ واہ وا کیا اچھی طرح عمر بسر ہوتی ہے۔ اب اصل حقیقت سنو لڑکوں کو ساتھ لے گیا تھا وہاں انہوں نے ناک میں دم کر دیا...... اس سبب سے جلد چلا آیا" اس خط کے اس جملہ پر کہ (واہ واہ کیا اچھی طرح عمر بسر ہوتی ہے) آزاد کا حاشیہ سنئے۔ لکھتے ہیں "غرہ رمضان سے یکر یہاں تک فقط شوخی طبع ہے کیونکہ جو باتیں ان فقروں میں ہیں مرزا ان سے کوسوں بھاگتے تھے اور یہ خط غدر کے بعد کا ہے۔ اسوقت یہ باتیں دلی میں خواب و خیال ہو گئی تھیں" اگر آزاد صرف اسی قدر لکھتا کہ ان باتوں سے مرزا کوسوں دور تھے، تو خیر کچھ مضایقہ نہ تھا۔ واقعی وہ کوسوں دور تھا۔ مگر واضح رہے کہ غالب ایک رند پارسا اور آزادِ بے ریا تھا۔ بقولِ حالی سے بے ریائی تھی زہد کے بدلے۔ زہد اسکا اگر شعار نہ تھا۔ اس نے کبھی گناہوں کے اقرار میں ننگ و درنگ نہیں کیا وہ شیاد و کیاد نہ تھا کہ اپنے کو عابد و زاہد لکھتا۔ وہ اپنے کو جیسا ظاہر کرتا تھا ویسا ہی سیرت میں بھی تھا۔ وہ اس طبیعت کا ہرگز نہ تھا کہ نماز و تراویح نہ پڑھتا۔ روزہ نہ رکھتا مگر اپنے کو تراویح کا پابند جھوٹ لکھدیتا۔ یہ سچ ہے کہ اسنے روزے بہت کم رکھے اور نمازیں بہت کم پڑہیں۔ اور یہ بھی غلط نہیں کہ وہ رمضان مبارک میں شطرنج و چوسر کھیلتا اور شرط بد کر کھیلتا، لیکن یہ بھی ناممکن نہیں کہ اس ماہ مبارک کی برکتیں کسی گناہ گار کو اپنی طرف کھینچکر روزے رکھوادیں اور نمازیں پڑھوادیں چنانچہ ہر سال رمضان میں تجربہ ہوتا ہے کہ عمر بھر جو روزہ و نماز سے بیگانہ رہتا وہ بھی نماز و روزہ کا پابند بنجاتا ہے۔ غرض غالب بیچارہ تو بلا جبر و اکراہ بحالتِ ثباتِ عقل و درستی ہوش لکھ رہا ہے کہ "میں تراویح پڑھتا ہوں" آزاد کہتے ہیں کہ نہیں۔ غلط ہے؟ مدعی سست گواہ چست!! اور آگے تو کمال ہی کیا کہ (یہ خط غدر کے بعد کا ہے۔ اسوقت یہ باتیں دلی میں نہیں رہ گئی تھیں) اس جملہ پر تو ہنسی کے مارے میری حالت خود غالب ہی کیطرح ہو رہی ہے، جیسا انہوں نے منشی غلام غوث بیخبر کو کسی خط میں لکھا ہے کہ "تمہارا افلاس جملہ پڑھوں اور اتنا ہنسوں کہ پیٹ میں بل اور آنکھوں سے آنسو آجائیں" کیوں صاحب کون سی چیز دلی میں بعد غدر نہیں رہ گئی تھی؟ دلی کی جامع مسجد؟ یا حامد علیخاں کی مسجد؟ یا قرآن رہ گیا تھا

یا حفاظ قرآن موجود نہ تھے؟ یا ماہ رمضان المبارک۔ تراویح پڑھنا اور سننا ختم ہو گیا تھا؟ یا روزہ کا فریضہ بعد غدر دلی میں نہ رہ گیا تھا؟ غالب نے اس تحریر میں تو انہیں چیزوں کا تذکرہ کیا ہے آخر انہیں سے کونسی چیز نہ رہ گئی تھی؟ مگر یہ تمام چیزیں (باستثنائے تین چیزوں کے) تو حشر تک روئے زمین پر رہیں گی شاید آزاد کا اسیر ایمان نہیں!! ہاں دو تین چیزیں تو ممکن ہے کہ بعد غدر دلی میں نہ بچی ہوں، ایک مولوی جعفر علی خود، دوسرے مہتاب باغ۔ تیسرے حامد علیخاں کی مسجد (کیونکہ مسجد جامع تو آجتک ہی باقی ہے) لیکن واضح رہے کہ میں نے "ممکن" کی شرط کیساتھ کہا ہے۔ غالب جیسر یہ سب باتیں گذری ہیں وہ تو لکھتا ہے کہ یہ سب چیزیں ہیں اور میں اُنسے بہرہ اندوز ہوتا ہوں اور آزاد کہتے ہیں کہ موجود نہیں۔ جس کا ثبوت اب ان لوگوں کے ذمہ ہے جو آزاد کے ارادتمند ہیں حقیقت یہ ہے کہ آزاد نے بھی غضب کی دیدہ دلیری سے کام لیا کہ غالب کے لہجہ اور انداز بیان پر بھی غور نہیں کیا۔ وہ لکھتا ہے "تم میری عادت بھول گئے" ایسے انداز سے چلا کر چاندرات کے دن یہاں پہونچا" عادت ایک مرتبہ کے کرنے کو تو کہتے بھی نہیں، معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسپر متواتر کئی سال کاربند رہا ہے جو "تقیہ" کا کام کبھی نہیں ہو سکتا۔ اور وہ لکھتا بھی ایسے شخص کو ہے جو اسکی عادت سے واقف ہے۔ اسکے علاوہ اگر لڑکوں کو گھر پہونچانا ہی مقصود تھا تو ٹھیک اسی دن جب چاند نکلنے والا تھا دلی پہونچنے کے کیا معنے؟ آخر یہ التزام کچھ معنے رکھتا تھا!! لیکن شاید آزاد کو غالب کے اس فقرہ سے دھوکہ ہوا ہے کہ "......اب اصل حقیقت سنو۔ لڑکوں کو ساتھ لے گیا تھا......" الخ۔ اس سے وہ یہ سمجھا ہوگا کہ غالب نے ابتک تو تقیہ کی باتیں کی ہیں، اب اصل حقیقت لکھ رہا ہے۔ بس اتنی گنجائش پاکر اسنے فوراً ہی حاشیہ چڑھا دیا کہ لاؤ سرے سے تراویح پڑھنے ہی کی شہادت کو غلط یا مشتبہ کر دوں۔ "بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است" آزاد کو کہاں سے پاؤں جو سمجھاؤں کہ بھیا! گو چھوٹا منہ بڑی بات ہے کہ میں آپکو زبان و محاورہ بتاؤں مگر کیا کروں مجبوری ہے۔ سنئے یہ بھی ایک محاورہ ہے جب ایک بات ختم کر کے کوئی دوسری بات اہم اور ضروری بیان کرنی ہوتی ہو تو یہ اور ایسے کلمات لوگ لکھدیا کرتے ہیں مثلاً "اب اور سنو۔ ایک لطیفہ سنو۔ ادھر کی سنو۔ اصل سنو۔ معاملہ کی بات سنو۔ انصاف کی بات سنو" اور انکا مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ ایک اور اہم بات بھی ہے۔ اگر کہیں ایسے محاورے اور جملے آپکو نہ ملیں تو غالب ہی کے رقعات غور سے پڑھ لیجئے پچاس جگہ مل جائیں گے۔ ایک خط کے بیچ میں غالب لکھتا ہے "میاں لڑکے سنو" ایک جگہ لکھتا ہے "سنو غالب! رونا پیٹنا کیسا کچھ اختلاط کی باتیں کرو"

واہ رے آزاد! یہ ہے آپ کے کلک گوہر سلک کی آزادہ روی اور قلم کی زہرافشانی! جس جگہ غالب جیسا صاف گو اتنی کچھ نشانہ بنایا چھوڑ جائے اسپر حاشیہ چڑھانا اور دن کو رات کر دکھانا آپ ہی کا کام ہے پھر ان شعرا کا کیا حال ہوگا جنکے متعلق اتنی فشانیاں بہم پہونچ سکتی ہوں لیکن مشکور ہیں ان حضرات کی محنتیں جو بلا خوف لومۃ لائم، غلط کو غلط اور صحیح کو صحیح ثابت کر دکھاتے ہیں چاہے بعضوں کو ناگوار گزرے، یہاں آزاد کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے وہ غالب کے ضمن میں استطراداً لکھا گیا ہے اور وہ بھی اصول درایت و تنقید کے لحاظ سے۔ ورنہ آزاد کی استادی۔ قادر الکلامی اور معجز نگاری سے مجھے انکار نہیں۔ مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ (۱) وہ بیان واقعات میں بلیسانہ تحریف و تدلیس سے کام لیتا ہے اور (۲) ادائے مطلب میں اس حد تک رنگین بیانی، تناسب و ایہام کو کام میں لاتا ہے کہ وہ

لطافت سے متجاوز ہوکر ضلع جگت پھبتی کے سوا کچھ نہیں رہجاتا۔ آزاد کی تحریریں اسطرح واضح اور مبیّن ہیں کہ زمانہ جیسے نقاد کے ہاتھوں اسکا پوشیدہ رہنا یا پوشیدہ کرنے کی کوشش کرنا "حجاب نوعروساں" سے بیش نہیں کہ "اگر ماند شبے ماند شب دیگر نمی ماند"

آزاد کی آبحیات کو لوگ جس قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں دراصل وہ انہی خرابیوں کی وجہ سے اس قدر کے لائق نہیں۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ آزاد نے اردو شعراء کا تذکرہ ایسے وقت میں لکھا اور اردو والوں پر احسان کیا جب قریب تھا کہ یہ سب حالات زمانہ کے ہاتھوں فراموش ہوجاتے مگر یہ غلط ہے آزاد کو میر تقی میر کا نکات الشعراء نامی تذکرہ کہیں سے ہاتھ لگ گیا وہ تھا نایاب۔ اسنے بھی سوچا ہوگا کہ یہ کتاب کا ہے کو بعد میں کسی کو ملیگی لہذا لاؤ جسکا ذکر جیسا چاہو لکھدو۔ اور اسنے ایسا ہی کیا۔ مگر حق کبھی چھپایا نہیں چھپتا باطل کو عارضی فروغ ہوتا ہے۔ زمانہ نے کروٹ لی۔ مولانا حبیب الرحمٰن خانصاحب شروانی نے تذکرہ نکات الشعراء پر مقدمہ لکھکر اس سے زیادہ احسان کیا جتنا آزاد کی آبحیات نے کیا تھا۔ نکات الشعراء مل گیا اور شایع ہوگیا۔ اب نکات الشعراء اور آبحیات کے مقابلہ سے قدم قدم پر مسخ و تحریف کا عمل نظر آتا ہے۔ ادھر مسند درس و تدریس کے ایک نام لیوا نے جبین ہوگیا کہ افسوس! نامور اور باکمال شعرائے اردو کو "آبحیات" سے کیا فائدہ پہونچا جب سب لوگ چاروں طرف عجیب عجیب بدنما ہیئت میں پڑے سسک رہے ہیں ایسی زندگی جاوید سے تو انکی گمنامی ہی اچھی تھی۔ لہذا اسنے محض حق کی حمایت میں "گل رعنا" کھلایا۔ رسالہ نگار نے عام شعراء کے حالات پر مختصر تبصرہ کرکے آزاد کی قلعی کھولدی اور مرزا فرحت صاحب نے حکیم آغا جان عیش کا صحیح حال لکھکر آزاد کا فریب طشت از بام کردیا

——— "کجا بودم مرکب کجا تاختیم"، ذیل میں دلائل تسنن بیان کرتا ہوں اسکے بعد داخلی شہادت عرض کرونگا۔

۱ - غالب تراویح پڑھتا تھا۔ اور یہ تراویح پڑھنی غدر ۱۸۵۷ء سے لیکر ۱۸۶۹ء (سنہ وفات غالب) تک کا فعل ہے یعنی آخر عمر کا کیونکہ یہ خط غدر کے بعد کا ہے اور تراویح کوئی شیعہ نہ پڑھے گا نہ کہ مسجد جامع جاکر۔

۲ - اقوال و تصانیف سے جو تشیع ظاہر ہوتا ہے تو زیادہ تر فارسی کلام سے ظاہر ہوتا ہے اور وہ بھی بہ تقلید ایران ہے۔ اور اوائل عمر کا کلام ہے کیونکہ اسنے آخر عمر میں فارسی قصائد۔ فارسی خطوط نویسی بند کردی تھی جگر کاوی کی طاقت نہ رہ گئی تھی۔

۳ - وہ ایک بزرگ صوفی (شاہ محمد اعظم صاحب غالباً) کا مرید تھا۔ اور شیعوں میں ارادت و بعیت نیز ولایت و تصوف کا کوئی مفہوم نہیں ہے۔

۴ - وہ اہلبیتؑ سے دلی محبت رکھتا تھا، چند خارجی اسباب بھی اسکے تصنع شیعیت کا سبب بنے۔

۵ - اسنے کسی صحابی کو برائی سے یاد نہیں کیا جو خالص تسنن کی علامت ہے۔

۶ - سب سے بڑھکر یہ کہ درگاہ سلطان نظام الدین اولیاؒ میں مدفون ہوا۔ جسے نہ کوئی شیعہ پسند کرتا نہ اسکو میسر ہوتا۔

۷ - مولانا حالی کی شہادت :۔ (نمبر ۱۔ یادگار صفحہ ۹) "اہلسنت اور امامیہ دونوں فرقوں کے لوگ جنازہ کی مشایعت میں شریک تھے سید صفدر سلطان..... نے نواب ضیاء الدین خاں مرحوم سے کہا "مرزا صاحب شیعہ تھے ہم کو اجازت ہو کہ ہم اپنے طریقہ پر ان کی تجہیز و تکفین کریں مگر نواب صاحب نے نہ مانا اور تمام مراسم اہلسنت کے موافق ادا کیے گئے، اسمیں شک نہیں کہ نواب صاحب سے

زیادہ اُنکی اصلی مذہبی خیالات سے کوئی شخص واقف نہیں ہو سکتا" جہاں تک مجھے معلوم ہے نواب ضیاالدین خاں مرزا کے
عزیز قریب تھے۔ ان کا یہ فعل، اور سید صفدر کی درخواست کو نامنظور کرنا مرزا کے سنی ہونیکی بڑی دلیل ہے۔ (نمبر ۲۔ یادگار صفحہ ۹۴)
"اگرچہ مرزا کا اصل مذہب صلح کل تھا مگر زیادہ تر انکا میلان طبع تشیع کیطرف پایا جاتا تھا۔
جناب امیرؑ کو وہ رسول اللہؐ کے بعد تمام امت سے افضل جانتے تھے۔ ایک بار بادشاہ نے کہا "ہمنے سنا ہے مرزا غالب شیعی مذہب
ہیں.... تو مرزا نے چند رباعیاں لکھکر حضور کو سنائیں جنمیں تشیع اور رفض سے تحاشی تھی۔ ایک رباعی اسوقت یاد رہگئی ہے۔

جن لوگوں کو ہے مجھ سے عداوت گہری — کہتے ہیں مجھے وہ رافضی و دہری
دہری کیونکر ہو جو کہ ہووے صوفی — شیعی کیونکر ہو ماورا النہری

..... چوتھے مصرعہ کا مطلب یہ ہے کہ ماوراء النہری یعنی ترکستان کے لوگ متعصب سنّی ہونے میں ضرب المثل ہیں یہانتک کہ شیعہ انکو ناصبی و خارجی سمجھتے ہیں۔ چونکہ مرزا کی اصل ماوراء النہر سے تھی اسلئے کہتے ہیں کہ ماوراء النہری رافضی یا شیعی کیونکر ہو سکتا ہے۔ جو لوگ مرزا کی طرز مزاج اور طرز کلام سے ناآشنا ہیں وہ شاید یہ سمجھیں کہ مرزا نے بادشاہ کے حضور میں اپنا رسوخ قایم رکھنے کیلئے اپنا مذہب غلط بیان کیا اصل حقیقت یہ ہے کہ سب رباعیاں بادشاہ کے خوش اور اہل دربار کے ہنسانے کے لئے لکھی گئی تھیں کیونکہ دربار میں ایک متنفس بھی ایسا نہ تھا جو مرزا کو شیعی یا کم سے کم تفضیلی نہ جانتا ہو" انتہی۔

اس عبارت سے اتنی باتیں معلوم ہوتی ہیں (۱) مرزا جس مذہب کے بھی رہے ہوں کٹر، متشدد اور متعصب نہ تھے۔ روادار اور صلح کُل تھے (۲) انکا میلان شیعیت کیطرف تھا کیونکہ وہ جناب امیر کو افضل سمجھتے تھے۔ (مگر یہ کوئی تشیع نہیں تفضیل علی کے تو بہت سے سنّی قایل ہیں خصوصاً اہل تصوف (۳) مرزا نے اپنے تشیع کی تردید کی ہے۔ مرزا کی طبیعت کو نہ پہچاننے والے لوگ شاید یہ سمجھیں کہ اسنے خوشامد میں اپنے کو سُنّی کہا ہے مگر نہ اسنے غلط کہا ہے نہ خوشامد کی ہے۔ بلکہ دربار والے جو اسکو شیعی یا تفضیلی سمجھتے تھے وہ ان باتوں کو کب مانتے لہذا انکے ہنسانے اور خوش کرنیکو رباعی لکھی ورنہ غالب جو تھا وہ تھا۔

یہ تھی مولانا حالی کی عبارت اور شہادت جسکو ہمنے باوجود اصولی اختلاف کے لکھدیا ہے مولانا حالی نے گو انکو تفضیلی کہنے میں ایک علمی سہو و مسامحہ سے کام لیا ہے پھر بھی انکی تحریر سے صاف ٹپک رہا ہے کہ وہ اسکو سُنّی جانتے ہیں.... "میلان..... پایا جاتا تھا" اس جملہ کا یہ صیغۂ مجہول لکھنا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ انکو اس سے اختلاف ہے اور ایک ضعیف سے شک پر مجہول کا صیغہ لکھدیا۔ وہ بھی کیا کرتے۔ آزاد جو خود شیعہ ہے وہ بھی تو غالب کو صاف شیعہ نہیں لکھتا اور نہ لکھ سکتا تھا۔ لہذا انہوں نے بھی اسکی ہر مذہبی طبیعت کو عام سُنّی ذہنیت سے ہٹا ہوا دیکھ کر تنزل کے طور پر تفضیلی لکھکر پیچھا چھڑانا چاہا۔ مگر یہ ان کا سہو ہے۔ انکی طرح اکثر سنیوں کو یہ غلط فہمی ہے کہ "تفضیلی" شاید سنیوں کا کوئی فرقہ ہے مگر "تحفۂ اثنا عشریہ" میں شاہ صاحب نے لکھدیا ہے کہ "تفضیلی شیعوں کا فرقہ ہے اور خطرناک فرقہ ہے"

اب میں مرزا کے دیوان فارسی و اردو سے داخلی شہادت اس بات کی پیش کرتا ہوں کہ غالب سنی تھا اور سنیوں بلکہ صوفیوں کے

کے عقاید کا قایل :-

۱ - وحدتِ وجود اور وحدتِ شہود - جو صرف حضرات صوفیہ کا عقیدہ و مسئلہ ہے -

۱-	دل ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر	ہم اوس کے ہیں ہمارا پوچھنا
۲-	قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن	ہم کو منظور تنک ظرفیِ منصور نہیں
۳-	ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی	ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے
۴-	ہر چند ہر ایک شئے میں تو ہے	پر تجھ سی تو کوئی شئے نہیں ہے
۵-	ہے مشتمل وجودِ صور پر وجودِ بحر	یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں
۶-	ہے غیب غیب جسکو سمجھتے ہیں ہم شہود	ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں
۷-	محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا	یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا
۸-	جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود	پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

مینے ہر شعر کا مطلب الگ الگ لکھنا مناسب نہ سمجھا - ان تمام اشعار کا مطلب تمثیلوں اور مرزا کی رنگارنگی کو چھوڑکر، تھوڑے تھوڑے فرق سے یہ ہے کہ دنیا اور دنیا والوں کا وجود الگ کوئی چیز نہیں - دنیا میں صرف خدا کا وجود اور اس کے آثار و علائم موجود ہیں - کثرت کے پردہ میں وحدت مخفی ہے مگر دیکھنے والوں کے لئے بالکل نمایاں ہے - ہر چیز جلوہ خداوندی کی مظہر ہے لہذا وحدتِ شہود سے ترقی کرکے ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ گویا ہر چیز خدا ہے - مگر ہم منصور نہیں کہ چھلک پڑیں یا اُبل جایئں ہم ضابط ہیں کہ دریا کا دریا پئے بیٹھے ہیں اور ڈکار تک نہیں لیتے -

۲ - مرتبۂ فنا :-

۱-	ہر چند سبکدست ہوئے بت شکنی میں	ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگ گراں اور
۲-	عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا	. . . .
۳-	قطرہ ملجائے جو دریا میں تو دریا ہو جائے	. . . .
۴-	قوی فتادہ چو نسبت ادب مجو غالب	ندیدہ کہ سوئے قبلہ پشت محراب است

مطلب یہ کہ فنا فی اللہ ہو جانا چاہئے اور من تو شدم کا درجہ حاصل کر لینا چاہئے تاکہ من دیگرم تو دیگری کا الزام نہ دے سکے - یہی انسان کو منصب ہے اور یہی غایت کمال

۳ - وجود عالم -

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں	ہم کہاں ہوتے اگر حُسن نہ ہوتا خود بیں

ۃمیں اشارہ ہے ایک مشہور حدیث قدسی کی طرف یعنی کُنْتُ کَنْزاً مخفیاً فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَفَ فَخَلَقْتُ الخلق

فلسفۂ مذہب

(بسلسلۂ سابق)

اب سوال یہ ہے کہ کیا مذاہب کا آخری انجام اسلام ہوگا اور ہوگا تو کیونکر۔ قرآن سے تو یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ بالفعل کوئی قوم اپنے پرانے مذہبی خیالات بدلنے پر آمادہ نہیں۔ وجہ اسکی یہ ہے کہ ہر شخص کو اپنی چیز پیاری ہوتی ہے خواہ وہ ہماری نگاہ میں کتنی ہی بری کیوں نہ ہو۔ یہ بھی ایک انسانی فطرت ہے اور اگر ایک شخص اپنی زبان۔ معاشرت۔ تمدن اور قومیت سے متنفر ہوکر کسی دوسری قوم کی عادات و زبان و معاشرت اختیار کرے تو یہ عام انسانی طبیعت کو گوارا نہیں۔ اسلئے اسلام اگر باہر سے قوموں میں داخل ہوگا تو قوموں کو اپنی محبوب چیزوں کے مقابل اسکے اختیار کرنے میں ہمیشہ تامل ہوگا۔ بلکہ وہ اسکی جان توڑ مخالفت پر کمربستہ ہوجائیں گے۔ پھر اگر اسلام کی ترویج اس طرح کیجائے جیسا عیسائی مشنریوں کا طریقہ ہے یا اب آریہ سماجیوں کی شدھی نے وہی وتیرہ اختیار کر رکھا ہے تو اس سے بہتر ہے کہ تبلیغ نہ کیجائے۔ کیونکہ اسکا لازمی نتیجہ قوموں میں منافرت پھیلانا ہے۔ قرآن میں ہمکو ایسی بہت سی آیتیں ملتی ہیں جسکو مینے خود عنوان مذہب و قومیت میں نقل کیا ہے۔ جن سے اسلام کی مذہبیت کا منشا اظہر من الشمس ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اصول بلکہ عبادات کی حیثیت سے تقریباً تمام مذاہب ایک ہیں۔ مگر اس اتفاق کے ساتھ جب فروعات میں جاؤ تو وہ بعض اوقات اسدرجہ قباحت دیستی کی طرف چلے جاتے ہیں کہ انسانی فہم و عقل کے لئے لعنت ہوجاتے ہیں۔ اور اس بات کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ کیا اچھا ہوتا کہ ان قوموں کو جنہوں نے اصل الاصول کو فراموش کردیا ہے پھر یاد دلایا جاوے یہی اسلام کا منشا ہے لیکن ہم اگر قوموں کو عربیت یا عجمیت کی طرف بلانا چاہتے ہیں۔ تو یہ سعی لاحاصل اور اپنے مشاغل و اوقات کی توہین ہے اسلئے ہمکو ہر اس مذہبی سوسائٹی کا ساتھ دینا چاہئے جو اپنی قوم کے مذہبی خیالات کے بدلنے کی کوشاں ہے۔ کیونکہ وہ ہمیشہ اسلام ہی کی ایک صورت ہوتی ہے اور اسمیں اور ہمارے اسلام میں صرف نام کا فرق رہجاتا ہے۔ دیکھو اسلام ہی کے اثر سے ایک وقت میں یورپ کے افکار نے خود بخود ڈائزم ( ) کو پیدا کیا اور دوسری طرف ہندوستان میں برھمو سماج کو۔ جنکی مختصر و جامع تعریف یہ ہے کہ وہ بلا محمدؐ و عرب کے مسلمان ہیں۔ (میری اس تعریف کے تائید میں دیکھو مضمون ڈائزم و برھمو سماج مندرجہ انسائیکلوپیڈیا برٹانکا) یہ تو وہ خیالات ہیں جنہوں نے تاریخی حیثیت پائی ہے مگر اس کے ساتھ دنیا کا ایک بہت بڑا طبقہ ہے جو دل سے اپنے پرانے خیالات کی تائید نہیں کرتا اور باوجودیکہ اسکا قومی تعصب راہ حق میں حائل ہے۔ مگر وہ خود بخود دل سے اسلامی اصول کا مقر ہوجاتا ہے۔ لیکن بایں ہمہ کیا وجہ ہے کہ یہ خیالات جو ایک قسم کے اسلام کے پرتو ہیں اور جو قوموں میں خود بخود پیدا ہوجاتے ہیں اور لوگوں کا اسپر عمل بھی ہوجاتا ہے اسکو کوئی پائداری و ثبات نہیں ہوتی اور

رفتہ رفتہ دو تین صدی کے بعد یا اس سے پہلے وہ محو ہو کر پرانے خیالات غالب آجاتے ہیں۔ چنانچہ ڈائزم جسکا ایک زمانہ میں اور ایک طبقہ میں پولینڈ، جرمنی، فرانس اور انگلستان کے اندر بہت زور و شور سے رواج تھا بلکہ انقلاب فرانس میں روشو کی رائے تھی کہ اسکو فرانس کا ملکی مذہب قرار دیا جائے۔ اسکے افراد کا پتہ نہیں۔ اسی طرح برہمو سماج کے خیالات نے بھی خود اپنی قوم میں ویسی عالمگیری نہیں پائی جو ان خیالات کا تقاضا تھا۔ اور سوامی دیانند کے خیالات جو انہوں نے اپنی معدوم شدہ ستیارتھ پرکاش میں ظاہر کئے تھے۔ وہ تو انکی زندگی کے ساتھ ہی ختم ہو گئے۔ اور اسکی جگہ ایک ایسے مذہبی خیالات نے لی جس نے مذاہب کی توہین کو اپنا خاص مقصد بنا لیا۔ تو اسکی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ مذہب ہی ایک ایسی چیز ہے جس کے اصول انسان کے خود بنانے سے نہیں بن سکتے اور جب انسان اپنے سلسلے کسی نوع خصوصاً اسلام کو پیش نظر رکھ کر ایک مذہبی خیالات کی ترتیب دیتا ہے تو عام انسانوں کا دل اس سے مطمئن نہیں ہوتا۔ ان کا دل فوراً یہ سوال کرتا ہے کہ تمہارے اس قول کی سند کیا ہے اور تم کیوں کر ہمکو اس زندگی کے انجام کی خبر دے سکتے ہو جو ہماری نظر سے مستور ہے۔ جبکہ تم بھی ہماری طرح انسان ہو۔ کیا تم کو یہ باتیں القا ہوتی ہیں۔ اسوقت یا تو ایسا شخص ایک ایسی حالت کا دعویٰ کرے جو عام انسانی فطرت سے علیحدہ و بالاتر ہو یا پھر اپنے قول کی سند کسی ایسی کتاب سے پیش کرے جس کے معتقد اسکے سننے والے ہوں۔ مختصر یہ کہ انسان کبھی ایسے شخص کے کلام کا قائل نہیں ہو سکتا جسکے متعلق اسکو یقین نہ ہو جائے کہ اس انسان کے تعلقات عالم غیب سے ہیں۔ یعنے جو کچھ وہ کہتا ہے اپنی طرف سے نہیں کہتا۔ جب تک یہ دعویٰ انسان نہ کریگا۔ اور اس دعوے کا یقین نہ دلائیگا اسکی تدابیر و اصول عام معاشرت، قوانین دنیاوی میں قابل پذیرائی ہوں تو ہوں مذہب میں انکی کوئی تدبیر چل نہیں سکتی۔ پس ایک جدید مذہبی خیالات کے شیوع کیلئے یا تو اس شخص کو خود اپنے مذہبی نوشتوں کی بلندی ثابت کرنا پڑے گی یا وہ خود نبی بنکر اپنی نبوت کا ثبوت دیگا۔ مگر یہ دونوں صورتیں پیدا کرنی مشکل ہیں۔ اسلئے آخری نتیجہ یہ نکلے گا کہ مذہب کے ایسے اصول جو انسان کی طبیعت کیلئے باعث تسکین ہوں، وہی شخص تلقین کر سکتا ہے جو الہام کا مدعی ہو۔ اور یہ ضرورت ہمکو ایسے نبی کی جستجو پر مجبور کرتی ہے جسکا دعوے نبوت ہر طرح ثابت بھی ہو اور جسکا قول ایسا ہو، اسکو ماننے بغیر انسانی فطرت کا چارہ نہ ہو۔ پس اگر اسلامی اصول ایسے ہیں جو انسانی فطرت کو مطمئن کرنے والے ہیں، تو سب سے پہلے ہم اسکی جانچ کریں۔ اور پھر ہم اس نبی سے قوموں کو روشناس کرائیں۔ اور جب تک یہ صورت پیدا نہ ہوگی مذہب کی وہ ازلی صورت جسکا نام اسلام ہے قوموں میں انکے پرانے خیالات کی جگہ نہ لیگی۔ اسلام کیوں دوسرے مذاہب سے مرجح ہے۔ اسکی تفصیل یہ ہے۔

۱۔ اسلام ہی وہ مذہب ہے جسنے انسان پرستی یا عناصر پرستی کو دنیا سے مٹایا۔

۲۔ اسلام ہی وہ مذہب ہے جسنے انسان کو دوسرے انسان کے برابر تسلیم کیا۔

۳۔ اسلام ہی وہ مذہب ہے جس کا خدا سارے جہان کا مالک ہے اور اس کے سب بندے ہیں اور سب نجات کے حقدار۔

۴۔ اسلام ہی وہ مذہب ہے جو کسی مذہبی ریفارمر یا مرشد کی توہین نہیں کرتا اور سب کو قابل احترام سمجھتا ہے۔

۵۔ اسلام ہی وہ مذہب ہے جسنے فلاح دارین کو سعی ذاتی پر مبنی کیا ہے اور خدا و بندے کے درمیان کوئی وسیلہ یا واسطہ قائم نہیں کیا۔

۶۔ اسلام ہی وہ مذہب ہے جسنے ایک شخص کے نفس کی حفاظت کو ویسا ہی ضروری سمجھا ہے جیسا دوسرے ابنائے جنس کی حفاظت نفس کو اور خود کشی (نفس کشی) کو ویسا ہی برا جانا ہے جیسے دوسرے انسان پر ظلم کو۔

۷۔ اسلام ہی وہ مذہب ہے جسنے دولت کی تقسیم و برابری کی تعلیم زکوٰۃ کو فرض کرنے اور سود و قمار بازی کو حرام کرنے سے دی۔

۸۔ اسلام ہی وہ مذہب ہے جسنے سب سے پہلے ام الخبائث والجرائم یعنی شراب کو قطعی حرام کیا۔

۹۔ اسلام ہی وہ مذہب ہے جسنے سب سے پہلے غلاموں کی آزادی کی صورتیں پیدا کیں۔

۱۰۔ اسلام ہی وہ مذہب ہے جسنے انسان کے اس فطری جذبہ یعنی "خوف و ہراس موت"، کو جس نے درحقیقت اسکو عبدیت و مذہبیت کی عادت سکھائی، سب سے بہتر طریقہ سے زائل کیا۔

۱۱۔ اسلام ہی وہ مذہب ہے جسنے سب سے پہلے عورتوں کے حقوق کو تسلیم کیا۔

مگر یہ وہ اسلام ہے جسکا ذمہ دار قرآن ہے۔ ورنہ اسلام کی اگر دوسری صورت دیکھنا چاہو تو شرح عقاید نسفی، مواہب لدنیہ، رح وقایہ۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی کی "مالابد منہ" اور پھر صوفیہ کے ملفوظات پڑھو۔ مسلمان سنت سنت بست پکارا کرتے ں اور ایک غیر مقلد کا بڑا فخر یہ ہوا کرتا ہے کہ ہر چیز کی سند کتاب و سنت سے ڈھونڈھتا ہے۔ دوسروں کی تو نہیں جانتا مگر خود میرا دل جانتا ہے کہ "سنن" نے میری کیا حالت کر دی تھی واقعہ یہ ہے کہ حدیثیں پڑھنے کے بعد خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ عظمت میرے سے اٹھ گئی جو حدیث پڑھنے سے پہلے تھی۔ اور اگر قرآن میں آپکا لقب رحمۃ للعالمین نہ پاتا یا میں تمام ایسی حدیثوں کو بلا بحث و نقید ٹھکرا نہ دیتا تو میرا اسلام پر قائم رہنا مشکل ہو جاتا۔ کیونکہ اسلام کا جسم اگر اقرار توحید ہے تو اقرار نبوت محمدی روح ہے۔ قاضی علی ن جاد کر دی جو ایک وقت میں شیخ الاسلام قسطنطنیہ کے باش کاتب رہ چکے تھے اور جو مدرسۃ القضاۃ قسطنطنیہ کے سند یافتہ اضل ہیں جب میں نے انسے عراق میں سبقاً سبقاً بخاری و مسلم کا درس لیا۔ اور انکے ساتھ بطور خود دوسری کتابیں مثلاً ابن ماجہ ابوداؤد کا مطالعہ کیا تو اس شوق میں موطا کا ترجمہ بھی انگریزی میں کر ڈالا تو میں سمجھا کہ میری زندگی کی بڑی آرزو پوری ہوئی اور اب ں ہر مولوی سے قوت آزمائی کر سکتا ہوں مگر افسوس کہ انمیں سے کوئی ایک بھی مجکو ہضم نہ ہو سکی۔ اور بعض گندگیوں سے میرے خیالات ں ایسی متلی پیدا ہوئی کہ میں نے وہ سب ساری کی ساری قے کر ڈالی اور موطا کا انگریزی ترجمہ تو اپنے ہاتھ سے پھاڑ ڈالا اس ستفراغ کے بعد جب میں نے قرآن کا بدرقہ چکھا تو مجھے ایسی روحانی صحت حاصل ہوئی کہ میں خدا کا شکر ادا نہیں کر سکتا۔ سلمانوں کو شاید اسکا علم نہو کہ خود سنن کی ابتدا اسلام میں کیونکر ہوئی۔ اس ساری قیل و قال کو اس مجموعۂ عجائبات کو چھوڑ کر جو عسقلانی لی تقریب التہذیب یا نواب صدیق حسن کی خرافات میں پائے جاتے ہیں اور جو ایک نسانی کو مخبوط الحواس کرنے کیلئے بہت کافی ہیں۔ میری خود اپنی ایک تعبیوری ہے جو میں پیش کرتا ہوں۔ سنت جسکی جمع سنن ہے۔ خالص عبرانی لفظ ہے۔ اور یہ لفظ دراصل "مشنا" (Mishna) کا معرب ہے۔ یہودیوں نے اپنی ادبار کے زمانے میں جہاں ایک ظلم یہ کی کہ صحف وریت کو مسخ کر ڈالا، وہاں توریت کا بدل "مشنا"، بھی ایجاد کیا۔ یہ کیا تھا۔ انبیائے بنی اسرائیل (موسیٰ) کیطرف سے ہر قسم کے

ہفوات وہذیانات کا مجموعہ جو درحقیقت ربیوں کی نوایجاد کردہ حدیثیں تھیں۔ اور مسیح سے چند سال پہلے یہود کا عملدرآمد اسی "مُشنا" پر رہ گیا تھا۔ یہی وہ اصل نمونہ ہے جسپر مسلمانونکو اپنے یہاں "سنن" پیدا کرنے کا شوق ہوا۔ اور پھر تو اس میدان میں وہ جولانیاں کی گئیں کہ الامان الحفیظ۔ تین راوی یعنے حضرات ابن عباس و انس و ابوہریرہ تو اس بلا غضب کے ہیں کہ جنسے کوئی ایسی حدیث نہیں چھوٹی جو پیغمبر کی خلوت وجلوت کے کسی کام کو ظاہر نہ کرتی ہو۔ یہ اور بات ہے کہ انمیں سے ایک صاحب آنحضرت کی وفات کے وقت بالکل صغیر سن بچے تھے اور دوسرے ایک نو عمر اور ناتجربہ کار غلام اور تیسرے کا اسلام آنحضرت کی وفات سے کے سے دو تین سال قبل کا تھا۔ اگر آنحضرت بیت الخلا تشریف لیجاتے تو ابن عباس (بچے ہی تو تھے) کوٹھے پر چڑھکے جھانکتے کہ آنحضرت کا منہ قبلہ کی طرف ہے یا پیٹھ۔ اگر آنحضرت خلوت میں جاتے ہیں تو حضرت انس کو یہ خبر ہو جاتی ہے کہ آپ کتنی بیویوں سے اور کے بار ہمبستر ہوئے۔ اور اگر حضرت ابوہریرہ کی تمام قولی حدیثیں جمع کی جائیں خصوصًا وہ لمبی چوڑی حدیثیں جن کا سر یہود کی تالمود میں ہے اور جنکا پیرا اوہام جاہلیت ہیں اور وہ تمام آثار قیامت جو وقت ومقام کے تعین کے ساتھ ابوہریرہ نے خود اپنی وفات سے پہلے اپنی آنکھوں سے فتوحات اسلام میں دیکھ لیا تھا، ان سب کو اگر ساڑھے تین سال کے گھنٹوں سے تقسیم کی جائیں تو بھی ایک چوتھائی حدیث باقی بچ رہتی ہیں۔ گویا آنحضرت ابوہریرہ کو بے تکان چوبیس گھنٹے حدیثیں سنایا کرتے تھے۔ اور انکا حافظہ بھی اس بلا کا تھا کہ وہ ایک لفظ بھی نہیں بھولے کیونکہ آنحضرت نے انکے دماغ کو اس قوت سے بھر دیا تھا۔ میں نے عنوان مذہب وقومیت کے حاشیہ میں ایک جوش عاقلانہ کے ماتحت ایک فہرست ان احکام وعقاید کی دیکر جو اسلام سے باہر فقہ وحدیث میں یہ کہدیا تھا کہ یہ سب لغو ہیں۔ میری اس جرأت اور بدعت پر مولینا نیاز بھی چیخ اٹھے۔ مگر میں کیا کروں۔ قرآن کہتا ہے کہ کفار کی عورتیں اگر گرفتار ہو جائیں اور تم انمیں سے کسی سے نکاح کرنا چاہو تو انکے لوگوں سے اذن لیکر نکاح کر سکتے ہو بشرطیکہ وہ محدود تعداد میں ہوں۔ مگر حدیث وفقہ کا قول ہے کہ جسقدر تمہارے قبضہ میں آئیں ان سب کو رکھو اور بلا اکراہ وتکلف و بلا نکاح انسے متمتع ہو۔ حدیث نے قرآن کے خلاف ایسا کیوں کہا۔ اسلئے نہیں کہ یہ قول آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے حاشا وکلا۔ بلکہ صرف اسلئے اور صرف اسلئے کہ یہودیوں کے ربیوں نے "مُشنا" میں جنٹائل اور دشمنان بنی اسرائیل کی عورتوں سے یہ سلوک روا رکھنے کی اجازت دی تھی (دیکھو انسائیکلو پیڈیا جیوز مضمون ( ) قرآن نے کہیں بھولے سے بھی ساحرہ کا ذکر نہیں کیا لیکن اصح الکتاب بعد کلام اللہ یعنی الموطا امام مالک میں ہے کہ ساحرہ سنگسار کیجائے، اسلئے نہیں کہ نعوذ باللہ ایسا وحشیانہ اور جاہلانہ حکم آنحضرت کا ہے۔ بلکہ صرف اس لئے کہ کتاب توریت استثنا میں مرقوم ہے۔ "اور تو ساحرہ کو جینے نہ دے۔ تو اسکو سنگسار کر ڈال" اور جسپر یورپ اٹھارہ صدی تک عامل رہا اور اب شرماتا اور کف افسوس ملتا ہے۔ اس قسم کی احادیث میں غالبًا سب سے زیادہ حیرت فگن وہ حدیث ہے جو جناب عایشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے نام سے صحیحین میں پائی جاتی ہے۔ یا ابن ماجہ میں (مجھے ٹھیک یاد نہیں رہا) یعنے اگر ایک عورت کسی نامحرم کو محرم بنانا چاہے تو اسکی ترکیب یہ ہے کہ عورت اپنی چھاتیوں کا دودھ

اس مرد کو پلا دے۔ اسکے بعد وہ نامحرم اپنا بھائی اور لڑکا ہو جاتا ہے۔ مگر میں اس حدیث میں وہی یہودیوں کی فقہ پرستی یعنی "لیگلزم" (Legalism) اور ظاہر پرستی "فارملزم" (Formalism) کی بو پاتا ہوں یہود یا فقہا کو اس سے مطلب نہیں کہ کسی حکم کی غایت و علت کیا ہے۔ اور اس کے کرنے یا نہ کرنے سے اخلاق پر کیا اثر پڑتا ہے وہ قانونی لوگ صرف لفظوں کے مرد میدان تھے۔ مذہب کی اسپرٹ سے انکو واسطہ نہ تھا۔ چنانچہ ہمارے فقہا کے وہ حیل شرعی لوگوں کو معلوم ہونگے شلاً سود حرام ہے۔ کیوں حرام ہے۔ اس سے فقہا کو مطلب نہیں۔ حرام ہے اسلئے کہ قرآن نے حرام کیا ہے۔ اور فقہا کے نزدیک سود کی تعریف یہ ہے کہ ایک جنس کا بدل اسی جنس سے اگر کم و برابر ہو تو وہ سود ہے۔ جیسے ہم اگر دس روپیہ نقد کسی کو دیں اور اس سے کہیں کہ تو اس کے بدلے ہمکو گیارہ روپیہ آج یا کل یا برس پیچھے دیدے تو وہ سود ہے۔ لیکن اگر سود کھانے کی ضرورت ہو تو اسکی بڑی آسان ترکیب ہے۔ سانپ بھی مرے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ یعنی بجائے دس روپیہ نقد دینے کے دس روپیہ کا نوٹ دیدے اور قرض لینے والے سے کہدے کہ بھائی ہم تو اس نوٹ کو گیارہ روپیہ میں بیچتے ہیں، جنس بدل گئی اور بیع کی صورت پیدا ہو گئی۔ لیجئے بالکل مباح اور جائز۔ اسی سلسلہ میں مجھے فقہا کا وہ اصول یاد پڑا کہ دار الحرب کے کفار سے سود لینا جائز ہے۔ اسلئے کہ یہود کی عادت تھی کہ وہ غیر قوموں سے عدل نہیں کرتے تھے اور انکا قول تھا کہ غیر یہود کے مال کو غصب کر لینا انکی شریعت میں جائز ہے۔ چنانچہ انکے اس مشہور فعل بد کا ذکر قرآن شریف میں بھی ہے اور عرب کے امیوں کی امانت اس خیال سے کھا جاتے تھے کہ وہ یہود نہیں ہیں بلکہ امی ہیں فقہا نے اس مسئلہ سے فائدہ اور آنکھ بند کر کے وہی یہودی طریقہ مسلمانوں کے لئے مباح کر دیا اور جس طرح انہیں غیر یہود سے سود لینا جائز ہے اسی طرح مسلمانوں میں بھی جائز ہو گیا۔ اسی طرح اگر تمکو قسم قسم کی عورتوں سے شوق ہو اور اس شوق کو مذہب کے جواز کے ساتھ پورا کرنا چاہو تو فقہا کی ترکیب پر عمل کرو۔ اپنی چار بیویوں میں سے ایک کو وقتاً فوقتاً طلاق دیکر بدلتے رہا۔ یہی ترکیب حضرت امام حسین بھی کرتے تھے اور سنتا ہوں کہ دیوبند کے ایک جید عالم جو ایک بڑی ریاست کے صدارت مذہب پر متمکن ہیں انہوں نے اپنے کو اکو یہی شرعی عیاشی کا طریقہ سمجھایا ہے۔ اور سلطان ابن سعود بھی اسی پر عامل ہے فقہا کی بلا جانے کہ نکاح اور زنا میں کیا فرق ہے۔ اور نکاح کی غایت کیا ہے۔ انکے نزدیک نکاح اسکو کہتے ہیں جسمیں مہر و ایجاب و قبول ہو۔ اسلئے رنڈی بازی بھی جائز اور مباح ہو گئی۔ اسی قبیل کے وہ فقہی اجتہادات ہیں جس سے عالم اسلام گونج رہا ہے اور جسکو مسلمان کا بچہ بچہ جانتا ہے۔ یعنی زید کا پائجامہ اونٹنگا ہے یا عمر کی داڑھی خشخشی ہے تو اسکا یہ فعل حلال ہے یا حرام یا اگر بکر چار انگل سے بڑی مسواک استعمال کرتا ہے یا جمائی لیتے وقت اپنے منہ پر ہاتھ نہیں رکھتا تو اسکا یہ فعل خلاف سنت ہے یا نہیں؟[1]

---

[1] تاریخ تدوین حدیث میں مسلمان کبھی اس نکتہ کو فراموش نہ کریں کہ حدیثوں کے جمع کرنیکا زمانہ تقریباً دو سو برس بعد ہجرت کا ہے جبکہ صحابہ تابعین اور تبع تابعین میں سے دنیا میں کوئی باقی نہ رہ گئے تھے۔ اسلئے عام طور سے جو لوگوں میں مشہور ہے کہ امام بخاری نے حدیثوں کی اسناد کی

آخر یہ زبردست خلیج جو قرآن کے درمیان حائل ہوگئی ہے اور جس میں بہت سے نفوس ذکیہ غرقاب ہو چکے ہیں کیونکر دور ہوگی یہ مانا کہ جب چھاپہ خانہ کا رواج دنیا میں نہ ہوا تھا تو مسلمانوں کے مذہبی پیشوا قرآن کے ساتھ وہی سلوک کرتے تھے جو یہود و عیسائیوں کے علما اپنی بائبل سے کرتے تھے کہ وہ عوام کو پڑھنے نہ دیتے تھے۔ اور مسلمانوں نے تو پاکی اور ناپاکی کی قید میں قرآن کا ایسا ناطقہ بند کر دیا تھا۔ اور اسکے ترجمہ کرنے پر اس درجہ مخالف تھے کہ بہت ممکن ہے کہ بدنصیب مسلمانوں کو خصوصاً عجم کے لوگوں کو جہاں حدیث و فقہ کا زیادہ چرچا ہوا ہے۔ قرآن سے بالکل محروم رہنا پڑا ہو اور انکو اپنے مذہب کی بنیاد اسپر رکھنی پڑی ہو جو فقہا کا قیاس و اجتہاد تھا۔ مگر دنیا اب بدل گئی۔ کیا اب بھی دیوبند کے مولوی چھاپہ خانوں کو شیطان کا گھر کہکر حرام کریں گے اور مسلمانوں کے ہاتھ سے قرآن چھین لیں گے۔ نہیں ہرگز نہیں۔ پھر ہم قرآن کیطرف رجوع کیوں نہیں ہوتے اور لوگوں کو اسکی طرف کیوں نہیں بلاتے اسی ایک خیال نے مجھے اس کتاب کے لکھنے پر آمادہ کیا۔

اب میں اس سلسلہ مضمون کو ختم کرتا ہوں اور اس افسوس کے ساتھ کہ یہ اختتام بجائے دعا و کلمات خیر کے کلمات تلخ پر ہوتا ہے مگر میری نیک نیتی کی دلیل میری خود یہ کتاب ہے۔ اور اس سلسلے میں اور کتابیں جو میں لکھ رہا ہوں یا لکھونگا۔ وہ سب اسی دعا و نیت سے ہیں کہ مسلمانوں اور خصوصاً تعلیمیافتہ نوجوانوں اور غیر مذاہب کے لوگوں کو صرف قرآن کی طرف دعوت دیجائے۔ ہر چند یہ ضرور ہے کہ انکو ہمارے پیغمبر کے حالات جاننے کے لئے ان کتابوں کے مطالعہ کی بھی ضرورت پڑے گی جن سے میں خود اکتا گیا ہوں۔ مگر میں انکو یہی دوستانہ مشورہ دونگا کہ وہ اسکو مذہبی نگاہ سے کبھی نہ دیکھیں اور جس طرح طبری و واقدی سے انکو بہت سی مفید معلومات عرب و پیغمبر و خلافت کی معلوم ہو سکتی ہیں اسی طرح بخاری و مسلم کے رطب و یابس سے۔ انکو اختیار ہے کہ بلا ملامت مذہب وہ روایات کی تصدیق کریں یا تکذیب یا تنقید بہر صورت ایسی باتیں جو آنحضرت کی شان رسالت کے منافی نظر آئیں۔ اسپر انکی طرح میرا بھی صاد رہے گا۔ اور وہ زہریلا مواد جو زنادقہ و دشمنان عقل و دین نے کتب حدیث و سیر میں بھر دیا ہے۔ وہ اسکو حقارت سے دیکھ دیکھ کر جلد جلد اس سے گذر جائیں۔ اور اپنے دین و ایمان کو اس ایک

(بقیہ نوٹ صفحہ ۴۰) تصدیق میں شرق سے غرب تک چھان ڈالا۔ وہ کم سے کم میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس سفر کے کرنے کے بعد ان کو کیسے اطمینان ہو جاتا تھا کہ اسناد کا یہ سلسلہ جو صحابہ تک پہونچتا ہے بالکل صحیح ہے فرض کرو کہ انہوں نے کوفہ کی جامع میں ایک فقیہ کو ممبر پر یہ کہتے ہوئے سنا۔ حدثنا عن فلاں عن فلاں۔ تو اگر یہ فلاں و فلاں ایک ہی وقت و زمانے میں پائے جائیں تب تو انکی تصدیق بالکل آسان ہے لیکن اگر یہ مختلف زمانوں میں تھے اور جو زمانہ گذر گیا ہے تو اس کی تصدیق کی کیا صورت تھی۔ حدیثوں کے متعلق سب سے بہتر معیار تصدیق کا درایت ہو سکتا ہے۔ اور میرے نزدیک بخاری کی آدھی سے زیادہ حدیث درایت سے لغو ہو جاتی ہیں۔ یا پھر حدیثوں کے صحیح و غیر صحیح ہونے کا سب سے بہتر معیار یہ ہے کہ ان حدیثوں کا موازنہ قرآن شریف سے کیا جائے۔ اور جو قرآنی آیات کی تصدیق نہ کریں۔ ان کو رد کر دینا چاہئے۔ (مقبول احمد)

الہامی کتاب پر قایم و استوار رکھیں جسکا نام قرآن ہے۔ بہت ممکن ہے کہ مجھے خود خدا یہ توفیق دے کہ میں "تقریب القرآن" میں قرآن کی خصوصیات۔ اسکی ترتیب و نزول کی تاریخ۔ اسکے الہامی ہونے کے معقولی و منقولی ثبوت اور آیات دونوں کا تجزیہ تاریخی حیثیت سے کروں اور اگر اس سے زیادہ مجھے توفیق و فرصت ہو تو توحید و نبوت و قصص و احکام کی آیتیں علیحدہ علیحدہ جمع کرکے اسکی مختصر تشریح کروں۔ جس سے ہر عامی مسلم و غیر مسلم کو فہم قرآن میں مدد ملے۔ بہرحال میں لکھوں یا کوئی اور لکھے میری ہمیشہ یہ آرزو رہے گی کہ کاش مسلمان قرآن کی وہ قدر کریں جو انکا حق ہے۔ اور جسکو فقہا و محدثین نے بالکل زبردستی پس پشت ڈالدیا ہے

سید مقبول احمد (بی اے)

(نگار) ہمارے عزیز دوست سید مقبول احمد بی۔ اے کا مضمون "فلسفۂ مذہب" اس ماہ کی اشاعت کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے اور ہمکو اسکے ختم ہونے پر ویسا ہی افسوس ہے جیسے عرصہ تک کسی ہمنوا دوست کی صحبت نصیب ہونے کے بعد دفعۃً اس سے جدائی ہو جائے۔ اول اول جب اسکا سلسلہ شروع ہوا تو بعض حضرات نے پسند نہیں کیا، لیکن رفتہ رفتہ خود انکو اسمیں سامان بصیرت نظر آنے لگا اور اب حلقۂ نگار میں شاید ہی کوئی ایسا شخص ہو جو اس مضمون کی اہمیت کا معترف نہو۔

آغاز اجرا سے لیکر تا ایندم نگار اس امر کی تبلیغ کرتا رہا ہے کہ موجودہ اسلام حقیقی اسلام نہیں ہے، اور وہ علمبرداران مذہب جو "باندازۂ عبائے دراز" گمراہیاں بھی اتنی ہی وسیع رکھتے ہیں اس قابل نہیں کہ انکو رہنما و قاید سمجھکر ملک اور قوم کا مستقبل انکے ہاتھ میں چھوڑ دیا جائے اور یہ کہ اگر مذہب کو سمجھنا ہے تو صرف کلام مجید کا مطالعہ کیا جائے اور احادیث کو بالکل پس پشت ڈالدیا جائے کیونکہ سب سے بڑا مہلک حربہ، علماء مذہب کے ہاتھ میں یہی فن حدیث ہے جس کا وہ استعمال کر رہے ہیں اور جسنے انسانیت و اخلاق کے چہرہ کو بالکل مجروح و داغدار کر دیا ہے۔ میری اس تبلیغ نے مجھے کس قدر بدنام کیا، کتنے اصحاب کو مجھ سے بدظن کر دیا، نگار کی اشاعت پر اسکا کیا اثر ہوا۔ انکا ذکر میں نہ کرونگا کیونکہ یہ سب کچھ "اندیشہ" کے مطابق تھا، لیکن اسی کے ساتھ جو خوش کن تجربہ خلاف توقع مجھے ہوا اسکا اظہار ضرور ہے اور وہ یہ کہ پبلک کے سامنے اگر بار بار کسی صداقت کا اظہار کیا جائے تو نتیجہ ضرور پیدا ہوتا ہے، چنانچہ آج بحمد اللہ "حلقۂ نگار" کی یہ حالت ہے کہ اگر کبھی میرے قلم سے کوئی لفظ خلاف جرأت مذہب کے باب میں نکل جاتا ہے تو مجھ سے مطالبہ کیا جاتا ہے۔ غالباً یہ فخر صرف نگار کو حاصل ہے کہ اس کے مطالعہ کرنے والے تقریباً سب روشن خیال ہیں اور مذہب کی وہ تنگ نظری انمیں نہیں پائی جاتی جو عام طور پر لوگوں میں نظر آتی ہے۔

میری فطرت شروع ہی سے ایسی واقع ہوئی ہے کہ جب تک کسی بات کو سمجھ نہ لوں، تسلیم نہیں کرتا۔ اور بغیر علت کا مطالعہ کئے ہوئے معلول پر غور کرنا پسند نہیں کرتا۔ جب درس نظامی کی تکمیل کے سلسلہ میں اوج میرے نزدیک

بدترین نصاب تعلیم ہے) حدیث پڑھنے کا اتفاق ہوتو ہدایۂ اخیرین کے ساتھ ساتھ "مشکوٰۃ" کا بھی درس شروع ہوا۔

مدرسہ کے مدرس اول مولانا نور محمد صاحب مرحوم فریضۂ حج ادا کرنے چلے گئے تھے اور عارضی طور پر بجائے انکے مولانا محمد حسین خانصاحب ساکن کوٹ ضلع فتحپور جو دیوبند کے فاضل تھے متعین کئے گئے ہیں انکے "عبوساً قمطریرا" چہرہ کو دیکھکر پہلے ہی ڈر گیا تھا کہ سوائے چھلکے کے مغز کا کہیں پتہ نہیں ہے۔ لیکن خیر قہراً جبراً درس میں شریک ہوا اور چونکہ میں سارے درجہ میں سب سے زیادہ حجتی اور سرکش طالب علم سمجھا جاتا تھا اس لئے مولانا نے اپنے پندار فضل وکمال کے بنا پر مجھی کو "قاری" بننے کا حکم دیا تاکہ مجھ سے زیادہ تر سوال وجواب کی نوبت آئے ہرچند میں قاری بننا پسند نہیں کرتا تھا کیونکہ اس طرح میرے دماغ کو بجائے مفہوم ومعنی کے الفاظ اور صحت اعراب پر زیادہ غور کرنا پڑتا تھا لیکن مینے تعمیل حکم کی۔ اتفاق سے انکے درس کا پہلا دن، میری قرأت کا انکے سامنے پہلا موقعہ، اور حدیث آگئی وہ جسمیں دوزخ کی سانس چھوڑنے اور کھینچنے کی وجہ سے دنیا میں سردی اور گرمی پیدا ہونے کا ذکر ہے۔ میں اس سے قبل رات کے مطالعہ ہی سے اس حدیث کی لغویت کو سمجھ چکا تھا، لیکن میں نے اسے پڑھا اور پڑھنے کے بعد خاموش ہو گیا۔ مولانا نے فرمایا "ترجمہ کرو" مینے عرض کیا "اسکا ترجمہ حدیث سمجھکر تو میں کر نہیں سکتا، آپ ہی ارشاد فرمائیے میری سمجھ سے باہر ہے کہ دنیا کی سردی وگرمی دوزخ کی سانس چھوڑنے اور کھینچنے پر کسطرح منحصر ہے اور رسول اللہ کو کیا ضرورت تھی کہ وہ کسی ایسے مسئلہ پر گفتگو فرماتے جو انکے دایرۂ مقصد وتبلیغ سے الگ تھا۔ البتہ اگر اس حدیث کا کوئی اور مفہوم غامض ایسا ہو جو الفاظ سے متبادر نہیں ہے تو وہ بیان فرمائیے"۔

مولانا بدقسمتی سے خشک دماغ مولوی ہونے کے ساتھ ہی پٹھان بھی تھے اور نہایت ہی سخت قسم کے صفرادی مزاج سریع الاشتعال انسان تھے۔ انہیں اس تنقید کے سننے کی تاب کہاں تھی۔ میں طالب علم تھا اور کمسن، وہ استاد تھے اور غضبناک، بید انکے پہلو میں تھا اور میں انکی دراز دستی سے بالکل قریب۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انکو اپنی جگہ چھوڑنا پڑی اور مجھکو اپنی۔ یہ منظر بھی دیکھنے کے قابل تھا کہ ایک فاضل محدث برہنہ پا برہنہ سر ایک خایف وترساں طالب علم کے تعاقب میں خونخوار درندہ کی طرح دوڑا جا رہا تھا، اور دنیا قہقہہ لگا رہی تھی۔ اس کے کچھ زمانہ کے بعد مولینا عین القضاۃ مرحوم کی درسگاہ میں جب ہجرت کرنے سے قبل وہ فرنگی محل کے پل کے قریب بالاخانہ میں رہتے تھے، بخاری کے درس میں شریک ہوا، لیکن بالکل والد مرحوم کے اصرار سے مجبور ہوکر ورنہ میں احادیث کی کتابوں سے یکسر بیزار ہو چکا تھا یہاں میں نے بہت سلامت روی سے اپنا وقت صرف کیا اور کوئی نزاع پیدا نہیں ہونے دیا۔ جسکا سبب یہ تھا کہ مولانا عین القضاۃ مرحوم کی عزت انکے اخلاق کیوجہ سے میرے دل میں بہت زیادہ تھی اور میں نہیں چاہتا تھا کہ انکو میری طرف سے کوئی صدمہ پہونچے، علاوہ اسکے میں حدیث کو حدیث سمجھکر پڑھتا بھی نہ تھا، بلکہ صرف اس خیال سے کہ اچھا ہے اس بہانہ سے عربی کی اتنی ضخیم کتاب نگاہ سے گذر جائیگی اور عربی الفاظ کا کافی ذخیرہ دماغ میں محفوظ ہو جائیگا۔

ایک دن البتہ مولانا شاہ عبدالنعیم مرحوم کے اس استفسار پر کہ "آجکل کیا پڑھ رہے ہو" بیساختہ میرے منھ سے نکل گیا کہ "ترک اسلام کا درس لے رہا ہوں"۔ مولانا مرحوم اپنے علم و فضل، اپنے زہد و ورع اور اپنے اخلاق و تقدس کیوجہ سے فرنگی محل کے دور آخر کی ایک بیمثل یادگار تھے اور ہر چند میں نے انکو اسوقت دیکھا جبکہ وہ بستر مرگ پر اپنی عمر کی اخیری ساعتیں صبر و تحمل کے ساتھ بسر کر رہے تھے، لیکن چونکہ انکے فرط التفات نے مجھے بہت زیادہ گستاخ بنا دیا تھا اس لئے وہ یہ سنکر مسکرانے لگے اور بولے "میں نہیں سمجھا" میں نے عرض کیا "کہ بخاری کے درس میں شریک ہوں اور اسلام سے بیزار ہوتا جاتا ہوں۔ والد نہیں مانتے، آپ ہی ان سے کہئے کہ کوئی اور مفید شغلہ میرے لئے تجویز کریں"۔ یہ سنکر انہوں نے کچھ تامل فرمایا اور بولے کہ "واقعی تمہاری عمر ابھی[1] اس قابل نہ تھی۔ اچھا میں کہونگا"۔

اس بیان سے مدعا یہ ہے کہ مذہب اسلام کے سارے لٹریچر میں علاوہ قرآن کے جو کچھ بھی ہے، وہ اگر غیر مسلم ہونے کے لحاظ سے دیکھا جائے، تو نقایص سے خالی نہیں نظر آتا۔ اور بغیر اصول درایت استعمال کئے ہوئے انکی صحت کو تسلیم کر لینا حقیقتاً اسلام کی توہین کرنا ہے۔ کلام مجید کے بعد اسلام کا سب سے زیادہ مہتم بالشان لٹریچر حدیث ہے اور اسمیں کلام نہیں کہ فن حدیث اتنا وسیع و زبردست فن ہے کہ مشکل سے کوئی دوسرا مذہب اسکی مثال پیش کر سکتا ہے، لیکن اس فن کا وسیع ہو جانا ہی دلیل اس امر کی ہے کہ اسوقت بھی لوگ حدیث کی صحت کی طرف سے مطمئن نہ تھے اور انکو اسکی جانچ میں کسقدر زحمتیں اٹھانا پڑتی تھیں۔ چنانچہ ایک فن مخصوص "معرفت الرجال" ہی احادیث کے جانچنے کیلئے قایم ہو گیا اور اسکی بعض مشہور کتابیں مثلاً طبقات ابن سعد، طبقات الحفاظ علامہ ذہبی کی، نسائی کی کتاب الضعفاء علامہ ابن حجر کی الاصابہ فی تمیز الصحابہ اور ابن اثیر کی اسد الغابہ، وہ ہیں جن سے ہر اہل علم واقف ہے۔ اسی کیساتھ حدیثوں کی تقسیم کر کے انکے اقسام مقرر کئے گئے اور صحیح، حسن، ضعیف۔ مدرج، متروک، موضوع۔ مرفوع، موقوف مقطوع۔ مسند، مسلسل۔ عالی۔ متصل، منقطع، مرسل، معنعن، مبہم۔ متواتر، مشہور، عزیز، آحاد، غریب وغیرہ بہت سے نام تنقید کے مختلف پہلوؤں کے اعتبار سے رکھے گئے اور پھر ترتیب کے لحاظ سے کتابوں کی بھی تقسیمیں کی گئیں اور اس طرح چند در چند علوم تنقیدی کی بنیاد پڑ گئی۔

سنت اس طریق عمل کو کہتے ہیں جو آبا و اجداد سے چلا آتا ہو۔ اور بعثت نبوی سے قبل بھی اہل عرب ایام جاہلیت میں اپنے اسلام کے طریق عمل کی پیروی کیا کرتے تھے، اور اسکا نام بھی انکے یہاں اتباع سنت تھا۔ جب اسلام کا ظہور

---

[1] میری عمر اسوقت مشکل سے پندرہ سال کی ہوگی۔ ممکن ہے بعض حضرات کو تعجب ہو، لیکن جو طالب علم ۹ سال کی عمر میں سکندر نامہ اور ابو الفضل پڑھکر فارغ ہو جائے اس سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ ۱۵ سال کی عمر میں درس نظامی کی تکمیل کر کے بخاری تک پہونچ جائے۔ میری تعلیم و تربیت کی عجیب و غریب داستان ہے، جسکا مینے لوگوں کے استفسار پر بھی کبھی اظہار نہیں کیا۔ اسوقت سلسلۂ کلام میں اسقدر ظاہر کرنا پڑا۔ نیازؔ

ہوا تو "اتباع سنت" کا وہی خیال جو عہد جاہلیت میں پایا جاتا تھا بدستور قایم رہا، لیکن اسکی صورت و نوعیت بدل گئی اور بجائے روایات اسلاف کے رسول اللہ کے طریق عمل اور انکے اسوۂ حسنہ کو سامنے رکھا گیا۔ جبتک رسول اللہ زندہ رہے لوگوں کو نہ کسی سے دریافت کرنے کی ضرورت تھی اور نہ جرح و تعدیل کی۔ آپکی زندگی سامنے تھی اور اسی پر عمل کرنا شعار اسلام اور اتباع سنت سمجھا جاتا تھا۔

جب رحلت نبوی کے بعد فتوحات اسلام وسیع ہوئے اور مختلف ملک و ملت کے لوگوں سے تبادلۂ خیال ہوا تو اس سلسلہ میں مسیحیت، یہودیت، زردشتیت اور بودھیت سب کا اثر مسلمانوں کے ذہن و خیال پر پڑا اور تمدنی زندگی کی تمام اُن ضروریات کے لئے جو غیر اقوام و ممالک کے لوگوں سے ملنے کے بعد بہت متنوع ہو گئی تھیں اسی "اصول سنۃ" کے لحاظ سے احادیث کی جستجو ہوئی کہ رسول اللہ یا صحابہ کا طرزِ عمل ان صورتوں میں کیا تھا، انکی کیا ہدایات تھیں اور انکے اقوال کیا تھے۔ اور جستجو کا نتیجہ یہ ہوا کہ وضع احادیث کی بنیاد قایم ہو گئی اور اسلام ایک ایسے فتنہ میں پڑ گیا جس سے آجتک اسکو خلاص نصیب نہیں ہوا۔

چونکہ وسعت تمدن کے ساتھ جماعتوں اور فرقوں کی بنیاد بھی پڑتی ہے اسلئے فتوحات کی وسعت کے ساتھ ساتھ مختلف گروہ مختلف اغراض و مقاصد کے پیدا ہو گئے اور انمیں سے ہر ایک نے اپنے اپنے ذوق اور فائدہ کے مطابق احادیث پیش کرنا شروع کردیں۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ احادیث نبوی میں امثال انجیل، اقوال ربین، خیالات یہود اور فلسفۂ یونان، سبھی کچھ نظر آتا ہے۔ جس کا اثر بعد کو اسلامی فقہ پر بھی پڑا، اور بہت سے احکام حلال و حرام، قواعد شریعت، اصول اعتقاد ایسے شامل ہو گئے جنھیں قرن اولیٰ کے اسلام سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ چنانچہ دوزخ جنت کے تفصیلی حالات، معاد کے بیانات، عذاب قبر و نکیرین کے فسانے، فرشتوں کے کارنامے، واقعۂ قیامت کے حالات، یہ سب نصاریٰ اور یہود وغیرہ سے لئے گئے ہیں اور اس نوع کی احادیث میں سے ایک بھی ایسی نہیں ہے جو واقعی رسول اللہ کی ہو۔ اسی طرح سیاسی اغراض کی بناء پر مختلف جماعتوں نے اپنے اپنے مفاد کیلئے بہت سی حدیثیں وضع کرائیں۔ اور دور بنی امیہ و بنی عباس اس خصوصیت کے لحاظ سے بہت ممتاز نظر آتا ہے۔ انمیں سے ہر جماعت نے ہزاروں حدیثیں اپنے مطلب کی وضع کرائیں جو آجتک تمام کتب معتبرۂ احادیث میں نظر آتی ہیں۔

اسی کے ساتھ ایک اور امر بھی پیش نظر رہنا چاہئے کہ احادیث جتنی بھی پائی جاتی ہیں (سوائے چند کے) وہ سب بالمعنی روایت کی گئی ہیں، یعنی سب سے پہلے جس شخص نے رسول اللہ سے کچھ سنا اسکا مفہوم اپنی زبان میں دوسرے سے بیان کیا، دوسرے نے اپنی زبان میں تیسرے سے کہا اور اسنے چوتھے سے یہانتک کہ آخری راوی تک رسول اللہ کا ارشاد خدا معلوم کتنی مختلف زبانوں اور کتنے مختلف اذہان و عقول کی کتر بیونت کے بعد پہنچا پھر جب ہمارا روز کا تجربہ ہے کہ ایک ہی دن میں ایک ہی واقعہ مختلف زبانوں سے ادا ہو کر کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے۔

تو کیونکر ممکن ہے کہ رسول اللہ کے ادا کئے ہوئے الفاظ کا مفہوم اتنے راویوں سے منتقل ہونے کے بعد صحیح رہا ہوگا۔ خدا معلوم رسول اللہ نے کس وقت کس حالت میں، کس لب و لہجہ کے ساتھ اور کس مصلحت و ضرورت سے کیا فرمایا اور اسے راوی اوّل نے بھی سمجھا یا نہیں، چہ جائیکہ بعد کے روایت کرنے والے۔

یہی سبب تھا کہ متقدمین صحابہ اور علی الخصوص حضرت عمر نے رسول اللہ سے احادیث روایت کرنے کو پسند نہیں کیا اور ہمیشہ آپ نے اس باب میں سختی سے کام لیا۔ اسمیں شک نہیں کہ ایک گروہ محدثین، فقہا اور صوفیین شافعیہ کا روایت بالمعنی کو ناجائز قرار دیتا ہے لیکن اس شرط کو اگر ضروری قرار دیا جاتا تو آج رسول اللہ کی صرف چند حدیثیں نظر آتیں، لوگوں نے اسکی پرواہ نہ کی اور صحابہ و تابعین برابر بالمعنی روایت کرتے تھے، جیسا کہ فتح المغیث میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے اور حسنؓ کا یہ قول کہ (لولا المعنی ما حدثنا یعنے اگر بالمعنی روایت کی اجازت نہوتی ہم کوئی حدیث بیان ہی نہ کرسکتے) اسکی کھلی ہوئی توثیق ہے۔

پھر جب احادیث کی روایتیں اکثر بالمعنی ہوئی ہیں اور روایت بالمعنی میں بہت زیادہ غلطی کا احتمال ہے تو صحت حدیث کا مدار صرف روایت پر نہیں ہوسکتا۔ علامہ عبدالقادر بغدادی خزانۃ الادب، سیوطی کے قول کو نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "ہکو نہیں معلوم کہ جو احادیث معتبر قرار دی گئی ہیں انکی صحت و عدم صحت دریافت کرنیکا کیا طریقہ اختیار کیا گیا۔ حدیثوں کی جو تقسیم ہے وہ بلحاظ اسناد راویوں کی ہے نہ بلحاظ درایت"

اسی لئے علماء حدیث نے چند اصول درایت کے وضع کئے اور ہمارے نزدیک راویوں کے اسناد سے زیادہ ان اصول پر لحاظ کرنا چاہئے۔ اگر کوئی حدیث ان اصول کے مطابق درست نکل آئے تو پھر غور کرنا چاہئے کہ باعتبار اسناد و روایت اسکا کیا مرتبہ ہے۔ ورنہ بقول ابن جوزی جو حدیث اصول درایت کے مخالف ہو اسکو موضوع قرار دیکر راویوں کے جرح و تعدیل کی بھی ضرورت نہیں۔ اصول درایت دس ہیں:- (۱) حدیث عقل کے مخالف نہو (۲) حس و مشاہدہ اس کے مخالف نہو (۳) قرآن و اجماع قطعی کے موافق ہو (۴) تھوڑے سے کام پر سخت عذاب یا بڑے ثواب کا وعدہ نہو (۵) معنے رکیک نہوں (۶) تاریخ مشہور کے خلاف نہو (۷) وقت و حال اسکے کذب کو ظاہر نہ کریں (۸) راوی منفرد نہو (۹) کسی نہایت امر اہم پر صرف وہی ایک روایت نہو (۱۰) مفہوم یا الفاظ ایک رسول کی شان کے موافق ہو۔

کچھ تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ تمام اصولیین حدیث نے یہی اصول درایت کے قرار دئے ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ کتابیں احادیث کی ان اصول کے مطابق مرتب نہیں کیگئیں، بلکہ ان میں صرف راویوں کے اسناد کو کافی سمجھ لیا گیا ہے جو بالکل بیکار سی بات ہے۔

آج معتبر سے معتبر حدیث کی کتاب کو اٹھا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اسکا بڑا حصہ ایسا ہے جو اصول درایت کے

کے لحاظ سے لغو ہے، لیکن فن "معرفت الرجال" پر بھروسہ کرکے انکو داخل کتاب کر لیا گیا ہے حالانکہ بقول ابن جوزی وہ اس قابل ہی نہیں کہ اسناد کے لحاظ سے اپر اعتناء کیا جائے۔

الغرض احادیث کا مجموعہ ایسا نہیں ہے جن پر اعتماد کرکے ہم کسی مذہب یا ملت کے اصول حیات و معاشرت منضبط کریں اور فقہ میں جتنی خامیاں اسوقت نظر آرہی ہیں وہ سب نتیجہ ہے اس امر کا کہ آنکھ بند کرکے احادیث پر عمل کیا گیا اور اپر شریعت کی بنیاد رکھی گئی۔ سب سے پہلی چیز کلام مجید ہے اور جو تعلیم اسمیں دی گئی ہے وہ اس قدر عام، ایسی لچکیلی، اس درجہ ہمہ گیر و وسیع ہے کہ کسی قانون یا شریعت کے انضباط کے لئے احادیث سے استعانت کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔

تدوین فقہ میں شروع ہی سے یہ غلطی کیگئی اور برابر ہوتی چلی آرہی ہے، قانون کا منشاء چونکہ ملک کے تمدنی و معاشرتی حالات کی اصلاح کرنا ہے، اسلئے اسکو ہمیشہ بدلنا چاہئے اور ضرورت زمانہ کے لحاظ سے اسمیں تغیر ہونا ضروری ہے۔ اسی لئے قرآن شریف میں صرف اصول سے بحث کرکے فروع میں آزاد چھوڑ دیا ہے تاکہ ضرورت کے مطابق ہمیشہ اسکا جداگانہ انضباط ہوتا رہے۔ آج اسلامی فقہ کی کتابوں کو اٹھا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اسمیں ضرورت زمانہ کے لحاظ سے بہت سے مسایل موجود نہیں ہیں اور بعض ایسے احکام ہیں کہ جو ہمارے موجودہ مصالح کے موافق نہیں پڑتے۔ اس لئے اب ضرورت ہے کہ انہیں حذف و اضافہ کیا جائے، مگر اسکی ہمت کسی کو نہیں ہو سکتی کیونکہ فقہ کی تدوین زیادہ تر احادیث کی مدد سے ہوئی اور فقہ کو بدل دینا گویا احادیث کو کی مخالفت کرنا ہے، جو بمنزلہ کفر کے ہے۔ احادیث پر غلط اعتماد کرنیکی یہ دوسری خرابی ہے جو مذہب اسلام میں داخل ہوگئی ہے کہ آج ہم کوئی نیا قانون ضروریات زمانہ کے لحاظ سے اپنے لئے نہیں بنا سکتے

احادیث بہ لحاظ معنی و مفہوم چار قسم کی ہیں۔ ایک وہ جن میں عبادات و اعتقادات سے بحث کی گئی ہے، دوسری وہ جن میں معاشرتی احکام و تعیین حلال و حرام ہے۔ تیسری وہ جن کو تاریخ سے تعلق ہے، اور چوتھی وہ جو معاد سے متعلق ہیں۔ اول الذکر قسم میں بڑا حصہ موضوع ہے اور خصوصیت کے ساتھ وہ احادیث جن میں تقشف کی تعلیم دی گئی ہے۔ یہ خیالات یہود و نصاریٰ سے لئے گئے اور خواہ مخواہ رسول اللہ سے منسوب کئے گئے۔ اسی طرح تعیین حلال و حرام میں اسوقت کے رواج اور دیگر اقوام کے معاشری مراسم کا لحاظ کرکے زبردستی حدیثیں گڑھی گئیں، یہی حال تاریخی و معادی احادیث کا ہے جن میں امم سابقہ کے حالات بالکل علم الاصنام کا رنگ رکھتے ہیں اور معاد کے متعلق دوزخ و بہشت وغیرہ کے بیانات بالکل وہی ہیں جو نصاریٰ و یہود کی مسخ شدہ کتابوں میں پائے جاتے ہیں۔ اگر احادیث کی تمام کتابوں کا مطالعہ کیا جائے تو اسمیں بعض باتیں ایسی بھی نظر آئیں گی جو واقعی صحیح ہیں اور جو حقیقتاً رسول اللہ کی احادیث کہلائی جا سکتی ہیں، لیکن ان کا شمار بہت کم ہے اور ایک شخص کے لئے بہت مشکل ہے کہ پوری عمر صرف کرنے بعد بھی ان خذف ریزوں سے جواہر ریزوں کو نکالے۔ اس لئے اسلام کا مدار اگر کسی چیز پر ہو سکتا ہے تو وہ صرف

مغالطہ ذرا ہٹا کر!

"حال ہی مین ہمارے عزیز دوست رشید احمد صاحب صدیقی ام ۔ اے کا ایک مضمون اس عنوان سے انٹر کالج میگزین علیگڈھ مین شایع ہوا ہے۔

رشید صاحب آجکل یہین لکھنؤ کے مڈیکل کالج مین بغرض علاج قیام پذیر ہین ——— (مین یہین بتانا چاہتا کہ انکا مرض کیا تھا اور کسقدر ہمت مردانہ اور عزم استوار سے کام لیکر انھون نے عمل جراحی کے اُس "صراطِ نازک" کو طے کیا جہان جراح کے نیشتر کا ایک غلط "تموج ایتھری" بھی موت و حیات کے اقلیدسی خطِ اتصال کو نمایان کر دیتا ہے۔ کیونکہ انھون نے وعدہ کیا ہے کہ اپنی زندگی کے اس سب سے زیادہ نازک تجربہ کو اپنے ہی مخصوص اندازِ انشاء مین ضبط کرکے نگار کو مرحمت فرمائین گے) ——— اور اس مضمون کو اب انھون نے نظر ثانی اور کچھ اضافہ کے بعد نگار کو عنایت فرمایا ہے۔

رشید صاحب جس "بدیعۂ انشاء" کے مالک ہین، اس کے اظہار کی ضرورت نہین کیونکہ ملک کا ہر وہ شخص جو کچھ بھی ذوق ادب رکھتا ہے اس سے واقف ہے۔

رشید صاحب کا طنزیاتی رنگ حقیقتاً ایک بلند تنقید ہے ایک پاکیزہ "اخلال جذبات" ہے اور حقیقی معنی مین اُس "ادب لطیف" کا نمونہ ہے جس کو اصول تربیت کے لحاظ سے "کنڈرگارٹن" طریق انشاء بھی کہہ سکتے ہین

ہر چند رشید صاحب، (میرے دیرینہ کرم فرما ہونے کے باوجود) اس وقت تک نگار کے لئے "غیر کرمفرما" ہی ثابت ہوئے ہین، لیکن مین نے ان کے اس بے نیازی کو بھی ہمیشہ محبت کی نگاہ سے دیکھا۔ اور اب بھی اگر وہ باوجود اُس میثاق کے جو انھون نے اپنی کرسی علالت (عدالت نہین) پر کیا ہے بدستور مستغنی ثابت ہون، تو بھی مجھے اُن کی "کم نگاہیون" سے بجز اس کے کوئی گلہ نہ ہوگا ——— "کہ اے کافر بدینسان نیز دل رامی توان بُردن۔ نیاز

———✻———✻———

نہ حُسنش غایتے دارد، نہ سعدی را سخن پایان

نان کو اپریشن کے مانند مغالطہ بھی ایک کیفیت دماغی ہے اور ممکن ہے یہی سبب ہو کہ نان کو اپریشن اور مغالطہ دونون اب تک کسی منطقی یا نفسیاتی تعریف کے متحمل نہ ہو سکے۔ نظر بران نان کو اپریشن کو ایک حد تک وسیع پیمانہ پر مغالطہ اور مغالطہ کو محدود پیمانہ پر نان کو اپریشن قرار دے سکتے ہین۔ لیکن جس طور پر نان کو اپریشن کے مختلف پہلو اور مختلف اقسام تھے اسی طور پر مغالطہ بھی مختلف النوع اور مختلف الجہات ہے۔

مین نے مغالطہ کے ریسرچ (تفتیش و تحقیق) پر اپنے فرصت کے اتنے ہی لمحات صرف کئے ہین جتنے تاریخ کے دشمن لیکن تاریخی واقعات کے شیدائی سے توقع کیجا سکتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ خالی دماغ شیطان کا کارخانہ بن جاتا ہے یہ ایک طور پر "عضوی" جغرافیہ کی ایک سنگین غلطی ہے جسے مرور ایام نے دلچسپ بنا دیا ہے۔ حقیقت یہ نہین ہے کہ جب دماغ خالی ہوتا ہے تو اس مین وساوس شیطانی دخل پا جاتے ہین۔ وساوس شیطانی کا تعلق صرف شکم سے ہے۔ معدہ خالی ہو یا پر شیطانی ذریات ہمہ وقت دماغ کی طرف صعود کرتے رہتے ہین۔ اسی بنا پر ہر بھلے مانس کو شکم سیر افطار اور گرسنہ اشراف سے گریز کرنے کی ہدایت کی گئی ہے جن کی شیطانی ذریات کبھی اجرہ کبھی ریاح، کبھی مزدور اور کبھی سرمایہ دار کی صورت مین جلوہ گر ہو کر بالخصوص ایسی حکومتوں کو جن کا قیام قانون اور امن کے ماتحت عمل مین آیا ہو ستاتی رہتی ہین۔ اور گو حکومت کا سر ریاح اور منقی دماغ ادویات (مثلاً مارشل لا اور دفعہ ۱۴۴ الف سے) ان کا مداوا کرتی رہتی ہے مگر یہ قوم ایسی بد پرہیز "خام گوش" اور بدسگال واقع ہوئی ہے کہ ایک پیش نہین جاتی۔ چنانچہ نوبت یہان تک پہونچ گئی ہے کہ اب تک قدیم الایام سے جو ضرب المثل صحیح چلی آتی تھی یعنی رعایا کو اسی قسم کی حکمران جماعت ملتی ہے جس کی وہ مستحق ہوتی ہے اب بالکل بدل گئی ہے یعنی ہر حکومت کو اسی قسم کی رعایا ملتی ہے جس کی وہ سزاوار ہوتی ہے۔

مغالطہ کی تحقیق و تفتیش مین میرے پاس بھی وہی مواد موجود ہے جو موداکو اپنے گھوڑے کے سلسلہ مین دستیاب ہوا تھا، فرق صرف یہ ہے کہ ان کے گھوڑے پر شیطان سوار ہو کر جنت سے نکلا تھا اور میری تحقیقات سے یہ نتیجہ برآمد ہوا ہے کہ مغالطہ خود شیطان پر سوار ہو کر دنیا مین آیا۔ یاد ایامیکہ! یہ وہی زمانہ تھا جب فرشتون کو حکم دیا گیا کہ وہ آدم کو سجدہ کرین، حضرت ابلیس کو خاکی اور آتشی کا مغالطہ لگا اور فرشتون کی جماعت سے نکل کر خدا جانے کہان کہان بھٹکتے رہے بالآخر "جنت نشان" ہندوستان آگئے، سنا گیا ہے کہ اس زمانہ مین ناخواندہ مہمان کی آمد پر سخت احتجاج کیا گیا یعنی "شیطان چلے جاؤ"، "شیطان چلے جاؤ"، لیکن ان کے استقلال مین فرق نہ آیا اور از آدم تا ایندم موجود ہین۔

یہ تو شیطان کا تاریخی پہلو تھا لیکن اس کا نفسیاتی پہلو بھی کبھی دلچسپی سے خالی نہین رہا۔ مشیت الٰہی نے جب تکوین خلایق و اشیا کی تو یہ ضروری ہوا کہ اس نیرنگ خانہ کو ایسی حیثیت دیجائے جس مین ایک طرف مبدء اعلیٰ کا شوکت آفرین، عسیر الفہم، لاہوتی تخیل قائم رہے اور دوسرے طرف ناسوت کی گریزپا اور رنگین آویزشین اور لغزشین بھی کارفرما رہین۔ انسان کو اگر صرف انسان ہی بنانا یا رکھنا مقصود ہوتا تو پھر ملائک کی خشک اور غیر دلچسپ جماعت غیر ضروری ہو جاتی اس لئے انسانون کی جماعت مین "غیر سرکاری" عنصر (اہرمن) کا اضافہ کیا گیا۔ ابلیس "وہان" کے "نکالے ہوؤن" مین تھا اس کو بڑی درک نسبت تھی پھر اس کے لیے کیا مشکل تھا، وہ لاہوتی حقیقتون کو ناسوتی کرشمون مین بے نقاب کرنے لگا۔ اس نے انسان کے کمزور پہلو یعنی عقل و دماغ پر اپنا تسلط بٹھایا اور اس کے سب سے مضبوط پہلو روح اور قلب کو اپنے حریفون کیلئے چھوڑ دیا۔

وہ جانتا تھا کہ انسان اپنے کمزور پہلو کو اپنے کمزور بچے کے مانند زیادہ عزیز رکھتا ہے لیکن اس کا قائل نہین ہوتا اور محض اس لئے کہ وہ قائل ہونا گوارا نہین کرتا۔ اس کو یہ بھی معلوم تھا کہ زنجیر کی تمامتر استواری کا مدار زنجیر کے کمزور ترین حلقہ پر ہوتا ہے، اس لیے ذہن ودماغ سے زیادہ بہتر اور موزون میدان اس کے جولانگاہ کے لیے نہین ہوسکتا تھا۔ پھر اس کے کارفرمائی کے مظاہر اور مناظرے آپ خود ہی دیکھتے رہتے ہین، حریم یلدیز مین حسن وعشق کی جلوہ فروشیان دیکھئے اور انگورا مین مسئلۂ خلافت کی دھجیان، مہاتما گاندھی کی لنگوٹی دیکھئے اور گورنمنٹ کا پھاگ کھیلنا دیکھئے اور .... اور .... "جھانسی کی رانی دیکھو .... اور دیکھو دیکھو کلّو پہلوان دیکھو" .... الخ

نفسیات اور الٰہیات کے اسی قسم کے مسائل بیان کرتے کرتے غالب اپنی "ولایت" کے مغالطہ مین آگئے پھر کیا عجب اگر ان سے بہتر اور عجیب تر مسائل بیان کرنے کا ہم کو بھی مغالطہ ہوا ہو۔ چنانچہ ناظرین یہ نہ سمجھ لین کہ ان کے مشتبہ یا پُرعتاب "فکر بالجہر" کا ہمکو علم نہین ہوا، حالانکہ یہ سمجھ لینا بھی ایک قسم کا مغالطہ ہے اور یہ تو یقینی طور پر مغالطہ ہے کہ آپ اپنی حماقت کا اقرار کرکے عقلا کے زمرہ مین داخل ہوجائین گے۔ حماقت ایک مستقل فن ہے جس طور پر "ایک بار فری میسن ہمیشہ کے لئے فری میسن (Freemason) ضرب الامثال مین داخل ہوگیا ہے اسی طور پر "ایکبار احمق ہمیشہ کے لئے احمق" بھی زبان زد ہے۔

یہان تک مغالطہ یا شیطنت یا بقول بعض "آقایانِ ملت" جو ان کے بہترین مفسر یا علمدار سمجھے جاتے ہین، طاغوتیت کا ایک "طائرانہ" یا "اشتراانہ" جائزہ تھا، اب دیکھنا یہ ہے کہ دنیائے عمل مین اس کی کیا کیا کرشمہ کاریان ہین۔ مغالطہ ایک قسم کی گمراہی ہے جس مین مبتلا ہو کر انسان کچھ ایسا محسوس کرنے لگتا ہے اور محسوس کرنے سے زیادہ محسوس کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ اُس خاص صفت مین اللہ میان تو اس کے چپکے چپکے احسانمند ہوہی رہے ہین، ساری دنیا فرطِ رشک ورقابت سے رفتہ رفتہ جل کر تباہ ہوجائیگی یا اسے تباہ ہوجانا چاہئے۔ اگر اس کے پاس دولت ہے تو وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس نعمت کا موجد اور مورد دنیا مین اب تک صرف وہی رہا ہے اور یہی نہین بلکہ جو لوگ اس سے محروم ہین وہ یا تو عنقریب "ہذا ربی" کہکر اس کے قدمون پر گر پڑین گے یا پھر وہ خود کلکٹر صاحب کے قدمون پر گر کر اس کو جیلخانہ بھجوا دیگا۔ لطف یہ ہے کہ دونون قدمون پر گرتے ہین اور دونون کامیابی سے دور رہتے ہین، ایک اس فعل کو اس لئے اختیار کرتا ہے کہ اپنے پاؤن پر کھڑے ہونے کی طاقت نہین ہوتی، دوسرا اس لیئے گرتا ہے کہ اس کے بازوؤن مین سکت نہین ہوتی!

دولت کا مغالطہ اپنی بوقلمون حیثیات کے اعتبار سے عجیب وغریب ہے۔ ہر دولت مند اپنے آپ کو سب سے زیادہ طاقتور، سب سے زیادہ باعزت سب سے —— زیادہ مہذب سب سے زیادہ تعلیمیافتہ۔ سب سے بڑا عقلمند۔ سب سے زیادہ قوم پرست، سب سے زیادہ متقی۔ سب سے زیادہ وفادار —— "برٹش سبجکٹ" اور آہا ہا ہا ——

——— سب سے زیادہ معقول بھی سمجھتا ہے۔

اس کے نزدیک یہ تمام سعادتیں ''بنک سسٹم'' پر قائم ہیں دو دو چار چار لاکھ روپئے ہر مد مین جمع کر دیئے، اس کی آمدنی اور سود سے اس کی سعادتوں مین دن رات اضافہ ہوتا رہتا ہے اس کا خیال ہے کہ افلاطون، جالینوس، دھنونتری ابوریحان بیرونی، لوتھر، نپولین، مکالے، گوئٹے، آئن اسٹائن، مہاتما گاندھی اور ''اراکین مسلم یونیورسٹی کمیشن'' ان سب کے مورث اعلیٰ بنک مین اتنی دولت جمع کر گئے تھے کہ ان بزرگون کو ساری سعادت اور برومندی بطور ورثہ اسی کے سود سے حاصل ہوئی تھی۔ حالانکہ خود اسے جو نام نہاد سعادت یا رفعت حاصل ہے اُس کی تحقیق خود اپنے نظریہ کے مطابق کرنے سے ہمیشہ گریز کرتا ہے اور اگر کوئی دوسرا اس نیک کام کے لئے اپنی خدمات پیش کرے تو بگڑتا ہے اور عدالتی چارہ جوئی کی دھمکی دیتا ہے۔ لیکن لطف یہ ہے کہ دوسرا عدالتی چارہ جوئی پر آمادہ ہو جائے تو اسے اپنی دولت کا تھوڑا بہت شریک کر کے خاموش کر دیتا ہے!

وہ دولت کا غلام بنکر غیر دولت مندون پر حکومت کرنا چاہتا ہے اور ہندوستانیون کے مانند اسکا قائل ہونا پسند نہین کرتا کہ غلامی اور تفوق دو متضاد حقیقتیں ہیں۔ وہ ''ڈومینین اسٹیٹس'' (　　　) ''یا'' سوراج'' ملک معظم کی سالگرہ کے موقعہ پر حاصل کرنا چاہتا ہے اور یہی اس کے مغالطہ کا مضحک ترین پہلو ہے۔ وہ جتنا جاہل ہوگا اتنا ہی عالمون سے علم و فضل کی باتین کرے گا اور وہ بھی اس طور پر گویا اس کے مخاطب ان جواہر پارون سے اتنا ہی نا آشنا تھے جتنا مس میو ہندوستان سے۔ وہ ہر فن کے ماہرین سے اس طور پر گفتگو کریگا گویا وہ ان فنون کا خود امام رہ چکا ہے لیکن اب بر بنائے ایثار اس فن کو دوسرون کے کھانے کمانے کے لئے ترک کر چکا ہے۔ اس فرقہ مین کچھ لوگ ایسے بھی ہین جو ماہرین علم و فن سے اس فروتنی اور فتادگی کے ساتھ پیش آئین گے گویا اپنے مخاطب کو ''نعوذ باللہ'' کلکٹر صاحب سمجھتے ہین، ''مین تو آپ کے خاک پا کے برابر ہون، آپ کا فرمانا سر آنکھون پر، بے شک لاریب، آپ ملک و قوم کے لئے باعث نازش ہین۔ ہائے ہماری شامت، خدا اس قوم پر رحم کرے، مسلمانی در کتاب و مسلمانان در گور'' وغیرہ وغیرہ لیکن یہ سب اس انداز سے گویا وہ آپ کو دنیا کا سب سے بڑا احمق ہی نہین سمجھتا بلکہ تمام دنیا آپ کو ایسا ہی سمجھتی ہے۔ کبھی کبھی یہ حرکات محض اس بنا پر بھی ہونگے کہ دنیا یہ سمجھ لے کہ وہ صاحبان علم و فن کا مربی اور سرپرست ہے اور اکبر و بکرماجیت کے عہد کو از سر نو بیدار کرنے کے لئے اتنا ہی مضطرب ہے جتنا ہندو مہا سبھا اور جمعیت العلما ہندوستان کو حکومت خود اختیاری دلانے کے لئے دست بدعا یا دست و گریبان ہین۔ آپ سے اسکا کام نکلتا ہو تو وہ آپ پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کرے گا کہ آپ بیک وقت اس کے بھائی، باپ یا لڑکے اور کلکٹر صاحب تو خیر نہین کلکٹر صاحب کے چپراسی یا پیشکار ہین اور مشکل یہ ہے کہ آپ بھی باوجود اس کے کہ آپ صرف ایک کثیر الاولاد، بے روزگار، انگریزی دان ہندوستانی مقروض شوہر ہین، تھوڑی دیر کے لئے اس مغالطہ مین پڑ جائینگے کہ یہ شخص جو کچھ کہہ سن رہا ہے وہ اتنا ہی صحیح ہے جتنا کتاب العرب کی آیات بینات! لیکن اِدھر کام نکلا اُدھر آپ ہین اور وہی

آپ کے محسن کی گالیان، میونسپلٹی کی نالیان، بیوی کی بقیہ بالیان اور ہمہ وقت غمگساریان!

جس طور پر حکومت ہند کو آئی سی ایس نے مغالطہ مین مبتلا کر رکھا ہے اسی طور پر طبقۂ رؤسا کو مصاحبین اور متوسلین نے گمراہ کر رکھا ہے، حکومت ہند نے طبقۂ آئی سی ایس کو اپنا ہاتھ پاؤن ہی نہین بلکہ عقل و دماغ قرار دیدیا ہے، دوسری طرف رؤسا کے مصاحبین ہین جو ان کے ہاتھ پاؤن ہی نہین بلکہ اور اعضائے رئیسہ کا بھی کام دیتے ہین۔ یہ مصاحبین عام طور پر حاجت مند اور جاہل ہوتے ہین اور چونکہ یہ اپنی بعض نہایت قیمتی متاع ان کے ہاتھون فروخت کر چکے ہوتے ہین اس لئے اس کا معاوضہ بھی اسی دلیری اور بے حجابی سے لیتے ہین۔ ان مصاحبین کی عقل و ذہانت کا مغالطہ ان کی سرکار پر ایسا طاری ہوتا ہے کہ وہ کبھی یہ محسوس نہین کرتا کہ اس نظام شمسی اور کائنات عالم مین بعض چیزین ایسی بھی ہین جو اُس کے اور اُس کے مصاحبین سے زیادہ باوقعت اور قابل توجہ ہین۔ یہ مشیر اور مصاحب اکثر تیسرے درجہ کے لوگ ہوتے ہین اور ان کی مثال بعض جزئی ترمیم کے ساتھ اُن مردہ کیڑون کی ہے جو انجکشن کے ذریعہ سے جسم انسانی مین پہونچائے جاتے ہین اور زندہ کیڑون کو ہلاک کر ڈالتے ہین مصاحب اور مشیر کا رکھنا گزیر خرافات مین سے ہین ورنہ رؤسا کی غیر ضروری آمدنی کا غیر ضروری تو صرف ہی کیا ہو لیکن شاید یہ زیادہ بہتر ہو کہ رؤسا غیر معمولی قابلیت اور اہلیت کے لوگون کو جو موجودہ عہد مین گرے پڑے ٹوٹون ہی سے نہین بلکہ یونیورسٹیون سے زیادہ سستے ہین اپنا حاشیہ نشین اور وابستۂ دامن بنائین۔ اس مین شک نہین مصاحبت کا پروگرام بھی ان کو اپریشن کے مانند تخریبی ہے لیکن قابل اور نااہل مصاحبین کے تخریبی پروگرام مین بھی امتیازی مدارج ہین، کون نہین جانتا واجد علیشاہ اور اکبر دونون مصاحبین کے گمراہ کئے ہوئے تھے لیکن ایک "رنگیلے" اور "رسیا" کے نام سے یاد کئے جاتے ہین اور دوسرا بگڑ کر خدا بن گیا!۔

مغالطہ کی ایک طرفہ قسم اور بھی ہے، بعضون کو یہ خیال پیدا ہو جاتا ہے کہ ان کا وجود دنیا کے لیے ناگزیر ہے۔ ان سے کوئی پوچھے کہ آخر اس بیسوین صدی مین کتنے لوگ خود خدا کے ناگزیر ہونے کے قائل ہین، خیر خدا کو تو جانے دیجیے وہان "تعزیرات ہند" اور "پبلک اوپینین" (رائے عامہ) کہان ہے، کتنے ہین جو ہندوستان کے امن و ترقی کے لئے حکومت برطانیہ ہی کو ناگزیر سمجھتے ہین، حالانکہ حکومت برطانیہ کے پاس دفعہ ۱۲۴ سے لیکر سر مائیکل اوڈائر تک موجود ہین۔

مین اپنے دو دوستون سے واقف ہون جن کو اپنے متعلق یہ غلط فہمی ہے کہ اگر وہ اپنے جگہ سے ہٹائے گئے یا دنیا سے اٹھائے گئے تو اسی دن نظام شمسی درہم برہم ہو جائے گا۔ ایک تو میری "مخدومہ" ہین جو گھر کا کھانا پکاتی ہین اور ہر اس چیز کو میرے گھر کیلئے غیر ضروری اور اپنے لیے ناگزیر سمجھتی ہین جو گھر والون کے نظر سے اوجھل اور نقل و حمل کی متحمل ہو۔ ان کو کسی نے یقین دلادیا ہے کہ دانہ پر ہر شخص کا نام لکھا ہوتا ہے اور وہ اس کے حصہ مین آکر رہتا ہے، اس بنا پر ان کا مسلک جزئی ترمیم کے ساتھ وہی ہے جو اکثر صوفیا کا ہے۔ یہ "ہمہ از اوست" کے بجائے "ہمہ ازان ماست" کی قائل ہین۔ ان کا خیال ہے کہ

انھون نے ہم کو اپنی خدمات سے سبکدوش کر دیا اسی دن ہمپر کمیشن" بیٹھ جائے گا اور ہمارا نام حضرت میکائیل کے رجسٹر سے حذف کر کے اسرافیل کے صور پر اسی طور سے لکھا ہوا نظر آئے گا جس طور پر گراموفون کے ریکارڈ پر ایک "صاحب" کی تصویر نظر آتی ہے اور نیچے لکھا ہوتا ہے، "ہز ماسٹرس ووئس" (His master's Voice) لیکن اگر یہ اُردو مین لکھا ہوا تو ممکن ہے بعض حضرات ایسے یون بھی پڑہین "ہر ماسٹرس وائس" (Her master's Voice) ہماری مخدومہ ہر شخص کے بارہ مین ایک رائے رکھتی ہین، ان کا خیال ہے کہ مسلم یونیورسٹی اور دنیا کی محرومی کا راز یہ ہے کہ لوگ بیویان رکھنے کے عادی ہین اور یہی نہین بلکہ جس قدر بیوی پر اعتماد کرتے ہین اتنا ان پر نہین کرتے۔ میری مخدومہ انتہائی انتقامانہ جوش و محویت کے ساتھ لکڑیان پھونکتی ہین، اور مین اکثر کسی محفوظ مقام سے گھر مین نوٹس دیدیا کرتا ہون کہ بیوی بچے ہوشیار رہین، یہ کہین لکڑی کے ساتھ انھین بھی چولہے سے آشنا نہ کرا دین۔ کبھی کبھی یہ قطع تعلق کا اعلان کر دیتی ہین اس وقت ہم کو اپنی حالت پر خود ترس آجاتا ہے اور اس اندیشہ سے کہ ممکن ہے کوئی دوسرا نہ ملے یا ان سے بھی زیادہ مہربان ملے ہم فوراً ایک جلسۂ خاص منعقد کرتے ہین جس مین انکی خدمات اور احسانات کا اعتراف و اعادہ کرتے ہین، بیوی "شیم شیم"، اور بچے "ہیر ہیر" (جن کا اخباری ترجمہ "شرم شرم" اور "سنو سنو" ہے) کرتے ہین اور ایکبار پھر ہم ان کو اپنے آپ پر مسلط کر لیتے ہین!

سر سید مرحوم کی انتہائی بدنصیبی تھی اور ہماری اب بھی ہے کہ یہ سر سید کے عہد مین تھین۔ ان کو سر سید کا اتنا شدید مغالطہ ہے کہ یہ ہر اصلاح یا اعتراض پر سر سید یا ان کے عہد سے مرافعہ کرتی ہین اور چونکہ ہم پیدائش کے اعتبار سے مسلمان اور پیشہ کی حیثیت سے قبر پرست واقع ہوئے ہین اس لیے سر سید کا نام مخدومہ کی زبان سے سنکر لرز جاتے ہین۔ چیزین چرانے اور لکڑی پھونکنے کے علاوہ ان کا فرصت کا لمحہ سر سید کی خطبہ خوانی مین صرف ہوتا ہے۔ ایکدن مین نے کہا بڑی بیوی اندنون کمیشن آیا ہوا ہے۔ ہم لوگ فوجداری سپرد ہین، کچھ دعا کرو کہنے لگین "میان، سر سید کے مزار پر چراغ جلاؤ اور پھول چڑھاؤ اور بیوی سے کہو، کھوج کھچڑ مین نہ رہا کرین، غریبون کو کھانا کھلائین، اور میان آفت کیون نہ آئے ماشاءاللہ سر سید کے داڑھی تھی، آج کل کے مردوئے ڈاڑھی منڈ واتے ہین، سر سید کی برسی مین ایک سال چراغ چڑھانے اور طاق بھرنے نہین گئی تھی، میری بچی کے چیچک نکل آئی، ننھے کے ابا کو معلوم ہوا تو سارے گھر مین کہرام مچا دیا، کہنے لگے "ابکے نہ گئی تو سارے گھر کو کچا کھا جاؤنگا،،

چنانچہ میان، جبسے کان پکڑا، ہر سال برسی کے موقعہ پر مزار پر جاتی ہون اور ایک پاؤن پر کھڑی ہو کر دعا مانگتی ہون کہ میان تمھارے کالج کے لڑکے بڑے اچھے ہین، بیویان البتہ بہت ستاتی ہین، ان کو کوئی خواب دکھاؤ، مین تو ان کو ایکدن مین ٹھیک کر لون لیکن یہ تمھارا ڈائننگ ہال ٹھیک نہین ہونے دیتا، مین ان کو سوکھے ٹکڑے کے لئے ترساؤن لیکن سب ڈائننگ ہال سے بریانی کھانے لگتے ہین۔ اور کیون میان اس ڈائننگ ہال کو فوجداری سپرد نہین کراتے،، مین نے کہا اس پر بھی آفت آئی تھی لیکن ہائیکورٹ سے یہ سب بری ہو گئے کہنے لگین، ان سبھون نے حاکمون کو بریانی کھلائی ہوگی اور سر سید کی مانتا مانی ہو گی آپ لوگ بھی مزار پر حاضری دیجئے، رات کو سر سید خواب مین بشارت دینگے، صبح کے وقت محتاجون مین بریانی تقسیم کرائیے، مین نے کہا

اچھا یہ تو سب رہا ذرا لکڑی چولہے سے کھینچ لو، فضول جل رہی ہے، کہنے لگین میان سرسید کے زمانہ مین ایسا ہی ہوتا تھا، بیوی نے کہا، آج کھانا پکنے مین دیر ہوئی، ذرا جلدی کرو، فرمایا کہہ لو بی بی کہہ لو سرسید کا زمانہ ہوتا تو بتاتی، غرض سرسید کا خیال، ان کا عہد، ان کے کارنامے اور ان کا وجود اس درجہ ان پر مسلط ہے اور بات بات پر مرحوم کو اس کثرت کے ساتھ معرض بحث مین لاتی ہین کہ اکثر بے اختیار جی چاہتا ہے کہ موقعہ ملے، سرسید اجازت دین اور بیوی مانع نہ ہون تو بڑی بی کے ساتھ مزار مین سما جاؤن۔

میرے دوسرے دوست ابھی جیلخانہ سے واپس آئے ہین، نان کو اپریشن کی تعبیر کرنے مین ان سے اور ان کے ضلع کے کلکٹر صاحب سے اختلاف آرا ہوا، اس اختلاف نے ایسا طول پکڑا کہ جیلخانہ جانا پڑا لیکن اب خود محرک کو نان کو اپریشن سے سخت اختلاف پیدا ہو گیا ہے، فی الحال ان کا عقیدہ یہ ہے کہ ان سے اور ان کے خاندان دونون سے زیادہ اہل اور مستحق دنیا مین نام نام و نمود پیدا کرنے کا کوئی اور نہین ہے، ان کے سامنے جب کبھی اس قسم کا تذکرہ آئے گا کہ فلان شخص نہایت قابل ہے یا نہایت حسین ہے یا نہایت پرہیزگار ہے یا نہایت منتظم ہے تو وہ ہمیشہ یہ فرمائین گے کہ اُن کو یا ان کی کسی عزیز یا رشتہ دار کو اس قسم کے مواقع حاصل نہین ہوئے ورنہ کوئی وجہ نہ تھی کہ یہ یا ان کے عزیز اُس پایہ کے نہ ہوتے۔!

ایک مرتبہ کارنیگی اور راک فلر کا تذکرہ آیا، فرمانے لگے بھئی کیا کہتے ہو میرے پاس اتنا روپیہ ہو اور اتنے مواقع حاصل ہون تو کیا مین کارنیگی اور راک فلر نہین ہو سکتا۔ مصطفیٰ کمال، مصطفیٰ کمال، ان مین کیا رکھا ہے، اسلام سے برگشتہ اور بیزار ہو کر اتنی شہرت ہی حاصل کر لی تو کیا ہوا، مجھے دیکھو۔

منکرِ مے بودن و ہمرنگِ مستان زیستن

ایک مرتبہ یہ ذکر چھڑا کہ انگریز عورتین نہایت محنتی اور منتظم ہوتی ہین۔ فرمانے لگے یون تو کہئے گا پروپگنڈا کرتا ہون لیکن آپ یقین مانئے جفاکشی اور انتظامی امور مین میری بیوی کو کمال حاصل ہے، یہ اس کی بدنصیبی تھی کہ میرے حصہ مین آئی ورنہ اگر کہین وہ یورپ مین پیدا ہوئی ہوتی اور کمبخت پردہ وغیرہ کی پابندی نہ ہوتی تو لطیفہ خانم اور ملکہ ثریا کا کوئی نام نہ لیتا، میری خود یہ حالت ہے کہ ان کے سامنے بالکل سہما ہوا رہتا ہون۔ یہ انھین کی تعلیم و تربیت کا اثر ہے کہ میرے بچے صحت اور ذہانت مین اپنا نظیر نہین رکھتے، چھوٹے بچے کو تو آپ نے دیکھا ہوگا اس کی ذہانت کا مین کبھی خیال کرتا ہون تو دنگ رہ جاتا ہون ایک دن تو اُس نے مجھکو بالکل متحیر کر دیا، مین اندر سبھا پڑھ رہا تھا، راجہ اندر کی تصویر دیکھکر کہنے لگا کیون ابا یہ کس کی تصویر ہے نانا! اتفاق سے وہ بھی بیٹھی ہوئی تھین، طیش مین آکر بول اُٹھین۔ کیون بے، یہ تیرے ابا ہین تو کیا یہ ساری قطامہ جو پرا لگائے کھڑی ہین وہ تیری نانی ہین۔

قابلیت کا ذکر آیا تو فرمانے لگے، میرا بھتیجا آئیڈیل طالب علم ہے، کل کلب مین کہین میری زبان سے اس کا نام نکل گیا، تمام لوگ اُٹھ کھڑے ہوئے، اور منہ پھاڑ پھاڑ کر دریافت کرنے لگے کیون صاحب وہ آپ کا بھتیجا ہے، ایک صاحب نے فرمایا!

آپ اس کو ولایت کیون نہین بھیجدیتے ۔ دوسرے صاحب نے فرمایا اس کو پروفیسر بنائے، تیسرے بزرگ دریافت فرمانے لگے کیون صاحب ان کی شادی ہوئی ہے یا نہین ۔

میرے دوست کوئی ایسی چیز پسند نہین کرتے جو ان کے پاس نہ ہو بلکہ دوسرون کی ملک ہو، آپ نہایت اچھا کپڑا پہنکر جائین وہ کہین گے بھئی سلا اچھا نہین، رنگ بھی کچھ طرحدار نہین۔ تم نے میری شیروانی تو دیکھی ہوگی، ایکدن پہنکر نکلا تو تمام لوگ سناٹے مین آگئے، آپ کا مکان بہت اچھا ہے، لیکن کچھ تاریک سا ہے، میرے مکان کو دیکھئے بھئی مین بارہ بارہ بجے رات کو نکل کر صحن مین آیا ہون، تمام گھر روشن اور شگفتہ نظر آتا تھا۔ آپ کے گھر پر تو بالکل سناٹا چھایا ہوا تھا۔

غرض آپ کوئی تذکرہ کرین یہ اپنا اپنے بیوی بچون یا عزیزون کا پروپگنڈا کئے بغیر نہ چھوڑین گے۔ مین نے سُنا جیلخانہ مین اس عادت کو انھون نے بالکل ترک کر دیا تھا کیونکہ قیدیون کے کارنامے سنکر اکثر آپ نے اپنے قبیلہ والون کے کارنامہ کا خطبہ پڑھنا شروع کر دیا تھا، پولیس نے تحقیقات شروع کر دی، بالآخر ایک دن ان کے اعزہ اور اقربا ان سے ملنے آئے اور تاکید کر دی کہ وہ اُن کے بارہ مین لوگون کو مرعوب کرنے کی کوشش نہ فرمایا کرین ورنہ ایک دن ایسا آئے گا کہ ان کے سارے خاندان والے پولیس اور عدالت کے زد مین آکر جیلخانہ پہونچ جائین گے!

ڈپٹی کلکٹر کو گورنمنٹ سے وہی نسبت ہے جو کنگارو (Kangaroo) کو اپنے بچہ کے ساتھ ہوتی ہے جسطور پر کنگارو کا بچہ خطرہ کی آہٹ پا کر ماں کی جھونجھ مین بیٹھ جاتا ہے اسی طرح ڈپٹی کلکٹر بھی حکومت کی پناہ ڈھونڈھنے مین نہایت آزاد اور کامیاب ہوتا ہے لیکن اگر خطرہ کا سامنا نہ ہو تو پھر جلال و تجبر مین ڈپٹی کلکٹر کسی دیہاتی تھانہ کے سب انسپکٹر یا دیہاتی زمیندار کے گھوڑے سے کم نہین ہوتا۔ اکڑے گا، ہنہنائے گا، پٹنک جھاڑے گا نہ اپنی زندگی کی پروا نہ دوسرے کے جان یا ایمان کا خطرہ۔

ڈپٹی کلکٹر اپنے مغالطہ کے اعتبار سے کئی قسم کا ہوتا ہے ایک مادرزاد ڈپٹی کلکٹر، دوسرا چوبیس گھنٹہ ڈپٹی کلکٹر، تیسرا پیشہ ور ڈپٹی کلکٹر وغیرہ، ان مین تفریق کرنا مشکل بھی ہے اور اندیشہ ناک بھی خصوصاً ایسی حالت مین جب اس حقیقت کو بھی تسلیم کر لیا جائے کہ ڈپٹی کلکٹر صرف تنہا نہین ہوتا بلکہ ایک ڈپٹی کلکٹر کے معنی بے شمار ڈپٹی کلکٹرون کے ہین اسکے دوست اعزہ چپراسی، خانساماں، بھنگی سب کے سب ڈپٹی ہوتے ہین۔ ڈپٹی کلکٹری کی تاریخ مین بعض ابتدائی قسمین ایسی بھی ملتی ہین جو اب افریقی شیر کے مانند یا تو ناپید ہین یا پھر خال خال کہین نظر آجاتے ہین۔

کسی زمانہ مین ایک ڈپٹی فتح علی خان تھے۔ شکل وصورت ڈیل ڈول اور رکھ رکھاؤ مین لندھور بن سعدان ۔ اگر آپکو رحمت اللہ رعد کی بڑی جنتری اور اُسکی بعض اشتہاری تصاویر یاد ہون تو انکا کچھ اندازہ ہوسکتا ہے مثلاً نوشیروانی خضاب کی مفسر، نوشیروان عادل کی وہ تصویر جس مین نوشیروان کے سارے عدل و جلال و جبروت کی حامل اسکی لمبی دامنِ دار ڈاڑھی کا وہ نصف سیاہ حصہ تھا جو نوشیروانی خضاب کے اثر و اقتدار کا علمبردار تھا۔ سر پر عمامہ بقدر ایک چھولداری،

آواز ایسی جسکا متحمل صرف کسی ڈپٹی کلکٹر ہی کا "گھیگھا" ہو سکتا ہے۔ لفظ گھیگھا ادبی اور لسانی نقطۂ نظر سے کتنا ہی جز ثقیل بھدا، اور غیر شاعرانہ کیون نہ ہو اسکی "گھریلو" بلاغت سے کسی سلیم المذاق کو انکار نہین ہو سکتا۔ وہ صرف سزا دیتے تھے اور "شبہہ کا فائدہ" اگر کبھی کسی نے حاصل کیا تو وہ ملزم نہین بلکہ اسکے وکیل مختار ہوتے تھے اور غالباً یہی سبب تھا کہ وکیل مختار اپنے موکل سے زیادہ اپنی خیر منانے پر مائل رہتے تھے۔ ڈپٹی صاحب کو تعزیرات ہند کا یہ مغالطہ تھا کہ اسکا مقصد صرف لوگونکو سزا دینے کا تھا، شبہہ یا عدم ثبوت اُسے ڈپٹی صاحب وکیلون کا فریب یا حاکم عدالت کی کمزوری یا عدم قابلیت پر محمول فرماتے تھے اُنکی عدالت مین مقدمہ آنے کا منشا یہ تھا کہ سزا تیقن ہے گویا دو ہندوستانی اڈیٹرون مین اختلاف آرا ہو گیا ہے اور جب تک اُنمین سے کوئی فوجداری کرنہ بیٹھے گا یا فوجداری سپرد نہ ہوے گا نہ خود چین لے گا اور نہ دوسرون کو عافیت سے بیٹھنے دے گا۔

ڈپٹی صاحب کا کام صرف سزا دینا یا فرصت کے لمحات مین یاد الٰہی مین مصروف رہنا تھا۔ انکا مقصد حیات صرف ڈپٹی صاحب رہنا تھا یا محض خدا رسیدہ ہونا۔ یہ ضرور ہے کہ عدالت مین خدا رسیدگی اور عبادت مین عدالت کا خیال کبھی ملحوظ نہین رکھتے تھے۔ ڈپٹی صاحب سے ہر شخص لرزہ براندام رہتا تھا۔ اُنکی بیوی نہین بلکہ بیوی کے گھر والے بھی!! ڈپٹی صاحب خدا جانے کب سے زندہ تھے اور خدا ہی جانتے کب تک زندہ رہنے کا قصد رکھتے تھے، اسلئے انکے نزدیک ہر شخص جھوٹا تھا اور اسلئے زدوکوب سب وشتم کا سزاوار، اس مین بیوی بچے، پیشکار، وکیل مختار، مدعی، ملزم، کسی کی تخصیص نہ تھی۔
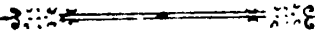
اتفاق وقت، کلکٹر صاحب اور ڈپٹی صاحب ساتھ ساتھ کہین دورے پر تھے۔ بابو گنیشی لال ایک پُرانے زمانہ کے مختار، وکیل، ایڈوکیٹ، بیرسٹر سب ہی کچھ تھے۔ بوڑھے! قانون کے علاوہ سب کچھ پڑھے ہوئے، قدرے شاعر نہایت طرار، حاضر باش، حکام رس، حاضر جواب۔ کسی مقدمہ کی پیروی مین کیمپ کے ساتھ ساتھ تھے اور خانساماں وغیرہ کے ساتھ بیٹھے حقہ کے دو چار کش پی رہے تھے۔ قضارا رفع حاجت کی ضرورت محسوس ہوئی ایکطرف بیت الخلا تھا، لوٹا لئے ہوئے، بدحواسی کے ساتھ داخل ہوئے وہان جو دیکھتے ہین تو ڈپٹی فتح علیخان صاحب موجود ہین۔

تو گوئی ہم تخت سُہراب بود

لوٹا فوراً زمین پر رکھدیا، جھک کر سلام کیا اور پھر لوٹا وہین چھوڑ کر فرار ہوئے تو کہا جاتا ہے کہ جب تک ڈپٹی فتح علی خان صاحب اُس ضلع مین رہے، بابو گنیشی لال کو کسی نے عدالت کے احاطہ مین نہین دیکھا!

---
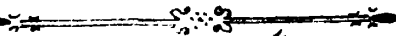
۲۴ گھنٹہ ڈپٹی کلکٹر کی علامت یہ ہے کہ وہ تنگ سوٹ پہنے گا اور سستی قسم کا سگرٹ کثرت سے پئے گا اور ٹھیک اسوقت جب انگریزی بولنا ضروری ہو وہ غلط اُردو بولے گا اور ٹھیک اسوقت جب اُردو بولنا مناسب ہو وہ غلط تر انگریزی شروع کردیگا۔ زین کے کوٹ پتلون سے اُسے خاص الفت ہوتی ہے۔ وہ بالعموم شرعی پتلون پہنے گا یعنی ٹخنون سے کم سے کم ایک بالشت اونچا۔

موزہ عمدہ ہوگا لیکن جوتا نہایت گھٹیا اسکا سبب یہ ہے کہ وہ اپنے بد قوارہ پاؤن کے چھپانے کے لئے عمدہ موزہ پہنتا ہے لیکن دوسری طرف بد قوارہ پاؤن جوتے کو بے ہنگم کر دیتا ہے لیکن ایسا کبھی نہ ہوا کہ وہ اپنی ڈپٹیانہ قابلیت اور جبروت کو منوانے کے لئے ہر وقت اور ہر لفظ و جملہ پر پاؤن زمین پر نہ پٹکتا ہو۔ اسکا کوٹ ہمیشہ تنگ ہوگا۔ گو دیدہ و دانستہ کبھی ایسا کوٹ نہین تیار کراتا لیکن اسکا کیا علاج، جسمانی ضخامت کے بڑھانے مین اسکی ڈپٹیت نادانستہ اور نامعلوم طور پر ہمیشہ معین ہوتی رہتی ہے۔ اسکی مثال بھاشا شاعری کے اُس عجیب شعر سے دیجا سکتی ہے جس مین ایک دوشیزہ حسینہ کے بارہ مین کسی آبرو باختہ[1] شاعر نے کہا ہے کہ وہ ہمیشہ درزی سے جھگڑتی ہے کہ اُسنے اُسکی محرم تنگ بنائی اور اُسے ہمیشہ نئی محرم تیار کرانیکی ضرورت محسوس ہوا کرتی ہے!۔

ڈپٹی کو اپنی سوسائٹی کے لئے صرف ڈپٹی ہی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ دوسرون کی صحبت مین یا تو وہ اپنے آپ کو بالکل بے وقوف یا پھر بے انتہا برتر سمجھتا ہے لیکن نتیجہ دونون حالتون مین یکسان ہوتا ہے یعنی وہ خود ......

...... معلوم ہوتا ہے۔ آپ اُس سے ملین۔ آپ کے سلام پیام، مزاج پرسی اور اس قسم کے دوسرے تکلفات رسمی کو سنکر کچھ ایسا محسوس کرے گا کہ گویا یہ سب کچھ غیر متعلق باتین تھین۔ اسدوران مین وہ کچھ ایسا کھویا کھویا سا نظر آئیگا، گویا کسی دوسرے ڈپٹی صاحب کا متلاشی یا متمنی ہے، وہ ملجائین اور یہ جلد ان مین جا کر ملجائے۔

وہ عام طور سے بائیسکل پر بیٹھتا ہے لیکن کبھی گھنٹی نہین بجاتا، بالخصوص احاطہ عدالت مین ہوبچکر تا کہ کوئی گنوار ٹکراتے ٹکراتے بچے اور یہ اسکو بالعموم اپنا سفید دانت نکالکر غلط اُردو مین اسطور پر گالی گلوج کرے کہ ایکطرف بیچارہ گنوار سہم جائے اور دوسری طرف ڈپٹی صاحب کی آمد کی اطلاع ساری کچہری مین ہوجائے۔ وہ ہمیشہ اسکی کوشش کریگا کہ اسکی وضع قطع یا طور طریقہ کو دیکھکر لوگ یہ سمجھنے لگین کہ یہ سلسلۂ "فاتحان ہند" کی کوئی کڑی ہے۔

۲۴ گھنٹہ ڈپٹی کلکٹر کی زندگی صرف اسوقت سے شروع ہوتی ہے جب وہ ڈپٹی کلکٹر مقرر ہوا اسکے قبل کے سارے واقعات زندگی یا روداد خاندانی وہ اسطور پر بھلا دے گا گویا وہ کبھی پلٹین ہی نہین آئے۔ اب نہ وہ عزیزون کو پہچانیگا، اور نہ دوستون کو خاطر مین لائیگا بشرطیکہ وہ کلکٹر صاحب نہ ہون۔ ناظرین مین سے بہت سے اصحاب ایسے ہونگے جنکو ایسے ڈپٹی صاحبان سے نیاز حاصل ہوگا جنکو اپنے کم خوش نصیب اعزہ سے چھٹکارا پانے مین خاص وقت پیش آئی ہوگی۔ ڈپٹی صاحب کے نزدیک مرنا جینا سب کچھ صرف ڈپٹیت کیلئے روا اور موزون ہے۔ وہ کبھی ہنستے ہوئے نہین پایا جائیگا اور کبھی ایسا ہوا بھی تو محض یہ محسوس کرانیکے لئے کہ وہ آپ پر احسان کررہا ہے وہ ہر واقعہ یا مسئلہ کو، خواہ وہ اُسکے عقل و فہم سے کتنا ہی بلند کیون نہ ہو، اسطور پر سنے گا گویا اسکی تہ تک پہونچ گیا ہے اور آپ پر جس سنجیدگی یا تشویش کے ساتھ گفتگو کررہے ہین وہ صرف آپکی حماقت کی دلیل ہے۔ ڈپٹی کلکٹر کبھی بے تکلف نہین ہوگا۔ کیونکہ اسکو یقین ہی کہ اگر تمکنت اور تبختر کے علاوہ کوئی اور فعل اس سے سرزد ہوا تو پھر ممکن ہے ہندوستان سے انگریزی اقتدار اُٹھ جائے اور شاید اسکے ساتھ اسکی ڈپٹیت بھی!!۔

---

[1] وہ آبرو باختہ شاعر "رحیم خانخانان" تھا۔ دوہا یہ ہے:۔　بار بار درجن گھر جھگرت ٹھاڑھ
جیون جیون انگیا سیوت سو سو گاڑھ

دگر از سر گرفتم قصۂ زلفِ پریشان را۔

مغالطہ کے بارہ مین اب تک جو کچھ کہا گیا ہے وہ اُس دفتر بے پایان کا ایک صفحہ بھی نہین ہے جس سے یہ نیرنگ کدۂ حیات لبریز ہے۔ لیکن جہان تک رسالۂ ہذا کے صفحات اور ہماری محدود بصیرت ہماری رفاقت کر سکتی ہے ہم امید کرتے ہین ہمارے ناظرین بھی (جو پسند کرین تو یقیناً اسکی زد سے محفوظ ہین) ہمارا ساتھ دین گے۔ اور "دو تماشے" کے بعد کی "دو نقل" سے بھی لطف اٹھائین گے۔

بعض لوگون کا راسخ عقیدہ یہ ہے کہ ان کا عجیب الہیئت ہو جانا، غیر معمولی کپڑے پہن لینا یا غیر معمولی طور پر کپڑے اتار دینا یا بالون کو خاص طور پر پھیر لینا، پھیرتے رہنا یا ان کو انکی حالت پر چھوڑ دینا، یا غیر طبعی طور پر چلنا یا گفتگو کرنا ان کی شہرت یا قابلیت کے لیے اتنا ہی اکسیر ہے جتنا امرت دھارا یا حکیم صاحب کی گولیان۔ مثلاً ایک صاحب موسیقی مین کمال رکھتے تھے۔ ان کی عادت برہنہ سر رہنے کی تھی، ایک دوسرے بزرگ نے محض اس خیال سے کہ لوگ بھی ان کو ویسا ہی با کمال سمجھنے لگین یا ان کو دیکھکر لوگون کو اول الذکر کا دھوکا ہو، ٹوپی ترک فرما دی، اب ان کے سر سے ٹوپی ایسی ہی غائب ہے جیسا ان کے ہم نوع کے سر سے ایک طبعی آلۂ مدافعت، حالانکہ ان کا کمال اگر ظاہر ہو سکتا تھا تو شاید صرف اس طور پر کہ سوا ٹوپی کے یہ سارے کپڑے ترک فرما دیتے۔

ایک چیز اور عجیب و غریب آج کل نظر آئے گی، بعض لوگ جو ہمیشہ انگریزی لباس مین نظر آتے ہین اور بحیثیت اس کے کہ ان کی انگریزی تعلیم، انگریزی معاشرت اور انکا انگریزی لباس متقین اور مسلم ہے، جب کوئی غیر معمولی تقریب ہوگی تو وہ قدیم سے قدیم اور متروک شدہ ہندوستانی لباس مین نظر آئین گے، اور محض اس لئے کہ لوگ حیرت زدہ ہو جائین کہ ایسا قابل اور ایسا مشہور آدمی، دیکھئے، تو کس لباس مین نظر آ رہا ہے، ہائے ہائے یہ کسر نفسی، یہ سادگی، یہ ایثار، اس نے تو قرون اولی کے مسلمانون کا نمونہ پیش کر دیا۔ لیکن بعض دوسرے بزرگ اس نیت سے اس قسم کا لباس زیب تن فرمائین گے کہ دُنیا ان کو نہایت معمولی درجہ کا آدمی سمجھے لیکن جب لوگون کو حقیقت حال معلوم ہو تو وہ اپنی بیوقوفی پر حیرت زدہ رہ جائین، اور دل مین سوچنے لگین کہ "بار خدایا دراین گرد مین ایسا سوار!" کبھی کبھی اس قسم کا لباس اس لئے بھی اختیار کیا جاتا ہے کہ پہننے والا بالکل کمسن اور تھوڑا بہت (بقدر توفیق) حسین اور مجموعی طور پر بھولا بھالا بیوقوف سا معلوم ہونے لگے تاکہ لوگ اس پر متحیر ہون کہ دیکھئے تو ابھی اس کا سن ہی کیا ہے اور بظاہر کیسا کم رد ہے لیکن کتنا بڑا آدمی ہو گیا ہے، اور پھر ان کو اس پر عبرت ہونے لگے کہ ہم کو دیکھئے بڈھے ہو گئے اور دنیا مین کچھ نہ کر سکے، اچھا گھر چلکر بیوی کی اجازت سے کر خود کشی پر آمادہ ہونگے! ایک دوسرے بزرگ اس تیور اور رکھ رکھاؤ سے "علی الرغم" نماز پڑھین گے اور اس کے لئے آمادہ ہونگے گویا تمام دوسرے لوگ دوزخی ہین اور یہی نہین بلکہ ان بدقسمتون کے نام خدائی وارنٹ بھی آ گیا ہے۔ ایک حضرت ہین جن کا مقصد زندگی صرف یہ رہ گیا ہے کہ وہ مشہور لوگون کے ساتھ رہین اور ہمیشہ ان کے ساتھ دیکھے جائین وہ کھیلنے سے قطعاً نا آشنا ہونگے لیکن کپتان کے ساتھ رہین گے یا کہین کھیل ہو رہا ہو تو وہ گھوم پھر کے وہین رہین گے جہان کھلاڑی جمع ہون اور اپنے سوا کسی دوسرے کو وہان آنے

بھی نہ دین گے۔ اس سلسلہ مین ان کو دو چار پست قسم کے کام کرنے پڑین یا کپتان یا ٹیم والے اُن کو تفریحاً گالی دیدین یا ایک آدھ ہاتھ تفریحاً رسید بھی کردین تو وہ غالب سے نابلد ہونے کے باوجود غالب کے مسلک

دے وہ جسقدر ذلت ہم ہنسی مین ٹالین گے

کے پیرو نظر آئین گے، اب سوال یہ ہے کہ ان کو اس کا معاوضہ کیا حاصل ہوتا ہے، صرف یہ کہ وہ کپتان یا کھلاڑی یا دوسرے نمایان افراد سے بے تکلف ہین!! وہ ان کے بحث مباحثہ مین شریک ہونگے، کبھی کبھی اپنا کھانا منگاکر ان کے دسترخوان کے بھی شریک ہوجائین گے۔ ان کی عدم موجودگی مین دوسرون سے کھیل کا حال یا کھیل کا طریقہ یا کھیل کا فلسفہ اس طور پر بیان کرین گے گویا یہ خود اس مین شریک رہے ہین اور انھین کے نام پر ٹرافی حوالہ کی گئی ہے، پہلی بار تو خیر مجبوری ہے ٹرافی کپتان ہی کے ہاتھ مین دی جائے گی لیکن اس کے بعد پھر غریب ٹرافی ہے اور یہ ہین، تانگے پر ریل مین، پلیٹ فارم پر، چوراہے پر ہر جگہ ٹرافی انھین کے آغوش مین ہوگی۔ اس قسم کے لوگ یا اس قسم کی حرکتین صرف کھیل کود تک محدود نہین ہین بلکہ زندگی کے ہر شعبہ مین پائی جاتی ہین۔ مثلاً لکھنا پڑھنا، تقریر کرنا، فیل ہونا، کھانا، مانیٹری کرنا، اسٹرائک کرنا، مارنا، مارکھانا شادی کرنا، والدین بننا یا نان کو آپریشن کرنا وغیرہ وغیرہ۔

ایک صاحب اور ہین جن کا خیال ہے کہ ان کے علاوہ تمام دوسرے لوگ مغالطے مین مبتلا ہین، اگر ناظرین ان کا ٹھیک ٹھیک پتہ بتائین تو ہم وعدہ کرتے ہین اور یقین دلاتے ہین کہ اس صلہ مین یہ مضمون پتہ لگانے والے صاحب کے نام معنون کردیا جائیگا!

رشید احمد صدیقی (علیگ)

آج کی رات!

کتنی شاداب ہے دنیا کی فضا آج کی رات! کتنی سرشار ہے گلشن کی ہوا آج کی رات!
کتنی فیاض ہے رحمت کی گھٹا آج کی رات! کتنا مسرور ہے بندوں سے خدا آج کی رات!
کہ نظر آئے گی وہ ماہ لقا آج کی رات!

کیوں نہ گلزار میں اٹھلاتی پھرے موج نسیم کیوں نہ ہر پھول ہو لبریز بہارِ تسنیم!
کیوں نہ آمادۂ افلاک ہو پروازِ شمیم کیوں نہ ہر جلوہ بنے جلوہ گہ طور کلیم!
کہ انہیں دیکھیں گے ہم جلوہ نما آج کی رات!

آج کیا بات ہے دنیا کے نظارے خوش ہیں باغ میں پھول خوش آکاش پہ تارے خوش ہیں
ایک بے نام سی سرمستی کے مارے خوش ہیں ایک میں خوش ہوں کہ جتنے بھی ہیں سارے خوش ہیں
ہے خوشی، چار طرف جلوہ نما آج کی رات!

"غائبانہ" جو ہمیں "نامے" لکھا کرتی تھی!! دور سے ہمیہ دل اپنا جو فدا کرتی تھی!!
"داد اشعار" جو "گمنام" دیا کرتی تھی!! ہو کے بے پردہ جو پردے میں رہا کرتی تھی!!
سامنے ہوگی وہی شوخ ادا آج کی رات!

جسکی رنگینی سے افکار ہیں مدہوش مرے! جسکی الفت سے ہیں اشعار پر از جوش مرے!
جسکی فرقت میں خیالات ہیں غم کوش مرے! جسکے جلووں سے تصور ہیں ہم آغوش مرے!
گود میں ہوگی وہی حور لقا آج کی رات!

داستانِ دل بیتاب سنائیں گے انہیں آپ روئینگے، گلے مل کے رلائینگے انہیں
خود ہی پھر رونے پہ ہنس دینگے ہنسائینگے انہیں اور جرات کی تو سینہ سے لگائیں گے انہیں
نت نئے جذبوں کی ہے نشو و نما آج کی رات!

دل کی رگ رگ میں ہے بیتاب، محبت اسکی! آنکھ کے پردے پہ لہراتی ہے صورت اسکی!
خلوتِ روح میں آباد ہے الفت اس کی! میرے جذبات پہ طاری ہے لطافت اسکی!
اور کچھ یاد نہیں اس کے سوا آج کی رات!

واقفِ دردِ دلِ زار کریں گے ان کو!! غم الفت سے خبردار کریں گے ان کو

محرمِ خلوتِ اسرار کریں گے ان کو! گود میں لیں گے نہیں، پیار کرینگے ان کو!

دل کی رگ رگ سے یہ آتی ہے صدا آجکی رات!

مگر اظہارِ خیالات کریں گے کیونکر؟ شرم آتی ہے ملاقات کریں گے کیونکر؟

بات کرنی ہے مگر بات کرینگے کیونکر؟ ختم، یہ خواب کی سی رات کریں گے کیونکر؟

آہ! یہ آج کی! یہ خواب نما آج کی رات!

ہم میں کچھ جراءتِ گویائی بھی ہوگی کہ نہیں؟ ہمتِ ناصیہ فرسائی بھی ہوگی کہ نہیں؟

شرم سے دور، شکیبائی بھی ہوگی کہ نہیں؟ "یوسفِ دل" سے "زلیخائی" بھی ہوگی کہ نہیں؟

آج کی رات! اف او میرے خدا! آجکی رات!!!

اختر شیرانی

ضمیر

ضمیر — سرچشمۂ صداقت!
ضمیر — گلدستۂ محبت!
ضمیر — آئینۂ حقیقت!
ضمیر — مضرابِ سازِ فطرت!
تمام اوہام سے گذرنا
ضمیر کا احترام کرنا!

"ندائے ایام" — ہے تو یہ ہے
"سروشِ الہام" — ہے تو یہ ہے
"خدا کا پیغام" — ہے تو یہ ہے
بہت بڑا کام ہے تو یہ ہے
کبھی محالات سے نہ ڈرنا
ضمیر کا احترام کرنا

ضمیر — فاروقِ کفر و ایماں!
ضمیر — مسجودِ علم و عرفاں!
ضمیر — شرحِ پیامِ یزداں!
ضمیر — رازِ خدا و انساں!
اسی پہ جینا اسی پہ مرنا
ضمیر کا احترام کرنا!

جو "قلب" میں شعلۂ وفا ہے
جو آنکھ میں نورِ اتقا ہے
اگر تجھے الفتِ خدا ہے
"روش" جو تو بندۂ رضا ہے
تو وسوسوں پر نہ کان دھرنا
ضمیر کا احترام کرنا!

روش صدیقی

نالۂ جرس

(نوجوانانِ ہند کے لئے)

جھکے نہ ہند کا نشاں بڑھے چلو بڑھے چلو

عمل کے رازداں ہو تم جواں ہے دل جواں ہو تم جواں تمہارے حوصلے جواں تمہارے ولولے
تمہاری قوتیں جواں - بڑھے چلو بڑھے چلو
جھکے نہ ہند کا نشاں - بڑھے چلو بڑھے چلو

نہ مست ہو خیال میں نہ محو ہو جمال میں سراب رنگ و بو ہے یہ فریب آرزو ہے یہ
طلسم خانہ ہے جہاں - بڑھے چلو بڑھے چلو
جھکے نہ ہند کا نشاں - بڑھے چلو بڑھے چلو

سرور میں ملال میں عروج میں زوال میں قیود ماہ و سال میں غرض ہر ایک حال میں
مثال بحر بیکراں - بڑھے چلو بڑھے چلو
جھکے نہ ہند کا نشاں - بڑھے چلو بڑھے چلو

نہیں مآلِ زندگی مگر سوائے حریت یہ ہے سوال زندگی نہ لو بجائے حریت
ملے جو عمر جاوداں - بڑھے چلو بڑھے چلو
جھکے نہ ہند کا نشاں - بڑھے چلو بڑھے چلو

چمن میں سبزہ جاگ اٹھا ہر ایک ذرہ جاگ اٹھا رواں ہے جوئے آب بھی عجب نہیں سراب بھی
مثال موج ہو رواں - بڑھے چلو بڑھے چلو
جھکے نہ ہند کا نشاں - بڑھے چلو بڑھے چلو

ہر ایک شئے جہان کی زمین کی آسمان کی ہے سعی ناتمام میں ہے گردش مدام میں
ہمیشہ دور آسماں - بڑھے چلو بڑھے چلو
جھکے نہ ہند کا نشاں - بڑھے چلو بڑھے چلو

جہانِ انقلاب میں نجات جز عمل نہیں زمانِ اضطراب میں قرار کا محل نہیں
مثالِ گردِ کارواں۔ بڑھے چلو بڑھے چلو
جھکے نہ ہند کا نشاں۔ بڑھے چلو بڑھے چلو

بہت ہیں وار راہ میں بچھے ہیں خار راہ میں رُکے نہ پائے جستجو بجھے نہ شمعِ آرزو
کہ چل رہی ہیں آندھیاں۔ بڑھے چلو بڑھے چلو
جھکے نہ ہند کا نشاں۔ بڑھے چلو بڑھے چلو

گماں نہ ہو خطر نہ ہو مآل پر نظر نہ ہو شکایت اثر نہ ہو تمیزِ بحر و بر نہ ہو
نہ ہو سوالِ این و آں۔ بڑھے چلو بڑھے چلو
جھکے نہ ہند کا نشاں۔ بڑھے چلو بڑھے چلو

جو عقل راہ روک دے تو اسکا ساتھ چھوڑ دو جو مذہب آکے ٹوک دے تو اس کی قید توڑ دو
قدم بڑھاؤ مہرباں۔ بڑھے چلو بڑھے چلو
جھکے نہ ہند کا نشاں۔ بڑھے چلو بڑھے چلو

زمانہ اب بدل گیا وہ سحر تھا جو چل گیا بہار تھی نکل گئی ہوا اگر بدل گئی
تو ہو نہ خوگرِ خزاں۔ بڑھے چلو بڑھے چلو
جھکے نہ ہند کا نشاں۔ بڑھے چلو بڑھے چلو

اگر اندھیری رات ہے تو ہو، خدا کی ذات ہے ضیا ہے دل کے داغ کی بڑھا دو لَو چراغ کی
کہ بڑھ چلیں سپاہیاں۔ بڑھے چلو بڑھے چلو
جھکے نہ ہند کا نشاں۔ بڑھے چلو بڑھے چلو

گھٹا میں گھر کے آئی ہیں زوال بن کے چھائی ہیں نہ مضمحل ہو تم مگر ستارے چھپ گئے اگر
چمک رہی ہیں بجلیاں۔ بڑھے چلو بڑھے چلو
جھکے نہ ہند کا نشاں۔ بڑھے چلو بڑھے چلو

جو راہبر ٹھہر گئے! نہیں مقام پیش و پس جو ہم سفر بچھڑ گئے تو چھیڑ دو نالۂ جرس!
سنو جمیل کی فغاں۔ بڑھے چلو بڑھے چلو
جھکے نہ ہند کا نشاں۔ بڑھے چلو بڑھے چلو

(جمیل مظہری کاظمی)

ننھا ادیب

۱۔

جب بادِ صبا کے جھونکوں میں اک مستی رقصاں ہوتی ہے
جب شبنم آ کر چپکے سے سب پھولوں کے منھ دھوتی ہے
اک نرم پروں کے بستر میں جب چین سے لیٹا ہوتا ہوں
اور قدرت کے ان کھیلوں میں مَیں محوِ تماشا ہوتا ہوں
وہ دورِ فضائے مغرب سے اک چاند سا مکھڑا آتا ہے
میں چپکے چپکے تکتا ہوں وہ پاس مرے آجاتا ہے
پھر وہ زرّیں حرفوں میں کچھ سامنے میرے لکھتا ہے
میں نقل تو کرنا چاہتا ہوں پر ہاتھ قلم کھو دیتا ہے

مایوسِ تمنّا ہو کر میں
پھر چپکے سے رو دیتا ہوں

۲۔

جب بادل گھر کر آتے ہیں جب ٹھنڈی ہوا سی چلتی ہے
جب کھیتوں کی ہریاول سی اک خنکی پیدا کرتی ہے
جب بادِ صبا کی ٹھوکر میں اعجازِ مسیحی ہوتا ہے
اک لہر سی دل میں اٹھتی ہے اک جوش سا دل میں بھرتا ہے
جب کیف ترنّم بڑھتا ہے جب پودوں کے سر ہلتے ہیں
جب اہلِ چمن پر مستی کے آثار نمایاں ہوتے ہیں
میں ایک قلم لے لیتا ہوں اور ہات کو جنبش دیتا ہوں
جب حرفِ تمنّا لکھتا ہوں کوئی قلم لے جاتا ہے

مایوسِ تمنّا سا ہو کر
میں چپکے سے رو دیتا ہوں

۳۔

جب شامِ سیہ کی تاریکی سب دنیا پر چھا جاتی ہے
جب نیند کی ظالم بیہوشی سب بچّوں کو تھپکاتی ہے

جب بزم فلک پر تارے سے
کچھ جھل مل جھل مل کرتے ہیں
جب عبرت کی اس دنیا پر
خاموشی کے منظر ڈھلتے ہیں
اک ہاتھ کہیں سے آتا ہے
اور صفحوں کا غذ لاتا ہے
اور زور سے کہتا جاتا ہے
"اب لکھ جو لکھنا چاہتا ہے"
پر لکھنے سے اب ڈرتا ہوں
میں چپکے سے رو دیتا ہوں

نیاز جالندھری

یادِ ماضی

یاد ایام کہ جب کوئی شناسا ہی نہ تھا
ماسوا تیرے ہمیں کچھ نظر آتا ہی نہ تھا
منزلوں تک نظر آتے تھے نشان منزل
اسکو کیا کیجئے کوئی ڈھونڈنے والا ہی نہ تھا
قبل از وقت خدا جانے تھے کیا کیا ارماں
جب کھلی آنکھ تو سر میں کوئی سودا ہی نہ تھا
تیرے جلووں کی تمنا میں یہاں مر بھی چکے
تیرے نزدیک کوئی دیکھنے والا ہی نہ تھا
ہائے کب باغ کو تھی رنگ بہار انکی تلاش
جب کوئی قطرہ خون آنکھ سے ٹپکا ہی نہ تھا
پیش آیا ہی مقدر سے وہی اے ثاقب
عمر بھر میری نگاہوں نے جو دیکھا ہی نہ تھا

ثاقب جالندھری

غزل فرخ بنارسی

تجلی رخ روشن نہ نقاب عبث
حجاب حسن ہیں جلوے تو پھر حجاب عبث
یہاں سکوت میں ہے دل کا مدعا حاصل
وہاں سوال کا سمجھے ہیں وہ جواب عبث
تری نگاہوں کی گردش سے مست ہیں ساقی
ہمارے واسطے ہے ساغر شراب عبث
غرور حسن انہیں ہم کو پاس خودداری
یہاں سوال عبث ہے وہاں جواب عبث
رہے نہ ہوش بجا شوق دید میں فرخ
اب انکو سامنے آنے میں ہے حجاب عبث

غزلیات

انعام زبیری

کیا جانوں تلخ کامی اغماض و اجتناب — برسوں نگاہِ لطف کا خوگر رہا ہوں میں
ہاں مجھ کو ربطِ حسن و محبت کی کیا خبر — بس اتنا جانتا ہوں غلام آپکا ہوں میں
بے مہر ہونے پہ بھی ہے گمانِ وفا مجھے — مجبور اپنے دل سے کچھ اتنا ہوا ہوں میں
اب جاتا ہوں رخصت یک سجدہ بھی بہت — گو در پہ تیرے ناصیہ فرسا رہا ہوں میں
تجدیدِ عہد کی ہے تمنا کہ آج پھر — پیدا ہر ایک ذرہ سے دل کر رہا ہوں میں
غمہائے روزگار سے صورت بدل گئی — پہچانئے تو آپ قدیم آشنا ہوں میں

انعام کیا بتاؤں گذرتی ہے کس طرح
خمیازہ ہائے عشق بتاں کھینچتا ہوں میں

حافظ غازی پوری

رعبِ حسنِ یار سے، میں ساکت و خاموش تھا — دل مگر آئینہ دارِ "جلوہ ہائے دوش" تھا
"لن ترانی" جزوِ احساس شباب حسن ہے — کوئی کیوں رہنِ فریب فطرت خاموش تھا
چل پڑا میں در سے سنکر نوائے ذوق شوق — ہر نفس گویا مرا رختِ سفر بر دوش تھا
یاد ہیں مجھ کو وہ سب "عنوان الفت" کے مزے — "بے محابا" جب کوئی ہمت ربائے ہوش تھا
بن گیا خود عشق پیشِ حسن اک تصویرِ شوق — عرضِ مطلب کون کرتا، کسکو اتنا ہوش تھا
گونج اٹھی ہنگامۂ احساس سے ساری فضا — "نغمۂ دل" میں خدا جانے کہاں کا جوش تھا
عرصۂ ہستی میں ہے جو آج پابندِ قیود — جلوہ گاہ ناز میں کل وہ نظارہ کوش تھا

ہو گیا برباد الفت حافظِ شوریدہ سر
پردۂ دنیا پہ وہ نقشِ اذیت کوش تھا

طالب باغپتی

دیکھنا اہل نظر اس دل کی قسمت دیکھنا ... بیوفا اس کو بتاتے ہیں یہ تہمت دیکھنا!
چارہ گر پہلے مرض تشخیص کرنا چاہیے ... انکی صورت دیکھ لو پھر میری حالت دیکھنا!
وہ ہنسے اظہار غم پر میں یہ سمجھا خوش ہوئے ... ان جفاؤں پر مرا حسن عقیدت دیکھنا!
اپنی صورت میں انہیں بھی دیکھنے کا قصد ہے ... دیکھنے والو مرا معیار حیرت دیکھنا!
یہ بھی اک ضد ہے وفاداری کی مجھے شرط ہے ... میری تاثیر محبت انکی نیت دیکھنا!
غیر سے کہتے ہیں ہنسکر انکی حالت پوچھنا ... یہ ستم آمیز اظہار محبت دیکھنا!

امتحاں گاہ عمل ہے کشمکش زار حیات
طالب اسمیں عین نادانی ہے راحت دیکھنا

ناصر حبیب

پیچ ہوں گیسو میں گیسو بنکے پیش شانہ میں ہوں ... آجکل مصروف پھر دل اپنا الجھانے میں ہوں
کہہ رہی ہے کیفیت یہ چشم میگوں کی تری ... میں ہی صہبا میں ہوں ساغر میں ہوں پیمانہ میں ہوں
ایکدن دیکھو گے تم نخل ثمر افشاں مجھے ... میں نہال نادمیدہ ہوں مگر دانے میں ہوں
دور ہوں اہل وطن سے کون ہے پرساں مرا ... وحشی الفت ہوں آوارہ ہوں ویرانے میں ہوں
کون ہے آگاہ میری قدر و قیمت سے یہاں! ... ایک گنج مایہ ہوں لیکن میں ویرانے میں ہوں
تم اگر ہو حسن بنکر شمع محفل میں نہاں ... سوز الفت کی طرح پنہاں میں پروانے میں ہوں

بلبل و گل سنکے ناصر مجھ کو حیرت میں ہے
میں وہ رنگیں داستاں دنیا کے افسانے میں ہوں

نظیر لودھیانوی

تیرے خنجر کی روانی یاد آتی ہے مجھے! ... موج آب زندگانی یاد آتی ہے مجھے
ذبح ہوتا کاش تیرے ہاتھ سے اک بار پھر ... زیر تربت عمر فانی یاد آتی ہے مجھے
میری قیمت ایک مشت خاک ہے بازار میں ... آج اپنی وہ گرانی یاد آتی ہے مجھے

کھولتا ہے غنچہ جب گلزار میں اپنی کتاب — خونچکاں دل کی کہانی یاد آتی ہے مجھے
جب سناتا ہے کوئی ہمدرد وفا کی داستاں — آپ کی نامہربانی یاد آتی ہے مجھے
خاکساروں سے تجھے جب دیکھتا ہوں ہم سخن — برق کی شعلہ زبانی یاد آتی ہے مجھے
آج کل مقتل میں تجھ کو دیکھکر خنجر بکف — اکثر اپنی بدگمانی یاد آتی ہے مجھے
شمع اپنی آگ سے خود جل کے ہوجاتی ہے خاک — اہل دل کی سخت جانی یاد آتی ہے مجھے

صحن گلشن میں تری آواز سن کر اے نظیر
بلبلوں کی نغمہ خوانی یاد آتی ہے مجھے

ایک ادبی و علمی دعوت

جنوری ۱۹۲۸ء کی اشاعت نگار کو مومن کے لئے مخصوص کرکے میں نے اپنے آپکو گویا پابند بنا لیا ہے کہ ہر سال کسی نہ کسی ایسے شاعر کی یاد کو تازہ کیا جائے جس کے مٹانے میں زمانہ نے اپنی پوری قوت صرف کر دی ہے۔

چنانچہ ارادہ ہے کہ جنوری ۱۹۳۰ء کا نگار، ابو المظفر سراج الدین بہادر شاہ ظفر کیلئے مخصوص کر دیا جائے اور کم از کم ۲۰۰ صفحات کو محیط ہو اس سلسلہ میں جو عنوانات قایم کئے گئے ہیں، یہ ہیں :-

(۱) ظفر کی سیرت اور اس کے عہد کے تاریخی خصوصیات (۲) عہد ظفر کے سیاسیات (۳) ظفر کی شاعری اور اسکی خصوصیات (۴) عہد ظفر میں دہلی کی شاعری (۵) ظفر کی شاعری پر سیاسیات وقت کا اثر (۶) دربار ظفر اور عہد ظفر کے شعراء (۷) ظفر کے عہد میں دہلی کی علمی و ادبی فضا (۸) ظفر رنگون میں (۹) حالی و آزاد کی رائے ظفر کی شاعری کے متعلق اور اسپر محاکمہ (۱۰) انتخاب کلام ظفر

اُمید ہے کہ ملک کے ارباب علم و ادب

عنوانات بالا میں سے کسی عنوان پر یا ایک ہی مضمون کے سلسلہ میں ان تمام یا چند عنوانات پر اپنی تحقیقات و معلومات بھیجکر ممنون فرمائینگے۔ انتخاب کلام ظفر کی خدمت ادارۂ نگار نے اپنے ذمہ لی ہے اسلئے اسپر کسی کو وقت صرف کرنیکی ضرورت نہیں۔

اسی سلسلہ میں غالباً یہ عرض کر دینا بے محل نہوگا کہ بہترین مضمون کیلئے نگار کی طرف سے ایک حقیر ہدیہ **سو روپیہ کا پیش کیا جانا قرار پایا ہے**۔ جو کامیاب مضمون نگار کی خدمت میں ٹھیک ۵ جنوری ۱۹۳۰ء کو روانہ کر دیا جائیگا۔ زیادہ سے زیادہ ۳۰ ستمبر ۱۹۲۹ء تک مضامین کا دفتر نگار میں پہونچ جانا ضروری ہے۔

نیاز فتحپوری (اڈیٹر نگار) لکھنؤ

باب الاستفسار

لفظ "سلطان" کی تاریخی تحقیق

(جناب عبدالباسط صاحب - کانپور)

کیا آپ آگاہ فرما سکتے ہیں کہ لفظ سلطان کا صحیح مفہوم کیا ہے اور کب سے اور کیوں یہ معنے بادشاہ و حکمران استعمال ہونے لگا۔ میں ممنون ہونگا اگر آپ تاریخی تحقیق سے مطلع فرمائیں۔

(نگار) کلام مجید میں لفظ سلطان متعدد جگہ استعمال ہوا ہے، کسی جگہ اس کی نسبت انبیاء سے کی گئی ہے اور کہیں شیاطین سے اور ہر جگہ اس کا مفہوم "اختیار، قدرت، قبضہ، تسلط" یا دلیل و حجت لیا گیا ہے۔

سورۂ ابراہیم میں انبیاء کی زبان سے کہلوایا ہے کہ وما کان لنا ان نأتیکم بسلطان الا باذن اللہ۔ یعنی ہم کوئی دلیل و حجت بغیر اذن خداوندی کے تمہیں نہیں لاسکتے تھے۔ دوسری جگہ اسی سورت میں شیطان کہتا ہے کہ "وما کان لی علیکم من سلطان" یعنی مجھے تم پر کوئی اختیار و تسلط نہ تھا۔ اسی طرح سورۂ انعام، سورۂ الاعراف اور سورۂ نور میں شیطان کا یہ عدم اختیار حسب ذیل آیتوں سے ظاہر کیا گیا ہے:-

ان عبادی لیس لک علیہم سلطان ــــــ انہ لیس لہ سلطان علی الذین آمنو۔

وما کان لہ علیہم من سلطان ــــــ اہل لغت نے بھی اس کے معنی "حجت و برہان" لکھے ہیں اور چونکہ حکومت وقت اپنے قبضہ و اقتدار کی وجہ سے "برہان من اللہ" سمجھی جاتی تھی اسلئے اس کو سلطان کہنے لگے۔

احادیث میں بھی سلطان کا لفظ بہ معنے حکومت وقت مستعمل ہوا ہے۔ ترمذی کی ایک حدیث ہے:- السلطان ولی من لا ولی لہ (جس کا کوئی ولی نہیں حکومت وقت اس کا ولی ہے) اور السلطان ظل اللہ فی الارض کی حدیث تو کھلی ہوئی موجود ہی ہے، جسے العتبی نے اپنی کتاب الیمینی میں نقل کیا ہے اور اس کے شارح المنینی نے بہ سلسلہ روایت عبداللہ ابن عمر تک پہونچایا ہے۔

عربی انشاء میں چوتھی صدی ہجری کے اخیر تک لفظ سلطان، ہر جگہ نظام حکومت کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ لیکن بعد کو عمال اور خلفاء کے لئے بھی اس کا استعمال ہونے لگا، چنانچہ خلیفہ منصور، خلیفہ الموفق اور خلیفہ القادر خطبوں میں سلطان

کے لقب سے یاد کئے جاتے تھے۔

الغرض حکومت کے بجائے حکمران کو سلطان کہنا ابتداءِ اسلام کی بات نہیں ہے بلکہ یہ تغیر بعد کو ہوا ہے۔ ابن خلدون کا بیان ہے کہ جعفر برمکی بھی سلطان کہلاتا تھا اور بعد کو غاصبین خلافت بھی امیر الامرا اور سلطان کے لقب سے یاد کئے جانے لگے۔ خاندان بویہ اور غزنوی خاندان کے حکمراں بھی یہی لقب اختیار کر لیا تھا۔ ابن اثیر کا بیان ہے کہ محمود غزنوی کو یہ لقب خلیفہ القادر نے دیا تھا، لیکن العتبی نے اس لقب کے دیے جانے کا ذکر کہیں نہیں کیا گو اس نے محمود غزنوی کے تمام القاب شمار کرا دیے ہیں۔ خاندان غزنی میں سب سے پہلے جس نے سکہ میں لفظ سلطان کا اضافہ کیا وہ ابراہیم تھا۔ خلفاء فاطمیین نے بھی اپنے آپ کو سلطان الاسلام کہلوایا، اور اسی زمانہ میں بویہ فرمانرواؤں نے سلطان الدولہ کا لقب اختیار کیا۔ خاندان بویہ کا آخری فرمانروا الملک الرحیم بھی سلطان کہلاتا تھا لیکن جب طغرل بیگ سلجوقی نے اس سے سلطنت چھین لی تو دربار خلافت سے سلطان رکن الدولہ کا لقب اسے عطا ہوا۔ طغرل بیگ ہی پہلا سلطان فرمانروا تھا جس نے اپنے سکوں میں سلطان المعظم منقوش کرایا اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سلجوقی فرمانروا ہی شاید سب سے پہلے حکمراں تھے جنہوں نے باقاعدہ اس لقب کو اختیار کیا۔ المعظم کے لفظ کا اضافہ ہی اس لئے کیا گیا تاکہ اس لفظ کا مفہوم ہی بجائے حکومت کے حکمراں سمجھا جائے۔ بعد کو لفظ المعظم حذف کر دیا گیا اور شاہان سلجوقی کا شاہانہ لقب صرف سلطان رہ گیا۔ سلجوقیوں کے بعد خوارزم شاہی خاندان نے یہ لقب اختیار کیا اور صرف جلال الدین خوارزم شاہ ایک ایسا کمزور فرمانروا اس خاندان کا تھا جس کے سلطان ہونے کو خلیفہ الناصر نے منظور نہ کیا۔ اس کے بعد سلاجقہ روم نے بھی اپنے آپ کو سلطان کہلوایا اور اسی زمانہ میں پہلا ایوبی فرمانروا صلاح الدین سلطان لکھا جانے لگا۔ لیکن اس خاندان کے اور فرمانروا سلطان نہیں کہلائے صرف الملک کے لقب سے یاد کئے گئے۔ خلفاء عباسیہ کے عہد تک سلطان کا لقب انہیں کی طرف سے دیا جاتا تھا، لیکن زوال بغداد کے بعد بہت سی چھوٹی چھوٹی مسلم ریاستوں نے یہ لقب اختیار کر لیا۔ اور اس کے الفاظ اعظم اور عادل وغیرہ کا بھی اضافہ کیا اور اس عہد کے مورخین نے بھی انہیں اسی لقب سے یاد کیا۔ اور علماء فقہ نے اس کے جواز میں بہت سے نظریے اختراع کئے۔

سلطنت عثمانیہ (ترکی) میں سب سے پہلے سلطان کا لقب خلیفہ قاہرہ کی طرف سے بایزید کو دیا گیا (اس سے قبل صرف امیر کہلاتے تھے) فتح قسطنطنیہ کے بعد محمد ثانی نے اپنے آپ کو سلطان البرین والبحرین کہلوایا اور جب سلطان سلیم نے ملوک سلطنت کو فتح کر لیا تو پھر سلاطین عثمانیہ متفقہ طور پر سلطان تسلیم کئے جانے لگے۔ صفوی خاندان کے فرمانروا کاغذات سرکاری میں اپنے آپ کو سلطان لکھواتے تھے لیکن وہ ہمیشہ شاہ کہلوائے اور اب تک ایران کا فرمانروا شاہ ہی کہلاتا ہے۔

ترکی میں علاوہ فرمانروا کے شاہزادگان اور خاص خاص امرا بھی سلطان کہے جاتے تھے۔ عبدالحمید ثانی کے عہد میں یمن کے گورنر بھی اپنے علاقوں میں سلطان کے ہی لقب سے یاد کئے جاتے تھے لیکن پایۂ تخت میں آنے کے بعد وہ اس لقب کا استعمال اپنے نام کے ساتھ نہیں کر سکتے تھے۔ ترکی میں یہ لفظ سلطان ہمیشہ فرمانروا کے نام سے قبل بڑھایا جاتا تھا۔ لیکن شاہزادوں کے نام کے بعد۔ ایران میں بھی گورنروں کو سلطان کہا کرتے تھے۔

مصر میں ملوکوں کے انتزاع سلطنت کے بعد سے اس لفظ کا استعمال ترک ہوگیا تھا لیکن اب پھر اس کا استعمال ہونے لگا ہے اور موجودہ فرمانروائے مصر سلطان فواد کہلاتا ہے۔ مراکش میں فلالیا شرفانے سب سے پہلے اس لقب کو اختیار کیا۔
مشایخ صوفیہ کو بھی تیرھویں صدی عیسوی کی ابتدا سے سلطان کہنے کا رواج ہوا، لیکن خصوصیت کے ساتھ ایشیائے کوچک اور دیگر مقبوضات ترکی میں۔ ممکن ہے کہ پہلے یہ لفظ لقب کی صورت سے استعمال نہ کیا گیا ہو بلکہ دوسرے لفظ کا جز ہونے کی حیثیت سے استعمال ہوا ہو جیسے سلطان العاشقین، سلطان العلماء وغیرہ اور بعد کو اس خیال کی بنا پر کہ درویش بھی اپنے اقتدار کے لحاظ سے بادشاہ ہے اُسے سلطان کے لقب سے یاد کرنے لگے۔

معلومات

قیامت کی علمی توجیہ

کائنات میں حیات کا وجود خدا جانے کب سے ہے اور سائنس کا نہایت مہتم بالشان نظریہ کہ قوت وماده کو فنا نہیں ہمارے کرۂ ارض کے باب میں بھی صحیح ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آفتاب کی کرنیں بیکار سا کائنات کا طواف کیا کرتی ہیں کیونکہ انکی قوت کا نہایت ہی حقیر حصہ حیات ارضی کو قایم رکھنے کے کام آتا ہے لیکن یہ بھی یقین ہے کہ آفتاب کی شعاعوں کی قوت سب کی سب کائنات میں صرف ہو جاتی ہے اور مختلف قسم کی قوتوں میں تبدیل ہو جاتی۔ اس حد تک تو یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے لیکن اس کے علاوہ جو کچھ ہے اس میں ہم بالکل اندھے کی طرح ہیں۔ گمان ہی کیا جاتا ہے کہ زمین اپنے وجود کو بھی کبھی اسی طرح غارت کر دے گی جس طرح اور کرے غارت ہو کر زمین کے وجود کا باعث ہوئے۔ یعنے نظام آفرینش کا یہ سلسلہ کہ برقپاروں سے ذرات اور ذرات سے عناصر پیدا ہوتے ہیں الٹ جائیگا۔ یہ ہے نہایت ہی سادہ اور منطقی توجیہ قیامت کی۔ لیکن کیا اس سے قبل جو بیان کیا جاتا تھا کہ زمین کسی اور کرہ سے ٹکرا کر تباہ ہو جائے گی، صحیح نہیں نظریہ کے لحاظ سے تو یہ غلط نہیں، لیکن عملاً اس کا امکان بہت مستبعد ہے کیونکہ باہم کروں کے درمیاں بہت فصل پایا جاتا ہے اور اب اہل سائنس اس مسئلہ پر غور کرنا تضیع اوقات خیال کرتے ہیں۔

جغرافیہ طبعی کے مطالعہ میں بہت سے دلچسپ مناظر ایسے سامنے آتے ہیں جنسے انجام زمین کے سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے۔ یہ غالباً ہر شخص کو معلوم ہے کہ زمین کے بیرونی خشک چھلکے کے نیچے ایک رقیق و ملتہب مادہ چکر کھا رہا ہے۔ علمائے طبقات الارض کی تحقیق ہے کہ عناصر کا وجود دس ہزار سنٹی گریڈ کے درجۂ حرارت تک ممکن ہے اور زمین کا چھلکا جس میں یہ عناصر پائے جاتے ہیں۔۔ ۱۲۰ کلومیٹر دبیز ہے۔ زمین کا مرکزی مادہ منجمد خیال کیا جاتا ہے اس لئے اس مرکزی منجمد مادہ اور چھلکے کے درمیان کا حصہ گرم اور رقیق مانا گیا ہے جو آہستہ آہستہ خشک ہو کر زمین کے چھلکے کو موٹا کرتا جاتا ہے اور ایک زمانہ

آئے گا جب یہ سارا گرم اور رقیق مادہ سرد ہو جائیگا زمین کی حالت چاند کی سی ہو جائے جہاں سوائے برف کے پہاڑوں اور میدانوں کے کچھ نظر نہیں آتا اور عناصر حیات مفقود ہو گئے ہیں۔

دوسرا نظریہ زمین کے فنا ہونے کے متعلق وہ ہے جس کا تعلق شعاعوں سے ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ علاوہ ان شعاعوں کے جو ہمیں نظر آتی ہیں اور بھی غیر مرئی شعاعیں موجود ہیں۔ انہیں میں سے ایک قسم کی شعاع وہ ہے جو ۱۸۰ سنٹی میٹرہ بیر سیسہ کی تختی میں نفوذ کر جاتی ہے اور اسکا اثر حیات عضوی پر بہت خراب پڑتا ہے۔ اس کا تجربہ کیا گیا ہے کہ اگر کسی جانور کو ۱/۲ سکنڈ وقت کے لئے اس شعاع کے سامنے رکھا گیا تو اس کی جلد پر جلنے کے علامات نمایاں ہونے لگے۔ اس شعاع کے دریافت کرنے والے کا خیال ہے کہ ساری فضا اس شعاع سے لبریز ہے اور خدا جانے اس سے قبل کب تمام آثار حیات اس شعاع کی وجہ سے مفقود ہو جاتے۔ لیکن بات یہ ہے کہ یہ شعاع ذروں سے ٹکراتی ہوئی آتی ہے اور اس طرح اس کے تموج کی لمبائی بڑھ جاتی ہے اور زمین تک پہونچتے پہونچتے وہ بے ضرر ہو جاتی ہے۔

الغرض کرۂ ارض کے باشندے ہر وقت خطرہ میں ہیں۔ اوپر سے ہر وقت مہلک شعاعوں کا نزول ہوتا رہتا ہے۔ زمین کے نیچے پگھلا ہوا مادہ زلزلوں وغیرہ کی صورت میں ٹکراتا رہتا ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ کب اور کس طرح کرۂ زمین کے جاندار تباہ ہو جائیں۔

۱۹۸۰ء کی زندگی موجودہ علوم و فنون کی ترقی کو دیکھتے ہوئے حکم لگایا جا سکتا ہے کہ پچاس سال کے بعد انسان کی معاشرت کا کیا رنگ ہو جائے گا۔ ذیل میں ایک تاجر کی مفروضہ ڈائری کا ایک ورق زیادہ وضاحت کے ساتھ بتائے گا کہ مستقبل کے معاشرتی تغیرات کیا ہونگے۔

۱ر جنوری ۱۹۸۰ء۔ توبہ، کس قدر تکلیف دہ ہے کہ مجھے آج اپنی ڈائری کا صفحہ سیاہی سے بڑے بڑے حروف میں لکھنا پڑتا ہے میرا ریڈیو برقی قلم غالباً میری بیوی اپنے ساتھ نیویارک لیگئی تھیں۔ وہ گذشتہ شب کو وہاں سے ہوائی اکسپرس پر روانہ ہوکر صبح یہاں پہونچیں اور بغیر ملے ہوئے اب وہ تفریحی ہوائی جہاز پر تاش کھیلنے لندن چلی گئیں ہیں۔ آج شام کو وہ واپس آئینگی تو دریافت کرونگا۔ ہاں مجھے یہ بھی تو کہنا ہے کہ جارج کل صبح ناشتہ نہیں کریگا۔ کل جب جانسبرگ سے اسنے مجھ سے گفتگو کی تو وہ کچھ مضمحل سا معلوم ہوتا تھا، اسلئے میں نے اس سے کہا کہ فضائی اکسپرس سے روانہ ہوکر یہاں آجائے اور چند دن تفریح کرے۔

۱ر جنوری ۱۹۸۰ء جارج گھر واپس گیا۔ میں برلن کے دفتر میں نہ جاؤنگا۔ برلن میں جو نیا خریدار ہے اسکو ٹیلی وائزن (   ) کے ذریعہ سے دیکھ لونگا۔ مگر اس آلہ میں ابھی اور ترقی کی ضرورت ہے بعض دفعہ صورت غلط نظر آتی ہے جس طرح اگلے زمانہ میں ٹیلیفون کے نمبر غلط ہو جاتے تھے۔

۱۲ر جنوری ۱۹۸۰ء وائنا کے دفتر میں دو سخت محنت کے دن بسر کئے، اب گھر جانا چاہیئے۔ مگر میرا ہوائی موٹر کچھ بگڑ گیا ہے۔ اسی وجہ سے ایک گھنٹہ پیرس میں دیر ہو گئی تھی اور وہاں اترنا پڑا تھا جہاں بیس سال قبل ایفل ٹاور قائم تھا۔ یہاں کھانے کیلئے

بجھا بجھا سا ہوں شب بیتی پڑی۔

۱۹۶۰ء ۲۸ جنوری جان کا بجز انتظام کرنا چاہئے وہ تعلیم کے وقت بھی فٹ بال کھیلا کرتا ہے۔ اس کو بیرے قدم بقدم چلنا چاہئے تاکہ وہ بھی کسی وقت میری طرح بیک وقت روئے زمین میں پھیلے ہوئے یا [illegible] ممتاز کا انتظام کر سکے۔ آج صبح کو ناشتہ کی میز پر بصری خبر رساں فیتہ کے ذریعہ سے معلوم ہوا کہ وہ میوبچے میں مصروف لہو و لعب ہے اور وہاں سے فارغ ہو کر شام کو روم چلا جائے گا۔

۱۹۶۰ء ۲۹ جنوری رات گرم ہے اس لئے میں سقف شمسی پر آرام کروں گا اور آلہ "حاجب صدا" لگا دوں گا تاکہ شور کان تک نہ پہونچے۔ نیچے سڑکوں کے شور سے تو میں نہیں گھبراتا لیکن یہ جو سر کے اوپر فضا میں رات دن دو سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے موٹروں اور جہازوں کا ہنگامہ پیدا ہوتا ہے۔ اس سے سخت تکلیف ہوتی ہے۔

۱۹۶۰ء ۳۰ جنوری آج جان کی سالگرہ ہے۔ میں نے اس کو ایک جیبی منظار ٹیلی فون دیا اور اس کی ماں نے ایک بلوری واسکٹ تحفۃً دی ہے۔

۱۹۶۰ء ۳۱ جنوری آج چند لوگوں کی دعوت ہے اور کھانا قدیم طریقہ سے پکایا جائے گا۔ آج سارا دن میری بیوی نے میوزیم میں صرف کیا تاکہ کھانا پکانے کا قدیم طریقہ سیکھے۔ چونکہ مجھے معلوم ہے کہ کھانا کھانے کے قابل نہ ہوگا اس لئے میں نے حکم دیا ہے کہ معمولی کھانا بھی جس طرح روز تیار کیا جاتا ہے۔ پکایا جائے۔ پہلے لوگ بھی کس قدر عجیب تھے کہ گوشت کی بوٹیاں کھاتے تھے اس لئے انہیں ڈاکٹروں کی ضرورت زیادہ ہوتی تھی۔ ان کی عمر کا اوسط اسّی سال ہوتا تھا۔ [illegible]ی عمر اس وقت ۵۵ سال کی ہے اور ابھی جوان بھی نہیں ہوا۔

آپ کے فائدہ کی بات

آئندہ سال [illegible] سولھویں جلد کا پہلا پرچہ ہوگا۔ خریداران نگار میں بہت سے حضرات ایسے ہیں جن کا چندہ جون کے رسالہ کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے اور جولائی سے ان کا نیا سال شروع ہوتا ہے اس لئے اگر آپ کا چندہ جون میں ختم ہو جاتا ہے اور آپ آئندہ خریدار رہنا پسند فرماتے ہیں تو چندہ (پانچ روپیہ) [illegible] بھیج دیجئے اس سے آپ کو ایک فائدہ تو یہ ہوگا کہ وی۔ پی کے زائد مصارف سے بچ جائیں گے، اور دوسرا بڑا فائدہ یہ ہے کہ "تذکرہ [illegible]" [illegible] قیمت [illegible] پانچ [illegible] میں محصول وی۔ پی کر دیا جائے گا۔ اگر آپ اس سے قبل سالانہ قیمت [illegible] بھیج چکے ہیں تو آپ کو [illegible] کی قیمت علاوہ محصول ایک روپیہ ہے [illegible] محصول [illegible] مل جائے گی [illegible] کے ساتھ [illegible] [illegible] آنہ ہے [illegible] پیش کیا جائے گا۔ [illegible] خریداری [illegible] [illegible]

[illegible] — منیجر نگار لکھنؤ

علم بڑی دولت ہے آؤ آج اسے بھی نصف قیمت پر خرید لو
اپنا روپیہ صرف آن واحد میں دوگنا کرلو
نصف قیمت
یہ موقع
اس رسالہ کے خریداروں کو آج پہلی مرتبہ دیا گیا ہے
جس دن یہ رسالہ آپ کو مل جائے ایک ہفتہ کے اندر اندر اپنا آرڈر ڈاک میں رعایتی کتابوں کے منگانے کے لئے ضرور بھیج دیجئے
آرڈر لکھتے وقت رسالہ کا حوالہ ضرور دیجئے۔ بغیر رسالہ کے حوالہ کے کتابیں نصف قیمت پر نہ بھیجی جائینگی
نصف قیمت کے علاوہ چند دیگر شاندار رعائتیں
(۱) دس روپے کے خریدار کو دو روپے کی کتابیں اس فہرست میں سے جو وہ چاہیں مفت دی جائیں گی (۲) بیس روپے کے خریدار کو چھ ماہ کے لئے انتخاب لاجواب مفت دیا جائیگا۔ (۳) چالیس روپے کے خریدار کو ایکسال کے لئے رسالہ انتخاب لاجواب مفت دیا جائیگا۔ (۴) پچاس روپے کے خریدار کو محصول ڈاک معاف کیا جائے گا۔
اس سے زیادہ اور کیا رعایت ہو سکتی ہے؟
ضرور کوئی نہ کوئی کتاب منگا کر علمی قدردانی کا ثبوت دیجئے
منیجر انتخاب لاجواب لاہور

مکمل مرغی خانہ ۴عہ ۱ر	اس فہرست میں تمام اصل قیمتیں درج کی گئی ہیں!!	صابون سازی عہ، ایک روپیہ

ہمارے چند تازہ ناول

- عصمت کا البم ۸/
- ذبیح فاطمہ ۶/
- دلیر عاشق ۴/
- فیروز محمودہ ۱۲/
- معشوقہ غدر ۸/
- ظالم عاشق ۶/
- آستانہ کی حور ؏
- چھلاوہ عہ/
- ماں کا قاتل ؏
- حمیدہ بانو ۸/
- ولایتی بھوت ۸/
- نقاب پوش ڈاکو ۴/
- عشرت شباب
- اسلام کی پہلی دوسری تیسری چوتھی کتاب قیمت ۳-۴-۵-۶-آنے

مادر ہند
مصنفہ مس میئو
قیمت تین روپے
(سے)

- خونی ہیرا مکمل ۱عہ
- خونی فہرست ۱۲/
- بحری جاسوس ۱۴/
- بکھرے موتی دو حصہ ؏
- طلسمی ہیرا ۱۴/
- خونی داستان ۱۲/
- شاہی جاسوس ۱۲/
- خونی انتقام ۱۴/
- ترچھی چتون عہ/
- بدبخت لیڈی ہر سہ حصے سے/
- انارکلی ۸/
- تصویر حسرت ۱۲/
- جانباز عاشق ۱۴/
- خونی انتقام ۱۴/
- روح لیلےٰ ۱۴/

- لیڈرا جاسوس ۱۴/
- خونی رومال ہر دو حصے ؏
- تشنۂ خون ۸/
- حسن انجلینا عہ/
- فردوس بریں عہ/
- ملک العزیز ورجنا عہ/
- حسن بن صباح ۴/
- منصور موہنا عہ/
- اسمٰعیل صفیہ ۴/
- خوبصورت ناگن ۱۴/
- خضر شباب عہ/
- عاشق شیطان ؏
- برق غضب ۱۲/
- بلوری آنکھیں عہ/
- قدسیہ یا پاکدامن ۶/

- پریتم کی تلاش ۴/
- سلیمان عذرا ۶/
- کمسن بی بی مسن شوہر ۴/
- کمسن شوہر مسن بی بی ۴/
- پیرس کا گنڈا عہ/

بچوں کی چند کتابیں

- بچوں کے گیت ۱۲/
- سندھ باد جہازی ۴/
- گلیور صاحب کی سیاحت ۴/
- اخلاقی کہانیاں ۱۲/
- جادو کی پہیلی ۴/
- اسلام کی پہلی دوسری تیسری چوتھی کتاب قیمت ۳-۴-۵-۶-آنے

رسالہ انتخاب لاجواب
کے گذشتہ سالانہ فائل
قیمت فی فائل چھ روپے
(ہے)

منیجر انتخاب لاجواب لاہور

بیج بیجنے۔ کھاد پانی یا آبپاشی۔ بارانی کاشت کی اور صلاحیتی ہلوں پر مختلف باب ہیں ایک واقف فن کے علم و تجربہ کا نتیجہ ہے (با تصویر) عہ

کیمیائے زراعت شمس العلما خان بہادر سید امداد امام صاحب نے یہ جامع کتاب فن زراعت پر بڑی قابلیت سے لکھی ہے تمام قابل کاشت غلوں اور ترکاریوں وغیرہ فصلوں کے بونے اور ان سے زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کرنیکی تدابیر درج ہیں فصلوں اور زراعتی چیزوں کے تمام انگریزی میں لکھے ہیں۔ مسٹر محمد حسین اسسٹنٹ ڈائرکٹر کی رائے ہے کہ اس سے بہتر کتاب میری نگاہ سے نہیں گذری۔ عہ

کاشت آلو آلو کی فصل کس طرح بہت عمدہ پیدا ہو سکتی ہے تمام تدابیر کاشت وغیرہ قیمت — ۲ر

ترکاریاں باتصویر یعنی خانہ باغ حصہ سوم اس کتاب میں ہندوستان اور ممالک غیر کی ایسی تمام ترکاریوں کی کاشت پرورش نگہداشت اور ان سے فائدہ حاصل کرنے کی ترکیبیں درج ہیں کہ جو ہندوستان میں کاشت ہوتی ہیں یا ہو سکتی ہیں یہ یقین ہے کہ کوئی ترکاری یا سبزی ایسی نہیں ہوگی جسکی پوری کیفیت اس کتاب میں درج نہیں کی گئی کل تصاویر قریباً (۶۰) اور (۱۱۲) صفحہ میں قیمت عہ

بول چال اور حوالہ کی کتابیں

فارسی بول چال جس میں زمانہ حال کی فارسی زبان کے سیکھنے اور بولنے کا طریقہ بہت سی جدید لغات اور محاورات کے ذریعہ سے بتایا گیا ہے جو فارسی آجکل ایران میں بولی جاتی ہے اسمیں ترکی۔ روسی فرانسیسی اور اجنبی زبانوں کے لفظ اور غیر مانوس محاورات میں ایسے جو بکثرت پہلے دو ہزار الفاظ اور کئی محاورات ہیں بالمقابل اردو معانی درج ہیں عہ

عربی بول چال جس میں مبتدیوں کو زمانہ حال کی عربی زبان سیکھنے اور بولنے کا طریق بتایا گیا ہے۔ ابتدا میں دو ہزار الفاظ عربی مع معانی اردو ہر قسم کی گفتگو کے لئے درج کئے گئے ہیں۔ تجارتی فقرات اور محاورات آجکل کی شام اور عرب کے روزمرہ بول چال کے مختلف ابواب پر تقسیم کرکے درج کئے گئے ہیں اخیر میں خط و کتابت و رقعات کے نمونے درج ہیں عہ

ترکی بول چال ترکی سکھلانے کی اردو زبان میں سب سے پہلی کتاب جو منشی محبوب عالم صاحب ایڈیٹر پیسہ اخبار نے قریباً پونے دو سو صفحہ پر لکھی ہے اور جس کے ذریعے سے ایک ہوشیار آدمی جو فارسی اور عربی زبان کو کسی قدر واقف ہو تین ماہ کے اندر محنت کرکے ترکی زبان سمجھ سکتا ہے۔ قیمت عہ

انگریزی بول چال کل کتاب کے ۱۴۰ صفحے ہیں جنمیں ۱۵ سو سے زیادہ فقرے اور محاورے انگریزی ٹائپ میں چھپے ہوئے ہیں اور انکے بالمقابل اردو ترجمہ درج ہے کل کتاب کو چھ حصوں اور مختلف بابوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ تاکہ کسی قسم کا طریق گفتگو باقی نہ رہ جائے۔ قیمت — عہ

رہنمائے پولیس جملہ ملازمین محکمہ پولیس اور عوام کے دلچسپ اور فائدہ مند کتاب نیز اور سراغرسانی کے کام میں بہترین رہنما ثابت ہوئی ہے قیمت عا

انگلش ٹیچر بغیر استاد کی مدد کے انگریزی سکھانے والی کتاب اسمیں گرامر ٹرانسلیشن محاورے اور لیٹر رائیٹر بھی شامل ہے جو انگریزی زبان کا لفظ بھی نہیں جانتے تھوڑے عرصہ میں اس کی مدد سے انگریزی سیکھ سکتے ہیں عہ

مفتاح البلاغت اردو میں فن بلاغت کی بہترین کتاب مصنفہ حکیم مولوی محمد نجم الغنی صاحب رامپوری فن بلاغت و فصاحت میں اس سے بہتر کتاب موجود نہ ہوگی قیمت مجلد عہ

جنگ یورپ کے ٹکنیکل حالات موجودہ جنگ یورپ کے دلفریب حالات جنکو پڑھکر عقل حیران رہجاتی ہے قیمت ۴ر

دنیا کی گوری و رنگین قومیں دنیا کی آئندہ سرداری کن اقوام کے ہاتھ میں ہوگی رنگدار قوموں کی بیداری ایک یورپین مصنف کی قلم سے

قواعد ترکی ترکی زبان سیکھنے کیلئے ترکی صرف و نحو کے علم ضروری قواعد اردو میں ۴ر

اردو زبان اردو زبان پر ایک قابلانہ لکچر جس میں اردو کی فوقیت بمقابلہ ہندی معقول دلائل و معلومات سے ثابت کی گئی ہے۔ ۴ر

تحفہ بینظیر خلاصہ دیوان حافظ بتشریح نظم پنجابی قابل دید اشعار ۲ر

ہدایت الحجاج حج کرنیوالوں کے لئے تمام ضروری ہدایتیں سفر کے مشکلات ڈاک جہاز کا انتظام وغیرہ معلومات حج ۲ر

کارنامہ راجپوتاں اس کتاب میں بڑے بڑے راجپوت بہادروں کے حالات اور انکے کارنامے

ایشیا و یورپ کی ضرب الامثال سو ایشیائی زبانوں اور آٹھ یورپین زبانوں کی چیدہ ضرب المثلوں کا اردو ترجمہ قابل دید۔ قیمت

فائرمین پاکٹ بک مصنفہ مستری حاکم دین انجنیئر کتاب سٹیم انجن پر چلنے والے اور آگ دینے والے فائرمینوں کے لئے نہایت مفید ہو پاکٹ بک میں انجن کے حصے کے نام اور اس کا معمولی کام وغیرہ لکھا گیا ہے قیمت فی جلد ۸ر

لوہا ڈھالنا سٹیل وکاسٹ آئرن کی ڈھلائی فونڈری قائم کرنا پن نب سوئیاں بنانے کے طریقے (با تصویر) ۱۲ر

آئینہ جواہرات اس میں ہر قسم کے جواہرات کی شناخت ۔ حالات ۔ خواص ۔ اصول جو ماہرین فرنگ و دانشمندانہ زمانہ نے قائم کئے ہیں ماہیت کیمیائی ترکیب عقائد پیدائش حالات برآمد دکان کنی ۔ کاٹ جلا و دستکاری کھرے کھوٹے کی پہچان غرض جواہرات کے متعلق ہر بات درج ہے جناب پنڈت امرناتھ صاحب تحصیلدار نے مدت مدید کی جد و جہد سے بیادگار سری حضور مہاراجہ بہادر پٹیالہ والے یہ کتاب تیار کی گورنمنٹ پنجاب نے مصنف کو انعام دیا ۔ ہفت رنگ جواہرات کی اصلی تصاویر قیمت صہ

لغات النخواتین یا اردو بول چال علامہ مشہور مولانا اشرف علی صاحب مرحوم لکھنوی کے قلم سے اس میں ہندوستانی گھروں میں جو عورتوں کی اصل بول چال ہے اس کی ہزار مثالیں مع معانی درج ہیں قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ عہ ۸ر

ہر قسم کے روغن و وارنش بلیننگ لاکھا جاپاننگ ہر قسم کے روغن پکانے اور وارنش بنانے کے طریقے درج ہیں قیمت صرف عہ

حالات کبیری کبیری پرندکی پرورش و نگہداشت کے طریقے اس کتاب میں درج ہیں ۱۲ر

کلید صنعت حصہ دوم سٹیم انجن کے کل پرزوں کی شناخت و حالات ان سے کام لینا ہر انجنیئر کو ضروری ہے نہایت قابل دید کتاب ہے قیمت ۱۲ر

محب المویشی اس میں ہاتھی شیر گھوڑا خچر ۔ گدھا بھینس گائے بکری بھیڑ وغیرہ تمام پالتو جانوروں کے امراض اور ان کا علاج اور ان کی نگہداشت کے نہایت آسان طریقے درج ہیں قیمت دس آنے ۱۰ر

بھیڑ بکری کی پرورش اس میں بھیڑ بکری کے ریوڑ پالنے اور ان کی تجارت کے نگہداشت کے تمام طریقے درج ہیں ۱۲ر

بھوجن پرکاش باورچی خانہ و رسوئی سے محبت رکھنے والوں کے لئے ضروری ہے کہ اس کا مطالعہ کریں اس میں تیار اور پرمزہ نمکین اور شیریں کھانوں انواع و اقسام کی مٹھائیوں حلوے اور ریاں وغیرہ درج ہیں ۸ر

ہدایت نامہ باورچیاں اس میں ہر قسم کے انگریزی کھانے پکانے کی ہدایت خانساموں کیلئے نہایت ہی مفید کار آمد کتاب ہے

سندباد جہازی بحری ۔ الف لیلہ کے نہایت مقبول اور دلچسپ قصص سے ایک بحری جہازی مسافر کی عجیب و غریب ۱۲ر

گمشدہ میراث [illegible]

ایک دلچسپ فسانہ جس میں جنوبی افریقہ کے حبشیوں کی زندگی کا حیرت انگیز خاکہ کھینچا ہے

غبارہ میں پانچ ہفتے مشہور فرانسیسی ناول مصنفہ جولیس ورن جو ہوائی جہاز کی ایجاد سے قبل لکھا گیا تھا [illegible]

تخم بدی سراغرسانی کا نہایت حیرت انگیز اور نہایت دلچسپ قصہ قابل دید ۱۲ر

اسرار آکلینڈ ایک انگریزی ناول کا ترجمہ جس میں نیکیوں کے خوشگوار نتائج ۔ شرارتوں کی سزا وغیرہ درج ہے قیمت ۱۲ر

امریکہ کی نازنین دریائے شکاگو کی سیر کے دوران میں ایک خوبصورت نوجوان لڑکی ایک بدمعاش ڈاکو کی عیاری اضلاع متحدہ امریکہ کی نمائش سے لڑکی کا گم ہونا سراغرساں کا پتہ لگانا وغیرہ قیمت عہ

شمع شبستاں لاہور کا ایک امیرزادہ ایک نہایت مفلس بڑھیا کی لڑکی پر شیدا ہوتا ہے جو بڑی مشکلات سے اس کے ہاتھ آتی ہے اور آخر شوہر سے بلند مرتبہ ثابت ہوتی ہے ۔ قیمت ۹ر

سلسلہ مقبول یا فیلسوف سلسلہ مقبول کا تیسرا اخلاقی ڈرامہ عربی سے ترجمہ کیا گیا ۱۲ر

خواجہ ناصر الدین ترکوں کے مشہور شیخ چلی خواجہ ناصر الدین کے چند مضحکہ خیز لطیفے ترکی زبان سے اردو میں ترجمہ کئے گئے ہیں

لطائف و ظرائف گزشتہ تیس سال میں انتخاب لاجواب ہر ہفتہ وار رسالے اخبار میں جو لاکھوں لطیفے چھپتے رہے ہیں ناظرین کے اصرار سے کتابی صورت میں چھاپے گئے ہیں آٹھ حصے ہیں ہر ایک حصہ میں پانصد لطائف ہر ایک حصہ کی قیمت ۸ر مکمل سٹ کی قیمت للعہ

علاج الغربا عہ سوانح غوث اعظم ۱۲ر

موتیوں کا جزیرہ یا کونٹ آف مانٹی کرسٹو مشہور و معروف فرانسیسی ناولسٹ سر امیگز نیڈر ڈیوس شائقین کے اصرار سے شائع کیا گیا ہے اس کے پایہ کے ناول اردو زبان میں آج تک کوئی نہیں لکھا گیا قیمت ہر جلد ۱۲ر

چار ہم چمن زمانہ کی عیاری مشہور و دلفریب ناول مصنفہ منشی احمد حسین صاحب بی اے مشہور فسانہ نگار قیمت ۸ر

مطلوب حسیناں اپنی طرز کا بہترین اور اچھوتا ناول ہے نہایت ہی دلچسپ ہے قیمت ۶ر

سیر بکاولی قصہ بکاولی جو پراسرار عجیب و غریب طلسم کے حشیۂ حالات درج ہیں ۸ر

آلات کیمسا کا بلگوں کمرہ دنیا کی نیرنگیوں کا دلچسپ مرقع ۱۲ر

حسن آرا بیگم ایک زنانہ اخلاقی اور نہایت دلچسپ ناول ہے قیمت صرف ایک روپیہ عہ

قدرتی سیر بین ہندوستانی زندگی کا دلچسپ اور عبرت انگیز ناول ہے قیمت ایک روپیہ چار آنہ

چلتا پرزہ خفیہ پولیس کے ہوشیار سراغرساں کی عجیب و غریب کیفیت ۔ [illegible] ایک حسین لڑکی کا جان بچانا وغیرہ عہ

تاریخ سیالکوٹ اکبر۔ جہانگیر۔ شاہجہان۔ عالمگیر وغیرہ کے عہد میں سیالکوٹ کے حالات پر تبصرہ مولوی عبدالحکیم صاحب سیالکوٹی کی نادر تصنیفات کا تذکرہ قیمت فی جلد ۱۲ر

معلومات بوسہ بازی خان احمد حسین خان بی۔ اے کی نہایت دلچسپ تصنیف اس میں تمام دنیا کی مختلف قوموں میں بوسہ بازی کا رواج بوسہ کے متعلق مختلف شاعروں کا کلام وغیرہ جمع ہے کتاب کی زیادہ تعریف بے سود ہے۔ ایک دفعہ منگا کر دل خوش کیجیے ۶ر

صنعت و حرفت کی کتابیں

ذخیرہ صنعت و حرفت آٹھ جلدیں یہ نادر اور لاثانی کتاب جو آٹھ حصوں میں مشتمل ہے بجائے خود صنعت و حرفت کا مکمل کورس ہے اس کے مطالعہ سے آپ بے انتہا فائدہ اٹھا سکتے ہیں ہندوستان کے افلاس کا سب سے بڑا سبب ملکی صنعت و حرفت کا فقدان ہے۔ امریکہ۔ جاپان جرمنی۔ آسٹریا۔ فرانس۔ سویڈن وغیرہ تمام ترقی یافتہ ممالک کی صنعت و حرفت کا لب لباب اس کتاب کی آٹھ جلدوں میں بھر دیا گیا ہے۔ تمام ہندوستان میں اردو زبان کی کوئی کتاب بھی صنعت و حرفت کے متعلق اس کے برابر شائع نہیں ہوئی۔ اس کتاب کے کئی ایڈیشنوں کا چھپ کر ملک میں فروخت ہو جانا اس کی ہر دلعزیزی اور پسندیدگی کا زندہ ثبوت ہے قیمت حصہ اول ۸ر حصہ دوم عہ حصہ سوم ۱۲ر حصہ چہارم عہ حصہ پنجم عہ حصہ ششم عہ حصہ ہفتم ۱۲ر حصہ ہشتم ۸ر مکمل سٹ کی قیمت (۵) روپے

روشنائی تین سو قسم کی روشنائیوں اور سیاہیوں کے حالات قیمت ۸ر

چھریاں چاقو ڈاکٹری آلات بذریعہ مشینری بنانا اور ان کی ساخت اور مفصل تشریح اس کتاب میں درج ہے ۱۲ر

مکمل مرغی خانہ سونے کا انڈا دینے والی مرغیاں اب بھی ملتی ہیں۔ اگر مرغیوں کی تجارت اور پرورش سے ہر روز سونے کا انڈا حاصل کرنیکا آپ کو بھی شوق ہے تو ہماری کتاب مکمل مرغی خانہ جس میں مرغیوں، ٹرکیوں، بطخوں اور دیگر انگریزی پالتو جانوروں کی پیدائش بذریعہ مشین اور ان کی پرورش اور نگہداشت اور امراض کا علاج اور مرغیوں کی تجارت سے روپیہ کمانیکے مفصل حالات درج ہیں ۱۲ر

عملی صابون سازی تین سو قسم کے دیسی و انگریزی صابونوں کے مختلف نسخے مع ترکیب کے ساتھ درج کئے گئے ہیں اس کتاب کی مدد سے ہر شخص خود بخود صابون تیار کر سکتا ہے صابون سازی ایسا ہنر ہے کہ صابون [illegible] اپنی زندگی بخوبی بسر کر سکتا ہے قیمت عہ

موم بتی بنانا مشینری کے ذریعہ موم بتی بنانا اور [illegible]

آتشبازی یورپین اور ہندوستانی آتشبازی کے ۲۷۵ نسخے۔ ۱۲ر

رنگائی چھپائی سوتی ریشمی اور اونی کپڑوں پر چھینٹ چھاپنے اور اس کی مفصل تشریح درج ہے قیمت ۸ر

وارنش اور پالش لکڑی۔ لوہے پتھر وغیرہ پر پالش اور وارنش کرنے کے جدید طریقے جو ابھی تک اردو زبان میں شائع نہیں ہوئے ہیں قیمت ۶ر

سیمنٹ ۱۱ قسم کے سیمنٹ جس سے ہر قسم کی اشیا کانچ پتھر وغیرہ جوڑی جاتی ہیں ۸ر

گنجینہ جواہرات ہر قسم کے جواہرات کی شناخت خواص و حالات اور تحقیقات اور تجارت کی مفصل کیفیت درج ہے ۱۲ر

تربیت الدجاج مرغ۔ بط۔ تیتر۔ بٹیر وغیرہ جانوروں کی پرورش اور ان کے امراض اور علاج کے طریقے نہایت وضاحت سے بتائے گئے ہیں ۸ر

مصنوعی دھاتیں اور ٹانکے لگانا جرمن سلور اور دیگر مصنوعی دھاتیں بنانے کی عملی ترکیبیں مفصل تشریح کیساتھ درج ہیں

جلا و آبداری لکڑی پتھر لوہے کو جلا دینے اور صیقل کرنیکے مجرب نسخے ۸ر

دباغت ملیشہ۔ نری۔ بال دار کھال رنگنے اور اس کے تیار کرنے اور نرم و ملائم کرنے کے کیمیائی طریقے درج ہیں ۱۲ر

چینی مٹی اور اس کے مصنوعات ہر قسم کی مٹیوں کے حالات اور شناخت جن سے چینی مٹی کا خمیر بنتا ہے اور برتن وغیرہ بنانے اور ان کے فروخت کرنیکے حالات ۸ر

مکمل گھڑی سازی باتصویر گھڑیاں۔ کلاک۔ ٹائم پیس وغیرہ مرمت کرنے اور گھڑیوں کے پرزے بنانے مرمت اصلاح کرنے کے طریقے قیمت عہ

خوان نعما مسلمانوں کے انواع و اقسام کے صدہا لذیذ کھانے پلاؤ زردہ قورمہ۔ گوشت کوفتے وغیرہ پکانے کے دوران میں مصالح ڈالنے اور پکانیکی پوری ترکیب اس میں درج ہیں ۸ر

کارخانہ دھلائی یعنی لانڈری یا پارچہ شوئی سرد و گرم کپڑے دھونے داغ دھبے چھڑانے دھوبی خانے سے روپیہ کمانے کے طریقے درج ہیں۔ قیمت عہ

رسالہ فوٹوگرافی فوٹوگرافی سیکھنے کی مکمل رہنما۔ قیمت ۸ر

مکمل دندان سازی مصنوعی دانت لگانے، دانتوں کو پالش کرنے، سونا بھرنے، ربڑ کا جبڑا بنانے، دانت اکھاڑنے وغیرہ کے طریقے درج ہیں۔ قیمت عہ

معالجات الکلب کتوں کی ہر قسم کی بیماریاں اور ان کا علاج اور [illegible]

نگار

فہرست مضامین اگست ۱۹۲۹ء

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

ملاحظات

اگر خالص لکھنوی آبادی کا تجزیہ کیا جائے تو غالباً اس کے صرف تین عنصر دریافت ہوں گے۔ شاعر، حکیم، افیونی اور ان تینوں کو اپنی فطرت، پیشہ اور مشرب کے لحاظ سے جس درجہ مرنجاں مرنج، صلح کل اور منکسر مزاج ہونا چاہئے ظاہر ہے۔ یہ میں اس وقت کہتا ہوں ورنہ اس سے قبل اوائل عمر اور زمانۂ طالب علمی میں، جس لکھنؤ کو میں نے دیکھا وہ موجودہ لکھنؤ سے بہت مختلف تھا۔ مولوی صدیق حسن غازیپوری میرے اتالیق ہر وقت میرے ساتھ رہتے تھے اور ہر چند یہ اپنے حلقۂ احباب میں بہت رنگین مزاج مشہور تھے، مگر میرے لئے وہ ایک مستقل بے آب و رنگ چیز تھے اور میں نے ہمیشہ انکو نگاہ کراہت سے دیکھا۔ دن کا تمام حصہ اور رات کے کچھ گھنٹے انہیں کی بے مہری اور عبوس فطرت کی معیت میں بسر ہوتے تھے اور میری حالت ایک طایر پر بندسے زیادہ نہ تھی۔ اس لئے اگر کسی دن مجھ کو آزادی نصیب ہو جاتی تھی، تو میں لکھنؤ کو حد درجہ حریص نگاہوں سے دیکھتا تھا اور اس قلیل فرصت کو نتائج و مطالعہ نہیں بلکہ زیادہ تر صرف قیاس و خیال سے کام لیکر رنگین بنانے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ چنانچہ اب بھی مجھے وہ نامعلوم سی کشش یاد ہے جو یہاں کی درو دیوار میں محسوس کرتا تھا اور ہنوز اس محبت کی لذت میرے دل سے محو نہیں ہوئی، جو یہاں کی فضا سے پیدا ہو گئی تھی۔ اس کو میری

عنوی زندگی کا دور اولین سمجھنا چاہئے

میری عمر اسوقت زیادہ سے زیادہ تیرہ چودہ سال کی ہوگی، لیکن نہ صرف صحت جسمانی و استواری اعضاء کے لحاظ
ے بلکہ اس اعتبار سے بھی کہ فارسی ادبیات ختم کرچکا تھا اور عربی کے درسِ نظامی کی نشاط کش اور ہادمِ لذات مشغلہ
ے باوجود ابھی تک عرفی و نظیری، غالب و بیدل میرے دل ودماغ پر مستولی تھے۔ صوری ومعنوی دونوں طرح دوسرے کو
ی نوجوان نظر آتا تھا اور خود بھی عنفوان شباب کی لذت کو ایک نئی کھلنے والی کلی کی خوشبو کی طرح محسوس کر رہا تھا۔
میرے والد اسوقت دولت گنج کے تھانہ میں انچارج تھے اور چونکہ خود فارسی کے اچھے ادیب شاعر تھے اور اپنے اخلاق
صایص کی وجہ سے نہایت ہی دلچسپ و ہر دلعزیز انسان تھے، اس لئے صبح و شام ایک اچھی خاصی مجلس شعراء، امراء وظرفاء
برپا ہوجاتی تھی

شاعروں میں سے صرف ایک صاحب (نھومیاں شفیق) کا نام مجھے یاد رہ گیا ہے اور انکی یہ خصوصیت بھی یاد ہے
کان پر نیم کا تنکا (غالباً خلال کرنیکیلئے) ضرور رکھا رہتا تھا۔ ظرفاء میں سے ایک صاحب سید باقر حسین تھے افیون اور چنڈو
کے نشاط زندگی کا جزو لازم تھیں۔ میں نے اسوقت تک ایسا دلچسپ و لطیف گفتگو کرنے والا انسان نہیں دیکھا۔ وہ بات
ن پر انکی لطیفہ سنجیاں، شعر خوانیاں، خوش الحانیاں اور لکھنؤ کے صحیح ٹکسالی محاورات کا استعمال مختصراً یوں سمجھئے کہ:۔

''از اثر ناطقہ بند م طراز''

صحیح و مکمل تصویر تھے

الغرض وہ ماحول جو اوایل عمر میں یہاں پیدا ہوگیا تھا وہ میرے احساسات کے لحاظ سے ایسا پرلطف تھا کہ ہر وقت
ے دماغ پر نشہ سا چھایا رہتا تھا اور لکھنؤ کی ساری فضا کو اسی کیفیت میں ڈوبا ہوا پاتا جس نے مجھے سرشار بنا رکھا تھا۔ یہ دوسرا
رتھا جو یہاں آکر ختم ہوتا ہے

دن گزرتے گئے اور رفتہ رفتہ میری عمر کے ساتھ پابندیاں بھی کم ہوتی گئیں، یہاں تک کہ وہ زمانہ آیا جب والد نے اپنی خاص
ول تربیت کی بناء پر مجھے بالکل آزاد چھوڑ دیا اور یہی وہ تیسرا دور تھا جس نے مجھے بتایا کہ زندگی کسے کہتے ہیں، شاعری کا
اق کیا ہے اور بہت سے شاعرانہ الفاظ وتراکیب کا صحیح مفہوم کیا ہوسکتا ہے۔
اس کے قبل فارسی ادبیات اور اردو شاعری کا جو مطالعہ میں نے کیا تھا، وہ بالکل ایسا ہی تھا جیسے کسی مرئی چیز کا درس
ف سامعہ کے ذریعہ سے دیا جائے۔ لیکن اب مجھے اجازت تھی کہ دیکھنے کی چیزوں کو دیکھوں، سننے کی باتوں کو سنوں اور جو
یاء چھونے کے لئے وضع ہوئی ہیں انہیں اپنے لمس سے محسوس کروں۔

اس سے قبل میں غالب کی ایک مثنوی کا یہ شعر پڑھ چکا تھا:

جلوہ گرے آفت نظارۂ　　برق ز تمثال وے انگارۂ

لیکن حقیقت یہ ہے کہ میرا استاد باوجود کوشش بلیغ کے مجھے کبھی نہ سمجھا سکا کہ جلوہ گری کا صحیح مفہوم کیا ہے اور "آفت نظارہ" کس نوع کا "آشوب چشم" ہے۔ لیکن اب ازخود اک الہامی کیفیت کے ساتھ نہ صرف یہی بلکہ:-

"میانہا نازک و دلہا توانا" کی حقیقت

"قیامت قامتاں مژگاں درازں" کا مفہوم

"زرنگیں جلوہا غارتگر ہوش" کا علم مجھے حاصل ہو رہا تھا

بلکہ اس سے بھی زیادہ

"زہرہ را اندر ردائے نور عریاں دیدہ ام" اور

"کتان خویش می شویم بہ مہتاب" کے

مدارج و منازل سے گزر رہا تھا

الغرض لکھنؤ کے مطالعہ اولین کا آخری منظر جس طرح ختم ہوا وہ تو ایک ایسی چیز تھا جو بہر حال و صورت میں جانے

دعوت برگ و نوا کے کند

اور اس لئے جب میں یہاں سے جدا ہوا تو میری حالت ایسی تھی جیسے ساون میں کسی کی بینائی زایل ہو

میں نے لکھنؤ کو اپنی عمر کے جس خوشگوار موسم میں اول اول دیکھا اُسے

"ز موج گل بہاراں بستہ زنار"

کہنا چاہئے اور اسکا تعلق بالکل خود فراموشانہ اور اس لئے غیر ذمہ دارانہ زندگی سے تھا۔ اُس کے بعد بھی بارہا لکھنؤ آنے کا اتفاق ہوا لیکن بالکل مسافرانہ یا کبھی کبھی کسی خاص ضرورت سے مجبورانہ جس کو شاعری یا شاعرانہ احساس سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اس مرتبہ جب میں نے مستقلاً یہاں قیام کا ارادہ کیا تو حالات زندگی بالکل بدل چکے تھے، حیات کی مشکلات اور عاملانہ ذمہ داریوں نے بقول غالب

"ز دشواری زیستن مردۂ"

بنا رکھا تھا، نہ وہ فراغت خیال تھی، نہ آسودگی حال، نہ وہ جوش نشاط تھا نہ وہ سن و سال، "فکر فضول" کی جگہ "غور و تامل" نے "جرأت رندانہ" کی جگہ "احتراز پیرانہ" نے لے لی تھی اور خیالات کے شیریں عالم سے ہٹ کر واقعات کی "تلخ گزار" دنیا میں آ گیا تھا۔ بہرحال اس مرتبہ میرا لکھنؤ آنا نہ عہد گذشتہ کی یاد تازہ کرنے کے لئے تھا اور نہ اس کا ماتم کرنے کے لئے،

بلکہ بجائے تماشائی کے، یہاں کی آبادی میں شامل ہو کر خود تماشا بننے لگے تے

اگر گذشتہ تین سال کا مسلسل قیام اور آیندہ کے لئے تا بقائے حیات یہیں رہنے کا عزم راسخ، مجھے (اہل لکھنؤ تو خیر کیا) خادمان لکھنؤ میں شامل کر سکتا ہے، تو مجھ کو یہ حق غالباً حاصل ہے کہ باشندۂ لکھنؤ ہونے کی حیثیت سے اپنے اُن تجربات کا ذکر کروں جو اسوقت تک دوران قیام میں مجکو یہاں حاصل ہوئے۔

اب آپ اس مقالہ کے اولین فقرہ کی طرف پھر توجہ کیجئے جو خالص لکھنؤ کی آبادی کے "عناصر سہ گانہ" کے متعلق میں نے لکھا تھا ——— ہاں، تو ان تین عنصروں میں سے اس وقت مجھے جس سے بحث کرنا ہے وہ عنصر شعراء ہے جسمیں اہل فصاحت کو بھی شامل کر لینا چاہیئے

لکھنؤ کے شاعروں میں بڑا حصہ تو ان حضرات کا ہے جو یہیں کی خاک سے پیدا ہوے یا یہیں کی سرزمین سے اپنے آپ کو منسوب کر کے لکھنوی لکھتے ہیں (اس جماعت میں بعض وہ حضرات بھی شامل ہیں جو ہیں تو ضلع لکھنؤ کے کسی قریہ یا دیہہ کے، لیکن اپنے آپ کو ظاہر کرتے ہیں وہ لکھنوی ہی) دوسرا چھوٹا حصہ ان بیرونی شاعروں کا ہے جو بسلسلۂ ملازمت، تجارت یا تعلیم و تعلم وغیرہ یہاں مستقلاً یا عارضی طور پر مقیم ہیں

گذشتہ تین سال کے اندر میں نے اسکو نہایت تکلیف سے ساتھ محسوس کیا کہ یہ دونوں جماعتیں، باوجود ہم مشرب و ہم مسلک ہونے کے ایک دوسرے کی حد درجہ مخالف ہیں اور کسی محفل میں ان دونوں کا اجتماع گویا دو متصادم عناصر کا اجتماع ہوا کرتا ہے۔ ایک کہتا ہے کہ وہ دیہقانی ہے، گنوار ہے، لکھنؤ کے محاورات، یہاں کی زبان اور یہاں کے لب و لہجہ سے کیا واقف ہو سکتا ہے۔ دوسرا کہتا ہے کہ

آنچہ در گفتار فخر تست آں ننگ من ست

لکھنؤ میں آجتک کوئی شاعر پیدا ہی نہیں ہوا، یہاں کی سرزمین میں اس جنس بے بہا کی پیداوار کی اہلیت ہی نہیں ہے۔ تغزل نام ہے جذبات نگاری کا جس سے یہاں کے شعراء بالکل ناآشنا ہیں اور صرف رعایت لفظی کے جھوٹے طلسم میں اپنے آپ کو پھنسائے ہوے ہیں

ہر چند میں اس وقت لکھنوی و غیر لکھنوی شاعری کے فرق و امتیاز پر بحث کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہوں، مگر جہاں تک تنقید صحیح کا تعلق ہے ضمناً یہ کہنے سے باز نہیں رہ سکتا کہ اس مسئلہ میں دونوں زیادتی پر ہیں

اہل لکھنؤ کا ظلم تو یہ ہے کہ وہ یہاں کی فضا میں کسی بیرونی شاعر کا وجود دیکھ ہی نہیں سکتے اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ کسی غیر کا ان کی محفل یا ان کے شہر میں غزل پڑھ دینا گویا "باندازۂ یک غزل" انکی شہرت کو صدمہ پہونچانا ہے۔ اور اس کا انتقام لینے کے لئے وہ زبان، محاورہ وغیرہ کے دلایل سامنے لاتے ہیں جو اسوقت واقعی بالکل بے معنی سی بات ہے

غیر لکھنوی شعرا کی یہ زیادتی ہے کہ اُن کو لکھنؤ مین کوئی شاعر نظر ہی نہین آتا اور زبان کی شاعری یا رعایت الفاظ کو وہ ایسی معمولی بات سمجھتے ہین کہ ہر شخص اس کو حاصل کر سکتا ہے علاوہ اس کے اگر جذبات نگاری ہی کو اصل چیز مان لیا جائے تو بھی اس کے نمونے یہان کے شعرا (اور وہ بھی خصوصیت کے ساتھ آجکل کے شعرا) کے کلام مین ملسکتے ہین

حال ہی مین رسالۂ مبصر نے بعض لکھنوی شعرا کے کلام کا انتخاب دیا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ بعض بعض شعر بہت خوب ہین مثلاً جناب آشفتہ کے یہ اشعار:-

کوئی پوچھے دل وحشی سے حقیقت اسکی — وہ جو اک چیز نظر آتی ہے ویرانون مین
جلا کے خاک نہ کر دو نگا برق سے پہلے — پرون مین آگ لگائے ہون آشیان کیلئے
تو نے اُسے بھی لغزش منصور کھو دیا — اک اعتبار تھا رسن و دار پر مجھے
ایسا تلاش دوست نے بیگانہ کر دیا — پہچانتی نہین ہے کسی کی نظر مجھے

جذبات نگاری سے الگ ہٹ کر بھی خالص لکھنوی رنگ کے یہ اشعار جناب آشفتہ کے بُرے نہیں:-

اپنی ہوس تو دیکھ کہ تو اور نگاہ ناز — اے دل خدا کرے تجھے رسوا کرے کوئی
ہان مرے دل پہ ابھی زخم ہے ناسور نہین — تم سلامت ہو تو وہ دن بھی کوئی دور نہین

اس طرح منظر لکھنوی کے یہ اشعار ملاحظہ کیجئے

اے نسیم سحری ڈھونڈھتی پھرتی ہے کسے — اب کہان جاگنے والا شب تنہائی کا
گلے تک یون نہین آیا ہے خنجر — جفاؤن کو وفا کہنا پڑا ہے
مجھے تو خندۂ گل نے کیا تھا آپ سے باہر — تمھین نے ہات بڑھکر رکھدیا ہوتا گریبان پر

قدیر لکھنوی کا یہ شعر ملاحظہ فرمائے

اب مری آواز پر او بیخبر آواز دے — سنتے سنتے تھک گیا ہون مین کہ منزل دور ہے

شمس لکھنوی کہتے ہین:-

روتے روتے ابھی آئی تھی ذرا دل کو ہنسی — آپ نے پھر وہی ذکر دل ناشاد کیا
یہ کیا کیا کہ جدا ہو گئے گلے مل کے — ابھی تو زخم بھی بھرنے نہ پائے تھے دل کے
یہ کس نے آتے ہی رُخ سے اُٹھا دیا ہے نقاب — کہ جھلملانے لگے سب چراغ محفل کے
ادھر نقشہ پھرا آنکھون مین ادھر بجلی ادھر چمکی — ہمین اب خوف آتا ہے خیال آشیان کرتے
اب زلیخا ہے نہ وہ بھیڑ خریدارون کی — لے گیا لوٹ کے رونق کوئی بازارون کی

سراج لکھنوی کا یہ شعر کیا داد طلب نہیں؟

وہ سر مرا وہ یار کا زانو وہ شام وصل — اللہ پھر وہ خواب نہ آیا نظر مجھے

الغرض اسی طرح اور لکھنوی شعراء کے کلام مین بھی اچھے نمونے غزلگوئی کے ملسکتے ہین۔ یہ اُن حضرات کا کلام ہے جو آجکل کے نوجوان شعراء مین شمار کئے جاتے ہین، ورنہ کہنہ مشق شاعرون مین صفی، عزیز، اثر وغیرہ کا جو رنگ شاعری ہے اسکے اچھا ہونے مین کسے کلام ہوسکتا ہے:

الغرض بیرونی شاعرون کی بھی یہ زیادتی مجھے پسند نہین کہ اُن کو یہان کی شاعری مین کوئی خوبی نظر ہی نہین آتی ہے چونکہ ضمناً شاعری کا ذکر آگیا تھا اس لئے اس سے زیادہ مجھے اس موضوع پر لکھنے کی ضرورت نہین۔

میرا اصل مقصود بالکل اس سے علیحدہ صرف انسانیت، اجتماعیت، واخوت کی بنا پر یہ عرض کرنا تھا کہ اگر تھوڑی دیر کے لئے شعر و شاعری کے جھگڑون کو علیحدہ کردیا جائے تو بھی ایک رشتہ بیرونی واندرونی شعراء مین فطرت کی طرف سے ایسا قایم ہے کہ اگر اس کا پاس کیا جائے تو یہ باہمی مناقشت ومنافست بہ آسانی دور ہوسکتی ہے اور مخالفت کی موجودہ صورت جو سب و شتم تک پہونچگئی ہے بڑی حد تک اصلاح کو قبول کرسکتی ہے

معین الادب، معراج الادب، خاصان ادب، لکھنوی، غیر لکھنوی، اور اسی طرح کے تمام بے معنی اصطلاحون کو جن سے بوئے تفریق آتی ہے یکسر سٹ جانا چاہئے اور سب کو یہ سمجھکر کہ ایک جگہ کے باشندہ ہین، ایک ہی فضا مین سانس لے رہے ہین، انسان پیدا ہوئے ہین، نظام تمدن کے سلسلہ مین تعاون عمل ضروری ہے، رواداری وایثار سے کام لے کر باہم مل جانا چاہئے۔ شاعری سے زیادہ ضروری واہم چیز "پاس انسانیت" ہے۔ ایک شاعر اگر دوسرے سے اچھا ہے تو کوئی خوبی کی بات نہین۔ قابل فخر یہ امر ہے کہ کون "انسان" زیادہ ہے، اگر میرا شعر تقطیع سے گرتا ہے تو گرنے دیجئے مجھ سے نفرت نہ کیجئے میرے عادات واطوار کو دیکھئے کہ وہ تو انسانیت سے گرے ہوئے نہین ہین، اسی طرح اگر آپ کے تمام اشعار جواہر کی لڑیان ہین تو مجھے کیا اگر آپ کے اخلاق خذف ریزون سے بدتر ہین

مجھے نہین معلوم کہ یہان کی مختلف انجمنون کا سررشتۂ حیات وعمل کن ہاتھون مین ہے اور بیرونی شعراء مین کس کو "سرغنہ" ہونے کا مرتبہ حاصل ہے، اس لئے مین تخصیص کے ساتھ کسی سے خطاب نہین کرسکتا بلکہ عمومی طور پر ہر جماعت اور جماعت کے ہر ہر فرد کی توجہ اس جانب مبذول کرنا چاہتا ہون کہ شاعری کی بے بود نمایش پر "حقیقتون" کو پامال نہ کرین اور ایک دوسرے کے ساتھ ملکر زندگی بسر کرنا سیکھین کہ وقت کی نزاکت اب اس سے زیادہ خطرناک مرکز پر نہین پہونچ سکتی۔ پھر اگر یہ مقصود ترک شاعری کے بعد ہی حاصل ہوسکتا ہے تو مین اس کے ترک کا مشورہ دونگا کیونکہ شاعری کا ماتم اسقدر سخت چیز نہین ہے جسقدر انسانیت واخلاق کا ماتم۔ اُس کے نہ ہونے سے تو صرف ہماری گرمی محفل پر اثر پڑیگا، لیکن اس کا فقدان تو ہماری موت، قوم کی موت اور روحانیت کی موت ہے، جو یقیناً حشر سے بھی بے نیاز ہے۔

مین باوجود سعی و ارادہ ابھی تک سفر دکن کے لئے طیار نہین ہوسکا۔ اور اب آیندہ کے لئے ماہ و تاریخ کی تعین کرتے ہوئے بھی ڈرتا ہون کیونکہ میرے اور خدا کے درمیان اکثر یہی معاملہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی برتری و خداوندی کو میرے عزائم توڑ کر ثابت کرتا ہے اور مین بھی "علاجے نیست داغ بندگی را" کہکر خاموش ہوجاتا ہون

اس درمیان مین دکن کے جن احباب نے میرے اس عزم کا ذکر نگار مین دیکھ کر مجھے دعوتی خطوط روانہ کئے انکا شکریہ ادا کرتے ہوئے بہ ادب عرض کرتا ہون کہ جب تک مین وہان پہونچ نہ جاؤن، میرے کسی قول کا اعتبار نہ کرین، کیونکہ یہان کے مشاغل پیچھا نہین چھوڑتے اور باوجود ہر ممکن کوشش کے مین ہنوز روانگی کا انتظام نہین کرسکا۔ یہ یقینی ہے کہ مین ایک بار "خاک پاک دکن" کی زیارت کرونگا ضرور، لیکن کب؟ اس کا جواب بجائے وعدہ کے "ایفاء عہد" سے دینا چاہتا ہون، بشرط آنکہ "عمر بے وفائی نہ کرے"۔ آرزو تو یہی ہے کہ زیادہ سے زیادہ اخیر اگست یا اوایل ستمبر تک وہان پہونچ سکون

گذشتہ چند ماہ سے مسلسل نگار مین "علمی و ادبی دعوت" کے عنوان سے جو اعلان شایع ہورہا ہے۔ اس کے متعلق مین یہ ظاہر کردینا ضروری سمجھتا ہون کہ جو حضرات ظفر یا ظفر کی شاعری کے متعلق لکھین وہ واقعی محنت و تحقیق کا نتیجہ ہونا چاہئے، محض اس کی شاعری پر معمولی تبصرہ کافی نہ ہوگا۔ مین چاہتا ہون کہ ظفر کے متعلق جو مضمون ہو وہ سیرت نگاری و تنقید کا بہترین نمونہ ہو۔ سو روپیہ کا جو ہدیہ مقرر کیا گیا ہے، اس سے مقصود صرف یہ ثابت کرنا ہے کہ اس باب میں نگار اپنی پوری ذمہ داری کو محسوس کررہا ہے، نہ یہ کہ وہ ارباب علم و ادب جنکا مرتبہ اس نوع کے حقیر ہدایا قبول کرنے سے بلند و ارفع ہے، ان کو اس طرح نایل کیا جائے یہ مین نے اس لئے ظاہر کردیا کہ مبادا رفیع المرتبت ہستیان محض انعام یا ہدیہ کے خیال سے محفل ظفر مین شرکت کرنے سے ابا کرین

اس ماہ کی اشاعت مین پہلا مضمون سلسلہ کا ہے اور جس کی اہمیت کی طرف مین اس سے قبل توجہ دلاچکا ہون۔ اگر یہ ترجمہ، ترجمہ کی شان سے ہٹکر پیش کیا جاتا، تو زبان کی سلاست اور جملون کے ربط مین زیادہ حسن پیدا ہوجاتا۔ بہرحال مفہوم اور معنی کے لحاظ سے یہ سلسلہ خاص چیز ہے۔

ایک مانہ کے بعد پھر جناب مجنون گورکھپوری کا افسانہ شایع ہورہا ہے جس کا سلسلہ آیندہ دو ماہ تک قایم رہیگا ناظرین نگار کے لئے چونکہ مجنون اور ان کے افسانے کوئی نئی چیز نہین ہے اس لئے تعارف کی ضرورت نہین

دوسرا افسانہ وعدہ شکن المحشر عابدی کا ہے جو گولڈ اسمتھ سے لیا گیا ہے۔

تنقید فسانۂ عجایب کے سلسلہ مین جناب نقاد نے اردو کے قدیم فسانون پر نہایت اچھی روشنی ڈالی ہے۔ یہ مضمون ماہ آیندہ مین ختم ہوجائیگا۔ ریختی گوئی پر جناب تمکین کاظمی کا مضمون نہایت معقول ہے۔ حصۂ منظومات مین فارسی کی نظم بہاریہ، ایران کے ملک الشعراء مرحوم بہار کی ہے جو طہران کے مشہور اخبار وطن سے نقل کی گئی ہے۔ مقبرۂ ہمایون پر جناب محمود اسرائیلی نے بھی بہت پاکیزہ نظم لکھی ہے۔ غزلون مین اختر شیرانی کی غزل کے بعض اشعار غایت درجہ شعر واقع ہوئے ہین

نیاز

حکومت برطانیہ کی وسعت کا راز

اور
قبضۂ ہندوستان کی دلچسپ داستان

سلطنت ہند

اس سلسلہ مین نو آبادیات کی طرح سلطنت ہند سے اسی حد تک بحث کی جائیگی جہان تک اس قانون توسیع کی تشریح ہوتی ہو جو انگلستان کی تاریخ کے حصہ جدید مین کارفرا ہے یعنی ہندوستان سے صرف اسی حد تک بحث کی جائیگی جہان تک اسکا تعلق ہماری اپنی سلطنت سے ہے۔ اسپر تاریخی (یعنی اس کے اسباب وجود) اور سیاسی (یعنی اسکے فوائد یا استحکام) دونون حیثیتون سے روشنی ڈالی جائیگی۔

اس نقطۂ نظر سے تاریخی ترتیب ملحوظ رکھنا ہمارے لئے آسان نہ ہوگا۔ ہم نے ہندوستان کو اندھون کی طرح حاصل کیا انگریزون نے جتنے بڑے بڑے کام کئے ان مین کوئی اتنا اتفاقی اور غیر ارادی نہین تھا۔ یقیناً نو آبادیات کے قیام مین ہم نے بہت کم فکر و ارادہ سے کام لیا۔ جب ہمارے قدیم باشندے ورجینیا اور انگلینڈ جدید مین توطن پذیری کے لئے گئے تو ہمارا خیال کبھی نہین تھا کہ ہم ایک بڑی جمہوری سلطنت کی بنا ڈالینگے۔ لیکن یہان واقعہ نے اپنی نوعیت مین صرف مدارج سے اختلاف کیا ہے۔ ہم نے ایک جدید قومیت کی بنا کا خیال ضرور کیا تھا اور ہمکو یہ علم بھی تھا کہ اسکا میلان جمہوری ہوگا البتہ اسکی بے پایان وسعت ہم سے مخفی تھی۔ لیکن ہندوستان مین ہماری غرض کچھ تھی اور ہو گیا کچھ۔ ہمارا مقصد تجارت تھا لیکن اسمین خصوصیت سے کامیابی نہین ہوی۔ ہم نے یہان آنے کے ۱۰۰ برس بعد تک دیسی ریاستون سے جنگ کا مطلق خیال نہین کیا اور اُسکے بعد بھی جو لڑائیان ہوئین وہ صرف ایسی ہی تھین جنسے ہمارے تجارتی اغراض کو تقویت پہونچتی تھی۔ اسکے بعد بھی تقریباً نصف صدی تک ہمکو ملک گیری کا خیال نہین پیدا ہوا۔ انیسوین صدی شروع ہو چکی تھی جب ہم نے دیسی ریاستون پر غلبہ حاصل کرنیکی پالیسی اختیار کی۔ اور جو اعلیٰ مرتبہ آج ہمکو نصیب ہے لارڈ ڈلہوزی کی گورنر جنرلی سے قبل کا حاصل کردہ نہین کہا جا سکتا۔ اسکو مشکل سے چوتھائی صدی کا عرصہ ہوا۔ ہم برابر تاکتے رہے دوسری طرف اور چلتے تھے دوسری طرف۔ اس صورت مین تاریخی ترتیب کیساتھ مطالعہ کرنا بدترین انتخاب ہوگا اگر ہم ایسٹ انڈیا کمپنی کی سال بسال تاریخ کا پتہ ڈائرکٹران کمپنی کے نقطۂ خیال کے مطابق لگانا چاہین تو گویا ہم اپنے کو بالکل اندھا تسلیم کرینگے کیونکہ وہ قوتین جن کی بدولت سلطنت ہند معرض وجود مین آئی۔ ہمیشہ ڈائرکٹران کی مرضی پر غالب رہین اگرچہ

ڈائرکٹران نے ان قوتون کا سخت مقابلہ بھی کیا لیکن بیکار۔ اس سبب سے یہ نہایت ضروری ہے کہ دوسرے سرے سے آغاز کیا جائے اور یہ دریافت کرنے سے قبل کہ سلطنت اس موجودہ عظمت کو کس طرح پہونچی ہم معلوم کرین کہ درحقیقت اسوقت یہ کیا ہے۔

ہم اس سلطنت کو ایک مفتوح سلطنت کہتے ہین تاکہ یہ امتیاز ہو جائے کہ ہم نے بحیثیت نوآبادی کے اسکو نہین حاصل کیا ہے بلکہ کمپنی کو متواتر لڑائیون مین دیسی ریاستون سے یہ ملک ملا ہے۔ لیکن کیا ہمین یقین ہے کہ اس موقع پر لفظ "فتح" استعمال کرنا درست ہوگا۔

مین نے اس سے پہلے "مقبوضات انگلینڈ" اصطلاح پر اعتراض کیا تھا جو عام طور پر نوآبادیات کے لئے مستعمل ہے۔ مین نے سوال کیا تھا کہ اگر انگلینڈ سے مراد وہ لوگ ہون جو انگلینڈ مین آباد ہون اور نوآبادیات سے وہ چند انگریزی قومین مراد ہون جو سمندر پار بستی ہون توکس طرح ان مین کی ایک آبادی دوسری کی ملک ہو سکتی ہے۔ یا اگر انگلینڈ سے تم سلطنت انگلشیہ مراد لیتے ہو جو خود نوآبادیات کی بھی حکومت ہے تو ہم کیون ایک حکومت کی رعایا کو اسکی مقبوضہ یا ملک کہین ایسی حالت مین کہ وہ مفتوح ہو کر رعایا نہین ہوی ہو یہ اعتراض براہ راست ہندوستان پر نہین عائد ہوتا کیونکہ یہ ملکہ وکٹوریہ کی حکومت مین فتح ہو کر آیا۔ اس طرح ہندوستان انگلینڈ کی ملک ہو سکتا ہے لیکن اس معنی مین نہین جس معنی مین کہ نوآبادیات ہیں۔ تاہم لفظ "فتح" مثل دیگر لغات حرب کے نہایت قدیم زمانہ کا لفظ ہے اسلئے ممکن ہے کہ اسکے مفہوم مین غلطی ہو جائے۔ پھر بھی ہم پوچھ سکتے ہین کہ ہندوستان کس معنی مین انگلینڈ کی ملک ہو سکتا ہے۔ جو چیز ہمارے قبضہ مین ہوتی ہے ہم اسکو اپنے مصرف مین لاتے ہین۔ اگر میرے پاس کچھ زمین ہے تو مین یا تو خود اس کی فصل سے منافع اٹھاؤنگا یا اگر لگان پر دیدون تو اسکا لگان پاؤنگا۔ زمانہ قدیم مین بھی کسی ملک کے فتح کرنے سے یہی مطلب سمجھا جاتا تھا کہ فاتح نے واقعی کسی چیز پر اپنا قبضہ کیا ہو۔ بعض اوقات ایسا ہوا کہ فاتحین ملک مفتوحہ یا اسکے ایک جزو کے متعلقہ دار ہوگئے جیسا کہ اُس فتح بیت المقدس مین ہوا جسکا حال بائبل کی کتاب یسوع مین درج ہے یا اُن فتوحات روم مین جن مین ضبط شدہ زمین کا کچھ حصہ اکثر چند رومی شہریون کو دیدیا جاتا تھا۔ یقینًا ہندوستان اس معنی مین مفتوح نہین کہا جا سکتا۔ انگلینڈ نے ہندوستان کی زمین پر قبضہ نہین کیا اور نہ دیسی زمینداروں کو اُس سے بیدخل کرکے انگریزون کے قبضہ مین دیا۔

اس کے علاوہ ایک اور مفہوم بھی مفتوحہ ملک سے متبادر ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ باجگذار ہو البتہ اسکا لحاظ ضرور رکھنا چاہتے کہ ہم اس اصطلاح سے کیا مفہوم سمجھتے ہین۔ اگر اس سے یہ مراد ہو کہ اہل ملک ٹکس ادا کرتے ہین یا بالفاظ دیگر اپنی حکومت یا سرحدی فوجون کے اخراجات برداشت کرتے ہیں تو اس مین کوئی ایسی بات نہین جو مفتوح قوم کے لئے عجیب ہو۔ تقریبًا تمام قومین کسی نہ کسی صورت مین اپنی حکومت کے اخراجات کی کفیل ہوتی ہین۔ اگر لفظ

باجگذار، مفتوح، یا، محکوم، کا مترادف ہو تو یقیناً اسکے معنی یہ ہونگے کہ اہل ملک علاوہ اخراجات حکومت کے کچھ اور بھی ادا کرتے ہین۔ اسکی مثال مصر جدید مین تم کو ملیگی۔ مصر کی حکومت ایک خدیو کے ہاتھ مین ہے جو قوم کے روپیہ سے اپنی جیب بھرتا ہے۔ لیکن مصر سلطان ٹرکی کا باجگذار ہے یعنی مصر سلطان کو ایک معقول رقم نذر کرتا ہے جو کسی دوسری شکل مین ملک مین واپس نہین آتی۔ بلکہ سلطان کے ساتھ مصر کا رشتۂ محکومیت ظاہر کرتی ہے۔

ایسا خراج صاف طور سے بتاتا ہے کہ اسکا ادا کرنے والا لینے والے کی ملک ہے۔ کیونکہ یہ بجنسہ وہی صورت ہے جس مین ایک کاشتکار اپنے زمیندار کو لگان دیتا ہے۔ کیا ہندوستان اس معنی مین انگلینڈ کا باجگذار ہے؟ ہرگز نہین کم از کم براہ راست یا مسلمہ طور پر تو نہین۔ ہندوستان کی طرح انگلینڈ مین بھی ٹکس وصول کیا جاتا ہے۔ تو کیا انگلینڈ کو باجگذار کہا جائیگا۔ ہندوستان سے جو روپیہ کھینچا جاتا ہے وہان کی حکومت پر صرف کیا جاتا ہے اور ضروری اخراجات کے علاوہ ایک کوڑی بھی نہین بچاتی۔

البتہ یہ امر قابل بحث ہوسکتا ہے اور اکثر ہوا بھی ہے کہ ہندوستان اور مختلف صورتون مین انگلینڈ پر قربان کیا جاتا ہے خصوصاً رنگ برنگ کی حیلہ سازیون سے اُسکی دولت اینٹھی جاتی ہے۔ مجھے اس وقت اس سوال سے کوئی بحث نہین کیونکہ مین محض یہ دریافت کررہا ہون کہ قانوناً ہندوستان اور انگلینڈ کے درمیان کون سا رشتہ ہے مجھے اس سے تعرض نہین کہ بددیانتی سے کہان تک اس رشتہ مین پیچیدگی پیدا کردی گئی ہے۔ لہذا ہندوستان اس معنی مین کہ وہ اصولاً انگلینڈ کا باجگذار ہے کبھی موخر الذکر کی ملک نہین کہا جا سکتا اور نہ ہماری نوآبادیات سے زیادہ کہلانے کا مستحق ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ اگرچہ ہندوستان اور انگلینڈ کا موجودہ رشتہ تاریخی حیثیت سے صرف لڑائی کی بدولت پیدا ہوا لیکن انگلینڈ نے کبھی، کم از کم علانیہ، ہندوستان پر اپنا یہ حق نہین ظاہر کیا۔ ملکہ وکٹوریہ کے فرمان خسروی مورخہ یکم نومبر ۱۸۵۸ء مین جسکی رو سے علیا حضرت نے اپنی حکومت کا بالاعلان اظہار کیا، یہ صاف اور صریح الفاظ موجود ہین "ہم پر جو فرائض اور پابندیان ہماری دوسری رعایا کی طرف سے عائد ہوتی ہین بالکل وہی مملکت ہند کے باشندگان کی طرف سے بھی ہم پر عائد ہین اور ہم اُن فرائض کا اپنے کو مکلف سمجھتے ہین"، یعنی فتح کیوجہ سے کسی کو مخصوص استحقاق نہین حاصل ہوتے یا بالفاظ دیگر یون کہئے کہ ہندوستان عملی اغراض کے لئے مفتوح ملک نہین ہے۔

اگرچہ تہذیب و تمدن کی ترقی نے نہ تو جنگون کا سلسلہ یک قلم موقوف کیا اور نہ کم، تاہم اپنی نوعیت مین بہت کچھ تبدیلی پیدا کردی ہے۔ نام نہاد فتح اب بھی ممکن ہے۔ لیکن اس لفظ کے اب وہ معنی نہین رہے۔ آج کل کسی مستبد طاقت کے استیصال یا تسخیر کا نام فتح نہین ہے۔ اسی وجہ سے اب فتوحات کی حرص و تمنا مین نمایان کمی واقع ہوگئی ہے۔ الغرض ہندوستان پر قبضہ کی وجہ سے ہم پر بہت اور ناقابل تحمل ذمہ داریان عائد ہوتی ہین۔ لیکن یہ امر کہ ہم کو ہندوستان سے

کوئی نفع ہے پہلی نظر مین نہین واضح ہوتا۔

لہذا ہمین اپنے دماغ سے اس خیال کو نکالدینا چاہئے کہ ہندوستان عملی معنون مین انگلینڈ کی ملک ہے عام محاورہ مین ملکیت اور حکومت دونون کے مفہوم اسقدر مخلوط ہین کہ خواہ مخواہ الجھن پیدا ہوتی ہے۔ جب ہم ہندوستان کو اپنا ایک،، عالیشان محکوم ملک" کہتے ہین یا اُسکو انگریزی جواہر خانہ کے سب سے بیش قیمت اور درخشان لعل سے تشبیہ دیتے ہین تو یہ صرف ایک استعارہ ہوتا ہے جو زمانہ قدیم سے ابتک مستعمل ہوتا چلا آیا ہے حالانکہ اب وہ قدیم سوسائٹیان ایک گذشتہ چیز ہو گئی ہین۔ ہندوستان اس معنی مین البتہ انگلینڈ کا محکوم ہے کہ اسکی قسمت اور پالیسی انگریزون کے اختیار مین ہے اس معنی مین نہین کہ وہ انگلینڈ کی کوئی خدمت کرتا ہے یا بلا واسطہ انگلینڈ کو قوی تر یا زیادہ مالدار بناتا ہے۔ ٹھیک نوآبادیات کی طرح ہندوستان کا مسئلہ بھی جب ہمارے سامنے آتا ہے تو بھی سوال پیدا ہوتا ہے ،، آخر اس سے کیا فائدہ ہے؟،، ایشیا کے ۲ کرڑوڑ باشندون پر حکومت کرنیکی ذمہ داری اور پریشانی ہم کیون اپنے اوپر لئے ہوئے ہین؟

یہ سوال نوآبادیات کے لئے الجھاؤ ہے اگرچہ قدرتی طور پر ایسا نہ معلوم ہوتا ہو۔ البتہ اس صورت مین الجھاؤ نہ ہوگا جب یہ ثابت ہو جائے کہ نوآبادیات ہم سے اتنی دور واقع ہین کہ اُنسے افادہ یا استفادہ بالکل ناممکن ہے نوآبادیان ہماری ہی نسل سے ہین۔ صرف انگریزی قومیت نئی آبادیون مین پھیل گئی ہے۔ اگر یہ ممالک انگلینڈ سے ملحق ہوتے تو انگریزی آبادی جون جون بڑھتی ان پر پھیلتی جاتی اور بظاہر یہ مناسب بھی ہوتا بشرطیکہ سیاسی علیحدگی کی نوبت نہ آتی۔ لیکن چونکہ وہ ملحق نہین ہین بلکہ بہت دور واقع ہین اسلئے کچھ دشواریان پیدا ہوتی ہین لیکن برقی اور دخانی ایجادات کے زمانہ مین ان دشواریون پر غالب آنا مشکل نہین ہے۔ تم نے دیکھا کہ یہ دلیل انگلینڈ اور اسکی نوآبادیات کے لئے ٹھیک ہے کیونکہ ان دونون ممالک مین خون کا اتحاد ہے۔ ہندوستان کے متعلق یہ دلیل ناموزون ہے۔ انگریزون اور ہندؤن سے زیادہ شاید ہی کوئی دو قومین اسدرجہ ایک دوسرے سے مغائرت رکھتی ہون۔ البتہ تاریخ علم السنہ نے ایک ایسا رشتہ ان دونون قومون مین ڈھونڈھ نکالا ہے جسکا آج سے قبل کسی کو وہم و گمان بھی نہ تھا۔ جو زبان ہندوستانی قومون مین مروج ہے وہ ہماری ہی زبان کے خاندان سے ہے۔ لیکن اور دوسرے اعتبارات سے انمین شدید ترین مغائرت ہے۔ انکے رسم و رواج ہم سے بالکل مختلف ہین۔ اسلام سے کہین زیادہ غیریت انکے مذہب کو ہمارے مذہب سے ہے۔

ہماری نوآبادیات زیادہ تر کرہ زمین کے غیر آباد حصون مین قائم ہوئین اسی وجہ سے انکی پوری یا غالب آبادی انگریزی ہے۔ مین نے یہ بھی بیان کر دیا ہے کہ یہ صورت اسپین کی ان نوآبادیات کی نہین ہے جو وسطی اور جنوبی امریکہ مین قائم ہوئین کیونکہ اسپینی نوآبادون کی تعداد کم تھی غالب حصہ آبادی سرخ انڈین کا تھا جن کو

اِن لوگون نے بالکل غلام بنالیا تھا۔ یہان پر اب نوآبادی کی دو قسمین ہوئین جن مین سے ایک بہ نسبت دوسرے کے مادر وطن سے زیادہ قریب ہے۔ لیکن دونون قسم کی نوآبادیان رشتہ خون سے مادر وطن سے منسلک ہین۔ ہندوستان ان دو قسمون مین سے کسی مین نہین آتا۔ کیونکہ اسکی آبادی کا کوئی خونی تعلق انگلینڈ سے نہین ہے۔ اگر انگلینڈ کے توطن پذیر ہندوستان مین جاکر آباد بھی ہوتے تو انکی کچھ حقیقت نہ ہوتی کیونکہ ہندوستان کی دیسی آبادی اُنکے مقابلہ مین بہت زیادہ ہوتی۔ قدرت نے ہندوستان اور انگلینڈ کے درمیان ایسی مستحکم حد فاصل قائم کردی ہے کہ ہندوستان انگلینڈ کی نوآبادی ہو ہی نہین سکتا۔ قدرت نے یہان کی آب وہوا ایسی بنادی ہے کہ اس مین انگریز نشو ونما نہین پاسکتے۔

جس طرح انگلینڈ کا تعلق اسکی نوآبادیات سے بالکل قدرتی معلوم ہوتا ہے اسی طرح ہندوستان کے ساتھ اسکا تعلق پہلی ہی نظر مین قطعی غیر فطری معلوم ہوتا ہے۔ ان دو ممالک مین کوئی قدرتی رشتہ اتحاد نہین ہے۔ نہ تو نسلی اتحاد نہ مذہبی کیونکہ ہم عیسائی اور وہ ہندو اور مسلمان اور نہ اتحاد مقاصد بجز ان عام مقاصد کے جو ایک ملک کو دوسرے سے ہوتے ہین یعنی سامان تجارت کی درآمد برآمد۔ تم خود سوچو اسکے علاوہ انگلینڈ اور ہندوستان کے درمیان کون مشترکہ غرض ہے۔ انگلینڈ کی اغراض زیادہ تر یورپ اور دنیاء جدید سے وابستہ ہین۔ ہندوستان ایسے الگ تھلگ ملک کا کوئی بیرونی تعلق اگر ہوسکتا ہے تو فارس، افغانستان اور وسط ایشیا سے ہوسکتا ہے جنسے براہ راست ہمارا کوئی تعلق نہین ہے البتہ ہندوستان کے توسط سے۔

ہندوستان کی فتح نے اسپینیون کی فتح امریکہ سے زیادہ تعجب خیز نتائج پیدا کئے اگرچہ میرا خیال ہے کہ اسکے اسباب نسبتاً بہت کم حیرت انگیز تھے۔ یہ واقعہ انگلینڈ کی تاریخ جدید مین نہایت نمایان ہے چاہے ہم کچھ خیال کرین اگرچہ ہمارے مورخین اس واقعہ پر اتنی توجہ نہین مبذول کرتے جتنی اسکے شایان شان ہے۔ تاہم انگلستان کی تاریخ جدید مین اسکو اہمیت خصوصی حاصل ہے۔ لیکن اس وقت تک ہمین اسکی اہمیت کا اندازہ نہین ہوسکتا جب تک ہم اپنے دماغ سے اسکی غرابت کا خیال نکالکر اسکی بے پایان وسعت پر نظر نہ رکھین۔ اسکے متعلق بہت خامہ فرسائی ہوچکی ہے کہ ہندوستان کا بڑا بھاری فرض ہمارے ذمہ ہے گیا ہے لیکن اس سے کوئی نتیجہ بمشکل پیدا کیا جاتا ہے۔ جب عدد و شمار ایک خاص حد سے متجاوز ہوتے ہین تو ہمارے تخیلات مین رعشہ آجاتا ہے۔ اپنی خانگی سیاست مین جب ہماری دلچسپی زیادہ بڑھتی ہے تو اسی نسبت سے مسئلہ تنقیح طلب کی اہمیت بھی بڑھ جاتی ہے۔ لیکن جب ہماری سلطنت کے وسیع مسائل ہمارے سامنے آتے ہین تو ہماری دلچسپی غائب ہوجاتی ہے۔ اگر ہم سے یہ کہا جائے کہ سلطنت ہند کی مثال سلطنت روم کے اس دور کی سی ہے جب موخر الذکر ترقی کے اعلی زینہ پر تھی اور یہ کہ ہم اس کے ذمہ دار ہین، تو ہماری طبیعت پھر جاتی ہے اور اس مضمون کے مطالعہ کو جی نہین چاہتا۔

کیا واقعی ہم ایسا کرنے مین حق بجانب ہین۔ مین سمجھتا ہون ہم ایک حد تک اس غلط فہمی مین مبتلا ہین کہ دنیا کے طرقی ممالک کی وسعت یا تنگی سے کوئی فرق نہین ہو سکتا۔ اس طرح سے اگر ہندوستان وسیع ملک ہے تو کناڈا اور آسٹریلیا اس سے بھی زیادہ وسیع ہین لیکن اُنکے امور ہماری توجہ کے اتنے زیادہ محتاج نہین ہین۔ یہ صحیح ہے لیکن ایک خاص مابہ الامتیاز شے کو نظر انداز کر دیتے ہین۔ کناڈا اور آسٹریلیا رقبہ مین تو بڑے ہین لیکن انکی آبادی بہت مختصر ہے۔ یہ ممالک ہندوستان کی طرح ہم سے دور ہی نہین ہین بلکہ یہ اُن بڑی سلطنتون سے بھی دور واقع ہین جنسے ہمین جنگ کا امکان ہو۔ ہندوستان کی بالکل مختلف حالت ہے۔ آبادی کے لحاظ سے وہ یورپ کی طرح گنجان ہے بلکہ بعض حصے تو یورپ سے بھی زیادہ گنجان ہین۔ یہ وہ ملک ہے جس مین ہمکو بار بار اعلیٰ اعلیٰ پیمانہ پر جنگ کرنا پڑی۔ مرہٹون کی دوسری لڑائی مین ۱۸۱۵ء لارڈ ہسٹنگز کی فوج ایک لاکھ سے زیادہ تھی۔ ہندوستان کتنی ہی دور واقع ہو لیکن یہ یورپ کی سیاست سے باہر نہین کہا جا سکتا۔ چنانچہ اٹھارھوین صدی مین یہ ایک شطرنج کی بساط تھا جس پر شاطران فرانس و انگلینڈ نے اپنی ہنرمندی دکھلائی۔ اور صرف ہندوستان ہی کی بدولت ۱۸۳۰ء سے ہمارے اور اوس کے درمیان کشیدگی پیدا ہو گئی۔ اسوقت سے ہمکو مشرق کے معاملات سلجھانے سے خاص تعلق پیدا ہو گیا ہے۔

اگر ہندوستان کو تشبیہ دیجا سکتی ہے تو ممالک یورپ سے نہ کہ دنیائے جدید کے دور افتادہ غیر گنجان ممالک سے۔ ہم اس ملک کے طول و عرض کا خیال اپنے دماغ مین قائم کرین پھر اس کا مقابلہ کسی ایسے ملک سے کرین جس سے ہم واقف ہون ماسوائے یورپ کے اس حصہ کے جو چند صدی قبل تمدن تاریخ گہوارہ تھا اور جسکے اندر سلطنت روم کے تمام یورپی ممالک معہ جرمنی اور (Scandinavian) ریاستین شامل ہین ہندوستان سے مشابہ ہو سکتا ہے۔ ہندوستان بلحاظ آبادی و رقبہ ان تمام ملک کے جمہوریہ کے برابر ہے۔ وہ سلطنت جس پر ہم ڈاؤننگ اسٹریٹ سے بیٹھکر حکومت کرتے ہین اور جسکا بجٹ ہر سال دار العلوم مین پریشانیون اور ناامیدیون کا باعث ہوتا ہے نپولین کی سلطنت سے کہین بڑی ہے۔ جیساکہ مین بیان کر چکا ہون یہ ملک جنوبی امریکہ کی قدیم اسپینی ریاستون کی طرح غیر آباد اور وسیع نہین ہے بلکہ ایک گنجان آباد خطہ ہے جسکی تہذیب نہایت قدیم ہے جو خود اپنے مذاہب، زبان، فلسفہ اور ادبیات کا مالک ہے۔

اگر ہندوستان کو کئی حصون مین ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جاے تو اسکے سمجھنے مین آسانی ہو جائیگی۔ یورپ کا خیال ہم پر کیون اتنا اثر کرتا ہے اسکی وجہ یہی ہے کہ جہان یورپ کا نام لیا گیا فوراً ہمارے دماغ مین اسکی تمام بڑی ریاستون کا تصور آگیا جو تعداد مین ۶ یا ۷ ہین۔ یورپ کا تصور انگلینڈ، فرانس، جرمنی، آسٹریا، اٹلی، اسپین اور یونان کا مجموعی تصور ہے۔ اسی طرح اگر ہندوستان بھی ایسی ہی چھ بڑی سلطنتون کا مجموعہ ہوتا تو اسکا تصور ہمکو ذرا معلوم ہوتا۔ مین ایک بات یہان پر ظاہر کر دینا چاہتا ہون۔ ہندوستان مین صرف ایک ایسا خطہ ہے جو آبادی مین

یورپ کی ہر سلطنت سے ماسوائے روس کے اور اضلاع متحدہ امریکہ سے بڑا ہے۔ یہ علاقہ لفٹنٹ گورنر بنگال کے ماتحت ہے۔ اسکی آبادی ۴ کروڑ ۶۰ لاکھ ہے حالانکہ اسکا رقبہ فرانس سے بہت کم ہے۔ اس کے علاوہ دو اور ایسے خطے ہین جو یورپی ریاستون کے مقابلہ کے ہین۔ یہ شمالی مغربی صوبے ہین جو برطانیہ کلان ماسوائے آئرلینڈ کے مقابل ہوسکتے ہین۔ البتہ رقبہ مین کچھ کم ہین مگر آبادی اُنکی زیادہ ہے۔ پھر احاطہ مدراس ہے جو رقبہ مین تو برطانیہ کلان بشمول آئرلینڈ کے برابر ہے لیکن بلحاظ آبادی کم آباد ہے اور مملکت اٹلی کے برابر ہے ان تینون صوبون کی آبادی ۲ کروڑ سے بہت زیادہ ہے۔ انکے علاوہ دو اور صوبے ہین جنکی آبادی بھی قریب قریب ۲ کروڑ ہے۔ ایک تو پنجاب ہے جو بلحاظ آبادی اسپین سے کسی قدر بڑا ہے اور دوسرا احاطہ بمبئی جو کسی قدر چھوٹا ہے لیکن رقبہ مین برطانیہ کلان اور آئرلینڈ سے بڑا ہے۔ دوسرے درجہ پر اودھ ہے جو بلجیم اور ہالینڈ کے مجموعی رقبہ سے کچھ بڑا ہے اور پھر صوبہ متوسط ہے جو ان دونون ملکون کے برابر ہے۔ ان صوبہ جات اور نیز دیگر غیر مشہور اضلاع کے مجموعہ کا نام ہندوستان ہے جو براہ راست گورنمنٹ برطانیہ کے زیر حکومت ہے۔ لیکن وہ خطہ جو عملاً برطانوی سیادت کے اندر ہے اس سے بھی بڑا ہے۔ سلطنت نپولین سے ہماری مراد صرف انھین ممالک سے نہین ہوتی جو براہ راست اسکے عمال کے زیر حکومت تھا بلکہ اسکے اندر وہ ریاستین بھی تھین جنکے فرمانروا برائے نام تھے اور عملاً وہ نپولین کی ماتحت تھین۔ چنانچہ جمعیت رائن جس مین متعدد جرمنی ریاستین شامل تھین باضابطہ آئین کی رو سے نپولین کو اپنا محافظ تسلیم کرتی تھی۔ اسی طرح ہندوستان مین انگلینڈ کی ایک اور ماتحت جمعیت ہے یعنی خود مختار ریاستیں جو باعتبار آبادی امریکہ سے بڑی ہیں۔

کیا یہ صحیح ہے کہ علاوہ اپنی خوفناک کثیر آبادی کے جسکی سیاست نہایت پریشان کن ہے اور علاوہ اپنی وسیع نوآبادیات کے ہم ہندوستان کے بھی ذمہ دار ہین جسکی آبادی یورپ کے برابر ہے۔ کیا واقعی یہ بھی سچ ہے کہ ہمکو اس کے متعلق نہایت معمولی واقفیت بھی نہین ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ اگر ہمکو یہ واقفیت حاصل بھی ہوجائے تو ہم ایسے پیچیدہ اور بعید معاملات کے متعلق کوئی صائب رائے قائم کرسکتے ہین؟

اس سے پہلے بڑی بڑی سلطنتین گذر چکی ہین جنکی عنان حکومت صرف چند تجربہ کار شخصون کے ہاتھ مین تھی روم کو مجبوراً اپنی سلطنت ایک غیر ذمہ دار مدبر کی حفاظت مین دینا پڑی یہان تک کہ وہ اپنی قدیم معاشرتی آزادی بھی کھو بیٹھا۔ امریکہ مین البتہ باوجود اس غیر محدود وسعت کے جمہوری حکومت قائم ہے۔ اگرچہ یہ ملک بہت وسیع ہے لیکن مربوط اور مسلسل ہے، اسکی آبادی کتنی ہی زیادہ ہوجائے لیکن ہمیشہ متحد رہیگی۔ اگر امریکہ ایسے ملک کے قبضہ مین آجائے جو اس سے بذریعہ سمندر الگ ہو اور اُسکی قومیت بھی مختلف ہو تو پھر اُسکی پوزیشن دنیا مین فوراً بدل جائیگی۔ ہندوستان اور انگلینڈ کے رشتہ مین جو بات سب سے زیادہ انوکھی ہے وہ یہ ہے کہ انگلینڈ ایک ایسے ملک پر حکومت کرنیکی کوشش کرتا ہے جسکی آبادی صرف دور ہی نہین واقع ہے بلکہ حکمران قوم سے کلیۃً مخالف ہے

اور طرز حکومت بھی جمہوری ہے شخصی نہین - راے عامہ عام طور سے چند سیدھے اور سہل خیالات پر مبنی ہوتی ہے - جب ملک کی اغراض سادہ اور حکومت کے اصول ناقابل خطا ہون تو راے عام بڑے بڑے مسائل کا بھی تصفیہ بغیر خطرہ کے کر سکتی ہے - لیکن جب سیاسی چالاکیون اور موشگافیون کی نوبت آتی ہے اور ایک اصول چھوڑکر دوسرا اصول کام مین لانا پڑتا ہے تو راے عامہ ششدر رہجاتی ہے - اور ایسے ششدر کن معاملات ہماری سلطنت ہند مین پیدا ہوتے رہتے ہین ہندوستان اپنی نوعیت مین نوآبادیات اور خود انگلینڈ سے اتنا جدا گانہ واقع ہوا ہے کہ اُسکے لئے سرتا پا مختلف طرز حکومت کی ضرورت ہے - اسی لئے راے عامہ حیران ہے کہ کیا کرے وہ حکومت کو جو اپنے طرز مین قطعی غیر انگریزی ہے نہایت غضب آلود اور مایوس نگاہون سے دیکھتی ہے - ایسی حکومت جو مستبد ہے جو ایک حکمران قوم کے ہاتھون مین ہے جسکا قیام فوجی طاقت پر ہے جسکے محاصل یوروپین طریقہ پر نہین وصول کئے جاتے بلکہ نمک اور افیون کی اجارہ داری سے جسکی حیثیت ایک عالمگیر تعلقہ دار کی ہے الغرض جو انگلینڈ کی روایات سے سیکڑون بات مین مختلف ہے -

ہم سے سوال ہوسکتا ہے "آخر اس سے فائدہ" جیسا کہ مین نے کہا ہے اس تعلق سے براہ راست ہمکو کوئی نفع نہین ہے اب ہمکو دیکھنا چاہئے کہ آیا اس سے کوئی ضمنی فائدہ بھی ہے یا نہین - ہم دیکھتے ہین کہ صرف ایک تجارت ہے جو رفتہ رفتہ دونون ملکون کے درمیان اعلی پیمانہ پر پہونچ گئی ہے - اگر ہندوستان مین ہمارے خلاف بغاوت رونما ہوجاے یا ہندوستان ایسی حکومت کے قبضہ مین آجاے جو تمام بندرگاہون کو ہم پر بند کردے تو چھ کروڑ پونڈ سالانہ کا ہمارا نقصان ہوگا - بالفاظ دیگر ہندوستان کی تجارت کا خاتمہ ہوجائیگا - لیکن اُس بار کے مقابلہ مین جو ہندوستان کی بدولت ہماری خارجی حکمت عملی پر پڑتا ہے یہ نفع کچھ حقیقت نہین رکھتا - آج کل محکوم ممالک کو فوجی طاقت کے روز سے قبضہ مین رکھنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے کسی قوم کے گلے مین چکی کا پاٹ باندہ دیا جاے - کیونکہ اس طرح فاتح قوم کو ہمیشہ ایک فوج محفوظ رکھنا پڑتی ہے کہ شاید کسی وقت اپنے تحفظ یا دیگر اغراض کے لئے اسکی ضرورت پڑ جائے - ہم جانتے ہین اسوقت بسمارک کس اطمینان سے افریقہ اور ایشیا مین فرانس کو فتوحات کی تدابیر مین مشغول دیکھ رہا ہے - اگر انگلینڈ کو، جو یقیناً فوجی سلطنت نہین ہے، ۲۰ کروڑ باشندون کو بذریعہ فوج محکوم رکھنا ہو تو میرے خیال مین اسکے اظہار کی ضرورت نہین ہے کہ یہ بار ہمارے لئے ناقابل برداشت ہوگا - مگر ایسا نہین ہے اسکی وجہ یہ ہے کہ سلطنت ہند مین ایک بنیادی خصوصیت ہے جس پر آیندہ مین مفصل بحث کرونگا - وہ خصوصیت یہ ہے کہ انگلینڈ نے ہندوستان کو فتح تو کیا لیکن اب ہندوستانی ہی فوج سے اسپر قابض ہے اور لطف یہ کہ فوج کی تنخواہ بھی ہندوستان ہی دیتا ہے - ہماری انگریزی فوج ہندوستان مین صرف ۶۵۰۰۰ ہے لیکن صرف یہی بار ہم پر نہین ہے - ایک طرف وہ ہماری فوج کو معطل رکھتا ہے تو دوسری طرف ہماری خارجی پالیسی مین دو چند مشکلات پیدا کرتا ہے - کسی ملک کی کمال مسرت یہ ہے کہ وہ قانع رہے دوسری قومون سے کوئی مطلب نہو - واشنگٹن کی یہ نہایت

دانشمندانہ نصیحت اپنے ہمقومون کو تھی "کہ جب تک ہو سکے تم اس حقیقی مسرت کو ہاتھ سے نہ جانے دو"۔ انگلینڈ کی یہ قسمت نہین تاہم اگر ہندوستان اُسکے قبضہ مین نہ ہوتا تو نسبتہً اسکو اس حقیقی مسرت سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملتا۔ ہماری نوآبادیات کے باشندے زیادہ تر یا تو امن پسند ہین .... یا قطعی وحشی اور اب یورپ مین جدوجہد مین ہمارے پرانے مفاد ختم ہو چکے ہین البتہ مشرق مین ہمارے تعلقات بہت گہرے ہین ۔ چنانچہ اسی وجہ سے مجبورًا ہم ترکی کی ہر تحریک، مصر کی ہر نئی بات اور ایران، برہما اور افغانستان کی ہر نئی کروٹ کو نہایت ہوشیاری سے دیکھتے ہین ۔ اسکی وجہ یہی ہے کہ ہندوستان پر ہمارا قبضہ ہے ۔ محض اسی وجہ سے دول ایشیا مین ہماری پوزیشن ممتاز ہے اور ان تمام ممالک کے معاملات سے جو ہندوستان کی راہ مین حائل ہین ہمکو خاص دلچسپی ہے ۔ محض ہندوستان کی بدولت روس سے ہمنے دائمی رقابت مول لی اور یہ رقابت انیسوین صدی مین انگلینڈ کے لئے بجنسہ ویسی ہی جیسی اٹھارہوین صدی مین دنیاے جدید کی خاطر فرانس سے تھی ۔

میری غرض اس لکچر سے یہ ہے کہ تمھارے سامنے ہندوستان کے مسئلہ کا خاکہ پیش کردون مین نے شروع مین چند ایسی باتین بیان کی ہین جنسے شاید تم اس مسئلہ کے متعلق کوئی پریشان کن یا مایوسانہ خیال قائم کرو۔ اگر یہ امر مشتبہ ہے کہ ہندوستان سے ہمین کوئی فائدہ ہے اور یہ حقیقت بالکل غیر مشتبہ ہے کہ اسکی وجہ سے ہم ایسی ذمہ داریون مین پھنسے ہین کہ ہمارا دماغ یاس انگیز مشکلات سے مختل ہو رہا ہے تو کیا اُس ساعت کو ہم انگلینڈ کے لئے ایک منحوس گھڑی کہنے مین حق بجانب ہونگے جب کلایو کی بے خوف عالی دماغی نے ایک تجارتی کمپنی کو سیاسی سلطنت مین تبدیل کر دیا اور سیکڑون سال کے لئے مسلسل لڑائیون کی بنیاد ڈالدی ؟ کیا ہم اُن ممتاز سیاست دانون کی طرح جنھون نے اپنی زندگی ہندوستانی معاملات مین گذاری ہے یہ راے نہین قائم کر سکتے کہ یہ سلطنت سریع الزوال ہے اور وہ زمانہ کچھ دور نہین ہے جب ہمکو اس ملک سے واپس آنا پڑے ؟ ۔

دوسری طرف ایسے مسئلہ پر غور کرنے مین عقلمند سے عقلمند انسان غلطی کر سکتا ہے ۔ سلطنت ہند کی انتہا شاید اتنی ہی بعید از قیاس ہے جتنی اسکی ابتدا۔ تاریخ مین ایسی کوئی نظیر نہین ہے ۔ اگر ایک دور افتادہ جزیرہ سے ہندوستان کی حکومت ایک ناپائدار شے نظر آتی ہے تو یہ بالکل قدرتی ہے کیونکہ ہم جانتے ہین ایک وہ دن تھا جب اُسکے وجود کا ہمکو گمان بھی نہین تھا .... بہرکیف اگر اسکو زوال ہونا ہے تو اس زوال کے ثبوت کا جاننا ہمین لازم ہے ۔ جن بے حساب مشکلات کا اسکو مقابلہ کرنا پڑتا ہے انکا ثبوت البتہ ہم دریافت کر سکتے ہین لیکن اسکے زوال کے آثار شاید ہی کوئی بتا سکے ۔ اور پھر اگر ہم تسلیم کر لین ۔ انکار نہ کرین کہ انگلینڈ کو اس سلطنت کی پیدا کردہ مشکلات کا معاوضہ نہین ملا تو اس اقرار مین کوئی عملی اہمیت نہین پیدا ہوتی ۔ اس طرح کے اقرار اور کسی ایسی عملی تجویز مین (جیسے اس سلطنت کو چھوڑ دینا) بڑا فرق ہے ۔

یہ خیال قائم کرنا ممکن ہے کہ اگر انگلینڈ سرے سے کسی سلطنت کی بنیاد نہ ڈالتا اور چین کی طرح ہندوستان کے ساحلون پر بھی محض ایک تاجر کی حیثیت سے رہتا تو اسوقت اسکی حالت بدرجہا بہتر ہوتی۔ مگر وہ لوگ بھی جن کو یقین ہے کہ ایک نہ ایک دن ہمکو ہندوستان چھوڑنا ہے اس خیال پر علمی حیثیت سے غور وخوض کرنے کے عادی نہین ہین۔ بہت سے ایسے کام ہین جنکا نہ کیا جانا اچھا تھا لیکن ہوجانے کے بعد انکا بگاڑنا کچھ اچھا نہین ہے۔ ایسا وقت آسکتا ہے جب ہندوستان کو اسکے حال پر چھوڑنا ممکن العمل ہوگا لیکن فی الحال اسپر اسی طرح حکومت کرنی چاہئے گویا ہمکو ہمیشہ کرنا ہے۔ ایسا کیون؟ یہ نہ سجھو کہ اس مین ہماری ہی غرض ہے۔ بعض لوگ کہتے ہین کہ ہماری عزت قومی اس بات کی متقاضی ہے کہ جس ملک کو ہمارے آباد اجداد نے اپنا خون بہاکر حاصل کیا ہو اور جو ہماری قوم کی بہادری کی عظیم یادگار ہو اسپر قابض رہین۔ لیکن میرے خیال مین عزت کے تمام ایسے مفہومون مین درندگی کی بو آتی ہے۔ ان مفہومون کی بناء جیسا مین کہہ چکا ہون، حکومت اور ملکیت کے قدیم اور متروک معنی کو خلط ملط کردینے پر ہے ایک لمحہ کے لئے بھی سوائے ہندوستان اور انگلینڈ کی بہبودی کے کوئی اور بات نہین ملحوظ رکھنا چاہئے لیکن چونکہ ہندوستان کا مفاد زیادہ وابستہ ہے اور وہ انگلینڈ سے زیادہ بڑا اور زیادہ غریب بھی ہے لہذا اُسکا خیال انگلینڈ سے پہلے کرنا چاہئے۔ انھین اصول کی بنا پر اور خصوصًا ہندوستان کے مفاد کی رعایت سے ہمارا اسکو چھوڑ دینا فی الحال غیر ممکن ہے۔ اگر صرف ہمارے ذاتی نفع کا سوال ہوتا تو ہم ایسا کرسکتے تھے۔ اگرچہ آج تجارت اس اعلی پیمانہ پر پہونچ گئی ہے اور انگلینڈ نے اپنا کثیر سرمایہ گذشتہ چند سالون کے اندر ملک مین لگا دیا ہے تاہم اسکا چھوڑ دینا آسان ہی نہین بلکہ ممکن بھی ہے۔ برخلاف اسکے جب ہم ہندوستان کے مفاد کا خیال کرتے ہین تو یہ امر قطعی ناممکن نظر آتا ہے ہمارے طرز حکومت پر بہت سے بجا اعتراضات ہوسکتے ہین۔ بعضون کو کلام ہوسکتا ہے کہ ہماری حکومت یہان کے باشندون کے مزاج کے موافق ہے اور اسکے اخراجات بلاضرورت اور مسرفانہ ہین۔ اور اسی طرح کے دوسرے اعتراض کئے جاسکتے ہین۔ اس ناموازی تجربہ کے انجام کے متعلق ہمین جائز اندیشہ پیدا ہوسکتا ہے لیکن میرے نزدیک اس امر سے انکار کرنا کہ مسلمانون کی فتح کے بعد سے جتنی حکومتین ہندوستان مین قائم ہوئین اُن سے ہماری حکومت اچھی ہے، درست نہ ہوگا۔ اگرچہ اکثر لوگون کا خیال ہے کہ ہماری حکومت آخر کار ناکام ہوگی لیکن ملک کو کبھی ہم ایسی قابل رحم حالت مین نہین چھوڑ سکتے جو اُسوقت سے جب ہم نے اسکو حاصل کیا کچھ زیادہ اطمینان بخش نہین ہے۔ ایک متوسط درجہ کی حکومت بالکل نہونے سے تو بہتر ہی ہے۔ ایک ظالم اور مستبد حکومت کا بھی یکایک ہٹ جانا خطرناک تجربہ ہے۔ بلاشبہہ ایسے ممالک ہین جو اس آزمائش مین بغیر فتنہ وفساد مین مبتلا ہوے ثابت قدم رہ سکتے ہین۔ اُن ممالک سے جو غیر گنجان آباد ہین یا جنکے باشندے عرصہ دراز سے آزادی عمل کے عادی ہین امید کی جاسکتی ہے کہ وہ جلد از جلد حسب ضرورت کوئی نظام حکومت ترتیب دے لین گے۔ لیکن ہندوستان کی

بابت ایسی تجویز کا خیال کرنا کسی قدر مضحکہ خیز ہے۔ جس وقت ہندوستان مین ہمارا قبضہ شروع ہوا وہ ایسے خوفناک فتنہ و فساد کی حالت مین تھا کہ شاید یورپ کو اپنی ساری زندگی مین ایسا تجربہ نہ ہوا ہوگا۔ جو رہی سہی حکومت باقی تھی وہ بھی جابر تھی اور عموماً ایسے جنگ و جدال پسندون کے ہاتھ مین تھی جنکا سہارا ایسی فوج پر تھا جس مین آوارہ گرد اور لٹیرے بھرے تھے جنکا پیشہ غارتگری کے سوا کچھ نہ تھا۔ اسوقت مرہٹون نے ہندوستان کے بڑے حصہ کو گھیر لیا تھا، دہلی اور کلکتہ دونون اُنکے خوف سے کانپ رہے تھے حالانکہ انکا مرکز پونہ تھا۔ لیکن یہ قوت بھی غارتگری کی ایک باقاعدہ تحریک تھی۔ ادھر شمال مین نادر شاہ اپنی مہمول مین تیمور لنگ کی ہمسری دکھا رہا تھا لیکن یہ عذر کیا جاسکتا ہے کہ یہ بدامنی صرف چند روزہ تھی اور سلطنت مغلیہ کی تباہی سے پیدا ہوی تھی۔ تاہم اس سے اسقدر ضرور ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستان ایسا ملک نہین ہے جو حکومت کی علیحدگی برداشت کرسکے کیا سلطنت مغلیہ کے متعلق ہمارا قیاس مبالغہ آمیز نہین ہے؟ اسکا عروج بہت قلیل عرصہ تک رہا۔ دکن مین اسکو حقیقی استقامت کبھی نہین ہوی جس طرح کی انارکزم سے کلایو اور ہسٹنگز کو ہندوستان مین سابقہ پڑا وہ اپنی نوعیت مین ایسی نادر نہین تھی جیسی بظاہر معلوم ہوتی ہے۔ البتہ اُس وقت ابتری اور بدامنی اتنی سخت تھی کہ اُسکی نظیر نہین ملتی محمود کے زمانہ سے برابر ہندوستان ایک قسم کی بدنظمی مین مبتلا چلا آتا تھا البتہ اکبر اور شاہجہان کے عہد مین اسکا شمالی حصہ چندے اس بلا سے مامون رہا۔

الغرض ہندوستان ان تمام ممالک سے جن مین مستحکم سلطنت کے ارتقا کی قابلیت ہے زیادہ ناقابل ہے اور مجھے اندیشہ ہے کہ جو کچھ رہی سہی قابلیت اسکے اندر تھی اسکو ہماری حکومت نے کم کردیا ہے کیونکہ ہمارے تسلط نے ان طبقون کو جنمین کچھ بھی حکومت کی استعداد اور عادت تھی یقیناً پست کردیا ہے۔ قدیم شاہی نسل امرا، شرفا کے طبقہ نے خصوصاً مسلمانون نے جو سلطنت مغلیہ کے عمال حکومت مین جزو غالب تھے ہماری حکومت مین سب سے زیادہ نقصان برداشت کیا اور سب سے کم نفع اٹھایا۔ اور یہ بربادی اور تباہی اُن لوگون کے لئے جو ہماری سلطنت کا تاریک پہلو دیکھتے ہین حد درجہ غم انگیز ہے لیکن کیا یہ اس امر کی دوسری دلیل نہین ہے کہ ہماری حکومت کو ابھی قائم رہنا چاہیئے۔ اب تم ملک کے اس طول و عرض کو دیکھو اور سوچو کہ ہمنے برہمنی روایات کی جگہ کس طرح مغربی سائنس رائج کرکے روشن دماغ طبقہ کے اخلاقی اور مذہبی خیالات کو اندر ہی اندر کھوکھلا کردیا ہے۔ جب تم ان پہلوؤن پر غور کروگے تو تمکو معلوم ہوجائیگا کہ ایسے ملک سے جو صرف ہماری حکومت کا محتاج ہے اور بجز ہمارے کسی دوسرے کی محکومیت کا اہل نہین، اپنی حکومت کا سایہ اُٹھا لینا سخت ...... ناقابل عفو جرم ہوگا اور بہت اندیشہ ہے کہ اسکی وجہ سے ناقابل قیاس آفات و ابتلا رونما ہوجائین۔

یہ ہے خاکہ، مسئلہ ہند، کا۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ مسئلہ کیونکر پیدا ہوا؟ ہمارے قبضہ مین اتنی عظیم الشان سلطنت کس طرح آئی؟۔

(باقی آیندہ)

عبدالقیوم رسا

(۱)

ادریس کو صرف یہ غم نہ تھا کہ محبت میں اس کے ساتھ دغا کی گئی اور رابعہ سے اس کو محروم ہونا پڑا - اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس کو رابعہ کے ساتھ شدید الفت تھی اور رابعہ کے حرکات وسکنات سے بھی پایا جاتا تھا کہ وہ ادریس کو چاہتی ہے۔ ادریس کو یقین تھا کہ وہ اس کے سوا کسی غیر کیطرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گی - اس کو رابعہ کی محبت پر اعتماد تھا - رابعہ نے طوطے کی طرح اسکی طرف سے آنکھیں پھیرلیں اور رؤف کے ساتھ کچھ ایسا محو ہوئی کہ ادریس اک بھولا ہوا خواب ہو کر رہ گیا - اس سے ادریس کو . . . صدمہ ہوا ہوگا اس کا اندازہ کرنے کی کوشش بیکار ہے - لیکن شاید وہ اس صدمہ کو برداشت کر لیجاتا مگر سب سے بڑا دھکا اس کو یہ لگا تھا کہ رابعہ جس کو وہ محبت اور معصومیت کا مجسمہ سمجھتا تھا، آزمایش سے اس طرح مغلوب ہوگئی اور اپنی نسوانیت کا بھی پاس نہ کیا - ادریس عورت کی ہر کمزوری اس کے ہر عیب کو معاف کرنے کے لئے تیار تھا - لیکن تردید محبت عورت کا وہ جرم تھا جس کی سزا میں جو عقوبت بھی تجویز کیجائے وہ کم تھی - آج اس نے سمجھ لیا کہ محبت اور معصومیت دنیا سے اٹھ گئی ہے - اس لئے کہ جب رابعہ میں یہ خوبیاں نہیں تو دنیا کسی عورت میں نہیں ہوسکتیں - رابعہ ایسی بے اعتبار نکلی تو دنیا کی ہر عورت بے اعتبار ہوگی یہ تھی ادریس کی منطق جس نے اسکو اس نتیجہ پر پہونچایا تھا کہ عورت سے وفا و محبت کی امید رکھنا اپنی غلطی ہے - عورت صرف گناہ کے لئے پیدا ہوئی ہے وہ محض ایک آلہ ہے جس کے ذریعہ قدرت اپنا کام پورا کرتی ہے اور انسان کو آسانی سے آزمایش و ابتلا میں گرفتار کرتی ہے - عورت کو بھی اب وہ "پردۂ زنگاری" کے "معشوق" کا ایک جانستاں غمزہ سمجھنے لگا تھا۔

ادریس ایک نہایت غریب گھرانے کا لڑکا تھا - سات پشت سے محتاجی و ناداری اس کے گھر میں چلی آتی تھی اس کے باپ نے اپنے قوت بازو سے کما کر موضع رام نگر میں چار آنہ کا حصہ خریدا تھا، اس کے علاوہ آٹھ دس بیگہ کھیت آبائی تھے - یہ کھیت اس جاگیر کی یادگار تھے جو کسی زمانے میں ادریس کے مورث اعلیٰ کو معافی ملی تھی اور جو غدر کے ایام میں یا کچھ دنوں پہلے زمانے کی چند کروٹوں میں خاندان کے قبضہ سے نکل گئی تھی۔

ادریس کا باپ اس کم بضاعتی میں تین لڑکیوں اور ایک لڑکے کی پرورش کر رہا تھا اور ادریس کو انگریزی تعلیم دلا رہا تھا - تینوں لڑکیاں زاہدہ - شاہدہ - اور عاصیہ ادریس سے بڑی تھیں - ادریس کی عمر چودہ سال کی تھی اور وہ نویں درجہ میں پڑھتا تھا جبکہ تینوں بہنوں کی شادی ہوگئی اور وہ اپنی اپنی سسرال گئیں - باپ کے سر سے بوجھ ہلکا ہوگیا مگر اب دوسری فکر دامنگیر تھی کہ جو کچھ زمینداری ہے اس کا کافی حصہ دختری میں نکل جائے گا - اور ادریس کی وہی حالت ہوگی جو ابتدا میں اس کے باپ کی تھی۔

اسی لئے باپ اس دُھن کے ساتھ اپنا پیٹ کاٹ کر ادریس کو پڑھا رہا تھا کہ آگے چلکر اپنا ذریعۂ معاش آپ نکال سکے۔لیکن اس کو بیٹے کا وہ خوش آیند مستقبل دیکھنے کی نوبت نہ آئی۔جس سال ادریس نے انٹرنیس کا امتحان دیا۔باپ ہیضہ کا شکار ہوگیا اس مصیبت پر سال بھر بھی نہ گزرا تھا کہ ادریس کو یہ دوسرا صدمہ ہوا۔رابعہ اسکی رشتہ کی بہن ہوتی تھی اس کے ماں باپ امیر اور فکر معاش سے آزاد تھے۔ادریس بچپن سے رابعہ کا دلدادہ تھا۔رابعہ بچپن سے ادریس کے ساتھ منسوب تھی۔رابعہ کے دادا کی وصیت تھی کہ وہ ادریس کے ساتھ بیاہی جائے وہ چاہتے تھے کہ ان کی دولت خاندان کے اور لوگوں میں بھی تقسیم ہوجائے اور ادریس سے ان کو خاص محبت تھی اس لئے کہ لڑکا ہونہار اور سعادتمند تھا

ادریس گورکھپور میں پڑھتا تھا۔ایف۔اے کا پہلا سال تھا۔امتحان کے دن قریب تھے۔ادریس آج تک درجہ میں دوم نہ ہوا تھا۔کالج کی ابتدائی زندگی تھی طلبہ میں حریفانہ چشمک بڑھی ہوئی تھی، ہر شخص اول آنے کی فکر میں تھا ادریس بھی خاموشی اور محویت کے ساتھ محنت کر رہا تھا اسکو وظیفہ کی بھی فکر تھی۔انٹرنیس کا وظیفہ اسکو مل رہا تھا اور اگر یہ مقامی وظیفہ بھی مل گیا تو ماں کو بار سے یکلخت سبکدوش کردیگا، ادریس امروز فردا کی نیرنگیوں سے بے خبر امتحان کی تیاری میں مشغول تھا کہ اسکو ممتاز کا خط ملا جس نے اسکے سکون و اطمینان کی دنیا کو آناً فاناً برباد کرکے رکھدیا۔

رؤف، رابعہ کا چچازاد بھائی تھا اس کا باپ کانپور میں تجارت کرتا تھا اور بڑا آدمی سمجھا جاتا وہ زیادہ تر پردیس ہی میں رہا کرتا تھا گھر بہت کم آتا تھا۔رؤف کو اس نے بڑے ارمانوں کے ساتھ پڑھایا تھا۔رؤف نے بی۔اے کرلیا تھا اور سرکاری ملازمت پا گیا تھا۔ملازمت میں اس کا جی نہ لگا تو اس کو شوق ہوا کہ اپنی زمینداری کو چل کر سنبھالے اس غرض سے اُسنے چھ ماہ کی رخصت لی اور رام نگر میں اپنے چچا کے یہاں آکر ٹھہرا۔رابعہ کے ساتھ دن رات کا اٹھنا بیٹھنا تھا۔نتیجہ جو ہوا وہ خلاف توقع ہرگز نہ تھا۔رؤف نے رابعہ کو اپنا گرویدہ بنا لیا اور تین چار مہینوں میں تو یہ عالم تھا کہ رابعہ اگر کبھی تمام دن رؤف کو نہ دیکھتی تو ایسا محسوس کرتی کہ اس کا دم گھٹ رہا ہے۔رابعہ کے والدین اس کا یہ حال دیکھ دیکھ کر خوش تھے اس لئے کہ وہ رؤف کو رابعہ کے لئے بہترین شوہر سمجھتے تھے، ادریس کا خیال رفتہ رفتہ سب کے ذہن سے نکل گیا۔رابعہ خود بھی اس کو چند مہینوں میں خاطر انداز کرچکی تھی۔

ممتاز، ادریس اور رابعہ دونوں کا رشتہ دار تھا۔کئی پشت سے اس کا گھرانہ فلاکت و تنگدستی میں بسر کرنے کا خوگر تھا، ادریس اور ممتاز بچپن کے ساتھی تھے، ممتاز کے والدین ایسے نادار تھے کہ دو وقت کی روٹیاں بھی مشکل سے مہیا کرسکتے تھے لیکن رابعہ کے دادا بڑے کنبہ پرور تھے انہوں نے ادریس اور ممتاز دونوں کو فارسی کی تعلیم گھر پر دلوائی دونوں کو انگریزی پڑھنے کا بڑا ارمان تھا۔اکثر جب وہ تنہائی میں اکٹھا ہوتے تو اسی موضوع پر بڑے ولولوں کے ساتھ گفتگو کیا کرتے تھے۔دونوں مصمم ارادہ کئے ہوئے تھے کہ گورکھپور میں چلکر انگریزی اسکول میں نام لکھائیں گے اور جہاں تک ان کے بس میں ہوگا تعلیم کا سلسلہ جاری رکھیں گے مگر زمانہ کی رفتار کچھ عجیب بے معنی اور بے قاعدہ ہوتی ہے وہ سب کو یکساں موقع نہیں دیتا ادریس کی حسرت پوری ہوگئی لیکن

ممتاز بیچارہ کی حسرت دل کی دل ہی میں رہی۔ رابعہ کے دادا اگر زندہ ہوتے، تو بہت ممکن تھا اس کا بھی حوصلہ پورا ہو جاتا، لیکن اس نیک نہاد اور خدا ترس بزرگ کے بعد کوئی ایسا نہ تھا جو کسی دوسرے کے دل کی لگی کو سمجھتا اور اس کے ساتھ ہمدردی کرتا اور ممتاز کے ماں باپ کی مقدرت سے یہ باہر تھا کہ وہ بیٹے کو پڑھاتے لکھاتے۔

ممتاز، مقدر کے آگے سر جھکا کر بیٹھ رہا۔ اہل قضا و قدر کی بے نیازی کا اگر کوئی جواب ہو سکتا ہے تو وہ سر تسلیم ہے ممتاز جانتا تھا کہ ہم پر آپ پر اختیار کا دروازہ جب کھلا نہیں ہے تو پیشانی پر بل ڈالنا ایک فعل عبث ہے۔ سوا اسکے کہ جو کچھ آپ کو دیا گیا ہے اسپر صبر و شکر کرکے بیٹھ رہیئے۔ اور کر ہی کیا سکتے ہیں۔ رہ گیا یہ کہ اس کے بعد اپنی قسمت کو کوس کوس کر اپنی زندگی کو دوزخ بنا لیجئے یا ہر بات میں ایک راحت کا پہلو نکالکر دوزخ کو بھی جنت سمجھئے سو ممتاز کے خیال میں بالکل اپنی اپنی توفیق کی بات تھی، یہاں اس سے بحث نہیں کہ ممتاز کا خیال صحیح تھا یا غلط۔ لیکن واقعہ یہ تھا کہ وہ اپنی تلخیوں سے لذت حاصل کر رہا تھا۔

ادریس کی طرح ممتاز بھی بچپن سے رابعہ کا دلدادہ تھا۔ مگر وہ جانتا تھا کہ رابعہ کی آرزو کرنا زمین پر رہ کر چاند کی آرزو کرنا ہے۔ ادریس اور ممتاز ایک دوسرے کے راز سے واقف تھے ادریس میں ممکن ہے کہ جذبۂ رقابت کا کوئی شائبہ رہا ہو۔ مگر ممتاز شوق کی اس منزل تک ہو چکا تھا جہاں "عداوتِ اغیار" تو ایک طرف دل میں "ہوس یار" تک باقی نہیں رہتی جس دھن کے ساتھ ممتاز رابعہ کو چاہنے کا دعویٰ کر سکتا تھا، شاید ادریس نہیں کر سکتا تھا، لیکن اسی کے ساتھ وہ اپنے دل میں یہ بھی سمجھے ہوئے تھا کہ :-

"مرا از اں چہ کہ شیریں لبے است در کشمیر　　مرا از اں چہ کہ نوشیں لبے است در نوشاد"

ممتاز طبعاً صوفی منش آدمی تھا اس کے ضمیر میں وہ جذبات موجود تھے جو آخر میں انسان کو صوفی یا بیراگی بنا کر چھوڑ دیتے ہیں۔ اس لئے رابعہ سے ہاتھ اٹھا لینا اس کے لئے کوئی بڑی بات نہ تھی اس کے سکونِ نفس کے لئے یہ خیال کافی تھا کہ وہ کسی سے محبت کرتا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ رابعہ کی شادی ادریس سے ہوگی اور وہ خوش تھا کیونکہ یہ بھی جانتا تھا کہ رابعہ کو ادریس سے بہتر شوہر نہیں مل سکتا۔

ممتاز موضع یوسف پور میں رہتا تھا جو رام نگر سے تقریباً آدھی میل اتر پورب کے کونے پر ہے یہ دونوں گاؤں ضلع بستی میں گھگر کے قریب دریائے آمی سے کچھ دور پچھم واقع ہیں اور گرد و نواح کی آبادیوں میں اس لئے ممتاز سمجھے جاتے ہیں کہ یہاں زیادہ تر شرفا کی بستی ہے۔ ممتاز کے باپ کو مرے ہوئے چار سال ہو گئے تھے۔ اس نے کچھ دنوں تک تو ان کھیتوں پر زندگی بسر کی جنکو ایک کم مایہ زمیندار سے لگان پر اس کے باپ نے لے رکھا تھا۔ مگر پھر یہ بھی سہارا نہیں رہا۔ اس ملک میں زمین تو زمیندار کی ازلی میراث ہوتی ہے۔ فاقہ کرنے والے کسان ان کے دستِ کرم کے محتاج ہوتے ہیں۔ انہوں نے جب چاہا کاشتکار سے کھیت اس طرح نکال لیا جس طرح چور سے مال مسروقہ۔ ممتاز کے پاس بھی وہ کھیت رہنے نہ پائے۔ زمیندار نے نہ جانے

کس مصلحت سے اسکو ممتاز کے قبضہ سے نکال لیا۔ ممتاز نے بڑی بڑی مشکل سے ایک چھوٹی سی پونجی مہیا کی اور خلیل آباد میں
کپڑے کی ایک دوکان کھول کر توکل کے ساتھ بیٹھ گیا۔

خلیل آباد بستی کی ایک تحصیل ہے اور گھر سے کوئی چار، پانچ میل پچھم ہے۔ ممتاز دن کو خلیل آباد میں رہتا اور شام کو دوکان بڑھا کر گھومتا پھرتا ہوا سب سے پہلے رام نگر پہونچتا تھا اور ایک نظر رابعہ کو دیکھتا ہوا اپنے مکان کو چلا آتا تھا۔ رابعہ اسکی بے غرض محبت سے واقف تھی مگر کبھی اس نے اسپر زیادہ غور نہیں کیا اور نہ اس کے نزدیک ممتاز کوئی قابل اعتنا ہستی تھا وہ بس کبھی کبھی ممتاز سے دلربایانہ انداز کے ساتھ مسکرا کر دو چار باتیں کر لینا ممتاز کی نیازمندیوں کا کافی صلہ سمجھتی تھی۔

ممتاز زندگی کی ماہیت سے آگاہ تھا اسکو معلوم تھا کہ "اسفل السافلین" میں کرب والم بمقابلہ راحت و انبساط کے کہیں زیادہ ہے مگر وہ ان لوگوں میں سے تھا جو خدا کو "حکیم و بصیر" مانتے ہیں۔ اسکا عقیدہ یہ تھا کہ انسان کو جس چیز نے انسان بنایا ہے وہ اس کا دکھا ہوا دل ہے ورنہ آج وہ بھی زیادہ سے زیادہ کرد بیوں کا ہم بزم ہوتا اور اشرف المخلوقات کہے جانے کا کسی طرح مستحق نہ ہوتا۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہماری یہ زندگی محنت و ابتلا کی زندگی ہے لیکن ہماری روحانی تحسین و تکمیل کے لئے یہ ایک لازمی چیز ہے سنائی نے ارتقاء انسانی کے لئے یہ شرط بتائی ہے

"درد باید صبر سوز و مرد باید گامزن"

ممتاز کا فلسفۂ زندگی بھی یہی تھا وہ زمانہ کی تلخیوں اور زمین و آسمان کی ستم ایجادیوں سے بے خبر تو نہیں مگر بے پرواضرور تھا۔ اس کو "نفس مطمئنہ" جیسی دولت نصیب تھی اس کے لئے سب سے بڑی راحت رابعہ کی محبت تھی جس کو وہ بجائے خود ایک نصب العین سمجھے ہوئے تھا۔

لیکن جب اسکو معلوم ہوا کہ رابعہ نے اپنے جذبات محبت ادریس سے رؤف کی طرف منتقل کر دیئے ہیں اور اسکے والدین اب سال کے اندر رؤف کو اسکا رفیق زندگی بنانے والے ہیں تو ممتاز کے دل کو غیر معمولی دھکا لگا۔ دنیا کی یہ سفلہ پروری برداشت کے قابل نہ تھی۔ اسکا دل دکھ گیا وہ ادریس کو رابعہ کے لئے بہترین شوہر سمجھتا تھا۔ ادریس کی اس سے بڑھ کر حق تلفی اور کیا ہو سکتی تھی۔ ممتاز نہ جانے کیوں رؤف سے پہلے ہی نظر میں نفرت کرنے لگا تھا۔ رؤف کے تیور سے اسکی طبیعت میں ایک غیر واضح بدمزگی سی پیدا ہوگئی تھی جو پھر کبھی دور نہیں ہوئی۔ جس وقت ممتاز نے رابعہ اور رؤف کو پہلی بار اکٹھا دیکھا اسکا دل ایک نامعلوم اندیشہ سے دھڑکنے لگا، اور یہ دھڑکن قایم رہ گئی۔ رؤف کے آتے ہی ممتاز نے رابعہ سے ملنا کم کر دیا تھا اور اب جبکہ یہ بات گرد و نواح میں مشہور ہوگئی کہ عنقریب رابعہ کی شادی رؤف سے ہونے والی ہے تو اس نے رام نگر کا آنا جانا بھی بند کر دیا اور ادریس کو مفصل حالات لکھ بھیجے۔

(۳)

ادریس افتاد طبیعت کے لحاظ سے ممتاز کا مد مقابل تھا۔ بچپن سے وہ زندگی کو ایک روگ سمجھتا تھا جن ناہمواریوں سے

اسکو گزرنا پڑ رہا تھا انکو وہ کسی رحیم و کریم کارساز کی عنایت سمجھنے سے طبعاً معذور تھا۔ دنیا کی کسی چیز میں اسکو کوئی روشن پہلو نظر نہ آتا تھا۔ رابعہ اور رابعہ کی محبت ہی ایک چیز تھی جو کبھی کبھی اسکے دل میں یہ خیال پیدا کردیتی تھی کہ ممکن ہے اس دنیاوی زندگی کا انجام بخیر ہو مگر اب تو وہ ایک ایسی تاریک خلا میں پھینکدیا گیا جہاں اس کے سہارے کے لئے ایک تنکا بھی نہ تھا۔ ممتاز کے خط کے ساتھ اس کی ماں نے بھی ایک تحریر بھیجی تھی جس میں بیٹے کی تسلی و تشفی کے لئے بیچاری نے اپنا کلیجہ نکالکر رکھدیا مگر ادریس کی تسلّی آسان نہ تھی۔ کچھ دنوں تک تو ایسا معلوم ہوتا کہ خود اپنے کو نہیں پہچانتا۔ گرد و پیش جو بہر صورت مانوس تھے اسکو غیر مانوس نظر آرہے تھے اگر اس میں ارادہ کی قوت زبردست نہ ہوتی تو شاید بہت جلد ڈاکٹر اسکو فتورِ دماغ کی سند دیدیتے وہ نہ جانے کیسی کیسی امنگوں کو اپنے دل میں پرورش دے رہا تھا، وہ یہ سوچ سوچ کر رگوں میں اک روح افزا گرمی محسوس کررہا تھا کہ جب رابعہ اسکی اپنی ہوجائے گی تو وہ اس زندگی کو جو "نمرود کے آتشکدہ" سے کسی طرح کم نہیں "ابراہیم کا گلزار" بنانے کی کوشش کریگا اور اسکو قوی امید تھی کہ اس کوشش میں کامیاب ہوگا، مگر امیدیں پوری کب ہوتی ہیں۔ قدرت کا کارخانہ ہی کچھ نرالا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہماری اندھیری رات روشن ہوجائے اور ہمارا دن بھی سیاہ کردیا جاتا ہے۔ ہم اپنی تمام قوت "باراں کی آرزو" میں صرف کردیتے ہیں اور آخرکار ہمارے لئے آگ برسائی جاتی ہے۔ حسرتوں کا خون کرنا قدرت کا کھیل ہے اگر کبھی کسی کی کوئی حسرت پوری ہوجائے تو اسکو صرف ایک حسن اتفاق یا قدرت کی.... فروگذاشت سمجھنا چاہئے۔ قطرہ بالعموم موتی نہیں ہوتا اس تمنّا میں نہ جانے کتنے قطروں کو "کام نہنگ" کی نظر ہوجانا پڑتا ہے۔

ادریس دنیا میں صرف دو ہستیوں کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتا تھا۔ ایک تو رابعہ تھی اور دوسری اپنی ماں۔ رابعہ سے دفعتہً اسکو اپنا دل ہٹانا پڑا تو ماں کے ساتھ اسکی محبت دگنی ہوگئی۔ یہ ماں ہی کی محبت تھی جس نے اسکو ایک خطرناک لمحہ سے بچالیا ورنہ اس کے اعصاب کو ایسا دھکا لگا تھا کہ شاید اب آگے پڑھنا اس کے بس کی بات نہ ہوتی لیکن اس خیال نے کہ اس کے ماں کی آیندہ خوشیاں اسی کے دم سے ہیں اس کو اپنے کام میں ثابت قدم رکھا۔ کچھ دنوں میں اس نے اپنے منتشر حواس کو مجتمع کیا اور اب پہلے سے کہیں زیادہ انہماک کیساتھ پڑھنے میں مشغول ہوگیا۔ یہی نہیں بلکہ اپنے فرصت کے اوقات کو بھی اس نے کام میں صرف کرنا شروع کیا۔ وہ اسکول کے تین چار لڑکوں کو پڑھانے لگا تھا اور اب ماں سے ایک پیسہ بھی اپنے خرچ کے لئے نہیں مانگتا تھا بلکہ کبھی کبھی کچھ روپیہ اپنی کمائی سے اسکو بھیجدیا کرتا تھا، یہ سب ادریس کی غیر معمولی قوت ارادی کا نتیجہ تھا۔ اس میں ایک تغیر البتہ پیدا ہوگیا تھا۔ اس سے پہلے اسکو خوش پوشی کا شوق تھا وہ اپنی بے مائگی میں جیسے صاف ستھرے کپڑے پہنتا تھا بڑے بڑے امیرزادوں کو نصیب نہ تھے ادریس کا سلیقہ ضرب المثل تھا مگر اب وہ اسکی طرف سے بھی غافل تھا اور زیادہ تر موٹے کپڑے پہننے لگا تھا دفعتہً یہ انقلاب ادریس کے ہم جماعتوں کی سمجھ میں نہ آیا۔

پہلے سال ایف۔ اے کے امتحان میں ادریس بڑی کوششوں کے بعد ممتاز رہا۔ اسکو مقامی وظیفہ ملگیا اور اس کا علمی حوصلہ بڑھ گیا۔ گرمی کی تعطیل میں وہ صرف چند دنوں کے لئے اپنی ماں کے پاس آکر رہا اور پھر اسکو دلاسا دے کر چلا گیا۔

رام نگر کی بدلی ہوئی فضا سے بقدر جلد وہ موانست نہیں پیدا کر سکتا تھا۔ رابعہ کا قرب تو ایک طرف ادریس کے لئے اب ہر وہ چیز سوہانِ روح تھی جو اسکو رابعہ کی یاد دلا دے اس لئے اب وہ کم از کم رام نگر میں رہنے کی تاب نہ لا سکتا تھا، اس کے علاوہ جن لڑکوں کو وہ پڑھاتا تھا ان کے لئے چھٹیوں میں بھی اسکا گورکھپور رہنا ضروری تھا۔ لہذا وہ ماں کو سمجھا بجھا کر چلا گیا۔ غریب سکینہ ان ماؤں میں سے تھی جو اولاد کی فلاح و بہبود کے لئے جان سے بھی دریغ نہیں کرتیں۔ اسکو اسکا صدمہ تھا کہ بیٹا سال بھر کی جدائی کے بعد بھی دو ماہ کے لئے اطمینان کے ساتھ اس کے پاس نہیں رہ سکتا مگر وہ خوب جانتی تھی کہ ادریس کے دل پر کیا گذر رہی ہے۔ اس نے پردہ ہی پردہ میں ادریس کی دلجوئی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا اور جب یہ دیکھا کہ بیٹے کے لئے رام نگر سے دور ہی رہنا بہتر ہے تو ہنسی خوشی سے اسپر بھی راضی ہوگئی۔

ایف۔ اے کا دوسرا سال تھا، جاڑوں کا موسم تھا۔ رابعہ کی شادی کے دن قریب تھے۔ ادریس کے نام بھی دعوتی رقعہ آیا تھا ادریس پر اس سے زیادہ ظلم ممکن نہ تھا اس کے دل کے ایک ایک ریشہ سے ٹیسیں اٹھ رہی تھیں مگر اس نے بڑے ضبط سے کام لیا انگیٹھی میں ڈال کر خاموش ہو رہا۔ وہ رابعہ کی شادی میں شریک نہیں ہوا۔ رابعہ اب رابعہ نہ تھی اب وہ رؤف کی بیوی تھی پہلی رابعہ کو ادریس خواب کی رابعہ سمجھکر بھول گیا تھا۔

(۴)

پانچ برس گذر گئے رابعہ اور رؤف کی زندگی کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ خوشگوار تھی اگرچہ رؤف نے اس عرصہ میں کچھ جوہر ایسے نکالے جس کی لوگوں کو امید نہ تھی۔ اس نے ملازمت ترک کر دی تھی اور اب اپنی جائداد کی دیکھ بھال میں مصروف تھا۔ اسکی جایداد رابعہ کی جایداد سے کہیں زیادہ تھی۔ اس کے علاوہ وہ صاحب تعلقہ تھا اور اس حیثیت سے بھی ملازمت کا محتاج نہ تھا پھر کیا وجہ کہ وہ گھر پر عیش و بے فکری سے زندگی بسر نہ کرے، اس نے اپنی ماں اور چھوٹی بہن کو بھی گاؤں پر بلا لیا اور پرانے مکان کو از سر نو شہری طرز پر تعمیر کرا کے وہیں سکونت اختیار کر لی اس کا بس ہوتا تو باپ کو بھی بلا لیتا مگر باپ نے کانپور چھوڑنا پسند نہیں کیا۔

رؤف فطرتاً اوباش تھا۔ عیاشی اور لذت پرستی اس کو وراثت میں ملی تھی۔ اسکی محبت بوالہوسی تھی۔ رابعہ کے ساتھ دو سال تو اس نے بڑے انہماک میں گذارے اس کے بعد اس نے اپنے خروش نفسانیت کو آسودہ کرنے کے لئے نت نئی دلچسپیاں نکالنا شروع کیں لیکن پھر بھی رابعہ کے ساتھ اسکا برتاؤ ایسا نہ تھا جو کسی طرح قابل ملامت سمجھا جاتا۔ البتہ اب وہ اسکو ایک ہندوستانی بی بی سے زیادہ قابل قدر نہیں سمجھتا تھا۔

رؤف کی روش لوگوں سے پوشیدہ نہ رہ سکی۔ قریب و دور کی بہو بیٹیوں کو بہکانا اور ان کو مبتلا کر کے چھوڑ دینا دن رات کا اسکا مشغلہ ہو گیا تھا۔ گھر والوں نے مجبوراً اس کو ریاست کی ایک شان سمجھ لیا مگر گاؤں والے رؤف کو پورا شیطان سمجھتے تھے اگر اس کے پاس اتنی دولت نہ ہوتی جو ہر موقعہ پر اسکے کام آتی تھی تو شاید آج اسکا اس جوار میں رہنا دشوار کر دیا جاتا۔ فاقہ مست کسان بکشمی کے خلاف کوئی سست سے سست تدبیر اختیار نہ کر سکتے تھے۔ ناچار سب دیکھتے تھے اور رؤف کی جان کو کوستے

چپ رہ جاتے تھے۔

روشن نے چاروں طرف اپنا سکہ جمانے کی اک صورت اور بھی نکالی رکھی تھی وہ سود پر روپیہ تقسیم کرتا تھا زمین پھاڑ کر پیٹ پالنے والے کسان اور چھوٹی پونجی والے زمیندار اس کے قرضدار رہتے تھے اور روشن ان سے جو چاہتا تھا روپیہ کے بل پر کرا لیتا تھا بظاہر وہ ان ناداروں کی روپیہ سے مدد کرتا تھا مگر حقیقت یہ ہے کہ بیچاروں کا خون چوس رہا تھا۔ سرمایہ داری کا روگ یوں تو ساری دنیا میں پھیلا ہوا ہے مگر ہندوستان اس کے ہاتھوں بری طرح مٹ رہا ہے اور سرمایہ داری و زمینداری نے ملک کا شتکاروں کے پاس سوا جسم اور سانس کے اور کچھ نہیں چھوڑا ہے اس ملک کی آبادی میں کسانوں کی تعداد غیر متناسب طور پر زیادہ ہے ہندوستان کی فلاح و بہبود در اصل انہیں "غم زدوں" کی فلاح و بہبود پر موقوف ہے مگر شامت ہو تو ایسی ہو کہ آج طرح طرح کی اقتصادی اور سیاسی شورشیں ملک میں پھیل رہی ہیں مگر ان میں سے ایک بھی ایسی نہیں جو اس طرف اپنی توجہ مبذول کرے اور خلوص نیت کے ساتھ کانوں کی پست اور گندی زندگی کو ابھارنے کی کوشش کرے۔

(۵)

اگہن کا مہینہ تھا۔ سنیچر کی شام تھی۔ ممتاز آج خلیل آباد سے سویرے لوٹ آیا تھا۔ ہاتھ پاؤں دھو کر اور ماں نے جو کچھ روکھا سوکھا سامنے رکھ دیا اس کو کھا کر حسب معمول سیر کے لئے نکل گیا اسکا روزانہ دستور یہی تھا صبح شام وہ ٹہلنے ضرور نکلتا تھا اور دور دور کا چکر لگا آیا کرتا تھا۔ شام کے وقت تو وہ بڑی دیر تک گھر سے غایب رہتا تھا۔ زیادہ تر وہ پر یتیا کے جنگل یا اس کے نواح میں گشت کیا کرتا تھا۔ آبادی سے دور ویرانوں میں اس کے لئے دلچسپی کا سامان زیادہ تھا۔

پر یتیا کا جنگل جو قرب و جوار میں مشہور ہے آمی کے کنارے واقع ہے اور رام نگر اور یوسف پور کی سرحد سے لیکر چاروں طرف ڈیڑھ کوس کے رقبہ میں پھیلا ہوا ہے جنگل بے انتہا گھنا ہے لیکن اس میں بڑے درخت کم ہیں زیادہ تر ببول اور ڈھاک کے درخت ہیں۔ رات کو اس جنگل سے جو گذرتا ہے بڑا دلیر سمجھا جاتا ہے اس لئے کہ درندوں اور سانپ بچھوؤں کے علاوہ یہاں ڈاکوؤں کا بھی ڈیرا رہتا ہے اور جاہل و غیر متمدن کسانوں کا خیال ہے کہ پر یتیا بھوت پریت کا بھی اکھاڑا ہے چنانچہ پر یتیا اسے اسی نسبت سے کہتے ہیں۔ ممتاز کو جو لوگ نہیں جانتے تھے وہ حیرت کرتے تھے کہ وہ اتنی رات تک جنگل میں صحیح و سالم کیسے پھرا کرتا ہے مگر جو لوگ جانتے تھے وہ اسکو صاحب کرامات سمجھتے تھے وہ اللہ والا مشہور تھا۔ اکثر لوگ اس کے مرید تھے۔ اور دعا تعویذ کے لئے اس کے پاس آتے تھے وہ بھی انکو مایوس کرنا نہیں چاہتا تھا اور اپنی بندگی اور بیچارگی کا دل میں خضوع و خشوع کے ساتھ اعتراف کر کے ان کے لئے دعا کر دیا کرتا تھا یا تعویذ لکھ دیا کرتا تھا۔ یوں تو اس جنگل کو دیکھکر ہمیشہ ممتاز کے دل میں ایک جلیل القدر قوت کا احساس ہونے لگتا تھا لیکن جاڑے کے موسم میں اسکا یہ احساس تیز ہو جاتا تھا جبکہ اس جنگل کا جلال پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ جاتا تھا۔ آج کہر بے طرح گر رہی تھی۔ زمین اور آسمان ملگئے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ قدسیوں اور خاکیوں میں کچھ مشورے ہو رہے ہیں۔ جنگل کا ایک ایک درخت اور درخت کا ایک ایک پتہ ذی روح معلوم ہوتا تھا۔

سورج ابھی غروب نہیں ہوا تھا۔ آبادیوں میں ابھی دھوپ تھی لیکن پربتیا، تیرہ و تار ہو رہا تھا، اگر کوئی بہ یک وقت پربتیا کا قریب کی بستیوں سے مقابلہ کرتا تو اسکو ماننا پڑتا کہ اگر یہ بستیاں اس دنیا کی چیزیں ہیں تو یہ جنگل کسی دوسری دنیا کی چیز ہے۔ دن ابھی باقی تھا مگر لکڑہارے اپنے اپنے بوجھ سنبھال رہے تھے کیونکہ جنگل میں ایک گھنٹہ پہلے ہی رات ہو گئی تھی۔

پربتیا کی سیر کا مناسب وقت یہی ہے جبکہ ساری دنیا دھیرے دھیرے خواب میں محو ہونے لگتی ہے اور جنگل کی روحیں بیدار ہونے لگتی ہیں ہر طرف ایک حرکت ایک دوا دوش ہونے لگتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پتا پتا کسی اہم کام میں مصروف تھے۔ ایسے وقت پربتیا کے "رموز مملکت" میں دخل در معقولات کرنا یا ممتاز جیسے ازخود رفتہ لوگوں کا کام تھا، یا چور اور ڈاکوؤں کا۔

پربتیا میں ایک سرے سے دوسرے تک نالوں کا ایک جال پھیلا ہوا ہے۔ یہ نالے آمی سے نکلے ہیں جو برسات میں بھر جاتے ہیں اور جنگل کے سماں کو اور بھی بھیانک بنا دیتے ہیں لیکن جاڑوں میں ان میں پانی کم رہ جاتا ہے۔ ممتاز اپنے عصائے موسیٰ کے بل پر نالوں کو پھاندتا ہوا پربتیا کے شمالی کنارے تک پہونچ گیا، رات ہو گئی تھی مگر گھر پلٹنے سے ابھی اسکی "شب پرست" طبیعت اسکو روک رہی تھی۔

ممتاز نے جنگل کے آخری حد تک پہونچ کر پلٹنا چاہا۔ اپنا رخ پھیرنے بھی نہ پایا تھا کہ جنگل کے باہر سے کچھ کھڑکھڑاہٹ کی آواز آئی اور اسی کے ساتھ کسی نے پکار کر کہا "رؤف میاں آج اتنی دیر کیوں ہوئی" آواز میں کچھ نسوانی نزاکت تھی۔ ممتاز پہلے تو کچھ سہم سا گیا مگر دریافت حال کی غرض سے جنگل کے باہر نکل آیا۔ ایک بیس سال کی عورت سفید ساری پہنے ہوئے اسکی طرف آرہی تھی لیکن ممتاز کے قریب آکر جھجک گئی اور یہ کہکر ایک کنارہ ہو رہی "دھوکا ہوا!" ممتاز اندھیرے میں تو اس کی صورت نہ دیکھ سکا لیکن وہ سمجھ گیا کہ اس جوار مین ایسی سفید پوش عورت سوا ایک کے اور کون ہو سکتی ہے۔ ممتاز واپس ہونے لگا کہ جنگل کے اندر سے کسی کے کرنے کی آواز آئی۔ ممتاز آواز پر دوڑ پڑا تھوڑی دور پر ایک گہرا نالا تھا جس مین پانی برائے نام تھا۔ ممتاز نے دیکھا کہ ایک شخص اُس مین سے باہر نکلنے کی کوشش کر رہا ہے نزدیک سے دیکھنے پر معلوم ہُوا کہ رؤف ہے۔ ممتاز نے اُسکی مدد کی۔ رؤف نالے سے باہر نکلا تو اسکو احساس ہُوا کہ وہ کس کے سامنے ہے۔ اُس کا اس جنگل مین ایسے ناوقت پایا جانا ہر طرح کے شبہے دل مین پیدا کر سکتا تھا۔ وہ اس خیال سے نادم تھا کہ ممتاز اپنے دل مین کیا سمجھتا ہوگا اُس نے اپنی بندوق کو جو کیچڑ مین لت پت تھی ہاتھوں سے صاف کرکے کاندھے پر رکھا اور ممتاز سے کہا "مین شام کو ادھر شکار کی غرض سے روز آتا ہون۔ آج مجھے اپنے منشی سے ایک ضروری کام کے متعلق کچھ کہنا تھا اسلئے تیواری پور جا رہا تھا مگر اب چلو گھر واپس چلونگا" ممتاز نے طنز آمیز لہجہ مین کہا "نہین اب آپ اپنا کام پورا ہی کر لیجئے۔ آپ کا منشی جنگل کے اُس سرے پر آپ کا دیر سے انتظار کر رہا ہے" یہ کہکر وہ تیزی کے ساتھ وہان سے روانہ ہو گیا۔ رؤف دیر تک اُس کے الفاظ پر غور کرتا رہا

وہ سمجھ گیا کہ ممتاز اُس کے راز سے واقف ہے۔

(۶)

مگہر ضلع بستی کے اُن مقامات مین سے ہے جو تاریخی شہرت رکھتے ہین۔ یون تو اکثر ٹوٹے پھوٹے کھنڈر یہان آپ کو نظر آئین گے جن کی عبرت آموز ہیئت آپ کو ایک مٹے ہوے تمدن کی یاد دلا کر آپ کے نازک ترین جذبات کو اُبھا دیتی ہے اور آپ اپنی آنکھون مین نمی محسوس کرنے لگتے ہین لیکن جس چیز نے اس مگہر کو سارے ہندوستان مین ایک قابل احترام جگہ بنا دیا ہے وہ کبیر داس کا روضہ ہے جو قصبہ سے اتر دریائے آمی کے کنارے واقع ہے اس عمارت کا نصف حصہ ہندؤن کے قبضہ مین ہے اور نصف مسلمانون کے۔ کبیر دراصل ایک شاعر صوفی تھے اُن کو کفر و اسلام سے کوئی سروکار نہ تھا مگر اُن کی معاشرت کچھ ایسی تھی کہ ہندؤن نے اُنکو ہندو سمجھا اور مسلمانون نے مسلمان۔ ظاہر پرست عوام اس حقیقت کو سمجھنے سے معذور رہین کہ ایک ہی شخص بہ یک وقت مسلمان اور ہندو دونو رہ سکتا ہے۔ بہرحال مرنے کے بعد کبیر کی خاک دو حصون مین بٹ گئی۔ ایک حصہ کو مسلمانون نے لیکر مقبرہ بنایا اور دوسرے حصہ سے ہندؤن نے ایک مندر تعمیر کیا۔

یہ تو ہوئی مگہر کی تاریخی حیثیت فی الحال مگہر بیرونی مقامات مین جُلاہون کے بُنے ہوے موٹے کپڑون اور پان کیلیے مشہور ہے لیکن مقامی طور پر یہان کے تاڑی خانون کو کافی اہمیت حاصل ہے۔ کوس ڈیڑھ کوس تک کے فاصلہ پر رہنے والے یہان تاڑی پینے آتے ہین۔ ان تاڑی خانون کو دیکھکر انگلستان کے وہ قہوہ خانے یاد آجاتے ہین جو سولھوین اور سترھوین صدی مین کُنجی جنتون سے ممتاز تھے۔ شام کو جب دن بھر کے تھکے ماندے مزدور اور جولاھے (جن مین جوان ادھیڑ اور بڈھے سبھی شامل ہوتے ہین) "بادہ فروش" کے گرد حلقہ باندھ کر بیٹھتے ہین۔ اسوقت کون سا ایسا مسئلہ ہوتا ہے جسپر چہ میگوئیان نہین ہوتین۔ حکومت برطانیہ کی گندم نما جو فروشیون سے لیکر آٹے دال کے بھاؤ اور ہمسایون کی بیبیون تک سبھی کچھ پر بآواز بلند مباحثے ہوتے رہتے ہین۔ ان مباحثون مین اکثر ہاتھا پائی کی بھی نوبت آجاتی ہے۔ ایسے موقع پر عموماً ساقی یا ساقیہ کی برمحل مداخلت سے جھگڑا چُک جاتا ہے اور پھر سب آپس مین ہنسنے بولنے لگتے ہین نہین تو فریقین کے سرون کیساتھ کوزے اور مٹکے بھی معرض خطر مین آجاتے ہین۔ ہفتہ مین ایکبار بدھ کے دن مگہر مین بازار لگتا ہے اس دن ان تاڑی خانون کی رونق مین معمولی طور پر بڑھجاتی ہے۔

جس سنیچر کا ذکر کیا جاچکا ہے اُسکے چار روز بعد مگہر مین بازار لگا ہوا تھا۔ بازاریون کی آمد ورفت سے سڑک آباد ہو رہی تھی۔ سہ پہر کیوقت قصبہ سے باہر سڑک کے کنارہ تاڑی کی ایک دوکان پر اور دوکانون سے زیادہ ہجوم تھا اُسکی وجہ یہ تھی کہ یہان جو بحث چھڑی ہوئی تھی وہ حال کے ایک واقعہ سے متعلق تھی اور اسقدر دلچسپ تھی کہ بہتیرے پرہیزگار جو تاڑی کی مہک کو بھی گناہ سمجھتے تھے۔ بحث مین آکر شریک ہوگئے تھے

میان رؤف اور مریم کے درمیان گذشتہ چھ مہینون مین جو تعلقات پیدا ہو گئے تھے اُنھین پر ہر شخص اپنے اپنے خیالات کا اظہار کر رہا تھا آخر کار دکان کی مالکہ کی تائید سے ایک بڑے میان کا بول بالا رہا اور کثرت راے سے مریم جادوگرنی تسلیم کر لی گئی مریم کا شہرہ دور دور تھا۔ وہ تیواری پور مین گانوٴن کی آبادی سے باہر اپنے دادا رسول شاہ کے ساتھ ایک کچے مکان مین رہتی تھی۔ اُس کو پڑوس مین آئے ہوئے سال بھر سے زیادہ عرصہ گزر چکا تھا۔ اُس کے متعلق طرح طرح کی افواہین مشہور تھین۔ بعض اسکو ہرجائی بیسوا کہتے تھے اور اُسکو ملامت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور بعض اُسکو جادوگرنی سمجھکر اُس سے کانپتے تھے۔ عام طور پر مشہور تھا کہ پرتیا کے جتنے بھوت پریت ہین وہ سب اس کے تابعدار ہین۔ گانوٴن کے نوعمر لڑکون اور لڑکیون کو بڑھے بوڑھے مریم کے پاس آنے جانے نہین دیتے تھے لیکن چھپ چھپ کر لڑکیان خصوصیت کے ساتھ اُس کے پاس آیا کرتی تھین۔ مریم ہُنروالی عورت تھی۔ اُس کی زبان نسبتاً صاف اور شستہ تھی۔ وہ تھوڑا بہت لکھنا پڑھنا جانتی تھی اور سینے پرونے کے کام مین ماہر تھی۔ آس پاس کے لوگون کو اگر کوئی خط لکھوانا یا پڑھوانا ہوتا یا اگر کبھی کسی شوقین کو کوئی اچھا کپڑا سلوانا ہوتا تو مریم ہی یاد کیجاتی تھی۔ چونکہ مریم کو کسی کیساتھ دوستانہ لگاوٴ نہین تھا اس لئے وہ اُن کے کام اُجرت پر کیا کرتی تھی۔

افواہون سے برطرف ہو کر مریم کے بارے مین صحیح حالات جو معلوم ہو سکے ہین وہ یہ ہین۔ رسول شاہ کا آبائی پیشہ فقیری تھا۔ باپ دادا کے وقت سے بھی روزی کا ذریعہ تھا۔ اور زکواۃ خیرات سے اُس کا روٹی کپڑا چلتا تھا۔ رسول شاہ کے باپ کے زمانہ سے کچھ کھیتی بھی ہونے لگی۔ رسول شاہ نے آمدنی کی ایک اور تدبیر نکالی وہ ڈاکوٴن کے گروہ مین داخل ہو گیا جس مین اُس نے کافی نمود حاصل کر لی۔ دس بیس کوس کے حلقہ مین جہان کہین ڈاکہ پڑتا رسول شاہ اُس مین ضرور شریک ہوتا تھا۔ اب بڑی فرغت سے بسر ہونے لگی۔ رسول شاہ کے ایک بیٹی اور ایک بیٹا تھا۔ بیٹی بیاہی جا چکی تھی اور سُسرال مین رہتی تھی۔ بیٹے کا نام سجاد تھا۔ اس کی عُمر اٹھارہ سال کی تھی۔ ابھی شادی نہین ہوئی تھی۔ راہزنی مین وہ باپ سے سبقت لے گیا تھا۔ اس عُمر مین دو دفعہ وہ قیدخانہ کی سیر کر آیا تھا۔ ایکدفعہ ایک ڈاکہ کے سلسلہ مین جس مین کئی خون بھی ہوٴے تھے۔ سجاد گرفتار ہو جانے کے خوف سے گھر چھوڑ کر بھاگ گیا اور پھر کوئی اُس کا پتہ نہ پا سکا۔ رسول شاہ عرصہ تک اس جرم مین پولیس کے ہاتھون بندھا پھرا کہ بیٹے کا پتہ جانتا ہے اور بتاتا نہین مگر واقعہ یہ تھا کہ اُس کے فرشتون کو بھی خبر نہ تھی کہ سجاد کہان ہے رسول شاہ قسی القلب ڈاکو ہونیکے باوجود اولاد پر دم دیتا تھا۔ بیٹے کے غم مین وہ نہ جانے کتنے یعقوبی آنسو گرا چکا تھا مگر اُس کے "کلبہٴ احزان کو "گلستان" ہونا نصیب نہ ہُوا۔

تقریباً بیس برس بعد کلکتہ سے سجاد کی چھٹی آئی جس مین اُس نے اپنی مختصر سرگذشت بیان کر دی تھی وہ یہان سے بھاگ کر سیدھا کلکتہ پہونچا تھا اور برسر روزگار ہو گیا تھا۔ سال بھر بعد وہین ایک یتیم بھکارن سے

شادی کرلی تھی دوسرے سال ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ بیوی چند سال بعد مرگئی اور لڑکی کو سجاد نے بڑی بڑی منتوں کے ساتھ پالا۔ اب لڑکی عمر اٹھارہ سال کی تھی۔ رسول شاہ کو خط لکھنے کی تقریب یہ تھی کہ کوئی آٹھ نو مہینہ سے سجاد سخت تپ میں مبتلا تھا اور بچنے کی کوئی امید نہ تھی اب وہ چاہتا تھا کہ رسول شاہ جاکر اس کی بیٹی مریم کو اپنے ساتھ وطن لے آئے اور اسکو اسی طرح اپنی جان سے زیادہ عزیز سمجھ کر رکھے جس طرح ابتک خود سجاد نے رکھا تھا۔

رسول شاہ خط پاکر بہت رویا اور دو دن کے اندر ادھر ادھر سے کچھ نقد کا بندوبست کرکے کلکتہ روانہ ہوا۔ سجاد کی حالت ابتر تھی۔ وہ دم توڑ رہا تھا اگر رسول شاہ ایک دن اور دیر کرکے پہونچتا تو بیٹے کو زندہ نہ دیکھتا۔ سجاد میں زیادہ بولنے کی تاب نہ تھی۔ اس نے اکھڑے ہوئے جملوں میں مریم کو رسول شاہ کے سپرد کیا اور ایک آخری سانس لیکر زندگی کے جھگڑوں سے بے خبر ہوگیا۔ رسول شاہ مریم کو لے کر وطن آیا اور اسکو اپنے بڑھاپے کا سہارا سمجھ کر اپنی توجہ اسپر وقف کردی۔ مریم کی کوئی خواہش ایسی نہ تھی جس کو رسول شاہ پورا نہ کرتا ہو۔ مریم بھی دادا سے بڑی محبت کرتی تھی، اور ہر طرح اس کے آرام کا خیال رکھتی تھی۔ سینے پرونے سے اسکو جو کچھ ملتا تھا وہ سب رسول شاہ کی ہاتھ میں لاکر دیتی تھی۔ یہ سب کچھ تھا مگر مریم اپنی آزادی اور بیباک روی میں کسی کو خلل انداز نہ ہونے دیتی تھی۔ رسول شاہ نے چاہا کہ اسکی شادی کردے مریم نے انکار کردیا اور رسول شاہ دوبارہ کچھ کہنے کی ہمت نہ کرسکا۔ مریم مردوں سے بے جھجک ملا کرتی تھی۔ رسول شاہ نے دبی زبان سے منع کیا مگر مریم نے توجہ نہ کی، وہ ان عورتوں میں سے تھی جو اپنی عصمت اور اپنے وقار کو قائم رکھتے ہوئے مردوں کی ابلہانہ فریفتگی سے لطف اٹھایا کرتی ہیں

مریم خوبصورت تھی رنگ سرخ و سپید تھا۔ جسم نرم و نازک تھا اعضا کی ساخت سڈول تھی اس کے گھنے اور سیاہ بال جس وقت بکھر جاتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ پھولی ہوئی شفق پر طوفانی رات مسلط ہوگئی ہے۔ وہ کپڑوں کی شوقین تھی اور ان کو ایسے سلیقہ سے پہنتی اور رکھتی تھی کہ سال سال بھر کے کپڑے نئے معلوم ہوتے تھے۔ اس وجہ سے بھی دیہاتی اسکو عامل سمجھتے تھے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ جن، فرمانبردار موکل ہیں جو مریم کو کپڑے اور روپئے لالاکر دیا کرتے ہیں

مریم کو کسی دوسرے عالم کی بہار کہنا مبالغہ نہ ہوگا۔ اس کے حسن و جمال کی پوری تصویر کھینچنا ایسا ہی ہے جیسے کسی لطیف شعر کے اثرات کی تشریح کرنا۔ اس میں اکثر ایسے "نکات دلبری" تھے جنکا تجزیہ نہیں کیا جاسکتا، مثلاً اسکی کالی پتلیاں تاریکی کے ان اسرار سربستہ سے معمور تھیں جنکا علم صرف آدھی رات کے جاگنے والوں کو ہوسکتا ہے اسکی آنکھوں میں جو اثر تھا وہ اس کو جادوگرنی ماننے پر مجبور کرتا تھا۔ جس نے اسکی آنکھوں کا ایک بار سامنا کیا وہ اپنے دل میں ایک عجیب و غریب کیفیت لے کر گیا۔ جس کی طرف اسکی نظر اٹھ گئی اسکا قرار و سکون پامال ہوکر رہ گیا۔ ایسی ہی آنکھوں کا نہ دیکھنا بقول مومن "عین نگہہ التفات" ہوا کرتا ہے۔ خود مریم اپنی آنکھوں کی سحر آفرینیوں سے اکثر مغلوب ہوجاتی تھی اسوقت یہ معلوم ہوتا تھا کہ آنکھیں کھولے ہوئے سو رہی ہے اور گرد و پیش سے بالکل بیخبر ہے۔ اسکے نازک رسیلے ہونٹوں کے متعلق یہ کہنا بجا ہوگا کہ باتیں کرنے کیلئے نہیں بلکہ صرف چوسے جانے کیلئے اور بوسوں کے ہیجان سے کپکپانے کیلئے بنائے گئے تھے۔

مریم بلاناغہ صبح و شام جنگل اور ندی کی سیر کے لئے نکلتی تھی اسکو قدرت اور قدرت کی نیرنگیوں میں تنہا رہنے کی لت تھی۔ گرمیوں میں شام کو جب وہ لٹیں جھٹکا کر آمی کے کنارے کھڑی موجوں کا تماشا دیکھتی ہوتی تو کسی طرح اسکو اس عالم عناصر کی مخلوق تسلیم کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ بس یہ محسوس ہوتا تھا کہ جنگل کی دیوی ہے یا کوئی جل پری جو آسمان والوں کو بھی سر بسجود کر کے چھوڑے گی یا پھر زہرہ و مشتری کی کوئی ہمجنس ہے جو کسی فرشتہ کی ملکوتیت خاک میں ملا کر سانس لے گی پھر اگر تنگ خیال دیہاتی اسکو جادوگرنی کہتے تھے تو کوئی حیرت کی بات نہ تھی وہ اس جوار میں کم از کم ایک اجنبی سی چیز ضرور تھی۔

رؤف نے پہلی بار مریم کو اسی آن سے دیکھا تھا اور اسکی صورت کا پرستار بنگیا تھا۔ رؤف کے لئے یہ ایک نیا تجربہ تھا جسنے اسکو بے قابو کر دیا وہ اب تک نہ جانے کہاں کہاں اپنا دل لگا چکا تھا، لیکن اس کے دل میں کوئی تغیر نہیں ہوا تھا۔ اب اس نے اپنے دل کو متغیر ہوتے ہوئے پایا۔ اس کے دل کی دھڑکنوں میں بھی ایک نئی کیفیت تھی۔ مریم دوسری عورتوں کی طرح نہ تھی جسپر ایکبارگی دسترس پاکر رؤف پھر قطع نظر کر لیتا۔ مریم کو رؤف کی افتادگی میں لذت ملی وہ اسکی بوالہوسی کے کارنامے سن چکی تھی وہ اپنے کو آسانی سے سپرد کر دینے والی ضعیف الاعصاب عورتوں میں سے نہ تھی۔ وہ اپنے دامن کو آلودگی سے بچائے ہوئے رؤف کی دل کی آگ کو بھڑکا رہی تھی اور اس سے لطف اٹھا رہی تھی۔ ڈیڑھ سال یوں ہی گذر گیا اور رؤف کے شوق کی آگ تیز ہوتی گئی لیکن مریم کے جلال حسن کے سامنے اسکی اتنی ہمت نہ پڑی کہ اپنی تمناؤں کو سیراب اور سرسبز کرنے کی کوشش کرے۔ ناچار انکو اپنے دل کے خون سے سینچتا رہا، وہ مریم کا بے عذر غلام ہو کر رہ گیا تھا اسکی گردیدگی کا چرچا دور دور پھیل گیا تھا۔ گھر والوں سے بھی حقیقت حال چھپی نہ رہ سکی۔ رابعہ اپنی سرنوشت کو کوس رہی تھی اس لئے کہ رؤف میں جو زمین و آسمان کا فرق پیدا ہو گیا تھا وہ اسکی برداشت سے باہر تھا۔ رؤف رات رات بھر مریم کے خیال میں تڑپا کرتا تھا۔ اب تک اس نے جو بے عنوانیاں کی تھیں وہ اپنے لئے کیں تھیں۔ رابعہ کے ساتھ اس کا برتاؤ بدستور قایم تھا۔ مگر اب اسکو رابعہ سے کوئی دلچسپی باقی نہ رہی۔ اس نے اپنی تمام قوتوں کے ساتھ اپنے کو مریم کے حوالہ کر دیا۔

(۷)

زمانہ داغ بھی دیتا ہے اور زمانہ اسکو مٹا بھی دیتا ہے۔ ادریس کے دل کو جو داغ لگا تھا وہ کچھ اس کلیہ سے بری نہ تھا وہ اپنے "غم عشق" کو بھول چکا تھا اور اب "غم روزگار" میں سرگرم تھا اس نے بی۔ اے امتیاز کے ساتھ کیا تھا۔ اسکو بارہ بنکی میں اسکول کی ہیڈ ماسٹری ملگئی وہ اس کام کے لئے فطرتاً موزوں تھا۔ وہ اب بھی لڑکوں کو گھر پر پڑھاتا تھا اور اس طرح مہینے میں اسکی اوسط آمدنی دو سو روپیہ کی تھی، اسکا ذاتی خرچ بہت کم تھا، کم از کم دو ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار ماں کو بھیجدیا کرتا تھا، سکینہ کا دل بلغ باغ ہو رہا تھا۔ وہ سمجھتی تھی کہ اب دن پلٹ رہے ہیں اور اگرچہ وہ اپنی زندگی کا نصف حصہ طے کر چکی تھی اور زمانہ کے اس نئے دور کی راحتوں سے خود اسکو زیادہ عرصہ تک بہرہ اندوز ہونے کی امید نہ تھی مگر وہ اس

خیال سے خوش تھی کہ بیٹے کے اچھے دن آگئے ہیں اور اسکی زندگی آرام کی زندگی ہوگی۔ تین سال کے اندر ادریس کی زمینداری میں بھی کچھ اضافہ ہوگیا تھا گاؤں والے بھی ادریس کے گھر کو خوشحال دیکھکر مالک تقدیر کی درگاہ میں شکر ادا کر رہے تھے۔ ادریس اپنے حسن اخلاق سے دلوں میں گھر کئے ہوئے تھا۔ کاشتکاروں کے ساتھ اسکو دلی ہمدردی تھی۔ اکثر خود تکلیف اٹھاکر وہ ان کے برے وقت میں کام آجایا کرتا تھا۔ نتیجہ یہ تھا کہ گاؤں والے بھی اسکی خوشی اپنی خوشی اور اسکی مصیبت کو اپنی مصیبت سمجھتے تھے۔ مرد عورت چھوٹے بڑے سب اس کے گھر کے کام بلا اجرت کیا کرتے تھے۔

ادریس چھٹیوں میں برابر آیا کرتا تھا۔ ماں کے علاوہ اگر وہ کسی سے مل لینا ضروری سمجھتا تھا تو وہ ممتاز تھا اس کے دو اسباب تھے ایک تو ممتاز کے ساتھ اس کے بچپن کی یاد وابستہ تھی۔ دوسرے وہ ممتاز کی شخصیت کا قایل تھا اور اسکا دل سے احترام کرتا تھا۔ ممتاز کو بھی ادریس کے ساتھ روحانی خلوص تھا۔ وہ ادریس کو ایک "معصوم گمراہ" سمجھتا تھا جو اتفاق زمانہ سے مجبور ہوکر سکون و طمانینت کی راہ کھو بیٹھا ہے اور اب جس کو زندگی میں سوا دکھ کے کچھ نظر نہیں آتا۔

ادریس کو ملازمت کرتے ہوئے تقریباً ساڑھے تین سال ہوگئے تھے۔ اس درمیان میں اسکی صحت کچھ خراب ہونے لگی تھی۔ اب اپنے لئے وہ اسکی سخت ضرورت محسوس کرتا تھا کہ شہر اور تمدن کے ہنگاموں سے دور کسی گوشۂ عافیت میں جاکر سکون قلب حاصل کرے۔ اسکی بہترین صورت یہ تھی کہ اپنے گاؤں پر جاکر رہے اور جو کچھ نقد اسکے پاس موجود ہے اسکو کسی کاروبار میں لگاکر حلال کی روٹی کھائے۔ گذشتہ سال اس نے پورے سال بھر ایک متمول تعلقدار کے لڑکے کو مفت پڑھایا تھا۔ صاحبزادے کچھ ایسے خدا کے سنوارے ہوئے تھے کہ تین سال سے جان توڑ کوششیں کر رہے تھے اور کسی طرح انٹرنس پاس نہیں ہوتے تھے، ادریس نے ان کے ساتھ بڑی جانفشانی کے ساتھ محنت کی اور اب کے سال وہ کامیاب ہوگئے، ان کے گھر والوں کو دریادلی سوجھی تو ادریس کو یکمشت دو ہزار روپئے دے ڈالے، ادریس کو ان روپیوں سے بڑی تقویت ہوگئی تھی اب وہ بلا کسی قسم کی دقت کے نوکری سے کنارہ کش ہوکر رام نگر میں گوشہ گیر ہوسکتا تھا۔ اسمیں اسکا ایک مقصد اور بھی تھا۔ ملک میں سیاسی شورشیں شروع ہوچکی تھیں ادریس میں بچپن سے بنی نوع انسان کے ساتھ ہمدردی کا مادہ موجود تھا اور رفتہ رفتہ یہ مادہ غالب ہورہا تھا وہ جانتا تھا کہ اپنی تنہا ذات سے ساری دنیا کو فایدہ نہیں پہونچایا جاسکتا۔ اسلئے اپنی قوم اور اپنے ملک کے لئے جو کچھ انسان کرسکتا ہے ضرور کرنا چاہئے۔ ہندوستان کی آبادی کا زیادہ حصہ اَن پڑھ اور بھوکے کسانوں پر مشتمل ہے۔ ادریس محسوس کر رہا تھا کہ سب سے پہلے انہیں کی حالت کو سدھارنے کی ضرورت ہے۔ جبتک یہ ترقی نہیں کرتے ملکی ترقی کا شور بادپیمائی سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا اسلئے ادریس نے یہ سوچا تھا کہ رام نگر میں چندہ اکٹھا کرکے ایک مدرسہ کھولے گا اور پڑوس کے دیہاتوں میں اتنی تعلیم پھیلانے کی پوری کوشش کریگا جتنی کہ ان کی بہبودی کے لئے ضروری ہے۔

ادریس نے پیشتر ہی سے ممتاز اور سکینہ کو مطلع کردیا تھا۔ گرمی کی لمبی تعطیل میں وہ استعفا داخل کرکے چلا آیا۔ آتے ہی ایک طرف تو وہ ممتاز کی دوکان میں پانچسو روپیہ لگاکر حصہ دار ہوگیا اور دوسری طرف مدرسہ قایم کرنے کے لئے زمینداروں سے

ان کی حیثیت کے مطابق چندہ وصول کرنا شروع کر دیا۔ اس کارِ خیر میں ممتاز بھی اسکا شریک تھا۔ رام نگر اور یوسف پور کے درمیان ایک پر فضا آم کا باغ ہے اسی میں ایک بڑی جھونپڑی ڈالی گئی اور مدرسہ کا افتتاح ہو گیا۔ گانوں گانوں اس کا چرچا پھیلا۔ دور دور سے لڑکے آکر بھرتی ہونے لگے۔ ممتاز بھی ایک گھنٹہ روزانہ ان کو پڑھانے میں صرف کرتا تھا۔ اسکے بعد دکان کی نگرانی میں لگ جاتا تھا۔ ادریس زیادہ تر مدرسہ کے کام میں مشغول رہتا تھا۔

(۸)

مریم نے جب پہلی بار یہ سنا تھا کہ ادریس جو ”یاران وطن“ کی ”بے مہریوں“ دلگیر ہو کر پردیس چلا گیا تھا۔ اب غربت کی ناسازگاریوں سے مجبور ہو کر پھر وطن آنے والا ہے۔ اسی وقت اس نے اپنی رگوں میں ایک خفیف ہیجان محسوس کر لیا تھا۔ وہ ادریس کی پوری سرگذشت جانتی تھی۔ اس کو ادریس سے غایبانہ انس پیدا ہو گیا تھا۔ وہ یہ بھی سن چکی تھی کہ ادریس کی صورت بڑی دلکش ہے اسلئے اسکو کم سے کم ایکبار دیکھنے کی مشتاق تھی۔

ادریس کو آئے ہوئے پانچ چھ مہینہ ہو گئے تھے اور مریم کو اسے دیکھنے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ وہ اپنے کو چھپا کر ادریس کی جھلک دیکھ لینا چاہتی تھی۔ اسکی ابتک کوئی تدبیر اس کے ذہن میں نہیں آئی تھی لیکن کبھی کبھی مسبب الاسباب کی طرف سے ہماری مرادیں بھی پوری ہو جاتی ہیں۔ مریم کے پرستاروں میں ایک پٹھان کا لڑکا بھی تھا۔ جس کا نام نور محمد تھا، اسکی عمر کوئی بیس بائیس برس کی تھی۔ وہ یوسف پور کا رہنے والا تھا اور رسول شاہ کے کھیت کھلیان کی دیکھ بھال کیا کرتا تھا۔ وہ مریم کی صورت کا پروانہ تھا۔ مریم اس کی والہانہ نگاہوں کا اپنی پر خلوص مسکراہٹ سے جواب دے دیا کرتی تھی۔ نور محمد اس کو بھی غنیمت سمجھتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ مریم سے اس سے زیادہ امید نہیں کیجا سکتی۔

ایک روز سوچتے سوچتے مریم نے سوچا کہ نور محمد کو اپنا ہمراز بنانا چاہیئے اور اسکی شیفتگی سے کام لینا چاہیئے۔ جب دوسرے دن شام کو نور محمد اپنا کام ختم کر کے اور مریم پر ایک حسرت بھری نظر ڈالکر گھر جانے لگا تو مریم نے کہا ”نور تھہرو میں بھی تمہارے ساتھ ندی تک چلوں گی۔ مجھے تم سے ایک ضروری بات کہنا ہے“ مریم کا لہجہ آج کچھ غیر معمولی سا تھا نور محمد رک گیا۔ مریم اس کے ساتھ ہو لی۔ راستہ بھر وہ خاموش تھی اور نور محمد متحیر۔ دریا کے کنارے پہونچکر مریم نے نور محمد پر اپنی مسحور کر دینے والی نگاہیں جما کر کہا ”نور تم مجھ کو چاہتے ہو؟“ نور محمد کا دل دھڑکنے لگا۔ مریم نے اس سے پہلے اسکو کبھی اس طرح مخاطب نہیں کیا تھا۔ نور محمد اپنے رگ و پے میں ایک بے چینی محسوس کرنے لگا۔ تھوڑی دیر کے لئے اسکی زبان بند ہو گئی، لیکن جب مریم نے اپنا سوال دھرایا تو اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا ”اسکا جواب میری آنکھوں سے ملسکتا ہے“ مریم نے کہا ”دیکھو میں کسی کی محبت نہیں کر سکتی البتہ تمہاری محبت کی قدر کرتی ہوں۔ یقین مانو رؤف میاں سے کہیں زیادہ میں تمہاری قدر کرتی ہوں، میں تم سے کوئی ایسے وعدے نہیں کر سکتی جس کو پورا نہ کر سکوں اور بعد کو شرمندہ ہوں اور تم مایوس۔ میں تم کو ایک بار اپنا منہ چومنے کی اجازت دے سکتی ہوں مگر شرط یہ ہے کہ تم بھی میرا ایک کام کسی طرح کر دو“

نور محمد کی دنیا چمک اٹھی اس نے بغیر آگا پیچھا سوچے ہوئے کہا "مریم اس دولت کو پانے کے لئے جو کچھ کرنے کے لئے تیار ہوں" مریم نے اپنا منہ نور محمد کے منہ کے قریب کر کے کہا "اچھا لو چوم لو" نور محمد نے ہچکچاتے ہوئے اس کا بوسہ لے لیا۔ مریم نے اسکو اتنی فرصت نہ دی کہ وہ اس لذت کو پوری طرح محسوس کرے۔ مریم نے فوراً کہا "میں نے ادریس میاں کی شہرت اس نواح میں بہت سنی ہے۔ میں ذرا ان کو ایک نظر دیکھنا چاہتی ہوں۔ میں کہہ نہیں سکتی کہ میرے دل میں یہ خواہش کیوں پیدا ہوئی۔ بہر حال اب تمہارا فرض یہ ہے کہ تم میرے لئے اس کی کوئی تدبیر نکالو" دفعتہً نور محمد کا دل سرد ہونے لگا مگر وہ مریم سے معاملہ کر چکا تھا اور اب پلٹنا اس کا کام نہ تھا۔ اس کی صورت سے حسرت اور بیچارگی ٹپک رہی تھی۔ اس نے غیر معمولی ضبط سے کام لیا اور کہا "اچھا اب کی جمعرات کو کشن گڈھ کا میلہ ہے۔ اگر تم چار کوس آنے جانے کی تکلیف برداشت کر سکو تو میرے ساتھ چلو۔ وہاں تم جس کو دیکھنا چاہتی ہو دیکھ لو گی اور بھیڑ میں تم پر خاص طور پر کسی کی نظر بھی نہ پڑے گی" مریم پر دھیرے دھیرے ادریس کو دیکھنے کا جن سوار ہو گیا تھا۔ وہ دھن والی عورت تھی اور اپنے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے ہر طرح کی صعوبت گوارا کر سکتی تھی۔ اس نے تین دن تڑپ تڑپ کر گذارے۔

کشن گڈھ خلیل آباد اسٹیشن سے ڈیڑھ دو کوس دکھن ہے وہاں ہر سال ہندوؤں کا ایک میلہ ہوتا ہے۔ جمگھٹا اچھا خاصہ رہتا ہے جسمیں ہندو مسلمان سبھی شریک ہوتے ہیں۔ اس ملک میں ہندو مسلم اتحاد و مشارکت کی امید اگر ہوتی ہے تو وہ انہیں کو "مست جاہل مگر صاف باطن دہقانیوں کو دیکھکر ہوتی ہے ورنہ شہروں کو تو "شہریت کا دیوتا" اتنا غارت کر چکا ہے کہ بظاہر ہندوستان کی قومی اصلاح کے آثار نظر نہیں آتے۔

ممتاز اور ادریس دونوں نے یہ رائے قائم کی تھی کہ کشن گڈھ چل کر عام مجمع میں مدرسہ کے فواید بیان کر کے چندہ کی تحریک کریں۔ نور محمد ان کے ارادے سے واقف تھا۔ جمعرات آئی تو وہ بڑے سویرے مریم کو لے کر کشن گڈھ پہونچا۔ جاڑے کا زمانہ تھا، ادریس اور ممتاز مندر سے کچھ دور ایک میدان میں تخت بچھائے ہوئے بیٹھے تھے۔ سامنے تقریر سننے والوں کی بھیڑ تھی۔ پوجا سے فارغ ہو کر لوگ سب سے پہلے اسی طرف آتے تھے۔ ادریس اور ممتاز اپنا سارا زور اس بات پر صرف کر رہے تھے کہ ان سادہ لوح دلوں کو تعلیم و تعلم کی ضرورت محسوس ہو جائے۔ ہر شخص ہمہ تن گوش بنا سن رہا تھا۔ درمیان میں جس کو جو کچھ بطور چندہ کے دینا ہوتا وہ اپنی جگہ سے اٹھتا اور ممتاز کے آگے چپکے سے لے جا کر رکھ دیتا۔ ممتاز کے سامنے پیسوں اور دوسرے چھوٹے سکوں کا ڈھیر لگ گیا تھا۔

مریم کو نور محمد نے قریب ہی ایک دوکان پر بٹھا دیا جہاں سے وہ سب کچھ دیکھ سکتی تھی۔ ادریس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی مریم کے دل میں تمناؤں کا ایک خروش تھا۔ اس نے یوسف کے حسن کی داستان پڑھی تھی۔ آج اسکو معلوم ہوا کہ حسن واقعی ایسی ہی چیز ہے جو زلیخا اور اسکی ہم جنسوں کو "پردہ عصمت" سے باہر نکالکر چھوڑتی ہے۔ رؤف، ادریس کی گرد بھی نہ تھا۔ مریم کی سمجھ میں نہ آیا کہ اگر رابعہ کے والدین نے دولت کے لالچ میں رؤف کو ادریس پر ترجیح دی تو خود رابعہ ادریس کے خیال کو اپنے دل سے کیسے نکال سکی۔ شام تک ادریس اسی تخت پر بیٹھا دھواں دھار تقریر کرتا رہا اور شام تک مریم اپنی جگہ سے دم بخود اس کو دیکھتی رہی اور

اور پھر بھی اسکا جی نہ بھرا۔ اس کو اپنی بھوک پیاس کا بھی ہوش نہ تھا۔ محبت کی ابتدا شاید یونہی ہوتی ہے کہ محبوب کو پہروں محویت کے ساتھ دیکھا کیجئے اور پھر جب وہ آنکھوں سے اوجھل ہو تو "حسرت و دیدار" کا وہی عالم ہو جو دیکھنے سے پہلے تھا، مریم گھر واپس آئی تو اسکے دل میں خلش نہیں بلکہ درد تھا، جس سے اسکی رگ رگ بیکل تھی۔

مریم کو اس کے بعد کوئی تین ماہ تک ادریس کے دیکھنے کا موقعہ نہیں ملا۔ مگر اسکی محبت شعلہ زن ہوتی رہی۔ وہ جلی جارہی تھی اور کسی طرح جل نہیں چکتی تھی۔ اس نے آہستہ آہستہ رؤف سے ملنا کم کر دیا اور آخر کار رؤف سے ایک دن صاف صاف کہہ دیا کہ "میں اب اپنے اور تمہارے دونوں کے لئے بہتر سمجھتی ہوں کہ ہم ایک دوسرے سے ملنا بند کر دیں۔ تم اب اپنی اور رابعہ کی زندگی سدھارو۔ میں کسی سے سچا خلوص نہیں رکھ سکتی۔ رؤف مریم کا بھید نہیں جانتا تھا، اس نے لاکھ چاہا کہ مریم اس سے قطع نظر نہ کرے، لیکن اس کا کوئی زور نہ چل سکا۔ مریم نے فیصلہ کر دیا اور رؤف مایوس ہو کر چلا گیا۔ اس نے درمیان میں کئی بار مریم سے کوشش کی مگر مریم اس سے کتراتی رہی۔ ناچار رؤف کو رابعہ کے ساتھ از سر نو منہمک ہونا پڑا، اگرچہ مریم کا داغ اسکے دل سے کبھی نہیں گیا۔

(۹)

پھاگن کے دن تھے۔ ہولی گذر چکی تھی۔ ہوا اپنا زور بھر رہی تھی گویا گذشتہ موسم کی جو افسردگی اور مردنی بطور یادگار باقی رہ گئی ہے اسکو دور کرنے کے لئے اپنی تمام قوت صرف کر رہی ہے۔ بسنت رت کا چپہ چپہ سے اعلان ہو رہا تھا۔ سبزہ زار اور چراگاہ ابھی سوکھے پڑے تھے۔ جھاڑیاں بے جان اور برہنہ تھیں لیکن بالیدگی نے اپنا کام شروع کر دیا تھا۔ ڈھاک میں نئی کونپلیں نکل رہی تھیں۔ اور وہ زمانہ آگیا تھا کہ پتی پتی اپنی عروسی خلعت سے آراستہ ہو جائے۔ فضا صداؤں سے معمور تھی، چرند پرند نے اپنی رام کہانیاں چھیڑ دی تھیں۔

ادریس اور ممتاز دونوں اپنے مشترکہ کاروبار میں روز افزوں ترقی کر رہے تھے۔ دولت و اقبال کی دیوی جسکی دوستی اور دشمنی دونوں ناقابل اعتماد ہیں ان پر مسکرا رہی تھی۔ مدرسہ چل رہا تھا اور دوکان تو ممتاز کے حسن انتظام سے اس طرح چمک اٹھی تھی کہ اس سے جو منافع ہوتا تھا اس کا آدھا غلے اور اینٹوں کی تجارت میں لگانا پڑا۔ ممتاز اور ادریس زمین کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بھی خرید رہے تھے، مگر دونوں کی معاشرت ویسی ہی سادہ اور نمایش سے عاری تھی۔ ادریس میں شہری زندگی کی صرف ایک برائی تھی۔ وہ چائے پیتا تھا۔ ممتاز کو بھی چند مہینوں میں یہ لت لگ گئی۔

تیواری پور میں ایک آنہ حصہ ایک بنئے کا تھا جسمیں کچھ آم مہوے اور کٹھل کے درخت بھی تھے باقی رؤف کا حصہ تھا۔ بنیا رؤف کا بری طرح مقروض تھا۔ رؤف نے اسکو ستانا شروع کیا۔ غرض یہ تھی کہ بنیا کسی طرح تنگ آکر وہ ایک آنہ حصہ بھی اس کے حوالہ کر دے۔ مگر بنیا بھی اپنی ہٹ کا آدمی تھا۔ اس نے جب دیکھا کہ بغیر اس ایک آنہ کو جدا کئے چھٹکارا نہیں ہوتا تو اس نے قسم کھالی کہ رؤف کے ہاتھ کبھی نہ بیچوں گا۔ اس لئے وہ ادریس کے پاس آیا اور اس سے معاملہ کیا۔ سب کچھ طے ہو چکا تھا۔ صرف

کھیتوں اور درختوں کو ایک نظر دیکھ لینا رہ گیا تھا۔ بنیئے کے جانے کے بعد ممتاز اور ادریس نے صلاح کی کہ صبح طلوع آفتاب سے ایک گھنٹہ پہلے چائے وغیرہ سے فارغ ہوکر چلیں اور سب کچھ دیکھ بھال کر دس بجے تک واپس آجائیں۔

رات کا سماں دلکش تھا۔ دن بھر کی تپش کے بعد اس وقت ہوا میں ایک سکن خنکی پیدا ہو گئی تھی۔ لیکن ممتاز اور ادریس جاگ رہے تھے۔ ممتاز کو سویرے سو جانے کی عادت تھی۔ ادریس پر کبھی کبھی بےخوابی کا دورا پڑ جاتا تھا۔ ایسی حالت میں ممتاز اسی کے مکان پر سویا کرتا تھا اور شب بیداری میں اسکا ساتھ دیا کرتا تھا۔ ساری رات مباحثوں میں کٹ جاتی۔

آج شام کے وقت رام نگر میں ایک ہلچل سی مچی تھی۔ ایک گوالے کا لڑکا جو تمام دن پریتیا میں اپنے مویشی چراتا رہا شام کو گھر لوٹا تو اسکو تیز بخار چڑھا ہوا تھا اور سرسامی حالت تھی۔ ڈاکٹروں سے اگر رائے لی جاتی تو وہ فوراً "ضربۃ الشمس" یا "تپ محرقہ" بتا دیتے، مگر دیہاتیوں کا نظریہ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ رام نگر والوں کو یقین تھا کہ لڑکے کو آسیب ہو گیا ہے اور یہ پریتیا کے کسی بھوت کا کام ہے جسمیں کار فرما تم ہے۔ ادریس کا دماغ بھی آج اسی عقدہ کو حل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ممتاز سے حجت ہو رہی تھی۔ ممتاز ادریس کی طرح کوئی فلسفی نہ تھا۔ وہ جو کہتا تھا ادعائی ہوتا تھا۔ اگر وہ ادریس کو قائل نہ کر سکتا تھا تو خود بھی کبھی قائل نہ ہوتا تھا اور بحث زیادہ تر دونوں کے سکوت پر ختم ہوتی تھی۔ آج ادریس اپنی تمام منطق زندگی کو اک بلا ثابت کرنے میں صرف کر رہا تھا۔ ممتاز اس سے متفق نہ تھا۔ آخر کار ادریس نے کہا "کم از کم ہمارے مشاہدات اور تجربات یہی بتاتے ہیں کہ قدم قدم پر ہم کو غارت کرنے کے لئے قوتیں مسلط ہیں۔ اس گوالے کے لڑکے کو دیکھو اس نے خود تو اپنے کو بیمار ڈالا نہیں اور نہ اس معصوم کے کسی گناہ کا پتہ چلتا ہے۔ پھر یہ مصیبت کیوں اس پر نازل کی گئی۔ یہ کسی ایسی ہستی کا کام ہے جو ہمارے تمہارے قابو سے باہر ہے اور جو دراصل گناہ و ثواب کا امتیاز نہیں جانتی"۔

ممتاز نے جواب دیا "اگر تمہارا کہنا مان بھی لیا جائے تو اس سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہم کو بلاؤں کا مقابلہ کرنا ہے۔ زندگی تو اس سے بلا ثابت نہیں ہوتی۔ میرا اپنا خیال ہے کہ زندگی محض جہد للبقا نہیں بلکہ جہد للارتقا ہے اور اس کے لئے حائلات و موانع لازم ہیں ورنہ ارتقا کے کوئی معنے نہیں ہوتے"۔ اسی پر دونوں چپ ہو گئے تھے اور اپنی اپنی جگہ کچھ سوچنے لگے تھے۔

تین بجے دونوں نے ملکر چائے تیار کی اور ایک گھنٹہ بعد مکان سے چل کھڑے ہوئے۔ پریتیا کے قریب پہونچکر ممتاز نے کہا "دیکھو ادریس سماں کتنا سہانا ہے، سعدی نے ایسی ہی وقت کے لئے کہا ہے:۔

بامداداں کہ تفاوت نہ کند لیل و نہار   خوش بود دامن صحرا و تماشائے بہار

ادریس نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا "جس کا جی چاہے کہہ لے مگر حقیقت یہ ہے کہ "در دست دیگر است خزان و بہار ما"۔ ایسی حالت میں ہماری خزان و بہار ہی کیا۔ چاہے آپ بہار میں غزلخوانی کیجئے اور خزاں کا رونا روئیے یا خزاں سے زبردستی لذتیں حاصل کیجئے اور بہار پر اپنا دل خون کیجئے میں دونوں کو یکساں سمجھتا ہوں"۔ ممتاز پھر چپ ہو گیا۔

بیچ جنگل میں پہونچکر ادریس نے پھر سکوت توڑی۔ نہ جانے کیوں اس نے ممتاز سے پوچھا "کیوں ممتاز!

"رابعہ کے بارے میں اب تمہارا کیا خیال ہے؟ کیا اب بھی اس کو اسی طرح چاہتے ہو؟" ممتاز نے جواب دیا "میں بھی تم سے یہی سوال کر سکتا ہوں، لیکن مجھے چونکہ تمہارے جذبات معلوم ہیں اس لئے خواہ مخواہ تم کو چھیڑنا نہیں چاہتا۔ رابعہ اب تمہارے لئے کچھ نہیں رہی۔ . . . ."

ادریس نے بات کاٹ کر کہا "رابعہ ہی نہیں بلکہ دنیا کی کوئی عورت کچھ نہیں رہی"

"خیر یونہی سہی" ممتاز نے رفع تکرار کے لئے تسلیم کر لیا اور اپنی محرومیوں کی طرف رجوع کیا "میرے لئے رابعہ وہی ہے جو پہلے تھی۔ مجھے اس سے امیدیں کبھی نہ تھیں اس لئے مایوسی بھی نہیں ہوئی۔ پہلے وہ تمہاری ہونے والی تھی اب رؤف کی ہوگی۔ مجھے کچھ تو تمہارے خیال سے اور کچھ خود اس کے خیال سے تکلیف تو ضرور ہوئی کیونکہ رؤف کو میں برخلاف رابعہ کے والدین کے رابعہ کے لئے بدترین شوہر ہمیشہ سے سمجھتا تھا۔ لیکن جہاں تک میری اپنی ذات متعلق ہے رابعہ میں کوئی تغیر نہیں ہوا ہے، یا یوں سمجھو کہ میری محبت اپنی اصلی حالت پر قایم ہے۔ محبت محبوب سے شروع ضرور ہوتی ہے مگر اسکی ہر تبدیلی کے ساتھ بدلتی نہیں رہتی۔ میں محبت کو ارتقاء شخصیت کے لئے ضروری سمجھتا ہوں۔ کسی موہنی صورت کا دیوانہ ہونا در اصل اپنے دل کا دیوانہ ہونا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اگر رابعہ کو لوگ میرے ساتھ بیاہنا چاہتے تو میں انکار کر دیتا۔ میں سب کچھ تج کر اس سے شادی کرتا اور ممکن ہے اس وقت صورت حال کچھ اور ہوتی۔ لیکن بحالات موجودہ جبکہ مجھ کو رابعہ کے ساتھ کوئی ظاہری لگاؤ نہیں ہے میں اپنے کو یوں تسلی دیتا ہوں :-

نہیں نگار کو الفت نہ ہو نگار تو ہے   روانیٔ روش و مستیٔ ادا کہئے ! !

اور ادریس تم یقین مانو یہ تسلی جھوٹی تسلی نہیں ہے"

ادریس آج ممتاز کی زبان سے ہیگل اور گیٹے کا فلسفۂ محبت سن رہا تھا جس کی دل ہی دل میں داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ لیکن چونکہ اس قسم کی باتیں کبھی اس کے حلق سے نیچے نہیں اتریں اس لئے حسب عادت چڑھ کر بولا "میں بشریت کے دائرہ سے باہر جانا نہیں چاہتا۔ تم نے جو کچھ تصوف بکا ہے وہ صرف ان لوگوں کے لئے ہے جو جان کھو کر قاتل کو خوں بہا دیتے ہیں اور زبان کٹنے پر خنجر کو مرحبا کہتے ہیں۔ اور تمہیں کیا ایسے لوگ ہیں کتنے؟"

ممتاز نے یہ کہہ کر بحث کو چھوڑ دیا "تم نے میرے متعلق پوچھا تھا۔ میں نے اپنے خیالات کا اظہار کر دیا ساری خدائی سے مجھے کیا کام ہے"

جنگل کی مسافت طے ہو چکی تھی مشرقی افق سورج کی نرم کرنوں سے روشن ہو رہا تھا۔ ہر طرف ایک دھندلی روشنی پھیل رہی تھی سامنے دریا تھا جس کی ہلکی ہلکی لہریں سورج کی سنہری کرنوں کو جذب کر رہی تھیں۔ اس منظر سے ادریس اور ممتاز دونوں اپنے اندر ایک فرحت محسوس کرنے لگے۔ اتنے میں دونوں نے کچھ دیکھا، ادریس کو تو یہ بھی ہوش نہ رہا کہ وہ کہاں ہے۔ وہ کچھ ایسا مبہوت ہو گیا تھا۔ ممتاز نے ادریس کے استغراق کو محسوس کر لیا۔

مریم ندی کے کنارے بے حس و حرکت ایک بت کی طرح کھڑی تھی۔ اس کے بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔
اس کے ہونٹوں پر ایک تبسم تھا اور وہ لہروں کی سیر میں بے خود تھی۔ ادریس کو یونانیوں کی آرزو را یاد آگئی اس کو ایسا
معلوم ہو رہا تھا کہ یا تو آج وہ اس دورِ معصومیت کے یونان میں سانس لے رہا ہے جبکہ نوریوں اور خاکیوں میں خلا ملا تھا
یا الف لیلہ کا زمانہ سیکڑوں گردشوں کے بعد پھر آگیا ہے اور وہ کسی پری بانو کے سامنے پہونچ گیا ہے۔
ادریس کی رفتار سست ہو گئی تھی، ممتاز بھی قدم سے قدم ملائے چل رہا تھا۔ جب دونوں کچھ دور نکل گئے تو
ادریس نے مڑ کر مریم کو ایک نظر پھر دیکھا۔ اس نے بہت چاہا کہ خاموش رہے لیکن آخر کار نہ رہا گیا اور اس نے ممتاز
سے پوچھا "ممتاز تم جانتے ہو یہ کون ہے؟" اسکو دیکھ کر مجھے بیساختہ یہ شعر یاد آرہا ہے:۔

تو غنچۂ سحر و من چراغ صبحدمم   تو خندہ برلب و من جاں در آستیں دارم

ممتاز کا دل نہ جانے کس خطرہ کے احساس سے دھڑکنے لگا، لیکن اس نے اپنی حالت کو چھپا کر بے پروائی کیساتھ
کہا "مریم ہی ہے" اس سے زیادہ کہنے کی ضرورت نہ تھی۔ ادریس مریم کے نام سے اچھی طرح واقف ہو چکا تھا۔
جس کام کو انجام دینے کے لئے دونوں تیواری پور گئے تھے وہ پورا ہونے کو تو ہو گیا مگر ادریس کے بشرہ سے صاف
ظاہر تھا کہ اس کا دل کہیں اور ہے۔ ممتاز اگر نہ ہوتا تو شاید تیواری پور کا کام بھی رہ جاتا۔

(باقی آئندہ)

مجنوں گورکھپوری

تصوف اسلام پر ایک مورخانہ نظر

(بہ سلسلۂ سابق)

خواب کا اسلوب وماہیت اور امام غزالی کا نظریہ

المظنون مطبوعہ قاہرہ (ورق ۵ طبع ۱۳۰۳ھ) کے حوالہ سے میکڈونلڈ نے امام غزالی کے وہ فلسفیانہ مباحث پیش کئے ہین جن مین انھون نے خواب کی حقیقت اور اسکے طریق حدوث کے متعلق عقلی اور نقلی پہلو سے روشنی ڈالی ہے، امام غزالی نے صحیح حدیث قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم من رآنی فی المنام فقد رآنی فان الشیطان لا یتخیل بی (اسکے راوی حضرت انسؓ ہین دوسری مین جو حضرت ابی ہریرہؓ کی روایت سے ہے ولا یتمثل الشیطان بی۔ ہے) کی جو فلسفیانہ تاویل کی ہے وہ ملک کے ان علم برداران جدل وتنقید کے لئے باعث عبرت ہے، جو اپنے ولولۂ قدامت پسندی اور انہماک عقاید عامیانہ مین صحیح استنباط نتایج سے محروم رہجاتے ہین یہ مانا کہ وطن کے بعض متکلمین کے بعض مجتہدانہ خیالات اور افکار قابل رد ہین، مثلاً اثبات نماز سہ گانہ اور انکار معاد وغیرہ مجھے بھی اس قسم کی فکر واحساس سے سخت اختلاف ہے، لیکن یہ کیا غضب ہے کہ معائب احساس کے مطالعہ سے انسان اپنی حریت فکری اس حد تک کھو بیٹھے کہ اسے محاسن افکار نظر ہی نہین آئین علمائے ملت، اور ادبائے قوم کا تو فرض تھا کہ وہ دلایل اور براہین سے ان مسائل پر ناقدانہ روشنی ڈالتے، لیکن اسکے بدل انھون نے مجالس خاص وعام مین سب وشتم کرکے اپنے اطمینان قلب کا سامان پیدا کرنا چاہا، اہل بینش اور ماہرین خصایص نفسی جانتے ہین کہ یہ اظہار عجز وناتوانی کی ایک طفلانہ ہنگامہ آرائی ہے۔

امام غزالی فرماتے ہین، جو شخص رؤیا (خواب) کی حقیقی ماہیت نہین جانتا، وہ اقسام رویا کے مختلف حقایق سے بھی نابلد ہے، اور جو شخص آن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور انبیا کے رؤیا کی حقیقت نہین جانتا وہ خدا تعالی کی روئیت خواب سے بھی ناواقف رہتا ہے، اسلئے ایک عامی انسان یہ تصور کرتا ہے کہ جو شخص نبی صلعم کو خواب مین دیکھتا ہے، وہ گویا خاص آپکے جسد مبارک کو دیکھتا ہے، لیکن جس طرح نفس مین ایک پرتو خیال آتا ہے، اور وہ قوت مصورہ کی بدولت لفظی صورت اختیار کرلیتا ہے، اسی طرح ہر اثر نفس کے لئے قوت مصورہ ایک خاص شکل تجویز کرتی ہے کوئی شخص آن حضرت صلعم کے خاص جسد مبارک کو کیونکر دیکھ سکتا ہے، جب آپکا جسم مبارک مدینہ منورہ مین سپرد خاک ہے اور اسے چھوڑکر اس مقام مین نہین جاتا جہان ایک آدمی نے خواب مین دیکھا، اور اگر ہم لوگ یہ مان بھی لین کہ ہان یہ خاص آپکا جسد مبارک ہی رہتا ہے، تب بھی یہ بحث پیدا ہوتی ہے، کہ ایک ہی رات مین ہزارون آدمی آن حضرت کو مختلف

صورتون مین دیکھتے ہین عقل سلیم کہتی ہے، کہ ایک ہی شخص کو لوگ بیک وقت دو مختلف صورتون مین نہین دیکھ سکتے لیکن غالبًا وہ کہہ سکتا ہے، جسے اس نے خواب مین دیکھا، وہ آن حضرت کی مثال تھی، آپکی شخصیت نہین تھی، تب یہ بحث پیدا ہوگی کہ یہ یا تو آپکی شخصیت کی مثال ہوگی یا آپکی حقیقی روح مقدسہ کی جو شکل وصورت کے ملوثات سے پاک ہے، اگر یہ مانا جائے کہ یہ آپکی مثال شخصیت ہوتی ہے، جو مجموعۂ استخوان و لحم ہے، تو بہلو گون کو اسکی کیا ضرورت آپکا جسد یا تشخص بذاتہ مطمع تصور و محسوسات ہے، تب اس سے یہ بات نکلے گی کہ جس شخص نے آن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آپکی وفات کے بعد خواب مین دیکھا، اس نے نبی صلعم کو نہین دیکھا، بلکہ اس جسد (مظہر) کو دیکھا جو آپکے اشارہ اور ارادہ سے حس وحرکت کیا کرتا تھا تب وہ شخص جو آپکی "مثال شخصیت" دیکھتا ہے، کیونکر کہہ سکتا ہے کہ مینے آن حضرت کو خواب مین دیکھا، حقیقت یہ ہوتی ہے کہ یہ آن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مقدسہ کی "مثال" ہوتی ہے، جو مہبط وحی (الہیہ) ہے اور اسی کو انسان آپکی روح یا جوہر ذات، یا آپکی شخصیت (جسد مظہر) خواب مین نظر نہین آتی، بلکہ فی الحقیقت یہ آپکی مثال ہوتی ہے، اسوقت یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ تب آپکی حدیث کا کیا مطلب ہے؟ آپ نے فرمایا جسنے مجھے خواب مین دیکھا درحقیقت اس نے مجھی کو دیکھا کیونکہ شیطان خود کو میرے مثل نہین بنا سکتا، (امام غزالی رح نے وہ حدیث لکھی تھی جسے مینے اوپر نقل کیا، میکڈونلڈ نے اسی کا ترجمہ کیا ہے) اس کا عقیدہ یہ ہے، کہ خواب دیکھنے والا ایک مثال دیکھتا ہے، جو اسکے اور نبی صلعم کے درمیان مین واسطہ پیدا کرتی ہے اور اسے حق وصداقت کی تعلیم دیتی ہے، جس طرح جوہر نبوت یعنی آن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مقدسہ جو آپکی وفات حقیقی کے بعد باقی ہے، اور وہ رنگ، شکل اور صورت سے منزہ ہے، اور پھر بھی لوگون کو اس سے محض ایک حقیقی مثال کے ذریعہ، جس مین رنگ بھی رہتا ہے اور شکل وصورت بھی رہتی ہے، (آپکی تلقین و مواعظت کا) علم حاصل ہوتا ہے، حالانکہ جوہر نبوت اس (رنگ، شکل وصورت) سے پاک ہے، ٹھیک اسی طرح ذات الٰہی بھی شکل وصورت کے رسوم وقیود کی حامل نہین، لیکن ایک مثال محسوسہ کی وساطت سے مخلوقات کو اسکا علم ہوتا ہے، یہ مثال محسوسہ ایک مہبط انوار ہوتی ہے، یا حسن وجمال کا کوئی دوسرا مرقع جسے اس ذات الٰہی کے پرتو حسن سے تعبیر کرسکتے ہین جس مین نہ رنگ کی آرائش ہے، نہ شکل وصورت کی قید و بند، وہ مثال حقیقی ہوتی ہے، اور حصول علم ومعرفت کے درمیان مین واسطہ پیدا کرتی ہے، اسلئے جو شخص یہ کہتا ہے کہ مینے اللہ جل شانہ، کو خواب مین دیکھا تو اسکا یہ مطلب نہین ہوتا کہ اس نے ذات باری تعالی کو دیکھا جس طرح ایک شخص جو یہ کہتا ہے، کہ "اسنے نبی صلعم کو خواب مین دیکھا، تو اس سے ذات اور روح یا شخصیت نبوت مراد نہین لیجا سکتی، بلکہ محض رویت مثال مقصود ہوتی ہے، لیکن یہ کہا جا سکتا ہے کہ پیغمبر صلعم کا مثل تو ممکن ہے، لیکن خدا کا مثل تو وراء امکان ہے، تو یہان "مثل" (Likeness) اور "مثال" (Image)

کے مابہ الامتیاز کے سمجھنے مین غلطی ہو گی۔ مثال اور مثل مین فرق ہے ۔ مثل کے لئے ضروری ہے کہ تمام صفات مین مساوات ثابت ہو، اور مثال مین یہ شرط نہین رہتی، "قوت ادراک" ایک ایسی چیز ہے کہ اسکا مثل نہین پھر بھی ہملوگ اسکے لئے آفتاب کی مثال دیسکتے ہین، کیونکہ دونو ایک حیثیت سے متشابہ ہین، آپکی وساطت سے ہملوگ محسوسات ظاہرہ کا علم حاصل کرتے ہین، اور قوت ادراک کی بدولت محسوسات باطنہ کا، مثال کے لئے صرف یہی ایک وجہ تشبیہ کافی ہے، اس سے بھی واضح مثال یون سمجھنا چاہئے، کہ ایک بادشاہ کو کوئی شخص آفتاب کی شکل مین دیکھے اور وزیر کو چاند کی شکل مین، بادشاہ اور آفتاب، چاند اور وزیر شکل وخیال کے اعتبار سے مساوی نہین ہین لیکن وجہ تشبیہ یہ ہے کہ ایک بادشاہ تمام عالم پر حکمرانی کرتا ہے اور تمام چیزین اسکے زیر اثر ہین یہی حیثیت آفتاب کی ہے، اور جسطرح ایک وزیر، بادشاہ اور اسکی رعایا کے درمیان مین صحیح احکام کے اصدار کے لئے واسطہ رہتا ہے، اسی طرح چاند بھی، آفتاب اور کرۂ ارضی کے درمیان مین، روشنی پہونچانے مین واسطہ رہتا ہے، یہ مثالین ہین "مثل" نہین۔

نبی صلعم کے حضور مین لوگون نے بعض ایسے خواب کا تذکرہ کیا، جس مین دودہ اور رسی کا ذکر تھا[1] آپ نے تعبیر بتائی کہ دودھ سے اسلام مراد ہے، جس طرح دودھ ظاہری زندگی کی غذا ہے، اسی طرح اسلام باطنی زندگی کی، رسی سے قرآن مجید مراد ہے، جس سے ہملوگ سلامتی مین رہتے ہین، اسی طرح خدا کا بھی "مساوی" نہین لیکن اسکی "مثالین" ہین، جو اسکے صفات کے ساتھ ذہنی تشابہ رکھتی ہین، ہملوگ کسی طالب تحقیق کو تعلیم دیتے ہین کہ خدا کس طرح پیدا کرتا ہے، کس طرح ارادہ کرتا ہے؟ ان تمام مسائل کے لئے ہملوگ ایک انسان کی مثال پیش نظر رکھتے ہین، اگر انسان (ذات الٰہی کے ادراک مین) اپنی ہی صفت سے ہوگا، تو وہ خدا کے متعلق بھی مثال نہین سمجھ سکتا، خدا کے متعلق ایک مثال ممکن ہے، اور اسکا مثل ناممکن، چونکہ مثال سے صرف تصریح و وضاحت ہوتی ہے، لیکن "مثل"، مشابہ ہوا کرتا ہے۔

لیکن یہ کہا جا سکتا ہے جو کچھ تمنے ذکر کیا، اس سے یہ نتیجہ تو نہین نکلتا ہے کہ خدا کو دیکھ سکتے ہین بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خواب مین نظر آنے کا انکار ثابت ہوتا ہے، کیونکہ کسی شے کی مثال کا دیکھنا اس شے کی ذات کا مشاہدہ کرنا نہین ہے، تب آنحضرت صلعم نے کیونکر یہ فرمایا کہ "جس نے مجھے خواب مین دیکھا، اُسنے

---

[1] بخاری شریف مین حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے ایک حدیث مروی ہے، جس مین آنحضرت کا خواب مین دودھ دیکھنا مذکور ہے، لیکن آپنے اسکی تعبیر "علم" بتائی ہے فما اولت ذلک یا رسول اللہ قال العلم۔ اسی طرح آپکے سامنے ایک شخص نے اپنا خواب بیان کیا جس مین شہد، رسی، اور گھی کا تذکرہ تھا، حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اسکی تعبیر بتائی اور رسی کو کہا کہ اس سے وہ طریقہ مراد ہے جسپر آنحضرت لوگون کو چلا رہے ہین، واما السبب الواصل من السماء الی الارض فالحق الذی انت علیہ۔

مجھی کو دیکھا" (من رآنی فی المنام فقد رآنی) تو گویا یہ ایک ناجائز تعبیر مجازی ہے، اس مفہوم کی کہ "گویا اسنے مجھی کو دیکھا"، تب اسکا جواب یہ ہے کہ ٹھیک یہی صورت تو اسوقت بھی پیدا ہوتی ہے، جب ایک شخص یہ کہتا ہے کہ "مینے خواب مین خدا کو دیکھا"، اسکا یہ مطلب نہین ہوتا کہ اسنے ذات باری تعالی کو دیکھا، کیونکہ یہ مسلمہ نظریہ ہے کہ ذات باری تعالی کو نہین دیکھ سکتے، بلکہ ذات باری تعالی، یا ذات نبوت کی ایک "مثال" دیکھ سکتے ہین، اس قسم کے خواب سے انکار نہین ہو سکتا، حتی کہ وہ شخص جسنے اس قسم کے خواب نہین دیکھے اسے بھی متواتر احادیث کے ذریعہ ماننا پڑیگا، بعض اوقات یہ مثال صادقہ ہوتی ہے، اور بعض اوقات کاذبہ[1]، جب صادقہ ہے، تو اسکا مطلب یہ ہے کہ خدا تعالی اس رویت "مثال"، کو خواب دیکھنے والے اور نبی صلعم کے درمیان مین ایک واسطہ بنا دیتا ہے، قدرت الٰہیہ اسپر حادی ہے کہ مخلوقات اور اسکے حصول صداقت کے درمیان مین وہ ایک ایسا واسطہ پیدا کر دے"۔

امام غزالی کا خواب میکڈونلڈ نے امام غزالی کے متعلق بھی دو خواب کا تذکرہ کیا ہے، جن مین ایک خود امام غزالی کے الفاظ مین ہے، امام موصوف فرماتے ہین۔

پہلے مین اولیاء اللہ کے رموز بیخودی کا منکر تھا، اور مجھے مبتدی طریقت کے مدارج ترقی سے بھی انکار تھا، یہانتک کہ مجھے اپنے شیخ یوسف نساج کا فیض صحبت میسر آیا، شیخ موصوف نے میرے قلب کی جلا کرنی شروع کی، یہانتک کہ اللہ تعالی نے مفاوضات کشف والہام سے مجھے نوازا، مینے خواب مین اللہ تعالی کو دیکھا اور اسنے کہا "الی ابوحامد؟"، مینے کہا کیا شیطان مجھ سے کلام کر رہا ہے، اسنے کہا "نہین بلکہ مین ہون تمھارا خدا کیا مین تمھارا اللہ نہین ہون (اشارہ ہے قرآن کی آیت کیطرف) تب اسنے کہا الی ابوحامد تم اپنے رسمی ضوابط ترک کرو، اور اُن ارباب ذوق کا جلس وندم اختیار کرو، جو زمین پر میری عزت کا مستقر ہین، یہ لوگ وہ ہین جنھون نے دو تو جہان کو میری محبت کے بدل بیچ ڈالا، (عرفی نے اپنی ایک رباعی مین یہی نظریہ پیش کیا ہے ؎

گویند کہ دل و دین فروشید بدرد

تب مینے عرض کیا یا اللہ تیری قدرت کی قسم، مین تجھ سے التماس کرتا ہون کہ تو مجھے اُنکے متعلق اچھے خیال کا ذوق عطا کر"، اسنے کہا مین قبول کرتا ہون، تیرا ان سے جدا رہنا، اس بنا پر تھا کہ تو اس عالم فانی کی محبت مین سرشار تھا، اسلئے تو خود، اپنے ارادہ سے اس بند محبت سے آزاد ہو جا تاکہ موت کے

[1] امام غزالی نے جو متکلمانہ مباحث کئے ہین وہ مینے میکڈونلڈ کے انگریزی ترجمہ سے لئے ہین۔ امام غزالی کی بحث ہر چند فلسفیانہ ہے، لیکن یہان انھون نے حدیث کی تائید مین جو بحثین کی ہین، وہ تشفی بخش معلوم نہین ہوتین خصوصًا، جب "مثال" الٰہی یا مثال نبوت کاذبہ بھی ہو سکتی ہے تو آخر حدیث کے لفظ فان الشیطان لا یتمثل بی کی کیا توجیہ ہو سکتی۔

وقت تجھے زبردستی اس سے جدا کرنیکی ضرورت نہ ہو، مین تجھ پر نزول انوار کی بارش کرتا ہون، اس لئے اسے لے اور اوڑھ، مستفیض ہو، تب مین بڑی خوشی مین بیدار ہوا، اور اپنے شیخ یوسف نساج کے پاس گیا، اور اُن سے اس خواب کا تذکرہ کیا، وہ مسکرا کر بولے، اے ابو حامد! یہ تغیر پذیر حالات و مقامات ہملوگون کے نزدیک کوئی وقعت نہین رکھتے، اگر تم میری صحبت مین رہو، تو تمھاری نظر باطن منکشف ہو جاویگی، اور تم عرش اور اسکے ماحول کا مشاہدہ کرو گے، تمھارے ذوق طلب کی تشنہ کامی ایک صبر آزما شوریدگی تم مین متہیج رہیگی اور تم اسوقت وہ چیزین مشاہدہ کرو گے، جنکی حد کشش تک احساس نظر کی رسائی نہین، اور تم اپنی کثافت فطریہ سے ایسے پاک وصاف ہو جاؤ گے، کہ پھر تمھارا اگذر وہان ہوگا، جو تمھاری ادراک کے حدود سے متجاوز ہے، تم موسی کی طرح اللہ جل شانہ، کا کلام سنو گے۔

امریکن اورنیٹل سوسائٹی کے جریدہ جلد ۲ مین میکڈونلڈ نے ابو بکر الشاشی کی مفصلہ ذیل روایت نقل کی ہے، ابو بکر نے امام غزالی کی وفات کے صرف دو برس کے بعد انتقال کیا، وہ کہتے ہین "ہمارے عہد مین ایک شخص تھا جو امام غزالی سے نفرت رکھتا تھا، اور انہین برا کہتا، اُسنے آنحضرت صلعم کو خواب مین دیکھا، حضرت ابو بکرؓ اور عمرؓ آپکے پہلو مین تھے، امام غزالی آپکے سامنے بیٹھے ہوئے تھے اور کہہ رہے تھے، یا رسول اللہ! یہ شخص میرے خلاف بولا کرتا ہے، اسپر آنحضرت نے فرمایا کوڑا لاؤ۔ اور امام غزالی کو بُرا کہنے کی پاداش مین اس شخص کو کوڑے لگائے گئے، تب وہ آدمی خواب سے بیدار ہوا، اور اسکی پشت پر کوڑے کی علامت باقی تھی، وہ نالہ وبکا کرتا اور یہ واقعہ کہتا،

ابن خلکان کا خواب

ابن خلکان ایک دینی عالم، ایک فقیہ، ایک نحوی اور ایک ادیب بھی تھے، انھون نے ۶۸۲ھ مین وفات پائی، اپنی کتاب وفیات الاعیان مین انھون نے اپنے ایک خواب کا تذکرہ کیا ہے، مصنف کے ہات کا لکھا ہوا، وفیات الاعیان کا ایک قلمی نسخہ برٹش میوزیم مین موجود ہے، وہ لکھتے ہین،۔

"ایک مرتبہ مینے المبرد کو خواب مین دیکھا اور اسکے ساتھ ایک نہایت تعجب انگیز معاملہ ہوا، اسلئے مین اسے کہنا چاہتا ہون، ۶۳۶ھ مین، مین اسکندریہ کے اندر تھا، اور وہان پانچ مہینہ تک مقیم رہا اسوقت المبرد کی کتاب "کامل" اور "عقد" مصنفہ ابن عبد ربہ میرے پاس تھین اور مین انکا مطالعہ کر رہا تھا"۔

اسکے بعد علامہ موصوف نے صاحب "عقد" اور المبرد کی دوسری کتاب "روضتہ" کے متضاد بیان کا تذکرہ کیا ہے، جو اسکی دلچسپی کا مرکزی نقطہ تھا، اور اسکے بعد کہتے ہین۔

جب مینے ان متضاد بیانات کا مطالعہ کیا، اسکی چند راتین گزرنے کے بعد مینے خواب مین دیکھا کہ جیسے

مین حلب کے اندر قاضی بہاؤ الدین معروف بہ شداد کے مدرسہ عالیہ مین ہون، جہان مین طالب العلمی کے زمانہ مین رہ چکا تھا، اور دیکھا کہ مین جماعت کے ساتھ ظہر کی نماز پڑھ رہا ہون، جب مین اپنی نماز ادا کر چکا تو جانے کے لئے اوٹھا، لیکن مینے ایک شخص کو گوشہ مین کھڑے ہوکر نماز پڑھتے دیکھا، حاضرین مین سے ایک شخص نے مجھ سے کہا یہ المبرد ہے، اسلئے مین اسکے نزدیک گیا، اور اسکی فراغت نماز تک مین منتظر رہا وہ نماز سے فارغ ہو گیا تو مینے اسے السلام علیک کیا اور کہا مین آجکل آپکی کتاب "کامل" کا مطالعہ کر رہا ہون، وہ بولا کیا تم نے میری کتاب روضہ دیکھی ہے، ؟ مینے کہا "نہین" چونکہ مینے اسے اسوقت تک نہین دیکھا تھا، تب اسنے کہا آؤ مین تمہین دکھادون، اسلئے مین اسکے ساتھ ہو لیا، اور ہم دونو اسکے مکان پر آئے اور اندر داخل ہوئے، مینے بہت سی کتابین دیکھین، وہ ان کتابون کے سامنے بیٹھ گیا، اور اپنی کتاب "روضہ" تلاش کرنے لگا، مین اسکے سامنے بیٹھا رہا تب اسنے ایک جلد اوٹھائی، اور مجھے دی، مینے اسے کھولا، اور اپنے زانو پر چھوڑ دیا، اسکے بعد کہا، "یہان آپ پر لوگون نے کچھ اعتراض کیا ہے، اسنے دریافت کیا وہ کونسا اعتراض ہے مینے کہا، آپنے ابو نواس کے فلان فلان اشعار پر تنقید کی ہے، اور مینے وہ اشعار اسکے سامنے نقل کئے، اسنے کہا یقیناً وہان غلطی پائی جاتی ہے، مینے کہا، نہین، وہ صحت پر تھا، اور لوگونکا خیال ہے، اسپر تنقید کرنے مین آپ نے غلطی کی ہے، اسنے کہا کیسے ؟ اسلئے مینے اسکے سامنے صاحب "عقد" کی رائے بیان کی اسنے دانت سے اپنی انگلی دبائی، اور ایک وارفتگی کے عالم مین جیسے گھبرایا ہوا ہو، تعجب سے میری طرف دیکھتا رہا وہ اسی حالت مین تھا کہ مین خواب سے بیدار ہو گیا۔

ابو ریحان البیرونی

میکڈونلڈ کہتا ہے، المبرد نے ۸۹۸ء مین وفات پائی، ابن خلکان سے تقریباً چار سو برس قبل وہ گذرا ہے، ابن خلکان ایک کامل مسلم شخصیت کی نیابت کرتا ہے، لیکن اگر خیال کیا جائے کہ ایک دینی عالم اور فقیہ پر وہمیت کا اثر ہو سکتا ہے، تو ابو ریحان البیرونی کا واقعہ لے لیجئے جسنے ۱۰۴۸ء مین وفات پائی، البیرونی قریب قریب یقیناً اپنے زمانہ کا سب سے بڑا حکیم تھا، اسکا دماغ بالکل ناقدانہ واقع ہوا تھا، وہ ایک ہیئت دان تھا، ایک مورخ تھا، اور سنجیدگی کے ساتھ رسم ورواج اور مذہب و ملت کا مطالعہ کیا کرتا، وہ کہتا ہے، میری حیات کے ۶۱ سال کی آخری رات تھی، مینے خواب مین دیکھا کہ طلوع قمر کا مشاہدہ کرنے کے لئے مین افق آسمان کی طرف دیکھ رہا ہون جہان اسروز اسے ظاہر ہونا چاہئے تھا مینے ایک آواز سنی، "چاند کو چھوڑ دو، تم ۱۹۰ مرتبہ اسکے بیٹے ہوگے" اسنے اسکی تعبیر سمجھی کہ مین ابھی ایکسو نوے قمری مہینہ تک اور زندہ رہونگا، میکڈونلڈ کہتا ہے، اس واقعہ سے اسکی مزید تائید ہوتی ہے کہ اسکی اصل زندگی اس حساب سے صرف ایک ہی مہینہ کم واقع ہوئی۔

ناصر خسرو علوی

مذہبی دنیا کی طرف توجہ کیجائے تو ایسے خواب کا پتہ معلوم ہوتا ہے جسکے باعث ایک شخص نے شعار ملت کے مطابق اپنی زندگی کی اصلاح کی. ناصر خسرو، اپنے سفرنامہ مین خود لکھتا ہے. کہ اس ذریعہ سے پیشے دنیا سے منہ موڑ لیا، حکومت مرو مین وہ سکرٹیری (نظامت) کے عہدہ پر مامور تھا دولت کی فراوانی اور اسکی لذت آگینیان اسکی رفیق زندگی تھین وہ ظاہر کرتا ہے، کہ اکتوبر ۴۵ھ مین مجھے موقعہ ملا کہ اگر مین اسرار نجوم کے مطابق دولت کے لئے خدا سے دعا کرون تو مقبول ہوگی، بظاہر اسکی زندگی انقلاب پذیر نہ معلوم ہوتی تھی، مذہب، نجوم، دنیاوی ہوس اور لذات کے مخلوط اثرات مین وہ مبتلا تھا، ایک شب اسنے خواب مین دیکھا کہ ایک صورت یون خطاب کر رہی ہے "کبتک تم شراب پیتے رہو گے، جو انسان کی عقل کھو دیتی ہے، اچھا ہوتا کہ تم اپنے مین آجاتے،، اسنے جواب دیا عقلمندون نے شراب سے بڑھکر تردداتِ دینوی کی زائل کرنے والی کوئی دوسری چیز نہین پائی، اس شکل نے کہا عقل کے فقدان اور اپنی ذات پر تصرف نہ رکھنے کی گم گشتگی سے روح کو اطمینان نہین ہوتا، کوئی عقلمند آدمی کسی کو جنون کی رہنمائیون کی صلاح نہین دے سکتا، بلکہ اسکی تلاش ضروری ہے، جس سے عقل بڑھتی ہے، ناصر خسرو نے کہا تو مین کیا کرون،، اس صورت نے جواب دیا "جو یندہ یا بندہ"......... اور مکہ کی طرف اشارہ کیا

اس خواب نے ناصر خسرو کی زندگی بدل دی، اسکی نفسیاتی حالت مین کتنی ہی استعداد کیون نہ آگئی ہو، اسکے دماغ کے پیش نظر کوئی ایسا سوال نہ تھا، جسکے ماتحت اسقدر سرعت کیسا تھ اسکی زندگی انقلاب پذیر ہو جاتی، صبح کے وقت اسنے ارادہ راسخ کر لیا، کہ وہ تمام چیزین ترک کر دے جو چالیس سال تک زندگی سے متعلق رہی تھین، اسنے سکرٹیری کے عہدہ سے استعفا دیدیا، اپنی دولت لٹا دی صرف ضرورت سفر کے مطابق رکھ لی، اور ۶ مارچ ۴۶ھ کو مرو سے بارادہ حج بیت اللہ روانہ ہوا، اسکے بعد اسنے ایک مذہبی سیاح کی طرح زندگی گذار دی اور ۸۱ھ مین ایک تارک الدنیا درویش کی طرح بدخشان کے پہاڑ پر مر گیا.

امام اشعری

اسی قسم کا ایک مذہبی انقلاب علامہ ابو الحسن الاشعری کی زندگی مین بھی واقع ہوا تھا امام اشعری مسلمانون مین اشعریہ فرقہ کے بانی گذرے ہین، انکے متکلمانہ افکار و احساسات اور فقیہانہ اجتہاد و نظریات آٹھ سو برس سے اسلامی مذہب مین متداول ہین، انھون نے معتزلی فکر و عقیدہ مین نشو و نما پائی تھی، معتزلہ وہ ہین جو عقلی اصول کی بنا پر انکار کرتے ہین کہ قرآن مجید غیر مخلوق ہے، یہ کہ ایمان والون کو بہشت کے اندر خدا کا دیدار ہوگا اور یہ کہ مخلوقات کے تمام اعمال کا خالق خدا ہے، عموماً ان لوگون نے الہیات مین بحث و تمحیص کی، اور اہل سنت والجماعت کی طرح انھون نے آبائی معتقدات کا تتبع کرنا نہ چاہا جو قرآن مجید کے نظریات اور آنحضرت صلعم کے ذاتی کلمات مواعظ پر مبنی تھے.

امام اشعری نے معتزلہ کی طرح نشوونما اور تربیت پائی تھی، اور چالیس برس کی عمر تک آپ نے آبائی مسلک کے مطابق بحث وجدل بھی کرتے رہے، میکڈونلڈ لکھتا ہے کہ امام اشعری چونکہ سامی الاصل (Semites) تھے اسلئے انکی حیات شاعرہ ایک سیدھے سادے نصیحت آمیز عقیدہ کی خواہان تھی، اس وجہ سے وہ اپنے مسلک کے ارباب فکر کی منطقیانہ سخن پردازیون سے دل مین اکتا گئے تھے،

مطالعہ نتیجہ سے واضح ہوتا ہے، کہ وہ سمجھ رہے تھے، (گو انکا یہ ادراک انکی سطح شعور سے فروتر تھا) کہ ایک خالص عقلی علم کلام بیکار ہے، اور یہ کہ انسانی خیال مین اسرار کائنات کی ترجمانی نہین ہوسکتی انکے نفس باطن مین یہ خواہش پیدا ہورہی تھی کہ "اس طرح خدا کہتا ہے" کی بلا واسطہ صد ...... سن لین، جو فراغ خاطر کا سبب ہو، وہ روحانی انقلاب پذیری کی رزمگاہ مین تھے، کہ ماہ رمضان کے ایک دن جب انہین صائمانہ اور متعبدانہ انہماک تھا، خواب کے اندر ایک سرد ش غیب آیا، میکڈونلڈ کہتا ہے، یہ قصہ مختلف طریقون سے بیان کیا جاتا ہے، لیکن مین یہان اسپٹیا کی کتاب "سیرت ابوالحسن الاشعری" سے یہ روایت نقل کرتا ہون، جو نفسیاتی اعتبار سے زیادہ قابل توجہ ہے، یہ بھی یاد رکھنی چاہئے کہ ایک معتزلی کی حیثیت سے ابوالحسن الاشعری کے نزدیک خواب کی کوئی اہمیت نہ تھی، پھر بھی یہ تعجب انگیز امر ہے کہ انکی فکر واحساس نے خواب کی صورت اختیار کرلی۔

امام اشعری فرماتے ہین۔

"ایکدن جب کہ مین ماہ رمضان کے پہلے عشرہ مین سویا ہوا تھا، مینے آن حضرت صلعم کو خواب مین دیکھا آپنے فرمایا۔ اے علی! تم میری حدیث کی تائید کرو، کیونکہ وہ صحیح ہے، پھر جب مین بیدار ہوا، مجھے نہایت مصیبت معلوم ہوئی، اور مین برابر خیالات اور اندیشہ مین پڑا رہا، چونکہ ان مسائل (حدیث) کے متضاد پہلوؤن کے متعلق براہین ساطعہ میرے پیش نظر تھے، آخرکار دوسرے عشرہ مین بھی مینے ایک رات آن حضرت صلعم کو خواب مین دیکھا، آپنے فرمایا تم نے اسکے متعلق کیا کیا جسکے بارہ مین مینے تمھین حکم دیا تھا مینے کہا یا رسول اللہ! مین کیونکر کرون؟ آپکی حدیث سے مینے ایسے ایسے مسائل استنباط کئے، جنکے متعلق الہیاتی استدلالات نے فتوائے جواز دیا، اور مینے اس صحیح سند کی پیروی کی جو خالق پر مجموعی حیثیت سے منطبق ہوسکتی تھی، تب آپنے فرمایا، میری حدیث کی تائید کرو، چونکہ وہ صحیح ہے، مین حزن وملال کی گرانی کے ساتھ بیدار ہوا، اور ارادہ کرلیا کہ متکلمانہ استدلالات ترک کردونگا، مینے احادیث نبوی، کا مطالعہ اور تلاوت قرآن مجید شروع کردی،

اسکے بعد جب (رمضان کی) ستائیسوین تاریخ آئی جس رات مین میرا دستور تھا کہ مین بصرہ مین علما، صلحا، اور حفاظ قرآن مجید کے ساتھ شبینہ پڑھا کرتا تھا، حسب دستور مین اس جماعت کے ساتھ تھا لیکن مجھ پر نیند کا

ایسا غلبہ ہوا، کہ مین قیام نہ کرسکا؛ اور جب مین گھر آیا، سو رہا، اس رات کے قیام اور تلاوت کے ترک ہوجانیکا مجھے سخت صدمہ تھا، مینے آن حضرت صلعم کو خواب مین دیکھا، آپنے فرمایا تمنے اسکے متعلق کیا کیا جسکے بارہ مین مینے تمھین حکم دیا تھا، مینے کہا، "مینے الہیاتی استدلالات ترک کردئے اور تلاوت قرآن مجید، اور آپکے اقوال و سنن کی روایات کا مطالعہ شروع کردیا، لیکن آپنے فرمایا کیا مینے تمھین حکم دیا تھا کہ الہیاتی مباحث ترک کردو، مینے تمھین صرف یہ حکم دیا تھا کہ تم میری احادیث کی تائید کرو، چونکہ وہ صحیح ہین، تب مینے کہا یا رسول اللہ مین کیونکر ان مسائل کی تائید کرون جن کے عناصر مینے بوضاحت سمجھے نہین، اور جنکا ثبوت اس تیس برس تک مینے خواب سے زیادہ نہین تصور کیا، آپنے فرمایا اگر مین یہ نہین جانتا کہ خدا تعالی تم پر خاص نظر رحمت موقوض کریگا تو مین جب تک ان پیچیدہ مقامات کی توضیح نہ کردیتا، تمھارے نزدیک سے نہ ہٹتا، اور تم جب میرا یہ آنا محض خواب (وخیال) تصور کرتے ہو، تو مجھ پر حضرت جبرئیل کا آنا بھی خواب (وخیال) تھا؟ اسکے بعد تم اس طریقہ سے مجھے نہ دیکھوگے اسلئے تم اس امر مین مشغول ہوجاؤ، خدا کی طرف سے تمھاری خاص مدد ہوگی، تب مین خواب سے بیدار ہوا، اور مینے کہا صداقت کے لئے جستجو مشروط ہے، اسکے بعد مینے آن حضرت صلعم کی اُن احادیث کی تائید و توکیل شروع کی جو خواب، مداخلت نبوی، اور رویت الٰہی کے متعلق ہین اُسکے بعد قسم خدا کی میرے دماغ مین ایسی ایسی باتین آنا شروع ہوئین جنکا تذکرہ نہ کبھی میرے مخالفین نے کیا تھا، اور نہ جنکے مباحث مینے کسی کتاب مین دیکھے تھے، اسلئے مین یہ سمجھا، کہ یہ وہی تائید الٰہی ہے جسکے متعلق ہمارے نبی صلعم نے بشارت دی تھی۔

اس خواب کو نقل کرکے میکڈ ونلڈ لکھتا ہے، کہ امام اشعری نے سچ مچ یہ خواب دیکھا تھا، اسکے متعلق شبہ نہین، کیونکہ اسکے بعد انکی زندگی مین انقلاب رونما ہوا، اور وہ معتزلی عقاید ترک کرکے اہل سنّت والجماعت مین داخل ہوگئے، امام اشعری آئے تو علم کلام بھی ساتھ لائے جسکا وجود صرف معتزلہ کی جماعت مین تھا امام اشعری کے قبل اہل سنّت والجماعت مین متکلمانہ ذوق مفقود تھا، یہ اسلام کی مذہبی تاریخ کا ایک انقلابی دور تھا، اسوقت سے اہل سنّت والجماعت نے اپنے عقاید کی تائید مین صرف احادیث ہی سے مدد نہین لی بلکہ اس مین قیاس ورائے بھی شامل کرلیا، یہ واقعہ تیسری صدی ہجری مین واقع ہوا،

میکڈ ونلڈ نے اسکے بعد برٹن کے سفرنامہ سے ایک پنجابی کے خواب کی روایت نقل کی ہے جس نے حضرت علیؑ کو خواب مین دیکھا تھا اور حج کے لئے چلا گیا، برٹن اپنی سیر و سیاحت کے سلسلہ مین اس پنجابی سے خود مکہ معظمہ مین ملا تھا، چونکہ اس نے اس خواب کا تاریک پہلو پیش کیا ہے، جو عصبیت سے ملوث معلوم ہوتا ہے، اس لئے مین اسے نظرانداز کرتا ہون، جن ارباب ذوق کو دلچسپی ہو وہ میکڈ ونلڈ کی کتاب کا مطالعہ کرین، ۔

"خواب میں تعلق" "غیر مشہود"، کے باب کو میکڈونلڈ مفصلہ ذیل تتمہ کے بعد ختم کرتا ہے، وہ کہتا ہے، کہ اسلامی جماعت کا ہر رکن خواہ وہ اہل سنت والجماعت سے تعلق رکھتا ہو، یا ارباب کفر و الحاد کے زمرہ سے خواہ وہ علمائے دین کے مشرب سے وابستہ ہو یا فلاسفہ کے مسلک سے، خواب کے اوپر ایمان رکھتا ہے، اسکے بعد لکھتا ہے کہ اہل اسلام میں خواب کے متعلق ایک کتاب ہے، جو ہر چند اپنی مختلف النوع مرکزیت دلچسپی، اور مصنف کے موضحانہ طریق نقش طرازی، اسکی سیر و سیاحت اور تاریخ عصری کا مرقع ہونیکی حیثیت سے، اسقدر مشہور نہیں ہے، حالانکہ اسے مشہور ہونا چاہئے .... یہ کتاب ابن بطوطہ کی زندگی اور اسکا سفرنامہ ہے جسے اسنے ۱۳۵۵ھ میں بمقام فیض پیش کیا اسے مصنف نے ۲۸ سال کے سفر سے واپس آنے، اور تقریباً ۷۰ ہزار میل کی رہ نوردی کرنے کے بعد لکھا ہے، سینگوئینیٹی اور ڈفرامیری نے اس کتاب کا اصل عربی نسخہ عمدہ فرنچ ترجمہ کے ساتھ شایع کیا۔

باقی ــــ باقی

"عبدالمالک آروی"

(سرزمین چین کی ایک عبرتناک داستان)

(۱)

سلطنتِ کوریا (چین) کے گوشے گوشے مین چودانگ کی محبت پرستی کا شہرہ پہنچ گیا تھا - اور اس کی پاک اور حقیقی محبت لوگون کے لئے ایک عجیب اور نادر مثال بن گئی تھی - چودانگ حسن وجمال مین بھی نہایت ممتاز تھا اور حکمت پر بھی کامل دسترس رکھتا تھا - قسمت سے اُسے بیوی بھی نہایت شریف اور نیک طینت اور پاک باطن ملی تھی - اور وہ بھی اپنے شوہر کے ساتھ اپنی وفا شعاری، اور شوہر پرستی مین یکتائے زمانہ تھی دنیا ان کی محبت پر شک کرنے لگی تھی -

چودانگ جب کہین سیر و تفریح کو جاتا تو ہانسی کو بھی اپنے ساتھ لیجاتا - اور ہانسی کی تمام خوشیون اور مسرتون مین چودانگ اسکا ہم جلیس رہا کرتا - جب وہ کسی جلسے یا دعوت مین شریک ہوتے تو دونون ایک دوسرے کے ہاتھ مین ہاتھ ڈالے رہتے - اور انبساط وسکون ان کے چہرون سے ظاہر ہوتا - جب وہ گفتگو کرتے تو ان کی زبان سے ایک ہی قسم کے الفاظ نکلتے -

وہ محبت کے رازہائے پنہان اور رموز مخفی سے بھی بخوبی آشنا ہو گئے تھے - اور کسی کو کبھی یہ خیال بھی نہو سکتا تھا کہ ان کے اس سکون مین کوئی چیز خلل انداز ہو سکتی ہے -

(۲)

ایک شام ہر طرف سکوت چھایا تھا - پرندے اپنے اپنے آشیانون مین چھپتے جارہے تھے اور ہر طرف اس وقت سناٹا طاری تھا - شہر سے باہر ایک قبرستان مین انتہائی خاموشی حکمران تھی - اور اس عالمِ سکوت مین اور ایسے بھیانک مقام پر، ایک عورت سفید لباس مین ملفوف، ایک بہت بڑا پنکھا اپنے مرمرین نازک ہاتھون مین لئے ہوئے، ایک قبر پر جھلنے مین مصروف تھی - اور کسی خیال مین یکسر محو تھی - اس کا چہرہ نہایت دلکش اور خوبصورت تھا اور شباب کی رعنائیان اس کے عضو عضو سے جھلک رہی تھین وہ اس لباس مین ایک حور خیال سے کم نہ نظر آتی تھی - تاہم وہ کسی قدر بےچین اور بیقرار تھی - وہ بار بار اپنا چہرہ اُٹھا کر آسمان کی طرف دیکھتی - آہ سرد بھرتی اور پھر خاموش ہو جاتی اور پنکھا جھلنے لگتی -

اس اثنار مین قبرستان کی چاردیواری کے قریب ایک انسانی شکل متحرک نظر آئی - وہ بدستور حرکت کرتی رہی

۔۔۔۔۔۔ پھر چند منٹ تک ایک مقام پر ٹھہر گئی۔ اور پھر متحرک ہوئی اور آخر اس عورت کے بالکل قریب پہنچ گئی
عورت نے پُر ارمان نگاہون سے آنیوالے کی طرف دیکھا۔ اور پھر سر جھکا کر اپنے کام مین مصروف ہو گئی آنیوالا
شخص اس عورت کو کچھ دیر تک دیکھتا رہا۔ اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ کسی گہرے خیال مین مستغرق ہے پھر کچھ
دیر کے بعد وہ چونکا۔ اور اس نے نہایت جرأت کر کے اس جوان عورت سے نرم لہجے مین پوچھا۔ "تم یہان کیون
کھڑی ہو اور اس قبر پر پنکھا جھلنے سے تمھارا کیا مطلب ہے؟"
عورت نے غمگین لہجے مین جواب دیا۔ (اس کی آنکھون مین آنسو ڈبڈبا رہے تھے) "مہربان اس ہمدردی کا
شکریہ تہِ دل سے ادا کرتی ہون۔ لیکن آپ پوچھکر کیا کرینگے۔؟"
چو دانگ بولا: "مگر آپ کو بتانے مین کیون عذر ہے؟ مین اس لئے دریافت کر رہا ہون کہ شاید آپکی مدد کر سکون"
عورت نے آنسو بہاتے ہوئے کہا۔ "آہ افسوس اب دنیا مین مجھے ایسا شوہر کہان ملے گا جو اس قبر مین راحت
ابدی کی نیند سو رہا ہے۔ میرا پیارا شوہر، ایک نہایت رحمدل، اور نیک خصلت انسان تھا۔ مرتے وقت اس نے
مجھسے کہا تھا کہ جب تک اس کی قبر کی مٹی خشک نہو جائے۔ اس وقت تک مین دوسری شادی نکرون۔ اسوقت
آپ مجھے اُسی حکم کی تکمیل مین منہمک دیکھ رہے ہین"

چو دانگ نے پوچھا۔ ہان مٹی تو ضرور خشک ہو جائیگی مگر پنکھا جھلنے کی کیا ضرورت محسوس ہوئی؟
عورت نے جواب دیا: "اس لئے کہ مٹی جلد سوکھ جائے۔ اس کام مین مین نے دو دن صرف کر دیئے ہین اور
یہ ارادہ کر لیا ہے کہ جب تک اس وعدہ کی تکمیل نہو جائے دوسری شادی نکرونگی۔ خواہ اس قبر کے سوکھنے مین اور
چار دن کیون نہ لگ جائین۔

چو دانگ، بیوہ کے حسن سے متاثر ہو چکا تھا۔ اور ابتک نہایت سنجیدگی اور احترام کے ساتھ اُس سے گفتگو کر رہا
تھا۔ مگر بیوہ کے اس عجلت کے خیال سے وہ مسکرا دیا۔ تاہم فوراً ضبط کر کے اس نے نہایت ہمدردی کے انداز سے کہا۔
"محترمہ۔ اگر آپ میری ناچیز التجا کو نگاہ مشکوک سے نہ دیکھین۔ تو مین یہ عرض کرونگا۔ کہ میرے غریب کدے پر تشریف
لے چلئے۔ میری بیوی آپ کو دیکھکر بہت مسرور ہوگی اور آپ کی تشفی اور دلداری ہی کریگی"
عورت نے شرمگین انداز سے جواب دیا۔ "مہربان آپ کی اس عنایت کی ممنون ہون۔ مین آپکے اس جذبۂ
ہمدردی کو احترام کی نظر سے دیکھتی ہون۔ مجھے آپ کی شرافت پر کامل اطمینان ہے اور چلنے مین کوئی عذر نہین۔

(۳)

ہانسی اپنی خلوتگاہ مین ایک مسہری پر دراز تھی۔ سرہانے ایک چھوٹی خوبصورت میز پر ایک شمع جھلمل کر رہی
تھی اور وہ کسی کتاب کے مطالعہ مین محو تھی۔

چو دانگ کمرہ مین داخل ہوا۔ اور آہستہ آہستہ اس کے قریب پہنچ گیا۔ ہانسی اُسے دیکھکر اٹھ کھڑی ہوئی اور چو دانگ اسکے برابر بیٹھ گیا اور بولا "پیاری ہانسی ایک بات کہنے آیا ہون۔ سنو گی اور میرا کہنا مانو گی"۔

ہانسی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا: "تمھاری بات سننے سے بھلا مجھے عذر ہو سکتا ہے اور میں نے تم سے انکار کس بات مین کیا ہے؟"۔

چو دانگ نے کہا: "پیاری ہانسی۔ آج اتفاقاً مین قبرستان چلا گیا تھا وہان ایک بیوہ عورت کو غمگین حالت دیکھکر مین بیحد متاثر ہو گیا ہون۔

ہانسی نے قدرے بیچین ہو کر پوچھا۔ کس بات سے؟۔

چو دانگ نے جواب دیا۔ اس کا شوہر مر گیا ہے اور مرتے وقت اس نے اپنی بیوی سے کہا تھا کہ جب تک اسکی قبر کی مٹی خشک نہو جائے وہ دوسری شادی نکرے۔ چنانچہ وہ بیچاری قبر پر پنکھا جھل کر مٹی خشک کر رہی تھی اُسے مین اپنے گھر لے آیا ہون۔ تم اس کی تسلی اور تسکین کرو، یہ ایک انسانی ہمدردی ہے، مگر ہانسی ——

ہانسی ابتک چپ چاپ سن رہی تھی اور دل ہی دل مین اس عورت کو کوس رہی تھی۔ مگر اس نے بیچین ہو کر پوچھا: کیون چپ ہو گئے۔ پیارے چو دانگ کہو نا کیا مجھسے کوئی بات چھپانی ہے۔

چو دانگ بولا: نہین ہانسی تم سے کون راز پوشیدہ ہین۔ ہان مین کچھ کہنے والا تھا۔ مگر شاید تمھین ناگوار گذرے

ہانسی نے کہا: نہین تمھاری کوئی بات مجھے ناگوار نہ گذریگی۔ تم شوق سے کہو۔

چو دانگ نے کہا: میرا یہ خیال ہے کہ اگر میرا بھی یہی انجام ہوا تو شاید تم بھی اسی بیوہ کی طرح کرو۔

ہانسی یہ سنکر بے ساختہ رو پڑی۔ اس کے تمام جسم مین لرزش پیدا ہو گئی۔ وہ ہمہ تن غصہ بن گئی۔ اس نے برہم نگاہون سے چو دانگ کو گھور کر دیکھا۔ اور بولی "چو دانگ۔ چو دانگ تم نے مجھے کیون ایسا سمجھ لیا ہے۔ آہ مجھے تو تم سے ایسی بدگمانی کی کبھی بھی امید نہ تھی"۔

چو دانگ نے تسلی دیتے ہوئے کہا: "پیاری ہانسی تم غصہ ہو گئین۔ مین نے صرف اپنا ایک خیال ظاہر کیا تھا۔ تمھین اس سے صدمہ پہنچا۔ پیاری ہانسی معاف کردو۔ مین تو سمجھتا تھا کہ تمھین اس سے کوئی تکلیف نہوگی۔

ہانسی نے اشک آلود نگاہون سے دیکھکر جواب دیا۔ چو دانگ ان الفاظ سے تم نے میرے قلب کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے مین اب کس دل سے تم سے بات کرون۔ آہ تم کس قدر ظالم ہو کہ بلا کسی وجہ کے ایسا فضول خیال قائم کر لیا۔ چو دانگ مین اور میری جان صرف تمھارے لئے ہین مین کسی دوسرے سے محبت نہین کر سکتی چو دانگ۔ میری باتون کو دل پر نقش کر لو۔ مین تم سے سچ کہہ رہی ہون۔

چو دانگ نے متاثر ہو کر کہا۔ ہانسی پیاری ہانسی مجھے تمھاری طرف سے ذرا بھی بدگمانی نہین معلوم نہین کیون

یہ خیال آ گیا تھا۔ اور میں چونکہ اپنے دل کی کوئی بات تم سے مخفی رکھنا نہیں چاہتا۔ اس لئے میں نے اسکا بھی اظہار کر دیا مگر خیر اب اسے درگذر کرو۔ پیاری ہانسی چودانگ تم سے معافی مانگتا ہے۔

ہانسی نے جواب دیا:۔ میں تمھیں معاف کرتی ہوں۔ لیکن میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ جہاں ایسی بے وفا اور بیشرم عورت رہیگی میں ایک لمحے وہاں ٹھہرنا گوارا نہ کرونگی۔ اُسے ابھی نکالدو۔ اس کی وجہ سے میرا گھر ناپاک ہو جائے گا۔

چودانگ نے کہا:۔ اچھا تم اس قدر ناراض نہو اس قدر برہم نہو۔ پیاری ہانسی میں کبھی تمھاری دلشکنی گوارا نہیں کرسکتا۔ میں ابھی اُسے نکالے دیتا ہوں۔ پیاری ہانسی میری پیاری" اور یہ کہکر اس نے ہانسی کو اپنی آغوش میں لیا۔

(۴)

رات نہایت طوفانی اور سرد تھی۔ آندھی بہت زور شور سے چل رہی تھی۔ اور رات زیادہ بھیانک ہو گئی تھی بیچاری بیوہ عورت، چپ چاپ گھر سے نکلی اور تاریکی میں کسی طرف روپوش ہو گئی۔

ایک گھنٹہ گذر گیا دروازہ کھٹکھٹانیکی آواز آئی۔ دروازہ کھولدیا گیا۔ چودانگ کا ایک شاگرد جسے چودانگ نے بہت عرصہ سے نہ دیکھا تھا۔ اندر داخل ہوا۔ دونوں اس کے خیر مقدم کے لئے اُٹھ کھڑے ہوے اور نہایت فرخندہ روی اور زندہ دلی سے پیش آئے ——— سب لوگ گفتگو میں مشغول ہو گئے۔

ایک نہایت بڑے اور آراستہ کمرے میں فرش بچھایا گیا مختلف قسم کے کھانے دسترخوان پر چنے گئے۔ اس وقت چودانگ اور ہانسی کے اندازہ واطوار سے اطمینانِ قلب، نشاط و بہجت کے آثار ہویدا تھے۔ اور ان کے اس اتحاد کی مسترت ان کے چہروں سے ظاہر ہو رہی تھی۔

یکایک چودانگ بیٹھے بیٹھے زمین پر گر پڑا۔ اور بیہوش ہو گیا۔ اور اس کے قلب کی حرکت بند ہو گئی تمام لوگ یہ منظر جانگداز دیکھکر بہت مضطرب اور پریشان ہو گئے۔ کوئی ادھر دوڑنے لگا کوئی اُدھر۔ کوئی ڈاکٹر کو بلانے گیا کوئی پنکھا جھلنے لگا۔ چنانچہ چند ہی لمحوں میں ہر شخص بدحواس ہو گیا۔ اور چودانگ کو ہوش میں لانیکی تدابیر کی جانے لگیں۔ بعد دوا دوش اور کوششوں کے بعد بھی کوئی مفید نتیجہ نہ نکلا۔ اور سب نے چودانگ کو مردہ سمجھ لیا۔

شوہر پرست ہانسی پر اس صدمۂ جانکاہ سے ایک بجلی سی گر پڑی اور وہ سر پکڑ کر ایک کرسی پر گر پڑی ——— بہت دیر تک اُسی پر پڑی رہی۔

(۵)

شاگرد، اپنے استاد کی اس اچانک موت سے بہت سراسیمہ اور غمزدہ ہو گیا اُسے کسی کل چین نہ آتا تھا۔ ہانسی شاگرد کی اس حالت کو دیکھکر بہت متفکر ہو گئی اور آخرکار چودانگ سے وفا شعاری کا وعدہ اس نے فراموش کر دیا بیوہ عورت کی حالت بھی اس کے دماغ سے محو ہو گئی۔ اور اب وہ شاگرد کی بےچینی کو رفع کرنے میں سراپا محو ہو گئی

ایک دن گذر گیا۔ دوسرے دن وہ شاگرد سے نہایت دلچسپ گفتگو کرکے اس کی تسلی اور تشفی کرتی رہی۔ گفتگو مین اس قدر آزادی اور عریانی خیال موجود ہوتی تھی کہ دونون کے جذبات مین ایک ہل چل سی مچ جاتی تھی۔ تیسرے دن دونون ایک دوسرے سے شادی کرنے پر رضامند ہوگئے۔

(۶)

چو دانگ کی آرام گاہ اس وقت غم و آلام کے آثار سے معرا تھی۔ مسرت کی رنگینیان بہار کی طرح ساری فضا پر چھائی تھین۔ نشاط و فرحت کی صدائین ہر طرف سے بلند ہو رہی تھین۔

چو دانگ کی نعش ایک تابوت کے سپرد کرکے ایک تنہا کمرہ مین رکھدی گئی تاکہ جب تک عدالت سے دفن کرنیکا حکم نہ ملے۔ وہان محفوظا پڑی رہے۔

دولھا اور دولھن نے نہایت بیش قیمت، زرین اور لباس فاخرہ زیب تن کئے۔ ہانسی نے ناک مین ایک بیش قیمت بُلاق پہنا۔ اور تو شہ نے مرحوم استاد کے ملبوس سے اپنے آپ کو آراستہ کیا۔ عقد کا وقت قریب آ گیا۔ تمام خاندان اس آنیوالی مسرت سے نہایت مسرور اور شاد نظر آرہا تھا اور تمام کمرے۔ برآمدے۔ اور دالان روشنی سے جگمگا رہے تھے۔ عطر و عنبر کی خوشبوؤن سے فضا معطر ہو رہی تھی۔

اس وقت ہانسی دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ، ایک نہایت آراستہ خلوتکدے مین، تنہا بیٹھی ہوئی تھی۔ اور اپنے نوجوان شوہر کا انتظار کر رہی تھی۔ اسی عالم فرحت و بہجت مین ایک ملازم نہایت متوحش اور مضطرب کمرے مین داخل ہوا۔ اور اس نے گھبرائی ہوئی آواز مین کہا۔

"ہمارا ــ نوجوان آقا ــ اچانک ــ ایک سخت مرض ــ مین ــ مبتلا ہو گیا ــ ہے ــ مرض نہایت خطرناک ہے ــ جب تک ــ کسی مردہ ــ انسان کا دل ــ اُس کے سینے ــ پر نہ رکھا جائے اس ــ کی زندگی کی کوئی ــ امید نہین"

ان الفاظ کو سنتے ہی ہانسی دفور غم سے تڑپ کر کھڑی ہوگئی۔ اُسے ایسا معلوم ہونے لگا جیسے کوئی اس کی رُوح کو شکنجے مین کس رہا ہو۔ اس کے مضمحل اور حسین چہرے پر اضطراب کی لہرین سیلاب کی طرح دوڑنے لگین وہ دیوانی سی ہوگئی۔ تاہم اُس نے جلد جلد اپنے لمبے جوڑے اور زمین پر گھسٹنے والے کپڑون کو سمیٹا۔ وہان سے نکلکر دوسرے کمرے مین گئی ایک کلہاڑی لی۔ اور دوڑ کر اس کمرے مین جا پہنچی۔ جہان اس کے شوہر کی نعش پڑی ہوئی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ مردہ شوہر کا دل نکالکر زندہ شوہر کی روح کو موت کے چنگل سے چھڑائے۔ وہ اس خیال مین کھوئی ہوئی تھی۔ اُسے انجام کی ذرا بھی فکر نہ تھی ــ وہ زور۔ زور سے کلہاڑی صندوق پر مارنے لگی۔ چند ضربون کے بعد صندوق ٹوٹ گیا۔ اور ساتھ ہی چو دانگ کی نعش حرکت کرنے لگی۔ جسے تمام لوگون نے مردہ سمجھ لیا تھا۔

اس ہیبتناک منظر سے خوفزدہ ہو کر ہانسی نے کلہاڑی چھوڑ دی - اس کا تمام جسم اور جسم کا رونگٹا رونگٹا خوف سے تھر تھر کانپنے لگا - وہ اس منظر کو زیادہ نہ دیکھ سکی اور وہان سے بھاگ آئی -

(۷)

چو دانگ صندوق سے باہر نکل آیا - اور اپنی بیوی کی اس غیر معمولی آرائش اور اسکی پریشانی دیکھکر سخت متحیّر ہوا - وہ کچھ دیر تک ساکت رہا - لیکن جب ہانسی وہان سے چلی گئی تو وہ وہان سے نکلکر باہر آیا - تاکہ اس آرائش کا سبب دریافت کرے - اُسے وہان کوئی نہ ملا وہ آگے بڑہا - اس اثناء مین دو ملازم داخل ہوئے اور اور انھون نے چو دانگ کو دیکھکر بھاگنا چاہا - چو دانگ نے ان کو پکارا - اور وجہ دریافت کی - لوگون نے اُسے بہت دیر کے بعد زندہ سمجھا اور گذشتہ واقعات بلاکم وکاست بیان کر دیئے -

چو دانگ کو ملازمون کی باتون پر یقین نہ آیا - وہ اپنی بیوی کے متعلق ایسی باتین سنکر بہت برہم ہوا اور ملازمون کو بُرا بھلا کہکر خود ہی ہانسی کو تلاش کرنے لگا - وہ چاہتا تھا کہ ان تمام واقعات کی حقیقت سے آشنا ہو وہ چاہتا تھا کہ ہانسی کے متعلق لوگون کے بیانات غلط ثابت ہون - اور وہ یہ بھی چاہتا تھا کہ اگر یہ تمام واقعات سچ ہون تو وفا شعار ہانسی سے اُس کی وعدہ شکنی کا تذکرہ کرکے اُس پر اظہار نفرت کرے -

(۸)

ہانسی، نفس پرست اور وعدہ شکن ہانسی بدنامی اور رسوائی کے خوف سے لرز گئی - اس کے لئے دنیا مین اس سے بڑھکر اور کوئی ذلت نہو سکتی تھی کہ اس نے اپنے عزیز شوہر سے وعدہ شکنی کی تھی -

چو دانگ اِدھر اُدھر تلاش کرتا رہا - اور آخر کار پھر اُسی کمرے مین جا پہنچا جہان اسکا تابوت رکھا تھا - اس نے دیکھا اور دیکھکر چونک پڑا - اس نے دیکھا اور اپنا دل تھام کر رہ گیا - ہانسی نے ذلت، ندامت اور بیوفائی کا صدمہ نہ برداشت کرکے خودکشی کر لی تھی -

چو دانگ ایک فلسفی تھا - وہ نہایت عمیق نظر اور نکتہ رس اور دانشمند تھا - اُس نے یہ سب دیکھا - اُس نے اپنی مونس زندگی، اپنی رفیقۂ حیات اور محبوبۂ دلنواز کو خاک و خون مین آلودہ دیکھا - لیکن اس کی زبان سے اُف تک نہ نکلا - وہ چون کا تون کھڑا رہا - اور واقعات پر غور کرنے لگا - یہ ایک ایسا منظر تھا کہ اگر اس وقت اور کوئی شخص ہوتا تو رو دیتا - لیکن چو دانگ اپنی ذات کو اس کمزوری سے افضل اور برتر سمجھتا تھا - وہ ساکت کھڑا رہا - کچھ دیر گذر گئی - اس کی باریک بین نگاہون نے سب کچھ دیکھ لیا - سارے رازیکے بعد دیگرے اس پر منکشف ہو گئے - اور اُس نے پُرانے تابوت کو درست کرکے اُس مین اپنی وعدہ شکن بیوی کی نعش رکھدی -

(۹)

چو دانگ پھر خاموش ہو گیا - اور کسی سوچ مین پڑ گیا - پھر وہ اُٹھا - اس کے دماغ مین کوئی مفید تدبیر آگئی تھی - اس نے تمام آرائش اور سازو سامان کو اسی حالت مین رکھ کر اُس پنکھے والی بیوہ عورت کو تلاش کیا اور اپنے گھر لے آیا - چونکہ دونون ایک دوسرے کی فطرت اور اخلاق کی کمزوری سے واقف ہو چکے تھے اس لئے وہ شادی کے بعد ایک دوسرے کی غلطی معاف کرنے اور عیوب سے چشم پوشی کرنے کے رموز سے بھی آشنا بن گئے تھے -

محشر عابدی

(گولڈ اسمتھ)

ہماری قدیم فسانہ نگاری
اور
فسانۂ عجائب کے اجزائے ترکیبی

جہانتک خیال کیا جاتا ہے۔ اور مشہور ہے۔ لکھنؤ کی سرزمین نے نثر و نظم مین اپنے یہان کے باکمالون کے دو ادبی شاہکار پیش کئے۔ اور آجتک تفاخر اور ناز کے ساتھ یہی دونون پیش کئے جاتے ہین۔ ایک اُن مین سے مرزا رجب علی بیگ کا "فسانۂ عجائب" ہے۔ اور دوسرا منشی دیا شنکر نسیم کی "گلزار نسیم"۔

گلزار نسیم ایک شاہکار ادب سہی۔ ایک عجوبۂ روزگار مثنوی سہی مگر اس حقیقت کو کوئی طاقت نہین چھپا سکتی کہ وہ صرف ایک شراب کہنہ ہے جسکو دو آتشہ کر دیا گیا ہے جیسا کہ خود اس کا مصنف کہتا ہے ؎

وہ نثر تھی داد نظم دون مین   اس مے کو دو آتشہ کرون مین

یعنی قصہ پرانا تھا اب اوسکو نظم کر دیا گیا ہے۔ بعض مضمون نگارون نے اس طرف توجہ کی ہے کہ آیا وہ مے جسکو دو آتشہ کیا گیا ہے وہ اپنی ہی آگ سے دو آتشہ کی گئی ہے یا اُسکے لئے بھی حرارت کا کہین اور سے دست نگر ہونا پڑا ہے۔ چنانچہ اس مین بھی تحقیق کے بعد بہت بڑا شک پڑ جاتا ہے۔ کہ یہ مے دو آتشہ خود مصنف کی گرمی سخن کی کہان تک رہین منت ہے۔ بعض ستم ظریفون نے فارسی کے مصرع کے مصرع سامنے رکھدئے ہین۔ اور بتا دیا ہے کہ نسیم کی کاوش نمایش کی منزل سے آگے نہین بڑھتی۔ بہتون نے اور ذرا عنایت کی ہے انھون نے اسکو آتش کے دل و دماغ کا نتیجہ بتایا ہے۔ اور اگر بڑھنے والے زیادہ قدم اوٹھاتے ہوے اس راہ مین بڑھ گئے ہین اور مثنوی بدر منیر سے اوسکا تقابل کر دیا ہے تو پھر ایک قیامت ہی آگئی ہے ان قضیون کے دیکھنے والے کو سوا اسے "وائے بر جان سخن" کہنے کے اور کچھ بن ہی نہین پڑتا۔

یہ ہے اوس گلزار نسیم کا حال ، جو ہمیشہ میدان ادب مین ہل من مبارز کے ساتھ پیش کیجاتی ہے۔

فسانۂ عجائب ایک ایسی چیز ہے جس پر شاید کوئی اعتراضی داغ ابتک نہین پڑا ہے۔ اور جسکے جواب مین سروش سخن کو ہمیشہ نقش ثانی سمجھا گیا ہے۔

اس فسانہ کی بدیعی سحر کاری ، شاید تین چار حیثیتین رکھتی ہے۔ یعنی یہ کہ اوسکی نثر مقفی ہے۔ دلکش ہے اور اپنے وقت کا ادبی معجزہ ہے۔

دوسرے یہ کہ سرور نے فسانۂ عجائب کا قصہ بالکل طبعزاد لکھا ہے اور صرف اپنی کوشش و کاوش کو اہل دماغ کے سامنے پیش کرکے اپنی جودت طبع کا شید ابنا دیا ہے۔

کہنے والے یہ بھی کہتے ہین کہ فسانۂ عجائب کی گفتگو خاص قلعۂ معلی یا بیگمات کی گفتگو ہے۔ اور یہ عقیدہ اسقدر عام ہے کہ ایمان بالغیب کی حد تک پہونچگیا ہے۔

یون تو سرا سران دعاوی کی تکذیب نہین کیجا سکتی۔ مگر پھر بھی بہت سے شکوک اور اوہام کی اسمین گنجایش ہے۔ اور پھر بہت سے شکوک حد شک سے گزر کر یقین کی حد تک پہونچتے ہین۔ چنانچہ ہم فسانہ عجائب کی ان چارون حیثیتون پر ایک غایر نظر ڈالتے ہین۔ اور بتانا چاہتے ہین کہ گو ظاہر پرست سطحی نظرون کے سامنے وہ معجزہ ادب ہو۔ سحر نگاری ہو۔ بدیعۂ ادب ہو مگر غایر نگاہون کے سامنے یہ دعوی ع دو شرط ایمان بود ورزش ایمان بالغیب۔ اسے ایک قدم بھی آگے نہین بڑھتا۔ سب سے پہلے ہم بتانا چاہتے ہین کہ فسانہ عجائب قصہ کے لحاظ سے کیا حیثیت رکھتا ہے۔

ہمارے یہان کے قدیم افسانون کی ابتدا کے لئے تین چار مضامین سنگ بنیا د قرار پا گئے ہین اور غور و فکر کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ کد و کاوش کے باوجود بھی ادبی سیاح ان طلسمی مضامین کے جنگل سے باہر قدم نہین رکھ سکے۔ وہ لاکھ لاکھ تجربہ کار ہوئے اونکی گرم رفتاری کسی حد پر پہونچی۔ مگر پھر پھر کر آخر کار دائرہ ہی مین قدم رکھا۔

یہ کچھ شرط سی قرار پاگئی ہے۔ ایک واجب سی بات ٹھیر گئی ہے کہ مہتم بالشان قصہ کے لئے کسی ذی مرتبہ ہستی کو انتخاب کیا جائے جس کا درجہ زیادہ سے زیادہ شاہ جنات تک پہونچتا ہے اور ادنی سے ادنی ہو تو کوئی نواب یا امیر وزیر اس سے کم کے لئے ایشیائی افسانہ نگاری مین گنجایش ہی نہین ہے۔ اگر الف لیلہ کو مستثنی کر دیا جائے تو قریب قریب یہ بات ایک کلیۂ قرار پاجائیگی کہ گویا غریب اور ادنی درجہ اور طبقہ کے لوگون مین کوئی ایسا واقعہ کبھی پیش ہی نہین آتا جسکو افسانہ کے طریق پر لوگون کو سُنا سکین۔ قصہ نویسون داستان گویون۔ قدیمی افسانہ نگارون کے نزدیک گویا ادنی اور غربا کی زندگی ایک سادہ ورق ہے جسپر کسی واقعہ کا دھبا پڑا ہی نہین۔ نظم و نثر دونون اصناف کے قصے ایسے ہی ہین۔ چنانچہ نظم مین گلزار نسیم مثنوی قلق۔ مثنوی زہر عشق۔ مثنوی ماہ پیکر۔ مثنوی سحر البیان۔ قصۂ سیاہ پوش۔ مثنوی شیرین خسرو مثنوی نلدمن۔ مثنوی پدماوت۔ مثنوی شوق قدوائی۔ مثنوی موجۂ غم۔ مثنوی یوسف زلیخا۔ مثنوی گلشن عشق۔ مثنوی جوہر عشق۔ مثنوی دریائے تعشق وغیرہ وغیرہ اور نثر مین قصۂ ممتاز۔ داستان امیر حمزہ۔ حاتم طائی۔ باغ و بہار۔ گل وصنوبر۔ بلکہ الف لیلہ۔ بوستان خیال۔ سروش سخن۔ قصہ سیاہ پوش۔

وغیرہ وغیرہ سب اسی دائرہ مین ہین ۔ سب کی ابتدا بادشاہون اور امیرون کے آوارہ مزاج صاحبزادون سے ہوتی ہے ۔ یا خود اوباش مزاج حکمران کی سیاہ کاریون سے افسانون کے کاغذ کو رنگا گیا ہے ۔ یہ ہم نہین کہتے کہ ان سب کا راستہ ایک ہے اور ایک ہی داستان ان سب مین ہے ۔ بلکہ مقصد یہ ہے کہ جہان سے چلے ہین وہ جگہ ایک ہی ہے ۔ اسی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ سرور کے دماغ نے کوئی نئی بات نہین کہی بلکہ وہ بھی اُسی آموختہ کو دُہراتے رہے ۔ جو استاد ازل نے اونکو سکھا دیا تھا ۔ اونکو بھی سوائے بادشاہ کے اور کوئی ایسا نہ ملا جس سے وہ اپنے قصہ کی ابتدا کرتے ۔ اوسکی نظیر مین ہم نے متعدد قصے پیش کئے ہین ۔ لہذا اُن کے قصہ مین کوئی نُدرت برائے نام بھی نہین ہے ۔

اسکے بعد دوسری منزل آتی ہے ۔ عموماً ایشیائی قصتون کی ابتدا اسی طرح ہوتی ہے کہ کسی بادشاہ کے لڑکا پیدا نہوا ۔ تمام اسباب شاہی ہیچ نظر آنے لگے ۔ دولت و حشمت بیہودہ ہو گئی ۔ آخر بادشاہ سلامت مایوس ہوئے ۔ وحشت نے زیادہ زور کیا تو وہ ترک شاہی کا ارادہ کر بیٹھے اور اگر خلل دماغ اسدرجہ پر نہ پہونچا تو خیر پھر گوشہ گیری اور عزلت اختیار کر لی ۔ بعد خرابی بصرہ صاحبزادے یا شاہزادے صاحب پیدا ہوئے تو دیوانہ و مجنون نے رسوا سر بازار ے کی صحیح مثال ۔ اور حماقت کی مجسم تصویر ۔ چنانچہ سرور نے بھی یہی کیا اور یہ خیال مثنوی میر حسن ۔ یا باغ و بہار سے لے لیا ۔

اسکے بعد تیسری منزل آتی ہے جس مین صاحبزادے یا شہزادے کو عشق پیدا ہوتا ہے مگر اسکے لئے بھی چند مخصوص وزایع ہوتے ہین ۔ کسی کی طبیعت بیٹھے بیٹھے اُکتاتی ہے پیچ و تاب کھا کر شیدائے محض بنکر رہ جاتا ہے ۔ چنانچہ فیضی نے راجہ نل کو اسی حال مین پھنسایا ہے ۔ دوسرا ذریعہ قبول خاطر و لطف سخن خداداد کی بموجب خواب ہے ۔ یہ خواب بھی ایک بلائے بد ہے ۔ عموماً اسکی تعبیر آیندہ چلکر صحرا نوردی اور جنون ۔ غربت ہوا کرتا ہے ۔ اس خیال کی ابتداء یوسف زلیخا کے قصے سے ہوئی ہے اور پھر لوگون نے اس سے اسقدر جائز و ناجائز فائدے اُٹھائے کہ آج بہت سی داستانین اس سے بھری ہوئی نظر آتی ہین ۔ تیسرا دام فریب تصویر ہے ۔ جسکے ذریعہ سے ظاہر دل شکار کئے جاتے ہین ۔ چوتھا حیلہ نظارہ محض یا نظارہ لب بام ہے اس کے ذریعہ سے بھی بہت سے عشاق طائر بسمل کی طرح رقص بسمل کرائے جاتے ہیں ۔

اِن سب کے بعد افسانہ نویسون کی تدریجی ترقی اسدرجہ پر پہونچتی ہے کہ بادشاہ کے گھر مین لڑکا پیدا ہوتا ہے اور جوان ہو کر اتفاق سے سیر بازار کو جاتا ہے کوئی طوطا خریدتا ہے ۔ اور اوس طوطے سے کسی حسن جانسوز کا افسانہ عشق سنکر مبتلا ہو جاتا ہے ۔ چنانچہ فسانۂ عجائب مین بھی یہی کہا گیا ہے جان عالم نے طوطا خریدا ہے اور اس کے بعد ہی اوسکو جلاوطنی نصیب ہوئی ۔ یہ ایک پامال خیال ہے اسکو ہر گز سرور کے

دماغ کی پیداوار نہین کہا جا سکتا۔ اصل مین یہ خیال بہار دانش سے لیا گیا ہے۔ یا پدماوت۔ کیونکہ پدماوت مین راجہ رتن سین۔ اور بہار دانش مین بہرہ ور بانو کے عشق مین شاہزادہ جہاندار شاہ طوطے ہی کی بدولت مبتلا ہوا ہے اور پھر سفر کی بہت سی مصیبتین اُٹھائی ہین۔

جیسے جانعالم کے ساتھ یہ طوطا گیا ہے اسی طرح جہاندار شاہ کے ساتھ بھی طوطا ہر ایک سفر مین رہا ہے اور اسی واسطے اس خیال کو مصنّف بہار دانش کے دل و دماغ کا نتیجہ کہا جائے گا۔

جانعالم چلتے چلتے ایک جنگل مین پہونچا جو نہایت ہی پر فضا تھا۔ وہان اسکو دو ہرن نظر آئے۔ اور جانعالم اُنکو دیکھکر بے چین ہو گیا۔ وزیرزادے سے کہا کہ کسی طرح انکو جیتا گرفتار کیجئے۔ ہرن اِن دونون کو اپنے درپے دیکھکر دوڑے۔ آگے چلکر وہ ہرن ایک دوسرے سے جُدا ہو گئے اور بادشاہزادہ اور وزیرزادہ بہین سے علیحدہ ہو کر گمراہ ہوئے

یہ خیال بظاہر مصنف فسانہ عجائب کا پیدا کیا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ مگر جب باغ و بہار مین تیسرے درویش کی سیر پر نظر جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ خیال وہان سے لیا گیا ہے۔ باغ و بہار مین یہ ذکر تیسرے درویش کی سیر مین اس طرح کیا گیا ہے کہ تیسرا درویش عجم کا شاہزادہ ہے۔ ایک روز یہ شکار کے لئے گیا تو بالکل ایسے ہی جنگل مین پہونچ گیا جیسے جنگل مین جان عالم پہونچا ہے۔ وہان اسکو ایک کالا ہرن نظر آیا، جو طرح طرح کے نفیس سامانون سے سجا ہوا تھا۔ اور اس جنگل مین جہان خود رو سبزے اور پھولون کی کمی نہ تھی چرتا پھر رہا تھا۔ شاہزادہ عجم کو شوق ہوا کہ کسی طرح اس کو زندہ گرفتار کیا جائے اُسنے اپنے ساتھیون سے کہا کہ تم یہین ٹھہرو۔ مین اس کو زندہ گرفتار کرون گا چنانچہ اس نے اوس ہرن کے پیچھے گھوڑا دوڑایا۔ اور آخر گمراہ ہو گیا۔ ہرن غائب ہو گیا۔

اس واقعہ کے بعد جانعالم کو۔ اور ایک سخت ہولناک جنگل مین پہونچایا گیا ہے اور وہان اُسکو ایک چشمۂ آب نظر آیا ہے۔ یہ خیال بھی باغ و بہار سے لیا گیا ہے اُسنے بھی اپنے شاہزادہ کو چشمہ پر پہونچایا ہے فرق صرف اتنا ہے کہ اُسنے ایک باغ مین یہ چشمہ دکھایا ہے اور جان عالم تے جنگل مین۔

اسکے بعد ایشیائی مذاق قصہ گوئی کے موافق کسی پیر مرد کا ملنا ضرور تھا۔ چنانچہ شاہزادۂ جانعالم کو ایک پیر مرد ملا ہے جسنے اسپر ترس کھا کر راستہ بھی بتایا ہے۔ اور ایک نظر ملک زرنگار کو (جہان جانعالم کی محبوبہ انجمن آرا رہتی تھی)، بھی دکھا دیا ہے اسکے بعد پیر مرد نے اسکو سُلا دیا ہے۔ اور صبح کو جب اُسکی آنکھ کھُلی ہے تو وہ اُسی جگہ آ پہونچا ہے جہان سے ہرن کے پیچھے اُس نے گھوڑا دوڑایا تھا

یہ خیال بھی باغ و بہار کا ہے چنانچہ شاہزادہ عجم کو بھی ایک پیر مرد ملا ہے۔ اور اُسنے بھی ازراہ مہمان نوازی جان عالم کو کچھ ماحضر کھلایا ہے۔ شاہزادہ سو گیا ہے اور آنکھ کھلنے پر اُسکو بھی اپنے سوا اور دس لال مین

کوئی نظر نہین آیا۔ اس واقعہ کے بعد مصنف فسانہ عجائب باغ وبہار کا ساتھ چھوڑ دیتا ہے اور دوسرے راستہ پر چلنے لگتا ہے۔ یعنی جانعالم جب اُس جگہ پر آیا جہان سے اُسنے گھوڑا دوڑایا تھا۔ تو وہ ازسرنو سرگرم سفر ہوا۔ اور پھر ایکروز تمازت آفتاب کی شدت سے گھبراکر ایک روز ایک حوض پر پہونچا۔ اُس حوض مین اسکو انجمن آرا کی شکل نظر آئی اور اُسی مین کود پڑا۔

کسی پُر تعجب اور سخت سے سخت جگہ پر پہونچانا ایشیائی مضمون کا خاص شیوہ ہے۔ چنانچہ مصنف بہار دانش نے جہاندار شاہ کو ایک آب ناپیدا کنار پر پہونچایا ہے۔ اور وہان وہ ایک درویش کی مدد سے عبور کرسکے ہین۔ اسی صورت سے دوسرے مصنفین نے بھی یہ سخت مناظر دکھائے ہین۔ مگر یہ چشمہ اور اس مین کودنا ایک حد تک کسی خاص دماغ کی کاوش کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن وہ دماغ سرور کا دماغ نہین ہے۔ بلکہ یہ خیال پہلے مصنف قصہ حاتم طائی کے دماغ مین پیدا ہوا ہے۔ چنانچہ حاتم طائی جب منیر شامی کی امداد کرتے اور حسن بانو کے سوالون کے جوابات دینے کی غرض سے روانہ ہوا ہے اور پہلے سوال (ایکبار دیکھا ہے پھر دیکھنے کی ہوس ہے) کے جواب کیلئے سرگردان اور پریشان ہے تو ایک ہرے بھرے جنگل مین پہونچا ہے وہان سو گیا ہے اور وہین ایک آدمی سے اسکی ملاقات ہوئی ہے اُسنے راستہ بتایا ہے اور حاتم ایک دشت ہولناک مین پہونچا ہے تو وہان اسکو ایک تالاب ملا ہے۔ حاتم اوس تالاب کے کنارے بیٹھا ہے اوس تالاب مین اُسکو ایک حسین عورت نظر آئی ہے۔ جو بالکل برہنہ تھی وہ حاتم کا ہاتھ پکڑکر اُس تالاب مین کود گئی ہے۔ جب حاتم تہ پر پہونچا ہے اور اسکی آنکھ کھلی ہے تو اُسنے اپنے آپ کو ایک متکلف مکان مین پایا ہے۔ جہان لاکھون طرح کی تصویرین دیوارون پر لگی تھین۔ وہان اسکو ایک خوبصورت عورت ملی ہے۔ اور اُسی نے لات مار کر حاتم کو دشت ہویدا مین پہونچایا ہے۔ کسی ذی وقار باختیار عیار عورت کے ملنے تک مصنف فسانہ عجائب مصنف آرائش محفل کا ہم خیال رہا ہے۔ مگر اسکے ملنے کے بعد اُس کا خیال بدل گیا ہے اور یہین سے اُسنے قصہ حاتم طائی سے قطع نظر کی ہے۔

جان عالم ایک جادوگرنی کے دام فریب مین پھنسا ہے۔ اور اُسکو اسکی ہم جنسی اور ہمصحبتی کی تکالیف سے دوچار ہونا پڑا ہے اُسنے چاہا کہ کسی صورت سے اس مصیبت سے نجات ملجائے۔ مگر وہ ناکام رہا۔

یہ خیال بھی ایک عام اور پامال خیال ہے مشرقی قصہ نویسون کا ایک خاص رنگ ہے کہ وہ اپنے ہیرو کو ضرور اس قسم کی مصیبت سے دوچار کراتے ہین اور ضرور ایسی جگہ پہونچاتے ہین جہان اُسکو کوئی مصنوعی معشوق ملتا ہے۔ یہ بھی عام دستور ہے کہ ہیرو سے کوئی جوان یا ستر برس کی بڑھیا محبت کرتی ہے اور ہیرو التفات نہین کرتا۔ چنانچہ میر حسن کے مصنف نے یہی کہا ہے بینظیر کا فرخ پری کے یہان پہونچا اور اُس کا اسکی خاطر تواضع مین محبت کے مارے آنکھین بچھا دینا۔ اور میان بینظیر کا متوجہ نہ ہونا بالکل ایسا ہی واقعہ ہے۔ فرق یہ ہے کہ

فرخ بینظیر کو اُسکے کوٹھے پر سے اُڑا کر لائی تھی اور یہان جانعالم قریب قریب اپنے پاؤن سے اپنی قبر مین پہونچ مین۔ اگرچہ بہت ممکن ہے کہ سرور کے دماغ نے یہین سے فائدہ اُٹھایا ہو۔ مگر اس داستان کا اصلی فائدہ لکھنؤ کے ایک دوسرے مشہور مصنف یعنی امانت نے اندر سبھا کے لئے اُٹھایا۔ وہ بھی شاہزادۂ گلفام کو صاف کوٹھے سے اُڑائے گئے اور دیو سیاہ کی بدولت اوسکو سبز پری کے جال مین پھنسا دیا۔ جہان غریب گلفام کو اپنی تنہائی پر آنسو بہاتے ہوئے یہ شعر پڑھنا پڑے کہ۔

حیف صد حیف کسی نے نہ خبر لی میری ۔۔۔ کیا عزیزون نے مرے دِسے بھلا یا مجھکو
نیند سے آنکھہ کسی کی نہ کھلی کوٹھے پر ۔۔۔ اُٹھ کے موذی کے نہ چنگل سے چھڑایا مجھکو

اگر ہم اسباب کو نظر انداز کر دین کہ سرور نے مثنوی میر حسن سے یہ واقعہ نہین لیا تو ہم کو یہ ماننا پڑے گا کہ گل وضوبر سے ضرور مدد لی گئی ہے رشمشاد لعل پوش کا ساتوان لڑکا الماس روح بخش جب مہرانگیز اور دل آرام کے پاس سے رخصت ہوکر چلا ہے تو اسکو بھی حسب معمول ایک پیر روشن ضمیر نے راستہ بتایا ہے۔ مگر وہ بدقسمتی سے ایک باغ مین ہو نچکر لطیفہ بانو جادوگرنی کے قبضہ مین گیا ہے۔ اور جب اُسنے لطیفہ بانو سے رخصت چاہی ہے تو ایک معجون کھلادیا گیا ہے اسکے بعد ایک لکڑی سانپ کی صورت کی شاہزادے کے مونڈھے پر ماری جس سے مسحور ہو کر وہ ہرن کی صورت بن گیا ہے۔

کہنے والا اگر یقین کے ساتھ نہین تو گمان غالب کے ساتھ یہ ضرور کہہ سکتا ہے کہ یہ مضمون وہین سے لیا گیا ہے اور اگر یہ نہین تو یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ یہ خیال بھی پہلے سے موجود تھا سرور کے دماغ نے کوئی نئی بات نہین نکالی ہے۔

ہیرو کو بلا مین پھنسانے کے بعد مصنفین کو اس وجہ سے کہ قصہ جاری رہے فوراً یہ خیال آتا ہے کہ اس دام بلا سے صاحب قصہ کو رہائی دلائی جائے۔ مگر الفاظ کی زبردست اور غیر متزلزل زنجیرون مین وہ پہلے ہی سے جکڑا ہوا ہوتا ہے اسواسطے اُس کا چھڑانا بغیر کسی زبردست غیبی امداد کے دشوار ہو جاتا ہے اور یہ بھی ایک مقام ہے جہان قصہ نویس کے دماغ کو اختراع اور ابداع کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس کے طریقہ مختلف رکھے گئے ہین۔ کہین کوئی پیر مرد بصورت اصلی نمودار ہو جاتے ہین۔ اور کہین خواب مین جلوہ افروز ہوتے ہین۔ کہین کوئی عمل بتاتے ہین۔ کہین اسم اعظم سکھاتے ہین۔ کہین نقش سلیمانی ملجاتا ہے۔ کہین اوس جادوگرنی کے والدین کو خبر ہو جاتی ہے غرض کہ اسی قسم کے مافوق الفطرت اتفاقات واقع ہوتے ہین اور وہ اسیر دام بلا اس سے رہائی پا جاتا ہے سرور نے بھی اس دائرہ سے باہر قدم نہین رکھا اور اس ترکیب سے شاہزادہ کو چھڑا دیا کہ ایکروز اس خیال سے کہ مبادا کوئی اور جادوگرنی جانعالم کو لے اڑے ایک تعویذ سلیمانی اوسکو دیدیا۔

میر حسن کو بھی یہ موقع پیش آیا ہے لیکن اُنھون نے بینظیر کو ایک کاٹ کا کل دار گھوڑا دلوا کر اسکو رہائی سے

قریب کر دیا ہے۔ پھر اُسے ایک اندھے کنوین مین قید کرا کے فرخ کے باپ کو خبر ہونے کے ڈر سے شاہزادہ کو رہائی دلا دی ہے
اسکے بعد وہ مقام آتا ہے جہان جان عالم ملکہ مہر نگار کے باغ مین پہونچا ہے۔ اور ملکہ سے اوسکی ملاقات ہوئی ہے یہ کوئی ایسی بات نہین ہے کہ اس مین افسانہ نویس کو کوئی وقت اور کاوش اٹھانا پڑے۔ مگر اکثر ہوتا یہی ہے کہ بعد اس دام بلا اور مصیبت کے رہائی و آسایش کا منظر بھی دکھایا جاتا ہے۔ اور کوئی مونس یا رفیق پیدا کیا جاتا ہے۔ چنانچہ تاج الملوک جب گل بکاؤلی لیے لیتا ہے راستہ مین اسکی ملاقات حمالہ کی لڑکی اور دلبر بیسوا سے ہوئی۔ اور ان دونون سے وہ وہ کام نکلے جن سے وہ اپنے مقصد مین کامیاب ہو گیا۔
اسی طرح قصہ گل وصنوبر مین شاہزادۂ الماس روح بخش کو جمیلہ بانو ملی ہے اور اسکی توجہ سے شاہزادے نے رہائی بھی پائی ہے اور اپنے مقصود مین کامیاب بھی ہوا ہے۔
بوستان خیال مین اس خیال کی کوئی انتہا ہی نہین ہے۔ بیسون جگہ عورتون نے مردون کی اسی صورت سے مدد کی ہے۔ داستان امیر حمزہ مین بھی بار بار اس خیال کا اعادہ اور اس مضمون کی تکرار کی گئی ہے۔ اسی طرح آرایش محفل مین بھی جا بجا یہ مضمون ملتا ہے۔
ملکہ مہر نگار سے ملنے کے بعد جانعالم کو ملکہ مہر نگار کے باپ سے ملایا جاتا ہے۔ اور وہ ایک لوح عنایت فرماتے ہین جو دراصل فتح وظفر کی کنجی اور تمام آفات ارضی وسماوی کی سپر ہے۔ یہ لوح ایک ایسی عام چیز ہے کہ اکثر طلسم کشایان اور رہنوردان غربت کو مل ہی جاتی ہے اور حقیقت حال یہ ہے کہ اسکے بغیر کام چلنا دشوار ہے۔ بوستان خیال کی مین جا بجا اسی لوح نے مشکل کشائی کی ہے اور دوسرے طلسمی کتابون مین بھی لوح آڑے آئی ہے
اسکے بعد جانعالم انجمن آرا کے شہر زرنگار مین پہونچتا ہے۔ اور وہان پہونچکر لوح کی مدد سے اسکو جادوگر کے قبضہ سے چھڑا لیتا ہے۔ اور اُسکے گھر پر آجاتا ہے۔ اسی طرح سے جا بجا اس لوح کی بدولت فتوحات کثیرہ میسر ہوئی ہین اور یونہی بہت سے آوارگان غربت کی محبوبہ بلاؤن مین پھنسی ہوئی ملتی ہین۔ چنانچہ داستان امیر حمزہ۔ اور بوستان خیال مین برابر انھین کا فرما جرائیون کے طلسم ہین داستان امیر حمزہ سے میری مراد وہ داستان ہے جو فارسی مین تھی اور جو فسانہ عجائب سے بہت پہلے موجود تھی۔
اسکے بعد انجام کار مین وہی شادی کتخدائی انجمن آرا کی ہے جو ہونا چاہیے تھی اسکے لئے کوئی مثال متعین کرنا فضول ہے۔ لب لباب اور خلاصہ تمام مصائب غربت کا یہی ہے اور اکثر ایشیائی قصون کی یہین آکر تان ٹوٹتی ہے۔ مگر اس مسلمہ قاعدہ کے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی طے کردہ مسئلہ ہے کہ دولھا اور دلھن کو کبھی چین سے نہین بیٹھنے دیا جاتا۔ اور آسمان کو انکا دشمن کر کے برابر انکے اوپر بلاؤن کے پہاڑ توڑے جاتے ہین۔ مصنف فسانہ عجائب نے بھی وہی کیا ہے پہلے انجمن آرا کی شادی کرائی ہے اور اسکے بعد تاج الملوک پھول لینے کے بعد محمودہ۔ اور

دلبر بیسوا کو اپنے حبالۂ نکاح مین لایا ہے اسی طرح میان جانعالم نے بھی اپنی رفیقہ قدیم۔ مہرنگار سے شادی کر لی ہے۔

سب سے بڑا کارنامہ اس داستان کے بعد شروع ہوتا ہے اور بادی النظر مین معلوم ہوتا ہے کہ سرور کے دماغ نے ایجاد و اختراع سے کام لیا ہے یعنی یہ کہ وزیر زادے نے شہزادۂ جانعالم کو دغا دی ہے شہزادہ بندر بنا ہے۔ وزیر زادہ نے اپنے قالب کو چھوڑ کر شہزادے کے قالب مین حلول کیا ہے مگر یہ بھی کوئی نئی بات نہین ہے۔ ابن نشاطی دکنی کی کتاب موسوم بہ مثنوی پھول بن ترجمہ بساتین فارسی اسی الٹ پھیر پر مبنی ہے اور اسی وجہ سے ایک نقاد نے یہ فقرہ لکھا ہے کہ عجب نہین فسانہ عجائب اسی کو دیکھکر لکھی گئی ہو۔ اس کتاب مین تمام تر ایک قالب سے دوسرے قالب مین روح کے لیجانے کا بیان ہے۔ سرور کے یہان قصہ کا بڑا دارو مدار اسی ایک عنوان پر ہے۔

اسکے علاوہ الف لیلہ جو ایک قدیم کتاب ہے اوس مین اس قسم کے قصے موجود ہین کہ آدمی بکری وغیرہ بنا دیا گیا۔ چنانچہ ابتدا ہی مین سوداگر اور جن کا قصہ اس قسم کا لکھا گیا ہے کہ تین بڈھون نے اپنے قصے بیان کرکے بڈھے سوداگر کی خطا جن سے معاف کرائی ہے انیہ وغیرہ کا قصہ بھی ایسا ہی ہے۔ غرضکہ تبدیل قالب کا جادو بھی مدتون سے ایشیائی قصہ نگارون مین پھیلا ہوا ہے۔ اور داستانون کی داستانین اسی سے بھری ہین۔ کسی خاص شخص کی دماغی پیداوار نہین ٹھہر سکتی۔ اور اسکی ایجاد کا سہرا بھی سرور کے سر نہین رہتا۔

جانعالم کا بندر کے قالب کو چھوڑ کر طوطے کے قالب مین آنا بھی ویسا ہی ہے جیساکہ انسان کے قالب کو چھوڑ کر بندر کے قالب مین آنا۔ اور یہ تو ایک مشہور بات ہے کہ بہت سے لوگون کی پرانی کہانیون مین طوطے کے قالب مین روح پائی جاتی ہے۔

اسی طرح وزیر زادے کا بکری کے بچہ کے قالب مین آنا۔ اور پھر جانعالم کا توتے کے قالب کو چھوڑ کر انسان بنجانا یہ سب اسی تبدیل قالب والے جادو کے توابعات مین سے ہین۔

اسکے بعد جب جانعالم معہ انجمن آرا و مہر نگار تشریف لیچلے ہین تو اسی جادوگرنی نے اپنی بدمعاشیان شروع کی ہین اور تمام لشکر کو نصف پتھر کا بنا دیا ہے۔ یہ نصف پتھر کے جسم کا معاملہ اتنا عام ہے کہ اسکے نئے کچھ لکھنا بیکار ہے۔ بیچاری بکاولی بھی مدتون راجہ اندر کی بد دعا سے گلزار نسیم مین نصف پتھر کی بنی ہوئی مٹھ کے اندر بند رہی ہے۔ اور اس نے بھی برسون اسی طرح دنیا کی ہوا کھائی ہے۔ اور سیکڑون اسیران بلا کو یہ واقعہ پیش آیا ہے جسے اکثر لوگ جانتے ہین انکا لکھنا بیکار ہے۔ مگر ہان نصف جسم کے پتھر ہونے کے بعد ہی ہمیشہ کسی مشکل کشا کی ضرورت پڑتی ہے۔ اسی واسطے یہان ملکہ مہر نگار کے والد کو جادوگر سے لڑنے کی صورت پیش آئی۔ اور کسی نہ کسی طرح قضیہ کا انفصال ہوا۔ لڑائی مین بھی وہی تبدیل قالب کا قصہ ہے۔ یعنی جادوگرنی شیرنی بنی۔ اور ملکہ مہر نگار کے والد شیر بنے یہ لڑائیان سیکڑون جگہ طلسمی قصون مین ملتی ہین اور اس لحاظ سے ان مین کوئی ندرت نہین ہے جنگ کے بعد جیساکہ دستور ہے

ہمیشہ پیرمردوں کی فتح ہوتی ہے اور جادوگروں کو شکست یہاں بھی وہی ہوا۔
اسکے بعد شاہزادے معہ ہر دو بیگم کے چلدیتے ہین اور خدا معلوم کس نئے راستہ کا سفر ہے کہ بیچ مین دریائے شور بھی آجاتا ہے۔ حالانکہ پہلے ایسا نہین ہوا تھا۔ اب یہ سب جہاز پر سوار ہوتے ہین۔ جہاز کی سواری گویا تباہی کا نشان ہے۔ اور قصہ نگارون کا یہ مسلمہ مسئلہ ہے۔ ہزارون عشاق کے بھرے ہوئے جہاز تباہ ہوئے ہین۔ اور لطف یہ ہے کہ موت ایک کو بھی نہین آتی سب تختے پر ترتے ترتے کنارے پہونچے ہین۔ یہ محفوظ مضمون سرور نے بھی دیکھا۔ اور الف لیلہ والے سندباد جہازی کی طرح جانعالم کا جہاز بھی تباہ کردیا۔ اور پھر بال بال بچالیا۔ اور پھر ایک باکمال جوگی سے ملادیا۔ یہان بھی جان عالم کو وہی تبدیل قالب کا لٹکا جوگی نے سکھایا ہے۔ جو آگے چلکر بہت کام آیا ہے۔
اسکے بعد مصنف نے قصہ کا رخ دوسری طرف پھیر دیا ہے یہ کہ جان عالم ایک دریا پر پہونچا اور وہان اسکو ایک لعل پانی پر بہتا ہوا ملا۔ پھر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بہت سے لعل ملے۔ وہ انکو دیکھتا ہوا ایک عمارت کے قریب پہونچا جہان اوسکو باوجود تلاش کے بھی دروازہ نہ ملا تو پھر وہی تبدیل قالب کیا۔ اور بلبل بنکر اندر پہونچا۔ وہان ایک بنگلہ تھا۔ بنگلہ مین دیکھا کہ کوئی دوشالہ اوڑھے سوتا ہے۔ اور یاقوت کی تپائی پر پھولون کا دستہ نصف سرخ نصف سفید رکھا ہے۔ مگر دوشالہ اٹھاکر جو دیکھا تو وہ ایک بے سر کی لاش تھی۔ اور اسکے بعد معلوم ہو گیا کہ وہ انجمن آرا ہے ایک دیو کے قبضہ مین گرفتار تھی اور جسے سفید دیو کی امداد سے رہائی دلائی گئی ہے۔
(باقی) ——— (باقی) "نقاد"

ریختی گوئی کا موجد کون تھا؟

ریختی کی ایجاد کا سہرہ تمام تذکرہ نویسون نے سعادت یار خان رنگین کے سر باندھا ہے مولانا محمد حسین آزاد فرماتے ہین
”ریختی کا شوخ رنگ سعادت خان رنگین کا ایجاد ہے۔“ (آب حیات)
اور ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے۔
”اس دور مین میان رنگین سب سے نئے گلدستے بنا کر لائے اور اہل جلسہ کے سامنے سجائے یعنی ریختے سے ریختی نکالی۔“ (آب حیات)
خود رنگین نے اپنے دیوانِ ریختی کے دیباچے مین۔
”گندہ بر وزہ باخشکہ خوردن ہر چند گندہ مگر ایجاد بندہ“
لکھکر ریختی گوئی کو خود اپنے آپ سے نسبت دی ہے اور نہ صرف یہی بلکہ انشاؔ پر حملے بھی کرتے ہوے اسی کا ادعا ہے کہ:۔

ریختی کہنی اجی رنگین کا یہ ایجاد ہے ۔۔۔ منہ چڑھاتا ہے موا انشاؔ جیا کس واسطے

زبس ہے ریختی ایجاد رنگین ۔۔۔ اسی باعث کہا کرتا تھا اکثر
موا انشاؔ بھی اب کہنے لگا ہے ۔۔۔ چہ خوش اس چیونٹی کے بھی ہوے پر

مولانا عبد الحی مرحوم فرماتے ہین:۔
”شوخی اور بذلہ سنجی کے ساتھ رنگین کی طبیعت ایجاد پسند واقع ہوئی تھی اسی بنا پر ریختہ سے ریختی نکالی جس کو ان کے لنگوٹئے یار میر انشاء اللہ خان نے چمکا دیا اور لکھنؤ مین یہ رنگ خوب مقبول ہوا۔“ (گل رعنا صفحہ ۲۶۷)
مولانا عبد السلام ندوی فرماتے ہین:۔
”اس سے بڑھ کر یہ کہ اسی زمانے مین سعادت یار خان رنگین نے جنکو اکثر پردہ نشین عورتونکی صحبت مین رہنے کا اتفاق ہوا تھا، ریختی نکالی اور ایک مستقل دیوان عورتون کی زبان مین مرتب کیا“
(شعر الہند جلد اول صفحہ ۸۸)
قادر بخش، صابرؔ، وغیرہ رنگین کو ریختی کا موجد نہین تصور کرتے بلکہ انشا اللہ خان انشاؔ کو یہ اعزاز دیا جاتا ہے

البتہ رنگین مشیر بنائے جاتے ہین مگر خود انشا لکھتے ہین :-

"اور سب سے زیادہ ایک اور سنئے کہ سعادت یار طہماسپ کا بیٹا انوری ریختہ آپکو جانتا ہے رنگین تخلص ہے ایک قصہ لکھا ہے اسی مثنوی کا نام دلپذیر رکھا ہے، رنڈیون کی بولی اس مین باندھی ہے میر حسن پر زہر کھایا ہے ہر چند اس مرحوم کو بھی شعور نہ تھا "بدر منیر" کی مثنوی نہین لکھی گویا سانڈے کا تیل بیچتے ہین، بھلا اس کو شعر کیونکر کہئے، سارے لوگ دلی کے لکھنؤ کے رنڈی سے لیکر مرد تک پڑھتے ہین "

چلی وان سے دامن اُٹھاتی ہوئی   کڑے کو کڑے سے بجاتی ہوئی

"سوا اس بیچارے رنگین نے بھی اسی طور پر قصہ کہا ہے کوئی پوچھے۔ بھائی! تیرا باپ رسالدار مسلم لیکن بیچارا برچھی بھالے کا رکھنے والا تیغے کا چلانے والا تھا تو ایسا قابل کہان سے ہوا، اور شہد پن جو بہت مزاج مین رنڈی بازی سے آگیا ہے تو ریختہ کے تئین چھوڑ کر ایک ریختی ایجاد کی ہے اسواسطے کہ بھلے آدمیون کی بہو بیٹیان پڑھ کر مشتاق ہون، بھلا یہ کلام ہے۔ اور ایک کتاب بنائی ہے اس مین رنڈیون کی بولی لکھی ہے "   (دریائے لطافت)

مگر مولانا عبدالحی نے ہاشمی بیجاپوری کو ریختی گو اور انکی یوسف زلیخا کو ریختی قرار دیا ہے اور خاکی کے دو شعر نقل کر کے انکی ریختی گوئی کا ثبوت بھی دیا ہے۔ مولانا نے ہاشمی کے ہندی آمیز اشعار کو ریختی تصور فرمایا ہے اور اسی طرح خاکی کے اشعار کو بھی۔ خاکی کے جس دیوان کا حوالہ مولانا نے اپنے تذکرہ مین دیا ہے وہ ہماری نظر سے گزر چکا ہے جس مین باوجود تلاش کے ہمین کوئی شعر ریختی کا نہ ملا بلکہ ہندی آمیز شعر اکثر ہین، جن پر مولانا کو ریختی کا دھوکا ہوا۔ مولانا عبدالسلام ندوی بھی ہمارے ہم خیال ہین وہ لکھتے ہین کہ۔

"ہمارے نزدیک امیر خسرو کے زمانے سے لیکر قدما کے دور تک کے جو اشعار ان تذکرہ نویسون نے نقل کئے ہین انکو ریختی نہین کہہ سکتے بلکہ وہ ہندی شاعری کے طرز و روش پر کہے گئے ہین جس مین عورت کو عاشق اور مرد کو معشوق قرار دیا گیا ہے "   (شعر الہند جلد دوم بیان ریختی)

انہین پر نظر کر کے ہم نے بھی اپنے مضمون "ریختی اور رنگین" مطبوعہ رسالہ "قوس قزح" لاہور (سالنامہ ۱۹۲۶ء) مین رنگین ہی کو ریختی کا موجد قرار دیا تھا مگر محمد صدیق قیس کے کلیات کے مطالعہ کے بعد ہمین اپنی رائے بدلنی پڑی۔

قیس حیدر آباد کے مشہور شاعر ہین تاریخ "گلزار آصفیہ" مین انکا تذکرہ اس طرح آیا ہے کہ۔

"محمد صدیق قیس ہمشیرزادہ شیر محمد خان ایمان تخلص شعر نازک و دلپسند بوضع خواجہ میر درد و میر تقی میر میگوید و مضامین دلچسپ و نو بنو رنگارنگ می آرد از نزد مہاراجہ[1] بہادر دورویہ توسیع واند

[1] [illegible]

نزد امیر کبیر[1] دو روپیہ یومیہ روزمی یابد نہایت مرد خلیق خوش فکر درین ولا بہذا قسم کم کسے میرسد ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ صاحب دیوان است کہ نام دیوان خود "پیشکار" داشتہ است"

(گلزار آصفیہ صفحہ ۴۵۴ و ۴۵۵) ۔

مولوی عبدالجبار خان صوفی ملکاپوری لکھتے ہین ۔

"قیس تخلص محمد صدیق نام آپکا اصلی وطن حیدر آباد دکن ہے آپ کے بزرگ اکثر سرکار عالی نظام مین وقائع نگاری اور اخبار گوئی کی خدمات پر مقرر تھے چنانچہ آپکے نانا محمد عاقل نائک مخبرین کے افسر تھے اور آپ کے خالو شیر محمد خان ایمان اعظم الامراء ارسطو جاہ کے مصاحب تھے اور شعراء مین استاد الشعراء مشہور تھے، آپ نے نشو ونما کے بعد سن شباب مین بقدر ضرورت فارسی عربی پڑھ کے تحریر و تقریر کی استعداد حاصل کی اور موروثی وقائع نگاری و تاریخ دانی کا کمال پیدا کیا، شعر گوئی بھی شروع کی، کلام کی اصلاح خالوئے بزرگوار سے لیا کی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آپ نے ایک دیوان ریختی شاہجہان آباد کی بیگمات کی بول چال مین لکھا فقیر مؤلف کو آپکا دیوان ملا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آخر سنہ ۱۲۳۰ھ مین جان بحق ہوے"

(تذکرۂ شعراء دکن جلد دوم صفحہ ۹۴۱ و ۹۴۲)۔

مولوی نصیر الدین ہاشمی لکھتے ہین ۔

"محمد صدیق قیس متوفی سنہ ۱۲۳۰ھ شیر محمد خان ایمان کا ہمشیر زادہ خواجہ میر درد اور میر تقی میر کی وضع کا پیرو تھا غزل کے ساتھ قصائد بھی مشہور ہین"

(دکن مین اردو صفحہ ۱۲۹)

قیس مہاراجہ چندو لال کے معاصر تھے اور بقول صوفی ملکاپوری اور نصیر ہاشمی سنہ ۱۲۳۰ھ مین انتقال کیا، اور رنگین کے متعلق مولانا عبدالحئ فرماتے ہین کہ اسی سال کی عمر مین سنہ ۱۲۵۱ھ مین وفات پائی (ملاحظہ ہو گل رعنا ص ۲۶۵) اس طرح قیس اور رنگین معاصر بھی تھے اور پھر قیس نے رنگین سے اکیس سال قبل وفات پائی ۔

قیس کے کلیات مین (۱۴۱) سطری مسطر کے (۴۴) صفحات ریختی کے بھی موجود ہین جو ہاشمی، خاکی، رحمان، ورحیم، معاصر ولی کے ہندی آمیز ریختہ سے بالکل جدا اور رنگین کے رنگ مین رنگے ہوے ہین، قیس اور رنگین کی ریختی کا مطالعہ کرنیوالا صرف دو نتیجون پر پہونچ سکتا ہے کہ قیس نے رنگین کے دیوان کا جواب کہا ہے یا رنگین نے قیس کے دیوان کا ۔ مگر ہماری رائے یہ ہے کہ نہ تو قیس نے اسقدر غیر معمولی شہرت حاصل نہین کی تھی جو انکا دیوان حیدر آباد سے باہر نکل کر رنگین تک پہونچتا اور نہ قیس کی وفات سے قبل یعنی سنہ ۱۲۳۰ھ سے پہلے رنگین ہی کو اسقدر شہرت حاصل ہوئی تھی جو انکا دیوان حیدر آباد تک آتا ہماری رائے مین قیس اور رنگین نے الگ الگ کام کیا ہے یعنی قیس نے الگ ریختی کہی ہے اور رنگین نے جدا!

[1] نواب شمس الامراء امیر کبیر

رنگین اپنی ریختی کے دیوان کے دیباچے مین لکھتے ہین۔

"بعد حمد رب العالمین اور نعت سید المرسلین خاکپائے شعراء نکتہ چین سعادت یار خان رنگین عرض کرتا ہے کہ بیچ ایام جوانی کے یہ نامہ سیاہ اکثر گاہ بیگاہ عرس شیطانی کہ عبارت جس سے تماش بینی خانگیون کی ہے کرتا تھا اور اس قوم کی ہر ایک فصیح کی تقریر پر دھیان دھرتا تھا ہر گاہ چند مدت جو اس وضع پر اوقات بسر ہوئی تو اس عاصی کو انکی اصطلاح اور محاورون سے بہت سی خبر ہوئی پس واسطے انہین اشخاص کے عام بلکہ خاص بیبیون کو انکی زبان مین اس بے زبان ہیچمدان نے موزون کرکے ترتیب دیا"

(دیکھو دیباچہ ریختی رنگین وانشاء مطبوعہ نظامی پریس بدایون)

قیس کے کلیات مین ریختیون کے آغاز پر۔

"منتخب دیوانِ ریختی قیس محاورۂ بیگمات شوخ محل بادشاہی شاہجہان آباد"

لکھا ہوا ہے، گویا ریختی، قیس کی نظرون مین محلات شاہی شاہجہان آباد کی شوخ چشم بیگمات کا محاورہ تھی، ملاحظہ کیجئے کہ قیس اور رنگین مین کتنا فرق ہے وہ "عرس شیطانی" مین جاکر "خانگیون کی تماش بینی" کرکے ریختی کہتے ہین اور یہ حیدرآباد مین بیٹھے ہوئے "دلی کی شوخ چشم بیگمات" کا تصور کرکے انکے محاورے استعمال کرتے ہین۔ گو دونون کی رسائی ایک ہی نقطے پر ہوتی ہے اور ایک ہی جگہ سے چل کر ایک ہی جگہ ملتے ہین مگر خیال دونون کا جدا جدا ہے،

بعض زمینون مین قیس اور رنگین دونون کے شعر موجود ہین دیکھئے۔

قیس

تہ بے ربط ہے اڑ جائے یہ چڑیا کم بخت
تیسے دری یہ عجب ڈھب کی کسی مغلانی

مجھ ٹھیٹھ نانن نے چاہ کا چل دور ددا
جھوٹے منہ کا تیرے جائیگا اڑ نور ددا

پک گیا ہے تیرے ہاتون سے کلیجہ میرا
تجھ کو دولن جیلون کو گر ہو میرا مقدور ددا

رنگین

تونے چڑیا وہ بنائی کہ ابھی اُڑ اٹھے
تیرے ہاتون کے مین قربان گئی مغلانی

آتنے کیون موتی لگائے اری نادان ددا
جھک گئے بوجھ سے موتی کے میرے کان ددا

ہیئے مین مونڈھے تو اس کرتی کے ٹکن تنا
تنگ ہوتا ہے گلے مین ہے گریبان ددا

افسوس ہے کہ میرا مختصر کتب خانہ گلبرگہ شریف مین بے ترتیب پڑا ہوا ہے اور مین حیدرآباد مین بیٹھا ہوا رواروی مین یہ مضمون لکھ رہا ہون اسوقت رنگین کے دیوان کا کوئی نسخہ میرے پیش نظر نہین ہے ورنہ اور شعر بھی اسی طرح بالمقابل نقل کرتا۔

کپڑے لتون کا تذکرہ اپنی ریختیون مین جس طرح رنگین نے کیا ہے اسی طرح قیس نے بھی کیا ہے، دیکھئے۔

چنپا لگا تھا جس کے گریبان کے اوپر
کرتی وہ مری کیا ہوی پستائی جمیلا

لاڈ بازار[1] کو جاتی تو ہے صدقے تیرے
بھول مت یاد سے لے آ میری ڈوری انّا

---

[1] حیدرآباد کے ایک بازار کا نام ہے جو بفضلہ اب بھی اسی نام سے موسوم اور موجود ہے ۱۲

بوالادے ایسا طرح دار جوتا | جھلا یورٹ[1] کا کوئی دھوان دھار جوتا
کاہے کو بہنون گی باجی مین تھاری انگیا | ایک سے ایک میرے پاس ہے بھاری انگیا
جسکی چڑیا کا وہ عالم تھا کہ اب اڑجائے | مین نے باجی سے جو کل شرط مین ہاری انگیا
ٹوکیان ڈھیلی ہین اور تنگ بچھاؤن مین ددا | اس طرح کوئی بھی سیتا ہے گنواری انگیا
کیا بنالائی ہے منہیارن مجانی چوڑیان | مین نہ پہنون گی کبھی یہ آسمانی چوڑیان
بدگئین جو چوڑیان تو بدگئین کرتی ہے کیا | ہین سے چل ہاتھ ڈھیلا چھوڑ جانی چوڑیان
قیس پر کرتے تھے فرمائش کہ یون جوڑا بنا | سبز، سالو ورنہ دہانی، آسمانی چوڑیان
آگے پیچھے عاشق و معشوق کی گوٹین لگا | دہار پھلا دہار کے کل اس مین دہانی چوڑیان

جان صاحب طرحدار اصیل رکھتے ہوے گھبراتے تھے کہ

جان سولی پہ رہیگی میری بھیا منصور | بدنظر دہ ہین نہ رکھون گی طرحدار اصیل

مگر قیس نفیس سے نفیس دھوان دہار اصیل رکھتے ہین:۔

ایکے رکھی ہون دوگا نا وہ طرحدار اصیل | نوجوان پتلی سی، گوری سی دھوان دہار اصیل

مگر اسپر بھی اصیل کو نزدیک بلانیکی ہمت نہین ہوتی اعلیٰ دماغی تو دیکھئے:۔

ابٹنا مل کے نہا۔ آتی ہے بو تجھ مین سڑی | کتنی گندی ہے اری دور ہو مردار اصیل

قیس کو باوجود معصیت کے امید مغفرت تھی۔

بخشنے والا ہے صاحب میرا اوپر والا | یہ تو کہتی نہین مین نیک ہون بدکار ہون مین

مگر جان صاحب کا اور ہی عالم ہے کہتے ہین۔

اپنے پلے سے نہ باندھو مجھے صاحب چھوڑو | لاکھ مکارون کی مکارہ ہون بدکار ہون مین

اوڑھنی اور ریختی گوؤن نے بھی لکھی ہے مگر قیس نے ایک خاص بات پیدا کی ہے۔

کیا مین کرون گی لیکے تیری ہلکی اوڑھنی | لادے ددا وہ مجھ کو جلاجل کی اوڑھنی
چپے کا اسپہ کام تھا کیا خوب واچھڑے | کوٹھے پہ جو لٹکتی تھی وہ کل کی اوڑھنی
شعلہ سا ایک آنکھ مین میرے چمک گیا | سر پرسے انکے وہ جو کہین ڈھلکی اوڑھنی

رنگین نے اسی خانگیون کی تماش بینی کے مد نظر "ڈولی" کا استعمال کیا ہے مگر قیس بیگمات شوخ چشم کی خاطر منگواتے ہین تو پینس

---

[1] یہ شاید کسی گاؤن کا نام ہے جہان جوتے عمدہ تیار ہوتے تھے ہونگے۔

مجھ کو رخصت دے اب میرے گھر سے — لیکے پینس اصیل آئی ہے

ڈولی "پینس" ہی کا امتیاز نہین ہر بات مین قیس نے بیگماتی شان نبھائی ہے۔

کل پاؤن میرے دابنے جو آئی جمیلا — نیند آ گئی تلوؤن کو جو سہلائی جمیلا

بی چاندنی سے کہدو ہو فرش کی تیاری — آتی ہے میرے گھر کو مہمان میری گوکا

ایسا نہو محل مین کوئی دیکھ لے تجھے — باندی کنارے بیٹھ کے دھولا ازاربند

راحت افزا اسے یہ کہیوا جی گلشن بُوبُو — ہاتھ دھونے کو میرے لائیو بےسن بُوبُو

تکیہ چون چون کا تو زانو کے تلے دھر دینا — بیٹھے مسند پہ جب آ کر میری سمدھن بُوبُو

قیس نے ہر ایک غزل مین ایک ایک اور بعض وقت دو دو قطعے بھی کہے ہین۔

دوگانا تو کیا ہے کسو کے بھی آ گئے — اری قیس کا کرنہ مذکور باندی

قسم ہے علی جی کی کہتی ہون تجھ سے — کرون گی تیری ہڈیان چور باندی

ہاتھ سے تیرے اے دوا۔ ناک مین جان ہے میری — ایکدن ایسا کر اری زہر تو بھی کھلا مجھے

کا ہیکو طعنے[1] مہنے تو دیتی ہے اٹھتے بیٹھتے — جینے سے جی بتنگ ہے آتی نہین قضا مجھے

بعض شعر بہت ہی صاف اور عمدہ کہے ہین۔

ٹکڑے ہوی جاتی ہے زبان مارے طلب[2] کے — راتب کا میرے پان بھی منگوا لی جمیلا

نل[3] بھر گئے پیڑو مین میرے درد ہے میٹھا — مت چھیڑ مین ہون جان سے حیران دوگانا

تیری گود مین تو مین کھیلی ہوی ہون — مری بات کا مت برا مان آجا

اری قیس کے مین تو جاتی ہون گھر کو — مرے ساتھ چل تو بھی مہمان آجا

غرض دیکھ کر تو بھی خوش ہو گی دل مین — عجب طور[4] کا ہے وہ انسان آجا

ہوتی ہون تیرے پر سے قربان میری کوکا — منہ پر تو دوشالے کو مت تان مری کوکا

رسوائی کا مت، اب یہ خلل جائے تو اچھا — باندی تو میرے گھر سے نکل جائے تو اچھا

مین آئی تھی میلے مین دوگانا سے خفا ہو — جی دو گھڑی وان میرا بہل جائے تو اچھا

تم ہو پائل[5] چمکتی ہے بجلی — بیٹھو پردے مین جاؤ باجی جان

دیکھ انا تجھے دیتی ہون مین سر کی سوگند — جوک جاتی ہے میرے واسطے لا ری گڈیان

کہدو یہ دوگانا سے مین شام کو آتی ہون — کل پیر[6] بلّے کی درگاہ کو جاتی ہون

[1] یعنی طعن تشنیع [2] عادت [3] نلے [4] طرح [5] پائل اور بھلی لڑکیون کو بجلی چمکتے وقت ہٹا دیتے ہین عورتون کا خیال ہے کہ ان پر بجلی گرنا چاہتی ہے [6] نہ جانے یہ پیر بلّے کون تھے آج تک ہم نے نام بھی نہین سنا۔ (ت ک)

مدپر تو جوانی کے ہے اب جو رز ناخی — بھرتی نہین آنکھون مین تیرے حو رز ناخی

بعض جگہ ایسے والہانہ شعر کہدئے ہین کہ جی لوٹ جاتا ہے۔

کیا جانئے کیا ہوگی جوانی مین یہ آفت — کوکی بھی میری ایک دھوان دہار ہے گوئیان

کیا دہوان دہار ہے پرکالۂ آتش آف رے — آگ لینے جو وہ آئی تھی پڑوسن بُو بُو

بعض بعض پتے پتے کی باتین بھی کہہ گئے ہین مگر بڑے مزے سے،

رات مجھے جگا جگا تونے کیا ہے رت جگا — اب بھی نہین ہے جی بھرا سونے دے مت جگا مجھے

رات کو تھے پہ تیری دیکھ لی چوری اتا — کالی اوپر تھی چڑھی نیچے تھی گوری اتا

کبھی میلاد دیکھنے کے لئے نکلتی ہین اتا شلکتی تھرکتی، بے دھڑک آگے آگے ہو لیتی ہے تو فرماتی ہین:۔

اتا تجھے کیا ہوگیا چھاتی پہ سے کپڑا — اس بھیڑ مین چھاتی کوئی مل جائے تو اچھا!

مصرعۂ ثانی عریاں ہے مگر بے ساختہ ہے۔

ایک شعر اسی رنگ کا کہا ہے۔

لوگ سن لینگے ٹھر جا کم بخت — بولتی میری جار بائی ہے

قیس نے بعض کھلی ہوئی باتین بھی کہی ہین جو بیہودگی کی حد تک پہونچ گئی ہین نمونتاً بعض مصرعے نقل کئے جاتے ہین۔

ع۔ خالی جو لڑاتی ہے بلبل تو لڑاتی ہون

یا ع۔ کل کا تو دن ہے یا تی پرسون مین نہاتی ہون

یا ع۔ بن گیا پھول سمٹ غنچۂ سوسن بُو بُو

ایسے شعر بہت کم ہین۔ رنگین اور جان صاحب کیطرح اکثریت نہین۔

ایک شعر سے صرف اسقدر پتہ چلتا ہے کہ قیس نے عنفوان شباب مین ریختی کہی ہے اور یہ قرین قیاس بھی ہے۔

قیس کو مین نے دیکھی ہون کل سبزہ بھی آغاز نہین — اچھی اٹکی باجی تونے جا کر کورے بالم سے

ایک دکھنی شاعر کا جسنے کبھی دلی کی صورت نہ دیکھی ہو اس بے تکلفی سے "بیگماتی اردو" کا استعمال کرنا نہ صرف حیرت انگیز بلکہ تعجب خیز بھی ہے، قیس نے دلی کی زبان ہی استعمال نہین کی بلکہ جا بجا ضرورتاً دکھنی محاورے بھی ستعمال کئے ہین اور اس لطف کے ساتھ کہ دکنیت کا شبہ تک نہین ہوتا۔ بخلاف ریختی کے قیس کا ریختہ ایسا نہین ہے اس کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ قیس دکھنی تھے اور قدم قدم پر دکنیت نظر آئیگی۔

"سید تمکین الکاظمی"

باب المراسلة والمناظرہ

ایک صاحب جن کا نام ضیاء الدین احمد خاں ہے اور جو ضلع اٹاوہ میں گرداور قانون گو کی خدمت پر مامور ہیں نگار کے قدیم خریدار تھے۔ اِن کی میعاد خریداری چونکہ جون ۱۹۲۹ء میں ختم ہوتی تھی اس لئے منیجر نگار نے حسب معمول اِن سے آئندہ کی خریداری کے متعلق استصواب کیا جس کا جواب یہ آیا کہ "بعض حالات کی بنا پر جن کا تعلق معتقدات سے ہے وہ آئندہ خریداری سے معذور ہیں"۔ منیجر نے ان کو لکھا کہ "اگر نگار کے مذہبی مقالے آپ کے معتقدات کے خلاف ہیں تو بھی اُن کا مطالعہ آپ کو کرنا چاہیئے تاکہ آپ کو معلوم ہو سکے کہ ایک مذہب کی صحت و سقم کا کیا معیار قائم ہو سکتا ہے۔ علاوہ اس کے نگار میں مذہبی حصہ بہت تھوڑا ہوتا ہے اگر آپ اُسکو نظر انداز کر دیں تو بھی کافی سامان آپ کے ادبی و علمی ذوق پورا کرنے کے لئے اس میں موجود ہوتا ہے۔ اس سے فائدہ اُٹھایئے" اس کے جواب میں اُن کی حسب ذیل تحریر موصول ہوئی ہے۔

"مکرمی جناب منیجر صاحب۔ تسلیم۔ صحیفہ گرامی موصول ہوا۔ مجھ کو خود نگار سے جدائی کا بیحد صدمہ ہے۔ مگر اس کے وجوہ یہ ہیں۔ آپ ہی مشورہ دیں کہ مجھکو ایسی حالت میں کیا کرنا چاہیئے۔

مجھ کو نیاز صاحب کے ہموطن ہونے کا فخر حاصل ہے اور مجھے نگار سے خاص انس ہے۔ والد ماجد قبلہ نہایت متشدد اور سادہ مسلمان ہیں اور ہر قسم کی بدعات کے دشمن۔ جب کبھی وہ یہاں تشریف لائے، نگار کو ملاحظہ فرمایا اور اکثر مذہب کے معاملہ میں نگار کی روش پر سخت اعتراض کیا۔ میں اکثر تاویل سے کام لیتا اس مرتبہ یعنی جون کا نگار جس میں نیاز صاحب نے موجودہ ارکان نماز کو غیر قرآنی ثابت کرنے کا دعوی کیا ہے اِن کی برداشت سے باہر ہو گیا اور انھوں نے سختی کے ساتھ ہدایت فرمائی کہ اس رسالہ کا مطالعہ بند کر دو۔ ورنہ میری سخت ناخوشی کا باعث ہوگا۔ اب میں مجبور ہو گیا۔ والدین کے ارشاد کی تعمیل تمام دنیاوی امور پر بہرحال مقدم ہے۔ ہر چند مجھے نیاز صاحب کے بتائے ہوئے مذہب سے اتفاق نہیں ہے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کا اثر میرے قلب پر ضرور ہے اور اب بعض سوالات اضطراراً فقہ و حدیث کے متعلق میرے دل میں ایسے پیدا ہو گئے ہیں جنکا جواب میں نہیں دیکھتا اور نہ کسی سے پوچھ سکتا ہوں کیونکہ ان کا دریافت کرنا ہی میرے لئے بارگاہ دیوبند و بریلی سے فتوای کفر و شرک صادر کرا سکتا ہے "متبع نیاز" تو خطاب پہلے ہی سے مل چکا ہے ...."

اس تحریر نے چونکہ بعض اصولی بحثیں پیدا کر دی ہیں۔ اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ نہ صرف تحریر کی تنقید اور صاحب تحریر کی تسکین کے لئے بلکہ تمام ناظرین نگار کو آگاہ کرنے کے لئے مجمل طور پر اُن کو صاف کر دیا جائے۔

سب سے پہلے تو مجھے اُن حضرات کی ذہنیت پر تاسف کرنا ہے جن کے نزدیک مذہب نام ہے صرف کورانہ تقلید کا اور اس قدامت

پرستی کا جو نسلاً بعد نسلٍ چلی آرہی ہے۔ گویا مذہب کوئی ترکہ یا جائداد ہے جو میراث میں ہاتھ آتا ہے اور خود اپنے ذہن وعقل سے اُسے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ حالانکہ مذہب بالکل انفرادی یقین واطمینان کا نام ہے۔ اگر کوئی شخص کورانہ تقلید کے بعد اپنے نفس کو مطمئن پاتا ہے تو کوئی حرج نہیں، اس کا مذہب وہی درست ہے اور اس کو اس راستہ سے نہ ہٹنا چاہئے کیونکہ فطرت کی طرف سے اس کے دماغ میں تفتیش وتحقیق کی اہلیت موجود نہیں ہے، لیکن اگر اس کے دل میں کوئی خلش پیدا ہوتی ہے، کوئی الجھن موجود ہے (جیسا کہ صاحب تحریر کے دل میں پائی جاتی ہے) تو پھر اس کا خاموش بیٹھ جانا محض اس خیال سے کہ باپ خفا ہوگا یا دیوبند اور بریلی سے کفر کا فتویٰ صادر ہو جائے گا، اسقدر عجیب وغریب فلسفہ قبول مذہب کا ہے کہ کم از کم میرا ذہن اس کے فہم سے بالکل قاصر ہے۔

اگر میرے مذہبی مقالات نے میرے محترم دوست کے دل میں کوئی کیفیت مستفسرہ پیدا کر دی ہے تو اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ ان کا یقین سابق متزلزل ہوگیا ہے اور وہ کبھی اپنے آپ کو راسخ الاعتقاد نہیں کہہ سکتے جب تک ان کی خلش دور نہ ہو جائے اور اس کی تدبیر صرف یہی ہو سکتی ہے کہ یا تو وہ خود غور کر کے کسی نتیجہ پر پہونچیں یا دوسروں سے دریافت کر کے یکسوئی حاصل کریں۔ ایسی صورت میں تو نگار کا مطالعہ اور ضروری ہو جاتا ہے نہ کہ اس سے احتراز وبیزاری۔ علاوہ اس کے یہ بھی ایک اہل مذہب (اور خصوصیت کے ساتھ ایک مسلمان) کی حد درجہ کمزوری ہے کہ وہ تحقیق وتنقید سے خائف ہو اور یہ اندیشہ کرے کہ اس کا مذہب اس کی برداشت نہیں کر سکتا۔ میرا تو اعتقاد ہے کہ دنیا کا اگر کوئی مذہب سخت سے سخت تنقید کے بعد بھی پورا اتر سکتا ہے تو وہ اسلام ہے اور ایک مسلمان سے زیادہ بے خوف اس باب میں کوئی نہیں ہو سکتا، بشرطیکہ مذہب نام اُس اندھا دھند اتباع کا نہ ہو جو اس وقت کم سواد علماء کے گمراہ کن تعلیمات سے ہر جگہ نظر آتا ہے۔

مجھے حیرت ہے کہ صاحب تحریر اس کو دنیاوی امور میں شامل کر کے والدین کے ارشاد کی تعمیل کو اس پر مقدم چاہتے ہیں حالانکہ جب کوئی خطرہ قلب پر مذہب کے باب میں مستولی ہوگیا اور بعض سوالات اضطراراً ایسے پیدا ہونے لگے جن کا وہ خود کوئی جواب نہیں دے سکتے تو یہ حالت دنیاوی امور سے بالکل علحدہ ہوگئی اور اس کا تعلق معتقدات مذہبی سے ہوگیا، جہاں خود ارشاد نبوی کے مطابق والدین کا فرمان بھی اپنی ساری اہمیت کھو بیٹھتا ہے اگر خدانخواستہ کل کو ان کے والد محترم کسی اور مسلک کو اختیار کر لیں اور ہمارے معزز دوست کو اس کے اتباع پر مجبور کریں تو کیا وہ اپنے موجودہ مسلک کو صرف اس لئے ترک کر دیں گے کہ "والدین کے ارشاد کی تعمیل مقدم" ہے اور "لکم دینکم ولی دین" کی ہدایت کو نظر انداز کر دیں گے۔ اگر وہ ایسا نہیں کر سکتے تو پھر حیرت ہے کہ باوجود دل میں خلش رکھنے کے وہ کیونکر اُن کے فرمان کی تعمیل کو ضروری سمجھتے ہیں جبکہ اس کا تعلق یکسر مذہب ومعتقدات مذہب سے ہے۔

دوسرا مسئلہ ارکان نماز کو "غیر قرآنی" کہنے کے متعلق ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس پر کسی کو برہمی کا کیا سبب پیدا ہو سکتا ہے۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ نماز کی موجودہ صورت "غیر الہامی" یا "غیر محمدی" ہے قرآن میں بہت سی باتوں کا ذکر نہیں ہے

بہت سی ہدایات ایسی ہین جو صرف رسول اللہ کے اقوال سے مستنبط ہوتی ہین، تو کیا ہم اُن کو ’’غیر قرآنی‘‘، کہکر ان کی اہمیت سے انکار کرسکتے ہین، یہ تو آپ بھی جانتے ہونگے کہ وحی کی دو قسمین ہین ایک ’’متلو‘‘ دوسری ’’غیر متلو‘‘ قسم اول کو قرآن کہتے ہین اور قسم دوم کو ’’احادیث‘‘۔ اس لئے اگر نماز کی موجودہ صورت اور اس کے جملہ ارکان کی صراحت قرآن مجید مین نہین ہے بلکہ رسول اللہ کے طریق عمل سے ثابت ہوتی ہے تو کیا ہم اس کی اہمیت کو نظر انداز کرسکتے ہین اور اس کو غیر قرآنی کہکر (جبکہ واقعی قرآن مین اس کی تفصیل و صراحت موجود نہین ہے) اس کی فرضیت سے قطع نظر کرسکتے ہین۔

مین نے اگر ارکان نماز کے متعلق یہ دعویٰ کیا تھا کہ ان کی تفصیل کلام مجید مین نہین ہے تو اس سے مقصود یہ نہین تھا کہ مین ان کو غیر ضروری سمجھتا ہون بلکہ مدعا صرف ایک واقعہ کا اظہار تھا اور ضمناً یہ بتانا تھا کہ خدا کے نزدیک ارکان عبادت کی تفصیل سے زیادہ اس کے غایت کا اظہار ضروری تھا جس کو ہم لوگون نے نظر انداز کردیا ہے۔

مجھے حد درجہ افسوس ہے کہ بعض حضرات میرے مضامین کو پڑھکر ایسے نتائج پیدا کرلیتے ہین جو نہ نفس مضمون سے کوئی تعلق رکھتے ہین اور نہ میرا مقصود ہوتے ہین۔ اگر مین نے یہ ظاہر کیا تھا کہ ارکان نماز کا ذکر قرآن مجید مین نہین ہے، تو اس کے یہی معنی لینے چاہیے تھے جو ان الفاظ سے ظاہر ہوتے ہین۔ اس سے ہٹنے کی کوئی ضرورت نہ تھی اور نہ اس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا تھا کہ مین نماز کا مخالف ہون یا اس کو ضروری نہین سمجھتا۔

اسی سلسلہ مین مین اپنے معزز دوست سے عرض کرونگا کہ اگر واقعی ان کے دل مین کوئی ایسی خلش پیدا ہوگئی ہے جس کو وہ دور کرنا چاہتے ہین تو دیوبند اور بریلی کے فتوائے کفر و شرک سے نہ ڈرین، کیونکہ اوّل تو اب ان بارگاہون کی کوئی وقعت ہی نہین رہگئی ہے کہ ان کے احکام کو کوئی عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھے اور دوسرے یہ کہ کفر و اسلام کا معاملہ صرف خالق و مخلوق کے درمیان کا معاملہ ہے جس مین ’’کراماً کاتبین‘‘، کو بھی دخل دینے کی ضرورت نہین، چہ جائیکہ اہل دیوبند و بریلی جنھون نے کبھی خدا کی ہستی کو اہرمن کی ہستی سے آگے بڑھنے نہین دیا۔

نیاز

باب الاستفسار

حقوق اللہ وحقوق العباد

(جناب ناظم حسین صاحب - گوالیار)

کہا جاتا ہے اور غالباً ہر مسلمان کا اعتقاد ہے کہ انسان کے فرائض اللہ کے حقوق اور بندوں کے حقوق پر مشتمل ہیں اور خدا اگر چاہے تو اپنے حقوق کے ترک کرنے والے کو معاف کر دے، لیکن بندوں کے حقوق ادا نہ کرنے والوں کو وہ معاف نہ کرے گا بعض وقت اعمال کی اس تفریق کے سمجھنے میں مجھے الجھن پیدا ہوتی ہے اور ذہن میں اک خاص تشویش محسوس کرتا ہوں کہ یہ تفریق کیوں اور کیسی ہے اور اس سے کیا نتیجہ ملحوظ ہے۔ کیا آپ اس مسئلہ میں کوئی شافی گفتگو کر کے مجھے مطمئن کر سکیں گے۔

"نگار" "حقوق اللہ اور حقوق العباد" کا مسئلہ بھی منجملہ اُن دیگر مسائل کے ہے جن کو معتقدات اسلامیہ سے غیر متعلق ہونے کے باوجود غلطی سے جزو ایمان واسلام قرار دے لیا گیا ہے اور وہ ہر وہ شخص جو اسلام واسلامیات پر تنقید کرنے کے بعد پورے اطمینان نفس کے ساتھ مسلمان ہونا چاہتا ہے وہ اس مسئلہ میں آپ ہی کی طرح مشوش ہوگا اور ہونا چاہیے

اول اول جب مذاہب عالم کی تفتیش ومطالعہ کے سلسلہ میں، مذہب اسلام میری جستجو وتحقیق کا مرکز قرار پایا اور مہمات مسائل سے گزر کر جزئیات تک پہونچا تو میرا ذہن بھی اس مسئلہ میں آپ ہی کی طرح مشوش ہوا اور آخر کار میں نے فیصلہ کیا کہ فرائض انسانی کی یہ تقسیم ممکن ہے کسی مصلحت کے لحاظ سے درست ہو لیکن حقیقت کے اعتبار سے بالکل نادرست ہے۔

قبل اس کے کہ میں ان دلائل کو پیش کروں جنکی بنا پر میں نے یہ فیصلہ کیا ہے، یہ بتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ فرض اور حق میں کوئی فرق نہیں ہے سوائے اس کے کہ جس کی طرف سے ادائے فرض کا مطالبہ ہوتا ہے وہ اس کو حق کہکر طلب کرتا ہے اور جو ادا کرتا ہے وہ اُسے فرض کے نام سے موسوم کر کے انجام دیتا ہے اس لئے اگر حق کا مفہوم متعین ہو جائے تو فرض کی صورت بھی متعین ہو سکتی ہے اور اس کی غایت کا بھی علم ہو سکتا ہے۔

ادائے فرض یا حق نام ہے کسی ایثار یا احسان وکرم کے اعتراف کا ایثار کے ذریعہ سے یا کسی اور ایسے ذریعہ سے جسے احسان کرنے والا اپنے لطف وکرم کا معاوضہ سمجھ سکے۔ ایک شخص کی احتیاج کو ہم پورا کرتے ہیں تو اس کا فرض ہو جاتا ہے کہ

وہ کسی وقت ہمارے بھی کام آئے اور اگر وہ ایسا نہ کرے تو تارک فرض کہلائے گا۔ اسی طرح ایک شخص ہمکو قرض دیتا ہے تو ہمارا فرض ہوتا ہے کہ اُس کو وقت معین پر ادا کردیں اور اس کے احسان کی تلافی کردیں۔ اگر ہم ایسا نہ کریں گے تو فرض کے ترک کرنے والے کہلائیں گے۔ ایک صورت تو یہ ہوئی جب کہ حق کا طلبگار اور ادائے فرض کرنے والا دونوں احتیاج کے لحاظ سے قریب قریب ایک سطح پر ہیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ احسان کرنے والا بہت بلند ہو اور وہ اس کے معاوضہ کا وقت احسان بظاہر محتاج نہ ہو اس صورت میں ایک معنوی اور اخلاقی احساس احسان کا تو ضرور پیدا ہوتا ہے لیکن اس کے عوض کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ مثلاً یہ کہ ہم کسی نہایت ہی مفلوک الحال فقیر یا اپاہج کی کچھ مالی اعانت کریں تو اس وقت نہ ہمارا مقصود یہ ہوتا ہے کہ اس کا عوض اس سے کسی وقت چاہیں گے اور نہ اس کے ذہن میں یہ بات آسکتی ہے کہ کبھی اس کا عوض دینا پڑے گا۔ لیکن اگر کسی وقت ہم اس کی طرح مفلوک الحال ہو جائیں اور وہ ہماری طرح دولتمند یا کسی اور صورت سے ہم کو اس کی مدد کی ضرورت لاحق ہو جائے تو پھر اس کے ادا کئے جانے کا سوال از خود پیدا ہو جائے گا گو بحالت موجودہ ہم اور وہ دونوں اس سے خالی الذہن ہیں۔

تیسری صورت ایک اور ہے۔ وہ یہ کہ احسان و کرم کرنے والی ذات ایک ایسا عمومی مبدء و منبع ہو جو بلا تخصیص و تعیین بلا غرض و سبب لطف عمیم کی عادی ہے، جیسے آفتاب کا وجود کہ اس کی روشنی کوہ و راغ، صحرا و باغ، وادی و مرغزار ہر جگہ یکساں جاں بخش و حیات افروز ہے، یا پھول کی نکہت کہ اس کی شامہ نوازی کسی مخصوص و محدود زمان و مکان کے لئے مختص نہیں ہے یا ابر مطیر جس کے نزدیک شاہ و گدا، نشیب و فراز، شب و روز، صبح و شام کسی چیز کی تخصیص نہیں ہے ایسی صورت میں کوئی سوال حق و فرض کا پیدا ہوتا ہے نہ اس کے ادا کئے جانے کا۔

خدا اور انسان کا تعلق اگر کسی شق میں آسکتا ہے تو وہ یہی تیسری صورت ہے، کیونکہ ذات خداوندی کے انعامات بغیر کسی وجہ و سبب، بلا کسی غرض و غایت کے ہر ایک ہستی و مخلوق پر یکساں ہیں اور اگر آج تمام نوع انسانی بلکہ جملہ مخلوق ان سے منکر ہو جائے تو بھی اس کے الطاف اسی حال سے جاری رہیں گے اور اُن کے اعتراف یا عدم اعتراف سے اُن کے استمرار و دوام پر کوئی اثر نہیں پڑیگا۔ جس کی طرف سے کسی حق کا مطالبہ ہوتا ہے یا جس کا کوئی حق ہم اپنے اوپر تسلیم کرتے ہیں، تو گویا ضمنی طور پر اس کا کسی حد تک صاحب احتیاج ہونا بھی تسلیم کرتے ہیں ورنہ مطالبہ و ادائے فرض کا مفہوم بالکل لغو قرار پاتا ہے، اس لئے اگر خدا کا کوئی حق بندوں پر ہے اور اس کا ادا کرنا ہم پر فرض ہوتا ہے تو اس کے صرف ایک ہی معنی ہو سکتے ہیں اور وہ یہ کہ خدا کا ہمکو پیدا کرنا، عقل و ادراک کی نعمت بخشنا، دنیا کے نعایم و لذایذ مہیا کرنا، کوئی ایسی غایت و غرض رکھتا تھا جس میں شاید خود خدا کا کوئی فائدہ تھا اور اس لئے ہمارا اس کے فائدہ کو ان احسانات کے عوض میں نظر انداز کردینا ایک ایسی غلطی و سرکشی ہے جس کی سزا ہمیں ملنا چاہئے۔ حالانکہ خدا کی ذات اسقدر بلند ہے کہ اس کے ساتھ کسی سبب یا غرض کی نسبت ہو ہی نہیں سکتی اور وہ ہر قسم کے تاثرات سے بے نیاز ہے۔

اگر حقوق اللہ میں کوئی چیز ایسی ہو سکتی ہے جس کا احساس فطرت کی طرف سے ہر شخص میں ودیعت کیا گیا ہے تو سب سے

پہلے اس کی ذات اور وجود کو تسلیم کرتا ہے۔ لیکن اگر آج کوئی اس سے انکار کردے بلکہ اس سے زیادہ یہ کہ اس کو گالیاں دینے لگے، تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ خدا اُس سے ناخوش ہو جائیگا اور اپنے اُن انعامات عمیم سے اُسے محروم کردیگا جو بلا کسی سبب کے اُس نے ہر شخص کے لئے ارزانی کر رکھے ہیں؟ ہماری بڑی غلطی یہ ہے کہ ہم خدا اور اس کے کاروبار کو بالکل دنیاوی اصول زندگی کے لحاظ سے دیکھتے ہیں اور اس کے مطابق حکم لگاتے ہیں۔ ہم خدا کی حقیقت سمجھنے اور سمجھانے کے لئے بڑے سے بڑے بادشاہ کی مثال پیش کرتے ہیں اور جس طرح یہاں ایک بادشاہ کے حقوق رعایا پر ہوتے ہیں اسی طرح خدا کے حقوق کو بھی بندوں پر ثابت کرتے ہیں۔ ممکن ہے کہ عوام کے سمجھانے کے لئے اور اُن کے اخلاق کی تہذیب و تربیت کے لئے یہ ایک مفید طریق کار ہو، لیکن جہاں تک حقیقت کا تعلق ہے معاملہ بالکل اس کے خلاف ہے اور خدا کی حقیقت یا اس کے ساتھ تعلق مخلوق کو سمجھنے کے لئے ہم عالم حواس و ادراک کی کسی چیز کو مثال یا تشبیہ کی صورت سے پیش ہی نہیں کر سکتے ایک ایسی ذات جو یکسر غنا ہے، جو بے نیازی کے سوا کچھ نہیں، جو ازل سے لیکر لانہایت تک صرف ایک قوت کامنہ کی حیثیت میں ذرہ سے لیکر آفتاب تک ہر جگہ کارفرما ہے اس کے متعلق یہ کہنا کہ اس کے بندوں پر حقوق ہیں، یا وہ ہم سے کسی فرض کی ادائی اپنے لئے چاہتی ہے میرے نزدیک ذات باری کا استخفاف اور معنوی شرک ہے

اب آپ اصولی گفتگو سے ہٹ کر نیچے آیے اور دیکھئے کہ جن باتوں کو خدا کے حقوق سے تعبیر کیا جاتا ہے وہ کیا ہیں اور ان میں کونسی وہ خصوصیت ہے جو "حق اللہ" کو ہم پر ثابت کرتی ہے ہر مذہبی تعلیم دو چیزوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ عبادات و معاملات معاملات کو تو چھوڑیئے کیونکہ وہ بین طور پر حقوق العباد سے متعلق ہیں۔ رہ گئی عبادات سو حق اللہ کو انھیں سے متعلق سمجھا جاتا ہے۔ درانحالیکہ ان میں سے ایک بھی حق اللہ نہیں ہے اور عبادت خواہ کسی صورت سے ہو حقوق العباد ہی سے متعلق ہے مسلمانوں میں جہانتک عبادت کا تعلق ہے اس میں نماز، روزہ، حج داخل ہیں اور انھیں کو حق اللہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اب آپ انھیں کی حقیقت پر غور کر لیجئے کہ وہ خدا کا حق کیونکر ہو سکتی ہیں اور خدا کو ہماری عبادات کیا فائدہ پہونچ سکتا ہے

وہ لوگ جو نماز، روزہ اور حج کو حق اللہ میں داخل کرتے ہیں، وہ بھی غالباً اس امر کا انکار نہیں کر سکتے کہ ان میں سے کوئی عبادت ایسی نہیں ہے جو صرف ہمارے ہی فائدہ کے لئے نہ بتائی گئی ہو۔ مثلاً نماز کو لیجئے کہ اس وجہ سے جو طہارت و پاکیزگی کا خیال پیدا ہوتا ہے وہ خود ہماری ہی صحت کے لئے مفید ہے، یا جو اجتماع و یکجہتی کی صورت صف بستہ عبادت گزاروں میں پائی جاتی ہے وہ خود ہماری اجتماعی زندگی اور تمدنی ترقی کے لئے کس درجہ کارآمد ہے یا "فحشار و منکر" سے باز رہنے کی صورت میں جو تزکیۂ اخلاق رونما ہوتا ہے وہ کس حد تک ہماری قومی و انسانی ارتقار کا ضروری جزو ہے۔ اس لئے اگر ہم تارک الصلوٰۃ ہیں تو اس کے یہی معنی ہو سکتے ہیں کہ ہم اپنی اجتماعی و تمدنی ترقی کے لئے سعی نہیں کرتے، ہم دنیا میں سعادت و خوشحالی حاصل کرنے کی طرف سے متوجہ نہیں ہوتے اور اسطرح گویا نماز کا ترک کرنا اُن حقوق کو پامال کر دینا ہے جو قوم کی طرف سے اس کی ایک ایک فرد پر عائد ہوتے ہیں اور داعیات قومی کی پرواہ

نہ کرنا یقیناً قوم کا گناہ ہے جسے صرف حق العباد ہی سے متعلق کیا جا سکتا ہے۔ حج چونکہ نماز با جماعت ہی کی ایک زیادہ وسیع صورت ہے اور اس کا مقصود بھی محض اخوت عامہ کی بنیاد کو مستحکم کرنا ہے اس لئے اس کا بھی حق العباد میں شامل ہونا ظاہر ہے۔ یہی حال روزہ کا ہے کہ اس کی تاکید بھی صرف اس لئے کی گئی ہے کہ ہم اپنی قوم کے مسکین و بیکس افراد کی حالت کا احساس کر سکیں اور اُن کی مدد کی طرف متوجہ ہوں اور اگر یہ جذبہ ہم میں پیدا نہیں ہوتا تو روزہ بالکل بے معنی چیز ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ عبادات بھی سراسر حق العباد سے متعلق ہے۔ الغرض دنیا میں کوئی عبادت یا کوئی طریق نیایش ایسا نہیں ہو سکتا جو حق اللہ کہلایا جائے۔ کیونکہ خالق و مخلوق کا رشتہ ایک ایسے غنی و محتاج کا رشتہ ہے جس میں حق کے پیدا ہونے یا اُس کے ادا کئے جانے کا کوئی سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔

رہا یہ امر کہ جب حقیقت یہ ہے تو کیوں ایسا بتایا گیا اور یہ تقسیم و تفریق حق کی کس غرض سے کی گئی اس کی وجہ بظاہر یہی معلوم ہوتی ہے کہ مذہب اور فلسفۂ مذہب دو بالکل علٰحدہ چیزیں ہیں، یعنی یہ ضروری نہیں کہ ہر شخص فلسفۂ مذہب جاننے کے بعد مذہب اختیار کرے۔ کیونکہ جو نتائج محض کسی مذہب کے اختیار کرنے سے پیدا ہو سکتے ہیں وہ بہرحال بغیر فلسفۂ مذہب کے علم کے بھی مترتب ہو سکتے ہیں اور اس لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر شخص کو پہلے کسی عبادت یا فعل حسن کی فلسفیانہ حقیقت سے آگاہ کر دیا جائے بلکہ اگر ہم یہ دیکھیں کہ کوئی شخص بغیر ان موشگافیوں کے علم کے احکام خداوندی پر اچھی طرح کاربند ہو سکتا ہے تو ہمارا فرض ہے کہ اس کو اس طرف سے بے خبر ہی رکھیں طبقۂ عوام میں چونکہ علمی توجیہوں کے سمجھنے کی اہلیت نہیں ہوتی اور نہ وہ اُن کی اہمیت سے واقف ہو سکتے ہیں، اس لئے ان کے لئے یہی مناسب ہے کہ ان کو عبادت یا تعلیم اخلاق کی طرف بالکل اس انداز سے راغب کیا جائے جس طرح ہم بچوں کو مختلف پیرایوں سے کسی امر کی طرف راغب یا کسی بات سے متنفر کرتے ہیں۔ ایک بچہ ہاتھ میں چاقو لیکر کھیلنے لگتا ہے اور ہم اُس سے یہ نہیں کہتے کہ دیکھو اس میں تیز دھار ہے، جس کا استعمال تم نہیں جانتے اور اندیشہ ہے کہ تمھاری بے احتیاطی سے یہ جسم کو مجروح کر دے۔ بلکہ اس سے گھبرا کر یہ کہتے ہیں کہ چاقو پھینک دو نہیں تو کن کٹی ہو جائے گی بلی پکڑ لیجائے گی، کتا کاٹ لیگا وغیرہ وغیرہ اور وہ خائف ہو کر چاقو پھینک دیتا ہے، حالانکہ حقیقتاً ان میں سے ایک بھی نہیں ہے اور نہ ہمارے اس کہنے کو کوئی کذب و دروغ کہتا ہے انبیاء کرام اور اکابر دین نے بھی تبلیغ و ہدایت کے لئے یہی فلسفہ اختیار کیا تھا کہ عوام کی ذہنیت اور اُن کے نارسیدہ عقول کو دیکھکر اعمال و افعال کے عواقب و نتائج اور اسباب و علل سمجھائے تھے۔ اگر ایک جاہل کے سامنے نماز کی حقیقی روح پر لکچر دیا جائے اور اس کو بتایا جائے کہ اس میں یوں اجتماعی فوائد مضمر ہیں تو اس کے نزدیک نہ نماز میں کوئی اہمیت باقی رہیگی اور نہ وہ اس کے پابندی کریگا، لیکن اگر اس سے صرف یہ کہدیا جائے کہ دیکھو یہ خدا کا حکم ہے، خدا کا حق ہے جو تمہیں ادا کرنا ہے، تو ایک خاص قسم کی خشیت اُس پر طاری ہو جائے گی، وہ اس کا پابند بن جائیگا اور آخرکار وہ نتیجہ از خود بغیر اس کے علم کے پیدا ہو جائیگا جو نماز کی پابندی سے پیدا ہونا چاہئے۔

اس سلسلہ میں یہ امر بھی بحث طلب ہے کہ کسی معصیت کو خدا کا معاف کر دینا کیا معنی رکھتا ہے - میرا مسلک اس باب میں یہ ہے کہ جس طرح خدا کا کوئی حق بندہ پر نہیں ہے، اسی طرح خدا کو عفو و درگزر یا تعذیب و تعزیر سے بھی کوئی واسطہ نہیں ہے - یعنی جس طرح ایک انسان کے اعمال حسنہ خود اس کے لئے مفید ہیں اسی طرح اعمال سیئہ اس کے لئے مضر ہیں اور اس فائدہ و مضرت کا دوسرا نام ثواب و عذاب ہے - خدا کی شان اس سے بہت بلند و ارفع ہے کہ وہ ہمارے اچھے کاموں کی تحسین اور بُرے کاموں کی تشنیع کے لئے کوئی اہتمام کرے - ہمارا عذاب و ثواب ہماری دوزخ و جنت خود ہمارے اندر اور ہمارے ساتھ ہے جو بالکل اسطرح لازمی طور پر ظہور پذیر ہو جاتی ہے جس طرح دو اور دو کا نتیجہ چار - اگر ہم ان ہدایات پر عمل نہیں کریں گے جو شارع نے بتائے ہیں تو اس کا نتیجہ ازخود ہمارے اور ہماری قوم کے حق میں بُرا پیدا ہوگا اور اگر ان پر کاربند ہوں گے تو ہم خود اس سے فائدہ اٹھائیں گے - خدا نے جو سلسلہ اسباب و علل اور نتائج کا پیدا کر دیا ہے اس کے مطابق تمام مظاہر رونما ہوتے ہیں اور ہوتے رہیں گے - جس میں خدا کی معافی یا سرزنش کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا -

اس جگہ یہ شک پیدا ہوتا ہے کہ کلام مجید میں اکثر جگہ خدا نے عذاب و ثواب کو اپنے سے تعلق کیا ہے - اس مسئلہ پر غالباً میں اس سے قبل اپنے خیالات کا اظہار کر چکا ہوں لیکن مختصراً پھر بتا دینا چاہتا ہوں کہ یہ نہ صرف مذہبی بیان کا انداز بیان ہے تاکہ عوام پر اس کا اثر ہو بلکہ ایک لحاظ سے حقیقت بھی ہے کیونکہ خدا کے بتلائے ہوئے اصول سے منحرف ہو کر یا ان پر کاربند ہو کر نقصان و نفع اٹھانا گویا اس کے مقرر کردہ نتائج کو حاصل کرنا ہے جسے ہم بجا طور پر ہر وقت خدا سے منسوب کر سکتے ہیں -

دوسرا شبہ یہ بھی وارد ہو سکتا ہے کہ خدا نے جا بجا "مغفرت ذنوب" کا بھی ذکر کیا ہے - لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہمارے کسی گناہ کا بُرا نتیجہ نہ پیدا ہوگا - بلکہ اس سے مدعا صرف یہ ہے کہ اگر ہم معاصی سے باز آجائیں گے تو اُن کے اثرات بھی رفتہ رفتہ محو ہو جائیں گے اور یہی گناہوں کی بخشش و معافی ہے -

نماز کی موجودہ صورت

(ی - س - صوفیہ صاحبہ علیمی میان بازار حیدرآباد دکن)

"آپکے لعن طعن نے جہاں مولویوں کی جماعت کے وقار کو جو ہم ناقص العقل عورتوں کے ذہن میں تھا گھٹا دیا وہاں ہمارے ان عقائد کو بھی کمزور کر دیا جن کو ہم نے باپ دادا سے سیکھا اور جن پر اپنے شوہروں کے سامنے بلا خوف تردید ابتک عمل پیرا رہے -

خدا کا شکر ہے کہ میں آپکا رسالہ ہر ماہ پڑھتی ہوں اور جتنی چیزیں قرین عقل و قیاس ہوتی ہیں ان کو درست

ہی نہیں جانتی بلکہ اسپر عمل بھی کرتی ہوں۔ مگر جولائی کے رسالہ میں ملاحظات پڑھنے کے بعد میرے دل ودماغ میں ایک عجیب قسم کا ہیجان پیدا ہو گیا ہے اور عجیب قسم کے خطرات پیدا ہو گئے جنکا علاج میں خود نہیں کر سکتی۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ اگر قرآن شریف میں نماز کے متعلق اور خاصکر رکوع وسجود کے متعلق قطعی احکام صادر نہیں ہوئے ہیں تو پھر یہ نماز جو ہم پڑھتے ہیں درست ہے یا نہیں۔ کم ازکم میں یہ سمجھتی ہوں کہ خداوند بزرگ نے ہمکو نماز کے احکام رسول کریم کے توسط سے صادر فرمائے۔ اور اب یہ بتایئے کہ جس طرح سے نبی کریمؐ نے ان احکام کی پابندی کی اور عملی پیرایہ میں جس طرح ہمارے آگے پیش کیا وہ قابل تقلید ہے یا نہیں براہ مہربانی میرے اس سوال کا جواب آیندہ پرچے میں رقم فرما کر میرے شبہات دور فرمایئے ورنہ اس کج عقیدگی کو جو آپکی تحریر سے میرے دلمیں پیدا ہو گئی ہے میں آپکی طرح سے سمجھوں گی اور آپ جیسے عالموں پر لازم ہے کہ ان شکوک کو رفع کریں جو آپکی تحریر کیوجہ سے پیدا ہو گئے ہوں۔ فی الوقت میں اس سے زیادہ نہیں لکھ سکتی البتہ آیندہ نگار میں جواب پڑھنے کے بعد اپنے خیالات پریشان کو قلم بند کرکے روانہ کرونگی

دوسرا سوال یہ ہے کہ گراموفون کے ذریعہ سے اگر اذان مقرر کی جائے تو درست ہوگا یا نہیں

"نگار" "آپ کی تحریر پڑھکر مجھے خوشی بھی ہوئی اور افسوس بھی۔ خوشی تو اس لئے کہ آپ اُن تنگ نظر اور کوتاہ خیال لوگوں میں نہیں ہیں جو اپنے عقاید ومزعومات کے خلاف کوئی بات سننا پسند ہی نہیں کرتے؛ خواہ وہ کتنی ہی صداقت کے ساتھ کیوں نہ کہی گئی ہو، اور افسوس اس بات پر ہوا کہ آپ نے میری تحریر کو غور سے نہیں پڑھا اور خواہ مخواہ آپ کے دل میں نماز کی درستی کی طرف سے شک پیدا ہو گیا حالانکہ میرا مقصود وہ نہ تھا جو آپ نے یا بعض اور حضرات نے سمجھا۔

نماز یا عبادت کی جو موجودہ صورت وہیئت مسلمانوں میں پائی جاتی ہے وہ بادنیٰ اختلاف وہی ہے جیسے رسول اللہ نے بتایا، صحابہ نے عمل کیا اور اُس وقت سے لیکر تا ایندم مسلمانوں کے مذہبی مرکزیت کا بڑا راز اس میں پوشیدہ رہا ہے کیونکہ اسی نے ہماری اجتماعیت کو قائم رکھا اسی نے ہمارے اندر جذبۂ اخوت وہمدردی پیدا کیا اور بلا خوف تردید اس کو ایک بہترین طریقہ عبادت کے صورت میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا نماز صرف قیام، قعود، رکوع وسجود کا نام ہے، کیا عبادت سے مراد محض چند اعضا کی جنبش وحرکت ہے۔ ظاہر ہے کہ کوئی شخص اس کا مدعی نہیں ہو سکتا اور نہ دنیا کا کوئی مذہب یہ کہہ سکتا ہے کہ عبادت کا مدعا صرف جھکنے، سجدہ کرنے یا کھڑے ہو جانے سے پورا ہو سکتا ہے۔

انسانی حرکات اگر وہ بے اختیارانہ طور پر سرزد ہوں، تو ہمیشہ ان کو جذبات کا تابع سمجھا جاتا ہے اور اسی لئے صورت کو دیکھ کر قلب کی حالت کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص ہمارے سامنے بے اختیارانہ ہات جوڑ کر کھڑا ہو جاتا ہے یا جھک کر ہمارے قدم چھوتا ہے، یا سامنے زمین پر سر ٹیک دیتا ہے تو اس کے صرف ایک ہی معنے ہوا کرتے ہیں اور وہ یہ کہ اس نے اپنے آپ کو ہمارے رحم وکرم پر چھوڑ دیا ہے، اپنی خطاؤں سے پشیمان ہے، اپنی عاجزی کا اعتراف کرتا ہے اور آیندہ کے لئے طاعت ووفاداری کا عہد کرتا ہے۔ لیکن اگر ہمیں کسی طرح معلوم ہو جائے کہ اس کے یہ ظاہری خوشامد حقیقت سے دور ہے

اور اس کے دل مین بدستور سرکشی پائی جاتی ہے تو ہم ایسے آدمی کو ٹھکرا دیتے ہین اور اس کے اظہار عجز و نیاز پر رحم کرنے کے بجائے اور زیادہ بیزاری کا اظہار کرتے ہین۔

بالکل اسی پر نماز کو منطبق کر لیجئے کہ اگر ایک شخص کا رکوع و سجود حقیقتاً دل کی اس کیفیت کے ساتھ ہے جو بے اختیارانہ طور پر انسان کو جھک جانے کے لئے مجبور کرتی ہے تو اس کی نماز واقعی نماز ہے، ورنہ اک فعل عبث ہے اور خدا کی توہین ہے

اس لئے ظاہر ہوا کہ نماز و عبادت سے اصل مقصود صرف ایک کیفیت عبودیت اپنے اوپر طاری کرنا اور معاصی و مناہی سے محترز رہنے کا عہد واثق کرنا ہے اور اسی مقصود کے ساتھ رسول اللہ نے اس کی پابندی مسلمانون پر عاید کی تھی

میرا مدعا یہ کہنے سے کہ نماز کی موجودہ ہیئت و صورت کے ذکر سے کلام مجید ساکت ہے یہ نہین ہے کہ وہ کوئی فعل عبث یا غیر ضروری ہے یا یہ کہ رسول اللہ نے اس کا حکم نہین دیا (یقیناً وہ نہایت اہم و ضروری ہے اور رسول اللہ نے ہمیشہ اس کی پابندی کی اور دوسرون کو پابندی کی ہدایت نہایت شدت سے کی) بلکہ مقصود صرف یہ بتانا ہے کہ خدا نے عبادت کی صرف اصلی روح اور اس کی حقیقی غایت بتا کر اس کی صورت و ہیئت سے کوئی بحث نہین کی ہے جس سے گویا یہ بتانا مقصود تھا کہ خدا کے نزدیک اصل چیز عبادت کی کوئی مخصوص صورت نہین ہے، بلکہ اصل مقصود صرف خشیت الٰہی کا پیدا کرنا ہے اور اسی غایت کو پیش نظر رکھ کر رسول اللہ نے موجودہ صلوٰۃ کو قایم کیا۔

کلام مجید مین جہان جہان صلوٰۃ قایم کرنے کا حکم دیا ہے وہان اس سے نماز کے اصطلاحی معنی مراد نہین ہین جو اُس کی ہیئت و ارکان کو ظاہر کرتے ہین، بلکہ مقصود صرف عبادت کا قیام ہے جس کو رسول اللہ نے نماز اصطلاحی کی صورت مین ادا کیا اور اس کی ہدایت کی۔

مجھے حیرت ہے کہ میری تحریر سے لوگون نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ مین نماز کا مخالف ہون یا اس کو غیر ضروری قرار دیتا ہون البتہ یہ ضرور کہتا ہون کہ کلام مجید مین اس کے ارکان یا اس کی موجودہ ہیئت سے کہین بحث نہین کی گئی اور اس حقیقت سے غالباً کسی کو انکار نہین ہو سکتا۔

رہا آپ کا دوسرا سوال کہ اذان گراموفون کے ذریعہ سے ادا کیجا سکتی ہے یا نہین۔ یہ مسئلہ بہت کھلا ہوا ہے کیونکہ اذان خود عبادت ہے، عبادت کی تمہید ہے اور اس کے ادا کرنے مین کوئی صورت لہو و لعب کی پیدا کرنا قرین عقل و انصاف نہین ہے۔ آج اذان کے متعلق گفتگو ہوئی ہے تو کل امام کی جگہ بھی گراموفون مشین رکھنے مین کوئی حرج نہ قرار دیا جائیگا اور اس طرح عبادت ایک تمسخر اور غیر سنجیدہ حرکت مین تبدیل ہو جائے گی۔

مین اس کا بھی سخت مخالف ہون کہ گراموفون مین کلام مجید کے رکارڈ بھرے جائین اور ایسے لوگون کو جو چند دراہم کے عوض ایسی سخیف حرکت کرتے ہین یا جو ایسے رکارڈ سننا پسند کرتے ہین نہایت ہی بُرا سمجھتا ہون کیونکہ میرے نزدیک یہ کلام پاک کی سخت توہین ہے اور کلام الٰہی کے متعلق ایسا جذبۂ استخفاف ہے جسکو کوئی صحیح العقل مسلمان کبھی گوارا نہین کر سکتا

مطبوعات موصولہ

پنجاب میں اُردو جناب حافظ محمود خان صاحب شیرانی پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور نے جو ناقدانہ تصانیف کا نہایت پاکیزہ ذوق رکھتے ہین، یہ کتاب اس مقصد کے ساتھ لکھی ہے کہ اُردو زبان کی قدامت اور اس کے نشو و آغاز پر روشنی ڈالی جائے فاضل مصنف نے پہلے ایک مختصر سا مقدمہ تحریر فرمایا ہے جسے ہم کتاب کا ملخص کہہ سکتے ہین۔ اس مین انھون نے ظاہر کیا ہے کہ اردو کا آغاز پنجاب سے ہونا معلوم ہوتا ہے اور تاریخی و لسانی اشارون سے اس کو ثابت کیا ہے اس کے بعد اصل کتاب شروع ہوتی ہے جس مین اس مقصد کو بہت زیادہ فصاحت و تفصیل کے ساتھ پیش نظر رکھا گیا ہے۔

پہلے لفظ اُردو کی وجہ تسمیہ، لفظ ریختہ کی تحقیق اور ریختہ کی قسمون سے بحث کی ہے اور اخیر مین یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اُردو کا قدیم ترین نام ہندی یا ہندوی تھا اور اُسے گوجری بھی کہتے تھے۔

دوسرا باب اُردو کے آغاز سے بحث کرتا ہے جس مین بتایا گیا ہے کہ اُردو کیونکر برج سے نکلی، دہلی اور پنجاب کے کیا تعلقات تھے فارسی پر ہندی کا کیا اثر پڑا اور اسی سلسلہ مین انھون نے عہد غزنوی سے بحث کرتے ہوئے ثابت کیا ہے کہ لاہور اسوقت مرکز اسلام تھا اور اُس عہد کے اکابر شعراء و مصنفین کے حالات و خصوصیات شاعری سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُردو کا نشو و آغاز پنجاب سے ہوا۔

اس کے بعد تیسرے باب مین اکابر و اعاظم پنجاب کا ذکر کرکے بتایا ہے کہ اُس عہد مین یہان کے مصنفین و شعراء نے کیا کیا تصانیف کی اور زبان سے ان کو کس حد تک کس طرح کا تعلق تھا۔

چوتھے باب مین پنجابی اور اُردو کے عنوان سے لسانی تحقیق کی گئی ہے اور میری رائے مین کتاب کا اہم ترین حصہ یہی ہے اس کے بعد قدیم اُردو پر پنجاب کے اثر کو دکھایا ہے اور بہت سے قدیم پنجابی شعراء و مصنفین کے تذکرہ سے اپنے دعوی کا ثبوت پیش کیا ہے الغرض موضوع کے لحاظ سے جتنے پہلو بحث کے پیدا ہو سکتے تھے ان سب پر مصنف نے نہایت فاضلانہ و محققانہ بحث کی ہے اور اس کتاب کے مطالعہ کے بعد ایک شخص یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ جو نتیجہ فاضل مصنف نے نکالا ہے وہ بڑی حد تک صحیح ہے۔

ہر چند شمالی ہند کے رہنے والون کو اور خصوصاً اہل لکھنؤ کو یہ دعوی نہایت عجیب و غریب معلوم ہوگا کہ اُردو کا آغاز پنجاب سے ہوا۔ لیکن جس طرح اس سے قبل دکن مین اُردو لکھنے والا یہ فخر ان لوگون سے چھین لے گیا اور وہ کچھ نہ بول سکے۔ اسی طرح اب پنجاب مین آردو پر بھی خون کے گھونٹ پی پی کر رہجانا پڑیگا۔ اور شاید اس سے بہتر انتقام یہان کے اہل علم و ادب کی تنگ نظری کا اور کوئی نہین ہو سکتا تھا۔

یہ بالکل صحیح ہے کہ اہل پنجاب یا اہل دکن یہ دعوی نہین کرسکتے کہ انھون نے اُردو زبان مین وہ مہارت حاصل کی

جو شمالی ہندواؤن کو حاصل ہے، لیکن ان مین اس فخر سے کبھی محروم نہین کیا جا سکتا کہ اُردو کا نشو و آغاز انھین کی وجہ سے ہوا اور وہ اب بھی اس کی ترقی مین کافی حصہ لے سکتے ہین۔

جناب شیرانی نے یہ کتاب لکھ کر تاریخ زبان اُردو مین ایک ایسی بیش بہا تحقیق کا اضافہ کیا ہے، اور ایک ایسا جدید راستہ پیدا کر دیا ہے کہ اس سے قبل اس کی کوئی مثال نظر نہین آتی۔

اسی سلسلہ مین، یہ عرض کر دینا بھی ضروری ہے کہ جناب شیرانی اہل پنجاب سے نہین ہین اور اس لئے اُن پر یہ الزام قائم نہین ہو سکتا کہ انھون نے صرف وطن پرستی کی بنا پر ایسا لکھ دیا ہے۔ ہر چند اگر وہ پنجابی ہوتے تو بھی اُن کے پیش کردہ تحقیق کے سامنے سوائے سکوت کے اور کوئی جواب نہ ہو سکتا تھا۔

اس کتاب کا مطالعہ ہر اُس شخص کے لئے ضروری ہے جو کچھ بھی زبان اُردو سے لگاؤ رکھتا ہے۔ کتابت و طباعت بہت پسندیدہ ہے۔ حجم ۳۱۲ صفحات ہے۔ قیمت عمار ملنے کا پتہ۔ انجمن ترقی اُردو اسلامیہ کالج لاہور۔

بصائر مجموعہ ہے جناب آسی کے قطعات و رباعیات کا جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل دو جدا چیزین ہین قطعات کا حصہ زیادہ تر اُن اقوال حکما پر منحصر ہے جو اُن کو مختلف کتابون کے دوران مطالعہ مین قابل نظم نظر آئے اور رباعیات کا حصہ خود اُن کی طبعزاد چیز ہے۔

قطعات تقریباً ۱۶۰ ہین اور سب مین کوئی نہ کوئی خیال ایسا موزون کیا گیا ہے جو اخلاق انسانی سے تعلق رکھتا ہے۔ اس مین شک نہین کہ کسی دوسرے کے خیال یا کسی نثر کو نظم مین ادا کرنا اور اس خوبی کے ساتھ کہ قایل کے قول کی اصل رُوح باقی رہے، دشوار کام ہے، لیکن جناب آسی کی کہنہ مشقی اور خوش ذوقی نے اس مشکل وادی سے گزرنے مین ان کی بڑی مدد کی ہے اور اس خوبی کے ساتھ انھون نے ان خیالات کو نظم کیا ہے کہ دیکھنے والا یہ محسوس ہی نہین کر سکتا کہ وہ کسی اور جگہ سے لئے گئے ہین۔

قطعات مختلف بحور و اوزان مین ہین لیکن کسی جگہ ان کے انتخاب مین بدذوقی ظاہر نہین ہوتی۔ ان کی زبان جناب آسی نے اسقدر سادہ اور انداز بیان اسدرجہ سہل و شیرین رکھا ہے کہ معمولی پڑھا لکھا انسان بھی ان سے پورا لطف اٹھا سکتا ہے۔ اس لئے میرے نزدیک حضرت آسی کی یہ کوشش قابل داد و ستایش ہے اور حقیقی معنی مین زبان کی خدمت کہلائے جانے کی مستحق ہے۔ یہانتک کہ اگر اس کو مدارس و مکاتب مین لڑکون اور لڑکیون کے مطالعہ کے لئے ضروری قرار دیدیا جائے تو اُن بہت سی نظم کی کتابون سے بہتر ہوگا جو آجکل نصاب مین داخل ہین۔

دوسرا حصہ ۱۰۰ سے زیادہ رباعیات پر مشتمل ہے جناب آسی اس دور کی بہترین رباعی لکھنے والون مین ہین اور مشکل ہی سے کوئی رباعی ایسی ہوگی جو معیار پر صحیح و کامل نہ اُترے۔ چار چھوٹے چھوٹے مصرعون مین کسی خیال کو اس تکمیل کے ساتھ نظم کر دینا کہ جذبات کے تمام مدارج و منازل اس مین آجائین اور چوتھا مصرعہ بالکل ایک لطیفۂ غیبی کی صورت سے سننے والے کے ذہن و عقل

مین خاص لذت سرور پیدا کردے آسان نہین ہے۔ لیکن جناب آسی کی رباعیون مین یہ تمام باتین نہایت تکمیل کے ساتھ پائی جاتی ہین جو ان کے قادر الکلامی کا بہترین ثبوت ہے۔ ان کی رباعیان یقیناً خیام کے ٹکر کی نہین ہین اور نہ سرمد وعطار کا تتبع انھون نے کیا ہے، بلکہ جو کچھ انھون نے لکھا ہے، خود انھین کے جذبات ہین اور اس لئے پورے جوش کے ساتھ نظم ہوئے ہین۔ ہم یہان چند رباعیان درج کرتے ہین جن سے ناظرین نگار کو ان کی خوبی کا اندازہ ہو سکیگا۔

افسانۂ شوق متصل کہتا ہون کہنے سے خجل ہون اور خجل کہتا ہون
سمجھا نہین تا فلہ مرے مقصد کو مین تنگ جرس نہین درِ دل کہتا ہون

اللہ رے یہ جذب آہ کی بے اثری اللہ رے یہ درد اور یہ خونین جگری
دریوزہ کے واسطے نہین ہے کاسہ کاسہ کے لئے کرتا ہون دریوزہ گری

اک محفل عیش مین ہوا میرا گزر دیکھا اک خشک پھول کو مجمر پر
پوچھا مینے کہ کیون جلاتے ہین تجھے بولا کہ چمن مین ہنس لیا تھا دم بھر

یہ کتاب چھوٹی تقطیع کے ۱۶۰ صفحات کو محیط ہے اور طباعت وکتابت وغیرہ مین بھی کافی اہتمام کیا گیا ہے۔ قیمت ۱۲/ ملنے کا پتہ۔ یونائیٹڈ انڈیا پریس نمبر ۱۸ وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنؤ۔

الروضتہ البہیتہ سلاطین فاطمیہ اور بہتانات خارجیہ کے رد میں ذاکر حسین جعفر صاحب نے یہ کتاب مرتب کی اور مطبع نادری جبل پور نے شایع کی ہے۔ اس تصنیف مین شاہان بنی فاطمہ کے مختصر حالات درج کئے گئے ہین اور ابن العذاری کے اُن الزامات کا جواب دیا گیا ہے جو اسنے شاہان بنی فاطمہ مصر پر قائم کئے تھے۔ اخیر مین قوم بوہرہ کی بھی مختصر تاریخ درج کی گئی ہے۔ کتابت وطباعت وغیرہ پسندیدہ ہے اور ۱۲/ مین مطبع مذکور سے ملسکتی ہے۔

سیرت وکردار ۵۶ صفحات کا مختصر سا رسالہ جس مین بچون کے لئے چند اخلاقی ومعاشری اسباق درج کئے گئے ہین۔ کتابت وغیرہ بہت صاف اور روشن ہے اگر بچون کے سامنے ابتدا ہی سے اس قسم کا لٹریچر پیش کیا جائے تو بڑا اچھا نتیجہ پیدا ہو لیکن افسوس ہے کہ ہملوگون مین مطلق اس کا خیال نہین کیا جاتا اور ایسی ناقص کتابین پیش کردیجاتی ہین کہ شروع ہی سے بچون کے دماغ مین مُہلک ذوق کے جراثیم پیدا ہوتے ہین۔

یہ کتاب مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدر آباد سے ملسکتی ہے۔

رہنمائے تعلیم الف۔ بے کا ابتدائی قاعدہ ہے جسے جناب شیخ چاند بھائی بی اے ماسٹر راجکمار کالج راجکوٹ نے بالکل جدید اصول پر مرتب کیا ہے۔ بچون کے ابتدائی تعلیم کا مسئلہ بے انتہا اہم ہے اور بدقسمتی سے اس وقت تک بہت کم توجہ اس طرف کی گئی ہے کہ اُن کی ابتدائی تعلیم کے لئے کس قسم کا نصاب مقرر کرنا چاہئے۔ شیخ چاند صاحب نے اس قاعدہ کو کنڈرگارٹن اصول پر مرتب کیا ہے اور اس کے ساتھ ایک کلید بھی شایع کی ہے جس مین اساتذہ کو طریق تعلیم بتایا گیا ہے۔ میرے نزدیک یہ قاعدہ بہت مفید ہے۔ اس کی قیمت معہ کلید کے ۲/ رکھی گئی ہے۔

غلط فہمی ۵۰ چھوٹے صفحات کا ایک مختصر سا ڈرامہ ہے جسے جناب نصیر ام۔ اے نے لکھا اور شمس الاسلام بک ڈپو بلیماران دہلی نے شایع کی ہے۔ یہ ڈرامہ اپنی زبان، اپنی طرز انشا اور پلاٹ کے لحاظ سے ایسی چیز ہے جس کو دیکھ کر ہر شخص آسانی اس نتیجہ پر

بھونچ سکتا ہے کہ جناب نصیر ام۔ اے اپنی قابلیت ڈرامہ نگاری کے متعلق سخت مغالطہ مین مبتلا ہین۔

اگر بلند انگریزی تعلیم کا یہی معیار ہے اور اُس سے اس طرح کا ذوق تحریر و انشار ایک انسان مین پیدا ہو سکتا ہے، توہم حیران ہین کہ ایک جاہل سے ایسے تعلیم یافتہ انسان کو کیونکر ممیز کر سکتے ہین۔

پلاٹ صرف اسقدر ہے کہ ایک شریف خاندان کی شریف لڑکی ہے جسکا نام رضیہ ہے ایک اور شریف مرد کی نسبت قرار پائی ہے جسکا نام اختر ہے اور دونون مین محبت بھی ہے۔ ایک اور اوباش شخص فرید جو میخوار بھی ہے اس نسبت کا مخالف ہے اور خود وہان شادی کرنا چاہتا ہے۔ اپنی غرض پوری کرنے کے لئے وہ پہلے تو ڈاکہ مار کر مال حاصل کرتا ہے اور پھر رضیہ کو ایک گمنام تحریر بھیجتا ہے کہ اختر بدچلن میخوار ہے اور پھر ایک صحبت بادہ مرتب کر کے اس مین دھوکہ سے اختر کو شریک کرتا ہے اور رضیہ اسی وقت نقاب پوش ہو کر آتی ہے اور اختر کو اس مجلس مین دیکھ کر بدگمان و متنفر ہو جاتی ہے۔ چند دن تک یہ حالت رہنے کے بعد راز کھل جاتا ہے، فرید گرفتار ہوتا ہے اور اختر کے ساتھ رضیہ کی شادی ہو جاتی ہے۔

یہ پلاٹ ہے ایک انتہائی تعلیم یافتہ کے دماغ سے نکلا ہوا جس کی ترتیب مین ہر وہ بدذوقی جو پیدا ہو سکتی ہے موجود ہے۔

مکالمہ کی زبان اسقدر سوقیانہ و بازاری ہے کہ صرف جامع مسجد کی سیڑھیون ہی پر سنی جا سکتی ہے رضیہ کا جو کیرکٹر اسکی گفتگو سے ظاہر ہوتا ہے وہ بھی نہایت ہی معمولی اور شرافت سے گرا ہوا ہے۔

الغرض یہ ادبی کوشش جناب نصیر کی اسی لٹریچر مین شامل کیجا سکتی ہے جسے انگریزی مین "Penny dreadful" [illegible] "قابل" نادانی قرار دیتے ہیں اس کی قیمت ۸ رکھی گئی ہے۔ ڈرامہ کا ایک بدترین نمونہ دیکھنے کے لئے زیادہ نہین ہے ڈرامہ کا نام "غلط فہمی" یقیناً بہت موزون ہے کیونکہ مصنف نے واقعی اپنی قابلیت کے متعلق سخت غلطی فہمی مین مبتلا ہو کر اس کو تحریر کیا ہے۔

دیوان درد | دیوان ہے جناب سردار عطا محمد خان صاحب درد کا جو نسباً دُرانی اور موطناً قندھاری ہین۔ فی الحال آپکا قیام گجرات مین ہے اور وہین سے یہ دیوان شایع کیا گیا ہے۔

اس دیوان مین جس شاعری کو پیش کیا گیا ہے وہ اسقدر عجیب و غریب چیز ہے کہ مشکل سے اس زمانہ مین اس کی دوسری مثال سوائے دیوان شاد ان کے کوئی اور نظر آسکتی ہے میر کی شاعری یکسر متشائم (Pessimistic) شاعری ہے، اس لئے موجودہ دور انحطاط مین اس کا مطالعہ مناسب نہین، غالب کے سمجھنے کے لئے جو وقت صرف ہوتا ہے اس کا استعمال دوسرے مفید کامون مین ہونا چاہیئے۔ جان صاحب کا مطالعہ انسان مین نسائیت پیدا کرتا ہے، جعفر زٹل، بے غیرتی کا درس دیتا ہے اور جرکین متونت دغثیان کا باعث ہوتا ہے۔ اس لئے ضرورت تھی کہ کوئی ایسا کلام مطالعہ مین رہے جو ان تمام باتون سے علیحدہ ہو کر وجہ تفریح ثابت ہو اور میرے نزدیک یہ مقصد اس دیوان سے پورا ہوتا ہے۔ بعض اشعار ملاحظہ ہون۔

یار جلوہ فگن بن گیا　　مرے دل کا دیدہ لگن بن گیا
چھوے جس نے گیسوے مشکین تمہ　　سراسر وہ مشک ختن بن گیا

دیدۂ دل کا پھیل کر لگن ہو جانا اور انسان کا ازسرتاپا مشک ہی مشک بن جانا کسقدر جدید تخییل ہے۔

دیکھ اے گل نہ کر ہماری جانچ　　تو نے رہنا ہے چار دن یا پانچ
خار سینہ مین بھی لگے اس کے　　جس نے دل مین مرے لگائی آنچ

پہلے شعر بے ثباتی کا نقشہ جس موثر انداز سے کھینچا گیا ہے وہ صرف جناب درد کا حصہ ہے اور دوسرے شعر مین عاشقانہ نیاز و فتادگی کے مقابلہ مین درس خودداری دیا گیا ہے جو ہر انسان کا فطری حق ہے۔

ہرگز نہ آپ جینے ہین ظرف روغنی مین　　بیگم مین ہے جو خاصہ پایانہ ڈومنی مین
شب کو رقیب سے مہ ملنا ہے ناچ گھر مین　　اندھیر ہو رہا ہے بجلی کی روشنی مین

پہلے شعر مین معاشرت کے تعمیری پہلو کو نمایان کیا گیا ہے۔ اور دوسرے مین تخریبی پہلو کو۔

بے نیازی کیسے صدقے ترے تیا مین ہین　　اور توڑے باغ سے کوئی انارِ زندگی
ہند مین ضائع ہوئی عمر گران شیر کو چل　　کچھ گزارین چین سے دن درد یار زندگی

پہلے شعر مین محبوب کی جوانی کو انارِ زندگی کہنا اور دوسرے شعر مین "دن درد یارِ زندگی" کی ترکیب داد سے مستغنی ہے

بعض مشکل ردیف و قوافی مین ایسے ایسے شعر نکالے ہین کہ باید و شاید۔ مثلاً:۔

مسقط کا نہ لا شیخ تو حلیہ مرے آگے　　رہنے ہی دے گلفام کے بھلمے آگے

مژگان بت کا حال سنا جب جھوک سے　　سینہ یہ چھد گیا مرا اور دل بھی دوک سے
اس کے فراق و عشق مین میرا ہے زرد رنگ　　خون چوسنے مین کم نہین دلبر زلوک سے

کوئی بھی جانتا نہین اسکے سب علوم　　عاجز ہین کل فلاسفہ بے بس ہین فی ہی فہوم
ہر بتان شراب و کباب و رباب و چنگ　　ہے عاشقون کے واسطے دنیات یا تن قوم
شب کو اٹھا کے لیگیا کوئے بتان مین دل　　آیا نہ باز جیف خصومت سے یہ خصوم
حاسد ہے کیا یہ درد کلالے ہمدمو عجیب　　دل مین ہے بالخصوص تو پہلو مین بالعموم

سوز فرقت کی لگ گئی ہے آگ　　تم بجھاؤ تو میرے جاگین بھاگ
تابش حسن نے تری خورشید　　منہ سے عاشق کے ہے بھائی جھاگ
خوش نصیبی ہے آجکل اس کی　　جس کو ملتی ہے دال روٹی ساگ

صدمہ ہاے درد سے دل ہو گیا ہے پاش پاش　　اب ہو گیا اس کا مداوا تو بتاوے تاش تاش
درد و غم نے کر دیا ایسا نحیف و ناتوان　　اندرون پھر ہو گئی میری غذا ہے آش آش

گر نہین صاحب تمھارے دل مین کچھ مکر و فریب　　کیون بھلا خلوت سرا کا بند کرتے ہو کواڑ
ہو سکے گی کس طرح ان کی مرمت اے تبو　　درد ہجران سے پڑے ہین خانۂ دل مین دراڑ

مست بازارون مین جو پھرتا ہے سانڈ　　والدہ اسکی ہے گھر مین ایک رانڈ
ایک دم جاتے رہے عیش و طرب　　درد نے آکر دیا جب دل کو مانڈ

فارسی کی بھی ایک غزل جناب ورمانے تحریر کی جس کے بعض شعر یہ ہین :-

چون بہ یورپ رفتم و دایر شدم ہر زبان مغربی تا در شدم
حل نمودم نکتہ ہاے فلسفہ از خطاب مغربی فاخر شدم
یافتم ہر اوج جاہ و منزلت چون بہ بزم دوستان حاضر شدم
چون عروسے خوبرو ہر شعر من میکشد ہر قلب را ساحر شدم

یہ مجموعۂ لطایف مصنف سے یا دوکان شیخ الہی بخش [illegible] تاجران کتب گجرات سے عہ مین ملسکتا ہے -

کوئی صاحب بغیر اجازت تحریری مصنف اس کو طبع نہین [illegible] سکتے اور اگر کسی جلد مین مصنف کا فوٹو نہ ہو تو اس کو مال مسروقہ سمجھنا چاہئے - مین نے بھی اس کا اظہار اس لئے کر دیا کہ حلقۂ [illegible] مین کوئی صاحب طمع زر مین اس دیوان کو طبع کرانے کا قصد نہ کرین، ورنہ "بجائے نفع کے نقصان" اٹھائین گے، اور مصنف کبھی اس کو گوارا نہ کرینگے کہ ان کے جواہر ریزے ملک عام ہو کر رہجائین۔

مویدالمسلمین یہ ایک مختصر سا رسالہ ہے جس مین جناب ابوالظفر موید الدین حسن صاحب مددگار ناظم کورٹ آف وارڈز حیدر آباد نے چند اسباق توحید و رسالت، نماز و روزہ حلال و حرام، نکاح و طلاق وغیرہ کے درج کر دئے ہین۔ رسالہ بہت صاف و سلیس زبان مین ہے اور عورتون اور بچون کی ابتدائی تعلیم کے سلسلہ مین اس کو سبقاً سبقاً پڑھا دینا ضروری ہے طباعت و کتابت صاف و روشن ہے - قیمت درج نہین ہے - مکتبۂ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدر آباد دکن سے ملسکتا ہے -

بہاریہ

رسید موکب نوروز و چشم فتنہ غنود   درود باد، مرین موکب خجستہ درود

کنون کہ برشد آوائے مرغ از بر مرغ   شنید باید آوائے رود بر لب رود

بکتف دشت یکے جوشنیست مینا فام   بفرق کوہ یکے مغفریست سیم اندود

سپہر گوہر بار دہی بہ مینا درع   سحاب، لولو پاشد ہمی بسیمین خود

شکستہ تاج مرصع بشاخہ بادام   شکستہ عقد گہر برستاک شفتالود

تل شقیق، بمانند مقتتی است شریف   درخت سرو، بمانند گنبدیست کبود

بطرف مرز بر، آن لالہ ہائے نشگفتہ   چنان بود کہ سر نیزہ ہائے خون آلود

بروی آب نگہ کن گہ از تطاول باد   چنان بود کہ، گہ مکرمت جبین جہود

ہزار طرفہ ز آثار پاستان یابی   کجا بخواہی، کامے دو باغ راپیمود

صنیع آذربینی و حجت زرتشت   گواہ موسیٰ یابی و معجز داود

ہر کہ برگذری شادی بزد در دل   ہر چہ درنگری، اندہی کند بدرود

یکیست شاد بہ سیم و یکیست شاد بزر   یکیست شاد بچنگ و یکیست شاد برود

ہمہ بچیزے شادند و خرمند ولی
مرا بخرمی ملک شاد باید بود

(م ۔ بہار)
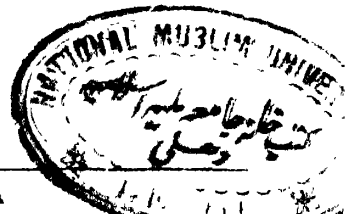
صبح — راوی کے کنارے!

یہ صبح کا وقت، اور یہ راوی کا کنارا　　وجد آور و صد کیف بداماں ہے نظارا
فطرت نے ہے کس ذوق سے دریا کو سنوارا

بکھرا ہوا ہے چار طرف حسن فراواں!　　میدان میں سارے! راوی کے کنارے!
بکھرے ہوئے موتی ہیں کسی زہرہ جبین کے　　کھوئے ہوئے منظر ہیں کسی خواب حسین کے
ٹکڑے ہیں مگر کیف گہ خلد بریں کے

یا رند ہیں میخانۂ افلاک میں لرزاں!　　یہ ڈوبتے تارے! راوی کے کنارے!
راوی کے کنارے کی یہ خاموش فضائیں!　　بیتاب کناں ہجر در آغوش فضائیں!
رنگینی فطرت سے ضیا پوش فضائیں!

یہ صبح طرب ریز، لب رود خراماں　　یہ مست نظارے! راوی کے کنارے
فردوس کی موسیقی سے لبریز ہے دریا　　یا خلد کے نغموں سے جنون خیز ہے دریا
یا رقص سے حوروں کے طرب ریز ہے دریا

حوریں!۔ جو ہیں آغوش میں راوی کے خراماں　　دلکش ہیں نظارے، راوی کے کنارے
لیکن ہے غم آلود یہ موسیقی رنگیں　　نغمات میں راوی کے ہے روداد غم آگیں
موجوں کے تبسم میں ہے اک گریۂ خونیں!

اور "عہد گزشتہ" کی طرف لہروں کا ہیجان　　کرتا ہے اشارے! راوی کے کنارے
رنگ "مئے پارینہ" سے شاداب ہے راوی　　اُس "عشرت برباد" کا اک خواب ہے راوی
اُن "محفلوں" کی یاد میں بے تاب ہے راوی

ہاں، یاد جہانگیر میں راوی بھی ہے گریاں　　لرزاں ہیں ستارے، راوی کے کنارے

"راشد علی پوری"

مقبرۂ ہمایون

نکہت رمیدہ غنچہ کے برگِ جگر فگار اک نازنین کے جذبۂ الفت کی یادگار
اے تاجِ ہند کے صدف دُر آبدار

اے آسمان جاہ کے بے نور ماہتاب اے شاہد جمال کے اُترے ہوئے شباب
عبرت سرائے دہر کی تصویر بے نقاب

تو نغمۂ خموش ہے نا آشنائے چنگ وہ صحنِ گلکدہ کہ جو ہو بے نیاز رنگ
وہ تیغ جس کے رُخ پہ پڑی ہو نقاب زنگ

وہ سنگ جس کے دل مین ہو پنہان جمال طور وہ قطرہ جس کے سینہ کے اندر ہو بحر نور
وہ ذرہ جس کے بطن سے ہو مہر کا ظہور

وہ طوق جس مین بسمل تیر قضا ہو قید وہ دام جس مین طائر شیرین نوا ہو قید
یا وہ قفس کہ تارون مین جسکے ہما ہو قید

اے چشمِ مضطرب یہ تجھے کیا ہوا کہ تو ہے آج اس مزار پہ سرگرم جستجو
کیون اے لب خموش یہ کیسی ہے گفتگو؟

اک جنبشِ نگاہ سے تربت اُچھال دی اُف! آرزوے مردہ مین پھر جان ڈال دی
محمود تو نے نعش ہمایون نکال دی!!

"محمود- اسرائیلی"

"شکوۂ تغافل"

بھولنے والا مرا ہر وقت مجھکو یاد ہے مین تو ہون ناشاد لیکن بھول کر وہ شاد ہے

سنگدل کہتے بھی ڈرتا ہون اُسے صدمہ نہ ہو مجھ سے ہو سکتی نہین فریاد بھی فریاد ہے

(قاضی محمد مرید صابر وزیرآباد)

آزادی

تو کیا شے ہے اے آزادی — تیرے غم نے آفت ڈھا دی
تیرے نام کا شیدائی ہوں — تیرے شوق کا سودائی ہوں
آنکھ سے سیلِ اشک رواں ہے — لب پر ہر دم آہ و فغاں ہے
اپنی کہانی کس کو سناؤں — کس کو داغِ سینہ دکھاؤں
آنکھ کھلی صیاد کے گھر میں — دہر قفس ہے میری نظر میں
یاد بھی مجھ کو اب نہیں آتا — تھا بھی نشیمن یا کہ نہیں تھا
غنچۂ خاطر کھل نہ سکا اُف — سعی کا سامان مل نہ سکا اُف
جب ذوقِ پرواز دیا تھا — یا رب کیوں پابند کیا تھا
زہر ہوا ہے رنجِ اسیری — حد سے گزری بے توقیری
خون ہوا ہے دل سینے میں — اب کیا رکھا ہے جینے میں
عالم میں بیکار سی شے ہوں — خم میں گویا دُردِ مے ہوں
رونا میرا ننگِ دیدہ — دستِ دعا ہے دستِ بُریدہ
نقشِ سجدہ داغِ جبیں ہے — میری عبادت دشمنِ دیں ہے
جو آزاد ہیں شاد وہی ہیں — شاد وہی آباد وہی ہیں
عیش اُنکا آرام اُن کا ہے — ہستی اُن کی نام اُن کا ہے
اے آزادی تو کیا شے ہے — میں تو زندانی ہوں ہے ہے
تو عالم کی روحِ رواں ہے — بزمِ فنا کی شمعِ جاں ہے
رودِ آب رواں ہے تجھ سے — موجِ باد دواں ہے تجھ سے
سازوں میں آواز ہے تجھ سے — چڑیوں میں پرواز ہے تجھ سے
دام میں پروانہ گر ہوتا — شمع سے واصل کیونکر ہوتا
عشق و دین و مذہب تجھ سے — دنیا عقبےٰ ہے سب تجھ سے
زہر بھی ہے کچھ جام میں تیرے — دھوکا بھی ہے نام میں تیرے

دیکھی نہیں ہے صورت تیری — پھر بھی ہے یہ حالت میری
دل ہے مشتاقِ نظارہ — غم سے جگر ہے پارہ پارہ
نام تیرا میں جب سنتا ہوں — بیتابانہ سر دھنتا ہوں
میرا کوئی یار نہیں ہے — ہمدرد و غمخوار نہیں ہے
آہ بہارِ چمن کیا جانوں — میں لطفِ گلشن کیا جانوں
نشو و نما ہونے نہیں پائی — پیدا ہوتے ہی موت سی آئی
مجھ کو ملے تھے جتنے جوہر — رہ گئے دل کے دل میں دب کر
گر یہ بال و پر ہی نہ ہوتے — تو پرواز کو ہم کیوں روتے
کوئی نہ پوچھے اب میں کیا ہوں — اُف زندہ در گور ہوا ہوں
اک اک پل بھاری ہے جینا — جینا خونِ جگر ہے پینا
میرا وجود ہے بارِ ہستی — جیتا رہنا عارِ ہستی
جوشِ عشق فریبِ دل ہے — میرا عہدِ وفا باطل ہے
عشق ہے حیرت کا طالب — ذوقِ عمل وسعت کا طالب
عاشق وہ ہیں عامل وہ ہیں — ہر پہلو سے کامل وہ ہیں
مالک اس دنیا کے وہ ہیں — بندے اپنے خدا کے وہ ہیں
تیرا راز جنھوں نے جانا — کہتے ہیں وہ عاقل و دانا
جب تو نے صورت دکھلائی — شمس و قمر میں گردش آئی
تجھ سے نشو و نما ہے بن میں — جوشِ گل صحنِ گلشن میں
تجھ سے خونِ تن میں روانی — تجھ سے دل میں جوشِ جوانی
گر دیندار آزاد نہ ہوتے — دیر و حرم آباد نہ ہوتے
کہتے ہیں لیکن یہ بھی مبصر — کرتی ہے گمراہ تو اکثر
مطلق آزادی تو جنوں ہے — عقل کا کھونا کارِ زبوں ہے

یہ مانا آزاد ہے عالم　　لیکن دیکھیں غور سے گر ہم　　پابندِ آئینِ قدرت　　ہیں سارے اجزائے فطرت
انجم و ماہ و مہرِ اعظم　　ہیں پابندِ جذبِ باہم　　جذبِ باہم ربطِ جان ہے　　نظمِ عالم کا سامان ہے
جو ہے کشش اس نظمِ جہاں میں　　ہے اخلاق وہی انسان میں　　اس آزادی کو رد تا ہون　　جب میں بہت بیکل ہوتا ہون
گلشن میں آزاد رہون لیکن　　بے خوفِ صیاد رہون میں　　پابندِ اخلاق و محبت　　ہو میرا ہر جز دِ طبیعت

عشق گلشن روحِ روان ہو
کارِ وفا ایمانِ جان ہو

جگر بریلوی

ترانۂ دل

مری نمود کفِ خاک سے ہے وابستہ　　وہ نشۂ ہون کہ رگِ تاک سے ہے وابستہ
مین ہون تو نخل بہ آغوش دانہ مین لیکن　　مری نمو گلِ نمناک سے ہے وابستہ

(۲)

خودی پرست بھی ہون مین خدا پرست بھی ہون　　مین اپنی آپ ہی تعمیر بھی شکست بھی ہون
مرے تضاد سے رونق ہے بزمِ ہستی کی　　مین ہوشیار بھی ہون اور سیاہ مست بھی ہون

(۳)

خمِ سفال اگر بادہ ہے نہ سرور ہے تو　　بذاتِ خود ہے گلِ تیرہ بے شعور ہے تو
مرے ظہور سے تابان ہے ذرہ ذرہ ترا　　مری نمود سے اے مشتِ خاک طور ہے تو

امین حزین

غزلیات

اختر شیرانی:-

بیوفا کو عبث الزام جفا دینا تھا! ہم ہی بھولے کہ تجھے دل سے بھلا دینا تھا!
حسن و الفت میں نہیں تفرقۂ فرد دوئی جذبِ کامل کو یہ پردہ بھی اٹھا دینا تھا!
مبتلا ہو کے ترے عشق کی سرمستی میں دل سے نقشِ غمِ ہستی کو مٹا دینا تھا!
رسم فرہاد ہے دنیا میں ابھی تک زندہ! یہ تماشا بھی کبھی اُن کو دکھا دینا تھا!

ہو گئے ناکام، ہوس کار تھے کیوں اختر
یادِ سلمیٰ میں جوانی کو گنوا دینا تھا!

اثر رحمانی رامپوری:-

خدا سرسبز رکھے گلستانِ حسن جاناں کو تصور ہی میں ہم بھر لیتے ہیں پھولوں سے داماں کو
جہاں تک چھپ سکا دل میں چھپایا رازِ پنہاں کو مگر کیا کیجئے اس دیدۂ خوننابہ افشاں کو
وفاؤں کا گلہ ہو یا جفاؤں کی شکایت ہو پشیماں کیا کرے گا عشق حسنِ ناپشیماں کو

اثر گھر سے نکل کر بھی نہ وحشت کم ہوئی دل کی
بیاباں میں کبھی پہنچا کبھی دیکھا گلستاں کو

ثاقب جالندھری:-

مرے دل کو ہے ان کے حسنِ عالمگیر کی خواہش خدا کی شان ہے ذرہ کرے تنویر کی خواہش
اگر پوری نہ کرنی تھی نہ کرتے پوچھ تو لیتے کسی ناکام کی حسرت کسی دلگیر کی خواہش
مجھے صحرا کی جانب چند کانٹے کھینچ لائے تھے لئے جاتی ہے زنداں کی طرف زنجیر کی خواہش
بہت مشکل ہے میرے عقدۂ مشکل کا حل ہونا نشاط انگیز ہے کیوں ناخنِ تدبیر کی خواہش
یہ مرگ و زیست کے ہنگامے گذریں تو وہاں گذریں جہاں لے جائے رنگِ عالمِ تصویر کی خواہش

ابھی تک عالمِ بیم و رجا کی کشمکش مین ہون
خدا جانے دکھائے کیا مجھے تقدیر کی خواہش

شوق مرادآبادی:۔

وعدہ کیا ہے آپ نے آنے کا خواب مین
اب کام کیا بھلا۔ مری آنکھون مین خواب کا

ہر جنبشِ نگاہ پہ گھبرا رہا ہے دل
مورد ہو کون دیکھئے ناز و عتاب کا

تھین کس کی چشمِ مست مین کل میفروشیان
کِسنے پلا دیا ہمین ساغر شراب کا

رنگِ پریدۂ رُخِ عاشق گواہ ہے
یارب! کسی کی برہمیٔ بے حساب کا

دل ہے فریب خوردۂ طرزِ وفائے دوست
پرسان ہو کون اب مرے حالِ خراب کا

سوزِ غمِ فراق سے رگ رگ تپیدہ ہے
کیا خوف حشر مین تپشِ آفتاب کا

اے شوق سر بزانوئے غم ہون تمام رات
کیون راز فاش ہو دلِ پر اضطراب کا

عشرت رحمانی:۔

ضبط کی تاب نہین، طاقتِ فریاد نہین
اور تسکین کا پہلو بھی مجھے یاد نہین

اب جہان چاہے مجھے خانہ خرابی لیجائے
خود فراموش کچھ ایسا ہون کہ گھر یاد نہین

پردہ ہائے حرم و دیر اُٹھے ہین لیکن!
سجدۂ عشق سے آگے مجھے کچھ یاد نہین

انتہا یہ ہے کہ جینے کا نہین ہوش مجھے
ابتدا کیا ہوئی اُلفت کی یہ کچھ یاد نہین۔

کیا شکایت کرین عشرت کہ بقول غالب!
ہمکو بے مہریٔ یارانِ وطن یاد نہین!!

نظیر لودھیانوی:۔

شبِ غم زبان سے یارب کبھی وہ صدا نہ نکلی
جسے سُن کے خوابگہ مین کوئی بے قرار رہوتا

ہے فروغِ ماہ شب بھر ہے بہارِ باغ دو دن
تری دوستی پہ کیونکر مجھے اعتبار رہوتا

جو سکون کسی قدر ہے تو وفورِ یاس سے ہے
جو امیدِ وصل ہوتی تو کسے قرار رہوتا

اسے رائیگان نہ سمجھو یہ نفسِ عجیب شے ہے — تب و تابِ عشق رکھتے تو یہی شرار ہوتا
غمِ عشق وہ بلا ہے کہ جو مہرومہ نہ ہوتے — تو فلک پہ شعلہ بن کر یہ غم آشکار ہوتا
غمِ ہجر مین بھی آتا مجھے لطف زندگی کا — مے خوشگوار ہوتی لبِ جوئبار ہوتا
ترے غم مین جان دیدی تو یہ کونسی خطا کی — کسی در پہ سر جھکاتا تو گناہگار ہوتا
مرا خونچکان فسانہ اگر ایک بار سنتا — کوئی دہر مین سکون کا نہ امیدوار ہوتا

جو نظیر اُس کے دل مین نہ خدا نے رحم ڈالا
تو مجھے ہی میرے دل پر کوئی اختیار ہوتا

معلومات

حقایق طبیعی کے بعض عجائب

ایک پونڈ پانی کو جوش دیجیئے تو معلوم ہوگا کہ جسقدر وزن اُس کا نقطۂ انجماد پر تھا اس سے کچھ زیادہ ہو گیا ہے، لیکن یہ زیادتی ۵/۱۰۰۰۰۰۰۰۰ پونڈ سے زاید نہ ہوگی۔ اسی طرح جب پانی غلیانی حالت سے اُتر کر نقطۂ انجماد پر پہونچتا ہے تو اس کا وزن ۳/۱۰۰۰۰۰۰۰۰ پونڈ کم ہوجاتا ہے حالانکہ اس کا حجم بڑھجاتا ہے۔

اسی طرح جب آکسیجن اور ہیڈروجن دو گیسیں پانی کی مقدار معین بنانے کے لئے باہم ملتی ہین تو ان دونون کا وزن پانی سے زیادہ ہوتا ہے اور یہ زیادتی ۱/۶۰۰۰۰۰۰۰ ہوتی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ جب پانی سرد ہوتا ہے تو حرارت کے ذریعہ سے کوئی چیز اس سے کم ہوجاتی ہے اور جب آکسیجن ہیڈروجن ملتی ہین تو وہ حرارت جو باہم ملنے سے قبل ان مین پائی جاتی تھی مفقود ہوجاتی ہے۔ یعنی دونون صورتون مین جسم سے قوت کا کچھ حصہ زایل ہوجاتا ہے اور قوت کے لئے جرم اور جرم کے لئے وزن ضروری ہے۔

ریاضی کے حسابات دقیقہ سے ثابت ہوتا ہے کہ آفتاب ہر ثانیہ مین ۴۰۰ ملین ٹن مادہ شعاعون کے ذریعہ سے خارج کرتا رہتا ہے۔ اور اصولاً اس سے جرم شمس مین کوئی نقص پیدا ہونا ضروری ہے، لیکن اس کی عظمت کا یہ حال ہے کہ اگر اسی حساب سے ۱۰ ملین سال تک برابر اپنا مادہ ضایع کرتا رہے تو اس کے جرم اور قوت کشش کو لاکھوین حصہ سے بھی کم نقصان پہونچیگا۔

کہربائی آنکھ اور اس کا استعمال

جس وقت آفتاب غروب ہو جاتا ہے اور افق مین تاریکی پیدا ہو جاتی ہے اُس وقت اگر کسی کتاب کا مطالعہ کیا جائے تو آنکھون کو بہت صدمہ پہونچتا ہے۔ اس زحمت کو دور کرنے کے لئے امریکہ کے مدارس نسوان کی مہتمم عورتون نے تعلیم پانے والی لڑکیون کے لئے کہربائی آنکھ کا استعمال شروع کیا ہے۔

کہربائی آنکھ کا ذکر اس سے قبل نگار کے باب معلومات مین آچکا ہے۔ یہ ایک کہربائی بیٹری ہے جو طبیعی روشنی کو جذب کرکے برقی رَو مین اسے تبدیل کر دیتی ہے۔

مدرسون کے کھڑکیون مین یہ آلہ رکھدیا جاتا ہے جس کے ذریعہ سے فضا کے روشن حجرون کے ایک ایک گوشہ مین پہونچتی ہے اور رات کو بغیر برقی روشنی کے مدد سے اس کے ذریعہ سے مطالعہ ہو سکتا ہے اس آلہ کا ایک طبی فائدہ بھی ہے اور وہ یہ کہ مکان کے جن حصون مین آفتاب کی روشنی بہ آسانی نہین پہونچ سکتی وہان اس آلہ کے زریعہ سے بخوبی روشنی پہونچ سکتی ہے اور تاریکی کے مُضر اثرات سے مکان کے رہنے والے محفوظ رہسکتے ہین۔

پتھر کے ملبوس

اسبستوس ایک قسم کی معدنی سنگین چیز ہے جس مین ریشے پائے جاتے ہین اور آگ کو قبول نہین کرتے۔ فلاڈلفیا کے ایک ماہر کیمیا نے دعویٰ کیا ہے کہ وہ اس سے کپڑا طیار کرنے والا ہے جو ریشم کی طرح نرم ہوگا لیکن نہ اس پر تیزاب کوئی اثر کرسکے گا اور نہ آگ اُسے جلاسکیگی۔

پروفیسر مذکور کا بیان ہے کہ قدیم روما مین اس کے لباس کا رواج پایا جاتا تھا لیکن اس طرح کہ ریشم کے تاگون کے ساتھ اس کے تارون کو بھی ملا دیتے تھے اور یہ کپڑا کفن کے لئے مستعمل ہوتا تھا۔

اسی طرح سترھوین صدی مین چین کے تاجر اس کے مندیلون کی تجارت کرتے تھے۔ مدعا یہ کہ اسبستوس کے کپڑے طیار کرنا کوئی نئی بات نہین ہے، لیکن اس کا کپڑا ایسا صاف نہ بن سکتا تھا کہ عام طور پر اس کا رواج ہو جاتا۔ اب پروفیسر مذکور نے اس کو ایک بہترین خوشنما کپڑے کی صورت مین تبدیل کرنے کا ارادہ کیا ہے جو عام کپڑون سے ارزان بھی ہوگا۔

اگر اس مین واقعی کامیابی حاصل ہوگئی تو مانچسٹر کو امریکہ کے مقابلہ مین ایک بالکل نئی مصیبت سے متصادم ہونا پڑیگا۔

ریڈیم کا جدید استعمال

اسوقت معدنی اشیا مین ریڈیم سے زیادہ قیمتی چیز کوئی نہین ہے اور علاج امراض مین اس سے بہت کام لیا جاتا ہے لیکن حال ہی مین اس سے اور کام لیا جانے لگا ہے یعنی روس کے پایۂ تخت لیننگراڈ مین ایک کارخانہ ربڑ کے کپڑے طیار کرنے کا ہے وہان اس سے حفاظت آتش کا کام لیا جاتا ہے۔

چونکہ ربڑ کے کارخانون مین آگ لگنے کا بہت احتمال ہوتا ہے اور بسا اوقات بجلی کے تارون سے آگ کی چنگاری نکل کر گودام کے گودام تباہ کر دیتی ہے، اس لئے ریڈیم کا استعمال کیا جاتا ہے تاکہ آگ کے حادثے رونما نہ ہون۔

ریڈیم کا یہ بھی ایک خاصہ ہے کہ وہ بجلی کی مجتمع قوت کو آہستہ آہستہ فضا مین منتشر کر دیتا ہے اور نقصان کے احتمال کو دور کر دیتا ہے۔ اسلئے انھون نے ریڈیم لگا دیا ہے جس سے بجلی کے تارون مین آگ پیدا ہونے کا احتمال نہین ہوتا۔

رجسٹرڈ نمبر ایل ۱۱۰۳
ستمبر ۶۹ء

بسم اللہ

نگار

فہرست مضامین ستمبر ۱۹۲۹ء

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد (۱۶) ستمبر ۱۹۲۹ء شمار (۳)

ملاحظات

آپ کو معلوم ہے کہ مذہبیات عالم میں سب سے زیادہ مہتم بالشان رفیع المرتبت و جلیل القدر ساعت از ابتدائے ظہور آدم تا ایندم کونسی ہے۔ وہ ۲۶ صفر ۱۳۴۸ھ یوم شنبہ مطابق ۲ اگست ۱۹۲۹ء وقت ۲ بجے دن کی ہے جبکہ آفتاب ۱۲ درجہ ۲۰ دقیقہ ۴۰ ثانیہ پر مائل بہ مغرب قائم تھا اور تمام نجوم سعد کا قران اعظم فرنگی محل لکھنؤ کی محلسرا پر نور افگن

اللہ اکبر اللہ اکبر لا الٰہ الا اللہ

واللہ اکبر اللہ اکبر وللہ الحمد

حضرت قبلہ مولینا قطب الدین عبدالوالی صاحب مدظلہٗ فرنگی محلی سرپرست انجمن معید الاسلام نے دعوت خاص دی اکناف ہند کے تمام ممتاز علمائے کرام اور اکابر رہنمایان قوم کا دائرہ ٹریمبت کی ایک نبان مین شاندار اجتماع ہوا لامذہبی اور دہریت کے انسداد کی تدابیر پر غور و مشورہ کیا گیا اور اس طنطنہ و دبدبہ اور اس شوکت و جبروت کے ساتھ کہ

تزلزل در ایوان کسرے فتاد

راویان خجستہ اطوار و پیام رسانان ذی جاہ و وقار متفقہ طور پر یوں زمزمہ پرداز ہوتے ہیں کہ ٹھیک اسی وقت جبکہ یہ اجتماع فرنگی محل میں برپا ہو رہا تھا،

امریکہ میں بمقام واشنگٹن، ایران میں بمقام طہران، ترکی میں بمقام انگورا، روس میں بمقام لینن گراڈ، اطالیہ میں بمقام وٹیکن، اور نظیر آباد میں بمقام دفتر نگار سخت خطرناک زلزلہ کے آثار محسوس ہوئے، روشنی کے منارے بجھ گئے، مشینیں چلتے چلتے رک گئیں کلیساؤں کے گھنٹے زمین پر آرہے، ماہی زمین نے کروٹ لی، قطب اپنی جگہ سے ہٹتے ہٹتے رہ گیا اور کوہ طور پر بجلی چمک چمک کر

سُبُّوحٌ قُدُّوسٌ رَبُّنَا وَرَبُّ الْمَلَائِكَةِ وَالرُّوحِ ۔

جناب مولانا قطب الدین عبدالولی صاحب نے اپنی "مؤثر و ایمان آفریں" انداز میں افتتاحی تقریر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ :-

> لامذہبیت اور زندقہ کا سیلاب ہندوستان میں ٹھہر رہا ہے اور تحریروں و تقریروں میں جس طرح مذہب کو بازیگاہ بنایا جارہا ہے وہ آپ حضرات سے پوشیدہ نہیں، افغانستان ایران جس طرح آزاد ہو رہے ہیں وہ ایسی چیز نہیں ہے جس کا اثر ہندوستان پر نہ پڑے، اس لئے ضرورت ہے کہ علمائے کرام بہت جلد اپنے فرض امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو ادا کرنے کے واسطے میدان عمل میں آجائیں ۔"

اس کے بعد متعدد "مولاناؤں" نے جنہیں بہ لحاظ حجم مولینا شوکت علی و بہ لحاظ انحنا مولانا آزاد سبحانی خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں اپنی "قیمتی تقریروں" میں "فاضل مقرر" کی تائید کرتے ہوئے علمائے کرام کی مستعدی و فرض شناسی کی ضرورت کا اعتراف کیا اور اس طرح گویا اصولاً تحریک کی ضرورت پر مُہر توثیق ثبت ہوگئی ۔

اس کے بعد مولینا شہید انصاری نے بعض "بزرگان قوم" کے خطوط کا خلاصہ سنایا جنہوں نے اس مقصد سے اظہار ہمدردی کیا تھا اور پھر "مختلف علمائے کرام" کا ایمان افروز اور خلوص پرور بیان پیش ہوا جس میں ظاہر کیا گیا تھا کہ :-

> مغربی تعلیم۔ یورپی معاشرت اور فرنگی مادہ پرستی کا ایک خطرناک اثر ہندوستان میں یہ ہوا کہ بہت سے لوگ آزادی مذہبی بلکہ لامذہبی کا شکار ہو رہے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ ارکان دین میں ترمیم کی ضرورت ہے کوئی سمجھتا ہے کہ دین کی مطلقاً ضرورت نہیں کسی کا خیال ہے کہ دین و علمائے مذہبی آزادی و ترقی کے لئے سنگ راہ ہیں اور جسقدر جلد ممکن ہو انکا خاتمہ کردیا جائے۔ غرض آزادی مذہبی مختلف صورتوں میں نمودار ہو رہی ہے اور روز بروز اندر ہی اندر جدید نسل کے قلوب میں گھر کر رہی ہے، یہاں تک کہ بعض نام نہاد حاملان دین بھی اس سیلاب میں بہہ گئے ہیں ہندوستان کے نوجوان مختلف جماعتوں کے نام سے منظم ہو رہے ہیں جو علی الاعلان کہتے ہیں کہ کسی مذہب کو زندہ نہ رہنے دو۔ اور قصر مذہب کی اینٹ سے اینٹ بجادو ان لوگوں نے مذہب کے خلاف عام بغاوت کا اعلان کردیا ہے۔ اور نئے فتنہ کے احیاء و ابقا میں سرگرمی کا اظہار کر رہے ہیں اس تہلکۂ عظیم سے اگرچہ دیگر اقوام کو بھی نقصان پہونچیگا لیکن وہ قوم (مسلمان) سب سے زیادہ خسارہ میں رہیگی جنکی قومیت سیاست اور وطنیت سب مذہب ہی ہے اور جسکی اخروی نجات کا انحصار اسلام ہی پر ہے، ان حالات اور انکے خوفناک نتائج کو محسوس فرماکر انجمن معین الاسلام فرنگی محل لکھنؤ نے ۲ و ۳ اگست ۱۹۲۹ء کو ہندوستان کے ہر طبقہ کے علماء کو مدعو کیا اور مقتدر اعیان ملت سے بھی مشورہ لیا گیا۔ اس جلسۂ مشاورت نے بالاتفاق مقتدر علماء کی ایک کمیٹی بنادی جو اسباب لامذہبی کے انسداد پر غور کریگی۔ سردست ہم دستخط کنندگان یہ اعلان کرنا ضروری خیال کرتے ہیں کہ قوم مسلمین کی پناہ و حفاظت اور اسکی دینی اور دنیوی نجات اسلام اور صرف اسلام ہی سے وابستگی پر منحصر ہے۔ آزاد یورپ کی

ترقی یافتہ قومیں آجتک نام نہاد مسیحیت کی پرستش کرتی ہیں۔ بائیس کروڑ ہندو برادران وطن اسکی سرفروشانہ جدوجہد کررہے ہیں کہ ویدک دھرم کی ہر رسم کی حفاظت کی جائے۔ ہمارا اسلام دین فطرت ہے اور خالق فطرت کی حکیمانہ تشریحات کا مقدس مجموعہ ہے وہ جمالی و حانیت و اخلاق کا بحر ذخار ہے وہاں سچی وطنیت اور سچی آزادی کا بھی علم بردار ہے، لہذا ہر کلمہ گو کا فرض ہے کہ وہ پکا اور سچا مسلمان بنے۔ اسلام ہی اسکی عقاید کی روح ہے اور وہی اسکی زندگی کے ہر لمحہ میں رہبر و راہ نما۔ نیز اوسے چاہئے کہ اپنے قول و فعل کی تمام طاقتوں سے لامذہبی اور الحاد کو پامال کرے اور خدا کے بندوں کو خدا کی بغاوت سے روک دے۔ اس بارہ میں داعی اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کا اسوۂ حسنہ ہمارے لئے بہترین ہادی ہے، اور ہمارا فرض ہے کہ دین و دنیا کے اس محسن اعظم کی ہر سنت کو زندہ رکھیں اور خود زندہ رہیں۔

اس کے بعد بعض علمائے کرام کی ایک کمیٹی بنائی گئی اور یہ ڈراما اس طرح ختم ہوا، کہ دستور العمل بنانے کے لئے مولانا آزاد سبحانی اور سید جالب کا انتخاب کیا گیا:۔

ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں!

یہانتک تو "اس اہم جلسہ" کی کارروائی کا بیان تھا جو ۲۰ اگست کو فرنگی محل میں لامذہبیت و دہریت کے انسداد کے لئے قایم ہوا، لیکن آیئے ساتھ ہی ساتھ اس "جلسہ" اور "ارکان جلسہ" کی حقیقت پر بھی اک نظر ڈال لیں، کیونکہ ممکن ہے یہ کہانی پھر دوبارہ آپکے سننے میں نہ آئے۔

سب سے پہلا سوال ان جلسہ کرنے والوں سے یہ ہونا چاہئے کہ وہ اپنے آپکو علمائے کرام میں کس استحقاق سے شمار کرتے ہیں اور ایک عالم کی وہ کیا خصوصیات ہیں جن کا حامل وہ اپنے آپ کو سمجھتے ہیں۔

کیا فرنگی محل کی سکونت، کیا دیوبند کا قیام، کیا درس نظامی کی چند کتابوں یا اس سے بھی زیادہ "یک خروار کتابوں" کا مطالعہ ایک شخص کو علمائے کرام میں شامل کرسکتا ہے؟ کیا عالم نام ہے صرف اس شخص کا جو بالکل مقلدانہ و غیر مجتہدانہ طور پر چند مسایل فقہیہ کا علم رکھتا ہو، کیا ایک عالم کا تشخص منحصر ہے محض اس امر پر کہ اسنے چند کتابیں حدیث کی پڑھ لی ہوں، کیا عالم کی پہچان یہی ہے کہ وہ عمامہ و عبا سے کبھی منزنگ نظر نہ آتا ہو، کیا عالم حقیقتاً وہی ہے جو صرف خوش بیان واعظ اور خوش الحانی سے مثنوی مولانا روم کے اشعار پڑھ سکتا ہو؟ کیا عالم اسکو کہتے ہیں جو اپنے آپکو موجود دنیا سمجھے اور اپنے سوا سارے عالم کو حقیر و ذلیل۔ اگر واقعی ایک شخص انہیں خصوصیات کا حامل ہونے کے بعد عالم کہلائے جانے کا مستحق ہو سکتا ہے تو کس کے منہ میں زبان ہے کہ اس جلسہ کی اہمیت سے انکار کرے۔ لیکن اگر عالم کہتے ہیں نبض شناس فطرت کو، اصلاح ملک و قوم کے لئے تمام دنیاوی اغراض کو ترک کر کے ایثار و قربانی کا عملی درس دینے والے کو، اس صالحیت و صلاحیت کے حامل کو جس کے لئے وراثت ارض کا وعدہ خدائے قدوس نے کیا ہے، ان صلحائے نفس کو جو سینوں کو بغض و حسد سے، دلوں کو نفاق و ریا سے پاک کر کے محض خالصتہً للہ ہدایات خداوندی پر عامل ہو کر دوسروں کے لئے دلیل راہ بنتے ہیں، اور اگر عالم کی ذات عبارت ہے اس استقامت عمل، اس استواری عزم اور اس روحانیت اخلاق سے جس کا لازمی نتیجہ دنیا میں ہمیشہ ایک اور صرف ایک (انتم الاعلون) ظاہر ہوا ہے، تو میں کہونگا کہ علمائے کرام کے لئے یہ زیادہ موزوں ہوتا کہ وہ دوسروں کے ایمان کا جائزہ لینے کے

بجائے پہلے خود اپنے ہی اخلاق و اعمال کا احتساب کرتے اور دوسروں کی اصلاح پر متوجہ ہونیکے بجائے پہلے وہ اپنی ہی اصلاح سے فارغ ہوجاتے اور بجائے قال کے وہ صرف اپنا حال پیش کرتے کہ دنیا از خود انکی طرف جذب ہوجاتی

آج فرنگی محل میں علمائے کرام کی ایک جماعت ملک کے اندر دہریت و لامذہبیت کی اشاعت پر ماتم کرنے کے لئے فراہم ہوجاتی ہے، لیکن اس سے قبل کبھی اس کی توفیق اس کو نصیب نہیں ہوتی کہ وہ ضلالت و گمراہی کی تقسیم کرکے یہ متعین کرلی کہ اگر دنیا لامذہبیت کی بلا میں گرفتار ہے تو وہ خود صراطِ مستقیم سے منحرف ہونے میں کس نوع کی گمراہی کا اپنے آپ کو مجرم قرار دیتی ہے

جہانتک اعلان و نمایش کا تعلق ہے بیشک یہ اپنے آپ کو علمائے کرام کہنے والا گروہ بہت نمایاں حیثیت رکھتا ہے، کیونکہ یقیناً وہ نماز میں زیادہ پڑھتا ہے، پیشانی پر اثر سجود کو بھی نمایاں کرلیتا ہے، صیام کے سلسلہ میں ہزاری روزہ بھی ترک نہیں کرتا اور جب حج کو جاتا ہے تو وہاں سے خاک شفا کی تسبیح اور ماء زمزم بھی اپنے احباب و اعزہ کے لئے لاتا ہے۔ لیکن اگر ایمان و اسلام کا تعلق بطون سے ہے، اگر عبادات سے مقصود تزکیۂ نفس و اخلاق اور تصفیۂ قلب و روح ہے، تو میں نہیں سمجھ سکتا کہ محشر میں ان علمائے کرام کیلئے کوئی علیحدہ صف قائم کیجائیگی

آج یہ "علمائے کرام" کا گروہ اس کا تو شاکی نظر آتا ہے کہ "لوگ مذہبی آزادی بلکہ لامذہبی کا شکار ہو رہے ہیں" لیکن خود اپنے گریبان میں منھ ڈالکر یہ غور کرنیکی توفیق کبھی نہیں ہوتی کہ "یہ آوردۂ تست" تو نہیں ہے، وہ زمانہ گیا جب ایک طرف "حق را بسجود ے و نبی را بہ درود ے" کا افسوں کارگر ہوجاتا تھا اور دوسری طرف دامن امید پر۔ اب دنیا ایک خاص اضطراب میں مبتلا ہے، علوم و فنون کی ترقی سے عقول انسانی ترقی یافتہ ہوکر مطالبہ کررہی ہیں کہ سب سے زیادہ مدعی صداقت مذہب، سب سے زیادہ ثبوت اپنے فطری ہونے کا دے اور علماء کی تنگ نظری، بیکسی و بیچارگی، تہی مائگی و ناداری کا یہ حال ہے کہ اگر انکے منقولات کے دفتر کو نظر انداز کردیا جائے تو پھر سوائے کافر کہدینے اور گالیاں دینے کے اور کوئی ذریعہ تعریب و دفاع ان کے پاس نہیں رہجاتا کیونکہ خود انکے اندر کوئی قوت اخلاق و سعی کی ایسی ہے نہیں جو دوسروں پر اثر ڈال سکے

جس وقت کسی گوشہ سے یہ صدا آجاتی ہے کہ "علما کا جلد سے جلد خاتمہ کردیا جائے کیونکہ وہ آزادی و ترقی کے لئے سنگ راہ ہیں" تو یہ اپنی گردن چھڑانے کے لئے بہت اچھلتا کودتا ہے، لیکن یہ نہیں سمجھتا کہ جو چیز عملاً بیکار ہوجاتی ہے وہ اصولاً آپ ہی حذف ہوجایا کرتی ہے، اسکا خاتمہ تو اسیوقت ہوگیا جب اس نے دین کو ذریعۂ رزق قرار دیا۔ خدمت دینی کا منصب خدا نے اسیوقت اس سے چھین لیا جب اس نے اپنے آپکو ایک بت کی حیثیت سے دنیا کے سامنے پیش کیا

وہ یہ زبان سے تو ضرور کہتا ہے کہ:—

"ہمارا اسلام دین فطرت ہے، خالق فطرت کی حکیمانہ تشریح کا مقدس مجموعہ ہے، وہ سچی وطنیت اور سچی آزادی کا علمبردار ہے"

لیکن عمل کے لحاظ سے اسکی تعلیم یہی ہوتی ہے کہ اسلام نہ وطنیت کا حامی ہے نہ آزادی کا علمبردار، نہ اسمیں کوئی حکیمانہ تعلیم ہے اور نہ مصلحانہ تبلیغ، بلکہ وہ بالکل غیر فطری، غیر آلہی، اور غیر مہذب مذہب ہے جو دنیا میں صرف خود غرضی اور نفس پرستی کی اشاعت کے لئے رونما ہوا

ایک عالم یہ ضرور کہتا ہے کہ:—

"داعی اسلام رسول اللہ کا اسوۂ حسنہ ہمارے لئے بہترین ہادی ہے"

لیکن نہ وہ اسوۂ حسنہ کے مفہوم سے واقف ہے اور نہ داعی اسلام کے اخلاق و عادات سے، اس نے اس قسم کے چند الفاظ محض گرمی سخن قائم رکھنے کے لئے یاد کر لئے ہیں، قلب و روح کی حرارت کو اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ کیا یہ علماء تاریخ اسلام سے مطلق واقف نہیں اور کیا انہیں نہیں معلوم کہ جب عہد عباسیہ میں اسلام کو ایک خدائی و فطری مذہب کی حیثیت سے دنیا کے سامنے پیش کیا گیا اور دیگر ملل و مذاہب کے علماء و حکما کو اس کی حقیقت سمجھانے کی کوشش کی گئی تو کتنے جدید مسایل بروئے کار آئے اور اس عہد کے علماء و متکلمین نے کس وسعت نظر اور مصلحت اندیشی سے کام لیا۔ اور کیونکر انہوں نے منقولات کو علٰحدہ رکھکر صرف معقولات کی مدد سے فریق مخالف کو اسلام کا مداح بنا لیا۔ پھر آج جبکہ عباسیہ کے وقت سے زیادہ علم کی روشنی پھیل چکی ہے اور اسوقت سے کہیں زیادہ تنقید و تحقیق کے ذرایع لوگوں کے ہاتھ آ گئے ہیں، آپکا اپنے منقولات کا دفتر لے کر بیٹھ جانا کیا فائدہ پہونچا سکتا ہے، اور اگر آپ یہ دعوی کریں کہ نہیں آپ معقولات میں بھی اپنے خصم کو ساکت کر سکتے ہیں، تو معاف فرمائیے میں اسکو سوائے "دخل در معقولات" کے اور کسی چیز سے تعبیر نہیں کر سکتا۔ کیونکہ آپکے یہاں کے معقولات تو اب فترہ پارینہ ہیں، اور معقولات جدیدہ کی آپ کو ہوا بھی نہیں لگی۔

حقیقت یہ ہے کہ اسوقت کی جماعت علماء کرام بالکل ایک (FOSSIL) متحجر چیز ہے اور موجودہ کاروبار حیات میں اسکا وجود مایہ اعتبار و بینش کی حیثیت تو رکھ سکتا ہے، لیکن اسے سرمایہ حیات و زندگی نہیں کہہ سکتے

میں ان تمام "علماء کرام" سے دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ اسوقت تک انہوں نے کونسی دینی خدمت انجام دی ہے؟ کیا حلال و حرام کے معمولی مسایل بتا دینا، کیا مساجد میں امامت کر لینا، کیا مجالس میلاد میں وعظ کہدینا، کیا رنگون وغیرہ جا کر جاہل و احمق مسلمانوں سے خلافت و تبلیغ کی بے معنی تحریک کے لئے چندہ وصول کر لانا، کسی آریہ کی کتاب کا جواب لکھدینا، تقلید و عدم تقلید کے مسئلہ میں مناظرہ کر لینا، ایسی اہم خدمات ہیں جو ایک شخص کو علماء میں داخل کر سکتی ہیں؟ اگر ایسا نہیں ہے، تو پھر میں دعوی کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ان علماء کرام میں سے ایک شخص بھی ایسا نہیں جس کو صحیح معنوں میں ہادی و مرشد یا عالم و فاضل کہہ سکیں

جہانتک علم ظاہر کا تعلق ہے ان کی بے مایگی کا یہ عالم ہے کہ سوائے ان چند دقیانوسی کتابوں کے جو انہوں نے کسی وقت مدرسہ میں پڑھ لی ہیں اور جنکی صحت پر اب بھی انہیں ویسا ہی ایمان ہے جیسے اندھے کو اپنے زوال بینائی کا، انکو کچھ خبر نہیں کہ دنیا میں کتنے اور علوم و فنون رونما ہو گئے ہیں اور عقول انسانی نے کسقدر ترقی کر لی ہے، نہ انکا مطالعہ وسیع، نہ انکی معلومات عامہ درست، نہ انکا ذہن ترقی یافتہ، نہ انکی عقل صحیح و پختہ، نہ ان میں بالغ نظری ہے نہ نکتہ رسی، نہ مصلحت اندیشی ہے نہ دیدہ وری، دوسری قوموں کے علوم و فنون سے واقف ہونا تو درکنار ان غریبوں کو خود اپنے یہاں کے علوم کی بھی خبر نہیں، یہانتک کہ اگر آج ان سے دریافت کیا جائے کہ اسوقت سب سے بہتر کتاب فن تنقید میں کونسی سمجھی جاتی ہے تو وہ اس کا کوئی جواب نہ دے سکیں گے، وہ اب بھی یہی سمجھے ہیں کہ جو ایک دو کتابیں انہوں نے پڑھ لی ہیں، اس سے زیادہ علوم اسلامی کے حدود وسیع ہو نہیں سکتے، اور دور زمانہ کی رفتار سے اسقدر بیگانہ ہیں کہ اگر آج مصر کی جدید کتاب انکے سامنے رکھدی جائے تو وہ ایک صفحہ بھی اسکا نہ سمجھ سکیں گے اور حیران رہجائینگے کہ یہ کونسی نئی زبان اسقدر جدید اصطلاحات کے ساتھ پیدا ہو گئی ہے۔ یہ ہے انکی عربی دانی کا حال، فارسی زبان چونکہ آتش پرستوں کی ہے اسلئے وہ اسے کیا حاصل کر سکتے ہیں، رہگئی اردو، سو اسکے متعلق شاید وہ فخر کے ساتھ کہہ سکیں گے کہ اس میں کمال حاصل کرنا انکی شان کے منافی ہے مغربی علوم و فنون کا کیا ذکر کہ ان غریبوں کو تو انکے نام بھی نہیں معلوم

علم باطن جس کا تعلق یکسر اخلاق و روحانیت سے ہے، اس کا ذکر فضول ہے کیونکہ اس کا دعویٰ شاید انہیں بھی نہ ہوگا اور بجز اس کے کہ وہ اپنے نام کے ساتھ لفظ فقیر کا اضافہ کر کے ایک ہلکی سی جسارت اس نمائش کی کریں اور زیادہ ان کے بس کی بات نہیں، کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ دنیا انہیں خوب جانتی ہے۔ رہی اس گروہ کی قوت عمل سو اسکی مثالیں بھی کثرت سے موجود ہیں اور آگرہ کا وہ منظر سامنے ہے جب اس سے کہیں زیادہ جوش و قوت کے ساتھ مذہبی کانفرنس کی بنیاد ڈالی گئی تھی، لیکن اسکا دوسرا جلسہ ہونیکی نوبت اسوقت تک نہیں آئی

پھر جب حالت یہ ہے تو میں حیران ہوں کہ یہ اپنے منھ سے اپنے آپ کو بغیر کسی استحقاق بعید کے بھی علمائے کرام کہنے والا گروہ (بقول صاحب کن "محفوظ نفس" کے ماتحت اس جسارت پر آمادہ ہوا ہے) اور دہریت و لامذہبیت کا کیا مقابلہ کر سکتا ہے، جبکہ وہ ابھی تک یہی نہیں سمجھ سکا کہ جسکو وہ "لامذہبیت" کے نام سے موسوم کرتا ہے حقیقتاً اسلام وہی ہے، اور موجودہ اضطراب حقیقتاً مذہب کے محو کرنے کے لئے نہیں ہے بلکہ انہیں علمائے کرام کے بت توڑنے کے لئے پیدا ہوا ہے

یہ لوگ بالکل غلط کہتے ہیں کہ اسوقت بیدینی اور لامذہبیت کے خیالات پھیلتے جا رہے ہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ دنیا اب علمائے سو کے عذاب کو اپنے اوپر زیادہ عرصہ تک مسلط نہیں رکھنا چاہتی اور اس کو مٹا دینے کے لئے آمادہ ہوگئی ہے اس لئے جو کچھ اس جلسہ میں بیان کیا گیا، بالکل خلاف حقیقت ہے اور صداقت سے یکسر دور، جو خوف انہیں اپنی ذات سے متعلق ہے اسے اسلام سے کیوں وابستہ کرتے ہیں۔ اور اگر اسلام عبارت انہیں کی ذات سے ہے تو پھر یقیناً "انہدام اسلام" ہی انسان کا فرض اولین قرار پائے گا

اس جلسہ کی کارروائی میں متعدد جملے ایسے نظر آتے ہیں جن سے نہایت انہماک اور مستعدی کا اظہار ہوتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ جو کمر ہمت آج فرنگی محل کی محلسرا میں کسی گئی ہے وہ داور حشر کے سامنے ہی کھلے تو کھلے لیکن میں اس کے اعتراف میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہنا چاہتا کہ

ہے کیا جو کس کے باندھئے میری بلا ڈرے
کیا جانتا نہیں ہوں تمہاری کمر کو میں

گزشتہ دو ماہ کے اندر جو مطبوعات موصول ہوئے ہین، ان پر اس مہینے کے نگار مین ریویو نہین کر سکا، ماہ آیندہ مین اسکا امکان ہے لیکن انھین کتابون مین ایک چیز ایسی موصول ہوئی ہے جس کا ذکر مین جلد سے جلد کر دینا چاہتا ہون اور وہ قانون مسعودی جلد چہارم کے ایک حصہ کا ترجمہ ہے جو نمونتاً مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کی طرف سے بہ طلب آرا شایع کیا گیا ہے۔

قانون مسعودی، البیرونی کی نہایت معرکۃ الآرا تصنیف ریاضیات فلکی پر ہے جس کے ترجمہ کا خیال سب سے پہلے نواب محمد اسحاق خان مرحوم کو پیدا ہوا تھا لیکن یہ ارادہ قوت سے فعل مین نہ آسکا

اب ہمارے فاضل دوست مسٹر محمد فاروق ام اس سی اس خدمت کے لئے منتخب ہوئے ہین انھون نے فی الحال صرف ۸ صفحات کا ترجمہ (بزبان انگریزی) معہ حواشی و استدراکات کے پیش کیا ہے اور موضوع کی دشواری کے لحاظ سے جس وقت اس کوشش پر نگاہ کیجاتی ہے تو بقول ہمارے ایک دوست کے فاروق صاحب کو بالکل "دیوتا" ماننا پڑتا ہے۔ انھون نے چار قدیم نسخون سے مقابلہ کر کے

اصل کتاب کو مرتب کیا ہے اور پھر اس کے انگریزی ترجمہ کے ساتھ جو (اصطلاحات ریاضی کو علیحدہ کرنے کے بعد) بے انتہا صاف و سلیس ہے، پھر اس نفع بخشی کا اضافہ کیا ہے جو اس کتاب کو سریع الانتقال الی الذہن بنانے کے لئے ضروری تھا۔

ہمارے نزدیک جناب فاروقی کا یہ کارنامہ ان کی اُس قوت کامنہ کا اعجاز ہے جس کا علم شاید انھیں بھی اس سے قبل نہ رہا ہوگا، ہمکو امید ہے کہ ارباب یونیورسٹی اب اس سلسلہ کو منقطع نہ ہونے دینگے اور فاضل مترجم کو ہر وہ آسانی فراہم کرینگے جو اس کام کو جلد انجام تک پہونچانے مین مفید و معاون ہوسکے۔ ترجمہ کے ساتھ اصل کتاب کی عبارت بھی ایک مرتب کی تمام ذمہ داریون کے ساتھ درج کتاب کی گئی ہے اور اس طرح فاروق صاحب بیک وقت دو نہایت مشکل مگر بے انتہا ضروری خدمت علم انجام دے رہے ہین۔

اس اشاعت کا پہلا مضمون ہمارے فاضل دوست پروفیسر محمد نعیم الرحمان ام۔اے کا ہے جو آیندہ ماہ مین غالبًا ختم ہوجائے گا۔ تعارف و تقریب کی ضرورت نہین کیونکہ صاحب مضمون اور مضمون دونون خود آپ اپنی سفارش ہین۔

مجنون کا فسانہ ماہ آیندہ مین ختم ہوجائیگا۔ چونکہ مجنون کے اکثر افسانے ہارڈی کے مطالعہ کا نتیجہ ہوتے ہین اس لئے ان مین ایک خاص قسم کے دل دکھادینے والی ٹریجڈی کا پایا جانا ضروری ہے۔ ہرچند وہ ہارڈی کی طرح خدا کو صرف اہرمن سمجھنے والے تو نہین ہین لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وہ خدا سے کچھ زیادہ خوش بھی نہین ہین۔

انارکسٹ، ایچ۔ جی ویلس (عہد حاضر کی نہایت ہی مشہور انشاپرداز) کے ایک فسانہ کا ترجمہ ہے۔

جناب بدر اصلاحی کا مضمون مشرقی مآثر پر خوب ہے۔ فسانہ عجائب اس ماہ مین ختم ہوگیا ناظرین نے اس مضمون کو پسند کیا اور نقاد کے تحقیق کی کافی داد دی لیکن مجھے کہیں کہیں اُن سے جادۂ اعتدال چھوڑ دینے کی شکایت ضرور ہے

تین مضمون اُن حضرات کے ہین جنھون نے اپنے نام کے اظہار کی اجازت نہین دی اور تینون مضمون چونکہ تنقیدی ہین اس کے لئے اظہار نام کی چندان ضرورت بھی نہ تھی۔

جناب ناطق کی غزل پر جو تنقیدی مضمون موصول ہوا تھا وہ کافی حذف کرنے کے بعد شایع کیا جارہا ہے، اب بھی بعض مقامات کے رُخ لہجہ سے مجھے اختلاف ہے۔

آیندہ اشاعتون مین بعض نہایت ہی دلکش و مفید مضامین شایع ہونے والے ہین۔ منجملہ اُن کے ایک کلام حزین پر تبصرہ ہے جو بہت کاوش سے لکھا گیا ہے، اس طرح مصحفی کی شاعری پر ایک صاحب نے جو یادگار مصحفی ہین ابسیط مضمون روانہ کیا ہے۔ مین نے بھی ایک فسانہ لکھا تھا جو اس ماہ مین نہ شایع ہوسکا آیندہ اشاعت مین درج ہوگا۔ ایک مختصر سا مضمون میرا حجاب کی شاعری پر آیندہ اشاعت مین درج ہوگا جو سلطنت اودھ کے عہد شباب کی ایک شاعرہ امیرزادی تھی اور حقیقتًا شعر کہتی تھی اسیطرح مولانا کیفی چریاکوٹی کا ایک عالمانہ مضمون مومن کی شاعری پر شایع ہوگا

نظیر کے متعلق جو حضرات مضامین لکھ رہے ہین ان کو یہ اطلاع دیدینا ضروری ہے کہ ماہ ستمبر بہت قریب ہے اور زیادہ سے زیادہ اکتوبر کے اخیر تک نظیر نمبر کی کتابت شروع ہوجائے گی

نیاز

ہندی اور بابلی علم الاصنام کی مشابہت

متھیا (دیومالا، متھالوجی، علم الاصنام، خرافیات، وغیرہ جس نام سے چاہئے اُسے موسوم کیجئے) ایک جامع اصطلاح ہے اور اُن تمام قصون اور روایتون پر حاوی ہے جو دُنیا کی مختلف اقوام مین قدیم اور قدیم ترین زمانے مین رائج تھین اور جن پر وہ ایسا ہی راسخ اعتقاد رکھتے تھے جیسا آج ہم اپنی جدید سے جدید معلومات پر رکھتے ہین۔ اور زیادہ تفصیل سے یون کہا جاسکتا ہے کہ ان روایات مین آفرینش کی ابتدا، کائنات کی پیدائش، خدائی یا انسان سے بالاتر اشخاص کی پیدائش اور اُن کے اعمال اور افکار سے بحث ہوتی ہے کہ یہ حضرات کیونکر پیدا ہوئے، اُنھون نے کیا کیا کمالات حاصل کئے، کون کون سے کارہائے نمایان کئے، تمام بنی نوع انسان یا اپنے خاص فرقے اور قبیلے کی انھون نے کیا کیا خدمت کی، دُنیا کی حکومت مین انھون نے کیا حصہ لیا، انسان کے ساتھ اُن کی دوستی اور دشمنی کا کیا رنگ تھا، خود اُن کے آپس مین تعلقات کیا اور کیسے تھے، وغیرہ وغیرہ، دنیا کی ہر قوم اپنی زندگی کی ابتدائی منزلون مین ایسی روایات اور خُرافات کا ذخیرہ رکھتی تھی۔ ان مین سے اکثر قومون کی متھیا دریافت کی جاچکی ہے اور جو باقی ہین ان کے متعلق علم حاصل کرنے کی برابر کوشش کی جارہی ہے

مختلف ملکون اور قومون کی متھیا کے مطالعہ مین ایک نہایت دلچسپ بات جو فوراً ذہن مین آتی ہے یہ ہے کہ کئی کئی اقوام اور ممالک کے باشندون کے خیالات اور عقیدے آپس مین ایک دوسرے سے بہت کچھ مشابہ تھے۔ نہ صرف یہ کہ ایک ہی خاندان کی مختلف اقوام کے خیالات ایک ہی اسلوب اور نہج پر نظر آتے ہین، بلکہ مختلف خاندانون کے اور ایک دوسرے سے معقول فاصلے پر بسنے اور رہنے والی قومون کے خیالات بھی آپس مین مُشابہت رکھتے ہین، اس وقت ذیل کی سطرون مین بابل اور ہندوستان کی متھیا کی مشابہت دکھانا مقصود ہے۔ اس غرض سے مجھے جو جو روایات، اور قصے ایسے مل گئے ہین جن مین بابل اور ہندوستان آپس مین شریک ہین، وہ قلمبند کر دیئے ہین، ہندوستان کی قدیم عظمت اور جلال کے ثبوت کے لئے غالباً یہی چند مثالین فی الحال کافی ہونگی

لیکن قبل اس کے کہ بابلی اور ہندی علم الاصنام یا متھیا کی روایات کی مُشابہ تصویرون کو پیش کیا جائے یہ عرض کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان روایات کا زمانہ (عام اس سے کہ وہ بابل کے متعلق ہو یا ہندوستان کے) معین کرنا نہایت دشوار ہے۔ اس ضمن مین صرف دو باتین کہی جاسکتی ہین۔ ایک تو یہ کہ ان روایات کا زمانہ غالباً تین اور چار ہزار سال قبل مسیح سے لے کر ایک ہزار اور پانچ سو سال قبل مسیح تک کا ہے، دوسرے یہ کہ اغلب امر یہ ہے کہ یہ روایات بابل سے ہندوستان پہنچی ہین اب خواہ اُنہین آریا قوم وہان سے اپنے ساتھ لائی ہو (اور یہ امر آجکل مستشرق علما کے ہان زیر بحث ہے)

، خواہ ہندی سوداگرون اور سیاحون کے

ذریعہ سے ہمارے ملک مین پہنچ گئی ہون۔ اور اس لحاظ سے غالباً ہندی کی ان روایتون کا زمانہ بابلی روایتون کے بعد آتا ہے۔
چونکہ زمانہ کا ذکر ہو رہا ہے، اس لئے سب سے پہلے اسی سے شروع کرنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

۱۔ جُگ

ہندی (اور اسی طرح یونانی اور آئرلینڈی) متھیا مین دُنیا کی عمر کو چار زمانون مین تقسیم کیا گیا ہے۔ چاندی (سفید) سونا (زرد)، برنج (سُرخ) اور لوہا (سیاہ)، جن کو ہمارے ملک مین بالترتیب کرت جگ، ترتیت جگ، دواپر جگ اور کل جگ کہتے ہین۔ قدیم ہندی حساب سے ایک مہا جگ ۴۳۲۰۰۰۰ (تینتالیس لاکھ بیس ہزار) برس کا ہوتا ہے اسی طرح اہل بابل کا عقیدہ تھا کہ اُن کے ہان "طوفان" سے پہلے دس بادشاہ راج کر چکے تھے اس تمام مدت کا مجموعہ ۱۲۰ (ایک سو بیس) "سروئی" ہوتا ہے، اور چونکہ ایک سروئی مین ۳۶۰۰ (تین ہزار چھ سو) برس ہوتے تھے، اس لئے ۱۲۰ سروئی ۴۳۲۰۰۰ (چار لاکھ بتیس ہزار) برس کے برابر ہوئی۔ اس رقم کو اگر دس سے ضرب دیا جائے تو وُہی ہندی مہاجگ کے تینتالیس لاکھ بیس ہزار سال پیدا ہوتے ہین۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بابل اور ہندوستان دونون مین وقت اور جگہ (زمان و مکان) کا اندازہ کرنے کے لئے دس (۱۰) اور چھ (۶) کے ہندسون سے بہت کام لیا جاتا تھا، کیا عجب ہے کہ ہندی اور بابلی حساب کے طریقہ کی بناء ایک ہی ہو، اور یہ امر بھی نہایت دلچسپ ہے کہ آجکل تمام دُنیا ایک ڈگری سے لے کر گھنٹہ تک (جو وقت کی پیمائش کے اُصولی ذریعے ہین) ۱۰+۶ (=۶۰) ہی کے حساب سے کام کر رہی ہے!

۲۔ برہما....

جس طرح ہندی متھیا مین (چھوٹے چھوٹے دیوتاؤن سے قطع نظر کرکے) تین بڑے خدا مانے گئے ہین، اسی طرح اہل بابل کے بھی تین بڑے خدا تھے۔ بابل کی خدائی تثلیث مین آیع، بعل، انلیل اور آنو کو بالکل وہی خدائی کاروبار سپرد تھے (بلکہ اب بھی ہین!) وشنوجی کی طرح آیع بھی دُنیا کا پالنے پوسنے، زندہ سلامت رکھنے اور حفاظت کرنے والا تھا، شوجی کی مانند بعل انلیل کو مارنے اور غارت، برباد، ہلاک اور تباہ کرنے کی خدمت سپرد تھی، اور برہماجی کی طرح انُو دیوتا بھی سب کا پیدا کرنے والا اور سب کا باپ تھا، کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہودی قوم کا ایک حصہ جب عرصہ تک ایک کیلے "یہوا" کا نام سنتے سنتے اور جپتے جپتے تنگ آگیا تو اُس نے اُسے معزول کرکے پھر ایک مرتبہ باپ، بیٹا اور روح القدس کے نام سے اپنے پُرانے تین خداؤن کو زندہ کرکے بٹھا دیا اور اپنے اس کمال کی داد کو پاک ویے گناہ یسوع مسیح کے نام پر وقف کر دیا چنانچہ دُنیا کی انسانی آبادی کا ایک معتد بہ حصہ آج بھی ان کی داد دے رہا ہے۔ ملک اشوریا کا خدا اشور جگ دیوتا تھا، ہندوستان کے برہما کی طرح وہ بھی برماتما اور پرمیشور تھا، سارے جہان کا خالق، نگہبان، محافظ اور ہلاک کرنے والا تھا آگ، پانی، زمین، ہوا، آسمان، سورج، چاند، ستارون اور بجلی کا بھی خدا تھا، گویا انُو اور اشور دونو ہی ان کے برہما تھے

۳۔ اِندر

بابلی متھیامین رمّن دیوتا ہوا، گرج اور بجلی کا دیوتا تھا، وہ پانی برساتا، اناج پیدا کرتا اور باہم لوگوں مین فساد ڈالتا اور لڑائیان کراتا تھا، وہ عموماً پہاڑ دن پر رہتا تھا اور وہین سے اپنے فرائض منصبی ادا کیا کرتا تھا، وہ مغرب سے آریا قوم کی رَو کے ساتھ چل کر پنجاب کے راستے ہمالیہ پہنچا اور وہین قیام کیا۔ یہان وہ 'اندر' دیوتا کے نام سے مشہور ہوا۔ اندر دیوتا کے بھی بعینہ وہی سب کام ہین جو بابل مین 'رمن' کے سپرد تھے، وہ بابل مین 'تموز' کے نام سے سردی اور آندھی کے، اور ہندوستان مین 'اندرا' کے نام سے خشک سالی کے دیوؤن کو قتل کرکے پانی برساتا اور اناج پیدا کرتا تھا، وہان بابلی اور یہان ہندوستانی اپنے اس اَن داتا کو خوش رکھنے کے لئے انسانون کی قربانیان چڑھاتے (اور اس غرض کے لئے عموماً غیر ملکون سے لوگون کو قیدی بنا بنا کر لاتے) تھے اس خدمت کے معاوضہ مین ان داتا اُنھین کھانے پینے کو دیتا تھا! بابل کے رمن کی طرح ہندوستانی اندر بھی ہر سال مرجاتا تھا۔ چنانچہ مہابھارت (آدی پرب) کے ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ پانچ پانڈو بھائی اصل مین پانچ پرانے اندر تھے جو اپنے اپنے وقت مین مرچکے تھے

بابل کا میرودخ دیوتا اپنے باپ آیع کے مرنے کے بعد اژدھون کے مارنے کی خدمت پر سرفراز ہوا تھا، اسی طرح ہندی اندر نے بھی اپنے باپ دیوس کو مار کر اس کے خدائی کامون کو اپنے ذمے لے لیا تھا

بابلی دیوتا آیع ہندی اندر کی طرح مختلف قسم کی صنعت اور دستکاری مین کمال رکھتا تھا، اکثر ضرورت کیوقت آیع اپنے (خلیج فارس کے) گھر مین سے نکل کر اپنے بندون کو نہرین کھودنا، کھیتی باڑی کرنا، دھات کا کام کرنا، مٹی کے برتن اور اینٹین بنانا اور اُن سے مندر اور عبادت گاہین تیار کرنا سکھاتا تھا۔ اُس نے اس دنیا کو بالکل اسی طرح بنایا تھا جسطرح کوئی معمار مکان بناتا ہے۔ اندر دیوتا نے بھی اپنے ہتھوڑے اور بسولے کے ذریعہ اسی طرح یہ تمام کائنات بنا کے رکھ دی تھی جیسے اُس وقت کے ہمارے آریا آباواجداد لکڑی کو کاٹ، چھیل اور جوڑ کر اپنے گھر بنایا کرتے تھے۔

ہندی اندر بیک وقت بابلی آیع، رمن اور میرودخ کے برابر تھا!

۴- اگنی

ہندی متھیا مین اگنی آگ کا دیوتا ہے۔ ویدون کے بھجنون اور روایتون مین اُس کا نام اکثر پایا جاتا ہے، اُس کی مورتی مین دو چہرے، تین ٹانگین اور سات بازو ہوتے ہین، اور عموماً اُس کے ساتھ ایک مینڈھا ہوتا ہے[1]۔ اسی طرح بابلی متھیا مین گرّو، گشبار، گبل اور نسکو آگ کے دیوتا تھے۔ ہندوستان نے ان چار کے مقابلے مین اپنے ایک ہی دیوتا کو دو چہرے اور سات ہاتھ دے رکھے تھے۔ اس لحاظ سے پھر یہی کہنا پڑتا ہے کہ ہندوستان بابل پر فوقیت لے گیا۔

---

[1] تاکہ اُس کی قربانی کرکے اُسے جلایا جاسکے۔ قربانی اور آگ اکثر قدیم قومون کے ہان لازم ملزوم چیزین تھین۔ ہندی مسلمان بھی بقرعید کے دن کباب کھانے کے بہت شوقین ہین! مگر ایک بزرگ ایک مرتبہ فرماتے تھے کہ شب برات مین اگنی دیوتا بہت خوش رہتے ہین

گو یہ یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ بابلی بھی ہمارے آبا و اجداد کی طرح اپنے ان دیوتاؤن کو زندگی اور رُوح کی بنا (جس کا ظہور جانداروں کے بدن کی گرمی مین پایا جاتا ہے) سمجھتے تھے یا نہین، لیکن یہ ضرور ہے کہ قدیم (اور غالبًا آجکل کے بھی) ہندوستانیون کی طرح اُن کے ہان بھی آگ کو جادو ٹونے کے لئے استعمال کیا جاتا تھا، مُردے کو جلا کر راکھ کر دینے کا قاعدہ جو آج تک ہندو گھرانون مین باقی ہے، اُس کی حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ قدیم آریا یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ اُن کے مُردے آگ مین بھسم (یا یون کہئے کہ اگنی دیوتا کی ذات والاصفات مین فنا۔ فنافی النار) ہو کر براہ راست سورگ (جنت) مین پہنچ جاتے تھے، اسی طرح اہل بابل بھی کبھی کبھی اپنے مُردون کو جلایا کرتے تھے، قدیم سمیا طیقی قومون مین قربانی کے وقت جانورون کو (اور بعض اوقات انسانون کو بھی) آگ مین بھسم کر دینے کا عقیدہ اور عمل بالکل عام تھا، اہل بابل کا (مذکور بالا) نُسکو دیوتا ہمارے ملک کے اگنی دیوتا کی طرح دیوتاؤن کا دُوت (قاصد) بھی تھا۔ چنانچہ جب میرودخ دیوتا کو بابل کے تمام دیوتاؤن کی سرداری ملی ہے تو اُس نے نسکو ہی کو آیع دیوتا کے پاس اس ترقی منصب کی خبر پہنچانے کیلئے قاصد بنا کر بھیجا تھا۔

اسی طرح بابلی دیوتا تمُوز (جس کے نام پر سُریانی تقویم کے ایک مہینہ کا نام بھی تموز ہے، جو ہمارے بیساکھ جیٹھ اور انگریزی جون جولائی کے وقت مین ہوتا ہے) اور اگنی دیوتا کی چند صفات آپس مین مشترک ہین تموز دیوتا "شفا دینے والا" تھا، اگنی "سب طرح کی بیماریون کو دور کرنے والا" تھا، تموز گھن گھرج آواز کا دیوتا تھا، اگنی بھی ایک مست سانڈ کی طرح چنگھاڑتا تھا، تموز اور اگنی دونون بڑے دلاور اور جنگجو تھے، دونون بڑے بڑے دیوون کو مارتے اور قتل کرتے تھے، اہل بابل کے ہان تموز دیوتا کا ایک کام یہ بھی تھا کہ وہ رات کے وقت آسمان کی رکھوالی کرے۔ اس حیثیت مین وہ لوگ اُسے بکرے کی صورت مین تصور کرتے تھے، روایت ہے کہ ایک مرتبہ بابل مین طرح طرح کی بیماریون کی وبا پھیلی، تو لوگون نے عاجز آکر میرودخ دیوتا سے دُعا کی کہ انھین ان وباؤن سے بچائے، اور اس کے ساتھ ہی انھون نے ایک بکرے کو اُسے خوب بنایا سنوارا اور میرودخ کے نام پر جنگل مین چھوڑ دیا ؎۔ دیوتا نے بکرا قبول کیا، اور اپنے بندون کو وبا سے نجات دی۔ وہ بکرا آسمان پر پہنچ کر ستارہ بن گیا (جسے آجکل کی اصطلاح مین قطب تارہ کہتے ہین)۔ چنانچہ عربی زبان مین اب بھی اُس کو "جدی"، (بکری کا بچہ) کہا جاتا ہے، اسی طرح ہندی ستھیا مین بھی اگنی دیوتا اور وَرُن دیوتا کا بکرے سے تعلق ہے۔ قدیم آریا لوگ اپنے مردون کا کریا کرم کرتے وقت اس نیت سے بکرا قربان کیا کرتے تھے کہ اس طرح وہ دیوتاؤن کو خبر کر دین کہ ایک نئی رُوح اس دنیا سے اُس دنیا مین داخل ہو رہی ہے اور دیوتاؤن کی پناہ اور سرپرستی کی خواستگار ہے!

؎ ممکن ہے یہی بکرا ان بکرون کا مورث اعلیٰ ہو جن کو آج بھی ہمارے بعض دیندار بھائی خوب بنا سنوار کے بزرگان دین اور اولیاء اللہ کے نام پر چھوڑ دیتے ہین! پھر اُن بکرون سے نہ معلوم ان کا کیا رشتہ ہے جن کو ہمارے ملک کے جادوگر اور سیانے کالی مائی کے نام پر قربان کر کے اور ان کا خون پی کر اپنے معتقدین کے حق مین حیرت انگیز پیشگوئیان کرتے ہین؟

۵- سورج

بابل مین سورج دیوتا کا نام شَمَش (عربی شمس - سورج) تھا۔ وہ قسمت اور تقدیر کا مالک تھا، سب زندہ اور مُردہ ہستیون کا خدا تھا، وہ سب سے بڑا منصف، سب سے بڑا قانون ساز تھا، اور سب سے انصاف کا برتاؤ کرتا تھا۔ وہ بدکاری کا دشمن تھا، گناہ سے سخت نفرت رکھتا تھا، صدق اور خلوص کا عاشق تھا، اپنے پوجاریون مین سچائی اور ایمانداری کی روح پھونکتا اور گناہگارون کو سزا دیتا تھا، وہ دُنیا کو روشن کرتا تھا اور اُس کے نور کی شعاعین دنیا کے ہر ہر کونے مین پہنچتی تھین۔ وہ ہر چیز کو دیکھتا اور ہر انسان کے خیالات کو جانتا اور پڑھ سکتا تھا۔ کوئی چیز اُس سے پوشیدہ نہ تھی۔ اُس کا ایک نام مِترا بھی تھا۔

ہمارے ملک کے ویدون (خصوصاً رگ وید) مین مِترا دیوتا وَرن کا ہمزاد تھا۔ یہ دونون انسان کی زندگی کی مدت مقرر کرتے اور اُس کی نگہبانی مین مصروف رہتے تھے۔ وہ سورج اور چاند کے راستون اور عملون کا اندازہ اور اُن کی تعین کرتے تھے، وہ ہوا، پانی اور موسم سب سے اُن کے ٹھیک ٹھیک وقت پر کام لیتے تھے۔ وہ ہر گھر مین ہر شخص کے نگہبان اور سرپرست تھے، اور گناہگارون کو سزائین دیتے تھے، وہ زمین پر پانی برساتے تھے۔

جس زمانے مین آریا لوگ پنجاب مین تھے اور وَرن اور مِترا کی پوجا کرتے تھے وہ اپنے مُردون کو جلاتے نہین تھے بلکہ ”مٹی کے گھرون“ مین دفن کرتے تھے۔ یہی حال شَمَش کے پوجنے والون کا بابل مین تھا، ہندوستان کے یَم دیوتا کی طرح بابل کا مِترا دیوتا بھی اس دنیا سے جانے والی روحون کا بادشاہ تھا، یہ روحین جس ملک مین رہتی تھین اُس مین پہنچنے کے لیے (بابلی اور ہندی دونون عقیدون کے مطابق) بڑے بڑے پہاڑون اور ”موت کی ندی“ کو پار کرنا پڑتا تھا،

یہی مِترا ایران مین مِہر (سورج) کے نام سے جلوہ گر تھا!

۶- طوفان

بابلی روایت کے مطابق پیر نپشتیم[۱] نے گلگمیش[۲] سے طوفان کا واقعہ جس طرح بیان کیا تھا وہ مختصراً یون ہے۔ دریاے فرات کے کنارے شُرپاک کے شہر مین سب دیوتاؤن کا مجمع ہوا اور اُنھون نے متفق طور پر یہ طے کیا کہ زمین پر پانی کا ایک طوفان پہنچنا چاہیئے۔ اَیَع دیوتا نے (جو عقل کا خدا تھا) پیر نپشتیم کو (خواب مین) یہ ہدایت کی کہ چونکہ ہم سب دیوتاؤن کی یہ مرضی ہے کہ زمین پر ایک سخت طوفان بھیجین، اس لئے تم اس سے خبردار رہو اور اُس مین ہلاک ہونے سے بچنے کے لئے اپنے مکان کو توڑ کر ایک بہت بڑی سی کشتی بنا لو، اور جب طوفان شروع ہو تو اپنے سارے خاندان اور اسباب وغیرہ کو لے کر اُس کے اندر رہو بیٹھنا اور دروازہ بند کرکے کشتی کو پانی کے بہاؤ پر چھوڑ دینا تاکہ تمھین حفاظت اور احتیاط سے کسی مقام پر پہنچا دے۔ اس ہدایت کے

---

[۱] پیر نپشتیم کی حیثیت بابلی روایت مین وہی ہے جو (اُس سے ماخوذ) یہودی روایت مین حضرت نوح (علیہ السلام) کی ہے۔ [۲] گلگمیش کو گویا بابل کا بھیم یا ہنومان سمجھنا چاہیئے۔ اس کا ذکر ابھی آئیگا ۱۲ [۳] یہ ”زبردستی“ ملاحظہ ہو، کیون نہ ہو آخر دیوتا تھے، جو کچھ چاہتے تھے کرتے تھے!۔

مطابق پیرپنشتیم (جسے مین آئندہ اختصار کے خیال سے صرف پیر کہونگا) نے ایک بہت بڑی کشتی تیار کی، جو ایک سو بیس ہاتھ لانبی اور اسی قدر چھوڑی تھی اور اُس مین اوپر نیچے چھ منزلین تھین۔ اس کشتی کے بننے مین پورے چھ دن لگ گئے، اور جب ساتوین دن تیار ہوگئی تو پیر نے اپنے گھر کے سب لوگون کو اُس مین بٹھا دیا، پھر اپنا تمام سازوسامان، گھر کا کل اسباب، سونا چاندی زیور، نوکر چاکر، جانور اور کھانے کے لئے اناج غلہ وغیرہ، غرض یہ کہ سب کچھ اس کشتی کی چھ منزلون مین بھر دیا، اُسی روز رات کے وقت دیوتاؤن نے خوب پانی برسایا۔ پیر نے آیَع دیوتا کی ہدایت کے مطابق سب دروازے بند کرلئے اور کشتی کو پانی کے بہاؤ پر چلنے دیا۔ پھر کیا تھا، بادل خوب گرجے اور کڑکے، بجلیان کوندین، زمین کے جتنے بھوت پریت اور دیو جن تھے سب کے سب زمین کے اندر سے اپنی اپنی مشعلین لیے لیے کر باہر نکل آئے اور خوب جی کھول کے بادل اور بجلی کی مدد کی۔ ایک دن کے اندر ہی اندر یہ حال ہو گیا کہ ساری زمین پر سوا پانی کے اور کچھ نظر نہین آتا تھا! آخر اشتر دیوی کو زمین والون پر رحم آیا، اور اُس نے دیوتاؤن سے التجا کی کہ اب انسانون پر رحم کرو۔ تب کہین چھ دن اور چھ رات کے بعد پانی کم ہونا شروع ہوا۔ پیر نے یہ اندازہ کرنے کے لئے کہ کہین کسی جگہ خشکی بھی نمودار ہو گئی ہے یا نہین، پہلے ایک فاختہ کو اڑایا، مگر اُسے کہین پاؤن رکھنے بھر کی جگہ نہ ملی اور وہ مایوس ہو کر پھر کشتی مین واپس آگئی۔ اس کے بعد پیر نے یکے بعد دیگرے ایک ابابیل کو، پھر ایک کوّے کو اڑایا۔ ابابیل تو فاختہ کی طرح مایوس ہو کر واپس آگئی، مگر کوّا ایسا گیا کہ پھر نہ آیا۔ اس کے غائب ہو جانے سے پیر کو یقین ہو گیا کہ کہین نہ کہین ضرور خشک زمین نکل آئی ہے، آخر جب ایک پہاڑ پر پہنچ کر اُس کی کشتی رکی، تو وہ خود بھی اُترا اور اپنے تمام انسان اور حیوان رفیقون کو بھی اُتارا۔ سب نے مل کر دیوتاؤن کا شکر ادا کیا اور اُن کے نام پر چڑھاوے چڑھائے[۱]۔ رفتہ رفتہ کچھ عرصہ کے بعد پیر کے خاندان مین پھر وہی اگلی سی چہل پہل ہو گئی، اور دُنیا کی آبادی مین اضافہ ہونے لگا۔

ہندی متھیا کی روایات کے مطابق اہل ہندوستان کا عقیدہ ہے کہ دُنیا کی زندگی کے چار زمانے ہین کرت یگ، تریتا جگ، دواپر جگ اور کلجگ ۔۔۔ ہر یگ کے خاتمہ پر ایک بڑا سا طوفان آتا ہے جس سے دنیا فنا ہو جاتی ہے، یا یون کہئے کہ اسی طوفان کے اٹھنے سے ایک جگ ختم ہوتا ہے اور اُس کے بعد سے نیا جگ قائم ہوتا اور نئی دنیا آباد ہوتی ہے۔ مہابھارت (بان پرب) مین ایک روایت ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب دُنیا مین انسانون کی آبادی اتنی بڑھ گئی کہ زمین پر اُن کے رہنے سہنے اور رینگنے پھرنے کی جگہ باقی نہین رہ گئی اور دھرتی ماتا کے جوڑ جوڑ مین درد ہونے لگا، تو وہ گھبرا کے نارائن جی (سب سے بڑے دیوتا) کے پاس گئین اور اپنی ساری بپتا سنا کر اُن کی کرپا اور دیا چاہی، نارائن نے اُن کا یہ دُکھ دور کرنے کے لئے ایک بڑا سا طوفان بھیجا جس سے سب انسان فنا ہو گئے۔ اس کے بعد پھر آہستہ آہستہ انسانون کو پیدا کر کے زمین کو آباد کر دیا

[۱] اُس استبدادی طرز عمل کے بعد یہ ستم ظریفی قابل داد ہے، شہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب الٹا!۔

مہابھارت کی اس روایت کے علاوہ طوفان کی ایک اور ہندی روایت "ست پت براہمن" مین درج ہے اور منوجی سے متعلق ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک روز صبح کو جب منوجی نے نہانے کے لئے پانی مانگا تو اُس مین ایک چھوٹی سی مچھلی تھی، جس نے اُن کے ہاتھ مین بیٹھ کے باتین شروع کین اور کہا کہ ایک طوفان آنے والا ہے اور مین اس شرط سے تمھین اس سے بچانے کا وعدہ کرتی ہون کہ تم میری اس طرح حفاظت کرو کہ پہلے مجھے ایک چھوٹی سی گھڑیا مین رکھو، پھر ایک تالاب مین رکھو اور جب مین اتنی بڑی ہو جاؤن کہ اس تالاب مین نہ سما سکون تو مجھے احتیاط سے سمندر مین چھوڑ دو۔ منوجی نے اُس کی حفاظت کا وعدہ کیا، اور بڑی سی ناؤ بنا کے اُس مین ہو بیٹھے۔ کشتی کے تیار ہونے تک وہ مچھلی بڑھتے بڑھتے اتنی بڑی ہو گئی کہ تالاب مین نہین سماتی تھی تب منوجی نے اُسے سمندر مین ڈالدیا مچھلی کی پیشگوئی کے مطابق ایک زبردست طوفان آیا اور اُس نے دنیا کے سب جاندارون کو ہلاک اور برباد کر دیا۔ منوجی کی ناؤ اس سراسیمگی کے عالم مین ڈگر ڈگر کرتی پھرتی تھی، کہ اُن کی وہی مچھلی اُن کو سر بن دینے کو آموجود ہوئی۔ منوجی نے اپنی ناؤ کو اُس کے سر سے باندھ دیا، اور اُس نے اُسے لے جا کر اُتر طرف کے (غالباً ہمالیہ) پہاڑون پر رکھ دیا۔ منوجی وہان اُتر گئے اور جیسے جیسے پانی ہٹتا اور کم ہوتا گیا وہ بھی نیچے کو آتے گئے۔ جب میدان مین پہنچ گئے تو انھون نے دیوتاؤن کے نام پر چڑھاوے چڑھائے اور قربانیان کین دیوتاؤن کے دل بھی آخر پسیج گئے اور انھون نے اپنی دیا سے دھرتی کو پھر نئے سرے سے آباد کر دیا۔

بھاگوت پران مین طوفان کا قصہ یون لکھا ہے کہ ایک دفعہ جب برہماجی سو رہے تھے ایک راکھشس سارے وید چرا کر لے گیا ہری دیوتا ایک مچھلی کا بھیس بھر کے راجا ستیا ورت کے پاس گئے، جو صرف پانی پی پی کے زندگی بسر کیا کرتا تھا۔ یہ مچھلی (منوجی کی مچھلی کی طرح) بڑھتی رہی یہان تک کہ بیس لاکھ میل لانبی ہو گئی۔ راجا ستیا ورت نے طوفان سے بچنے کے لئے ایک بڑی سی ناؤ بنائی (یا اُسے کہین سے مل گئی) جس مین وہ بہت سے برہمنون کو ہمراہ لے کر داخل ہو گیا۔ جب راجا نے برہمنون کی ہدایت سے دیوتاؤن کی تعریف کے بھجن گائے، تب کہین اُسے اس آفت سے خلاصی کی صورت نظر آئی۔ ہری دیوتا نے اُس راکھشس کو قتل کر دیا اور اُس سے سب وید جو وہ چرائے گیا تھا چھین لئے اور ستیا ورت کو اُس کی تپسیا اور بھجن گانے کے انعام مین ساتوان منو بنا دیا۔

(باقی)

"محمد نعیم الرحمن" ایم اے

بازگشت

(بہ سلسلۂ ماسبق)

(۱۰)

دوسرے دن شام کو ممتاز دکان سے کسی قدر دیر کرکے آیا۔ ادریس خلاف معمول گھر پر موجود نہ تھا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ کہین سیر کو گیا ہے۔ آج یہ پہلی بار ادریس بغیر ممتاز کو ساتھ لئے سیر کے لئے نکل گیا تھا۔ ممتاز اس سیرگاہ کو جانتا تھا۔ اُسکی زبان سے اضطراری طور پر نکل گیا

نئے فتنون مین اب چرخ کہن کی آزمائش ہے

یہ کہکر وہ اپنے گھر چلا گیا۔ اُسدن رات کو پھر نہ وہ ادریس سے ملنے گیا اور نہ ادریس نے اسکو بلایا۔ مگر وہ تمام رات متفکر رہا

ادریس قصداً ممتاز سے پہلو بچا کر نکل گیا تھا۔ اور اسکے قدم بے اختیار اسکو تیواری پور کی سمت لئے جارہے تھے۔ آج وہ عمر مین پہلی بار ایسے ناوقت پر بستی سے گذر رہا تھا لیکن اپنے خیالات مین کچھ اس طرح گم تھا کہ اسکو اسکا مطلق احساس نہ ہوا۔ جنگل سے باہر نکل کر اسکی نگاہین سب سے پہلے اس طرف کو اُٹھین جہان کل اُسنے مریم کو دیکھا تھا۔ مریم وہان نہ تھی۔ ادریس کی مایوسی دیکھنے کے قابل تھی۔ وہ اپنے دل مین ایک ایسی گرانی محسوس کرنے لگا جسکو برداشت نہین کیا جاسکتا۔ اس گرانی کو لئے ہوئے پلٹنا چاہتا تھا کہ ایک طرف سے ایک لطیف و نازک آہ سنائی دی۔ آہ مین ایک کیفیت تھی جسکو گرد و پیش سے خاص مناسبت تھی۔ ادریس کی نظر اُٹھ گئی۔ مریم دریا سے کچھ فاصلہ پر جنگل سے قریب ایک ٹیلہ پر بیٹھی تھی۔ اُسنے ادریس کو دیکھ لیا تھا۔ ادریس نے جب اسکو دیکھا تو اسکی نگاہین جھک چکی تھین وہ ادریس سے زیادہ دور نہ تھی

ادریس دم بخود ہوکر اسکو دیکھنے لگا۔ مریم آنکھین نیچی کئے بیٹھی رہی۔ رہ رہ کر اسکے منہ سے دہی دہیمی آہ نکل رہی تھی جسکے معنی ادریس سمجھ نہ سکا۔ ایسی بھیانک تنہائی مین رات کی بلاؤن سے مریم کی بے پروائی اس بات کی دلیل تھی کہ اسکو دنیا مین کسی چیز کا ڈر نہین ہے۔

ہوا کے ہلکے جھونکون مین ترنم تھا کہا جاسکتا ہے کہ جنگل کی روحین اپنی زبان مین باتین کررہی تھین اور مریم بھی انکی گفتگو مین شریک تھی اسکی آہون کا سلسلہ بدستور قائم تھا۔ اسکی صورت پر یاس و حرمان کا رنگ چھایا ہوا تھا جسکو شام کے دہندلکے نے اور بھی بڑھا دیا تھا۔ ادریس پتھر کی مورت بنا ہوا اسکو دیکھ رہا تھا اسکو یہ بھی خیال نہ تھا کہ اگر کسی نے اسکو اس حالت مین دیکھ لیا تو کیا کہیگا۔ مریم بھی کبھی کبھی ایک غلط انداز نگاہ ادریس پر ڈال لیتی تھی۔ ادریس کے دل کی دھڑکن اتنی تیز تھی کہ وہ اسکو اپنی کنپٹی کی رگون مین محسوس کررہا تھا۔ اسکا دل اس "دوشیزۂ صحرا" سے ہم کلام ہونے کے لئے تڑپ رہا تھا مگر اُسنے اپنے اندر اتنی جرات نہ پائی۔

رات اپنا جادو جگا رہی تھی۔ اندھیرا آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا۔ کائنات کا ذرہ ذرہ خواب کیطرف مائل تھا ہر چیز پر ایک ہیبت و جلال کا رنگ پھر رہا تھا پرندے بسیرا لے رہے تھے۔ شب بیدار جانورون نے اپنی گشت شروع کردی تھی۔ ادہر ادریس اور مریم نے اپنی اپنی

جگہ سے جنبش بھی نہ کی۔ مریم کا گھر تو خیر قریب تھا مگر ادریس اپنے گھر سے اسقدر دور تھا اور راستہ اسقدر ہولناک، کہ ایک ہوش و حواس والے آدمی کے دلمین محض اسکے خیال سے کپکپی پیدا ہو جاتی لیکن ادریس بر خود غلط اتنا تھا کہ اسکو اسوقت مریم کے سوا ہر چیز اسکے احاطۂ شعور سے نکل گئی تھی

تھوڑی دیر بعد مریم نے حرکت کی اور ٹیلے سے اُتر آئی گویا ابتک وہ اسی پُر اسرار تاریکی کا انتظار کر رہی تھی ادریس کا دل اس زور سے دھڑکنے لگا کہ اسکے سارے جسم مین ایک ہیجان سا پیدا ہو گیا اور وہ اسی جگہ بیٹھ گیا۔ اب مریم کی آنکھین ادریس پر جمی ہوئی تھین۔ وہ ادریس کے پاس آئی اور پوچھا "آپ کون ہین اور کہان جانا چاہتے ہین؟ آپ تو صورت سے بیمار معلوم ہوتے ہین

ادریس کی زبان سے ایک حرف نہ نکلا۔ وہ مریم کا مُنہ تکتا رہا۔ مریم اپنے اعصاب مین ایک لہر سی محسوس کرنے لگی وہ ادریس کی حالت کا اتنی دیر مین بہت کچھ صحیح اندازہ لگا چکی تھی۔ اُسنے بڑھکر ادریس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا اور پوچھا "آپکو بخار تو نہین ہے؟ ادریس مین اب مقاومت کی تاب نہ تھی۔ وہ گھبرا کر اُٹھ کھڑا ہوا اور چاہا کہ جلدی سے بھاگ کر مریم سے الگ ہو جائے اور اپنے گھر کا راستہ لے۔ مریم اسکی نیت سمجھ گئی۔ اُسنے ادریس کا ہاتھ تھام کر کہا "ٹھہرئیے مین آپکو یون نہین جانے دونگی۔ آپ بتا دیجئے کہ آپکو کیا ہوا ہے" ادریس بے وست و پا ہو کر رُک گیا۔ مریم کا حکم اسوقت ایک ملکہ کے حکم سے کم نہ تھا۔ اور اس حکم مین نہ جانے کونسی قوت تھی جسنے ادریس کے رگ و پے مین ایک جوش پیدا کر دیا۔ اسکی بیزبانی دور ہو گئی اور اب وہ اس قابل تھا کہ اپنی زبان سے شرح آرزو کر سکے

اُسنے مریم کو پیار کی نگاہ سے دیکھکر کہا "کیا بتاؤن مجھکو کیا ہوا ہے۔ وہی ہوا ہے جو ایک بار مجھکو غارت کر چکا ہے مین سمجھا تھا کہ اب اس بلا سے مین ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو گیا ہون۔ آہ مجھکو اپنی طبیعت کا کتنا غلط اندازہ تھا!"

مریم پھر کہا "آخر کچھ بتائیے تو وہ کونسی بلا ہے؟"

ادریس نے بیساختہ مریم کے دونون ہاتھ اپنے ہاتھ مین لے لئے اور کہا "مین دو دن کے اندر تمکو بری طرح چاہنے لگا ہون مین نے کل ساری رات ٹہل ٹہل کر کاٹی ہے۔ رہ رہ کر تمھارے خیال کو دل اور تمھاری صورت کو آنکھون کے سامنے سے ہٹانا چاہتا تھا مگر آخر کار اپنا چاہا کچھ نہ ہوا اور آج مین پاگلون کی طرح یہان تمکو کھڑا اتنی دیر سے دیکھ رہا ہون اور جی نہین بھرتا"

مریم نے اپنے تیور سے بغیر کسی قسم کی حیرت یا سراسیمگی کا اظہار کئے ہوئے پوچھا "آپنے مجھکو اس سے پہلے کب دیکھا تھا؟"

ادریس نے کل کی سرگذشت بیان کر دی اور پھر رابعہ کے ساتھ اپنی ناکام محبت کا واقعہ بھی من و عن بیان کر کے کہا "مریم شاید میرے مقدر مین یہی ہے کہ مین محبت کی آگ مین بھٹکتا رہون۔ مین نے کل تمکو ایک نظر دیکھا اور دیکھتے دیکھتے تمھارا ہو کر رہ گیا۔ دیکھو اسکا انجام کیا ہوتا ہے!"

مریم کو معلوم ہو گیا کہ وہ بلا کسی قسم کی جد و جہد یا ریشہ دوانی کے اپنی منہ مانگی مراد پا چکی ہے اسلئے اُسنے فوراً تکلف

اور اجنبیت کا پردہ ہٹا دیا اور ایک آہ کر کے کہا " تو آپ اسقدر ہراسان کیون ہوتے ہین؟ محبت تو مزے کی چیز ہے۔ کم از کم مجھکو تو اسمین بڑا مزہ مل رہا ہے۔ مین آپ سے پہلے یہ چوٹ کھا چکی ہون۔ آپ میری صورت دیکھ کر بے قابو ہو گئے۔ مین تو آپکا نام سنکر تڑپنے لگی تھی۔ اللہ اللہ اسکے بعد مین نے آپکی صورت دیکھنے کے لئے کیا کیا نہین کیا۔ آپ آج صرف دو تین گھنٹون تک دیکھتے رہے ہین۔ اور مین بشن گڈھ کے میلے کے دن صبح سے شام تک آپکی صورت دیکھتی رہی ہون" مریم نے بھی اپنی داستان سنا دی اور پھر کہنے لگی " یہ چاہت میری طرف سے شروع ہوئی اور یہ میری چاہت کا اثر ہے جسنے آپکو یون بے چین کر رکھا ہے اور یہ میری چاہت کا ثبوت ہے" مریم نے ادریس کا منہ چوم لیا۔ ادریس مبہوت ہو گیا۔ اسکو اپنے حواس پر اعتماد نہین رہا۔ اسکو ایسا محسوس ہونے لگا کہ وہ خواب مین ہے اور یہ سب کچھ خواب مین ہو رہا ہے

دونون طرف کی آگ برابر تھی۔ مریم اور ادریس ایک دوسرے کے ساتھ جیسا اس ایک رات مین کامیاب ہوئے شاید دو چاہنے والے ساری عمر گریۂ تمنا مین گذار دینے کے بعد بھی نہ ہوتے ہون

(۱۱)

دن گذرتے دیر نہین لگتی۔ پورے پانچ مہینے گذر گئے اور ادریس آنے والی پیچیدگیون سے بے خبر مریم کے ساتھ روزانہ شام کے تین چار گھنٹے خود فراموشی کے عالم مین بسر کرتا رہا! محبت کے تیور چھپنے نہین۔ ادریس کے چلن سے سب واقف ہو گئے اور رفتہ رفتہ وہ لوگون کی نظرون مین گر گیا۔ اور یہ سب مریم کی بدولت۔ اچھے بُرے کا واقعی کوئی صحیح معیار ہے یا نہین؟ اخلاقیات کے اس مسئلہ سے یہان بحث نہین۔ واقعہ یہ ہے کہ دنیا مین وہ معیار رائج نہین۔ دنیا والے جب کسی چیز کو اپنے گوں کی نہین پاتے یا اسکو اپنے توقعات کے خلاف پاتے ہین تو اسکو بُرا سمجھنے لگتے ہین۔ ادریس کی نئی زندگی لوگون کے توقعات کے خلاف تھی اسلئے قطعاً بُری تھی

ادریس نے سکینہ کو جس کوفت مین مبتلا کر دیا تھا اسکو اتنے دنون وہ ضبط کئے بیٹھی رہی۔ اسکی مایوسیون کی کوئی حد نہ تھی لیکن ابھی اسکو امید تھی اور قوی امید تھی کہ ادریس خود بخود پھر رہ راست پر آجائیگا۔ آخرکار یہ امید بھی موہوم ثابت ہوئی۔ مجبوراً سکینہ نے ایک دن جبکہ ادریس دوپہر کا کھانا کھا رہا تھا اس ذکر کو چھیڑ کر کہا " ادریس تمکو سوجھی کیا ہے؟ کوئی اس طرح بھی اندھا بھی ہوتا ہے؟ آخر مریم کہانکی بکاؤلی ہے جو تم اسکے پیچھے یون باؤلے ہو رہے ہو؟ ایک آبرو باختہ ہرجائی کے ہاتھون پڑ کر خاندان کا نام کیون ڈبوتے ہو؟ میری اُمیدون کا سارا دارمدار تم پر تھا۔ اُف کیسے کیسے ارمان میرے دل مین تھے! اُن کا پورا ہونا تو درکنار مین دیکھتی ہون کہ تم اُلٹے میرا مُنہ کالا کر رہے ہو۔ خدا کو مانو۔ ہوش مین آؤ۔ دیکھو دنیا نے تم کو کس عزت کی نگاہ سے دیکھنا شروع کیا ہے۔ کم از کم اسکا تو پاس کرو۔ آج دو روز ہوئے فیض آباد سے خط آیا ہے۔ مین نے مناسب موقع نہ پا کر تم سے ذکر نہین کیا۔ میرے بھائی جنھون نے ابتک اپنی بھکارن بہن کی بات بھی نہین پوچھی تھی اب چاہتے ہین کہ تمکو اپنی دامادی مین لے لین۔ یہ صرف اسلئے کہ تم ہونہار ثابت ہوئے اور تمھاری لیاقت نے تمھاری مفلسی کے عیب پر

پردہ ڈال دیا ہے۔ شاہدہ کو مین نے بچپن مین دیکھا ہے۔ صورت شکل والی ہے اور تمھارے مُنہ لائق ہے۔ لیکن مین بھائی سے کیا کہون اور کس برتے پر کہون؟ تم اپنی روش بدلو تو انکو اس نسبت کی منظوری کی اطلاع دیدون،،

ادریس سر جھکائے مان کی جھڑکیان سنتا رہا۔ اسکے بعد اسنے اپنے کو مجسم سنجیدگی بناکر جواب دیا "امان مین نے آجتک تم سے اس بارے مین ایک حرف اسلئے نہین کہا کہ مجھے اندیشہ تھا کہ تمکو میری باتون سے کوئی دکھ نہ پہنچ جائے۔ لیکن اب تمنے خود میری دُکھتی ہوئی رگ کو چھیڑا ہے۔ اسلئے اب میرا فیصلہ بھی سُن لو اور اس فیصلہ کو اٹل سمجھو۔ رابعہ سے بدمزہ ہونیکے بعد مین نے قسم کھائی تھی کہ اب کسی عورت سے کوئی سروکار نہ رکھونگا اور اپنی تمام عمر تجرد مین بسر کردونگا مگر ارادے بہ حیثیت ارادون کے پورے نہین ہوتے۔ میری زندگی نے ایک دوسری کروٹ لی۔ مجھے اس مریم سے دلبستگی پیدا ہوگئی۔ تم نے آج اچھی طرح اپنے دل کا غبار نکال لیا اور مریم کو جو جی مین آیا کہہ ڈالا اور مین نے چپ چاپ سُن لیا۔ لیکن اب مین کہے دیتا ہون کہ آئندہ اسکی شان مین ایسے تبرے سننے کے لئے تیار نہ ہونگا۔ تم جو چاہو سمجھو۔ مین مریم کو اپنے حق مین سیتا سمجھتا ہون اور اسکو اپنی تمام عمر کا ساتھی بنانا چاہتا ہون۔ مجھے ٹھیک معلوم نہین کہ زمانہ کی ناسازکاریون نے تم پر کیا اثر ڈالا ہے لیکن مین اپنی ذات سے زندگی کے ہاتھون بُری طرح مٹ چکا ہون اور اب دنیا کے رسم و رواج اور تکلف و تصنع کی تاب نہین لاسکتا۔ مریم ہرجائی ہے تو ہوا کرے۔ شیخ سید نہین تو نہ ہو۔ مین اسکو دنیا کی شریف زادیون پر ترجیح دیتا ہون اور مجھکو یقین ہوگیا ہے کہ اگر اب مین کسیکے ساتھ خوش رہ سکتا ہون تو مریم کے ساتھ۔ تم فیض آباد میرا صاف انکار لکھ بھیجو۔

سکینہ کا پیمانہ صبر پہلے سے لبریز تھا۔ بیٹے کی اس صاف گوئی نے اسکو چھلکا دیا۔ اُسکا چہرہ تمتما اُٹھا۔ آج وہ ایک دوسری سکینہ تھی جس مان نے ابتک ادریس سے کبھی سختی یا ترشی کے ساتھ بات بھی نہین کی تھی آج وہ غضبناک تھی۔ ادریس کا فیصلہ سنکر اُسنے بھی اپنا مختصر فیصلہ سنا دیا "مین اس قحبہ کا نام آئندہ پھر کبھی سننا گوارا نہین کرسکتی اگر تمکو اپنے ارادہ سے باز نہین آنا ہے تو آج سے مجھے اپنی صورت نہ دکھانا،،

یہ سنکر ادریس کے تیور بدل گئے۔ اسکی صورت سے جلال و جبروت ٹپکنے لگا۔ آج وہ دبی ہوئی قوت کام کر رہی تھی جسنے اسکو زندگی کی تلخیون کو شربت کی طرح پی لینے کے قابل بنا دیا تھا اور رابعہ کو اکدم خاطر انداز کرکے یکسوئی کے ساتھ علمی مشاغل مین منہمک ہوگیا تھا۔ ادریس نے سنگدلی اور بےمہری کے ساتھ مان کو جواب دیا "بہتر ہے،، اور فوراً اُٹھکر باہر چلا گیا اور پھر مان کو اپنی صورت نہین دکھائی۔

بات کی بات مین ادریس کو مان سے نفرت ہوگئی۔ اسکو یہ یقین ہوگیا کہ دنیا کے رسوم و قیود نے نہ صرف سکینہ کی آنکھون پر بلکہ اسکے دل پر بھی پردہ ڈال دیا ہے۔ اور وہ ان بندشون پر اپنے بیٹے کی مسرتون کو قربان کردینا چاہتی ہے۔ جسوقت ادریس مان سے کبیدہ ہوکر باہر آیا تو ممتاز کو انتظار کرتا ہوا پایا جب سے ادریس مریم مین محو ہوا

ممتاز کو رام نگر مین سونیکی نوبت نہیں آئی ادریس نے اسکو اپنے ساتھ سونیکے لئے بلانا چھوڑ دیا تھا۔ اب ادریس کو اپنی تنہائیوں مین لذت ملنے لگی تھی اور وہ تنہا رہنا چاہتا تھا۔ ممتاز سے بظاہر اب بھی وہی لگاؤ تھا لیکن حقیقتاً اب ادریس کی ساری گرمجوشی سارا تپاک دوسرے مرکز کی طرف مائل ہو چکا تھا۔ ممتاز کے ساتھ جو کچھ گفت و شنید ہوتی وہ زیادہ تر معاملات تک محدود ہوتی تھی ممتاز اسکو خوب محسوس کر رہا تھا مگر ادریس کو ابھی چھیڑنا اُسنے مناسب نہین سمجھا تھا۔ آج نہ جانے کیون اسکے دل نے کہا کہ چلو ایک بار اپنی سی کر آئین اور آنیوالی زندگی کا اونچا نیچا ادریس کے ذہن نشین کر آئین۔

ادریس باہر نکلا تو ممتاز کو اسکے تیور دھندلے نظر آئے۔ ادریس نے اسکو اپنی اس حالت پر غور کرنیکا موقع نہین دیا اور پوچھا "کہو ممتاز کیسے آئے؟ کیا دکان سے متعلق کوئی خاص بات ہے؟"

ممتاز نے بڑی جرأت کی اور کہا "نہین تمھاری ذات سے متعلق ہے۔ بُرا نہ مانو تو کہون"، "کہو" ادریس نے تامل کرتے ہوئے جواب دیا۔

ممتاز آنکھین جھکا کر کہنے لگا "کہنا یہ ہے کہ تمنے یہ جو نئی زندگی اختیار کی ہے اسمین شاید کافی سوچ بچار سے کام نہین لیا گیا ہے۔ مین اپنی جگہ یہی سمجھے ہوئے ہون کہ تم جو کچھ کر رہے ہو وہ آنکھین بند کر کے کر رہے ہو۔ ادریس مین وعظ و پند کی غرض سے نہین آیا ہون۔ میرا دل نہ جانے کیون دھڑک رہا ہے کہ کہین ایک دن تمکو یہ کہکر رونا نہ پڑے کہ

"الٰہی دل لگا تھا کس گھڑی کا"

ادریس پہلے ہی سمجھ چکا تھا کہ ممتاز کوئی اسی قسم کی بات کہنے والا ہے۔ اسنے ایک تلخ تبسم کے ساتھ کہا "ممتاز معلوم ہوتا ہے آج ساری دنیانے اپنی پند و نصیحت سے مجھکو راہ راست پر لانیکا بیڑا اُٹھا رکھا ہے۔ مگر خیر اپنی خیر اندیشی کا مختصر سا جواب سن لو۔ مریم کو دیکھتے ہی میرے اندر ایک لپی ہوئی آگ پھر بھڑک گئی اور اس سے ملنے کے بعد مجھکو معلوم ہو گیا کہ مین اسقدر آشفتہ اور دلگیر کیون رہتا ہون۔ مریم نے مجھے بتا دیا کہ مین کس درد کا مارا ہوا ہون اور اسکا علاج کیا ہے۔ مین محبت کا بھوکا تھا۔ محبت میرے خمیر مین ہے۔ مجھکو کسی ایسی چیز کی ضرورت تھی جسمین مین کھو کر رہ جاؤن۔ وہ چیز مریم کی صورت مین مجھے مل گئی

جلوہ کرد کہ من ہم ہمہ او گردیدم

اس سے زیادہ مین کہنا سننا نہین چاہتا۔"

ممتاز تھوڑی دیر تک ادریس کی صورت دیکھتا رہا۔ پھر اُسپر ایک مایوسانہ نگاہ ڈالتا ہوا وہان سے چلا گیا۔ ادریس اپنے کمرہ مین جا کر لیٹ رہا اور سوچنے لگا۔ وہ بہت دنون سے ارادہ کر رہا تھا کہ مریم کے ساتھ شادی کرلے اور یکبارگی تمام جھگڑے دن کو اُٹھا کر ختم کر دے۔ اُسنے اشارۃً مریم سے دو ایک دفعہ اپنے ارادہ کا اظہار بھی کیا تھا مریم اسکے جواب مین ادریس کو صرف پیار کر کے رہ گئی تھی ادریس نے بھی زیادہ اصرار نہین کیا تھا۔ مگر اب وہ اس بات پر تل گیا تھا کہ آج ہی مریم سے اس مسئلہ پر واضح گفتگو کر کے کوئی فیصلہ کرلے

ساون کا آخری موسم تھا صبح سے جھڑی لگی ہوئی تھی۔ ہوا مین ایک فردوسی ٹھنڈک تھی۔ بستر پر کروٹین بدلتے بدلتے

ادریس کو نیند آگئی اور پھر جو آنکھ کھلی تو سورج مغربی افق تک پہنچ چکا تھا۔ ادریس جلدی سے اُٹھا اور منہ ہاتھ دھوکر سیر بیتا کی راہ لی مریم ابھی نہین آئی تھی۔ ادریس جنگل کے اتر پورب ایک کنارے بیٹھکر انتظار کرنے لگا۔

۱۲

رات ہو چلی تھی۔ بارش بند تھی۔ لیکن آسمان کی فضا مکدر تھی۔ چاند کا کہین پتہ نہ تھا ستارون کی روشنی مدہم تھی۔ اردگرد باڑہ کے پانی سے جل تھل ہو رہا تھا۔ اندھیرے مین سطح آب کی روپہلی چمک دلون کو ہیبت وجلال سے معمور کر رہی تھی۔ کونہ کونہ سے عبرتناک صدائین نکل رہی تھین اور ادریس اپنے مقدر پر غور کر رہا تھا۔ اُسنے رام نگر کی "صحرائی زندگی" اسلئے اختیار کی تھی کہ اسکو ہیئت اجتماعی اور اسکی لغو اور لاطائل شورشون سے نجات ملجائے اور وہ رسم و روایت کی جانگسل زنجیر سے آزاد ہو کر راحت وسکون کی سانس لے سکے۔ مگر اب اسکو معلوم ہوا کہ یہان بھی وہی خدا پوجا جاتا ہے اور یہان کا باوا آدم بھی وہی ہے۔ دنیا مین رہکر دنیا کے جنجال سے آزادی چاہنا ایک خواب بے تعبیر ہے۔ پھر ان تمام جھگڑون اور محنتون سے گلوخلاصی حاصل کرنیکے لئے انسان عدم آباد کی راہ کیون نہین لیتا جہان یقیناً آسودگی نصیب ہے۔ ادریس اپنے خیال مین یہان تک پہنچا تھا کہ اسکو غالب کا یہ کہنا یاد آگیا

"وائے وان بھی شور محشر نے نہ دم لینے دیا　　لے گیا تھا گور مین ذوق تن آسانی مجھے"

ادریس کی توجہ کا مرکز بدلگیا اور اب وہ آسمان کی فضا مین گم ہو گیا۔ وہ ایسا محسوس کرنے لگا کہ یہ کوئی خیالی پرواز نہین ہے بلکہ جسمانی معراج ہے۔ وہ "چاند" "سورج" "قوس قزح" "ذات الفرس" اور "مسلسلہ" کی سحابی دنیا کی سیر کر رہا تھا جہان وہ سکون ہی سکون محسوس کر رہا تھا۔ یہ دنیا لطافتون سے آباد تھی اور یہان اُن الائشون کا خواب بھی کسی نے نہین دیکھا تھا جن سے اس "خراب آباد" کا ذرہ ذرہ مملو ہے۔

ادریس کی افلاک نوردی نہ جانے اسکو کہان لیجاتی اگر کسی کے قدمون کی آہٹ اسکو چونکا نہ دیتی۔ اب وہ پھر اسی گرد وغبار کی کثیف دنیا مین سانس لے رہا تھا جہان آدم اور انکے بہکانیوالے پھینکے گئے تھے۔ ادریس کو آواز پر کان لگائے ہوئے مشکل سے چند لمحے ہوئے ہونگے کہ کسی نے سردی لہجے مین کہا "آج مجھے دیر ہو گئی۔ دادا آج کچھ بیمار ہین اُنھین کے کامون مین لگی رہی"۔ ادریس کچھ کہنے بھی نہ پایا تھا کہ مریم اسکی گود مین تھی۔ دونون کے ہونٹ ملے اور محبت کے عہدنامہ پر ایک تازہ مہر لگ گئی

چوبیس گھنٹے کے بچھڑے ہوئے دلون نے جب ایک دوسرے کے ساتھ جی کھول کر اپنے اپنے ارمان نکال لئے تو ادریس کو یاد آیا کہ وہ گھر سے کیا سوچ کر چلا تھا۔ اُسنے اپنی آواز کو غیر معمولی طور پر سنجیدہ اور متین بنا کر کہا "مریم مجھے تم سے آج ایک بات کہنا ہے"!

"وہ کیا؟ یہی کہ ہم اب اپنی محبت کو نہین ختم کر دین تو اچھا ہے؟" مریم نے بات کاٹ کر پوچھا۔

"نہین مریم نہین۔ مجھ پر ظلم نہ کرو۔ مین تمھاری اتنی محبت کرتا ہون کہ اسکے درد سے میرے دل ودماغ پھٹے جا رہے ہین۔ مین نے اس سے پہلے بھی محبت کی ہے مگر وہ محبت نہ تھی ایک خواب تھا۔ لاؤ مین تمھاری چاند سی صورت کو پھر غور سے

دیکھون۔ اسمین اور اُن بے شمار صورتون مین جنکو ابتک دیکھ چکا ہون کیا فرق ہے؟ کچھ نہین۔ مگر نہین اتنا فرق ہے جتنا کہ سونے اور خاک کے ذرون مین۔ مریم تمھاری آنکھون مین نشہ ہے جسکو مین اپنے رگ وپے مین ساری ہوتے ہوئے محسوس کر رہا ہون مین نے شراب پی ہے مگر اس نشہ کا تجربہ مجھے کبھی نہین ہوا تھا۔ ادریس نے مریم کا منہ پھر چوم لیا

مریم نے افسردہ لہجہ مین کہا "مین نے آج دن مین خواب دیکھا ہے کہ آپ بلا وجہ مجھ سے خفا ہو کر چلے گئے ہین اور پھر میرے رونے دھونے کا آپ پر کوئی اثر نہین ہوا۔ مین نے کیسے کیسے خدا کے واسطے دلائے لیکن آپ نے مڑ کر مجھے دیکھا بھی نہین۔ میرا دل کانپ رہا ہے کہ دیکھئے اس خواب کی تعبیر کیا ہوتی ہے"

"بیکار جی نہ کڑھایا کرو۔ یہ سب تمھارا وہم ہے اور کچھ نہین" ادریس نے جواب دیا "مین آج اسی مسئلہ کو طے کرنے آیا ہون۔ ہمارے دن یون کب تک بسر ہونگے۔ جہان تم ہر طرح سے میری ہو وہان شرعاً بھی میری ہو جاؤ۔ اب زیادہ غور و تامل کا وقت نہین ہے۔ صرف ایک بات میرے دل مین کھٹکتی ہے۔ اس کھٹک کو دور کر دو پھر جس تاریخ کو مناسب سمجھو ہم یہان سے کہین دور جا کر شادی کر لین۔ مین یہ جاننا چاہتا ہون کہ رؤف کے ساتھ تمھارے تعلقات کس قسم کے تھے؟"

مریم مسکرا دی۔ اسکی مسکراہٹ مین خود اعتمادی کے ساتھ ساتھ شرارت بھی تھی۔ ادریس نے کہا "سچ بتانا ورنہ میرے دل کا بوجھ بڑھتا جائیگا" مریم نے کہنا شروع کیا "رؤف میان نے خود مجھے چھیڑ کر مجھ سے راہ و رسم پیدا کی۔ مین اُن سے بھاگتی رہی۔ وہ میرا پیچھا کرتے رہے۔ آخر کار مجھے بھی ایسے بیدرد کی بے بسی مین مزہ آنے لگا۔ مین اُنکے سارے قصے سُن چکی تھی۔ مین اُن سے کھلکر ملنے لگی لیکن آپکو یقین ماننا ہے تو مانئے کہ آجتک رؤف میان نے میرے جسم کو چھوا تک نہین ہے۔ نہ جانے مجھ مین کیا تھا کہ میرے سامنے اُنکے ہاتھ پاؤن ڈھیلے رہتے تھے۔ جس تاریخ سے مین نے آپکی صورت دیکھی اُن سے ملنا بالکل چھوڑ دیا ہے۔ مجھے کہنا نہین چاہئے۔ اُنھون نے میرے قدمون پر گر کر خوشامدین کی ہین کہ مین اُن سے دامن نہ چھڑاؤن لیکن مین نے اُن سے کھلے الفاظ مین کہدیا کہ مجھے اُن سے دراصل کبھی کوئی لگاؤ نہ تھا اور نہ ہو سکتا ہے اور نہ زبردستی کی عشقبازی ہو چکی۔ رؤف میان اسکے بعد بھی اپنی سی کرتے رہے مگر آخر کار مجھے پتھر کی طرح اٹل دیکھکر صبر کر کے بیٹھ رہے۔ مین اُنکی نظرون مین بسی ہوئی ہون۔ وہ اگر آج چاہین تو مجھکو یہان سے اُجاڑ سکتے ہین۔ مجھے اسکی بھی پروا نہین ہے۔ مین تو آپ کا سودا مول لے چکی ہون" مریم نے سلسلہ ختم کر کے ادریس کو غرور و پندار کے ساتھ دیکھا۔ ادریس نے اطمینان کی سانس لی اور مریم کو لپٹا کر کہا "تو آج سنیچر کا دن ہے۔ آیندہ جمعہ کو تم میری بیوی ہو گی۔ جمعہ کا دن مبارک دن ہے"

مریم کے چہرہ سے ایک بےچینی کا اظہار ہونے لگا۔ وہ کچھ دیر چپ رہی۔ ادریس نے پوچھا "کیون؟ کیا تمکو منظور نہین ہے؟"

مریم نے ایک آہ کر کے کہا "منظور مجھے سب کچھ ہے مگر نہ جانے کیون میرا دل کہتا ہے کہ آپ مجھ سے شادی کر کے خوش نہین رہ سکینگے۔ میرے اندر بیوی بننے کی قابلیت بہت کم ہے۔ کیا یہ ممکن نہین کہ ہم ہمیشہ یونہی رہین؟ اچھا اس ذکر کو جانے دیجئے۔ دیکھئے چاند بادل کے پردون سے باہر نکل آیا۔ اسکی دھیمی روشنی مین آپ مجھے محبت کے دیوتا معلوم ہوتے ہین۔ آئیے اس رُت اور اس گھڑی سے

سے جو کچھ حاصل ہو سکے حاصل کرلین۔ آنے والی گھڑیون کی بابت جب مین سوچتی ہون تو طرح طرح کے وسوسے دل مین پیدا ہونے لگتے ہین،،
مریم کی آنکھین نم آلودہ تھین۔ ادریس پر ایک نشہ سا چھا گیا اور اسنے مریم کی کمر مین ہاتھ ڈالکر اسکو لپٹا لیا اور خوب پیار کیا
وہ اس سے پہلے بھی مریم کے منہ سے اسی قسم کی شاعری سن چکا تھا اور اسکو معلوم ہو گیا تھا کہ اس پیکر نور کو اگر باقاعدہ تعلیم و تربیت
دیجاتی تو وہ ہندوستان مین ایک چیز ہوتی۔ آج ادریس مریم کی باتون سے دیر تک لذت نہ اٹھا سکا۔ اسکو ایک قطعی فیصلہ پر
پہنچنا تھا۔ اسنے پھر کہا " مریم ذرا سوچو۔ دنیا بڑی بُری جگہ ہے۔ بلا شرع کی زنجیر مین جکڑے ہوئے ہمارا اس طرح ملتے رہنا معیوب
سمجھا جا رہا ہے اور ہر طرف شورشین پھیل رہے ہین۔ ہم دونون بدنام ہو رہے ہین۔ شادی کے بعد مجھے دنیا کے کہنے سننے کی مطلق
پروا نہ ہوگی،،

" لیکن آپکی مان کیا کہین گی،، مریم نے رکتے ہوئے پوچھا

ادریس نے بلند آہنگی سے جواب دیا " انکا جو جی چاہے کہین۔ مجھے اسکی بھی پروا نہین۔ مین نے اُنکے روٹی کپڑے
لیلئے کافی سامان کر دیا ہے۔ اُنکو میرے نہ ہونے سے کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ اب اگر وہ بیٹے کی خوشی مین شرکت کرنا چاہتی ہین تو کرین
ورنہ مین سمجھونگا میرے کوئی مان نہ تھی۔ مین ساری دنیا کی آسائشون کو تج دونگا اور تمھاری جھونپڑی کو بہشت سمجھکر تمھارے ساتھ
رہونگا۔ للہ مریم تم میرے سوال کو رد نہ کرو اور شادی کا اقرار کرلو ورنہ مین پھر کہین کا نہ ہونگا،،

مریم مجبور ہو گئی۔ وہ اپنا دل خون کر سکتی تھی مگر ادریس کو آزردہ کرنا اسکو گوارا نہ تھا۔ اُسنے صرف ایک شرط پیش کی اور
وہ یہ تھی کہ شادی کے بعد بھی وہ اسی طرح بے پردہ سیر و تفریح کیا کریگی۔ ادریس نے شرط منظور کرلی اور مریم نکاح پر آمادہ ہو گئی
وہی جمعہ کا مبارک دن نکاح کا دن ٹھیرا۔

جمعہ کا وہ دن بھی آ گیا مریم اور ادریس دو دن غائب رہے۔ اسکے بعد جو لوٹے تو گھر گھر اسکا چرچا تھا ہر شخص یہی کہہ رہا تھا
کہ ادریس کے دماغ مین ضرور کچھ فتور ہے جو اونچے خاندان کی پریزادیون کو چھوڑکر ایک بے نام و نسب بد قماش بھکارن کو یون گھر مین
بٹھا لیا۔ نکاح کے مفصل حالات کا پتہ نہین۔ اتنا معلوم ہے کہ ادریس مریم کو لیکر بستی چلا گیا تھا اور وہان قاضی اور گواہون کو جمع کرکے
خاموشی کے ساتھ نکاح پڑھوا لیا۔ دیکھنے والونکا بیان ہے کہ جب دونون واپس ہوئے ہین تو اُنکے چہرون پر اس بشاشت اور شگفتگی
کی کوئی جھلک نہ تھی جسکی ایسی حالت مین توقع کی جا سکتی تھی

ادریس کی زندگی مین اب کوئی کمی نہ تھی جس چیز کی اُسنے آرزو کی وہ اسکو در پردہ تقدیر،، سے مل گئی۔ اب اسکو آسودہ
ہونا چاہیئے لیکن نکاح کے چند ہی گھنٹون کے بعد سے وہ اپنے دل پر ایک بوجھ سا محسوس کرنے لگا جسکو وہ خود بھی نہین سمجھ سکتا تھا کہ
کیا ہے۔ وہ مریم کی صورت دیکھ دیکھ کر باغ باغ ہو رہا تھا مگر اسکے دل کے اندر جو کانٹے کھٹکنے لگے تھے اُنکا علم سوائے اسکے دل کے اور
کسی کو نہ تھا

مریم اب ادریس کیلئے کوئی دیوی یا پری یا دیوتی کی کوئی کاہنہ نہ تھی بلکہ دنیا کی ایک معمولی عورت تھی جس کیلئے اسکو دنیا کے طعنون اور سرزنشون کا مقابلہ کرنا تھا۔ مریم اب زمانہ کے تند جھونکون سے محفوظ رہنے کیلئے ادریس کے سایۂ دامن کی محتاج تھی

ادریس مریم کے ساتھ اپنے گھر مین نہ رہ سکتا تھا۔ وہ اپنے قول کا سچا نکلا۔ اُسنے رسول شاہ کی جھونپڑی مین بود و باش اختیار کرلی۔ اس جھونپڑی کو اُسنے اپنی ضرورتون کے مطابق پھر سے بنوایا اور تیوارہی پور مین ایک نیا مکان تعمیر کرانیکی فکر مین لگ گیا

مدرسہ اور دکان کا کام بدستور جاری رہا۔ ممتاز ضروری معاملات مین اب بھی ادریس سے ملکر اس سے مشورہ لیتا رہتا تھا مگر اب ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دونون کے درمیان ایک گہری خلیج حائل ہوگئی ہے۔ ادریس کو مدرسہ کے ساتھ وہی انہماک تھا۔ مگر وہ چارون طرف بدنام ہو رہا تھا اور مدرسہ کا کام خود بخود سُست ہونے لگا تھا

(۱۴)

سات مہینون کی مدتمین ادریس کو ہر طرف کی انگشت نمائیون سے پناہ ملگئی اور اب کہا جا سکتا تھا کہ مریم اور ادریس دونونکو یکسوئی نصیب ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ ادریس پر ردعمل شروع ہو گیا تھا۔ وہ اگر پچھتا نہین رہا تھا تو اسکا یہ خیال ضرور پکا ہوگیا تھا کہ اُسنے مریم کے ساتھ شادی کرنے مین غیر معمولی عجلت کو راہ دیا۔ ماں کے چھوٹ جانیکا غم اسپر مستزاد تھا اور وہ اس غم مین بھی بہت کچھ گھل رہا تھا۔ ادریس بھی اپنی ماں کی طرح بات کا پکا آدمی تھا اُسنے ایکبار بھی سکینہ سے ملنے کی آرزو ظاہر نہین کی مگر مریم سے اسکا درد چھپا نہ تھا۔ ادریس مریم سے ہنس ہنس کر میٹھی میٹھی باتین کیا کرتا تھا اور مریم اسکی ہنسی مین دُکھے ہوئے دل کی ایک جھلک دیکھ لیتی تھی

دو تین مہینون سے ادریس کی آنکھین سوجی ہوئی تھین۔ پہلے تو اسکو معمولی آشوب سمجھا گیا اور اسکی وجہ کثرت مطالعہ بتائی گئی لیکن کچھ دنون سے چارہ گرون کو یہ اندیشہ ہو گیا تھا کہ ادریس کی آنکھین کہین عمر بھر کیلئے بیکار نہ ہو جائین۔ گورکھپور کے ایک ڈاکٹر کا علاج شروع ہوا۔ ادریس کی آنکھون پر پٹی بندھ گئی اور روشنی سے پرہیز کرنیکی سخت تاکید ہوگئی۔ ادریس اسی رسول شاہ کی جھونپڑی مین دن رات ایک اندھیری کوٹھری مین بند رہنے لگا۔ اب اسکا دماغ اپنی پوری جولانی کے ساتھ زندگی کی ناکامیون پر غور کر رہا تھا۔ اسکی اُمیدون کا طلسم ٹوٹ چکا تھا اور اسپر یہ سنگین حقیقت روشن ہو چکی تھی کہ مریم کے ساتھ آسودہ رہنا اس کے لئے اور بھی دشوار ہے

ادریس کا ادھر یہ حال تھا۔ اُدھر مریم کی مایوسیان بھی کچھ کم نہ تھین۔ شادی سے پہلے وہ طرح طرح کے خواب دیکھ رہی تھی اُسکی طبیعت اس خانقاہی زندگی سے اب اُچاٹ ہو چکی تھی۔ اُسنے ادریس کو لکھنؤ اور دوسرے بڑے شہرون کی پرتکلف زندگی کا ذکر کرتے ہوئے سنا تھا جو اسکو دلفریب درخوش آئند معلوم ہو رہی تھی۔ اُسنے کئی بار ادریس سے کہا بھی تھا "آپ ناحق ایسے ایسے شہرون کو چھوڑ کر اس اُجڑے دیار مین اپنی زندگی کو خاک مین ملا رہے ہین۔ آپنے ایسی ایسی مشقتون کے بعد علم حاصل کیا۔ اس سے آپکو فائدہ اُٹھانا چاہیئے تھا جن شہری دلچسپیون کا آپ ذکر کرتے ہین کاش وہ مجھے میسر ہوتین،، ادریس ہنس کر اسکا جواب دیتا تھا " مریم تمکو اس زندگی کا تجربہ نہین ہے اسلئے اُسکی آرزو کر رہی ہو مین جانتا ہون کہ وہ کیسی بےچین زندگی ہے اسلئے اس سے پناہ مانگتا ہون،،

شادی کے بعد مریم نے زبردست تحریک شروع کی کہ ادریس اس کو ردہ کو چھوڑ دے اور کسی دور و دراز شہر مین ذریعۂ معاش تلاش کر کے اسکے ساتھ تعیش کی زندگی بسر کرے۔ ادریس برابر ٹالتا رہا۔ آخرکار ایک روز مجبور ہو کر اُسنے نہایت حقارت اور بیدردی سے کہدیا "مین تمھاری اس خواہش کو پورا کر کے اپنی زندگی عذاب نہین بنا سکتا"۔ مریم نے پھر کچھ نہ کہا مگر اس جواب سے اسکو جو ملال ہوا وہ کبھی اسکے دل سے گیا نہین۔

... مریم کو سب سے بڑا صدمہ یہ تھا کہ اب ادریس بات بات مین اس سے بگڑ جاتا تھا اور سخت سست کہنے لگتا تھا۔ مریم سب کچھ برداشت کر سکتی تھی لیکن ادریس کی چڑھی ہوئی تیوریان اور اسکی ہر وقت جھڑکیان اسکے لئے زہریلے نشتر سے کم نہ تھین ادریس تھوڑی ہی دیر بعد مریم کو خوشامدین کر کے منانے لگتا تھا اور مریم من بھی جاتی تھی مگر مریم کو یہ معلوم ہو گیا تھا کہ اب اسکو تمام عمر انھین کانٹون مین رہنا ہے جنکو خود اُسنے اپنے دل کے خون سے سینچ سینچ کر پرورش کیا ہے۔ وہ سمجھ چکی تھی کہ ادریس باوجود اپنے دعوی کے مان کو نظر انداز نہین کر سکتا اور چونکہ اپنے کئے کی لاج بھی ہے اسلئے مان سے معافی مانگ کر مصالحت بھی نہین کر سکتا نتیجہ یہ ہے کہ سارا نزلہ "عضوِ ضعیف" پر گرتا ہے اور مریم موردِ عتاب بنتی ہے۔ اب اسکو یہ فکر تھی کہ کسی طرح مان بیٹے مین ملاپ ہو جائے۔ اس ملاپ سے اسکو یقین تھا کہ ادریس کی کوفت تو قطعاً دور ہو جائیگی اور بہت ممکن اسکی خود اپنی زندگی بھی خوشگوار ہو جائے۔ اس خیال سے ایک دن جبکہ ادریس رات بھر کی بیخوابی کے بعد دوپہر کو سو رہا تھا مریم اُٹھی اور ایک چادر سر سے لپیٹ کر رام نگر کیطرف چلی۔ ادریس کے مکان پر پہنچکر وہ سیدھی اندر داخل ہو گئی۔ سکینہ ایک چارپائی پر لیٹی ہوئی تھی۔ گھر مین کوئی دوسرا نہ تھا۔ مریم سکینہ کو سلام کر کے اسکے پاس بیٹھ گئی۔ سکینہ نے مریم کو کبھی دیکھا نہین تھا۔ مریم نے اسکو حیرت کا موقع نہین دیا۔ اور بلا کسی تمہید کے اپنا تعارف کرایا۔ سکینہ کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ مریم نے چند منٹ کے اندر نہایت اختصار کے ساتھ ادریس کی اندوہناک حالت بیان کر دی اور پھر آنکھون مین آنسو بھر کر کہنے لگی "آپ مجھے جو چاہئے سمجھئے اور جو چاہے کہئے۔ مین آپکو اپنی مان سمجھتی ہون۔ گنہگار مین ضرور ہون لیکن اس گناہ پر میرا کوئی اختیار نہ تھا۔ مین نے آپکے بیٹے کو اس نادانی سے بہت روکنا چاہا مگر اُنھون نے میری ایک نہ سنی اور اب اگر وہ اپنے کئے پر پچھتا نہین رہے ہین تو آپ سے یون چھٹ جانیکے ملال مین گھُل ضرور رہے ہین اگر آپ نے سچے دل سے اُنکو معاف نہ کیا تو مجھے ڈر ہے کہ نصیب دشمنان اُنکی جان پر آبنے گی۔ اگر آپ یہ چاہین کہ مین اُنکو چھوڑ دون تو مین اسپر راضی ہون بشرطیکہ وہ مجھکو چھوڑ سکین۔ میرا خدا مالک ہے۔ کسی نہ کسی طرح زندگی کٹ ہی جائیگی"

مریم کا لب و لہجہ اتنا دردناک تھا کہ پتھر بھی پانی ہو سکتا تھا مگر سکینہ پر اس کا اُلٹا اثر ہوا۔ اسکا چہرہ سرخ ہو گیا اور اسکی صورت سے غیظ ٹپکنے لگا۔ اسمین شک نہین کہ مریم کی صورت اور اسکی باتون کا اسپر کافی رعب چھا گیا تھا اور اسمین بھی شک نہین کہ وہ ادریس پر جان نثار کر سکتی تھی لیکن کسی طرح اس خیال کو اپنے دل سے دور نہ کر سکتی تھی کہ وہ سیدھے اور مریم کوچہ و بازار کی ایک رذیل بدمعاش عورت ہے۔ اُسنے اپنے غصہ مین کانپتے ہوئے ہاتھ سے "دور باش" کا اشارہ کرتے ہوئے کہا "اپنی سفارش اپنے پاس رکھو اور اپنی چرب زبانی سے کہین اور جا کر کام لو۔ مجھے معلوم ہے کہ ادریس کو میری ضرورت نہین ہے ورنہ

آج وہ مجھ سے یون منہ موڑ کر میری محبت کو تم پر نہ قربان کر دیتا۔ اب تم ادریس کو بھیک سمجھ کر مجھے واپس دینے کے لئے تیار ہو؟ شاید اب کوئی اور نگاہ پر چڑھ گیا ہے۔ بس اب یہان سے چلی جاؤ اور پھر میرے گھر مین اپنے قدمون کی برکت نہ لانا"۔ سکینہ کو اسوقت دیکھنے والے جلاد سمجھتے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ ضد اور آن والی عورت تھی اسکو اپنی سیادت پر گھمنڈ تھا ورنہ آج وہ مریم کو ضرور اپنی بہو تسلیم کر لیتی۔ مریم آنکھو نمین آنسو بھرے چلی گئی۔ سکینہ اسدن شام تک پڑی سسکیان لیتی رہی۔

مریم رام نگر سے ملول و دلگیر چلی تھی اور راستہ بھر سکینہ کے برتاؤ پر غور کرتی رہی۔ پربتیا کے قریب پہنچتے پہنچتے اسکا رنج غصہ سے بدلگیا اور اب اسکے خیالات نے پلٹا کھایا۔ سکینہ کے انداز سے اسکو یہ معلوم ہوا تھا کہ اگر مان بیٹے ملگئے تو اب اسکی اپنی زندگی مصیبت ہو گی۔ اسکو یقین ہو گیا تھا کہ سکینہ کبھی اسکی دوست نہین ہو سکتی۔ مریم نے اسی جگہ قسم کھالی کہ جہانتک اسکا بس چلیگا وہ یہی کوشش کرتی رہیگی کہ ادریس اور سکینہ مین میل کی کوئی صورت نہ نکلنے پائے۔

مریم جنگل کے اندر سے ہو کر نہین جا رہی تھی بلکہ اس کھلے ہوئے راستہ سے جا رہی تھی جو آمی اور جنگل کے درمیان سے گذرتا ہے۔ آدھے سے زیادہ راستہ طے ہو چکا تھا۔ مریم اپنے خیالات مین گم تھی۔ اتنے مین بائین طرف سے کسی نے اسکا نام لیکر پکارا۔ آواز آشنا سی تھی مریم چونک پڑی۔ دیکھا تو جنگل کے کنارے رؤف کھڑا تھا۔ رؤف نے نگاہون سے التجا کرتے ہوئے کہا "اگر کوئی ہرج نہ ہو تو اتنی مدت کے بعد دو باتین مجھ سے بھی کرتی جاؤ"۔ مریم ہچکچاتے ہوئے رک گئی۔ رؤف قریب آگیا اور چند منٹ تک مریم کو پرستارانہ نگاہون سے دیکھتا رہا۔ مریم نے گھبرا کر کہا "مجھے جلد گھر پہنچ جانا چاہئے۔ کہئے آپکو کیا کہنا ہے"۔ رؤف نے محسوس کر لیا کہ مریم اب وہ مریم نہین ہے۔ اسلئے کہ اسکے لہجہ مین آج وہ اکڑ وہ خودداری وہ معصومانہ سرکشی نہ تھی۔ رؤف نے ایک آہ کر کے کہا "خدا جانے تمنے اپنی زندگی بنالی یا نہین مگر مجھکو تو بری طرح مٹی مین ملا دیا۔ یون تو بظاہر مین جیسا تھا ویسا اب بھی ہون مگر کہہ نہین سکتا تمھاری صورت دیکھنے کو تمھاری باتین سننے کو ترستا ہون۔ اب اور کوئی آرزو کرنا تو بیکار ہے لیکن کیا یہ امید بھی ناجائز ہے کہ کبھی کبھی اپنی صورت دکھا دیا کرو۔ تم آزاد اب بھی ہو اور اتنا کر سکتی ہو۔ کہو تو مین اسی جگہ روز آیا کرون"۔ مریم نے سراسیمہ ہو کر جلدی سے جواب دیا "نہین آپ اسکی کوشش نہ کیجئے۔ مین بدنام ہو جاؤنگی۔ ہان اگر آپ کی حسرت صرف اسقدر ہے تو مجھ سے جب کبھی ہو سکیگا آپکو اپنا شامت زدہ منہ دکھا دون گی"۔ مریم رخصت ہو جانا چاہتی تھی۔ مگر رؤف نے پوچھا "کیون مریم شامت زدہ کیون؟ کیا تم خوش نہین ہو؟" مریم نے ملاقات کو مختصر کرنے کے لئے کہا "مجھے کوئی شکایت نہین۔ مجھے خدا کا دیا سب کچھ ملا ہے۔ لیکن اسکا کیا علاج کہ مین دنیا مین خوش رہنے کے لئے نہین بنائی گئی ہون۔ میری جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو یقیناً خوش ہوتا"۔ یہ کہکر وہ وہان سے روانہ ہو گئی۔

ادریس ابھی سو رہا تھا۔ مریم بیٹھکر اپنی گذشتہ اور موجودہ زندگی کا موازنہ کرنے لگی۔ کیا اسکے حق مین یہ بہتر نہ ہوتا کہ وہ بلا کسی قسم کی زنجیر مین اپنے کو جکڑے ہوئے اپنی تمام عمر گذار دیتی؟ یا اگر اسکو کسی کا پابند ہی ہونا تھا تو کیا رؤف ادریس سے زیادہ مستحق اور اس سے زیادہ موزون آدمی نہ تھا؟ آج پہلا دن تھا کہ مریم نے رؤف کو قدر کی نگاہون سے دیکھا تھا۔ لیکن ادریس کے مقابلہ مین رؤف کا خیال آتے ہی اسکو اپنی ذات سے شرم آنے لگی اُسنے "توبہ توبہ" کہکے فوراً اس خیال کو اپنے ذہن سے دور کر دیا اور آہستہ سے ادریس کو جاکر جگا دیا۔ ادریس فرشتون کو بھی خبر نہ تھی کہ مریم اتنی دیر مین کہان کہان ہو آئی اور کیا کیا کر آئی مریم نے بھی ادریس سے آج کے واقعات کا کوئی ذکر نہین کیا

(باقی) — مجنون گورکھپوری

حکومت برطانیہ کی وسعت کا راز
اور
قبضۂ ہندوستان کی دلچسپ داستان

ہم نے ہندوستان کس طرح فتح کیا؟ یہ سوال کہ ہمنے ہندوستان کس طرح فتح کیا، اُن سوالات سے جنکو مین نے گذشتہ سلسلۂ تقریرمین اُٹھایا تھا قطعی مشابہ نہین ہے۔ دنیائے جدید مین ہمارے نوآبادکارون نے یقیناً ایک وسیع خطہ پر تصرف کر لیا تھا لیکن وہ نسبتہً غیر آباد تھا، جن مشکلات کا اسکو مقابلہ کرنا پڑا زیادہ تر وہان کے دیسی باشندون کی طرف سے نہین تھین بلکہ یورپ کی دوسری قومون کی رقابت سے پیدا ہوی تھین۔ مین کسی حد تک بیان کر چکا ہون کہ رفتہ رفتہ کن کن طریقون سے ہم نے ان حریفون پر فوقیت حاصل کی۔ اس سوال کا جواب گو بادی النظر مین بالکل کھلا ہوا نہین معلوم ہوتا تاہم اسکا دریافت کر لینا زیادہ مشکل نہین۔ برخلاف اسکے یہ سوال کہ ہندوستان کس طرح فتح ہوا پہلی ہی نظر مین نہایت پریشان کن معلوم ہوتا ہے۔ یہان آبادی گنجان تھی، یہان کا تمدن، (گو اسکا سر چشمہ بالکل مختلف تھا) ایسا ہی حقیقی اور قدیم تھا جیسا ہمارا اپنا۔ ہم نے یورپ کی تاریخ مین متعدد مثالین ایسی دیکھی ہین کہ ایک سمجھدار قوم کو جو زبان و مذہب مین اپنے حملہ آورون سے قطعی مختلف تھی، فتح کرنا بالکل ناممکن ہوگیا ہسپانیہ کی پوری طاقت اسّی سال مین بھی ڈچ کے صوبون کو جنکی آبادی نہایت مختصر تھی نہ فتح کر سکی۔ یہی حال پرانے زمانہ مین سوئٹزرلینڈ والون اور حال مین یونانیون کا تھا کہ وہ مغلوب نہ ہوسکے اور ٹھیک اُسی وقت جب ہم نے ہندوستان کی فتح کا پہلا قدم اُٹھایا، ہم امریکہ کے ۳۰ لاکھ باشندون کو جو ہماری ہی نسل سے تھے تاج برطانیہ کا وفادار رکھنے مین ناکام رہے۔ یہ کیسا عجیب اجتماع ضدین ہے! انگریزون نے جنگ امریکہ کی سی مایوس کن نااہلی کبھی نہین دکھلائی اسوقت بظاہر یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ انکے عروج کا زمانہ ختم ہوگیا اور انگلینڈ کا زوال شروع ہوگیا۔ لیکن اُسی وقت ہندوستان مین وہ بحیثیت ایک ناقابل مقاومت فاتح کے نظر آرہے تھے اور اپنی اسی فوقیت کو دیکھکر وہ اپنے کو بہادرون کی ایک قوم سمجھنے لگے تھے۔ اس اختلاف کی کیا تشریح ہوسکتی ہے؟

تاریخ کا مطالعہ اسقدر سطحی نگاہ سے . . . . کیا جاتا ہے کہ یہ اختلاف یا بالکل . . . نظر انداز ہوجاتا ہے یا زیادہ سے زیادہ ہماری نظرون کے سامنے فتح کی ایک جھلک آجاتی ہے جسکی وجہ سے ہم خیال کرتے ہین کہ باوجود ان باتون کے اُسوقت ہمارے اندر آثار حیات موجود تھے۔ یقیناً (اگرچہ اس اختلاف کی تاویل کتنی ہی مشکل معلوم ہو) اسمین کوئی شبہہ نہین ہے کہ بارہا ہندوستان مین پلاسی یا دوسرے موقعون پر ہماری فوجون نے خوفناک مشکلات کے باوجود فتوحات حاصل کین۔ اگر ہم یہان اپنی قومی برتری پر ناز کرین اور محسوس کرین کہ ہندوؤن کے مقابلہ مین ہم خوفناک لوگ ہین تو کوئی مضائقہ نہین۔

لیکن سچ مچ کیا یہ دعوی اس مشکل کو رفع کر سکتا ہے؟ فرض کرلو کہ ایک انگریز سپاہی ۱۰ یا ۲۰ ہندوؤن کے برابر ہے۔ کیا اسوقت بھی یہ قیاس مین آسکتا ہے کہ انگریزون نے سارے ہندوستان کو فتح کرلیا جس وقت یہ فتح شروع ہوئی انگریزون کی کل تعداد ۱۲ ملین (ایک کروڑ ۲۰ لاکھ) تھی اور ہندوستان کے علاوہ انکو دوسری جگہون پر بھی لڑائیان درپیش تھین۔ کلائیو کا کچھ زمانہ یورپ کی جنگ ہفت سالہ مین پڑتا ہے اور جب ہم نپولین سے برسرپیکار تھے تو لارڈ ویلزلی ہندوستان مین بڑے بڑے ملحقات کا اضافہ کر رہا تھا ہماری سلطنت فوجی نہین ہے۔ اُس زمانہ مین ہم کوئی زبردست نبرد آزما فوج رکھنے کے قابل نہین تھے اور نہ ہمکو اس کا دعوی تھا۔ اسطرح یورپ کی جنگون مین ہم عام طور پر بحری بیڑون سے کام لیتے تھے اور جب خشکی پر مقابلہ کی نوبت آتی تو کسی اپنے حلیف کے طرفدار ہو جاتے۔ چنانچہ کبھی آسٹریا کا ساتھ دیتے اور کبھی پروشیا کا۔ باوجود اپنی بری طاقت کی کمزوری کے ایسے وقت مین کیونکر ممکن تھا کہ ہم ہندوستان کے بڑے حصہ پر فتح حاصل کرتے جسکا رقبہ تقریباً ۱۰ لاکھ مربع میل اور آبادی ۲۰ کروڑ تھی۔ اسکی وجہ سے ہماری فوجی قوت اور خزانہ پر کتنا بار پڑا ہوگا۔ تاہم کسی وجہ سے یہ بار کبھی محسوس نہین ہوا۔ یورپ کی جنگون نے ہم پر اتنا قرض لاد دیا جو کبھی ادا نہ ہوسکا لیکن ہندوستان کی جنگون سے ہمارے قومی قرضہ مین مطلق اضافہ نہین ہوا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جو کچھ محنت و مشقت ہمکو وہان برداشت کرنا پڑین انکا کوئی اثر باقی نہ رہا۔

اسلیئے ضرور اس موجودہ خیال مین کچھ غلطی ہے کہ انگلینڈ سے سپاہی ہندوستان گئے اور انھون نے اپنے شجاعت اور ذہنی تفوق کی بدولت سارے ملک کو فتح کیا۔ ۱۸۱۸ء مین مرہٹون سے جو بڑی لڑائی ہوئی اس مین ہمارے ایک لاکھ سے زیادہ سپاہی تھے لیکن یہ کسقدر حیرت کا مقام ہے یہی وہ زمانہ ہے جب جنگ نپولین کے بعد ہماری بے سروسامانی اور بے بضاعتی حد درجہ المناک تھی۔ کیا یہ ممکن تھا کہ جنگ واٹرلو کے تین ہی سال بعد ہم ہندوستان مین اتنے بڑے پیمانہ پر جنگ مین مصروف ہوتے اور ہمارے پاس اتنے سپاہی ہوتے جتنے لارڈ ولنگٹن کے پاس اسپین مین بھی نہ تھے۔ پھر اس وقت بھی ہندوستان مین ہماری فوجی قوت صرف ۲ لاکھ نفوس ہے صرف دو لاکھ سپاہی! درانحالیکہ ہماری سلطنت بھی فوجی سلطنت نہین ہے!!

درحقیقت مین جس بات کی طرف اشارہ کر رہا ہون تم اُسکو سمجھ رہے ہو۔ ہم سب جانتے ہین کہ یہ ہندوستانی فوج خالص انگریزی نہین ہے بلکہ اسمین غالب عنصر دیسی فوج کا ہے۔ ۲ لاکھ مین سے صرف ۷۵۰۰۰ یعنی ایک تہائی سے بھی کم اسمین انگریز سپاہی ہین اور یہ تناسب غدر کے بعد سے قائم کیا گیا جب سے کہ انگریزی سپاہ مین اضافہ اور دیسی فوج مین تخفیف کی پالیسی شروع ہوئی۔ اسطرح غدر کے وقت انگریزی سپاہ کی تعداد صرف ۴۵۰۰۰ تھی اور اُسکے مقابلہ مین دیسی سپاہ ۲۳۵۰۰۰ تھی یعنی انگریزی سپاہ ہندوستانی سپاہ کے بقدر ۱/۵ تھی پھر ۱۸۰۸ء مین دیکھتا ہون کہ انگریزی سپاہ ۲۵۰۰۰ تھی اور دیسی سپاہ ۱۳۰۰۰۰ یعنی ۱/۵ سے بھی کم۔ یہی تناسب ۱۷۷۳ء مین بھی تھا جسوقت برطانوی ہند اور ریگولیٹنگ ایکٹ وجود مین آئے۔ اسوقت کمپنی کی فوجی قوت ۹۰۰۰ یوروپین اور ۴۵۰۰۰ دیسی سپاہ پر مشتمل تھی۔ اس سے قبل یوروپین سپاہ کا تناسب مین اس سے بھی کم پاتا ہون یعنی صرف ۱/۷ اگر اسی طرح ہم پیچھے ہٹتے جائین تو دیکھین گے کہ شروع شروع مین ہندوستانی فوج کلیتہً دیسی ہی تھی، یوروپین سپاہ کا اسمین نام کو بھی نہین تھا۔ کرنل جسنے (Col. Chesney) اس کے متعلق تاریخی نقطۂ نگاہ سے یون لکھا ہے،،

"کمپنی کی ہندوستانی فوج ۱۷۴۸ء مین وجود مین آئی جب فرانسیسیون کی دیکھا دیکھی اپنے تحفظ کے لئے اُسنے مدراس مین ایک مختصر دستہ سپاہ کا مرتب کیا۔ ٹھیک اُسی وقت یوروپین سپاہ کا ایک دستہ بھی مرتب ہوا جسمین وہ ملاح شامل تھے جو جہاز کے کام سے فاضل بچتے تھے یا وہ لوگ ہوتے تھے جنکو کمپنی کے جہاز ران انگلینڈ سے پھنسا کر لاتے تھے۔"

کمپنی کی ابتدائی لڑائیون مین جنکی بدولت اسکو استحکام نصیب ہوا، ہر موقع پر ماحاصرہ ارکاٹ محاصرہ پلاسی، اور بکسر مین، اسکے دیسی سپاہیون کی تعداد یوروپینون سے زیادہ تھی۔ یہان پر ظاہر کر دینا مناسب ہے کہ ہمارا یہ خیال نہین ہے کہ دیسی سپاہ لڑنے مین نالائق تھی یا میدان جنگ مین سارا بوجھ یوروپینون ہی پر پڑتا تھا جس شخص کا ایسا طفلانہ خیال ہو۔ ایسا خیال عام طور سے مورخین اپنے زور قومیت مین ظاہر کرتے ہین۔ اسکو یہ سنکر ہرگز متعجب نہین ہونا چاہئے کہ انگریز مصنفین دیسی سپاہ کی حقیقت کا اندازہ کرنے مین بالکل قاصر تھے میکولے نے کلایو پر جو مضمون لکھا ہے اسکو پڑہو تم اسمین ایسے تعریفی کلمات بھرے پاؤگے، "شاہی قوم"، "سمندر کی بہادر اولاد" "کلایو اور اُسکے ہمقوم انگریزون سے کوئی مقابلہ نہین کرسکتا تھا" لیکن اگر ایک مرتبہ تسلیم کر لیا جائے کہ دیسی سپاہ ہمیشہ انگریزون سے تعداد مین زیادہ تھی اور ہر موقع پر جنگی لیاقت مین انگریزون کے ہم پلہ تھی تو ہماری کامیابی کا سارا دعویٰ جسکی بنا ہماری غیر محدود فطری شجاعت کی برتری پر ہے، متزلزل ہو جائیگا۔ جن لڑائیون مین ہماری فوج دشمن کے مقابلہ مین "ایک اور دس" کی نسبت رکھتی تھی اگر ہم کہین کہ ایک انگریز دس دیسی کے برابر تھا تو یہی بات ایک دیسی سپاہی کے لئے بھی صادق آسکتی ہے۔ اس سے نتیجہ نکلتا ہے کہ اگرچہ دونون سپاہ مین فرق تھا لیکن یہ فرق قومیت کا نہین تھا بلکہ ڈسپلن اور فن جنگ کا اور اکثر اوقات بلاشبہ سپہ سالاری کا تھا۔

تم دیکھوگے کہ مل (Mill) نے "فتح ہند" کی جو سرسری تفصیل لکھی ہے اسمین انگریزون کی اس فطری برتری کا کہین ذکر نہین ہے، وہ لکھتا ہے "ہندوستان کی فتح دو اہم باتون کے دریافت پر منحصر تھی۔ پہلی یہ کہ دیسی فوج یورپین فوج کے مقابلہ مین بے قاعدہ ہوتی ہے دوسری یہ کہ یورپین ملازمت مین رہنے والی دیسی سپاہ کو فوجی قواعد سکھانا آسان ہوتا ہے۔ یہ دونون باتین فرانسیسیون نے دریافت کی تھین"

اگر ہم تسلیم بھی کرلین کہ انگریزی سپاہ لڑنے مین دیسی سپاہ سے عمدہ تھی اور مشترکہ فتوحات مین اول الذکر کا حصہ زیادہ تھا تو بھی یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ انگریزی قوم نے ہندوستانی قوم کو فتح کیا۔ . . . . ہندوستانی قومون کو اس فوج نے زیر کیا جسمین صرف ⅕ حصہ انگریزی عنصر تھا ہم ان کامیابیون مین نہ صرف اپنی کارگذاری کو مبالغہ کے ساتھ بیان کرتے ہین بلکہ شروع سے ان کی حقیقت ہی کو غلط سمجھتے اور غلط بیان کرتے ہین۔ پہلا فوج کا ⅘ حصہ کس قوم کی سپاہ سے تھا۔ دیسی ہندوستانیون سے۔ لہذا یہ کہنا کہ ہندوستان کو غیر ملکیون نے فتح کیا مشکل سے صحیح ہوگا۔ سچ تو یہ ہے کہ ہندوستان کو خود ہندوستانیون نے فتح کیا۔ اگر ہم ہندوستان کو فرانس یا انگلینڈ کی طرح متحد القوم سمجھنے مین برسر حق ہوتے، حالانکہ ہم نہین ہین، تو کبھی نہ کہتے کہ وہ غیر ملکی دشمنون سے دب کر چُور چُور ہو رہا تھا۔ بلکہ ہمکو کہنا چاہئے کہ اُسنے فتنہ و فساد اور طوائف الملوکی سے نجات حاصل کرنے کے لئے صرف ایک حکومت کے آگے گردن جھکا دی اگرچہ وہ حکومت غیرون ہی کی تھی۔

ہندوستان کی یہ تعریف یا اُسکے متعلق یہ سمجھنا کہ وہ سیاسی اعتبار سے متحد تھا قطعی غلط اور مبالغہ آمیز ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان نہ تو سیاسی اعتبار سے اور نہ کسی دوسرے صحیح مفہوم مین ہندوستان تھا۔ یہ لفظ محض ایک جغرافیائی اصطلاح ہے یہی وجہ تھی کہ ہندوستان اس آسانی کیساتھ فتح ہوگیا۔ بالکل یہی حالت اطالیہ اور جرمنی کی تھی جو نپولین کے پنجہ مین آگئے تھے۔ کیونکہ دراصل اطالیہ اور جرمنی کا وجود حقیقی معنون مین تھا ہی نہین انہین قومیت کا جذبہ بالکل مفقود تھا۔ نپولین جرمنی کی ایک ریاست کو دوسری ریاست کے مقابلہ مین کھڑا کردیتا یا جب وہ آسٹریا یا پروشیا سے برسرپیکار ہوتا تو اسکی حلیف بویریا اور ورٹمبرگ کی ریاستین ہوتین جس طرح نپولین نے دیکھا کہ وسط یورپ مین فتوحات حاصل کرنے کا یہ طریقہ نہایت کامیاب ہے اُسی طرح ڈوپلے نے شروع شروع ہندوستان مین بھی قیام سلطنت کے اس طریقہ کو موثر پایا بشرطیکہ وہان کسی یورپین حکومت کے مستحکم کارخانجات ہون۔ اُسنے دیکھا کہ یہان ہرایک ریاست سے دوسری ریاست سے خانہ جنگی مین مبتلا ہے اگر انکی باہمی لڑائیون مین کوئی غیرملکی دخل دیدے تو بلاشبہہ انکی قوت متوازن کرنیکی کنجی اسی کے ہاتھ مین ہوگی۔ ڈوپلے نے اس تجویز پر عمل کیا۔ چنانچہ ہندوستان مین اہل یورپ کی سلطنت کی ابتدا اُسوقت ہوئی جب فرانسیسیون نے حیدرآباد کی اُس لڑائی مین دخل دیا جو نظام الملک اعظم کی جانشینی کے سوال پر ۱۷۴۸ء مین ہوئی تھی۔

اسلئے حقیقت امر یہ ہے کہ ہندوستان کو اجنبیون سے مغائرت ہی نہین تھی جسکی وجہ یہ تھی کہ وہان قومی اتحاد مفقود تھا۔ اور صحیح معنی مین نہ ہندوستانی ہندوستانی تھے اور نہ غیرملکی غیرملکی اس حد تک، جیسا کہ مین نے اشارہ کیا ہے، یورپ مین بھی اسکی مثال موجود ہے۔ جب ہم اس حقیقت پر غور کرتے ہین کہ ہندوستان کو انگریزون نے دیسی سپاہ کی مدد سے فتح کیا تو ہمکو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ وہان قومیت کا احساس اس سے کہین زیادہ مردہ ہوچکا تھا جتنا کہ اسّی سال ہوئے جرمنی مین تھا۔ نپولین نے بویریا کو آسٹریا کے خلاف یا دونون کو پروشیا کے خلاف لڑا دیا، لیکن اس نے کبھی یہ کوشش نہیں کی کہ بویریا، آسٹریا یا پروشیا کو آپس میں لڑا دے کیونکہ ان میں کچھ نہ کچھ احساس قومیت کا موجود تھا۔ . . . . نپولین ایک معاہدہ کی رو سے بویریا کے صدر سے آسٹریا پر حملہ کیوقت ایک فوج حاصل کرتا ہے لیکن وہ محض روپیہ کی بدولت جرمنون کی فوج مرتب کرکے خود جرمنی کو نہین فتح کرتا ہے۔ لیکن ہندوستان مین ایسا ہی ہوا۔ یورپ کے اندر اگر تم اسکی مثال سمجھنا چاہو کہ ہندوستان کو ایسی فوج نے فتح کیا جسمین ۴/۵ دیسی سپاہ تھی اور صرف ۱/۵ انگریزی تو تم فرض کرو کہ انگلینڈ نے فرانس پر حملہ کیا اور فرانسیسیون کو معقول تنخواہ دیکر اسقدر کافی فوج بھرتی کرلی کہ فرانس فتح ہوگیا۔ اُف یہ خیال ہی کسقدر ہیبتناک ہے۔ اتم متعجب ہوگے کہ فرانسیسی فوج اور جب چاہے فرانس پر حملہ کرے۔ تاہم اگر تم غور کرو تو محسوس کروگے کہ ایسا ہونا ممکن تھا بشرطیکہ فرانس کی گذشتہ تاریخ مختلف ہوتی۔ ہم خیال کرسکتے ہین کہ فرانس مین قومیت کا جذبہ کبھی پیدا ہی نہین ہوا اور یہ بہت آسان ہے کیونکہ ہم دیکھتے ہین کہ بارھوین صدی شاہ پیرس اور شاہ رُون (Rouen) کی خانہ جنگیون سے بھری ہوئی ہے۔ ہم اپنے سلسلہ خیال کو آگے بڑھائین تو دیکھینگے کہ فرانس کے مختلف حصون مین جو حکومتین قائم تھین اُنہین کی بیشتر غیرملکی تھین یعنی ملک پہلے ہی سے غیرملکی حکمرانون کے جوئے کے نیچے دبا ہوا تھا۔ ایسے ملک مین اگر خارجی اثرات سے ایسی ابتری رونما ہوجائے کہ کرایہ پر لڑنا ایک منفعت بخش پیشہ سمجھا جانے لگے تو ملک زرپرست اور پیشہ ور سپاہیون سے بھر جائیگا۔ ایسے سپاہی ہر حکومت سے لڑنے کے لئے تیار ہوجائینگے چاہے وہ ملکی ہو یا غیرملکی۔

ہندوستان کی حالت بالکل ایسی ہی تھی۔ انگریزون نے وہان غیرملکی غلبہ کی بنا نہین ڈالی کیونکہ وہ پہلے ہی سے موجود تھا

اس موضوع کے متعلق ہم نے ایک مخصوص غلط فہمی پیدا کردی ہے۔ یورپین قوم سے مراد وہ قوم ہے جو ایک خاص حصۂ ملک پر قابض ہو۔ ہمارے نزدیک ایسی قومیت معمولی شئے ہے حالانکہ یہ نہایت غیر معمولی ہے۔ اسی قومیت کے تخیل پر ہماری حب الوطنی اور تمام قومی خصائل حمیدہ کی بنا ہے ہندوستان مین ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قومیت کا مفہوم بالکل پراگندہ ہے۔ یہی نہین کہ گیارھوین صدی سے ملک اسلامی حملون سے محصور تھا بلکہ اگر ہم اس سے اور پہلے نظر کرین تو دیکھینگے کہ مختلف قومین ایک دوسرے سے مل جل گئی ہین، ایک قوم دوسری قوم پر غلبہ کئے ہوئے ہے۔ وہ سنسکرت بولنے والی آرین قوم جو برہمنیت کی خالق ہے جو ہندوستان مین نام نہاد اتحاد قائم کرنے کی دعویدار ہے خود ایک حملہ آور قوم ہے اور بحیثیت حملہ آور ہونے کے اپنے اندر قدیم اقوام کو جذب کرنے سے قاصر رہی۔ یورپ مین قدیم قوم بالکل غائب ہو چکی ہے یہان تک کہ یورپین زبانون مین اُسکے وجود کا کوئی نشان نہین باقی ہے برخلاف اسکے ہندوستان مین قدیم اقوام ہر جگہ ظاہر ہین۔ وہان کی مروجہ زبانین سنسکرت کی مسخ شدہ شکلیں نہین ہین بلکہ سنسکرت اور قدیم زبانون کی آمیزش کا نتیجہ ہین۔ جنوبی ہند مین تو ان زبانون مین سنسکرت کی بُو بھی نہین ہے۔ برہمنیت جو بادی النظر مین عالمگیر معلوم ہوتی ہے نظر غائر سے مطالعہ کرنے پر محض چند اصول فلسفہ کے مبہم مجموعہ کا نام رہ جاتی ہے۔ جسنے متضاد اور بے جوڑ اوہام یگانگت کی جھلک پیدا کردی ہے۔ لہذا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہندوستان مین وہ بنیادی دعوی ہی مفقود ہے جسپر مغربی اصول سیاست کی بنیاد ہے۔ وہان وہ قومیت ہی نہین جسپر قومی حکومت ممکن ہو۔ اسکے ثبوت کے لئے ہمکو بہت پیچھے جانے کی ضرورت نہین ہے بس اتنا دیکھنا کافی ہے کہ محمود غزنی کے زمانہ سے ہندوستان مین اسلامی حملہ کا ایک مستقل سیلاب آتا رہا مغلون کی آمد سولھوین صدی مین تھی اور اس سے بہت پیشتر وہان کی اکثر حکومتین اسلامی تھین۔ اس لئے اُسی وقت سے ہندوستان کی اکثر ریاستون مین قومیت کا شیرازہ منتشر ہو چکا تھا۔ حکومتون کی بنیاد اب عدل و انصاف پر نہین تھی۔ انکو اب حق نہین باقی رہا کہ وہ قومیت اور حب الوطنی کے نام پر اپیل کرین۔

ان حالات کے اندر ہندوستان کی فتح کی تشریح ہندوستانیون کو دوسری قومون سے فروتر سمجھے بغیر ممکن ہے۔ بنا برآن کوئی وجہ نہین کہ ہم خواہ مخواہ انگریزون کو دوسری قومون سے اعلی خیال کرین۔ ہمارے نزدیک انسان کا اپنے ملک کی خاطر غیر ملکیون سے لڑنا ایک فرض ہے لیکن لیکن سوال یہ ہے کہ اُسکا ملک کیا ہے؟ جب ہم اس خیال کا تجزیہ کرتے ہین تو یہ مفہوم نکلتا ہے کہ انسان ایک ایسی قوم مین پیدا ہو کر پرورش پائے جو بطور ایک بڑے خاندان کے سمجھی جاتی ہو اور وہ فطری طور پر ملک کو بمنزلہ اپنی مان کے سمجھتا ہو لیکن اگر قوم کی ترکیب ایسی نہین ہے بلکہ اس مین دو یا تین قومون کی آمیزش ہو جو آپس مین ایک دوسرے سے نفرت کرتی ہون اور زیادہ سے زیادہ اپنے گانون کو گھر سمجھتی ہون تو ایسی صورت مین وہان کے باشندون کا کوئی قصور نہین اگر انمین بجائے حب الوطنی کے گانون کی محبت ہو۔ پہلے پہل غیر ملکی جوے کو اپنے کندھے پر رکھنا اور چیز ہے اور ایک غیر ملکی جوے کو ہٹا کر دوسرا غیر ملکی جوا رکھنا بالکل دوسری چیز ہے۔

ہندوستان کی فتح کا تعجب خیز پہلو یہ نہین ہے کہ وہ انگریزون کو نصیب ہوئی بلکہ یہ ہے کہ انگلینڈ کو اس کے لئے کوئی محنت یا کوشش نہین کرنا پڑی۔ ہم اتنی بڑی آبادی فتح کرنے مین مصروف تھے جو یورپ کی آبادی کے برابر تھی لیکن انگریزون نے نہ تو کوئی ٹیکس دیا، نہ انگریزی حکومت نے قرضہ لیا نہ کبھی جبری فوجی بھرتی ہوئی، نہ کبھی آدمیون کی قلت محسوس ہوئی اور نہ ہمکو دوسری جنگون کے جاری رکھنے مین کوئی وقت ہی محسوس ہوئی۔ بظاہر یہ صورت ناقابل یقین معلوم ہوتی ہے لیکن مین نے اسکی وجہ بیان کردی ہے جہان تک ان لڑائیون کی مالی حالت

کا تعلق ہے وہ عام اصول جنگ کے مطابق تھی۔ فتح ہمیشہ اپنا خرچ آپ برداشت کرتی ہے۔ نپولین کو کبھی مالی پریشانی نہین ہوی کیونکہ وہ ہمیشہ انھین کے صرفہ پر رہتا تھا جنکو مغلوب کرتا تھا۔ اسی طرح ہندوستان بھی ہندوستان ہی کے روپیہ سے فتح ہوا۔ اب صرف یہ سمجھنا مشکل ہے کہ آخر فوج کس طرح فراہم ہوسکتی تھی۔ اور یہ مشکل بھی رفع ہوجاتی ہے جب ہم دیکھتے ہین کہ اس فوج کا بڑا حصہ ہمیشہ دیسی سپاہ پر مشتمل ہوتا تھا

اگر ہم بغور دیکھین تو ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہندوستان پر حصول سیادت کے لئے لفظ "فتح" کا استعمال صرف ناموزون ہی نہین بلکہ قطعی مغالطہ آمیز ہے۔ کیونکہ اس طرح ہم ہر واقعہ کو ایسی صورت مین تقسیم کرنے کے مرتکب ہونگے جس سے وہ دراصل مشابہ نہین ہے بلاشبہہ اس سے قبل مین نے اچھی طرح بیان کر دیا ہے کہ جب کبھی یہ لفظ استعمال کیا جائے تو اس سے کہین زیادہ جامع تعریف کا متقاضی ہوتا ہے جتنی عام طور سے لوگ کیا کرتے ہین نیز یہ کہ اسکے بہت سے دوسرے معنی بھی ہوتے ہین۔ یقیناً یہ لفظ اسی موقع پر استعمال ہوتا ہے جب ایک سلطنت دوسری سلطنت کے خلاف کوئی قدم اُٹھاتی ہے، دو سلطنتون مین جنگ ہوتی ہے ایک حکومت کی فوج دوسرے کی فوج پر حملہ آور ہوتی ہے اور اسکو درہم برہم کردیتی ہے یا ایسی ذلیل صلح پر مجبور کرتی ہے جو اُسکی آزادی سلب کرنیوالی ہوتی ہے۔ اسی کا نام صحیح معنون مین فتح ہے۔ اب چونکہ ہم کہتے ہین کہ انگلینڈ نے ہندوستان کو فتح کیا تو اسکا مطلب یہ ہوا کہ ان دونون ملکون کے درمیان اس قسم کا کوی واقعہ ہوا۔ سکندر اعظم نے جب مملکت فارس کو فتح کیا تو حکومت مقدونیہ اور حکومت فارس کے درمیان جنگ ہوی تھی جسکا نتیجہ فارس کی شکست مین ظاہر ہوا۔ جب سیزر نے گال (Gaul) فتح کیا تو وہ جمہوریت روم کی طرف سے ایک عہدہ پر ممتاز تھا۔ وہان کی سنیٹ نے اسکو سلطنت رومہ کی فوج کا سپہ سالار مقرر کیا تھا۔ لیکن ہندوستان مین اس قسم کا کوئی واقعہ نہین تھا۔ شاہ انگلینڈ نے نہ تو مغل بادشاہ سے اور نہ کسی راجہ یا نواب ہی سے اعلان جنگ کیا۔ سلطنت انگلینڈ کو ہندوستان کی فتح سے کبھی کوئی تعلق نہ ہوتا اگر اول الذکر کو فرانسیسون سے پانچ مرتبہ جنگ کی نوبت نہ پڑی ہوتی جب فرانسیسی قبضہ ہندوستان مین اچھی طرح جم گیا تو انگریزون کو اُنسے لڑنے کی ضرورت لاحق ہوی۔ اور چونکہ انکی بعض لڑائیان ہندوستان مین ہوئین اسلئے قدرتاً ایک حد تک ایسٹ انڈیا کمپنی اور دیسی ریاستون سے بھی انکا تعلق ہوگیا۔ اگر ہم اس واقعہ کی ماہیت کو واضح طور پر سمجھنا چاہتے ہین تو چاہئے کہ کہ صورت حالات کو جو بالکل اتفاقی تھی نظر انداز کرکے غور کرین۔ اُسوقت ہم دیکھینگے کہ ہندوستان مین درحقیقت کوئی ایسی بات نہین ہوئی جسکو "فتح" سے تعبیر کیا جاسکے حقیقت یون ہے کہ چند سوداگر ہندوستان کے ساحلی شہرون مین آباد ہوگئے۔ جب سلطنت مغلیہ کو زوال شروع ہوا اور بدامنی رونما ہوی تو انھون نے مجبوراً اپنی فوجی تنظیم کی اور کچھ فوج بھی ملازم رکھ لی۔ ان فوجون کی مدد سے انھون نے رفتہ رفتہ سارے ہندوستان پر قبضہ کرلیا حسن اتفاق سے یہ سوداگر انگریز تھے جنکی ملازمت مین کچھ انگریزی سپاہ بھی تھی۔

اب اسکو غیر ملکی "فتح" نہین کہہ سکتے البتہ اندرونی انقلاب کہہ سکتے ہین۔ کسی ملک مین جب حکومت کو زوال ہوتا ہے اور بدامنی کا دارودورہ شروع ہوجاتا ہے تو عام قاعدہ یہی ہے کہ ملک کی باقی ماندہ منظم قوتون مین زور آزمائی شروع ہوجاتی ہے اور جو سب سے زیادہ زبردست ثابت ہوتی ہے وہ اپنی حکومت قائم کرلینے مین کامیاب ہوجاتی ہے۔ مثلاً فرانس مین جب مجلس باربن (Bourbon) کم

زوال ہوا تو پیرس کی میونسپلٹی نے جو برسر اقتدار تھی سلطنت کی عنان اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اور پھر تھوڑے ہی دنوں بعد جب اسکو زوال ہوا تو بوناپارٹ نے اپنی فوجی حکومت قائم کر لی۔ ہندوستان بھی ۱۷۵۰ء میں سلطنت مغلیہ کے انحطاط کیوجہ سے بدامنی میں مبتلا تھا۔ یہ انحطاط ۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب کی وفات کے بعد سے شروع ہوا۔ ہر جگہ چھوٹے چھوٹے صاحب اثر سردار دن نے منظم ہو کر برسر اقتدار ہونا چاہا۔ یہ طاقتیں عام طور سے جیسا کہ ہندوستان کا دستور تھا، کرایہ کے سپاہیوں پر مشتمل تھیں جو یا تو کسی مغلیہ صوبہ کے گورنر کی ماتحتی میں ہوتیں یا کسی صاحب اختیار اور دلیر لٹیرے کی سرکردگی میں یا کسی مقامی قوت کی زیر قیادت جو مغلوں کے استیلا سے قبل موجود تھی اور جسنے کبھی پوری طرح انکی سیادت کو تسلیم نہیں کیا تھا۔ ہر قوت کی ایک ایک مثال دیکھئے مثلاً حیدرآباد کی ریاست، اسکو نظام نے قائم کیا جو شاہان مغلیہ کا ایک صوبہ دار تھا۔ ریاست میسور، اسکی بنا حیدر علی نے ڈالی جو ایک بہادر مسلمان سپاہی تھا۔ مرہٹوں کی طاقت کا بانی پیشوا تھا، یہ ایک برہمنی طاقت تھی اور قدیم ہندوستان کی حالت کو پیش کرتی تھی۔ لیکن یہ سب کی سب طاقتیں کرایہ کے سپاہیوں پر بھروسہ کرتی تھیں ہمیشہ ایک دوسرے سے لڑتیں لوٹ و غارتگری کرتی پھرتیں۔ شاید یورپ نے کبھی یہ صورت نہیں دیکھی۔ البتہ کارلنگین ایمپائر (Carolingian Empire) کی شکست کے موقع پر ایسی ابتری رونما ہو گئی تھی۔

نئی طاقتوں کے عروج کے لئے یہ صورت حالات البتہ خاص طور سے معاون تھی۔ دوسری صورتوں میں فتح کیلئے ضروری ہے جیسا کہ میں نے کہا ہے، کہ ایک زبردست قوت اپنے ہاتھ میں ہو۔ کوئی شخص تاوقتیکہ اسکے پاس منظم حکومت اور فوج نہ ہو فتح کا منصوبہ نہیں کر سکتا۔ لیکن چونکہ یہاں حالات مختلف تھے لہذا اُسکے اسباب بھی مختلف ہو گئے۔ حیدر علی کے پاس سوائے اُسکے دل و دماغ اور قوت بازو کے کچھ نہ تھا مگر وہ سلطان میسور ہو گیا۔ کرایہ کے سپاہی ہر جگہ تھے اور جو شخص انکا منہ روپیوں سے بھر دیتا یا اپنے رعب طاقت سے اپنا طرفدار کر لیتا وہ اُسکی ملازمت میں آجاتے۔ اور جس کسی کے پاس ایسی فوج ہوتی وہ ہندوستان کے زبردست سے زبردست صاحب اختیار کا ہمسر بن جاتا کیونکہ حکومت کی شکست کے وقت صرف فوجی قوت ہی ایک قوت باقی رہ جاتی ہے۔

اب ان مختلف مقامی طاقتوں میں اگر کوئی طاقت تھی جو ایسے مخصوص حالات میں سلطنت قائم کرنے میں کامیاب ہو سکتی تھی تو وہ ان سوداگروں کی تھی جنکی ساحلی شہروں میں کوٹھیاں تھیں۔ بلاشبہ وہ غیر ملکی تھے، لیکن، جیسا کہ میں نے بیان کیا ہے، غیر ملکی ہونا ہندوستان میں کوئی مضائقہ نہیں تھا۔ ہندوستان کی بیشتر سلطنتیں غیر ملکی تھیں شاہان مغلیہ خود غیر ملکی تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی اس حیرت انگیز خوش نصیبی کی بڑی توصیف کیجاتی ہے۔ بیشک یہ صحیح ہے کہ اس قسم کی خوش نصیبی کی گذشتہ مثال نہیں ملتی اور اسی وجہ سے اسکے امکان کے متعلق پیشین گوئی کا کسی کو خیال نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن چونکہ اسکی توجیہ دشوار نہیں ہے اور اسکے اسباب بالکل ظاہر ہیں اسلئے اسکو معجزہ نہیں کہہ سکتے ایسٹ انڈیا کمپنی کے پاس واقعی کچھ سرمایہ تھا، اسکے قبضہ میں دولت تھی، سمندر تھا، اُسکے پاس دو تین قلعے تھے اور سب سے بڑی بات یہ کہ ایک کمپنی تھی جسکے لڑائی میں مارے جانے یا کسی بیماری سے مرنے کا مطلق اندیشہ نہیں تھا۔ ہم نے اکثر دیکھا ہے کہ ایک معمولی حیثیت کا شخص اٹھتا ہے اور بڑی بھاری سلطنت کا مالک بن جاتا ہے لیکن ہمکو تعجب نہیں ہوتا کیوں، اسلئے کہ اکثر ایسا ہوا کرتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ اُس سے زیادہ قابل تعجب ہے۔ کارسیکا (Corsica) کا ایک غریب نواب تھا اُسکے چھوٹے لڑکے نے صرف استبدادی قوت کی مدد سے یورپ کے غالب حصہ کو

اپنے قابو مین رکھا۔ کیا یہ واقعہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہندوستان فتح کرنے سے زیادہ حیرت خیز نہین ہے؟ بونا پارٹ تے بغیر کسی رفیق اور بغیر ایک پیسہ کے سلطنت قائم کرلی۔ لیکن ۲۰ سال سے کم کی مدت مین اسکو کھو بھی دیا۔ اسی طرح حیدر علی سندھیا یا ہلکر کا عروج زیادہ تعجب خیز تھا اور ایسٹ انڈیا کمپنی سے زیادہ انکو اپنے عروج کیلئے قسمت کا مرہون منت ہونا پڑا۔ مین چاہتا ہون کہ تم اس واقعہ کو بالکل الگ ایک مخصوص حیثیت سے دیکھو۔ یہ ایک ریاست کی دوسری ریاست پر فتح نہین تھی۔ اسمین دو حکومتین کم از کم براہ راست متعلق نہین تھین اور نہ ہی اس کا رشتہ کسی غیر ملکی کے ہاتھ مین تھا۔ یہ ہندوستان کی سوسائٹی مین ایک اندرونی انقلاب تھا اور اسکو ان ناگہانی حکمت عملیون یا تغلب وتصرف سے تشبیہ دی جا سکتی ہے جو کسی جماعت کی اندرونی بےچینی کو ختم کردے۔ آؤ ایک لمحہ کے لئے ہم فرض کرلین کہ یہ داگر جو صاحب اثر و نفوذ بن بیٹھے اجنبی نہین تھے۔ اس سے واقعہ کی نوعیت مین کوئی فرق نہین آئیگا۔ فرض کرلو کہ بمبئی مین کچھ پارسی سوداگر تھے جب انھون نے اپنی تجارت کو بدامنی سے نقصان پہونچتے دیکھا تو یکجہت ہوکر کچھ قلعے بنالئے اور فوجین بھی فراہم کرلین اور بعد ازان خوش قسمتی سے انھون نے اچھے اچھے جنرل بھی مقرر کرلئے۔ اس صورت مین انکے ساتھ بھی یہی بکسر اور پلاسی کا معاملہ پیش آتا اور وہ بھی شاہان مغلیہ سے کسی صوبہ کی دیوانی حاصل کرنے مین کامیاب ہوجاتے جو انکی سلطنت کی بنیاد ہوتی اور ایک وقت مین سارے ہندوستان پر پھیل جاتی۔ لہذا اس صورت مین بھی واقعہ مادی طور سے وہی ہوتا لیکن اسوقت وہ اپنی اصلی روشنی مین دکھائی دیتا اور ہم اسکو اندرونی انقلاب سے تعبیر کرتے کیونکہ عام طور سے ایسا ہوتا ہے کہ ایک جماعت اپنے وجود کو معرض خطر مین دیکھکر بدامنی فرو کرنیکی کوشش کرتی ہے۔

اگر ایسا ہوا ہوتا تو کوئی تعجب نہ ہوتا۔ پھر اس لحاظ سے تو ایسٹ انڈیا کمپنی کا عروج بہت ہی کم قابل تعجب ہونا چاہئے کیونکہ کمپنی مذکور کا قریبی تعلق یورپ سے تھا جہان سے وہ بوقت ضرورت فوجی امداد طلب کرسکتی تھی جو ظاہر تھا کہ ہندوستانی فوج سے زیادہ لائق اور قواعد دان تھی۔ ڈوپلے نے جسنے ہندوستان کی فتح کا اصل اصول دریافت کیا محسوس کرلیا کہ ہندوستانی فوج یورپین فوج کے سامنے ایک لمحہ نہین ٹھہر سکتی لیکن اسنے یہ بھی اندازہ کرلیا کہ ہندوستانیون مین یورپین ڈسپلن قبول کرنے اور یورپین قابلیت کیساتھ جنگ کرنیکی پوری استعداد موجود ہے بشرطیکہ انکو تعلیم دی جائے۔ یہ تھی وہ کنجی جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھ مین تھی جسکی بدولت اسنے ہندوستان کی مختلف طاقتون مین نہ صرف اپنے وجود کو قائم رکھا بلکہ ان پر غلبہ بھی حاصل کیا۔ یہ غلبہ کسی ناقابل انتقال جسمانی یا اخلاقی برتری کے سبب نہین تھا، جیسا کہ ہم خیال کرتے ہین، بلکہ فوجی تنظیم و تربیت کے سبب سے تھا اور یہ باتین ہندوستانیون مین بھی پیدا کی جا سکتی تھین۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے لئے ایک بڑی سہولت اور بھی تھی۔ یہ تو یقینی ہے کہ وہ سلطنت انگلیشیہ کی نمائندہ نہین تھی، لیکن انگلینڈ کے ساتھ اسکا تعلق اسکے حق مین بہت کارآمد تھا۔ بیشک روپیہ اور آدمیون کی فراہمی، جنکی بدولت ہندوستان فتح ہوا، خاص کمپنی کے ذمہ تھی لیکن چونکہ شاہی فرمان کی رو سے وہ ہندوستان اور چین کی تجارت کی واحد اجارہ دار تھی اسلئے سلطنت انگلشیہ اور پارلیمنٹ کو اس کیساتھ دلچسپی کا ہونا قدرتی تھا۔ چنانچہ اکثر ایسا ہوا کہ انگریزی قوم نے ان معرکہ آرائیون کو انگلینڈ اور فرانس کی باہمی جنگ کی حیثیت سے دیکھا اور بڑی خوشی سے ان مین امداد بھی کی۔ یہ واقعہ بنیادی اہمیت رکھتا ہے لیکن اکثر اس پر کافی غور نہین کیا جاتا ہندوستان مین انگریزی فتح کی ابتدا کمپنی اور کسی دیسی طاقت کی باہمی آویزش سے نہین ہوئی بلکہ فرانسیسیون کی اس خوفناک کوشش سے جو دکن پر

غلبہ حاصل کرنے کیلئے کی گئی۔ اُنھون نے حیدر آباد کی جانشینی کے معاملہ مین دخل انداز ہوکر کوشش کی کہ بمبئی اور مدراس سے انگریزونکا قدم اکھاڑ دین۔ مشرق مین ہماری پہلی پیش قدمی فرانسیسی حملہ کی مدافعت مین تھی۔ اس وقت سے ستر سال تک یعنی جب نپولین سے ہماری لڑائیان ختم ہوگئین، ہندوستان مین ہماری لڑائیان کم وبیش فرانسیسیون سے مدافعت کی شکل مین ہوتی رہین۔ اگرچہ یہ جنگین سلطنت انگلشیہ کے نام یا بوتے پر نہین ہوئین لیکن انجام کار انکی شکل ایک حد تک قومی جنگون کی ہوگئی۔ اور ان سے انگلینڈ کو بہت گہری دلچسپی تھی۔ اسی لئے کمپنی کی فون کو بڑی حد تک شاہی فوج سے مدد دی جاتی تھی اور ۱۷۸۵ء سے جب لارڈ کارنوالس ہندوستان کا گورنر جنرل مقرر ہوکر ایک لائق مدبر کی حیثیت سے سیاسی اور فوجی معاملات کی نگہداشت کے لئے بھیجا گیا تو پارلیمنٹ مین کمپنی پر حملے، لارڈ کلائیو کے خلاف تحریک ملامت، ہسٹنگز کے خلاف تعزیری کارروائی، کمپنی کے معاملات سلجھانے کیلئے پے بہ پے کوششین، جن سے ایک مرتبہ ۱۷۸۳ء مین انگلینڈ کی سیاسی دنیا مین ہلچل ہی مچ گئی تھی، اور اسی طرح کی دیگر کارروائیون نے ہماری ہندوستانی معرکہ آرائیون کو قومی جنگ کی شکل دیدی۔ ان وجوہ سے کمپنی کو بمنزلہ انگریزی قوم کے سمجھا جانے لگا۔ اس طریقہ سے کمپنی کو عملی طور پر یورپ کی ایک اول درجہ کی سلطنت کے اعتماد وشہرت سے تقویت پہونچ رہی تھی اگرچہ اس سلطنت نے کمپنی کی امداد ان لڑائیون مین قطعی نہین کی جنکی بدولت ہندوستان فتح ہوا۔

مہتم بالشان تاریخی واقعات کے لئے اکثر "حیرت انگیز" یا "عجیب" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن جس آزادی کیساتھ انکا استعمال ہماری فتح ہندوستان کیلئے کیا جاتا ہے اُس آزادی کیساتھ کسی دوسرے واقعہ کیلئے نہین۔ ایک واقعہ حیرت انگیز یا عجیب ہو سکتا ہے لیکن یہ بالکل ضروری نہین ہے کہ اُسکی توجیہہ بھی دشوار ہو۔ ہندوستان کی فتح اس معنی مین البتہ نہایت حیرت انگیز ہے کہ اسکی نظیر گذشتہ زمانہ مین نہین ملتی، اسلئے اسکی توقع اُن لوگون کو نہین تھی جنھون نے ڈیڑھ صدی تک ہندوستان مین کمپنی کے معاملات کا انصرام کیا۔ بلاشبہ Pitt [illegible] Job Charnock گورنر مدراس کو (جو لارڈ چیتھم کا دادا تھا) کبھی خواب مین بھی خیال نہ ہوا ہوگا کہ ایک دن ہم پیشوا اور خود مغل شہنشاہ کے اختیارات کو سلب کر لینگے۔ لیکن یہ واقعہ اس معنی مین بالکل حیرت انگیز نہین ہے کہ اسکے حقیقی اسباب کا دریافت کرنا مشکل ہے۔ سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد جب ہندوستان مین کوئی صاحب اختیار مرکزی حیثیت کا باقی نہین رہ گیا تھا جسکا جی چاہتا صاحب اختیار بن جاتا، جو چاہتا اپنی حکومت قائم کر بیٹھتا، اگر اسوقت ایک تجارتی کمپنی نے جسکے پاس کرایہ کی فوج رکھنے کیلئے کافی روپیہ تھا ان سورماؤن کا مقابلہ کیا اور انکو مغلوب کیا تو کونسا تعجب کا مقام ہے۔ خصوصًا اس صورت مین کہ اُسکے پاس یورپین باقاعدہ فوج اور سپہ سالار تھے، اسکی پشت پر انگلینڈ کی سلری قوت تھی اور اُسکے مشیر انگریز مدبر تھے۔

مین نے جو کچھ بیان کیا اسکا خلاصہ یہ ہے کہ ہندوستان کی فتح عام معنی مین فتح نہین تھی۔ اسلئے کہ یہ کسی سلطنت کا فعل نہین تھا، اسکو کسی سلطنت کی فوج یا روپیہ نے نہین حاصل کیا۔ مین نے یہ بات اس لئے ظاہر کردی ہے تاکہ اس بیان سے کہ انگلینڈ نے ہندوستان کو فتح کیا جو الجھن پیدا ہو وہ رفع ہوجائے۔ ہندوستان انگلینڈ سے ہزارون میل دور ہے، اسکی آبادی یورپ کے برابر ہے پھر بھی یہ فتح اس صورت مین ہوئی کہ انگلینڈ کوئی فوجی سلطنت نہین تھی اور نہ اس عظیم الشان فتح مین اُسنے کوئی تکلیف اور محنت برداشت کی نہ ایک پیسہ خرچ کیا۔ اس لئے اس کے معنے یہی ہوں گے کہ انگلینڈ نے ہندوستان کو فتح کیا ہی نہین،

بلکہ یہ چند انگریزون کی خوش نصیبی تھی جو سلطنت مغلیہ کے زوال کے وقت حسن اتفاق سے ہندوستان مین سکونت پذیر تھے اور حیدر علی یا رنجیت سنگھ کی طرح عالی اقتدار ہو گئے۔

تاہم عملی نتیجہ کے لحاظ سے یہ واقعہ ہندوستان پر انگلینڈ کی فتح ہی ثابت ہوا۔ اسلئے کہ اب جب یہ تمام عمل مکمل ہو چکا ہے اور ایسٹ انڈیا کمپنی غائب ہو چکی ہے ہم دیکھتے ہین کہ ملکہ وکٹوریہ قیصرۂ ہند ہین اور ایک سکریٹری جو انگریزی کابینہ کا ممبر ہے اور انگریزی پارلیمنٹ مین بیٹھتا ہے ہندوستان کے نظم و نسق کا ذمہ دار ہے انگلینڈ نے بحیثیت ایک سلطنت کے ہندوستان کو حاصل نہین کیا پھر بھی اب یہ اُسکے سر پڑ گیا ہے۔ یہ ایک مثال تھی اُس عام اصول توسیع کی جو اہل یورپ کے ان تمام بیرونی مقبوضات مین کار فرما ہے جو کولمبس کے زمانہ سے برابر حاصل ہوتے رہے ہین اہل یورپ کتنے ہی دور دراز ممالک مین گھومتے، اُنکی کامیابی کتنی ہی حیرت انگیز اور عجیب ہوتی لیکن وہ کبھی یورپین شہریت کو ترک نہین کر سکتے تھے۔ کارٹیز (Cortez) اور پزارو (Pizarro) نے امریکہ کی ایک ایک ریاست کو اپنے قدمون سے روند ڈالا، جہان گئے بغیر سعی و محنت کے عالی اقتدار بن گئے، اگرچہ میکسکو مین وہ مونٹیزوما (Montezuma) کی حکومت کو ذرہ برابر خاطر مین نہین [illegible]۔ لیکن چارلس پنجم کی سیادت سے سرتابی کرنا تو کجا اسکا خیال تک کرنیکی جرأت نہ کر سکے۔ حالانکہ چارلس پنجم [illegible] کے اُس پار تھا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ جو فتوحات وہ اپنی ذاتی شجاعت سے بلا امداد غیرے حاصل کرتے اسپین قدرتی طور پر انھین ضبط کر لیتا یہی حال انگریزون کا ہندوستان مین ہوا ۱۷۶۵ء کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی سلطنت مغلیہ مین ایک نام نہاد علی عہدہ پر فائز تھی۔ لیکن انگریزی پارلیمنٹ دعویدار تھی کہ جو مقبوضات کمپنی حاصل کریگی وہ پارلیمنٹ کے ماتحت ہونگے۔ پارلیمنٹ کی بحثون مین مغل بادشاہون کا نام شاید ہی آتا تھا اور غالبًا یہ سوال کبھی زیر بحث نہین آیا کہ آیا وہ بنگال، بہار اور اڑیسہ کے صوبون کا انتظام ایک غیر ملکی حکومت کے ہاتھ مین دینا پسند کرینگے۔ کمپنی بہ یک ساعت دو سلطنتون کا جزو تھی، ایک طرف تو شاہ انگلستان کے فرمان کی رو سے وہ کمپنی تھی اور دوسری طرف مغل بادشاہ کی ماتحت ایک دیوان۔ لیکن جس طرح کارٹیز نے مونٹزوما کو نیست و نابود کر دیا اُسی طرح کمپنی مذکور نے مغل شہنشاہ کو صفحہ ہستی سے مٹا دیا۔ اور پھر چپ چاپ اپنے غیر محدود مقبوضات کو انگلینڈ کے سپرد کر دیا انجام کار جنگ پلاسی کے ایک صدی بعد کمپنی شکست ہو گئی اور خود بھی ہندوستان سے سلطنت انگلشیہ کے حق مین دست بردار ہو گئی۔

(باقی)

عبد القیوم رسا

انارکسٹ

"اور یہ"، ماہر جراثیم نے شیشہ کے ملے ہوئے ٹکڑوں کو خردبین کے نیچے رکھتے ہوئے کہا "یہ مشہور و معروف مرض، ہیضہ کے زہریلے جراثیم ہیں، آپ سمجھے ــــ کالرا کے جراثیم!!"

اجنبی خردبین میں بغور دیکھنے لگا، وہ یقیناً اس وضع کی باتوں کا عادی نہیں معلوم ہوتا تھا اسلئے کہ اُسنے بالکل گنوار دنکی طرح دوسری آنکھ کو اپنے ہاتھ سے ڈھک لیا اور کہنے لگا ــــــــ "دکچھ یونہی سا دکھائی دے رہا ہے"۔

"اس پیچ کو گھماؤ"، ماہر جراثیم نے کہا "غالباً خردبین تمھارے لئے صحیح فوکس پر نہیں ہے، نگاہ میں بھی اختلاف ہوتا ہے، بس ــــ ہاں...... ایک خفیف سی گردش، ادھر یا اُدھر ــــ اب تو صاف نظر آتا ہے؟"

"ہاں بیشک، اب صاف ہے،" اجنبی نے کہا "کچھ زیادہ چیزیں نہیں ہیں، پانچ سات چھوٹے چھوٹے گلابی اور نیلے دھاگے کے سے ٹکڑے، پناہ بخدا! اور یہی حقیر ٹکڑے، یہی بے وجود ذرات مجتمع ہو کر ایک مکمل شہر کو برباد کرتے ہیں ــــ کسقدر حیرت انگیز بات ہے!!"

وہ کھڑا ہو گیا اور شیشہ کے ٹکڑے کو خردبین کے نیچے سے نکالکر اپنے ہاتھ کو کھڑکی کی روشنی میں بڑھا دیا۔

"کچھ نظر نہیں آتا" اُسنے شیشہ کو بغور دیکھتے ہوئے ذرا تامل سے کہا "کیا یہ زندہ ہیں اور اب بھی خطرناک ہیں؟"

"جی نہیں، انھیں تجربہ کیلئے ہلاک کر دیا گیا ہے۔ خدا کرے ہم اسی طرح دُنیا کے تمام جراثیم کو ہلاک کر سکتے!"

"میرے خیال میں تو شاید آپ اپنے گھر میں ایسی چیزیں زندہ اور اصلی حالت میں بھی رکھنے کے عادی ہونگے اور مطلق خوف نہ کرتے ہونگے،" اجنبی نے ذرا مسکراتے ہوئے کہا۔

"بلکہ یوں کہئے کہ ہم ایسا کرنے پر مجبور ہیں، مثلاً یہاں،" وہ ایک الماری کی طرف بڑھا اور سربمہر نلکیوں کی ایک قطار میں سے ایک نلکی اُٹھا کر کہنے لگا،

"یہ زندہ چیز موجود ہے، مرض کا لرا کے اصلی زندہ اور متحرک جراثیم! ــــ یعنی سربند خطرناک مرض ہیضہ! کیا سمجھے؟"

"جی! ہیضہ!!" اجنبی نے جسم میں ایک کپکپی محسوس کرتے ہوئے نلکی کو دیکھ کر کہا "خدا کی پناہ، پروفیسر صاحب آپ نہایت خطرناک ہیں!!"

ماہر جراثیم نے نووارد کے چہرہ کے تغیرات کو غور سے مطالعہ کیا، یہ شخص اُسکے ایک نہایت ہی گہرے دوست کا تعارفی رقعہ لیکر تجربہ گاہ دیکھنے کی غرض سے آیا تھا۔ اُسکی پھٹی پھٹی آنکھیں، سیاہ اور بے ترتیب بال، گھبرائی ہوئی صورت، پریشان انداز، خود ساختہ حیرت، بناوٹی خوف ــــ یہ وہ تمام باتیں تھیں جنکو ماہر جراثیم شبہ کی نظر سے دیکھ رہا تھا۔ اُسکے دوست نے اجنبی کو سائنس کا محض مبتدی طالبعلم ظاہر کیا تھا۔

جس خوفناک موضوع پر گفتگو ہو رہی تھی اُسکے لحاظ سے ہر اجنبی غیر معمولی حیرت کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ مگر اجنبی کی

حسرت سے ایک قسم کا اطمینان ظاہر ہو رہا تھا اور یہی بات مشتبہ تھی۔

یکایک ماہر جراثیم نے نلکی کو اپنی نگاہوں کے سامنے کرتے ہوئے کہا "بیشک! انسانی تباہی اور بربادی اس نلکی مین بند ہے۔ اس چھوٹی سی نلکی کو صرف شہر کے مرکزی آبیار مین توڑ دیجئے اور ان حقیر، غیر محسوس، زندہ جراثیم سے جو آلۂ خوردبین کی پوری قوت سے محض ذرات نظر آتے ہین، اور جنھین نہ شامہ محسوس کرتا ہے نہ ذائقہ اتنا کہدیجئے —— "جاؤ، بڑھو، پھیلو، اور ہر پانی پر اپنی حکومت قائم کرلو"، —— آپ دیکھینگے کہ موت، پُراسرار، نامعلوم موت! نامحسوس، بلائے بے درمان موت! خونخوار کرب افزا موت!! تمام شہر پر مسلط ہو جائیگی، اور ہر ممکن ناممکن گوشہ تک اُسکی رسائی ہو جائیگی۔ کہین وہ خاوند کو بیوی سے اور بچہ کو مان سے جُدا کر دیگی، کہین مدیر کو اُسکے فرض سے اور مزدور کو اُسکے مصائب سے چھڑا دیگی۔ وہ پانی کے نالون سے گذریگی، سڑکون پر چھاپے ماریگی، گھرون مین بے تکان گھُس جائیگی اور ہر اُس شخص کی زندگی اُسکا ٹیکس ادا کریگی جو اُبلا ہوا پانی پینے کا عادی نہین ہے۔ وہ کنوؤن مین پہونچ جائیگی، ترکاریون مین سرایت کر جائیگی، اور برف مین منجمد ہو جائیگی

وہ مویشیون کے حوضون مین، پارک کے چشمون مین، جابجا صرف جاندار دن کے حلق تک پہونچنے کا انتظار کرتی ہوگی۔ یا زمین مین جذب ہو کر صدہا ایسے چشمون اور کنوؤن مین نمودار ہو جائیگی، جہان اسکی موجودگی کا کسی طرح قیاس بھی نہین کیا جاسکتا ——

غرض صرف ایک مرتبہ اُسے شہر کے آبیار تک پہونچا دیجئے، پھر قبل اسکے کہ دوبارہ اُسے گرفتار کیا جاسکے وہ اس دُنیا کے سب سے بڑے شہر کو آبادی سے بے نیاز کر دیگی"

وہ یکایک رُک گیا اور جواب کا انتظار کئے بغیر خود ہی کہنے لگا "لیکن یہان یہ بالکل مقید ہے، قطعًا بے بس، عضوِ معطل، آپ سمجھے —— ہم بالکل محفوظ ہین"، اجنبی نے سر کی جنبش سے اقرار کیا، اُسکی آنکھون مین ایک قسم کی چمک پیدا ہوئی لیکن صرف کھانس کر رہ گیا۔

"یہ انارکسٹ، بدمعاش —— بالکل بیوقوف ہین، قطعًا اندھے ہین جو اس قسم کی چیزین موجود ہونیکے باوجود بم استعمال کرتے ہین میرے خیال مین تو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "

زنجیر چھوٹنے کی ایک ہلکی سی جھنکار، اور دروازہ کھُلنے کی ایک خفیف سی آواز کمرے کے مشرقی گوشہ مین پیدا ہوئی، ماہر جراثیم نے پلٹ کر دیکھا۔

"صرف ایک منٹ کیلئے ہو جاؤ!" اسکی نوعمر بیوی نے دروازے سے جھانکتے ہوئے کہا۔

جب وہ دوبارہ اپنی تجربہ گاہ مین داخل ہوا تو اجنبی اپنی گھڑی دیکھ رہا تھا۔

"معاف کیجئے گا، مجھے مطلق خیال نہ رہا اور مینے آپکا ایک گھنٹہ ضائع کر دیا۔ چار بجنے مین صرف بارہ منٹ باقی ہین۔ مجھے ساڑھے تین بجے روانہ ہو جانا چاہئے تھا، لیکن آپکے دلچسپ لیکچر مین محو ہو گیا، اب اجازت دیجئے، وقت مین بالکل گنجائش نہین ہے، مجھے چار بجے ایک دوست سے ملنا ضروری ہے"

اجنبی شکریہ ادا کرتا ہوا کمرے سے گذر گیا، ماہر جراثیم دروازہ تک اُسے پہونچا کر خاموشی کے ساتھ اپنے کمرے مین واپس آگیا، وہ اپنے ذہن مین نووارد کی ظاہری شکل و شباہت پر تبصرہ کر رہا تھا۔

"عجیب آدمی تھا" اُسنے زیرِلب کہا "یقیناً خطرناک! وہ زہریلے جراثیم کا بیان کتنی دلچسپی سے سُن رہا تھا اور شیشی کو کیسی للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا" کسی بےچین خیال کے ماتحت وہ یکایک اُٹھا۔ دو دکش کے پاس بنچ پر جھک کر کچھ دیکھا، تیزی سے جھپٹ کر اپنی میز پر کچھ ڈھونڈا، جیبوں مین ہاتھ ڈال کچھ ٹٹولا اور بھاگ کر دروازہ پر آگیا۔

"غالباً مینے اُسے بڑے کمرے کی میز پر رکھ دیا ہے" اُسنے ذرا اونچی آواز سے کہا "منی!" ——— "جی!" کہین دور سے ایک زنانی آواز آئی۔

"مین ابھی جب تمسے بات کرنے آیا تھا، تمنے میرے ہاتھ مین کوئی چیز تو نہین دیکھی سچ بتادو پیاری منی! جلدی بتادو!!"

"کچھ نہین، پیارے جان! خیریت تو ہے؟"

"تباہی! بربادی!!" ماہرِ جراثیم نے کہا اور بدحواسی کے ساتھ دروازہ کی طرف دوڑا، ایک لمحہ بعد وہ شارع عام پر تھا منی نے دروازہ کھُلنے کی آواز سُنی اور کسی نامعلوم خطرے کے خیال سے بھاگ کر کھڑکی مین سے جھانکنے لگی سڑک پر ایک نحیف الجثہ، بدوضع سا آدمی ایک کرایہ کی گاڑی مین سوار ہورہا تھا، اُسکا خاوند ننگے سر، سلیپر پہنے ہوئے مجمع کو چیرتا ہوا بدحواسی سے گاڑی کی طرف دوڑ رہا تھا۔ ایک سلیپر اُسکے پیر سے نکل کر سڑک پر رہ گئی تھی مگر اُسے مطلق پرواہ نہ تھی۔

"خداوندا! یہ دیوانہ تو نہین ہوگیا ہے، سائنس نے اُسکا دماغ تو خراب نہین کردیا ہے" منی دل ہی دلمین کہہ رہی تھی۔

وہ کھڑکی کھول کر اُسے پکارنے کا ارادہ ہی کر رہی تھی کہ اجنبی نے اپنے چارون طرف نگاہ ڈالی، اور بالکل اُسی قسم کی دماغی خرابی کا اثر اُسکی صورت سے ظاہر ہونے لگا جسمین اُسکا خاوند مبتلا معلوم ہوتا تھا۔ اُسنے ایک لایعنی سا اشارہ ماہر جراثیم کی طرف کیا اور گاڑی والے کے کان مین کچھ کہا، گاڑی کا دروازہ بند ہوا، چابک مارنے کی مسلسل آواز سُنائی دی، گھوڑے کی ٹاپ سڑک پر گونجی اور ایک لمحہ بھر مین گاڑی آگے آگے اور ماہر جراثیم دیوانون کی طرح ننگے سر ننگے پاؤن پیچھے پیچھے دوڑتے ہوئے سڑک پر دکھائی دیئے اور موڑ پر پہونچکر دونون نگاہ سے غائب ہوگئے ———

منی تقریباً ایک منٹ تک کھڑکی سے جھانکتی رہی اور پھر کمرے مین واپس آگئی وہ بیحد متحیر تھی۔

"جان حد سے زیادہ مذاق پسند ہے!" اُسنے دل ہی دلمین سوچا "مگر اس زمانہ مین، دن دھاڑے ایک شریف آدمی کا ننگے سر ننگے پاؤن لندن کی شارع عام پر دوڑ لگانا! کتنی شرمناک حرکت ہے!؟"

ایک روشن خیال اُسکے دماغ سے گذرا! اُسنے تیزی سے اپنی ٹوپی اوڑھی، خاوند کے جوتے لئے، ہال مین آئی اور کھونٹیون پر سے اُسکا ہیٹ اور کوٹ اُتارا۔ دروازہ پر پہونچی اور ایک گاڑی کو جو خالی سڑک پر سے گذر رہی تھی کرایہ کرلیا۔

"سیدھے سامنے والے راستہ پر چلو وہان سے ہیولاک کریسنٹ پر موڑ لو اور راستہ مین ایسے شخص پر نگاہ رکھو جو ہاف کوٹ پہنے ہوئے ننگے سر ننگے پیر بھاگ رہا ہو!"

"ہاف کوٹ پہنے ہوئے ننگے سر ننگے پیر؟ - بہتر ہے، معزز خاتون! ابھی لو" یہ کہکر کوچبان نے گھوڑے کو چابک لگایا اور کچھ اس اطمینان سے گاڑی بڑھائی گویا تمام زندگی اسی پیشہ پر گاڑی ہانکنے مین بسر ہوئی ہے۔ چند منٹ کے بعد تانگہ والون اور آوارہ لوگون کے ایک مجمع نے جو ہیوسٹاک کے

اڈے پر جمع ہوتے ہین بڑے تعجب سے ایک گاڑی کو گذرتے دیکھا جسکی طوفانی رفتار میونسپلٹی کے قانون سے بے نیاز معلوم ہوتی تھی

جب تک گاڑی گذری سب خاموش رہے، اُسکے بعد ایک بیفکرے نے کہا "ابے یار دیکھا تمنے ہتّو کو! کس شان سے ہانک رہا تھا،"

"تڑا تڑ چابک مار رہا ہے مرا یار، . . . . وہ مُڑ گیا!" دوسرے نے کہا "اور یہ ایک اور پاگل آرہا ہے! —— یہ اُس سے بھی تیز ہے" تیسرے نے کہا "ارے —— ! یہ تو چچا جان سچ ہیں، تو نے ٹھیک کہا یار، یہ ضرور کسی کو پاگل خانہ لئے جا رہا ہے!" چوتھے نے کہا۔

"میرے خیال مین تو یہ ہتّو کا پیچھا کر رہا ہے" پہلے نے کہا

یہ خیال آتے ہی اڈے کے تمام تانگے والے بے ترتیبی سے چلانے لگے۔

"سرپٹ چھوڑ دے ہتّو" —— "بھاگ چچا، بھاگ!!" "گردن پہ مار گردن پہ!!" —— "آخ اسی دوڑ پہ فیصلہ ہے!" —— "پکڑے رہ گیا ہے تھوڑی سی دور!!"

"یہ لو، اور آمد!!" ایک نے پیچھے مُڑ کر کہا

"سمجھ مین نہین آتا یار، آخ کیا ہیمسٹیڈ مین سارے گاڑی والے پاگل ہو گئے ہین یا انکی کوئی شرط ہوئی ہے؟" دوسرا بولا

"ابکی دفعہ سبزے والے کی باری ہے" تیسرا بولا

"اسمین تو کوئی عورت ہے! —— ہان ہم سمجھ گئے اگلا آدمی بہت خوش قسمت ہے اور اسکے ہاتھ مین یہ کیا ہے یار؟"

پانچوان بولا

بھگوڑے عاشق کی ٹوپی!" پہلے نے جواب دیا

"کتنی شوخ تیزی ہے!! —— چچا جان سچ سی تو ٹھیک ایک اور تین کی نسبت ہے۔ ہا۔ ہا۔ ہا —— ہاہاہا!!"

منی جسوقت اس مجمع کے پاس سے گذری تو متفقہ طور پر اُسکے گھوڑے کو سراہا گیا اور عام طور پر تالیان بجائی گئین۔ اُسے بہت ناگوار گذرا لیکن اپنے فرض سے مجبور تھی۔ وہ ایک طوفانی رفتار سے ہیورا سٹاک ہل، سی۔ ٹی، ہائی اسٹریٹ وغیرہ سے گذر گئی۔ اُس کی آنکھین بوڑھے جاسج کی پشت پر لگی ہوئی تھین جو اُسکے خاوند کو اپنی صبا رفتار گاڑی مین اُڑے لئے جا رہا تھا

سب سے اگلی گاڑی مین جو شخص بیٹھا تھا وہی سب سے زیادہ مضطرب نظر آرہا تھا۔ اُسکے دونون ہاتھون کی مٹھیان بند تھین جنمین سے ایک کے اندر جراثیم کی تباہ کُن نلکی تھی۔ اُسکے چہرہ پر خوف اور پریشانی کی علامتین نمودار تھین بالخصوص وہ اسوجہ سے زیادہ پریشان تھا کہ اپنا کام کرنے سے پہلے کہین گرفتار نہ ہو جائے۔ اسی پریشانی کے ساتھ اُسے خوف بھی تھا اور وہ صرف اپنے سنگین، وحشیانہ اور ہولناک جرم کے خیال سے۔

"کوئی انارکسٹ مجھ سے قبل اس عجیب و غریب طریقہ کار کو معلوم نہین کر سکا کسی کے سر ایسی شاندار فتح کا سہرا نہین بندھ سکا" وہ اپنے ذہن مین سوچ رہا تھا "راؤکل، ویلانیٹ اور تمام مشہور و معروف ہستیان جو انارکی مین شہرۂ آفاق ہو چکی ہین اُسکی نگاہون مین حقیر معلوم ہو رہی تھین، صرف شہر کے مرکزی آبیار کو معلوم کرنا اور اُسمین شیشہ کی نلکی کو توڑنا شرط تھا، پھر کیا تھا، پھر تو وہ تمام نراجیون کا متفقہ بادشاہ تھا۔

اُسنے جس ذہانت کے ساتھ سازش کو مرتب کیا تھا وہ یقیناً قابلِ داد تھی۔

تعارف کیلئے جعلی خط بنانا، تجربہ گاہ مین داخل ہونا، ماہر جراثیم کو دھوکہ مین ڈالنا، اور معہ نلکی کے تجربہ گاہ سے نکل آنا:۔

"اب دُنیا یقیناً میرا نام سنیگی" اُسنے ایک کامیابی کی سانس لیتے ہوئے کہا "یہ تمام لوگ جو مجھسے نفرت کرتے رہے ہین، مجھے پس پشت ڈالتے رہے ہین، دوسرون کو ترجیح دیتے رہے ہین، میری محبت کو بار سمجھتے رہے ہین، بالآخر میری اہمیت کا اندازہ کرلینگے، موت! موت!! صرف موت!!! ——— اُنھون نے ہمیشہ مجھے فضول اور بیکار آدمی سمجھا ہے، تمام دُنیا مجھے پس پشت ڈالنے کے لئے ساز باز کر رہی تھی۔ اب مین بتادونگا کہ ایک شخص کو تنہا چھوڑ دینا، اُسکی قدر نہ کرنا کیا مصیبت لاسکتا ہے!!"

"یہ کونسی سڑک ہے؟ ——— سینٹ اینڈریو...... بیشک! دوڑ کا کیا نتیجہ رہا؟" اُسنے کھڑکی سے سر نکالکر پشت کی طرف دیکھا، ماہر جراثیم مشکل سے پچاس گز پیچھے تھا۔ "یہ بُرا ہوا، افسوس! اب مین پکڑا جاؤنگا اور ساری اُمیدون پر پانی پھر جائیگا" اُسنے اپنی جیب ٹٹولی اور نصف گنی کا ایک سکہ نکالکر ڈرائیور کی مٹھی مین دیدیا۔ "اور انعام ملیگا۔ بھگائے چلو اور صرف پچھلی گاڑی کے گھوڑے کو تھکا دو!!" اُسنے چلاّ کر کہا

"بہت اچھا حضور!" ڈرائیور نے گنی کو جیب مین ڈالتے ہوئے دو تین چابک لگائے

کھڑکی کا کھلا ہوا کواڑ کسی چیز سے ٹکرایا، گاڑی ڈگمگائی اور انارکسٹ نے تختہ پکڑنے کے لئے بیساختہ وہ ہاتھ بڑھا دیا جس مین جراثیم کی نلکی تھی۔

نلکی ٹوٹ گئی، شیشی کا آدھا حصہ گاڑی کے تختون پر اُسکے پیر کے برابر آ گیا۔ انارکسٹ کے مُنہ سے بیساختہ آہ نکلی اور اپنی جگہ پر ساکت رہ گیا، اب وہ ایک ایسی مایوسانہ نگاہ سے جسمین بےبسی جھلک رہی ہو سیال مادہ کے اُن دو تین قطرون کو جو گاڑی کے تختہ پر بکھر گئے تھے دیکھ رہا تھا۔

"خیر!" کچھ دیر بعد اُسنے کانپتے ہوئے کہا "پہلا شکار مین ہی سہی، کچھ پرواہ نہین، بہر حال شہید ہونا بھی ایک عزت ہے، تاہم.... ...... یہ نہایت ہی بے موقعہ موت رہی، خدا معلوم یہ چیز اسی قدر مہلک ہے یا نہین جسقدر بتلایا جاتا ہے"

اُسے ایک فوری خیال آیا اور اپنے پیرون کے درمیان کوئی چیز ٹٹولنے لگا، ایک چھوٹا سا قطرہ اب بھی ٹوٹی ہوئی نلکی مین باقی تھا وہ اُسے بلا تامل پی گیا "اب جسقدر میری موت یقینی ہے اُس قدر جراثیم کا پھیلنا بھی لازمی ہے" اُسنے دل ہی دلمین کہا اور ماہر جراثیم کا خیال آیا جس سے بچنا زائد از ضرورت معلوم ہوتا تھا۔ چنانچہ ولنگٹن اسٹریٹ مین اُسنے ڈرائیور سے گاڑی رُکوالی اور اُتر پڑا

زمین پر اُسکا پیر پڑتے ہوئے ڈگمگا رہا تھا اور سر چکرایا جاتا تھا۔ اُسنے گاڑی والے کو رخصت کر دیا اور سینہ پر دونون ہاتھ رکھ کر ماہر جراثیم کے انتظار مین سڑک پر کھڑا ہو گیا۔ اُسکے چہرے سے جلال اور آنکھون سے شاہانہ رُعب ٹپک رہا تھا۔ فوری موت کے خیال نے اُسے ہر نوع شاندار بنا دیا تھا۔

"زندہ باد۔ مزاج!!"

"دوست تمہاری آمد بعد از وقت ہے میں اُسے پی گیا ـــــــ ہیضہ پھیل چکا ہے!" ماہر جراثیم نے اپنا چشمہ درست کر کے تعجب سے اُسے دیکھا ــــ "پی گئے!

اچھا کیا۔ تم انارکسٹ تھے، مجھے اب معلوم ہوا"۔۔۔۔۔ "وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا مگر کہتے کہتے رک گیا اور تبسم اُسکے ہونٹوں کے نقطۂ اتصال پر کھیلنے لگا اُسنے اپنی گاڑی کا دروازہ اُترنے کے لئے کھولنا چاہا مگر انارکسٹ نے ڈراما کے مخصوص انداز میں اشارے سے "الوداع" کہا اور پشت پھیر کر آہستہ آہستہ واٹرلو برج کی طرف چل دیا۔ مرض پھیلانے کیلئے وہ اپنا جسم سڑک سے گذرنیوالے ہر آدمی سے قصداً مس کرتا ہوا جا رہا تھا ماہر جراثیم اُسکے خیال میں اس قدر منہمک تھا کہ منی کے یکایک سامنے آجانے پر اُسنے مطلق اظہار تعجب نہ کیا وہ پیار کے لہجہ میں اُس سے کہنے لگا "پیاری منی تمنے بہت اچھا کیا کہ میرے جوتے اور ٹوپی لیتی آئیں" اور بدستور انارکسٹ کو دور سڑک پر جاتے ہوئے دیکھتا رہا

"تم بیٹھ جاؤ!" اُسنے اُسی طرح سڑک کی طرف تکتے ہوئے کہا۔ منی کو اب یقین ہوتا جا رہا تھا کہ اُسکا خاوند حواس تمسر کھو چکا ہے چنانچہ اُسنے گاڑی میں بیٹھ کر مایوسی کے لہجہ میں ڈرایئور کو گاڑی ہانکنے کا حکم دیا۔

"میرے جوتے! پیاری منی!" پروفیسر نے اپنی بیوی سے دریافت کیا گاڑی مُڑ گئی اور دور سڑک پر سیاہ چیز جو رفتہ رفتہ آدمیوں کے ہجوم میں غائب ہوتی جا رہی تھی گھوڑے کی آڑ میں آگئی ـــــــ پروفیسر بے ساختہ قہقہے لگانے لگا۔

"یہ ایک ہی ہوئی ـــــ حالانکہ ۔۔۔۔۔۔!"

"منی تمھیں معلوم ہے کیا ہوا؟ سُنو! یہ آدمی آج تیسرے پہر مجھ سے ملنے کیلئے آیا، جانتی ہو کون ہے؟ انارکسٹ!۔۔۔۔۔ چیخنے چلانے کا کام نہیں، خاموشی سے سُنے جاؤ! ورنہ اسطرح میں باقی ماندہ قصہ نہیں کہہ سکتا ۔۔۔۔ سمجھ گئیں۔ میں اُسے متحیر کرنا چاہتا تھا، یا یوں کہو کہ بیوقوف بنانا چاہتا تھا، مگر مجھے مطلق علم نہ تھا کہ یہ انارکسٹ ہے۔ بالکل اطمینان سے مینے جراثیم کی وہ نلکی اُسے دکھائی جس کے بارے میں مینے تمسے تذکرہ کیا تھا کہ بندروں کے جسم پر نیلے دھبے ڈال دیتی ہے اور وہ آپس میں خوب لڑتے ہیں مگر مینے اُسے بالکل بیوقوف بناتے ہوئے یہ ظاہر کیا کہ اس میں ایشیائی ہیضہ کے زندہ جراثیم بند ہیں نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اُسے لیکر لندن کے تمام پانی میں زہر ملانے کی غرض سے بھاگ گیا مینے اُسکا پیچھا اس لئے کیا کہ اس میں دو تین اجزا نہایت کمیاب ہیں اور تیل کے ساتھ ملکر انتہائی زہریلے جراثیم بنا دیتے ہیں۔ بہرحال وہ اُس مادہ کو پانی میں ملا کر بھی کم از کم اس مہذب شہر کی تمام زندہ چیزوں کو نیلا ضرور بنا دیتا۔ مگر اچھا ہوا کہ وہ خود ہی اُسے پی گیا معلوم نہیں اب کیا ہوگا۔ لیکن تمھیں یاد ہے اس سے وہ کُتیا نیلی ہوگئی تھی! اُسکے بچوں پر نیلے داغ پڑ گئے تھے اور چڑیا کے گہرے آسمانی پر نکل آئے تھے۔ یہ تو جو کچھ ہوا سو ہوا مشکل یہ ہے کہ اب مجھے دوبارہ اسے تیار کرنے کی زحمت اُٹھانی پڑیگی۔

اور ہاں، تم یہ گرم کوٹ کیوں لائی ہو؟ کیا میں اسے پہنوں؟ ــــ کیوں؟ اسلئے کہ راستہ میں مسز جیبر نہ مل جائیں ـــــ پیاری منی! مسز جیبر ایسی نہیں ہیں لیکن پھر بھی کیا مجھے مسز جیبر کے ڈر سے کوٹ پہننا ـــــــ اچھا لو۔۔۔۔۔۔"

(ایچ۔ جی۔ ویلس)

طالب باغپتی

تصوف اسلام پر ایک مورخانہ نظر

(بہ سلسلۂ سابق)

ڈاکٹر ابرکرامبی اور اسکے نظریات خواب

عالم رویا مین دماغی کیفیت کو دو مفصلۂ ذیل حصون مین تقسیم کرسکتے ہین،
(۱) وہ خیالات جو دماغ مین ظاہر ہوتے ہین، اپنے وجود حقیقی ہونے کا یقین دلاتے ہین، اور عالم بیداری کی طرح جب ہملوگ اپنے خیال کو اشیائے موجود فی الخارج سے مقابلہ کرتے ہین تو یہ یقین صحیح نہین ہوتا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ عالم رویا مین جو صورتین ظاہر ہوتی ہین وہ حقیقی معلوم ہوتی ہین، مثلاً خواب مین ہملوگ کوہ و دشت، میلون میدان، سر بفلک عمارات، اور بڑے بڑے سمندر دیکھتے ہین، تو معلوم ہوتا ہے، انکا وجود حقیقی ہے خیالی نہین، جسطرح بیداری مین کوئی منظر وجود حقیقی کا احساس پیدا کرتا ہے، خواب مین بھی یہی ایقانی کیفیت ہوتی ہے، لیکن فرق یہ ہے کہ عالم بیداری مین ہملوگ جب اپنے خیال کو ان مناظر سے مقابل کرتے ہین، تو انہین موجود فی الخارج پاتے ہین اور عالم رویا مین جو مناظر ہمارے پیش نظر ہوتے ہین ان مین صرف ذہن ہی سے تعلق رہتا ہے، خارج عن الذہن ان کا وجود نہین پایا جاتا

(۲) خیالات اور تصورات ایک ایسے قانون ایتلاف کے ماتحت دماغ مین مربوط ہو جاتے ہین جسپر انسانی تصرف نہین ہوتا لوگ خیالات اور تصورات کے سلسلہ مین تغیر نہین کرسکتے، اور نہ انہین اپنے ارادہ سے وقفہ دیسکتے ہین،

قانون ایتلاف (ASSOCIATION) فلسفہ کی ایک اصطلاح ہے، ڈاکٹر صاحب کے قانون کی تفصیل یہ ہے کہ خیالات تصورات مستلزم ہوتے ہین یعنی جب ایک خیال پیدا ہوتا ہے، تو اسی قسم کا دوسرا خیال پیدا ہو جاتا ہے، اکثر حفاظ کو دیکھا ہوگا جہان پڑھتے پڑھتے رک گئے پھر وہان سے نہین بڑھتے، اور جہان بتا یا گیا (خواہ وہ ایک ہی لفظ ہو) پھر سلسلہ شروع ہو گیا، یہ اسی قانون کا نتیجہ ہے، ڈاکٹر موصوف کہتے ہین کہ جس طرح کسی خیال کے عناصر پر انکے باہم مربوط ہوتے وقت عالم بیداری مین ہمارا تصرف رہتا ہے، ویسا عالم رویا مین نہین، مثال کے طور پر جذبہ شہوت کو لے لیجئے، خیالات شہوانیہ کے اندر جب مرابطہ پیدا ہونے لگے، تو عالم بیداری مین ہملوگ مذہب اور ہیئت اجتماعی کے خوف سے ان عناصر خیال کو باہم مربوط ہی نہ ہونے دینگے، اور بالفرض یہ خیال ہوا بھی تو اسے عملی جامہ نہین پہنا سکتے اسکے برخلاف

ڈاکٹر ابرکرامبی انگلستان کا ایک مشہور عالم گذرا ہے اسنے ایک کتاب لکھی جو ایک ہی جلد مین دو حصون کے اندر پائی جاتی ہے، اسکا نام "قوائے عقلیہ، اور احساسات اخلاقیہ"، ہے پہلے حصہ مین ایک سکشن کے اندر اسنے خواب کے متعلق مبسوط مباحث کئے ہین، ۱۹۲۵ء مین خاکسار نے اسکا ترجمہ کیا تھا لیکن یہ وہ زمانہ تھا جب مین تعلیم سے فارغ ہی ہوا تھا اور نظر ثانی نہ کرسکتا تھا، اب مین نے پھر اس کو دیکھا اور ضروری حذف و اضافہ کے بعد اس بحث کے سلسلہ مین پیش کر رہا ہون ۱۲

عالم رویا میں ان عناصر کے باہم مربوط، اور منتظم ہو کر عملی صورت اختیار کر لینے پر ہمارا دست تصرف نہیں ہوتا، بڑے بڑے زہاد و صوفیا، علما اور صلحا خواب کے اندر ایسے مناظر سے مقابل ہوتے ہیں، جنکے متعلق عالم بیداری میں انہیں وہم و گمان بھی نہیں ہوتا، عالم بیداری میں ہرگز ایسا فعل ان سے سرزد نہ ہوتا، جو عالم رویا میں ان سے ہو جاتا ہے اسکی توجیہہ ڈاکٹر صاحب کے اس قانون سے ہوتی ہے

ڈاکٹر موصوف نے تکوین خواب کی چار علتیں قرار دی ہیں اور ہر ایک کے ضمن میں انہوں نے تاریخی اور ذاتی تجربات درج کئے ہیں، یہاں پر تفصیلات کی تو گنجایش نہیں لہذا، ڈاکٹر صاحب کے صرف چار دن عنوان بیان کا ترجمہ ہدیہ ناظرین ہے، موقعہ ہوا تو خواب کے متعلق عضویات اور نفسیات کی حیثیت سے بحث کیجاویگی، اور ڈاکٹر ابر کرامبی کی تمام تفصیلات پیش کیجاوینگی۔

(۱) جدید حادثات، اور جدید دماغی جذبات سے جو باہم مخلوط ہو کر ایک مسلسل سلسلہ میں مربوط ہو جاتے ہیں یا قدیم و جدید واقعات، کی مخالطت سے کسی احساس کے ذریعہ سے جو انمیں سے ہر ایک کیساتھ کم و بیش متحد رہتا ہے گو دوسری حیثیت سے ان جدید حادثات و دماغی جذبات یا جدید و قدیم واقعات کی کڑی باہم ملی نہو، اور انمیں انتشار و تشتت ہو، ایک خواب کی تکوین ہوتی ہے

(۲) تصورات کے وہ سلسلے جنھیں تاثرات جسمی کے باعث قانون ایتلاف وجود میں لاتا ہے۔

(۳) انسان بعض ایسے خواب دیکھتا ہے جنمیں ان معاملات یا اشیا کے متعلق جو دماغ سے غائب یا فراموش ہو گئے ہیں قدیم ایتلافات کی معاودت ہوتی ہے

ڈاکٹر صاحب اس کلیہ کے متعلق لکھتے ہیں، کہ ایسے خواب کی علت دریافت کرنا ناممکن ہے، اور انمیں بعض ایسے ہیں، جنھیں ان کلیات میں سے جن سے فی الحال ہم لوگ واقف ہیں کسی کلیہ کے ماتحت نہیں رکھ سکتے

(۴) عادات کا میلان (یا شوق) یا ایک دماغی جذبہ خواب کی شکل میں متشکل ہو جاتا ہے، اور وہ کسی قطری واقعہ کی بدولت عملی صورت اختیار کر لیتا ہے

خواب کے متعلق جدید تجربات

میرے ایک نہایت ہی مخلص دوست ہیں جنکی روایت میرے خیال میں ایسی ہے جسطرح میرے نزدیک خود اپنی روایت، وہ اکثر خواب دیکھا کرتے ہیں، جنھیں انھوں نے اپنے سوانح زندگی میں جستہ جستہ نقل بھی کر دیا ہے، گو انکی موجودہ زندگی نے ایک دنیا دارانہ صورت اختیار کر لی ہے، لیکن اپنی ابتدائی زندگی کا خواب جب وہ مجھ سے بیان کرنے لگے، تو میں نہایت متاثر ہوا، چونکہ میں انکی ابتدائی زندگی سے واقف ہوں اسلئے وہ میرے نزدیک ایک ثقہ راوی ہیں، پہلے وہ ایک غریب طالب العلم تھے، خموشی اور کنارہ کشی انھیں زیادہ محبوب تھی، تلاوت قرآن اور نماز انکا مشغلۂ علت تھا، وہ کہتے تھے کہ حیات کے اس دور میں برابر یہی خواب دیکھا کرتا تھا، کہ مسجد یا کسی دوسری جگہ پر قرآن مجید کی تلاوت کر رہا ہوں، اور بعض آیات پر فرط رقت میں زار زار رو رہا ہوں اور اسی حالت میں میری نیند کھل جاتی تھی، خواب کے اندر فارسی کے بعض اشعار پڑھتے پڑھتے جنمیں ترک دنیا بے ثباتی عالم، حب الٰہی اور درد و محبت کے جذبات پائے جاتے ہیں، انپر اکثر وجد انگیز کیفیات طاری ہو جاتی تھیں اور روتے روتے انکی نیند کھل جاتی تھی ایکدن خواب میں انھوں نے دیکھا کہ ایک سائبان میں صف باندھے، دس بارہ اشخاص بیٹھے ہیں، انکی وضع قطع بالکل صوفیانہ تھی، نیچا جبہ، عمامہ،

لانبی داڑھی، مقدس اور بارعب چہرہ دیکھکر میرے دوست پر نہایت کیفیت طاری ہوئی، اور وہ ایک بزرگ کے نزدیک جو دائین جانب شروع صف مین تشریف فرما تھے پہونچکر اظہار عقیدت کے جذبہ بے اختیار مین، انکا دست مبارک چومنے لگے۔ انھون نے میرے دوست کی گردن جھکائی اور انکی پشت پر ہات پھیر کر فرمایا "یہ خوب پڑھیگا"، میرے دوست ایک غریب اور ناپرسان حال انسان تھے علوم وفنون سے انھین چندان دلچسپی نہ تھی، لیکن انکی بعد کی زندگی کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ انھون نے یقیناً یہ خواب دیکھا ہوگا، اور وہ بزرگ ایک "سروش غیبی" تھے، میرے دوست نے اپنے سوانح زندگی مین ایک اور پر لطف خواب لکھا ہے، جسے مین انھین کے الفاظ مین لکھدیتا ہون،

ابا کا خط

۱۹ر اکتوبر ۱۹۲۵ء دوشنبہ

ابا آج سے چودہ سال پیشتر راحت ابدی کی نیند سو چکے دنیا کے کس پردہ مین ڈھونڈھنے سے بھی آپکا پتہ نہین مل سکتا! ہان آپکی مقدس اور خدا پرست صورت نے اتفاقاً خواب مین آکر دلکو البتہ مغموم و پریشان کیا ہے، ۱۹ر اکتوبر کو بوقت شب آخر مین نے والد ماجد کا ایک خط پایا، اس خط کی نوعیت اور تحریر عجیب دلکش تھی، مضمون سے لاڈ و پیار اور شوق ملاقات مترشح تھا، نیند کھلی تو خط کا مضمون مینے یاد کرلیا، یہ خط کا خلاصہ نہین بلکہ حقیقی الفاظ ہین جو نظام غیبی کے ماتحت میرے محبوب اور چہیتے والد مرحوم کے قلم سے نکلکر عالم رویا مین مجھ تک پہونچے، مینے دیکھا...... مسجد کے نزدیک چوک پر مین کھڑا ہون، دفعتہً ڈاکیہ نے ایک خط لاکر دیا، یہ پوسٹ کارڈ تھا اسکے ساتھ ایک زرد رنگ کا پرچہ چسپان تھا جو اکثر رجسٹری شدہ خطوط مین رہا کرتا ہے۔

مضمون خط

......کے دو مضامین مجھے موصول ہوئے جن سے علم و ہنر ٹپکتا ہے...... میرا لڑکا ہے جسکی خبر ۱۷ (جسکا مفہوم میرے ذہن مین اسوقت یہ آیا ۱۹۱۷ء اور طرز مضمون سے یہی معلوم ہوتا تھا صرف کتابت کی غلطی تھی) کے بعد سے مجھے کچھ معلوم نہین جب سے مینے یہ مضامین پائے ہین، کھانا پینا گانا بجانا ملنا جلنا سب ترک ہوگیا ہے"

باپ کی محبت اور انکے خط کے مطالعہ نے مجھے کچھ ایسا وارفتہ اور غریق بحر فنا بنادیا، کہ مین ہمہ تن چشم بنکر خط کا مرقومہ بالا مضمون پڑھتا رہا نیند کھلی تو ایک پژمردگی اور یاس کا عالم تھا، والد کے فراق کا غم تازہ ہوگیا اور اس سن وسال مین بھی آنسو ٹپک پڑے۔

میرے دوست ایک اور خواب کا تذکرہ کررہے تھے جو بالکل امام غزالی کے رویائے الٰہی سے ملتا ہوا ہے، چونکہ میرا قلب اس قسم کے احساسات کے سمجھنے سے عاری ہے، اسلئے مین اسکی صحیح اہمیت ذہن نشین نہین کرسکتا لیکن ایک ثقہ راوی کی روایت نظر انداز کرنے کو جی نہین چاہتا، وہ کہتے تھے ایک دن مین سفر مین تھا، مغرب کی نماز مین کچھ دیر ہوگئی ایک مسجد مین جاکر فوراً نماز پڑھی، انھین قرآن مجید کا کچھ حصہ یاد تھا، مغرب کی نماز سے فارغ ہونیکے بعد وہ وہین بیٹھ رہے، اور سورۂ جن سے لیکر ۲۹ پارہ کے اخیر تک زبانی تلاوت کی، اور عشا کی نماز پڑھکر اپنی منزل پر لوٹ آئے وہ اپنے بال بچون سے ملنے جارہے تھے، لہذا دل کسی اور شوق کا گرفتار تھا، لیکن تعجب ہے کہ انھون نے خواب مین دیکھا کہ مین وطن کی ایک سڑک پر ہون جسکے اردگرد شیشم کے بڑے بڑے درخت ہین ایسا سمان بندھا ہوا ہے، جیسے موسم بہار مین بدلی چھائی ہو، اور

بوندیں گرنے ہی کو ہوں، ایسے سنسان، مگر دلکش مقام میں عالم پر کامل سکوت طاری تھا نہ وہاں کسی انسان کا گذر تھا، نہ کوئی آواز سنائی دیتی تھی، اسوقت انھوں نے دیکھا کہ میں رامائن کے لہجہ میں ہندی کی ایک غزل پڑھ رہا ہوں، (حالانکہ وہ ہندی غزلیات سے واقف نہیں) انکی آواز میں نہ معلوم اسوقت کہاں سے ایسا سوز و گداز پیدا ہو گیا تھا، کہ وہ خود حیران تھے معلوم ہوتا تھا ترنم کی دلکشی نے اور لہجہ کے پردرد سوز انکے بازوؤں میں پر لگا دینگے اور وہ اڑ کر عالم بالا میں پہونچ جاوینگے، انکی آنکھوں کے سامنے سے معلوم ہوتا تھا پردے اٹھ رہے ہیں اور گویا انکے سامنے تو امیس آلہیہ کے جلوے موجود ہیں، ہر چند اس جلوہ گاہ میں انہوں نے، نہ کوئی صورت دیکھی نہ کوئی آواز سنی، لیکن انکے وجدان کو یہ احساس ہوا، کہ گویا انکے اور خدا کے درمیان کوئی حجاب نہیں

امام غزالی اور انکی صوفیانہ زندگی ۱۰۹۵ء سے امام غزالی کے عہد تصوف کی ابتدا ہوتی ہے، اسکے بعد آپکی زندگی کا کچھ حصہ تو ایک صوفی کی طرح بادیہ پیمائی میں گذرا، اور کچھ صوفیانہ عقاید کی تعلیم و تلقین میں آپنے ۱۱۱۱ء میں وفات پائی، اور اپنے تمام تجربات صوفیانہ آپنے خود اپنی زندگی میں قلم بند کئے ہیں، جو عربی میں اپنی لطافت اور کمال اظہار کے اعتبار سے فقید المثال کتاب ہے، امام موصوف اپنے صوفیانہ رجحان کو مفصلہ ذیل الفاظ میں بیان کرتے ہیں

میری توجہ طریقت صوفیہ کی طرف مبذول ہوئی، میں جانتا تھا کہ انکے جادہ طریقت پر رہروی کیلئے اصول اور عمل دونوں ذرایع ضروری ہیں، اسکا اصول یہ ہے، کہ انسان اپنے نفس سے تمام صفات و خصوصیات خبیثہ دور کر دے، یہانتک کہ انسان کا دماغ صرف اسماء الہیہ کے جلوہ سے معمور ہو جائے، میرے طریقت صوفیہ کا اصول اسکے علمی اور اد و وظائف کی بہ نسبت زیادہ سہل تھا، اسلئے مینے اسے جاننے کیلئے انکی کتابوں کا مطالعہ شروع کیا، (یہاں امام غزالی نے تصوف کی چند کتابوں کے نام لکھے ہیں) مینے انکے اصولی فکر و عقاید پر عبور حاصل کر لیا، اور انکی طریقت کے متعلق مجھے وہ تمام معلومات حاصل ہو گئے، جو مطالعہ یا سماعت سے حاصل ہو سکتے ہیں

مجھ پر یہ بات ظاہر ہوئی کہ مطالعہ کے ذریعہ سے طریقت کے خصایص کا علم حاصل نہیں ہو سکتا، اسکے لئے ذوق سلیم کی ضرورت ہے اسکے بعد امام غزالی نے ایک خطیبانہ انداز میں بیان کیا ہے کہ اسمیں جو حفظان صحت کے اصول و قوانین سے واقف ہے، اور جو خود صحیح اور تندرست ہو کسقدر فرق ہے، ایک وہ شخص جو صرف شرب اور بانگ نوشا نوش کی تعریف جانتا ہو، اس شخص سے جو لذت شرب سے پر کیف اور جو گاہے گاہے شبانہ و گہ بادہ صبوح، کی نشاط آفرینیوں سے سرشار ہو کسقدر ممتاز حیثیت رکھتا ہے "بادہ پیمائی" جسکا وظیفہ صبح" اور "ورد شام" ہو وہ بادہ پیمائی کی تعریف اور لذت خمار کے علمی لطائف نا واقف ہوتا ہے، اسے ایک وارفتہ کرنے والی مستی ہوتی ہے وہ لذت خمار سے ایک نشاط نفس حاصل کرتا ہے، اور بس، ایک سنجیدہ اور زاہد منش انسان تعریف خمار تو جانتا ہے بادہ پیمائی کے متعلق اسے علمی اور طبی اصول سے تو واقفیت ہوتی ہے، لیکن وہ لذت شرب سے بالکل ناآشنا ہوتا ہے، اسی طرح جب ایک طبیب بیمار ہوتا ہے حفظان صحت کے اصول، اسباب مرض اور دفعیہ کے اسرار سے تو واقف رہتا ہے، لیکن صحت اس سے مفقود رہتی ہے، ماہرین تصوف اور رہروان طریقت کے درمیان یہی فرق ہے

مجھے اسکا یقین ہو گیا، کہ صوفیہ کے نزدیک "احوال"، اہمیت رکھتے ہیں نہ کہ تعریفات اور یہ کہ جو کچھ علمی و نظری مباحث کے

ذریعہ ممکن تھا، مجھے حاصل ہوگیا، بقیہ معلومات مطالعہ وسماعت کے ذریعہ نہین حاصل ہوسکتے بلکہ انکے لئے "ذوق" کی ضرورت ہے، اور ایک مدت معینہ تک عملی اور اد و وظایف کی،

ان علوم کے ذریعہ جو مینے پڑھے تھے، اور ان طریقون کی وساطت سے جو مینے اقسام علوم (عقلی و نقلی) کی جستجو مین اختیار کئے تھے، میرا عقیدۂ توحید، رسالت اور آخرت کے متعلق راسخ ہوگیا تھا، ایمان کے یہ بنیادی عقاید میرے نفس مین اثبات کامل کے ذریعہ نہین جاگزین ہوتے تھے، بلکہ سلسلۂ ایتلاف، اور تجربات کے ذریعہ حاصل ہوتے تھے یہ بات مجھ پر ظاہر ہوگئی، کہ مجھے نجات اخروی کی امید صرف اتقا اور نفس کو مطلوبات شہوانیہ سے محفوظ رکھنے سے ہی ہوسکتی ہے، اور یہ کہ اسکی ابتدا یہ ہے، کہ قلب کو عالم مادی کے تعلقات سے منقطع کردیا جائے

ان خیالات کے پیدا ہونے سے مین سمجھنے لگا کہ مین زندگی کے ایک نہایت اہم دور سے گزر رہا ہون، آخرکار ایک دن مینے ارادہ راسخ کرلیا، کہ بغداد سے ہجرت کرکے حیات کی تمام کامرانیون سے دست بردار ہوجاؤنگا لیکن ابھی تک مین پس وپیش مین تھا صبح کو مین ترک دنیا کا ارادہ کرتا تھا، تو شام کو اسمین انقلاب رونما ہوجاتا میرے ارادہ مین استقلال نہ تھا مطلوبات شہوانیہ "دامن دل" پکڑ کر کہتے تھے کہ "جا اینجاست"، اور ایمان کا ایک سروش غیبی "بربند یدمحملہا" کا پیہم پیام سنا رہا تھا،

اسی طریقہ سے چھ ماہ گزر گئے، اور مین کبھی تو عالم مادی کے جذب وکشش سے متاثر ہوتا تھا، اور کبھی آخرت کی پکار سے، ۴۸۸ھ تھا رجب کا مہینہ تھا، اسوقت معاملہ میری مرضی اور خواہش سے بالاتر ہوگیا، مجھے مجبوری لاحق ہونے لگی، خدا نے میری زبان بند کردی، میری گویائی ایسی سلب ہوگئی، کہ مین تعلیم وتلقین کرنے سے بھی عاجز ہوگیا، ایک دن مینے دباؤ ڈالکر چاہا کہ بعض حضرات کے اطمینان خاطر کیلئے مین کچھ تعلیم کرون، لیکن میری زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا، اب زبان کی اس بندش اور نطق کے فقدان کے باعث مین سخت مغموم رہنے لگا میری قوت ہاضمہ مین فرق آگیا، نہ کھانے کی خواہش رہی، نہ پانی کی طلب، نہ مین ایک قطرہ آب جذب کرسکتا تھا نہ ایک لقمہ ہضم، میری قوت زائل ہونے لگی، اور اطبا نے بھی شفا سے مایوسی ظاہر کی، انھون نے تشخیص کی کہ کسی دماغی تکلیف نے نظام جسمیہ پر اثر ڈال رکھا ہے، اور اسکا علاج یہی ہے، کہ وہ فکر وتردد دماغ سے دور ہوجائے تب مینے ضعف ونقاہت کا احساس کرتے ہوئے، اور اپنے ارادہ کی طلب وادعا سے دست بردار ہوکر مینے اس شخص کی طرح جسکا وقت ضرورت کوئی حاجت روا نہ ہو، خدا کی طرف رجوع کیا

صدائے غیبی آئی، اور میرے لئے آسان ہوگیا، کہ مین جاہ وحشم کی تمنا، دولت کی فراوانی، اور کینہ ورفقا کے تعلقات سے سبکدوش ہوجاؤن۔

اسکے بعد امام غزالی فرماتے ہین کہ کس طرح مینے بغداد کے دربار خلافت سے رخصت حاصل کی، آپنے ظاہر کیا کہ حج بیت اللہ کا ارادہ ہے، حالانکہ آپکا اصل مقصد یہ تھا، کہ شام کا سفر کرین، اور وہین صوفیہ کی طرح ترک دنیا، اور مراقبہ کے اشتغال مین مستغرق رہین، امام غزالی اب یک بادیہ پیما راہب ہوگئے، آپ ملک شام مین پہونچے، اور وہان دو سال تک کنج عزلت مین بسر کی آپنے صوفیانہ ریاضت کی منزلین طے کین، تزکیہ دماغ اور تصفیہ قلب فرماتے رہے، اور ہمیشہ خیال الٰہی مین مستغرق رہے، اسکے بعد آپکے

قلب مین پہیم حج بیت اللہ کی خواہش پیدا ہوئی آپ نے مناسک حج ادا کئے، اور دس سال تک آپکی زندگی، دو حصون مین منقسم رہی، خود اپنا تزکیہ نفس، اور دنیا کے دوسرے ارباب کا خیال، تعلقات دنیا کے افکار، زندگی کی ضروریات اور اولاد کی منت وسماجت کبھی انہین اپنی طرف متوجہ کرلیتی، اور کبھی صوفیہ کی "جمعیت" اور "علاقہ الٰہی" کی طلب، کنج عزلت مین بٹھادیتی،

(باقی)

عبدالمالک آروی

ایک ادبی وعلمی دعوت

جنوری ۱۹۲۸ء کی اشاعت نگار کو مومن کے لئے مخصوص کرکے مین نے اپنے آپکو گویا پابند بنالیا ہے کہ ہر سال کسی نہ کسی ایسے شاعر کی یاد کو تازہ کیا جائے جس کے مٹانے مین زمانہ نے اپنی پوری قوت صرف کردی ہے۔

چنانچہ ارادہ ہے کہ جنوری ۱۹۳۰ء کا "نگار" **ابوالمظفر سراج الدین بہادر شاہ ظفر** کے لئے مخصوص کردیا جائے اور کم ازکم دو سو صفحات کو محیط ہو۔ اس سلسلہ مین جو عنوانات قایم کئے ہین، یہ ہین:-

(۱) ظفر کی سیرت اور اس کے عہد کے تاریخی خصوصیات (۲) عہد ظفر کے سیاسیات (۳) ظفر کی شاعری اور اسکی خصوصیات (۴) عہد ظفر مین دہلی کی شاعری (۵) ظفر کی شاعری پر سیاسیات وقت کا اثر (۶) دربار ظفر اور عہد ظفر کے شعراء (۷) ظفر کے عہد مین دہلی کی علمی و ادبی فضا (۸) ظفر رنگون مین (۹) حالی و آزاد کی رائے ظفر کی شاعری کے متعلق اور اسپر محاکمہ (۱۰) انتخاب کلام ظفر

امید ہی کہ ملک کے ارباب علم وادب

عنوانات بالا مین سے کسی عنوان پر یا ایک ہی مضمون کے سلسلہ مین ان تمام یا چند عنوانات پر اپنی تحقیقات ومعلومات بھیجکر ممنون فرمائینگے۔ انتخاب کلام ظفر کی خدمت ادارۂ نگار نے اپنے ذمہ لی ہے اسلئے اسپر کسی کو وقت صرف کرنیکی ضرورت نہین۔

اسی سلسلہ مین غالباً یہ عرض کردینا بے محل نہوگا کہ بہترین مضمون کے لئے نگار کی طرف سے ایک حقیر ہدیہ **سو روپیہ کا پیش کیا جانا قرار پایا ہے**۔ جو کامیاب مضمون نگار کی خدمت مین ٹھیک ۲۵ر جنوری ۳۰ء کو روانہ کردیا جائیگا۔ زیادہ سے زیادہ ۳۰ ستمبر ۲۹ء تک مضامین کا دفتر نگار مین پہونچ جانا ضروری ہے۔

نیاز فتحپوری (ایڈیٹر نگار) لکھنؤ

چند گھنٹے ایک مولوی کے ساتھ

دنیا میں "سانپ" اور "مولوی" دو چیزیں ایسی ہیں جنکی قسموں کی انتہا نہیں، البتہ فرق یہ ہے کہ اکثر سانپ زہریلے نہیں ہوتے اور موخرالذکر کا یہ حال ہے کہ:

ہر کرا جامہ مولوی بینی

در دمش صد ہزار مار انگار

مسجد کے ملا سے لیکر محراب و منبر کے واعظ تک، نماز جنازہ پڑھانے والے مولوی سے لے کر اس "مولانا" تک جو بیضاوی و بخاری کا درس دیتا ہے ایک چیز (الا ماشاء اللہ) سب میں مشترک پائی جاتی ہے اور وہ انکے ظاہر و باطن کا تضاد ہے۔ یعنے جس مولوی کا ظاہر جتنا زیادہ خوشنما ہے اتنا ہی زیادہ اسکا بطون مکروہ ہے۔

ایک مولوی کی "ہیئت وضعی" جس میں سکاب جکا عمامہ، الجھی ہوئی زلف (کا ہے تا دوش و گا ہے تا بناگوش) لانبی پریشان ڈاڑھی، زمین دوز بردت، سیاہ داغدار پیشانی، شیروانی نما کرتہ، نیم ساقی پاجامہ اور غیر دباغت شدہ متعفن چمڑے کا جوتا مع تسبیح و جریب رومال اور "نا سدانی" کے سب کچھ شامل ہے۔ ایک ایسی واضح، صریح، اختراع مستجل (Patent) ہے جس کو دیکھنے کے بعد گویا ہر شخص کا فطری فرض ہو جاتا ہے کہ وہ اس وضع والے کو مولوی سمجھے اور بہ حیثیت مولوی ہونے کے اس وضع کا اختیار کرنے والا تو گویا من جانب اللہ اس پر مامور ہی ہوا ہے کہ دنیا میں جہاں جہاں قورمہ اور مرغ پلاؤ مہیا ہو سکتا ہے وہاں اپنا سلسلۂ ارشاد و ہدایت دراز کرے۔ اس میں بھلا کسی کو اعتراض کی کیا گنجایش ہے۔

مولوی کی اولین قسم جو ارتقاء مولویت کی سب سے پہلی کڑی تھی اور جو مکتبوں کے بوریوں پر نظر آتی تھی اب تقریباً مفقود ہو چکی ہے، مگر ان کے کارنامے مولویت کی تاریخ لکھنے والے کے لئے ہمیشہ اہمیت رکھیں گے۔ کیونکہ "موجودہ مولوی" اسی "گذشتہ مولوی" کی ایک ترقی یافتہ صورت ہے اور وہ شخص جو "نفسیات مولویت" (Psychology of molvyism) سے بحث کرنا چاہیگا، اس کیلئے لازم ہوگا کہ وہ اس قوم کی ابتدا ظہور سے آغاز کرے۔ علمی اصولی حیثیت سے آپ اس پر غور کر کے انکی اہمیت کا اندازہ یوں کر سکتے ہیں:-

مثلاً ——— میرے محلہ میں بہت زمانہ ہوا ایک مولوی کسی رئیس کی ڈیوڑھی میں بیٹھ کر محلہ کے لڑکوں کو پڑھاتے تھے۔ ان کی ایک مولویائن تھیں اور چند در چند بچے جن کو اگر برابر برابر کھڑا کر دیا جاتا تو اچھا خاصہ زینہ بنجاتا۔ رئیس کے یہاں ان کو صرف پانچ روپیہ ماہوار اور کھانا ملتا تھا، لیکن انکی دیگر فتوحات کی صورتیں مختلف تھیں۔ عید، بقرعید، شبرات میں عیدیاں، بقرعیدیاں اور شبراتیاں "بپاس خاطر عزیز" لکھ کر انعام وصول کرنا تو خیر ایک جائز معمول تھا ہی، لیکن اس کے علاوہ وہ اور بھی مختلف ترکیبوں سے کام لیتے تھے اور اس باب میں وہ

ایک مخترع و موجد کی حیثیت سے بالکل اڈیسن کا مرتبہ رکھتے تھے۔ مثلاً ان کے موٹے لانبے کرتے میں آگے پیچھے، نیچے اوپر تقریباً ایکدرجن جیبیں تھیں۔ یہ جیبیں مختلف وسعت کی تھیں اور ان کا رنگ بھی مختلف تھا، کوئی سرخ تھی اور کوئی زرد، کوئی سفید تھی اور کوئی سبزی مائل، ہر لڑکے کو خفیہ ہدایت کر دی گئی تھی کہ جب وہ گھر سے آئے کوئی نہ کوئی چیز لیتا آئے، پھر اگر کوئی مرچ لایا تو سرخ جیب میں ڈالدی، کسی نے ہلدی کی گرہ پیش کی تو زرد رنگ کی جیب میں رکھ لی، کوئی آٹا لایا تو سفید جیب کی نذر ہو گیا، اور سبز ترکاریاں سبز جیب میں چلی گئیں۔ ایک جیب چمڑے کی بھی تھی جس کا راز ایک دن اتفاق سے یوں کھل گیا کہ ایک مسلمان تیلی کا لڑکا کچھ تیل کٹورے میں لایا اور انہوں نے آنکھ بچا کر اسی جیب میں تیل کو انڈیل لیا۔ الغرض شام کو جب وہ گھر جاتے تھے تو مولویائن اور "ملازلوں" کے لئے بقال کی اچھی خاصی دوکان بنکر جاتے تھے۔

ایک معمولی شخص کے لئے بظاہر یہ واقعہ زیادہ اہمیت نہیں رکھتا، لیکن ایک ماہر نفسیات غور کریگا کہ ایسے معلم کے شاگردوں میں کیا ذہنیت پیدا ہو سکتی ہے اور وہ آگے چلکر کس قسم کے "افراد قومی" بننے کی اہلیت رکھ سکتے ہیں۔

بہر حال اللہ کی یہ مخلوق تو اب مفقود (Extinct) ہو گئی ہے لیکن اسی کی اولاد، احفاد یا تلامذہ کے سلسلہ میں جو مولوی پائے جاتے ہیں، انکی تین بڑی تقسیمیں ہو سکتی ہیں۔ ایک وہ جو عربی مدارس میں لڑکوں کو پڑھاتے ہیں، دوسرے وہ جو وعظ و تبلیغ کے ساتھ لوگوں کو مرید بھی کرتے ہیں اور تیسرے وہ جو سیاسیات میں حصہ لینے کے بعد مسلمانوں کے قاید و رہنما بن گئے ہیں۔

اول الذکر قسم بظاہر گوشہ نشین اور بے ضرر قسم معلوم ہوتی ہے لیکن اس کی خلوت نشینی حقیقتاً ایک مستقل ہنگامہ محفل ہوتی ہے جس میں ایک شمع کی حیثیت رکھتا ہے اور طلبہ پتنگیوں کی، رہی بے ضرری سو اسکا حال اس سے عیاں ہے کہ اگر درسگاہ اس قسم کی ہے جس کے طلبہ مسجد و نمیں رہ کر محلہ والوں کی خیرات اور سویم کی روٹیوں پر زندگی بسر کرتے ہیں تو اخلاقی تربیت اور علوم مصلحی علوم اور اگر کوئی قومی مدرسہ ہے جسمیں دارالاقامہ کے اصول پر طلبہ کے رہنے کا انتظام ہے تو وہاں کا نصاب ہی فرسودہ و قدیم ہے جو انسان کو آگے بڑھانے کی جگہ پیچھے ڈھکیل دیتا ہے اور جس کی تکمیل کے بعد سوائے اذان دینے، نماز پڑھا دینے یا "مسئلۂ الیٰ حیط" سمجھا دینے کے اور کچھ نہیں کر سکتا، اور وہاں کے اساتذہ روشن خیال نہیں ہیں اور غریب طالب العلموں میں کوئی ولولۂ عمل اور نشاط روح پیدا ہونے نہیں دیتے

اول الذکر قسم کے مولویوں میں سے جو افراد زیادہ ذہین ہوتے ہیں وہ اکثر و بیشتر دوسری قسم میں منتقل ہو جاتے ہیں اور وعظ و تبلیغ شروع کر کے "مشائخانہ" حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ طبقہ زیادہ مالدار، زیادہ خوشحال، زیادہ کامیاب و رنگین ہے۔ ایسا مولوی سب سے پہلے بنگال و برما کے جاہل قریوں میں اپنی "مشق سخن" شروع کرتا ہے اور جاہل مسلمانوں کو جھوٹی روایتیں، گڑھے ہوئے کاذب افسانے مذہب و بانی مذہب کے متعلق سنا کر اول اول علماء امتی کالانبیاء بنی اسرائیل کا وعظ کہتا ہے اور جب اپنی حیثیت بلحاظ ایک عالم ہونے کے "علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل" کی طرح قائم کر لیتا ہے تو سراً و علانیاً مرشد و ہادی بنکر اپنے ارادتمندوں اور مریدوں کی رجسٹر کھولدیتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ کسی طرح کم از کم ۳۰۰ مرید اسکو حاصل ہو جائیں تا کہ اگر ایک روپیہ سالانہ بھی وصول کیا جائے (جو نہایت معمولی بات ہے) تو دو روپیہ روز کا اوسط پڑ جائے یہ طبقہ نہایت "خوش خور" و "خوش پوشاک" ہوتا ہے، اگر یہ کسی ایسے قریہ میں پہونچ جاتا ہے جہاں تمام ضروری چیزیں اسکے "ذوق شکم" کو پورا کرنیوالی ملسکتی ہیں تو پھر اس کے دسترخوان کا پروگرام یہ ہوتا ہے :۔

صبح کا ناشتہ:۔ نماز کے بعد ہی کشمیری چائے، سیر بھر دودھ اوٹٹا ہوا، پاؤ بھر مسکہ، ایک چھٹانک پسے ہوئے بادام، آدھ پاؤ قند، دو پراٹھے، تین ابلے ہوئے انڈے، چار کباب اور بس۔

دوپہر کا کھانا:۔ مرغ کا قورمہ، مرغ پلاؤ، بورانی، پسندے، باقرخانی، مزعفر، بالائی۔

سہ پہر:۔ سادہ چائے، اور تازہ پھل۔

شب کا کھانا:۔ وہی جو دوپہر کو تھا مگر شامی کباب اور بھنی ہوئی مچھلی کے اضافہ کے ساتھ۔

اگر مولانا کسی ایسے مقام میں پہونچ گئے ہیں جہاں یہ اشیاء فراہم نہیں ہوسکتیں اور ان کو اندیشہ ہوتا ہے کہ صرف دال ترکاری پر بسر کرنا ہوگی تو پھر وہ کہدیتے ہیں کہ آجکل میں جلالی عمل کا چلّہ کھینچ رکھا ہے اسلئے سوائے دودھ بالائی کے کچھ نہیں کھا سکتا۔

مولانا کی پوشاک بھی ہمیشہ دورہ ہی کے زمانہ میں تیار ہوتی ہے، عماموں کی تو خیر کمی نہیں کیونکہ ہر نیا مرید جب کچھ زر نقد اور مٹھائی لاتا ہے تو وہ ایک نیا عمامہ بھی پیش کرتا ہے (جو بعد کو گھر پہونچکر مولویائن کے دوپٹے اور ملازادوں کے کرتوں کے کام آتا ہے) لیکن یوں بھی قمیص اچکن، تہمد اور ازار کے لئے طرح طرح کے سوتی اور ریشمی کپڑے تحفۃً آتے رہتے ہیں اور جو مولوی زیادہ ہوشیار ہیں وہ صرف اسی غرض سے جولاہوں اور کپڑے کے تجارت کرنے والوں کو مرید بناتے ہیں۔ مولانا کے وعظ و تلقین کا جہاں تک تعلق ہے یکسر خدا کی شان جلالی سے وابستہ ہوتی ہے۔ خدا ایسا قہار ہے، ایسا جبّار ہے، اس نے جہنّم اتنا وسیع بنایا ہے وہ یوں اژدھوں سے ڈسوا تا ہے، اس طرح آگ میں جلاتا ہے۔ مگر ہاں وہ جس کی شفاعت رسول اللہ کردیں یا کوئی پیر، گویا خدا کا قہرانی وجود اپنے وقت کا چنگیز یا ہلاکو ہے اور مولینا اس کے وزیر با تدبیر، ان کی ملفوظات کا بڑا حصہ خود اپنے ہی کرامات و خوارق عادات سے متعلق ہوتا ہے۔ کہ فلاں مقام پر اس طرح ایک مرتے ہوئے شخص کو اچھا کر دیا، امساک باراں میں یوں پانی برسا دیا، فلاں کے دل کا حال اس طرح بتا دیا جن کے بادشاہ کو طلب کر کے فلاں کے سر سے آسیب کو یوں دور کرادیا وغیرہ وغیرہ۔

اگر مولانا کو ذوقِ موسیقی بھی ہے تو شب کے اول حصہ میں قوالی اور اس کے ساتھ حال قال کی چند مذبوحانہ حرکات بھی دکھائی جاتی ہیں، ورنہ شام ہوتے ہی، مولانا کا جائے قیام مردوں کے لئے "ممنوع الدخول" ہوجاتا ہے اور صرف عورتوں کی ہدایت کے لئے وقف سمجھا جاتا ہے، پیر صاحب نرم قالین پر نرم تکیوں کے سہارے دراز ہوجاتے ہیں، عورتیں ڈرتی ہوئی، سہمی ہوئی شرمائی ہوئی سامنے آتی ہیں اور مولانا کا وہ جسم جو مقوی اور قیمتی غذا سے خوب نرم اور پر گوشت بنا ہوا ہے دابنے لگتی ہیں۔ مولانا تھوڑی دیر اس لذت و لطف سے سرشار ہونے کے بعد دوسرے کمرے میں چلے جاتے ہیں اور وہاں علٰحدہ علٰحدہ ہر ایک تعلیم و تلقین خصوصی کے لئے طلب فرماتے ہیں، پھر چونکہ وہ مقام بلند ہے جو پیر صاحب کی اصطلاح میں۔ قاب قوسین او ادنیٰ سے کم نہیں، اس لئے یہاں کے راز اول تو بہت کم ظاہر ہوتے ہیں اور جو کبھی ہوگئے تو فوراً کل یوم ھو فی الشان اور اللہ جمیل و یحب الجمال کا وعظ شروع ہوجاتا ہے اور جاہل مرید خوشی کے ساتھ اپنی عورتوں لڑکیوں کو آلۂ تفریح بنانے کے لئے راضی ہوجاتے ہیں

تیسری قسم مولوی کی وہ مولانا ہے جو ملک کے اونچے اور تعلیمیافتہ طبقہ میں اپنی کارگاہ قایم کرتا ہے تاکہ ملک کا سیاسی قاید و رہنما تسلیم کیا جائے جہاں تک اصلاح ملک و قوم کا تعلق ہے میرا تجربہ بالکل صفحۂ سادہ کی حیثیت رکھتا ہے لیکن جس حد تک تخریب و فساد متعلق ہے، اس طبقہ کا

وجود اس درجہ خطرناک ہے کہ شاید ہی ہم اُفقی کمکر اس کی اہمیت کو پوری طرح ظاہر کر سکیں ۔

یہ مولانا کھدر پوش ہوتا ہے، دیسی چیزوں کا عاشق، ولایتی اشیاء سے متنفر، حریت و آزادی کا علمبردار، غلامی و استبداد کا عدو، ترقی کا حامی، تنزل کا دشمن اور

"یتیموں کا والی غریبوں کا ملجا"

سبھی کچھ اپنے آپ کو ظاہر کرتا ہے لیکن اس کے کھدر پوش سینہ کے اندر اتنا موٹا اور مکروہ قسم کا نفس ہوتا ہے کہ شاید ہی غریب فرعون کو نصیب ہوا ہو۔ اس کے تمام مقالات حریت، اسکی تمام شعلہ بیانیاں، اسکی جملہ سوراج پرستیاں، صرف حُب جاہ سے متعلق ہوتی ہیں اور اسکا مقصود ان تمام نمائشوں سے سوا اس کے کچھ نہیں ہوتا کہ وہ ریل کے اونچے سے اونچے درجہ میں سفر کرے، وداع کے وقت لوگوں کا ہجوم اس کو اسٹیشن تک پہونچانے جائے، جہاں پہونچے وہاں رسم مشایعت کے لئے ایک جماعت موجود ہو، گلے میں ہار ڈالے جائیں، اسکی موٹر کو نوجوانان ہند دھکیل کر لیجائیں، جلوس کے ساتھ جب وہ بازاروں کیطرف سے نکلے تو ایک غرور نما انکسار کے ساتھ دونوں ہاتھوں سے جھک جھک کر لوگوں کا سلام قبول کرتا جائے، اور جائے قیام پر ہر وقت زایرین کی آمد و شد سے میلہ سا لگا رہے

یہ اپنے آپ کو سیاسیات کا ماہر، نظام عالم کا "استن حنانہ" اور گردش ارضی کا محور سمجھتا ہے، اس کو یقین ہوتا ہے کہ اگر وہ نہو تو نظم دنیا درہم برہم ہوجائے، مشرق مغرب سے، شمال جنوب سے ملجائے اور قومیت کا بیڑا غرق۔ اس قسم کا مولینا بہت کم خطرہ میں پڑتا ہے اور اگر کبھی پڑجاتا ہے تو صرف تجارتی اصول کی بنا پر کہ آیندہ اس کے کاروبار کی رونق اس سے زیادہ بڑھ جائیگی۔ یہ سوائے اپنے کسی کی رائے کو پسند نہیں کرتا، یہ سمجھتا ہے کہ دنیا میں خدا نے صرف اسی کو ذی عقل و ہوش بنایا ہے اور خلیفۃ اللہ فی الارض اسی کی ذات سے عبارت ہے۔ وہ جلسوں میں ہمیشہ دیر کر کے پہونچتا ہے تاکہ جس وقت پہونچے تو سارا مجمع جو اسکا انتظار کر رہا ہے، گردن اٹھا اٹھا کر اسکو دیکھنے لگے وہ چوکڑیوں پر سوار ہو کر جاتا ہے، اونچی جگہ مسند وں اور زرنگار کرسیوں پر اپنا دامن عبا دراز کرتا ہے۔ وہ دوران جلسہ میں سرگوشیاں کرتا ہے، کاغذ کے پرزوں پر پنسل سے کچھ لکھ لکھ کر لوگوں کو ہدایات فرماتا ہے، گویا کہ وہ اس ساری جماعت کا ایک قاید اعظم ہے، اس مشین کا پہیوٹ یا گورنر اسپرنگ ہے جسپر پرزوں کی . . . . باضابطہ گردش قایم ہے۔

مولانا، مولانا کی آوازوں سے اسکا سیروں خون بڑھتا ہے، دست بوسی سے اس کے جذبات قیادت میں برقی رو دوڑ جاتی ہے اور جس وقت وہ اسٹیج پر جاکر تالیوں کی آواز سنتا ہے تو ایسا محسوس کرتا ہے کہ خدا عبارت ہے صرف اسی کی ذات سے، یہ حال ہے اسکی پبلک زندگی کا، لیکن اپنے گھر کے اندر وہ کیا ہے؟ اپنے متعلقین کے ساتھ اسکا کیا برتاؤ ہے۔ لوگوں کے حقوق وہ کیونکر ادا کرتا ہے، اسکا حال اسکی غریب بیوی کو پوچھئے جو ایک کنیز سے بدتر حیثیت رکھتی ہے، بچوں، خادموں اور اس کے اعزہ سے دریافت کیجئے کہ یہ اپنے آپ کو "خدا کا بیٹا" کہنے والا، کس طرح کا باپ کس قسم کا آقا اور کس انداز کا انسان ہے۔

اس کا مذہب یکسر خود پرستی، اسکا دین و ایمان سراسر کبر و غرور، اور اس کی ذات از سرتا پا یادگار ہے اُن فراعنہ و نمارده کی جنکا حال تو کتابوں میں ہمکو نظر آجاتا ہے، لیکن صورت اب تک کبھی نہیں دیکھی تھی۔

میں نہیں کہتا کہ اس جماعت میں کوئی مستثنےٰ نہیں ہے، لیکن اگر کوئی ہے تو اسکا عدم وجود برابر ہے اور اس کو یہ مرتبہ حاصل نہیں۔

اسقدر تمہید کے بعد مجھکو اصل مدعا کی طرف آنا چاہئے جو عنوان سے ظاہر ہے۔ میرے تجربات مولویوں کے متعلق اسقدر وسیع ہیں کہ اگر چاہوں تو برسوں تک اس سلسلہ کو قائم رکھ سکتا ہوں، لیکن اس وقت میں اپنا بالکل حال کا تجربہ پیش کرنا چاہتا ہوں جو ادبی حیثیت سے بھی کم پر لطف نہیں ہے:۔

۴۔ جولائی کو میں ایک ...... جلسہ میں شرکت کی غرض سے الہ آباد جا رہا تھا۔ پرتاب گڈھ اسٹیشن پر پہونچ کر میں جس درجہ میں داخل ہوا، وہاں پہلے سے ایک ہندو خاتون کونہ میں بیٹھی ہوئی تھی جس سے ایک مرد (جو غالباً اس کا خوش نصیب شوہر ہوگا) باتیں کر رہا تھا۔

یہ عورت جسے ایک نوجوان لڑکی کہنا زیادہ موزوں ہوگا، بہت مقبول صورت، حد درجہ مہذب، اور نہایت خوش ادا حسین تھی اور اپنی نزاکت کے لحاظ سے آسکر وائلڈ کی زبان میں بالکل ایک سفید فاختہ یا کبوتری معلوم ہوتی تھی۔ اس کے رنگ کی کندنی چمک، اس کے خد و خال کی کشمیریت، اسکی آنکھوں کی نشیلی کیفیت، اس کے لبوں کی میگونی، اس کے جسم کی لچکیلی نزاکت یہ سب باتیں اسکی خوش سلیقگی، متانت و سنجیدگی کے ساتھ ملکر ایک ایسی فضا پیدا کر رہی تھیں کہ ہر شخص کو اس سے متاثر ہونا چاہئے اور غلط ہوگا اگر میں یہ کہوں کہ مجھ پر کوئی اثر اس کا نہیں ہوا۔ لیکن ایسی صورتوں میں میرا فلسفہ صرف یہ ہوتا ہے کہ سب سے پہلے اپنے آپ پر غور کرتا ہوں اور جب اس نتیجہ پر پہونچتا ہوں کہ میں انسان ہوں اور انسان ہی تک میری ...... رسائی ہوسکتی ہے تو پھر اس نوع کی آسمانی مخلوق کی طرف توجہ نہیں کرتا اور اگر توجہ ہوتی بھی ہے تو بالکل نمائش کی حیثیت سے۔ میرے لئے موقعہ تھا کہ میں مقابل کی بنچ پر بالکل اس کے سامنے اور ...... اس کے بہت قریب ہوکر بیٹھ جاتا، لیکن میں نے ایسا نہیں کیا صرف احترام نسوانی کے خیال سے کہ ممکن ہے اسے کچھ تکلیف ہو اور وہ آزادی کے ساتھ گفتگو نہ کرسکے۔ میں یہی کچھ سوچ رہا تھا کہ ایک مولانا مع اپنی تمام خصوصیات ظاہری کے داہنے ہاتھ میں مٹھائی کی ہانڈی، اور بائیں ہاتھ میں طہارت کا لوٹا لئے ہوئے (جام بدستے و سبوئے بدستے) اندر داخل ہوئے اور بیک نگاہ گاڑی کا جائزہ لیکر بلا پس و پیش اپنا محاذ انہوں نے اسی جگہ قائم کر دیا جس کو میں نے قصداً چھوڑ دیا تھا۔

مجھے پہلے ہی ان کی وضع و صورت اور اس ناشائستہ حرکت سے یقین ہوگیا تھا کہ ہو نہ ہو یہ کوئی مولانا ہے، لیکن اتفاق سے اسی درجہ میں ایک وکیل صاحب ان کے شناسا اور ملگئے اور انہوں نے مولانا کے لفظ سے خطاب کرکے اور مہر توثیق ثبت کر دی۔

مولانا کی عمر ۶۰ سے متجاوز ہوگی، لیکن صحت ماشاء اللہ بہت اچھی تھی اور مصنوعی دانتوں کی تاب، اور داڑھی کا خضاب جو ہر چند طاؤسی ہوگیا تھا، بتا رہا تھا کہ ہنوز زعم جوانی موجود ہے۔ تمام اعضا صحیح و سالم تھے، البتہ داہنے ہاتھ کی چھوٹی انگلی اور انگوٹھا کچھ ٹیڑھا اور مفلوج سا تھا، جو غالباً عمل جراحی کا نتیجہ تھا کیونکہ ہاتھ پر ایک بڑا نشان اسکا پایا جاتا تھا۔

مولانا کو اسقدر اپنے سے قریب دیکھکر اس خاتون نے آنچل کی اوٹ سے نیچے ہی نیچے بہت غور سے دیکھا اور نہایت ہی مخفی تبسم کے ساتھ اس نے شوہر کو اور شوہر نے اسے دیکھا اور دونوں پھر باتوں میں مصروف ہوگئے۔

مولانا نے سب سے پہلے اپنی نشست کا انداز اس طرح قائم کیا کہ چہرہ، اسی طرف رہے اور اسکے ماتھے کی سرخ بندی جو بیر بہوٹی کی طرح دہک رہی تھی نگاہ سے اوجھل نہ ہو۔ جب وہ اپنے نشانہ و ہدف کی طرف سے مطمئن ہوگئے، تو انہوں نے چاہا کہ کسی طرح اس کے شوہر سے بے تکلفی پیدا کرکے

اپنے آپ پر گلچینیِ جمال کو حلال کر لیں، لیکن بدقسمتی سے وکیل صاحب جو ان کے شناسا تھے الف لیلہ کے کم گو حجام سے کم باتونی نہ تھے اور انہوں نے جو مولانا سے گفتگو شروع کی تو پھر اس کا موقعہ ہی نہ دیا کہ وہ کسی طرف اور متوجہ ہوتے۔ ہر چند مولانا کی چین پیشانی، بے رخی، چہرہ کی عبوست اور کبھی کبھی اخبار لیکر اس کے مطالعہ کی کوشش کرنا صاف کہہ رہا تھا کہ وہ کسی مداخلت کو پسند نہیں کرتے اور انکی توجہ و مراقبہ کو صدمہ پہونچ رہا ہے لیکن وکیل صاحب جو اپنی پہنائی اور قد و قامت کے لحاظ سے ابوالہول (Sphinx) کی لحد ہوتے تھے، اس غریب مُلّانا کے آزار کو نہ سمجھ سکے اور برابر انکی یکسوئی خیال ونگاہ میں حارج رہے۔ لیکن باوصف اسکے مولانا نے ایک لمحہ کے لئے بھی اپنے ہدف کو فراموش نہیں کیا اور اپنے کسی لمحہ عزیز کو انہوں نے بیکار جانے نہیں دیا۔ وہ باتیں کرتے تھے مگر نگاہ کا سمت بدلتا تھا، وہ وکیل صاحب کے سوالوں کا جواب دیتے تھے مگر ہر جواب کے دوران میں اس "سرمایۂ جاں" کا مطالعہ ضرور کر لیتے تھے۔ وہ کوشش کر کے اپنے ہاتھ کی معیوب وکج اونگلیوں کو چھپاتے تھے کہ مبادا وہ خاتون اس عیب کو دیکھ کر ان کو چاہنا چھوڑ دے، وہ آواز میں اک خاص قسم کا مصنوعی لوچ اور لحن پیدا کر کے گفتگو کرتے تھے، وہ اپنے قہقہہ میں ایک سیمیں جھنکار پیدا کرنیکی سعی فرماتے تھے (کانہ درھم رنّان) وہ اپنی خوشدلی، قابلیت، جاہ و ثروت، دولت و امارت کا ثبوت دینے کیلئے کبھی کبھی اتفاقاً بھی کتنے فارسی کے اشعار بھی پڑھتے بڑے بڑے لوگوں کے نام اور ان سے اپنے تعلقات کو بھی ضمناً ظاہر کرتے جاتے تھے اور سب سے زیادہ زور اس پر دے رہے تھے کہ دنیا میں تعصب سے زیادہ بری کوئی چیز نہیں اور بھئی میرا مسلک تو یہ ہے کہ "با مسلماں اللہ اللہ با برہمن رام رام" "رام رام" کہہ کر جس وقت مولینا نے اس عورت کو دیکھا تو وہ بھی انہیں دیکھ رہی تھی اور میں بھی ان دونوں کے دیکھنے دیکھ رہا تھا، ور آخر کار جب تینوں نگاہیں مرکز اجتماع سے ہٹیں تو اس طرح کہ تینوں نے علیحدہ علیحدہ ہر ایک کو دیکھا مگر یہ منظر پیدا کرتے ہوئے کہ مولانا اپنی جگہ مست تھے اور وہ خاتون محجوب۔ الغرض مولانا کے تمام لاعبانہ تیور اس کا پتہ دے رہے تھے کہ وہ انہیں لوگوں میں تھے جو

ایں کار را بہ شیوۂ کار آگہاں کنند

جب مجھے پوری طرح یقین ہو گیا کہ مولانا کی خوش طبعی اکتابی طور پر بڑھ گئی ہے اور انہیں وثوق کامل ہو گیا کہ سارے درجہ میں صرف انہیں کی ذات ایسی ہے جس پر وہ خاتون مایل ہو سکتی (ہو سکتی کیا ہو ہی گئی ہے) تو میں سنبھلا اور میں نے آگے بڑھ کر باادب عرض کیا کہ اگر جناب اجازت دیں تو چند مسایل حضور سے دریافت کر لوں، جو اسی وقت میرے ذہن میں آئے ہیں۔ وہ یہ سنکر دفعتہً چونک پڑے اور بولے "ہاں ہاں کہئے، ہم لوگ اسی لئے ہیں" اور یہ کہکر پھر ایک خاص پندار کے ساتھ اس طرف دیکھ لیا۔ میں نے عرض کیا کہ "مجھے یہ معلوم کر کے بڑی مسرت ہوئی کہ جناب تنہا عالم ہی نہیں ہیں بلکہ ادیب و شاعر بھی ہیں جیسا کہ آپکی شعر خوانی سے ظاہر ہوتا ہے۔ اور اس بنا پر مجھے یہ دریافت کرنے کی جرأت کرنا چاہئے کہ کیا "غنا ز خانۂ ہمسایہ" اور "حسن ہگذرے" سے فایدہ اٹھانے کا مسئلہ محض شاعرانہ ادعا ہے یا واقعی کوئی شرعی حقیقت اس میں پنہاں ہے؟" یہ سنکر ان کے چہرے پر پہلے اک ہلکی سی سرخی عتاب کی اور پھر زردی حجاب کی نمودار ہوئی اور پہلو بدلکر بولے کہ "آپ کو مجھ سے مذاق کرنیکا کیا حق حاصل ہے؟" میں نے کہا کہ "بندہ نواز میں آپ سے مذاق کر سکتا ہوں، میں تو واقعی آپ سے سنجیدگی سے پوچھ رہا ہوں کیونکہ بسا اوقات سفر حضر میں ایسا ہوتا ہے کہ نگاہ مجبوراً اٹھ جاتی ہے اور میں مسلمان ہونے کی حیثیت سے آخر کار کانپ اٹھتا ہوں کہ کہیں آخرت میں باز پرس نہ ہو۔"

مولانا نے مجھے غور سے دیکھا اور بولے کہ "یہ صورت تو عذاب سے ڈرنے والوں کی نہیں ہوتی، داڑھی منڈی ہوئی، مونچھ بڑھی ہوئی اور پیشانی سجدے کے نشان سے خالی"

میں۔ "بجا ارشاد ہوا، میں اپنی صورت کا سب سے زیادہ شناسا ہوں اور اچھی طرح جانتا ہوں کہ عذاب سے ڈرنے والی صورت کیسی ہوتی ہیں سامنے ہی موجود ہے، صراحت کی ضرورت نہیں۔ لیکن میں تو آپ سے ایک مسئلہ پوچھتا ہوں، اور آپ کو اس کا جواب بہ حیثیت عالم دین ہونے کے دینا چاہئے، عام اس سے کہ میری داڑھی منڈی ہوئی ہے یا خضاب سے رنگی ہوئی، میرے منہ میں دانت اصلی ہیں یا مصنوعی، میری اونگلیاں سیدھی ہیں یا ٹیڑھی، میری عمر باپ ہونے کی ہے یا شوہر بننے کی۔"

یہ سننے کے بعد مولانا کا غصہ ضبط سے باہر ہوگیا اور آستینیں چڑھا کر بولے کہ "تم مجھ سے مسخرہ پن کرتے ہو۔ یاد رکھو میں بدمعاشوں کے ساتھ بدمعاش بھی ہوں۔"

میں نے عرض کیا کہ "میں یوں بھی ایسا ہی سمجھتا ہوں" اس تنقید کی تاب کیا لا سکتے تھے۔ بے اختیارانہ طور پر اٹھ کھڑے ہوئے اور میں اطمینان کے ساتھ اپنی جگہ بیٹھا رہا، کیونکہ فنون سپہ گری کی رو سے اس قدر بہترین جواب حملے کے بعد ہی ہو سکتا تھا، لیکن وکیل صاحب نے اٹھ کر ان کو پکڑ لیا اور سارا درجہ مخاطب ہو کر ان کو سمجھانے لگا کہ جانے دیجئے آپ بزرگ ہیں اپنی طرف خیال کیجئے اور "جنیں چناں" میں نے کھڑکی کی طرف رخ کر لیا اور جب چند منٹ کے بعد سکون ہوگیا تو میں پھر انکی طرف متوجہ ہوا اور بولا کہ "مولانا اگر غصہ فرو ہوگیا ہو تو عرض کروں کہ میرے سوال کا جواب مرحمت ہو" یہ سنکر سارے درجہ والے تو خیر ہنس ہی پڑے تھے، وہ خاتون بھی مسکرانے لگی اور ان کی طرف دیکھنے لگی۔

مولانا بولے کہ "خدا کے لئے میرا پیچھا چھوڑیئے میں آپ سے بات کرنا نہیں چاہتا" میں نے کہا کہ "بات نہ کیجئے تو لکھ کر بتا دیجئے کیونکہ اس مسئلہ کا جواب تو حسب المراد سوائے آپ کے اور کوئی دے ہی نہیں سکتا"

وکیل صاحب خوش مزاج انسان تھے، انہوں نے کہا کہ "مولینا کیا حرج ہے آپ کیوں نہیں بتا دیتے" مولانا بولے کہ "آپ نہیں سمجھتے یہ مجھے بیوقوف بناتے ہیں، ورنہ کیا یہ خود نہیں سمجھ سکتے کہ جو کچھ یہ پوچھ رہے ہیں محض شاعرانہ بات ہے اور شرع ......"

"نہیں مولانا واللہ ایسا نہیں ہے، مجھے اسوقت تک تو صرف گمان ہی تھا، لیکن آج یقین ہوگیا کہ غنائے خانہ ہمسایہ جائز ہو یا ناجائز، لیکن حسن رہگذرئے سے لطف اٹھانا قطعاً جایز ہے۔"

مولانا۔ "یہ کیونکر آپ کو یقین ہوگیا"

میں۔ "ایک بنی اسرائیل کے نبی کے طرز عمل سے"

مولانا۔ "وہ کون نبی ہے"

میں۔ "آپ تو اس طرح دریافت کرتے ہیں گویا آپ علماء امت سے ہی نہیں اور آپ کا کوئی عمل مجھ ایسے عامی کے لئے حجت ہو ہی نہیں سکتا"

یہ سنکر مولانا غصہ میں اٹھے اور لوٹا لیکر منہ بناتے ہوئے بیت الخلا چلے گئے۔ ایک اسٹیشن درمیان میں باقی تھا کہ وہ باہر آئے اور جب اپنی جگہ بیٹھ گئے تو میں نے پوچھا کہ "تشبہ" کسی قوم کے ساتھ ایک شخص کو اسی قوم میں داخل کر دیتا ہے، اس لئے اگر ہمارے ہاں کی عورتیں بھی

غ بیندی کا استعمال کریں تو وہ ہندو ہو جائیں گی۔ آپ کا کیا خیال ہے"

مولانا۔" بیشک بیندی کا استعمال ہماری عورتوں کو نہ کرنا چاہئے"

میں۔" لیکن مولانا، یہ تو آپ نے دیکھا کہ ہے بڑی پیاری چیز اور خاصکر گورے رنگ پر تو قیامت ہی ہو جاتی ہے"

مولانا۔" حقیقت یہ ہے کہ تم ہو کوئی بڑے بدمعاش اور تمہیں وہ لوگ ہو جن کے لئے خدا نے عذاب دوام کی وعید نازل کی ہے"

اتنے میں پریاگ اسٹیشن آگیا جہاں مجھے اترنا تھا، مولانا بدستور بیٹھے رہے اور میں اتر پڑا لیکن نیچے پلیٹ فارم پر جاکر میں نے ان سے کہا کہ مولانا خدا کے لئے صرف ایک بات کان میں سن لیجئے۔ مجھے حیرت ہے کہ انھوں نے کہنا مان لیا اور جب انھوں نے کھڑکی کے پاس آکر اپنے کان قریب کئے تو میں نے عرض کیا کہ" مولینا اس میں شک نہیں کہ مال اچھا ہے، کچھ یاروں کا بھی حصہ ہونا چاہئے"۔

یہ سنکر انھوں نے میری گوشمالی کے لئے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ میں الگ ہٹ گیا اور گاڑی روانہ ہوگئی۔

اکاڈیمی کا دفتر پریاگ اسٹیشن سے صرف دو تین فرلانگ کا فصل رکھتا ہے، اور اس دس منٹ کے راستہ میں جس خیال نے میرے دماغ کو گھیر رکھا تھا وہ مولانا کا واقعہ نہ تھا بلکہ غالب کا یہ شعر تھا جسے میں گنگنا تا جا رہا تھا:-

اگر بہ دل نہ خلد آنچہ از نظر گزرد
زہے روانی عمرے کہ در سفر گزرد

ہماری فسانہ نگاری

اور

فسانہ عجائب کے اجزائے ترکیبی

(بہ سلسلہ سابق)

یہ مضمون بھی بہت پامال ہے اور طلسمی قصوں میں اکثر جگہ پایا جاتا ہے۔ اسی صورت سے بہار دانش میں ملکزادہ کو مہر بانو کی خلخال مچھلی کے پیٹ سے ملی ہے اور اسی کے ذریعہ سے وہ منزل مقصود پر پہونچا ہے۔ اسطرح مصنف بہار دانش نے ملکزادہ کو ایک ہولناک جنگل میں پہونچا کر دیو سے کشتی کرائی ہے۔ اور اُسے سرحد عدم میں پہونچا کر پری نزاد کو رہائی دلائی ہے۔ وہاں بجائے سفید دیو کے ایک وزیر زادہ کو ملکزادہ کا معین بنایا ہے۔
اسکے بعد انجمن آرا۔ اور جانعالم طوطے بنگئے ہیں اور اُڑتے پھرے ہیں۔ یہ وہی تبدیل قالب کا جادو ہے اور اس قسم کے واقعات مثنوی گلزار نسیم میں بھی موجود ہیں

ملکہ مہر نگار ایک بادشاہ یا کسی رئیس کے قبضے میں پھنسی ہے اور اس سے معاہدہ ہوا ہے کہ برس دن تک اگر کوئی ڈھونڈھنے نہ آئے تو میں تیرے ساتھ شادی کرونگی۔ یہ معاہدات ایسی سرگشتہ شاہزادیاں اکثر کرلیتی تھیں اس قسم کی بہت سی کہانیاں مشہور ہیں جو قریب قریب ہر شخص نے سنی ہونگی

اسکے بعد اُس طوطے کی بدولت جو اوّل میں جانعالم کا رفیق تھا مہر نگار اور انجمن آرا اور جانعالم کی ملاقات ہوئی ہے۔ چنانچہ اسی قسم کی امداد طوطے نے بہار دانش میں کی ہے اور آخرکار وہی ذریعۂ ملاقات باہمی بن گیا ہے۔ نل و دمن کی خط و کتابت بھی طوطے ہی کی بدولت ہوئی ہے

اسکے بعد پورے قصہ میں ایک جگہ سردی کی شدت کا بیان ہے اور ختم ہے۔ رہنوردان عشق کو ایسے جنگل ملتے ہی رہتے ہیں جہاں وہ امت موسیٰ کی طرح سرگرداں اور پریشان پھرا کرتے ہیں۔ ان جنگلوں میں کہیں گرمی زیادہ ہوتی ہے کہیں سردی۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے

فسانہ عجائب کے درمیان میں جو حکایات لائی گئی ہیں انکا طرز انوار سہیلی اور بہار دانش دونوں سے ملتا ہے۔ مگر اسکو بہار دانش ہی کا صحیح تتبع کیا جاسکتا ہے۔ کوئی خاص جدت نہیں ہے۔ غرضکہ یہ لحاظ نفس قصہ اول سے آخر تک کوئی نئی بات نہیں ہے

عبارت کے لحاظ سے اُس زمانہ کی کتابوں میں فسانہ عجائب کا ایک خاص درجہ ہے۔ اور بغیر رعایت کہا جاسکتا ہے کہ سرور نے حسن تک سے اس فسانہ کو تمام کیا اس کا جواب نہیں۔ پھر بھی دو تین باتیں اس میں ایسی ہیں جنسے عبارت کی زیب و زینت کو ایک داغ لگ گیا ہے

(۱) مصنف کو نثر مقفےٰ کرنیکی فکر ہر وقت دامنگیر رہتی ہے اور اسکی وجہ سے قوافی مین رطب یابس سبھی بھر دیتا ہے۔ کوئی بات حسب موقع اور حسب حال ہو یا نہو مگر کبھی کبھی قافیہ کی مجبوری کی وجہ سے لانا پڑتی ہے اور اس سے صاف تصنع اور بناوٹ کا اظہار ہوتا ہے۔ یہ رنگ فسانہ عجائب کی عبارت مین اول سے آخر تک ہے مثال کے لئے چند فقرے چنکر پیش کرنا بیکار محض ہے کیونکہ یہ کوئی ایسی بات نہین ہے کہ اس کے لئے چند صفحات کافی ہون اسکے لئے ضرورت ہے کہ کتاب کو اول سے آخر تک پڑھا جائے ہلکی سی نظر فکر کے سامنے یہ سب کرشمے آجاتے ہین

(۲) بتانے والے بتاتے ہین کہ فسانہ عجائب کی عبارت اُس زبان مین لکھی گئی ہے جو خاص بیگماتی یا شاہی زبان ہے حالانکہ یہ بات بالکل خلاف واقعہ ہے۔ مصرور نے گو اسکی کوشش کی ہے۔ مگر وہ متوسط فرقہ کی زبان سے آگے او سکو بڑھا نہین سکے۔ اور بعض جگہ تو اسدرجہ گر گئے ہین کہ ارذل وادانی کی زبان کو بھی مات کر دیا ہے مطلق یہ خیال نہین رکھا کہ یہان کیا کہنا چاہئے اور کیا کہتے ہین۔ وہ دکھاتے ہین کسی شخص کو فرقۂ اعلیٰ سے مگر اوسکی گفتگو ایسی بیموقع اور خلاف امید ہوتی ہے کہ کتاب کا درجہ اس سے پست ہو جاتا ہے مثلاً چند فقرے ملاحظہ فرمائیے۔ جانعالم ہزارون تمناؤن لاکھون آرزوؤن کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ وہان سرور اسکی خوبصورتی کے بیان مین رطب اللسان ہین۔ مگر ساتھ ہی ایک ایسے بچہ کے لئے جسے پیدا ہوئے ابھی دو گھنٹے بھی نہین گزرے یہ فقرے بھی لکھ جاتے ہین "کاسہ سر سراسر شور جوانی زور شباب سے معمور۔ آنکھین جھپکانے والی دیدۂ غزال ختن کی شراب عشق کے نشے سے چکنا چور" اسی طرح ایک جگہ جہان جادوگرنی بیان کرتی ہے کہ لے جانعالم مین مدتون سے تیری شیدا تھی وہان یہ بھی کہتی ہے کہ "آج لات ومنات کی مدد سے تو میرے قابو مین آیا" حالانکہ لات ومنات کو جادو سے کوئی تعلق اور واسطہ نہین۔ یا۔ اسی جادوگرنی سے جب شاہزادہ یہ کہتا ہے کہ مین تیرے پاس رہون تو کیونکر رہون مین محض انجمن آرا کے لئے گھر سے نکلا ہون حکومت کی مجھے پروا نہین ہے وہان شہزادہ کے [illegible] فقرہ نکلا ہے۔ "اللہ کی عنایت سے گھر کی حکومت چین کرنے کو کافی تھی" یہ وہ فقرہ ہے کہ شاہزادہ تو شاہزادہ ایک رئیس بلکہ [illegible] متوسط درجہ کا آدمی بھی نہین کہہ سکتا۔ ایسے ہی جادوگرنی نے جسوقت شاہزادے کو تعویذ دیا ہے تو اُس سے کہا ہے کہ تو یہان اکیلا رہتا ہے ڈرتا ہوگا۔ تو سرور شاہزادے کی شجاعت کے تمام گذشتہ افسانے بھول جاتے ہین اور شہزادے کی زبان سے یہ زنانے جملے کہلا دیتے ہین "کوئی ہمین مار ڈالے تو دن بھر مفت مٹی خراب رہے" ایک تو یہ کہنا کہ کوئی ہمین مار ڈالے دوسرے یہ کہ دن بھر مٹی خراب رہے۔ کچھ ایسے ہین جنکی کوئی گنجائش ایسے محل پر نہین

جادوگرنی نے شہزادے کو ایک نقش سلیمانی دیا کہ اسے بازو پر باندھ لو اُسنے باندھ لیا۔ ایک وزیر اتفاق وقت سے اُسکو کھولکر دیکھا تو اُس کا یہ نقشہ تھا "بست در بست کا نقش۔ ہر خانے مین اسمائے الٰہی معہ ترکیب وتاثیر تحریر تھے۔ دیکھتے دیکھتے خانہ مطلب مین نظر پڑی۔ لکھا تھا کوئی شخص کسی ساحر کی قید مین اگر ہو یہ اسم پڑھے نجات پائے" ہمارے نزدیک یہ بالکل نئی بات ہے کہ نقش مین یہ باتین درج ہون۔ اس طرح سے تو کوئی عمل کی کتاب ہو سکتی ہے نہ کہ نقش کی یہ ایک غلطی ہے۔ اور سخت غلطی ہے۔

ملکہ مہر نگار شاہزادے سے کہتی ہے۔ کہ میرے باپ نے ہر چند مجھسے شادی کو ارشاد کیا مینے بسبب مفارقت انکار کیا۔ اب دفعتاً آفت آسمانی و بلائے ناگہانی مجھپر ٹوٹ پڑی کہ بیک نگاہ عاشق کیا دیوانی ہو گئی" جہانتک خیال کیا جاتا ہے آخری فقرے ایک شاہزادی ورد بھی

ناکتخدا کبھی نہین کہہ سکتی۔ اور پھر وہ بھی ایک ایسے اجنبی شخص سے جو صرف ایک رات رہا ہو

ملکہ مہر نگار اپنے باپ کی تعریف کرتی ہے۔ "کہ ہر چند ظل سبحانی عامل بے بدل ساحر بے مثل ہین۔ علوی سفلی سب کچھ پڑھا لکھا"، علوی سفلی کا پڑھا لکھنا اس بات سے بھی زیادہ عجیب ہے کہ ظل اللہ عامل بھی ہین اور ساحر بھی۔ درویش متشرع مسلم بھی ہین۔ اور جادوگر زندیق اور کافر بھی

جانعالم جب ملکۂ مہر نگار سے رخصت ہوتا ہے تو ملکہ وہ فقرے فرماتی ہین جو بزرگ اپنے چھوٹون کے پردیس جانے کے وقت کہتے ہین۔ "جس طرح پیٹھ دکھاتے ہو اسی صورت اللہ تمھارا مُنھ دکھائے"

جانعالم جب شہر زرنگار مین پہونچتا ہے تو وہان کے بازار کی آب و تاب لکھتے ہوئے مصنف یہ مبالغہ آمیز فقرہ لکھتا ہے "دو کوئی شے کسی طرح کا اسباب ایسا نہ تھا کہ اس بازار مین نہ تھا مغرب و مشرق کی اشیائے نادرہ کا ہر جا انبار تھا" یہ لکھکر اشیائے نادرہ کا بیان اس صراحت سے کیا جاتا ہے۔ حلوائی۔ نان بائی۔ کنجڑے۔ قصائی۔ سقون کے کٹورون کی جھنکار میوہ فروشون کی پکار۔ دلالون کی بول چال وغیرہ وغیرہ مگر اشیائے نادرہ کا کوئی ذکر نہین ہے

شہزادہ جب انجمن آرا کے چھوڑانے اور جادوگر سے لڑنے کے لئے چلا ہے۔ اور انجمن آرا کی مان کو یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ کوئی ایسا حسین شہزادہ انجمن آرا پر عاشق ہو کر آیا تھا اور وہ جادوگر سے لڑنے جاتا ہے۔ تو وہان مصنف لکھتا ہے "انجمن آرا کی مان دردہ لبستر پر چلی آئی" سمجھ مین نہین آتا کہ وہ بیگم کسقدر شریف اور عفت مآب تھی۔ اسکے بعد مصنف نے یہان دکھایا ہے کہ جیسے ایک ادنی متمول سسرال مین تواضع ہوتی ہے جسکا اظہار کوئی محل نہین ہے۔

جادوگر کے قبضے سے چھوڑانے کے بعد انجمن آرا کی پہلی ملاقات جانعالم سے ہوئی۔ یا تو جانعالم وہ شریف اور ضابطہ عاشق تھا کہ فرشتے اُسکے دامن پر نماز پڑھتے تھے یا انجمن آرا کو دیکھتے ہی بالکل بدحواس ہو گیا وہان مصنف لکھتا ہے کہ "ہر چند ضبط کیا نہ ہو سکا۔ تھراتا۔ دم چڑھ جاتا۔ دوڑ دوڑ کر گرد پھرنے لگا لڑکھڑاہٹ سے گرنے لگا" اسیطرح یہ کہ انجمن آرا ایسی شریف۔ بھولی شرمیلی لڑکی جسکا کیرکٹر مصنف نے ہمیشہ بہت ہی شرمیلا دکھایا ہے۔ پہلی ہی ملاقات مین باوجود اس دیوانگی کے جان عالم پر عاشق ہوگئی۔ اسجگہ مجھے بیساختہ نصیبی کا یہ شعر یاد آتا ہے

زندہ در عشق چسان بود نصیبی مجنون
بیش ازین عشق مگر اینہمہ دشوار نبود

(اے خدا کیسے تھے وہ رقیق القلب۔ اور جلد باز عاشق۔ آج تو ایک کا بھی جلوہ نظر نہین آتا) مگر آگے چلکر مصنف کو تنبہ ہو جاتا ہے اور فوراً کہتا ہے کہ انجمن آرا نے یہ حرکتین دیکھکر جانعالم سے شرما کر سر جھکا کر کہا "شہزادہ صاحب کچھ پاس و لحاظ بھی کسی کا نہین ہے" اللہ اکبر کیا عذر گناہ بدتر از گناہ کی مثال کوئی اس سے زیادہ مل سکتی ہے۔ کیا ایک شاہزادی کی یہ گفتگو بیباکانہ تسلیم کی جائیگی

———— اسکے بعد بھی انجمن آرا سے ضبط نہ ہو سکا۔ اُسنے شاہزادہ کا جو بیہوش تھا۔ سر اپنے زانوئے نازنین پر رکھ لیا۔ اور جب جانعالم کو ہوش آیا تو اسنے زانو ہٹا لیا۔ مگر اس جگہ جانعالم نے جس رذالت اور شہدے پن کا ثبوت دیا ہے وہ قابل ملاحظہ ہے یعنی دریہ کہہ کے آنکھین بند کر لین کہ پھر ہمین غش آیا تمنے زانو کیون سرکایا اسپر بی انجمن آرا چڑھ گئین کھسیا گئین۔ اور ایسا جواب دیا کہ

تڑاق سے کہا کیا خوب اتنا اختلاط میری چرکھا ہے۔ مین نے تیری محنت اور شفقت پر نظر کرکے یہ الستاینت کی حرکت کی تھی۔ تم چل نکلے۔ خدا جانے دل مین کیا سمجھے۔ اپنی راہ لیجئے۔ چلتا دھندا کیجئے واہ واہ نیکی بر باد گنہ لازم،،، انجمن آرا کے یہ بازاری فقرے۔ چل نکلے۔ چلتا دھندا کیجئے اپنی راہ لیجئے وغیرہ۔ ایسے ہین کہ کوئی شریف نوجوان لڑکی نہین کہہ سکتی۔ اسپر حضرت جانعالم کے یہ سوقیانہ جواب اور پھکڑ مذاق اور بھی سہنے مین سہاگے کا عالم دکھاتے ہین ؎ چور کی داڑھی مین تنکا۔ تمھین اپنا عاشق کبھی نہ سمجھون گا۔ نہ معشوقون کے دفتر مین آپ کا چہرہ لکھو نگا" خیر اسپر بھی اگر بس کرتے تو خیر۔ مگر سرور مرحوم انجمن آرا سے یہ بیسواؤن کے سے فقرے بھی کہلاتے ہین۔ وہ چہ خوش بھلا دل تو بہلا لو۔ لچھ ہو یا نہو زبان کا مزا نکالو۔ یہ تو وہی مثل ہوئی ؎ مان نہ مان مین ترا مہمان،، عشق اور عاشقی کی باتین میری بلا جانتے۔ رمز و کنایہ کسی اور سے جاکے کرو۔ اپنا چوچلا تہ کر رکھو۔ اپنی صورت تو غور سے دیکھو تمنے سنا نہین۔ حلوا خوردن را روے باید،، انجمن آرا کی اس تقریر کو پڑھکر یہ معلوم ہوا کہ بھٹیاریان سرائے مین لڑ رہی ہین اسپر میان جانعالم کا یہ ارشاد سبحان اللہ و بحمدہ۔ کیا کہنا۔ گویا صاف صاف انجمن آرا کی عفت پر حملہ ہے ؎ مین بیچارہ خستہ تن۔ غربت زدہ دور از وطن محنت پن کہان سے لاؤن کیون کر ویسی صورت بناؤن۔ ایک ہنستا آکر ایک ونا ہے۔ کفر و اسلام مین بڑا فرق ہوتا ہے۔ تمھین ابھی تک نوجہن بھوگ کا ذائقہ نہین بھولا ہے دم تقریر زبان پر حلوا ہے"

مگر انجمن آرا بھی ایسی ڈھیٹ تھی کہ کسی طرح خاموش نہین ہوتی کہتی ہے وہ کہا چلو۔ صاحب ؎ موا قربان کیا تھا۔ اپنی جوتیچ بندکرو کٹی جلی کی ہنسی اپنے گھر جاکر کرو" یہ وہ باتین ہین جنھین سرور کے قلم نے ایک شاہزادی کے بجائے ایک بیسوا کا کیرکٹر دکھایا ہے اور جانعالم کو بجائے ایک شریف کے اچھا خاصہ لچا غنڈا بدمعاش بنا کر دکھایا

جسوقت انجمن ارا کو مانجھے بٹھایا گیا ہے یا منگنی کی گئی ہے وہان تو سرور کے قلم نے وہ انوکھی باتین لکھی ہین کہ کیا کہا جائے۔ اراذل اور راداتی کے یہان بھی وہ باتین نہین ہوتین۔ اوّل تو بیگمات مین ان رسوم کا دستور کہان ہے۔ اور اگر ہے تو اسقدر بیحیائی مان کے ملتجیانہ سوال کا ایسا بے باکانہ جواب انجمن آرا ہی کا کام تھا۔ سرور لکھتے ہین ؎ اسنے پہلے بیٹی کو گلے سے لگایا۔ پیار کیا۔ پھر کہا سنو پیاری دنیا کے کارخانے مین یہ رسم ہے کہ بادشاہ کے گھر سے فقیر تک بیٹی کسی کی مان باپ پاس ہمیشہ نہین رہتی۔ اور غیرت دار کے گھر بیٹی کی جوان۔ ہر وقت رنج کا نشان خفت کا سامان ہے اور خدا اور رسول کا حکم بھی یہی ہے۔ کہ جوان کو بٹھانہ رکھو۔،، بھلا خیال تو کیجئے کہ ایک مان اور مان بھی ملکہ۔ کیونکر یہ باتین اپنی بیٹی سے کہہ سکتی ہے۔ یہ باتین تو شریف غریب لوگون مین بھی نہین ہوتین۔ جن فقرون تک خط کینچا گیا ہے اونکو بار بار پڑھئے اور سمجھئے

آگے چلکر مان اپنی بیٹی کو جتاتی ہے کہ ایک شخص تجھپر عاشق ہے۔ اور تجھسے زیادہ خوبصورت ہے۔ اسپر انجمن آرا ارد کر کہتی ہے کہ صورت شکل کا کیا ذکر ہے "مان بیٹیون مین یہ باتین کسقدر فطرت سے دور معلوم ہوتی ہین اور کسقدر بیحیائی ان مین کوٹ کوٹ کر بھری گئی ہے۔

اسی وقت انجمن آرا اپنی مان سے یہ بھی کہتی ہے " خدا جانے وہ کون ہے کہان سے آیا ہے اپنے منہ سے میان مٹھو شہزادہ بنا یا ہے۔ آپکی لونڈی ہون ہر صورت فرمانبردار ہون اگر کنوئین مین جھونک دو چاہ سے گر پڑون اُف نکرون مگر جو آپ وسکی شکل پر ریجھ محنت و شفقت کو

سمجھ بوجھ یہ مقدمہ کیا چاہتی ہین تو مین راضی نہین،، اس عبارت کا ایک ایک فقرہ انجمن آرا کی بیباکی اور ناہمواری کا پتہ دیتا ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ عمر بھر آوارہ رہی ہے

اسپر ستم بالائے ستم یہ ہوتا ہے کہ مغلانیان وغیرہ سمجھاتی ہین۔ اونکے بھی فقرے وہی حماقت آمیز دور از عقل ہوتے ہین جو فقرہ اول مین لائے ہین ملاحظہ ہون "قربان جائین واری مان باپ کی عدول حکمی خدا اور رسول کی نافرمانی ہوئی ہے۔ تمھین انکار مناسب نہین۔ اور خدانخواستہ یہ کیا تمھارے دشمن ہین جو راہ چلتے کے حوالے کسی کے کہے سُنے سے بے دیکھے بھالے کر دینگی،،

رسم زمانہ کے موافق سرور نے شب عروسی کا سمان بھی دکھایا ہے مگر وہ حیاسوز منظر ہے کہ صاحبقران اور جان صاحب کے دیوانون مین نظر نہین آتا۔ مین اسپر کوئی تنقید کرنا نہین چاہتا صرف عبارت نقل کرتا ہون اور خط کھینچتا ہون

"خواہش کو اضطرار، حیا مانع کار، شرم برسر تکرار دونون کے دم چڑھ گئے تھے جنگ زرگری کا ذوریان کر رہے تھے۔ شہزادی موقع پر ہاتھ نہ لگانے دیتی تھی۔ بے بس آجاتی تھی تو چٹکیان لیتی تھی۔ گاہ کہتی تھی اتنا کوئی گھبراتا ہے دیکھو تو کون آتا ہے۔ کبھی خود اٹھ کے دیکھتی بھالتی تھی کوئی دم یون ٹالتی تھی، اسی موقع پر سرور نے فردوسی کا یہ شعر بھی نقل کیا ہے

چنان بُرد و آورد و آورد و بُرد — کہ دایہ ز حسرت پس پردہ مُرد

رشک وحسرت سے جگر صدف چاک ہوا دشمن کمبخت در پردہ ہلاک ہوا

تقاضائے سن، الھڑپنے کے دن اُسوقت دونون گھبرائے اور وہ کیفیت سب بھُولی جب دامن سب مین چادر پلنگ پر شفق صبح پھولی۔ صبح ہوئی تو دولھا دلھن اُٹھے۔ اوس موقع پر سرور نے نہایت ہی رکیک الفاظ استعمال کئے ہین اور پھر لطف یہ کہ یہ الفاظ نہ صرف رکاکت پر مبنی ہین بلکہ اونمین وہی بازاریت اور متوسط بلکہ ادانی کی زندگی کا نمونہ پایا جاتا ہے

"نمود سحر ہوی۔ عام شب کی خبر ہوئی۔ دم صبح ایک سرخرد۔ دوسرا ژولیدہ مو۔ حمام مین داخل ہوئی۔ جو جو محرم راز شریک نور دگداز تھین انھون نے رات کی باتون کے پتے رمز و کنائے مین دئے۔ سب نے قہقہہ مارا جب روبرو پنجیری اور تنبول آیا شرما کے سر جھکایا۔

آخری فقرے تو بالکل اُس رنگ مین رنگے ہین جو معمولی لوگون کے گھر ونمین ہوتا ہے۔

جان عالم جب انجمن آرا کو لیکر رخصت ہوا تو پہلے مہر نگار کے شہر مین پہونچا تمام حشم وخدم۔ فوج ولشکر ساتھ تھی ایک جنگل مین قیام کیا، تب ملکہ کو خبر ہوئی۔ یہ بھی ایک عجیب بات ہے فوج کی فوج آئی اور ملکہ کو خبر نہوئی سبحان اللہ۔ پھر معلوم کرنے کے لئے عام عورتون کی طرح تماشا دیکھنے کوٹھے پر چڑھ گئی تب خبر ہوئی۔ کیا جان عالم استقبال نہ تھا۔ کہ خبر کرا دیتا اور مہر نگار کیسی امیرزادی تھی کہ کوٹھے پر سے عام لوگون کی طرح دیکھنے گئی۔ یہان کی عبارت یہ ہے

"بارہ دری سے نیچے اُتری پھر کہا خدا جانے یہ لشکر کہانسے آکر اترا ہے بلکہ ہنسکر بحیلہ سیر خواصون کے کندھون پہ ہاتھ دھر کوٹھے پر چڑھی جان عالم مہر نگار کے مکان پر معہ انجمن آرا آیا۔ دو نو نوجوان شاہزادیون کی گفتگو ہوئی۔ مگر وہ گفتگو جو بالکل بموقع ہے اور بازاری عورتون مین بھی شاید ایسی گفتگو نہوتی ہو،،

"ملکہ آبدیدہ ہوکر بولی تمنے مجھے محجوب کیا۔ مین نقیر کی بیٹی تم شہزادے ہرچند شاہ وگدا دونون بندہ خدا ہین الا تمھارے قدم آنکھون پر رکھون تو بجا ہے۔ آپ کے آنے سے مجھے بڑا افتخار حاصل ہوا ہے۔ انجمن آرا بولی ہم نے خوب کیا رنڈی یہ چوچلے کی باتین بیگانہ وار نکرتی تو کیا ہوتا اے صاحب ہمارے تمھارے تو رشتہ ہمسری سررشتہ برابری ہے اور حساب کی راہ سے پہلے تو سلامتی سے تمھین ہو سرکار کا اُنس ہمین ملا ہے۔ پہلے مزا آپنے چکھا ہے۔ جوبن لوٹا ہے"

واضح ہو کہ یہ وہ انجمن آرا ہے جسکا کیرکٹر ہمیشہ مصنف نے نہایت ہی شرمیلا دکھایا ہے اور مہر نگار کے مقابلے مین ہر جگہ اسکو بھولا بھالا ثابت کیا ہے

ملکہ مہر نگار کا باپ جب بعد نکاح ملکہ کو رخصت کرتا ہے تو شاہزادے سے وہ باتین کرتا ہے جو بالکل چھوٹے لوگون مین ہوتی ہین ایک ایسے بادشاہ سے جو فقیر ہوگیا ہو یہ باتین اچھی نہین معلوم ہوتین۔ وہ کہتا ہے

"فقیر زادی کو کنیز عزیز جان کر نظر الطاف و کرم ہر دم رکھنا۔ یہ بھی خدمتگذاری مین قصور نکریگی اسے تمکو سونپا تمھین حافظ حقیقی کے سپرد کیا۔ لو خدا حافظ"۔

جب وزیرزادہ جانعالم کو تو اُسے سراپردۂ خاص مین لیگیا۔ اس جگہ مصنف لکھتا ہے۔ "جتنی جلیسین انیسین مہ جبینین دونون شہزادیون کے ہمراہ تھین اسے دکھا فرمایا جس طرف تیری رغبت ہو دلوا دون وہ نطفہ حرام اور خیال مین تھا غش کرنیلگا"

چونکہ وزیرزادہ شاہزادے کا دخیل صحبت تھا۔ تو دونون شہزادیون نے ان عامیانہ اور سوقیانہ الفاظ سے شاہزادہ کو سمجھایا۔ "ہر دم ایک شخص غیر اور جوان کو شریک صحبت خلا ملا رکھنا کیا مناسب ہے۔ اور آداب سلطنت سے بھی یہ امر بعید ہے شیطان کو انسان در بجانے۔ غیر تو غیر اپنے کا کیا اعتبار"۔

جب وزیرزادہ جانعالم کے قالب مین آگیا ہے۔ اور خیمہ مین آنے سے ملکہ کو کچھ شبہہ ہوا ہے تو اُسنے انجمن آرا سے وہ کلمے کہے جو عوام بھی نہین کہتے۔ "خدا خیر کرے آج بہت شگون بد ہوئے تھے صبح سے دہنی آنکھ پھڑکتی تھی راہ مین ہرنی اکیلی رستہ کاٹ میرا منہ تکتی تھی۔ اپنے سایہ سے بھڑکتی تھی خیمے مین اترتے وقت کسی نے چھینکا تھا خواب متوحش نماز کے وقت دیکھا تھا"۔

وزیرزادہ بصورت شہزادہ جب ملکہ کے خیمہ مین پہونچا تو ملکہ نے پوچھا آج کہان آرام کر دگے۔ ملکہ نے کہا یہین سو رہو۔ یہ بھی عجیب عامیانہ جملہ ہے جو ملکہ کی زبان سے نہین نکل سکتا۔

جب شاہزادہ جان عالم کو بصورت بوزنہ بادشاہ کے دربار مین لے چلے ہین تو ملکہ مہر نگار جھروکہ سے جھانک رہی تھی۔ اُسوقت ہزارون آدمیون کے مجمع مین وہ اُس جھروکے سے فرماتی ہین "ایک دم ٹھہر جائین اسکی تقریر کی مشتاق ہون"۔ سوداگر نے ہاتھی روکا ملکہ نے کہا "اے مقرب بے زبان گم کردہ خانمان اگرچہ اب ہم کس لایق ہین۔ مگر تیری داستان ظلم و جور کے شایق ہین"۔ دیکھنا یہ ہے کہ کیا کوئی شاہزادی کوٹھے پر تماشا دیکھنے کے لئے بیٹھ سکتی ہے اور کیا اتنے مجمع مین اُسکو یہ کہنے کی جُرات ہو سکتی ہے۔ اور کیا اُسکی زبان سے یہ لفظ اچھے معلوم ہوتے ہین "کہ اب ہم کس لائق ہین"

جہان شاہزادہ جان عالم کا جسم معہ لشکر کے نصف پتھر کا ہو گیا ہے اور تمام لشکر مصیبت مین مبتلا ہے وہان مصنف کے یہ فقرے کسقدر برمحل معلوم ہوتے ہین "وہ رنڈیون کی زاری انجمن آرا کی بیقراری علی الخصوص ملکہ کے بیان سے زمین و آسمان کانپتا تھا"

رنڈیون کا لفظ۔ اور ملکہ کا بین (بیان) کرنا علی الخصوص قابل داد ہین۔

جسوقت لشکر اس رنج و محن مین مبتلا ہوا ہے اتفاقاً ایک شاگرد ملکہ کے باپ کا پہونچا ہے اور وہ ملکہ کے خیمہ کے پاس آیا۔ وہان سرور ملکہ کی زبان سے یہ فقرے ادا کراتے ہین "بھائی اسوقت پردہ کہان کا"، یہ فقرے بالکل معمولی لوگون کے ہین

پیر مرد ملکہ مہر نگار کے باپ کا کیرکٹر مصنف نے ہر جگہ یہ دکھایا ہے کہ وہ ایک مرد فقیر مہذب قانع آدمی ہین۔ مگر وہ جب جادو گرنی سے لڑنے گئے تو یہ سوقیانہ گفتگو کرنے لگے۔ ملاحظہ ہو

"اے ننگ فرقۂ بنی آدم مردود عالم تجھے جوش شہوت و لولہ مباشرت نے آمادہ قتل ہزارہا بندگان اللہ بے جرم و گناہ کیا ہین مرگ عزیزان دیکھون مرنے سے ڈرون۔ بقول تیرے آج نہ موا کل مر جاؤنگا" ایسے ہی جب وہ جادو گرنی پر فتحیاب ہو چکا تو کہنے لگا۔ کہ "اسکا باپ شہنشاہ جادو دان ہے کوئی دم مین ضرور آئے گا بکھیڑا مچائیگا" آخری فقرہ بالکل عوام کے رنگ مین رنگا ہوا ہے

اسیطرح اس مرد فقیر نے جادو گرنی کے باپ سے یہ گفتگو کی "جسکا خون زمین پر گرے گا۔ اسکا مظلمہ مواخذہ تیری بیٹی جو فاحشہ تھی اسکی گردن پر ہوگا۔ ہم سمجھے تھے وہی ننگ خاندان تھی اب معلوم ہوا ایسون کے ویسے ہی ہوتے ہین تجھے سفید داڑھی کی شرم نہ آئی کہ وہ مرے پر کلنک کا ٹیکا مٹا" جو جو عامیانہ فقرے ہین وہ خود پکار رہے ہین مینے صرف خط کھینچ دیا ہے

جان عالم سیر دریا کے لئے جا رہا ہے۔ اور وہ ملکہ مہر نگار سے کہتا ہے "چلتی ہو"، ملکہ کہتی ہے "آپکو اور لہرا آئی نیا ڈھکوسلا سوجھا" ایک شوہر پرست ملکہ کی شاہزادے سے یہ گفتگو۔ یا شاہزادے کی یہ عامیانہ گفتگو کہ چلتی ہو کسقدر نازیبا ہے

ملکہ مہر نگار ایک شاہزادے کے یہان کشتی شکستہ ہو کر پہونچی ہے اُسنے بہت تواضع اور خاطر کی ہے اور مستدعی ہوا ہے کہ ملکہ اس سے شادی کرے۔ جب بہت مُصر ہوا تو ملکہ نے یہ فقرے کہے۔ جو بیحد عامیانہ ہین، اور ہرگز ایک ایسی عقلمند جلیل القدر شاہزادی کی زبان سے اچھے نہین معلوم ہوتے "جو میری خوشی چاہے تو برس روز کی مہلت دے اس عرصہ مین اگر کوئی ڈھو بانترا میرے وارثون کا پتا ملا"،

غرضکہ فسانۂ عجائب اسی قسم کے ناموزون فقرون۔ اور جملون سے بھری ہوئی ہے مصنف کو ایک جگہ بھی یہ خیال نہین رہتا کہ وہ کہان کا حال لکھ رہا ہے۔ اور کیسے جملے اُسکے قلم سے نکل رہے ہین۔ کن رسوم کا وہ ذکر کرتا ہے۔ اور کیا اُس کو ذکر کرنا چاہئے۔ غیر مہذب جملونکا طوفان قدم قدم پر امنڈ رہا ہے یہانتک کہ وہ جادو گرنی اور شاہزادے کے حال مین یہ جملے بھی لکھ گئے ہین "یہ کہکے گردن مین ہاتھ ڈالدیا وہ قحبہ تو ... بکھوے میں بھی بیٹھی تھی لپٹ گئی۔ ناچار خاطر افگار اس تیرہ بخت کا مُنہ کالا کرکے ہاتھ مُنہ دہو اُسکے ساتھ سو رہا۔ وہ چڑ مرانی بدمست لیٹتے ہی جہنم واصل ہوئی" اسکے بعد ہم تیسرے جزو کی طرف توجہ کرتے ہین۔ جنمین بعض داستانون مین سرور نے نظم کو نثر کا جامہ پہنا دیا ہے اور میر حسن کی محنت کو خاک مین ملا کر خود اُسکے مالک بن بیٹھے ہین۔ چنانچہ جہان بے نظیر کے پیدا ہونے سے پہلے بادشاہ نے نجومیون سے دریافت کیا ہے وہان میر حسن نے یہ سمان دکھایا ہے

یہ سنکر وہ رمال طالع شناس
لگے کھینچنے زائچے بے قیاس
دھری تختی آگے لیا قرعہ ہاتھ
لگا دھیان اولاد کا اُس کے ساتھ
جو پھینکین تو شکلین گئین مٹھول
کئی شکل سے دل گیا اون کا کھل
جماعت نے رمال کی عرض کی
کہ ہے گھر مین امید کی کچھ خوشی
بیاض اپنی دیکھی جو اس رمل کی
تو ایک یک نقطہ ہے دو دو خوشی
زن وزوج کی شکل مین ہے فرح
بیا کرمٔے وصل کا تو قدح
نجومی بھی کہنے لگے در جواب
کہ ہم نے بھی دیکھی ہے اپنی کتاب
نحوست کے دن سب گئے ہین نکل
عمل اپنا سب کرچکا ہے زحل
ستارے نے طالع کے بدلے ہین طور
خوشی کا کوئی دن مین آتا ہے دور
نظر کی جو تسدیس و تثلیث پر
تو دیکھا کہ ہے نیک سب کی نظر

کیا پنڈتون نے جو اپنا بچار
تو کچھ انگلیون پر کیا پھر شمار
جنم تیرا شاہ کا دیکھسکر
تلا اور برچھک یہ کرکے نظر
کہا رام جی کی ہے تجھ پر دیا
چندرمان سا بالک ترے ہوئے گا
نکلتے ہین اب تو خوشی کے بچن
نہو گر خوشی تو نہون برہمن
مہاراج کے ہون گے مقصد شتاب
کہ آیا ہے اب پانچوان آفتاب
نصیبون نے کی آپ کے یاوری
کہ آئی ہے اب پانچوین مشتری
مقرر ترے چاہئے ہو پسر
کہ دیتی ہے یون اپنی پوتھی خبر
ولیکن مقدر ہین کچھ اور بھی
کہ ہین اس بھلے مین برے طور بھی
یہ لڑکا تو ہوگا دلے کیا کہین
خطر ہے اسے بارھوین سال مین
نہ آوے یہ خورشید بالاے بام
بلندی سے خطرہ ہے اس کو تمام
نہ نکلے یہ بارہ برس رشک مہ
رہے برج مین یہ مہ چاردہ
کہا سنکے شہ نے یہ اُنکے تئین
کہو جی کا خطرہ تو اسکو نہین
کہا جان کی سب طرح خیر ہے
مگر دشت غربت کی کچھ سیر ہے
کوئی اسیہ عاشق ہو جن و پری
کوئی اُسکی معشوق ہو استری
کچھ ایسا نکلتا ہے پوتھی مین اب
خرابی ہو اسیر کسی کے سبب

سرور نے اسی مین اپنی ضرورت کے موافق تراش خراش اور ردو بدل کرکے جان عالم کے پیدا ہونے کے وقت یون لکھا ہے۔
درنجومی۔ پنڈت۔ جفردان۔ حاضر ہوے بہت سوچ بچار کر برہمنون نے عرض کیا۔ مہاراج کا بول بالا۔ جاہ وحشم۔ مرتبہ دوبالا اعلیٰ رہے ہماری پوتھی کہتی ہے۔ بھگوان کی دیا سے شہزادے کا چندرمان بلی ہے۔ چھٹا سورج ہے جو گرہ ہے سو بھلی ہے دیگ نیگ کا مالک۔ دھرم مورت یہ بالک رہے"
اسی کے بعد جیساکہ بدر منیر مین نجومیون نے بنیظیر کی آوارگی کا پتہ دیا ہے اسی طرح سرور نے جان عالم کی صحرانوردی کا مذکور کیا ہے "مگر پندرھوین برس مشتری بارھوین آئیگی سنیچر پاؤن پڑے گا" گسیان کی کرپا سے جان کی کھیر ہے۔ بڑی بڑی ہرنی کی سیر ہے"

اسمین شک نہین کہ سرور نے اس داستان کو بہت بڑھا کر اور اپنے قصہ کیموافق بنا کر لکھا ہے مگر یہ سب خیالات مثنوی میرحسن ہی سے لئے گئے ہین۔ اگرچہ الفاظ مین رد و بدل کر دیا گیا ہے۔ اور مشرقی آزادی نے اُن خیالات مین بھی اضافہ کر دیا ہے مگر اصل ماخذ سے کسی طرح انکار نہین ہو سکتا۔ سرور لکھتے ہین۔

"ایک سمت درخت گنجان چشمہ ہاے آب روان دیکھکر جا بیٹھا"

میرحسن بھی اسی عالم مین جبکہ شاہزادہ بدرمنیر کے باغ مین پہونچا ہے لکھتے ہین

تھے اک طرف گنجان باہم درخت ۔۔۔ کہ بیٹھے ہون جس طرح مشتاق سخت

لگا وان سے چھپ چھپ کے کرنے نظر ۔۔۔ درختون سے جون ماہ ہو جلوہ گر

اسکے بعد ان دونون نے اپنے اپنے طرز پر اُس منظر کی الفاظ مین تصویر کھینچی ہے مگر جہان بینظیر نے بدرمنیر کو۔ اور جان عالم نے ملکہ مہرنگار کو دیکھا ہے اور ایک خاص عالم طاری ہوا ہے اُسکے الفاظ بالکل مل گئے ہین۔ اور یقینی اُسکے موجد میرحسن ہین۔ ملاحظہ ہو

سرور کہتے ہین "یہ تو مدتون کا مسافت دیدہ مسافرت کشیدہ تھا۔ وہ زمین خجستہ اُسے بہت پسند آئی"

میرحسن۔ ملی جنس کی اپنے جو اسکو بو ۔۔۔ لگا تکنے حیرت سے ہر ایک سو

یہ صدا جو اہتمام سواری آگے آگے کرتی تھین اونکے کان مین پڑی اور نگاہ جمال جان عالم سے لڑی

میرحسن کہتے ہین

جو دیکھے تو ہے اک جوان حسین ۔۔۔ درختون کی ہے اوٹ مین مہ جبین

یہ چرچا جو پھیلا توظاہر ہوا ۔۔۔ ہر اک حال سے اُس کے ماہر ہوا

سرور کہتے ہین۔ سب لڑکھڑا کر ٹھٹک گئین۔ کچھ سکتے کے عالم مین سہم کر جھجک گئین۔ کچھ بولین ان درختون سے چاند نے کھیت کیا ہے۔ کوئی بولی نہین ری سورج چھپتا ہے۔ کسی نے کہا غور سے دیکھو ماہ ہے۔ ایک چہانک کر بولی باللہ ہے۔ ایک نے غمزے سے کہا چاند نہین تو تارا ہے۔ دوسری جنگلی لے بدلی اچھال چھکا تو بڑی خام پارا ہے۔ ایک بولی سرو ہے یا چمن حسن کا شمشاد ہے۔ دوسری نے کہا تیری جان کی قسم پرستان کا پریزاد ہے۔ کوئی بولی غضب کا دلدار ہے کسی نے کہا دیوانیو چپ رہو خدا جانے کیا اسرار ہے۔ ایک نے خوب جھانک تاک کے کہا خدا جانے تم سب کے دیدون مین چربی کہان کی چھاگئی ہے یہ تو بھلا چنگا ہٹا کٹا مرد وا ہے

اَب دیکھئے میرحسن بالکل یہی تصویر دکھلاتے ہین اور معلوم ہوتا ہے کہ سواے چند الفاظ کے سرور بھی کوئی فرق نہ دکھا سکے

یہ سن ایک سے ایک وان سب کی سب ۔۔۔ پھرین برگ گل کی طرح غنچہ لب

جو دیکھین تو شعلہ سا روشن ہے کچھ ۔۔۔ درختون کا روشن سا آنگن ہے کچھ

کسی نے کہا کچھ نہ کچھ ہے بلا ۔۔۔ کسی نے کہا چاند ہے یان چھپا

کسی نے کہا ہے پری یا کہ جن ۔۔۔ کسی نے کہا ہے قیامت کا دن

لگی کہنے ماتھا کوئی اپنا کوٹ ۔۔۔ ستارا پڑا ہے فلک پر سے ٹوٹ

ہوئی صبح سب اُٹھ گیا یہ حجاب　　درختون مین نکلا ہے یہ آفتاب
کسی نے کہا دیکھیو اے بوا　　کھڑا ہے کوئی صاف یہ مرد وا
کسی نے کہا یہ تو دلدار ہے　　کسی نے کہا کچھ یہ اسرار ہے

اسکے بعد سرور لکھتے ہین

"سواری جوُرکی - ملکہ نے پوچھا خیر ہے" سب نے ملکہ کو بتایا اور ملکہ آگے بڑھی - اسی کو میر حسن کہتے ہین

گئی بات یہ شاہزادی کے گوش　　یہ سنتے ہی جاتا رہا اسکا ہوش
کہا مین تو دیکھون یہ کہکر اُٹھی　　گیا سنسناجی تو رہ کر اُٹھی
خواصون کے کاندھے پہ رکھ اپنا ہاتھ　　عجب اک ادا سے چلین ساتھ ساتھ
کچھ اک خوف سے ہول کھاتی ہوئی　　دھڑک اپنے دلکی مٹاتی ہوئی
کئی ہمدمین تھین جو کچھ دہ پڑھین　　دعائین وہ پڑھ پڑھ کے آگے بڑھین

سرور کہتے ہین "دیکھا ایک جوان رشک مہ پیر کنعان رعنا سرو قامت سہی بالا بحرحسن وخوبی کا در یکتا - کاسہ سر فر شاہی نمایان بادۂ حسن دلفریب سے معمور ہے - دماغ مین کشورستانی ہے - بھتی جوانی ہے" اس تعریف کو سرور نے بھی طول دیا ہے اور میر حسن نے بھی اوران دونون داستانون مین خیالات کی یکرنگی ہے - الفاظ مین فرق ہے مگر بہت زیادہ فرق نہین - بلکہ بعض شعر خود فسانہ عجائب مین پورے پورے نقل کر دئے ہین جیسے کہ

برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن　　جوانی کی راتین مرادون کے دن

آگے چلکر جو مہر نگار اور جانعالم کے وصل کا منظر دکھایا ہے وہ بھی قریب قریب ویسا ہی ہے جیساکہ بینظیر اور بدر منیر کے ملنے کا حال میر حسن نے دکھایا ہے

باغ کی بہار کا عالم - اور جان عالم کے جانے کے بعد باغ کی ویرانی تقریبًا وہی ہے جو میر حسن کے یہان ہے - اور اسی طرح مختلف داستانین شلاً بارات وغیرہ کا حال میر حسن کا کھینچا ہوا نقشہ ہے - الغرض یہ ہے فسانہ عجائب کی اصل حقیقت جس نے اُسکو دنیا مین مشہور کر دیا ہے -

"نقاد"

ایک شاعر کا انجام

مشرقی مآثر

فلکیات وریاضی مین!!

تاریخ عالم کے زرین اوراق اس امر پر شاہد ہین کہ دنیا کی اور قومون کے مقابلہ مین ہمارے اسلاف تجارتی امور مین بہت زیادہ ممتاز تھے، اُنکی تجارت کا سلسلہ تقریباً دنیا کے ہر گوشہ تک پہونچا ہوا تھا میدان تجارت مین روئے زمین پر کوئی انکا حریف مقابل موجود نہ تھا، اس لئے جب اُنکے تجارتی کاروبار کا دائرہ زیادہ وسیع ہوگیا، تو اونکو اول اول بہ تقاضائے ضرورت تجارتی حساب کے اصول وقواعد وضع کرنے کا احساس پیدا ہوا چنانچہ انھون نے سب سے پہلے اس فن کے مبادی اور اصول مقرر کئے، پھر رفتہ رفتہ مختلف زمانون مین مختلف ترقیان کین، سندات و دستاویزات، تحاویل مالیہ، شرکات، وصولات، حساب فائدہ وغیرہ قسم قسم کے تجارتی حسابات، قیاسات اور اوزان کے نظام کی تعین، ہندسی طریقون سے آراضی کی پیمائش اعداد لکھنے کی ایک مخصوص نوع کا استنباط، گنتی کے ستینی نظام کی ایجاد، یہ سب ہمارے اسلاف ہی کے ذہن وعقل، غور وفکر کے زندہ جاوید نتیجے ہین، نظام ستینی کے آثار قدیمہ ابتک ہمارے بعض نظامات مین شایع ہین، مثلاً ۶۰ منٹ کا ایک گھنٹہ، ۶۰ سکنڈ کا ایک منٹ، ۳۶۰ درجہ کا ایک دائرہ، ۶۰ دقیقہ کا ایک درجہ، ۶۰ ثانیہ کا ایک دقیقہ، اس کے علاوہ اعداد صحیحہ اور بعض کسور بسیطہ کی وضع بھی انھی کی ذہنی طاقت کا خوشگوار ثمرہ ہے

یہ تمام حسابات اور یہ تمام طریقہ ان خشتون مین مدوّن پائے گئے ہین، جن کا ابھی ابھی مابین النہرین اکتشاف کیا گیا ہے۔ ماہرین حضریات کا بیان ہے کہ ان آثار قدیمہ کی تاریخ ۳۰۰۰ برس ق۔م ہے، سنہ ۱۸۹۴ء مین فرانسیسی وفد نے اسی اطراف مین ایک مدرسہ کی بنیاد کا سراغ لگایا تھا جسکی تاریخ بھی ۳۰۰۰ برس ق م بتائی جاتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قدامت کے اس زمانہ مین ہمارے اسلاف تعلیم وتعلم کے مہذب طریقے سے بھی واقف تھے

ان خشتون مین غور کرنیکے بعد ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہین کہ، مسیح علیہ السلام سے تین ہزار برس قبل ہمارے اسلاف ۱-۶۰ کے مربع اعداد کو اس کے مکعبات، جذر مالی کو اچھی طرح جانتے تھے، اس لئے کہ ان اینٹون مین مربع اعداد مکعبات، اور ضرب و تقسیم کی مکمل جداول موجود ہین، نسبت وتناسب، ہندسہ کے سلسلۂ متصلہ، اور قوۃ ثانیہ کی طرف کیتہ ثنائیہ کی ترقی وغیرہ کے اصول ومبادی سے بھی وہ لوگ بخوبی واقف تھے، ہندسہ مین انکی معلومات ومعارف کا دائرہ البتہ محض بعض ہندسی اشکال جیسے مربع، مستطیل، مثلث، اور دائرہ تک محدود تھا لیکن ان کے معارف ہندسیہ تمامتر سامی تھے، ان کے ہندسی اور میکانیکی معارف کے متعلق سر ولیم ولکوکس نے تفصیل سے بحث کی ہے لیکن بخوف طوالت ہم اس تفصیل کو قلم انداز کرتے ہین،

علم الافلاک مین ہمارے اسلاف کی معرفت کا سلسلہ اعتدال ربیعی کے زمانہ اور اسکی تعیین تک پہونچتا ہے۔ اس لئے کہ انھون نے اعتدال

ربیعی ہی سے اپنا سال شروع کیا، اور پہلے مہینہ کا نام ثور رکھا، اس سے یہ حقیقت معلوم ہوتی ہے کہ ان لوگون نے اسوقت یہ تقویم بنائی تھی جب اعتدال ربیعی کے زمانہ مین آفتاب برج ثور کے اندر تھا یعنی اس تقویم کی تاریخ تقریباً ...۵ برس قبل مسیح ہے) اور انھون نے دائرہ بروج کو بارہ برجون پر تقسیم کیا۔ حرکاتِ سیارات کی تحقیقات کی، مختصر یہ کہ انھین نے سب سے پہلے علم الفلک کے مبادی اور اصول وضع کئے، اس کے نطاقِ معرفت کو وسیع کیا، اوقات و تاریخ، سنین و شہور معلوم کرنے کے لئے جنتری ایجاد کی، معرفت اوقات کے لئے دھوپ گھڑی کا استنباط کیا، سال کے فصلون کی تحدید کی، نجوم کو مجامیع اور کوکبات پر تقسیم کیا، ان کے اوضاع اور ان کے اوقات طلوع و غروب کو معلوم کیا، الغرض فن ملاحت اور دریائی سفر کی سہولت کیلئے انھون نے اس فن کو غیر معمولی کاوشون سے بہت زیادہ منقح اور مہذب بنایا

ہم کو معلوم ہے کہ مصریون نے سنہ ۴۲۴۱ ق۔م مین ایک تقویم بنائی تھی، جسمین سب سے پہلے انھون نے سال کے بارہ مہینے، اور ہر مہینہ کے ۳۰ دن مقرر کئے تھے، اور پورے سال مین رسمی تہوارون کیلئے پانچ دن کا اور اضافہ کرکے ۳۶۵ دن کا سال بنایا تھا۔ یہ تمام ایجادات ان کے نظام اعداد، ضبط حساب، دقت ارصاد، اور رسوخ معارف کی غیر معمولی ترقی پر دلالت کرتی ہین، ہمارے اسلاف نے ہندسۂ بنا، معارف میکانکی مساحت عملی کے اندر جو کچھ ترقیان کین، وہ محتاج بیان نہین ہین، انھون نے دور دراز مسافتون کو طے کرنے کیلئے مستقیم خطوط بنائے، ارتفاع و انحدار کے فرق کی معرفت کیلئے مستوی سطحون کی دقیق طور پر تعیین کی، قدما کی اس قسم کی سب سے بڑی یادگار ہرم اکبر ہے، موجودہ زمانہ کے ماہرین فن نے اس ہرم کو دیکھا، اور فن کی حیثیت سے دیکھا، تو اسکی جوانب کی تعیین مین زیادہ سے زیادہ ۱½ سنٹیمیٹر اور زوایا کی تحدید مین زیادہ سے زیادہ قوس دائرہ کے ۱۲ ثانیہ یا ۱/۲۴ زاویہ قائمہ کی غلطی نکال سکے،

الغرض مشرق مین جو کچھ ہونے کو تھا وہ ہوا۔ پھر یہ تمام علوم و فنون یونانیون کی طرف منتقل ہوگئے، اور انھون نے ایک راسخ علمی اصول اور منطقی نظریات پر انکی از سر نو ترتیب دی، اور ان مین بہت سے ایسے رجال علام اور فلاسفہ کبار پیدا ہوئے جنکی نظیر قدیم یا جدید دنیا مین ملنی دشوار ہی نہین بلکہ قطعاً ناممکن ہے۔ افلاطون، ارسطوطالیس، ارخمیدس، اور اقلیدس جیسی بے نظیر اور باکمال ہستیان سرزمین یونان سے اٹھین جنھون نے بعض اقسام علوم مین کسی مستزید کیلئے کوئی مجال بحث باقی نہ چھوڑی، منطق و فلسفہ کی مملکت کے تو وہ اکیلے فرمان روا تھے، چنانچہ ان فنون مین وہ امام اول شمار کئے جاتے ہین،

عرب در اسلام کے مآثر

عرب نے صدر اسلام مین جب میدان ترقی کے اندر قدم رکھا۔ تو فتح و ظفر ان کے ہم رکاب تھے جدھر وہ جاتے مظفر و منصور واپس آتے، چنانچہ تھوڑے ہی دنون مین اطراف و جوانب کے تمام ملوک و سلاطین ان کے زیر نگین ہوگئے اور دنیا کے بیشتر حصہ پر ان کا پرچم لہرانے لگا۔ فتوحات ملکی کا سلسلہ جب ختم ہوا۔ اور انکو کامل فراغت نصیب ہوئی تب وہ علوم و معارف کی طرف مائل ہوئے، اور فلکیات و ریاضی اور علوم طبیعی مین بہت سی یونانی کتابون کا ترجمہ لکھا، ہنود و اعجام کی بہتیری تصنیفات کے اقتباسات شائع کئے۔ عباسی خلفا نے اپنے زمانہ حکومت مین اس علمی حرکت اور فکری نہضت کی ہر ممکن وسائل سے تشجیع کی مختلف مذاہب اور مختلف اجناس کے افضل علماء کو ترجمہ اور تالیف کی خدمت پر مقرر کیا حتی کہ تھوڑی ہی مدت مین سنسکرت اور یونانی زبان کے تقریباً تمام علوم کا عربی مین ترجمہ ہوگیا اور عربون نے ہندی رقوم مین جو مناسب اور عمدہ اعداد تھے، انکو مہذب بناکر اپنے قوم مین داخل کیا۔ یہی وہ واقعات ہین جنکی وجہ سے

مغربیوں میں عام طور پر یہ خیال پھیل گیا کہ عربوں نے علوم و فنون کو محض ناقلانہ حیثیت سے نقل کیا ہے۔ خود انکی کمائی کا اسمیں کوئی سرمایہ نہیں لیکن مستشرقین کی تازہ بحثوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عربنے بہت سے جدید امور کا بھی استنباط کیا جو اس سے قبل بالکل غیر معلوم اور مجہول تھے، اس لئے اس موقع پر ہم عربوں کے صرف فلکیات اور ریاضی کے مشہور اور عام آثر کو اختصار کے ساتھ بیان کرتے ہیں، ناظرین غور سے پڑھیں اور اندازہ لگائیں کہ یورپ کے اس زعم باطل میں راستی و صداقت کا عنصر کہانتک مفقود ہے!!

علم الحساب میں، نظریات اعداد کے اندر عربوں نے بہت کم اضافہ کیا موضوعات کی تبویب، اور ہندی رقوم کی تہذیب میں البتہ انہوں نے بہت کچھ کوشش کی، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اعداد میں صفر کا اضافہ پہلے عربوں ہی نے کیا، اور یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے پہلے پہل صفر کو موجودہ غایت کے لئے استعمال کیا فرنگیوں نے بھی اس عربی لفظ کو اس معنے میں اپنی زبان کے اندر نقل کیا ہے ——— اس لئے

مرجح بھی معلوم ہوتا ہے کہ کسر عشری کی علامت فاصلہ کو عربوں ہی نے سب سے پہلے وضع کیا تھا،

علم الجبر کے اصول و قوانین بھی عربوں ہی نے وضع کئے، اور قانونی و نظامی صورتوں سے علامات و اشارات جبر کلیہ کام لیا۔ بعض اعداد کا غیر معروف قوانین و ضوابط سے استنباط کیا، علامہ خوارزمی نے سب سے پہلے موجودہ طرز پر معادلہ درجہ ثانیہ کی تحلیل کی، اور اس کے جذر کو مستخرج فرمایا۔ خوارزمی وہ پہلا شخص ہے جس نے سب سے پہلے اس علم کا نام علم الجبر والمقابلہ رکھا، یورپ والوں نے انہی سے اس علم کو نقل کیا ہے۔

عربوں نے سلاسل اعداد یا انکے مجموعات سے بھی بحث کی، جبر و ہندسہ کے طریقوں سے بعض معادلات درجہ ثانیہ کی تحلیل پر بھی قادر ہوئے۔

اور انہی نے معادلات جبریہ کی تحلیل ایک بالکل جدید اور سہل اسلوب پر قایم کی، انہی نے یہ نظریہ دنیا کے سامنے پیش کیا کہ دو مکعب اعداد کا مجموعہ مکعب عدد نہیں ہوسکتا۔ اس نظریہ کو انگریزی میں (Fermat) کہتے ہیں، اور انہی نے سب سے پہلے ہندسہ کے بعض قضایا اور عملیات کی تحلیل میں اسالیب جبریہ سے کام لیا۔ حقیقت میں عربوں کی یہ وہ قیمتی بحثیں ہیں جن پر شہرۂ آفاق ڈیکارٹ نے اپنے مباحث عالیہ کی تعمیر کھڑی کی۔

پہلے یہ بیان کیا جاچکا ہے کہ خود یونانیوں نے ہندسہ کا فن اتنا مکمل کر دیا تھا کہ اسمیں مزید حواشی کا اضافہ کرنے کی مطلق ضرورت نہ تھی اس لئے اس فن میں عرب کے مشاغل کا دائرہ محض وضع تمارین، اور بعض مشکل مسائل کی تحلیل تک محدود رہا

علم المثلثات اور علم الانساب میں عربوں کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ اس لئے کہ انہی لوگوں نے سب سے پہلے مثلثات کے اکثر قضایا اور قوانین (مثلاً قانون تناسب جیوب، اور قوانین مثلثات کرویہ غیر قائمۃ الزاویہ وغیرہ) کا اکتشاف کیا۔ اور انہی لوگوں نے سب سے پہلے مثلثات کی اس نوع کی تحلیل کیلئے ایک عام قانون بنایا۔ اور انہی لوگوں نے سب سے پہلے قاطع اور اس کے امثال و نظائر کو معلوم کیا، اور انہی لوگوں نے سب سے پہلے مماس اور قاطع وغیرہ کی نظایر کے لئے جدولیں وضع کیں، اور انہیں لوگوں نے سب سے پہلے سطح کرہ پر اصول رسم کی حقیقت کا پتہ لگایا۔

عربوں کے فلکی مباحث بہت مشہور ہیں، انہوں نے چاند، سورج اور سیارات کی گردشوں کی تحقیقات کی، اور انکے اوقات کو ضبط کیا، بطلیموس کے جداول کی تنقیح کی، چاند کی حرکت میں بعض انواع خلل کا اکتشاف کیا۔ اور انہی لوگوں نے خلیفہ مامون کی فرمایش پر سب سے پہلے علمی اور قانونی طریقہ سے خط نصف النہار کے درجہ کا طول معلوم کیا، عربوں کی ذہن و عقل، غور و فکر، دانش و بصیرت کی غیر معمولی اہمیت کا اس سے تم کو اور صحیح اندازہ ہوسکیگا کہ تقریباً آٹھ سو برس پہلے جبکہ یورپ کی علمی دنیا پر جہل و نادانی کی کثیف گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں، عربوں نے چند جگہ ہیں

آسمانی حالات کا مطالعہ کرنے کیلئے قائم کین اور ان جداول کی تصحیح کی جو حرکات قمر کے ساتھ مخصوص تھین، گردش زمین کا حال معلوم کیا، متعدد تجربات کے بعد انھی نے سب سے پہلے یہ فیصلہ کیا کہ زمین اپنے محور پر گردش کرتی ہے مختصر یہ کہ فلکیات مین عرب یونانیون سے زیادہ ممتاز ہین، اس لئے عربون نے اپنی خداداد لیاقت سے اس علم کو ایک استقرائی علم بنا دیا، انھون نے یونانیون کی طرح محض نظریات پر اکتفا نہین کی بلکہ نظریات کے ساتھ ساتھ عقلیات پر بھی کافی عبور حاصل کیا

بہر حال! فلکیات و ریاضی مین مشرق نے سب سے پہلے اپنی خدمات جلیلہ پیش کین، زمانہ قدیم مین اسنے سب سے پہلے ان علوم کے اصول و مبادی وضع کئے، اور پھر عصر متوسطہ مین جو ایک مظلم اور تاریک زمانہ گزرا ہے اس نے محض ان اصول و قواعد کے حفظ ہی پر اکتفا نہ کی بلکہ اسمین بہت سے اہم ترین حقایق و معارف کا گران ارز اضافہ بھی کیا

ان تمام تر معروضات کا نتیجہ دوسرے لفظون مین یہ ہے کہ علوم و فنون کسی خاص جماعت یا فرد کی ملک نہین ہین بلکہ وہ، ہر قوم، ہر جماعت اور ہر فرد کی ایک مشترکہ ملکیت ہین، جو شخص اس کے حصول کے لئے جد و جہد، سعی و کوشش کرتا ہے وہ اس دولت کو پاتا ہے۔ ہمارا موجودہ تمدن معارف علمیہ کا ایک خوشگوار ثمرہ ہے۔ اور چونکہ یہ معارف مطالب عمران اور مقتضیات حیاۃ پر پورے اترتے ہین، اس لئے اگر ہم عمار عمران مین خوض کرنا چاہتے ہین، تو ہمپر ضروری ہے کہ ہم علمی بحث و تفکیر کے اسالیب پر اپنے ناشئہ جدیدہ کو ضرور سکھین، اس لئے کہ علم ہی درحقیقت ثروۃ کی اصل وبنا ہے، اور امم و شعوب کی ترقی کا اصلی راز، مال اور مال پیدا کرنیوالے رجال ہی مین مضمر ہے،

"بدر اصلاحی"

ایک سیّاح کی ڈائری

پہلا ورق

"لکھنؤ و لکھنویات"

سوچ سمجھ کر کام کرنے کا مفہوم ہم لوگوں میں عام طور پر یہی ہے کہ کبھی کوئی کام نہ کیا جائے۔ برخلاف اس کے مجھ پر یہ الزام قائم کیا جاتا ہے کہ پہلے کام شروع کر دیتا ہوں اور پھر سوچتا ہوں کہ:-

نہ ہو تو کیجئے کیا اور ہو تو کیونکر ہو!

اس زندگی میں سب سے پہلی آزادی تو مجھے اسوقت ملی جب میری بیوی نے انتقال کیا۔ صبح کو وہ رخصت ہوئیں، شام کو تجہیز و تکفین سے فارغ ہو کر سیدھا کلکتہ چلا گیا، اس لئے نہیں کہ انکی جدائی کا غم دور ہو جائے بلکہ اس حقیقت کی بنا پر کہ جب آدمی کے بیوی نہ ہو تو سوائے آوارہ پھرنے کے وہ آخر کر ہی کیا سکتا ہے۔ دوسری آزادی مجھے ایک سال کے بعد ملی جب میری دوسری شادی ہوئی ـــــ یہ پہلے ہی طے ہو گیا تھا کہ بعد عقد "وہ" ایام گرما بسر کرنے کو مری چلی جائینگی ـــــ اور میرے لئے قلب کی ایک خاص بیماری کی وجہ سے تمام پہاڑ "لن ترانی" ہو کر رہ گئے تھے ـــــ اس لئے میں نے ہندوستان کا رخ کیا اور سب سے پہلی روانہ ہونے والی گاڑی پر سوار ہو گیا۔ کامل ۱۹ گھنٹے کے بعد صبح کو جو دفعۃً آنکھ کھلی تو کانپور کا اسٹیشن نظر آیا۔ میں یہاں اتر پڑا منزل مقصود سمجھ کر نہیں، بلکہ محض اس خیال سے جسے "دفع دخل" کہتے ہیں۔ دن بھر کانپور کی خاک چھاننے کے بعد جب شام کو اسٹیشن پہونچا تو لکھنؤ جانے والی ریل تیار تھی اور مسافروں کے ہجوم سے تل رکھنے کی جگہ نہ تھی، معلوم ہوا کہ آج محرم کی ۸ ہے اور یہ سب لوگ وہاں روشنی دیکھنے جا رہے ہیں۔ میں شمسی تاریخوں سے بھی بے خبر رہتا ہوں چہ جائیکہ قمری۔ اسوقت یہاں "محرم" اور "لکھنؤ" یہ دو نام سنکر بے اختیارانہ طور پر ایک وجد میں داخل ہو گیا اور شام کو ۷ بجے اس سرزمین میں پہونچ گیا جو اپنی روایات کے لحاظ سے بجا طور پر "کربلائے ہند" کہلائی جا سکتی ہے۔

"یا حسین! وا حسینا!!"

قبل اس سے کہ میں قیام لکھنؤ کے حالات قلمبند کروں اس حقیقت کا اظہار ضروری ہے کہ میرے لئے یہاں کی زیارت کا یہ اولین شرف تھا، اور میں نے جو خیالی تصویر یہاں کی اپنے دماغ میں کھینچ رکھی تھی اس کا تعلق یکسر "حسن و غنا" سے تھا یعنی میں سمجھتا تھا کہ لکھنؤ کا ذرہ ذرہ "معمورۂ جمال و موسیقی" ہے اور رات کی تاریکی میں یہاں بھی وہی نیرنگ حسن و عشق نظر آتا ہے جو کسی وقت عہد عباسیہ میں بغداد کے لئے مخصوص تھا۔ یہاں کی نزاکت جسم و خیال کے واقعات، یہاں کی پچھلی تہذیب و معاشرت کی حکایات، میں نہیں کہہ سکتا کب سے اور کیونکر میرے دماغ میں گونج

رہے تھے، لیکن یہ بالکل یقینی ہے کہ وہ اسقدر کمسن سال ہیں کہ اگر انکی ابتدا "فسانہ آزاد" کے زمانۂ تصنیف سے قرار دوں جب میں بہت کمسن تھا تو بیجا نہوگا، ممکن ہے آج کوئی نقاد سرشار کے متعلق یہ حکم لگائے کہ اس نے اپنی تصانیف میں جو توہین لکھنؤ کے بلند معاشرت والوں کی ہے وہ غداری کی حد تک پہونچتی ہے، لیکن اس کا کیا علاج کہ عنفوان شباب کی دیکھی ہوئی "حسن آرا" سے حریم ناز میں نہ سہی تو "تختۂ بازار" پر ملنے کی خواہش ضرور دل میں پیدا ہوتی ہے

مجھے بالطبع موسیقی سے لگاؤ ہے اور جانعالم نے ٹھمری کی ایجاد سے محمد شاہ رنگیلے کے خیال کو جسقدر رنگین بنا دیا اسکا بھی معترف ہوں ہر چند اصول فن کے لحاظ سے لکھنؤ کو کسی نایک کے پیدا کرنیکا شرف حاصل نہیں ہوا، لیکن جو بانکپن یا (لکھنؤ کی زبان میں چوچلا) صرف آواز کے اتار چڑھاؤ اور "مینڈ مسک" سے انہوں نے پیدا کیا وہ کہیں اور نہیں پایا جاتا لکھنؤ کا گانا لکھنؤ سے باہر میں نے بارہا سنا، لیکن یہ تمنا ہمیشہ قائم رہی کہ وہیں کی فضا کی اگر کوئی خنک سی چاندنی رات اس کے لئے میسر آجائے تو کیا کہنا۔ اس لئے جس وقت میں لکھنؤ کے اسٹیشن پر پہونچا تو میرا خیال لکھنؤ، میرے دل و دماغ میں کلورو فارم کی طرح بسا ہوا تھا اور ہر چند یہ معلوم کرکے کہ "یہاں آج کل محرم ہے" تھوڑی سی کلفت ہوئی، مگر پھر اس خیال سے کہ یہاں کا یہ زمانہ بھی خاص چیز ہے میں نے اپنے اوپر سیاحت کی تمام مسرتیں طاری کرکے قیام کا ارادہ کر ہی لیا

میں جس حصہ ملک کا رہنے والا ہوں، وہاں محرم کا وجود کوئی معنے نہیں رکھتا، نہ وہاں مجالس مرثیہ کا قیام ہوتا ہے، نہ بزم عزا آراستہ کیجاتی ہے، بلکہ کہیں کہیں گھروں میں "ذکر الشہادتین" کے قسم کی کتابیں پڑھکر "یادگار شہدائے کربلا" صرف دلمیں قائم کر لیجاتی ہے، اسلئے میرے لئے لکھنؤ کی شام کا یہ منظر کہ پھر شوق نہایت شوق و مسرت کے عالم میں پوری سج دھج کے ساتھ شاہ نجف چلا جا رہا ہے اور وہاں ہزاروں رنگین برقی قمقموں کی روشنی میں اس طرح پر تکلف دعوتیں کھا رہی ہیں جیسے واجد علیشاہ کی سالگرہ منائی جا رہی ہو، بالکل ناقابل فہم معمہ تھا۔ شاہ نجف سے لیکر حسین آباد تک تماشائیوں کا ہجوم اور امام باڑہ کا دلہن کی طرح سجا ہوا ہونا لبریز حوض میں فواروں کا جاری ہونا اور انکا روشنی کے انعکاس سے قوس قزح کی سی کیفیت پیدا کرنا ایک ایسا منظر تھا جس کو دیکھکر ایک شخص بیساختہ کہہ سکتا ہے کہ

ایں خانہ بدیں خوبی آتشکدہ بایستے

لکھنؤ کے محرم کے لئے یہ میرا پہلا جذبۂ شکر گذاری تھا کہ میں یہاں کی فراوانی مسرت میں گھر اور نئی بیوی کی جدائی کو بھی تھوڑی دیر کیلئے بھول گیا

۹ محرم کا سارا دن میں نے مجالس عزا میں شریک ہوکر بسر کیا، یہ امر افسوسناک ہے کہ سوزخوانی کا رواج یہاں سے تقریباً اٹھ گیا ہے یعنی تنہا وہ چیز جو ایک صاحب ذوق کو ان محافل کی شرکت پر مجبور کر سکتی ہے وہی مفقود ہو گئی ہے۔ موجودہ مجالس کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جن میں صرف مرثیے تحت اللفظ پڑھے جاتے ہیں اور دوسری وہ جنہیں "حدیث خوانی" کہتے ہیں، اول قسم کی محافل کا مقصود زیادہ تر یہ ہوتا ہے کہ مرثیہ گو اپنی شاعری، اپنی مرثیہ گوئی اور اپنی حرکات رقصیہ کی داد لے اور دوسری قسم کی مجلس صرف فن خطابت کی تکمیل کی نمایش ہوتی ہے لیکن میرے نزدیک دونوں ناکام ہیں۔ اول الذکر میں شاعری کا جہانتک تعلق ہے وہ ہر چند لکھنوی ذوق کے لحاظ سے بالکل مکمل چیز ہوتی ہے لیکن صحت روایات اور جذبات حماست کے اعتبار سے سارا مرثیہ "غیر معصوم لٹریچر" کی حیثیت رکھتا ہے اور شہادت حسین کا جس انداز سے اظہار الم کیا جاتا ہے وہ "اہل بیت" سے تو کسی طرح منسوب نہیں کیا جا سکتا، ممکن ہے کہ جانعالم کے مٹیا برج جاتے ہوئے ان کے پسماندگان نے اس طرح کا شور و شیون کیا ہو۔ رہا پیٹنے کا انداز

سو ممکن ہے کہ وہ کالکادین، بنداذین کے نقطۂ نظر سے کوئی خاص فن کی چیز ہو، لیکن میں نے تو بجائے حرکات شجاعت و تہور کے اِک قسم کی "نسائیت" ہی ان میں پائی۔

مجالس حدیث خوانی میں کوئی مجتہد یا "مولانا" جسے یہاں کی اصطلاح میں "قبلہ و کعبہ" کہتے ہیں، ممبر پہ جاکر سب سے پہلے فاتحہ کے لئے ہاتھ اٹھواتے ہیں، پھر کلام مجید کی کوئی آیت پڑھکر اس کے رموز و نکات بیان کئے جاتے ہیں، احادیث کی تلاوت کرکے انکا مفہوم بتایا جاتا ہے اور اخیر میں تمام وعظ کو کھینچ تان کر فضیلت حسین و شہادت حسین سے متعلق کرکے زور زور سے رانوں پر ہاتھ مار کر چیختے ہیں، روتے ہیں اور سننے والے بھی آنکھوں پر رومال رکھ کر روتے وقت اس طرح بدن کو جنبش دیتے ہیں جیسے کوئی انہیں گدگدا رہا ہے

یہاں کے ایک خاص واعظ کا بیان بھی میں نے سنا اور انکی تاویلات بیجا، انکے دلایل رکیکہ، انکی توجیہات سخیفہ، انکی وساوس روائی اور تحریفات تاریخی کو سنکر حیران رہگیا کہ اہل علم میں یہ بھی ہوا کرتا ہے

دریافت سے معلوم ہوا کہ تقریباً پورا سال یہاں اسی نوع کی مجالس ماتم و گریہ وزاری میں بسر ہوتا ہے حتیٰ کہ مصیبت دور کرنے اور خوشی طلب کرنے کا بھی یہی ایک طریق ہے۔ نسائی طبقہ میں جو "شبستان ماتم" قایم کی جاتی ہے وہ بیشک ایک لطیف پہلو بھی رکھتی ہے، کیونکہ اول تو یونہی کسی عورت کا "مخمل ماتم"، بنجانا کم قیامت نہیں ہے، چہ جائیکہ ایک خاص سوگوار لحن سے اشعار پڑھنا اور پھر ساری محفل کا نازک ہاتھوں سے نازک سینوں پر "خانہ برانداز" قسم کی ضربیں لگاتے لگاتے تھک کر ایک "آغوش طلب" انداز سے گرجانا —— حقیقت یہ ہے کہ ایک انسان یہ سوچنے پر مجبور ہوجاتا ہے کہ ایسی صورت میں "شہادت" کو زیادہ وزنی قرار دے یا اس "خوں بہا" کو

دس کی صبح کو چوک سے ضریح مبارک (میرے نزدیک اسکا اردو ترجمہ زری کافی ہے) کا جلوس نکلنے والا تھا۔ صحیح وقت معلوم نہ تھا اسلئے فرط اضطراب نے بیٹھنے نہ دیا اور جلدی وہاں پہونچ گیا۔ لکھنؤ کا چوک اپنی تنگی، مرطوب فضا اور غیر صالح ماحول کے لحاظ سے خواہ کتنا ہی معیوب حصۂ شہر کیوں نہ ہو، لیکن حقیقی لکھنؤ اسی حصۂ آبادی کا نام ہے اور قدیم لکھنوی معاشرت کے نمونے صرف یہیں دیکھے جاسکتے ہیں، باوجود سڑک کی تنگی و تاریکی کے یہاں ایک خاص قسم کی عطریت محسوس ہوتی ہے اور نبض میں اک عجیب قسم کا ہیجان پیدا ہوجاتا ہے

یہاں کے اکثر بالاخانے اس مخصوص طبقہ سے آباد ہیں کہ اگر اس عنصر کو انسانی آبادی سے علیحدہ کردیا جائے تو دنیا میں سوائے مسجدوں کے اور کچھ نہ رہ جائے۔ معلوم نہیں اڈیٹر ہمت اسے "حسن رہگذر" میں شامل کرتا ہے یا نہیں لیکن چونکہ میں وجوب کا قایل ہوں اس لئے اکبر کے اس فلسفہ پر کاربند ہوکر کہ

اس شہر میں تو کوئی مجھے جانتا نہیں

بلاتشبیہ "ارنی گوئے کوہ طور" کی طرح نگاہ شوق سے ان پردوں میں رخنہ پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہوا جو اسوقت بالاخانے پر پڑے تھے، آگے بڑھا اور ایک ایسے مقام پر پہونچ گیا جہاں سے ایک سڑک مغرب کی جانب جاتی ہے۔

میں تھک کر یا ہجوم سے گھبرا کر سڑک کے کنارے کھڑا ہوگیا اور تھوڑی دیر کے بعد جو دفعۃً آنکھ اٹھی تو دیکھتا کیا ہوں کہ غالب کی پوری مثنوی "چراغ دیر" مجسم سامنے موجود ہے

سامنے بالاخانے پر ایک تنی ہوئی سفید چادر کی اوٹ سے دو ساحر مگر حزین و سوگوار آنکھوں نے مجھے ایک بار غلط انداز انہ طور پر دیکھا اور میرا آسمان و زمین سب کچھ اپنے ساتھ لے گئیں لکھنو کا یہ پہلا اور آخری بدیعۂ جمال تھا جس نے میرے ساتھ وہی سلوک کیا جو نظیری کے ساتھ اسکے محبوب نے کیا تھا اور جس پر وہ بے اختیار ہو کر کہہ اٹھا تھا کہ :-

از کف نمی دہد دل آساں ربودہ را

دیدیم زور بازوے ناآزمودہ را

معلوم ہوا کہ باندازۂ جمال و نزاکت وہ غنا و موسیقی کی بھی نمک ہے اور آنکھوں سے زیادہ افسوں اس کی آواز میں ہے۔ اس خبر نے میرے حواس میں اور زیادہ تعطل کی سی کیفیت پیدا کر دی، اور میں کھڑا ہوا اس عالم اضطرار میں سوچ رہا تھا کہ کوئی اہل ملے تو لکھنوی شاعری کے انداز میں اس سے یہ تو پوچھ لوں کہ میرے دل کا مزار کس کی سایۂ دیوار میں بن رہا ہے مگر اتفاق سے ایک ضعیف عورت جس کے ہاتھ میں چھوٹی سی تسبیح بھی تھی، میرے پاس سے گذری اور میری "چشم نگراں" کو دیکھ کر بولی کہ "میاں آج کے دن تو اوپر نہ دیکھو" میں نے باادب عرض کیا کہ "بڑی بی اُن سے بھی تو کہو کہ آج کے دن نیچے نہ دیکھیں" اسنے غضب آلود چتون سے مجھے دیکھنا شروع کیا، لیکن زری کے ساتھ جو ہجوم بڑھتا آرہا تھا اس نے مجھے بچالیا اور پھر خبر نہیں کہ وہ کہاں غائب ہو گئی

زری کا جلوس کیا تھا؟ اسکا بیان اتنا ہی مہمل ہو گا جتنا اس کا اطناب، چند ہاتھی، چند اونٹ، کچھ جھنڈیاں، متعدد بینڈ، دو چار تعزیے اور ایک گھوڑا مع خون آلود ساز و یراق کے۔ یہ تھی زری اور اسکی جملہ کائنات۔ میں ان چیزوں کے فلسفہ سے واقف نہیں جس کو ضرورت ہو وہ اسی تاریخ کا ہمدم دیکھے جس میں جناب قمی جرنلسٹ نے نازہ سے لیکر نگاڑہ (نقارہ) تک ہر ایک بدعت درجہ بالغ نظری سے کام لے کر تحقیق حد کے دریا بہا دیے ہیں

یہاں صبح سے دو پہر تک شیعوں کے تعزیے نکلتے ہیں اور دو پہر کے بعد سے سنیوں کے، چونکہ دل و دماغ اک خاص خیال سے متاثر تھا اس لئے زری دیکھنے کے بعد میں نے آج کے تماشہ کو ختم کیا اور کربلا بھی نہ جاسکا، حالانکہ یہاں کا خونین ماتم، یہاں کی داد و یلا دیکھنے کی چیز ہے۔

اس کے بعد میں نے چند دن یہاں کے اکابر سے ملنے اور یہاں کے مجالس شعر و سخن کی حقیقت معلوم کرنے کے لئے اور قیام کیا۔ میں کس کس سے ملا، ان کو کیسا پایا اور انکی شاعری کے متعلق کیا رائے قایم کی۔ اسکی تفصیل آپ آیندہ ملاحظہ فرمائیں گے

ایک سیّاح

منظوقات ناطق

یا

جناب ابو العلاء ناطق لکھنوی کے الہامات شعری

بلکہ

ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہئے

”آپ نے اگست کے ملاحظات میں لکھنوی و غیر لکھنوی نزاع کو محو کرنے کے لئے جو مصلحانہ انداز اختیار کیا ہے وہ آپ کی نیت کے لحاظ سے یقیناً بہت مبارک چیز ہے لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس طرح آپ اُس احساس کو کیونکر مٹا سکیں گے جو اس وقت ساری دنیا میں لکھنؤ کی شاعری کے بے کیف و بے مزہ ہونے کے متعلق قائم ہو گیا ہے اور یہی احساس اصل بنیاد تمام جھگڑوں کی ہے

آپ نے جو اشعار بعض شعراء حال لکھنؤ کے درج کئے ہیں، وہ یقیناً بُرے نہیں ہیں لیکن تعجب ہے کہ آپ نے مبصر میں دوسروں کے شایع شدہ اشعار تو انتخاب کر لئے اور خود مدیر مبصر کی غزل کو چھوڑ دیا میں نے ان کی ایک نہایت ہی معرکۃ الآرا غزل پر ہلکی سی تنقید کی ہے جو پیش کرتا ہوں۔ اگر آپ کی مصلحانہ روش اجازت دے تو شایع فرما کر ممنون کیجئے، اس سے مقصود صرف یہ سوال ہے کہ کیا لکھنوی شعراء کوئی ایسی ہی درخشاں مثال ”حسنِ شاعری“ کی غیر لکھنوی شاعروں میں پیش کر سکتے ہیں؟۔ اگر نہیں تو پھر اُس فرقِ مراتب کو مٹانے والے آپ کون ہیں جسے خود خدا نے تخلیق ذہن و دماغ کے وقت ازل ہی میں پیدا کر دیا تھا۔

مجھے افسوس ہے کہ آپ نے اسباب اختلاف میں سے اک نہایت ہی ضعیف سبب کو سامنے رکھ کر پند و نصیحت شروع کر دی حالانکہ حضرات لکھنؤ کا کل لوگوں سے عناد رکھنا اس بنا پر نہیں ہے کہ ہم کیوں اُن سے اچھا شعر کہتے ہیں بلکہ زیادہ تر اس لئے ہے کہ ہم کیوں آپ آپ کو ”مومن“ کہتے ہیں پھر جب ہم ان کی نگاہ میں مومن ہی نہیں تو آپ کا ”کل مومن اخوۃ“ کا درس دینا کیا معنی رکھتا ہے۔ بہر حال میں اب تنقید پیش کرتا ہوں“

ہمارے ایک دوست کہا کرتے تھے کہ دنیا میں شاعر ہونا اتنا بڑا گناہ ہے کہ اس سے زیادہ کوئی گناہ ممکن نہیں لیکن ان کا ذہن کبھی اس طرف نہ ہوا کہ ایک گناہ اس سے بھی زیادہ عجیب و غریب ہے اور وہ یہ کہ ایک شخص باوجود شاعر نہ ہونے اپنے آپ کو شاعر سمجھے اور بہ جبر اپنے آپکو

شاعر تسلیم کرائے۔

پھر اس جُرم کی حیرتناکی اسی جگہ ختم نہین ہوجاتی، بلکہ اس سے آگے اور بڑھتی ہی یعنی یہ کہ ایسا شاعر کبھی کبھی اپنے آپ کو استاد بھی کہتاہے شاگردونکی ایک جماعت بھی پیدا کرلیتاہے (اپنی تخریب کو اصلاح، اور فساد کو گون کے نام سے موسوم کرکے مشاعرون مین "باندازِ مُغانہ" غزلین پڑھتاہے، اور رسایل مین "بہ شیوۂ حکیمانہ" اُن کی اشاعت بھی چاہتاہے ——— شیوہ و انداز اینان را نگر!!

ممکن ہے کہ کسی وقت کوئی اللہ کا بندہ تمام ایسے متشاعرین کے حالات مرتب کرے، اس لئے مین یہ مضمون ابھی سے بطور بنیاد و تقریب (برمقدمہ و تمہید تحریر کئے دیتا ہون اور اُس سے بزور سفارش کرتا ہون کہ جب کبھی وہ اس مفید تالیف کی طرف توجہ کرے تو جناب ابوالعلاء الناطق لکھنوی کو نہ بھول جائے کیونکہ میرے نزدیک جو مرتبہ میر کو شعرا مین حاصل ہے، وہی جناب ناطق کو غیر شاعر شاعرون کی جماعت مین حاصل ہے بلکہ اگر جناب ناطق اجازت دین تو اُنھین کے اسم گرامی و تخلص سامی سے اس کو معنون کردے

بحمد اللہ مجھے جناب ناطق اور ہر ایسے شخص سے جو اپنے آپ کو شاعر کہتاہے براہ راست ذاتی شناسائی نہین ہے، لیکن چونکہ رسایل و جراید کے مطالعہ کا مجھے مرض ہے اور اس سلسلہ مین رطب و یابس سبھی کچھ نگاہ سے گزرجاتا ہے اس لئے بغیر کسی سعی و کاوش کے مجھے معلوم ہے کہ جناب ناطق لکھنوی کے ایک رسالہ مبصر کے مدیر اعزازی ہین اور گاہے گاہے اپنے تبرکات شاعری دوسرے رسالون کو بھی تقسیم فرمادیتے ہین۔ چنانچہ حال ہی مین لکھنؤ کا ایک دوسرا رسالہ "خضر راہ" ناطق صاحب کے عطا کردہ "جرعۂ حیات" کو لیکر موصول ہوتاہے اور حقیقت یہ ہے کہ جناب ناطق کے "منطوقات" کی داد دینا اس دنیا کے اندر تو کسی سے ممکن نہین، عالم برزخ مین اس کا امکان ہو تو ہو

غزل مین تغزل سے ایسی صاف بیزاری، کیفیت عشق و محبت سے ایسا مکمل گریز حلاوت و شیرینی سے ایسا سخت تنفر، اور باوجود بامعنی الفاظ فراہم کرنے کے ہر ہر شعر کو صد گونہ اہمال کی صورت مین پیش کرنا۔ واقعہ یہ ہے کہ

"این سعادت بزور بازو نیست"

لوگ کہتے ہین غزل نام ہی صرف حکایت محبت کا، جذبات عشق کی صحیح ترجمانی کا، سادگی بیان کا بیساختگی کا اور ہر اُس کیفیت کے بیان کا جو مطالعۂ حسن سے پیدا ہوتی ہے حالانکہ اس وقت کا "شاعر اعظم، استاد الامم، ادام اللہ یا الشعر و الطب و الحکم" اس امر کا اعلان کر رہاہے کہ غزل نام ہے صرف حکایت تنفر کا، جذبات کراہت کے ترجمانی کا ژولیدگی بیان کا اور ہر اس کیفیت امتلا کا جو ایک مکروہ شے کے مطالعہ سے پیدا ہوتی یا ہوسکتی ہے

جناب ناطق کی حسین غزل کو دیکھ کر مین اس نتیجہ پر پہونچا ہون وہ اُن کی نہایت ہی معرکۃ الآرا فکر ہے اور کہا جاتاہے کہ جس وقت الہ آباد کے مشاعرہ مین اس کو پڑھا گیا تو ساری محفل ایک خاموش اضطراب مین مبتلا تھی ممکن ہے کہ جناب ناطق کے بدخواہ اس کو "داد نہ ملنے" سے تعبیر کرین، لیکن ممکن ہے یہ سب کچھ اس "جلوۂ جانانہ" اور "نطق سحر کارانہ" کا نتیجہ رہا ہو جو بعض اوقات "ممتلا معدہ" کے بعد عالم خواب مین ایک خاموش کابوسانہ تشنج بھی پیدا کرسکتاہے۔

اسقدر تمہید کے بعد یقیناً آپ بے چین ہونگے کہ اس غزل کو سنین لیکن مین دفعتہً ساری غزل آپ کے سامنے پیش نہین کرونگا بلکہ ایک ایک شعر سناؤنگا کیونکہ ممکن ہے آپ اس کو دیکھ لینے کے بعد میری تنقید پڑھنے کی ضرورت بھی محسوس نہ کرین اور اس طرح میری محنت اکارت جائے۔ مطلع ملاحظہ ہو۔

قطرے نہین حباب مین دل ہین نقاب راز مین　　چند حقیقت آشنا غرق ہوئے مجاز مین

اس شعر کے سننے کے بعد مین نہین کہہ سکتا کہ آپ مین کیا کیفیت پیدا ہوئی، لیکن مجھ پر جو عالم طاری ہوا وہ ضرور مجھے معلوم ہے، یعنی یہ کہ اتنے خوبصورت الفاظ اس سے زیادہ بے معنی طور پر آج تک کوئی مجتمع نہین کرسکا۔ قطرہ، حباب، نقاب، حقیقت، مجاز، علیحدہ علیحدہ کیسے صاف و پاکیزہ الفاظ ہین، لیکن شاعر کے کمال کو دیکھئے کہ "بیک گردش قلم"، "نادر و نادری" دونون کا صفایا کردیا۔ اچھا اب آئے "بطن شاعر" کو بھی دیکھ لین شاید کوئی مفہوم وہان سے دستیاب ہوسکے۔ فرماتے ہین

حباب کو حباب نہ جانو بلکہ وہ مجموعہ ہے قطرون کا

پہلی تشبیہ نقاب راز مین چھپے رہنے والے "دلہا" سے دی ہے اور دوسری مجاز مین غرق ہوجانے والے "حقیقت آشناؤن" سے۔ ایک شخص اس کے سننے کے بعد کہہ سکتا ہے کہ اس شعر مین تغزل کی کیا بات ہے، کونسی کیفیت، یا سرشاری محبت اس سے ظاہر ہوتی ہے، لیکن یہ اعتراض غلط ہے کیونکہ اس شعر مین حکیم صاحب نے صرف حباب کی حقیقت سے بحث کی ہے جس کا تعلق طبیعیات سے ہے نہ کہ عشقیات سے اور اس مین کلام نہین کہ حباب کی کُنہ وحقیقت دریافت کرنے مین ضرور انھون نے عالمانہ تفتیش سے کام لیاہے، کیونکہ دنیا اس وقت تک یہی جانتی تھی کہ حباب تو نیم قطرہ سے بھی کم صرف اک "کیفیت نم" کا نام ہے مگر حکیم صاحب کی تحقیق یہ ہے کہ اس آتشی شیشہ مین بہت سے قطرون کا عرق کشید کیا جارہا ہے حیرت و افسوس ہے کہ اس فاضلانہ انکشاف پر ۱۹۲۸ء کا نوبل پرائز متعلق بہ طبیعیات حکیم صاحب کو نہین ملا

تفو بر تو اے چرخ گردان تفو

اب اس شعر کی دوسری معنوی خوبی ملاحظہ ہو

دعوی یہ ہے کہ حباب مین قطرے نہین ہین۔ پھر کیا ہے؟ خود ہی اس کا جواب دیتے ہین کہ نقاب راز مین چھپے ہوئے دل ہین یا یون سمجھ لو کہ مجاز مین غرق ہوجانے والے چند حقیقت آشنا ہین۔ اس جواب کا ثبوت طلب کرنے کی ضرورت نہین کیونکہ جب بدبخت حقیقت آشنا نقاب راز مین چھپنے کے باوجود بھی مجاز مین غرق ہوتے دائے پائے جاتے ہین تو اصول طبیعیات سے یہ دعوی اقلیدس کے بدیہیات مین داخل ہوکر ویسی ہی تلخ حقیقت بنجاتا ہے، جیسے ریاح باسوری کے تکاثف سے امعاء مستقیم کا تشنج یا صداع صدغین۔ دوسرا شعر ملاحظہ ہو:۔

ایک بھی ہم سبق نہین مدرسۂ نیاز مین　　زخم ہین سب کے مختلف شرح نگاہ ناز مین

آپ جی مین کہتے ہونگے کہ ایسے مطلع کے بعد کیا کوئی شعر اس پایہ کا نکل سکے گا، لیکن آپ کو خبر نہین کہ حکیم صاحب کا دماغ ایک ایسا عجوبہ زار ہے کہ اگر مدۃ العمر وہ شب و روز سوائے غزلگوئی کے اور کچھ نہ کرین تو بھی ان کے "یہ جواہر ریزیان" کم نہ ہون

چنانچہ یہ دوسرا شعر ملاحظہ ہو، کیا مطلع سے کم درجہ رکھتا ہے۔ وہی حکیمانہ تیور، وہی مرشدانہ ٹھاٹ، وہی فلسفیانہ بے کیفی

چندے آفتاب چندے ماہتاب، ایک کو چھپایئے دوسرے کو نکالئے ۔ کیا ممکن ہے کہ سامع کی توجہ کسی اور طرف ہٹ جائے ۔ فرق اگر ہے تو صرف یہ کہ مطلع مین حکیم صاحب نے طبیعیات کے ایک معمہ کو حل کیا تھا اور اس مین ایک وسیع المطالعہ انسان ہونے کی حیثیت سے انھون نے ایک نئی کتاب کے وجود کی خبر دی ہے جس کا نام "نگاہ ناز" ہے ۔ اس کتاب کے موضوع پر حکیم صاحب نے کوئی بحث نہین کی ہے بلکہ صرف اس کے دقیق و دشوار ہونے کا حال اس طرح بیان کر دیا ہے کہ اس کی شرح و تفسیر سے جو مدرسۂ نیاز مین پڑھائی جاتی ہے ہر طالب علم اک نیا اثر زخم کی صورت مین حاصل کرتا ہے، یعنی اگر کسی کا زخم مستطیل ہوتا ہے تو دوسرے کا مربع، کسی کا دایرہ دار ہوتا ہے تو کسی کا مثلثی اور اگر یہ کہا جائے کہ "اختلاف زخم"، "اختلاف کیفیت" کے مفہوم مین مستعمل ہوا ہے تو پھر اس کا تصنع یقیناً تنقید سے بے نیاز ہے

تیسرا شعر :-

پردہ کی رسم و راہ ہے اپنے نیاز مند سے　　　ورنہ حجاب کو کہان دخل حریم ناز مین

اس شعر مین بھی ایک جدید انکشاف ہے اور وہ یہ کہ پردہ حریم ناز مین نہین ہوتا بلکہ "حسن لب بام" کیلئے مخصوص ہے ۔ اگر حریم کے لغوی معنی پوشیدہ یا پس پردہ کے ہین تو ہوا کرے، ناطق صاحب کی انشا مین حریم نام ہے "اس مینا بازار" کا جس مین داخل ہونے کی شرط اولین پردہ و حجاب کا اٹھا دینا ہے ۔ مفہوم اور تغزل کے لحاظ سے جو مرتبہ اس شعر کا ہے، اس کے اظہار کی ضرورت نہین

چوتھا شعر :-

حلقۂ زلف کی گرہ کھل ہی گئی اگر تو کیا　　　قید ہے میری منسلک سلسلۂ دراز مین

یعنی لوگ سمجھتے تھے کہ حکیم صاحب اس کے حلقۂ زلف مین محبوس ہین اور اسکے گرہ کھلنے کے بعد وہان سے نکل بھاگین گے ۔ اس خدشہ کو انھون نے رفع کیا ہے کہ ایسا نہین ہو سکتا کیونکہ ان کی قید سلسلۂ دراز سے متعلق ہے ۔ رہا یہ امر کہ یہ سلسلۂ دراز کس چیز کا ہے، سو اس کی صراحت اس لئے نہین کی گئی کہ شعر صاف ہو جاتا اور اس صنعت سے نکل جاتا جو اس غزل مین ملحوظ رکھی گئی ہے ۔ اس کے علاوہ منسلک کے بعد لفظ مین کا استعمال بھی قابل غور ہے ۔ ممکن ہے نہو، ایسے لکھنؤ یونہی بولتے ہون ۔

پانچوان شعر

شکل حقیقت اب کسے ہو اور کسی دل پہ نقش　　　صورت مستقل نہین آئینۂ مجاز مین

یہ شعر حکیم صاحب کا اس غزل کی جان ہے، اور مخصوص طور پر اس دعویٰ کے ساتھ لکھا گیا ہے کہ ساری دنیا کے علما تاویل جمع ہو جائین تو بھی اس کے معنی پیدا نہین کر سکتے ۔ اگر آئینۂ مجاز مین کوئی صورت مستقل طور پر مرتسم نہین ہو سکتی تو شکل حقیقت حکیم صاحب کے دل سے بجائے کسی اور کے دل پر کیون نقش ہو ۔ وہ کیون اس سے خائف ہین کیا انکا دل صرف آئینۂ مجاز ہے جس مین شکل حقیقت مستقلاً قائم نہین ہوتی ۔ غالباً یہ کوئی خاص لاہوتی یا ناسوتی معمہ ہے جسکو ہم ہی نہین سمجھ سکے ہیں حکیم صاحب غریب کیا سمجھین گے

چھٹا شعر

مسلک دید حل ہو سر ورکائنات سے　　　وہ جو لگی تھی طور پر آ کے بجھی حجاز مین

مسلک کا حل ہونا بالکل نئی بات ہے۔ معمہ حل ہوتا ہے، دواؤن مین موتی حل ہوتا ہے، مشک وعنبر حل ہوتا ہے، لیکن، مسلک شاید علم القافیہ کی کوئی نئی دریافت ہے کہ اس سے قبل کسی کو اس کا حل ہونا معلوم نہین ہو سکا تھا اگر حل ہونا حکیم صاحب نے واضح ہونے کے معنی مین لکھا ہے تو یہ اور ایک معمہ ہے جسے صرف جناب ناطق ہی کے گرہ کشا ناخن حل کر سکتے ہین

ایک اور شعر ملاحظہ ہو

سجدہ مین سر اگر گیا پھر نہ اٹھیگا تا ابد قید نہ رکھئے وقت کی میرے لئے نماز مین

اس شعر مین محض یہ خصوصیت قابل داد ہے کہ حکیم صاحب ابھی تک اپنے سجدہ یا نماز متعلق صرف گفت وشنود مین مصروف ہین اور معاملہ ابھی تک طے نہین ہوا۔ اصل جھگڑا یون شروع ہوا کہ حکیم صاحب نے (شاید ناوقت) کہا کہ مین سجدہ کرنا چاہتا ہون، جواب ملا کہ یہ بیوقت کی شہنائی کیسی۔ جو اوقات مقرر ہین ان مین سب کے ساتھ تم بھی سجدہ کر لیا کرو، اسپر حکیم صاحب نے فرمایا کہ مین اگر سجدہ کرنے پر آگیا تو حشر تک سجدہ ہی کرتا چلا جاؤنگا اور حشر تک سر نہ اٹھاؤنگا اسلئے میرے لئے وقت کی تعیین نہ کیجئے۔ اس کا نتیجہ کیا ہوا، شعر سے ظاہر نہین ہوتا۔ لیکن معلوم یہی ہوتا ہے کہ انھین اجازت اس کی نہین ملی، ورنہ ظاہر ہے کہ انھین تبصرکے ادارت کی فرصت کہان ملتی اور بجائے سر بسجود رہنے کے وہ ہر وقت "مایل بہ قعود" کیون رہتے۔

اس شعر کی بنیاد صرف لفظ اگر پر قایم کی گئی ہے اور یقیناً یہ شاعرانہ معجزہ ہے کہ صرف ایک لفظ سے ایسے ایسے غوامض انھون نے اس شعر مین پیدا کر دیے

اب جو نفس مین ہے خلوص نالہ مین کب اثر یہ تھا پردہ کوئی نہین ہا دل کے شکستہ ساز مین

یہ شعر بھی چند در چند عجائب فن اپنے اندر رکھتا ہے پہلے مصرعہ کی اگر نثر کیجائے تو اولاً اسکو یون ہونا چاہئے کہ "اب جو خلوص نفس مین ہے وہ نالہ مین کب تھا" اسطرح لفظ اثر بالکل بیکار ہو جاتا ہے اور اگر اس کی نثر یون کیجائے:۔

وہ نالہ مین کب یہ اثر تھا جو اب نفس مین ہے تو لفظ خلوص زاید قرار پاتا ہے۔ مگر جناب ناطق نے دونون لفظ رکھ کر گویا یہ بات پیدا کی جس لفظ کو جی چاہے نکال کر معنے پیدا کر لیجئے اور یہ پہلی نمایش فن ہے۔ دوسرے مصرعہ مین متعدد مسایل طے کئے گئے ہین۔ ایک یہ کہ ساز ٹوٹ جانے کے بعد اگر صرف پردے رہجائین تو موسیقی پیدا ہو سکتی ہے، لیکن اس کا اثر نہین ہوتا۔ دوسرے یہ کہ جب شکستہ ساز کے پردے بھی غائب ہو جائین تو موسیقی پھر عود کر آتی ہے اور پوری قوت کے ساتھ

یہان یہ شک وارد ہو سکتا ہے کہ اگر اس شعر مین دل کو واقعی شکستہ ساز سے تعبیر کیا گیا ہے تو اس مین پردے کس چیز کے ہونگے اور اگر پردہ بمعنی حجاب لیا گیا ہے تو دل کا ساز ہونا کیا؟ لیکن یہ اعتراض وہی شخص کر سکتا ہے جو اس حقیقت سے ناواقف ہے کہ اہل لکھنؤ جب ابہام کی شاعری پر آجاتے ہین تو وہ اجتماع ضدین کو بھی حسن شاعری قرار دیتے ہین چہ جائیکہ اہمال

زخم عدو نہ دیکھئے آپ نگاہ ناز سے لوگ کہین گے داغ ہے دامن پاکباز مین

یہ شعر بالکل لکھنوی ساخت کا ہے کہ نگاہ مین اس کی وسعت کے لحاظ سے دامن پیدا کیا گیا اور جب اس مین دامن پیدا ہو گیا تو

معمولی کپڑے کے دامن کی طرح اس کو خون عدو سے داغدار بھی کر دیا۔

علاوہ اس کے پہلے مصرعہ کا دوسرا ٹکڑا بالکل بیکار ہے۔ اگر ”نگاہ ناز سے“ کو حذف کر دیا جائے تو معنی مین کوئی سقم پیدا نہین ہوتا لیکن اگر یہ کہا جائے کہ نگاہِ ناز کی تخصیص و تعیین ضروری ہے کیونکہ بغیر اس کے دامن نگاہ کی داغداری ثابت نہین ہو سکتی، تو پھر سوال یہ ہوگا کہ محبوب کی وہ کونسی نگاہ ہے جس کو عاشق عدو کے لئے گوارا کر سکتا ہے اور جس سے دامن پاکیزہ کو وہ نہین ہو سکتا

ناطق سوختہ جگر دل پہ تو ہات رکھ کر ذرا   ایسی ہی کچھ چمک سی تھی نالۂ جانگداز مین

ہر چند اس شعر مین مفہوم پیدا کرنے کے لئے حکیم صاحب نے غیر معمولی مسیحا نفسی سے کام لیا، لیکن وہ کامیاب نہ ہوئے اول تو دل پر ہات رکھنے سے چمک کا احساس ہونا کیا معنی، ہات رکھ کر دھڑکن تو ضرور محسوس کیجا سکتی ہے، لیکن چمک دیکھنا تو آنکھ کا کام ہے نہ کہ ہات کا اور اگر اس کو نظر انداز کر دیا جائے تو بھی یہ بات سمجھ مین نہ آئی کہ اگر دل پر ہات رکھنے سے نالۂ جانگداز کی سی چمک محسوس ہوتی ہے (حالانکہ یہ مسئلہ بجائے خود حل طلب ہے کہ نالۂ جانگداز مین چمک کیون ہو) تو پھر نتیجہ کیا، یعنی اگر ناطق سوختہ جگر کو یہ بتایا جا رہا ہے کہ دل کی چمک اب اس خطرناک حد تک پہونچ رہی ہے جسے نالۂ جانگداز کہتے ہین تو سوال یہ ہوتا ہے کہ وہ زمانہ ماضی کا نالۂ جانگداز کیا سوائے دل کے کسی اور مقام سے نکلا تھا اور اگر یہ نہین تو پھر دل کی چمک سے خبردار کرنا بیکار ہے

اس غزل مین دو شعر اور ہین:-

اس کی جبین پہ اس لئے آکے شکن مچل گئی   سجدہ کو ناز کیون ہوا ناصیۂ نیاز مین

جینے نہ دے اگر جیون مرنے نہ دے اگر مرون   مرگ و مسیح دونون ہین پیکر چارہ ساز مین

پہلا شعر بے عیب ہونے کی حد تک پھیکا و بے مزہ ہے اس لئے اعتناء نہین کیا گیا اور دوسرے مین چونکہ لفظ پیکر کی ضرورت استعمال سے زیادہ اور کوئی امر بحث طلب پیدا نہین ہوتا اس لئے مرگ و مسیح مین سے مرگ ہی کا انتخاب اس کے لئے موزون سمجھا گیا۔

یہ ہے ایک لکھنوی (استاد) شاعر کی غزل گوئی کا رنگ جس پر اہل لکھنؤ کو ناز ہے اور جس پر اعتماد کر کے وہ دعوائے ”انا ولا غیری“ کا دم بھرتے ہین۔

”طوشا انجل“

(نگار) یہ مضمون جس مقصد کے ساتھ لکھا گیا ہے، اسے لکھنے والے نے خود ہی ابتدائی سطرون مین ظاہر کر دیا ہے اور اگر مجھے اس مسئلہ کو اکثریت کے ملاحظات ہی کے ساتھ ختم کر دینا ہوتا تو شاید مین اس کی اشاعت مناسب نہ سمجھتا، لیکن مین چاہتا ہون کہ اس باب مین مخالف و موافق دونون خیالات معلوم کر کے کسی نتیجہ پر پہونچون اور اس کا ذریعہ یہی ہو سکتا ہے کہ نگار کے چند صفحات کچھ دنون کے لئے اس بحث و نزاع کے لئے مخصوص کر دیئے جائین

مین اپنی رائے اس تنقید کے متعلق محفوظ رکھنا مناسب سمجھتا ہون، لیکن مین منقید نگار کے اس دعوی کو کبھی تسلیم نہین کر سکتا کہ غیر لکھنوی شاعرون کے کلام مین کوئی ایسی غزل پیش نہین کیجا سکتی (اگر ناطق صاحب کی یہ غزل واقعی بقول نقاد لغو و مہمل ہے) اور مین اس چیلنج کو نہایت ہی نادر جسارت سے تعبیر کرونگا

دوسرا دعویٰ (ضمناً) یہ کیا گیا ہے کہ ساری دنیا لکھنوی شاعری کی طرف سے بدظن ہے۔ مین اسکے ماننے کیلیے بھی طیار نہین، بلکہ مین تو علی الرغم یہ کہتا ہون کہ اب بھی اک بڑی جماعت ایسے لوگون کی ہے جو "لکھنؤ اسکول" کی شاعری پر سر دھنتے ہین اور "دہلی اسکول" کو پسند نہین کرتے۔

تیسری بات اور ہے جو یقیناً زیادہ توجہ کی مستحق ہے یعنی وہی "مومن اور غیر مومن" والا قصہ۔ واقعہ یہ ہے کہ میرا ذہن بھی اس طرف منتقل نہ ہوا تھا کیونکہ اس خصوص مین میرا جو مشرب ہے وہ کسی سے مخفی نہین اور میرے نزدیک نوع انسانی مین اس قسم کی تفریقات پیدا ہو جانا انتہائی بدنصیبی ہے۔

بہرحال مین ابھی تک یہ ماننے کے لئے آمادہ نہین کہ اہل لکھنؤ کی خلش کا یہ سبب ہے اور اگر ہو تو بھی دوسرون کی تنگ نظری کا جواب تنگ نظری سے دینا کب جائز ہے۔

نیاز

باب الاستفسار

غالب کی شاعری

(زبیدہ خاتون - رحمت باغ حیدرآباد دکن)

"میں نہایت ادب کے ساتھ جناب کی خدمت میں حسب ذیل استفسارات پیش کرنیکی جرأت کرتی ہوں - اگر جناب کو زحمت نہو تو اپنے زرین خیالات سے مجھے مستفید فرمائے -

(۱) شعر کی خصوصیات کیا ہیں؟ اور کیا ان میں فلسفہ داخل ہے غالب کی فلسفیانہ شاعری کے متعلق ڈاکٹر عبدالرحمان صاحب مرحوم بجنوری کی رائے سے آپ کس حد تک اتفاق فرماتے ہیں؟

(۲) ہندوستان کے شعرا میں غالب کا کیا درجہ ہے اور کن خصوصیات کی بنا پر؟"

(**نگار**) شعر کی خصوصیات کیا ہیں؟ یعنی کس شعر کو صحیح معنی میں شعر کہہ سکتے ہیں؟ یہ سوال اسقدر قدیم ہے کہ اگر ہم چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ تنقید کے اولین احساس کے ساتھ ہی یہ بھی وجود میں آیا تھا، اور اس لئے آپ جس زمانہ اور ملک کے لٹریچر کو اٹھا کر دیکھیں گی تو اس موضوع پر آپ کو کافی سرمایۂ تحقیق نظر آئے گا - مجھ سے سوال کرکے آپ کیوں اُس فرسودہ و پامال بحث کو زندہ کرنا چاہتی ہیں، جس میں اب کوئی جدت و ندرت باقی نہیں رہی - پھر یوں بھی نگار کے گزشتہ مجلدات میں اس مسئلہ پر ایک سے زاید مرتبہ اپنے خیالات ظاہر کر چکا ہوں، اور اس لئے اب انکا اعادہ کوئی لطف کی بات نہیں - مگر ہاں یہ کہنے سے باز نہیں رہ سکتا کہ جس طرح حسن و جمال کے لئے کوئی خاص مادی معیار اس وقت تک قائم نہیں ہو سکا اسی طرح فن یا اصول فن کے لحاظ سے شعر کی خوبی کا اندازہ دشوار ہے - البتہ جس حد تک ذوق و وجدان کا تعلق ہے یہ کہا جا سکتا ہے کہ حسن و شعر کی خوبی منحصر ہے صرف ناظر و سامع کے تاثر و تکیف پر جو بالکل ذاتی و انفرادی چیز ہے اور اس پر کسی کا اعتراض کرنا بالکل خلاف محل ہے - جس طرح ایک حبشی کی محبوبہ یورپ میں قبیح ترین چیز سمجھی جاتی ہے اس طرح حبش میں سیمبران فرانس کو مبروص سمجھکر اُن کی طرف سے منہ پھیر لیا جاتا ہے، اور یہی وہ راز ہے جس کی بنا پر آج تک یہ فیصلہ نہ ہو سکا کہ لکھنؤ اسکول کی شاعری قابل ترجیح ہے یا دہلی اسکول کی "ایک شخص جس کا دل کیفیت عشق و محبت سے خالی ہے اس کے نزدیک میر و درد کی شاعری لایعنی ہذیان سرائی ہے، اور دوسرا جو صرف حکایات محبت ہی سننا چاہتا ہے، وہ اسیر و ناسخ کے دواوین کو مجموعۂ مزخرفات جانتا ہے میں نے ایسے لوگ بھی دیکھے ہیں جو میر کا یہ شعر سنکر :-

اک نگہ سے بیش کچھ نقصان نہ آیا اس کے تئیں ۔۔۔ اور میں بیچارہ تو اے مہربان مارا گیا

گھنٹوں کے لئے بیکار ہو گئے اور وہ ملکوتی نفوس بھی میری نگاہ سے گزر چکے ہیں جن کے نزدیک "مرا سینہ ہے مشرق آفتاب داغ ہجران کا"

شاعری کا بہترین معیار ہے۔

بہرحال تنقید شعر کے متعلق کوئی ایسا فیصلہ جس کو سنکر ہر شخص سر تسلیم خم کرلے، نہ آجتک ہو سکا ہے نہ آیندہ اس کا امکان ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی یقینی ہے کہ اگر کوئی شخص صحت عقل و فکر سے کام لیکر محض فطری اصول اور علمی مسلمات پر بنیاد رکھ کر ایک شعر کی حقیقت کو سمجھنا چاہے تو وہ ایسے حدود معین کر سکتا ہے جو "خالص" و "عیار" کے تمیز میں مدد دے سکتے ہیں اور اسی لئے نہ صرف شعر بلکہ ادب و انشاء کے تمام اقسام کے لئے اولین اصول جس کو ہر شخص تسلیم کرتا ہے یہ قرار دے لیا گیا ہے کہ

انچہ از دل خیزد بر دل ریزد

پھر چونکہ شاعری مین زیادہ تر واردات قلب ہی سے بحث کیجاتی ہے، اس لئے وہان اس کلیہ کی قوت اور زیادہ نمایان نظر آتی ہے اور "بر دل ریزد" ہی کو دیکھ کر "از دل خیزد" پر حکم لگایا جاتا ہے

ہو سکتا ہے کہ ایک واقعہ میرے لئے اسدرجہ باعث تاثر نہ ہو جتنا آپ کے لئے، لیکن واقعہ کی نوعیت کو دیکھ کر بہ آسانی یہ فیصلہ ہو سکتا ہے کہ اصولاً اس کا اثر کسقدر اور کیسا ہونا چاہئے اور یہین سے وہ اصول مترتب ہوتا ہے جسے ایک شعر کی تنقید مین حقیقت مسلمہ کا درجہ حاصل ہے۔

شاعری مین حکمت و فلسفہ کے تمام شعبے داخل ہین یا نہین، میرے نزدیک لا یعنی سی بحث ہے کیونکہ ممکن ہے فلسفہ شعر مین آکر بلند ہو جائے لیکن شعر فلسفہ کے حدود مین جاکر کوئی خاص امتیازی مرتبہ حاصل نہین کر سکتا۔ شعر حقیقتاً نام ہے اُس شعور حفوی کا جس کا تعلق صرف انسان کے جذبات رقیقہ سے ہے یا اگر آپ سکو زیادہ بلند کرنا چاہین تو کہہ سکتے ہین کہ جس کا تعلق روحانیت سے ہے اس لئے میرے نزدیک ایک شعر کا تعلق "اخلاقیات" سے تو ہو سکتا ہے لیکن "حکمیات غیر اخلاقی" سے متعلق کرنا خواہ مخواہ کی جسارت ہے۔ اس مین شک نہین کہ فلسفہ و حکمت نہایت وسیع چیز ہے یعنی اس کی وسعت یہانتک ہے کہ "جرم و معصیت" بھی اس مین داخل ہو سکتی ہے، چنانچہ ہمارے ایک عزیز دوست جو "دسوز ہضم" کی حد تک فلسفہ داقع ہوئے ہین دنیا کے بعض قبیح ترین و شنیع ترین حرکات کو بھی نہ صرف فطری بلکہ الوہیت سے ماورا [illegible] (Demonia [illegible]) قرار دیتے ہین۔ لیکن شعر کی نزاکت اسقدر بھیانک وسعت کی متحمل نہین ہو سکتی اور وہ کبھی "داعیات فطرتِ صحیحہ" سے منحرف ہو کر کامیاب نہین ہو سکتا۔ اس سلسلہ مین اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ جس کو فطرت صحیحہ کہا جاتا ہے وہی ایک اعتباری و فرضی چیز ہے تو بیشک میرے پاس اسکا کوئی جواب نہ ہوگا اور میرے لئے اس صورت مین سپر ڈالدینا ہی زیادہ مناسب ہوگا۔

بہرحال چونکہ شعر کی پوری قوت کا اندازہ صرف اسی احساس و تاثر کے عالم مین ہو سکتا ہے جس کو مادیات یا منجر بہ مادیات سے کوئی تعلق نہین ہے اسی لئے آپ دیکھین گی کہ شرق و غرب ہر جگہ جس صنف سخن کی ترقی ہوئی یا جس کی قدر کی گئی وہ وہی ہے جسے تغزل یا غرامی (Amatory Poetry) شاعری کہتے ہین اس کی مقبولیت کا سب سے بڑا راز اس کا وہی غیر اکتسابی اور بالکل فطرت کے مطابق ہوتا ہے، چنانچہ آپ دیکھین گی کہ جس شعر مین عہد وحشت کی سی سادگی پائی جاتی ہے وہی بہت زیادہ موثر ثابت ہوتا ہے۔ ہرچند اس اصول کی بناء پر تغزل یا غرامی شاعری کے لئے یہ ضرور نہین کہ وہ "تعلق جنسین" ہی مین محدود ہو، بلکہ وہ مذہب، اخلاق، مناظر فطرت، قوم و ملک ہر ایک سے وابستہ ہو سکتی ہے، لیکن یہ تمام "انشعابات" عہد ترقی اور دورِ تمدن کی چیزین ہین، حقیقی اور اصلی شاعری تو وہی ہے

جس کا درس عورت کی نگاہ اولین نے دیا تھا وسد ورا قال

نخستین بادہ کاندر جام کردند   زچشم مست ساقی وام کردند

اس لئے میرا مسلک اس باب مین بہت کچھ قدامت پسند (واقع ہوا ہے) اور مین ایک شعر مین حکمت و فلسفہ کے بجائے، بیان درد و حکایت محبت کی جستجو کرتا ہون اور اس مین کسی قسم کے تضنع کو پسند نہین کرتا

ڈاکٹر بجنوری مرحوم جس زمانہ مین دیوان غالب کا مقدمہ لکھ رہے تھے، مین بھی بھوپال ہی مین تھا اور بارہا میرے اُن کے درمیان "غالب کی شاعری" موضوع بحث قرار پائی۔ اس مین شک نہین کہ وہ بہت پاکیزہ ذوق سخن رکھتے تھے، نہایت ذہین شخص تھے اور پوری قوت نقد اُن مین موجود تھی، لیکن اس کا کیا علاج کہ وہ اُس وقت تک سن وقوف کو نہ پہونچے تھے اور اُن کا ذوق شعر و تنقید پختگی کو نہ پہونچا تھا۔ مین نے ہمیشہ اُن سے یہی کہا کہ آپ نے اس کام کو کم از کم ۱۵ سال قبل از وقت شروع کیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ اگر آج وہ زندہ ہوتے تو غالب کی مدح سرائی کی وہ صورت جو ایک ذم کا پہلو لئے ہوئے ہے، کبھی اختیار نہ کرتے۔

غالب کے شاعر ہونے مین کس کو گفتگو ہو سکتی ہے، لیکن اس کے محاسن شاعری کا صرف اس لئے قایل ہونا کہ اسنے حکمت و فلسفہ کے تمام نکات حل کر دیئے ہین نہ صرف خلاف حقیقت و واقعہ ہے بلکہ میرے نزدیک غالب کی شاعری کی توہین بھی ہے۔ ممکن ہے کہ ڈاکٹر بجنوری مرحوم کی نگاہ عقیدت نے حکمت و فلسفہ کے تمام رموز بستہ کا حل کلام غالب مین پالیا ہو لیکن مین تو ڈرتا ہون کہ کہین یہ غالب پر اتہام نہ ہو اور نتیجہ ہو صرف ڈاکٹر بجنوری کی شاعری کا۔ مجھے افسوس ہے کہ انھون نے دیوان غالب مین غالب کا مطالعہ نہین کیا بلکہ خود اپنا مطالعہ کرنا چاہا، اور وہ یقیناً شاعری کے اس منزل مین تھے جس مین

بہ فیض بیدلی نومیدی جاوید آسان ہے

تو قلم سے نکل سکتا ہے لیکن یہ نہین کہا جا سکتا کہ

مرے دل مین ہے یارب شوق وصل و شکوہ ہجران   خدا وہ دن کرے جب اُس سے مین یہ بھی کہون وہ بھی

چونکہ ڈاکٹر بجنوری خود بہت وقت پسند و مشکل آفرین طبیعت رکھتے تھے اور زمانہ نے اُن کو کوئی درس ایسا نہ دیا تھا جو انسان سے "خیال محال" ترک کرائے "واقعیت امکانی" مین مبتلا کر دیتا ہے، اس لئے انھون نے غالب کو شاعری کے اُن حدود مین ڈھونڈھا جہان وہ صرف اسد تھا اور بجنوری صرف ڈاکٹر۔ اگر اُن کی عمر وفا کرتی اور کسی بیوفا سے واسطہ پڑتا تو اُن کے مقدمہ کا یہ رنگ نہ ہوتا اور پھر انھین معلوم ہوتا کہ غالب کی شاعری کا وہی حصہ بیکار ہے جسے وہ فلسفہ طرازی سے تعبیر کرتے ہین۔

ڈاکٹر بجنوری کا، دیوان غالب کو الہامی کتاب کہنا بالکل درست ہے کیونکہ ہر حقیقی شاعر کا حقیقی شعر الہام ہی ہوا کرتا ہے اور علاوہ غالب کے ہندوستان مین اور بھی شعراء ایسے ہین جو اس حیثیت سے، پیغمبری کا درجہ رکھتے ہین، لیکن بجنوری مرحوم نے الہامات کی تعیین کرتے ہوئے جس چیز پر زور دیا ہے وہ یہ ہے۔

قطرہ اپنا بھی حقیقت مین ہے دریا لیکن   ہمکو تقلید تنک ظرفی منصور نہین

حالانکہ الہام حقیقتاً یہ ہے:-

ظلم کر ظلم اگر لطف دریغ آتا ہو
تو تغافل مین کسی رنگ سے معذور نہین

اور یہی وہ خصوصیت شعری ہے جس کی بنا پر مومن کو غالب پر ترجیح دیجا سکتی ہے، کیونکہ مومن کی فلسفہ طرازی کبھی اس رنگ کو نہین چھوڑتی اور غالب تغزل سے ہٹکر کہین کہین اس حد تک پہونچ جاتے ہین کہ۔

ترے بیمار پہ ہین فریادی وہ جو کاغذ مین دوا باندھتے ہین

آپ کے سوال کا دوسرا حصہ کہ "ہندوستان کے شعرا مین غالب کا کیا درجہ ہے اور کن خصوصیات کی بنا پر" بہت زیادہ تفصیل کا محتاج ہے اور باب الاستفسار مین پوری طرح اسپر بحث نہین کیجا سکتی، تاہم مختصراً اسقدر ضرور عرض کرونگا کہ قبول و شہرت کا جہانتک تعلق ہے غالب کی ہستی بالکل منفرد ہے (اگو مجھے اس مین کلام ہے کہ محض قبول و شہرت دلیل کسی کی خوبی کی ہوسکتی ہے یا نہین) لیکن نفس شاعری کے لحاظ سے اور وہ بھی اُردو مین، غالب کا مرتبہ نہ اسقدر بلند ہے جیتنا بجنوری مرحوم نے سمجھا اور نہ اتنا گرا ہوا جتنا آپ کے حیدر آبادی پروفیسر ڈاکٹر عبداللطیف نے سمجھایا۔ بلکہ اُس کا درجہ اس افراط و تفریط کے درمیان ایک معتدل نقطہ پر قائم ہے۔

غالب کے کلام مین تین جداگانہ رنگ نظر آتے ہین، ایک وہ جسے غیر معتدل فارسی تخییل کہنا چاہئے مثلاً

شمار سبحہ مرغوب بت مشکل پسند آیا تماشائے بیک کف بردن صد دل پسند آیا

دوسرا رنگ وہ جس مین تخییل تو فارسی ہے لیکن بہت معتدل جیسے:-

دہر مین نقش وفا وجہ تسلی نہ ہوا گوش منت کش گلبانگ تسلی نہ ہوا
یا
تغافلہائے تمکین آزما کیا غم آوارگیہائے صبا کیا

تیسرا رنگ وہ ہے جس مین صرف سادگی نے حسن کلام پیدا کیا ہے۔ مثلاً

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالین گے بے نیازی تری عادت ہی سہی
قہر ہو یا بلا ہو جو کچھ ہو کاشکے تم مرے لئے ہوتے
وغیرہ وغیرہ

پہلے رنگ کا ذکر بالکل بیکار سی بات ہے، کیونکہ خود غالب ہی نے اس کو نظری کردیا تھا اور اس کو سامنے رکھ کر غالب کی شاعری پر حکم لگانا مناسب نہین۔ رہ گئے باقی دو رنگ سو اس مین کلام نہین کہ یہ دونون اپنی اپنی جگہ نہایت پاکیزہ ہین، لیکن ان کو غالب سے مخصوص سمجھنا درست نہین اُس وقت جتنے کامیاب شعرا تھے، سب کے یہان کم و بیش یہی دونون رنگ پائے جاتے تھے علی الخصوص مومن کہ اگر اس کے کلیات کا استقصا کیا جائے تو بآسانی کئی دیوان غالب نکل سکتے ہین۔ لیکن باانیہمہ یہ نہین کہا جاسکتا کہ غالب کی شاعری ایک اتباعی و تقلیدی رنگ رکھتی ہے اس کی معنی آفرینی، خلق مضامین، ندرت بیان، نوائے ترکیب، جدت تخییل، ہر چیز اپنی اپنی جگہ اس کے غیر معمولی ذہانت و طباعی کے ثبوت مین پیش کیجا سکتی ہے اور اگر آپ اس کے اُردو کے کلام کو نظر انداز کردین (جسے وہ اپنا "مجموعۂ بے رنگ" کہتا ہے) تو پھر فارسی مین اس کی انفرادیت

کو بھی ایک حد تک تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ غالب خود بھی اس کو محسوس کرتا تھا کہ ریختہ اس کے وسعت بیان کا متحمل نہیں ہو سکتا اور اس لئے اس نے زیادہ توجہ فارسی شاعری کی طرف کی۔

اس مین کلام نہین کہ غالب کی وقت پسند طبیعت نے سب سے پہلے میرزا عبدالقادر بیدل کا رنگ اپنے ریختہ اور فارسی مین پیدا کرنا چاہا لیکن چونکہ بیدل کا رنگ الفاظ و تراکیب سے بالکل علیحدہ محض وجدان و کیف سے پیدا ہونے والی چیز ہے جو غالب مین مفقود تھا اس لئے ان کو آخر کار سپر ڈال دینا پڑی اور اعتراف ناکامی کے بعد عرفی و نظیری کو پیش نظر رکھ کر شاعری شروع کی۔ جہانتک فارسی زبان اور شوخی و حلاوت کا تعلق ہے یقیناً غالب کو عرفی اور نظیری ہی کے صف مین جگہ دیجائے گی بلکہ جوش و خروش کی حیثیت سے اس کا مرتبہ بلند نظر آئیگا لیکن اثر و تاثر کی دنیا مین غالب ان دونون سے فروتر نظر آتا ہے۔ آپ غالب کا پورا کلیات چھان ڈالئے مگر عرفی کے اس شعر کا جواب آپ کو کہین نہین ملیگا:۔

امروز نگاہِ من و عرفی بہم افتاد ۔۔۔ باہم نگرستیم و گرستیم و گزشتیم

غالب نظیری کی تقلید مین اپنی سرشاری کا اظہار کرتے ہوئے سیر نہین ہوتا۔ چنانچہ متعدد جگہ لکھا ہے:۔

(۱) غالب از اوراق ما نقش ظہوری دمید ۔۔۔ سرمۂ حیرت کشیم دیدہ بدیدن وہیم

(۲) غالب از من شیوۂ نطق ظہوری زندہ گشت ۔۔۔ از نوا جان در تن ساز بیانش کردہ ام

(۳) جواب خواجہ نظیری نوشتہ ام غالب ۔۔۔ خطا نمودہ ام و چشم آفرین دارم

اور اس مین شک نہین کہ ان دونون کے کلام مین اس درجہ اتحاد و یکرنگی ہے کہ مشکل سے امتیاز ہو سکتا ہے، لیکن پھر بھی نظیری کے اس نوع کے اشعار کا جواب اس سے نہ ہو سکا:۔

درمحبت دل و دین باختن اول قدم ست ۔۔۔ ما نظیری ز تو خورسند بایِنہا نہ شویم

مثل لب دریا و حال مستسقی ست ۔۔۔ دہند شوق و سے رخصت نظر نہ دہند

تو مپندار کہ این قصہ بخود می گویم ۔۔۔ گوش نزدیک لبم آر کہ آوازے ہست

الغرض تغزل مین معاملات محاکات، رشک و حسد، طعن و تشنیع، شوق وصل و شکوۂ ہجران وغیرہ تمام وہ جذبات جو پندار عشق کے ساتھ پیدا ہوتے ہین غالب کے یہان نہایت خوبی و اہتمام سے پائے جاتے ہین، لیکن جہانتک جذبات استسلام (Passive feelings) کا تعلق ہے، غالب کی شاعری کوئی خاص امتیاز نہین رکھتی۔ یہی سبب ہے کہ غالب کے قصاید اُس کی غزلون سے اور مثنویان قصاید سے بہتر ہین۔ کیونکہ قصاید مین رنگ تغزل ضروری نہین اور مثنوی مین وسعت بیان کے لئے کافی میدان موجود ہوتا ہے جسمین غالب ایسا محاکات نویس و معاملہ نگار پورا زور طبیعت صرف کر سکتا ہے۔

"نیاز"

ہوا کا ترانہ

نہ ہے رہبر کوئی میرا نہ ہے رہزن میرا　　کہین منزل ہے مری اور نہ مسکن میرا
مست پرواز سدا رہتا ہے توسن میرا　　کبھی اُلجھا نہ کسی خار سے دامن میرا

آ رہی ہون مین کہان سے یہ مجھے یاد نہین
کوئی دنیا مین مری طرح بھی آزاد نہین

گام پیما ہون مین خاموش بیابانون مین　　میرے ہنگامے تڑپتے ہین گلستانون مین
دشت مین، وادی کہسارین، ویرانون مین　　بزم آرا ہون مین دنیا کے شبستانون مین

وہ فضا کون سی ہے مجھ سے جو آباد نہین
کون سالب ہے وہ جس پر مری روداد نہین

ابر ہین سبزۂ گردون پہ خرامان مجھ سے　　قلزم آب مین موجین ہین غزلخوان مجھ سے
صحن گلزار ہے فردوس بہ دامان مجھ سے　　رقص پیما ہین شرر ہائے گلستان مجھ سے

عکس آرائے گلگون ہے مرے سینے مین
زندگی جلوہ نما ہے اسی آئینے مین

ہر طرف پھیلی ہے اس باغ مین نکہت میری　　نہین دیکھی ہے کسی نے کبھی صورت میری
ایک حالت پہ نہین رہتی ہے فطرت میری　　ہر طرف مجھ کو لئے پھرتی ہے وحشت میری

نقش ہوتے نہین جنبش سے نمایان میری
جادہ رفتار سے رہتا ہے گریزان میری

مین اُڑا لاتی ہون پھولون کی بہار رنگین　　مین الٹ دیتی ہون ہے کریہ دیار رنگین
توڑ لیتی ہون مین گلہائے شرار رنگین　　مین چرا لاتی ہون نغمون کے نگار رنگین

آہ و فریاد کے پوشیدہ ہین پارے مجھ مین
سو رہے ہین غم و عشرت کے شرارے مجھ مین

کشمکش سے مرے ہوتے ہین ترنم پیدا　　میرے جلوون سے ہے کلیون مین تبسم پیدا
پتیون مین مرے دم سے ہے تکلم پیدا　　مین نے سبزہ پہ کئے صبح دم انجم پیدا

سن کے میرے نفس مست سے اعجاز بہار
لب ساحل پہ بجا کرتے ہین موجون کے ستار

قصر گل توڑ کے نکہت کو چراتی ہون مین
دشت و کہسار کو پھولون مین بساتی ہون مین
لے کے گہوارہ مین کلیون کو کھلاتی ہون مین
برگ خوابیدہ کو نغمون سے جگاتی ہون مین
صبح دم باغ مین شاخون کو سنوارتی ہون
گل کے افسردہ چراغون کو اُتارتی ہون

آہ کرتی ہون مین جا کر کبھی ویرانون مین
کبھی گاتی ہون ترانے مین شبستانون مین
پھول چنتی ہون کبھی آکے گلستانون مین
اور اڑاتی ہون کبھی خاک بیابانون مین
جام شبنم کبھی پھولون کو پلا دیتی ہون
ان کی محفل سے کبھی ان کو اٹھا دیتی ہون

بال سنبل کے کبھی کھینچ لیا کرتی ہون
دامن گل پہ کبھی رقص کیا کرتی ہون
کبھی دوشیزۂ نرگس سے حیا کرتی ہون
چوم کر لب کبھی پھولون کے چھپا کرتی ہون
فرش سبزہ پہ کبھی ناز سے اٹھلاتی ہون
تھام کر دامن نکہت کبھی اِتراتی ہون

چادر گرد اڑا لاتی ہون صحراؤن سے
گوہر آب چرا لاتی ہون دریاؤن سے
شاہد مے کو بھگا لاتی ہون میناؤن سے
نکہت گل کو جگا لاتی ہون ایماؤن سے
توڑ لیتی ہون گل شمع شبستانون مین
جام شبنم کو پٹک دیتی ہون ویرانون مین

تنگ آجاتی ہون جب گھوم کے صحرا و چمن
آکے دریا مین بناتی ہون مین آبی مسکن
اُس مین بُنتی ہون شعاعون سے انوکھا دامن
یاد آتے ہین مگر جب گل صحرائے وطن
دم مین بس توڑ کے اس خیمۂ آبی کی رسن
برق مضطر کی طرح اڑتی ہون بے رنج و محن

تاب خورشید سے جب کانپنے لگتی ہے فضا
جسم کو پیرہن خاک مین لیتی ہون چھپا
نَے کے دامن مین بھر اپنے خس و خاشاک بلا
رقص کرتی ہوئی اٹھتی ہون مین مینا رنما
اک بلندی پہ بناتی ہون نشیمن اپنا
پھر اتر آتی ہون مین پھاڑ کے دامن اپنا

لبِ جو آئینہ پھولون کو دکھاتی ہون کبھی اور گہوارہ مین موجون کے کھلاتی ہون کبھی
وصل و ہجران کے مزے دم مین چکھاتی ہون کبھی مین ملاتی ہون کبھی اُن کو ہٹاتی ہون کبھی
دشت و کہسار مین نکہت کو بھرایا مین نے
عالمِ خواب مین غنچون کو ہنسایا مین نے

آکے سنتی ہون کبھی نغمۂ مرغانِ بہار کبھی پھولون کا لگاتی ہون چمن مین انبار
ناچتی ہون کبھی دامن مین لئے اپنے شرار کھیلتی ہون کبھی چشمون کو بنا کر گلزار
چھیڑ کر موج کو اک زمزمہ سنتی ہون کبھی
آستین پیرہنِ آب کی چنتی ہون کبھی

چاند جب کھول کے دروازۂ زرین اپنا کہتا ہے تارون سے افسانۂ غمگین اپنا
جوشِ مستی مین لئے بربطِ پروین اپنا آکے مین چھیڑتی ہون نغمۂ رنگین اپنا
رقص کرتے ہین مرے سامنے گلہائے چمن
چومتی ہون مین لبِ نکہت فردوس وطن

جامِ مہتاب سے جب ہو کے ستارے مدہوش سنتے ہین شاہدِ فطرت کی نوائے خاموش
چادرِ ابر سمن بار سے پیرایہ بدوش آکے ہوتی ہون مین اس بزم مین افسانہ نیوش
کبھی چھپ جاتی ہون لیکر گلِ انجم کی بہار
اور ہنستی ہون بنا کر یہی پھر نقش و نگار

چاند کو توڑ کے موجون پہ بہاتی ہون کبھی اور لوٹے ہوئے ٹکڑون کو ملاتی ہون کبھی
گلِ سوسن کی طرح اُس کو ہنساتی ہون کبھی چین دامن مین اُسے اپنے چراتی ہون کبھی
اُس کو آغوش مین لے کر کبھی سو جاتی ہون
ظلمتِ شب کی طرح نور مین کھو جاتی ہون

چادرِ ابر پہ لے کر کبھی مستی مین قلم مین بناتی ہو کہین شہر کہین بزمِ صنم
کہین مینار، کہین قصر، کہین رقصِ علم کہین چشمے، کہین کہسار، کہین باغِ ارم
دم مین یہ نقش بنا کر مین مٹا دیتی ہون
آئینہ شاہدِ ہستی کو دکھا دیتی ہون

شور کرتی ہون مین آکر کبھی ویرانون مین خیمہ بردوش کبھی پھرتی ہون میدانون مین
کبھی پردون کو الٹ دیتی ہون ایوانون مین کھیلتی ہون کبھی شمعون سے شبستانون مین

حسن گلزار کو کرتی ہون مین مستی مین خراب
آکے موجون پر تڑپتی ہون مین ہو کر بے تاب

لے کے گرداب مین کشتی کو مچلتی ہون کبھی   بادبان چیر کے جون برق نکلتی ہون کبھی
مین اُگلتی ہون کبھی اُس کو نگلتی ہون کبھی   منہ مین مچھلی کی طرح لے کے اُچھلتی ہون کبھی

پھینک دیتی ہون کبھی دشت کو دریاؤن مین
کبھی دریا کو الٹ دیتی ہون صحراؤن مین

ابر کی فوج کو میدان مین لاتی ہون مین   شور کر کے دہل رعد بجاتی ہون مین
آگے آگے علم برق ہلاتی ہون مین   لشکر مہر کو حملون سے بھگاتی ہون مین

ہنس کے پھر بادشہ نور کو شرماتی ہون
چادرِ قوس قزح اوڑھ کے سو جاتی ہون

میرے آغوش مین سوتے ہین ہزارون طوفان   ہین ہزارون مرے دامن پہ بہارین قرباں
قہر مین کرتی ہون سیلاب پہ دنیا کو روان   اور خوشی مین اُسے کر دیتی ہون فردوس نشان

رقص کرتے ہین ہر اک رنگ کے جوہر مجھ مین
مین ہون عالم مین نہان عالم محشر مجھ مین

یاسمن روکتی ہے نازسے توسن میرا   ہنس کے گل کھینچتے ہین گوشۂ دامن میرا
ہاتھ ہی ہاتھ لئے شاہد سوسن میرا   کہتی ہے ناز سے آ دیکھ نشیمن میرا

کوئی پہناتا ہے پیراہن نکہت مجھ کو
اور سناتا ہے کوئی نغمۂ عشرت مجھ کو

مگر اِن عشوہ گرون سے مین چھڑا کر دامن   موج دریا کی طرح دیکھتی صحرا و چمن
جوشِ وحشت مین گزر جاتی ہون بے رنج و محن   کیا ہو مجھ پر اثر جادوِ نسرین و سمن

میری رفتار مین مضمر ہے نشیمن میرا
میرے دامن کی فضاؤن مین ہے گلشن میرا

تھی مین گلبانگ جہان خیز ازل پر رقصان   حضرتِ نوح کے طوفان مین ہر سو تھی روان
مین ہون دیکھے ہوئے جمشید کی محفل کا سمان   یون ہی گاؤن گی سدا دیکھ کے نیرنگ جہان

ہے ہوا نام میرا کام روانی میرا
سب کو سیراب کئے رہتا ہے پانی میرا

طفیل احمد شمیمی بی

سیر کہسار

کھنچ چکا تھا پردۂ شب مطلعِ کہسار سے
چھن رہی تھی روشنی قطراتِ گوہر بار سے

کس طرح کھلنے سے رہتا غنچہ مرجھا یا ہوا
ایک رنگِ قرمزی تھا چرخ پر چھایا ہوا

تھی فضا خاموش مثلِ پیکرِ "تصویرِ شوق"
اور قرطاسِ زمین پر پھول تھے "تحریرِ شوق"

پتی پتی سے نمایان شانِ محجوبی ہوئی
ٹھنڈی ٹھنڈی تھی ہوا بھی اوس مین ڈوبی ہوئی

ایک غفلت تھی مسلط وادیِ کہسار پر
چھا رہی تھی بیخودی "یا فطرتِ سرشار پر

یا نیازِ شوق مین ساری فضا مسجود تھی
قدرتِ تقویم گویا شاہدِ مقصود تھی

ناگہان اک نازپرور نازگستر نازنین
ماہ طلعت، ماہ رفعت، ماہ پیکر مہ جبین

ساتھ اپنے ہمنشین کے سیر کرنے آ گئی
بیخودی سی اور کچھ ساری فضا پر چھا گئی

زلف اُس کی غیرتِ ظلمات یا مشکین کمند
یا "طنابِ عنبرین"، یا رشتۂ حسنِ بلند

فرق، رشکِ برقِ کوہِ طور یا خطِ شہاب
یا افق پر پر جلوہ گر تارِ شعاعِ آفتاب

طاقِ ابرو سے عیان تھا حل کرے گا "ملکدہ"
سرخ ٹیکا بیچ مین تھا یا سوادِ "گل کدہ"

تھی وہ چلمن یا مژہ تھی مے فروشی پر تلی
یا دوکان تھی ساقیِ غارتگرِ دین کی کھلی

پتلے پتلے ہونٹھ تھے یا تھے خط جام شراب
انگبین ان سے چکان تھا یا روان رنگِ شہاب

نور کا فوارہ تھا یا گردنِ بلور تھی
یا صراحی نور کی یا برقِ کوہِ طور تھی

سینۂ شفاف گویا تختۂ کافور تھا
شانۂ سیمین جلائے غیرتِ بلور تھا

فطرتِ معصوم یا ناطورۂ مدہوش تھی
مختصر یہ ہے سراپا محشرِ خاموش تھی

اپنے پہلو مین لئے مصروف گلچینی تھا وہ
چشمِ شوق آرزو سے محوِ رنگینی تھا وہ

جب بکھرتی زلفِ شبگون اسکو سلجھاتا کبھی
جب پلٹتی چشمِ میگون، لڑکھڑا جاتا کبھی

جب تبسم کی جھلک دیتی پیامِ بیخودی
کروٹین لیکر بدل جاتا نظامِ بیخودی

جب غضب آلودہ تیور سے برستین بجلیان
وہ لرز جاتا مثالِ "طائرِ بے آشیان"

مختصر یہ ہے کہ دونون "ہمنوائے عشق تھے"
واقعاتِ عاشقی تھے "ماجرائے عشق" تھے

عشق مین جوش ہے اگر تو حسن بے پروا نہین
جس مین بدمستی نہو ایسی کوئی صہبا نہین

لازم و ملزوم ہین سرچشمہائے زندگی — باعثِ تنظیم دل ہین نغمہائے زندگی
چند ایسے شوخ لمحے ہین مآلِ زندگی!
ربطِ حسن و عشق حافظؔ ہے جمالِ زندگی!!

حافظ غازیپوری

جنوری ۱۹۳۰ء سے

دارالاشاعت نگار سے ایک نئے رسالہ کا اجراء

اس رسالہ کا نام جن ہوگا۔ جن کے لغوی معنی ہین ہر وہ چیز جو حواس ظاہری سے پوشیدہ ہو، اس لئے اس رسالہ مین تمام اُن امور و واقعات سے بحث ہوگی جن کا تعلق "ماوراء عالم حواس" سے ہے اور جس مین جنات، ارواح خبیثہ، مابعدالطبیعیات، روحانیات، وغیرہ سب شامل ہین۔ اس مین نہ صرف جنات وغیرہ کے معتبر واقعات و حکایات ہونگے، بلکہ ان پر تنقید بھی ہوگی، عالم ارواح و روحانیت کے متعلق جدید ترین تحقیقات و معلومات بھی ہونگی اور "حیات بعد الممات" کے متعلق اس وقت تک جو کچھ دریافت ہو چکا ہے اور ہوتا جا رہا ہے وہ بھی درج ہوتا رہیگا۔

اس رسالہ کی تقطیع ۲۰×۲۶ ہوگی اور ۲۵ سطر کے مسطر پر دو کالم مین باریک خط سے لکھا جائیگا۔ حجم فی الحال دو جزو ہوگا جس مین ۸ صفحات مستقلاً علمی تحقیقات کے لئے وقف ہونگے۔ اس رسالے مین ارواح خبیثہ اور جنات کے جتنے واقعات درج ہونگے ان سب کو مصور پیش کیا جائیگا جس کے لئے ایک آرٹسٹ کی خدمات مستقلاً حاصل کی گئی ہین۔ رسالہ کی سالانہ قیمت عہ/ تجویز کی گئی ہے اور ایک سال سے کم مدت کے لئے چندہ قبول نہ کیا جائیگا۔

جن حضرات کو اس دنیا سے دلچسپی ہو وہ براہ کرم اپنا پتہ بھیجدین تاکہ بعد اشاعت رسالہ کا نمونہ اُن کے پاس روانہ کیا جائے۔

اس کے ساتھ یہ استدعا بھی ہے کہ اگر کسی شخص پر اُس کی زندگی مین کوئی واقعہ ایسا گزرا ہے جسے وہ جنات یا بھوت پریت سے منسوب کرتا ہے تو براہ کرم اس کو قلمبند کرکے روانہ کردے زبان و تحریر کی پرواہ نہ کیجائے۔ یہان اس کو درست کر لیا جائیگا اور واقعہ کے مطابق تصاویر طیار کرالی جائین گی۔ لیکن اس کا خیال رہے کہ صرف اپنا تجربہ و مشاہدہ پیش کیا جائے دوسرون سے نقل کی ہوئی روایت نہ ہو۔

پہلا پرچہ جنوری ۱۹۳۰ء کے نگار کے ساتھ ہی شایع ہوجائے گا۔

مینیجر نگار، لکھنؤ

تربیت اطفال

ذرّہ دہر مین ہے نورِ قمر جلوہ فگن — سینۂ تخم مین ہے عکسِ شجر جلوہ فگن
صاعقہ پاش ہے گو موج روان دریا مین — دیکھنے والا مگر کوئی نہین دنیا مین
صحن گلشن سے اگر شاخ نہوتی روپوش — ہوتے کچھ غنچۂ خوشرنگ وہان جلوہ فروش
قطرے نیسان کے صدف سے جو نہ باہر گرتے — ایسے دُر بنتے کہ پھر نظرون سے گوہر گرتے
آہ اطفالِ وطن آج جو آوارہ ہین — ماہ بے نور ہین، آئینۂ ناکارہ ہین

صیقل علم سے گر انکو جِلا دی جاتی
انکے سینون ہی سے پھر کسبِ ضیا کی جاتی

(محمود۔ اسرائیلی)

تحریصِ عمل

تو ہی بلبلِ چمن ہے ہمہ سوز و ساز ہوجا — تو ہی شمعِ انجمن ہے ہمہ تن گداز ہوجا
یہ ترا سکون پیہم ہے حریفِ زندگانی — اسے سونپ کر خدا کو تو خرام ناز ہوجا
تری ہر ادا مین مضمر ہے جہان سرفرازی — ابھی اسکو آزمالے۔ ابھی سرفراز ہوجا
تری بندگی کی خو نے نہ تجھے کہین کا رکھا — دلِ غزنوی بگڑ کر نگہ ایاز ہوجا
ہے ترے عمل کی دنیا جسے خواب کہہ رہا ہے — جو شعورِ زندگی ہے تو عمل نواز ہوجا

تری "بزمِ آرزو" کا ہے جنون مدعا کو
تری "شمع جستجو" کی ہے تلاش ارتقا کو

ابنِ حزین

غزلیات

اختر شیرانی :—

دل و دماغ کو رولونگا، آہ کرلونگا
تمھارے عشق مین سب کچھ تباہ کرلونگا!

جو تم سے کردیا محروم، آسمان نے مجھے
مین اپنی عمر کو صرفِ گناہ کرلون گا!

ثواب کے لئے ہو جو گنہ وہ عینِ ثواب!
خدا کے نام پہ بھی اک گناہ کرلون گا!

حریمِ حضرتِ سلمیٰ کی سمت جاتا ہون
ہوا نہ ضبط تو چپکے سے آہ کرلون گا!

مجھے جو دیر و حرم مین کہین جگہ نہ ملی
ترے خیال ہی کو سجدہ گاہ کرلون گا!

یہ نوبہار، یہ ابرو ہوا، یہ رنگِ شراب!
چلو جو ہو سو ہوا اب تو گناہ کرلون گا

کسی حسین کے معصوم عشق مین اختر
جوانی کیا ہے مین سب کچھ تباہ کرلونگا!

دل شاہجہانپوری :—

بے نیازی ہے اُسکی عجز نواز
وقفِ سجدہ رہے جبینِ نیاز

اپنے نغمون کو چھیڑ اے بلبل
ہر گلِ تر ہے گوش بر آواز

کھینچ رہی ہین دلِ حزین کی رگین
ہم نفس اُٹھ رہا ہے پردۂ راز

شمع گریان ہون بزمِ ہستی مین
ہر نفس عشق مین ہے روح گداز

چھیڑتی ہے عبث ہوائے چمن
اب کہان ہم مین ہمتِ پرواز

زینتِ حسن بے حقیقت ہے
ہو نہ آلودۂ فریبِ مجاز

صورتِ شمع جل خموشی سے
ہے تقاضائے عشق سوز و گداز

شبِ غم اے دلِ فراق نصیب
ہے مصیبت خیالِ زلفِ دراز

کوچۂ عشق مین جناب دلؔ
ہے عبث شکوۂ نشیب و فراز

افسر صدیقی امروہوی :—

راہِ ہستی کس سے پوچھین کسکو اتنا ہوش ہے
آئینہ خانے مین ایک آئینہ خاموش ہے

حشر کیون کرتا ہے اپنی فتنہ سامانی پہ ناز
تیرے پہلو مین بھی اک ہنگامۂ خاموش ہے

شمع کیون بیتاب ہے جلتا ہے پروانہ اگر
عشق تو دیوانہ ٹھہرا حسن کیون پرجوش ہے

بیٹھے دیکھون انہین ڈالے ہوئے روشن پر نقاب
دیکھ لے جلوہ تمھارا کس کو اتنا ہوش ہے

کان مین آتی نہین اب لن ترانی کی صدا
ایک مدت ہو گئی دنیائے دل خاموش ہے

صبحِ خندان کی طرح افسر مرا دل ہے نہال
شامِ فرقت مین نہ جانے کون ہم آغوش ہے

نظیر لودھیانوی :—

تجھے دلبری کا مذاق ہے تو ہجومِ سرو سمن مین آ
بہ ہزار جلوۂ دامِ سحر تو نکل کے گھر سے چمن مین آ

تجھے ربطِ تیر و کمان سے کیا تجھے کام تیغ و سنان سے کیا
تو نہالِ حسن و جمال ہے تو بہار بن کے چمن مین آ

ذرا کرم کبھی اے صبا یہ پیام میرا اُسے سنا
کہ جلو مین عالمِ نو لئے شبِ ماہ دہرِ کہن مین آ

نہ ہو یہ یاسِ فرنگ مین نہ نواحِ جدہ و گنگ مین
جو تلاشِ لیلیٰ آرزو ہے تجھے تو نجد کے بن مین آ

تو ہر ایک طرح کا ظلم سہ تو رضائے دوست مین مست رہ
تو صراطِ عشق مین گام اُٹھا تو دیارِ دار و رسن مین آ

جو اضطراب نہین کوئی زندگی کا مزا نہین
جو نہین ہے شغلِ رباب و مے تو حریمِ اہلِ سخن مین آ

یہ کہا ہے اخترِ صبح نے کہ نہ بیخبر ہو مآل سے
یہ نشاطِ عمر ہے یک نفس نہ فریبِ چرخِ کہن مین آ

جو چڑھے تھے رنگ اتر گئے کئی ماہ و سال گذر گئے
ہے برائے دلبری کا ذوق کیون تو نظیر اپنے وطن مین آ

معلومات

کانچ اور فولاد کا شہر | اسوقت یوروپ کے مسائل تمدن مین سے ایک بڑا مسئلہ مکانون کی تعمیر کا ہے۔ آبادی کی کثرت سے جگہ مین تو اضافہ ہوتا نہین اور ہر آدمی کے لئے ہر نوع ایک معین جگہ زمین پر سانس لینے اور رہنے کے لئے ضروری ہے، چنانچہ محسوس کیا جا رہا ہے کہ وہان کے موجودہ مکانات آبادی کے لحاظ سے بہت تنگ اور صول صحت کے اعتبار سے ناقابل سکونت ہین نہ خاک سے پوری طرح حفاظت ہوتی ہے نہ ہوا اور روشنی کافی طور پر حاصل ہوتی ہے۔ گنجان آبادی مین سڑک کے دونون جانب بلند عمارتون کا سلسلہ، نہ ہوا کو آزادی کے ساتھ آنے دیتا ہے نہ روشنی کو، اور ہر چند وہان کمرون کے اندر ہوا اور مصنوعی روشنی پہونچانے کا انتظام بہت پُرتریج طریقون سے کیا جاتا ہے لیکن خاطرخواہ اس مین کامیابی نہین ہوتی۔

لندن کے ایک مشہور ماہر تعمیرات سنڈرے اکسیرس مین اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہین کہ یہ مشکل صرف اس طرح حل ہوسکتی ہے کہ تعمیر نہایت سادہ ہو فن تعمیر علمی طور پر تعمیری کا ایک جزو قرار دیا جائے اور بجائے اینٹ پتھر کے صرف فولاد اور کانچ کی عمارتین بنائی جائین۔ چنانچہ یوروپ وامریکہ کے ماہرین فن نے عمارتون کے بالکل نئے نقشے طیار کرنا شروع کردیئے ہین اور بڑی حد تک تمام دقتون کو دور کرکے مستقبل کی تعمیرات پر علمی حیثیت سے کوششون کا آغاز ہوگیا ہے

تجویز یہ ہے کہ بجائے بنیاد کھودنے کے جس مین رطوبت، گندگی اور دقت سبھی کچھ پیدا ہوتی ہے، عمارتین صرف ستونون پر قایم کی جائین تا کہ سڑک بھی وسیع رہے، لوگون کی آمد و رفت مین بھی سہولت پیدا ہو اور دوکانون کو بھی کافی جگہ ملجائے۔ جدید عمارتین فولاد، کانچ اور کنکریٹ کی ہونگی جن کے نیچے باغ مصنوعی جھیلین، پیرنے کے حوض، تفریح گاہین وغیرہ سب بن سکین گی اور اس طرح یہ تمام اسباب صحت و تفریح شہر کے اندر ہی ہر جگہ مہیا ہو سکین گے۔

لوگون کا خیال ہوگا کہ کانچ ایسی نازک چیز کے مکانات بہت کمزور ہونگے لیکن یہ صحیح نہین کیونکہ اگر کانچ بہت دبیز استعمال کیا جائے تو اس سے زیادہ مضبوط کوئی چیز نہین اور اس کی دیوارین، چھتین، دروازے، اور ستون بغیر کسی خطرہ کے بنائے جاسکتے ہین، اسی کے ساتھ سب سے بڑا فایدہ یہ ہے کہ شیشہ پر نقاشی، رنگسازی وغیرہ بھی بہت آسانی سے ہوسکتی ہے اور اُسے جس طرح چاہین ڈھال سکتے ہین اور حسین سے حسین چیز اس کی طیار کرسکتے ہین، پھر چونکہ وہ صاف رہنے والی چیز ہے، تم کو قبول نہین کرتی، اسپر خاک نہین جمتی اس لئے صحت کے لئے بھی بہت مفید ہے اور ارزانی اسکی ظاہر ہے

شیشہ کی عمارتون مین مصنوعی روشنی کا سوال بھی بالکل اُٹھ جائیگا کیونکہ یہ عمارتین ایسی بنائی جائینگی کہ از خود روشن ہو جائین اور اس طرح گویا کہا جاسکتا ہے کہ مستقبل کے مکانات روشنی کے بنے ہوئے ہونگے

اہرام مصری کا راز | اہرام مصری کے متعلق ایک نہایت عجیب و غریب نظریہ حال ہی مین یہ قایم کیا گیا ہے کہ مصر قدیم کے کاہن اس سے دھوپ گھڑی کا کام لیتے تھے اور موسم کی پیمایش کرتے تھے مسٹر کاٹشور تھ نے جو اس قیاس کا موجد ہے، حکومت مصر کو لکھا ہے کہ سب سے بڑے مینار کی چوٹی کا منہدم حصہ بنانے کی اجازت دیجائے تاکہ اس کا تجربہ ہوسکے۔

اس کا خیال ہے کہ مینار کا شمالی حصہ بجائے ڈایل یا سایہ دیکھنے کی جگہ کے استعمال ہوتا تھا اور اس کا تجربہ کرنے کے لئے مینار کی چوٹی کی تعمیر ضروری ہوگی۔

اس وقت تک جو عام طور پر یہ خیال قایم کیا جاتا ہے کہ اہرام مصری صرف فراعنہ کی لاشون کو محفوظ رکھنے کے لئے بنائے گئے تھے مسٹر کاٹسورتھ کے نزدیک ناقابل قبول ہے۔ وہ کہتا ہے کہ قدیم اہل مصر بڑے عملی لوگ تھے اور اہرام مصر صرف اس غرض سے بنائے گئے تھے کہ مصر کے کاہن اس کی مدد سے موسمون کی تعیین کر سکین، چنانچہ اہل مصر اس مدد سے اپنے ایک خاص غلہ کی تین تین فصلین کاشت کر لیتے تھے۔ تیسری مرتبہ کاشت کرنے کے لئے اگر دو چار دن کی بھی دیر ہو جاتی تو فصل خراب ہو جاتی تھی لیکن اہرام مصری کی مدد سے ایک دن کیا بلکہ ایک گھنٹہ کی بھی دیر نہ ہوتی تھی اور وقت کاشت کی بالکل صحیح تعیین ہو جاتی تھی،

اہرام مصر گویا کاہنین مصر کی پوشیدہ جنتری تھی جس کی مدد سے وہ مصر کے کاشتکارون کو احکام صادر کرتے رہتے تھے اور اس کے راز کو وہ کسی پر ظاہر نہ کرتے تھے۔ چونکہ مصر کی ساری آبادی کا کاشتکاری پیشہ تھی اور خود ان کو وقت و موسم کے تعیین کا طریقہ معلوم نہ تھا، اس لئے وہ کاہنون کو نہایت ہی عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور ان کا بڑا اثر سارے ملک پر قایم تھا۔ وہان کے کاہن ہر ماہ کے دسوین، بیسوین اور تیسوین دن ہر عشرہ کا پروگرام بتا دیا کرتے تھے کہ آیندہ دس دن مین کیا کرنا چاہئے اور موسم کی کیا حالت ہوگی مثلاً:- خزان شروع ہو گئی ہے۔ دریائے نیل پوری طغیانی پر ہوگا نہرون کے دہانے کھول دو، لونگ چقندر اور شلغم کی کاشت شروع کر دو، بھیڑون کو مینڈھون سے علیحدہ کر دو، زیتون اور ردی چن لو، پھلون کو جمع کر لو۔

اور یہ تمام پیشین گوئیان وہ اہرام مصری کی مدد سے کیا کرتے تھے اگر مسٹر کاٹسورتھ کا یہ قیاس صحیح نکلا اور حکومت مصر نے اس کو مزید تفتیش کی اجازت دیدی تو یقیناً یہ انکشاف نہایت ہی دلچسپ انکشاف ہوگا۔

زمین اور شہاب ثاقب | ڈاکٹر چارلس پی اولیویر نے جو جامعہ پنسلوینیا کے رصد خانہ کے مہتمم ہین حال ہی مین فلکیات کی ایک مجلس مین تقریر کرتے ہوئے بتایا ہے کہ اسوقت روزانہ کروڑ شہاب ثاقب زمین تک پہونچنے والے وہ ہین، جو ہمکو نظر آتے ہین ورنہ جو دوربین سے دیکھے جاتے ہین ان کی تعداد کا علم کسی کو نہین پھر حیرت ہے کہ ان سے زمین کو کیون نقصان نہین پہونچتا اس کا سبب یہ ہے کہ جب وہ آسمان سے ۲۰ سے لیکر ۷ میل فی سکنڈ کے حساب سے چلتے ہین، تو فضا کی گرمی ان کو جلا کر خاک کر دیتی ہے، اور جب وہ زمین پر پہونچتے ہین تو راکھ کا ڈھیر ہوتے ہین، دوسرے انکی ضخامت بھی کم ہوتی ہے،

امریکہ کی عورت کا اسراف | دنیا کی تمام عورتین اپنے اسباب آرایش مین فضول خرچی کے لئے بدنام ہین، لیکن اس حیثیت سے نیویارک کی عورتین سب سے آگے ہین، چنانچہ امریکہ کے اخبارات کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۹۲۷ء مین عورتون اور لڑکیون نے صرف کپڑون پر (جواب اس قدر کم ہو گئے ہین کہ انکی سرحد تقریباً عریانی سے جا کر مل گئی ہے) جو رقم صرف کی ہے وہ ۱۹۲۵ء کی رقم سے ۱۳۷۰۰۰۰۰ ڈالر یعنی تقریباً ۴ کروڑ روپیہ زیادہ ہے اور غریب مرد کو اسی اعتبار سے اپنے کپڑون مین کمی کرنا پڑی اور اس کمی کی مقدار ۱۹۰۰۰۰۰ ڈالر ہے۔

بسم اللہ

نگار

فہرست مضامین اکتوبر ۱۹۲۹ء

بسم اللہ

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد (۱۶)	اکتوبر ۱۹۲۹ء	شمارہ (۴)

ملاحظات

گذشتہ ماہ کے رسالہ کو کسی نے "سنان ونشتر" سے تعبیر کیا اور کسی نے "تیغ وتفنگ" سے اور جسقدر "جراحت پذیری" کی اہلیت کا تعلق ہے، اس کے اور نام بھی "مراتب تاثر" کے لحاظ سے رکھے جا سکتے ہیں لیکن مجھے اگر مسرت ہی تو صرف اس خیال سے کہ اگر ایک طرف یہ "تپش مذبوحی" جراحت ناکام کا پتہ دے رہی ہی تو دوسری طرف بحمد اللہ "بر نیاید ز کشتگان آواز" کا منظر بھی دل بڑھانے کے لئے موجود ہے۔ اور اگر تماشائیوں کے "آفرین و مرحبا" کو بھی اسی میں شامل کر لیا جائے تو پھر "دیت وخونبہا" کا سوال اُس "عشوہ و تبسم" سے آگے نہیں بڑھتا جسے ظہوری فخر کے ساتھ سرمایۂ تحمید و تقدیس کی صورت پیش کرتا ہے

میری حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی، جب بعض حضرات میری تحریروں سے عصبیت مذہب کو ثابت کرنا چاہتے ہیں، حالانکہ میری تنقیدیں خواہ وہ مذہب و معاشرت سے متعلق ہوں، یا علم و ادب سے اس خلوص نیت کا نتیجہ ہوتی ہیں جس کی اگر کوئی دنیاوی تعبیر ہو سکتی ہے تو صرف یہ کہ

شکایتے ست نگنجد بدل ز بسیاری

میں اس سے قبل بھی بارہا عرض کر چکا ہوں اور آج پھر اس کا اعادہ کرتا ہوں کہ تشیع و تسنن تو خیر نہایت ہی معمولی بات ہے میں نے تو اصطلاحی کفر و اسلام کا پردۂ امتیاز بھی نوچ کے پھینکدیا ہے اور میں اُس دعوے کے ساتھ نہ جس کے لئے تصدیق کی ضرورت ہوتی ہے نہ تردید کا اندیشہ "بصور سرافیل" اس امر کا اعلان کرتا ہوں کہ اگر جنت نام ہے صرف سکون روح و طمانینت قلب کا اور اگر یہ جنت ایک اہل شب زندہ دار صرف تقشف ہی سے حاصل کر سکتا ہے تو میں وہ ہوں کہ

فردوس را بدام نگہ می کنم شکار

میں اس چیز سے واقف ہوں، جس کی جستجو دیر و حرم میں کیجا رہی ہے، میں اس مقصود کو جانتا ہوں کہ جس کو مساجد و کنائس میں ڈھونڈھا جا رہا ہے، اور میں اس حقیقت سے بھی بیخبر نہیں ہوں کہ یہ محراب و منبر پر پیشانیاں رگڑ رگڑ کر نوشتۂ تقدیر کو مٹا دینے کی کوشش کرنے والے آجتک یہی نہیں سمجھ سکے کہ وہ کیا چیز ہے جو سجدہ ہائے نیاز کا مسجود ہو سکتی ہے اور وہ کونسا پردہ ہے جس کے اٹھنے کے بعد یہ تمام اعتبارات سطحی یہ جملہ ممیزات قشری محو ہو کر

چشم وا کردن زمین تا آسمان آغوش داشت

بنجاتے ہیں۔ پھر اس سے قبل خدا معلوم کتنی زریں صبحیں، کتنی رنگین شامیں، کتنی خنک راتیں میں نے صرف اس غور و تامل میں صرف کر دیں کہ کیا منصور کا انا الحق لکہکر دار و رسن کی منزل سے گزر جانا واقعی شاہد مقصود کے چہرہ سے حجاب اٹھا دینا تھا اور کیا میں بھی اگر ایسا دعویٰ کروں تو بیجا ہوگا، لیکن میں ہمیشہ اسی نتیجہ پر پہونچا کہ اول تو وہ منزل جسے

"مرا کردہ اند آشکارا بمن"

کہتے ہیں خود کوئی ایسی بلند منزل نہیں جس کو ہر شخص بادنیٰ تامل نہ پا سکتا ہو چہ جائیکہ اس میں بھی ناصبوری سے کام لیا جائے۔ اس لئے میں بے نیازانہ انداز سے آگے بڑھا اور میں نے اپنی فطری ودیعتوں میں سے ایک نہایت ہی ابتدائی منزل کی ودیعت کو بے نقاب کرنا چاہا لیکن حیرت ہے کہ دنیا اس کے بھی سمجھنے کے لئے تیار نہیں اور جسوقت میں یہ دعویٰ کرتا ہوں کہ

"یک مے ز آبگینہ و ساغر بر آدرم"

تو وہ مجھ سے منھ پھیر لیتی ہے، مجھے کافر کہتی ہے دہریہ اور ملحد کے لقب سے یاد کرتی ہے اور اپنے جہل سے میرے علم کو مغلوب کرنا چاہتی ہے، حالانکہ یہاں یہ عالم ہے کہ "گرانی محمل" کا احساس جسقدر قوی ہوتا جاتا ہے، اسی اعتبار سے

ہر پردہ را بولولہ سنجم ہزار بار

اس لئے میں اپنے تمام احباب سے خواہ کسی مذہب و مسلک کے متبع ہوں بتا دینا چاہتا ہوں کہ میرے شاہد مقصود کے سامنے یہ تمام نسبتیں، یہ جملہ اضافات وہی حقیقت رکھتی ہیں جو "پارۂ کتاں" چاند کے سامنے، اور بحمد اللہ میں اس سے بہت بلند ہوں کہ اس "نا استواری نسیج" کا تماشہ دیکھنے کے لئے ایک لمحہ کے بھی اپنی نگاہ پستی کی طرف مائل کروں۔ ——— دنیا اگر اپنی صحرا نوردیوں میں خضر کو رہبر بنانا چاہتی ہے تو بنائے اور جبتک جی چاہے سکندر کی ناکامی کا انتقام اس سے لیتی رہے لیکن مجھے اُس جستجو میں دعوت شرکت نہ دے کر۔

سیلاب را بہ بادیہ رہبر گرفتہ ام

اگر ایک طرف یہ عزم استوار ہے کہ تنقید خواہ وہ معاشرت و اخلاق سے متعلق ہو یا مذہب و سیاسیات سے، ہمیشہ بلند نقطۂ نظر سے ہونا چاہئے، تو دوسری طرف میں اپنی فطرت کی اس کمزوری سے بھی واقف ہوں کہ وہ کسی کا دل دکھانا گوارا نہیں کرتی اور اس لئے جب مجھے اس کا علم ہوجاتا ہے کہ میری تحریر یا نگار کے کسی مضمون سے کسی کو صدمہ پہونچ گیا ہے، تو میں بہت ملول ہوجاتا ہوں۔ بنا بریں اگر گذشتہ ماہ کے نگار سے کسی خاص شخص یا کسی مخصوص جماعت کو کوئی تکلیف پہونچی ہے تو میں اسکی معذرت میں صرف یہ یقین دلانا چاہتا ہوں کہ میرا مقصود کبھی تنگ نظری کا اظہار نہیں ہوتا اور اگر کوئی صورت ایسی پیدا ہوجاتی ہے تو صرف اس لئے کہ

مستم چناں کہ گل نشناسم ز نوک خار

اس سلسلہ میں مجھ کو برا کہنے والے دو قسم کے لوگ ہیں، ایک وہ جو انتقام لینے کے لئے صرف اپنے اہرمن سے چارہ سازی چاہتے ہیں اور گالیوں کی آزار رسانی کے سوا ان کے پاس کوئی آلۂ حرب نہیں ہوتا۔ اور دوسرے وہ جو میری تحریر میں بے حجابی، عریانی، فحاشی وغیرہ کے نقائص نکالکر اپنے پندار میں مجھے ذلیل و خفیف کرنا چاہتے ہیں۔ سو اول الذکر جماعت سے مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ جس طرح انکا اہرمن ان کے ساتھ ہے اسی طرح میرا یزداں میرے ساتھ ہے۔ اور اس لئے مجھے ڈرنے کی ضرورت نہیں، اور مؤخر الذکر جماعت کے حضور میں اپنے ذوق ادب دانشا کی طرف سے سوائے اس کے اور کچھ نہیں عرض کرسکتا کہ

نظارۂ خوباں دمے و نغمہ حرام است
دیدیم و شنیدیم و سمعنا و اطعنا

میرے پاس وہ مطبوعہ اعلان آیا ہے جسے کلکتہ میں قایم ہونے والی ”لیگ اگینسٹ ملاازم“ نے اپنے مقصد کی تبلیغ کے لئے شایع کیا ہے۔ اس لیگ کے روح رواں اور صدر مولوی عبد الرزاق ملیح آبادی ہیں اور سید محمد عثمان فاضل نائب صدر۔ اس لیگ کے قیام کا مدعا اُس ذہنیت کی مخالفت ہے جو تنگ نظری، تنگ دلی، تقلید و جمود، تعصب و عدم رواداری کو مذہب کے رنگ میں پیش کرتی ہے۔ اس ذہنیت کا اصطلاحی نام اس انجمن نے ملاازم اور اس ذہنیت والوں کا مُلا رکھا ہے۔ اس اعلان کے آخری صفحہ میں یہ بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ یہ انجمن الحاد و دہریت کی حامی نہیں ہے اور نہ ہر عالم دین کی مخالف ہے بلکہ وہ صرف ان نام نہاد مذہبی پیشواؤں کے خلاف ہے جن میں یہ ذہنیت پائی جاتی ہے۔

جس حد تک الفاظ اعلان کا تعلق ہے اس انجمن کے مقاصد نہایت ہی پاکیزہ اور قابل قبول معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن عملی حیثیت سے مجھے اس کے اندر چند در چند کمزوریاں محسوس ہوتی ہیں۔ جس وقت پبلک کے سامنے یہ دعوے پیش کیا جائے گا کہ ملاؤں کی جماعت تنگ نظر ہے متعصب ہے، تقلید کی پابند ہے تو لامحالہ یہ سوال پیدا ہوگا کہ ان کی تنگ نظری تعصب اور تقلید مذہب کے اندر ہے یا اس سے باہر ظاہر ہے کہ اس سے باہر نہیں ہوسکتی اور ہو تو بھی کون مانتا ہے۔ اس لئے وہ مذہب ہی سے متعلق ہوگی اور جس وقت آپ مذہبی مناظرہ

کریں گے تو ایک غیر متناہی سلسلۂ قال، اقول" کا پیدا ہو جائے گا اور آخر کار وہ مقصد حاصل نہ ہو گا جس کے لئے یہ لیگ قایم کی گئی ہے

اگر یہ لیگ مذہب کے ساتھ ساتھ ملاؤں کی مخالفت کرنا چاہتی ہے تو کوئی توقع کامیابی کی نہیں ہو سکتی اور نہ مذہب کی موجودہ مراسم کی حمایت کرتے ہوئے ملاؤں کے خلاف کوئی کامیاب پروپیگنڈا ہو سکتا ہے لیکن اگر آپ یہ دعویٰ کریں کہ جو اسلام اس جماعت نے پیش کیا ہے، وہی شروع سے غلط ہے اور ان میں سے ایک بھی بلا استثنا مذہب اسلام کے صحیح مفہوم کو نہیں سمجھا تو بیشک یہ لیگ کچھ اہمیت اختیار کر سکتی ہے اور اصلاح کی بھی اس سے توقع ہو سکتی ہے۔ یہ بالکل خلاف اصول ہے کہ اس جماعت میں سے بعض کو علیحدہ کر دیا جائے اور بعض کو لے لیا جائے، بلکہ ایک سرے سے ان سب کو حرف غلط کی طرح مٹا دینا چاہیئے اور لوگوں کو اسلام کی حقیقت ذہن نشین کر کے بتانا چاہیئے کہ اسلام نام ہے صرف ترک مذہب کا، نسخ ادیان کا، تفریق قومی کے مٹانے کا اور جامعۂ انسانیت کو ایک مرکز پر جمع کرنے کا جس کا نام اخلاق اور صرف اخلاق ہے۔ اسلام مسجد و مندر کی تفریق سے بے نیاز ہے، زنار و تسبیح کے امتیاز سے بالاتر ہے نہ ناقوس و اذان کی تمیز اس کا نصب العین ہے نہ پیکر یاں اور طواف کا فرق اس کا مطمح نظر۔ وہ تمام عالم کو، ساری کائنات کو، جملہ نوع بشری کو ایک رشتہ سے وابستہ کر کے صرف ایک نقطہ پر لانا چاہتا ہے اور وہ اس مساوات کا مبلغ ہے جس سے زیادہ وسیع مساوات دنیا میں کسی ہادی و رہنما کسی نبی و رسول نے اس سے قبل پیش نہیں کی۔

وہ نہ کسی کے نام کو دیکھتا ہے، نہ وضع و صورت کو، نہ وہ نسب کو وجہ امتیاز قرار دیتا ہے نہ حسب کو، نہ دولت اس کے نزدیک کوئی اہمیت رکھتی ہے نہ جاہ و ثروت۔ وہ دیکھتا ہے صرف رواداری کو، جذبۂ ایثار و فدویت کو، اور محض اس اضطراب کو جو بنی نوع انسانی کے ہر فرد میں دوسرے فرد کی اعانت کے لئے پیدا ہونا چاہیئے۔

پھر آج اسلام کا صحیح مفہوم بتانے کے لئے سب سے پہلے ضرورت ہے اُس عنصر کو محو کر دینے کی جو اسلام کو اصطلاحی لفظ قرار دیکر اس کو اخوت عامہ کے مقصد سے علیحدہ کر رہا ہے اور موجودہ ضروریات تمدن و زمانہ کے لحاظ سے تمام ان اصول معاشرت و حیات پر نظر ثانی کرنے کی جو آج اسلام کے چہرہ کو نہایت بدنما صورت میں پیش کر رہے ہیں۔ اگر زمانہ کے ساتھ لوگوں کے امیال و عواطف اور عقول و افکار میں تغیر ہونا ضروری ہے تو پھر یقیناً وہی مذہب حقیقی معنی میں خدائی مذہب کہلائے گا جو عہد و زمانہ کے لحاظ سے تمام عقول و اذہان کی رہبری کر سکے اور اپنے اندر اس تغیر کو روا رکھے جس کے بغیر "اخوت عامہ" کا مقصد عظیم حاصل نہیں ہو سکتا۔

پھر آج اگر منزل تک پہونچنے کا کوئی صحیح راستہ ہو سکتا ہے تو وہ نہ وہ ہے جسے تمام علماء دین زمانہ سے صدیوں پیچھے ہٹ کر متعین کر رہے ہیں اور نہ اس کی وہ تدبیر ہے جو کلکتہ کی اس لیگ نے بتائی ہے۔

اس لئے جس ایثار و قربانی، جس رسوخ و استواری کی ضرورت ہے وہ ہم میں سے سرمد و منصور کی طلبگار ہے سقراط و حسین کی متجسس ہے، اور اُن مردان خدا کی منتظر ہے جو ممبر پر نہیں بلکہ دار پر اس راز کا اعلان کرنے کی جرأت اپنے اندر رکھتے ہوں

پھر اگر آج بعض نفوس مقدسہ اس قربانی کے لئے آمادہ ہو جائیں خدمت اسلام کے لئے اپنے تمام مصالح ذاتی کو پس پشت ڈالنے کے لئے طیار ہو جائیں، تو بغیر کسی لیگ کے قائم کئے ہوئے حقیقی مقصد حاصل ہو سکتا ہے اور دنیا از خود ان مولویوں، ان ملاؤں، ان عالمان دین، ان پیران طریقت، ان تصوف پیشگان جم مرتبت کے بتوں کو ٹھکرا دینے کے لئے آمادہ ہو سکتی ہے

مین اس لیگ کے ارباب کار کو بتانا چاہتا ہون کہ مین جس منزل مین ہون وہ ان کے لیگ کے مقاصد سے بہت بلند ہے اور میرے نزدیک اس نوع کی جماعتون یا انجمنون کا قیام ایک طفلانہ نمائش تو ضرور ہے لیکن سنجیدہ و موثر تدابیر سے اس کو کوئی علاقہ نہین ہو سکتا اگر اس لیگ کو کچھ کرنا ہے تو مین مشورہ دونگا کہ

بیفشان دامن و آزادہ برخیز

ورنہ اسے فنا ہوجانا چاہئے کیونکہ جو " بابِ نبرد " نہ ہو اس کو "عشق نبرد پیشہ" کی دعوت پر لبیک کہنے کا کوئی حق حاصل نہین ہے

داس کا حکومت کے طرزِ عمل کے خلاف احتجاجاً فاقہ کی تڑپا تڑپا کر ہلاک کرنے والی صعوبتون کو برداشت کرکے اس دنیا سے گزر جانا، گو بظاہر نہایت معمولی بات معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر آپ تاریخ کے اوراق الٹ کر دیکھین گے تو معلوم ہوگا کہ زمانہ ایسے " مردانِ خدا " چند سے زیادہ نہین پیدا کر سکا

اس وقت یقیناً یہ سوال ہے صرف ایک شخص، ایک معمولی انسان کے جان دیدینے کا، لیکن عاقبت بین نگاہین دیکھ سکتی ہین کہ یہ موت، احیا ہے ایک قوم کا، نجات ہے ایک ملک کی

داس نہین مرا، بلکہ زندگی کا راز ہکو بتا گیا، اس کے جنازہ پر پھول نہین برسائے گئے، بلکہ آزادی کے دیوی لئے تخت و تاج کو آراستہ کیا گیا اور اگر فطرت نے اپنے اصول نہین بدلے ہین تو ہم کہہ سکتے ہین کہ داس نے انتظار کی مدت کو بقدر نصف صدی کم کر دیا ہے اور وہ وقت دور نہین جب ارتھی پر سوگ کے پھول چڑھانے والے ہات، " ملکۂ حرّیت " کے جلوس مین مسرت کی گلباریان کرتے ہوے نظر آئین گے

موت نام ہے دنیا سے محو ہوجانے کا - پھر کون ہے جو داس کو مردہ کہہ سکتا ہے - الا ان اولیاء اللہ لا یموتون - یقیناً داس اللہ کے اولیا مین سے ایک ولی تھا اور اگر مسلمان مجھے اس اظہارِ خیال پر اسلام سے خارج کرنا چاہین تو کر دین، مجھے پروا نہین

منت کش بتیم کہ حقیقت نگر آمد

اور اگر وہ ولایت خداوندی کو صرف اپنے ہی لئے مخصوص جانتے ہین تو کم از کم مجھے یقین نہ دلائین کہ میرے اوپر تو اس کے خیال سے بھی موت کا سا جمود طاری ہونے لگتا ہے اور نہ اپنی قربانیون کا ذکر کرین کہ

دارد تفاوت آب شدن تا گریستن

یہ بڑی حد تک صحیح ہے کہ ہندوستان کا سیاسی تگ و دو مین اس وقت تک کوئی کامیابی حاصل نہ کر سکتا ہندو مسلم تفریق کی وجہ سے ہے اور یہ بھی غلط نہین کہ اس تفریق کے قیام مین ہندوؤن کی تنگ نظری اور عصبیت بہت معاون ہو رہی ہے لیکن کیا مسلمان اس باب مین بالکل معصوم ہین کیا وہ ہندوستان کی مسئلۂ آزادی کو واقعی بہت اہم سمجھتے ہین اور کیا وہ اپنی پوری توجہ اس طرف

صرف کر رہے ہین؟ ممکن ہے بعض نفوس اس دعویٰ کر سکین، لیکن عام طور پر مسلمانون کی ذہنیت اسدرجہ انتشار و پراگندگی رکھتی ہے کہ اس وقت تک یہی نہین معلوم ہو سکا کہ انکا مقصود کیا ہے۔ کبھی وہ مسئلۂ تبلیغ کی کامیابی کو اپنے مرض کا علاج سمجھکر اس طرف متوجہ ہو جاتے ہین، کبھی "خدمت کعبہ" کو وہ اساس تہذیب و اخلاق جانکر اپنے آپ کو "خدام کعبہ" کہنے اور کہلوانے پر اصرار کرتے ہین کبھی "زوال خلافت" پر مجلس عزا مرتب کرکے اس کا نام "خلافت کمیٹی" رکھتے ہین اور اب خیر سے فلسطین کے معاملہ نے ایک اور نئی چیز "فلسطین کمیٹی" کی بنیاد کا مواد فراہم کر دیا ہے۔ گویا ہندوستان کے مسلمان ساری دنیا کے ذمہ دار ہین اور جب تک یہ ہندوستان مین بیٹھکر کوئی رزولیوشن پاس نہ کر دینگے اس وقت تک عالم اسلامی کی کوئی مشکل حل ہو ہی نہین سکتی۔ لیکن اس "خاک بسر" قوم سے کوئی پوچھے کہ۔ اس وقت تک ان تمام مذہبی، سیاسی اور اخلاقی انجمنون نے کیا کارہائے نمایان انجام دئے اور ان تحریکات مین حصہ لینے کے بعد دوسرون کو کیا فایدہ پہونچایا اور خود کیا فایدہ حاصل کیا۔ خلافت ختم ہونے کے بعد خلافت کمیٹی قایم ہوئی اور دولت بے اندازہ ہندوستان کے غریب مسلمانون سے جمع کی گئی، لیکن کیا حکومت حجاز نے ارض مقدسہ سے یہود و نصاریٰ کے اثرات محو کرنے مین کوئی مدد ان کی، کیا وہ اس سلسلہ مین اپنی کسی حقیر سے حقیر آرزو کو بھی پورا دیکھنے مین کامیاب ہو سکے۔ اسی طرح خدام کعبہ کی حیثیت سے وہ مسئول ہو سکتے ہین کہ اس باب مین ان کے خدمات کیا ہین۔ کیا حاجیون کی جماعت کو بمبئی مین ٹکٹ خرید کرکے لا دینا، مسافر خانون مین لاکر ان کو ٹھیرا دینا اور جہاز پر سوار کرا دینا اتنا بڑا کام ہے کہ اس سے زیادہ کوئی اور ذریعۂ نجات ہو ہی نہین ہو سکتا۔ جمعیتہ العلماء اور ان کی تبلیغ کا ذکر فضول ہے کیونکہ اب اس جماعت اور اس کے اس مقصد کی لغویت روز روشن کی طرح عیان ہے

اب اس ذہنیت کے ماتحت فلسطین کے مسئلہ مین ہنگامۂ گدایانہ برپا کیا جا رہا ہے، اور کیا عجب ہے کہ اس کے لئے بھی کوئی فہرست فراہمی چندہ کی کھولدی جائے۔ لیکن اس کا نتیجہ بھی جو کچھ ہونے والا ہے، کسی سے مخفی نہین۔ یہان کے مسلمان یہ نہین سمجھتے کہ جب تک وہ خود اپنی ملکی و مقامی حیثیت کو مستحکم و بلند نہ کرینگے اُن کے "طنین پشہ" کو کون سنیگا اور اُن کے شور و شغب سے دنیا کے یہ اصول کیونکر بدل سکتے ہین کہ پہاڑ سے سر ٹکرانا خود اپنے سر کو مجروح کرنا ہے۔ اگر مسلمان چاہتے ہین کہ واقعی ان کی آواز کو کوئی اہمیت دیجائے تو انکا فرض یہ ہونا چاہئے کہ پہلے اندرونی ملکی سیاسیات مین اپنے اندر ایک جماعت صالح کی سی اہمیت پیدا کرین اور جب خود اپنے گھر کو محفوظ کر لین تو دوسرون کے گھرون کی آگ بجھانے کی کوشش کرین۔ کیا ہندوستان کے مسلمانون کے باب مین، ترکی، ایران، افغانستان، مصر، فلسطین، حجاز کسی جگہ سے کوئی آواز بلند کیجاتی ہے، کیا کبھی سنا گیا ہے کہ وہان کی کسی انجمن نے کوئی تجویز اپنی حکومت کے ذریعہ سے حکومت برطانیہ کے پاس بھیجی ہو، پھر جب اس وقت حالت یہ ہے کہ ہر قوم و جماعت اپنے ہی تحفظ کی منزل سے نہین گزری، تو ہندوستان کے مسلمانون کی یہ "انجمن آرائیان" اور "رزولیوشن فرمائیان" کیا اہمیت رکھ سکتی ہین

مین دیکھتا ہون کہ مسلمانون کی ایک جماعت اور غالباً بڑی جماعت سارداابل کی منظوری سے چین بہ جبین نظر آتی ہے یہانتک کہ اسمبلی کے بعض مسلمان ممبر احتجاجاً ہال سے اٹھکر باہر چلے گئے۔ ہم نے مانا کہ صغر سنی کی شادیان ہندوؤن مین زیادہ ہوتی ہین اور

یہ قانون انھون نے اپنے ہی معاشرت کی اصلاح کے لئے نافذ کرایا ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ جب اصولاً مسلمان بھی اس کے مفاد کے منکر نہین ہین تو وہ کیون مخالفت کرتے ہین۔ رہا شریعت اسلامی کا سوال، سو مین پوچھتا ہون کہ کیا ہندوستان مین زنا کے جرم مین کسی کو سنگسار کیا جاتا ہے، کیا سرقہ کے ارتکاب پر کسی کے ہاتھ قطع کئے جاتے ہین، کیا تہمت پر یہان حد قذف جاری ہوتی ہے، کیا شراب خواری پر دُرّے لگائے جاتے ہین، پھر جب مسلمان ان تمام تعزیرات کو جو شریعت اسلامی کے خلاف ہین گوارا کئے ہوئے ہین تو کوئی وجہ نہین کہ وہ سارداابل پر چراغ پا ہون علی الخصوص اُس وقت جبکہ مسلمانون مین بھی ہندؤن کے ساتھ میل جول رکھنے کی وجہ سے صغر سنی کی شادی کا رواج کچھ کم نہین ہے

صغر سنی کی شادی کو روکنے والا قانون باوجود اس کے کہ مسلمانون کی ایک جماعت نے مخالفت کی، منظور ہو گیا اور ۱۹۳۰ء سے اس کا نفاذ بھی ہو جائے گا، جہانتک عورتون کی صحت کا تعلق ہے یہ قانون بہت مفید ہے اور معاشری حالت کی درستی مین بھی اس سے کام لیا جا سکتا ہے، لیکن اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ایک قانون اس سے بہت زیادہ اہم تھا جس کی طرف کسی نے توجہ نہین کی اور جس کا نفاذ بقائے عقل وحواس اور تحفظ انسانیت و اخلاق کے لئے ازبس ضروری ہے

اس وقت تمام اکناف ہند مین ایک کثیر جماعت ان لوگون کی دیکھی جاتی ہے جو اپنے آپ کو عالم دین کہتے ہین، صوفی راہ طریقت بتاتے ہین، مجالس وعظ مین سخت تباہ کن اور دشمن عقل و انصاف روایات بیان کرتے ہین صرف اس لئے کہ روپیہ کمائین، جاہلو اور احمقون کو اپنے کاذب کشف و مراقبہ سے دھوکا دیکر اپنا گرویدہ بناتے ہین تاکہ زندگی کے تمام نعایم ولذایذ اپنے لئے مخصوص کرلین درانحالیکہ انھون نے کوئی محنت نہین کی، کسی جفاکشی اور عرقریزی سے کام نہین لیا

اگر قانون تعزیرات ہند دغا بازون کو گرفتار نہین کر سکتا، اگر ضابطہ فوجداری آوارہ گردی کے سلسلہ مین ان کو نیک چلنی کا پابند کا نہین بنا سکتا، اگر امتناع گداگری کا قانون اُن پر نافذ نہین ہو سکتا، تو کوئی وجہ نہین کہ ان کی تباہکاریون سے بچانے کے لئے، ایک علحدہ قانون نہ مرتب کیا جائے اور ان معزز گداگرون، ان پڑھے لکھے بھکاریون کو جو "یسئلون الناس الحافا" کی ایک مخفی مگر نہایت ہی سخت لعنت مین مبتلا ہین وعظ بیشگی اور پیری مُریدی سے نہ باز رکھا جائے۔ نہ ان کے پاس کوئی جائداد ہے نہ ریاست نہ یہ کہین ملازمت کرتے ہین، نہ تجارت لیکن دولت ہے کہ ان کے قدمون پر نثار کیجا رہی ہے، اور عیش و نشاط کی دیوی ہے کہ ہر وقت ان کے پہلو سے وابستہ نظر آتی ہے۔ مین نہین سمجھ سکتا کہ غریب اہل ہند کی وہ کمائی جو پسینہ مین ڈوب کر حاصل ہوتی ہے، کیون بلا کسی محنت و استحقاقِ مُزد کے ان مولویون، پیرون، سیدون پنڈتون، جوتشیون اور برہمنون کو دیدیجائے جو ایک متعدی مرض کے جراثیم کی طرح صرف وبا اور ہلاکت پھیلانے کے لئے رونما ہوئے ہین

کیا اسمبلی کے کسی ہندو یا مسلمان ممبر مین یہ جرأت ہے کہ وہ اس مسئلہ کو پیش کر کے تکمیل کی حد تک پہونچائے؟

نیاز

ہندی اور بابلی علم الاصنام کی مشابہت

(بہ سلسلہ ماسبق)

۷۔ بھیم

گلگمیش اور ایع بانی قدیم بابل کے دو بڑے بڑے ہیرو تھے۔ اہل بابل کی متھیا میں ان دونون (اور خصوصاً گلگمیش) کا وُہی رتبہ تھا جو یونان مین ہرقل کا اور ہمارے ملک مین بھیم کا تھا۔ بابل کے یہ دونون ہیرو ایک دوسرے کے بہت گہرے دوست تھے۔ ایک ہفتخوان کو طے کرنے کے دوران مین ایع بانی کو موت کے دیوتا نے گرفتار کرکے زمین کے نیچے کے طبقہ مین مُردون کی سرزمین کو روانہ کر دیا (یعنی ایع بانی مرگیا) اور گلگمیش بھی بیماری مین مبتلا ہو گیا، تو مؤخر الذکر نے تہیہ کیا کہ وہ کسی نہ کسی طرح اپنے جد بزرگ پیر نپشتیم سے (جو زمین کے نیچے کی دنیا مین سمندر مین رہتا تھا) ملکر مدد لیگا اور اپنی اس پریشانی کو دور کریگا۔ چنانچہ وہ اس ارادہ سے نکلا، اور بڑے بڑے سر بفلک پہاڑون اور اُن کی دشوار گزار گھاٹیون سے گزرتا، قدم قدم پر خونخوار شیرون سے لڑتا اور انھین قتل کرتا ہوا مشتی پہاڑ کی ایک تنگ و تاریک سرنگ پر پہنچا جس کے دروازہ پر ایک بڑے سے بچھو کی شکل کے دیو اور اُس کی دیونی سے سابقہ ہوا۔ گلگمیش اُنھین دیکھتے ہی غش کھاکے گر پڑا۔ مگر چونکہ وہ جانتے تھے کہ گلگمیش دیوتا کا بچہ ہے اور دیوتاؤن کا سا جسم رکھتا ہے، اس لئے اُنھون نے اُسے کچھ ایذا نہین دی، ہوش مین آیا تو دیونے اس کے سفر کا مقصد دریافت کیا، اور معلوم کرنے پر اُسے بڑے پیار سے اور تمام دشواریون سے آگاہ کرکے اُن پر قابو پانے اور زندہ سلامت منزل مقصود تک پہنچ جانے کا طریقہ بتایا۔ چنانچہ گلگمیش ان ہدایتون پر عمل کرتا اور طرح طرح کی دشواریون (خصوصاً "موت کے سمندر" کی آفتون) سے بچتا ہوا آخر پیر نپشتیم کے پاس پہنچ گیا۔ وہ پیر کو جوان اور مضبوط چاق چوبند دیکھ کر بہت حیران ہوا۔ اس سے نہ رہا گیا اور پیر سے سوال کیا کہ "آپ باوجود اتنے سن رسیدہ ہونے کے اب تک کیونکر ایسے مضبوط اور جوان ہین؟" اس سوال کے جواب مین پیر نے اُسے طوفان کا قصہ سنایا (جو ادھر بیان ہو چکا ہے)۔ اس کے بعد گلگمیش نے اپنی ساری رام کہانی سنائی کہ کس طرح ایع بانی جیسے ہمدم وہمراز کا ساتھ چھوٹا اور وہ خود کیسی کیسی بیماریون مین مبتلا رہا اور کیا کیا آفتین جھیل کر وہ وہان تک پہنچا۔ چونکہ بہت تھک چکا تھا، سو گیا۔ پیر کی بیوی کو اُس پر بڑا ترس آیا، اور اُس نے اپنے شوہر سے کہا کہ "اس لڑکے کو اپنے ہاتھ سے چھو دیجئے تاکہ اس کی سب بیماریان دُور ہو جائین اور اسے جادو کا کھانا کھلا دیجئے تاکہ وہ پھر صحت اور سلامتی کے ساتھ اپنے گھر واپس پہنچ جائے۔" چنانچہ ابھی گلگمیش سو ہی رہا تھا کہ پیر نے اُسے چھُوا، اور پیر کی بیوی نے جادو سے تیار کی ہوئی غذا بھی اُسی حالت مین کھلا دی۔ گلگمیش جاگا تو اپنے اندر ایک نئی طاقت نئی روح محسوس کرتا تھا لیکن بوڑھے پیر کو اس پر بھی صبر نہ ہوا اور اُس نے گلگمیش کو "آب حیات" کے چشمے پر غسل کرنے کو بھیج دیا۔ اس غسل سے اُس کے جسم کی تمام بیماریان دور ہو گئین اور وہ پہلے سے بھی زیادہ تندرست اور توانا ہو گیا۔

مہابھارت (بان پرب) مین بھیم کے متعلق بھی اسی قسم کی روایت درج ہے۔ بھیم نے بھی گلگمیش کی طرح کُبیر کے چشمے کی تلاش مین

جہان اُسے معلوم ہوا تھا کہ ایسے ایسے سُندر کنول پھول ہوتے ہین کہ دھرتی والون نے کبھی سُننے مین بھی نہ دیکھے ہون اور اُن کو دیکھنے اور چھُونے سے ساری تھکن دُور ہو کر نیا زور اور بل پیدا ہوجاتا ہے۔ دیو لوک تک پہنچنے کے لئے اُتر پورب کی طرف سفر کیا جس طرح گلگمیش کو پیر نپشتیم نے طوفان کا قصہ سنایا تھا اُسی طرح بھیم کو ہنومان جی مل گئے تھے اور اُنھون نے اُسے دنیا کی عمر کا حال بتایا تھا اور طوفان کی کہانی سنائی تھی جس نے اُس وقت سے پہلے کی سب نسلون کا ستیاناس کردیا تھا۔ بھیم بھی کبیر تال پر پہنچ کر دیو ون سے لڑا تھا، اور گلگمیش کی طرح اُسے بھی کبیر مین نہانے اور اُس کے امرت کے پینے سے ایک نیا بل نیا زور مل گیا تھا اور اُس کے جسم کے سارے گھاؤ اچھے ہوگئے تھے

بابلی تھیا مین گلگمیش کے سرنگ کو پار کرنے کی جو کہانی ہے (جس کا اوپر مختصر سا ذکر ہوا ہے) وہ ہندی متھیا کی اس کہانی سے بہت مشابہ ہے جس مین لنکا کا راجا راون سیتا جی کو اُٹھا کرلے گیا تھا اور ہنومان جی سیتا جی کی تلاش مین ایک بڑے ملبے سے غار کو پار کر کے ایک جوگن کے محل پر پہنچے تھے۔ ہنومان جی نے سری رام چندر جی سے کہا تھا کہ "مہاراج" مین نے راجا جنک کی بیٹی کو دیکھا ہے۔ جب ہم دکھن کے پہاڑون غارون اور جنگلون مین گھومتے گھومتے تھک گئے تو ہمین ایک بڑا سا غار دکھائی دیا۔ ہم اُس غار مین گھُس گئے۔ اندر پہنچ کے معلوم ہوا کہ غار بہت گہرا ہے۔ چارون طرف گھُپ اندھیرا تھا۔ ہر طرف بڑے بڑے درخت تھے، اور زمین پر بھانت بھانت کے بھیانک کیڑے مکوڑے رینگتے پھرتے تھے۔ بڑی بڑی آفتون کا سامنا کر کے ہم نے اُس غار کو پار کیا، دور تک نکل جانے کے بعد ہمین سورج کی روشنی دکھائی دی اور ایک بڑی سی گڑھی نظر پڑی۔ یہ مایا دیوی کی گڑھی تھی۔ اُس مین پربھاوتی نام ایک جوگن اپنی تپسیا مین مشغول تھی۔ اُس نے ہمین طرح طرح کھانے پینے کی چیزین دین۔ جب ہم کھا پی چکے اور تازہ دم ہوگئے تو جوگن کے بتائے ہوئے راستے پر چل کھڑے ہوئے۔ جب ہم اُس غار سے نکلے تو ہمین ایک سمندر نظر آیا جس کے کنارے پر تین پہاڑ تھے۔ ہم نے اُن مین سے ایک پہاڑ پر کھڑے ہو کر دیکھا تو سامنے ایک بہت بڑا سا سمندر دکھائی دیا۔ تب تو ہم لوگ اپنی زندگی سے مایوس ہوگئے اور ہمین کسی طرح کی امید نہین رہ گئی کہ اب ہم اپنے گھر واپس پہنچ سکینگے۔.....
وغیرہ وغیرہ۔ اُسی جگہ ہنومان جی اور اُن کے ساتھیون کو ایک بڑا سا عقاب ملا، جس نے انھین بتایا کہ ہونہ ہو سیتا جی کو راون ہی لے گیا ہوگا۔ مگر ان مین اس سمندر کو پار کرنے کی ہمت نہ تھی۔ آخر ہنومان جی نے ایک تدبیر سوچی، اور کسی طرح ہوا کے دیوتا وائی کی مدد سے سمندر کے اوپر سے اُڑتے اور راستے مین سب بھوت پریت اور دیو وی کو مارتے ہوئے لنکا پہنچے اور سیتا جی کا پتہ لگا لیا

اب اس کے مقابلے مین گلگمیش اس سرنگ کے پھوٹما جو کیدار اور اُس کی بیوی کی ہدایت پر آگے بڑھا تو اُسے معلوم ہوا کہ وہ پہاڑی سرنگ بارہ میل لمبی تھی اور ہر طرف سوا گھپ اندھیرے کے اور کچھ نہ تھا۔ مگر گلگمیش نے کمر ہمت چست کی اور اُس سرنگ کو کسی نہ کسی طرح پار کرنے کی ٹھان لی۔ وہ آگے بڑھا اور اُس اندھیرے غار مین گھس گیا۔ پورے چوبیس گھنٹے تک طرح طرح کی مصیبتین جھیلنے کے بعد اُسے کچھ روشنی دکھائی دی جسے دیکھتے ہی وہ بے تحاشا بھاگا اور اس سرنگ مین سے نکل گیا۔ اور پھر دن کی روشنی مین پہنچ گیا۔ وہان پہنچ کر اُسے ایک خوشنما اور دلکشا باغ نظر آیا جس کے بیچون بیچ ایک بہت ہی خوبصورت اور بابرکت درخت لگا ہوا تھا۔ اُس کی شاخین طرح طرح کے بیش بہا پتھرون کے گچھون سے لدی ہوئی تھین اور پتے جواہرات کے تھے۔ گلگمیش یہ نظارہ دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ کچھ دیر اسی طرح حیرت سے اُسے دیکھتا رہا، آگے بڑھا تو اُسی قسم کے اور بہت سے درخت اُسے نظر آئے۔ مگر وہ ان سب کو پیچھے چھوڑتا ہوا آگے بڑھا، اور چلتے

چلتے ایک سمندر کے کنارے پر پہنچا یہ " موت کا سمندر" تھا جس ملک مین وہ سمندر تھا جب اُس کی رانی نے اُسے آتے ہوئے دیکھا تو وہ جلدی سے اپنے محل مین گھس گئی اور دروازہ بند کر لیا۔ گلگمیش نے بڑی خوشامدون اور دھمکیون سے دروازہ کھلوایا اور رانی سے آگے کا راستہ دریافت کیا۔ رانی نے کہا کہ " اس بھیانک سمندر کو آج تک کوئی پار نہین کر سکا۔ تم مین اتنی طاقت کہان سے آئی کہ تم موت کی موجون کا مقابلہ کر سکو!" لیکن بہادر سیاح اس پر بھی مایوس نہین ہوا، اور آخر کار رانی کو بتانا ہی پڑا کہ ارد اریع نامی ملاح کی مدد سے اُس سمندر کو پار کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اس نے ارد کو بلایا اور اُسے اپنے ہمراہ کشتی مین بٹھا کے لے چلا۔ یہان پھر اُسے سخت سے سخت آفتین جھیلنی پڑین۔ لیکن وہ اپنے ارادے مین کامیاب ہوا اور پیر نپشتیم سے ملاقات ہو گئی! پیر نے اُسے طوفان کا قصہ سنایا (جو اوپر بیان ہو چکا ہے)...... وغیرہ وغیرہ

۸۔ گرُڑ

گرُڑ ہندی متھیا مین نہ صرف پرندون کا بادشاہ اور وشنو جی کی سواری ہے، بلکہ اُسے ایک دیوتا کا رتبہ بھی حاصل ہے۔ گرُڑ کی مان کو سانپ (جو گرُڑ کے سخت دشمن تھے) اُٹھا کے لے گئے تھے اور اُس بیچاری کو اپنی باندی بنا کر طرح طرح کی ایذائین دیتے تھے۔ گرُڑ نے ہزار جتن کئے، مگر اپنی مان کو ان ظالمون کے پنجے سے نہ چھڑا سکا۔ آخر اُس نے یہ تدبیر نکالی کہ دیوتاؤن کا امرت (آب حیات جس سے دیوتاؤن کو دوامی زندگی حاصل تھی) چُرا کے گیا اور سانپون کی نذر کیا۔ تب کہین جا کے اُس کی مان کو خلاصی نصیب ہوئی۔ جب اندر دیوتا کو معلوم ہوا کہ امرت چوری گیا، تو اُس نے گرج گرج کر گرُڑ پر بجلیان برسانی شروع کین۔ مگر ایک بھی کارگر نہ ہوئی۔ صرف اتنا ہوا کہ گرُڑ کا ایک پر زخمی ہو کر گر گیا، اور بس۔ آخر لاکھ دشواریون کے بعد اندر کو وہ " چاند کا پیالہ " ہاتھ لگا جس مین امرت رکھا رہتا تھا، اور وہ اسی کو لے کر دیولوک کو واپس چلا گیا امرت نہ ملا نہ سہی، غنیمت ہوا کہ پیالہ ہی ہاتھ آ گیا!

قریب قریب یہی حال بابل کی متھیا مین زُو پرندے کا ہے، جو آجکل گھوڑا (سپت مکھ اشو) اور بیل (برشب ثور) کے نام سے موسوم ہے۔ وہ لوگ اُسے " بدکار " اور " بدی کا سر اُٹھانے والا " کہتے تھے۔ ایک مرتبہ اُس کے جی مین آئی کہ کسی طرح دیوتاؤن پر حکومت کرنا اور اُن پر زور چلانا چاہیئے۔ اس غرض سے اُس نے خداؤن کے خدا (مہادیو؟) ئیل کے گھر مین سے " لوحِ تقدیر " کو (جس کے ذریعہ وہ سب دنیا دارون کی قسمتون اور تقدیرون کو اپنے دست قدرت مین رکھتا تھا) چُرا کرے بھاگا، اور سیدھا عرب پہنچ کر ایک پہاڑ کی چوٹی پر دم لیا۔ انُو دیوتا نے گرجنے والے دیوتا رمنؔ (ہندی اِندر) سے درخواست کی کہ وہ زُو پر حملہ کر کے اُسے تباہ کر دے۔ لیکن رمن ڈر کے جھجک گیا اور حملہ نہ کر سکا۔ اسی طرح اور سب دیوتا بھی کانون پر ہاتھ دھر کے الگ ہو گئے اور کسی کی اتنی ہمت نہ ہوئی کہ زُو پر حملہ کر کے " لوح تقدیر " اُس سے چھین لینا۔ آخر جب کسی سے کچھ نہ ہو سکا تو چاند کا دیوتا عرب جا کر زُو سے لوح کو چھین لانے کے ارادہ سے روانہ ہوا...... (افسوس کہ قدیم روایات سے یہ پتہ نہین چلتا کہ اس کے بعد چاند دیوتا اور زو کا کیا حشر ہوا)

بابل کی متھیا مین دو بڑے بیر (بلکہ انھین مہابیر اور راج بیر کہنا زیادہ مناسب ہوگا) گلگمیش اور اینکی تھے ان دونون کے

بارے مین کہا جاتا ہے کہ بادشاہ تھے، اور دونون نیچے والی دُنیا (پاتال؟) کے سفر کو گئے تھے۔ ایتن وہان سے "پیدائش کا پودا" لانے کے لئے گیا تھا اور گلگمیش "زندگی کا پودا" لانے کی نیت سے۔ ایتن نے ایک بڑے سے دیونما عقاب سے مدد لی، جو ہمارے ہندی گرڑ کی طرح سانپون کا دشمن تھا۔ اور جس طرح ہندوستان مین وشنوجی مہاراج گرڑ کی پیٹھ پر سوار ہوتے تھے اُسی طرح ایتن بھی اس بابلی عقاب پر سوار ہو گیا تھا۔ ایک اور موقع پر جب ایتن نے سب سے اوپر کے آسمان (عرش؟) کا سفر کرنا چاہا تھا تب بھی اُس نے اسی عقاب سے مدد مانگی تھی۔ اس استمداد پر عقاب نے کہا کہ "ہان دوست، مین بڑی خوشی سے تمھین سب سے اوپر کے آسمان تک لے چلونگا۔ اپنے سینے کو میرے سینے پر اور اپنے بازوؤن کو میرے پرون پر رکھ دو اور اپنے جسم کو میرے جسم سے ملا کر بالکل ایک کردو، اور چلے چلو!" چنانچہ ایتن نے ایسا ہی کیا، اور عقاب[1] سے اپنے شہپرون پر اس طرح چسپان کئے ہوئے اوپر کو اڑا، دو گھنٹے تک اُڑتے رہنے کے بعد عقاب نے ایتن سے کہا کہ "ذرا نیچے دیکھو" ایتن نے دیکھا کہ سمندر زمین کو چارون طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ عقاب اور بلند ہوا، اور دو گھنٹے کے بعد اُس نے ایتن سے پھر کہا کہ نیچے دیکھو، اب کے اُس مہابیرنے دیکھا کہ سمندر زمین کو بالکل ایک پٹی کی طرح گھیرے ہوئے ہے۔ عقاب اور اونچا اڑا، اور پھر دو گھنٹے کے بعد ایتن نے دیکھا کہ سارا سمندر ایک چھوٹے سے تالاب کے برابر رہ گیا ہے۔ اتنی دیر (چھ گھنٹے) مین وہ دونون انُ، بَعل اور ایع کے آسمان پر پہنچ گئے، جہان ایتن کو آرام اور سایہ کی جگہ مل گئی۔ کچھ سستانے کے بعد عقاب پھر ایتن کو لے کر اڑا، اور سیدھا آسمان کی ملکہ (اور سب سے بڑی دیوی) اشتر کے آسمان کی طرف چلا۔ اس اثنا مین اُس نے پھر دو دو گھنٹے کے بعد ایتن سے نیچے دیکھنے کو کہا اور ایتن برابر دیکھتا رہا کہ زمین کس طرح جلدی جلدی سکڑ رہی ہے! اس کے بعد کچھ حادثہ پیش آیا، اور عقاب بجائے اُونچا ہونے کے نیچے کو گرنے لگا[2]۔ اور گرتے گرتے دھڑام سے زمین پر آرہا۔ عقاب کے تو پرخچے اڑ گئے، لیکن ایتن (غالبًا) زندہ سلامت بچ گیا

ہمارے گرڑ کے ساتھ ایسا حادثہ تو نہین ہوا، لیکن دو واقعات اُس سے منسوب کئے جاتے ہین۔ (۱) ایک دفعہ وشنوجی مہاراج اُس پر سوار چلے جارہے تھے۔ راستے مین ایک جگہ انھون نے اپنے داہنے بازو سے (جو تمام کائنات سے زیادہ وزنی تھا!) اُسے دبایا تو اس بوجھ سے اُس کے کچھ پر جھڑ گئے۔ (۲) رامائن شریف مین گرڑ کے دو بیٹون کا ذکر آتا ہے۔ اُن مین سے ایک کو راون نے زخمی کر کے مار ڈالا تھا، اور دوسرا سری رام چندر جی مہاراج کو زخمی بلکہ نیم مردہ حالت مین پڑا ہوا ملا تھا۔ اُس نے آنجناب سے بیان کیا تھا کہ "ایک دفعہ ہم دونون بھائی ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے کی شرط بد کے سورج کی طرف اُڑے۔ سورج کے قریب پہنچ کر میرے تو پر جل گئے۔ مگر میرے بھائی کے پر بچ گئے۔ مین یہان اس پہاڑ پر گر پڑا، اور اب تک ان برے حالون مین یہان پڑا ہون!"

اس ضمن مین اسی نوع کی دو اور دلچسپ روایتین بیان کرنا بیجا نہ ہوگا جو عرب کے (مُسلم!) باشندون مین عام طور پر رائج تھین (اور غالبًا اب بھی ہین)۔ ایک تو بابل کے بادشاہ نمرود کے متعلق ہے کہ جب حضرت ابراہیم نے اُسے ایک خدا کی عبادت کرنے کی دعوت دی تو اُس نے ایک بہت بلند مینار بنوایا تاکہ اُس پر چڑھ کر "ابراہیم کے خدا" کو دیکھ سکے۔ لیکن جب خدا کی قدرت سے یہ مینار بننے کے بعد گر گیا، تو وہ ایک صندوق مین بیٹھ کر اسے چار بڑے بڑے دیو صفت پرندے اڑا کر اوپر لے گئے۔ دور کی بلندی تک پہنچنے کے بعد

[1] اگر یک سرموی برتر پرم ۔۔۔۔ [2] فروغ تجلی بسوزد پرم!

وہ اس زور سے ایک پہاڑ پر گرا کہ پہاڑ بھی ہل گیا! ـــــ دوسری روایت سکندر ذوالقرنین کی ہے کہ اُس نے "ملک ظلمات" مین عقاب سے بھی زیادہ بڑے بڑے پرندے پال رکھے تھے۔ ایک مرتبہ اُس نے اپنے چار سپاہیون کو حکم دیا کہ ان پرندون پر بیٹھ کر اڑین اور آسمان کی خبر لائین۔ چنانچہ وہ اڑے اور اوپر سے "زندہ لوگون کے ملک" کی خبرین لائے۔ اسی طرح سکندر کے متعلق حبشی روایتون مین ایک روایت یہ بھی ہے کہ اُسے زمین کی لمبائی چوڑائی کا پورا حال معلوم تھا، اور اس علم کے حاصل کرنے کی تدبیر اُس نے یہ نکالی تھی کہ اُس نے اپنے آپ کو بہت ہی چھوٹا سا بنا لیا اور ایک عقاب کی پیٹھ پر سوار ہو کر اڑا اور آسمانون کی سب سے اونچی بلندیون تک پہنچ کر وہان کے سب حالات کی تحقیق کر کے واپس آ گیا!

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، گرڑ وشنوجی کی برق پا سواری تھی۔ وشنوجی کی اس سواری کے عالم کی جو مورتیان ہین اُن مین وشنوجی کے ہاتھ مین ایک چکر نظر آتا ہے جو ایک آتشین چکر ہے اور ہر وقت بڑی تیزی سے گھومتا رہتا ہے۔ مہابھارت (آدی پرب) مین لکھا ہے کہ وشنوجی مہاراج نے گرڑ کو اپنی رتھ پر جھنڈے کی چوب پر بٹھا لیا اور فرمایا "اب تم اسی طرح میرے اوپر بیٹھے رہا کرو گے" یہی حال بابل کے دیوتا شمش (سورج دیوتا)، مہادیوی اشتر اور چند اور دیوتاؤن کا بھی ہے۔ اُن کے ہاتھون مین بھی چکر ہوتے ہین، جو حیات جاوید کا نشان ہوتے ہین۔ خاص کر شمس دیوتا کی مورتی اس طرح بنائی جاتی تھی کہ وہ ستون دار محل مین اپنے تخت پر بیٹھا ہے اور اُس کے سامنے سورج کا چکر ہے۔ اس چکر (یا پہیے) کے ارے لہردار ہوتے تھے اور ہر لہر یا تین تین خطون سے بنایا جاتا تھا

اسی طرح ایران کے قدیم کتبون مین وہان کے بادشاہون کے سرون کے اوپر ہرمزد خدا ایک پردار پہیے یا چکر کے اندر منڈلاتا ہوا نظر آتا ہے!

۹- کرن

ہماری مہابھارت کا زبردست بیر اور سورما کرن رانی پرتھا کا بیٹا تھا۔ اتفاق سے سورج دیوتا کی نظر رانی جی پر جا پڑی تھی اور وہ ہزار جان سے اُن پر عاشق ہو گیا تھا۔ جب اس عشق کا نتیجہ کرن کی صورت مین نمودار ہوا تو رانی نے ایک ٹوکری کی ناؤ بنائی اور اس معصوم کو اُس ٹوکری مین رکھ کر ندی کے سپرد کر دیا۔ وہ اُسے بہا کر گنگا مائی کے پاس لے گئی اور اُن کے حوالہ کر دیا۔ گنگا جی نے اُسے انگ راج تک پہونچا دیا، جہان ایک عورت نے اُسے اُٹھا لیا اور اپنے شوہر کے پاس لے گئی۔ کرن اپنے ان نئے مان باپ کی شفقت کے سایہ مین پل کر پروان چڑھا، اور ایک زبردست جنگجو سپاہی اور سپاہ سالار ہو کر آخر کار انگ راج کا راجا ہو گیا

قدیم اسیریا مین بھی ایک لڑکی دیوداسی بنا کر سورج دیوتا شمش کے نام پر مندر مین بٹھا دی گئی تھی۔ اُسے بھی سورج دیوتا نے سُرغون نام ایک بیٹا عطا کیا تھا۔ اس شرم کی ماری مان نے بھی اپنے لال کو ایک چھوٹی سی ناؤ مین رکھ کر دریا کے سپرد کر دیا تھا۔ خُدا جانے کتنی دور نکل جانے پر کسی غریب کسان نے اُسے اُٹھا لیا اور بیٹا بنا کر پالا۔ جیسے کرن کو گنگا مائی نے برکت دی تھی، اسی طرح اشتر دیوی نے سرغون کی مدد کی، اور وہ جوان ہو کر نہ صرف ایک بے باک اور دلاور سپاہی ہو گیا بلکہ بہت جلد اپنے قوت بازو سے اسیریا کا بادشاہ بن گیا۔ اُس زمانہ کی تاریخ (جیسی کچھ بھی ہم تک پہنچی ہے) گواہ ہے کہ وہ اسیریا کے نہایت زبردست اور جلیل القدر حکمرانون

مین سے تھا[لہ]

۱۰۔ لکشمی

اہل بابل کے ہان اشتر دیوی زرخیزی اور پیداوار کے دیوتا کی ماں تھی۔ ہمارے ملک مین لکشمی جی نے پہلے وشنوجی مہاراج سے، پھر سرونی دیوی کے نام سے برہماجی سے، بیان کیا تھا اور (پُران کے ایک بیان کے مطابق) دنیا کی ماں تھین (ہین!) اور ہمیشہ ہمیشہ زندہ سلامت رہینگی

۱۱۔ شکنتلا

قدیم ہندوستان کی حسن و عشق کی روایتون مین شکنتلا کو جو رتبہ حاصل ہے اُس سے ہندوستان کا ہر شخص واقف ہے، وہ مینکا نام ایک اپسرا کے بطن سے ایک بڑے رشی وشوامتر کی بیٹی تھی اور مالنی ندی کے کنارے کسی مقام پر پیدا ہوئی تھی۔ مینکا اُسے ندی کے کنارے چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ ایسے ہو کے مقام مین جہان ہر وقت شیرون اور بھیڑیون کا خطرہ رہتا تھا، خدا نے اُس کی حفاظت کے لئے بہت سے گدھ بھیج دئے تھے جو ہر وقت اُس کے گرد حلقہ باندھے بیٹھے رہتے تھے اور اُس کی نگہبانی کرتے تھے۔ کئی دن کے بعد ایک خدا ترس بزرگ کا وہان گزر ہوا۔ وہ اُسے اُٹھا کے اپنے گھر لے گیا اور بڑے چاؤ چوچلے سے اُس کی پرورش کی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وغیرہ وغیرہ

بابل کی ملکہ سیمی رامس کا واقعہ بھی اسی نوعیت کا ہے۔ اُس کی ماں بھی اس زمین کی رہنے والی نہ تھی، بلکہ آسمان ہی سے نازل ہوئی تھی۔ وہ بھی اپنی اس بچی کو پیدائش کے بعد ایک درخت کے نیچے ڈال کے چلی گئی تھی۔ خدا نے اُس کی نگہداشت کا سامان یون پیدا کیا کہ بہت سی فاختائین ہر وقت اُس کے گرد جمع اور قسم قسم کے نازک پھلون اور پھولون سے اُس کی غذا اور تفریح کا سامان کئے رہتی تھین۔ کئی دن تک اسی طرح فاختاؤن کی حفاظت مین گزر گئے۔ ایک دن اتفاق سے شاہی چرواہا اُدھر جا نکلا اُس نے اُسے وہان پڑا ہوا پاکر اٹھا لیا اور اپنے گھر لے جاکر بیٹی بنا کر پالا

جس طرح شکُنت (پرندہ) کی وجہ سے ہندی لڑکی کا نام شکنتلا رکھا گیا تھا ویسے ہی (غالباً اس سے پہلے) سُمّت (فاختہ) کے سبب سے بابلی لڑکی کا نام بھی سُمّم رَمّت ہوگیا تھا۔ پھر سمم رمت سے بگڑ کر یہ نام سیمی رامس ہوگیا

دونون اپنے اپنے ملکون مین حسن کی دیویان خیال کی جاتی ہین۔ شکنتلا راجا دشینت سے بیاہی گئی اور رانی کھلائی۔ سیمی رامس نینوا کے حاکم اور سپہ سالار اون کے بیاہ مین آئی۔ وہان کا بادشاہ نین اُس پر عاشق ہوگیا اور اُسے اون سے طلب کیا۔ پہلے تو اوُن سے انکار کرتا رہا، لیکن جب دیکھا کہ اُسے نین کے حوالے کر دینے کے سوا اور کوئی چارہ نہین ہے تو خود پھانسی لے کر مر گیا اور سیمی رامس نین کی بیوی بن کر ملکہ ہوگئی۔

۱۲۔ سیتلا

جس طرح ہندوستان مین سیتلا (ماتا، مائی، مہارانی، دیوی) چیچک کی دیوی ہے، اور اس مرض کو دفع کرنے کے لئے اس کی

لہ آپ کو یاد ہوگا کہ یہودیون کے ہان بھی ایک مہابیر اسی طرح ٹوکری کی ناؤ مین رکھ کے چھوڑ دیا تھا، اور گو وہ راجا نہین ہوا مگر راجپوت ضرور ہوگیا تھا، اور اپنی قوم کا سردار اور سپہ سالار بھی تھا۔ ممکن ہے اللہ کے اُس بندے کی کہانی بھی کبھی بیان کرسکون ۱۲

تصوف اسلام پر ایک مورخانہ نظر

(بہ سلسلۂ ماسبق)

امام غزالی کے صوفیانہ تجارب امام غزالی فرماتے ہین اس دور عزلت نشینی مین مجھ پر ایسی ایسی چیزین منکشف ہوئین کہ انھین شمار نہین کر سکتے، دوسرونکے فائدہ کے لئے اتنا بتا دینا چاہتا ہون، کہ مجھے علم یقینی ہو گیا ہے، کہ صرف صوفیہ ہی سلوک الہیہ کے رہرو ہین، اور اور یہ کہ انکے آئین وضوابط سب سے عمدہ انکا طریقہ سب سے یقینی، اور انکے صفات سب سے پاک اور ستودہ ہین، اگر عالم کے عقلا اپنے ذہن فضلا اپنی عقل، اور قانون الہیہ کے ماہرین اسرار، اپنے علم و معرفت کیساتھ مجتمع ہو کر چاہین، کہ مسلک تصوف کے کسی آئین مین تغیر و تبدل یا ترمیم کرین، تو انہین اسکا موقع نہین، صوفیہ نے تمام عملیات خواہ وہ حرکت سے متعلق ہون یا سکون سے، خارجی ہون یا داخلی شمع وحی کی روشنی سے مستفاد ہین، اور روئے زمین پر انوار وحی کے سوا، کوئی دوسری شے ایسی نہین جس سے استفادہ نورانی کیا جائے مختصر یہ کہ انکے پاک مسلک کے متعلق، جو کچھ کہا گیا، وہ یہی ہے، مسلک تصوف کی پہلی تلقین یہ ہے، کہ دماغ کو غیر خدا سے بالکل پاک و صاف کر دیا جائے، اسلئے داخلہ کی کنجی اذان نماز کی طرح (جسکا مقصد یہ ہے کہ اب نماز کے سوا، تمام اعمال ناجائز ہین) یہ ہے کہ دماغ کو سراپا خدا کی یاد مین مستغرق رکھا جائے،

اسکے بعد ایک رہرو طریق، کی نظرون سے حجابات (مادیہ) دور ہو جاتے ہین، اور اس کیلئے لدحانی علم و عرفان کا دروازہ کھول دیا جاتا ہے، طریقت کا وہ رہرو، عالم بیداری ہی مین ملائکہ اور ارواح انبیا کا مشاہدہ کرتا ہے، انکی آوازین سنتا ہے، اور ان سے کسب عرفان کرتا ہے، اسکے بعد اسکی روحانی حالت ایسی ارفع ہونے لگتی ہے، کہ صور و امثال کے حجابات دور ہو جاتے ہین، اور وہ ایک ایسے نشیمن لاہوتیہ مین جاگزین ہوتا ہے، جسکا صحیح مرقع الفاظ مین نہین پیش کر سکتے، قرب الہیہ کی وہ منزل اسکے سامنے ہوتی ہے، جسے بعضون نے "حلول" سے موسوم کیا، بعضون نے "اتحاد" اور "وصول" سے لیکن یہ تمام تعبیرات ناقص ہین، جو اس عالم شہود کی صحیح ترجمانی نہین کر سکتین،

عالم "شہود" اور کیفیت "حال" صوفیہ کا خیال ہے کہ رہرو طریقت کو یہ لذت شہود عالم "حال" مین میسر ہوتی ہے "حال" کے متعلق میکڈونلڈ لکھتا ہے، کہ اس سے وہ نفسیاتی حالت مراد ہے، جسکی تکوین نہ تو کسی سعی کا نتیجہ ہے، اور نہ کوئی ظاہری علت اسکے حدوث کا سبب ہے، یہ ایک احساس ہے، جو قوت ادراک کے مخالف ہے، یہ ایک قریبی شعور ہے، جسے مشتقات علمیہ سے تعبیر نہین کر سکتے، صوفیہ نے لفظ "احوال" کو مسرت و غم، علو و حضیض سے بھی تعبیر کیا ہے، جو عابد کے قلب مین نازل ہوتا ہے، یہ اصطلاح اپنی آخری ترقی یافتہ صورت مین وہ اعلیٰ معنی ظاہر کرتی ہے، جسے بیخودی (Ecstasy) کہتے ہین، جسوقت صوفی احساس خودی سے گزر جاتا ہے، اسے عالم مادی کا شعور باقی نہین رہتا، اسوقت اسے صرف خدا ہی کا شعور ہوتا ہے، یہ کیفیات اسکے ارادہ سے حاصل نہین ہو سکتین بلکہ اس وقت روح آتی اور روانہ ہوتی ہے

ملا شاہ اور مراقبہ ذات

میکڈونلڈ لکھتا ہے، کہ صوفیانہ زندگی کی دوسری مثال ہلوگون کو ہندوستان کے اس دور کی طرف متوجہ کرتی کرتی ہے جب اکبر، جہانگیر، شاہجہان، اور اورنگزیب سریر آرائے حکومت تھے، اس عہد مین ایک نہایت مشہور صوفی گزرے ہین، جو کچھ دنون بلخ مین رہے، کاشمیر مین آئے، اور پھر لاہور مین اقامت کرتی، فرانس کے مشہور مستشرق، وان کریمر کی بدولت آپکی زندگی، اور آپکے اقوال منصہ شہود پر آگئے فاضل مستشرق نے یہ روایات بہ سند متصل حاصل کئے ہین جنھین آپکے ایک مقرب مرید نے ایک کتاب مین جمع کر دیا تھا، یہ جامع روایات (خسرو دہلوی کی طرح) صوفیانہ زندگی گزار رہا تھا، اور دربار مغلیہ مین بھی ایک معزز عہدہ پر فائز تھا، وہ بزرگ حضرت ملا شاہ تھے، جو سنہ ۱۵۸۴ء مین بمقام بدخشان پیدا ہوئے، بلخ اور لاہور مین تعلیم پائی اور سلسلہ قادریہ مین بیعت کرلی، آپ وحدت فی الکثرت کا ذوق صوفیانہ رکھتے تھے، اور لوگونکی ناراضگی اور دل آزاری کے خیال سے اسلام کے ظاہری طریقہ پر بھی عامل تھے، آپکا حلقہ اثر اسقدر مقناطیسی پہلو رکھتا تھا کہ مریدکا ہجوم لگا رہتا، آپ کے متعلق کفروالحاد کا فتوی بھی جاری ہوا، لیکن آپ نے اورنگزیب جیسے ظاہر بین، اور سخت گیر مسلمان کو مالوف رکھا، اور ایک پاک اور مقدس زندگی گزار کر سنہ ۱۶۶۱ء مین بمقام لاہور انتقال کیا،

آپکے مرید اور مولف زندگی کا نام توکل بیگ تھا، جسے آپنے ابتدائے شباب ہی مین صوفیانہ زندگی سے آشنا کیا، توکل بیگ کمالات صوفیانہ کے اس نقطہ پر پہونچا، جہان اس نے نور باطن کا مشاہدہ کیا، اور جہان اسے ہر شے مین وحدت کی جلوہ گری معلوم ہوتی تھی، اور جہان وہ اپنی انفرادی ہستی کو بھی فانی اور ہستی واحد مین جذب ہوکر، باقی تصور کرنے لگا تھا،

توکل بیگ خود اپنی صوفیانہ ریاضت کے متعلق لکھتا ہے، جسے وان کریمر نے فارسی سے فرنچ مین ترجمہ کیا میکڈونلڈ نے فرنچ ہی کا انگریزی ترجمہ کیا تھا، جسے اردو مین پیش کیا جاتا ہے، توکل بیگ لکھتا ہے:-

مینے تمام رات بغیر آنکھ جھپکائے گزار دی، اور ایک لاکھ مرتبہ قرآن مجید کی ایکسو بارہوین سورۃ (سورۃ اخلاص) تلاوت کرنے مین مشغول ہوگیا، یہ عمل مینے چند دنون مین ختم کیا، مشہور ہے کہ اس سورہ مین اسم اعظم ہے، جو شخص اسے ایک لاکھ مرتبہ پڑھیگا، اسکے اثر سے اسکی تمام مرادین بر آوینگی، اسلئے مینے حضرت ملا شاہ کی نظر محبت حاصل کرنے کی غرض سے یہ عمل شروع کر دیا، اور مین عقیدہ راسخ رکھتا تھا، کہ اس سے میری مراد بر آویگی، مینے جسوقت لاکھون مرتبہ یہ سورت پڑھی، میرے مرشد کے دل مین میری ہمدردی پیدا ہوئی، اور آپنے اسوقت سنگھین محمد اپنے خلیفہ کو بھیجکر مجھے اپنے حضور مین طلب کیا، تمام رات آپنے مجھ پر "توجہ" مبذول کی اور مین خود اپنے قلب کی طرف توجہ کرتا رہا، مگر میرے قلب کی عقدہ کشائی نہ ہوسکی،

اس طرح تین راتین گزر گئین، حضرت ملا شاہ اپنی روحانی توجہ صرف فرماتے رہے، لیکن کوئی اثر مرتب نہوا، چوتھی رات ملا شاہ نے کہا کہ سنگھین محمد اور صالح بیگ جو جذبہ "حال" رکھتے تھے، اپنی توجہ کرینگے، انھون نے اس حکم کی پیروی کی، اور مین تمام رات قبلہ رخ ہوکر بیٹھا رہا، اور اپنی تمام قوتین اپنے قلب کی طرف مبذول رکھین، صبح کے وقت کسی قدر نور اور صفائی میرے قلب مین جلوہ گر ہوئی، لیکن مین رنگ یا صورت کی تمیز نہین کرسکتا تھا،

نماز صبح کے بعد مین ان دونو متذکرہ بالا آدمیون کے ساتھ اپنے پیر کے پاس گیا، انھون نے مجھے سلام کیا اور ان دونون آدمیون سے

دریافت کیا کہ میرے لئے انھون نے کیا کیا، تب وہ میری طرف مخاطب ہوئے، اور مجھ سے میرے تجارب کے متعلق سوال کیا، مینے کہا کہ مین قلب کے اندر ایک قسم کی صفائی محسوس کرتا ہون، اسپر شیخ کا چہرہ خوشی سے چمکنے لگا، اور مجھ سے کہا کہ تمھارا قلب مجموعہ محاسن ہونیکے باوجود اس قدر تاریک ہوگیا ہے کہ سمندر نا پیدا کنار کے دو کھوے بھی اسمین نہ تو چمک پیدا کرسکے، نہ جلا، اب وقت آگیا ہے کہ مین خود دکھاؤن کہ یہ کیونکر پاک و صاف ہوجاتا ہے،

اسکے بعد انہون نے مجھے اپنے نزدیک بٹھایا، میرے حواس کا یہ حال تھا کہ جیسے مین مست ہون، میرے مرشد نے مجھے حکم دیا کہ مین آپکی صورت قلب مین متعین کرون، آپنے میری آنکھون پر پٹی باندھ دی، اور کہا کہ مین اپنی تمام دماغی قوتین اپنے قلب پر مجتمع رکھون، مینے ایسا ہی کیا، اور ایک آن مین خدا کی عنایت اور شیخ کے فیضان باطنی سے میرا قلب منکشف ہوگیا، مینے دیکھا کہ میرے اندر الٹے ہوئے پیالہ کی طرح کوئی چیز رکھی تھی، وہ سیدھی ہوگئی، اس سے مجھ مین بے انتہا مسرت پیدا ہوئی مینے مرشد سے کہا کہ اس حجرہ کی طرح جسمین مین آپکے نزدیک بیٹھا ہوا ہون، ایک دوسرا حجرہ خود اپنے اندر دیکھ رہا ہون، اور مجھے ایسا نظر آرہا ہے، جیسے کوئی دوسرا توکل بیگ کسی دوسرے ملا شاہ کے نزدیک بیٹھا ہوا ہے،

تب انھون نے حکم دیا کہ مین آنکھین کھول دون، مینے اپنی ظاہری آنکھون سے انھین اپنے نزدیک بیٹھا ہوا دیکھا اسکے بعد پھر انہون نے میری آنکھون پر پٹی باندھ دی، اور مینے اپنی روحانی آنکھون سے انھین اسی طرح بیٹھا ہوا دیکھا حیرت مین آکر مین پکار اٹھا، یا مرشد! خواہ مین اپنی جسمانی آنکھون سے دیکھون یا روحانی آنکھون سے صرف آپ ہی آپ نظر آتے ہین،

اسکے بعد مینے دیکھا کوئی ترمراتی ہوئی شکل میری طرف چلی آرہی ہے، جب اپنے مرشد سے مینے اسکا تذکرہ کیا تو انھون نے مجھسے کہا کہ اس صورت سے نام دریافت کرنا، مینے اپنے دماغ ہی مین یہ سوال کیا، اور اس صورت نے قلب سے جواب دیا، میرا نام عبدالقادر جیلانی ہے[۱]، مینے اپنے گوش روحانی سے یہ آواز سنی، تب میرے مرشد نے مجھے تلقین کی کہ مین ولی موصوف سے، روحانی استمداد، اور فیض باطنی کی درخواست کرون، جب مینے یہ درخواست کی تو روح نے جواب دیا کہ مین تمھین اپنی امداد تفویض کرچکا ہون، اور یہی وجہ ہے کہ تمھارے قلب کی عقدہ کشائی ہوئی ہے، جذبۂ تشکر سے سرشار ہوکر مینے ولی موصوف کی طرف سے ہر جمعہ کی رات کو کامل قرآن ختم کرلینا لازم کرلیا، اور کامل دو سال تک یہ عمل مینے کیا کبھی ناغہ نہ کیا میرے مرشد ملا شاہ نے کہا، عالم روحانی اپنے کمال حسن کے ساتھ تمھین دکھا یا گیا اب بیخودی کو کامل طور سے اس عالم غائب کے مشاہدۂ عجائب مین مٹاتے رہو

مین سختی کے ساتھ اپنے مرشد کے ہدایات پر عمل پیرا رہتا تھا، اور روز بروز عالم روحانی کا علم مجھے زیادہ ہوتا جاتا تھا، اسکے بعد مینے ایک دن آن حضرت صلعم اور آپکے مخصوص صحابیون کی صورت دیکھی اور ملائکہ اور اولیاء اللہ کی جماعتین میری نظر باطن سے گزرتی تھین اسی صورت سے تین ماہ گزر گئے، اور مین ارتقائے روحانی کے اس نقطہ پر پہونچا، جہان رنگ مٹ جاتا ہے، اسوقت یہ تمام صورتین غائب ہوگئین، اس دور مین

---

[۱] (Proceedings of the Psychical Research Society) مین اس قسم کے اکثر واقعات پائے جاتے ہین، یورپ اور امریکہ مین روحانیات کی ترقی نے اس قسم کے بہتیرے صوفیانہ خیالات کی تصدیق کردی ہے، آجکل میرے ماموں جناب مخدومی سید مظہر الحق صاحب بیرسٹر کو روحانیات کے مطالعہ کا خاص شغف ہے مطبوعات امریکہ و یورپ کی قدیم و جدید تقریباً پانچسو جلدین آپکے کتب خانہ مین اس فن کی کتابین موجود ہین فرماتے تھے کہ ایک ماہر روحانیات خود اپنا مشاہدہ لکھتا ہے، کہ اسنے امام غزالی کی روح سے ملاقات کی، اور انہین زمرد کا ہار پہنے دیکھا، دماغ ہی مین سوال کرنا اور قلب مین جواب پالینا موجودہ (قرأۃ افکار) (Telepathy) نے ثابت کردیا ہے،

میرے مرشد نے کبھی وصل الٰہی اور "باطن" صوفیانہ کی توضیح کرنی ترک نہین کی، لیکن انھون نے مجھے حقیقت کاملہ دکھانا پسند نہین کیا، البتہ ایک برس کے بعد علم حقیقت اور یہ کہ اس سے میری اصلی ہستی کو کیا تعلق ہے، مجھ پر منکشف ہوا، اسوقت میرے قلب مین مفصلہ ذیل اشعار کا الہام ہوا، اور یہان سے غیر شعوری طور پر یہ اشعار میری زبان پر جاری ہوگئے

(میکڈونلڈ نے انگریزی اشعار لکھے ہین جو وان کریمر کے فرانسیسی کا ترجمہ ہے، توکل بیگ کے اشعار ملہمانہ فارسی مین تھے، انگریزی کا خلاصہ ترجمہ حسب ذیل ہے،

مجھے یہ خبر نہ تھی کہ یہ برباد ہوجانے والا جسم صرف آب وخاک کا ایک تودہ ہے، مجھے پتہ نہ تھا کہ قلب، روح، اور جسم مین کیسی کیسی تو تین مجتمع ہین، مین بہت متاسف ہون، کہ میری زندگی کا اس قدر حصہ تیرے (خدا!) بغیر گزر گیا، مین "تم" تھا اور مجھے اسکا علم نہ تھا جب مین نے ملاشاہ سے اس شاعرانہ الہام کا تذکرہ کیا، تو وہ خوش ہوئے کہ اب "اتحاد الٰہیہ" کا خیال میرے دلمین ظاہر ہوا، اور اپنے احباب کو مخاطب کرکے انھون نے کہا، "توکل بیگ نے میرے منہ سے اتحاد الٰہی کی باتین سُنین اور وہ کبھی اسکے رموز کی تکذیب نہین کرینگے، انکی نظر باطن منکشف ہوگئی انکے سامنے رنگ وروپ کا میدان آیا اور وہ اسکی اس منزل پر بھی پہونچے جہان الوان وصور مٹ جاتے ہین، اس شخص کو جو اتحاد الٰہیہ کے ان وادیون سے گزر جاتا ہے، کامل حقیقت کا علم ہوجاتا ہے، پھر نہ تو وہ اپنے شکوک سے گمراہ ہوتا ہے، نہ منکرین کی اغواء سے،

اسکے بعد میکڈونلڈ نے ملاشاہ کے دو شاہی مریدون دارا شکوہ اور بہن فاطمہ کے متعلق توکل بیگ کے بیان کا ترجمہ کیا ہے، فاطمہ نے مشاہدات باطنی، صوفیانہ تجارب، اور علوی روحانی تفصیل سے لکھے ہین ارباب ذوق چاہین تو "رلجس ایٹیچیوڈ اینڈ لائف ان اسلام" کا مطالعہ کرین،

مثال نفس کشی، "ذکر" اور اسکے اسرار ایڈورڈ ولیم لین اپنی اقامت قاہرہ کے زمانہ کی مفصلہ ذیل روایت اپنے ترجمہ الف لیلیٰ کے نوٹ مین لکھتا ہے،

ابو القاسم گیلانی قاہرہ مین میرے ایک دوست تھے، انھون نے درجۂ ولایت کے حاصل کرنے کیلئے جو نفس کشی اور دوسرے ذرایع اختیار کئے تھے، انکا تذکرہ مجھ سے کر رہے تھے، یہ عمل، جبر نفسیہ، اور کامل توکل علی اللہ سے متعلق تھا، انہون نے تلاش مرشد مین اپنا گھر چھوڑ دیا، اور فارس اور اسکے آس پاس کے ممالک مین اور اگر ضرورت ہوئی تو دور دراز مقامات مین) سیر وسفر کرنے کے لئے نکلے، بہت دنون تک وہ انسانی آبادی سے علیحدہ علیحدہ رہے، صبح سے شام تک روزہ رکھتے، اور کسی قدر گھانس یا جنگلی پھل سے افطار کرلیتے، یہانتک کہ بتدریج وہ کل شرب کے تکلفات سے بھی سبکدوش ہوگئے، پہلے انکے پاؤن مین آبلے پڑ گئے، سخت پتھرون سے جگہ بہ جگہ زخمی ہوئے، اور بالکل صلب ہوگئے، مگر غذا کی کمی کے اعتبار سے اصول فطرت کے خلاف انکا جسم اور توانا ہوگیا، اور خواہشات بڑھ گئین، آفتاب کی حدت، اور شانہ پر کالے کالے بال لٹکائے رہتے، اور عریانی جسم سے انکی صورت بھیانک اور دہشتناک معلوم ہوتی تھی، پہلے پہل جب ایک قصبہ مین انکا گزر ہوا، تو لڑکون نے انہین گھیر لیا، اور پتھر برسانے لگے، اسلئے وہ آبادی سے علیحدہ ہوگئے، اور ہمارے قدیم الایام اجداد کی طرح ایک حد تک جسم کو پتون سے چھپایا، اور قبل اسکے کہ پتے سوکھ کر جسم سے علیحدہ ہون وہ شہر چھوڑ دیتے تھے، عموماً انسانی رہگزر سے الگ رہتے، اگر کسی ریگستان مین گزر ہوتا

(جہان نہ جنگلی میوے دستیاب ہوسکتے تھے، نہ پتے) تو آبادی طرف رخ کرتے، اور ایک ٹکڑہ روٹی اور ایک گلاس پانی کسی سخی آدمی سے لیتے،
ایک چیز جس سے خصوصیت کے ساتھ وہ خوف کرتے تھے، یہ تھی کہ کہین، کہ کسی فاسق یا شیطان سے (جو انسانی شکل مین ہو) مدد نہ پہونچے
ایک مرتبہ ایک تپتے ہوئے ویران مقام مین انکا گزر ہوا، تین دن تک انھین کچھ کھانے کو نہ ملا، نہ گھانس کی ایک پتی ملی نہ پانی کا کوئی چشمہ،
تشنگی کا سخت غلبہ تھا، انھون نے دعا کی کہ خدا کسی شخص کو ایک گھڑا پانی لیکر روانہ کرے لیکن ساتھ یہ شرط بھی کی کہ پانی بغدادی گھڑے مین ہو
تاکہ مین جان لون کہ یہ تیری طرف سے ہے، شیطان کی طرف سے نہین ہے، اور جب مین اس سے پینے کے لئے مانگون، تو وہ اسے میرے سر پر ڈال دے
تاکہ مین اپنے نفس امارہ کو زیادہ آسودہ نہ کرسکون، مینے پیچھے پلٹ کر دیکھا تو ایک آدمی سبز بغدادی گھڑے مین پانی لئے ہوئے آرہا تھا مینے جب
اس سے پینے کیلئے مانگا تو اس نے میرے سر پر بہا دیا، اور روانہ ہوگیا، اللہ کی قسم ایسا ہوا، اس معجزانہ کرامت کو انھون نے درجات ولایت کا
ایک حصہ سمجھا، پانی سے وہ تازہ دم ہوگئے اور منازل ریگستان طے کرنا شروع کئے، لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد پھر تشنگی کا غلبہ ہوا، اور انھین
ایسا معلوم ہونے لگا کہ اب وہ بیہوش ہوجاوینگے، کہ سامنے ایک پہاڑی نظر آئی، اور اسکے دامن مین ایک جھرنا جاری تھا، انھون نے نفس
کشی کی غرض سے پانی پینے کے قبل پہاڑ کی چوٹی پر چڑھنے کا ارادہ کیا، جہان وہ بڑی وقت سے تمام دن کی محنت کے بعد پہونچے، وہ قلہ کوہ پر
کھڑے تھے کہ انھون نے سوارونکی ایک جماعت دیکھی جو دامن کوہ کے نزدیک آکر ٹھہر گئی، انکا سردار جو آگے آگے تھا، انکا نام لیکر بولا، اے ابو القاسم
لے گیلانی نیچے آؤ، اور پانی پیو، لیکن میرے دوست نے اس خیال سے کہ وہ ابلیس ہے، اور اسکے رفقا اسکی اولاد ہین، انھون نے خواہش رد کی
یہانتک کہ یہ فریبی اپنی جماعت کے ساتھ روانہ ہوا، اور نظر سے غائب ہوگیا، آفتاب غروب ہوگیا، اور انکی تشنگی مین بھی کچھ کمی ہوگئی تھی، پھر گو
انھون نے پانی کے چند قطرے پئے، دشت پیمائی کرتے کرتے انکا گزر ایک سنگلاخ مین ہوا، جہان انھون نے ایک ضعیف العمر شخص کو بیٹھے ہوئے
دیکھا، انکی داڑھی لانبی اور سفید تھی، بزرگ نے انھین مخاطب کرکے دریافت کیا، کہ کس چیز کی تلاش ہے؟ انھون نے کہا کہ مین ایک روحانی مرشد
کی تلاش مین ہون، اور میرا دل کہہ رہا ہے، مجھے جسکی تلاش ہے، وہ آپ ہی ہین، بزرگ نے کہا میرے بچے، تم سامنے ایک بزرگ کا مقبرہ دیکھ رہے ہو
یہ وہ جگہ ہے، جہان دعا کا جواب ملتا ہے، وہان جاؤ اور مقبرہ کے اندر بیٹھو، نہ کھاؤ نہ پیو اور نہ استراحت کرو، بلکہ رات دن آہستہ آہستہ
لا الٰہ الا اللہ کا ورد رکھو دیکھو، ذی روح مخلوق تمھاری جنبش لب دیکھ نہ سکے، کیونکہ اس وظیفہ کے مخصوص صفات مین ایک یہ ہے
کہ ورد مین لب کو کوئی جنبش نہ ہو، جاؤ تم پر سلامتی ہو" میرے دوست کہتے تھے حسب ارشاد مین وہان گیا تو دیکھا ایک چھوٹی سی مربع
عمارت ہے، جس مین ایک گنبد ہے، اور دروازہ کھلا ہوا ہے، مین اندر جاکر بیٹھ گیا اور طاق اور مخروطی شکل کی عمارت کی طرف جو قبر پر
بنی ہوئی تھی اپنا رخ کرلیا،

یہ شام کا وقت تھا، مینے توحید کے یہ خموش مشاغل جس طرح میرے مرشد نے ہدایت کی تھی، شروع کردئے مینے دیکھا کہ ایک دھندلے رنگ
کی کوئی صورت میرے پہلو مین بیٹھی ہے، اور مجھے میری ریاضت عابدانہ مین مدد دے رہی ہے مینے اسے مس کرنے کے لئے اپنے ہاتھ پھیلائے، لیکن
مجھے معلوم ہوا، کہ یہ کوئی مادی ذات نہین ہا اینہمہ وہ صورت وہان موجود تھی، مینے اچھی طرح دیکھا، اس نظارہ سے مجھے ترغیب ہوئی، اور
مین اپنے عمل مین بلا وقفہ شبانہ روز مشغول رہا، نہ مین کچھ کھاتا تھا نہ پیتا تھا، پھر بھی میری روحانی طاقت روز افزون تھی، تیسرے دن

میں مقبرہ کی سفید دیواروں، زمین اور ہوا میں، اور جس طرف میں نظر اوٹھا کر دیکھتا تھا لا الہ الا اللہ لکھا ہوا پاتا، اور جب کبھی ایک مکھی مقبرہ میں داخل ہوتی تھی تو وہ بھی اپنے رقص پرواز سے یہی کلمہ لکھ دیتی تھی، خدا کی قسم ایسا ہوا، اب میرا مقصد کامل طور سے حاصل ہوگیا میں نے دیکھا کہ مجھے علم مابعد الطبیعۃ حاصل ہوگیا ہے، احباب اور ارباب تعارف کے خیالات مجھے ستاتے نہ تھے لیکن ہر دوست جو فارس، ہند، عرب، ترکستان میں تھا، اور جو کچھ وہ کر رہا تھا میرے پیش نظر معلوم ہوتا تھا مجھے ایک ناقابل بیان مسرت حاصل ہوئی .... یہ حالت چند سال تک باقی رہی، لیکن آخرکار میں دنیاوی اغراض کے فریب میں مبتلا ہوگیا، میں اس ملک میں آیا ایک خطاط کی حیثیت سے میری شہرت ہوتی، اور حکومت نے مجھے ایک منصب بھی عطا کیا، اب دیکھو یہ شال ہے، یہ الماس کی بنی ہوئی چیز میرے سینہ پر ہے میں ضعیف ہوگیا اب خوف ہوتا ہے کہ مجھے نفس کشی کے ان مصائب کی برداشت نہ ہوگی، جن سے بہت حقیقی حاصل ہو، گو میں نے ارادہ کرلیا ہے، کہ میں ایک بار کوشش کرونگا"

لین کہتا ہے، اس گفتگو کے تھوڑے ہی دن کے بعد میرے دوست منصب سے برطرف کردئے گئے، انھیں طاعون ہوگیا اور اسی میں انہوں نے انتقال کیا، لین نے اسکے بعد تنقید کی ہے، اور وہ کہتا ہے، کہ میرے دوست سچ مچ کچھ عرصہ تک بادیہ پیما عابد کی طرح زندگی گزار رہے تھے، اور چونکہ انہوں نے نفس کشی کی تکلیفیں جھیلیں، جسکے ساتھ جوش عقیدت کا تلازم تھا، تو بہت ممکن ہے، انکی قوت مصورہ میں بدنظمی ہوگئی ہو، اور انہوں نے سچ مچ یہ عجیب وغریب مناظر دیکھے ہوں، کیونکہ جب وہ بیان کر رہے تھے تو لہجہ ادا میں ایک خاص قسم کی آرزو، اور اخلاص پایا جاتا تھا، جسے ایک کاذب عمداً انہیں برت سکتا، لین ایک یوروپین تھا، جسکے لئے مادہ نوازی امر ناگزیر ہے، تخیلات کے عجائب در مابعد الطبیعۃ کا انوکھا پن اسکے نزدیک نہ تو قابل اعتماد ہے نہ لائق تسلیم اس نے ابوالقاسم گیلانی کے تجربات کو اختلال مصورہ کا نتیجہ بتایا، ہر چند اسے اپنے دوست کی حق گوئی اور راستبازی کا اعتراف ہے، اہل مذاق واقعہ کی اہمیت سمجھ لیں،

طریقت کی منزل افتتاحیہ

میکڈونلڈ نے صوفی لٹریچر کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد اس بحث عنوان کی ایسی جامع تلخیص کی ہے، کہ موجودہ دور کے انگریز مستشرق ڈاکٹر نکلسن نے بھی جنکا مذاق صوفیانہ اور مطالعہ تصوف عقیدت اور پرستش کی حد تک پہونچ گیا ہے، اپنی مایہ ناز کتاب "صوفیائے اسلام" کے باب اول میں میکڈونلڈ کی اس فاضلانہ تحریر کا اقتباس دیدیا ہے، میکڈونلڈ لکھتا ہے،

"رہرو طریقت کو چاہئے کہ تعلقات دنیا ترک کردے، اور اپنا دل ان سے خالی رکھے، اسے نہ کنبہ کا تردد ہو نہ دولت کی فکر، نہ بچوں کا خیال ہو نہ گھر کا غم، یہانتک کہ علم ظاہری کی طلب، حکومت کی تمنا، اور حوصلہ مندیوں کی شورش بھی مفقود ہو جائے، اسے قلب میں ایسی کیفیت پیدا کرلینی چاہئے، کہ اسکے نزدیک کسی شے کا وجود و عدم دونو یکساں معلوم ہوں، اسکے بعد اسے ایک گوشہ میں بیٹھنا چاہئے، اور اپنا مذہبی عمل صرف فرائض تک محدود رکھنا چاہئے، اسوقت اسے نہ تو قرآن مجید کی تلاوت کرنی چاہئے، نہ اسکے معانی ومطالب پر غور وفکر، نہ احادیث کا مطالعہ کرنا چاہئے، نہ اس قسم کی دوسری کتابوں کا، اسے جائزہ لیتے رہنا چاہئے کہ اللہ جل شانہ کے سوا کوئی دوسری شے اسکے دماغ میں داخل نہو، اور ایک گوشہ عزلت میں بیٹھکر مسلسل "اللہ اللہ" کا ورد رکھنا چاہئے، خیال اسی پر جمع رہے، عاقبت الامر، اسپر ایک ایسی کیفیت طاری ہوگی، جیسے اسکے زبان کی حرکت بند ہوگئی ہے، اور اسے معلوم ہوگا گویا یہ لفظ اسکی زبان سے بہ گیا اسے اسمیں استقلال رکھنا چاہئے، یہانتک کہ کامل طور سے زبان کی حرکت مفقود ہو جائے، اسمیں بھی اسے مستقل رہنا چاہئے، یہانتک کہ لفظ کی شکل، اسکے حروف

اور ہیئت قلب سے نکل جائین اور صرف ایک خیال رہجائے اسے ایسا معلوم ہونے لگے، جیسے اسکے قلب مین چھپا ہوا ہے، اور اس سے علحدہ نہین ہو سکتا، اس قدر عمل رہرو طریق کے ارادہ اور مرضی پر موقوف ہے، اس کیفیت کا قایم رکھنا، اور اغوائے شیطانیہ کو مسترد کرنا، اسکے زیر تصرف ہوتا ہے لیکن رحم ایزدی کا ایصال اسکے ارادہ یا مرضی سے بالاتر ہے، اب اسے صرف ایک امید وارانہ انتظار رکھنا چاہیئے، کہ خدا اسکے قلب مین کیا کشف کرتا ہے، جیسا کہ خدا نے اس طور سے انبیا اور اولیا کے ساتھ سلوک کیا ہے، اگر ایک رہرو طریقت مفصلہ بالا عمل پورا کرے تو اسے امیدوار رہنا چاہئے کہ اسکے قلب مین لمعان حقیقت کی ضیا باریان ہونگی، پہلے پہل یہ نور حقیقت نا استوار ہوتا ہے، برق کی چمک کی طرح یہ پیدا ہوکر غائب ہو جاتا ہے، گو بعض اوقات یہ قیام پذیر بھی ہوتا ہے اور جب یہ واپس آتا ہے، تو اسکی واپسی کبھی دیرپا ہوتی ہے کبھی اگریزپا، جس طرح سے اولیاء اللہ کے عادات و خصائل مختلف ہین اسی طرح انکا حصول کمالات بھی مختلف ہوتا ہے۔

ڈاکٹر نکلسن نے بھی اس ضمن مین علامہ ہجویری کی کتاب "کشف المحجوب" سے مفصلہ ذیل بحث اپنی کتاب صوفیائے اسلام مین نقل کی ہے، علامہ ہجویری کہتے ہین،

طریقت صوفیہ مین جب کوئی شخص داخل ہونا چاہتا ہے، تو شیوخ اسے تین سال تک تعلیم روحانی دیا کرتے ہین، اگر وہ انکے ارشادات تربیت پر کاربند ہوتا ہے، تو بہتر، ورنہ وہ سلسلہ طریقت مین نہین داخل کرتے پہلا سال مخلوق کی خدمت مین بسر ہوتا ہے، دوسرا سال عبادت الٰہی مین، اور تیسرا سال خود اپنے جائزہ قلب مین رہرو طریق اسوقت مخلوق کی خدمت کر سکتا ہے، جب وہ خود کو ایک خادم اور تمام خلایق کو مخدوم تصور کرے، اسے بلا استثناء یہ خیال رکھنا چاہئے کہ تمام افراد اس سے بہتر ہین، اور اسے اپنا فرض سمجھکر تمام لوگونکی یکسان خدمت کرنی چاہئے، اور وہ خدا کی عبادت اسی وقت کر سکتا ہے، جب اسکے تمام اغراض خواہ وہ موجودہ زندگی سے متعلق ہون، یا آخرت سے، مٹ جائین اور اسے چاہئے کہ خدا کی عبادت صرف خدا کیلئے کرے، چونکہ جو شخص کسی شے کیلئے خدا کی عبادت کرتا ہے، وہ خود اپنی عبادت کرتا ہے، نہ کہ خدا کی کوئی شخص اپنے قلب کا جائزہ اسی وقت لے سکتا ہے، جب اسکے خیالات مجتمع ہون، اور تمام ترددات فنا ہو جائین، اسلئے وہ اس قابل ہو جائے کہ قرب الٰہیہ مین اپنے قلب کو بے توجہی کی یورشون سے محفوظ رکھ سکے، جب مبتدی یہ صفات پیدا کر لیتا ہے، تو اسے حق ہے کہ نقال کی طرح نہین بلکہ ایک سچے صوفی کی طرح مرقع پہنے،

حضرت شبلیؒ اور جنید بغدادیؒ کا مکالمہ

"صوفیائے اسلام" مین حضرت شبلی اور جنید بغدادی کا ایک مکالمہ بھی پایا جاتا ہے حضرت شبلی، حضرت جنیدؒ کے پاس آئے، اور کہا کہ مینے سنا ہے کہ آپکے پاس علم الٰہی کی موتیان ہین، خواہ آپ مجھے عطا کیجئے یا فروخت کیجئے حضرت جنید نے جواب دیا، کہ مین اسے فروخت نہین کر سکتا، چونکہ تمھارے پاس اسقدر متاع ہی نہین کہ قیمت ادا کر سکو اور اگر مین تمھین یونہین دیدون تو مفت کی چیز سمجھکر تم اسکی قدر نہ کروگے جاؤ میری ہی طرح اس بحر زخار مین سر کے بل شناوری کرو، یہانتک کہ تمھین صبر و استقامت کی مدت گزارنے کے بعد وہ موتی حاصل ہوجائے حضرت شبلی نے کہا تو مجھے کیا کرنا چاہئے، کہا جاؤ ایک سال تک گندھک فروخت کرو ایک سال کے اختتام پر حضرت جنیدؒ نے کہا اس تجارت نے تمھین مشہور کر دیا ہے جاؤ اب درویشی اختیار کرو، اور صرف گداگری کرتے رہو، ایک سال تک حضرت شبلیؒ بغداد کی گلیون مین مارے مارے پھرتے رہے، راہگیر ان سے بھیک مانگتے، لیکن انکی طرف

کوئی مختونہوتا، اسکے بعد وہ اپنے مرشد حضرت جنید کے پاس آئے، وہ بول اوٹھے، اب دیکھو اہل دنیا کی نظر مین تمھاری کیا وقعت کیا ہے، تم اپنا دماغ انکی طرف متوجہ نہ کرو، اور نہ انکی باتو نکا کچھ خیال رکھو، تم چیمبرلین تھے، اور ایک عامل (گورنر) کی حیثیت سے صوبہ پر حکمرانی کی اس ملک مین جاؤ اور جن جن لوگون کے ساتھ تمنے خطا کی ہے، ان سے معافی چاہو، حضرت شبلیؒ نے چار برس تک دروازہ دروازہ جاکر سب سے معافی مانگی، صرف انھین ایک آدمی کا پتہ نہ معلوم نہ ہوسکا، مراجعت کی، تو حضرت جنید نے کہا، ابھی تک تمھارے دل مین شہرت و عزت کا خیال ہے، جاؤ، ایک سال تک بھیک مانگو، حضرت شبلیؒ تمام دن بھیک مانگتے، اور اسے اپنے مرشد کے پاس لاتے، وہ اسے فقرا اور مساکین مین تقسیم کردیتے، اور شبلی کو دوسری صبح تک بھوکا رکھتے، جب اس طرح ایک سال گزر گیا، تو حضرت جنید بغدادی نے انہین اپنا مرید بنایا اور یہ شرط کی کہ ایک خادم کی طرح انہین مخلوق کی خدمت انجام دینی ہوگی، ایک سال کی خدمت کے بعد حضرت جنیدؒ نے ان سے پوچھا، "اب تم خود کو کیا خیال کرتے ہو؟" شبلی نے جواب دیا "مین اب خدا کی تمام مخلوقات مین اپنے کو سب سے ذلیل سمجھتا ہون، مرشد نے کہا "اب تمھارا ایمان راسخ ہوگیا"

طریقت کے عملیات لازمہ | صاحب کتاب اللمع لکھتے ہین کہ طریقت مین سات "مقامات" ہین، توبہ، پرہیز، انقطاع، افلاس، صبر، توکل، قناعت یہ تو تصوف کے زاہدانہ اور اخلاقی تعلیم کے متعلق ہین "احوال" اسی طرح کا ایک نفسیاتی سلسلہ ہے جس مین مراقبہ، قرب (الہی) عشق، خوف، امید، خواہش، رفاقت، اطمینان، تصور، اور یقین داخل ہین "مقامات" اور "احوال" مین یہ فرق ہے، کہ سابق الذکر کا حصول سعی انسانی پر موقوف ہے، اور آخر الذکر روحانی احساسات اور اخلاق ہین جن پر انسان متصرف نہین ہوسکتا انکا ورود قلب پر خدا کی طرف سے ہوتا ہے، جب انکا نزول ہوتا ہے، تو انسان انہین مسترد نہین کرسکتا، اور جب وہ جاتے ہین تو انسان انہین روک نہین سکتا، طریقت صوفیہ اسوقت ختم نہین ہوسکتی، جب تک ایک رہرو طریق ان تمام مقامات کو طے نہ کرلے، اور جب تک ہر مقام مین کامل نہو جائے، خدا بھی اسے اس دور مین لذت "احوال" سے علی قدر مراتب مستفیض کرتا ہے، ان تمام مراحل کے طے کرلینے کے بعد صوفی، حیات شاعرہ کی اس سطح عالی پر پہونچ جاتا ہے، جسے معرفت و حقیقت سے تعبیر کرتے ہین، جہان طالب ایک عارف کی شکل مین منتقل ہوتا ہے، اور اسے محسوس ہوتا ہے، کہ عرفان، عارف اور معروف (معلوم) ایک ہی شے کی مختلف تعبیرات مجازی ہین، (باقی)

سید عبد المالک آروی

لکھنؤ کے عہد شباب کی ایک شاعرہ

نواب بیگم حجاب

جن حضرات نے تاریخ اودھ کا مطالعہ کیا ہے، وہ اس حقیقت سے بے خبر نہ ہونگے کہ نواب شجاع الدولہ سے لیکر جانعالم واجد علی شاہ تک زمانہ کیسا رنگین و عیش کوش گزرا ہے

یوں تو برہان الملک نواب سعادت علی خان ہی کے زمانہ سے صوبۂ اودھ پر سلطنت دہلی کا کوئی خاص اقتدار قایم نہ رہا تھا، لیکن شجاع الدولہ نے تو کھلم کھلا اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا اور وہ تمام آزادیاں جو ایک مطلق العنان فرمانروا کی طرف سے ظاہر ہو سکتی ہین اوسکی طرف سے ظاہر ہونے لگین۔ اس مین شک نہین کہ شجاع الدولہ کا زمانہ بدامنی و برہمی کا زمانہ تھا اور کوئی صورت اطمینان و سکون کی ایسی ظاہر نہ ہوئی تھی کہ وہ پوری طرح داد عیش دے سکتا، لیکن اس اضطراب و بے چینی کے عالم مین بھی جب اس کو موقعہ ملا نہین چوکا اور اپنے بعد آنے والون کے لئے اس منزل کی راہ متعین کر گیا جس سے پورا لطف حاصل کرنا قدرت نے واجد علی شاہ کی قسمت مین لکھ دیا تھا

بہرحال خدا معلوم سلطنت اودھ کی بنیاد کس ساعت مین ہوئی تھی کہ اس کا ایک فرمانروا بھی جذبۂ عشرت و نشاط سے معرا نظر نہین آتا اور جس وقت اسی سلسلہ مین ہم جانعالم واجد علی شاہ کے عہد پر پہونچتے ہین تو وہ تمام کہانیان جو راجہ اندر سے منسوب کیجاتی ہین ایک تاریخی حقیقت ہو کر رہجاتی ہین

یہ مسئلہ حقایق مسلمہ سے ہے کہ فرمانروا کے ذوق و مشاغل کا اثر رعایا پر بہت پڑتا ہے، اس لئے اگر واجد علی شاہ کے عہد مین سارا لکھنؤ ایک بلدۂ شعر و موسیقی، اک شہر حسن و محبت نظر آتا تھا تو جائے حیرت نہین کیونکہ خود جانعالم کی زندگی کا کوئی لمحہ اس نشۂ جان بخش سے خالی نہ گزرتا تھا۔ یہی سبب ہے کہ اس عہد کی شاعری بھی اس سے پوری طرح متاثر ہوئی اور اس کا معیار جلوۂ کوہ طور سے اتر کر نظارۂ لب بام تک آگیا۔ اور بجائے کیفیات حقیقت خروش کے جذبات معصیت کوش نظر آنے لگے

واجد علی شاہ نہ صرف اچھے مغنی اور بے مثل رقاص تھے بلکہ قادر الکلام شاعر بھی تھے اور اپنے جذبات و خیالات کو بغیر کسی اخفا کے نظم کرنے مین قدرت کاملہ رکھتے تھے۔ انھون نے اپنے واقعات شباب و سرخوشی کو نہ صرف پوری عریانی کے ساتھ نظم کیا بلکہ انکی اشاعت بھی چاہی جس کو جرأت اخلاقی بھی کہہ سکتے ہین اور بے غیرتی و بے حیائی بھی۔ بہرحال اُس وقت واجد علی شاہ نے ایک ایسی عجیب و غریب فضا لکھنؤ مین پیدا کر دی تھی جسے روما کے صنامی دور سے تشبیہ دی جاسکتی ہے اور کوئی گھر ایسا نہ تھا جو اس احساس سے خالی رہا ہو

کہ دور شاہ شجاع ست مے دلیر بنوش

گھر گھر مجالس لطف و نشاط کا قیام، گوشہ گوشہ مین رندان بادہ کوش کا اژدہام، ہر ہر بام سے حسن دلنواز کی جلوہ فروشی

اور ہر ہر گلی مین عشق کی تپش اندوزی ہر شام کو شب عیش کے اسباب کی فراہمی مین وہ افراط گویا صبح تک زندہ رہنا نہین اور ہر صبح آیندہ شام کیلئے وہ اہتمام کہ شاید کبھی مرنا نہین - گدا سے لیکر شاہ تک کی آنکھ مین سرسون پھولی ہوئی تھی اور جدھر دیکھئے قاقم و سنجاب کے پردون کے اوٹ مین ایرانی قالینون پر، حریری چادرون کے اندر حسن و شباب اس طرح مدہوش پڑے تھے، جیسے اس رات کی کبھی صبح ہونا ہی نہین ہے ظاہر ہے کہ جب سارا شہر اس رنگ مین رچا ہو تو ...... خود جانعالم نے حسن و شباب سے انتقام لینے کے لئے کیا کچھ نہ کیا ہوگا - اور اس کے ماحول مین جتنی بھی رنگینی رہی ہو کم ہے

جانعالم کے حریم خاص مین جن نازنینان پری پیکر کا ہر وقت جمگھٹ رہتا تھا اُن مین سے ہر ایک بادشاہ کے ذوق کو پورا کرنے والی تھی اور یہی سبب ہے کہ ان مین مغنیہ اور شاعرہ اکثر تھین

بادشاہ کے محلون کے علاوہ شاہی خاندان کی خواتین اور امرازادیان بھی اس ذوق سے خالی نہ تھین اور انھین مین سے ایک شاہ غازی الدین حیدر کے وزیر نواب معتمد الدولہ بہادر کی پوتی اور داروغہ عظم علیخان کی بیٹی تھی جس کا نام نواب بیگم عرفیت چھوٹی بیگم اور تخلص حجاب تھا

بعض تذکرہ نویسون نے جن مین سے ایک ہمارے عزیز دوست مولوی عبد الباری آسی بھی ہین لکھا ہے کہ یہ واجد علی شاہ کی بیوی تھی اور مٹیابرج ان کے ساتھ گئی تھی، حالانکہ یہ بالکل خلاف حقیقت ہے - نواب بیگم کا نہ واجد علی شاہ کے نکاح مین آنا تاریخ سے ثابت ہے اور نہ حرم مین داخل ہونا ظاہر ہوتا ہے - تذکرۂ چمن انداز مین واجد علی شاہ کی ایک بیوی کا ذکر جس کا تخلص عالم تھا - حجاب کے تحت مین کر دیا ہے اور اس کے بعد ہی نواب بیگم حجاب کا ذکر ہے معلوم ہوتا ہے کہ جناب آسی نے دونون حجاب کے واقعات و حالات کو ایک کر دیا اور اس طرح یہ غلطی رونما ہوئی -

نواب بیگم حجاب کا دیوان جس مین ۱۰۵ غزلین معہ تین تضمینون اور دو چار قطعات و رباعیات کے پائی جاتی ہین ۱۲۹۰ھ مین مطبع حسینی اثنا عشری لکھنؤ مین حسب ارشاد نواب مرزا علی امجد خان قیصر معروف بہ قیصر مرزا نبیرۂ نواب احمد علی خان خزانہ دار نواب آصف الدولہ طبع ہوا اور اس کا تاریخی نام تحریر عاشق رکھا گیا جس سے ۱۲۸۹ھ کے عدد نکلتے ہین یعنی ۱۲۸۹ھ مین یہ دیوان مرتب ہوا اور ۱۲۹۰ھ مین چھپ کر طیار ہوا - چونکہ حجاب کی ولادت ۱۲۵۹ھ مین ہوئی تھی جیسا کہ اس کے تاریخ تولد اور سجع کے حسب ذیل شعر سے ظاہر ہوتا ہے

وقت نزول آیۂ تطہیر کھُل گیا زہرا کو رب نے آج کیا اشرف النساء ۱۲۵۹

اس لئے طبع دیوان کے وقت حجاب کی عمر ۳۰ سال کی ہوگی

حجاب کے دیوان مین ایک مخمس، واجد علی شاہ کی بیوی عالم کی غزل پر بھی پایا جاتا ہے اور شروع مین عالم کے بعد اعلی اللہ سلطنتہا کے الفاظ بھی درج ہین جس سے ثابت ہوتا ہے کہ نواب بیگم حجاب واجد علی شاہ کی بیوی نہ تھی ورنہ وہ اپنی سوکن کی غزل پر تضمین نہ لکھتی اور لکھتی بھی تو مساوی درجہ رکھنے کی حیثیت سے اعلی اللہ سلطنتہا کے الفاظ کا اضافہ نہ کرتی

حجاب کا یہ دیوان اب کمیاب ہے اور بالکل اتفاق سے ہات آگیا ہے اس لئے مناسب سمجھتا ہون کہ اسکا مختصر سا انتخاب

یہاں دیدیا جائے۔

حجاب کا رنگ شاعری وہی ہے جو اُس زمانہ مین ہر جگہ نظر آتا تھا، لیکن بعض بعض اشعار خوب ہین۔ حجاب خود شاعر تھی اس کے ثبوت مین صرف ایک غزل پیش کرنا کافی ہے جو شروع سے اخیر تک نسائی لب ولہجہ اور نسائی جذبات سے معمور ہے۔ وہ غزل یہ ہے

خفا ابھی سے نہ ہو مدعا سنو تو سہی ــــ قبول کرنا نہ کرنا بھلا سنو تو سہی
رقیبون کی تو شب روز سنتے ہو باتین ــــ ہماری بھی کبھی اے مہ لقا سنو تو سہی
نہین یہ خوب کہ سنتے نہین کسی کی تم ــــ یہ دیکھو کہ مین کہتا ہون کیا سنو تو سہی
خطا تو میری بتا دو جو روٹھے جاتے ہو ــــ بگڑتے کس لئے ہو کیا ہوا سنو تو سہی
جواب دو کہ نہ دو اے بتو نہین پروا ــــ کہون جو کچھ وہ برائے خدا سنو تو سہی
نہ رحم آئے جو تم کو تو میری قسمت ہے ــــ تم اپنے دل سے میری التجا سنو تو سہی
معاف کرنے کو کہتا نہین مین صاحب سے ــــ یہ چاہتا ہون کہ عذر خطا سنو تو سہی

حجاب کو تو زمانہ مین جانتے ہین سب
مگر جو کہتے ہین تمکو ذرا سنو تو سہی

بعض بعض شعر لکھنوی رنگ سے ہٹکر کہے گئے ہین اور خوب ہین مثلاً

آگے سے بھی زیادہ بیقراری اندنون ــــ شکل پہچانی نہین جاتی ہماری اندنون

جو اس نے کہا گو وہی کرتے گئے ہمتو ــــ اسپر بھی نگاہون سے اترتے گئے ہمتو
وہ خلق سے پیش آئے یہ تھی ان کی عنایت ــــ گردن کو جھکائے ہوئے ڈرتے گئے ہمتو

خود کبھی پوچھین وہ احوال یہ عادت ہی نہین ــــ ہم جو کچھ آپ سے کہتے ہین گلا ہوتا ہے

خط دلدار کے آنے سے کبھو تکر دل ذرا ٹھیرے ــــ خدا جانے کہ پھر وقت ملاقات اس سے کیا ٹھیرے
رہے بتخانہ مین برسون نہ کعبہ مین ذرا ٹھیرے ــــ غرض تھی دل کے بہلانے سے جس جا دل لگا ٹھیرے

کہین گے اس کو نہ اچھا برا حجاب کبھی ــــ بیان کرینگے کسی سے نہ اپنے یار کا حال

بعض اشعار اور قابل داد ہین مثلاً

مین نے تو کوئی بات نہین ایسی کہی تھی
غیرون سے بھرا تھا کہ جو وہ بندہ پہ برسا

تم سے بتلائین کیا کہ فرقت مین
صدمے دلپر گزرتے ہین کیسا کیا
بُت کو خوفِ خدا حجاب نہین
ہم صنم سے بھی ڈرتے ہین کیا کیا

اے حجابؔ آج تو سوتا ہے وہ غافل کیسا
بخت جاگے ہین ذرا یار کو دیکھا ہوتا

دامن محبوب تک پہونچا نہ جب دست جنون
بڑھ گیا ناچار اپنے ہی گریبان کی طرف

مہینون ہوگئے صاحب کہانتک آزماؤ گے
گلے لگ جاؤ کیا ہر روز کا جھگڑا لگا ہے

گل پھولے ہین اس شوخ نے مہندی جو ملی ہے
جو پور ہے اونگلی مین وہ لالہ کی کلی ہے

اس زمین کا یہ شعر خصوصیت کے ساتھ قابل تحسین ہے:-

کچھ خوف خدا کیجئے اس طرح نہ چلئے
سو بار تو اس چال پہ تلوار چلی ہے

تذکرون مین اس کا صرف ایک یہ شعر نظر آتا ہے:-

بنکے تصویر حجابؔ اس کو سراپا دیکھو
منہ سے بولو نہ کچھ آنکھون سے تماشہ دیکھو

نیاز

شہاب کی سرگزشت

حکومت برطانیہ کی وسعت کا راز

اور

قبضۂ ہندوستان کی دلچسپ داستان

(بہ سلسلہ ماسبق)

ہم ہندوستان پر کس طرح حکومت کرتے ہین

مین نے اس تعلق کی نوعیت پر جو ہندوستان کو انگلینڈ کے ساتھ حاصل ہے غور کیا ہے اور یہ ظاہر کر چکا ہون کہ کیونکر بغیر معجزہ کے ایسا تعلق پیدا ہونا ممکن تھا۔ اب ہم ایک قدم اور آگے بڑھتے ہین اور اس مسئلہ پر غور کرتے ہین کہ آیا یہ تعلق اُسی طرح قائم رہیگا یا یہ کہ ہندوستان مین انگریزون کی حکومت کو ہم ایک سیاسی شعبدہ سمجھین جو اپنے زمانۂ قیام تک تو ہمارے لئے موجب حیرت ضرور ہے لیکن اسکا قیام پائدار نہین۔ سب سے بڑی دشواری ہندوستانی معاملات کے مطالعہ مین ایک طالب علم کو یہ پیش آتی ہے کہ وہ اس قدر عجیب اتنے بعید اور ایسے وسیع واقعات کے چکاچوند کر دینے والے اثر سے متاثر ہو کر یہ سمجھنے لگتا ہے کہ ہندوستان مین معمولی اسباب کی بنا پر واقعات کا رونما ہونا ممکن ہی نہین ہے، بلکہ اس خطہ مین جو کچھ ہے سراسر معجزہ ہے۔ تاریخ نویسی کا ادیبانہ انداز تحریر اس فریب کو اور مزید تقویت پہونچاتا ہے کیونکہ سلطنت ہند کے حیرت انگیز اور عجیب خط وخال کی نمائش کا شوق مورخین کو بہت زیادہ ہوتا ہے جس سے نتائج تک پہونچنا اور زیادہ دشوار ہو جاتا ہے۔

چنانچہ اسی مغالطہ کی بنا پر ہم خیال کرنے لگے ہین کہ ہندوستان پر ہمارا تسلط عام قواعد سے مستثنیٰ بالکل ایک سیاسی معجزہ ہے جس کا فخر انگریزی قوم کی دلیرانہ خصوصیات اور اسکی فطری قابلیت حکمرانی کو حاصل ہوتا ہے۔ جب تک ہمارا خیال یہ رہیگا ہم اُسکے قیام کی مدت کے متعلق کوئی رائے قائم کرنے سے قاصر رہین گے۔ جو چیز ابتدا مین معجزہ تھی یقیناً آخر تک معجزہ رہیگی۔ اگر عام اصول اس معاملہ مین معطل تھے تو کون کہہ سکتا ہے یہ تعطل کب تک باقی رہیگا۔ مین نے سلطنت کے آغاز پر متانت کیساتھ غور کرنیکی کوشش کی ہے۔ مین نے فتح ہندوستان کے مسئلہ پر بہت غور کیا ہے، اور اس مین شک نہین کہ فتح اس معنی مین ضرور حیرت انگیز تھی کہ ہمارا تجربہ ایسی کوئی بڑی نظیر پیش نہین کرتا۔ کیونکہ ایشیائی سوسائٹی کا انقلاب قدرتاً یورپ سے مختلف ہوتا ہے۔ لیکن اس معنی مین ہرگز حیرت انگیز نہین ہے کہ اُسکے اسباب ناقابل فہم ہین یا انکا پتہ لگانا مشکل ہے۔ اب مین دریافت کرونگا کہ ہندوستان مین ہماری سلطنت آیا اس معنی مین حیرت انگیز ہے یا نہین

اگر ہم یہ تصور کرلین کہ ہندوستان محض ایک مفتوح ملک ہے اور انگریز اُسکے فاتح ہین تو بظاہر یہ خیال صحیح معلوم ہوگا۔ مگر کون نہین جانتا کہ ایک مفتوح قوم کے جذبۂ بے اطمینانی کو دبانا کس قدر دشوار ہوتا ہے۔ اگرچہ فاتح قوم کی فوج بلحاظ تعداد وعمد گی مفتوح قوم سے بہتر ہی کیون نہ ہو لیکن نتیجہ کے لحاظ سے بارہا اس کو ناکامی ہوئی ہے اہل اسپین بڑے بہادر سپاہی تھے اور حکومت اسپین اُس وقت کی ساری

عیسائی سلطنتون سے زبردست تھی تاہم ([illegible]) مین ناکامی رہی۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ جب قومیت کا جذبہ یا غیر مذہب ہونے کا احساس کسی قوم کے تمام افراد مین ساری ہوجاتا ہے اور صرف لڑنے والے افراد تک محدود نہین رہتا تو شجاعت اور عسکریت دونون سے کہین زیادہ کارآمد ثابت ہوتا ہے، آئے اب ہم ہندوستان کی حالت کا اٹلی سے مقابلہ کرین جس جگہ یورپ کے نقشہ مین اٹلی واقع ہے، اُسی جگہ ایشیا کے نقشہ مین ہندوستان پایا جاتا ہے یہ بھی ہندوستان ہی کی طرح براعظم کے جنوب مین ایک جزیرہ نما ہے جس کے اوپر سر بفلک پہاڑون کا سلسلہ ہے اور نیچے مغرب سے مشرق کی جانب ایک بحر ذخار موجین لیتا ہے۔ حالات کے لحاظ سے یہ اور بھی ہندوستان سے مشابہ ہے کیونکہ یہ بھی صدیون تک غیر ملکی حملہ آورون کا شکار بنا رہا۔ ابھی زیادہ زمانہ نہین گزرا کہ اٹلی آسٹریا کے زیر حکومت تھا۔ اُس کے باشندے اور فوجین آسٹریا سے بہت ہی کم جنگجو اور تربیت یافتہ تھین۔ حالانکہ آسٹریا بالکل ملحق ہے۔ اگرچہ اٹلی کا پلہ لڑائی مین ہمیشہ ہلکا رہتا تھا پھر بھی آج وہ آزاد ہے۔ اٹلی لڑائیون مین عموماً شکست ہی کھایا کرتا تھا لیکن قومیت کا جذبہ اٹلی کے اندر اتنا زبردست تھا اور اوسکی وجہ سے غیرون کی اتنی قوی ہمدردی اُسکے ساتھ تھی کہ آخر الامر وہ کامیاب رہا اور اجنبیون نے اسکو اپنے حال پر چھوڑ دیا۔ ہر نقطہ نظر سے ہندوستان کا محل وقوع اُسکے لئے اٹلی سے زیادہ مفید ہے۔ اسکی آبادی انگلینڈ سے تقریباً ۸ گنا زیادہ ہے، وہ کرۂ زمین کے دوسرے سرے پر واقع ہے۔ علاوہ ازین انگلینڈ کوئی فوجی سلطنت ہونیکی مدعی نہین ہے، باوجود اس کے ہندوستان اُسکی غلامی کا جوا اپنے کندھے پر رکھے ہوئے ہے۔ ہم وہان پر بغاوت کی کوئی خبر نہین سنتے۔ سلطنت ہند کے انتظام مین ہمکو دقتین پیش آتی ہین لیکن خاصکر مالی یا اقتصادی وقت جو آسٹریا کو اٹلی مین پیش آئی ہمارے سامنے نہین ہے یعنی ہمکو ایک مفتوح قوم کے جذبہ مخالف کو دبانا نہین ہے۔ واقعی کیا یہ ایک معجزہ نہین ہے؟ کیا اس معاملہ مین عام اصول بالکل بے اثر نہین معلوم ہوتے۔ یا اس سے ہم یہ سمجھین کہ یا تو ہندوستانیون کی اطاعت شعاری کی انتہا نہین ہے یا پھر انگریزون کی قابلیت حکمرانی کی۔

اصل سوال یہ ہے کہ ہندوستانی مین قومیت ہے یا نہین اور یہ کہ اس قومیت کو انگلینڈ نے مفتوح کرلیا ہے یا نہین۔

سوال کے جزو اول کا جواب اثبات مین دینا سخت غلطی ہے، اہم یورپ کے باشندے دیکھتے ہین کہ یورپ کا نقشہ مختلف ملکون مین تقسیم ہے۔ ہر ملک کی ایک خاص قومیت اور ایک خاص زبان ہے۔ چونکہ ہم ان باتون کے خوگر ہین اسوجہ سے ایسی زبردست غلط فہمی مین مبتلا ہین۔ ہمارا خیال ہے کہ ہر ملک خواہ وہ یورپ کے اندر ہو یا باہر اگر اسکا کوئی نام ہے تو ضرور اپنی قومیت رکھتا ہوگا۔ لیکن اسی کے ساتھ ہم قومیت کا صحیح مفہوم سمجھنے اور اُسکی تعریف بیان کرنیکی زحمت نہین گوارا کرتے جس طرح ہم یہ کہکر اپنی تشفی کر لیتے ہین کہ اہل انگلینڈ فرانسیسیون کی محکومی سے اور اہل فرانس جرمنون کی محکومی سے کبھی خوش نہین ہوسکتے اُسی طرح ہمارا یہ خیال ہے کہ ہندوستانی انگریزون کی محکومی کو سخت ذلت محسوس کرتے ہونگے لیکن یہ داستان نہین ہے بلکہ بدیہی امر ہے کہ ہر آبادی کی ایک قومیت نہین ہوتی، انگریز اور فرانسیسی محض ایک آبادی سے عبارت نہین ہین بلکہ خاص طریقہ اور خاص قوتون سے متحد ہین۔ اس لئے دیکھنا چاہئے کہ وہی قوت ہندوستانی آبادی مین بھی کارفرما ہے یا نہین

پہلی قوت متحد النسل ہونا ہے جب نسلی اتحاد وسیع پیمانہ پر ہوتا ہے تو لسانی اتحاد پیدا ہوتا ہے۔ انگریزون سے مراد وہ قوم ہے جو انگریزی زبان بولتی ہے اور فرانسیسیون سے وہ جو فرانسیسی زبان بولتی ہے۔ کیا ہندوستان کے باشندے بھی ایک زبان بولتے ہین! اسکا جواب نفی مین ہے۔

جس طرح یورپ کے تمام باشندے ایک زبان نہیں بولتے اسی طرح ہندوستان کے باشندے بھی ایک زبان نہیں بولتے۔ علمائے علم السنہ نے سنسکرت اور دیگر زبانون کے ساتھ اُسکے قریبی تعلق کے بارہ مین بہت زور تحریر دکھلایا ہے لیکن مین یہ کہے بغیر نہین رہ سکتا کہ لسانی اتحاد کیلئے جو شرط سب سے مقدم ہے وہ زبانون کا قابل فہم ہونا ہے نہ کہ انکا باہمی پوشیدہ تعلق۔ چنانچہ اہل اٹلی اسٹریا والون کو اجنبی ہی سمجھتے تھے کیونکہ وہ جرمن زبان نہین سمجھ سکتے تھے انکو اس سے کوئی بحث نہین تھی کہ جرمن اور اطالوی زبانین انڈو یورپین زبانین ہین جس طرح یورپ کی مختلف زبانون مین قریبی تعلق ہے اُسی طرح ہندوستان کی متعدد زبانون مین بھی ہے۔ ہندی زبانون کو یورپ کی (Romance) زبانون سے تشبیہ دیجا سکتی ہے کیونکہ یہ زبانین ایک ہی اصل سے نکلی ہین۔ لیکن بنگالی مرہٹی اور گجراتی زبانون کا قریبی تعلق اُنکے بولنے والون کو ایک قوم نہین بنا سکتا۔ "ہندوستانی" زبان مسلمانون کی فتح کی وجہ سے پیدا ہوئی۔ مسلمان حملہ آورون کی فارسی زبان ہندوستانیون کی ہندی زبان سے گڈمڈ ہوکر ایک نئی زبان ہندوستانی پیدا ہوگئی۔ لیکن جنوب مین ہم ایسا لسانی اختلاف پاتے ہین جسکی مثال یورپ مین بھی نہین ملتی۔ کیونکہ وہان کی بڑی بڑی زبانین تامل تیلگو کناری انڈو۔ یورپین (Indo - European) زبانین نہین ہین۔ اور اُنکے بولنے والون کی تعداد یورپ کی اُن اقوام سے بہت زیادہ ہے جو انڈو یورپین زبانین نہین بولتی ہین

صرف یہی اس بات کی کافی وجہ ہے کہ ہندوستان کو فرانس یا انگلینڈ کی طرح نہین شمار کرنا چاہیے کیونکہ یہ دو قومیتون کے نام ہین ہندوستان کی مثال یورپ سے دیجا سکتی ہے جسکے اندر بہت سی قومین آباد ہین اگرچہ کسی طبعی تقسیم سے ان قومیتون کا ایک مشترک نام پڑ گیا ہے۔ یورپ کی طرح یہ بھی ایک جغرافی اصطلاح ہے لیکن کبھی اس مفہوم مین اسکا استعمال نہین ہوا ہے۔ یورپ کا لفظ اس معنی مین ہیروڈوٹس (Herodotus) کے زمانہ سے مستعمل ہوتا آرہا ہے لیکن ہندوستان سے جو مفہوم ہم اس وقت سمجھتے ہین بہت قدیم نہین ہے چونکہ سارا ملک کوہ ہمالیہ اور کوہ سلیمان کے سلسلون سے بقیہ ایشیا سے علیحدہ ہے اسلئے قدرتی طور پر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ایک نام ہو۔ لیکن ہمیشہ سے یہی خیال نہین رہا ہے۔ چنانچہ یونانیون کا اس ملک کے متعلق بہت مبہم خیال تھا، وہ عرصہ تک یہی سمجھتے تھے کہ انڈیا سے صرف انڈس (Indus) کا صوبہ مراد ہے کیونکہ وہ اسی سے مشتق ہے۔ جب وہ کہتے ہین کہ سکندر نے ہندوستان پر حملہ کیا تو اس سے انکی مراد صوبہ پنجاب سے ہوتی ہے۔ کچھ زمانہ کے بعد اُنکو گنگا کے دوآبہ کے حالات معلوم ہوے لیکن دکن کے متعلق انکو کچھ علم نہ تھا۔ خود ہندوستانیون کو سارے ملک کے لئے ایک نام استعمال کرنا اتنا قدرتی نہین معلوم ہوتا جتنا ہمکو کیونکہ اسکے شمالی اور جنوبی حصون مین بہت نمایان فرق ہے۔ آرین قوم جو سنسکرت بولتی تھی اور جسنے برہمنیت کی بنیاد ڈالی خاص کر پنجاب میں وہ گنگا کی وادی مین آباد ہوی ابتداً زیادہ جنوب کی سمت نہین پھیلی۔ اسلئے لفظ ہندوستان صحیح طور سے اُسی شمالی خطہ کا نام ہے۔ جنوب مین یعنی جزیرہ نمائے ہند مین دوسری قومین آباد ہین جنکی زبان غیر آرین ہے (اگرچہ اب برہمنیت وہان بھی پھیل گئی ہے) سلطنت مغلیہ اپنے عروج کے زمانہ مین بھی اس خطہ مین زیادہ دور تک نہین پھیل سکی تھی

اس سے معلوم ہوا کہ ہندوستان کوئی سیاسی نام نہین بلکہ یورپ یا افریقہ کی طرح ایک جغرافی اصطلاح ہے اُسے کسی خاص قوم اور زبان کا ملک نہین سمجھا جاتا بلکہ بہت سی قومون اور زبانون کا۔ یہ ہے اساسی فرق ہندوستان اور دوسرے ممالک مین

قومیت ایک سے زیادہ عناصر سے مرکب ہوتی ہے جس کا ایک عنصر ہم خون ہونے کا احساس ہے اور دوسرا عنصر اشتراک مفاد کا جسکے اور ایک سیاسی جمعیت قائم کرنیکی صلاحیت ہے۔ یہ عنصر اگرچہ ہندوستان مین کلیۃً مفقود نہین تھا لیکن کمزور ضرور تھا۔ ملک کے طول وعرض کو دیکھکر اس عنصر کا موجود ہونا ناممکن معلوم ہوتا ہے لیکن وہ حد فاصل جو ہندوستان کو باقی دنیا سے علٰحدہ کرتی ہے اتنی مضبوط ہے کہ باوجود خلی تقسیم کے اُسکے ایک کل، ہونے کا مفہوم بہت قدیم سے چلا آرہا ہے۔ محمود غزنی سے پہلے کی جو تاریخ ہے اسمین اکثر لکھا ہے کہ فلان بادشاہ سارے ہندوستان کا مالک تھا، فلان بادشاہ کے قبضہ مین کل ہندوستان تھا، اس کے اسلامی حکومت کے دور اول مین اور سلطنت مغلیہ کے عہد مین سارے ہندوستان کا قبضہ تسلیم کیا جاتا تھا۔ حالانکہ سلطنت مغلیہ کی وسعت کے متعلق بھی یہ خیال مبالغہ سے تہین چہ جائیکہ اس کے پیشتر۔ غور کروکہ سلطنت مغلیہ کی مدت کتنی مختصر تھی، اسکی ابتدا سنہ ۱۵۲۴ء سے قبل نہین کہی جاسکتی، یہ وہ سنہ ہے جب بابر نے لاہور پر قبضہ کیا۔ بالفاظ دیگر سلطنت مغلیہ کی ابتدا ہنری ہشتم کے عہد حکومت سے ہوی۔ واسکوڈی گاما نے جب ہندوستان مین قدم رکھا سلطنت مغلیہ کا وجود بھی نہین تھا۔ اور اُسکے اندر نمایان اور سریع انحطاط سنہ [illegible] یعنی ملکہ اَینی کے عہد سے شروع ہو گیا تھا۔ ان دونون تاریخون مین دو صدی سے بھی کم کا زمانہ ہوتا ہے پھر یہ بھی قابل غور ہے کہ ہندوستان مین بابر کے داخل ہوتے ہی سلطنت مغلیہ نہین شروع ہوگئی۔ بلکہ اسوقت جب مغلون کے حدود سلطنت مین مین ترقی ہوئی سنہ ۱۵۵۹ء مین جب اکبر تخت نشین ہوا یعنی ملکہ الزبتھ کی تخت نشینی کے دوسرے سال سلطنت مغلیہ کے اندر صرف پنجاب، دہلی اور آگرہ کے صوبے تھے۔ اکبر سنہ ۱۵۷۶ سے قبل بنگال نہین فتح کرسکا سندہ اور گجرات کے صوبے سنہ ۱۵۹۱ اور سنہ ۱۵۹۲ کے درمیان فتح ہوے، اسوقت البتہ اکبر کی سلطنت وسیع پیمانہ پر تھی اگر ہم بجاے سنہ ۱۵۲۴ کے سنہ ۱۵۹۴ کو سلطنت مغلیہ کے آغاز کی تاریخ قرار دین تو اسکی مدت ایک صدی سے کچھ ہی زیادہ ہوتی ہے

اب پھر یہ امر قابل غور ہے کہ اس عروج کے زمانہ مین بھی سلطنت مغلیہ کے اندر ہندوستان کے تمام علاقے نہین شامل تھے، اگر ہم اسکے برعکس خیال کرتے ہین تو ہندوستان اور انڈیا (India) کے دو الگ الگ مفہوم خلط ملط ہو جاتے ہین۔ سنہ ۱۵۹۵ء مین اکبر کی سلطنت دریاے نربدا تک پہونچی تھی یعنی اس نے ابھی دکن مین قدم نہین رکھا تھا۔ اسلئے وہ ہندوستان کا شہنشاہ تھا انڈیا کا نہین اکبر نے اپنی حکومت کے آخری سالون مین دکن پر حملہ کیا، اس زمانہ سے نصف جنوبی ہند مین مغلون کی چالبازیان شروع ہوئین۔ لیکن اورنگ زیب کی مہم دکن سے قبل (سنہ ۱۶۸۳) یہ کہنا کہ دکن فتح ہو چکا تھا کسی طرح درست نہین ہے۔ اس وقت سے البتہ ہم کہہ سکتے ہین کہ دکن سلطنت مغلیہ مین داخل تھا یعنی کل ہندوستان صحیح معنون مین ایک حکومت کے ماتحت تھا، ہرچند دکن کی فتح محض برائے نام تھی کیونکہ مرہٹے برابر زور پکڑتے جارہے تھے۔ فتح دکن کے بعد سلطنت کی حیات صرف چند ساعت کی تھی مغلون نے اس توسیع کے بدلے اپنی ساری سلطنت کی تباہی مول لی صرف ۴۴ سال کے اندر اسکا زوال نمایان ہونے لگا اور جیسا کہ میرا خیال ہے یہ تباہی اُسی اولوالعزمانہ مہم کا نتیجہ تھی سلطنت مغلیہ کو ہمیشہ ایک استوار بنیاد اور قومی مرکز کی ضرورت تھی، اُسکے قوٰی کے اضمحلال کی وجہ اسکی توسیع کی احمقانہ کوشش تھی

مختصر یہ کہ انڈیا سواے انگریزون کے کسی کے زمانہ مین ایک حکومت کے ماتحت نہین تھا۔ اور انگریزون نے بھی یہ کام لارڈ ڈلہوزی کی گورنر جنرلی سے قبل تک جسکو ۸۰ سال ہوے، مکمل نہین کیا تھا۔ اسلئے کہ لارڈ موصوف ہی کے عہد مین پنجاب، اودھ اور ناگپور کے صوبے برٹش گورنمنٹ سے ملحق ہوے

قومیت کا دوسرا امتیاز عنصر اتحاد مذہب ہے۔ یہ عنصر یقیناً ہندوستان مین کلیتہً مفقود نہین ہے برہمنیت (ہندو مذہب) سارے ہندوستان مین پھیلی ہوی ہے لیکن یہان صرف یہی ایک مذہب نہین ہے۔ ہندوستان مین ۵ کروڑ سے کم مسلمان نہین ہین، یہ تعداد حکومت ترکی کے مسلمانون سے بھی زیادہ ہے۔ کچھ سکھ مذہب کے لوگ ہین یہ مذہب ہندویت اور اسلام کی آمیزش سے پیدا ہوا ہے! تھوڑے سے عیسائی بھی آباد ہین۔ سیلون اور نیپال مین بودھ مت کے لوگ ہین لیکن برہمنیت غالب آبادی کا مذہب ہے۔ اسکی بنیاد نہایت مضبوط ہے کیونکہ متعدد بار اسکو خطرناک حملون کا مقابلہ کرنا پڑا ہے۔ دنیا کے تبلیغی مذاہب مین بودھ مذہب کا بڑا درجہ ہے۔ یہ ہندوستان ہی مین پیدا ہوا لیکن دور دور تک پھیلا۔ ہمارے پاس اسکا ثبوت موجود ہے کہ چوتھی صدی قبل مسیح مین یہ مذہب ہندوستان مین بڑے عروج پر تھا اور یہ عروج ساتوین صدی عیسوی تک باقی رہا۔ لیکن برہمنیت نے اسکو مغلوب کر لیا اور آج یہ مذہب ایشیا کے باقی حصون مین بہ نسبت اس ملک کے کہین زیادہ سرسبز ہے جسنے اسکو پیدا کیا تھا۔ اسکے بعد برہمنیت کو ایک دوسرے طاقتور اور جابر مذہب سے مقابلہ کرنا پڑا جسکے آگے زردتشت نے سپر ڈالدی اور جسکے مقابل مشرق مین عیسائیت کو چند قدم پیچھے ہٹنا پڑا۔ یہ مذہب اسلام تھا اس موقع پر بھی برہمنیت اپنی جگہ قائم رہی اسلامی حکومت سارے ہندوستان مین پھیل گئی لیکن یہان کے باشندون کو مسلمان نہ بنا سکی

اب میرے خیال مین مذہب ہی سب سے قوی اور اہم عنصر قومیت کی تشکیل مین ہے۔ اور یہ عنصر ہندوستان مین موجود ہے جب کہا جاتا ہے کہ ہندوستان بمقابلہ فرانس یا انگلینڈ یورپ سے زیادہ مشابہ ہے تو ہمکو فراموش نہین کرنا چاہئے کہ یورپ بلحاظ عیسائی مذہب ہونے کے اپنے اندر ہمیشہ سے ایک قسم کا اتحاد رکھتا آیا ہے۔ جو خطرہ کے وقت فوراً اور واضح طور پر رونما ہوگیا۔ چنانچہ قرون وسطی مین جب یورپ کو ایک خونخوار اور رلا مذہب دشمن کا خطرہ لاحق رہتا تھا اس اتحاد کا اظہار ہوجایا کرتا تھا۔ اس سے یہ ثابت ہوسکتا ہے کہ برہمنیت مین ایسے جراثیم ہین جن سے جلد یا بدیر قومیت پیدا ہوسکتی ہے شاید ایسا ہو لیکن اس صورت مین تو اس قومیت کو بہت پہلے پیدا ہوجانا چاہئے تھا۔ کیونکہ اسلامی حملون کے اندر جو پیہم صدیون تک جاری رہے، ان جراثیم کی نشو و نما کے لئے کافی مواد تھا۔ اسلام کے مقابلہ مین برہمنیت کیون اپنی جگہ قائم رہی کیون متحد نہین ہوی؟ اسلئے کہ اسنے کبھی اسکی اہلیت نہین دکھلائی اور نہ کبھی ایسا کیا۔ برہمنیت کو ہندوستان مین فروغ ہوچکا ہے۔ سیواجی سترھوین صدی کے وسط مین پیدا ہوا۔ وہ ایک سردار تھا، اسنے بمبئی کے عقب مین دو ایک پہاڑی قلعون پر قبضہ کرکے مرہٹہ سلطنت قائم کرلی۔ یہ ایک خالص ہندو تحریک تھی اور جون جون اسکی قوت بڑھتی گئی اسمین برہمنون کا اثر و نفوذ ترقی کرتا گیا۔ سلطنت مغلیہ کے زوال سے اس جمعیت کو بڑی قوت پہونچتی گئی یہان تک کہ اٹھارھوین صدی کے وسط مین اسنے قریب قریب سارے ہندوستان کو ڈھک لیا اس سے اندازہ ہوسکتا تھا کہ اس جمعیت کے اندر وہ تخم موجود ہے جس سے ہندوستانی قومیت کا پودا اُگے گا اور برہمنیت ہندؤن کیلئے وہ کام کریگی جو دوسرے مذاہب نے اپنے پیرؤن کیلئے کی ہے۔ لیکن یہ کچھ نہوا اور اسنے حب الوطنی کا جذبہ تک نہ پیدا کیا اس کا سبب یہ ہے کہ بوجہ جامعیت کے کمزور ہونیکے برہمنیت دراصل مذہب نہین ہے بلکہ کئی مذاہب کے درمیان ایک ضعیف سی مفاہمت ہے اور یہی وجہ ہے کہ اسکے اندر اجتماعی اصول کمزور ہے۔ بہرکیف مرہٹون کی تحریک مین کوئی ایسی خصوصیت نہین تھی جسکی وجہ سے ہم اسے ایک اعلی اور قومی تحریک کہہ سکین۔ یہ شروع سے آخر تک غارت گری اور لوٹ مار تھی

الغرض ہندوستان مین قومیت نہین ہے اگرچہ اسکے اندر ایسے جراثیم موجود ہین جنسے ہندوستانی قومیت پیدا ہوسکتی ہے۔ یہی ہے وہ حقیقی سبب جسکے باعث ہندوستان مین ہماری سلطنت قائم ہے ورنہ انگریزی قوم کو کوئی ایسی اعلیٰ فوقیت حاصل نہین ہے۔ اگر ہندستان مین اٹلی کی طرح قومی تحریک پیدا ہوجاے تو انگریزی حکومت اسکا اتنا بھی مقابلہ نہ کرسکے جتنا آسٹریا نے اٹلی مین کیا تھا۔ بلکہ فوراً اس کے سامنے فنا ہوجائے، کیونکہ انگلینڈ کے پاس، جو فوجی سلطنت بھی نہین ہے، کون ایسا سامان ہے جس سے ۲۰ کروڑ رعایا کی بغاوت کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔ کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ جس طرح ہمنے انکو پہلے فتح کیا تھا اُسی طرح پھر فتح کرلین گے۔ لیکن مین بیان کرچکا ہون کہ تم نے انکو فتح نہین کیا ہے مین بتلا چکا ہون کہ جس فوج نے انکو مفتوح کیا اسکا ⅘ حصہ دیسی سپاہ پر مشتمل تھا۔ چونکہ ہندوستان مین قومیت نہین تھی اسلئے ہمکو کرایہ پر سپاہی وہان دستیاب ہوگئے۔ اب اگر قومیت کا کمزور جذبہ بھی پیدا ہوجاے اور اگرچہ اُنکے اندر اجنبیون کو ملک سے نکال باہر کرنے کی پُرزور خواہش نہ بھی پیدا کیجائے تو بھی تمام رعایا کے دل مین یہ خیال پیدا ہونا ناگزیر ہے کہ اپنے ملک پر حکومت کرنے مین غیرون کی امداد کرنا نہایت شرمناک ہے۔ جونہی یہ خیال پیدا ہوا ہماری حکومت کا خاتمہ ہے۔ کیونکہ وہ فوج جو اسکی پشت پناہ ہے ⅘ دیسی سپاہ پر مشتمل ہے تم سوچو اگر حکومت آسٹریا اٹلی پر، اطالوی فوج کی مدد سے قابض ہوتی تو اہل اٹلی کیلئے اسکو اپنے ملک سے خارج کردینا کتنا آسان ہوتا۔ اب فرض کرو کہ ہندوستان مین دیسی سپاہ کی بھرتی ناممکن ہوجائے، تو ایک ہی لمحہ مین ہندوستان پر قابض رہنے کی حقیقت کھل جائیگی۔ ہمارا قبضہ قطعی ناممکن ہوجائیگا۔ ہندوستان مین ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اُسپر بغیر محنت کے قابض رہا جاسکتا ہے جس طرح انگریزی قومنے بغیر خاص کوشش کے اسکو فتح کیا اُسی طرح وہ اسپر متصرف بھی رہیگی۔ ہم اسکو برقرار رکھنے کے لئے کروڑون روپیہ اور بے شمار فوج نہین قربان کرسکتے اور نہ اسکے لئے تیار ہی ہین۔ جس وقت ہندوستان حقیقی طور سے اپنے کو مفتوح سمجھنے لگے گا، جیسا کہ ہم ابھی تک بے پروائی سے سمجھ رہے ہین، اُس وقت ہمکو معلوم ہوجائیگا کہ اسکا قبضہ مین رکھنا ممکن نہین ہے۔

الغرض نظر غور کے سامنے حیرت و اعجاز کا وہ طلسمی سراب جو اس سلطنت کے گرد نظر آتا ہے فوراً غائب ہوجاتا ہے علی الخصوص اُس وقت جب ہم یہ محسوس کرتے ہین کہ باوجودیکہ ہم غیر ملکی حکمران ہین لیکن ایسے فاتح نہین ہین جسکا انحصار اعلیٰ طاقت پر ہو اور چونکہ ہم ہندوستان کے باشندون کی مرضی کے مطابق حکومت نہین کرتے اسلئے لازماً انکی مرضی کے خلاف حکومت کرینگے۔ آزادی کی محبت کے لئے پہلی شرط سیاسی بیداری ہے جس ملک مین یہ نہین ہوگی وہان کے باشندون مین غیر ملکی حکومت کا احساس نہین ہوگا اور حکومت عرصہ تک بغیر جانفشانی و تدبر کے سرسبز رہیگی جو ملک اکثر مفتوح و مغلوب ہوتا رہا ہے اسکے اندر یہی مجہول احساس جڑ پکڑ لیتا ہے۔ بسا اوقات مستبد سے مستبد حکومتین جن کے پاس بغاوت کے مقابلہ کا کوئی ذریعہ نہین تھا صدیون تک قائم رہی ہین محض اس وجہ سے کہ انھون نے رعایا کی عادات مین دخل نہین دیا، کیونکہ رعایا طبعاً اطاعت پسند تھی۔ روس کی سولھوین صدی کی تاریخ پڑھو۔ ایک بڑی آبادی نے زار کے مظالم اور تشدد کو کیون چپ چاپ برداشت کرلیا۔ اسکا جواب بالکل سادہ ہے۔ اہل روس دو صدی تک برابر تاتاریون کے پاؤن تلے روندے جاتے رہے، جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ انکی طبیعتین اطاعت مجہول کی خوگر ہوگئین

اسی طرح ہندوستان کی پوری تاریخ مین کہین احساس آزادی کا پتہ نہین چلتا۔ اہل اٹلی اپنی گزشتہ تاریخ مین جمہوریت روما کو

دیکھتے تھے۔ رنیزی (Rienzi) نے صرف لیوی (Livy) سنا سنا کر انھین بغاوت پر آمادہ کر دیا ہندوستانی لیڈر کے پاس کوی ایسی کتاب نہین جسے وہ اپنی قوم کو سُنائے۔ ہندوستان مین انگریزون کی آمد سے قبل سات سو برس تک صرف ظالم ہی نہین بلکہ غیر ملکی مستبد حکمران بادشاہت کر چکے تھے۔ البتہ ایسے ملک کے لئے تعجب انگیز بات یہ ہوگی کہ وہان اس امر کا احساس پیدا ہو جائے کہ حکومت کا قیام و انحصار رعایا پر ہے، اور حکومت پر نکتہ چینی کرنے، اُسکے استیصال کے ذرائع سوچنے یا اُسکی مخالفت مین تنظیم پیدا کرنیکی عادت پیدا ہو جاے

ہندوستان مین ہماری حکومت دو صورتون مین معجزہ کہی جاسکتی۔ اول تو اس صورت مین کہ ہندو اپنے ہی ہم ملکون کی حکومت کے عادی اور حکومت سے مقابلہ کرنیکے خیال سے آشنا ہوتے۔ لیکن ہندوؤن مین یہ بات نہین چنانچہ وہ غیر ملکیون کی اطاعت کرتے ہین۔ تاریخ مین ہوتا آیا ہے کہ وسیع آبادیون نے ایسی حکومتون کی اطاعت قبول کر لی جنکو وہ چاہتین تو باسانی جڑ سے اُکھاڑ پھینکتین۔ چین آج بھی ایک تاتاری حکومت کا مطیع ہے، خود ہندوؤن نے انگریزون کی آمد سے قبل مغلون کی حکومت کے آگے سر جھکا دیا تھا۔ بیشک ہندوؤن پر مغلون کے تسلط سے یہ بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ اُن پر ہمارے غلبہ کے لئے ضروری نہین ہے کہ ہمارے اندر سیاست کی غیر فطری لیاقت ہو۔ کیونکہ مغلون کی تاریخ پڑھکر ہر شخص کو وہی بات کھٹکے گی جو حکومت انگریزی کی تاریخ مین کھٹکتی ہے۔ یعنی یہ کہ مغلون نے بھی قریب قریب بغیر ظاہری وسائل کے ہندوستان فتح کیا سلطنت مغلیہ کا بانی بابر جب ہندوستان آیا تو اُسکی پشت پر کوئی زبردست قوم نہین تھی، اور نہ اسکو کسی طاقتور ریاست کی تنظیم پر بھروسہ تھا۔ وسط ایشیا مین ایک چھوٹی سی تاتاری ریاست اُسکو وراثت مین ملی لیکن وہ بھی اُزبک حملہ آورون کی نذر ہو گئی، کچھ دنون تک وہ ادھر اُدھر گھومتا رہا پھر افغانستان مین ایک چھوٹی سی ریاست پر قابض ہو گیا سلطنت کا یہ ابتدائی تخم سب سے زیادہ بے حقیقت تھا۔ اس تاتاری نے کابل مین افغانون پر حکومت کرتے ہوے ایک ایسی سلطنت قائم کر لی جو تقریباً ۲۰ سال مین نصف ہندوستان پر پھیل گئی، اور ایک صدی مین قریب قریب کل ہندوستان پر (اگرچہ برائے نام ہی سہی) مین یہ نہین کہتا کہ وسعت و استحکام کے اعتبار سے سلطنت مغلیہ ہماری حکومت کی مقابل تھی لیکن وہ بھی ہماری ہی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ خود بخود قائم ہوی۔ کمپنی کے پاس کم از کم انگریزی روپیہ، انگریزی فوجی فنون اور ایک غیر فانی کارپوریشن تو تھی بابر اور اُسکے جانشینون کے پاس کیا تھا۔ وہ کون اسباب تھے جنکی بدولت اُنکی سلطنت معرض وجود مین آئی البتہ ہم صرف اتنا جانتے ہین کہ وسط ایشیا مین ایسی بے خانمان قومین بھری تھین جو فطرتاً کرایہ پر جنگ کرنا جانتی تھین۔ اسلئے روپیہ اور مال غنیمت کے لالچ مین وہ باسانی والی کابل کی ملازمت مین داخل ہو گئین

دوسری صورت ہماری حکومت کے معجزہ ہونیکی یہ ہوگی کہ کل کے کل ۲۰ کروڑ ہندوؤن مین تنہا ایک قوم کی طرح ایک ساتھ سوچنے کی عادت ہوتی لیکن چونکہ ایسا نہین ہے اس لئے ہماری حکومت کوئی معجزہ نہین ہے۔ ایک ایسی جماعت کو جسکے اندر اشتراک مفاد کا احساس نہو مغلوب کر لینا بالکل آسان ہے۔ کیونکہ ایسی حالت مین ایک فرد کو دوسرے کے خلاف عمل کرنے پر آمادہ کیا جاسکتا ہے۔ مین بتا چکا ہون کہ ہندوؤن کے درمیان رشتہ اتحاد کس قدر ناکافی اور کمزور ہے۔ اگر تم دیکھنا چاہتے ہو کہ اس داخلی اتحاد کی عدم موجودگی نے ہماری حکومت کو کسقدر

تقویت پہونچائی تو تم صرف غدر کی تاریخ کا مطالعہ کرو۔ مین بتا چکا ہون کہ ہماری دیسی فوج مین معمولی سی بغاوت بھی ہماری سلطنت کے لئے نہایت مہلک ہوگی۔ اُسوقت تمھارے دل مین خیال گذرا ہوگا کہ باوجود ۱۸۵۷ء کے غدر کے ہماری سلطنت ابتک اسی طرح فروغ پر ہے۔ لیکن غور کرو مین نے ایسی بغاوت کا ذکر کیا تھا جو تحریک قومیت سے عام رعایا مین پیدا ہو کر فوج مین پھیل گئی ہو ۱۸۵۷ء کی بغاوت اس قسم کی نہین تھی، کیونکہ یہ فوج مین پیدا ہوی، قوم نے اس مین کوی حصہ نہین لیا۔ اسکے رونما ہونے کے اسباب مخصوص فوجی شکایات تھین، حکومت غیر ملکی کے خلاف جذبات قومیت کو اس سے کوی سروکار نہین تھا۔ اب مین دریافت کرتا ہون کہ یہ بغاوت رونما ہونے کے بعد کس طرح فرو کی گئی؟ مجھے اندیشہ ہے انگلینڈ مین عام خیال یہی ہے کہ انگریزون نے اپنی غیر معمولی شجاعت اور ہندؤن پر اپنی ناقابل قیاس برتری کی بدولت اسکو کچل دیا۔ اب مین تمھارے سامنے کرنل چسنی (Col. Chesney) کی کتاب Indian Polity (دستور سلطنت ہند) سے اسی کے الفاظ مین اس واقعہ کی حقیقت پیش کرتا ہون۔ کرنل موصوف لکھتا ہے "بے ادبی' اپنے آقا کے خلاف جذبات منافرت اور اپنی قوت پر اس حد تک یقین کرنے مین کہ وہ انگریزونکا تختہ الٹ دینگے، ہندو اور مسلمان مین کوئی فرق نہین تھا۔" آگے چلکر وہ بیان کرتا ہے کہ "خوش قسمتی سے نام نہاد احاطہ بنگال مین تمام تر باقاعدہ فوج متعین نہیں تھی۔ چار بٹالین گورکھا فوج جو اس جماعتی جذبہ سے محفوظ تھی باستثنا ایک بٹالین خیر خواہ رہی۔ ان مین سے ایک بٹالین نے برطانیہ کی خاطر جس نمایان بہادری اور اطاعت شعاری کا اظہار کیا اسکا اعتراف اُنکے انگریزی رفیقون نے بھی کیا ہے۔ وہ دو زائد رجمنٹین بھی جو پنجاب اور ہمسایہ اضلاع سے بھرتی ہوئین ثابت قدم رہین۔ لیکن زیادہ مدد پنجاب کی بے قاعدہ فوج سے ملی۔ اگرچہ اسکا نام بے قاعدہ تھا لیکن اُسکی ترتیب، تنظیم اور تعلیم ویسی ہی با اصول اور مضبوط بنیاد پر تھی جیسی باقاعدہ فوج کی ہوتی ہے۔ اس فوج مین ۶ رجمنٹ پیدل اور ۵ رجمنٹ سوار فوج کی شامل تھین۔ علاوہ ازین انکے اندر ۴ مقامی سکھ رجمنٹین بھی تھین جو عموماً پنجاب ہی مین متعین رہا کرتی تھین۔ یہ فوجین براہ راست اُسی صوبہ کی حکومت کے ماتحت تھین، مرکزی حکومت کے ماتحت نہین کیونکہ باقاعدہ فوج کی ڈسپلن بگاڑنے مین مرکزی حکومت کا بھی حصہ تھا۔ انھین فوجون نے اُن تھوڑے سے یورپین سپاہیون کیساتھ جو بالائی ہند مین متعین تھے پہلے پہل باغیون کا مقابلہ کیا۔ اسی اثنا مین صوبہ پنجاب کے باشندون کی ہمدردی انکے حکمرانون نے حاصل کین۔ چونکہ یہ لوگ ابھی حال مین مفتوح ہوے تھے اور اپنی فوج کے شکست ہو جانیکے باعث اپنے طبعی پیشہ سے محروم ہو گئے تھے اسلئے اُن ہندوستانی فوجون کو جو انکے ملک مین متعین تھین پسندیدہ نظرون سے نہین دیکھتے تھے۔ چنانچہ جب اُنسے اُنکے موروثی دشمنون کا تختہ الٹ دینے کی اپیل کی گئی تو بڑی مستعدی سے انھون نے اس اپیل کا خیر مقدم کیا۔ جس قدر آدمیون کی ضرورت ہوتی فوراً مہیا ہو جاتے اور جس قدر جلد ممکن ہوتا سامان اور قواعد سے آراستہ کرنے کے بعد مقام جنگ پر بھیج دئے جاتے۔ چنانچہ جب فوج بنگال کی دوبارہ تنظیم ہوی تو اُسکے اندر اس فوج کا بہت بڑا حصہ تھا"

تم دیکھ سکتے ہو کہ ہندوستانی قومون ہی کو ایک دوسرے کے خلاف لڑا دینے کی وجہ سے بڑی حد تک بغاوت فرو ہوی۔ جب تک ایسا ممکن ہے، جب تک وہان کے باشندون مین حکومت پر، خواہ کیسی ہی حکومت کیون نہ ہو، نکتہ چینی کرنے اور اُس سے بغاوت کرنیکی عادت نہین پیدا ہوگی، ہندوستان پر انگلینڈ کی حکومت ممکن رہیگی اور اس مین کوی حیرت و استعجاب کی بات نہین ہے۔ لیکن جیسا کہ مین نے کہا ہے، اگر موجودہ صورت حالات مین تبدیلی پیدا ہو جاے، اور کسی ذریعہ سے ہندوستان کے باشندے ایک قومیت کے رشتہ مین منسلک ہو جائین اگر اُنکے اور ہمارے

باہمی رشتہ کو آسٹریا اور اٹلی کے تعلق سے دور کی بھی مشابہت ہو جائے، تو میرے نزدیک ہمین اپنی سلطنت سے بغیر کسی اندیشہ کے فوراً مایوس ہو جانا چاہئے۔ میرے خیال مین ہمین عالمگیر بغاوت کے خطرہ سے ڈرنا نہین چاہئے۔ بعض خوفناک رسالون مین جیسے مسٹر الیٹ کی کتاب ہے ہندوستان کی غریب رعایا کی مفلوک الحالی اور تباہی کا ہولناک نقشہ کھینچنے کے بعد یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ ان کا انجام یقیناً عام بے اطمینانی کی شکل مین رونما ہوگا اور ہم وہان سے نکال باہر کر دئے جائین گے آیا یہ نقشہ صحیح ہے یا نہین، اسکی تحقیق کا یہ موقع نہین ہے لیکن اگر بنظر بحث فرض کر لیا جائے کہ یہ صحیح ہے تو مجھے تاریخ مین کوئی ایسی نظیر نہین ملتی جسمین ان اسباب کی بنا پر کبھی انقلاب رونما ہوا ہو۔ مین نے بڑی بڑی آبادیون کو دیکھا ہے کہ وہ نہایت ذلیل افلاس مین صدیون تک چپ چاپ پڑی رہین لیکن کبھی بغاوت نہین کی بلکہ اگر وہ اس افلاس و نکبت کو برداشت نہین کر سکتی تھین تو فنا ہو جاتین یا جون توں کر کے زندگی کے دن کاٹ دیتی۔ انکے احساس مردہ ہو جاتے، انکی خواہشات تنگدستی سے دب کر مر جاتے آبادی وہی بغاوت کر سکتی ہے جو بلند حوصلہ ہو، جسکے اندر جذبہ امید ہو جسکو اپنی طاقت کا احساس ہو اگر اس قسم کی بیداری ہندوستان مین پیدا ہوئی تو تا وقتیکہ دیسی فوج ہندؤن کو اپنا بھائی اور انگریز افسرون کو غیر ملکی سمجھنا نہ سیکھے گی ہم اسی فوج سے اس تحریک کا گلا گھونٹ دینگے۔ برخلاف اسکے اگر ایسا احساس پیدا ہو جائے اور تمام ہندوستان اپنے کو ایک قوم سمجھنے لگے (ہمارا دور حکومت شاید تمام سابق حکومتون سے زیادہ اسکے امکان مین معین ہے) ۔ تو اسوقت اسکی ضرورت نہین ہوگی کہ سارے ملک مین خوفناک بے اطمینانی کی لہر دوڑ جائے، کیونکہ اس حالت مین دیسی فوج اس جذبہ سے متاثر ہو جائیگی جس پر ہمارا بھروسہ ہے۔ ۱۸۵۷ء کا غدر اگرچہ خوفناک تھا لیکن اُسکے فرو کرنے مین ہم کامیاب ہوگئے، کیونکہ بغاوت فوج کی صرف ایک حصہ تک محدود تھی، رعایا نے اسکا ساتھ نہین دیا، بلکہ الٹے ہماری امداد کی لیکن اب جب بغاوت ہوگی تو یہ صرف بغاوت نہین ہوگی بلکہ عالمگیر جذبۂ قومیت کا اعلان ہوگا، اسوقت ہماری سلطنت کی سلامتی کی تمام امیدون کا خاتمہ ہو جائیگا اور قدرتاً ہونا ہی چاہئے۔ کیونکہ درحقیقت ہم ہندوستان کے فاتح نہین ہین اور نہ بحیثیت فاتح ہم اسپر حکومت کر سکتے ہین۔ اگر ہم ایسا ارادہ کرینگے تو ہمارا کامیاب ہونا قطعی غیر یقینی ہوگا

(مترجم)

عبدالقیوم رسا

ازدواج مکرر

مسرت کی کوئی انتہا نہ تھی جب انھیں بعض ذرائع سے معلوم ہوا کہ صفیہ نہ صرف تعلیم یافتہ بالکل ادیب بھی ہے
ایک زمانہ سے ذکی کی شادی صرف اسی بنا پر ملتوی ہوتی آ رہی تھی کہ ان کے ذوق کے مطابق کوئی تعلیم یافتہ عورت نہ ملتی تھی، اور اس بات کا وہ عہد کر چکے تھے کہ جب تک کوئی خاتون ان کے جذبات شعر و ادب کی سمجھنے والی اور اسی زبان میں جواب دینے والی نہ ملیگی وہ عقد نہ کرینگے۔ چونکہ آدمی دولتمند اور معزز گھرانے کے تھے اس لئے پیام تو بہت جگہ سے آتے تھے لیکن کوئی ان کے مرضی کے موافق نہ ہوتا تھا، وہ نہ دولت چاہتے تھے نہ جاہ و ثروت، وہ نہ حسن کے طلبگار تھے نہ کسی اور صفت کے۔ بلکہ وہ مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ ایک مسلمان "سروجنی نائڈو" چاہتے تھے، جو ادب و انشاء کا نہایت پاکیزہ ذوق رکھتی ہو، اچھا شعر کہنے اور سمجھنے کی اہل ہو مضمون نگاری فسانہ نویسی، کر سکتی ہو اور زنانہ کلب یا کسی اور نسوانی جلسہ میں صدر بننے اور برمحل تقریر کرنے کی اہلیت رکھتی ہو

ان کے بعض احباب نے سمجھایا کہ کسی کمسن نوجوان لڑکی کا یہ تمام صفات اپنے ساتھ لانا ناممکن ہے مگر ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ بعد کو رفتہ رفتہ اس میں یہ تمام باتیں پیدا ہو جائیں، اس لئے اگر کوئی اچھی تعلیم یافتہ لڑکی مل جائے تو شادی کر لینا چاہئے اور پھر اس کی تربیت اپنے ذوق کے لحاظ سے خود اپنا فعل ہے۔ لیکن ذکی اس پر راضی نہ ہوا۔ اس میں کلام نہیں کہ وہ خود نہایت اچھا شاعر پاکیزہ ذوق ادب رکھنے والا انسان تھا، اس کی تحریر و تقریر میں ایک خاص دلکشی، ندرت اور بلندی خیال ہوتی تھی، وہ جو چیز لکھتا تھا اس میں خاص جدت ہوتی تھی، اور ملک کے رسایل و جراید اس کے مضامین کے متمنی رہتے تھے، لیکن ایک حد تک وہ ضدی تھا اور اس کے قیام میں اسکی دولت و خوشحالی نے اور زیادہ مدد کی

اس لئے جب ان کے ایک بہی خواہ مولوی مظہر نے صفیہ کیساتھ ان کے عقد کا مسئلہ پیش کیا تو انھوں نے وہی سوال کیا کہ تعلیمی حالت کیا ہے۔ اور جب یہ معلوم ہوا کہ وہ شاعرہ و ادیب بھی ہے تو انھوں نے فرط مسرت میں بلا کسی تحقیق و تفتیش کے اپنی رضامندی ظاہر کر دی اور شادی ہو گئی

(۲)

صفیہ ایک متوسط الحال خاندان کی لڑکی تھی لیکن وہ تمام صفات جو ایک شریف گھرانے کی لڑکی میں ہونا چاہئے اور جو ایک گھر کی ملکہ بننے کے لئے ضروری ہیں اس میں موجود تھیں صورت شکل کے لحاظ سے بھی بری نہ تھی اور اردو لکھ پڑھ لینے کی بھی کافی مشق تھی، مگر اس کو شاعرہ یا ادیب کہنا بالکل غلط تھا۔ یہ صرف مولوی مظہر کی شاعری اور مبالغہ تھا یا مصلحت اندیشی کہ انھوں نے صفیہ کو اس رنگ میں پیش کر کے ذکی کو شادی کے لئے راضی کر لیا

اول اول جب ذکی نے اپنی بیوی کو دیکھا تو خاص شاعرانہ نگاہ سے اور یہ معلوم کر کے واقعی اس کو بڑی مسرت ہوئی کہ اس کا نقشہ

اس کے خد و خال اور اس کی ادائین بہت معشوقانہ تھین اور وہ اسکو اپنی غزلگوئی کا موضوع بنا سکتا تھا لیکن اس کے بعد جب اس کے ادبی ذوق اور شاعری کے امتحان کا وقت آیا تو وہ کوئی فیصلہ نہ کرسکا کہ آیا جو خبر اس کو ملی تھی وہ صحیح نہ تھی یا یہ کہ شرم و حجاب بھی کھل کھیلنے کے لئے مانع ہے۔

ذکی کے نزدیک ایک عورت کے تعلیم یافتہ ہونے کا معیار صرف یہ تھا کہ وہ غالب کے دقیق سے دقیق شعر کو پورے لطف و ذوق کے ساتھ سمجھ سکے۔ درد و میر کے جذبات تغزل پر سر دُھنے اور جب اس موضوع پر گفتگو کرے تو ایک ماہر و محقق کی حیثیت سے اور صفیہ کے متعلق اُسے ابھی تک یقین نہ ہوا تھا کہ وہ اس معنی مین تعلیم یافتہ ہے یا نہین

شادی کے دوسرے دن صبح کو بالاخانہ پر چاء سے فارغ ہونے کے بعد ذکی جھولے کی کرسی پر آہستہ آہستہ جھول رہا تھا اور صفیہ چوکی پر تکیہ کے سہارے بیٹھی ہوئی چھالیا کتر رہی تھی اسوقت تک ذکی کو صفیہ کی گفتگو سے صرف اسقدر علم حاصل ہوا تھا کہ وہ صاف و سلیس اور اسی کے ساتھ بہت صحیح اُردو بول سکتی ہے، دوسرے کی گفتگو سمجھنے، کسی نتیجہ پر پہونچنے اور جواب دینے مین بہت ذہین اور حاضر طبیعت رکھتی ہے لیکن خالص ادبیات کے متعلق اس کے معلومات یا ذوق کا کوئی علم اُسے حاصل نہ ہوا تھا

ذکی نے جھولتے جھولتے غالب کا یہ شعر گنگناتے ہوئے پڑھا

ترے خیال سے روح اہتزاز کرتی ہے — بہ جلوہ ریزی باد و بہ پرفشانی شمع

اور پھر کنکھیون سے اپنی بیوی کو دیکھا کہ اُدھر کیا اثر ہوا، اتفاق دیکھئے کہ اسی وقت غریب صفیہ کے بیٹھ پر ایک چیونٹی چڑھ گئی اور بدن مین جھرجھری سی پیدا ہونے لگی۔ ذکی سمجھے کہ یہ کیفیت پیدا ہوئی ہے غالب کا شعر سنکر بس پھر کیا تھا، قیامت آگئی صبر و ضبط بات سے جاتا رہا، جذبات پر قابو نہ رہا اور بے اختیار ہو کر کہہ اٹھا "مین سمجھتا تھا کہ تمھارا ذوق شعری یقیناً پاکیزہ ہوگا اور اس وقت تک تم نے محض شرم کی وجہ سے اس کا اظہار نہین کیا، مگر جبلی طبیعت کہین رکتی ہے، غالب کا یہ شعر سنکر آخر کار تم بیتاب ہو ہی گئین۔ اچھا ایمان سے بتاؤ کہ عرفی کے بعد ایسی پیاری قسمین کسی نے کھائی ہین جیسی غالب نے اس شعر مین پہلے جلوہ ریزی باد کی قسم کھانا اور پھر پرفشانی شمع کی جو نتیجہ ہے اول کا اور پھر سارے مصرعہ کو مشبہ بہ کی صورت مین پیش کرنا اور اول مصرعہ کو مشبہ قرار دینا حقیقت یہ ہے کہ اس انداز بیان کی مثالین اگر کہین ملتی ہین تو صرف بیدل کے ہان، بیدل کا یہ شعر تم نے سنا ہوگا لیکن مین تو تمھاری صورت مین ہر وقت اس شعر کو دیکھتا رہتا ہون۔ اُف،

تجدید ناز آشفتۂ رنگ لباس رائیت — بے پردگی دیوانۂ طرح نقاب فگندنت

کیا دنیا کے شاعری مین حُسنِ بیان، رنگ تغزل اور توازن مصرعین کی کوئی اور ایسی مثال آسانی سے ملسکتی ہے، شاعری کا الہامی چیز ہونا اسی نوع کے کلام سے ثابت ہوتا ہے"

ذکی اپنے جوش ادبیت مین غالب، بیدل، عرفی، نظیری، حافظ وغیرہ خدا جانے کن کن شعراء کے کلام پر ہلکی ہلکی ادبی تنقید کرتا ہوا جا رہا تھا اور صفیہ جس نے اس کے کسی ایک فقرہ کا بھی صحیح مفہوم نہین سمجھا، حیران تھی کہ "میرے متعلق جو یہ حُسن ظن ان کو قایم ہو گیا ہے، اسے کیونکر گوارا کرے" اور کچھ وہ اس خیال سے خایف تھی کہ مبادا حقیقت کا علم ہو جانے کے بعد احتراز کی کیفیت ان مین پیدا ہو جائے وہ دیر تک ایک خاص کیفیت شرم و اضطراب کے ساتھ ذکی کی باتون کو سنتی رہی اور غالباً سنتی رہتی اگر وہ اسی سلسلہ مین

یہ سوال نہ کر بیٹھتا کہ

" مومن کی شاعری کے متعلق تمھاری کیا رائے ہے " جب تک وہ صرف سننے پر مجبور تھی ، سنتی رہی ، لیکن جب اس سے سوال کیا گیا اور جواب دینا اس کے لئے ناگزیر ہوگیا تو وہ بہت گھبرائی اور اس کی سمجھ مین نہ آیا کہ وہ کیا کہے

نظم کی کتابون مین اسنے سوائے مسدس حالی اور مناجات بیوہ کے کسی اور کتاب کو نہ دیکھا تھا اور وہ مطلق اس سے بیخبر تھی کہ مومن کون کافر ہے

وہ خاموش رہی ، سر کو نیچا کئے ہوئے بدستور چھالیہ کترتی رہی اور ایک ہلکے سے رعشہ بدن کے ساتھ سوچتی رہی کہ اُسے کیا جواب دینا چاہئے ذکی نے پھر اصرار کیا اور یہ اصرار زیادہ التماس محبت لئے ہوئے تھا ، لیکن حسن اتفاق سے باہر سے اطلاع آئی کہ ذکی کے دوست اختر آئے ہین اور اس لئے ذکی کو اپنے سوال کا جواب حاصل کئے بغیر باہر چلا جانا پڑا - اور دوسرے روز صفیہ کا بھائی آکر اسے گھر لے گیا

(۳)

صفیہ کو گھر گئے ہوئے پانچ دن ہوگئے ہین اور ذکی حد درجہ بے چینی کے ساتھ اس کے خط کا انتظار کر رہا ہے اسنے چلتے وقت تاکید کر دی تھی کہ ایک خط روزانہ مفصل روانہ کیا جائے اور اسی طرح روز ایک خط کی توقع کیجائے ، چنانچہ وہ پانچوین دن کا پانچوان خط جو یکسر شاعری ادب سے لبریز تھا اور حسن مین بقول غالب " شوق وصل " " وشکوۂ ہجران " دونون کی غیر معمولی شرح وتفسیر کی گئی تھی ، لکھ کر روانہ ہی کر چکا تھا کہ دوپہر کی ڈاک سے صفیہ کا خط اُسے ملا ، چونکہ یہ صفیہ کی بالکل پہلی تحریر تھی اس لئے اسنے نہایت بیتابی سے اُسے کھولا کہ خدا جانے کیا کیا اور کیسے کیسے بدیعہ ہائے ادب وانشا دہات آئین گے ، لیکن جب وہ اسے ختم کر چکا تو اسپر ایک ایسی کیفیت طاری تھی جس کو صرف دم گھٹنے سے تعبیر کر سکتے ہین ، خط کا مضمون یہ تھا -

" ایک تو مین یہان آکر بیمار ہوگئی ، دوسرے اس فکر مین پڑ گئی کہ آپ کی قابلانہ تحریر دن کا جواب کیا دون جبکہ مین انھین سمجھ بھی نہین سکتی حقیقتاً یہ غم میرے لئے اب ناقابل برداشت ہوتا جاتا ہے کہ آپ نے جس صفیہ کو اپنی معیت کی عزت بخشی ہے ، وہ غالباً وہ صفیہ نہین ہے ، جو آپ کے ذہن مین تھی - سب سے آخری صحبت مین جو گفتگو آپ نے مجھ سے کی تھی اور جس سوال کو چھوڑ کر آپ باہر تشریف لے گئے تھے اس کا جواب اب مین تحریر کے ذریعہ سے دینا چاہتی ہون ، کیونکہ میرے لئے غالباً یہ زیادہ آسان ہے کہ آپ کو اپنے سے ابتدا ہی مین متنفر کر دون بجائے اس کے کہ آپ کو عرصہ تک فریب مین مبتلا رہنے دون مین نہین کہہ سکتی کہ آپ کو کس نے اور کیون یہ یقین دلا دیا کہ میری تعلیمی حالت بہت بلند ہے - واقعہ یہ ہے کہ اُردو کی سوائے چند معمولی کتابون کے مین نے آجتک کسی شاعر کا دیوان دیکھا تک نہین بلکہ سچ پوچھئے تو مین شعر موزون بھی نہین پڑھ سکتی اس کی خوبیون کا سمجھنا تو خیر بڑی بات ہے

مجھکو جو تعلیم وتربیت دی گئی ہے وہ اس سے زیادہ نہین ہے کہ شوہر کی اطاعت کرون ، اس کے آرام وآسایش کا خیال رکھون اور گھر کو ایسی صورت سے اس کے سامنے پیش کرون کہ جب وہ دنیا کی کشمکش سے خستہ ہوکر واپس آئے تو

اُس کی تمام کلفتین دور ہوجائین اور وہ محسوس کرے کہ اس دنیا مین اگر خلوص وصداقت کی آغوش کا سکون کہین دستیاب ہوسکتا ہے تو صرف گھر مین! اس کے ساتھ مجھے یہ بھی سکھایا گیا تھا کہ شوہر کی مزاج شناسی کو مقدم سمجھون اور اُس کی پسندیدگی کا لحاظ ہر ممکن قربانی کی حد تک کردان۔ لیکن میری کتنی بڑی بدنصیبی ہے کہ آپ کے علمی وادبی ذوق کو دیکھتے ہوئے (جو آپ کی زندگی کی تنہا مسرت معلوم ہوتا ہے) مین اپنے آپ کو اسدرجہ ناکام دبست پاتی ہون کہ آپ کو خوش رکھنے کے خیال سے میرے جسم پر رعشہ سا طاری ہوجاتا ہے اور مین اپنے مستقبل کی تاریکی کو دیکھ دیکھ کر کانپ اُٹھتی ہون مجھے شعروشاعری سے اتنا ہی بُعد ہے جتنا آپ کو اُس سے قُرب، اس لئے سخت پریشان ہون کہ مین آپ کو کس طرح خوش رکھ سکتی ہون اور آپ کو مجھ سے کیا آرام وسکون میسر آسکتا ہے۔ بہرحال نتیجہ جو کچھ ہو مین اس حقیقت کو ظاہر کئے بغیر نہین رہسکتی اور بےچینی کے ساتھ نتیجہ کی منتظر ہون کہ آپ نے میری نسبت کیا فیصلہ کیا۔ آخر مین مجھے یہ بھی ظاہر کردینا چاہئے کہ یہ خط نہ مین نے اپنے قلم سے لکھا ہے اور نہ مضمون میرا ہے، چونکہ مین بہت بدخط ہون اور اپنے جذبات کو مناسب الفاظ مین ظاہر بھی نہین کرسکتی، اس لئے عزیزہ سے لکھوا رہی ہون "

اس وقت ذکی کی حالت بالکل اُس قیدی کی سی تھی جسے صبح پھانسی دیجانے والی ہو اور رات کو اپنی آزادی ورہائی کا خواب دیکھتے ہوئے دفعتہً اُسے چونکا دیا گیا ہو

دنیا مین امید ویقین کے خلاف کسی امر کا ظہور اسقدر تکلف دہ امر ہے کہ بعض اوقات جنون ودیوانگی کی سرحد یہین سے شروع ہوجاتی ہے، اس لئے ذکی کے کرب واضطراب کا اندازہ آسان نہین، وہ دیر تک سر پکڑکر بیٹھا رہا اور پھر اُٹھ کر سراسیمگی کے عالم مین ٹہلتا رہا۔ اس کا چہرہ غصہ سے تمتا رہا تھا، اس کے ہات پانون مین تشنج کی سی کیفیت پیدا تھی اور اگر اُس کے آنسو نہ جاری ہوجاتے تو نہین کہا جاسکتا کہ اسکے یہ جذبات کیسی خطرناک صورت اختیار کرلیتے

ذکی اپنی فطرت کے لحاظ سے نہایت نیک نفس اور سلجھا ہوا شخص تھا، اس لئے جب جوش الم کم ہوا تو وہ تمام واقعات پر غور کرکے اس نتیجہ پر پہونچا کہ صفیہ یقیناً بیگناہ ہے اور اگر گناہگار ہو تو بھی اس اعتراف کے بعد اس کو قابل الزام قرار دینا خود بدترین گناہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ مولوی مظفر نے کیون غلط بیانی سے کام لیا، ممکن ہے انھین خود اطلاع صحیح نہ ملی ہو یا میرا فائدہ سمجھ کر قصداً غلط بیانی سے کام لیا گیا ہو۔ بہرحال اب ان سے بھی اس کی باز پُرس بیکار ہے۔ ظاہر ہے کہ صفیہ کو مین چھوڑ نہین سکتا، نہ اس لئے کہ اس مین بدنامی ہے، بلکہ اس لحاظ سے بھی کہ وہ واقعی اپنی خصوصیات کے لحاظ سے قابل قدر ہے، رہی تعلیم سو ممکن ہے کہ مین اس کی کمی کو پورا کرسکون اور چند سال مین وہ اس منزل پر پہونچ جائے جہان مین اسے دیکھنا چاہتا ہون۔ عورت یون بھی قدرتاً بہت ذہین ہوتی ہے اور صفیہ تو خصوصیت کے ساتھ غیر معمولی طور پر ذکی ..... لفظ ذکی پر پہونچتے ہی (کیونکہ یہی اسکا نام بھی تھا) اس کے دماغ مین دفعتہً ادبی میلان پیدا ہوگیا اور اس خیال سے کہ اگر صفیہ کا نام ہی صفیہ ذکی رکھدیا جائے تو کسقدر موزون ہوگا، اس کے چہرہ پر تبسم کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اور اب وہ صفیہ نہین بلکہ

صفیہ ذکی کے مستقبل اور اس کی علمی و ادبی شہرت کے متعلق ایک خیالی کارگاہ قایم کرنے مین مصروف ہوگیا یہانتک کہ کامل دو گھنٹے اسی محویت مین صرف ہوگئے اور پھر دفعتہً کسی غیر معمولی تدبیر کے ذہن مین آجانے سے وہ اچھل پڑا اور انتہائی مسرت کے عالم مین اسنے فوراً صفیہ کو تار دیدیا کہ فوراً آجائے۔ مین بے چینی کے ساتھ منتظر ہون۔

(باقی)

نیاز

جنوری ۳۰ء سے

دار الاشاعت نگار سے ایک نئے رسالہ کا اجراء

اس رسالہ کا نام جن ہوگا۔ جن کے لغوی معنی ہین ہر اُس چیز کے جو اس ظاہری سے پوشیدہ ہو، اس لئے اس رسالہ مین تمام اُن امور و واقعات سے بحث ہوگی جن کا تعلق "ماوراء عالم حواس" سے ہے اور جس مین جنات ارواح خبیثہ مابعد الطبیعیات، روحانیات، وغیرہ سب شامل ہین۔ اس مین نہ صرف جنات وغیرہ کے معتبر واقعات و حکایات ہونگے، بلکہ ان پر تنقید بھی ہوگی، عالم ارواح و روحانیت کے متعلق جدید ترین تحقیقات و معلومات بھی ہونگی، اور "حیات بعد الممات" کے متعلق اس وقت تک جو کچھ دریافت ہوچکا ہے اور ہوتا جارہا ہے وہ بھی درج ہوتا رہیگا

اس رسالہ کی تقطیع ۲۰×۲۶/۸ ہوگی اور ۲۵ سطر کے مسطر پر دو کالم مین باریک خط سے لکھا جائیگا۔ حجم فی الحال دو جزو ہوگا جسمین ۸ صفحات مستقلاً علمی تحقیقات کے لئے وقف ہونگے۔ اس رسالے مین ارواح خبیثہ اور جنات کے جتنے واقعات درج ہونگے ان سب کو مصور پیش کیا جائیگا جس کے لئے ایک آرٹسٹ کی خدمات مستقلاً حاصل کی گئی ہین۔ رسالہ کی سالانہ قیمت عہ تجویز کی گئی ہے اور ایک سال سے کم مدت کے لئے چندہ قبول نہ کیا جائیگا۔

جن حضرات کو اس دنیا سے دلچسپی ہو وہ براہ کرم اپنا پتہ بھیجدین تاکہ بعد اشاعت رسالہ کا نمونہ اُن کے پاس روانہ کیا جائے اس کے ساتھ یہ استدعا بھی ہے کہ اگر کسی شخص پر اُس کی زندگی مین کوئی واقعہ ایسا گزرا ہے جسے وہ جنات یا بھوت پریت سے منسوب کرتا ہے تو براہ کرم اس کو قلمبند کرکے روانہ کردے زبان و تحریر کی پرواہ نہ کیجائے یہان اس کو درست کرلیا جائیگا اور واقعہ کے مطابق تصاویر طیار کرلی جائینگی۔ لیکن اس کا خیال رہے کہ صرف اپنا تجربہ و مشاہدہ پیش کیا جائے، دوسرون سے نقل کی ہوئی روایت نہ ہو۔

پہلا پرچہ جنوری ۳۰ء کے نگار کے ساتھ ہی ساتھ شایع ہوجائے گا

مینیجر نگار۔ لکھنؤ

مرقع چغتائی

یعنے

دیوان غالب کا مصور اڈیشن

غالب کی موجودہ شہرت، روا ہو یا ناروا اس سے بحث نہین لیکن یہ واقعہ ہے کہ ہندوستان کے اُردو شاعرون مین جو آوازۂ قبول غالب کو نصیب ہوا، وہ اس وقت تک کسی دوسرے شاعر کو حاصل نہین ہوسکا مشرق مین عام طور پر کسی کتاب یا تصنیف کی شہرت و مقبولیت کا اندازہ صرف اس سے کیا جاتا ہے کہ کتنے اڈیشن اس کے شایع ہوئے اور کتنی زبانون پر اس کا نام جاری ہے۔ مغرب مین بھی اعتراف کی یہ صورت جزو مشترک کی حیثیت رکھتی ہے، لیکن چونکہ وہان دولت ہے، علم ہے، ذوق ہے اور فنون کی ترقی اوج کمال کو پہونچ گئی ہے، اس لئے وہان تنقید کی نوعتین بھی متعدد ہین اور اعتراف کمال کی صورتین بھی مختلف۔ ہم اگر کسی چیز کو پسند کرتے ہین تو اس کے حصول کی خواہش بھی قوۃ سے فعل مین نہین آتی اور وہان اس کے حاصل کرنے کے لئے بازار مسابقت قایم ہوجاتا ہے، جس مین دولت و زر کی نمایش سے زیادہ تفوق ذوق کا مظاہرہ مقصود ہوتا ہے۔ پھر یہ ہنگامہ اسی جگہ ختم نہین ہوجاتا بلکہ اس جوش کو متلاطم رکھنے کے لئے اور اپنے احساس اعتراف کو نمایان کرنے کے لئے ہر شخص اپنے اپنے ذوق کے شمول سے اس مین نئی نئی روح پھونکنا چاہتا ہے، یہانتک کہ اگر آپ اسے ہر شخص کے نقطۂ خیال سے جدا جدا طور پر دیکھین گے تو اس کے مختلف مناظر آپ کے سامنے آئین گے اور ہر منظر آپ کو بجائے خود اک مستقل چیز معلوم ہوگا، گویا وہ فانوس خیال ہے کہ ایک ہی شمع کو آغوش مین لئے ہوئے اپنی گردش سے ہر پہلو کو ایک جدید نقش کی صورت مین پیش کررہا ہے۔ یہان کسی شاعر کے حسن کلام کا انتہائی اعتراف وہ ہے جسے ہم زیادہ سے زیادہ "سردھننا" سے تعبیر کرتے ہین لیکن وہان کے اعتراف کی حقیر ترین صورت بھی "ہلچل مچا دینے" سے کم نہین ہوتی۔ ہم اگر کسی اچھے شاعر کے دیوان کو دیکھین گے تو زیادہ سے زیادہ دس پانچ مرتبہ سر کو جنبش دے کر رہجائین گے لیکن وہان ایک شعر مختلف مجلسون مین پہونچکر مختلف صورتین اختیار کرلیتا ہے۔ مغنی اُسے گاتا ہے، رقاص اس پر رقص کرتا ہے، نقاش اسے نقش کرتا ہے اور اس طرح گویا ایک داستان کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے ہر ٹکڑے کو ایک مستقل داستان بنا دیتے ہین، مثلاً خیام ہی کو لے لیجئے ہرچند حافظ نے یہ شعر اپنے ہی لئے کہا تھا کہ

زشعر حافظ شیراز می گویند و می رقصند — سیہ چشمان کشمیری و ترکان سمرقندی

مگر وہ صادق آتا ہے خیام اور اہل مغرب پر جہان خیام کا اعتراف "می گویند و می رقصند" کے منزل سے بھی آگے بڑھا ہوا نظر آتا ہے قصہ مختصر یون سمجھئے کہ ہمارا اعتراف حسن و کمال صرف "آہ" ہے اور اُنکا "واہ" اور یہ فرق قدرتی طور پر اک تشائم (Pessimism) اور تفاول (optimism) قوم کے درمیان ہونا چاہئے۔

اس مین شک نہین کہ مغربی تعلیم اور مغربی اصول تنقید کے سلسلہ مین اس کمی کا احساس یہان کے لوگون مین بھی پیدا ہوگیا ہے، لیکن کوئی علمی تحریک ابھی تک اس نوع کے پیدا نہین ہوئی تھی جسے ہم بجا طور پر نشان نہضت (Renaissance) کہہ سکین - اس لئے چغتائی کا یہ فخر کبھی ان سے نہین چھینا جا سکتا کہ سب سے پہلے انھون نے اس طرف توجہ کی اور " تقدیم اقدام " کا امتیاز انھون نے اپنے لئے مخصوص کر لیا- غالب کے دیوان کو ایک فلسفی نے دیکھا اور اسے الہامی کتاب کہدیا ہر چند یہ طفلانہ جسارت سے زیادہ حیثیت نہین رکھتا تاہم ایک فلسفہ طراز کی جانب سے اعتراف کی صورت یہی ہوسکتی تھی، ایک صوفی نے اس کا مطالعہ کیا اور " مطالب غالب " کو فصوص الحکم کا ہم پایہ قرار دیا- یقیناً یہ تقلید تنگ ظرفی منصور " سے زیادہ اہمیت نہین رکھتا، تاہم ایک متصوف اس سے زیادہ اور کیا کہہ سکتا ہے، اخیر مین پنجاب کا ایک نوجوان نقاش اُٹھا اور اس نے حقیقی معنی مین صرف اپنے موقلم سے " سخنہائے گفتنی " کی تشریح اور اپنا اعتراف خلوص کو بعض خطوط و نقوش کی صورت مین پیش کیا - اور اس سے کسی کو انکار ہوسکتا ہے کہ اگر شاعری اور نقاشی کا امتزاج صحیح کسی وقت ہوجائے، تو پھر اس کی داد دینا حیرت و سکوت کے بس مین بھی نہین - تو کیا چغتائی کا مرقع واقعی یہی حیثیت رکھتا ہے، کیا حقیقتاً اُسے چغتائی کی " انتہائے تمنا " اور " اور بلند ترین آرزو " کہہ سکتے ہین؟ اس صحبت مین مجھے اسی موضوع پر لکھنا ہے اور اسی حقیقت سے بحث کرنا

مرقع چغتائی یعنی دیوان غالب کا مصوّر اڈیشن یون تو تنقید کے لئے مختلف حیثیتین رکھتا ہے لیکن گفتگو مین آسانی پیدا کرنے کے لئے مین صرف دو تقسیمیں کرونگا، ایک متعلق بہ دیوان اور دوسری متعلق بہ نقاشی - امر اول کی نسبت مجھے زیادہ نہین کہنا سوائے اس کے کہ نفیس کاغذ پر نفیس جدول و حاشیہ کے ساتھ بلاک سے چھاپا گیا ہے جس کو طباعت کی پاکیزہ ترین صورت کہا جاتا ہے- اخیر مین نسخۂ حمیدیہ کو دیکھ کر بعض ان اشعار کو بھی بصورت انتخاب درج کر دیا ہے جو عام مطبوعہ دیوانون مین نہین پائے جاتے، میری رائے مین جناب چغتائی اس امر مین اپنے حدود سے آگے بڑھ گئے ہین اور اس کو مین اگر غیر شاعرانہ نہین تو " غیر نقاشانہ " جسارت سے ضرور کہونگا - ابتدا مین ڈاکٹر جیمس کزنس اور ڈاکٹر اقبال کی مختصر تمہید و تقریب انگریزی زبان مین ہے - ڈاکٹر کزنس نے جو نقاشی کے ماہر سمجھے جاتے ہین مختصراً چغتائی کے فن نقاشی پر روشنی ڈالی ہے اور ڈاکٹر اقبال نے ایک خاص دلکش انداز مین مجملاً شاعری و نقش کے ارتباط کو فلسفیانہ مگر سرسری انداز سے سمجھانے کی سعی فرمائی ہے-

خود جناب چغتائی نے بھی " سخنہائے گفتنی " کے عنوان سے چند خیالات پریشان (astray thoughts) (جو کہین کہین " بکھرے ہوئے موتیون " سے کم دلچسپ نہین ہین) ظاہر کئے ہین اور اس سلسلہ مین انھون نے مشرق و مغرب کی نقاشی کا جو فرق بتایا ہے وہ بہ لحاظ انشا و خیال بہت لطیف اور بہ لحاظ حقیقت نہایت مستحکم ہے - کیا اچھا ہوتا اگر اس ایتھری (Ethereal) قسم کی انشا کو " اترونا "، " کیچڑ " اور " لتھڑا رہنے والے " وغیرہ ایسے الفاظ سے پاک رکھا جاتا - جمیل ترین چہرہ مین حقیر ترین بدنمائی بھی اچھی نہین معلوم ہوتی

اب مین اس حصہ کی طرف متوجہ ہوتا ہون جسے صحیح معنی مین مرقع چغتائی کہا جا سکتا ہے اس مجموعہ مین کل ۴۴ تصویرین ہین ۱۲ تصویرین چار رنگون کی ہین باقی ایک رنگ کی ہین یا صرف پنسل کا خاکہ یا محض رنگین خطوط کا مجموعہ

قبل اس کے کہ مین ان نقوش پر تنقید کرون مختصراً یہ ظاہر کر دینا ضروری سمجھتا ہون کہ چغتائی کس اسکول کے نقاش ہین چغتائی ایرانی اسکول کے نقاش ہین اور ایرانی اسکول کی وہ خصوصیت جسے " رومانیت نقش " کہنا بہ نسبت " نقش رومانیت " کے زیادہ موزون ہے

ان کے موقلم مین تکمیل کے ساتھ ودیعت ہوئی ہے۔ ایک نقش کے عناصر بالعموم تین ہوا کرتے ہین ایک وہ جسے بیک گرونڈ (فضائے بعید) کہتے ہین دوسرے تصویر کا اندرونی دماحولی منظر اور تیسرے خود اصل تصویر جسے مرکز یا نقطۂ انشعاب کہنا زیادہ مناسب ہے پھر چونکہ نقش بجائے خود کوئی چیز نہین ہے بلکہ وہ محض نقاش کے دماغ کی اپج ہے یا یون سمجھیے کہ ایک خیال ہے جو خطوط کی صورت مین نمایان ہوتا ہے اس لئے ایک تصویر کی خوبی یہی ہے کہ نقش کا کوئی خط، کوئی نقطہ " واقعیت " خیال کے حدود سے آگے نہ بڑھے یہ " واقعیت خیال " سے مراد وہ فطری حدود ہین جن کی پابندی سے آزاد ترین تخیل کو بھی چارہ نہین۔ یعنی جس طرح شعر مین حد سے زیادہ مبالغہ شعر کے لطف کو غارت کردیتا ہے اسی طرح نقش مین " واقعیت خیال " سے آگے بڑھجانا ذوق کے منافی ہے۔ پھر جس طرح شعر کے مختلف اقسام ہین اسی طرح نقش کی بھی کئی قسمین ہوسکتی ہین، اور اس لحاظ سے ان کے محاسن کی جانچ ہوتی ہے۔ اگر شعر مین آپ محاکات، معاملہ بندی، اور جذبات نگاری وغیرہ وغیرہ کی علحدہ علحدہ تعیین کرسکتے ہین تو نقش مین بھی اسیطرح واقعیت، تخیل، رومان، اور احساسات کی جستجو ہوسکتی ہے، لیکن فرق یہ ہے کہ نقش کا تعلق بہ نسبت شعر کے مادیت سے بہت کم ہے اور وہ نقاش جو صرف تنوع مادیت کے اظہار کو اپنا مقصود قرار دیتا ہے اُسے بجائے نقاش کے صناع کہنا زیادہ موزون ہے۔

فرض کیجیے کہ ایک حسین عورت کا نقش طیار کرنا ہے تو وہ نقاش جو مادہ کی حدود سے آگے نہین بڑھتا، صرف یہی کریگا کہ اسکی صورت، اس کے خد و خال، اس کے اعضا اور اس کے ملبوس کو نہایت جمیل و دلکش بنادیگا، لیکن وہ نقاش جو رومان واحساس کا پرستار ہے، اس کی صورت سے زیادہ اعتنا نہ کریگا بلکہ خود اپنے جذبات و تاثرات کو تصویر کے ماحول اور فضا مین اس طرح بھر دیگا کہ حُسن سے زیادہ عشق نمودار ہوجائے اور مرکز انشعاب نے ماحول مین اس طرح تحلیل ہوجائے کہ حسن و عشق کے حدود کی تعیین و تمیز آسان نہ رہے۔ اگر نقاش صرف نقال ہے تو وہ مادیت سے آگے نہین بڑھتا اور اگر خلاق ہے تو مادہ سے گزر کر روحانیت مین پہونچ جاتا ہے، وہ مادہ کا پابند رہتا ہے اور یہ مادہ کو اپنا پابند بنالیتا ہے، اس کا موقلم منظر کے تغیر کے ساتھ ساتھ جنبش کرتا ہے اور یہان منظر مصوّر اس کے جنبش قلم کے ساتھ ساتھ متغیر ہوتا ہے، وہ محکوم و تابع ہوکر کاغذ مین رنگ بھرتا ہے اور یہ اک حاکمانہ اقتدار کے ساتھ اپنے رنگ مین موضوع (Theme) کو رنگ دیتا ہے۔ اس لئے آپ دیکھین گے کہ جتنے نقاش جمالیاتی تخلیق کے لئے مشہور ہوئے ہین ان کے ان کے نقش کے عناصر سہ گانہ مین سے مرکز انشعاب یا موضوع نقش اسقدر نمایان نہین ہوتا جتنا ماحول اور فضا ایسے نقوش مین دیکھنے والے کی نگاہ، مرکز سے فضا کی طرف نہین جاتی بلکہ فضا سے مرکز کی طرف آتی ہے۔ چغتائی کی نقاشی بھی چونکہ زیادہ تر روحانی یا احساسی قسم کی ہے اس لئے وہ لوگ جو حقیقت سے ناواقف ہین ان کی تصویر کے مرکزی حصہ مین نقص محسوس کرتے ہین اور وہ اس حقیقت سے بیگانہ ہین کہ وہ تمثیل (Symbol) سے ہیولی (chaos) نہین پیدا کرتا بلکہ ہیولی سے تمثیل کو نمایان کرتا ہے۔

لوگ کہتے ہین کہ چغتائی کی تصویرون کی آنکھ، ناک، اور انگلیان بدنما، خلاف اصل، اور مضحک ہوتی ہین، لیکن یہ وہی لوگ ہین جو چغتائی کے نقش کی اصل رُوح سے واقف نہین اور جن کی پسندیدگی مادی نقاشی سے آگے نہین بڑھتی

چغتائی نے غالب کے جن اشعار یا مصرعون کو نقش کیا ہے وہ یہ ہین:-

(۱) نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

چونکہ غالب کے اس شعر سے دیوان شروع ہوتا ہے اس لئے چغتائی نے بھی اس سے ابتدا کی ہے، چغتائی کا یہ نقش بالکل کار چوبی (Japanese) قسم کا ہے اور اس لئے فضا کے لحاظ سے بالکل سادہ اور ماحول کی حیثیت سے معمولی ہے۔ با الفاظ دیگر یون کہئے کہ جیسا شعر غالب کا ہے ویسا ہی اس کا نقش ہے، نہ شعر سے کسی خاص لطیف جذبہ مین تحریک پیدا ہوتی ہے اور نہ تصویر مین کوئی پاکیزگی پائی جاتی ہے

(۲)۔ اس کے بعد "مطرب بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے" کا نقش ہے۔ افسوس ہے کہ یہ مصرع بھی مادی حدود سے آگے خیال کے رہبری نہین کرتا اس لئے چغتائی کو بھی زیادہ گنجائش نہ تھی، تاہم وہ مصرعہ کے پہلے ٹکڑے کو کسی حد تک اور دوسرے ٹکڑے کو بڑی حد تک نمایاں کر سکے ہیں، لیکن دونوں میں امتزاج کامل نہیں ہے۔ مطرب (مطربہ؟) ساز لئے ہوئے ہے لیکن اس سے فارغ، نغمہ کا مفہوم صرف اسکے ہاتھون اور انگلیون سے پیدا کیا گیا ہے جس سے تالی اور چٹکی بجانے کا رنگ پوری طرح تصویر سے نمایان ہوگیا ہے۔ دوسرے ٹکڑے کو صرف فضا کے اثر سے ظاہر کیا گیا ہے اور نسبتاً زیادہ تکمیل کے ساتھ

(۳) ہان مہ نو سنین ہم اس کا نام جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام

اس کا نقش نئی چیز نہین بلکہ اس سے قبل ہلال عید کے عنوان سے پنجاب کے بعض رسایل مین شایع ہو چکا ہے اس تصویر کو اس شعر کا نقش قرار دینا میرے نزدیک بالکل ذوق کے خلاف ہے۔ جہانتک ہلال عید کا تعلق ہے یہ تصویر یقیناً اچھی ہے لیکن اس شعر سے متعلق کرنے کے بعد اس کی تمام خوبیان زایل ہو جاتی ہین۔ چاند کو دیکھ کر ایک ضعیفہ بیٹھی ہوئی ہاتھ اٹھائے دعا مانگ رہی ہے، ایک چھوٹا بچہ اس کی گردن مین ہات ڈالے ہوے چاند کو دیکھ رہا ہے اور خود بھی اس معانقہ کی حالت مین تقلیداً ہات دعا کے لئے کھول دیتا ہے۔ پیچھے ایک نوجوان دوشیزہ انتہائی معصومیت کے ساتھ دعا مانگ رہی ہے افق کے شفقی روشنی مین ہلال نظر آرہا ہے اور دور مسجد کے گنبد و مینار بھی نمایان ہین تصویر بہ حیثیت مجموعی اس تمام معصومیت و تقدس کو لئے ہوے ہے جو ہلال عید کے دیکھنے کے بعد ایک مسلمان گھرانے کے افراد مین پیدا ہو سکتی ہے لیکن غالب کے شعر سے اسے کوئی لگاؤ نہین ہے

(۴) غم ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج شمع ہر رنگ مین جلتی ہے سحر ہونے تک

یہ شعر نقاشی کا اچھا موضوع ہو سکتا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ چغتائی نے اس خیال کو بغیر کسی فضائے بعید کے پیدا کئے ہوئے نہایت خوبی سے "منقوش" کیا ہے۔ اس تصویر مین اگر ایک طرف غالب کا تکلم بالنفس (Soliloquy) ظاہر ہے تو دوسری طرف مصرعہ ثانی کو بھی پوری قوت کے ساتھ نمایان کیا گیا ہے اور مین کہہ سکتا ہون کہ اس شعر کا کوئی لفظ ایسا نہین ہے جس سے چغتائی نے کام نہ لیا ہو یا تصویر سے پیدا نہ کیا گیا ہو

ایک مرد ضعیف (جو یقیناً غالب ہے) طاق مین رکھے ہوئے چراغ کے پاس ایک خاص انداز حسرت و اندوہ سے کھڑا ہوا دیکھ رہا ہے اور چراغ کا تیل جو ٹپک ٹپک کر دیوار کو داغدار بنا چکا ہے اب بھی نہایت ہی ہلکا سا شعلہ قایم کئے ہوئے ہے منظر کی تاریکی بتا رہی ہے کہ ابھی

سحر ہونے نہین ہے اور اس طرح نقش کو دیکھ کر "غم ہستی" "جز مرگ" "علاج" اور جلتی ہے سحر ہونے تک" سب کا سمان انفرادی اور مجموعی دونون طور پر بیک وقت سامنے آجاتا ہے اور یہ نقاش کی معمولی کامیابی نہین ہے

(۵) سب کہان کچھ لالہ وگل مین نمایان ہوگئین	خاک مین کیا صورتین ہونگی کہ پنہان ہوگئین

اس نقش کا تعلق بیشک فضائے بعید سے ہے اور اس مین کلام نہین کہ چغتائی نے شعر کے مفہوم کو واضح کرنے کے لئے جو فضا پیدا کی ہے وہ بہت مناسب ہے، لیکن اس نقش مین ایک غیر ضروری جز و شامل کر کے اس کے اثر کی قوت کو ضعیف کر دیا ہے۔ لالہ وگل کے پاس کسی انسانی ہستی کو دکھانے کی ضرورت نہ تھی۔ اگر وہ اس تصویر کے دو حصے کر کے ایک مین ایک مصرعہ کو اور دوسرے مین دوسرے مصرعہ کو بغیر کسی جاندار چیز کے شمول کے ظاہر کر دیتے تو اس تصویر کی رمزی (Symbolism) قوت بہت زیادہ ہو جاتی

(۶) چاہے ہے پھر کسی کو مقابل مین آرزو	سرمہ سے تیز دشنۂ مژگان کئے ہوئے

نہ غالب کا یہ شعر در خور نقش ہونے کا اہل تھا اور نہ چغتائی اس مین کامیاب ہوئے ہین۔ یہ نقش صنعت کے حدود مین آگیا ہے اور بجائے نقاش کے کسی صناع کے دماغ کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے

(۷) باوجود یک جہان ہنگامہ پیدائی نہین	ہین چراغان شبستان دل پروانہ ہم

چغتائی نے ہر چند اس شعر کو صرف یک رنگ خطوط مین نقش کیا ہے، لیکن مین نہین سمجھ سکتا کہ اس سے زیادہ تکمیل کے ساتھ یہ شعر منقوش ہو سکتا ہے۔ غالب نے پہلے مصرعہ کا جیسا زبردست ثبوت دوسرے مصرعہ مین دیا ہے وہ نہایت ہی بلند و عمیق نقاشی کا مقتضی تھا اور واقعہ یہ ہے کہ چغتائی نے پوری داد اس خیال کی دی ہے۔ چراغ کے دھوین کے پیچ و تاب سے "شبستان دل پروانہ" قایم کرنا اور پھر اس مین پروانون کی سوختگی و برشتگی کے ساتھ ان کی "نیمۂ داغ و نیمہ خاکستر" حالت کو، چراغان کی صورت سے دکھانا، ایسی زبردست تخلیق فنی ہے کہ مشکل سے دوسری نظیر اس کی مل سکتی ہے

(۸) وہ فراق اور وہ وصال کہان	وہ شب و روز و ماہ و سال کہان

مین حیران ہون کہ چغتائی نے اس شعر کا انتخاب کیون کیا۔ اگر یہ تصویر اُن کی پہلی تصویرون مین سے ہے اور محض مرقع مین داخل کرنے کے لئے غالب کے کسی موزون شعر کی جستجو ہوئی تھی تو کوئی دوسرا شعر تلاش کرتے۔ تصویر بُری نہین ہے لیکن اس شعر نے اس کو بہت گرا دیا ہے

(۹) نفس نہ انجمن آرزو سے باہر کھینچ	اگر شراب نہین انتظار ساغر کھینچ

اس نقش مین سوائے اس کے کہ ایک خاتون کی حالت منتظرہ دکھا دی ہے اور کوئی غایر جذبہ ایسا پیدا نہین ہوتا جو غالب کے اس شعر کے مطابق ہو سکے

(۱۰) رو مین ہے رخش عمر کہان دیکھئے تھمے	نے ہات باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب مین

یہ نقش بھی منجملہ اُن چند نقوش کے ہے جن پر چغتائی کیا دنیا کے بہتر سے بہتر نقاش کو ناز ہو سکتا ہے۔ غالب نے دوسرے مصرعہ

پہلے مصرعہ کے مفہوم کو جسقدر وسیع مستحکم کر دیا ہے، وہ نقش کے لئے بھی ویسی ہی عمیق و بالغ نگاہ چاہتا تھا اور حقیقت یہ ہے کہ جو جلال (sublimity) اس نقش مین پیدا کیا گیا ہے وہ اپنے مرکز، فضا اور ماحول کے لحاظ سے خیال کو اُس لانہایت (infinity) تک لیجاتا ہے جو مشکل ہی سے غالب کے شعر سے سامنے آسکتا ہے۔ چغتائی کا یہ نقش ایک ایسا زائیدۂ خیال ہے کہ اگر اُسے اُن کے عہد نقاشی کا سرمایۂ حیات قرار دیا جائے تو بیجا نہ ہوگا

(۱۱) - اس کے بعد ایک غیر متعلق تصویر ملکۂ صحرا کے عنوان سے دی گئی ہے، جو رنگین خطوط کے دوایر، زوایا اور انحنا خطوط کا ایک پاکیزہ مجموعہ ہے۔ صحرا ہیں جس کی فضائے بعید مشرقی وضع کی گنبد دار عمارتون سے ہلکے طور پر آباد نظر آتی ہے، ایک خاتون خاص انداز سے سہمی ہوئی بیٹھی ہے اس کی پشت پر ایک نہایت ہی حسین اونٹ گردن اُٹھائے کسی دور کی چیز کو دیکھ رہا ہے، محمل کی آرائش اور حریری زیبائش اس کو ملکۂ صحرا ثابت کرنے مین پوری طرح مدد دے رہے ہین۔ تصویر صحرا ے نجد کی شہرۂ آفاق داستان لیلے مجنون کو پوری تازگی کے ساتھ سامنے لے آتی ہے۔ اگر خاتون کا بائین ہاتھ (جو ضرورت سے زیادہ سکڑا ہوا معلوم ہوتا ہے) بڑھا کر محمل کے پردہ تک لیجایا جاتا اور اس لحاظ سے اس کی انداز نشست مین تغیر کر دیا جاتا، تو یہ تصویر بہت زیادہ رومانی ہو جاتی

(۱۲)　　ساقی بجلوہ، دشمن ایمان و آگہی

یہ مصرعہ نقش کے لئے انتخاب کے قابل نہ تھا اور اس لئے نقش مین بھی کوئی خاص بات نہین ہے چونکہ چغتائی صرف احساسی نقاش ہیں اس لئے وہ مادی قسم کی تصاویر مین کبھی کامیاب نہین ہوتے

(۱۳)　　آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لیکے رہ گئے　　صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

میرے نزدیک چغتائی کا یہ نقش ان کے بدترین نقوش مین شمار کئے جانے کے قابل ہے اور اس قدر سطحی طور پر اس کی تکمیل کی گئی ہے کہ مجھے حیرت ہوتی ہے انھون نے مرقع مین اسے کیون شامل کیا۔ اس مین ناکام رہنے کا وہی سبب ہے جو ابھی عرض کیا گیا

(۱۴)　　قطرہ مین دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو مین کل　　کھیل لڑکون کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا

غالب کا یہ شعر بہت مشکل سے نقش پذیر ہو سکتا تھا، لیکن چغتائی اس مین پوری طرح کامیاب ہوئے ہین۔ اس شعر کے چار ٹکڑے ہین　قطرہ مین دجلہ - جزو مین کل - کھیل لڑکون کا - دیدۂ بینا - اور یہ چارون حصے نہایت تکمیل کے ساتھ دکھائے ہین

بچہ بلبلے بنا بنا کے اڑا رہا ہے، اس کے ارد گرد کچھ کھلونے پڑے ہوئے ہین، ماں سامنے آنکھین بند کئے ہوئے دیدۂ بینا کی تصویر بنی ہوئی بیٹھی ہوئی ہے۔ اس تصویر کی فضا، ماحول اور مرکز سب اپنی اپنی جگہ مکمل ہین اور سب کا امتزاج بھی ایک عجیب متاملانہ کیفیت پیدا کر دیتا ہے جو اصل روح ہے اس شعر کی

(۱۵)　　شمع بجھتی ہے تو اس مین سے دھوان اُٹھتا ہے　　شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد

اس شعر کو بھی پوری تکمیل کے ساتھ نقش کیا گیا ہے "بجھتی ہوئی شمع" اور "میرے بعد" ان دونون خیال کو ملا کر قبر سے ظاہر کرنا نہایت ہی مکمل تعبیر ہے۔ اسی طرح شعلۂ عشق کے سیہ پوش ہونے کیلئے سوگوار بیوہ کو قبر کے پائین متالم حالت مین دو زانو دکھانا

اور پھر تمام فضا مین ایک حزین والم آگین تاریکی پیدا کرکے اس خیال کو اور زیادہ گہرا کردینا، اسقدر عمیق خیال ہے کہ شاید ہی اس مین کوئی اور اضافہ ہوسکے

(۱۶) نہ گل نغمہ ہون نہ پردۂ ساز　　مین ہون اپنی شکست کی آواز

ہے جہان فکر کشید نہائے نقش روئے یار　　ماہتاب ہالہ پیرا گردۂ تصویر ہے

دونون نقش بہت معمولی ہین اور کوئی قابل ذکر ملس مُو قلم کا ان مین نہین پایا جاتا

(۱۷) دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو　　میری سنو جو گوش نصیحت نیوش ہے

اچھا نقش ہے اور شعر کی تمام کیفیات کا حامل ہے۔ ایک مرد ضعیف چند بچون سے مخاطب ہے۔ ایک طرف بچون کا تمام لاعبانہ کیفیات کے ساتھ گردنین اُٹھا اُٹھا کر پیر مرد کو دیکھنا اور دوسری طرف پیری و اضمحلال کے تمام آثار و علائم کے ساتھ خمیدہ کمر لئے ہوئے بچون سے گفتگو کرنا خاص اثر پیدا کرتا ہے، اس تصویر کی بیک گرونڈ اور رنگ کے انتخاب مین نہایت ماہرانہ ذوق سے کام کیا گیا ہے اور انھین دونون نے اس نقش مین جان ڈالی ہے

(۱۸) دیکھو اے ساکنان خطۂ پاک　　اس کو کہتے ہین عالم آرائی

کہ زمین ہو گئی ہے سر تا سر　　روکش سطح چرخ مینائی

اس نقش مین بھی کوئی قابل التفات بات نہین پائی جاتی

(۱۹) داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی　　اک شمع رہگئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

چغتائی کا یہ نقش بھی غیر فانی ہے اور اسقدر زبردست رمزی (Symbolic) تصویر ہے کہ اس کی خوبی الفاظ سے ادا نہین ہوسکتی

(۲۰) جوش قدح سے بزم چراغان کئے ہوئے　　(۲۱) بلبل کے کاروبار پہ ہین خندہ ہائے گل

(۲۲) چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگین نوائی کا

(۲۳) گو ہات مین جنبش نہین آنکھون مین تو دم ہے　　رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

سہ رنگی تصویرون مین قابل ذکر نہین

(۲۴) مانگے ہے پھر کسی کو لب بام پر ہوس　　زلف سیاہ رخ پہ پریشان کئے ہوئے

(۲۵) سایک ذرہ نہین فیض چمن سے بیکار　　سایۂ لالۂ بیداغ سویدائے بہار

یک رنگی تصویرون مین معمولی چیزین ہین اور قابل ذکر نہین

(۲۶) یک نظر بیش نہین فرصت ہستی غافل　　گرمی بزم ہے اک رقص شرر ہونے تک

(۲۷) گلفشانیہائے ناز جلوہ کو کیا ہوگیا　　خاک پر ہوتی ہے تیری لالہ کاری ہائے ہائے

یک رنگی تصاویر میں یہ دونوں نہایت دلکش چیزیں ہیں۔ پہلے میں رقص شرر کی تعبیر اور دوسری تصویر میں خاک پر لالہ کاری کا رمز (Symbol) بہت عجیب و غریب ہے

غیر متعلق یک رنگی تصویروں میں (Soliloquy) (تکلم بالنفس) بھی نہایت ہی مکمل نقش ہے

اس مرقع کی ابتدا میں ایک صفحہ پر "الاعمال بالنیات" بھی درج ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ چغتائی اپنے ان نقوش پر "بازپرس محشر" سے خائف ہیں اور "دفع دخل" کے طور پر پہلے ہی سے اس "حدیث" کو اپنا وکیل بنا کر پیش کئے دیتے ہیں۔ اگر میرا یہ خیال صحیح ہے تو چغتائی کے نقوش میں کہیں کہیں خامی و لغزش کا پایا جانا بے وجہ نہیں اور جب تک وہ اس کو نیایش و عبادت سمجھکر اختیار نہ کرینگے کبھی کمال کی حد تک نہیں پہونچ سکتے۔ یہ ہے نتیجہ اس تربیت کا جو ہمیشہ مذہب کو فنون لطیفہ کا دشمن بناتی ہے اور ایک فطری نقاش کو بھی اپنے فریب میں مبتلا کرکے "صراط مستقیم" سے ہٹا دیتی ہے

میں اپنی تفصیلی رائے مرقع چغتائی کے متعلق ظاہر کرچکا اور اس میں شک نہیں کہ بہ حیثیت مجموعی وہ بہت قابل قدر چیز ہے، لیکن اسی سلسلہ میں مجھے اس حقیقت کے اظہار سے باز نہ رہنا چاہئے کہ چغتائی اگر چاہتے تو موضوع نقش کے لئے ان سے بہتر اشعار غالب کے ان کو ملسکتے تھے اور میں ان کو مخلصانہ مشورہ دونگا کہ آیندہ وہ اس مسئلہ کو نظر انداز نہ کریں۔ مثالاً میں چند اشعار غالب کے ایسے پیش کرتا ہوں جو چغتائی کے مخصوص ذوق نقاشی کے لئے بہت موزوں ہوسکتے ہیں

جی ڈھونڈھتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن — بیٹھے رہیں تصور جاناں کئے ہوئے
کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب — آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی
ناکامی نگاہ ہے برق نظارہ سوز — تو وہ نہیں کہ تجھ کو تماشہ کرے کوئی
سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہے — کہ دامان خیال یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے
ہاں کھائیو مت فریب ہستی — ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے
ہر قدم دوری منزل ہے نمایاں مجھ سے — میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے
آغوش گل کشودہ برائے وداع ہے — اے عندلیب چل کہ چلے دن بہار کے
جبکہ تجھ بن نہیں کوئی موجود — پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
شق ہو گیا ہے سینہ خوشا لذت فراغ — تکلیف پردہ داری زخم جگر گئی

الغرض اس قسم کے بہت سے اشعار ملسکتے ہیں جن کو خارجی و ذہنی (Subjective, objective) یا مادی و روحانی دونوں قسم کی نقاشی کا موضوع زیادہ تکمیل و وضاحت کے ساتھ بنایا جاسکتا ہے میں نے جس اڈیشن کو دیکھ کر یہ تنقید کی ہے وہ ۵ عشرہ کی قیمت کا ہے۔ پہلا اڈیشن ایک سو دس روپیہ کی قیمت کا بھی میں نے دیکھا ہے اور ان دونوں میں کوئی زیادہ فرق نہیں پایا جاتا۔

اخیر میں مجھے یہ بھی کہنا چاہئے کہ باوجود اس اہتمام کے بھی کہیں کہیں کتابت کی غلطیاں باقی رہگئی ہیں اگر ممکن ہو تو آیندہ اس نقص کو بھی دور کردینا چاہئے۔

نیاز

مومن وکلام مومن

تمہید جس طرح "شہرت" دلیل کمال نہین، اسی طرح "گمنامی" نقص کا ثبوت نہیں بن سکتی شہرت کے کئی اسباب ہوتے ہین

۱۔ طالب شہرت ایسے ذرایع اور تدابیر اختیار کرے کہ وہ مشہور ہوجائے حقیقت موئد شہرت ہو یا نہ ہو جیساکہ آجکل عام طور پر ہو رہا ہے۔

۲۔ "حلقہ شہرت" کے نزدیک وجہ شہرت فضل وکمال نہ ہو بلکہ روایات اور پروپگنڈا ہون، اس کے افراد مین نقد وتنقید کی صلاحیت نہ ہو۔ انہین کے لئے "العوام کالانعام" کا حکم ہے

۳۔ کسی کی شہرت یا گمنامی کسی خاص خیال اور غرض کے تحت مین ہو

۴۔ فضل وکمال کی بنیاد پر "شہرت" ہو، یہ اسوقت ممکن ہے جب "حلقہ شہرت" مین فرق اور امتیاز جانچنے کا مادہ ہو

یہ جس طرح آج مفقود ہے، زمانہ سابق مین بھی کمیاب تھا فرق صرف اسقدر ہے کہ آج بیشتر وہ لوگ مشہور ہین جو پہلی اور دوسری دفعہ مین آتے ہین، پہلے اہل فضل وکمال بھی مشہور ہوتے تھے لیکن کم ایک زمانہ ایسا بھی ماننا پڑیگا جو صرف اہل فضل وکمال کا موئد تھا۔ ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ شہرت اور گمنامی کی بنیاد اگر حقیقت پر نہ ہو تو اس کا وزن کہانتک قابل ذکر ہے؟ مبصرین اور عقلا کے نزدیک اسکی کچھ حقیقت نہین

اس مین شبہہ نہین کہ ۲ و ۳ صورتون نے بہترین فضل وکمال کا گلا گھونٹ کر ان لوگون کو روشناس کیا ہے جنکی چمک بالکل ذرون سے نہیں۔ ایسے مواقع کے لئے کہا گیا ہے (All that glitters is not gold) ہر چمکنے والی چیز سونا نہین ہوتی

جب کبھی قوم یا کسی ملک مین خیرہ نظری کی یہ صورت رونما ہوجائے کہ ہر چمکنے والی چیز سونا، چاندی، اور جواہرات سے تعبیر ہو تو سمجھنا چاہئے کہ اس کے دن اچھے نہین زمانے نے جن لوگون کو باوجود "فضل وکمال" ابھرنے ندیا ان مین حکیم مومن خان "مومن" بھی ہین حکیم مومن خان کو علوم وفنون کے ساتھ شاعری مین جس درجہ کمال تھا اسی قدر وہ محروم شہرت تھے اسباب گمنامی پر تذکرہ نویسون اور نقادون نے جسقدر تحقیق کی ہے بیشتر ناتمام اور تشنہ رہگئی ہے اسوقت تفصیل کے ساتھ اس پر بحث کرنے کی ضرورت ہے۔

جس طرح "آفتاب بہت دنون تک بادل مین نہین رہتا اسی طرح "کمال" پردے مین رہنے کی تاب نہین لاتا ملک مین ایسی ہستیان بھی پیدا ہوگئین جو غالب اور ذوق کے نقارخانہ شہرت مین مومن کے کمال کے لئے آواز طوطی بنگئیں

عرصہ سے مجھ کو خیال تھا کہ مومن کے کمال کو روشناس کرنا اُردو شاعری پر بہت بڑا احسان ہے، مجھ کو اپنے اس خیال کی تائید حسرت موہانی سے ہوی کہ دنیائے شاعری مین "مومن" آفتاب تھے مین نے نواب عماد الملک مرحوم کی فرمایش اور محترم جناب مولوی

محمد عثمان صاحب فاروق وکیل کی تائید اور اصرار سے انتخاب کلام مومن کی شرح رسالہ العلم مین لکھنا شروع کی اس کے بعد بیحان مین افسوس ہے کہ تکملہ سے پہلے دونون رسالے بند ہوگئے اس اثنامین "مومن" کے موئدین کی تعداد ملک مین بڑہتی گئی یہانتک کہ نیاز فتحپوری نے اپنے رسالہ نگار اور مولوی عبدالحق صاحب نے رسالہ اُردو مین مومن کی شاعری پر مبسوط مضامین لکھوائے، ان دونون رسالون مین اکثر غیر مشہور واقعات اور ضروری مواد یکجا ہوگئے، نیاز صاحب کے رسالے مین دادِ تحقیق یقیناً "زیادہ دیگئی - مومن کا کلام اینک جو محروم شہرت رہا اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ مومن اور اکثر شعرا کی طرح علام و فنون سے بے بہرہ نتھے بلکہ اہل فضل و کمال شعرا مین ان کا درجہ اکثر سے بلند ہے انھون نے شاعری کی جامہ مین علوم و فنون، کو اس طرح بھر دیا کہ دیکھنے اور سمجھنے والے چیستان سمجھنے لگے مثلاً کہین نجوم ہے، کہین جفر، کہین ریاضی ہے کہین فلسفہ، معانی و بیان کے اکثر مسائل کا ان کی غزلین مرقع ہین اس طرح کہ اگر ان کے اشعار ترتیب کے ساتھ یکجا کئے جائین تو یہ تمام مسائل مسلسل منضبط نظر آئین، معانی و بیان کے اعتبار سے ان کے کلام مین جو جواہر ہین ان کی تفصیل ملاحظہ فرمائیے اور "مومن" کے فضل و کمال اور اعجاز شاعری کو تسلیم کیجئے

تفصیل و تشریح

مثلاً کہتے ہین؟

۱- ہر جامہ ہے تیرا جلوہ لیکن | دیکھا تو کہین نظر نہ آیا
تو واحد و بے نظیر و ہمتا | تو حاکم و خالق برایا
تجھ کو بھی نہ کہہ سکین تراشل | یان تک نقش دوئی مٹایا

پہلے دو شعر علم معانی کے مسئلہ "اسناد حقیقی عقلی" کے حامل ہین، اسناد حقیقی عقلی کی چار قسمین ہوتی ہین ان مین سے ایک وہ ہے جو واقعہ اور اعتقاد دونون کے مطابق ہو اوصاف مذکورہ پر اسلامی نقطۂ خیال سے اعتقاد بھی ہے اور انکی حقیقت بھی ہے تیسرے شعر مین علم کلام کا مسلم مسئلہ بیان کیا ہے کہ خدا کا مثل نہین "قل ہو اللہ" کی اس آیت کی طرف تلمیح ہے وَلَمْ يَكُنْ لَّهُ كُفُوًا أَحَدٌ (اس کا کوئی مثل نہین) اس مسئلہ خشک کو غزل کی رنگینی مین بیان کرنا "مومن" کا کمال ہے

اسکو بھی سمجھ لینا چاہئے، کہ مومن کڑ مسلمان تھے

۲- مسند الیہ کی تعریف علمیت کے ساتھ اس طرح کہ اظہار تعظیم کے لئے نظر ہو

تری غلامی کی دولت سے خاک پائے ہلال | سفیدۂ رخ فغفور چین و قیصر روس

یہ شعر نعت مین ہے، انصاف کیجئے لغت کا یہ مضمون آقائے دو عالم کے غلام کی شان کہان پہونچا تا ہے

۳- اظہار علمیت سے علم کا کنایہ اصلی معنی کی طرف بھی ہوتا ہے:-

آج ہوتا کمال تو کہتا | اب تخلص مرا ہے نقصانی

کمال شاعر ایرانی کا تخلص ہے یہان اصلی معنی مین استعمال ہوا

گر ترے کوچہ سے دی کعبہ کو نسبت کیا گناہ — مومن آخر تھے کبھی اے بندۂ اسلام ہم

اس قسم کی رعایت "مومن" کے اکثر مقطعون مین ہے

تیسرا شعر دیکھئے۔

بے نام آرزو کا تو دل کو نکال دین — مومن نہ ہون جو ربط رکھین بدعتی سے ہم

اکثر جگہ مومن نے ایک ایک شعر مین مختلف اور متعدد مسائل بیان کئے ہین، معانی و بیان بھی، فلسفہ و کلام بھی، لفظی رعایت بھی معنوی خوبی بھی پھر لطف یہ کہ روانی اور تغزل کو ہاتھ سے جانے نہین دیا

۴۔ کبھی علم کا اظہار اس سے ہوتا ہے کہ سامع کے دل مین رحم آجائے ؎

کہ ترے صدقے مری جان مومن — جانِ مومن ترے قربان مومن

دوسرا شعر ہے۔

مومن زار کہ تھا گرم بیان — سوزش سینہ سے تھا شعلہ فشان

۵۔ مسند الیہ کی تعریف موصول بنا کر ہو اس کے ایک قسم مین اشارہ ہوتا ہے کہ فلان خبر ایسی ہوگی ؎

وہ جو ہم مین تم مین قرار تھا تمھین یاد ہو کہ نہ یاد ہو — وہی وعدہ یعنی نباہ کا تمھین یاد ہو کہ نہ یاد ہو

۶۔ مسند الیہ نکرہ ہوتا ہے اور تنکیر سے تجدید مقصود ہوتی ہے ؎

کوئی کہتا ہے حاشا ہے یہ گرمی غب خالص کی — اسی جانسوز شعلے نے دھوان دل کا اڑایا ہے

کوئی کہتا ہے ترکیب اور غالب خلط بلغم ہے — رطوبت گر نہین تو کیون پسینے مین نہایا ہے

پہلے شعر مین بیان مسئلہ کے ساتھ الفاظ کی نشست اور معنوی تناسب کو بھی ہاتھ سے جانے نہین دیا ہے، دوسرے شعر مین طب کا معرکۃ الآرا مسئلہ بیان کر کے تشریح مزاج انسانی بھی کی ہے

۷۔ مسند الیہ موصوف ہوتا ہے اور صفت اس کی توضیح کرتی ہے ؎

اُڑتے ہی رنگ رخ مرا نظرون سے تھا نہان — اس مرغ پر شکستہ کی پرواز دیکھنا

مرغ کی صفت پر شکستہ اس لئے ذکر کی ہے کہ بیان پرواز مین ندرت ہو۔

۸۔ مسند الیہ کے عطف سے حصر پیدا ہوتا ہے، کوئی دوسرا تیسرا سمجھا نہین جاتا ؎

عشق کے دیکھے ہین ہم نے عالم — عشق جانے ہمین اور عشق کو ہم

۹۔ معطوف اور معطوف علیہ مین التزام ہوتا ہے ؎

بعد یک چندے گر خدا چاہے — مین ہون اور تیرے در کی دربانی

۱۰۔ مسند الیہ کے عطف سے تعجب اور حیرت کا اظہار ہوتا ہے ؎

مومن اور عشق بتان اے پیرومرشد خیر ہے — یہ ذکر اور منہ آپ کا صاحب خدا کا نام لو

دوسرا شعر دیکھئے ؎

در تبخانہ و عشق بتان اور آپ اے مومن — یہ حضرت آگئی اکبار کیا طبع مقدس مین

۱۱۔ مسند الیہ پر اس لئے عطف کیا جاتا ہے کہ مخاطب راہ خطا سے صواب کی طرف پھیرا جاے ؎

قابل ترک تھی خوے ستم آرا نہ کہ مین — لائق سہو تھی یہ رنجش بیجا نہ کہ مین

۱۲۔ متکلم شک مین ہوتا ہے اس وجہ سے عطف کیا جاتا ہے کہ مخاطب کو شک ہو جائے ؎

نکتہ سنجون سے جی مین ہے پوچھون — کہ مین شہری ہون یا بیابانی

۱۳۔ صنعت التفات مین تکلم سے خطاب کی طرف التفات عام طور پر اور شعرانے بھی استعمال کیا ہے لیکن مومن کا رنگ بالکل جداگانہ ہے، یہ صنعت قرآن پاک مین بہت ہے ؎

رکھے مجھکو جیسا مین اُس کو عزیز — نہ معشوق و عاشق مین ہووے تمیز

نہین اب چپ کہ مومن دعا ہو چکی — بہت زاری والتجا ہو چکی

مثنوی کے اشعار ہین

۱۴۔ خطاب سے غیبت کی طرف التفات۔

مومن اب ختم کر دعا پہ سخن — تا کجا لا فہاے طولانی

۱۵۔ ایک غزل مین خطاب۔ تکلم۔ غیبت اور تکلم دونون ؎

غیر کو سینہ کہے سے سیم بر دکھلا دیا — تمنے کیا کچھ کس کو آتنی بات پر دکھلا دیا

زردمتہ دکھلا دیا غم کا اثر دکھلا دیا — آج ہم نے اس کو اپنا زور وزر دکھلا دیا

صبح سے تعریف ہے صبرو سکون غیر کی — کس نے شب مجھکو تڑپتے بیش درد دکھلا دیا

موت کے صدقے کہ وہ بے پردہ آئے لاش پر — جو ند یکھا تھا تماشا عمر بھر دکھلا دیا

پہلے شعر مین خطاب دوسرے تیسرے مین تکلم ہے چوتھے مین تکلم اور غیبت دونون

۱۶۔ اضمار قبل ذکر کبھی ناپسندیدگی اور کراہیت کی بنیاد پر ہوتا ہے:۔

وہ ہے خالی تو یہ خالی یہ بھرے تو وہ بھرے — کاسۂ عمر عدو حلقۂ آغوش ہوا

۱۷۔ تقئید مسند فعلی باشرط، کبھی تجاہل عارفانہ کے ساتھ ہوتی ہے ؎

نچوڑینگے ہم اپنا دامن تر — جہنم مین ہے اے واعظ اگر آگ

۱۸- مخاطب کے اعتقاد کے مطابق کلام کیا جاتا ہے

گردیتی ہون اس مین دم مین تجھکو ہو تیغِ علی کی مار مجھکو +

مومن کی مثنوی کا شعر ہے

۱۹- ماضی وحال کے ساتھ اگر مسند فعلی کی تقیید شرط کے ساتھ ہو تو اس سے یقین مراد ہوتا ہے

جب سے گئے وہ ادھر نہین یاد کیا پوچھی نہین کچھ خبر نہین یاد کیا

۲۰- نکتۂ بدیعی کی وجہ سے شرط کے بعد جزا مین صیغۂ ماضی استعمال کیا جاتا ہے۔

بالطبع گر کرم ہو تو مفلس بھی ہے کریم ہوتا ہے سائے کو شجر بے ثمر سے فیض

۲۱- ذکر شرط سے تفاول منظور ہوتا ہے ؎

ہو حق وفا ادا قضا نے چاہا کعبے کا سفر بخت رسا نے چاہا ہے ترک علاج ان تبون کا مومن دیکھو جا ہین گے گر خدا نے چاہا

ایک مسلمان کو ہر دم انشاءاللہ کہنا چاہئے، مومن نے اس مسئلہ کا بھی ذکر کر دیا ہے

۲۲- مقام تعظیم مین مسند کا صرف ؎

اللہ رے تیری بے نیازی یعقوب کو مدتون رُلا یا

۲۳- تنکیر مسند مین مقصود بالتمثیل سائل ہوتا ہے مگر سائل کا حصر مسند الیہ پر منظور نہین ہوتا اور نہ سائل کا تعین مقصود ہوتا اسکی صورت یہ ہوتی ہے ؎

کب تلک چشم سے خون ہو جاری کب تلک درد کرے دلداری

۲۴- کبھی تفخیم کا فائدہ ہوتا ہے ؎

سچ ہے کہ یہ ایک بیوفا ہین جتنے ہین حسین بری بلا ہین

۲۵- تقدیم مسند اہمیت کی وجہ سے ؎

بیٹھین نہ اسے یہ کھول کر بال رو وین نہ یہ منہ پہ دھر کے رومال

۲۶- کبھی اس لئے تقدیم ہوتی ہے کہ بُرائی کے اظہار مین عجلت ہو

کوئی اس دور مین جیسے کیو نکر ملک الموت سے ہے ہر ایک بشر

۲۷- متعلقات فعل مین مفعول کی شان کا اہتمام اس طرح مدنظر ہوتا ہے

تجھ کو بھی نہ کہہ سکین ترا مثل یان تک نقش دوئی مٹایا

یہ شعر ایک جگہ اور دوسری خصوصیات کے ساتھ ذکر ہو چکا ہے

۲۸- موصوف پر صفت کا قصد۔

لائق جور و جفا ہے وہ نہ مین　　مفتری فتنہ بلا ہے وہ نہ مین

۲۹- قصر کی ایک صورت یہ ہوتی ہے کہ اس سے اعتقاد باطل ہو جائے تو

نہ وہ خالق ہے مگر ہے اثر باعث خلق　　نہ وہ رازق ہے مگر قاسم رزقِ مقسوم

اس صفت مین انکار سے اقرار کا ثبوت ہوتا ہے

۳۰- قصر کے لئے الفاظ معین ہین ان مین ایک "تنہا" بھی ہے

تھا مین اس گھات مین کہ گر اک آن　　ملے تنہا وہ راحتِ دل و جان

بیان انشا

۳۱- انشا مین ایک چیز تمنا ہوتی ہے تمنا چاہے ممکن الحصول شے کی ہو یا محال عقلی کی:

پہونچتے وان تو اس پردہ نشین کو دیکھے　　کاش ہوتے بچشم نرگس دیدہٗ بادام ہم

۳۲- استفہام کے لئے الفاظ "کیون" "کس لئے" بھی آتے ہین

کہون گر غیر سے مت مل تو کہوے طعن سے رُک کر　　یہ کیون! کس واسطے!! ہم ایسے تیرے ہوگئے بس مین

۳۳- استفہام سے تعین زمانہ اس طرح ہوتا ہے۔

عمر رفتہ کی جستجو کب تک　　اپنے مرنے کی آرزو کب تک

۳۴- استفہام سے تعریف و تحسین مطلوب ہوتی ہے

کیا تن نہ خاک اللہ اللہ　　کیا صورت پاک اللہ اللہ

۳۵- استفہام سے تفصیل مطلوب ہوتی ہے

کیا کرون اللہ سب ہین بے اثر　　دل کیا نالہ کیا فریاد کیا

۳۶- استفہام سے حسرت و افسوس مراد ہوتا ہے

کہان وہ ربط بتان اب کہ اس کو تو مومن　　ہزارون سال ہوئے سیکڑون برس گزرے

۳۷- صیغہ امر دعا کے لئے

خدایا لشکر اسلام تک پہونچا کہ آ پہونچا　　لبون پر دم بلا ہے جوش خون شوق شہادت کا

۳۸- فصل و وصل کے سلسلے مین معطوف اور معطوف علیہ کی صورت

نالہ اکدم مین اڑا ڈالے دھوین　　چرخ کیا اور چرخ کی بنیاد کیا

۳۹- کمالِ اتصال

کہا اس بت سے، جب، مرتا ہے مومن　　کہا مین کیا کرون مرضی خدا کی

۴۰- جملہ حالیہ مین ایک جملہ مین ثبوت اور دوسرے مین تجدد مقصود

کب گل کھلے گا دیکھئے ہے فصل گل سے دور　　اور سوے دشت بھاگتے ہین کچھ ابھی سے ہم

ایجاز و اطناب

۴۱۔ مساوات ؎ تم مرے پاس ہوتے ہو گویا جب کوئی دوسرا نہین ہوتا

۴۲۔ تطویل ؎ نہ جاؤنگا کبھی جنت مین مین نہ جاؤنگا اگر نہوے گا نقشہ تمھارے گھر کا سا

۴۳۔ اطناب بہ شکل اعتراض تہدید کے لئے ؎

ہم نکالین گے سُن اے موج ہوا بل تیرا اس کی زلفون کے اگر بال پریشان ہونگے

علم بیان

۴۴۔ مشبہ اور مشبہ بہ حسی جس کا تعلق حس سامعہ سے ہے

دمِ مصاف ترے دشمنون کے لشکر مین صدائے نوحہ و شیون ہے شور و غلغل کوس

۴۵۔ مشبہ اور مشبہ بہ حس ذائقہ کے متعلق ؎

جھوٹی شراب اپنی مجھے مرتے دم تو دے یہ آب تلخ شربت قند و نبات ہے

۴۶۔ مشبہ حسی اور مشبہ بہ عقلی

بات کرنے مین رقیبون سے ابھی ٹوٹ گیا دل بھی شاید اسی بدعہد کا پیمان ہوگا

۴۷۔ مشبہ عقلی اور مشبہ بہ حسی

رنگینی بزم کا بندھا دھیان جون بوے گل اُڑگئے سب اوسان

۴۸۔ وجہ شبہ واحد حسی ؎ بادہ کش ایسی تلخ کام کہ ہے کفِ مارِ سیہ مئی احمر

۴۹۔ مشبہ اور مشبہ بہ عقلی ؎ رکھے مجھ کو جیسا مین اسکو عزیز نہ معشوق و عاشق مین ہوتے تمیز

دوسرا شعر عیش وطن اندوہِ غریبان دستِ جنون سے چاک گریبان

۵۰۔ وجہ شبہ متعدد ؎ بار انداز ہوا روزِ سفید نکلی وہ گھر سے کہ نکلا خورشید

۵۱۔ غرض تشبیہ اک داغِ سیاہ خال سا تھا یہ لطفِ فغان شعلہ زا تھا

۵۲۔ غرض تشبیہ سے لاغری مقصود ہے۔ یہ حالتِ قامتِ خمیدہ جیسے شجرِ خزان رسیدہ

۵۳۔ شبیہ سے غرض ہجو نفس اجل تصویرِ وبا تھی صورتِ فتنہ شکل بلا تھی

بات مین وہ آواز مسلسل صور کا جیسے نفخۂ اول

۵۴۔ تشبیہ سے مشبہ بہ کی شان ظاہر کیجاتی ہے اسکو اظہار مطلوب کہتے ہین

صورت وہی عظمت وہی گردش وہی گیتی حیران ہے کہ یہ چرخ ہے یا آبلہ اپنا

۵۵۔ حرف تشبیہ "جون" سے مشبہ اور مشبہ بہ ایک دوسرے کے عین سمجھے جاتے ہین

گاہ آوازِ خوش سنا دینا جون سحر گاہ مسکرا دینا

۵۶- تشبیہ قریب لبریز بہار صد جنون تھا ہر سنگ وہان کا بے ستون تھا

۵۷- تشبیہ مفصل دُردِ شراب و سختی قاتل تلخ سخن مانند ہلاہل

۵۸- تشبیہ مجمل داغ اس کے زبس مثال گل تھے تھے ہاتھ کہان نہالِ گل تھے

۵۹- وجہ شبہ پوشیدہ ہے رگِ خواب سے غفلت محسوس ہو گئی طرز تجاہل کابوس

۶۰- صرف وصف مشبہ مذکور ہو۔ تھی پشت خمیدہ یا کمان تھی تھا تیر کہ آہ خونچکان تھی

۶۱- تشبیہ کفایہ ابر رحمت تپ عذاب الیم سایہ نادر احتراق جحیم

استعارہ

۶۲- استعارہ غیر متعارف دشمن مومن رہے ہیں بت سدا مجھ سے مرے نام نے یہ کیا کیا

۶۳- وجہ جامع

درِ نایاب تو کیا خاک سے بھی منہ نہ بھرے جس کے در پر مین کردن لوے شاداب نثار

۶۴- طرفین استعار اور مستعار لہ کا حسی ہونا ہے مجھے بھی خیال طوف حرم خضرہ گر ہو فضل رحمانی

۶۵- مستعار لہ اور مستعار منہ حسی

اے غارتِ جان و جانِ مومن اے آفت خان ومانِ مومن

۶۶- شبہ فعل مین استعارہ

خندہ زن کس کا ہوا زخم درون شدّتِ گریہ مرنہان کیون ہے

۶۷- کبھی مضاف الیہ سے استعارے کا فائدہ حاصل ہوتا ہے ساقیا زہر پلادے مجھ کو شربتِ گ چکھادے مجھ کو

۶۸- اقرار ہے صاف آپ کے انکار سے ظاہر ہے مستی شب نرگس میخوار سے ظاہر

آنکھ کا استعارہ نرگس سے کرکے آنکھ کے مناسب مستی اور بیخودی کا ذکر کیا ہے

۶۹- استعارہ بالکنایہ

لطف سے اس کے زمین غیرت باغِ فردوس خلق سے اس کے زمان رشکِ دکانِ عطار

۷۰- استعارہ تخئیلیہ

ہان جوشِ تپش چھیڑ چلی جائے کہ پر تو جھڑ جائینگے فرسودہ اگر دام نہ ہوگا

۷۱- مجازِ مرسل مین جو لفظ سبب کے واسطے موضوع ہو اس کو سبب پر استعمال کرین۔

ساقیا دے چک آبِ آتش رنگ گرم و سردِ زمانہ سے ہون تنگ

۷۲۔ کنایہ کی تصریح ؎

چاک پردہ سے یہ غمزے ہین تواے پردہ نشین
ایک مین کیا کہ سبھی چاک گریبان ہون گے

۷۳۔ خون کے میرے ارادہ سے ہوا ذابح سعد
قتل پر میرے کمر باندھے بہ شکل جبّار

سعد ذابح سے قمر کی بائیسوین منزل مراد ہے ؎

۷۴۔ وہ قہرمان فلک توسن وبخوم حشم
کہ ترکِ چرخ غلام اس کا مہر جا کر ہے

بترکِ چرخ مریخ سے کنایہ ہے۔

۷۵۔ کنایہ قریب ؎

مو سفیدی کے قریب اور ہے غفلت مومن
نیند آتی ہے بہ آرام مگر آخر شب

۷۶۔ تعریض ؎

مین ہی تو رہا ہون کہین شب سرخوش وخرم
مین نے ہی تو کی بادہ کشی غیر سے باہم

۷۷۔ رمز ؎ بیٹھین لبِ آب جو پہ اکدم
پہونچائین سبو سبو پہ اکدم

علمِ بدیع

۷۸۔ تجنیس تام مماثل ؎

یوسف سے عزیز کو کئی سال
زندانِ عزیز مین پھنسایا

۷۹۔ تجنیس مرکب مفروق ؎

وان سے جواب صاف ہی لائی
بات بنائی پر نہ بن آئی

۸۰۔ تجنیس زائد وناقص ؎

ہم نکالین گے سُن اے موجِ ہوا بل تیرا
اسکی زلفون کے اگر بال پریشان ہونگے

۸۱۔ تجنیس مضارع ؎

بن ترے بزمِ سور مین ہین یہ قیامتین کہ ہے
نغمۂ صور کا اثر نغمۂ نے نوا زمین

صور اور سور مین تجنیس مضارع ہے

۸۲۔ تجنیس لاحق ؎

سرمۂ تسخیر سے ہم خود مسخر کیون نہ ہون
آنکھ کی پتلی جو تھی جادو کا پتلا بن گیا

۸۳۔ صنعت شبہ اشتقاق ؎

کیا کیا جلی ہے بزم مین تجھ بن نہ جب پھرے
پروانے شمع شعلہ شمائل کے آس پاس

۸۔ ردالعجز علی الصدا مع تکرار ؎

دل ابکی بار ہوا ایسی بے جگہ مائل — کہ جان کو بھی ٹھکانے لگا رکھے کا دل

۸۔ ردالعجز علی الحشو مع الاشتقاق

ہے طبع مین ہر روز فزون رنج فزائی — اپنے مین سماتے نہین کیا دل مین سمائی

۸۔ صنعت سیاق الاعداد ؎

جز نہ سپہر ہین۔ مرے دشمن تو اور بھی — لیکن بڑے غضب یہی دو تین چار ہین

۸۔ صنعت معما ؎

کیفیتِ وصال بس اب کچھ نہین رہی — کیونکر نہ ہون ملول میں شب کچھ نہین رہی

شب کے معنے رات کے ہین عربی مین لیل کہتے ہین، الفاظ ملول مین سے لیل نکالا مومن رہگیا۔

۸۔ صنعتِ لغز ؎

بولے وہ جب تک کہ کوئی بولائے — نہ لفظ اور معنی سمجھ مین کچھ آئے — شب روز غوغا مچایا کرے — اسی طرح سے مار کھایا کرے

اس لغز یا پہیلی سے گھڑیال مراد ہے

صنائع معنوی

۸۔ طباق ایجابی ؎

جب تلک باعثِ نشاط و ملال — ہے وصال و فراق جانانی

۹۔ طباق سلبی ؎ بات اپنی وہان نہ جمنے دی — اپنے نقشے جمائے لوگون نے

۹۔ صنعت تشابہ الاطراف ؎

زبان گنگ ہے عشق مین گوش کرے — بڑا سنتے سنتے بھلا کہتے کہتے

۹۔ صنعتِ ارصاد ؎

غیر بیمروت ہے آنکھ وہ دکھا دیکھین — زہرِ چشم دکھلائین پھر ذرا مزا دیکھین

کچھ نظر نہین آتا آنکھ لگتے ہی ناصح — گر یقین نہین حضرت آپ بھی لگا دیکھین

۹۔ صنعت تجرید ؎ سوزِ غضب سے ہے کرۂ نار سینے مین — اک مشتِ خاک ور یہ کین اے فلک دریغ

۹۔ صنعتِ مقابلہ ؎ ہون مین سیہ روز کہ وہ شمع رو — شام کو آیا تھا سحر کر گیا

۹۔ صنعت تجاہل عارفانہ ؎

تارے آنکھین جھپک رہے تھے — تھا بام پہ کون جلوہ گر رات

۹۶- صنعت جمع وتفریق ؂ آئینہ بصفاے دل میرا　　کیا ہوا گر نہین ہے حیرانی
دوست کرتے ہین ملامت غیر کرتے ہین گلہ　　کیا قیامت ہے مجھی کو سب بُرا کہنے کو ہین
۹۷- صنعت رجوع ؂ خنجر تھا الٓہی یا زبان تھی　　خنجر سے زیادہ تر روان تھی
۹۸- حسن التعلیل ؂ خمیدہ کس لئے تو آسمان تھے بھلا　　نہ تھا ازل سے جو مد نظر ترا پا بوس
۹۹- احتجاج بدلیل ؂ شبہ کیا عصمتِ بخت جگر احمد مین　　جب مسلم ہے کہ معصوم ہے جز و معصوم
۱۰۰- صنعتِ ادماج ؂ تیرا اقبال روز افزون ہو　　جیسے مومن پہ فضلِ رحمانی
۱۰۱- تبلیغ ؂ دمِ مصاف ترے دشمنوں کے لشکر مین　　صداے نوحہ و شیون ہے شورِ غلغل کوس
۱۰۲- رعزرق- (مبالغہ قریب العقل بعید العادت کا نام ہے)؂ گرگ نے دورِ عدل مین اُس کے　　سیکھ لی راہ و رسم چوپانی
۱۰۳- صنعتِ تعجب ؂
زخم کھایا زہر کھایا تو بھی کچھ ہوتا نہین　　دیر گزری مرگ کو کیا جانئے کیا ہو گیا
۱۰۴- صنعت تلمیح ؂ ہر آہ کہ لب پہ ہے شرر ریز　　دیپک کا ہے نغمۂ جنون خیز

اس تفصیلی بیان کے سلسلے مین یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ "مومن" نے اُن صنایع وبدایع لفظی ومعنوی کو لیا ہے جو فصاحت اور بلاغت کے اعتبار سے مستحسن اور پسندیدہ ہین اور غیر پسندیدہ صنایع سے سخت احتراز کیا ہے۔ یہ صنایع اور بدایع وہ ہین جو بہ روانی کلام میں خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں

باقی　　"کیفی چریاکوٹی"

مرد اور عورت!

ابتکار و تقلید مین!!

کیا فریقین قوائے عقلی مین برابر ہین؟

اپنی رفیقۂ حیات یا اپنی عزیز محبوبہ کسی سے بھی فریقین کی حقیقت کے متعلق مباحثہ کرو تو وہ اس امر کا اعتراف کرینگی کہ مستورات مردون کے مقابلہ مین عموماً قد کی چھوٹی، وزن مین ہلکی، اعضلات کی کمزور، اور مصیبت کے وقت بے صبر ہوتی ہین، لیکن اگر ان سے تم اس امر کا اعتراف کرانا چاہو کہ وہ فہم وذکا، کے میدان مین بھی مردون سے پیچھے ہوتی ہین - تو یہ ان کے لئے ایک ناقابل تسلیم حقیقت ہو گی عورتون کے مقابلہ مین مردونکے تفوق عقلی پر زمانہ قدیم سے سب کا اتفاق چلا آتا ہے چنانچہ اسی وجہ سے لوگون نے جنس لطیف کو ناقص العقل کہنا شروع کر دیا لیکن حقیقت مین اسوقت مستورات کا جو طبقہ قیود ماضی کی بیڑیون سے آزاد ہو چکا ہے - اور واقعی معنونین زندگی کے تمام شعبون مین مکمل طور سے آزاد ہے، اس کے حیرت انگیز کارنامے، مردون کے تفوق عقلی کے اس خیالی دعویٰ کی بنیاد کو بہت کچھ کمزور بنا رہے ہین

پھر اصل معاملہ کی واقعی حقیقت کیا ہے ؟ کیا مرد و عورت دونون قوائے عقلی مین ایک ہی طبقہ کے دو مساوی فرد ہین ؟ جرمن کا مشہور فلسفی کانٹ کیزرلنگ آخری دنون مین جب امریکہ کی زیارت کے لئے گیا، تو اُسنے وہان تحول اجتماعی کے جو روح پرور مناظر دیکھے انکو اپنے لفظون مین اس طرح بیان کرتا ہے - مین نے امریکہ مین جہان دیکھا، جن جن شعبون مین دیکھا اکثریت اور غلبہ جنس لطیف ہی کو حاصل تھا"

جرمن فلسفی کی یہ رائے حقیقت مین مشاہدہ پر مبنی ہے - اور یہ ضروری نہین کہ ہر مشاہدہ حقیقت کے مطابق ہو - کبھی مشاہدہ واقعی بھی ہوتا ہے اور کبھی حقیقت و امتحان اسکی تائید نہین کرتے، علامہ پاپیز پروفیسر جامعۂ کورنل (امریکہ) نے البتہ اس موضوع پر ایک علمی بحث کی ہے - جو نفس مسئلہ پر بہت کچھ روشنی ڈالتی ہے - پاپیز نے ہلین گارڈنر مشہور زعیمۂ نسوان کے دماغ کی علمی طریقہ پر باریک تحقیقات کی تو انکو ثابت ہوا کہ عورت کا دماغ رتبہ اور مرتبہ مین مرد کے دماغ سے نہ چھوٹا ہوتا ہے نہ کمزور، چنانچہ مسز گارڈنر کے دماغ کا مسٹر ویلڈر موسس جامعہ کورنل کے دماغ سے موازنہ کیا گیا تو دونون بلہ برابر رہے - حالانکہ ان دونون دماغون کا وزن صرف ۱۱۵۰ گرام تھا جو عام دماغون کے توسط وزن سے بھی کم ہے - اکابر رجال کے دماغ کا وزن عموماً ۱۳۰۰ یا ۱۴۰۰ گرام ہوتا ہے - تاریخ مین صرف تین شخص ہین، جن کے دماغ کا وزن ۲۰۰۰ گرام تھا - انمین سب سے زیادہ مشہور روس کا نامور قصہ گو تورجینتو ہے

جامعۂ کورنل (امریکہ) مین دماغی مسائل کی تحقیقات کے لئے مشاہیر حکماء کی کھوپڑیان نہایت احتیاط کے ساتھ محفوظ رکھی

ی ہین ۔امریکہ کا یہ خاص طریقہ ہے کہ مشہور ہستیان اپنی حیات مین وصیت کر جاتی ہین کہ مرنے کے بعد ہمارے دماغ اس یونیورسٹی کے سپرد کردے جائین،
نچہ یہ مبارک رسم اب تک جاری ہے۔ اور اسی رسم کے مطابق مسز گارڈنر نے بھی اپنے دماغ کو اسی مجموعہ مین شامل کرنے کی حاتمانہ وصیت کی تھی،
پاپینر نے جب مسز موصوفہ کے دماغ کی نوعی تحلیل کی تو انکو ثابت ہوا کہ اس قسم کے دماغون مین مادہ سنجابیہ کی مقدار زیادہ ہوتی ہے
ین کسی شخص کے سر کی بڑائی یا چھوٹائی سے اس شخص کے فہم و ذکاء کو قیاس کرنا ایک ناقابل توجہ بات ہے۔ حجم سر یا دماغ کے وزن سے مرد کی
ادت کا صحیح انداز لگانا ہماری استطاعت اور بس کے حدود سے باہر ہے

تاریخی حیثیت سے جامعۂ کولمبیا کے مشہور پروفیسر استاذ کٹیل ماہر فلسفہ عقلیات نے ایک ہزار مشہور تاریخی نوابغ کے سیر و حالات جمع کئے
انکو معلوم ہوا کہ ان نوابغ کی صف مین اکتیس ۳۱ خواتین بھی مردون کے دوش بدوش موجود ہین۔ ڈاکٹر کٹیل کی فہرست نوابغات مین گیارہ فرانروا
شاہزادیان ہین جنکو سلطنت و جہانبانی وراثۃً ملی تھی، اور ۸ حسن و جمال، خوبی و شمائل کی پاک دیویان ہین ۱۰، ادب و لٹریچر کی ماہرہ
ین، دو باقیات الصالحات پر ایک یونان کی مشہور شاعرہ سافو اور دوسری جان ڈارک فرانس کی بطلۂ مقدسہ ہے،

خواتین شہیرات کے سوانح حیات مین غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انھون نے مختلف لائنون مین مردون کے مقابلہ نمایان
امیابی حاصل کی ہے، اس تاریخی شہادت سے یہ پتا چلتا ہے کہ انسانی عقل و فکر کی ترقی کے میدان مین مستورات نے مردون کے ساتھ
لنے کی کوشش ہی نہین کی، ورنہ اس میدان مین مردون کے بھدّے پاؤن، عورتون کے ہلکے قدمون سے بازی نہ لیجاتے

لیکن پھر یہ سوال ہوتا ہے کہ کیون مستورات مین نبوغ بہت کم پایا جاتا ہے؟ بعض مرد اس کا یہ جواب دیتے ہین کہ
سلئے اور صرف اسلئے کہ فہم و ذکا مین مستورات مردون سے کمزور ہوتی ہین" لیکن مردون کا یہ جواب حقیقت مین غبار سے
خالی نہین، جنس لطیف اسکا یون رد کرسکتی ہے کہ اگر یہ صحیح ہے تو پھر مردون نے یہ کیسے ثابت کیا کہ مدارس مین طالبات کی ذکاوت
درجہ طلباء سے کہین زیادہ بلند ہوتا ہے۔ اور جنسین مین بلندی دستی کا یہ انداز سن مراہقت تک باقی رہتا ہے۔ مراہقت کے بعد
لبتہ مرد عورت سے آگے نکل جاتے ہین۔ باقی بلوغ کے پہلے اور اس کے بعد فریقین کے فہم و ذکا کا اوسط کم از کم متقارب ہوتا ہے،

ماہرین فن نے جنسین کی طالب علمانہ زندگی پر غور کیا تو انکو ثابت ہوا کہ جن دروس و اسباق مین تفکیر و تحلیل، اور ابتکار
ی زیادہ ضرورت نہین ہوتی، انمین مستورات زیادہ تیز ہوتی ہین۔ وہ ضروری باتین بلا کسی تردد و یا حیرت کے اپنے حافظہ کے اعتماد پر
فوراً یاد کرلیتی ہین انکو اسباب و علل کے اختلافات سے کچھ سروکار نہین ہوتا۔ درجات مدارس کے حصول مین ان کے غیر معمولی
تفوق کا یہی اصلی راز ہے۔ اور نوجوان طلبہ چونکہ ہر چیز کی علت اور اسباب ڈھونڈھتے پھرتے ہیں۔ اسی لئے وہ ہمیشہ متحیر اور
متسائل نظر آتے ہین۔ اور یہی وجہ ہے کہ جن اسباق مین بحث و مقارنہ کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے (جیسے طبیعیات، تاریخ، اور کیمیا،
وغیرہ) انمین یہ زیادہ ممتاز ہوتے ہین۔ مختصر یہ کہ مرد کی امتیازی خصوصیت صرف اعمال قدیمہ کو علمی جامہ پہنانے کیلئے وسائل جدیدہ
کا ابتکار ہے۔ اس بنا پر یہ کہنا صحیح معلوم ہوتا ہے کہ عورت کی عقل ٹھیک اسی طرح محاکاۃ و تقلید کی طرف زیادہ مائل ہے، جس طرح
مرد کی عقل ابتکار و اقدام کی طرف!!

لیکن صنف نازک ان اقوال کی پھر یوں تردید کرتی ہے کہ چونکہ عورتوں کو فرصت اس قسم کا موقعہ نہیں دیتی، کہ وہ اپنے مقالات اور نبوغ، جوہر اور فکر کو سپرد کر سکیں، اسی لئے وہ ابتکار و اقدام مین مردون سے پیچھے نظر آتی ہین، جب کام کا وقت آتا ہے، اور مرد، مکتشفات کا اکتشاف، مستنبطات کا استنباط، آراء و مذاہب کا ابتکار کرتے ہین۔ اور متین و پائدار بنیادون پر حضارۃ و عمران کی بنا رڈالتے ہین۔ تو اسوقت وہ اپنی عائلانہ زندگی مین نوابغ کو دودھ پلاتی ہوتی ہے

اس جواب مین اگرچہ صحت و صداقت کا ایک بڑا حصہ موجود ہے، لیکن پھر بھی یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگر مردون کے اعمال مین انکو شرکت کرنے کا موقعہ نہ ملا۔ تو وہ زنانہ اعمال (فرش بیوت، زنانہ لباس، فلسفۂ اطفال کے ابتکار وغیرہ) مین کیون فائق نہ ہوئین؟ حالانکہ جن نوابغ نے عالمگیر شہرت اور جہانگیر عظمت حاصل کی، انھون نے بھی یہ مراتب علیہ دمقس اور حریر پر چلکر نہین پائے، بلکہ بارہا اس راہ مین انکو بھی الم و عذاب، نقش و اعراض، تکلیف و مصیبت، درد و غم کے خونخوار عفاریت سے مقابلہ کرنا پڑا، تاریخ کے صفحات اس قسم کے واقعات سے لبریز ہین۔ اگر انکو تفصیل سے عرض کیا جائے تو وہ بجائے خود ایک لمبی داستان ہوگے اسلئے ہم اسکو نظر انداز کرتے ہین۔ غرض یہ کہ تاریخ کے مشہور ترین نوابغ نے جوجو مصیبتین جھیلی ہین، ان مصاعب عظیمہ کے مقابلہ مین عورتون کی عائلانہ زندگی کے بکھیڑے بہت ہی معمولی اور غیر اہم ہین

علامہ لوریا جامعۂ برن کے مشہور پروفیسر فلسفۂ عقلیات کا خیال ہے کہ دنیا مین سینکڑون ایسے عمدہ کام کرنیوالے افراد موجود ہین۔ جنکو ترقی اور تفوق کی طرف صرف انکے شعور اور احساس نے برانگیختہ کیا، ذکاوت کو اس کامیابی مین کوئی دخل نہین ہے،

عورتون کے مقابلہ مین مردون کے تفوق کی ایک یہ وجہ بھی بتائی جاتی ہے کہ: مرد چونکہ فہم و ذکا کے استعمال مین زیادہ روشن ہوتے ہین۔ اور عورتون مین روشنی کا یہ جوہر نہین پایا جاتا۔ اس لئے عورتون مین نبوغ کم ہوتا ہے، اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ذکا مین عورت و مرد دونون مساوی ہین، فرق ہے تو صرف طریقۂ استعمال کا فرق ہے۔ اور حقیقت مین مردون کی اس شرف و مزیۃ کا اصلی سبب صرف انکی جسمانی طاقت کی زیادتی ہے کسی بیوی سے تانسے والے سے اس حقیقت کے متعلق سوال کرو تو وہ تمکو بتائے گا کہ اس کا اصلی راز غدد صما ہین، یہی غدد ہین، جو اپنے قدرتی اثر سے جسم کے حجم کو بڑا، عضلات کو مضبوط اور عزم و ارادہ کو روشن بناتے ہین۔ چنانچہ جب کسی سبب سے یہ غدود بیکار ہوجاتے ہین تو مرد اپنے ممتاز ترین صفات رجولیہ سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے، بعض ماہرین فن نے مرغ کے انھی غدود کو نکال کر مرغی کے جسم مین لگا دئے تو کچھ ہی دنون مین خود مرغی کے اندر مرغ کی صفتین ظاہر ہوگئین

بہر حال! نبوغ کیا چیز ہے؟ کیا نبوغ صرف انہی اعمال عظمہ کا نام ہے۔ جو تاریخی صفحات مین جگہ پانے والے اور بظاہر نظر فریب ہین (مثلاً کسی حیرت انگیز آلہ کا استنباط، یا کسی طبیعی حقیقۃ کا اکتشاف، کسی مملکۃ کی تدوین یا کسی مجسمہ اور تمثال کی مورت، کسی بہترین صورت کی تصویر، یا کوئی مفید اور دلچسپ نظم وغیرہ) اور کیا یہ صحیح نہین کہ لفظ نبوغ کا اطلاق ان اعمال پر بھی کیا جائے جو گھرون کے گوشے مین، مکانون کے کونے مین بلا کسی اعلان اور شور کے پورے ہوتے ہین؟ اور جن کا ترقی عمران مین ایک مخصوص اثر بھی ہوتا ہے؟

اگر یہ صحیح ہے تو پھر اسی سلسلہ مین اب ہمین ان عورتون کو بھی شمار کرنا ضروری ہوگا جو اپنی محبت و دوستی، عطف و مواساۃ،

حسن انتظام اور خوش سلیقگی مین خود مردون سے بھی خراج تحسین وصول کئے بغیر نہین رہتین،

حقیقت یہ ہے کہ ابتدا تاریخ سے لیکر آج تک طبقہ مستورات مین جو مخفی عامل کارفرما ہے۔ وہ انکو صرف محبت و وداد، الفت و دوستی، زوجیت و امومت مالکہ، مکان اور مربی بیت کی حیثیت سے ممتاز کرتے رہے۔ چنانچہ وہ ان فضائل مین اپنی نظیر آپ ہین اور ان کے اس عظیم الشان تفوق کا کوئی دانشمند انسان انکار نہین کرسکتا

غرض یہ کہ جہانتک مین نے غور کیا عورتون مین قلت نوابغ کا سبب سا سی صرف یہ سمجھ مین آتا ہے کہ مستورات خود نوابغ ہونا ہی نہین چاہتین، بلکہ وہ صرف "عورت" بننا چاہتی ہین اور "عورت" ہی ہونے کو اپنا بہت بڑا فخر سمجھتی ہین، ورنہ اگر وہ اس میدان مین اُترین تو یقیناً مردون سے کسی طرح پیچھے نہین رہ سکتی ہین،

"بدر اصلاحی"

ایک سیاح کی ڈائری

(سیاحت نامۂ لکھنؤ کی دوسری قسط)

لکھنؤ کے محرم کا ہنگامۂ "مسرت" ختم ہونے کے بعد میرا خیال تھا کہ شاید کوئی غیر معمولی "سوگ" یہان کی فضامین پیدا ہو جائیگا اور مجھے اس "ماتمکدہ" کو جلد چھوڑ دینا پڑیگا، لیکن میرا یہ خیال غلط نکلا۔ یہان کی آبادی خواہ کسی قدر اپنے سینون کو فگار دکھانے کی کوشش کرے، لیکن دلون کے اندر ابھی تک وہی "نشاط غیر معصوم" (مگر فطری) موجزن ہے جس کی ابتدار، اولین فرمانروائے اودھ کے عہد مین ہوئی اور جس کی انتہا آخری شاہ اودھ کی اُس سیرت پر جو قیصر باغ کے ایک ایک حوض سے عریان ہو کر نکلنے والی دوشیزہ کو "موج کوثر و تسنیم" مین ڈوبی ہوئی حور سمجھکر "مالِ یغما" نہین بلکہ "حصۂ مومن" کی حیثیت سے قابض ہو جاتی تھی۔ اُس "فراموشکارِ فردا" عہد کے "ذرات مبثوثہ" یہان کی فضامین اب بھی بالکل اسی طرح نظر آتے ہین جیسے کسی رقاصہ کی محفل سے اُٹھ جانے کے بعد اس کے زر کار ملبوس مین سے ٹوٹے ہوئے "بادلہ کے ریزے" کہین کہین فرش پر چمکتے ہوئے مل جائین

یہان کی آبادی کا دولت و جاہ والا عنصر وہ ہے جس کا اصطلاحی نام "تعلقہ داران اودھ" ہے اور جن مین ہندو مسلمان دونون افراد شامل ہین۔ ان کی کوٹھیان، ان کے قصر، ان کے مکانات لکھنؤ کے مختلف حصون مین منتشر ہین اور جب وہ اپنی دیہی زندگی کے بے آب و رنگ مشاغل سے تھک جاتے ہین تو یہان کی متمدن فضامین آکر قیام کرتے ہین اور تمام وہ "لوازم نشاط" جو دولت سے حاصل کئے جاسکتے ہین ان کی دسترس سے باہر نہین رہتے، ہر چند ان کی اقتصادی حالت قابل تعریف نہین، لیکن جس حد تک حکومت کے ساتھ وفادارانہ تعلق رکھنے کے بعد آزادی خلاق، کا استحقاق پیدا ہو سکتا ہے وہ سب انہین حاصل ہے اور اس کے لئے زر و مال کی کمی کی شکایت انھین کبھی پیدا نہین ہوئی۔ صوبۂ اودھ مین اس جماعت کو وہی درجہ حاصل ہے جو رُوئے زیبا پر مصنوعی خال کا ہوا کرتا ہے کہ بعض کے نزدیک وہ یکسر تصنع نا روا ہے اور بعض کے نزدیک "افزایش حسن" ـــــ مین نے بھی رات کے وقت ان "کا شانہائے حسن و جمال" کو برقی روشنی مین جگمگاتے دیکھا اور خیال کی ایک مکمل "کارگاہِ معصیت" مین اپنے آپ کو مرکزی حیثیت دیکھکر پورا لطف تصور بھی اُٹھایا ہے۔ حیران ہون کہ جن کے عیش و مسرت کی گھڑیان اس انداز سے ہمیشہ گزرتی رہتی ہین وہ زندہ کیونکر رہتے ہین کیا سرمایہ و عمل کی جنگ یا اشتراکیت و اجتماعیت کا اصول اسی نوع کے انتہائی غیر عادلانہ تقسیم فطرت کو دیکھ کر تو پیدا نہین ہوا!

یہان کا دوسرا مخصوص طبقہ جو اپنے "سقوط راس" اور "ذرۂ آفتاب تابانیم" دونون حیثیتون سے خالص لکھنوی ہے وثیقہ دارون کا ہے، جن مین بعض وہ ہستیان بھی ہین جو لاکھون کی مالک ہین اور بعض وہ متوکل نفوس بھی ہین جن کے اخلاق کا ارتقاء گداگری پر ختم ہوتا ہے، متوسطین کی حالت گداگرون سے بدتر ہے کہ ان کے پاس حصول معاش کا یہ ذریعہ بھی نہین اور وثیقہ کی تنگی

انہیں جی کھولکر" افیون سیاہی " کی بھی اجازت نہیں دیتی۔ ان کا ایک ایک بال قرض میں بندھا ہوا ہے، غالب کی تنخواہ میں ساہوکار صرف تہائی کا شریک ہوا تھا مگر وہ دلی کی باتیں ہیں اور دور کی، یہاں لکھنؤن میں ساہوکار تین چوتھائی سے زیادہ کا شریک ہے اور باقی چوتھا حصہ "چنیا بیگم " کے لئے بھی کافی نہیں ہوتا، " قدر کفاف " اور " سد رمق " کا کیا ذکر ہے اس جماعت کی اخلاقی و معاشری حالت کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب دولت " مزد " کی حیثیت سے ہٹکر صرف " دست غیب " " یا ترکہ " کی صورت میں ملتی ہے تو اس میں کسقدر "عفونت وگندگی" پیدا ہوجاتی ہے۔ لوگ بہو بیگم کی تعریف کرتے ہیں کہ لاکھوں کا وثیقہ ان کی ذات سے لوگوں کو ملا۔ میں کہتا ہوں کہ وہ اس سے زیادہ ظلم اہل لکھنؤ پر کوئی اور کرہی نہ سکتی تھیں کہ اتنی بڑی جماعت کو بیکار و بے دست و پا بناکے رکھدیا اہل لکھنؤ کی پست ذہنیت کا بڑا سبب یہی " غلط بخشی " ہے اور یہ جو لکھنؤ سے باہر ہر جگہ یہاں کا زنانہ پن بدنام ہے، اس کی علت بھی اسی کو قرار دے سکتے ہیں جس نے تو اعمل کو بیکار کرکے عورتوں کی طرح مہمل زندگی کا عادی بنادیا۔

میں یہاں کے ایک بڑے وثیقہ دار سے ملنے گیا جنکی آمدنی کانوں اور وثیقہ کی ملاکر ایک ہزار سے کم نہیں ہے، آباواجداد کا چھوڑا ہوا ایک عالیشان قصر بھی ہے موٹر بھی رکھتے ہیں، حاجب و دربان بھی موجود ہیں، لیکن حالت یہ ہے کہ ان کے مکان کی فضا و ہاں کا ماحول اور ایک ایک چیز پر ادبار کا گہرا سوگ برس رہا ہے اور وہاں پہونچتے ہی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاید خون کی روانی رگوں کے اندر کم ہوگئی ہے۔ اور غنودگی سی رُوح پر طاری ہورہی ہے۔ ان کے یہاں کی محافل اس میں شک نہیں کہ بڑی حدتک ان کے اسلاف کی یادگار ہیں، وہی کبوتر و بٹیر کی لت وہی فسانۂ آزاد کے صف شکن خان بٹیر کی تعریف کرنے والے مصاحبوں کا گروہ، وہی ارباب نشاط کا ہجوم اور وہی ذوق رقص و موسیقی، لیکن چونکہ حقیقتاً رُوح نشاط سے خالی ہے، اس لئے یہ تمام سامان بجائے مسرور کرنے کے میرے دل کو دُکھا رہا تھا اور حیران تھا کہ یہ لوگ جنھوں نے تمام عمر ایک دن بھی اپنے جسم و دماغ کو محنت سے تھکا کر تفریح کے لئے آمادہ نہیں کیا وہ کس طرح اس سے لطف حاصل کرسکتے ہیں اور کیوں نہیں وہ ان تمام اسباب عیش و تفریح سے بیزار ہوکر خودکشی کرلیتے۔ اس مختصر صحبت میں کبوتروں کے عجیب و غریب نام، ان کے سیکڑوں اقسام، فن کبوتر بازی کی اصطلاحیں، بٹیر بازی کے بہت سے رموز و نکات، موسیقی کے متعدد دل تڑپا دینے والے ٹکڑے، مصاحبوں کی خالص لکھنوی ذہنیت کا پتہ دینے والی لکھنوی ٹکسالی زبان سبھی کچھ میں نے دیکھا اور سُنا، لیکن بالکل سرمایۂ اعتبار و بصیرت سمجھ کر اور پھر مجھ میں ہمت نہیں ہوئی کہ دوبارہ اس المناک مسرت کا اذیت کوش لطف حاصل کروں

یہاں کے وثیقہ داروں کی جماعت خواہ وہ ایک ہزار کا وثیقہ یاب ہو یا ایک روپیہ کا یکساں طور پر ایک ہی نسبت سے مقروض ہے۔ اور شب و روز ڈگریوں کے خوف سے مکان کے اندر مقفل رہنا اس طبقہ کی مشہور خصوصیت ہے، صبح کو بالائی اور باقرخانی کا ناشتہ کرنا اور شام کو تھیٹر جانا (اگر بدقسمتی سے کوئی تھیٹر موجود ہو) خواہ بیگم کا کلی دار پاجامہ ہی کیوں نہ علحدہ کرنا پڑے مشاہدات روزانہ میں داخل ہے جہانتک غذا کا تعلق ہے فصلی چیزوں کے باب میں ان کی نزاکت " سوء ہضم " کے حدود تک پہونچ جاتی ہے اور یہاں کا نازک سے نازک تن نواب بھی جس کے متعلق مشہور ہے کہ مولی کا پتہ بھی پانوں کے نیچے آکر زکام زکام کا باعث ہوجاتا ہے،

جس وقت گاجر، سنگھاڑا، شکرقند کھانے پر آجاتا ہے تو محکمۂ حفظان صحت کے ملازمون کے لئے ایسا ناکافی ڈھیر چھلکون کا نہین چھوڑ جاتا کہ ان کی طرف سے تن آسانی کی شکایت پیدا ہوسکے، لباس یہان کی تمام لکھنوی آبادی کا تقریبًا ایک ہی سا ہے، دوپلی سفید ٹوپی جس سے مقصود صرف مانگ کا چھپانا ہے، فیلبان سے لیکر فیل نشین تک ایک کے سر پر نظر آتی ہے، اچکن کا رواج بھی کثرت سے ہے لیکن بیرکی پائنچے اب کم نظر آتے ہین اس کی جگہ چوڑیدار پاجامے نے لیلی ہے، بہ حیثیت مجموعی ان کی وضع سے ایک نوع کی نسائیت ضرور ظاہر ہوتی ہے، علی الخصوص اس وقت جب وہ فرط نزاکت سے " زیر قدمت ہزار جانست " کے قسم کی چال دکھانے پر آجاتے ہین۔ یہان سلام کرنیکا بھی مخصوص انداز ہے، سر و گردن کے ایک ایسے خم کے ساتھ جو پشت تک موثر ہوتا ہے، داہنے ہات کو سینہ کے محاذ مین لاکر ہتھیلی اور انگلیون کو پورا پھیلا کر نانگر، کلائی کے جوڑ کو ڈھیلا کرکے مسلسل کئی بار جلدی جلدی جنبش دیتے ہین اور اس طرح سارے ہات مین تھرتھری پیدا کرنے کو رسم سلام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مین نے غور کیا کہ کہین میرزا مظہر جانجانان نے اسی " ادائے کورنش " کا ذکر تو اس شعر مین نہین کیا

دل ازین تیغ بُردن آسان نیست آہ، مظہر خمِ سلام کسے

لیکن مین مطمئن نہ ہوسکا کہ لکھنوی اندازِ سلام واقعی اسی حد تک دلربا ہے۔

ہات جوڑ کر حد درجہ اظہار عجز و انکسار کے ساتھ بات بات مین قبلہ، حضور کے الفاظ سے خطاب کرنا یہان آداب گفتگو کی خصوصیت مین داخل ہے اور اس مین شک نہین کہ بڑی حد تک مُردم فریب بھی ہے، لیکن تجربہ کرنے کے بعد وہ ایک غیر حقیقی نمائش سے زیادہ کوئی چیز نظر نہین آتی۔

یون تو ہر جگہ ایک انسان کی اندرونی اور بیرونی اخلاق و معاشرت مین فرق ہوتا ہے، لیکن لکھنؤ مین یہ فرق حد سے متجاوز ہے آپ ایک شخص کو دیکھتے ہین کہ نہایت صاف ستھرے کپڑے پہنے چوک سے گزر رہا ہے اور آپ اس کی صفائی سے بہت متاثر ہوتے ہین، لیکن اس کا گھر کسی طرح مزبلہ سے کم نہ ہوگا اور وہان کی ایک ایک چیز سے آپ کو اس کی گندگی و عفونت کا ثبوت ملیگا۔ آپ دوسرے شخص کو دیکھتے ہین کہ نہایت ہی انکسار سے ہات جوڑ کر گفتگو کر رہا ہے، لیکن اس کے معنی صرف یہ ہین کہ وہ ایک لفظ بھی صحیح معنی مین استعمال نہین کرتا اور وہ آپ سے جدا ہونے کے بعد اتنی ہی گالیان دیگا جتنی تعریف آپ کے سامنے کرگیا ہے۔ یہان کی معاشرت مین کذب و دروغ، مکر و فریب اس درجہ سرایت کرگیا ہے کہ اس کے معیوب ہونے کا احساس ہی محو ہوگیا ہے اور وہ اس طرح کام نکال لینے کو فراست و ہوشیاری سے تعبیر کرتے ہین یہان کے معمولی سودا بیچنے والون کا یہ حال ہے کہ جس چیز کی قیمت وہ پانچ روپیہ کہہ رہے ہین، اس کو وہ نہایت آسانی سے ایک روپیہ بلکہ اس سے بھی کم مین دیدینگے۔ چنانچہ یہان کا ایک قصہ مشہور ہے کہ ایک اجنبی نخاس گئے وہان ایک آدمی ٹوٹی کا بٹا بیچ رہا تھا۔ وہ ان کی وضع و صورت دیکھ کر بھانپ گیا کہ اجنبی (یا لکھنوی زبان مین گنوار) ہین۔ انھون نے بٹے کی قیمت دریافت کی، اسنے اپنی تمام دلفریب ادائون کے ساتھ کہا کہ " حضور یہ بٹا ہے تو نہایت قیمتی۔ پیارے محمد علی خان کے ہات کا کشید کیا ہوا اور انھین کے صاحبزادے میان احمد علیخان کے ہات کا کڑھا ہوا ہے۔ حضور شاید واقف ہونگے کہ یہ محمد علیخان وہی ہین جن کے کشید کئے ہوئے اور کاڑھے ہوئے

رومال ولایت جاکر ہزارون مین بکتے ہین۔ وقت پڑ گیا ہے اس لئے جدا کر رہا ہون، ورنہ اسی قسم کے پلے کل ہی منولال بزاز نے ایک رئیس کے ہات دس دس روپیہ مین بیچے ہین۔ آپ سے مین صرف پانچ روپیہ لیلونگا۔ زرا حضور ملاحظہ تو فرمائین کہ کیا چیز ہے، ایک ایک پتی منھ سے بول رہی ہے، پلا کیا ہے چمن کھلا ہوا ہے" وہ غریب ایک نگاہ دیکھنے کے بعد چلے گئے کچھ دور چلے ہونگے کہ اسنے پھر آواز دی کہ "اے حضور کیا آپ خفا ہوگئے؛ اچھا تو یارون کی چھوٹ بھی دیکھتے جایئے۔ اور آٹھ ہی آنے دلوایئے" وہ حیران رہگیا کہ یہ کیا تماشہ ہے اور لوٹ کر قیمت ادا کی اور پلا لے لیا۔ جب وہ جانے لگا تو اس نے ہنسکر کہا کہ " آپ زیادہ افسوس نہ کرین، اس قم مین بھی چار آنے یارون کے کہین نہین گئے"

یہ قصہ غلط ہو یا صحیح لیکن اس سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ یہان کے ذہینت کیا ہے اور اہل لکھنؤ سے معاملہ کرنا کسقدر خطرناک امر ہے

لکھنؤ کے دو حصے ہین ایک مشرقی جو امین آباد سے شروع ہوکر حضرت گنج بلکہ صدر تک چلا گیا ہے اور دوسرا مغربی حصہ جو رکابگنج کے بعد سے شروع ہوکر قریب قریب سعادت گنج تک چلا گیا ہے۔ پہلا حصہ وہ ہے جسے اہل لکھنؤ، لکھنؤ سے علحدہ سمجھتے ہین اور یہان کی آبادی کو گھسیارون، خانسامان، کی آبادی کہتے ہین۔ مغربی حصہ خالص لکھنؤ کہلاتا ہے اور نوابون، وثیقہ دارون، طبیبون، شاعرون، افیونیون اور دستکارون کی آبادی اس حصہ مین زیادہ ہے اور بہت سے لکھنوی تجربات یہین کی گلیون مین پھرنے سے حاصل ہوتے ہین۔ اس حصہ مین امام باڑے اور عزاخانے بھی ہین یہین بٹیرون کی پالیان قایم ہوتی ہین اسی جگہ کنکوے لڑتے ہین اور یہین شیعہ سنی علماء کا مخزن ہے

ہرچند مجھے اس حصہ کے مطالعہ کا کم وقت ملا، لیکن اس قلیل فرصت مین بھی یہ نتیجہ نکالنا میرے لئے دشوار نہ تھا کہ وہ جرائم جو نوابان اودھ کے عہد مین پیدا ہوگئے تھے وہ ہنوز مختلف صورتون مین یہان پائے جاتے ہین اور تاوقتیکہ یہ سارا حصہ برابر نہ کردیا جائے بقول آتش " زمین کے نشیب و فراز کا دھبہ مٹنا" بالکل محال ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ اگر زندگی کا صرف لاعبانہ پہلو پیش نظر ہو تو بلاخوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ

خدا آباد رکھے لکھنؤ کو پھر غنیمت ہے

اہل لکھنؤ کی گفتگو یقیناً اہل دہلی سے زیادہ شایستہ، شگفتہ نرم اور دلچسپ ہوتی ہے، دہلی پنجاب کے لب و لہجہ سے متاثر ہوکر اپنی خصوصیات زبان کو کھو چکی ہے اور لکھنؤ باوجود اس کے کہ بڑا حصہ یہان کی آبادی کا دہقانیون اور پوربیون پر مشتمل ہے، ابھی تک اپنی خصوصیات زبان کو سنبھالے ہوے ہے لیکن غلطی ہو گی اگر اس زبان کو کوئی علمی درجہ دیا جائے یا اس کو شعر و شاعری مین استناداً پیش کیا جائے کیونکہ ہر ملک کی علمی زبان بازاری یا کاروباری زبان سے علحدہ ہوتی ہے اور شاعری کی لطافت خیال بھی ایک مخصوص انداز بیان کی محتاج ہے جس کو روزمرہ یا کسی مختص المقام محاورہ سے صرف اس حد تک سروکار ہو سکتا ہے کہ وہ شعر خود کوئی ٹکنکل یا اصطلاحی حیثیت نہ اختیار کرے

مین ہرچند شاعر نہین ہون لیکن "عالم بالا" سے زیادہ "شعرفہمی" کا مدعی ضرور ہون اور اس بنا پر اگر لکھنؤ آنے کے بعد میرے اندر یہان کے محافل شعر وادب، یہان کے اکابر شعراء سے ملنے کا ولولہ پیدا ہوا تو بیجا نہ تھا۔ یون تو رسایل کے ذریعہ سے مین یہان کے بعض شعراء اور اڈیٹرون سے واقف ہو چکا تھا لیکن جی چاہتا تھا اور بالکل بے اختیارانہ طور پر کہ ان سے خود ملون اور ان کی باتین سنون اور ان کا مطالعہ زیادہ قریب سے کرکے کسی نتیجہ پر پہونچون۔ اجنبی ہونے کی حیثیت سے مجھے اس کی تکمیل مین ضرور کچھ نہ کچھ دشواریان اٹھانا پڑین، لیکن نہ اسقدر کہ انکا ذکر ضروری ہو

شام کا وقت تھا، امین آباد پارک کے سبزہ پر تنہا بیٹھا ہوا صبح آیندہ کا پروگرام مرتب کر رہا تھا کہ دو صاحب جن مین سے ایک دُہرے بدن کے اوسط قد والے اور دوسرے اکہرے جسم کے پستہ قامت شخص تھے مجھ سے کچھ دُور آکر بیٹھ گئے اور گفتگو کرنے لگے انکی گفتگو کا موضوع یکسر ادبی تھا اور وہ کسی غزل پر تنقید کر رہے تھے۔ مین جسارت کرکے اٹھا اور قریب جاکر عرض کیا کہ "اگر دو شاعرون کے درمیان کسی غیر شاعر وجود کو برداشت کیا جاسکتا ہے تو براہ کرم مجھے اجازت دیجئے کہ قریب سے آپ حضرات کی گفتگو سنون اور نووارد سیاح ہونے کی حیثیت سے آپ کی اعانت چاہون" اس کا جواب وہی ملا جو ملنا چاہئے لیکن بجائے اس کے کہ وہ اپنے سلسلۂ گفتگو کو جاری رکھتے، انھون نے خود میرے حال کی تحقیق شروع کردی۔ مین نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا کہ "میرا نام لیخ سہدریہ، کرۂ مریخ کے ایک شہر منہنعکا ز کا رہنے والا ہون، آج ہی صبح بغرض سیاحت مافوق النبفسجی شعاعون پر سوار ہوکر یہان آیا، تمام دن اس کوشش مین صرف ہوگیا کہ انسان بنکر باہر نکلون کرۂ زمین کا باشندہ ہونے کی حیثیت سے تفریح کرون لیکن پہلے تو گھنٹون یہی فیصلہ نہ کرسکا کہ یہان کی بہترین معیاری صورتِ انسانی کیا ہوتی ہے۔ کبھی ضرورت سے زیادہ ناک لمبی ہوگئی کبھی دہانہ ایک کان سے دوسرے کان تک پھٹ کر رہگیا، کبھی ابرو آنکھ کے نیچے لٹک گئی اور کبھی ہونٹون کے اوپر، الغرض بڑا وقت تو اسی تعمیری کام مین خراب ہوا آخرکار مین نے یہ فیصلہ کیا کہ آنکھ بند کرکے بیٹھ جاؤ اور پھر آنکھ کھولنے کے بعد جو شخص سب سے پہلے نظر آجائے اس کا نمونہ طیار کرو۔ ہرچند میرا یہ فیصلہ درست نہ تھا کیونکہ جس وقت مین نے اس پر عمل کرکے اپنے آپ کو انسان بنایا اور سڑک پر نکلا تو کسی نے پشت سے آواز دی کہ "جالب صاحب، جالب صاحب" اور اب مین سمجھا کہ کسی دوسرے کی صورت بننا بہت ذمہ داری کا کام ہے اس لئے مین گھبرا کر ایک گلی مین ہوگیا اور خود ہی اپنی ذہانت سے کام لیکر دوسری فرضی صورت اختیار کرکے یہان بیٹھا ہی تھا کہ آپ حضرات تشریف لے آئے"

مین نے یہ گفتگو صرف اس لئے کی تھی کہ تمام منازل تکلف دفعتہً دُور ہو جائین اور مین جلد سے جلد ان کی آزاد صحبت و گفتگو مین شریک ہوسکون۔ چنانچہ مین اس مین کامیاب ہوا اور اسی وقت شام کو ان مین سے ایک صاحب مجھے اپنے گھر لے گئے اور دیر تک ان سے گفتگو ہونے کے بعد یہان کے شعراء سے ملنے کا پروگرام مین نے طیار کیا۔

(باقی)

اظہار تمنا

(ایک افسانہ)

ولمنٹن، پطرو وچ پریدرکن نے، جو ایک قبول صورت نوجوان تھا، شام کا لباس پہنکر، اپنے نفیس، نوکدار جوتے پہنے اور طرحدار، شاعرانہ ٹوپی سے آراستہ ہوکر، بدقت تمام اپنے جذبات کو قابو میں رکھتے ہوئے، شہزادی ویرا زیلکانا کے گھر کا راستہ لیا

ناظرین! اگر آپ شہزادی ویرا کو نہیں جانتے تو بڑے افسوس کی بات ہے ——— اُس پر پیکر لطافت، اور سحر طراز ہستی کو، جو نیلیں آنکھوں اور زرین زلفوں کی مالک ہے سمندر کی ہر حسین ساحل سے ٹکرا کر پلٹ جاتی ہیں لیکن اُسکی زلفوں کی موجیں، سخت سے سخت پتھر کو پانی کر دیتیں۔ اُسکے دلاویز تبسم، اور چھوٹے، خندان چہرے کے حسن سے متاثر ہوکر بے قابو نہ ہونا، مردہ دلی، اور بے حسی کی نشانی ہے جو اُسکو بات کرتے، ہنستے اور اُسکے سفید دانتوں کو چمکتے دیکھکر اپنے آپکو فلک ہفتمین تصور نہ کرے وہ ایک عجیب چیز ہے اور بس

وہ شہزادی کے مقابل بیٹھا، اور جذبات سے بے قابو ہوکر کہنے لگا ——— "شہزادی! کیا تم میری گفتگو سننا گوارا کروگی؟" "ہاں ہاں!"

"شہزادی ——— معاف کرنا، سمجھ میں نہیں آتا، کیونکر ابتدا کروں ——— تمھیں اچنبا ہوگا .... اس طرح دفعتاً ......

...... خفا تو نہ ہوگی!؟" ——— اُس نے اپنی جیب سے رومال نکالا، اور منہ پونچھا، شہزادی مسکرا رہی تھی، اور مستفسر نظروں سے اُسکی طرف دیکھ رہی تھی

"شہزادی" اُسنے سلسلۂ سخن جاری رکھا "جب سے میں نے تمکو پہلی بار دیکھا، میری روح ایک غیر مفتوح تمنا کا شکار ہے ......

یہ تمنا مجھے رات دن چین نہیں لینے دیتی .... اور اگر یہ پوری نہ ہو تو مجھے ...... مجھے سخت تکلیف ہوگی"

شہزادی نے متفکرانہ انداز سے آنکھیں نیچی کرلیں

"تمکو فی الحقیقت تعجب ہوگا ...... شہزادی، تم مادی اشیا سے بہت بلند ہو لیکن .... میرے لئے تم بہت مناسب ......" خاموشی

"خصوصاً اس وجہ سے کہ میری جائداد، تمھاری زمین سے متصل ہے ...... میں بھی کافی دولتمند ہوں اور ...."

"مگر یہ سب کس لئے؟" شہزادی نے آہستگی سے سوال کیا

"یہ سب اس لئے ہے، شہزادی" پریدرکن نے بے قابو ہوکر اپنی کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا "میں التجا کرتا ہوں کہ انکار نہ کرنا ......

... اپنے انکار سے میری تمام تدابیر پر پانی نہ پھیر دینا .... عزیزمن! میں صرف یہ تجویز پیش کرنا چاہتا ہوں کہ ...."

ولمنٹن پطرو وچ پھر جلدی سے بیٹھ گیا۔ اور شاہزادی کی طرف جھک کر سرگوشی کرنے لگا

"صرف یہ تجویز .... تجویز بہت نافع ہے کہ۔ ہم کو اپنی ملحقہ زمینوں میں، اُدن کی ایک باقاعدہ، مشترکہ، محدود کمپنی قائم کرنا چاہئے .... اس طرح ہم سال بھر میں ایک لاکھ گٹھے اُدن کے بہ آسانی بیچ سکیں گے .... ہے نا؟"

شہزادی نے لمحہ بھر سوچ کر جواب دیا .... "بالکل ٹھیک بات ہے۔ اور میں اسپر راضی ہوں"

عزیز احمد

باب الاستفسار

کس زبان کی شاعری ہے

جناب محمد سجاد صاحب - امیراکدل - سرینگر

یہان کشمیر مین ایک نہایت ہی معمر شخص ہین جو ہین تو ایرانی النسل لیکن اب ایک زمانہ سے یہین رہتے ہین اور مصاحبانہ خوش باش زندگی بسر کرتے ہین - ان کو فارسی، کشمیری، عربی زبان کے ہزارہا شعر یاد ہین اور جس وقت وہ اپنے ترنگ مین ہوتے ہین تو ان کو ایک خاص لحن سے پڑھا کرتے ہین - بعض مرتبہ وہ ایسے شعر پڑھتے ہین جو بظاہر فارسی کے معلوم ہوتے ہین لیکن انکا مفہوم کچھ نہین ہوتا - ان سے پوچھئے تو ہنسنے لگتے ہین اور کوئی جواب نہین دیتے - منجملہ اُن کے ایک شعر یہ بھی ہے

جو از عمت بدر مرا ہروخ کہ شو مرا ــــ یک شو بیا بردم تا ببینم چتو مرا

کیا آپ بتا سکتے ہین کہ یہ کیا بلا ہے؟

نگار:- آپ کے معمر دوست سبزواری معلوم ہوتے ہین یا یہ کہ انھون نے اس زبان کا مطالعہ کرکے اس زبان کے اشعار یاد کرلئے ہین - رایل ایشیاٹک سوسائٹی جرنل مین مسٹر آونو نے اپنی تفتیش و تحقیق کی بنا پر ایک مقالہ سبزواری زبان کی شاعری پر کئی سال ہوئے شایع کرایا تھا اور اس مین سبزوار کی دہقانی زبان کی شاعری پر بھی بحث کی تھی - اس سلسلہ مین انھون نے نیر اور فیاض دو سبزواری شاعرون کا نمونۂ کلام بھی دیا تھا - آپ کے دوست کا یہ شعر فیاض سبزواری کا کلام ہے اور انتخاب مین درج ہے

پروفیسر براؤن نے بھی ایک درجن سے زیادہ ایسے ایرانی شاعرون کا نمونۂ کلام دیا ہے جو نیچے طبقہ کی دہقانی و مختص المقام زبان مین شاعری کرتے تھے - اسی طرح بدایونی نے اپنی منتخب التواریخ مین ہفت اقلیم مین امین رازی نے اور ریاض الشعراء مین والہ داغستانی نے بعض ایسے شعرا کا ذکر کیا ہے - انھین مین سے ایک ایک دانہی بھی تھا - دانہ ایک گانون ہے نیشاپور کے قریب یہین کا رہنے والا تھا اور کاشتکاری کا پیشہ کرتا تھا - لیکن اس پیشہ کو چھوڑکر اسنے شاعری اختیار کی اور عہد اکبری مین ہندوستان آیا - امین رازی اور بدایونی نے عہد اکبری کے شعراء مین اس کا بھی ذکر کیا اور نمونۂ کلام دیا ہے - اس کے بعض اشعار (جنھین مشکل سے شعر کہا جا سکتا ہے) اکبر کی مدح کے یہ ہین اور مسٹر آدانو نے بھی انھین ان تذکرون سے نقل کیا ہے

قلم آنشوخ خرد کک مکنہ ــــ جان فدائش کہ خوش ملک مکنہ
شہ جلال الدین محمد غازی ــــ کہ دعائش بر فلک ملک مکنہ

صلۂ شعر شاعران گذر — یک لک و دو لک و سہ لک مکنہ
مچہ نالم ز احمد و محمود — ہر چہ مکنہ بمن نلک مکنہ

(خرد لک - خرد کی تصغیر مکرر ہے۔ یعنی بہت ہی چھوٹا - مکنہ - شیکند - گذر - دگر - مچہ = من چہ

مسٹر ہوآتو نے لکھا ہے کہ ایک شاعر اور حسینا تھا جو خالص دہقانی زبان مین شعر کہتا تھا۔ اس کی رباعیان اضلاع سبزوار نیشاپور اور ترشیز وغیرہ مین اب بھی گائی جاتی ہین۔ اسی طرح ایک شخص ملا صبوحی برجندی تھا جو اب سے ایک صدی قبل پایا جاتا تھا ایران کے اور صوبون مین بھی اس قسم کے شاعر پائے جاتے تھے۔ والہ واغستانی نے ان مین سے عبد الحیٔ اصفہانی کا ذکر کیا ہے اور ایک دوسرے شاعر لطیف کا۔ لطیف اچھا شاعر تھا لیکن چونکہ جاہل تھا اس لئے وہ مخلف محاورات بھی استعمال کرجاتا تھا اور وزن و تقطیع کا بھی لحاظ نہ رکھتا تھا۔ ایک اور طہرانی شاعر ملا سحری تھا جو طہران کی بازاری زبان مین شعر کہتا تھا۔ یہ تینون سترھوین صدی عیسوی کے اخیر مین پائے جاتے تھے

اصفہان کے ایک اور شاعر درویش عباس المتخلص بہ جزی تھا پروفیسر زکوسکی نے اس کی بعض نظمین مرتب کرکے شایع کی ہین۔ ایران کے جنوبی مغربی حصہ مین فایز، بچمہ، دفتری، محمد تقی خان، حیدر خان اسی رنگ کے شاعر گزرے ہین اور ایزدی و علی اصغر خان نہاوندی کی یاد تو اب تک وہان کے لوگون مین تازہ ہے۔ وسط ایران مین مشہور شاعر لیغا جندقی کے علاوہ اس کا ہمعصر ورقیب نعیمہ سمنانی بھی قابل ذکر شاعر تھا

مسٹر اوآتو نے نیر و فیاض کا نمونۂ کلام دیتے ہوئے لکھا ہے کہ فیاض سبزوار کے قریب ایک گانون مغیثہ کا معمولی زمیندار تھا یہ عمال امرا عصر کی تعریف مین شعر کہا کرتا تھا۔ نیر کا اتنا حال بھی نہین معلوم ہوسکا۔ فیاض اور نیر دونون معمولی قسم کے شاعر تھے جو دیہ و شہر کے ملی جلی زبان مین شعر کہتے تھے۔ لیکن نیر زیادہ ذہین معلوم ہوتا ہے

آپ نے جو شعر لکھا ہے وہ فیاض کا ہے۔ مین اس کو یہان مکرر درج کرکے اس کی اصلی ہیئت بھی پیش کرتا ہون تاکہ سمجھنے مین مدد ملے

جو از غمت بدر مرہ ہر وح کہ شو مرہ — (یعنی) — جان از غمت بدر میرود ہر وقت کہ شب میشود
یک شو بیا بر دم تہ ببینم چتو مرہ — یک شب بیا برم تا ببینم چہ طور می شود

اسی غزل کے اور شعر مسٹر اوآتو نے یہ درج کئے ہین:-

{ گر بند و زم نگا بگلزار رخسار ش — (یعنی) — گر بیند ازم نگاہ بگلزار رخسار ش
چونی طبق زدیک ہی چشموم گلو مرہ } — جو نی طبق زدیک دو چشمم گلاب میرود

{ اگر پر سمت رقیب بمردہ بگو کہ ہو — (یعنی) — گر پرسمت رقیب مُرد بگو کہ بلی
ورگوئی کہ نے دلم از قصہ آد مرد } — ورگوئی کہ نے دلم از غصہ آب میشود

نیر کی شاعری کا بھی نمونہ ملاحظہ فرمایئے:-

به پہلوی رخ یاقیت رنگش رخ سودائی (یعنی) به پہلوئے رُخ یاقوت رنگش ریخت سودائے
به نزدیک آوجیوتش جیرچہ لبہ به نزدیک آب حیاتش حورچولائی ست

اس غزل مین یہ تین شعر بہت فحش لکھے ہین:۔

بشیخ شیخی نظر کردوم میون جفتہ مستش بدیدوم بلبلیش ازخشنک تبوش منویہ
کہ ناگہ ملیم ور جبرف توقال سینبش چوقوشی کہ زبندش سردیی رقال بلویہ
کہ ناگہ میشکا قوم دردرش رف تانافش زجاورجس ورسرزہ کہ کنزیہ دکے گیہ

ان کے معنی اس لئے نہین لکھا کہ ان کی عریانیان عام نہ ہوجائین

آپ اپنے دوست کو یہ اشعار سنائے ممکن ہے اس کے بعد کچھ اور کلام آپ کو سنائین اگر ایسا ہو تو میرے پاس یہ تمام اشعار ضبط کرکے بھیجدیجئے

اگر مین مسٹر اوانو کے مضمون کو اس سے قبل نہ دیکھ چکا ہوتا تو مین قطعاً کوئی جواب آپ کے استفسار کا نہ دیسکتا تھا۔ آپکا استفسار پڑھتے ہی میرے ذہن نے یہ مرتسمات پیش کردئے جو آپ تک پہونچاتا ہون

نیاز

الہام شعر

جب شب کی سکون پرور تاریکی دنیا پر چھا جاتی ہے
سرشار ہوا کی ہر جنبش راحت کے ترانے گاتی ہے

تارون کے فسون موسیقی سے ہوتی ہے، مسحور فضا
جان بخش مئے آسائش بے تخصیص پلائی جاتی ہے

خاموش ہوائین، بیخود موجین، صحرا گم، خوابیدہ چمن
کچھ غور مین اس دنیا کی ہر شے محو سی پائی جاتی ہے

غفلت کی پریشان جمعیت ہوتی ہے یہانتک ضبط شکن
احساس عمل کی بیداری، خود تاج ظفر پہناتی ہے

ہر چیز رہین خواب گران، ہر سمت سکوت و بیخبری
اک نقطۂ ساکن پر کھنچکر، بیچین فضا آجاتی ہے

اس وقت مین اپنی خلوت مین، اک پیکر حسرت ہوتا ہون
تصویر نشاط عہد تمنا آنکھون مین پھر جاتی ہے

کیا تجھکو بتاؤن مین ہمدم، کیا دل پہ گذرتی ہے میرے
آلام کی آتش فروزی کن شعلون کو بھڑکاتی ہے

سینہ مین تلاطم ہوتا ہے دل کی اُبھر آتی ہین چوٹین
ہر موج صبا اک تازہ پیام حسرت و عبرت لاتی ہے

ہر چیز پہ گرد و پیش مرے ہوتی ہے خموشی چھائی ہوی
دھندلی سی فقط اک شمع مری حالت پر اشک بہاتی ہے

ناگاہ بجھا دیتی ہے اسے بھی موج سبک رفتار صبا
مین اور انیس غم میری اب تاریکی رہ جاتی ہے

اس تلخ دھندلکے مین کچھ یون دم گھٹنے لگتا ہے میرا
جس طرح سے قید جسم مین روح حیوانی گھبراتی ہے

اک چشم زدن مین لیکن پھر اس طرح بدلتا ہے یہ سمان
مین غرق تحیر ہو جاتا ہون جنبش دل تھم جاتی ہے

ہوتا ہے مجھے محسوس کچھ ایسا گویا میرے ہر جانب
ہلکی سی نظر افروز تجلی حلقہ کرتی جاتی ہے

ہو جاتی ہین خیرہ میری نگاہین اور ادھر تاریکی مین
یہ موج ضیا بڑھتے بڑھتے تا حد نظر چھا جاتی ہے

رہتا ہے یہ منظر کچھ لمحے، یک بار درون خلوت دل
خوابیدہ حسین کروٹ لیتی ہین، روح مین قوت آتی ہے

ہوتا ہے حریم ہوش و خرد پر پردۂ کیف بیخبری
اور پیش نگاہ صرف تحیر، برق سی اک لہراتی ہے

کچھ نغمۂ شیرین دھیمے سرون مین جس سے پیہم اُٹھتے مین
وہ جن کی لطافت رگ رگ مین اک لہر نئی دوڑاتی ہے

جو مجھکو بتایا جاتا ہے پیغام وہی مین دیتا ہون
سنتا ہون جو کچھ اس عالم مین کاغذ پہ اسے لکھ لیتا ہون

سید علی اختر۔ اختر

مشاہدات

(۱)

حوض مین مستانہ بط کے تیرنے سے جس طرح کائی مین پڑتا چلا جاتا ہے خطِ رہگزار
حافظے پر یونھین اک بیدار کن گہری خراش ڈال دیتی ہے شبِ مہ مین پپیہے کی پکار!

(۲)

مسکرایا خواب مین اِس طرح اک طفلِ صبیح ہو گیا دل دیکھنے والون کا شاد و باغ باغ
اور اِس نرمی سے جیسے بتکدے کے طاق مین جھٹپٹا ہوتے ہی روشن کر دیا جائے چراغ!

(۳)

شاد و فرحان ہین نئے احباب تیرے لطف سے سرد مہری سے قدیم احباب کا رُخ زرد ہے
یہ تری سیرت ہے ایسے تیز موٹر کی طرح جسکے آگے روشنی ہے، اور پیچھے گرد ہے!

(۴)

رکھّے ہوے سونے کا طبق ناز سے سر پر کہرے مین نظر آتی ہے یون صبحِ درخشان
ہو جاتی ہے جس طرح کہ انسان کی شرافت ہنگامۂ اِفلاس مین کچھ اور نمایان!

(۵)

سر سے نزدیک ہو کے اک طائر یون اُڑا جیسے صبح نیند آئے
نصف ملنے کے واسطے مجکو تنے اِس طرح شہپرون کے سُنائے
ذہن سے جس طرح کہ بات کوئی یاد آتے ہی محو ہو جائے!

(۶)

شب کو اکثر کھو کھلی تاریکیان میدان کی روح پر کرتی ہین طاری اِس طرح خوابِ گران
دل سمجھتا ہے کہ ہے غم کی گھٹا چھائی ہوی جس طرح کہرے پہ ہو جاتا ہے بارش کا گمان!

(۷)

خاکِ گلشن پہ دُھندلکے کی اماوس کی مین یون ہین پامال شگوفون پہ نقوشِ بیداد
عید کے چاند کی ہلکی سی چمک سی جس طرح دل مین معصوم یتیمون کے ہو مان باپ کی یاد!

(۸)

سب سے پہلے عشق کی شب میں دلِ عشاق کو
چٹکیوں میں یوں مسلتا ہے خیالِ رُوئے یار
صبح بچی نیند سے جس طرح چونک اُٹھنے کے بعد
کمسنی کی پھول سی آنکھوں میں چُبھتا ہے خمار!

(۹)

وداعِ طفلی و قربِ شباب کے باعث
تری "نگاہ" ہے، یا وہ "خیالِ دل افروز"
بدل رہا ہے جو پہلوضمیرِ شاعر میں
اور آب وتاب سے موزوں نہیں ہوا ہے ہنوز!

(۱۰)

کیا بتاؤں کہ وہ دمِ گلگشت
کس طرح سے قدم اُٹھاتی ہے
جیسے کلیوں پہ رشحۂ شبنم
جیسے آنکھوں میں نیند آتی ہے

جوش

حجابات

عصمتِ جذبۂ تقدیس کی تصویر ہوں میں
عشق اک خواب ہے - اور خواب کی تعبیر ہوں میں
مست ہوجاؤں تو تقدیر ہے پابند مری
ہوش میں آؤں - تو وابستۂ تقدیر ہوں میں
خلشِ عشق کبھی دل سے یہ کہہ اُٹھتی ہے
تو مجھے درد سمجھتا ہے مگر تیر ہوں میں
عیشِ امروز ہے پیغامبرِ آزادی
غمِ فردا کا اشارہ ہے کہ زنجیر ہوں میں
یہ محبت کی لطافت ہے تو شاید اک دن!
مری تصویر ہو تو - اور تری تصویر ہوں میں
حسن اور عشق نے ترتیب دیا تھا جس کو
اسی "افسانۂ معصوم" کی تفسیر ہوں میں
یوں تو دل - تیری محبت میں رہا ہے معصوم
تو اگر چاہے تو ہاں ــــ قابلِ تعزیر ہوں میں
ابتدا تھی مری تخلیقِ نظامِ ہستی
انتہا میری کہ شرمندۂ تدبیر ہوں میں
صبر آجائے مجھے بے اثری پر اپنی!
اے خداوند! نہ منت کشِ تاثیر ہوں میں
اے روش! "جلوہ گہ حسن" ہے دنیا میری
میری قسمت کہ "محبت کا جہانگیر" ہوں میں

روش صدیقی

شالامار باغ

جسے خواہش ہو بزم عشق کے آثار کو دیکھے — یہان کشمیر مین آکر وہ شالامار کو دیکھے
چمن مین ساغر گل سے مئے عشرت چھلکتی ہے — جدہر جاؤ اسی جانب کلی دل کی مہکتی ہے
خوشی کا دور ہے مسرور ہین سب صحن گلشن مین — طرب کی روح پھیلی ہے ہر اک دل کے نشیمن مین
نہ ہون کیون روح کے سادہ ورق رنگین ہونے کو — کہ آمادہ ہے دل اب داغ ناکامی کے دھونے کو
عیان حسن مجازی ہے یہان وحدت سے کثرت مین — ہزارون حسن کے جلوے ہین رقصان بزم الفت مین
نئے انداز سے چلنا روش پر مہ جبینون کا — گلون کے بیچ مین متانہ وہ اٹھکھیلیان کرنا
مہک وہ بھینی بھینی اور وہ منظر خیابان کا — وہ ٹھنڈی چاندنی راتون مین اک عالم گلستان کا
چمن کے سینۂ رنگین سے بوئے یاسمن نکلی — نقاب الٹے ہوئے گویا کوئی تازہ دلھن نکلی
جو سر سے کوہ کے وہ برف رہ رہ کر پگھلتی ہے — وہی آغوش مین گلشن کے آ کر مچلتی ہے
دکھائی ہے نئی ترکیب صناعون نے پانی کی — عجب ترتیب ہے کچھ آبشارون کی روانی کی
کسی مین شکل بنتی ہے گھنے پھولون کے چادر کی — کنارے پر دورویہ بیلین بنتی ہین برابر کی
کسی کے چہرے پر زرتار ساری بنتی جاتی ہے — ہر اک پہلو مین پھولون کی کیاری بنتی جاتی ہے
چمن کے وسط مین اک خوشنما رنگین عمارت ہے — اور اسکے پاس چارون سمت فوارون کی کثرت ہے
اکھٹے تین نشو اسی کبھی جب رقص کرتے ہین — جدہر دیکھو اسی جانب ہزارون گل بکھرتے ہین
اسی کے آگے ہی اک خوشنما دیوار اٹھی ہے — جو اونچی چار گز ہے۔ اور صدہا گز وہ لمبی ہے
چڑھی ہین اس پہ دورویہ کئی بیلین برابر سے — ڈھکی ہے سر سے پاؤن تک گھنے پھولون کی چادر سے
جدہر دیکھو اسی جانب برابر پھول پھولے ہین — جڑون سے پتیون تک ہر جگہ پر پھول پھولے ہین
ہویدا صاف ہر سو ہے ہر اک کی چشم حیران سے — ہزارون پھول کھنچ کر آگئے صدہا گلستان سے
عروس نو سنوارا ہو جیسے قدرت کے ہاتھون نے — جسے آغوش مین پالا جہان کی ٹھنڈی راتون نے
بیان ہو کس طرح سے اسکے چہرے کی صباحت کا — ملا ہو حسن کی دیوی سے جب غازہ ملاحت کا

مہک دوشیزگئ گلشن فطرت کی پھیلی تھی
فضا وہ تھی کہ میری روح تک پرواز کرتی تھی

محمود الہ آبادی

یادِ محبوب

شاہدِ دوراں کی زلفِ عنبریں برہم سی ہے چاک ہے گل کا گریباں چشمِ شبنم نم سی ہے
کشتیٔ امید کچھ ساحل سے نامحرم سی ہے جنبش امواج میں اک شورشِ پیہم سی ہے

اضطرابِ دل مرا ہنگامہ در آغوش ہے
ضبط کہتے ہیں جسے اک نالۂ خاموش ہے

شانہ سینہ چاک ہے زلفِ معنبر کے لئے آئینہ حیرت میں ہے اِک روئے انور کے لئے
پس گیا سرمہ کسی چشمِ فسوں گر کے لئے ہاتھ ملتی ہے حنا پا بوسِ دلبر کے لئے

جس کو شانہ کی ضرورت تھی وہ گیسو ہی نہیں
سرمہ کیسا اب وہ چشمِ رشکِ آہو ہی نہیں

بار تھا طبعِ سبک پر گیسوئے پرفن کا بوجھ اُٹھ نہ سکتا تھا کمر سے جنبشِ دامن کا بوجھ
اف وہ نازک جسم اور خاکِ سرِ مدفن کا بوجھ وائے قسمت بوجھ اور وہ بھی ہزاروں من کا بوجھ

زیب جس کے جسم پر دیتا تھا رنگین پیرہن
آج سر سے پاؤں تک پہنے ہے اِک سادہ کفن

اب وہ آنکھیں بند ہیں سوتی تھیں جن میں بجلیاں ہیں وہ لب پژمردہ جن پر کھیلتی تھیں شوخیاں
کل کھلی تھی جو کلی وہ ہو گئی نذرِ خزاں ہائے رنگِ بوستاں لے وائے رنگِ بوستاں

اڑ گئی یک لخت رنگینی جو رخساروں میں تھی
پڑ گئے سرد آتش افروزی جن انگاروں میں تھی

ثاقب جالندھری

غزلیات

انجم رحمانی رام پوری

دل کا مقابلہ ہی کیا تیرِ نگاہِ ناز سے / کیسے بچاتے ہم اسے عشق کے ترکتاز سے
قابلِ احترام ہے ہمتِ اہلِ عشق بھی / گھس گیا سنگِ آستان ناصیۂ نیاز سے
اتنے حواس تھے کہ مین خود تو وہان سے آسکا / دل کو مگر نہ لا سکا اُن کے حریمِ ناز سے
غیرتِ عشق کے سبب آگے نہ بڑھ سکا قدم / بچ کے زرا چلا تھا مین جادۂ امتیاز سے

افسر صدیقی امروہوی

شمع کے زیرِ قدم لاش ہے پروانے کی / انتہا خوب ہوئی عشق کے افسانے کی
کوہ و صحرا نے دیا نعرۂ وحشت کا جواب / گئین خالی نہ صدائین ترے دیوانے کی
اے جنون کون سے عالم مین گنون آپکو مین / نام گھر کا ہے مگر شکل ہے ویرانے کی
صوَرِ عالمِ فانی کو نہ دے دل مین جگہ / دیکھ پڑ جائیگی بنیاد صنم خانے کی
عالمِ ہوش مین آجاؤن اگر مین افسر / جوشِ وحشت کی قضا موت ہے دیوانے کی

عشق رامپوری

غلط کہ الفتِ بیداد گر نہین ہے مجھے / گر ہے یہ بھی کہ اپنی خبر نہین ہے مجھے
کسی کی دید کا خواہان ہون کیا قیامت ہے / یہ جانتا ہون کہ تاب نظر نہین ہے مجھے
تمھارے ظلم سے تعبیرِ لطف کرتا ہون / یہ اور کیا ہے محبت اگر نہین ہے مجھے
نہ پوچھ دل کی مصیبت کا حال کچھ مجھسے / یہی خبر ہے کہ کچھ بھی خبر نہین ہے مجھے

وفائے عہد و قول و قسم غلط نہ سہی
سکون قلب میسر مگر نہین ہے مجھے

فراق گورکھپوری

قتل یون ہونے محبت کے گنہگار آئے
ہین یہ تیور کہ انھین نیند سر دار آئے

ہین یہی اے نگہ ناز ترے قدر شناس
بید لون پر تجھے اللہ کرے پیار آئے

با دِ صرصر بھی تھمی آبلہ پا بھی ٹھہرے
دشت غربت مین نظر شام کے آثار آئے

یا تو یہ ہو کہ مین اُس شوخ کو دیکھون ہی نہین
یا جو دیکھون بھی تو اتنا نہ مجھے پیار آئے

اے فراق آؤ کرین کھوئے ہوئے دل کی تلاش
بعد مدت کے سرِ کوچۂ دلدار آئے

ناطق جیلانی

جنھین ذوقِ شورِ وجود تھا وہ اسی ہوس مین فنا ہوئے
جو اٹھے تو اُٹھ کے کہین نہ تھے یہ ہوا کہ بانگ درا ہوئے

جو تمھین ادھر ہو تمھین اُدھر تو کہان گئے مرے ہم نظر
دمِ جلوہ تم نے یہ کیا کیا وہ جو دیکھتے تھے وہ کیا ہوئے

یہ بنائے دیر نگاہ کر یہ نہین حقیقتِ بندگی
جو بیانِ اہل مجاز ہے تو ہمین بتون کے خدا ہوئے

یہ مآلِ اہل حسد ہوا کہ وبال جان ہوئی زندگی
یہ حریف ایسے تھے نا سزا کہ جو آپ اپنی سزا ہوئے

ہمین ہمسفر سے خلش رہی یہ رہِ طلب کی روش رہی
نہ کسی کو راہ نما کیا نہ کسی کے راہ نما ہوئے

یہ نمازِ اہل نیاز ہے کہ کبھی پڑھین نہ قضا کرین
اُنھین قیدِ رسوم کیا جو بیذوقِ نارفنا ہوئے

وہ ہمارے گھر جو نہ آئین گے تو ابو الحسن ہین جائین گے
کوئی ہم تو اُن سے خفا نہین وہ ہوا کرین جو خفا ہوئے

ثاقب جالندھری

یہ پست وبلندِ عالم ہے یہ نازو نیازِ ہستی ہے
لوگ اس کو بلندی سمجھے ہین جو حق مین ہمارے پستی ہے

بس ٹوٹ گیا بس ٹوٹ گیا ہر تارِ نفس مین ساز جو تھا
اب کس کو سناتے نغمہ ہو اب کونسی ایسی ہستی ہے

ہم عشق کرین وہ ہم سے کھنچین یہ ہر مین ہوتا آیا ہے
آباد انھی دو چیزون سے تو عالم کی یہ بستی ہے

آباد کبھی وہ دل بھی تھا برباد جسے اب دیکھتے ہو
سنسان نظر جو آتی ہے وہ ایک پرانی بستی ہے

ہے حسن ازل ہر ایک جگہ خالی نہین اس سے کوئی فضا
کیون دیر وحرم کے گوشون تک محدود تلاش ہستی ہے

جرعات محبت پیتے ہی ثاقب یہ ہمارا عالم ہے
ہر وقت ہے بیشِ چشم کوئی آنکھون مین ہمیشہ مستی ہے

نوٹس

ہندوستانی ایکاڈمی صوبہ متحدہ الہ آباد کے مطبوعات

ازمنۂ وسطیٰ مین ہندوستان کے معاشرتی اور اقتصادی حالات ——— مجلد عہ

ازعلامہ عبداللہ یوسف علی - ایم - اے - ایل ایل - ایم - سی - جی - ای ——— غیر مجلد عہ

زیر طبع

(۱) مغلون سے پہلے عرب ہندوستان کے تعلقات۔ (ازمولانا سید سلیمان صاحب ندوی)

(۲) مسلمانون کے تمدن پر ہندؤن کا اثر۔ (ازمولانا محمد امین صاحب عباسی)

(۳) ازمنہ وسطیٰ کا ہندوستانی تمدن۔ (از رائے بہادر مہامہوپادھیا گوری شنکر ہیراچند صاحب وجھا)

(۴) ہندی شاعری۔ (از ڈاکٹر اعظم صاحب کریوی)

جنرل سکریٹری ہندوستانی اکاڈیمی الہ آباد

معلومات

سرزمین عجائبات

دنیا مین چار نزہت گاہین سب سے زیادہ مشہور ہین۔ شعب بوان، صغد ثمرقند، نہر ابلہ، اور غوطۂ دمشق۔ مگر یہ کل دلکش مقامات بطور "سینی ٹوریم" (تفریح گاہ) کے ہین ان مین بجز سبزہ زار، آب روان اور میوہ دار درختون کے کوئی عجیب و غریب بات نہین۔ ذیل مین ہم ایک ایسے عجیب و غریب خطہ کا ذکر کرتے ہین جو اپنے محیر العقول عجائبات کے باعث (Wonder Land) مشہور ہے

دی یلو اسٹون پارک (The Yellow Stone Park) (اس مقام کا نام ہے) یہ پہلے ریاست وئیومنگ کے قبضہ مین تھا۔ مگر ۱۸۷۲ء سے امریکہ کے قبضہ مین آگیا ہے یہ پارک عام تفریح گاہ کے طور پر استعمال نہین کیا جاتا نہ اس پارک سے وہ پر لطف باغ مراد ہین جو شہرون مین ہوتے ہین۔ اسکا کل رقبہ ۳۳۰۰ مربع میل ہے اور غالباً دنیا مین کوئی اسقدر مختصر خطہ اتنے زیادہ عجائبات کا قابض نہوگا

ہم اس مین شمالی راہ سے داخل ہوتے ہین اور تقریباً پانچ میل پہاڑی راستہ کو طے کرکے گرم چشمون کے قریب پہنچتے ہین۔ یہان سے ایک رہبر کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہان کا بوقلمون منظر! سبحان اللہ! اس نظارہ کو دیکھکر آنکھین کھلی کی کھلی رہجاتی ہین۔ کٹورے کی طرح تالاب بھرے ہوئے ہین جن پر گہر کا لطیف سائبان ہر وقت معلق رہتا ہے۔ جب اسکے پار نگاہ گزرتی ہے تو صدہا دلاویز مختلف رنگ نظر آنے لگتے ہین۔ تالاب کے خوشنما کنارون پر گرم گرم پانی کی بلورین موجین آکر لگتی ہین تو سفید سفید کف جمع ہوجاتا ہے۔ "سطح آب کا یہ سحر کار منظر ایک قسم کے خوشنما پود و نگار ہین منت ہے جو اسکے اندر اُگے ہوئے ہین" ان الفاظ سے رہبر سیاح کی حیرت کو رفع کرتا ہے۔

چشمون سے آگے بڑھکر ایک عجیب سرزمین نظر آتی ہے جسکو (Goblin Land) یا ارض شیاطین کہتے ہین۔ اسکے متعلق روایت ہے کہ پہاڑ کی ایک جانب سے شیطان اور دوسری جانب سے اسکی بیوی کے پھسل پڑنے سے اس مقام کی ایسی ہیئت ہوگئی ہے اور اسی مناسبت سے یہ مشہور ہے۔ واقعی یہ عجیب سرزمین ہے اوپر بلند پہاڑ ہے جس کے دامن مین بڑے گہرے غار ہین۔ گورنمنٹ امریکہ نے ارض شیاطین مین سے سڑک نکالنی چاہی تھی مگر غارون کی وجہ سے کامیابی نہوئی

گرم چشمون سے بارہ میل کے فاصلہ پر ہم ایک سڑک پر سے گزرتے ہین جو ٹھوس شیشے کی بنی ہوئی ہے اسکے ایک سمت بیور جھیل کا نیلا پانی جھلکتا نظر آتا ہے اور محاذ مین پہاڑی حصار ہے۔ سڑک کے دوسری طرف شیشے کا ایک ٹھوس پہاڑ کھڑا ہے جسکی سیاہ سطح چکنی اور نہایت چمکدار نظر آتی ہے اس پہاڑ کے دامن مین سڑک بنانا بھی بہت دشوار امر تھا کیونکہ سیاہ کانچ کے بڑے بڑے تودے ہر طرف کھڑے تھے جنکو نہ بارود سے اڑایا جاسکتا تھا نہ اوزارون سے توڑا جاسکتا تھا۔ چنانچہ یہ ترکیب کیگئی کہ انکو پہلے خوب گرم کردیا گیا اسکے بعد ان پر پانی ڈالدیا جس سے پاش پاش ہوکر رہگئے

اسکے بعد ہم (Geyser) دیکھنے بڑھتے ہین "جیسر یا گیسر" کی حقیقت سمجھنے کے لئے اسکو "چشمۂ آتش فشان"

کہنا چاہئے۔ زمین کے اعماق مین پانی جمع ہو جاتا ہے اور وہان حرارت سے بھاپ بنکر نہایت شدت سے اُبل پڑتا ہے۔ "جیسرز" گرم پانی کے بڑے بڑے تالاب ہین جسوقت اُن مین اشتعال آتا ہے تو پانی کے علاوہ کیچڑ تک کا پتہ نہین چلتا۔ یہ کیفیت ہمیشہ نہین رہتی ہے مگر اسکا بھی کسی کو علم نہین کہ کب دفعتہً پانی مین آگ لگ جائے۔ ان چشمہ ہائے آتش فشان مین (Norris) بڑا ہے جسکا کھولتا ہوا نیلا پانی دور سے نظر آتا ہے۔ اس سے تھوڑی سی دور دوسرا چشمہ ہے جسکا نام (Monarch) ہے جو ان تمام چشمون کا بادشاہ معلوم دیتا ہے۔ اسکی وسیع سطح گرد و نواح مین خوشنما پہاڑون کا منظر پھر پانی کھولنے کی ترنم ریز آواز۔ بخارات کے لطیف بادل عجیب دلکش سینری پیش کرتے ہین اسکے اشتعال کا بھی کوئی وقت مقرر نہین جب چاہتا ہے اپنے دہانۂ آبی سے آگ اُگل دیتا ہے

یہان سے سیر کرتے ہوئے ہم ایک عجیب دہشتناک مقام پر پہنچتے ہین جسکا نام (Hell) یا سقر ہے واقعی یہ سرزمین نمونۂ سقر ہے۔ یہان کے وحشت خیز مناظر اور بھیانک چیزون کو دیکھکر گمان ہوتا ہے کہ یہ جن یا شیاطین کا مسکن ہے۔ کہر اور بھاپ کے دل یا دل ہمارے سرون پر معلق ہو جاتے ہین۔ تمام فضا "گوگردی" بو سے پر ہے جسمین سانس لینا سخت دشوار ہے۔ دم گھٹنے لگتا ہے اور ضیق کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے پھیپھڑون مین خراش و سوزش ہونے لگتی ہے۔ ہر طرف چھن چھن کی آوازین اس طرح آتی ہین گویا کسی گرم گرم بڑے برتن پر پانی پڑ رہا ہے۔ خود زمین اسقدر گرم رہتی ہے کہ پیر جھلس جاتے ہین الغرض سقر کی تمام صعوبتین یہان آکر محسوس ہونے لگتی ہین

یہان سے چلکر (Excelsior) کے پاس پہنچتے ہین جو دنیا مین سب سے بڑا چشمۂ آتش فشان ہے۔ وہ عرصے سے خاموش پڑا ہوا ہے۔ اسوقت اسکے اندر نیلا کھولتا ہوا پانی بھرا ہوا ہے جس کے کنارون پر سفید کف کا حاشیہ بہت بھلا معلوم دیتا ہے۔ اسکے قریب ہی ایک اور چشمہ ہے جسکا نام ([illegible]) ہے۔ اسکا پانی اسقدر صاف و شفاف ہے کہ ۱۵۔۱۶ فیٹ تک گہرائی مین نظر پہنچ جاتی ہے۔ اسکی تہ مین سے پانی کے بڑے بڑے بلبلے اس طرح سطح پر آکر پھوٹتے ہین گویا دیگ مین پانی کھول رہا ہے

(Morning glory) یا "چشمۂ نور سحر" ان تمام چشمون مین دلفریب ہے۔ پانی کا ایک صاف چشمہ ہے جہان صبح کے آثار اُس کی بلوری لہرون مین جذب ہو کر مختلف رنگون مین رونما ہوتے ہین بوقلمونی رنگ کی آبی تہ جسمین سے آفتاب کی پہلی شعاع گزر کر سینکڑون قوس و قزح کے مناظر پیدا کر دیتی ہے ایسا دلاویز نظارہ ہے کہ طبیعت پھڑک اٹھتی ہے جب سطح ساکن ہوتی ہے تو یہ معلوم دیتا ہے گویا تمام تالاب مین نقرہ یا منجمد پارہ بھرا ہوا ہے اسکے ساتھ ہی یہ تمام فریب کا منظر یہ نقرئی سطح نہایت خطرناک بھی ہے۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہی کھولتا ہوا پانی اور اُٹھتی ہوئی بھاپ کے گرم گرم بھپکے پھر موجود ہین۔ فطرت کی یہ فریب کاری معصوم جانورون کی جان بھی لے لیتی ہے بھولی بھالی چڑیان، اس دلفریب منظر کی شیدائی، کلیلین کرتی ہوئی اس گرم چشمے مین غسل کرنے آتی ہین اور مر کر نکلتی ہین۔ کئی آدمی بھی ان چشمون مین گر کر بھن گئے۔ یہ تمام سرزمین اس قسم کے چشمون سے بھری پڑی ہے، ان تمام کی سیر کرنے کو ایک عرصہ چاہئے۔ ان مین (Giantess) بھی بہت مشہور ہے۔ ایک شخص اُسکے اشتعال کا چشم دید

حال اِن الفاظ مین بیان کرتا ہے

" جسوقت یہ فریب وہ ساکن سطح دفعتہً متلاطم ہوئی اور ساتھ ہی غضبناک ہوکر پانی اُبلا تو ایسا معلوم دیتا تھا گویا ہزارون جن اور دیو بڑے بڑے برتنون مین پانی بھر بھر کر آسمان کی طرف پھینک رہے ہین۔ پہلے تو ایکدم زمین لرزی اسکے بعد سطح آب سے بلبلے جنمین دھوان اور بھاپ بھری ہوئی تھی اُٹھنے شروع ہوئے پھر ایک مقام پر سے پانی فوارہ کی طرح بہت بلند ہو کر گرنے لگا۔ اسکے بعد تمام آبی وسعت مین سخت تلاطم پیدا ہوگیا اور کھولتا ہوا پانی نہایت غیظ و غضب کے ساتھ آس پاس کی خاموش فضا مین گونج اور شور پیدا کرتا ہوا اڑنے لگا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا گرم گرم پانی مین کئی اہرمن تہلکہ مچاتے ہوئے دوڑتے پھر رہے ہین دفعتہً اشتعال بہت شدید ہوگیا اور ایک ایسی سُرعت کے ساتھ کہ میرا خیال بھی اسکے پیچھے رہگیا تمام سطح آب ایکدم بلند ہوئی اور ہوا مین اڑ گئی۔ پانی ہوا مین بلند ہوتا جاتا تھا یہانتک کہ آسمان کے نیچے ایک عظیم الشان دریا بہتا ہوا نظر آرہا تھا۔ گرج اور آواز بدستور ہو رہی تھی بھاپ کے بادل جنگل کی طرف اُڑے چلے جارہے تھے اور چشمے کی تہ مین سے پھر پانی کی موٹی موٹی دھارین اُبل رہی تھین۔ عجیب سین تھا اسکی خوفناک دلفریبی ناقابل بیان ہے "

جب ہم اس خوفناک چشمے سے دور مقام پر کھڑے ہوتے ہین تو وہان بھی پانی کے کھولنے کی صاف آواز آتی ہے اور ہوا کے جھونکون کے ساتھ بھاپ کے بھپکے ہمارے کپڑے اور چہرے کو تر کرتے ہوئے نکل جاتے ہین۔ اِن تمام چشمون کو چھوڑ کر اب ہم پھر " یلوسٹون پارک " کے دوسری طرف آتے ہین۔ اس جگہ ایک آبشار نظر آتا ہے جو ([illegible]) نیاگرا کے آبشار سے بلند ہے۔ آفتاب غروب ہوتے وقت یہانکا منظر قابل دید ہوتا ہے۔ پانی کی چادر پر بیشمار قوس قزح نظر آنے لگتے ہین۔ پہاڑی پر سے یہ سمان عجیب و دلکش معلوم دیتا ہے۔ میلون تک آبشار کا شفاف پانی بہتا ہوا چلا گیا ہے یہان تک کہ ایک سبزہ زار کے مخملی پردون مین گم ہوجاتا ہے

اِس پارک مین اور بھی بیشمار عجائبات ہین۔ کوہستانی سلسلہ کے درمیان مین بہت سی چمکتی ہوئی چھوٹی جھیلین ہین۔ کئی دلدل ہین جنکے اندر صدیون سے قد آور درخت پتھر کا کوئلہ بنے پڑے ہین۔ کئی سدا بہار دلکش صحرا اور جنگل ہین جنکی سبزہ زار بہار ہر وقت تھکے ماندے دلونکو بشاش کرنے کو تیار رہتی ہے۔ اس پارک مین ایک عجیب و غریب بات یہ ہے کہ یہ بہت سے جنگلی جانورون کا مسکن بھی ہے۔ یہان شکار کی ممانعت ہے۔ صدہا قسم کی جنگلی بکریان۔ ہرن بھینسے قدرتی سبزہ زار کو روندتے پھرتے ہین۔ وہ انسانون سے نہین ڈرتے کیونکہ انکو معلوم ہے کہ وہ مارے نہین جاسکتے۔ چیتے بھیڑیے ریچھ وغیرہ بھی انسان سے اسقدر مانوس ہورہے ہین کہ بلا ستائے کسی پر حملہ نہین کرتے۔

الغرض یہ پارک بہشت کا نمونہ ہے اور جہنم کا بھی۔ اگر ایک ایک جگہ کی سیر کی جائے تو بہت وقت کی ضرورت ہے

قیسی

مطبوعات موصولہ

نظم و نثر افسوس ہے کہ نہ مین مطبوعات موصولہ کو اس وقت تک دیکھ سکا اور نہ ان پر تبصرہ کرنے کے لئے اس ماہ مین جگہ نکال سکا۔ غالباً ماہ آیندہ کی اشاعت مین اس کی تلافی ہو سکے۔ لیکن مین ایک کتاب کا ذکر مختصراً اس مہینے مین ضروری سمجھتا ہون اور وہ **تاریخ ادب اردو** ہے

اصل کتاب مسٹر رام بابو سکسینا نے انگریزی مین تحریر کی تھی اور اب اسکو نولکشور پریس نے اُردو زبان مین منتقل کرا کے شایع کیا ہے

اس کتاب کے ترجمہ کی خدمت ہمارے فاضل دوست مرزا محمد عسکری صاحب بی۔اے کے سپرد گی گئی تھی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ انھون نے اس خوبی کے ساتھ اس کام کو انجام دیا ہے کہ اگر بجائے مترجم کے ہم انھین مُرتب کہین تو بیجا نہین۔

اصل کتاب مین جہان کہین تسامُح پایا جاتا تھا اس کو ترجمہ مین دور کر دیا گیا ہے اور اس کے ساتھ اسقدر مزید حواشی و اضافے اس مین کر دئیے گئے ہین کہ اصل کتاب انگریزی سے بہت زیادہ جامع حیثیت اس نے اختیار کر لی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسوقت تک اس موضوع پر کوئی کتاب ایسی بسیط نہین لکھی گئی اور دنیائے ادب کو جناب عسکری صاحب کے ذوق علم کا ممنون ہونا چاہئے کہ انھون نے ایسی مفید خدمت زبان کی انجام دی۔ اس کتاب کے دو حصہ ہین۔ ایک نثر سے متعلق ہے دوسرا نظم سے متعدد تصاویر بھی دی گئی ہین اور کتابت و طباعت مین بھی خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ یہ کتاب مجلد شایع ہوئی ہے اور تقریباً ۸۰۰ صفحات کو محیط ہے۔ قیمت للعہ اور ملنے کا پتہ۔ نولکشور پریس لکھنؤ

بسم اللہ

صفحہ و صفحہ ۲، ۳ کے اعلانات غور سے پڑھئے

نگار

فہرست مضامین نومبر ۱۹۲۹ء

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد (۱۶)	نومبر ۱۹۲۹ء	شمارہ (۵)

ملاحظات

آہ زعمرے کہ گزشت اینچنین!

چند دن سے میں جس کیفیت میں مبتلا ہوں اس کو اگر کسی ایک فقرہ سے ظاہر کر سکتا ہوں تو عنوان کے مصرعہ کو ملاحظہ فرمائیے ـــــ آہ زعمرے کہ گزشت اینچنین!

ماضی کی ہر یاد خواہ وہ کتنی ہی تلخ ہو حال کی شیرینیوں سے زیادہ پُر کیف ہوتی ہے اور مستقبل کی ہر تمنا خواہ کتنی ہی عسیر الحصول کیوں نہ ہو، حاصلات حاضرہ سے زیادہ قیمتی معلوم ہوتی ہے یعنی انسان نام ہے ایک طرف خواہش استرداد کا اس کیلئے جو گزر گیا اور دوسری طرف دست امید بڑھانے کا اس کیلئے جو ہنوز عدم میں ہے۔ پھر چونکہ حیات انسانی کا ہر لمحہ حال ہی ہو کر گزرتا ہے اسلئے اُسکا کار آمد ہونا معلوم لیکن میری حالت اس سے بالکل علیحدہ ہے، ماضی کے استرداد کی تمنا نہیں اور حال کی کیفیت یہ ہے کہ

برمن آں می رود امروز کہ گوئی فرداست

کہتے ہیں کہ جہل کا علم، علم کی پہلی منزل ہے، لیکن شاید یقین کی نہیں! معلوم نہیں علم کو جہل سمجھنے [illegible] باب میں کیا کہتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اس سوال کا پیدا ہونا ہی دماغ انسانی کی پہلی بدعت ہے جسے فطرت تو برداشت کر لیتی ہے [illegible]

نزاکت اس کی متحمل نہیں۔ پھر کتنے ہیں جنکی روحیں اس کشمکش کی سوگوار نہیں اور کہاں ہیں وہ نفوس جو احساس کی اس بے اعتدالی سے دل فگار نہیں۔ جہل وعلم سے زیادہ اہم وضروری یہ دیکھنا ہے کہ ہمارا نقص اپنی تکمیل کا طلبگار رہے یا نہیں اور جو امکان کے ذرات کس مرکز کی طرف پہونچنے کے لئے بیتاب ہیں

انسان کا وجود اپنی تخلیق کے لحاظ سے سراپا جستجو ہے، روح خواہ وہ مادہ سے مجرد ہو یا والبستہ یکسر اضطراب تمنا ہے۔ صبح کا جلوۂ زریں، شام کا نقاب رنگیں، آفتاب کی زرپاشیاں، چاند کی نوربیزیاں، شاہد مقصود کے مختلف مظاہر وآثار Phenomena ہیں جو ہمکو عین ذات (Noumena) کی طرف بلاتے ہیں، خزاں کی سوگواری، بہار کا نشاط، دریا کی روانی، پہاڑ کی استقامت اور ان کو بھی جانے دیجئے، خود مساعی انسانی کے تمام نتائج جو سربفلک عمارتوں، محیر العقول ایجادوں، اور زر وسیم کے انبار کی صورت میں ہر جگہ نظر آتے ہیں، یہ سب دعوتیں ہیں اصل منزل تک سعی کرنے کی، اُس آغوش رحمت تک پہونچ جانے کی جس کا نام مذہبی کاروبار والوں نے فردوس رکھا ہے اور میں اس کو "دار الصحو والمنام" کہتا ہوں۔ جہاں روح اپنی جستجو کو ختم کر کے شیریں خواب میں محو ہو جاتی ہے، جہاں تمام تفریقات جسم ورنگ مٹ کر صرف ایک احساس امن وسکون میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

آج علم وحکمت کی ترقیاں اس حد تک پہونچ گئی ہیں کہ زمان ومکان، سمت وجہت کا مفہوم بدل گیا ہے اور تمام محالات ایک ایک کرکے مکان وقوعی کی صورت اختیار کرتے جاتے ہیں، لیکن کیا انسان باایں‌ہمہ اقتدار واختیار روح میں کوئی شائبۂ سکون محسوس کرتا ہے؟

آج زر ودولت کی فراوانی کا یہ عالم ہے کہ تمام وہ تمنائیں اور خواہشیں جو انسان کے گوشت وخون سے متعلق ہو سکتی ہیں، "شئے حاصل" کی حیثیت اختیار کر چکی ہیں، لیکن، سوال یہ ہے کہ کیا رُوح کی گرسنگی میں کسی قسم کی کوئی کمی محسوس کیجاتی ہے؟

انسان آگے بڑھ کر رہا ہے۔ انسانیت پیچھے ہٹ رہی ہے — دماغ ترقی کر رہا ہے — روح تنزل کر رہی ہے — اسوقت کا انسان ایک ایسا مستسقی ہے جس کے سامنے دریا جاری ہے اور وہ خود پانی پینے کیلئے آزاد۔ لیکن اس کی روح جس کیلئے بیتاب ہے اسکا یہ عالم ہے کہ

دہند شوق و بے رخصت نظر نہ دہند

دنیا کے مذاہب اسی "فردوس گم گشتہ" کو ڈھونڈھ نکالنے کے لئے آئے، انبیاء ورُسل، اولیا واکابر کی ہستیاں رُوح کی اسی فریاد کی مختلف صورتیں تھیں، جو ابراہیم واسماعیل، سلیمان وداؤد، یوسف وموسیٰ، عیسیٰ ومحمد، زردشت وکرشن، بودھ وکنفوشس کے نام سے ظاہر ہوئیں اور آیندہ مختلف ناموں اور صورتوں سے ظاہر ہوتی رہینگی، لیکن ان ہستیوں کے اُٹھ جانے کے بعد انسان نے جو کچھ یاد رکھا وہ صرف یہ تھا کہ فلاں آتش پرست ہے اور فلاں گوسالہ پرست، یہ صلیب کا پرستار ہے اور وہ کعبہ کا، یہ ناقوس پھونکتا ہے اور وہ اذان دیتا ہے، یہ مذہب ہے یہود کا اور وہ اسلام کی، حالانکہ یہ تمام تفریقات صوری، یہ جملہ تمیزات ظاہری، نوع انسانی کی اس رُوح کا تجزیہ نہیں کر سکتے جسکا درد ودرماں ایک، جس کی راحت واذیت ایک، جس کا اوج وحضیض ایک اور جس کی فنا وبقا ایک ہے

خدا ایک ہے اور اس کا پیغام بھی ہمیشہ ایک ہی رہا ہے، وہ پیغام ہمیشہ سے ایک صدق بسیط ایک حقیقت مستدام، ایک صداقت لازوال، ایک قطعیت غیر فانی رہا ہے اور ایسا ہی رہیگا خواہ اسکے پہونچانیوالے کسی ملک و قوم اور کسی رنگ و نسل کے ہوں۔ پھر آج دنیا کی سوگواریوں کا سبب نہ خدا کی دوئی ہے، نہ اسکے پیام کا تنوع، بلکہ صرف یہ جستجو کہ پیامبر کا وطن کہاں تھا، اس کا نام کیا تھا، شکل صورت کیسی تھی، اس کا لباس کس طرح کا تھا اور وہ کیا کھاتا تھا کیا پیتا تھا۔ خدا کی مرضی تو یہ تھی کہ اپنی روح ہم تک پہونچائے، مگر ہم نے اس کو جسم سمجھکر اپنے حواس کے تلذذ کو اس کے عرفان کا معیار قرار دیا، وہ چاہتا تھا کہ اپنی نکہت سے صرف ہمارے دماغ کو متاثر کرے، لیکن ہم نے پھول کو اصل چیز سمجھکر اس کے رنگ، اس کی صورت سے اپنے ذوق و پسندیدگی کو وابستہ کیا، پھر جب وہ پھول مرجھا کر فنا ہو گیا تو نکہت سے وہ ہلکا سا تعلق بھی جاتا رہا اور ہماری روحیں پھر تڑپنے لگیں

آج دنیا کو امن کی جستجو ہے، سکون کی تلاش ہے، پھول کی چادروں سے چنگاری کی سوزش، زرکار ملبوس سے شعلوں کی تپش اور زر و سیم کے انبار سے آگ کی لپٹ آ رہی ہے۔ بنارس کا مرتاض برہمن "قشقہ بر جبین" ہات میں سمرن لئے ہوئے اٹھتا ہے اور کہتا ہے "میرے مندر میں آؤ، صدائے ناقوس سنو اور مورتی کے سامنے جھک جاؤ تاکہ یہ جلن دور ہو"۔ دیوبند اور فرنگی محل کا عبا پوش مولوی، جبہ و تسبیح لئے ہوئے رونما ہوتا ہے اور کہتا ہے "میری مسجد میں آؤ، اذان کی آواز سنو، قبلہ کی طرف منہ کرکے سجدہ میں گر جاؤ تاکہ یہ سوزش دفع ہو"۔ ـــــ ایک راہب کہن سال پیدا ہوتا ہے اور تلقین کرتا ہے "میرے عالیشان کلیسہ میں آؤ، گھنٹے کی صدا پر متوجہ ہو، پیمبر مصلوب کی شبیہ سے التجا کرو، تاکہ یہ بےچینی دور ہو"۔ جاتریوں کا گروہ جوق در جوق مندروں سے نکلتا ہوا نظر آتا ہے، لیکن اُن کے قشقہ کا صندل بھی خشک نہیں ہو چکتا کہ اُن کے سر جنگ و جدل سے رنگین نظر آنے لگتے ہیں ـــ جماعت کی جماعت مسجدوں سے باہر نکلتی ہوئی دکھائی دیتی ہے مگر ان کی پیشانی سے سجدہ کا نشان خاک بھی محو نہیں ہو چکتا کہ ایک دوسرے پر کثافت اچھالتا ہوا نظر آتا ہے ـــــ گروہ کا گروہ کلیسہ سے باہر آتا ہے اور ابھی عود و عنبر کے بخور کی خوشبو بھی ان کے لباس سے جدا نہیں ہوتی کہ معصیت کی پُر عفونت آغوش اُن کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ ایک رند لاابالی، ایک مرد ژولیدہ مُو، جو نہ کبھی کسی مندر میں گیا، نہ مسجد میں نہ جس نے کبھی دیر میں سر جھکایا نہ کلیسہ میں انسانی زندگی کی اس بیچارگی کا مطالعہ کرتا ہے اور اُس قوت کے سامنے جس کو اسنے ہمیشہ تمام علائق مذاہب و مسالک سے بے نیاز ہو کر پہچانا، متحیرانہ و مستفسرانہ کھڑا ہو جاتا ہے ـــ آسمان کا ایک ستارہ ٹوٹ کر روشن لکیر بناتا ہوا غائب ہو جاتا ہے اور یہ بھی اپنی راہ لے لیتا ہے۔ صبح کو قدوسیوں کی جماعت اس کو خاک بسر و گرد آلود حالت میں دیکھ کر منھ پھیر لیتی ہے کہ یہ کوئی شرابی ہے۔ یقیناً وہ شرابی ہے، وہ مست ہے۔ لیکن اس طرح کہ

مستیش را نبود نغمۂ و صہبا سامان

دوسرا گروہ آتا ہے کہتا ہے کہ یہ تو فاسق و فاجر ہے، ملحد و بیدین ہے۔ بیشک وہ سب کچھ ہے مگر اس شان کے ساتھ کہ

نازد بکفر خود کہ بہ ایمان برابر ست

اسکے مجروح جسم، اسکے داغدار سر و سینہ کو دیکھ کر لوگ نفرت کرتے ہوئے گذر جاتے ہیں مگر جسوقت وہ بیتاب ہو کر چیخ اٹھتا ہے کہ

درد یست در دلم کہ بدرماں برابرست

تو اس کا سننے والا کوئی نہیں ہوتا

میں نہیں کہہ سکتا کہ میرے یہ تاثرات کب سے مجھے بیتاب بنائے ہوئے ہیں اور ٹھیک اس وقت جبکہ میں چیخ چیخ اُٹھنے کیلئے مجبور تھا کس کس طرح "تاب گفتگو" مجھ سے چھین لی گئی، لیکن میں دیکھتا ہوں کہ اب "اشارات" کا رُخ بدل گیا ہے، "ایاز ربانی" کچھ اور ہے، ظلمت کی شدت اب اس حد تک پہونچ گئی ہے کہ اسکے بعد روشنی کا نمودار ہونا لازم ہے۔ اسلئے مجھے بلا پس و پیش اس حقیقت کا اظہار کر دینا چاہئے کہ وہ جو اپنے کو اکابر دین کہتے ہیں ان کو گروہ طاغوت سمجھو، وہ جو خانقاہوں میں ہاتھوں کو رسم دست بوسی کے لئے پھیلائے ہوئے پڑے ہیں، ان کو دشمن روحانیت جانو، وہ جو اپنے آگے تمھیں جھکنے پر مجبور کرتے ہیں ان کو غول صحرائی سے زیادہ وقعت نہ دو۔ وہ وقت گزر گیا جب خدا مسجد و مندر میں ملتا تھا، کہ اب نہ وہ مسجد و مندر ہیں نہ وہ مسجد و مندر تک پہونچانے والے۔ اب خدا ملتا ہے، نفس کی آزادی میں، ترک تقلید میں، قلب کے اُس انبساط میں جو صرف اپنے ہی تدبر و تفکر سے حاصل ہوتا ہے اور روح کی اُس حریت میں جو اخلاق، صرف اخلاق ہی کی پاکیزگی سے میسر آتی ہے۔ مذاہب کو ترک کر دو کہ اب ان سے صرف فساد و "سفک دماء" کا کام لیا جاتا ہے، مدعیان مذہب کو ٹھکرا دو، کہ نوع انسانی کی تفریق کا ذمہ دار گروہ تنہا یہی ہے۔ تمام انسان ایک ہیں، اور صرف انسانیت ہی کے رشتہ کو اپنا مذہب قرار دو اگر مذہب کا لفظ تمھارے لئے ضروری ہے۔ ناموں کی تفریق مٹا دو، لباس کی تمیز اُٹھا دو، رنگ و نسل کا امتیاز محو کر دو۔ آسمانی رحمت کا دروازہ کبھی بند نہیں ہوتا، مگر اسوقت جب ہماری نگاہوں کے زاویے بدل جائیں۔ پھر اگر تم چاہتے ہو کہ دنیا میں حقیقی امن و سکون قائم ہو، تمھاری روح کی بے چینیاں دور ہوں تو اپنی نگاہوں کا مرکز ایک ہی قرار دو اور حسب و نسب کے تفاخر، دولت و جاہ کے تفوق، حسن و جمال کی تعلی، اور علم و فضل کے پندار کو یکسر محو کر دو کہ خدا کی بارگاہ میں شریف و رذیل، شاہ و گدا، عالم و جاہل سب ایک ہیں اور وہاں اگر کسی چیز کو امتیاز حاصل ہے تو محض اُس خوئے عجز کو جسنے بندگان خدا میں کبھی تفریق نہیں کی اور سب کو اپنی ہی ہستی کا ایک جزو قرار دیا

میں جیسا کہ میرے ایک عزیز دوست نے اندیشہ ظاہر کیا ہے: مہدویت کا دعویٰ نہیں کرتا اور نہ میں کبھی نبوت و رسالت کا مدعی ہو سکتا ہوں، کیونکہ نہ اب کسی مہدی کی ضرورت ہے نہ رسول کی لیکن یہ ضرور عرض کرونگا کہ اگر کبھی رات کی تنہائی میں، صبح کی خلوت میں طبیعت سکون کی طرف مایل ہو تو جو کچھ میں کہتا ہوں اس کو سامنے رکھئے اور پھر مجھ سے نہیں بلکہ

زخود بجوے کہ مارا چہ درد ل افتادست

دسمبر ۳۶ء کے نگار میں، میں نے اسکولوں اور کالجوں کے طلبہ کو مشورہ دیا تھا کہ سالانہ تقریب میں بجائے مشاعروں کے کوئی اور سنجیدہ و مفید مشغلہ تلاش کرنا چاہئے اور میں نے اسی کے ساتھ یہ بھی ظاہر کیا تھا کہ بزم شعر خوانی کے ساتھ طلبہ کا اسقدر شغف نتیجہ ہے

اُس ادنیٰ قسم کی ذہنیت کا جو موجودہ نصاب تعلیم اور اصول تربیت کے ماتحت اس وقت ہندوستان کی بڑی سی بڑی درسگاہ میں پائی جاتی ہے میں سمجھتا تھا اور غالباً اپنے خلوص نیت کی بناء پر صحیح سمجھتا تھا کہ میرا یہ کہنا کسی کو گراں نہ گزرا ہوگا، لیکن اُسوقت یہ امر میرے ذہن میں بھی نہ آیا کہ ہندوستان کا گروہ شعراء ہنوز جناب احسن مارہروی ایسی ذہنیت رکھنے والے شاعروں سے خالی نہیں ہے جو اپنی اہمیت کو صرف اپنی شاعری ہی سے ثابت کرنا چاہتے ہیں درآنحالیکہ سچ پوچھئے تو وہ شاعر بھی نہیں ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ میں نے اسوقت تک جناب احسن کو ایک لمحہ کے لئے بھی صحیح معنی میں شاعر سمجھنے کی غلطی کا ارتکاب نہیں کیا تھا اور میں ہمیشہ ان کو غیر شاعر ہونے ہی کی حیثیت سے ایک اچھا انسان جانتا تھا، لیکن اب انٹر کالج میگزین کے جون تا ستمبر نمبر کے ملاحظہ سے (جو غزلوں کے ایک گلدستہ کی صورت میں جناب احسن کے مقالہ افتتاحیہ کے ساتھ شایع ہوا ہے) ثابت ہوتا ہے کہ اگر انھیں اپنے شاعر نہیں تو کم از کم شاعر دکنی نقیب ہونے پر مُصر در اصرار ہے اور وہ میرے اُس خیال سے اسقدر برہم ہیں کہ مجھ سے اس کا انتقام لینے کے لئے ان کو ایک سے زاید تیر اپنے ترکش طعن و تشنیع سے نکال کر استعمال کرنا پڑے

کس منہ سے شکر کیجئے اس لطف خاص کا

جناب احسن مارہروی نے میرے مصلح اُردو ہونے کی حقیقت، میری اصابت رائے کی نازش، میری اعلیٰ ذہنیت کی مفروضیت اور "بادہوائی" خیالی رفعت کو بھی بے نقاب کرنے کی سعی فرمائی ہے۔ لیکن بالکل حسبتہً للہ کیونکہ مبادا طلبہ کی ناتجربہ کار طبیعتیں اس سے مرعوب ہوجاتیں اور وہ شاعری کا مشغلہ ترک کرنے کے بعد فلاح دارین سے محروم ہوجاتے۔ پھر اے میرے محترم بزرگ اور طلبۂ علیگڈھ کے نقطۂ نظر سے، اے آبروئے خلوت و اے فخر انجمن، میرے پاس تو کافی الفاظ بھی نہیں کہ آپ کے اس خلوص نیت، اس استادانہ شفقت وکرم، اس مصلحانہ انداز و شمایل اور اس بزرگانہ حزم و نگہداشت کی داد دے سکوں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اگر اس کی جزائے خیر آپ کو داور حشر کی طرف سے نہ ملی تو سب سا پہلا وہ شخص جو اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا ہوا، استناداً و برہاناً آپ کے اس گلدستہ کو پیش کریگا، وہ میں ہونگا، خواہ وہ کالائے بد کہکر بجائے آپ کے میرے ہی مُنہ پر کیوں نہ پھینک دیا جائے

سچ ہے اگر کالج کے طلبہ کو شروع ہی سے یہ درس نہ دیا جائے گا کہ محبت کے رموز کیا ہیں، معشوق سے کیونکر باتیں کیجاتی ہیں، ہجر و وصل کے شداید و اندایذ کیا ہیں، تو پھر قیس و فرہاد کی نسل کیونکر قایم رہیگی اور احسن صاحب اپنے "عشق پیرانہ سری" کے جوش میں کس پر یہ عمزۂ محبت صرف کرینگے کہ:۔

قسم اپنی، ستم اپنا، مری خواہش، مرا نام یہی دو چار رہیں باتیں جو انھیں یاد نہیں

مجھے نہیں معلوم کہ یہاں جناب احسن کے سپرد کونسی خدمت ہے، لیکن میں انسے درخواست کرونگا کہ اگر کبھی اس کا موقعہ ہات آجائے تو اپنے اس شعر کی تشریح کرتے ہوئے طلبہ کو کم از کم یہ ضرور بتادیں کہ آپ کے محبوب نے کیا قسم کھائی تھی جو یاد نہیں رہی اور آپ کی وہ کونسی خواہش تھی جو پوری نہیں کی گئی۔

یہ ہے وہ شاعری جسکو الشعراء تلامیذ الرحمان اور ان من الشعر لحکمۃ و ان من البیان لسحرا کی آڑ پکڑ کر جناب احسن

کالج میں رواج دینا چاہتے ہیں۔ ملا غنیمت کا

بمکتب می رود طفل پریزاد   مبارکباد مرگ نو باستاد

کہنا آجتک بدنام ہے لیکن کس کے منہ میں زبان ہے جو جناب احسن مارہروی سے یہ بازپرس کرے کہ کالج کے حدود میں کمسن طلبہ کے سامنے اپنے محبوب کی قسم اور اپنی خواہش کی داستان دُہرانے کا اُن کو کیا حق حاصل ہے۔ کیا لوگ نئے بچوں کو اسی یقین کے ساتھ وہاں بھیجتے ہیں کہ وہاں کا مہتمم مشاعرہ سال میں دو چار مرتبہ ایسے پست و دنی مشاغل ایسے ذلیل دردی جذبات ضرور ان میں رائج کریگا

میں نے اسی دسمبر ۲۸ء کے رسالہ میں یہ بھی ظاہر کیا تھا کہ "غریب بسم اللہ کے گنبد میں زندگی بسر کرنے والے نوجوان (طلبہ) کیا سمجھ سکتے ہیں کہ ہندوستان کا شاعر کسقدر عجیب و غریب چیز ہے اور اس کے اخلاق، نفسیات کے کتنے ناحل شدہ مسایل اپنے اندر پنہاں رکھتے ہیں"۔ ہمارے احسن صاحب بانی محفل مشاعرہ علیگڈھ کو یہ فقرہ بھی بہت ناگوار ہوا اور وہ سمجھے کہ شاید میں نے اسی سلسلہ میں ان کے اخلاق پر بھی حملہ کیا ہے۔ حالانکہ جو شخص شوق سندیلوی کی کتاب اصلاح سخن کا مطالعہ کر چکا ہے، وہ جانتا ہے کہ جناب احسن مارہروی کے خطوط (جو اس میں درج ہیں) ایسی معمولی دستاویزی شہادتیں نہیں ہیں، جن کے ہوتے ہوئے مجھے ان کے اخلاق پر روشنی ڈالنے کی یا اُن کو اپنے اخلاق سے روشنی ہٹانے کی جرأت ہوسکے۔ حقیقت یہ ہے کہ جناب احسن مارہروی کی یہ عبارت اس شخص کو بھی تھوڑی دیر کے لئے حیرت میں ڈالدینے والی ہے جو "بکفت چراغ دارد" کے نام سے بدنام ہے

رہا مجھے آیندہ مشاعرہ کے لئے معہ "ساز و سامان" کے شرکت کی دعوت دینا سو میں ان کے اس نوید کا ہر ممکن احترام ملحوظ رکھتے ہوئے نہایت افسوس کے ساتھ اس حقیقت کے اظہار پر مجبور ہوں کہ اگر علیگڈھ کا ہجوم مشاعرہ، فردوس ہو تو بھی میرا وہاں کیا کام جب آپ ایسے رضوان نے پہلے ہی سے وہاں کی فضا کو داغدار و آلودہ بنا رکھا ہے

معاف فرمائیے میں آپ کی لغزش مستانہ سے اپنے ارتعاش لب ناکام کا تبادلہ کرنے کے لئے کبھی آمادہ نہیں ہوسکتا

تو و طوبیٰ و ما و قامت دوست   فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

جناب احسن مارہروی نے یہ بھی مشورہ مخلصانہ دیا ہے کہ جب کبھی میں علیگڈھ آؤں تو خسرو کے یہ دو شعر ضرور سن لوں کہ

نظم را علّے تصور کن بذات خود تمام   کاں نہ محتاج اصول و صوت خنیاگر بود

در کند مطرب بسے ہاں ہاں و ہوں ہوں سرود   چوں سخن نبود ہمہ بے معنی و ابتر بود

ہر چند میں شاعر نہیں لیکن چونکہ مشورہ صائب ہے اسلئے میں نگار کے ذریعہ سے تمام خنیاگر قسم کے شاعروں کو پہونچائے دیتا ہوں لیکن اسی کے ساتھ میرا بھی ایک مشورہ احسن صاحب کے حضور میں ہے اور اگر برا نہ مانیں تو عرض کردوں کہ جب وہ طلبہ کو درس شاعری دینے کے بعد فارغ ہوجایا کریں تو سعدی کے یہ دو شعر وہ خود بھی ضرور پڑھ لیا کریں

کریما ببخشائے بر حال ما   کہ ہستم اسیر کمند ہوا

نداریم غیر از تو فریاد رس   توئی شاعران را خطا بخش و بس

افسوس ہے کہ اس مہینہ مین زیادہ تفصیل کا موقعہ نہیں لیکن ماہ آیندہ میں اس گلدستہ کا پورا مطالعہ کرنے کے بعد بتاؤنگا کہ آپ حدود کالج میں تلامیذ الرحمان قسم کے شاعر پیدا کررہے ہین یا تبہم الغاؤن نوعیت کے اور پھر آپ کے " آبگینہ حصار" میں آپکی "ابلہانہ گریز" کا تماشہ دیکھونگا، مین جانتا ہون کہ یونیورسٹی کے ہر ملازم کو ارباب یونیورسٹی کی نگاہ مین اپنے تئین فرد مفید ثابت کرنے کے لئے بہت سی تدابیر اختیار کرنا پڑتی ہیں اور جناب احسن حقیقتاً اس سے زیادہ کچھ نہین کرسکتے کہ ہر سال مشاعرہ کا ایک لغو وبے معنی ہنگامہ پیدا کرکے اپنے خداوندان رزق کے سامنے اپنے وجود کی اہمیت کو ثابت کرتے رہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ اُن کی اس " کارگاہ معاش فریب " کو دنیا کیون برداشت کرے اور اُن کے مصالح ذاتی پر فرزندان ملک کے اخلاق کی قربانی کیون چڑھائی جائے۔ اگر جناب احسن سوائے مشاعرہ سازی کے کسی اور خدمت کے اہل نہیں ہیں، تو اس کے یہ معنی تو نہین ہوسکتے کہ نوخیز طلبہ مین احسن صاحب کی اہلیت کے لحاظ سے مخصوص ذہنیت پیدا کیجائے۔ اور اس طرح نسل کی نسل کو تباہ وبرباد کیا جائے

گزشتہ ماہ کے نگار میں بسلسلۂ " سیاح کی ڈائری " میرزا مظہر جانجانان کا ایک شعر درج ہوا ہے جس کے پہلے مصرعہ میں بجائے سَر کے دل درج ہوگیا ہے۔ اصل مصرعہ یون ہے:۔

سر از مین تیغ بُردن آسان نیست

نیاز

جن حضرات کا چندہ نومبر و دسمبر ۱۹۲۹ء مین ختم ہورہا ہے

وہ ذہن نشین کرلین کہ آیندہ نگار کی خریداری جاری رکھنے میں اُن کو کتنا فایدہ ہے:۔

(۱) کتاب سائنس کے عجائب ان کو مفت ملیگی

(۲) جنوری ۱۹۳۰ء کا رسالہ ۲۰۰ صفحات کا بغیر کسی اضافۂ قیمت کے حاصل ہوسکے گا۔

(۳) بعض ایسے ایسے نادر و دلچسپ مضامین مطالعہ میں آئین گے جو مشکل ہی سے کہین اور نظر آسکتے ہیں

(۴) شہاب کی سرگزشت قیمتی (عہ)، فراست الید قیمتی عہ، شاعر کا انجام قیمتی ۱۲ار جذبات بھاشہ قیمتی ۱۲ار ہر ایک کتاب نصف قیمت میں مل سکے گی۔

(۵) تذکرہ خندۂ گل جس کی قیمت چار روپیہ ہے معہ محصول صرف دو روپیہ میں ملسکیگا۔

نوٹ:۔ جدید خریدار بھی ان تمام رعایتوں سے فائدہ اُٹھا سکتے ہین

مینیجر نگار۔ لکھنؤ

مومن و کلام مومن

(بسلسلہ سابق)

پیدائش اور خاندان مومن خان ۱۲۱۵ھ مطابق ۱۸۰۰ء مین، محلہ کوچہ چیلان دہلی مین پیدا ہوے، ان کے والد کا نام غلام نبی خان تھا جو مشہور طبیب تھے، حکیم غلام نبی خان کے والد نامدار خان کشمیر کے رہنے والے تھے، قسمت آزمانے کے لئے ترک وطن کر کے دہلی آئے یہ زمانہ "شاہ عالم" کی حکومت کا تھا، طالع نے یاوری کی شاہی طبیبون مین داخل ہو گئے خدمات طبابت کے صلے مین بادشاہ کی طرف سے پرگنہ نارنول کے کچھ مواضعات بطور جاگیر عطا ہوے

ایسٹ انڈیا کمپنی نے جب جھجر کی ریاست نواب فیض طلب خان کو دی تو اس مین پرگنہ نارنول بھی تھا نواب صاحب نے نامدار خان کے ورثا کو ایکہزار روپیہ سالانہ پنشن دی اس مین حکیم مومن خان بھی شامل تھے، ایسٹ انڈیا کمپنی نے بھی مومن کو ۲۵ روپیہ ماہوار وظیفہ دیا تھا مومن کے والد حضرت شاہ عبد العزیز صاحبؒ کے معتقد تھے اس لئے جب مومن پیدا ہوے تو شاہ صاحب نے ان کے کانون مین اذان دی، اور "مومن" نام رکھا جو نگین شہرت بنا

تعلیم و تربیت مومن نے اول اول گھر پر تعلیم اور تربیت پائی، اس کے بعد حضرت شاہ عبد القادر اور حضرت شاہ عبد العزیز ایسے جید علما سے فیض حاصل کیا، درسیات ختم کر کے اپنے خاندان مین طب کی تکمیل کی، وہین عرصہ تک نسخہ نویسی بھی کرتے رہے

علم طب کو شاعری سے براہ راست بہ ظاہر کوئی تعلق اور مناسبت نہین لیکن "مومن" نے ان کو دونون کا ڈانڈا ملا دیا ہے اکثر غزلون کے اشعار مین اس کے مسائل اس طرح بیان کئے ہین کہ شعر مین لطف پیدا ہو گیا ہے

جذبات شاعری کے ساتھ علم الابدان، اور تشریح اعضا مزاج انسانی کا پیوند ایسا ملایا ہے کہ ان کی شاعری کے لئے ایک میدان نکل آیا۔

طبابت کے علاوہ نجوم، اور جفر مین بھی ایسی مہارت حاصل کی کہ اس فن کے ماہرین ان کو استاد تسلیم کرتے تھے، شطرنج مین بڑے بڑے شاطران کے کمال کے معترف تھے، "مومن" نے ان علوم کو بیکار رہنے نہ دیا بلکہ اپنی شاعری مین اس طرح ممزوج کیا کہ اگر کوئی ماہر چاہے تو ان کی شاعری سے ان علوم کے اکثر مسائل کا پتا لگا سکتا ہے اس کمال اور جدت مین "مومن" نہ صرف اردو شعرا مین یگانہ دیکھتا ہین بلکہ فارسی شاعری مین بھی انکی طبیعت کے شاعر مشکل سے ملین گے

لباس اور حلیہ مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی نے رسالہ اردو اورنگ آباد مین "۱۲۶۱ھ مین دہلی کا ایک مشاعرہ" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا ہے اس مین حکیم مومن خان کا حلیہ اور لباس وجاہت، خوش پوشاکی کا نقشہ

ان الفاظ مین کھینچا ہے

"حکیم مومن خان کی عمر تقریباً ۴۰ سال کی تھی، کشیدہ قامت، سرخ و سفید رنگ تھا جس مین سبزی جھلکتی تھی، بڑی بڑی روشن آنکھین، لمبی لمبی پلکین، کھینچی ہوی بھوین لمبی ستوان ناک، پتلے پتلے ہونٹھ ان پر پان کا لاکھا جما ہوا، مسی آلودہ دانت ہلکی ہلکی مونچھین، خشخاشی داڑھی، بھرے بھرے ڈنڈ، پتلی کمر، چوڑا سینہ لمبی انگلیان، گھونگر والے بال لمبے لمبے کاکلون کی شکل مین کچھ تو پشت پر اور کچھ کندھون پر پڑے ہوے، بدن پر شربتی ململ کا نیچی چولی کا انگرکھا لیکن اس کے نیچے کرتا ندارد، جسم کا کچھ حصہ انگرکھے کے پردے سے دکھائی دیتا تھا، گلے مین سیاہ رنگ کا فیتہ، اس مین چھوٹا سا سنہرا تعویز، کاکریزی رنگ کے ڈوپٹے کو بل دیکر کمر مین لپیٹ لیا تھا اور اس کے دونون کونے سامنے پڑے ہوے تھے، ہاتھ مین پتلا سا خار پشت، پاؤن مین سرخ گلبدن کا پاجامہ مہریون سے تنگ اوپر ڈھیلا، پاجامے کا کپڑا ہمیشہ ریشمی اور قیمتی ہوتا تھا، چوڑا سرخ نیفہ، انگرکھے کی آستین آگے سے کٹی ہوئی ہوتی تھین، کبھی لٹکتی رہتی تھین، کبھی پلٹ کر چڑھا لیتے تھے، سر پر گلشن کی بڑی دو پلڑی ٹوپی، اس کے کنارے پر باریک لیس، ٹوپی اتنی بڑی کہ سر پر منڈھ کر آگئی تھی، اندر سے مانگ اور ماتھے کا کچھ حصہ اور بال صاف جھلکتے تھے"

جس زمانے کی یہ وضع اور لباس تھا اسوقت اس مین تکلف اور شوقینی کی انتہا ہو گئی تھی، "مومن" کی متانت اور سنجیدگی مزاج، خودداری، تہذیب اس کے گواہ ہین کہ یہ وضع شرفا کی تھی، اب اگر اس وضع مین کوئی شخص رہے تو تماشہ بننے کے علاوہ غنڈون مین شمار ہو، ہر ملک راہر رسمے کے سوا "ہر قرنے راہر رنگے" بھی صحیح اور درست ہے

اسی اُردوئے "مومن" کی جو تصویر شایع کی ہے (اور جو نگار میں بھی نکل چکی ہے) اس سے "مومن" کی ذہانت، غور و خوض، فکر اور تعمق کا پورا پتا چلتا ہے، علم الابدان اور علم قیافہ کو جہانتک دخل ہے اس سے واضح ہے کہ مومن کے ایسے حلیہ کا آدمی کبھی معمولی اور عامی نہین ہوتا

حالات و سوانح

"مومن" رنگین مزاج ضرور تھے لیکن اوباش فطرت نہ تھے، طبیعت مین درد، سوز و گداز عاشقانہ ادائین موجود تھین لیکن غیر محتاط نہ تھے جن تذکرہ نویسون نے ان کی ظاہری شکل و صورت، وضع و لباس پر انکی وارستہ مزاجی، آزادی (بقول بعض) اوباشی قیاس کی ہے وہ مع الفارق ہے یہ ثابت ہے کہ "مومن" نے ابتدائے جوانی مین شاہ سید احمدؒ کے ہاتھ پر بیعت کرلی اور آخر وقت تک اس بیعت کو نبھایا

رسالہ "نگار" جنوری ۲۸ء صفحہ ۱۳ پر یہ عبارت ہے کہ :-

"مومن کی شاعری پر شاہ سید احمد کی تعلیمات کا اثر تھا"

شاہ سید احمد صوفی اور درویش کامل تھے، ان کی تعلیم مقامات تصوف "ہمہ اوست"، فنا و بقا، دنیا کا عالم مثال ہونا، وحدت وجود وغیرہ پر مشتمل ہوتی ہے جس کے لوازم طبیعت کا گداز، خودداری، توکل، عاشقانہ رنگ، "آہ سرد و رنگ زرد و چشم تر" ہین

"مومن" کے کلام مین شروع سے اخیر تک تصوف موجود ہے اس کی تفصیل آتی ہے اس جگہ اصولی طور پر ایک امر ذہن نشین کرلینا چاہئے کہ عشق مجازی" کے جو لوازم ہین وہ عشق حقیقی کا عکس ہین، اگر مومن کی شاعری اور غزلیات مین عشق، درد، جذبات سوز و گداز موجود ہے تو رموزِ تصوف سے انکار نہین کیا جاسکتا، در آنحالیکہ یہ ثابت ہوچکا ہے کہ "مومن" ایک پیر طریقت کے مرید اور خمخانہ تصوف کے میکش اور سرشار تھے۔ "مومن" پر جس قسم کے اتہامات لگائے گئے ہین انکی شکل ان الزامات سے ملتی جلتی ہے جو شیخ سعدی، ایسے بزرگ پر تراشے گئے ہین

شیخ سعدی اور مومن

شیخ سعدی" کے جذبات تغزل کا بعض واقعات رسمی کی بنیاد پر" امرد پرستی" سے منسوب کرنا بالکل بے اصل اور بے حقیقت ہے اس سلسلے مین اس کا اجمالی بیان نامناسب نہ ہوگا

فارسی تغزل کی بنیاد " امرد پرستی" ظاہر کی جاتی ہے شیخ سعدی فارسی "تغزل" کے امام یا موجد تھے اس لئے ظاہر ہے کہ یہ جدت، اور اس مین رنگِ تغزل کی بلندی بالکل نئی چیز تھی اس لئے شیخ، کا دامن امرد پرستی" کے واقعات خود ساختہ سے ملوث کیا گیا

یہ بھی پیش نظر رکھنا چاہئے کہ اس قسم کے لغو الزامات شیخ سعدی کے زمانے مین ایران کے اندر ان کے ہم منزلون اور ہمخیالون کی طرف سے عائد نہین کئے گئے بلکہ اغیار کی طرف سے ان کے وطن سے باہر ان کے زمانے کے بہت بعد لگائے گئے ہین، اس لئے حقیقت ظاہر ہے

شیخ کے متعلق ایک واقعہ گلستان کی ایک حکایت کے بیان کے مطابق یہ بیان کیا جاتا ہے کہ " انھون نے ایک نوعمر، سبزہ آغاز شخص کے بوسے لئے تھے" استغفراللہ کجا شیخ سعدی کجا یہ الزام" صورت حقیقت یہ ہے کہ ایران مین یہ رواج پہلے بھی تھا اور اب بھی ہے کہ رخصت ہونے یا رخصت کرنے کے وقت فریقین ایک دوسرے کے سر اور پیشانی چومتے تھے، کبھی ایک ہی فریق کی طرف سے یہ اظہار گرمجوشی ہوتا تھا اس مین عمر اور قد کی کوئی قید نہین، الزام دینے والون نے صرف اس رسم کو سامنے رکھ کر الزام کا پہاڑ بنا لیا

شیخ سعدی عالم متبحر، متورع، پارسا، ابوالفرح ابن جوزیؒ ایسے سخت متشرع پیر کے مرید تھے جن کے نزدیک " سماع" تک احتیاط کے خلاف تھا شیخ سعدی ان کے پیرو تھے، تہجد گزار، متعدد حج پاپیادہ کئے تھے، ان کے نسبت اس قسم کا خیال صرف راویون کی اُپج، ہے یا تعصب اس کے سوا کچھ نہین

جذبات تغزل کی بنیاد پر اس الزام کی صورت اس لطیفے سے ملتی جلتی ہے کہ " کسی نے کسی سے پوچھا کہ مجاہد کون ہے ؟ اس نے جواب دیا کہ جس کے لمبی داڑھی ہو"

" مومن " غریب پر بھی یہ الزام بالکل یہی نوعیت رکھتا ہے" جس طرح شیخ سعدی کی غزلین واقعات امرد پرستی بن گئین اسی طرح مومن کی مثنوی، داسوخت، ان کی آزادی، وراستہ مزاجی اوباشی کا خط و خال بنگئین- ان اضافہ پر آیندہ گفتگو ہو گی

مومن کی طرف سے جن الزامات کی تردید کی گئی ہے اس پر مزید برہان اور حجت کی ضرورت ہو تو ان کے حالات اور

خصائل پر نظر کیجئے

"مومن" طبعًا نہایت غیور اور خود دار تھے ان کا دوش احسان کے معمولی بوجھ سے بھی کبھی آشنا نہ ہوا قناعت اور توکل انکی گھٹی مین تھے ، وطن پرستی ان کے ایمان کا جز تھا انہین وجوہ سے اپنے ہی آستانے پر پڑے رہے دہلی سے باہر کبھی نہیں گئے

راجہ کپور تھلہ نے ان کو دہلی سے طلب کیا ساڑھے تین سو روپیہ ماہوار تنخواہ مقرر کی ، خرچ سفر بھی بھیجا ، مومن کو راجہ صاحب کی قدردانی کا پورا علم تھا ، جانے پر آمادہ ہو گئے لیکن جب معلوم ہوا کہ ریاست مین ایک گانیوالے کی بھی یہی تنخواہ ہے تو اپنا ارادہ فسخ کر دیا ۱۸۴۲ء مین ان کو کالج کی پروفیسری پیش کی گئی اس سے بھی انکار کیا

مومن کے پیر بھائی والئی ٹونک نے ان کو بلاتے اور اپنے ساتھ قیام کرنے کی کوشش کی ، مگر معذرت کر دی اور نہ گئے چار یا پانچ باران کو وطن چھوڑکر رام پور ، بدایون ، سہسوان ، سہارنپور ، جہانگیر آباد جانا پڑا اور ان کے مذاق اور طبیعت کے مطابق آرام بھی تھا عزت بھی تھی لیکن قبلۂ وطن دہلی ان کے دل کا ہمیشہ قبلہ نما بنا رہا

"حب الوطن من الایمان" کو اپنے عمل سے صحیح ثابت کر دیا ، مسٹر رام بابو سکسینہ اس خصوصیت کو اپنے الفاظ مین اس طرح ادا کرتے ہین "انھوں نے پانچ بار دہلی کو چھوڑا ، لیکن محبت کی وطن نے ہمیشہ ان کو اپنی طرف کھینچ لیا" . . . . راجہ اجیت سنگھ رئیس پٹیالہ دہلی مین رہتے تھے ، سخاوت مین مشہور تھے ، مومن خان کو قیمتی ہودج کے ساتھ ہتھنی دی ، خانصاحب نے اظہار شکریہ مین قصیدہ کہا جسکا مطلع یہ ہے

صبح ہوی تو کیا ہوا ہے وہی تیرہ اختری کثرتِ دود سے سیاہ شعلۂ شمع خاوری

پورے قصیدے کو دیکھئے اس مین مومن خان کی شان کہین کم نہین ہوی ہے اور ممدوح کو غلط اوصاف سے متصف کرکے ، نامناسب اور ناجائز مبالغے سے متہم نہین بنایا ہے

آزاد کی رائے ہے کہ سوا اس قصیدے کے کوئی اور مدح کسی دنیادار کی صلہ کے توقع پر نہین لکھی

"مومن نے اس قصیدے کو قصیدہ کے پورے معیار پر لکھا ہے اس کی تفصیل موقع پر آتی ہے

"مومن" مین خدا نے ذہانت اور ذکاوت کے ساتھ غیر معمولی قوتِ حافظہ عطا کی تھی ، دنیا مین ایسے لوگ غیر معمولی کہے جاتے ہین جن مین یہ دونون قوتین ہوتی ہین

ان دونون قوتون سے مالامال ہستیون نے جو کچھ کیا ہے وہی "مومن" نے بھی کیا

شیخ ابن سینا نے فلسفہ اور دوسرے علوم کے ساتھ جو کچھ کیا ہے وہی مومن نے ، شاعری میں جوہر دکھائے ہیں اگر ان کی شاعری کی حقیقت سمجھی نہ گئی تو مومن کا کیا قصور ہے

"مومن" خود دار ضرور تھے لیکن مغرور و متکبر نہ تھے، وہ کسی کی مدح یا ذم اپنی طبیعت کے خلاف کبھی گوارا نہ کرتے تھے لیکن اظہار حقیقت مین ان کو کبھی عار نہ تھا

جن تذکرہ نویسون نے یہ لکھا ہے کہ "وہ کسی کے کمال کا اعتراف نہ کرتے تھے" مومن پر بہتان اور ان کے وصف "اعتراف حقیقت" کی پردہ پوشی ہے

رسالہ اُردو اکتوبر ۱۹۲۲ء کے صفحہ ۵۹۲ پر مرزا فرحت اللہ بیگ کے مضمون کی یہ عبارت دیکھئے "مومن نے غالب کے متعلق یہ الفاظ کہے ہین

"غالب کے رنگ مین شعر کہنا تو کیا وہ یا ان کے استاد پہلے مرزا نوشہ کے شعرون کو سمجھ تو لین"۔

یہ الفاظ مومن نے ہدہد الشعرا اور ان کے استاد کے متعلق کہے تھے، "مومن نے پیشہ طبابت پر رزق کا انحصار نہین کیا تو شاعری نجوم، رمل وجفر سے کیا کسب زر کرتے

حاصل کلام یہ ہے کہ "مومن"، خود دار، وطن پرست، متوکل، انصاف پسند، ذہین وزکی، قوی الحافظہ، سوز وگداز اور دردِ عشق کی تصویر تھے

خصوصیاتِ کلام

"مومن" کے تمام اصنافِ سخن پر بحث اور تبصرہ کرنے سے پہلے "غزل" پر اظہار خیال ضروری ہے کیونکہ "غزل" ہی کے میدان مین "مومن" آفتاب بنکر چمکے اور اصناف اس آفتاب کی کرنین ہین، مومن اپنے کمال اور خداداد مہارت کے اعتبار سے جو مشہور نہ ہوے اس کی وجہ یہ ہے کہ انھون نے عام روش سے علیحدہ اپنا راستہ بنایا تھا اس راستے کو کسی نے "بدعت"، کسی نے "تماشا" کسی نے "چیستان" کسی نے "معما" کہا۔ حالانکہ وہ اپنی شاعری بالخصوص تغزل کے اعتبار سے جتنی بلندی پر ہین وہان تک نظر پہونچنا بھی مشکل ہے، اس لئے جو لوگ یہ سب کچھ کہتے ہین انکی خطاے نظر ہے۔ "ہسٹری آف اُردو لٹریچر" صفحہ ۱۵۰ مین رام بابو سکسینہ نے بلیغ الفاظ مین "مومن" کے امتیاز کو نمایان کیا ہے لکھتے ہین کہ:۔

"مومن اپنے خیالات کی بلندی اور بلند پروازی کی ندرت مین سب سے الگ اور ممتاز نظر آتے ہین، ان کے تشبیہات اور استعارے معمولی سطح سے اسقدر بلند ہین کہ ان کے اشعار ان خصوصیات مین بالکل نمایان ہین

"مومن نے خیالات بلند اور الفاظ شاندار کو اپنی شاعری مین یکجا کر دیا ہے۔ وہ "عاشق تن" شاعر ہین لیکن ان کے عشق کا ذریعہ اظہار غزل ان کے کمالات کی وجہ سے غیر معمولی ہے"

تعجب ہے کہ جس فرض کو مدعیان اُردو تذکرہ نویسون نے ادا نہین کیا اس کو رام بابو نے چند الفاظ مین ادا کر دیا۔ مومن کے اوصافِ شاعری کی تفصیل کیجائے تو یہی الفاظ ہونگے جو رام بابو نے اختیار کئے ہین

یہ کیسی بوالعجبی اور افسوسناک حیرت ہے کہ "مومن" کا کمال بعض غلط بین نگاہون مین عیب اور نقص ہے

مین نے اپنے ماہانہ رسالہ "تعلیم" اور "سحبان" مین ایک لطیفہ درج کیا تھا ایک صاحب ادعا، مدعی سخن فہمی نے

مجھسے بھی شاعرون کے تذکرے پر کہا کہ "مومن" کا کلام بیشتر مہمل ہوتا ہے، مین نے تعجب سے پوچھا کہ کوئی مہمل شعر پڑہیے، حضرت نے یہ شعر پڑہا سے

کرعلاج دردِ وحشت چارہ گر   لادے اک جنگل مجھے بازار سے

مین نے پوچھا اس شعر پر کیا اعتراض ہے؟ جواب ملا کہ جنگل کہین بازار مین ملا کرتا ہے؟

مین نے کہا اس شعر مین "مومن" نے کمال بیان کی قدرت دکھائی ہے، اس شعر مین ایک طرف فصاحت دوسری طرف بلاغت ہے شاعر کہتاہے کہ جس طرح بازار مین جنگل نہین ملتا (کیونکہ یہ کوئی سودا نہین) اسی طرح دردِ وحشت کا علاج ناممکن ہے طریقۂ بیان نے مضمون کے سونے کو سکہ بنا کر اقلیم سخن مین جاری کیا ہے

اہلِ فن جانتے ہین کہ بلاغت کا یہ انداز "اعجاز" کا مرتبہ رکھتا ہے جو "مومن" کے سوا کسی کو نصیب نہین لفظی شکوہ مین معنوی طلسم کا انتظام جادو بن گیا ہے، اگر مہمل گوئی کا یہی معیار ہے تو "موضوع گوئی" کو کیا کہا جاے۔

اس کی مثال بالکل اس اعتراض سے ملتی جلتی ہے کہ "عربی۔ فارسی۔ اُردو اس لئے بہتر زبان نہیں ہیں کہ سیدھی طرف سے لکھی جاتی ہین؟ یورپ کے ایک فلسفی نے اپنی ایک تقریر میں یہی درفشانی کی تھی جب دعویٰ اور دلیل کی یہ صورتین ہون تو اہلِ تحقیق کو قلم رکھدینے کے سوا چارہ نہین

اس ضمنی بحث کے بعد اصل موضوع سے پہلے حقیقت شعر اور تغزل پر نقد وبحث کی حاجت ہے

ایک شاعر جب شعر کہتا ہے تو فضا، آب وہوا، زمانہ، اپنے علم وفضل، واقعات، وحالات سے متاثر ہوتا ہے، بلکہ یون کہنا چاہئے کہ شاعر کی طبیعت اثرات مذکورہ بالا سے متاثر ہوتی ہے اور شعر اس کی طبیعت کا خاکہ ہوتا ہے دونون بیانون کا حاصل ایک ہے شاعر کا یہ کمال ہے کہ وہ جس قسم کے خیالات ظاہر کرنا چاہتا ہے اسی اعتبار سے "الفاظ" "ترکیب" "بندش" کو پیش نظر رکھتا ہے نہ یہ کہ ہر قسم کے خیالات، مسائل فلسفہ وطبعیات، علوم وفنون کو مقررہ زبان یا ترکیب مین ادا کرسکتا ہے، کیونکہ یہ امر بغیر کسی دلیل کے مسلم ہے کہ تمام خیالات ایک زبان اور ایک لہجہ مین ادا نہین ہوسکتے

اصنافِ سخن پر نظر کیجئے قصیدہ۔ غزل۔ مثنوی۔ مرثیہ۔ واسوخت، ہجو، رباعی۔ بند علیحدہ علیحدہ اسلوب سے بیان کئے جاتے ہین غور سے دیکھئے تو انکی زبان اور الفاظ مین بھی بیّن فرق ہوتا ہے۔

اس پر یہ دلیل قائم ہوتی ہے کہ "اثر معنی کے تابع ہے، معنی الفاظ کے تابع"

جب مرثیہ کا اثر قصیدے سے علیحدہ تسلیم کیا جا سکتا ہے تو اسی دلیل سے مرثیہ کے الفاظ وطرز ادا کا قصیدے سے علیحدہ ہونا مسلم ہے، ایس جانسن، لائیوز آف دی پوئٹس مین لکھتے ہین:۔

"الفاظ وتراکیب کے اُس انتخاب پر بہت کم توجہ کیجاتی ہے جو نظم کو نثر سے علحدہ کر دیتے ہیں"

اسی سلسلہ میں آگے لکھتے ہیں:۔

نہ تو گل خار سے علحدہ کئے گئے اور نہ مختلف رنگ باہم گر . . . .

اس طرح ملائے گئے کہ ہر رنگ میں جان پڑ جاتی . . . .

. . . .

. . . .

. . . .

ای۔ ایس ڈیلاس کی رائے ہے کہ :۔

"الفاظ، خیالات کے اظہار کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ ہر فن کے لئے مخصوص زبان ہوتی ہے"

اس کا مطلب یہ ہے کہ "اگر داستان غم اور مضمون رنج بیان کرنا ہے تو اسی مناسبت سے الفاظ لانا چاہئے، خوشی اور مسرت کے اظہار میں اسی قسم کے الفاظ استعمال کئے جائیں، یہی شاعر کا کمال ہے، جو شاعر اس اعتبار سے جس قدر کامیاب ہے اسی قدر باکمال سمجھا جاتا ہے

"شکسپیر" اپنے اسی کمال کی وجہ سے مشہور ہے، وہ فطرت نگار" ہے طبائع پر اس کو عبور ہے، جس کا کیریکٹر بیان کرتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ اس پر وہ حالت خود طاری ہو رہی ہے، فارسی میں فردوسی، کا شاہنامہ اُردو میں مراثی انیس و دبیر، اُردو ڈراموں میں آغا حشر کے ڈرامے ان خصوصیات کی وجہ سے مشہور ہیں

خاقانی اور ذوق نے فارسی اور اُردو میں قصیدہ گوئی کا معیار قائم کیا اور اس کے مطابق الفاظ لائے، اس لئے ان کا درجہ بہت بلند ہے عربی میں یہی خصوصیات اس مرتبہ کمال پر پہونچ جاتی ہیں کہ بالآخر معجزہ بن جاتی ہیں، انسان کو اس کے مثل کہنے کا یارا نہیں رہ جاتا ہے

اس کا نام قرآن ہے

ہندی (بھاشا) شاعری میں اصطلاح معین کے بموجب، رس، خاص چیز ہے، اس کے اصلی معنی ذائقہ کے ہیں، اصطلاح میں اظہار جذبات کا نام ہے،

اس کی نو قسمیں ہیں

۱۔ شرنگار۔ اس کے ذریعہ سے خواہش نفسانی کا اظہار ہوتا ہے اس کے مطابق الفاظ لاتے ہیں

۲۔ ہاسی۔ آواز یا حرکت کی وجہ سے تاثر

۳۔ کرونسرا۔ ہجو وغیرہ کے جذبات

۴۔ راود۔ غصہ کے جذبات

۵۔ ویررس۔ اس میں خوشی کے جذبات کا اظہار ہوتا ہے

۶۔ بھیانک رس ۔ خوف کے جذبات ظاہر کئے جاتے ہین

۷۔ وی بھتس ۔ اظہار توہین کے جذبات

۸۔ ادبھت ۔ حیرت اور استعجاب کا اظہار ہوتا ہے

۹۔ شانت ۔ خدا کے تصور سے رونگٹے کھڑے ہو جانا یا اس قسم کی تاثیر کا اظہار

ہندی شاعری مین الفاظ کے اعتبار سے ترنم بھی ہوتا ہے اس ترنم کے لحاظ سے راگ اور راگنی وسیع علم بن گیا ہے جس کا جواب ہندوستان کے باہر نہین ملتا۔

ہندی مین ایک ایک رس کی متعدد قسمین ہین ان سب کو یکجا کر کے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ رس کی شاعری نے انسانی جذبات کو کس طرح سمجھا ہے؟

موضوع بحث کو مسلسل کرنے اور ترتیب مقدمات کے بعد نتیجہ نکالنے کے لئے فصاحت اور بلاغت کا ذکر بھی ضروری ہے

یورپ مین ایساکریس علم معانی وبیان کا معلم اول ہے اس نے فصاحت کی تعریف ان الفاظ مین کی کہ "وہ فن ترغیب و تحریص"

ابن سنان کے نزدیک فصاحت کا مدار ذیل کے اصولون پر ہے :۔

۱۔ لفظ مانوس ہو، یعنی اہل زبان استعمال کرتے ہون، زبانون پر روان ہو، اسی کی بناوٹ مین کوئی غرابت نہ ہو اوضاع لغوی سے خارج نہ ہو (یعنی دریا کہہ کر پہاڑ، زمین کہکر آسمان مراد نہ لین)۔

۲۔ لفظ آسانی سے زبان پر جاری ہو سکے، سننے مین دلکش ہو

۳۔ بحیثیت استعمال لفظ سہل ہو، اور معنا دل نشین ہو

۴۔ سختی اور نرمی مین حسب موقع کارآمد ہو، غصہ کے موقع پر اظہار غصہ ہو سکے، صبر اور حلم کی جگہ اس کا اظہار ہوتا ہو

معنوی خصوصیات یا مفہوم اور مطلب کا اظہار اس طرح ہو کہ ادراک اور احساس کو اس سے لذت ہو ایک لفظ کثیر معانی پر دال ہو

مومن کا ایک شعر ہے:۔

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا		جب کوئی دوسرا نہین ہوتا

لفظ "گویا" اس جگہ اسقدر بلیغ ہے کہ اس سے زیادہ کوئی لفظ اس مفہوم کو ادا کرنے والا مشکل سے ملیگا

آئمہ فن نے اس پر مبسوط بحثین کی ہین اس جگہ ان کا ذکر موضوع اور مضمون کو ناگوار طویل بنا دیگا

یہان ضمنی طور پر یہ بحث پیدا ہوتی ہے کہ خوبی عبارت کو لفظ سے تعلق ہے یا معنی سے

ایک گروہ کا دعویٰ ہے کہ اس کا تعلق الفاظ سے ہے دوسرا فریق معنی کو کہتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ تنہا نہ تو لفظ ہی مقصد کو پورا کرتا ہے اور نہ تنہا معنی بلکہ دونون سے معانی مطلوب پیدا ہوتے ہین

تنہا نہ تو کوئی لفظ فصیح ہے اور نہ بلیغ۔ بعض وقت غیر فصیح الفاظ ترتیب سے آکر فصیح ہو جاتے ہین۔ مثلاً عربی مین ضیزیٰ "کا لفظ ہے، ایک لفظ مین "ض" اور "ز" کا اس طرح جمع ہونا فصاحت کے خلاف ہے لیکن قرآن مین جہان یہ لفظ استعمال ہوا ہے نہایت فصیح ہے "تلک اذا قسمۃ ضیزیٰ"!

لفظ بمبوق، بغچوبچون، "ڈگڈمبر" بہ ظاہر غیر فصیح ہین لیکن ان سے اگر مذاق مراد ہو اور تربیت مین یہ معنی پیدا ہون تو اپنی جگہ بہت فصیح ہین

مومن نے اپنے اشعار مین الفاظ کی فصاحت، معانی کی بلاغت، ترتیب کی خوبی زبان کی سلاست، بندش کی بیساختگی کا یکجا اس طرح اہتمام کیا ہے کہ کہین دوسری جگہ نظیر نہین ملتی۔ اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ شاعری مین مومن کا مرتبہ مجتہد اور امام کا ہے ہمارے دعاوی کی دلائل بھی اس جگہ دیکھ لیجئے ؂

۱۔ تم مرے پاس ہوتے ہو گویا جب کوئی دوسرا نہین ہوتا

لفظ "گویا" کی "فصاحت" پر ایک طرف نظر کیجئے اور اسکی معنوی بلاغت پر دوسری طرف نگاہ رکھئے، ترکیب مین "گویا" جہان واقع ہے اس پر بھی نظر کیجئے پھر پورے شعر کی بندش اور سلاست پیش نظر رکھئے، کیا یہ مثال دوسری جگہ مل سکتی ہے؟

لفظ "گویا" اگر دوسری جگہ رکھدیا جائے یا شعر کے الفاظ مین کچھ تغیر کر دیا جائے تو یہ تناسب اور یہ لطافت قائم نہین رہ سکتی یہ مومن کے کمال اور ہمارے دعوی کی کھلی ہوی دلیل ہے۔

فصاحت الفاظ:۔ ؂

۲۔ پھوڑا تھا دل نہ تھا یہ موے پر خلل گیا جب ٹھیس سانس کی لگی دم بھی نکل گیا

اس شعر مین الفاظ ٹھیس، پھوڑا، سانس، دم کی فصاحت لفظی دیکھئے۔

مومن نے چونکہ پہلے مصرعہ مین لفظ پھوڑا، استعمال کیا ہے اس لئے دوسرے مصرعہ مین "ٹھیس"، لگنا کہا ہے، پھوڑے "مین ٹھیس لگتی ہے اس کے لئے اس جگہ دوسرا لفظ موزون نہین ہوسکتا، اس طرح "ٹھیس" کے لئے پھوڑا لازم تھا، ٹھیس لگنا نازک سے نازک تر چیز کے لئے استعمال ہوتا ہے، اس جگہ اس لفظ نے بتا دیا ہے کہ پھوڑے کی حالت نازک سے نازک تر تھی

"سانس"، کا لفظ چونکہ آچکا تھا اس لئے "دم" سے زیادہ کوئی لفظ موزون اور مناسب نہ تھا

اب معنوی بلاغت دیکھئے:۔

دل کو پھوڑا، کہا اس لئے کہ اس کی صورت اس سے ملتی ہوی ہوتی ہے پھوڑا مواد سے بھرا ہوتا ہے، دل کا بھرنا اور بھر آنا بھرا ہوا ہونا وہ صفتین یا مصادر ہین جو مستعمل ہین۔ لہذا معنوی حیثیت سے اس کے تناسب کا اعجاز ملاحظہ فرمائیے

"دم" کے دوسرے معنی "خون" کے ہین، اب دم نکل جانے کی خوبی بلاغت دیکھئے جس طرح پھوڑے سے مواد وخون اور ریم نکلتا ہے، اسی طرح سانس کی ٹھیس لگنے سے دم یا جان یا خونِ دل نکل گیا، خونِ دل بھی جان ہی ہے، اس جگہ "مومن" نے

اپنی حکمت وطبابت کو بھی ہاتھ سے جانے نہین دیا۔

چھوڑے مین ہر چیز سے ٹھیس لگتی ہے لیکن دل کی ایسی نازک چیز مین سانس کی ٹھیس کافی نہین ضروری ہے

پھر دل - سانس - دم - کی مناسبت نے معنوی خوبیون کے نگینے شعر کی انگشتری مین مناسب اور موزون ترین مقامات پر جڑ دئے ہین - نزاکت، اور تلاش نے ایک طرف سلاست، زبان اور بندش نے دوسری طرف اس شعر کو بیمثال کر دیا ہے

اس شعر کا کمال دیکھئے کہ اس کا کوئی لفظ بدل دیجئے یا ترکیب اور ترتیب مین ردوبدل کیجئے تو شعر بدل جائے گا اور یہ خوبی باقی نہ رہیگی "مومن" کے اعتراف کمال کے لئے یہ کافی ہے

دوسرا شعر حمد کے سلسلے مین مناجات کا ہے

۳- خدایا ہاتھ اٹھاؤن عرض مطلب سے بھلا کیونکر کہ ہے دستِ دعا مین گوشہ دامانِ اجابت کا

اس شعر کے اجزائے ضروری ہاتھ اٹھانا - دستِ دعا - دامانِ اجابت ہین "مومن" چونکہ دعا کر رہا ہے (مومن کی مناسبت معنوی کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے) اس لئے ہاتھ نہین اٹھا سکتا یعنی ناامید نہین ہو سکتا۔

ہاتھ اٹھانے کے دوسرے معنی بھی ہوتے ہین اس کو اس مضمون سے مقید کر لیا ہے کہ دست دعا مین چونکہ دامانِ اجابت کا گوشہ ہے اس لئے نہین اٹھا سکتا مبادا وہ چھوٹ جائے جو عین مدعا ہے

پہلے مصرعہ مین ہاتھ اٹھانا دوسرے مین دست دعا ہے بظاہر لفظاً تکرار ہے لیکن معنوی اعتبار سے ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ مقصود دعا اور اجابت کے لئے ان الفاظ سے زیادہ اگر کوئی موزون الفاظ ہو سکتے ہین تو ان کو لا کر دیکھئے کہ شعر کی یہ خوبی باقی رہتی ہے؟

۴- درد ہے جان کے عوض ہر رگ و پے مین ساری چارہ گر ہم نہین ہونے کے جو درمان ہوگا

یہ شعر لفظی خصوصیات کے اعتبار سے زیادہ معنوی خصوصیات کی شان رکھتا ہے - الفاظ دردٗ - جانٗ - چارہ گرٗ - درمانٗ اس انگشتری کے نگینے ہین جو اپنی جگہ پر موزون تر ہین

معنوی بلاغت دیکھئے کہ "مومن" کہتا ہے کہ اب "درد" طبیعت اور خون بن گیا ہے جو جسم کے ہر حصہ مین موجود ہے جس طرح جان جسم مین ہر جگہ موجود ہے (یہ مسئلہ بھی مومن کے فلسفہ طب کو آشکار کرتا ہے) لہذا اس کا علاج نہین ہو سکتا علاج کے معنی یہ ہین کہ "درد" دفع ہو اور وہ جان بن گیا ہے، لہذا درمان سے درد کی جگہ "جان" کا دفعیہ ہوگا، جب جان جسم مین باقی نہ رہی تو انسان زندہ نہ رہا، اس زندہ نہ رہنے کو ان الفاظ مین بیان کیا ہے کہ ہم نہین ہونے کے، اس سے بہتر طرز بیان ہونا خیال مین نہین آتا۔

اس ترکیب کی دوسری خوبی ملاحظہ فرمائیے، متکلمین اور علمائے فلسفہ کے نزدیک "انسان" مجموعہ جسم وجان کا نام ہے، یعنی انہین سے اک کوئی بھی جزو نہ ہو تو انسان مکمل نہین - "مومن" نے اس مسئلہ کو سامنے رکھ کے بلیغ الفاظ استعمال کئے ہین "ہم نہین ہونیکے"۔

"مومن" نے "جان کے عوض" کہکر درد ہی کو جان بنا دیا ہے "جان کی طرح" اگر کہتے تو دوسرے مصرعہ مین یہ خوبیان پیدا نہ ہو سکتی تھین

معنوی اعجاز کے علاوہ "زبان" کی کرامت کو بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے۔ "ہم نہیں ہونے کے جو درماں ہوگا" یعنے اگر درماں ہوگا تو ہم نہ ہونگے دوسرے الفاظ میں یا تو درماں ہو، یا ہم ہوں، کیسا محاورہ اور کیسی زبان ہے

۵۔ چارہ گر جنت میں اس کے آستاں سے لے گئے　　ایک بھی میری نہ مانی لاکھ سر پٹکا کیا

اس شعر کے اجزاے ضروری جنت - آستاں - سر پٹکا کیا - لیگئے - میری نہ مانی ہیں

لفظی تناسب اور اعتبار سے پہلے مصرعہ میں چونکہ "آستان" کہا ہے اس لئے دوسرے مصرعہ میں "پٹکنا" استعمال کیا ہے آستانِ معشوق پر عاشق سر پٹکتا ہے یہ مضمون عام ہے قریب قریب اکثر شاعروں نے لکھا ہے "مومن" کی تلاش اور انداز اس کا پابند کیونکر رہتا! وہ کہتا ہے کہ:-

"چارہ گر آستانِ یار سے جنت میں علاجِ عشق کے لئے لیگئے، لیکن عاشق کو جنت سے کیا کام اس لئے آستانِ یار کا چھوڑنا گوارا کیونکر ہوتا اس ناگواری کو سر پٹکنے سے ظاہر کیا ہے، ایک بھی میری نہ مانی، محاورہ اور زبان کی بیساختگی ہے اس سے اور چار چاند لگا دیئے ہیں۔ "لاکھ سر پٹکا کیا؟ بلاغت کی روح ہے"

۶۔ لاش کس کی ہے یہ عدو سے نہ پوچھ　　میں ہوں کشتہ ترے تجاہل کا

اجزاے شعر لاش - کشتہ ہیں لفظی اعتبار سے لاش کے ساتھ کشتہ، کا ذکر ضروری تھا معنوی خوبی دیکھئے کہ:-

"معشوق، رقیب سے عاشق کی لاش کو دیکھ کر پوچھتا ہے کہ یہ کس کی لاش ہے، (حالانکہ وہ جانتا پہچانتا ہے) عاشق زبانِ حال سے کہتا ہے کہ یہ عدو یا رقیب سے پوچھنے کی بات نہیں، یہ تو مجھسے پوچھو کہ میں کون ہوں! میں تمھارے ناز تجاہل کا مارا ہوا ہوں۔ یہ "تجاہل" چاہے معشوق کا عام انداز ہو یا اس وقت وقتِ خاص کا میں ہوں کشتہ ترے تجاہل کا "کیسا دلپذیر لہجہ ہے زبان نے اس کو چمکا کر آفتاب بنا دیا ہے"

"مومن" کے دیوان میں شروع سے آخر تک یہ کمالات اور کرامات شاعری موجود ہیں، جنکا وجود ابتداسے اب تک کہیں نہیں ملتا

حاصل کلام یہ ہے کہ "مومن" نے اپنے تمام کلام بالخصوص غزلیات میں، الفاظ کی فصاحت معانی کی بلاغت، ترکیب کی خوبی ترتیب کی موزونی، زبان کی سلاست جذبات کے نشتر، بندش کی بیساختگی مضمون کی بلندی - تلاش - طرز ادا یکجا کر دیئے ہیں پھر کمال یہ ہے کہ اس اہتمام سے ان کا تمام دیوان شروع سے آخر تک بھرا پڑا ہے۔

سب سے زیادہ عجیب اور غریب خصوصیت "مومن" کی یہ ہے کہ آورد کے اہتمام میں اندازِ بیان سے "آمد" کی بیخودی اور دلیری پیدا ہو گئی ہے، مومن اپنی اس صفت میں دنیاے شاعری میں منفرد اور اکیلے ہیں

یوروپ کے اہلِ قلم "شکسپیر" کی تعریف کرتے ہوے لکھتے ہیں کہ "اس نے اپنی گرامر، اور زبان علیحدہ کر لی ہے

ان لوگون کو یہ معلوم نہین کہ یہ کسی کے کمال کی تعریف نہین ہو سکتی، عام راستہ سے الگ راہ طیار کرکے ہر شخص چلنے کی مقدرت رکھتا ہے، کمال اس کا نام ہے کہ اس راہ پر اس طرح چلے کہ نظرون کے ساتھ انگلیان بھی اُٹھنے لگین
"مومن" نے اپنے اسی کمال کا اظہار کیا ہے، وہ قواعد مقررہ، عام زبان یا لغات و محاورات بعینہٖ ہیں اسی انداز سے کہتا ہے کہ نئی بات معلوم ہوتی ہے۔

(باقی) کیفی چریاکوٹی

جنوری سنہ ۳۰ء سے

دارالاشاعت نگار سے ایک نئے رسالہ کا اجرار

اس رسالہ کا نام جن ہوگا۔ جن کے لغوی معنی ہین ہر اُس چیز کے جو حواس ظاہری سے پوشیدہ ہو، اس سے اس رسالہ مین تمام اُن امور و واقعات سے بحث ہوگی جن کا تعلق "ماورا، عالم حواس" سے ہے اور جس مین جنات ارواح خبیثہ مابعدالطبیعیات، روحانیات، وغیرہ سب شامل ہین۔ اس مین نہ صرف جنات وغیرہ کے معتبر واقعات و حکایات ہونگے، بلکہ ان پر تنقید بھی ہوگی، عالم ارواح و روحانیت کے متعلق جدید ترین تحقیقات و معلومات بھی ہونگی، اور "حیات بعد الممات" کے متعلق اس وقت تک جو کچھ دریافت ہو چکا ہے اور ہوتا جا رہا ہے وہ بھی درج ہوتا رہیگا۔

اس رسالہ کی تقطیع $\frac{20\times26}{8}$ ہوگی اور ۲۵ سطر کے مسطر پر دو کالم مین باریک خط سے لکھا جائیگا۔ حجم فی الحال دو جز ہوگا جسمین ۸ صفحات مستقلاً علمی تحقیقات کے لئے وقف ہونگے۔ اس رسالے مین ارواح خبیثہ اور جنات کے جتنے واقعات درج ہونگے ان سب کو مصور پیش کیا جائیگا جس کے لئے ایک آرٹسٹ کی خدمات مستقلاً حاصل کی گئی ہین۔ رسالہ کی سالانہ قیمت عہر تجویز کی گئی ہے اور ایک سال سے کم مدت کے لئے چندہ قبول نہ کیا جائیگا

جن حضرات کو اس دنیا سے دلچسپی ہو وہ براہ کرم اپنا پتہ بھیجدین تاکہ بعد اشاعت رسالہ کا نمونہ اُن کے پاس روانہ کیا جائے اس کے ساتھ یہ استدعا بھی ہے کہ اگر کسی شخص پر اُس کی زندگی مین کوئی واقعہ ایسا گزرا ہے جسے وہ جنات یا بھوت پریت سے منسوب کرتا ہے تو براہ کرم اس کو قلمبند کرکے روانہ کردے زبان و تحریر کی پرواہ نہ کیجئے یہان اس کو درست کر لیا جائے گا اور واقعہ کے مطابق تصاویر طیار کرلی جائین گی۔ لیکن اس کا خیال رہے کہ صرف اپنا تجربہ و مشاہدہ پیش کیا جائے، دوسرون سے نقل کی ہوئی روایت نہ ہو۔

پہلا پرچہ جنوری سنہ ۳۰ء کے نگار کے ساتھ ہی ساتھ شایع ہو جائیگا

مینیجر نگار۔ لکھنؤ

جھوٹ

"تم جھوٹی ہو، خدا کی قسم بالکل جھوٹی ہو!!"

"پھر اتنا کیون چیخ رہے ہو، کیا محلہ والون کو بھی اپنے قول کا گواہ بنانا چاہتے ہو!"

یہ بات بھی جھوٹ تھی، اس لئے کہ مین چیخ ہی نہین رہا تھا، بالکل آہستہ آہستہ باتین ہورہی تھین، اُسکی کلائی میری گرفت مین تھی اور مین بالکل عاشقانہ لہجہ مین اُس سے مخاطب تھا۔ ہان یہ بات مینے بھی محسوس کی کہ "جھوٹ" کا لفظ بار بار سانپ کی پھنکار کی طرح میری زبان سے نکل رہا تھا

"آہ! مجھے تم سے کتنی محبت ہے؟!" اُسنے درد آمیز لہجہ مین کہا "تمھین اسکا بالکل یقین نہین آتا۔ آخر مین کس طرح باور کراؤن"

مگر جب مینے اُسے قریب کھینچ کر اپنی آغوش مین لینا چاہا تو وہ تیتری کی طرح اُڑ گئی۔ مین نے برآمدہ کے اندھیرے سے نکلکر اُس کمرے تک اُسکا تعاقب کیا جہان ابھی تک رقص و سرود کی محفل گرم تھی، مگر دروازے کے پاس پہونچکر مین ٹھٹک گیا۔ اُس نے پلٹ کر دیکھا اور ہاتھ کے اشارے سے مجھے اندر بلا لیا

کئی جوڑے مصروف رقص تھے، مجھسے نہ کوئی مخاطب ہوا، نہ مجھے رقص کی دعوت دیگئی، سب کی نگاہون مین شاید ایک مین ہی ایسا شخص تھا جو اجنبی خیال کیا جا رہا تھا اس لئے مینے بھی سب سے علیحدہ ایک گوشے مین سازندون کے قریب بیٹھنا مناسب سمجھا۔ تانبے کی سماعت آزما نفیری کا مُنہ بالکل میرے سر کے قریب تھا۔ اُسکی آوازسے کانون کے پردے پھٹے جاتے تھے، مگر پھر بھی مین اس طرح خاموش بیٹھا رہا گویا موسیقی سے مجھے انتہائی رغبت ہے

ہر دس پانچ منٹ کے بعد ایک سفید، معطر، سایہ میرے پاس ہوکر گذرتا تھا ——— یہ وہی تھی ——— مجھے معلوم نہین کہ آیا وہ کس ترکیب سے دوسرون کی نگاہین بچاکر پروانہ وار آتی تھی اور مجھسے اظہار محبت کرجاتی تھی۔ البتہ اتنا احساس ہے کہ ایک لمحہ کے لئے، محض چشم زدن کیلئے اُسکے سڈول شانے میرے شانون سے مس ہوئے، ایک لمحہ ہی کیلئے میری نگاہین اُٹھین، اور مجھے ایک بلورین گردن، چمکدار لباس کا سا دھوکہ ہوا۔ پھر ایک بلورین چہرے کا خیال ہے ایسا بلورین چہرہ جس مین وفا و محبت بیک وقت موجود تھین اور جسے حور شمایل سمجھکر بھی خیال مطمئن نہ تھا ——— یقین کیجئے بالکل یہ معلوم ہوتا تھا کہ آسمان سے زہرہ رقص کرتے کرتے تھک کر آ گری ہے

مینے اُسکی آنکھین دیکھین، وہ ہرنی کی آنکھون کی طرح بیقرار، شوخ اور کسی روشنی کی متمنی تھین۔ خوبصورتی کا مفہوم یقیناً اُنکی دلکشی کی تشریح نہین کرسکتا

دراز پلکون کے سایہ مین اُسکی گہری گہری سیاہ اور سراپا محبت پتلیان تھین ——— جسوقت میری نگاہ ملی اُنکی گہرائی سمندرون کی طرح اتھاہ ہوگئی، جب مینے اُن پر غور کیا میرا قلب ساکن ہوگیا۔ اس مین مطلق مبالغہ نہین، ممکن ہے کہ یہ وقفہ لمحہ بھر یا اس سے بھی کچھ کم رہا ہو مگر وہ زندگی کا یہی لمحہ ہے جس مین مینے کائنات کی گردش کا تعلق حسین پتلیون کی لرزش سے محسوس کیا ہے صرف محسوس ہی نہین بلکہ اچھی طرح اپنی آنکھون سے دیکھا ہے!

ہراس و مجبوری کی ایک مسلسل کشمکش لئے ہوئے میری روح کشان کشان اُسکی نگاہون مین جذب ہو رہی تھی۔ یہانتک کہ مین اپنی ہستی سے بھی بیگانہ ہوگیا، ——— بے بس، بے یار و مددگار، قریب قریب مُردہ۔ زندہ تو یقیناً نہ تھا

دیکھتے دیکھتے وہ پھر فاختہ کی طرح اُڑ گئی، اس مرتبہ میری روح بھی اُسی کے ساتھ تھی

ہال مین ایک کشیدہ قامت، خوشرو نوجوان کے ساتھ وہ مصروفِ رقص تھی، خدا معلوم وہ کون تھا؟ مین اُسکی ایک ایک چیز کو گہری نظرون سے مطالعہ کر رہا تھا۔ اُسکے جوتون کی ساخت، شانون کی بناوٹ، بالون کے پٹھے، خوفناک تبسم خوش رنگ رومال غرض ہر چیز میری نگاہون مین کھٹک رہی تھی۔ لیکن وہ ایک شانِ استغنا کے ساتھ، لاپرواہی سے ادھر اُدھر نگاہین ڈالکر مجھے پامال کئے جا رہا تھا۔ اُسکی حرکات و سکنات سے ظاہر تھا کہ ارادۃً یا دلچسپی سے اُسنے کسی چیز کو بھی نہین دیکھا

مجھے اُسکی یہ آسودہ نگاہی دیوار مین پیوست کئے دیتی تھی، مین تباہ ہو رہا تھا۔ یہانتک کہ جس دیوار کے سہارے سے میٹھا تھا، رفتہ رفتہ مجھ مین اور اُس مین کوئی فرق نہ رہا

محفل مین روشنیان گُل ہونے لگین، ساز کی آوازین آخری گونج کے بعد خاموشی کے اتھاہ سمندر مین کھو گئین، مین چپکے سے اُٹھکر اُسکے پاس گیا اور آہستہ آہستہ کہنے لگا:۔

"چلو جلسہ ختم ہوگیا، مین تمھین گھر تک پہونچا دون"

مگر اُس نے بالکل معصومانہ انداز مین جواب دیا:۔

"اور میرا چچازاد بھائی کس کے ساتھ جائیگا؟"

یہ کہکر وہ مجھے خالی کمرے مین لیگئی اور مسلسل بوسون سے میرے لب بند کر دیئے۔ جب وہ رخصت ہونے لگی تو مینے چپکے سے کہا:۔

"تم جھوٹی ہو!"

"پھر وہی،" اُسنے مسکرا کر کہا "کل آؤنگی تم وہین ملنا"

یہ کہا اور اجنبی کے ساتھ چل دی

جسوقت مین گھر کی طرف روانہ ہوا، اچھا خاصہ صبح کا وقت ہوگیا تھا۔ بازار بند تھے اور سڑک پر صرف دو آدمیون کے علاوہ کسی کی صورت نظر نہ آتی تھی ——— ایک مین دوسرا میرا کوچبان

سرد ہوا سے بچنے کے لئے کوچبان کسی قدر پیچھے جھک گیا تھا اور اُسکے لمبے برساتی کوٹ کا دامن میری پیشانی پر لٹک رہا تھا۔ وہ علحدہ کچھ

سوچتا جارہا تھا مین علیحدہ اپنے خیال مین منہمک تھا۔ اور بلند دیوارون کے پیچھے تمام شہر سکون واطمینان کی میٹھی نیند لیتے ہوئے علیحدہ اپنے خواب وخیال مین مدہوش تھا۔ اسوقت میری آنکھون مین اُسکی بھولی بھولی صورت تھی اور خیال مین اُسکا ——— جھوٹ، حیات وممات کا فلسفہ بھی بعض اوقات اس خیال مین جگہ نکال لیتا اور نگاہون مین پھر اسقدر غلبہ پالیتا کہ مکانون کی بلند اور کشیدہ قامت دیوارین جو صبح کی دہندلی روشنی مین بتدریج نمایان ہورہی تھین۔ موت کی مختلف ڈراونی صورتین معلوم ہونے لگتین جس طرح لاش ٹھنڈی ہوکر اینٹھ جاتی ہے اسی طرح وہ بھی صرف ایک حالت مین ساکت وصامت ہوکر رہ گئین تھین

مجھکو چہان کے خیالات کا اندازہ نہین ہوسکا اور نہ یہ معلوم ہوسکا کہ بھاری دیوارون کے پیچھے سونے والے کیا خواب دیکھ رہے تھے مگر پھر انھین کو میرے خواب وخیالات کا کیا اندازہ تھا

اس حالت مین میری گاڑی خالی سڑک پر برابر راستہ طے کرتی جارہی تھی۔ سورج کی ابتدائی شفقی شعاعین، مکانون کی چھتون اور دور ختون کی بلند چوٹیون کو رفتہ رفتہ نمایان کررہی تھین۔ اور ماحول کی ہر شے مین ایک ایسی زندگی پیدا ہورہی تھی جو احساس وحرکات سے مطلقاً بے نیاز ہو کوئی معطر سفید چیز سایہ کی طرح میرے برابر سے گذر گئی جسوقت وہ میرے برابر سے گذری، کسی کے بے محابہ مردانہ قہقہہ کی آواز میرے کانون مین آئی: ——— ہا-ہا-ہا-ہاہا-ہا

(۲)

اُسنے مجھسے جھوٹا وعدہ کیا تھا، مینے صبح سے شام تک انتظار کیا مگر اُسے نہ آنا تھا نہ آئی

ایک دھندلی، گہری تاریکی۔ رفتہ رفتہ فضا پر غالب آگئی۔ مین نہین بتا سکتا کہ دن کی روشنی شام کی سنہری شفق مین اور شفق رات کے تاریک دھندلکے مین کب اور کس طرح تبدیل ہوگئی۔ میرے لئے تو انتظار کی تمام گھڑیان ایک طویل رات سے مشابہ تھین ایسی طویل رات جسمین تارے کی روشنی کا بھی نشان نہو

مین نے تمام دن متاہلانہ چہل قدمی مین گذار دیا، مین نہ اُس مکان کے قریب گیا جہان وہ رہا کرتی تھی۔ نہ اُس خوشنما دروازے سے گذرا جو زردہ بارجے کے سایہ مین میری نگاہون کو خوش آمدید کہا کرتا تھا۔ دن بھر اپنے گھر کے سامنے والی سڑک پر جہان سے اُسکا دروازہ اور بارجہ دونون نظر آتے تھے ایک معینہ رفتار اور یکسان قدمون سے ٹہلتا رہا۔ اس طرح کہ جب آگے بڑھتا دروازہ پر بلا کسی خاص ارادے کے نگاہین جمی رہتین اور جب واپس ہوتا تو اکثر راستہ مین ٹھہر کر مُڑ مُڑ کر دروازے کو دیکھ لیتا ——— یہانتک کہ برف گرنے لگی، اور اُسکی تیز خنکی جابجا نشترون کی طرح میرے چہرے پر چُبھنے لگی

نشتر! ——— ہان ایسے خطرناک، ایسے تیز، ایسے سرد ایسے جان خراش نشتر جو رفتہ رفتہ میرے دل مین پیوست ہوگئے۔ اور اُسے چھید چھید کر اتنا مجروح کردیا کہ سوائے افسردگی، انتقام اور غم وغصہ کے اُسمین کچھ نہ رہا

انتظار کی گھڑیان قیامت بنکر گذر رہی تھین، مگر اُسکا کہین پتہ نہ تھا۔ مین برابر سرکاری لالٹین کی روشنی مین کچھ ڈھونڈھ رہا تھا کچھ عرصہ کے بعد ایسا محسوس ہونے لگا گویا میرے جسم مین بھی کوئی شے چراغ کی لو کی طرح جل رہی ہے ———!

جس راستہ پر مین ٹہل رہا تھا اُسپر آمد رفت بہت کم تھی بعض اوقات میرے سامنے دور سڑک پر کوئی انسانی صورت نظر آتی اور جون جون قریب ہوتی جاتی اسکا قد بڑھتا ہوا معلوم ہوتا۔ یہانتک کہ وہ خاموشی سے ایک تاریک سایہ کی طرح میرے برابر سے گزر کر بتدریج گھٹنا شروع ہوتی اور سفید عمارت کی دیوارون کے نیچے پہونچ کر رفتہ رفتہ نگاہون سے غائب ہو جاتی

پھر جب مین واپس ہوتا، تو انھیں دیوارون کے پاس سے کوئی شخص برآمد ہوتا، میرے قریب سے گذرتا اور اُسی طرح گھٹتے گھٹتے کہرآلود فضا مین نگاہون سے غائب ہو جاتا

لمبے لمبے لبادون مین لپٹے ہوئے یہ غیر متشکل مجسمے ایک دوسرے سے اسقدر مشابہ تھے اور سڑک پر جابجا ٹہلتے ہوئے اس طرح نظر آتے تھے گویا کسی مخصوص گروہ کے صدہا آدمیون نے راستہ پر پہرہ لگا لیا ہے

مین اب بھی اُسکا انتظار کر رہا تھا مگر بے سود۔ انتہائے غم و افسوس سے میری آنکھون مین آنسو ڈبڈبانے لگے اور بے تحاشہ رونے کو جی چاہنے لگا۔ اُنگلیان از خود کسی درندے کے پنجون کی طرح اینٹھنے لگین اور یہ محسوس ہونے لگا گویا وہ کسی زہریلے سانپ کو جسکی پھنکار سے جھوٹ کے شعلے نکل رہے ہون اپنی گرفت سے کچل دینا چاہتی ہین

اُدھر یہ خیالی سانپ میرے ہاتھون پر لپٹ رہا تھا اور رسّے کی طرح انھین جکڑ کر بار بار دل پر ڈنک مار رہا تھا۔ تا آنکہ اُسکے زہریلے اثر سے میرا سر ڈھلکنے لگا ——— دُنیا کی ہر چیز جھوٹ تھی

میرے عدم و وجود کی حد فاصل جوش خیال مین ناپید ہو گئی، بعض اوقات یہ محسوس ہونے لگتا گویا مجھے کبھی زندگی سے کوئی واسطہ ہی نہین رہا، اور بعض مرتبہ یہ خیال ہوتا کہ زندگی دراصل نام ہی اُس کیفیت کا ہے جو مجھے حاصل ہے

اُسوقت یہ معلوم کرنا کہ درحقیقت مین معدوم تھا یا موجود میری قوت فیصلہ کے لئے ناممکن تھا ——— البتہ یہ یقین کے ساتھ کہہ سکتا تھا کہ "وہ" میرے عدم و وجود کی دونون حالتون مین ہمیشہ اور ہمہ وقت شریک رہی ہے۔ اُسے مجھپر حکومت کرنے کے لئے اور مجھے اُس کا محکوم بننے کے لئے من و تو کی بحث چھیڑی گئی ہے

اکثر مجھے اس خیال پر تعجب ہونے لگتا کہ اُسکا بھی مجھسے علیحدہ کوئی نام مجھ سے جُدا کوئی جسم ہے۔ اُسکی ہستی بھی کسی مخصوص ابتدا یا انتہا کی رہین منت ہے - - - - - - - - - ۔ اُسکا کوئی نام نہ تھا، وہ ہرگز مجھسے علیحدہ کوئی خاص شخصیت نہ تھی میرے خیال مین تو وہ میری ہی شخصیت کا ایک ایسا فریب تھی جسے صرف جھوٹ بولنے تڑپانے اور کشمکش انتظار مین ڈالکر کبھی نہ آنے کے لئے قدرت نے تخلیق کیا تھا

مجھے معلوم نہین کیون اور کس بنا پر مجھے ہنسی آئی ——— مینے ایک طویل قہقہہ لگایا، کھٹکنے والے نشتر دل مین اور پیوست ہو گئے۔ کچھ دیر بعد کانون مین یا تو میرے ہی قہقہہ کی بازگشت، یا کسی دوسرے کے خیالی قہقہہ کی آواز آئی ——— ہا۔ ہا۔ ہا۔ ہاہا!

مینے آنکھ اُٹھا کر سفید عمارت کی اُن کھڑکیون کو بغور دیکھا جنکے رنگین شیشون سے روشنی چھن چھن کر باہر آرہی تھی۔ - - - -

وہ بھی اپنی سرخ سبز زبان مین مجھ ہی سے مخاطب تھین۔ اور صاف کہہ رہی تھین: ——— "بیوقوف! وہ تجھے دھوکا دے رہی ہے"

جھلی کی طرح کھلا رہی ہے، تو گھنٹوں سے اُسکے انتظار مین ٹہل رہا ہے، برف اور طوفانی ہوا کی مصیبتین جھیل رہا ہے مگر وہ، خوبصورت حسین جفا جو بدہ جو، سفید ناگن اپنے عاشق کے ساتھ مصروف عیش و نشاط ہے۔ ایسے مین اگر تو بہادرانہ جذبۂ انتقام کے ساتھ یکایک اندر داخل ہو جائے اور اُس بے مروت ہستی کو جسے غلطی سے تو نے راحتِ روح سمجھ لیا ہے، قتل کردے تو دُنیا جھوٹ سے پاک ہو جائے۔

مینے سختی سے اُس مُٹھی کو بند کر لیا جس مین چاقو تھا اور قہقہہ لگا کر زیر لب کہا۔

"ہان، ٹھیک ہے، مین اُسے ضرور مارونگا، جھوٹ کا دُنیا سے خاتمہ کر دینا ہی بہتر ہے"

لیکن کھڑکیون نے مجھے غمگین نگاہون سے دیکھتے ہوئے کہا:-

"تو اُسے کیا مار سکتا ہے! تیرے ہاتھ مین جو چاقو ہے وہ خود ایک فریب ہے اُسکے بوسون سے زیادہ بے معنی فریب"

سڑک پر آمدرفت بند ہو چکی تھی اور برف کے طوفان مین صرف ایک مین ہی ایسا شخص تھا جسے خانہ بدوش کہا جا سکتا تھا ورنہ ہر جاندار کو کہین نہ کہین پناہ مل گئی تھی

مین اور شاہراہ کی لالٹین کا بیکس شعلہ ــــــــ بظاہر کائنات مین یہ دو چیزین سردی کھانے اور غم و آلام اُٹھانے کیلئے بنائی گئی تھین

قریب کے گرجا مین گھنٹہ بجا۔ اور اُسکی تیز، سماعت شکن آواز، ماحول کے اثر سے مضمحل ہو کر کانپتی ہوئی برف کی طوفانی فضا مین کھو گئی ــــــــ ٹھیک اس طرح جس طرح کوئی بیمار آخری ہچکیان لیکر دم توڑ دیتا ہے

مینے گھنٹے گننا شروع کئے، اور گن کر ایک قہقہہ لگایا ــــــــ پندرہ بجے تھے ـ!

گرجا اور اُسکا گھنٹہ دونون پُرانے تھے، ہر چند کہ گھڑی ٹھیک وقت دیتی تھی لیکن گھنٹہ ہمیشہ بے تکا بجتا تھا، بعض اوقات واتنا بے تکا کہ پادری صاحب کو مینار پر چڑھ کر اپنے ہاتھ سے اُسے روکنا پڑتا تھا۔

مگر اسوقت گرجا کے گھنٹہ کی آواز کسی کے لئے جھوٹ بول رہی تھی ــــــــ یقیناً میرا مذاق اُڑا رہی تھی۔

گھنٹہ کی آخری آواز کے ساتھ سامنے والے سفید مکان کا دروازہ کھلا اور ایک کشیدہ قامت آدمی زینہ سے اُترتا معلوم ہوا۔ مین صرف پُشت دیکھ سکا مگر فوراً پہچان گیا، اس لئے کہ مینے یہی مغرور، سراپا لعنت صورت گذشتہ شام کو دیکھی تھی۔ اُسکی مطمئن چال سے قلبی مسرت جھلک رہی تھی، وہ کل شام کی بہ نسبت یقیناً اسوقت زیادہ مسرور تھا ــــــــ مین بھی اسی دروازہ سے اکثر اسی قسم کی مستانہ روی کے ساتھ نکلا کرتا تھا ــــــــ اُسکے ایک ایک قدم سے اس بات کی تصدیق ہوتی تھی کہ کسی نوجوان عورت کے جھوٹے بوسون کے نشہ آور خیال مین مدہوش ہے

(۳)

مینے اُسے دھمکایا، ڈرایا، پھر خوشامد کی ہاتھ جوڑے اور کہا: ــــــــ "خدا کیلئے مجھسے دورنگی نہ برتو! مجھے فریب نہ دو، جتنی بات ہو سچ سچ بتا دو!"

مگر وہ ایک بے لوث اور معصومانہ انداز سے اپنی بھوین چڑھاتے ہوئے مسکرائی اور حسین پتلیوں کی اتھاہ گہرائی سے وفا و محبت کا یقین دلاتے ہوئے مجھسے کہنے لگی:۔

"بھلا تمسے اور جھوٹ!"

وہ جانتی تھی کہ میرے پاس اُسکے جھوٹ کا کوئی باقاعدہ ثبوت نہین ہے اور میرے تمام شبہات ساری روح فرسا بدگمانیون کیلئے اسکا صرف ایک لفظ، ایک جھوٹا فقرہ کافی ہے

مین اُسی فقرہ کا منتظر تھا۔ وہ اُسکی زبان سے بظاہر وفا و محبت کے رنگ مین رنگا ہوا لیکن درحقیقت اپنے مفہوم مین جھوٹ ادا ہوا:۔

"آہ! مجھے تمسے کتنی محبت ہے؟ ! کیا مین تمھاری۔ ۔ ۔ ۔ نہین ہون۔ مگر تمھین یقین ہی نہین آتا۔ خدا جانے کیا ہو گیا؟"

ہم قصبہ کی آبادی کے آخری کنارے پر رہتے تھے، اور برف سے ڈھکی ہوئی سفید سفید چوٹیاں کھڑکیون سے دکھائی دیا کرتی تھین، مگر اسوقت اندھیرے مین چھپی ہوئی تھین، ماحول کی ہر چیز پر رات نے ایک سیاہ غلاف ڈال دیا تھا۔ مگر جھیل چمک رہی تھی ——— بالکل اس طرح جس طرح گہری تاریکی مین کسی مردے کی کفنائی لاش

کمرے مین صرف ایک دھیمی لیمپ کی روشنی پڑ رہی تھی، مگر اُسمین بھی مردہ جھیل کا عکس نمایان تھا

"بتا دو، خدا کیلئے مجھے سچ سچ بتا دو، اسکی پرواہ مت کرو کہ مجھے صدمہ ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ مین اُسے سنکر مر ہی جاؤنگا۔ کوئی ہرج نہین جھوٹ اور فریب کی زندگی سے سچی موت بہتر! مجھے صرف ایک مرتبہ تم اپنے دل کی بات بتا دو، پھر مین ہمیشہ کیلئے تمھارا چھوڑ دونگا"

مین جذبات کے طوفان مین اُس سے مخاطب تھا، لیکن وہ خاموش تھی، اور اُسکی بھولی بھالی مغموم نگاہین نشتر کی طرح میرے دلمین اُتری جا رہی تھین، میری روح تڑپ رہی تھی اور مین درد و کرب کی مجسم تصویر بنا ہوا اُسکے سامنے کھڑا تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بالآخر مینے پھر کہا:۔

"بتا دو! ——— دیکھو خدا کا واسطہ! ورنہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مین ۔ ۔ ۔ تمھین قتل کر دو ۔ ۔ ۔ ۔ گا"

"کر دو" اُسنے اطمینان سے جواب دیا "بعض اوقات زندگی واقعی بار ہو جاتی ہے، اور آدمی عاجز آکر موت کے بہانے ہی ڈھونڈا کرتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تمھارے ہاتھ سے، زہے نصیب! ——— مگر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اُس نے ذرا رُک کر کہا

"جس خیالی حقیقت کی تمھین تلاش ہے، جو سچ تم معلوم کرنا چاہتے ہو وہ بھی تمھین معلوم ہو جائیگا، یا میری موت بھی تمھین مطمئن نہ کر سکے گی؟" ——— مین بلا ارادہ اُسکے قدمون مین گر پڑا، اور انتہائے عاجزی سے گڑگڑا کر کہنے لگا:۔

"خدا کیلئے! " ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !" اپنی جوانی کا صدقہ، مجھپر رحم کرو اور اپنے دلکی بات بتا دو، صاف صاف کہدو کہ مجھے تمسے محبت نہین ہے"

اُس نے از راہ محبت میرے سر پہ ہاتھ رکھ دیا اور کہنے لگی

" اللہ رحم کرے! آج تمھین ہو کیا رہا ہے؟ "

" رحم! " مینے ہاتھ جوڑ کر کہا " ابتو بتا دو! "

میری نگاہین اُسکی شفاف پیشانی پر پڑین اور معاً خیال آیا کہ صرف اس نازک سے پردے مین اصل حقیقت چھپی ہوئی ہے، کسی دیوانہ خواہش کے ماتحت دل نے کہا ——— " اسے توڑ کر حقیقت معلوم کر لینا کتنا آسان ہے؟ "

پھر خیال سینہ کی طرف منتقل ہو گیا، اُسکے نظر فریب اُبھار کے پیچھے، صاف دل دھڑکتا ہوا معلوم ہو رہا تھا، وہی جھوٹا، فریبی مکار اور دغاباز دل جسنے مجھے دیوانہ بنا دیا تھا۔ مینے چاہا کہ اپنے تیز ناخنون سے اُسکے ٹکڑے ٹکڑے کر دون تاکہ اُس مین چھپی ہوئی حقیقت، وہ چیز جسے مین دل کی بات سمجھتا تھا جون کی تون معلوم ہو جائے ——— مگر نہین "

لیمپ کا ہلالی شعلہ رفتہ رفتہ بے نور ہو رہا تھا، اُسمین بھی کوئی حرکت نہ تھی، حقیقت کو وہ بھی چھپا رہا تھا۔

دیوارین بتدریج بڑھنے والی دھندلی دھندلی تاریکی مین مٹی جا رہی تھین مگر مجھ سے اُنھین بھی کوئی ہمدردی نہ تھی،

ہر چیز پر ایک قسم کی ویرانی، خوف، دہشت اور سوگ برس رہا تھا۔

" اللہ رحم کر! میرے اچھے "........" کی حالت پر رحم کر " اُسنے زیر لب کہا۔ لیمپ کے زرد شعلہ مین ایک قسم کی تھرتھری پیدا ہوئی، لمحہ بھر کیلئے نیلی سی چمک نمودار ہوئی ——— اور گل ہو گیا۔

گہری تاریکی نے ہمین چھپا لیا

اب مجھے نہ اُسکا چہرہ نظر آ رہا تھا، نہ آنکھین، صرف ایک ہاتھ میرے سر پر رکھا ہوا تھا اور اُس سے محبت کی ایسی قوی لہر جسم مین سرایت کر رہی تھی کہ مین مدہوش تھا اور جھوٹ کا خیال خواب کی طرح دماغ سے محو ہو رہا تھا۔ مینے آنکھین بند کر لین اور اور خیال کو غور و فکر، احساس و عمل سے آزاد کر کے صرف اُس روح افزا لمس کی طرف منتقل کر دیا

وہ سچی تھی! ...... مین دیکھ رہا تھا کہ اسکی محبت حقیقی اور بے داغ ہے ——— !!

اند[illegible]ے مین ہلکی ہوئی سی آواز مین کسی نے آہستہ آہستہ کہا:۔

" ذرا اور پاس آجاؤ .... مجھے ڈر لگ رہا ہے! "

پھر خاموشی .... وہی بے معنی خاموشی، اور پھر ...... وہی ہلکی ہلکی زیر لب گفتگو!

" تم کونسی سچی بات پوچھتے ہو؟ .... مجھے خود معلوم نہین میرے دلمین سوائے تمھارے خیال کے اور کونسی سچی بات ہے؟ ——— آہ! خدا کرے مین پہلے سے جانتی کہ تم اتنے سخت دل نکلو گے .... بس ہمین رہو ——— دیکھو تو کتنی ڈراونی رات ہے؟! "

یہ کہکر اُسنے میرے سینہ پہ اپنی آنکھین چھپا لین۔

مینے نگاہ اُٹھائی تو تاریکی کھڑکیون سے دور ہوکر آہستہ آہستہ دیوار کے گوشون مین مجتمع ہو رہی تھی۔ اور رنگین شیشون کے پیچھے کوئی نہایت ہی طویل خوفناک سفید سفید جیز کفنائے ہوئے مُردے کا سا جسم اختیار کر رہی تھی ——!

یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی کی بے نور، پتلیان ہین تک رہی ہین

خوف کیوجہ سے بیساختہ ہمارے جسم مین تھرتھری دوڑ گئی ہم اور زیادہ ایک دوسرے سے چمٹ گئے۔ اُسکے ہلکے ہلکے الفاظ نغمہ کی طرح میرے دل و دماغ مین گونج رہے تھے:۔

"دیکھو تو، کتنی ڈروانی رات ہے؟!"

(۴)

مینے اُسے قتل کر دیا!

جب وہ کھڑکی کے قریب، ایک بے حس اور بے جان مجسمہ کی صورت مین پڑی تھی مینے اُسکی لاش پر اپنا پاؤن رکھ دیا اور خوب ہنسا ——— یہ دیوانگی کی ہنسی نہ تھی ——— جی نہین! مین صرف اسلئے ہنس رہا تھا کہ اب میرا دل قرار پر تھا، اُسے پورا اطمینان وسکون حاصل ہو چکا تھا اور سینہ کی وہ مستقل خلش جسنے مجھے کرب مجسم بنا دیا تھا، اب کافور تھی۔

مینے ذرا جھک کر اُسکی بے نور آنکھون کو دیکھا:۔

اُف وہ دلکش، روشنی کی تشنی، نیم وا آنکھین — ! وہ نرگسی سرشار پُر اسرار آنکھین ——!

یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی ہرن کی گڑیا سے مستعار لیلی گئین ہین

مین اُنھین اُنگلیون سے چھو سکتا تھا، حسب مرضی کھول سکتا تھا، بند کرسکتا تھا، مطلق خوف محسوس نہ ہوتا تھا اسلئے کہ اُنکی اتھاہ گہرائیون مین اب مکر و فریب، اشتباہ و بدگمانی کا وہ جن موجود نہ تھا جو ایک زمانہ سے میرے سر پر سوار تھا اور جو مدتون سے میرا خون چوس کر پرورش پا رہا تھا

مین جسوقت گرفتار ہوا اُسوقت بھی ہنسا اور یہ بات اُن لوگون کیلئے جنھون نے مجھے گرفتار کرایا تھا قطعًا ناقابل برداشت ثابت ہوئی۔ وہ مجھے درندہ کہہ رہے تھے اور نفرت وحقارت کے ساتھ میری طرف سے منہ پھیر پھیر کر گالیان دے رہے تھے، شاید [illegible]وس بھی ہو رہے ہون۔

دوسرے لوگ جو ذرا اجنبی تھے میری بد قسمتی سے متاثر ہوکر از راہ ہمدردی میری طرف بڑھ رہے تھے اور میرے استقلال و اطمینان پر حیرت سے انگشت بدندان تھے

"کوئی دیوانہ ہے" ان الفاظ مین وہ اپنے دلکو تسلی دے رہے تھے۔ اور فی الواقع صرف یہی الفاظ اس بے معنی صورت حال کی تشریح ہو بھی سکتے تھے۔ سب متحیر تھے کہ اسقدر وفا کیش عاشق ہوکر مینے کیون اپنے معصوم و بیگناہ معشوق کو قتل کر دیا، پھر یہی نہین اُسے قتل کرنیکے بعد تعجب ایسی کونسی مسرت ہے کہ کسی طرح ہنسی نہین رُکتی۔ صرف ایک خوش مزاج، آزاد منش شخص نے مجھے دوسرے الفاظ مین مخاطب کیا اور وہی الفاظ میری مسرت کو پامال کر گئے، مین مبہوت ہوکر رہ گیا

وہ آہستہ آہستہ ہمدردانہ لہجہ مین کہہ رہا تھا:-

"آہ! اس غریب کی حالت کسقدر قابلِ رحم ہے!"

"بس خبردار! ایسی الفاظ زبان سے نہ نکالنا" مینے اُسے ڈانٹ کر کہا نہین کہہ سکتا کہ کن جذبات سے متاثر ہوکر مینے ایک جست کی اور اُس شخص کے سامنے جا کھڑا ہوا

مین یقیناً نہ اُسے مارنا چاہتا تھا، نہ سزا دینا چاہتا تھا مگر پھر بھی تمام مجمع جو مجھے دیوانہ اور مجرم سمجھ رہا تھا خوف و دہشت سے کانپ اُٹھا اور چیخین مار کر اس طرح پیچھے ہٹنے لگا کہ مجھے پھر ہنسی آ گئی اور مین نے خوب قہقہے لگائے

اسکے بعد جب لوگ مجھے اُس کمرے سے باہر لے گئے جس مین لاش پڑی تھی مینے بآواز بلند سب سے مخاطب ہوکر کہا:-

"دنیا میں مجھ سے زیادہ کوئی مسرور نہین ہو سکتا، میں بیحد مطمئن ہون" اور یہ واقعہ تھا

(۵)

بچپن مین مینے عجائب گھر مین ایک چیتا دیکھا تھا - اُسے دیکھکر مین اتنا متاثر ہوا تھا کہ مدتون خیال مین اسکی صورت قائم رہی وہ اُن درندون کے مانند نہین تھا جو تماشائیون کو بے معنی اور مبہم نگاہون سے تکا کرتے ہین - وہ ہمیشہ اُقلیدس کے اصولون کے ماتحت ایک کونے سے دوسرے کونے تک خط مستقیم بناتا ہوا ٹہلا کرتا اور ہر مرتبہ ٹھیک اُسی نقطہ پر مڑا کرتا جہان سے چلتا تھا - صرف اُسی آہنی سلاخ سے جسم رگڑتا جو پانچوان قدم اُٹھانے کے بعد اُسکے شانے کے پاس ہوتی سر ایک فلسفیانہ انداز سے جھکا ہوتا اور آنکھین ٹھیک خطِ مستقیم پر سامنے دیکھا کرتین - ایک مرتبہ بھی ایسا اتفاق نہین ہوا کہ اُسنے کسی برابر کی چیز کو دیکھا ہو

دن بھر تماشائیون کا ہجوم اُسکے پنجرے کے سامنے لگا رہتا مگر اُسے اسکی پرواہ بھی نہ ہوتی تھی، وہ بدستور اپنی مقررہ رفتار سے پنجرے مین چہل قدمی کرتا رہتا اور تماشائیون کی طرف نگاہ اُٹھا کر بھی نہ دیکھتا

آنے جانے والون مین سے اکثر اسکی حالت پر اظہار افسوس کرتے اور اکثر مسکرا کر چلے جاتے - لیکن جسوقت وہ تمام جانورون کو دیکھکر عجائب گھر سے نکلتے تو بالعموم مڑ کر چیتے کے پنجرے کو ایک دو مرتبہ ضرور دیکھ لیتے - خدا معلوم یہ کونسی کشش تھی، بہت ممکن ہے اُنین اور اس مقید درندے مین کوئی جنسی مناسبت یا صفت مشترک موجود ہو

اسکے بعد جب مین بڑا ہوا تو کتابون مین انسان کو "حیوانِ ناطق" لکھا دیکھا مینے جسقدر اس بین تحقیق کی چیتے کی مثال میرے سامنے آتی رہی - انسان واقعی حیوان ہے جسے حیوانیت کا جزُ چیتے کے ساتھ تقسیم کیا گیا ہے - مگر جنگلی چیتون کے ساتھ نہین بلکہ اُن چیتون کے ساتھ جنھین "مقید رہنے اور کڑھنے" کیلئے تخلیق کیا گیا ہے

مین بھی اسوقت جیل کی تنگ و تاریک کوٹھری مین بالکل اُسی چیتے کی طرح مقید تھا، مین بھی اُسی طرح کوٹھری کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک ایک خط مستقیم پر ٹہلا کرتا اس دوران مین خیالات کے ہجوم سے دماغ اتنا بھاری ہو جاتا کہ

م دنیا کے مصائب کا بار مجھے اپنے سر پر معلوم ہونے لگتا

یہ تمام خیالات، ایک نقطہ، صرف ایک خوفناک نقطہ پر قائم تھے اور وہ لفظ "جھوٹ" تھا۔

جیل کی ہر کوٹھری سے، کوٹھری کی ہر دیوار سے، دیوار کی ہر اینٹ سے "جھوٹ" کی آواز میرے کانون مین سانپ کی پھنکار کی طرح آرہی تھی اور میری روح پر ایک تاریک بادل کی طرح چھائی جارہی تھی اب وہ معمولی سانپ کی پھنکار نہین معلوم ہوتی تھی، بلکہ کسی بڑے بھاری خونخوار اژدہے کی پھنکار تھی جو ہر طرف سے میری روح کو اپنی آہنی گرفت مین کس رہا تھا۔ اور جب مین درد کی شدت سے، ایک ایسا احساس لئے ہوئے گویا میرے تمام جسم پر سانپ رینگ رہے ہین، چیخ اُٹھتا، زبان سے صرف "جھوٹ" پھنکار بنکر نکلتا، جس سے مجھے خود پر بھی یہ شبہ ہونے لگتا کہ کہین مین سانپ تو نہین ہوگیا ہون

مین ان ہی خیالات مین منہمک صبح سے شام تک ٹہلا کرتا، یہانتک کہ سُرخ پتھرون کا فرش میری نگاہ مین ایک دھندلی ویرے رنگ سی تاریک خندق معلوم ہونے لگتا، پیرون سے فرش کے لمس کا احساس جاتا رہتا اور اکثر یہ محسوس ہونے لگتا گویا مین کسی کہر آلود فضا مین نہایت بلندی سے گرایا جارہا ہون۔

پھر میرا دل خوف سے اُچھلنے لگتا، اور اُس سے کراہنے کے لہجہ مین وہی پھنکار نکلتی جو اوپر سے، نیچے سے، آسمان سے، زمین سے، درختون سے، اینٹوں سے، غرض کائنات کی ہر چیز سے بازگشت ہوتی ـــــــــــ اس طرح گویا وہ کسی دوسری دُنیا سے ہزارہا منزلیں طے کرکے کہر اور برف مین لڑکھڑاتی ہوئی مجھ تک پہونچ رہی ہے۔

مجھے یقین تھا کہ اسی مدہم پھنکار کے پردے مین ایک ایسا تیز طوفانی جھونکا ہے جو درختون کو جڑ سے اُکھاڑ کر پھینک سکتا ہے لیکن مجھ تک پہونچنے مین وہ صرف اس زیرلب کہے ہوئے آہستہ لفظ کی صورت اختیار کر لیتا ہے "جھوٹ"

اس ذلیل لفظ نے مجھے برافروختہ کردیا، اور مین نے زور سے فرش پر اپنا پاؤن مارتے ہوئے کہا ـــــــــــ

"کوئی جھوٹ نہین ہے! .... مینے جھوٹ کا خاتمہ کردیا ہے!"

یہ کہکر مین قصداً دوسری طرف مخاطب ہوگیا مگر بیکار، جس جواب سے ڈرتا تھا وہی جواب خاموشی کے ساتھ فرش کی خوفناک خندق سے برآمد ہوا:-

"جھوٹ!"

آہ! ...... اب مجھے احساس ہوتا ہے مینے بڑی سخت غلطی کی کہ جھوٹی عورت کو قتل کردیا لیکن اُسکے جھوٹ کو بنا دیا۔!

پس عوام کو میری یہ نصیحت ہے کہ ہرگز کسی جھوٹ یا فریب کار عورت کو قتل نہ کیا جائے تاوقتیکہ استدعا و التجا سے جبر و تشدد سے جس طرح بن پڑے اُسکی دلی کیفیت نہ معلوم کرلیجائے۔

کوٹھری مین مسلسل ۲۷ گھنٹہ چہل قدمی کرنے کے بعد مین اس نتیجہ پر پہونچا ہون

(۶)

وہ جگہ جہان اُسنے سچی بات کے ساتھ اپنا جھوٹ بھی چھپالیا ہے نہایت اندھیری، اور خوفناک ہے ——— مگر مینے ارادہ کرلیا ہے کہ وہان بھی اُسکا پیچھا نہ چھوڑون، خدا کے سامنے اُسے پیش کرونگا اور اُسکے قدمون پر گر کر روؤنگا، وہان تو کوئی بات نہین چھپ سکتی۔

خدا میرا انصاف کریگا!

لیکن خدا! ؟ اوہو........ خدا —— یہ بھی جھوٹ، محض فریب، وہان بھی صرف یہی بے پایان تاریکی ہے اور صدہا صدیون، ہزارہا قرنون کا ایک لامحدود خدا! لیکن "وہ" وہان بھی نہین ہے ——— کہین بھی نہین ہے!

صرف جھوٹ اُسکی یادگار رہ گیا ہے، بالکل غیر فانی یادگار!!

فضا کے ذرات مین، دُنیا کی گردش مین، عقبیٰ کی تاریکی مین، وقت کی رفتار مین ہر جگہ جھوٹ ہی جھوٹ ہے فریب ہی فریب بھرا ہوا ہے۔ اور جب مین سانس لیتا ہون وہ ہوا کے ساتھ میرے پھیپھڑے مین داخل ہو کر سانپ کی طرح پھنکارتا ہے اور دل کو ڈس کر سارے جسم مین زہر ہی زہر پھیلائے دیتا ہے ——— نہایت ہی قاتل زہر!

آہ! حقیقت کی تلاش بھی انسان کی کتنی زبردست دیوانگی ہے؟ انسان کیون مجبور ہے؟!

کوئی نہین بتاتا ———!!

"سب فریب........ خدا کیلئے —— مین مرا ——— لوگو مجھے بچاؤ!!"

طالب باغپتی

بنگالی ناولون کے ترجمے

تصوف اسلام پر ایک مورخانہ نظر

(سلسلۂ سابق)

حصول علم کے دو طریقے وحی اور الہام کے امتیازی پہلو

امام غزالی فرماتے ہین، حصول علم کے دو طریقے ہین، ایک وہ جو مطالعہ اور غور و فکر سے حاصل ہوتا ہے، اور یہ علما کا طریقہ ہے، دوسرا وہ ہے، جو اچانک قلب مین داخل ہوتا ہے، مخلوق کو خبر بھی نہین ہوتی کہ یہ علم اسے کیونکر حاصل ہوا، کہان سے آیا، اور اسے کیون موقوف ہوا، یہ صرف عالم ملکوت کا تصور ہوتا ہے، جسے وہ اپنے قلب مین پاتا ہے، جب اس قسم کا علم اولیا، اللہ کو عطا کیا جاتا ہے، تو اسے "الہام" کہتے ہین، الہام کے لفظی معنی ہین "جذب کرنا"، میکڈونلڈ کہتا ہے یہ لفظ صرف ایک جگہ قرآن مین، استعمال ہوا ہے، فالھمھا فجورھا وتقوٰیھا ۵ (والشمس) لیکن نہین کہا جا سکتا ہے کہ اسکا استعمال قدیم معنی مین ہوا ہے، یا دینی اصطلاحی معنی مین۔ وحی اس علم اعلی کو کہتے ہین جو انبیا کو عطا ہوتا ہے، وحی کے لفظی معنی "ترسیل" اور "ترقیم پیام" کے ہین الہام اور وحی مین فرق یہ ہے، کہ جو فرشتہ پیام علم لیکر آتا ہے، ملہم کی نظرون کے سامنے ظاہر نہین ہوتا، اسکے برخلاف وحی جب انبیا پر آتی ہے تو وہ فرشتہ کو دیکھتے ہین

قلب و نفس کے اسرار

میکڈونلڈ نے "رہروطریق کی تربیت" کے عنوان سے ایک مفصل باب ہی لکھا ہے، اس مین ایک جگہ لکھتا ہے "اب مین امام غزالی کی تعلیم قلب کو پیش کرنا چاہتا ہون، مینے قلب کا ترجمہ انگریزی مین "دل" (Heart) کیا ہے، حالانکہ قلب و دل کے معانی مین خاص فرق ہے، انگریزی لفظ Heart کہنے سے معاً جذبات، تاثرات، خواہشات اور وجدان کے خیالات سامنے آجاتے ہین، اسمین بنیادی حیثیت سے عموماً جذبی خصوصیت پائی جاتی ہے، ذہنی یا عقلی خصوصیت کا اسمین کم حصہ ہوتا ہے، لیکن عربی لفظ قلب کے یہ معنی نہین، یہ زیادہ تر دماغ کا مستقر ہے، ایک مسلم شارح اسے "لطیفہ ربانیہ" سے نامزد کرتا ہے، - - - - - جو ایک غیر مادی عنصر ہے اور عالم غائب سے متعلق ہے، امام غزالی ماہیت قلب کی بحث کرتے ہوئے لکھتے ہین کہ اب قلب کے متعلق مزید مباحث نہین پیش کئے جا سکتے قلب کے متعلق مزید سوالات عملی سائنس کے بجائے تخیلی سائنس سے علاقہ رکھتے ہین، حیات عملی کا مقصد صفات قلب کا جان لینا ہے، اسکی ذاتی اور طبعی ماہیت کی شرح، غیر متعلق بحث ہے، اسمین بھی روح کا سا سوال پایا جاتا ہے، جس پر آن حضرتؐ نے سکوت کیا ہے، تاہم شارح لکھتا ہے، کہ قلب ایک "روح عقلیہ" ہے روح اسکا داخلی حصہ ہے، اور روح حیوانیہ اسکا مرکب ہے، صرفی حیثیت سے "نفس" کے معنی سانس کے ہین، اور عبرانی مین لفظ "نفش" اسکا مترادف ہے، جسکا ترجمہ بائبل مین روح اور بعض اوقات

سائنس، زندگی اور خواہش (Immortality) کیا گیا ہے، میکڈونلڈ کے نظریہ "نفس" کے متعلق میڈیم بلاوٹسکی کی بھی یہی تحقیق ہے، جو اسکی قابل قدر کتاب (Isis unveiled) "خدائے مکشوف" مین پائی جاتی ہے، اسکے بعد میکڈونلڈ نے امام غزالی کے وہ مباحث پیش کئے ہین، جو انہون نے قرآن کے مختلف مقامات مین لفظ نفس کے مختلف استعمال کے متعلق لکھا ہے قرآن مجید مین اسکے تین خصوصیات بتائے گئے ہین، مطمئنہ، لوامہ اور امارہ (فجر، قیامہ، یوسف)

"صوفی کی وجہ تسمیہ اور تاریخ تصوف پر مشرقی و مغربی علما کے نظریات"

قبل اسکے کہ شریعت اسلامیہ کے صوفیانہ عناصر پر روشنی ڈالی جائے، یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ تصوف کے متعلق اس عالمانہ اور محققانہ بحث کی تلخیص کریجائے جو لفظ "صوفی" کے ماتحت انسائیکلوپیڈیا[۱] آف رلجن اینڈ اتھکس مین پائی جاتی ہے، ہر چند تاریخ تصوف کے متعلق گزشتہ اوراق مین ایک حد تک بحث ہو چکی ہے، لیکن انسائیکلوپیڈیا کے مفصلہ ذیل مقالہ مین بعض اہم معلومات پائے جاتے ہیں

بعضون کا خیال ہے، کہ یہ صف سے مشتق ہے، جسکا مفہوم یہ ہے کہ صوفیہ تعلقات الہیہ مین شریک اول صف ہین، بعضون نے اسے "اہل صفہ[۲]" سے منسوب کیا ہے، القشیری اور دوسرے صوفیہ ان تمام تعبیرات مین کسی کو تسلیم نہین کرتے، ابو نصر السراج نے تسلیم کیا ہے کہ یہ لفظ صوف سے مشتق ہے (بحوالہ کتاب اللمع مرتبہ نکلسن) جاسف وان ہیمر کی تحقیق ہے کہ صوفیہ ہندوستان کے (gymnosophists) سے متعلق ہین اور یہ کہ "صوفی" اور "صفا" دو نو یونانی الفاظ (σοφός اور σοφος) کی طرح ایک ہی مادہ سے ہین تھالک نے اسکی تردید کی ہے لیکن عہد جدید کے ایک عالم اڈلبرٹ مرکس نے وان ہیمر کے نظریہ کی تائید کی ہے، نالڈک نے جو اسٹراسبرگ یونیورسٹی ..... مین عربی کا پروفیسر تھا، ۱۸۹۴ء مین مسئلہ کو حل کر دیا، اسنے دکھایا کہ لفظ σοφός ارمی Aramaic

---

[۱] انسائیکلوپیڈیا مین جو طویل مقالہ ہے، وہ مشرق اور مغرب کے مشاہیر کی علمی تصنیفات سے مستفاد ہے، چنانچہ مقالہ نگار نے ماخذ کا تذکرہ کرتے ہوئے، عبد القادر جیلانی، حلاج، ابن طفیل، رومی، ابن عربی، الشعرانی اور سہروردی کے اسمائے گرامی لکھے ہین، مقالہ نگار نے جرمنی انگلستان، فرانس کے مشہور مستشرقین کی تصنیفات سے بھی استفادہ کیا ہے، اس سلسلہ مین اسنے پروفیسر گولڈزیہر، ڈی ایس مارگولیتھ، ای جی براؤن، نکلسن، آر ہارٹمین وغیرہ کی کتابونکا بھی گہرا مطالعہ کیا،

[۲] اہل صفہ عہد نبوت کی وہ جماعت صحابہ تھی جو غربت اور افلاس کے باعث مسجد نبوی کے نزدیک ایک چبوترہ پر اقامت گزین رہتی، امور دنیوی سے انہین کوئی تعلق نہ تھا وہ ہمیشہ تلاوت قرآن، اور عبادت مین مشغول رہتے

[۳] "انسائیکلوپیڈیا آف رلجن اینڈ اتھکس" مین لفظ تھیاسفی کے ماتحت مقالہ نگار نے عالمانہ اور محققانہ بحث کرتے ہوئے ہندوستانی تصوف کے چار ماخذ قرار دیئے ہین، اپنشید، ویدانت، سانکھیہ (فلسفہ) یوگا، (فلسفہ) اور اسکے بعد جین اور بدھ مذہب کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ کس طرح تھیاسفی (ہندی) مذہب کی شکل مین رونما ہوئی،

مین بھی نہین پایا جاتا، اسلئے عربی زبان مین پایا جانا قرین قیاس نہین، دوسری بات یہ ہے کہ آری اور عربی دونو زبان
مین (σοφιστής اور σοφός، φιλόσοφος) پائے جاتے ہین، عربی مین یونانی حرف "σ" کی جگہ پر حرف سین استعمال ہوتا
اگر وان ہیمر کا نظریہ صحیح ہوتا تو لفظ صوفی مین پہلا حرف "صاد" کی بجائے "سین" ہوتا، نالڈک نے یہ بھی دکھایا کہ لباس الصوف ادب
کی ابتدائی کتابون مین پایا جاتا ہے، جسکے متعلق یہ بھی ہے، کہ اسے وہ شخص پہنتا تھا، جو تارک الدنیا ہوتا، فارسی زبان مین تارک الدنیا
درویشونکے متعلق "پشمینہ پوش" کا لقب پایا جاتا ہے، یہ مسیحی راہبون سے لیا گیا، جب حماد بن سلمی (۱۶۷ء) بصرہ مین آئے تو انھون
نے فرقد السنجی سے جو پشمینہ (صوف) کا لباس پہنے ہوے تھا کہا کہ یہ لباس اتار دو، چونکہ اسے نصاری پہنتے ہین، قشیری کا بیان ہے، کہ
اسکا رواج ۲۰۰ھ (۸۱۵ء) مین ہوا السراج کا خیال ہے، کہ اہل بغداد نے اسے ایجاد کیا، ہر چند "صوفی" کی وجہ تسمیہ کے متعلق
کوئی قطعی فیصلہ موجود نہین، لیکن یہ بھی محض قبول کی گئی ہے، کہ یہ اصطلاح آنحضرت کے زمانہ سے متعلق ہے، یا بعثت اسلام
سے قبل پائی جاتی تھی لیکن اسکا رواج دوسری صدی ہجری کے اخیر مین ہوا، جبکہ زاہدانہ زندگی سے صوفیانہ زندگی کی طرف
رجحان ہو رہا تھا، تیسری اور چوتھی صدی کے صوفیہ خود کو آنحضرت صلعم کے سچے متبعین مین شمار کرتے تھے، سب سے پہلا مصنف
جس نے عربی زبان مین لفظ "صوفی" استعمال کیا جاحظ بصری (۸۶۹ء) ہے

اسلام مین تصوف کی ابتدا، پہلوؤنکے سامنے اس عہد کی یاد تازہ کر دیتی ہے، جبکہ زہد کی تحریک شروع ہوئی، جو عموماً ساتوین
صدی مین مسیحی اثرات کے ماتحت تھی، اس تحریک مین بیشتر زاہدون کا نام پایا جاتا ہے، یہ تحریک مذہبی (اسلامی) پہلو رکھتی تھی
اس مین مذہبی عنصر کا گہرا رنگ غالب ہے، جسکی بنا مفصلہ ذیل افکار و عقاید پر تھی، ضعف انسانی، بے انتہا خوف خدا، اور اسکے ارادہ
کی تسلیم کامل اس زمانہ مین صوفیہ کا کوئی منظم شیرازہ نہ تھا، اہل بصرہ نے تصوف کے تعلیمی عقاید کی بنیاد ڈالی، اہل شام نے اسکے ظاہری
رنگ و روپ مین حصہ لیا حسن بصری فرماتے تھے کہ تصوف عاجزی کا نام ہے، نہ کہ لباس و غذا کا، دوسری صدی کے صوفیہ پر مذہبی رنگ کا غلبہ
تھا، اور وہ مذہبی قانون کے پابند تھے، انہین لوگون نے غربت و افلاس فروتنی و انکساری اور ترک تلذذات کا رواج دیا، اگر وہ
خدا کی محبت رکھتے تھے تو اس سے زیادہ انہین اسکا خوف تھا، وہ زہد یا تھیاسفی کے درمیانی مقام مین تھے، ان پر صحیح معنی مین رہبانیت
(Quietism) کی اصطلاح منطبق ہوتی ہے، اس ضمن مین مفصلہ ذیل اشخاص کا تذکرہ خاص اہمیت رکھتا ہے

"ابراہیم ابن ادہم جو بلخ کے شہزادہ تھے، جنکے واقعات زندگی گوتم بدھ سے ملتے ہوئے ہین شفیق بلخی جنھون نے عقیدہ
توکل کو ترقی دی، رابعہ جو بصرہ مین پیدا ہوئین اور بیت المقدس مین وفات کی، معروف الکرخی بغدادی، وہ
شخص ہین جنکی پہلی تاریخی تعریف تصوف یہ ہے، کہ تغیرات قبول کرنا، اور جو خدا کے مخلوقات کے ہاتھ مین ہے، اسے
ترک کر دینا"

تیسری صدی ہجری مین تصوف قطعی طور پر ایک عہد جدید سے روشناس ہوتا ہے، ہر چند رضا (Quietism) اور زہد
(Asceticism) کے عقاید اب بھی محکم طور سے متداول تھے، لیکن انکے مقابلہ مین تخیل اور وحدت فی الکثرت کا احساس

زیادہ زور یکطرفہ رہی تھی، لیکن موخر الذکر عقاید کو جو تصوف کی روح رواں ہین اس فتح کے باعث زہد و رضا کے ابتدائی صوفیانہ عقاید کو تفوق
بانی دنیا یا انھین کو تصوف کا سبب آفرینش بتانا تاریخی غلطی ہے، لیکن اسکا پتہ لگانے مین کہ صوفیہ نے رضا سے وحدت فی الکثرت کا عقیدہ
کیون اختیار کیا، ہم لوگ نہین کہہ سکتے کہ صوفیہ نے غیر اسلامی عقاید سے جلب منفعت نہین کیا مسیحیت فلاطونیت جدید اور بدھ مذہب
کی اثر آفرینی، ناقابل انکار حقیقت ہے، ہرچند اس مسئلہ پر موضحانہ بحث کرنیکا موقعہ نہین لیکن اس نظریہ کو ثابت کرنے کیلئے کافی مواد
موجود ہے۔ تیسری صدی کا تصوف تاریخ کے تمام صوفیانہ مسالک کی طرح مختلف اثرات کی پیداوار تھا، مثلاً، مسلمانون کے مسئلۂ توحید
کی تخیلی ترقی، مسیحی زہد و تصوف، عارفیہ، یونانی اور ہندی فلسفہ، بعضون نے غلطی کی ہے، کہ انھون نے تصوف کو صرف ایک
مسلک ویدانت یا فلسفہ اشراقی کا نتیجہ تصور کیا، انکا خیال ہے کہ تصوف، ایک سامی مذہب کے مقابلہ مین جو زبردستی منوایا گیا
تھا آریہ قوم کے ذہنی ردعمل کا نتیجہ ہے

موجودہ دور کے علمانے کسی ایک مسلک کو ماخذ تصوف قرار دینے کے بجائے، مختلف اثرات کا مطالعہ کیا اور تشریح کی کہ کس
مسلک نے کونسا عقیدہ تصوف مین داخل کیا: یہ اس ماحول کے اثرات ہین جسمین تصوف نے نشوونما پائی، اور اسمین وہ تمام سیاسی
تمدنی، اور مذہبی حالات شامل ہین جو ارتقائے تصوف کی مدد ہوئین، مثلاً عہد امویہ کی تباہ کن خانہ جنگیان، ابتدائے عہد عباسیہ کی
ملحدانہ اور عقلی امواج، علما کی فرقہ دارانہ، اور فقیہانہ شورش پسندیان، تیسری صدی مین ارتقائے تصوف کے مفصلہ ذیل اسباب تھے۔

قدیم صوفیہ اپنی زندگی کا ہر قول، ہر فعل، اور ہر خیال مرضی الٰہیہ کے مطابق بنانے کی کوشش کرتے تھے اس اصول نے فطرتاً
نیت الٰہی (جو رضا کی سب سے بڑی صورت ہے) اور "حال" (جو بالقصد یا بلا قصد زاہدانہ ریاضت کا نتیجہ ہے) کے عقاید پیدا
کئے، ہرچند قدیم صوفیہ متشرع تھے، اسلام سے انکا تعلق ایسا ہی تھا جس طرح دور وسطیٰ مین ہسپانوی صوفیہ کا تعلق رومن کیتھلک
چرچ سے، جلد یا بدیر عشق و حال کے ایک مذہب کا مذہب اسلام کے مخالف ہونا ناگزیر تھا، حضرت رابعہ بصریہؓ نے ظاہر کیا کہ مجھے
نہ تو جہنم کا خوف باقی ہے نہ بہشت کی طلب و امید میرے دل مین محبت نبویؐ بھی نہین چونکہ مین خدا کی محبت مین اسقدر جذب ہون
کہ کسی دوسری ذات سے محبت یا نفرت کیلئے میرے دل مین جگہ ہی نہین[۵]، بتدریج خالق و مخلوق کے حجابات دور کردئے گئے، توحید کی
تعریف وحدت فی الکثرت قرار پائی، خدا کی ذات یکتا و بے مثل جو انسانی رسائی سے بالاتر تھی، "الحق" کی صورت مین متبدل
ہوگئی جسکی شان تجلی ہر مخلوق مین موجود ہے، یہانتک کہ صوفیہ کی وہ ہستی جو عالم حال مین "خودی" کے فنا اور شعور انفرادی
کے اضمحلال کا نتیجہ ہے، ذات حق کا پرتو قرار پاگئی اس تعلیم کو جسقدر بھی دوسرے معانی اور مجازی رنگ مین کیون نہ پیش کیا جائے

---

[۵] اسی طرح کا ایک واقعہ تاریخ فرشتہ مین حضرت ابوالحسن خرقانیؒ کے متعلق بھی پایا جاتا ہے، محمود غزنوی نے آپ کو لکھ بھیجا تھا (اطیعو اللہ
واطیعو الرسول واولی الامر منکم (قرآن) اور اپنے حضور مین طلب کیا تھا، حضرت ابوالحسن خرقانیؒ نے جواب دیا کہ —
اطیعو اللہ مین ایسا مستغرق ہون، کہ اطیعو الرسول سے شرم آتی ہے، (یعنی حق اطاعت رسول ادا نہ کرسکنے کے باعث شرمندہ
ہون) اولی الامر مین کیون کر مشغول ہوسکتا ہون

لیکن یہ تصوف کی روح رواں ہے، اور خصوصیت کیساتھ غیر اسلامی مبادی سے حاصل کی گئی ہے، مرکس نے یقیناً زیادتی کی کہ اسنے اسے بالکل یونانی کہدیا، اور تخصیص بھی کر دی کہ یہ تعلیم دیا نیسیوس کی تحریرون سے لیگئی ہے، ہرچند ممکن ہے، کہ یہ تعلیم دیانیسیوس کی تحریرون اور ارسطو کی الہیات سے بھی اثر پذیر ہوئی ہو

ذوالنون مصری فرماتے تھے کہ سچا مرید وہ ہے، جو خدا سے بھی بڑھکر اپنے شیخ کی اطاعت کرے، (تذکرۃ الاولیا) امام غزالی وحدت فی الکثرت کا عقیدہ نہین رکھتے تھے، وہ کہتے تھے کہ خدا کی ذات جداگانہ ہے، وہ یکتا ہے بے نظیر ہے، صوفیہ نے قطب، نقبا اوتاد، ابرار، ابدال کا عقیدہ اسمعیلیہ فرقے سے لیا ہے

صوفیانہ شاعری صوفیہ نے مذہبی جذبہ پیدا کرنیکا جو ظاہری عمل وضع کیا، اسمین سب سے زیادہ قوی اور اثر آفرین سماع ہے یعنی موسیقی اور غنا کی سماعت، بہت سی روایتین ایسی پائی جاتی ہین کہ کسی لڑکی نے یا صوفیہ ہی مین سے کسی نے ایک نظم کے چند اشعار پڑھ دئے، اور صوفیہ بیخود ہوگئے، انھین وجد آگیا، ایسے اشعار ظاہری معنی پر مبنی ہوتے تھے، صوفیانہ نشاط کا نتیجہ نہ تھے شاعر خود اشعار کو تاویلات پر مبنی نہین رکھتا تھا بلکہ صوفیہ اپنے ذوق مین اشعار کی صوفیانہ تاویلین کرتے تھے، "صوفیانہ شاعری کا یہ حال نہین یہان شاعر اپنے کلام مین خود صوفیانہ رنگ پیدا کر دیتا ہے، ہرچند ظاہری معنی کے اعتبار سے اشعار سراپا تشبیب ہی کیون نہون؟ اور اکثر ایسا ہوتا ہے، کہ مجاز و حقیقت مین امتیاز کرنا مشکل ہوجاتا ہے، اور جب تک ہملوگ شاعر کے رجحان اور ارادہ سے واقف نہون، یہ بتانا دقت طلب امر ہے کہ عشق و محبت کے جو جذبات اسنے ادا کئے ہین وہ کسی انسانی محبت کا نتیجہ ہین، یا حب الٰہی کا اگر یہ سوال کیا جائے کہ شعرا نے ایسا انداز کلام کیون اختیار کیا تو کہا جا سکتا ہے کہ انھون نے ولولہ اور وجد پیدا کرنیکی اس سے بہتر صورت نہین دیکھی کہ باطنی محبت کے انوار اطراف کو ظاہری محبت کے رنگ مین ادا کیا جائے

اس قسم کی صوفیانہ شاعری فارسی ادب کی شان مخصوص ہے، یہ رنگ سخن ابوسعید بن ابی الخیر کی رباعیات فریدالدین عطار، جلال الدین رومی، جامی کی شاعری اور گلشن راز محمود شبستانی مین پایا جاتا ہے، مغربی علما کیلئے عربی شاعری کا ایسا مذاق دلکش نہین، لیکن ابن الفرید کا کلام بہت عمدہ ہے، اور ابن عربی کے کلام مین ہرچند گہرے معانی پنہان ہوتے ہین لیکن بعض نظمین نفاست ادا کے اعتبار سے بہت اچھی ہین، ترکی شعرا مین صوفیانہ رنگ سخن کے اعتبار سے نسیمی بہت اچھا شاعر ہے، ہرچند صوفیانہ شاعری مین نفاست بیان اور طرز اصلی پایا جاتا ہے لیکن اسے علمی صنعت کی پیداوار نہین کہہ سکتے، جلال الدین رومی، ابن الفرید اور ابن عربی کی بہترین غزلین عالم بیخودی مین کہی ہوئی ہین، جنھین ہملوگ (Automatic writing)[1] "تحریر غیر اختیاری" سے تعبیر کرسکتے ہین، ابن عربی کی شرح ترجمان الاشواق سے پتہ چلتا ہے کہ خود شاعر اپنے بعض کلام کے معنی نہین بتا سکتا،

---

[1] موجودہ علم روحانیات (Spiritualism) کی استقرار و ترقی مین یہ ایک نہایت حیرت انگیز مشاہدہ ہے۔

شریعت اسلامیہ کے صوفیانہ عناصر اور طریقت کی افراط و تفریط

ابھی تک جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ تصوف کے خارجی و داخلی مباحث سے متعلق تھا، اب یہان دو بحثین پیدا ہوتی ہین، ایک یہ کہ آیا قرآن مجید مین مبادی تصوف کے متعلق مواد پائے جاتے ہین یا نہین؟ سرور کائنات اور صحابہ کی زندگی مین صوفیانہ ذوق کا پتہ ملتا ہے یا نہین؟ علمائے مغرب کی تحقیقات سے پتہ چلتا ہے، کہ لفظ صوفی اسلام کی پیداوار نہین، انسائیکلوپیڈیا مین "صوفی" کی وجہ تسمیہ کے متعلق ایک رائے یہ بھی پائی جاتی ہے، کہ یہ "صفہ" سے لیا گیا ہے، یہ ایک قرین قیاس امر تھا کیونکہ ترک دنیا، غربت، رضائے الٰہی، عبادت، تعلقات ازدواجی سے انقطاع، یہ تمام باتین عہد نبوت کے اصحاب صفہ مین پائی جاتی ہین، لیکن ساتھ ہی یہ بات بھی نظرانداز نہین کیجا سکتی، کہ ابتدائے اسلام کی پریشان حالی کے باعث صحابہ کی ایسی جماعت تھی، وہ اسلامی قانون سمجھکر یا باوجود وسعت ایسی زندگی نہین گزارتے تھے علاوہ برین علامہ قشیری وغیرہ صوفی کی نسبت صفہ کو تسلیم نہین کرتے، الغرض صوفیانہ ادبیات کا مطالعہ کرنیکے بعد قول راجح یہی معلوم ہوتا ہے، کہ یہ دوسری صدی کی پیداوار ہے، عہد نبوت و صحابہ مین اسکا وجود نہ تھا، اور پر لطف یہ ہے کہ مسیحی راہبونکی دیکھا دیکھی اسلام مین اس بدعت نے رواج پایا، جیسا کہ میکڈونلڈ، نکلسن اور ابن خلدون وغیرہ نے لکھا ہے، خود قرآن مجید مین نہ کہین صوف کا لفظ آیا ہے، نہ صوفی کا البتہ امام بخاریؒ نے القارعہ کی تفسیر مین حضرت عبد اللہ ابن مسعود کی یہ قرآۃ بھی نقل کی ہے کہ وہ کالعھن المنفوش کو کالصوف المنفوش پڑھا کرتے تھے، مگر صحیفہ مین یہ لفظ نہین، صف اور صفا کا لفظ قرآن مجید مین پایا جاتا ہے، لیکن علما نے انکی طرف صوفی کی نسبت ہی نہین دی، لہذا ایک متشرع لفظ "صوفی" ہی پر اعتراض رکھتا ہے، اور ایک غیر جانبدار محقق کے سامنے تو اسے اسلام کی طرف منسوب کرنا ایک تاویل بیجا سے زیادہ نہین۔

اب مین اپنے عنوان بحث کو دو حیثیت سے واضح کرنا چاہتا ہون، قرآن کی تعلیم، اور آنحضرت و صحابہؓ کے واقعات زندگی، موخرالذکر بحث کیلئے مینے صرف احادیث کو ماخذ قرار دیا ہے، ورنہ تاریخی اور کلامیہ مباحث سے جو اوپر گزر چکے یہ بات ثابت ہو چکی ہے، کہ صوفیانہ تخیلات محض اسلام ہی سے نہین لئے گئے، ہرچند میکڈونلڈ کی کتاب "رلیجس ایٹیچوڈ اینڈ لائف ان اسلام" مین صحابہ کرام کے زاہدانہ رجحان، (Asceticism) اور انسائیکلوپیڈیا آف رلیجن مین قرآن اور ابتدائی مسلمانون کے مسلک رضا (Quietism) کے متعلق فلسفیانہ مباحث پائے جاتے ہین

نکلسن نے تو "صوفیائے اسلام" مین یہ بھی لکھا ہے، کہ اگر پیروان اسلام دنیا کے اور مسالک بدھ، مسیحی اشراقی وغیرہ سے الگ بھی رہتے، تو بھی اسلام کے اندر قرآنی تعلیم کی بنا پر تصوف کی کوئی نہ کوئی صورت ضرور رونما ہوتی، لہذا جب ایک محقق قرآن مجید پر اس نقطہ نظر سے غور کرتا ہے، تو وہ مفصلہ ذیل آیات کی اہمیت نظرانداز نہین کر سکتا

(۱) زندگی کی بے ثباتی، موت کا ناگزیر ہونا، دنیا مین انہماک سے پرہیز،

کل نفس ذائقة الموت وانما توفون اجورکم یوم القیامه فمن زحزح عن النار وادخل الجنته

فقد فاز ط وما الحیوٰۃ الدنیا الا متاع الغرور (آل عمران)

ہر نفس کیلیے موت ناگزیر ہے، اور تمھین قیامت کے دن تمھاری مزدوری ملیگی، اور وہ جو آتش دوزخ سے کنارے رہیگا اور جنت مین داخل ہوگا، خوش ہوگا، اور دنیا کی زندگی ایک دھوکا کی ٹٹی ہے

وانفقوا مما رزقنکم من قبل ان یاتی احدکم الموت فیقول رب لولا اخرتنی الی اجل قریب فاصدق واکن من الصالحین ۵ ولن یؤخر اللہ نفسا اذا جاء اجلها (منافقون)

اور جو کچھ مینے تمھین روزی دی ہے، اس مین سے خرچ کرو، اسکے قبل کہ تم مین سے کسی ایک کو موت آئے اور کہے خدا، اگر مجھے ایک مختصر میعاد (زندگی) عطا کرے تو مین صدقہ دون، اور مین نکوکارون مین سے ہوجاؤن، اور جسوقت جس نفس کی قضا آ گئی اسمین تاخیر نہوگی

ان اجل اللہ اذا جاء لا یؤخر (نوح)

جب خدا کی میعاد مقررہ آتی ہے، تو اسمین فرق نہین ہوتا

وما کان لنفس ان تموت الا باذن اللہ کتابا مؤجلا ومن یرد ثواب الدنیا نؤتہ منها ومن یرد ثواب الآخرۃ نؤتہ منها وسنجزی الشاکرین (آل عمران)

کوئی نفس خدا کی اجازت کے بغیر نہین مرسکتا جسکی تعین ہو چکی ہے اور جو اجر دنیوی کا خواہشمند ہے، اسے وہی ملیگا، اور اور جو اجر آخرت کا طالب ہے، اسے ثواب اخروی نصیب ہوگا اور قریب ہے کہ ہم شکر کرنے والونکو بدلہ دین،

یا ایها الذین آمنوا لا تلهکم اموالکم ولا اولادکم عن ذکر اللہ (منافقون)

اے ایمان والو ایسا ہو کہ تمھاری دولت، اور تمھاری اولاد تمھین ذکر الٰہی سے اپنی طرف پھنسا لیں

یا ایها الذین آمنوا ان من ازواجکم واولادکم عدوا لکم فاحذروهم وان تعفوا وتصفحوا وتغفروا فان اللہ غفور الرحیم ۔ انما اموالکم واولادکم فتنۃ ۵ واللہ عندہ اجر عظیم (تغابن)

اے ایمان والو! تمھاری بیویان اور تمھاری اولاد تمھارے دشمن ہین، ان سے واقف رہو اور اگر تم ان سے درگذر کرو اور انکے قصور معاف کردو، تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے، تمھاری دولت اور تمھاری اولاد فتنہ مین، اور اللہ کے پاس اجر عظیم ہے

زین للذین کفروا الحیوٰۃ الدنیا (بقرہ)

کافرون کو حیات دنیوی کی زینت دی

زین للناس حب الشهوات من النساء والبنین والقناطیر المقنطرۃ من الذهب والفضۃ والخیل المسومۃ والانعام والحرث ذلک متاع الحیوٰۃ الدنیا واللہ عندہ حسن المآب ۵ قل اؤنبئکم

بخیر من ذلکم (آل عمران)

(۲) ذکر و تسبیح کے متعلق قرآن مجید مین کثرت سے آیات پائی جاتی ہین، مثلاً

والذکروا اللہ قیاماً وقعوداً وعلی جنوبھم (آل عمران)

اور کھڑے بیٹھے، اور پہلو پر اللہ کا ذکر کرتے ہین

فاذکرونی اذکرکم (بقرہ)

پس تم میرا ذکر کرو مین تمھین یاد کرونگا

قرآن نے ذکر و تسبیح کی تعلیم دی ہے، لیکن اصطلاحات صوفیہ مین ذکر و تسبیح کے یہ معنی نہین، جو قرآن سے ثابت ہوتا ہے، اور جس پر خود سرور کائنات اور صحابہؓ کا عمل رہا، صوفیانہ "ذکر" کے متعلق خلوت، خاص تعداد وغیرہ ضروری ہین، جس کی ایک مثال اس سے قبل لین کی کتاب سے لکھی جا چکی ہے، ایسی جفاکشی نہ قرآن کی تعلیم تھی، نہ صحابہ کا دستور العمل، غالباً اسی غلو عبادت سے قرآن مین سرور کائنات کو منع کیا گیا ہے،

قم اللیل الا قلیلاً نصفہ او انقص منہ قلیلا - "مراقبہ ذات" ہندوستان کی چیز ہے، جو "دھیانہ" کے نام سے ہندی فلسفہ مین پائی جاتی ہے، دانہ تسبیح کا استعمال بدھ مذہب کے راہبون سے لیا گیا ہے، اسلام کو ان سے تعلق نہین خصوصاً مراقبہ ذات تو ایک قسم کی بت پرستی ہے، اور اگر صوفیائے کرام نے اسے جائز رکھا ہے تو پھر "پرستاران صنم" سے گلہ کیسا؟ اور "رد کفر" کے کیا معنی؟ بدھ مذہب کے بعض صوفیانہ پہلوؤن کے متعلق میڈم بلیوٹسکی نے اپنی کتاب "تعلیم باطنی" (Esoteric Buddhism) مین روشنی ڈالی ہے، وہ لکھتی ہین

> "بودھی" ایک قسم کی وجد انگیزانہ کیفیت کا نام ہے، جس مین صوفی علم روحانیہ کے بلند نشیمن پر پہونچ جاتا ہے (غالباً صوفیانہ "معرفت" کا تخیل بھی ہندی فلسفہ کا منت کش ہے) گوتم بدھ کی تعلیم کے دو پہلو تھے، ظاہری اور باطنی بدھ، باطنی تعلیم اپنے مسترشدین کو ایک غار مین بمقام راجگیر دیا کرتا، جو گلدھ کا قدیم پایہ تخت تھا، اور بعض علمائے آثار کا بیان ہے کہ فاہین (چینی سیاح) اسی کو "چیتا غار" لکھتا ہے بدھ اس خاک اوڑھتا تھا، جو آریہ قوم کا مسکن تھی، وہ وہ ایک ہندو اور قومیت کے اعتبار سے چھتری تھا، اسلئے اسکی باطنی تعلیم یقیناً قدیم برہمنون سے مختلف نہ تھی، اسکا مذہب ایسے ممالک چین، جاپان، سیام برما وغیرہ مین پہونچا جو ہندوستان کی مابعد الطبعی تخیلات قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھے، اسلئے بدھ کی تعلیم کے متعلق ان ممالک مین غلط فہمیان پائی جاتی ہین،

اسی طرح اتحاد، وصل وغیرہ کی جو صوفیانہ تعبیرات ہین وہ بھی بڑی حد تک دنیا کے دوسرے ممالک سے اسلام مین داخل ہوئی ہین، میڈیم بلیوٹسکی جو عہد جدید مین صوفیانہ معلومات، بالخصوص ہندوستانی فلسفہ و تصوف کی ایک مستند محققہ مانی جاتی ہین اپنی دوسری کتاب "خدائے مکشوف" (Isis Unveiled) مین لکھتی ہین

'' مذاہب عالم، مسیحی، یہودی، بت پرست اور بدھ مذہب کے پیروؤن مین ایک مستقل جنگ علم حقیقت کے فقدان کا نتیجہ ہے، حقیقت کا علم کم افراد کو ہے، بقیہ حضرات خواہش ہی نہین کرتے کہ قلب سے حجاب دور کرین، ہر ظاہری مذہب کا کردگار ایک بت ہے، ایک افسانہ ہے، اسکے سوا دوسری چیز ہو ہی نہین سکتا، کپیلہ برہمن یوگیون کو صرف اس بنا پر نشانہ طعن وتشنیع بنا تا ہے کہ وہ اپنے '' شہود صوفیانہ '' مین واحد اعلی کی دیدار کے مدعی تھے اسی اظہار خیال نے گوتم بدھ کو آیندہ نسلون سے ایک دہریہ کا خطاب دلادیا، فیثاغورث اپنے تصوف تادیلی اور مسئلہ تناسخ کی بدولت ایک چالباز کاذب متصور ہوا دوسرے فلاسفہ اپالونیوس، اور فلاطینوس کا بھی یہی حال ہوا، جنھین لوگون نے '' محویان خواب '' کے نام سے یاد کیا، افلاطون پر اسکے مترجمین نے بھی بیوقوفی کا الزام لگایا، اور یہانتک کہہ ڈالا کہ وہ اپنی زبان سے بھی ناواقف تھا، یہ کیون؟ اسلئے کہ اسنے '' قوسی العزیز '' کے متعلق یہ کہا کہ اسکا علم دوسرے علوم کی طرف الفاظ کے ذریعہ حاصل نہین ہوسکتا، مین ایک جلد ان حضرات کے نام سے بھر سکتی ہون، جنکی تحریرون کو لوگون نے اس '' حجاب '' کو دور نہ کرنیکی عدم استعداد مین صوفیانہ احماقت سے تعبیر کیا ''

تعلیم تصوف جہانتک حب الہی، اخلاق حسنہ، اعمال صالحہ، تزکیہ نفس، اور تصفیہ قلب سے متعلق ہے قرآن مجید سے کی گئی ہے، بقیہ اصول وقواعد رہبانیت، اعتزال، فنا وغیرہ اسلام کی چیزین نہین، اور نہ قرآن مین انکی تعلیم ہے،

صحابہ کرامؓ مین ایسے لوگ تھے، جو تیسری صدی کے صوفیہ کی طرح تارک الدنیا اور فانی ہونیکی تمنا رکھتے تھے، چنانچہ بخاری کی کتاب النکاح مین کثرت سے ایسے واقعات ملتے ہین، حضرت ابوہریرہؓ تعلق ازدواجی کو ہمیشہ کیلئے خیرباد کہنے کیلئے خصی ہونا چاہتے تھے، حضرت عبداللہ ابن عمرو بن العاص تمام دن روزے رکھتے اور ساری رات عبادت کرتے بیوی سے بھی کنارہ کش تھے جسکی شکایت دربار رسالت تک پہونچی، حضرت ابوذر غفاریؓ شام سے اس بنا پر بگڑ کر چلے آئے کہ انکے عقیدہ مین مال رکھنا جائز نہین تھا، اور امیر معاویہ اس عقیدہ کے مخالف تھے، حضرت ابوذر غفاریؓ قرآن کی آیت سے استدلال کرتے تھے، مدینہ مین بھی آتے تو آبادی سے جدا رہے، بخاری کی کتاب النکاح مین پہلی طویل حدیث ہے، جسمین مذکور ہے، کہ چند اشخاص آپس مین آن حضرتؐ کی عبادت وغیرہ کا تذکرہ کر رہے تھے ایک نے کہا مین مدت العمر روزے رکھونگا، دوسرے نے کہا نمازین پڑھتا رہونگا، تیسرے نے کہا شادی نہین کرونگا آن حضرتؐ یہ تمام باتین سن رہے تھے، باہر تشریف لائے اور انہین ایسی راہبانہ زندگی سے منع کیا اور فرمایا **فمن رغب عن سنتی فلیس منی**، البتہ کتاب الرقاق مین ایسی حدیثین پائی جاتی ہین جنھین دیکھکر ایک سطحی معلومات رکھنے والا شخص صوفیانہ عقاید کو سراپا اسلام کے مطابق سمجھ لیگا، لیکن جب اسکی نظر کتاب البیوع اور کتاب النکاح کی حدیثون پر جاویگی تو اسے معلوم ہوگا کہ دنیا اور آخرت کے متعلق اسلام کا صحیح معیار کیا ہے؟

معزز ناظرین:۔ یہ مضمون جب مین روانہ کرچکا تو اثنائے تلاوت مین سورۂ نحل کی اس آیت پر غور وفکر کا موقعہ ملا ''

واللہ جعل لکم من بیوتکم سکنا وجعل لکم من جلود الانعام بیوتا تستخفونہا یوم ظعنکم ویوم اقامتکم ومن اصوافہا واوبارہا واشعارہا اثاثا ومتاعا الی حین ؕ

ترجمہ۔ اور اللہ نے تمہارے واسطے تمہارے گھرون مین رہنے کی جگہ بنائی اور تمہارے واسطے تمہارے جانورون کی کھال کے گھر بنائے، جنکو تم اپنے کوچ کے دن اور مقام کے دن ہلکا پاتے ہو اور انکے اون اور انکے رؤن اور انکے بالون سے گھر کا سامان اور فائدہ کی چیزین ایک مدت تک کیلیے بنائین۔

اس آیت سے صرف یہی نہین کہ عہد نبوت مین تمدن عرب کے متعلق لطائف تاریخی پر روشنی پڑتی ہے، بلکہ اس سے میرے اس سرسری تحقیق کا بھی رد ہو جاتا ہے جسمین مین نے لکھدیا ہے، کہ قرآن مجید مین کہین "صوف" کا لفظ استعمال نہین ہوا، اس سے بھی بڑہکر لطف یہ ہے کہ اکثر محققین یورپ کے اس بیان پر بھی تنقیدی روشنی پڑتی ہے جنھون نے لکھا ہے، کہ لباس "صوف" کا استعمال شام کے مسیحی راہبون سے لیا گیا ہے، حالانکہ استشہاد قرآنی سے یہ ثابت ہے، کہ لباس صوف کا استعمال نزول قرآن کے وقت بھی عربون مین مروج تھا مبادی تصوف پر تاریخی روشنی ڈالنے مین علمائے مغرب نے "لباس الصوف" کو بڑی اہمیت دی ہے، چنانچہ تصوف کے متعلق پروفیسر نالڈک کی تاریخی تحقیقات کا مدار زیادہ تر اس نظریہ پر بحث وتحیص سے متعلق ہے، کہ لباس صوف کا استعمال شام کے مسیحی راہبون سے لیا گیا ہے، (انسائیکلو آف ریجن اینڈ اتھکس) غضب تو یہ ہے کہ علامہ ابن خلدون نے بھی یہی لکھا ہے، اور غالبًا ابن خلدون ہی سے پروفیسر نالڈک نے استفادہ کیا، (ریجس ایٹچیوڈ اینڈ لائف ان اسلام) نکلسن نے مقدمہ "صوفیائے اسلام" مین اپنی نظریہ پر زور دیا ہے، کہ صوفی کا لقب مسیحیت کا منت کش ہے، اور یہ کہ قدیم زہاد اسلام ترک دنیا کے خیال مین مسیحی راہبون کی دیکھا دیکھی موٹا بدنما اُونی لباس پہنا کرتے تھے، (مسٹکس آف اسلام) ابھی تک میرے پاس ایسے مواد تاریخی موجود نہین جنکی بنا پر علمائے مغرب کے اس نظریہ کی تردید کیجائے کہ لفظ صوفی کا وجود عہد نبوت مین نہ تھا، یا یہ کہ یہ اسلام کی پیداوار نہین ہے، لیکن محققین مغرب کے طوفان تحقیق پر قرآن مجید کی اس آیت سے توکم ازکم تنقیحی روشنی پڑتی ہے کہ صوفیہ نے لباس الصوف کا استعمال مسیحی راہبون کی دیکھا دیکھی نہین شروع کیا، بلکہ اس مشابہت لباس کی جو تاریخی تعیین کی جاتی ہے اس سے قبل بھی عرب مین اسکا رواج تھا، ممکن ہے، اپنے ملکی لباس ہی کے دائمی استعمال کے باعث ایک جماعت زہاد "صوفیہ" کے لقب سے موسوم کر دیگئی ہو، بہرحال قرآنی آیت کی بنا پر مغربی علما کی وہ تحقیق جو لفظ صوفی کی وجہ تسمیہ کے متعلق ہے، ایک تاریخی، نقص، اور ایک ظن لاطائل ہے، جسے ایک جویائے حق صحیح تسلیم کرنے کیلئے تیار نہین مجھے بڑی مسرت ہو گی اگر ناظرین نگار مین سے کوئی صاحب جنھون نے "واقعۃً" تصوف کے متعلق تحقیق و کاوش کی ہو، میرے مضمون کے "صوفیانہ حصہ" پر تنقیدی روشنی ڈالینگے، تاکہ عوام کے معلومات مین اضافہ ہو، اور مجھے تصوف کے متعلق اپنے خیالات مین ایک معتدل راہ اختیار کرنی پڑے۔

عبد المالک آروی

سیاح کی ڈائری

(تیسری قسط)

لکھنوی شاعری اور اس کا ہیولیٰ

قبل اس کے کہ مین لکھنؤ کے موجودہ شاعرون کی شاعری اور ان کے حالات سے بحث کرون ، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مختصراً یہان
کی شاعری کی ہیئت وضعی ، وضع ترکیبی ، اور ترکیب عنصری پر اپنے خیالات کا اظہار کردون۔

اس وقت تک عام طور پر دہلی لکھنؤ کی شاعری کے متعلق بحث کا جو پہلو اختیار کیا گیا ہے ، وہ بہت سطحی ہے اور سوائے
اس کے کہ چند پیش پا افتادہ باتین دونون جگہ کی شاعری کی تمیز و تفریق کے لئے بیان کردیجائین ، کوئی ایسی عمیق اور اصولی بحث اختیار
نہین کی گئی جو اس تفریق و امتیاز کے اسباب کو بھی سامنے لائے اور ہر شخص ان کو دیکھکر از خود فیصلہ کرسکے کہ ان دونون مین
حقیقتاً وجہ امتیاز کیا ہے اور کن وجوہ کی بنا پر ایک کو دوسرے سے مرجح قرار دیا جا سکتا ہے

ظاہر ہے کہ لکھنؤ کوئی قدیم آبادی نہین ہے بلکہ لکھنؤ کا وجود اپنی تمام "لکھنویت" کے ساتھ ایک استعارہ ہے ، فیض آباد
سے ، جو نوابان اودھ کا اولین مہبط تھا۔ اب اسی کے ساتھ آپ حکومت اودھ کی تاریخ پر بھی غور کیجئے کہ اس کی بنیاد کیونکر قائم
ہوئی ، یہ امر شاید کسی سے مخفی نہین کہ شاہان دہلی سے بغاوت و انحراف کا نام حکومت اودھ ہے اور برطانیہ کی بساط سیاست پر
ایک شاطرانہ چال بنیاد ہے شاہان اودھ کے وجود کی۔ جس طرح سلطنت مغلیہ کے دوسرے وفادار اور نمک حلال عمال دیگر اکناف
ہند مین اپنی اپنی حکومتین قایم کرکے داد وفا دیچکے تھے ، اسی طرح نواب سعادت علی خان بانی حکومت اودھ نے اپنی قابل ستایش
ذہنیت کا ثبوت دیا اور چونکہ حکومت برطانیہ کلیتہً دہلی کا اقتدار مٹا دینا چاہتی تھی اس لئے آخر کار "غازی الدین حیدر" کو
شاہ کا لقب دیکر گویا یہ خصوصیت بھی دہلی کی چھین لی۔ اس لئے اگر فرمانروایان اودھ کے دلون مین شروع ہی سے دہلی اور دہلویت
سے تنفر رہا ہو اور یہان کی فضا مین اس جذبہ کے ماتحت لوگون نے پرورش پائی ہو تو جائے حیرت نہین پھر اگر آپ دونون جگہ
کے اخلاق و معاشرت تہذیب و تمدن ، وضع و ملبوس ، خیال و زبان پر غایر نگاہ ڈالین گے تو معلوم ہوگا کہ لکھنؤ نے
قصد کرکے دہلی کی ہر بات کو محو کرنا چاہا حتی کہ اگر دہلی والے کسی لفظ کو مذکر بولتے تھے تو اہل لکھنؤ نے اسے مونث بنا کر چھوڑا اس
مغایرت کا ایک سبب تو یہ تھا اور دوسرا بڑا سبب مذہب تھا جو حقیقتاً تاریخ اودھ کی داستان کا نہایت ہی دردناک ٹکڑا ہے
مین اس کی تفصیل سے لطیف طبائع کو منغص کرنا نہین چاہتا ، جن حضرات کو اس کے جزئیات کا علم حاصل کرنا مقصود ہو وہ
تاریخ کی کتابون مین جستجو کرین۔ لیکن مختصراً یہ ظاہر کردینا ضروری ہے کہ حکومت اودھ کی ساری تاریخ گویا ایران کے عہد صفوی کی

تاریخ ہے - اور مذہبی تنگ نظری کی وہ تمام صورتین جو ایک انسان کو مذہب کا بھی دشمن بنا دیتی ہین پوری قوت کے ساتھ لکھنؤ مین ہر جگہ پائی جاتی تھین - ایران کے دور صفوی مین تو صرف اسیقدر ہوا کہ شاعری صرف مرثیہ گوئی ہو کر رہگئی، لیکن لکھنؤ کی شاعری نام تھا ان عفونتون اور گندگیون کا جو ادباشانہ اخلاق کا جز و لازم ہین اور تمام اُن رکیک و سخیف اور رذیل و دنی جذبات کا جو صرف ایک گناہگار اور سیاہ کار دل ہی سے پیدا ہوسکتے ہین - اگر یہ صحیح ہے کہ ماحول کا اثر شاعری پر ہونا لازم ہے، تو ایک ملک و قوم کی شاعری کو دیکھ کر اس کے ماحول کا اندازہ کرنا بھی لازم منطقی نتیجہ ہے - پھر خواہ آپ سلطنت اودھ کے سیاسی، اخلاقی، مذہبی، معاشری حالات کے ساتھ ساتھ اُس وقت کی شاعری کا مطالعہ کیجئے یا اُس عہد کی شاعری سے آپ اُس زمانہ کے اخلاق پر حکم لگائے نتیجہ ایک ہے اور اس یقین تک پہونچنا لازم کہ لکھنؤ کا وہ دور جسے یہان کا عہد زرین کہا جاتا ہے اپنے ذہنی و دماغی انحطاط، اخلاقی و معاشری زوال، مذہبی گندگی و تنگ نظری، بلکہ مین تو یہ کہونگا کہ اپنی حیوانیت و درندگی اور وحشت و سبعیت کے لحاظ سے ایک ایسا عبرتناک دور حضیض تھا کہ شاید ہی اس کی کوئی دوسری مثال دنیا کی تاریخ مین پیش کیجا سکے - خواجہ عبد الرؤف عشرت خواہ کتنی ہی حسرت کے ساتھ قیصر باغ کی رنگ رلیون کا ذکر کیون نہ کرین، عیدین کے موقعہ پر شاہانہ جلوس اور اس کے تزک و احتشام کا افسانہ خواہ کسی زبان و انشا مین کیون نہ تحریر فرمائین، لیکن دنیا اس واقعہ کو کبھی فراموش نہین کرسکتی کہ اسی قیصر باغ مین شہر کے اکابر و امرا کی حسین حسین لڑکیان محرم کی روضہ خوانیون، عزاداریون اور تمثیل سازیون مین ائمۂ اطہار کی بیویان بنا بنا کر پیش کیجاتی تھین اور واجد علی شاہ وہ عظیم المرتبت انسان وہ شوکت و جبروت والا بادشاہ، اچھوتیون کے ساتھ خود بھی دردِ زہ مین مبتلا رہنے کے بعد کسی نہ کسی امام زادہ کو (مومی شبیہ، چینی کی مورت، یا گڑیا کی صورت مین) جنا کرتا تھا، اور جب "مبارک سلامت" کے ترانے گائے جاتے تھے تو وہ ایک نوعروس کی طرح گھونگٹ کرکے بیٹھ جاتا تھا اور جب عالم نشاط کی فراوانی سے مجبور ہو جاتا تو خود بھی کنچنیون، پاتردن اور کسبیون کے ساتھ ملکر اپنی بھدی کمرین "لرزش رقصانہ" اور عفریتی جسم مین جنبش رامشگرانہ پیدا کرنے کی کوشش کرتا تھا

ظاہر ہے کہ جس ملک کا فرمانروا اس رنگ کا رہا ہو، جس کی نفس پرست زندگی نے حلال و حرام کا پردۂ تمیز اٹھا دیا ہو، جس نے اپنی زندگی کا "اسوۂ حسنہ" یہ پیش کیا ہو، وہان کی رعایا کی اخلاقی حالت کا کیا عالم ہوگا اور ان کی حیوانیت "ارتقا" کے کس دور مین رہی ہوگی - پھر یہ برکات صرف واجد علی شاہ کے عہد سے مخصوص نہ تھے بلکہ اودھ کا ہر حکمران کم و بیش یہی ذہنیت لیکر آیا تھا اور کسی نہ کسی اخلاقی پستی کا مظہر اتم ہونے کی خصوصیت کبریٰ اسے حاصل تھی

اگر شاعری نام ہے جذبات کے اظہار کا اور جذبات پیدا ہوتے ہین خود اپنے اور ماحول کے معاشری و اخلاقی حالات سے تو ہر شخص بہ آسانی حکم لگا سکتا ہے کہ لکھنوی شاعری کو کیسا ہونا چاہئے اور اس کی حقیقت کیا ہوسکتی ہے - مثلاً ناسخ کے ایک مشہور شاگرد شیخ امان علی سحر کا یہ شعر ملاحظہ ہو -

استخارہ جو سحر وصل پہ واجب آیا مسکرا کر وہی کنٹھا مرے منہ پر مارا

استخارہ ایک مذہبی عمل ہے لیکن اس کو اخلاق کی پستی کہئے یا مذہبی زندگی کا غلو کہ معشوق خود "بے اختیاری شوق" کے عالم میں وصل کے لئے استخارہ کرتا ہے (گویا وہ بڑا عمل خیر ہے) اور شاعر "واجب آیا" کہکر اُسے ایک اور درجہ ترقی پر پہونچا دیتا ہے البتہ دوسرے مصرعہ میں جس معشوقانہ ادا کا اظہار ہے، وہ بجائے خود ایسی چیز ہے کہ کنٹھا کہے یا نہ کہے، وصل کا واجب کیا، فریضۂ سحر کی صورت اختیار کرلینا یقینی ہے

میرے نزدیک شاعری کے تمام اصناف مین "غزلگوئی" جسقدر بلند چیز ہے کوئی نہین، روح کی گہرائیون، اور قلب کے اعماق سے خبردار کرنے والی چیز اگر کوئی ہوسکتی ہے تو صرف غزل ہے اور اسی بناء پر کہا جاتا ہے کہ غزل کا ارتقاء تصوف ہے (تصوف سے مراد عہد حاضر کی قبر پرست، مرید ساز خرقہ پوش سالوس والی درویشی نہین ہے، بلکہ میری مراد وہ علوئے فطرت وہ عروج روح، اور وہ استعلاء تصور ہے جہان انسان مادیت سے گزر کر اپنے حیّز اصلی، نور ربانی اور جلوۂ حقیقی سے ہم آغوش ہوجاتا ہے اور تمام امتیازات دنیاوی کو جن مین امتیاز مذہبی بھی شامل ہے محو کر دیتا ہے) پھر جو شخص فطرتاً شاعر ہوتا ہے وہ اپنی اول منزل مین بھی جو یقیناً "منزل لب بام" ہی ہوا کرتی ہے، شاہد اصلی کے جلوہ کو سامنے رکھتا ہے، انتہائی منزل کے حصول سے غافل نہین ہوتا اور دنیا دی زیر و بم مین بھی اس نغمۂ سرمدی کو سنتا رہتا ہے جو ہر ساعت، ہر لحظہ، ہر دم اس کو اپنی لذت سے بیخود رکھتا ہے،

یہ صحیح ہے کہ ہر شاعر اختلاف استعداد کے لحاظ سے ایک مخصوص درجہ سے آگے نہین بڑھتا، اور بہت کم ایسے ہوتے ہین جو بیدل کے مرتبہ تک پہونچنے مین کامیاب ہون۔ لیکن ایک فطری و دہبی شاعری خواہ وہ کتنی ہی ابتدائی منزل مین کیون نہ ہو، اُس سوز و گداز، اُس درد و تاثیر، اُس عذوبت بیان، اس حلاوت زبان، اور اُس حقیقت و صداقت سے خالی نہین ہوسکتی جو فطرت کی طرف سے صرف ودیعت ہوتی ہے اور کوشش سے حاصل نہین کیجا سکتی

پھر غور کیجئے کہ اُس دور حکومت کی شاعری جو غداری کورنمکی، اور جذبۂ نفرت و استکراہ پر قایم ہوئی ہو اور اُس عہد معصیت کی شاعری جس مین ادنیٰ و ذلیل درجہ کے حیوانی جذبات کے سوا کسی جذبۂ عالی کی پرورش کی فضا نہ پیدا ہوئی ہو اور اُس زمانۂ فسق و فجور، کی شاعری جب مذہبی استخفاف اور بے حیائی و بے غیرتی اس حد تک پہونچ جائے کہ وصل کیلئے استخارہ کا کنٹھا سنبھالنا بھی معیوب نہ رہے، یعنی انیسوین صدی کے نصف اول کی وہ لکھنوی شاعری جس نے اسی ماحول، اسی ذہنی پستی، اسی اخلاقی فرومایگی، اسی مذہبی تنگ نظری اور اسی ہیجان بدمستی مین آنکھ کھولی ہو، وہ ناسخ و وزیر ہی پیدا کرسکتی تھی نہ کہ مومن و میر، اس مین سحر و صبا ہی کے تخلیق کی اہلیت تھی نہ کہ درد و قایم کے

لکھنؤ کی شاعری مین الفاظ کی طلسم بندی، کنگھی چوٹی انگیا، آنچل، آرسی سرمہ، بے معنی صنائع و بدائع اور اسی قسم کے بہت سی سطحی و غیر سنجیدہ خصوصیات کے پیدا ہونے کا سبب یہی تھا کہ اُس وقت کی زندگی ہی ایک جھوٹی زندگی تھی اک غیر حقیقی ہستی تھی اور رات دن ان کو انھین چیزون سے واسطہ تھا اور انھین پر اُن کے نشاط کی بنیاد

قائم تھی۔ ان کی شاعری کا موضوع عہد وحشت کی وہ عورت تھی جب اس سے صرف ہوس رانی کا کام لیا جاتا تھا اور جس کو اسباب آرائش وزیبایش کی دوسری کم مایہ جنسون کی طرح قابل بیع وشری جنس قرار دیا گیا تھا۔ لکھنؤ کی سرزمین میں قصر شاہی سے لیکر فقیر کے جھونپڑے تک یکسان طور پر جذبۂ شہوت پرستی کارفرما تھا نہ فرمانروا کو اپنی ذمہ داریون کا احساس رہگیا تھا اور نہ رعایا کو تحسین تمدن کا، ہر شخص اپنی اپنی جگہ عیش کوشی ونشاط اندوزی مین مصروف ومنہمک تھا اور نسائیت جو پرُ معصیت زندگی کا لازمی نتیجہ ہے بلا تفریق ہر طبقہ کے مردون مین پیدا ہوتی جا رہی تھی سرکار انگریزی نے عملاً تمام اقتدار شاہانہ سے محروم کرکے شاہ ورعایا سب سے عسکری روح چھین لی تھی اور ان کے جذبات حماست وشجاعت کو صرف بٹیر بازی، کنکوے بازی اور تیتر بازی مین تبدیل کر دیا تھا اور وہ بالکل غیر معلوم وغیر محسوس طور پر انسانیت کی اُس نیچی سطح پر آرہے تھے جو حیوانیت تک پہونچنے کے لئے حد فاصل درمیان نہین رکھتی۔ اسی لئے لکھنؤ کا شاعر کبھی ایک یاوہ گو ناظم، ایک ہرزہ سرا متشاعر ایک بوالہوس حسن پرست ایک بازاری فقرہ باز، ایک عامی پھبتی گو، ایک سوقی عیاش کی حیثیت سے آگے نہین بڑھا اور نہ بڑھ سکتا تھا کیونکہ ماحول اور فضا کا اقتضا یہی تھا

اہل لکھنؤ کا دعویٰ ہے کہ زبان کو جو ترقی یہان ہوئی کسی جگہ نہین ہوئی یہانتک کہ شعراء دہلی نے بھی یہین آکر یا یہان کی زبان کو سامنے رکھ کر اپنی زبان کی موج نکالی۔ اول تو مجھے اسی مین گفتگو ہے کہ یہان زبان کو ترقی ہوئی۔ کیونکہ زبان کی ترقی کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ وہ بلند سے بلند جذبہ وخیال کے اظہار پر قادر ہو جائے اور اس کی ایک مثال بھی یہان کے بڑے سے بڑے شاعر کے کلام مین نہین ملتی۔ البتہ عیاشانہ اور بازاری زبان نے یہان ضرور ترقی کی اور عامیانہ خیالات کے اظہار کے لئے بیشک بہت سے جدید اسلوب پیدا کر دئے، چنانچہ آج بھی یہان کا سنجیدہ سے سنجیدہ نقاد ایک شعر کی داد دیتے وقت کبھی اس کو زہریلا بنا دیتا ہے، کبھی، اس کے دھوین کو ما ورا سر حد محفل بل کھاتا ہوا پاتا ہے، کہین اس کے "کس، بل" کو نمایان کرتا ہے اور کہین "اے توبہ، اُوئی اللہ" کہکر خدا معلوم اپنی یا شاعر کی نسائیت کو ظاہر کرتا ہے —— اگر اسے تسلیم بھی کر لیا جائے کہ لکھنؤ نے زبان اور محاورون کو درست کیا تو میری سمجھ مین نہین آتا کہ شاعری اور وہ بھی خصوصیت کے ساتھ غزل کو اس سے کیا فایدہ پہونچا جو قطعاً ان دونون چیزون سے بے نیاز ہے، غزل کی زبان کبھی پہلے نہین بنتی، بلکہ غزلگو کے خیال کے ساتھ ساتھ پیدا ہوتی ہے وہ زبان کا پابند نہین ہے بلکہ خود زبان اس کی محتاج ہے۔ اگر ناسخ نے جو لکھنوی شاعری کی دنیا کا ابو الآبا سمجھا جاتا ہے، بہت سے محاورات اپنے دیوان مین نظم کر دئے، صحت الفاظ کا بہت خیال رکھا، تو نتیجہ کیا ہوا یہی ناکہ وقت ضرورت اس سے ایک لغت یا فرہنگ کا کام لے لین۔ غزلگوئی کو اس سے کیا فائدہ پہونچا محاورے اس نے جتنے بھی لکھے ہون لیکن غزل اس کی ان حدود سے آگے نہین بڑھتی کہ

سخت دل جو ہین انھین محروم رکھتا ہے فلک　　بیضۂ فولاد سے بچہ کہان پیدا ہوا

نہین آتا نظر مرہم لگائے کس جگہ کوئی دہان یار گویا منہ ہے میرے زخم پنہان کا

جب وہ مسجد مین ادا کرتے ہین سب نماز اپنی قضا کرتے ہین

میرے نزدیک لکھنوی شاعری عبارت ہے۔ ناسخ، آتش، مصحفی اور ان کے شاگردونکے کلام سے۔ ناسخ کے کلام کی بے نمکی اور اس کا "شعر" کی تعریف سے یکسر علیحدہ ہونا کسی سے مخفی نہین ناسخ کے جتنے مشہور شاگرد ہوئے وہ بھی اس باب مین اپنے استاد سے کسی طرح کم نہ تھے، چنانچہ امداد علی بحر، شیخ امانعلی سحر خواجہ وزیر کا کلام اٹھا کر دیکھئے، یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان غریبون مین کبھی جھوٹی محبت کا بھی جذبہ پیدا نہین ہوا

بحر کے بعض اشعار ملاحظہ ہون:۔

خوشبو مین کیا ہین داغ مودت کے ابجرے سر ہے کہ دوش پر ہے قرابہ گلاب کا
افسوس ہم نے خط غلامی دیا اُسے لکھوا لیا نہ اس سے مچلکا رقیب کا
اے بحر نہ ے عارض محبوب کا بوسہ شبہہ ہے مجھے کان کی بجلی پہ مگر کا
بیمار ہون خوبصورتون کا حسن یوسف مری دوا ہے

سحر کی شاعری مین ایک تو وہی کنکھے والا شعر ہے، دوچار نوادر اور ملاحظہ ہوں

طایر روح کو دانے پہ لگا یا قاتل دل پہ ہم نے تری بندوق کا چھرا کھایا
دوڑ کر ابرو قاتل کی بلائین لے لین بیٹھے بٹھلائے اوٹھے ہات مین چرکا کھایا
مسکرا کر وصل مین جب دانت پیسے یار نے موج خندہ بن گئی زنجیر موتی چور کی

وزیر کی لفظ پیمائیان بھی عجیب وغریب ہین:۔

گرمیان کیں اسقدر ہر عضو شعلہ ہو گیا شب کو روشن یار کے بازو کا اکا ہو گیا
بدن مین میرے جتنے زخم ہین آنکھین چرا تے ہین نہ پوچھو کسقدر پیاسا ہون آب تیغ قاتل کا
گردم مشق خیال خط جانان ہوگا پھر تو جو خط مین لکھونگا خطِ ریحان ہوگا

شاعری کا جہان تک تعلق ہے آتش یقیناً ناسخ سے بدرجہا بہتر ہے لیکن "لکھنوی خصوصیت" اس کے کلام مین بھی کثرت سے پائی جاتی ہے:۔

دیدۂ یار کہین کیا اسے کیفِ مے مین بھونکر روز گزک کرتے ہین بادام کو ہم
چلے تو سیر کو ہین آپ مستی ملکے گلشن مین اشارے کیسے کیسے ہونگے نافرمان وسوسن مین
یادِ رخسار کتابی جو رہا کرتی ہے دل سمجھتا ہے مرا حافظ قرآن مجھ کو

ان کے شاگردون مین رند و صبا کا خاص مرتبہ سمجھا جاتا ہے، لیکن ان کی یہ خصوصیت بھی صرف اسی رنگ کی بناپر ہے، رند کے چند شعر ملاحظہ ہون

بادۂ گلگون مین افیون کا اثر ہو جائے گا — دورِ ے یا رب دورانِ سر ہو جائے گا

خالِ رُخ کے عشق مین مرتے ہین عاشق سیکڑون — سنکھیا کا عالم اس حب شفا کا ہو گیا

تلوار دکھاؤ مجھے گولی سے نہ مارو — تل ڈھانک لو اور ابروِ خمدار دکھاؤ

صبا کا مرتبۂ شاعری یہ ہے:-

سرکشی پر جو وہ سروِ ستم ایجاد آیا — پاس اترے کے گھسٹتا ہوا شمشاد آیا

یارگل اندام نسے پہلو جو خالی ہو گیا — سوکھ کر مین شکل تصویر نہالی ہو گیا

مصحفی چونکہ لکھنؤ کے نہ تھے اس لئے ان کے سلسلہ سے یہان بحث کرنا فضول ہے، لیکن اسقدر اظہار ضروری ہے کہ دور ناسخ کی لنو و مہمل شاعری سے انحراف کرکے سہل و شستہ زبان مین کچھ کچھ جذبات کو لئے ہوئے غزل کہنے کی بنیاد ڈالنے والے دو ہی شخص تھے ایک ضامن علی جلال جو رشک کے شاگرد تھے اور دوسرے منشی امیر احمد مینائی جو اپنے علم و فضل، اخلاق و عادات کے لحاظ سے بہت زیادہ بلند انسان تھے اور جنکو شاعر کہنا میرے نزدیک ان کی توہین ہے، چونکہ اُس وقت کی فضا مین سوائے شاعری کے کوئی دوسرا نغمہ مقبول ہی نہ تھا، اس لئے منشی امیر احمد مینائی پر بھی اس کا اثر ہوا اور شاعری کی طرف متوجہ ہوگئے ورنہ قدرت نے انکو اس سے بہت زیادہ اہم خدمات کیلئے پیدا کیا تھا، مگر چونکہ فطرت مین لوچ تھا جوہر کمال کے حصول کا ان مین موجود تھا، اس لئے اساتذۂ شعر مین بھی انکا شعار ہونے لگا اور حقیقت یہ ہے کہ یہ امتیاز ان سے کبھی نہین چھینا جا سکتا کہ انھون نے باوجود لکھنؤ مین رہنے کے جہان ناسخ کی شاعری کے جراثیم ایک مرض متعدی کی طرح پھیلے ہوئے تھے ایک الگ راہ شاعری کی قایم کی اور اپنی فطری صلاحیت کی بناء پر وہ وہ شعر کہگئے کہ ہمین کسی ایک لکھنوی شاعر کے کلام مین نہین ملسکتے، لیکن دنیا شاید یہ سنکر تعجب کریگی کہ اہل لکھنؤ، امیر مینائی سے کچھ خوش نہین ہین اور ان کے مستند استاد ہونے سے بھی انکار کرتے ہیں

امیر مینائی کے دو دیوان مرآۃ الغیب اور صنم خانہ دو علٰحدہ رنگ کے دیوان ہین اور اس سے انکار نہین ہو سکتا کہ ان دونون مین کثیر اشعار اُس رنگ کے ہین جن پر صحیح تغزل کا اطلاق نہین ہو سکتا، لیکن ناسخ کی شاعری کو دیکھتے ہوئے امیر کا برُے سے برُا شعر بھی ایک درجہ رکھتا ہے اور اگر پورا تفحص کیا جائے تو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ذہنیت یکسر دہلوی تھی لیکن ماحول کے اثر سے مجبور ہو کر انھون نے لکھنوی شاعری کو اختیار کیا

ان کے چند اشعار جن سے ان کا صحیح ذوق شعری نمایان ہوتا ہے ذیل مین درج کئے جاتے ہیں:-

کہتے تھے دل کسی سے لگاؤ نہ اے امیر — دیکھو تو چار روز مین کیا حال ہو گیا

وہ آئے کھینچ کے تلوار سب کو شاد کیا — امیر آج بہت ہم نے تم کو یاد کیا

کچھ آج نہین رنگ یہ افسردہ دلی کا — مدت سے یہی حال ہے یارو مرے جی کا

لیا پھر تونے اس کا نام اے دل ارے ظالم ابھی سمجھا چکا ہون
کرتے ہین جو لوگ ذکر اُن کا ایک ایک کا منہ میں دیکھتا ہون
دم لے نہ ابھی پوچھ مرے درد کو ہمدم رونے سے جو دل ٹھیرے تو کچھ بات کرونین
کھاتے ہو قسم نہین ہیں عاشق صورت تو امیر اپنی دیکھو
اک ذرا پردۂ محمل کو اُٹھادے لیلی پھر کوئی حالت بیتابی مجنون دیکھے
تم دکھاتے تو ہو امیر کا دل اور جو وہ کوئی آہ کر بیٹھے
ہات ڈالا مین نے دامن پر تو بولے ناز سے میرا دامن چھوڑ دے اپنا گریبان پھاڑ دے
اک کنارے پڑا ہوا ہے امیر کچھ تمھارا غریب لیتا ہے
کوئی آمیر ترا درد دل سنے کیونکر تو ایک بات کہے اور دو گھڑی روئے

کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ اشعار کسی لکھنوی شاعر کے ہین؟ مین تو سمجھتا ہون کہ یہ تصرف ہے ان کے دادا استاد مصحفی کا جو غیر لکھنوی تھے اور خود اُن کی فطری صلاحیت کا جس مین دہلویت بڑی حد تک مرکوز تھی

امیراللہ تسلیم بھی لکھنؤ سے نسبت رکھتے ہین لیکن یہ نسبت ہر لحاظ سے غلط ہے، کیونکہ نہ انکا اصلی وطن لکھنؤ تھا اور نہ وہ لکھنوی ذوق کے متبع تھے۔ چنانچہ خود وہ ایک جگہ لکھتے ہین

مین ہون اے تسلیم شاگرد نسیم دہلوی مجھکو طرز شاعران لکھنؤ سے کیا غرض

متاخرین مین مرزا تعشق کا وجود بیشک ایسا ہوا ہے جو خاندان ناسخ کی شاعری مین علیحدہ رنگ رکھتا تھا اور ان کے مختصر دیوان مین تلاش کرنے سے بعض ایسے شعر ملسکتے ہین جن کو شعر کہا جاسکتا ہے، لیکن چونکہ خالص لکھنوی لوگ تھے اور تلمذ بھی ناسخ سے تھا اس لئے مہملات کی بھی کمی نہین ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

سوئے دریا خندہ زن وہ یار جانی پھر گیا موتیون کی آبرو پر آج پانی پھر گیا
کیا معاذاللہ مری وحشت نے پھیلائے ہین پانون راہ برسون کی مرا چاک گریبان ہو گیا
عشق دندان کی رعایت مرے جان لازم ہے آبروے دل بے تاب و توان لازم ہے
کیا کنوین مجھ کو جھنکائیگی مری کاہیدگی چاہ میرے واسطے ہر نقش پا ہو جائے گا
کیون کبوتر کے عوض ہدہد نہ لایا خط شوق اس خطا پر مجھ سے وہ بلقیس[1] ثانی پھر گیا

ہر چند لکھنوی شاعری کا یہ رنگ برابر انحطاط پذیر ہے اور اب شاید ہی کوئی صحیح مقلد و متبع اس شاعری کا ہو، لیکن وہ سمیت جو فضا مین اس طرح پھیل گئی ہو دفعۃً دور بھی نہین ہو سکتی اور "زمانۂ قریب" مین بھی بعض خدا کے بندے ایسے گزرے ہین

[1] اگر تعشق کو کسی عورت سے محبت نہ تھی، تو پھر بلقیس کا مرد ہونا یقینی ہے۔

جو استاد ناسخ کی رُوح کو خوش کرنے کے لئے کافی سامان اپنے بعد چھوڑ گئے ہین، چنانچہ زیادہ زمانہ نہیں گزرا جب فرنگی محل کی علم خیز سرزمین سے مولانا حافظ محمد برکت اللہ رضا کا ایک دیوان مطبع یوسفی سے شایع ہوا تھا جس مین یقیناً تمام وہ خصوصیات پائی جاتی ہین جو ایک "اعجوبۂ ادب" مین ہونا چاہئے۔ مولانا رضا فرنگی محلی یون تو امیر کے شاگرد تھے، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی رُوح روز الست ہی مین ناسخ کے سامنے زانوے ادب تہ کر چکی تھی ملاحظہ ہو:۔

خیال سبزۂ خط مین زمرد کا پیا پانی تصور مین ترے دانتون کے ہیرا کوٹ کر پھانکا

مولانا نے یہ شعر نعت مین فرمایا ہے رسول کے سبزۂ خط اور حُسن دندان کا ذکر ان الفاظ مین کرنا حقیقۃ یہ ہے کہ فرنگی محلی ہی ذہنیت کا کام ہو سکتا ہے کسی اور کے بس کی بات نہین ہے، مولانا نے ایک بار محبوب کا بوسہ مانگا تھا اس کا حال ان الفاظ مین بیان ہوتا ہے:۔

بوسہ مانگا کالیان کھائین رضا زہر پایا ہم نے شکر کا جواب

مولانا کی بوالہوسی ملاحظہ ہو:۔

حیرت سے ہم نہ ہوتے جو مبہوت وصل مین نیند آتی اے رضا انھین کیونکر تمام رات

دوسرے مصرعہ کو پڑھکر غور فرمائیے کہ "اُن" کے رات بھر نہ سو سکنے کا کیا سبب ہو سکتا تھا اور مولانا کے "تہیۂ پریشانی" کی داد دیجیے۔ ایک صاحب نے یہ شعر سنکر فرمایا کہ ممکن ہے مولانا نے کوئی جائز و حلال صورت پیدا کرکے یہ اشعار کہے ہون مین نے کہا بالکل درست ہے کیونکہ مولانا نے یہ شعر کہکر اس حُسن ظن کی بھی گنجائش نہیں رکھی

لپٹا یا رضا ہم نے تو جھنجلا کے وہ بولے اب آپ کے گھر ہم کبھی آیا نہ کرینگے

یہ ہے شاعری ایک عالم متبحر، ایک فقیہ مستند، ایک محدث جید کی جس کے خاندان مین ہمیشہ سے تورع و تقدس چلا آرہا ہے اور جس کے اخلاق و سیرت کو لوگ نمونہ و مثال کی صورت سے پیش کرتے ہین

اس سے آپ کو اندازہ ہو سکیگا کہ لکھنوی شاعری کے مذموم اثرات کن کن صورتون سے کن کن طبقون مین سرایت کر چکے ہین اور جن کے دور ہونے کے لئے میری رائے مین کم از کم ابھی نصف صدی کی ضرورت اور ہے

الغرض لکھنؤ مین تغزل کی جتنی مٹی پلید ہوئی وہ ناقابل عفو حد تک عفونت و گندگی سے بسر یز ہے یہ ماننا پڑیگا کہ شاعری کی اُس صنف نے جسے مرثیہ کہتے ہین، یہان غیر معمولی ترقی کی اور شاہان اودھ کے اخلاقی مظالم کی تلافی اگر فطرت کی طرف سے کوئی ہوئی تو صرف یہ کہ اسنے انیس و دبیر کو یہان پیدا کر دیا، مرثیہ گوئی کم و بیش ہر زبان اور مُلک مین پائی جاتی ہے، لیکن مذہبی و قومی اہمیت کے لحاظ سے جو مرثیہ لکھنؤ کے مرثیہ گوئی کا ہے اس کی نظیر دنیا مین کہین نہین ملسکتی

لکھنؤ کے موجودہ شعرا کی شاعری کا کیا رنگ ہے، اس کے متعلق میرا سرسری فیصلہ یہی ہے کہ فی الحال وہ دہلی اسکول کی ایک ناکام تقلید سے زیادہ حیثیت نہین رکھتی اور ہنوز وہ غلو پیدا نہین ہوا جو شاعری کو الہام کے حدود سے ملا دیتا ہے

آیندہ قسط مین، اس مسئلہ پر زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کا موقعہ ہے اگر کوئی اور بحث نہ چھڑ گئی ———

حکومت برطانیہ کی وسعت کا راز

(بہ سلسلۂ سابق)

انگلینڈ اور ہندوستان کا باہمی اثر

گذشتہ دو لکچروں میں تحقیق بتلایا گیا تھا کہ ہندوستان کی فتح، اور اسپر انگریزوں کی حکومت میں ایک خاص مفہوم تک کوئی امر قابل حیرت نہیں ہے - ہمکو بجا طور پر فخر ہو سکتا ہے کہ ہمارے ہم قوموں نے ہندوستان میں بہت بڑے بڑے کارہائے نمایاں کئے، ہمکو اُن انگریزوں پر ناز ہو سکتا ہے جنھوں نے حکمرانی کی عدیم المثال استعداد و لیاقت دکھلائی - لیکن یہ سمجھنا سراسر غلط ہے کہ سلطنت ہذا بذات خود ایک زندہ ثبوت ہے ہندوستانی اقوام کے مقابلہ مین انگریزی اقوام کی بے پایان برتری کا - اس برتری کا خیال اپنے دماغ سے نکالنے کے بعد ہم اپنی سلطنت کے ارتقا اور قیام کے اسباب دریافت کرسکتے ہیں اور اگر حیرت انگیز سے محض، معجز نما، مراد ہے یا یہ کہ معمولی اسباب پر اسکے وجود کو معلول کرنا مشکل ہے تو یہ سلطنت قطعی حیرت انگیز نہیں ہے

تاہم ایک مفہوم میں یہ سلطنت اُن تمام عام مفہوموں سے بہت زیادہ حیرت انگیز ہے - یعنی یہ اپنے اسباب کی بہ نسبت اپنے انجام میں زیادہ حیرت انگیز ہے - بالفاظ دیگر اسکی عظمت مخصوص تاریخی مفہوم مین ہے - کیونکہ بقول میرے واقعات کی نتیجہ خیزی ہی نے اِسکو تاریخ کا درجہ دیا - اسی معیار سے ہم نے تاریخ انگلینڈ کے بہت سے واقعات کا درجہ بلند کردیا خصوصاً انقلاب امریکہ کا جو بوجہ غیر دلچسپ اور بے چاشنی ہونے کے بہت کم مطالعہ کیا جاتا تھا - اس لئے میں کہونگا کہ سلطنت ہند اگرچہ نظر غائر کو کتنی ہی کم حیرت انگیز معلوم ہو لیکن جوں جوں بحیثیت افسانہ اسکا لطف کم ہوتا جائیگا، اسکی تاریخی دلچسپی بڑھتی جائیگی

یہ کوئی ضروری بات نہیں ہے کہ ایک بڑی مشرقی سلطنت خاص طور سے اہم ہو - ایشیا میں بہت سی ایسی بڑی بڑی سلطنتیں گزری ہیں جو تاریخی اعتبار سے یونانی اور ٹسکنی (Tuscan) شہری جمہوریتوں سے بھی کم اہم تھیں، صرف اسوجہ سے کہ اُنکے حدود بہت زیادہ اور مدت قیام طویل تھی ایسی سلطنتیں لائق دلچسپی نہیں ہوسکتیں - جب ہم انکی جزئیات کی تحقیق کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ انکا نظام ادنی تھا، اسکے بار سے تمام افراد دب کر چور چور ہو رہے تھے، نہ تو انکو اطمینان و خوش نصیبی حاصل تھی نہ وہ ترقی کرسکتے تھے اور نہ کوئی قابل یادگار ایجاد کرسکتے تھے - پہلی نظر میں بظاہر ہماری سلطنت ہند بھی اس درجہ لائق توجہ نہیں نظر آتی جس قدر عام خود رو ایشیائی مستبد حکومتیں معلوم ہوتی ہیں - ہم انگریزی رائے عامہ کے مرہون منت ہیں جس کے ہاتھ میں ہندوستانی معاملات کا انصرام ہے، کیونکہ صرف اسی کی بدولت آج ہندوستان دماغی، اخلاقی اور انسانی ہمدردی کے اوصاف میں سلطنت مغلیہ کے زمانہ سے ارفع مقام پر کھڑا ہے - لیکن زیادہ سے زیادہ اس سلطنت کو ہم خراب سیاسی نظام کا ایک بہتر نمونہ کہہ سکتے ہیں - ہم کو اسکا فخر نہیں ہے کہ ہم شاہان مغلیہ کے جانشین ہیں - ہمیں شبہہ ہے کہ آیا باوجود ہماری تمام انتظامی

خوبیوں کے رعایا خوش ہے یا نہیں۔ ہمیں اسمیں بھی شبہہ ہے کہ آیا ہماری سلطنت ہندوستانیوں کو بہتر حالت کیلئے تیار کر رہی ہے یا اور زیادہ مصیبت کی طرف ڈھکیلتی جا رہی ہے، ہمیں اس بات کا بھی اندیشہ ہے کہ شاید وہاں صحیح معنوں میں کوئی ایشیائی حکومت یا خود ہندوؤں کی ایک قومی حکومت قائم ہو جائے۔ اور انجام کار ہماری سلطنت سے زیادہ مفید ہو۔ اگرچہ یہ حکومت ہماری اجنبی اور غیر ہمدرد حکومت سے کم متمدن بھی ہو لیکن بوجہ باشندگان کی طبائع کے موافق ہونے کے اس سے زیادہ مفید ہوگی

لیکن ان وجوہ سے ہر سلطنت میرے نزدیک غیر لائق توجہ نہیں ہو سکتی۔ مثلاً سلطنت رومہ کو لے لو۔ مجھے یہ خیال ظاہر کرنے میں کوئی اندیشہ نہیں ہے کیونکہ حال میں تاریخ کے متعلق ہمارے خیالات میں بہت زیادہ تبدیلی ہو گئی ہے۔ یقیناً ایک زمانہ تھا جب رومن سلطنت بھی غیر قابل توجہ سمجھی جاتی تھی کیونکہ مستبد اور بعض اوقات باعث تکلیف اور نیم وحشی تھی۔ ایک نسل پہلے عام خیال یہی تھا کہ سیاست میں سوائے آزادی کے کوئی اچھائی نہیں ہے اس لئے تاریخ کے ان تمام عہدوں کو نظر انداز بلکہ منسوخ کر دینا چاہئے جنمیں آزادی معدوم ہو۔ اسی خیال کے ساتھ ساتھ مطالعہ تاریخ کی عادت بھی بالکل نظم کے مطالعہ کی سی تھی یعنی تاریخ کا مطالعہ صرف بخیال انبساط کیا جاتا تھا۔ چنانچہ اس عادت کی وجہ سے جب ہم ایسے عہد کی تاریخ پر پہونچتے تھے جو شاندار اور قابل تحسین واقعات سے معرا ہو تو ہم کتاب بند کر کے رکھ دیتے تھے۔ بلا شبہہ اس زمانہ میں رومن سلطنت کی بھی مذمت کی جاتی تھی۔ جمہوریت رومہ کو صرف اس لئے عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے کہ اوسمیں آزادی تھی۔ اور رومن سلطنت کا ابتدائی عہد بھی محض اس خیال سے مطالعہ کیا جاتا تھا کہ اسکے اندر حُریت کے نشانات ملتے ہیں۔ لیکن جہاں دوسری صدی عیسوی شروع ہوئی ہمنے کتاب بند کر دی، گویا دسوین صدی تک جو کچھ ہوا، تباہی و بربادی کے سوا کچھ نہ تھا اور پھر کتاب اُسوقت تک ہمارے ہاتھ میں نہ ہوتی جب تک انگلینڈ اور اطالوی جمہوریت میں حُریت کا نشان پھر نہ ملنے لگتا۔ میرے خیال میں تاریخ کیساتھ یہ سلوک اب متروک ہو گیا اب تاریخ محض تفریح کی خاطر نہیں پڑھی جاتی بلکہ سیاسی نشو و نما اور انقلابات کے اصول دریافت کرنے کے لئے۔ نظر بران ہمکو اس سے بحث نہیں ہوتی کہ فلاں عہد شاندار ہے یا تاریک اگر وہ عہد بصیرت افروز ہے اور اُس سے ایسے سبق حاصل ہوتے ہیں جو دوسرے عہدوں سے حاصل نہیں ہوتے تو بس کافی ہے۔ ہم نے سیکھا ہے کہ علاوہ حریت و آزادی کے سیاست میں اور بھی خوبیاں ہیں۔ مثلاً قومیت اور تمدن۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک سلطنت مین آزادی تو نہیں ہے لیکن جہاں تک اِن دو مقاصد کے حصول کا تعلق ہے وہ بڑی رحمت ہے۔ اس لئے رومن سلطنت نہ صرف اپنے ابتدائی عہد میں بلکہ تیرھویں صدی تک باوجود اپنی غیر شائستگی، اوہام پرستی اور تکالیف کے تمام تاریخی واقعات سے دلچسپ ہے کیونکہ محسوس کیا جاتا ہے کہ یہ سلطنت ہرگز اندرونی ترقی، ابداعی قابلیت یا قابل یادگار نتائج سے معرا نہیں تھی۔ اسلئے کہ اسی کے بطن سے وہ بچہ پیدا ہوا جو موجودہ 'اخوت' اور متمدن اقوام کے 'باہمی رشتہ' کی شکل میں آج دکھائی دیتا ہے۔ اسی وجہ سے یہ سلطنت اگرچہ مستبد تھی لیکن اُسکی تاریخ کا مطالعہ نہایت توجہ اور کمال شوق سے کیا جاتا ہے

سلطنت رومہ اور اُن دیگر سلطنتوں میں جنکا قیام فتح پر تھا یہ فرق اسوجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ فاتح قومیں مفتوح

قوموں سے تہذیب میں فائق تھیں۔ ایک بڑی جنگجو اور فتحمند قوم کیلئے ضروری نہیں ہے کہ وہ متمدن بھی ہو۔ چنگیز خاں حقیقی معنوں میں فاتح تھا لیکن وہ کون تھا؟ ایک ایسے جفاکش قبیلہ کا سردار جو افلاس سے عاجز آکر قتل و غارتگری پر اتر آیا تھا۔ ایسے حملہ آوروں کے سامنے یقینی طور پر تمدن مغلوب ہو جائیگا۔ چنانچہ تاریخ میں ہم اکثر تمدن کو مفتوح دیکھتے ہیں۔ بعض اوقات اگر کسی وجہ سے تمدن اپنی جگہ قائم بھی رہ گیا تو ترقی نہیں کر سکتا تھا۔ البتہ موجودہ زمانہ میں ایجادات کی ترقی نے تمدن کے ہاتھ کو قوی کر دیا ہے۔ تاریخ کی سب سے بڑی فاتح اقوام میں ترکمانوں کی قوم تھی لیکن باعتبار ترقی سب سے پیچھے تھی۔ ایشیا کے تقریباً تمام اولوالعزم بادشاہوں کو زیادہ تر اسی قوم سے کرایہ کی فوجیں دستیاب ہوئیں بابر اور اکبر نے بھی اسی قبیلہ کی امداد سے ہندوستان فتح کیا۔ یہ تو عام اصول تھا لیکن جب کوئی خاص صورت پیدا ہو جائے اور ایک اعلیٰ درجہ کی متمدن قوم کسی ادنیٰ درجہ کی ترقی یافتہ آبادی میں بذریعہ فتح تہذیب کی نشر و اشاعت کرے تو ایسی سلطنت نہایت ہی مخصوص دلچسپی رکھتی ہے۔ اس قسم کی مثال سکندر اعظم کی فتح مشرق میں ملتی ہے۔ چونکہ اہل مقدونیہ یونانیوں سے بہت قریبی تعلق رکھتے تھے اس لئے وہ اپنے ساتھ تمام یونانی روایات و عادات مشرق میں لیتے آئے۔ چنانچہ ڈایاڈوچی (Diadochi) حکومتیں، اگرچہ محض ادنیٰ درجہ کی فوجی طاقتیں تھیں لیکن یونانی اور مشرقی خیالات کے اختلاط نے نہایت ہی عجیب اور قابل یادگار نتائج پیدا کئے۔ اس سے زیادہ قابل ذکر اثر سلطنت رومہ نے اقوام یورپ میں پیدا کیا کیونکہ اسکی مدت حیات طویل تھی اور سب اسکو اچھی طرح جانتے تھے۔ درحقیقت یہ واقعہ بنی نوع انسان کی تاریخ میں بہت نمایاں اور مرکزی خصوصیت رکھتا ہے، اگر اسکو موجودہ انسانی تہذیب کا سنگ بنیاد کہا جائے تو عین مناسب ہوگا

اب اگر انگریزوں کی فتح ہندوستان کا مقابلہ بجائے ترکوں اور مغلوں کی فتوحات سے اہل یونان کی فتح مشرق اور اہل رومہ کی فتح ([illegible]) گال اور اسپین سے کیا جائے تو دونوں میں زمین آسمان کا فرق نظر آئیگا۔ اگر اسکا شمار اول الذکر فتوحات میں کیا جائے تو بغیر اسکی عظمت سے فریب کھائے ہوئے ہم اسے عہد جاہلیت کی تاریخ کا ایک معمولی ثانوی حیثیت کا واقعہ قرار دینگے۔ لیکن اگر اس فتح کا موازنہ آخر الذکر فتوحات سے کیا جائے تو پھر ہم اسکو دنیا کے افضل ترین واقعات کی صف اول میں جگہ دینگے، ایسے واقعات ہیں جو تمدن اقوام کی تاریخ میں اسی قدر عالی مرتبت ہیں جسقدر ادنیٰ درجہ مشرق کی معمولی فتوحات ہیں

یہاں پر اس عام حقیقت سے بحث کرنیکی ضرورت نہیں ہے کہ برطانوی ہند کی حکمران قوم کا تمدن دیسی اقوام سے زیادہ قوی اور اعلیٰ ہے۔ ایسا دعویٰ کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ انگریزوں کی قوم دماغی اور ذہنی خصوصیات کے لحاظ سے یونانی قوم نہیں ہے، لیکن جس تمدن کی وہ وارث ہے وہ اسکا ذاتی نہیں ہے، بلکہ یورپ کا تمدن ہے جو یورپ کی تمام اقوام کی متحدہ کوشش سے پیدا ہوا جس میں دنیائے قدیم کی زندہ دلی نے روح پھونکی۔ اب ہم ہندوستانی تہذیب کے متعلق کیا اندازہ قائم کریں

میں نے بار بار کہا ہے کہ ہندوستان ایک ملک نہیں ہے، اسلئے اسکا تمدن بھی ایک نہیں ہے۔ اس تمدن میں اتنی بھی یگانگت نہیں ہے جتنی بظاہر معلوم ہوتی ہے کیونکہ برہمنیت نے اپنے مخصوص انداز جذب و ہضم سے اپنے اندر ایسے تمدنوں کو جمع کر لیا ہے جو واقعی متضاد ہیں۔ اگر ہم سطح کے نیچے بغور دیکھیں تو یہاں پر دو صاف مختلف قسم کی آبادیاں نظر آئینگی۔ ایک سفید فام اور دوسری سیاہ فام۔ دونوں قسمیں قریب قریب ہر جگہ نمایاں ہیں۔ سیاہ فام آبادی جنوب میں غالب ہے۔ بنگال میں اگرچہ اسکی تعداد سفید فام آبادی سے کم ہے لیکن تاہم اسکی ہستی نمایاں ہے۔ گنگا کی بالائی وادی میں البتہ یہ آبادی بالکل غائب ہو جاتی ہے۔ یہ امر کہ دونوں آبادیاں قریب قریب تمام ہندوستان میں آپس میں مل جل گئی ہیں اس سے ثابت ہے کہ وہاں کی کوئی مروجہ زبان سنسکرت کی بگڑی ہوئی صورت نہیں ہے۔ جسطرح کہ فرانسیسی اور اطالوی زبانیں لاطینی کی شاخیں ہیں۔ ہر ہندی زبان اگرچہ اُسکے لغات بیشتر سنسکرت ہی ہوں، اشتقاق و شکل میں غیر آرین ہے۔ لہذا ہندوستانی تمدن کے متعلق اندازہ قائم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ وہاں کے نسلی امتیاز کو بنیاد قرار دیا جائے سیاہ فام قومیں اکثر حصوں میں متمدن نہیں ہیں بلکہ وحشی ہیں۔ مسٹر بی۔ ایچ۔ ہڈسن کہتا ہے "ہندوستان کے وسیع برّاعظم میں تقریباً ہر جنگلی اور کوہستانی علاقہ میں لاکھوں انسان بستے ہیں جنکی حالت مادی طور پر ان جرمنوں سے مختلف نہیں ہے جنکا حال ٹیسی ٹس (Tacitus) نے بیان کیا ہے"

اب پھر ہمکو خالص ہندو اقوام اور مسلمان تارکان وطن میں امتیاز کرنا ہے۔ ہندوستان میں پانچ کروڑ سے کم مسلمان نہیں ہیں۔ اُن میں سے زیادہ تر افغانی ہیں یا پٹھان، عربی، ایرانی اور ترکمان یا تاتاری جو مختلف اوقات ہندوستان میں داخل ہوئے یا مسلمان فاتحین کیساتھ اُنکی فوجوں میں آئے۔ یہاں بھی مثل دیگر اسلامی ممالک کے انمیں ایک قسم کا نیم تمدن اور خاص خاص منتخب خوبیاں پائی جاتی ہیں، لیکن ان سے قدامت کی بو آتی ہے، الغرض انکے خیالات و عقائد سوسائٹی کی موجودہ حالت کے مناسب نہیں ہیں

اب ہم آخر میں ہندوستان کی مخصوص آبادی کی طرف آتے ہیں۔ یہ آرین قوم ہے جو پنجاب سے سنسکرت بولتی ہوئی آئی اور خاصکر گنگا کی وادی میں پھیلی۔ لیکن سارے ہندوستان میں اپنا مخصوص دیوبانی آئین جاری کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ شاید کسی دوسری قوم نے اس سے زیادہ تمدن کی اہلیت نہیں ظاہر کی، اسکے عہد جاہلیت سے بھی جیسا کہ دیدک لٹریچر سے منعکس ہوتا ہے رحمدلی اور فراست ظاہر ہوتی ہے۔ ہندوستان میں آباد ہونیکے بعد بتدریج اس نے تمدن میں ترقی کی۔ اسکے عادات و رسوم قانون بن گئے اور پھر ان قوانین کو ایک جگہ منضبط کر دیا گیا۔ اسنے تقسیم کار کا اصول منضبط کیا، اسنے نظم، فلسفہ اور مبادیات سائنس ایجاد کئے۔ اسی کے سینہ سے وہ عظیم مذہبی اصلاح پیدا ہوئی جو بدھ مت کے نام سے موسوم ہوئی اور جو آج بھی دنیا کے ممتاز مذاہب میں شمار ہوتی ہے۔ اس حد تک یہ قوم اُن برگزیدہ اقوام سے مشابہ ہے جنکی پیدا کردہ ہماری تہذیب ہے

لیکن آرین قوم نے جتنی ترقی یورپ میں کی اتنی ہندوستان میں نہیں کی۔ ہندوستان میں اُسنے تاریخ نگاری میں خد حبہ اپنی نااہلی کا ثبوت دیا۔ چنانچہ اسکے تمام حالات بالکل گمنامی میں ہیں بجزان مواقع کے جب یونانی اور مسلمان حملہ آوروں سے اسکا مقابلہ ہوا۔ محض قیاسات کی بناپر ہم اُن اسباب کو دریافت کرسکتے ہیں جو اسکی ترقی میں حارج ہوے۔ وہ مذہبی اصلاح چند صدیون کے بعد نامعلوم اسباب کی بناپر ناکام رہی، بدہ مذہب ملک سے خارج کردیا گیا۔ اور پجاری قوم (برہمنون) کا ظلم استوار بنیادون پر قائم ہوگیا کوئی بڑا اور ٹھوس سیاسی نظام نہیں پیدا ہوا اور نہ شہری تمدن کا کہین برائے نام وجود تھا۔ یہان تک کہ غیر ملکی فتوحات کا تازیانہ لگ گیا

عرصہ تک غیر ملکی محکومیت میں رہنا قومیت کی بربادی کے نہایت زبردست اسباب میں سے ہے۔ جو کچھ تھوڑے بہت واقعات ہمیں قدیم ہندوٗن کی بابتہ معلوم ہیں اُن سے ہمارے اس قیاس کی تصدیق ہوتی ہے کہ کیا اثرات اُنکی شومی قسمت نے اُنکے اخلاق پر پیدا کئے۔ یونانی مصنف ارین (Arrian) ہندوستانیون کی عادات کے متعلق لکھتا ہے " وہ نہایت بہادر ہیں شجاعت میں تمام ایشیا والون سے بڑھے ہیں، وہ اپنی سادگی اور دیانت کیلئے مشہور ہیں، اسقدر معقول پسند ہیں کہ کبھی مقدمہ بازی کی نوبت نہیں آتی۔ وہ اتنے ایماندار ہیں کہ نہ تو اپنے دروازوں میں قفل بند کرتے ہیں اور نہ باہمی معاہدات کو دائرہ تحریر میں لاتے ہیں اس میں شک نہیں کہ اس تعریف میں مبالغہ کی بوآتی ہے لیکن بقول الفنسٹن اس سے پتہ چلتا ہے کہ اُس زمانہ سے ہندون کے خصائل میں غیر معمولی تبدیلی ہوگئی ہے۔ حقیقی خصائص کو واقعیت سے بڑھاچڑھا کر ظاہر کرنے کا نام مبالغہ ہے۔ لیکن آج ٹھیک یہی خصائص ہندوٗن میں غیر فطری پیمانہ پر مفقود ہیں۔ چنانچہ زمانہ حال کے سیاح ٹھیک ان کے متضاد خصائص کے بیان کرنے میں مبالغہ کرتے ہیں۔ وہ ہندوٗن کو جھوٹا، بزدل اور انتہا درجہ کا مقدمہ باز بتاتے ہین۔ لیکن یہ اختلاف واقعی ایسا ہی ہے جو عرصہ تک غیر ملکیون کی محکومی میں رہنے کے باعث قدرتاً پیدا ہوتا ہے

فی الجملہ ہندوستان میں ہم تہذیب کے تین دور پاتے ہیں۔ پہلا کوہستانی قبائل کا دور جسے عہد جاہلیت کہہ سکتے ہیں اسکے بعد اسلامی تہذیب کا دور آیا۔ تیسرا دور اس برگزیدہ قوم کی نیم مردہ اور مغلوب تہذیب کا دور تھا جو ابتدا سے دنیا کے حکمران اور ترقی کرنے والے تمدن سے حیرت انگیز طریقہ پر علیحدہ رہی۔ جو کچھ اس قوم نے حاصل کیا مدت ہوی کہ حاصل کیا، اُسکی رفیع الشان رزمیہ نظمیں جنکا مقابلہ مغرب کی سب سے بڑی نظمون سے کیا جاسکتا ہے، قدیم ہیں، اگرچہ جتنا خیال کیا جاتا ہے اس سے بہت ہی کم قدیم ہیں۔ یہی حال اُسکے فلسفہ اور قواعد کا ہے۔ ملک نے زمانہ حال میں کچھ نہیں حاصل کیا اس کا مقابلہ یورپ سے کیا جاسکتا تھا اگر یورپ بھی وحشی اقوام کی یورش اور تمدن قدیم کے زوال کے بعد نشاۃ ثانیہ سے محروم رہتا اور دسوین اور تیرھوین صدی میں تاتاری حملوں سے اپنے کو محفوظ نہ رکھ سکا ہوتا، بالفرض یورپ بھی آج تک اُسی حالت میں رہتا جو دسویں صدی میں تھی، ہر وقت ایشیای حملوں کی آماجگاہ بنا رہتا، زبردست قوموں اور طاقتور ریاستوں سے محروم رہتا، اُسکی زبانیں محض روزمرہ (ورناکیولر) ہوتیں جو ادبیات کے لئے غیر مفید ہوتین، اُسکی تمام عقل و دانش ایک مردہ زبان میں محفوظ ہوتی، جسکو صرف ایک مغرور مذہبی اجارہ دار

طبقہ بقیہ لوگوں میں تقسیم کرتا، اُسکے تمام علوم صدیوں کے پُرانے ارسطو، دلگیٹ (Vulgata) اور فاورتس (Fathers) کے مقدس صحیفے ہوتے جن میں کچھ اضافہ کرنا بغیر توضیح وتشریح ناممکن ہوتا۔ یہ ہے حالت ہندوستان کے آرین کی۔ عہد جاہلیت سے تو اسکو کوئی مشابہت نہیں ہے البتہ مغرب کی تہذیب کے دور وسطی سے اسے حیرت انگیز مشابہت ہے

مغربی اقوام پر رومہ کی حکومت کی مثال ایسی تھی جیسے جاہلیت پر تمدن کی حکومت ہو۔ اہل گال اور عبرانیوں کے درمیان رومہ کی حیثیت ایک چراغ ہدایت کی تھی، جسکی درخشندگی کو وہ تسلیم کرتے اور اس سے اکتساب نور کر کے ممنون ہوتے۔ ہندوستان پر انگلینڈ کی حکومت گویا عہد وسطی پر عہد حاضر کی حکومت ہے۔ وہ تنویر جو ہم لاتے ہیں کم حقیقی نہیں ہے البتہ شاید کم کشش رکھتی ہے اور کم احسانمندی کے ساتھ لی جاتی ہے۔ یہ روشنی تاریکی میں چمکنے والی درخشاں روشنی نہیں ہے بلکہ اسکی مثال ایسی ہے جیسے شام کی گرم اور پر شکوہ روشنی شفق میں دن کی قدرے ٹھنڈی روشنی داخل ہو جائے

بہت سے سیاحوں کا بیان ہے کہ ایک تعلیمیافتہ ہندو باوجودیکہ وہ ہماری طاقت کو تسلیم کرتا ہے، ہماری بنائی ہوئی ریلوں کو استعمال بھی کرتا ہے پھر بھی ہماری عزت وتعظیم کرنا تو درکنار ہم سے نہایت ہی سچے دل سے نفرت کرتا ہے یہ بالکل قدرتی ہے ہم ہندوؤں سے زیادہ عقلمند نہیں ہیں، ہمارا دماغ اُن سے زیادہ گران بہا اور اعلی نہیں ہے۔ ہم اُسکے سامنے، وحشیوں کی مانند، ایسے خیالات پیش کرکے جسکا اُسے وہم وگمان نہ ہو، اسکو حیرت زدہ نہیں کرسکتے۔ وہ اپنی نظموں میں سے ایسے خیالات پیش کرسکتا ہے جو ہمارے اعلی ترین خیالات کی ہمسری کرسکتے ہیں۔ ہمارے علوم میں بھی شاید بہت کم ایسے خیالات ہونگے جو اُسکے لئے بالکل جدید ہوں۔ ہم اسبات پر فخر نہیں کرسکتے کہ ہمارے پاس خیالات کا کافی ذخیرہ ہے یا ہمارے خیالات زیادہ اعلی ہیں البتہ ہمکو فخر ہے کہ ہمارے خیالات زیادہ پختہ اور کسوٹی پر پرکھے ہوئے ہیں۔ زمانہ وسطی یا زمانہ قدیم کے تمدن کے مقابلہ میں موجودہ تمدن کو اس وجہ سے فوقیت حاصل ہے کہ اسمیں صداقت مبرہن کا زیادہ ذخیرہ ہے اور اس لئے اسکی عملی طاقت بہت ہی زیادہ ہے۔ لیکن ایک شاعر مزاج یا معرفت کوش فلسفی ہرگز صداقت مبرہن کی عظمت کا قائل نہیں ہو سکتا۔ بلکہ وہ اسکو سطحی تصور کریگا، اسکی عملی کامیابیوں پر ناک بھوں چڑھائیگا اور اپنے غیر محدود و دور از کار قیاسات وتخیلات کی فراوانی پر وجد کریگا

ہم اہل یورپ اس امر پر بالکل متفق ہیں کہ وہ گنجینۂ صداقت جس پر مغربی تہذیب کی بنیاد ہے نہ صرف برہمنی تصوف سے بلکہ اُس روشن خیالی سے بھی جسکو قدیم سلطنت رومہ نے یورپین اقوام میں منتقل کیا، بہت زیادہ قیمتی ہے۔ لہذا ہمارا فیصلہ ہے کہ وہ صورت حالات جو اس وقت ہندوستان میں ایک فاتح قوم کے تمدن کی اشاعت سے پیدا ہے اپنی اہمیت اور دلچسپی میں اُس صورت حالات کے مساوی ہے جو رومن ایمپائر نے پیدا کی تھی۔ علاوہ ازیں یہ تجربہ مساوی طور پر وسیع پیمانہ پر ہو رہا ہے۔ بالعموم اس سلطنت کا اندازہ اس امر سے کیا جاتا ہے کہ باشندوں کی بہبودی پر اسکے فوری اثرات کیا ہیں۔ ایک کہتا ہے کہ اس نے قدیم الایام کی خرابیاں رفع کردی ہیں، دوسرا کہتا ہے اسنے نئی نئی خرابیاں پیدا کردی ہیں اس تمام بحث سے اُس مخصوص نوعیت کے کام کا پتہ چلتا ہے جو ہماری سلطنت کو کرنا پڑا ہے یعنی برہمنیت کے اندر یورپ کے تخیلات متعلق بہ کائنات کا

اختلال۔ اسوقت اتنا دلچسپ تجربہ کرۂ ارض کے کسی حصہ میں نہیں ہو رہا ہوگا۔ جب ہم خیال کرینگے کہ کسی قوم کو کوئی قابل یادگار کام انجام دینے کا موقع بہت شاذ ملتا ہے تو اس تجربہ کی ترقی سے ہماری دلچسپی بہت زیادہ بڑھ جائیگی اور ہم اُس مایوسی پر غالب آجائینگے جو قدرتاً ہم سے مطالبہ کرتی ہے کہ اس نمتائے ہوئے ملک ہیں، کھلے ہوئے سورج کے نیچے اس قدر محنت و شفقت سے ہمکو کیا نفع ملتا ہے

یہاں پر یہ امر قابل لحاظ ہے کہ ہمکو اس کام میں ایک بڑی سہولت کا فائدہ حاصل ہے۔ یہ اُسوقت واضح ہوتی ہے جب ہم اپنی سلطنت کا مقابلہ سلطنت رومہ سے کرتے ہیں۔ رومہ اپنی سلطنت کے قلب میں واقع تھا اسلئے ہر وقت ہکو چاروں طرف سے ردّ فعل کا اندیشہ لگا رہتا تھا۔ علاوہ بریں رومہ جملہ خطرات کیلئے کھلا ہوا تھا۔ برخلاف اسکے انگلینڈ اپنی سلطنت سے بالکل الگ تھلگ ہے اُسے ردفعل کا مطلق اندیشہ نہیں ہے

تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ وہ سلطنت ہی کا بھوت تھا جس نے رومہ کی آزادی کو تباہ کیا۔ وہ تمام شہری جمعیتیں جنھوں نے رومہ کی عظمت کی آبیاری کی تھی اور جنکا مرہون منت رومہ اپنی اُس ساری تہذیب کیلئے تھا جسے اُسنے بلاد مغرب کو منتقل کیا، چھوڑ دینا پڑیں اور رومہ کو اپنے لئے نسبتہً ایک ادنی نظام اختیار کرنا پڑا جب اُسنے اپنی تہذیب منتقل کی تو یہ انحطاط پذیر تھی۔ سلطنت کے ایک بڑے حصہ میں خود رومہ کی زبان یونانی سے مغلوب تھی۔ یہاں تک کہ شہنشاہ ایم اوریلیس نے (Meditations) M. Aurelius خود اپنا (تخیلات) یونانی زبان میں تصنیف کیا۔ رومن مذہب بجائے اپنے متبعین پیدا کرنے کے آخر میں ایک دوسرے مذہب سے مغلوب ہو گیا جو سلطنت رومہ کے ایک دور افتادہ صوبہ میں پیدا ہوا تھا۔ ایک زمانہ ایسا آیا جب تمام رومن خیالات و جذبات مردہ ہوگئے اور شہنشاہان رومہ شاہان مشرق کی طرح صرف تاج شاہی پہننے کے لئے رہ گئے۔ ہمکو اب علم ہوا ہے کہ درحقیقت یہ صورت نہیں تھی بلکہ رومن روایات و اثرات صدیوں تک یورپ کے دماغ پر مستولی رہے۔ لیکن یہ استیلا کچھ عرصہ تک پوشیدہ طریقہ سے قانون اور کیتھولک اصول کی شکل میں کارفرما رہا اور پھر آگے چلکر ادب و فنون کی تعمیر میں۔ خیال کرو وہ شہر جو یورپین تہذیب کی ماں ہے اگر بجائے اپنی شاگرد اقوام کے درمیان واقع ہونے اُنکی باہمی نزاع دہنگامہ آرائیوں سے پریشاں ہوتے اور انکو تہذیب سکھا کر الٹے ہاتھوں غیر شائستگی مول لینے کے بالکل الگ تھلگ واقع ہوتا، آزادی کے ساتھ اپنی خوشحالی سے بہرہ ور ہوتا اور خود اپنی تہذیب کو زیادہ انہماک و مستعدی سے ترقی دیتا، اپنی محکوم اقوام کی ہدایت میں پھنس نہ جاتا، تو آج یورپ کی تاریخ جدید کس قدر مختلف ہوتی

اس لحاظ سے رومن سلطنت ایک مخصوص حیثیت رکھتی تھی کیونکہ بمقابلہ مفتوحہ سلطنت کے فاتح قوت نہایت ہی حقیر تھی۔ گویا روشنی بجائے ایک ملک سے خارج ہونے کے ایک شہر سے خارج ہوتی تھی جو ایسی روشن قندیل نہیں تھی جس میں کافی مقدار میں روشنی جمع ہو۔ جمہوریت رومہ کے اندر خاصکر شہری جمعیتیں تھیں چنانچہ جب اٹلی ہی کے اندر اس جمہوریت کو وسعت دیگئی تو اسکی شکست شروع ہو گئی۔ لیکن جہاں فاتح قوت وسیع بنیاد پر ہوتی ہے تو فتح کی کشمکش سے اُسکی صورت

عام طور سے بدل جاتی ہے۔ فتح کیلئے جنگ لازمی ہوتی ہے اور پھر اُسکے قیام کیلئے انتظام کی۔ اور ان دونوں باتوں کے لئے جدید طرز حکومت اور مستحکم مالی حالت لازمی ہیں۔ ہندوستان میں سلطنت انگلینڈ کی سب سے بے نظیر خصوصیت یہ ہے کہ ہندوستان اور انگلینڈ کا رشتہ اتحاد بالکل ہی بے حقیقت ہے۔ بالفاظ دیگر انگلینڈ ہندوستان کے ردعمل کی زد سے باہر ہے۔ میں بیان کر چکا ہوں یہ صورت کیونکر پیدا ہوئی۔ میں نے واضح کیا ہے کہ ہم نے ہندوستان کو اس طرح حاصل کیا کہ ہمکو کوئی قیمت اسکی نہیں دینا پڑی۔ انگلینڈ اگر ایک ریاست کی حیثیت سے سلطنت مغلیہ کو تہ و بالا کرنے پر کمربستہ ہوتا تو خود اسکا نظام اسی طرح تباہ ہو جاتا جسطرح رومہ کا فتح یورپ کی سعی میں ہوگیا۔ کیونکہ اس صورت میں انگلینڈ کیلئے ازبس ضروری ہوتا کہ وہ اپنے کو ایک اعلیٰ درجہ کی فوجی سلطنت میں تبدیل کرے لیکن چونکہ سلطنت ہند چند انگریزوں نے بدامنی کے زمانہ میں وہاں کے حالات پر قابو حاصل کرکے قائم کی اور اُنسے انگلینڈ کو ورثہ میں ملی اسوجہ سے اُس کے خانگی معاملات میں زیادہ گڑبڑی نہیں ہوی۔ اسمیں شک نہیں کہ اسکی بدولت انگلینڈ کی خارجی حکمت عملی میں ایک حد تک تبدیلی پیدا ہوگئی ہے لیکن خود انگلینڈ کی اندرونی حالت میں کوئی تغیر نہیں پیدا ہوا۔ اس معنی میں ہندوستان، انگلینڈ پر اتنا ہی کم اثر انداز ہوتا ہے جتنا وہ نئی سلطنتیں جنکا حال ہی میں الحاق ہوا ہے۔ مثلاً ہنے ور (Hanover) اور ہالینڈ (Holland) اس مثال میں تمدن اعلیٰ کا اثر تمدن ادنیٰ پر زوردار اور مسلسل پڑتا ہے لیکن یہ بات رومن یا یونانی سلطنت کو مشرق میں نہیں حاصل تھی۔ اُن صورتوں میں تمدن ادنیٰ نے تمدن اعلیٰ کو جوں ہی اسنے اول الذکر کو اپنی سطح پر لانا چاہا فنا کر دیا۔ یونانیت نے مشرق کو ڈھک لیا لیکن خود یونان کی عظمت ہمیشہ کیلیے رخصت ہوگئی۔ تمام قومیں رومن شہریت میں جوق درجوق شامل ہوئیں لیکن اصلی رومنوں کا کیا حشر ہوا۔ برخلاف اسکے انگلینڈ اس جوہر کی کمی سے جو ہیں سے نکل جاتا ہے مطلق ضعیف نہیں ہوتا۔ وہ ہندوستان کو عہد وسطی سے نکال کر عہد جدید میں لانا چاہتا ہے۔ اس کام میں اُسکو دقتوں اور خطروں کا سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن انگلینڈ کو اس بات کا مطلق اندیشہ نہیں ہے کہ ہندوستان اسکو نیچی سطح پر کھینچ لائیگا یا ایک لمحہ کیلئے اُسکی ذاتی ترقی میں حارج ہوگا۔

یہ ہے انجام لیکن ایک عرصہ تک کسی کو یقین نہیں تھا کہ اس انجام کی نوعیت یہ ہوگی۔ برطانوی ہند کی تاریخ میں دو باب نہایت دلچسپ ہیں بلکہ میرا تو خیال ہے کہ ساری دنیا کی تاریخ میں ان سے زیادہ سبق آموز کوئی باب نہیں ہوگا۔ پہلا باب، ہمکو بتاتا ہے کہ کس طرح ہندوستان کی طرف سے انگلینڈ کو مضرت رسان ردعمل سے محفوظ رکھا گیا اور دوسرا یہ کہ کس طرح بہت پس وپیش کے بعد قصداً یورپین تہذیب کا بار ہندوستان کے سینہ پر ڈالا گیا۔ پہلا باب جارج سوم کے عہد نصف اول پر حاوی ہے۔ یہ زمانہ تاریخ انگلینڈ میں نہایت ہی پرآشوب اور غیر مستقل تھا کیونکہ اُسی وقت ایک طرف امریکہ ہاتھ سے گیا اور دوسری طرف ہندوستان ہاتھ آیا۔ اسمیں کلایو اور ہسٹنگز کا عہد داخل ہے۔ اسکے آخر میں لارڈ کار نوالس کا عہد حکومت ممتاز ہے جو ۱۷۸۵ء سے شروع ہوا۔ دوسرا باب موجودہ صدی کے ابتدائی چالیس سالوں پر حاوی ہے اور

اس عہد کا ممتاز اور آخری نقطہ لارڈ ولیم بنٹنگ کی گورنر جنرلی ہے - کیونکہ ہندوستان میں لارڈ کارنواس اور لارڈ ولیم بنٹنگ دو ہی اعلی درجہ کی قانون ساز ہستیاں گذری ہیں جس طرح کہ کلایو کے بعد لارڈ ولزلی - لارڈ ہسٹنگز - اور لارڈ لہوزی تین بڑے بڑے فاتح گذرے - چونکہ ہندوستان میں ہم تمدن کی رفتار ترقی پر غور کرتے ہیں یہ دو بڑی قانون ساز ہستیاں ہماری کمال توجہ کی مستحق ہیں

پہلے ہمکو دیکھنا چاہئے کہ شروع میں کس طرح ہندوستان کی جانب سے ردعمل کا خطرہ پیدا ہوا اور پھر کس طرح اسکا دفعیہ کیا گیا - اٹھارھویں صدی کے ۸۰ و ۹۰ کی تمام تحریروں میں وہ خوف نہایت ہی دہشتناک ہے جسکا اظہار برک نے وارن ہسٹنگز کے خلاف اپنی تقریروں میں کیا تھا - اسوقت انگلینڈ ہند و سیاست کے غار عمیق میں کو دپڑا تھا - اسوقت انگریز مسلمان نوابوں کے وزیر مال یا نوابی فوجوں کے سپہ سالار مقرر ہوتے تھے اور انگلینڈ میں سلطنت مغلیہ کا مال غنیمت لالا کر بھر رہے تھے - اُسوقت ہمارے لئے دو خطرات تھے ایک تو یہ کہ مبادا انگریزی عادات خراب ہو جائیں کیونکہ وہ لوگ بھی جو ہند و عادات کے مداح ہیں یہ تسلیم کرینگے کہ گذشتہ صدی میں ہند و سیاست نہایت ہی ناگفتہ بہ اور مذموم تھی - اور دوسرا خطرہ یہ تھا کہ وہ مالدار اور اولو العزم اشخاص جو ہندوستان سے لوٹ کر ایشیائی خیالات ساتھ لیکر انگریزی سیاسی زندگی میں داخل ہوتے تھے، مبادا اُسکے نظام ترکیبی کو درہم برہم کردیں - یہ خطرہ اسوقت خاص طور سے تھا کیونکہ اس زمانہ میں پارلیمنٹ کی بہت سی نشستیں ایک طور سے فروخت ہوتی تھیں - علاوہ ازیں اس وقت حکومت کی سب سے بڑی طاقت کا ذریعہ سیادت تھی - لہذا یہ اندیشہ رہتا تھا کہ ممکن ہے کوئی فریق ہندوستان کی سیادت پر نہ چھاپا مار بیٹھے اور یہ دولت ایسی تھی کہ جاہے بادشاہ کو ملتی یا وِگ پارٹی (Whig) کو اسکا پانے والا قوت اعلی کا مالک ہوجاتا

اس خطرہ کا ایک نمونہ دینے کے خیال سے جو اُسوقت کے سربرآوردہ اشخاص کو لاحق تھا میں تمھارے سامنے ایک پارہ ولیم پٹ (Pitt) کی اس تحریک سے پڑھکر سناؤنگا جو اُسنے اصلاح پارلیمنٹ کی غرض سے ۱۷۸۲ء میں پیش کی تھی - وہ کہتا ہے "ہمارے قوانین میں بخیال رقابت یہ قاعدہ ہے کہ کوئی غیر ملکی شخص پارلیمنٹ کے نمایندہ کو ایک ووٹ نہ دے - لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ غیر ملکی والیان ریاست نہ صرف ووٹ دیتے ہیں بلکہ پارلیمنٹ کی نشستیں خریدتے ہیں، اور اپنے ایجنٹوں کو بحیثیت نمائندہ قوم ہمارے برابر بیٹھنے کیلئے بھیجتے ہیں - میں جس امر کی طرف اشارہ کررہا ہوں اُسکے سمجھنے میں کسی کو دقت نہیں ہوگی - ہمارے درمیان راجہ تنجور اور نواب ارکاٹ کے ممبران بیٹھے ہوئے ہیں جو چھوٹے چھوٹے مشرقی مستبد حکمرانوں کے نمائندے ہیں - یہ بات اب عام طور سے مشہور ہے لوگ کھلے میدان اسکا تذکرہ کرتے ہیں لیکن لاپرداہی سے کوئی انکی طرف توجہ نہیں کرتا - ہماری بے عزتی روز روشن کی طرح نمایاں ہے - اب تو یہ اسقدر عام بات ہوگئی ہے کہ کسی کو اسپر مطلق حیرت نہیں ہوتی - اب یہ ایک معمولی بات سمجھی جاتی ہے کہ چند برطانوی رائے دہندگان نے اپنے ووٹ بے ایمانی سے رشوت لیکر غیر ملکی حکومتوں کے ہاتھ فروخت کردئے یا یہ کہ ہمارے سینٹ کے بعض ممبران کسی غیر ملکی مستبد کے اختیار میں ہیں، اور یہ کہ ہمارے مبعوثین طانوی

اوصاف حمیدہ کے نہیں بلکہ مشرق کے ذمائم اور بدکاریوں کے نمائندے ہیں

اس کشاکش کے قابلِ ذکر واقعات یہ ہیں، فاکس (۱۷۸۳) کے انڈیا بل پر کولیشن منسٹری کی شکست، اور پٹ (۱۷۸۴) کے انڈیا بل کا منظور ہونا، وارن ہسٹنگز پر مقدمہ چلایا جانا لارڈ کارنوالس کا اسکی جگہ گورنر جنرل ہونا اور ہندوستان میں اسکا انتظامی اصلاح جاری کرنا۔ میں صرف ان واقعات کی طرف اشارہ کر رہا ہوں تاکہ انکی اہمیت کا اندازہ ہوجائے اور معلوم ہوجائے کہ اُن سے کیسے کیسے نتائج رونما ہوئے۔ اگر میں تفصیل میں جاتا تو تمکو دکھا سکتا تھا کہ فاکس کے انڈیا بل پر جو اسقدر شور شغب مچایا گیا اور ہسٹنگز کے خلاف جو اسقدر شدید حملے کئے گئے ان میں کس حد تک نامعقولیت تھی۔ میں اُس دوگانہ حکمت عملی پر بھی اعتراض کرسکتا تھا جو پٹ کے انڈیا بل نے ہندوستان میں جاری کی لیکن اگر وسعت نظر سے دیکھا جائے تو یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ خاص خاص خطرات سے کامیابی کیساتھ نجات مل گئی اور لارڈ کارنوالس نے خراج احسانمندی اور اڈمنڈ برک نے عزت و آرام حاصل کیا۔ کیونکہ لارڈ کارنوالس کے عہد حکومت میں کمپنی کے دامن سے بداخلاقی کا دھبہ جادو کی طرح دور ہوگیا، گورنر جنرلوں کو ایک کبھی نہ فراموش کرنے والا سبق سکھا دیا گیا اور ساتھ ہی ساتھ ہندوستان کے تعلق سے جو سیاسی خطرہ تھا وہ گذر گیا

انگلینڈ نے ان زنجیروں کو جنسے اُسے مقید ہونے کا خطرہ تھا توڑ دیا۔ یہانپر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انگلینڈ جس نے اس سختی کیساتھ ہندوستان کا اثر قبول کرنے سے انکار کردیا، ہندوستان پر اپنا اثر ڈالنے میں کہانتک حق بجانب تھا۔ ہم اچھی طرح سے محسوس کرتے تھے کہ ہماری اور ہندوستان کی تہذیب میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ ہماری تہذیب کو بحیثیت مجموعی ترجیح حاصل تھی، لیکن کیا ہمکو ہندوستانیوں سے اپنے خیالات منوانے کا کوئی حق تھا۔ ہمارا مذہب، فلسفہ، تاریخ اور سب کچھ مختلف تھا۔ کیا۔ کیا ہندوستانیوں کے ساتھ ہمارا صریح معاہدہ نہیں تھا کہ یہ تمام چیزیں ہم سرکاری طور سے اُن سے علیحدہ رکھینگے۔ شروع شروع میں لوگوں کا یہی خیال تھا۔ یہ عام طور سے مسلمہ تھا کہ انگلینڈ اپنی سلطنت کیساتھ وہ کھیل نہیں کھیلیگا جو روما نے کھیلا تھا۔ نہیں بلکہ اسے اپنی تہذیب ایک طرف رکھکر ہندوستان پر ہندوستانی نقطہ خیال ہی سے حکومت کرنا چاہئے تھا۔ جوں جوں پہلی نسل کے اینگلو انڈینوں پر علم سنسکرت کی جدید اور موہوم دنیا کھلتی جاتی تھی ان کے اندر یہ خیال تقویت حاصل کرتا جاتا تھا۔ وہ ایک قدیم فلسفہ اور خیالی تاریخ سے مسحور ہوگئے تھے، گویا ایک طرح وہ برہمنیت میں داخل ہوگئے تھے، اور نہیں چاہتے تھے کہ اپنی مسحور مشرقی چہاردیواری کے اندر عیسائیت یا کسی اور مغربی علوم کو داخل ہونے دیں

اس لکچر میں اب اتنی گنجائش نہیں کہ اجمال سے بڑھکر میں تفصیل میں پڑوں۔ صرف اتنا اشارہ کرنا کافی ہوگا کہ کیونکر بتدریج ہم اس خیال کو چھوڑتے گئے اور بلاخوف اپنے کو بحیثیت اوستادان تہذیب "اور" متمدن گر" پیش کردیا یہ تبدیلی ۱۸۱۳ء میں شروع ہوئی جب کمپنی کے عہدنامہ کی تجدید کیوقت ایک رقم قدیم علوم کے احیاء اور کارآمد فنون و علوم جدید کے اجراء کے لئے منظور ہوئی۔ اس قانون پر ایک تعلیمی کمیٹی ۲۰ برس تک بحث کرتی رہی کہ آیا علوم و فنون کو مشرقی نقطہ خیال سے ہمیں سمجھنا چاہئے تھا یا اپنے معتقدات کی روشنی میں

آیا ہمکو سنسکرت اور عربی کی تعلیم دینا چاہئے تھی یا انگریزی کی

روے زمین پر اس سے زیادہ اہم مسئلہ پر کبھی بحث نہیں ہوی ہوگی۔ ۱۸۳۵ء میں لارڈ ولیم بنٹنگ کے عہد حکومت میں یہ بحث زوروں پر تھی، اُسوقت حسن اتفاق سے ایک ایسا مشہور شخص موجود تھا جسکی وجہ سے اس قابل یادگار بحث کو بڑی آب وتاب حاصل ہوی۔ یہ لارڈ میکولے کی رائے تھی جس نے کہ اس بحث کا انگریزی کے حق میں فیصلہ کیا۔ میکولے کی اس یادداشت میں یا سر سی۔ ٹرے ولین ([illegible]) کی کتاب " ہندوستان میں مسئلہ تعلیم" میں تم اس بحث کو بخوبی دیکھ سکتے ہو۔ تم دیکھوگے کہ اس بحث میں ایک عجیب غلطی سرزد ہوی۔ اس مسئلہ پر اس نقطہ نظر سے بحث ہوئی گویا ایک طرف عربی اور سنسکرت اور دوسری طرف انگریزی میں انتخاب کرنا تھا یہ تمام زبانیں عام آبادی کیلئے یکساں غیر مانوس ہیں۔ عربی اور انگریزی تو غیر ملکی ہی تھیں لیکن سنسکرت بھی ہندؤں کیلئے وہی حیثیت رکھتی تھی جو یورپ کے باشندوں کے لئے لاطینی۔ اسی سے تمام خاص خاص مروجہ زبانیں نکلی ہیں لیکن خود یہ مردہ ہے، اور لاطینی سے زیادہ عرصہ سے مردہ ہے کیونکہ تیسری صدی قبل مسیح میں اسکا شمار مستعمل زبانوں میں نہیں تھا۔ سنسکرت کی نظموں، فلسفیانہ اور مذہبی کتب کے بیشتر حصہ سے بڑی تصنع اور آورد کی بو آتی ہے۔ ٹھیک اس طرح لاطینی زبان کی ([illegible]) اور ([illegible]) کی منظومات ہے۔ میکولے کو سنسکرت پر آسانی سے فتح حاصل ہوگئی کیونکہ یہاں پر اسکو محض یہ ثابت کرنا تھا کہ انگریزی کی نظمیں سنسکرت کی نظموں سے کسی طرح ادنی نہیں ہیں اور اول الذکر کا فلسفہ، تاریخ اور سائنس تو سنسکرت سے کہیں ترقی یافتہ ہے۔ لیکن سوال یہ ہوتا ہے کہ انتخاب صرف مردہ زبانوں سے کیوں کیا گیا۔ کیا لارڈ میکولے کا خیال تھا کہ ۲۵ کروڑ اہل ایشیا کو انگریزی سکھانا آسان کام ہے؟ غالباً نہیں بلکہ قوی گمان یہ ہے کہ اُسنے سوچا کہ محض ایک مختصر سی تعلیم یافتہ جماعت پیدا کیجائے۔ میرا بھی خیال ہے کہ میکولے کی کلاسکل زبانوں کی تعلیم نے اُسکے اندر یقین پیدا کردیا تھا کہ مردہ زبان تعلیم کے لئے ضروری ہے لیکن واقعی اگر ہندوستان کو روشن دماغ بنانا ہے تو یہ مقصد نہ تو سنسکرت سے حاصل ہوسکتا ہے اور نہ انگریزی سے، بلکہ اُسکی دیسی زبانوں سے جیسے ہندستانی ہندی، بنگالی وغیرہ۔ میکولے نے کسی مبہم خیال کی وجہ سے اِن زبانوں کو اس قدر ناملائم سمجھا کہ اُنکو فلسفہ اور علوم کا ذریعہ بنانا مناسب نہیں سمجھا، اگر وہ انگریزی کے مقابلہ میں اِن زبانوں کے خلاف اپنے دلائل پیش کرتا تو یقیناً ناکام رہتا

اگرچہ یہ عظیم غلطی ہوگی۔ البتہ ۱۸۵۴ء میں سر چارلس وُڈ کی تعلیمی کمیشن کی سفارشات کے بعد سے قدرے اسکی تلافی ہوچکی ہے، لیکن جس فیصلہ کی طرف لارڈ میکولے کی یادداشت نے رہنمائی کی وہ ہماری سلطنت کی تاریخ کا کا درخشاں واقعہ ہے خصوصاً اس لحاظ سے کہ ہماری سلطنت ایک انجمن تہذیب ہے۔ یہ واقعہ اس زمانہ کی یاد دلاتا ہے جب ہم نے قصداً اپنے تئیں مکلف کرلیا کہ ایشیا میں ہمارے اوپر ایک ایسا فرض عائد ہوگیا جیسا روما نے یورپ میں اپنے ذمہ لیا تھا، اور یہ فرض اِن تمام فرائض سے جنکی انجام دہی کسی حکومت کے سر پڑ سکتی ہے زیادہ اہم ہے

(ترجمہ) عبدالقیوم رسا

ازدواج مکرر

(افسانہ)

(بہ سلسلۂ ماسبق)

(۴)

صفیہ کو آئے ہوئے تقریباً ایک ماہ کا زمانہ گزر چکا ہے اور اس دوران میں کوئی ایسا واقعہ ذکی اور صفیہ کی زندگی میں پیش نہیں آیا، جسے کوئی خاص اہمیت دیجائے۔ صفیہ کو گھر کے انتظام، اور اُن نسوانی مصروفیتوں سے جو شادی کے بعد ایک عورت کا محبوب ترین مشغلہ ہوجاتے ہیں، اتنی فرصت ہی نہیں ملتی کہ وہ ذکی کے ادبی وعلمی انہاک پر غور کرکے اپنے آپ کو اس میں حصہ لینے کے قابل بنائے اور نہ ذکی کو تحریر ومطالعہ اس امر کی اجازت دیتے ہیں کہ بیوی سے اس موضوع پر کوئی گفتگو کرسکے

گھر کی فضا اس وقت یہ ہے کہ ذکی بظاہر اپنی جگہ مطمئن ہے کہ صفیہ تعلیم یافتہ ہو یا نہ ہو لیکن بیوی ضرور ہے اور صفیہ بھی اپنی جگہ اس خیال سے خوش ہے کہ ذکی لاکھ آزاد خیال سہی لیکن صحیح معنی میں شوہر وانسان ہے

جب صفیہ میکہ سے واپس آئی تو اُسے خیال تھا کہ شاید ذکی پھر اُس بحث کو چھیڑے گا اور ممکن ہے کہ اس کا جہل یا غیر تعلیم یافتہ ہونا پھر کس وقت ذکی کی کبیدگی کا باعث ہو، لیکن اس ایک مہینے میں ایک بار بھی ذکی نے اس کا ذکر نہیں کیا اور تمام وہ التفات جسکی توقع ایک مرد کی طرف سے عورت کو ہوسکتی ہے اسپر صرف کئے گئے، ہرچند وہ اس کو ضرور محسوس کرتی تھی کہ ذکی جب گھر میں آتا ہے تو کوئی خاص موضوع گفتگو کا اُسکے پاس نہیں ہوتا اور زیادہ حصہ یا تو خاموشی میں بسر ہوتا ہے یا پھر کتابوں کے مطالعہ میں لیکن چونکہ اس انداز میں وہ کسی نوع کی نفرت نہیں پاتی تھی اس لئے اُسے کوئی شکایت بھی نہ تھی۔ فرصت کے اوقات میں وہ اس امر کی کوشش کرتی تھی کہ اپنے اندر ادبی ذوق پیدا کرے، لیکن جہاں اُسنے کسی نظم کی کتاب یا کوئی دیوان اُٹھاکر دیکھا اور اس کو وحشت ہوئی وہ ایک مصرعہ بھی موزون نہ پڑھ سکتی تھی اور قطعاً اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ایک شریف مرد یا عورت ایک غزل کا مطالعہ کیونکر کرسکتا ہے جبکہ اس میں اسقدر بےحجابانہ اور شرم انگیز طور پر محبت کا اظہار کیا جاتا ہے۔

اسنے بارہا الماری سے داغ وغیرہ کا دیوان نکال کر دیکھنے کی کوشش کی اور باوجود تنافر کے اسنے جبر کرکے اس کو سمجھنا بھی چاہا لیکن کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اسنے کسی شعر پر غور کیا ہو اور آخرکار اسنے منفعلانہ انداز سے اُسے بند کرکے نہ رکھدیا ہو۔ اس لئے بظاہر اس کو کوئی امید نہ تھی کہ وہ اب یہ کسی وقت اپنے ادیب وشاعر شوہر کے ذوق ادب کی ہم آہنگ ہوسکے گی بلکہ بعض اوقات وہ ذکی کے جانب سے بھی یکسر استفسار واستفہام ہوجاتی تھی کہ وہ شخص جو شاعری کا اسقدر دلدادہ ہو کیونکر اس کے چال چلن کی طرف سے اطمینان ہوسکتا ہے

ذکی کی زندگی ہرچند گھر کے اندر نہایت ہی سادہ معلوم ہوتی تھی لیکن اس کی یہی سادگی باہر جاکر "پُرکاری" میں تبدیل ہوجاتی اور اس کے وقت کا اکثر حصہ اپنے احباب کو اس امر کے یقین دلانے میں بسر ہوجاتا تھا کہ اس کی بیوی بے مثل ادیب وشاعرہ ہے۔ وہ پہلے ہی فیصلہ کرچکا تھا کہ اگر وہ خود براہ راست اپنی بیوی کی تعلیم یافتہ ہونے کے برکات ونعایم حاصل نہیں کرسکتا تو کم از کم وہ دنیا کو ضرور اس کا یقین دلاکر اپنی زندگی کو دوسروں کے نزدیک قابل رشک ثابت کریگا۔ چنانچہ وہ اب اپنے مضامین سے زیادہ اپنی بیوی ہی کے افکار نظم ونثر لوگون کو سنایا کرتا تھا اور جس وقت داد ملتی تھی تو وہ پھولا نہیں سماتا تھا۔ انسان جب اول اول اپنے آپ کو فریب میں مبتلا کرتا ہے تو کچھ عرصہ تک اس کو اس فریب کا احساس رہتا ہے، لیکن جب طبیعت اس کے عادی ہوجاتی ہے تو پھر یہ احساس بھی محو ہوجاتا ہے اور اس کو جھوٹی مسرت ولذت بھی اصلی وواقعی سی معلوم ہونے لگتی ہے۔

بالکل یہی حال ذکی کا تھا کہ وہ اپنی بیوی کے نام سے مضامین لکھ کر لوگون کو سناتا، رسایل میں شایع کراتا اور اُن کی داد ملتی تو وہ خود بھی یہ سمجھکر کہ واقعی اس کی بیوی کے یہ کارنامے ہیں، بہت خوش ہوتا اور ایسا محسوس کرتا کہ اس وقت ساری دنیا اس کے خوش بختی پر رشک کررہی ہے۔

صفیہ ان حالات سے ابتک بالکل بے خبر تھی کیونکہ ڈاک باہر ہی آتی تھی اور ذکی نے انتظام کردیا تھا کہ کوئی رسالہ خط یا اخبار اندر نہ جانے پائے۔ وہ چاہتا تھا کہ خود کسی وقت بیوی سے ذکر کرکے اس خلش کو بھی دور کردے لیکن چونکہ اس کا ضمیر اس باب میں گناہگار تھا اور صفیہ کے مزاج سے وہ خایف تھا کہ مبادا اس کو پسند نہ کرے اسلئے اس کو ہمت نہ ہوتی تھی

ایک دن صبح اسنے آرٹ پر ایک مضمون صفیہ کی طرف سے لکھا اور اس کو تمام اُن نزاکتون اور لطافتوں سے بھر دیا جنکی اس موضوع پر ایک عورت کی طرف سے توقع کیجاتی ہے۔ وہ بہت خوش تھا۔ اتنا خوش کہ بے اختیارانہ اس کو لئے ہوئے اندر چلا آیا اور اس عزم کے ساتھ کہ آج وہ صفیہ سے ذکر کرکے اس پردہ کو بھی اوٹھا دیگا۔ صفیہ تمام کامون سے فارغ ہوکر ایک رسالہ کے مطالعہ میں مصروف تھی اور ایک غزل کو موزوں پڑھنے کی کوشش کررہی تھی۔ ذکی کو آتا دیکھ کر اسنے رسالہ الٹ کر رکھدیا۔ لیکن ذکی نے آتے ہی فوراً رسالہ اُٹھا لیا اور اپنی بیوی کے ذوق میں یہ تبدیلی دیکھ کر اس کے ارادہ میں اور تقویت پیدا ہوگئی اسنے بیٹھتے ہی پورے لطف وانبساط کے ساتھ مسکراتے ہوئے دریافت کیا۔ "کھئے اس رسالہ میں آپ کو کوئی مضمون پسند آیا یا نہیں؟"

صفیہ نے جو بہت زیادہ بے تکلف ہوگئی تھی ہنستے ہوئے جواب دیا کہ " میں تو ایک غزل کو پڑھ رہی تھی اور غور کررہی تھی کہ شاعری میں وہ کیا بات ہے جس پر آپ لوگ اس قدر سر دُھنتے ہیں میں تو اس مشغلہ کو نہایت ہی شرمناک بات سمجھتی ہوں" اس عجیب وغریب تنقید کو سنکر ذکی ہنس پڑا اور بولا کہ " بتایئے وہ کونسی غزل ہے اور اسمیں کیا شرمناک بات ہے"

صفیہ۔ کسی ایک غزل پر کیا موقوف ہے، میں تو جب کسی شعر کو پڑھتی ہوں، یا تو وہ بالکل جھوٹ نظر آتا ہے یا بالکل فحش۔ کل میں نے کسی کتاب میں یہ شعر پڑھا:۔

چھوڑ دوں گا میں نہ بات چلے آؤ ساتھ ساتھ   نازک کلائی دکھتی ہے تو آستین سہی

میں سچ کہتی ہوں کہ شرم سے پانی پانی ہو گئی - لاحول ولا قوۃ - آپ لوگ کیونکر ایسی بیہودہ باتوں کو پسند کرتے ہیں"
ذکی بے اختیار ہنس پڑا اور بولا کہ " بالکل صحیح ہے ، میں خود بھی اس شاعری کو پسند نہیں کرتا ، لیکن سب شعرا ایسے تھوڑے ہی ہوتے ہیں" - اور صفیہ نے رسالہ لیکر ورق گردانی کی اور کہا کہ اچھا بتاؤ اس شعر میں کیا خرابی ہے :-

مرے صیاد سر گرداں سے اتنا کوئی کہدیتا   جہاں رُک جائے بجلی ہے وہ شاخ آشیاں میری

صفیہ " ماشاءاللہ ، کیا کہنا ہے - بجلی بھی کہیں کسی سے رُک سکی ہے اور فرض کرو اگر وہ چٹیل میدان میں کسی جگہ رُک جائے تو وہاں شاخ آشیاں کہاں سے آئے گی - اس کے علاوہ صیاد سے کہنے کا کیا سبب ہے کیا شاعر کوئی چڑیا ہے جس کو صیاد گرفتار کرنا چاہتا ہے اور ایسا ہو بھی تو چڑیا کہیں خود اپنا پتہ بتا سکتی ہے - الغرض مجھے تو اس میں جھوٹ ہی جھوٹ نظر آتا ہے - آپ بتائے اگر کوئی خاص بات اس میں ہو"

ذکی " میں خود تو کچھ نہیں بتا سکتا ، مگر کوشش کرونگا کہ تم کو خود ایسی جگہ لے آؤں جہاں تم اس قسم کا کوئی اعتراض نہ کرسکو - اچھا یہ شعر کیسا ہے :-

دل نے دنیا نئی بنا ڈالی   اور ہمیں آج تک خبر نہ ہوئی

صفیہ " اس شعر کا پہلا حصہ بالکل جھوٹ ہے - دل کوئی نئی دنیا نہیں بنا سکتا - اس دنیا کے اندر جو دنیا بن سکتی ہے وہ اسی دنیا کی ہوگی "

ذکی " اچھا یہ شعر کیسا ہے :-

ہے کوئی بات آج ہونے کو   جی بہت چاہتا ہے رونے کو

یہ شعر سنکر صفیہ کے جسم میں بے اختیار اک جھرجھری سی پیدا ہو گئی اور خاموش سر پکڑ کر بیٹھ گئی - چونکہ اس کے پہلے مصرعہ میں ایک نسائی اعتقاد کی جھلک موجود ہے اور دوسرے مصرعہ کی کیفیت اسپر ایک آدھ مرتبہ گزر چکی تھی اس لئے اسپر بہت اثر ہوا اور تھوڑی دیر بعد بولی کہ " وہ شعر جو انسان کو افسردہ کردے کس کام کا - رونے کے لئے آدمی کے پاس یونہی کیا کم اسباب موجود ہیں کہ اس میں شعر کا اضافہ کیا جائے - مہربانی کرکے اب کوئی شعر میرے سامنے اس طرح کا نہ پڑھئے - خدا جانے مجھے کیا کیا وہم پیدا ہونے لگتے ہیں " اُس کی آنکھوں میں تری جھلک آئی تھی اور اس کا چہرہ مضمحل سا معلوم ہوتا تھا "

ذکی دیر تک غور کرتا رہا اور اندر ہی اندر اس تجربہ سے بہت مسرور ہوا کیونکہ آج اسنے صفیہ کے حقیقی ذوق شعری کو معلوم کرلیا تھا اور اس کی مُردہ امیدوں میں از سر نو آثار حیات پیدا ہونے لگے تھے - وہ اس وقت تک یہی سمجھ رہا تھا کہ صفیہ بالکل بے حس ہے ، لیکن آج اسے معلوم ہوا کہ اس کے اندر شاعری کی نہایت لطیف و پاکیزہ حس موجود ہے اور اگر اس میں کوئی تحریک پیدا ہو جائے تو پوری قوت کے ساتھ بروئے کار آسکتی ہے اسنے جرأت کرکے پھر اس مسئلہ کو اُٹھایا اور بولا " میں نے آجتک

تم سے ایک بات چھپائی ہے، لیکن اب اس کا پوشیدہ رکھنا بیکار ہے۔ خفا نہ ہو تو کہوں"

صفیہ۔ یہ آپ نے کیا کہا میں آپ سے خفا ہو سکتی ہوں، عورت خفا ہونے کے لئے نہیں پیدا ہوئی بلکہ منانے کے دنیا میں آئی ہے؟ ذکی اُس کے اس عاشقانہ کیفیت رکھنے والے فقرہ سے بیتاب ہو گیا اور بولا "تم کو غالبًا وہ وقت یاد ہو جب تم نے مجھے خط لکھا تھا اور میں نے تمھیں تار دیکر فورًا طلب کیا تھا۔ تمھیں حیرت ہوگی کہ میں نے پھر کوئی ذکر تم سے نہیں کیا اور نہایت خاموشی کے ساتھ اتنا زمانہ بسر کر دیا

واقعہ یہ ہے کہ میری انتہائی مسرت کی صورت صرف یہی ہو سکتی تھی کہ تم شاعر ہوتیں، ادیب ہوتیں، تمھارے مضامین رسایل میں شایع ہوتے اور میں ان کی تعریف دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا، لیکن جب میں اس طرف سے مایوس ہوا میں نے ایک نمایشی اور غیر حقیقی مسرت پر قناعت کرنا مناسب سمجھا اور تمھاری طرف سے میں نے غزلیں، نظمیں، مضامین اور فسانے وغیرہ لکھ کر شایع کرائے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج ہندوستان کے ہر گوشہ میں تمھاری قابلیت و ذہانت کا ذکر ہو رہا ہے اور اس کثرت سے تمھارے نام تعریف کے خطوط آرہے ہیں کہ ایک بکس اُن سے بھر گیا ہے، تمھارا ادبی نام اپنے نام کی رعایت سے میں نے صفیہ ذکی رکھا ہے اور تمھیں نہیں معلوم کہ آج صفیہ ذکی کتنی شہرت و عزت کی مالک ہے"

صفیہ یہ سنکر سکتہ میں رہگئی اور ذکی کو اس طرح دیکھنے لگی گویا وہ کوئی اجنبی شخص ہے، غصہ و انفعال سے اس کے چہرہ پر نم آلود سُرخی دوڑ گئی تھی اور وہ ایسا محسوس کر رہی تھی کہ کسی بازار میں برہنہ کھڑی ہے اور لوگ اس کو دیکھ دیکھ کر قہقہہ لگا رہے ہیں۔ فرطِ تاثر سے اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور وہ ایسے غم و غصہ کے عالم میں جو کبھی انتہائی مایوسی کے عالم میں ہو جاتا ہے اس سے زیادہ نہ کہہ سکی کہ "آپ نے بڑا غضب کیا"

اب اس کا جسم تھر تھر کانپ رہا تھا، آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور ذکی جو کبھی اس نتیجہ کی توقع نہ کر سکتا تھا، حیرت و غم سے صفیہ کی اس حالت کا مطالعہ کر رہا تھا۔ جب کچھ دیر کے بعد صفیہ کا وہ اضطراب کم ہوا تو ذکی نے کہا کہ "یہ بات ایسی اہم تو نہ تھی کہ تمھیں اسقدر تکلیف ہوتی"

صفیہ۔ "میں پوچھتی ہوں کہ آپ کو اس سے کیا فایدہ ہوا۔ اگر واقعی میں ویسی ہوتی جیسی آپ چاہتے ہیں تو بھی اعلان بیکار سی بات تھی چہ جائیکہ بالکل خلاف واقعہ و حقیقت لوگوں کو اس کا یقین دلائیں۔ میں نہیں سمجھتی کہ اس سے زیادہ توہین میری اور کیا ہو سکتی ہے اور اس سے زیادہ رسوائی میری اور کیا ہو گی

میں حیران ہوں کہ وہ لوگ جو اپنی بیویوں کی قابلیت و ذہانت، خوش سلیقگی و تہذیب کا اعلان کرنا پسند کرتے ہیں وہ کس نتیجہ کو سامنے رکھ کر خوش ہونا چاہتے ہیں۔ اس جذبہ کا مدعا سوائے اس کے کچھ نہیں ہو سکتا کہ دنیا اُن کی طرف سے ایک خیال پسندیدگی و ستایش پیدا کرکے غائبانہ ان سے محبت کرے بے تکلف صحبتوں میں انکا ذکر کرکے غیر مہذب و ناشایستہ الفاظ سے یاد کرے اور موقعہ ہو تو خط و کتابت سے ان پر اپنی محبت کا اظہار کر کے اپنی طرف مایل کرلے آپ اگر

کسی چیز پر دنیا کو مبتلائے رشک کرنا چاہتے ہیں تو اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ آپ جانتے ہیں دنیا اس کے حصول کی خواہش کر رہی یا کر سکتی ہے۔ پھر جو آپ نے مجھ کو اس صورت سے دنیا پر ظاہر کیا تو کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ لوگ مجھ سے محبت کریں اظہار عشق کریں، میرے حصول کی خواہش اُن کے دلوں میں پیدا ہو اور آپ اُن کی ناکامی، نامرادی اور مایوسی کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوں۔ اگر میں واقعی ایسی ہوتی تو بھی ایک صورت تاویل کی پیدا ہو سکتی تھی، لیکن موجودہ حالت میں، آپ کا یہ جذبہ میرے نزدیک ایک غیر شریفانہ حرکت سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ (صفیہ کا غصہ بڑھتا جاتا تھا)۔ میں صرف اس وقت تک آپ کی بیوی رہ سکتی ہوں جب تک آپ اس تعلق کا احترام کریں، لیکن جب آپ مجھ سے کسی ایسے امر کی توقع کرینگے جو میرے اس تعلق کی توہین کرنے والا ہے تو میں انتہائی افسوس کے ساتھ آپ سے نافرمانی کرنے کی معصیت کو تو گوارا کر لونگی، لیکن آپ کو خوش کرنے کا ثواب حاصل کرنے کی ہمت مجھ میں کبھی نہ ہوگی۔ جس وقت میں اپنی اس رسوائی کا خیال کرتی ہوں تو شرم و غیرت سے زمین میں گڑھ جانا چاہتی ہوں۔ خدا جانے لوگ کیا سمجھتے ہونگے میری غزلوں کو دیکھ کر جن میں یقیناً آپ نے نہایت ناروا جذبات کا اظہار کیا ہوگا، میرے چال چلن کی طرف سے کسقدر مشتبہ ہو گئے ہونگے اور یقیناً ایسے خطوط بھی آپ کو ملے ہونگے جو کبھی آپ مجھے نہیں دکھا سکتے اور کسے خبر ہے کہ آپ نے میری طرف سے اُن کو کیا جواب دیا ہوگا اور ان کی جسارتیں کس حد تک بڑھ گئی ہونگی

میں نے آپ کو پہلے ہی لکھ دیا تھا کہ میں قطعاً آپ کے ادبی ذوق کو پورا نہیں کر سکتی اور میں آج کہتی ہوں کہ وہ عورتیں جو اپنے شوہروں کے اس ذوق کو پورا کرنے والی ہیں وہ سب کچھ ہو سکتی ہیں لیکن بیوی نہیں بن سکتیں اور اس لئے مجھے ایک لمحہ کے لئے اس امر کے اعتراف میں شرم نہ کرنا چاہئے کہ میں جاہل ہوں، غیر تعلیم یافتہ ہوں اور جس تہذیب و تعلیم کی جستجو آپ لوگ عورتوں میں کرتے ہیں اس کو میں اپنی انتہائی توہین خیال کرتی ہوں

خدا کے لئے بتائے کہ اب آپنے کیا سوچا ہے اور مجھے اس عذاب سے کیونکر نجات دلا سکتے ہیں" ذکی اس میں شک نہیں کہ نہایت سنجیدہ انسان تھا اور مشکل ہی سے اس کو غصہ آتا تھا، لیکن اس وقت صفیہ کی اس برہمی اور سخت تنقید سے وہ اس حد تک نادم ہو گیا تھا کہ چارۂ کار بغیر اس کے نہ رہگیا تھا کہ وہ اپنی شوہریت کے اقتدار سے کام لے اور غصہ کا جواب غصہ سے دے اس نے صفیہ کی گفتگو کو دفعتہً روک دیا اور بولا کہ "مہربانی کر کے مجھے درس نہ دیجئے اور خاموش رہئے۔ جو کچھ ہو چکا ہے اس کی تلافی امکان میں نہیں ہے اور نہ اس کی ضرورت، آیندہ بھی یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہیگا۔ آپ کی اگر اس میں توہین ہے تو ہو مجھے پرواہ نہیں کیونکہ صفیہ ذکی جس کے مضامین شایع ہو رہے ہیں وہ میری دوسری بیوی کا نام ہے اور اس کے متعلق آپ کو بولنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے

. . . .

گزشتہ واقعہ کو پندرہ روز ہو چکے ہیں اور اس دوران میں ذکی ایک مرتبہ بھی اندر نہیں آیا۔ سولھویں دن دوپہر کی

ڈاک سے بعض اخبار ورسایل آئے تو ان سب میں یہ اعلان اس کو نظر پڑا:-

"نہ میں شاعر ہوں نہ ادیب"

مجھے معلوم ہوا ہے کہ کچھ عرصہ سے بعض مضامین نظم ونثر میرے نام سے نکل رہے ہیں، اور دنیا کو غلط طور پر یہ یقین دلایا جارہا ہے کہ میں بڑی قابل وفاضل عورت ہوں۔ حالانکہ اس میں مطلق صحت کا شائبہ نہیں ہے۔ میں اس کو اپنی سخت توہین جانتی ہوں کہ کسی قسم کی کوئی تحریر میرے نام سے منسوب کیجائے اس حال میں کہ وہ میری نہیں ہے۔ نہ میں نے اس وقت تک کبھی کچھ لکھا اور نہ آیندہ اس کی توقع ہوسکتی ہے۔ میں بہت کم سواد معمولی پڑھی لکھی عورت ہوں اور شعر موزوں بھی نہیں پڑھ سکتی چہ جائیکہ خود تصنیف کروں۔ اس لئے میں اس تحریر کے ذریعہ سے پبلک کو آگاہ کرتی ہوں کہ آیندہ اس نام سے شایع ہونے والی تحریروں کو نہ مجھ سے منسوب کرے اور نہ مجھ سے خط وکتابت کرے صفیہ (اہلیہ مسٹر ذکی ....)

اس کے بعد ذکی اور صفیہ کے درمیان جو گفتگو ہوئی اس کی تفصیل بیکار ہے، مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ صفیہ کو اپنے گھر آجانا پڑا اور ذکی مجبور ہوگیا کہ اپنا غم وغصہ دور کرنے کے لئے کہیں باہر چلا جائے، ہرچند اس نے صفیہ کو طلاق نہیں دی تھی، لیکن جدائی بظاہر ہمیشہ کے لئے ہوگئی تھی اور دونوں اپنے مستقبل سے بے خبر حد درجہ غمزدہ زندگی بسر کرنے پر مجبور تھے۔

(باقی)

نیاز

آرٹ

روح کی پرواز ترقی کی طرف ہے لہذا اپنے تجربات کو کبھی دُہراتی نہیں بلکہ ہمیشہ کوشاں رہتی ہے کہ نئے اور زیادہ حسین وجمیل نقوش پیدا کرے - اگر عامتہ الناس کی طرح کاموں کی تقسیم اُنکے مقصد کو مدنظر رکھتے ہوئے مفید اور خوش آیند میں کیجائے تو اس قول کا اطلاق دونوں اقسام پر ہوگا - فنون لطیفہ کا منشا تخلیق ہے نہ کہ نقالی - کسی منظر کی مصوری میں صناع کی یہ کوشش ہونا چاہئے کہ اُس سے خوبصورت مرقع کھینچے جسکا ہمکو علم ہے - تفصیل یعنی فطرت کے تلون کو دباتا اور صرف روح اور اُسکی رعنائیاں دکھانا چاہئے

ہر صناع کو یاد رکھنا چاہئے کہ کوئی خاص منظر اُسکی نگاہ کے لئے ساماں نشاط اس لئے مہیا کرتا ہے کہ ایسے خیال کا ترجمان ہے جسکی وہ صناع قدر کرتا ہے - اور قدر اس لئے کرتا ہے کہ وہی طاقت جو اُسکی آنکھوں کے ذریعہ سے دیکھ رہی ہے اُس منظر میں بھی کارفرما ہے - ایسا ملکہ پیدا ہوجانے پر وہ بجائے فطرت کے فطرت کے انکشافات کا دلدادہ ہوجائیگا اور اپنی تیار کردہ فرد میں صرف وہی خیال وخط نمایاں اور مرتفع کریگا جنھون نے اُسکے دل میں خوشی کی لہر دوڑائی - ایک یہی صورت ہے کہ وہ نور سے کسب نور اور ظلمت سے اُسکے راز چھین سکتا ہے - کسی شخص کی تصویر بنانے میں اُسکے ناک نقشہ سے زیادہ اُسکی سیرت کی طرف توجہ کرنا چاہئے کیونکہ جو شخص سامنے بیٹھا ہے ایک ناقص تمثال اور دور کی شبیہ ہے اُس حوصلہ مند اصل کی جو پس پردہ ہے

تمام روحانی مصروفیت میں جو شانِ اختصاص وانتخاب پائی جاتی ہے وہ اسی جذبۂ تخلیق کا کرشمہ ہے - ایک پرتو ہے اُس الہام کا جو گہرے معانی کو سادہ الفاظ میں بیان کرنا سکھاتا ہے

انساں کیا ہے؟ خود نمائی میں فطرت کی شاندار کامیابی! انسان کیا ہے؟ ایک منظر جو زیادہ خوشنما اور زیادہ بلیغ ہے اُن مظاہر سے جو افق کی زینت ہیں - وہ فطرت کا نقطۂ انتخاب ہے! اسکی تفریر، اُسکا جذبۂ مصوری، اُسکی شیفتگیٔ فطرت کیا ہے؟ ایک بلند تر کامیابی!

تھکانے والے کالے کوس، فاصلہ اور ابعادِ ثلثہ کا بار گران دور ہوگیا اور اُنکا جو ہر یار کی موسیقی سے لبریز ایک لفظ یا نسل کی ایک پُرکار جنبش میں مقید کرلیا گیا!

لیکن صناع مجبور ہے کہ وہی نشانیاں استعمال کرے جو اُسکے عہد اور اُسکی قوم میں رائج ہیں تاکہ اُسکے ہم جنس اُسکا پیغام سمجھیں - یہی وجہ ہے کہ آرٹ میں جو کچھ جدید ہے اُسکا ماخذ قدیم ہے البتہ دورِ حاضر کی فطانت اپنی کبھی نہ مٹنے والی مُہر کردیتی ہے اور ایسی دلکشی بھرتی ہے جو ناقابل اظہار ہے اور جس سے صرف متخیلہ لذت اندوز ہوتا ہے - صناع جسقدر اپنے عصر کے روحانی خصوصیات سے مغلوب ہوگا اور اُنھیں اپنے مخلوقات میں نمایاں کریگا اُسی قدر اُسکے کارناموں کی عظمت دیرپا ہوگی اور آنے والے نقاد دل سے

سامنے نامعلوم و ناگزیر روحانی قوتوں کے مظاہر پیش کریگا۔ کوئی شخص اس عنصر احتیاج کو اپنی محنت سے علیحدہ نہیں کرسکتا۔ اپنے دَور اور اپنے ملک کے قیود سے آزاد نہیں ہوسکتا۔ نہ کوئی ایسا نمونہ پیش کرسکتا ہے جس میں اُس عہد کی تعلیم، مذہب، اقتصادیات، روایات اور علوم و فنون کا حصہ نہو۔ چاہے اُس میں کتنی ہی اُپج ہو، چاہے کتنا ہی خود مختار و آزاد رہو اُن خیالات کے نقش و نگار نہیں مٹ سکتا جن میں نشو و نما پائی۔ ایسا احتراز ہی اُس رواج کی چغلی کھائیگا جس سے بچنا چاہتا ہے۔ وہ اپنی مرضی کے خلاف اور بلاارادہ اُس فضا سے مجبور ہے جس میں سانس لیتا ہے اُن تخیلات سے متاثر ہونا لابد ہے جو اُسکے اور اُسکے معاصرین کے مایۂ حیات و حاصل سعی ہیں۔ وہ اپنے زمانہ کے خصوصیات کا علمبردار ہوتا ہے اگرچہ واقف نہیں ہوتا کہ وہ خصوصیات کیا ہیں۔ کسی عمل کا وہ حصہ جو فطرتاً ترتیب پاتا ہے ہمیشہ اور ہرحال میں اُس حصہ سے زیادہ دلکش ہوتا ہے جس میں انفرادی ذہانت گُل کھلا رہی ہو کیونکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک دیو کا ہاتھ صناع کے قلم یا چھینی کو تاریخ نسل انسانی میں ایک سطر کے اضافہ کی رہبری کررہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مصری و ہندی و چینی مورتیں خواہ کیسی ہی بھدی اور بدشکل ہوں اہمیت رکھتی ہیں۔ اُن سے پتہ چلتا ہے کہ اُس دور خاص میں روح انسانی کی اعلیٰ ترین تحریک کیا تھی۔ وہ خیالی تصویریں نہیں ہیں بلکہ وہی گہری ضرورت جو تکوین عالم کا موجب ہوئی اُنکی بھی موجد ہے

شاید اسکے بعد یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ تمام فنون لطیفہ کی اہمیت کا راز اس میں مضمر ہے کہ وہ مکمل تاریخیں اور خوبصورت یادگاریں ہیں نقاش ازل کے ساختہ مرقع قضا و قدر کی جس کے اشارہ پر ہر شئے اپنی قسمت کی تکمیل کو منزل کی طرف قدم بڑھا رہی ہے

تاریخی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو فنون لطیفہ کا منصب ادراک حسن ہے۔ ہم بحر حسن میں غرق ہیں لیکن آنکھوں کو اُسکا جلوہ صاف نظر نہیں آتا۔ ضرورت ہے کہ اُسکے خصوصیات کو فرداً فرداً نمایاں کیا جائے تاکہ ہمارا سویا ہوا وجدان جاگ اُٹھے اور صحیح راستے پر لگایا جائے۔ جب ہم بت تراشی یا مصوری کرتے یا ان فنون کے نمونے دیکھتے ہیں تو ہماری حالت ایسے طالبعلم کی ہوتی ہے جو محض ترتیب و ساخت کی لطافتوں کا مطالعہ کرتا ہو۔ حالانکہ کمال فن تحلیل میں ہے۔ کسی شئی کو اُسکے پریشان کُن ملحقات سے علیحدہ کرنا۔ جب تک ایک چیز دوسری چیزوں کے استعمال سے پاک نہ کیجائے ہم اُس سے لطف اُٹھا سکتے ہیں اُسکا تصور کرسکتے ہیں لیکن اُسکا صحیح اندازہ نہیں ہوتا نہ اس نہج سے ہماری شادمانی والم کا کچھ ماحصل ہوتا ہے۔ شیرخوار بچہ اطمینان سے خاموش پڑا رہتا ہے لیکن اُسکے ذاتی کردار اور اُسکی عملی قوت کا انحصار اس طرح روزانہ ترقی کرنے میں ہے کہ ایک شئی کو دوسری شئی سے جدا کرے اور ایک وقت میں ایک ہی شئی سے سروکار رکھے۔ محبت اور دیگر جذبات کا تقاضا ہوتا ہے کہ تمام زندگی ایک ہی ذات سے وابستہ کردیجائے۔ بعض طبائع کا خاصہ ہے کہ اپنی پوری توجہ بغیر کسی استثنا کے ایک وقت میں ایک ہی شئی یا ایک ہی خیال یا ایک ہی نقطہ کے لئے وقف کرکے اُسی کو دنیا بھر کا وکیل یا مشیر بنا دیتے ہیں۔ یہی لوگ صناع یا مقرر یا سوسائٹی کے پیشوا ہیں علیحدہ کرنا اور علیحدہ کرکے توسیع کی قدرت اُس طلاقت لسانی کا جوہر ہے مقرر یا شاعر جسکا مالک ہوتا ہے۔ یہی طلاقت یا کسی شئی کی

عارضی شوکت کو قائم کردینے کی مہارت مصور یا بت تراش رنگ یا پتھر میں منتقل کردیتا ہے۔ اس قدرت کا ، ارو مدار اس امر پر ہے کہ صناع نے زیر غور شئی کو کتنی گہری نظر سے دیکھا۔ ہر شئی کا سلسلہ فطرت مرکزی پر مختتم ہوتا ہے اور اسکی شرح اس طرح کیجا سکتی ہے کہ وہی دنیا بن جائے لہذا اطباعی کا ہر عمل ایک خاص وقت میں تنہا بلا شرکت غیرے حکمران ہوتا اور پوری توجہ اپنی طرف پھیر لیتا ہے۔ اُسوقت وہی ایک کام ہے جو قابل ذکر ہے غزل ہو یا راگ ، یا کسی منظر کی تصویر یا کوئی مجسمہ ، یا خطبہ ، یا کسی مندر یا میدان جنگ کا نقشہ ، یا کسی نئے خطۂ ارض کی تلاش میں بحری سفر۔ زیادہ وقت نہیں گزرتا کہ پہلی شئی کی طرح ایک دوسری شئی پیش پیش ہوکر مطمح نظر بنتی اور جاذب توجہ ہوتی ہے۔ مثلاً ایک باغ جو خوش سلیقگی سے لگایا گیا ہو۔ اُس وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ باغ کے سوا کوئی اور کام کرنے ہی کا نہیں۔ میں آگ کو دنیا کی بہترین چیز سمجھوں اگر آب ، خاک ، باد سے واقف نہوں۔ ہر قدرتی شئی ، حقیقی ذہانت ، اور ودیعت شدہ اوصاف کو یہ حق حاصل ہے اور اُنکی سرشت ایسی ہے کہ ایک خاص وقت میں وہی دنیا کی چوٹی پر ہوں۔ ایک گلہری جو ایک شاخ سے دوسری شاخ پر کودتی اور پورے جنگل کو اپنی اُمنگ میں درخت واحد سمجھتی ہے ایک شیر سے کم جاذب نظر نہیں ہوتی۔ وہ بھی خوبصورت مکمل اور فطرت کی نائب ہے۔ ایک اچھا گیت سامعہ نواز ہوکر میرے دل کو اُسی طرح کھینچتا ہے جس طرح ایک رزمیہ نظم۔ کسی کامل فن کی بنائی ہوئی کتے کی تصویر اُسی طرح میرے ذوق کی تشنگی بجھاتی ہے جس طرح انجلو کے تیار کردہ مرقع۔ دلپذیر اشیا کے اسی تواتر سے آخرکار دنیا کی عظمت اور فطرت انسانی کے مالامال ہونے کا سبق ملتا ہے۔ اسی کے ساتھ یہ علم بھی ہوتا ہے کہ جس بات نے مجھے پہلی چیز میں متحیر کیا اور دل کو موہ لیا وہی کیفیت دوسری چیز کے مشاہدہ سے بھی پیدا ہوئی لہذا خوبی تمام اشیا میں مشترک ہے

مصوری اور بت تراشی کا درجہ محض ابتدائی ہے۔ بہترین تصویریں اپنا آخری راز بتا دیتی ہیں۔ وہ بھدے نمونے ہیں یعنی بے سعدومے چند نقطوں لکیروں اور رنگوں کے جو مجتمع ہوکر ہمیشہ متغیر ہونے والے منظر حیات کا سماں دکھاتے رہتے ہیں اور جن کے درمیان ہم زندگی بسر کرتے ہیں۔ مصوری آنکھ کے لئے وہی کرتی ہے جو رقص اعضا کے لئے۔ جہاں بدن کا سادھنا آ گیا ، جسم نے پھرتی اور حرکات میں تناسب پیدا ہوا رقاص جانچ جانچ کر قدم رکھنا بھول جاتا ہے۔ اسی طرح مصوری رنگوں کی خوشنمائی اور خال وخط کی مناسبت کی تعلیم دیتی ہے۔ جتنی زیادہ تصویریں اور کمال فن کے نمونے دیکھنے میں آتے ہیں اُس ناتمناہی ذخیرہ کا اندازہ ہوتا جاتا ہے جو مصور کے موقلم میں پنہاں ہے۔ اُسے اختیار ہے کہ بیشمار تمثالوں میں جسے چاہے اپنا موضوع بنائے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب وہ ہر شئی کی شبیہ بنا سکتا ہے تو پھر کسی شئی کی شبیہ کیوں بنائے؟ اب میری آنکھیں کھلتی ہیں اور آنکھوں میں وہ تصویریں پھرنے لگتی ہیں جو نقاش فطرت ہر رہگزر میں بنایا کرتا ہے۔ مرد اور بچے فقیر اپنی گدڑی میں اور خوبصورت عورتیں زرق برق لباس پہنے ہوئے متحرک نظر آتے ہیں۔ کسی کے بال لمبے ہیں کسی کے گھونگھر والے کوئی سرخ وسفید ہے کوئی سیاہ فام ، کسی کے چہرہ پر جھریاں ہیں کوئی بلند بالا ہے ، کوئی پست قد کسی کا سینہ فراخ ہے ، کسی کا تنگ ، کوئی فربہ ہے کوئی لاغر ، کوئی متین کوئی شوخ۔...

پتھر کی مورتیں بھی یہی تعلیم دیتی ہیں مگر ذرا سادگی کے ساتھ۔ تصویر سے رنگوں کا پتہ چلتا ہے اور مجسمہ سے اوضاع

واطوار کا۔ جب میں کوئی عمدہ مجسمہ دیکھکر کسی مجمع عام میں داخل ہوتا ہوں تو اُس شخص کے قول کی تصدیق ہوتی ہے جو کہتا تھا کہ ہنر کی مزاولت کے بعد ہر فرد بشر دیو معلوم ہوتا ہے۔ میں بھی محسوس کرتا ہوں کہ تصویر کشی و بت سازی تختہائے عشق ہیں تاکہ آنکھ اپنے فرائض کی باریکیاں اور سحر کاریاں دیکھے

کوئی مجسمہ چلتی پھرتی تصویروں کا مقابلہ نہیں کرسکتا، انکو پے بہ پے تغیر کی وجہ سے اصنام خیالی پر بدرجہا شرف حاصل ہے۔ کیسا عمدہ مجموعہ فن کے شاہکاروں کا ہے! کس جدت پسند صناع نے اپنی مختلف جماعتیں اور ایسی نئی نویلی تمثالیں بنائی ہیں! اے نو اصناع اپنے دل سے باتیں گڑھتا اور جٹائیں تراش رہا ہے! بہت مصروف ہے اور بہت خوش۔ ابھی ایک خیال آیا، ابھی دوسرا، اور ہر لحظہ پوری قضا، پورا منظر، پورا اسلوب بدلتا رہتا ہے حالانکہ وہی مٹی ہے اور وہی خمیرا

لے جاؤ روغن اور تختۂ قرمز کو، سنگ مرمر اور چھینیوں کو، سب خرافات ہے! اگر ان سے دائمی آرٹ کی جادو طرازیوں کے مشاہدہ کے لئے ہماری آنکھیں نہیں کھُلتیں تو محض فیلسوفی و شعبدہ بازی ہے!

فن کے ہر نمونے کو آخر کار ایک طاقت اولیں سے منسوب کرنے سے اس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے کہ ان میں جو مشترک خوبی ہے یہ ہے کہ دنیا بھر اُن سے محفوظ ہوتی ہے اور اُن میں یہ استعداد ہے کہ ہماری سادگی ہمکو واپس دیں علاوہ بریں انمیں مذہبی شان پائی جاتی ہے کیونکہ وہ جس کمال کا آئینہ ہیں روح مطلق کا ظہور ثانی ہے۔ اُسی چشمۂ نور کی ایک دھار ہے۔ اُنکے مشاہدہ سے دل پر وہی نقوش مرتسم ہونا چاہئے جو مناظر قدرت کے مشاہدہ سے ہوتے ہیں۔ مبارک اوقات میں فطرت ہمارے سامنے صرف ایک صورت میں ظاہر ہوتی ہے یعنی فن کمال کو پہونچا ہوا۔ یہی شان ایک صناع کے اختراعات فائقہ کی ہوتی ہے۔ وہی شخص آرٹ کا بہترین ناقد ہے جس میں سادہ جذبات اور عظیم حادثات انسانی سے متاثر ہونے کی صلاحیت مقامی واقعات اور مخصوص رجحانات پر جو تربیت کا نتیجہ ہیں فائق رہے۔ حسن دستیاب نہیں ہوسکتا چاہے اُسکی تلاش میں ہم دنیا بھر چھان ڈالیں تاوقتیکہ ہم اُسکو اپنے ساتھ لئے نہ پھریں۔ حقیقی حسن سطح کی دلکشی، خطوط کی ترتیب یا قواعد فن سے ماورا ہے۔ وہ صناع کی تخلیق میں انسانی کردار کی جلوہ گری ہے، حیرت انگیز اظہار ہے پتھر یا قرمز یا سُریلی آواز کے ذریعہ سے ہماری فطرت کے عمیق و سادہ ترین خصوصیات کا۔ لہٰذا حسن کو وہی افراد سمجھ سکتے ہیں جنکی روح میں وہ خصوصیات موجود ہیں۔

یونان کے سنگین مجسموں، روما کی عمارتوں اور اُستادان فن کی تیار کردہ تصویروں میں سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ تمام دنیا اُنکا پیغام سمجھ سکتی ہے۔ تہذیب نفس، خلوص محبت، امید اُنکے پردے میں سانس لیتے ہیں۔ ہم اُنکے پاس جو کچھ لے کر جاتے ہیں وہی واپس لاتے ہیں البتہ حافظہ کے لئے خوبصورت مثالوں کا اضافہ ہوجاتا ہے۔ جو سیاح وٹیکن جاتا اور مختلف کمروں سے سلسلہ در سلسلہ گزرتا ہے جن میں مجسمے، ظروف، کتبے، جھاڑ فانوس اور ہر قسم کی حسین و قیمتی اشیا آراستہ ہیں اُسکو یہ خطرہ رہتا ہے کہ اُن اصولوں کی سادگی کو نہ بھول جائے جن کی بدولت یہ اشیا معرض وجود میں آئیں اور یہ کہ اُنکا سرچشمہ ...

خیالات و قوانین ہیں جو خود اُسکے سینہ میں جوش زن ہیں ۔ وہ اُن یادگاروں میں ترتیبی قواعد کا مطالعہ کرتا ہے یہ نہیں یاد رہتا
کہ یہ اشیا متفقہ مساعی کا نتیجہ نہیں ہیں بلکہ مختلف زمانوں اور مختلف ملکوں کے عطیے ہیں ۔ ہر فرد کسی ایک صناع کی تخلیق ہے
اور محنت کرتے وقت اُسے کسی دوسرے نمونہ کا شاید علم ہی نہ تھا ۔ حیات اور تاہل کی زندگی شیریں و تلخ ذاتی تعلقات ،
دھڑکتے ہوئے دلوں ، لڑنے والی آنکھوں ، افلاس و احتیاج وامید و بیم کے علاوہ کوئی شبیہ پیش نظر نہ تھی ۔ یہی اُس کے
ملہمات ہیں اور وہی تاثرات آپ کے اور میرے دل و دماغ پر طاری کرتا ہے ۔ جسقدر شدت کے ساتھ اُسنے کسی جذبہ کو خود
محسوس کیا اُسی شدت کے ساتھ اُسکا کردار اُسکے کارنامہ سے ظاہر ہوگا صناع کو ساز و سامان و آلات کی بنا پر مجبور یا محدود
نہونا چاہئے بلکہ جہاں یہ نکتہ سمجھا کہ اپنے عمل میں اپنی روح منتقل کر دے سنگ خارا بھی موم ہو جائیگا اور پورے اقتدار
و رعنائی کے ساتھ ایک معقول حد تک اُسکے محسوسات کی ترجمانی کریگا ۔ اُسکو حاجت نہیں کہ مروجہ و مسلمہ طرز کی پیروی کرے
یا یہ دریافت کرے کہ روما و پیرس میں کیا دستور ہے اُسکا مکان ، موسم ، طرز معاشرت جسکو افلاس اور غیر معروف خاندان میں
پیدائش نے بیک وقت ناگوار اور پیارا بنا دیا ہے وہ لکڑی کا میلا اور بے رنگ و روغن کا شانہ جو گمنامی کے ایک گوشہ میں
کسی گاؤں یا جنگل کے قریب ہے یا تنگ و تاریک مسکن جو شہر کے مفلوک الحال باشندوں کے لئے مخصوص ہے کسی روشن ماحول
کی طرح اُس خیال کی جنبش کو کافی ہیں جو ہر شئی سے بلا امتیاز اُبل پڑتا ہے ۔

اُس روح کو غرض نہیں پست و بلند سے ۔۔۔ جو آپ کارساز ہے اور گرم کار ہے
جس جا ہے ایسی روح وہاں ہے سب اُو کچھ ۔۔۔ ہر جا ہے ایسی رُوح اُسی کی بہار ہے

فنون لطیفہ کی ثنا و صفت میں جو کچھ بھی کہا جائے یہ ماننا پڑیگا کہ ابھی ابتدائی منزل میں ہیں ۔ ہم اُس مقصد کی تعریف
کرتے ہیں جو پیش نظر تھا نہ کہ نتیجہ کی وہ شخص انسانی امکانات کی تحقیر کرتا ہے جو سمجھتا ہے کہ فنون لطیفہ کی تخلیق کا بہترین زمانہ
ختم ہو گیا حالانکہ جو کچھ ہوا چند لہروں سے زیادہ وقیع نہیں جو دریائے فطرت کے سطح پر اٹکھیلیاں کرتی ہوئی گزر گئیں وہ صرف
اُس طوفان کا پتہ دیتی ہیں جو قعر دریا میں کروٹیں لے رہا ہے اور جسکا میلان تخلیق کی طرف ہے ۔ آرٹ ابھی تکمیل کو نہیں پہونچا ،
اُسکو چاہئے کہ دنیا کی قوی ترین تحریکات کے دوش بدوش بڑھے اُسکا پہلو عملی و اخلاقی ہو ، ضمیر سے وابستہ ہو ، غریبوں اور عدم
تربیت یافتہ لوگوں کو آواز بلند دعوت صلح و امن دے ۔ آرٹ کا ایک ما حصل اور ہے جو فنون لطیفہ سے بلند تر ہے ۔ یہ فنون
تو ایک ناتمام یا ضایع شدہ تحریکِ نفس کے ایسے بچے ہیں جو میعاد معینہ سے قبل پیدا ہوں ۔ آرٹ تخلیق کی ضرورت کا نام ہے
لیکن اسکی اصل عمیم و عالمگیر ہے ۔ اپاہج اور بندھے ہوئے ہاتھوں سے کام کرنا اسکو شاق ہے اور تصویروں اور مجسموں کے
مائل لولے لنگڑے کا داک عفریت پیدا کرنا باعث ننگ سمجھتا ہے ۔ اسکا کوئی مقصد ایسا نہیں جو انسان اور فطرت کی
تخلیق سے پست ہو ، آرٹ کچھ نہیں اگر انسان کے پورے مقدور کا مظہر نہیں ، آرٹ کو چاہئے کہ دلوں میں خوشی کی ترنگ
پیدا کر دے اور تمام امتیازات و افتراقات کو مٹا دے تاکہ دیکھنے والا کُل کائنات میں وہی قدرت و تناسب و ہم آہنگی دیکھے

جسکا پتہ کسی صناع کی ذات میں اُسکا صنعتی عمل دیتا ہے۔ اسکا یہ اثر ہوگا کہ ویسے ہی دوسرے صنعت گر پیدا ہونگے۔
اس معنی میں ہر قابل قدر ہستی مع اپنے اقوال و افعال و اوضاع کے ایک مجسمہ ہے۔ ہر خوبصورت عورت جو اہل نظر کو اپنے حسن و جمال سے شریفانہ و غیر ملوثانہ طریقہ پر دالہ و دیوانہ کردے ایک تصویر ہے۔ اور زندگی ایک نغمۂ شیریں و افسانۂ رنگیں۔

(ماخوذ) از ایمرسن

اثر لکھنوی

جنوری ۱۹۳۰ء کا نگار

جو ظفر شاہ کیلئے مخصوص ہے، مرتب ہو رہا ہے اور مضامین کی کتابت بھی شروع ہوگئی ہے لیکن اس وقت تک بہت کم مضامین موصول ہوئے ہیں اور جو آئے ہیں وہ بھی قابل ذکر نہیں اسلئے ہم نے وصولی مضامین کی تاریخ ۲۰ نومبر ۱۹۲۹ء تک بڑھا دی ہے۔ امید ہے کہ ارباب علم و قلم ادھر توجہ فرما کر تاریخ مقررہ تک اپنے مضامین بھیج دینگے۔

اگر اب بھی کافی مضامین موصول نہ ہوئے تو جو مضمون آجائیں گے انھیں شایع کردیا جائیگا اور انعامی مقابلہ کی میعاد آیندہ ۶ ماہ تک اور بڑھا دیجائیگی لیکن جنوری ۱۹۳۰ء کا نگار بہر حال کم از کم ۱۶۰ صفحات پر شایع ہوگا خواہ سب کا سب ظفر کیلئے مخصوص نہ ہو۔ مینیجر نگار

رسالہ جن کا نمونہ نمبر

اخیر نومبر ۱۹۲۹ء تک طیار ہو جائیگا۔ اسلئے جن حضرات نے ابھی تک نمونہ کی درخواست نہیں بھیجی وہ فوراً روانہ کردیں ورنہ پرچہ ختم ہونیکے بعد پھر نمونہ مفت نہیں ملیگا۔

رسالہ جن اردو زبان میں بالکل نئی چیز ہوگا اور عالم ارواح، عالم خواب، مابعد الطبیعیات، قرأت افکار، مقناطیسیت، حاضرات، مسمریزم، اور تمام اُن امور و مباحث پر جو انسانی رُوح و دماغی ارتقا سے تعلق رکھتے ہیں، تاریخی، علمی، تحقیقی بحث کریگا اور اُن تجربات و واقعات کو بھی درج کریگا جو عالم رُوح کی عجوبہ زار دنیا سے واسطہ رکھتے ہیں ضخامت فی الحال ڈھائی جزء ہوگی اور قیمت عہ سالانہ۔
۶ ماہ کیلئے خریداری منظور نہ کیجائیگی۔ مینیجر رسالہ نگار لکھنؤ

باب المراسلۃ والمناظرہ

مکرمی - السلام علیکم - آپکا والانامہ لکھنؤ سے میرے پاس آیا - آپکی یادآوری کا ممنون - آپ کا نگار مین عرصہ دو سال سے دیکھتا ہوں - آپکے ادبی مقالات کی میں بہت قدر کرتا ہوں - لیکن افسوس ہے کہ آپکی مذہبی تحقیقات میری سمجھ سے باہر ہیں - شروع میں تاویلات کر لیا کرتا تھا لیکن رفتہ رفتہ تاویلات کا دائرہ تنگ ہوتا گیا اور اب باوجود کوشش میں سمجھنے سے قاصر ہوں - پچھلے دو مہینہ کے پرچہ دیکھنے سے مجھے اطمینان ہوگیا کہ میری طرح اور اصحاب کو بھی آپکی مذہبی تحقیقات میں اعتراض ہے - اگر میرا خیال صحیح ہے تو یقیناً آپکی تصریحات مذہبی ایمانیات کی جڑ ونکو مضبوط کرنیکے بجاے متزلزل کر دینگی - اسلئے میں مجبور ہو گیا کہ آپکی توجہ دلاؤں امید ہے کہ آپ میری جسارت کو معاف فرما دینگے اور اپنی تحریرات کو پھر ایک مرتبہ نظر غور سے ملاحظہ فرما دینگے افسوس ہے کہ اس زمانہ میں ایسی ہستیوں کی امید رکھنا جو اپنی غلطیوں پر مطلع ہوکر تسلیم کریں بیسود ہے - جبکہ تاویلات کا دروازہ کھلا ہوا ہے ہر معاملہ کی تاویل کیجا سکتی ہے - بلکہ جو لوگ اہل قلم ہیں وہ الفاظ اور لغات کا پردہ ڈال دیا کرتے ہیں آپ نے اپنے خط میں پرچہ ماہ اگست کے مطالعہ کی طرف ہدایت فرمائی ہے - میں نے اوسکو دیکھا لیکن افسوس ہے کہ اسکی تصریحات اب بھی تشفی بخش نہیں ہیں اسلئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپکے مقالات مذہبی پر ایک سرسری تبصرہ کرکے میں نے جو نتیجہ نکالا ہے پیش کروں

"تو خواہ از سخنم پند گیر یا کہ ملال"

قرآن - قرآن کے نسبت آپکا نظریہ یہ ہے کہ "قرآن کو اصول فطرت ہی کے مطابق سمجھنے دیجئے اور غیر متعلق باتوں کو اوس میں شامل کرکے مذہب کی سادگی کو تباہ نکیجیے"

اصول فطرت سے آپکا کیا مطلب ہے اسکی تصریح کرنا چاہیے - غیر متعلق باتوں سے آپ نے کون باتیں مراد لیں ہیں وضاحت کی ضرورت ہے - کیا اصول فطرت وہی ہیں جنکے پابند ہوکر آپنے قرآنی آیتوں کی تفسیر کی ہے جسکے چند نظائر ذیل میں درج کرتا ہوں -

مثلاً حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے بارے میں قرآن فرماتا ہے :-

مثل عیسی کمثل آدم خلقہ من تراب ثم قال لہ کن فیکون - آپ یوسف نجار کو اونکا باپ بتاتے ہیں - کیونکہ آپکے اصول فطرت میں بغیر باپ کے لڑکا پیدا نہیں ہو سکتا - لیکن معلوم نہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام کے ! دیکھیں جناب کیا ارشاد فرما دینگے - پھر افسوس ہے کہ الفاظ قرآنی اور سیاق عبارت بھی آپکا ساتھ نہیں دیتے کیونکہ حضرت آدم علیہ السلام کی تمثیل اور لفظ کن فیکون کا ہونا - جگہ جگہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نام کے ساتھ ابن مریم فرمانا سب بیکار ہو جاتا ہے - پھر انھیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں بطور خرق عادت کے استحسانا ارشاد ہوتا ہے -

واذ تخلق من الطین کھیئۃ الطیر باذنی فتنفخ فیھا فیکون طیراً باذن اللہ وتبری الاکمہ والابرص باذنی

واذ تخرج الموتی باذنی۔ لیکن جناب کے نزدیک یہ خرق عادت نہیں ہے۔ اسی طرح حضرت موسی علیہ السلام کا عصا یا ید بیضا صرف ایک تعبیر کامیابی تھی۔ اس موقعہ کے الفاظ قرآنی ملاحظہ فرمائیے

فالقی عصاہ فاذا ھی ثعبان مبین۔ ونزع یدہ فاذا ھی بیضاء للناظرین۔ دوسری جگہ بجای ثعبان مبین کے حیتہ تسعی ارشاد ہوا ہے اور واضمم یدک الی جناحک تخرج بیضاء من غیر سوء آیتہ اخری اب ثعبان اور حیتہ تسعی کے کیا معنی ہیں۔ تخرج بیضاء من غیر سوء سے کیا مراد ہے یہ سب نظر بندی ہے یا تعبیر کامیابی۔ اسی طرح دریا کا پھٹ جانا اور پانی کا مثل دیوار کے قائم ہو جانا۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں قرآن زنان مصر کی زبان سے جو عجب حسن سے مرعوب ہوگئیں تھیں۔ ما ھذا بشرا ان ھذا الا ملک کریم فرماتا ہے لیکن آپ اوسکو افسانہ سمجھتے ہیں۔ یہ وہی افسانہ ہے جسکو خدا احسن القصص فرماتا ہے

نماز کے بارے میں خدا اکثر جگہ سے زیادہ قرآن میں مختلف عنوان سے ہدایت فرماتا ہے اور اوسکو مسلمانوں پر ان الصلوٰۃ کانت علی المومنین کتابا موقوتا سے فرض عین کرتا ہے۔ حتی کہ خوف جان کی حالت میں بھی وقت سے بیوقت پڑھنے کی اجازت نہیں دیتا بلکہ نماز پڑھنے کا جنگ کی حالت میں طریقہ بتاتا ہے اسی آیت سے پہلی آیتیں قرآن کھول کر پڑھئے۔ اور آپکا یہ فرمانا کہ خدا کی بتائی ہوئی عبادت، رسم ورواج یا ظاہری نقوش وحرکات کی پابند نہیں ہو سکتی، اب آپ فرماتے ہیں کہ عبادت کی غرض اتقیاد امرا اور اجتناب از معاصی ہے صرف الفاظ کا پردہ ڈالنا ہے۔ اس سے کس کو انکار ہے لیکن یہی ظاہری حرکات وارکان مقصود تک پہونچنے کا ذریعہ ہیں۔ اور ذریعہ مقصود سے مقدم ہوتا ہے۔ تمام دنیا جانتی ہے کہ طہارت سے مراد ظاہری پانی بہا کر اعضا کو صاف کرنا نہیں ہے۔ بلکہ اعضا کو گناہوں اور دل کو خیالات فاسدہ سے پاک کرنا مراد ہے۔ قرآن نے بھی اسی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ قد افلح من ذکہا لیکن باوجود اسکے ارشاد ہوتا ہے۔ اذا قمتم الی الصلوٰۃ فاغسلوا وجوھکم وایدیکم الی المرافق وامسحوا برؤسکم وارجلکم الی الکعبین۔ یہ صرف پانی بہا کر اعضا کو پاک کرنا ہی۔ چونکہ وسیلہ ہے مقصود تک پہونچنے کا اسلئے ہدایت فرمائی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام آپسے زیادہ جانتے تھے کہ کعبہ سے مقصود توجہ الی اللہ ہے لیکن پھر بھی خود خدا سے ارکان حج کی تعلیم چاہتے ہیں۔ وارنا مناسکنا۔ اسپر احرام باندھنا۔ طواف کرنا۔ سعی کرنا وغیرہ وغیرہ تعلیم فرمایا جاتا ہے جو بجنسہ بھی رائج ہے، اب آپکا یہ فرمانا کہ قرآن میں نماز موجودہ کی تصریح نہیں ہے یہ بھی تائید لفظی ہے۔ اور بے معنی ہے۔ بلکہ آپ جانتے ہیں کہ قرآن ایک متن متین ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا آپنے قرآن کو ایک ضابطہ کی شکل میں پیش کیا۔ اجمال کی تفصیل کی۔ یا خدا کی طرف سے خود تفصیل بتائی گئی۔ چنانچہ نماز کے بارے میں بھی حضرت جبریل کا آنا اور نماز کا طریقہ تعلیم فرمانا صحیح حدیثوں سے ثابت ہے۔ لیکن چونکہ آپ کے نزدیک کوئی صحیح حدیث موجود نہیں ہے ہم استدلال میں پیش نہیں کرتے صرف معقولات سے جو آپ کے نزدیک ذریعہ رشد وہدایت کا ہے، گفتگو کرتے ہیں۔ ہر صورت میں نماز کی فرضیت نہیں جاتی۔ مثلاً وضو کے بارہ میں صرف ایک آیت سے

اذا قمتم الی الصلوٰۃ الخ - لیکن کس طریقہ سے عمل کیا جاوے قرآن ساکت ہے نماز میں صرف اوقات نماز اور ارکان کے الفاظ مثلاً رکوع وسجود قیام وقعود کو بتایا ہے لیکن نہ کوئی خاص تعین وقت کی ہے نہ تعداد رکعت کی نہ طریقہ ادا کی - اسی طرح حج کو فرض کرتے ہوئے کوئی خاص طریقہ حج کا بیان نہیں کیا صرف ارکان مثلاً احرام - طواف - سعی وغیرہ بتائے ہیں روزہ میں صرف ایکماہ کا روزہ اور تعین وقت ہے زکوٰۃ میں صرف مصرف زکوٰۃ - کیا اس مجمل بیان کی وجہ سے آپ ان سب باتوں کی فرضیت سے انکار کرینگے - اور اسکو نظام قومی اور سوسائٹی کا فرض بتا کے ختم کر دینگے، ظاہر ہے کہ اگر قرآن میں ہر ایک بات کی تصریح اور تفصیل کیجاتی تو معلوم نہیں کتنے دفتر طیار ہو جاتے - اسلئے کہیں تفصیل کر دی کہیں اشارہ کر دیا - اسکے ساتھ مسلمانوں کو رسول کی اطاعت فرض کر دی - چنانچہ ملاحظہ ہو آیات قرآنی - وما اتاکم الرسول فخذوہ وما نھاکم عنہ فانتھوا و من یطع الرسول فقد اطاع اللہ - و قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ - ولکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ - اس صورت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو قرآن کے اجمال کی تفصیل کی ہے وہ بھی دراصل قرآنی ہے - کیا اس صورت میں آپ احادیث میں جو قرآنی تفسیر یا تشریح ہے اوسکو غیر متعلق با تو نہیں شامل کرکے اوسکی اہمیت کو کم کر دینگے میرے نزدیک قرآن کی تفسیر کے بارے میں یہ نظریہ ہونا چاہئے کہ

۱- قرآن کے مطالعہ وفہم کا وہ طریقہ ہو جو تمام تر قرآن پر مبنی ہو ۲- قرآن میں باہر کے اثرات کو دخل نہو مثلاً منطق فلسفہ سائنس - بنی اسرائیلیات - ۳- عربی لغتہ کے صاف اور معروف معانی - ۴- عربی بول چال کے بے تکلف اور سادہ محاورات ۵ - صدر اول کا بے لاگ ذوق فہم - ۶- اور رسول اللہ کا فطری اور غیر صناعی اسلوب بیان کیونکہ انبیاء کرام کی تعلیم کا مقصود بحث و نظر نہیں ہوتا بلکہ تلقین اور یقین پیدا کرنا ہوتا ہے - قرآن نے خود جا بجا اپنے نام گنائے ہیں وہ کہتا ہے کہ میں موعظتہ ہوں - ذی الذکر ہوں - تبیاناً لکل شئے ہوں - تذکرہ ہوں - ھدی ورحمۃ ہوں اور یہ ظاہر ہے کہ جو بات موعظت ہو تذکیر ہو - نصیحت ہو ہدایت ہو - روح ودل کے روگوں کی شفا ہو وہ تاویلات کا بے پایاں دفتر نہیں ہو سکتا - نہ منطق وفلسفہ کا اکھاڑہ - خود امام رازی جنھوں نے تفسیر اسی رنگ میں لکھی تسلیم کرتے ہیں کہ لقد تاملت الطرق الکلامیہ و المناھج الفلسفیہ فما رایتھا تشفی علیلا - ورایت اقرب الطریق طریقۃ القران کیا مصیبت ہے کہ قرآن عربی زبان میں عرب میں نازل ہوتا ہے - تمام فصحا، قریش اوسکی فصاحت کے آگے سربسجود ہو جاتے ہیں - لیکن آج تیرہ سو برس کے بعد ایک شخص فتحپور میں پیدا ہوتے ہیں جو قرآن کو مجموعہ تاویلات اور معقولات کا ظاہر کرتے ہیں -

حدیث - کے متعلق آپکا نظریہ یہ ہے کہ بخاری جو اصح کتاب بعد قرآن ہے گیارہ سو برس سے مانی جاتی ہے آپ اوسکو ترک اسلام کا مرادف بتلاتے ہیں استدلال یہ پیش کرتے ہیں کہ دو سو برس کے بعد حدیث کی کتابیں تصنیف ہوئیں جب تحقیق کے دروازہ مسدود ہو چکے تھے اسلئے ناقابل اعتبار ہیں - گویا امام بخاری کی سولہ برس کی جانکاہی آپنے نوک قلم سے عبث اور بیکار ثابت کر دی - بلکہ جناب علامہ سید مقبول احمد صاحب تو کسی حدیث کی کتاب کو ہضم نکر سکے مجبوراً اونکو تے کرنا پڑی - شاید

انکو معلوم نہیں کہ غذا معدہ کی قوت ، صلاحیت اور مناسبت سے ہضم ہوتی ہے ۔ قرآن کا تو خود دعوی ہے کہ بعض قلوب جن کی دلمیں روگ ہے اس سے گمراہ ہوجاتے ہیں ۔ کا کلمہ تو لوگ ہضم نکر سکے قتل اور جلا وطن ہونا منظور کیا ۔ آفتاب کی روشنی بھی کمزور آنکھوں کو پسند نہیں آتی ۔ پانی کی خاصیت طبعی سبزہ کو اوگاتی ہے لیکن بعض زمینوں مین روئیدگی بھی پیدا نہیں ہوتی پھر اونکو اگر حدیث کی کتابیں ہضم نہ ہوسکیں تو کیا تعجب ہے معلوم نہیں کہ امام ابوحنیفہ رح جو پہلی صدی میں ہوئے تھے اونکے مسانید کیوں ناقابل قبول ہیں ۔ اکثر احادیث مختلف طریق سے روایت کی گئیں ہیں تو کیا قدر مشترک بھی صحیح نہیں ہوسکتا اب جبکہ تمام احادیث کی کتابیں بقول سید مقبول احمد صاحب مجموعہ اکاذیب اور بقول آپکے ترک اسلام کے مرادف ثابت ہوگئین اور اوسپر جناب نے ایک کلیہ بھی ارشاد فرمادیا کہ یہ کہنا "حدیث میں یہ آیا ہے بے معنی طریقہ رشد و ہدایت کا ہے" پھر اگست کے پرچہ میں ارشاد فرمانا کہ وحی کی دو قسمیں ہیں ایک متلو دوسری غیر متلو ایک بے معنی جملہ ہے یا مغالطہ اسواسطے کہ جب غیر متلو کا وجود ہی نہیں ہے تو اوسپر بحث کرنا بیفایدہ یا حوالہ دیا ہوتا کہ فلاں کتاب کی حدیث یا کم از کم فلاں فلاں حدیث قابل استدلال اور صحیح ہے ۔ معلوم نہیں کہ خدا کے اس حکم کی تعمیل کہ لکم فی رسول اللہ اسوۃ الحسنہ کیسے ہوسکتی ہے جبکہ اسوہ حسنہ کا پتا نہیں ۔

فقہ ۔ فقہ کے نسبت آپ فرماتے ہیں کہ دفتر بے پایاں ہے ۔ اور بغیر سوچے سمجھے عرب میں بیٹھکر تمام دنیا کی قسمت کا فیصلہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کردیا گیا کیسے ممکن ہے کہ تمام دنیا کے لئے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کافی ہو جبکہ تمام دنیا کا تمدن اور تہذیب طرز معاشرت رسم ورواج میں مختلف ہونا یقینی ہے ۔ یہ نظریہ ہے جناب کا معلوم نہیں کہ قرآن کو اس کلیہ سے کیوں مستثنیٰ فرماتے ہیں ۔ حالانکہ اوسکے بارے میں جناب ارشاد فرماتے ہیں کہ یہ کافر مومن ہر شخص کے لئے ہر ملک کے لئے قیامت تک کے لئے کافی ہے آپ جانتے ہیں کہ ان محدثین اور فقہا نے اخلاص اور محبت کے ساتھ نہایت جانفشانی سے اپنی تمام عمر صرف اسکے لئے وقف کردی تھی ۔ محض حدیث کی صحت کے لئے ایک خاص فن معرفت الرجال کا نکالا ۔ ہر راوی کی تحقیق نہایت غیر طرفداری سے کی ۔ کھرے کھوٹے کو علیحدہ کردیا ۔ اسی اعتبار سے احادیث کی قسمیں کیں ان قسموں کے اعتبار سے احکام کی تفریق کی ۔ یہ ممکن اور بہت ممکن ہے کہ باوجود ان کوششوں کے کہیں غلطی واقع ہوگئی ہو ۔ پھر اگر با قتضاء البشریت کہیں غلطی واقع ہوگئی ہو اور میں کہتا ہوں کہ ضرور ہوئی پھر بھی وہ اصحاب اور اونکے کارنامے موجب تحسین ہیں نہ سبب نفریں لیکن اگر یہ کوششین بھی جناب کے نزدیک قابل اعتبار نہیں ہیں تو پھر دنیا کی تاریخ سب بیکار ہوجائیگی جس نے محض خیالی بنیاد قائم کی ہے ۔ پھر تمام دنیا جانتی ہے کہ ایک معمولی گھر کا انتظام بھی بغیر قاعدہ اور قانون اور اجتماعی حالت کے چل نہیں سکتا ۔ سلطنت کے کاروبار چلانے کیلئے بھی ایک قانون اور اوسپر اجتماعی طور سے پابند ہونیکی ضرورت ہے لیکن آپ تمام دنیا کے مسلمانوں کو دعوت دیتے ہیں کہ انفرادی حالت میں ہر شخص کو چاہئے کہ جسکی جو سمجھ میں آوے کرے ۔ حالانکہ جب تمام دفتر فقہا کا بیکار ہوگیا تو انفرادی حالت میں سب کا ایک مرکز پر جمع ہوجانا کیسے ممکن ہے ۔ بہر حال جنکی تعداد فی ہزار نوسو ننانوے ہے کس قانون کے مطابق چلیں

کیا آپ بتا سکتے ہیں کے ہندوستان میں آپ جیسے علامہ کتنے ہیں جنھوں نے چھ برس کی عمر میں فارسی درسیات سے فراغت حاصل کی ہو۔ کتنے ہیں جو چودہ برس کی عمر میں فضیلت کی دستار کے مالک بنگئے ہوں۔ ان بیچاروں کے لئے کیا ہدایت ہے۔

تقلید۔ اسکو آپ لعنت فرماتے ہیں۔ اسواسطے کہ ہر شخص کا پیدائشی حق آزادی ہے کوئی وجہ نہیں کے اوسکو پابند بنایا جاوے بیشک ہر شخص محکوم ہونا لعنت سمجھتا ہے۔ غلامی کی زندگی کو موت سے بدتر سب سمجھتے ہیں۔ ذلیل رہنا کس کو گوارا ہے۔ لیکن مجبوراً سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک جوان عقل وسمجھ کا انسان ایک طفل صغیر ناسمجھ کی تقلید پر مجبور ہے۔ مریض ایک غیر مہذب ڈاکٹر کے آگے سر تسلیم خم کر دیتا ہے۔ محض اسوجہ سے کے نابینا یہ سمجھتا ہے کہ راستہ کا علم اسکو ہے اسی طرح مریض سمجھتا ہے کے اسنے پانچ سال اس فن کو لاہور یا لکھنؤ کالج میں حاصل کیا ہے۔ اعلیٰ ادنیٰ کو جذب کر لیتا ہے۔

گر تو سلطاں نہ رعیت باشی چو نبی نیستی زامت باشی

جو جواب اسکے بارے میں آپ دیں وہی ہماری طرف سے قبول فرمائیے۔ اور پھر جاہلوں کے بارہین آپ کیا ہدایت فرما دینگے۔ کیا اونکو بھی اجازت ہے کہ ہر کہ آید در دات بے خوف کن۔ ضیاءالدین احمد خانصاحب کی طرح کسکو کسکو نگار کے مطالعہ کی ہدایت فرمادینگے

ہم بھی چاہتے ہیں کے یہ قلادہ گردن سے اوتار کے پھینکدیں لیکن ہماری سمجھ میں ابتک کوئی صورت نہیں آئی۔ میں آپکا بڑا ممنون ہونگا اگر آپ تقلید سے میری گردن چھوڑادیں سب سے پہلی بات جو اسمیں سنگ راہ ہے وہ حدیثوں کی تحقیق اور اوسکے رواۃ کی جانچ ہے۔ فقہا اور محدثین کے اجتہاد کو علیحدہ کرکے کوئی صورت بتائیے۔ جبتک براہ راست حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیثیں نہ ملیں تقلید کرنا پڑیگی۔ آج تیرہ سو برس کے بعد اسبات کے یقین کرنیکی کون صورت ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے یہ حسن ہے۔ یہ مرفوع ہے یہ مرسل ہے

آپ فرماتے ہیں کہ یہ ایسا زبردست ترقی کا زمانہ آیا ہے کہ اب منقولات کی سپر کام نہیں دیسکتی اور حفاظت کی صورت اگر کوئی ہے تو صرف معقولات

اسکے متعلق مجھے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ زبردست ترقی کے زمانہ سے آپکی کیا مراد ہے۔ کس چیز میں زبردست ترقی ہے۔ علم وحکمت میں۔ الحاد وزندقہ میں دولت وثروت میں بے دینی اور لامذہبی میں۔ اگر علم وحکمت مقصود ہے تو کس علم کی طرف جنابنے اشارہ فرمایا ہے۔ فلسفہ۔ حکمت سائنس۔ منطق۔ انگریزی۔ فارسی۔ عربی۔ ظاہر ہے کہ چونکہ قرآن فصیح زبان عربی میں نازل ہوا ہے اس لئے قرآن کا سمجھنا بغیر عربی کے ممکن نہیں اور ابتک کوئی آلہ ایسا ایجاد نہیں ہوا جسکے ذریعہ سے ایک علم کے پڑھنے سے تمام دوسرے علوم پر دستگاہ اور عبور ہو جاے، کیا آپ اسبات کو تسلیم کرتے ہیں کہ ہر شخص طب کی کتابوں کا ترجمہ دیکھکر ایک طبیب حاذق ہو سکتا ہے۔ یا قانونی کتابوں کے ترجمہ سے دفعات کے مطالب حل کر سکتا ہے اگر نہیں ہو سکتا تو پھر کیسے ممکن ہے کہ بغیر عربی کی دستگاہ کامل رکھے ہوے قرآن کے مطالب حل کر سکے۔ اور قرآن کے مطالب حل کرنیکے لئے کن کن علوم کی ضرورت ہے اور اون علوم سے ہندوستانکے کالجوں میں کتنے طالب علم ماہر ہیں۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ اس زبردست ترقی کے زمانہ میں کتنے ابوحنیفہ ہیں کتنے شافعی ہیں کتنے بخاری

یا مسلم ہیں کتنے بایزید اور جنید و شبلی ہیں کتنے غزالی اور رازی ہیں۔ بریلی اور دیوبند کی بارگاہیں تو بند ہوگئیں کسی کالج ہی کی بارگاہ کا پتہ بتا دیجئے جہاں ان علوم کی تعلیم ہوتی ہو۔ اگر انہیں سے کچھ نہیں ہے تو بے معنی الفاظ سے جملہ مرکب کرنا سوائے مغالطہ دینے کے اور کیا فائدہ ہے

اب رہی سائنس سو اسکا تمام تر مدار تجربہ اور مشاہدہ پر ہونیکے باوجود کیا آپکو معلوم نہیں کہ روزانہ اسکے اصول بدلتے رہتے ہیں کیا سائنس کی مطابقت قرآن سے کرنا چاہتے ہیں۔ تاکہ جب سائنس کا اصول بدلجائے تو قرآن کے احکام پھر غلط ہو جائیں۔ افسوس طوالت مانع ہے ورنہ علمائے سائنس کے اصول ہم آپکے سامنے رکھتے اور دریافت کرتے کہ اب اُنکی کیا حالت ہے۔ رہگیا فلسفہ و حکمت اسکے اصول خود ظنی ہیں پھر ظن کو یقین سے بدلنا آپ جیسے علامہ کا نظریہ ہو سکتا ہے علاوہ اسکے کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ انبیاء کرام فلسفہ اور حکمت کی تعلیم دینے کے لئے آئے تھے۔ اگر انبیاء کرام اپنے طریق تعلیم میں فلسفہ اور حکمت کا طریقہ اختیار کرتے تو ظاہر ہے کہ انکا خطاب عام نوع بشر سے نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ بجز چند افراد کے جنھوں نے علوم وضعیہ کا طریقہ سیکھا ہے نہ سمجھ سکتے ہیں نہ مکلف ہو سکتے ہیں۔ یا وہ ایمان کی براہ راست دعوت دینے کے بجائے مدرسوں میں تعلیم دلواتے پھر اون سے بحث و جدل کرکے قایل کرکے ماننے کے لئے مجبور کرتے۔ لیکن پھر بھی اس نام نہاد فتح و شکست سے سچائی کا فیصلہ کس طرح ہو سکتا تھا۔ قرآن اور سنت پر تدبر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اور اس قسم کے تمام طریق حصول مقصد کے لئے سودمند نہیں ہیں بلکہ ہدایت اور یقین کی راہوں سے دور کر دینے والے ہیں۔

اب یہ بات کہ خلاف عقل باتوں کو اس طرح باور کرانا کہ حدیث میں ایسا آیا ہے بے معنی صورت رشد و ہدایت کی ہے، معلوم نہیں کہ جناب نے عقل کا معیار کیا قرار دیا ہے علم کی کمی بیشی کا اثر عقل پر پڑ سکتا ہے یا نہیں اگر پڑ سکتا ہے تو سب لوگوں کا ایک مرکز پر جمع ہو جانا کیسے ممکن ہے ہیئت اجتماعی کیسے پیدا ہو سکتی ہے۔ بڑے بڑے عقلمندوں نے عقل دوڑائی اور عجائب و غرائب قدرت کے کارخانوں کو دیکھ دیکھ کر اور سوچ سوچ کر جان لڑائی اور کچھ نہ جانا اور جو جانا غلط جانا کیونکہ اگر عقل کی رو سے جاننا چاہے تو ہزارہا امور ایسے ہیں جو دھوکا دیتے ہیں اور صحیح راستہ اور منزل حق تک نہیں پہونچنے دیتے۔ جب مشاہدہ اور تجربہ ہمیشہ دھوکا دیتے ہیں تو عقل کیسے رہنمائی کر سکتی ہے۔ جو صرف ایک ظنی علم ہے۔ مجبوراً بڑے بڑے سائنس دانوں کو ماننا پڑا کہ وہ دھوکہ میں ہیں چنانچہ اڈورڈ کلاڈ کہتا ہے کہ "بیسویں صدی کے انکشافات گزشتہ صدی کی تحقیقات سے بازی لیجائینگے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ہم جسقدر عقل میں ترقی کر رہے ہیں اوسیقدر اسرار کائنات پیچیدہ ہوتے جاتے ہیں"۔ مسٹر براٹ اسپنسر جسکو مسائل سائنس کو فلسفیانہ رنگ میں بیان کرنے میں ید طولی حاصل تھا اپنی مشہور کتاب اصول اولیہ میں بیان کرتا ہے کہ "عقل انسانی علم حقیقی کے حصول سے عاجز ہے" یوشین صاحب لکھتے ہیں کہ "خداتعالی نے بے شک اس بات کے دکھانیکو کہ انسان اگر مطلق اپنی عقل پر چھوڑ دیا جاوے تو اوسکا وہی روپ ہوجاتا ہے جو اہل مصر کا تھا جنھوں نے عقل انسانی کو اعلی درجہ پر پہونچا دیا تھا اور پھر ایسی نفرت انگیز بیہودہ بت پرستی میں پھنسے کہ لوگوں کا تماشہ گاہ بنے۔ یونان کی بھی یہی حالت ہوی۔ افلاطون

جسنے صحیفہ قدرت سے بعد غور کامل چند اصول لکھے تھے افسوس ہے کہ وہ خود بھی نہ برقائم نہ رہ سکا۔ اسلئے ایسی فطرت عالیہ کا وجود ہدایت کے لئے ضرور ہے جو حق کو باطل سے تمیز کرکے بتا سکے اور تمام خلق کو اصلی راہ دکھا سکے جو آیندہ نسلوں کے لئے مشعل ہدایت ہو" یوروپین علماء کے نتائج تحقیقات جتنے اسلئے پیش کئے کہ آپنے انھیں سے مرعوب ہوکر عقل کو معیار الہیات کے حاصل کرنے کا قرار دیا ہے۔ حالانکہ یہ وہی آواز بازگشت ہے جسکو معمولی درجہ کے اسلامی شعرانے کئی سو برس پہلے ملک کے سامنے پیش کیا تھا۔ چنانچہ حافظ شیرازی اپنی مستانہ ادامیں فرماتے ہیں کہ

حدیث مطرب ومی گو ورازِ دہر کمتر جو — کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معمارا

نظامی گنجوی فرماتے ہیں

مہندس بسے جوید از راز شاں — نداند کہ چوں کردی آغاز شاں
خرد تا بد و مرزتا بد ترا — کہ تاب خرد بر نتابد ترا

وغیرہ وغیرہ۔ حیرت اور سخت حیرت ہے کہ جو لوگ علم الادیان میں دریدہ دہن نظر آتے ہیں وہی علم الابدان مین دہن بستہ ہو جاتے ہیں۔ کیا وجہ ہے کہ ایک بزرگ کا کہنا جسنے اوس علم کے حاصل کرنے میں اپنی تمام عمر صرف کی ہو۔ بدترین صورت رشد وہدایت کی سمجھی جاے اور دوسرا شخص جسنے صرف چار پانچ سال ایک فن کو حاصل کیا ہو بڑے بڑے عقلا کی زبان بند کردے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ مذہب کی باتیں عقل وسمجھ سے باہر ہیں لیکن ہر شخص کی سمجھ ایک مرکز پر جمع ہو جاے اور ایک ہی قسم کا نیتجہ نکالے اصولاً غلط ہے۔ یہ سچ ہے کہ قانون قدرت پر غور وفکر کرنے سے ایسی باتونکو جو انسان کی طبیعت کو دھوکا دین دریافت کرسکتے ہیں مگر کب جبکہ انسان کے معلومات کو ایک کافی ترقی اور قوانین قدرت پر اور اون مختلف قوی کے اسرار پر جو اوسکے بانی نے اوسمیں رکھیں ہیں ایک معتدبہ آگاہی بھی حاصل ہو پھر تمام انسان اون دقایق پر نہیں پہونچ سکتے اور بالفرض جو پہونچ بھی سکتے ہیں وہ معدودے چند کے سوا نہیں ہوسکتے اور وہ بھی نہ اپنی عمر میں بلکہ پشتوں در پشتوں اور صدیوں در صدیوں میں۔ پس اسلئے کہ اوس قادر مطلق کی حکمت بیکار نرہے ضرور ہوا کہ وقتاً فوقتاً ملک اور زمانہ کے لحاظ سے ایسے ہادی پیدا کئے جائیں جو باعتبار اپنی فطرت کے سچے اخلاق کے بیان کا مخزن ہوں اور لوگونکو دھوکا کھانے سے بچاویں اور اس راہ کی تکمیل فرماویں۔ انھیں کو اصطلاح شرع میں نبی رسول اور پیغمبر کہتے ہیں اور چونکہ ہر وقت اور ہر زمانہ میں ایسے ہادی نہیں رہ سکتے اسلئے یہ بھی ضرور ہوا کہ وہ اصول زریں اور سچے اخلاق جو نبی اور رسول نے بتائے ہیں اپنی اصلی حالت پر قائم رہیں اور ایک ایسی قوم انکی جانشین ہو جو دوسروں کو پہونچادے۔ نبی کی کامیابی اور اوس کی سرگرمی صرف اسبات میں ہے کہ اوسکے افعال اور احکام ممد بقا ہوں نہ ممد فنا۔ اور اپنی اصلی حالت پر باقی رہیں۔ لیکن اگر آپکے نظریہ کے مطابق دیکھا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ نبی سے جو سنا اوسکو غلط کرکے دوسرونکو پہونچایا اور جنکو پہونچایا انھوں نے غلط نتیجہ نکالکر ایک مجموعہ اغلاط ملک کے سامنے پیش کیا۔

کیف یجوز لاحد من المسلمین ان یتکلم بمثل ھذا و یبدل کلام اللہ من تلقاء نفسہ و یحرفہ عن مواضعہ سبحانک ھذا بہتان عظیم۔ کیا حضرت امام ابو حنیفہ یا امام شافعی رحمہ اس قسم کے لوگ تھے۔ ذرا مولانا شبلی کی

سیرۃ النعمان اوٹھاکر دیکھئے تو آپکو معلوم ہوگا کہ حدیث میں انکی نظر کسقدر وسیع تھی اصول و رایت جسپر آپ بہت زور دیتے ہیں وہ انھیں کی ایجاد ہیں پھر تدوین فقہ کے لئے انھوں نے اپنے خاص شاگردوں میں چالیس آدمی منتخب کئے تھے مسائل کا استنباط زیادہ تر قرآن سے کرتے تھے بمجبوری صحیح حدیثوں سے مدد لیتے ہیں حضرت امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ تمام خلق امام ابوحنیفہ کی فقہ میں عیال ہیں۔ تقلید کو آپ لعنت کہتے ہیں۔ حالانکہ اجلہ علما مثلاً امام غزالی جنکے آگے آج بھی مشاہیر یورپ سرجھکانے کو تیار ہیں امام شافعی کی تقلید پر فخر کرتے تھے۔ صوفیائے کرام بھی تقلید کرنیکے لئے مجبور ہوئے خود حضرت سیدنا و مولانا عبد القادر جیلانی رحمہ اللہ حضرت امام حنبلؒ کے مقلد تھے۔ علما کے نسبت جناب کا نظریہ یہ ہے کہ اس جماعت کے اکثر افراد اپنے علم کے لحاظ سے اس قدر جاہل۔ مذہب کی حیثیت سے اس درجہ نامسلمان اور اخلاق کے لحاظ سے اتنے منافق ہوتے ہیں کہ اگر اسلام کا معیار صرف انکی ذات کو قرار دیا جاوے تو پھر معیار کفر و نامسلمانی قائم کرنے کیلئے کوئی اور ہستی نہیں مل سکتی"۔ جزاک اللہ اسکے بارے میں ہمکو زیادہ لکھنا نہیں کیونکہ ہم علما کی طرف سے وکالت کرنا نہیں چاہتے اسکے متعلق صرف اسقدر عرض کرنا ہے کہ چونکہ آپنے اکثر کا لفظ استعمال کیا ہے اوس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اب بھی کچھ علما ہیں جنکو صحیح معنوں میں عالم اور انکی ذات کو معیار کفر و نامسلمانی قائم کرنیکے لئے پیش کیا جا سکتا ہے کیا براہ مہربانی جناب مطلع فرما دینگے کہ یہ کس علم کے حاصل کرنے سے آپکے نزدیک بھی مسلم الثبوت مانے گئے۔ وہی بخاری کی حدیث جو ترک اسلام کے مرادف ہے اور وہی فقہا کا دفتر پارینہ جو غلط اصول پر مرتب کیا گیا ہے یا کوئی نئی کتاب حدیث کی جمع کی ہے اور اوس سے نیا دفتر فقہ کا مرتب کیا گیا ہے

اب آخر میں نہایت ادب سے عرض کرتا ہوں کہ شکست و ریخت بہت آسان ہے لیکن تعمیر مشکل ہے۔ نکتہ چینی سہل ہے لیکن انتظامی قابلیت کی جلوہ آرائی مشکل ہنگامہ آفرینی سب کرسکتے ہیں مگر سکون اور امن قائم کرنیکے واسطے تدبر کی ضرورت ہے۔ آگرہ کا تاج محل یا آصف الدولہ کا امام باڑہ گرانیکے لئے ہر جگہ مزدور مل سکتے ہیں لیکن شاہجہاں کی معجز نما عمارت بنانیوالا کوئی ایک کاریگر نہیں مل سکتا۔ زبان سے جو چاہنا ایک دینا قلم سے جو چاہنا لکھدینا ہر شخص کر سکتا ہے۔ آپکو اوسوقت تک فقہا یا محدثین کے کارناموں پر پانی پھیرنیکا حق حاصل نہیں ہے جبتک اوسکی جگہ دوسرا مجموعہ نہ طیار کرلیں۔ نصاب نظامیہ کو آپ بدترین نصاب فرماتے ہیں براہ مہربانی بہترین نصاب سے مطلع فرمائیے

من آنچہ شرط بلاغ است با تو میگویم ۔۔۔ تو خواہ از سخنم پند گیر یا کہ ملال
اندکے پیش تو گفتم غم دل ترسیدم ۔۔۔ کہ دل آزردہ شوی ورنہ سخن بسیار است

ربنا اغفرلنا ولاخواننا الذین سبقونا بالایمان ولا تجعل فی قلوبنا غلا للذین امنوا ربنا انک رؤف الرحیم۔

بدیع الزمان از فتحپور

نگار:۔ میرے محترم دوست جناب مولوی بدیع الزماں صاحب فتحپوری نے (جن کے ہم وطن ہونے اور ایک ہی استاد کے سامنے زانوئے ادب تہ کرنے کا فخر مجھے بھی حاصل ہے) اپنے مکتوب میں جس محبت و خلوص اور جس تاثر و درد مندی کے ساتھ میری کجروی

بیدینی، ناحق کوشی، اور زندقہ و الحاد کا ذکر فرمایا ہے، اس کے اعتراف میں جی تو یہی چاہتا ہے کہ کسی طرح میں بھی وہی "چیز" بنجاؤں جو ان کے نزدیک قابل عزت ہے اور اپنے اندر وہی تغیر پیدا کروں جس کے دیکھنے کے وہ متمنی ہیں۔ لیکن

گریباں عالمے دارد کہ در دامن نمی گنجد

اور باوجود سعی و کوشش کے بھی میں ایک لمحہ کے لئے بقول عرفی اس میں کامیاب ہوتا نظر نہیں آتا کہ

محبت تو کنم جمع با مسلمانی

یہ اور بات ہے کہ آپ میری اس کیفیت کو جسے میں مسلمانی یا اسلام سے تعبیر کرتا ہوں کفر و بیدینی کا مترادف قرار دیں اور میں آپ کے اسلام کو صرف "سہ جوے نمی ارزد" کہکر ٹال جاؤں۔ بہر حال میں اپنے فاضل دوست کے تمام جذبات خلوص کی قدر کرتے ہوئے یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ جو دلایل انھوں نے میرے خلاف ضبط فرمائے ہیں وہ جدید نہیں اور اس سے قبل بارہا میرے سامنے پیش ہو چکے ہیں اور میں نے کبھی اُن کو "نسیج عنکبوت" سے زیادہ نہیں سمجھا

آپ ضمناً بعض ایسے مسایل کا بھی ذکر کر گئے ہیں کہ اگر میں ہر ایک پر تفصیل کے ساتھ بحث کروں تو دفتر کے دفتر طیار ہو جائیں، لیکن اجمال کے ساتھ بھی ان پر بحث نہیں کرونگا۔ اس لئے نہیں کہ نتیجہ معلوم ہے، بلکہ اس لئے بھی کہ یہ طریق بحث اُس طریق کار سے بالکل جدا ہے جس کو میں نے اسلام کا مفہوم جاننے کے لئے متعین کیا ہے۔ آپ اسلام کو سمجھنا چاہتے ہیں شافعی وابوحنیفہ کو سمجھنے کے بعد اور میں اسلام سمجھنے کے بعد شافعی وابوحنیفہ کا مطالعہ کرنا چاہتا ہوں ـــ تو از آتش دُخاں بینی من آتش از دخاں بینم ـــ آپ کا اصول سفر یہ ہے کہ آنکھ پر پٹی باندھ کر رہبر کے ہات میں ہات دیدینا چاہئے اور میں اپنی بصارت کو زایل کرنے کے بعد کسی بصیرت کے حاصل کرنے پر آمادہ نہیں۔ اس لئے ممکن ہے کہ آپ منزل تک پہونچ جائیں اور میں ایک قدم بھی آگے نہ چل سکوں مگر جس حد تک اطمینان ضمیر کا تعلق ہے، میں کبھی آپ کے "قطع منازل" اور "اپنی لغزش پا" کو متوازی نہیں سمجھ سکتا۔

آپ نے سلسلۂ گفتگو میں "حضرت آدم علیہ السلام" کے متعلق بھی اپنے پندار میں نہایت ہی مُسکت دلیل کے طور پر اک طعن آمیز استفسار کیا ہے حالانکہ آپ جن کو حضرت آدم علیہ السلام کہتے ہیں وہ کوئی مخصوص شخص نہ تھے اور نہ کلام مجید سے اس کو ثابت کیا جا سکتا ہے، موسیٰ کے عصا اور ید بیضا کا بھی ذکر کر کے مجھے مرعوب و مغلوب کرنے کی سعی فرمائی ہے، دریا کے پھٹ جانے اور دیوار کی طرح اس کے قایم ہو جانے کی روایت کو بھی اک حتمی و اذعانی دلیل کی صورت میں پیش کیا ہے ورانحالیکہ یہ سب ایک طرف ادب و انشاء کے استعارات و تشبیہات ہیں اور دوسری طرف تعبیرات اخلاقی جن سے ہر زمانہ کے نبی کا کلام لبریز نظر آتا ہے۔ اسی طرح آپ نے نماز، روزہ، حج وغیرہ کے متعلق بعض آیات قرآنی کے اشارہ سے میرے دعادی کو باطل کرنا چاہا ہے لیکن اس انداز سے کہ شاید آپ نے میرے مدعا کو بھی اس وقت تک نہیں سمجھا، بہر حال میں ان کے جواب میں اسوقت بغیر کسی ادنی تفصیل کے اس سے زیادہ کچھ نہیں کہنا چاہتا کہ میرا مذہب ان "اصنامی خرافیات" سے بہت بلند ہے اور اگر اسلام کے نزدیک

بغرض محال ان تمام مسایل کو اسی روشنی میں دیکھنا ضروری ہے، جس میں آپ مطالعہ کر رہے ہیں تو معاف فرمائیے اس سے آپ کا مقصود سوائے اس کے کچھ نہیں کہ لوگ شافعی و ابوحنیفہ سے ہٹ کر خود بانی اسلام کے مقصد کو مشتبہ قرار دیں اور فقہ وحدیث سے ہٹ کر خود قرآن کو ریب و شک کی نگاہ سے دیکھنے لگیں۔ ممکن ہے آپ اس کے جواب میں فی قلوبہم مرض کہکر اپنی تسکین کریں، لیکن آپ کی تسکین دوسروں کے اضطراب کا علاج نہیں اور اسلام کا دعوائے حقیقت وحقانیت غالبًا مسلمانوں سے زیادہ غیر مسلموں سے کیا گیا ہے

مجملاً آپ نے احادیث کا بھی ذکر کیا ہے اور مجھ پر تعریض کی ہے کہ جب میں احادیث کی صحت کا قایل نہیں تو ان کو "وحی غیر متلو" کیوں کہتا ہوں۔ معاف فرمائیگا۔ اس باب میں بھی آپ نے میرے مقصود ومفہوم کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ میں یقینًا اقوال رسول اور افعال رسول کو سب سے زیادہ قابل تقلید وتمسک چیز قرار دیتا ہوں، لیکن آج صحیح احادیث کہاں ہیں اور کتنی۔ بعد ام الکتاب سب سے زیادہ معتبر بخاری کو سمجھا جاتا ہے حالانکہ تضاد وتناقض، رکاکت وسخافت، بے عقلی وادہام پرستی، جن سے ایک نبی کے افعال و اقوال کو آپ بھی منزہ مانتے ہیں، بخاری کے حجم وضخامت کے خاص عناصر ہیں۔ اسی پنجوقتہ نماز کے باب میں دیکھئے کہ کتنی حدیثیں بخاری میں ایسی موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ نے تین وقت کی نماز کو کافی بتایا ہے اس لئے میں یہ کہتا ہوں کہ جب کتب احادیث کی یہ حالت ہو تو ان کی تصحیح وتنقید کی طرف توجہ کرنا بیکار ہے کیونکہ اس میں ہمیشہ اختلاف رہیگا اور کسی ایک مرکز پر ہم کافہ انام کو نہ لاسکیں گے، چنانچہ آج حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی کی تفریق انھیں کتب احادیث کی بدولت ہے اور وہ مذہب جس سے زیادہ وحدت فی الاعتقاد، وحدت فی العمل اور وحدت فی الحیات کا درس کسی نے نہیں دیا، اس وقت احادیث کے اسی تناقض وتخالف کی وجہ سے اک طرفہ تماشہ نظر آرہا ہے۔ اور شخص تماشائی ان تمام مسالک کے انبوہ دلایل میں گم ہو کر رہجاتا ہے اور اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کس جماعت کو واقعی مسلمان سمجھے اور کس کو غیر مسلم۔ اور اگر آپ یہ کہیں کہ یہ اختلاف حقیقتًا رحمت ہے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ اس اصول کو پیش نظر رکھ کر ایک شخص ہات چھوڑ کر یا ہات باندھ کر نماز پڑھنے آمین بالجہر وآمین بالخفا کے جھگڑے کو دیکھنے کے بعد کیوں نہ تیسری صورت اختیار کرے جو ان دونوں سے مختلف ہو۔ علے الخصوص اسوقت جبکہ "اذا تعارضا تساقطا" کے منطقی استدلال سے آپ کو بھی انکار نہ ہوگا۔

اسلام کے تمام منازل عروج وانحطاط کو تاریخی نقطۂ نظر سے دیکھنے والا شخص اس نتیجہ تک پہونچنے پر مجبور ہے کہ اسلام میں تشتت وافتراق پیدا کرنے والا صرف احادیث کا عنصر ہے حتی کہ فقہ میں اختلاف کا سبب بھی اختلاف احادیث ہے اور اس سے زیادہ شرمناک بات ایک مذہب کے لئے کیا ہو سکتی ہے کہ وہ مختلف خیال کی مختلف جماعتوں کا مجموعہ ہو اور جن کے قانون میں بھی، رات دن، سیاہ وسپید اور ہاں، نہیں کا سا فرق پایا جائے۔

اس حال میں ظاہر ہے کہ آپ ایک غیر مسلم کو جب اسلام کی دعوت دینگے تو فروع سے ہٹا کر سب سے پہلے اصول ہی کی طرف لائیں گے اور اصول سمجھنے کا ذریعہ غالبًا سوائے قرآن کے اور کوئی نہیں۔ پھر ایک شخص جب اصولًا مسلمان ہو جائے

تو کوئی وجہ نہیں کہ فروع کے انتخاب یا اجتہاد میں اسے آزاد نہ چھوڑ دیا جائے جب کہ آپ کے یہاں پہلے ہی سے اس میں کبھی نہ ختم ہونے والی نزاع قایم ہے۔ آپ ایک شخص کو تعلیم قرآنی کے تسلیم کرنے پر تو مجبور کر سکتے ہیں کیونکہ ان کی صداقت خود کسی دلیل کی محتاج نہیں لیکن امام بخاری اور امام ابوحنیفہ کی تقلید کو تو اصل مذہب قرار نہیں دے سکتے۔ آپ کو کیا حق حاصل ہے کہ ایک شخص کی آزادی تنقید کو اس سے چھین لیں۔ فرض کیجئے ایک شخص توحید و رسالت کو ماننے کے بعد مسلمان ہو جاتا ہے؛ لیکن وہ کہتا ہے کہ فروع کے باب میں مجھے آزاد چھوڑ دیجئے میں خود تحقیق و مطالعہ کے بعد فیصلہ کرونگا کہ صحیح کیا ہے اور غلط کیا، تو کیا آپ اسے اپنی جماعت سے اس بنا پر نکال دینگے، کیا آپ اس سے یہ کہیئے کہ نہیں اسلام کی ضروری شرط یہ بھی ہے کہ ابوحنیفہ اور امام شافعی کی تحقیقات پر آنکھ بند کرکے عمل کیا جائے۔ یقیناً کوئی ذی عقل انسان ایسا نہیں کہہ سکتا اور ہمارے یہاں کے علماء کرام کا یہی ظلم تھا اور ہے جس نے اسلام کو سخت نقصان پہونچایا

یہ بالکل صحیح ہے کہ قرآن کی تعلیمات حکمت و فلسفہ سے بالکل علحدہ ہیں، کیونکہ اخلاق کی تعلیم دیگر دنیاوی علوم و فنون سے بالکل متمایز چیز ہے، لیکن اس کے یہ معنی تو نہیں کہ مذہب کی تعلیمات عقول انسانی کو سلب کر لیتی ہیں۔ جب تک کوئی بات کسی کی سمجھ میں نہ آئے گی، کیونکر اطمینان نفس اس کو پیدا ہوگا اور یقین و اعتقاد کی صورت کیونکر رونما ہوگی۔ آپ مجھے تو یہ کہکر ساکت کر سکتے ہیں کہ تو جاہل ہے؛ یہ قوت ہے تیرے دماغ میں قبول صلاح کی اہلیت نہیں ہے کیونکہ میں واقعی ایسا ہوں، لیکن ہر شخص سے تو آپ ایسا نہیں کہہ سکتے اور اگر ایسا کہہ سکتے ہیں تو اس کے یہی معنی ہیں کہ آپ اسلام کو صد درجہ تنگ نظر اور مستبد مذہب ثابت کرنا چاہتے ہیں جو بالکل حقیقت و واقعہ کے خلاف ہے۔

اب فرض کیجئے کہ ایک شخص قرآن کو کلام الٰہی اور نبی کو خدا کا پیامبر سمجھ کر مسلمان ہوتا ہے اور کلام مجید پر غور کرنے کے بعد کہتا ہے کہ۔ ید بیضا، عصائے موسوی، خرق دریائے نیل، قصۂ آدم، ولادت عیسیٰ وغیرہ کے متعلق جو باتیں عام مفسرین بتاتے ہیں ان کو میری عقل قبول نہیں کرتی، اس لئے میں خود کلام مجید سے اُن کو سمجھنا چاہتا ہوں، تو کیا آپ اس کو رد کردینگے؟ کیا کلام مجید پر غور کرنے اور کسی نتیجہ تک پہونچنے سے اُسے باز رکھیں گے۔ کیا آپ یہ کہد ینگے کہ کلام مجید کو صرف ایک عرب ہی سمجھ سکتا ہے اور چونکہ تم عرب نہیں ہو اس لئے اس کو نہیں سمجھ سکتے۔ اگر اسلام واقعی اس تحدید و امتناع کا نام ہے تو پھر عہد وحشت کی لامذہبیت کیا بری چیز تھی جب کم از کم معصیت کی آزادی تو انسان سے سلب نہ ہوئی تھی

مذہب کو دلایل منطقی، استنتاج فلسفہ، اصول حدیث و فقہ وغیرہ کی الجھنوں سے آزاد کرکے محض اخلاق کے سادہ اصول سے دیکھنا چاہئے اور ان سے تجاوز کرکے فضول مباحث میں نہ پڑنا چاہئے، کیونکہ جب تک یہ نہ کیا جائے گا ایک مذہب کبھی وسیع نہیں ہو سکتا اور نہ اس کی تبلیغ کیجا سکتی ہے۔ صرف اخلاق ہی ایک ایسی چیز ہے جس پر ہر ملک و عہد کا انسان متحد الخیال ہو سکتا ہے اور جس کو نوع انسانی مرتبۂ مرکزیت دے سکتی ہے؛ لیکن ایک مولوی یہ کہتا ہے کہ پہلے مجھے مولوی مانو، اس کے بعد ابوحنیفہ کو امام سمجھو، اور پھر قرآن پر غور کرو یا نہ کرو مسلمان ہو۔

میرا عقیدہ ہے کہ دنیا میں اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جسپر تمام نوع بشری کا اجتماع ہو سکتا ہے اور اس خیال کو بنیاد قرار دیکر میں نے اسلام کا مطالعہ کیا ہے۔ میں اسلام کو جس صورت میں پیش کرنا چاہتا ہوں وہ ایک ایسی حقیقی صورت ہے جس کی وسیع آغوش سے دنیا کا کوئی ذی فہم انسان باہر نہیں نکل سکتا اور آپ حضرات یہ چاہتے ہیں کہ جو چند افراد مسلمانوں کے پائے جاتے ہیں وہ بھی اسلام سے خارج کر دئے جائیں اور اسلام کو ایک لایعنی معمہ، اک مہمل چیستاں، ایک عجوبہ زار بناکر پیش کیا جائے جس میں سوائے خرافیات کے کچھ نہ نظر آئے اور جس کو ایک سنجیدہ انسان دیکھتے ہی ہماری عقلوں کے انحطاط پر بلا پس وپیش حکم لگا دے۔ پھر میں نہیں سمجھ سکتا کہ ان معتقدات سے اخلاق کو کیا فایدہ پہونچتا ہے اور انسان کی کس ترقی کا راز اس میں مضمر ہے

آپ فرماتے ہیں کہ شکست وریخت آسان ہے، تعمیر مشکل ہے، بالکل میرا بھی یہی جواب ہے اور انصاف ہر ذی فہم کے ہات میں کہ علماء دین مذہب کی تعمیر کو مسمار کر رہے ہیں یا مستحکم

نیاز

نوٹس

ہندوستانی ایکاڈمی صوبہ متحدہ آلہ آباد کے مطبوعات

ازمنۂ وسطیٰ میں ہندوستان کے معاشرتی اور اقتصادی حالات ———

از علامہ عبداللہ یوسف علی۔ ایم۔ اے۔ ایل ایل۔ ایم۔ سی۔ بی۔ ای ———

مجلد	عہ/
غیر مجلد	عہ/

زیر طبع

(۱) مغلوں سے پہلے عرب ہندوستان کے تعلقات (از مولانا سید سلیمان صاحب ندوی)

(۲) مسلمانوں کے تمدن پر ہندوؤں کا اثر (از مولانا محمد امین صاحب عباسی)

(۳) ازمنۂ وسطیٰ کا ہندوستانی تمدن (از رائے بہادر مہامہو پادھیا گوری شنکر ہیرا چند صاحب اوجھا)

(۴) ہندی شاعری (از ڈاکٹر اعظم صاحب کریوی)

جنرل سیکرٹری ہندوستانی اکاڈمی الہ آباد

باب الاستفسار

ہندو مسلم اتحاد

(جناب عبدالباقی صاحب۔ نوتنواں بازار۔ گورکھپور)

۲۸ تاریخ ماہ گزشتہ کی مختصر صحبت میں منجملہ دیگر تذکار کے ایک "ہندو مسلم اتحاد" بھی تھا جو موجودہ صورت میں "غیر تسلی بخش اور لایعنی" ثابت ہونے تک گفتگو ختم ہو چکی تھی

سوال یہ ہے کہ ہمیں من حیث القوم سیاسی حقوق حاصل کرنے کے لئے اب کیا طرز عمل اختیار کرنا چاہئے۔ میرے خیال میں یہی ایک سوال ہے جس کے حل ہونے پر ہندوستان کی نجات کا انحصار ہے۔

(نگار) آپ کے استفسار میں دو باتیں درج ہیں "ہندو مسلم اتحاد" اور "من حیث القوم" سیاسی حقوق کا حاصل کرنا میں ان دونوں میں ایک نوع کا تضاد محسوس کرتا ہوں۔ خیال و منطق کا تضاد نہیں بلکہ "رودادِ عمل" کا تضاد۔ جس وقت تک کسی مخصوص قوم یعنی مخصوص مذہب کی حیثیت سے کوئی مطالبہ ہوتا رہیگا، اس وقت تک اتحاد کا خیال اک واہمہ و خواب سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا، لیکن اگر تفریق قومی یا تمیز مذہب سے قطع نظر کرکے صرف وطنیت کو پیش نظر رکھا جائیگا تو پھر ہندو مسلم اتحاد بھی حاصل ہو جائیگا اور "من حیث القوم" کا بھی سوال نہ پیدا ہوگا

چونکہ اس وقت تک ہمارے ان کے قائدین نے (خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان) مذہبیت کو علیحدہ رکھ کر اس مسئلہ پر غور نہیں کیا اس لئے تمام موجودہ دشواریاں پیدا ہو رہی ہیں اور اس وقت تک رونما ہوتی رہینگی جب تک ایک دوسرے کو عملاً فنا نہ کردے۔ اس باب میں ہندو و مسلمان دونوں برابر کے مجرم ہیں اور مذہبی تنگ نظری دونوں فریق میں ایک ہی انداز کی پائی جاتی ہے نہ ان کی سمجھ میں آئیگا کہ چھوت چھات اور گائے کے عنصر کو کس طرح ہندو دھرم سے علیحدہ کیا جا سکتا ہے اور نہ یہ قربانی اور باجہ وغیرہ کو جزو ایمان سمجھنے سے باز آئیں گے۔ اگر آج ہندو و مسلمان دونوں اپنے اپنے مذہب سے حشو و زوائد کو علیحدہ کرنے میں کامیاب ہو جائیں یعنی دونوں بجائے مذہب کے صرف فلسفۂ مذہب کو سامنے رکھیں تو آج عصبیت دور ہو سکتی ہے اور عصبیت کا دور ہو جانا ہی اصل اتحاد و اتفاق ہے۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ یہ ممکن العمل نہیں ہے اور اس لئے یہ پیشین گوئی کرنا نہایت آسان ہے کہ ہندو مسلمان کبھی آپس میں نہیں ملسکتے اور ان کی جنگ اس وقت تک ختم نہ ہو گی جب تک ان میں موجودہ مذہبیت قائم ہے۔ یہ تو ہو گیا نظریہ۔ اب واقعات و حالات کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اب سوال ہندوستان کے سوراج ملنے یا نہ ملنے کا نہیں ہے بلکہ انتظار ہے صرف وقت کا

یہ امر روز روشن کی طرح متحقق ہو چکا ہے کہ ہندوستان آزاد ہوئے بغیر نہیں ہو سکتا، لیکن کب؟ اس کی تعیین بھی چنداں دشوار نہیں اور اگر لوگ میری پیشین گوئی پر خندہ زن نہ ہوں تو میں کہونگا کہ دس سال کی مدت بھی اس کے لئے بہت زیادہ ہے

پھر ہندوستان کا آزاد ہونا چونکہ صرف ایک ہی معنی رکھتا ہے اور وہ یہ کہ ہندو جماعت اپنی کثرت آبادی، فراوانی دولت اور اشاعت علم کی مدد سے تمام دوسری قوموں پر حاوی ہو جائے، اس لئے مسلمانوں کا قلت آبادی، کثرت افلاس، اور جہل کے اعتبار سے ایک عنصر ضعیف کی حیثیت اختیار کرنا ناگزیر ہے - یہ بالکل ریاضی کی طرح کھلا ہوا نتیجہ ہے جس پر نہ شور و واویلا کی ضرورت ہے، نہ نالۂ و شیون کی - ہندوستان ہندو قوم کا ملک ہے، انھیں کی سرزمین ہے، اک وقت غیر معلوم سے لیکر اس وقت تک خدا جانے کیسے کیسے دور حیات اِن پر یہاں گزر چکے ہیں، اس لئے کسی کو کیا حق حاصل ہے کہ ان سے اُن کے ملک کو چھین لے یا اُن کے مقابلہ میں اپنے تفوق و برتری کو ثابت کرے، ترکی، ایران، افغانستان، مصر و حجاز میں مسلم حکومتیں موجود ہیں اس لئے اگر ہندوؤں کے دل میں بھی یہ ولولہ پیدا ہو کہ وہ ہندوستان میں اپنی اکثریت سے فائدہ اُٹھا کر اقتدار حکومت قایم کریں تو بالکل فطری امر ہے اور اس پر کسی کو بُرا ماننا میرے نزدیک سخت نا انصافی ہے

تاریخ کا یہ کوئی نیا واقعہ نہیں ہے۔ بارہا اس کا تجربہ ہو چکا ہے کہ جب کسی ملک کی قومیں بیدار ہوئیں تو غیر ملکیوں کو وہاں سے نکلنا پڑا یا محکومیت اختیار کرنا پڑی - اگر مسلمان اس کو اپنی توہین سمجھتے ہیں کہ وہ ہندی کہلائیں تو پھر غیر ملکیوں کے ساتھ انکا بھی حشر ہونے والا ہے اور اگر وہ اپنے آپ کو یہیں کا فرزند جانتے ہیں، تو پھر ان کو اپنی موجودہ مذہبیت کی تنگ نظری چھوڑنا چاہئے اور سمجھنا چاہئے کہ جس چیز کو آج وہ ایثار و قربانی کے نام سے ترک کر سکتے ہیں، کل اُن کو بہ جبر چھوڑنا پڑیگی اور پھر اُس وقت کسی معاوضہ کا سوال بھی نہیں اُٹھایا جا سکیگا -

نہرو رپورٹ سے مخالفت کرنے والے وہی لوگ ہیں جو سمجھتے ہیں کہ برطانیہ کا اقتدار ہندوستان میں ہمیشہ قایم رہیگا لیکن جن کی نگاہیں زیادہ دُور رس ہیں وہ جانتے ہیں کہ نہرو رپورٹ کے نظام کو بھی ایک دن بدلنا ہے اور وہ نظام حکومت جو اس کے بعد آنے والا ہے، مسلمانوں کے لئے اور زیادہ سخت ثابت ہوگا اگر اس وقت انھوں نے رواداری سے کام لیکر ہندوؤں کا ساتھ نہ دیا

میں اس منطق کا قایل نہیں ہوں کہ اگر ہندو رواداری سے کام نہیں لیتے تو ہم کیوں لیں، رواداری خود آپ اپنی جگہ پیدا کر لیتی ہے، اور اگر ہم پہلے سے سیلاب کے گزر جانے کے لئے جگہ بنا دیں تو دیوار کے گرنے کا اندیشہ باقی نہیں رہتا - اس لئے میرے نزدیک ہندو مسلم اتحاد سے زیادہ یہ مسئلہ غور طلب ہے کہ مسلمان کس حد تک ایثار سے کام لے سکتے ہیں اور اپنی اقلیت کو اہم بنانے کے لئے وہ کس حد تک تعلیم و اقتصاد میں ترقی کرنے کے لئے آمادہ ہیں - اس کے علاوہ اور کوئی سوال اس وقت غور طلب نہیں ہے لیکن مجھے معلوم ہے کہ جب تک یہ کم سواد علماء اور کوتہ اندیش لیڈروں کا گروہ موجود ہے وہ اذان باجہ، ناقوس، قربانی، تبلیغ، شدھی وغیرہ کے جھگڑوں ہی میں مبتلا رکھیگا اور کبھی اس کا موقعہ نہ دیگا کہ مسلمان سنجیدگی سے اپنے مستقبل پر غور کر کے

ان مہلات کو ترک کریں اور بحیثیت مسلمان ہونے کے نہیں بلکہ بہ لحاظ انسان ہونے کے دوسروں سے اتحاد کرنا سیکھیں حقیقت یہ ہے کہ ان حالات کو دیکھتے ہوئے مجھے مسلمانوں کا مستقبل بہت تاریک نظر آتا ہے اور یہ سیاسی یا مذہبی حقوق طلبی بالکل بے نتیجہ سی بات ہے۔ جس وقت تک اسپین کی قومیں بیدار نہ ہوئی تھیں مسلمانوں نے پوری داد حکومت دی، لیکن جب ان کو ہوش آیا اور انھوں نے آزادی حاصل کی تو مسلمانوں کو آخر کار ہسپانیہ کی سرزمین کو خیرباد کہنا ہی پڑا۔ بالکل یہی حال ہندوستان کا ہے کہ جب تک یہاں کی قوموں میں احساس ذلت و محکومیت پیدا نہ ہوا تھا مسلمانوں نے بھی حکومت کی، انگریزوں نے بھی شاہنشاہی کر لی۔ لیکن اب جبکہ سارے ملک میں بیداری پیدا ہو گئی ہے نہ انگریزوں کی حکومت یہاں رہ سکتی ہے اور نہ مسلمانوں کو کوئی ایسا خاص حق مل سکتا ہے جس کے وہ کسی طرح سے مستحق نہیں ہیں

نیاز

مرغ شب آہنگ

گرچہ میں ظاہر میں ہوں اک طائرِ یک مشت پر
قدر میری جانتے ہیں کچھ مگر اہل نظر

ہوں نوا سنج فغاں بھی زمزمہ پرداز بھی
میرے نغموں کی صدا میں سوز بھی ہے ساز بھی

غیرت صحن چمن ہے تنگ دامانی، مری
نغمہ پردازی بھی ہے، گویا گل افشانی مری

کھینچ لیتی ہے دلوں کو، زمزمہ سازی مری
وجد میں لاتی ہے طرز نغمہ پردازی مری

سحر پنہاں ہے مری آواز میں ڈوبا ہوا
میری طرز نغمہ میں جادو ہے اک چلتا ہوا

ہے مرا حسن ترنم جلوہ آرائے چمن
میرے ہر ذرہ میں پوشیدہ ہے سورج کی کرن

میں نے پرتو لے ادھر اور اُس طرف آئی بہار
ہے مری جنبش میں راز گردش لیل و نہار

میرے نغمے اور بہار جلوۂ حسن چمن
تازہ کر دیتے ہیں رنگین یاد ایام کہن

''عشرت دیرینہ'' کا خواب پریشان، دیکھنا
اس طرف بھی اک ذرا او چشم گریان دیکھنا

شب کو جب ہوتی ہے ہر سو خامشی چھائی ہوی
صحن گلشن میں صبا پھرتی ہے اترائی ہوی

ذرہ ذرہ خواب سے لبریز ہو جاتا ہے جب
جلوۂ انجم، تبسم ریز ہو جاتا ہے جب

وسعت عالم پہ چھا جاتا ہے ہر جانب سکوت
ہر نفس دیتا ہے ذوق استراحت کا ثبوت

جب ترنم آفریں ہوتی ہے، موج آبشار
ہر طرف ہوتی ہے، عطر افشاں ہوائے خوشگوار

نخل جھک جاتے ہیں، ذوق خواہش آرام سے
روح ہو جاتی ہے غافل تلخی ایام سے

ہلکی ہلکی ابر کے ٹکڑوں سے، پڑتی ہے پھوار
بھینی بھینی بوئے گل دیتی ہے پیغام بہار

شوق پنہاں چٹکیاں لیکر جگاتا ہے مجھے
چپکے چپکے داستان گل سناتا ہے مجھے

بیخودی میں آشیانے سے نکل آتا ہوں میں
ساز گلشن میں نئی اک روح دوڑاتا ہوں میں

پھول کھل جاتے ہیں پھر میرے ہنسانے کے لئے
باد نرم آتی ہے مجھکو گدگدانے کے لئے

جھومتے ہیں غنچۂ نورس مری آواز پر
رقص یا کرتی ہیں، کچھ پریاں صدائے ساز پر

وجد کرتے ہیں شجر، چلتی ہے رک رک کر ہوا
بربطِ موج رواں سے اب نہیں آتی صدا

محفل انجم میں رک جاتا ہے ساز سرمدی　　میرے نغمے ہیں نوا پرداز راز سرمدی
چاندنی لینا چاہتا ہے مجھ کو، پھر آغوش میں
میں سراپا شوق ہوتا ہوں ڈوبِ جوش میں
میں اسی عالم میں ہوتا ہوں نوا پرداز شوق　　نغمۂ الفت سے پُر ہوتا ہے میرا ساز شوق
یک بیک برباد ہو جاتا ہے، سامان طرب　　آہ، وہ کیفیت سرشار، وہ شان طرب

وہ شباب آرزو آشوب پیری بن گیا　　میرا نغمہ ہی مری وجہ اسیری بن گیا
کیا خبر تھی قصر دل ہو جائے گا برباد بھی　　دام پھیلائے ہوئے ہے تاک میں صیاد بھی
اب نہ وہ میں ہوں، نہ وہ عیشِ بہار فصل گل　　میری آنکھیں ہیں مگر نوحہ گزار فصل گل
اب نہ وہ جوش ترنم ہے نہ وہ آزادیاں　　بن گیا ہوں میں سراپا ساز آہنگ فغاں
ماتم حسرت ہے، میرا شغل بیکاری تجھے　　بند رکھتی ہے قفس کی چار دیواری مجھے
ہوں سراپا غم قفس میں آشیانے کے لیئے　　فکر ہوتی ہے مجھے کب آب و دانے کے لیئے
اضطراب زندگی سے برسرِ پیکار ہوں
گنج ہستی سے نکلنے کے لیئے تیار ہوں
ہم اگر سمجھیں تو ہے ایسا ہی اس دنیا کا حال　　ابتدا سے چاہیئے انسان کو احساس مآل
کام زائد، وقت کم، سرگرم، بیدادِ اجل　　تاک میں آٹھوں پہر رہتا ہے، صیادِ اجل

جسم پابند فنا ہے، اور [illegible] ہے تنہا　　یاد رکھ ہے روح کو حاصل مگر دائم بقا
"روح بھی، لیکن وہ مُردہ ہے جو بے احساس ہے"　　تجھ کو اس آئینِ فطرت کا اگر کچھ پاس ہے
یادگاریں چھوڑ جا، اس دار فانی کے لئے
کام کچھ کر جا، حیات جاودانی کے لئے

ملی اختر۔ اختر

اسرار

(۱)

روحِ خوابیدۂ الفت ہے تو بیدار نہ کر
قلب سرشارِ محبت ہے تو ہشیار نہ کر
لذتِ درد کو — ہم معنیٔ آزار نہ کر
عشق رکھتا ہے اگر دل میں تو — اظہار نہ کر

(۲)

نغمۂ عشق نہیں — دھن میں گا نیکے لئے
یہ فسانہ نہیں — دنیا کو سنانے کے لئے
نہ جلانے کے لئے ہے — نہ بجھانے کے لئے
عشق کی آگ ہے سینے میں دبانے کے لئے

(۳)

"حسن" تو لاکھ حجابوں میں رہے یوں مستور
اور بے پردگیٔ عشق ہو تجھ کو — منظور
کیا ملے گا تجھے — ؟ یہ راز ہو اگر مشہور
سامنے ہے ترے افسانۂ "دار و منصور"!

(۴)

اشک بنکر بھی نہ عریاں ہو ترا ذوق گداز
تیرے جذبات کا گہوارہ ہو — خلوتگہ راز
آرزوؤں کو نہ دینا کبھی — اذن پرواز
ورنہ ہستی تری ہو جائیگی مجبورِ نیاز

(۵)

جس طرح نکہت گل ہو گل رنگیں میں نہاں
جس طرح نشۂ مے ہو مئے زریں میں نہاں
جیسے — گوہر ہو تہِ چشمۂ آئیں میں نہاں
یون ہی الفت بھی ہو تیرے دلِ غمگیں میں نہاں

(۶)

شام میں ہو کوئی دھندلا سا ستارہ — روپوش
قلب صحرا میں ہو کوئی گل صحرا — روپوش
جیسے — فانوس میں ہو شمع تجلی روپوش
ترے دل میں ہو یونہی داغ تمنا روپوش

(۷)

مشتعل شمع اگر ہو تو — بجھانا اچھا!
درد بنجائے اذیت تو — مٹانا اچھا!
جس طرح خواب پریشاں کا بھلانا اچھا!
ہے یونہی جوشِ محبت کا دبانا اچھا!

(۸)

مصحفِ عشق کی — تفسیر نہیں کرتے ہیں
معنیٔ عشق کو — "تصویر" نہیں کرتے ہیں
عصمتِ عشق کی — تشہیر نہیں کرتے ہیں
یعنی اس خواب کی — تعبیر نہیں کرتے ہیں

(۹)

جو سراپردۂ الفت کے مکیں — ہوتے ہیں
خاتمِ رازِ محبت کے نگیں — ہوتے ہیں
جو کبھی عشق میں — "بیصبر" نہیں ہوتے ہیں
وہ خداوندِ محبت کے "امیں" ہوتے ہیں

روشن صدیقی

غزلیات

باسط بسوانی

کونسا جور و ستم تم نے اٹھا رکھا ہے　　یاد سب کچھ ہے مگر دل نے بھلا رکھا ہے

گر یہی رنگ جفا ہے تو خدا خیر کرے　　آج تک دل کو تو پابند وفا رکھا ہے

سر جھکا لیتے ہیں وہ سن کے ہماری باتیں　　اس تغافل کا مگر نام حیا رکھا ہے

آپ ہی در پہ ترے کرتا ہوں پھروں فریاد　　آپ ہی کہتا ہوں فریاد میں کیا رکھا ہے

بزم عشاق میں منہ پھیر کے ہنسنے والے　　یہ بھی تو دیکھ لے کس کس کو رلا رکھا ہے

وہ سنیں یا نہ سنیں آہ سحر اے باسط　　ہم نے تو اپنا یہی وقت دعا رکھا ہے

ثاقب جالندھری

کوئی نہ جب اٹھا سکا بار گران زندگی　　خاک میں ساری مل گئی عزت و شان زندگی

دل کی مرے اک آرزو آپ جسے مٹا چکے　　تھی وہی روح زندگی تھی وہی جان زندگی

زیست ہے آجکل مگر فتنہ و شر کی زیست ہے　　دور فلک سے مٹ گیا امن و امان زندگی

دشت نورد دشت کے ذروں کو خوب چھان لے　　شاید انھیں میں مل سکے کوئی نشان زندگی

برسوں سے زندگی پہ ہے ہم کو گمان موت کا　　برسوں رہے گا موت پر ہمکو گمان زندگی

. . . .

وہ کہ نہیں اٹھا سکے ہاتھ میں اپنے تیغ بھی　　ہم کہ اٹھائے پھرتے ہیں بار گران زندگی

. . . .

. . . .

. . . .

ثاقب زار تھا کہاں زندہ دلی سے آشنا　　دل کی تڑپ نے کر دیا سحر بیان زندگی

حافظ غازی پوری

کھل گیا جب حسن کے رخسار سے بندِ نقاب
عشق کے مطلع پہ چمکا پھر نیا اک آفتاب

جب نگاہِ "شوخ" اسکی بنگئی برقِ سحاب
حسن کی دنیا ہوئی "آسودۂ" عہدِ شباب

عشق کی کیفیتوں میں لغزشِ مستانہ ہے
حسن کی تاثیر میں ہے نشۂ جامِ شراب

عشق اپنی سادگی میں فطرت آسودہ تھا
کردیا اُس میں بھی پیدا حسن نے اک انقلاب

ہر شکست "آرزو" میں ہے نمودِ امید کی
قطرہ قطرہ بحرِ ہستی کا بنا رشکِ حباب

ذرہ ذرہ زندگی کا ہے تلاطم آشنا
ہے یہ "احساس" سکون بھی ایک کیفِ اضطراب

جلوہ گر ہونے کو ہے اب آفتابِ روزِ حشر
لو اُٹھو حافظ بہت تم رہ چکے مصروفِ خواب

فرخ بنارسی

وجد آفرین جو نغمۂ سازِ الست تھا
ایک ایک ذرہ کیف ترنم سے مست تھا

کم روزِ حشر بھی نہوا کیف بیخودی
دل سرخوشِ سرورِ شرابِ الست تھا

حدِ تعینات سے جب مین گزر گیا
یکسان مری نگاہ مین بالا و پست تھا

روزِ ازل تھا دونوں طرف رنگِ اتحاد
بیخود ادہر تھا عشق اُدہر حسن مست تھا

آزاد ہو کے اور بھی مجبور ہو گئے
پوشیدہ فتحِ نفس مین رازِ شکست تھا

وحشت میں بھی رہا وہی سودائے جستجو
دیوانۂ مجاز حقیقت پرست تھا

کیفیتِ بہار کی اللہ رے مستیان
جو پھول تھا چمن مین وہ ساغر بدست تھا

مجموعۂ حوادثِ پیہم تھی زندگی
تھا جو نفس وہ نغمۂ سازِ شکست تھا

فرخ کا سر جھکا نہ کسی کی جناب مین
وہ بندگی کے جوش میں بھی حق پرست تھا

نظیر لودھیانوی

ترستا ہے تماشائی کو جلوہ اے خدا میرا
عدم میں کب تلک پنہاں رہیگا آشنا میرا

دیارِ عاشقی میں تذکرہ ہے جا بجا میرا
مگر منکر ہے میری دوستی سے بیوفا میرا

چمن والوں نے اندازِ ترنم مجھ سے سیکھا ہے
تعجب ہے کہ نامحرم ہے اب تک ہم نوا میرا

یہی عالم ہے گر احباب کی بے التفاتی کا
درو دیوار سے پوچھیں گے اکدن مدعا میرا

سکوتِ صبح ہستی میں ابھی مثلِ نوا گم ہوں
ابھی حرف و زباں سے بے خبر ہے ماجرا میرا

سمجھتے ہیں مجھے ادنیٰ مسافر ہم سفر میرے
چراغِ رہگذر آخر بنے گا نقشِ پا میرا

تحیر عشق کی قوت سے ہوگا ایک دنیا کو
شبِ فرقت ابھی اُٹھا نہیں دستِ دعا میرا

سنا ہوگا فسانہ قیس کی صحرا نوردی کا
محبت کے جنوں میں وہ بھی اک انداز تھا میرا

وفورِ دردِ فرقت سے سراپا سازِ حسرت ہوں
زباں ہے غم فزا میری سخن ہے جانگزا میرا

ملے گر بادشاہی بے مشقت میں نہ لوں ہرگز
مجھے اس رنگِ کسریٰ سے ہے بہتر بوریا میرا

کسی نااہل کے اعزاز سے مجھکو حسد کیوں ہو
مجھے آخر دلا ہی دیگا میرا حق خدا میرا

کہا واعظ کے ارشادات سن کر زاہدِ دنیا نے
ابھی نکلا ہے میخانہ سے چھپ کر پارسا میرا

نظیر اقبال کے اس قول پر ایمان رکھتا ہوں
میں وہ بندہ ہوں جس پر ناز کرتا ہے خدا میرا
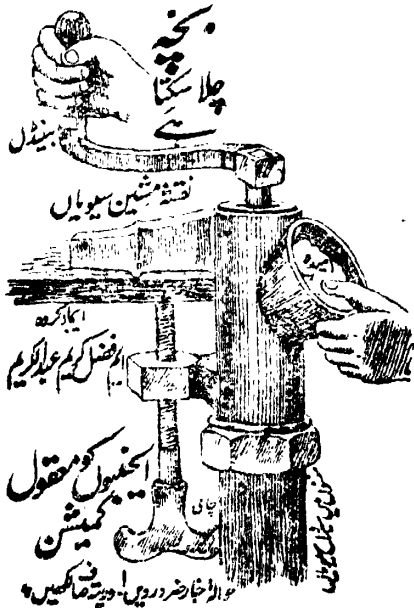
معلومات

نشوونما میں جگہ کا اثر!

الوانِ حیوان کی علمی تعلیل

جنگل اور میدان، باغ اور گلشن میں ہمیشہ رہنے والے قادر عظم کی اس حکیمانہ اور بصیرت افروز قدرت کا علانیہ مشاہدہ کرتے ہیں کہ درندے اور چرندے بہایم اور وحوش، پرندے اور طیور، ہوام اور حشرات سب کے اجسام کا رنگ مقام مسکونہ کے مانند ہوتا ہے چنانچہ شمالی شہروں میں جہاں کثرت سے برف باری ہوتی ہے۔حیوانات اکثر سفید رنگ کے ہوتے ہیں۔ اور جن جنگلوں اور میدانوں میں ریت زیادہ ہوتی ہے، وہاں کے حیوانات کا رنگ بیشتر ریتیلا ہوتا ہے۔جن چمنوں میں کلیاں زیادہ کھلتی ہیں۔ وہاں کے حشرات اور طیور رنگین ہوتے ہیں جن نیستانوں میں نے کے سائے مستوی خط میں زمین پر پڑتے ہیں۔ وہاں اکثر مخطط (چیتا) رہتا ہے بہتیرے پتنگے جن کلیوں پر رہتے ہیں، انھی کے مشابہ ہوتے ہیں۔ اکثر چھوٹے چھوٹے ٹڈے جن شاخوں پر رینگا کرتے ہیں انھی کے مانند ہوتے ہیں۔ الغرض حشرات وحیوان کی جتنی قسمیں ہیں خواہ چھوٹی ہوں یا بڑی، ان تمام کا رنگ اپنے مکان مسکونہ کے رنگ سے ملتا جلتا ہوتا ہے حتی کہ موسم کے بدلنے پر جب کبھی جگہ کا رنگ بدل جاتا ہے تو اس تبدیلی سے بھی حیوانات کے رنگ متغیر ہو جاتے ہیں۔ اور یہ تمام باتیں وہ عینی مشاہدے ہیں جن میں شاید دنیا کے دو انسان کبھی مختلف نہ ہونگے

لیکن پھر اس تلون کے کیا اسباب ہیں؟ ماہرین فن نے پہلے پہل اس مسئلہ کی یہ تعلیل بیان کی کہ عنایت آلہیہ حیوانات کو ان الوان کے ساتھ محض انکی حفاظت کیلئے رنگتی ہے تاکہ دشمن کی متجسس نگاہیں انپر نہ پڑ سکیں، اور وہ ان کی زندگی کا فیصلہ کردینے والے حملوں سے محفوظ رہیں۔ لیکن حقیقت میں مسئلہ کا یہ حل کوئی شافی حل نہیں ہے

اسپر اعتراضاً یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر اس سے عنایت آلہی کا منشا حیوانات کی محض حفاظت اور نگہداشت ہوتی تو بہت ممکن تھا کہ وہ کسی دوسرے سہل اور عمدہ اسلوب پر انکی حفاظت کرتی یعنی ایسا ہوتا کہ وہ تمام حیوانات کو نبات خور بنا دیتی اور خود ان درندوں میں شکار کا کوئی طبعی میلان ہی پیدا نہ کرتی، اس لئے کہ مثلاً شیر کو طبعاً شکار حیوان کی طرف مائل کرنا اور شیر کی خوراک صرف حیوانات کا گوشت بنانا پھر شیر کے حملوں سے حیوانات کی حمایت کرکے شیر کو بھوکوں مارنے کی سعی کرنی یہ کوئی حکیمانہ بات نہیں ہے۔ اور مشاہدہ بھی اس حمایت کی تائید نہیں کرتا ہم دیکھتے ہیں کہ شیر ہمیشہ حیوانات کا شکار کرتا ہے اور اسکی خوراک انھی حیوانات کا لذیذ گوشت ہوتی ہے

علماء فن نے الوان حیوان میں پھر مزید غور و فکر کے بعد ایک دوسری عقل سے زیادہ قریب یہ تعلیل بیان کی کہ:-

اگر کسی ہرنی کے دو بچے پیدا ہوں اور ایک کا رنگ مکان پیدائش کے ہمرنگ ہو اور دوسرے کا اس کے خلاف، تو راجح یہی ہے کہ شیر اسی بچے کو دیکھ سکیگا اور اس پر حملہ بھی کرے گا جس کا رنگ اس زمین کے رنگ کے خلاف ہوگا، دوسرا بچہ اس قسم کے خطرات سے بالکل محفوظ رہیگا۔ یہیں سے اس قول کی تصدیق کیجاتی ہے کہ حیوان کا رنگ جو مکان کے مشابہ ہوتا ہے وہ دراصل اسکی حفاظت کا ایک طبیعی سلاح ہے لیکن اسکا یہ منشا نہیں ہے کہ جو حیوانات اون مکان کے ہمرنگ ہوتے ہیں وہ کلیتہً اپنے اعداء کی چیرہ دستیوں سے محفوظ رہتے ہیں۔ بلکہ اس سے یہ مراد ہے کہ اس قسم کے حیوانات ان حیوانات کے مقابلہ میں جن کا رنگ مکان سکے مخالف ہوتا ہے البتہ خطرات سے مامون ہوتے ہیں، ماہرین فن کے نزدیک اس سلاح کو انتخاب طبیعی سے تعبیر کیا جاتا ہے؟

مگر حقیقت میں یہ تعلیل بھی مسئلہ کے تمام حقایق و معارف کی پردہ کشائی نہیں کرتی، ابھی تک نفس مسئلہ کی یہ پہلی گرہ بھی نہ کھل سکی کہ حیوانات کا رنگ شروع میں کیونکر متغیر ہوتا ہے؟ اور پھر کن کن تبدیلیوں کے بعد کیونکر وہ مکان کے ہمرنگ ہوجاتا ہے؟ اگر اصل میں اسکی کوئی طبیعی علت ہے تو ضروری ہے کہ وہ علت اس کے نسل میں بھی کارفرما ہو،

علامہ ڈلیش ماہر طبیعیات نے اس موضوع پر ایک استقرائی بحث کی تو انکو معلوم ہوا کہ جن پرندوں میں اوقات معلومہ کے اندر قوۃ حیاۃ بڑھتی رہتی ہے وہ دوسرے پرندون کے مقابلہ میں زیادہ رنگین اور خوبصورت ہوتے ہیں، عرصہ دراز سے ہمکو یہ معلوم ہے کہ بعض حیوانات کے رنگ جاڑونمیں زائل ہوجاتے ہیں تو اسکی بھی بڑی وجہ ان حیوانات میں قوۃ حیات کا ضعف ہے بعض محققین خرگوش کو ایسے پہاڑوں پر لیگئے جو ساحل بحر سے تقریبًا ۹۵۰۰ قدم اونچے تھے۔ اور وہاں ان کے بچونکی سات سال تک مسلسل پرورش کی تو انکو ثابت ہوا کہ ان بچوں کے اجسام کچھ چھوٹے ہوگئے اور ان کا رنگ سفید اور خونمیں ایک کیمیاوی تغیر پیدا ہوگیا یعنی خونمیں لوہے کا عنصر زیادہ بڑھگیا، اور جذب آکسیجن کی طاقت بھی زیادہ ہوگئی اگر ان خرگوشون کی یہ نسل زیادہ دنون تک وہاں رہتی تو یہ تغیر اور زیادہ نمایاں ہوجاتا اور خرگوش کی ایک نئی صنف پیدا ہوجاتی لیکن یہ عظیم الشان انقلاب محض فعل مکان کیوجہ سے ہوتا کسی دوسرے سبب سے نہیں، مختصر یہ کہ قوۃ حیاۃ کی زیادتی الوان کو زیادہ اور اس کا نقص الوان کو کم کردیتا ہے۔ اور شاید مرغ کی رنگینی و خوبصورتی کا اصلی راز بھی قوۃ حیاۃ کی فراوانی ہے

بعض لوگوں نے ثابت کیا ہے کہ حیوان کا رنگ، غذا کے رنگ پر موقوف ہوتا ہے وہ اپنے دعوی پر یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ بعض دریاؤنمیں جو گھاس مینڈک اور گھونگھے کثرت سے کھاتے ہیں، وہ قرمزی رنگ کے ہوتے ہیں، اور بعض لوگ جو کیڑوں کو رنگین غذائیں کھلاتے ہیں اس کا منشا صرف انکو رنگین بنانا ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ اُنہی رنگونمیں رنگ بھی اٹھتے ہیں، لیکن اس ترکیب کا اثر صرف حیوانات صغیرہ تک محدود ہے۔ حیوانات کبیرہ میں اس کا کوئی اثر نہیں ظاہر ہوتا یا بڑے حیوانات مین اسکی تاثیر دوسرے موثرات کے فعل کے ساتھ مختلط ہوجاتی ہے، اس لئے اس کا نتیجہ ظاہر نہین ہوتا

بہتیروں نے اس حقیقت کا بھی سراغ لگایا کہ جو مچھلیاں کچھ دنوں کسی دریا میں رہی ہوں اور کچھ دنوں کسی نہر میں تو ان کا رنگ محض اختلاف نور کیوجہ سے بدلجاتا ہے۔ جب پانی کم اور صاف ہوتا ہے اور اسمیں روشنی بخوبی پہونچتی ہے تو مچھلی کا رنگ سفید

ہوتا ہے پھر جب وہ زیادہ گہرے اور سیاہ پانی میں چلی جاتی ہے تو اسکا رنگ مکدر ہو جاتا ہے، اس مقام پر دیکھو انتخاب طبیعی کا کوئی محل نہیں ہے، بلکہ مچھلی کے رنگ میں محض اختلاف نور کی وجہ سے تبدیلی آگئی ہے

ماہرین فن کو یہ حقیقت معلوم ہو چکی ہے کہ جو چھوٹی مینڈک نباتات اور اشجار کی ڈالیوں پر رہتی ہے، وہ سبز پتیوں میں سبز ہوتی ہے۔ اور جب اسکو زمین پر یا گندم گون پتیوں پر رکھدیا جائے تو اس کا رنگ گندمی ہو جاتا ہے۔ نیز اس قسم کا تغیر گرگٹ وغیرہ میں زیادہ نمایاں ہوتا ہے۔ بعض علماء نے مینڈک کے رنگ کے تغیر کے اسباب سے بحث کی تو انکو معلوم ہوا کہ مینڈک کے جسم میں جو لبصلات کے تین طبقے ہیں۔ طبقہ اسفل میں سیاہ، طبقۂ متوسط میں اصفر اور طبقہ اعلیٰ میں ارزق رنگ ہوتا ہے اور ان تینوں طبقات سے اوپر ایک رقیق اور شفاف پردہ منڈھا ہوتا ہے۔ جب مینڈک اشجار و نبات کی پتیوں پر ہوتا ہے تو اصفر اور ارزق کے امتزاج سے اخضر رنگ پیدا ہوتا ہے۔ اور جب وہ زمین یا کسی تاریک چیز پر رکھدیا جاتا ہے تو طبقۂ اسفل کا سیاہ رنگ ظاہر ہوتا ہے اسی طرح گرگٹ کے جسم میں بھی مختلف لبصلات ہوتے ہیں وہ بھی جب نبات سبز پر ہوتا ہے تو اس کا رنگ سبز ہو جاتا ہے۔ اور جب سرخ رنگ کی شاخوں پر چلتا ہے تو اس کا رنگ سرخ ہو جاتا ہے اور جب اسکو کسی برتن کے نیچے سطح بند کر دیا جائے کہ وہاں کسی ذریعہ سے روشنی نہ پہونچ سکے تو اس کا رنگ سیاہ ہو جاتا ہے، اس تغیر کا سبب یا تو کوئی عصبی فعل ہے جو مختلف رنگ کے حویصلات پر موثر ہوتا ہے یا اس کا سبب محض نور ہے۔ ماہرین فن کے نزدیک دوسرا سبب زیادہ مرجح ہے

بعضوں نے ثابت کیا ہے کہ جس مچھلی کا رنگ پانی کے تغیر کے ساتھ متغیر ہو گیا ہو اگر وہ اندھی ہو جائے تو پھر پانی کا رنگ بدلتے پر بھی کبھی اس مچھلی کا رنگ نہ بدلے گا، یہ حقیقت اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ نور، پہلے عصب بصر پر موثر ہوتا ہے، پھر اسکی تاثیر ان اعصاب کی طرف منتقل ہوتی ہے جن کے ذریعہ حویصلات ملونہ میں انبساط یا انقباض پیدا ہوتا ہے۔ بعض محققین کی یہ تحقیقات ہے کہ نور بلا کسی واسطے کے مباشرۃً بھی حویصلات پر موثر ہوتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے تجربتاً ایک مینڈک کو تاریکی میں رکھا اور جب وہ سیاہ ہو گئی تو اس کے بدن پر مختلف جگہوں میں سیاہ کاغذ کے ٹکڑے لپٹا دئے اور روشنی میں انکو رکھا تو کاغذ کی جگہوں کے سوا پوری جلد سبز ہو گئی، بعض علماء نے مزید تجربہ کیلئے ستر مینڈکوں کی آنکھیں نکال لیں، اور انکو ایک تاریک مکان میں رکھا تو ان کا رنگ فوراً سیاہ ہو گیا پھر جب سبز شاخیں ان کے پاس لائی گئیں تو ان کا رنگ سبز ہو گیا۔ اس تجربہ سے یہ ثابت ہوا کہ جو اخضر نور اوراق سبز سے منعکس ہوتا ہے وہ ایک مخصوص تاثیر کے ساتھ اعصاب جلد میں موثر ہوتا ہے۔ چاہے اسکو مینڈک دیکھے یا نہ دیکھے

اس کے علاوہ علماء کے اور بہت سے مباحث ہیں جو اس حقیقت پر دلالت کرتے ہیں کہ طعام و مکان یہ دونوں حیوانات کے رنگوں میں بہت زیادہ موثر ہیں۔ نیز مزید تحقیقات کا سلسلہ ابتک برابر جاری ہے۔ امید ہے کہ عنقریب وہ اس مسئلہ کے بہت سے غوامض و مشکلات اسرار و رموز کا انکشاف کریں گے۔

بدر اصلاحی

نمونہ رسالہ نگارات　　ملنے کا پتہ۔ مینیجر عصمت دہلی　　محصول ڈاک بذمہ خریدار

رسالہ عصمت دہلی

شریف بیگمات کے لئے ہندوستان بھر کا بہترین رسالہ ہے

اسی لئے

ہندوستان بھر کے تمام زنانہ رسائل واخبارات میں سب سے زیادہ اشاعت رکھتا ہے

عصمت ۔ اکیس سال سے کامیابی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے اور امراء، رؤساء، و شرفاء کے طبقہ میں قابل رشک مقبولیت و وقعت حاصل کر چکا ہے اور شریف کنواری بچیوں کو آنکھ بند کر کے دیا جاتا ہے۔

ہندوستان کے سینکڑوں رسالوں میں صرف **عصمت** کو یہ فخر حاصل ہے کہ **علامہ راشد الخیری** مدظلہ کے گراں بہا مضامین اور افسانے قریب قریب ہر ماہ شائع کرتا ہے۔

ہندوستان بھر میں صرف عصمت وہ رسالہ ہے جس کی مضمون نگار خواتین ہندوستان کے ہر حصہ میں کافی تعداد میں موجود ہیں۔

عصمت کے دستکاری و خانہ داری پر مفید مضامین، تمدنی معاشرتی تعلیمی بحثیں، عصمت کے سبق آموز و نتیجہ خیز افسانے، موثر و دلاویز نظمیں ادب اردو میں امتیازی شان رکھتی ہیں۔

عصمت مضمون نگار خواتین کو نہایت معقول انعامات ہر سال تقسیم کرتا ہے۔

عصمت ۔ اردو کے مقتدر رسالوں میں سب سے زیادہ تصاویر شائع کرتا ہے۔

اردو کے تمام رسالوں میں صرف **عصمت** کا ٹائٹل پیج رنگین بلاکوں کا نہایت خوبصورت چھپتا ہے۔

عصمت کی اشاعت میں کبھی ایک دن کی بھی دیر نہیں ہوتی، نہایت پابند وقت رسالہ ہے۔ ہمیشہ ۲۰ تاریخ کو شائع ہو جاتا ہے۔

عصمت اردو کے تمام زنانہ رسالوں سے زیادہ مضامین ہر ماہ شائع کرتا ہے۔ بھرتی کے مضامین اس میں درج نہیں کئے جاتے۔

سالانہ چندہ مع محصول ڈاک پیشگی صرف پانچ روپے (صہ)

قسم دوم بے تصویر۔ معمولی ٹائٹل اوسط درجہ کا کاغذ۔ صرف تین روپے چھ آنہ (سہ ۶)

قسم خاص تمام رسالہ آرٹ کاغذ پر چھپتا ہے سالانہ چندہ دس روپے (عہ) فی پرچہ عہ

سالانہ خریداروں کے ساتھ رعایت

اگر اس وقت آپ عصمت کے سالانہ خریدار بن جائیں تو آپ کو یہ فائدہ ہوگا کہ عصمت کا مشہور شاندار جوبلی نمبر جس کی قیمت ۸؎ ہے آپ صرف ۸؎ میں علاوہ محصول ڈاک حاصل کر سکتے ہیں اور سالگرہ نمبر ۲۹ء جس کی قیمت عہ ہے صرف عہ میں۔ مگر بہت کم پرچے باقی ہیں اس لئے جلدی کیجئے۔

اردو رسائل کے خاص نمبروں میں عصمت کے خاص نمبر امتیازی شان رکھتے ہیں

مینیجر عصمت کوچہ چیلان دہلی

ملنے کا پتہ: منیجر عصمت دہلی
الزہرا
از علامہ راشد الخیری مدظلہ
بنت الرسول خاتون جنت حضرت بی بی فاطمہ کی اردو زبان میں بہترین سوانحعمری تاریخ میں بیش بہا اضافہ کے علاوہ الزہرا بتاتی ہے کہ میاں بیوی کس طرح رہتے ہیں مائیں بچوں کو کس طرح پالتی ہیں دنیا کے ساتھ دین کیونکر میسر آتا ہے واقعات اس قدر دردانگیز کہ پڑھتے پڑھتے ہچکی بندھ جاتی ہے خاتمہ پر واقعہ کربلا پر بحث۔ آٹھواں ایڈیشن قیمت عہ
اُمّت کی مائیں
از علامہ راشد الخیری مدظلہ
رسول اکرم صلعم کے ازواج مطہرات کے مختصر مگر مکمل حالات جو مسلمان مردوں عورتوں کو دین و دنیا میں کامیابی کا صحیح رستہ بتاتی ہے کثرت ازدواج پر اس قدر معقول بحث ہے کہ غیر مسلم بھی تسلیم کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ہر مسلمان خاتون کی لائبریری میں یہ کتاب ہونی ضروری ہے
قیمت صرف عہ
منازل السائرہ
از علامہ راشد الخیری مدظلہ
یہ وہ مشہور تصنیف ہے جو یونیورسٹیوں کے کورس میں داخل ہے۔ جس پر مشہور اخبارات نے بڑے شاندار ریویو کئے تھے ایک لڑکی کی پیدائش سے موت تک کے تمام واقعات اس قدر دلچسپ پیرایہ میں لکھے گئے ہیں کہ بار بار پڑھنے پر انسان مجبور ہوتا ہے۔ حصہ اول عہ دوم عہ
قیمت مکمل۔ دو روپے (عہ)
بنت الوقت
از علامہ راشد الخیری مدظلہ
ہماری مستورات کی موجودہ تعلیم و تربیت کا مکمل مرقع آجکل کی مہذب بیبیوں کی لاثانی تصویر وقت کی اندھا دھند تقلید کرنیوالی ایک ناعاقبت اندیش لڑکی کا عبرت انگیز انجام تعلیم نسواں کے سلسلہ میں اس کتاب کا مطالعہ اشد ضروری ہے۔ چھ دفعہ چھپ چکی ہے۔ قیمت صرف ۸ر (آٹھ آنہ)
سراب مغرب
از علامہ راشد الخیری مدظلہ
تعلیم نسواں کے مسئلہ میں غیر مسلم ذرائع سے مستفید ہونا کہاں تک جائز ہے اس موضوع پر علامہ محترم کی سحر کار تصنیف تقلید مغرب کے دردناک نتائج پارٹیز کا حشر فیشن جدید کا عبرتناک انجام ماں باپ کی ناعاقبت اندیشی کا نتیجہ خاندان سادات کی بدنامی، ایسے ایسے باب ہیں کہ آنسو نکل پڑتے ہیں قیمت ۸ر
سات روحوں کے اعمالنامہ
از علامہ راشد الخیری مدظلہ
دنیا کے ساتھ بہترین کیرکٹر انسانی زندگی کے ہر شعبہ سے بحث، اس قدر دلچسپ قصہ کہ کئی بار پڑھئے کہیں روتے روتے ہچکی بندھ جائے کہیں ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ جائیں۔ ہندوستان میں اسلام کا انجام اور مسلمانوں کی معاشرت کے دل ہلا دینے والی تصویریں۔ چھ دفعہ چھپ چکی ہے۔ قیمت ۸ر
فسانۂ سعید
از علامہ راشد الخیری مدظلہ
بیوہ کا نکاح ثانی اسلام کا حکم ہے
یہ کتاب
نوحۂ زندگی
از علامہ راشد الخیری مدظلہ
بیوہ کے نکاح ثانی پر علامہ محترم کی مشہور تصنیف رسم و رواج میں پھنسکر مسلمان کس طرح تباہ ہوئے اس کتاب سے معلوم ہوگا یہاں ایسا قبرستان ملے گا جہاں عصمت کی لاج رکھنے والی بیوی اور عزت پر قربان ہونیوالی مائیں اپنے معصوم بچوں کو لئے گہری نیند سو رہی ہیں۔ نہایت موثر کتاب ہے۔
ساتواں ایڈیشن قیمت صرف ۱۲ر
اندلس کی شہزادی
از علامہ راشد الخیری مدظلہ
جس کا دوسرا نام تائید غیبی بھی ہے مسلمانوں کی تباہی ہے سرزمین اندلس پر وہ کیا کر چکے ہیں جس طرح انہوں نے ترقی کی اپنے اعمال سے فنا ہوئے قصہ بے انتہا دلچسپ ہے آنسو نکل پڑتے کبھی بے ساختہ ہنسی آجاتی ہے بڑی عمر کی عورتوں اور مردوں کے لئے ہے۔
قیمت صرف ۸ر
ملنے کا پتہ: منیجر عصمت دہلی

فخر نسوانِ ہند محترمہ خاتون اکرم جنت مکانی کی بے مثل تصانیف

جن سے اُردو لٹریچر میں گرانبہا اضافہ ہوا ہے

جمالِ ہمنشیں

یہ اس محترم خاتون کے دلاویز مضامین ہیں جنکی مضمون نگاری کا ہندوستان بھر میں ڈنکا بج چکا ہے جو تعلیم یافتہ خواتین کے محبوب ترین انشاپرداز تھیں، جن کے فلسفیانہ خیالات نے جن کے دردو اثر [illegible] ہوئے پُرزور تحریر نے شہرت عام اور بقائے دوام کا خراج تحسین وصول کیا تھا۔

جمالِ ہمنشیں مندرجہ ذیل مضامین کا مجموعہ ہے

فانی زندگی	تغیرات زندگی	زندگی زمانہ	اجل
عالم نزع	عبرت گاہ دنیا	[illegible]	رسم [illegible]
ساون	پھول	رمضان	عید
[illegible] زندگی	شمس ہدایت	کسی کی یاد	وعدہ [illegible]
ہنسی مذاق	خوشی کا دن	خدا کی عظمت	تعزیت نامہ

انڈین ڈیلی میل کی رائے۔ جمال ہمنشیں کی اردو صاف رواں ہے اور کتاب نہایت دلچسپ ہے۔

اخبار ہمدرد کی رائے ہے۔ جمال ہمنشیں کے مضامین کی عبارت بہت پختہ اور فصیح ہے۔

علیگڈھ میگزین کہتا ہے۔ خاتون اکرم مرحومہ فخر نسوانِ ہند کا طرز بیان نہایت شگفتہ اور دلنشین ہوتا تھا۔ جمال ہمنشیں قابل قدر کتاب ہے۔

مضامین کے اعتبار سے جمال ہمنشیں اعلیٰ درجے کی کتابوں میں ہے اور خوبصورتی کے اعتبار سے بہت کم اردو کتابیں ایسی دلکش و دلفریب ملیں گی۔ عام کتاب آرٹ کاغذ پر رنگین چھپی ہے۔ مقبولیت کا اندازہ اس سے لگایئے کہ ڈیڑھ سال میں تین دفعہ چھپ چکی ہے۔

قیمت صرف عہ/ — علاوہ محصولڈاک

پیکرِ وفا

ایک نہایت دلچسپ سبق آموز افسانہ مع دیباچہ از ایڈیٹر

خاتون اکرم جنت مکانی کی کامیاب افسانہ نگاری کا بہترین نمونہ۔

رسالہ ہمایوں کی رائے ہے پیکر وفا ایک کامیاب و مفید افسانہ ہے جس میں عورتوں کے [illegible] کو واضح کیا گیا ہے جس کی تعلیم مذہب اسلام نے ہمیں دی ہے، انداز بیان دردانگیز عبارت سادہ و شگفتہ۔

اخبار ریاست لکھتا ہے۔ پیکروفا ایک نتیجہ خیز دلآویز افسانہ ہے۔ طرز بیان اس قدر صاف و دلکش کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔

رسالہ حرم کی رائے ہے، پیکر وفا میں عورتوں کی وفاداری و قربانی کا بے مثل نمونہ پیش کیا گیا ہے۔ آرٹ کاغذ پر رنگین چھپی ہے

قیمت صرف آٹھ آنہ (۸/)

بچھڑی بیٹی

ایک نہایت دلچسپ افسانہ

ایک لڑکی ماں باپ سے بچھڑ جاتی ہے اس کی جدائی میں ماں کی جو کیفیت ہوتی ہے وہ صرف پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ برسوں کے بعد وہ لڑکی اس طرح ملتی ہے کہ بے ساختہ جنت مکانی کی کامیاب افسانہ نگاری کا معترف ہونا پڑتا ہے، پلاٹ بے انتہا دلاویز طرز تحریر پُر اثر و دلنشین۔

یہ افسانہ اردو کے کئی رسالوں میں شائع ہو کر مقبول ہوا ہے

قیمت صرف چھ آنہ (۶/) — علاوہ محصولڈاک

ملنے کا پتہ۔ منیجر عصمت کوچہ چیلان دہلی

عِصمت جوبلی نمبر کا دوسرا ایڈیشن

اُردو صحافت میں ہمیشہ یادگار رہنے والا عصمت جوبلی نمبر جس کے متعلق ہندوستانی پریس کی متفقہ رائے ہے کہ اس سے بہتر شاندار اور دلچسپ مفید خاص نمبر کسی مردانہ یا زنانہ رسالہ کا شائع نہیں ہوا ختم ہو چکا تھا لیکن شائقین ادب کے اصرار پر اب دوبارہ چھپوایا گیا ہے وہی تمام مضامین ۲۵۰ صفحوں کے وہی بہترین سادہ و رنگین ۶ تصاویر، جن میں ایک درجن بلاک جرمنی میں بنے ہیں، وہی کاغذ لکھائی چھپائی غرض دوسرا ایڈیشن زر کثیر خرچ کر کے انتہائی شاندار اور خوبصورت تیار کیا گیا ہے۔ عصمت کا جوبلی نمبر اگر آپ کے کتب خانہ میں نہیں ہے تو آپ کی لائبریری یقیناً نامکمل ہے قیمت صرف ۱۲؍ مگر جدید خریداران عصمت سے ۸؍ اسکے مقابلہ میں دس روپیہ کچھ حقیقت نہیں رکھتے۔

سلمان لڑکیوں کیلئے کوئی مذہبی رسالہ نہ تھا

رسالہ بنات

تربیت گاہ بنات دہلی سے علامہ راشد الخیری مدظلہ نے جاری فرما کر اس کمی کو بھی پورا کر دیا اور دو سال میں ہی بنات کو وہ مقبولیت حاصل ہوئی کہ اب

ماہوار سے پندرہ روزہ ہوتا ہے

بنات کے دلچسپ اور مفید مضامین لڑکیاں ہی نہیں بڑی عمر کی عورتیں اور مرد بھی بڑی خوشی سے مطالعہ کرتے ہیں اور ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں، عصمت کے علاوہ صرف یہی پرچہ ہے جس میں علامہ راشد الخیری مدظلہ کے مضامین شائع ہوتے ہیں نومبر سے بنات پندرہ روزہ شائع ہوگا۔ سالانہ چندہ صرف دو روپیہ اس چندہ میں تربیت گاہ بنات جیسی مفید درسگاہ کی نادار یتیم بچیوں کی امداد بھی شامل ہے اس لئے ہر درد مند مسلمان کو بنات منگانا چاہیئے۔ اسقدر کم چندہ میں بنات سے زیادہ مفید رسالہ ہندوستان بھر میں نہیں مل سکتا

مینیجر بنات دہلی

بسم اللہ

نگار

(صفحہ ۸۰ کا اعلان ملاحظہ فرمایئے)

فہرست مضامین ماہ دسمبر ۱۹۲۹ء

بسم اللہ

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

شمارہ (۶)	دسمبر ۱۹۲۹ء	جلد (۱۶)

ملاحظات

کون کہتا ہے انسان مدنی الطبع پیدا ہوا ہے۔ کیا اس لئے کہ وہ اپنی مقابل جنس سے محبت کرتا ہے، مگر یہ فطرت کی مجبوری ہے یا اپنی خواہش کی تکمیل کا اقتضار۔ کیا اس لئے کہ وہ اپنی اولاد پر شفقت ورافت صرف کرتا ہے، لیکن وحشی سے وحشی درندہ بھی اس جذبہ سے خالی نہیں کیا اس لئے کہ وہ اپنے ابنائے جنس کے ساتھ نرمی و تلطف سے کام لیتا ہے مگر شاید صرف اس لئے کہ وہ اپنے ساتھ کسی سلوک کی توقع رکھتا ہے۔ تم فطرت انسانی کا مطالعہ خواہ کسی پہلو سے کرو، اس کی خود غرضی، اس کی ناحق کوشی، اور اس کی حرص وہوا پرستی اس کی زندگی کے ہر ہر لمحہ اور اسکے اعضار کی ہر ہر جنبش سے وابستہ پاؤگے۔ یہاں تک کہ وہ خدا کی عبادت بھی کرتا ہے تو صرف اس طمع سے کہ وہاں اس کو حوریں ملیں گی، کوثر و تسنیم ملینگے اور ہر وہ چیز ملیگی جو اس دنیا میں اسکو میسّر نہیں آسکتی۔

عالم طفلی سے لیکر عہد [illegible] تک کوئی دور زندگی کا ایسا نہیں ہے، جس میں انسان کی اس فطری خصوصیت کی جھلک نمایاں طور پر نہ پائی جائے اور اس قدیم حیوانیت کے علامات اسمیں نظر نہ آئیں جس کا ثبوت ماہرین علم تشریح بعض اثری عضاسے دیتے ہیں اور ڈارون، قانون ارتقار سے۔

یقیناً انسان نام نہ اس کے اعضار کا ہے۔ اور نہ اُن خصوصیات کا جو اس کے محض ایک جاندار چیز ہونے کے ثبوت میں پیش کیجا سکتی ہیں

بلکہ انسان کا بہترین تشخص اساسی وہ ہے جو کائنات کی سب سے زیادہ روشن و مکمل الہامی کتاب نے بتایا ہے۔
"انی جاعل فی الارض خلیفۃ"۔ وعلم آدم الاسماء کلہا اس لئے آیئے آج کی صحبت میں اجمالاً استخلاف فی الارض اور حقیقت علم پر ایک نگاہ ڈال لیں، کیونکہ میرے نزدیک تمام اخلاق کی اساس اور فلسفۂ مذہب کی بنیاد اسی پر قائم ہے۔
خلافت سے مقصود ربانی کیا ہے، اور اس خلافت کی غایت کیا ہے؟ بظاہر یہ بحث بہت طویل الذیل گفتگو کا مقتضی معلوم ہوتا ہے لیکن خدا نے جس طرح تمام فلسفۂ حیات کو نہایت آسان و مختصر الفاظ میں بیان کر دیا ہے، اسی طرح خلافت انسانی کے مسئلہ کو بھی بہت واضح و صاف طور پر ظاہر کر دیا ہے، ارشاد ہوتا ہے:-
وعد اللہ الذین آمنوا منکم وعملوا الصلحت لیستخلفنہم فی الارض کما استخلف الذین من قبلہم۔
(یہ اللہ کا وعدہ ہے کہ جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے اچھے کام کئے ان کو زمین میں اپنا قایم مقام بنائے گا جیسا کہ اس سے قبل کے لوگوں کو عطا فرمایا گیا) نہ صرف اس آیت میں بلکہ اکثر مقام پر جہاں استخلاف کا ذکر کلام مجید میں آیا ہے اسی کے ساتھ ارض کا بھی ذکر کیا گیا ہے:-
(۱) قال عیسیٰ ربکم ان یہلک عدوکم ویستخلفکم فی الارض فینظر کیف تعلمون۔
(۲) ولو نشاء لجعلنا منکم ملٰئکۃ فی الارض یخلفون
(۳) ثم جعلناکم خلٰئف فی الارض من بعد ھم لننظر کیف تعمون۔
اس سے ظاہر ہے کہ یہ استخلاف، یہ خلافت اسی زمین سے متعلق ہے، اسی دنیاوی حیات سے تعلق رکھتی ہے اور اسی عالم کے کاروبار سے متعلق ہے جس کو دوسرے مقامات پر وراثت ارضی سے تعبیر کیا گیا ہے:-
(۱) ولقد کتبنا فی الزبور من بعد الذکر ان الارض یرثہا عبادی الصالحون۔
(۲) ان الارض للہ یورثہا من یشاء من عبادہ والعاقبۃ للمتقین۔
(۳) وقالوا الحمد للہ الذی صدقنا وعدہ واورثنا الارض نتبوأ من الجنۃ حیث نشاء۔ فنعم اجر العاملین۔
پھر کسی جگہ وراثت ارض کے ساتھ عبادی الصالحون کا ذکر ہے، کسی جگہ متقین کا بیان ہے اور کہیں عاملین کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی خلافت خداوندی، نیابت الٰہی یا وراثت ارضی کے حصول کا ذریعہ صرف یہی ہے کہ انسان، اچھے کام کرے، ترقی کے لئے جدوجہد کرے، دنیا میں امن و سکون کو رواج دے اور اپنے استقلال و استقامت سے شیطانی قوتوں، طاغوتی لشکروں اور اخلاقی بغاوتوں کا مقابلہ کرے۔
پھر اسی کے ساتھ سورۂ احقاف کی اس آیت کو ملاحظہ فرمایئے:-
فہل یہلک الا القوم الفاسقون (کیا سوائے فاسق قوم کے کوئی اور قوم ہلاک ہو سکتی ہے) اور غور کیجئے کہ ا[illegible] یات کے مفہوم کو مربوط کرنے سے کیا نتیجہ پیدا ہوتا ہے۔
پہلے ارشاد ہوا کہ "میں زمین میں اپنا قایم مقام، اپنا نائب پیدا کرنا چاہتا ہوں، جس کا نام انسان ہے"۔ پھر بتایا گیا کہ خلافت سے مراد یہ ہے کہ "وہ زمین کا وارث ہو، وہاں حکومت کرے، امن و سکون پھیلائے، ترقی کی راہیں نکال کے خدا کی پیدا کی ہوئی تمام نعمتوں سے فائدہ اٹھائے،

رات دن محنت وعمل میں لگا رہے اور حیات دوام حاصل کرے۔ اس کے بعد فیصلہ کن الفاظ میں بتادیا گیا کہ جب تک انسان ان باتوں پر کاربند رہے گا وہ برابر ترقی کرتا رہیگا، کیونکہ خدا کا دستور یہی ہے کہ وہ صرف ان قوموں کو ہلاک کرتا ہے جو فاسق ہیں، باغی ہیں، اور خدا کی ودیعت کی ہوئی قوتوں سے کام نہ لیکر کفران نعمت کا ارتکاب کرتی ہیں۔

یقیناً ترقی سے مراد صرف مادی ترقی نہیں ہے، محض صنعت وحرفت، دولت وتجارت، جاہ وثروت کی ترقی مقصود نہیں ہے، لیکن اسی کے ساتھ کلام مجید سے یہ بھی ثابت نہیں کہ وراثت ارضی سے مراد نکبت وذلت اور عسرت وافلاس ہے۔ اس لئے وہ قومیں جو اس وقت دنیاوی حیثیت سے ترقی یافتہ نظر آتی ہیں باوجود انتہائی انحطاط اخلاق کے بھی، ایک لحاظ سے اپنے آپ کو یرثھا عبادی الصالحون کے تحت میں لاسکتی ہیں، لیکن وہ جن کے پاس نہ دولت ظاہری ہے نہ دولت اخلاق اور ہلاک ہورہی ہیں آپ نے آپ کو فعل یھلک الا القوم الفاسقون سے کیونکر علیحدہ کرسکتے ہیں۔

کیا کوئی بڑے سے بڑا مولوی، یعنے خدا کا کوئی بڑے سے بڑا خلیفہ اس کا جواب دے سکتا ہے۔

علم کی تعریف خدا نے ان الفاظ میں بیان کی ہے:۔ ولا تقف ما لیس لک بہ علم۔ ان السمع والبصر والفواد کل اولئک کان عنہ مسئولا۔

یعنی ہر اس چیز کو شان لیا کرو جس کا تمہیں علم نہ ہو اور علم کی حقیقت اس طرح سمجھ لو کہ تمہارے کان، تمہاری آنکھ اور تمہارا قلب ان میں سے ہر ایک جواب دہ ہے کہ دنیا میں جو کچھ تم کرتے ہو وہ پوری طرح سوچ سمجھ کر اطمینان نفس وقلب کے ساتھ کرتے ہو یا محض دوسروں کے کہنے سننے سے۔

یہ ہے تفسیر وتشریح علم آدم الاسماء کلھا کی۔ علم اسمار سے مراد حقایق اشیار کا علم ہے اور علم بھی وہ جس کا ذکر اوپر کیا گیا، پھر اب انسان کے مسئلہ خلافت فی الارض اور حقیقت علم دونوں کو ملاکر غور کرو کہ اسلام کی صحیح تعلیم کیا ہے اور اسی کو معیار قرار دے کر فیصلہ کرو کہ وقت وزمانہ کے لحاظ سے ہمکو کیا کرنا چاہئے کہ کھوئی ہوئی وراثت ارض حاصل ہوسکے۔

میں نے ہمیشہ اس امر کی تبلیغ کی ہے کہ اسلام سے زیادہ وسیع النظر، قریب الفہم، آزاد خیال اور وسیع آغوش رکھنے والا مذہب کوئی نہیں ہوسکتا، اس نے کوئی چیز ایسی پیش نہیں کی جو مذہب کے دایرہ کو تنگ ومحدود کردینے والی ہے، بلکہ اس نے دوسرے مسلک والوں کے ساتھ اس رواداری کا اظہار کیا ہے جس کی نظیر دنیا کا کوئی مذہب پیش نہیں کرسکتا۔ اس نے دوسرے مذہب کے انبیار وا کابر کی عزت کرنے کا درس دیا ہے اس نے دیگر اقوام کی کتب مقدسہ کا احترام کیا ہے۔ اس نے لکل اجل کتاب کا سبق دیا ہے، اس نے لکل قوم ھاد کی حقیقت کو تسلیم کیا ہے، وہ علی الاعلان معترف ہے اس امر کا کہ وان من امۃ الا خلد فیھا نذیر اور اس نے صاف صاف یہ بھی بتادیا ہے کہ لکل امۃ رسول پھر جب حقیقت یہ ہے تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اسلام جو اس فراخدلی کے ساتھ تمام دنیا کو دعوت دے رہا ہے اور جو اس سے زیادہ کچھ نہیں چاہتا کہ

تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا وبینکم الا نعبد الا اللہ ولا نشرک بہ شیئاً۔

کیوں نہیں سارے عالم پر چھا جاتا اور کیوں نہیں دنیا اس مرکز پر آجاتی جسے اسلام نے صرف انسانیت اور اخوت عامہ سے تعبیر کیا ہے۔ اگر اس راز کی حقیقت معلوم کرنا ہے تو اسلام کی تعلیمات کو نہ دیکھو کہ وہ تو ہمیشہ سے بے لاگ ہیں، کلام مجید پر غور نہ کرو کہ اس میں بھی کوئی تبدیلی

پیدا نہیں ہوئی، بلکہ صرف اس جماعت کی تاریخ کا مطالعہ کرو جو اپنے آپ کو عالم دین، ہادی طریقت، اور مرشد و رہبر کہتی ہے کہ اس نے ہمیشہ اپنے اغراض نفسانی کے لئے تعلیمات مذہب کو مسخ کرکے پیش کیا اور آج بھی عالم انسانی اس طاغوتی قوت کا مجروح نظر آتا ہے۔ وہ تمکو اس امر کی اجازت نہیں دیتا کہ کلام مجید پر غور کرو، حالانکہ خدا نے علم و یقین کے باب میں تمہارے قلب کو بھی ذمہ دار بنا دیا ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ منشار ایزدی کو صرف اسی نے سمجھا ہے حالانکہ علم آدم الاسماء کلھا میں تمام افراد نوع انسانی شامل ہیں۔ وہ تعلیم دیتا ہے کہ مسلمان بننے کے لئے صورت بدلو، لباس بدلو، خاص وضع اختیار کرو، مخصوص طریق حیات کے پابند ہو، حالانکہ خدا نے یہ شرط کہیں عاید نہیں کی۔ خدا مسلمانوں کو انتم الاعلون کے لقب سے یاد کرتا ہے، لیکن ان کا تقاضہ یہ ہے کہ محکوم رہو، غلام بنو، دوسروں کے دستگر بنے رہو، اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ مذہب کا تعلق صرف درستی اخلاق سے ہے، لیکن یہ گروہ کہتا ہے کہ مذہب نام ہے قومیت کا، سیاست کا، اور ہر اس چیز کا جس سے حقیقتاً مذہب کو کوئی تعلق نہیں ہے۔

پھر آج جبکہ اس جماعت نے ہمارے تمام نظام مذہبی کو درہم برہم کر رکھا ہے، سب سے پہلے سوال یہی پیدا ہوتا ہے کہ مسلمان کب تک آنکھ بند کرکے انکے مواعظ و ہدایات کو وحی آسمانی سمجھتے رہیں گے اور کس حد تک وہ بانی اسلام اور اسکی توہین کو گوارا کریں گے۔ وقت آگیا ہے کہ لوگ ہوشیار ہو جائیں اور ان کے اقتدار کے بار گراں سے اپنی گردنوں کو آزاد کرلیں کیونکہ جب تک یہ "حجاب کثیف" درمیان باقی ہے، امت مسلمہ کبھی منزل مقصود تک نہیں پہونچ سکتی۔

گذشتہ ماہ کی ڈائری پر لکھنؤ کے ایک شیعی اخبار سرفراز نے ۱۲ر نومبر ۲۹ء کی اشاعت میں پورے تین کالم کا مقالہ افتتاحیہ آخرکار سپرد قلم کر ہی دیا

چشم من روشن کہ رویش بامداداں دیدہ ام

ڈائری میں صرف لکھنوی شاعری کے حقیقی عناصر سے بحث کرکے بتایا گیا تھا کہ وہ کیا اسباب تھے جنہوں نے اس کو ایک مخصوص رنگ میں رنگ دیا تھا اور اسی سلسلہ میں تاریخ اودھ کے اس المناک حصہ کا بھی ذکر آگیا تھا، جس کا حوالہ بسلسلۂ تنقید ضروری تھا، لیکن ہمارے محترم معاصر نے اسے جس زاویۂ نگاہ سے دیکھا وہ کم از کم میرے لئے ضرور حیرتناک ہے۔

اگر وہ اس کے جواب میں لکھنوی شاعری کے عناصر ترکیبی سے بحث کرکے اختلاف کرتے یا تاریخی حیثیت سے تردید فرماتے تو یقیناً وہ علم و زبان کی ایک اہم خدمت ہوتی، لیکن انہوں نے شروع سے لیکر آخیر تک سارے مضمون کو فرقہ دارانہ جذبہ کا نتیجہ بتایا ہے، اور اس قدر بے اختیاری و بے صبری کے ساتھ کہ اگر میں چاہوں تو کہہ سکتا ہوں کہ

چھائی جاتی ہے یہ دیکھو تو سراپا کس پر؟

میں دنیا کے ہر الزام کو قبول کرنے کے لئے آمادہ ہو سکتا ہوں، لیکن عصبیت، نفاق انگیزی یا دل آزاری کا الزام میرے اوپر قایم کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے میں اڈیٹر سرفراز کو سنی کہدوں کہ وہ یہ سنکر سوائے ہنسنے کے اور کیا کہہ سکتے ہیں۔

جو حضرات نگار کا مطالعہ کر رہے ہیں وہ آگاہ ہیں کہ مذہب کے باب میں میرا نظریہ اس قدر وسیع ہے کہ وہاں کافر و مسلم کے سوال کی بھی گنجائش نہیں ہے

چہ جائیکہ شیعہ سنّی اور اس لئے اگر میری کسی ادبی یا تاریخی تنقید میں کوئی شخص عصبیت کی بو پاتا ہے تو میں بلا تامل کہدوں گا کہ یہ اس کے مشام کی گمراہی ہے، جس کا نقص ہے۔

اسی نگار میں خود میں نے اپنے قلم سے مذہب اہل سنت کے بہت سے مروجہ عقاید و مسایل پر نہایت سخت تنقیدیں کی ہیں اور کرتا رہتا ہوں، جہانتک مراسم مذہب کا تعلق ہے یا رواجی دنیا سے اسے واسطہ ہے، میں اس وقت تشیّع و تسنّن کیا ہر مذہب کو مجموعۂ خرافات پاتا ہوں اور یقیناً میں اس کے اظہار میں تامل نہیں کرتا، اور کوئی صاحب اور اک انسان انکار نہیں کر سکتا کہ اسوقت دنیا مذہب کے صحیح اصول سے کس قدر ہٹی ہوئی ہے، مثلاً میں خود سرفراز کے قابل اڈیٹر سے دریافت کرتا ہوں کہ نوابان اودھ کے دربار میں مذہب کے نام سے جو جو بدعتیں روا رکھی جاتی تھیں کیا واقعی مذہب تشیّع انہیں جایز سمجھتا ہے۔ وہ تو وہ مجھے معلوم ہے کہ سنجیدہ علمار شیعہ عزاداری کی اس صورت کو بھی جو فی الحال عام طور پر رائج ہے کبھی پسند نہیں کرتے۔ سلطنت اودھ میں جو کچھ ہوا وہ اخلاقی نقطۂ نظر سے یقیناً گندگی و عفونت ہی کہلائے گا، اور اگر بجائے شیعہ سلطنت کے کوئی سنّی حکومت ہوتی تو میں اسوقت بھی اسے انہیں الفاظ سے یاد کرتا۔ چنانچہ آپ نے دیکھا ہوگا کہ منصور کے باب میں اور نگزیب پر میں نے ایسی سخت تنقید کی ہے کہ شاید ہی آپ کو کسی دوسری جگہ ملے۔ یا جہانتک انصاف کا تعلق ہے میں نے معاویہ و حسین کے کردار کا فرق دکھانے میں جس صفائی سے کام لیا ہے وہ غالباً آپ کے لئے بھی حیرتناک ہو۔ میں اس معاملہ میں اپنے آپ کو اسقدر بے لاگ پاتا ہوں کہ اگر آج میں شیعہ عقاید کا متبع ہو جاؤں تو بھی میری تنقید کا لب و لہجہ یہی ہوگا، بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ سخت۔ میں جماعتی تفریق یا مذہبی امتیاز کو سامنے رکھ کر کبھی کچھ نہیں لکھتا بلکہ صرف اخلاق و انسانیت کو سامنے رکھ کر تنقید کرتا ہوں، خواہ وہ مسئلہ حضرات شیعہ کا ہو یا اہل سنت کا۔

اب رہا لکھنوی شاعری، یا سلطنت اودھ کی بنیاد کا سوال، سو میں بہت ممنون ہونگا اگر اڈیٹر سرفراز کوئی تفصیلی جواب اسکا پیش کریں گے، کیونکہ ممکن ہے خود انہیں کی طرف سے بہت سے ثبوت ایسے فراہم ہو جائیں، جنکو میں نے قصداً نظر انداز کر دیا تھا، اسی سلسلہ میں انہوں نے یہ بھی ظاہر کیا ہے کہ وہ "دربار خلافت کی ان رنگ رلیوں کا بھی ایک ہلکا سا فوٹو دکھانے کے لئے مجبور ہوں جو تقدس کے پردہ میں جایز رکھی گئی تھیں"۔ اہلاً و سہلاً ضرور ایسا کیجئے بلکہ اگر آپ دربار رسالت میں کوئی نقص محسوس کرتے ہیں تو اس کا بھی اظہار کیجئے۔ آپ کی اس تنقید پر سب سے پہلا مبارکباد دینے والا شخص اڈیٹر نگار ہوگا اگر واقعی وہ کوئی تاریخی خدمت ہوئی۔

ہمارے عزیز دوست اور ملک کے نہایت کمسن سال صحافی جناب جالب نے میرے اس مضمون سے اختلاف کرتے ہوئے جو گذشتہ ماہ نگار میں بسلسلۂ استفسار "ہندو مسلم اتحاد" پر لکھا گیا تھا، ایک مقالۂ افتتاحیہ تحریر فرمایا ہے جو ۲۴ اور ۲۷ نومبر کے ہمت میں شایع ہوا ہے۔

جناب جالب کے اس ناقدانہ مضمون پر چند در چند پہلوؤں سے بحث کی جا سکتی ہے اور بعض نہایت اہم اصولی مسائل معرض گفتگو میں آسکتے ہیں، لیکن افسوس ہے کہ ملاحظات میں بالتفصیل اس بحث کو نہیں چھیڑ سکتا اور نہ غالباً اس امر کی ضرورت ہے کہ اب جبکہ ہندوستان کے سیاسیات "نظریہ" کی دنیا سے ہٹ کر "عملی" پہلو اختیار کر رہے ہیں خواہ مخواہ ان مباحث میں بیکار وقت ضایع کیا جائے، لیکن میں اس قدر ضرور عرض کروں گا کہ نہ جناب جالب صاحب میرے مدعا کو سمجھے اور نہ میں ان کی تنقید کو، جالب صاحب

فرماتے ہیں کہ مسلمانوں میں وطنی جذبہ کام کر رہا ہے اور میں یہی چیز مسلمانوں میں نہیں پاتا۔ ان کے یہاں اگر کوئی صحیح یا نادرست جذبہ ہے تو وہ صرف مذہبی جذبہ ہے اور وہ اسی کے ماتحت اپنی قومیت و وطنیت کو قائم کرنا چاہتے ہیں، جو میرے نزدیک بدترین سیاسی گمراہی ہے۔ جب تک کسی قوم کے سیاسیات اس کے مذہب سے علیحدہ نہ ہوں گے نہ اس میں وطنیت پیدا ہو سکتی ہے اور نہ وہ حکومت میں کامیاب ہو سکتی ہے۔ اسی خیال کی بنا پر میں نے لکھا تھا کہ مسلمانوں کا مستقبل مجھے بہت تاریک نظر آتا ہے لیکن اگر جالب صاحب کے نزدیک حقیقت یہ نہیں ہے (جسے وہ کبھی ثابت نہیں کر سکتے) تو میں کیا ساری دنیا ان کی ہمنوا ہو سکتی ہے۔

دوسری سب سے بڑی غلطی جالب صاحب نے یہ کی ہے کہ وہ ہندوستان کو ہر عسکری قوت کے سامنے جھکنے پر مجبور پاتے ہیں اور ثبوت میں انگریزوں کو پیش کرتے ہیں کہ کس طرح انہوں نے مٹھی بھر جماعت سے ہندوستان کو فتح کیا اور اب تک اس پر حکومت کر رہے ہیں۔ جناب جالب کو معلوم ہونا چاہئے کہ ہندوستان انگریزوں نے کبھی فتح نہیں کیا بلکہ خود ہندوستانیوں نے انگریزوں کے لئے کیا، یعنی جس وقت تک ہندوستانیوں میں جذبۂ وطنیت پیدا نہیں ہوا تھا وہ دوسرے کے لئے آلۂ کار بنکر خود اپنا نقصان کرنے میں جری تھے۔ لیکن اب جبکہ یہ جذبہ پیدا ہو گیا ہے جالب صاحب اس امید موہوم پر کوئی ایسی تعمیر قائم نہیں کر سکتے جسے وہ مسلمانوں کا قبلۂ مقصود یا کعبۂ امن و امان قرار دیں۔ کیونکہ اگر مسلمانوں نے ہندوؤں سے علیحدہ ہو کر محض انگریزوں کی تتبع میں "جس کی تیغ اس کی دیگ" پر عمل کیا تو اس کا نتیجہ سوائے ناکامی کے اور کچھ نہیں ہو سکتا کیونکہ اب زمانہ وہ نہیں ہے جو کلایو کو ملا تھا، بلکہ وہ ہے جب ایک نہرو رپورٹ کے مطالبہ کی تردید بھی حکومت کے بس کی بات نہیں۔ مجھے حیرت ہے کہ جالب صاحب نے حکومت کی تقسیم یونانی و اسلامی تو سمجھ لی لیکن اس طرف خیال منتقل نہ ہوا کہ آج ہندوستان میں جس حکومت کا مطالبہ ہے وہ نہ یونانی ہو گی نہ اسلامی بلکہ خالص ہندوستانی اور وہ جو اپنے آپ کو ہندوستانی نہ سمجھے گا اس کی برکات سے یقیناً محروم رہیگا۔

آپ اپنے لئے جداگانہ انتخاب چاہتے ہیں، آپ اپنے لئے علیحدہ قانون طلب کرتے ہیں، آپ چاہتے ہیں کہ آپکی اقلیت اکثر کی حیثیت قبول کر لے، لیکن اہلیت و قابلیت کا یہ عالم ہے کہ اگر یہ سب کچھ دیدیا جائے تو بھی ایک مست کی پگڑی کی طرح اس کا سنبھالنا دشوار ہے۔ پہلے مسلمانوں سے اس ذہنیت کو دور کر دیجئے جو باجہ اور رام لیلا پر آمادۂ جنگ ہو جاتی ہے اور علم الدین کو (جو یقیناً قتل کا مجرم تھا اور جس کو بالکل بجا طور پر پھانسی دی گئی)، شہید قوم سمجھ کر اس کی قبر کو زیارت گاہ بنا لیتی ہے، اس کے بعد آپ مسلمانوں کے مستقبل کے متعلق کوئی امید افزا پیشین گوئی فرمائیے گا، اور پھر یوں بھی میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر آپ کو مسلمانوں کا مستقبل موجودہ حالات کے ماتحت بھی بہت درخشاں نظر آتا ہے، تو پھر آپ نہرو رپورٹ سے کس اندیشہ کی بنا پر اختلاف فرما رہے ہیں۔ کیا بقول آپ کے مسلمانوں کی اقلیت دو لاکھ مسلح افراد بھی نہیں نکال سکتی ہے کہ ہندوؤں کو مفتوح کر کے حکومت برطانیہ کی سنت کو پھر از سر نو زندہ کر دے۔

بر تمنا ہائے عرفی خندہ می آید مرا

یہ رسالہ سولھویں جلد کا آخری پرچہ ہے اور جنوری ۱۹۳۰ء کے رسالہ سے سترھویں جلد شروع ہوگی، ۱۹۲۹ء کے پروگرام کا جزو غالب تنقیدی مضامین تھے اور تنقید سے جو ہیجان پیدا ہو سکتا ہے، وہ ملک میں پیدا ہوا اور بالکل بجا۔ لیکن الحمد للہ نگار و صاحب نگار دونوں کا

ضمیر مطمئن ہے کہ اس نے ذاتیات یا عصبیت کو کہیں دخل نہیں پانے دیا اور اگر کسی نے اس کے خلاف رائے قایم کی تو اس کی ذمہ دار خود اس کی قوت فیصلہ ہے۔

سنہ ۳۰ء کا پروگرام کیا ہوگا؟ اس کے متعلق قبل سے کوئی بیان دینا مناسب نہیں مستقبل خود بتائے گا کہ ہمارا لائحۂ عمل کیا تھا اور ہم کس حد تک اسمیں کامیاب ہوئے۔ و افوض امری الی اللہ۔

اس رسالہ کے ساتھ اکثر حضرات کا چندہ ختم ہوتا ہے۔ اس لئے مینجر کی طرف سے جو اعلان صفحہ ۸۰ پر شایع ہوا ہے اس کو ایک بار ضرور دیکھ لیجئے۔ میں ان حضرات کو جو ہمیشہ شروع سال سے جدید خریدار پیدا کرکے مجھ پر کرم فرمانے کے عادی ہیں، ان کو بھی خصوصیت سے توجہ دلاتا ہوں۔ **ایک مطبوعہ کارڈ** اس رسالہ کے اندر آپ حضرات کو ملیگا، براہ کرم اس کی خانہ پری کرکے **اخیر دسمبر ۲۹ء تک** دفتر نگار میں بھیجدیجئے۔ یہ التجا مینجر کی نہیں ہے بلکہ **میری درخواست** ہے جس کو اگر آپ **مطالبہ** بھی سمجھیں تو نادرست نہیں ہو سکتا۔ اگر نگار کی خدمت کو کسی قابل سمجھتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ آپ اس کی توسیع اشاعت میں حصہ نہ لیں **جبکہ آپ کو اپنے حلقۂ احباب میں صرف دو خریدار جدید فراہم کر دینا چنداں دشوار نہیں ہے۔**

گذشتہ ماہ کے رسالہ میں ایک فسانہ جناب طالب باغپتی کا "جھوٹ" کے عنوان سے شایع ہوا ہے، یہ فسانہ لیونڈ اینڈریو کے فسانہ کا ترجمہ ہے۔ کاتب کی غلطی سے اس کا اظہار اختتام مضمون پر نہ ہو سکا۔

ماہ جنوری سنہ ۳۰ء کا رسالہ ظفر اور اس کی شاعری کے لئے مخصوص ہے، اس وقت تک جتنے مضامین موصول ہوئے ہیں نہیں اس کی شاعری سے بحث نہیں کی گئی۔ لیکن اس عہد کے بعض تاریخی و معاشرتی حالات سے متعلق دو مضمون (ایک جناب مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب اور دوسرا سید وزیر حسین صاحب دہلوی کا) ایسے پاکیزہ موصول ہوئے ہیں کہ اگر ظفر نمبر میں سوائے ان دو مقالوں کے اور کوئی تیسرا مضمون نہ ہوتا تو بھی کافی سے زیادہ سامان دلچسپی فراہم ہو جاتا۔ لیکن آپ دیکھینگے کہ ۶۰ صفحات میں علاوہ ان دو مضامین کے اور بھی جو کچھ درج ہوگا وہ آپ اپنی نظیر ہوگا۔

ہمارے پاس انڈین میڈیکل اسٹور نظیر آباد لکھنؤ سے ایک شیشی سرمہ کی آئی تھی جس کو ہم نے خود بھی استعمال کیا اور اپنے بعض احباب کو بھی دیا۔ تجربہ سے یہ سرمہ بہت مفید ثابت ہوا ہے اور آنکھوں کے بہت سے امراض کیلئے کارآمد چیز ہے۔ اگر کوئی عیب ہے تو یہ کہ سفید ہے ممکن ہے جدید خیال کے حضرات اس کو بھی خوبی میں شمار کریں۔

نیاز

مومن وکلام مومن

(بہ سلسلہ سابق)

خصوصیات شعر

ابو الہلال عسکری امام بلاغت اپنی مشہور کتاب "صناعتین" مین لکھتے ہین کہ "کلام نثر ہو یا نظم اس مین سہولت ۔ سلاست ۔ بہتر الفاظ ، عمدہ معانی اچھی ترکیب ۔ موزون نشست الفاظ ہونا ضروری ہے"

شعر کی تعریف میں لکھتے ہیں کہ "شعر کی خوبی یہ ہے کہ اس میں ایسے الفاظ استعمال کئے جائیں جو معانی کثیرہ پر حاوی ہون ۔ جن کو سنکر سننے والا خود بخود لطف حاصل کرے ، سہل ہو، قلیل النظیر ہو

امام یحیٰی بن علی یمنی نے اس مسئلہ پر طویل بحث کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ناظم اور ناثر کو علوم ضروریہ پیش نظر رکھ کر کلام کو مرتب کرنا چاہئے یعنی کہان مبتدا کو ہونا چاہئے کہان خبر کو، کہان مقدم ہونا ضروری ہے کہان موخر۔ اسی طرح جملہ فعلیہ مین یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ فاعل کہان ہونا چاہئے اور مفعول کی کون جگہ ہے، کس قسم کا فعل لانا مناسب ہے ضمائر میں بھی مناسبت اور عدم مناسبت کا پیش نظر رکھنا لازم ہے ، منشائے بیان یہ ہے کہ اگر اشعار قواعد مقررہ (نحویہ وصرفیہ) کے مطابق ہیں تو اس قابل ہین کہ سندیں پیش کئے جائیں، ان کی صحت کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ناگزیر ہوتا ہے ۔

جہاں یہ امر مسلم ہے وہیں یہ بھی مان لینا پڑے گا کہ اس قسم کے اشعار آمد کے درد اور بیساختگی کے نشتر بن نہیں سکتے ۔ یہ بہت مشکل ہے کہ کوئی شخص ان قیود کے ساتھ آمد کا رنگ پیدا کرے ۔ اگر ایسا کوئی شاعر نظر آئے تو اس کے اشعار زور تخیل کا نتیجہ نہونگے بلکہ کرامت کی دلیل ۔

حکیم مومن، اسی قسم کے شاعر ہیں کہ پابندیوں کے اندر وہ اس طرح آزاد ہیں کہ نظر کو دھوکا ہوتا ہے ، یہی سبب ہے کہ اعتراض کرنے والے اعتراض کرتے ہیں لیکن ان کو اس کی صحت اور عدم صحت کا احساس بھی نہیں ہوتا ۔

علامہ قلقشندی صبح الاعشیٰ کی جلد دوم میں صفحہ ۲۷۰ پر خصوصیات شعر کے متعلق نہایت محقق اور دلچسپ بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :-

شعر کی خوبی کے سات مدارج ہیں :-

۱- کسی شعر کا ہر مصرعہ بجائے خود مستقل ہو، مثلاً امرئ القیس کا شعر ہے :-

افاطم مهلا بعض هذا التدلل

وان كنت قد ازمعت هجري فاجملي

اس شعر کا ہر مصرعہ اپنی جگہ پر مستقل ہے۔ شعر کا یہ درجہ اعلیٰ ہے۔

۲۔ دونوں مصرعے مستقل بھی ہوں اور ایک دوسرے سے مربوط بھی ہوں، مثلاً امرئ القیس کا یہ شعر۔

قفا نبک من ذکری حبیب و منزل

بسقط اللوی بین الدخول فحومل

اس شعر کا پہلا مصرعہ بجائے خود مستقل ہے۔ لیکن جب دوسرا مصرعہ ملا دیا گیا تو اسکا درجہ بڑھ گیا۔

۳۔ شاعر اپنے کسی شعر کے دونوں مصرعوں کو جس جگہ چاہے رکھدے لیکن معنی میں فرق نہ آئے۔ اس کا نام تصریع موجہ ہے مثلاً ابن حجاج کا یہ شعر:۔

من شروط الصبوح فی المرجان

خفۃ الشرب مع خلو المکان

۴۔ پہلا مصرعہ غیر مستقل ہو لیکن جب دوسرا مصرعہ ملا یا جائے تو شعر پورا ہو جائے۔ اسکا نام تصریع ناقص ہے۔ متنبی کا شعر ہے:۔

مغانی الشعب طیباً فی المغانی

بمنزلۃ الربیع من الزمان

۵۔ شعر میں کوئی لفظ وسط اور قافیہ میں بہ طریق حقیقت واقع ہو جیسے:۔

و کل ذی غیبۃ یؤب

و غائب الموت لا یؤب

اس میں لفظ یوب تصریع کر رہے۔

کبھی یہ طریق مجاز ہوتی ہے، مثلاً:۔

فتیً کان شرباً للعفاۃ و مرتعاً

فاصبح للھندیۃ البیض مرتعاً

اس شعر میں لفظ " مرتعا " مجاز ہے۔

۶۔ پہلا مصرعہ اسوقت تک معلق رہے جب تک دوسرے مصرعہ کا پہلا لفظ اسکی صفت بناکر نہ ملایا جائے۔ مثلاً:۔

الا ایہا اللیل الطویل الا انجلی

بصبح وما الاصباح فیک بامثل

پہلا مصرعہ لفظ " بصبح " کا محتاج ہے، اسکو تصریع معلق کہتے ہیں۔

۷۔ مختلف القافیہ مصرعوں کے نام کو تصریع مشطور کہتے ہیں، مثلاً:۔

اقلبی قد ندمت علی الذنوب
وبالاقدام غدات من الجحود

اس شعر میں ذنوب کا قافیہ جحود لایا گیا ہے جو معیوب ہے۔

مومن اور خصوصیات شعر اسی کسوٹی پر "مومن" کے اشعار دیکھنا چاہئے، مومن کے تمام دیوان میں زیادہ تر اول و دوم مدارج کے اشعار ہیں، سوم و چہارم کے کم، پنجم و ششم کے اس سے کم۔ ہفتم کا نشان نہیں۔

(مثال اول و دوم)

(۱)

غضب سے تیرے ڈرتا ہوں رضا کی تیری خواہش ہے
نہیں بیزار دوزخ سے نہ میں مشتاق جنت کا

پہلا مصرعہ بجائے خود مستقل ہے لیکن دوسرا ملا دیا گیا تو ارتباط بڑھ گیا۔

(۲)

اظہار شوق شکوہ اثر اس سے تھا عبث
میں نے کہا کہ مرتے ہیں تم پر کہا عبث

اس شعر کا پہلا مصرعہ اس قدر مستقل ہے کہ دوسرا نہ بھی ملایا جائے تب بھی مضمون میں کوئی نقص نہیں رہتا۔

(۳)

تصریع ناقص کی مثال:-

خبر نہیں کہ اسے کیا ہوا پر اس در پر
نشان پا نظر آتا ہے نامہ بر کا سا

(۴)

نہ جاؤں گا کبھی جنت کو میں نہ جاؤں گا
اگر نہ ہووے گا نقشہ تمہارے گھر کا سا

اس شعر میں تصریع موجہ ہے یعنی پہلا مصرعہ دوسرے کی جگہ اور دوسرا پہلے کی جگہ رکھ دیا جائے تو مقصود میں فرق نہو۔ مرتبہ پنجم حفاظ اور قادر الکلام شعراء کے نزدیک عیب سمجھا جاتا ہے، اس لئے "مومن" نے اس سے حتی الوسع احتراز کیا ہے۔

الفاظ اور شعرا ناظم اور ناثر کی قدرت اور فضیلت نظم اور نثر میں الفاظ اور معانی کی موزونیت سے معلوم ہوتی ہے۔ ابن رشیق قیروانی العمدہ صفحہ ۸۰ جلد اول میں لکھتے ہیں کہ:-

''لفظ جسم اور معنی روح ہے ان دونوں میں باہم ارتباط ایسا ہوتا ہے جیسا جسم اور روح میں، جس طرح جسم کی قوت سے روح قوی اور ضعف سے ضعیف ہوتی ہے، یہی حال الفاظ کا ہے، معنے اگر درست ہوتے ہیں اور لفظ میں نقص ہوتا ہے تو شعر میں نقص پیدا ہوجاتا ہے، اگر معنے میں خرابی ہے تو لفظ بیکار معلوم ہوتا ہے''

اسی کتاب میں آگے چلکر معانی اور الفاظ کے موازنے میں ''الفاظ'' کی خرابی و صحت زیادہ زور دیا ہے:-

''اکثر ائمہ لغت خوبی الفاظ کو معانی پر ترجیح دیتے ہیں، بعض علماء کا قول ہے کہ الفاظ، معانی سے زیادہ ضروری اور قیمتی ہوتے ہیں ابو ہلال عسکری اس فن کے جیّد امام کا قول ہے کہ ''معانی کی تمام خوبیاں الفاظ پر موقوف ہیں، یہی وجہ ہے کہ شعرا اور خطباء اپنے کلام میں اثر پیدا کرنے کے لئے مناسب الفاظ کی ترتیب دیتے ہیں'' (صفحہ ۲۸ کتاب صناعتین)

علامہ قلقشندی کی رائے ہے کہ:-

''شیریں الفاظ کی طرف طبیعت خود بخود مائل ہوتی ہے نہ کہ معانی کی طرف''

کلام فصیح کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:-

''فصاحت کا انحصار الفاظ پر ہے، یعنے لفظ فصیح وہ ہے جس کے فوراً سمجھنے میں کسی قسم کے اہتمام کی ضرورت نہ ہو۔

پھر لکھتے ہیں کہ:-

الفاظ میں خاص قسم کی کشش ہوتی ہے جس کی طرف قوت سامعہ کا خود بخود میلان ہوتا ہے۔ اگر الفاظ میں سختی ہوتی ہے تو اس سے نفرت پیدا ہوتی ہے اول الذکر کی مثال آواز بلبل اور دوسرے کی مثال گدھے کی آواز ہے''

اس پر اگر یہ اعتراض کیا جائے اس قسم کی نفرت یا رغبت کا انحصار الفاظ پر نہیں بلکہ آواز پر ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ آواز الفاظ کی تابع ہوتی ہے، یعنے کوئی آواز لفظ یا الفاظ سے خالی نہیں ہوتی۔

ہماری رائے میں الفاظ صرف سامعہ نواز ہی نہیں ہوتے بلکہ ان سے قوت باصرہ، دل و دماغ سب کو کیفیت و لذت حاصل ہوتی ہے۔

(مثال الفاظ فصیح)

مومن نے اپنے اشعار میں اس کا کہاں تک اہتمام کیا ہے، ذیل کے شعروں سے معلوم ہوسکتا ہے:-

دیدۂ حیراں نے تماشا کیا
دیر تلک وہ مجھے دیکھا کیا

اس شعر میں الفاظ دیدۂ حیراں۔ تماشا۔ دیکھا کیا کی فصاحت قابل ذکر ہے، اس شعر میں ان سے زیادہ موزوں الفاظ کا اجتماع مشکل ہے۔ یا اس مضمون یا ان معانی کو دوسرے الفاظ میں ڈھالنے سے یہ خوبی ساقط ہوجاتی ہے۔

(۲)

تیرے پردے نے کی یہ پردہ دری
تیرے چھپتے ہی کچھ چھپا نہ رہا

اس شعر کے الفاظ خط کشیدہ کو معیار مذکورہ پر جانچ کر دیکھئے۔

(۳)

تلخ کامی پر مجھے، تجکو لب شیریں پہ ناز
آمرے جادو سے اعجاز مسیحائی ملا

اس شعر میں الفاظ تلخ کامی۔ لب شیریں۔ جادو۔ اعجاز مسیحائی کے کرشمے دیکھئے۔

(۴)

ہلجاتے ہی اغیار نکل آتے ہیں باہر
زنجیر در یار ہے یا سلسلہ اپنا

اس شعر میں لفظ سلسلہ نے شعر کو شعر بنا دیا ہے۔

معانی اور شعر

صبح الاعشیٰ میں ہے کہ "معانی" کا وجود الفاظ کے لئے ایسا ہے جیسا کہ جسم کے لئے لباس ہوتا ہے جس طرح جسم کپڑے کا تابع ہوتا ہے اسی طرح الفاظ معانی کے تابع ہوتے ہیں۔ صاحب بلاغت کو الفاظ سے زیادہ معانی کے اہتمام کی ضرورت ہوتی ہے۔

معانی کی چند صورتیں ہوتی ہیں:۔

۱۔ مستقیم حسن ـــــ یہ صورت وہ ہوتی ہے کہ اپنی صحت پر خود دلالت کرتی ہے۔ اسکی مثال عربی میں "رایت زیداً" ہے اور اردو میں "مینے زید کو دیکھا" ہے، اس قسم کے اہتمام کا نام "سحر حلال" ہے

۲۔ مستقیم قبیح ہے، اس کی مثال عربی میں "زیداً رایت" "زید کو دیکھا میں نے" اس کا دوسرا نام تعقید ہے ابن اثیر نے مثل السائر میں اس کا نام مغالطۂ معنویہ رکھا ہے۔

۳۔ مستقیم کاذب ـــــ اس کی مثال "حملت الجبل" "مینے پہاڑ اٹھالیا" حقیقتاً غلط ہے لیکن اپنے موقعہ پر مبالغہ موزوں ہے۔

۴۔ مستقیم محال ـــــ ان باتوں کا ذکر جو عقلاً اور عادۃً محال ہوں۔ اس کا دوسرا نام غلو ہے۔ یہ بھی اپنے موقعہ پر مستحسن اور موزوں ہے۔ بشرطیکہ شاعر کا دماغ صحیح ہو اور اس میں کافی تمیز ہو، ورنہ معیوب ہے مثلاً اردو کا یہ شعر:۔

ایک دن رونے جو بیٹھا میں برائے امتحاں
سو سمندر ساٹھ نالے، کتنے دریا بہہ گئے

۵۔ مستقیم غلط۔ اس کی مثال عربی میں یہ ہے کہ کوئی کہے "ضرب بنی زیدٌ"۔ مجھ کو زید نے مارا، لیکن منشا ہو "ضربت زیداً" "میں نے زید کو مارا، یہ بھی اپنے موقع پر درست ہوتا ہے بشرطیکہ شاعر اس موقعہ کو سمجھے۔

"مومن" نے ان اقسام کو جس طرح پیش نظر رکھا ہے انکی مثالیں دیکھ لیجئے:۔

مثال اول:۔ ؎

اس کو چہ کی ہوا تھی کہ میری ہی آہ تھی
کوئی تو دل کی آہ پر نکھا سا جھل گیا

اس شعر میں "سلاست" کی خوبی جہانتک ہے ارباب نظر پر مخفی نہیں۔

مثال دوم:۔ ؎

ایسی لذّت خلش دل میں کہاں ہوتی ہے
رہ گیا سینہ میں اسکا کوئی پیکاں ہوگا

اس شعر میں تعقید ضرور ہے لیکن "معیوب" نہیں، اہل فن سمجھ سکتے ہیں۔ اس قسم کے اشعار بہت کم بلکہ اشاذ کالمعدوم ہیں لیکن ان کا "عیب" "مومن" نے اپنی حکمت سے نکال دیا ہے۔

مثال سوئم:۔ ؎

مرگئے اس کے لب جاں بخش پر
ہم نے علاج آپ ہی اپنا کیا

اس شعر کا کذب "صدق استعارہ وتشبیہ کے انداز رکھتاہے، شاعر کا یہ کمال قابل ذکر ہے۔

مثال چہارم:۔ ؎

یہ مشت پر سوختہ پھونکیں گے قفس کو
تو ساتھ کسی کے مجھے صیّاد نہ کر بند

"مومن" کے اس محال میں امکان کی بیباختگی دیکھئے۔

مثال پنجم:۔ ؎

نام وصال لینے سے ہوتا ہے مضطرب
کیونکر کہوں اسے مرے مرنے کا غم نہیں

لفظ "وصال" سے کذب میں صدق کا جلوہ موجود ہے، مومن نے اس قسم کا کمال اپنے دیوان میں کثر جگہ دکھایا ہے۔

ترتیب اور شعر

اہتمام الفاظ ومعانی سے زیادہ "ترتیب" کا خیال شعر کو بہتر اور شاعر کے کمال کو ظاہر کرتا ہے۔ جو شاعر جس قدر صاحب کمال ہوتا ہے، اسی قدر اس کے اشعار کی ترتیب بہتر ہوتی ہے۔

فصیح اور بلیغ الفاظ استعمال بھی کئے جائیں لیکن انکی ترتیب درست نہو تو ان کی فصاحت اور بلاغت بیکار ہوتی ہے۔ بعض الفاظ عام طور پر استعمال کئے جاتے ہیں۔ لیکن ان کا کوئی اثر نہیں ہوتا لیکن الفاظ ترتیب اور ترکیب سے دلکش اور دلگداز بن جاتے ہیں۔

ائمہ معانی و بیان کی رائے ہے کہ قرآن حکیم اپنی ترتیب الفاظ کی وجہ سے معجزہ ہے۔

آیات:۔ وقیل یا ارض ابلعی ماءک ویا سماء اقلعی وغیض الماء وقضی الامر واستوت علی الجودی الخ سنکر ایک عرب نے اس کی فصاحت و بلاغت پر سجدہ کیا تھا، حالانکہ الفاظ ارض۔ سماء۔ امر۔ ماء وہی ہیں جو روزانہ بولے جاتے ہیں۔ لیکن ترتیب میں آکر معجزہ بن گئے۔

ترتیب میں حسب ذیل امور کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

۱۔ ضعف تالیف نہو، مثلاً "ضرب غلامہ زیداً" (مارا اس کے غلام نے زید کو) اسمیں ضعف تالیف ہے۔

۲۔ تعقید نہ ہو۔ (اسکی مثال بیان ہو چکی ہے)

۳۔ تنافر کلمات نہ ہو مثلاً (ولیس قرب قبر حرب قبر) اسکی دوسری مثال آچکی ہے۔

شمس الدین محمد بن قیس رازی نے ان خصوصیات پر ایک فیصلہ کن محقق مضمون لکھا ہے، اسکا خلاصہ دیکھئے اور اس معیار پر "مومن" کو جانچئے۔

"کوئی شخص اس وقت تک شاعر کہے جانے کا مستحق نہیں جب تک ادوات شعر سے واقف نہو کلمات صحیح، الفاظ شیریں، عبارات بلیغ، معانی لطیف سے اپنے شعر کو آراستہ کرنا نہ جانتا ہو، وزن مناسب، ردیف اور قافیہ کی خوبی اور موزونیت سے آگاہ نہ ہو"

دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ:۔

شاعر کو اس جوہری کے مانند ہونا چاہئے، جو جذب نظر خریداران کے لئے اپنے جواہرات کو مناسب اور موزوں مواقع پر رکھتا ہے، شاعر کو بھی شعر میں مناسب الفاظ کو موزوں جگہ رکھکر اپنے صحت مذاق کا ثبوت دینا چاہئے۔

اس موضوع پر نہایت شرح و بسط کیساتھ جمیع اصناف پر اس کتاب میں لطیف بحث ہے، اس جگہ صرف اسی پر اکتفا کرنا مناسب سمجھا گیا۔

"مومن" دنیائے شاعری میں میر، کے بعد پہلے شخص ہیں جو الفاظ کو شعر میں نگینے کی طرح جڑتے ہیں اور اس فن میں موزونیت اور مناسبت کا ایسا کمال دکھاتے ہیں جو نظروں کو خیرہ کر دیتا ہے۔

اگر اس خصوصیت کا اضافہ کر لیجئے کہ تمام اصناف معانی و بیان سے اپنے پورے دیوان کو سجایا ہے تو ان کی اس قدرت میں ان کا شریک کوئی شاعر نہیں۔

پہلے بتایا گیا ہے کہ "شاعر" اپنے فضل وکمال طبیعت، وقت، فضا، گردوپیش، رنگ زمانہ سے متاثر ہوتا ہے، اور وقت و زمانہ شاعر کو متاثر کرکے اپنی زبان بنالیتا ہے۔ اس لئے شاعر جو کچھ کہتا ہے وہ اس کی زبان نہیں ہوتی بلکہ زمانے کی۔ ہومر اپنے وقت کے یونانیوں کی زبان تھا اور ڈینٹ اور ملٹن کا بھی یہی حال تھا

حکیم "مومن" بھی اپنے وقت اور زمانے کے واقعات اور فضا سے متاثر ہوئے ہیں، لیکن اپنی خودداری کے حدود سے آگے نہیں بڑھے، اور شعرا کی طرح زمانے نے ان سے بھی موافقت نہیں کی ہے لیکن وہ اس سے پریشان اور مضطرب ہوکر متانت سے کبھی آگے نہیں بڑھے، ضروریات نے ان کو بھی مجبور کیا ہے، لیکن کبھی اپنے اشعار کے موتیوں کو بازار میں لے کر نہیں گئے۔

باقی ——— باقی

"کیفی چریاکوٹی"

نوٹس

ہندوستانی اکاڈمی صوبۂ متحدہ الہ آباد کے مطبوعات

ازمنۂ وسطیٰ میں ہندوستان کے معاشرتی و اقتصادی حالات ———

مجلد	۴ عہ
غیر مجلد	عہ ۳

از علامہ عبداللہ یوسف علی۔ ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ ایم۔ سی۔ جی۔ ای

زیر طبع

(۱) مغلوں سے پہلے عرب و ہند کے تعلقات (از مولانا سید سلیمان صاحب ندوی)

(۲) مسلمانوں کے تمدن پر ہندوؤں کا اثر (از مولانا محمد امین صاحب عباسی)

(۳) ازمنۂ وسطیٰ کا ہندوستانی تمدن (از رائے بہادر مہامہوپادھیا گوری شنکر ہیرا چند صاحب اوجھا)

(۴) ہندی شاعری (از ڈاکٹر اعظم صاحب کریوی)

جنرل سکریٹری ہندوستانی اکاڈمی الہ آباد

گناہ کی گٹھری

(فسانہ)

اسکا پورا نام بسنت رام تھا، لیکن گاؤں کے سب لوگ اس کو بسنتا کہتے تھے۔ چچا۔ چچی کے سوا اس دنیا میں بسنتا کا کوئی عزیز اور نہ تھا۔ پھر بھی گاؤں والوں نے اس کو اپنا بنالیا تھا، اس کی وجہ یہ تھی کہ بسنتا گاؤں والوں کا تو کام کر دیتا تھا لیکن اپنے گھر کی وہ کوئی پرواہ بھی نہ کرتا تھا۔ گاؤں بھر کے بیگار کرنے میں بسنتا کا خوب جی لگتا تھا وہ کھیتی باڑی کے کام میں خوب ہوشیار تھا لیکن اس سے اس کے چچا کو کوئی مدد نہ ملتی تھی، بسنتا کو گھر کے کام میں لگانے کے لئے اس کے چچا کی تمام کوششیں بیکار ثابت ہوئیں۔ ادھر ادھر کی بیگار کرکے جب بسنتا اپنے گھر میں گھستا اور ہنس ہنس کر اپنی چچی سے کھانا مانگتا تو وہ بہت خفا ہوتی۔

بسنتا کے سرپرست صرف بسنتا ہی پر نہیں خفا ہوتے بلکہ وہ اپنے پڑوسیوں کو بھی دو چار الٹی سیدھی سنانے سے باز نہ آتے تھے، خصوصاً جگوا کو تو وہ اٹھتے بیٹھتے گالیاں دیتے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ جگوا ہی نے بسنتا کو کچھ "دوا دارو" کھلا کر اپنے بس میں کر لیا ہے۔

بوڑھا جگنّا تھ (جگوا) ذات کا مالی تھا اس کے پاس دو چار بیگھے موروثی کاشتکاری تھی، اسی میں اس کی بخوبی بسر اوقات ہو جاتی تھی گھر میں وہ اور اس کی نواسی "سکھیا" کے سوا اور کوئی نہ رہتا تھا، اس کا ایک ناتی "جنوا" جوان ہوتے ہوئے بھی اپنے بوڑھے نانا کی کوئی مدد نہ کرتا تھا، بلکہ وہ اِدھر اُدھر آوارہ مزاج لڑکوں کے ساتھ مارا مارا پھرا کرتا، جب کبھی اس کو خرچ کی ضرورت ہوتی تو وہ دو چار دن کے لئے گھر آکر اپنے نانا کو تنگ کیا کرتا۔

(۲)

برکھا رُت اور دوپہر کا وقت تھا، رم جھم رم جھم پانی برس رہا تھا، بوڑھا جگوا اپنے گھر کے برآمدے میں بیٹھا ہوا دھان کوٹ رہا تھا اور اس کے قریب ہی سکھیا کوٹے ہوئے دھان کو پھٹک رہی تھی۔ سکھیا کی عمر زیادہ سے زیادہ بارہ برس کی رہی ہوگی پھر بھی وہ گھر کے کام کاج میں بڑی ہوشیار تھی۔ پانی برستے ہی میں بسنتا نے جگوا کو آکر پرنام کیا اور سکھیا سے کہا۔ "سکھیا! "کلی" کہاں ہے، ذرا اٹھا تو لا میں نانا کو تمبا کو پلا دوں"

بسنت، جگوا کو نانا کہتا تھا، دونوں حقہ پینے کے بڑے شوقین تھے۔ بسنتا چلم پر چلم بھرے جاتا اور اس کے بدلے میں بوڑھا جگو اپنی جوانی کے واقعات اور غدر کے قصے سنایا کرتا، اس وجہ سے ان دونوں میں بڑی دوستی تھی۔

سکھیا نے کلی" لاکر بسنتا کو دیدی، چلم میں تمبا کو جما اور آگ رکھ کر بسنتا نے "کلی" جگو کی طرف بڑھا کر کہا "لو نانا تم

ذرا دم لگا لو میں دھان کوٹے دیتا ہوں"

سکھیا نے بسنتا کی طرف غور سے دیکھا، اور کہا "بھیا کیا آج تم نے روٹی نہیں کھائی؟"

سکھیا کے اس سوال سے بسنتا سٹ پٹا گیا اس سے کوئی جواب نہ بن پڑا لیکن اس کے پژمردہ چہرہ سے یہ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ سکھیا کا خیال درست ہے۔ جگو نے حقہ کا ایک کش لیکر کہا "ارے! اب تک نہیں کھایا۔ سکھیا تو کیسے جان گئی میں تو بوڑھا ہو گیا ہوں اب مجھے کچھ نہیں سوجھتا" بوڑھے کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو چھلکنے لگے

سکھیا اسی وقت بسنتا کے لئے کھانا لائی۔ بسنتا نے کھانا کھاتے ہوئے کہا۔ "سکھیا تو نے ہی یہ کھانا پکایا ہے"

سکھیا نے لجا کر جواب دیا۔ "ہاں"

"واہ! واہ!! تو تو بڑا مزیدار کھانا پکاتی ہے"

"معلوم ہو گیا تم ہنسی میں ایسا کہہ رہے ہو۔ ترکاری خراب ہوگی"

"تیری قسم ترکاری تو بہت اچھی ہے۔ میری "چاچی" بھی اس سے اچھا نہیں پکا سکتی"

"کیا "چاچی" بہت اچھا کھانا پکاتی ہے؟"

"لیکن تجھ سے اچھا نہیں"

"چاچی" کا ذکر ہوتے ہی سکھیا نے پوچھا۔ "بھیا یہ تو بتاؤ آج تم نے گھر میں کھانا کیوں نہیں کھایا؟ کیا "چاچی" کچھ خفا تھیں؟"

بسنتا نے اداس ہو کر جواب دیا۔ "چاچا" نے کھیت پر جانے کو کہا تھا، میں نہیں گیا اسی سے "چاچی" بہت خفا ہو گئیں"

"تم نے "چاچی" اور "چاچا" کا کہنا کیوں نہیں مانا؟"

"میں کھیت پر جانے کے لئے تیار تھا لیکن اسی وقت موہنا کے گھر سے ایک دنی مجھے بلانے آیا اور میں کھیت پر نہ جا سکا"

"چاچا" کا کام چھوڑ کر تم موہنا کے یہاں کیوں گئے"

"موہنا کے یہاں میرا جانا بہت ضروری تھا کیونکہ اس کے یہاں کے سب لوگ بخار میں پڑے ہیں، کوئی پانی دینے والا بھی نہیں "چاچا" کا کام کرنے والے بہت ہیں میرے نہ جانے سے ان کا کچھ حرج نہیں ہو سکتا"

سکھیا اور بسنتا کی یہ باتیں جگو ابھی بڑے دھیان سے سن رہا تھا اس نے دل میں کچھ سوچ کر ایک ٹھنڈی سانس لی دو بہت دیر تک کچھ سوچتا رہا اور جب بسنتا کھانا کھا کر اس کے پاس پہونچا تو اس نے کہا۔ "بیٹا ایک بات کہوں مانو گے"

"نانا تمہاری بات نہ مانوں گا تو پھر کس کی مانوں گا"

بوڑھے نے کلی بسنتا کی طرف بڑھا کر کہا۔ "اچھا سن ۔" بوڑھے کو کھانسی آ گئی، اس نے کھنکھار کر پھر کہا۔ "بسنتا تو اپنا دل نہ چھوٹا کر میرے ہی گھر میں رہا کر۔ میں اپنی سکھیا سے تیرا بیاہ کر دوں گا اور میرے پاس جو دو چار بیگھے زمین ہے وہ بھی تیرے نام لکھ دوں گا مٹھی بھر اناج کے لئے چچا کی گالیاں کیوں سنتا ہے"

بسنتا نے دانتوں سے اپنی زبان دبا کر کہا: "نانا یہ تم کیسی بات کہہ رہے ہو، تمہارا جو کچھ ہے وہ سب "چنوا" کا ہے کھیت مکان سب پر اسی کا حق ہے۔ میں اس کا حق چھین کر نرک میں نہ جاؤں گا۔ رام! رام!! یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا۔ رہ گیا بیاہ کا معاملہ تو میں اس سے دور بھاگتا ہوں، میں بیاہ کروں گا ہی نہیں"

بوڑھے نے مایوس ہو کر کہا۔ "یہ کیوں؟"

بسنتا نے دھان کوٹتے ہوئے جواب دیا۔ "نانا تم بوڑھے ہو کر بھی اتنی سی بات نہیں سمجھ سکتے، بات یہ ہے کہ بیاہ ہوتے ہی میں تم کو پرایا سمجھنے لگوں گا۔ یہی میرے چچا پہلے مجھ کو بہت پیار کرتے تھے، لیکن جب سے ان کا بیاہ ہوا، اور "چاچی" آئیں تب سے ——— اور کیا کہوں ——— کچھ ڈر نہ ہو تو مجھے کچا ہی کھا جائیں۔"

(۳)

اسی دن شام کو "چنوا" اپنے نانا کے یہاں آیا، وہ گانجہ پیئے ہوئے تھا، اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں، کرپارام بنیا تیہ لگا کر "چنوا" سے اپنے روپیوں کا تقاضا کرنے آیا، پانچ برس ہوئے "چنوا" نے اس سے کچھ روپئے ادھار لئے تھے، لیکن ابتک دینے کا نام نہ لیتا تھا۔ کرپارام آج ذرا تیز ہو کر آیا تھا، اُدھر "چنوا" بھی گانجہ کے نشہ میں خوب گرم ہو رہا تھا، کرپارام نے سختی کی تو چنوا نے بگڑ کر کہا:۔

"ابے! بجو کی سی آنکھیں کیوں نکالتا ہے، تیرے ایسے بنیوں کو میں سمجھتا ہی کیا ہوں، یہاں سے اپنا منھ کالا کر، میں روپئے نہیں دوں گا، جا نالش کر دے"

کرپارام نے چنوا کو یونہی روپئے دیدیئے تھے، کچھ "لکھا پڑھی" نہ کی تھی نالش کرنے سے اس کو کچھ فائدہ حاصل ہونے کی امید نہ تھی۔ اس نے کہا: "سارا غنڈاپن نکال دوں گا، دے گا کیسے نہیں، کیا مفت کے روپئے تھے۔ تو کیا میں تو تیرے باپ سے لیلوں گا۔"

نشہ میں چور "چنوا" نے اس زور کی لات کرپارام کے جگر پر ماری کہ وہ دھم سے زمین پر بے سدھ ہو کر گر پڑا، اس کے گرتے ہی چنوا کا نشہ ہرن ہو گیا، دوڑ کر پانی لایا اور کرپارام کے منھ پر چھڑکنے لگا، لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوا، اس کے قریب ہی سُکھیا کھڑی ہوئی کانپ رہی تھی۔ اور بوڑھا جگوا بخار میں کراہ رہا تھا۔ بہت کوشش کرنے پر بھی جب کرپارام کو ہوش نہ آیا تو چنوا کا ڈر کے مارے برا حال ہو گیا، اس نے بہت آہستہ سے سکھیا سے کہا: "ہائے اب کیا ہوگا؟ یہ تو مر گیا" خوش قسمتی سے چنوا کا مکان بستی کے ایک سرے پر تھا اس کے قریب اور کوئی مکان نہ تھا، ورنہ چنوا اور کرپارام کی گالی گلوج پر بہت سے لوگ جمع ہو جاتے۔ بہن اور بھائی جب دونوں ناامید ہو کر دعائیں مانگ رہے تھے تو انہیں کچھ آہٹ معلوم ہوئی آواز پہچانی ہوئی معلوم ہوئی کسی نے کہا: "اری سُکھیا کیا اب تک گھر میں دیا نہیں جلا، نانا کو بخار چڑھ آیا کیا؟" سُکھیا نے دبے پاؤں آگے بڑھ کر کہا۔ "بھیا شور نہ مچاؤ آہستہ آہستہ بولو بہت بڑی مصیبت آ گئی۔ بسنتا نے گھبرا کے کہا: "کیسی مصیبت؟ باہر کون لمبا لمبا پڑا ہے؟"

سُکھیا نے بسنتا کے منھ پر ہاتھ رکھکر کہا: "چپ! چپ!!" یہ کہکر سکھیا نے چپکے چپکے سب حال کہدیا۔ چنوا نے بسنتا کے دونوں پاؤں پکڑ لئے اور کہا: "بسنتا اب تو ہی بچا"

سکھیا نے بھی سسکیاں بھرتے ہوئے کہا۔ "بھیّا جس طرح سے بھی ہو میرے بھائی کی جان بچالو"
بسنتا نے کچھ دیر سوچ کر کہا: "ڈرنے کی کوئی بات نہیں، میں سب ٹھیک کرلوں گا، اچھا یہ تو بتاؤ کہ گھر میں کوئی بوری یا تھیلا ہے؟"
سکھیا نے آنسو پونچھتے ہوئے جواب دیا: "ہاں ہے"
"اچھا تو جلدی لے آ"

بسنتا اور جنوا نے مل کر کرپارام کی لاش کو بوری میں بند کیا اور یہ طے پایا کہ جب سب لوگ سو جائیں اور گاؤں میں سناٹا ہو جائے تو بسنتا اس بوری کو ندی میں ڈال آئے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ آدھی رات کے وقت بسنتا کرپارام کی لاش کو اپنی پیٹھ پر لاد کر ندی کی طرف چل پڑا، اس کے جاتے ہی جنوا خود کو اپنے دل میں پاپی سمجھنے لگا۔

بسنتا کہہ گیا تھا کہ وہ لاش کو ندی میں ڈال کر رات ہی کو "جنوا" کے گھر آجائے گا، مگر دن نکل آیا اور وہ واپس نہ ہوا۔ "جنوا" کو بسنتا سے زیادہ اپنی فکر تھی کہ اگر کہیں بسنتا گرفتار ہوا تو "جنوا" کی خیر نہیں۔ دس بجے دن کے جب اس کو پتہ چلا کہ پولیس نے بسنتا کو کرپارام کے قتل کرنے کے جرم میں گرفتار کر لیا تو "جنوا" کا منھ فق ہوگیا، وہ سوچنے لگا: "ایک دن مرنا تو ہے ہی پھر اپنی جان کے لئے بسنتا کو کیوں پھنساؤں ——— تھانہ میں چلکر سچّی بات کہہ دوں ——— لیکن اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟" یہ سوچکر جنوا کانپ اٹھا۔ بوڑھے جگوا کو تو یقین نہ آتا تھا کہ بسنتا نے کرپارام کا خون کیا ہوگا، سکھیا کی عجیب حالت تھی۔ اس کا دل بیٹھا جاتا تھا، بھائی کی محبت میں وہ اپنے نانا سے بھی سچّی بات نہ کہہ سکی۔ ادھر جب اُسے ناکردہ گناہ بسنتا کا دھیان آتا تو وہ کلیجہ تھام کر رہ جاتی۔ "جنوا" اب گھر سے بہت کم باہر نکلتا تھا، وہ دن بھر ایک گوشہ میں چپ چاپ پڑا کچھ سوچتا رہتا۔ جس دن بسنتا کا مقدمہ عدالت میں پیش ہونے والا تھا، اس دن "جنوا" کی حالت غیر ہوگئی، سکھیا نے اس کا حال پریشان دیکھ کر کہا "آج تمہارا منھ کیوں اترا ہوا ہے خیریت تو ہے؟"
جنوا نے بہن کی طرف مجرمانہ نظر سے دیکھ کر کہا۔ "مجھے کیا ہوگیا ہے؟ ——— تو کیا سمجھ سکتی ہے سکھیا!"

(۴)

جس دن بسنتا کا مقدمہ عدالت میں پیش ہوا تو "جنوا" بھی وہاں موجود تھا، اس کو دیکھ کر بسنتا کا دل دھڑکنے لگا، ابھی مقدمہ کی کارروائی شروع نہ ہوئی تھی کہ جنوا ایک بارگی مجسٹریٹ کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہوگیا اور کہنے لگا: "حضور! بسنتا بڑا بیڈھب آدمی ہے یہ میرے گناہ کی گٹھڑی چرا لایا ہے، اصلی مجرم میں ہوں، کرپارام مجھ سے اپنے روپیوں کا تقاضا کرنے آیا تھا اس نے مجھے گالی گلوج کی میں گانجہ پیئے بیٹھا تھا مجھے بھی غصہ آگیا اور میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اس کے پیٹ پر ایک لات جما دی اور وہ بیہوش ہوکر زمین پر گر پڑا، میں نے اس کے منھ پر پانی چھڑکا کہ اسے ہوش آجائے لیکن اسکو تو مجھے سزا دلانا تھا جان بوجھکر مر گیا، اس کے بعد یہ چور بسنتا میرے گھر آیا اور اس نے کہا کہ میں لاش کو ندی میں پھینک آؤں گا، میں راضی ہوگیا، اور میں نے لاش کو بوری میں بند کرکے اس کی پیٹھ پر باندھ دی۔ حضور اب تو آپ کو معلوم ہوگیا ہوگا یہ بسنتا بڑا بیڈھب آدمی ہے مجھ کو دھوکا دینا چاہتا ہے۔ کیوں بسنتا ٹھیک ہے نا!" یہ کہکر جنوا نے بسنتا کی طرف مسکرا کر دیکھا۔

مقدمہ پھر نئے سرے سے شروع ہوا "جنوا" سشن سپرد کیا گیا اور بسنتا کو اخفائے جرم کی پاداش میں ۲ سال قید سخت کی سزا ملی۔ سشن میں مقدمہ خراب ہو گیا اور جنوا سزائے موت سے بچ گیا۔

---

۲ سال کی سزا کاٹ کر جب بسنتا رہا ہوا تو وہ سیدھا اپنے جگوا نانا کے پاس پہونچا، جنوا کے متعلق اس نے اس سے کچھ نہ دریافت کیا، کیونکہ اس نے سمجھ لیا تھا کہ جنوا کو ضرور پھانسی ہو گئی ہوگی۔

بسنتا نے منھ لٹکا کر غمگین لہجہ میں جگوا سے کہا "نانا! اس کی تقدیر!!"

بوڑھے نے جواب دیا "ہاں اس نے جوانمردوں کا سا کام کیا ہے، مگر تو تو بتا کر تو نے مفت میں کیوں اپنی جان جوکھوں میں ڈالی تجھے اتنی تکلیف اٹھانے کی بالکل ضرورت نہ تھی"

بسنتا نے روتے ہوئے کہا: "نہ میری ماں ہے نہ باپ۔ مرجاؤں تو کوئی رونے دالا بھی نہیں ہے، اگر مجھے پھانسی ہو جاتی تو بہت اچھا ہوتا ———"

بوڑھے نے بسنتا کو جھڑک کر کہا: "جب تیرا ایسا خیال ہے تو آج سے مجھے "نانا" مت کہنا۔ کیا ہم لوگ تیرے کوئی نہیں کیوں رے بسنتا؟"

سکھیا حلیم بھر رہی تھی، اس نے ہنس کی طرح گردن موڑی اور بسنتا پر تیز نگاہ سے حملہ کر کے بولی "اب چپ چاپ کیوں کھڑے ہو جواب کیوں نہیں دیتے کیا ہم تمہارے کوئی نہیں ہیں؟"

بسنتا کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں وہ نانا کے گلے سے لپٹ کر رونے لگا۔ بوڑھے نے بسنتا کو اپنے کلیجہ سے لگا لیا، ایک ہفتہ کے اندر ہی اچھی ساعت میں بوڑھے جگوا نے سکھیا کے ساتھ بسنتا کا بیاہ کر دیا، بسنتا پھر شادی کرنے سے انکار نہ کر سکا۔

(ماخوذ از بنگالی) **اعظم کریوی**

مسلمانانِ ہند کے پستی کے اسباب

اور

مذہب و قوم کی غلط تعبیر

حکومتِ ہند کی ایجوکیشنل کمشنر کی رپورٹ سنہ ۱۹۲۲ء تا سنہ ۱۹۲۷ء سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانانِ ہند میں تعلیم کی پستی کے خاص اسباب مندرجہ ذیل ہیں :۔

"دیگر اقوام کے لڑکوں کی نسبت مسلمان مذہبی قیود کے باعث تعلیم میں اکثر پیچھے رہ جاتے ہیں۔ انکو نہ صرف ۷ برس کے عرصہ تک محض قرآن شریف کی تعلیم حاصل کرنی پڑتی ہے بلکہ اس کے بعد چند سال انکو اپنے صوبجات کی مروجہ زبانیں سیکھنے میں صرف کرنے پڑتے ہیں۔ اس طرح ان کو چھوٹی عمر میں تین زبانیں سیکھنی پڑتی ہیں۔ مذہبی زبان یعنی عربی یا فارسی اور بعض اوقات دونوں۔ اردو زبان اور اس کے بعد ضلع کی مروجہ زبان جو کچھ بھی ہو۔ اور اگر وہ آگے تعلیم جاری رکھتے ہیں تو انکو زبان انگریزی بھی پڑھنی ہوتی ہے۔ گویا چار بلکہ پانچ زبانوں کیطرف پوری توجہ کرنی پڑتی ہے۔ برخلاف اس کے ہندوؤں کو کافی سہولتیں حاصل ہیں۔ اول تو انکو اپنی آبائی زبان یعنے سنسکرت سیکھنی نہیں پڑتی۔ دوم ضلع کی زبان وہ آغوشِ مادری ہیں سیکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ ہوش سنبھالنے پر انکو صرف دو زبانیں سیکھنی پڑتی ہیں، ایک ورنیکولر دوسری انگریزی۔ ان زبانوں کو بھی یہ ہندو لڑکے اس وجہ سے نہیں سیکھتے کہ یہ ان کی زندگی میں کارآمد ثابت ہو، بلکہ وہ دماغ اور حافظہ کی تربیت کیلئے سیکھتے ہیں غالباً ہندوؤں کی تمام مذہبی کتابیں سنسکرت ہی میں ہیں، لیکن ان کے لئے سنسکرت پڑھنا لازمی امر نہیں ہے۔ انکے مذہبی کتب کا زیادہ حصہ ورنیکولر زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے اور ہندو زیادہ تر انہی ترجموں سے ضروری واقفیت حاصل کرتے ہیں۔ پھر کیوں نہ مسلمان طلبہ کو بھی مذہبی تعلیم عام فہم زبان میں دی جائے۔ اب مسلمانانِ ہند کو اپنی تعلیمی کانفرنسوں میں اس سوال پر ضرور غور کرنا چاہیئے۔ لیکن جس قدر توجہ اس اہم سوال کی جانب کرنی چاہیئے اس قدر ابتک نہیں کی گئی۔ لیکن باوجود ان تمام رکاوٹوں اور پابندیوں کے مسلم طلبہ کی تعداد میں سنہ ۱۹۱۷ء و سنہ ۱۹۲۲ء کے درمیان بہ نسبت پیشتر کی ۱۴۲۰۰۰ کا اضافہ ہو گیا ہے۔ اور سنہ ۱۹۲۲ء و سنہ ۱۹۲۷ء کے درمیان ان کی تعداد میں ۸۵۰۰۰ کی زیادتی ہوئی۔ اگرچہ مسلمان لڑکوں کو قرآن شریف کی تعلیم دینا از حد مفید ہے۔ لیکن بلا مطلب و معانی سمجھائے ہوئے رٹانے سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔ بہترین طریقہ یہی ہو سکتا ہے کہ انکو مذہبی باتیں عام فہم زبان میں سمجھا دی جائیں۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ کل اضافہ شدہ طلبہ کی تعداد میں ۳۰ فیصدی تعداد مسلمان لڑکوں کی ہے۔ صوبجات متحدہ میں پرائمری و سکنڈری اسکولوں میں تعلیم پانے والے مسلمان طلبہ کی تعداد میں صرف ۵۲۰۰۰ کا اضافہ ہوا ہے"۔۔۔۔۔۔

قابلِ غور امر یہ ہے کہ یہ مذہبی قیود "از ماست" کہ "بر ماست" تو نہیں۔ غالباً اس بات سے کسی ذی فہم کو انکار نہوگا کہ اگر عموماً

ہندوستان وخصوصاً بنگال میں ہندو مسلمانوں کا تناسب سوائے جیل خانوں، قحبہ خانوں، غریب خانوں کے کہیں بھی آبادی کے لحاظ سے نہیں یا ہندوستان میں کسی علمی وسیاسی وتمدنی زندگی میں ہمارا کماینبغی حصہ نہیں، تو اس کی اصل وجہ ہماری تعلیمی پستی ہے۔ اور در حقیقت تعلیم کا فقدان ہی قومی زوال کی انتہا ہے۔ جس کا مظاہرہ افغانستان کے واقعات میں ہمارے سامنے ہو رہا ہے۔ پس تعلیمی پستی کا سبب بجز اس کے کچھ نہیں کہ ہم دنیا میں یا تو ایک ایسے نرالے مذہب کے پابند ہیں جو ہمکو ترقی کے میدان میں جانے نہیں دیتا یا خود ہم نے اس مذہب کو نرالے طریقہ سے اختیار کیا ہے۔ اور وہی ہماری پستی کا سبب ہے۔

جنہوں نے فلسفۂ مذہب کا مطالعہ نگار میں کیا ہے۔ ان سے یہ حقیقت پوشیدہ نہ ہوگی کہ میرا مقصد اس کتاب کے لکھنے سے نہ یہ تھا کہ اصحاب تقویٰ سے مبارز طلبی کی جائے۔ اور نہ یہ کہ اربابِ نظر و فلسفہ سے داد حاصل کی جائے۔ میرا مقصد سوائے اس کے اور کوئی نہ تھا کہ میں اپنے ہم مذہب لوگوں کو یکبار پھر اپنی موجودہ حالت پر جایزہ لینے کے لئے آمادہ کر سکوں۔ اور اس کے بعد ان سے اجازت اس بات کی لوں کہ اپنے مذہبی مطامح نظر میں زمانہ کے موافق ترمیم کر لیں۔ چونکہ دل مجروح وبے قرار تھا، اور میں نے اسلامی بدبختی کے شیطان کو پکڑ لیا تھا اس لئے ناملائم الفاظ قلم سے نکلتے چلے گئے۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک شخص اندھیری رات میں اپنے مکان کو جلتا ہوا دیکھ لے یا کسی نقب زن کو پکڑ لے تو اس وقت وہ اصطلاحی الفاظ کا دھیان نہیں کرتا اور حالت اضطراب میں جانے کیا کیا زبان سے نکل جاتا ہے۔ تو مذہب وتمدن کا وہ شیطان کون ہے جو مسلمانوں کا رہزن ہے۔ کیا اس کی ضرورت ہے کہ قارئین کرام کو اپنی کتاب کے "مذہب اور قومیت" والے حصہ پر توجہ دلاؤں۔ یا میں پھر اس مضمون میں اس کا لب لباب پیش کروں، یا اب عملی کارروائی پر متوجہ ہوں۔ بہرحال ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم پہلے اس بات کو طے کر لیں کہ مسلمان کوئی قوم ہے یا ایک مذہب۔ اگر کوئی قوم ہے تو پھر ہندوستان وچین وجزائر بحر ہند وافریقہ وروس میں ہماری درماندگی کا علاج بقراط کے بھی سمجھ میں نہ آئے گا۔ یہودی قوم ایک مختصر سی قوم ہے۔ مگر وہ بھی جب تک اپنی ہمسایہ قوموں سے گھل ملکر ایک نہ ہو گئی، ترقی کے زینے پر قدم نہ رکھ سکی۔ ہماری قوم تو ماشاء اللہ ایک خمس ربع مسکون کی آبادی کے لگ بھگ ہے۔ اور وہ لوگ بھانت بھانت کی بولیاں بولتے ہیں، انکو علیحدہ قومی حیثیت دے کر ترقی پر لگانا صرف انہیں ممالک میں ممکن ہو سکتا ہے، جہاں ہم اپنی قسمت کے خود مالک ہوں، مگر جن ممالک میں ہم اپنی قسمت کے خود مالک ہیں وہ قوم کا دسواں حصہ بھی نہیں ہے، باقی ۹/۱۰ حصہ دوسروں کے اختیار میں ہے۔ جہاں ہماری بے دستی وپائی عیاں ہے۔ اور جہاں ہمارے پاس کوئی ایسے ذرائع نہیں جن سے ہم اپنی قوم کو مدارج ترقی پر پہونچا سکیں۔ پھر آیئے سب سے پہلے قومیت کو سمجھ لیں۔

قوم کی تعریف یہ ہے کہ انسان کی ایک جماعت۔ ایک زبان۔ ایک معاشرت۔ ایک قانون وشریعت۔ ایک روایت کی متبع ہو۔ مگر یہ ضرور نہیں کہ وہ ایک مذہب بھی رکھے۔ قومیں عموماً اپنے ملکوں سے نسبت رکھتی ہیں۔ مگر بعض قومیں جن کا کوئی ملک نہیں ہوتا وہ بجائے ملک کے مذہب سے اپنی نسبت کرتی ہیں۔ جیسے یہود وپارسی۔ سکھ۔ جین۔ ہنود وغیرہ۔ اور جب مذہب کو قوم سے نسبت دیجاتی ہے تو اس کے معنے ظاہر ہیں کہ اپنے مذہب کے اندر وہ تمام خصوصیتیں پیدا کر لیتی ہے۔ جو قوم کے شرائط میں داخل ہے۔ مثلاً ایک ہی لباس، معاشرت۔ تمدن۔ زبان۔ روایت اور رفتہ رفتہ مذہب ان ساری باتوں پر حاوی ہو جاتا ہے، اگر ایسی قوم کسی ملک کی مالک ہوئی تو مذہب

کے اندر سیاست بھی داخل ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر اس قوم کا کوئی ملک نہیں تو سیاست کا جزو معطل ہو جاتا ہے۔ قومی مذاہب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس پر عمومیت کا اطلاق قائم نہیں رہتا۔ اور چونکہ قوم صرف ایک ہی قانون سے گھٹتی بڑھتی ہے۔ یعنی توالد و تناسل سے اس لئے مذہبی جماعت کا بڑھنا بھی موقوف ہو جاتا ہے الا توالد و تناسل کے اصول سے یا ایک غیر معمولی قوت جاذبہ یعنی وہ دوسری ہمسایہ قوموں کی روایت و زبان کو مٹانے پر قادر ہو اور اس کو اپنے میں جذب کرلے۔ اب مذہب اسلام کو اس نظر سے دیکھنا چاہئے۔ سب سے پہلے مسلمانان عالم کا ایک مختصر خاکہ بیاں دے دینا چاہئے کہ وہ کس طرح دنیا میں پھیلا ہوا ہے اور کتنی مختلف قوموں سے اس کی جماعت بنی ہے۔

۱۔ قوم عرب یا مستعرب۔ ۵۹ ملین

یمنی ۲ ملین — حجازی ۱ ملین۔ شامی ۴ ملین — عراقی ۵ ملین — نجدی ۳ ملین — عمانی ۲ ملین۔ مصری ۱۵ ملین — بربری ۲۰ ملین — حضرمی ۲ ملین — عرب ماورائے ممالک عربیہ (افریقہ و امریکہ و جزائر) ۵ ملین

۲۔ قوم ترک۔ ۴۷ ملین

اعثمانی ۱۴ ملین — ترکمان ۲ ملین — اوزبک ۶ ملین — تاجیک ۳ ملین — کرغیز ۵ ملین — باشکر ۴ ملین تاتار روس و قریم و قفقاس ۱۰ ملین۔ ۸۔ ترکان چین و یارقند ۲ ملین۔ ۹۔ ترک ماورائے ممالک (بلقان مصر و شام وغیرہ) ۱ ملین

۳۔ قوم عجم۔ ۲۴ ملین

ایرانی ۱۲ ملین — افغان ۷ ملین۔ کیروٹ ۴ ملین — بلوچ ۱ ملین — عجم ماورائے ممالک مثل قفقاس ہندوستان افریقہ وغیرہ ۲ ملین۔

۴۔ قوم ہند۔ ۶۹ ملین

پنجابی ۱۲ ملین — سندھی ۳ ملین — کشمیری ۳ ملین — بنگالی ۲۵ ملین — ہندوستانی ۱۷ ملین — دکھنی ۱ ملین اورائے ہند (افریقہ و جزائر) ۱ ملین۔

۵۔ قوم چین۔ ۵۰ ملین

تنگان ۳۰ ملین — پانتھے دھونی ھونی ۱۸ ملین — ماورائے چین (ملایا۔ امریکہ) ۲ ملین

۶۔ قوم سلاو۔ ۱۰ ملین

۱۔ روس و پولینڈ ۴ ملین — بلقان ۶ ملین۔

۷۔ قوم یونان ۱½ ملین

البانوی ۱ ملین — اہل کریٹ و یونان و سمرنا ½ ملین۔

۸۔ قوم ملایا ۲۴ ملین — ۱۔ سماترا ۳ ملین — جاوا ۲۰ ملین — ملکس و سیلبز ۴ ملین — ملاکا ۱ ملین — فلیپائن

دیاپوا، ۱ ملین - بورنیو - ۴ ملین، ماورائے ملایا (جنوبی افریقہ - میڈگاسکر وغیرہ) ½ ملین -

۹- اقوام یورپ وامریکہ واسٹریا، ۱ ملین -

۱۰- اقوام افریقہ، ۵۰ ملین :-

حبشی ۳ ملین — سوڈانی ۴۵ ملین — سواحلی ۲ ملین

تو اسلام اس وقت ۱۰، اقوام عظیم میں شایع ہے - کیا یہ سب ایک ہی قوم ہیں - اگر نہیں ہیں اور یقیناً نہیں ہیں تو ہم ہندوستانیوں میں کون طرۂ امتیاز ہے کہ وہ یہاں آکر ایک مسلمان کی قوم بن جائے حتےٰ کہ بڑے سے بڑا جوشیلا مسلمان بہائے قوم وائے قوم کرتا ہے، تو اس سے اس کی مراد صرف اپنے ہم مذہب والوں سے ہوتی ہے - سب سے پہلے ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ مذہب اسلام کو ہندوستان میں قوم بنانے کی بدعت کہاں سے نکلی - اور اس کے بعد ہم یہ دیکھیں گے کہ قوم بننے کی رفتار کیسی ہے، آیا یہ قوم تیار ہو چکی ہے یا ابھی تیاری پر ہے - اور قوم بن کر وہ کہاں تک قومی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہوئی - پھر ہم یہ دیکھیں گے کہ اس قومیت نے کتنے موانع مذہب و معاشرت کے متعلق ہم میں پیدا کر دیئے ہیں - اور پھر اس غلط عقیدہ کے ازالہ کی صورت کیا ہے -

اسلام کو قومیت کا رنگ دینے کے جراثیم قرآن سے باہر فقہ اور حدیث میں ملتے ہیں - اور چونکہ مسلمانوں میں قرآن ایک ہوّا بنکر رہ گیا ہے - جس کا چھونا تک مشکل ہے - نہ کہ اسکا پڑھنا اور سمجھنا، اس لئے ہمارے مذہب کا سارا دار و مدار فقہ و حدیث پر ہے اور یہیں سے ہماری ساری خرابیوں کی ابتدا ہوتی ہے - بات یہ ہے کہ عرب کا قومی عروج ایک عرصہ تک اشاعت اسلام کا مرادف سمجھا جاتا رہا - عربوں کے مفتوحہ ممالک کے باہر اسلام کی اشاعت کا کبھی خیال پیدا نہیں ہوا - اور مفتوحہ ممالک میں غیر عربی قوم میں اسلام محض معاشرتی سیاسی جاذبیت کا نتیجہ رہا - فقہائے اسلام کے نزدیک دنیا دو حصوں میں منقسم ہے - ایک دار الاسلام اور دوسری دار الحرب - اور جب فقہا کا یہ قول ہے کہ دار الحرب میں اشاعت اسلام کیا معنی وہاں تک جانا جائز نہیں تو ہمکو خواہ نخواہ اس بات کو تسلیم کرنا پڑیگا کہ مذہب اسلام واقعی ایک عربی پولیٹیکل مذہب تھا - اور اسپر عمومیت کا اطلاق کبھی نہیں ہوا - اور اس لئے اس کی اشاعت اسلامی سلطنت سے باہر نہیں کی گئی اور نہ ہونا چاہئے - دار الاسلام کے اندر قومی خصوصیت کے سارے اجزا طبعی طور سے مذہب کے اندر ہی رہے، اور جس کو ہم معاشرت، شریعت، سیاست سے تعبیر کرتے ہیں اور جس کو مذہب سے علیحدہ جگہ دیتے ہیں وہ محض مذہب کی شاخیں ہیں مگر یہ حالت دیر تک قایم نہ رہی اس لئے کہ یہ صورتیں قرآن کی عمومیت اور تبلیغ کے منشاء کے خلاف تھیں - اور اس کو سوائے خدائی مصلحت کے اور کیا کہا جائے کہ عربوں سے سلطنت چھین لیگئی یہ ایک ایسا تازیانہ غیبی تھا کہ اب مسلمان اگر ہوش سنبھالتے تو قرآن کے مبلغ بنکر دنیا کی قوموں میں نکل جاتے، اور پیغام الٰہی کو دنیا کے کونے کونے میں پہونچا دیتے - مغلوں کا زمانہ شروع ہوتا تھا کہ گویا عربوں کو یہ پرانا عہد یاد پڑ گیا اور یا کم سے کم ان کے موالی تبلیغ اسلام کیطرف متوجہ ہوئے اور اس زمانے سے لیکر اب تک اور خصوصاً چودھویں صدی عیسوی میں تبلیغ کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کی جماعت خود فاتح تاتاریوں میں جزائر اوقیانوس - افریقہ - روس و چین کے اندر پیدا ہو گئی - حسن اتفاق یا سوئے اتفاق سے غیر عربی جماعتیں جو اسلام لائیں وہ حکمراں سے لیکر رعایا تک سب کی سب ایمان لائیں - ایسا نہوا کہ کسی ملک میں تھوڑے سے اصلی باشندے مسلمان ہو گئے ہوں - اور باقی غیر مسلم

اور جہاں ایسی حالت پیدا ہوئی، جیسے ساحل چین و ملیبار میں وہاں وہ غیر ملکی اور علیحدہ قومی حیثیت رکھتے رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسکی ضرورت ابھی تک محسوس نہ ہوئی کہ مذہب کو معاشرت و معاملات سیاست سے جدا کیا جائے۔ یعنی مختصر یہ کہ فقہ و اجتہاد کا عروج باقی رہا، اور مذہب و قوم میں کوئی مابہ الامتیاز بات پیدا نہ ہوئی۔ انیسویں صدی شروع ہوتے ہی مسلمانوں کی سلطنت پر زوال آنا شروع ہوا۔ ہندوستان اور ملایا اور افریقہ میں اہل فرنگ نے قبضہ کیا۔ تاتاریوں کی سلطنت پر روس کا قبضہ ہوگیا۔ ایک طرف اگر یہ ہوا تو دوسری طرف چین کے اصلی آبادی میں اسلام نے معتد بہ اضافہ کرلیا۔ یہ غالباً ایسی خدائی مصلحت کے ماتحت شروع ہوا۔ اور رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک پہونچی کہ مسلمانوں کی بڑی جماعت غیر مذہب والوں کی حکومت میں آگئی۔ اس حالت کو ڈیڑھ سے برس سے زیادہ نہیں ہوا اور یقیناً یہ بہت تھوڑا زمانہ ہے کہ مسلمان غور کرسکیں کہ ایسی حالت میں انکو کیا کرنا چاہیئے۔ وہ ابھی تک ہاتھ پر ہاتھ دھوئے بیٹھے ہوئے ہیں اور چونکہ ابھی تک ان پر ایسی حکومت کا خمار باقی ہے جو مذہب اور سیاست کو یکساں سمجھ رہا تھا وہ اپنی قوم اپنے مذہب ہی کو سمجھ رہے ہیں۔ مگر اب رفتہ رفتہ شاید یہ محسوس کر رہے ہیں کہ سیاست پر ان کا قابو نہیں رہا۔ اس کا حصہ مذہب سے نکالنا ہی پڑے گا۔ معاشرت کے بعض قوانین کو جس میں غیر ملکی حکومت دخل دینا نہیں چاہتی، مذہبی چیز سمجھ لیا گیا۔ یعنی وراثت، شادی، طلاق کے معاملات میں جسکو پرسنل لا یعنی شخصی قانون کے نام سے قایم رکھا گیا ہے۔ لیکن درحقیقت جب اسلام نام ہے صرف عمومی مذہب کا تو یہ شخصی قانون "مہمل" سی بات ہے۔ اور وہی مثل ہے کہ "سارا ہاتھی نکل گیا اور دُم پھنس گئی ہے"۔ یعنی اس کے معنی یہ ہوئے کہ اگر آج ایک جرمن۔ یا فرانسیسی یا انگریز یا ایک ہندو اسلام قبول کرے تو وہ اپنی قومی قوانین کے بعض حصے کے لئے نوٹس دے کہ ان کا عمل اسپر موقوف کیا جائے۔ صرف اس لئے کہ اس نے لا الٰہ الا اللہ کا کلمہ پڑھ لیا ہے۔ نہیں۔ درحقیقت قرآن کو قومی و شخصی قانون سے کوئی تعرض نہیں وہ صرف ذریعہ اصلاح اخلاق کے جو ذرائع ہیں۔ اگر ان کے لئے ملکی سیاست جگہ نہیں رکھتی۔ تو قرآن نے مختصراً اسکو بھی سمجھا دیا ہے یا اس کی ایسی اصلاح کردی ہے جس سے اخلاق پر برا اثر نہ پڑے۔ اس نکتہ کو کبھی فراموش نہ کرنا چاہیئے کہ قرآن کے اوامر و مناہی موقع کے لحاظ سے فرض و واجب و مستحسن وغیرہ ہیں۔ اور قرآن کے ہر حکم کو فرض عین خیال نہ کرلیا جائے۔ مگر قرآن کا دراصل منشا اشاعت توحید اور اصلاح اخلاق ہے اور باقی سب فروع اور ذرایع ہیں جس میں طریقۂ عبادات بھی شامل ہے۔

اگر آج ہندوستان کے مسلمان اس بات کو قطعی بھول جائیں کہ وہ ایک جدا قوم ہیں تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ ان کی قوم کے مختلف اجزا جو ہندوستان میں پھیلے ہوئے ہیں اپنی قومی معاشرت و زبان و تمدن کی طرف واپس جاکر اپنے اسلامی خمیر کو جو قرآن سے ان کو ملا ہے۔ ساری قوم میں سرایت کردیں گے۔ لیکن ان سے جدا رہکر ان کو ایک ایسی تنظیم کی ضرورت ہوگی جو سلطنت کی تعمیر محال ہے۔ اور ہندوستان میں قرآن مختلف زبانوں میں پڑھا اور سمجھا جائے گا۔ کوئی خدا کی عبادت اُس طرح کرے گا جیسے رسول اکرم کے وقت مسلمان کرتے تھے۔ کوئی اس طرح جو ہر طرح رقت انگیز اور قابل قبول خدا ہے۔ اپنی زبان ہوگی اپنی رسم اور اپنے طریقے اپنی شرع۔

لکل امۃ جعلنا منسکا ھم ناسکوہ۔ کے ماتحت قومی رنگ جدا ہوگا۔ البتہ ان کے اتفاق کے لئے قرآن و کعبہ باقی رہیگا اس وقت ہم یہ نہ کہیں گے کہ قوم مسلمان ترقی نہیں کرتی۔ بلکہ یہ کہیں گے کہ قوم ہند بر سر اوج ہے۔ اور ماشاء اللہ وہ مسلمان ہے۔ مگر اس کے خلاف

کیسی کیسی احمقانہ حرکتیں ہم سے ظہور میں آرہی ہیں۔ صرف اس لئے کہ شمالی ہندوستان میں مغلوں نے سلطنت کی۔ ہماری بڑی کوشش یہ ہے کہ ہندوستانی زبان کو فارسی رسم الخط میں لکھیں۔ اس میں فارسی الفاظ ٹھونسیں اور پھر غضب یہ کریں کہ قرآن و مذہب کو اس سے باہر نہ جانے دیں۔ اور اسی زبان کو اس کا زینہ بنائیں۔ بنگالی مسلمانوں کو مجبور کریں کہ وہ اردو سیکھیں۔ اردو اس کا نام رکھیں اور اس کو قومی روایت سے عاری کر دیں اور اس میں عربی اور عجمی روایات کو بھرتی کریں۔ کوئی حرج نہیں ہے۔ مگر تم اپنے گرد ایک ایسا حصار کھینچ رہے ہو، جو ہندو کو نہ تم سے ملنے دے گا نہ تمہارے مذہب کی طرف آنے دے گا۔ سب سے طرفہ بات یہ ہے کہ فارسی جو یقیناً غیر اسلامی زبان ہے، اس کو تو اسلامی زبان سمجھی جائے لیکن بھاشا و سنسکرت کو غیر ملکی اور غیر مذہبی حتیٰ کہ اس میں قرآن کا ترجمہ بھی روا نہ ہو۔

پس مسلمانانِ ہند کی پستی کا علاج ہے تو صرف یہ کہ وہ اس غیر فطری حصار کو جو قوم اسلامی کے نام سے وضع کیا گیا ہے۔ توڑ کر پھینک دیں اور جہاں جہاں سے اس کے اجزا لے کر جمع کئے ہیں وہ واپس کر دیں۔ کسی شخص کو محض اس قصور پر کہ وہ مسلمان ہو گیا ہے، عرب بنانے کی سزا نہ دیں، بلکہ اس کو صرف ایک قرآن اسی کی زبان میں دیں اور پھر دیکھیں کہ قرآن کس قدر جلد پھیلتا ہے۔ مسیح نے جو آسمانی بادشاہت کی تشبیہ ضمیر سے دی ہے، وہ درحقیقت اسلام و قرآن کی بہترین تشبیہ ہے۔ اور اگر ہم اس نکتہ کو از خود نہیں سمجھتے ہیں تو خدا ہم کو سمجھا کر رہیگا۔

سید مقبول احمد (بی اے)

"خلیق اورنگ آبادی"

کتب خانہ آصفیہ کی ورق گردانی کے دوران میں گلزار معاصرین (نمبر ۴۴ دواوین فارسی) کے آخر میں ریختہ کے دس صفحات بھی نظر آئے، جن پر خلیق کے اردو شعر لکھے ہوئے ہیں بسم اللہ الرحمن الرحیم کے بعد :-

"ریختہ جات وغیرہ من تصنیف رائے روپ نرائن خلیق تخلص اورنگ آبادی" لکھا ہوا ہے

اس میں نہ کہیں سنہ درج ہے اور نہ کاتب کا نام افسوس ہے کہ خلیق کا حال بھی نہیں ملتا صرف "مجلہ عثمانیہ" جلد ا نمبر ۲ صفحہ ۱۱۷ پر شیخ چاند صاحب متعلم جامعہ عثمانیہ نے "اورنگ آباد اور اردو شاعری" پر اظہار خیال کرتے ہوئے اپنے مضمون کے "پانچویں دور سنہ ۱۲۶۰ تا سنہ ۱۳۰۰" میں خلیق کا نام بھی گنا دیا ہے، چنانچہ لکھتے ہیں :-

"اس دور میں اورنگ آباد کی تباہی کے پورے سامان ہو چکے تھے. مشاعروں کی محفلیں گرم تھیں، لیکن کوئی لائق ذکر شاعر نہیں تھا البتہ بعض نام ملجاتے ہیں جنھوں نے بزرگوں کی تقلید میں شاعری کی، ان میں خلیق کا نام لینا ضروری ہے، ان کی بعض غزلیں دیکھنے کا مجھے اتفاق ہوا، بہت صاف اشعار ہیں اور کوئی خاص بات نہیں"

موصوف نے خلیق کی غزل کے تین شعر بھی نقل کئے ہیں نہ جانے ان کے پاس خلیق کو (سنہ ۱۲۶۰ تا سنہ ۱۳۰۰) کا شاعر ماننے کے کیا اسباب ہیں، چونکہ ہمارے سامنے اس وقت کچھ اور مواد نہیں ہے اس لئے ہم سردست یہی فرض کرتے ہیں کہ خلیق کی شاعری کی ابتدا سنہ ۱۲۶۰ یا اسکے درمیان میں سنہ ۱۳۰۰ تک ہوئی ہے۔

نام سے پتہ چلتا ہے کہ خلیق کایستہ یا کھتری تھے اور جیسا کہ اس زمانہ کے ہندوؤں کے عقائد تھے حضرت علی علیہ السلام کے مداح تھے. ہر غزل میں "محبت مولا" کا ثبوت دیتی ہے، وہ بھی ایک زمانہ تھا کہ ہندو مسلمانوں کے عقاید مشترک تھے مسلمان جنکی مدح کرتے تھے ہندو بھی ان کے ثنا خواں تھے اور ایک زمانہ یہ ہے کہ مسلمان ہندوؤں کے پیشواؤں کو برا بھلا کہتے ہیں تو ہندو مسلمانوں کی قابل تعظیم ہستیوں کی ہجو کرتے ہیں۔ خلیق کے اس مختصر دیوان کی پہلی غزل ملاحظہ ہو، حمد، نعت، منقبت سے مملو ہے معلوم ہوتا ہے کہ کسی مذہبی مسلمان کی غزل ہے :-

مجال کیا ہے زباں کو کہے جو حمد خدا　　　سبھی طرح سیتی ہو لال کیا کرے وہ ثنا

اسی طرح سیتی ناقص ہے نعت حضرت میں　　　ازل سوں احمد احد ایک ہیں نہیں ہیں جدا

خلاف اسکے جو بوجھے سو بے شبہ کافر　　　اگر جو صدق ہے دلمیں تو مان میری صدا

چہار چیز سے پیدا کیا ہے انساں کو　　　مثال اس کے تو ہیں چار یار، رہ نما

خلیق یار علی کا غلام ہو دل سے　　　ہیں دستگیر ترے بے شبہ وہ روز جزا

اس غزل کو دیکھ کر کوئی یہ نہ سمجھے کہ خلیق پر اسلام کا رنگ اس قدر چھا گیا تھا کہ انھوں نے اس کی تقلید شروع کر دی تھی، خلیق ہندو تھے اور انکو اس امر کا اعتراف بھی تھا کہ وہ ہندو ہیں۔ ذیل کی غزل کا چوتھا شعر دیکھئے :-

یاالٰہی مجھے اپنا نہ طلب گار کیا — کاہے کو عشق مجازی میں گرفتار کیا
ہے مجھے یقیں میری شرم سے تجھ کو[1] — مری بخشش کے لئے اپنے کو غفار کیا
بے طلب مجھ کو دیا جو کہ مجھے تھا درکار — دستگیری کو میری احمد مختار کیا
گرچہ ہندو ہوں گنہگار سراپا یا رب — پن گنہگاروں میں مجکو بھی تو سردار کیا
جس کو سرشار کیا اس کو نوازا بے شک — جس کو سرشار کیا اس کو پھر ہشیار کیا
مجھ کو لازم ہے یہی سجدہ کروں میں ہر دم — ورنہ میں آن کے دنیا میں نہ کچھ کار کیا
ہیں ترے طالع بڑے تجھ کو میں کہتا ہوں خلیق — سرفرازی کی نظر حیدر کرار کیا

[1] یہ مصرع اسطرح لکھا ہوا ہے

اس منقبت کو دیکھئے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی "نصیری" ہے جو فنا فی علی ہو چکا ہے

ہمارا یا ہے بر حق خلیق سر کو نیوا — ہمارے دین میں جا ہیں طرف ہی سجدہ روا
مگر وہ قبلۂ مومن کے مولد عالی — زبان خلق میں مشہور ہے گا بیت اللہ
بس آگے وصف کروں کیا کہ یہ مکان و مکیں — جو شرک لاوے سو ہے کافر جناب اللہ
علی ہے شیر خدا اور رسول کا داماد — یہ وہ رسول ہے جو نئیں خدا سے کچھ بھی جدا
احد کے لفظ میں جو میم ہو گیا ساکن — وہی ہے میم جو مشکلشا پسند کیا
دلیل میرے سخن پر حدیث قدسی ہے — خدا نے ناد علی کا حوالہ آپ دیا
گئے تھے قصد جو معراج کا رسول کریم — خراماں ہو کے ہوا سامنے وہ شیر خدا
پیام حق کا کئے عرض جبرئیل امیں — کہ دیو خاتم کے تئیں ہاتھ سے لے راہ نما
ہوئے جو محرم اسرار حق بحق ملحق — ہزار بار ادب سے کہوں میں صلی اللہ
جو دیکھی دست مبارک میں اپنی انگشتر — طعام نفل کو کھا کے کئے خدا کی ثنا
تمام آکے ملائک ادب سے کئے تسلیم — درود پڑھ کے کہے سب نبی رسول اللہ
ادب سے نام لے حضرت نبی علی کا خلیق — کہ تجھ کو ذات انہوں کی شفیع ہے روز جزا

مبارکباد خدا نے کہا علی داماد
یہ وہ علی ہے کہ ہے نام جسکا اسد اللہ

ایسی ہی ایک اور نعت آمیز منقبت کہی ہے :-

کون کہو سکے مصطفےٰ تیئں ذات اللہ سے جدا — واسطے بخشش کے میری صورت انساں کیا

بھید پایا ہوں خدا کیو اسطے سونا ضرور — خود علم ہو نجھ پر مشکلشا ظاہر کیا

یہ معمہ گر تو سمجھے ہو یقیں عاقل پسند — تھا احد اول سے آخر میم ہو احمد ہوا

عین میں تیرے علی والے نے بخشی روشنی — کامیابی دو جہاں کی عین میں ہے مدعا

کمترین کمتراں ہے روپ نادانی خلیق
یا علی مشکلشا یا ابو الحسن ناعلیا

اس کے علاوہ اور بھی متفرق شعر نعت و منقبت میں کہے ہیں، خصوصاً مقطع اسی رنگ کا کہتے گئے ہیں:۔

میم احمد میں جو کہ ظاہر ہے — وہی ہے میم میرے مطلب کا

مظہر حق علی مظہر ہیں — فدوی مظہر العجائب کا

حق تعالیٰ سے یہی عرض کرے ہر گاخلیق — دستگیری کو میری حیدر کرار مرا

ہو دل سے فدا علی ولی کا تو خلیق — اس رمز کو خوب تو نے جانا جانا

خلیق اب یاد ہے مولیٰ علی کی — میرے دل کو علی بھایا سو بھایا

خلیق اب فضل ہے مولیٰ علی کا بے شبہ تجھ پر — وگرنہ کا ہے کو جگ میں نمایاں دلربا کرتا

عاجز خلیق عرض کرے یا علی ولی — جز ذات پاک والا میرے کون ہما

یہی نہیں کہ وہ "نصیری شیعی" تھے بلکہ ایک "قبر پرست سنی" بھی تھے چنانچہ حضرت غوث اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی مدح بھی کی ہے:۔

قادر قدرت نمادہ شاہ گیلانی ہوا — قادر مطلق نے بر حق قطب ربانی کیا

دستگیر دو جہاں میراں محی الدین شاہ — نام حق نے حق تمہیں محبوب سبحانی کیا

شکر حق جو اس زباں سیں کہوں پیران پیر — یازدہ سجدہ ادا کر غوث صمدانی کہا

گرچہ ہوں میں سر لے پاؤں تلک غرق گناہ — دستگیری کو میری وہ شاہ جیلانی ملا

اے خلیق لازم ہے تجکو دمبدم سجدہ کرے — خوف کیا ہے غوث اعظم ہے تری حامی جنت روا

کسی کو "مرشد کامل" بھی بنالیا تھا چنانچہ کہتے ہیں:۔

بھول مت حکم مرشد کامل — رب ارنی ہے دیکھنا اپنا

عید میں بھی قربانی کرتے تھے اور جیتے جی نذر لیجانا نہیں چاہتے، مقصد یہ ہے کہ زندہ رہکر نذر کیا لیجائیں قربان ہی کیوں نہوں!

یہ عید جو آج آئی ہے قربانی کی — کیا جی کے نذر تیری لے آنا جانا

بعض اشعار نہایت ہی عمدہ اور صاف کہے ہیں اور "مرشد کامل" کے تذکرے میں جو شعر نقل ہوا ہے اسکے ساتھ دو شعر اور لکھکر قطعہ بند کیا ہے:

بھول مت حسکم مرشد کامل　　رب ادنیٰ ہے دیکھنا اپنا
ماورا اس کے لن ترانی ہو　　مثل کوہِ طور آپ میں چھپنا
نہ کر مانندِ مہر ہر ذرۂ گرد　　جس جگہ جانا اس جگہ دھپنا

دیکھئے یہ غزل مسلسل کہی ہے اور کس قدر اچھی کہی ہے، خاص کر مطلع آج کل کے لئے کوئی نئی بات نہیں مگر اس زمانہ کے تخیل کے لحاظ سے ایک عمدہ چیز ہے۔

نہ ہوتا کوئی تیرا عاشق تو لے معشوق کیا کرتا　　تو اپنی خوبصورت کو لئے خالی پھرا کرتا
ہمارے عشق نے مغرور تجکو کردیا ظالم　　دگر نہ سانس ٹھنڈی رات دن ہر دم بھرا کرتا
اگر اس باغِ الفت کا نہ ہوتا باغباں میں تو　　چمن کے حسن کو تو کس طرح سیتی ہرا کرتا
نگاہِ عشق نے میرے　　،　　نہیں تو حسن کو اپنے جلا کر کیا طلا کرتا

ذیل کے اشعار کتنے اچھے ہیں اور خاص کر مطلع کا مصرعہ "یہ دل ہے جس طرف آیا سو آیا" کس غضب کا ہے!

مزہ جو عشق کا پایا سو پایا　　یہ دل ہے جس طرف آیا سو آیا
ارے زاہد عبث بکوا کرے ہے　　ہمارے دل کو جو بھایا سو بھایا
شہادت کا مزہ اس کو ہے معلوم　　جو زخم عشق کو کھایا سو کھایا
خدا کے واسطے منظور کریو　　یہ سر دل کی نذر لایا سو لایا

دکن کے اساتذہ نے اس زمین میں خوب طبع آزمائی کی ہے، خلیق نے بھی اچھی غزل کہی ہے، ملاحظہ ہو،

عجب گھڑی تھی کہ جو دل گیا سو پھر نہ پھرا　　پتنگ کے طور پہ جو جل گیا سو پھر نہ پھرا
ارے یہ زخم کو دل کے دکھاؤں میں کسکو　　کہ قتل کر کے جو قاتل گیا سو پھر نہ پھرا
کیا تھا وعدہ کہ میں شام کو پھر آؤں گا　　مثال مہر کے جو ڈھل گیا سو پھر نہ پھرا
تیری نگاہ کے کیا تیر ہیں ارے کافر!　　یہاں سے آج جو گھایل گیا سو پھر نہ پھرا
ارے خلیق عجب ہے فنا کا ملکِ خموش　　زمانہ سیتی جو کابل گیا سو پھر نہ پھرا

اسی بحر میں قافیہ بدل کر ایک اور غزل کہی ہے۔

جہاں کے خواب میں جو دم گیا سو پھر نہ پھرا　　مثال آہو کے جو رم گیا سو پھر نہ پھرا
عجب بلا ہے قیامت یہ عشق کی منزل　　کہ اس کی راہ میں جو گم گیا سو پھر نہ پھرا
یہ زخم دل کا تو ناسور ہو گیا ہے آہ!　　جگر کا میرے جو مرہم گیا سو پھر نہ پھرا
ہوئی ہے شام مجھے اسکی انتظاری میں　　الٰہی آج جو برہم گیا سو پھر نہ پھرا

دنیا اور زندگی کو لوگوں نے خواب سے تشبیہ دی ہے اور اسی طرح خلیق نے بھی مگر کس قدر سادگی ہے ۔

یہ جہاں تو مثال ہے سپنا　　آپ میں آپ سوچنا جینا

رباعی اور غزل کا دکن میں بہت کم فرق تھا، خلیق کے زمانہ میں رباعی کی طرح غزل بھی اسی بحر میں کہی جاتی تھی، دیکھئے بعض شعر کتنے اچھے ہیں

دل دل سے ملا کے آج جانا جانا　　مئے ہم کو پلا کے آج جانا جانا!

چھوٹے ہو جہاں میں اور رہم سے سچے　　قسمان کھانا اور پھر نہ آنا جانا!

دلدار اگرچہ جگ میں لاکھوں ہیں گے　　دل میرا ہوا ترا دیوانا جانا!

محبت کی چاٹ بری ہوتی ہے کس مزے سے کہتے ہیں :۔

جس کو لاگا ہے لپکا تجھ لب کا　　بھولتا ہے وہ ذائقہ سب کا

ذیل کے متفرق شعر دیکھئے کتنے صاف ہیں :۔

جان من جان تجھ کو کہتا ہوں!　　دیکھ تو آشنا ہوں میں کب کا!

عشق سے آن پڑا ہیگا خدا کا میرا　　ذات تیری کے سوا کوئی نہیں غمخوار میرا

رشتہ ہی دانۂ تسبیح کو زنار کے ساتھ　　اس سبب رشتۂ الفت ہے ہار میرا

لازم ہے تجھ کو ورد کرے نام پنجتن　　دافع تیری بلا کے ہیں وہ شاہ کربلا

سب کو قضا قضا ہی رضا کو نہیں قضا　　جسمیں رضا قضا کی ہو وہ ہے قضا رضا

سب سے بہتر ہے اے خلیق مرے　　شمع سا گھل کے آپ میں کھینا

گو خلیق کے کلام میں کوئی خاص بات نہیں اور نہ ان کے کلام سے حالات ہی معلوم ہو سکے مگر ایک سو سال پہلے کی شاعری کا نمونہ ضرور ہے اور اسی لئے ہم نے خلیق کو روشناس کرانے کی کوشش کی، ممکن ہے کہ کبھی مکمل دیوان مل جائے اور کسی جگہ حالات بھی نظر آئیں۔ ایسے سینکڑوں گمنام شعرائے دکن کا کلام ہمارے پاس محفوظ ہے جن کے حالات وغیرہ نہیں ملتے، انشاء اللہ اسکے بعد دیگر سب کا کلام پیش کیا جائے گا۔

سید تمکین کاظمی

مُصحفی کا مرتبۂ شاعری

آزاد کی تنقید۔ میر و مصحفی کا تقابل

(۱)

اسلوب شاعری اور انداز بیان کے لحاظ سے قدیم اردو شاعری کو تین صورتون مین تقسیم کیا جا سکتا ہے

۱۔ سادہ و بے تکلف زبان مین نرم نرم محبت کی باتین وصل کا ارمان، فراق کی المناک کیفیت اور جذبات انسانی کی صحیح ترجمانی جیسی میر تقی - درد - سوز - یقین - بیان - ہدایت اور بیدار نے کی کسی سے بن نہ آئی ان شعرا کی غزلین پڑھو اور اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر دیکھو کہ کہان تک صحیح کہتے ہین

۲۔ جوش و خروش کلام کی گرمی، دلاویزی سنگلاخ زمینون اور مشکل ردیف قافیون مین شعر کی آب و تاب دیکھنا چاہو تو میرزا رفیع سودا - قائم اور بقا کا کلام دیکھو

۳۔ اگر روزمرۂ و محاورہ مین بیان کی بے تکلفی اور سادگی دیکھنا چاہو تو میر تقی اور میر سوز کی غزلین پڑھو جن پر ہزار بار دہن قربان

زمانۂ مابعد مین جسقدر شعرا مشہور ہوئے ان مین سے ہر ایک نے انھین اساتذہ متقدمین مین سے کسی نہ کسی کے اسلوب بیان کو شمع راہ بنایا۔ مثلاً جعفر علی حسرت نے سوز و گداز کی آمیزش کرکے میر سوز کے سادہ و سلیس انداز بیان کو رونق دی - میر حسن نے تمام و کمال میر تقی کی تقلید کی - جرأت نے معاملات عاشقانہ کے اضافہ کے ساتھ اپنے استاد کے رنگ کو قایم رکھا۔ انشا نے ترکیب الفاظ اور انداز کلام مین اور شاہ نصیر نے مشکل ردیف اور قوافی کو اختیار کرنے مین مرزا سودا کو اپنا امام بنایا۔ مرزا غالب اور حکیم مومن خان مومن نے فارسی کی لطیف اور نادر ترکیبون کے ساتھ میر تقی کے رنگ کو زمین سے آسمان پر پہونچایا۔ اور سب سے اخیر مین مرزا داغ نے سلاست و روانی، برجستگی اور بیساختگی کے موتیون سے میر سوز کے سادہ انداز بیان کو ایسا سجایا کہ سارے ہندوستان مین دھوم ہو گئی۔ لیکن شیخ مصحفی کی ہمہ گیر و ہمہ رنگ طبیعت نے کسی خاص رنگ پر قناعت نہ کرکے مشاہیر شعرائے متقدمین و متاخرین مین سے تقریباً ہر ایک کے انداز سخن کا پسندیدہ نمونہ پیش کیا ہے - چنانچہ ان کی غزلون مین کہین میر کا درد ہے - تو کہین سودا کا دبدبہ، کسی مقام پر فغان کی رنگینی ہے تو کسی جگہ سوز کی سادگی - کہین واقعات مین جرأت کی سلاست و حقیقت نویسی سے کام لیا گیا ہے تو کہین ترکیب الفاظ اور انداز بیان مین انشا کا طنطنہ و جبروت صرف ہوا ہے - کہین پر غزلون کو واقعات مسلسل پر ختم کرنے مین مرزا جعفر علی حسرت کا رنگِ کلام پیش نظر ہوتا ہے - تو کہین مشکل ردیف قافیہ

شاہ نصیر کا کمال سامنے آجاتا ہے اور جن غزلون اور بیتون مین ان اساتذہ کی خوبیون کو ان کی کہنہ مشقی اور اُستادی یکجا کردیتی
ان کا شمار لاریب اردو شاعری کے بہترین نمونون مین کیا جا سکتا ہے۔ بلکہ مین تو یہانتک کہنے لئے طیار ہون کہ دور آخر کے اساتذہ غالب
مومن بلکہ داغ کی ساحرانہ خصوصیات کلام کا بھی بیشتر حصہ ان کے کلام مین موجود ہے۔ اور جس طرح خواجہ حافظ شیرازی اپنی ہمہ
ری اور اپنی ہمہ رنگی کے باعث شعرائے فارسی مین بلبلِ شیراز کے بامعنی خطاب سے مخاطب ہین اسی طرح شیخ مرحوم کو اُردو
عرا کے گروہ مین عندلیب ہزار داستان کا درجہ حاصل ہے

اس دعوے کو پایۂ ثبوت تک پہونچانیکے لیے یہ ضروری نہین کہ شیخ مرحوم کے کلام کو تمام شعرائے مذکورہ کے کلام کے بالمقابل
ھا جائے۔ کیونکہ انشا۔ شاہ نصیر اور ذوق کی شاعری مین مرزا سودا کی شاعری کا عکس ہے۔ اور میرحسن، جرأت، وحسرت کا کلام میر تقی اور میر سوز
رنگ کلام کا منت پذیر۔ پس جس شخص کی شاعری مین میر و میرزا دونون اُستادون کے کلام کی خصوصیات موجود ہونگی۔ لامحالہ ان تمام شعرا
مماثل ہوگا۔ البتہ مومن و غالب اور داغ سے تقابل کرنے کے لئے علیحدہ علیحدہ ابواب کی ضرورت ہے۔ کیونکہ ان حضرات نے اپنی جدت
سند طبائع سے کام لیکر کچھ ایسی بات پیدا کرلی ہے کہ شعرائے متقدمین کے مقلد ہوتے ہوئے بھی ان کی شاہ راہ جدا اور ان کا پیرایہ بیان
لکل علیحدہ نظر آتا ہے۔ اور اسی پیرایۂ بیان کا طفیل ہے کہ مرزا غالب و مرزا داغ ایک طرز خاص کے موجد و مخترع تصور کئے جاتے ہین
سب سے پہلے میر تقی اور شیخ مصحفی کے کلام کا موازنہ کیا جاتا ہے

میر تقی کا انداز میر صاحب کے کلام کی خصوصیتین آزاد نے ان لفظون مین بیان کی ہین

"غزل کے لئے عاشق و معشوق کے خیالات عشقیہ، ذکر وصل، شکایت فراق، دردانگیز اور
المناک حالت گفتگو ایسی بے تکلف، صاف اور نرم نرم گویا وہی دونون بیٹھے ہوئے باتین کررہے
ہین اس کے ادائے مطلب کے لئے الفاظ بھی اور ہین اور اُسکی بحرین بھی خاص ہین میر صاحب کی طبیعت
قدرتی درد خیز اور دل حسرت انگیز تھا۔ کہ غزل کی جان ہے اسلئے اُن کی غزلین ہی ہین اور خاص خاص
بحور و قوافی مین ہین" (آبِ حیات صفحہ ۱۶۴)

میر کی طرح شیخ مصحفی کے کلام مین بھی ایک خاص قسم کی خوشگواری و روانی پائی جاتی ہے اور اسکے چند اسباب ہین۔ اول توانھون
نے شگفتہ اور چھوٹی چھوٹی بحرین اختیار کی ہین جن مین خواہ مخواہ بات کو صفائی سادگی اور اختصار سے ادا کرنا پڑتا ہے۔ اور چونکہ
سادہ و مفرد خیالات کے لئے اس قسم کی بحرین خاص مناسبت رکھتی ہین۔ اس لئے جن مضامین کے اظہار کے لئے انھین انتخاب
کیا گیا ہے۔ سوادِ الفاظ سے چودھوین رات کے چاند کی طرح ہر جگہ نمایان و درخشان ہین۔ یہی وجہ ہے کہ جن غزلون یا بیتون مین
پُر درد مضامین ہین اُن کا ایک ایک لفظ تیر و نشتر کا کام دیتا ہے۔ اور جہان پُرجوش خیالات ہین دو چار شعر پڑھنے کے بعد
جوش و خروش پیدا نہ ہونا ناممکن ہے۔ اس سلسلے مین بعض ایسی بحرین بھی ہین۔ جن کی تخلیق مین فطرتاً ترنم اور موسیقیت کا

عنصر بہت زیادہ ہے اس لئے جب ان مین شعر کہا جاتا ہے تو لامحالہ طبیعت کو ایک قسم کا لطف حاصل ہوتا ہے۔ پھران مین شعر کے اجزا بلکہ مصرعون کے ارکان بھی ایسے فراہم کئے ہین۔ جو تال اور سم کا کام دیتے ہین۔ اور جہان جہان یہ حصے ختم ہوتے ہین صاف معلوم ہوتا ہے کہ گانے کی تان ٹوٹ رہی ہے۔ سب سے زیادہ یہ بات ہے کہ الفاظ زیادہ تر اس قسم کے جمع کئے ہین جن کی آوازین ایک دوسرے سے موافقت و توازن رکھنے کے باعث خوش آیند معلوم ہوتی ہین۔ دوسرے یہ کہ ردیف کی تلاش مین بڑی کوشش و کاوش سے کام لیا ہے۔ ردیف جیسا کہ بعض اہل فن کا خیال ہے حسن و زیبائش کے علاوہ اردو شاعری مین خیالات کی وسعت رنگینی اور تنوع کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ کیونکہ ردیف بدلنے کے ساتھ ہی قافیے کی حیثیت بھی تبدیل ہو جاتی ہے۔ اور ردیف کو بدل بدل کر ایک ہی قافیہ کو سیکڑون طرح سے موزون کیا جاسکتا ہے علاوہ برین ردیف بذات خود شعر کا ایک زیور ہے۔ اور ترنم و موسیقیت پر اسکا گہرا اثر پڑتا ہے۔ اسی تلاش کا یہ اثر ہے کہ معانی ردیف کے تنوع نے شیخ مصحفی کے کلام مین رنگینی و وسعت کی وہ دنیا پیدا کر دی ہے جسکے ایک ایک کونے مین سیکڑون گلہائے رنگا رنگ اپنی بوقلمونی کی بہار دکھا رہے ہین۔ اور یہ بات متقدمین و متاخرین مین سے شاید کسی کو نصیب نہ ہوسکی۔ مشاعرون کی طرحی غزلیات اور دوست احباب کے فرمائشی کلام کو چھوڑ دینا چاہئے کیونکہ دوسرون کی پاسداری اور اپنی میلانِ خاطر و رنگ طبیعت کی مخالفت دو ایسے داغ ہین جو حسنِ کلام اور خوبی بیان کے چہرے کو ذرا بدنما بنا دیتے ہین۔ (حسب روایت صاحب آبِ حیات یہ بات میر صاحب مین بھی موجود تھی) باقی جسقدر غزلین ہین سب کی سب اچھوتی اور خوشگوار ردیفون مین لکھی گئی ہین۔ جن کو مضامین تغزل کی مناسبت نے اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے تیسرے یہ کہ قوافی کے استعمال مین خصوصیت کے ساتھ اس خیال کو مدنظر رکھا ہے کہ حروف قافیہ مین کیفیت آمیز توازن قائم رہے۔ اور ایسے قوافی سے پرہیز کیا ہے۔ جن کے حروف مین سخت بیگانگی یا آوازمین حد سے زیادہ کراہت و ثقالت پائی جاتی ہے۔ انہین مرزا سودا خصوصاً سید انشا کی طرح یہ خبط کبھی نہین پیدا ہوا کہ دماغ مین سمائے ہوئے ہر ایک مضمون کو خواہ مخواہ لفظون مین ادا کر دین چاہے اس مین شعر کی لطافت قافیے کی خوبی بیان کی روانی حتی کہ شعر کے مقصود اصلی کا خون کیون نہ ہو جائے بلکہ وہ قافیہ کی شگفتگی الفاظ کی موسیقیت اور سب سے زیادہ مضمون کی سلاست کو تلاش مضمون پر ترجیح دیتے تھے۔ اور یہی ناقابل عفو بلکہ قابل سزا قصور ہے جسکی پاداش مین بعض کوتاہ اندیش و کم سواد حاسدین کو یہ کہنے کا موقع مل گیا ہے کہ ان کے یہان صرف باتین ہی باتین ہین تازگی خیال و بلندی فکر نظر نہین آتی۔ گویا ان لوگون کے نزدیک وہی باتین شیخ مصحفی مرحوم کے معائب کلام مین داخل ہین جنھین غزل کی جان کہنا چاہئے غزل کی جان کیا ہے؟ درد، سوز و گداز، جذبات و معاملاتِ عشق عجز و نیاز اسکے ساتھ یہ شرط بھی ہے کہ جذبات و معاملات جس زبان مین ادا کئے جائین وہی زبان ہو جسمین عاشق اپنے معشوق سے راز و نیاز کی باتین کرتا ہے۔ یعنی سادہ ہو بے تکلف ہو، نرم ہو، لطیف ہو، نیاز آمیز ہو اسکے لئے یہ بھی ضرور ہے کہ چھوٹی چھوٹی بحرین ہون۔ جملون کی ترکیب مین نام کو الجھاؤ نہ ہو قریب الفہم خیالات ہون۔

اور یہ تمام باتین ایک ایک کرکے ہمارے فطرت نگار شاعر کے عاشقانہ کلام مین رونما ہین۔ سنئے

رہنے دو میرے سینے مین پیکاں کو نہ چھیڑو
از بہرِ خدا ناوکِ جاناں کو نہ چھیڑو

یہ وہ نہین ناسور کہ ہو بند کسی سے
بہنے دو میرے دیدۂ گریان کو نہ چھیڑو

ٹک رحم کرو چاکِ گریبان پہ ہمارے
یارو کوئی اُس شوخ کے دامان کو نہ چھیڑو

اے ناصحو کچھ فکر کرو چاکِ جگر کی
بیکار مرے چاکِ گریبان کو نہ چھیڑو

دکھتا ہے یہ دل اور بھی فریاد کرے ہے
مت ہاتھ لگاؤ دلِ نالان کو نہ چھیڑو

رہنے دو پڑا مصحفی خاک بسر کو
اس غمزدۂ بے سروسامان کو نہ چھیڑو

تمام غزل مین سوز و گداز کے خیالات اس طرح ادا کئے ہین جس طرح آگ سے دھوان اُٹھتا ہے، ایک اور غزل ہے:۔

مین وہ نہین ہون کہ اُس بت سے دل مرا پھر جائے
پھرون مین اُس سے تو مجھسے مرا خدا پھر جائے

اگر مین رونے پہ آؤن برنگِ ابرِ بہار
ابھی زمانے کی اے دوستو ہوا پھر جائے

شبِ فراق مین بچنا بشر کا مشکل ہے
یہ بات اور ہے آئی ہوئی قضا پھر جائے

خدا کرے نہ ملے اُسکو آشنا کوئی
اگر کسی سے کوئی ہوکے آشنا پھر جائے

جو دے سکے نہ رہِ عشق مین ہمارا ساتھ
ہمارے ساتھ نہ آئے وہ آشنا پھر جائے

عجب نہین کہ تری خو کے ڈر سے اے ظالم
زبان پہ آکے مرے حرفِ مدعا پھر جائے

پکارتا ہے تجھے مصحفی جواب تو دے
کھڑا رہے یہ ترے آستان پہ یا پھر جائے

یہ رنگِ تغزل جرأت کے یہان اور سید انشا کے یہان نہ ہونے کے برابر پایا جاتا ہے۔

باندھ آیا تھا کمر وہ دشمنِ جان کھینچکر
کتنا پچھتاے ہین ہم کل اُسکا دامان کھینچکر

آج اس وحشی نے نی پھر راہِ صحرا ہم جسے
کل بہ مشکل لے گئے تھے تابہ زندان کھینچکر

ساتھ پیکان کے نکل آیا جو دل لپٹا ہوا
کیتے پچتاے مرے سینے سے پیکان کھینچکر

کچھ نہین معلوم ہوتا ہمکو جرمِ مصحفی
کیجیے ہین یار کیون اسکا گریبان کھینچکر

زمین ایسی کہ طبیعت اُلجھن اور ذہن کشاکش مین پڑ جائے لیکن قافیون کی تلاش اور ردیف کے ساتھ اُن کی پیوستگی نے اسی کو شگفتہ بنا دیا ان دو تون باتون کے ساتھ مضامین کی عمدگی زمین سے آسمان پر لے اُڑی

ساقی شراب لایا مطرب رباب لایا
مجھپر تو اک قیامت عہدِ شباب لایا

دل دردِ غم کی اُسکے آخر نہ تاب لایا
یہ ہر گھڑی کا رونا اور اک عذاب لایا

کیا دور ہے جو پردہ رُخ سے ترے اُٹھادے
دنیا مین مہر دن سے کو جو بے نقاب لایا

کہتا نہ تھا مین اے دل جانا نہ اس گلی مین
آخر تو مجھپر آفت خانہ خراب لایا

نامے کے مرے ٹکڑے لاڈالے مرے آگے — نامہ کا میرے قاصد یہ کیسا جواب لایا
آئینہ کیا کہ اُسنے پتھر پہ جب نظر کی — چہرہ پر اپنے وہ بھی اک آب و تاب لایا
اے مصحفی تو اب منہ کیا دیکھتا ہے سے بھی — ہاتھون سے اپنے ساقی جام شراب لایا

اول سے آخر تک بندش چست، الفاظ صحیح، ترکیب مناسب اور مضامین متین و سنجیدہ ہین خصوصاً پانچوان شعر اپنی جگہ پر ایک چیز ہے۔ جیسے نواب مصطفےٰ خان شیفتہ جیسا عالی دماغ خیال نقاد بھی بغیر انتخاب کئے نہ رہ سکا۔ ہر مصرع کے ارکان اس خوبصورتی سے جمع کئے گئے ہین کہ شاعری اور موسیقیت یکجا معلوم ہوتی ہین

میر صاحب کی دوسری خصوصیت کا تذکرہ ان لفظون مین کیا گیا ہے

"میر صاحب کی زبان شُستہ، کلام صاف، بیان ایسا پاکیزہ جیسے باتین کرتے ہین دل کے خیالات کو جو سب کی طبیعتون کے موافق ہین محاورہ کا رنگ دیکر باتون باتون مین ادا کر دیتے ہین اور زبان مین خدا نے ایسی تاثیر دی ہے کہ وہی باتین ایک مضمون بن جاتی ہین اسی واسطے ان مین بہ نسبت اور شعرا کے اصلیت کچھ زیادہ قائم رہتی ہے۔ بلکہ اکثر جگہ یہی معلوم ہوتا ہے۔ گویا نیچر کی تصویر کھینچ رہے ہین۔ یہی سبب ہے کہ دلوں پر اثر بھی زیادہ کرتی ہین۔ وہ گویا اُردو کے شیخ سعدی ہین (آب حیات صفحہ ۱۶۴)

"میر تقی کہین کہین میر سوز کے قریب آجاتے ہین پھر بھی بہت فرق ہے وہ بھی (میر تقی) محاورہ خوب باندھتے تھے۔ مگر فارسی کو بہت نبھاتے تھے۔ اور مضامین بلند لاتے تھے (آب حیات صفحہ ۲۱۳)

شیخ مصحفی مرحوم کی زبان مین بھی صفائی و سلاست حد سے زیادہ ہے اگرچہ اسوقت کی ترکیبین فارسی سے مستعار تھین۔ اور کچھ الفاظ متروک ہوجانے کے باعث اب کانون کو غیر مانوس معلوم ہونگے۔ نیز بعض اسماء کی تذکیر و تانیث بھی جھگڑے کی بات ہے۔ تاہم مجموعی حیثیت سے شیخ مرحوم کی زبان نہایت صاف و شستہ ہے۔ اور یہ صفتین دو نون با کمالون کے یہان اس مناسبت کے ساتھ موجود ہین کہ آج بھی کسی کی زبان کو میر و مصحفی کی زبان سے تشبیہ دیکر اُس کی خوبی کا اعتراف زباندانی کی سند دینے کے برابر ہے۔ مشابہت زبان کا ثبوت اس سے زیادہ کیا ہوسکتا ہے کہ لوگ مصحفی مرحوم کے کلام کو بعض اوقات میر تقی کا کلام سمجھنے لگتے ہین شیخ صاحب کا کلام دور از کار استعارات، بعید از قیاس مبالغہ اور غیر فطری بیان سے قطعی خالی ہے۔ انھون نے قلبی واردات و کیفیات کو نہایت سادہ۔ صاف اور شستہ زبان مین ادا کیا ہے جنمین اسلوب بیان کی دلکشی نے وہ بات پیدا کر دی ہے کہ بعض بعض غزلون کا ایک ایک شعر سوز و گداز کی تصویر نظر آتا ہے۔ ان مین الفاظ کا صحیح استعمال اور ان کی ترتیب و ترکیب خاص کیفیت رکھتی ہے۔ اور ان سب باتون نے یکجا ہو کر شیخ مصحفی مرحوم کی زبان کو بھی اسی طرح سہل ممتنع بنا دیا ہے جس طرح میر کی زبان کو، مثلاً:۔

ترے کوچے ہر بہانے مجھے دن سے رات کرنا کبھی اس سے بات کرنا کبھی اُس سے بات کرنا
تجھے کس نے روک رکھا تیرے جی مین کیا یہ آئی کہ گیا تو بھول ظالم ادھر التفات کرنا
یہ دعا ہے مصحفی کی جو اجل بھی اسکی آئے شبِ وصل کو تو یا رب نہ شبِ وفات کرنا

جو ہم سے وعدۂ دیدار یار ٹھہرے گا تو کچھ نہ کچھ یہ دل بیقرار ٹھہرے گا
چلی بھی جا جرس غنچہ کی صدا پہ نسیم کہین تو قافلۂ نوبہار ٹھہرے گا
یہی ہے دل کا دھڑکنا مرے اگر تہِ خاک تو کیا مزار پہ سنگِ مزار ٹھہرے گا
جو سیر کرنی ہے کرلے کہ جب خزان آئی نہ گل رہیگا چمن مین نہ خار ٹھہرے گا
یہی ہے لوٹ تو دست جنون کے ہاتھون سے نہ ایک میرے گریبان کا تار ٹھہرے گا
شتاب آئیو ٹھہرا رکھین گے ہم اسکو جو دم لبون پہ شبِ انتظار ٹھہرے گا
اسے نہ دفن کرو ہمدمو یہ سمجھو تو لحد مین مصحفیؔ بے قرار ٹھہرے گا؟

معانی ردیف کے اختلاف سے محاورات کی وسعت پر خاص طور سے روشنی پڑتی ہے ہر شعر مین "ٹھہریگا" اپنے مفہوم کیلئے خاص ہے چھٹے شعر کو دیکھئے انتظار معشوق مین عاشق کا دم لبون پر آجانا ایک بے اختیاری کیفیت ہے۔ لیکن "ٹھہرا رکھین گے ہم اسکو" خاص صبر و تحمل کی صورت ہے۔ "شتاب آئیو" کہنے کا موقع اس سے بڑھ کر اور کیا ہوسکتا ہے تیسرے شعر مین "مزار ٹھہریگا" کی مشکل ترکیب کو کس خوبی سے ایک لفظ سنگ نے اپنی جگہ بٹھا دیا ہے مقطع کے محاسن ظاہر ہین۔

بے طرفہ ماجرا مرے قاتل کے سامنے بسمل پڑا تڑپتا ہے بسمل کے سامنے
حسرت پر اُس مسافر بیکس کی روئیے جو تھک گیا ہو بیٹھ کے منزل کے سامنے
افسوس کی جگہ ہے کہ دریائے عشق مین کیا کیا غریب ڈوبے ہیں ساحل کے سامنے
جا رہیے اس جگہ کہ جہان اچھی صورتین بے پردہ ہوکے آتی ہین سائل کے سامنے
اے مصحفی طلسمِ جہان سے نہ دل لگا قدر اسکی کچھ نہین کسی عاقل کے سامنے

تمام شعرون سے قطع نظر دوسرے شعر مین مسافر بیکس کی حسرت کا خاکہ ایسا کھینچا ہے کہ شہرت و قبولیت کے سبب سے زبان زد خاص و عام ہوگیا ہے

اسی سلسلے مین وہ کہین فارسی کی اچھوتی اور مزیدار ترکیبین بھی استعمال کرجاتے ہین اور اس صفت نے اُنھین میرزا کے رنگ سے کسی قدر ممتاز اور میر تقی کے رنگ سے مماثل کردیا ہے

ہجران مین بسکہ مجھ پہ عذاب الیم تھا ہر شعلہ آہ کا مری نار جحیم تھا

کرتے تھے گل مزار سے میرے شگفتگی — یعنی کبھی ادھر بھی گذارِ نسیم تھا
افشائے عشق بعد خدا جانے کیا بنے — جب تک حجاب تھا یہی امید و بیم تھا
کس زلفِ مشکفام کی بو تھی کہ باغ مین — ہر ایک غنچہ نافۂ عنبر شمیم تھا
چلتی تھی تیغ وان سرِ دشمن پہ مصحفی — اور میرا مارے اشک کے یان دل دو نیم تھا

تیری رفتار سے اک بے خبری نکلے ہے — مست و مدہوش کوئی جیسے پری نکلے ہے
اک فریبندہ ہے تیری روشِ طرزِ خرام — اسکے عہد سے کوئی کبکِ دری نکلے ہے
گل کو نسبت ہے اسی واسطے با اہل جنون — وضع مین اسکے جو اک جامہ دری نکلے ہے
اپنے رونے کو کوئی سمجھے تو آئینہ مثال — دیدۂ خشک سے آنسو کی تری نکلے ہے
کھول دیتا ہے تو جب جاکے چمن بین زلفین — پا بہ زنجیر نسیم سحری نکلے ہے
مصحفی کس کے کھُلے بال تو دیکھ آیا ہے — کہ تری وضع سے شوریدہ سری نکلے ہے

نکلے ہے تو میرو مصحفی کی زبان تھی لیکن فریبندہ - طرزِ خرام - اہل جنون - دیدۂ خشک اور پا بہ زنجیر کی فارسی ترکیبین جس خوبصورتی سے استعمال ہوئین وہ اس بات کا ثبوت ہین کہ شیخ مصحفی مرحوم اس رنگ مین بھی میر صاحب کے ہم پلہ ہین - بلکہ جن لوگون کو خدا نے نظر کامل دی ہے وہ تو یہانتک کہہ گئے ہین کہ اگرچہ شیخ مصحفی کی زبان میر و مرزا سے بہت کچھ ملتی جلتی ہے لیکن اس درجہ سبک اور شیرین واقع ہوئی ہے کہ اکثر اسکی حلاوت اس زمانے مین بھی ناظرین کے دلون مین اُسکے متروک الاستعمال ہونے کا گمان نہ پیدا ہونے دیگی (حسرت موہانی) مثلاً

جب واقفِ راہ و روشِ ناز ہوئے تم — سچ ہے کہ عجب خانہ برانداز ہوئے تم
مین تم سے نہ بولون گا کبھی اے لب بستہ — اُس بن بہ تبسم بھی اگر باز ہوئے تم
پہنی جو قبا جامۂ گل دوز کی تم نے — طاؤس صفت اور بھی طناز ہوئے تم
پھوٹچین گے تمھین تازہ نہالانِ چمن کیا — اب نام خدا سرو سرافراز ہوئے تم
اے مصحفی مرغانِ چمن رہ گئے خاموش — گلشن مین اگر زمزمہ پرداز ہوئے تم

تمام الفاظ قوافی فارسی ہین لیکن اجنبیت اور غرابت کا کہین پتہ نہین گویا میر صاحب کی طرح شیخ مصحفی نے بھی غزل کی ایک جداگانہ زبان قائم کر لی تھی - جیسا کہ ایک جگہ خود فرماتے ہین

یون تو کہنے کو سبھی شعر و سخن کہتے ہین — مصحفی ریختہ گوئی کی زبان اور ہی ہے

رات پردے سے ذرا منہ جو کسو کا نکلا شعلہ سمجھا تھا اُسے مین پہ بھبھو کا نکلا
مصحفی ہم تو یہ سمجھے تھے کہ ہوگا کوئی زخم تیرے دل مین تو بہت کام رفو کا نکلا

ترسا نہ مجھکو کھینچ کے تلوار مار ڈال گر مار ڈالنا ہے تو اک بار مار ڈال
صیاد تجھکو کس نے کہا تھا کہ فصل گل مجھکو قفس مین کر کے گرفتار مار ڈال

"تجھ سے کہا تھا" کی جگہ "تجھکو کہا تھا" قدیم زبان ہے

اس نازنین کی باتین کیا پیاری پیاریان ہین پلکین ہین جس کی چھریان آنکھین کٹاریان ہین
دل کی طپش کا اپنے عالم ہی کچھ جدا ہے سیماب و برق مین کب یہ بیقراریان ہین
نومید ہین بظاہر گو وصل سے ہم اُس کے دل مین تو سو طرح کی امیدواریان ہین
کیا پوچھتے ہو ہمدم احوال مصحفی کا راتین اندھیریان اور اختر شماریان ہین

میر صاحب کی تیسری خصوصیت کی تفصیل یہ ہے

ہمارے عاشق مزاج شعرا کی رنگینیان اور خیالات کی بلند پروازیان ان کے مبالغون کے جوش و خروش سے معلوم ہین۔ مگر اسے قسمت کا لکھا سمجھو کہ ان مین سے بھی میر صاحب کو شگفتگی یا بہار عیش و نشاط یا کامیابی وصال کا لطف کبھی نصیب نہ ہوا وہی مصیبت اور قسمت کا غم جو ساتھ لائے تھے اسکا دکھڑا سناتے چلے گئے۔ جو آج تک دلون مین اثر اور سینون مین درد پیدا کرتے ہین کیونکہ ایسے مضامین اور شعرا کے خیالی تھے اور ان کے حالی تھے۔ عاشقانہ خیال بھی ناکامی زار نالے، حسرت و مایوسی ہجر کے لباس مین خرچ ہوئے ان کا کلام صاف کہہ دیتا ہے۔ کہ جس دل سے نکلکر آیا ہون۔ وہ غم و درد کا پتلا نہین حسرت و اندوہ کا جنازہ تھا ہمیشہ وہی خیالات بسے رہتے تھے۔ بس جو دل پر گذرتے تھے وہی زبان سے کہہ دیتے تھے۔ کہ سننے والون کے لئے نشتر کا کام کر جاتے تھے۔ (آب حیات)

شیخ مصحفی مرحوم کا اصلی میدان بھی حسرت و ناکامی کا اظہار اور حرمان و مایوسی کا بیان ہے کلام کو دیکھئے بدقسمتی کا شکوہ آسمان کی گردش کا رونا، احباب و اعزہ کی مفارقت، کوشش و سعی مین ناکامی اور اپنی بیکسی و بے بسی غرض اس قبیل کا کوئی مضمون نہین جسے انھون نے نظر انداز کر دیا ہو۔ بالکل یہ معلوم ہوتا ہے کہ غم و الم کا ایک سیاہ بادل ان پر چھایا ہوا ہے جس سے خوشی و خرمی کے سورج کی ایک کرن بھی چھنکر ادھر نہین پڑتی۔ یا ایک حرمان نصیب قیدی ہے جو اپنی مصیبت خیز زندگی گزارنے مین مصروف ہے یہانتک کہ زار نالی کے مضامین کی ہنات اور مایوسانہ مضامین کی اکثریت نے ان کے کلام کو مرثیہ اور انھین

غزل گو کے درجہ سے نکال کر مرثیہ گو بنا دیا ہے۔ جیسا کہ خود بھی ایک جگہ فرماتے ہین۔

مجھکو شاعر نہ کہو مصحفی ہون مرثیہ خوان — سوز پڑھ پڑھ کے محبون کو رُلا جاتا ہون

ان تمام باتون نے جمع ہو کر جذب و تاثیر کی وہ کیفیت پیدا کر دی ہے کہ شعر ادھر زبان سے نکلتا ہے اور ادھر دل کی گہرائی مین پیوست ہو جاتا ہے۔ گویا شیخ اور اُن کا کلام ملکر ایک ہو گئے ہین۔ اور کلام کو دیکھنے والا کبھی نہین کہہ سکتا کہ اُن کی عمر دکھ درد اور رنج و تکلیف کی سخت ترین منازل سے نہین گزری

اس مین وہ موقع سب سے زیادہ موثر، دلشکن اور طبیعت مین ہیجان پیدا کرنے والا ہوتا ہے کہ جہان خوشی و خرمی تو در کنار درد و غم بھی اس بہتات کے ساتھ نصیب نہین ہوتے کہ طبیعت سیر ہو سکے۔ اور طالب غم دل مسوس کر رہ جاتا ہے۔ مثلاً

درد و غم کو بھی ہے مقدر شرط — یہ بھی قسمت سوا نہین ملتا

واقعہ یہ ہے کہ یہی مضامین غزل گوئی کی جان ہین۔ اور جس شخص مین یہ مضامین جسقدر کثرت کے ساتھ پائے جائین اسیقدر کامیاب غزل گو خیال کیا جاتا ہے۔ یہی صفت ہے کہ جس نے میر تقی کو سرتاج شعرائے اُردو بنایا اور جسکی بنا پر خود شیخ مصحفی مرحوم صرف اپنے دور کے نہین بلکہ ہر دور کے شعرا مین ممتاز درجہ رکھتے ہین۔ اب ہم چند غزلین پیش کرتے ہین۔

نظرون مین تیری پیارے گو بیوقار تھے ہم — اسپر بھی جان و دل سے خدمت گذار تھے ہم
دامان و جیب اپنا گریہ سے سب چمن تھا — تو سیر کو نہ آیا ابر بہار تھے ہم
آتے تھے پاس تیرے جو دوڑ دوڑ ہمدم — کمبخت دل کے ہاتھون بے اختیار تھے ہم
صیدِ زبون سے اپنے کیون تو نے منہ کو موڑا — اس پر بھی کام کے تھے لاغر ہزار تھے ہم
اے مصحفی تصور اُس کا جو بندھ گیا تھا — با صد ہزار حسرت شب ہم کنار تھے ہم

دیکھ اُسکو اک آہ نے ہم نے کر لی — حسرت سے نگاہ ہم نے کر لی
کیا جانے کوئی کہ گھر مین بیٹھے — اس شوخ سے راہ ہم نے کر لی
جب اُس نے چلائی تیغ ہم پر — ہاتھون کی پناہ ہمنے کر لی
نخوت سے جو کوئی پیش آیا — کج اپنی کلاہ ہم نے کر لی
دی ضبط مین جب کہ مصحفی جان — شرم اُس کی گواہ ہمنے کر لی

مری حالت سے جاکر یون کرے اُسکو خبر کوئی — کہ روتا ہے کھڑا تیرے لئے بیرون در کوئی
گیا مین اُسکی محفل مین تو وہ دربان سے یون بولا — یہ مجلس ہے کہ میلا، جو چلا آتا ہے ہر کوئی

خدایا صبر دے دل کو کہان تک راہ مین اُسکی
دھرے زانو پہ سر بیٹھا رہے دو دو پہر کوئی

صبا گر جائے تو خلوت مین اس سے اتنا کہدینا
ترے کوچہ سے غافل کر گیا شب کو سفر کوئی

مرا مرنا ہی بہتر ہے صنم تا تو بھی یہ جانے
کہ دو دن کی جدائی مین گیا جی سے گذر کوئی

ہوا تو مصحفی بے جان مگر اے وائے تنہائی
سر بالین نہ آیا اُسکی شب بھر نوحہ گر کوئی

شب ہجران تھی مین تھا اور تنہائی کا عالم تھا
غرض اس شب عجب اک بے سروپائی کا عالم تھا

شمع پر پروانہ شب جس وقت جل کر رہ گیا
دیکھ کر مین اُسکو اپنے ہاتھ مل کر رہ گیا

بِن دیکھے جس کے پل مین آنکھین بھر آئیان ہون
کیا قہر ہے کہ اُس سے برسون جدائیان ہون

اے شب ہجر کہین تیری سحر ہے کہ نہین
نالۂ نیم شبی تجھ مین اثر ہے کہ نہین

گھر کا دروازہ جو ہم صبح کو وا کرتے ہین
شام تک تیری ہی بس راہ تکا کرتے ہین

ہے غریبی مین خبر کس کو وطن والون کی
کیا گرفتار سے پوچھو ہو چمن والون کی

کبھو تک کے در کو کھڑے رہے کبھی آہ بھر کے چلے گئے
ترے کوچے مین جو ہم آئے بھی تو ٹھہر ٹھہر کے چلے گئے

لوگ کہتے ہین محبت مین اثر ہوتا ہے
کون سے شہر مین ہوتا ہے کدھر ہوتا ہے

کس نے رکھتے تھے قفس اُن پہ گرفتارون کے
کانٹے کیون سُرخ ہین سب باغ کی دیوارون کے

نہ کہین صبح ہی ہوتی ہے نہ خواب آتا ہے
رات کیا آتی ہے اک سر پہ عذاب آتا ہے

کب اس طرف وہ بت کج کلاہ آتا ہے گدا کے گھر بھی کہین بادشاہ آتا ہے

میر صاحب کی چوتھی خصوصیت کے بارے مین آزاد کہتے ہین کہ

"ان کی غزلین ہر بحر مین کہین شربت اور کہین شیر و شکر ہین مگر چھوٹی چھوٹی بحرون مین فقط آبِ حیات بہاتے ہین۔ جو لفظ منہ سے نکلتا ہے تاثیر مین ڈوبا ہوا نکلتا ہے۔ مگر یہ بھی بعض بزرگون سے معلوم ہوا کہ مشاعرے یا فرمائش کی غزلین ایسی نہ ہوتی تھین۔ جیسی کہ طبع زاد طرح مین ہوتی تھین۔" (آبِ حیات صفحہ ۲۱۳)

شیخ مصحفی مرحوم کی بھی جو غزلین بحرِ خفیف مین ہین ان کے رنگ شاعری کو اور زیادہ واضح کرتی ہین۔ اُن کا ایک ایک لفظ آئینہ ہے اور یہ تمام آئینے اس حسن ترکیب و ترتیب سے رکھے گئے ہین۔ کہ ذرا سی ٹھیس لگ جانے سے ٹوٹ جانے کا احتمال ہوتا ہے۔ اگر میر تقی مرحوم کی غزلون کو صرف آب حیات کی نہرین کہا جا سکتا ہے تو شیخ مصحفی مرحوم کی چھوٹی چھوٹی غزلین اپنی تازگی اور صفائی مین سلسبیل و کوثر سے جا ملتی ہین

صاحبِ آبِ حیات نے اپنی تصنیف مین شیخ مرحوم کی ان بیش بہا اور قیمتی غزلون کے متعلق ایک حرف بھی نہین لکھا تو ہمین اسکا افسوس نہین کیونکہ جیسا کہ ابتک ثابت کیا جا چکا ہے۔ آب حیات مین جسقدر تعریف یا تعریض کی ہے وہ کسی واقفیتِ فن کا نتیجہ نہین ہے۔ بلکہ یون ہی ایک کی محبت اور دوسرے کی عداوت کے جوش و خروش مین جو الفاظ زبان قلم پر آگئے ہین بے تکلف ادا کر گئے ہین

ان کی خاموشی سکوت سخن شناس نہین ہے البتہ ان کی تعریف تحسین ناشناس ضرور ہے۔ اسلئے ہم خوش ہین کہ شیخ مصحفی کے چند پارہائے جگر ایک ناشناس کی تحسین کے تیرون سے محفوظ رہ گئے ورنہ ان کی قیمت کم ہو جاتی

آبِ حیات مین جو مسلک تمام جذبات گو شعرا کے لئے جائز رکھا گیا ہے اس سے یہ اُمید نہین پڑتی۔ کہ آزاد ان خوبیون کو عمداً نظرانداز کر گئے اگر ان کی نظر پہنچ جاتی تو اپنی مسلّمہ فطرت کی بنا پر بگاڑ سنوار کر کہتے اور جا بجا جلی کٹی سنانے مین کوتاہی نہ کرتے اور نہین معلوم کن الفاظ مین باکمال مگر غریب الوطن مصحفی پر پھبتیان اُڑائی جاتین۔ البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اُن کا تیر نشانہ پر نہ بیٹھا۔ اور نگاہ غلط انداز سے ایک ایسی غلطی ہو گئی۔ جو حلقۂ احباب مین عرصے تک سرگوشیونکا سبب بنی رہیگی۔ چند غزلین اور ملاحظہ ہون:۔

مین خستہ تمام ہو چکا اب جا در دکہ کام ہو چکا اب
زلفون مین پھر اُس نے منہ چھپایا بس وعدۂ شام ہو چکا اب
سیرِ شبِ ماہ یا رتک تھی لطفِ لبِ بام ہو چکا اب
دربار ہو یا نہ ہو عرض کیا اپنا تو سلام ہو چکا اب

رکھا نہ خاک مصحفی کو آرام تمام ہو چکا اب

یون چلتے ہین لوگ راہ ظالم یہ چال ہے کون آہ ظالم
غیرون کو تو روز دیکھتا ہے مجھ پر بھی کوئی نگاہ ظالم
کس کس کو ملے گی حشر مین داد اک خلق ہے داد خواہ ظالم
کہدے کوئی جا کے مصحفی سے ہوتی ہے بُری یہ چاہ ظالم

کیا کرین جا کے گلستان مین ہم آگ رکھ آئے آشیان مین ہم
مر کے نکلے قفس سے خوب ہوا تنگ آئے تھے اس مکان مین ہم
شاخِ گل کے گلے سے مل مل کر روتے ہین موسم خزان مین ہم
مصحفی عشق کر کے آخر کار خوب رسوا ہوئے جہان مین ہم

ایک ایک شعر بے مثل ہے

اپنے مژگانِ رخنہ گر کو دیکھ آن کر پھر مرے جگر کو دیکھ
میرے آگے نہ دیکھ آئینہ میری حسرت بھری نظر کو دیکھ
دیکھنا کیا ہے عقد پروین کا اپنے آویزۂ گہر کو دیکھ
تھی شب وصل کھل گئی جب آنکھ رنگ فق ہو گیا سحر کو دیکھ
مصحفی یہ ستم نکر نادان خط نہ دے اپنے نامہ بر کو دیکھ

بیٹھ کر وہ جہان سے اُٹھتا ہے ایک فتنہ وہان سے اُٹھتا ہے
نالہ کرتی ہے جس گھڑی بلبل شعلہ اک آشیان سے اُٹھتا ہے
جم کے جو سنگ کی طرح بیٹھا کب ترے آستان سے اُٹھتا ہے
مصحفی ضبط آہ کر ورنہ پردہ رازِ نہان سے اُٹھتا ہے

غمِ دل کا بیان چھوڑ گئے ہم یہ اپنا نشان چھوڑ گئے
چلتے چلتے بھی یہ جفا کیشان ہاتھ مجھ پہ ندان چھوڑ گئے

صفحۂ روزگار پر لکھ کر — عشق کی داستان چھوڑ گئے
راہ میں مجھ کو میرے ہمراہی — جان کر ناتوان چھوڑ گئے
لے گئے سب بدن زمین میں ہم — مصحفی اک زبان چھوڑ گئے

الغرض زبان کی سلاست بیان کی دلآویزی اور خیالات کی واقعیت میں میر صاحب اور شیخ صاحب میں صرف یہی امتیاز ہے کہ میر صاحب متقدم ہونے کے سبب سے افضل سمجھے جاتے ہیں اور شیخ صاحب مقلدین کے گروہ میں آ کر آگے بڑھنے سے رہ گئے ہیں۔ اسی بنا پر مولانا حسرت موہانی نے فیصلہ کیا ہے کہ بحیثیت مجموعی مصحفی کا کلام میر سے دوسرے درجے پر ہے آزاد صاحب کی منطق یہاں بھی دنیا سے نرالی ہے کہتے ہیں

"اسی کوچے میں اکثر شعر میر صاحب کے بھی جھلک دکھاتے ہیں مگر جو اُن کے جوہر ہیں وہ اُن ہی کے ساتھ ہیں یہ اس ڈھنگ میں کہتے ہیں۔ تو بھسنڈے ہو جاتے ہیں" (آب حیات صفحہ ۳۱۲)

ہم پوچھتے ہیں کہ آخر میر صاحب کے جوہر کیا ہیں زبان کے متعلق تو یہ ہے کہ خود آزاد نے اسی آب حیات میں اُن کو میر و سوداؔ کا ایک آخری ہمزبان قرار دیا ہے۔ نیز ہم نے صفحات بالا میں مماثلت میر و مصحفی کی بنیاد جن اصول پر رکھی ہے وہ ان ہی کے بیان کردہ ہیں اسکے بعد محاسن زبان کا قضیہ تو ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔ اب رہے مضامین۔ پس اگر یہ فقرہ مضامین سے تعلق رکھتا ہے۔ تو اسقدر تشریح کے بعد بھی جس میں الفاظ ومعنی اور زبان وبیان دونوں کا لحاظ مساوی طور پر قایم رہا ہے ہم دس پانچ مثالیں مہیا کرنے میں بخل نہیں برت سکتے ہیں تو دروغ گو را تا بخانہ رسانید۔ پر عمل کرنا ہے۔ اور محض یہ دکھانا ہے کہ میر تقی کے انداز میں کوشش کرتے ہوئے شیخ مصحفی بھسنڈے ہو کر رہ گئے ہیں یا آزاد نے محض تعصب اور ہٹ دھرمی سے کام لے کر اپنے نامۂ اعمال کی سیاہی میں اور اضافہ کر لیا ہے

ہم نے جانا تھا لکھے گا تو کوئی حرف اے میر — پر ترا نامہ تو اک شوق کا دفتر[1] نکلا (میر)
مصحفی ہم تو یہ سمجھے تھے کہ ہوگا کوئی زخم — تیرے دل میں تو بہت کام رفو کا نکلا (مصحفی)

شیخ مصحفی مرحوم کے دونوں مصرعے جسقدر برجستگی کے ساتھ زبان میں ڈوب کر نکلے ہیں اسکا لطف بے تعصب اہل زبان اٹھا سکتے ہیں

اس بیکسی سے کون جہان میں موا کہ میں — جز داغ سینہ آج چراغ لحد نہیں (میر)
داغ حسرت لے گئے دنیا سے بعد مرگ ہم — کون لاتا ہے غریبوں کے سر مدفن چراغ (مصحفی)

میر صاحب کے شعر سے اول تو داغ کی توجیہہ نہیں ہوتی۔ دوسرے بادی النظر میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ چراغ لحد اُس چراغ کا نام ہے جو لحد کے اندر جلے کیونکہ سینے کا داغ جو اُسکی نیابت کا حق ادا کر رہا ہے لحد سے باہر نہیں ہو سکتا لیکن مصحفی مرحوم نے چراغ کو چراغِ مدفن اور داغ کو داغِ حسرت کہہ کر مضمون کو دونوں لغزشوں سے بچا دیا شیخ مرحوم کے شعر میں ایک مخفی پہلو اور لطیف کنایہ

[1] میرے نزدیک ان دون شعروں کا تقابل اصولاً درست نہیں۔ (اڈیٹر)

بھی ہے کہ جب زندگی مین کسی نے توجہ نہ کی اور ہمین داغ حسرت لیجانا پڑا تو مدفن پر چراغ جلانیکی توفیق کسے ہو سکتی ہے۔ گور غریبان کی رعایت سے مرنے والون کو غریب کہنا لطف سے خالی نہین کاش آزاد انصاف سے کام لیتے اور شیخ مصحفی مرحوم کے حسن کلام کو جو مزار کی تربت کا چراغ ہو کر تحفظ نام و نشان کا سبب واحد تھا۔ اس طرح ناحق شناسی کے دامن کے سپرد کرنے سے پرہیز کرتے

امید وار وعدۂ دیدار مر چلے آتے ہی آتے یارو قیامت کو کیا ہوا (میر)
مدت ہوئی کہ بیٹھے ہین ہم انتظار مین کیا جانے آتے آتے قیامت کہان رہی (مصحفی)

میر صاحب کے دوسرے مصرعہ مین "یارو" ایک زائد لفظ[1] معلوم ہوتا ہے۔ نیز امید وار وعدۂ دیدار کا مر جانا یا مرنے کے قریب پہونچ جانا جذبۂ محبت و مودت کے بالکل منافی ہے اسکے خلاف شیخ مصحفی کا پورا شعر روانی اور برجستگی کے قالب مین ڈھل کر نکلا ہے اور میر کے شعر سے زیادہ کیفیات کا حامل ہے

ہم فقیرون سے بے ادائی کیا آن بیٹھے جو تم نے پیار کیا (میر)
اُمیدِ کرم پر تری آتے ہین یہانتک جس روز نہ دیکھینگے کرم بیٹھ رہینگے (مصحفی)

میر صاحب کے شعر مین بے ادائی ایک ایسا لفظ ہے جسکے معنی شعر کے لئے کچھ زیادہ مفید نہین کیونکہ ادا بمعنی کرم[2] جمہور کے خلاف ہے۔ نیز پیار[3] کرنا شان معشوق کے خلاف ہونیکی وجہ سے نامناسبت کا پہلو رکھتا ہے۔ البتہ شیخ مصحفی مرحوم کا شعر ہر لحاظ سے بلند تر ہے

وہ دشت خوفناک رہا ہے مرا وطن سُنکر جسے خضر نے سفر سے حضر کیا (میر)
جس بیابان خطرناک مین ہے اپنا گذر مصحفی قافلے اُس راہ سے کم نکلے ہین (مصحفی)

میر صاحب کا دوسرا مصرعہ خضر سفر حذر تین متفق الحرکات کے الفاظ کے اجتماع سے ثقیل ہو گیا ہے۔ اور پہلے مصرعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دشت خوفناک کسی وقت وطن کی حیثیت رکھتا تھا۔ بحالت موجودہ اس سے کوئی تعلق نہین۔ لیکن شیخ مصحفی مرحوم کے شعر پر ایسا کوئی اعتراض وارد نہین ہوتا۔ بلکہ ایک اور لطیف پہلو یہ نکلتا ہے کہ مین جس خطرناک بیابان مین سرگرم سعی ہون اس راستے سے یکہ و تنہا آدمی تو کیا قافلون کو بھی قدم رکھنے کی ہمت نہین پڑتی

آزاد صاحب نظر ہوتے تو اندھیرے اُجالے کا جو فرق شیخ مصحفی اور خواجہ آتش کے کلام مین نظر آیا میر صاحب و شیخ صاحب کے کلام مین زیادہ آسانی کے ساتھ نظر آ سکتا تھا

جون صبح اب کہان ہے طول سخن سے فرصت قصہ ہی کوئی دم کو ہے مختصر ہمارا (میر)
شمع سحری ہین نہین کچھ عمر کو وقفہ یان کام ہے اپنا تو تمام ایک نفس مین (مصحفی)

میر صاحب کا شعر طول و مختصر کی صنعتِ تضاد کے سوا کوئی خاص خوبی نہین رکھتا۔ بلکہ انسان فانی کو صرف سحر کے ساتھ

---

[1] ہرگز زاید نہین (اڈیٹر) [2] میر نے ادا بمعنے کرم کب استعمال کیا ہے۔ بے ادائی بہ معنے بے رخی آیا ہے۔ (اڈیٹر)
[3] پیار کرنا اس معنی مین نہین ہے جو صاحب مضمون نے سمجھا ہے (اڈیٹر)۔

تشبیہ دیئے جانے کی وجہ سے ایک حد تک قابل اعتراض بھی معلوم ہوتا ہے۔ یہ مضمون بھی شیخ مصحفی مرحوم کے حصے کا ہو گیا شمع سحری کہکر ایک نفس مین کام تمام کرنا کس قدر لطف آمیز ندرت ہے

سعی طوف حرم نہ کی ہم نے آستان پر ترے مقام کیا (میر)
کیا غرض تھی طرف دیر و حرم کیون جاتے اسکے کوچہ مین ہمین عمر بسر کرنا تھا (مصحفی)

شاعرانہ طور پر طلب حق کے دو راستے مانے جاتے ہین ایک دیر دوسرا حرم لیکن عاشقان صادق ان جھگڑون مین پڑنا پسند نہین کرتے بلکہ براہ راست اپنے مطلوب کے آستانِ ناز پر زندگی بسر کرنے کو عین طاعت و عبادت خیال کرتے ہین یہی مضمون ہے جو دونون کے ہان بیان ہوا ہے لیکن شیخ مصحفی کا طرز بیان زیادہ مدلل۔ زیادہ واضح اور زیادہ محیط ہے "کیا غرض تھی" اس جملے مین دیر و حرم سے بے تعلقی ظاہر کرنے کا جو زور ہے وہ "سعی طوف حرم نہ کی" سے پیدا نہین ہو سکتا۔ اور "اس کوچہ مین ہمین عمر بسر کرنا تھا" اس مصرع نے عاشق کے جس طور زندگی کی قید کر دی۔ وہ میر صاحب کے دوسرے مصرعہ کے مقابلے مین کہین بڑھ چڑھکر ہے نیز صرف حرم پر اکتفا نہ کر کے دیر و حرم دونون کو نظر انداز کر دینے کا مسئلہ بھی خصوصیت کے ساتھ دیکھنے کے قابل ہے۔ غرض ہر جہت سے شیخ مصحفی کا شعر بلند ہے۔ مگر افسوس یہ بلندی آزاد کی نگاہ مین پستی کی ہم معنی ہے

طالع جو خوب تھے نہ ہوا جاہ کچھ نصیب سر پر مرے کرور برس تک ہما پھرا (میر)
دیا ہے مجھ کو یہ برگشتہ طالعی نے اثر کہ آکے سر پہ میرے سایۂ ہما پھر جائے (مصحفی)

میر صاحب کے شعر مین "طالع جو خوب تھے" ثقیل انداز بیان ہے۔ "کرور برس تک" مبالغہ ہے اور مبالغہ بھی کریہہ جس سے طوالت وقت کے سوا کچھ منظور نہین "ہما پھرا" ایسے برے پہلو سے نظم کیا گیا ہے کہ اصلی معنی بھی خاک مین مل گئے۔ برخلاف اس کے شیخ مصحفی کا شعر ہر لحاظ سے بلند ہے۔

کیا رکھا کرتے ہو آئینہ سے صحبت ہر دم ٹک کبھو بیٹھو کس طالب دیدار کے پاس (میر)
میرے آگے نہ دیکھ آئینہ مری حسرت بھری نظر کو دیکھ (مصحفی)

میر صاحب کا شعر زبان کے لحاظ سے کچھ زیادہ صاف اور ترکیب کے لحاظ سے کچھ زیادہ برجستہ نہین پھر اسمین وہ بیتابی اور بیقراری بھی نہین پائی جاتی جو شیخ مصحفی مرحوم کے شعر کا اصلی جوہر ہے۔ معشوق نہین معلوم کس خیال سے عاشق کے سامنے آئینہ بینی مین مصروف ہو جاتا ہے۔ عاشق اس بات کو گوارا نہین کر سکتا کہ اسکی موجودگی مین کوئی دوسری ہستی دیدار یار سے فیض یاب ہو۔ اور نہایت بیتابی کے ساتھ محو آرائش معشوق سے کہتا ہے کہ او ظالم تو میرے سامنے آئینہ کیون دیکھتا ہے اس وقت تو میری حسرت بھری نظر کو دیکھ۔ تیرا مطلب اسی سے پورا ہو سکتا ہے۔ حسرت بھری نظر کو دیکھنے کے دو مقصود ہین۔ ایک تو یہ کہ حسن کی قدر کرنا اہل نظر کا کام ہے۔ دوسرے یہ کہ صاحب حسن اپنے حسن کے اوصاف آئینہ دیکھکر معلوم نہین کر سکتا اس کے لئے پھر کسی حسرت بھری نظر کی ضرورت ہے۔

ربط صاحب خانہ سے مطلق بہم پہونچا نہ میر — مدتوں سے ہم حرم مین بھی پہ نامحرم گئے (میر)

ابتک حرم وصل سے محرم نہ ہوئے ہم — کعبہ مین حجاب در و دیوار غضب ہے (مصحفی)

دونوں کے یہاں تصوّف کا ایک مسئلہ نظم ہوا ہے۔ میر صاحب کہتے ہین کہ ہم ایک مدت سے حرم مین تھے لیکن صاحب خانہ سے مطلق ربط پیدا نہ ہوسکا۔ آخر کار نامحرم ہی جانا پڑا اول تو یہان ربط پیدا نہ ہونیکی کوئی وجہ ظاہر نہین کی گئی۔ دوسرے حصول مقصد سے پہلے منزل کوشش وسعی سے قدم اُٹھا لینا حقیقی جذبۂ محبت کے منافی ہے اس کے خلاف شیخ مصحفی کے الفاظ و معنی بجائے خود مستقل ہین صاحب خانہ کے بجائے حرم سے محرم نہ ہونا کسی دوسری دنیا مین پہونچا دینے والا جملہ ہے۔ دوسرا مصرعہ جس تیور سے ادا ہوا ہے۔ اُس نے شک وشبہ کی گنجائش باقی نہین رکھی۔ اور صاف ثابت کر دیا کہ مجردات تک رسائی حاصل کرنے کیلئے مادیات کا سہارا لینا خوفناک غلطی ہے۔ حجاب در و دیوار ایک ترکیب ہے منجملہ ان خوشگوار ترکیبوں کے جو شیخ مصحفی کے کلام مین اکثر پائی جاتی ہین

یہ چند مثالین اس بات کا ثبوت دینے کے لئے کافی ہین۔ کہ میر صاحب اور شیخ صاحب کے میدان شاعری اور حد پرواز تخیل مین ذرہ بھر تفاوت نہین حالانکہ آزاد حسب الوطنی کے جوش یا خدمت بزرگان خاص کے شوق مین غریب الوطن اور بیکس مصحفی کو میر تقی کے مقابلہ مین نہین بلکہ بعض چھوٹے درجے کے شعرا کے سامنے بھی ذلیل کرنے کی کوشش کرتا ہے حیرت ہے

شاید آزاد کا یہ خیال ہو کہ میر صاحب کے کلام کی بندشین چست اور ترکیبین درست ہین اور شیخ مصحفی مرحوم کا کلام ان اوصاف سے خالی ہے تو ہم چند ہم قافیہ اشعار درج کر کے حسن و قبح کا فیصلہ اہل نظر پر چھوڑتے ہین

درہمی حال کی ہے سارے مرے دیوان مین — سیر کر تو بھی یہ مجموعہ پریشانی کا (میر)

ہوش اڑ جائینگے او زلف پریشان تیرے — لب پر آیا جو مرے ذکر پریشانی کا (مصحفی)

وہ بھی جانے کہ لہو رو کے لکھا ہے مکتوب — ہم نے سرنامہ کیا کاغذ افشانی کا (میر)

ہم اسیرون کو قفس مین نہ ملا لطفِ فراغ — شوق جی ہی مین رہا بال و پر افشانی کا (مصحفی)

شرمندہ ترے رُخ سے ہے رخسار پری کا — چلتا نہین کچھ آگے ترے کبک دری کا (میر)

مردون کو جلاتی ہے ترے پاؤن کی ٹھوکر — اس چال پہ مرنا ہے بجا کبکِ دری کا (مصحفی)

آفاق کی منزل سے گیا کون سلامت — اسباب لٹا راہ مین یان ہر سفری کا (میر)

کیا لطف مقام اُن کو جو مشتاق عدم ہین 	دل کوچ مین رہتا ہے ہمیشہ سفری کا 	(مصحفی)

کیا کہئے آہ جی کو قیامت ہے انتظار 	آتا نہ کاش وعدۂ دیدار درمیان 	(میر)
ہم روئے عیش دیکھ چکے روز حشر بھی 	یون ہی رہا جو وعدۂ دیدار درمیان 	(مصحفی)

دفتر نہین کہانی نہین مثنوی نہین 	کیا شرح سوز عشق کرون مین زبان نہین 	(میر)
اسکا یہی سبب ہے جو گرم فغان نہین 	اپنا تو اس چمن مین کوئی ہمزبان نہین 	(مصحفی)

عبارت خوب لکھی شاعری انشا طرازی کی 	وے مطلب ہی کم دیکھین تو کہئے مدعا حاصل 	(میر)
کسی نے کر لیا معلوم رازِ دل تو کیا حاصل 	مزا جب ہے کہ ہو چپکے ہی چپکے مدعا حاصل 	(مصحفی)

زمین پر مین جو پھینکا خط کو کر بند 	بہت تڑپا کیا جون مرغِ پر بند 	(میر)
مرے سینے مین دل بیتابیون سے 	پھڑکتا ہے مثال مرغ پر بند 	(مصحفی)

افسر امروہوی

سیّاح کی ڈائری

(موجودہ اکابر لکھنؤ)

اس سے قبل میں جب کسی کا شعر سنتا تھا، تو اپنے تاثر یا شعر کے اثر کے لحاظ سے شاعر کی ایک ذہنی تصویر قایم کر لیتا تھا اور جب تک اسکو دیکھ نہ لیتا، اسی خیالی صورت کے ساتھ ساتھ اس کے کلام کا مطالعہ کرتا تھا، لیکن جب بعد کے تجربات نے ثابت کیا کہ ہندوستان کا شاعر اپنے "عالم شعر" سے بالکل علحدہ چیز ہوتا ہے اور اس کے اقوال سے کبھی اس کے حال و اعمال پر صحیح حکم نہیں لگایا جا سکتا، تو میں نے اس اصول پر کاربند ہونا ترک کر دیا اور دوسرا اصول بالکل اس کے خلاف یہ قائم کیا کہ "سب سے اچھا شاعر سب سے بُرا انسان ہے" ہرچند اس اصول کی بھی صحت پر مجھے وثوق تام نہیں ہے، لیکن یہ اتنا غلط بھی نہیں ہے، کیونکہ اگر سب سے اچھا شاعر سب سے بُرا انسان نہیں ہوتا تو کچھ ایسا زیادہ دلکش و پسندیدہ چیز بھی نہیں ہوتا کہ اس اصول کو کلیۃً غلط قرار دے دیا جائے۔

اول اول جب میں نے کلام اقبال کا مطالعہ کیا تو ان کے خیال کی رفعت اور جذبات کی اثیریت کو سامنے رکھ کر جو صورت میں نے اُن کی قایم کی، یہ تھی:-

ایک نحیف الجثہ انسان (دماغی ترقی اور صحت جسمانی دونوں کا اجتماع کبھی میرے ذہن میں نہیں آتا) بڑی چمکیلی آنکھیں، داڑھی اگر ہوئی تو بالکل "مسترسل الشعر" قسم کی ورنہ چار ابرو کا صفایا۔ ہنستے کم ہوں گے لیکن باریک جلد کے نیچے ایک خاص قسم کا نورانی خندہ ہر وقت جھلکتا ہوگا معاشرہ نہایت سادہ مگر پاکیزہ ہوگی، بہ لحاظ اخلاق کے یکسر عجز و فروتنی ہوں گے، بات بات پر آنکھیں اشک آلود ہو جاتی ہوں گی اور بہ حیثیت مجموعی ان میں ایک ایسی کشش ہوگی کہ انسان خود بخود ان کی طرف کھنچ جاتا ہوگا، لباس بالکل مشرقی وضع کا ہوگا اور نمائش سے بالکل دور"

لیکن جب میں ان سے ملا تو مجھے کس قدر تکلیف ہوئی کہ وہاں ایک بات بھی میرے مزعومات کے مطابق نہ تھی۔ میں کبھی یہ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ وہ شلوار پہنتے ہوں گے جو مرد کے لئے سر درجہ غیر شاعرانہ ملبوس ہے اور اونچا کوٹ جو پنجابی یونیفارم کا جزو غیر منفک ہے، استعمال کرتے ہوں گے، جسے کم از کم فلسفیانہ ذہنیت کا انسان کبھی پسند نہیں کر سکتا، ہرچند یہ ضروری نہیں کہ معمولی گفتگو بھی ایک شاعر کی شاعرانہ دلکشی رکھتی ہو، لیکن اس کا تو وہم بھی کبھی نہ گذرا تھا کہ وہ قیام کو کیام اور قہقہہ کو کہکہہ بولتے ہوں گے۔

وہ مجھ سے گفتگو کر رہے تھے اور میں حیران تھا کہ خدایا یہ اقبال دفعۃً اکبال کیسے بن گیا۔ آنکھیں چھوٹی اور بہت چھوٹی، جسم پہلوانی کے لگ بھگ فربہ و تربیت یافتہ، حقہ (حکہ) کے غیر لطیف و کثیف استعمال کی کثرت سے کمرے کی ساری فضا بدبو سے لبریز، چہرہ کی ساخت نقشہ کی قطع و برید یکسر غیر دلچسپ اور عوائد میں کوئی دلکشی نہیں ——

اس کے بعد بھی جب میں کسی شاعر یا بڑے انسان سے ملا تو سوائے ایک ٹیگور کے کہ وہ تو بیشک وہی نظر آیا جیسا میں نے سمجھا تھا، اور نہ سب کچھ

ہمیشہ اپنی ذہنی تصویر سے اس کو بالکل مختلف پایا، اور آخر کار میں نے قصد کرکے اپنی ذہنی مصوری کے اصول کو بدلدیا۔ اور آیندہ کے لئے یہ عہد کیا کہ جب کبھی کسی کا شعر سنوں گا، تو کبھی یہ جاننے کی کوشش نہ کروں گا کہ اس کا کہنے والا کون ہے، اور اگر یہ جاننے کے بعد میں، کوئی تصویر قایم کرونگا بھی تو بالکل اپنے تاثرات کے خلاف۔

لکھنؤ آنے سے قبل میں یہاں کے مشہور شعراء کا کلام دیکھ چکا تھا اور ان کی شکل وصورت، عادات و اخلاق کے متعلق بھی ایک حکم لگا چکا تھا، اس لئے میں بے چین تھا کہ کسی طرح ان سے ملوں، ان کی زبان سے ان کا کلام سنوں اور پھر اس کے مطابق اپنے "ذہنی مرقع" کی صحت کرلوں۔ یہاں آنے سے پہلے ہی میں ایک خیالی فہرست مرتب کر چکا تھا کہ مجھے کیا کیا دیکھنا ہے اور کس کس سے ملنا ہے، چنانچہ میں اپنے ذہن کی رفتار کے لحاظ سے جس کی کوئی وجہ نہیں بتا سکتا، بغیر رعایت حروف تہجی کے حسب ذیل اسمار کی فہرست تیار کر چکا تھا

چھتر منزل۔ صفی۔ بٹیروں کی پالی۔ عزیز۔ محشر۔ آرزو۔ قیصر باغ۔ جالب۔ رحم علی ہاشمی۔ ممتاز حسین۔ عروج۔ آصف الدولہ کا امام باڑہ ناطق۔ احسن۔ بیلی گارد۔ ثاقب۔ نولکشور پریس۔ آسی۔ افسر۔ خان بہادر عین الدین سٹی مجسٹریٹ۔ فرنگی محل کا پل۔ کپتان کے کنوئیں کی برفی اور تحسین کی مسجد۔ جیسا کہ آگے چلکر معلوم ہوگا، اس فہرست میں بعد کو بہت کچھ حذف و اضافہ ہوا، لیکن میرے خیال کی جولانگاہ اول اول یہی تھی جو فہرست بالا سے ظاہر ہوتی ہے۔

صبح اول وقت میں اس ارادہ کی تکمیل کے لئے نکلنے ہی والا تھا کہ وہی پارک والے "لقیط"[1] قسم کے دوست آگئے اور انہوں نے حدیقۃ الحیوانات کا ذکر کرکے جسے یہاں بنارسی باغ کہتے ہیں میری فہرست میں ایک نام کا اضافہ اور کردیا۔ صبح کا وقت تھا، موسم بھی خوشگوار تھا، اس لئے انکی رہبری میں حضرت گنج کی مغربی معاشرت کی آبادی سے گزرتا ہوا اس وسیع مقام پر پہونچ گیا، جو بیک وقت مرغزار بھی ہے اور صحرا بھی، باغ بھی ہے اور خشک میدان بھی۔ وحوش وطیور کو ان کی طبعی حالت پر دیکھنے کا مجھے بہت شوق ہے اور ہر چند انسانی گرفت میں آنے کے بعد ان کی حقیقی وحشت ورمیدگی باقی نہیں رہتی، لیکن یہاں بڑی حد تک آزادی کے اسباب فراہم کئے گئے ہیں۔ یہاں تک کہ شیروں کے لئے بھی تنگ کٹہرے کے ایک وسیع حصہ کو آہنی سلاخوں کے حصار سے محفوظ کردیا گیا ہے۔ جہاں ان کے لئے نیستان، کوہستان اور پانی کے حوض بنادیئے گئے ہیں۔ یہاں کا سب سے زیادہ رومانی حصہ وہ قطعۂ زمین ہے جہاں یوکلپٹس کے سرو آسا کلاہ فگن بلندی کی حد تک پہونچنے والے درختوں کا مختصر سا جنگل تھوڑی دیر کے لئے انسان کو تہذیب وتمدن کے تمام دل و دماغ تھکا دینے والے جذبات سے علٰحدہ کرکے ایک ایسی معصوم دنیا میں پہونچا دیتا ہے جہاں بغیر کسی معشوق کی موجودگی کے عشق کرنے کو جی چاہنے لگتا ہے۔

جب دھوپ تیز ہونے لگی اور واپس آنے کا خیال کیا تو میرے رہبر مجھے سنگ مرمر کی اس خوبصورت وخنک بارہ دری میں لے گئے، جہاں کسی وقت یہاں کے فرمانروا بیٹھتے ہوں گے لیکن اب صرف باغ کے مالی رونق افروز رہتے ہیں۔ یہیں ان کے دو دوست اور ملگئے جو اتفاق سے دونوں میرے یہاں درج رجسٹر تھے۔ ان کو میں اس وقت تک صرف آسی اور افسر کے نام سے جانتا تھا، اور میں نہیں چاہتا تھا کہ ان کا اصلی نام مجھ کو بتایا جائے، لیکن آرزو سے تقدیر نہیں پھرتی اور آخر کار ان دونوں کے نام (عبدالباری، اور حامد اللہ) جو غیر معمولی طور پر غیر شاعرانہ

[1] لقیط عربی میں اس بچہ کو کہتے ہیں جو کہیں اتفاق سے پڑا ہوا ملجائے۔

واقع ہوئے ہیں مجھے بتا ہی دیئے گئے۔ یہ گویا پہلا شگون بد تھا جو جانوروں کے مطالعہ سے فارغ ہونے کے بعد ان دو ثقیل اور سامعہ شکن نام رکھنے والے شاعروں کی صورت میں ظاہر ہوا ـــــ جناب آسی دوہرے بدن کے آدمی ہیں لیکن ادائیں ان کی سب اکہری ہیں (اکہری کا لفظ میں نے سادہ اور غیر مصنوعی کے معنے میں استعمال کیا ہے) خندہ رد[1]، تبسم لب، قہقہہ پیشانی (گھوڑے کا ستارہ پیشانی ہونا اور بات ہے) انسان ہیں۔ آنکھوں میں شرارت آمیز حیا، چتون میں ہلکی سی متانت آغشتہ شوخی، رفتار میں خفیف سی لٹک آسائیگی، اور گفتار میں ہلکی سی شکریں حلاوت، سبھی کچھ ہے لیکن بہ حیثیت مجموعی دیکھنے والے پر جو اثر پیدا ہوتا ہے اُسے ہم صرف "حلز دیت"[2] سے تعبیر کر سکتے ہیں، جو ممکن ہے ان کی انتہائی سادگی و نیکی کا انعکاس ہو۔ قیافہ فی الجملہ ذہین ہے، لیکن نگاہیں دور رس نہیں معلوم ہوتیں۔ ضلع میرٹھ کے رہنے والے ہیں اور سولہ سترہ سال سے لکھنؤ میں بسلسلہ ملازمت مقیم ہیں۔ باوجودیکہ تقریباً ربع صدی سے لکھنوی شعرا کے ہجوم میں اور لکھنوی شاعری کی محافل میں زندگی بسر کر رہے ہیں، لیکن ان کی شاعری کسی طرح یہاں کی آب و ہوا سے متاثر نہیں ہوئی اور ان کی غزلیں ان جذبات بلند کی حامل ہوتی ہیں جو یقیناً ان کو کاروبار زندگی و مشاغل حیات کو دیکھتے ہوئے حیرت میں ڈال دینے والی ہیں۔ لکھنؤ کے عام رواج کے مطابق یہ بھی غزل گا کر فرماتے ہیں، ہر چند اپنے پندار میں وہ بہت زبردست موسیقی پیدا کرتے ہیں اور آواز میں بھی وہ نزاکت پیدا کرنا چاہتے ہیں جو "دشنام یار" کو بھی "طبع حزیں" پر گراں نہ گذرنے دے، لیکن قدرتی محرومی کا کیا علاج کہ نہ مردانہ لب و لہجہ باقی رہتا ہے نہ نسائی غنا پیدا ہوتا ہے اور اس لئے جس حد تک پڑھنے کا تعلق ہے غزل بالکل مخنث ہو کر رہ جاتی ہے۔ عام شعراء کی طرح انہیں اپنا کلام سنانے کی ہوس نہیں ہے، اس لئے میرے اصرار پر چند مختلف اشعار انہوں نے سنائے جن میں سے بعض مجھے اب بھی یاد ہیں۔

افسر میرٹھی ایک پستہ قد انسان ہیں اور غالباً فطرت کے مقصود کو شرمندہ کرنے والے نہیں ہیں۔ ایک قیافہ شناس کے لئے ان کے چہرہ کی ساخت اور اس کے خطوط میں کافی سامان مطالعہ مل سکتا ہے ـ میں صرف اس قدر سمجھ سکا کہ سرسری ملاقات میں ان کو سمجھ کر مطمئن ہو جانا خطرہ سے خالی نہیں۔ ان کی شگفتہ روئی اگر وہ واقعی عوائد رسمیہ کی بنا پر ہو تو صحرا کے سراب سے زیادہ نہیں، لیکن ان کا وہ خندۂ بے اختیار بھی نہیں چھپتا، جب ان کا دل صداقت کے ساتھ اسپر مجبور کرے۔ بعض کا خیال ہے کہ ان کی آنکھیں فریدی قسم کی ہیں، یعنے ایک چھوٹی اور دوسری بڑی، لیکن یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ رقبہ کے لحاظ سے دونوں برابر ہیں، البتہ ایک کی ساخت مدور ہے اور دوسری کی مستطیل، اور اس طرح گویا اہرمن و یزداں دونوں ہر وقت ان کھڑکیوں سے جھانکتے رہتے ہیں۔ چونکہ میں ان کی بائیں جانب یعنے ان کے یزدانی حصّہ دماغ کی طرف تھا اس لئے مجھے ان کی اہرمنی دنیا سے کوئی واسطہ نہیں پڑا۔ آدمی بہت سلجھے ہوئے ہیں، اور کافی غور کے بعد کسی نتیجہ پر پہونچنے کے عادی ہیں۔ ان کی شاعری بڑی حد تک "شب پرستانہ" قسم کی ہے مگر "شب رو" نہیں، آسمان ستارے، کہکشاں، چاند، ان کے ذرائع پیام رسانی ہیں، اور مقصود شاعری "درس حیات"۔ ٹیڑھی میڑھی بحروں میں، ٹوٹے ٹوٹے شعر لکھنا ان کا خاص ذوق ہے، جس سے

---

[1] اصل میں یہ لفظ خنداں رو ہے لیکن اکثر خندہ رو لکھتے ہیں اور اسی کو سامنے رکھکر باقی دو لفظ اختراع کئے گئے ہیں۔

[2] میں نے قصداً عربی کا نہایت ثقیل لفظ استعمال کیا ہے اگر کوئی شخص اس کا مفہوم جاننا چاہتا ہے تو لغت سے مدد لے

بعض جگہ "انجیلی" (Biblical) کیفیت پیدا ہوجاتی ہے۔ تغزل میں ان کی جذبات نگاری کے بعض شعر میں کبھی نہیں بھول سکتا

واپسی کے وقت نولکشور پریس میں مرزا محمد عسکری بی۔اے اور پریم چند کی زیارت ہوئی۔ مرزا صاحب یہاں کے شعبۂ اردو کے مہتمم ہیں اور باوصف ضعف و پیرانہ سالی کہ پوری جوانانہ سرگرمی کے ساتھ تحریر و مطالعہ میں مصروف رہتے ہیں۔ آپ کا آخری علمی کارنامہ "تاریخ ادب اردو" ہے جو تقریباً ... صفحات کو محیط ہے۔ لکھنؤ میں مسلم اکاڈمی کا وجود آپ ہی کی ذات سے قائم ہے۔ کیونکہ نہ آپ ہر ماہ اپنے مکان پر ممبروں کو پر تکلف دعوت دیں اور نہ کوئی شرکت کے لئے مجبور ہو۔ ارادہ ہے کہ محض لطف دعوت کے لئے میں بھی عارضی ممبر بن جاؤں، کیونکہ یوں بظاہر ان سے امید نہیں کہ "مسافر نوازی" سے کام لیں، اکاڈمی میں اس وقت تک بعض اچھے اچھے مضامین پڑھے جا چکے ہیں اور یہ سب نتیجہ ہے مرزا صاحب ہی کے شغف علمی کا۔ مرزا صاحب سرخ و سپید رنگ، باریک کترے ہوئے نقشہ کے انسان ہیں اور اس حد تک "صنادید عجم" کے آثار آپ میں نمایاں ہیں کہ بے اختیار جی چاہا کہ ایام خزاں میں ان کے "افسانہائے بہار" سنوں، لیکن ہم لوگوں میں جرأت اخلاق کا اس قدر فقدان ہے کہ ایام شباب کی معصیت کو شیوں کا بھی ذکر کرتے ہوئے شرماتے ہیں، حالانکہ جوانی نام ہے اسی "بے راہ روی" کا جو ہر قدم پر نشان لغزش چھوڑ جائے اور اس "شب روی" کا جو ہر رات کو ایک کہانی بنا جائے

پریم چند گورے رنگ کے شریف ہندو ہیں اور ایسی نورانی شکل رکھتے ہیں کہ اگر ان کی مونچھیں خالص ہندو قسم کی نہ ہوتیں تو میں انہیں مشورہ دیتا کہ وہ داڑھی بن جائیں اور دین و دنیا دونوں سے "مرفوع القلم" زندگی بسر کریں، ہندی شعبہ کا انتظام ان کے سپرد ہے اور رسالہ مادھری کی ترقی انہیں کے ساعی کی ممنون ہے۔ پریم چند کی فسانہ نگاری ملک میں کافی شہرت و قبول حاصل کر چکی ہے، لیکن جب سے انہوں نے ہندی زبان میں لکھنا شروع کیا ہے، ان کی ذہنیت میں کافی تغیر ہوگیا ہے چنانچہ "چوگان ہستی" (ہندی ناول کا ترجمہ) دیکھنے والے سمجھ سکتے ہیں کہ جس قطویل بے جا کو اردو برداشت نہ کر سکتی تھی وہ ہندی میں کس آسانی سے مقبول ہوگئی اور وہ عصبیت جو انکی اردو فسانہ نگاری میں کبھی ایک افسردہ چنگاری سے زیادہ نمودار نہیں ہوتی تھی وہ ہندی میں کس طرح "شعلۂ ملتہب" بن گئی

ہر چند پریم چند فارسی عربی سے بقدر ضرورت بھی آگاہ نہیں ہیں اس لئے اردو زبان پر ان کو وہ قدرت حاصل نہیں ہو سکتی جو سادہ فسانہ نگاری کو چھوڑ کر، کسی عمیق غور و فکر یا علمی و تحقیقی تحریر کے لئے درکار ہوتی ہے، لیکن اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ انکا سادہ اسلوب ادا کافی دلکش ہے جس میں پلاٹ کا مقامی رنگ اور زیادہ دلچسپی پیدا کر دیتا ہے، تاہم مجھے حیرت اس امر پر ہے کہ وہ شخص جو اردو اس قدر صاف لکھنے کا عادی ہو ہندی میں پہونچکر اس قدر ثقیل ہوجاتا ہے کہ اور نہ صرف یہ بلکہ نصاب کی جو اردو کتابیں نولکشور پریس سے شایع ہوتی ہیں ان میں بھی سنسکرت کا عنصر غالب کر دیتا ہے۔ اردو کو عربی فارسی کی مشکل الفاظ سے پاک کرنے کا یہ مدعا تو نہ ہونا چاہئے کہ سنسکرت کے ثقیل الفاظ ان کے بجائے استعمال کئے جانے لگیں۔ ارادہ ہے کہ نولکشور پریس سے جو اردو کی نصابی کتابیں شائع ہوتی ہیں ان پر آیندہ تفصیل سے بحث کروں اور بتاؤں کہ وہ کس قدر اغلاط سے لبریز ہیں اور فرقہ دارانہ جذبات نے انہیں کس حد تک مسخ کر دیا ہے

یہاں اسوقت تین روزانہ اخبار جاری ہیں، ان میں سب سے قدیم ہمدم ہے جو پہلے جناب جالب دہلوی کی اڈیٹری میں نکلتا تھا اور اب چودھری رحم علی ہاشمی اس کے مدیر اعلیٰ ہیں۔ جالب صاحب کا ہمدم سے علیحدہ ہونا شعبۂ انتظام کے اختلاف کی بنا پر ہوا ورنہ جالب صاحب کی پالیسی کبھی کوئی نہ تھی اور ہمیشہ اپنے آقا کی مرضی کے مطابق وہ اخبار چلانے کے عادی رہے ہیں۔ ہمدم سے علیحدہ ہونے کے بعد انہوں نے اپنا ذاتی اخبار ہمت کے نام سے نکالا ہے لیکن چونکہ اس کی پالیسی وہی ہے جو نہرو رپورٹ کے مخالفین کی ہے اس لئے پبلک میں ...... زیادہ مقبول ہونے کی توقع نہیں کی جاتی۔ جہاں تک فن صحافت کا تعلق ہے جالب صاحب اپنی وسیع معلومات کی بنا پر اس وقت ایک بے مثل و بے نظیر صحافی ہیں، لیکن چونکہ ان کا طرز تحریر جوش و شوخی سے معرا ہے اس لئے ایک تنگ و محدود حلقہ کے علاوہ ان کا اخبار اور کہیں مقبول نہیں ہو سکتا۔ جالب صاحب کی ایک خصوصیت اور بھی عجیب و غریب ہے کہ باوجود عدم ادعائے شاعری کے وہ صرف اپنے تخلص ہی سے مشہور ہیں اور اس حد تک کہ اگر دفعتاً ان سے سوال کیا جائے تو شاید بغیر سوچے ہوئے وہ خود بھی اپنا نام نہیں بتا سکتے۔

ہمدم کے دوسرے اڈیٹر چودھری رحم علی ہاشمی ایک جوان العمر انسان ہیں، لیکن جوانی کی حرارت سے بالکل خالی۔ ان کی سنجیدگی، نیکی، دھیما پن، اُس کھولت کا پتہ دیتا ہے جو لکھنؤ میں بچوں کی شرارت دور کرنے کے بعد افیون کے استعمال سے پیدا کی جاتی ہے۔ ہاشمی صاحب کے زمانہ میں ہمدم نے ترقی کی ہے جس کا سب سے بڑا سبب پالیسی کا تغیر ہے۔ ترتیب، حجم، دلچسپی اور طباعت کے لحاظ سے بھی قدیم روش میں کچھ تغیر ہوا ہے لیکن ایسا نہیں کہ دیکھتے ہی کوئی شخص

"گھبرا کے یہ کہدے کہ لو وہ آئے"

ذوق جدید و رواج حال کے مطابق دو کالم اس میں مزاح کے بھی ہوتے ہیں جو "دو باتیں" کے عنوان سے پہلے صفحہ میں درج ہوتے ہیں۔ "دو دو باتیں" لکھنے والے اک نوجوان شاعر ہیں، جو اس کے شعبۂ ادارت سے وابستہ ہیں۔ یہ شعر بھی اچھا کہتے ہیں اور پڑھتے بھی خوب ہیں آنکھیں بھی سرمگیں ہیں اور جسم بھی چھریرا۔ ۲۶ ½ ۲ تقطیع کا رکھتے ہیں، صورت سنجیدہ ہے لیکن طبیعت شوخ، دہانہ کی ساخت سے ظاہر ہے کہ کسی راز کے چھپانے کے اہل نہیں اور اس لئے دل کا معاملہ ان کے ساتھ کرنا خطرہ سے خالی نہیں، معلوم نہیں ان سے محبت کرنے والے کیونکر زندہ ہیں۔

تیسرا روزانہ اخبار حقیقت ہے، اس کے اڈیٹر اس قسم کے لوگوں میں ہیں جو غلطی سے ایک صدی قبل پیدا نہ ہو سکے تھے اور اب قدرت اپنی فروگزاشت کی تلافی اس طرح کر رہی ہے کہ ان کو زمانۂ حال میں پیدا کر کے اڈیٹر بنا دیا۔ سعی و انہماک، صدق و خلوص کے ساتھ کسب معاش کرنا اور کسی کی محکومی اختیار نہ کرنا، یہ ہے نصب العین اس اخبار کا۔

ماہانہ رسائل میں صرف الناظر کے اڈیٹر جناب ظفر الملک سے ملنے کا اتفاق ہوا، یہ بیک وقت لیڈر بھی ہیں اور اڈیٹر بھی، مولانا بھی ہیں اور شہر کے قاضی بھی لیکن دبلا پن بالکل فطری ودیعت ہے، کسی اندیشہ و غم سے اس کا تعلق نہیں۔ بظاہر بہت متواضع و منکسر معلوم ہوتے ہیں "پس پشت" اور "باطن" کا حال خدا جانے۔ نگاہ نقد و نظر اس قدر بلند ہے کہ دنیا میں مشکل ہی سے کوئی چیز انہیں پسند آتی ہے۔ لیکن خود اپنی ذات کو اصول تبصرہ سے مستثنیٰ جانتے ہیں۔ سچ بھی انہیں کی اہتمام سے نکلتا ہے اور عبد الماجد صاحب دریاآبادی اس کے اڈیٹر ہیں۔ ان سے ملنے کا موقع نہیں ملا، مگر سنا ہے کہ ان کا دماغ کسی خاص کیفیت سے متاثر ہے اور ملنا بے سود۔ یہیں سے جناب مولوی صبغۃ اللہ صاحب اڈیٹر خادم الحرمین سے

ملاقات ہوئی۔ آپ خیر سے شاعر بھی ہیں اور شہید تخلص فرماتے ہیں۔ خصائل کے لحاظ سے صبغۃ اللہ کے متعلق کوئی کیا کہہ سکتا ہے، جبکہ ومن احسن من اللہ صبغۃ کی نص قطعی موجود ہے، اللہ ان کو ہندوستان میں بیٹھکر حرمین کی خدمت کی ہمت عطا کرے اور مسلمانوں کو غور کرنے کی توفیق لطف فرمائے۔

لکھنؤ کے شعراء حال میں سے صرف چند کا نام خصوصیت کے ساتھ مشہور ہے:۔ عزیز، صفی، محشر، ثاقب۔ جناب عزیز سے ملنے میں بہت دقت ہوئی کیونکہ آجکل محمود آباد میں قیام رہتا ہے۔ اتفاق سے چند گھنٹے کے لئے لکھنؤ آئے تھے کہ مجھے خبر مل گئی اور میں مکان پر جاکر قدمبوس ہوا۔ میں نے انہیں بھی ایک نحیف الجثہ انسان سمجھ رکھا تھا لیکن یہ بھی "ماشاء اللہ" نکلے۔ چہرہ کے گوشت نے خد و خال چشم و بینی کا بدنمائی کی حد تک احاطہ کر رکھا ہے اور نقشہ کی ذہانت معدوم ہوگئی ہے۔ چہرہ کی خشونت سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی اندرونی خلش ہر وقت ایذا دیتی رہتی ہے اور وہ اپنی زندگی سے کچھ خوش نہیں ہیں۔ گفتگو میں نہ کوئی دلکشی ہے نہ کوئی عمق و ذہانت، لیکن اس میں شک نہیں کہ ان کا دماغ شاعرانہ ہے، شعر اچھا کہتے ہیں اور تمام اصناف سخن پر پوری قدرت رکھتے ہیں، مضمون کی جستجو، الفاظ کی تلاش، ترکیب کی چستی، خیال کی حلاوت اور جذبات کی اثر انگیزی ان کے کلام کی خصوصیات ہیں، شاگردوں کی بڑی جماعت رکھتے ہیں۔ جن میں سے رواں اور اثر کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے جو خود اپنی اپنی جگہ استادانہ حیثیت رکھتے ہیں۔

صفی، معمر شخص ہیں اور "غیر شاعرانہ" حد تک زار و نحیف۔ عجیب بات ہے کہ میں نے ان کی شاعری سے اُن کے "عظیم الجثہ" ہونے پر حکم لگایا تھا، لیکن "یہ" بالکل "وہ" نکلے۔ نہ طبیعت میں شگفتگی، نہ چہرہ پر رونق، نہ اداؤں میں دلبستگی، نہ گفتگو میں جاذبیت، الغرض دنیاوی انسان ہونے کے لحاظ سے وہ صفر کا درجہ رکھتے ہیں، اور ایک ایسی غیر جمالیاتی فضا ان کے چاروں طرف محسوس ہوتی ہے کہ اگر قدرت نے شعر گوئی کا ملکہ نہ دیا ہوتا تو شاید ہی کوئی شخص .... مگر سنا ہے کہ آدمی نیک ہیں اور اخلاق و اطوار بھی غیر پسندیدہ نہیں رکھتے۔ شاعر ہونے کی حیثیت سے ان کو مرتبۂ استادی حاصل ہے اور لکھنؤ کے جدید دور کے شعراء میں وہ خاصی قدر و منزلت رکھتے ہیں۔ جہاں تک غزل کا تعلق ہے، ان کے کلام کی سادگی، شگفتگی، یقیناً قابل ستائش ہے، لیکن انہوں نے قومی شاعر بننے کی کوشش میں اس خصوصیت کو ایک حد تک مجروح کر دیا ہے اور ممکن ہے کہ ان کے قومیات شعری کسی طبقہ میں کچھ چیز سمجھے جاتے ہوں، لیکن میں ان کو اس جوش سے بالکل معرا پاتا ہوں جو قومی نظموں کو غزلوں سے ممتاز کر دیتا ہے۔ ان کی بڑی معرکۃ الآرا قومی نظم "وقت آنے دو وقت آنے" والی ہے، لیکن اس میں ایک مصرعہ بھی ایسا نہیں جس کے اندر شعلہ تو کیا کوئی چنگاری ہی راکھ میں دبی ہوئی مل جائے۔ مثنوی کہنے کا بیشک انہیں خاص سلیقہ حاصل ہے، اور اسی میں ترقی کرنا انکی کامیابی ہے اگر وہ سمجھیں۔

اب محشر کا وہ ہنگامہ نہیں ہے جو پہلے کسی وقت تھا، لیکن خیر بعض بعض شعر اب بھی کہہ جاتے ہیں اور سنا ہے کہ آدمی بُرے نہیں۔ مجھ سے صرف ایکبار چوک میں سرسری ملاقات ہوئی تھی۔ پہلے تو میں یہی سمجھا تھا کہ یہاں کے کوئی عطر فروش ہوں گے، لیکن بعد کو معلوم ہوا کہ جناب محشر آپ ہی ہیں، خود ان کی زبان سے ان کے کلام سننے کا فخر مجھے حاصل نہیں ہوا، اور نہ اس کے لئے میں زیادہ بیتاب تھا۔

جناب ثاقب آج کل مہاراجہ صاحب محمود آباد کے بعض صاحبزادگان کے اتالیق ہیں۔ اور اپنی خدمات کی انہاک کی وجہ سے شعر و شاعری

کی جانب زیادہ توجہ نہیں کر سکتے، آدمی بہت نیک، خوش اخلاق، متواضع و منکسر مزاج معلوم ہوتے ہیں، اور چہرہ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ عام شعراء کی طرح ان کا باطن بھی ناقابل ذکر نہیں ہے۔ ان کے شعروں کی خصوصیت یہی ہے کہ ابتذال کہیں نہیں ہوتا اور خیال بھی عام سطح سے بلند ہو کر اچھوتی چیز پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

عروج جو یہاں دولھا صاحب کے نام سے مشہور ہیں، خاندان انیس کے باقیات الصالحات میں سے ہیں، اور حقیقت یہ ہے کہ مرثیہ خوب کہتے ہیں اور خوب پڑھتے ہیں۔ ہر چند ضعیفی سے کمر جھک گئی ہے اور تمام وہ علامات شیب جو انسان کو آدمی سے خدا جانے کیا بنا دیتے ہیں انہیں پوری طرح نمایاں ہیں، لیکن جب وہ ممبر پر پہونچتے ہیں تو دفعۃً ایسا تغیر ان میں پیدا ہوتا ہے جیسے کوئی اچانک نشہ سے چونک پڑے اور [illegible] کے تمام حرکات پوری قوت کیساتھ رونما ہونے لگتے ہیں۔

جناب احسن لکھنوی جو اپنی ڈرامہ نگاری کے لحاظ سے خاص شہرت رکھتے ہیں، غزلگوئی کے لحاظ سے کوئی مرتبہ رکھتے ہوں یا نہ رکھتے ہوں لیکن بہ حیثیت انسان ہونے کے وہ ضرور خاص چیز ہیں۔ طبیعت بہت غیور پائی ہے، اور سب سے الگ بے لاگ زندگی بسر کرنے کے عادی ہیں، باوجود عمر رسیدہ ہونے کے اب بھی ان کی جوانی کا بانکپن ان کے اعضاء سے ظاہر ہے اور مخصوص حلقۂ احباب میں اب بھی ان کی شگفتگی و زندہ دلی دیکھنے کی چیز ہوتی ہے، موسیقی سے خاص لگاؤ ہے اور ہارمونیم اچھا بجاتے ہیں۔ انہوں نے اپنی زندگی جس لطف سے بسر کی ہے، وہ شاید یہاں کے کسی شاعر کو نصیب ہوئی ہو، اور اب بھی جس نفاست و پاکیزگی اور جس سلیقہ کے ساتھ وہ رہتے ہیں اس کا نشان بھی دوسرے شاعروں میں نہیں پایا جاتا۔

یہاں کے شیعی طبقہ کے صحافیوں میں صرف ایک سید ممتاز حسین صاحب عثمانی اڈیٹر اودھ پنچ قابل ذکر ہیں۔ ہر چند موجودہ اودھ پنچ کا موازنہ سجاد حسین کے اودھ پنچ سے کرنا مناسب نہیں بات ہے، لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ لکھنؤ میں سوائے ممتاز حسین صاحب کے اودھ پنچ کی روایات قدیمہ کی یاد کو تازہ رکھنے والا کوئی اور ہو بھی نہیں سکتا۔ آدمی پڑھے لکھے ہیں، وسیع المطالعہ ہیں، اور ہر چند انکی وضع و صورت اور گفتگو سے کبھی کسی کو یہ توقع نہیں ہو سکتی کہ وہ پنچانہ رنگ کے انسان ہوں گے، لیکن یہ واقعہ ہے کہ وہ ایسے ہی ہیں اور بعض اوقات ان کا قلم ایسے نقوش چھوڑ جاتا ہے کہ بے اختیار داد دینا پڑتی ہے۔ میں اس سلسلہ میں ان واقعات کو بیان کرنا پسند نہیں کرتا جو انکی عصبیت کے ثبوت میں مجھ سے بیان کئے گئے، کیونکہ اگر وہ صحیح ہوں تو بھی جہانتک پنچ اور پنچین (کوئی صاحب اسے کچھ اور نہ پڑھ لیں) کا تعلق ہے ان کی تعریف ہی کی جائے گی۔

میں ان سے ملنے کے بعد جائے قیام پر واپس آیا ہی تھا کہ میرے ایک دوست کا تار آیا جسمیں انہوں نے مجھے ایک ضروری مسئلہ طے کرنے کیلئے دیرہ دون طلب کیا تھا، اس لئے میں بغیر تکمیل پروگرام کے لکھنؤ چھوڑ رہا ہوں۔ اگر زندگی رہی تو پھر کسی وقت حاضر ہونگا، لیکن محرم کا زمانہ بیچ کے تاہم دیرہ دون پہونچکر مجھے یہاں کے اس مشاعرہ کا حال ضرور لکھنا ہے جس میں شرکت کا فخر مجھے حاصل ہوا تھا اور اسی سلسلہ میں لکھنوی شاعری کی موجودہ ذہنیت پر اپنے خیالات کا اظہار کرونگا، خواہ اس کے بعد مجھے "نادِ علیاً" کا حصار ہی کیوں نہ اپنے گرد کھینچنا پڑے

ازدواج مکرر

(بہ سلسلۂ سابق)

(۵)

ہر وہ شخص جو ذکی کی جگہ اپنے آپ کو فرض کرے، بہ آسانی اندازہ کر سکتا ہے کہ صفیہ کی اس انتہائی صفائی اخلاق سے اس کو کس قدر صدمہ ہوا ہوگا اور صفیہ کے اعلان کے بعد دنیا نے ذکی کو کیا سمجھا ہوگا۔ ذکی کو صدمہ اس امر کا نہ تھا کہ اس کی بیوی کی وہ ہستی جو اس نے انتہائی سعی اور انہماک کے بعد خود اپنے ادیب دماغ سے پیدا کی تھی، صفیہ کی تحریر سے فنا ہو گئی، بلکہ اس کو یہ بھی اس امر کی تھی کہ دنیا نے اس جذبہ کو بالکل عریاں دیکھ لیا۔ انسان غلطی کرنے کے بعد دنیا کو فریب میں مبتلا رکھنا پسند کرتا ہے، لیکن یہ کبھی گوارا نہیں کرتا کہ دنیا پر اس کی غلطی ظاہر ہو جائے۔ اگر ذکی غور کرتا تو اس کو صفیہ کا ممنون ہونا چاہئے تھا کہ اس کی کارگاہ فریب جس کا نتیجہ یقیناً اچھا نہ ہوتا جلد درہم برہم ہو گئی لیکن اس نے صفیہ کی اس پاکبازی اور علوئے اخلاق کو حد درجہ خیرہ وفا شعاری بلکہ غداری سے تعبیر کیا اور انتہائی غم و غصہ کے عالم میں اس سے علیحدہ ہو گیا۔

وہ جس وقت کلکتہ پہونچا تو اس کا مقصود صرف یہ تھا کہ چند دن رہنے کے بعد یہاں سے کسی اور جگہ چلا جائے گا، لیکن بدبختی کہیے یا خوش بختی کہ اس نے قیام کیا وہاں کے ایک ایرانی خاندان میں اور ان لوگوں کی خاطر مدارات نے ایسا گھر کا سا سکون پیدا کر دیا کہ وہ اپنے اضطراب میں کچھ کمی محسوس کرنے لگا اور جس وقت ثمرہ (جو حقیقتاً اس خاندان کی جہر نیم روز تھی) انتہائی بے تکلفی کے ساتھ صبح کو اپنی نرم و شیریں آواز میں "آفندم، آفندم ذکی" یا "آقایم" یا "آغا ذکی" کہکر اس کے کمرہ کے دروازہ پر دستک دیتی تو اسے ایسا معلوم ہوتا جیسے برفباری کے زمانہ میں کوئی گرم شعاع سینہ سے گذر کر دل تک پہونچ رہی ہے اور وہ زندگی کی کسی نئی لذت سے آشنا ہو رہا ہے۔

ثمرہ اپنی تعلیم کے لحاظ معمولی چیز تھی، لیکن چونکہ ہندوستان کے ہر شخص کو فارسی بولنے والی عورت خواہ وہ کتنی ہی جاہل کیوں نہو سرنوشت کی بیٹی ہی معلوم ہوتی ہے، اس لئے جب کبھی ایرانی تہذیب کے مطابق وہ "جانم فدایت یا قربانت شوم" کے فقرے استعمال کرتی تو ذکی ہمہ تن عالم شعر و موسیقی میں غرق ہو جاتا اور ایسا محسوس کرتا کہ وہ اس سے بہت کمتر درجہ کا انسان ہے۔ اس دوران میں بارہا ذکی نے روانگی کا خیال ظاہر کیا، لیکن جس وقت وہ اس کے جواب میں ثمرہ کے میگوں لبوں سے "اقبالت مستدام، سرکار این چہ حرفی فرمائید" سن لیتا تو اس کے اعصاب میں سرخائی کیفیت پیدا ہو جاتی اور وہ پھر اسے "فدویانہ" نگاہوں سے دیکھ کر اس طرح خاموش ہو جاتا، گویا قوت گویائی اس سے چھین لی گئی ہے۔

ذکی فارسی اچھی جانتا تھا، بے تکلفی سے بول سکتا تھا اور ذوق شعری کے لحاظ سے وہ یقیناً بہت بلند چیز تھا، لیکن ثمرہ کو دیکھتے ہی اس کی طلاقت لسانی اور اس کی ادبیت سب کافور ہو جاتی تھی اور وہ حقیقی معنے میں بالکل عجمی (گونگا) بنکر رہ جاتا تھا۔ ہر چند کسی قسم کا لگاؤ اسے ثمرہ سے نہیں پیدا ہوا تھا، لیکن اس کی معیت میں وہ اپنے آپ کو بالکل نئی دنیا میں پاتا تھا اور تھوڑی دیر کے لئے اپنی گذشتہ معصوم زندگی

یا ذکر کے کشیدہ خاطر ہو جاتا۔ شمسہ کا اصلی وطن تو طہران تھا لیکن اس کا باپ بسلسلۂ تجارت کلکتہ آیا تھا اور پھر اس کو ایران واپس جانے کا موقع نہیں ملا۔ اس نے یہیں ایک ایرانی خاندان میں شادی کی جس سے شمسہ پیدا ہوئی۔ تجارت میں جب وہ کامیاب نہ ہوا تو اس نے ریلوے کے دفتر میں ملازمت کرلی، اور اپنے مکان کا ایک حصہ لوگوں کے قیام کے لئے مخصوص کر دیا۔ وہ قیام و طعام وغیرہ کے جملہ مصارف دس روپیہ روز کے حساب سے لیتا تھا اور چونکہ شمسہ کی ماں ضعیف ہو گئی تھی اس لئے گھر کا سارا انتظام مہمانوں کی نگہداشت، خاطر مدارات، سب شمسہ ہی کے سپرد تھی جسے وہ ایک یہودی خادمہ کی مدد سے پوری ذہانت کے ساتھ انجام دیتی تھی۔ یہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ شمسہ تعلیم کے لحاظ غیر معمولی چیز نہ تھی لیکن اپنی ذہانت کے اعتبار سے یقیناً وہ بڑی ذی دماغ تھی فارسی تو خیر اس کی مادری زبان ہی تھی۔ لیکن اردو میں بھی اسے ایک ادیبانہ ذوق حاصل تھا اور فارسی کی طرح اردو کے بھی اسے اچھے اچھے شعر یاد تھے، جنہیں وہ برجستگی کے ساتھ استعمال کرتی تھی اور یہی ایک چیز ایسی تھی جس نے اس کی تہذیب و شایستگی، اس کی خوش ادائی، اس کی شیریں گفتگو اور سب سے زیادہ "بادۂ سرجوش" کی طرح اس کے بھرپور شباب کے ساتھ ملکر ذکی کے لئے کافی اسباب تباہی پیدا کر دئے تھے اور اگر اپنی فطرت کے لحاظ سے وہ اس قدر محتاط و سنجیدہ نہ ہوتا اور کبھی کبھی صفیہ کا خیال اس کے کرب و ملال میں اضافہ نہ کر دیا کرتا تو غالباً وہ شمسہ کی دعوت شگفتگی کو اس سے بہت پہلے قبول کر لیتا۔ لیکن اس کی چوٹ سخت تھی اور تازہ اس لئے ابھی تک اس کی متشائم کیفیت دور نہیں ہوئی تھی اور اگر کہیں وہ شگفتگی کی طرف مایل ہوتا بھی تو دفعتہً اس کو ماضی کا خیال آجاتا اور مضمحل ہو کر رہجاتا۔

اول اول جب ذکی نے یہاں آکر قیام کیا تو شمسہ کی طرف سے سوائے معمولی اور رسمی مدارات کے کوئی خاص توجہ صرف نہیں کی گئی، لیکن جب اس کو معلوم ہو گیا کہ دولت کے لحاظ سے وہ ایک رئیس کی حیثیت رکھتا ہے تو پھر شمسہ کی تمام تابناکیوں کا مرکز سوائے ذکی کے اور کوئی نہ رہگیا اس نے اپنی خلوت و جلوت، اپنی صبح و شام اپنی زیبایش و آرایش، ذکی کی تالیف کے لئے وقف کر دی اور غلط بیانی ہوگی اگر کہا جائے کہ ذکی پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ آہستہ آہستہ لیکن پورے استحکام کے ساتھ اپنے مرکز سے ہٹتا جا رہا تھا اور جس وقت رات کو وہ خیر باد یا شب بخیر کہہ کر رخصت ہونا چاہتی تو بے اختیار اس کا جی چاہتا کہ ہات پکڑ کر اس کو بٹھالے اور کچھ دیر اور اس کی باتیں سنتا رہے۔ لیکن اس کی ہمت جواب دے جاتی اور وہ مسکراتی ہوئی، اپنے لچیلے بدن میں ناگن کے سے بل ڈالتی ہوئی، آخری مرتبہ دروازہ کھول کر انتہائی شوخی کے ساتھ اُسے جھانکتی اور غائب ہو جاتی۔

یہ تمام باتیں ایسی تھیں کہ اگر ذکی کی جگہ کوئی دوسرا شخص ہوتا تو کبھی کا دفتر تدبیر و مصلحت کو "غرق مے ناب" کر چکا ہوتا لیکن گذشتہ ایک ربع صدی کی راسخ صلاحیت جو ذکی کو وراثت و تربیت کے ذریعہ سے حاصل ہوئی تھی یوں دفعتہً نہیں ٹوٹ جا سکتی تھی۔ رات رات بھر اسکو یہی سوچتے گزر جاتی تھی کہ آخر یہ بے معنی زندگی کب تک بسر ہو سکے گی، اور اس رہبانیت کا نتیجہ کیا ہے لیکن اخیر میں کامیابی اس کے اخلاق ہی کو ہوتی تھی، یہانتک کہ جب شمسہ صبح کو اس کے لئے چاء کا سامان لاتی تو کبھی کبھی اس کے تیور بالکل اجنبی سے محسوس کرنے لگتی لیکن اس نے بھی ایک عزم کر لیا تھا اور وہ پھر اس کو اسی نقطہ پر کھینچکر لے آتی جہاں روزانہ اسے چھوڑ کر جاتی تھی

ایک دن، موسم بہت خوشگوار تھا، سامنے دریچہ سے نارنج کی خوشبو کمرہ کو معطر کئے ہوئے تھی اور شاما کا جوڑا صحن باغ کے گلاب پر آ آکر اپنی مست و شیریں آوازسے ذکی کے دل میں ہر مرتبہ ایک نیا ولولہ پیدا کر جاتا تھا۔ وہ دیر سے فلسفۂ حیات پر غور کر رہا تھا اور اس نتیجہ پر پہونچ رہا تھا کہ کہیں

حیاتِ دنشاط ایک ہی چیز کے دو نام تو نہیں ہیں۔ مسلمانوں کا یہ عقیدہ کہ "درِ توبہ ابھی بند نہیں ہوا" اگر ایک طرف دعوت و تبلیغ کا نہایت غایر فلسفہ اپنے اندر پنہاں رکھتا ہے، تو دوسری طرف اس میں نوید معصیت بھی شامل ہے اور ایک انسان اپنے ذوق و میلان کے لحاظ سے حسب ضرورت جس پہلو کو چاہے اختیار کر سکتا ہے۔ اس وقت ذکی کی رفتار خیال دوسرے پہلو کی طرف مایل تھی اور صرف "تجربہ و جستجو" کے بہانہ سے وہ ایک بار اپنے آپ کو ماحول کے سپرد کر دینا چاہتا تھا۔ اتفاق سے اسی وقت شمسہ آگئی اور ایسے غیر معمولی بانکپن کے ساتھ کہ غریب ذکی کی وہی حالت ہوگئی جیسے کوئی شخص ساحل سے پھسل رہا ہو اور پشت سے کوئی دھکا دیدے۔ آج شمسہ کی اٹھارویں سالگرہ تھی اور اہتمام کے لحاظ سے بھی واقعی اٹھارویں تھی، سر سے لیکر پاؤں تک رنگ و ریشم، عطر و خوشبو میں لپٹی ہوئی تھی، معلوم ہوتا تھا وہ کوئی تیتری ہے جو رات بھر پھولوں میں بسا کر صبح کو چھوڑ دی گئی ہے۔ وہ مذہباً گبر تھی اور آتش پرست لیکن آج تو وہ اپنے مذہب کی خدا یکسر شعلۂ جوالہ بنی ہوئی تھی۔ وہ مسکراتی ہوئی اکجاتی ہوئی اندر آئی اور بے اختیار ذکی کے منھ سے نکل گیا:۔

بہ آتشے ست کہ بر جان ما نہادی باز

اس نے بڑھ کر ذکی کے دامن کو بوسہ دیا اور بولی:۔

"مگر نشنیدہ ــــــ

اگر بہ سوزدت اے دل ز درد نالہ مکن

دم از محبت او میزن و بدرد بساز"

ساحل چھوٹ گیا تھا، ذکی کے قدم اکھڑ چکے تھے، سیلاب نے اسے گھیر لیا تھا، اور وہ ایک ایسے عالم میں جسے مدہوشی سے زیادہ بیہوشی کہنا زیادہ موزوں ہے شمسہ کے قدموں کی طرف کھنچا جا رہا تھا۔ اس نے شمسہ کا دامن تھام لیا اور انتہائی شیفتگی و ربودگی کے عالم میں کہہ اٹھا:۔

"ہر کمند کہ خواہی بگیر و باز م بند"

شمسہ نے شوخی سے فوراً دوسرا مصرعہ پڑھ دیا کہ:۔

"بشرط آنکہ ز کارم نظر نہ گیری باز"

اس سوال جواب سے ذکی اس وقت اپنے آپ کو جہانگیر اور شمسہ کو نورجہاں سمجھ رہا تھا، اور شام ہونے سے قبل حقیقی معنی میں وہ جہانگیر ہوگیا تھا اور شمسہ نورجہاں

(۶)

گذشتہ واقعہ کو ایک ماہ سے زیادہ زمانہ گذر گیا ہے اور ذکی نے ایک علحدہ کوٹھی شمسہ کے قیام کے لئے لے لی ہے۔ باپ کی جمع کی ہوئی دولت بیدردی کے ساتھ صرف ہو رہی ہے اور سوسائٹی میں شمسہ خانم کا وجود جذب مرکزی پیدا کرتا جا رہا ہے، رولس کار سواری کے لئے، زرکار پردوں اور قیمتی فرنیچر سے آراستہ مکان رہنے کے لئے، متعدد خادموں کی جماعت خدمت کے لئے، اسکاٹ لینڈ کی بہترین شراب لطف زندگی کیلئے اور بنک کی چیک بک ہر اس آرزو کی تکمیل کے لئے جس کا خیال بھی کبھی شمسہ کے دل میں نہ آسکتا تھا، اس کے پاس موجود تھی اور ذکی جس کو اپنی زندگی

میں اول مرتبہ یہ معلوم ہوا تھا کہ دولت اپنے اندر کیسے کیسے اسباب لذت و تفریح پنہاں رکھتی ہے، پانی کی طرح شمسہ کے قدموں پر بہا رہا تھا، اور سمجھتا تھا کہ شاید ابھی تک وہ اس نیم نگاہ کی بھی قیمت نہیں ادا کر سکا جو شمسہ اس پر کبھی کبھی صرف کر دیتی ہے۔ وہ خود بھی تمام اصول اخلاق و احتیاط کو بالائے طاق رکھ کر آزادی کے ساتھ ہر اس عشرت میں شریک تھا جس کی طرف کبھی اسکا ذہن بھی منتقل نہ ہوا تھا۔ اور جس وقت وہ نشۂ شراب میں شمسہ کے التفات پر نگاہ کرتا تو اس کے اندر جذبۂ ایثار اور زیادہ قوی ہو جاتا اور بے اختیار ہو کر پوچھ بیٹھتا کہ "میں کیونکر تمہارے اس احسان سے عہدہ برآ ہو سکتا ہوں"۔ شمسہ نہایت ہوشیاری سے اس کے ان جذبات کا مطالعہ کر رہی تھی اور آخر کار ایک دن جب کہ وہ پوری طرح اثرِ حسن و شراب سے متاثر ہو رہا تھا اس نے پوری لگاوٹ کے ساتھ اپنا وہ آخری حربہ استعمال کیا جس سے آسمان و زمین میں کہیں پناہ نہیں مل سکتی۔ عورت جب تک عالم عشق و محبت میں ہے، خواہ وہ ہنسے یا روئے، یکساں طور پر دل ڈبو دینے والی ہے، لیکن اگر وہ صرف محبت کی تمثیل کر رہی ہے تو غنیمت سمجھو جب تک وہ ہنستے کھیلتے تمہاری زندگی کو پر لطف بنا رہی ہے، ورنہ عورت کا وہ آنسو جو مکر و فریب کا نتیجہ ہوتے ہیں، ایک زبردست سیلاب اپنے اندر پنہاں رکھتے ہیں کہ مشکل ہی سے کوئی شخص ثابت قدم رہ سکتا ہے۔ اس وقت تک ذکی کی زندگی شمسہ کے ساتھ یکسر باغ و بہار کی طرح بسر ہوئی تھی اور وہ بالکل بھول گیا تھا کہ دنیا میں رنج و ملال کس کو کہتے ہیں، طرب و نشاط کا وہ دلفریب منظر جو تھوڑی دیر کے لئے انسان کو خدا بنا دیتا ہے۔ ذکی کے دل و دماغ پر اس طرح چھا گیا تھا کہ اس کا ردِّ عمل حد درجہ خطرناک ثابت ہوتا۔

رات کا وقت تھا، دریچوں سے ہلکی ہلکی خنک و معطر ہوا وھسکی کی ایک پوری بوتل سے چکر کھانے والے دماغ کو اور آسمان پر اڑائے لئے جا رہی تھی، ذکی پر ایسی مستی و سرخوشی کا عالم طاری تھا کہ اس سے قبل کبھی نہ ہوا تھا اور شمسہ زیبائش و آرایش کے اس بانکپن کے ساتھ جو کبھی اس میں پیدا نہ ہوا تھا، اپنی تمام نسائی لطافتیں و عنایتیں اس پر صرف کر رہی تھی کامیاب محبت کی باتیں مزے مزے سے ہو رہی تھیں کہ دفعۃً شمسہ ذکی کی آغوش سے علٰحدہ ہو کر کچھ سوچنے لگی اور پھر صوفا کے ایک جانب گردن ڈالکر رونے لگی۔ ذکی جس کی جدید حیات نشاط میں یہ بالکل پہلا تلخ منظر تھا، گھبرا گیا، پہلے تو چند منٹ تک شمسہ نے کوئی جواب ہی نہیں دیا لیکن جب ادھر سے اصرار و اضطراب کی حد ہو گئی تو آنسو پونچھتے ہوئے یا یوں کہئے کہ رومال میں عطرِ فتنہ "جذب کرتے ہوئے اٹھی اور بولی: "حیران ہوں کہ آپ کی ان غیر معمولی عنایتوں کو شکریہ کیوں کر ادا ہو سکتا ہے۔ آپ نے جو عزت مجھے دی۔ وہ میرے خواب و خیال سے زیادہ ہے اور میں ایسا محسوس کرتی ہوں کہ مجھے اب آپ کو زیادہ تکلیف دینے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے، جب تک میں اپنے آپ کو بھی خدمتگذاری کی اہل نہ ثابت کر دوں"۔

ذکی خواہ کتنا ہی آلودۂ عصیاں ہو لیکن چونکہ اس کی فطرت صالح تھی اس لئے شمسہ کے اخلاق کا اس نے یہ زبردست ثبوت دیکھ کر وہ بہت متاثر ہوا، اور بولا:-

"شمسہ یہ کیا کہہ رہی ہو۔ اگر تمہیں خدمت کرنے پر آجاؤ گی تو پھر دنیا میں مخدوم بنکر کون رہیگا، اور پھر یوں بھی جو تمہارے فرائض ہیں ان کو اس قدر تکمیل کے ساتھ انجام دے رہی ہو کہ اس سے زیادہ ممکن نہیں"۔

شمسہ:- میں دیکھ رہی ہوں کہ چند دن میں بہت بیکار روپیہ میرے اوپر ضایع ہوا اور میں چاہتی ہوں کہ اس کی تلافی کی جائے۔ پہلی صورت تو

یہ ہے کہ غیر ضروری مصارف کم کردیئے جائیں اور جو اس وقت تک صرف ہوچکا ہے اسکو کسی نئے طریقہ سے حاصل کیا جائے ۔"

ذکی :۔ "اس کی کیا صورت ہے"

شمسہ :۔ "آپ کو معلوم ہے کہ تجارت میرا خاندانی و آبائی پیشہ ہے اور اسی میں ترقی کرنا میرا نصب العین رہا ہے ، مجھے اس میں کافی تجربہ حاصل ہے اور کلکتہ کے بازار کا جس قدر غائر مطالعہ میں نے کیا ہے کوئی نہیں کرسکتا۔ کل ہی جو خبر مجھے معلوم ہوئی ہے ، وہ اسقدر کامیابی کی ہے کہ اگر دو لاکھ روپے میرے پاس ہوتے تو چند دن میں آپ کو یہاں کا "ملک التجار" بنا دیتی ـــــ اور ـــــ"

ذکی :۔ "دو لاکھ روپیہ نقد تو موجود نہیں ہے ، لیکن اس کی فراہمی زیادہ دشوار بھی نہیں۔ اگر تم ایک ہفتہ کی مہلت دو ، تو میں جائداد گرو کرکے لا سکتا ہوں ۔"

شمسہ :۔ یہ سنکر کچھ خاموش ہوئی اور بولی کہ "نہیں یہ مناسب نہیں معلوم ہوتا ، اچھا اس خیال کو جانے دیجئے۔ میری ہزاروں آرزوئیں پوری ہوچکی ہیں ، ایک پوری نہ ہوئی تو کیا ۔"

یہ کہکر اس نے افسردگی کے ساتھ ٹھنڈی سانس لی اور ایک طرف گردن ڈالکر خاموش ہوگئی ۔

ذکی جس نے اس وقت تک شمسہ کو ملول و حزین دیکھنے کی تکلیف برداشت نہیں کی تھی ، بیتاب ہوگیا اور اس خیال سے نہیں کہ وہ ملک التجار ہو جائے گا ، بلکہ صرف اس بنا پر کہ اس طرح شمسہ کی تمنا پوری ہوگی ، وہاں سے اٹھا اور جلدی جلدی اسباب سفر درست کرکے اسٹیشن پہونچا اور دوسرے دن ایک ہندو مہاجن سے گفتگو کرکے چوتھے دن دو لاکھ کی رقم شمسہ کے نام سے بنک میں جمع کردی اور بنک کی کتاب مع چک بک کے اس کے آغوش میں جاکر ڈالدی ۔

(۷)

اس واقعہ کو پندرہ دن گزر چکے ہیں اور ذکی نے شمسہ کے طرز عمل میں بظاہر اس سے زیادہ کوئی تغیر محسوس نہیں کیا کہ وہ بہ نسبت پہلے کے گھر سے زیادہ غیر حاضر رہنے لگی ہے ۔ ایک آدھ بار اس کا ذکر آیا بھی تو اس نے تجارتی تدابیر کا بہانہ کرکے ٹالدیا اور یہ بھی خاموش ہو رہا لیکن اس کے ساتھ یہ امر ضرور ذکی کے لئے باعث تکلیف ہوتا جا رہا تھا کہ اس کے احباب کا حلقہ وسیع ہوتا جا رہا ہے اور بہ نسبت پہلے کے تحائف و ہدایا کی تعداد میں بھی خاصہ اضافہ نظر آتا ہے ذکی فطرتاً رشک کرنے والی طبیعت نہ رکھتا تھا یا یوں کہئے کہ جب تک شمسہ نے اپنی تمام دلداریاں صرف اسی کے لئے مخصوص رکھیں ، اس نے پرواہ نہیں کی کہ کون آتا ہے اور کون جاتا ہے لیکن جب اس کی توجہ ہٹی تو اس کو بھی اس کا احساس شروع ہوا ، اور نہایت ہی خفی قسم کے برہمی کے آثار اس کے چہرہ سے ظاہر ہونے لگے ۔

پہلے شمسہ کو دونوں وقت ذکی کے ساتھ کھانا کھانا لازم تھا ، لیکن اب رات کا کھانا وہ مستقلاً باہر کھانے لگی تھی اور اگر کبھی ذکی نے اس کی شکایت کی تو ہنسکر ٹالدیا ، یا اپنے افسوں کا اثر قایم رکھنے کے لئے چلتے چلتے ایک آدھ غمزہ صرف کردیا ۔

کامل ایک ماہ تک ذکی شمسہ کی حالت کا مطالعہ کرتا رہا اور اس کی اجنبیت کو جس میں روز کچھ نہ کچھ اضافہ ہو رہا تھا بغور دیکھتا رہا ۔ ایک شام جبکہ وہ باہر جانے کے لئے بہترین ملبوس اور اپنے تمام قیمتی زیور نکال رہی تھی ، ذکی آہستہ آہستہ اس کے کمرہ میں گیا اور بولا شمسہ

مجھے تم سے کچھ کہنا ہے، تھوڑی سی شکایت کرنا ہے، تم کپڑے پہنتی رہو، میں آڑ سے کہتا رہوں گا اور تم جواب دیتی رہنا" شمسہ نے جو کسی زیور کے نہ ملنے سے جھنجھلا رہی تھی، غضب آلود نگاہوں سے ذکی کو دیکھا اور پھر اپنے کام میں مصروف ہوگئی۔

ذکی نے پھر اس کو مخاطب کیا لیکن اس استفسار کے ساتھ کہ "آج کہاں کی تیاری ہے"

شمسہ "عقد پروین کلب میں جلسہ ہے اور مجھے بہترین تقریر پر انعام دینا ہے۔ معاف کیجئے اس وقت بہت مصروف ہوں۔ کل میں آپ کی تمام شکایتیں دور کردوں گی"

شمسہ کے لب و لہجہ میں کچھ ایسی برودت تھی کہ ذکی کو سخت صدمہ پہونچا اور اس نے ارادہ کیا کہ آج اس کی تحقیق ضروری ہے کہ عقد پروین کلب جارہی ہے یا کہیں اور۔ یہ سوچکر وہ واپس آیا اور پہلے سے کپڑے پہن کر باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر میں وہ موٹر پر سوار ہوکر بنگلہ سے باہر آئی، اور ذکی بھی ایک ٹیکسی پر بیٹھ کر اس کے پیچھے روانہ ہوگیا۔ لیکن ذکی کے غم و غصہ و حیرت و استعجاب کی انتہا نہ رہی جب اس نے شمسہ کو بجائے عقد پروین کلب کے گرانڈ ہوٹل میں جاتے دیکھا اور وہاں سے وہ ایک نوجوان شخص کو لیکر جسے وہ بالکل نہیں پہچانتا تھا، ایڈن گارڈن کی طرف چلدی۔

ذکی لاکھ متین و سنجیدہ سہی، لیکن پھر بھی اس کی رگوں میں شریف خون دوڑ رہا تھا۔ یہ دیکھ کر انگاروں پر لوٹنے لگا اور کامل دو گھنٹے جبتک وہ اپنے محبوب کو لیکر باغ کے کنجوں سے باہر نہیں آئی یہ ہزاروں تجویز بنا بناکر بگاڑتا رہا، حتے کہ یہ ایک عزم راسخ کرکے اس طرف بڑھا جہاں شمسہ کا موٹر کھڑا ہوا تھا اور ٹھیک اس وقت جبکہ یہ دونوں دروازہ کھولکر اندر بیٹھنے والے تھے یہ بھی پہونچ گیا۔ شمسہ اس کو دیکھ کر سہم گئی اور اس کا محبوب تھر تھر کانپنے لگا۔ ذکی نے جیب سے بجلی کا لمپ نکالکر ان دونوں کے چہرہ پر روشنی ڈالی اور پھر اسے گل کرکے نہایت ادب سے سر جھکا کر شمسہ سے پوچھا کہ کیا عقد پروین کلب میں آپ نے اسی نوجوان کو بہترین تقریر پر یہ انعام دیا ہے جس سے زیادہ قیمتی چیز آپ اور کچھ نہ دسکتی تھیں۔ افسوس ہے کہ میرے پاس آئینہ نہیں ورنہ میں آپ کو دکھاتا کہ میں آپ کو کیا دیکھ رہا ہوں۔ (نوجوان سے مخاطب ہوکر) کیا آپ خود اپنی تعریف کرسکتے ہیں (شمسہ سے) کچھ آپ ہی فرمائیے۔

شمسہ اپنا اضطراب دور کرچکی تھی اور یہ معلوم کرکے کہ اب پردہ اٹھ گیا، اور تاویل سے تلافی ممکن نہیں، اس نے اپنے بطون کو دفعۃً بے نقاب کردیا اور بپھر کر بولی کہ "آپ کو میری آزادی میں دخل دینے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ حیرت ہے کہ آپ آج اس بات کو دیکھ رہے ہیں جسکو اس سے قبل دیکھنا چاہئے تھا۔ میرے راستہ میں حائل ہونے کی ضرورت نہیں اور اس وقت سے میرے اور آپ کے درمیان کوئی تعلق نہیں۔" یہ کہکر اس نے ذکی کو اسی جگہ حیران و مبہوت چھوڑ دیا اور اپنے محبوب کا ہاتھ پکڑ کے موٹر میں بیٹھی اور چلدی۔

(۸)

پندرہ روز سے جو ہذیانی تپ کا دورہ ذکی پر پڑا تو کسی طرح کم ہونے میں نہیں آتا۔ اگر کسی وقت کچھ ہوش بھی آجاتا ہے تو اس سے زیادہ نہیں کہ وہ صفیہ کو پہچاننے کی کوشش کرتا ہے، لیکن جب اس کا واہمہ اسے شمسہ کی صورت میں اسے پیش کرتا ہے تو پھر آنکھیں بند کرکے ایک کراہ کیساتھ منھ پھیر لیتا ہے۔

جس وقت ذکی کا تار ملنے پر عزیزہ صفیہ کا بھائی کلکتہ گیا ہے تو اس کی حالت اس قدر خراب نہ تھی اور کسی نہ کسی طرح وہ اس کو اپنے گھر تک

آیا تھا، لیکن یہاں آنے کے بعد دوسرے ہفتہ سے جو شدت مرض کی ہوئی تو بڑھتی ہی رہی۔

عزیز ایک دفتر میں ساٹھ روپیہ ماہوار ملازم تھا اور اپنی بیوہ ماں اور بہن (صفیہ) کی کفالت کا ذمہ دار تھا، اسی خیال سے اس نے شادی بھی نہیں کی تھی کہ وہ اس سے زیادہ بار کا متحمل نہ ہو سکتا تھا، ذکی کی مالی حالت اسقدر سقیم ہو چکی تھی کہ اگر عزیز اسے کلکتہ جا کر نہ لے آتا تو وہ خود کرایہ تک ادا نہ کر سکتا۔

علاج کے مصارف بہت زیادہ تھے مگر عزیز قرض وام سے اور صفیہ اپنے زیور بیچکر (جو دو چار اس کے پاس تھے) ان کو برداشت کر رہے تھے۔ فکرمند ہر شخص تھا، لیکن صفیہ کی حالت بہت دردناک تھی، وہ گذشتہ ۶ ماہ کے اندر جب سے ذکی اس کو چھوڑ کر چلا گیا تھا شب و روز ہر وقت اسی کی یاد میں محو رہتی تھی اور ایک خاموش پجارن کی طرح دل ہی دل میں اس کی پرستش کر رہی تھی، ہر چند وہ بالکل بے خبر تھی کہ ذکی کہاں اور کس عالم میں ہے، لیکن اسے یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن وہ ضرور آئے گا اور گذشتہ عہدِ الم کی پوری تلافی ہو جائے گی، مگر وہ اس سے آگاہ نہ تھی کہ اب ذکی ملے گا بھی تو اس حال میں کہ اس کی زندگی خطرہ میں ہوگی، عزت خاک میں مل چکی ہوگی اور دولت و جایداد بالکل تباہ و برباد۔ عزیز کی زبانی اسے تمام وہ حالات معلوم ہو گئے تھے جو اس نے کلکتہ میں سنے تھے، لیکن اب نہ اسے ان رسوائیوں کا خیال تھا، نہ عسرت و افلاس کا بلکہ وہ تڑپ رہی تھی اس کے لئے کہ کسی طرح وہ اس مرض سے جانبر ہو جائے اور اسے پھر اس کی خدمت کا موقع ہاتھ آئے۔

ایک ایک کرکے امید و بیم کے چالیس دن گذر گئے ہیں اور ذکی جو بالکل اپنے جسم کا سایہ سا معلوم ہوتا ہے، بے حس و حرکت لیکن تپ میں مبتلا پڑا ہوا ہے۔ صفیہ پاس بیٹھی ہوئی رو رہی ہے اور عزیز بھی مایوسی کی حالت میں باہر کمرہ میں افسردہ و خاموش بیٹھا ہے آج کامل ایک ہفتہ سے صفیہ کی آنکھ سے آنکھ نہیں لگی، سوائے چند گھونٹ پانی کے کھیل تک اس کے منھ میں اڑ کر نہیں گئی، لیکن محبت کی وہ آگ جو تھوڑی دیر کے لئے مردہ میں بھی جان ڈالدیتی ہے، اس کے اندر بھڑک رہی تھی اور وہ بغیر کوئی تکان محسوس کئے ہوئے ذکی کی تیمارداری میں مصروف تھی۔

آدھی رات گذر چکی تھی اور صفیہ تنہا بیٹھی ہوئی گھڑی گھڑی اس کا جسم دیکھتی جاتی تھی کہ دفعۃً ۲ بجے کے قریب اس نے ایسا محسوس کیا کہ بدن اتنا گرم نہیں ہے اور پیاس کی شدت میں بھی کمی ہے۔ دس منٹ کے بعد پھر اس نے دیکھا۔ پانچ منٹ نہ گذرے تھے کہ پھر اس نے نبض پر ہاتھ رکھا، یہاں تک کہ اب وہ ہر منٹ پر اس کا جسم دیکھتی تھی اور جب صبح ہوتے اس کو یقین ہو گیا کہ بخار واقعی کم ہو رہا ہے، تو ایک ایسی مسرت کے ساتھ جو دنیا میں کبھی اس کو حاصل نہ ہوئی تھی دوڑتی ہوئی عزیز کے پاس گئی اور کہا کہ جا کر فوراً ڈاکٹر کو لاؤ۔ ڈاکٹر آیا تو اس نے دیکھکر کہا کہ آج اکتالیسواں دن ہے اور بخار شام تک اتر جائے گا، لیکن کمزوری اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ وہ خود مرض بن گئی ہے اس خبر نے صفیہ پر جو اثر کیا وہ بارش خشک کھیتی پر بھی نہیں کرتی۔ اس مژدہ نے اس کے حوصلوں میں جان ڈالدی امیدوں نے پھر خون کو رگوں میں دوڑا دیا، اور گھر کی سوگوارانہ حالت دفعۃً مسرت سے تبدیل ہو گئی۔

. . . .

. . . .

ذکی:۔ "آپ جانتی ہیں کہ میں آپ کا کوئی نہیں"

صفیہ: "میں جانتی ہوں کہ آپ میرے سب کچھ ہیں اور مجھے آپ کی بیوی ہونے کا فخر حاصل ہے"

ذکی: "غلط، نہ آپ اس وقت تک حقیقی معنی میں میری بیوی تھیں اور نہ میں آپ کا شوہر، لیکن آج رات کی اس تنہائی میں آسمان کے تاروں کو، فضا کے سکوت کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ میں اس وقت آپ سے پھر نکاح کرتا ہوں اور یہی میرا "ازدواج مکرر" حقیقی ازدواج ہے جس کے ذریعہ سے میں اپنے آپ کو صفیہ کی پرستش کے لئے وقف کرتا ہوں اور......"

صفیہ نے ہنسکر ذکی کے منھ پر ہات رکھدیا اور بولی کہ دیکھئے آپ پھر اس ہیجان کے ساتھ شاعری کو ملائے دیتے ہیں اور مجھے پھر ڈر معلوم ہوتا ہے کہ........"

اس مرتبہ ذکی نے صفیہ کا منھ بند کردیا، لیکن ہات سے نہیں ——— !

نیاز

ارہر کا کھیت !

وہ گلیاں یاد آتی ہیں جوانی جنمیں کھوئی ہے

دیہات میں ارہر کے کھیت کو وہی اہمیت حاصل ہے، جو ہائڈ پارک کو لندن میں ہے۔ دیہات اور دیہاتیوں کے سارے فرائض منصبی احتیاجات فطری، اور حادثات معاشرتی میں پیش آتے ہیں۔ ہائڈ پارک کے خطیب مشہور ہیں، لیکن لوگوں کو نہیں معلوم کہ اسکی داغ بیل ہندوستان کے ارہر کے کھیت ہی میں پڑی تھی

پارلیمنٹ اور کونسلوں کی تیرہ تیر اور چیرہ جوان دنوں "رقص پروانہ" اور "پرفشانی شمع" سے زیادہ گرمی محفل کا باعث تصور کی جاتی ہیں وہ صدا ہائے بازگشت ہیں جو شاید سب سے پہلے کسی اکبر الصوت نے ارہر کے کھیت سے بلند کی تھیں۔ ہائڈ پارک کی خوش فعلیاں اکثر آرٹ یا اس کی نمایاں بندی پر ختم ہو جاتی ہیں۔ لیکن ارہر کے کھیت کی عریانیاں اکثر واٹر لو پر تمام ہوتی ہیں۔ یورپ کی عورتوں کو حقوق طلبی کا خیال بہت بعد میں پیدا ہوا لیکن ارہر کے کھیت میں کتنی گاؤں والیاں مسز پنکھرسٹ کی پیشرو گذر چکی ہیں۔ یہ دیہاتیوں کی اسمبلی ہے جہاں عورتوں اور بچوں کو گاؤں کی انتظامی حکومت میں اتنا ہی دخل ہوتا ہے جتنا ہندوستانی پارلیمنٹ میں اراکین پارلیمنٹ کو۔ دونوں بولتے ہیں، ضد کرتے ہیں جھگڑتے ہیں، روتے ہیں اور اپنے گھر کا راستہ لیتے ہیں۔ دیہاتی عورتیں اور بچے کچھ اور مفید کام کر جاتے ہیں، جس سے ان کو اور کھیت دونوں کو فائدہ پہونچتا ہے اور ہندوستانی اراکین پارلیمنٹ وہ کرتے ہیں جس سے ان کو اور ہندوستان دونوں کو نقصان پہونچتا ہے، ایک تقاضائے حاجت کرتا ہے اور دوسرا ——— نان کوآپریشن

شام کا دھندلکا اور گاؤں کا دھواں گہر آلود ہو کر پھیلنے لگتا ہے۔ کتے بھونکنے لگتے ہیں۔ کسان اور ان کے تھکے ہوئے مویشی ایک دوسرے سے سرگوشی کرتے ہوئے دیہات کو واپس ہوتے ہیں گویا دونوں ایک ہی مسئلہ پر غور کر رہے ہیں۔ یعنی گھر پہونچکر کھانا ملے کا، سونے کو ملے گا اور عافیت ملے گی۔ ان کے مقابلہ میں دن کی محنت ہر حیثیت سے دلآویز تھی۔ اور دوسرے دن کی مشقت خوش آیند۔ مویشی اور مالک دونوں کا خاندان ایک ہی ہوتا ہے، کسان کی بیوی، اس کے بچے بچیاں اور اسکا بوسیدہ جھونپڑا، کسان کے لئے اتنا ہی عزیز ہوتے ہیں جتنا خود مویشی کے لئے۔ کسان اور مویشی دونوں ایک دوسرے پر اعتماد کرتے ہیں، اس لئے زندگی کے نشیب و فراز سے بے خبر یا مستغنی ہوتے ہیں۔ غرض کسان کتنا ہی فلاکت زدہ کیوں نہ ہو وہ آجکل کے روشن خیال میاں بیویوں سے زیادہ خوش قسمت ہے۔ خوش قسمت نہیں تو مسرور سہی !

لیکن وہ دیکھئے کہ، گاؤں کے قریب والے کوئیں کے سامنے سے ایک راستہ کھیت کی سمت گیا ہے، ایک طرف گڑھا سا ہے جس میں کھاد پڑی ہوئی ہے، دوسری طرف ایک ببول کا کھوکھلا پرانا درخت ہے۔ جیسے کوئی ہشتاد سالہ ڈکٹوریہ کراس تمغہ یافتہ، پیر ایک آدھ شب زندہ دار یہ

اس طور سے بیٹھے ہوئے گرد و پیش کا جائزہ لے رہے تھے جیسے جنگِ عظیم کے اختتام پر یورپ کے بعض فرزندانِ قسمت شاخ زریں پر بیٹھے ہوئے گرد و پیش کا جائزہ لے رہے تھے۔ عورتوں کی کچھ تعداد کوئیں پر جمع ہوئی۔ یہاں کچھ دیر تک مزید کمک کا انتظار کیا گیا۔ ان میں جو جوان تھیں۔ پرشباب لیکن بے خطر کوئیں کی جگت پر تھیں یا دس لٹکائے ہوئے کچھ گنگناتی ہوئی یا بوڑھیوں کو دعوت تندید و عتاب دیتی ہوئی۔ کچھ بوڑھیاں تھیں جو جگت کے نیچے بیٹھی ہوئی کراہ رہی تھیں، گالیاں دے رہی تھیں اور کھانستی جاتی تھیں۔ اتنے میں ایک اور گروہ آ پہونچا، نوجوان جگت پر بیٹھنے والیوں نے اپنی ہجولیوں کا شوخی و طراری سے، اور بوڑھیوں نے کوسنے، گالی اور کھانسی سے خیر مقدم کیا۔ آخری قطار میں ایک دوسرے کے پیچھے پر مجمع کھیت کی پگڈنڈی پر ہو لیا جسموں کو تولتے ہوئے۔ نوجوان لڑکھڑاتیں تو ایک ہلکی سی چیخ اور بلند قہقہہ کے ساتھ سنبھل جاتیں۔ بوڑھیوں کا قدم ڈگمگاتا تو زمیندار اور کسان جس کا کھیت حاشیہ پر ہوتا، موسم، پاس کا لڑکا یا لڑکی یا قہقہہ لگانے والی عورت گالیاں سنتی ۔۔۔۔ یہ مہم چلتے چلتے ایک تاریک ناقابلِ گذار، اندیشہ ناک اور خاردار سدِ راہ کے سامنے رک گئی۔ یہ دیہاتی تخیم کے قلعے تھے

برسوں گذرے ہیں اس دشت کی سیاحی میں

لیکن بعض ثقات جس کا شاید نام لینے سے گھبرائیں ۔۔۔۔۔۔ ارہر کا کھیت!

ناظرین سمجھ گئے ہوں گے یہ لشکر کس مہم پر روانہ ہوا تھا۔ یہاں وہ سب کچھ ہوگا جس کے لئے ہم جوتے یا مار کھاتے ہیں۔ یہیں سے شاعری کا اختتام اور تعزیراتِ ہند کا آغاز ہوتا ہے۔ یہیں حفظانِ صحت کے جراثیم ملتے ہیں۔ یہاں آنے پر معلوم ہوگا کہ بہت سے منچلے یا مظلوم پہلے سے پہونچ چکے ہیں کسی کا "آرام جاں" اور "مونسِ قلب" بچھڑ گیا ہے وہ اس کے لئے افتاں و خیزاں یہاں تک پہونچا ہے اور کسی سے وعدۂ دید و اندک کے مزید کا قول و قرار ہے، وہ سراپا شوق چلا آ رہا ہے، اور ۔۔۔۔۔ کسی کا گدھا کھو گیا ہے، وہ بھی بھٹکتا ہوا آن پہونچا ہے۔ یہ اس بھول بھلیاں کا کرشمہ ہے کہ بچھڑے یہاں ضرور ملتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کبھی گدھے والے کے ہاتھ عشاق کی گردن پر ہوتا ہے یا خود گدھا کسی محبوبہ کے پہلو میں۔ آخر یورپ کے ازمنۂ وسطےٰ میں (masqurade) ماسکوریڈ یا جشن "نقاب پوشی" کیا تھا جس پر یورپ والے ناز کرتے ہیں اور ہم روتے ہیں، یا گالیاں دیتے ہیں۔ ہندوستان کی سرزمین صرف دو چیزوں کے لئے موزوں ہے، مہابھارت یا ارہر کا کھیت، مہابھارت تو شاید اختتام پر ہے، سائمن کمیشن کی سفارش اور ارہر کے کھیت کا اور انتظار ہے!

جوانی کا کھونا اور وہ بھی ارہر کے کھیت میں، ایسا مسئلہ ہے جس پر ناک بھوں پر زور دینے سے پہلے، دل و دماغ پر زور دینا زیادہ ضروری ہے ہندوستان میں جوانی کا انجام دو طریقوں پر ہوتا ہے۔ اکثر شفاخانہ میں ورنہ جیلخانہ میں۔ جیلخانہ کا راستہ تو اکثر ارہر کے کھیت ہی سے گذرتا ہے اور شفاخانہ کا شہروں کی صاف، شفاف سڑکوں سے جس سے موٹر بھی گذرتے ہیں اور مولوی بھی۔ یہ ہندوستان کی بدنصیبی ہے کہ ہمارے نوجوانوں نے اسرافِ شباب کے لئے شفاخانوں کو جیلخانوں پر ترجیح دی۔ زندگی کے [illegible] نے نشتر سے زیادہ جیلخانہ کے ڈنڈے میں [illegible] جا سکتے ہیں۔ شفاخانہ سے زندگی اور جیلخانہ سے موت گھبراتی ہے۔

شباب اور مفلسی کا اجتماع اتنا ہی بے کیف ہے جتنا بے مرچوں کا سالن یا بے تمباکو کا پان، مانا، کہ مرچ اور تمباکو مضر صحت ہیں لیکن تندرستی کا معرف تحفظ تندرستی نہیں بلکہ اس سے لطف اندوز ہونا ہے۔ شباب میں پیرانہ سالی کا لطف (اگر اسے لطف کہہ سکتے ہیں) اٹھانا ممکن ہے لیکن پیرانہ سالی میں شباب کا کیف کیسے پیدا کیا جاسکتا ہے۔ شباب اور پیری دونوں حالات منتظرہ ہیں، ایک کا مقصود "انتظار دشمن ایمان و آگہی" یا "رہزن تمکین و ہوش" ہے دوسرے کا ———— ؟

لیکن یہ ستم ظریفی ہندوستان کے مطالبہ آزادی سے زیادہ دلچسپ ہے کہ شباب ایک طرف تو عقل سے شرمسار ہونے پر ضد کرتا ہے اور دوسری طرف سب کا انتقام بھی پورا پورا لیتا ہے۔

ارہر کے کھیت میں عقل سے شرمساری کی نوبت آتی ہے تو گاؤں والے بسولے سے کام لیتے ہیں اور عدالت رندے سے خبر لیتی ہے، کسی منچلے شہری کا ارہر کے کھیت میں دیہاتیوں کے ہاتھ سے مار کھانا اتنا ہی دلچسپ اور شاید عبرت آمیز منظر ہے جتنا کسی پبلک مشاعرہ میں، بھلے مانس شاعر کا اپنا کلام سنانا!

دیہاتی سمجھتا ہے کہ جب تک زمیندار اور پٹواری موجود ہیں اس کی ساری ملکیت منقولہ ہے الّا عورت، شہری اس کا قائل ہے کہ جب تک یورپ اور دولت حق و قائم ہیں اس وقت تک سب کچھ غیر منقولہ ہے الّا عورت۔ دیہاتی عورت کو مایۂ عزت سمجھتا ہے، اور شہری آلۂ تفریح۔ دیہاتی کے نزدیک عورت کا مفہوم یہ ہے کہ وہ اس کا مکان ہے جہاں وہ ہنستا ہے، بولتا ہے، آرام کرتا ہے پناہ لیتا ہے اور کشاکش حیات سے عہدہ برآ ہونے کے لئے تازہ دم ہوکر نکلتا ہے۔ تعلیمیافتہ کے نزدیک عورت ایک عضویاتی ضرورت ہے یا ایک وسیلۂ تفننؔ جس کیلئے اس نے چوپاٹی اور اپالو تعمیر کیا ہے۔ دیہاتی پناہ اور آرام چاہتا ہے، شہری صرف غم غلط کرنا چاہتا ہے، دیہاتی کے یہاں محنت دیانت اور عورت ہے، شہری بھی عورت کا طالب ہوتا ہے، لیکن محنت و دیانت سے نہیں، بلکہ مکر و دولت سے آج چوپاٹی اور اپالو در بُرد ہو جائیں تو وہ جلد سے جلد کوئی اور چوپاٹی، اور اپالو تعمیر کرے گا، کسان کے جھونپڑے پر یہ آفت آئے تو یہاں سطح آب پر اپالو اور چوپاٹی کی خس و خاشاک یا گندگی نظر نہیں آسکتی بلکہ موجوں کے ساتھ ایک خفیف سی ہلکی رنگین تحریر ———— ! چوپاٹی اور اپالو کی تعمیر دولت اور مشین سے ہوتی ہے، یہ ایک لحظہ میں تعمیر ہوتے ہیں اور اپنے تعمیر کرنے والوں کی دولت اور حسن کی مانند ایک لحظہ میں فنا ہو جاتے ہیں، جھونپڑا نسلوں کی تعمیر ہے اور نسلوں کے فنا ہو جانے کے بعد بھی قایم رہتا ہے!

ارہر کا کھیت دیہات کی زنانہ پالیمنٹ ہے، کونسل اور اسمبلی کا صور یہیں سے پھونکا گیا تھا۔ گاؤں کا چھوٹا بڑا واقعہ سب یہاں معرض بحث میں آتا ہے۔ فلاں کی شادی کب اور کہاں ہو رہی ہے، داروغہ جی کیوں آئے اور کیا لیکر گئے۔ پٹواری کی بیوی نے اس سال کون کون سے نئے زیور بنوائے۔ رکمنیا کے بچہ کیوں نہیں پیدا ہوتا، او سکھیا کو حمل کیسے ٹھیرا، ایک نے کہا میری گائے کے بچھیا ہو گی، دوسری بولی پہلوٹی کی بچھیا ہو چکی ہے، ایکے بچھوا ہو گا، اسپر اختلاف آرا ہوا، اور ہندوستانی لیڈروں کی طرح دونوں بھول گئیں کہ ہم دراصل کس شغل میں مصروف تھے، اور اب کیا ہو رہا ہے،

اندھیرے میں گالی گلوج موثر نہیں ہوتی، دونوں آگے بڑھیں، ایک کا پاؤں اور دوسرے کا ہاتھ "لعوق حفظان الصحت" پر پڑا اور پڑتے ہی غصہ کا سیلاب دوسری جانب مائل ہو گیا، دونوں یکلخت اس نتیجہ پر پہونچیں کہ منیا کے زچہ کے ملندیا کا فیل تھا، دونوں نے ملندیا کو بآہنگ دہل کوسا، یہ گویا منیا کو اعلان جنگ تھا، منیا نے بیٹھے ہی بیٹھے للکارا، ملندیا گھبرا کر اپنی ماں کی تلاش میں بھاگا تو فریقین اول میں سے کسی کے دھکے جا گرا، دونوں چیخ پڑیں، منیا نے مار ڈالا، اب کیا تھا، سب نے اپنا اپنا شغل جہاں کا تہاں چھوڑا، نہ "مخشک طہارت" کا خیال رہا نہ تر نجاست کا، ایک غوغا بلند ہوا، بھگدڑ مچ گئی، کھیت کے چاروں طرف سے لوگ نکلنے لگے، مرد، عورت، بچے، گیدڑ، کتے، بھیڑیں، لومڑی، نیولا، بن بلاؤ ——— گویا اسمبلی میں بم گرا!

ایک روز ہمکو یکلخت معلوم ہوا کہ ہم کوئی نصف گھنٹہ مقررہ وقت سے پہلے کلاس پہونچ گئے ہیں۔ بحیثیت لکچرار کلاس میں تنہا پایا جانا، پانے والے کے لئے اتنا ہی دلچسپ اور بصیرت افروز ہے، جتنا کسی آثار قدیمہ دریافت کرنے والے کو ایک لاکھ برس قدیم آنجہانی گینڈے کا ڈھانچہ مل گیا ہو۔ ایسی حالت میں ہر اس گذر جانے والے کو مخاطب کرنا اور طوعاً و کرہاً اس سے اظہار خلوص یا برتری کرنا ضروری ہو جاتا ہے جس کے متعلق یہ اندیشہ ہو کہ یہ ہماری ہیئت کذائی پر سوچنے کا اہل ہے۔ اس اثنا میں ایک کتا سامنے سے گذرا، اور ہمنے بیٹھے ہی بیٹھے ایسی ڈانٹ بتائی اور آمادہ "نقص امن" ہوئے گویا اردو پڑھانے کے ساتھ ساتھ یونیورسٹی نے ہم کو کتوں کے استیصال کے لئے تھانہ دار بنا دیا تھا۔ اتنے میں ایک بھشتی گذرا اور ہمنے انتہائی سرپرستانہ لہجہ میں پوچھا، کیوں اس طرف کا دروازہ کھل جانے سے تم لوگوں کو طے مسافت میں بڑی آسانی ہو گئی ہوگی، اس نے نہایت انکسار اور تشکرانہ انداز میں ہامی بھری، ابھی یہ رسمی تکلفات ختم ہوئے تھے کہ ایک خوانچہ والا سامنے آگیا، بولا، میاں اس دروازہ کی کنجی آپ ہی کے پاس رہتی ہے، دروازہ کھلنے سے بڑا آرام ہو گیا۔ (خوانچہ کے اندر، جو ابھی سر ہی پر رکھا ہوا تھا، کچھ ٹٹولتے ہوئے) خدا آپ کو سلامت رکھے، یہ لیجئے بریلی کا بڑا تحفہ امرود ہے۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ حکام یونیورسٹی نے معلمین کے لئے کس مصلحت کی بنا پر گاؤن پہننا لازمی کر دیا ہے۔ لیکن ابھی ہمارا غصہ اور سکوت، خوانچہ والے اور "بریلی کے تحفہ امرود" کے درمیان پورے طور پر متوازن نہیں ہونے پایا تھا کہ ایکطرف سے "حاجی بلغ العلی" کچھ گنگناتے ہوئے اس طور پر جھپٹتے ہوئے نکلے گویا کملی اور داڑھی کے علاوہ

عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے!

حاجی صاحب کا عربی نام "بلغ العلی" اور فارسی "جریب زیتونی" ہے۔ کچھ لوگ "سابق دیوانہ ہمدرد" اور حال "ابو الجنون" کہتے ہیں کچھ دنوں "وحشت البرایہ" پر زور لگاتے رہے اندنوں "قانون مسعودی" کا ترجمہ کر رہے ہیں۔ اس کے بعد کا پتہ نہیں کہ اب جنون کی کیا حالت ہے۔

ملتے ہی فرمانے لگے، جلدی سناؤ جلدی، میں نے کہا کیا، فرمایا کوئی اچھا سا شعر، میں نے کہا سنئے:—

وہ تری گلی کی قیامتیں کہ لحد سے مردے نکل پڑے
یہ مری جبین نیاز تھی کہ جہاں دھری تھی دھری رہی

گردن ہلا کر، بجلوہ ریزی "کملی" و "برپرفشانی" ریش، اپنے سکوت کا ثبوت دیا،

میں نے کہا کوئی موضوع بتائیے تو مضمون لکھوں. فرمایا:

”ارہر کا کھیت!“

میں نے دریافت کیا کیوں جناب اس شعر کا یہ معاوضہ، سخن فہمی کی داد دوں ؟ کل کو حاجی صاحب نے ”جناب“ کر ایک سرے سے اٹھا کر مولانا ”کا تبین“ پڈال دیا (میں نے سہولت کی خاطر ان ”قسمہ یا“ بزرگوں کے نام علیحدہ کر دئیے ہیں اگر کوئی صاحب ان کے نام ونشان، حسب نسب، وطن اور مشاغل کے بابت اپنا ذخیرہ معلومات وسیع کرنا چاہتے ہوں تو نیاز صاحب سے رجوع کریں. مجھے امید ہے نیاز صاحب باب الاستفسار کے جن نمبر میں اس پر اظہار خیال فرمائیں گے. مجھے اندیشہ ہے کہ باب الاستفسار اور جن نمبر میں بھی کراما کاتبیں کے مانند مجھ سے کچھ غلط بحث سرزد ہو رہا ہے) فرمایا نواب صاحب کہاں میں گے. میں نے کہا کون نواب نواب مزمل اللہ خاں صاحب، کیا یہ شعر سنائیے گا. کہنے لگے. نہیں جی. وائس چانسلر صاحب، نواب مسعود یار جنگ بہادر، میں نے کہا ان کو سنانا ہے تو پھر یہ شعر سنائیے گا۔

ترا اگر مرد ر بازوے تیغ زن باقیست
بگیر تیغ کہ آن حسرت کہن باقیست

فرمایا، یہ کیا. میں نے کہا یہ ہے

من آں علم و ہنر را بپر کاہے نمی گیرم
کہ از تیغ و سپر بیگانہ سازد مرد غازی را

حاجی صاحب قبلہ نے کچھ گھبرا کر کچھ بے اختیار ہو کر فرمایا، ارے میاں، یہ سب تو ہوا، اب کیا ہو، اچھا تمہارے کلاس میں بیٹھ جاؤں، ذرا تمہارا لکچر سنوں گا، میں نے کہا، اور کلاس کی ڈسپلن کا کون ذمہ دار ہوگا، فرمایا، السلام علیکم اور میں ڈنڈا لئے ہوئے کلاس میں پہونچ گیا۔

”اس کے پڑھنے سے بہتوں کا بھلا ہوگا“

(۱) اگر مضمون اچھا ہے تو میں ذمہ دار

(۲) اگر عنوان برا ہے حاجی صاحب ذمہ دار

(۳) اگر کتابت وغیرہ کی غلطی ہے تو نیاز صاحب ذمہ دار

(۴) اگر کل برا ہے تو ناظرین ذمہ دار

خط وکتابت ”وترسیل زر“ میں ان امور کا لحاظ رکھا جائے۔

رشید احمد صدیقی ایم۔ اے (مسلم یونیورسٹی)

جلوۂ کرشن

جسودھا کی گود میں نشوونما پانے والے کو کون نہیں جانتا۔ نند کے آغوشی فرزند کو کون نہیں پہچانتا۔ دیوکی کے لاڈلے اور واسدیو کے صلبی فرزند سے کون واقف نہیں۔ متھرا کے کنہیا کا سکہ کون ہے جس کے دل پر بیٹھا ہوا نہیں ہے!! بانسری کی دلکش پکار کس کو متوالا نہیں بنا دیتی۔ بندرابن کے عاشقانہ ذرات اب بھی گوپیوں کے لئے افشاں کا کام دے جاتے ہیں۔ غرض کہ ہند میں ہزاروں سال سے اسی کا ترانہ ہے اور اسی کے جے کے نعرے، ہر مندر اسی کی جلوہ گاہ ہے اور ہر پجاری کا دل اسی کی حریم ناز! بچپن کا موسم محبت میں۔ جوانی کی فصل عاشقوں کی جھرمٹ میں اور موت کمبخت بھیل کے ترکش میں۔ جس نے اسے پرستش کے قابل بنا دیا۔

بھادوں کی تاریک گھٹاؤں میں، کال آگرہ محل کے زندان میں، دیوکی کے خوبصورت پیٹ سے وہ جنم لیتا ہے، جس کے گلے میں جینے کیلئے مالا اور راجدھانی کے لئے سر پہ "مکٹ" (تاج) کا قدرتی خلعت تھا، یہ آثار دیکھکر دیوکی کی آتما مسرت سے لرز گئی، واسدیو کا قلب کنس کے ظالمانہ سلوک سے تھرا گیا، آٹھواں مولود تھا اور یہی ان دونوں کا آخری سہارا! واسدیو نے ٹوکرے کی آغوش میں اس ننھی سی جان کو ڈالا اور اپنے پیر دل کی آہٹ کا احترام کرتا ہوا زندان کے دروازہ سے نکلا جمنا کو عبور کیا اور گوکل میں پہونچکر جسودھا کی معصوم پر درد آغوش میں سونپ دیا۔

جس کی زندگی دیوکی کے پیٹ سے انسانیت کا پیام لیکر نکلی تھی۔ وہ خوش اس لئے تھا کہ اس کو پرماتما نے ۹ سال زندہ رکھنے کے لئے پیدا کیا تھا۔ ورنہ کنس کے ہندی تو ہمات پہلی سانس بھی نہ لینے دیتے۔ اس کو تو ارجن کا رتھ بان بننا تھا اور مہابھارت کے معرکہ کارزار میں "بقائے روح" فلسفہ سمجھانا تھا وہاں یہ کہنے والا اور کون تھا کہ:۔

"جسم کا ناش ہوتا ہے مگر آتما امر اور غیر فانی ہے"

متھرا سے کوئی پوچھے، جس نے اس کے بچپن کی شوخیاں دیکھیں۔ بندرابن سے کوئی سوال کرے کہ واسدیو کے لخت جگر کی جوانی تیری مست فضا میں کیونکر مچلی۔ بنارس کے پنڈت شاستری بتا سکیں گے کہ انہوں نے اپنے سپوت کو علوم دھارمک کے کون کون سے سبق دیئے۔ دوارکا کی غیر آباد سرزمین اس کی بیدار زندگی کے کارنامے بیان کر سکے گی محبت کرنے والی رکمنی کہہ سکے گی کہ کندن پور سے آغوش محبت میں لے جانیوالا کون تھا۔ گنگا کی موجیں گواہی دے سکیں گی کہ اس نے اپنی جا در سیال سے ہند کے دیوتا کے عریاں جسم کو کس طرح ڈھانکا تھا۔

ہند کا یہ اوتار موسیقار بھی تھا اور رقاص بھی۔ اپنی بانسری کی روح پرور صداؤں سے زندگیوں کی مضمحل نبضوں میں حیات کی بجلیاں بھر دیتا تھا اور اپنی جوشیلی تقریروں سے سرفروشی کے لئے تیار۔ اس کے روح پرور نغمے۔ اس کا دلنواز رقص۔ اس کی جانگداز بانسری اور اس کی فلسفیانہ سحر بیانی یہ ایسی آپ ہوئی تلواریں تھیں جو اس کے حلقہ بگوشوں کے دلوں کو دونیم کر دیتی تھیں۔

ہمارا پرسری کرشن نے اپنے شائستہ عادات و اطوار، اپنی سانچے میں ڈھلی ہوئی سیرت اور تعلیم و تلقین سے جو نتائج و اثرات صفحۂ ہند پر چھوڑے تھے، وہ ان کی عظمت کو منوائے بغیر نہیں رہتے۔ ان کی ۹۰ سالہ زندگی "ایشور پرستی" ہی میں گذری۔ ان کا مشرب موحدانہ تھا۔

ان کا مسلک صوفیانہ تھا۔ ان کی زندگی کا ہر لمحہ غرق تھا ادائے فرض میں، دھرم پر ایقان رکھنے میں، اوقات کی پابندی میں، ثبات قدمی میں انسانیت کے احترام میں۔ اور رحم و ہمدردی کے انسانی صفات میں!۔

گو امتداد زمانہ نے حقیقت پرستی میں اوہام پرستی کی آمیزش کردی اور اصلیت کو مسخ کرکے رکھدیا، کیونکہ مہاراجہ سری کرشن خود پرست برہمنوں کی طرح نہ اپنے علم و فضل پر ناز کرتے تھے اور نہ اپنی ہستی کو اپنے ہم جنسوں سے بالاتر سمجھتے تھے۔ وہ چھتریوں کی طرح نہ اپنے شجاعانہ کارناموں کا ڈھنڈورا پیٹتے تھے۔ نہ ویشوں کی طرح دولت سمیٹنے کی دھن میں لگے رہتے تھے، اور نہ شدروں کی طرح اپنی انسانیت کی خود توہین کرتے تھے وہ انسانیت کو خدا کا اولین عطیہ سمجھتے تھے اور خود وہ انسانیت ہی کے حامل بنکر آئے تھے، اور انسانیت ہی پر قایم رہنے کے لئے "انسانوں" کو سبق دیتے تھے۔ مگر افسوس کہ ناقص اور باسی دماغوں کی پیداوار نے اس کو یکسر بھلا دیا اور "ذات پات" کی تفریق اور "چھوت چھات" سے کراہت پیدا کرکے انسانیت کو مجروح کردیا اور اس پر یہ بوالعجبی کہ اس کو اپنے دماغ کا بہترین کارنامہ بھی سمجھا۔ کاش تخلیق کی غایت پر غور کرتے اور انسانیت کا جنازہ اپنے کاندھوں پر نہ اٹھاتے!! آج ہندوستان اسی دماغی مرض میں شدت سے مبتلا رہ کر سوراج کیلئے گدایانہ سوال کر رہا ہے۔

بھگوت گیتا کے مصنف کی زندگی کا ۱۴۸ سال تک جنگ و پیکار ہی میں گذری۔ کنس کو چودھویں سال میں پچھاڑ کر دنیائے ہندوستان کو اس کے ناقابل برداشت مظالم سے نجات دلادی، جراسندہ کا مقابلہ اس نے کیا۔ کرناٹک اور بنارس کی مہمیں اس نے سر کیں۔ سال سے پر نبرد آزما رہا۔ مہابھارت کے خونیں مناظر اس کی آنکھوں نے دیکھے اور درد رقیدی کے سوئمبر میں ارجن کی تیراندازی پر صدائے تحسین اُس نے بلند کی۔

اس کی زندگی کے حالات نظم و نثر میں کثرت سے شایع ہو چکے ہیں۔ جس میں غالیانہ عقائد کی وجہ سے مبالغہ آمیز افسانوں کی بھرمار ہے اور وفور محبت نے حسن و قبح کا امتیاز بھی سلب کرلیا ہے۔ معلوم ہو رہا ہے کہ دماغ جہالت نے قدم قدم پر ٹھوکریں کھائی ہیں۔ بیسویں صدی کی حیدرآباد کے "کرشن" کی شاعرانہ طبیعت کا دریا موجیں مارتا ہے۔ صرف اس عقیدے کو لئے ہوئے کہ یہ بھی اسی کے نام پر ۶۵ سال سے زندہ ہے، گو شاد ہے مگر زمانہ کی رفتار اور اپنی افراط شرافت سے ناشاد۔ گو خاندانی امیر ہے مگر اپنی ذات سے فقیر! نام کی برکت ہزاروں سال کے گذر جانے پر بھی اس حد تک تو باقی رہی کہ واسدیو کا "کرشن" ہند کا بادشاہ تھا۔ چندولال کا "کشن" دکن کا وزیر ہے۔

مہاراجہ بہادر بالقابہ کی امیرانہ طبیعت کو شاعری کے ساتھ بچپن سے لگاؤ ہے۔ مہاراجہ چندولال شاداں کا شادانی دربار شعراء سے ہر وقت بھرا رہتا تھا۔ جس میں نصیر دھلوی کے سے استاد داد سخن دیا کرتے تھے۔ مہاراجہ شاد کے شاعرانہ دربار میں بھی سرشار مست رہا کرتے تھے، اور داغ بھی یوں نوا سنج رہتے تھے کہ ع

آئے گی اردو زباں آتے آتے

جنہیں دا اختر بھی برسوں اس خوان کرم کے زلہ ربا رہے ہیں۔ ضیا کی ضیاباریاں بھی شاعروں کو چمکا دیا کرتی تھیں۔ اور نجوی کی شاعرانہ نحوسیت اب بھی ہر جمعہ کو نظر آجاتی ہے۔ ثاقب نے بھی اپنی ہیلوانی کے شاعرانہ داؤ پیچ دکھائے ہیں اور غبار کی ضعیفی تو آتنگ حضرت شاد ہی

کے دامن سے لپٹی ہوئی ہے اور مشق سخن مصروف بیگم کے بوڑھے غمزے اب بھی ناک پر انگلی رکھ کر "طلاق چوڑیوں" کا خیال پیدا کرا دیتے ہیں۔ جہاں کی فضا ایسی شاعرانہ ہو۔ وہاں تو غیر موزوں طبیعتیں بھی موزوں ہو جاتی ہیں۔ نہ کہ مہاراجہ شاد جنہوں نے آنکھیں کھولتے ہی گھر میں شاعری کا چرچا سنا۔ کیونکر چپ رہتے۔ میدان شعر میں بے تکان دوڑیں لگانا شروع کر دیں۔ قوالوں کے گلے ان کی غزلوں سے حرکت کرنے لگے، رباعیات و قطعات کے بارے میں انکی جستیں حیرت کرنے کے قابل ہو گئیں۔ قصائد سے ان کا زور بیان ٹپکنے لگا۔ اور مثنوی سے واقعہ نگاری کی قابلیت معلوم ہونے لگی۔

اسی "جلوۂ کرشن" میں اپنا مسلک یوں نظم فرماتے ہیں:—

ہے میرا طریق صوفیانہ — توحید ہے بس مرا ترانہ
میں کیا کہوں کون ہوں میں کیا ہوں — اک آیت قدرت خدا ہوں
صوفی ہوں موحدانہ مسلک — کی میں نے نہ بت پرستی اب تک

مہاراجہ سری کرشن ماں کے پیٹ سے چندر بنسی اور باپ کے نطفہ سے سورج بنسی پیدا ہوئے تھے، اس بیان کے دو شعر اس مقدمہ میں سن لیجئے:

یہ تھے ہر اک گرم آشیانہ — وہ مہر کا سر آستانہ
تریاق بھی اور زہر بھی تھا — تھا مہر بھی اور قہر بھی تھا

سری کشن کی پیدایش کے وقت مہاراجہ شاد کے شاعرانہ دماغ کی موزونیت ذیل کے اشعار سے ظاہر ہوتی ہے:—

نقارۂ رعد بج رہا ہے — بادل اٹھ کر گرج رہا ہے
ہشیار کہ شیر کی ہے آمد — عالم کے دلیر کی ہے آمد
بنیاد ستم کی ڈھانے والا — احکام خدا سنانے والا
پیدا ہوا پیشوا مبارک — پورا ہو مدعا مبارک
کلیوں کی کہیں نظر نہ لگ جائے — اس گل کی مہک لگا لگ جائے

کنس کے درباریوں کے حاسدانہ طبائع کو ایک شعر میں کس لطیف استعارہ میں ظاہر کیا ہے:—

حسّاد کی واں کمی نہیں تھی — زہریلی ہوا تھمی نہیں تھی

کرشن مرلی کے موسیقیت کا سحر ان اشعار میں دیکھئے:—

وہ اسکی رسیلی تانیں دلکش — سنکر جسے سننے والے ہوں غش
گوکل کو انہیں سے تھا ہی دم — ہے مستی و بے خودی کا عالم
ہر تان یہ سب سمجھتے تھے یہ — سب شیام سندر کو تکتے تھے میں
تھی معجزہ بانسری کی آواز — فوق العادۃ تھا سوز میں ساز

کچھ ایسا سماں بندھا ہوا تھا سبزہ بھی زمیں پہ لوٹتا تھا
من موہ لیا بجا کے مرلی تھی شیام کی تان کیا رسیلی

کنس کے اکھاڑہ کا منظر۔ کرشن و بلرام کی آمد۔ مست ہاتھی سے مقابلہ۔ حاضرین کا خوف و ہراس۔ کرشن و بلرام کے شجاعانہ کارنامے۔ ان کی تصویر شعر کے قالب میں دیکھئے:۔

میدان میں پہلوان کھڑے تھے دو بچوں کی جان پر اڑے تھے
ہتھیار ہر ایک تولتا تھا تلوار کا ڈورا کھولتا تھا
تھا یاں تو دھکڑ پکڑ کا عالم ناگاہ کھلا ظفر کا پرچم
وہ گرد اٹھی غبار چھایا ہر شخص نے اپنا سر اٹھایا
دامن ہوا چاک گرد کا جب دو مہ نکل آئے آخر شب
میداں میں جب آئے شاہزادے تکتے تھے سوار اور پیادے
پہلے ہی سے یہ کھی بدی تھی اک سمت سے چھوٹا مست ہاتھی
سب جان چرا کے اپنی بھاگے بڑھ آئے کرشن سب سے آگے
تلوار لئے اڑے رہے وہ جس جا تھے کھڑے کھڑے رہے وہ
جب آیا قریب مست ہاتھی اک وار میں سونڈ کاٹ ڈالی
چنگھاڑ کے فیل مست بھاگا پیچھا دیکھا نہ اس نے آگا

کرشن و بلرام کی دیو پیکر پہلوانوں سے کشتی۔ کرشن کا غلبہ۔ تماشائیوں کا حیرت بدنداں ہونا اسکو نظم فرماتے ہیں کہ:۔

آئے جو مقابلہ کو دشمن گردانا کرشن نے بھی دامن
یاں آتے ہی ان کے چھکے چھوٹے لڑکوں کو جو دیکھا دل بھی ٹوٹے
سمجھے تھے کہ ان کی جان لیں گے دونوں کو اٹھا کے پھینک دیں گے
لڑتے رہے دونوں بے ارادے کھیلا کئے دونوں شاہزادے
وہ پیچ کیا کرشن جی نے لی سانس تلک نہ مدعی نے
سینے پہ اسے گرا کے بیٹھے اٹھا نہ وہ یوں دبا کے بیٹھے

کنس کے قتل پر وفادار و جاں نثار حاشیہ نشینوں کا سکوت عبرت کے لئے کافی ہے:۔

نیرنگیِ دہر کے کرشمے عبرت کے سبق کے ہیں معمے
آلودہ بخوں تڑپ رہا ہے سر تن سے کہیں جدا پڑا ہے
بیجا تھا غرور حکمرانی عبرت کی ہے جا جہان فانی

تاج اس کا زمین پر پڑا تھا ۔۔۔ جو ظلم کو رحم جانتا تھا
جو تاجوروں کا تاج لیتا ۔۔۔ راجاؤں سے جو خراج لیتا
بیجان پڑا ہے سر کٹائے ۔۔۔ سب دور ہیں پاس کون آئے
آیا نہ کوئی اسے بچانے ۔۔۔ وہ قتل ہوا کھلے خزانے
بے گور و کفن پڑا ہے لاشا ۔۔۔ دیکھا کئے سب کھڑے تماشا

کنس کی ظالمانہ زندگی کا خاتمہ کر کے سری کرشن جی مہاراجہ شاد کی شاعرانہ زبان سے اپنے پیروؤں کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں :-

مجھ کو نہیں خواہش حکومت ۔۔۔ جایز نہیں رکھتا میں خصومت
ظالم نہیں میں جو خون بہاؤں ۔۔۔ غاصب نہیں ہوں جو ملک پاؤں
ظالم سے کیا ہے ملک خالی ۔۔۔ یہ پھانس جگر میں تھی نکالی
میرا بھی فرض منصبی تھا ۔۔۔ قصہ کردوں پاک فتنہ گر کا
میرا جو ہے راج اور ہی ہے ۔۔۔ تخت اور تاج اور ہی ہے

مثنوی کا خاتمہ مہاراجہ شاد نے اس دعا پر فرمایا ہے جس پر آپ بھی آمین کہیئے :-

او شان ہر اک بدلنے والے ۔۔۔ یکتائی کی راہ چلنے والے
او بانسری کے بجانے والے ۔۔۔ ہر ایک کا دل لبھانے والے
او زلف سیاہ والے ہیتم ۔۔۔ او مظہر لطف رب اکرم
ہے داس ترا یہ شاد صوفی ۔۔۔ کرتا ہے نوا کے سیس سنگی
نرگن ہو کر سگن بنا دے ۔۔۔ پردے مری آنکھ سے اٹھا دے
پھر کیف بنا سر یہ میرا ۔۔۔ دنگ میں بنتا سرا ہے تیرا
مرلی کی مجھے صدا سنا دے ۔۔۔ وہ نغمۂ جانفزا سنا دے
دیکھا نہیں جو سماں دکھا دے ۔۔۔ وہ جلوۂ ضو فشاں دکھا دے
درشن دے سکھی رہوں میں ۔۔۔ کرپا سے ترے غنی رہوں میں
اس دل کی تڑپ نے مار ڈالا ۔۔۔ ارماں نہ مگر کوئی نکالا
سمرن تری جب سے کر رہا ہوں کب سے ۔۔۔ دے بھگوان مری طلب سے
سنتوش ہو من وہ روپ کھلا ۔۔۔ بھگوان جو گت کے بس میں آیا
من کی بپتا تو دیکھ میسری ۔۔۔ دکھ میں مرے تو دے دلی مری
میری جو مراد ہے تو یہ ہے ۔۔۔ خوش کامی شاد ہے تو یہ ہے

خدا حسن قبول دے اور زور بیان میں قوت، تاکہ آپکے دماغی افکار سے دنیا ہمیشہ تری ہمیشہ لطف اٹھاتی رہے۔

ہوش بلگرامی

زندگی

زندگی کی ماہیت اور اس کی علت غائی پر از آدم تا ایندم ہر زمانہ اور ملک میں انسان کچھ نہ کچھ غور و فکر کرتا رہا ہے۔ بظاہر ہم لاکھ آسودہ اور مطمئن ہوں بلکہ ہمارے اقتصادی، سیاسی، دماغی اور دیگر جو مطلبے پورے ہو چکے ہوں پھر بھی ہمارے اندر آسودگی کا ایک عنصر جراثیم سلّ کی طرح رہ جاتا ہے جو وقتاً فوقتاً ہماری ساری ہستی پر اس طرح چھا جاتا ہے اور ہماری زندگی کو کچھ اس قدر دردناک بنا دیتا ہے کہ شیلی کی طرح عاجز ہو کر چلا اٹھتے ہیں "واہ ری دنیا! واہ ری زندگی! واہ رے زمانہ!" یا بیدل کے ساتھ بیساختہ یہ کہکر سر پیٹنے لگتے ہیں:-

"چہ بارِ کلفتی اے زندگی کہ ہمچو حباب تمام آبلہ بر دوش کردہ ماراا"

بڑے سے بڑے شہنشاہ سے لیکر معمولی سے معمولی کوچہ گرد بھکاری تک اور بڑے سے بڑے عالم سے لیکر ایک غیر متمدن عامی تک سب کی زندگی میں ایسے لمحے کبھی نہ کبھی ضرور آتے ہیں کہ زندگی ایک بار معلوم ہونے لگتی ہے اور دنیا کا یہ نگارخانہ اپنی تمام دلفریبیوں اور نیرنگیوں کے باوجود ہم کو سکون دینے سے قاصر رہ جاتا ہے۔

زبردست سے زبردست مادہ پرست فرعون کو زندگی میں ایسی ساعتوں سے سابقہ پڑا ہے اور پڑتا رہتا ہے جبکہ اس کے اموال و مقبوضات اس کے کام نہیں آتے اور وہ اپنی تمام جاہ و ثروت ساری عظمت و شوکت لئے ہوئے بلا کسی ظاہری سبب کے ایک عجیب بیچینی ایک ناقابل اظہار پراگندگی یا ایک غیر واضح افسردگی محسوس کرنے لگتا ہے اور دنیا کی تمام مسرتوں سے بیزار ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات تو اس عالم انتشار میں ہمارا دم اس طرح گھٹنے لگتا ہے کہ ہم دلکش سے دلکش کلاہ سلطانی کو "بدردِ سر نمی ارزد" کہکر اتار پھینکتے ہیں اور ہماری ہستی کی گہرائیوں سے یہ جانکاہ صدا بلند ہوتی ہے:-

"ہائے کس خواب سے ہستی نے جگایا مجکو"

جاننے والے جانتے ہیں کہ مادیت کے علمبردار استدلالیت کے نبی اور افادیت کے مبلّغ جان اسٹورٹ مِل کو اپنی زندگی میں کتنی بار ایسے تاب آزما اور جاں گسل تجربے ہوئے ہیں۔ اسپر یکے بعد دیگرے ہیجان اور اضمحلال کے دورے پڑا کرتے تھے اور اس کو کسی پہلو قرار نہ تھا اس نے اپنی "حیات خود نوشتہ" میں ان حالتوں کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے ایسی نازک گھڑیوں میں اس کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ زندگی کی ساری بنیاد متزلزل ہو رہی ہے اور کائنات میں کوئی ایسی دلچسپ چیز نہیں ہے جو جینے کا سہارا بن سکے۔ یہ اس شخص کا حال تھا جس کا عقیدہ یہ تھا کہ زندگی کا نصب العین کسب مسرت ہے۔ "بطل پرست" کارلائل بھی ایک عرصہ تک اس روحانی مرض میں مبتلا رہ چکا ہے۔ شب و روز اسکو "دائمی نہیں" کا مقابلہ کرنا پڑتا تھا اور مقابلہ میں وہ ایک مدت تک بار بار ہارا یہ "دائمی نہیں" دراصل انسان کے اندر اس شیطانی قوت کا نام ہے جو ایمان و ایقان کو فنا کر کے روح کو تشکیک و لا ادریت کے طوفان میں چھوڑ دیتی ہے یہی "دائمی نہیں" ایک عمر تک امام غزالی کا پیچھا کرتی رہی یہاں تک کہ انہوں نے تصوف کی چار دیوار میں پناہ لے لی اور یہاں ان کو قطعاً سکون ملا ہوگا اس لئے کہ نو زندگی۔ کاینات خیر و شر

رنج و راحت کی اصلیت سے بہت بڑی حد تک آگاہ ہو چکے تھے، بہر صورت کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ناآسودگی انسان کا مقدر ہے اور اس سے نجات پانا اتنا آسان نہیں ہے جتنا کہ عموماً سمجھا جاتا ہے۔

اور پھر کون کہہ سکتا ہے کہ یہ ہیجان و اضطراب انسانی دنیا ہی تک محدود ہے اور دوسری مخلوقات اس غم سے ناآشنا ہیں؟ کون جانتا ہے کہ زمان و مکان کے تماشہ گاہ میں کون سا الم نامہ پیش کیا جا رہا ہے جس میں ہر مخلوق کا کوئی نہ کوئی حصہ ہے؟ بہت ممکن ہے کہ شیفتہ کا یہ نادا تعاً صحیح ہو:-

"آرام سے ہے کون جہان خراب میں	گل سینہ چاک اور صبا اضطراب میں"

یا بقول مومن:-

"شبنم خراب جھو کتاں سینہ چاک ماہ	لو اور بھی ستم زدہ روزگار ہیں"

تو پھر کیا ہماری زندگی واقعی ایک عذاب ہے؟ کیا یہ سارا ماجرا قدرت کا کوئی دل آزارانہ استہزا ہے؟ کیا شوپن ہار کا خیال صحیح ہے کہ جس مشیت نے ایک شارہ سے کائنات کا اتنا بڑا کارخانہ پھیلا رکھا ہے وہ ایک شریر قوت ہے؟ دنیا میں اکثر لوگ تو ایسے ہیں کہ ان سوالات پر ایک لمحہ کے لئے بھی سر کھپانا نہیں چاہتے۔ لیکن اس بے اعتنائی سے سوالات کی اہمیت کم نہیں ہوتی ہے اور جو دل و دماغ رکھتے ہیں وہ ان سوالات پر بغیر سر کھپائے ہوئے نہیں رہ سکتے۔

زندگی اگر صرف اندھوں کا کھیل یا کسی جبار ہستی کا ظلم ناروا نہیں ہے تو پھر آخر زندگی ہے کیا، اور اس کی غرض و غایت کیا ہے؟ اس سوال کے مختلف زمانوں میں لوگوں نے مختلف جواب دئے ہیں۔ بیکن نے اپنی مشہور عالم تصنیف "اطلانطس جدید" (Atlantis New) میں زندگی کا نصب العین قوانین قدرت کی تحقیق اور علم و حکمت کی ترقی قرار دیا ہے۔ بیچارہ اپنے زمانہ کی شورشوں سے مغلوب ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ بہر حال بیکن اور اس کے جانشینوں نے زندگی کے مسئلہ کو ریاضیات کا مسئلہ بنا کر چھوڑ دیا۔ وہ کہتے ہیں "ہم کو نہ یہ معلوم ہے، اور نہ یہ معلوم کرنے کی چنداں ضرورت کہ زندگی کی ماہیت کیا ہے، ہم بس اتنا جانتے ہیں کہ انسان احساسات و جذبات رکھنے والا جانور ہے اب جتنا ہی زیادہ انسانی احساسات و جذبات میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ اتنی ہی زیادہ زندگی خوشگوار ہوتی جائے گی اور اسیقدر زیادہ دنیا رہنے کے قابل جگہ بنتی جائے گی" اور انبساطی جذبات کو بڑھانے کی یہ صورت بتائی گئی ہے کہ ہم قوانین قدرت پر عبور حاصل کریں اور قدرت کو جہاں تک ممکن ہو اپنے قابو میں لائیں۔

اب آئیے تھوڑی دیر کے لئے آجکل کی مہذب دنیا کی سیر کریں جو بیکن کی "اطلانطس جدید" سے قطعاً منزلوں آگے بڑھ چکی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ طبیعیات اور کیمیا نے ہمارے لئے ہر طرح سامان عیش و تفریح بہم کر رکھا ہے ہر وہ بات جو آج سے سو سال پیشتر ناممکن معلوم ہوتی تھی نئی روشنی نے اس کو ہماری زندگی کا ایک کھیل بنا دیا ہے لیکن کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ انسان اب زیادہ پُرسکون زندگی بسر کر رہا ہے، ہمارا تجربہ اس سوال کا جواب نہیں میں دیتا ہے۔ مادیت کے قدم بہ قدم انسان کی ناآسودگی بھی بڑھتی گئی ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ بیکن کے وقت سے کہیں زیادہ آج کل اس پر غور کیا جا رہا ہے کہ انسان کے سکون و اطمینان کی صورت کیا ہو سکتی۔ دنیا کو سیاسی، اقتصادی، علمی اور اخلاقی حیثیتوں سے کیا ہونا چاہئے؟

یہ سوال ادبیات حاضرہ کا ایک خاص جز بنگیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ زندگی ایک ایسا معمہ ہے جس کو حل کرنا مادیت اور ظاہر پرستی کا کام نہیں ہے۔
سائنس اور تمدن سے مایوس ہوکر اب مذہب اور تصوف کی طرف آئے۔ اسمیں شک نہیں کہ ان دو چیزوں نے انسان کو ایک مہتم بالشان اور جلیل القدر چیز بنانے کی پوری کوشش کی ہے۔ پیغمبروں اور صوفیوں نے ہمکو بتایا کہ ہماری زندگی ایک عکس ہے نا [illegible] کا جو تمام کائنات پر محیط ہے۔ زمان و مکان کے مظاہر و حوادث چند آنی و فانی تنوعات ہیں، ایک لایزال ہمہ گیر ہمہ داں قوت کے۔ انسان ایک نقش ہے اس قادر مطلق کا جس نے ایک "کن" سے اٹھارہ ہزار عالم پیدا کر ڈالے۔ ہمکو بسعد نار پندار بتایا جاتا ہے کہ

"من ملک بودم و فردوس بریں جایم بود آدم آورد دریں دیر خراب آبادم"

ہم بذریعہ انفراد و انفصال اپنی اصل سے جدا کر دیئے گئے ہیں بالکل اسی طرح جس طرح "نے" کاٹ کر "نیستان" سے جدا کر دی جاتی ہے اب ہماری کوشش یہ ہونا چاہئے کہ جس چیز کو ایک بار کھو چکے ہیں اس کو پھر پالیں، جس فردوس سے ہم ایک مرتبہ نکالے جا چکے ہیں اسمیں پھر داخل ہوجائیں یہ کیونکر ممکن ہے؟ تقریباً ہر مذہب اور صوفیوں کے ہر فرقہ نے اس کا ایک جواب دیا ہے۔ سورگ کو جیت لینے کی صرف ایک تدبیر ہے اور وہ عبادت ہے بھگتی ہے۔ معرفت ہے گیان ہے اپنے "روزگار وصل" کو پھر حاصل کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم تنوعات سے قطع نظر کرلیں اور "اصل" کا دھیان کریں۔ انسان کل میں اسطرح محو ہوجانا چاہیئے کہ جزئیات کا احساس تک باقی نہ رہجائے دنیا "دار المحن" ہے زندگی "سجن المومنین" ہے اور اس سے پیچھا چھوڑانے کی کوشش کرنا ہر ایمان والے کا منصب دلین ہے، اور اس کی یہی ایک تدبیر کہ ہم دنیا و مافیہا کو ایک نقش بر آب ایک نمود بے بود سمجھ کر خاطر انداز کردیں۔ مذہب اور تصوف کا فلسفہ اور اصل و غایت جو کچھ بھی ہو۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ یہ دونوں آخر میں چلکر انسان میں بزدلی اور رہبانیت پیدا کر دیتے ہیں۔ یعنی زندگی کے مسئلہ کا حل یہ بتایا جاتا ہے کہ زندگی کو تج دو اور یہ کوئی حل نہیں ہوا یہ تو ایک طرح کی بے ہمتی اور نامردی ہوئی۔ زندگی اگر کوئی درد ہے تو اس کا علاج یہ تو نہیں ہو سکتا کہ اس کی ٹیسوں کی طرف سے بے حس ہوجاؤ۔ اب تک جتنے مبلغین اور متصوفین گذرے ہیں ان سب نے ایک عام غلطی یہ کی ہے کہ عقبیٰ کو دنیا سے الگ سمجھا اور سب نے بلا استثناء یہ کوشش کی کہ انسان کو خدا کی طرف لیجائیں۔ حالانکہ درحقیقت اس کوشش کی ضرورت تھی کہ خدا کو انسان کی طرف لے آیا جائے اور دنیا سے انسانیت کا اپنا مرکز قائم رکھتے ہوئے الوہیت کو [illegible] کر دیا جائے۔ "قطرہ" میں "دجلہ" اور "جز" میں "کل" دیکھنے کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ قطرہ کی ہستی کو بھول جاؤ یا "جزو" کو ایک حرف غلط سمجھ لو۔ فنا فی اللہ سے یہ مراد ہرگز نہیں کہ اللہ کی مخلوقات سے بیگانہ ہوجاؤ، عقبیٰ کی فکر اس کو نہیں کہتے کہ دنیا کو ٹھوکر دو عقبیٰ تو دنیا ہی کی ایک ارتقائی صورت ہے۔

زندگی نام ہے چند تعلقات کا۔ چند اعتبارات کا اور جب آپنے ان سے چھٹکارا حاصل کرلیا اور جب آپنے تیاگ کا پرچار شروع کردیا تو آپ جوگی سہی۔ اللہ والے سہی۔ ولی سہی۔ لیکن کم از کم آپ یہ کہنے کا منھ نہیں رکھتے کہ آپ نے زندگی کے مسئلہ کو حل کرلیا ہے۔ مذہب نے تو خیر دنیا سے کسی حد تک ناتا قایم رکھا۔ لیکن تصوف نے دنیا کو بری طرح مٹانے کی کوشش کی۔ میں یہ کہنے کے لئے تیار نہیں ہوں کہ تصوف کی بنیاد تیاگ پر ہے بلکہ برخلاف اس کے میرا تو عقیدہ یہ ہے کہ تصوف نام ہے عمل اور درس عمل کا۔ لیکن دنیا میں اب تک عملاً ایسے تصوف کا وجود نہیں رہا ہے جس نصب العین اٹھا ہے ستم ظریفی یہ ہے کہ اسی کو آخر میں چلکر نظر انداز کر دیتا ہے۔ ایسے صوفیوں کا شمار شاید انگلیوں پر کیا جاسکے جن کو بنی نوع انسان کیساتھ

کوئی عملی ہمدردی نہیں ہوتی۔ رہبانیت اور معزولی کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ انسان میں انفرادیت کا جذبہ غالب آجاتا ہے۔ گرد و پیش کے دکھ درد کو محسوس کرنے کی صلاحیت اس میں باقی نہیں رہتی یہی وجہ ہے کہ صوفیوں میں ایک طرح کا جمود پیدا ہو جاتا ہے، اور ان کی ہستی کا ایک جزو مفلوج ہو جاتی ہے، یہ سب جانتے ہیں اور یہ سب کہتے ہیں کہ

"بنی آدم اعضائے یکدیگر اند"

لیکن یہ جانتے ہوئے اور یہ کہتے ہوئے وہ ترک دنیا کی تعلیم دیتے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جب ہم اپنی آنکھوں سے یہ دیکھتے ہیں کہ ساری خلقت محبت و ابتلا میں سرگرداں ہے کہیں روٹی کپڑے کا رونا ہے کہیں تندرستی کا، کسی کو یار کا غم ہے کسی کو روزگار کا کسی کو کچھ دکھ ہے کسی کو کچھ تو پھر ہم ان سب کی طرف سے آنکھیں کیونکر پھیر سکتے ہیں اور ہم کو اپنی شخصی اشراقیت میں کیا راحت مل سکتی ہے اگر ہم کو یہ دعویٰ ہے کہ ساری کائنات کی اصل نسل ایک ہے۔ ہم سب ایک ہی ابوالبشر کی اولاد ہیں اور ہم سب کو ایک ہی قدرت کاملہ نے پیدا کیا ہے؟ فطرت سلیم رکھنے والوں پر روشن ہے کہ جب تک ہم اپنی مادی زندگی کے کثیف اور پرشور مسائل کو روحانیت میں شامل نہیں کر لیتے جب تک روحانیت کی بنیاد تجرد پر ہے اسوقت تک روحانیت کے ہاتھوں ہم کو سکون ملنا نظر نہیں آتا۔

اب سکون کی تلاش میں صرف دنیائے شاعری کا جایزہ لینا رہ گیا ہے شاعری کا دنیا پر ابتدائے آفرینش سے جو احسان ہے اس کا اعتراف نہ کرنا صریح کفر ہے۔ اگر آج دنیا میں شاعری نہ ہوتی تو زندگی قطعاً عذاب تھی اور خودکشی ہماری نجات کا ذریعہ۔ شاعری نے ہمکو اس قابل بنایا کہ ہم اس عذاب کو راحت نہیں تو اپنی دوزخ کو جنت بنا لیں۔ شاعری نے جو سب سے بڑا کام کیا ہے وہ یہ ہے کہ دنیا کی دنویت کو قائم رکھتے ہوئے اس کو فردوس میں تبدیل کر دیا ہے۔ شاعر جب تک اسیر مذہب اخلاقیات یا تصوف کا غلبہ نہیں ہوتا، انسان کی انسانیت کو قابل ملامت نہیں سمجھتا۔ وہ ان کمزوریوں کا احترام کرتا ہے جن کی بدولت انسان انسان ہوا، اسکو اس بات پر ناز نہیں ہے کہ انسان کبھی فرشتہ تھا۔ اسکے نزدیک تو مباہات کی اگر کوئی بات ہے تو یہ ہے۔

"آسماں بار امانت نتوانست کشید قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند"

شاعر کا مذہب محبت ہے اور محبت نام ہے تعلقات میں جکڑے رہنے کا۔ محبت کا تقاضا ہے کہ لاکھ تم کو محرومیوں اور مایوسیوں کا سامنا کرنا پڑے۔ لاکھ ہجر کی سختیاں جھیلنا پڑیں۔ لاکھ الٹی سانسیں لینا پڑیں مختصر یہ کہ زمانہ لاکھ تم کو ستائے تم اپنی محبت میں ہنستے کھیلتے ثابت قدم رہو شاعر اسکو شایان شان نہیں سمجھتا کہ محبت کی صعوبتوں سے گھبرا کر محبوب کو ترک کر دے اور "الاماں" کہتا ہوا گوشہ عافیت اختیار کر لے۔ بلکہ اس کے بالکل برخلاف وہ ہر مصیبت اور ہر ستم پر "ہل من مزید" کا ترانہ بلند کرتا ہے۔ وہ اگر روتا بھی ہے تو ہنس ہنس کر اور مزے لے لے کر۔ وہ ہم کو یہ سبق دیتا ہے کہ زندگی کا راز دھن اور لاگ ہے اور اس کا مقصد حرکت و اضطراب ہے نہ کہ افسردگی اور مجہولیت۔ شاعر جانتا ہے کہ ہمارے "چمن" کی "بہار" نت نئی شکستہ رنگیوں پر منحصر ہے۔ وہ زندگی کی حقیقت کو کما حقہٗ سمجھ چکا ہے جو بقول درد بس اسقدر ہے :-

"مرگ باز نیست کار ہا دارد زندگی انتظار ہا دارد"

یہ مان لیا کہ زندگی ایک بلا ہے اور ہستی کا یہ سارا جنجال کسی شریر قوت کا اندھیر ہے، لیکن ہم اس کو اپنے لئے سرمایہ راحت بنا سکتے ہیں۔

ہم کو اپنی بےچینیوں میں سکون حاصل کرنا ہے تو ہمکو اپنی ارب کی کروٹوں سے راحت ملے گی۔ راحت یا سکون کوئی خارجی چیز نہیں ہے بلکہ خود اپنے اندر موجود ہے اگر یہ سچ ہے کہ

"تمام کا ہے میرے وہ دکھ جو کسی کو نہ ملا　　کام کا ہے میرے وہ فتنہ کہ برپا نہ ہوا"

تو انسان کو اس خیال سے خوش ہونا چاہیئے اور اس کو اپنی خوش قسمتی سمجھنا چاہیئے۔ ہم میں ایک ذوق۔ ایک جوش۔ ایک حوصلہ کی ضرورت ہے، پھر ہماری زندگی کبھی تلخ اور بدمزہ نہیں ہو سکتی۔ اگر ہم میں شغف اور انہماک کا ملکہ ہے۔ اگر ہم دھن کے پورے ہیں۔ اگر ہم خلوص کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ:۔

"اگر قضا و قدر ز آسماں فرود آید　　من خیال تو با خیر و شر چہ کار مرا"

تو پھر یہ سمجھنا چاہیئے کہ ہم نے قضا و قدر پر واقعی فتح پائی ہے۔

شاعر کا پیغام یہ ہے کہ اگر آلام و مصائب ہماری قسمت میں ہیں۔ اگر ہم مجبور ہیں تو یہ کیا کم ہے کہ: ؎ "ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر" کم از کم ہم کو اپنی مجبوری کے اندر پورا اختیار حاصل ہے اگر ہم تڑپائے جاتے ہیں تو ہمارا کام یہ ہے کہ اپنی تمام قوت تڑپنے لوٹنے اور سر دھننے میں صرف کر دیں "گرانی محمل کا" جواب صرف یہ ہے کہ اپنی "حدی خوانی" کو تیز کر دیا جائے، زندگی کی تکان کو دور کرنے کی یہی ایک صورت ہے۔ ہستی کا غم یونہی غلط ہو سکتا ہے۔ نئی زندگی کے مسئلہ کا حل عمل ہے نہ کہ تیاگ اور بیراگ۔

شاعر سے اگر ذاتیت [illegible] اور انفرادیت کی خامی دور کر دی جائے اور خدا کا شکر ہے کہ وہ آجکل بہت حد تک دور ہو چکی ہے اور دور ہوتی جا رہی ہے) تو اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آج جبکہ مذہب ایک ڈھکوسلا ثابت ہو چکا جبکہ تصوف کا پردہ فاش ہو چکا ہے۔ جبکہ مادیت کی بے مائگی ظاہر ہو چکی ہے اور جبکہ مجاز اور حقیقت کی لغو تفریق مٹ چکی ہے اور مجاز بجائے خود ایک حقیقت رکھنے لگا ہے۔ انسان کا اگر کوئی نجات دہندہ ہو سکتا ہے تو شاعر جس کا پیغام یہ ہے۔

"عمل کن عمل کن کہ خامی ہنوز"

یہی زندگی ہے اور یہی روحانیت۔

مجنوں گورکھپوری

جن حضرات کا چندہ اس رسالہ ماہ دسمبر ۲۹ء کے ساتھ ختم ہوتا ہے

ان کو اطلاع دی جاتی ہے کہ جنوری ۱۹۳۰ء کا پرچہ جنوری کے پہلے ہفتہ میں تیار ہو جائے گا اگر اس سے قبل پانچروپیہ ذریعہ منی آرڈر وصول ہوگئے تو خیر ورنہ جنوری کا رسالہ دی۔ پی کے ذریعہ سے روانہ ہوگا۔

دی۔ پی مع محصولڈاک ۵؎ میں ہوگا اور ڈاکخانہ آپ سے دو آنے زاید لے گا، اس طرح گویا ۵؎ ادا کرنا پڑیں گے، منی آرڈر روانہ کرنے کی صورت میں ۳ آنہ کی بچت ہوگی۔

جو حضرات رعایتی قیمت پر کتابیں حاصل کرنا چاہتے ہیں، وہ رعایتی قیمت چندہ کے ساتھ ہی روانہ کر دیں تو بہتر ہے۔ کتابیں ذریعہ دی۔ پی طلب کرنے میں، ان کو اس امر کا انتظار کرنا پڑے گا کہ یہاں نگار کا چندہ وصول ہو جائے۔ کیونکہ یہ رعایت نگار کے خریدار رہنے ہی کی صورت میں حاصل ہو سکتی ہے۔ کتاب سائنس کے عجائب۔ بالکل مفت دی جائے گی لیکن اس میں بھی وصول چندہ کی شرط ہے۔ یوں ۲ر کے ٹکٹ موصول ہونے پر روانہ ہوگی۔

نگار کا آئین نمبر

۱۶۰ صفحات کو محیط ہوگا اور بعض نہایت بیش بہا مضامین اسمیں ہوں گے، کوئی مضمون ناقص و نامکمل نہ ہوگا۔

جن حضرات کا چندہ دسمبر میں ختم ہو رہا ہے۔ ان کو ایک مطبوعہ تحریر اسی رسالہ کے اندر ملیگی۔ اس کو ملاحظہ کرنے کے بعد فیصلہ فرمایئے کہ آیندہ خریدار رہنے کی صورت میں آپ منی آرڈر بھیجنا مناسب سمجھتے ہیں یا دی، پی طلب فرمانا۔

اَدَبی خطوط غالب

جنکو

مرزا محمد عسکری صاحب بی۔اے لکھنوی نے نہایت محنت و عرقریزی سے کتب مذکورہ بالا سے اخذ کر کے باضافہ ایک بسیط اور مفید مقدمہ و مرزا غالب کے اکثر مکتوب الیہم کے دلچسپ حالات و نمونہ کلام کے مرتب کیا ہے

حجم ۳۰۶ صفحات تقطیع ۱۸×۲۲ قیمت مع تصویر غالب (عہ)　　　"منیجر نگار نظیر آباد لکھنو"

باب الاستفسار

سارد ابل صغر سنی کی شادی۔ اور ہمارے علما کی غلط فہمیاں

(جناب سید عبد الکبیر صاحب۔ دار جلنگ)

آپ نے اس سے پہلے رسالۂ نگار میں مختصر طور پر اپنی رائے سارد ابل کے موافقت میں ظاہر کی تھی، لیکن وہ رائے غالباً سرسری تھی اور ضرورت اس امر کی ہے کہ ان دلایل کے مقابلہ میں جو علما کی طرف سے بیان کئے جاتے ہیں زیادہ شرح و بسط سے کام لیا جائے۔ اس لئے موقعہ و محل کے لحاظ سے اگر اس کو دیگر استفسارات پر مقدم سمجھ کر درج نگار فرمائیں گے تو غالباً بے محل نہ ہوگا۔

(**نگار**) اگر آپ کا یہ استفسار میرے سامنے نہ ہوتا تو بھی میں نے ارادہ کیا تھا کہ اس ماہ کے نگار میں کم از کم بہ سلسلۂ ملاحظات ہی، اس مسئلہ پر زیادہ وضاحت کے ساتھ روشنی ڈالوں گا، لیکن اب آپ کے استفسار نے اس ارادہ کو اور زیادہ قوی کر دیا اور میں آج کی صحبت میں اس باب پر اپنی رائے واضح طور پر ظاہر کئے دیتا ہوں۔

دنیا کی جتنی مذہبی قومیں ہیں، ان کے قانون شریعت پر دو طرح بحث ہو سکتی ہے، ایک یہ کہ اصل ماخذ شریعت کو سامنے رکھ کر اس سے کوئی نتیجہ نکالا جائے اور دوسرے یہ کہ تمدنی ضروریات کے لحاظ سے عقل کو راہبر بنا کر تنقید کی جائے۔ چونکہ نکاح کا مسئلہ بھی منجملہ قانون یا شرعی مسایل کے ہے، اس لئے اس پر بھی دونوں پہلوؤں سے گفتگو ہو سکتی ہے اور ہونا چاہئے۔

میں اس جگہ نفس مسئلہ نکاح پر کوئی عقلی یا نقلی بحث نہیں کروں گا اور نہ فلسفۂ ازدواج سے اعتنا کرنا میرا مقصود ہے (اگر اس حد تک کہ ضمناً اس کا ضروری ہو) بلکہ جہاں تک سارد ابل کا تعلق ہے، اسی حد تک اپنی گفتگو کو محدود رکھوں گا اس سے غالباً کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ سارد ابل کا نفاذ، جہاں تک وضع قانون کی نیت کا تعلق ہے۔ حد درجہ نیک نیتی کے ساتھ کیا جا رہا ہے۔ اور اس سے کوئی مذہبی یا قومی، تمدنی یا سیاسی استخفاف مقصود نہیں ہے، لیکن فریق مخالف اس کے جواب میں کہہ سکتا ہے کہ صرف حکومت کی نیک نیتی اس امر کی کافی وجہ نہیں ہو سکتی کہ وہ لوگوں کے مذہبی معاملات میں مداخلت کرے اور جن باتوں کو ان کے مذہب نے جائز قرار دیا ہے حرام کر دے۔ اور یہی اصل روح ہے تمام مخالفین سارد ابل کے جواب کی، جسکو مختلف اسلوب بیان سے پیش کیا جا رہا ہے۔ اس لئے اگر آج واقعی اس کا فیصلہ ہو جائے کہ مذہب اسلام نے صغر سنی کی شادی کو جائز قرار دیا ہے، تو یقیناً اس بل سے اتفاق کرنا مذہب کی مخالفت ہوگی اور اگر یہ ثابت نہ ہو سکے تو پھر سارد ابل کے خلاف احتجاج شاید ہی کوئی ایسا احمق ہوگا جو عقل کے منافی نہ سمجھے

آپ نے ملاحظہ کیا ہوگا کہ جتنے علمائے کرام کے بیانات اس باب میں شایع ہوئے ہیں انہوں نے بالاتفاق اس کو تسلیم کیا ہے کہ صغر سنی کی شادی فعل حسن نہیں ہے اور یقیناً بہت سی معاشری خرابیاں اس سے پیدا ہوسکتی ہیں۔ اس لئے میرا سب سے پہلا اعتراض ان حضرات پر یہ ہے کہ اگر اصول صحت و معاشرت کے لحاظ سے صغر سنی کی شادی فعل حسن نہیں ہے، تو کیوں مذہب اسلام نے اس کو جایز قرار دیا، جبکہ شریعت اسلام کو بہترین شریعت تسلیم کیا جاتا ہے۔ اسکا جواب ان کے پاس صرف یہ ہوسکتا ہے کہ اگر صغر سنی کی شادی کو ممنوع قرار دیا جاتا تو بعض ایسی صورتوں میں جبکہ مصلحتاً اور ضرورت وقت و زمانہ کے لحاظ سے کسی لڑکی کا قبل بلوغ شادی کرنا مناسب ہوتا ہے، ہم مجبور ہوتے اور اس فتنہ و فساد کا سد باب نہ کرسکتے جس کے دفعیہ کی بہترین تدبیر صغر سنی کی شادی ہی ہوسکتی ہے۔ اور اسی خیال کی بنا پر انہوں نے احتجاج کیا ہے کہ اس مسئلہ کا انحصار صرف علماء یا رہبران قوم پر ہونا چاہئے تھا اور حکومت کو قانون بنا کر یہ ذمہ داری اپنے سر نہ لینا چاہئے تھی کیونکہ یہ مداخلت فی الدین ہے اور وہ فعل جو کسی مصلحت کی بنا پر حلال قرار دیا گیا ہے، اسے حرام ٹھیرانا ہے۔ سب سے پہلے میں ان حضرات کو ساکت کردوں جو یہ کہتے ہیں کہ اس مسئلہ کا فیصلہ عالمان دین پر چھوڑ دینا چاہئے اس کے بعد بحث کے دوسرے پہلوؤں پر غور کردوں گا۔

میں ان عالمان دین سے جو اپنے آپ کو حامل شرع متین و ہادی راہ یقین کہتے ہیں اور جو قومی معاشرت کی اصلاح کو اپنا فرض دینی قرار دیتے ہیں، یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ صغر سنی کی شادی کا استکراہ کب سے ان کے علم میں ہے، اگر ان کا یہ علم اسی قدر قدیم ہے جس قدر ان کا وہ جبہ و دستار جو اعلان فضیلت کے وقت ان کے سر و دوش پر ڈالا گیا تھا، تو کیا میں ان سے پوچھ سکتا ہوں کہ اس وقت تک انہوں نے اس رسم قبیح کے مٹانے میں کیا کوششیں کیں اور کتنے مسلمانوں کو اس فعل سے باز رکھا۔ میں ہندوستان کے عرض و طول میں ہر اس شخص سے جو اپنے آپ کو مولوی ہونے کی حیثیت سے نکاح کے عقد و فسخ کا تنہا ذمہ دار سمجھتا ہے دریافت کرتا ہوں کہ کیا اسکی زندگی میں کوئی ایک واقعہ ایسا ہوا ہے جس میں اس نے صغر سنی کی شادی سے انکار کردیا ہو، انکار نہ کیا ہو یا تو فریقین کو صرف سمجھا ہی دیا ہو کہ یہ فعل محمود و مستحسن نہیں ہے، غالباً وہ نہیں بتا سکیں گے۔ لیکن برخلاف اس کے ہزاروں لاکھوں ایسی مثالیں موجود ہیں جنمیں انہیں مولویوں نے جو آج سارڈا بل کی مخالفت میں گردن کی رگیں پھلا پھلا کر اسٹیج پر آتش فشاں و شعلہ ریز تقریریں کر رہے ہیں، صغر سنی کی شادی پر نہ صرف جواز کے فتوے دیئے بلکہ بغیر کسی مصلحت کے بغیر کسی حیلہ شرعی کے خود خدا جانے کتنی کمسن لڑکیوں کی قربانی اپنے "عشق پیرانہ سر" کے دیوتا پر چڑھا کر ہمیشہ کے لئے ان کو اس جایز و فطری نشاط سے محروم کردیا جو ایک جوان عورت کو جوان مرد ہی کے آغوش میں میسر آسکتا ہے۔

آج اگر ان ہادیان طریقت کے تمام وہ کارنامے ہم پر ظاہر ہوجائیں جو دراز عباؤں کے وسیع دامنوں میں، لمبی چوڑی داڑھیوں کے طویل سایوں میں اور قرآن و حدیث کی اس اعجوبہ خیز تفسیر و تشریح کی اوٹ میں جو اُن کے لئے ہر حرام کو حلال اور ہمارے لئے ہر حلال کو حرام بنا دینے میں "سحر سامری" سے کم مرتبہ نہیں رکھتی، کئے جاتے ہیں، تو دنیا یہ دیکھ کر حیران ہوجائے کہ ہمارے کتنے وہ "ناکردہ گناہ"، جن کی حسرت بیاں سے بے جانے کا ذکر غالب نے کیا ہے ان کے نامۂ اعمال میں کس طرح تو برتو اور تہ بر تہ پائے جاتے ہیں، اور نہ صرف یہ بلکہ کتنی صورتیں معصیت کی ایسی ہیں جو کبھی ہم غریبوں کے خیال میں بھی نہیں گذرتیں اور یہ ہیں کہ خدا معلوم کتنی بار ان کو "چوم چوم کر" اور "چھو چھو" کر کرکے چھوڑ چکے ہیں اور فسق و فجور کو ایک فن کی حیثیت سے مرتب کر گئے ہیں۔

پھر مجھے حیرت ہے کہ حسن کے بطون کا یہ حال ہوا تیرکیونکر اصلاح معاشرت کے کسی مسئلہ کا انحصار ہوسکتا ہے صغرسنی کی شادی پر کس طرح انکا اقتدار مناسب ہے اور بعیروں کی چوپانی کیونکر ایک غیر راعی کے سپرد ہوسکتی ہے

اگر کہا جائے کہ ان کو صغرسنی کی شادی کا استکراہ حال ہی میں اس وقت سے محسوس ہوا ہے جب سے یہ تحریک ملک میں شروع ہوئی تو کیا وہ بتا سکتے ہیں کہ ۱۸۹۰ء سے لیکر (جبکہ اول اول یہ مسئلہ ملک کے سامنے پیش کیا گیا تھا) اس وقت تک کتنی بار انھوں نے اس کے استکراہ لوگوں پر ظاہر کیا اور کتنی لڑکیوں کو انھوں نے اس بلا سے بچایا۔ غالباً ایک بار بھی نہیں۔ پھر جو جماعت ۴۰ سال کے عرصہ میں کوئی ایک مبارک مثال بھی منع و احتراز کی اپنی طرف سے پیش نہ کرسکتی ہو، اس کا آج یہ کہنا کہ "آئندہ ہم ضرور ایسا کرتے" ایسی سفیہانہ نہیں، بلکہ مفسدانہ جسارت ہے جس کے جواب کے لئے یقیناً کسی دلیل کی ضرورت نہیں

اسی سلسلہ میں آیئے ان خطرات پر بھی اک نگاہ ڈال لیں جو سارداِ بل کے نفاذ سے مولویوں کے نزدیک ظہور میں آسکتے ہیں۔ مولانا عبدالماجد بدایونی نے (جنکی عزت میری نگاہ میں ان کے فضل و کمال سے زیادہ انکی ذہانت کی وجہ سے قائم ہے) اپنے مکتوب میں جو ممبران اسمبلی کو مخاطب کرکے شائع کیا ہے بہ پندار خود صرف عقلی دلایل پیش کرکے حد درجہ ناصحانہ و مشفقانہ انداز سے نرم لہجہ میں گفتگو کی ہے اور تمام ان خرابیوں کا ذکر کیا ہے جو اس قانون کے نفاذ سے ظاہر ہونے والی ہیں۔ اس لئے میں اس کو سامنے رکھکر بحث کے اس پہلو کو بھی ختم کئے دیتا ہوں۔

سب سے پہلے مولانا نے ممبران اسمبلی کو خطاب کرکے فرمایا ہے کہ:۔

> "میں سمجھتا ہوں کہ صغرسنی کی شادی کے انسداد کی طرف جو قباحت مائل و متوجہ کرنے والی ہوئی وہ صرف ایک تھی یعنی "قبل از وقت مباشرت"، مگر قابل معافی ہوں اگر برادرانہ اخلاص سے اس غلط فہمی کی طرف جناب کو متوجہ کروں کہ نکاح و مباشرت کو ایک سمجھ لیا گیا۔ شریعت اسلامیہ مباشرت قبل از بلوغ کو ظلم بتاتی ہے اور اسی لئے چاہیے مسلمانوں میں کمسنی کی شادی کی مثال شاذ و نادر کہیں مل بھی جائے مگر مباشرت قبل از بلوغ کے جواز کا ثبوت مشکل ہی سے مل سکیگا اور رواج و عمل کی مثال تو مس میو جیسی ...... بھی مسلمانوں کے متعلق قطعاً پیش نہ کرسکی"

امر اول کو ہر ذی ہوش انسان تسلیم کرے گا اور اس لئے یہ کہنا کہ ممبران اسمبلی نے دونوں کے فرق کو محسوس نہیں کیا، قیاس مع الفارق ہے، لیکن مولانا کا مقصود یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر بجائے نکاح کے مباشرت کے لئے وقت کی تعیین کردی جاتی تو انہیں کچھ عذر نہ ہوتا لیکن غالباً مولانا کو معلوم نہیں کہ ۱۳ سال سے کم عمر کی لڑکی سے مباشرت تو پہلے ہی سے تعزیرات ہند میں ممنوع ہے۔ ضرورت تو اس کی تھی کہ ایسے نکاح ہی کو ناجائز قرار دیا جائے جس سے قبل از بلوغ مباشرت کا نہ صرف امکان بلکہ وقوع ہوا کرتا ہے۔ میں مولانا سے دریافت کرتا ہوں کہ اگر تیرہ سال کی لڑکی سے کسی کی شادی ہوجائے تو کیا اسکا شوہر اس کو اپنے گھر نہیں لے جاسکتا اور اگر وہ لیجا سکتا ہے تو پھر اس کا یقین کس کو ہوسکتا ہے کہ وہ اس کے ساتھ مباشرت نہ کریگا، جبکہ سیکڑوں واقعے چھ چھ سات سات سال کی لڑکیوں کے عصمت دری کے موجود ہیں۔ چنانچہ بالکل حال کا واقعہ ہے کہ ایک شخص حمید اللہ نے حیدرآباد میں اپنی کمسن بیوی سے مقاربت کرکے اس کو ہلاک کرڈالا۔ اگر مولانا کے پاس کوئی ایسا ذریعہ ہے کہ وہ نکاح کے بعد لڑکی کی رخصتی کو روک سکتے ہیں یا رخصت ہونے کے بعد اس کے شوہر کو مقاربت سے باز رکھ سکتے ہیں، تو

براہ کرم پہلے اس کو بتائیں تاکہ اسپر غور کیا جائے ورنہ یوں تو وہ خرابی دور نہیں ہوسکتی جس کو وہ خود بھی ظلم سے تعبیر کرتے ہیں اور شریعت کے نقطۂ نظر سے ناجائز۔

امر دوم کے متعلق بصد ادب یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ مولانا نے یا تو قصداً کتمانِ حقیقت سے کام لیا ہے یا یہ کہ انہیں حقیقت کا علم نہیں۔ جناب تصدق احمد خاں صاحب شروانی نے جو اعداد و شمار کمسنی کی شادی کے مسلمانوں میں پیش کئے ہیں، وہ نہ صرف یہ کہ ہندوؤں کے قریب قریب ہیں بلکہ کہیں ان سے زیادہ زاید ہیں۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ مولانا کی زبان میں "شاذ و نادر" کا استعمال "کثرت اعداد" کی کس حد تک استعمال ہوتا ہے۔

امر سوم میں مولانا فرماتے ہیں کہ مباشرت کا جواز شریعت اسلامیہ میں "مشکل" ہی سے ملسکتا ہے، اگر "مشکل" کے معنے نفی مطلق کے ہیں تو خیر، اور اگر اس کا مطلب ہو کہ ضرورت کے وقت کوئی مولوی اپنے لئے یا کسی اور کے لئے اس کو جایز قرار دے سکتا ہے۔ تو براہ کرم اس طریق استدلال سے آگاہ فرمائیے۔

امر چہارم میں مولانا نے اسی ذہانت سے کام لیا ہے جس کا میں شیفتہ ہوں۔ یعنی مولانا نے "مباشرت قبل از بلوغ" کے رواج و عمل کے انکار کی ذمہ داری خود اپنے سر نہیں لی ہے، بلکہ اس باب میں اپنے اختیارات مس میو کو دیدیے ہیں۔ یعنی مولانا خود تو انکار نہیں کرتے لیکن جب مس میو نے کہیں اس کا ذکر نہیں کیا تو انہیں کیا پڑی ہے کہ وہ خود اس راز کو افشا کریں۔

آگے چلکر مولانا فرماتے ہیں:۔

"چونکہ بلوغ مزاج، آب وہوا کے لحاظ سے ہر ملک و ہر صنف میں مختلف عمر میں ہوتا ہے اس لئے اسلام نے کوئی عمر مقرر نہیں کی بلکہ صرف بلوغ پر مدار رکھا، البتہ نکاح ہر عمر میں جایز ہے۔ اس میں یہ حکمت ہے کہ بعض اوقات ہر ملک، ہر شہر، ہر خاندان میں ایسے حالات پیش آجاتے ہیں یا آسکتے ہیں۔ جن کے سبب لڑکی کے متعلق ۱۴ سال سے قبل اور لڑکے کے لئے ۱۸ سال سے قبل تنظیم مال و حفاظت احوال، و اصلاح مآل کی خاطر ایسی ضرورتیں ناگزیر ہوجاتی ہیں کہ اگر ان کا نکاح اس وقت نہ کردیا جائے تو انکی زندگیاں برباد، خاندانی میراث و املاک ضائع یا ان کے ناموس تباہ ہوجانے کا خطرہ ہوتا ہے۔ انگریزی قانون کے ہمہ گیر حول میں شرع اسلامی کے جو چند در باقی رہ گئے ہیں وہ نکاح، مہر، طلاق، وقف وغیرہ کے ہیں سارد ایکٹ ان سب پر غارتگری کا پہلا حملہ ہے اس قانون کے نافذ ہونے کے بعد کیا ضمانت ہے کہ اسلامی تعداد ازدواج کے بھی خلاف قانون نہ پاس کرلیا جائے گا، اور پھر اس کے بعد خلع و طلاق کا قانون بھی انگریزی یا ہندی مزاج کے مطابق نہ بنایا جائے گا۔"

یہ بالکل صحیح ہے کہ بلوغ کی عمر متفاوت ہوتی ہے، لیکن یہ بھی غلط نہیں کہ ہندوستان میں اکثر و بیشتر ۱۴ سال کی عمر میں لڑکی جوان ہوجاتی ہے اس لئے قانون کا نفاذ شاذ مثالوں کے لئے نہیں رد کیا جاسکتا۔ قانون میں ہمیشہ اکثریت و صلاحیت کو دیکھا جاتا ہے، یعنی یہ کہ کسقدر صورتیں کیا پیش آتی ہیں اور بہترین ممکن طریقہ کسی امر کے طے کرنے کا کیا ہے۔ دنیا میں کوئی قانون اس دعوے کے ساتھ پیش نہیں کیا جاتا کہ اسمیں

کوئی مستثنےٰ نہیں ہو سکتا، یا یہ کہ اس میں کسی قسم کا کوئی تنقص نہیں نکل سکتا، بلکہ مدعا صرف یہ ہوتا ہے کہ حالات حاضرہ میں بہترین صورت کو اختیار کیا جائے اور اکثریت کو ملحوظ رکھا جائے۔ اس لئے مولانا کی یہ دلیل تو کسی طرح قابل قبول نہیں ہو سکتی۔ اب رہ گیا سوال مصالح کا، سو وہ بھی تجربہ کرنے کے بعد کچھ نہیں رہتے۔ زیادہ صاف الفاظ میں گویا مولانا یہ کہنا چاہتے ہیں کہ بعض صورتیں ایسی ہوتی ہیں کہ اگر لڑکی کی شادی کمسنی میں نہ کردی جائے تو جائداد تباہ ہو جاتی ہے۔ اور کبھی اس کا اندیشہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی عصمت نہ کھو بیٹھے۔ اول تو میری سمجھ میں کسی طرح یہ بات نہیں آتی کہ کمسنی کی شادی اور تحفظ جائداد میں باہم کیا علاقہ ہے۔ اس کی ایک مثال زیادہ سے زیادہ یہ فرض کی جا سکتی ہے کہ ایک شخص بستر مرگ پر ہے اور اس کی کمسن لڑکی غیر منکوحہ ہے وہ چاہتا ہے کہ کسی سے اس کی شادی کردوں تاکہ جائداد تباہ نہ ہو۔ فرض کیجئے کہ ایسے شخص کو کوئی شخص شادی کے لئے نہیں ملا تو وہ کیا کرے گا، یا یہ کہ بجائے لڑکی کے کمسن لڑکا ہے تو وہ کیا صورت تحفظ جائداد کی اختیار کرے گا۔ عام طور پر یہی دیکھا جاتا ہے کہ جائداد کسی ولی کے سپرد کردی جاتی ہے۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ وہ کمسن لڑکی بھی ولی کے سپرد نہ کی جائے اور وہ بعد بلوغ اس کے نکاح کا فیصلہ کرے۔ لیکن اگر ہم اس کو تھوڑی دیر کے لئے مان بھی لیں تو میں یہ سوال کروں گا کہ ہزار میں کتنے مسلمان صاحب جائداد ایسے ہوتے ہیں جو اپنے بچوں کو کمسن چھوڑ کر مرتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ ۲۰ فرض کر لیجئے۔ پھر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مولانا ہزار میں ۲۰ کی رعایت تو ان کی دولتمندی کی وجہ سے کرتے ہیں لیکن ۹۸۰ کا تباہ ہونا گوارا کر لیتے ہیں اس لئے کہ ان کے پاس جائداد نہیں ہے۔ رہا سوال حفاظت عصمت کا سو یہ اس سے بھی زیادہ مہمل ہے۔ کیونکہ خیال عصمت منحصر ہے زیادہ تر تربیت پر۔ اگر لڑکی کی تربیت اچھی ہے تو اس کا اندیشہ نہیں۔ ورنہ بعد بلوغ و قبل بلوغ دونوں طرح اندیشہ رہتا ہے۔ اگر کوئی لڑکی گیارہ سال میں بالغ ہو گئی تو اس کی طرف سے یہ اندیشہ کرنا کہ ممکن ہے وہ عصمت کی حفاظت نہ کرے، اتنا زیادہ قرین قیاس نہیں ہے جتنا شادی کرنے کے بعد تنہا چھوڑ دینے سے۔ پھر یہ اکثر ہوتا ہے کہ شادی کر کے شوہر اپنی جوان عورت کو گھر پر چھوڑ جاتا ہے اور خود مہینوں بلکہ برسوں کے لئے باہر بسلسلۂ ملازمت و تجارت غائب رہتا ہے۔ اس لئے مولانا بتائیں کہ شرع میں کہاں اس کی ممانعت ہے۔ اور کیوں نہ ان کے نقطۂ نظر سے ایک اور قانون "امتناع ہجر الزوجہ بعد النکاح" نافذ کیا جائے۔

اسی کے ساتھ مولانا نے یہ اندیشہ ظاہر کیا ہے کہ آگے چلکر نکاح۔ خلع۔ طلاق، وراثت وغیرہ کی اسلامی شریعت پر حملہ نہ کیا جائے۔ اس کا جواب تو میرے پاس صرف یہ ہے کہ "خدا وہ دن تو کرے" البتہ "تعدد ازدواج" کے باب میں جو اندیشہ مولانا کو ہے اس سے میں اختلاف نہیں کروں گا، کیونکہ اگر ایسا ہو گیا تو پھر "غریب مولوی" مر جائے گا، اور اس کی وہ تمام کارگاہ خیال جس کو سامنے رکھکر فردوس کی موعودہ حوروں کی یاد میں چار چار شادیاں کرنے پر بھی اپنی ہوس کی پوری صیقل نہیں کر سکتا، بالکل درہم برہم ہو جائے گی۔ اور یہ سانحہ اس کے "حیات نشاط" اور "نشاط حیات" دونوں کے لئے کسی طرح قابل برداشت نہ ہوگا۔

یہاں تک تو ہو گئی عقلی بحث، اب آئیے اس سلسلہ میں قرآن مجید کو بھی دیکھیں کہ اس مسئلہ میں کیا فرمان ہے۔

کلام مجید میں نکاح کا ذکر چند جگہ آیا ہے اور ان میں کوئی مقام یا کوئی آیت ایسی نہیں ہے جس سے صغر سنی کی شادی کی اجازت پیدا ہوتی ہو بلکہ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ وہاں بلوغ سے قبل کی شادی ممنوع قرار دی گئی ہے، اور اس وقت تک جتنے نکاح مولویوں نے قبل از بلوغ کئے ہیں وہ سب ناجائز تھے۔ سورہ الروم میں نکاح کی غرض و غایت کو جن صریح الفاظ میں ظاہر فرمایا گیا ہے، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ

مذہب اسلام نے فلسفۂ نکاح کو کیا سمجھا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:۔

ومن آیاتہ ان خلق لکم من انفسکم ازواجا لتسکنوا الیھا وجعل بینکم مودۃ ورحمۃ

یعنے خدا نے تمہارے لئے جوڑے اس لئے پیدا کئے ہیں کہ تم ان سے جی کا سکون پاؤ اور آپس میں خلوص و محبت کا رابطہ پیدا ہو۔

ظاہر ہے کہ اس فلسفہ سے بہتر کوئی فلسفۂ نکاح پیش کیا جا سکتا ہے اور نہ کوئی مسئلہ ازدواج اس اصول سے ہٹ کر مرتب ہو سکتا ہے۔ پھر غور کیجئے کہ آیا کمسنی کی شادی میں یہ کیفیت باہم پیدا ہو سکتی، کیا نابالغ بچے اس راحت قلب اس سکونِ جاں اور اس لذتِ اتحاد کو سمجھ سکتے ہیں جس کا ذکر کلام مجید میں کیا گیا ہے۔

سورۂ نساء میں ارشاد ہوتا ہے:۔ فانکحوا ما طاب لکم من النساء" یعنی ان عورتوں سے جو تمہارے دل کو بھائیں نکاح کرو" ظاہر ہے کہ ایک مرد کے دل میں عورت کی طرف میلان بلوغ کے بعد ہی ہو سکتا ہے اور ایک عورت بالغ ہونے کے بعد ہی پسندیدگی کے قابل ہوتی ہے۔

اس صورت میں یتامیٰ کے متعلق ارشاد ہوتا ہے کہ:۔

وابتلوا الیتامیٰ حتیٰ اذا بلغوا النکاح فان آنستم منھم رشدا فادفعوا الیھم اموالھم یعنی یتامیٰ کی نگرانی کرو اس وقت تک کہ وہ بالغ ہو جائیں اور اگر تم دیکھو کہ وہ ذی شعور ہو گئے ہیں تو ان کا مال ان کے حوالہ کر دو۔

غالباً یہ معلوم کر کے لوگوں کو حیرت ہوگی کہ ابو حنیفہ نے بلوغ کی عمر اٹھارہ سال قرار دی ہے، جو آج مردوں کے لئے ساردا بل میں تجویز کی گئی ہے۔

کلام مجید میں ایک آیۃ اور ہے جس سے نابالغ لڑکی کے ساتھ شادی کرنے کی ممانعت ظاہر ہوتی ہے ملاحظہ ہو:۔

یا ایھا الذین آمنوا لا یحل لکم ان ترثوا النساء کرھا۔ اے ایمان والو تمہارے لئے کسی طرح جائز نہیں کہ جبر و اکراہ سے عورتوں کے وارث بن جاؤ۔ یعنی مدعا یہ ہے کہ عورتوں کی اجازت حاصل کر کے ان کی مرضی و خوشنودی سے ان کے شوہر و وارث بنو اور ظاہر ہے کہ ایک نابالغ لڑکی اس کی اہل ہی نہیں ہے کہ وہ اپنی رضامندی کا اظہار کر سکے۔ اس میں اتنی سمجھ ہی نہیں ہوتی کہ وہ اچھے برے میں تمیز کر کے اپنے شوہر یا وارث کا انتخاب کرے۔ اسی لئے اس آیت کے نزول کے بعد اسلام میں کوئی نکاح نابالغ لڑکی سے عمل میں نہیں آیا۔

امام سرخسی نے ذیل کی آیت سے نکاح صغیرہ کا جواز ثابت کیا ہے:۔ واللائی یئسن من المحیض من نسائکم ان ارتبتم فعدتھن ثلثۃ اشھر واللائی لم یحضن۔

طلاق کے سلسلہ میں عدت کا بیان ہوتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے کہ جو عورتیں کبر سنی کی وجہ سے حائضہ نہیں ہوتی ہیں یا جن کو حیض ہی نہیں آتا ہے انکی عدت تین ماہ ہے۔

اگر اس کو تسلیم کر لیا جائے کہ واللائی لم یحضن سے نابالغ لڑکیاں ہی مراد ہیں اور وہ عورتیں مراد نہیں جن کا کسی بیماری کی وجہ سے

حیض بند ہو جاتا ہے، تو بھی اس آیت سے صغیرہ کے نکاح کا جواز ثابت نہیں ہو سکتا، کیونکہ یہ آیت ان نکاحوں کے متعلق نازل ہوئی تھی جو اس سے قبل کی آیت نازل ہونے سے پہلے عمل میں آچکے تھے اور اس لئے اس سے نکاح صغیرہ کا جواز ثابت نہیں ہوتا۔

کلام مجید کے ساتھ جب احادیث پر غور کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ نے نکاح کے لئے عورت کی اجازت کو بہت ضروری قرار دیا ہے اور ظاہر ہے کہ طلب اجازت صغیرہ سے نہیں ہو سکتا، بلکہ وہ بالغ لڑکی سے ممکن ہے۔ چونکہ اس قسم کی متعدد روایات تمام مشہور کتب حدیث میں باب النکاح کے تحت پائی جاتی ہیں، اس لئے ان کے اندراج کی ضرورت نہیں۔ من شاء فلیرجع الیہ

نکاحِ صغیرہ کے جواز میں لوگوں نے جناب عایشہ کے واقعۂ نکاح کو پیش کیا ہے، حالانکہ اصولاً اس سے استناد صحیح نہیں کیونکہ رسول اللہ کا نکاح جناب عایشہ سے قبل اس آیت کے نزول کے ہو چکا تھا جس میں طلب اذن کو ضروری قرار دیا گیا ہے۔ اور اس کی صورت بالکل وہی تھی جیسی تعدد ازدواج کی تعیین کی کہ اس کی آیت بھی رسول اللہ کی متعدد شادیاں ہو جانے کے بعد نازل ہوئی۔

پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ مسئلہ جس کی تصدیق میں قرآن کے احکام صراحۃً موجود ہیں، جس کے باب میں احادیث کی تائید موجود ہے۔ جو طبّاً، تمدناً، اور اخلاقاً ہر طرح مستحسن قرار دیا جاتا ہے، اس سے اختلاف کرنا اور اختلاف بھی ایسا شدید کہ معلوم ہوتا ہے مولویوں کے سر پر کوئی پہاڑ آسمان سے ٹوٹ پڑا ہے، کس عجیب و غریب ذہنیت کا نتیجہ ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس قانون سے خود مولویوں کی تمناؤں اور آرزوؤں پر پانی پھر جاتا ہے، اور ان کی مخالفت اصلاح معاشرت نہیں، بلکہ خود اپنے جذبات کی رعایت پر مبنی ہے

وائسرائے نے جو جواب ڈپوٹیشن کو دیا ہے وہ اسقدر عاقلانہ مدبرانہ بلکہ مولویانہ ہے کہ شاید ہی اس سے بہتر مسکت جواب کوئی ہو سکتا ہے، لیکن مولوی جو قیامت تک نہیں سمجھ سکتا کہ مذہب و شریعت میں کیا فرق ہے، جو مذہب و قوم میں کبھی تمیز نہیں کر سکتا، جس کا ذہن کبھی اس قدر بلند نہیں ہو سکتا کہ وہ سیاسیات کو مذہبیات سے متمایز کر سکے، اس کی سرگی پیشانیاں بالکل حق بجانب ہیں اور اس کا چراغ پا ہونا اس کا فطری تقاضہ۔

بہرحال اب یہ قانون تو مکمل ہو چکا اور دنیا کی کوئی معمولی قوت اس کو منسوخ نہیں کرا سکتی تاوقتیکہ کوئی غیر معمولی مظاہرہ یا سخت خطرناک اجتماع نہ کیا جائے۔ اس لئے میں تمام مولویوں کو جو اس قانون کے مخالف ہیں بتا دینا چاہتا ہوں کہ محض جلسوں ریزولیوشنوں، تاروں اور ڈپوٹیشنوں سے کبھی کامیابی نہیں ہو سکتی۔ بلکہ اس کے لئے ضرورت ہے قربانیوں کی اور یہی چیز ایسی ہے جو آپ کے پاس موجود نہیں۔

اگر سارد ابل واقعی مداخلت فی الدین ہے تو اس سے زیادہ نازک وقت اور کیا آئے گا، کیوں نہیں علماء کرام احتجاجاً فاقے کرنا شروع کر دیتے اور اگر فاقے ممکن نہیں تو کم از کم تو مرغ پلاؤ ترک کر کے "نانِ جویں" ہی پر قناعت کریں کہ کسی طرح تو حکومت کو معلوم ہو جائے کہ جو

گروہ اس قانون کی مخالفت پر آمادہ ہے وہ زیادہ نہ سہی "باندازۂ سر سوزن" ہی تکلیف اٹھانے کے لئے تیار نظر آتا ہے۔ یہ صورت نفاذ سے قبل اختیار کرنی چاہئے۔ اور جب اپریل ۱۹۳۰ء میں اس کا نفاذ ہو جائے تو پھر "قانون شکنی" کرنا چاہئے اور ہر مولوی کو کم از کم چار چار شادیاں نابالغ لڑکیوں کے ساتھ کر کے "قید و بند" کی تکالیف برداشت کرنا چاہئے۔ اسکا نتیجہ جو کچھ ہو لیکن ایک فائدہ تو یقیناً حاصل ہو جائے گا اور وہ یہ کہ جس وقت تمام مولوی قانون شکنی کی پاداش میں جیل بھیجدئے جائیں گے تو کم از کم اتنی مدت کے لئے ضرور دنیا میں امن و سکون پیدا ہو جائے گا اور عالم انسانیت اس عذاب سے چھٹکارا پاکر چند دن تک تو آزادی کی سانس لے سکے گا

ترانہ

فتح کابل

ساقی! دردودے! بر جام و ساغر! مطرب! سرودے! با لحنِ خوشتر!
آمد نویدے، چون گل معطر! کز فضل حق شد، نادر مظفر!
وز تیغ او گشت کابل مسخر! اللہ اکبر! اللہ اکبر!!

یک چند کابل! وقف ستم شد! افغانیان را، دل صرفِ غم شد!
ہر قلبِ حساس، صیدِ الم شد! وامروز آخر، دل شاد ہم شد!
از فتح نادر شیر دلاور! اللہ اکبر! اللہ اکبر!!

یک چند ملت! مدہوش گشتہ! در قعرِ ذلت! روپوش گشتہ!
با شیر قالین ہمدوش گشتہ! بر جور سقا، خاموش گشتہ!
برداشت آخر! تیغِ دو پیکر! اللہ اکبر! اللہ اکبر!!

شیرانِ افغان! خوابیدہ ماندند! دلہائے ملت! ترکیدہ ماندند!
بر خاک پستی، غلطیدہ ماندند! در قلب ظلمت، رنجیدہ ماندند!
آخر، عیان شد، صبح منور! اللہ اکبر! اللہ اکبر!!

از غیب آمد، یک مردِ سنگی! افرشتہ پیکر، با روحِ جنگی!

از سطوت او، دل چاک، زنگی! وز ہیبت او، لرزان فرنگی!
ضرغام پر دل، شمشیر دلاور! اللہ اکبر! اللہ اکبر!!

بالا بلندے! روئین قبائے! دارا شکوہے! خسرو ادائے!
تیمور تمثال! رستم نمائے! نادر مثیلے! نادر لقائے!
شمشیر درکف! صمصام دربر! اللہ اکبر! اللہ اکبر!!

از خاک مغرب! آمد چو طوفان! با چشم پر خون! با روح سوزان!
از درد ملت! با قلب بریان! درکف نمایان! شمشیر عریان!
گوئی درخشان! صمصام داور! اللہ اکبر! اللہ اکبر!

غمخوار ملت! او را چو دیدند! شیران افغان! از جا جہیدند!
چون رعد و باران! یک یک رسیدند! تیغ از نیام، روئین کشیدند!
تیغے! چہ تیغے! یک برق مضطر! اللہ اکبر! اللہ اکبر!!!

با فوج احرار! نادر برون شد! قوم و وطن را، او رہنمون شد!
دلہائے اعدا، در سینہ خون شد! افواج سقا! زار و زبون شد!
وز دست او شد، کابل مسخر! اللہ اکبر! اللہ اکبر!!

تخت امانی! آباد بادا!! شمشیر نادر! آزاد بادا!!
شاہ ولی خان! دلشاد بادا!! اعدائے محمود، برباد بادا!!
کز تیغ شان گشت، ملت مظفر! اللہ اکبر!!! اللہ اکبر!!!

محمود شیرانی

ایک تصویر دیکھکر!

یہ حسنِ نازنین! یہ جلوۂ ناز آفرین تیرا!

یہ معصومانہ چہرہ! غنچۂ شاداب کا عالم!

یہ مستانہ نگاہین! اک بہشتی خواب کا عالم!

سراپا، اک خیالِ حور! جسمِ نازنین تیرا!

مجسم، خندۂ خوابِ پری، روئے حسین تیرا!

یہ موتی، یہ جبین، یا انجم و مہتاب کا عالم!

پریشان خواب کا سا، گیسوئے شبتاب کا عالم!

سراپا، اک شعاعِ نور، عکسِ دلنشین تیرا!!

تو از سرتا بہ پا، اک نکہت و تنویر ہے سلمیٰ!

شراب و شعر و موسیقی کی، پنہان تجھ مین، رنگت ہے!

مرے خاموش دل مین موجزن تیری محبت ہے!

بہار اور خواب کا ہیکل! تری تصویر ہے سلمیٰ!

ادا، اس طرح، فرضِ "رونمائی" کچھ تو کر جاؤن!!

تری تصویر، سینے سے لگا لون، اور مر جاؤن!!!

اختر شیرانی

کر دیتے ہین محو آکے دل مین — بس جاتے ہین راہ پا کے دل مین
یون اڑتی ہے چھو کر ہر چمن کو — باقی نہین رنج اور محن کو
اور دیکھ کے تو یہ گل طرازی — گاتی ہے نوائین تازی تازی
غم ہے نہ کہین فسردگی ہے — تیرا یہ اصولِ زندگی ہے

شمیمی - بی - اے

ایک دوست کی موت سے متاثر ہو کر

کوئی روتا ہے سرِ گورِ غریبان ہائے ہائے — رات کو یہ عالم شہرِ خموشان ہائے ہائے
ہے کھنچی آنکھون مین تصویرِ گلستان ہائے ہائے — نو گرفتارون کی پہلی شام زندان ہائے ہائے
پیچھے پیچھے موت ہے آگے خدا کا نام ہے — کاٹتا ہے یون کوئی راہِ بیابان ہائے ہائے
رک چلی ہے بادِ صرصر ہو کا عالم ہو چلا — دشت مین وہ آمدِ شامِ غریبان ہائے ہائے
یاد آتی ہین کسی شوریدہ سر کی وحشتین — دیکھکر گل کاریِ دیوارِ زندان ہائے ہائے
ایک سناٹے کا عالم تھا در و دیوار پر — میرے مرنے پر وہ پہلی شام زندان ہائے ہائے
اے ہوائے فصلِ گل تیری شرر انگیزیان — باغ مین ہر گل ہے شعلہ در گریبان ہائے ہائے
نور کا عالم تھا جوشِ مے سے میخانے مین رات — وہ چھلکتے جام وہ بزمِ چراغان ہائے ہائے
مرنے والے خاک ویرانون مین اڑتی ہے ترے — بادِ صرصر ہے تری گہوارہ جنبان ہائے ہائے
یہ گھڑی بھی آئی اور جیتا ہون مین فرقت نصیب — چھوٹتا ہے ہاتھ سے دامانِ جانان ہائے ہائے
ہم فریبِ حسن سے بیزار کیون ہون اے فراق — بھول جائین کیا کسی کے عہد و پیمان ہائے ہائے

فراق گورکھپوری

نیند

دامنِ شمشیر مین کس لطف سے آتی ہے نیند — کوئی ٹکڑا خلد کا گویا اٹھا لاتی ہے نیند
کانپ جاتے ہین ستارے عشق کی فریاد سے — حسن کی دنیا مین جب ہر سمت چھا جاتی ہے نیند
کار فرما کس کے جذبِ عشق کی تاثیر ہے — اے خدا مجھ کو کہان ہر روز لے جاتی ہے نیند
آہ جب بیداریون مین بھی سرورِ خواب تھا — یاد آجاتی ہین وہ راتین تو اڑ جاتی ہے نیند
ساری دنیا مین ہے جس بیداد گر کا نام موت — تیرے کوچے مین جو آجائے تو کہلاتی ہے نیند
صبح تک دنیا کا کس کو ہوش رہتا ہے نظیر — رات بھر گویا شرابِ ناب برساتی ہے نیند

اصغر حسین نظیر لودھیانوی

مشاہدات وارادات

اک شاعر شہرت یافتہ نے کل بزم سخن مین نظم پڑہی
اس طرح کہ پوری محفل مین ہنگامۂ تحسین برپا تھا
ہر لفظ سے پھوٹ پڑتی تھی، تنویر ضیائے حسن اثر
شاعر کے لبون پر شہرت کا دلچسپ تبسم پیدا تھا
اس نظم کے بعد اب شمع پھری اک اور سخن گو کیجانب
"گمنامی و ناپرسی" جس کی ناشاد جبین پر لکھا تھا
جو اس نے پڑہی اس محفل مین، سرشار لطافت نظم نہ تھی
کہسار کے فردوسی دامن مین، چشمۂ شیرین بہتا تھا
کیا تجھسے کہون کیا داد ملی شاعر کو مگر اس کاوش کی
مین دیکھ کے طرز اہل سخن ہمراز بس اتنا سمجھا تھا

یہ بزم جہانستان حقیقت خود محروم حقیقت ہے
معبودِ خداوندان سخن دراصل خدائے شہرت ہے

(۲)

عقل کو سمجھا ہے تو اسرار عالم پر محیط | مین تجھے پیغام دیتا ہون کہ غافل ہوشیار
تیری منزل ہے، فریبستان اوہام و قیاس | خود حجاب چشم ہے جس مین جمالِ آشکار
[illegible]ہی کی ہے موجودات عالم پر نظر | اے رہینِ شبنم و ناواقفِ ابر بہار
دیکھتا ہو، خواب سے جس طرح کوئی چونک کر | جسکی آنکھون مین ہو گہری نیند کا باقی خمار

جسکو دہندلے سے نظر آئین مناظر گرد و پیش
اور اس موہوم بینش، پر اُسے ہو اعتبار

سید علی اختر - اختر

ایک شاعر کا انجام

مُصنفہ نیاز فتحپوری

اڈیٹر نگار کا سب سے پہلا افسانہ حسن و عشق، حسین تخیل کی بلندی، ندرت تحریر، اسلوب بیان اور ندرت انشاء کے ایسے ایسے پاکیزہ نمونے موجود ہیں جو ساحری کی حد تک پہونچتے ہیں۔ جوش محبت کے جذبات جس مستانہ پن سے اس تصنیف میں ظاہر کئے گئے ہیں اسکا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ یہ افسانہ جناب نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا ہے۔

قیمت مع محصولڈاک ۱۲ار "مینجر نگار۔ لکھنؤ"

جذبات بھاشا

مصنفہ نیاز فتحپوری

ہندی شاعری میں جو لوچ اور کیفیت ہے، اس کا علم انہیں کو ہو سکتا ہے جنہوں نے اس زبان کی شاعری کا مطالعہ کیا ہے اس کتاب کو دیکھئے اور جذبات و خیال کی پاکیزگی کی داد دیجئے۔

قیمت فی جلد........ ۱۲ار

"مینجر نگار۔ لکھنؤ"
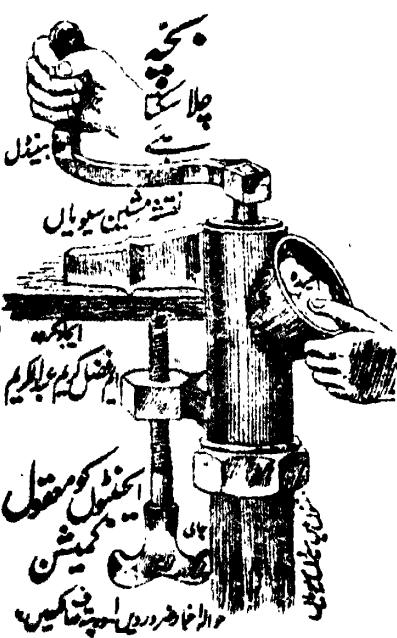
تصانیف مولانا نیاز فتحپوری
صحابیات
نگارستان
زیر طبع ہے
شہاب کی سرگزشت
جذبات بھاشا
فلسفۂ مذہب
جو رسالہ نگار میں شائع ہو چکا ہے زیر طبع ہے